شہیدِ اعظم ؑ
حصہ اوّل
یعنی
حضرت امام حسین علیہ السلام کی سوانحِ عمری
مؤلفہ
سیّد ریاض علی ریاض (بنارسی)
مؤلف: "الکرار" و "امامت تاریخی حیثیت سے" وغیرہ
باہتمام ضیاء محمد عباد علی منیجر و مالکان کے
مطبع اکسیر اعظم واقع محلہ مقیم گنج بنارس میں چھپی
ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ مطابق نومبر ۱۹۱۳ء
بار اوّل ایک ہزار
(جملہ حقوق محفوظ بحق مصنف)
قیمت: =/۲۸۰

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان

شہیدِ اعظمؑ

حصہ اول

یعنی

حضرت امام حسین علیہ السلام کی سوانحِ عُمری

مؤلفہ

سیّد ریاض علی ریاض (بنارسی)

مؤلف: "الکرار" و "امامت تاریخی حیثیت سے" وغیرہ

باہتمام ضیاء محمود عباد علی منیجر و مالکان کے

مطبع اکسیر اعظم واقع محلہ مقیم گنج بنارس میں چھپی

ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ مطابق نومبر ۱۹۱۳ء

بار اول ایک ہزار

نام کتاب "شہید اعظمؑ" (حصہ اول)

یعنی حضرت امام حسین علیہ السلام کی سوانح عمری

مؤلفہ سید ریاض علی ریاض (بناری)

مؤلف: "الکرار" و "امامت تاریخی حیثیت سے" وغیرہ

باہتمام ضیاء محمود عباد علی منیجر و مالکان کے

مطبع اکسیر اعظم واقع محلہ مقیم گنج بنارس میں چھپی

تعداد: بار اول ایک ہزار

تاریخ اشاعت: ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ مطابق نومبر ۱۹۱۳ء

اشاعت ثانی: ۱۴۳۰ھ مطابق ۲۰۰۹ء

قیمت: =/۲۸۰ روپے

ملنے کے پتے:

انڈکس ابواب

مقدمہ از صفحہ ۷ تا ۵۰

باب اول از صفحہ ۵۱ تا ۱۵۷

ولادت حسینؑ کے قبل سے رحلت رسولؐ تک (رسولؐ کی تعمیرانہ مصلحت)

بابؑ اول کا خلاصہ (واقعات کا نشو) از صفحہ ۱۵۸ تا ۱۷۳

بابؑ دوئم از صفحہ ۱۷۴ تا ۲۰۶

رسولؐ کی تعمیرانہ مصلحت کا انہدام (مجابل)

اہلبیتؑ اور ان کے مؤیدین حقوق پر دھاک بیٹھلانے کی کوشش

اہلِ بیتؑ پر بیعت کا تشدد، بیعتِ سقیفہ کی نیت، بڑی جماعتیں، اور بیعتِ ابوبکر، واقعۂ فدک، مانعینِ زکوٰۃ کا قتل، شرکائے دفنِ رسولؐ کے نام۔ جناب امیرؑ رحلتِ رسولؐ کے بعد حضرت فاطمہؑ کا اثرِ غم، طاہرہؑ کی علالت اور مخاطبہ، سیدہؑ کی وصیتیں اور رحلت، حسنینؑ، دفن، قبر، علیؑ مرثیہ کہتے ہیں۔ حافظ نذیر احمد صاحب کے بعض خیالات۔

بابؑ دویم کا خلاصہ (واقعاتؑ کا نشو) از صفحہ ۲۰۷ تا ۲۲۶

شرح و تنقید واقعات۔

بابؑ سیوم

رسولؐ اور اہلبیتؑ کے نام و حقوق وغیرہ کے زائل کرنے کی کوششیں (غفلت) از صفحہ ۲۲۷ تا ۲۵۹

عاملین توجہ عمال، علیؑ کی غیر مخالفانہ روش، خلیفہ کا انتخاب، ایک فطری سوال، علیؑ انتخاب کے متعلق، خلیفہ ثانی اور عمال کی تقرری، عمر کا خطبہ اور حسینؑ ترتیب دیوان، مقدمۂ زنا معاویہ دمشق کا عامل، دورِ ثانی کے بعض عمال، حضرت شہربانو، شیریں، تقسیم غنیمت اور حسینؑ، خمس، بنوہاشم اور عہدے، عمر اور عباس کا مکالمہ، شعائر اللہ کی تعظیم، آرائشِ کعبہ، رسولؐ کا یادگار درخت، روایت حدیث کا انسداد، ایک خطبہ، ابا حصہ کا قاتل۔

بابؑ چہارم از صفحہ ۲۶۰ تا ۲۹۲

مرکزی خلاف ورزیوں کی ترقی اور اس کا اثر

خلیفۂ ثانی کا مقرر کردہ اصولِ انتخاب، طریقۂ انتخاب کے متعلق علیؑ اور عباس، ابن عوف کی کارگزاری، بنی امیہ اور عثمان کا انتخاب، مقداد اور ابن عوف کی گفتگو، انتخابِ عثمان کے متعلق علیؑ اور مورخینؒ، ابوسفیان اور حسینؑ، عثمان کا پہلا خطبہ، قتل ہرمزان، عمال کا تقرر و تبدل، مسلمان سپاہیوں میں غنیمت کے لیے جنگ۔ حسینؑ اور افریقہ، مالِ غنیمت اور مروان، ابن عاص کا عزل، فتح قبرص، ولید کی شکایت، ندامہ ثالث وغیرہ، طبرستان اور حسینؑ، احراقِ مصاحف، خلیفہ گر اور خلیفہ، جناب امیرؑ اس زمانہ کے متعلق، اصحابِ رسولؐ کا وفد، عمار کے ساتھ برتاؤ۔ ابوذر کا شام اور مدینہ سے اخراج، رحلت ابوذر، سعید کا طرزِ عمل، مالک اشتر کی جلاوطنی، شکایتی وفود، مشورہ، اہلِ کوفہ کی صلاح، اہلِ کوفہ کے نام خلیفہ کا خط اور اس کا جواب، رسولؐ کی انگوٹھی، عام شکایات اور جناب امیرؑ کی وساطت، خلیفہ کی تقریر، صلاح اور معاویہ، مصر کا وفد خلیفہ کا محاصرہ، محمد ابن ابی بکر کی تقرری اور قتل کا فرمان، اصحاب پر اس کا اثر، مقدمہ، جماعت کو عزل کا اختیار نہ دینے کے لیے ابن عمر کی صلاح، علیؑ کی سفارت کا اثر اور پھر خلیفہ اور مروان کا طرزِ عمل، علیؑ کنارہ کشی کا عہد کرتے ہیں۔ وفود کے تصفیۂ کن شرائط، خلیفہ اور محاصرین کا مکالمہ، علیؑ نے پانی بھیجا، حضرت عائشہ حج کے لیے روانہ ہوئیں۔ طلحہ اور عثمان، حسنینؑ محافظ در، محمد ابن ابی بکر اور عثمان، رحلت، اہتمام، اس وقت کے عمال۔

بابؒ چہارم کا نشو اور واقعاتؒ کا خلاصہ از صفحہ ۲۹۳ تا ۳۲۲

شرح و تنقید واقعات

بابؒ پنجم از صفحہ ۳۲۳ تا ۳۶۴

رسولؐ کے بعد کے نظام کا سکون اور دوبارہ حرکت

علیؑ کی خلافت کے لیے بلا فصل خواہش کی مثال، خلافت کی پیش کش اور علیؑ، مخالفین بیعت، علیؑ کی بیعت کے واقعات، تقسیم بیت المال اور مساوات برتے جانے کی شکایت، تخلف اور اس کی وجہ، معاویہ اور دریافت حالات، بنی اُمیہ شام جانے لگے۔ طلحہ و زبیر بصرہ اور کوفہ کی حکومت طلب کرتے ہیں۔ عائشہ رحلت عثمان اور خلافت علیؑ سن کر تہیہ خروج، امامت نماز کا جھگڑا اور تصفیہ، حضرت اُمّ سلمہؓ اور عائشہ۔ ابوموسیٰ اور بیعت علیؑ، علیؑ کے عمال کی روانگی، شام کے قاصد کا بیان، شورش کی خبریں اور علیؑ۔ بنی اُمیہ اور اصحاب جمل میں اختلاف، اصحاب جمل اور بصرہ۔ جناب امیرؑ کی روانگی، علیؑ کے قاصد اور ابوموسیٰ، مخبرین علیؑ کوفی مددگار اور علیؑ۔ اصحاب جمل کی آمادگی جنگ، احنف کا سوال، جناب امیرؑ کا خطبہ اور اصحاب جمل کے نام خط، جواب اور سفارت۔ علیؑ کا جنگی خطبہ۔ تعبیہ جنگ، زبیر اور علیؑ، جنگِ جمل، امیر المومنینؑ کا اعلان اور اسرائے جنگ کے ساتھ برتاؤ۔ حضرت عائشہ کے بعض خیالات اور کوششیں، فتح کا اثر، کوفہ۔ معاویہ کی چھیڑ۔ صفین کی تیاری۔ ابن عاص اور معاویہ کا مجھوتہ۔ شرجیل ابن سمط ——— ابن عمر معاویہ کے پاس۔ فوجوں کی روانگی۔ صفین میں جناب امیرؑ کا خواب۔ کنارِ فرات جنگ۔ سفارت، قاتلانِ عثمان کا سوال اور جواب۔ محمدؒ بن حنفیہ کی جنگ، معاویہ کی کوششیں، سخت جنگ اور لشکرِ شام کی حالت۔ علیؑ فیصلہ کن جنگ کے لیے آمادہ ہوئے۔ حیلۂ قرآن۔ جناب امیرؑ فریب سے آگاہ کرتے ہیں۔ لشکر کی مخالفت۔ حکمین کا تقرر۔ فیصلہ اور نوبت جنگ۔ جناب امیرؑ کی وصیت۔ حکمین کا فیصلہ اور جناب امیرؑ کا اعلان۔ خوارج۔ شام کی طرف بڑھنے کا تہیہ اور لشکر کا عذر۔ ولادتِ امام زین العابدینؑ۔ مالک اشتر کی شہادت۔ محمدؒ ابن ابی بکر کی شہادت۔ معاویہ کی سرحدی کوششیں۔ جناب امیر تساہل کے نتائج سے مطلع کرتے ہیں۔ معاویہ سے جنگ کی آخری تیاری۔ امیر المومنین کی شہادت۔ آلِ عبد المطلبؑ اور حسنینؑ کو ہدایت۔ ایک قاتل معاویہ کو خبر دیتا ہے۔

بابؒ پنجم کا نشو از صفحہ ۳۶۵ تا ۳۹۹

واقعات کی شرح۔

بابؑ ششم از صفحہ ۴۰۰ تا ۴۴۰

بنی ہاشم کا دائمی زوال

حسنؑ کی بیعت، معاویہ بیعت لیتا ہے۔ جاسوس، مُراسلات۔ معاویہ کی جنگ کے لیے تیاری۔ حضرت امام حسنؑ کی فوج اور اس کی حالت۔ حسنؑ اور قیس کا کوچ۔ حسنؑ زخمی ہوئے۔ لشکر کی نافرمانی۔ تحریک صلح۔ حسنؑ کا خطبہ۔ قیس ابن سعد۔ شرائطِ صلح۔ معاویہ حسنؑ سے خطبہ کی خواہش کرتا ہے۔ خطبہ۔ عمرو بن عاص اور معاویہ کی تقریر۔ قیس اور معاویہ۔ حسینؑ سے طلب بیعت۔ صلح اور حسینؑ۔ حسنؑ سے صلح کے متعلق سوال و جواب۔ ابن بشر اور حسینؑ۔ اہل بصرہ۔ صلح کے متعلق حسنؑ کا مزید جواب۔ بنی امیہ حضرت امام حسنؑ کو توہین کرنے لیے بلاتے ہیں۔ شہادت حسنؑ۔ حسینؑ زہر دینے والے کا نام پوچھتے ہیں۔ دفنِ حسنؑ۔ معاویہ کو اطلاع اور اس کی حالت۔ حسنؑ کا مرثیہ۔ علیؑ کے دوست اور معاویہ۔ زیاد، زیاد اور شیعیان علیؑ۔ حجر ابن عدی۔ عمرو ابن الحمق۔ دیگر شہداء۔ حجر کے خلاف مقدمہ۔ شہادت حجر۔ حسینؑ اور معاویہ کی خط و کتابت۔ شہدائے احد کی قبریں۔ ولی عہدی یزید کی کوشش۔ مکہ میں حسینؑ کا خطبہ۔ حسینؑ اور قسطنطنیہ۔ معاویہ اور حسینؑ میں سختی سے گفتگو۔ معاویہ کے اعلان بیعت کے متعلق لوگوں کو حسینؑ کا جواب۔ ابن خالد اور عائشہ کی رحلت۔ معاویہ کی رحلت یزید کو اختیارات کی حوالگی اور وصیت۔ یزید کی تقریر۔ حسینؑ کے متعلق روایتیں اور حضرت کے اقوال۔ کنیت، تولیت، نقش خاتم۔ عدد اولاد و زوجات۔

بابؑ ششم نشوا از صفحہ ۴۴۱ تا ۴۷۱

شرح واقعات۔ معاویہ قیام یا اجرائے احکام شریعت کے لیے نہیں لڑتا تھا۔ علامہ سید رشید رضا کی تقریر کا اقتباس۔ صلح حسنؑ کی بحث۔

بابؑ ہفتم از صفحہ ۴۷۲ تا ۵۶۴

حسینؑ رجب ۶۰ھ تک

تبصرہ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شہید اعظم

یعنی

حضرت امام حسینؑ علیہ السّلام کی سوانحِ عمری

(پہلا حصہ)

مقدمہ

واقعہ، سبب اور نتیجہ

کسی بڑے واقعہ کے قبل اس کے اسباب مجتمع ہوتے رہتے ہیں اور اس کے وقوع کے بعد اس کے نتائج ایک زمانہ تک اثر دکھاتے رہتے ہیں۔ اگر کسی بڑے واقعہ کو دیکھنے کے بعد اس کے نتائج پر غور نہ کرنا غفلت اور کم نظری ہے، اسی طرح اس کی نسبت اس ضعف تصور سے کام لینا کہ وہ بڑے اسباب کا نتیجہ نہ تھا نتیجہ کو بغیر سبب کے مہیا کر دینا ہوگا۔ پیش نظر تحریر متذکرہ صدر خیال کا نتیجہ ہے۔

شہادتِ حسینؑ کی عظمت بمقابل ملل ماضیہ

یہ ہم سب لوگوں کے اچھی طرح ذہن نشین ہو گیا ہے کہ حسینؑ کی شہادت ایک ایسا واقعہ عظیم ہے جیسا نہ کبھی کہیں ہوا اور نہ خود تاریخ اسلام اس کا مقابل لا سکی۔ ملل ماضیہ اور ان کی تاریخ اگر اسی طرح قبول کر لی جائے جس طرح اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے جب بھی ان کا کوئی شہید یا سلسلہ شہداء مشکل سے ہمارے شہید کی عظمت و شرافت اعمال کے مقابلہ کا حوصلہ کر سکے گا۔ اولیاء مذاہب اور ان کی تکلیفیں حسینؑ کے انبوہ مصائب پر چھچھلتی ہوئی نظریں بھی ٹھہرا جائیں گی اور کسی یسعیاہ کا چیرنے والا تنہا آرہ ان بے شمار حربوں کے سامنے گونگا ہو جائے گا۔ جس پر ہمارے شہید کا خون ہے یا کسی صلیب رسیدہ جسم کی چند کیلیں حسینؑ کے جسم اقدس تک پہنچنے والے بے شمار تیر اور نیزے کی انیوں کے سامنے بے حقیقت ہوں گی۔

حسینؑ کی شہادت کے واقعات کیونکر ملے

ہمارے شہید کی تاریخ ہے۔ اس حیثیت کی تاریخ جو دشمنوں کے قلم اور زبان نے ہمارے حوالہ کی۔ حسینؑ کا دوست واقعہ نگار کوئی زندہ نہ چھوڑا گیا۔ اگر کوئی واقعہ نگاری کر سکتا تھا تو علیؑ ابن الحسینؑ اور مخدراتِ عصمت۔ امام زین العابدین علیہ السّلام اپنی قید سے بہت پہلے بستر علالت پر مقید تھے اور پردہ نشین بیبیاں حسینؑ کی زندگی تک بیرونی حالات سے بہت کچھ بے خبر تھیں۔ لیکن حسینؑ کی شہادت کے بعد نہ صرف علیؑ بن الحسینؑ اپنے بستر بیماری سے کھینچے گئے کہ وہ اس کے بعد کے واقعات دیکھیں بلکہ مخدراتِ عصمت نے بھی یہ دیکھا کہ ہمیں اپنے تقاضائے غیرت کے خلاف عام نگاہیں دیکھتی ہوں گی۔

افراد اور ان کے خصائل پر اجتہاد کی آسانی

کوئی وقت ہو اس کے متعلق سمجھنے کی ضرورت کے موافق ان مظلوموں کی تاریخ ہی فن تاریخ کا ترقی کیا ہوا زمانہ تھا در آنحالیکہ ان کے پیشتر کے اولیاء اور شہداء کا زمانہ اس حیثیت کا نہ تھا جس سے واقعات اور افراد کے خصائل پر اجتہاد تاریخی کی ایسی آسانیاں ہوں جیسی ان کے زمانہ میں تھیں۔ خود اسلام جو اس واقعہ سے ۷۳ برس قبل سے نشو و نما پا رہا تھا اس کے متعلق ایک فرانسیسی مورخ بہت کچھ صحیح ریمارک کرتا ہے کہ: یہ ایک مذہب کا تعجب خیز منظر پیش نظر کرتا ہے جس کا دن کی صاف روشنی میں وجود ہو رہا ہے۔ یہ سب تاریخی زمانہ کی آنکھوں کا دیکھا واقعہ ہے۔

شہادتِ حسینؑ سے بہت سے واقعات کا اصلی رنگ معلوم ہو گیا

حسینؑ کی شہادت نے تاریخ اسلام پر عام اس سے کہ وہ گزشتہ ہو یا آئندہ ایسی تیز روشنی ڈالی جس سے بہت سے ایسے واقعات کا اصلی رنگ معلوم ہو گیا جو بغیر اس قوی اشارہ کے بے توجہی سے گزر جاتے۔ بلکہ ان کی غرض اور حقیقت بمشکل چھپائے چھپ سکتی ہے۔

مؤلف کا کام

جو کچھ مجھے اپنے اس سبب سے پُر غم فرض کے متعلق کرنا ہے وہ یہ ہے کہ میں اس دعویٰ پر قناعت نہ کر لوں کہ شہادت حسینؑ ایک واقعہ عظیم ہے بلکہ یہ دکھلاؤں بھی کہ حقیقتاً یہ نہ صرف اسلام بلکہ عالم کی تاریخ کے مشہور واقعات میں ایک سرمایہ حیرت اور عظیم سانحہ ہے۔ جس حد تک حسینؑ کی سوانح عمری بالکل زیادہ غیر متعلق اثر کے قبول کر سکے میرا فرض اسی پر تمام نہ ہو جائے گا کہ میں سانحہ کو بحیثیت اس کے سانحہ ہونے کے بیان کر دوں اور بس۔ نہیں۔ یہ روش تو بہت کچھ زمانہ حال کے اس جائز مورخانہ اعتراض کی تابع رہے گی کہ واقعہ کو صرف بیان کر دینا قصہ خوانی سے زیادہ مفید نہیں ہے۔ بلکہ اس کتاب کی یہ غرض بھی ہوگی کہ واقعہ نہ صرف من حیث الواقعہ بیان کیا جائے بلکہ اس کے پس منظر پر بے جذب احتیاط سے نظر ڈالی جائے۔ اس سے امید کی جاتی ہے کہ جب حجاب دور کر دیے جائیں گے تو واقعہ اپنی مجموعی حیثیت سے اس سے زیادہ سمجھ میں آئے گا جس قدر صرف بحیثیت واقعہ پڑھ جانے کے سمجھ میں آتا۔ کیونکہ اب نہ صرف اسباب بلکہ نتائج نے بھی اس کے سمجھنے میں مددی ہوگی۔

اسباب شہادت کا خاصہ

فطری ہے اس خیال کا پیدا ہونا کہ "انا قتیل العبرة" کہنے والے کے اسباب شہادت جس کی بے گناہی پر ایک عالم شاہد اور مظلومیت پر ایک زمانہ اشک حسرت بہا رہا ہے، نہایت مسلسل، خلاف انسانیت، بے رحمانہ اور ایسی مصلحت کے تابع ہوں گے جن میں شخصی اور قومی شرافت سے تجاہل کیا جا سکتا ہوگا اور خود غرضیوں کی حفاظت کیسے ہی کریہہ اور ظالمانہ فعل کے کرنے سے رعشہ نہ پیدا کرتی ہوگی۔ بلکہ مدبرین کسی تھراہٹ کے پیدا ہونے کو نتیجہ حاصل کرنے کے جوش میں کمزوری سمجھتے ہوں گے اور اپنی عدم ہمدردانہ ضد کو استقلال سمجھ کر اپنے فعل کا جواز اور اپنا اطمینان کر لیتے ہوں گے۔ اگرچہ اس جواز اور ان کے اس اطمینان نے کیسا ہی فساد اور کیسی ہی تکلیف ان کی روش کے خلاف شخص یا اشخاص کے لیے کیوں نہ پیدا کر دی ہو۔ یا وہ زمانہ کے لیے کیسی ہی بری مثال کیوں نہ ہو۔ افسوس ایسا ہی تھا۔ مثالیں شاذ نہیں ہیں۔ اور اگر کسی دانست میں شاذ ہوں بھی تو وہ انداز اور اسباب جن سے مثالوں کی سی صورت تیار ہوتی ہے کسی طرح شاذ نہیں ہیں۔

حسینؑ کے پہلے اور حسینؑ کے زمانہ کی مصلحت کا فرق

وہ اسباب جن کا نتیجہ شہادت حسینؑ تھی اپنی ساخت کے لحاظ سے کبھی نرم لیکن ضدی اور مسلسل، اور کبھی سخت۔ لیکن رشتے کے قطع کرنے والے نہ تھے۔ ایسا نہ ہوتا سوچی ہوئی مصلحت بلکہ نامقبولیت پیدا نہ کرنے کا خیال تھا۔ ورنہ حسینؑ یا ان کی مصلحت کے محرک یا دوسرے لفظوں میں وہ جن کی مصلحت کے حسینؑ عامل تھے۔ بہت پیشتر قتل ہوگئے ہوتے۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ عین مصلحت میں فرق نہ تھا۔ اگر تھا تو سختی کے درجہ کا۔ اختیار اور حکومت کے ساتھ رشتہ کے قطع کر دینے کی سی سختی نہ کرنے کی وجہ سے گزشتہ مدبرین کامیاب ہوئے۔ اس وجہ سے کہ ظاہری بے عنوانیوں کے نہ ہونے کے سبب سے لوگ تجاہل میں رہے۔ یا لوگ اس تدبیری اندرونی رفتار ناموافقت کی گرفت اور صحیح اندازہ نہ کر سکے۔ درآنحالیکہ جس وقت حسینؑ شہید ہوئے رشتے اس قدر گھِس گئے تھے کہ بے ٹوٹ جانے کے کوئی صورت نہ رہ گئی تھی۔ یہ کھلا اتفاقی اور لاعلانہ نہ تھا۔ بلکہ اس وقت کے مدبرین گزشتہ روش اور اس کے اثر کو تولنے کے بعد۔ اب اس حد تک سختی کرنے کو اپنے لیے مخدوش نہ سمجھتے تھے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ حسینؑ کی مصلحت ایسی اور اس قدر کمزور ہوتی چلی آئی ہے کہ اس سے کسی قسم کا خوف نہیں ہے اور اس میں اب اٹھان کی قوت باقی نہیں ہے۔ اس لیے اس حالت کو کچھ دنوں اور عالم نزع میں رہنے دینا ایک اپنے لیے غیر ضروری اور مخدوش وجود کے بقا کی طرف رجعت کے توہم کو اوس پاں ہوتا ہے۔

بنی اُمیہ کی تباہی کا سبب

ملکی رقابت کے اس لطیف توہم نے درآنحالیکہ ملکی رقابت کا خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ بنی امیہ کو تباہ کرنے کی حد تک تباہ کیا۔ طلبائے تاریخ کے لیے تصور کی یہ سب سے حیرت خیز غور اک ہوگی کہ اس حالت میں جس کی بے قوتی کا صحیح اندازہ کیا گیا تھا کس طرح ایسی بے رکاوٹ قوت پیدا ہوگئی جو مرتب فوجوں کے ریلے، خزانوں کی پرقوت امداد اور سیاسی موقع شناس نگاہوں کے اندازہ پر غالب آگئی۔ ایک آگ تھی جسے عالم غیب سے نظر نہ آنے والی مقدس روحیں دامن سے ہوا دے رہی تھیں۔ آگ بھڑکتی تھی اس کی روشنی پس و پیش دکھائی تھی۔ اس کی سخت گرمی دشمنانِ آلِ رسالت کی ہڈیوں کے مغز جلا رہی تھی۔ ان کے بھیجے مدت سے بھرے تھے۔

مختلف الاثر ہیجان

لیکن اس کی خوشگوار گرمی عامہ مسلمین کی رگوں میں تیزی، پھرتی، ہمدردی اور اتفاق پیدا کرتی تھی۔ انھیں گزشتہ غافلانہ تساہلی پر جوش انابت ہوتا تھا اور اب اس میں مطلق شبہ نہ رہ گیا تھا کہ کم سے کم بنی امیہ اسلام اور رسولؐ کے سخت ترین دشمن ہیں اور اس لیے مطلق اس قابل نہیں ہیں کہ مسلمانوں کے والی امر ہو سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنی امیہ کی حکومت جتنے دنوں تک شہید کی صاف اور صریح پیشین گوئی کے موافق آپس کی عداوتوں سے دم توڑتی رہی اس وقت بھی مشہور باپ کا بیٹا عبد الملک اپنے مشہور عامل حجاج کو لکھتا ہے کہ مجھے آلِ رسولؐ کے خون سے بچانا۔ بنی امیہ ہمیشہ کے لیے ایسی وزنی ذلت سے دب گئے کہ انھیں اپنی اظہار قومیت سے بڑھ کر کوئی شرم کی بات نہ تھی۔ اگر عرب میں ان کی ہڈیاں مادر گیتی کے شکم میں دفن کے قابل نہ بھی گئیں بلکہ اس سے زیادہ مناسب مقامات پر منتقل کی گئیں تو اندلس کا الراجل اموی اپنے پھٹے ہوئے لباس سے گلیوں میں صدا لگاتا تھا کہ:

"میں ہوں اندلس کا آخری بادشاہ مجھ سے عبرت حاصل کرو"۔

شہید جس کی بے شمار مصیبتوں میں اس کی قابلِ وصیت پیاس بھی تھی۔ اپنی شہادت کے بعد صرف ایک بات کا پیاسا معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اسلام کے یہ سب سے بڑے دشمن دنیا سے مٹا دیے جائیں۔ پیاس بجھی وہ مٹ گئے۔

حسینؑ کے ساتھ ہمدردی کے جذبات

حسینؑ اپنی غرضِ شہادت میں کامیاب ہوئے اس کے ساتھ ہی لوگوں میں حسینؑ کے ساتھ جس درجہ کی ہمدردی اور محبت پیدا ہو گئی وہ تصنع کے شبہ سے جس قدر بالاتر تھی اسی قدر ہمدردی کرنے والوں میں آپس میں ایسی یک جہتی اور محبت پیدا کرتی تھی جیسا لطف انھیں اپنی یگانگت میں حاصل ہونا ناممکن تھا۔ اس لیے کہ حسینؑ کے ساتھ ہمدردی کے جذبات ان عناصر سے بنے تھے جو اہلِ عالم کے نزدیک ہمیشہ قابلِ وقعت رہا لوگوں میں ایسا ہیجان پیدا ہو گیا جو اعلیٰ خصائل قوی اور خصوصیاتِ ذاتی کی پرجوش قدر شناسی تھی اور جو جہاں ساخت اور تربیتِ خصائل کا پہلا زینہ ہے وہاں ترتیب قومیت کے مرکز سے کچھ زیادہ ہے۔ حسینؑ مجدد ثانی تھے۔ حسینؑ نے دین کو زندہ کیا۔ حسینؑ اپنی فنائے جسمانی کے بعد ایک وہ روشن اور بلند مینار بن گئے جس کا سایہ صالح صفاتِ انسانی کی پرورش کرتا ہے۔

جوشِ ہمدردی جوشِ عداوت پر غالب آگیا

گزشتہ سطروں کے اشارہ کے اعتبار سے یہ خیال ہوتا ہوگا کہ واقعہ شہادت کا نتیجہ نہایت عظیم تھا جس میں دو متضاد قوتیں تھیں۔ اگر کوئی اس تقسیم کو قبول کرنے میں متردد ہو تو یہ زیادہ واضح ہوگا کہ اس واقعہ نے جیسا جوشِ ہمدردی پیدا کیا وہ ان قابلیتوں سے پر تھا کہ دشمنانِ حسینؑ کے جوشِ عداوت پر غالب آجاتا۔

واقعۂ شہادت کیونکر دیکھا جاسکتا ہے

کیسے کوئی اس انقلابِ عظیم پیدا کرنے والے واقعہ کو کمزور توجہ کی گزرتی ہوئی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے بلکہ یہ یقین ہے کہ اگر کسی قدر زندہ ادراک سے کام لیا جائے تو اس واقعہ کی کل عقلی اور فطری تاریخ اور اس کا ہر پہلو کیسی ہی بے قرار گزرتی ہوئی توجہ کو گاڑ دے گا اور حیرت اس وقت تک اسے آگے نہ بڑھنے دے گی جب تک شخص میں پسندیدگی کا فطری تغیر نہ پیدا ہو لے۔ بہ استثنا ان صورتوں کے جس میں توجہ نہ ہونے دینا شخص نے قرینِ مصلحت سمجھ لیا ہو۔

صالح توجہ کے گمراہ کرنے کی مثالیں اور ان کی طینت

صالح توجہ کے بھٹکانے کی عام مثالوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک مسلمان کے اس مشہور فقرہ پر توجہ دلائیں گے کہ: "حسینؑ اپنے نانا کی تلوار سے قتل ہوئے"۔ (دیکھیے صواعق محرقہ) غور کرنے والے کو اس فقرہ کی دو رنگی ایک مسلمان صناع کی زبانی حیرت خیز معلوم ہوگی۔ جس میں اگر رسولؐ کی تلوار کی پرسش کا واقعہ سے زیادہ سخت اور پر طنز تذکرہ کیا گیا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس سے زیادہ تکلیف دہ یہ عکس ہے کہ رسولؐ کی مصلحت نے حسینؑ کو قتل کیا جس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ سختیاں حسینؑ پر گزریں انھیں رسولؐ کی مصلحت میں غوطہ دے کر نرمی پیدا کی گئی ہے۔ یا الزام کا رخ پھیر دیا گیا ہے۔ ذلیل دنیا پسندی، جوشِ عداوت، اور توہم نے جو مصلحت گھڑی تھی اسے وہ لباس پہنایا گیا ہے جسے سمجھی ہوئی نگاہ فوراً دیکھ کر بتا دے گی کہ ناموزونیت کا بہترین نمونہ ہے۔

رسولؐ نے جو عناصر قومیت پیدا کر دیے اور جن قوتوں سے مسلح کیا اب وہی کمالِ نا احسان شناسی سے ان کی اولاد پر صرف کی جا رہی تھیں اور یہ ذلیل ہنسی ہنسی جا رہی تھی کہ حسینؑ اپنے نانا کی تلوار سے قتل ہوئے۔ اس فقرہ میں یہ خیال بھی نفوذ کیا ہوا ہے کہ حسینؑ اس کے ہاتھوں سے قتل ہوئے جسے مسلمانوں نے خلیفہ رسولؐ سمجھا تھا، اور اس لیے کوئی شخص جس کے خیال کو خلیفہ اپنی روش کے خلاف سمجھے قابلِ تعزیر ہے اور یہ سختی اور تعزیر قابلِ الزام نہیں ہے۔

میں کافی یقین سے کہہ رہا ہوں کہ کہنے والے کے اس فقرہ میں متصورانہ حیرت یا تاسف کے آثر کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ اس فقرہ کی ترکیب بجز اس خیال کے جو ظاہر کیا گیا اور کسی تاویل سے ممکن نہیں، نہ اس سے علیحدہ اس کے الفاظ کوئی دوسری بُو دے رہے ہیں۔

مزید تائید اس خیال سے ہوتی ہے کہ جس زمانہ میں یہ خلافِ واقعہ بے رحمانہ اور اسلام آزاد فقرہ مسلمان بھی جانے والی زبان نے ادا کیا اس نے کسی طرح وجہ حسینؑ کی مدد نہیں کی بلکہ وہ ہمیشہ ان لوگوں کے لیے سپر بنا رہا جو یزید کے مظالم اور مصلحت کی مختلف لفظوں میں تائید کرتے رہے۔ وہ زمانہ ایسا نہ تھا جس میں کوئی ظاہر میں حسینؑ کی تائید میں کچھ کہنے کی جرات کرتا۔ جرات خودکشی ہوتی۔

اسی طرح گزشتہ فقرہ سے کم مدبرانہ لیکن اس سے زیادہ پر قوت مضر، عملی حیثیت سے یہ فقرہ ہے کہ: "واعظ پر حسینؑ کا ذکر حرام ہے"۔ نہیں معلوم فتویٰ دیتے وقت مفتی کو یہ یاد تھا یا نہیں کہ وہ شارع اسلام کے نواسے کے ذکر کے متعلق اپنے اسلامی احسان شناسی پر عکس ڈال رہا ہے۔ دین کے آکوں کے بے جا مصرف کی ایسی پختہ مثال شاید ہی کوئی لائی جاسکتی ہو۔ لیکن اس فتویٰ سے زیادہ حیرت خیز ان مسلمانوں کا اقتضائے اسلام ہے جو آج تک اس فقرہ کو دہرا دیتے ہیں۔ بغیر اس پہلو پر نظر ڈالے جس پر گزشتہ سطروں میں توجہ دلائی گئی یا بلا یہ سوچے ہوئے کہ اس فقرہ کی مصلحت اس کے بانیانِ مصلحت اور گرد و پیش کے اتفاقات کو فنا ہوئے صدیاں گزر گئیں کبھی وقت تھا کہ ایسا کہنا کہنے والوں میں امید منفعت پیدا کرتا تھا، اور تاویل حکومت کے ماتحتی مین تھی۔ اب یہ اشتہار فروشی سے زیادہ نافع نہیں ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اب وہ زمانہ نہیں ہے بلکہ ایسا کہنا کہنے اور سننے والے دونوں کے لیے مضر ہے۔

نواسۂ رسولؐ کی ہمدردی اتفاق کا ایک مرکز ہے

اس لیے کہ اس سے وہ اکیلی امید کہ ہم سب نبی کے نواسہ کی ہمدردی پر متفق ہو کر اپنے گزشتہ نا اتفاقیوں کے کارناموں کو بھلا دیں گے۔ کمزور ہوتی ہے۔

فتویٰ دینے والے اسباب شہادت حسینؑ کو خوب سمجھتے تھے

مجھے گزشتہ دونوں فقروں کے متعلق اس قدر اور کہنا ہے کہ ان دونوں جملوں کی مصلحت میں بعینہٖ وہ فرق ہے جو یزید کے پہلے اور یزید کی مصلحت میں فرق تھا۔ یہ بھی کہنا میں کہنے والے کی دور بینی کے ساتھ انصاف سمجھتا ہوں کہ وہ اسباب شہادت حسینؑ کو خوب سمجھتا تھا۔ وہ یزید کی مصلحت کا حامی نہ ہوتا اگر اسے یہ دکھائی نہ دے گیا ہوتا کہ نگاہیں اس سے بہت آگے بڑھ سکتی ہیں۔ جس کے سمجھنے کا راستہ نہایت ہموار ہو گیا ہے۔ میں ہر زمانہ میں ان فقرات کے درجہ مضرت کا مناسب تمیز نہیں کر سکتا لیکن یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ تلوار سے

زیادہ خوفناک کوشش تھی جس سے خاندان رسالت کا نام مٹایا جارہا تھا۔ ان لوگوں نے اپنے مقتول آکۂ قتل اور جوش کو ایسی قبر کے حوالہ نہیں کیا جو زمانہ کے ساتھ مٹ جاتی ہے۔ بلکہ ان چیزوں کو شیشہ کی قبر میں دفن کیا جس سے اگر مقتول سے ہمدردی کرنے والوں کی نفرت اور حقارت آج تک زندہ ہے تو فتویٰ دینے والوں کی مصلحت کے ساتھ دینے والے اب تک ان کے عکس کو دیکھتے ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ میں تصفیہ نہیں کرسکتا کہ کون زیادہ قابل الزام ہے۔ وہ جس نے قتل کیا، یا وہ جس نے قاتلانہ مصلحت کی حمایت کی اور اسے کاغذ کی ہمیشہ بولنے والی زبان کے حوالہ کردیا۔

مُسلمانوںؑ کے پسند کے مخالف شمائل اور طینت

اس سے ظاہر ہوگا کہ متذکرہ صدر فقرات اپنے شمائل اور طینت میں مُسلمانوں کے پسند کے لائق نہیں ہوسکتے۔

ہماری قوم کے کل جاہل اور عالم افراد پیدائش سے لے کر موت تک سب سے زیادہ اس امر کے متمنی معلوم ہوتے ہیں کہ دوسری مجلس میں پہلی مجلس سے زیادہ ماتم کریں۔ حسینؑ کی وہ مظلوم صورت جن پر ان کے عزیز ترین رفقا کا نقش ہے ان کے سامنے آکر گویا کہتی ہے کہ:

من کیستم کہ گریہ بحالم کنی ولے
می شاید ت ز نرگس شہلا گریستن

غمِ حسینؑ کا اثر

ہمارے بچے، جوان، بوڑھے، لڑکیاں، مائیں، بہنیں اس طرح اس زمانہ گزرنے کے باوجود بڑھتے ہوئے غم میں روتی ہیں جس طرح وہ اپنے عزیز ترین پر نہ روئی تھیں۔ اگر ہم اپنے سر برہنہ کردیتے ہیں تو وہ بھی ہمارے ساتھ اپنے سر کے بال کھول دیتی ہیں اور اپنے اسباب آرائش کو اس طرح بھول جاتی ہیں کہ گویا انھیں ان کی نمائش سے کبھی کوئی انسانی کمزوری یا پر ذوق رغبت ہی نہ تھی۔ ہر ایک کا جوش غم اس خیال سے بڑھتا جاتا ہے کہ بقیہ آلِ رسالت کو کربلا سے دمشق تک نہ رونے کا وقت تھا اور نہ رونے کی اجازت تھی۔ انھیں تجربہ اور یقین تھا کہ ہمیں روتے دیکھ کر کوئی بے رحم ہاتھ ہمدردی کے بدلے نیزے کی انی بڑھا دے گا۔

جذباتؑ کی یک رنگی

اس طرح ہمارے افراد خاندان اور قوم اس مظلوم کے ماتم میں متفق ہے۔ ایک خیال ایک ہمدردی، غم، غصہ، نفرت، حقارت، محبت پسندیدگی کے جذبات ایک وقت میں قوم کے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک تقسیم ہوتے رہتے ہیں۔ ایک دریا لہریں لیتا رہتا ہے اور کبھی ہم اپنے قومی غم کی مجلسیں تمام نہیں کرتے۔ جب تک ہم یالیتنی کُنتُ مَعَھُم فَافُوزَ فَوزاً عَظِیماً نہ کہہ لیں۔

اسبابِ شہادتؑ کی عام لاعلمی جو تفریط کہی جائے

لیکن قوم کا زیادہ حصہ جاہل ہے۔ اگرچہ مشکل سے اس کے حسینؑ کی کوئی مصیبت ہے جسے اس کا ہر فرد نہ جانتا ہو مگر نہ اسے اسباب شہادت حسینؑ معلوم ہیں اور نہ وہ کڑیاں جن کے جوڑ دینے سے یہ خوفناک زنجیر بن جاتی ہے۔ مضمون اس قدر آسان نہیں ہے کہ وہ کند اور بسیط نہ ہوسکنے والے خیال کے اندر آسانی سے سما سکے اور نہ خود قوم کے وہ لوگ جن پر پڑھے لکھے کا اطلاق ہوتا ہے عموماً تاریخ اور خصوصاً فلسفہ تاریخِ اسلام اور اس کے

ان باریک نکات پر توجہ کرتے ہیں۔ بہت سے ایسے ضرور ہیں جو ان واقعات اور اشارات سے واقف ہیں جن سے اسباب شہادت سمجھے جاتے ہیں لیکن انھیں بھی اس کا قابل تعریف اندازہ نہیں۔ اس کے عکس میں بے احتیاط غلو اور بے جا زہ مبالغہ نے بھی اثر کیا۔

افراط انتخاب الفاظ کی دشواری اور بے احتیاطی

واقعہ خوانوں میں سب ایسے نہ تھے جو مضامین الفاظ اور انداز کے مشکل انتخاب کا صحیح حس رکھتے۔ انھیں اکثر غلو کے ایسے کمزور احتیاط کے فقروں سے کہ "کوئی مصیبت ایسی نہ تھی جو امام حسینؑ پر روز عاشورہ نہیں گزری"۔ یا "جس صورت سے اس امر میں (رولانے میں) اہتمام کیا جائے اور جس طرح کوشش اس میں صرف ہو وہ سب ایک حد تک مقبول ہے"۔ یا "مصائب اور فضائل کی روایتوں میں زیادہ تحقیق کے درپے نہ ہوں بشرطیکہ وہ خلاف ضروریات مذہب نہ ہو" مدد ملی۔ انھیں "کوئی" "جس طرح" "جس صورت" "تحقیق کے درپے نہ ہوں" میں پوری اور بے رکاوٹ وسعت نظر آئی۔ اور پھر اس کے بعد جولانی طبیعت اور قوت تصنیف کا روکنا مشکل ہو گیا۔ انھوں نے ذمہ داروں یا صاحب حس لوگوں کی خاموشی سے نفع اٹھایا، بلکہ بے احتیاط ہوتے گئے۔ ان کی چاشنی سامعین کا مذاق خراب کرتی رہی اور گویا یہ بے مہاری واقعہ خوانی کی ایک مستند شان ہو گئی۔ بقول السید امیر علی صاحب جیسا وہ اپنی کتاب اسپرٹ آف اسلام میں فرماتے ہیں کہ: "اثر کے دائرہ کے وسیع ہونے یا زمانہ کے گزرنے سے قصے اور کہانیوں کا پیدا ہونا ابدی ہے کہ وہ بادشاہوں اور لوگوں کے مزاج اور مذاق کے موافق ہو۔ انسان کی اس فطری خواہش کے اثر سے کہ وہ اپنے مخصوص مذہب کے احکام کو اپنے خاص میلان سے دیکھے کسی مذہب کو مفر نہیں"۔ مذہب کے عام وسیع مفہوم سے قطع نظر کر کے میں اس وقت اپنی قوم کے سب سے دل پسند شغل کا تذکرہ کر رہا ہوں۔ ایسے لوگ ہیں جو اب بھی ذکر حسینؑ کی مخالفت کو ایک رسمی ورثہ سمجھتے ہیں۔ وہ اکثر پیش پا افتادہ اعتراضات کو اپنی تائید سمجھنے لگے ہیں اور اس سمجھانے کو بھی کہ ہم خود تمہارے اعتراض کے مفہوم سے دور ہیں اسے اپنی اصلی وجہ عداوت کے جوش میں تجاہل کے ساتھ سنتے ہیں۔

غم حسینؑ کے معترضین کی غرض

اس لیے کہ ان کی تمام غرض یہ ہے کہ وہ غیر صریح پہلوؤں سے اس امر میں کامیاب ہوں کہ ذکر حسینؑ نہ کیا جائے۔ ان کی غرض اپنے تمام تمسخر، سارے طنز اور کل پہلوؤں سے اصلاح نہیں ہے۔ بلکہ محو کر دینا ہے۔

غم حسینؑ کا نشو

مجھے اس کے لیے صرف یہ کہنا ہے کہ اگر صدیوں کے تجربہ نے اب تک یہ ان کے ذہن نشین نہ کیا ہو کہ حسینؑ کے ساتھ جوش عداوت پر ان کے ساتھ جوش محبت و ہمدردی ہمیشہ غالب رہا تو وہ پھر دیکھیں گے کہ کس طرح باوجود تمام نئی تراش خراش کی مخالفتوں کے ذکر حسینؑ اس جہاز کی طرح جو سخت طوفان کے بعد نسبۃً کمزور تلاطم میں خوشنمائی سے پانی چیرتا ہوا سینہ تانے طاؤس کی طرح بڑھتا چلا جاتا ہے۔ روز افزوں ترقی پر ہے۔

مصلحین سے ایک لفظ

اس جگہ مجھے ان لوگوں سے بھی یہ کہنا ہے جو خواہان اصلاح ہیں کہ سر کے بل کسی امر کی اصلاح میں جلدی کرنا اس سے زیادہ مضر ہے کہ تباہی اپنی حالت پر چھوڑ دی جائے۔ تباہی اپنی معمولی روش سے شاید اس قدر جلد اپنی خوفناک حد تک نہ پہونچے گی جس قدر اصلاح کی فوری

کوشش رسومات پیشین سے چھڑا کر ایک بے معنی انقلاب پیدا کرے گی اور اس لیے کچھ زمانہ تک تباہی کو گرم رفتار کر دے گی۔ سوچی ہوئی آہستہ قدم مثال، تدریجی اصلاح جس سے لوگ مصلح کے خیالات کے خوگر ہوتے جائیں۔ غالباً مفید ہو۔ کرنا سوچنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ بلکہ نظام مذہبی کی موجودہ عملی عدم ترتیب اور مفلسانہ بے انتظامی میں مسلمانوں کے کسی رسوم مذہبی کے پیچھے پڑنا عقل کے خلاف ہوگا۔ جب تک اصلاح شدہ رسم کا نمونہ پیش نہ کیا جائے یا قائم مقام طرز عمل کی آسانیاں مہیا نہ کر دی جائیں۔

اسبابِ شہادتؑ۔۔ خلاصہ

واقعہ شہادت اگر مختصر لفظوں میں بجھایا جائے یا اگر تمام کا خلاصہ کسی مختصر عبارت میں سما کر ختم کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک بڑی جماعت ہمیشہ اس امر کی درپے تھی کہ "نبوت اور خلافت ایک خاندان میں نہ ہو"۔ اور دوسری جماعت کریم النفسانہ شان سے اگر خلافت نہ ملنے پر مناسب نہ تھی تو اس پر ہمہ تن کوشاں تھی کہ وہ مذہب کا اصلی وقار قائم رکھے۔ ایک اپنی کوشش میں اس پر آمادہ تھی کہ اپنی مصلحت ہر زور دیتی جائے۔ اگرچہ وہ اسلام کے خلاف اور بانی اسلام کے ساتھ نا احسان شناسی کیوں نہ ہو، اور دوسری اس استقلال سے مسلح تھی کہ اپنے قائم شدہ حق سے انکار نہ کرے اور دوسرے غیر مستحق کو جائز ذمہ دار دین نہ سمجھنے میں اگر تمام قابل شمار تکلیفیں بھی گزر جائیں تو وہ حیرت خیز صبر کے ساتھ برداشت کی جائے۔

اس مشکل جزر و مد اور کشاکش کا نقشہ ایسے کسی واقعہ خوان کے ہاتھوں کھچا ہوا دیکھنا جس نے نیوز فرق کے اس جدوجہد زوال کی کوشش پر کمزور توجہ بھی نہیں کی ہے جس میں طبائع کی مشکل شان اور خاموشانہ رفتار خیال کی گرفت اور عمل کی تنقید کرنی ہے۔ اس عظیم الشان واقعہ کو ناقدری اور بے توجہی سے ایسے عیاں اور ایسی زبانوں کے حوالہ کر دینا ہے جو شایان سے بہت پیچھے ہیں۔

رَوِشِ مصلحت

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ بعض مشہور مثالیں اس انداز اور ان الفاظ میں بیان کی جائیں جو عام مجالس میں ہر طبقہ کے سامعین کے لیے موزوں نہ ہوں۔ ایسا کرنا عام توجہ میں انقباض پیدا کرے گا اور یہ مفید غرض کہ ذکر حسینؑ عام کیا جائے فوت ہو جائے گی۔ یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ ایسی روش اختیار کرنے والا کسی طرح مقبولیت نہ حاصل کرے گا بلکہ وجہ حسینؑ کو اپنی ناسمجھانہ رفتار کے جوش میں نقصان پہنچائے گا۔ زمانہ حال کے کشاکش کی تاریخ نے اگر اس غیر مفید عنصر کو واقعہ خوانی کا ایک جزو قرار دیا تو گویا مسلمانہ روش جس کی اب تک مفید تقلید کی گئی ہے عقل کے سایہ سے دور کر کے بے احتیاط جذبات کے تابع کر دی گئی۔ اور دل پسند لفظوں میں سمجھاؤں کہ کیسی ہی جوش خیز حالت میں حسینؑ کے صبر کی پیروی سب سے اچھی مصلحت ہوگی۔

ذکر حسینؑ کے شایان ہاتھوں میں دینے کا اثر

لیکن بہر حال میں بغیر کہے نہیں رہ سکتا کہ اگر ذکر حسینؑ اس سے زیادہ شایان لوگوں کے ہاتھوں میں رہتا جیسا اب تک رہا تو غالباً ہم اپنی قوم اور افراد کو عملاً زیادہ لطیف الخیال، زیادہ حق پسند، زیادہ مستقل اور زیادہ ملا اور جا ہوا پاتے۔ ان کے خصائل قوی اور روح مذہب کی دوبارہ نمود اگر ایسے سنوارنے والوں اور رہنماؤں کے زیر ہدایت رہتی جو مناسب تعمیر کے لائق ہوتے تو ہمارا اس سے زیادہ قوی نہ ہونا جیسا ہم اپنے کو پاتے ہیں عجب خیز ہوتا۔ جس طرح

ہم اس وقت اپنے عین وجود یا فنا نہ ہو جانے کو سب سے بڑا معجزہ سمجھتے ہیں۔

قربانی کی عظمت، وجہ کی عظمت ہے

یہ معجزہ صادر نہیں ہو سکتا تھا اگر شہادت حسینؑ کا ایسا قوی سبب نہ ہوتا۔ شہادتِ حسینؑ نہیں ہو سکتی تھی اگر وجہ شہادت اس قدر عظیم نہ ہوتی، یا کیسے قیاس کی جرأت کی جا سکتی ہے کہ ایسی عظیم الشان قربانی کسی معمولی یا کمزور وجہ کے لیے گوارا کی جا سکتی تھی۔

حسینؑ کا مقدس خون آثارِ حیات کا ذریعہ ہے

لیکن حسینؑ کا مقدس خون اسلام کے مرجھائے ہوئے پھول کے ساتھ یہ کر سکتا تھا کہ اس میں پھر ایسی زندگی کے آثار پیدا ہو جائیں جس سے مناسب آبیاری کے ساتھ گزشتہ حسن کی تحریریں واضح ہو جائیں اور ایک زمانہ اسے پھر تازگی کا شباب سمجھنے لگے۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ہر زمانہ میں اس مناسب آبیاری کے ذمہ دار بھی ہو سکتے۔

کیسے لوگ ذکرِ حسینؑ کے شایان تھے

بلکہ شخص چاہیے تھا جسے حسینؑ کی روح اقدس اپنے سایہ سے ہدایت کرتی رہتی۔ ایسے اشخاص چاہیے تھے جو مغالطہ حسینیہ نیک کے صحیح حس اور زندہ ادراک کے قابل ہوتے۔

شہادتِ حسینؑ کا اثر

فنا نہ ہونا حسینؑ نے روک دیا، اور گویا اگر ہمارے پیچھے ایک فولاد کی دیوار بنادی کہ ہم ایڑیوں کے بل نہ ہٹیں تو آگے بڑھنے کے لیے ایک صاف کیا ہوا میدان دکھا دیا۔ زوال کا رک جانا ترقی نہیں ہے۔ اگرچہ زوال کے رک جانے پر ترقی کی کوشش ممکن ہے۔ درآنحالیکہ زوال کے رکنے کے قوی اسباب نہ ہونے پر تمام کوششیں زوال کے روکنے کے لیے صرف کی جاتیں، نہ آگے بڑھنے اور ترقی کے لیے، اس کے بعد اس کی ضرورت تھی کہ ہم ایسی قوی رہنمائی کے تابع رکھے جاتے جو ہمیں چلاتی، چلاتی رہتی اور چلنے کی قابلیتوں سے مسلح کرتی رہتی۔ یہ ایسی مصلحت کا کام نہ تھا جس میں شکستگی کا وہم بھی کیا جاتا، بلکہ وہ شہادتِ حسینؑ کے اثر کی طرح مسلسل، پائدار اور قوی ہوتی، صفات قومی کا بنانا، یا رو بہ زوال ہونے کے بعد سنبھالنا نہ معمولی دماغ اور ارادے کا کام ہے اور نہ تھوڑی دیر کا مشغلہ، بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس بڑے کام کی کوئی حد نہیں ہے۔ اور نہ اس ترقی کی تکمیل کے لیے کوئی زمانہ اس کی انتہا ہے۔

زیر بحث مضمون اس قدر دلچسپ ہے کہ ناظر کو اس میں تھوڑی دیر اور الجھائے رکھنا شاید مقدمہ کا لحاظ کرنے پر بھی خلاف موقع نہ ہو۔ خصوصاً جب کہ ہمیں آخر میں اس کے اشارات کی ضرورت ہوگی۔

صفاتِ قومی کے کمال کا اساس

نبی عربی کی تعریف بحیثیت قوم گر کے یہ نہیں ہے کہ انھوں نے قوم میں صفات قومی کو کامل کر دیا۔ نہیں، بلکہ "دین کو کامل کر دیا" "وہ دین" جس کی غیر قومیں معترف ہیں کہ اپنے تعجب خیز اخوت پھیلانے اور تسویہ حقوق بین الاقوام اصول کی قوت سے دنیا میں حیرت خیز اثر ڈال گیا، ڈال رہا ہے اور ڈالے گا۔

اسلام اور شارع کے ساتھ غیر مسلم مؤرخین کا طرزِ عمل

اس جگہ میں عام مؤرخینِ عالم کو جنھیں اسلام کے سمجھنے میں دلچسپی ہے اور جنھیں خواہ مخواہ اس مصلحت کا ساتھ نہیں دینا ہے کہ حتی الوسع بے احتیاطی سے بھی اسلام اور شارع اسلام کا تعریف نہ کی جائے، اس امر پر توجہ دلاؤں گا کہ محض اصول اسلام اور اس کے شعور سے بانی اسلام کو سمجھنا ناکافی ہے۔ جب تک اس میں ذات رسولؐ شامل نہ کی جائے۔ کیسا ہی عمدہ اصول اثر نہیں کیا کرتا، جب تک کہ اس کے سمجھانے اور سنانے والی ذات نہیں ہوتی، اور ایسی ذات جو عمدہ اصول کے ساتھ اثر ڈالتی ہے۔ کبھی یہ عالم نہ پیدا کرتی جب تک اس میں خلیفان قابلیتیں نہ ہوتیں۔ عموماً غیر قوم مورخین نے جہاں اس مفید نکتہ سے اعراض کیا ہے وہاں ہر مفید اور عمدہ صورتوں کو اس روشنی میں دیکھا یا دکھایا ہے جس سے نہ جانتے والا بھیانک ہو۔ وہی خوبیاں جو ان کے کسی ہیرو اور قوم کے لیے مایہ ناز ہوتیں ہمارے لیے عیب کہی جاتی ہیں اور ایسا کہنے کے لیے ظاہر ایماندارانہ احتیاط سے بیشتر بدلے جاتے ہیں۔ وہی اصول جنھیں وہ ہمارے صدیوں کے بعد اختیار کرتے، ان کے لیے عقل اور انصاف کی حد لیکن ہمارے لیے زمانہ متوسط کی کمی ترقی کہی جاتی ہے۔ ہمارے افعال اور ان کے اچھے نتائج میں خواہ مخواہ بُری غرض تلاش کی جاتی، بلکہ ضرب دی جاتی ہے۔ بعض اوقات ہمارے ساتھ ہمدردی اور نیک صلاحیں دینے کے جوش سے ان کا اس قدر پیٹ پھول جاتا ہے جس سے انھیں آسانی سے سانس لینا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اب یہ دیکھنے والے کا کام ہوگا کہ وہ سانپ کے بیروں [illegible] یا وہ بھلے معلوم ہونے والے پھل ہیں، جو زہر آلود نہیں کیے گئے ہیں۔ ہماری قابل تعریف باتوں کا اس لیے اعتراف نہیں کیا جاتا، یا الٹے اس لیے مذمت کی جاتی ہے کہ ہم اس پر ثابت اور قائم نہ ہو جائیں، یہ چاہتیں ہم لوگوں کا مقدس فرض قرار دیتی ہیں کہ ہم دیکھیں کہ ان مختلف الحیثیت اثروں نے ہمیں اصل مرکز سے کس قدر ہٹا دیا ہے۔ لیکن اسلام ہر وقت ان صلاح کاروں اور ایسے ہی عذر خواہوں کو یقین دلاتا ہے کہ وہ بغیر ان کی صلاح اور عذر خواہی کی جنگ زرگری کے بھی مستغنی ہے۔ اور اس میں صلاح دینے والوں کی شخصیت پہچاننے کی کافی صلاحیت ہے۔ وہ جانتا ہے کہ شہد کی مکھی کا لعاب دہن شیریں ہے لیکن نیش بھی کافی ایذا رساں ہے۔

قوم گر نے کیا کیا

بہر حال نبی عربیؐ نے اگر افراد میں مجوزہ صفات دکھا دیا تو قوم میں صفات قومی کے آثار روشن کر دیے اور یہ سب حیرت خیز تھوڑے وقت میں۔ تھوڑے وقت میں ایسے زبردست قومی عناصر عادت اور خیال میں جاری و ساری کر دیے جس نے اور بھی عجب خیز اثر ڈالا ہوتا۔

سانچہ بدلنے کا نظام قومی پر مضر اثر

اگر سانچہ بدل نہ گیا ہوتا، اس وقت بجائے فاتحانہ جھلک کے جس نے ساخت قومیت سے مستغنی کر دیا، امن اور رفع فساد کی ہر جگہ حرکت ہوتی رہتی۔ یہ دونوں حالتیں اپنی ٹھوس جسامت اور قوی روحانیت سے اس ہیبت خیز شان اور حقی متانت سے بڑھتیں جس کے مقابلہ کی نہ کسی کو قوت ہوتی اور نہ تمنی اور نہ انصاف اس کے مخالفت کی وجہ پاتا۔ یہ صورت بہت کچھ نظر انداز کی گئی اور زیادہ تر اس شجاعانہ شان سے بالحاظ اعتدال کام نکالنا مفید سمجھا گیا جسے اصول اور ذات دونوں نے منجملہ دیگر صفات کے پالا تھا۔

میں کہہ رہا ہوں کہ رسولؐ نے "دین کو کامل کر دیا" اس سے میں یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ قوت یکجہتی میں ہے اور مذہب یکجہتی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اسلام یا یوں کہئے کہ عربی کا دین بلحاظ مذہب جوش اور برادرانہ لحاظ اب بھی دیگر اقوام میں ممتاز ہے۔ اب اس کے بعد پھر سوال کرنا چاہتا ہوں کہ آخر رسولؐ نے اس کی کیا کوشش کی کہ قوم میں صفات قوی کو کامل کر دیتے۔ درآنحالیکہ یہ معلوم ہے کہ صفات قوی کی تعمیر ایک دن کا کام نہیں ہے۔ لاذری کا ایسا قدیم چینی مصلح زمانہ حال کے اس خیال کے موافق معلوم ہوا ہے کہ "قومیت تابع نمو ہے تابع صنعت گری نہیں ہے"۔ رسولؐ نے کوئی کوشش اس کے ہمیشگی کے لیے کی یا نہیں یا محض اپنے زمانہ کی ترقی اور کوشش پر قناعت کر لی؟

سوال کا جواب، مُسلمہ حدیث کے عدد میں

یہ کہنا بہت کافی ہوگا کہ "اثنا عشر نقیبا" کا یہ صاف مطلب تھا کہ رسولؐ نے اپنے بعد خصائص قوی کی تعمیر کے لیے کچھ لوگ یکے بعد دیگرے مقرر فرمائے تھے۔ حقیقتاً "نقیب" کا تنہا لفظ سمجھانے کے لیے کافی نہیں ہے۔ بلکہ مفہوم زیادہ تر "اثنا عشر" کی تعداد میں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عدد ایک زمانہ کے لیے کافی ہے۔ یعنی اس عدد کے نقبا کے وجود کا، بغیر ایک وسیع زمانہ کے جس میں یہ لوگ نقابت کرتے رہتے۔ خیال کرنا خالی از عقل ہے۔

ائمہ کی دو صُورتیں

ان کا کیا کام ہوتا؟ بعض کے نزدیک: "امام کو صاحب اخلاق حمیدہ، اپنی زندگی میں ناقابلِ اعتراض یا افضل الناس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب کہ وہ مختار، بالغ، سمجھ دار اور خلافت کے معمولی انصرام کار کی قابلیت رکھتا ہے۔ وہ خلافت کا شایان ہے"۔ دوسرے کے نزدیک: "امام کو اولادِ رسولؐ ہونے کے علاوہ چند صفتوں سے متصف ہونا چاہیے۔ وہ معصوم ہو، اس کے عادات و اطوار اعلیٰ ترین ہوں اور سچائی میں سب سے ممتاز ہو"۔

پہلی نوعیت کے امام کی تعریف کا جائزہ

بغیر اس کے کہ ان دونوں فقرات اور دعوے کا تنقیدی جائزہ لیا جائے ظاہری نگاہ میں بھی پہلا کسی مذہب کا امام نہیں سمجھا جاسکتا۔ بلکہ اگر کوئی بے حد مصر ہو تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسے مذہب کا امام جس نے اخلاق کو طلاق دے دیا ہو، حقیقت تو یہ ہے کہ یہ تعریف ایک شخصی خود مختار اور مطلق العنان بادشاہ کی ہے۔ جو یہ بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے کہ وہ اصول اخلاق کا پابند رہے۔

ہم نے مانا کہ ضرور نہیں کہ وہ وہ عادات و اطوار میں عامہ ناس سے کم ہو۔ لیکن یہ تعریف ایسے امام کی روحانی اطاعت سے فطرتاً ایک طبعی انقلاب پیدا کرتی ہے۔ جب تک اطاعت کرانے کے کچھ اور ذرائع نہ ہوں۔ طبیعت پر کیا فطری دباؤ ایسے شخص کا ہوسکتا ہے جس کے خصائص اخلاقی نہ مستند ہیں نہ جن کی تعمیر آئندہ کے لیے کوئی چھوٹا سا دعویٰ ہے۔ بلکہ دوسرے پہلو سے یہ سوچنے کی کافی آزادی ہے کہ امام کو اپنے اس منصب کے وسیع ذرائع سے بمقابلہ عامہ ناس حدود اخلاقی پر پوری اور بے پرسش دستبرد کا اختیار ہے۔ اس کی مثالیں اموی اور عباسی دور میں کافی سے زیادہ ملتی ہیں اور ایسی تعریف گھڑنے والوں میں شاہزادی، جام شراب، اور کثیر انعام کی امید اور شاعرانہ غلو پیدا کر دیتی ہے۔ سوچنے والا سوچ سکتا ہے کہ کیا کسی نبی اور قوم گر کی امت کے والی امرا ایسے ہی ہوتے ہیں؟

دُوسرا مضر پہلو

اِختلافِ نقابت کا دُوسرا مضر پہلو یہ تھا کہ آلِ رسالت کا جا ہوا اور مستند تقدس اگر امامت کا عنان گیر ہوتا تو کسی کو عذر کی گنجائش نہ ہوتی، بلکہ ایک قومی مرکز اور تربیت خصائل کے لیے ایک زبردست سانچہ ہوتا، اور نہ کبھی شبہ کیا جاسکتا نہ ضرورت ہوتی کہ سانچہ بدل گیا۔ گزشتہ میلانِ طبعی کی تاریخ بھیانک نہ کرتی اور کیسی ہی خاموشی سے دل یہ سوال نہ کرتا کہ تم کون ہو جس کی روحانی اطاعت کو ہم اپنے ذمہ واجب کرلیں۔ تم کون ہو جسے ہم مسائل ناگفتہ الحل میں اپنا پنچ قرار دیں اور تم کس خصوصیت سے ہمارے رسُولؐ کے بعد نقابت کا حق رکھتے ہو؟

تیسرا مضر پہلو

تیسرا مضر پہلو یہ تھا کہ اگر خلیفہ اور امام ایک شخص تھا، اور وہ اپنی رحلت کے وقت کسی کو امام بنا سکتا تھا یا لوگ اسے پسند اور مقرر کرتے تھے تو اس نئے نائب کو نہ اپنے امام پیشین کے مصالح ملت معلوم تھے اور نہ اسے مصالح ملک و ملت ودیعت کی جاتی تھی۔ اس سے نہ صرف مصلحت کا سلسلہ شکست ہوجاتا تھا، بلکہ مرتے ہوئے امام کو خود اس نوعی طریقہ نے اس نہایت مفید نکتہ کی طرف سے لاپرواہ کر رکھا تھا کہ وہ آئندہ کسی کو اس بڑے منصب کے لیے تیار کرے۔ عامہ ناس کو نئے چنے ہوئے امام کی طرف سے نہ یہ اطمینان تھا کہ وہ گزشتہ امام کے زیر تربیت رہا ہے اور نہ انھیں یہ اطمینان تھا کہ وہ اس منصب کی خدمتیں نموشاں کے تسکین کرلینے کے لائق کرچکا ہے، بلکہ فطرتاً انھیں ایک زمانہ تک تردد اور شک لاحق رہتا ہوگا۔ حق تو یہ ہے کہ یہ اصولِ انتخاب بجائے نبوت یا امامت روحانی کی تاریخ کے قطعاً شاہی تاریخ کا ایک ورق ہے۔

چوتھا مضر پہلو

اختلاف کا چوتھا مضر پہلو یہ تھا کہ ایک امام کے زمانہ سے دوسرے امام کے زمانہ تک تشنگی ہے۔ یعنی امام کی پسندیدگی ایک امام سے دوسرے امام تک ایسی صاف جست کی گئی ہے کہ اگرچہ درمیان میں اکثر لوگ بڑے شد و مد سے حکومت کرچکے لیکن وہ امام نہیں سمجھے گئے۔ یعنی بہت سا زمانہ بغیر کسی نقیب کے گزرا درآنحالیکہ اثنا عشر کی تعداد بھی ابھی پوری نہ ہوئی تھی اور اس طرح اس عدد کا مفید اِستمرار اور سلسلہ درمیانی بے اثری سے نقصان اٹھاتا تھا۔ سب سے طویل جست کی موٹی مثال عمر بن عبدالعزیز سے خاندان بنی عباس تک چلی گئی ہے۔

پانچواں مضر پہلو

اختلاف کا پانچواں مضر پہلو یہ ہے کہ اس حیثیت کی امامت قبول کرنے والے خود اپنے حلقہ میں تجویز نقبا میں اِختلاف کرتے ہیں۔

چھٹا مضر پہلو

چھٹا مضر نتیجہ یہ ہے کہ عامہ مُسلمین مسئلہ "نقیب" اور "نقابت" کو مختلف فیہ جانتے ہیں۔ اور حقیقتاً یہی مُسلمانوں کی ہر طرح کی تباہی کی اصل ہوا تھا اور اب بھی ہے۔ اس اختلاف کے شور نے اور بہت سے ضمنی ٹکڑے کیے جو آخر میں زمانہ کے ساتھ علیحدگی میں ممتاز ہوتے گئے۔ یہ ایک خوفناک تلوار تھی جو اسلام کے فولادی جسم پر اپنی برش آزما رہی تھی۔

مسئلۂ امامت کے اختلاف کا اثر

اکثر لوگ مسئلۂ امامت کے اختلاف کو ہلکے دل سے علماء اور مورخین کا اِختلاف کہہ کر خاموش ہوجاتے ہیں۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو شاید مجھے بھیانک ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ کاش ان اختلافات کا ایسا ہی ہلکا اثر ہوتا۔ لیکن افسوس یہی مُسلمانوں کے اختلاف کی جڑ ہے۔ کسی قوم کے پڑھے لکھے افراد عامہ ناس کی عقل، آنکھیں اور زبان ہیں۔ ان کے اِختلافات

نسبتہً ان کے قوی اور مہذب دل و زبان سے متظر ہوتے ہوئے جب عامہ ناس کے دل و زبان تک پہنچتے ہیں تو قوت صبر اور تہذیب کی کمی کی وجہ سے ایک عام تہلکہ کے باعث ہوتے ہیں۔

علماء اور عامہ ناس کا اہم ترین فرض

باوجود اصولی اختلاف کے بھی اختلاف کرنے والے علماء کا اسلامی فرض ہوگا کہ عامہ ناس کے ایسے کسی مضر ہیجان کی لگام کڑی کیے رہیں اور عامہ ناس کا فرض ہوگا کہ دنگل دیکھنے والے علماء سے ان کی مقبولیت سلب کرلیں۔ اختلاف کے کبھی یہ معنی نہ ہونے چاہییں کہ اہل اسلام پر جزئی اصولی اختلافات سے کوئی قومی اختلاف کا شبہ کرے یا جس سے ہم قدر مشترک کو اس قدر بھول جائیں کہ معاشرتی یک جہتیوں میں کوئی فرق پایا جاسکے۔

ایک سچی بات

ہم سب مادرِ اسلام کی گود کے پالے ہیں۔ یہی وہ منتر ہونا چاہیے اور ہے جو اختلاف کا بھوت بھگا دیتا ہے۔ ہم لوگ پہلے مسلمان ہیں اس کے بعد شیعہ سنی اور اہل حدیث وغیرہ ہیں۔ واقعات جو گزر گئے وہ نہ شیعہ تھے نہ سنی تھے نہ اہل حدیث بلکہ زمانہ کی ایک سانس تھے جس سے تاریخ حاملہ ہوئی۔ مصلحتیں جو اس کی موجد تھیں فنا ہوگئیں۔ معیار اسلامی ہمیشہ باقی رہے گا۔ اب ہمیں انھیں تاریخی تجربہ اخلاقی فوائد اور اسلامی اصول کی روشنی میں دیکھنا ہوگا۔

اختلاف کی بے قناعتی

گزشتہ سطروں کا اختلاف اگرچہ اسلام کے لیے ہر طرح کے پر مضرت سامانوں سے مسلح تھا لیکن پھر بھی کہا جاسکتا تھا کہ یہ یا تو کتابوں کے خاموش اور راز دار سینوں یا لوگوں کے دماغ میں دفن ہے لیکن یہ یہیں تک نہ رہا، بلکہ اس نے یہ بھی اپنی بے قناعتی کی روش کے شایان کچھا کہ ایک ظاہری شکل بھی اختیار کرتا۔ اور خانہ کعبہ ماتمی لباس سے اپنے آغوش کو مصلوں میں تقسیم کیا ہوا دیکھتا رہتا۔ وہ جگہ جو خدائے واحد کی عبادت کے لیے مرکز قرار دی گئی تھی، جہاں مسلمان بلا لحاظ فطری تقسیم قومیت، نوعیت انسانی، زبان، مراسم اور عادات ایک جگہ جمع ہو کر توحد کا خوشگوار گھونٹ پیتے اور اسلام کی یکساں عمومیت اور عادلانہ پر لطف سایہ کی کیفیت کو اپنی یاد میں ہمیشہ قائم رکھتے، وہاں اب اپنی تمام مشقتوں کے برداشت کے بعد اپنے کو اس عبرت خیز نظارہ سے بھی باز نہیں رکھ سکتے۔

قوم گر اس اختلاف کو کیونکر دیکھتا

ذرا سوچو اس حالت کو کہ گویا رسولؐ پھر سے دنیا میں بھیجے گئے ہیں اور وہ نہ صرف اسلام کو مختلف فرقوں میں تقسیم کیا ہوا بلکہ خود کعبہ اور طریقہ عبادت کو بھی ٹکڑے ٹکڑے دیکھتے ہیں۔ اس وقت آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ کی وہ پہاڑیاں یاد کرتے ہیں جس پر بیعت لے رہے تھے، دامن کوہ اور گھاٹیوں میں آدمیوں کی زندہ ندی بہہ رہی تھی اور یَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (۱۱۰ : ۲) کی پیشین گوئی پوری ہو رہی تھی۔ اسی چوٹی سے اب خانہ کعبہ کی گود کے مصلے دکھائی دیتے تھے۔ رسولؐ یاد کرتے ہیں کہ ہم نے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (۳ : ۱۰۳) بھی کہا تھا، اور اسی وقت انھیں ان فرقوں کی فہرست سنائی جاتی ہے جو ان کے بعد سے آج تک مرتب ہوئی ہے۔

وجہ نہ تھی یورپین مورخین کو وہ کچھ سوچنے اور صلاحیں دینے کی جس سلسلہ خیال کو انھوں نے اپنی تحریروں میں ظاہر کرنا

مناسب سمجھا ہے۔ اگر ایسی ظاہری صورتوں نے ان کے آمادہ کرنے میں مدد نہ کی ہوتی، ان کے سیاسی رموز میں ڈوبی ہوئی تحریر کو مسلمان بغیر ان کے نتائج اور انعکاس کو قبول کیے ہوئے بھی اس طرح پڑھ سکتے ہیں کہ اپنی واقعی مضر حالتوں کی اصلاح کریں۔

دُوسری نوعیت کے ائمہ

امامت مسلمین کا یہی ایک رُخ نہ تھا جس کا متذکرہ صدر سطروں میں اشارہ کیا گیا، بلکہ اس کے علاوہ بھی تھا جسے اجماع یا مصالح کی ان روش سے کوئی تعلق نہ تھا، جن پر چلنا اور چلانا مذکورہ حیثیت کے ائمہ کے موافق تھا۔ یہ دوسرا سلسلہ علیؑ اور اولاد رسُولؐ کا تھا۔

انؑ کی اِمامتؑ بے مضرتؑ اور بے اِعتراضؑ ہوتی

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر پہلا گروہ ائمہ اختیارات اور عامہ ناس پر اس طرح قابض نہ ہو جاتا جو ایک واقعہ تاریخی ہے تو موخر الذکر گروہ ائمہ امت رسُولؐ کا بے مضرت اور بے اعتراض قائم مقام ہوتا، اس لیے کہ ذیل کی باتیں نہ ہوتیں۔

مضر باتوں کی مثالیں

عرب کی ایسی عموماً بندۂ زر قوم جب یہ دیکھتی تھی کہ ایک ہر حیثیت سے بے حق شخص ایک دوسرے حیثیت سے حق دار شخص کے مقابلہ میں رسُولؐ کا قائم مقام بن جاسکتا ہے اور اس طرح اختیارات اور حکومت پر قابض ہوتا ہے تو وہ اور اس کے افراد کیوں نہ محض اختیارات اور حکومت کا حوصلہ کریں۔

افضلیت کا اٹھا دیا جانا خلافتِ رسُولؐ کے تقدس کے لیے مُہلک ضرب تھی

درآنحالیکہ رسُولؐ کی قائم مقامی کی نہ صرف قابلیت یا عدم قابلیت کی بحث رسُولؐ کی تجہیز و تکفین کے ہم وقت سقیفہ بنی ساعدہ کے مشہور جلسہ میں تجاہل پیدا کرنے کی کسی قدر ممتاز قابلیت سے اٹھا دی گئی تھی۔ بلکہ آئندہ ایسے ہی سوال پیدا ہونے کو قد ولیت علیکم ولست بخیرکم کہہ کر انکساری سے روک دیا تھا۔ کیوں نہ یہ حالت اور یہ فقرہ ایسے ہی حوصلہ کرنے والوں کے لیے سند ہوتا۔ لیکن بلاشبہ خلافت رسُولؐ کے تقدس کے لیے یہ مُہلک ضرب تھی۔

خصائل کا تغیّر

نہ صرف اختیارات کے حاصل کرنے کا موقع اور انداز اور مسئلہ افضلیت کا درمیان سے اٹھا دیا جانا بلکہ اس کے بعد اختیار حاصل کرنے والوں کا اپنے کو اپنی جگہ مضبوط اور قائم کرنے کے لیے خالصاً ملکی ذرائع استعمال کرنا اوروں کو امیدیں دلانا بے لگام حوصلوں کی آگ کو اسی طرح بھڑکاتا تھا جس سے لوگ نہ صرف اپنے گزشتہ تعمیر خصائل کے اعتبار سے پست ہوتے جاتے، بلکہ آئندہ اس نئے قسم کی تعمیر کے خوگر ہوتے جاتے، جو اپنی ساخت کے اعتبار سے کیسا ہی کچھ کیوں نہ ہو، لیکن رسُولؐ کی تعمیر سے بہت کچھ الگ تھا۔ بہت درست کہا ہے کسی نے کہ "جیسا خدا ہوگا ویسے ہی اس کے پرستش کرنے والے ہوں گے"۔ یا "مجھے آدمی دکھا دو میں ان کے اصول بتا دوں گا"۔ آدمی اس چیز کی اخلاقی طینت کے مشابہ ہوتا جاتا ہے جس کی اس کے دل میں وقعت ہے۔ یا جس کی کسی طرح پیروی کرتا ہے۔ یہ اس کی طبیعت پر عمل کرتی رہتی ہے اور وقعت کرنے والا اپنے کو اس کے مثل بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اس کے عنایات کا منتظر رہتا ہے اور اس کے ارادوں کی موافقت کرتا جاتا ہے۔

مددگاروں کی حرکتوں سے چشم پوشی

یہ صورتیں اس کی بھی مقتضی تھیں کہ اپنے مددگاروں کی عامہ ناس پر مضر اثر ڈالنے والی کارروائیوں پر باز پرس نہ کی جاتی۔ جس سے اپنے دائرہ کے لوگ امت پر کسی قدر مطلق العنانی سے دستبرد کا موقع پاتے اور اس دستبرد سے زیادہ نقصان رساں اثر اس کی اس طرح کی حفاظت کا تھا کہ "وہ تلوار نیام میں نہیں رکھی جا سکتی جسے خدا نے کھینچا ہو"۔ یا کسی حد کے روندنے والے کو "سیفِ خدا" کا ایسا مقدس خطاب دے دیا جائے۔

الجھے رکھنے کے ذرائع

امیدیں دلانے کا اقتضا یہ تھا کہ وہ لوگ جنھیں امیدیں دلائی تھیں امید کے شایان کسی ایسے کام میں الجھے رہتے جو دونوں کے لیے مفید ثابت ہو۔ الجھنے کے ذرائع چاہیے تھے، ذرائع پیدا کیے گئے۔

پہلی نوعیت کے ائمہ دوسری نوعیت کے ائمہ کے مؤیدین حقوق کے ساتھ

اور سب سے پہلے اس وضع کے نقیب نے رسولؐ کی امت کے خون کو اپنے اوپر جائز کر کے اپنی اس قوت کے اجتہاد کا اثر آئندہ ہر زمانہ میں جاری کر دیا۔ یہ سختی اس لیے جائز بھی گئی کہ کچھ لوگوں نے رسولؐ کا نقیب سمجھنے اور بیت المال کو بارونق بنانے میں دلچسپی سے انکار کیا تھا۔ دوہری نافرمانی تھی۔ ایک تو یہ کہ ان کا انکار کرنا ایسے نقیب کے اختیار کی نفی تھی، دوسرے ایسے حوصلوں کے قاضی الحاجات کی زیارت بغیر وہ لوگ جو دارالحکومت میں امیدوں سے ٹھنڈے کیے گئے تھے۔ گرفت کے باہر ہو جاتے۔ خشک امید قناعت کا اچھا نسخہ نہ تھا۔ اور تیسری ایک سخت ناگوار بات تھی، وہ یہ کہ ان انکار کرنے والوں کے نزدیک رسولؐ کا نقیب دوسرا تھا۔ اور ایک تیسرا مسئلہ پیش کر رہا تھا کہ اگر تم ہو سکتے ہو اور حق دار گروہ نہیں ہو سکتا تو ہم کیوں نہ ہوں، حالت نازک تھی۔ کیونکہ یہ ابتدا میں جڑ پکڑ رہے تھے۔ صاحب اختیار گروہ کے لیے ان کی کوئی کوشش وہ حق دار کے لیے ہو یا اپنے لیے دونوں طرح مضر تھی۔ فوجیں سخت احکام اور ہدایتوں کے ساتھ روانہ کی گئیں۔ ملانے کی کوششیں کی گئیں۔ آخر میں ٹھنڈا فولاد گرمیوں کے سرد کرنے کے لیے کام میں لایا گیا۔ اور یہ سختی تھی ان کارروائیوں کی کہ اگرچہ انکار کرنے والوں کا ایک افسر جان بچانے کی مصلحت سے ساتھ ہو گیا مگر مل جانا نہ اس خوفناک یادداشت کو دماغ سے نکال سکا اور نہ ٹھنڈی سانس روک سکا۔

غلط اندازی یا اچھے فقرات کا برا مصرف

نقیب کے سپاہیوں نے عہد کے بعد ایفا کے وقت حیرت خیز تاویل کی، اور یہ کارروائیاں یا تو "خدا نے سینہ کھول دیا" اور یا "صلاح دین" کے تقدس میں ڈبوئے ہوئے فقروں میں ظہور کرتی تھیں۔

اختیار بخش جلسہ کی مضرتیں

وہ یک طرفہ جلسہ جو پہلے گروہ ائمہ کے لیے اختیار بخش ثابت ہوا اور جس کے باضابطہ ثابت کرنے میں کافی عرق ریزی کی گئی ہے اصول انتخاب کے لحاظ سے قابل تعریف ہو یا نہ ہو لیکن اس سے انکار نہ کیا جا سکے گا کہ انصار کو اوس و خزرج میں تقسیم کرنے اور پرانی کشیدگیاں بلکہ عرب کے طینت کے برے عناصر کے زندہ کرنے کا بہترین ثبوت تھا جس کے دبانے اور اصلاح میں

بانی قوم نے بہت سی زحمتیں گوارا فرمائی تھیں۔ بنی اُمیہ کا پرانا مقتدر گروہ اور بنی ہاشم کے ایک دن پہلے حاکم جماعت اس لامعلوم اور گویا پردہ نشین جلسہ کی کارروائیوں سے ناموافق تھی اور اسی طرح اس کے بھی بین ثبوت ہیں کہ مقتدر افراد مہاجرین بھی دوبارہ انتخاب چاہتے تھے جس سے گزشتہ انتخاب پر عکس پڑتا تھا۔ خود یہ انصافانہ خواہش نہ صاحب اختیار گروہ نے قبول کی اور نہ بجز عام ملکی چالوں کے اس کا مسلمانوں کی عام خواہش کے موافق فیصلہ کیا۔ اس بے میں یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ بعض کی اس پر تحمیل خواہش اور اس خواہش کے جلودار اعمال نے جس کی نیت کے حسن اور قبح سے اس وقت بحث نہیں ہے، یہ افسوس ناک نتیجہ پیدا کیا کہ وہ بڑے بڑے قوی گروہ خیالات میں متفرق ہو گئے جو ایک دن پہلے ایک تھے۔

قومی عناصر کی فنا

بعض کو بعض سے شکایتیں پیدا ہو گئیں۔ ایثار، ہمدردی، اور یک جہتی غرض معدوم ہو گئی۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس جلسہ کے لوگوں نے رسولؐ کو تو دفن نہ کیا لیکن ان صفات کو دفن کرنے میں بہت جلدی کی جو انھوں نے قوم میں پیدا اور زندہ کی تھیں۔ یقیناً اس نقصان کے اندازہ کرنے میں مبالغہ ممکن نہیں ہے۔

نقابت کے اس اصول کی مخالفت میں خاندان امیہ کے مشہور ترین شخص کا یہ فقرہ ہمیشہ کے لیے یادگار رہا جو تاریخ کے رازدار سینوں میں محفوظ ہے کہ: "اگر تم کہو تو مدینہ کو سوار اور پیادوں سے بھر دوں"۔

زبردست مخالف کی خریداری اور اس کا آئندہ اثر

خود غرضانہ ہوش مندی سے اس کا علاج کیا گیا۔ اور اس مخالف انتخاب کے دولڑکے یکے بعد دیگرے شام کے ایسے زرخیز ملک اور فوجی اور ملکی افسری کے ایسے بڑے عہدوں پر بحال کیے گئے۔ اس سے یہ پُر حوصلہ گروہ اگرچہ ایک زمانہ کے لیے قانع اور خاموش ہو گیا۔ لیکن شام بنی اُمیہ کی آبادی کا مرکز اور قلعہ ہو گیا۔ اسی جگہ سے اس منتقم گروہ کی بنیاد مضبوط ہونے لگی۔ مجھے اس سے اس وقت بحث نہیں ہے کہ ایسے قسم کھائے ہوئے دشمنان آل ہاشم کو جیت کر قوی کرنا کہاں تک نیت اور غرض پر شبہ وارد کر سکتا ہے۔ لیکن اسلام کی تاریخ نے جلی حرفوں سے لکھا ہے کہ اختیار سپرد کرنے کی اس تجویز نے وہ دانستہ ہو یا نادانستہ؟ اپنی دانست میں خاندان رسالت کا نام مٹا ہی دیا۔ اور مٹانا کسے کہتے ہیں۔ اگر حرملہ بن کاہل اسدی کے تیر اور چھ مہینہ کے بچہ کے خون آلود گلوئے نازنین کی شرح اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔ بنی ہاشم سے اختیار لے لینا جس کی ابتدا تھی بنی ہاشم پر اسی مصلحت کی پیروی سے اختیار صرف کرنا اس کی انتہا تھی۔

آئندہ زوال کے اسباب کے ذمہ دار پہلی نوعیت کے نقبا تھے

بعض اوقات چھوٹے اسباب بھی بڑے نتائج پیدا کرتے ہیں، چہ جائے کہ ایسے اسباب جو ابتدا ہی میں بڑی مخالفت کے عناصر سے پر ہوں۔ اس طرح کی حکومتیں جب فتوحات سے دم لیتی تھیں تو اندرونی عناصر تفرقہ اپنا اثر دکھاتے تھے۔ فوجی جوش، گھر کی ناموافقتیں، حسد، ناتربیت یافتہ حوصلہ، عدم ہمدردی، کمی ایثار، یک جہتی، غرض کی فراموشی کسی اعلیٰ فرض کے زندہ احساس کی کمی اور اس کی طرف سے صاحب اختیار نقبا کی سرد توجہی بلکہ تجاہل، روحانی مرکز کی بگڑی ہوئی ابتدا، اور اس کی طرف سے پیدا کی ہوئی خیالات کی پاشانی، موجودہ نقیب کا

روحانیت کی طرف سے طبعی استخفاف، انھیں بے کاری میں مشغلہ بتاتی تھی اور وہ دیکھتے تھے کہ ہمارے وہ دشمن جن کو ہم نے اپنی تلواروں سے مرعوب کرلیا، اس اندرونی دشمن کے مقابلہ میں بے حقیقت تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انھیں اپنی اندرونی سخت مخالفتیں اور اس کا پرمضرت اثر ایک زمانہ تک پرمضرت اثر ہی نہ معلوم ہوا۔ اس کے صحیح گرفت کی کمی یا گرفت کے بعد اس کے روکنے کے ذرائع کی کمی قوموں کے زوال کا باعث ہوتی ہیں۔ انھیں اس کے پرمضرت اثر کا احساس کیونکر ہوتا۔ اس لیے کہ وہ تو ان اشغال میں ملفوف تھے جو انھیں بتائے گئے تھے۔ مسلئہ نقابت سے انھیں اس کے سمجھنے میں کوئی مدد نہ ملی تھی بلکہ تجاہل میں پرورش پارہے تھے۔

تنگ مصلحتی کی مثالیں جو اخوتؑ اور مساوات کے منافی تھیں

ایک وقت تھا کہ ابتدا میں بعض لوگ حکومت پر قابض ہوکر مصالح ملک وملت کو آپس میں محدود رکھ کر عامہ ناس کو جاہل اور عدم ہمدرد رکھتے تھے۔ پھر یہ نمو ہوا کہ مُسلمین عرب کے مقابلہ میں غیر عرب مُسلمین تسویہ حقوق کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔ وہ ملکی امورات میں ہوں یا مذہبی، اور پھر یہ ترقی تھی کہ بنی اُمیہ بجائے عام ہمدردی کے صرف بنی اُمیہ کے ساتھ ہمدردی کرنا، اور اختیارات کا آپس میں رکھنا اسلام کے شایان سمجھتے تھے۔ کون کہتا کہ یہ ترکیبیں قوم کُر کی عالمگیر اسلامی مساوات، اخوت، اور معاشرت کا خون ہے۔ کس کے پاس ایک سے زیادہ زبان تھی کہ وہ کسی ایک کے کٹ جانے پر اس کا غم نہ کرتا، اور دوسری سے کام لیتا۔ کس کی آواز اس قدر بلند اور قوی تھی جو یہ سناتا کہ تم ایک عظیم الشان ساخت قومیت کو مُنہدم کررہے ہو۔ مگر یہ کہ حسینؑ مظلوم کے گلوئے بریدہ کی خون آلود رگیں نقابت کرتیں۔

مصلحت کی ابتدا، اس کے سمجھنے میں حارج تھی

گزشتہ اشاروں کے اعتبار سے یہ ظاہر ہوگا کہ جب نقیب کی ضرورتیں اسے بعض مصالح کے ایجاد پر آمادہ کرتی تھیں تو اگرچہ وہ ابتداءً چھوٹی معلوم ہوتی ہوں اور اس وجہ سے عملی تجربہ لوگوں کو نہ ہونے کی وجہ سے باز پرس نہ بھی کی جاتی ہو لیکن جس وقت کچھ ہی دن کے بعد مبالغہ کیا جاتا تھا، اور جب لوگ اسے سمجھتے تھے تو اگرچہ وہ مخالفت کرنے کی قوت نہ بھی پاتے ہوں تاہم ذمہ داران نقابت اور ان کے جلوداروں سے مخالفت اور بددلی کا سرمایہ مستقل اور زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ بہ استثناء ان لوگوں کے جن کے لیے ایسی کارروائیاں زرخیز ثابت ہوتی ہوں۔

بڑی بڑی تاریخی شہادتوں میں سے اگر کوئی مثال طلب کی جائے تو شاید یہ فقرہ جو ایک ذمہ دار نقیب کے لیے ایک اسی کی جماعت کے نزدیک قابلِ اعتبار زبان سے ادا ہوا تھا، کافی ہوگا کہ: "ابھی رسولؐ کا کفن پرانا نہیں ہوا لیکن ان کی سنت پرانی ہوگئی"۔ اس جملہ کی واقعیت اور اثر کو ہر پڑھا لکھا مُسلمان جانتا ہے۔

یہ تاریخی مثالیں ممکن ہیں کہ کسی کے نزدیک اب بھی قابلِ اعتبار نہ ہوں جیسے زمانۂ گزشتہ میں نہ ہوئیں لیکن اسے سوچنا ہوگا کہ بڑی لہریں لینے والے دریا کا سوتہ اپنی جگہ ایسا ہوتا ہے جیسے کسی نالہ کو کھیلتے ہوئے بچے کاٹھی کا گھروندا ابتداءً روک سکتا ہے۔ لیکن آخر میں یہی جب دریا ہوجاتا ہے تو سلطنتوں کے انجینئر اس کے پرچانے اور تابع کرنے کی اپنے میں قابلیت نہیں دیکھتے۔ مضرت کا درجہ تمیز اس سے ہوگا کہ قابلِ اعتراض حالتیں صاحب اثر اور صاحب اختیار لوگوں سے

سرزد ہوئی تھیں۔ مصلحتیں یا تو انھیں کی ایجاد کردہ تھیں یا ان کے انداز اور برتاؤ سے ان کی پیروی کرنے والوں میں وہ محرک ہوتا تھا جو مفید پہلو اور نتیجہ سے معرا تھا۔

چھوٹی باتوں کا بڑا نتیجہ

بڑوں کی باتیں مثالیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح ایک زمانہ آتا ہے جس میں قوم کے بڑے اور چھوٹے دونوں میں سے کسی کا کوئی محافظ اخلاق اور قومیت نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک مسلسل پر مضرت اثر اور اس کے بعد اس کی عادت انھیں ان کے بقائے قومی کی صفات سے خالی کردیتی ہے۔ میں ڈارون کی ذہانت کا اس قدر مُعترف نہیں ہوں جس قدر اس کے عکس میں آدمی اور قوم کے مسخ ہوجانے کا قائل ہوں۔ ہم ڈارون کی تھیوری کی کڑیاں کیوں صحراؤں میں ڈھونڈتے پھریں، جب کہ اس سے بدرجہا اچھا کام سامنے ہے کہ آدمی آدمی رکھا جائے اور جانور نہ ہونے دیا جائے۔

دوسرے گروہ ائمہ کا امت رسولؐ پر حاکم ہونا قطعاً بے مضرت ہوتا، متذکرہ صدر اصولی غلطیاں نہ ہوتیں، اس لیے کہ ان غلطیوں کا پیدا ہونا اول الذکر اصول امامت سے تھا جو نہ صرف بادی النظر میں بے اصول بلکہ آئندہ بے اصولیوں کے ایجاد کا محرک تھا۔

انہدام اساس

اصولی غلطیاں کل ڈھانچے کے شکست پر منتہی ہوتی ہیں۔ اگرچہ فروعات کی ترتیب کیسی ہی دوربینی اور احتیاط سے کیوں نہ کی گئی ہوں۔ اس اصول سے ملکی معاشرتی اور اخلاقی اعتبار فنا ہوگیا اور اس کے گرد وپیش کے اتفاقات نے مل جل کر نہ اس کے بچانے میں کوئی کسر اٹھا رکھی اور نہ حالات کے پوست کندہ ہونے پر بندہ غرض کے علاوہ کسی بے تعلق شخص کے لیے کوئی دلکشی باقی رہ گئی۔ الجھنیں پیدا ہوئیں۔ یہ واقعہ ہے۔ نہ ان کو موقع بینی اور بازی جیتنے کے لیے خلاف معمول کوششوں کی ضرورت ہوتی اور نہ الجھنیں پیدا ہوتیں۔ الجھنوں سے میرا مطلب وہ طبعی انقلاب ہے جس نے رسولؐ کے تعلیمی اثر اور مقدس ذات کو بھلا کر قطعاتی روش پر لوگوں کے خیال کو لگا دیا۔ اور نئی روش نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے وہ کوششیں ضروری سمجھیں جن سے نفس اسلام کے ساتھ مضر اثر کیا، اور چونکہ یہ کوششیں بقائے قومیت کے اغراض سے خالی تھیں، جب نئی تعلیم اور روش نے اپنا خوگر بنالیا تو اسلامی یک جہتی جواب تک ان کی مدد کرتی آئی تھی بہت کچھ کمزور ہوگئی، اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس روش کے نقیبا خود اسی جال میں الجھ گئے جو ان کے متقدمین نے بچھایا تھا، اور ابتدا میں اس نے اختیار اور حکومت پر قابض کرادیا تھا۔ تخت ملا، اور بیٹھ گیا۔ وہ قوم اب نہ تھی جس کی لاعلمی پائے سنبھال تھی۔ اب نہ قوم تھی اور نہ تخت۔

نفع اور نقصان کا موازنہ

یقیناً میں مبالغہ نہیں کرتا، اگر یہ کہتا ہوں کہ فارس اور شام نہیں بلکہ ان تمام فتوحات کو ایک طرف رکھو جو ملکی اسلام کے عروج کے زمانہ میں ہوئی اور ایک طرف ان مضرتوں کو رکھو جو گزشتہ اسباب نے پیدا کیں اور جس کے اس وقت سمجھنے میں زیادہ دشواریاں نہیں ہیں، تو یہ طے کرلینا آسان ہوگا کہ آگ کی طرح پھیلنے والی فتوحات کا ہونا، اور اس کا ان اسباب سے تباہ ہوجانا اس قدر مفید نہ تھا جیسا ان اصولی غلطیوں کی وجہ سے دیرپا مضر اثر ہوا۔ مُسلمان اس لیے بڑھتے تھے کہ اسے خود اپنے ہاتھ سے تباہ کریں۔ مجھے اسلام کی تاریخ میں اس سے زیادہ واضح کوئی بات نہیں دکھائی دیتی۔

کامیابی اسلام کی پیدا کی ہوئی بقیہ صفات کی بدولت تھی

اگر عروج اس مفہوم میں تھا کہ مسلمانوں میں بمقابلہ دیگر اقوام کے زیادہ شجاعت، استقلال اور دیگر اقوام کے ساتھ عمدہ برتاؤ کا خیال تھا تو میں بھولا ہوا مرثیہ یاد دلاؤں گا کہ اسی مرحوم اسلام کا صدقہ تھا جس کی عظیم ذمہ داری اور عنانگیری کا مشکل مسئلہ ہمارے ملک کے ذلیل ترین پنچایت اس کے انصاف اور توجہ سے بھی کم وقعتی سے دیکھا گیا۔

میرا یہ عرض کرنا مائل تفتیش کے لیے شاید پُرلطف توجہ کے قابل ہو کہ قوم کی یہ صفات نہ ان نقبا نے پیدا کی تھیں اور نہ اس کے قائم رکھنے کی ادنیٰ کوشش کی تھی۔ جس کوشش کو ہم اغراض فتوحات سے مستثنیٰ کر کے تعمیر قومی کے حوالہ کرسکیں۔

مثالیں جن میں اسلام کا شائبہ تھا

میں ابوالمحجن کے ترک شراب، خالد کی کوشش بعد عزل وغیرہ کا منکر نہیں ہوں، لیکن اگر ابوالمحجن کے ترک شراب کے خیال کی وجہ اسے اس کے افسر کے انعام سے زیادہ دکھاتی ہے تو خالد کی خاموشی کو اس کے افسر کی اندازہ اور موقع شناسی کی کمی یا عدم احتیاط سے زیادہ قابل ستائش سمجھتا ہوں۔

اختبار ائمہ کے خصائل اور تعلیم کا اثر

مذہب اگر ایک کے ترک شراب کا باعث تھا تو دوسرے میں وہ اطاعت جو مذہب نے سکھائی تھی فرمانبرداری کی محرک تھی۔ ان کا ایسے مواقع پر اپنے نفس کے ساتھ اجتہاد کرنا اسلام کے اثر سے تھا نقیب کے تعلیم اور اثر کے خیال کی اس میں نہ جھلک تھی اور نہ اس کا کوئی سایہ سمجھنے کے وجوہات دکھائی دیتے ہیں۔ گزشتہ زمانہ یا اوائل میں عروج کے اسباب وہ تھوڑی سی خوبیاں تھیں جو عادات اور خیالات میں چھپی چھپائی رہ گئی تھیں۔ نقیب اولیٰ یا اس کے بعد کے ایک آدھ قائم مقام اس تعریف کے مستحق نہ تھے کہ انھوں نے حفاظت کی کوشش کی تھی۔

قومی حافظہ

زمانہ کے گزرنے نے جہاں بقیہ خوبیوں کو قومی حافظہ سے خارج کردیا، وہاں برائیوں اور انتشار قومی کا سود بڑھتا گیا۔ عناصر قومیت کسی جلد میں نہیں رہتے بلکہ قوم کی عادت اور خیال میں رہتے ہیں، اور اسی طرح منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

دوسری نوعیت کے ائمہ کی بے مضرتی کی مثالیں

ثانی الذکر گروہ ائمہ کا امت رسولؐ کا عنانگیر ہونا بے اعتراض بھی ہوتا۔ اس لیے کہ عالم اسلام کے نزدیک رسولؐ کا ہر طرح کا حق ناقابل اعتراض تھا لوگ تسلیم کرچکے تھے اور اس تسلیم کی بنا پر خاندان رسالت میں سے کسی کو چاہتے تھے۔ لوگوں کا ایسا چاہنا بعض کے لیے باعث اضطراب تھا، نہ ان کے نقیب ہونے پر کسی کو یہ کہنے کی ضرورت ہوتی کہ: "ہم مدینہ کو سوار اور پیادوں سے بھردیں"۔ اور نہ مانعین زکوٰۃ کو قتل کرنا، اور قتل ہونا خواہ مخواہ بھلا معلوم ہوتا، نہ مغرور عرب یہ کہہ سکتے کہ ہم کسی کم درجہ نسب اور منزلت شخص کو اپنا افسر قبول نہیں کرسکتے۔ نہ انصار کے ایسے مقتدر گروہ کا افسر ایک زمانہ تک آنداز کنارہ کشی میں اپنی تسکین سمجھتا۔

مفید ہونے کے وجوہات

ثانی الذکر گروہ ائمہ کا امام ہونا نہ صرف بے مضرت اور بے اعتراض ہوتا بلکہ مفید بھی ہوتا۔ بے مضرت اور بے اعتراض کے معنی عموماً ضرور یہ نہیں ہیں کہ وہ پر فوائد اور مقبول بھی ہوتا۔ لیکن اس مخصوص موقع کے لیے یہ سوچنے کے کافی وجوہات ہیں کہ وہ مقبول اور مفید بھی ہوتا۔ یہ کیا کم مفید تھا کہ اس قدر مضرتیں نہ ہوتیں جو زوالِ قومی کی وجہِ اولیٰ ہوئیں۔ اور جب مخالفت میں آوازیں نہ آتیں بلکہ رسُول کے تعلیمی اثر اور زیر تربیت طبیعتیں، خاندانی مستند شرافت اور اس کی طبعی جلوگیر خوبیاں ذمہ دار ہوتیں تو اس کے مقبول نہ سمجھنے میں عالم کے تجربہ اور اخلاقی اعتبار کا منکر ہونا ہوگا۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ لوگ کسی دوسرے اثر سے متاثر نہ ہوئے ہوتے۔

مقبولیت

مقبول سمجھنے کے لیے متذکرہ صدر فقرات کہ: "ہم مدینہ کو سوار اور پیادوں سے بھر دیں"۔ یا "خاندانِ رسالت میں سے کسی کو چاہنا"۔ یا مانعین زکوٰۃ کا ان کے حقوق کی تائید کرنا، یا انصار کا ایسی ہی خواہش کرنا، کافی اور اس کا ثبوت ہے کہ ہر بڑا فرقہ ان کے عنانگیر اسلام ہونے کو کسی خیال، ناموافقت سے نہ دیکھ رہا تھا، بلکہ خیر مقدم کے لیے بلا کسی خود غرضانہ سفارش کے تیار تھا۔ ان کے ذمہ دار ہونے پر رسُول کے بعد کوئی انقلاب نہایت محسوس نہ کرتا۔ اس سے بڑھ کر یہ خیال نہ ہوتی۔ حوصلے اور خود غرضی میں تحرک نہ ہوتا، اور گویا رسُول کی تعلیم اور اثر میں ایک ہمیشگی پیدا ہوتی جاتی اور قوم یک جہتی اور ترقی خصائل کی طرف حرکت کرتی رہتی۔

دُوسری نوعیت کے امامِ اوّل کے تعمیرانہ فقرات

غور کرو اس وقت کو جب کہ گروہ ثانی کا نقیب اول اپنی معجز نما زبان اور زندہ کرنے والے فقرات کے ساتھ رسُولؐ کے منبر پر ہے (سچ کہا ہے کسی نے کہ منبر کی لکڑیاں اسی کی تلوار سے بنی ہیں) کوئی شتر نشین یا شام کا گروہ اسے مخالفت کے لیے للکارتا نہیں۔ (یہ للکار تو اسے بے حق کرنے، نئی جماعت تیار کر لینے اور قوت حاصل کرنے کے بعد تھی جو ایک زمانہ کی بے وقتی کے بعد اس کی بظاہر تھوڑی دیر کی قوت کے اثر میں بھی پیدا کرتی تھی) اس کے آدمی بنانے والے خطبے پڑھو تو تمہیں کسی زبان کے بھجانے سے پہلے خود یقین ہوجائے گا کہ ملہم من اللہ نبیؐ کا شاگرد بول رہا ہے۔

تم اس کا بھی یقین کرو گے کہ اس کے زیر تربیت اور مصلحت کے موافق نقبا کا سلسلہ امت رسُول کے لیے مفید ہوتا۔ وہی اپنے بستر احتضار سے کہتا تھا کہ: "اپنے درمیانی تنازعات کے مصلح بنو"۔ آنحضرت فرماتے تھے کہ: "اپنی ذات اور اپنے گروہ کی اصلاح تمام روزہ و نماز سے افضل ہے"۔ فرماتا تھا کہ: "جب تک بنی آدم ایک دُوسرے سے موافقت رکھتے ہیں اور بُرائی نہیں کرتے ان کے قبضے سے انتظام اور حکومت نہیں نکلتی۔ جب اس کے خلاف آپس میں نزاع جائز رکھتے ہیں تو کاموں میں خلل پڑتا ہے جس کا نتیجہ تباہی ہے"۔ کبھی اس پر متاسف تھا کہ: "شاہراہیں متروک اور ناپیدا ہوگئی ہیں"۔ اور کبھی اس پر سرد آہ بھرتا تھا کہ: "ہر اہل و نا اہل دینی اور دنیوی امور میں رائے زنی کرنے لگا۔ تلون مزاجیاں دامن گیر ہوگئیں"۔ اور کبھی کبھی مفید امورات میں باوجود بے وقت ہونے کے صاحب اختیار لوگوں سے شرط کرتا تھا کہ: "اپنے ہوائے نفس کی پیروی نہ کرو گے"۔

اس کے علاوہ اس کی مثالیں آئیں گی کہ اس سلسلہ کے ائمہ نے باوجود بے اختیاری کے اجماعِ امت کا کس درجہ لحاظ کیا۔ اگرچہ وہ ذاتی طور سے ان کے لیے مفید نہ ہوتا، ان کا نقیب ہونا مفید ہوتا۔

ان کا محض وجود لطافت اسلام کی بقا کا باعث ہوا

اس بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بھی یہ کہنا قرینِ انصاف ہوگا کہ اس سلسلہ کو بے اختیاری یا بے اختیاری کے بعد اختیار حاصل ہونے میں اگرچہ دشواریاں ہر وقت ملفوف رکھتی تھیں اور اس سے گویا انھیں کبھی وہ آزادانہ موقع ہی نہیں ملا کہ وہ تربیت اور تعمیر قومی کے فرائض ادا کرسکتے۔ تاہم ان کا محض وجود لطافت اسلام کی قائم رکھنے کا باعث ہوا۔ اور اگرچہ ان کی زبان پر مہر لگادی گئی تھی اور اکثر اس کا موقع نہ تھا کہ اپنے خیالات اور فقرات سے تعلیم کرسکتے۔

خاموشی میں طریقۂ تعلیم

لیکن ان کا دوسرا طریقۂ تعلیم یعنی خود اپنا عمل اس وقت تک فائدہ بخش ہوتا رہا جب تک قبر کا گوشہ یالوی بن نہیک کا سا قید خانہ انھیں لوگوں کی نگاہ سے بالکل مخفی نہ کردیتا تھا۔ ان کا عمل لوگوں پر اثر کرتا تھا۔ لوگ دیکھتے تھے۔ درشت خو محافظ قید خانہ اپنے مقدس اسیر کا قیدی بن جاتا تھا۔

حسینؑ کے سلسلہ ائمہ پر اُن کے پہلے اور بعد کی سختیوں کے مدارج اور وجہ

میں جس سلسلہ کو سمجھانا چاہتا ہوں اس کے لحاظ سے یہ کہہ دینا ضروری ہوگا کہ حسینؑ کے پہلے ان کے سلسلہ ائمہ پر اس قدر ظاہری تشدد بجز بعض فوری گزرتی ہوئی حالتوں کے نہ تھا، جس قدر ان کے زمانہ اور ان کے بعد تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ان پہلے ائمہ کا زمانہ رسولؐ سے قریب تر تھا۔ کچھ دیکھنے والے لوگ تھے اور اس لیے ان پر زیادہ سختی کرنا مصلحت کے خلاف تھا۔ درآنحالیکہ حسینؑ کے بعد سلسلہ ائمہ کے زمانہ میں کئی پشتیں مخالفت میں بسر کرچکی تھیں بلکہ ماں کے پیٹ سے مخالفتوں کے ساتھ پیدا ہوئی تھیں۔ سختیاں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ بجائے امام اور نقیب کی زبان کے اس کے پاؤں کی زنجیر اس کی مظلومی کی نقابت کرتی تھی۔ یا کوئی مظلوم امام اپنے کسی پہچاننے والے کے مخاطب ہونے پر اسے محتاط اشاروں سے روکتا تھا۔ حقیقی اسلام کے یہ قیامت تک غم کے لیے کافی ہے کہ توہین آلِ رسالت میں اس قدر ہمتیں بڑھائیں اور بڑھ گئی تھیں کہ کوئی ان ائمہ کے مُنہ پر سب کرتا تھا اور جب یہ اپنے کرم اور عفو سے اس کی طرف سے مُنہ پھیر لیتے تھے تو وہ دوسری طرف بھی آکر کہتا تھا کہ ہم نے تمھاری ہی سب کی ہے اور وہ یادگار رسولؐ جواب میں فرماتا تھا کہ: "میں نے اس سے بھی اعراض کیا"۔

ان کی روشنی

پھر بھی جس طرح حسینؑ کے پہلے ان کے سلسلہ ائمہ نے جان توڑ اصلاح کی کوشش سے یہ سمجھادیا کہ ہم بہت کچھ کرسکتے تھے اگر ہمارے ہاتھ کھلے ہوتے اسی طرح بعد کے خاموش ائمہ نے اس بڑی قربانی کے بعد بھی باوجود اس کے کہ ہر سنگریزہ اور مسلمات فضا میں "خاموش قتل یا زہر" نفوذ کیا ہوا تھا۔ اپنے مقدس کوشش کے آثار چھوڑے۔ یزید کا دربار ہو یا اموی بادشاہ کو سکہ کی صلاح لینی ہو۔ مامون کا دربار ہو یا امت رسولؐ کی کسی عید میں عبادت کے لیے لے جانا ہو، متوکل کے سامنے اپنے خلاف خواہش اشعار پڑھنے ہوں یا ہشام کا ایسا شاگرد چھوڑنا ہو جو بارکلی کے مشہور مکالمہ کے صدیوں پہلے اس کی ابتدا کرے۔ یہ سب مع اپنے تاریخی آثار انھیں گوشہ نشینوں

کی روشنی تھی۔ یہ لوگ علم اور عقل کو زندہ کرتے تھے اور تھوڑی سختی کی کمی ان کے دائرہ تعلیم اور روشنی کو وسیع دیکھنا شروع کرتی تھی۔ دربار اگر سیاسی مسائل اور فتوحات کی پیچیدگیوں میں الجھتا تھا تو یہ لوگ دماغوں سے الجھنیں دور کرتے تھے۔ خیالات کو ہموار کرتے تھے اور کچھ ایسی روحانی لذت اور علمی چاشنی پیدا کر دیتے تھے۔ کہ لوگ جرمانے ادا کر کے ان سے ایک ایک بات پوچھنے آتے تھے۔

ان کے کلام کی سند اور انتہا

انھوں نے آپس کے مصلے نہیں بنائے، ایک امام دوسرے کی گرما گرم مخالفت سے متنفر تھا۔ ان میں پطرس اور پولوس کی ایسی مشہور عداوت اور حسد نہ تھا۔ بلکہ یہ مقدس سلسلہ اپنے کلام کی سند اپنے مقدس پیشرو سے لاتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ جناب رسالت مآبؐ پر منتہی ہوتا تھا۔ اس سے نہ صرف صدق کلام اور کلام کے قبول کے لیے یہ سلسلہ ایک ثبوت تھا، بلکہ ایک امام نقیب گزشتہ کی تعلیم اور تربیت میں بسر کرتا ہوا اس قابل ہوتا تھا کہ وہ آئندہ کا امام ہو سکے۔

میں حسینؑ سے ہمدردی کرنے والوں کی تعمیر قومی اور ذکر حسینؑ کرنے والوں کی عموماً کمی قابلیت اور تعمیر کی کمزوری پر افسوس کرتا ہوا ناظر کو کسی قدر زیادہ بلند لے گیا، اور رسولؐ کے وقت سے ان کی تعمیرانہ مصلحت اور خواہش، اس کی پاشانی کے اسباب اور وجوہات پر اس لیے متوجہ ہو گیا کہ قوم کی حالت رسولؐ کے بعد کی مصلحت، اس کا اثر، مسئلہ نقابت کا حسینؑ سے تعلق اور ان کی کوشش اچھی طرح سمجھ میں آجائے، جو اس قربانی کی عظمت کے سمجھنے میں معین ہو۔ لیکن ہر حیثیت کے ذاکرین حسینؑ کو دوبارہ مخاطب کرنے کے قبل میں حسینؑ کے بعد کے ائمہ کا اس لیے ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ خود ان کی کوشش سمجھ میں آجائے جو شہادت کے قرب زمان کے لحاظ سے تھی۔

شہادتِ حسینؑ کو حسینؑ کے بعد کے ائمہ نے تعمیر قومی کے لیے ضروری سمجھا

حسینؑ کے بعد کے ائمہ نے اس مہتم بالشان قربانی کو تعمیر قومی کے لیے ضروری اور اصل ذریعہ سمجھا۔ میں آسانی مدنظر رکھ کر اعمال عاشورا اور زیارت کا تذکرہ کر دیتا، اور بس لیکن اس شبہ کے ساتھ آگے بڑھنے کو دل نہیں چاہتا کہ مبادا ناظران اشارات، الفاظ اور ان کے تموج سے بے ہوش گزر جائے جس پر توجہ دلانا میرا مقصود ہے۔

اعمالِ عاشور

غور کے قابل ہیں یہ احکام جن کے معنی موقع اور حالت میں مخفی ہیں کہ اچھے کپڑے پہنو، پاک صاف رہو، صحرا یا بام خانہ پر رہو، آستین الٹی رہے، محزون رہو، عمل عاشور میں شخص اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ رِضًا بِقَضَآئِہٖ وَتَسْلِیْمًا لِاَمْرِہٖ کہتا ہوا، کبھی آگے بڑھتا ہے کبھی پیچھے ہٹتا ہے۔ اس کا نفس ایک عالم میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جس سے وہ اپنے اس انتشارانہ عمل میں حسینؑ کی اس حالت کا زندہ احساس کرتا ہے۔

ایک حالت

جب وہ حضرت اپنی ناقابل بیان حالتوں میں کبھی سوچتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں کبھی سوچنے کے لیے دم لیتے ہیں، کبھی کوئی درد انگیز صدا یا خیال پیچھے ہٹاتا ہے۔ اور یہی تسلیم و رضا کے الفاظ زبانِ اقدس پر جاری ہو کر یا تو خیالات اور ارادہ کا تصفیہ کر دیتے ہیں، صبر کی ہمت دلاتے ہیں یا الفاظ کی صدائے بازگشت حالت یا خیال کے تکلیف دہ احساس سے تھوڑی دیر غافل کر دیتی ہے۔ یا تھوڑی تسکین ہو جاتی ہے۔

اعمالِ عاشور بجا لانے والا کہتا ہے کہ لقد عظمت الرزیة و جلت المصیبة بك علینا و علی جمیع اهل الاسلام (بہ تحقیق کہ آپ کی وجہ سے ماتم اور مصیبت ہم پر اور جمیع اہلِ اسلام پر بزرگ ہوگئی)
ف : اللہ امۃ اسست اساس الظلم والجور علیکم اهل البیت۔ (پس خدا۔۔۔ کرے اس گروہ پر جس نے تم اہل بیت کے لیے ظلم و جور کی بنیاد ڈالی)

نزاعی اور دفاعی عہد

اس کے بعد دشمنوں کے ہر تعلق سے برارت ظاہر کرتے ہوئے "انی سلم لمن سالمکم و حرب لمن حاربکم" (میں اس سے صلح کرتا ہوں جس نے آپ سے صلح کی اور جنگ کرنے والا ہوں اس سے جو آپ سے جنگ کرے)

دُعا جو زبان رکھتی ہے

اللھم عجل فرج آل محمد واجعل صلواتك علیه و علیهم و ستنقذهم من ایدی المنافقین۔۔۔ وافتح لهم فتحاً یسیرا واتح لهم روحاً و فرجاً قریباً واجعل لهم من لدنك علی عدوك و عدوهم سلطاناً نصیرا۔ (خداوندا آلِ محمد کی کشائش کار میں جلدی کر، اس پر اور ان پر درود بھیج اور انھیں منافقین کے ہاتھوں سے خلاصی دے۔۔۔ انھیں آسان فتح دے، ان کے لیے کشائش اور راحت جلد مہیا کردے۔ اور انھیں اپنی طرف سے اپنے اور ان کے دشمنوں پر غلبہ پانے والا کردے) فانك ضمنت اعزازهم بعد الذلة و تکثیرهم بعد القلة واظهارهم بعد الخمول۔ (پس بدرستیکہ تو ضامن ہوا ان کے اعزاز کا بعد ذلت کے۔ اور ان کی کثرت کا بعد قلت کے اور ظاہر کرنے کا بعد گمنامی کے)

زیارت

حسینؑ کی زیارت پڑھنے والا انھیں مشاہیر انبیاء کی صفات کا وارث کہہ کر پکارتا ہے۔ السلام علیك یا وارث آدم صفوة اللہ۔۔۔۔۔ اور نہ صرف ان کے برگزیدہ آبائے طاہرین اور ان کی ہدایت یافتہ اور ہدایت کنندہ اولاد پر سلام بھیجتا ہے بلکہ ان پر بھی جو ساتھ شہید ہوئے اور جن کی پاک روحیں ان کی ہم جوار ہیں۔ یہ فقرات سرسری طور پر کہیں کہیں سے زاد المعاد سے چن لیے گئے ہیں۔ ان کل فقرات میں جہاں غم کی گہری لکیر پڑی ہوئی ہے وہاں ذات حسینی سے جو جملہ صفات کی مرکز تھی ہمدردی کرنے، ہمدردی کرنے والوں کی یکجہتی دشمنوں سے برامت تسلیم و رضا کا سبق، عبادت سے تذکیہ اور یکجہتی غرض کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ دُعائیں اہلِ بیت رسُول کے ساتھ ایک نزاعی اور دفاعی عہد ہے۔ (دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن)

کوشش اسی پر تمام نہ ہوگئی تھی بلکہ اگر کوئی مظلوم امام مظلوم حسینؑ کا نام سن کر تمام دن متبسم نہ ہوتا تھا تو شعراء کو مرثیہ کہنے کے صلہ میں انعام سے زیادہ داد دی جاتی تھی۔ یک جہتی غرض کی کوشش گھر سے شروع ہوتی تھی۔ اگر اہلِ بیت طہارت پس پردہ خاموش آنسوؤں سے روتے تھے تو امام کے دیکھنے والے شاعر کے دل ہلا دینے والے الفاظ کے علاوہ امام کے اثر سے متاثر ہوتے تھے۔ کیا کوئی اسے غم کا کمزور اثر کہہ سکتا ہے کہ حضرت رباب ایک برس تک چھت کے نیچے نہ بیٹھیں، یا امام مظلوم بیمار کربلا کی نگاہوں کے سامنے یہ واقعہ عظیم چالیس برس تک تازہ رہا۔

لیکن ائمہ کی ان کوششوں کو اولیت کا درجہ حاصل نہ تھا بلکہ ابتدا خود حسینؑ ہی نے کی تھی۔ اور جو اہلِ بیتؑ

کے دمشق تک جانے اور مدینہ کی واپسی تک ہیجان پیدا کرنے والے اسباب مہیا کر چکی تھی۔ ائمہ کی کوششوں کو نہ صرف واقعۂ شہادت بلکہ خود ان اسباب سے مدد ملی جو حسینؑ پیدا کر چکے تھے۔ مثلاً:

حسینؑ کے الفاظ جو آئندہ اساس جماعت ہوئے

"مسیو ماربین" کے لفظوں میں حسینؑ کا یہ فرمانا کہ: میرے قتل ہو جانے کے بعد اور ان جانکاہ مصائب گزر جانے کے بعد خداوند عالم ایک جماعت کو آمادہ کرے گا جو حق کو باطل سے جدا کرے گی۔ اور ہماری قبروں کی زیارت کریں گے اور ہماری مصیبتوں پر روئیں گے اور دشمنان آل محمد کو اچھی طرح ہلاک کریں گے۔ یہ لوگ خدا کے دین اور میرے نانا کی شریعت کی ترویج کریں گے اور میں اور میرے جد بزرگوار انھیں دوست رکھیں گے اور وہ قیامت کے دن ہمارے ساتھ محشور ہوں گے۔ نہ صرف اندازہ کے باہر ہیجان غم سے آپس میں محبت پیدا کرتا تھا بلکہ انھیں یہ شریفانہ ہمت دلائی تھی کہ وہ اس دین کی حمایت کریں گے جس کی روحانیت قائم رکھنے کے لیے حسینؑ شہید ہو رہے ہیں۔ انھیں عظیم الشان اخلاقی اندازہ پر آمادہ کیا تھا کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کریں۔ بلاشبہ یہ نبیانہ پیشین گوئی نمود اور نشو نمائے قومی کی باعث اور مٹتے ہوئے دین کے لطافت قائم رکھنے کی وجہ اعلیٰ ہوئی۔

حسینؑ اور دیگر ائمہ کی ان کوششوں کے بعد ان کوششوں کے واضح اثر کے سمجھنے کے لیے ملوک دیالمہ اور فاطمی خلفاء کے زمانہ کے اعمال عاشور اور ان کے دربار کی مجالس دیکھنے سے کوشش کا بلوغ ذہن نشین ہوگا، جو اس کے بعد حسینؑ کے مجالسِ عزا کے عالمگیر ہونے یا ان کے حاضرین کو حق و باطل میں تمیز کرنے والے افراد اور قوم بنانے کا مقدمہ اور مدرسہ تھا۔

قومی دِنؔ

انھیں کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج عالم روز عاشور کو حسینؑ سے ہمدردی کرنے والوں کا قومی دن سمجھتا ہے۔ وائے ہو ہم پر اگر ہم اسے اس کی خالص فطری شان سے گرا دیں۔ یا سنجیدگی اور اثر کے درجہ کو کمزوری، غفلت یا بے تمیز رونق کے حوالہ کریں۔

مجالس

حسینؑ کی مجالسِ عزا کے اثر کے متعلق "مسیو ماربین" کے یہ فقرات زیادہ واضح ہوں گے کہ:

"حسینؑ تمام روحانیین میں زیادہ تر حضرت مسیح سے مشابہ تھے۔ مگر ان (حسینؑ) کے مصائب شدید تر اور سخت تر تھے اور ابتداء پیش رفت تابعان حسینؑ کے بھی پیروان مسیح کے قرون اولیہ کی طرح تھے۔ اگر یہی لوگ بھی پیروان حسینؑ کے اصول اولیہ کی پیروی اختیار کر لیتے یا جو موانع خود مسلمانوں میں پیدا ہوگئے پیروان حسینؑ کو ان کے عمل سے نہ روکتے تو انھیں دو مذہب سے ایک مذہب عالم کے قرون عدیدہ تک عالمگیر ہو جاتا۔ چنانچہ پیروان حسینؑ کی روک تھام کے موانع جب اٹھ گئے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہب تمام طبقاتِ اسلامی کو اور دیگر مذاہب کو سیل کی طرح احاطہ کیے لیتا ہے"۔

میں یہ اشارے تمام کر چکا کہ حسینؑ کے قبل اور بعد تعمیر قومی کی کیا کوششیں ہوئی تھیں اور کیسے کیسے موانع پیش آئے۔ جس سے اور زیادہ کامیابی کا نہ ہونا تعجب خیز نہ تھا۔ لیکن اس زمانہ اور مقامات میں جب اور جہاں حسینؑ کے نام کے بلند کرنے کی کوشش موانع کے مقابل نہ ہوتی تھیں۔

واقعہ کے فطری اثر میں کونسی چیزیں حارج تھیں

ذکرِ حسینؑ کا ہمارے خصائل پر اور زیادہ مفید اثر نہ ہونا میری گزشتہ سطروں کے موافق اس وجہ سے بھی تھا کہ ذکرِ حسینؑ کرنے والے زیادہ تر اس درجہ کے نہ تھے جو صفات حُسینیہ اور ان کے اعلیٰ اغراض کا صحیح اندازہ کرسکتے اور ہم میں اس عمدہ صفات پیدا کرنے والے واقعہ کی خوبیوں کو جاری اور قائم کردیتے۔ واقعہ کا فطری اثر عدم تربیت، بے قاعدگی اور سمجھانے والے کی کمی سے سر ٹکرا رہا تھا۔

اِسلام مذہبِ اُمید ہے مذہبِ یاس نہیں ہے

اس کہنے سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں یاس کا اثر ڈال رہا ہوں۔ نہیں میں سب سے آخری شخص ہوں گا جو اس کا مرثیہ کہے کہ وقت گزر گیا۔ ہم اپنے عیوب سے اس وقت تک خالی اور صفات سے اس وقت تک آراستہ ہوسکتے ہیں جب تک ہم میں کا ایک بھی باقی ہے۔ اور وہ اسلام اور حسینؑ پر قائم ہے۔ کم سے کم وہی ایک شخص مثال ہوگا۔

حسینؑ کی شہادت ایک حرکت ہے جس میں سکون نہیں

میں اس خیال کے ان غافل، کاہل، اور شکستہ خیال میزبانوں میں نہیں ہوں جو یہ سمجھتے ہوں کہ حسینؑ کی شہادت کا خصلت گر اثر تمام ہوچکا، یا حسینؑ کو جو کچھ کرنا تھا کرچکے۔ نہیں۔ واللہ! حسینؑ کا عمل اپنے پیشتر کے جاری قوانینِ الٰہی کے لیے جہاں ایک سخت جھنجوڑ تھی وہاں آئندہ کے لیے ایک ایسی تھراہٹ تھی جس میں سکون نہیں ہے۔ قتل ہو، پیاسے رہو، بھوکے رہو، بچوں کو قتل کرادو، جن کے منہ سے دودھ کی بو آتی ہو۔ ان کے خون کو اپنے ہاتھوں سے منہ پر مل کر یہ کہہ دو کہ بارِالٰہا! میں اب تک صابر ہوں"۔ لیکن نہ شریفانہ غیرت میں فرق آئے، نہ صبر میں شکستگی پیدا ہو اور نہ خلاف نفس افعال کی پیروی کے لیے ایک قدم آگے بڑھے۔ بلکہ جوں جوں تکلیفیں بڑھتی جائیں اپنی سچائی کے یقین کے ساتھ تشدد پر صبر کی قوت اور برائی سے نفرت کا اندازہ زیادہ وزنی ہوتا جائے۔

شہادت کی عالمگیر مقبولیت اپنے عناصر کی وجہ سے ہے

تاریخ عالم میں حسینؑ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ہمیں یہ سمجھایا، خدا کا یہ قانون بتایا، عملاً علم نفس کا یہ قانون سمجھایا کہ نفس انسانی کی قوت تمام شمار کیے جانے کے قابل مصیبتوں سے زیادہ ہے۔ حسینؑ کی شہادت کا اثر قوانینِ الٰہی کی طرح غیر فانی ہوگیا۔ حسینؑ نے مذاہب کے اس لازوال ورثہ میں جان پیدا کردی جو مردہ حیثیت سے گنگ اخلاقی کتابی شان میں پڑا تھا۔ انجیل کا یہ فقرہ کہ: "مبارک ہیں وہ لوگ جنھیں راستبازی کے لیے تکلیف دی جاتی ہے آسمانوں کی حکومت ان کے لیے ہے"۔ حسینؑ سے زیادہ کسی سے چسپدگی نہیں رکھتا بغیر ایسے حسینؑ کے عالم ہمارے لیے ایک غیر مرتب ڈھیر ہے۔

رکاوٹیں

اِس اِختلاف بین الائمہ کی تاریخی اِبتداء کا ذکر جس نے جماعتیں تیار کیں اور جس کے وسیع معنی اور اثر کی طرف توجہ دلائی گئی عام اس سے کہ وہ کیسی ہی سنجیدہ حیثیت سے کیوں نہ کیا گیا ہو تمام اسلامی فرقوں کا

لحاظ کر کے ساتھ ہی عقل سے علیٰحدہ اور محض اعتقاد کو پیشِ نظر رکھ کر۔ ایسا نہیں ہے۔ جس کی نسبت یہ کافی اطمینان سے سوچا جاسکے کہ وہ ہر ایک کو متوجہ کرسکے گا۔ اس وجہ سے کہ توجہ کی راہ میں ایسی ایسی خیال اور ناممکن البیان رکاوٹیں پیدا کی گئی ہیں جو ایک ایسے شخص کے لیے جو عقل اور تاریخ سے کام لینا چاہتا ہے بہت کچھ مضحکہ خیز ہوں گی۔ لیکن وہ شخص جو اسبابِ شہادتِ حسینؑ سمجھنا چاہتا ہے وہ یا تو ان واقعات اور اشارات پر ٹھنڈے دل سے نظر کرتا جائے جس میں یقیناً شاعرانہ مضمون آفرینی نہیں کی گئی ہے۔ یا قطعاً اس مصلحت کی پابندی کرے جس نے ذکرِ حسینؑ کو ذاکر پر حرام کیا ہے۔

واقعہ سمجھنے کے اِستفہامی الفاظ

آنکھ کان بند کرلے پھر کوئی مورخ کیا معنی مسبب الاسباب کو بھی اس کے سمجھانے کے لیے اپنی عادت بدلنی پڑے گی۔ جو لوگ ایسے معاملات میں بھی جس میں مفید حیثیت سے اپنا اختیارِ تمیزی صرف کرسکتے ہیں "آنچہ اُستادِ ازل گفت ہماں می گویم" کے عادی ہیں ان سے کچھ کہنا عبث ہے۔ لیکن اس شخص کے لیے جو اس عظیم الشان واقعہ کو سمجھنا چاہتا ہے اسے کسی کا ان فطری سوالات سے روکنا مشکل ہے کہ کیا، کیوں، کس لیے، کیونکر، کب، کس نے؟

اِختلافؑ بین الائمہ حسینؑ تک پہنچتے پہنچتے سمجھنے کے قابل ہوگیا تھا

یہ اِختلاف بین الائمہ اپنے اسباب اور ساخت کے اِعتبار سے جس طرح قدم بڑھارہا تھا وہ حسینؑ تک پہنچتے پہنچتے نہ صرف کافی طور سے حسینؑ کے سمجھنے کے لائق ہوگیا تھا۔ اور پہچانتے کے قابل صورت میں آگیا تھا۔ بلکہ یہ کہنا اور واضح ہوگا کہ حسینؑ اس خاص سلسلہ کے ایک فرد تھے جس پر مخالف گروہ کے ائمہ یا مخالف ائمہ کے گروہ کا سب سے زیادہ مخالفانہ اثر پڑتا تھا۔ اور اسی لیے وہ اس کا پورا اندازہ کرسکتے تھے۔

زمانہ کی مقدار اور سمجھنے کی آسانیاںؑ

رسُول کی رحلت کے وقت حسینؑ سات برس کے تھے اور شہادت کے وقت ۵۷ برس کے۔ یعنی اختلافات اور اس کے اثر کو اپنے سلسلہ پر سمجھنے کے لیے نصف صدی ملی تھی اور یہ وقت ایسا نہ تھا جو رحلت رسُول اور اپنی شہادت کے درمیانی زمانہ میں خاموشی سے گزر گیا ہو۔ بلکہ وہ وقت تھا جس کے واقعات نے آئندہ اسلام کی ہر حیثیت کی قسمت کا فیصلہ کردیا۔ یہ نکتہ حسینؑ کی روش کے اس خاص پہلو کے سمجھنے میں مدد دے گا کہ ایسا نہ تھا کہ حسینؑ کو اپنے گرد و پیش کے طبائع اور واقعات نہ معلوم ہوں جس سے انھیں کسی امر میں فیصلہ کرنے کے مناسب ذرائع نہ ملتے ہوں۔

اس سے میری یہ غرض بھی ہے کہ اس سمجھنے میں مدد دوں کہ حسینؑ کا وہ مستقل حیرت خیز ارادہ جس نے سب کچھ سمجھ کر تمام مصیبتوں کو گوارا کرلیا۔ کس سرمایہ نفرت سے اس قدر مستحکم تھا کہ انھیں ایسے زمانہ میں زندہ رہنا ناگوار ہوگیا تھا۔ اور آیا ان کی نفرت ایک وجدانی لہر تھی جسے بیشتر کے خیال سے مدد نہ ملی ہو یا جیسا اوپر کہا گیا انھیں اپنے سلسلہ کے ساتھ ایک زمانہ کی مسلسل ناملائم برتاؤ دیکھتے دیکھتے اس قدر کوفت ہوگئی تھی کہ وہ آئندہ اس توہین کو گوارا کرنا اپنی اور اپنے ذمہ داری کی ذلت سمجھتے تھے۔ اور اب بقول مسیو ماربین: "غور و فکر اور علم و ارادہ کے ساتھ مقتول ہوجانے پر آمادہ ہوگئے تھے"۔

حسینؑ کی شہرت

میدانِ کربلا کے وہ تعجب خیز حسینؑ جن کے مخصوص واقعات کی زندگی چند مہینہ اور زیادہ خاص کہنے کے لیے چند دنوں یا روزِ عاشورہ کی ہے انھوں نے ایک دن یا چند مہینوں میں کیا کیا کہ وہ خدا کے بعد عالم میں سب سے زیادہ مشہور ہوگئے۔

نموئے صفات کا سلسلہ

اب ناظر کو بہترین غور سے یہ دیکھنا ہوگا کہ ان کی یہ شانِ طبیعت ان میں واقعہ کے ساتھ ہی پیدا ہوگئی یا ترقی صفات اور نموئے خصائل کے آثار اور ابتدا کچھ دنوں قبل یا بہت پیشتر سے تھی۔ وہ اسباب کیسے اور کیا تھے۔ وہ کون سے نفوس تھے جن کے زیرِ تربیت رہنے سے حسینؑ ایسے کھرے حق رو بن گئے اور ان کے حالات جاننے والے کو یہ یقین ہوگیا کہ ان میں حق سے بال برابر ہٹ جانے کی قابلیت ہی نہیں رہی۔

وراثت صفات

حسینؑ کی اس مخصوص عبرت خیز زندگی کے افعال میں گزشتہ زمانہ کی کونسی مثالوں کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اور واضح لفظوں میں حسینؑ کس خاندان کے صفات کے وارث اور مظہر تھے۔ کون سے گرد و پیش کے واقعات اور آثار نے انھیں عظیم المرتبت بنانے میں مدد دی۔ ان کی تربیت اور خیالات کے کون سے نفوس رہنما تھے۔ یا حسینؑ کے افعال اور خصائل کے سمجھنے کے لیے کن طبائع سے مدد لینی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ شاید یہ تحقیقات وہ فطری روش ہوں جن سے خصائص حسینؑ کے متعلق طبعی تفتیش کی جرأت کی جاسکے۔ لیکن میں حسینؑ کو وہاں سمجھوں گا۔ جہاں سمجھ سکتا ہوں وہاں نہیں جہاں میری کوشش اور الفاظ جواب دیتے ہیں۔ غالباً اکثر مقامات پر ہر قوم کا ناظر میرے اس خیال کا ساتھ دے گا کہ اس جگہ حسینؑ کا سمجھنا ناممکن ہے۔ اس لیے کہ ویسی مثالیں تاریخ عالم نہ دے سکے گی۔ چہ جائے کہ انسانی تجربہ اس کی تکرار کرتا ہو اور اس لیے ہر انسان اس کے اندازہ کے قابل ہو۔

نہ صرف نوعی بلکہ رُوحانی امام

حسینؑ صرف نوعی مفہوم میں ہمارے قومی ہیرو نہیں ہیں بلکہ روحانی حیثیت سے بھی انھیں تمام عالمِ اسلام امام سمجھتا ہے۔

دو صُورتیں

اس جگہ یہ فرق ملاحظہ طلب ہوگا کہ وہ امام جس کی مذہبی تقلید بلحاظ حکومت لوگوں نے گلے میں ڈال لی ہو اس امام سے اپنی روحانی حیثیت میں مختلف الاثر ہے۔ جسے اپنے پہلے کے امام سے تقلید اور تعلیم روحانی کا ادعا ہو۔

پہلی صورت

مذہبی حیثیت سے اس قدر مفید نہیں ہے جس قدر سیاسی اغراض کے لحاظ سے جس میں لوگوں پر مفید اثر ڈالنے کے لیے ملک نے مذہب کو ساتھ رکھنا ضروری سمجھا ہے۔ درآنحالیکہ غرض اولیٰ ملک ہے۔ یعنی مذہب تغیر پسند ضروریات ملکی کے لحاظ سے ہمیشہ مفید ملکی حیثیت کی تاویلات اور روش کا تابع ہے۔ اور اس لیے وہ ان وسیع تاویلات اور اس کے جلوگیر اغراض اور ان کے اس حیثیت کے اثر اور تاویل کرنے والے کے طبائع اور خیالات کے رنگ میں ڈوبا جاتا رہتا ہے۔ یہ مخلوط صورت قائم نہیں رہتی اور آخر میں یا تو حکومت کی دلچسپیاں مذہبی شاخ سے بے توجہ کر دیتی ہیں یا اس بے توجہی کے عالم میں کوئی دوسرا گروہ مذہب کے سنبھالنے کو کھڑا ہوتا ہے یا بادشاہ اپنی طرف سے کچھ لوگوں کو رشوات اور ضروریات مذہب کے لیے مقرر کرتا ہے۔ یہ جہاں قوت مذہبی کے ضعف کی صورت ہے، وہاں

مذہب مصالح حکومت کا تابع ہے اور ایک ایسی جماعت تیار کرتا ہے جن کی خود غرضیاں مذہب کی روحانیت کو بہت کچھ صدمہ پہنچاتی ہیں۔ علمائے یہود کی تاریخ ہو یا تاریخ دین مسیح کوئی ان آثار سے خالی نہیں ہے اور افسوس ہے کہ اسلام جس کی بنا ایسی نہ تھی کہ وہ بھی اس صورت میں مسخ ہوتا۔ آخر روش کے تغیر سے اس حالت میں پہنچ گیا۔

دوسری صورت

دوسری صورت یہ ہے کہ جس میں غرض اولی مذہب ہے، عام اس سے کہ امامت رُوحانی کے ساتھ حکومت دُنیاوی ہو یا نہ ہو، مثلاً رسُول قبل ہجرت بغیر صاحب اختیار ہونے کے بھی ہمارے پیشوائے روحانی تھے۔ جس طرح حکومت کے بعد تھے لیکن رسُول کے بعد خلفا کو حکومت سے قطع نظر کر کے امامت روحانی کے کسی خیال سے عامہ ناس کی نگاہ میں وقعت نہیں دی گئی اس کے مقابلہ میں۔

ہم وزنی قوت

ایسے خلفاء کے مقابلہ میں رسُول کی اولاد جو سلسلۂ امامت میں تھی باوجود حاکم نہ ہونے کے آج تک بلکہ خود مخالف زمانہ میں بھی پیشوائے رُوحانی سمجھے گئے، اگرچہ اسے اختیار نہیں دیا گیا، اور اس کی صریحی کوششیں ہوئیں کہ اسلام کے لیے ان کے ہوتے ہوئے رقیب علماء تیار کیے جائیں جس سے اولاد رسُول کی مذہبی عزت کو صدمہ پہنچے۔ اس خاص شاخ میں بھی ہم وزنی قوت کی عظمت کے آثار رسُول کے بعد سے دکھائی دیتے ہیں۔

شناخت کے ذرائع

امامت رُوحانی اور ائمۂ رُوحانی کی صاف صریح اور قوت دار شناخت یقیناً اس سے زیادہ ممکن نہیں ہے کہ تاریخ اسلام میں یہ دیکھو کہ حکومت اور حاکم باوجود تمام اختیارات پر قابض ہونے کے اپنے تمام اختیارات کی قوت اور آنکھوں سے کون سے کسمپرس، بےکس، مظلوم اور گوشہ نشینوں کو بغیر پلک جھپکائے دیکھتے رہتے تھے۔ ڈرتے رہتے تھے۔ دانت پیستے رہتے تھے کہ ہمارے کتنے بچے بیکس ہیں۔ محسوس کرتے تھے کہ ہم باوجود اپنی نمائشوں اور چیزوں کے ان بے سروسامانوں کے سامنے کوئی وزن نہیں رکھتے۔

فرق

اسے عبد الملک، ہشام، سلیمان اور مامون وغیرہ خوب سمجھتے تھے، اور فرزدق وغیرہ دونوں کو خوب سمجھتے تھے۔ کوئی اگر امام جسم تھا تو کوئی امام قلب تھا۔ بڑا فرق تھا۔

شہادت کی عظمت سمجھنا اسباب کی قوت سمجھنے پر موقوف ہے

بہر حال جب ہم ان اسباب پر ناظر کو توجہ دلا چکیں گے جن کا نتیجہ قتل حسینؑ تھا تو اس کے سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ ایسے خوفناک آتش فشاں کے خاموش کرنے یا اس کی قوت گھٹانے کے لیے کیسے شخص کی ضرورت ہوتی اور تھی جو روش اور خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا کرنے کی قابلیت رکھتا۔ وہ قابلیت کیسی سخت اور اس کا صرف کس قدر عبرت ناک ہوتا۔ اگر حسینؑ کلی یا جزی حیثیت سے بھی کامیاب ہوئے تو انھوں نے عزیز اسلام پر کوئی احسان کیا یا نہیں۔ عالم کو بے غرضی، ایثار نفس، صبر، استقلال، حق ردی، غیرت، حمیت، اور حمایت وجہ حق کا ناقابل مقابلہ سبق دیا یا نہیں اور دیا تو اس میں کیا قوت تھی۔

مؤلف کے فرائض کی مزید تفصیل اور ضرورت

اس بات کے سمجھنے کے لیے کہ آیا حسینؑ نے اسلام پر کوئی احسان کیا یا نہیں مجھے کسی حد تک تاریخی واقعات لکھنے ہوں گے۔ وہ واقعات جن میں یہ دکھایا جا سکے کہ رسُول نے کیا کہا تھا۔ علیؑ کیا کرتے

رہے تھے۔ حسنؑ کیا کرتے اور حسینؑ کے لیے کیا کرنا رہ گیا تھا۔ اس کے لیے تغیرات پر توجہ دلانی ہوگی۔ مسلمانوں کے مختلف طبقات پر نظر ڈالنی ہوگی۔ یہ سب اس لیے ہوگا کہ آیا اسلام کے مفہوم میں ایسا انقلاب ہوا تھا یا نہیں جس سے یہ قیاس کیا جاسکے کہ وقت آ گیا تھا کہ ایسی عظیم الشان قربانی سے دماغ اور خیالات میں ایک سخت ہیجان پیدا کیا جاتا۔ حضرت رسولؐ، جناب امیرؑ اور حضرت امام حسنؑ کے حالات صرف اس قدر لکھے جائیں گے جن میں حسینؑ کے حالات سے موافقت یا اثر کا ربط ہے نہ یہ کہ میں ان نفوس قدسی کی پوری سوانح عمریاں لکھوں گا۔ موافق تو خیر مجھے مخالفین کے ساتھ بھی چلنا ہوگا۔

انسانی برداشت کا اندازہ حسینؑ کے ترقی خیز صبر کی قدر کرائے گا

حسینؑ کے مصائب اور ان کے مصائب میں ان کی شان کی وہ شخص قدر کرے گا جو اپنے مصائب اور اپنے اس وقت کے انداز پر غور کرے گا۔ کون نہیں جانتا کہ انسان تھوڑی سی تکلیفوں سے ایسا حواس باختہ ہو جاتا ہے جس کی کہانیاں کہی جاتی ہیں۔ اگرچہ یہ تکلیفیں فطری حیثیت سے اس کے متعلق ہو گئی تھیں، ایسا بھی ہوا ہے کہ مصائب کی عدم برداشت نے حدود اخلاق سے مطلق العنان بلکہ ملحد بنا دیا ہے۔ یہ سب اس لیے کہ واقعات کی رفتار اس کی خواہش کے موافق کیوں نہ ہوئی۔ یا خدا موم کا کیوں نہ ہوا، جو اس کے ارادہ کی گرمی سے پگھلتا جاتا۔ ان حالتوں کے بعد جس میں مصیبت اور انسانی برداشت کے درجہ اور دماغ کے متاثر ہونے پر غور کیا جا چکا ہوگا۔ جب حسینؑ کے سلسلہ مصائب پر غور اور ان کے ٹھنڈے سنجیدہ صبر اور بے لغزش حواس بلکہ اس کی ترقی پر نظر ڈالی جائے گی تو اس وقت حقیقتاً "صبر" اور "حواس" یہ دونوں لفظ پیشتر سے زیادہ گرانقدر معلوم ہوں گے۔ قطع نظر اس سے کہ آپ اس کے عامل کو کیا سمجھیں گے۔

خدا کے مظہر وجود بندے اور ان کا یقین

اور جب ان مشکل وقتوں میں خلوص اور اقرار توحید پائیں گے تو عظمت خداوندی کی عظیم الشان لہریں موج مارتی ہوئی دکھائی دیں گی اور آپ کو اس کے سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ کیسے لوگ کسی بڑے انعام کے شایاں ہیں۔ ایسے لوگ وجود خداوندی کے نقیب اور مرکز اخلاق کے مظہر صفات ہیں۔ ان کا وزنی یقین دوسروں پر اثر ڈالنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ میرا گمان ہے کہ بعض لوگ میرے اس کہنے پر غیر متصور نہ حیرت جائز رکھیں گے کہ میں حسینؑ کے واقعات کو رونے کے لیے نہیں لکھ رہا ہوں۔ حسینؑ سے ہمدردی کو تو تمہاری انسانیت کے ریشوں سے معاملت ہے۔ بلکہ میں اس لیے پیش کروں گا کہ تم خوش ہو۔ اپنی جگہ سے ہل جاؤ اور تمہارے دل کا ہر ریشہ چیخ اٹھے کہ: ع

ایسے بندے چاہییں تیری خدائی کے لیے

ایک مصیبت دوسرے کا پیش خیمہ تھی

حسینؑ کی مصیبت کی یہی شان نہیں ہے کہ ان پر کوئی صبر آزما مصیبت پڑی کوئی نہیں۔ بہت سی ایک سے ایک بڑھ کر اور پھر ایک مصیبت دوسرے کا پیش خیمہ تھی۔

حسینؑ نے اپنے بعد مصیبتیں برداشت کرنے کے لیے پس ماندوں کو تیار کیا

مختصر لفظوں میں شہید ہوتے وقت حسینؑ کو

یہ تسکین نہ تھی کہ ہم نے جام شہادت نوش کیا اور تکلیفیں کم ہو گئیں، بلکہ یہ بھی یقین تھا کہ ابھی سب سے بڑی توہین یعنی اہل بیتؑ کی اسیری باقی ہے۔ اس کے لیے حسینؑ نے پس ماندوں کو تیار کیا۔ حسینؑ کی اس وصیت نے اہل بیتؑ کی وہ حسین پسند شرافت قائم رکھی جس نے اس اشرف الشرفاء کی وجہ کو بڑی مدد دی۔ ان کی توہین کرتے وقت توہین کرنے والے ذلیل ہوتے تھے۔ اور یہ سمجھتے تھے کہ ان کی عظمت کو گھٹا دینا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔

امام اور ماموم

شہادت حسینؑ کا اطلاق صرف حسینؑ کی شہادت اور اہل بیت کی اسیری پر نہیں ہوتا بلکہ اسلام کے بقیہ بہترین نفوس کے خلوص، جانبازی، وجہ حق کی مدد، خطروں کی طرف سے لا پروائی کا وہ عدیم المثال تذکرہ ہے جس کے طرف لی آنڈرس اور ابن مریم الیازر جوزیفس اور جوڈایا ان کے رفقا کسی مناسبت پیدا کرنے کے خیال سے نظر نہیں کر سکتے۔ ایسے ماموم کے لیے حسینؑ کا ایسا امام اور ایسے امام کے لیے ایسے ہی پیرو ہونے چاہییں تھے۔ جسے شاعر بھی نیم متفرانہ وجد اور نیم حیرت سے کہتا ہے کہ:

"اللہ اللہ امام ایسا ہو پیرو ایسے"

قربانی حُبِ جاہ یا حصولِ اختیار کے لیے نہ تھی

ان کا شوق شہادت ایک دوسرے پر سبقت کرنا، ان کا ایسے وقت حفظ مراتب کا خیال، ان کا زندگی سے متنفر کی حد تک متنفر ہو جانا اس لیے کہ ان لوگوں کے گرد و پیش کے حالات ان کی برداشت کی حد کے باہر ہو رہے تھے۔ ایسی حالتیں ہیں جو متصور دماغ کو اپنی طرف کھینچتی ہیں اور وہ سوچتا ہے کہ کیا اس کا خواب بھی دیکھا جا سکتا تھا کہ انھیں اس خلوص، حق روی، اور جانبازی کے عوض میں کسی دنیاوی آسائش کی امید تھی۔ اس کی عظمت میں اور زیادتی ہوتی ہے۔ جب اس پر غور کیا جاتا ہے کہ ان میں زیادہ تر ایسے لوگ تھے جو بڑے عابد اور زاہد تھے۔ اور جن کے تقدس کا خود فریق مخالف معترف تھا۔ ان میں اسلام کی نمود اور ترقی کا مشاہدہ تھا۔

دنیا کی دلفریبیاں پیش کی گئی ہیں

اس کے عکس میں حسینؑ کا ساتھ چھوڑ دینے پر دنیا کی دل فریبیاں مال و جاہ کے حوصلے اور زندگی کے اقرار کیے گئے تھے لیکن ان بندگان حق کے لیے حسینؑ کے لب تشنہ اور فاقہ کش ذات سب کچھ تھی۔ انھوں نے فاقہ، پیاس اور شہادت گوارا کی اور دشمنوں کے وعدوں کو ان کے منہ پر کھینچ مارا۔ کبھی حق و باطل کے تصفیہ اور لہجہ کے لیے انسانی ارادہ کو ایسا رکھا وقت نہیں ملا۔

مرقع

مرقع کھنچ جاویں گے جس میں نئی دلہن اپنے شوہر کو حسینؑ پر صدقے ہونے کے لیے بھیج رہی ہے۔ شوہر اپنی بیبیوں کو طلاق دے رہے ہیں، اس لیے کہ اپنے شہید ہونے کا یقین ہے۔ عورتیں اپنی اس شرعی مجبوری پر کہ انھیں اجازت جہاد نہیں ہے۔ تاسف کرتی ہیں۔ مائیں اپنے بچوں کی محبت بھول گئیں اور اپنے لخت جگر کو آغوش سے کھینچ کر حسینؑ پر صدقے ہونے کے لیے بھیج رہی ہیں اور دودھ بخشنے کی شرط زخم کھانا اور شہید ہونا قرار دے رہی ہیں۔ باپ اپنے بیٹے کو آنکھ کے سامنے دم توڑتے دیکھتا ہے اور اس کے اس پر خم ادا پر مرحبا کہتا ہے۔ کمر شکستہ بوڑھے رعشہ دار ہاتھوں سے تلواریں اٹھا رہے ہیں۔ بچے قتل ہو رہے ہیں۔ جن کے ادنیٰ ایذا دینے کے خیال پر دنیا کا سب سے بڑا

بے رحم نامرد شرمائے گا۔

ناظر سے یہ خواہش کرنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ اس پر غور کرے کہ عورتوں بچوں بوڑھوں اور دوستوں کا ایسا مجمع ہوا خالص وفادار نہ جوش کبھی اور بھی ان کی نگاہ سے گزرا ہے اور اگر کوئی ان میں سے کسی خاص شان کو دکھا گیا تو آیا ان اسباب اور اتفاقات میں جن میں حسینؑ اور ان کے رفقا گھرے ہوئے تھے جو قصہ کوئی مقابلہ کے لیے لاتا ہے اس کا ہیرو کس خاص غرض سے اس کا حامل ہوا، وہ فوری جوش تھا یا متین اور سنجیدہ تصفیہ۔ آیا اس کے لیے کوئی دوسری راہ مصائب سے بچنے کے لیے دکھائی گئی تھی یا نہیں، یا اسے بجز جان دینے کے چارہ نہ تھا۔ میرے یہ استفہام، مجھے یقین ہے کہ استفہامی حیثیت سے بڑھ کر تحدی کی حد تک پہنچ گئے ہیں اور میں اس میں کوئی نرمی نہیں پیدا کرنا چاہتا۔

دو اور باتیں جس سے مؤلف کی غرض تذکرہ سے زیادہ نہیں ہے

ضمناً ہم دو باتوں کا اور تذکرہ کریں گے جن کے لیے اگرچہ ہمارے پاس زبردست حتمی ثبوت نہ بھی ہوں لیکن ہمیں یقین ہے کہ ان سے اعراض کرنا واقعہ پر اثر ڈالنے والی ایک نمایاں شان سے چشم پوشی ہوگی۔ لیکن میری غرض تاریخی مذاقِ تحریر کے لحاظ سے یہ نہ ہوگی کہ اس سے خواہ مخواہ ناظرین پر کوئی خاص اثر پڑے بلکہ یہ بہت کچھ انسانی طبائع کے رجحان پر موقوف ہے۔ کیوں ایسا ہوا؟ اس کے لیے نہ میرے پاس دو اور دو چار کی طرح کوئی ہندسی ثبوت ہے اور نہ غالباً طبیعت انسانی پر ایسے اتفاقات کے منکر کے پاس کوئی تسکین دلانے والے ثبوت ہیں۔ مگر جہاں یہ سب کچھ ہے وہاں انسانی تجربہ مجھ سے زور سے یہ کہلوا رہا ہے کہ اس کا امکان نہ صرف حسینؑ کے ساتھ تھا بلکہ تمام انسانوں کے لیے ویسا ہی ممکن الوقوع ہے۔

خواب

میری غرض شہادت حسینؑ کے متعلق بہت سے خواب سے ہے۔ خواب جسے فراعنہ مصر، ابراہیمؑ اور یوسفؑ دیکھ سکتے تھے اور جس کی تعبیر یوسفؑ اور اکثر انبیائے بنی اسرائیل کو بادشاہوں کی نگاہ میں وقعت دے سکتی تھی جسے خود حسینؑ کے جد امجد دیکھ کر متاسف ہو سکتے تھے اور جسے مولانا و مقتدانا علی ابن ابی طالب ملاحظہ فرما سکتے تھے اور حسینؑ کو صبر کی نصیحت فرما سکتے تھے۔ وہی۔ خواب۔ حسینؑ بھی دیکھ سکتے تھے۔ میں اپنی روشِ تحریر سے اعراض کے لیے استثنا نہ کرتا اگر مختلف زمانہ کے مکاشفات کے الفاظ اور خیالات میں ویسی یک جہتی نہ ہوتی جیسے کہ شہادت حسینؑ کے لیے ہوئی۔

ناظرین میں سے کم و بیش اکثر کو ایسے خواب دیکھنے کا اتفاق ہوا ہوگا جس کی تعبیر قریب قریب ویسی ہی تھی جیسا اس عالم میں دیکھا تھا۔ اگرچہ خواب دیکھنے اور تعبیر پانے کے درمیانی زمانہ میں اس پر مطلق غور نہ کیا ہو، اور تعبیر پانے پر انھیں معاً خیال آ گیا ہو کہ ہم نے ایسا خواب دیکھا تھا۔ یہ یاد آ جانا حافظہ کی تازگی تھی لیکن یہ کسی طرح خیال میں نہ تھا کہ ہم نے کبھی اس مضمون خواب پر اپنی یاد میں غور کیا ہو یا اپنے سوچنے اور خواب دیکھنے کے درمیانی زمانہ میں مسلسلاً اس مضمون پر مصر رہے ہوں۔ ورنہ یہ طے کر لینا آسان ہوتا کہ ہمارا یہ خواب ایک بہت بیشتر یا کچھ قبل سوچے ہوئے سلسلہ کی تازگی تھی۔ اگرچہ ہمیں سوچنے کے ارادہ کا احساس نہ ہوا ہو، نہ ہمیں اس سے تسکین ہے کہ تعبیر خیز خواب کی مثال بیداری کے اس بیج غور کی طرح ہے جس کا وہی نتیجہ ہوا جسے وقوع کے قبل ہم طے کر چکے تھے۔ اگرچہ یہ بتانے خود خدا کی بڑی رحمت ہے۔ لیکن

خواب میں ہم تماشا گر نہیں ہوتے بلکہ تماشائی ہوتے ہیں۔

نفسِ انسانی کوئی عظیم الشان اور پر راز قوتوں کا مرکز ہے۔ اس کے اثر ڈالنے اور اثر لینے کا میدان کس قدر وسیع یا کس قدر محدود ہے۔ اس کے کون سے ذرائع ہیں۔ یہ سب میرے تصفیہ سے بالاتر ہے۔ لیکن یہ کہنا شاید کوئی بحث نہ ہو کہ نفس کی تمام عظمت اسی کی تربیت اور بے آلودگی پر موقوف ہے۔ ہم اکثر اس کا حس نہیں کرتے کہ ہمارے نفس پر کیسی لہریں قدرت کے ناقابل انتہا خزانہ رحمت سے چلتی رہتی ہیں۔ لیکن انسان ہی اس کا حس کرتا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد تمیز کرنے اور معنی سمجھنے کے مدارج باقی رہتے ہیں۔ یہ سب اس کے لیے آسان معلوم ہوتا ہے جو حس اور تمیز کرنے کے بعد قربت سے مطالعہ کرتا ہے اور سمجھنے سے اپنے کو منتقل نہیں کر دیتا یا ایک بے معنی تخیل سمجھ کر اسے اندازہ کے قابل نہیں سمجھتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اسی قدر قانون قدرت نہیں ہے جس طرح فطرت کے آسانی سے سمجھ میں آنے والے اور قوانین ہیں۔ قدرت کی گونگی زبان اس کے لیے گویا ہو جاتی ہے۔ جو اس کے معنی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اگرچہ اس کے بعد وہ خود گونگا کیوں نہ ہو جاتا ہو۔

تنہا اتفاق نہ تھا

کوئی شخص کسی خواب کو جو نتیجہ کی طرف لے جائے اتفاق کہہ سکتا ہے۔ اس سے اس کی عظمت میں کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ہم کسی تنہا اتفاق کا ذکر نہیں کر رہے ہیں بلکہ خواب کے وجود تاریخی کی مثالیں اور تجربہ انسانی کے اندر داخل ہونے کے دعوی کے بعد یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ہم جس خواب کا ذکر کر رہے ہیں اس کے تکرار دو مختلف پاک دماغوں میں اتفاقی حد سے کچھ زیادہ ہوئے۔

خوابؑ کو خوابؑ نہ سمجھا

اور انھوں نے اسے کوئی بے معنی تخیل یا خواب کو اس کے عام مفہوم میں بے حقیقت نہیں سمجھا بلکہ ان پر وہ اثر ہوا جیسے کسی پر عین واقعہ کے بعد ہوتا۔ یہ ان کی صحیح حس، تمیز اور معنی فہمی تھی۔

پیشین گوئی کی احادیث

ہماری دوسری بات شہادتِ حسینؑ کے متعلق پیشین گوئی کی احادیث ہیں۔ جس کے متعلق ہم تھوڑی دیر میں ذکر کریں گے۔

سوانح نویس کی دشواریاں

ہماری دانست میں جو کچھ لکھا جانے والا ہے وہ اس سے بہت کم ہے جو لکھا جانا چاہیے تھا۔ وہ حیثیت جو اس وقت سوانح عمری کی ہونی چاہیے، ایک تیرہ صدی قبل گزرے ہوئے بزرگ کے متعلق مرتب ہونی دشوار ہے۔ آسانی ہوتی اگر ان مشاہیر کے انداز، رفتار، گفتار، شغل، پسندیدگی، معاملت وغیرہ وغیرہ کی حکایتیں پوری حیثیت اور آسانی سے دستیاب ہوتیں اور اگر کوئی واقعہ ہوتا تو اس کے اسباب محنت اور سمجھ داری سے مرتب کیے ہوئے ملتے جس سے ہر شخص کو نتیجہ نکالنا سہل ہوتا۔ وائے بر حال اس بزرگ کے جس کی سوانح عمری لکھے جانے کا وعدہ کیا گیا ہے۔

اس کی دشواریاں سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ ایک بات ہو تو کہی جائے۔ وہ شخص جس سے اور جس کے خاندان سے ملکی، مذہبی، معاشرتی مخالفت اور مغایرت پیدا کرنے کے لیے کل کوششیں صرف کی گئیں، اس کی پوری حالت لکھنے کا تو وہی دعوی کرے جس نے مخالف گروہ کے وہ خفیہ احکامات دیکھے ہوں جو عاملوں کو دیے گئے، اور جنھیں زرپاشی سے حریفوں کو

اپنا فدائی بنا لینے کا طریقہ معلوم تھا۔ اور جو ان کل ممکن وسائل کو جو ان کی غرض پوری کرنے کے لیے بکار آمد ہو سکیں، صرف کرتے تھے۔ بہت سی دستاویزیں جو مکمل حیثیت سے واقعہ کے سمجھنے میں معین ہوتیں ایک آدھ فقرہ سے زیادہ نہیں ہیں۔ اکثر اوقات نہایت مفید واقعات کے اشاروں اور نام لینے کے علاوہ مورخین میں نہ تفصیل کا کوئی خیال ہوا، اور نہ انھوں نے آئندہ نسلوں کی اس ناقابل تسکین حالت کا خیال کیا کہ جس واقعہ کو وہ اس کند حیثیت سے ختم کیے دیتے ہیں اس کے متعلق بہت سے فطری سوالات سے کسی کو روکنا اس کے ساتھ بے رحمی ہے۔ بہت سے مقامات پر تاریخ اس طرح خاموش ہے کہ موقع کی تاریکی سے دم گھٹنے لگتا ہے اور بجز اس کے کہ معلومہ حالتوں سے لا معلوم حالات کے لیے قیاس سے مدد لی جائے اور کوئی دوسری صورت راستہ ٹٹولنے اور نتیجہ سمجھنے کی سمجھ میں نہیں آتی۔ تاریخ کی بدنصیبی سے وہ مقامات ایسے نہیں ہیں جن پر بلا کافی غور کے گزر جانا مناسب حال اور واقعہ نگاری کے شایانِ شان ہو۔

ہم کیونکر بڑھیں گے

اس کے ملزم ہم نہیں ہیں کہ کیوں ہماری تاریخ پوری نہیں ہے۔ حکومت ہماری تاریخ پر قابض تھی۔ اس سے ظاہر ہو گا کہ ہم اکثر مقامات پر لنگڑے لولے واقعات کو مسلّم واقعات سمجھ کر آگے بڑھنے پر مجبور ہوں گے۔

وہ واقعات جو حسینؑ کے سمجھنے میں مدد دیتے انھیں جہاں متذکرہ صدر دشواریوں کا سامنا ہے وہاں متعصب مورخین کی ناانصافی اور غلط اندازی سے کم مقابلہ نہیں ہے، یا اسی طرح کی اور بغض و حسد اور ذلیل نمائش تحقیق میں ڈوبی ہوئی کوششیں جن سے اثر زائل کرنے کی آمادگی ظاہر کی گئی۔

قوتِ تخیل کا مصرف

اکثر ایسے لوگوں نے جن کے دوستدار حسینؑ ہونے میں ہمیں کوئی شبہ نہیں اپنی پست درجہ عقل اور معلومات اور نافہمانہ کوشش ترقی کے جوش میں ایسی ایسی کہانیاں بھی کہی ہیں جس سے انھوں نے قصص الانبیاء کی نیم تاریخی حیثیت کو اپنے درجہ سے اور بھی گرا دیا ہے۔ انھوں نے ایک نئی تالمود بنانی چاہی ہے۔ اور یہ سب غالباً اس لیے کہ ملتے جلتے قصے حسینؑ کے واقعات بیان کرنے میں چاشنی پیدا کریں گے۔ ان کی قوتِ تخیل نے عادت الٰہی سے ٹھوکر کھانے کا کہیں ارادہ ہی نہیں کیا ہے اور نہ انھیں اس کا خیال رہا ہے کہ ہم اپنے غلو میں ایسی باتیں تو نہیں کہہ رہے ہیں جو ان نفوسِ قدسی کے خصائل کے مغایر ہو۔

آئندہ کے لیے قابلِ لحاظ باتیں

بہر حال جو کچھ دستیاب ہوا وہ بھی گزشتہ مشکلات کی خیال کر کے بڑی حد تک قابل تسکین ہے۔ اگرچہ اکثر واقعات اور اشارات، الفاظ اور اظہار کی صدا بہت دھیمی ہے لیکن اس کی صدائے بازگشت نہایت ہی عظیم ہے۔ گو اکثر فقرات اور الفاظ نہایت مختصر ہیں مگر غور میں وہ ایک دفتر معلوم ہوں گے اور اپنی پس بینی کی تحریک سے تاریخ کی جلدوں اور ان کے تاریک مقامات کو روشن کر دیں گے۔ یہ پوری طرح سمجھ میں آجائے گا کہ یہ چھوٹی سے لڑائی ملکی، مذہبی، معاشرتی اور خاندانی تھی یا کل کا مجموعہ تھی۔ حسینؑ سے لڑنے کے لیے یزید کے سپاہی اور افسر اس معنی میں آئے تھے اور بھیجے گئے تھے کہ بادشاہ کے حکم کے عام مفہوم میں اطاعت کریں یا اس سے کچھ زیادہ تھا۔ کس غرض کے لوگ بھیجے گئے تھے اور حسینؑ کے حیرت خیز بہتر

کس مادے کے لوگ تھے؟ یہ تھا یا نہ تھا کہ حق و باطل کا مجسمہ لڑ رہا تھا۔

واقعات کا جائزہ کیوں نہ لیا گیا

میں اب تک بعض دشواریاں بیان کر رہا تھا جن کا تعلق کچھ تو زمانہ سے تھا جن میں یہ واقعات ہوئے۔ کچھ مؤرخین کی قطع و برید یا تعصب سے اور کچھ تاریخ نویسی کے مذاق سے۔ اب میں اس پر کسی حد تک نظر ڈالتا ہوں کہ واقعات کا بہ حیثیت موجودہ حسینؑ کے ہمدردوں نے ایسا جائزہ کیوں نہ لیا جو ایک زمانہ حال کی اشتہا کے موافق سوانح عمری کی صورت میں ہوتا۔

ان کے سمجھنے کی فطری کوششیں کیوں نہ ہوئیں

یہ تو سب جانتے ہیں کہ ۴ھ ہجرت کے شعبان کے مہینہ میں حسینؑ پیدا ہوئے۔ اور یہ کہ حسینؑ والدین کی طرف سے ہاشمی تھے، اور کوئی مسلمان جس کے قوم کی تعداد اس وقت تک عالم میں تیس اور چالیس کروڑ کے درمیان ہے، یا جو آج سے ۶۱ھ ہجری تک ملت اسلام میں پیدا ہونے سے مشرف ہوئے۔ ایسا نہیں ہے جو یہ نہ جانتا ہو کہ ان کے پدر بزرگوار، مادر گرامی اور جد عالی مقدار کا نام کیا ہے۔ یہ علم ہر مسلمان جاہل اور عالم میں قدر مشترک ہے۔

اعتقاد کی کفایت نے آگے بڑھنے نہ دیا

اور اس کے بعد بغیر کسی کوشش کے خاندان نبوت کے زیادہ ترنسبی سلسلہ کے لحاظ سے لوگوں میں ایک روحانی وقعت پیدا ہوتی ہے جس کے بعد وہ کسی تفتیش اور اضافہ معلومات کو اعتقاد کی موجودگی میں غیر ضروری سمجھ کر اس طرح چپ ہو جاتے ہیں کہ حقیقتاً ان کے سمجھنے اور ان کے متعلق وہ معلومات حاصل کرنے کے خیال کی جس سے ان کے سمجھنے میں مدد ملتی۔ صورت کیا معنی صورت کا معمولی سے معمولی خاکہ بھی کھنچنے نہیں پاتا ہے اور جب خیال ہی اپنی جگہ وجود پذیر نہیں ہوتا تو اس کے ترجمان یعنی الفاظ ہی کیوں پیدا ہوتے اور جب الفاظ نہ تھے تو کیونکہ سمجھنے کا کوئی دفتر ہوتا۔ اور ایک خیال کو دوسرے سے مدد مل سکتی۔ اور جب شرح نفس کے مولف نہ تھے تو نقاد کا وجود کیونکر ہوتا۔ حسینؑ یا ان کے آبائے طاہرین کے سمجھنے کی روش زیادہ تر ایسی تھی اور ہے جس طرح وہ بچہ جس کے منہ میں ابھی الفاظ نہیں بنے ہیں کسی مٹھائی کو پہچان کر دوڑتا تو ضرور ہے لیکن نہ وہ اس کے فوائد سے واقف ہے اور نہ اس کے عناصر اور ساخت اور بنانے والے اور بازار سے واقف ہے۔ جہاں مل سکتی ہو۔ نہ یہ جانتا ہے کہ اسے کیا کہیں اور اس کے متعلق کیا کہیں۔ ماں باپ کے چاٹ دینے سے اتنا ضرور ہے کہ وہ صورت آشنا ہے اور لذت کا حس اس میں پیدا ہو کر اس کی طرف اس کے تمام اعضاء کو پھیر دیتا ہے۔ اس کا ہمکنا ساری گویائی ہے جو اس کی داستان شوق کہتی ہے۔

محبت کے فرائض

اتفاق ہے کہ ہم حسینؑ کے نام سے وراثتہً واقف ہوتے آئے ہیں۔ ادب اور محبت کا ایک ورثہ ہے جو ہم تک پہنچا ہے۔ اور ہم میں ننانوے فیصدی تو یہ بھی نہیں جانتے کہ ان نفوس قدسی سے اس اتفاقی وابستگی کو کیا کہیں اور یہ سمجھنا تو بہت بہت دور ہے کہ ادب اور محبت نے ہم پر کیا کیا لازم ٹھہرایا ہے اور ہم کہاں کہاں اپنے خیال میں ان کے مناسب ادب اور محبت کے فرائض کی شناخت سے کمی کرتے ہیں۔

ضعفِ احساس کمی معرفت کی وجہ سے

اور یہیں یہ بھی خیال نہیں ہوتا کہ ہم نے کوئی خلاف ورزی بھی کی یا نہیں۔ ہم کو احساس نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ ہم ان کو نہ پہچانتے ان کی صفات سے واقف نہ ہوتے۔ ان کے عمل اور طریقہ عمل کی خوبیاں سمجھانے کے لیے مناسب الفاظ نہ ہوتے۔ کہاں سے ہوتے۔

دوسرا درجہ

اور بلند ہو اور انھیں دیکھو جو حسینؑ اور واقعات سے واقف ہیں۔ یہ اپنے اظہار وفا میں سرشار ہیں۔ انھیں حسینؑ کے نام کی محبت ہیجان انگیز حالت تک ہے۔ انھیں ان کے واقعات کی تکرار میں ایک غیر فانی لطف ہے اور ان کا تمام اظہار وفا اور اخلاص اپنی یہ شرح کر اسکتا ہے کہ ہم رسولؐ کی ذریہ امت کے اس گرانقدر لحاظ اور اس روش کا جس کا ترجمہ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا (دہر: ۹) سے ہوتا ہے۔ مشکورانہ جواب دے رہے ہیں جو ان کے آخری لحظہ تک انھیں ہمارے متعلق فراموش نہیں ہوا۔ اور اس کے بعد وہ بھی کھو جاتے ہیں۔

بلند تر درجہ

بلند ترین درجہ ان کا ہے جو قدیم نظام تعلیمی کے اعتبار سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ واقعات حسینؑ سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ وہ تاریخ اسلام کی واقعہ دانی میں بھی کسی کمی کے مورد الزام نہیں ہیں۔ ان کی تمام تر کوشش اس مصلحت کی پیروی ہے کہ ذکر حسینؑ حتی الوسع عام کیا جائے اور ان کی غم انگیز حالت سے لوگوں میں ہمدردی پیدا ہو۔ وہ اپنی فاضلانہ تقریر میں فلسفہ اخلاق کے لطیف سے لطیف مضمون کو اٹھا نہیں رکھتے۔ وہ شجاعت، سخاوت، شرافت، ایثار نفس، زہد، تقویٰ غرض کہ کل عمدہ صفات کی روایتیں بیان کر جاتے ہیں۔ یہ سب ممدوح ہے۔ لیکن ان کی مثال اس سائنٹسٹ کی ایسی ہے جو گوشت خون اور ہڈی کے اجزا علیحدہ علیحدہ کر سکتا ہو لیکن روح نہ پیدا کر سکتا ہو۔ اور جو روح کے سمجھانے کے لیے ایسے خیالات سے بہکتا ہو کہ ہمارے مادے اجزا کا انتہائی نشو روح ہے یا سمجھنے کے لیے چھوڑ دیتا ہو۔ بلکہ جو اپنے قیاسات میں اس حد تک بھی نہ پہنچا ہو کہ ہمارے مادی امتزاج کی ایک کیفیت کا نام روح ہے۔ سائنٹسٹ اپنے غلط یا صحیح قیاسات کے ساتھ مسلسل کوشش کر رہا ہے۔ درآنحالیکہ وہ جن سے ہم حسینؑ یا ان کے آہانت طاہرین کے سمجھنے کی امید کرتے ان کی کوششوں کا راستہ تعارف طبعی کے قریب نہیں ہے۔

محض ذکر کی تکرار تمام تر مفید نہیں ہے

ان کی سعی مشکور ضرور ہے لیکن اس کا منشا اگر نفس اور اس کی خصوصیات کے صحیح تعارف کی کوشش پر مبنی نہیں ہے تو اس سے باوجود ذکر کی تکرار کے یہ امید دور ہے کہ ہم میں ان کی قریبی معرفت سے وہ کیفیت پیدا ہو سکے گی جسے ہم معنی دار "محبت" کہہ سکیں۔ بلکہ اس کا نتیجہ محض یہ ہوگا کہ ہم ان کے دشمنوں کو پہچانیں اور ان سے نفرت کریں۔

شر سے محض نفرت خیر کی طرف عمل حرکت نہیں ہے

مجھے اس میں عذر نہیں ہے کہ برائی کا پہچاننا اور اس سے نفرت کرنا بھلائی کا پہلا قدم ہے لیکن شر سے محض نفرت خیر کی طرف کوئی عملی حرکت نہیں ہے۔ ہم نے اگر برا نہ کیا تو اچھا بھی نہ کیا۔ یعنی وہ جن سے بہتر امر کی امید کی جاتی انھوں نے ایک امر کے دو پہلوؤں میں سے پست تر کو قبول اور اپنا طرز عمل قرار دیا ایسا کرنا صحیح ہو یا نہ ہو لیکن قابل تعریف نہیں کہا جا سکتا۔ یہ اعرافی حالت زیادہ تر "توقف" کے نام سے پکاری جا سکتی ہے۔

مؤلف کا ایک خیال

کسی تنہا شخص کا سوچنا مطلوبہ حد تک شاید مفید نہ ہو لیکن غالباً یہ سوچنا وقت بلکہ وقت کے بہت بعد کی بات ہو کہ آیا ہمیں اپنی روش کو معکوس کر دینا مناسب ہے یا نہیں، یعنی ہماری کوششیں زیادہ تر حسینؑ اور ان کے آبائے طاہرین کے سمجھنے اور ان کی سچی محبت پیدا کرنے کی طرف راجح ہوں بہ نسبت اس کے کہ ہماری غرض اولیٰ ان کے دشمنوں سے نفرت پیدا کرنے کی ہو۔ دشمنوں کو تو موت اور نفرت نے ڈھانپ لیا لیکن ہماری غرض اور اصلی کوشش کو اس سے سیر ہو کر حسینؑ اور ان کے آبائے طاہرینؑ کی صفات کے روشن کرنے سے غافل نہ ہونا چاہیے۔ محض ذکر کرنا اور سننا ننید میں بات کرنے اور سننے سے شاید ہی بہتر ہو۔

ہماری خصوصیات کو ان کی صفات سے ممتاز ہونا چاہیے

اگر وہ اعلیٰ صفات ہمارے خصوصیات کا امتیاز نہ ہو سکیں یا نہ کی جاسکیں۔ "بوئے تو گرفتہ بود" کافی نہیں ہے جب تک "خوئے تو گرفت" تک ترقی نہ کی جائے۔ یہ ان کی ذوات کے مناسب معرفت بغیر ممکن نہیں ہے۔ میں پسند کرتا ہوں کہ آنریبل مسٹر تھوڈور مارکس نے اپنی تازہ تقریر میں مشرق کے (جس سے ہندی مسلمان مراد ہوں) درستی خصائل کے لیے حسینؑ کا نام لینے کو ترجیح دی ہے۔

غفلت کے اسباب

گزشتہ غفلت کے اسباب میں زیادہ واضح قوم کی صفات قومی کے احساس کی پست حالت، کسی منظم دفتر کی ناموجودگی، تاریخ کا مناسب طریقہ سے عدم مطالعہ لکھنے اور کہنے والوں کا خیال کی اس حد ترقی پر نہ پہنچنا جو کہ محض اعتقاد سے بلند ہوتی اور ایک تالیف حسی کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ ایسے لوگوں کے اظہار خیال میں قمی جرأت جو کہنے کے شایاں ہوں لیکن اس طریقہ کو عوام کے بھاتک ہونے یا اعتقادی روش سے عقلی تفتیش تک پہنچنے تک متردد ش سمجھتے ہوں یا ان میں باوجود خیالات کی پختگی کے اظہار خیال کے لیے مناسب الفاظ کی کمی ہو۔

چند ماموین کے نام جو مرکز کی دلیل تھے

میں اس سے کوئی تعرض نہیں کرتا کہ ان نفوس قدسی کی معرفت حق معرفت تک ممکن نہیں ہے میں کہہ رہا ہوں کہ ہم یاسرؑ، حجرؑ، حبیب بن مظاہر، قنبرؑ، ابن سکیت وغیرہ بھی نہیں ہیں چہ جائے کہ اس سے زیادہ بلندی کا حوصلہ کریں۔ لیکن جب میں ان وفا شعاروں کا نام لے رہا ہوں تو یہ جتلانے کی خواہش ہے کہ زمانہ گزشتہ موجودہ کے سمجھنے کا ایک مناسب ذریعہ ہے۔

ان میں کیا تھا جو ہم میں نہیں ہے

اس کے بعد یہ سوچا جاسکتا ہے کہ کیوں یہ لوگ ایسے تھے اور ہم کیوں ایسے نہیں ہیں ان میں کیا تھا جس کی ہم میں کمی ہے۔ محض مشاہدہ اگر انعکاس صفات کے قابل ہوتا تو سب دیکھنے والے ایسے ہی ہوتے۔ یہ ان کی پسندیدگی، میلان اور حالت جذب تھی جس نے انھیں وہ تو نہیں بنایا جس میں جذب ہوئے تھے لیکن ایک ایسے نوع کی تخلیق ہوتی جو اپنے مرکز کا نشان بتاتی اور جوہر طرح ایک امام کے سچے ماموم کہے جاسکتے۔ ان میں سے ہر ایک بڑا عالم نہ تھا لیکن عمدہ عمل کا عامل ضرور تھا اور صفات کی پسندیدگی نے اسے آخر میں اس کا خلاصہ طبعی قرار دے دیا تھا۔

اُصولِ جذبؑ اور وراثت صفاتؑ کی احادیث

ہم نہیں جانتے کہ "سلمان منی اهل البیت" کی حدیث اور کونسا اصول بھاتی ہے یا اس روایت میں کہ "ہمارے دوست اس مٹی سے بنے ہیں جو ہم سے بچ رہی تھی" طینت کی یک رنگی کے لیے کیسا حوصلہ دلایا گیا ہے۔ بلکہ ان کے صفات کی وراثت اور اس کے داشت کی عظیم ذمہ داری ہمارے حوالہ کی گئی ہے۔

بلند ہونے کے لیے مذاہب کی مثالیں

ہم ہندو نہیں ہیں جو یہ کہیں کہ "اہم برہما" (میں ہی برہما ہوں) جو "انا الحق" کے قریب المعنی ہے۔ نہ بودھ ہیں جو یہ سوچیں کہ "ہر شخص بودھ ہو سکتا ہے"۔ ہم مسلمان ہیں اور اس پر افتخار ہے کہ "یابن آدم اطعنی حتی اجعلك مثلی" تینوں بڑے مذاہب کے طرزِ بیان اِحتیاط اور اِنتخاب الفاظ کا موازنہ کرو۔ اگر تمھیں دل چسپی ہو اب کس نے تمھیں حوصلہ کرنے سے منع کیا ہے۔

قانونِ اِرتقاء

لیکن حلوہ خوردن را روی باید، شیر شاہ ہو یا نپولین، دونوں میں سے کوئی ہندوستان اور یورپ کا دفعتہً بادشاہ نہیں بن گیا اور نہ کوئی انسان ہوش کے ابتداء سے نبوت کرنے لگتا ہے۔ نبی ہو یا اتفاقات کا کھلونا کوئی آدمی، اُسے ضرور قانونِ ارتقاء کے پیچھے چلنا ہوگا۔

ہم کیوں نہیں سمجھتے

حسینؑ ہوں یا ان کے آبائے طاہرینؑ ہم انھیں نہیں سمجھتے اس لیے کہ ان نفوس قدسی کی سطح ہم سے بہت بلند ہے اور کوئی غیر مسلسل لنگڑی کوشش جو طبیعی حس تفتیش کبھی جاسکے اپنے لیے دفعتہً راستہ تلاش کرنے میں گم ہو کر رجعت قہقری میں اپنی تسکین اور پیچھے راستہ ٹٹولنے کو اپنی تفتیش کی کامیابی سمجھتی ہے۔ میں نے ایک مرتبہ نہیں سوچا ہے کہ زندہ قومیں بہ نسبت ہمارے حسینؑ کو بہتر سمجھ سکتی ہیں۔

مؤرخ

ایسے مؤرخ ہوں یا سوانح نویس جنھوں نے واقعات کے کم وبیش فراہمی پر قناعت کی ہے ان سے بھی یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے فرائض کامل حد تک ادا کرچکے بلکہ ان کا شکریہ اس حد تک لازم ہے کہ انھوں نے واقعات کو فنا ہونے سے بچالیا اور بس۔

اب اور اس کے بعد کے فرائض

یعنی روئی چھوڑی کہ سوت کاتا اور کپڑا بنا جائے کہ وہ پہننے کے قابل ہو۔ ورنہ محض قالی اگر کبھی مفید تھی تو آج نہیں ہے۔ رٹی ہوئی اور سنی سنائی باتوں کا اگل دینا کافی نہیں ہے، بلکہ غور کرنا اور سمجھنا ہوگا کہ آئندہ کہنے کے قابل ہو سکے۔ غالباً وہ واقف نہ تھے کہ واقعات کی صف بندی اور مناسب یک رنگ انتخاب ملتے اور ایک دوسرے کو مدد دیتے ہوئے واقعات کی ترتیب اور ایک سبب کا کئی نتائج پیدا کرسکنا اور کسی علت کے نتیجہ کے سمجھنے کے لیے محض مفصل واقعہ سے سیر نہ ہو جانا، بلکہ نظر کو یہاں تک بڑھاتے جانا کہ آئندہ اس کے متعلق مناسب مدد ملنے کی امید باقی نہ رہے اور اس مجموعہ کو کسی منفرد واقعہ سے سمجھنے کے لیے زیادہ موزون سمجھنا ان کے نزدیک وقت کا مناسب مصرف اور کوشش کا قابل تعریف شعار نہ تھا۔ یا کاہلی تھی یا ان کا خیال تاریخ نویسی اس حد تک نشوونما پذیر نہ ہوا تھا۔

ترتیب پیش بینی اور پس بینی زبان پیدا کرتی ہے

انھیں احساس نہ تھا کہ ترتیب کے تھوڑے پس و پیش یا پیش و پس اور ایسی پیش بینی یا پس بینی سے گونگے واقعات میں زبان اور مردہ سوانح میں جان پیدا ہو جاتی ہے۔ بے معنی حروف کی ترکیب اگر معنی دار لفظ پیدا کر سکتی ہے تو مناسب خیالات اور فقرات کی ترتیب اور ترکیب سے کیونکر تاریک اور گونگے واقعات میں روشنی اور گویائی نہ پیدا ہوگی۔ زمانہ نے محض مورخ کے قابل تعریف درجہ کو ویسا اعلیٰ نہیں رکھا بلکہ بایولاجسٹ (علم روح جاننے والے) مورخ کے لیے جگہ خالی کی۔ مورخ چاہیے جو کسی واقعہ کے لیے علت تلاش کرے اور اس کے نشو سے ایک نتیجہ سمجھا سکے۔

میں سچ تصنیف کی دشواریوں سے واقف ہوں اور اس لیے ہر شخص سے اس کی امید نہیں کرتا خصوصاً جب کہ غیر مبنی بہ عقل اعتقاد اور تعصب تیہار اٹھا ہوں۔ وہ کسی طرح کے کیوں نہ ہوں۔

شاعر اور خاصہ نگاری

ایک لفظ شاعر کے لیے اگر شاعر سے مراد وہ ہے جو تقطیع کر سکتا ہو اور مصرع موزون کر سکتا ہو یا زمین و آسمان کے قلابے ملانے سے مطلب ہو تو بڑھنی کو ہماری نگاہ میں اس پر کہیں ترجیح ہے۔ لیکن اگر اس سے بلند تر مفہوم ہے اور شاعری سے فطرت کے مصوری اور موزون واقعہ خوانی ہے اور شاعر وہ ہے جو چیزوں کے سینہ میں بیٹھ کر بولتا ہے تو ہم کو اس سے خاصہ نگاری کی امید کرنی چاہیے۔ سچ ہے کہ اس کی محدود زمین اس قدر کشادہ نہیں ہے کہ محرکات طبعی کا نقشہ کھینچنے کے لیے لفظوں کا وسیع مصرف اس کے اختیار کی چیز ہو۔ لیکن پھر بھی لفظوں کا مناسب اور مناسب لفظوں کا انتخاب اسے بھی ستار کی طرح مدد دے سکتا ہے اور وہ کچھ دینے کے لیے قابل تعریف جذبات کو ابھار کر اس سے زیادہ اثر ڈال سکتا ہے جس قدر ستار دیا غور کے سامان مہیا کر سکتا ہے۔ میں چاہتا کہ تلوار کی ایسی تعریف کی طرح کہ ع: "مردوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے"

نفس انسانی کی شرح کے متعلق بھی ایسے بہت سے مصرعے مل سکتے یا ایک نفس کی دو صورتیں اور حالتیں دکھانے کے لیے ایسے اشعار بکثرت ملتے کہ روز روشن خواجۂ ہر شیر مرد، شام تارے خادم ہر پیر زن۔ اور پھر عین واقعہ ہونا اس کے لطف کو پائیداری بخشتا جو سچ بایوگرافی کا ایک ورق ہوتا۔ کیا ہے اس شعر میں مگر یہ کہ کہنے والے نے اپنے ممدوح کو الٹ پلٹ کر دیکھا ہے اور جو کچھ کہا ہے سمجھ کر کہا ہے۔ اس طرح نہیں کہا ہے کہ جو کچھ کہا ہے اسے خود نہیں سمجھا ہے۔

بے توجہی کا نتیجہ

میری غرض ان تمام متذکرہ صدر ریمارک سے یہ ہے کہ اگر ایسے بزرگ افراد عالم جو احسن التقویم انسان کی ہدایت کے نشان ہیں اپنے حالات میں زمانہ کی بے توجہی، غور کی کمی اور ایسی روش بیان کے حوالہ رہے جو اپنے اعتبار سے بھلانے کے منافی ہے تو ہم نے خداوند تعالیٰ کے ایک عظیم احسان سے فائدہ نہ اٹھایا۔ ہم نے کھڑے ہونے کے مرکز کی تحقیر کی، جس سے مرکز کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ نقصان تمہارا ہے جسے ہر گرمی موم کی طرح پگھلاتی رہے گی بغیر اس کے کہ اس میں ریڑھ کی ہڈی ہو۔

ان نفوس قدسی اور گزشتہ انبیاء اور مشاہیر کا فرق

میرا تعجب اور رنج اس وجہ سے بھی ہے کہ خدا کے یہ ممتاز بندے زمانہ

قدیم کے ان انبیاء کے ایسے دو تھے جن کے سمجھنے کے لیے معمولی واقعات بھی نہیں ہیں اور اگر ان کے پیچھے بچائے مقلدین کو کچھ ورثہ میں ملے ہیں تو وہ نہ تاریخی حیثیت سے پورے اعتبار کے شایان ہیں اور نہ ان سے بجز کسی خاص طرز عمل کے کسی انسان کے ہر شان طبیعت کی طرح کی مثالیں ملتی ہیں۔ میرے اس کہنے کے لیے توریت اور انجیل مثال میں پیش ہے۔ نہ وہ ان رشیوں کے ایسے تھے جو تاریک اور ناقابل قیاس کہانیوں میں آلودہ ہوں جس حیثیت میں میں رومیوں، یونانیوں اور مصریوں کی کہانیوں کو بھی شامل کرتا ہوں۔ نہ انھوں نے اپنے زمانہ میں اور نہ اپنے بعد کے لیے مخلوقات الٰہی کو اس توہم میں گرفتار ہونے کی وجہ چھوڑی کہ وہ ان کی عبدیت میں مشتبہ ہو جائیں، نہ وہ پہاڑوں کی چوٹیوں سے بات کرتے تھے اور نہ دوسروں کی کمائی کا شوربا روٹی کھاتے تھے بلکہ وہ سختی سے ایک متمدن انسان کی روزمرہ کے دستور العمل کی خود مثال دیتے تھے۔ شریفانہ زندگی سکھاتے تھے، وہ انسانی قوتوں کو سمجھتے تھے اور اس کے موافق حکم کرتے تھے۔ ایسا حکم جس کے حسن پر عقل کو تسکین ہو۔ وہ صبح اور شام بجھانے اور اس کے فرائض بنانے کے لیے خلق کیے گئے تھے۔

ہمارا خطرناک انتظار

اور باوجود ان واضح باتوں کے جو ان کی تعلیم اور ان کے طرز عمل سے ظاہر ہے ہم فائدہ نہیں اٹھاتے چہ جائے کہ ہم اس لحاظ سے ان کی عالمگیر تعلیم کو اپنے علاوہ بھی لوگوں کو دکھلانے کی کوشش کریں بلکہ اس کا انتظار کرتے ہیں کہ ہمارے مقتداؤں کے حالات ہمیں غیر مسلمین کے قلم زبان سے ملیں۔ اور اسے ہمارے بچے اور نوخیز پڑھیں۔ جنھیں زمانہ نے اس قدر وقت نہیں دیا تھا کہ وہ گھر کی بات پہلے گھر سے جانتے۔ اگر یہ سچ ہے تو پرانے فاضل ضرور زمانہ کے رنگ کی عدم شناسائی کے لیے مورد الزام ہیں لیکن نئے تعلیم یافتہ؟ انھوں نے باوجود زمانہ شناسی کے خود کچھ کیوں نہ کیا۔ قابل افسوس لاپروائی یا حیرت خیز تدبر۔

زبان

سچ ہے کہ وہ جنھیں یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں اور اس کے خوبصورت، محتاط لطیف، معنی خیز اور وسیع البیان الفاظ اور فقرات کا چسکا پڑ گیا ہے انھیں اپنی مادری زبان ایک بے مزہ ہڈی معلوم ہوتی ہے اور اس لیے نہ وہ اپنی زبان کو اپنے وسیع خیال کا حیز سمجھتے ہیں اور نہ اس کی کوئی تصنیف کے مطالعہ سے اپنا وقت خراب کرتے ہیں۔ لیکن سوال ہے کہ اسپرٹ آف اسلام ہی کی ایسی کے کتاب لکھی گئیں جس سے اردو نہ پڑھنے والوں کو تسکین ہو سکتی۔ اور سوال ہے کہ جب تعلیم اس قدر گراں قیمت ہوتی جاتی ہے تو کیا یہ روپیہ اور وقت کے مفید کفایت نہیں ہے کہ ہم اپنی زبان کا علمی ذخیرہ مہیا کر کے واقفیت کا نسبتاً آسان ذریعہ چھوڑیں؟ میں سوچتا ہوں کہ نئی روش سے متاثر لوگوں کو اپنی زبان اور اس کے ذخیرہ کی فراہمی کا زیادہ احساس ہونا چاہیے۔ خصوصاً جب کہ اتفاقات بھی ایسا چاہتے ہوں اور وہ قومی حیثیت کی تعلیم کا ایک اہم ترین مسئلہ ہو گیا ہو۔

متذکرہ صدر بے موقع یا باموقع، متعلق یا غیر متعلق اظہارِ خیال اور اس کی گرمی کی مخلصانہ معذرت کرتا ہوں اور مجھے امید معافی ہے لیکن غور کی التجا سے باز نہ آؤں گا۔

حسینؑ کے متعلق بعض اور غور طلب باتیں

علاوہ ان باتوں کے جو کہی گئیں حسینؑ کے اس زمانۂ حیات کو جو ہجرت مدینہ سے ورود کربلا تک ہے بعض نہایت غور طلب مسائل سے تعلق ہے۔ مثلاً آیا حسینؑ کی روش نزاعی تھی یا دفاعی، آیا

حسینؑ نے عقل کو جذبات کا تابع کر دیا۔ آیا مسلم بن عقیل کی کوئی اطلاع حسینؑ تک پہنچی جس میں وہ حسینؑ کو حکومت کرنے کے لیے طلب کر رہے تھے۔ آیا اس وقت بھی حسینؑ کا روانہ ہونا امید خلافت سے تھا۔ آیا حسینؑ نے جو کچھ کیا ان کا عمل اپنے برادرِ معظم کی مخالفت تھی؟

قضا و قدر

ایک اور پہلو مفید توجہ کا محتاج ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قضا و قدر میں غلو کی مصلحت پر حاکم گروہ نے کیوں زور دیا۔ آیا یہ موجدین مصلحت کے لیے مفید ثابت ہوا۔ اس نے عامہ ناس پر کیا اثر کیا۔

سبب اور نتیجہ کا بعدِ زمان درمیانی شکستگی نہیں ہے

میری کتاب کا کوئی بے قرار ناظر یہ چاہے گا کہ اسباب شہادت حسینؑ کا نتیجہ ویسا سریع کیوں نہ ہوا جیسا لکڑی مارنے اور سر پھٹنے میں ہوتا ہے۔ اور وہ سبب اور نتیجہ میں کسی قدر بعد زمان کو درمیانی شکستگی سمجھنے لگے گا۔ لیکن اسے غور کرنا ہوگا کہ سر پھٹنا اگرچہ لکڑی سر پر پڑنے کا نتیجہ تھا لیکن سبب کا نتیجہ پیدا کرنے کے قابل نشو ہونا کوئی فوری کام نہ تھا بلکہ وہ خود ایک ارادہ، تربیت اور عمل کا تابع تھا یعنی "لکڑی پڑنے" والا سبب خود محتاج نمو تھا۔ بیج اگرچہ پھل کا سبب ہے لیکن بیج پڑتے ہی پھل نہیں نکل آتا بلکہ بیج کے پھل لانے تک مختلف تغیرات اور مدارج نمو طے ہوتے ہیں جس کے بعد پھل یا نتیجہ ہوتا ہے۔

جزئی باتوں کا کافی سمجھنا غلطی کا باعث ہوتا ہے

اسی طرح وہ دو فقروں میں خلاصہ سن لینا چاہے گا یا کسی تائیدی اشارے کو پکار لے کر اس طرح ناپے گا کہ گویا صرف وہی مطلق ثبوت ہے اور جب وہ ناپ میں کم پائے گا جیسا کہ ہونا چاہیے تو وہ پیمانے اور چیز دونوں کو دے مارے گا۔ بغیر یہ سوچے ہوئے کہ اس نے قد اور جسامت کے موافق پیمانے کے انتخاب میں تمیز کا کسی قدر وسیع مصرف گوارا کیا ہے۔ اس نے مطلق یہ تکلیف نہ اٹھائی ہوگی کہ سمجھانے والے کے اس قدر ساتھ چلتا کہ اسے ایک جنس کی چیزیں سمجھ میں آجاتیں اور اس کے بعد وہ کل کو تولتا۔ نتیجہ کے سمجھنے میں جزئی باتوں سے مدد لینا اور انھیں کافی سمجھنا اکثر انسانی تجربہ میں غلطی کا باعث بلکہ مضر ثابت ہوا ہے۔

دو دھارے

میرے لیے یہ آسان نہیں ہے کہ ان عظیم الشان تغیرات کو جس نے بعض کو ایک قوم میں سے اپنے جوش مخالفت میں اس قدر پختہ کر دیا کہ وہ اپنے نبی کے نواسہ کو قتل کر سکیں مختصر لفظوں میں بیان کر دوں۔ اور نہ کیسے ہی وسیع اور منتخب لفظوں میں یہ گنجائش ہے کہ حسینؑ کے اس جوش حمایت کو جوان میں اپنی وجہ کے لیے تھا اس طرح ادا کر دے کہ پھر وہ شرح کے محتاج نہ رہیں، بلکہ وضاحت ممکن نہیں جب تک یہ نہ سمجھا یا جائے کہ وہ ایک دوسرے کے مخالف دھارے بڑے جوش و خروش سے بہہ رہے تھے۔

ایسے اسباب جن میں کسی دوسرے نتیجہ کے پیدا کرنے کا ارادہ نہ تھا

اس کے بعد ان کی ابتداء وسعت کے اسباب ان کے عناصر، ترکیب، خاصیت، حرکت اور سرعت پر غور کیا جائے اور پھر اس کے بعد دیکھا جائے کہ اس حالت تک

پہنچنے میں ان دونوں دھاروں کی نمود اور کوئی صورت بجز اس نتیجہ کے پیدا کر سکتی تھی یا نہیں۔ آیا اسباب ایسے تھے یا نہ تھے جن سے کسی دوسرے نتیجہ پیدا کرنے کا ارادہ پایا جاتا ہو۔

ہو سکتا ہے کہ حسینؑ کے مخالف دھارے کو شخص کی تجویز کا ادراک نہ ہو اور حسینؑ تک پہنچتے پہنچتے ہر شخص دیکھنے لگا ہو کہ مخالفت کا ہیبت خیز طوفان حسینؑ پر چلا چاہتا ہے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ خاندان معلوم نہ تھا۔ یہ بہت دن پیشتر سے معلوم تھا۔ جس اصول سے نبی اسرائیل کا نبی ان کی ستر برس غلامی اور اسیری کی پیشین گوئی کر سکتا تھا۔

پیشین گوئی اور شخص

میرا یہ کہنا ایک مؤرخ کی نظر سے ہے جو صرف واقعات تاریخ کی نمود سے بحث کر رہا ہے۔ لیکن اگر اس میں ان احادیث کا جزو مرکب کر دیا جائے جو رسولؐ کی زبانی حسینؑ کی شہادت کی پیشین گوئی کے متعلق ملتی ہیں اور جن کا کتب اسلامی میں کافی ذخیرہ ہے (دیکھو سر الشہادتین وغیرہ) تو اس قدر فقرہ اور بڑھانے کی ضرورت ہوگی کہ "لیکن یہ نہ تھا کہ شخص کا کسی کو ادراک نہ ہو" خواب کے بعد یہ دوسری بات ہے جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

مدبرانہ پیشین گوئی سے بلند تر

پیشین گوئی کے اس حصہ کے سمجھنے میں دشواری کا خیال نہیں کیا جاسکتا کہ مخالفت کا طوفان خاندان رسالت کے کسی فرد پر چلے گا سیاسی تیز دیکھنے والی نگاہوں کی تاریخ میں ایسی پیشین گوئی شاذ نہ ہوگی لیکن شخص کا اس وقت تجویز کیا جانا جس وقت اس کے ساتھ کسی طرح کی مخالفت کا خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا مدبرانہ پیشین گوئی سے کچھ زیادہ ہے۔

تین صورتیں

میرے دانست میں اس کے حل کرنے کی صرف تین صورتیں ہیں۔ ● اول یہ کہ حسینؑ کی تجویز شہادت کی پیشین گوئی کی جس قدر احادیث ہیں وہ قطعی انکار سے ذبح کر دی جائیں۔ ● دوئم یہ کہ یہ پیشین گوئی ٹھیک واقعہ بین صاف سیاسی نگاہ کے ذریعہ سے سمجھی جائے۔ ● سوم یہ کہ وہ اس سے بالاتر ذریعہ سے سمجھی جائے۔ وہ الہام ہو، وحی ہو، یا بہ اختلاف نام اسی مفہوم کے کسی وسیلہ سے۔

پیشین گوئیوں کا ذخیرہ تاریخی شہادت کی حیثیت رکھتا ہے

پہلی صورت یعنی پیشین گوئی کی احادیث

اس قدر مسلسل اور متواتر اور اس فطری شان اور موقع سے بیان کی گئی ہیں کہ اب وہ ایک تاریخی شہادت ہیں اور بجز اس صورت کے کہ جب تک ان کے غلط اور وضعی ہونے کے قرین عقل اور موید بہ تاریخ وجوہات نہ بیان کیے جائیں اس حیثیت سے ماننے والوں کے نزدیک ایک بے انصافانہ اور بے حواسانہ انکار سمجھا جائے گا۔ ان کی صحت میں اشتباہ نہ ہونے کے قرائن اس سے قوت پاتے ہیں کہ حسینؑ کے مخالفین نے کبھی ان کے وضعی ہونے کا الزام نہیں دیا۔ مزید قوت اس سے ہوتی ہے کہ یہ احادیث مختلف مواقع پر مختلف لوگوں کے زبانی بیان کی گئی ہیں اور حسینؑ نے بھی اسے ایک سے زیادہ مواقع پر سنا اس کی تصدیق کی اور تصدیق کرائی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر کوئی مؤرخ اسے اعتقادی حیثیت سے قبول نہ کرے اور اسے رسولؐ کی سیاسی دور بین نگاہ کا نتیجہ سمجھے تو اسے بجز اس کے کہ پانچ چھ برس کی عمر میں حسینؑ کے شجاعانہ آثار طبیعت اور بعض طبیعتوں کے انقلاب خیز احساس

کو اس پیشین گوئی کا ماخذ قرار دینا پڑے اور کوئی صورت مشکل سے ملے گی۔ لیکن یہ وجہ تشکیک کے قابل دراز نہیں ہے۔
تیسری صورت یہ ہے کہ یہ پیشین گوئی تاریخی حیثیت سے ناقابلِ تنسیخ ہے۔ جس میں ایک مسلسل ہیجان عداوت کا نتیجہ، جو دو فریق میں پیشتر سے چلا آرہا تھا اور مختلف وجوہات اس میں شدت پیدا کرتے جاتے تھے۔ کسی خاص شخص کے لیے تجویز کیا گیا ہے۔ لیکن یہ پیشین گوئی اس وقت کی گئی ہے جس وقت پیشین گوئی کرنے والے اور خود اس کے ذریعہ سے ملکی حیثیت سے حسینؑ کا موقع بہ نسبت مخالف گروہ کے نہایت قوی تھا

تعیینِ زمان اور تجویزِ شخص کا معجزہ

اور قیاس اس کا کم مقتضی تھا کہ حسینؑ اس قدر کمزور ہو جائیں گے کہ انھیں فریقِ مخالف سے یہ تکلیفیں پہنچیں گی۔ اس لحاظ سے تعیینِ زمان اور تجویزِ شخص کا یہ ایک ایسا معجزہ تھا جو موقع اور طبیعت شناسی سے کسی قدر بالاتر ذرائع سے تھا۔

قیاس کی دشواری

تجویزِ شخص اور تعیینِ زمان میں سیاسی حیثیت سے پیشین گوئی کا اقتضا نہ ہونا اس وجہ سے بھی ہے کہ یہ پیشین گوئی حسینؑ کے مخالف گروہ نے نہیں کی تھی جس سے یہ قیاس آسان ہوتا کہ دشمنوں نے حسینؑ کو اپنی خلافِ انسانیت عداوت کے لیے مختص کر لیا ہے، بلکہ یہ محض اس کی زبان سے تھی جس کا کاندھا خود حسینؑ کو سب سے زیادہ پسند تھا۔ یہ پیشین گوئی اگر رسولؐ کی آخری زمانہ حیات میں حسینؑ کے پدرِ بزرگوار کے متعلق ہوتی (جیسی ایک حیثیت کی ہے) تو اس کے متعلق سیاسی نگاہ کے قبول کرنے میں زیادہ دشواری نہ تھی۔ حسینؑ کے متعلق پیشین گوئی جس قدر عجب انگیز ہے، بنی امیہ کے متعلق آخری گھڑیوں میں خود حسینؑ کی پیشین گوئی ویسی ہی حیرت خیز ہے جس میں وہ بنی امیہ کو ان کے عین عروج میں آپس کی جنگ سے تباہی کی خبر دے رہے ہیں۔ اگرچہ یہ آخر الذکر پیشین گوئی صاف بین سیاسی نگاہ کے اندازہ کے اندر آسکتی ہے۔

اس کتاب کے موضوع

بعض کی نگاہ میں میں نے مقدمہ میں غیر مفید وقت صرف کیا ہوگا اور خواہ مخواہ ایسے موضوعات میں الجھا ہوں گا جس کی ضرورت اس کی نگاہ میں نہ ہوگی۔ لیکن میں صاف دیکھ رہا ہوں کہ وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے جب اس کا زیادہ احساس کیا جائے گا کہ اگرچہ واقعات کی طبعی اور فطری حیثیت تفتیش کی کوشش کی گئی، لیکن کوشش اس سے زیادہ وسیع چاہیے تھی۔ وہ زمانہ ہوگا جس سے حقیقتاً میرے اس بنیاد ڈالنے کی امیدیں وابستہ ہیں جو الکرار کے بعد اس سلسلہ میں جس کی ترتیب کی باوجود کمی اسباب کے کد ہے تعداد میں دوسری ہے۔

جذبات کا مصرف

میں نہیں جانتا کہ میری اس تحریر سے ضروری مقامات اور ان کی شان کے مناسب ناظر کے دل میں، غم، غصہ، نفرت، حقارت، ہمدردی، جوش اور پسندیدگی کا عالم پیدا ہوگا یا نہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ غم، غصہ، نفرت اور حقارت کے جذبات کا پیدا ہونا میری خواہش کے وہیں تک موافق ہوگا جہاں تک یہ اس کام آسکیں کہ ان جذبات کے پیدا کرنے والی چیزوں سے شریفانہ کنارہ کشی کی جاسکے جو برائی کی بے وقعتی اور اس لیے رفع فساد ہے۔ لیکن اگر یہ جذبات ان ناگوار نتائج کے باعث ہوں جن کا قطعاً پیدا نہ ہونا زیادہ مفید ہوتا تو مجھے شخص کے اس اچھی چیز کے برے مصرف پر تاسف ہوگا۔ جذبات اس حد تک قابلِ تعریف ہیں جب تک ان پر عقل اور احتیاط

کی لگام چڑھی رہے۔ واقعہ تاریخی اور ان پر حتی الوسع قربت سے نظر کرنے کی کوشش حسینؑ کے سمجھنے کے لیے ہے نہ کہ حسینؑ کے واقعات ناموافقت خیال کا کوئی ذخیرہ فراہم کرنے کے لیے۔

اے کاش! میں ان واقعات کو ترک کرسکتا جن سے خوشگوار بو نہیں آتی۔ ایسا کرنا اپنی غرض کی نفی ہوتی کہ ایک وقت میں کسی کی سوانح نویسی کا دعویٰ کرتا اور پھر ان اسباب سے چشم پوشی بھی کرتا جو اس کے واقعات پر مؤثر تھے۔

مؤلف کا اعلانِ برأت

میرا موقع اس طالب علم کا سا ہے جسے مدرسۂ جراحی میں علم تشریح سیکھنے کے لیے لاشیں چیرنی پڑتی ہے۔ میں ان لوگوں سے برأت کا اعلان کرتا ہوں جو اس کتاب کو بجائے سمجھنے کے ذریعہ کے کج بحثیوں کا آلہ بنانے کی کوشش کریں۔

مصلحت سکوت کی صحت غرض سے انکار

ہوسکتا ہے کہ عام فرق اسلامیہ میں سے کسی کو یہ شکایت ہو کہ میں بھی حسینؑ کے متعلق ویسے ہی سکوت آموز مصلحت کیوں نہیں اختیار کرتا جس کا گزشتہ اوراق میں اشارہ کیا گیا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس مصلحت کی صحت غرض کا منکر ہوں۔ میں اسے حسینؑ کے ساتھ بے رحمی اور ناانصافی اور عالم کے اس فطری اصول سے اعراض سمجھتا ہوں کہ اچھا اور برا اپنی معلومہ حیثیت کے اعتبار سے ویسا نہ سمجھا جائے جیسا وہ ہے۔ میں اس خاموشی پسند مصلحت کو مسلمانوں کے مفاد قومی کا سب سے بڑا تباہ کن ذریعہ سمجھتا ہوں اگرچہ کسی کے نزدیک مجھے ایسا سمجھنے کا کوئی حق نہ ہو۔ میں کیسے خوشی سے ایسا ہو جاؤں جسے واقعات دیکھنے کی جرأت نہیں ہے۔ واقعات لکھنے سے خوف کرنا نہ واقعات کو چھپا دے گا اور نہ خوف کو۔ کون اس کا قائل ہوگا کہ حباب پر فولاد منڈھنے سے حباب مضبوط ہو جائے گا۔ یا آگ لگی ہوئی دیکھ کر آنکھ بند کرلینا "آگ لگے ہونے" کے واقعہ اور اس کے نتائج کو معدوم کردے گا بلکہ محفوظ تدبیر یہ ہوگی کہ ہم آگ لگنے کے اسباب سمجھیں۔ جو آئندہ آگ لگنے کے مواقع کو دور کردے گا، اور گزشتہ آتش زدگی کے برے نتائج کی مکافات کرے گا۔

نظامِ تحریر

میں واقف ہوں کہ مجھے بعض ایسے واقعات سے سابقہ ہے جن کی طینت ان کے ذکر کے وقت اعتدال سے ہٹا دیتی ہے لیکن میں اس کی ہر حالت میں احتیاط کروں گا کہ گرم کیا معنی شیر گرم الفاظ بھی میرے قلم سے نہ نکلیں۔ مناسب ہے کہ کسی مؤرخ کا قلم ڈفالی کی پڑھی ہوئی چھری نہ ہو۔ میں اس کی کامل احتیاط کروں گا کہ مفید مواقع پر کتاب کا نام اور اس کی عبارت یا لفظی ترجمہ پیش کروں اور واقعات اور رائے کو مخلوط کرکے واقعہ نہ کہوں۔ مفید ابواب میں میں پہلے واقعات ترتیب دے جاؤں گا، اور خود کچھ کہنے کے لیے دوسرا باب قرار دوں گا۔ یا اس طرح کہوں گا کہ واقعات اور میری شرح میں فرق کیا جاسکے۔ اس سے کسی حد تک طوالت ہوگی لیکن واقعہ سمجھنے اور ہر شخص کو آزادانہ رائے قائم کرنے کی یہ ایماندارانہ ترتیب ہوگی۔ موجودہ روشِ تحریر کے لحاظ سے مجھے واقعات کو تفصیل اور ترتیب سے نہ لکھنا چاہیے تھا بلکہ محض شرح اور اشارے کرتے جانا کافی تھا۔ یہ میں نے اس لیے نہیں کیا کہ ہماری عام قومی تعلیمی حالت ایسی نہیں ہے کہ محض اشاروں سے کام چل سکے۔ خصوصاً جس زمانہ میں اپنا مذہبی میلان ظاہر کرنا تدبر کے خلاف سمجھا جاتا ہو۔ خدا کرے پڑھنا چاہنے والے کے لیے میری تحریر میرے اظہارِ خیال میں شبہ نہ پیدا کرے۔ اس کے بعد یہ بھی کہہ دوں کہ یہ کتاب ان کے لیے ہے جنھیں اپنے اوپر اس قدر اعتبار

ہے کہ "یہ دیکھو کہ کیا کہا یہ نہ دیکھو کہ کس نے کہا" پر عمل کر سکتے ہیں۔ میں تھوڑے صبر اور غور کا ملتجی ہوں اور سب کے آخر میں: ؎

تاج سر من خاک کف پائے کسے است ۔۔۔۔۔ کو چشم مرا بہ عیب من بینا کرد

خاکسار ریاض

علاماتؒ جو ہم کام میں لائے ہیں

! مخاطبہ یا تعجب یا اظہارِ تاسف۔

؟ اِستفہام۔

۔ یا جملہ ختم ہو گیا، یا آخری لفظ کا سلسلہ دوبارہ اسی نشان کے پہلے لفظ سے ہوگا

--- اس کا منشا ہے کہ کچھ عبارت غیر مُتعلق سمجھ کر حذف کی گئی۔

" " اس نشان کے اندر کی عبارت خاص اس شخص کی ہوگی جس کا تذکرہ کیا گیا۔

: ذکر کی جانے والی عبارت کا اس کے بعد آغاز ہوتا ہے۔

( ) خطوطِ ہلالی کے اندر کی عبارت اس کے پہلے کے لفظ کی کسی شرح کے لیے ہے۔

باب اوّل

ولادتِ حسینؑ کے قبل سے رحلتِ رسولؐ تک

(رسولؐ کی تعمیرانہ مصلحت)

غارِ حرا کا طالب علم

مشیت ازدی اس کی مقتضی ہوئی کہ غارِ حرا کا طالب علم دنیائے گزشتہ کا مصلح اور آئندہ کا رہنما ہو۔ مصلح بنا اور رہنما ہوا۔ اس کے سمجھنے کے لیے مذاہب گزشتہ کی کتبِ مقدسہ ان مذاہب کے بانیوں کی ذات اس کے اثر ان کی عقل، کامیابی اور افعال پر نظر کرنا اور اس کے بعد بے تعصبی سے اسلام اور شارع اسلام کی ان کل باتوں کو دیکھنا صحیح فیصلہ سے دور نہ رکھے گا۔

ہادیٔ عالم کی بعثت کے وقت مذاہب کی حالت

اس کتاب کا مبحث اس غرض سے بہت دُور ہے جس میں متذکرہ صدر مقابلہ کی گنجائش ہو۔ مجھے اس جگہ جو کچھ کہنا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ اگرچہ اس زمانہ تک جہاں تک تاریخی نگاہ جاسکتی ہے اس کے آثار ہیں کہ قوموں میں ہادی پیدا ہوئے اور انھوں نے چاہا، کوششیں کیں، بلکہ اکثر اپنے جوش ہدایت میں جانیں دیں لیکن جس وقت نبی عربی مبعوث ہوئے اس وقت مشہور مذاہب کی ایسی قابل تاسف حالت تھی جو ایک ہادی کی ضرورت بتا رہی تھی۔ اور ضرورت اس امر کی تھی کہ اس کے اصول ایسے عالم گیر ایسے معتدل اور اس درجہ کمال عقلی کے مظہر ہوں کہ لوگ جو پیشتر کے کسی مذہب کے پیرو ہوں اور وہ اپنی تباہ شدہ حالت پر غور کر کے کسی زبردست نفس اور ہادی کی مدد لینا چاہتے ہوں۔ انھیں اس نقیب کی نقابت قبول کرنے میں کوئی منصفانہ عذر نہ ہو وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ کوئی ایسی بات کہہ رہا ہے جسے پہلے کی عمدہ باتوں سے مغایرت ہے۔ اس کا حکم نہ محض جنٹائیلس کے لیے ہو، نہ یہود کے لیے اور نہ وہ کسی ایسے مذہب کا نقیب ہو جس کی تعریف بجائے مذہب کے جغرافیائی حدود کا سبق دیتی ہو۔ بلکہ خدا کے پیدا کیے ہوئے تمام انسان اور عالم کے لیے ہو۔

ایک نبیؑ کے بعد دُوسرے کی کیوںؑ ضرورت ہوئی

ایک نبی کا دوسرے نبی کے بعد مبعوث ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ گزشتہ انبیاءؑ کی تعلیم کو قطعاً منسوخ کرنے کے لیے آیا ہے۔ نہ وہ اس لیے آیا ہے کہ اسے کچھ ایسے اصول اخلاق اور نیکیاں سکھانی ہیں جو پیشتر نہ سکھائی گئی تھیں۔ نہیں۔ نیکیاں ہر زمانہ میں نیکیاں تھیں اور یہی ان کی نیکی ہونے کا بہترین ثبوت ہے۔ جو کچھ ضرورت ایک نبی کے بعد دوسرے کو ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جس جس طرح زمانہ گزرتا جاتا ہے اور جو جو مبالغہ یا کمی احکام میں پیدا ہوتی جاتی ہے اسے متنبہ کرے۔ بھولی ہوئی باتوں کو یاد دلائے اور انھیں اس طرح سکھائے کہ ان پر اس کے جوش اور اس کی سچائی کا اثر ہو۔ ہدایت پائے ہوئے ہدایت کرنے والے کے پیرو معلوم ہوں اور وہ غرض پوری ہو جو اس کی بعثت سے ہو سکتی تھی۔

ضروری معیار

بلاشبہ نبی کی اس وقت بعثت ہوتی ہے جب اس کی خاص ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اس وقت کے خیال کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس وقت کی جماعت کی طرح پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ایسا کہ اپنے زمانہ کے لوگوں کو اپنی باتیں سمجھا سکے۔ ورنہ اگر درجہ عقلی میں ان لوگوں سے کم ہو جنھیں وہ سمجھانے آیا ہے تو حقیقتاً نہ وہ سمجھا سکتا ہے اور نہ لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ اس لیے معیار نبوت میں بظاہر جو چیز سب سے زیادہ ضروری معلوم ہوتی ہے وہ اپنے زمانہ، اپنے گروہ یا اپنے مخصوص نقطۂ ہدایت میں اس کی ترقی عقلی اور اخلاقی عظمت ہے۔

تجدید کی ضرورت

اگر خداوند تعالیٰ اس بات کا التزام فرماتا کہ ایک ایسے زمانہ میں جو ابتدائے آفرینش فرض کرلیا جائے انھیں ایسا کامل دین اور اصول ہدایت سکھایا جائے جس میں اصولاً کوئی ترمیم یا تنسیخ یا تجدید نہ ہو سکے تو یہ ایسے زمانہ کو ایسی باتیں سکھانی ہیں جس وقت کا دماغ اپنی فطری ترقی اور نشو میں اس حد تک نہیں پہنچا ہے جس میں وہ ایک اعلیٰ ترقی پائے ہوئے زمانہ کے اصول کا تحمل ہو سکے۔ وہ جس نے ناتکمل چیز نہیں دیکھی ہے وہ تکمل کی شایان قدر نہیں کرسکتا۔ اس حالت میں اگرچہ اصول قطعاً تکمل ہے لیکن اس لحاظ سے کہ وہ زمانہ کے موافق نہیں ہے عین ناتکمل سمجھا جائے گا۔ اس لیے کہ اس کی تکمیل کس کام کی جب وہ اتنی بھی ہدایت نہ کرسکا جو اس سے کم درجہ تکمیل لیکن زمانہ کے موافق سے ہوتی۔ مثلاً اگر افریقہ کے اس خطہ میں جہاں کوئی طریقہ حکومت نہیں ہے اور طوائف الملوکی کے بھی خوگر نہیں ہیں اگر دفعتہً یورپ کی انتہائی ملی یا مشروطہ حکومت جاری کی جائے تو یقیناً ایسی حکومت اور رعایا دونوں کی انتہائی بدنصیبی ہے۔

انبیاء کی ایک دوسرے پر فضیلت

بجائے کسی اور بحث کے ہم مسلمانوں کا ہدایت نامہ اسے ان مختصر لفظوں میں کہ: "تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ" (۲: ۲۵۳) طے کردیتا ہے۔ آخر انھیں بجز اپنی ذات، عمل اور اصول کے اور کس چیز سے فضیلت ہو سکتی تھی۔ ضرورت تھی کہ ایک مرتبہ ایک بڑا نبی پیدا ہوتا، اپنا اثر ڈالتا اور گزر جاتا کچھ لوگ اس کے اصول کے ساتھ اترتے آتے اور کچھ کم درجہ کے مصلحین اسے سنبھالتے آتے یہاں تک کہ مشیت ایزدی اس کی مقتضی ہوتی کہ کوئی ایسا پیدا ہو جو بعض فروعات کو منسوخ کرے بعض قائم مقام فروعات کی تعلیم دے اور کچھ ان نئے خیالات اور افعال کی روش کی اصلاح کرے جو اس درمیان میں پیدا ہو گئی تھیں۔ مثلاً:

حضرت موسیٰؑ کی مثال

نہ صرف اعتقادی بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی یہ مسلم ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے قبل انبیاء تھے، لیکن حضرت موسیٰؑ کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ ایک قانون مرتب کرتے اور وہ اپنے زمانہ کے بلکہ اپنے بعد بہت زمانہ تک کے بڑے نبی تھے۔ ان کے بعد ان کا دین کبھی پستی کی طرف اس طرح مائل ہوا کہ ابھرنے کی کوئی امید نہ رہی اور کبھی دفعتہً اس طرح ابھرا کہ گویا پستی سے مطمئن ہو گیا۔ اور اس جزر و مد میں انبیا پیدا ہوتے رہے جو اپنے اپنے درجہ نفس اور قوت کے موافق ہدیت کرتے رہے یہاں تک کہ

ابنِ مریمؑ نے دینِ موسوی سے کبھی برائت ظاہر نہ کی

ابن مریمؑ پیروان یہود کے گھر پیدا ہوئے اور خود ان کے متعلق یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ کب یہودی نہ تھے اور کب انھوں نے دینِ موسوی سے آزاد ایک دین کا اِعلان کیا۔ ان کی نہایت مخصوص تعلیم یہ تھی کہ:

ابن مریمؑ نے بعض اموراتؐ میں اصلاح چاہی

شریعت موسوی نے کہانت اور رسومات میں جو افراط پیدا کی تھی اور اس کے انہاک نے مذہب کی اصلی خوبیوں سے جس درجہ تغافل پیدا کیا تھا اس سے متنبہ کریں۔ شریعت موسوی کے اثر یا اس کے متعلق غلط فہمی نے بنی اسرائیل میں دوسری قوموں سے مغایرت پیدا کی اور وہ ناقابل اصلاح حد تک پہنچ گئی۔ ابن مریمؑ کی تعلیم محبت کا وعظ کہتی رہی۔ اگرچہ انھوں نے کبھی یہ مخصوص غرض اپنی وجہ بعثت کی ظاہر نہیں کی۔

انبیاءؑ کا درجہ کیونکر سمجھا جائے

زمانہ جزر و مد خیالات، افراط و تفریط، حوادث اور دیگر تغیرات وہ خاص عناصر ہیں جس موقع پر انبیاءؑ کی بعثت دکھائی دیتی ہے اور وہ کرتا ہے جو کچھ کر سکتا ہے۔ اس کی کامیابی، اس کا درجہ ان باتوں اور اثر سے سمجھا جاتا ہے جو وہ کر گیا اور یہی اس کی بہترین یادگار ہوتی ہے۔

ایک نبی اکثر دوسرے کا شارح تھا

وجوہات بعثت میں جو ایک اور غرض میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ ایک نبی اس قدر سمجھاتا ہے جس قدر سمجھانے کی ضرورت سمجھتا ہے لیکن یہ سمجھنا اور کامل حد تک سمجھنا دشوار ہے کہ وہ لوگ بھی جو سمجھائے گئے تھے اس کی تعلیم کے ہر پہلو کو اس طرح سمجھ گئے جو اس کے بتانے کی غرض تھی۔ بڑے لکھنے والوں نے اکثر اس کا اقرار کیا ہے کہ کسی بات کو اس طرح سمجھانا کہ وہ ہر طرح اور ہر درجہ عقل کے آدمی کی سمجھ میں آجائے دشوار ہے۔ اس لحاظ سے یہ سوچنا غالباً کوئی حدود شکنی نہیں ہے کہ اکثر انبیاء دوسرے گزرے ہوئے نبی کے شارح تھے اور انھوں نے وہی کام جاری رکھا تھا جس کی اس وقت کی نسل کو ضرورت تھی اور جس نسل میں گزشتہ نبی کی ذات فقرات اثر اور تعلیم سے مس نہ تھا۔ قرآن فرماتا ہے:

مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا (۲ : ۱۰۶) (ہم کسی نشانی کو نہ باطل کرتے ہیں نہ بھلاتے ہیں مگر یہ کہ اس سے بہتر یا اس کے مانند لاتے ہیں)

ہمارے ہادی کی بعثت رقیب مذاہب کے حلقہ میں ہوئی

نبی عربی کی بعثت کا بہترین ثبوت اور ہدایت خلق کے لیے خدا کی طرف سے بھیجا جانا منجملہ اور بہت سے ثبوت کے یہ ہے کہ وہ ایک ایسے مقام پر پیدا ہوئے جہاں کے لوگوں کو نہ صرف یہودیت، مسیحیت، زردشتیت، صابئیت (صابئین) اور ہندویت کا علم تھا بلکہ ان مذاہب کے لوگ بہ استثنائے ہنود عرب کے کسی نہ کسی خطہ پر بحیثیت حاکم گروہ کے بھی قابض تھے اور ان میں سے ہر ایک کے علماء اور فقہا اپنی اپنی حکومت کے آغوش میں بعافیت بسر کرتے تھے۔ دور کیوں جایئے تعجب خیز برداشت نے آغوش خانہ کعبہ کو عرب کے ہر مذہب کی نمائش گاہ بنا دیا تھا۔ مثلاً:

خانہ کعبہ قبل اسلام

نہ صرف خانہ کعبہ کی چہار دیواری میں اس کی تعمیر کرنے والے کی اس طرح تصویر رکھی تھی کہ ایک طرف حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کا بت تھا اور اس کے سامنے ایک بھیڑ کھڑا تھا۔ تو مسیحیوں کے لیے یہ ناممکن تھا کہ حضرت مسیحؑ کو حضرت مریم کی گود میں بیٹھا ہوا نہ دیکھتے۔ لات و منات کی تمام عرب پرستش کرتے تھے درآنحالیکہ لات نہایت قدیم زمانہ سے اہل بابل کی بلکہ تحت الارض تھی اور چونکہ

اہل بابل نے علم الآثار میں بہت سی کتابیں لکھی تھیں اور وہ سیاروں سے خاص فال اور اثر کے امیدوار رہا کرتے تھے۔ اس لیے عجب نہیں ہے کہ صابئین اہل بابل کی یادگار ہوں اور یہ بت دونوں قوموں کی مذہبی خیال کا مجسمہ ہو۔ زمانہ اسلام کی تاریخ عرب بتاتی ہے کہ ہُبل قریش کا خدائے جنگ تھا کیونکہ جب احد میں حضرت رسولؐ کی شہادت کی خبر مشہور ہوئی تو ابوسفیان نے خصوصیت سے اس بت کی تعریف کی تھی اور کسی فوجی مہم کے روانگی کے قبل اسی سے طلبِ اِستِعانت بھی کی جاتی تھی۔ اور بلحاظ اس کے کہ قدیم الایام سے انسان بتوں کے سامنے اپنا اظہار خلوص و عقیدت کیا کرتا تھا اس لیے عرب میں بہت سے بتوں کا زمان کے اختلاف نام کے لحاظ سے موجود ہونا اس مفہوم سے کسی طرح الگ نہیں ہے کہ مذہب بت پرستی کی بھی معمول سے زیادہ وکالت ہوتی تھی۔

خانہ کعبہ مذاہب کا وکالت خانہ تھا

اور اس لحاظ سے کہ کچھ موحدین بھی اس حیثیت کے تھے جو ان عقائد سے اس قدر متاثر نہ ہوں جس قدر توحید سے رغبت ہو اور وہ روایات یا فطری روش خیال سے اس نتیجہ پر پہنچے ہوں کہ ابراہیمؑ نے اسے خدائے واحد کی پرستش کے لیے بنایا تھا اور ان کی وقعت اور اپنے اعتقاد کو اس گھر سے وابستہ رکھتے ہوں لیکن یہ ان کے امکان کے باہر تھا کہ اس مشہور مذاہب عالم کے خانہ ملی سے ہر ایک وکیل کو نکال دیتے اور محض خدائے واحد کی پرستش کے لیے مقدس کرتے۔ شاید ہی دنیا کے کسی معبد کو اس قدر مشہور مذاہب کے مرکز ہونے کا موقع ملا ہو۔

ہم وزنی اثر

خانہ کعبہ کے اس حیثیت کے مجموعہ معبد ہونے سے گمان غالب ہوتا ہے کہ اس کی وقعت کسی طرح کسی زمانہ میں کم نہیں ہوئی۔ روایتیں ہوں شہرت ہو، یا لوگوں کا عام رجحان ہو، ان میں سے ہر شے اس کی تائید کرتی تھی ہم وزنی اثر تھی اور اس طرح ایک مذہب دوسرے پر اپنا اثر ڈالتا تھا۔ اور کچھ ایسا ہم وزن اثر تھا کہ ایک فریق دوسرے کی شے پرستش کا تخلیہ نہیں کر سکتا تھا۔ چہ جائے کہ کوئی ایک اس امر کی کوشش کرتا کہ وہ بقیہ کو اس معبد سے نکال کر اپنے لیے مختص کرے۔

مکہ کی مرکزیت

اور اسی وجہ سے کہ یہ بہت سے اقوام کا مرکز پرستش تھا۔ لوگوں کا جمع ہونا اور جمع ہوتے رہنا اس امر کی ضرورت پیدا کرتا تھا کہ ان کی آسائش کی چیزیں مُہیا کی جائیں اور اس طرح عرب کا یہ خطہ قدیم زمانہ میں بھی مرکز تجارت ہو جانے کے لیے موزونیت رکھتا تھا۔

دافع کسل اشغال

مذہب اور تجارت یہ دونوں چیزیں جب مختلف حیثیت کے لوگوں کو دور دور دراز مقامات سے کھینچ سکتی تھیں تو یہ تعجب خیز نہ تھا کہ لوگ فرائض مذہبی کی سبکدوشی اور ایک حد تک امورات تجارت کے انہاک کے بعد اس کے متمنی ہوتے ہوں کہ ان کی دافع کسل بھی کوئی شے ہو اور اس کے لیے فصیح خطیب اپنی تقریروں اور شیریں بیان شعرا اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کرتے ہوں۔

ذریعۂ تعلیم

ایسے زمانہ میں جب کہ کسی ملک میں اشغال علمی اور کتابی علم کی ترقی نہ تھی یہ دونوں چیزیں لوگوں کی واقفیت میں اضافہ اور ان کے خصائل کی درستی، حوصلوں کا پیدا کرنا یا قرب و جوار کے رنگ میں رنگنے کا زبردست ذریعہ تھیں۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ عرب کی شاعری زیادہ تر واقعاتی نظم ہوتی تھی۔

امارتِ زبانؑ

اس نے عکاظ اور ذو المجاز کے میلوں کو جو کعبہ کی بدولت مشہور اور پیدا ہوئے تھے ایک بھلی چنگی درس گاہ بنا دیا تھا، جہاں ایک سال کی مختلف خبریں ہر ایک کو پہنچ جاتی تھیں۔ ناممکن تھا کہ ایسا مجمع جہاں فصیح خطیب اور شعرا مجمع ہوں وہ زبان کی امارت میں مدد نہ دے۔ عرب کے ایسے ملک میں جہاں اشیائے آرائش اور دیگر اسباب یا فطری منظر کی اس قدر کمی ہے زبان کے اس درجہ وسیع ہونے کی اور کوئی وجہ بجز کعبہ اور اس کے ضمن میں اس کے میلوں کے علاوہ نہیں بتائی جاسکتی ہے۔

ابرہہ کے حملہ کی غرض

جو کچھ اغراض ہوں یہی ابرہہ کے حملہ کے لیکن جو کچھ ظاہری باتیں آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہیں وہ یہی چاہتا تھا کہ کعبہ کے ڈھا دینے سے لوگوں کا عقیدہ یا اس کا مرکز قائم نہ رہے گا۔ لوگ مجمع نہ ہوں گے۔ یہاں کی تجارت جاتی رہے گی اور یہ لوگ اپنی ضروریات کے لیے دوسرے مقامات کے محتاج ہو جائیں گے اور کوئی عجب نہیں ہے کہ اس نے اس غرض سے کوئی تجارتی مرکز اپنے فائدہ کے لحاظ سے قائم کرنا چاہا ہو۔

عربؑ ہدایت سے بے خبر نہ تھا

اس سے قیاس ہو سکے گا کہ عرب من حیث القوم اور ملک ایسی قوم اور ملک نہ تھا جو مذاہب سے بے خبر ہو۔ وہ خبردار تھا اور دنیا کے مشہور مذاہب ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ مجھے اس سے بحث نہیں ہے کہ کوئی نبی اس کے قبل ان کی سرزمین میں مبعوث ہوا تھا یا نہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ نہ صرف حضرت ابراہیمؑ کی تشریف آوری کے آثار ہیں بلکہ قیاس ہوتا ہے کہ اکثر انبیائے بنی اسرائیل کم سے کم اس کے بعض حصص کی طرف گزرے ہیں۔ اور یہ توپال کے خطوط صاف صاف کہتے ہیں کہ وہ عرب کی سرزمین میں گئے تھے۔

نئے مذہب کے لیے کیا دشواریاں تھیں

چونکہ ہر مذہب کے فقہا اور واقفان مذہب موجود تھے، جیسا تاریخی آثار صاف بتاتے ہیں اور بہ لحاظ اس کے کہ مذہبی پیشوا اپنی روحانی حکومت سے بہ آسانی دست بردار ہونے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے، نہ اکثر اوقات تعصب انھیں دوسرے مذہب کے متعلق آزادی سے کچھ دیکھنے سننے دیتا ہے۔ اس لیے اس حالت نے وہاں کے عقائد کے پلٹنے نہ جاسکنے کے متعلق اور بھی دشواریاں پیدا کی تھیں۔ اور بظاہر ان مشکل حالتوں میں کوئی اور صورت بجز اس کے دکھائی نہ دیتی تھی کہ نہ عرب کا کوئی خاص مذہب ہوتا اور نہ اسے کوئی ایسا صاف قوی مرکز ملتا جس کی تعمیل نہ صرف اعتقادی حیثیت سے مفید ہوتی، بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ وہ بہت سے غیر مفید اوہام سے کنارہ کش ہوتا، اور اسے واضح اور فطری راستہ دیکھنے اور چلنے کی توفیق ہوتی۔

عربؑ کا سیاسی موقع

جو کچھ خوف ہو سکتا تھا وہ یہ تھا کہ عرب کے دو جانب دو عظیم الشان سلطنتیں حکومت کر رہی تھیں اور اگرچہ عرب کے زیادہ تر ریگستانیت نے اس کا قیاس قابل عمل نہ رکھا تھا کہ یہ دونوں حکومتیں ملکی رقابت پر آمادہ ہو کر دو طرف سے دباؤ ڈالیں گی اور عرب ان دو بھاری چکی کے پاٹ میں پس کر رہ جائے گا۔ لیکن تاہم عرب کے زرخیز صوبے محفوظ نہ رہے تھے اور آغازِ اسلام میں یمن کا ایسا صوبہ

باذان کے ماتحت تھا۔ عرب کے سرچشمۂ حیات یعنی دجلہ اور فرات کی زمین شمال میں اگر رومی حکمت کی ماتحتی کے قابل ہو سکتی تھیں تو مغرب اور جنوب کیان ایران کے زیر اثر رہ سکتا تھا۔ جو کچھ اہلِ عرب کے لیے چھوٹا ہوا تھا وہ اس کا صوبہ حجاز تھا، یا صحرائے عرب۔

اس کا اثر

دوسری وجہ کہ کیوں یہ دونوں سلطنتیں ہر ایک عرب کو اپنے زیر اثر رکھنا چاہتیں، نہ صرف موجودہ زمانہ کے لحاظ سے قابل فہم ہے بلکہ اس زمانہ کی تاریخ بھی بتاتی ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک عرب کی سی آزاد اور جنگجو قوم کو زیر اثر رکھنا چاہتا تھا۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ وہ دشمن اور اپنے درمیان ایک زبردست آڑ ہوتی بلکہ اس لیے بھی کہ ان کا اور ان کی جانوں کا میدان جنگ کے لیے خرید لینا بہت آسان تھا۔ اگر اس کے آثار ہیں کہ اکثر شیوخ عرب کسریٰ کے دست نگر تھے تو یہ بھی واضح ہے کہ اہل روم بھی اس منقولہ جائیداد کو اپنی طرف کھینچنے کی فکر سے خالی نہ رہے۔

فرزندِ صحرا مسیحی یا آتش پرست نہ ہوا

یہ صورتیں تھیں کہ عرب کا بجائے یہودی یا عام مفہوم کا بت پرست رہنے کے مسیحی یا آتش پرست ہو جانا آسان تھا۔ لیکن باوجود ان دل کش سامانوں کے حیرت خیز امر یہ ہے کہ یہ دونوں شاہی مذاہب اپنا مذہبی اثر ڈالنے میں ناکامیاب رہے اور فرزندِ صحرا اپنے اس شاخِ خیال میں بھی مطلق العنان رہا۔

سیاحت اور جغرافیائی موقع

عرب اس لحاظ سے بھی کوئی بڑی ناواقف قوم نہ تھا کہ اسے اس کی ضرورتیں مجبور کرتی تھیں کہ اپنے سے زیادہ زرخیز صوبوں میں بغرض تجارت جایا کرے۔ اسے ہر منزل پر سوچنے اور دیکھنے کا کافی وقت ملتا تھا۔ یہاں تک کہ شام، مصر اور یونان کی زمینیں اس کی آنکھ سے پوشیدہ نہ تھیں اور نہ قیصرانِ روم یا خسروانِ ایران کے دربار اور ان کی عظمت ان کے لیے کوئی خواب کا واقعہ تھا۔ قدیم الایام سے اس کے بندر وہ ذریعہ تھے جہاں سے یورپ اور افریقہ میں تبادلۂ اجناس ہوا کرتا تھا۔ اس لیے اگرچہ اسے فطرت سے زرخیزی کا کوئی بڑا حصہ نہ ملا تھا، مگر اس کا موقع ایسا بنایا گیا تھا جہاں سے وہ ریاست عیش اور آرام کی چیزوں کو اپنی نگاہ سے دیکھ سکتا تھا۔

فصاحت کا صرف

یہ تمام حیثیتیں مل جل کر ایسے مواقع پیدا کرتی ہوں گی جہاں ایک قوم اپنی انتہائے فصاحت اور جوشِ ایمانی سے اپنے مقتدایانِ دین کی عمدہ صفات اور محاسن بیان کرتے ہوں اور یہ ذریعہ دوسرے پر اعتقادی فضیلت حاصل کرنے کے لیے موزون سمجھا جاتا ہو۔ اگرچہ عرب میں خانہ جنگیوں کی مثال اور جانوروں کے لیے لڑائیوں کا ہونا معمول سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ امر شاذ ہے کہ ان میں مذہبی مناظروں نے کبھی آپس میں کوئی فساد قائم کیا ہو۔ اگرچہ فتح بیت المقدس کے وقت اہل عرب رومیوں کے مقابلہ میں جنگ کرنے کے لیے بلائے گئے تھے۔ اسی طرح عرب کی فصیح زبان اور فطری شاعری کے جوش کے لحاظ سے یہ معمول سے زیادہ ممکن تھا کہ تمام مذاہب کے اعتقاد اور روایتیں انتہائی مبالغوں سے ہوا میں اڑ رہی ہوں اور معیار تنقید کی طرف سے کاہلانہ تجاہل انھیں ایسی تمام باتوں کو ویسا ہی سچ سمجھاتا ہو جیسا عامہ ناس میں اعتقادی روایتوں کے متعلق عام میلان ہے۔ اور جس میں

روسائے روحانی کی یہ عام روش کہ ان کا قول کبھی تنقید یا شبہ کے حوالہ نہ کیا جائے جس سے ان کی حکومت قلوب میں ضعف پیدا ہو اور ترقی پیدا کرتی جاتی ہے جو روز بروز مذہب کے اصول اصلی کا زوال ہے۔

اخلاقی اصول سے نابلد نہ تھا

عرب اخلاق کے اصول اولیہ سے بھی بے بہرہ نہ تھا، اور نہ صرف ان کی طرف اسے حسنِ ظن تھا بلکہ اس میں پسندیدگی کا حس بھی تھا، اور بہت سی خوبیاں تو گویا اس کے خصائل قومی میں داخل تھیں۔ مہمان نوازی اس کے خاصہ قومی میں داخل تھی۔ ہمسایہ کے حال پر مہربانی اور اس کی خبرگیری نیک آدمیوں کے اوصاف میں شمار ہوتی تھیں، محتاجوں اور بے کسوں کی مدد کرنا تمام نیکیوں میں افضل تھا۔ عزت کا لحاظ اور وعدہ کا خیال رہتا تھا۔ اور حمیت عرب اگرچہ نہایت بے مہار تھی لیکن اسی کی بدولت وہ کبھی کبھی اچھے کام بھی کرجاتا تھا۔ عرب کے اخلاقی حس کے لیے اس سے قوی مثال نہیں دی جاسکتی کہ جاہل اور محدود نظر کی عورتیں بھی اس سے بے بہرہ نہ تھیں جو اس مثال سے ظاہر ہے۔

مثال

جب کہ ہمارا ہادی فتح مکہ کے بعد ہر طبقہ کے لوگوں کو ان کے موافق نصیحت فرما رہا تھا اور ابوسفیان کی بی بی ہندہ عصمت کے متعلق حکم سن کر کہتی ہے کہ: "محمدؐ ہمیں نہیں سکھاتے مگر اخلاقِ حسنہ"۔ یا کہتی کہ: "ہم تم سے غرور اور فریب میں تھے"۔

جعفر بن ابی طالبؑ کے قبل الاسلام خصائل اور رسولؐ کا اعترافؐ

اس میں اخلاقی قوی حس ہونا اس واقعہ سے بھی ظاہر ہے کہ جعفر بن ابی طالب قبل اسلام سے ان صفات سے ممیز تھے کہ انھوں نے زنا نہیں کی، شراب نہیں پی، بت پرستی نہیں کی اور جھوٹ نہیں بولے۔ اور یہ صفات پروری تھی شارع اسلام کی کہ وہ عام مجمع میں بلائے جاتے ہیں، ان کی ان صفات کا اعتراف کیا جاتا ہے اور ان سے ان عیوب سے احتراز کی وجہ پوچھی جاتی ہے۔ جعفر کہتے ہیں میں نے شراب اس لیے نہیں پی کہ اس سے عقل زائل ہوجاتی ہے، جھوٹ نہیں بولا اس لیے کہ دروغ گوئی مردانگی اور مروت کم کرتی ہے، کسی کی حرمت سے زنا نہیں کی، اس لیے کہ اگر میں زنا کروں گا تو دوسرا میری حرمت سے زنا کرے گا۔ کبھی بت نہیں پوجا اس لیے کہ اس سے کوئی نفع یا ضرر نہ تھا۔

رسولؐ کے متعلق شکایت کا جوابؐ

اور اسی طرح جب حضرت ابی طالب سے لوگ ہادی عالم کی شکایت کرتے ہیں تو وہ جواب دیتے ہیں کہ: "محمدؐ حسن خلق ہی تو تعلیم کرتے ہیں"۔

عربؐ کا خاصہ

متذکرہ صدر مثالیں بتائیں گی کہ عرب اپنی واقفیت اصول اخلاق میں بے بہرہ نہ تھا، بلکہ اس لیے ممتاز تھا کہ اس میں یہ باتیں ایک خاصہ طبعی ہوگئی تھیں، درآنحالیکہ وہ ممالک جن میں کتابی علم ترقی پر ہو الفاظ، لغت، تعریف کی کمی یا زیادتی وغیرہ وغیرہ پر دماغ سوزی اور وقت صرف کرتے ہوں گے۔ اسی طرح عرب اپنی ترقی عقلی میں بھی ایسا نہ تھا کہ اس کا ان اقوام سے مقابلہ کیا جاسکے جنھیں اپنی معاشرت اپنے حقوق اور اپنے پس و پیش کا اِدراک نہیں ہے۔

نظامِ حکومت

اگرچہ اس میں قبیلہ بندی تھی مگر اکثر اوقات ایک بڑے قبیلہ کی بہت سی شاخیں ہوجاتی تھیں اور اگرچہ اس طرح ان کی قوت تقسیم ہوتی تھی لیکن یہ قبول کرنے کے قابل نہیں ہے کہ وہ قومی مواقع پر تمام قبائل کے سرداروں یا شیوخ سے اِستصواب نہ کرتے ہوں اور نہ ایسا تھا کہ ہمیشہ ایک تیغ دوسرے سے برسرِ پرخاش یا زبانی جنگا جنگی ہی کرتا ہو۔ بلکہ مثالیں ہیں جہاں وہ مل کر بھی کام کرتے تھے۔ شیوخ کو طلب کرتے تھے اور آپس کی مشورت سے ایک بات طے ہوتی تھی۔ ان کی یہ طے شدہ بات عموماً ان کے نقطۂ خیال کے لحاظ سے عمدہ تصفیہ ہوتی تھی اور دوسری بے اِنتہا مفید بات یہ تھی کہ اس کی ناکامی کی صورت میں وہ اِلزام کسے دے سکتے تھے درآنحالیکہ وہ کام جس کے عمل میں ناکامی ہوئی ایک قومی تصفیہ تھا، اس لیے اس کے اچھے یا برے نتیجہ کی تمام قوم اور اس کے فرد ذمہ دار تھے۔

ایک مفید حالت

اور اسی طرح دوسری ایک اور اچھی بات یہ تھی کہ وہ اپنے قومی سرداروں کے حکم پر عمل کرنا جانتا تھا۔ اور اس صورت میں وہ ان قومی مجموں سے اچھا تھا جن کا نام قومی مجمع ہو۔ لیکن ہر شخص اختلاف رائے سے مجمع کو تراش رہا ہو۔ عرب کے نزدیک ایسے سو سقراط سے جو کسی شے کی کامل تعریف پر جمع نہ ہو سکیں ایسے تھوڑے سے جاہل اچھے تھے جو بغیر چوں وچرا کے اپنے سردار کا حکم مانیں اور اس کی اِطاعت کریں۔

یہ سب باتیں جو اب تک کہی گئی ہیں اس بات کے دکھانے کے لیے ہیں کہ اب کسی نبی کی بعثت کے لیے کس قدر دشواریاں پیدا ہوگئی تھیں۔ لوگ بڑی باتوں میں ناواقف نہ تھے۔ مذاہب تھے، اخلاق تھا، مدنیت تھی، اغراض سیاست اور ان کے نتائج سے واقف تھے، تجارت تھی، نفع اور ضرر کا حس تھا۔ اور ان تمام قوموں کے مذاہب کا ایک دوسرے پر ایسا دباؤ تھا کہ جس سے نہ صرف کسی نئے مداخل کے لیے دشواریاں بڑھتی جاتی تھیں بلکہ وہ سب آپس میں بھی کھسک نہ سکتے تھے۔ کسی کا ہمت کرنا لوگوں کی نگاہ میں اور کس جواب کا مستحق ہوسکتا تھا۔ بجز اس کے کہ لوگ اس پر ہنسیں، خاموش ہوجائیں یا اس پر تعجب کریں کہ یہ کون ہے جو ایک تھمی ہوئی حالت میں متنفرانہ ہیجان کا باعث اور اس لیے اپنی مخالفت پر لوگوں کو کمربستہ کر رہا ہے۔ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ جب ملک اور اس کی دل فریب اشیا سے جلوبندہ زر عرب یا عرب کی موجودہ گردوپیش پر کوئی اثر نہ ڈال سکتا تھا تو وہ کونسا ذریعہ تھا جو لوگوں کو اپنی طرف راغب کرتا۔ کام ایسے قصہ خوان مقرر کا نہ تھا جو چند سیکھی ہوئی باتوں کو جسے اور لوگ بھی جانتے ہوتے لوگوں کے بھرے ہوئے کانوں کے حوالہ کرتا یا کہتا جاتا جب تک کہ اسے کہنا ہوتا اور اس کے بعد تھکتا، بیٹھ جاتا، اس کے الفاظ اور ان کی ہوا جبالِ عرب سے ٹکرا کر چور ہوتی یا ریگستانی ہوا اسے خاک کے نیچے اس طرح دباتی کہ وہ اونٹ کے قد سے زیادہ گہری دفن ہوجاتی۔ اس کے الفاظ کے پہلے اس کا جوش صرف ہوجاتا اور اب بجائے اس کے کہ وہ دوسرے کو کچھ سکھائے خود سیکھنے اور قبل اس کے کہ وہ دوسروں میں جوش پیدا کرے اپنے میں جوش اور اِستقلال پیدا کرنے کے لیے تیار ہوتا۔

عرب کا دوسرا رُخ

اب تک عرب کی تصویر کا ایک رخ تھا جو ناظر نے دیکھا، اس کے علاوہ ایک دوسرا رخ بھی تھا۔ عرب سب سے زیادہ غیر مستقل مزاج شخص تھا۔ اس کی سیماب خصالی ایک مشہور چیز ہے۔ اور اس کی حمیت جو کسی وقت جدلیں کی عزت کے لیے اِنتقام پر آمادہ ہوسکتی تھی۔ ایسے حرکات بھی سرزد کرا سکتی تھی جسے رحم، اِنسانیت اور انصاف سے کوئی تعلق نہ ہو۔

عرب کے لیے کسی مصلح کا کامیاب ہونا نبی عربیؐ کے قبل ناممکن القیاس تھا

اس کے جوش کی تربیت کرنا اور اس کا معتدل مصرف نکالنا ایسے نفس شناس اور ایسے تربیت پرور کا کام ہوتا جو آغاز اسلام کے قبل ایسی چیز نہ تھا جس کے متعلق خیال کرنے کی بھی کوئی جرات کرتا اور اگرچہ عرب میں وہ خوبیاں تھیں جن کا ذکر کیا گیا اور وہ طبعی صفات تھیں جن سے کام نکالا جاسکتا تھا لیکن اس کا طغیان، اس کا سیلابی جوش اس کی خونخواری اور برائیوں میں انہماک ایسی ظاہری چیزیں تھیں جسے دیکھ کر "کام نکالا جاسکتا" تیز سے تیز عقل والے مدبر، حلیم سے حلیم نبی اور اعلیٰ سے اعلیٰ مدرس اخلاق کے نزدیک حباب کو کوہ ابوقبیس پر دیدہ و دانستہ چور ہونے کے لیے دے مارتا تھا۔

عربؑ اچھے سے زیادہ بُرا تھا

پڑھو ابن خلدون وغیرہ یا ڈیون پورٹ کا مختصر رسالہ "مراسم العرب قبل الاسلام" تو تمھیں معلوم ہوگا کہ عرب اپنی تصویر کے اس رُخ میں کیسا بھیانک تھا۔ اس سے کہیں زیادہ جس قدر وہ ایک رُخ سے اچھا ہوسکتا تھا۔

خسرو پرویز کے لیے بلحاظ عربؑ ہونے کے نبی عربیؐ کا درجہ دفعۃً سمجھ جانا محال تھا

وہی جنھیں خسرو پرویز صحرائی، سوسمار خوار، وحشی وغیرہ کہہ سکتا تھا۔ جب کہ اس کے پاس نبی عربیؐ کا دعوت اسلام کے لیے نوشتہ پہنچتا ہے حق تو یہ ہے کہ وہ دفعۃً کیسے سمجھ جاتا کہ یہ اس کا فرمان ہے جو نہ صرف عرب کے تمام حیثیتوں سے مجموعہ صفات اچھا ہے، بلکہ افضل اور اکمل عقول عالم ہے۔ جب کہ تیرہ سو برس کے بڑے وقتوں ایسے بہت سے دماغ نہیں پیدا کیے جو اسے سمجھتے، اور حقیقت تو یہ ہے کہ ایک شخص میں مبدءِ فیض سے سمجھنے کے وہ عناصر جمع ہوجانا اس کا خود عالم کے ممتاز نفوس میں بلند ہوجاتا ہے۔ مثلاً کسی کا ایسے اسباب میں پرورش پانا کہ وہ تقلیدی حیثیت کی اکثر اوقات راہ سے ہٹانے والی روش سے ہٹ کر عالم اور اس کے قوانین کو خود سے سوچے، اور اس میں غلطی نہ کرے۔ مثلاً:

نبیؐ عربی کو سمجھنے کی دشواریاں

ایسا سوچنا اسے برابر راہِ معارف پر اس طرح چلائے کہ اس کی عقل برابر ترقی کرتی رہے اور آئندہ غلطیوں کے خوف سے محفوظ ہونے کی حد تک پہنچ جائے۔ مثلاً اس کی قابلیتیں اسے خاصہ اور طبائع انسانی کو اسی طرح سمجھائیں جو آخر میں عین واقعہ بھی جائیں اگرچہ اس نے قیافہ اور بشرہ میں کوئی کتاب یا علم نفس کے دفتروں میں سے کوئی ورق نہ پڑھا ہو، مگر اس کی آنکھیں اس طرح سمجھ لیتی ہوں جس طرح اس نے انھیں اس وقت سمجھا ہے جس وقت یہ اشیاء عمل کے لیے متحرک تھیں۔ مثلاً اس میں برائیوں کی طرف سے ایک ایسا طبعی تنفر پیدا کیا گیا ہو کہ اسے دوسروں میں برائیوں کی بو بھی معلوم نہ ہوتی ہو چہ جائے کہ اپنے میں یہ میل گوارا کرسکے۔ مثلاً وہ اس درجہ صاف اور ستھرے ہوئے خیال کا ہو جو غلطیوں میں الجھتا ہی نہیں بلکہ وہ جاتا ہی ادھر ہے جسے ایک مجمع یا زمانہ کا ایک جز یا وقت کا کچھ حصہ یا جماعت انسانی اپنی فطری روش میں عرصہ کے بعد سوچتی ہے یا جسے اس درجہ اخذ نتائج میں ملکہ حاصل ہوگیا ہے کہ وہ اس اساسہ کو جو عالم کے خیال نے الجھا ہوا چھوڑا تھا، اپنا کرلے اور اس سے

وہ ممتاز اور روشن نتیجہ نکال لے جس سے پیشتر کی عقول عاجز تھیں یا انھیں اس نتیجہ پر پہنچنے کی جرأت نہ تھی، یا وہ اس طرح اپنے خاصہ طبعی کے نمو میں تیار ہو گیا ہو کہ اپنے خیال کا اپنے لفظوں میں مجسمہ بن گیا ہو، اور ان باتوں نے اس میں وہ اثر، وہ وقار، اور وہ شان پیدا کی ہو کہ کیسا ہی نفس ہو مگر اپنے اوپر ذات اور کلام کا اثر دیکھتا ہے، کیسا ہی ناشنو ہو مگر وہ اپنے تمام ناشنوی میں اپنے کو اس کی طرف کھنچتا ہوا دیکھتا ہے۔ یہ سب وہ نورانی عقل ہو۔ غلطیوں سے محفوظ ہوتا ہو، وزنی ذات ہو یا اس کا حیرت خیز اثر۔ کسی طرح شاعری نہیں ہے۔ بلکہ اس حد تک بھی جن میں مبالغہ ممکن نہ ہو کسی طرح حدود شاعری سے ادنیٰ مس نہیں رکھتا۔

عرب کی فصاحت اگرچہ اپنے عمدہ مصرف میں قابل تعریف تھی لیکن دولت مندوں کی لڑکیوں اور عورتوں کی عزت ان کی مقتول تھی۔ بدکاری اور زناکاری اس کے لیے ندامت کی چیز نہ تھی، اور قدیم اسرائیلیوں کا یہ ورثہ ان تک پہنچا تھا کہ اپنے باپ کی حرم پر متصرف ہو جائیں۔ یعنی سوتیلی ماں ان پر حرام نہ تھی۔ بے گناہ لڑکیوں کا قتل ان کی جاہلانہ حمیت کے مقابلہ میں کوئی بری چیز نہ تھا بلکہ اگر ان کی اونٹنی یا بکری پانچویں مرتبہ مادہ جنتی تو اسے بھی کان کاٹ کر چھوڑ دیتے تھے۔ کسی اجنبی کے گھر میں بغیر اجازت دورانہ گھس جانا عیب میں داخل نہ تھا، اور کعبہ میں برہنہ حج کرتے تھے۔ ان کے نزدیک مردہ جانوروں کا گوشت نہایت لذیذ ہوتا تھا۔ شراب اور نشی چیزوں کا استعمال مدہوشی کے عالم میں اس سے معیوب باتیں سرزد کراتا تھا، اور قمار بازی بلا استثنا ہر دلعزیز کھیل تھا، لونڈیاں گانا بجانا سکھائی جاتی تھیں، وہ حرام کاری کی مجاز تھیں اور یہ آمدنی آقا کے تصرف میں آتی تھی۔ رہزنی اور غارت گری انتہائی حد کو پہنچی تھی۔ ٹوٹکے اور شگون کا اعتقاد کرتے تھے اور جانوروں کے اڑنے سے فال لیتے تھے۔ انھیں اعتقاد تھا کہ اگر انتقام خون نہ لیا گیا تو مقتول کے سر میں ایک چھوٹا پرند اور کیڑا پیدا ہو کر آسمان میں چیختا پھرتا ہے۔ کسی کا مرجانا اس کے اونٹ کی قضا تھی۔ اس لیے کہ وہ قبر میں باندھ دیا جاتا تھا۔ قحط اور گرانی میں اونٹوں کو مجروح کر کے اس کا خون پیتے تھے۔ اور گائے کی دم میں سوکھی گھانس اور چھریاں باندھ کر پہاڑوں میں چھوڑ دیتے تھے اور اس کے بعد پانی برسنے کے امیدوار رہتے تھے۔

کیا چاہیے تھا

لیکن جو بات نہایت ضروری تھی وہ یہ نہ تھی کہ سب کے پہلے عرب سے ٹوٹکے یا شگون کا عقیدہ دور کیا جاتا، یا اسے لطافت تہذیب سکھائی جاتی۔ یہ زمانہ کا کام تھا۔ پہلے اسے ایسی تعلیم اور اصول کی ضرورت تھی جو اس کے لیے ایک فطری مرکز ہوتا، اس سے محبت اور خلوص بڑھتا جاتا، وہ شرافت اور صدق وصفا کا قلعہ سمجھا جاتا، اور یہ نمونہ انھیں اپنی فطری روش سے بلند کرتا، اور یہ چڑھائی خود بخود نفس کے باعث ذلت افعال سے اپنے میں متنفر رینگتا ہوا دیکھتی۔ سب کے پہلے نہ صرف عرب بلکہ عالم کو خدائے واحد چاہیے تھا۔ ایسا خدا نہیں جو خداؤں میں بڑا خدا ہو۔ یا وہ کئی اور سے مل کر ایک معجون بن گیا ہو، یا گوشت اور خون میں اوتار ہو، یا نیکی اور بدی کے الگ الگ خدا ہوں۔ جو باپ کے گناہ کا عوض بے گناہ پشتوں سے لیا کرتا ہو، یا جس نے مخلوقات کو خود ہی گناہگار پیدا کیا ہو اور پھر انھیں پر اپنے انصاف کی قوت بھی آزمائے۔ یا جس نے شفاعت ناس کے لیے عام اس سے کہ وہ حدود الٰہی پر چلتے ہوں یا نہ ہوں، درمیانی آدمی رکھا ہو، اور اسے بخشوانے کے اسے اختیارات تفویض کر دیے گئے ہوں کہ خود اختیار بخشنے والے

کے اختیارات مداخلت کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ ضرورت تھی کہ وہ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ (۳ : ۱۸۲) (اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا) ہو۔ اور مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (۲ : ۲۵۵) (کون ہے کہ اس کی اجازت بغیر شفاعت خواہ ہو) کا اختیار اس سے ساقط نہ ہو گیا ہو۔ ضرورت تھی کہ اس کے علاوہ دنیا میں کوئی خدا نہ ہو۔ وہ خالق ہو اور سب مخلوق ہوں۔ یہ نہ ہو کہ وہی خالق بھی ہے وہی مخلوق بھی ہے۔ اور ایک عجب لیھڑ دھوں دھوں کارخانہ ہے کہ نہ قاتل قاتل ہے نہ مقتول مقتول۔ نہ حاکم حاکم ہے نہ محکوم محکوم۔ سب ایک ہیں، درآنحالیکہ ہر ایک اپنے کو متضاد حالتوں میں پا رہا ہے۔ یہ نہ ہو کہ خدا انسانی صفت کا نمونہ ہو بلکہ خدا کی صفت اور قدرت تمام اشیائے عالم میں ظاہر ہوں اور اپنی زبان سے اپنے صانع کی حکمت وقدرت کی ثنا کرتی ہوں۔ ضرورت تھی کہ وہی مرکزِ صفات ہو، اس کی صفت عین ذات ہو بلکہ کمال الاخلاص لہ نفی الصفات عنہ ہو۔ ترقی اخلاق نے اسے نہ بنایا ہو بلکہ عالم کے تجربہ اخلاقی میں وہ ظاہر ہوا ہو۔ وہ اخلاق کا خزانہ ہو نہ یہ کہ اخلاق اس کی زینت ہو۔ اخلاق کو اس کی طرف نسبت دیے جانے سے افتخار ہو، نہ یہ کہ اخلاق سے نسبت دیے جانے سے اس کی کوئی وقعت بڑھ جائے۔

سوچو عالم کے مذاہب کے خدا کو۔ سوچو ہر طرح کے شرک کو۔ سوچو وحدت وجود کو۔ سوچو خود پرستی کو اور پھر اس کے بعد غور کرو اس حیرت خیز مختصر فقرہ کو جسے ہم عالم کے تصفیۂ توحید پر ترقی کہتے ہیں کہ "لا الٰہ الا اللّٰہ"۔ اس "لا" اور "الا" میں نہیں دکھائی دیتی کوئی بات مگر یہ کہ اس کا کہنے والا عالم کے اس وقت کے اصول توحید پر پورا حاوی تھا اور جس توحید پر زمانہ حال کا فلسفہ اور سائنس کوئی ترقی کی قلعی نہیں کر سکا۔ یہ صاف، شفاف، سیدھا مختصر، شرک کش، شبہ شکن جملہ تمام پیشتر کے اوہام اور الجھنوں کو جڑ سے کاٹ رہا تھا۔ یہ دہریت اور مادیت کی خاک کو ہوا میں اڑا رہا تھا۔ یہ اللّٰہ تعول رسولؐ کے سب سے بڑے شاگرد کے وہ تھا جس کی طرف انسان اس وقت متوجہ ہوتا ہے جس وقت اسے ہر طرف سے مایوسی ہوتی ہے اور تمام امیدیں قطع ہو جاتی ہیں۔ یہی انسان کی آخری پناہ قرار دی گئی تھی۔

لیکن اس جگہ ایک عقدہ مالاینحل یہ پیش ہوتا ہے کہ کہیے :

یتیمے کہ نا کردہ قرآں درست کتب خانۂ چند ملت بشست

نبی عربی کیونکر ایسے ہوئے

کوئی کہتا ہے کہ جس وقت نبی عربی "محمد بن عبداللّٰہ" کی حیثیت سے بارہ تیرہ برس کے سن میں شام گئے تھے اور نسطورا راہب سے جو کچھ باتیں ابوطالب سے ہوئی تھیں وہی اصل میں وہ بنیاد ہوئیں جنھوں نے آخر میں انھیں اس بڑے منصب کے لیے تیار کیا، اور یہ اس لیے کہا گیا ہے کہ حقیقتاً حضرت عیسیٰؑ کی یہی ابتداء ہوئی، جنھیں بپتسمہ دینے والے یوحنا نے بپتسمہ دیا، اور جس کی تقریر اور جوش نے ابن مریمؑ کو متوجہ کیا۔ کوئی مثل سر ولیم میور رسولؐ کی تعلیم، مذاہب کے لیے قیاسات کی حیرت انگیز قوت سے اس لوگوں کو لاتا ہے جو لڑکپن میں قید ہو گئے تھے اور ہوتے ہواتے کسی طرح مکہ مدینہ پہنچ گئے اور مسلمان ہوئے۔ کبھی کسی پادری سے کہیں وعظ کہلوا دیا ہے، وہ کسی زمانہ میں کیوں نہ ہو اور رسولؐ نے سنا ہو یا نہ سنا ہو لیکن مسیحی مؤرخین کے موافق رسولؐ کی تعلیم کے لیے ایک ذریعہ ہو گیا۔ اور پھر بھی یہ مذاہب اس قابل ثابت نہ ہو سکے کہ وہ ان پر کوئی اثر کرتے۔ دوسرا خود ہی کہتا ہے کہ نسطورا کی زبان دوسری تھی وہ عبرانی ہو یا ارامایک۔ اگر یہی ہے تو تصفیہ کرنا

پڑے گا کہ رسولؐ اس معصومانہ سن میں یہ زبانیں سیکھ چکے تھے کس سے سیکھی تھی۔ مکہ میں کیا کوئی مدرسہ الٰہیات یا مدرسہ السنہ عالم تھا۔ اس کے پروفیسر کون تھے۔ انھیں عبدالمطلب یا ابوطالب کیا تنخواہ دیتے تھے۔ وہ مدرسہ اب کہاں ہے۔ اس کے کھنڈر کچھ باقی ہیں یا بالو سے دب گئے اور پھر یورپ کے تمام ارکیولوجیکل سوسائٹی میں سے کسی نے اسے کھود نکالنے کی کوشش نہ کی۔ شاید کوئی کتاب نکلتی اور عالم کی معلومات میں اضافہ کرتی۔

دُوسرا کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ: نبیؐ عربی کی معلومات شام میں اپنے شباب کے سفر سے ہوئی، اور وہیں انھوں نے توریت اور انجیل کا مطالعہ کیا۔ لیکن تعصب کے گہرے پردہ نے یہ سوچنے نہ دیا کہ مذاہب کا مطالعہ وہ کھیل نہ تھا جو راستے زمانہ میں کھیلا جائے۔ جس میں کوئی شخص اپنی اشیائے تجارت فروخت کرے، درآنحالیکہ وہ امی ہو۔ بحث طلب مفید نکات نوٹ نہ کر سکتا ہو، اس کی مسل مرتب نہ کر سکتا ہو اور پھر یکساں مضمون کو تنقید کے لیے اپنی نگاہ کے سامنے نہ رکھ سکتا ہو۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ اس وقت میکسمولر کی کتاب "مشرق کے مقدس مذاہب" بن گئی تھی یا مسیحی سوسائٹیوں کے چھوٹے چھوٹے رسالے عرب اور شام میں شائع ہوگئے تھے جس سے مدد لی جاسکتی۔ یا دبستان المذاہب وغیرہ ایران سے تصنیف ہو کر آگئی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ سمجھنے کا ثبوت بھی ہو کہ اس تئیس چوبیس برس کے سن میں محمدؐ عربی کو ایک مذہب کے قائم کرنے کا خیال بھی ہو جو چالیس برس کے سن میں پختہ ہوا اور یہ اسی وقت سے اپنی بعثت اور دعویٰ کے وقت تک برابر ایک مصنف کی طرح مضامین کے پھول چن چن کر گلدستہ بنا رہے تھے اور اس شہد کی مکھی کی طرح بے کسل کوشش کر رہے تھے جو اڑے بیٹھے یا بھنبھنائے مگر اسے صرف یہی خیال ہے کہ کیونکر اپنا چھتا بنائے۔

نبیؐ عربی کیا کیا تھے

وہ مواد کہاں تھا جس پر رسولؐ عربی سوچتے اور یہ تمام باتیں ان کے دماغ میں جمع رہتیں اور بلا سہو۔ کامل حیثیت سے۔ بلا اشتباہ اس وقت نکل آتیں جس وقت ضرورت کہتی کہ یہی بہترین موقع ہے۔ پھر وہ ایک وقت عالم مذاہب ہوتے، دوسرے وقت پیطر اعظم اور نیپولین یا والٹاسر کی تعریف کے قابل مدبر اور مقنّن ہوتے، تیسرے وقت ان کا نفس انبیائے گزشتہ کا افتخار ہوتا، اور چوتھے وقت وہ ایسے فصیح و بلیغ ہوتے کہ عرب کے افصح الفصحاء سبعہ معلقہ کو کیڑوں کے کھانے کے لیے چھوڑ دیتے۔ اور علیٰ ہذا القیاس وہ ایک وقت ایسے شجاع ہوتے کہ علیؑ کا ایسا مستند شجاع عالم یہ کہہ سکتا کہ انتہائے خطرہ کے وقت ہم لوگ رسولؐ کے پاس پناہ لیتے تھے یا وہ ایسا سپہ سالار ہوتا کہ جو عبداللہ بن جبیر کو پیشتر سے ایسے درہ کی محافظت کے لیے مقرر کرتا جس سے خوف ہو سکتا تھا، اور آخر میں محافظین کی لاپروائی سے دشمن کا موقع کو غنیمت سمجھنا اس کے اندازہ کرنے والی سمجھ کا ثبوت ہوتا۔ کبھی وہ ایسا جامع قوم ہوتا کہ افراد کو قبیلہ، قبیلہ کو ایک قوم اور عالم کی قوموں کو جو بہت سی حیثیتوں سے مختلف تھیں ایسی بنیاد پر کھڑا کرتا جسے دھوپ، بارش، زمانہ اور اسی طرح کمزور کرنے والی چیزیں کمزور نہیں کر سکتیں۔ اور جس کی حد بندی کو صحرائے عرب کا سب سے بڑا طوفان کسی طرح ہٹا نہیں سکتا۔ ایک لطف، ایک برادرانہ محبت، ایک جذبۂ شوق، ایک پر کیفیت تھراہٹ، اہلِ اسلام کے دلوں میں پیدا کر دیتا جس کے احساس اور شیریں نغمہ پر مخالفتوں کے مہیب قرنا اور طبل کی صدا غالب نہیں آسکتی۔

قبل بعثت اس کا کوئی اشارہ نہیں ہے کہ انھوں نے آئندہ دعویٰ نبوت کا اعلان کیا

کہیں کتب تاریخ میں اس کا ثبوت نہیں ہے کہ نبی عربی نے اپنی بعثت کے ایک دن قبل بھی یہ دعویٰ کیا ہو کہ وہ نبی ہونے والے ہیں۔ چہ جائے کہ انھوں نے بارہ برس کے معصومانہ زمانہ، یا چوبیس برس کی عمر میں اس کا کوئی اِشارہ کیا ہو۔ لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ تمام ملک، تمام مرکز جماعت، تمام صحبتیں، اور فضا اس صدا سے رچی ہوئی تھیں کہ ایک نبی پیدا ہونے والا ہے، اور اس "نبی پیدا ہونے والا ہے" کے فقرہ میں دل کی گہری سے گہری تہ کی یہ خواہش ظاہر ہو رہی تھی کہ "ایک نبی کی ضرورت ہے"۔

کس پر نگاہیں اٹھتی تھیں

اور انھی دو فقروں کے بعد جب نگاہ اس بات کو ٹٹولتی ہے کہ آخر لوگ کس میں اپنے اس خیال کے آثار کو پاتے تھے۔ کہاں ان کی نگاہیں ٹھہرتی تھیں، تو یہ بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ یتیم عبد اللہ کی ذات تھی جو اکثر حیثیتوں سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی تھی۔

آثار

اس کے آثار ہیں کہ عرب اپنی مذکورہ حالت میں سوچ رہا تھا کہ ایک ہادی کی ضرورت ہے اور اگرچہ یہ کہنا موازنہ کے لحاظ سے دشوار ہے کہ آیا عرب کی یہ امید شدت میں ویسی ہی تھی جیسے یہود کا "زمانہ آمد مسیح" تھا۔ لیکن بہت کچھ یہ امید ایسی واضح ہو چلی تھی کہ اس کا تشخص یتیم عبد اللہ کی ذات میں ہونے لگا تھا۔ عرب کی جہانگرد نظر ہو، یا نسطورا راہب کی ایک صدی پرانی نگاہ۔ یہ دونوں اس خاموش بولتی ہوئی سایہ فگن روح میں کچھ پاتی تھیں اور جس جس طرح تجربہ ہوتا جاتا تھا ان کی وقعت بڑھتی جاتی تھی۔ نسطورا کا یہ فقرہ اب تک محفوظ ہے کہ "اسے یہود سے بچانا"۔ کیوں کیا اس لیے کہ ایک زمانہ تک مسیحیوں میں یہ خیال تھا کہ یہود دوسری قوموں کے بچوں کو اپنے سینا گوگ میں ذبح کر ڈالتے ہیں؟ لیکن تخصیص کیا تھی یتیم عبد اللہ سے۔ یہ کوئی موقع نہ تھا جہاں نسطورا یہود اور مسیحیوں کی مشہور عداوت کے لحاظ سے اس کا موقع دیکھتا کہ عربوں میں یہودیوں کی عداوت کا ہیجان پیدا کیا جائے۔ اسی طرح بوڑھے ورقہ کا یہ فقرہ ابتدائی زمانہ کا پر غور لحاظ بتاتا ہے کہ "میں کسی کو محمد بن عبد اللہ سے زیادہ نبوت کے قابل نہیں پاتا"۔ اسی طرح اوائل عمر سے طبیعتوں پر گہرے اور دل کش اثر کا یقین اس وفد سے ہوتا ہے جب کہ سرداران قریش انسان کی تین بڑی کمزوری کو ابن عبد اللہ میں تلاش کرنے اور اس کا علاج کرنے آئے تھے اور انھوں نے اپنے بھتیجے کی عمدہ صفات کا اقرار کیا تھا۔ اور اسی طرح بہت کچھ کہتی ہے یہ حالت کہ جو "دیکھتا تھا فریفتہ ہو جاتا تھا"۔

ہر وقت کے دیکھنے والے زیادہ متاثر تھے

ہر وقت کے دیکھنے والوں میں بجائے اس کے کہ اپنے اس مرکز نگاہ اہل وطن کی وقعت کے متعلق تجاہل یا کمی پیدا ہو روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ وہ دیکھتے تھے کہ اس میں سے خوش خلقی اور محبت ٹپکی پڑتی ہے۔ وہ اس میں تربیت کے اعلیٰ آثار پاتے تھے۔ وہ اپنی عقل کو اس کی تبعیت پر مجبور دیکھتے تھے۔ وہ اس میں ایک عظمت پاتے تھے جس کے سامنے ادب سے دبے جاتے تھے۔ اگرچہ وہ سن میں کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں۔ وہ اسے ایک ابر دیکھتے تھے جس کی خوشگوار بوندیں عالمگیر ہوتی جاتی ہیں۔

طفلی میں وجہ خلقت کا اشارہ

جی چاہے گا اس بچہ کی زیارت کو جو بچوں میں کھڑا ہے لیکن یہ کہہ رہا ہے کہ: "انسان لہو و لعب کے لیے خلق نہیں ہوا ہے بلکہ اس سے بہتر افعال کے لیے پیدا کیا گیا ہے"۔ جس کی قرآن سے آگے چل کر وضاحت ہوئی کہ: "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ" (۵۱ : ۵۶) یا حضرت امام حسن عسکریؑ غرض خلقت انسانی، علم اور عبادت کے لیے فرماتے۔ غور کرو تو اس کی صورت تمہاری آنکھوں میں پھر جائے گی جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ: "اندو ہش پیوستہ وفکرش دائم"۔

بعض حالتیں اور شغل

وہی جس کے دل پسند افعال میں بچوں کو دیکھ کر مسکرا دینا انھیں سلام کرنا اور غلاموں کے ساتھ کھانا داخل تھا۔ وہ جسے بھلا معلوم ہوتا تھا کہ سال کا ایک مہینہ ایسی جگہ بسر کرے جہاں اہل عالم کی نظر اس کے اعضا میں نہ چبھے۔ اس کے کان دنیا کی صداؤں سے خالی رہیں۔ اس کے خیال پریشان نہ ہوں۔ وہ ادھر متوجہ ہو جدھر وہ چاہے۔ وہ اپنا آپ مالک ہو۔ عالم اور اہل عالم کی بے شمار چیزیں اسے خواہ مخواہ ہر طرف دوڑاتی نہ پھریں۔ وہ جس نے باب بنی شیبہ کو اپنی یادگار داخلہ اور نصب حجر اسود سے عربوں کا در امید بنا دیا۔ عرب سمجھے کہ ہم من حیث القوم جس امر کو طے نہ کر سکے اسے ایک نوجوان کی عقل نے اس محبت اور خاکساری سے فیصل کر دیا کہ گویا اس کے نزدیک یہ کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی جس پر افتخار کا خیال بھی کرتا، اور اپنی افضلیت کے اظہار سے کوئی ناگوار باور کہتا۔ وہ دل کے لیے چھوڑ تا تھا۔ وہ مثالوں سے اپنی فضیلت کا احساس کراتا جاتا تھا۔ اس کے لیے کوئی ادعائے بزرگی جو خودستائی کی کیسی ہی لطیف حد میں ہو شریفانہ کنارہ کشی کے لائق تھا۔ وہ ضرور آگے چل کر "خود" کے قابل پذیرائی اور اثر بخش شان پر لوگوں کو ان کے لیے متوجہ کرتا تھا۔ یہ بلند مفہوم ہر اعتراض سے بالاتر اور سخت سے سخت تنقید کا مقابلہ کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ یہ اس کا قصور نہ تھا کہ وہ دوسروں کو ایسا نہ پاتا تھا جنھیں نمونہ اور مرکز بنا سکے۔ لیکن وہ "منی اہل البیت" کہنے میں کافی سخاوت سے کام لیتا تھا۔ جب اس کا شایان پاتا تھا اگرچہ وہ جسے مردم شناس کی نگاہ نے یہ افتخار بخشا۔ حبشی غلام کے پر طنز فقرات سے کیوں نہ یاد کیا جاتا ہو۔ اور وہ حبشی جرأت اور خوش پسندی کی اس حد تک آ گیا ہو کہ تمام طنز اور جاہلانہ نسبی افتخار کو یہ کہہ کر جھاڑ دے کہ: "میں فرزند اسلام ہوں"۔

قبل نبوتؐ احسان

نصب حجر اسود کے تصفیہ کا احسان اس قابل تھا کہ عرب ہمیشہ کے لیے اس دن کو یادگار دن قرار دیتے جب کہ ان کی نیاموں میں ان کی تلواروں کو اپنی گود میں رکھ سکیں، ورنہ ظاہر ہے کہ ایسی لڑائی کیا کچھ کر سکتی تھی جس میں ایک پر ایک نہیں ہے بلکہ ہر شخص کی تلوار ہر شخص کی گردن پر ہے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اگر اس آئندہ کے مصلح بنی آدم اور لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ (۲ : ۱۱) کے حقیقی نقیب نے ان کی مدد نہ کی ہوتی، تو کب تک وہ درندوں کی طرح ایک دوسرے پر حملہ کرتے رہتے۔ کس قدر قتل عام ہوتا، اور قتل کے بعد آنے والے نتیجے صورت معاملہ کو کس قدر مہیب کر دیتے۔ غالباً اس سے زیادہ مضر اثر پیدا کرنے کے لیے کوئی اور سبب ایسا قوی نہ ہو سکتا تھا، اگرچہ سبب مذہبی مخالفت نہ ہوتی لیکن مذہبی جوش اور باہمی مخالفت کی باعث ہوتی۔ مسبب الاسباب نے واقعات دکھا کر پیشین گوئی کرائی تھی کہ دیکھو بہت جلد یہی تمہارا جامع قوم ہوگا۔ تم اس وقت اس کا کہنا نہ مانو گے۔ مخالفتیں کرو گے۔ لیکن اس کی ضرورت تمھیں ہوگی، اس کی ہر طرح کی خوبیاں تمھیں اپنی طرف کھینچیں گی اور آخر میں وہ

تمھارے نظامِ پارینہ کا تار تار الگ کردے گا اور ایک ایسی بنیاد پر کھڑا کردے گا جو تمھیں اس وقت تک بکھرنے نہ دے گی جب تک تم اس کے اصول کو اپنی دینی، دنیوی، عقلی، تمدنی اور معاشرتی بنیاد سمجھو گے۔

دوسرا بڑا احسان

قبل بعثت نبی عربیؐ کا دوسرا بڑا احسان یہ تھا کہ انھوں نے اپنی قوم کو ایک عرب کے وطن فروشی سے مطلع کردیا جو اہلِ روم سے اس بات کی سازش کرتا تھا کہ انھیں مملکت حجاز پر قابض کرادے۔ یہ نہ صرف اہلِ عرب بلکہ تمام ممالکِ اطراف کی دائمی شکر گزاری کے قابل ہے جو رومیوں کے زیرِ تمدن اور اثر آسکتا۔ اہلِ روم کی تاریخ ان کے خونی کارناموں سے رنگی ہوئی ہے۔ انھیں ملک کے آباد کرنے کی فکر نہ تھی بلکہ فتوحات اور غنیمت کا جوش اور اور اپنے ملک کی قدردانی کی آرزو انھیں ویرانی اور بے رحمیوں کے لیے آمادہ کرتی تھی اور اس کا اثر مفتوحہ ملک کے رہے سہے تمدن اور اخلاق کو بھی غارت کردیتا تھا۔

تیسرا بڑا احسان

تیسرا بڑا احسان یہ تھا کہ انھوں نے عربوں کے ایک قدیم عہد کو جو "حلف الفضول" کہلاتا تھا، تازہ کیا۔ جس میں غربا کی مدد، مظلوموں کی حفاظت اور عورتوں کی حفظِ عصمت اور حمایت بھی شامل تھی۔ اور یہ شہرت تھی اس سردارانِ عرب کے یادگار کی امانت داری کی کہ آخر میں غالباً عمر شریف کے چوبیسویں برس

صورت کی دل کشی اور لہجہ

ملکہ عرب حضرت خدیجہؑ نے جن کے ساٹھ ہزار سے زیادہ اونٹ عمان، یمن اور شام کی طرف اجناسِ تجارت کے تبادلہ کے ذریعہ ہوتے تھے۔ اپنا وکیل بنایا۔ یہ مرحلہ شام دلچسپ معلوم ہوتا ہے، جب اس نوجوان کو شام کی بازار میں دیکھیے، اس کے حسنِ خداداد، اس کی فطری شیریں کلامی، اس کی متصوّرانہ شان، اس کی غور میں ڈوبی ہوئی آنکھیں، اس کے مقوس بانزاکت ابروؤں کے نیچے دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ خبریں کہتی ہیں کہ چیزوں کو کوئی نہیں دیکھتا تھا، اور سب بیچنے والے کے گرد ہجوم کرتے تھے۔ غالباً اس آرزو میں ہر شخص قریب آنے کی کوشش کرتا ہو کہ اس کی باتیں سنیں جس کا بقول اس کے شاگرد کے: "لہجہ سب سے زیادہ درست تھا"۔

چونکہ میں تجارت کا ذکر کرنے لگا، اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ عربوں کے تعلیم تجارت کے متعلق اس قدر اور کہدوں کہ اتفاق سے یہ افتخار بھی اس گھر کے لیے تھا کہ وہ عربوں کو دور دور دراز ملکوں سے تجارت کرنا، نفع اٹھانا، تجربہ حاصل کرنا، اور اس سے اپنے خیالات اور ملک کی ترقی میں کوشاں ہونا سکھاتا۔

خاندانی پس منظر

پانچویں صدی مسیحی کے قریب قصی نے جو فہر الملقب بقریش (تاجر) کی اولاد سے تھے اور جن کا شجرہ نسب معد بن عدنان سے ملتا ہے، جو حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے تھے، مکہ پر اقتدار حاصل کیا، اور رفتہ رفتہ تمام حجاز ان کے زیرِ اثر ہو گیا۔ ان کے پہلے مکہ چھوٹی چھوٹی بستیوں میں تقسیم تھا، اور انھیں کو کعبہ کے از سرِ نو تعمیر کی ضرورت ہوئی۔ اپنے قیام کے لیے معبد کے قریب ایک ممتاز عمارت تعمیر کرائی جس کا ایک بڑا کمرہ امورات سیاسی اور قومی کے انجام دہی کے لیے مختص تھا۔ قصی نے ۴۸۰ء میں وفات پائی۔ قصی کے بیٹے عبدالدار اور عبدمناف تھے۔ جن کی اولاد میں نزاعات کی ابتدا ہوئی۔ عبدالدار کی رحلت کے بعد اس کے پوتوں اور اس کے بھائی عبدمناف کے بیٹوں میں انتظام اور حکومت کے لیے نزاع ہوئی اور اس کی اس طرح تقسیم ہوئی:

قصی
عبدالدار (کے پوتے : کعبہ، مجلس شوریٰ، فوجی انتظام)
عبدالمناف
ہاشم عبدالشمس مطلب (آب رسانی، لگانوں کی وصولی)

ہاشم کے احسانؒ

عبدالشمس نے اپنی حکومت اپنے بھائی ہاشم کے حوالہ کردی۔ ہاشم نہایت سربرآوردہ تاجر تھے۔ ہاشم کے معنی ریزہ ریزہ کرنے والا۔ اور یہ خطاب انھیں اس لیے ملا تھا کہ یہ مہمانوں کو شوربے میں روٹی توڑ توڑ کر کھلایا کرتے تھے اور رفتہ رفتہ حاجیوں کی دعوت اور مہمانی انھیں کے متعلق ہوگئی تھی۔ انھوں نے زمانہ قحط میں اپنے اہل وطن کے لیے ممالک شام سے غلہ فراہم کیا اور ان کی بڑی مدد کی۔ ان کو مکہ میں ناقابل مثال ہردلعزیزی حاصل تھی اور تمام حاجی ان کی توجہ کے مشکور واپس جاتے تھے۔ ہاشم نے ۵۱۰ء میں انتقال کیا۔ یہی اپنی قوم میں شام سے تجارت کے محرک ہوئے۔ ان کے بعد ان کے بھائی مطلب الملقب بہ سخی ان کے جانشین ہوئے۔ انھوں نے بھی ۵۲۰ء میں انتقال کیا، اور ان کے بعد اختیارات ان کے بھتیجے شیبہ کے سپرد ہوئے جو زیادہ تر عبدالمطلب کے نام سے مشہور تھے۔[۱]

ہاشم عبدالشمس مطلب
عبدالمطلب امیہ

عبدالدار کے پوتے مالدار ہوتے گئے لیکن یہ خاندان ہاشم کی عزت اور شہرت دیکھ دیکھ کر حسد کے انگاروں پر لوٹ رہے تھے اور کسی طرح مکہ پر تسلط جمانا چاہتے تھے۔ عبدالشمس کا حریص بیٹا امیہ ان کا مددگار تھا۔ لیکن باوجود اس کشاکش کے عبدالمطلب ۵۹ برس تک حکومت کرتے رہے۔

ابرہہ اور عبدالمطلب

انھیں کا زمانہ تھا کہ حبشہ کے مسیحی بادشاہ نے کعبہ کی بربادی کا قصد کیا۔ انھیں کے زمانہ کو ایسی عظیم الشان مرتب فوج کے آسمانی موقع کی مدد سے تباہ ہونے کا افتخار ہوا۔ اور انھیں کی ہمت اور استقلال نے عربوں کو منتشر ہونے نہ دیا۔ ورنہ زیادہ ممکن تھا کہ عرب ہاتھیوں کے ایسے قوی ہیکل جانوروں کے مقابلہ کے لیے کوئی چیز نہ پاتے۔ حیرت اور خوف ان کے حواس پر اثر کرتا اور دشمن کی آمد کے قبل یہ اپنے وطن اور معبد کو چھوڑ چھوڑ کر پہاڑوں اور ریگستانوں میں جا چھپتے۔ یہ عبدالمطلب کی مضبوط ذات تھی جس نے انھیں مجتمع رکھا، اور اس کے بعد "رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت"۔ حضرت عبدالمطلب ہی تھے جنھوں نے زمزم کو جو خراب اور بند ہوگیا تھا صاف کرایا۔

عبدالمطلب
عبداللہؑ ابوطالبؑ حمزہؑ عباسؓ ابولہب
محمدؐ علیؑ
فاطمہؑ —— حسنؑ حسینؑ زینبؑ امّ کلثومؑ

نبیؐ عربی کی پرورش کا ذمہ دار

یہ محبِ وطن تھا جس نے اکمل افراد عالم کے ابتدائی پرورش میں انہماک ظاہر کیا، اِس لیے کہ ولادت رسولؐ کے چند ماہ قبل حضرت آمنہؑ خاتون بیوہ ہو چکی تھیں اور بروایت شاذان ابھی چار مہینہ کے تھے کہ ماں کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ بقول ملا جامی "حضرت آمنہؑ خاتون اپنے عفت و جمال کے لحاظ سے سیدۂ عرب کہلاتی تھیں"۔ کافی ہے کسی معصوم بے زبان بچے کے لیے یہ غم کہ ماں کا گرم سینہ اسے چھوٹے چھوٹے پاؤں مارنے اور چلنے کے لیے نہیں ملتا۔ دودھ پیتے بچے کا دودھ پیتے وقت طنطنہ دیکھو۔ اس کی بھولی حکومت اور زعم پر غور کرو، اور اس گوارا بار کے نیچے ماں کے خوشی سے اچھلتے ہوئے دل کا خیال کرو۔ ماں بچہ کی اور بچہ ماں کی محبت کا احساس کرتا ہے اور آپس کا قلبی سمجھوتا ایک لطف ہے جس پر ماں اپنی رات کی نیندیں اور زندگی کا آرام صدقے کرتی ہے۔ اس معصوم کے لیے یہ لطف اور راحت زیادہ زمانہ کے لیے نہ تھی۔ ماں نے رحلت کی۔ تین دن تک اضطراب رہا۔ ہاشمی عورتیں یکے بعد دیگرے اپنے سردار کے پاس آتی ہیں۔ لیکن بچہ کسی طرف رغبت نہیں کرتا۔ ماں کا دل ان میں نہ تھا جو اس بچہ کو کھینچ سکتا۔ کوئی سینہ چاہیے تھا جس میں فطری مناسبت اور عنصر محبت کی امتیازی اثر دار شان ہوتی۔ بچہ کو کھینچتی اور وہ میلان ظاہر کرتا۔

عبدالمطلب کا انتشار

یہ حالت تھی اس بچہ کی اور ادھر سردار عرب سے اس کا اضطراب دیکھا نہ گیا۔ جو میدانِ جنگ میں تلواروں کی جھنکار سے تیور نہ بدلتا۔ نیزوں کی خلش اور تیروں کے پیکان سے اف نہ کرتا۔ لاشوں کا تڑپنا اس کے شجاعانہ متانت میں فرق نہ ڈالتا۔ نہ آنکھوں کا کوئی ریشہ ڈھیلا کرتا۔ وہی اس بچہ کے چیخنے اور تڑپنے سے بے چین ہو کر گھر میں نہ رہ سکا۔ خاموش اور غمگین خانہ کعبہ کے پاس بیٹھ گیا۔

اضطرابؐ کی وجہ

بوڑھا عقیل بن ابی وقاص پاس سے گزرا اور عبدالمطلب کو افسردہ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ حال پوچھا۔ جواب ملا کہ: میرا پوتا بے ماں کا ہو گیا ہے۔ کسی کا دودھ نہیں پیتا اور اس کے اضطراب سے کھانا پینا ناگوار ہو گیا ہے۔

دائی اور اس کی صفت

عقیل نے کہا اے ابوالحارث میں حلیمہ دختر عبداللہ بن حارث کو جانتا ہوں اور قریش میں اس کی سمجھ، فصاحت، صباحت اور شرافتِ نسب کی نظیر نہیں ہے۔ عبدالمطلب نے اس کے اوصاف سن کر اپنے غلام شمردل کو ایک تیز ناقہ پر بٹھا کر قبیلہ بنی سعد بن بکر کی طرف بھیجا کہ فوراً عبداللہ بن حرث کو حاضر کرے۔ عبداللہ لائے گئے۔ حضرت عبدالمطلب نے بڑے تپاک سے استقبال کیا، اور حال کہا۔ کہا کہ اگر تم قبول کرو گے تو تمھیں غنی کر دوں گا۔ عبداللہ نے منظور کیا، اپنی لڑکی سے کہا۔ اس نے غسل کیا۔ خوشبو لگائی، اچھے کپڑے پہنے اور اپنے شوہر بکر بن سعد اور باپ کے ساتھ واپس آئیں۔ حضرت عبدالمطلب نے خواہش ظاہر کی کہ اگر وہ مکہ میں رہیں تو ان کے لیے ایک قصر خالی کر دیا جائے۔ ہر مہینہ ہزار درہم، ایک جامۂ رومی، ہر روز روٹی اور گوشت دیا جائے۔ لیکن ان لوگوں نے اپنے موضع میں رہنے کو ترجیح دی۔

دائی کے حوالہ کیا

حضرت عبدالمطلب نے سپردگی کے لیے ویسی محبت آمیز شرطیں کیں جو کی جا سکتی ہیں۔ حلیمہ نے قابلِ توجہ بات کہی کہ: "میں نے جب سے اس بچہ کو دیکھا ہے اس کی محبت

میرے دل میں پیدا ہو گئی ہے"۔ اس کے بعد کعبہ کے قریب سب کو لے گئے۔ طواف کیا۔ خدا کو گواہ کیا۔ تحفے دیے اور بچے کو حوالہ کر کے کعبہ سے کچھ دور تک ساتھ ساتھ گئے۔

طریقہ پرورش کا شرع میں لحاظ

اس جگہ مجھے صرف اس امر پر توجہ دلانی ہے کہ اس شریف خاندان نے بچہ کی پرورش کے لیے کیسی دایہ تجویز کی، وہ جو اکثر عمدہ صفتوں میں ممتاز تھی۔ آگے چل کر تم کتب اسلامی میں اس کی کافی وضاحت اور احکام پاؤ گے۔ کہیں کہا گیا ہے کہ وہ دودھ بچہ کو نہ پلاؤ جو زنا سے پیدا ہوا ہو۔ کہیں حکم ہے کہ ایسی عورت کا دودھ جس کی آنکھ میں عیب یا احمق ہے نہ پلاؤ۔ کہیں تاکید ہے کہ اچھی صورت اور سیرت کی دایہ ہونی چاہیے۔ اور یہ سب اس لیے کہا گیا ہے کہ شرع نے دودھ کے اثر کو نہ صرف اعضا بلکہ قوائے ذہنی اور خصائل پر ساری سمجھا ہے۔ احساس کیا ہے کہ بچہ کی سیرت اور صورت میں دایہ سے مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السّلام نے بچوں کے لیے سب سے نافع دودھ ماں کا تجویز فرمایا ہے، جو حال کے یورپ کی تحقیقات طبی سے مصدق ہے۔

دادا کا آخری لحاظ

۵۷۹ء میں اس بچہ پر سے دادا کا پر شفقت سایہ اٹھ گیا۔ لیکن رحلت کے قبل بستر احتضار پر یہ لحاظ اور شرائط محافظت کا نمونہ بھول نہیں جاتا کہ ایک بچہ اس کی حفاظت اور پرورش میں تھا۔ اپنے فرزندوں سے پوچھا کہ کون اس کی پرورش اور پرداخت اپنے ذمہ لیتا ہے۔ ابولہب کی درخواست دنی الطبع ہونے کے لحاظ سے منظور نہ کی گئی۔ عباس کی خواہش اس لیے قبول نہ کی گئی کہ وہ غصور تھے، ابوطالب کی خوبی، سلیم الطبعی، اور علوّ صفات نے ان کی سفارش کی اور دادا اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گیا۔ ان کا عزیز بچہ اس وقت آٹھ برس کا تھا۔ دایہ بھی دو برس قبل انتقال کر چکی تھی۔ رحلت کے وقت حضرت عبدالمطلب کی عمر بیاسی برس کی تھی۔

ابوطالب

میں ابن ابی الحدید کے ساتھ سوچتا ہوں کہ حضرت ابوطالب نے رسولؐ کی تربیت محافظت اور پرورش میں جو حصہ لیا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اہل اسلام کی ممنونیت کا مستحق ہے جس طرح ان کے مشہور عالم فرزند نے ہوش سنبھالنے کے قبل سے آخر عمر تک وجہ رسولؐ کے لیے اپنے کو وقف کر دیا۔ اشاعت اسلام کبھی ان کے بار احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ رسولؐ کو بھی جنھوں نے اپنے ماں باپ کو نہیں دیکھا تھا حضرت ابوطالب اور حضرت فاطمہؑ بنت اسد سے بڑی محبت تھی۔ گیارہ بارہ برس کے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ مہربان چچا فکر معاش میں شام جا رہا ہے۔ جدائی گوارا نہیں ہوتی، آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ حضرت ابوطالب سے پرنم آنکھیں نہیں دیکھی جاتیں۔ ساتھ ساتھ لیے جاتے ہیں۔ لیکن ایک بڑا تغیر پیدا ہونے والا تھا جو آئندہ رسولؐ کے مشن کی سچائی اور حضرت ابوطالب کی محبت پر بے لوث اثر ڈالتا۔

نازک موقع

قریش کا وفد جاتا اور اپنے سردار عرب سے کہتا کہ تمھارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی تحقیر کیا کرتا ہے، اسے باز رکھو۔ یہ ایک نہایت ہی زبردست مصلحت تھی جس نے عربوں کو حضرت ابوطالب کے پاس بھیجا۔ بظاہر یہ نہایت صلح پسندانہ تھی۔ انھوں نے بیک جسم جا کر اپنی یک جہتی کا بار ڈالنا چاہا تھا۔ جس سے حضرت ابوطالبؑ مرعوب ہو جاتے اور وہ اس تصفیہ پر مجبور ہوتے کہ قوم کی مجموعی مخالفت کے سامنے بھتیجے کو روک دینے کے اور کیا

کیا جاسکتا ہے۔ حضرت ابوطالب ہی سے اس لیے کہا گیا کہ لوگ جانتے تھے کہ ابن عبداللہ کا ایسا احسان شناس ہرگز اپنے چچا کی بات کارد کرنا گوارا نہ کرے گا۔ رسولؐ کے لیے موقع نازک تھا۔ انکار کرنا اپنے کو ایسی زبردست پناہ سے نکال لینا تھا اور اس کے بعد ایسے خطروں کا سامنا کرنا تھا جس میں خود تنہا اور دوسری طرف تمام قوم ہوتی اور اسے ایذا رسانی پر اس لیے جرأت ہوتی کہ وہ اپنے شرائط پیش کر چکے ہیں۔

ایک انداز

لیکن ایسے مشکل مسئلہ کا جواب دیر میں نہیں دیا گیا۔ جواب گول گول نہیں دیا گیا۔ جس سے ہاں نہیں کچھ تصفیہ نہ ہوسکے۔ آئینہ کا سا صاف تھا۔ اور صنوبر کی طرح سیدھا تھا۔ "اٹھے" یہی جواب تھا۔ یہی تصفیہ تھا۔ یہی آئندہ کی کنجی تھی۔ یہی ثبوت تھا۔ لیکن آج بھی آنسو ڈبڈبا آئے تھے۔ دل بھر آیا تھا۔ محبت تھی اور کیا کیا تھا کون جانے کس قدر خیالات، اس کی کیسی سرعت تصفیہ اور نفس کی کون سی حرکت نے کیا کیا بجھانے کے لیے آنسو نکال دیا تھا۔ اس کی کامل شریفانہ شرح کے لیے علم نفس نے کافی الفاظ فراہم نہیں کیے ہیں۔ اٹھے۔ اب محض ابوطالب کی پناہ سے نہیں اٹھے، بلکہ بے شمار دولت، امارت اور بہترین عورت جو قریش خاموشی کا صلہ دیتے اسے لات مار کر اٹھے۔

اس کی شرح

اٹھنا محض ایک جسمانی حرکت کا اظہار تھا۔ اس کی شرح ہونی چاہیے تھی۔ شرح ان یادگار اور صمیم ارادہ کے پہاڑ لفظوں میں ہوئی کہ: "اگر آفتاب کو میرے داہنے ہاتھ اور ماہتاب کو بائیں ہاتھ پر رکھ دیں تو بھی میں اپنے پروردگار کی مخالفت نہ کروں گا"۔ پھر فرمایا: "میں ان سے ایک بات چاہتا ہوں اگر یہ مانیں گے تو عرب اور عجم کے بادشاہ ہوجائیں گے"۔ پوچھا وہ کیا بات ہے؟۔ فرمایا: "خدا کی وحدانیت اور میری رسالت کا اقرار کریں"۔ جب قریش نے اپنے کو ناکامیاب دیکھا تو دوسری شرط پیش کی کہ تم عمارہ بن ولید کو فرزندی میں لو اور محمدؐ کو ہمارے حوالہ کردو۔ اس کا جواب دیا کہ تم کس قدر انصاف سے بعید بات کہتے ہو کہ میں اپنے فرزند کو قتل ہونے کے لیے تمہارے حوالہ کروں اور تمہارے فرزند کی خود تربیت کروں۔ اس کے بعد حضرت ابی طالب نے اشعار فرمائے ہیں جو اس مسئلہ کے لیے قطعی ثبوت ہیں کہ آیا وہ مسلم تھے یا نہ تھے۔

حضرت ابوطالب کا ایمان اور جوشِ حمایت

مجھے اس مسئلہ کی ضرورت ایجاد اور بعض مؤرخین کے ہٹ دھرمی اصرار پر عجب ہے کہ حضرت ابی طالب نے قبل اقرار اسلام رحلت فرمائی۔ یقیناً ان لوگوں کی نگاہ سے حضرؑت کا قصیدہ لامیہ نہیں گزرا۔ دیکھنے کی حالت میں یا تو قصیدہ سے انکار کرتے اور اپنے وجوہات پیش کرتے یا اقرار کرتے لیکن نہ کسی نے انکار کیا ہے اور نہ وجوہات پیش کیے ہیں بلکہ اکثر نے اسی کو ان کے مسلم ہونے کا حتمی ثبوت قرار دیا ہے۔ بوڑھا سردار اپنی مستند شرافت اور خاندانی عظمت کی زبان اور اپنی شجاعانہ شان سے بول رہا ہے جہاں وہ کہتا ہے کہ: ہم محمدؐ کو دشمنوں کے حوالہ کردیں درآنحالیکہ نہ ابھی نیزے چلے ہیں نہ تیروں کا سناٹا سنائی دیا ہے نہ لاشیں تڑپی ہیں۔ رسولؐ کو اپنا کام جاری رکھنے کی ہمت دلائی ہے۔ آخر دم تک مدد کا اعلان کیا ہے اور دین کی تعریفیں کی ہیں۔ حیرت کم نہیں ہوتی جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوطالب کی باتوں سے مشرکین کو ان کی طرف سے یاس ہوجاتی ہے لیکن مسلمان ان کے کفر یا ایمان کے متعلق سوال کرنا اپنی اسلامیت کے شایان سمجھتے ہیں۔ انھیں یہ بھی خیال نہیں کہ حنیف کم سے کم موحد سمجھے جاتے تھے اور خود حضرؑت عبدالمطلب مجدد توحید خیال کیے گئے ہیں۔ ان استنباطی حالتوں سے

درگزر کر کے وہ اس موٹی اور صاف روایت سے بھی آنکھ بند کر لیتے ہیں کہ حضرت ابوطالب علیؑ کو رسولؐ کے ساتھ نماز پڑھتا دیکھ کر اپنے دوسرے فرزند کو بھی شریک کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد میں مؤرخین کے وجہِ اصرار پر اگر کوئی ہو، کوئی نظر نہیں ڈالتا۔

رسولؐ حضرت فاطمہؑ بنتِ اسد کی لاش سے کیونکر مخاطب ہوئے

میں حضرت ابوطالب کی محبت کی مثالیں دے رہا تھا، اور میں نے کہا ہے کہ حضرت فاطمہؑ بنتِ اسد کو بھی بڑی محبت تھی۔ یہ خود رسولؐ کی زبانی ہے جب کہ علیؑ اپنی مادرِ گرامی کی رحلت کی خبر دیتے ہیں اور رسولؐ لاش کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں: "اے میری ماں خدا تجھ پر رحم کرے تو میری ماں کے بعد میری ماں تھی۔ تو آپ بھوکی رہتی تھی اور مجھ کو کھلایا کرتی تھی، تو خود نہیں پہنتی تھی مگر مجھ کو کپڑے پہناتی تھی، تو اپنے نفس کو اچھے کھانے سے باز رکھتی تھی اور مجھے سیر کرتی تھی اور مجھ سے حسن سلوک سے پیش آتی تھی"۔ بے موقع نہ ہوگا اگر میں یہ خواہش ظاہر کروں کہ رسولؐ اور ابن مریمؑ کے اپنے پالنے والی اور حقیقی ماں سے برتاؤ کا موازنہ کیا جائے۔

رسولؐ اور خدیجہؓ

میں نے رسولؐ کو شام کے بازاروں میں دکھایا تھا۔ ابھی امین کہوں، کیونکہ عرب ابھی انھیں اسی خطاب سے یاد کرتا تھا۔ اسے بھی ابھی یہ معلوم نہ تھا کہ یہ آئندہ نہ صرف ہمارا بلکہ عالم کا ہادی ہونے والا ہے۔ میری کتاب کا ناظر جانتا ہوگا کہ خدا نے نبی عربیؐ کو حسن ذاتی بھی معمول سے زیادہ عطا فرمایا تھا۔ میں یہاں آمادہ نہیں ہوں کہ تفصیلاً حلیہ مبارک عرض کروں، شام سے تمام مال فروخت کرنے کے بعد واپس آئے، اور ایک آدھ منزل سے اپنے قافلہ کے لوگوں نے خواہش ظاہر کی کہ حضرت خدیجہ کے پاس جا کر سفر کی کامیابی کی خوشخبری دی جائے۔ رسولؐ گئے۔ حضرت خدیجہ نے ایک سوار کو آتے دیکھا۔ شان معلوم ہوئی۔ سوار انھیں کے گھر ٹھہرا۔ حال کہا۔ مسرت زیادہ ہوئی۔ اور خواہش کی کہ اس مرتبہ پھر قافلہ کے ساتھ اسی طرح آؤ۔ میں حیات القلوب کی عبارت میں حضرت خدیجہ کی مسرت میں جذبۂ محبت پاتا ہوں۔ اور تائید اس سے ہوتی ہے کہ وقت عقد اپنے چچا کی وکالت کی پابند نہیں رہتیں، بلکہ وہ اختیارات صرف کرتی ہیں جس کی فطرتاً بالغہ مجاز ہے۔

ابوطالب کا خطبہ

حضرت ابوطالب اپنے خطبہ میں بقول ابن خلدون فرماتے ہیں کہ: "محمدؐ کا جس سے چاہو مقابلہ کرو وہ سب سے راجح نکلے گا"۔ یہ بھی فرمایا کہ: "ہم کو خدا نے حرم میں عامہ ناس کا امن و امان اور حاکم قرار دیا ہے اور ہم کو مخصوص کیا ہے اس گھر سے جہاں اطراف سے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ جانو کہ تم کسی کو قیاس نہ کرو گے مگر یہ کہ میرا بھتیجا اس سے عظیم تر ہوگا۔ اس کے پاس مال کم ہے لیکن مال تغیر پذیر چیز اور سایہ کی طرح ہے، اسے خدیجہ سے رغبت عقد اور خدیجہ کو اس سے خواہش عقد ہے"۔

سن شریف

یہ بات مشہور ہے کہ رسولؐ کا سن اقدس اس وقت پچیس برس کا تھا، اور حضرت خدیجہ کبریٰ کی عمر شریف چالیس برس کی تھی۔ روایتیں اس سے کم عمری کی بھی ہیں۔ لیکن تواتر کا زیادہ وزن اول الذکر سن پر ہے۔ میں اس پر کوئی بحث نہیں کر سکتا کہ حضرت خدیجہ کا اس سے پہلے عقد ہوا تھا یا نہیں۔ یا زینب، رقیہ اور اُمّ کلثوم حضرت خدیجہ کے بطن سے تھیں، یا ان کی بہن ہالہ بنت خویلد کی لڑکیاں تھیں، جن کی وفات کے بعد حضرت خدیجہ نے ان کی پرورش کی۔ یہ بحث ضروری ہو یا نہ ہو کم سے کم میرے لیے غیر متعلق ہے۔

حضرت خدیجہؓ کی ذات کا اسلام میں درجہ

مجھے جو کچھ اس تذکرہ سے غرض ہے وہ یہ ہے کہ حضرت خدیجہ کی ذات بھی منجملہ ان نفوسِ اقدس کے تھی جن سے حضرت رسولؐ کو واقعی تسکین ہوئی اور جن کی وجہ سے رسولؐ کو اپنے کارِ رسالت کی انجام دہی میں آسانی ہوئی۔ بہت کچھ بجھانے کے لیے حیات القلوب میں علامہ مجلسی کا یہ انتخاب کافی ہے کہ :

"در روایتے وارد شدہ است کہ خدیجہ نیکو وزیرے و معینی بود برائے رسالت آں حضرت۔ ہر گاہ کہ مردم ازو دوری میکردند اور مونس آں حضرت بود و ہرگاہ کہ اہل مکہ آں حضرت را آزار میکردند او یارے آں حضرت می نمود و آں حضرت را دلداری می نمود و بحسن معاشرت و ملاطفت آں حضرت را از کدورت بیرون می آورد و بمال خود آں حضرت را معاونت می نمود"۔

روایت میں ہے کہ خدیجہؓ اچھی وزیر اور مددگار تھیں حضورؐ کے لیے۔ لوگوں کی دوری کے وقت آپؐ مونس ہوتیں، اہلِ مکہ ستاتے وہ مدد کرتیں اور حضرتؐ کی دلداری کرتیں اور حسنِ معاشرت اور نرم روی سے آپؐ خوش کرتیں اور اپنے مال سے مدد کرتیں۔

یہ روایتیں عام ہیں کہ کس طرح کسی بی بی نے رسولؐ سے سوال کیا کہ آپ کو مجھ سے زیادہ محبت ہے یا خدیجہ سے اور رسولؐ نے پرنم آنکھوں سے جواب دیا کہ خدیجہ نے میری اس وقت تصدیق کی جب کہ سب انکار کرتے تھے اور اس وقت مونس تھی جب کہ سب تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ میں اس سوال کو اس کمزوری کے لحاظ سے قابلِ معافی سمجھتا ہوں کہ محض کم عمری حسن صفات کے مقابلہ میں محبت کی محرک سمجھی گئی تھی یا قیاس کیا گیا تھا کہ رسولؐ وقت کے لحاظ سے مروت میں موجود کو بہ مقابلہ گزشتہ کے ترجیح دیں گے۔ لیکن رسولؐ کی حالت اور الفاظ نے جو کچھ بجھایا وہ سوال کے عکس کا زیادہ مؤید ہے، جس کے معنی ہیں کہ : "تم اس وقت تصدیق کرتی ہو جس وقت اور جس کے پہلے بہت سے تصدیق کر چکے ہیں۔ تم اس وقت مونس ہو جس وقت اظہارِ محبت کے لیے بہت سے آمادہ ہیں"۔

عام الحزنؑ

رسولؐ کی محبت کا اندازہ اس سے ہو سکے گا کہ ۱۰ سنہ بعثت، جس میں حضرت ابوطالب اور حضرت صدیقہ خدیجہ کبریٰ نے چند روز کے عرصہ میں رحلت فرمائی۔ رسولؐ کے نزدیک "عام الحزن" تھا۔ یہ مثالیں ہیں جس سے تم رسولؐ کے نفس قدسی کی خوشبو سونگھو گے۔ تم سمجھو گے کہ اس میں محبت اور قدر شناسی کا کیسا کامل نشو تھا کہ اپنے غلام زید بن حارثہ پر روئیں گے۔ اور کہیں گے کہ : "یہ ایک دوست کا شوق ہے اپنے دوست کے لیے"۔

رسولؐ کے متعلق چند اشارے

یا کبھی سلمان کے لیے اپنا تکیہ بڑھا دیں گے۔ یا جب مجلس اقدس پُر ہوگی تو کسی دُور بیٹھنے والے کے لیے اپنا جامۂ اقدس بچھا کر بیٹھنے کے لیے پھینک دیں گے۔ یا جب کوئی شیخ عرب کسی غریب پاس بیٹھنے والے سے اپنے کپڑے سمیٹے گا تو کہیں گے کہ : "اے شخص کیا اس کی میل تجھ میں سرایت کر گئی کہ تو کراہت کرتا ہے، یا اس کا افلاس تجھ میں داخل ہو گیا"۔

دس برس قبل بعثت علیؑ کی ولادتؑ اور تاریخِ اسلام میں ان کی ذاتؑ

بعثت کو ابھی دس برس باقی

تھے کہ علی بن ابی طالب علیہ السّلام کی ولادت ہوئی۔ ہونے والا تھا کہ اگر رسولؐ شارع اسلام ہوتے تو علیؑ حامی اسلام ہوتے۔ اسلام کی مشکلات سے رحلتِ رسولؐ تک کوئی خوف اور قربانی کی جگہ تلاش کرو، کسی مفید امر کی انجام دہی دیکھو اور تم وہیں دیکھو گے کہ علیؑ سامنے ہیں، موجود اور مستعد ہیں۔ گردن اور سر آگے بڑھائے ہیں۔ دل پہاڑ کی طرح قائم ہے۔ رسولؐ کی اطاعت کرنی سیکھی ہے۔ سوال کرنا نہیں جانتے۔ کام کرنا اور حکم بجالانا جانتے ہیں۔ ہونے والا تھا کہ علیؑ رسولؐ کے حکم اور عمل کے شارح ہوتے۔ ہونے والا تھا کہ رسولؐ کے بعد کے تغیرات میں علیؑ یا مظہراتم نفس رسولؐ کی عظیم الشان ذات حقیقی اسلام کی روح قائم رکھتی۔ ملکی اسلام فتوحات، نام، شہرت، حوصلہ اور غنیمت کے پیچھے دوڑتا، علیؑ اس لیے گوشہ نشین ہوجاتے کہ خاموشی سے اس سب پر نظر ڈال جائیں جو دیکھا یا کیا تھا، خود بجھ چکے تھے۔ لوگوں کو بجھانا تھا بجھانے کے لیے تیار ہورہے تھے۔ اپنے کو اسلام کا مجسمہ دکھانا تھا۔

علیؑ سے محبت کے وجوہات

اور یہ بھی ہونے والا تھا کہ علیؑ اور رسولؐ میں تصور سے بڑھ کر محبت ہوتی۔ محبت کی صرف یہ وجہ نہ تھی کہ رسولؐ ابوطالبؑ اور فاطمہؑ بنت اسد کے اِحسانات کا معاوضہ کرتے تھے۔ یہی وجہ نہ تھی کہ لڑکپن سے گودیوں میں پالا تھا۔ یہی وجہ نہ تھی ایک جدی بھی تھے۔ یہی وجہ نہ تھی کہ ابتدائے سن سے زیر تربیت تھے اور اس نے استاد اور شاگرد کی عزت اور محبت قائم کی تھی، یا وہ خلوص اور جانبازیاں ظاہر ہوئی تھیں جو کسی سے ظاہر نہ ہوئیں۔ یا پہلے مسلمان صدیق تھے۔ یا رسولؐ کی تنہا یادگار کے شوہر تھے۔ یا یہ امید تھی کہ آئندہ یہ محافظِ اسلام ہوں گے۔ بلکہ ان میں ایک دُوسرے کی محبت اور عزت ان خیالات اور وجوہات سے بلند ہوکر اس لیے تھی کہ دونوں ایک دُوسرے کو پہچانتے تھے۔ دو نفس قدسی تھے جس کی ایک دوسرے کو قدر تھی۔ ویسا اتصال قلبی جیسا ایسے نفوس طاہرہ میں ہونا چاہیے۔ دو لوئیں تھیں جو عالم گیر تاریکی میں روشن تھیں اور ایک دُوسرے کو مدد دے رہی تھیں۔

پانچ برس قبل بعثت فاطمہ زہرا علیہا السّلام کی ولادت

بعثت کو پانچ برس باقی تھے رسولؐ کا سن اقدس پینتیس برس کا تھا غالباً اسی سنہ میں جب کہ مکہ میں بڑا قحط پڑا تھا، اور ہمارے ہادی نے حضرت ابوطالب کی کثیر الاولادی کی وجہ سے علیؑ کو مستقلاً پرورش کے لیے لے لیا کہ تاریخ کا ایک اور ایسا ستارہ طالع ہوا جس کی نرم روشنی طبقہ اناث کے لیے خصوصیت سے باعث ہدایت ہوئی۔ سیدہ طاہرہ، ذکیہ، زہرا، فاطمہ علیہا السّلام پیدا ہوئیں۔ خالق عباد نے ان کی وجہ سے ہم لوگوں پر یہ سوچ سکنے کا احسان فرمایا کہ عورتیں اس سے کہیں بلند ہوسکتی ہیں جس حد تک سوچنے کے ہم لوگ عادی ہیں۔ مشکل سے کسی شریف کو اس درجہ عسرت اور تنگ دستی اور تکلیف میں بسر کرنے کی جرأت ہوسکتی ہے مشکل سے کوئی ایسی حالتوں میں شرافت نفس کا ایسا نمونہ رہ سکتا ہے، یا تسلیم و رضا اس کا حق کہا جاسکتا ہے۔ ان کے گھر کا یہ فقرہ اور اس کی انتہائی عملی خوبی انھیں کے گھر کے لیے مخصوص ہوئی کہ: "عفت غربت کی زینت ہے"۔ پڑھو ان کی حالت کو اور تم دیکھو گے کہ تمھارا دل تمھارے قبضہ سے نکلا جاتا ہے۔ کبھی تم ان کی مشقتیں اور اس میں ان کا خاموشانہ شکر دیکھ کر رو دو گے۔ کہیں اس حالت میں دوسروں کی مدد اور ہمدردی کا عملی ارادہ دیکھ کر تم بے چین ہوجاؤ گے۔ کہیں ان کی اور خوبیاں اس طرح اپنی خوشبو

پھیلائیں گی کہ تم اسے اس کے مناسب درجہ عظمت تک پہنچنے سے اپنے آپ کو قاصر پاؤ گے۔ کبھی تم پاؤ گے کہ اوب کرنے والے گستاخ ہوتے جاتے ہیں، اور ان صبر شکن حالتوں میں جب کہ انھیں اس کے مناسب جواب کا اختیار نہ ہوگا وہ اپنی شریفانہ غیرت کے آفتاب ہوں گے۔ اور تم میں شریف کی مجبوری اس کی حمایت کے لیے جذبات پیدا کرے گی اور تم سمجھو گے کہ یہ حمیت دنیا کی بہترین خوبی ہے۔ تمھیں اطمینان ہوگا اور خود اپنی عزت تمھاری آنکھوں میں بڑھ جائے گی۔ آگے چل کر تم اور حالات اسی کتاب میں پڑھو گے۔

حسینؑ کے آبائے طاہرین کے ذکر سے غرض

میں قصی، ہاشم، عبدالمطلب، حضرت آمنہ، حضرت ابوطالب، حضرت فاطمہ بنت اسد، حضرت خدیجہ، حضرت علیؑ بن ابی طالب اور فاطمہ زہرا علیہا السلام کے مختصر حالات (مناسب تفصیل آگے آئے گی) اس لیے مس کر رہا تھا کہ آئندہ اپنے ہیرو میں قانون وراثت صفات دیکھ سکوں اور اس میں نشو صفات کے سمجھنے کی آسانی ہو۔ جس سے آخر میں یہ فقرہ، جو عام تاریخوں میں پایا جاتا ہے، اچھی طرح سمجھنے میں آنے کے قابل ہو کہ: "تربیت یافتگان آغوش پاکیزہ کبھی حقارت اور مذلت کو شہادت کی سعادت پر اختیار نہ کریں گے" جس کے "تربیت" اور "آغوش پاکیزہ" کے لفظوں میں ایک معنی دار تاریخ ہے۔ خصوصاً جب کہ بلیغ خطیب نے اس کی صفت اور نتیجہ بھی بیان کیا ہے کہ اس کی وجہ سے حقارت اور مذلت گوارا نہیں کی جاسکتی۔ اور اسی طرح حسینؑ کا وہ قصیدہ جس کا اس موقع پر جب کہ فی البدیہہ کہا جانا ایک بہت سی حیثیتوں کا معجزہ تھا افتخار نقابت کرتا ہے کہ: "خیرۃ اللہ من الخلق ابی بعد جدی و انا بن الخیرتین"۔ یہی مفہوم زیارت کے ان فقرات سے پیدا ہے کہ: "اشہد انک کنت نوراً فی الاصلاب الشامخۃ و الارحام المطہرۃ"۔ یہ فقرات وراثت صفات کے یقین اور احساس سے پر ہیں۔ خود حسینؑ فرماتے ہیں کہ: "یا ایہا الرجل المغبون شیمۃ انی ورثت رسول اللہ عن رسل"۔ (اے وہ شخص جس کی طبیعت میں کھوٹ ہے یہ جان لے کہ میں رسولان سلف سے سلسلہ بہ سلسلہ رسولؐ کا وارث ہوں)

وراثت صفات

قانون وراثت صفات کے متعلق کوئی کہتا ہے: "وجدان کوئی حقیر شے نہیں ہے بلکہ نہ صرف وہ ہمارے انفرادی بلکہ ہمارے تمام اسلاف کے منجمد تجارب کا لب لباب ہے۔ قوانین ارتقاء کے رو سے ہم اپنے اسلاف کے غیر مدرک خصوصیات ہی کے وارث نہیں، بلکہ ان کے تمام مدرکات، محسوسات، جذبات وغیرہ بھی توارث کے ذریعہ سے ہم تک منتقل ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے ہمارا وجدان ایک رجسٹر ہے جس میں اختصار کے ساتھ گزشتہ نسلوں کے کل تجارب محفوظ ہیں"۔ میرا ذاتی یقین ہے کہ اسلام میں اصول تبنی کا نہ ہونا اس دشواری کے احساس سے ہے کہ کسی کا گود لینا وراثت صفات کا کوئی سلسلہ نہیں ہے۔ کیونکہ متبنیٰ فطرتاً نہ ذاتی قائم مقام ہے نہ صفاتی۔

سچ ہے کہ محض نسبی افتخار اسلام میں شدت سے دور رکھا گیا ہے۔ لیکن نسبی افتخار کا چھچھلاپن اور ہے اور ذلیل النفسی سے محفوظ رہنے کے لیے صفات خاندانی کو سپر بنانا اور ہے۔ تم آگے چل کر غور کرو گے اس خاندان کی مستند شرافت پر جب دشمن ان کی تعریفیں کرے گا، اس کا اندازہ ہر وقت ویسا ممکن نہیں جیسا خاص خاص موقع پر یا امتحان کے وقت،

مثالیں آئیں گی کہ دشمن کی حیرت اپنی ذلت اور ان کی شرافت کا ان لفظوں میں اقرار کرے گی کہ: "اس کے باپ کا نفس اس کے پہلو میں ہے۔ وہ کبھی ذلت گوارا نہ کرے گا"۔

خصوصیاتِ قومی

"تمدن عرب" کی یہ عبارت بھی مفید ہوگی کہ: "قوم کے خصائص سے مراد وہ چند محسوسات اور قابلیتیں ہیں جو اس قوم کے اشخاص میں پائی جاتی ہیں اور ان قوتوں کو ایک ہی طرف مصروف کردیتی ہیں۔ یہ عام مجموعہ خیالات اور محسوسات کا سال دراز میں پیدا ہوتا ہے اس کا نام خصائصِ قومی ہے"۔

قوم کا لفظ بہ نسبت خاندان کے زیادہ وسیع ہے۔ لیکن جب یہ خیال کیا جائے گا کہ اکثر خاندان مل کر ایک قوم بنتی ہے تو خاندان قوم کا ایک جزو ترکیبی سمجھا جائے گا۔ اسی طرح خاندان میں کوئی پیدا ہوتا ہے جس کے خصائص ممتاز حیثیت کی قوت رکھتے ہیں، اس کی قوت اپنے گرد و پیش اور اثر پذیر نفوس پر عمل کرتی ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ جب تک بعد کے زمانہ میں ان ممتاز خصوصیات کا جوش ضائع نہ ہوجائے۔ اثر کن خاصہ کے لوگوں کا کسی خاندان یا قوم میں پیدا ہوتے جانا ترقی اور اس کے عکس میں خصوصیات قومی کی تنزلی ہے۔

وحی اور بعثت

نبی عربی کا سن اقدس چالیس برس کا ہوا تھا کہ خداوند تعالیٰ نے یتیم عبداللہ کو خاتم النبیین تجویز فرمایا۔ ان پر اپنی قدرت کے راز صاف اور قوی زبان سے کھولے۔ قدرت کی زبان ان کے لیے کھلی۔ اس طرح کھلی کہ اب حکم بجالانے اور معنی سمجھنے میں کسی غلط فہمی کی گنجائش نہ تھی۔ صاف اور صریح حکم تھا۔ کہا گیا تھا کہ تم نبی ہو۔ نبوت اور رسالت کا لفظ اس وقت تک اس درجہ عام ہوچکا تھا کہ اس وحی اور بعثت مفہوم کسی کے لیے نیا نہ تھا۔ جگہ ایسی نہ تھی جہاں بہت سی آوازیں آتی ہوں۔ سناٹا اور خاموشی تھی۔ غالباً خشک اور بے گیاہ پتھریلی پہاڑی، جہاں پرندوں کے نشیمن بھی نہیں ہوتے اور نہ چرندوں کے سموں اور چرنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہاں کی کھری چٹان تھی اور ہمارا ہادی۔ یہاں کا سنجیدہ سناٹا تھا۔ اور ہمارا ہادی، جہاں اسے خموشی میں ایک آواز بلند ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ ہمارا کملی پوش تھا جسے تنبیہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ حکم دیا گیا کہ اپنے رب کی بڑائی ظاہر کرے۔ ﴿يَآ أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝١ قُمْ فَأَنذِرْ ۝٢ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝٣﴾ (۷۴ : ۱-۳) "قُمْ" (اٹھ) فرمایا گیا تھا۔ کسی دیر کی جگہ نہ تھی۔ تساہل کا خیال ناممکن تھا۔

بشیر اور نذیر انبیاء

ہمارے نبی کو فَأَنذِرْ (تنبیہ کر، ڈرا، دھمکا) کا حکم دیا گیا تھا۔ پیشتر نذیر پیدا ہوچکے تھے۔ یسعیاہ، یرمیاہ، حزقیل۔ نذیر تھے کس درجہ اثر کے۔ اس کے سمجھنے کے لیے توریت پڑھو یا ان کے اثر کو تاریخ یہود میں تلاش کرو۔ یہاں اس پر غور کی ضرورت ہے کہ تجدید عہدہ کے لیے خداوند تعالیٰ کی مشیت کیوں مقتضی ہوئی اور بندوں کا اس میں کیا فائدہ متصور ہوتا ہے ہم لوگوں کے ناقص فہم میں آسکتا ہے۔ بجز تاریخ کے اور کوئی ذریعہ ہماری مدد کا نہیں ہے۔ یسعیاہ، یرمیاہ اور حزقیل کی بے اثری ان کی قومی تاریخ سے ظاہر ہے۔ بے سود استعارے عناصر قومی کی تربیت نہ کرسکے۔ ان کے بعد ابن مریمؑ نے تہدید کو اس درجہ ترک کیا کہ مشتبہ الاطوار کی عورت کو جس نے انھیں عطر یا تیل ملا تھا، بخشش کی بشارت دی۔ اس لیے کہ اس سے محبت ظاہری ہوئی تھی۔ اگرچہ یہود کو ان کے حق بشارت پر اعتراض ہی کیوں نہ ہو۔ وہ صلیب پر چڑھائے جانے کے وقت ایک چور مصلوب کو بہشت کی خوشخبری دے رہے تھے، درآنحالیکہ اس سے نہ انابت ظاہر

ہوئی تھی اور نہ اس نے اِقرارِ نبوت کیا تھا بلکہ اس کے فقرات سے طنز ظاہر تھا۔ اور یہ غالباً اس لیے کہ تہدید ان کے اصول کے خلاف تھی۔ وہ بغیر کسی تہدید یا توبہ کرائے ناقابلِ اعتقاد عورتوں کو اپنے زمرہ میں داخل کر لیتے تھے۔ جس سے یہود کو عجب ہوتا تھا۔ یا جس عجب میں بعض یورپین مورخین ان کے شریک ہیں۔ لیکن اس کے آثار نہیں ہیں کہ کہیں انھوں نے گنہگار انسان میں جوشِ انابت پیدا کرنے کے لیے خدا کی عدالت اور خلاف ورزی کے سزا کا خوف دلایا ہو۔

اس کا اثر

انبیائے یہود نے دھمکایا بغیر تسکین دلائے۔ ابن مریم نے تسکین دی بغیر خوف دلائے۔ ایک نے اگر یاس پیدا کی تو دوسرے نے محض عفو سے انسان کی قابلیت گناہ پر کوئی رکاوٹ تجویز نہ کی۔ محض بشارت ہو یا محض نذارت، اپنی اپنی جگہ ناکمل تھی۔

نبی عربی بشیر اور نذیر تھے

اور ضرورت پیدا ہو گئی تھی کہ خداوند تعالیٰ کسی کے لیے اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (۲:۱۱۹) (بہ تحقیق کہ بھیجا ہم نے تجھ کو ساتھ حق کے بشارت دینے والا اور خوف دلانے والا) کا اعلان فرماتا۔ یعنی ایک ذات میں دو عہدے تجویز کیے جاتے۔ خوف اور بشارت کا وزن اپنی اپنی ضرورت پر کام دیتا۔ نہ محض بشارتیں بے مہار ہونے دیتیں اور نہ محض خوف انھیں ناامید کر دیتا۔ یہ ان کے خصائل پر برا اثر ڈالتیں۔ مایوسی انھیں برائیوں کی آلودگی میں منہمک کر دیتیں۔ محبت اور کشادہ دلی ان سے جاتی رہتی اور محض تاریکی اس کا نتیجہ ہوتی۔ یہ جماعت کا شیرازہ منتشر کر دیتی اور غالباً مذہب کا یہ لحن بودھیت کا ہم آہنگ ہوتا۔

اس کا اسلامی اصول پر اثر

بعض کی مذہبی سیاست نے اسلام کو مذہب خوف کہنا قرین مصلحت کہا ہے۔ یہ ان کی حسی اور تالیفی غلطی ہے۔ وہ جان سکتے تھے کہ ہمارا پالنے والا (رب) رحمان اور رحیم ہے اور ہمارا ہادی رحمۃ للعالمین کہا جاتا ہے۔ اور قرآن شریف رحمت اور امید کے وعدوں سے پر ہے۔ ہم کسی ایسے اِعتقاد کے پیرو نہیں ہیں کہ انسان فطرتاً گنہگار ہے اور وہ غضب خداوندی کا آماج ہے۔ یہ نظریہ محبت کے منافی ہے کہ ہم ایسے پیدا ہی کیے جاویں جس پر خدا اپنے قوت غضب کو آزمائے۔ یا پولس کے لفظوں میں جیسا وہ گلیتیوں کو لکھتے ہیں کہ: "کتاب مقدس نے سب کو گناہ کا ماتحت کر دیا تا کہ وہ وعدہ جو مسیح پر ایمان لانے پر موقوف ہے ایمان داروں کے حق میں پورا کیا جائے"۔ قیاس آسان ہے کہ تمام دنیا کی نیکیوں کے بعد بھی اگر خدا اپنے وعدہ کو ملتوی رکھ سکتا ہے اور خود پولس کے لفظوں میں: "یسوع مسیح پر ایمان لانے سے گناہ گار راست باز ٹھہرایا جانا" قرار پا سکتا ہے تو پیروان مسیحی کے لیے عمل خیر کی کوئی رغبت قطعاً فضول ہے۔ جب کہ محض ایمان لانا کافی ہے۔ ہر وہ شخص جس کو حق و باطل کے اِمتیاز سے محبت ہے عالم پر ایسے اصول کے اثر کو سمجھ سکتا ہے۔ ہم مُسلمان اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (۷۶:۳) (چاہے شکر کریں چاہے کفران کریں) کے قائل ہیں۔ جس کا بیں حس اور ادراک دونوں ہے۔ ہم میں اپنی آزادی اِرادہ اور اس لیے اس کے عمل کی ذمہ داری کا منصفانہ اقرار ہے۔ اسلام کو مذہب خوف کہنے والے اگر مُسلمانوں کے کسی ایسے مذہبی مجمع میں شریک ہوئے ہوتے جہاں کوئی واعظ خدا کی رحمتوں کا ذکر کرتا ہے اور سامعین اپنے مالک کے احسانوں کو سن کر

بے تاب ہو جاتے ہیں تو اسے یہ مذہب خوف مذہب محبت سے بدرجہا زیادہ مذہب محبت کجھ میں آجاتا۔
مسیحیت میں محض محبت کی تعلیم پر دوسرا مبالغہ شفیع مطلق کا تھا۔ مشکل سے یہ بات کجھ میں آتی ہے کہ اگر خدا کا آماج غضب (انسان) محض ابن مریم کی وساطت سے مغفرت پاسکتا تھا تو کیا ان کے قبل کے لوگ باوجود اپنی تمام نیکیوں اور ارادہ خیر کے عفو، رحمت اور مغفرت سے محروم رہے؟۔ مسئلہ شفاعت اپنی اس شکل میں انسانی اختیارات کے مسلوبیت کی دوسری صورت ہے۔ اور سب سے حیرت خیز تو کرنتھیوں کے نام یہ عبارت ہے کہ: "جب سب کچھ بیٹے کے تابع ہو جائے گا تو وہ خود اس کے تابع ہو جائے گا جس نے سب چیزیں اس کے تابع کر دیں"۔ انسانی تجربہ اور ضرورتیں خاص مواقع پر سفارش یا شفاعت کا خیال دلاتی ہیں لیکن اس کی تعمیم شفاعت کرنے والے کو نہ صرف غیر عادل بلکہ اصل کل خیر کی برباد کن قرار دیتی ہیں۔ ہو کہ خدا اپنے کسی پیارے بندہ کی سفارش اس لیے قبول کرے کہ اس نے اس کی راہ میں وہ ناگوار مصیبتیں اٹھائیں جس کا صلہ نہ صرف اس کا علوِ مرتبہ ہو، بلکہ یہ بھی ہو کہ وہ تمام عمر خطا کرنے والے بندہ کو بخش دے لیکن آیا ایسا بندہ ایسے خاطی بندہ کی سفارش کا موقع پائے گا۔ یہ ایک دوسری مشکل ہے۔ اور وہ کب اور کتنی مرتبہ اپنی نیکی اور خدمت کا واسطہ دیتا رہے گا؟ انبیاء اور ہادیین کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو اپنے حلقہ اطاعت میں اس لیے داخل کریں کہ داخل ہونے والوں کے اخلاق اور عادات درست کریں، اسے وہ فرائض بتائیں جو اس پر واجب ہونے چاہییں۔ اس کی کامیابی ان کی راحت اور اس کی ناکامی ان کا رنج ہے۔ یہ سوچنے کے بعد آیا قیاس اس کا مقتضی ہے کہ ایسا نبی اس کی سفارش کرے گا جسے وہ دیکھے کہ اس نے حلقہ اطاعت میں داخل ہونے کے بعد بہ استثنا داخلہ کے تمام برائیوں کا ارتکاب کیا جن سے بچنے کی ہدایت میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا گیا تھا۔ کجھ کے نزدیک نہ ایسے داخلہ کا اعلان اطمینان بخش ہے اور نہ داخل ہونے والے کی حرکت قابل تسکین جس کی غرض یہ تھی کہ وہ اپنے گناہوں کی گٹھڑی بھاری کرتا جائے۔ اس لیے کہ محض داخلہ اس کی جوانگی اور دھوڑا لنے کے لیے کافی ہے۔ مشکل سے کسی نبی کی اخلاقی شان ایسی شفاعت کی مرتکب ہو سکتی ہے۔ یہ ایسی ستی شفاعت چاہنے والوں کے لیے مزید دشواری ہے۔ وقت آگیا تھا کہ: وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۲: ۱۲۳) (ڈرو اس روز سے کہ نہ عوض ہو گا کسی کا کسی سے کسی چیز کے ساتھ اور نہیں قبول کیا جائے گا اور نفس سے کوئی عوض اور نفع نہ دے گی ان کو کوئی شفاعت اور نہ وہ یاری کیے جاویں گے) کا اعلان کیا جاتا۔

خدا کی بزرگی بیان کرنے کا حکم

اس بشیر و نذیر کو وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ کا حکم دیا گیا تھا۔ مشکل سے مکہ کی کوئی اونچی یا نیچی جگہ چھوٹی جہاں لوگ کسی درجہ کے دکھائی دیتے ہوں اور ہمارا ہادی قولوا لا الہ الا اللہ نہ کہتا ہو۔ کس حالت میں کہتا تھا؟ سوچو اور تائید الٰہی پر غور کرو۔ یہ بھی ظاہر کرنا مناسب موقع ہو گا کہ یہود ہوں، نصاریٰ ہوں یا کفار یہ اس گھر کے جسے وہ معبد قرار دیتے تھے اور کسی جگہ عبادت نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہوئی کہ جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا تو یہود طعن کرنے لگے اور ان سے کہا گیا: وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ (۲: ۱۱۵) (اور واسطے خدا کے ہے مشرق و مغرب پس جس طرف کہ متوجہ ہو تم پس وہ جہت ہے واسطے اطاعت خدا کے)

اسلام کا ذکر حسینؑ کے قربانگاہ کی تصویر کشی ہے

اسلام کے متعلق ضمنی مختصر اشاروں سے میں اس قربان گاہ کی تصویر کھینچ رہا ہوں جو اس قابل ہو سکتی کہ حسینؑ کا ایسا اشرف الشرفا اپنے اس پر چڑھا دیتا۔ یہ سوچنا شاعرانہ تخیل نہیں ہے کہ اگر حسینؑ دنیا کے سب سے بڑے شہید تھے تو ان کی وجہ شہادت بھی سب سے ممتاز ہونی چاہیے تھی۔ اور وہ یہ کہ اسلام جو مذاہب عالم پر ایک ترقی ہے، اس کی لطافت اور روح کے باقی رکھنے کے لیے حسینؑ اپنے کو قربان کرتے۔ گیا وقت کہ ابراہیم اور اسحاق کوئی پتھر خدا کی قربانی کے لیے مخصوص کرتے یا ابن مریمؑ کے لیے "یہودیوں کے بادشاہ" کا خطاب مصلوبیت کا ذریعہ ہوتا۔ اب وقت تھا کہ حسینؑ کل خیر یا عالم کے اصول خیر یا حدود الٰہی یا اسلام کو اپنی قربان گاہ بناتے۔ اور خود قربان ہوتے۔ حسینؑ اس کی شریعت کی لطافت اور روحانیت قائم رکھنے کے ذمہ دار تھے جو "بعثت لاتمم مکارم الاخلاق" (میں اس لیے مبعوث کیا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کردوں) فرماسکتا تھا۔

پہلی صدیقہ اور پہلا صدیق

وحی کے بعد نہ اب مجھے اس کی تفصیل کرنی ہے کہ کیونکر ہمارا ہادی حضرت خدیجہ کبریٰ کے پاس پہنچا اور کس عالم میں نہ مجھے یہ کہنا ہے کہ اگر عالم میں کس متنفس کو اسلام کا پہلا شرف حاصل ہوا تو وہ ہماری یہی صدیقہ تھی۔ جس کے بعد ہمارے سید اور آقا علیؑ بن ابی طالب کا نمبر تھا۔

دعوت اِسلام کے تین برس

رسولؐ تین برس تک دعوت اسلام فرماتے رہے اور اس زمانہ میں مکہ کے اکثر ممتاز لوگ جن کی تعداد کم وبیش سو کے قریب تھی ایمان لائے۔

دعوت ذوالعشیرہ چوتھے برس

چوتھا برس تھا کہ اسلام کے اعلان کے لیے مخصوص رسمی مجلس قرار دی گئی جو تاریخ اِسلامی میں "دعوت ذوالعشیرہ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مجلس اپنے موضوع کے لحاظ سے کیسی ہمت شکن تھی۔

ابولہب کے الفاظ

اس کے سمجھنے کے لیے ابولہب کے یہ الفاظ جسے میں "اکسیر التواریخ" سے نقل کرتا ہوں، کافی ہوں گے کہ:

"این سبب خواہد شد کہ جمیع مردم اطراف بر ما ہجوم آرند و قریش را طاقت مقاومت با تمام قبائل عرب نیست"

اس کی وجہ سے اطراف کے لوگ ہم پر حملہ آور ہو جائیں گے اور تمام عرب کے قبائل کا مقابلہ کرنے کی قریش میں طاقت نہیں ہے۔

لیکن ابولہب کے ایسے ہزار فقرے اسے بٹھا نہیں سکتے تھے جسے اپنے مالک کی طرف سے "قُم" کا حکم دیا گیا تھا۔

وصایت اور خلافت کا اِعلانؑ نبوت کے اِعلانؑ کے ہمرکابؑ

اٹھے، اعلان کیا اور بقول ابوالفدا فرمایا کہ: "جو شخص میرے کارِ ہدایت میں مدد دے گا وہ میرا خلیفہ اور وصی ہوگا"۔ بہادر اور عرب کے ممتاز لوگ بیٹھے تھے لیکن اس جرأت نمائی نے کسی کو ممتاز نہیں کیا کہ وہ مددگاری کا اعلان کرتا۔ اگرچہ تمام عرب اس کے دشمن ہو جاتے جس وقت مسن اور

تجربہ کار لوگ اعلان کی اہمیت پر غور کر رہے تھے رسولؐ کی گود کا کھلایا یہ بچہ جو اَب قریب سولہ برس کا ابھرتا ہوا نوجوان تھا اٹھ کھڑا ہوا، بیعت کی اور بکارِ رسالت میں مدد کا اعلان کیا۔ رسولؐ کی آنکھیں، چہرہ اور زبان سب بقول ڈیون پورٹ کہہ رہی تھیں کہ: "میرے بھائی اور وزیر کو دیکھ لو"۔ یا بقول ابوالفدا: "یہ میرا وصی اور خلیفہ ہے"۔ یا بقول روضۃ الصفا وغیرہ: "این برادر من است و وصی من سخن او را بشنوید و از فرمان او تجاوز منمائید"۔ عموماً یورپین مورخین جنھوں نے تاریخ اسلام لکھنے کی ضرورت بھی ہے اس حامی اسلام کے اس وقت کے اعلان کی عمدہ لفظوں میں تعریف کی ہے۔

خلیفہ بنانا خدا کے اختیار میں تھا

متذکرہ صدر سطروں کے سوچنے میں اور زیادہ لطف آئے گا جب ابن خلدون کے یہ فقرہ یاد رکھا جائے جو مشرکین قریش رسولؐ سے کہتے تھے کہ: "ہم اس شرط پر ایمان لائیں گے کہ ہم کو ملک و حکومت دے دو"۔ اور رسولؐ جواب دیتے تھے کہ: "یہ کام اللہ جلشانہ کا ہے مَیں وعدہ نہیں کر سکتا"۔ یا جیسا مترجم ابن خلدون نوٹ میں ابن اثیر سے نقل کرتا ہے کہ: جس وقت آپ نے بنو عامر کو دعوت دی تو کسی نے کہا کہ:

قریش کی خواہش ان کی طبیعت کا آئینہ ہے

"اگر ہم تمھاری متابعت کریں اور اللہ تعالیٰ ہم کو تمھارے مخالفین پر فتح یاب کرے تو کیا ہم کو اپنے بعد اپنا خلیفہ بناؤ گے؟"۔ آپ نے فرمایا: "یہ کام اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، جیسا وہ چاہے گا کرے گا"۔ اس شخص نے کہا: "یہ بہت درست ہے کہ اس وقت تو ہم تمھارے لیے اپنی گردنیں عرب کے سامنے کر دیں اور پھر جب تم کامیاب ہو تو دوسرے لوگ صاحب حکومت ہو جائیں"۔ یہاں مجھے یہ بتانے کی غرض تھی کہ "ذوالعشیرہ" میں رسولؐ کا اعلان حکم خدا سے تھا اور اگرچہ اس کی مخصوص غرض اعلان توحید اور نبوت تھا مگر آپ نے دیکھا کہ وصایت اور خلافت کا اعلان بھی ضروری سمجھا گیا۔

خلافت کے لیے مذہب فروشی پر تیار تھے

دوسری بات جو اس میں دیکھنے کی ہے وہ یہ کہ عرب کسی مذہب کے قبول کرنے کے لیے ایک باقاعدہ مالی مسئلہ پیش کرتا تھا۔ اس کے نزدیک مذہب ایسی چیز تھی جو روپیہ پر فروخت ہو سکتی۔ اس کی اور مثالیں بھی ہیں، جہاں بندۂ زر عرب پر شان و شوکت کا وہ اثر ہوا جو اثر ڈالنے والوں کے کام آسکتا تھا۔ مثلاً:

اور مثالیں

● دارالحکومت سے دور مقام کے لوگ جب معاویہ کے دربار میں پہنچے تو وہاں کی آرائشیں دیکھ کر کسی نے کہا: "السلام علیک یا رسول اللہ"۔ جس پر امیر شام کو مسکرا دینے کی ضرورت ہوئی۔

● یا جیسا ملا جامی شواہد النبوۃ میں ایک عرب شیخ عارف کا ذکر کرتے ہیں جسے اپنا اُونٹ خدا سے زیادہ پیارا تھا۔

● یا جیسا روضۃ الصفا میں ایک لطیفہ ہے جسے میں ناظرین کی دلچسپی کے لیے لکھ دیتا ہوں: مہدی عباسی ایک روز شکار میں گیا بھوک اور پیاس سے بے تاب ہو کر یہ ایک اعرابی کے جھونپڑے میں گھس گیا اور اس سے اپنی حالت بیان کی۔ غریب اعرابی نے جو کچھ اس کے پاس موجود تھا حاضر کیا۔ اس میں ایک قدح شراب بھی تھا۔ خلافت مآب نے چند گھونٹ نوش فرمانے کے بعد سرور میں اعرابی سے پوچھا: "مجھے جانتا ہے؟"۔ جواب دیا: "نہیں"۔ کہا: "مَیں امیر کا خادم ہوں"۔

چند گھونٹ اور ملاحظہ فرمانے کے بعد: "مجھے پہچانتا ہے؟"۔ جواب دیا: "آپ امیر کے خادم ہیں"۔ کہا: "نہیں میں مصاحب ہوں"۔ چند گھونٹ اور ملاحظہ فرمانے کے بعد: "مجھے جانتا ہے"۔ جواب دیا: "حضور نے ابھی فرمایا ہے کہ آپ امیر کے مصاحب ہیں"۔ کہا: "نہیں میں خود امیر ہوں"۔ یہ سن کر اعرابی نے کاسہ سامنے سے اٹھالیا اور کہا: "اس کے بعد اب رسالت اور الوہیت کا درجہ باقی ہے"۔ مہدی ہنس دیا۔ اتنے میں اُس کے متلاشی خدام بھی پہنچ گئے، اور مہدی نے اعرابی کو انعام دیا۔ انعام پاکر اعرابی نے کہا: "میں نے چوتھے اور پانچویں دعویٰ کو بھی قبول کیا"۔

● بعض تھے جو یہ کہتے تھے کہ: "اگر تم نبی ہوتے تو اس طرح زمین پر پاؤں گھسیٹتے نہ چلتے"۔

ان مثالوں کی غرض

یہ مثالیں عرب کی اس شاخ طبیعت کو کافی حد تک سمجھائیں گی۔ ورنہ یہ آسانی سے سمجھ میں نہ آئے گا کہ کیونکر سنان بن انس ملعون یہ شعر پڑھ سکتا تھا کہ:

اوقر رکابی فضة و ذهباً   انی قتلت السید المحجبا

جس کا ذکر آنے والا ہے۔ رسولؐ حیرت ناک طریقہ سے فقرا میں تقویٰ سے اِستغنا پیدا کر کے حرص اور طمع کو قابو میں رکھنے کی تعلیم میں بھی کامیاب ہوئے۔ اس کے سمجھنے کے لیے ان دو زمانوں کی روش پر غور کرو: ● جب تک رسولؐ کی عادلانہ معلمت کے لوگ تابع رہے، اور ● جب اِمتیاز کے خوگر ہو گئے۔

ہجرتِ حبشہ

"دعوتِ ذوالعشیرہ" کے بعد یعنی مُسلمانوں کے ہجرتِ حبشہ کے زمانہ تک قریب دو سو سمجھ دار لوگوں کے اصولِ اسلام کے پیرو ہو چکے تھے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا تھا رسُولؐ کا جوشِ ہدایت بڑھتا جاتا تھا۔ اور اسی طرح کفارِ قریش کا جوشِ مخالفت بسر کردگی ابولہب اور ابوسفیان زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ مومنین کفار کی اذیتیں سہتے تھے اور صبر و رضا کے ساتھ اپنی تسکین روحانی پر قائم تھے۔ یہاں تک کہ تہتّر یا چوراسی کے قریب آدمیوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم ملا۔ اس قافلہ کے سردار حضرت جعفر بن ابی طالب تھے۔ قریش اس پر بھی رضامند نہ تھے کہ وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں عرب کے باہر بھی آرام سے رہ سکیں اور اس غرض سے کہ نجاشی انہیں عرب میں پھر واپس کر دے کہ ان اہلِ ایمان کے ساتھ یہ لوگ اپنی خواہش کے موافق برتاؤ کر سکیں۔

عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ربیعہ کی قبل الاسلام ایک کوشش

قریش نے دو شخصوں کو منتخب کیا، جنھوں نے اسلام کے پولٹیکل اقتدار کے زمانہ میں نہ صرف نام اور شہرت حاصل کی بلکہ اہلِ بیتِ نبوت کے حقوق کو نقصان پہنچانے میں نہایت ممتاز ہوئے۔ ان میں سے ایک عمرو بن عاص تھے جن کی قرآن اور نیزے کے ربط یا حکم کی کارروائی مشہور ہے۔ اور دُوسرے عبداللہ بن ابی ربیعہ جنھوں نے عثمان کے خلیفہ منتخب ہونے میں عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی تائید کی تھی۔ ان دونوں نے تحفہ اور تحائف کے ساتھ حاضر ہو کر جعفر اور ان کے گروہ کے اخراج کی خواہش کی۔ نجاشی نے حضرت جعفر بن ابی طالب سے حالات پوچھے اور انھوں نے جو کچھ فرمایا وہ نہ صرف اگلی حالت کا موجودہ حالت سے مقابلہ تھا، بلکہ دینِ اسلام کا خلاصہ تھا۔ نجاشی نے قریش کے تحائف واپس کر دیے اور مہاجرین کو رہنے کی اجازت دی۔ یہ پہلی ہجرت تھی جو اہلِ اسلام میں اپنے دشمنوں کے خوف سے واقع ہوئی۔

عامہ قریش کا تصفیہ قتل رسولؐ کے لیے

قریش کو جب معلوم ہوا کہ حبشہ میں ہماری کوشش بے سود ہوئی تو انھوں نے ایک بڑی صحبت میں یہ طے کیا کہ جس طرح بنے ہم لوگ محمدؐ بن عبداللہ کو قتل کریں۔ ان کا یہ تصفیہ ابوجہل کے اس اعلان کے بعد تھا کہ جو محمدؐ کو قتل کرے گا ہم اسے سو اُونٹ اور ہزار اوقیہ سونا دیں گے۔ اور اس کے لیے وہ آمادہ ہوئے جنھیں تاریخِ اِسلام کو خلیفہ ثانی دیکھنا تھا۔ لیکن اِسلام ان کے بُرے اِرادہ پر غالب آیا۔

مختصر جماعت کے لیے کسی ایک فرد کا داخلہ بھی موجبِ مسرت ہوتا ہے

اس وقت اسلامی جماعت اس قدر مختصر تھی کہ اس میں کسی ایک فرد کا داخل ہونا بھی اس چھوٹی سی جماعت کے لیے بڑی خوشی کا باعث ہوتا تھا۔ میرے لیے یہ عجب کی بات نہیں ہے کہ اس شخص کے داخلِ اسلام ہونے پر معمول سے زیادہ خوشی کی گئی ہوگی جس نے شارع کے قتل کا ٹھیکا لیا تھا۔ یا خود ہادی نے اِرادۂ قتل رکھنے والے سے اپنے حلقہ اِطاعت میں داخل ہونے کا اقرار سن کر اللہ اکبر فرمایا ہوگا۔

حضرت ابوطالب قریش کا ارادہ سن کر طریقۂ محافظت پر غور کرتے ہیں

حضرت ابوطالب کو جس وقت قریش کے اِس تصفیہ کی خبر معلوم ہوئی تو آپ نے بھی مع حضرت نبوی کے طریقۂ حفاظت پر غور فرمانا شروع کیا۔ اس مشورت میں حضرت حمزہؓ، عباس اور دیگر بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب بھی تھے۔ جناب رسالت مآب نے فرمایا: "ہمارے اقربا اور مددگاروں کے مکان مشرکین مکہ کے درمیان پراگندہ ہیں۔ اس صورت میں ہم لوگ اپنی حفاظت نہیں کرسکتے۔ مناسب ہوگا کہ ہم سب لوگ کسی ایک جگہ کو اپنی پناہ قرار دیں۔ جب تک خدا ہم میں اور ہماری قوم میں کوئی تصفیہ نہ کرے"۔ یہ رائے پسند کی گئی۔

شعبِ ابوطالب

سب نے مکہ سے کوچ کیا، اور شعب ابوطالب میں پناہ لی۔ حضرت ابوطالب نے درہ کی محافظت کی اور تمام کمزور اور حملہ کے قابل مقامات پر پہرہ والے مقرر کیے اور خود اکثر اوقات مع اپنے فرزند علیؑ بن ابی طالب کے مسلح رہتے تھے۔

بنی ہاشم سے معاملت اور معاشرت ترک کی گئی جس سے آب و دانہ کا قحط ہوا

یہ دیکھ کر قریش نے ایک دوسرے جلسہ میں یہ طے کیا کہ بنی ہاشم سے ہر قسم کی معاملت اور معاشرت ترک کی جائے اور کسی طرح آب و آذوقہ ان تک نہ پہنچنے پائے۔ اس وقت کی حالت کو صاحب "سیر الائمہ" نہایت خوبصورت اور قابلِ تعریف روش میں ظاہر کرتا ہے۔ جسے میں ناظرین کی پسندیدگی کے لیے پیش کرتا ہوں:

نبی کی قوتِ تصرف:

مدت سہ سال کار بدیں گونہ رفت و ابوطالب و یاران آں حضرت در حفظ و حمایت او دقیقہ غفلت نمی نمودند و بہ آں عزت کہ در بزرگان عرب داشتند این ہمہ ذلت و خواری را تحمل نمودند و چناں عشق

و ارادت پیغمبر در دلہائے ایشان جائے گیر شدہ بود کہ بایں ہمہ زحمات و ظلمات ہیچ از برائے ایشان کلالت و کسالتی در ہواداری پیغمبر روی نمی داد چون شخص عاقل در این امور تامل کند جز قوت تصرف پیغمبر در قلوب آن مردم چیزے نخواہد دید و چوں در قوت تصرف او غور کند خواہد دانست کہ این تصرف از دو جہت است یکے حسن اخلاق و یکی قوت تاثیر کلام کہ ہرچہ می فرمود چنان مبنی بر عقل بود کہ در قلوب ہوش مندان کالنقش فی الحجر جائے گیر میشد و ہیچ اغراض شخصیہ از فرمائشات او فہم نمی کردند جز خیر بندگان خدا و تربیت ایشان و این مردی کہ بر آن حضرت دل نہادہ بودند ہمگی مردم باعقل بودند"۔

ترجمہ تین سال کام اسی طرح چلتا رہا۔ ابوطالبؑ اور آپؐ کے مددگار آپؐ کی حفظ و حمایت میں کوئی غفلت نہ کرتے اور باوجودیکہ عربوں کے بڑوں میں بہت معزز شمار ہوتے تھے یہ سب ذلت و خواری برداشت کی اور پیغمبرؐ سے عشق و عقیدت انکے دلوں میں راسخ تھی کہ ان سختیوں اور تھپیڑوں کی وجہ سے پیغمبرؐ کے ساتھ محبت میں کوئی کمزوری یا سستی نہیں آئی تھی۔ اگر عقل مند شخص ان باتوں میں غور کرے گا تو دیکھ لے گا کہ ان لوگوں کے دلوں پر پیغمبرؐ کو قوت تصرف حاصل تھی۔ اس قوت تصرف میں غور کرے گا تو جان لے گا یہ تصرف دو وجہ سے ہے۔ ایک حسن اخلاق اور دوسرا کلام میں قوی اثر کہ جو کچھ بھی فرماتے تھے اس طرح مبنی بر عقل ہوتا تھا کہ صاحب ہوش لوگوں کے دل میں پتھر پر لکیر کی طرح نقش ہو جاتا تھا۔ اس سے آپ کی کوئی شخصی غرض مفہوم نہیں ہوتی تھی، سوائے اللہ کے بندوں کی بھلائی اور تربیت کے۔ یہ لوگ جو حضور کو دل دیے بیٹھے تھے سب صاحب عقل تھے۔

اس ناگوار حالت میں تین برس گزر گئے۔ علامہ مجلسی فرماتے ہیں کہ اکثر اوقات کھانے پینے کی چیزیں اس قدر نایاب ہو جاتی تھیں کہ بنی ہاشم کے بچے بے چین ہو جاتے تھے اور اکثر محاصرہ کرنے والے ان کے رونے کی صدا سنتے تھے۔ یہ پہلا محاصرہ اور پہلا موقع تھا جہاں آلِ ہاشم پر آب و دانہ بند کیا گیا تھا۔

بُرائی نے اپنے کو بُرائی ثابت کیا

اس کے بعد روسائے قریش نادم ہوئے اور ان میں سے پانچ نے جا کر خانہ کعبہ میں اپنے پیشتر کے عہدنامہ سے بیزاری ظاہر کی اور قریب قریب سب نے ان کا ساتھ دیا۔ حضرت ابوطالب کو خبر دی گئی۔ لوگ محاصرہ سے نکلے۔ مہاجرین حبشہ کو جب معلوم ہوا کہ قریش کا جوش عداوت کم ہو گیا تو یہ لوگ بھی واپس ہوئے اور اپنے ہادی کی زیارت سے تسکین اور مسرت حاصل کی۔

دعوتِ اسلام کا مختلف طبائع پر اثر

ہمارا ہادی پھر کھڑا ہوا۔ لغایت اسلام کے لیے ہر وضیع و شریف اس کے نزدیک مساوی اور عبدِ خدا تھا۔ کبھی سوق

عکاظ میں تھے تو کبھی ذوالمجاز میں اور کبھی حجر اسماعیل پر کھڑے ہوتے۔ آنے جانے والوں کو بلند آواز سے خدا کی طرف پکارتے تھے۔ کچھ مسخراپن کرنے والے، توہین و تضحیک کرتے تھے۔ اور باتوں کو بغیر سنے اور سمجھے ہوا میں اڑانا چاہتے تھے اور کچھ تھے جو خاموش کھڑے رہتے تھے۔ سنتے تھے، دیکھتے تھے کہ الفاظ دل میں گھسے جاتے ہیں اور ان کی بہترین تجزیہ کر رہی ہے کہ یہ کہنے والا سچ کہہ رہا ہے۔ کچھ اسلام قبول کرتے تھے اور جو اقرار بھی نہ کرتے تھے، وہ رسولؐ کے الفاظ وزن طرز کلام، صفائی نفس اور تعلیم کی خوبی کا اثر لے کر واپس جاتے تھے اور اطراف و جوانب میں ان کی بزرگی، عقل، فصاحت، خوبی اور سچائی کی شہرت ہو رہی تھی۔

مدینہ کے چھ متلاشی

زمانہ حج آ گیا، دور دور سے لوگ جمع ہوئے اور نقیب خدا نے اپنے سننے کے لیے آدمی پائے۔ ایک نہایت مفید امر کی ابتدا ہوئی۔ وہ یہ کہ رسولؐ کی شہرت سن کر مدینہ کے چھ آدمی دریافت حال کے لیے آئے۔ یہ لوگ قبیلہ خزرج کے تھے۔ یہ لوگ کچھ احکام اور آیات قرآنی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ مدینہ میں لوگوں کو دکھلانا شروع کیا۔ اور اب لوگ متواتر مدینہ سے مکہ آنے لگے۔

اسلام کا مشنری

یہاں تک کہ حضرت کو تعلیم اسلام کے لیے مصعب بن عمیر بن ہاشم بن عبد مناف کو بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ غالباً یہ اسلام کے پہلے مشنری تھے۔ حیرت خیز سرعت سے اسلام اہل مدینہ میں پھیلنے لگا اور باشندگانِ چند قریب قریب کل مسلمان ہو گئے۔

ایسی جگہ اسلام کی اشاعت جہاں اسلام کا کوئی سیاسی اقتدار نہ تھا

سوچنے کی بات ہے کہ نہ مدینہ میں کوئی تلوار بھیجی گئی تھی اور نہ کوئی ایسی ذات روانہ کی گئی تھی جو خوف دلاتی ہو یا جس کی مدد کے لیے عقب میں تلواریں اور نیزے ہوں اور لوگ مرعوب ہو کر دین میں داخل ہو گئے ہوں۔ بلکہ اسلام کا سادہ، صاف اور فطری اصول تھا جس نے ہر دلعزیزی پیدا کی۔ یہ حالت یقیناً یوشع بن نون، اشوک اور قسطنطین کے رشک کے قابل تھی۔

کوہ صفا سے دعوت

یہی یا اس کے قریب کچھ پیشتر کا زمانہ تھا کہ بقول علامہ مجلسی زمانہ حج میں کوہ صفا کے اوپر سے حضرت نے حاجیوں کو دین کی دعوت دی۔ مشرکین قریش پہاڑی کے گرد جمع ہو گئے اور پتھر پھینکنے لگے۔ حضرت اسے چھوڑ کر کوہ مروہ پر گئے اور مشرکین یہاں بھی ساتھ ساتھ پتھر پھینکتے ہوئے آئے۔ کوئی پتھر فرق مطہر پر لگا اور خون جاری ہوا۔ اسے بھی چھوڑ کر حضرت کوہ ابو قبیس پر تشریف لے گئے۔ لیکن مشرکین پیچھے پیچھے رہے اور ایذا رسانی کی فکریں کرتے رہے۔

علیؑ اور خدیجہؑ دیکھتے ہیں

حضرت خدیجہؑ اور علیؑ بن ابی طالب علیہ السلام کو یہ خبر معلوم ہوئی، آئے، دیکھا کہ کوہ ابو قبیس پر آفتاب رسالت چمک رہا ہے۔ وحدانیت خدا اور اپنی نبوت کا اعلان ہے اور گرد پہاڑ کے مشرکین ہیں۔ کچھ اوپر چڑھتے جاتے ہیں اور اس فکر میں ہیں کہ قریب پہنچ کر ایذا دیں۔ شام کی تاریکی پھیلنے لگی اور ہمارا ہادی کسی طرح زغہ اعداء سے نکل کر گھر تشریف لایا۔ مشرکین یہاں بھی پہنچے اور گھر پر پتھر پھینکنے لگے۔

کفارِ قریش نے حضرت خدیجہؓ کا احترام کیا

یہاں تک کہ رحمۃ للعالمین نے انھیں مخاطب کر کے فرمایا کہ: "اے قریش تمھیں شرم نہیں آتی کہ تم اپنی نجیب ترین عورت کے گھر میں پتھر پھینکتے ہو"۔ یہ سن کر قریش کو شرم آگئی حمیت اور نجابت کا خیال کیے واپس گئے۔

مشرکین کب زیادہ دلیر ہوئے

سردار عرب حضرت ابوطالبؑ اور ملکہ عرب حضرت خدیجہؑ کی رحلت سے مشرکین قریش جناب رسالت مآبؐ کو اذیتیں پہنچانے میں اور دلیر ہوگئے۔ دوبارہ عہد لیے گئے، جن میں ابوسفیان نہایت پیش پیش تھا۔

ہادیؐ کی حالت

ان لوگوں نے راستہ میں کانٹے بچھانے اور پتھر پھینکنے میں اپنی عورتوں اور بچوں کو بھی شریک کرلیا۔ اور خود استہزاء کے لیے ہر جگہ موجود رہنے لگے۔ یہ بھی ہوا کہ نفاست پسند ہادی پر اوجھڑیاں پھینکی گئیں۔ اور پیچھے پیچھے سیٹی بجائی گئی۔ کبھی سرِ اقدس سے خون بہا تو کبھی تلوے زخمی ہوئے اور کبھی ایڑیاں لہو سے تر ہو گئیں۔

مدینہ کی ہجرتؐ

خدا خدا کر کے یہ زمانہ بھی گزرا لیکن نہ مومنین کے ایمان میں وحشیانہ مظالم سے کوئی لغزش ہوئی اور نہ مشرکین کی اذیتیں ہادی کے جوش کو کم کرسکیں۔ یہاں تک کہ مدینہ میں اسلام شائع ہوا، اور اہلِ مدینہ نے خواہش ظاہر کی کہ نبی خدا اور ان کے مکی پیرو مدینہ چلے آئیں۔ وہاں کے مسلمین ان کی ہر طرح کی حفاظت کریں گے۔ کل مسلمانوں کا یک جسم جانا ممکن نہ تھا۔ رفتہ رفتہ لوگ جانے لگے اور اہلِ یثرب نے ان کی مدارات میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔

رسولؐ کے سرِ اقدس کے لیے دوبارہ انعام مشہور کیا گیا

مشرکین کو خبر معلوم ہوئی اور اس مرتبہ وہ نئے جوش سے ان کے قتل [illegible] آمادہ ہوئے۔ اور دوبارہ رسولؐ کے سرِ اقدس کے لیے انعام کا اعلان کیا گیا۔ لیکن خداوند تعالیٰ ہمارے سید کو دشمنوں کے درمیان سے محفوظ نکال لے گیا۔ اور محفوظ مدینہ پہنچا دیا۔

وطن سے ہجرتؐ کے وقت کیا فرمایا

مؤثر ہے مناہج النبوۃ کی یہ روایت کہ حضرت مکہ معظمہ سے نکلتے وقت حزورہ پر کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ واللہ تو زیادہ محبوب ہے میرے نزدیک خدا کی زمینوں میں اگر تیرے اہل مجھ کو باہر نہ نکالتے۔

بسترِ رسولؐ پر قتل ہوجانے کے لیے علیؑ خلیفہ تھے

کون نہیں جانتا کہ رسولؐ خطرہ کے موقع پر اپنا کوئی قائم مقام بجز علیؑ کے نہ پاتے تھے کس نے نہیں سنا کہ علیؑ ان تلواروں کی چھاؤں میں سوئے جو رسولؐ کے قتل کے لیے کھینچی گئی تھیں۔ بسترِ رسولؐ پر سوئے جہاں رسولؐ کے دھوکے میں شہید ہوجاسکتے تھے۔ ڈیون پورٹ نے بہترین الفاظ میں خاکہ کھینچا ہے اس وقت کا جب کہ مشرکین کچھ تو دیوار کے قریب سے دیکھ رہے تھے کہ رسولؐ سو رہے ہیں اور کچھ گھر میں داخل ہوئے کہ کام

تمام کر دیں: "لیکن بجائے اپنے شکار کے نوجوان علیؑ کو متانت اور تسلیم و رضا سے اس موت کا منتظر دیکھا جوان کے سردار کے لیے تجویز کی گئی تھی۔ اس قدر اخلاص نے ان خونیوں میں رحم پیدا کیا اور علیؑ سے تعرض نہ کیا گیا"۔ سچ کہتا ہے صاحبِ مناہج النبوت کہ: "جناب ولایت مآب اول ہیں اس شخص کے جس نے فدا کیا اپنی جان کے تئیں اور بیچا اپنے تئیں راہ محبت میں رسولؐ خدا کی یہ آیت اس جناب کی شان میں اس باب میں نازل ہوئی ہے کہ: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ (۲: ۲۰۷) (مردوں سے وہ شخص جو بیچتا ہے اپنی ذات کو خدا کی طلب خوشنودی میں اور خدا مہربان ہے ان بندوں پر جو اس کی طلب رضا میں اپنی جان فدا کرتے ہیں)

باپ اور بیٹے کی ہم معنی شاعری

ایک وقت تھا کہ حضرت ابوطالب فرماتے کہ:

و اللہ لن یصلوا الیک بجمعھم　　حتی او سد فی التراب دفینا

(قسم ہے خدا کی کہ وہ سب مل کر بھی تیرا کچھ نہیں کر سکتے جب تک میں زیر خاک مدفون نہ ہو جاؤں)

اب وقت تھا کہ وہ جوان کے بعد محافظ تھا یہ کہتا تھا کہ:

اردت بہ نصر الالہ تبتلا　　و اضمرتہ حتی اوسد فی قبر

(یہ میں نے ہر چیز سے قطع نظر کر کے محض خدا کے دین کی امداد کی نیت سے کیا اور آخر بھی یہی ٹھان لی ہے جب تک کہ قبر میں تکیہ لگا کر نہ لیٹوں)

قتل کرنے والا نیزہ استقبالی نشان بن گیا

● سراقہ کی روایت مشہور ہے کہ کیونکر وہ انعام کے لالچ میں رسولؐ کا تعاقب کرتا رہا، کس طرح وہ مجبور ہو گیا، اور رسولؐ نے اس کی جان بخشی فرمائی۔ ● اسی طرح بریدہ بن الخصیب اسلمی ستر آدمیوں کے ساتھ تلاش کرتا رہا تھا۔ لیکن رسولؐ کے کلام نے اسے بھی غلام بنا لیا اور اب اس نے بجائے اس کے کہ نیزہ کا وار کرتا نیزہ میں اپنی پگڑی باندھ کر نشان بنایا اور رسولؐ کے آگے آگے مقدمہ لشکر کی طرح ہمراہ چلا۔

رسولؐ کی خبر آمد سن کر اہلِ مدینہ کا اشتیاق اور استقبال کا بے پناہ جوش

اہل مدینہ ایک زمانہ سے منتظر تشریف آوری تھے ان دنوں زیادہ خبر گرم تھی کوئی دروازہ پر بیٹھا رہتا تھا کچھ لوگ بلندیوں سے دور دور نگاہ دوڑاتے تھے کہ ایک روز انھیں کچھ آثار معلوم ہوئے اور دفعۃً سبھوں نے "رسولِ خدا آ گئے" کا نعرہ بلند کیا۔ جوق جوق لوگ گھروں سے نکلے۔ عورتیں اور بچے بھی ساتھ ہو لیے۔ ہر شخص ناقہ کی مہار اپنے گھر کی طرف کھینچتا تھا کہ مکہ کا جلاوطن ہمیں سرفراز کرے۔ خبریں کہتی ہیں کہ سوار خوشی میں نیزے ہلانے لگے۔ کوئی گھوڑا دوڑانے لگا اور بنی نجار کی لڑکیاں دف پر یہ شعر گانے لگیں:

نحن جوار من بنی النجار　　یا حبذا محمد من جار

(ہم بنی نجار کے ہمسایہ ہیں، خوشا وہ جس کا ہمسایہ محمدؐ ہو)

انصار کی بیبیاں اپنے محلوں میں بلندیوں پر کوٹھوں پر کھڑی ہوئی کہہ رہی تھیں کہ:

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع　　وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع

(ہم پر بدر طالع ہوا وداع والی گھاٹیوں سے ہم پر شکر واجب ہو گیا جب تک کوئی ایک بھی اللہ کو پکارنے والا پکارتا رہے گا۔

عجب نہیں ہے کہ اہل یثرب کے اس پر محبت استقبال سے رسولؐ کا دل بھر آیا ہو۔ کبھی رسولؐ کو قوم کا جذبۂ غیظ دور کرنا تھا کہ حجر اسود کو ایک چادر میں رکھ کر اس کا گوشہ ہر قبیلہ کے سرداروں کے ہاتھ میں دیدیتے' آج جذبۂ شوق اور محبت کو سدھارنا تھا کہ وہ آئندہ رشک اور حسد نہ پیدا کرے۔ بلانے والوں سے ارشاد فرمایا کہ میرا ناقہ جس جگہ ٹھہرے گا میں وہیں فروکش ہوں گا۔ ناقہ ابوایوب انصاریؓ کے گھر کے قریب ٹھہرا اور کسی کو اس تصفیہ پر عذر نہ ہوا کہ نبی خدا ابوایوبؓ کے گھر تشریف لے جاتے۔

علیؑ کی ہجرت ادائے خدمت بھی تھی

اس کے بعد کوئی کہتا ہے کہ رسالت مآبؐ نے اپنے آزاد غلام زید بن حارثہ اور ابورافع کو مکہ بھیجا کہ حضرت فاطمہؑ اور ام کلثومؑ و سودہؓ بنت زمعہ وغیرہ کو لے آئے۔ اور کوئی کہتا ہے کہ حضرت نے ابوواقد کی معرفت اپنے جان نثار کو مدینہ چلے آنے کا حکم بھیجا۔ میں آخر الذکر روایت کو زیادہ صحیح سمجھتا ہوں۔ فطری ہے یہ امر کہ جس خوف کے عالم میں سرورِ عالم روانہ ہوئے تھے یا جس عالم میں مرتضیٰ کو چھوڑ گئے تھے' اس کی ایک دوسرے کو خبر دی جاتی' یا یکجائی کا موقع تلاش کیا جائے۔ جناب سرورِ کائنات اپنی دختر نیک اختر کو پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ حضرت فاطمہ بنت اسد بھی ابھی مکہ میں تھیں اور بجز علیؑ کے ان کے کل فرزند مدینہ روانہ ہو چکے تھے۔ فاطمہ بنت زبیر اور ام ایمن بھی مکہ تھیں' جن میں آخر الذکر بوجہ اس کے کہ ماں تھیں اسامہ بن زید کی' ان کی کفالت اسی گھر سے متعلق تھی۔ یہ حالات مقتضی تھے کہ کوئی معتبر شخص ان لوگوں کی حفاظت کے لیے مکہ رہتا' اور پھر مدینہ اپنے ہمراہ لے جاتا' اور انھیں جناب رسالت مآبؐ کے پاس پہنچا دیتا۔ علیؑ مخدرات کی حفاظت اور امانتوں کی واپسی کے لیے پیچھے چھوڑے گئے تھے۔ جیسا سواعق محرقہ کی اس حدیث سے واضح ہو گا کہ:

"روایت کرد احمد و ترمذی و نسائی و ابن ماجہ از حبشی بن جنادہ کہ گفت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

"علیؑ منی وانا من علیؑ ولا یودی عنی الا علیؑ"۔

علیؑ از من است و من از علیؑ و ادای امانات نکند از جانب من مگر علیؑ"۔

علیؑ مجھ سے ہیں اور میں علیؑ سے ہوں۔ میری طرف سے امانت کوئی نہیں ادا کرے گا مگر علیؑ۔

اور اس فرض کی انجام دہی کے بعد مکہ میں انھیں قیام کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس صورت میں ابوواقد ہو زید بن حارثہ ہو یا ابورافع ان میں کسی کا بھیجا جانا مبنی تھا محفوظ پہنچنے کی اطلاع پر۔ ظاہر ہے کہ اگر اہل یثرب رسولؐ کا خیر مقدم ویسا نہ کرتے جیسا تھا یا رسولؐ ان کے اخلاص میں مشتبہ ہوتے تو ہرگز عورتوں کو نہ بلاتے۔ ان آدمیوں کا دوسرا کام یہ تھا کہ یہ دو اونٹ اور پانچ سو درہم لائے تھے۔

کفار نے راستہ روکا

علیؑ نے سامان سفر درست کیا اور تمام آدمیوں کو ہمراہ لے کر مدینہ طیبہ روانہ ہوئے۔ راستہ اس لحاظ سے مخدوش تھا کہ دشمن کا کسی شرارت پر آمادہ ہونا بہت ممکن تھا۔ اسی لیے ابوواقد اونٹوں کو تیز لے جا رہا تھا۔ اس جگہ حضرت علیؑ مرتضیٰ کا یہ قول ہم تک پہنچا ہے کہ:

"اے ابوواقد عورتوں کے ساتھ مدارا کر اور ان کے اُونٹوں کو آہستہ لے چل کہ وہ کمزور ہوتی ہیں" یہ بھی خبر ہے کہ آٹھ کفاروں نے راستہ روکا، اور علیؑ نے حارث بن امیہ کے غلام کا شانہ زخمی کیا، اور اس کے بعد کفار بھاگ گئے۔

علیؑ کی آبلہ پائی اور رسولؐ کے دستِ اقدس

اس کے بعد بقول صاحب منائح النبوۃ: "روضۃ الاحباب والا کہتا ہے کہ علیؑ مرتضیٰ مکہ سے پیادہ براہ چل کر مدینہ میں حضرتؐ کے پاس آئے اور اس جناب کے دونوں پاؤں میں پیادہ چلنے سے چھالے پڑ گئے تھے۔ حضرتؐ نے اپنا دستِ مبارک ان کے پاؤں پر ملا"۔

قبل الاسلام مدینہ کا نظام حکومت

رسولؐ کی تشریف آوری کے قبل مدینہ میں کوئی باقاعدہ انتظام نہ تھا۔ قبیلہ اور فرقہ بندی کی حکومت تھی اور وہ اس خوف سے کبھی خالی نہ تھے کہ مبادا ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ سے کوئی وجہ پرخاش پیدا ہو جائے اور آپس میں کشت و خون جاری ہو اور ایک دوسرے کے حلیف فرقے ایک دوسرے کی مدد کر کے اچھی خاصی مخالف جماعتیں تیار کر دیں۔ دو بڑے قبیلے جن کا نام اوس اور خزرج تھا، ایک دوسرے کے دشمن چلے آتے تھے اور کوئی صورت آپس میں اتحاد اور اتفاق کی نظر نہ آتی تھی۔ جناب رسالت مآبؐ کی قوی ذات اور عادلانہ اصول نے وہ تمام امتیاز جو سردار ان قبیلہ کو حاصل تھے شکست کر دیے اور جس قدر مدنی مُسلمین تھے سب کو انصار کا خطاب عطا فرمایا۔ وہ لوگ جو مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تھے مہاجرین کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ حضرتؐ کی ذات کو مہاجرین ہوں یا انصار ہر حالت میں اپنا رہنما سمجھتے تھے اور بقول سید امیر علی صاحب: "اب آنجنابؐ صرف ایک واعظ ہی کی حیثیت میں نہ تھے بلکہ لوگوں کے چیف مجسٹریٹ بھی تھے جو اپنے مجمعوں میں اصحاب کبار کو مدعو کرتے تھے اور شہر کی حفاظت آنجنابؐ کے ذمہ کر دی تھی آنجنابؐ کا فرض فتنہ فرو کرنا، اور سازش سے بچانا تھا"۔ (تاریخ الاسلام ترجمہ ہسٹری آف سارا سینس)

ذاتِ اقدس نبویؐ کا یہ اثر ہوا کہ کشت و خون، فتنہ و فساد سب رفع ہو گیا، اور تمام لوگ صرف ایک دھن میں تھے کہ کس طرح اسلام سیکھیں اور کس طرح اس پر عمل کریں۔ اور اس اثر اور یکساں جوش کا نتیجہ تھا کہ ایک روش اور ایک خیال کے لوگوں میں ایک جذبہ محبت اور برادرانہ اخلاص پیدا ہو گیا تھا۔

مکہ اور مدینہ میں جنگ کے اسباب جمع ہو رہے تھے

مدینہ تجارت کے لحاظ سے مکہ کا رقیب شہر تھا اور بقول سید امیر علی صاحب جیسا وہ تاریخ اسلام میں فرماتے ہیں: "اہلِ مکہ اہلِ مدینہ کے برخلاف سخت برافروختہ تھے کہ انھوں نے کیوں آنحضرتؐ اور اصحابِ کبار کو جنھیں وہ باغی خیال کرتے تھے پناہ دے رکھی ہے۔ ان کے اور اہلِ مدینہ کے درمیان لڑائی اٹل تھی"۔

اس کے علاوہ مشرکین مکہ نے ان مُسلمانوں کو اذیتیں پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا جو مکہ میں رہ گئے تھے اور بوجوہات مدینہ کی طرف کوچ نہ کر سکے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ مشرکین نے یہ بھی روش اختیار کر لی تھی کہ وہ جہاں جاتے تھے غلط افواہیں مشتہر کرتے تھے۔ جس سے ہدایت کی راہ کے مسدود ہونے کا اندیشہ تھا۔ اور سب سے زیادہ عملی مخالفت

یہ ہوئی تھی کہ مشرکین قریش کے قافلہ نے مہاجرین کے اُونٹوں کو لوٹ لیا۔

اِسلام کی اِشاعت کے خلاف وصیت اور ضمانت

ان کی عداوت کا درجہ اس مثال سے سمجھ میں آئے گا کہ ولید بن مغیرہ (خالد کا باپ) پر حالت نزع میں بے قراری طاری تھی اور رو رہا تھا۔ ابوجہل نے اس سے بے قراری کی وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا کہ مجھے خوف ہے کہ کبشہ[1] کا دین مکہ میں ظہور کرے۔ اس پر ابوسُفیان نے اسے تسکین دی اور کہا کہ میں ضامن ہوں کہ اس کا دین ظہور نہ کر سکے گا۔

اسلام کے لیے موت اور زندگی کا مسئلہ تھا

یہ حالتیں بجھانے کے لیے کافی ہیں کہ اِسلام اور اس کے اس وقت کے چھوٹے سے جسم کے لیے موت اور زندگی کا مسئلہ تھا۔ کئی مرتبہ رسولؐ کے قتل پر عہد کیا گیا۔ اور انھیں کون کون سی تکلیفیں نہ دی گئیں۔ اسلامی تاریخ کے ناظر سے حضرت یاسرؓ، عمارؓ اور ان کی مادرِ گرامی کے واقعات چھپ نہیں سکتے اور نہ بغیر اپنا اثر ڈالے گزر سکتے ہیں۔ سوچو عرب کی گرم ریگ کسی کے برہنہ جسم اور سینہ پر بھاری پتھر کو، اور ان کی قدر کرو۔ لڑائی کا ہونا لابدی تھا۔ جب ہوئی رسولؐ اور ان کا گروہ کم اور کمزور تھا۔ کوئی شکست ان کے دین کے ساتھ جس قدر برا اثر کرتی اس کے سمجھنے کے لیے زیادہ دماغ سوزی کی ضرورت نہیں ہے۔ اور کسی طرح کی غفلت اس برے نتیجہ کو ان کے سامنے موجود کر دیتی۔ خبریں گرم ہو سکتی تھیں کہ قریش نے جس طرح مہاجرین کے اُونٹ لے لیے یا جس طرح ان سے اور ایسی ہی نزاعی حرکتیں سرزد ہوئیں وہ ایک دن اہل یثرب کے سر پر موجود ہو جاتے۔ اور موقع ایسا نازک ہو جاتا کہ انھیں بھی مغلوب اور منکسر بنے اور کچھ بن نہ آتا۔ اور پھر نہیں معلوم یہ انسانیت سے معرا دشمن رسولؐ اور اس کے دین کا نام کس کس طرح مٹانے کی کوشش کرتے۔

رسولؐ نے کن حالتوں میں جنگ کا تصفیہ کیا

ایسی حالت میں یہ نبیؐ کے دیکھنے کا موقع تھا کہ وہ کب اور کہاں دشمن کو روکیں۔ اور کون سا موقع تلاش کریں جہاں دشمن کی شکست اسے آئندہ شرارتوں سے باز رکھے اور ان کی دھاک آئندہ امن اور صلح میں معین ہو۔ یہ سوچنا بھی اس وقت تھا جب کہ دشمن سے اذیت رسانی کی انتہائی کوششیں سرزد ہو چکی تھیں۔ ہو رہی تھیں اور کوئی امید اس کی نہ تھی کہ وہ آئندہ اپنی شرارتوں سے باز آئیں گے۔ جب تک ان پر متواتر کاری ضربیں نہ لگائی جائیں۔

جنگِ بدر

یہ وقت تھا جبکہ سنا گیا کہ کاروان قریش شام کے سفر سے آرہا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ تجارت کر کے آرہا ہے اور اب اس کے پاس مال بھی ہے جسے وہ نزاعی روش میں صرف کر سکے یا اس کے اسباب فراہم کرے۔ اس وقت اگر یہ خبر غلط بھی ہو کہ وہ حملہ کرنے کا موقع دیکھتے ہیں تاہم احتیاطاً اس کی متقضی ہونی چاہیے تھی کہ رسولؐ آمادہ رہتے۔ اور یہ سمجھتے کہ مبادا وہ ہمیں تیار نہ پا کر حملہ کر بیٹھیں۔ یہ خبر سن کر کہ رسولؐ بھی غافل نہیں ہیں ابوسُفیان نے مکہ میں خبر بھیجی اور وہاں سے امدادی فوج پہنچی۔

---

[1] مشرکین حضرتؐ کو ابن ابی کبشہ کہتے تھے۔

مسلمانوںؓ اور دشمنوں کی تعداد

اور موضع بدر میں دشمن کے لڑسکنے والے سپاہیوں کی تعداد نو سو پچاس تھی اور رسولؐ کے اصحاب صرف تین سو چودہ تھے۔ یعنی ایک مسلمان کا تین کفار سے مقابلہ تھا۔ ذرا لشکر اسلام کے سازوسامان پر بھی نظر کرو۔ تمام لشکر میں صرف تین گھوڑے تھے۔ چھ زرہ پوش تھے۔ آٹھ تلواریں تھیں اور ستر اُونٹ تھے۔ دو دو تین تین شخص تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اُونٹ پر سوار ہوتے تھے۔

رسولؐ اور علیؑ کی سواری

بقول صاحب مناہج النبوۃ: "شریک حضرت رسولؐ کی سواری میں علیؑ مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ تھے جب حضرت کے پیادہ چلنے کی نوبت پہنچتی تب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے کہ: "یارسولؐ اللہ تم سوار ہو میں تمہاری رکاب میں پیادہ چلتا ہوں"۔ حضرت فرماتے: "یا علیؑ تم مجھ سے زیادہ قوی نہیں ہو، اور میں مستغنی زیادہ تم سے نہیں ہوں اجر میں"۔

دشمن کی ثروت

کفار کے پاس نہ صرف بہت سامان تھا اور امرائے لشکر میں سے ہر ایک ایک ایک دن تمام لشکر کی ضیافت کرتا تھا بلکہ انھوں نے یہ بھی قیاس کیا تھا کہ ہم ایسے کروفر کے ساتھ رہیں کہ نبی عربی اور ان کے رفقا مرعوب ہو جائیں اور ہمارا شہرہ دور تک پہنچے۔ ایک اور مخصوص بات جو ذکر کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ لشکر اسلام جس جگہ ٹھہرا تھا وہ وادی تھی۔ اُونٹ اور آدمی ران تک دھنس جاتے تھے۔ پانی کی کمی تھی اور ہر ایک کو پیاس کی شکایت تھی۔ درآنحالیکہ دشمن کی فرودگاہ میں میں پانی بہ افراط تھا۔

اس جنگ میں سعد بن عبادہ، مقداد بن عمرو اور سعد بن معاذ نے محبت اور مدد کے مستقل اظہار ارادہ سے رسولؐ کو تسکین دی۔ رسولؐ کو خدا نے فتح دی۔

علیؑ نے کون سے لوگوں کو میدان میں قتل کیا

اور مجھے جس خاص بات کی طرف اشارہ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اس جنگ میں علیؑ بن ابی طالب نے میدان جنگ میں علاوہ اور مشاہیر کے ان لوگوں کو قتل کیا: ● ولید، معاویہ کا خالو۔ ● حنظلہ بن ابوسفیان، معاویہ کا بھائی۔ ● عمر بن عثمان عم طلحہ بن عبداللہ۔ ● عثمان و ● مالک برادر طلحہ۔

اِسلام کا ایک دشمن کم ہوا اور دوسرا زخمی ہو کر بھاگا

صاحب "تمدنِ اِسلام" واقعہ خوانی کرتا ہے، جہاں وہ یہ کہتا ہے کہ:

"اس جنگ میں سب سے زیادہ پرجوش اور کوشش کرنے والے صرف دو تھے۔ ● ایک علیؑ بن ابی طالب، رسولؐ اللہ کے چچیرے بھائی، اور ● دوسرے حمزہؓ بن عبدالمطلب"۔ مشرکین پر ان ہاشمی دلیروں کی شجاعت سے ہیبت طاری ہوئی اور وہ بھاگ گئے لیکن اسلام کا سب سے بڑا دشمن ابوجہل مارا گیا۔ اور ابوسفیان زخمی ہو کر نکل بھاگا۔

حالتِ اسیری میں عباس کے کراہنے سے رسولؐ بے خواب رہے

اسیران جنگ میں عباس بن عبدالمطلب بھی تھے، جنھیں کفار بہ جبر لائے تھے۔ یہ پیشتر سے مُسلمان ہو چکے تھے۔ اور مشرکین کے احوال کی خبر دینے مکہ میں رہ گئے تھے۔ اور ان کے متعلق قبل ابتدائے جنگ رسولؐ نے بھی فرمایا تھا کہ جو ان تک پہنچے گرفتار کرلائے۔ شب کے وقت عباس کے کراہنے

سے رسولؐ کو نیند نہ آتی تھی۔ اصحاب نے وجہ دریافت کی اور معلوم ہونے پر لوگوں نے ان کی زنجیریں ڈھیلی کر دیں۔

قیدیوں کے ساتھ رحم

اب رسولؐ نے دریافت کیا کہ کیوں عباس کے کراہنے کی صدا نہیں آتی؟ اور جب معلوم ہوا کہ اہل اسلام نے رسولؐ کے لحاظ سے ان کی زنجیریں ڈھیلی کر دی ہیں تو آپ نے دُوسرے قیدیوں کے متعلق بھی اس نرمی کا حکم دیا۔

پڑھنا لکھنا جاننے والے قیدی معلم مقرر کیے گئے

دُوسری بات جس کا میں ذکر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسیرانِ جنگ جو فنِ کتابت جانتے تھے ان سے یہ کام لیا گیا کہ ان میں ہر ایک انصار کے دو دو لڑکوں کو لکھنا سکھا دے۔

عقد مواخات ۱ھ

ہجرت کے پہلے سال کا ایک مفید واقعہ عقد مواخات تھا۔ جس میں رسولؐ نے مُسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا۔ اس کا سیاسی اور معاشرتی مفید اثر ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ جب وہ اس پر غور کرے گا کہ لوگ "بھائی" بنائے گئے تھے۔ جو کچھ مجھے اور کہنا ہے وہ یہ ہے کہ: "عقد مواخات باندھا حضرتؐ نے درمیان ابوبکر کے اور عمر بن الخطاب کے، اور درمیان طلحہ اور زبیر کے اور درمیان عثمان بن عفان اور عبدالرحمٰن بن عوف کے"۔ تب علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے کہا: "یا رسولؐ اللہ! اپنے یاروں کے درمیان عقد برادری باندھا حاتم نے اور مجھ کو بھول گئے اور کسی کے ساتھ مجھے برادری نہ دی۔ میرا بھائی کون ہے"۔ حضرتؐ نے فرمایا: "بھائی تیرا میں ہوں"۔ اور فرمایا:

"یا علی انت اخی فی الدنیا والآخرۃ"۔ اے علیؑ تو دنیا و آخرت میں میرا بھائی ہے۔ (مناہج النبوۃ)

تمام مؤرخین اس پر متفق اللفظ ہیں۔ مشکل سے میں سوچ سکتا ہوں کہ کسی نے اس وقت جس وقت سلسلہ مواخات قائم ہوا یا اس کے بعد آج تک جب کہ اس واقعہ کے بعد صدیاں ڈھلک گئی ہیں سوچا کہ رسولؐ نے جو جوڑ تجویز کیے اس کے کوئی معنی تھے یا ایک بے سمجھا ہوا فعل تھا۔ مشکل سے مجھے تمام دنیا سمجھا سکتی ہے کہ یہ ایک اتفاقی فعل تھا۔ مجھے رسولؐ کا یہ فعل صاف بتا رہا ہے کہ حضور نبویؐ نے ملتی جلتی طبیعتوں کو چن کر الگ الگ کر دیا تھا۔ میں اس سے بہتر الفاظ نہیں پاتا بجز اس کے جو کچھ میں نے الکرار میں کہا ہے کہ:

> "آگے چل کر ایک زمانہ آنے والا ہے جس میں طبائع کے میلان کی صحیح گرفت کا اندازہ کیا جا سکے گا۔ اور اس وقت یہ تصفیہ آسان ہو گا۔ جب رحلت رسولؐ کے بعد علیؑ تنہا دکھائی دیں گے کہ رسولؐ نے طبیعت شناسی اور نسبت دینے میں ایک ایک رنگ طبیعت کو علیحدہ علیحدہ کر دیا تھا۔ یہ کوئی اتفاقی فعل نہ تھا جو رسولؐ سے عمل میں آیا، بلکہ سمجھا ہوا ارادی"۔

ابوتراب کا خطاب اور ایک حدیث، اور اس خطاب کا زمانہ آئندہ سے تعلق

ہجرت کے اسی ۱ھ کا واقعہ غزوہ عشیرہ ہے۔ ابن خلدون اور مناہج النبوۃ کے نزدیک حضرتؐ کنانہ سے صلح کر کے واپس آئے، مورخین کے نزدیک اسی واقعہ کے اثنا میں علیؑ بن ابی طالب کو "ابوتراب" کا خطاب عنایت ہوا۔ یہ روایت حضرت عمار یاسر کی زبانی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم اور علیؑ

ایک کھجور کے درخت کے نیچے سو رہے تھے۔ زمین ریتلی تھی اور ہم لوگ گرد آلود ہو گئے تھے کہ حضرتؐ سرہانے کھڑے ہو گئے اور بیدار کیا۔ اور علیؑ کو "قم یا ابا تراب" فرمایا۔ پھر کہا ـــــ تمام جہان کے لوگوں سے زیادہ بدبخت وہ ہے جو تمہارے محاسن کو تمہارے خون سے رنگین کرے گا۔ یہ فرماتے تھے اور دست مبارک علیؑ کے سر اور چہرہ پر پھیرتے جاتے تھے۔ علی بن ابی طالبؑ کو اپنا یہ خطاب سب سے زیادہ پسند تھا۔ اس واقعہ کے لکھنے سے نہ صرف مجھے صاحب مناقب النبوۃ کے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ "مخالفین اور معاندین حضرت علیؑ کو اس کنیت سے پکارتے تھے اور قصد کرتے تھے اس جہت سے نقصان اور حقارت کے تئیں حالانکہ اس کنیت میں اس عالی جناب کی کمال تعظیم و تکریم ہے"۔ بلکہ ایک سے زیادہ موقع آنے کا جہاں ہماری اس کتاب کے ہیرو کو دشمن "یا ابن ابی تراب" کہہ کر پکاریں گے۔

علیؑ اور فاطمہؑ کا عقد اور اسؑ کے وجوہات

ہجرت کا دوسرا سنہ ۲ھ شروع ہوا۔ جس میں حضرت فاطمہؑ زہرا کا عقد علی بن ابی طالب علیہ السلام سے ہوا۔ کوئی کہتا ہے رمضان کے مہینہ میں، کوئی صفر میں اور کوئی رجب میں۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ جب ۱۳ر اور ۲۷ر رجب ولادت علیؑ اور بعثت رسولؐ کے لیے ہم میں مستند ہے تو ایک تیسری خوشی اسی مہینہ سے مخصوص نہ کی جائے۔ اسی طرح کسی کے نزدیک یہ عقد قبل جنگ احد اور کسی کے نزدیک بعد جنگ ہوا۔ بلحاظ اس کے کہ حضرت بتولؑ عقد سا پانچ برس قبل بعثت پیدا ہوئی تھیں۔ سن شریف اس وقت ۱۹ برس کا تھا۔ اور بہ لحاظ اس کے کہ سیدنا علی بن ابی طالبؑ دس برس قبل بعثت خلق ہوئے تھے سن شریف چوبیس برس کا تھا۔ (میں نے مہینے حساب میں نہیں لیے)

وہ تاریخیں جو اس عقد کا تذکرہ کرتی ہیں صاحب مناقب النبوۃ کی اس عبارت کے مفہوم کو ادا کرتی ہیں کہ: "خواستگاری کی فاطمہؑ زہرا کی ابوبکر صدیق نے پس تعلل کیا حضرتؐ نے اور فرمایا کہ میں انتظار کرتا ہوں وحی کا تزویج کرنے میں زہرا کے۔ بعد اس کے عمر خطاب نے خواستگاری کی حضرتؐ نے جواب اسی کلمہ سے دیا جو صدیقؓ کو فرمایا تھا اور مشکوٰۃ میں آیا ہے کہ جب خطبہ کیا یعنی خواستگاری کی حضرت فاروقؓ کے تئیں شیخین نے تب حضرتؐ نے فرمایا کہ وہ صغیرہ ہے"۔ اس کے بعد صاحب سیر الائمہ کے موافق ابوبکرؓ، عمرؓ اور سعد بن معاذ میں باتیں ہوتے ہوتے عقد کا تذکرہ چھڑا اور کسی نے کہا کہ: "علیؑ کی کمی بضاعت انھیں اس امر کی خواہش سے روکتی ہے"۔ حالانکہ:

"ایں امر روشن است کہ رسولؐ خدا فاطمہؑ را از برائے علیؑ محبوس داشتہ"۔

اس کے بعد صلاح ہوئی کہ علیؑ کی خواہش دریافت کی جائے۔

تحریکِ عقد نے علیؑ سے کیا کہلوایا

علیؑ کسی انصاری کے باغ میں پائے گئے۔ وفد نے اپنا فرض ادا کیا اور سوال سن کر: "علیؑ آب در چشم بگردانید و فرمود اے ابوبکر جنبش دادی چیزے را کہ در من ساکن بود و از خاطر بر انگیختی امرے را کہ در من قائم بود"۔ (سیر الائمہ)

بعینہ یہی الفاظ علامہ مجلسی نے ادا کیے ہیں۔ جسے میں مجالس الابرار میں پاتا ہوں۔ بہر حال علی بن ابی طالب علیہ السلام تشریف لے گئے۔ رسولؐ حضرت ام المومنین ام سلمہؓ کے دولت خانہ پر تشریف رکھتے تھے۔ علیؑ سامنے پہنچے۔ سر جھکا لیا اور زمین کی طرف دیکھتے رہے۔ رسولؐ نے بات کرنے کی اجازت دی، اور فرمایا کہ: "تم اس طرح آئے ہو کہ

گویا تمھیں کوئی حاجت کہنی ہے"۔

علیؑ خواہشِ عقد کے وقت اور درخواست کی خوبصورتی

اب علیؑ نے عرض کرنا شروع کیا۔ ادب، تہذیب اور خوبصورتی توجہ کے قابل ہے کہ:

"بابی انت و امی تو خود دانائی کہ مرا ہنگام صبی از پدرم ابو طالب و مادرم ماخوذ داشتی و بہ ادب خود مودب فرمودی و اینک تو ذخیرہ دنیا و آخرت منی لاجرم دوست دارم چنانکہ خداوند بازوے مرا بہ قوت تو محکم کردہ از برائے من دختر تو زوجہ باشد اینک برغبت تمام بحضرت تو شتافتم باشد کہ فاطمہ دختر خود را بامن تزویج فرمائی"۔

ترجمہ: میرے ماں باپ آپؐ پر قربان۔ آپؐ خود جانتے ہیں مجھے بچپن میں آپؐ نے میرے ماں باپ سے لے لیا تھا، اور اپنے آداب سے مؤدب فرمایا۔ آپؐ میرے لیے دُنیا و آخرت کا ذخیرہ ہیں۔ یقیناً میری خواہش ہے کہ جس طرح اللہ نے میرے بازو کو آپؐ کی قوت سے محکم فرمایا، آپؐ کی دختر میرے گھر کی مالک ہو۔ میں پُوری رغبت سے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپؐ اپنی دختر کا عقد نکاح مجھ سے فرماویں۔

یہ سن کر رسولؐ کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ منبر پر تشریف لے گئے۔ خطبہ پڑھا اور اس کے بعد علیؑ کو اظہار مطلب کی اجازت دی۔ حمد اور سپاس کے بعد علیؑ نے کہا کہ رسولؐ نے اپنی دختر نیک اختر کا عقد میرے ساتھ منظور فرمایا، اور میری زرہ مہر قرار دی گئی، موجود اصحاب نے رسولؐ سے تصدیق چاہی، رسولؐ نے اقرار کیا۔

رسولؐ فاطمہؑ کا استمزاج لیتے ہیں

اس قدر مجھے اور کہنا باقی ہے کہ جب اکابر قریش اظہار عقد کرتے تھے اور جناب رسالت مآبؐ حضرت زکیہؑ کو اطلاع دیتے تھے تو آپؑ کے چہرہ سے اظہارِ کراہت ظاہر ہوتا۔ علیؑ کے اظہار پر بھی جب حضرت رسولؐ نے اطلاع دی اور بقول علامہ مجلسی فرمایا: "علیؑ نے تمھاری خواستگاری کے بارے میں کچھ کہا ہے تمھاری اس میں کیا مصلحت ہے"۔ جناب سیدہ یہ سن کر چپ ہو گئیں۔ لیکن مُنہ اپنا نہیں پھیرا اور اظہارِ کراہت نہیں فرمایا۔ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اٹھے اور فرمایا کہ: "اللہ اکبر سکوت کرنا فاطمہؑ کا اس کے رضا کی علامت ہے"۔ (مجالس الابرار)

انتظامِ عقد، ولیمہ اور شرکائے دعوت

اس کے بعد مجھے یہ سب کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر آرائش عروس حضرت ام سلمہ کے سپرد ہوئی تو کپڑا خریدنا حضرت ابوبکر کے حوالہ کیا گیا، ولیمہ کے سلسلہ میں لوگ بلائے گئے اور خبریں کہتی ہیں کہ اس میں قریب قریب چار ہزار کے اہلِ مدینہ شریک تھے۔

رخصتی

رخصتی ہوئی۔ دختران عبدالمطلب اور مہاجر و انصار کی عورتیں رجز پڑھتی ہوئی عروس کے ناقہ کے آگے آگے تھیں۔ تمام ہاشمی برہنہ شمشیر کے ساتھ پیچھے پیچھے تھے۔ اور جناب رسولؐ ان کے ساتھ تھے۔

حضرت اُمّ سلمہؓ کا رجز تھا کہ: "اے میری ہمسایہ کی عورتو خدا کی تائید کے ساتھ چلو اور ہر حال میں اس کا شکر کرو۔ رب عُلیٰ کے انعام کو یاد کرو جس نے مکروہات اور آفات زائل کیے۔ ہدایت کی ہم کو ساتھ ایمان کے قبل اس کے کہ کافر تھے اور رب السماوات نے ہمیں اُٹھایا۔ چلو بہترین نساء عالم کے ساتھ ہمارے عمات اور خالات اس پر فدا ہوں۔ اے بیٹی اس کی کہ خدا نے فضیلت دی ہے اسے وحی اور رسالت کے سبب سے"۔ اسی طرح ام سعد اور دیگر عورتیں رجز پڑھتی تھیں اور ان کے مطلع دہرائی جاتی تھیں۔

رسولؐ پاکیزگی نسل کی دعا دیتے ہیں

رسولؐ نے علیؑ و فاطمہؑ کو دعا دی اور فرمایا: "بار الٰہا یہ دونوں بڑے دوست ہیں میرے نزدیک، پس تو بھی انھیں دوست رکھ، ان کی ذریت میں برکت دے اور ان پر اپنی جانب سے حافظ مقرر کر اور میں ان کو اور ان کی ذریت کو تیری پناہ میں دیتا ہوں شیطان رجیم سے"۔ یا بقول شواہد النبوۃ شب عروسی کی صبح کو رسولؐ نے طویل سجدہ کیا اور دعائیں فرمایا کہ: "اے فاطمہؑ [illegible] تراب پاکیزگی نسل"۔ یا فرمایا کہ: "ان کی پراگندگی کو جمع کر اور ان کے دلوں میں الفت دے"۔ یا ایک دوسرے کو محبت اور لحاظ کی تاکید کی۔ دونوں کے متعلق دونوں سے سوال کیا اور ہر ایک نے دوسرے کو اچھا کہا۔ رسولؐ کا یہ فرمانا اب تک کتب اسلامی میں محفوظ ہے کہ: "اگر نہ پیدا کرتا خدا فاطمہؑ تو کوئی علیؑ کا کفو نہ ہوتا"۔

علیؑ فاطمہؑ کے متعلق اور فاطمہؑ علیؑ کے متعلق

اس عقد کا نتیجہ علیؑ کے لفظوں میں یہ تھا کہ: "جب تک فاطمہؑ دنیا میں رہیں میں نے انھیں کوئی رنج نہیں پہنچایا کسی امر میں اور ہرگز میں نے وہ امر نہیں کیا جو ان کے ناگوار طبع ہو اور وہ ہرگز مجھے غصہ میں نہ لائیں اور کسی امر میں نافرمانی میری نہیں کی اور جب میں انھیں دیکھتا تھا تمام غم و الم میرے سینہ سے دُور ہو جاتے تھے"۔ (مجالس الابرار)

حضرت فاطمہؑ کے لیے "امرك سمع یا ابن عم وطاعته"۔ پہلا فرض تھا اور میدانِ جنگ کا رجز علیؑ سے کہلواتا تھا کہ:

"ولی الفخر علی الناس بعرسی و بنیھا ثم فخری برسول الله اذ زوجنیھا"

(اور مجھ کو فخر ہے آدمیوں پر بہ سبب اپنی زوجہ اور اس کے فرزندوں کے۔ پھر فخر میرا بہ سبب رسول اللہ کے ہے جب کہ اپنی دختر کو میری عروسی میں دیا)

ابھی تک میں عقد کے متعلق ہر پہلو کے واقعات لکھ رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کھودے۔ جانے اور ہموار کیے تھے لیکن موٹے موٹے واقعات محض کافی نہیں ہوا کرتے۔ جب تک واقعات غور کی زبان سے نہ بولیں۔ میرے لیے ابتدا اس سوال سے ہوتی ہے کہ آیا یہ عقد اپنے اس عام مفہوم میں تھا کہ بالغہ کا ولی اسے شوہر کے سپرد کرنے کے بعد سمجھتا ہے کہ وہ اپنا اس وقت تک کا فرض ادا کر چکا اور اسے اب اس کے بعد کی زندگانی کے ذمہ داری کے لیے کوئی جواب دہی نہ رہی، بلکہ آئندہ کے لیے تمام ذمہ داریاں اس شخص نے اپنے اوپر لے لیں جس نے خدا کے سامنے عہد (عقد) کیا اور زن و شو نے اپنے اپنے نفس کا ایثار کیا اور رنج و راحت کی شرکت میں یک دل اور ہم زبان ہو گئے۔

رسولؐ کے متعلق ذکر کیے ہوئے سوال سے میری یہ غرض نہیں ہے کہ میں نفس عقد پر بحث کروں یا زن و شو کے

تعلقات پر کوئی مضمون لکھوں، یہاں مجھے یہ کہنا ہے کہ عقد کا عام مفہوم بھی ایک غرض تھی۔ کسی شوہر کا اپنی بی بی کے متعلق یہ کہنا کہ: "جب میں انھیں دیکھتا تھا تمام غم والم میرے سینہ سے دُور ہوجاتے تھے"۔ اس بی بی کے لیے وہ سب کچھ کہہ دیتا ہے جو شارح کو کہنے کی ضرورت ہو۔ ہمارا تو یہ بھی لکھنے کو یہاں جی چاہتا ہے کہ "خصوصاً جب کہنے والا علیؑ ہو"۔ یہیں علیؑ کی راحت اور علیؑ کے رنج دونوں کی قدر ہے۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ ساتھ ساتھ اس پر غور کیا جائے کہ: "اگر تم اچھی اولاد چاہتے ہو تو اچھے ماں باپ بنو"۔ رسُولؐ کی یہ تنہا یادگار عالم کے مثالی فرد کی مثالی بی بی تھی۔ جن کی اولاد کے ذکر کے لیے ہم راستہ صاف کر رہے ہیں۔

والدین کی تاریخ خصوصیات سے سمجھنے میں مدد لی گئی ہے

بعض کے لیے شاید یہ غور کا دلچسپ مضمون ہو کہ اسلامی تاریخ ہیں اس مسئلہ پر سوچنے میں مدد دیتی ہے کہ زن و شو کی محبت اچھی اولاد ہونے میں معین ہوتی ہے۔ غور کرو کہ حضرت آمنہ اور حضرت عبداللہ کا فرزند کون تھا۔ سوچو کہ حضرت ابطالب اور فاطمہؑ بنت اسد کا مشہور یادگار عالم کا کیسا ضروری فرد تھا۔ اسی طرح حضرت رسُولؐ اور حضرت خدیجہؑ نے کسے اور کیسا چھوڑا۔ تم آگے پڑھو گے کہ علیؑ اور فاطمہؑ کے کیسے یادگار تھے۔ یہ مثالیں میرے لیے سوچنے میں محرک اور معین ہوئیں اور مجھے اس میں کبھی اپنی روش تصور کی غلطی کا گمان نہیں ہوا۔

عربؐ اور شرافتِ نسب

اب یہ سوچنا آسان ہوگا کہ عرب جسے شرافت نسب اور اس لیے خاندانی صفات کے منتقل ہوتے رہنے کا اعتراف تھا، وہ اپنے نازک رشتوں کے لیے کس قدر چھان بین کرتا ہوگا اور چونکہ وہ صفات خاندانی کا اندراج تھا وہ دوسروں کی ایسی ہی صفت کا اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ہمارا ہادی عرب تھا۔ عرب کے شریف ترین قبیلہ بلکہ سرچشمہ شرافت افراد کا یادگار تھا اسے ضرورت لاحق ہوئی تھی کہ اپنی پارۂ جگر کو کسی کے سپرد کرے۔

عقد کی نسبی وجہ

اپنا خاندان بچا ہوا خاندان تھا۔ اس کے ایک بچہ کو لڑکپن سے گودیوں میں کھلایا تھا۔ زبان چوسائی تھی۔ یہ بھی کہنا تھا یا کہہ چکے تھے جیسا تم صواعق محرقہ میں پاؤ گے کہ:

"انا وعلی من شجرۃ واحدۃ"۔ (ہم اور علیؑ ایک درخت سے ہیں)

ابطالبؑ نام کے باپ تھے۔ درآنحالیکہ ان کی تمام ذمہ داریاں جو پرداخت یا تربیت کے متعلق ہوسکتی تھیں رسُولؐ کے متعلق ہوگئی تھیں۔ اب رسُولؐ کا کام تھا کہ وہ اپنی خواہش اور روش کے موافق پالتے۔ پالا، اپنا مظہر اتم بنا دیا۔ یہ سوچنا مشکل کردیا کہ آیا ایسے بچے پر بے کی کوئی اور بھی مثال ہے۔ اس سے نہ صرف رسُولؐ کو اس کا موقع تھا کہ وہ صفات خاندانی جانتے ہوتے، بلکہ عین شخص اور اس کی صفات اور اس کی تمام قوتوں اور خیالات دل سے واقف تھے۔ عقد فاطمہؑ کے متعلق باوجود شرفائے قریش کی خواہش کے رسُولؐ کا تعین اور طویل سکوت کہتا ہے کہ رسُولؐ طبیعت اور اخلاق و عادات شناسی کا ایک بڑا فرض ادا کر رہے تھے۔ اور اس کے منتظر تھے کہ فاطمہؑ کا کفو (ہمسر) وہ ہو جو علم اور تجربہ کے معیار سے اپنا ثانی نہ رکھتا ہو۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسُولؐ کے نزدیک اور ان کے علم و تجربہ میں اگر علیؑ وہ شخص تھے جنھیں یہ شرف بخشا جاسکتا تھا، جو صواعق محرقہ کی اس حدیث سے سمجھ میں آئے گا کہ:

"مرویست از ابوہریرہ کہ پیغامبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمود علیؑ را کہ فاطمہؑ دوست تر است نزد من از تو و تو اعزی بر من از وے"۔

تو پھر خود سے اس امر کی تحریک کیوں نہ کی گئی۔ اسے ایشیا کا ہر شریف سمجھتا ہے۔ کیسی دنیا نے اس کی ذمہ داری اپنی بالغہ لڑکی کے حوالہ کردی ہے۔ رسولؐ "منتظر" تھے۔ قوی قرائن تھے کہ علیؑ خواہش کرتے۔ جیسا ہوا۔ نیز یہ حالت کہ جب علیؑ اس خواہش کے ساتھ آئے اور رسولؐ نے دیکھا تو متبسم ہو کر فرمایا کہ: "جو کچھ کہنے آئے ہو کہو کہ تمہاری خواہشیں قبول ہیں"۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ علیؑ کے منہ سے وہ کہلوانا چاہتے تھے جو خواہش تھی۔ ذاتی طور سے مجھے خیال ہوتا ہے کہ ام ایمن کا علیؑ سے یہ کہنا کہ تم کیوں نہیں کہتے، رسولؐ کے ایماء سے اگر نہ تھا تو استزاج کے بعد تھا۔

خاندان کی فطری تقسیم اور امتزاج

مختصر یہ کہ سیدہ عالم کی پارہ جگر جس کا شایان خطاب "سیدۃ نساء العالمین" ہے۔ اسے دی جا سکتی تھی جو "سید عرب ہو اور امیر المومنین (تمام حیثیتوں سے ہو) ہونے کی قابلیت رکھتا ہو۔ حضرت فاطمہؑ وہ ذریعہ تھیں جنھوں نے حضرت عبداللہ اور حضرت ابوطالب کے خاندان کو ملا کر ایک کر دیا اور ان کی یادِ خصوصیات اور استحقاق اولادِ فاطمہؑ میں باقی رہے"۔

عقد کی معاشرتی سیاست کا آئندہ پر اثر

وہ وقت جس وقت کہ خاندان حضرت عبداللہ اور ابوطالب حضرت علیؑ اور فاطمہؑ کے لحاظ سے ایک ہو گیا ایسا تھا جس میں رسولؐ کو حاکمانہ وقار حاصل تھا۔ وہ حاکم تھے۔ ان کے اختیارات میں نہ صرف اضافہ کی قابلیت تھی بلکہ اضافہ ہو رہا تھا جو اب ہمارے لیے ایک مستند واقعہ ہے۔ اب سوچو کہ رسولؐ اپنی یادگار کو ان گرد و پیش کی حالت میں کسی کو سپرد کیا چاہتے ہیں۔

بجز علیؑ کے فاطمہؑ کا کفو نہ ہونے کے عناصر

یہ بھی ملا کر سوچو کہ اشراف قریش خواہش کرتے ہیں لیکن جواب انھیں ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ علیؑ خواہش ظاہر کرتے ہیں اور رسولؐ کے انداز جواب دیتے ہیں کہ بجز اس کے ان کی اور کوئی خواہش ہی نہ تھی۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک "کوئی نہ تھا جو فاطمہؑ کا کفو ہو سکتا بجز علیؑ کے"۔ کیوں نہ ہو سکتا؟ اسے سوچو اور دیکھو کہ حقیقتاً اس پر معنی کفو کے عناصر کسی اور میں بجز علیؑ کے جمع تھے؟۔

اس وقت تک کی خدمتِ اسلام بھی ایک بڑی وجہ تھی

جس بات پر میں اب توجہ دلانے والا ہوں وہ رسولؐ کے نزدیک ان تمام باتوں سے زیادہ پیاری تھی اور وہ خدمت اسلام تھی جس پر قربان ہونے کے لیے علیؑ اب تک کئی مرتبہ آمادگی ظاہر کر چکے تھے۔ میں ایسی خدمت کا بھی معترف ہوں کہ کوئی چار سو روپیہ میں اونٹ خریدے اور اسے گھانس کھلا کر فربہ کرے اور نو سو کو بیچ ڈالے لیکن اس خدمت کو میں عالم کی ان تمام اقوام کے اعتراف کے حوالہ کرتا ہوں۔ جنھیں ایثار نفس کا حس ہے کہ کوئی شخص کسی کے لیے "اپنی جان" قربان کرتا ہے اور اس کی کوئی قیمت کی نہ شرط کرتا ہے نہ دام لیتا ہے۔

بقول صاحب قرۃ العیون: "چادر حضرتؐ کی اوڑھ کر آپؐ کے بستر پر سو رہے اور اپنے نفس کو فدائے ذاتِ مقدس کیا"۔ (دیکھو مدارج النبوت و قرۃ العیون شرح سرور المحزون)۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا

ایک مشہور مثل ہے۔ دعوت ذوالعشیرہ میں رسولؐ کی امیدیں ڈوب رہی تھیں، ان کے اعلان کی صدا فنا ہوتی جاتی تھی جس وقت نوجوان حامیٔ اسلام نے نامرعوب دل اور بے لکنت زبان سے مدد کا وعدہ کیا۔ سہارا ہوا تسکین ہوگئی۔ "اقصدیایم" اسی لیے خطاب ہوا کہ لڑکپن میں کفار کے سکھائے ہوئے بچوں کی سنگ افگنی روکنے کے لیے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو مستعد رکھتے تھے۔ کون جانتے کہ رسولؐ ان ہاتھوں میں آئندہ اسلام کا علم دیکھتے ہوں اور انھیں ہاتھوں کو اسلام اور اس کے نشان کے وقار کا محافظ خیال کرتے ہوں۔

خدماتؑ کی مصوری علیؑ کے لفظوں میں

کیا اس میں کہیں سے مبالغہ ہے کہ:

و اذا اضرم حرباً احمد قدمنیھا + و اذ نادیٰ رسول اللہ نحوی قلت ایہا

(اور جب افروختہ کیا آتش حرب کو احمدؐ نے مقدم کیا مجھ کو اور جب ندا دی رسول اللہؐ نے میری جانب تو میں نے کہا: کیا ارشاد ہے)

(دیوانِ جنابِ امیرؑ)

علیؑ کا ایکؑ بمطابق واقعہ فخر

اور کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ: "وبنا اقام دعائم الاسلام" (اور بسبب ہمارے قائم کیا ارکانِ اسلام کو) جسے حسّل خلیفہ ثانی کی مجلس میں کہتے ہیں۔

مکالمہ جو نظم کیا ہے

اور کیا دیوان میں حضرت ابوطالبؑ کا مکالمہ علیؑ سے کوئی خیالی امر ہے جس کا علیؑ جواب دیتے ہیں کہ: اے پدر بزرگوار! آپ مجھے نصرتِ احمدؐ میں صبر و استقامت کا حکم کرتے ہیں، واللہ میں نے کوئی بات بے صبری میں نہیں کہی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میری نصرت دیکھئے اور جانتے کہ میں آپ کا ہمیشہ کا فرمانبردار ہوں اور نصرتِ احمدؐ میں میری کوشش خدا کی خوشنودی کے لیے ہے جو میں ہادی اور محمودؐ ہے طفلی اور نوجوانی میں۔

ناظر کو اخذِ نتائج کا اختیار ہے

میں پیشتر کہہ چکا کہ وصایت ایک امر تھا جسے حکمِ الٰہی سے تعلق ہے۔ میں لکھ چکا کہ رسولؐ نے اپنی نبوت کے ساتھ امامت کا اعلان اور امام کی شناسائی ضروری سمجھی۔ میں دکھا چکا کہ علیؑ کو رسولؐ اپنا جانشین منتخب کرسکتے تھے۔ میں حسد کے خاندانی، روحانی اور ملکی وجوہات دکھا چکا۔ اس کے بعد اخذِ نتائج کا ہر شخص کو اپنی جگہ اختیار ہے۔

رسولؐ کی اس صاحبزادی کا حق جو علیؑ کو بیاہی گئی بمقابل رسولؐ کی اور کسی صاحبزادی کے جو کسی دوسرے کو بیاہی گئی ہو

ایک امر اور ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر رقیہ اور ام کلثوم دختران حضرت خدیجہؑ تھیں اور ساتھ ہی دختران رسولؐ بھی تھیں، تو ان کی اولاد کو بھی وہی حق ہونا چاہیے تھا جو اولاد حضرت فاطمہؑ کو۔ قطع نظر دیگر مسائل کے پھر بھی

اولادِ فاطمہؑ کو حق مرجح حاصل تھا۔ اس لیے کہ فاطمہؑ اور علیؑ کے عقد نے آلِ عبداللہ اور آلِ ابوطالب کے حقوق کو اولادِ فاطمہؑ میں مجتمع کر دیا تھا جس کا عبدالمطلب کے بعد تقسیم ہو جانا خیال کیا جاسکتا تھا۔ اور یہ حقوق رسولؐ کی اور کسی صاحبزادی کو حاصل نہیں ہو سکتے تھے بجز اس کے جو علیؑ یا ان کے کسی بھائی سے بیاہی گئی ہو۔

ایک سوال

اس پر سوچنا کہ صورت معاملہ کیا ہوتی اگر رسولؐ کی اولادِ ذکور میں کوئی باقی ہوتا؟ اسی امر پر غور کرنا ہے جس کا وجود نہ تھا۔ اس لیے کہ حضرتؐ کے دو فرزند ابراہیم اور قاسم خود حضرتؐ کے سامنے رحلت کر گئے تھے اور ان کا کوئی حق پیدا نہ ہونے پایا تھا۔ جس طرح رقیہ اور ام کلثوم نے رسولؐ کے سامنے رحلت کی۔ ایک روایت ملا جامی کی شواہد النبوۃ کے علاوہ کتابوں میں بھی پائی جاتی ہے کہ ایک روز رسولؐ حسینؑ کو ایک زانو اور اپنے فرزند ابراہیمؑ کو دوسرے زانو پر بٹھائے ہوئے تھے کہ جبرائیلؑ نازل ہوئے اور کہا کہ: "خدا ان دونوں کو ایک وقت میں مجتمع نہ رکھے گا۔ ان میں سے ایک کو اختیار کرو"۔

رسولؐ کا رُوحانی اِضطرابؑ اور تصفیہ

رسولؐ نے فرمایا کہ اگر حسینؑ نے انتقال کیا تو مجھے علیؑ اور فاطمہؑ کو صدمہ ہوگا۔ اور ابراہیم نے انتقال کیا تو مجھے زیادہ صدمہ ہوگا۔ اس لیے میں نے ان کے صدمہ پر اپنا صدمہ گوارا کیا۔ اور ایسا ہوا کہ تین روز کے بعد ابراہیم نے رحلت کی۔ اس کے بعد جب حسینؑ رسولؐ کے سامنے آتے تو منہ چوم کر فرماتے: "اھلاً و مرحباً بمن فدیتہ بابنی ابراھیم"۔ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ رسولؐ ایسے وقت جب کہ وہ ان دونوں بچوں کو دیکھتے پیار کرتے اور خوش ہوتے ہوں گے کسی ایسے ہولناک خیال کا تصفیہ کہ اگر ان دونوں وجہ محبت پر کوئی آفت ہو تو کس کی مصیبت پر صبر کیا جائے۔ یہ کہا تے تھے کہ ابراہیم کی رحلت پر صبر کیا جاسکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ حسینؑ باقی رہیں۔ سچ ہے کہ قانوناً کسی فرزند سے زیادہ محبت کا ہونا دوسرے فرزند کے حقوق کو کم یا زائل نہیں کرتا۔ جب تک محبت کرنے والا کسی خاص وصیت کی ضرورت نہ سمجھے۔ یہاں صرف واقعات اور ان کے آثار سے بحث ہے۔ جس کے طبعی تصفیہ کا ہر شخص کو اختیار ہے نہ یہ کہ کسی عدالت میں مقدمہ لڑنے کے لیے تیاری کی جا رہی ہے۔

صورت معاملہ کی دلچسپی اور بڑھ جاتی ہے جب صواعق محرقہ میں یہ دیکھا جائے کہ:

"و طبرانی روایت کرد کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمود کہ خدائے تعالیٰ ذریت ہر پیغمبرے را در صلب وے نہادہ و ذریت مرا در صلب علیؑ بن ابی طالب نہادہ"۔

اسی کتاب میں ابوالخیر الحاکمی اور صاحب کنوز المطالب سے ایسی ہی حدیث نقل کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس جگہ اصول تبنیت کی وہ دشواری نہیں ہے جس سے متبنّی ذاتی اور صفاتی قائم مقام نہ ہو سکے۔ اس لیے کہ رسولؐ اور علیؑ کے بیچ صرف ایک پشت حضرت عبدالمطلب کو تقسیم کرتی تھی اور خود حسنینؑ رسولؐ کی صاحبزادی کے فرزند تھے۔

اگرچہ بدر کے بعد بہت سے چھوٹے چھوٹے غزوات اور سرایا ہوئے لیکن کوئی اس درجہ مفید نہیں ہے جس کا تفصیلی تذکرہ ضروری ہو۔ لیکن اس قدر کہہ دینا ضروری ہے کہ جب ابوسفیان واپس آیا بدر سے تو قریش کو اظہار مصیبت اور رونے سے اس لیے روکتا تھا کہ دشمن شماتت نہ کرے۔ اسے نہ صرف اپنے ایک لڑکے حنظلہ کے مارے جانے کا غم تھا

بلکہ دوسرا لڑکا جس کا نام عمر تھا اسیر ہو گیا تھا۔ اسی طرح ہندہ ابوسفیان کی بی بی کا باپ عتبہ مارا گیا تھا۔

ابوسفیانؔ اور ہندہ کی قسمیں

ابوسفیان نے قسم کھائی تھی کہ جب تک اس کا انتقام نہ لے گا نہ وہ سر میں تیل لگائے گا اور نہ عورتوں سے ملاعبت کرے گا۔ اسی طرح اس کی بی بی نے بھی قسم کھائی تھی۔ رسولؐ کے لیے اس جنگ کی فتح نے یہ مفید اثر کیا کہ جس قدر لوگ آپ کے ساتھ نہ بھی آئے تھے وہ مدینہ میں رسولؐ کی واپسی کی خبر سن کر مقام روحا میں چھتیس میل آگے استقبال کے لیے آئے۔

ابوسفیان قسم پوری کرتا ہے

ابوسفیان نے اپنی قسم کے متعلق عملی کارروائی اس طرح شروع کی کہ دو سو سواروں کے ساتھ موضع عریض میں جو مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے پہنچ کے ایک درخت جلا دیا اور ایک انصاری کو قتل کر کے بھاگا کہ اس نے اپنی قسم پوری کی۔ جب رسولؐ کو معلوم ہوا اور تعاقب میں چلے تو دشمن نے اپنے کو ہلکا کرنے کے لیے سویق (ستو) پھینک دیا۔ مسلمانوں کے لیے یہ غنیمت ہوا اور جنگ نہیں ہوئی۔

یہودان بنی قینقاع

یہودان بنی قینقاع نے کر یہہ چھیڑ اور تکلیف دہ طنز شروع کیا بجائے گئے، نہ مانا۔ مجبوراً محاصرہ کیا گیا اور اب انھوں نے شرائط صلح پیش کیے کہ ہم لوگ اپنے اہل و عیال پر قابض ہوں اور مال مسلمانوں کے حوالہ کر دیں۔ بنی قینقاع اضلاع شام کی طرف جلا دیے گئے۔

حسنؑ کی ولادت

واقعات کی یہ روش تھی کہ ۱۵ رمضان ۳ھ کو علیؑ اور فاطمہؑ کے گھر تاریخ اسلام کا ایک بڑا محسن پیدا ہوا۔ جس نے دوست دشمن دونوں کی نگاہوں میں حیرت خیز کام کیا جس پر آئندہ بحث ہوگی۔ یہ بزرگ "سید جوانان اہل بہشت" میں کا ایک تھا۔ جس میں رسولؐ اپنی شان "ہیبت اور سرداری" پاتے تھے۔

رسولؐ کے دو نواسوں کے دو بڑے فرض

یہ وہ بزرگ تھے جن کے مشہور سرمایہ حیرت فعل کے بعد بھی دشمنوں کے برتاؤ نے ہماری اس کتاب کے ہیرو کے پر استقلال ارادہ کے جواز میں قوت پیدا کر دی۔ حسنؑ کی وجہ سے اگر زمانہ کو یہ تجربہ ہوا کہ اہل بیت رسالت امت کے رفع فساد کے خیال سے دولت اور امارت سے دست بردار ہو سکتے ہیں تو ہماری کتاب کے ہیرو نے یہ دکھایا کہ ہمارے ہوتے ہوتے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ دین اسلام پر بلائیں آتی رہیں اور کسی نے اپنے کو قربان نہ کیا۔

کتاب کے آئندہ حصہ کے لیے بعض غور طلب باتیں

یہ مقامات کتاب کے آئندہ حصہ میں نہایت غور سے دیکھنے کی باتیں ہوں گی۔ جس میں صلح و جنگ کا اپنے اپنے زمانہ اور اتفاقات میں تصفیہ کرنا ہوگا کہ آیا ان ذو صلح اور جنگ کرنے والوں میں صلح اور جنگ کی قوت تھی یا نہ تھی۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ لوگ یہ سوچنے میں اکثر غلطی کرتے ہیں کہ صلح اور جنگ کا ہر وقت اختیار ہوتا ہے۔ یا قوت رہتی ہے۔ اگر کہیں صلح کی قوت دیکھ کر جنگ کرنے کی بھی قوت بھولی گئی ہے تو کہیں جنگ کی قوت نہ دیکھ کر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ تو پھر صلح ہو سکتی تھی۔ اور اگر کہیں یہ تیسری صورت پیدا ہو گئی کہ صلح اور جنگ دونوں کی قوت نہ

ہونے کی حالت میں ایسی صلح پیش کی گئی جس کا موقع اور دکھاوا اختیاری صلح سمجھا جائے تو یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ پہلے تو صلح نہ کی گئی آخر میں مجبور ہو کر اس وقت صلح کی خواہش کی جب موقع نہ رہا تھا۔ حالانکہ موقع ہی سمجھنے میں معترضین نے غلطی کی ہے۔

غزوۂ اُحد، بدر کا اِنتقام اور اُن کے سامان

۳ھ کا دوسرا بڑا واقعہ غزوۂ احد ہے۔ جو بادی النظر میں بھی غزوۂ بدر، سویق، اور سریہ قردہ کا نتیجہ تھا۔ دارالندوہ میں مشرکین قریش نے جن کے سرغنہ صفوان بن اُمیہ اور عکرمہ بن ابوجہل تھے، ابوسفیان سے کہا کہ تم مال جمع کرو کہ لشکر آراستہ ہو اور ہم لوگ اپنے مقتولین کا انتقام لیویں۔ چنانچہ جس قدر اشیاء جمع ہوئیں ان کا وزن ایک ہزار اُونٹوں پر بار ہوا۔ عمرو بن عاص منتخب کیے گئے کہ یہ قبائل عرب کو جمع کریں۔ اس لیے کہ یہ بہت "چرب زبان" تھے۔ اور ایک پورا طائفہ ہندہ کی ماتحتی میں پندرہ ہودجوں پر روانہ ہوا کہ وہ مقتولین بدر پر نوحہ کرے اور لوگوں میں انتقام کا جوش پیدا کرے۔

جوشِ عداوت کی ایک وحشیانہ حرکت اور اُس کی غرض

دشمنوں کا درجہ عداوت اس سے معلوم ہوگا کہ جب یہ لوگ موضع ابوا میں پہنچے جہاں حضرت آمنہ خاتون کی قبر تھی تو انھوں نے قبر کھودنے اور ہڈیاں نکال لینے کا قصد کیا۔ اس خیال سے کہ اگر مشرکین کی عورتیں گرفتار ہوئیں تو ہڈیاں دے کر واپس کی جائیں اور در صورت ایسا نہ ہونے کے رسولؐ بہت سا مال دے کر واپس لیتے لیکن پھر یہ صلاح اس لیے مسترد کی گئی کہ قبیلہ بنوبکر اور خزاعہ رسولؐ کے حلیف تھے وہ یا دشمنوں کی اس حرکت پر انھیں روکتے اور جنگ کرتے یا خود دشمنوں کی قبریں جواب میں کھود ڈالتے۔

نگہبانِ اصحاب اور مشورۂ جنگ

جس روز سے اصحاب کو دشمنوں کی تیاری کی خبر ملی وہ مسلح ہو کر حضرتؐ کی نگہبانی میں مشغول ہوئے۔ ان میں سے مشہور سعد بن معاذ، سعد بن عبادہ اور اسید بن حضیر تھے۔ دیر تک اس کی بحث تھی کہ مدینہ میں رہ کر جنگ کی جائے یا بیرون مدینہ۔ حضرت حمزہؓ کے اس فقرہ نے کہ: "اس وقت تک روزہ نہ کھولوں گا جب تک دشمنوں سے اپنی تلوار سے جنگ نہ کروں"۔ تصفیہ میں مدد دی اور یہی طے پایا کہ خارج از مدینہ جنگ کی جائے۔

علمدارانِ لشکرِ اسلام

مہاجرین کے علمدار حضرت علیؑ بن ابی طالب، اسید بن حضیر اوس کے اور سعد بن عبادہؓ اور حباب بن منذرؓ قبیلہ خزرج کے علمدار قرار دیے گئے۔

بعض کمسن نوجوانوں کے نام جنھیں زمانہ آئندہ سے تعلق ہوگا

لشکر کی گنتی کے وقت رسالتمآبؐ نے چند کمسن نوجوانوں کو مدینہ کی طرف واپس جانے کی اجازت دی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ہماری کتاب کے آئندہ واقعات سے بھی تعلق ہوگا۔ "مناہج النبوۃ" میں ان کے نام: ① عبداللہ بن عمر بن خطاب ② زید بن ثابت ③ اسامہ بن زید ④ زید بن ارقم ⑤ براء بن عازب ⑥ ابوسعید خدری ⑦ سمرہ بن جندب، اور ⑧ رافع بن خدیج ہیں۔

رسُولؐ نے محمد بن مسلمہ کو پچاس مجاہدین سے لشکر کی پاسبانی کے لیے، اور کفار نے عکرمہ بن ابی جہل کو اپنے لیے مقرر کیا۔ حضرت نے کوہِ احد کو پشت پر لیا اور مدینہ کو سامنے رکھا۔ سلسلہ کوہ میں ایک پہاڑ جس کا نام عینین تھا، شگاف دار تھا۔ جس میں دشمن کمین کر سکتا تھا۔ حضرت نے عبداللہ بن جبیر کو سخت تاکید کی کہ وہ فتح و شکست کی صورتوں میں کسی طرح اپنی جگہ نہ چھوڑے۔

ابودجانہ کی سپاہیانہ شان

جنگ ہونے لگی۔ ابودجانہ کا تبختر پسند کیا گیا۔ اور اگرچہ یہ ہندہ یا بقول مجموعہ کامل ترجمہ تاریخ واقدی عمرہ بنت الحارث کے پاس پہنچا، اور خیال اولی یہ ہوا کہ اس ابھارنے والی کو قتل کرے۔ لیکن پھر بقول مناہج النبوۃ تصفیہ یہ کیا کہ: "یہ تلوار اس سے برتر اور گرامی ہے کہ اس عورت کے خون سے آلودہ ہو"۔

زخمی کے ساتھ علیؑ کا شجاعانہ رحم

قریش کا صاحب لوا طلحہ بن ابی طلحہ میدان میں آیا، اور اسے شیر بیشہ ہیجا علیؑ مرتضیٰ نے، جس کا بقول واقدی: "سربند پشمینہ سفید تھا" وار کیا، اور اس کا سر شگافتہ ہوا، علیؑ میدانِ جنگ سے چلے آئے، اور لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے اسے قتل کیوں نہ کیا؟ فرمایا کہ "جب وہ گرا اس نے مجھے قسم دی کہ میں اسے چھوڑ دوں۔ مجھے شرم آئی کہ پھر اس سے متعرض ہوں"۔ بقول واقدی: "وہ برہنہ ہو گیا تھا، اور علیؑ نے پوچھنے والوں کو جواب دیا کہ "مجھ کو اس پر رحم اور ترس آیا کہ میں اس پر رداء ڈال کر پھر آیا کہ وہ سردار لشکر ہے"۔

علیؑ کی شجاعت نمائی کا رسُولؐ اور لشکرِ اسلام پر اثر

اسی مؤرخ کے موافق: "جب طلحہ قتل ہو گیا اور رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو سرور ہوا، اور اظہار تکبیر کا فرمایا، پھر سارے مسلمین نے تکبیر کہی"۔ اس کے بعد ابوشیبہ عثمان ابی طلحہ میدان میں آیا، اسے ہاشمی شیر اور رسُولؐ کے زمانہ کے سید الشہداء حضرت حمزہؓ نے جو خود میں شتر مرغ کے پر لگائے ہوئے تھے قتل کیا، اور یہ کہتے ہوئے پھرے کہ: "انا ابن ساقی الحجاج" (میں حاجیوں کے پانی پلانے والے (حضرت عبدالمطلبؑ) کا فرزند ہوں) علیؑ نے ارطاۃ بن عبد شرحبیل اور صواب غلام بنی عبدالدار دوسرے علمدارِ کفار کو بھی قتل کیا۔ بعض اور سردار سعد بن ابی وقاص اور زبیر بن العوام اور قزمان کے ہاتھوں سے بھی قتل ہوئے۔

لشکرِ اسلام کی فتح و شکست

مسلمان یہاں تک غالب آئے کہ دشمنوں کے خیموں پر قابض ہو گئے۔ لیکن فتح و شکست میں تھوڑا فرق تھا۔ شکست کی وجہ عرب کی جبلی کمزوری یعنی لالچ ہوئی۔ عبداللہ بن جبیر اپنے محافظین درہ کو اس سے باز نہ رکھ سکا کہ وہ شریک غارت نہ ہوں اور رسُولؐ کا حکم مانیں، وہ لوٹتے لوٹتے مارا گیا۔ اپنی زندگی میں دشمن کو گزرنے نہ دیا۔ دشمن غالباً اس کی لاش پر سے گیا۔

مسلمانوں کا اضطراب

اب حالت یہ تھی کہ بقول مجموعہ کامل: "مسلمین ساتھ مشرکین کے مخلوط ہو گئے تو باہم مشتبہ ہو کر مقابلہ کرنے لگے اور باخودہا ایک دوسرے کو مارتے تھے۔ مگر عجلت اور حالت اضطراب میں جس کو مارتے تھے کسی کو پہچانتے نہ تھے کہ وہ کون ہے"۔ چنانچہ ● اسید بن خضیر کو ابوبردہ نے

زخمی کیا، اور ❺ ابوبردہ کو ابوزعنہ نے زخمی کیا، اور جب پہچانا تو "لاعلمی" کی وجہ سے یہ زخم "فی سبیل اللہ" سمجھے گئے۔ اسی طرح ❻ حذیفہ کے باپ یمان قتل ہوگئے۔ اور ❼ حباب بن منذر جو داد شجاعت دے رہے تھے جبار بن صخر کی ایسی ہی نادانستہ ضربت سے زخمی ہوئے۔

"سیفؓ اللہ" کی زبانی ایک روایت

ان بزرگ کے متعلق جن کی ہیبت، وجاہت اور جسامت بعض مؤرخین کے ادعا کے موافق مکہ میں علانیہ نماز پڑھا سکی، انھیں مؤرخین کے نزدیک "سیف اللہ" کہتے ہیں کہ: "روزِ اُحد جس وقت مُسلمین روگردان و گریزاں ہوئے تو میں نے عمر بن الخطاب کو دیکھا کہ وہ چلے جاتے تھے اور ان کے ساتھ کوئی نہ تھا۔۔۔ کسی نے میرے سوا ان کو نہیں پہچانا۔۔۔۔ آخر میں نے دیکھا کہ وہ شعب جبل کی جانب متوجہ تھے"۔ اسی کتاب میں ہے کہ جب "محمدؐ قتل ہوئے" کی صدا بلند ہوئی تو عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں اس وقت آگے بڑھا، اور جبل پر مثل بز کوہی چڑھ گیا۔ حالت اگر ایسی ہی تھی تو عجب نہیں ہے کہ وہ لوگ جو ان کے جُثّہ سے متاثر ہوں انھیں "شعب" کی طرف جاتا ہوا دیکھ کر خود بھی میدان میں کھڑا رہنا خلافِ مصلحت سمجھتے ہوں۔ وقت مخدوش تھا، اور قرینہ غالب تھا کہ رسولؐ کو ان سے صلاح کی ضرورت ہوتی جنھیں مؤرخین نے "وزارت" کا عہدہ حوالہ کر دیا ہے۔ اس کی ایک مثال موافق مجموعۂ کامل غالباً یہ ہو کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے جب مقابل طلب کیا، اور حضرت ابوبکر نے مقابلہ کا قصد کیا تو رسولؐ نے فرمایا: "تلوار میان میں کر اور اپنی جگہ پھر جا، اور اپنی ذات سے ہم کو منفعت پہنچا"۔ "اپنی ذات سے ہم کو نفع پہنچا"۔ یہ اس قدر پُر معنی لفظ ہے جس کے انتخاب کی داد دی جاسکتی ہے۔ لیکن ذات اور نفع کے معنی ہم کو موقع جنگ کے لحاظ سے معلوم ہوں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ لڑائی سے باز رکھے گئے اور نہ یہ اُن آٹھ آدمیوں میں تھے جنھوں نے مرنے کی بیعت کی تھی اور نہ کہیں صلاح مشورہ کا موقع تھا۔ اس لیے اگر اس کے کوئی معنی ہوسکتے ہیں تو یہ کہ تمھاری موجودگی زیادہ تعداد دکھانے میں مفید ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ وزیر کے لفظ سے مؤرخین کی غرض وزیر جنگ نہ ہو۔ یہ حالت اس دوسری حالت کے معنی بتاتی ہے کہ محمد بن عمر الواقدی نے کہا کہ روزِ اُحد رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ: "تم میں سے کون شخص اس تلوار کو لیتا ہے جیسا کہ حق تلوار پکڑنے کا ہے"۔ لوگوں نے عرض کی: "وما حقه؟" یعنی حق تلوار پکڑنے کا کیا ہے؟ فرمایا: "دشمنوں کو قتل کرنا"۔ عمر نے کہا: "یا رسولؐ اللہ! اس تلوار کو میں لوں گا"۔ حضرت نے ان کی طرف سے مُنہ پھیر لیا اور اس تلوار کو اس شرط پر پھر پیش کیا۔

مرنے پر بیعت کرنے والوںؓ کے نام

بقول واقدی: "اس روز آٹھ آدمیوں نے حضرت کے ہاتھ پر بیعت مرنے کی کی تھی۔ تین نے مہاجرین میں سے: ❶ علیؑ ❷ زبیر ❸ طلحہ۔ اور پانچ نے انصار میں سے: ❹ ابو دجانہ ❺ حارث بن صمہ ❻ حباب بن منذر ❼ عاصم بن ثابت، اور ❽ سہیل بن حنیف"۔

اِسلام کے شہداء

اسلام کے لیے خوفناک تاریکی کا وقت تھا، اور ہم بھی عامہ مُسلمین کے ساتھ چاہتے تھے کہ وہ جنھیں مولوی شبلی صاحب الفاروق میں "آسمانِ اِسلام کے مہر و ماہ" فرماتے ہیں میدان

جنگ کو روشن کرتے۔ عمارہ بن زیاد زخموں سے چور چور رسولؐ کے قریب کھڑا تھا، اس کو حضرت نے اپنے قریب بلایا، اور جسم اطہر کا تکیہ لگا دیا، اور اسی حالت میں وہ بہادر اپنا فرض ادا کر گیا۔ انھیں وقتوں میں کوئی عباس بن عبادہ بن نضلہ کا ایسا فدائی بھی تھا جس نے اپنی زرہ اور خود اتار ڈالا، دشمن کے لشکر میں مارتے ہوئے گھس گئے اور شہید ہوئے۔

رسولؐ اور اسلام کے لیے خوفناک وقت میں علیؑ کا ثبات اور اس کا اثر

بقول صاحب مدارج النبوۃ: "جب لشکر اسلام فراری ہوا اور حضرت کو اکیلا چھوڑا حضرت غضب میں آئے اور پسینہ پیشانی مبارک سے نیچے دوڑنے لگا، اس حالت میں اس جنابؐ نے دیکھا کہ حضرت علیؑ پہلو میں کھڑے ہوئے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ: "یا علیؑ کس طرح کی بات ہے کہ تم یاروں میں ملحق نہ ہوئے"۔ یعنی نہ بھاگے۔ ان کے ہمراہ علی مرتضیٰ نے کہا: "ءاکفر بعد الایمان ان لی بک اسوۃ" آیا کافر ہوں میں ایمان لانے کے بعد تحقیق کہ مجھے تجھ سے اقتدا ہے یاروں سے اور بھائیوں سے کیا کام جو بھاگے۔ اسی وقت میں ایک گروہ کفار کا متوجہ طرف اس جنابؐ کے ہوا، حضرتؐ نے فرمایا:

"یا علیؑ مجھے اس گروہ سے بچاؤ حق خدمت و یاری بجا لاؤ کہ وقت یاری ہے"۔

علی مرتضیٰ متوجہ طرف اس گروہ کے ہوئے ــــ اور ان کو پراگندہ کیا، اور ایک جمع کثیر کو طرف جہنم کے روانہ کیا"۔ پھر یہی مؤرخ لکھتا ہے: "اس وقت ایک آواز سننے میں آئی کہ گویندۂ غیبی کہتا تھا کہ:

"لا فتی الا علیؑ لا سیف الا ذوالفقار"

اور اس مبارز غازی نے علی کرم اللہ وجہہ نے حق مبارزت اور محاربت اور جلادت اور شجاعت وہ بجا لایا کہ فوق اس سے متصور نہ ہو سکے"۔ علیؑ کو اس جنگ میں سولہ زخم لگے تھے اور چار مرتبہ سنبھل نہ سکے اور گر گئے۔ لیکن پھر اٹھے اور اس وقت تک میدان جنگ سے نہ ہٹے جب تک کہ دشمن واپس نہ گیا۔ حضرت کے دیوان کا یہ شعر بدر کی سرخی میں لکھا گیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ احد کی واقعہ خوانی کرتا ہے کہ:

نصرنا رسول اللہ لما تدابرو	و تاب الیہ المسلمون ذووا الحجی

(مدد کی ہم نے رسولؐ خدا کی جب پھر گئے لوگ اور پھرے طرف حضرتؐ کے مسلمان عقل والے)

روایتیں ہیں کہ اکثر نساء مسلمین نے اس حالت میں جنگ کی، جب کہ لشکر اسلام میدان جنگ میں متفرق ہو گیا۔ چنانچہ ام عمارہ نسیبہ اور صفیہ بنت عبدالمطلب نے مشرکین کو قتل کیا۔

حالتِ زخم میں رسولؐ کا ثبات

اگرچہ موقع جنگ رسولؐ کے لیے اس حد تک مخدوش ہو گیا تھا کہ عتبہ بن ابی وقاص لب و دندان رسولؐ زخمی کرتا، ابن شہاب سر فرق اقدس کو صدمہ پہنچاتا، اور اسی طرح ابن قمیہ کی ضرب صدمہ پہنچاتی اور جناب رسالت مآبؐ ایک گڑھے میں گر پڑتے لیکن سردار اسلام ایسا ہی ہونا چاہیے تھا کہ وہ اس تمام یورش میں اپنی جگہ سے ایک بالشت نہ ہٹتا، اور کسی وقت دشمن ہجوم کرتے اور زخمی کرنا شروع کرتے اور کوئی تنہا محافظ ہیتیروں کا ایک وقت میں جواب نہ دے سکتا

مسلمان عورتیں اور لشکر کی خدمت

اس جنگ کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ اکثر نساء مسلمین اپنے ساتھ کھانا اور پانی لائی تھیں اور زخمی مسلمانوں کو پلاتی تھیں۔ عائشہ بنت سعد اپنے کاندھے پر دوہری مشکیں لیے تھیں، اور ام ایمن بھی پانی پلا رہی تھیں۔ یہ لوگ زخمیوں کی تیمار داری بھی کرتی تھیں۔ یہ بیبیاں غالباً اس وقت میدان جنگ میں پہنچیں جس وقت مدینہ میں یہ خبر عام ہو گئی کہ جناب رسالت مآب شہید ہوئے۔

فاطمہ ؑ رسول ؐ اور علی ؑ

میں نہیں جانتا کہ کس طرح حضرت زکیہ طاہرہ ؑ میدان میں پہنچی ہوں گی۔ اور کس طرح اپنے پدر بزرگوار کے چہرۂ اقدس کو خون آلودہ دیکھا ہوگا۔ جس حالت میں آنجناب بقول تمام مؤرخین کے یہ فرما رہے تھے کہ: "کیسے فلاح پائے گی وہ قوم جو اپنے نبی کے چہرہ کو خون سے رنگین کرتی ہے۔ درآنحالیکہ وہ انھیں خدا کی طرف بلاتا ہے"۔

رسول ؐ کو جناب امیر بغلوں میں ہاتھ دے کر گڑھے سے نکال چکے تھے۔ پیاس کی شدت تھی اور خون کسی طرح بند نہ ہوتا تھا۔ حضرت اسد اللہ الغالب مہراس کی جھیل سے پانی لائے اور زخم جناب نبوی کو دھونا شروع کیا۔ لیکن خون کسی طرح بند نہ ہوتا تھا۔ جناب فاطمہ زہرا ؑ نے ریشمی یا کسی قسم کا موٹا کپڑا جلا کر اس کی راکھ جسم میں بھری اور اس سے خون بند ہوا۔

علی ؑ کا رجز

بقول مجموعہ کامل واقدی علی ؑ زخم سر کے دھونے کے وقت حضرت فاطمہ ؑ کو اپنی تلوار لیے رہنے کو حوالہ کرتے ہیں۔ دیوان جناب امیر و حیات القلوب وغیرہ کے موافق فرماتے ہیں:

"اے فاطمہ ؑ تو اس تلوار کو جو بری نہیں ہے اور میں خوف زدہ لئیم اور ناکس نہیں ہوں، اے فاطمہ ؑ میں نے سخت کارزار کی نصرت احمد اور خوشنودی پروردگار میں جو بندوں پر رحیم ہے، میں بجز ثواب خدا کے اور کسی شے کی خواہش نہیں رکھتا اور خدا کی رضا جنت اور بہشت کی آسائش ہے اور میں وہ مرد ہوں کہ بلندی ڈھونڈتا ہوں جب لڑائی دامن چڑھائے اور دشوار کام برپا ہو، بغیر اس کے کہ سزاوار ملامت ہو، میں نے قصد کیا پسر عبد الدار کا یہاں تک کہ مارا میں نے اس کو اپنی تلوار آبدار سے جو مقوم اعضاء استخوان کو کاٹتی ہے۔۔۔ اور میری شمشیر میرے ہاتھ میں مانند شہاب درخشاں کے تھی، جسے میں چلاتا تھا۔۔۔ میں ہمیشہ تاک میں رہا یہاں تک کہ میرے پروردگار نے ان کی جماعتوں کو پراگندہ کیا، اور شفا و تسکین دی میں نے ان سے ہر صبر کرنے والے کے سینہ کو"۔ واقدی نے کوئی سخاوت نہیں کی ہے جہاں علی ؑ کے متعلق رسول ؐ سے یہ کہلوایا ہے کہ تم نے "بہت خوب جنگ کی"۔

لشکر اسلام کے بعض مجاہد اور مثالی دل کی عورتیں

اس جنگ میں حضرت حمزہ ؓ، مصعب ؓ بن عمیر ؓ، ابو دجانہ ؓ، حباب ؓ بن منذر، سہیل ؓ بن حنیف خصوصیت سے قابل تعریف ہیں جنھوں نے اس طرح جنگ کی جو شجاعت کا حق تھا۔ اسی طرح میں ان عورتوں کی تعریف کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا جن میں سے کوئی اپنے جوان بیٹوں کی لاش اپنے اونٹ پر لیے جا رہی ہے لیکن کسی پوچھنے والے سے ان کی غم کی ہوا بھی نہیں دیتی اور رسول ؐ کی سلامتی کی خوشخبری سناتی ہے اور کوئی اپنے فرزند اور شوہر کی لاش دیکھ کر رسول ؐ کی خبر سلامتی دریافت کرنے کے جوش میں ان کی طرف سے منہ پھیر کر آگے بڑھ جاتی ہے۔

یہ مائیں تھیں جن پر اسلام کی خصلت شجاعت پروری کو افتخار ہونا چاہیے۔

حضرت حمزہؓ کی شہادت

خاتمہ جنگ کے بعد کا دردانگیز منظر اب شروع ہوا، اور رسولؐ نے اسلام کے ایک بڑے مددگار شیر یعنی حمزہؓ کو دریافت فرمایا، جس نے دشمنوں کی صفیں چیری اور روندی تھیں۔ کسی کے دل میں یہ طاقت نہ تھی کہ وہ رسولؐ سے کہتا کہ وحشی نے چھپ کر اس بہادر کے پہلو میں نیزہ مارا اور ہندہ نے نہ صرف سینہ شگافتہ کر کے ان کا دل چبایا، بلکہ مثلہ بھی کیا۔ زخمی سپاہیوں پر عبرت خیز عالم طاری ہوا۔ جب علیؑ بن ابی طالب علیہ السلام اپنے سہارے سے رسولؐ کو اپنے عم بزرگوار کی لاش پر لے چلے۔ واقدی اور مدارج النبوۃ کے علاوہ مورخین قائل ہیں کہ رسولؐ چشم پرآب ہوگئے۔ لیکن اس وقت اور بھی بے قراری بڑھ گئی جس وقت حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب نے لاش کے قریب جانا چاہا۔ اس وقت تمام مسلمین بھی رو رہے تھے۔

فاطمہؓ بنت حمزہؓ کا سوال اور رسولؐ کی شفقت

اور کسی کا دل ایسا سخت نہ تھا کہ فاطمہؓ بنت حمزہؓ کو یہ پوچھتے سنتا کہ:
"میرا باپ کہاں ہے"۔ اور کوئی اپنی آنکھوں سے آنسو نہ ٹپکنے دیتا۔ دیر تک یہ سر راہ کھڑی رہیں، اور دیکھا کہ جوق جوق لوگ ایک طرف چلے جا رہے ہیں۔ اس منظر نے بجائے تسکین کے اور متاثر کیا ہوگا۔ جب اس گروہ میں کسی سپاہی کو خود میں شترمرغ کے پر لگائے نہ دیکھا ہوگا۔ اس کے بعد یہ بھی رسولؐ کے پاس پہنچائی گئیں۔ یہاں بھی نہ پایا۔ اب بے چینی سے لگام فرس پر ہاتھ ڈال دیا، اور وہی دل ہلا دینے والا سوال کیا کہ: "میرا باپ کہاں ہے؟" رسولؐ نے فرمایا: "میں تیرا باپ ہوں گا"۔ ذکی الطبع لڑکی نے کہا کہ "یا رسول اللہ اسی سے خون کی بو آتی ہے"۔ رسولؐ اور اصحابؓ کی آنکھوں کے آنسو نے اس سوال کا جواب دیا۔

حمزہؓ کی تعزیت کے لیے رسولؐ کا حکم اور انصار

حضرت پر شہادت حمزہؓ کا جیسا دیرپا اثر ہوا وہ اس واقعہ سے معلوم ہوگا کہ:
جب آنجنابؐ مدینہ واپس تشریف لائے اور انصار کے گھروں سے اپنے اپنے مقتولین پر رونے کی صدا سنی تو فرمایا کہ: "حمزہؓ پر کوئی رونے والا نہیں ہے"۔ انصار نے یہ سن کر اپنی عورتوں کو ہدایت کی کہ تم پہلے حمزہؓ کے گھر جا کر روؤ۔ حضرتؐ نے جب حمزہؓ کے گھر سے آواز گریہ سنی اور حالات پر مطلع ہوئے تو بقول مدارج النبوۃ فرمایا کہ: "راضی ہو خدا ان عورتوں سے اور ان کی اولاد سے اور اولاد کی اولاد سے"۔

زخم اور عبادت

حضرتؐ اس قدر زخم دار تھے کہ بیٹھے بیٹھے نماز پڑھائی اور بقول مجموعہ کامل واقدی جب شہداء پر رسولؐ نماز پڑھاتے تھے تو فرمایا کہ: "میں ان لوگوں پر شاہد ہوں"۔

رسولؐ کی حدیث زمانۂ مستقبل کے لیے

تب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: "یا رسول اللہ! کیا یہ لوگ ہمارے برادر تھے کہ اسلام لائے تھے؟"
..... فرمایا: "ہاں سچ ہے، لیکن انھوں نے اپنے اجور دکمائی میں سے کچھ نہیں کھایا، اور میں نہیں جانتا کہ تم میرے بعد کیا کیا احداث و بدعت کرو گے"۔

غزوۂ اُحد میں میں نے ترتیب واقعات میں ناظرین کا زیادہ وقت لیا، اس سے زیادہ جس قدر میں آئندہ غزوات اور سرایا میں ضرورت سمجھوں گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ذکر کیے ہوئے واقعات کو ہمارے ہیرو کے بعض آئندہ واقعات سے حسب معنی خیز مناسبت ہوگی۔

اسلام کے اور شہداء

اس کے بعد اگرچہ بعض سرایا وقوع میں آئے لیکن ان میں سے زیادہ توجہ کے قابل واقعہ رجیع تھا۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ سلافہ بنت سعد نے جو طلحہ بن ابی طلحہ کی بی بی تھی، عام اعلان کیا کہ: "جو شخص میرے دو بیٹوں کے قاتل عاصم بن ثابت کا سر لائے گا، اسے سو اُونٹ دیے جائیں گے"۔ اس پر ایک شخص سفیان بن خالد آمادہ ہوا، اور اپنے قبیلہ کے چند شخصوں کو لے کر خدمت رسولؐ میں حاضر ہوا، اور بہ مکر مسلمان ہونا ظاہر کیا۔ اور اس کے بعد خواہش کی کہ اگر کچھ لوگ اس کے قبیلہ کی طرف ہدایت دین کے لیے روانہ کیے جائیں تو سب اسلام لائیں گے۔ رسولؐ نے سات آٹھ آدمی منتخب فرمائے۔ جب یہ لوگ تنعیم میں پہنچے تو سفیان بن خالد نے اپنے قبیلہ کو خبر دی اور اس نے آکر ان کو گھیر لیا۔ یہ سات آدمی بہادروں کی طرح لڑے، اور سب نے بہ استثناء دو آدمیوں کے شہادت پائی۔ ان کے نام خُبیب اور زید بن دثنہ ہیں۔ یہ مکہ میں لاکر فروخت کیے گئے۔ خُبیب کو حارث بن عامر کے بھائی نے خریدا، اس لیے کہ خُبیب نے حارث کو بدر میں قتل کیا تھا، اور زید کو صفوان بن امیہ نے خریدا۔ اس لیے کہ اس کے باپ کو انھوں نے قتل کیا تھا۔ یہ لوگ دار پر کھینچے گئے۔ اور ان سے اسلام سے پھر جانے کی خواہش کی گئی۔ یہ وفادار اسلام کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔ اس وقت چالیس نیزہ دار جن کے اعزا بدر میں مارے گئے تھے جمع ہوئے، اور انھیں انیان چھانے لگے، اور اس طرح یہ دو مسلمان جاں بحق تسلیم ہوئے۔

رسولؐ کو دو مسلمانوں کی لاش کا دار پر رہنا گوارا نہ ہوا

رسولؐ کو اس خبر نے متاسف کیا، اور زبیر اور مقداد نے یہ وعدہ کیا کہ یہ لوگ ان کی لاشوں کو دار پر سے اتار لیں گے۔ یہ لوگ گئے اور بہت ہوشیاری سے لاشیں اتار لیں، اور اپنی وفادارانہ کارروائیوں کے اختتام کے بعد رسولؐ کو اس کی خبر دی۔ (شواہد النبوۃ، مناہج وغیرہ)

اسلام کے وقار کی حفاظت

تمام ذاتی تکلیف کے لحاظ سے مقدم تھی

اس کے قبل صفوان بن امیہ اور عکرمہ بن ابی جہل اس پر متاسف تھے کہ اُحد کی جنگ کے بعد کیوں مدینہ کو نہ لوٹا۔ بعض ان میں سے اس کے مخالف تھے۔ یہ خبر رسولؐ کو پہنچی اور اگرچہ آپ مع اکثر ممتاز جاں نثاروں کے زخمی تھے لیکن سب وقار اسلام کے محفوظ رکھنے کے لیے حمرآء الاسد میں جمع ہوئے، درآنحالیکہ ان کے زخموں پر پٹیاں بندھی تھیں۔ علامہ مجلسی حیات القلوب میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ علیؑ ایسے زخمی تھے کہ بستر سے اٹھ نہ سکتے تھے مگر جس وقت رسولؐ نے فرمایا کہ مشرکین حمرآء الاسد میں جمع ہونے کا قصد رکھتے ہیں تو علیؑ میں جنبش پیدا ہو گئی اور ساتھ جانے کا قصد ظاہر فرمایا، اور رسولؐ کی اشک آلود نگاہوں نے شکریہ ادا کیا۔ مسلمانوں کی اس دلیری نے کفار کی ہمت پست کر دی اور جنگ نہ ہوئی۔

وہ لوگ جن کو مکر جلاوطن ہوئے
جنھیں اسلام نے جلاوطن کیا

اسی طرح نجد میں ان مسلمانوں کو جو دعوتِ اسلام کرنے گئے تھے، عامر بن طفیل نے مع انبوہ کثیر کے گھیرا اور شہید کیا۔ غزوہ بنی نضیر میں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ یہود کا یہ موقع بیان کردہ اگرچہ پیشتر پابندِ عہد تھا، مگر واقعۂ اُحد سے نہ صرف اظہارِ عداوت کرنے لگا بلکہ مشرکین قریش سے مل گیا اور کبھی رسُولؐ کو دعوت دے کر بے خبری میں پتھر مارنا چاہا، تو کبھی ان کے سپاہی غرور انے اسلام کے سپاہیوں کو کمین سے قتل کرنے کا قصد کیا۔ اس پر بھی ان کی خواہش صلح منظور کی گئی تو بقول منہاج انھوں نے :

"اپنے تئیں سنوارا، دف بجاتے اور گیت گاتے مدینہ کے بازار سے نکلے"۔

نہ اس کے قبل کہ اپنے گھروں اور پس ماندہ چیزوں کو اپنے ہاتھ سے خراب نہ کیا ہو۔

سنہ ۴ھ سیوم ماہِ شعبانؑ ولادت حسینؑ

ماہِ شعبان تک تاریخ اسلام کا اس حد تک نشو اور خاندان نبوت کا اس درجہ وقار قائم ہو چکا تھا کہ جناب رسالت مآب اپنی پارۂ جگر کے حجرے کے باہر کھڑے تھے۔ یہ نہ تھا کہ جناب اقدس نبوی نے اپنی عادت کے موافق سلام کیا ہو اور اس کے منتظر ہوں کہ جواب ملے تو ہم اندر داخل ہوں۔ اور نہ یہ تھا کہ جناب رسالت مآب کہیں سے تشریف لانے ہوں اور اپنی لاڈلی بیٹی کو معمول کے موافق پہلے دیکھنا چاہتے ہوں۔

رسُولؐ کی حالتِ انتظار

آج رسُولؐ بالارادہ بیرون خانہ تشریف رکھتے تھے اور ایک بچے کی ولادت کے منتظر تھے۔ بچہ پیدا ہوا، اور بقول خصائص حسینیہ : "حضرتؐ نے حالت سجدہ میں آواز دی کہ میرے فرزند کو لا ..... پس لائی اسماءؑ امام حسینؑ کو ایک پارچہ ریشم میں لپیٹ کر۔ پس حضرتؐ نے امام حسینؑ کو گود میں لیا۔

بعض احادیث

● اور ہادیؐ نے اپنے اس فرزند کے کانوں میں اذان کہی۔ ● یہ بچہ سید جوانان بہشت کا دوسرا تھا۔ ● اور یہ سید العرب کا دوسرا فرزند تھا۔ ● یہ دو ریحان رسُولؐ میں کا ایک تھا۔ جس کے متعلق رسُولؐ نے بقول صواعق محرقہ فرمایا کہ : ● "حسینؑ از من است و من از وے ام"۔ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ ● خدا آن را دوست داشتہ است ہر کس کہ حسینؑ را دوست داشتہ است۔ خدا اس سے محبت کرتا ہے جو حسینؑ سے محبت کرے۔ اس کتاب میں یہ بھی حدیث ہے کہ : ● "ہارون دو پسران خود را شبر و شبیر نام کرد و من دو پسران خود را حسن و حسینؑ نام کردم"۔ ہارونؑ نے دو بیٹوں کے نام شبر اور شبیر رکھے تھے، اور میں نے اپنے دو بیٹوں کے نام حسنؑ و حسینؑ رکھے ہیں۔

رسُولؐ نے حسینؑ نام رکھا ہے

یہ روایت سر الشہادتین میں بھی مذکور ہے اور اس میں اس قدر اضافہ ہے کہ جب حضرت امام حسینؑ علیہ السلام پیدا ہوئے تو جناب رسالت مآبؐ نے حضرت علیؑ سے دریافت فرمایا کہ تم نے کیا نام رکھا ہے۔ آپؑ نے جواب دیا کہ "حرب"۔ فرمایا حضرتؐ نے بلکہ اس کا نام "حسینؑ" ہے۔

عقیقہ ساتویں دن ایک سفید کپڑے میں لپیٹے گئے، عقیقہ ہوا اور بالوں کے وزن کے موافق چاندی تصدق کی گئی اور بحسا ر کے موافق کان چھیدے اور بندے ڈالے گئے۔

حسینؑ میں رسولؐ کی سخاوت اور جرأت

بعض کے موافق اس وقت جناب فاطمہ زہرا (علیہا السلام) نے اپنے فرزند کے لیے رسولؐ سے کچھ مانگا اور رسولؐ نے فرمایا: "میں نے اسے اپنا جود اور اپنی شجاعت عطا کی"۔ صواعق محرقہ کے لفظوں میں:

"طبرانی از فاطمہؑ روایت کرد کہ پیغامبر فرمود صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ اما حسن پس مرا وراست ہیبت من و سرداری من و اما حسینؑ پس برائے اوست جرأت من و جود من"۔ حضورؐ نے فرمایا: حسنؑ کے لیے میری ہیبت اور سرداری ہے، حسینؑ کے لیے میری شجاعت اور سخاوت ہے۔

رسولؐ کے مشابہ بچہ کو ماں لوریاں دیتی ہے

روایتیں ہیں کہ جناب امام حسینؑ رسولِ اکرمؐ سے مشابہ تھے جس کی تائید اس شعر سے بھی ہوتی ہے جو جناب فاطمہؑ حسینؑ کو لوریاں دیتے وقت فرماتی تھیں کہ:

انت شبیہ بابی لست شبیہا بعلی

حسینؑ اور رسولؐ

اس کے بعد ناظر ملاحظہ کرے گا کہ یہ بچہ کبھی رسولؐ کے دستِ اقدس پر ہے۔ کبھی سینہ پر ہے۔ کبھی کاندھے پر ہے۔ کبھی رسولؐ چوم رہے ہیں اور کبھی ام ایمن یا ام الفضل کی اس لیے چشم نمائی کرتے ہیں کہ کیوں حسینؑ کو اس طرح گود سے کھینچا کہ وہ بسورنے لگے۔ حسینؑ بڑھتے جائیں گے اور بقول سرالشہادتین نبی اللہ کے کاندھے پر جھومیں گے اور کبھی سرخ کپڑے پہنے ہوئے چھوٹے چھوٹے پاؤں سے ڈگ ڈگ کرتے اور لڑکھڑاتے ہوئے مسجد میں چلے آئیں گے۔ رسولؐ منبر پر سے دیکھیں گے۔ دل بے چین ہو جائے گا کہ کہیں گر نہ پڑیں۔ چوٹ نہ لگے اور رونہ دیں۔ منبر سے اتر آئیں گے۔ گود میں لے کر پیار کرنے لگیں گے اور بقول صواعق محرقہ فرمائیں گے کہ:

"خدائے تعالیٰ راست گفتہ کہ جز این نیست کہ اموال و اولاد شما فتنہ ایست من نظر کردم باین دو صبیان یعنی حسنؑ حسینؑ کہ می آیند و پائے ایشان می لغزد پس صبر نتوانستم کرد تا این کہ حدیث خود را قطع نمودہ برداشتم ایشان را"۔

ترجمہ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے: مال و اولاد تمہارے لیے آزمائش ہے۔ میں نے دیکھا ان دو بچوں حسنؑ اور حسینؑ کو کہ آ رہے ہیں اور ان کے پاؤں لڑکھڑا رہے ہیں۔ پس میں صبر نہ کر سکا اپنی بات چھوڑی اور ان کو اٹھا لیا۔

ہم پھر مجبور ہیں کہ اس مولودِ مسعود کے حالات سے اس وقت تک رک رہیں جب تک یہ تاریخِ اسلام میں عملی شرکت کے قابل نہ ہو جائے۔ اس درمیان میں ہم پھر ان عظیم الشان واقعات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جن سے حسینؑ کی سوانح عمری متاثر ہے۔

حضرتؓ فاطمہؓ بنتِ اسد کی رحلت اور رسولؐ

اس سال میں حضرت فاطمہؓ بنت اسد نے رحلت فرمائی۔ حضرتؑ کے حکم سے بقیع میں قبر تیار کی گئی۔ خبر سن کر رسولؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ: "چلو اپنی ماں کے پاس چلوں"۔ اصحاب اس طرح رسولؐ کے ساتھ چلے گویا ان کے سروں پر طائر بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرتؑ نے اپنا پیراہن ان کے کفن کے لیے عطا فرمایا۔

رسولؐ کاندھا دیتے ہیں

اور جب جنازہ باہر آیا تو بقول مناہج النبوۃ اس جنابؐ نے اس جنازہ کا پایہ اپنے کتف مبارک پر اٹھایا، اور تمامی راہ میں کبھی اگلا پایہ جنازے کا اور کبھی پچھلا کاندھے پر اٹھائے تھے۔ کاندھا دیے ہوئے چلے جاتے تھے"۔

رسولؐ کا پیارا مخاطبہ

انس بن مالک کہتے ہیں کہ رسولؐ لاش کے سرہانے بیٹھے تھے اور فرماتے تھے: "یا اُمّی بعدَ اُمّی" (اے میری ماں کے بعد میری ماں)

رسولؐ نے قبر کھودی اور مٹی نکالی

اور "اسامہؓ بن زیدؓ، ابوایوبؓ انصاری اور عمر بن الخطاب نے قبر کھودی۔ اور لحد ان کی اس جنابؐ نے اپنے دست مبارک سے کھودی، اور اپنے ہاتھوں سے خاک اس کی باہر نکالی"۔

سعد بن معاذ کی تجہیز و تکفین

حضرت فاطمہؓ بنت اسد کا تو کیا ذکر سعد بن معاذ کی تجہیز و تکفین میں رسولؐ نے مخصوص شرکت فرمائی اور وقت نزع ان کا سر زانوئے مبارک پر رکھا۔ یہ اسلامی خدمات کا اعتراف تھا۔ لیکن رسولؐ غیر مسلمین کے جنازہ کا بھی احترام فرماتے تھے اور کھڑے ہو جاتے تھے۔

غزوہ بنی مصطلق

۵ھ میں ایک واقعہ ہوا جس بعض مورخین ۶ھ میں بھی کہتے ہیں جس نے ہماری تاریخ کے آئندہ اوراق پر گہرا اثر ڈالا۔ واقعہ کو بغیر کسی تنقید یا اجتہاد تاریخی کے مختصر لفظوں میں پیش کرتا ہوں۔ مجھے اس واقعہ کے متعلق لحاظ اور امید ہے کہ کم سے کم میرے ہم خیال مورخین کبھی اسے کسی تنقید یا اجتہاد کے تابع نہ کریں گے۔ مجھے ذاتی طور سے یہ یقین ہے کہ یہ مصلحت جناب امیرؑ کی پیروی ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ حارث بن ضرار نے جو بنی خزاعہ کا سردار تھا قبائل عرب کو رسولؐ کی جنگ پر مجتمع کرنا شروع کیا۔ رسولؐ مع اپنے علمدار کے روانہ ہوئے۔ حارث بن ضرار مع اپنے بیٹے کے علیؑ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ لشکر بے سردار ہو چکا تھا۔ مسلمانوں نے یک بارگی حملہ کیا، اور دشمن کے دس آدمی اور قتل ہوئے تھے کہ مسلمان فتح یاب ہوئے۔

حدیثِ افک

رسولؐ واپس آ رہے تھے اور قریب مدینہ پہنچ رہے تھے کہ ایک شب کوچ کا اعلان کیا گیا۔ کوچ کے اعلان کے وقت حضرت عائشہ قضائے حاجت کے لیے لشکر سے باہر تشریف لے گئیں۔ اور جب واپس آئیں تو دیکھا کہ گردن بند نہیں ہے۔ پھر واپس گئیں اور ڈھونڈنے میں دیر ہوئی۔ جب لشکر گاہ میں آئیں تو دیکھا کہ یہاں کوئی نہیں ہے۔ یہ بیٹھ گئیں اور نیند آ گئی۔ صفوان بن معطل سلمی اس لیے عقب لشکر رہتا تھا کہ لوگوں کی چھوٹی ہوئی چیزیں دیکھ لیا کرے۔ بقول مناہج النبوۃ عائشہ صدیقہ کہتی ہیں کہ: بس صبح کی صفوان نے میری منزل کے نزدیک اور دیکھا اس نے ایک سیاہی آدمی کی کہ بیچ خواب کے سوتا ہے۔ پس پہچانا اس نے مجھے۔ جس وقت اس نے

مجھے دیکھا اور اس نے مجھے پیش از حجاب دیکھا تھا کہا اس نے انا للہ وانا الیہ راجعون ---- پس جاگی میں اس کے استرجاع کی آواز سے اور ڈھانپا میں نے اپنے منہ کو اپنی چادر سے ---- پس اترا صفوان اپنے اونٹ سے اور بٹھایا اس نے اپنے اونٹ کو پس رکھا اس نے پاؤں اونٹ پر اور یہ اس واسطے کیا تاکہ آسان ہو عائشہ کو سوار ہونا ---- پس کھڑی ہوئی میں اور گئی طرف اونٹ کے اور سوار ہوئی اس پر ---- یہاں تک کہ آئے ہم اور پہنچے ہم لشکرگاہ میں گرم گاہ روز میں ---- پس دراز کی اہل افک نے زبان ---- اور سرانجام کرنے والا بڑا عبداللہ بن ابی سلول ہوا ---- اور تعجب یہ ہے کہ اہل اسلام سے بھی کئی شخص اہل افک کے ساتھ شریک ہوئے ---- حسان بن ثابت اور مسطح بن اثاثہ ابوبکر صدیق کی خالہ کی بیٹی کا بیٹا تھا، اور حمنہ بنت جحش، زینب بنت جحش کی ہمشیرہ جو امہات مومنین سے ہے۔

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ مدینہ پہنچ کر میں بیمار ہو گئی اور اہل افک کے باتوں کی مجھے کوئی خبر نہ تھی۔ لیکن رسولؐ کا مزاج اپنی طرف سے متغیر پاتی تھی۔ یہاں تک کہ کچھ دنوں کے بعد ام مسطح نے قصہ سنایا۔ اس کے بعد حضرت عائشہ رسولؐ سے اجازت لے کر اپنے باپ کے گھر تشریف لائیں۔ یہاں معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر نے بھی یہ روایت سنی ہے۔

مشورہ اور علیؑ کا جواب

کچھ دن گزرے تھے کہ حضرت رسولؐ نے اسامہ بن زید اور جناب امیر علیہ السلام سے مشورہ طلب کیا۔ جناب امیرؑ نے بقول مدارج النبوۃ فرمایا:

"یا رسولؐ اللہ تنگ نہیں کیا ہے حق تعالیٰ نے واسطے تیرے عورتوں کے تئیں اور عورتیں اس کے سوا بہت ہیں۔ پوچھیے آپ جاریہ سے یعنی بریرہ سے" ---- پس بلایا حضرتؐ نے بریرہ کے تئیں ---- بریرہ نے عرض کی: "یا رسولؐ اللہ قسم خدا کی نہیں دیکھا میں نے عائشہ سے ایسا کوئی کام جو عیب دار کرے عائشہ کو زیادہ اس سے کہ لڑکی ہے خرد سال، غافل اس سے کہ بکری آتی ہے اور جو آٹا میں نے گوندھا کھا جاتی ہے"۔

طبری اور روضۃ الصفا وغیرہ میں بھی یہی ہے

جناب امیرؑ نے جو کچھ فرمایا اس کے متعلق مؤلف کتاب مولوی عبدالحق صاحب دہلوی فرماتے ہیں کہ:

"جب دیکھا علیؑ مرتضیٰ نے کہ حضرتؐ تنگی عرق اور حیرت اور تنگ دلی میں پڑے ہیں اور اس غم و اندوہ کی کشادگی کار کی کوئی راہ نہیں ہے تب یہ کہا، اور یہ بات برادری میں محبوں میں اور خیرخواہوں میں ہوتی ہے ---- ظاہر یہ ہے کہ جتنی محبت اور خیرخواہی کہ علیؑ مرتضیٰ حضرتؐ سے رکھتے تھے عائشہ سے نہیں رکھتے تھے۔ پس اس نے یعنی حضرت علیؑ نے حضرتؐ کی رعایت کر کے ایک بات کی"۔

اسی کتاب میں صحیح بخاری سے نقل کی گئی ہے کہ زہری روایت کرتا ہے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف اور ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث سے کہ عائشہ نے ان سے کہا کہ: "علیؑ میرے قصہ میں خاموش (ساکت) تھے"۔

جامع ترمذی، قرۃ العیون اور مدارج میں بہ اختلاف الفاظ حضرت عائشہ نے رسولؐ کو یہ جواب دیا کہ:

"اگر میں کہوں کہ میں اس سے پاک ہوں تو تصدیق نہ کروگے اور یقین نہ کروگے میرے کہنے پر۔ اور اگر اقرار کروں میں ایک امر پر جس کا انھوں نے مجھ پر بہتان باندھا ہے تو تصدیق کروگے"۔

قرآنؐ کا تصفیہ

اگر سورۂ نور اسی قصہ کے متعلق ہے تو اس میں یہ الزام قانونی حیثیت سے خارج کیا گیا ہے کہ: لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (۲۴ : ۱۳) (کس واسطے نہیں لائے اوپر اس کے چار گواہوں کو پس وقتیکہ نہ لائے وہ گواہوں کو پس وہ گروہ ہیں نزدیک خدا کے دروغ گویوں سے) اور اس کے بعد نہایت جائز ہدایت کی گئی ہے: يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۲۴ : ۱۷) (منع کرتا ہے تم کو خدا یہ کہ پھر ذکر کرو تم مانند اس ذکر کے کبھی اگر ہو تم ایمان لانے والوں سے)

علیؑ کی رائے

اس جگہ میں یہ کہنا علیؑ کے ساتھ انصاف سمجھتا ہوں کہ رسولؐ کے صلاح لینے پر علیؑ کا جواب نہ صرف دیانت کا مظہر ہے بلکہ کوئی صریح رائے نہ دے کر اپنے کو اس الزام سے دور رکھا ہے کہ عائشہ کے متعلق انھوں نے کوئی بے رحمانہ تصفیہ کیا بلکہ معاملہ قطعاً رسولؐ کی رائے پر موقوف رکھا۔ اس کے بعد اس لیے علیؑ سے کوئی مخالفت پیدا ہونا نہ صرف ان کے فیصلہ اور موقع کے ساتھ ناانصافی ہے بلکہ ان کے لطیف احساس کی ناقدری ہے۔

مؤلف نے کیوں یہ واقعہ نقل کیا

یہ موٹے موٹے واقعات تھے جنھیں میں نے پیش کیا حقیقتاً مجھے ان واقعات کا لکھنا بے سود تھا اگر آئندہ اس کا کوئی اثر نہ ہوا ہوتا بلکہ مجھے اس کے لکھنے کی اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس واقعہ نے آئندہ علیؑ کے متعلق واقعات پر حضرت عائشہ کی بدولت بڑا اثر ڈالا۔ میں نہیں کہتا کہ یہی ایک وجہ تھی جس نے آئندہ واقعات کو متاثر کیا بلکہ اکثر واقعات میں جس نے علیؑ کی تاریخ پر اثر کیا واقعہ بنی مصطلق ممتاز ہوا۔

غزوۂ خندق

یہود اور کفار کا اتحاد اسلام کے خلافؐ

۵ھ کا مشہور واقعہ غزوۂ خندق ہے۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ جلاوطن بنی نضیر نے اب قریش سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ: "تم سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عداوت اور استیصال پر عہد کریں"۔ اس پر ابوسفیان نے جواب دیا کہ: "بہترین اشخاص ہمارے نزدیک وہ ہیں جو ہماری مدد کریں محمدؐ کی عداوت پر"۔ اس کے بعد کعبہ میں عہد و پیمان مضبوط کیا گیا

دشمن کی تعداد

بنی نضیر نے قبیلہ غطفان کو بھی خیبر کے ایک سال کے غلے پر اپنے ساتھ کر لیا۔ اس کے بعد ابوسفیان قبائل اسلم، اشجع، ابومرہ، کنانہ، فزارہ اور غطفان کو لے کر آگے آگے چلا۔ اس لشکر کی تعداد دس ہزار تھی۔ دشمن کا انبوہ زیادہ تھا۔

سلمانؓ کی صلاح سے حفاظت کے لیے خندق کھودی گئی

رسولؐ نے استشارہ فرمایا اور طے یہ کیا گیا کہ مدینہ کا وہ سمت جدھر میدان ہے اور کوئی فطری یا عارضی آڑ نہیں ہے اس طرف خندق کھودی جائے۔ خندق کی صلاح حضرت سلمان فارسی نے دی

تھی۔ حضرت سلمانؓ خندق کھنی میں ایسا انہماک ظاہر کرتے تھے کہ مہاجر اور انصار دونوں انھیں اپنی طرف لینا چاہتے تھے۔ رسولؐ نے تصفیہ فرمایا کہ "سلمان منا اهل البیت"

مُسلمین کی بے سروسامانی اور کوشش

اس فصل میں ہوا نہایت سرد تھی۔ اصحاب بھوکے تھے۔ خاک ان کے سر اور کاندھوں پر پڑی تھی۔ مگر پھر بھی کہتے تھے کہ: "ہم نے بیعت کی محمدؐ سے جہاد پر جب تک زندہ ہیں"۔ اور حضرت فرماتے تھے کہ: "خداوندا کوئی عیش آخرت سے بہتر نہیں ہے۔ تو مہاجر اور انصار کو بخش دے"۔ خود جناب رسالت مآبؐ اس قدر بھوکے تھے کہ شکم اقدس پر پتھر بندھا ہوا تھا۔ حیات القلوب میں لکھا ہے کہ جناب فاطمہؑ زہرا ایک ٹکڑا روٹی کا لائیں اور رسولؐ نے فرمایا کہ: "یہ ٹکڑا ہے جو تین دن میں تیرے باپ کو میسر ہوا ہے"۔

گھر کے دشمن

لشکر اسلام کو نہ صرف کبھی اتنے بڑے لشکر سے سابقہ نہ ہوا تھا بلکہ دشواری میں اس سے اور اضافہ ہو گیا تھا کہ حُیَی بن اخطب اور ابوسفیان نے صلاح کی کہ بنی قریظہ کو جو رسولؐ کے حلیف ہیں، ملا لیں۔ انھوں نے پیمان شکنی کی، اور اب لشکر اسلام کو عقب اور سامنے دونوں طرف سے خوف ہو گیا۔ اگرچہ رسولؐ نے بنی قریظہ کے پاس زبیر، سعد بن معاذ یا سعد بن عبادہ کو سمجھانے کے لیے بھیجا، مگر یہ لوگ راہ پر نہ آئے۔

کمزور دِل مُسلمانوںؓ کی حالت

مسلمانوں کی حالت اس سے معلوم ہوگی کہ: "اِشتدّ البلایا مسلمانوں کے خوف نے اور عظیم ہوئی بلا ان کی"۔ حضرت نے فرمایا: "حسبنا اللہ و نعم الوکیل"۔ لیکن منافقین اسلام کے دل کفار کی شوکت اور کثرت سے اڑنے لگے اور آنکھیں نہایت رعب سے خیرہ ہوئیں، یعنی کھلی رہ گئیں۔ (مناہج) بہترین مصوری خداوند تعالیٰ نے سورۂ احزاب میں فرمائی ہے۔

محلاتِ مدینہ کی حفاظت کا اِنتظام

رسولؐ نے نہایت احتیاط سے زید بن حارثہ کو تین سو آدمی دیے اور یہ مدینہ کے محلات کی محافظت کرتے تھے، اور بقول صاحب حیات القلوب: حضرت اسد اللہ الغالب تمام شب گردِ لشکر گشت کرتے تھے اور دشمن کے طلایہ سے اکثر جنگ ہو جاتی تھی۔ حضرت نے جس جگہ نماز پڑھی اس جگہ مسجد امیر المومنینؑ ہے جو مسجد فتح سے ایک تیر کے پرتاب پر واقع ہے"۔

علیؑ کی یادگار مسجد

اس جنگ کی حالت کو مولانا علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام اپنے دیوان میں نظم فرماتے ہیں:

وکانوا علی الاسلام اِلبا ثلثة　　　فقد خر من تلک الثلثة واحد

(اور تھے یہ لوگ اسلام میں تین گروہ پس منہ کے بل گرا ان تینوں میں سے ایک)۔

علیؑ کی خدمت کا وزن

اس کے بعد بقول صاحب مناہج النبوۃ: "محاربہ اور مقابلہ میان دونوں لشکروں کے واقع ہوا۔ خصوصاً حیدرِ کرار صاحب ذوالفقار علی مرتضیٰؑ سے اس غزوہ میں وہ وہ مبارزت اور مقاتلت واقع ہوئیں کہ حد قیاس اور عقل کے احاطہ سے باہر ہے۔ جیسا کہ اخبار میں واقع ہوا ہے۔ لمبارزة علی بن ابی طالب یوم الخندق افضل من اعمال امتی الی یوم القیامة (جنگ کرنا علیؑ بن ابی طالبؑ کا

افضل ہے میری امت کے اعمال سے روزِ قیامت تک") اسی مورخ کے موافق: "حضرتؐ نے دعائیں کیں حضرت علیؑ کے حق میں اور شمشیر اپنی جس کا نام "ذوالفقار" تھا اس جناب کو عطا کی"۔ اس جنگ میں مخصوص پہلوان کا ایک واقعہ عمر بن عبد ود کا میدان میں آنا تھا، اور لشکرِ اسلام کی افسوس ناک خاموشی تھی۔ بقول ابن عبد ود: "ہر آئینہ للکار کر کہا میں نے اس کی جماعت میں کہ: ہے کوئی مبارز تو میں کھڑا تھا جب بزدلی کی بہادر نے، مقامِ دلیر جنگ کنندہ میں"۔ نہ ابن عبد ود کا یہ کہنا کارگر ہوا کہ: "کیا تم میں کوئی مرد نہیں ہے؟" اور نہ رسولؐ کا یہ فرمانا کسی کو عزیز ہوا کہ: "کون ہے جو اس کو مجھ سے دور کرے"۔

داؤدؑ اور علیؑ کی مماثلت

مسلمانوں کی حالت اس وقت بنی اسرائیل کی ایسی تھی جس وقت نامعون فلسطینی قد آور بہادر جالوت انھیں للکار رہا تھا، اور بنی اسرائیل آپس میں کہہ رہے تھے کہ: "تم اس مرد کو جو نکلا ہے دیکھتے ہو؟ یقیناً یہ بنی اسرائیل کو رسوا کرنے کو آیا ہے اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی اس کو مارے گا تو بادشاہ بڑی دولت سے اسے دولت مند کرے گا۔ اور اپنی بیٹی اسے دے گا، اور اس کے باپ کے گھرانے کو اسرائیل کے درمیان آزاد کرے گا"۔ (سموئیل ۱۷ باب۔ ۲۵ آیت) بنی اسرائیل پر سے نوجوان داؤد نے یہ بلا ٹالی۔ انھیں بھی ساؤل نے یہ کہہ کر رخصت کیا کہ: "روانہ ہو خدا تیرے ساتھ رہے"۔ اور اس کے بعد اپنے ہتھیار داؤد پر سجے۔ داؤد نے فلاخن سے اسے قتل کیا، ساؤل کا سپہ سالار داؤد کو بادشاہ کے پاس لایا ـــــ ساؤل نے اسے سپاہ کا سردار کیا، اور وہ سب لوگوں اور ساؤل کے ملازموں کا بھی منظور نظر ہوا"۔ کس قدر مماثلت ہے اس واقعہ میں داؤد کو علیؑ سے۔ روضۃ الصفا اور تاریخ الاسلام مولوی عباسی میں ہے کہ: "تین مرتبہ حضرتؐ نے اصحاب سے پوچھا، اور تینوں مرتبہ علیؑ بولے"۔ اور اب حضرت رسولؐ نے تلوار باندھی۔ زرہ پہنائی اور عمامہ علیؑ کے سر پر رکھا دعا مانگی کہ: "بار الٰہا! اس کی مدد کرنا۔ تو نے عبیدہؓ کو بدر میں اور حمزہؓ کو اُحد میں اٹھا لیا۔ اب میرے پاس صرف علیؑ رہ گیا ہے۔ اس کی حفاظت کرنا"۔ رسولؐ کی دعا درد انگیز تھی۔ اسی میں ساری واقعہ خوانی ہے۔ اسلام کے وقار کے لیے آج پھر علیؑ ہی بھیجے جا رہے تھے۔ علیؑ نہ ہوتے تو ضرور رسولؐ اس کام کو بھی اپنے ذمہ لیتے۔ لیکن علیؑ تھے۔ یہ کہنے کے لیے تھے کہ:

اثبت لحاك الله ان لم تسلم   لوقع سيف عجل في مخضرم

(قدم ثابت رکھ خدا تجھے قلع کرے اگر تو اسلام نہ لائے۔ واسطے ضرب شمشیر آبدار کے)

یہ کہنے اور کرنے والا تھا کہ:

"قد جدت لله بلحمي ودمي"

(بہ تحقیق جوانمردی کی میں نے واسطے خدا کے اپنے گوشت اور خون سے)

علیؑ اس جنگ میں اپنے مشہور بہادر دشمن سے خطابت توحید نہ بھولے۔ جنگ ہوئی۔ ایک کاری زخم لگا، مگر اپنے دشمن کو قتل کیا۔ میدانِ جنگ سے واپس آنے کے قبل ان کی صدائے تکبیر نے رسولؐ کو ان کی سلامتی اور فتح کی خوشخبری سنادی تھی۔ علیؑ واپس آئے، اور بقول روضۃ الصفا شیخین نے پیشانی چوم لی۔

اسی جنگ کا ایک اور قابلِ التفات واقعہ یہ تھا کہ عمرو بن عبد ود کی بہن اپنے بھائی کے میدانِ جنگ میں مارے

جانے کی خبر سن کر روتی ہوئی آئی۔ لیکن لاش کے پاس پہنچ کر بجائے اس کے کہ وہ قاتل کے جوشِ عداوت میں نظم پڑھتی جوشِ مدح میں یہ شعر پڑھنے لگی کہ :

لو کان قاتل عمرو غیر قاتله لکنت ابکی علیه و اخر الابد

لکن قاتله من لا یعاب به من کان یدعی قدیماً بیضة البلد

(اگر عمرو کا قاتل سوا اس کے قاتل کے کوئی ہوتا تو میں ہمیشہ اس پر رویا کرتی۔ لیکن اس کا قاتل وہ ہے جس کے نسب میں کوئی عیب نہیں ہے۔ اور وہ ہمیشہ سے شہر کا سردار پکارا گیا ہے)

اس کی تعریف کی یہ وجہ تھی کہ باوجود عرب کے اس دستور کے کہ قاتل مقتول کا اسلحہ لے لیتا تھا علیؑ نے اس کی قیمتی زرہ لے کر اسے برہنہ نہیں کیا۔ اور یہ دیکھ کر اس نے پہلے کہا کہ ماقتله الا کفو کریم۔

اسلام کا وقار قائم رہا۔ کچھ تو اس سبب سے کہ علیؑ نے دشمن کے سب سے بہادر سپاہیوں کو قتل کیا تھا۔ کچھ اس حیلے سے کہ "خدا کے لشکر" نے مدد کی۔ کچھ اس وجہ سے کہ قریش اور بنو قریظہ آپس میں مشتبہ ہو گئے۔ اسلام پر سے بلا ٹلی اور ان کا نام ہمیشہ کے لیے بحیثیت سرفروشانِ اسلام کے ممتاز ہوا جنھوں نے ایسے وقت جان بازی کی اور رسولؐ نے ان کی خدمتوں کا اعتراف کیا۔

بنو قریظہ

خندق کی واپسی کے بعد ہی بنو قریظہ کو ان کی بدعہدی کی سزا دی گئی۔ سزا ان کی جرم کے قبل نہ تھی۔ نہ بنی قریظہ نے اپنے اوپر رحم کیے جانے کا کوئی پہلو اٹھا رکھا تھا۔ یہاں بھی علیؑ ممتاز تھے اسلام کی خدمتوں میں۔

فدک اور علیؑ

کچھ دنوں کے بعد قبیلہ بنی سعد کی گوشمالی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ علیؑ سو سپاہیوں کے ساتھ فدک بھیجے گئے۔ دشمن بھاگا۔ علیؑ غنیمت لائے اور مسلمان حصہ میں شریک ہوئے۔

صلح حدیبیہ

ہجرت کے چھٹے برس صلح حدیبیہ واقع ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نبی کریمؐ نے ارادہ حج فرمایا۔ اور مسلمانوں کو رسولؐ کے ارادہ سے آگاہی دی گئی۔ مشرکین کو معلوم ہوا اور انھوں نے روکنے کا قصد کیا۔ رسولؐ نے اپنی غرض سمجھانے کے لیے آدمی بھیجا۔ لیکن وہ گرفتار کر لیا گیا۔

حضرت عمرؓ سفارت سے انکار کرتے ہیں

حدیبیہ میں پہنچ کر رسولؐ نے بقول واقدی : "حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو حکم کیا کہ اہل مکہ کے پاس جا کر ان سے اذن و اجازت حاصل کریں کہ وہ لوگ حضرتؐ کے لیے تین دن تک کے واسطے مکہ کو خالی کر دیں، تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مناسک و ارکانِ حج ادا کر لیں، بعد ازاں واپس چلے جاویں گے۔ تب عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی : "یا رسول اللہ میں مکہ میں کمتر قبیلہ والا ہوں۔ یعنی وہاں میرے عزیز داقارب بہت کم ہیں میں اس قوم سے ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے"۔ حدیبیہ میں رسولؐ نے اس شرط پر بیعت کی کہ اگر قتال واقع ہو تو فرار نہ کریں۔ اہل مکہ نے صلح کے لیے دو آدمی بھیجے، اور جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ : "مجھے سب باتوں سے صلح زیادہ پسند ہے"۔ مہاجرین و انصار میں صلح کا شغل ہو گیا۔ اور کچھ مہاجرین (۲) اپنے عزیزوں و قریبیوں کی ملاقات کے لیے مکہ میں چلے گئے"۔ انھیں قریش نے گرفتار

کرلیا۔ مسلمانوں کو جب اس کی خبر ملی تو یہ لوگ مکہ میں گھس گئے اور کعبہ کے پاس بہت سے آدمیوں کو پاکر گرفتار کرلیا۔ رات کو مشرکین تیر مارنے لگے۔ اور بقول واقدی: "اس وقت تو مسلمین پریشان ہوتے"۔ صبح کو مسلمانوں نے جنگ شروع کی، اور مشرکین کو بھگا دیا، اور اس وقت آیت نازل ہوئی کہ:

هُوَ الَّذِیْ کَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْکُمْ وَ اَیْدِیَکُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَکَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَکُمْ عَلَیْهِمْ

"وہ خدا وہ ہے جس نے روک دیے ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے درمیان مکہ کے بعد ازاں کہ تم کو ان پر ظفر حاصل ہو چکی"۔ (۴۸ : ۲۴)

اس کے بعد سہیل بن عمرو مشرکین کی طرف سے یہ شرائط لایا کہ رسولؐ واپس چلے جائیں اور کسی شخص کو مشرکین سے جو ان کے پاس جائے دو برس تک قبول نہ کریں۔ اور اس کے عوض میں سال آئندہ مشرکین تین دن کے لیے مکہ کو خالی کردیں گے اور رسولؐ کسی قسم کا اسلحہ بجز تلوار کے جو نیام میں رہے گی اپنے ہمراہ نہ لاسکیں گے۔ دس برس تک آپس میں صلح رہے گی۔ تمام بلاد میں لوگ بہ امن جاسکیں گے اور ہم سو گیروں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔

حضرت عمرؓ اور صلح

حضرت عمر کو عہدنامہ کے اکثر دفعات پر اعتراض تھا۔ واقدی کے نزدیک حضرت عمر کہیں ملتجیانہ لہجہ سے کہتے ہیں کہ: "آیا آپ ان کے لیے یہ بات مقرر کریں گے؟"۔ اور کہیں کہہ دیتے ہیں کہ: "ایسا نہ کیجیے"۔ اور رسولؐ کہیں کہتے ہیں کہ: "اے عمر سکوت کر"۔ اور کہیں: "عمر کی بات پر ہنس دیتے ہیں"۔ صاحب سیرۃ الفاروق کے موافق شرائط کے طے ہونے کے وقت حضرت عمر حضرت ابوبکر کے پاس جاکر پوچھتے ہیں کہ: "کیا آنحضرتؐ "رسول اللہ" اور ہم مسلمان نہیں ہیں؟"۔ اسی مؤرخ کے نزدیک: "آنحضرتؐ کے منشا کے خلاف چاہنے پر اپنی غلطی کا اقرار کیا، اور اس کے کفارہ میں غلام آزاد کرنے کا عہد کیا"۔ صاحب مناہج النبوۃ صرف اس قدر کہلواتا ہے کہ: "یارسولؐ اللہ! اس بات پر راضی مت ہو"۔ صاحب قرۃ العیون لکھتا ہے: "عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ کہا انھوں نے کہ: "اس دن میرے دل میں ایک امر عظیم پیدا ہوا، اور مراجعت کی میں نے ساتھ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسی مراجعت کہ مثل اس کے ہرگز نہ کی تھی میں نے"۔ اور ایک روایت میں ہے کہ: کہا انھوں نے کہ: "گیا میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اور عرض کی کہ تم رسولؐ اللہ کے برحق ہو؟"۔ آپ نے فرمایا کہ: "ہاں برحق ہوں" --- پھر میں نے عرض کی کہ: "کس لیے ہم اس نقصان اور ذلت کو قبول کریں، اور اس طرح سے صلح کرکے لوٹیں؟"۔ آپ نے فرمایا: "بے شک میں رسول خدا کا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ مجھ کو ضائع نہ کرے گا"۔

حضرت عمر کہتے ہیں کہ کہا میں نے کہ: "کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ قریب ہے کہ ہم زیارت بیت اللہ کو جاویں گے اور طواف کریں گے"۔ آپ نے فرمایا کہ: "ہاں! ولیکن کیا یہ بھی کہا تھا کہ اسی سال؟"۔ میں نے عرض کی کہ: "نہیں"۔ آپ نے فرمایا تھا کہ: "غم مت کھا کہ تو زیارت بیت اللہ کو جائے گا"۔ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ: "اسی طرح ملول و محزون میں آپ کی مجلس سے اٹھا اور ابوبکر کے پاس گیا اور تمام حکایت ان سے کہی" ---

مصلحت اسی میں ہے

فرمایا حضرت صدیق نے کہ: "اے عمر جا، اور ہاتھ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رکاب میں مار اور کچھ اعتراض مت کر کہ وہ خدا کے رسولؐ ہیں۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں وحی سے کرتے ہیں اور مصلحت اسی میں ہے"۔ اور منقول ہے حضرت عمر سے کہ فرمایا انھوں نے کہ: "بہت اعمال صالحہ مثل نماز، روزہ و تصدق و اعتاق کفارہ میں اس گستاخی کے کیے میں نے"۔ مترجم قرۃ العیون یہ بھی کہتا ہے کہ: بعض محققین نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے اور پھر یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ: "حضرت عمر کا پوچھنا بطور استکشاف و استفسار کے تھا، نہ بطریق شک اور انکار کے، حاشا و کلا"۔ مؤلف تاریخ الاسلام مولوی عباسی صاحب کے نزدیک "حضرت عمر صلح کے زیادہ خلاف تھے اور نادم بھی تھے"۔ ابوالفدا کے نزدیک کہا کہ: "یارسول اللہؐ! یا تو آپ خدا کے رسولؐ نہیں ہیں، یا ہم لوگ مسلمان نہیں"۔ کبھی کہا: "صلح سے عزت کھوتے ہیں"۔ اس مؤرخ نے ایسا کہنا گرمجوشی اسلام پر محمول کیا ہے۔ ہم کو اس کوشش کا بھی اقرار ہے جو "الفاروق" میں کی گئی ہے۔ جو کچھ ہوا اکثر مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ آیہ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (۴۸ : ۱) صلح حدیبیہ سے متعلق ہے۔ صلح کو فتح مبین کہنے کا مذاہب عالم میں اسلام کو افتخار ہے۔

مشرکین علیؑ سے عہد نامہ لکھوانا چاہتے ہیں

بہر حال ایک نہایت مفید بات جو اب بھی ہم تک پہنچی ہے وہ یہ ہے کہ شرائط طے ہونے کے بعد مناہج النبوۃ اور قرۃ العیون کے موافق حضرت نے اوس بن خولی انصاری کو عہد نامہ لکھنے کا حکم دیا۔ لیکن مشرکین کے وکیل سہیل نے کہا کہ: "اے محمدؐ یہ نامہ علیؑ کو لکھنا چاہیے جو تمھارے چچا کا بیٹا ہے"۔ (قرۃ العیون) اسی مؤرخ کے موافق: "یہ کہنا سہیل کا اس لیے تھا کہ ظاہراً احق اور اولیٰ معاملہ میں اور مصالحہ اور معاہدہ اور نقض عہد میں آدمی کے اس کے عصبات اور اس کے اہل ہوتے ہیں، اور سبب یہی تھا کہ حضرتؐ نے سورہ براءت پڑھنے کو ---- بعد بھیجنے حضرت ابوبکر کے حج ادا کرنے کے لیے کہ امیر حاج ان کو کیا تھا، حضرت علیؑ کو پیچھے سے بھیجا تھا"۔ یہ اختلافِ الفاظ "مناہج النبوۃ" کا مفہوم بھی یہی ہے۔

قلم سے تلوار

دوسرا عجب خیز واقعہ یہ تھا کہ جب رسولؐ کے حکم سے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے "---- علیہ محمد رسول اللہ" لکھا تو مشرکین کو "رسول اللہ" کے لفظ پر اعتراض ہوا، اس وقت بقول قرۃ العیون: "حضرت علیؑ نے وہ کاغذ رکھ دیا، اور ہاتھ تلوار کے قبضہ پر رکھا"۔ علیؑ کے لیے میں یہ کہنا ہی بے کار سمجھتا ہوں کہ یہ "گرمجوشیٔ اسلام" سے تھا۔ رسولؐ نے خود دست مبارک سے محو فرمایا، اور عام مؤرخین کے موافق جیسا صاحب "شواہد النبوۃ" بھی لکھتے ہیں: حضرت نے فرمایا کہ: "یا علی! تجھ کو بھی ایسا ہی واقعہ پیش آئے گا"۔ یہ آئندہ کا واقعۂ تاریخ ہے، جس کا ذکر کچھ دیر میں آئے گا۔

فتح خیبر ۷ھ

۷ھ فتح خیبر کے لیے مشہور ہے۔ اس سے اسلام کو بڑی تقویت ہوئی لیکن جس وقت لشکر یہود اور لشکر اسلام ایک دوسرے کے مقابل تھے تو بقول قرۃ العیون: "ایک دن ابوبکر نشان لے کر قلعہ قموص کے نیچے آئے اور خوب لڑے اور سخت مقابلہ کیا۔ فتح یاب نہ ہوئے، دوسرے روز حضرت عمر گئے اور خوب لڑے اور بہت مقابلہ کیا۔ بہ نسبت پہلے دن کے، مگر قلعہ فتح نہ ہوا۔

اور روایت ہے کہ حضرت عمر دو بار لڑے"۔ واقدی کہتا ہے کہ: "ایک روز مرحب یہود کے لشکر کا سالار تھا اور سردار مہاجرین حضرت عمر تھے۔ اور حال مسلمانوں کا یہ تھا کہ جب مرحب لڑنے کو نکلتا تھا تو اس کے مقابلہ میں کمی کرتے تھے۔ پھر جس وقت مسلمین قریب دروازہ خیبر پہنچے اس وقت مرحب اپنا غول ہمراہ لیے ہوئے مسلمانوں پر نکل پڑا اور ان کو بھگا دیا۔ یہاں تک کہ ان کو صف بزرگ تک یعنی لشکر گاہ تک بھگا دیا"۔

خیبر میں اسلام کا علم اور علمداری کی شرطیں

صاحب شواہد النبوۃ بھی ہم زبان ہے۔ اس میں یہ زیادہ ہے کہ رسالت مآبؐ اس روز دردِ شقیقہ میں مبتلا تھے۔ یہ حالت پہنچ گئی تھی کہ جناب رسالت مآبؐ نے عامہ مورخین کے موافق فرمایا کہ: "لا عطین الرایۃ غداً رجلاً کراراً غیر فرار یحب اللہ و رسولہ و یحبہ اللہ و رسولہ لا یرجع حتی یفتح اللہ علی یدہ"۔ (کل اسے علم عطا کروں گا جو نہ بھاگنے والا بہادر ہے اور جو خدا اور رسولؐ کو دوست رکھتا ہے، اور جسے خدا و رسولؐ دوست رکھتے ہیں نہ پھرے گا جب تک اس کے ہاتھ خدا فتح نہ دے)

حضرت عمرؓ کا حوصلہ

بے شک رسولؐ نے ایسا ہی کچھ فرمایا تھا کہ حضرت عمر بقول مناہج فرماتے کہ "ہرگز امارت کو میں نے دوست نہیں رکھا مگر اس روز"۔ یا فاتح عجم رسولؐ کی توجہ مبذول کرنے کے لیے کھڑے کھڑے دم سے گھٹنوں کے بل گر پڑتا۔

قریش کی قابلِ توجہ باتیں

قریش میں یہ باتیں بھی ہونے لگیں کہ: "علیؑ مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ اس مراد سے فائز نہ ہوں گے، کیونکہ ان کی آنکھیں آئی ہیں، اور درد کرتی ہیں اس درجہ میں کہ اپنے پاؤں کے اگاڑی نہیں دیکھ سکتے"۔

علیؑ نے بھی رسولؐ کا ولولہ خیز اور پہنچوانے والا کلام سنا تھا اور کچھ کہا بھی تو یہ کہ "اللّٰھُمَّ لَا مَانِعَ لِمَآ اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ"۔ (اے پروردگار کوئی مانع نہیں ہو سکتا جسے تو عطا کرے اور کوئی عطا نہیں کر سکتا جسے تو منع کرے)

رسولؐ علیؑ کو پوچھتے ہیں

لوگوں کی ہم آہنگی

صبح ہوئی، اسلام کی عزت کا نشان رسولؐ کے دستِ اقدس میں لہرا رہا تھا۔ سب لوگ درِ دولت پر کھڑے تھے۔ سناٹے کے عالم میں رسولؐ کی آواز سنائی دی۔ دریافت فرمایا کہ: "علیؑ کہاں ہیں؟"۔ اور بقول مناہج: سب لوگ چاروں طرف سے پکار اٹھے کہ: "یہاں ہی ہیں، لیکن آنکھیں اُن کی ایسی دکھتی ہیں کہ اپنے سامنے نہیں دیکھ سکتے"۔ فرمایا: "ان کو میرے پاس لاؤ"۔ سلمۃ بن الاکوع نے جا کر حضرت علیؑ کا ہاتھ تھامے ہوئے لا کر حضرتؐ کے خیمہ میں پہنچایا۔ سرورِ عالمؐ نے اس جناب کا سر اپنے زانوئے مبارک پر رکھا اور آب دہانِ مبارک اپنا حضرت علیؑ کی آنکھوں میں لگایا۔ فی الحال دردِ چشم زائل ہوا ـــــ تب سرورِ عالمؐ نے اپنی خاص زرہ ان کے بدنِ مطہر پر سجائی اور ذوالفقار کمر سے لگائی اور رایت اپنا اس شیرِ یگانہ کے ہاتھ میں دیا، اور فرمایا: "جاؤ التفات مت کرو، جب تک مفتوح کرے اللہ تعالیٰ قلعہ تمہارے ہاتھ سے"۔

جب علیؑ مرتضیٰ علم ہاتھ میں لے کر چلنے لگے تب کہا: "یا رسول اللہ! قتال کرتا ہوں میں جب تک کہ وہ مانند

ہمارے ہوں۔ یعنی اسلام لاویں"۔ فرمایا: "یا علی! تعجیل مت کرو جب تک ان کی ساحت میں اترو اس وقت ان کو طرف اسلام کے دعوت کرو، اور خدائے عزوجل کے حقوق پر جو کچھ اس نے اپنے بندوں پر واجب گردانا ہے واقف کرو اور قسم خدا کی اگر ہدایت کرے خدائے تعالیٰ تمھارے ہاتھ سے ایک مرد کو بہتر ہے وہ تجھ کو اس بات سے جو تجھ کو ہوویں اشتران سرخ مو کہ راہ خدا میں تصدق کرو تم"۔

کل اور آج کا فرق

علیؑ چلے۔ رسولؐ کا دل ساتھ ساتھ چلا۔ اسلام کا وقار ساتھ ساتھ رہا۔ مسلمانوں کی نگاہیں نقشِ قدم پر ساتھ ساتھ رہیں۔ ایک وقت تھا کہ لشکرِ اسلام پسپا ہوتے ہوتے لشکر گاہ تک پہنچ جاتا۔ آج شواہد النبوۃ پڑھو کہ لشکر اسلام لشکر گاہ کے قریب (پیچھے) چھوٹ گیا اور سردار قلعہ کے پاس پہنچ گیا یہاں تک کہ علیؑ نے نشان فوج ایک ٹیلہ پر گاڑ دیا۔

دیدبانؓ کی چیخ

قرۃ العیون اور مناہج کے موافق دیدبان نے پوچھا کہ: "اے صاحب علم تو کون ہے؟"۔ کہا: "میں علیؑ بن ابی طالبؑ ہوں"۔ یہ سن کر دیدبان چلا اٹھا کہ: "اے اہل قلعہ قسم ہے توریت کی کہ اب تم مغلوب ہو گئے"۔ یہودی کا یہ فقرہ اور کیا بتاتا ہے بجز اس کے کہ علیؑ کے چہرہ پر فطری متانت، غیر آلودہ تصنع تصمیم اور شجاعت کی تحریریں ایسی پکی تھیں کہ دیکھنے والا ایسے زبردست ارادہ کے نفس سے مرعوب ہو جاتا یا اور کیا کچھ میں آتا ہے بجز اس کے کہ قیافہ اور شہرت نے ایک دوسرے کو مدد دی تھی۔

امانؓ

تم کو اگر رجز خوانوں میں دل چسپی ہے تو جناب امیر کا دیوان یا دیگر تواریخ پڑھو۔ ہمیں صرف یہ کہنا ہے کہ جب حارث اور مرحب کیسے ایسے پشت و پناہ یہود ذوالفقار کے وزن سے جھک گئے تو بقول قرۃ العیون و مناہج وغیرہ:

> "جب حصار والوں نے قوت بازو علیؑ کرم اللہ وجہہ کی دیکھی امان طلب کی۔ حضرت علیؑ نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے ان کو امان دی اور اس شرط پر کہ نقد اور سلاح مسلمانوں کو دیں اور کچھ چھپا نہ رکھیں ۔۔۔ اور اس شرط پر بھی کہ ہر مرد ان میں سے ایک اونٹ بھر کر کھانے کو لے اور اس شہر سے نکل جائے"۔

رسولؐ نے علیؑ کا استقبال کیا

جب خیبر کے فتح کی خبر حضرت سرورِ عالمؐ کو پہنچی شکرانہ اس نعمت کا بجا لائے کہ یہ فتح سبب ظہور عزت اسلام کی ہوئی اور جب حضرت امیر۔۔۔ فتح و فیروزی سے متوجہ طرف سید ابرار کے ہوئے حضرتؐ اس عالی جناب کی تہنیت کے واسطے استقبال اور استبشار کے لیے خیمہ سے باہر آئے اور حضرت امیرؑ سے بغل گیر ہوئے اور ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا، اور فرمایا: "قد بلغنی بنائک المشکور و صنیعک المذکور قد رضی اللہ و رضیت انا عنک"۔ (مجھے تمھاری تعریف مشکور کارگزاری اور سعی کی خبر پہنچی ہیں اور خدا تجھ سے راضی ہوئے) پس حضرت امیرؑ روئے۔ حضرتؐ نے فرمایا: "یا علیؑ! یہ رونا خوشی کا ہے یا اندوہ کا"۔ کہا: "بلکہ خوشی کا ہ اور کیونکر خوش نہ ہوں کہ آپؐ اور خدا راضی ہیں"۔ صاحبِ مناہج کے موافق: "غزوۂ خیبر میں بہت کام تھے علیؑ مرتضیٰ کے حوالے" جن کی کوئی فہرست نہیں ہے۔ خیبر میں علیؑ کی خدمت اسلام کچھ ایسی ہی تھی کہ مؤلف "الفاروق" اپنے ہیرو کی تعریف ملتوی کر کے علیؑ کی تعریف کر اٹھا

علیؑ کے لیے ایسے مواقع کم نہیں ہیں، جہاں احتیاط کے بے اختیاری کا معجزہ صادر ہوا ہو۔

غنیمت اس جنگ میں علاوہ مال و متاع کے ایک سو زرہ چار سو تلواریں اور ہزار نیزے ملے۔ کیا اچھا ہوتا کہ یہ حربے علیؑ اور اولادِ رسولؐ کی مخالفت میں صرف نہ ہوئے ہوتے اور یہ یا آگے پیچھے جو کچھ وصول ہوا وہ ان کی ایذادہی کا صلہ نہ قرار دیا جاتا۔

رسولؐ کا رحم آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ بلالؓ حضرت صفیہؓ دختر حُیی بن اخطب کو لاشوں کی طرف سے لائے۔ اس وقت بقولِ واقدی: "حضرت علیہ السلام نے لوگوں سے فرمایا: کیا بلالؓ کو نہیں دیکھتے ہو کہ اس نے کیا کام کیا"۔ آخر جب بلالؓ صفیہؓ کو خیمہ میں پہنچا کر خدمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں پھر آئے تو آپؐ نے فرمایا: "اے بلالؓ کیا تو نے اپنے دل سے رحم کو دُور کر دیا۔ تجھ کو کون امر باعث ہوا اس بات پر کہ تو اس کمسن لڑکی کو مقتولوں کی طرف سے لے گیا"۔ بلالؓ نے معذرت کی اور نبی اللہؐ نے عفو فرمایا۔

رسولؐ نے عزت کی صفیہ کو اسلام اور یہودیت میں مختار کیا۔ لیکن انھوں نے اسلام قبول کیا۔ اور شرف زوجیت کی التجا کی۔ لشکر کی روانگی کے وقت حضرت نے زانوئے مبارک کے سہارے سے ناقہ پر سوار کرایا۔ اور چادر ان کے سر پر درست کرتے تھے۔

مسلمانوں کو رسولؐ کے اِحترام کا خیال ان کی غیرت سے مسلمان آپس میں کہہ رہے تھے کہ: "رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اگر صفیہ کو حکم فرماویں کہ وہ اپنا مُنہ ڈھانپ لیں تو جان لو کہ وہ امہات مومنین سے ہیں، اس صورت میں آپ کے ساتھ ساتھ نہ چلو۔ کیونکہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم بڑے غیور ہیں"۔

خمس سے بنو ہاشم اور بنو عبد المُطلب کا حصہ صاحبِ مناہج کے پاس ایک مفید واقعہ اور ہے کہ: "رسولؐ نے خمس سے بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کو ایک حصہ ارزانی فرمایا۔ اور یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ عثمان بن عفان اور جبیر بن مطعم سرورِ عالم کے حضور میں گئے کہ ہم بنی ہاشم کی فضیلت کا انکار نہیں کرتے۔ کیونکہ آپ انھوں سے ہیں لیکن قرابت ہماری اور بنو مطلب کی آپ سے ایک مرتبہ میں ہے۔ یہ کیونکر ہوا کہ انھوں کو بنو عبد مطلب کا سہم آپ نے عطا کیا۔ اور ہم کو محروم کیا۔ جواب میں فرمایا حضرت نے کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب نہیں ہیں مگر ایسے ہی جس طرح بیان کیا۔۔۔۔ اور اپنی انگلیوں کو کھولا اور فرمایا: ہم اور بنی مطلب آپس سے جدا نہیں ہوئے، نہ جاہلیت میں نہ اسلام میں۔ جبیر کہتا ہے پس نہ دیا اس حضرت نے بنو عبد الشمس کے تئیں"۔ ہم آگے ذکر کریں گے کہ جبیر بن مطعم سے کیا کام نکالا گیا۔

قبضہ فدک فتح خیبر کا نتیجہ تھا فتح خیبر کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ بقول ابن خلدون: "جب اہلِ فدک کو خیبر کے شکست کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ پیام بھیجا کہ: "ہم کو صرف ہماری جانوں کی امان دی جائے مال و اسباب سے ہم کو سروکار نہیں"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی۔ چونکہ فدک پر حملہ نہیں کیا گیا تھا۔ اور نہ اس پر کسی سوار و پیادہ

کو نیزہ تلوار چلانے کا موقع ملا تھا، اس وجہ سے بلا تقسیم جیسا کہ جناب باری عز اسمہٗ نے حکم دیا آپ کے قبضہ میں رہا"۔
ابوالفدا کہتا ہے: "ایسا ہی اہلِ فدک سے معاملہ ہوا تھا مگر اتنا فرق ہے کہ فدک خالصاً رسول اللہؐ کی ملک میں تھا، اور خیبر تمام مسلمانوں کا تھا۔ کیونکہ بدون حاجت سواروں اور فوج کشی کے پیادہ پا مسلمانوں نے فتح کیا تھا"۔ اسی مورخ نے زمانہ عثمان میں کہا ہے: "ایک سبب یہ بھی تھا کہ باغِ فدک جو میراث بی بی فاطمہؑ کے تھا، وہ مروان نے چھین لیا تھا، یہ ایک باغ رسول اللہ کا تھا، اس کو جناب فاطمہؑ نے رسول اللہؐ سے میراث میں پایا تھا"۔ روضۃ الصفا کی عبارت ہے کہ:

"جبرئیل نازل شد کہ خدای فرماید کہ حق خویشان بدہ رسولؐ فرمود خویشان کیانند گفت فاطمہ۔ پیغمبر فاطمہ را خواند و حجتے نوشت و آن وثیقہ بود کہ بعد از وفات رسول اللہ پیش ابوبکر آورد و گفت این کتاب رسول خدا است کہ برائے من و حسنؑ و حسینؑ نوشتہ است"۔

جبرائیل نازل ہوئے کہ خدا فرماتا ہے کہ قریبیوں کا حق دے دو۔ رسولؐ نے فرمایا قریبی کون ہیں۔ کہا فاطمہؑ ہے۔ پیغمبرؐ نے فاطمہؑ کو بلوایا اور ان کے لیے دلیل حجت لکھی، اور یہ وہ وثیقہ تھا جو وفاتِ رسولِ خدا کے بعد ابوبکر کے پاس لائیں اور فرمایا یہ رسولِ خدا کی تحریر ہے کہ جو آپ نے میرے لیے اور حسنؑ و حسینؑ کے لیے لکھی ہے۔

سید امیر علی صاحب اپنی "تاریخِ اسلام" میں فرماتے ہیں: "فدک کا باغ جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت تھا، اور مروان نے غصب کر لیا تھا، آنجنابؐ کی اولاد کو واپس کر دیا"۔

فتح مکہ ۸ھ

۸ھ کا مشہور ترین واقعہ فتح مکہ ہے۔ اگرچہ صلح حدیبیہ کا زمانہ ابھی منقضی نہ ہوا تھا لیکن قریش نے رسولؐ کے حلیف بنی خزاعہ کو سخت اذیتیں دیں اور ان کے اکثر آدمیوں کو حرم میں قتل کیا۔ بنو خزاعہ نے رسولؐ سے فریاد کی، اور رسولؐ نے ان کی اعانت کا وعدہ کیا۔

جلاوطن نبیؐ مکہ میں داخل ہوا

مکہ کا جلاوطن نبیؐ اب کس طرح مکہ میں داخل ہوا، وہ ابوسفیان کی حالت اور الفاظ سے معلوم ہوگا۔ جو وادی کے کنارہ سے عباس کے ساتھ لشکر اسلام کا جلال دیکھ کر پوچھتا ہے: "من ھولاء؟" جس کا عباس جواب دیتے ہیں کہ: "ھذا رسول اللہ فی المھاجرین والانصار"۔ اور ابوسفیان یہ سن کر تعجب سے کہتا ہے کہ: "تمہارے لڑکے کا جاہ و جلال بہت بڑھ گیا"۔

اعلانؐ

رسولؐ نے داخلہ کے قبل یہ اعلان فرمایا تھا کہ: "جو شخص مسجد میں یا ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو یا دروازہ بند کر لے وہ امان میں ہے"۔ حضرت عباس کے نزدیک ابوسفیان "امتیاز پسند" تھا، اس لیے رسولؐ نے اس کے گھر کو یہ امتیاز عطا فرمایا۔ لشکر اسلام کا جاہ و جلال دیکھ کر ابوسفیان نے ذرائع امان کا تذکرہ کیا۔

سعد بن عبادہؓ کی علمداری اور حضرت عثمانؓ

بقول ابن خلدون و حیات القلوب لشکر اسلام کا رایت اس وقت سعد بن عبادہ کے ہاتھ میں تھا۔ جب یہ ابوسفیان کے قریب سے گزرے تو جوش میں کہہ اٹھے: "الیوم یوم الملحمہ۔ الیوم تحل الحرمہ"۔ اے گروہِ اوس و خزرج آج ابوسفیان سے احد کا کینہ نکالو۔ ابوسفیان ڈر گیا، اور رسولؐ سے فریاد کی۔ اور بقول مناہج: "عثمان بن عفان

کے تئیں مہر قرابت کی اور رعایت ان کی دامن گیر حال ہوئی اور بولے: یارسول اللہؐ! ہم سعد بن عبادہ سے بے فکر نہیں، اور دہشت میں ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ قریش کو آسیب پہنچائے"۔ اس کے بعد بقول ابنِ خلدون: "رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ سن کر رایت سعد بن عبادہ کے ہاتھ سے لے کر علیؑ بن ابی طالب کو مرحمت فرمایا"۔ اور بقول حیات القلوب و مناہج: "نرمی سے داخل ہونے کا حکم دیا"۔

خانہ کعبہ اور علیؑ

رسولؐ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے اس کے بعد صاحبِ مناہج النبوۃ نے یا ملا جامی نے شواہد النبوۃ میں جو واقعہ بیان کیا ہے اسے فیضی کی حیرت میں کہنا ہے کہ:

زہر نقش پائے کہ بر دوشِ احمدؐ — ز مہرِ نبوت معتدم نشیند

مکہ میں خون ریزی کی ممانعت

ایک خطبہ میں بقول ابن خلدون رسولؐ نے یہ بھی فرمایا کہ: "کسی شخص کے لیے جو اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان لائے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس (مکہ) میں خون ریزی کرے اور نہ اس میں کوئی سرسبز درخت کو کاٹے"۔ وہ قریش جنھوں نے رسولؐ کو ناقابلِ برداشت اذیتیں دی تھیں اب رسولؐ ان سے سوال کر رہے تھے: "اے گروہِ قریش کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم تمھارے ساتھ کیا کرنے والے ہیں"۔ قریش نے کہا: "بھلائی۔ بھائی کریم اور بھائی کریم کے بیٹے ہو"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: "بے شک میں کہتا ہوں جو کہا تھا یوسف نے اپنے بھائیوں سے تم پر کوئی برائی نہیں ہے آج کے دن۔ جاؤ تم سب لوگ آزاد ہو"۔ اس کے بعد بقول مناہج: "معاویہ ابوسفیان کا بیٹا بھی اس فتح مکہ میں مسلمان ہوا، اور مولفۃ القلوب میں ہے"۔ اس کے بعد آفتابِ رسالت کوہِ صفا پر چمک رہا تھا۔ قبائل جوق جوق بیعت کے لیے آ رہے تھے اور خدا کے دین میں لوگ فوج فوج داخل ہو رہے تھے۔

حضرت عثمانؓ کی دوسری سفارش

عبداللہ بن سعد بن ابی سرح عثمان بن عفان کا برادر رضاعی جو مرتد ہو گیا تھا، پناہ لینے انھیں کے گھر آیا۔ اس کے واجب القتل ہونے کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ عثمان اسے بیعت اور معاف کرانے رسولؐ کے پاس لائے۔ رسولؐ نے ان کی اِلتجا کا بقول مناہج تین مرتبہ کوئی جواب نہ دیا، اور جب یہ اٹھ کر باہر چلے گئے تو رسولؐ نے اصحاب سے فرمایا کہ تم نے اس مرتد کو قتل کیوں نہ کیا۔ اصحاب نے کہا کہ نبیِ خدا نے کوئی اِشارہ نہیں فرمایا۔ کہا کہ انبیاء اِشارہ نہیں کرتے۔ مدبر واقدی نے واقعات بیان کیے ہیں لیکن حضرت عثمان کا نام لینے سے اِحتیاط کی ہے۔ ناظر آئندہ دیکھے گا کہ ابنِ ابی سرح ابن عفان کے لیے کام کا آدمی ثابت ہوا۔ ابن ابی سرح کو نہ صرف یہ غرہ تھا کہ میں جو چاہتا ہوں لکھ دیتا ہوں بلکہ اپنے اُوپر وحی نازل ہونے کا دعویٰ بھی تھا۔

انصار اور رسولؐ

اس کے بعد جیسا سید امیر علی صاحب فرماتے ہیں کہ: "فتح کے وقت کوئی داخلہ کسی مفتوحہ شہر میں ایسا بامن نہیں ہوا"۔ انصار نے جو اس امید میں تھے کہ رسول قریش سے انتقام لیں گے، جب دیکھا کہ رسولؐ نے اپنے پرانے دشمنوں کے ساتھ خلاف امید رعایت کی تو وہ سمجھے کہ اب رسولؐ مدینہ کو ترک کر کے پھر مکہ میں اقامت فرمائیں گے، حضرت کو جب ان کے خیالات معلوم ہوئے تو ان سے فرمایا کہ: "میں نے ہجرت کی تمھاری طرف حیات میری تمھارے ساتھ ہے اور موت میری تمھارے درمیان ہوگی"۔ پس انصار

رونے لگے اور بولے: "واللہ یا رسول اللہؐ! یہ بات بدگمانی کی جہت سے نہ تھی بلکہ کمال محبت اور دل بستگی سے آپؐ کی جناب میں ہم نے یہ باتیں کیں کہ آپؐ اوروں کے واسطے ہوں اور ہم کو چھوڑ دیں"۔

غزوۂ حنین ۸ھ

۸ھ کا ایک دوسرا واقعہ جس میں لشکر اسلام کو احد کی مصیبت کا سامنا ہوا اور جس میں بنی ہاشم نے اپنی شجاعت اور استقلال سے رسولؐ کی حفاظت کی اور اسلام کا وقار قائم رکھا، غزوۂ حنین تھا۔

مشکل وقت کے جان باز

ابوالفدا کے موافق: "مسلمان دشمنوں کے اچانک حملہ سے اس طرح مستغرق ہوگئے کہ انھیں ایک دوسرے کی خبر نہ تھی"۔ تاریخ الاسلام اور روضۃ الصفا کے نزدیک "اس وقت صرف یہ لوگ تھے: ① جناب امیرؑ، ② عباس، ③ ابوسفیان بن حارث، ④ ابن عم رسولؐ جعفرؑ، ⑤ ربیعہ، ⑥ قثم، ⑦ فضل بن عباس ⑧ اسامہ بن زید، اور ⑨ اس کی ماں کا بھائی تھا۔ صاحب مناہج نے ان کے علاوہ لکھا ہے کہ ⑩ عبداللہ بن زبیر بن عبدالمطلب اور ⑪ عقیل بن ابوطالب اور کئی شخص اور بھی جو اہل بیت ہی سے تھے۔ اس کے بعد لکھتا ہے: اور ⑫ ابوبکر صدیق اور ⑬ عمر خطاب اور ⑭ مسعود بھی درمیان انھوں کے تھے۔ بعض انھوں کے مُنہ کی طرف اور بعضے یمین شمال۔ یہ تفسیر ان تین صاحبوں کی ہے جو آخر سب کے نام لے گئے۔ اور تعجب تو یہ ہے کہ شیخین جو اول ہیں سب کے بعد ان کے نام اس جنگ میں لکھے گئے"۔ صاحب قرۃ العیون نے بھی حضرت ابوبکر اور عمر کے سب کے نام دیے ہیں۔ اس میں جب کہ کوئی بہادر آگے آگے شمشیر زنی کرتا تھا، کوئی رکاب اور کوئی جناب رسالت مآبؐ کے مرکب کی لگام تھامے تھا۔ عباس کو جو بہت ہی بلند اور قوی آواز تھے حکم دیا گیا کہ اصحاب کو یہ کہہ کر آواز دو کہ یا اصحاب سمرہ، یا اصحاب سورہ بقر۔ خود رسولؐ فرما رہے تھے کہ: "انا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب"۔ عباس کی صدا پر سو انصار "لبیک لبیک" کہتے ہوئے آئے۔

بڑی غنیمت

تنورِ جنگ گرم ہوا۔ دشمن بھاگا۔ اور اس جنگ میں جس قدر مالِ غنیمت حاصل ہوا کبھی اس قدر نہ ملا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ تقسیم کے وقت نہ صرف اس قدر لوگ ہوں گے جو روانگی کے وقت تھے، بلکہ یہ بھی چاہا ہوگا کہ حضرت رسولؐ اگر اپنے وفورِ سخاوت سے اپنا حصہ بھی ہمیں بخش دیں تو نچی نگاہ کر کے لے لیں۔

بچے اور اجیروں کے قتل کی ممانعت

اس جنگ میں یہ واضح اعلان کیا گیا کہ: لڑکے، بچے اور اجیر نہ قتل کیے جائیں۔

علیؑ کا مشن اور راز کی باتیں

کفار کا ایک گروہ طائف کی طرف بھاگا۔ صاحبِ قرۃ العیون کے لفظوں میں: "ایام محاصرہ میں طائف کے علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کو حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف میں اس دیار کے واسطے صفائی مشرکین کے بھیجا۔ انھوں نے جا کر خوب جدال و قتال کی اور ہوازن اور ثقیف کے اطراف کے بتوں کو توڑا اور سب آثار اور دیار مشرکین بے دین کے خراب اور تباہ کیے اور پھر حضرت کی خدمت فیض درجت میں آ کر حاضر ہوئے۔ جب آپ کی نظر برکت اثر حضرت علیؑ کے چہرۂ سعادت بہرہ پر پڑی تو آپ نے تکبیر کہی، اور ان سے خلوت کی اور خفیہ کچھ ان سے باتیں کیں۔ جب بہت دیر ہوئی، تب صحابہ

رضوان اللہ علیہم نے کہا کہ: "آج عجب رازِ دُور و درازِ آپ نے اپنے چچا کے بیٹے سے کہا کہ اس طرح آپ اوروں سے نہیں کہتے"۔ آپ نے فرمایا: "ما انتجیتہ ولکن اللہ انتجاہ"۔ (میں نے خود سے اس سے راز نہیں کہا، لیکن خدا نے ایسا کرنے کا مجھے حکم دیا) مظاہر حق ترجمہ مشکوٰۃ المصابیح میں بھی یہی ہے۔ بعض کے نزدیک اظہارِ عجب کرنے والے حضرت عمر تھے اور رسولؐ کا جواب سن کر فرمایا تھا کہ: "مجھے خوف ہے کہ یہ اعتراض مثل حدیبیہ کے نہ ہو"۔ یہ الفاظ کہ: "اس طرح آپ اوروں سے نہیں کہتے"۔ وہ کسی نے کیوں نہ کہے ہوں، صاف ظاہر کرتے ہیں کہ رسولؐ کے راز دار بہت سے نہ تھے، بلکہ خود حضرت عمر اپنی نسبت ان مؤرخین کے اس حُسنِ ظن کی تردید کرتے ہیں کہ وہ وزیر اور صلاح کار تھے۔ جب ابوسفیان فتح مکہ کے زمانہ میں عباس کے ساتھ آتا ہے اور حضرت عمر سے خواہش سفارش پر بقول ابن خلدون آپ فرماتے ہیں کہ: "اگر مجھ کو یہ معلوم ہو گیا ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا قصد ہے تو میں تجھ سے آج نپٹ لیتا"۔۔۔۔ ابوسفیان اس کلام کو سن کر چپکا علیؑ بن ابی طالب کے پاس چلا آیا۔۔۔۔ علیؑ نے کہا: "میں اس بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ گفتگو نہیں کر سکتا"۔

انصار اور رسولؐ کا خطبہ

جس وقت جناب رسالت مآبؐ طائف کے بعد مقام جعرانہ میں پہنچے جہاں حنین کی غنیمت رکھی تھی اور آپ نے مؤلفۃ القلوب کو زیادہ حصہ دیا، تو انصار نے جو مصلحت نہ سمجھتے تھے شکوہ کیا۔ بعض نے ان میں سے یہ بھی کہا کہ: "رسولؐ تمام قبائل کو جنھوں نے راہِ خدا میں کوئی محنت نہیں اٹھائی انعام دیتے ہیں اور ہمیں محروم کیا ہے، جن کی تلواروں سے ابھی کفار کا خون خشک نہیں ہوا"۔ رسولؐ کو معلوم ہوا، اور پوچھنے پر لوگوں نے جواب دیا کہ: "ہمارے اکابرین نے ایسا نہیں کہا، لیکن نوجوانوں کے ہم ضامن نہیں"۔ اس کے بعد نبیؐ خدا نے جو خطبہ فرمایا، وہ بہت اثر خیز تھا۔ جس کے بعض فقرات درج کیے جاتے ہیں۔ فرمایا: "آیا میں نے تم کو گمراہ نہیں پایا؟۔ خدا نے میرے سبب سے تمھیں ہدایت بخشی۔ جب میں تم میں آیا تو تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ خدا نے تمھیں محبت عطا کی۔ اور تمھارے مال اور اولاد میں برکت دی۔ کیوں مجھے اس کا جواب نہیں دیتے؟"۔ انصار نے جواب دیا کہ: "یا رسول اللہؐ ہمارے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں۔ ہم کیا جواب دیں۔ بے شک آپؐ کا ہم پر احسان ہے"۔ یہ سن کر آنحضرتؐ نے پھر فرمانا شروع کیا کہ: "اگر تم چاہو تو کہو کہ تم سچ کہو گے اور اس کی تصدیق کی جائے گی کہ: تو ہماری طرف آیا، درآنحالیکہ قوم نے تیری تکذیب کی، اور ہم تیری تصدیق کرتے تھے۔ اور کوئی تجھے نصرت نہیں دیتا تھا، اور ہم نے تیری مدد کی۔ تو اپنے وطن سے باہر نکالا ہوا تھا، ہم نے تجھے جگہ دی۔ تو فقیر اور درویش تھا، ہم نے تیری خدمت کی۔ تو خائف تھا، ہم نے بے خوف کیا"۔ حضرتؐ سے یہ مشکورانہ فقرات سن کر انصار بولے کہ: "احسان خدا اور اس کے رسولؐ کا ہے۔ اگر آپ کا وجود ہم میں نہ ہوتا تو ہم میں اور دوسروں میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ ہم آپ کی وجہ سے معزز اور سرفراز ہوئے۔ ہماری خوبیاں آپ کے سبب سے ہیں۔ ہم راضی ہیں خدا سے اور اس کے رسولؐ سے، ہماری نظر آپ کی متابعت پر ہے۔ متاعِ دنیا پر نہیں ہے"۔ یہ کہتے جاتے تھے اور کہن سال سرداران قوم روتے جاتے تھے"۔ اس کے بعد رسولؐ نے انھیں بھی عطا فرمایا، اور اپنی مصلحت ظاہر کی کہ تازہ اسلام یا متوجہین کے دل میں عطایا سے رسوخِ اسلام اور محبت پیدا کی جاتی تھی۔ اور فرمایا: "اے گروہِ انصار کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ لوگ

اُونٹ اور بکریوں کے ساتھ اپنے گھروں کو پھریں اور تم خدا اور رسُولؐ کے ساتھ اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔ تم غصّہ کرتے ہو کہ میں مؤلفۃ القلوب کو مال دیتا ہوں اور تم کو تمھارے ایمان پر چھوڑتا ہوں اور تمھارے کمال اخلاص پر اعتماد کرتا ہوں۔ اگر لوگ کسی وادی اور شعب میں چلیں میں انصار کی وادی اور شعب کی طرف چلوں گا۔ لوگ دثار (بیرونی پوشاک) ہیں اور انصار میرے شعار (اندرونی پوشاک) ہیں۔ میں حیات اور ممات میں تمھارے ساتھ ہوں"۔ اس کے بعد رسُولؐ نے بحرین کو انصار سے مخصوص کر کے ان کے نام وثیقہ لکھا۔ انصار روتے جاتے تھے اور کہتے تھے کہ: "آپ کے بعد ہمیں اس کی احتیاج نہیں، وہ دن نہ ہو جس میں آپ نہ ہوں"۔

خالد کا جوشِ انتقام اسلام نے فرو نہیں کیا

اس زمانہ میں یا اس کے کچھ قبل رسُولؐ نے خالد بن ولید کو جواب یہ سوچ کر کہ قریش کی شوکت اور قوت تمام ہوگئی "مُسلمان" ہو گیا تھا۔ بنی خزیمہ کی طرف ایک گشتی جماعت کے ساتھ روانہ کیا۔ خالد دعوتِ اسلام کے لیے بھیجے گئے تھے۔ قتال کا حکم نہ تھا۔ بدنصیبی سے کسی زمانہ میں خزیمہ نے خالد کے چچا الفاکہ کو قتل کیا تھا۔ بنی خزیمہ یہ سن کر کہ خالد آیا ہے احتیاطاً مسلح آئے اور بقول قرۃ العیون جب خالد نے پوچھا کہ: "تم کون لوگ ہو"۔ انھوں نے کہا: "ہم مُسلمان ہیں کہ محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم اور ان کی شریعت اور ان کے دین پر ایمان لائے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور ہم نے مسجد بنائی ہے۔ اس میں اذان و اقامت کہتے ہیں اور جمعہ و جماعت ادا کرتے ہیں"۔ خالد نے مسلح آنے کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے کہا کہ: "ہمیں ایک جماعت عرب سے بوجہ عداوت کے خوف تھا"۔ خالد نے ہتھیار رکھنے کو کہا۔ انھوں نے حکم کی تعمیل کی۔ اب خالد نے انھیں بقول مناہج و قرۃ العیون وغیرہ بے گناہ قتل کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ سو آدمی قتل ہوئے۔ صرف بنو سلیم نے قتل کیا تھا۔ مہاجر و انصار نے اپنے اسیروں کو قتل نہ کیا۔ کسی نے جا کر رسُولؐ کو خبر دی۔ حضرتؐ یہ سن کر غصّہ ہوئے اور دو یا تین مرتبہ کہا: "اللھم انی ابرأ الیك مما صنع خالد"۔ (خداوندا میں بیزار ہوں اس سے جو کچھ خالد نے کیا)

علیؑ نقصان کی تلافی کے لیے بھیجے گئے

اس کے بعد عام مؤرخین کے موافق رسُولؐ نے علی بن ابی طالب علیہ السّلام کو روانہ فرمایا، اور دیت کا روپیہ دیا۔ جناب امیرؑ نے روپیہ تقسیم کیا۔ (خالد کی غلطی اور رسُولؐ کی براءت کا تذکرہ کیا۔ اور غالباً خالد کی کافی چشم نمائی کی۔ (جسے مؤرخین نے اس لیے نہیں لکھا کہ آئندہ خالد کو ایسا ہی کچھ پھر کر کے "سیف اللہ" ہو جانا تھا) اور جو کچھ بچ رہا تھا وہ بھی مزید تالیف کے لیے تقسیم کر دیا۔ سید امیر علی صاحب کے لفظوں میں جیسا وہ اپنی تاریخ الاسلام میں فرماتے ہیں کہ: "حضرت علیؑ کے اخلاق و جود و سخا سے ہر شخص کا دل خوش ہوا اور سب نے ان کو دعائے خیر دی، اور جب حضرت علیؑ وہاں سے پھر کر رسُول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آنحضرتؐ نے بھی نہایت مدح و ثنا کی اور بہت شکریہ ادا کیا"۔ اس کے بعد بقول مناہج: "حضرتؐ ایک مدت تک خالد پر برسر غضب تھے" ...... "حضرتؐ بعضے (؟) اصحاب کی شفاعت کے وسیلہ سے خالد سے در گزرے"۔

عمرو بن عاص اور اسلام

میں یہ کہنا بھی فراموش نہ کروں گا کہ فتح مکہ کے بعد عمرو بن عاص مسلمان نہیں ہوگئے بلکہ انھوں نے بادشاہ حبشہ کے پاس سکونت کا ارادہ کیا، اس خیال سے کہ اگر قوم غالب ہوئی تو آجائیں گے، نہیں تو محفوظ رہیں گے۔ نجاشی نے بھی ان کا خیر مقدم اچھا نہ کیا۔ اب اس کے بعد سوچنا آسان ہے کہ یہ بے خانماں ہو کر جو کچھ سوچے اور کیا وہ خود کس حد تک ان کے مفید تھا۔ ان کے دلچسپ واقعات ابھی تاریخ اسلام میں بہت سے ملیں گے، جس کا دوامی اثر ہوا۔ کس حیثیت کا اسے ناظر خود سمجھے گا کہ یہ سوچنا بعض نتائج پر پہنچنے میں مفید ہوگا کہ یہ کس کس کے مددگار رہے۔

غزوۂ موتہ ۸ھ

۸ھ میں ایک واقعہ ہوا جو خصوصاً اس لیے قابل ذکر ہے کہ اس میں اسلام کا ایک ذی فہم واعظ اور اخلاق کا اخلاقی اندازے سے پابند بزرگ کم ہوگیا۔ یہ بنی ہاشم کے ممتاز شہدا کا تیسرا تھا۔ میری غرض سریہ موتہ سے ہے۔ جس میں اسلام کے علم کے ایک ممتاز محافظ حضرت جعفر بن ابی طالبؑ تھے۔

حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کی آمد یا فتح خیبر زیادہ خوشی کی چیز

ان کے متعلق جناب رسالت مآبؐ کا یہ فرمانا ان کے لیے بہت کچھ کہتا ہے جب یہ غزوہ خیبر کے بعد رسولؐ کے پاس ہجرت حبشہ سے واپس آئے ہیں کہ: "مجھے نہیں معلوم کہ میں خیبر کی فتح سے زیادہ مسرور ہوں یا جعفرؓ کی واپسی پر"۔ انھیں کے متعلق بقول مناہج فرمایا تھا کہ: "اشبہت خلقی و خلقی"۔

زید بن حارثہ کی شہادتؓ

لشکر اسلام کے تین ہزار سپاہیوں کو ہرقل کے دو لاکھ سپاہیوں کا سامنا تھا پھر بھی بہادر زید بن حارثہ اس طرح لڑا جیسا ایک سرفروش راہ خدا کو لڑنا چاہیے تھا۔

حضرت جعفرؓ کی شجاعتؓ اور شہادتؓ

یہ تنہا گھر گئے اور شہید ہوئے۔ ان کے بعد حضرت جعفرؓ نے بقول ابن خلدون:

"دوڑ کر رایت اسلام سنبھالا اور لڑنے لگے تا آنکہ ان کا گھوڑا زخمی ہو کر گر پڑا اور یہ پاپیادہ لڑنے لگے۔ دشمنان اسلام نے ہر چہار طرف سے ان پر وار شروع کر دیے۔ جب ان کا دایاں ہاتھ کٹ کر گرا تو انھوں نے رایت اسلام کو بائیں ہاتھ میں لیا"۔ یہ بھی ان کے جسم پر باقی نہ رہا، اور ابوطالبؑ کا فرزند اسے بازوؤں کے سہارے سنبھالے رہا۔ یہاں تک کہ دشمن نے کمر پر وار کیا، اور یہ شیر دل بقولے پچاس، بقولے ستر اور بقولے نوے زخم کھا کر اسلام پر نثار ہوگیا۔

وہی منظر جو فاطمہؓ بنت حمزہؓ کی وجہ سے ہوا

اسماءؓ بنت عمیس زوجہ حضرت جعفرؓ بن ابی طالبؑ کہتی ہیں کہ جب جعفرؓ کی شہادت کی خبر حضرتؐ کو پہنچی تو میرے گھر میں تشریف لائے اور دریافت کیا کہ جعفرؓ کے لڑکے کہاں ہیں۔ میرے پاس لاؤ۔ میں لڑکوں کو حضور میں لے گئی۔ حضرتؐ نے گود میں لیا، چوما، اور سونگھا، اور آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ میں نے عرض کی کہ یا رسول اللہؐ گویا جعفرؓ کی سنائی آئی ہے۔ فرمایا: ہاں وہ شہید ہوئے۔ (مناہج)

رسولؐ نے کھانا بھجوایا

اس کے بعد چشم پُر آب اُٹھے اور حضرت فاطمہؑ کے گھر تشریف لائے۔ یہاں بھی حضرت زہراؑ نے "یا عماہ یا عماہ" کہہ کر روتے سنا فرمایا: چاہیے کہ جعفر کے ایسے شخص پر رونے والی روئے۔ حضورِ اقدس نبویؐ نے جعفر کے گھر کھانا بھجانے کا بھی حکم فرمایا۔

عدی بن حاتم کا اِسلام اپنی بہن کے ساتھ اچھے برتاؤ کو دیکھ کر

۹ھ میں جناب رسالت مآبؐ نے امیرالمومنین علیؑ بن ابی طالب کو قبیلہ طے کے مشہور بت خانہ فلس کی طرف بھیجا۔ اس سریہ میں مشہور حاتم طائی کی بیٹی اور عدی بن حاتم کی بہن لشکر اسلام کے قبضہ میں آئی۔ اولاد حاتم پر دار الحرب کا اصول تقسیم غنیمت موثر نہ کیا گیا بلکہ اسے مدینہ کے ایک گھر میں محفوظ رکھا۔ رسولؐ نے آزاد کیا۔ اور عدی بن حاتم شام سے آکر مسلمان ہوا۔

رسولؐ عدی کا اِحترام کرتے تھے

آئندہ زمانہ میں دیکھا جائے گا کہ عدی بن حاتم یا اس کا فرزند حجر بن عدی علیؑ کے خاص جان نثاروں میں تھا۔ اس کی ابتدائی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ اس شریف قوم پر احسان اور حفظ عزت نے اثر کیا تھا۔ عدی بڑا شکاری تھا۔ اور مولوی عبدالحق صاحب مناہج میں فرماتے ہیں کہ: "حضرتؐ کو اس پر عنایت بہت تھی۔ یہاں تک کہ جب عدی واسطے شکار کے سوار ہوتا تو حضرتؐ اس کے ساتھ وادی عقیق تک مشایعت فرماتے"۔

عمرو بن عاص اور ابوعُبیدہ میں امامت نماز کا جھگڑا

میں ایک واقعہ اور اس لیے بیان کرتا ہوں کہ آئندہ بعض کے میلان طبیعت کی نمک چشی کی جاسکے۔ واقعہ یہ تھا کہ رسولؐ کو بنی قضاعہ کے مدینہ پر شب خون مارنے کی خبر پہنچی۔ رسولؐ نے ابن عاص کو ان کی طرف روانہ کیا۔ انھوں نے اپنی قلت اور دشمن کی کثرت دیکھ کر مدد طلب کی اور اب رسولؐ نے ابوعُبیدہ کی ماتحتی میں ایک جماعت مُسلمین کو جس میں ابن ابوقحافہ اور ابن الخطاب بھی تھے، روانہ کیا۔ نماز کا وقت تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ امیر سابق پیش نمازی کرے یا امیرِ لاحق۔ عمرو بن عاص دونوں کا امام بننا چاہتا تھا۔ اور ابوعُبیدہ اس پر تصفیہ کر رہے تھے کہ تم اپنی جماعت کے امیر ہو اور ہم اپنی جماعت کے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابوعُبیدہ دب گئے اور ابن عاص بازی لے گیا۔

عمرو بن عاص اور عمر بن الخطابؓ

لیکن قصہ یہیں ختم نہیں ہو گیا۔ بلکہ بقول قُرۃُ العیون و مناہج یہ بھی ہوا کہ: "حضرت عمر فاروق نے اس میں (آگ جلانے یا نہ جلانے میں) ان سے بہت گفتگو کی اور سخت کلام کیے۔ عمرو بن عاص نے کہا کہ: "تم مامور ہوئے ہو کہ میری بات سنو اور میرا حکم مانو"۔ حضرت فاروق اعظم نے کہا کہ: "ہاں ہم مامور ہیں"۔ انھوں نے کہا: "تو پھر مامور بنے رہو"۔

سرپر عصابہ باندھنا دشوار پیش آمد کا اِشارہ تھا

روضۃ الصفا اور حیات القلوب کو اس کے علاوہ کچھ کہنا ہے اور وہ یہ کہ ابن عاص، ان کے بعد ابن خطاب اور پھر ابن ابی قحافہ کو شکست ہوئی اور اب رسولؐ نے علیؑ کو بھیجا۔ اور علیؑ اپنی محتاط فوجی نقل و حرکت سے دشمن کے سر پر پہنچ گئے۔ صاحب حیات القلوب کو اس قدر اور کہنا ہے کہ سخت لڑائیوں میں جناب امیر علیہ السلام

سر پر ایک عصابہ باندھ لیتے تھے۔

فرض جسے فاطمہؑ کے آنسو نہ ٹال سکے، نہ آنسو فرض کے ٹالنے کے لیے تھے

جب جناب امیر علیہ السلام نے عصابہ طلب کیا تو بتولؑ عذرا آنکھوں میں آنسو بھر لائیں۔ لیکن فرض کا ادا کرنا پہلے تھا، علیؑ عصابہ باندھے، کاندھے پر بردِ یمانی ڈالے، نیزۂ خطی ہاتھ میں لیے اپنے سرخ گھوڑے کو مہمیز کرتے ہوئے روانہ ہو گئے۔

علیؑ کا استقبال اور ایک حدیث

مؤخر الذکر مؤرخین کے موافق: اسی جنگ کی صبح کو سورۂ والعادیات رسولؐ نے تلاوت فرمایا۔ یہ کہنا بے کار ہے کہ علیؑ کو فتح ہوئی۔ رسولؐ نے اصحاب کو استقبال کے لیے بھیجا، اور خود آگے آگے تشریف لے چلے۔ علیؑ کو گھوڑے سے اترنے نہ دیا، اور فرمایا: "اگر مجھے خوف نہ ہوتا اپنی امت سے کہ جو کچھ مسیح ابن مریمؑ کے لیے کہا جاتا ہے ایسا ہی کچھ وہ تیری شان میں بھی کہے گی، تو میں تیرے لیے کچھ کہتا کہ تو جس طرف سے گزرتا لوگ تیرے قدم کی خاک اٹھاتے"۔ سیر الائمہ، روضۃ الصفا وغیرہ کے علاوہ مشابہت عیسٰی کی حدیث علامہ جلال الدین سیوطی نے البازار، ابو یعلٰی اور الحاکم سے نقل کی ہے۔ مشکل سے میں سوچ سکتا ہوں کہ جو کچھ جناب رسالت مآبؐ فرمانا چاہتے تھے وہ نہیں فرمایا، بلکہ اس طرح فرمایا جس سے زیادہ پرقوت انداز سے کہنا مشکل تھا۔

غزوہ تبوک ۹ھ اور بعض خصوصیات

۹ھ کا ایک نہایت مخصوص واقعہ غزوہ تبوک ہے۔ اس کے وہ مخصوص نکات جسے ہم لکھنا چاہتے ہیں یہ ہیں کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ اصول تھا کہ کسی جنگ کے لیے کیوں نہ تشریف لے جائیں لیکن کبھی اپنا ارادہ ظاہر نہیں فرماتے تھے۔ لیکن اس غزوہ کی روانگی کے قبل ظاہر فرما دیا۔ دوسرا امر یہ تھا کہ اس غزوہ کے لیے سرحد شام تک جانا تھا، اور درمیان میں بہت سی تکلیفیں تھیں۔ تیسری بات یہ تھی کہ بنی اسد، غطفان اور رفقائے عامر بن طفیل اور ابن ابی سلول ان میں سے کچھ عذر کر کے بیٹھ گئے اور کچھ راستہ سے پلٹ آئے اور وہ قابل ذکر بات یہ تھی کہ اس مرتبہ جناب امیرؑ کو بجائے اس کے کہ ہر غزوہ کی طرح پشت و پناہ لشکر رکھتے، مدینہ میں اپنا قائم مقام چھوڑا۔

دیوانی یا فوجی عہدے میں علیؑ کسی کے ماتحت نہیں رکھے گئے

یہ واقعہ ہے کہ جب حضرت رسالت مآبؐ اور جناب امیرؑ غزوات کے لیے باہر جاتے تھے تو مدینہ کی حفاظت کے لیے کوئی شخص ذمہ دار بنایا جاتا تھا۔ لیکن یہ مقام بھی تبوک کی مثال سے صاف ہو گیا کہ اگر مصلحت اس کی مقتضی تھی کہ جناب امیرؑ ہمراہ نہ رکھے جائیں تو مدینہ میں وہ اور کسی حیثیت سے بغیر قائم مقام کے نہ چھوڑے جا سکتے تھے۔ جس طرح غزوات میں کسی کے ماتحت نہ بنائے جا سکتے تھے۔ اس لیے کسی کا یہ کہنا کہ علیؑ کا خلیفہ چھوڑنا اس لحاظ سے کہ رسولؐ نے اور مواقع پر دوسرے لوگوں کو خلیفہ چھوڑا تھا کوئی وزن نہیں رکھتا بلکہ ایک صریح مغالطہ ہے۔ اس لیے کہ ہم تو یہ کہہ رہے ہیں کہ کوئی ایسا کام جو فوجی ہو یا ملکی اور وہ ایسی اہمیت رکھتا ہو کہ اسے جناب رسالت مآبؐ ہی کو ادا کرنا ہو تو ایسے موقع پر کوئی رسولؐ کے نزدیک بجز علیؑ کے اپنے کو اعتبار کا شایان نہیں ٹھہراتا

تھا۔ مساوات منزلت تو اس وقت ہوتی جب علیؑ اور کسی کے ہوتے ہوئے ایک مرتبہ یہ اور ایک مرتبہ وہ ہوتا، بلکہ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ علیؑ کے ہونے کے معنی دوسرے کا نہ ہونا تھا۔ علیؑ اور رسولؐ کی ناموجودگی میں کسی کا ہونا رفع ضرورت تھی اور علیؑ کے ہوتے ہوئے دوسرے کا نہ ہونا علیؑ کی قدر و منزلت۔

رسولؐ اور علیؑ میں موسیٰؑ اور ہارونؑ کی مناسبت کا اشارہ

غزوہ تبوک کی اس مستند بین الفریقین حدیث: "اما ترضی ان تکون منی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انه لا نبی بعدی"۔ باوجود مستند ہونے کے دفتر کے دفتر سیاہ کیے گئے ہیں۔ کوئی صاحب قرۃ العیون کا ایسا مؤلف ان الفاظ کو روک نہیں سکتا کہ: "یہ حدیث دلیل اہل سنت کی ہے بیچ ثابت کرنے فضیلت حضرت امیر رضی اللہ عنہ اور صحت امامت ان کی کے اپنے وقت میں، اس واسطے کہ اس حدیث سے استحقاق حضرت امیرؑ کا واسطے امامت کے مستفاد ہوتا ہے"۔

سوال کیا جاسکتا ہے کہ: "جب یہ حدیث رسولؐ کی حیات میں اور پھر ایک زمانہ کے بعد کسی خاص وقت کے جناب امیرؑ کے لیے بمنزلہ سفارش اور فضیلت کے ہوسکتی ہے تو متصلاً رسولؐ کے بعد کیوں نہیں ہوسکتی؟"۔

ولی عہدی کے متعلق

اگر کسی بادشاہ کا ولی عہد مرجائے، اور اس صورت میں وہ بادشاہ کے بعد قائم مقام نہ ہوسکے، تاہم عامہ ناس یہی سمجھتے ہیں کہ: "اگر وہ زندہ رہتا تو قائم مقام ہوتا"۔ موت نے اس واقعہ کو کہ وہ ولی عہد تھا، فنا یا نیست نہیں کردیا، اگرچہ شخص فنا ہوگیا۔ اِسلانِ وصایت ہارونؑ اور علیؑ میں عام تھا۔ ہارون رحلت کرگئے، علیؑ زندہ رہے۔ اور اس لیے ولی عہد کرنے والے کی خواہش کے موافق انھیں خلیفہ ہونا چاہیے تھا۔

ہارونؑ کا توریت میں موقع

دوسری بات جو اس ضرورت کے لیے توریت پڑھنے والوں نے عمداً یا سہواً فروگزاشت کی ہے وہ یہ ہے کہ ہارونؑ کی کہانت کے لیے مقدس کیے جانے کے وقت خدا نے ان کے لیے جو رعائتیں اور حقوق مقرر کیے وہ دیگر بنی اسرائیل کے لیے نہ تھے۔ بنی اسرائیل اولاد ہارونؑ کی موجودگی میں کسی دوسرے کو اپنے رسومات مذہبی کا پیشوا نہیں سمجھتے تھے اور بیت المقدس کی کہانت یا ریاست روحانی اولاد ہارون ہی میں تھی۔ برخلاف مسلمانوں کے جنھوں نے ایک خاص وقت اور اس کے اثر سے اپنا یہ اصول قرار دے لیا کہ جو بادشاہ ہے وہی پیشوائے روحانی بھی ہے۔ وہ کوئی، اور کیسا ہی کیوں نہ ہو۔

فرق

ہر مورخ اسے مانتا ہے کہ رسولؐ نے پہلے علیؑ کو اپنا قائم مقام کیا، اس کے بعد جناب امیرؑ کے ہمراہ نہ جانے کے اظہارِ تاسف پر یا منافقین کے اس کہنے پر کہ: "اس لیے یہاں چھوڑ گئے کہ کچھ کدورت خاطر مبارک میں رکھتے تھے"۔ فرمایا کہ: "ایسا کہنے والے جھوٹے ہیں۔ کیا تو اس پر راضی نہیں ہے کہ تیری نسبت مجھ سے وہ ہو جو ہارون کو موسیٰؑ سے تھی۔ صرف فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا"۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ اگر علیؑ کا پیچھے چھوڑ جانا محض اہل و عیال کی حفاظت تھی تو موسیٰؑ اور ہارونؑ کی مثال کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

مناسبت کا نقطۂ صحیح

بلکہ موسیٰؑ اور ہارونؑ کی مثال اس لیے ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰؑ نے اپنے زمانہ غیبت میں قوم کے خیالات کا محافظ اور رہنما اپنے اعتبار کے ایک آدمی کو چھوڑا تھا اسی طرح جناب رسالت مآبؐ نے اسے اس سے زیادہ سخت اتفاقات میں جن کا موسیٰؑ کو سامنا تھا اپنا قائم مقام چھوڑا تھا۔ جس پر رسُولؐ کے اعتبار کے متعلق راز گوئی کا طنز سب سے زیادہ واضح اور زبردست دلیل ہے۔

تبوک کی وقتی قائم مقامی سے رسُولؐ کے بعد کی قائم مقامی کا استنباط

مشکل سے وہ شخص "نبوت" کے خطاب سے ممتاز کیا جاسکتا ہے جو اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے لیے تو محافظ چھوڑے اور قوم کی حفاظت کا کسی کو ذمہ دار نہ بنائے۔ لیکن یہ عجب خیز نظریہ ہمارا نہیں ہے کہ نبیؐ نے کسی کو قوم کا مستند ذمہ دار نہیں چھوڑا، بلکہ واقعۂ تبوک ان لوگوں کے قول کی نفی ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ رسُولؐ نے اپنے بعد کوئی قائم مقام نہیں چھوڑا۔ جب سرورِ عالم تبوک کے زمانہ غیبت میں اپنا قائم مقام چھوڑ سکتے تھے تو اپنے بعد انھوں نے بہ مراتب زیادہ اس کا لحاظ کیا ہوگا کہ امت کا کوئی محافظ چھوڑیں۔ ایسے قائم مقام کا انتخاب رسُولؐ کا فرض تھا نہ کہ بھیڑ یا دہسان خلقت کا۔

ایک حدیث جو وقتی یا غیر وقتی وصایت کا تصفیہ کرتی ہے

ان مورخین کو جو اس پر مصر ہیں کہ تبوک کی قائم مقامی میں موسیٰؑ و ہارونؑ کی حدیث کا فرمایا جانا آئندہ پر کوئی اثر نہیں رکھتا، میں روضۃ الاحباب کی یہ حدیث یاد دلاؤں گا کہ: "علی خلیفتی علیکم فی حیاتی وفی مماتی فمن عصاہ فقد عصانی"۔ (علیؑ تم پر میری زندگی میں بھی اور میرے مرنے کے بعد بھی خلیفہ ہے اس کا نافرمان میرا نافرمان ہوگا۔) جسے ام المومنین ام سلمہؓ ام المومنین عائشہؓ کو یاد دلاتی ہیں اور وہ تصدیق کرتی ہیں۔ جس میں حیات اور ممات کا قصہ طے ہو جاتا ہے۔ لیکن شاید یہ حدیث بھی بحث کے موقع پر اس لیے قبول نہ کی جائے کہ یہ اس کے زبانی ہے جس نے نہ صرف حضرت عائشہ کی سپہ سالاری میں شرکت نہ کی بلکہ اس پارٹی میں بھی نہ تھیں جن کی ایک فرد حضرت عائشہ تھیں۔ مزید تائید کے لیے صواعق محرقہ سے یہ حدیث نقل کرتا ہوں کہ:

"ما تریدون من علی ان علیاً منی وانا منہ وھو ولی کل مؤمن بعدی"۔ (چہ میخواہید از علی۔ سہ نوبت تکرار ایں لفظ کردہ گفت۔ بدرستیکہ علی از من و من از وے ام و او والی ہر مومن است بعد از من)۔ (تم علیؑ سے کیا چاہتے ہو۔ یہ تین بار کہہ کر فرمایا: علیؑ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ علیؑ میرے بعد ہر مومن کا والی ہے)

یہ تمام باتیں اس میں مطلق شبہ کی گنجائش نہیں رکھتیں کہ وصایت یا خلافت یا امامت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے لیے جناب رسالت مآبؐ نے حتمی اعلان فرمایا، اور سب کی تصدیق حجۃ الوداع میں کی۔ مورخین کا یہ کہنا کہ اس سے مقصود امامت تھی "اپنے وقت میں" اس لیے ہے کہ کچھ وقت دوسروں نے اپنا کر لیا تھا۔ اور مورخین نے اور لحاظ کے ساتھ رسُولؐ کے اس فرمانے کے معیار سے بھی ان کے وقت پر غور نہیں کیا کہ رسُولؐ کی قائم مقامی وہ کرتا ہے جو "رسُولؐ میں سے ہو"۔ کم سے کم رسُولؐ نے اپنے زمانہ میں ہر مفید موقع پر یہی بھجایا۔ اور خود یہ اصول اس قدر فطری تھا کہ سہیل بن عمر نے اس کی خواہش کی۔

رسولؐ کو ہلاک کرنے کا ارادہ

جو کچھ غزوۂ تبوک کے متعلق مجھے اور کہنا ہے وہ یہ ہے کہ جناب رسالت مآبؐ کی واپسی کے وقت کچھ لوگوں نے آنحضرتؐ کے ہلاک کرنے کا قصد کیا جو واقعہ عقبہ کے نام سے مشہور ہے۔

واقعۂ عقبہ

مؤرخین کو اس واقعہ کے زمانہ کے متعلق تھوڑا سا اختلاف ہے اور وہ یہ کہ واقعہ عقبہ بعد تبوک ہوا، یا بعد حجۃ الوداع۔ اس اختلاف سے ہمارے خیال پر کوئی اثر نہیں پڑتا وہ کبھی کیوں نہ ہوا ہو۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ مشہور منافقین یا تو مدینہ رہ گئے یا راہ سے عذر کر کے واپس آئے۔ لیکن پھر بھی لشکر اسلام کے ساتھ کچھ لوگ تھے جنھیں لوگ عام طور سے نہ جانتے تھے کہ یہ دشمن رسولؐ ہیں۔

واقعہ عقبہ اس کا ثبوت ہے کہ ظاہر منافقین کے علاوہ کچھ غیر ظاہری تھے

رسولؐ جس وقت عقبہ کے پاس پہنچے، مہارِ شتر عمار بن یاسر پکڑے تھے، اور حذیفہؓ پیچھے پیچھے آرہے تھے کہ کچھ لوگ پس پشت کی طرف سے پیدا ہوئے جو چہروں پر نقاب ڈالے ہوئے تھے۔ رسولؐ کو آہٹ ملی اور آپؐ نے حذیفہؓ سے فرمایا کہ انھیں واپس پلٹا دو۔ حذیفہؓ ان کے ناقوں کے مُنہ پر مار کر کہتے تھے کہ: دُور ہو دُور ہو اے دشمنانِ خدا۔ دشمن جن کی تعداد زیادہ سے زیادہ پندرہ تھی، یہ سمجھ کر کہ رسولؐ کو ان کے ارادہ کی اطلاع ہو گئی، پلٹ گئے۔

سواریاں پہچانی گئیں

اس کے بعد بقول شواہد النبوۃ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم از حذیفہ پرسید کہ ہیچ کس را ازیں گروہ شناختی؟ گفت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راحلہ فلاں و فلاں (؟) را شناختم۔ اما ہمہ روہہائے خود بستہ بودند و شب تاریک بود ایشاں را نہ شناختم چوں از عقبہ گزشتہ و صبح دمید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسید بن حضیر را گفت یا ابا یحییٰ می دانی کہ شب منافقان چہ اندیشہ کردند۔۔۔

ترجمہ رسول اللہؐ نے حذیفہؓ سے پوچھا کہ اس گروہ میں سے کسی کو تو نے پہچانا۔ حذیفہؓ نے کہا اے رسولِ خدا فلاں فلاں کی سواری کو پہچان لیا ہے۔ لیکن سب نے مُنہ لپیٹے ہوئے تھے۔ اور رات تاریک تھی۔ ان کو پہچان نہیں سکا۔ جب اس گھاٹی سے گزر گئے اور صبح نمودار ہوئی تو رسولِ خدا نے اسید بن حضیر سے فرمایا اے ابویحییٰ جانتے ہو منافقوں نے آج رات کیا منصوبہ بنایا تھا۔۔۔

کیوں رسولؐ نے منافقین کو سزا نہ دی

اسید گفت بفرمائی یا رسول اللہ ۔۔۔ تا فی الحال سرہائے منافقان را بحضرت تو رسانم۔ گفت اے اسید مکروہ میدارم کہ مردم گویند چوں حرب منقضی شد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قتل اصحاب خود آغاز کرد۔ اسید گفت ایشاں از اصحاب تو نیستند فرمود کہ اظہار شہادت می کنند و خدائے تعالیٰ مرا از قتل اہل شہادت نہی کردہ است بعد ازاں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نامہائے آں جماعت باحذیفہ گفت ۔۔۔ وبغیر وے از اصحاب ہیچ کس آں را نمی دانست"۔

یعنی اُسید نے کہا: اے رسولِ خدا فرمائیے کہ ابھی منافقوں کے سر کاٹ کر آپؐ کی خدمت میں پیش کروں۔ فرمایا: اے اُسید میں ناپسند کرتا ہوں کہ لوگ کہیں کہ جب جنگ ختم

ہو گئی تو پیغمبرؐ نے اپنے اصحاب کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اسید نے کہا وہ آپؐ کے اصحاب سے نہیں ہیں۔ فرمایا کہ اظہارِ شہادت کرتے ہیں اور خدا نے شہادت دینے والوں کے قتل سے منع فرمایا ہے۔ اس کے بعد رسولِ خداؐ نے اس گروہ کے نام حذیفہؓ کو بتلائے۔ اور حذیفہؓ کے سوا اور کسی کو معلوم نہ تھے۔

رسولؐ نے عمار اور حذیفہؓ کو منافقین کے نام بتا دیے

اس سے معلوم ہوگا کہ نہ صرف ہر ایک کا راحلہ پہچانا گیا بلکہ رسولؐ نے حذیفہؓ کو اور بقول قُرۃُ العیون عمار بن یاسر کو بھی سب کے نام بتا دیے۔ اب ایک سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اگر رسولؐ نے اپنے زمانہ میں خود علام طور سے ظاہر کرنا بعض مصالح کے لحاظ سے پسند نہ بھی فرمایا ہو تو کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ رسولؐ کے بعد ان ناموں کا اعلان نہ ہو جاتا۔ اس لیے کہ اس کے بعد مشتہر ہونے سے دین اور دنیا کی کوئی خرابی نہیں نظر آتی۔

ایک شخص حذیفہؓ سے سوال کرتا ہے

قُرۃُ العیون میں اس امر کا دلچسپ تذکرہ ہے کہ: کسی مجلس میں اہلِ عقبہ میں سے ایک نے (؟) حذیفہؓ کو قسم دی کہ وہ حملہ آور منافقین کی تعداد بتا دیں۔ حذیفہؓ نے کہا کہ: "مجھے خبر دی گئی ہے کہ وہ چودہ آدمی تھے۔ اور اگر تو بھی اس میں سے ایک ہے تو پندرہ تھے"۔ یہ بھی تذکرہ ہے کہ ان منافقین میں سے تین نے معذرت کی، اور ان کا قصور معاف کیا گیا۔

نام چھپ نہیں سکتے تھے

یہ کل باتیں بتاتی ہیں کہ اس کے بعد منافقین کا نام مخفی رہنا محال تھا۔ کیسے ممکن تھا کہ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان کے ہادی پر حملہ کرنے کا ارادہ کرنے والے چودہ پندرہ آدمی تھے اور ان میں سے عام طور سے چند نے معافی مانگی اور پھر ان لوگوں سے بقیہ کا حال نہ معلوم ہو گیا ہو۔ درآنحالیکہ رسولؐ نے ان سے اخفا کی کوئی تاکید نہ فرمائی تھی۔

حضرت عمر حذیفہؓ سے اپنی قلبی حالت کی تفتیش فرماتے ہیں

حیرت پر حیرت احیاء العلوم غزالی جلد چہارم کی حسبِ ذیل عبارت سے ہوتی ہے کہ "عمر بہت مبالغہ کرتے تھے اپنے قلبی حالت کی تفتیش میں، یہاں تک کہ پوچھا کرتے تھے حذیفہؓ سے کہ آیا وہ ان میں کچھ نفاق کا اثر پاتے ہیں؟"۔ اور اس طرح حضرت عمر ہی کے متعلق کہا گیا ہے کہ رحلتِ رسولؐ کے بعد اس شخص کی نماز جنازہ پڑھتے تھے جس پر حذیفہؓ کو پڑھتے ہوئے دیکھتے تھے۔ اور حذیفہؓ کا ہاتھ پکڑ لیتے تھے۔

مؤلف کی حیرت

جس بات پر میں نے مزید عجب سے غور کیا ہے وہ یہ کہ اگرچہ تاریخِ اسلام میں اکثر موقع پر یہ نظر آتا ہے کہ حضرت عمر کی تلوار کے نیام سے باہر نکل آنے اور کسی گرفتار دشمنِ رسولؐ کے مار ہی ڈالنے میں کوئی دیر نہیں ہے۔ لیکن اس موقع پر حضرت عمر کی کسی ایسی کوشش کا تذکرہ نہیں ہے جس میں انھوں نے جناب رسالت مآبؐ یا حذیفہؓ سے منافقین کے نام دریافت کرنے کی التجا اور انھیں قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہو۔ جیسا اُسید بن حضیر نے عرض کیا تھا۔ میں اس تصفیہ سے دور نہیں ہوں کہ رسولؐ ہی کے زمانہ میں منافقین کے نام معلوم ہو گئے تھے۔ لیکن بلحاظ اس جواب کے جو اُسید بن حضیر کو دیا گیا مومنین خاموش تھے۔ اب رہا یہ کہ رسولؐ کے بعد ان کا نام کیوں ظاہر نہ ہو گیا؟ اس کا

جواب رسولؐ کے بعد بھی حیرت خیز انقلاب میں ہے اور بس۔

ایک سوال جو تاریخ کے آئندہ مناسب موقع کے لیے ملتوی کیا گیا

میں نے باب تک یہ سمجھانے کی کوشش نہیں کی کہ منجملہ ان وجوہات کے جن سے یہ لوگ (منافقین) ایسے فعل کے ارتکاب پر آمادہ ہوئے جن سے بڑھ کر کسی مسلمان کے نزدیک برا کام نہیں ہو سکتا میری تحریر کے نقطۂ خیال کے لحاظ سے کونسی وجہ ہو سکتی ہے۔ میں اسے کتاب میں مناسب موقع کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔ غالباً واقعات تاریخ ہی اس کے صاف کرنے کے لیے کافی ہوجاویں گے۔

ادائے رسالتؐ کے متعلق ایک مفید حکم اور علیؑ

اسی سنہ کا ایک اور قابل توجہ واقعہ یہ ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے بقول صاحب قرۃ العیون ابوبکر صدیق کو تین سو آدمیوں کے ساتھ سردار کر کے حج کے واسطے بھیجا کہ مناسک حج کی لوگوں کو تعلیم کریں اور اول سورہ برأۃ سے تیس چالیس آیتیں لوگوں کو پڑھ کر سناویں۔۔۔ بعد اس کے حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نازل ہوئی کہ ادائے رسالت و پیغام نہ کرے کوئی مگر تو یا وہ شخص کہ تجھ میں سے ہو۔۔۔ سو حضرت نے علی کرم اللہ وجہہ کو بلایا اور فرمایا کہ تم ابوبکر صدیق کے پیچھے جاؤ اور اوائل سورۂ برأت کی آیتوں کو ان سے لے کر حج کے روز تم سب کو سنا دینا۔۔۔ یہ ارشاد فرما کر اپنی اونٹنی پر کہ نام اس کا غضبا تھا حضرت علیؑ کو ان کاموں کے لیے سوار کر کے روانہ کیا۔۔۔ حضرت علی تشریف لے گئے اور ہر ایک خیمہ میں روبرو لوگوں کے وہ آیات بینات پڑھنے لگے اور وہ چاروں احکام مذکورہ (● بہشت میں بجز مومن کے کوئی داخل نہ ہوگا ● کوئی برہنہ طواف بیت اللہ نہ کرے ● اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور بیت اللہ کے قریب نہ رہے۔ ● یہ کہ جو کوئی عہد مؤقت رکھتا ہو ساتھ خدا اور رسولؐ کے تو چاہیے کہ اس مدت کے گزرنے تک اپنے عہد پر ثابت رہے۔ اور اگر کوئی عہد نہ رکھتا ہو یا عہد غیر مؤقت ہو تو وہ چار مہینہ کی مدت تک امان میں ہے) پہنچانے لگے۔ پھر جب اس کام سے فراغت کر کے مع الخیر مدینہ میں آئے تب حضرت صدیق نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی کہ: "یا رسول اللہ! مجھ سے کونسی ایسی خطا واقع ہوئی جو آپ نے مجھ سے وہ خدمات آیات پڑھنے اور احکام اربعہ کے پہنچانے کی موقوف رکھی"۔ آپ نے فرمایا: ۔۔۔ "سبب یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام میرے پاس آئے اور یہ حکم لائے کہ تبلیغ اس امر کی کوئی نہ کرے مگر تم آپ یا وہ جو تم میں سے ہو۔ اس لیے میں نے یہ کیا"۔

بقول ابوالفدا (جب حضرت علیؑ نے ابن ابی قحافہ سے سورۂ برأت لے لیا) "یہ بات سن کر حضرت ابابکر صدیق راہ ہی میں سے مراجعت کر کے پیغمبر خدا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔۔۔"

علیؑ آج فرستادۂ خدا ہیںؑ

سورۂ برأت کو علیؑ تنہا اس جگہ لے جاتے ہیں جہاں کفار کا ہجوم اور انبوہ ہے۔ مجمع کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ: ایہا الناس! انی رسول اللہ الیکم (اے لوگو! میں تمہاری طرف فرستادۂ خدا ہوں) لوگ پوچھتے ہیں کہ کس چیز کے ساتھ؟ اور آپ جواب میں فرمانا شروع کرتے ہیں کہ: بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔۔۔ (بیزاری ہے خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف سے۔۔۔)

سُورۂ براءت کی اہمیت

سورۂ براءت کے تذکرہ سے میری یہ غرض تھی کہ میں اس پر توجہ دلاؤں کہ عہد ناموں کی تجدید، توثیق یا تنسیخ کس پایہ کی ہوتی ہے اور اس وکیل کو کس درجہ معتمد بین الفریقین ہونے کی ضرورت ہے۔ ایسے سیاسی عناصر میں وکیل کی ذات مخصوص اثر پیدا کیا کرتی ہے بغیر کسی اور طویل توجیہ کے میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اس میں نہ صرف سیاسی شان تھی بلکہ اس لحاظ سے کہ یہ عہد کے متعلق صاف اور صریح اعلان تھا اور رسولؐ کی طرف سے تھا۔ اس میں اخلاقی اور مذہبی عناصر بھی پہلو بہ پہلو تھے۔

ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر جب کہ جناب امیرؑ گزشتہ صلوٰت کے الفاظ نے اور حق صلوت کے قائم کرنے لیے تشریف لے گئے تھے موقع کا تذروش ہونا عجب خیز نہ تھا۔ چنانچہ جناب امیرؑ کی واپس تشریف آوری کی خبر جب ابوذر نے ہادی برحق کو پہنچادی تو رسولِ اکرمؐ نے استقبال کیا اور بغل گیر ہوئے۔

سنہ ۱۱ھ

حسینؑ رسولؐ کے ایک فرض میں شرکت کے قابل ہوئے

دیر تک میں نے ناظر کو یہ کہنے کے لیے منتظر رکھا کہ اب وہ وقت آیا جس میں حسینؑ رسالت مآبؐ کے نفس الفن میں شرکت کے قابل ہوئے۔ اور شرکت بھی جس امر میں ہوئی وہ اس درجہ مہتم بالشان تھا جس کا ذکر نہ صرف ہمارے ہدایت نامہ (قرآن شریف) میں ہے بلکہ جس واقعہ سے علماء نا اس کی نگاہوں میں اسلام کا وقار خدائی فیصلہ کے بنیاد پر قائم رہا بلکہ اس میں اضافہ ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ سید و عالمؐ نے سنہ ۱۰ھ میں نصاریٰ نجران کو دعوتِ اسلام کا مکتوب روانہ فرمایا۔ اور ان میں سے چودہ شخص بغرض تفتیش مدینہ میں آئے۔ رسولؐ نے دعوتِ اسلام فرمائی۔ ان لوگوں نے انکار کیا اور پوچھا کہ حضرت عیسیٰ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔

عیسیٰؑ کی مثال خلقت میں مثل آدمؑ کے ہے

اس کے جواب میں حضور انور پر یہ آیت نازل ہوئی، جسے آپ نے تلاوت فرمایا کہ:

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ۝ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُن مِّنَ الْمُمْتَرِينَ ۝ فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ۝ (۳ : ۵۹-۶۱)

(تحقیق کہ مثل عیسیٰؑ کی خدا کے نزدیک مثل آدمؑ کے ہے بنایا اس کو مٹی سے پھر کہا اس کو ہو جا وہ ہو گیا۔ حق بات ہے تیرے رب کی طرف سے پھر تو شک میں نہ پڑ۔ پھر کوئی بعد اس کے کہ تجھے علم ہو چکا اس بات پر جھگڑا کرے تو تو کہہ کہ آؤ بلا دیں ہم اپنے بیٹے اور تمہارے بیٹے اور اپنی عورتیں اور تمہاری عورتیں اور اپنی جانیں اور تمہاری جانیں پھر دعا اور لعنت کریں جھوٹوں پر) نصاریٰ نے یہ سن کر مہلت مانگی۔

مباہلہ کی صُورت اور حسینؑ کی شرکت

دُوسرے روز جناب رسالت مآبؐ مباہلہ پر اس طرح مستعد تھے کہ حسینؑ کو گود میں لیے ہوئے اور حسنؑ کا ہاتھ پکڑے تھے پشت اقدس پر، زکیہ طاہرہؑ تھیں اور علی مرتضیٰ سب کے آخر میں رکھے گئے تھے اور

سرورِ عالمؐ نے سب کو ہدایت فرمائی تھی کہ جب میں دعا کروں تو تم آمین کہنا۔

نصرانی ثانی رسولؐ کا یہ اہتمام دیکھتا تھا اور اس کا یہ قول ہم تک پہنچا ہے کہ: "اے قوم میں چند آدمیوں کے چہرے دیکھتا ہوں کہ اگر وہ خدا سے پہاڑ کے ٹل جانے کی دعا کریں تو پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے گا خبردار مباہلہ نہ کرنا ورنہ ہلاک ہوگے"۔ (قرۃ العیون)

نصاریٰ نجران سے معاہدہ اور اس کے دفعات

نصرانیوں نے مباہلہ نہ کیا بلکہ اس پر صلح کی کہ: "ہم ایک ہزار حلہ ماہ صفر اور ایک ہزار حلہ ماہ رجب میں دیا کریں گے۔ تمہارے وکلا کی مہمانداری کریں گے۔ اس شرط پر کہ ہم اپنے دین پر قائم رہیں اور تم ہمیں اپنی پناہ میں لو"۔ مصلح بنی آدم نے یہ عہد نامہ منظور فرمایا۔

آیۂ مباہلہ کا ترجمہ

مشکل سے مجھے یہ کہنے کی ضرورت باقی رہ گئی ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے آیۂ مباہلہ کا جو عملی ترجمہ فرمایا اس سے عالم پر ثابت ہو گیا کہ ابنائنا میں حسنینؑ، نسائنا میں جناب فاطمہؑ زہراؑ اور انفسنا میں علیؑ مرتضیٰ، رسولؐ کے نزدیک وہ لوگ تھے جو خدائی فیصلہ کے پر عظمت اور جلالت کے موقع پر لائے جاتے مجھے تو اس وقت اس سے بحث ہے کہ حسینؑ اس قابل ہوگئے تھے کہ ان کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ رسولؐ کی گود سے آمین کہنے کے لیے بلند ہوتے اور کوئی عجب نہ تھا کہ رسولؐ ان ہاتھوں کو اسی وقت چوم لیتے۔ میں ابوالحارث کے قول کو جو اس مباہلہ چاہنے والی جماعت کے چہروں کی شان کے متعلق ہے پر غور توجہ کے حوالہ کرتا ہوں۔

آیۂ تطہیر اور حسینؑ

صاحب صواعق آیۂ تطہیر کو لکھتے ہوئے کہتا ہے: "اکثر مفسرین بریں رفتہ اند کہ ایں آیت نازل شد در شان امیرالمومنین علی و فاطمہ و حسنؑ و حسینؑ رضی اللہ عنہم"۔ اس کے بعد صلاح پیش کرتا ہے کہ روایتیں بعض مؤید ہیں اس کی کہ یہ پنج تن کی شان میں نازل ہوئیں۔ اور بعض ازواج رسولؐ کے متعلق اور اس ضمن میں روایت کرتا ہے:

> مرویست بروایت احمد از ابو سعید خدری کہ ایں آیت در شان پنج کس نازل شد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم و علی و فاطمہ و حسن و حسین (رضی اللہ عنہم) و ابن جریر مرفوعاً بایں لفظ روایت کردہ است نزلت ہذہ الآیۃ فی خمسۃ فی النبی صلی اللہ علیہ وسلم و فاطمہ و حسنؑ و حسین۔ و طبرانی نیز روایت کردہ۔۔۔۔

> یعنی: بروایت احمد بن حنبل ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ یہ آیت تطہیر پانچ تن کی شان میں اتری ہے۔ پیغمبرؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ۔ اور ابن جریر نے مرفوعاً ان لفظوں سے روایت کی ہے کہ یہ آیت پانچ افراد کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ نبیؐ کے بارے میں، علیؑ اور فاطمہؑ اور حسنؑ اور حسینؑ کے بارے میں۔ اور طبرانی نے بھی روایت کیا ہے۔

رسولؐ اہلِ بیتؑ کو پہچنواتے ہیں

و مسلم بایں طریق روایت کردہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایشان را در کسائے یعنی عبائے کہ بروئے بود در آورد و ایں آیت بر خواند و بصحت رسیدہ کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم عبا را بریں چہار کس پوشانید و فرمود اللھم ھؤلاء اھل

بیتی و حامتی ای اذھب عنھم الرجس و طھرھم تطھیرا۔ بار خدایا این جماعت اہل بیت من اند پس بر از ایشان گناہ را و پاک گردان پاک گردانیدنی ۔۔۔۔ و در روایت دیگر آنکہ بعد از تطہیر گفت انا حرب لمن حاربھم و صلح من صالحھم و سالم لمن سالمھم و عدو لمن عاداھم من جنگ می کنم باکسیکہ با ایشان جنگ کند و صلح می کنم باکسیکہ با ایشان صلح می کند و دشمن خواہم شد باکسیکہ بہ ایشان دشمنی می کند ۔۔۔۔ و در روایتے آنست کہ سہ نوبت فرمود: اللھم ھولاء اھل بیتی۔

یعنی: مسلم نے اس سند سے روایت کیا ہے کہ رسولِ خداؐ نے ان کو اپنی چادر یعنی عبا میں جو اوڑھے ہوئے تھے، لیا اور یہ آیت پڑھی۔ اور یہ حدیث سے ثابت ہے کہ: رسولِ خداؐ نے ان چار ہستیوں کو چادر اوڑھائی اور فرمایا: "اے اللہ! یہ میرے اہلِ بیتؑ ہیں اور میرے قریبی۔ ان سے رجس کو دور رکھ اور انھیں پاک رکھ جیسا پاک رکھنے کا حق ہے"۔ دوسری روایت میں تطہیراً کہنے کے بعد فرمایا: "میری جنگ ہے ان لوگوں سے جو ان سے لڑیں، اور میری صلح ہے ان سے جو صلح رکھیں، میں ان سے سلامتی کے ساتھ ہوں جو ان کے ساتھ سلامتی سے رہیں، اور میں ان کا دشمن ہوں جو ان سے دشمنی کریں"۔ ایک اور روایت میں ہے تین بار فرمایا: "اے اللہ یہ میرے اہلِ بیتؑ ہیں"۔

مشکوٰۃ المصابیح، تاریخ الخلفاء اور مسلم وغیرہ میں سعد بن ابی وقاص کی روایت دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ جناب امیرالمومنینؑ، حضرت زکیہ طاہرہ اور حسنینؑ علیہم السّلام پر اطلاق اہلِ بیتؑ کا ہوتا تھا یا جن کے نسبت جناب رسالت مآبؐ نے بیّن اور صاف لفظوں میں فرمایا تھا کہ: "خداوندا یہ میرے اہلِ بیتؑ ہیں"۔

اہلِ بیتؑ کی تخصیص کیوں شبہ کے حوالہ کی جاتی ہے

اہلِ بیتؑ کے مفہوم کے متعلق جو کچھ غلط اندازی کی گئی ہے اس میں زیادہ لغوی دلیل سے زور دیا جاتا ہے اور کبھی جب یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں خادمہ اور کنیز بھی داخل ہو جائیں گی۔ کیونکہ گھر میں رہنے والوں میں ان کا بھی شمار ہوگا۔ (جب کہ بہت سے اور شامل ہو سکتے ہیں) تو تخصیص شروع ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ ازواجِ رسولؐ اور تمام اہلِ ہاشم اور بنو عبدالمطلب کے لیے کہا گیا۔ اور پھر جب واقعہ نجران پر نظر جا پڑتی ہے تو مورخین کو بجز اس کے چارہ نہیں ہوتا کہ اہلِ بیت سے مراد متذکرہ صدر حضرات ہیں۔ تاریخِ اسلام کا جاننے والا مشکل سے اس میں مشتبہ رہ سکتا ہے کہ کیوں اس صریح آیت اور واقعہ تاریخی کے لیے لغت کی ضرورت ہوتی۔

حسینؑ کے متعلق روایتیں

اب وقت آگیا ہے کہ حسینؑ کے متعلق میں ان تمام روایتوں کو بیان کروں جن کے متعلق کسی زمانہ کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

راکبؑ اور مرکبؐ

ایک روز جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم حسینؑ کو اپنے دوش مبارک پر لیے ہوئے بیٹھے تھے کہ کسی نے کہا: "کیا اچھا مرکب ہے"۔ رسولؐ نے جواب دیا: "دیکھو راکب بھی کیسا اچھا ہے"۔

حسینؑ کو سنبھالنے کا حکم

اس کے علاوہ روایتیں ہیں کہ حسینؑ کو جناب رسالت مآبؐ شکم اقدس پر لٹائے رہتے تھے اور حسینؑ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ریش اقدس سے کھیلتے تھے۔ کسی روز حسنینؑ آپس میں کشتی لڑ رہے تھے جناب رسالت مآبؐ نے حضرت فاطمہؑ سے فرمایا کہ: "حسینؑ کو سنبھالو"۔

حسینؑ کے رونے سے رسولؐ متاذی

جناب رسالت مآبؐ حسینؑ کے رونے کی آواز سن کر جناب فاطمہؑ زہرا سے فرماتے تھے: "کیا تم نہیں جانتیں کہ حسینؑ کے رونے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے"۔

رسولؐ حسینؑ کو راستہ میں پاتے ہیں

یعلیٰ بن امیہ کہتے ہیں کہ ایک روز ہم جناب رسالت مآبؐ کے ہمراہ کسی جگہ ضیافت میں جا رہے تھے حسینؑ راستہ میں کھڑے تھے۔ انھیں دیکھ کر رسولؐ نے پکڑنا چاہا۔ حسینؑ دوڑے لیکن گرفتار ہو گئے۔ رسولؐ نے ایک ہاتھ پشت پر اور ایک ٹھوڑی پر رکھ کر پیار کر لیا۔ ضرور پھر حسینؑ بھولا قہقہہ لگا کر بھاگے ہوں گے۔

مجمع اصحاب میں حسینؑ کو پہچنواتے ہیں

حذیفۃ الیمان کی سند سے امالی میں صدوق نے نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک دن رسولؐ نے فرمایا:

"ایھا الناس! یہ حسینؑ پسر علیؑ بن ابی طالبؑ ہے اسے پہچانو قسم ہے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ حسینؑ کے دوست بہشت میں رہیں گے"۔ اس واقعہ کو شاعر نے نظم کیا ہے:

اخذ النبی ید الحسین وصنوہ — یوماً و قال و صحبہ فی مجمع
من ودنی یا قوم او ھذین او — ابویھما فی الخلد مسکنہ معی

یعنی: "ایک دن نبیؐ نے حسینؑ اور اس کے بھائی کا ہاتھ پکڑا اور صحابہ سے بڑے اجتماع میں فرمایا: اے لوگو! جو مجھ سے ان دونوں سے ان کے ماں باپ سے محبت رکھے گا اس کا ٹھکانا میرے ساتھ جنت میں ہوگا"۔

اس روایت میں ایک عام اعلان اور رسولؐ کا پہچنوانا توجہ کے قابل ہے۔

رسولؐ کا سجدہ اور حسینؑ

ایک دن جناب اقدس نبویؐ سجدہ میں تھے کہ حسینؑ پشت پر سوار ہو گئے۔ ایک یہودی حاضر تھا یہ دیکھ کر کہنے لگا:

ایک یہودی کا اعتراض

"آپ لڑکوں سے ایسی محبت کرتے ہیں جو ہمارا شیوہ نہیں ہے"۔ فرمایا: "اگر تم خدا اور رسولؐ پر ایمان لاتے تو تم بھی بچوں کو موجب رحمت و راحت سمجھتے"۔

ابو رافع اور حسینؑ

ایک مرتبہ ابو رافع اور حسینؑ مداحی (ایک کھیل جس میں لڑکے گڑھا کھودتے ہیں اور اس میں چھوٹے چھوٹے پتھر یکے بعد دیگرے رہا کرتے ہیں۔ اگر دوسرا پتھر پہلے سے لگ جاتا

ہے تو جس کا پتھر لگا ہے وہ بیٹے پر سوار ہوتا ہے) کھیلتے تھے۔ جب ابو رافع جیتتے تھے تو حسینؑ کہتے تھے: تو چاہتا ہے کہ اس کی پشت پر سوار ہو جسے رسولؐ اپنی پشت پر سوار کرتے ہیں۔ اور جب حسینؑ بازی لے جاتے اور ابو رافع کی پشت پر سوار ہونے کا قصد کرتے تو ابو رافع کہتے تھے: یا ابا عبد اللہ تم نے ہمیں سوار ہونے نہ دیا۔ ہم بھی نہ سوار ہونے دیں گے۔ اب حسینؑ کہتے تھے: کیا اس پر راضی نہیں ہے کہ اسے اپنی پشت پر سوار کرے جسے رسولؐ اپنی پشت پر اٹھاتے ہیں۔ بے چارا ابو رافع معقول ہو کر چڑھی دیا کرتا تھا۔

کشتی یا وصلی

ایک دن حسنینؑ نے رسولؐ کی خدمت میں کشتی لڑنی چاہی اور رسولؐ کو پنچ بنانا چاہا۔ مگر رسولؐ نے فرمایا: کشتی نہ لڑو بلکہ وصلیاں لکھ کر لاؤ۔ جس کا خط اچھا ہوگا وہی جیتا۔ بھولے بھولے بچے اپنی اپنی تعریف کے حوصلہ میں وصلیاں لکھ کر لائے۔ اور رسولؐ نے دونوں کی سرگرمی دیکھ کر اس خیال سے کہ کسی کی دل شکنی نہ ہو فرمایا: "میں اُمی ہوں۔ بہتر ہوگا کہ وصلیاں اپنے باپ کو دکھاؤ"۔ بچے وصلیاں لیے ہوئے علیؑ بن ابی طالب کے پاس آئے اور قضیہ معلوم ہونے انھوں نے فرمایا: "بہتر ہوگا کہ تم اپنی ماں کو دکھاؤ"۔ بچے اب اپنی ماں کے پاس آئے، اور جب زکیہؑ کو معلوم ہوا کہ نانا اور باپ نے فیصلہ سے کسی کو رنجیدہ نہیں کیا تو نہایت خوب ترکیب نکالی اور فرمایا: "میرے گلے میں ہار ہے، میں اس کے دانے زمین پر پھینکتی ہوں جو زیادہ دانے چنے گا اسی نے بازی جیتی"۔ موتی بکھرائے گئے اور حسنِ اتفاق سے دونوں صاحبزادوں نے برابر دانے چنے اور کسی کو ناخوشی کا موقع نہ ملا۔

حسینؑ کا تتلانا اور تکبیر کا زبان پر جاری کرایا جانا

رسولؐ ایک مرتبہ نماز کے لیے کھڑے ہوئے اور تکبیر کہی۔ حسینؑ بھی کھڑے ہو گئے مگر بوجہ کم سنی تکبیر زبان سے صاف نہ ادا ہوتی تھی۔ رسولؐ نے سات مرتبہ اعادہ فرمایا اور اب حسینؑ کی زبان پر رواں ہو گئی۔

رسولؐ تلاش کرنے گئے

ایک مرتبہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب فاطمہؑ زہرا کے دولت سرا پر تشریف لائے۔ یہاں حسینؑ کو نہ پایا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ بھوک کی وجہ سے باہر کھیلنے چلے گئے ہیں۔ اس وقت ابو دردا آ گئے اور ان سے معلوم ہوا کہ محلہ بنی جذعان میں ہیں۔ رسولؐ تشریف لے گئے اور لے آئے۔

حسنینؑ کو نانا کا کاندھا زیادہ محبوب تھا

ایسا ہی ایک موقع حدیقہ بنی نجار میں ہوا تھا۔ اس وقت حضور اقدس نبیؐ کے ہمراہ جناب امیر المومنینؑ اور اصحاب تھے۔ رسولؐ نے کاندھے پر بٹھا لیا۔ علیؑ اور اصحاب نے اپنی اپنی گود میں لینا چاہا۔ مگر صاحبزادوں نے کہا: "نانا ہمیں آپ کا کاندھا اور لوگوں سے زیادہ محبوب ہے"۔

حسینؑ دحیہ کلبی سے بے تکلف تھے

حسینؑ دحیہ کلبی سے بہت بے تکلف تھے۔ اور جب یہ اپنے تجارتی سفر سے واپس آتے تھے تو حسینؑ کے لیے تحائف لیتے آتے تھے۔ اور حسینؑ ان کی گود میں بیٹھ کر سب کا تعلیقہ کر لیتے تھے۔

گھوڑے کی سواری سکھائی جاتی ہے

ایک مرتبہ حسینؑ گھوڑے پر سوار ہو رہے تھے کہ ابن عباسؓ نے رکاب تھامی۔ کسی نے اعتراض کیا۔ اعتراض حسینؑ کی خورد سالی اور ابن عباسؓ کے احترام کی بنا پر تھا۔ ابن عباسؓ نے جواب دیا: "یہ فرزندانِ رسولؐ ہیں اور جو نعمت خدا نے مجھے عطا فرمائی ہے اس کی شایان ہے کہ میں رکاب پر ہاتھ رکھوں اور انھیں اچھی طرح گھوڑے پر بیٹھنا بتاؤں"۔

اس بچہ سے رسولؐ کی محبت جسے حسینؑ سے محبت تھی

حسینؑ سے رسولؐ کی محبت کی روایتوں میں اس سے زیادہ کونسی روایت تلاش کی جاسکتی ہے جو نور العین ترجمہ خصائص الحسینؑ میں ملتی ہے کہ: "ایک دن ایک لڑکے کو حضرتؐ نے بازار میں دیکھا، پاس بیٹھ گئے اور اسے اٹھالیا اور اس بچہ سے ملاطفت فرماتے تھے۔ ایک شخص نے سبب اس کا دریافت کیا۔ فرمایا کہ: "یہ بچہ میرے فرزند حسینؑ کو دوست رکھتا ہے۔ کیونکہ میں نے دیکھا جبکہ خاک قدم حسینؑ کو لے کر اپنے منہ پر ملتا تھا"۔

حسینؑ کی علالت، نذر اور ہل اتیٰ

ایک مرتبہ حسینؑ کچھ علیل ہوگئے اور نذر کی گئی کہ اگر خداوند تعالیٰ نے صحت عطا فرمائی تو تین روزے رکھے جائیں گے۔ حسینؑ صحت یاب ہوئے اور روزے رکھنے کے لیے تین صاع جو قرض لیا گیا۔ روزہ رکھا گیا۔ اور افطار کے وقت ایک مسکین آگیا۔ جناب امیرؑ نے سنا، اور حضرت فاطمہؑ کو مخاطب فرماکر ارشاد کیا کہ: "ایک سخی رسیدہ اندوہگین ہے، اور ہم سے گرسنگی کا شکوہ کرتا ہے"۔ (دیوان جناب امیرؑ)

اہلِ بیتؑ اور مسکین و یتیم و اسیر

طاہرہؑ نے جواب دیا کہ: "میں اسے کھانا دوں گی۔ مجھے ساعت تنگی کی پرواہ نہیں ہے اور بھوکے کو سیر کرنے کی آرزو رکھتی ہوں"۔ آج کا حصہ کھانا دے دیا گیا، اور بچے تک بھوکے رہے۔ دوسرا دن ہوا، پھر روزہ رکھا گیا۔ افطار کا وقت آیا، اور آج یتیم نے دروازہ پر صدا دی، اور آج پھر جناب امیرؑ نے فرمایا: "اے سید کریمؐ کی دختر! اللہ ہمارے پاس یتیم کو لایا ہے، جو شخص آج رحم کرے گا وہ رحیم ہے"۔ سیدہؑ نے فرمایا کہ: "میں یتیم کو کھانا دوں گی حالانکہ میرے بچوں نے بھوکے شام کی ہے"۔ تیسرا دن ہوا۔ یہ نذر کرنے والے جو استقلال کا خزانہ تھے، آج بھی روزہ سے تھے۔ کس طرح شام کی ہوگی، اور کس قدر ضرورت ہوگی کہ یہ کچھ کھاتے لیکن ہونے والا یہ تھا کہ ان کا مخلوقاتِ الٰہی کے ساتھ رحم ذاتی تکلیف پر غالب آئے۔ آج بقیہ تیسرے حصہ کی روٹیاں افطار کے لیے تیار کی گئی تھیں، لیکن آج ایک اسیر کو آواز دی تھی۔ تیسرے دن کے بھوکوں نے سنا، اور رحمۃ للعالمینؐ کے وصی نے کہا: "اے فاطمہؑ اے پیغمبر ستودہ کی بیٹی بے شک آراستہ کیا ہے خدا نے اس (قیدی) کو گردن نازک سے۔ زنجیر میں بندھا ہوا اور طوق میں مقید، ہم سے اپنی بڑھی ہوئی بھوک کا شکوہ کرتا ہے۔ اسے بغیر احسان شوم کے کھلاؤ۔ یہاں تک کہ تم جزا دی جاؤ اس چیز سے جس کی نہایت نہ ہو"۔ جناب فاطمہؑ نے جواب دیا: "جو کچھ آپ لائے تھے اس سے بجز ایک صاع کے کچھ باقی نہیں ہے اور میری ہتھیلی ذراع کی نوک سے گھس گئی ہے۔ خدا کی قسم میرے دونوں بچے بھوکے ہیں۔ ان کا باپ خیرات سے نیکی کرنے والا ہے"۔

اس کے بعد اہل بیت نبوتؐ بلکہ ان کی مشہور خادمہ فضہؓ نے بھی اپنا اپنا حصہ راہِ خدا میں بخش دیا۔

بالاختیار تین دن بھوکے رہے

غالباً یہ پہلا تاریخی دن تھا جس میں اہل بیتؑ خصوصاً حسنینؑ تین دن تک بھوکے رہے۔ اگرچہ یہ بالاختیار تھا۔ ہم لوگوں کے لیے یہ اس قدر واقعہ ہے جس قدر کا فاقہ اور قلم کی زبان اندازہ کرا سکتی ہے لیکن ان نفوسِ اقدس کے لیے یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس کا یہ خود اندازہ کر رہے تھے۔ بلکہ واقعہ ان کا اور یہ واقعہ کا اندازہ کر رہے تھے۔ ہم کو واقعہ سے ان کا اندازہ کرنا چاہیے۔ سن لینا اور ذرا سا ان کے اس عالم برداشت پر متاسف ہوجانا اور ہے اور ایسا دل رکھنا جو دوسروں کو اپنے اُوپر ایسی سخت حالتوں میں مقدم رکھے اور ہے۔ جود کو ان پر ناز تھا، رحم و کرم کا ان سے اِفتخار تھا۔ یہ اس قابل تھے کہ سورہ ھل اتیٰ سے ممتاز کیے جاتے۔

قبیلہ بنو ضلیع کی گوشمالی

اسی سنہ میں رسولؐ نے قبیلہ بنو ضلیع کی گوشمالی کے لیے جنھوں نے دحیہ کلبی کا مال لوٹ لیا تھا زید بن حارثہ (واقعہ بنو ضلیع ۶ھ کے قبل کا ہے، یا اگر ۶ھ کا ہے تو بجائے زید بن حارثہ کے کوئی دوسرا افسر بھیجا گیا) کو روانہ کیا۔ زید کے سپاہیوں نے کچھ بنو ضیب کو بھی قتل کیا جو مسلمان تھے۔ بنو ضیب نے رسولؐ کو خبر دی اور خواہش کی کہ ہمارے اسیر رہا کیے جاویں۔ جناب رسالت مآبؐ نے بقول ابن خلدون: "علیؑ بن ابی طالب کو اُونٹ پر سوار کر کے ان کے ہمراہ روانہ کیا، اور تصدیق کے لیے اپنی تلوار مرحمت فرمائی"۔ (ابن خلدون)

۸ھ علیؑ یمن بھیجے گئے

اسی سال جناب رسالت مآبؐ نے حضرت امیر المومنینؑ کو تین سو سواروں کے ساتھ یمن کی طرف روانہ کیا۔ ان کے لیے ایک نشان مرتب فرمایا۔

رسولؐ اپنے ہاتھ سے آراستہ کرتے ہیں

سر پر اپنے دست مبارک سے عمامہ باندھا۔ اس کا ایک سرا مونڈھے کی طرف اور دوسرا پشت کی جانب رکھا گیا۔

اظہارِ تاسف جدائی پر

اور فرمایا: "اے علیؑ میں تمھیں بھیجتا ہوں مگر تمھاری جدائی پر افسوس کرتا ہوں"۔ علیؑ پر رسولؐ کی ایسی ہی توجہ کی حدیث مشکوٰۃ المصابیح سے ملے گی کہ: روایت ہے ام عطیہ سے کہ کہا: بھیجا رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر کہ ان میں علیؑ تھے۔

رسولؐ کی ایک دعا: کہا ام عطیہ نے: پس سنا میں نے آنحضرتؐ سے اس حالت میں کہ اٹھانے والے تھے دونوں ہاتھ اپنے دعا کے لیے دعا فرماتے تھے یعنی دقت پہنچے ان کے کے یا نزدیک توقع آنے ان کے کے یا الٰہی نہ مار مجھ کو یہاں تک کہ دکھاوے تو مجھ کو علیؑ کو سلامتی سے پھر کر آویں۔ نقل کی یہ ترمذی نے"۔ یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ علیؑ اس اہتمام سے بقول ابن خلدون خالد بن ولید کے بھیجے جانے کے بعد روانہ کیے جا رہے تھے۔

علیؑ کی دعوت سے قبیلہ ہمدان اسلام قبول کرتا ہے

یمن میں علیؑ کی دعوتِ اسلام کی کامیابی کی اطلاع پر رسولؐ نے سجدۂ شکر کیا اور تین مرتبہ "السلام علیٰ ھمدان" فرمایا۔ یمن کا قیام اور انتظام اس کا مقدمہ ہوا کہ جناب رسالت مآبؐ اقضاکم علیؑ فرماتے۔

علیؑ رسولؐ کے اخلاق و شمائل کی شرح کرتے ہیں

شواہد النبوۃ ملا جامی کی یہ روایت دلچسپ غور کے قابل ہے کہ:

"چوں حضرت امیر بشرح اخلاق و شمائل رسول صلی اللہ علیہ وسلم مشغول شد کعب الاحبار تبسم کرد۔ حضرت امیر سبب تبسم پرسید۔ کعب گفت: بسبب این صفات کہ ما در کتب قدیمہ خود چنیں یافتہ ایم پس تصدیق کرد و ایمان آورد"۔ (قرۃ العیون وغیرہ)۔

یعنی: جب حضرت امیرؑ نے رسولِ خدا کے اخلاق و عادات کی شرح کرنی شروع کی تو کعب الاحبار مسکرائے۔ حضرتؑ نے مسکرانے کی وجہ پوچھی۔ کعب بولے: ان اوصاف کی وجہ سے کہ ہم نے خود اپنی پرانی کتابوں میں ان کو پایا ہے۔ پھر تصدیق کی اور ایمان لے آئے۔

بریدہ رسولؐ سے علیؑ کی شکایت کرتے ہیں

واقعہ یمن کے متعلق ایک بات اور ذکر کی گئی ہے جس سے مورخین نے بعض مفید مواقع پر پناہ لی ہے اور وہ یہ ہے کہ جملہ اسباب خمس کے ایک کنیز تھی جسے جناب امیرؑ نے اپنے ذمہ رکھا۔ بریدہ معترض ہوا اور اس نے خالد بن ولید سے بھی کہا اگرچہ جناب امیرؑ نے اسے جواب دیا کہ وہ مال خمس میں تھی لیکن بریدہ کو تسکین نہ ہوئی اور جناب رسالت مآبؐ کی خدمت میں شکایت کی۔

شکایت سن کر شکایت کرنے والے پر رسولؐ کا غصہ

بقول مورخین رسولؐ نے فرمایا: "تو ان کو دشمن نہ رکھ۔ اگر تو ان سے دوستی رکھتا ہے تو ان کی دوستی میں زیادہ کر۔ اے بریدہ! اس کا حصہ خمس میں سے زیادہ اس کنیز سے تھا"۔ بریدہ کی زبانی یہ بھی روایت ہے کہ: "شکایت پر حضرت کے رخساروں کا رنگ چمک اٹھا یعنی غضب سے اور فرمایا: "علی کی شان میں بدگمانی نہ کر، اس لیے کہ میں ان سے ہوں، اور وہ مجھ سے ہیں۔ اور وہی تمھارے مولا یعنی معظم و مکرم اور رفیق ہیں۔ جس کسی کا میں مولا ہوں، اس کے علی مولا ہیں"۔ یہ سن کر بریدہؓ کے نزدیک کوئی صاحب میں سے نہ تھا کہ حضرت علیؑ سے زیادہ دوست ہو"۔

حجۃ الوداع کی جماعت علیؑ کو خبر بھیجی گئی

زمانہ حج قریب پہنچ گیا تھا۔ رسولؐ نے اپنے ارادۂ حج کا اعلان فرمایا، اور علیؑ کو جو یمن میں تھے خبر دی گئی۔ جہاں تک روایتیں بتا سکتی ہیں وہ یہ ہے کہ اس مرتبہ رسولؐ کے ہمراہ حج کو جانے والی جماعت ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ علیؑ پہنچ گئے، اور رسولؐ کے پوچھنے پر کہ تم نے کیا نیت کی ہے، فرمایا: جو آپ نے نیت کی ہے۔ ارکان حج بجالائے گئے۔ اونٹ نحر کیے گئے، اور شور ہا اس کا پیغمبر خدا نے علیؑ مرتضیٰ کے ساتھ تناول فرمایا۔ اور عرفات میں ایک طویل خطبہ پڑھا جس میں فرمایا:

عرفات کا خطبہ

ایہا الناس! سنو! بلاشبہ میں آئندہ اس سال کے بعد تم سے اس مقام پر ملنے کا یقین نہیں کرسکتا ہوں۔ اس کے بعد قتل و غارت سے منع کیا۔ امانت داری میں ایمان داری کی تاکید کی۔

جاہلیت کا خون وضع کیا۔ سود کی ممانعت کی اور خود سے عباس بن عبد المطلب کا سود اور ربیعہ بن الحرث بن عبد المطلب کا خون معاف کیا۔ عورت اور مرد کے حقوق کو واضح فرمایا۔ کسی کا مال لینے اور نفسوں پر ظلم کرنے سے ممانعت فرمائی اور ارشاد کیا کہ "مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں"۔ (ابن خلدون وغیرہ)

غدیرِ خم میں قیام

اثناء مراجعت میں غدیرِ خم پہنچے۔ موقع تھا کہ لوگ اپنے گھروں کو واپس جاتے۔ لیکن رسولؐ نے سب کو ٹھہرنے کا حکم دیا۔ میدان صاف ہونے لگا۔ پالانوں کا منبر بننے لگا اور ہر شخص جو مناسکِ حج اور دیگر امورات میں جنابِ رسالتمآبؐ کا خطبہ اور نصیحتیں سن چکا تھا متحیر ہوا کہ اب یہاں کیا ہونے والا ہے۔ رسولؐ اس مقامی منبر پر تشریف لے گئے۔ وہ تمام مجمع جو ساتھ ساتھ آیا تھا اور جس کا شوق زیارتِ رسولؐ کے تاسّف اظہار سے اور بڑھ گیا تھا کہ: "اس سال کے بعد تم سے اس مقام پر ملنے کا یقین نہیں کر سکتا"۔ دھڑکتے ہوئے دل، اٹھی ہوئی نظریں اور کھلے ہوئے کانوں سے ایک ایک لفظ کو جو رسولؐ کی زبانِ اقدس پر جاری ہوتا تھا بڑی پیاس کے عالم میں پیتا جاتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگرچہ عربوں کا مجمع بہت خاموش مجمع نہیں ہوا کرتا لیکن اس موقع پر بجز خاموشی کے کوئی زبان نہ بولتی ہوگی اور رسولِ خداؐ کے الفاظ ہوں گے جو میدان میں پھیلتے اور گونجتے ہوں گے اور لوگ اپنے حافظہ میں ذخیرہ کرتے جاتے ہوں گے۔ (دیکھئے: مشکوٰۃ المصابیح)

رسولؐ اولیٰ بالمؤمنین ہونے کا اقرار لیتے ہیں

رسولؐ کے پہلے ہی استفہام پر لوگوں کو عجب ہوا ہوگا۔ وہ اپنے دلوں میں کہہ رہے ہوں گے کہ رسولؐ کو ہماری طرف سے شبہ کی کیا وجہ ہوئی جو ہم سے پوچھتے ہیں کہ: "الستم تعلمون انی اولیٰ بالمؤمنین من انفسہم"۔ (کیا تم نہیں جانتے کہ میں بہ نسبت مومنین کے نفس کے ان پر اولیٰ ہوں)

اثبات میں جواب

اور تاکید یہ ہے کہ اس سوال کی تین مرتبہ تکرار کی۔ اور مجمع نے جواب دیا کہ: "ہاں آپ اولیٰ بالمؤمنین من انفسہم ہیں"۔

رسولؐ کے سوال کی غرض اس کی بلندی تھی جو لڑکپن سے انھیں ہاتھوں پر تھا

سوال کا مطلب اب کھلا، جب رسولؐ علیؑ کی طرف پھرے۔ ان کی بغلوں میں ہاتھ دیا، اور اٹھایا۔ یہاں تک کہ کل آنکھوں نے وہ دیکھنا چاہتیں یا نہ چاہتیں یہ دیکھا کہ وہ بچہ جو روزِ ولادت سے انھیں ہاتھوں پر تھا آج پھر دستِ اقدس پر بلند ہوا ہے، اور ان کل کانوں نے وہ سننا چاہتے یا نہ چاہتے، سنا کہ: پرمعنی دعاء: اللھم من کنت مولاہ فعلی مولاہ (خداوندا جس کا میں مولا ہوں پس اس کا علیؑ بھی مولا ہے) اللھم وال من والاہ و عاد من عاداہ و انصر من نصرہ واخذل من خذلہ۔ (خداوندا دوست رکھ اُسے جو اسے دوست رکھے اور دشمن رکھ اُسے جو اسے دشمن رکھے، مدد کر اُس کی جو اسے مدد دے اور مخذول کر اسے جو علیؑ کو چھوڑ دے) وادر الحق حیث ما دار علی (اور پھیر حق کو ساتھ علیؑ کے جس طرف وہ پھرے)

مولیٰ علیؑ کی وداعی تقریر اور خاتم النبیینؐ

تاریخ اپنے کو دہرا رہی تھی۔ موسیٰؑ نے اپنی آخری وقت میں مقام سیشم کو وداعی تقریر اور اپنی ہدایت کی تصدیق وغیرہ کے لیے چنا تھا

جس کے ایک طرف کوہ ایبل اور دوسری طرف کوہ گریزیم تھا۔ اسرائیل کے چھ چھ قبیلہ ایک ایک پہر کھڑے تھے اور اپنے ہادیؑ کے قول کے جواب میں آمین کہتے تھے۔ ہمارے ہادیؑ نے یہ گوارا نہ فرمایا کہ اپنی زندگی میں مسلمانوں کے مجمع کو دو حصوں میں تقسیم کرتے جو گویا جوڑا اور اسرائیل کی حکومتوں کی مشین کوئی ہوتی۔ صرف تمہارا سُوانح تھے جو فرمارہے تھے اور خم کی گھاٹیوں میں مسلمانوں کا ایک جسم تھا جو سخت دھوپ میں اپنے ہادیؑ کے ادنیٰ ہونے کا اقرار کر رہا تھا۔ اور اپنے رسولؐ، متقی اور جامع قوم کی زبان سے نہ صرف یہ سن رہا تھا کہ: "جس کا میں مولیٰ ہوں اس کے علیؑ مولا ہیں" بلکہ:

مرکز سے ہوشیار کر رہے تھے

اس کے علاوہ دوسرے لفظوں میں ایک مرکز پہچان رہا تھا کہ: میں تم میں دو امرِ عظیم چھوڑے جاتا ہوں ایک قرآن (مجموعۂ قوانین) دوسرے میرے اہلِ بیت (عامل) اور یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے (یا یہ کہ اگر تم ان سے تمسک کروگے تو گمراہ نہ ہوگے) توریت گنتی باب ۲۷ کی ۲۲ آیت میں تم پڑھوگے کہ جس وقت حکمِ خدا سے حضرت موسیٰؑ نے یوشع بن نون کو اپنی امت کا پیشوا مقرر کیا (ہارونؑ کی رحلت کے بعد) تو صرف یہ کیا تھا کہ یشوع کو لے کے الیعزر کاہن اور ساری جماعت کے سامنے کھڑا رکھا اور اپنے ہاتھ اس پر رکھے اور اسے جیسا خداوند نے اس کو فرمایا تھا وصیت کی۔ تاریخِ اسلام رسولؐ کے وصی کی تقرری کے وقت حالات کی تفصیل بیان کرتی ہے، مگر پھر بھی مسلمانوں کو واقعہ اور تفصیل کے سامنے عذر کی ضرورت ہے۔

ایک زمانہ کے بعد لوگوں نے شہادت دی

یہ واقعہ ایسا صاف اور صریح تھا کہ تاریخ الخلفا اور مواعق محرقہ کے موافق آئندہ زمانہ میں علیؑ کے سوال کرنے پر حاضر الوقت تیس صحابیوں نے گواہی دی، یا شواہد النبوۃ کے موافق دس انصار نے تائید کی۔

خیمہ نصب کیا گیا، مبارکبادیں دی گئیں

صاحبِ روضۃ الصفا کوئی عجب خیزبات نہیں کہہ رہا ہے کہ اس واقعہ کے بعد خیمہ نصب کیا گیا لوگوں نے مبارکبادیں دینا شروع کیں۔ جس میں سب سے ممتاز اور یادگار تہنیت حضرت عمر کی تھی۔ بقول صاحبِ مناہج: "ملاقات کی حضرت امیر المومنین علیؑ سے "امیر المومنین" عمر نے بعد حکایت کی اور کہا گوارا ہو اور شاد رہو اے ابوطالبؑ کے فرزند کہ صبح کی تم نے اور شام کی اور ہوئے تم مولا تمام مومنین کے کیا مزہ کیا نورت"۔ روایت کیا ہے اس حدیث کے تئیں احمد نے براء بن عازب سے اور زید بن ارقم سے کذا فی المشکوٰۃ۔

آیہ اکملت لکم دینکم اسی دن نازل ہوا

یہی دن تھا جس میں مورخین مثل طبری و تاریخ الاسلام مولوی عباسی صاحب قائل ہیں کہ آیہ: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (۵: ۳) نازل ہوا۔ کیونکہ: یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ ؕ (۵: ۶۷) کی ایسے سخت موقع پر تعمیل کی گئی تھی۔

آیت کی تسکین دہی

وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (اللہ تجھے لوگوں سے بچائے گا) نہایت توجہ کے قابل فقرہ ہے۔ جس سے اس پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ رسولؐ نے جو کچھ آج کیا اس کا کرنا بہت مخدوش تھا۔

واقعہ غدیر پر ہم کوئی مزید بحث نہیں کرتے جسے ہم "الکرار" اور "امامت تاریخی حیثیت سے" میں کافی حد تک کر چکے ہیں۔ وہ چہ واقعہ غدیر میں رسولؐ کے صاف اور صریح طرز عمل اور لوگوں کے مسرورانہ مبارکبادوں کو ایسا واقعہ نہیں سمجھتا جسے عالم میں تاریخ اپنی ضرورتوں کے وقت دہرایا کرتی یا جو اس موقع پر رسولؐ کے ایسے بالاعلان نمائش کو علیؑ کے متعلق رسولؐ کے اقوال اور افعال کا نشو نہیں دیکھ سکتا۔ اس کے لیے کوئی بحث اور مثال بکار آمد نہیں ہو سکتی۔ میں اپنا خیال رائٹ آنریبل سید امیر علی صاحب کی "اسپرٹ آف اسلام" سے پیش کرتا ہوں اور بس۔ ممدوح فرماتے ہیں: "یہ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ رسولؐ نے ولیعہد نامزد نہیں کیا۔ لیکن یہ واقعات کا ایک غلط توہم ہے۔ کیونکہ اس کی کافی شہادت ہے کہ رسولؐ نے اکثر ولیعہدی کے لیے علیؑ کی طرف اشارہ کیا۔ خصوصاً حجۃ الوداع کی واپسی کے موقع پر۔ اس جگہ جسے "خم" کہتے ہیں ٹھہر گئے اور مجمع میں جو الفاظ فرمائے اس سے ان کے ارادہ ولیعہدی میں شبہ کی گنجائش نہیں رہتی"۔

تاریخ اسلام کے تاسف کا موقع

تاریخ اسلام کو اس کا افسوس ہونا چاہیے کہ ایک ایسے مسئلہ کے متعلق جسے ہمارے محققین نے واضح سے زیادہ صاف کر دیا تھا اور نہ صرف قول بلکہ فعل سے اس کا ترجمہ فرما دیا تھا زمانہ کو اس کی ضرورت ہوئی کہ اختلاف کیا جاتا۔

تبوک اور غدیر میں اعلان اور ادائے رسم کا تھوڑا فرق تھا

یہ ہم پیشتر کہہ چکے ہیں کہ واقعہ عقبہ بعض مورخین کے موافق حجۃ الوداع کے بعد ہوا۔ اگر واقعہ تبوک میں جناب امیرؑ تھوڑے دنوں کے لیے قائم مقام بنائے گئے تھے اور مشہور حدیث سے آئندہ کی ولیعہدی پر روشنی ڈالی تھی تو واقعہ غدیر میں ولیعہدی کے رسومات عملاً برتے گئے تھے۔ یہ باتیں ان لوگوں کے لیے خوش آئند نہ ہو سکتی تھیں جو اسلام لانے کو اس شرط سے مشروط کرنا چاہتے تھے کہ "تو پھر ہمیں اپنے بعد اپنا خلیفہ بناؤ گے؟"

واقعہ عقبہ کی ملتوی وجہ بیان کی گئی

یا وہ جنھوں نے موٹے موٹے لفظوں میں یہ ظاہر تو نہیں کیا لیکن امارت کے لیے سرد آہیں بسینہ میں رہ نہ سکیں۔ اب ان کے لیے اس سے زیادہ کونسی بڑی چوٹ ہو سکتی تھی کہ وہ ذوالعشیرہ کے بالاعلان خلیفہ کی رسمی ولیعہدی دیکھتے اور خواہ مخواہ چہرے پر بشاشت اور خوشی وقتی کے آثار ظاہر کرنے پڑتے۔ اگرچہ دل اینٹھتا اور بیٹھا جاتا تھا۔

واقعہ عقبہ میں رسولؐ پر حملہ کی غرض

بہت غور سے اس کا اندازہ کرو کہ واقعہ عقبہ ظاہری دشمنوں کا کام نہ تھا کیونکہ وہ تو خود سے پیچھے رہ گئے تھے اور تبوک یا حجۃ الوداع ہی کے بعد ان کا یہ مصمم ارادہ کہ رسولؐ کو شہید کریں اور کیا وجہ عداوت سمجھا سکتا ہے بجز اس کے کہ جب ہماری امیدیں خاک میں مل گئیں تو ہم اپنی حسرت کا انتقام کیوں نہ لیں۔ اور پھر آئندہ کی فکر یں کریں۔

آئندہ کے متعلق انعکاس

تم یہ بھی کہ چکے ہو کہ منافقین کا نام چھپ جانا محال تھا۔ اب اس کے بعد جو واقعات بیان ہوں گے ان کی طبیعت تمہیں مخالفت کے اور روئی شدید بہتے ہوئے دھاروں کا حال بتائیں گے اور تمہیں بہت سے اگلے پچھلے واقعات کیسے ہی چھپائے ہوئے یا کیسے ہی مختلط لفظوں میں کیوں نہ بیان کیے گئے ہوں یا کسی روشنی میں کیوں نہ معترضین نے پیش کیے ہوں سمجھ میں آجائیں گے۔ تم آدمی پہچانو گے۔ تم لوگوں کے متعلق رسولؐ کا خیال سمجھو گے اور تمہیں اس وقت اخلاص کا درجہ اور مقدار سمجھنے کا تناسب مل جائے گا۔ واقعات گزشتہ تمہارے مددگار ہوں گے۔ تمہارے سوچتے ہیں مواق مرقد کی یہ روایت بھی معین ہوگی جو ابوسعید خدری سے مذکور ہے کہ:

"منافق را بہ این شناختم کہ امیر المومنین علیؑ را دشمن میداشت"۔

یعنی ہم میں منافق کو اس سے پہچانتا کہ وہ امیرالمومنین علیؑ سے دشمنی رکھتا تھا۔

حجۃ الوداع کے بعد ہادی کی حیات

ہادیٔ عالم واقعہ غدیر کے بعد بہت دنوں تک اہلِ عالم کے لیے زندہ نہ رہا۔ زیادہ سے زیادہ مدت تراسی دن اور کم سے کم ستر دن ہیں۔

دروازوں کے بند کرنے کا حکم علیؑ کو مستثنیٰ کرکے

انھیں دنوں میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حکم دیا کہ جن لوگوں کے دروازے مسجد کی طرف ہیں وہ بند کرلیں۔ اس کے بعد بقول روضۃ الصفا:

"الا خانہ علی، فرمود کہ: ما از صحبتِ او گریز نیست و او را از صحبتِ من"۔

"سوائے علیؑ کے گھر کے۔ فرمایا کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا"۔

بقول مناقب مرتضوی: "یہ امر صحابہ کو شاق گزرا"۔ اگرچہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا تھا کہ:

"میں نے بحکم خدا کہا ہے"۔

حضرت عمر کی درخواست شدت سے نامنظور کی گئی

مظاہر حق ترجمہ مشکوٰۃ المصابیح میں ہے کہ: "عمر نے درخواست کی کہ اپنی دیوار میں ایک روزن چھوڑ دیں تا کہ دیکھ لیا کریں آنحضرت کو اس وقت نکل کر آویں مسجد میں"۔ پس فرمایا آنحضرت نے کہ:

"نہ چھوڑیں اگرچہ مقدار ناک کے بھی ہو"۔

اسی کتاب میں ہے کہ: "پوچھے گئے ابن عمر کہ کیا کہتے ہو بیچ حق عثمان اور علیؑ کے؟ پس بیان کیا یہ حدیث بعد اس کے کہا مت پوچھ حال علیؑ کا اور قیاس نہ کرو کسی کو ان پر بند کیے دروازے سب کے سوا دروازہ ان کے"۔

بعض احادیث

علیؑ کے لیے اس امتیاز کا بھی ہونا تاریخِ اسلام کے جاننے والے کے لیے عجب خیز نہ ہوگا اور اگر فنِ حدیث میں دل چسپی ہے تو یہ احادیث مدد دیں گی کہ: "انا مدینۃ العلم وعلی بابہا"۔ یا "انا دار الحکمۃ وعلی بابہا"۔ (میں شہر ہوں علم کا یا گھر ہوں حکمت کا اور علیؑ اس کے دروازہ ہیں)

یا "لا یحل لاحد ان یجنب فی ھذا المسجد غیری و غیرک" (حلال نہیں ہے کہ کوئی حالت جنب میں ہو اس مسجد میں سوائے میرے اور تیرے) یا "علی باب حطۃ من دخل منہ کان مومنا و من خرج منہ کان کافرا"۔ (علی باب مغفرت اور حطہ ذنب ہیں جو کوئی اس دروازہ سے داخل ہوا اور اس کی متابعت کی وہ مومن ہے اور جو شخص کہ اس سے باہر نکل گیا اور پیٹھ پھیری وہ کافر ہے)۔ (صواعق محرقہ)

پر معنی استعارہ

اس سے معلوم ہو گا کہ اس کے لیے مسجد کا دروازہ بند نہیں کیا جاسکتا تھا جو پر معنی استعاروں میں دروازہ کہا گیا ہے۔ اب دوسرا سوال یہ باقی ہے کہ پھر کیوں لوگ ایسے دروازے سے جہاں سے رسولؐ کی نقل و حرکت دیکھ سکتے تھے اور پاس پہنچ جاتے تھے اس سختی سے روکے گئے درآنحالیکہ ایک سوراخ کی اجازت مانگنے والے بعض مورخین کے نزدیک اتابک اعظم سے کم نہ تھے۔

بہت سی رائے بہت سے قرآن مہیا کرے

کم سے کم ایسے شخص کو جس کے متعلق مظاہر حق میں ابن عساکر سے علیؑ کی زبانی کہلوایا گیا ہے کہ:
"قرآن ایک رائے عمر کی رائے میں سے ہے"۔ یہ امتیاز دینا چاہیے تھا کہ ان کا مسجد کی طرف والا دروازہ کھلا رہنے دیا جاتا۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ انھوں نے ایسی التجا کی تھی۔ اس کے برخلاف بغیر کسی ایسی التجا کے اس کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا گیا جسے بیشتر امتیاز دیے گئے تھے۔

رسولؐ پوچھیں گے کہ تم نے علیؑ کے ساتھ کیسا سلوک کیا

اور جس کے متعلق مرض موت میں ایک مجمع کے سامنے ہاتھ پکڑ کر بقول صواعق محرقہ فرمایا تھا کہ:

"ھذا علی مع القرآن و القرآن مع علی لا یفترقان حتی یردا علی الحوض فاسئلھما کیف خلفتم فیھما"۔

(یہ علیؑ قرآن کے ساتھ اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے۔ یہ دونوں آپس میں جدا نہ ہوں گے جب تک میرے پاس حوض کوثر پر وارد نہ ہوں لیں پوچھوں گا کہ میرے بعد تم نے ان سے کیسا سلوک کیا)

میں اس دوسرے سوال کا جواب مناسب وقت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

ہادی کی علالت

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تپ اور درد سر میں مبتلا ہو گئے۔ اب موقع تھا کہ دوسرے وزیر اعظم جنھوں نے ہجرت میں مشہور اونٹ مشہور قیمت پر پیش کش کیے تھے جن پر غار کی مصاحبت میں مشہور کیفیت طاری تھی اور جنھیں رات کو سانپ نے کاٹا اور صبح تک پیالے اس کے زہر کا اثر ہوتا درد بڑھتا رہا۔ جنھوں نے سیراقہ کا معمول سے زیادہ ہیبت سے خیر مقدم کیا۔ رسولؐ سے تیمار داری کی التجا کرتے۔

حضرت ابوبکر کی درخواست رد کی گئی

لیکن حیرت یہ ہے کہ بقول روضۃ الصفا اس زمانہ تک کے مشہور حکیم کی درخواست بھی منظور نہ فرمائی اور

مناہج النبوۃ کے ان فقرات سے ہوتی ہے جو ان الفاظ میں جواب دیا: "اے ابوبکر اگر میں تیمار داری بغیر اہلبیت کے کسی کو فرماؤں تو مصیبت ان کی زیادہ ہوگی" لیکن حیرتوں کی حیرت اس سے بڑھ جاتی ہے کہ عام مورخین نے اس پر ہر طرح سے زور دیا ہے کہ رسولؐ زمانہ علالت کو بجز حضرت عائشہ اور کسی کے گھر صرف نہ فرمانا چاہتے تھے۔

استنباطی حیرت

اور مورخین یہ بھی کہتے ہیں کہ اہلبیت میں ازواج بھی شامل ہیں۔ پس اگر رسولؐ حضرت عائشہ کے گھر اپنی بیماری میں تشریف فرما تھے اور وہ اہلبیت میں داخل تھیں تو حضرت ابوبکر کو حضرت عائشہ کے گھر میں داخل ہونے سے روکنا کیا معنی جن سے شہرقا کوئی پردہ نہ تھا سب جانتے ہیں کہ صدیق اور صدیقہ باپ بیٹی تھیں۔ اس سے کیا کچھ معلوم ہوتا ہے، بالفعل ہمیں کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس سے اہلبیت کے معنی معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی درخواست جس کے قبول کرنے میں بظاہر کوئی عذر نہیں کر سکتا منظور نہ کی گئی۔ اب انکار معنی پیدا کرتا ہے۔

ایک معترض کے نزدیک انکار کے معنی

معنی تلاش کرنا غور کرنے والے اور پس و پیش کے واقعات میں ڈوبنے والے کا کام ہے۔ یہ منظور کرنے کے بعد بھی کہ جناب رسالت مآبؐ حضرت عائشہ ہی کے گھر تشریف رکھتے تھے پیچیدگی کم نہیں ہوتی یعنی کیوں سرکاری طور سے باپ کو اس کی اجازت نہ دی گئی کہ وہ بیٹی کے گھر میں داخل ہوتا جب کہ یہ انکار اشتراک اور اجتماع کا سدباب بجا جا سکتا تھا۔

تاریخ علالت

علالت جناب رسالت مآبؐ کی تاریخ ۲۸ صفر اور رحلت کی تاریخ ۲ یا ۱۲ ربیع الاول جانی گئی ہے۔ مجھے مورخین کے قول کے موافق متذکرہ صدر تاریخ کے لحاظ سے واقعات کا اندازہ کرنا ہوگا۔

جیشِ اُسامہ

گزشتہ اوراق میں اس کا اشارہ کیا گیا کہ ۸ھ میں غزوہ موتہ واقع ہوا اور زید بن حارثہ شہید ہوئے۔ ۲۶ صفر ۱۱ھ میں دوبارہ مخالفین کے شورش کی خبر ملی۔ رسولؐ نے اسامہ بن زید کو بلایا اور انھیں ایک لشکر کا امیر کر کے حکم جنگ دیا۔ لڑائی مقام ابنی پر ہونے والی تھی جو اہلِ روم کے قبضہ میں تھا اور جہاں زید مارے گئے تھے۔ موضع جرف مرکزِ لشکر قرار دیا گیا۔

بہ اِستثنائے علیؑ مشاہیر اصحاب کو زید کی ہمراہی کا حکم دیا

اور "حکم عالی یوں صادر ہوا کہ اعیان مہاجر و انصار مثل صدیق اکبر اور عمر فاروق اور عثمان ذوالنورین اور سعد بن ابی وقاص اور ابوعبیدہ بن جراح وغیرہم سب (اسامہ بن) زید بن حارثہ کے ہمراہ جاویں مگر علی مرتضیٰ کے تئیں ہمراہ نہ کیا"۔ (مناہج)

تمام مورخین یہ استثناء مترجم ابن خلدون کے قائل ہیں جناب رسالت مآبؐ نے جناب امیرؑ کو ہمراہ نہ کیا۔ بایں تیمار داری کے لیے رکھ لیا۔ خود مترجم اپنے نوٹ میں قائل ہوا ہے کہ "لیکن علالت کی وجہ سے آپؐ نے بااجازت اسامہ علیؑ و عباس رضی اللہ عنہما کو تیمار داری کی غرض سے مدینہ میں رکھ لیا تھا باقی اور اجلہ اصحاب اُسامہ کے ہمراہ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ اُسامہ مدینہ سے ایک کوس چل کر جرف میں ٹھہر گئے اور وہاں سے ابوبکر و عمر وغیرہما رضی اللہ عنہم اُسامہ سے اجازت

لے کر رسول اللہؐ کو دیکھنے آتے تھے اور پھر چلے جاتے تھے۔ اس منزل سے اُسامہ کوچ کرنا چاہتے تھے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا انتقال ہو گیا۔

اس امر پر اعتراض جس پر فنافی الدین حضرت جعفرؓ نے کوئی عذر نہ کیا

یہ بات لوگوں کی خاطر پر گراں گزری کہ پیغمبر خدا نے ایک غلام کو اکابر مہاجرین و انصار پر امیر کر دیا۔۔۔ جب یہ اخبار سمع مبارک میں پہنچے خاطر مبارک سخت رنجیدہ ہوئی اور غضب میں آئے اور باوجود تپ اور درد سر کے سر مبارک اپنا عصابہ سے باندھ کر باہر آئے اور منبر پر رونق افروز ہوئے اور خطبہ پڑھا اور فرمایا:

انحراف پر تنبیہ

"اے معشر الناس! میں نے اُسامہ کو جو امیر بنایا تم اس سے انحراف کرتے ہو، اور اس کے باپ کی امارت میں بھی غزوہ موتہ کے درمیان سخن کرتے تھے تم یہ کیا بات ہے۔ قسم خدا کی کہ وہ سزاوار ہے امارت کا، اور اس کا باپ بھی سزاوارِ امارت تھا"۔

حضرت عمرؓ کا سلام اور پُر معنی جوابؓ

روایت ہے کہ حضرت عمر اپنے دورانِ خلافت میں اُسامہ کو دیکھ کر "السلام علیک یا ایہا الامیر" کہتے تھے۔ اور اُسامہ جواب دیتے تھے: غفر اللہ لک یا امیر المومنین۔ بقول ابن خلدون جب اسامہ کے متعلق رسولؐ نے فرمایا کہ: اگر اس کا باپ لائق امارت تھا تو یہ بھی قابل امیر ہونے کے ہے۔ جاتے جاؤ۔ اسامہ نے یہ سنتے ہی کوچ کا حکم دیا، اور جرف میں پہنچ کر پڑاؤ کیا۔ کہا گیا ہے کہ سرورِ عالم کا خطبہ دسویں تاریخ ربیع الاول کو ہوا۔ (قُرّۃُ العیون) صبح کو دوشنبہ کے روز (اسامہ) پھر آیا، اور حضرتؐ کو تھوڑی تخفیف حاصل ہوئی تھی۔ اسامہ کو حضرتؐ نے وداع کیا، اور فرمایا: "اغز علی برکۃ اللہ"۔ (جنگ کر خدا کی برکت پر) اور اسامہ حضرتؐ کے فرمان کے مطابق لشکر گاہ کو پھرا، اور اس نے حکم کیا کہ لشکر کوچ کرے اور جب چاہا کہ اب سوار ہووے اس کی ماں ام ایمن نے پیغام بھیجا کہ رسولِ خداؐ نزع میں ہیں۔ اسامہ پھر پھرا، اور اعیان اصحاب بھی پھر آئے اور ابوبکر صدیق اور عمر فاروق اور امثال انھوں کے خود مدینہ ہی میں تھے۔ اور جب ابن خلدون پڑھو گے تو معلوم ہو گا کہ دوشنبہ کے دن بعد نماز صبح ابوبکر "اپنے اہل کے پاس سنح چلے گئے"۔ بعض تاریخیں یہ بھی کہتی ہیں کہ جناب رسالت مآبؐ نے سعد بن عبادہ کو اس پر مقرر فرمایا کہ لوگوں کو گھروں سے بلا کر اسامہ کے ہمراہ بھیجو۔

عدم روانگی کی وجہ تجہیز لشکر نہیں ہو سکتی

اس واقعہ کے ذکر سے میں خود سمجھنے کے لیے سوال کرتا ہوں کہ کیا وجہ ہوئی جو باوجود اس کے کہ جناب رسالت مآبؐ نے ۲۶ صفر کو حکم دیا تھا مگر گیارہ ربیع الاول تک فوج روانہ نہ ہوئی۔ درآنحالیکہ اس کے قبل بنی قرانطیہ وغیرہ کی جنگ بتاتی ہے کہ صرف حکم دینے کی دیر ہوتی تھی اور کچھ دیر کے بعد لشکر روانہ ہونے کے لیے مستعد ہو جاتا تھا۔ اس واقعہ میں دیر کی یہ وجہ نہیں بتائی گئی ہے کہ تجہیز لشکر کی وجہ سے دیر ہوئی۔ اگر کوئی یہ عذر بھی کرے تو یہ عذر اس خیال سے قابل پذیرائی نہیں ہے کہ رسولؐ کے خطبہ کے بعد اُسامہ نے کوچ کیا، اور جرف میں پڑاؤ ڈالا۔ اگر سامان کی کمی دیر کی

وجہ ہوتی تو درنگی کے قبل اُسامہ کا کوچ کرنا اور پڑاوڈالنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اب روانہ نہ ہونے کے اغراض حل طلب ہیں۔

لشکر کا امیر دیر کا سبب نہ تھا

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسامہ یعنی اس لشکر کے سردار کی وجہ سے دیر ہوئی تھی؟ نہیں بلکہ وہ ایک وفادار سپاہی کی طرح حکم پاتے ہی روانہ ہو گیا اور جرف میں پڑاؤ ڈالنے کی یہ وجہ ہوئی کہ جب بقیہ لوگوں کو جنھیں کچھ دیر ہوئی ہے لشکر کے روانگی کی خبر معلوم ہوگی تو جلدی کریں گے اور اس کے بعد یہاں سے لشکر روانہ ہو سکے گا۔ پھر تو کیا عام سپاہیوں کی تساہلی کی وجہ سے سردارِ لشکر روانہ نہ ہو سکتا تھا۔ اسے بھی اسامہ کی روانگی اور پڑاؤ قطعاً کاٹ دیتا ہے۔

تاخیر کی ایک وجہ

اور تاخیر کی پہلی تاریخی وجہ جو سمجھ میں آتی ہے وہ ان لوگوں کا اعتراض ہے جو خیالِ اِمتیاز کو رسُولؐ کے حکم پر مقدم رکھتے تھے۔ مورخین نے ہمراہی کے حکم میں جن مخصوص اصحاب کا نام بتانا مناسب سمجھا ہے ان میں پانچ نام ہم لکھ چکے، بقیہ نام یہ ہیں: سعد بن زید، قتادہ بن نعمان اور سلمہ بن اسلم بن حرش۔

کون تساہلی کرسکتا تھا

مشکل سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ سعد بن ابی وقاص یا قتادہ بن نعمان کا ایسا سپاہی فوجی کارنامے کی شرکت میں کوئی تامل کرے اور نہ آئندہ وقت جس کا ذکر کرنے والا ہے، ان سے اس طرح متعلق ہے کہ ان پر کسی خاص وجہ سے روانہ نہ ہو سکنے کا شبہ کیا جاسکے۔ ہم سعید بن زید اور سلمہ بن اسلم کے متعلق بھی کچھ نہیں کہہ سکتے اس لیے کہ نہ پیشتر نہ بعد ان کے واقعات نے کسی کو متردد کیا ہے اور نہ یہ کوئی مخصوص حالت میں پائے گئے ہیں۔ زیادہ جو ان پر الزام لگایا جاسکتا ہے وہ یہ ہو کہ ممکن ہے کہ یہ بھی اس اِعتراض میں شریک ہوں کہ ہم پر ایک غلام کو امیر کیا ہے اور اس کے بعد تاکیدی حکم نے انھیں مستعد کر دیا ہو۔ حضرت عثمان جب عموماً میدانِ جنگ کے مواقع پر امتیاز سے نہیں دیکھے گئے ہیں تو ہمیں البتہ ان کی عدم روانگی پر زور دینے یا اِعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

رسُولؐ قابلیت شناس تھے

لیکن سوال یہیں ختم نہیں ہوجاتا، بلکہ اب ایک دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا رسُولؐ اپنے اصحاب کے قابلیت شناس تھے یا نہ تھے؟ کوئی با حواس آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ بغیر طبیعت شناسی اور اندازہ قابلیت کے کوئی بڑا ہو سکتا ہے، نہ کہ ہمارا ہادی۔ جس کی انبوہ صفات میں یہ صفت نہایت مخصوص تھی۔ پھر جب رسُولؐ جانتے تھے کہ حضرت عثمان میں صفت شجاعت تلاش کرنا بہت کچھ چاہتا ہے تو پھر بھی انھیں کیوں روانگی کا حکم دیا۔ کیا یہ ایک بے معنی حکم تھا؟ یہی سوال حضرت عمر اور ابوبکر کے متعلق اپنے کو دہراتا ہے۔ مورخین نے اپنے طرزِ عمل سے ہمیں یہ سوال کرنے کا موقع دیا ہے کہ کیوں دونوں کے دونوں حضرات ایسے دُور کے مقام پر بھیجے جا رہے تھے۔ درآنحالیکہ امیر نہ تھے، بلکہ مامور تھے۔ اور رسُولؐ کو متعلق اس کا کوئی تاسف نہ تھا کہ رائے اور مشورہ لینے کے وقت ان میں سے کوئی نہ ہو جن میں سے ایک کے متعلق مولوی شبلی صاحب "الفاروق" میں فرماتے ہیں کہ: "انتظامِ اِشاعتِ اِسلام میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جو حضرت عمرؓ کی شرکت بغیر انجام پایا ہو"۔ سوچا جاسکتا ہے کہ شدید علالت اور آخری اوقات میں معتبر لوگوں کو قریب رکھنے کی سخت ضرورت ہوتی ہے اور اس وقت کا ہر لفظ مفید اور ان کی بجا آوری ایک خدمت ہوتی ہے۔ ایسے وقت

ایک نبی، مصلح اخلاق اور قوم گر کو کس قدر وصایا کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ لیکن ایسے وقت خصوصیت کے ساتھ ان کی روانگی کے حکم اور ماموریت سے ان کی رائے کا وزن اس سے بالکل الگ معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ مؤرخین نے بھلانے کی کوشش کی ہے۔ اور نہ ان کی روانگی اس مجبوری سے تھی کہ ان سے زیادہ باعتبار فوجی افسر کا ملنا دشوار تھا اب خواہ مخواہ گزشتہ واقعات سامنے آجاتے ہیں کہ ایک بزرگ کو اتنی اجازت ملتی کہ وہ رسُولؐ کے دولت سرا کی طرف ایک سوراخ رہنے دیں تو دوسرے کو یہ رخصت نہیں ہے کہ وہ تیار داری کرسکیں۔ اگرچہ ان کی بیٹی ہی کے گھر کیوں نہ ہو۔ کیا اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ رسُولؐ نے ایک کو اگر اس سے روکا تھا کہ وہ ہر وقت نقل و حرکت کا نگران نہ ہو تو دوسرے کو نہ صرف اس خیال سے بلکہ اس سے بھی روکا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے پاس جا کر کسی ایسے خیال میں مشترک نہ ہو جائے جو موقع بینی کہی جاسکے۔ بلحاظ اس کے کہ حضرت حفصہ اور عائشہ داخل ازواج تھیں۔ حضرت عمر اور ابوبکر کا موقع ایسے ناقد کے سامنے نہایت ہی نازک ہے جو کسی ایسے اِجتماع اور اِشتراک کو جو کسی صاحبِ اِختیار کی رحلت یا علالت کے وقت ہو سیاسی نگاہ سے دیکھنا چاہتا ہے۔

رسُولؐ کو علیؑ کی صحبت سے گریز نہ تھا

علیؑ کے متعلق روضۃ الصفا کا یہ فقرہ کہ: "مرا از صحبت او گریز نیست"۔ اگر صحیح ہے تو یہ فقرہ سمجھنے کے عنصر میں اپنے عکس سے مدد دیتا ہے کہ کچھ لوگ جن کے دروازے مسجد کی طرف تھے ایسے تھے جن کی صحبت سے رسُولؐ کو گریز تھا۔

ازواجِ رسُولؐ کی دو جماعتیں

یہ کوئی راز نہیں ہے کہ جناب رسالت مآبؐ کے ازواج کی دو پارٹیاں تھیں اور ان میں بعض ایسی تھیں جن سے سرورِ عالم کو کچھ بہت راحت نہ تھی۔ ان میں سے ایک پارٹی کی طرف حضرت ام سلمہ تھیں اور دوسری طرف حضرت عائشہ اور حفصہ وغیرہ۔ مشکوٰۃ المصابیح سے معلوم ہوگا کہ حضرت زینبؓ نے ایک مرتبہ جناب رسالت مآبؐ کے لیے شہد مہیا کیا، اور جناب سرورِ عالم دیر تک ان کے گھر تشریف فرما رہے اور حضرت عائشہ کو رشک ہوا، اور اِتفاق کیا حفصہ سے کہ آنحضرتؐ جس کے پاس ہم میں سے آویں تو کہے کہ آپؐ میں سے بومغافیر (بدبودار گوند) کی آتی ہے"۔ سورۂ تحریم اس کے سمجھنے میں اور مدد دے گا۔ (مناہج)

رسُولؐ کی نقل و حرکت پر نظر

اسی طرح زمانۂ علالت میں یہ واقعہ بھی غور کے قابل ہے کہ: "عائشہ سے آیا ہے کہ پیغمبرؐ میرے گھر سے باہر نکلے اور میں حضرتؐ کے پیچھے نکلی غیرت کی جہت سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حضرتؐ اپنے قبیلوں سے کسی بی بی کے یہاں جاویں۔ یہاں تک کی حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بقیع کو پہنچے اور بہت دیر کھڑے رہے اور تین بار اپنے دستِ مبارک اٹھائے اور دعا کی اور وہاں سے پھرے میں بھی پھری اور حضرتؐ کے پہنچنے سے آگے گھر میں پہنچی اور سو گئی۔ متعاقب میرے حضرتؐ بھی آئے اور جب رسُولِ خدا نے اثر اضطراب اور تنگی نفس کے تئیں میرے دریافت کیا، پوچھا: اے عائشہ کیا حال ہے اور کیا ہوا جو مضطرب معلوم ہوتی ہے۔ صورتِ حال میں نے عرض کی۔ فرمایا: وہ سیاہی جو میں نے اپنے آگے آگے دیکھی تھی مگر تو تھی؟۔ میں نے کہا: ہاں، یا رسُول اللہ۔ پس رسُولِ خدا نے ایک ہاتھ عنف (درشتی) سے میرے سینہ پر مارا، اور کہا: تو نے گمان کیا تھا کہ خدا اور

رسولِ خدا تیرے حق میں ظلم کرتے ہیں"۔ ایک روایت میں یوں آیا ہے کہ : حضرت نے عائشہ سے فرمایا کہ : "شیطان نے تجھے اس بات پر گماشتہ کیا ہے"۔ یہ مثالیں اس سمجھنے کے لیے دی گئی ہیں کہ حضرت عائشہ کی ایک پارٹی تھی۔ اور کیسے ہی حسن ظن سے کیوں نہ ہو لیکن رسولؐ کے نقل و حرکت پر غور سے نظر رہتی تھی۔ اور یہ کوشش تھی کہ رسولؐ ان کے ارادہ سے مطلع نہ ہو جائیں۔ ایسے جاسوسانہ فعل کے علم پر اگر رسولؐ نے اپنے شبہات کو واقعہ سے زیادہ وزن دیا بھی ہو تاہم اس کا الزام کسی طرح رسولؐ پر نہیں ہے۔ غرض اور ارادہ پر مطلع ہوتا یا تو اس پر منحصر تھا کہ اس سے دریافت کرتے جس پر کسی قسم کا شبہ ہوا، اور اس جواب پر قناعت کر لیتے جو دیا گیا یا ان اسباب پر نظر ڈال کر جن سے موجودہ واقعہ کا سمجھنا آسان ہو اخذ نتائج کرتے۔ روایتیں ہیں کہ جناب رسالت مآبؐ اس سے کشیدہ ہوئے کہ بعض ازواج نے بعض باتوں کو ظاہر کر دیا جو راز کے طور پر حوالہ کی گئی تھیں۔

کیا ان حالتوں نے رسولؐ کو اس حکم پر آمادہ کیا تھا کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اپنی بظاہر قابل قبول خواہش میں مایوس کیے جاویں اور رسولؐ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ کو ہر وقت کا نگران سمجھ کر اس کی احتیاط کرتے ہوں کہ کہیں یہ لوگ اپنے اپنے باپ سے مل کر کسی ایسی کارروائی پر آمادہ نہ ہوں جو رسولؐ کی خواہش اور منشا کے خلاف ہو اور انھیں ان کے محض نقلوں پر اطلاع نہ ہو۔

رسولؐ کا حضرت حفصہؓ سے عورتوںؓ کے متعلق مخاطبہ

حیرت خیز تائید مناہج النبوۃ کے اس فقرہ سے ہوتی ہے جب عائشہ حفصہ سے عمر کے نماز پڑھانے کی سفارش کرتی ہیں اور رسولؐ فرماتے ہیں کہ : "تم اسے گروہِ مستورات صواحبِ یوسف ہو۔ یعنی اپنی بات پر پائیداری کرتی ہو اور دل میں کچھ رکھتی ہو اور باہر کچھ کہتی ہو"۔

مجھے کوئی شبہ نہیں کہ عجب نہیں ہے کہ معترضین امارتِ اُسامہ میں حضرت عمر اور ابوبکر اس افتخار کے جوش میں مخصوص نمود رکھتے ہوں کہ وہ رسولؐ کے خسر ہیں، اور اس لیے محض اس رشتہ کی بنا پر امیدوارِ امتیاز ہوں۔ لیکن رسولؐ کی سخت رنجیدگی، غضب اور دردِ سر کے باوجود پر تصمیم ارادہ نے امید امتیاز کو قائم نہ رکھا ہوگا۔ اور سمجھا دیا ہوگا کہ محض رشتہ اور ایسا کمزور رشتہ رسولؐ کے ہاتھوں ممتاز نہیں ہو سکتا جب تک مخصوص اسلامی خدمات سے مؤید نہ ہو۔

کیا روانہ نہ ہونا محبت سے تھا

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسولؐ انھیں کیوں مدینہ طیبہ سے دُور بھیجتے تھے اور یہ کیوں روانہ نہ ہونے کو اولیٰ سمجھتے تھے؟۔ اور باوجود حکمِ روانگی یہ لوگ کیوں بقول مترجم ابن خلدون : "رسول اللہ کو دیکھنے آتے تھے اور پھر چلے جاتے تھے"۔ آیا یہ آنا اور دیکھ جانا محبت سے تھا؟۔

ایک بدیہی تضاد

ان تنقیحات کے جواب چند روز بعد کے واقعات نہایت صفائی سے دے سکیں گے بالفعل مجھے جس امر کی طرف توجہ دلانا ہے اس کا بدیہی تضاد کسی طرح قابلِ تسکین نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر حضرت ابوبکر و عمر وغیرہ جرف سے آتے اور دیکھ جاتے تھے اور انھیں صریح حکم روانگی دیا جا چکا تھا جس کی بنا پر یہ پڑاؤ میں مقیم تھے۔ تو ساتھ ہی ساتھ یہ امامت مسجد میں رسولؐ کی قائم مقامی کیسے کر سکتے تھے اور یہ بھی فرصت تھی کہ

نسخ بھی ہو آیا کرتے۔ اور ایک صریح حکم کے سامنے آیا یہ امامت مسجد اگر واقعہ بھی ہو رسولؐ کے علم حکم اور خواہش سے بھی جا سکتی ہے اور کیسے بقول ابن خلدون تیرہ نمازیں اور بقول مجموعہ کامل آٹھ دن اور بقول مناہج تین دن قبل رحلت و نیز تیرہ تک ابوبکر نے نماز پڑھائی۔ اور ابوبکر کی امامت مسجد کا حکم مجموعہ کامل کی اس روایت سے کیونکر ہم آہنگ ہو سکتا ہے جس میں بلال سے رسولؐ فرماتے ہیں کہ "ابن خطاب سے تو کہہ دے کہ لوگوں کو نماز پڑھاوے"۔ اور خود اس روایت کو اس سے کیسے موافقت ہو سکتی ہے جیسا مناہج میں ہے کہ جب رسولؐ نے عبداللہ بن ربیعہ (وہی جس نے عثمان کے انتخاب کے لیے ابن سرج کی تائید کی) کو ابوبکر کے نماز پڑھانے کا حکم دیا اور اس نے انھیں نہ پا کر عمر سے کہا اور عمر کی بلند آوازی جب رسولؐ کے سمع مبارک میں پہنچی تو فرمایا: "ابا (انکار) رکھتا ہے خدا تعالیٰ اور ابا رکھتے ہیں مسلمان مگر ابوبکر کو"۔ اور ابن خلدون دلچسپی میں یہاں تک اضافہ کرتا ہے کہ: "دسویں روز جب درد کے خفیف ہو جانے سے حضرت باہر تشریف لاتے ہیں جب کہ ابوبکر نماز پڑھا رہے تھے اور وہ پیچھے ہٹنے کا قصد کرتے ہیں تو رسولؐ نے مونڈھا پکڑ کے جہاں پر پہنچ گئے وہیں پر کھڑا رکھا"۔ جسے صاحب مناہج یہ کہتا ہے کہ: "پس طلب کیا حضرت نے علیؑ مرتضیٰ اور عباس کے تئیں اور تکیہ کیا انھوں کے اوپر اور باہر آئے مسجد کی طرف اور نماز ادا کی"۔ طبری کو یہ کہنا ہے کہ جب رسولؐ باہر تشریف لائے تو لوگوں نے نہ صرف امامت ابوبکر کی نیت توڑ دی بلکہ خود حضرت ابوبکر نے بھی نماز شکستہ کر دی۔ جی چاہے تو اختتم کوئی اور مناقب مرتضوی کا یہ خیال بھی سن لیجیے کہ امامت مسجد کا حکم رسولؐ خدا کی طرف سے نہ تھا بلکہ حضرت عائشہ کی طرف سے تھا۔ جو بعینہٖ خیال حیات القلوب کا ہے۔

فضل بن عباس کا فطری متعجبانہ اِستفہام

علامہ مجلسی لوگوں سے یہ فطری سوال بھی کرتے ہیں کہ تمھیں کس نے بھیجا ہے اور لوگ دریافت کرنے دولت سرا کی طرف جب آتے ہیں تو فضل بن عباس سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ پوچھتے ہیں کہ: "کیا ابوبکر جیش اسامہ کے ساتھ نہیں گئے؟"۔ میں اس بے رحمانہ اقدام سے باز رہوں گا کہ اِمامت مسجد کے مسئلہ پر جس کے ایک لفظ کو دوسرے سے ایسا ہیبت ناک اِختلاف ہے تنقیدی نگاہ سے دیکھوں۔ روایت کا خاصہ سمجھنے کے لیے اس سے بھی مدد ملے گی کہ اگر رسولؐ عبداللہ بن ربیعہ کے زبانی پیغام بھیجتے ہیں تو روایت کرنے والی حضرت عائشہ ہیں۔ مجھے حضرت ابوبکر کی نرمی طبیعت سے کافی ہمدردی ہے جس کی بنا پر حضرت عائشہ یا حفصہ کی بھی سفارش کر دیتی ہیں یا حضرت عمر کا کمال ایثار ہے کہ وہ حضرت ابوبکر کو اپنے اُوپر مقدم کر دیتے ہیں۔ اور باوجود ان تمام باتوں کے رسولؐ یہ بھی فرماتے ہیں کہ: "دل میں کچھ رکھتی ہو اور باہر کچھ کہتی ہو"۔

شور غل اور غش کے پیچھے

لوگ کہتے ہیں کہ رسولؐ مسجد میں درد کی تخفیف سے باہر آئے۔ یہ بھی وجہ ہوئی کہ رسولؐ کو مسجد میں نہ دیکھ کر حضرت ابوبکر مارے افسوس کے غش کھا گئے اور لوگ رونے لگے۔ رسولؐ نے یہ صدا سنی اور تشریف لے گئے۔ شور و غل کی صدا میں ہو سکتا ہے کہ غم محرک ہوا ہو لیکن واقعات کے سمجھنے کے لیے اس پہلو پر غور کرو کہ جب حضرت ابوبکر امامت کے لیے مسجد میں پیش قدمی کرتے ہیں تو کچھ لوگ جو یہ جانتے ہیں کہ انھیں اسامہ کے لشکر کے ساتھ روانہ ہونے کا حکم ہے پوچھتے ہیں کہ آپ یہاں کیسے تشریف رکھتے ہیں۔ کچھ بلند آواز لوگ ان کی تائید کرتے ہوں گے۔ کچھ کہتے ہوں گے کہ چلو دریافت کر آئیں اس میں

شور و غل ہوا ہوگا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وادی الرمل والے عمرو بن عاص بھی اس مجمع میں موجود تھے یا نہ تھے۔ یہ شور غل سن کر رسولؐ عباسؑ اور علیؑ کے کاندھے پر تکیہ کرکے باہر تشریف لائے ہوں گے اور انھوں نے ایسے لوگوں کو پایا ہوگا جنھوں نے ایک صریح حکم سے انحراف کیا تھا۔ اور ایسے لوگ رسولؐ کو دیکھ کر پیچھے ہٹے ہوں گے۔

جہاں استنباط آسان ہے

ہم تک نہ پہنچا رسولؐ نے اس وقت کیا فرمایا ہوگا کسی طرح معجزہ نہیں ہے۔ لیکن یہ سوچنا کہ کیا فرمایا ہوگا کچھ بہت مشکل بھی نہیں ہے۔

فتنے کالی رات کی طرح ہجوم کر آتے ہیں (مناہج)

اسی زمانہ علالت کے واقعات میں ایک یہ بھی ہے کہ نصف شب کو جناب سرورِ عالم اپنے غلام موہبہ کو اپنے ہمراہ لے کر گورستان بقیع میں تشریف لے جاتے ہیں اور فرماتے ہیں: "اے اہلِ قبور گوارا ہو جیو تم کو وہ حالتیں کہ صبح کی تم نے اور ــــ دُور ہو تم ان فتنوں سے کہ ہیں جن فتنوں میں لوگ اور تم کو نجات دی ہے ان فتنوں سے اور خلاصی دی ہے خدا تعالیٰ نے ان فتنوں سے تحقیق کہ ہجوم لائے ہیں لوگوں پر فتنے مانند کالی رات کے قطعوں کے مثیل ہے آخر ان فتنوں کا اول سے ان فتنوں کے ــــ بعد اس کے حضرت اصحاب کی طرف رونق افروز ہوئے اور فرمانے لگے کہ وے (اہل قبور) تم سے بہتر ہیں ــــ اصحاب نے عرض کی کہ یا رسول اللہ وے ہمارے بھائی ہیں، جس طرح وے ایمان لائے ہیں

اصحاب کا سوال اور رسولؐ کا جواب

ہم بھی لائے، انھوں نے انفاق کیا ہم نے بھی کیا۔ وے گئے ہم بھی جائیں گے۔ ہم پر ان کی زیادتی کس چیز کی ہے۔ فرمایا کہ: "وے گزرے اور اپنے اجر سے انھوں نے دنیا میں کچھ نہیں کھایا، اور میں نہیں جانتا کہ تم میرے بعد کیا کروگے، اور کیا کیا فتنے تمھارے درمیان تم سے سرزد ہو دیں گے"۔

حضرت عائشہ نام نہیں لیتیں

اسی کتاب میں زمانہ علالت کے متعلق صحیح بخاری کی عائشہ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے جو تعلقات کے سمجھنے میں مدد دے گی کہ وہ ذکر علالت کرتی ہوئی کہتی ہیں کہ: "باہر آئے حضرتؐ ایک روز گھر سے مسجد کی طرف اور حال یہ کہ حضرتؐ درمیان دو مردوں کے ہیں اور اُوپر ان کے اعتماد کیے ہوئے یعنی تکیہ کیے ہوئے اور خط کھینچتے تھے دونوں پاؤں اس جنابؐ کے زمین میں نہایت ضعف و ناتوانی سے اور وہ دونوں ایک عباسؓ تھے چچا حضرتؐ کے اور دُوسرا ایک مرد اس جنابؐ کے اہلِ بیتؑ سے"۔

ابنِ عباسؓ نام بتاتے ہیں

ضبیداللہ بن عبداللہ اس حدیث کے راوی نے ابن عباسؓ سے یہ روایت بیان کی اور ابن عباسؓ نے پوچھا کہ آیا تو قیاس کرتا ہے کہ وہ دوسرا مرد کون تھا۔ اور انکار پر جواب دیا کہ: "وہ مرد علیؑ بن ابی طالبؑ تھے"۔ مؤرخین نے حضرت عائشہ کے نام نہ لینے کی جو تاویلیں کی ہیں وہ مشکل سے موافق واقعہ ہیں۔ جب کہ یہ طرزِ عمل اور مصلحت عالمگیر ہوتی جاتی ہے کہ اپنے ناموافق فریق کے کسی کارنامے یا خدمت کے ذکر یا حتی الوسع نام لینے سے پرہیز کیا جائے۔

پنج شنبہ، قصۂ قرطاس

ایک اور واقعہ جو بقول ابن خلدون اور مناہج پنج شنبہ کو ہوا، اسے ہم نے اب تک نہیں لکھا۔ قصہ قرطاس ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ

بقول مناہج و ابن خلدون : "آپؐ نے فرمایا کہ میرے پاس دوات و کاغذ لاؤ۔ میں تم کو کچھ لکھ دوں، تاکہ بعد اس کے گمراہ نہ ہو"۔ لوگ بحث و مباحثہ کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب پھر اس کلام کا اعادہ کرانا چاہا تو آپ نے ارشاد کیا کہ : "تم لوگ مجھے چھوڑ دو، میں جس حالت میں ہوں اچھا ہوں اس سے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو"۔ مترجم ابن خلدون بخاری و مسلم سے نوٹ کرتا ہوا کہتا ہے کہ : "عمر نے کہا کہ ہمارے لیے قرآن مجید کافی ہے جو ہمارے پاس ہے"۔ اور بے شک اس وقت آپ کے درد زیادہ ہو رہا تھا۔۔۔ اس اثنا میں کسی نے یہ بھی کہہ دیا کہ : "ان کو اختلاطِ کلام ہو گیا ہے"۔

رسولؐ نے شور شغب کرنے والوں کو چلے جانے کا حکم دیا

"آپؐ نے فرمایا کہ میرے پاس سے چلے جاؤ۔ پیغمبروں کے پاس شور شغب کا کام نہیں ہے"۔

حضرت عمر کا لحن خطاب

صاحب مناہج کہتے ہیں : "عمر خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ مرد یعنی پیغمبر خدا شدت مرض کے وقت ایسی باتیں کرتا ہے کہ اختیار کے دائرے سے باہر ہیں۔ شاید کہ یہ باتیں بھی مانند ان باتوں کے ہوں۔ یعنی مبادا لوگوں کے تئیں راہ سخن پیدا ہو اور کہیں اور خیال کریں اور طعن کریں کہ رسولِ خدا ہذیان کرتا ہے۔ یعنی بڑبڑاتا ہے۔ جس طرح بیمار بیماری کی سختی کے وقت کہتے ہیں"۔ مولوی شبلی صاحب فرماتے ہیں : "یہ واقعہ بظاہر تعجب انگیز ہے۔ ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ اس سے زیادہ اور کیا گستاخی او سرکشی ہوگی کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بستر مرگ پر ہیں اور اُمت کے درد و غم خواری کے لحاظ سے فرماتے ہیں کہ ایک ہدایت نامہ لکھ دوں جو تم کو گمراہی سے محفوظ رکھے۔ یہ ظاہر ہے کہ گمراہی سے بچانے کے لیے جو ہدایت ہوگی وہ منصب نبوت کے لحاظ سے ہوگی اس لیے اس میں غلط و سہو کا احتمال نہیں ہو سکتا۔ باوجود اس کے حضرت عمر بے پروائی ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کچھ ضرورت نہیں ہم کو قرآن کافی ہے۔

بعض روایتیں کہ حضرت عمرؓ ہی نے
رسولؐ کے ارشاد کو ہذیان سے تعبیر کیا

طرہ یہ کہ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عمرؓ ہی نے آنحضرتؐ کے اس ارشاد کو ہذیان سے تعبیر کیا۔ نعوذ باللہ۔ صاحبِ مظاہر حق کہتا ہے : "ابنِ عباس کہتے ہیں کہ : "تحقیق مصیبت کامل وہ حال ہے کہ جو حائل اور مانع درمیان پیغمبر خدا کے اور درمیان اس کے کہ لکھیں ان کے لیے یہ نوشتہ بہ سبب اختلاف ان کے کے اور شور و شغب ان کے کے۔ کاش کہ وہ اختلاف اور غل نہ کرتے تا حضرتؐ کچھ لکھتے کہ سبب ہدایت کا ہوتا"۔

ابنِ عباس کا تأسف

"پس تھے ابنِ عباس مائل طرف خلاف اس چیز کے کہ کہی عمر نے اور انھوں نے کہ تابع تھے ان کے اصحاب میں سے ۔۔۔۔ پھر روئے ابن عباس اتنا روئے کہ تر کر دیا ان کے آنسوؤں نے سنگ ریزوں کو کہ وہاں پڑے تھے"۔

بعض کا خیال ہے کہ نزاع نہ ہونے کے لیے

خلیفہ کا تعین چاہا تھا

یہی مفہوم مناہج میں ہے۔ یہ دونوں کتابیں بعض کا یہ خیال بھی لکھتی ہیں کہ چاہا تھا کہ معین کر دیں ایک کو اصحاب میں سے واسطے خلافت کے تا واقع نہ ہو نزاع ان میں"۔

رسولؐ نے اسبابِ تحریر کب طلب فرمایا

تفصیلی حیثیت سے یہ بحث الکرار میں کی جا چکی ہے۔ اس کتاب میں بجز خاص مفید نکات کے میں زیادہ طول مناسب نہ سمجھوں گا۔ تم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جناب رسالت مآبؐ نے قلم و دوات یا اسبابِ تحریر اس وقت طلب کیے جب کہ لوگ دیر سے آنجناب کے وصلیا کو سن رہے تھے اور ہر شخص سمجھ رہا ہے کہ حضرت اس لحن میں تقریر فرما رہے ہیں جو صاف طریقہ سے دوامی تقریر بھی جائے۔

طلبِ قرطاس کے پہلے عذر نہ ہوا

کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ حاضرین اور متکلم میں اُمت اور نبی کا واسطہ قائم ہے۔ نہ کوئی یہ کہتا ہے کہ بیماری میں زیادہ گفتگو کرنے سے آپ کو تکلیف ہوگی، اور نہ اب تک کسی کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ چونکہ آیہ "اکملت لکم دینکم" نازل ہو چکا ہے۔ اب ہمیں یہ کہنے کا موقع ہے کہ محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات منصبِ نبوت سے خالی ہو گئی۔

دوشنبہ تک گفتگو فرمائی

پنج شنبہ کیا معنی دوشنبہ تک جناب سرورِ کائنات نے تقریریں فرمائیں اور کسی نے اس عذر بے جا کو اپنے اسلامیت کے شایان نہ سمجھا کہ شدتِ مرض نے رسالت کا حق ساقط کر دیا ہے۔ بلکہ فوری تغیر اور انقلاب طبیعت کے آثار رسولؐ کے اس فرمانے کے ساتھ ہی پیدا ہو گئے کہ: "دوات کاغذ لاؤ میں تم کو کچھ لکھ دوں تا کہ بعد اس کے گمراہ نہ ہو"۔ درآنحالیکہ یہ الفاظ صاف صاف کہہ رہے تھے کہ یہ فرمانا خالصاً منصبِ ہدایت کے لحاظ سے تھا۔

آیا حضرت عمر کو کچھ ایسا لکھے جانے کا خوف تھا جو ان کے لیے مضر ہوتا

سوال یہ ہے کہ آیا حضرت عمر کو یا کچھ ایسے لوگوں کو جو ان کے زیر اثر ہوں یہ خوف یا شبہ تھا کہ جناب رسالت مآبؐ کچھ ایسا تحریر فرمائیں گے جو ان کے حقوق کے لیے مضر ہوگا۔ اور کیا لکھنے کا انتظار نہ تھا۔ آیا اس کے کچھ آثار ہیں جو حضرت عمر کے خوف کی وجہ بھی جا سکے۔

مراسمِ دینیہ کے متعلق ہدایت مضر نہ ہوتی

ایسے مخالف اور موافق ہر شخص تسلیم کرے گا کہ نماز روزہ حج اور زکوٰۃ وغیرہ کے متعلق رسولؐ کا کچھ فرمانا کسی حیثیت سے کسی کے مضر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو ذاتی منفعت کے مخالف اور رد حقوق کا سبب ہو سکتی۔ یہ یقینی امر ہے کہ حضرت عمر کا ایسا کچھ کہنا جو رسولؐ کی خواہش میں رکاوٹ پیدا کرے اس خیال سے نہیں ہو سکتا تھا کہ رسولؐ نماز و روزہ کے احکام کو کاغذ قلم کے حوالہ نہ کریں۔ اور نہ اس میں کسی صاحب حواس کو شبہ ہو سکتا ہے کہ جو کچھ کہا گیا اور جس طرح کہا وہ کسی طرح اس خیال سے تھا کہ رسولؐ کو تکلیف نہ ہو۔

کونسی تکلیف زیادہ ہے

اس لیے کہ رخصت ہوتے ہوئے بزرگ کی کوئی ایسی تکلیف جسے وہ اپنے آخری عالم میں گوارا کرتا ہے وہ اس کے مقابلہ میں بہت کم ہے کہ وہ اپنے بعد آخری وصیتیں کرنا چاہے اور نہ کرسکے۔ جاہل سے جاہل اور وحشی سے وحشی قوم آخری وصیت کو توجہ سے سنتی ہے اور حتی الوسع اسے پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

صاحبِ خلقِ عظیم ہمدردی کا ایسا جواب نہیں دے سکتا تھا

اگر اباحفصہ نے رسولؐ کے ساتھ ہمدردی کے لحاظ سے کہا ہوتا تو بھی اس کا جواب رسولؐ کے ایسے صاحبِ خلقِ عظیم سے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ یہ فرماتے کہ:

"میرے پاس سے چلے جاؤ۔ پیغمبروں کے سامنے ایسے شوروشغب کا کام نہیں ہے"۔

مؤرخین نے کسے چھوڑا اور کس کی حفاظت کی

مؤرخین کا تمام "عجب" اور "نعوذباللہ"۔ اور مختلف پیرایوں میں ان الفاظ کو دکھانا اور ڈھالنا اور اس کے بعد قیامت تک ایسی ہی یا اس سے ہزار درجہ عمدہ لفظوں اور پیرایوں میں اس کے اصلی ہیئت کو بدلنے کی کوشش صرف ایک اور اکیلے ایک بات بھلا دے گی اور وہ یہ ہوگی کہ:

نہ صرف ہدایت کا سد باب ہوا بلکہ مسلمانوں کو متفرق ہونے کا ذریعہ حوالہ کیا اس قصہ میں کون کون فریق ہیں

ان مؤرخین نے اس کی محافظت کی جس نے نبی عربی کی نہ صرف صریح ترین انداز اور لفظوں میں تخفیف کی بلکہ مسلمانوں کو جو اس وقت سے قیامت تک پیدا ہوتے رسولؐ کی ایک ایسے واضح اور مستند ارادہ ہدایت سے باز رکھا اور آئندہ مسلمانوں کو متفرق ہونے کا راستہ بتایا۔ معاملہ صرف رسولؐ اور اباحفصہ میں نہیں ہے بلکہ اباحفصہ اور عام مسلمانوں میں بھی ہے۔ محافظ مسلمان ہمیں سمجھاتے ہیں کہ قرآن پر اکتفا کرنا بہت درست تھا۔ اس سے شاید وہ ہمیں یہ سمجھانا چاہتے ہوں کہ رسولؐ کا مشن ایک یہ تھا کہ وہ قرآن کی چند جلدیں شائع کرجائیں اور بس۔ یا دوسرے لفظوں میں ہمیں یہ بتانا ہو کہ رسولؐ کو اس کا مطلق خیال نہ تھا کہ وہ قرآن حوالہ کرچکے ہیں۔

ایک پہلا انسداد

اور سب سے زیادہ مضحک یہ دلیل ہے کہ اس انحراف کا جواب اس دوسرے انحراف سے دیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ رسولؐ نے ابوہریرہ کو اس اعلان کا حکم دیا کہ جو شخص صدق دل سے لا الٰہ الا اللہ کہے اس پر آتشِ دوزخ حرام ہے۔ اس سے بھی اباحفصہ نے روکا اور رسولؐ خاموش رہے۔

مخالفت کے باوجود رسولؐ کا حکم پہنچ گیا

وہ لوگ جو اس پر غور نہ کریں کہ حکم دینے کے بعد رسولؐ کی خاموشی نے باوجود انحراف کے ان کے اس فرمانے کو آج بھی ہم تک پہنچا دیا۔

خاموشی سے اصرارِ مخالفت کا انسداد منظور تھا

درآنحالیکہ اگر اس وقت انحراف کا لحاظ نہ فرماتے اور حکم دیتے جاتے تو جہاں ہمیں یہ خبر ملتی کہ رسولؐ کے حکم کا اعلان کیا گیا وہاں یہ خبر بھی پہنچتی کہ ایک شخص اسی طرح ممانعت بھی کرتا جاتا تھا اور

عامۂ ناس پر اس لیے برا اثر پڑتا کہ وہ ممانعت کرنے والے کو اصحاب رسولؐ میں سمجھتے۔ درآنحالیکہ خاموشی اعلان کے راہ میں حائل نہیں ہوئی، اور ممانعت صاف صاف ہسم تک پہنچ گئی۔ بعینہٖ یہی صورت نوشتہ کے التوا کی ہوئی۔

اگر حضرت عمر کو اپنے متعلق کچھ اُمید ہوتی تو وہ لکھنے دیتے

یہ امر بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ کچھ لوگ تھے جو سمجھتے تھے کہ حضرت آئندہ کے لیے اپنا خلیفہ تجویز کریں گے اور اسے مصدق بہ تحریر کردیں گے۔ حضرت عمر یا ان کی جماعت کی مخالفت بتاتی تھی کہ انھیں اپنی نسبت رسولؐ سے کوئی امید نہ تھی، ورنہ لکھنے دینا ان کے مفید تھا اور اپنے مفید امر سے مخالفت کا خیال نہیں ہوسکتا۔

حضرت ابوبکر کے موافق کچھ لکھا جانا حضرت عمر کے خلاف نہ ہوتا

اور نہ یہ روایت کہ میں ابوبکر کے ہوتے ہوئے پیش نمازی نہیں کرسکتا، یا اس کے کچھ روز بعد کا واقعہ کہ خود حضرت عمر سب سے پہلے حضرت ابوبکر کی بیعت کرتے ہیں، اس کی جگہ چھوڑتا ہے جس سے یہ قیاس کیا جاسکے کہ حضرت ابوبکر کے لیے رسولؐ کا کچھ تحریر فرمانا حضرت عمر کے ناگوار طبع ہوتا۔

رسولؐ اسے امت کا والی امر نہیں قرار دے سکتے تھے جسے ان کی حیات میں کوئی مُفید خدمت نہیں دی گئی

نہ اس کا قرینہ ہے کہ حضرت ابوبکر جو عمرو بن عاص یا اُسامہ بن زید کے ماتحت رکھے جاسکیں، یا سورۂ برات اس لیے تلاوت کے لیے نہ ملے کہ اس کام کو رسولؐ کریں یا جو رسولؐ کے اہلِ بیت سے ہو تو عقل اور انصاف کے نزدیک بہت بعید ہے کہ رسولؐ ایک ایسے بڑے کام کو جس میں کلی ہر لحاظ سے مسلمانوں کا والی امر ہو، ایک ایسے شخص کے سپرد کردیں جسے پیشتر نسبتاً کم درجہ کے کام بھی نہ دیے گئے ہوں یا دیے گئے ہوں تو ایسے وجوہات پیدا ہوگئے ہوں کہ اس منصب کو لے لینے کی ضرورت محسوس ہوئی ہو۔

کس کے متعلق رسولؐ کچھ لکھ سکتے تھے

اب خواہ مخواہ وہ شخص سامنے آتا ہے جس کی خدمات، ایثار نفس، لحاظ، اور اہل بیت میں ہونا رسولؐ کا ولی، خلیفہ، وصی، بمنزلۃ الراس من بدنی (جسم میں بمنزلہ سر) مولیٰ اور کیا کچھ نہ فرمانا مسلمانوں کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ اسی بزرگ کے لیے لکھتے۔

آخری وقت علیؑ کو قریب رکھا تھا اور حضرت عمر اور ابوبکر اور عثمان کو دُور بھیج رہے تھے

اس کا غالب قرینہ جہاں گزشتہ تاریخ افعال اور عمل سے ہے، وہاں اس واقعہ سے بھی ہوتا ہے کہ رسولؐ سب کو دور کے مقامات پر اصرار کے ساتھ روانہ کرتے ہیں اور اسی کو پاس رکھتے ہیں جس کی نسبت دعا کرچکے تھے کہ اس وقت تک موت نہ آئے جب تک علیؑ کو دیکھ نہ لیں۔ یا فرماتے تھے کہ بالضرورت تمھیں بھیجتا تو ہوں لیکن جدائی پر افسوس کرتا ہوں۔ رسولؐ کانٹے چن رہے تھے، کون اس سوچنے سے باز رکھا جاسکتا ہے کہ رسولؐ ان تمام لوگوں کو جو ذاتی وجوہات سے علیؑ کے حقوق کی مخالفت کرتے صدر مقام سے دُور ہٹا رہے تھے کہ کوئی جناب امیرؑ کے راہ میں حائل نہ رہتا۔

جیشِ اُسامہ کے ساتھ روانہ نہ ہونے کی وجہ

اور لوگوں کا روانہ نہ ہونا اس خوف اور شبہ سے تھا کہ کہیں اسی کو رسولؐ اپنا جانشین چھوڑ کر رحلت نہ فرمائیں جس کے جانشین ہونے اور کیے جانے کا دلوں کو یقین ہے اور ہم لوگ دُوری کی وجہ سے کوئی کوشش نہ کرسکیں۔ ظاہر ہے کہ ایک مرتبہ بلا کسی شورش اور مخالفت کے علیؑ کا جانشین ہو جانا دوسروں کی امیدوں کو خاک میں ملا دیتا۔

کیا ہوتا اگر اس وقت علیؑ خلیفہ ہوتے

یہ بھی کہہ دوں کہ اگر ایسا ہوتا تو آج اِسلام اور مُسلمان دُوسرے ہوتے۔ اس لیے کہ عناصرِ تفرقہ نہ اس قدر جلد پیدا ہوتے اور نہ ایسا موقع ملتا۔ علیؑ کے مخالفین حقوق اپنی کوشش سے باز نہیں آئے۔ جس کا ذکر تھوڑی دیر میں کیا جائے گا اور وہیں اس اِستفہام کا جواب ہو سکے گا کہ آیا بعض لوگوں کا لشکرِ اُسامہ کے ساتھ روانہ نہ ہونا رسُولؐ کی محبت سے تھا؟

سوچو کہ اگر حضرت عمر کا یہ برافروختہ فقرہ غم خواری کے لحاظ سے ہوتا تو کیا ضرورت تھی کہ دریائے علم ابنِ عباس روتے اور یہاں تک روتے کہ ان کی آنکھوں کے آنسو سنگریزوں کو تر کردیتے۔ اس لیے روئے کہ لوگ رسُولؐ کو ایسی چیز کے لکھنے سے مانع ہوئے جو مُسلمانوں کی ابدالآباد تک کے لیے ہدایت کرتا۔ اور وہ قوم کش اختلافات نہ ہوتے جو مسئلۂ امامت سے ہوئے۔ یہ اسلام کی سچی ہمدردی تھی۔

رسُولؐ کا ایک فقرہ جسے مؤلف نہیں سمجھا

میں رسُولؐ کے اس فقرہ کے بقیہ نصف کو مُطلق نہیں سمجھا کہ: "مجھے چھوڑ دو میں جس حالت میں ہوں اچھا ہوں۔ اس سے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو"۔ پہلے نصف فقرہ کا مطلب صاف ہے کہ رسُولؐ شور غل کرنے والوں کو مجلس اقدس سے دور کر رہے تھے اور ان کا قریب رہنا ناگوار تھا۔ لیکن دوسرا نصف کہ: "اس سے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو"۔ واقعات کی کمی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ جو کچھ خیال ہے وہ یہ ہے کہ شور و شغب کرنے والوں نے کوئی رائے پیش کی ہوگی جو رسُولؐ نے قبول نہ فرمائی۔

ایک نہایت مفید بات تاریخ میں معدوم ہے

لیکن چونکہ مؤرخین نے یہ نہیں لکھا کہ لوگوں نے رسُولؐ کو کس طرف بلایا تھا۔ اس لیے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن سوچتا ہوں کہ اگر یہ کوئی مخالف تجویز پیش کی گئی تھی تو اس کا تاریخ میں ہونا حالت کو صاف بتا دیتا۔ جو اب اس لیے حذف کیا گیا کہ رسُولؐ نے نامنظور فرمایا۔ اور لکھنا بہت سے حالتوں کو پوست کندہ کر دیتا۔

رسُولؐ نے زیارت کی اِستدعا نامنظور کی

ابوالفداء کو یہ کہنا ہے کہ بیماری میں اور زیادتی ہوئی اور لوگوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ زیارت کے لیے آنے کی اجازت دی جائے تو سرور عالم نے فرمایا کہ: "میری بیماری کی تکلیف کم ہے بہ نسبت تمہاری موجودگی کے"۔

رسُولؐ کا اسبابِ خاصہ علیؑ کے حوالہ ہوا

افسوس دورانِ علالت کی آخری باتوں میں صاحب حیات القلوب اور مناقب مرتضویؑ نے پُردرد تصویر

کھنچی ہے کہ رسولؐ علیؑ کو اپنی تلوار، زرہ، ناقہ اور کپڑے عطا فرما رہے ہیں۔ ان کپڑوں میں ایک وہ پتھر بھی ہے جسے آنحضرت گرسنگی کے وقت شکم اطہر پر باندھ لیتے تھے۔ اور علیؑ روتے روتے بے خود ہو گئے ہیں۔

علیؑ عکاشہ کے تازیانہ کے لیے

سرورِ عالم نے اپنے آخری وقت یہ بھی اعلان فرمایا کہ اگر میں نے کسی کو تکلیف پہنچائی ہو تو مجھ سے انتقام لے لے۔ عکاشہ بن محصن نے دعویٰ پیش کیا کہ مجھے رسولؐ کا تازیانہ لگا ہے۔ رسولؐ آمادہ ہو گئے۔ اور طبری کے موافق عکاشہ کے تازیانہ کے لیے خصوصاً علیؑ نے اپنے کو پیش کیا۔ عکاشہ نے پشت مبارک پر بوسہ دیا اور در گزرا۔ اے کاش آئندہ زمانہ میں بھی اہلبیتِ نبوی کا ویسا ہی احترام باقی رہتا جیسا عکاشہ سے سرزد ہوا۔

رسولؐ کا سر مبارک علیؑ کے زانو پر

اس کے بعد بقول مناقب سرورِ عالم نے فرمایا کہ میرے بھائی علی مرتضیٰ کو بلاؤ۔ علیؑ مرتضیٰ آئے اور حضرت کی بالیں پر بیٹھے۔ اور سر مبارک اس حضرت کا اپنے زانو پر اس جناب نے رکھا۔ امیرالمومنین سے اور وصایا فرمائے۔ کچھ ایسے قرض کے متعلق تھے جو ذاتی تھے۔ کچھ اس قرض کے متعلق تھا جو اسامہ کے لشکر کی آراستگی کے لیے لیا تھا۔ اور سب سے مخصوص وصیت یہ تھی کہ:

آئندہ کے متعلق ایک یادگار وصیت

"میرے بعد تجھے بہت سے صدمے پہنچیں گے تجھے چاہیے کہ گھبرا نہ جانے اور صبر اپنا شعار کرے۔ جب تو یہ دیکھے کہ لوگ دنیا کی طرف مشغول ہو گئے تو تو آخرت اختیار کرنا"۔

رسولؐ طاہرہؑ کے آنسو پونچھتے ہیں

ہادی عالم کی حالت خراب ہوتی گئی، اور یہ نوبت پہنچی کہ ان کی لاڈلی بیٹی ضبط نہ فرما سکتی۔ رسولؐ نے آنکھیں کھولیں اور اپنے دستِ اقدس سے آنسو پونچھے۔

حسنینؑ کی طلبی اور اُن کا اضطراب

اور بقول روضۃ الشہداء اپنے فرزندوں کو طلب کیا۔ غالباً لوگ بچوں کو بلانے تیزی سے دوڑے ہوں گے اور عجب نہیں ہے کہ لوگوں کی گھبراہٹ اور افسردہ صورتوں نے بچوں کے اثرپذیر دل کو متاثر کیا ہو۔ اگرچہ وہ حالت کا صحیح اندازہ نہ کر سکے ہوں۔

حسنینؑ کے اضطراب نے اصحاب کو رلا دیا

رسولؐ بچوں کے متعلق وصیت کرتے ہیں

سات آٹھ برس کے بچے اس طرح جلد جلد قدم اٹھاتے ہوئے جا رہے تھے کہ چھوٹے چھوٹے عمامے سروں سے گرے جاتے تھے۔ وہ اصحاب جو در ہدایت سرا پر کھڑے تھے حسنینؑ کو بسورتے اور اس طرح جاتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار ہو گئے۔ بقول مناقب: "حضرتؐ نے ان کو بوسہ دیا اور سونگھا اور لوگوں کی تعظیم احترام اور محبت کے باب میں اصحاب کو اور تمامی اُمت کو وصیت کی"۔ اور شاید یہی وقت ہو جس کے متعلق علامہ مجلسی حدیث نقل فرماتے ہیں کہ جناب رسولؐ چشم پرآب ہو کر علیؑ سے فرماتے ہیں کہ: "میں جانتا ہوں کہ تمہارے لیے میری اُمت کے بہت سے لوگوں کے دلوں میں کینے ہیں کہ وہ لوگ ان کینوں کو ظاہر نہ کریں گے۔ یہاں تک کہ میں انتقال کروں۔ (مجالس ابرار)

اس وقت کی حالت

واقعات بتائیں گے کہ کوئی چشم دید واقعہ خوانی اس پیشین گوئی سے بڑھ نہیں سکتی تھی۔ اس وقت کی حالت نجانے لکھے جانے کے سوچی خوب جا سکتی ہے۔

علیؑ جنھیں رسولؐ نے فرزندوں کی طرح گود میں پالا تھا۔ فرزندی میں قبول کیا تھا۔ ہدایت پائی۔ سایہ میں جوان ہوئے اور اثر حاصل کیا۔ اپنے کو تنہا دیکھ رہے ہیں۔ حضرت فاطمہؑ کہہ رہی تھیں کہ بابا اب حسنینؑ کس پر مچلیں گے۔ اور کون ناز اٹھائے گا۔ اصحاب اہل بیتؑ کی مصیبت پر سر پیٹ رہے تھے۔ اور دیکھنے کی یہ بات تھی کہ وہ یتیم عبداللہ جسے مکہ سے جلا وطن کیا۔ طائف میں نہ رہنے دیا۔ مدینہ میں چین سے بیٹھنا نہ ملا، اب اس پر مکی اور مدنی اس طرح رو رہے ہیں کہ کبھی کوئی بیٹا اس طرح باپ پر اور کوئی باپ اس طرح اپنے بیٹے پر نہ رویا ہوگا۔ مدینہ کے ہر کوچہ و بازار سے رونے کی صدا بلند تھی اور یہ آوازیں در و دیوار سے اپنا سر ٹکرا رہی ہیں۔ اسلام میں کبھی ایسا نوحہ و ماتم نہیں ہوا۔ یہ پہلا غم تھا۔

فاتحِ خیبر سرِ مبارک نہ اٹھا سکا

درِ خیبر اٹھانے والے علیؑ سے سرِ اقدس نہ اٹھ سکا کہ لٹا دیتے اور عباس کو آواز دی:

"میں بے خود ہو رہا ہوں میری خبر لے"۔ اس لیے کہ ہادی جو اس دنیائے فانی میں اپنا کام پورا کر چکا تھا عالمِ قدس کی طرف بلا لیا گیا۔

بابؑ اوّل کا خلاصہ

واقعاتؑ کا نشو

کسی حد تک سر زمینِ عرب کی حالت دکھائی گئی اور یہ بتایا گیا کہ اگرچہ سرزمینِ حجاز و عرب میں ہدایت کا مجموعہ تھا لیکن وہ اپنے مذہبی خیال میں اس درجہ پست تھے کہ ان کے عین اصول مسخ ہو گئے تھے۔

مسخ ہونے کے اسبابؑ وہ اس وجہ سے ہو کہ بانیانِ مذاہب نے اپنی اصول کو مختلف لفظوں ظاہر نہ کیا ہو۔ یا خود اصول ہی تغیر پذیر ہوں یا امتداد زمانہ کی وجہ سے مقلدین میں مبالغہ کی خواہش اور حاملین کی کمی احتیاط یا اصول کی گرفت کے قابلیت کی کمی نے انھیں اس حد تک پہنچ جانے دیا ہو۔

مذہبی جزر و مد بہت غور کے قابل ہے کسی کا یہ فقرہ کہ مذہب ایک دریا ہے۔ جس میں جزر و مد ہوتا رہتا ہے۔ اس میں ترقی ہوتی ہے اگر اس کے عنان گیر ترقی کی طرف پہنچانے کے قابل ہوئے اور تنزلی ہوتی ہے اگر ذمہ دار لوگ اپنی عقل اور معلومات میں ضروریات سے پست درجہ کے ہوئے۔

کیسے لوگ گزر چکے تھے مشاہیر انبیاء مثل حضرت موسیٰؑ اور عیسیٰؑ گزر چکے تھے اور ایسے قوت دار اور عقل والے لوگ مثل داؤدؑ اور سلیمانؑ کے صفحۂ تاریخ پر اپنی ہستی کا نقش ڈال چکے تھے۔ مشرق میں بودھ اپنے گوشہ نشین فلسفہ کے ساتھ نمودار ہوا اور بہت جلد اس کے خیالات گوشہ نشینوں کے ذہن میں رہ گئے یا لوگ اپنے خیالات اولیٰ میں اپنی جگہ رہے اور بودھ کی نصیحتوں کو بھی دماغ میں اسی طرح رہنے دیا جس طرح اور بہت سی اچھی باتیں سنائی دیتی ہیں۔

مذہب کی غرض انفرادی اور قومی خصائل کی درستی ہے لیکن وہ کوئی ایسا وزن نہیں رکھتیں جو خصائل پر گہرا اثر اور علو قات الٰہی سے اچھا واسطہ قائم کرنے میں معین ہوں یا روزانہ معاشرت میں بودھ کے خیالات کسی طرح نمونہ ہو سکے ہوں۔

بودھ کے تعلیمی نقائص یا کوئی خدا دکھایا ہو جس نے دل کی گہری سے گہری تہ میں ایسی جڑ پکڑلی ہو کہ پھر کیسی ہی ہواؤں سے اس کا اکھڑنا ناممکن ہو گیا ہو۔ اچھا تھا کہ کنگفوزی نے ملکی اخلاق کی تعلیم کی اور میرے خیال میں چینی قوم کے لیے بودھ کے بہ نسبت زیادہ اچھی اور بکار آمد باتیں کہہ گیا اور بعض عملی مثالیں بھی بتا گیا۔ لیکن وہ بودھ ہو، کنگفوزی ہو یا لاؤزی یا تینوں کا مجموعہ اپنی تعلیمی حیثیت سے قوم کے عادات و خصائل کو کوئی ایسا مرکز نہ بتا گیا جس سے وہ تنہا یا مجمع میں یہ سوچ سکتی کہ ہم یہاں ایک ہیں۔ یہ ہمارا نقطۂ خیال اور یہ ہمارے جمع ہونے کی جگہ ہے۔

بے حقیقی کے فلسفہ میں شہیدانہ منزلت کا احساس ممکن نہ تھا مشکل سے سوچا جا سکتا ہے کہ بودھیت جس کا

ترجمہ موجودات کی بے حقیقی کا حقیقی اعتقاد ہو سکتا ہے وہ کسی اصول پر قربان ہونے کو شہیدانہ منزلت سمجھتی۔

نظامِ موسوی

موجودہ توریت میں حضرت موسیٰؑ کی زندگی اور عمل سے معجزات کا حصہ نکال دو، پھر اس کے بعد سمجھو کہ ہم بحیثیت ایک قوم کے انھیں کس نگاہ سے دیکھیں، تو تمھیں غالباً صرف اس سے تسکین ہوگی کہ انھوں نے رسوماتِ مذہبی کے بارے قوم کو اس طرح دبا دیا تھا کہ وہ اس سے علیحدہ ہونے کی فرصت اور سوچنے کا وقت نہ پاتی، اور مزید احتیاط کے لیے کاہنوں کو مسلط کر دیا تھا۔ اگرچہ کوئی اس کی ذمہ داری نہ تھی کہ سب ہارون کے ایسے ہو سکتے۔ یا عیلی کے بیٹوں کے ایسی دست برد سے معتقدین محفوظ رہتے۔ اور جب تم استقلال تلاش کرنا چاہو گے تو تمھیں محض یہود کے قوم گر کی ذات تسکین نہ دے گی بلکہ اس کے قریب کوئی بڑا پتھر اور رسی یا تسمہ بھی تلاش کرنا ہوگا۔ اور اگر تم کوئی قابلِ وقعت خدا ڈھونڈنا چاہو گے تو تمھیں ویسا خدا دکھائی دے گا جیسے یہود کی تاریخ ان کے خصائل سمجھاتی ہے۔ اور اگر تم اعتدال یا رحمتِ خداوندی تلاش کرو گے تو ضرور تمھیں اپنی تمام کوشش میں تھک کر بیٹھنا ہوگا۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ خدا نے اپنی خاص قوم یہود کو اس سلیے اپنی رحمت کے لیے کچھ دنوں تک مختص کر لیا کہ اُسے غیر قوموں کے ساتھ اعتدال حرام تھا۔

عیسوی انتہا پسندی اور مسیحی نظام

حضرت عیسیٰؑ ایک زمانہ تک یہودی تھے۔ جیسا خود پالئے لیث بھی خیال کرتا تھا۔ (یوحنا باب ۱۸ : آیت ۳۵) انھوں نے یہ بھی ظاہر نہ کیا کہ وہ کسی نئے مذہب کی بنا ڈال رہے ہیں۔ اگر ان کی تعلیم میں کوئی مخصوص شان تھی تو یہ کہ وہ تمام رسومات کو خفت سے دیکھتے تھے۔ یہ دوسرے وضع کی انتہا پسندی تھی یا فقہائے یہود کی تصنع اور ان کے پست صفات پر طنز کر رہے تھے۔ یہ پال تھے جنھوں نے یہودیت اور مسیحیت کی جڑنے والی زنجیر کو کاٹ دیا۔ چالیس سے زیادہ انجیلوں میں چار رہ گئیں اور وہ بھی مختلف نقطۂ خیال سے بیان ہوئیں جو بدیہی تناقض سے پر ہیں جس سے اس کا یہ اثر کہ وہ الہامی حیثیت رکھتی تھیں جاتا رہا۔ اگرچہ خود اسی میں کلام ہے کہ کسی نے حضرت عیسیٰؑ کے اقوال کو جمع کیا۔ خود اس مباحثہ نے کہ آیا انجیل غیر یہود اقوام پر پڑھی جائے یہ شبہ پیدا کیا کہ حضرت عیسیٰؑ کا مشن نہایت محدود تھا۔ اور موحدپن کے لحاظ سے مذہب عیسوی کی تثلیث پرستی نے اسے درجہ توحید سے گرا دیا۔ (دیکھو جیس کرائسٹ مصنفہ کونٹ گبلی ڈی رینیی)

یہودیت میں درجۂ شہادت

موجودہ یہودیت یا مسیحیت اپنے شہدا کا تذکرہ کرتی ہے۔ شہدائے یہود کے سمجھنے کے لیے میں توریت اور ملمین صاحب کی تاریخ یہود سے مدد لیتا ہوں۔ مجھے ان دونوں کتابوں سے درجہ شہادت کا ممتاز احساس نہیں ہوتا۔ جس سے یہود کے اپنے شہدا کے افتخار میں میں بھی شریک ہو سکوں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ان شہدا کی ابتدائی تاریخ اور ان کے عادات و خصائل کے متعلق حالات کی کمی ہے۔ دوسرے یہ کہ محض قتل ہو جانا درآنحالیکہ امتحان خیز حالتوں کی کمی ہے اور جس میں علم و ارادہ سے مقتول ہونے کے آثار نہیں ہیں، ان کے کسی ایسی صفت یا صفات کا معترف نہیں بناتا جس سے ان کا استقلال حق روی ایثار اور باطل سے کنارہ کشی یا حق پر قتل ہو جانے کی تصمیم پائی جاتی ہو۔ بجائے کسی اور لفظی موازنہ کے میں سفارش کروں گا کہ ان مدارج کے سمجھنے کے لیے ناظران واقعات کا انتظار کرے جو میں اپنے شہداء کے متعلق پیش کرنے والا ہوں۔

شہدائے یہود کی مثالیں

توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ اخی اب کی ملکہ ازبل نے انبیا کو قتل کیا۔ یا کوئی نبی دوسرے انبیاء کے قتل کی شکایت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ تواریخ کے چوبیسویں باب میں لکھا ہے کہ یہویدع کے بیٹے ذکریا پر خدا کی روح نازل ہوئی۔ ذکریا نے لوگوں کو تنبیہ کی لیکن لوگوں نے مخالفت کی اور پتھر مارے۔ اور یواس بادشاہ نے ان کے فرزند کو قتل کیا۔ مرتے وقت انھوں نے کہا کہ: "خداوند دیکھے اور انتقام لے"۔ بعد اس کے ارام کی فوج چڑھ آئی اور اس نے انبیا کو قتل کیا۔ اور جب وقت یواس زخمی تھا اس کے ملازموں نے یہویدع کاہن کے بیٹے کے خون کے سبب اس پر بلوہ کیا اور اسے اس کے بستر پر ایسا مارا کہ وہ مرگیا"۔

۱۶۸ برس قبل مسیح ...... رومی گورنر نے یہود کو ان کے فرائض مذہبی سے روکنا چاہا۔ ایک یہودی نے جس کا نام الیازر تھا مخالفت منظور نہ کیے اور تکلیفیں گوارا کیں۔ اس زمانہ میں سات آدمیوں نے اور نام پیدا کیے۔ جنھیں ان کی ماں نے غیرت دلائی تھی۔ شہر مودن میں اپلیس کے مقابلہ میں متاتھیس نے شجاعت سے جنگ کی یہ پہاڑوں میں رہتا تھا اور لوٹ مار سے دشمن کو ستاتا تھا۔ آخر یہیں مرگیا۔ جوڈا اس کا قائم مقام ہوا۔ اس نے اعلان کیا کہ بیاہے خوف زدہ اور باغ کے لگانے والے چلے جائیں۔ لوگوں نے علیحدگی اختیار کرنی شروع کی۔ پھر بھی اس کے ساتھ تین ہزار آدمی رہ گئے۔ اور ان سے اس نے سات ہزار کا مقابلہ کیا۔ جیسں ولد اناتس کو جو یروشلم کی تباہی کے قبل نوحہ پڑھتا تھا نہ صرف یہود نے مارا بلکہ رومیوں کے پاس بھی سزا دلانے لے گئے اور انھوں نے اس قدر مار پڑی کہ ہڈیاں نکل آئیں اور وہ کہتا ہوا مرگیا کہ: "ویل ویل ہے یروشلم کے لیے"۔ شہر جوٹاپاٹا کے محاصرہ میں جس وقت منجنیق دیواریں توڑ رہی تھی، الیازر ابن سامئس نے ایک پتھر سے منجنیق کا سر توڑ ڈالا اور جب آہنی سرزمین پر گرا فصیل سے کود کر اسے اٹھا لیا۔ اب تیر پڑنے لگے لیکن یہ فصیل کی طرف بڑھتا گیا۔ اور پانچ تیر جسم میں در آئے یہ ہمت کر کے فصیل پر چڑھا۔ رعشہ دار ہاتھوں سے اپنا تحفہ دکھایا۔ گرا اور مرگیا۔ اس جنگ میں نطیوس اور فلپ نے رومیوں کے دستے میں گھس کر کار نمایاں کیے۔ اس کے علاوہ تاریخ یہود اکثر ایسے منظر پیش کرتی ہے جن میں یہود نے اپنے ہاتھ سے مردوں اور بزرگوں کو اس لیے قتل کیا ہے کہ وہ دشمن کے ہاتھ میں نہ جائیں اور اس کے بعد خود کشی کی ہے۔ حضرت یسعیاہؑ کو دشمنوں نے آرا سے چیر ڈالا۔ یہ ممتاز واقعات ہیں۔ جنھیں باوجود تلاش کے میں تاریخ یہود اور تمام توریت سے منتخب کر سکا ہوں۔ اسی طرح مسیحیت کے متعلق یہ امر ممکن تھا کہ ایرانیوں اور رومیوں نے اپنے اپنے زمانہ میں ان پر مذہبی تشدد کیے ہوں۔ روم کی تاریخیں کہتی ہیں کہ نیرو، ڈومیشین، ترجن اور ڈائیو کلیشین نے اپنے اپنے زمانہ میں مسیحیوں پر تشدد کیے۔ مسیحی شہداء کے متعلق اڈورڈ گلاڈ کی یہ عبارت جو میں اس کی کتاب جیسں آف نزارتھ سے نقل کرتا ہوں اخذ نتائج میں معین ہوگی کہ: "یہ زیادہ حیرت خیز بات نہیں ہے کہ سختی اور دہائے جانے کے زمانہ میں سزائے موت دی جاتی ہو، حالانکہ یہ اس سے بہت کم تھا جس قدر شہدا کے مؤرخین لکھتے ہیں"۔

کفار نے مسیحیوں کو زیادہ قتل کیا یا مسیحیوںؑ نے غیر مسیحیوں کو

اس کے بعد یہی مؤرخ کوچ کی تاریخ روم سے نقل کرتا ہے کہ "اب یہ بات شبہ کے قابل نہ رہی کہ مسیحی مذہبی جوش نے مذہبی مخالفوں کے تاریک زمانہ میں جس قدر آدمیوں کو قتل کیا وہ اس تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ جس قدر مسیحی کفار کے ہاتھ سے ضائع ہوئے"۔

مصلوبیتِ مسیحؑ کے اسباب و حالت اور نتیجہ

مسیحیت کی سب سے بڑی شہادت پر بالفعل میں قناعت کرتا ہوں جو درجہ شہادت اور اس کی جلوگیر صفات کے سمجھنے میں مدد دے گی۔ واقعہ مصلوبیت ابن مریمؑ ہے جس صورت سے وہ موجودہ اناجیل میں پایا جاتا ہے۔

فسح کی عید کی وجہ سے ابنِ مریمؑ کی گرفتاری ملتوی رکھی گئی

ابن مریمؑ سے یہود بد دل ہوتے جاتے تھے یہاں تک کہ ان کے اس فقرہ نے کہ میں اس معبد (بیت المقدس) کو جو ہاتھوں سے بنایا گیا ہے توڑ کر تین دن میں ایسا بنا دوں گا جو ہاتھوں کا بنا ہوا نہیں ہے"۔ مخالفت کو دشمنی کی حد تک پہنچا دیا۔ لیکن ان دنوں فسح کی عید تھی۔ یروشلم میں لوگ جمع ہو رہے تھے، اس لیے عید ہونے اور لوگوں کے منتشر ہو جانے تک یہود نے ان کی گرفتاری ملتوی رکھی۔

مسیح کی افسردہ حالت اور دُعا

مخالفت کی خبریں ابن مریمؑ کو پہنچی تھیں اور یہ افسردہ دکھائی دیتے تھے۔ متی کے باب ۲۶ آیت ۳۹ میں ہے کہ: "موت کی سی حالت ہوئی اور منہ کے بل گر کر دعا مانگی کہ اے میرے باپ اگر ہوسکے تو یہ پیالا (موت) مجھ سے گزر جائے"۔ اور وہ جانکنی میں پھنس کے اور بہت گڑگڑا کے دعا مانگتا تھا۔ اور اس کا پسینہ لہو کی بوند کے مانند ہو کر زمین پر گرتا تھا"۔ (لوقا باب ۲۲: آیت ۴۴) دو یا تین مرتبہ یہ دعا مانگی۔

پوشاک مضحکہ اور الفاظ

جوڈا اسقریوط نے ساٹھ روپیہ کی لالچ میں انھیں گرفتار کرادیا۔ ابن مریمؑ کو قرمزی رنگ کا کپڑا پہنا دیا گیا۔ کانٹوں کا تاج سر پر رکھا اور ہاتھ میں ایک سرکنڈا دے کے لوگوں نے اپنے گھٹنے ٹیکے اور مضحکہ کیا کہ: اے یہودیوں کے بادشاہ سلام"۔

صلیب کے نویں گھنٹے مسیحؑ کے الفاظ

صلیب دیے جانے کے نویں گھنٹے مسیحؑ زور سے چلائے کہ: "اے میرے خدا میرے خدا کیوں تو نے مجھے اکیلا چھوڑا"۔ اور اس کے بعد "یسوعؑ نے پھر بڑے شور سے چلا کر جان دی"۔ مرقس میں یہی ہے۔ لوقا میں جزع و فزع کے الفاظ اگرچہ موجود نہیں ہیں لیکن چلانا لکھا گیا ہے۔

یہ واقعات بتاتے ہیں کہ نہ صرف حضرت مسیحؑ کے ذہن میں کوئی ایسی بڑی وجہ نہ تھی جس کے لیے انھوں نے پیشتر سے یہ مصمم ارادہ کرلیا ہو کہ ہم اس کے لیے جان دیں گے لیکن پیچھے نہ ہٹیں گے۔ اور نہ انھیں یہ اس کے مفر تھا کہ یہود کی عام آواز اور فتوے کو قبول کرتے۔

اِلزام

یہود کچھ تو اس وجہ سے مخالفت کرتے تھے کہ وہ انھیں مذہب یہود کی تخفیف کرتے ہوئے دیکھتے تھے اور کچھ اس لیے مخالف تھے کہ انھوں نے انھیں ان کے مذہبی وقار سے گرا دینا چاہا تھا۔ اور ان دونوں نے مل کر رومی گورنر پائے لیٹ پر اس کا زور دیا کہ اپنے کو "یہودیوں کا بادشاہ" کہنے والا باغی ہے۔ اس لیے کہ یہودیوں کا بادشاہ قیصر روم ہے۔

ابنِ مریمؑ سے پائے لیٹ کا سوال

جب پائے لیٹ نے ابن مریمؑ سے پوچھا کہ: "کیا تو یہودیوں کا بادشاہ ہے"۔ تو اس کا جو جواب دیا گیا اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ ابن مریمؑ نے نہ اقرار کیا، اور نہ انکار کیا۔

مفید موقع پر اناجیل کا اختلافؐ اور گول جوابؐ

متی میں ہے کہ: "تو کہتا ہے"۔ مرقس میں ہے: "میں ہوں"۔ لوقا میں ہے: "اگر میں تم سے کہوں تم یقین نہ کرو گے"۔ یوحنا میں ہے کہ: "یہ بات تو کہتا ہے یا لوگوں نے تجھ سے کہی ہے"۔ ایسے گول جواب کی ضرورت بجز اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ اقرار ملزم ٹھہراتا اور انکار معتقدین پر سے اثر زائل کر دیتا۔

تسلیم و رضا کی لغزش

موت کے آثار دیکھ کر نہ صرف ابن مریمؑ میں افسردگی پیدا ہوئی بلکہ موت کی سی حالت طاری ہوئی، اور انھوں نے اس کے ٹل جانے کی بھی دعا مانگی۔ ہم نہیں سوچ سکتے کہ یہود یا رومی حکومت ان کے مشن کے متعلق اگر کچھ شرائط پیش کرتی تو یہ کس حد تک منظور کرتے اور کس حد تک اپنی روش پر مصر رہتے۔ عین مصلوبیت کی حالت نے ان میں اس درجہ لغزش پیدا کی کہ یہ سوال کر سکتے کہ: "میرے خدا تونے مجھے کیوں چھوڑ دیا"۔ یا جزع و فزع کی حالت طاری ہوتی۔

مصلوبیت مسیح بڑی باتؐ نہ سمجھی گئی

یہ حالتیں تھیں جس سے مسیحیت کے اس پہلے شہید کے درجہ استقلال کا قابلِ تعریف اندازہ نہیں ہوتا، اور نہ بجز یہودیوں کے بادشاہ کے خطاب کے کوئی وجہ شہادت سمجھ میں آتی ہے۔ انھوں نے شہادت کا ارادہ نہیں کیا۔ شہادت ان کی طرف دوڑائی گئی۔ اس وقت کے مؤرخین مثل جوزیفس وغیرہ کے کہتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کے واقعہ نے لوگوں پر کوئی اثر نہ کیا۔

حضرتؐ موسیٰؑ کے استقلال کی جنبش

مسیحؑ کے پیش رو حضرت موسیٰؑ میں بھی اپنی قوم کی بغاوت اور سرکشی سے اس درجہ تزلزل پیدا ہو گیا تھا کہ وہ تائید ایزدی کے وعدہ میں مشتبہ ہو جاتے جس کی پاداش میں انھیں چالیس برس بیابان میں سرگردانی ہوتی اور پھر بھی وہ باز رکھے جاتے کہ دودھ اور شہد کے ملک میں وہ خود داخل نہ ہوں بلکہ ایک بلند پہاڑ سے اس جگہ کا نظارہ کر لیں۔

شہدائے عالم اور شہدائے کربلا کا فرق

عالم میں اگرچہ اس وقت تک ایسے واقعات گزر چکے تھے جس میں حوصلہ، امید یا مجبوری شجاعت پر آمادہ کرتی۔ میدان جنگ کسی کا بڑا قتل عام دیکھے۔ کوئی قتل کرے اور کوئی مقتول ہو، اس میں کوئی بہ نسبت دوسرے کے ممتاز ہو اور شجاع سمجھا جائے۔ لیکن ان تاریخی شجاعوں کے کارنامے جو ان دشواریوں کے سامنے کام نہیں کر رہے تھے جن کے تذکرے آنے والے ہیں کوئی غیر معمولی نظر کے محتاج نہیں ہیں اور یہ تو بہت دور ہے کہ ان کی شجاعت اور متعلق صفات با اخلاص اس وقت ظاہر ہوئی ہوں جس وقت نہ صرف علائق دنیا سے بیزاری کے آثار ملتے ہوں بلکہ فتح کے بعد بھی آسائش کی کوئی امید نہ ہو۔ یہ اس وقت بھی جان دینے پر آمادہ ہوں جس وقت انھیں جان بخشی اور انعام کا یقین دلایا جاتا ہو۔

تاریخ عالم کے مشہور کارنامہ شجاعت

تاریخ قدیم میں شجاعت کا سب سے مشہور کارنامہ لی آینڈلس کا ہے۔ جس وقت ژرکزین (خسرو) نے یونان پر بیس لاکھ سپاہیوں سے حملہ کیا۔ مغرور شہنشاہ کی فوج ایسے تنگ راستہ سے گزرتی جاتی ہے جس کی ایک طرف پہاڑ اور دوسرے طرف سمندر تھا۔ شاہ اسپارٹا نے اس ملک افگن فوج کا استقبال کیا۔ یہاں تک کہ تھرماپولی کے درہ میں اس کے ساتھ صرف تین سو آدمی بچے۔ اور ایرانی فوج ان کی زندگی تک آگے نہ بڑھ سکی۔ بلکہ یہ فوج ان محبان وطن کی لاشوں پر سے ہوکر گزری۔ تاریخ روم میں شجاعت کی مثال ہوریشس کوکلس کی ہے جس نے ٹائبر کے پل پر پوسنیا کی فوج کو تنہا روکا یہاں تک کہ پل توڑ دیا گیا۔ یہ بھی دریا میں گرا لیکن تیرتا ہوا کنارہ پہنچ گیا۔ قوم نے قدر کی۔

موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے مخلصین

تمام توریت کا ملاحظہ یہ نہیں بتاتا کہ حضرت موسیٰ کی تمام قوم گری نے ان کے لیے کچھ ایسے مخلصین تیار کیے ہوں جن کی ذہن میں ان کی اطاعت حکم جان سے زیادہ عزیز ہو، بلکہ ان کی قوم نہ صرف ذرا ذرا سی بات پر بغاوت پر آمادہ رہتی ہے بلکہ بار بار خود حضرت موسیٰ خدا سے بھی شکایت کرتے ہیں اور اپنے منصب سے استعفا پیش کرتے ہیں۔ اور اسی طرح حضرت عیسیٰؑ اپنے ظاہر اضطراب کے وقت پیٹر کے ایسے مشہور حواری کی وفاداری کے متعلق اس کے منہ پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ: "میں تجھ سے سچ کہتا ہوں کہ تو اسی رات کو مرغ کی بانگ دینے کے پہلے تین بار میرا انکار کرے گا"۔ (متی ۲۶ باب: (۳۴)

زندگی میں معتقدین کے اخلاص کی یہ حالت آئندہ زمانہ کے ایسے واقعات سے کہ یہود یا مسیح کسی ظالم بادشاہ کے حکم کے شکار ہوئے اور دفعتہ قتل ہوگئے یا یہ ذکر بھی کہ انھوں نے زحمتیں گوارا کیں (جو بہ نسبت مسیحی تاریخ کے تاریخ یہود میں زیادہ ممتاز ہے) لیکن تبدیل مذہب نہ کیا۔ اس لحاظ سے قابل موازنہ نہیں ہے جس طرح تمام فوج میں چند سپاہیوں کا میدان جنگ میں قتل ہو جانا کوئی مخصوص ہیئت نہیں ہے۔ یہ حالت محض اس تعریف کی مستحق ہے کہ وہ میدان جنگ میں تھے اور ان کا موقع بھی ویسا ہی تھا جیسا دشمن کا وہ بھی اپنے مقابل دشمن سے حوصلے نکال سکتے تھے۔ اور دشمن بھی اسی تعداد میں مارا جاسکتا تھا جس قدر ان کے آدمی مقتول ہوئے۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ محض فوج میں قتل ہو جانا یا کسی ظالم بادشاہ کے حکم سے زندگی سے سبکدوش کر دیا جانا باوجود اس کے کہ اس حالت میں ان سے قابل تعریف امورات سرزد ہوئے ہوں۔ ان واقعات کے سامنے بے حقیقت ہیں جن کا ذکر حسینؑ کی سوانح عمری سے متعلق ہے۔ یہ حالتیں انھیں مخصوص افراد عالم کے لیے تھیں اور ان کی تعریف یہ تھی کہ ان مخصوص مواقع پر انھوں نے بہترین صفات کو بڑی پختہ حد تک دکھایا جن حالتوں میں ان صفات کا دکھایا جانا اگر ہو بھی تو نہایت شاذ ہوگا۔

مذہب زردشتی میں شہادت کی معدومیت

مذہب زردشتیت نے نہ صرف شہادت کے اعلیٰ مفہوم کو کبھی نہ دکھایا بلکہ ایسے زمانہ میں بھی جب کہ عربوں یا کبھی کی حکومت یا غیر مذہب قوم نے حملہ کیا۔ ایرانیوں میں بجز حاکم قوم کی کوشش کے جو اپنے اختیار کے لیے لڑ رہی تھی، مذہبی قوت کے کوئی آثار معلوم نہ ہوئے اور نہ کسی نے اپنے کو مذہب پر قربان کیا۔ یہ بھلا معجزہ ہوگا کہ آتش پرست اور سب کچھ پرست بغیر اس کے کہ فاتحین کے مذہب کو اپنے مذہب سے زیادہ صاف قوت دار اور قابل عمل سمجھتے

ہوں، ملک کے ساتھ اپنے گزشتہ مذہب کو بھی بلا وجہ چھوڑ بیٹھے ہوں۔ زرد شتیت اس کے آثار پیشتر سے ظاہر کرنے لگی تھی کہ اسے بجائے اس ایزد اور اہرمن کے محبت اور خوف کے جسے سیموئل لینگ کا ایسا کوئی زمانہ حال کا حامی اصول خیر و شر کا فلسفہ بتاتا ہے، ایک صاف صاف مرکز اعتقاد کی ضرورت ہے۔ اس کا ثبوت اس وقت ملے گا جب ایرانی بیت المقدس پر قبضہ کرتے ہیں اور اس میں کسی دیوتا کو نہیں دیکھتے اور آخر میں نہ صرف لوٹی ہوئی چیزیں واپس کراتے ہیں بلکہ اس کے قیام کے لیے بھی مدد کرتے ہیں۔

اسلام کا خدا اور معبد

اور جب اس کا وقت آیا کہ "خدا" یا بسیط کل یا عالمگیر ذات کی پرستش کسی خاص گھر میں مقید نہ رکھی جاتی بلکہ اس کی عبادت کا بہترین مندر قلب انسانی ہوتا اور ہر جگہ وہ ہر جگہ اپنا عجز و انکسار ظاہر کر سکتا تو عالم نے خدا اور اس کی عبادت کو نہ صرف مندر اور پوجاریوں سے آزاد دیکھا بلکہ آزادی سے اس کے غلامی کا خلوص پیدا ہوا اور اس کے بعد خدا کے دین میں لوگ فوج فوج داخل ہونے لگے۔ بہ استثناء ان صورتوں کے جب کہ اس فطری عالمگیر مذہب کی راہ میں مندر اور پوجاریوں کی ذاتی منفعت حائل ہوگئی ہو یا زمانہ حال میں نوعی اُصول نے اپنی تمام ایجادیں اس کے رد کرنے میں صرف کر دی ہوں۔

حضرت موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی ابتدائی کوشش کا درجہ

حضرت موسیٰؑ کو ایک بڑی اور بے کاوش ابتداء یہ ملی تھی کہ انھیں ایک ایک اینٹ جوڑنی نہ پڑی تھی۔ بلکہ ان کا فرض یہ تھا کہ وہ قوم جو کبھی حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں محسن مصر کی قوم بھی جاتی تھی اور جس پر کچھ زمانہ کے بعد حاکم قوم نے مظالم اور تشدد کیے تھے انھیں سرزمین مصر سے نکال لاتے اور ایک ایسی جگہ انھیں دیتے جہاں وہ اپنے رسومات ادا کر سکتی۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کو کچھ تو اس وجہ سے زیادہ خوف اور دشواری نہ تھی کہ وہ کوئی خاص اصول مذہب نہ قرار دے رہے تھے اور نہ کسی تعریف کا اعلان کرتے تھے بلکہ مبہم نصیحتیں تھیں جس کے کہنے اور سننے کا ہر شخص کو حق حاصل تھا۔ اگر انھوں نے فقیہ یا کاہن فرقہ کو اپنا مخالف نہ بنایا ہوتا یا بیت المقدس کے متعلق وہ کچھ نہ کہا ہوتا جو کہا یا خدا کی حکومت کا ویسا ترجمہ کیا ہوتا جیسا حال کے یکی مؤرخین کرتے ہیں اور ضمناً اپنے متعلق "یہودیوں کے بادشاہ" کا حوصلہ خیز اور ملکی حیثیت سے مشتبہ فقرہ قبول یا ظاہر نہ کیا ہوتا تو انھیں کوئی دشواری کا سامنا نہ ہوتا۔ یہود کو اس سے کوئی مخالفت نہ ہوتی کہ انھوں نے مشتبہ اطوار کی عورتوں کو بخش دیا، یا انھیں اس درجہ رسوخ عطا کیا کہ وہ تیل یا عطر ملتیں اور ان کی زلفیں ان کے پاؤں پر لہراتی رہتیں۔ جب کہ خود یہود زہرہ کی دل فریب پرستش اور عشارت کی رقاص کنیزوں کے گردیدہ ہوگئے تھے۔ اسی طرح انھیں نظریہ محبت سے کوئی مخالفت نہ ہوتی۔ اچھا تھا کہ کوئی شخص کم سے کم بنی نوع انسان کے سامنے ہر روز ہزار مرتبہ محبت محبت کہا کرتا۔ عام اس سے کہ وہ اپنے حلقہ معتقدین میں محبت پیدا کر سکتا، یا خود اپنی ذات سے اخلاص میں کسی کو راسخ کر سکتا یا نہ کر سکتا۔ حضرت مسیحؑ کو ایک اور آسانی یہ تھی کہ وہ رومیوں کے حکومت کے زیر سایہ اپنی تعلیم پھیلاتے تھے۔ جو ملکی حیثیتوں سے یہود کے سخت دشمن تھے اور خود یا قیصر روم کا بت پوجتے تھے یا اپنے اور بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ رومیوں کے لیے برابر تھا کہ یہودی مذہب کی تلقین کی جاتی، یا دین مسیحی کی، درآنحالیکہ دین یہود سے علیحدہ ہو کر دین مسیحی میں آنا ایک قوی جماعت کا شکستہ ہونا تھا۔ اور اس لیے

رومیوں کے مفید تھا۔

قوموں میں اپنے مشاہیر کی عزت

واقعاتِ عالم یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ اہلِ مصر اپنے محسن یوسفؑ اور ان کے باپ یعقوبؑ پر بھی ستر دن تک روتے اور لاش میں خوشبو بھرتے ان کی فطری موت پر غم کرتے۔ اہلِ چین آج تک کنگفوزی کی یادگاریں قائم کرتے اور اس کی اولاد کی عزت کرتے۔ اسی طرح اہلِ رُوم اور ان کی عورتیں اپنے کونسل بروٹس پر ایک سال تک اس لیے غم کرتیں کہ اس نے لکرشیا کی نقص خوردہ عصمت کا انتقام لیا تھا۔ فرانسیسیوں نے ایک زمانہ کے بعد نپولین کے باقیات کو سینٹ ہیلیا سے منگا کر خاکِ وطن میں دفن کیا، اور ایک عالی شان یادگار قائم کی۔ انگلستان اپنے مشاہیر کو ویسٹ منسٹر ابے میں دفن کرتا ہے۔ بنی اسرائیل موسیٰؑ اور ہارونؑ کا ایک مہینہ تک غم کرتے۔

نبی عربیؐ کی ابتدائی مشکل

اب اسلام کی باری تھی۔ نبی عربیؐ کو حضرت موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی سی آسانیاں نہ تھیں بلکہ خود ایک ایک اینٹ جمانی تھی۔ ایسی جگہ جہاں صابئین، کاہن، دین مسیحی کے علماء اور کفار تھے۔ اور ان کے پادریوں کاہنوں اور پوجاریوں کی مرتب فوج مخالفت کے لیے آمادہ تھی۔ کسی ایسی قوم کے سامنے اسلام پیش کرنا نہ تھا جیسی اسٹریلیا، پولینشیا یا امریکہ کے قدیم اقوام کی حالت تھی جہاں کسی مستند مذہب کے گزر کے آثار نہ تھے۔ اور نہ حکومت کے مذہب کی حیثیت سے سامنے لایا گیا تھا۔ لیکن مشیت ایزدی کا اقتضا یہی تھا کہ اسلام ان بڑے اور مستند مذاہب کے دانتوں کی بیچ سے نکلتا ان کی آنکھوں کے سامنے اس کا آغاز ہوتا، اور بے پردہ اپنے لیے قدم اٹھاتا۔ غالباً اس لیے کہ اگر ہندوستان میں ابتداء ہوتی تو ایک زمانہ تک محض اہلِ ہند سنتے اور دیکھتے۔ اگر چین میں ہوتا تو صرف بودھوں کے لیے مفید ہوتا یا فلسطین میں نقابتِ اسلام محض یہود کے لیے ذریعۂ ہدایت ہوتی یا کسی ایسی جگہ جہاں محض مسیحیت تھی اسلام کا اعلان صرف مسیحیت کے لیے ہدایت بھی جاتی بلکہ اسلام کا مشن یہ تھا کہ ایک وقت میں البتہ ان میں کے قریب کل مذاہب نقابت اسلام سنتے اور اپنی قوتیں اس کے سمجھنے یا مخالفت میں صرف کرتے۔

اسبابِ عروجِ اسلام

اسلام کے موافق کیا تھا؟ عرب کی اچھی خصوصیات قومی، اسلام کی فطری سادگی، گزشتہ انبیاءؑ ہادیین اور صالحین کی ہدایت کا اقرار، ابہام سے کنارہ کشی، عالم اور اس کے جذبات کو اپنی دونوں جسمانی اور عقلی آنکھوں سے دیکھنا نہ کہ خیالی جالوں سے آڑ کرنا۔ مساوات اپنی ہر شاخ میں جو اخوت اسلامی کی زبردست بنیاد ہوئی، امتیاز درجہ ترقی صفات میں جس سے خدمات اور تذکیہ نفس میں ناقابل الزام رقابت پیدا ہوئی اور حیرت خیز سرعت سے صفات نے ترقی کی۔

سرچشمہ

خدا اور اس کے رسولؐ پر "بھروسا" "کثرتِ ظن" سے پرہیز زبردست برادرانہ معاشرت اور درگزر، سادگی، انصاف، بے شمار نہروں سے یہ چند نام لیے گئے جو اس سرچشمہ سے جاری ہوئیں۔ جسے ہم "رحمۃ للعالمین" کہتے ہیں۔ یہ نہریں اسی کی زبان اور عمل سے جاری ہوتی تھیں۔ ان باتوں نے نہ صرف رائٹ آنریبل سید امیر علی صاحب کے ان بہترین لفظوں میں کہ "اوس اور خزرج اپنی کہنہ خونریز لڑائیوں کو اسلام کے برادرانہ لطف و محبت

کے جذبہ میں بھول گئے"۔ اثر کیا، بلکہ قوم کی قوم ایک تھکہ ہو گئی ایک ٹھوس جسم بن گئی جس میں اخلاق اور اخلاص اور محبت کی حقیقی بو تھی۔ سرفروشی جان نثاری خلوص محبت ایثار نفس ان سے ظاہر تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ: "من جان زبرائے دوست می دارم دوست"۔ اُستاد کی عظیم الشان ذات ہر شخص کی ذاتی قابلیت کے لحاظ سے کم وبیش ہر ایک سے جھلک رہی تھی۔ ایک معجزنما جلوہ تھا جو عالمگیر ہوتا جاتا تھا۔

ذاتِ رسالتؐ اور اسؐ کے عناصر

اس نے کام شروع کیا جو عربوں کے شریف ترین اور ممتاز قبیلہ کا ایک فرد تھا۔ جس نے امین کا امتیاز حاصل کیا۔ جس نے نصب حجراسود سے قبائل عرب کو ایک رکھا، اور اختلاف نہ ہونے دیا، اور جو ملکہ عرب کا شوہر ہوا۔ اس نے کام شروع کیا جس کا خاندان ان عربوں کا پیشتر سے روحانی پیشوا تھا، جو ان کے اگلے محسنوں اور حاکموں کا فرزند تھا۔ کام اس وقت تک نہ شروع ہوا جب تک اس کے انداز، رفتار، گفتار اور ذات میں وزن اور کشش نہ پیدا ہو گئی۔ اس وقت تک کچھ ایک لفظ آئندہ کے متعلق زبان سے نہ نکلا جب تک حرم کی چٹانوں نے اسے خاموشی میں یہ صدائے بازگشت نہ سنائی کہ اٹھ اور ہدایت کر۔ اب نہ مکہ اور اس کے مشرک روک سکتے تھے اور نہ طائف کی سیلیاں اس کی آواز پر بلند ہو سکتی تھی، عورتوں کی ہجا، پختہ مغز بوڑھوں کی صلاحیتیں، جوانوں کی ہیبت، بچوں کے پتھر، ظریفوں کا تمسخر اس کے ارادہ اور مسلسل استقلال کے سامنے خشک پتیاں تھیں جو اس وقت کھڑکھڑاتی ہیں جب ہوا چلتی ہے۔

مُسلمانؐ اور انؐ میں شجاعت کے اسبابؐ شجاعت کا مرکز

دنیا کہہ چکی ہے کہ مُسلمان ایک شجاع قوم ہے۔ اس لیے کہ اس میں اس کے خیال میں۔ اس کی ترکیبؐ میں وہ عناصر ساری ہو گئے ہیں جو کسی قوم کو شجاع بنا سکتے ہیں۔ لیکن یہ تمام صفات بغیر نبی عربی کی حیرت خیز اور مجموعہ صفات بلکہ مظہر صفات ذات کے ایک وہ بے روح کہانی ہوتی جیسے کتاب کے کیڑے سنتے اور کھاتے رہتے انھیں اس کا احساس نہ ہوتا اور نہ مسلمانوں کو اس جائز افتخار میں شرکت کا موقع ہوتا کہ ہم میں ہمارے خون میں ان آباء و اجداد کا اثر ہے جنھوں نے رسُولؐ کے ذات اقدس کی اِستقلال اور شجاعت کو محسوس کیا تھا، اور اثر لیا تھا۔ تم نے پڑھا ہے کہ جس وقت لشکرِ اسلام میدانِ جنگ میں نہ رہ سکتا تھا زندہ اسلام (رسول) اس وقت بھی اپنی جگہ نہ چھوڑتا تھا، اور کسی تنہا سرفروش کی جان نثاری کا ان الفاظ سے اِعتراف کرتا تھا کہ: "لا فتی الا علی لا سیف الا ذوالفقار" اسی جگہ نہ چھوڑنے کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ وہ جو دشمن کے دباؤ سے ہیبت زدہ ہو کر جگہ چھوڑ دیتے تھے۔ پھر اس عظیم الشان ذات کے اِستقلال کو دیکھ کر کھنچتے تھے۔ اور اِستقلال فتح پاتا تھا۔ خصوصًا جب کہ اِستقلال کے عناصر خدا پر بھروسا، سچائی اور ہدایت تھی۔

مُسلمانوں کے شجاعت کی تاریخ

سوچو اسلام کی حالت اور اس کے سپاہیوں کے سامان کو کبھی دشمن کی تعداد کے آدھے بھی نہیں ہیں۔ کبھی چند تلواریں ہیں اور چند صاع کھجوریں تمام لشکر کے خوراک کا سامان ہیں۔ دشمن وزنی خود اور زرہوں سے اپنے جسم کو بچا رہا ہے، یہ چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے اس کے سامنے جاتے ہیں۔ اس صورت سے جاتے ہیں کہ نہ زرہ پوش کو اپنے فولاد میں ڈوبے رہنے کا

خیال آتا ہے اور نہ یہ دکھائی دیتا ہے کہ ہمارے حریوں کو دشمن کا برہنہ جسم دکھائی دے رہا ہے۔ نہ انھیں خوف اور اندیشہ ہے کہ ہم اپنے کو نیزوں کی انی اور تلواروں کے بڑے منہ چڑھانے جارہے ہیں۔ مرنے کی خوشی تھی۔ مرنے کی دعائیں مانگتے تھے نہ مرنے پر افسوس کرتے تھے۔ بقول ان میں سے کسی کے کہ: "ہم موت کو اس سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں جس قدر تم زندگی کو عزیز رکھتے ہو"۔ موت سے شریفانہ نفرت تھی۔ ایسی زندگی حقیر تھی جو ان کی بڑی وجہ کی راہ میں حائل ہو کہ کوئی خوف یا اپنی محبت پیدا کرے۔ شراب کا غناٹا انھیں میدان میں نہ لے جاتا تھا، اور نہ کوئی تنخواہ والے افسر تھے جو سپاہیوں کو طمنچوں کے خوف سے میدان میں قائم رکھتے ہوں۔ ہم لوگ جو دہریت اور مادیت کی لہروں کے طمانچے کھاتے رہتے ہیں ممکن ہے کہ ان کے اس جوش اور اخلاص پر اپنے دانتوں کو ہوا کھلادیں لیکن سوچنا ہوگا کہ جان دینا آسان نہیں ہے۔ وہ لوگ دیکھتے تھے اندازہ کرتے تھے احساس کرتے تھے اور پھر بھی اپنے جوش پر قائم رہتے تھے ان کا جوش پلک جھپکانے کے ترازو پر تولنے کا نہ تھا، ایسا جوش تھا جس میں شکستگی نہ تھی۔ جوش لذتوں کے حصول کے لیے نہ تھا، اس لیے تھا کہ شارع کے حکم کی اطاعت اور اسلام پر قربان ہو رہے ہیں۔ اس نتیجہ کے لیے کہ خدا کی خوشنودی حاصل ہوگی۔ نام و شہرت دنیاوی قدر دانی اور اصول منفعیت کا گزر نہ تھا۔ کوئی رومی فاتحانہ محراب کی صورت نہ جانتا تھا۔

رسولؐ کی ذاتؐ سے محبت

یہ ذات اقدس تھی جو یاسر کو اس وقت بھی پیاری تھی جس وقت پشت گرم ریت پر جھلس رہی تھی اور سینہ پر بھاری پتھر رکھا تھا سمیّہ زوجہ یاسر ہزاروں تعریفوں کی مستحق تھی کہ ان کے صبر اور استقلال میں ناقابل برداشت اذیتوں سے لغزش نہ پیدا ہوئی، عمارہ بن زیاد، عباس بن عبادہ، غسیل الملائکہ، ابن جبیر، نسیبہ، خبیب، زید بن وشنہ، زید بن حارثہ، اور جعفر بن ابی طالب ہیں جو اسلام کے بڑے دل والے سرفروشوں کی فہرست میں سے لکھ دیے گئے ہیں۔ لوگ تھے عورتیں تھیں۔ جنھیں اپنے اعزا کی لاش پر کھڑی ہونے کی اس لیے مہلت نہ تھی کہ انھیں رسولؐ کو پہلے دیکھنا سب سے زیادہ عزیز تھا۔

اُمّت پر رسولؐ کی پدرانہ توجہ

وہ پدرانہ توجہ جو رسولؐ کو اپنی اُمّت سے تھی اس نے اُمّت کے افراد میں اس کا اثر کیا، اور اگرچہ فوج سے بھاگنے والے یا رانہ ظاہر کر دینے والے کے لیے کوئی کورٹ مارشل نہ تھا۔ لیکن واقف ہونے پر بیٹا، بیٹی، بی بی، عزیز اور دوست سب کے سب اسے جماعت سے عاق کر دیتے تھے جب تک اس کے دل میں توبہ کا ایسا کامل جوش نہ پیدا ہوتا تھا کہ خدا اور اس کا رسولؐ اسے معاف کرے۔ معافی کے بعد اس کی خلاف ورزیاں محو تھیں وہ پھر جماعت کا ویسا ہی فرد ترکیبی ہو جاتا تھا جیسا پہلے تھا۔ توبہ اس کے لیے شوب ہو جاتی تھی۔ وہ ماں کے پیٹ سے دوبارہ پیدا ہوتا تھا، اور مُسلمان لذت معافی کو محسوس کرتے تھے۔

غُربت اور امارت

اس طرح خدا کی حکومت اپنے سفیر کے ذریعہ سے جڑ پکڑتی جاتی تھی۔ نہ غربت ذلت کی چیز تھی اور نہ امارت مایہ ناز بھی جاتی تھی۔ اگر غریب کو صبر اور قناعت کی تعلیم دی گئی تھی تو امیر کو کبر و نخوت سے روکا تھا۔ غریب کو اگر سوال کی ذلت سے منع کیا تو امیر کو اپنے غریب بھائیوں کے حقوق یاد دلائے تھے۔ روسا اور شرفائے قوم کا اگر لحاظ کیا جاتا تھا تو انھیں یہ اجازت نہ تھی کہ کیسی ہی ذلیل حالت کے مُسلمان کا دل دکھائیں۔

قوتِ جذب پیدا ہوئی

ان باتوں نے دوسری جماعتوں کو کھینچا۔ انھیں ساخت قومی کی ایسی حیرت خیز کل چلتی ہوئی معلوم دی جو ان کی سمجھ سے بہت بالاتر تھی۔ وہ سب کچھ سمجھ جاتے لیکن اس نور کے دھوئے ہوئے دل کے اثر کو بغیر حلقہ اطاعت میں داخل ہوئے کیونکر محسوس کرتے جو ان مسلمانوں پر سایہ فگن تھا اور جس خرادپر اتر کر لوگ وہ کسی جماعت اور آب وہوا کے کیوں نہ ہوں دفعۃً رسومات پیشین کی کیچلی اتار کر نئے دین کی روح سے گرما گرم معلوم ہوتے تھے۔

فطری ولولہ

تم پڑھ چکے کہ دشمن اس قدر اذیتیں نہ صرف ہادی برحق کو پہنچا چکے تھے جس قدر عداوت کا قیاس اور کوشش ممکن تھی بلکہ مختصر سی اسلامی جماعت کے ساتھ چھیڑ بھی نہ حبشہ میں اٹھا رکھی اور نہ مدینہ میں۔ بعض اوقات تو موقع اس قدر نازک ہو گیا کہ یہود اور مشرکین میں پس جانے کا کوئی شبہ نہ رہ گیا تھا۔ پھر بھی تم نے دیکھا کہ حتی الوسع درگزر سے کام لیا گیا۔ اور وہ رعایتیں کی گئیں جس نے خود دشمن کو حیرت میں ڈالا۔ اور اسی مصلح بنی آدم نے بڑھوں بچوں عورتوں مریضوں اور اسیروں سے تعرض نہ کرنے کا پہلا اعلان کیا۔ تم سوچ سکتے ہو کہ شیردل حضرت حمزہ جنھوں نے وجہ اسلام کو اپنی شجاعت سے کیسی مدد دی ان کی عبرت خیز شہادت رسولؐ کو انتقام پر آمادہ کر سکتی تھی۔ لیکن ہمارا رسولؐ شیوع اسلام کے لیے آیا تھا (تلوار کرنے) یا سانس کو بھوسے چھڑانے نہیں آیا تھا مثلہ کرنا یا آگ سے جلا دینا شدت سے روکا گیا۔ اگرچہ وہ کیسا ہی دشمن کیوں نہ ہو۔ اسلام کا کیسا ہی دشمن اقرار اسلام پر امن میں تھا۔ اگرچہ اسلام کی آغوش میں بہت سے ایسے داخل ہو گئے تھے جو آئندہ اس کے سخت ترین دشمن ثابت ہوئے۔ انھوں نے اس کے امن کو اس کے خلاف فساد قائم کرنے کا وسیلہ بنا دیا۔ یہاں تک کہ ۹ھ کے مختلف وفود نے یہ ثابت کر دیا کہ خداوند تعالیٰ نے حجاز اور عرب میں عام اشاعت اسلام کے لیے ہر شخص میں ایک فطری ولولہ پیدا کر دیا ہے۔ اسلام لانے والے فخر کر رہے تھے کہ خدا نے اسلام سے ہمیں عزت دی۔ دیر کرنے والے دوڑ رہے تھے کہ ہم نے وقت ضائع کیا۔ ہمارے ہادیؐ کی ساخت قومی اور درستی خصائل کے اس معجزے کی تخفیف کرنا فطرت کے معجزے اور قانون کا انکار ہوگا۔ ایسا معجزہ جسے دنیا کے تمام مدبر قوم گر اور فلسفی سر جوڑ کر بھی نہیں دکھا سکتے۔

رسولؐ کے بعد اُمت کی عنان گیری کا سوال اور اس کی وجہ

لیکن ہمیشہ ذہن میں آنے والا یہ سوال باقی تھا کہ رسولؐ نے اپنے بعد کے لیے کیا انتظام کیا۔ اور اُمت کو جو ایسی سرکش قوم سے مرکب تھی جسے قتل غارت شراب، زنا اور انتقام سے کام تھا۔ اس کے جذبات کو لگام دینے اور اس قدر تنظیم اور درجہ تہذیب کی محافظت جو اسے حاصل ہو چکی تھی کس ذات کے سپرد کی۔ اور کسے ان کا آئندہ رہنما مقرر کیا۔ یا یہ کیا کہ مہاجر اپنے میں سے اور ان میں کا ہر قبیلہ اپنا اپنا سردار اور انصار اپنے میں سے اور اپنا اپنا سردار مقرر کریں۔ اور اسلام کی یک جہتی قبل الاسلام افتراق پر منتج ہو۔

ہارونُ الرشید اور اس کا عمل

صواعق محرقہ میں ابوبکر بن عیاش کی زبانی ہارونُ الرشید کو سمجھا دیا گیا ہے کہ خدا اور رسولؐ نے سکوت کیا لیکن اس حیرت خیز سکوت نے شاید کچھ دیر

کے لیے اس پر مضحک سکوت طاری کیا ہو لیکن اس سے خود رشید کو کوئی نصیحت نہ ہوئی بلکہ اس نے کمال اہتمام سے اپنے بعد امین اور مامون کے متعلق وصیت جائز اور ضروری سمجھی۔

رسولؐ کے الفاظ جو اپنے بعد کا لحاظ سمجھاتے ہیں

رسولؐ کے یہ خیال ہم تک پہنچے ہیں کہ کبھی اُحد میں اور کبھی بقیع میں اصحاب سے کہتے ہیں کہ: "نہیں معلوم میرے بعد کیا کرو گے"۔ فرماتے ہیں کہ: "میرے بعد فتنے ہوں گے"۔ یا بقول مناوی کہتے ہیں کہ: "میں نہیں ڈرتا ہوں تمہارے پر کفر کے تئیں اور شرک کے تئیں یعنی یہ کہ تم میرے بعد کافر اور مشرک ہوگے۔ لیکن ڈرتا ہوں اس بات سے کہ دنیا کی رغبت کروگے اور آپس میں لڑوگے"۔ جب کہ یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ: وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (۳: ۱۰۳) جو ہدایت سے بڑھ کر متفق رہنے اور متفرق نہ ہونے کے استغاثہ تک پہنچ گیا ہے اور علیؑ سے اس ہدایت اور وصیت نے کہ:

"میرے بعد تجھے بہت سے جدے پہنچیں گے۔ تجھے چاہیے کہ گھبرا نہ جائے اور صبر اپنا شعار کرے اور جب تو دیکھے کہ لوگ دنیا کی طرف مشغول ہوئے تو تو آخرت اختیار کرنا"۔

یہ سمجھا دیا کہ رسولؐ کا سارا خوف یہ تھا کہ لوگ دُنیا میں مشغول ہو جائیں گے۔

رسولؐ نے ایک مرکز قائم کیا۔ اپنا قائم مقام چھوڑا اس لیے کی عناصر تفرقہ خود سری کے ہاتھوں قوت نہ پکڑیں اور قیام امن کی کوششیں ذاتی اغراض کے ہاتھوں پائمال نہ ہوں۔

جناب امیرؑ کے ذکر سے ایک غرض یہ تھی کہ رسولؐ کے بعد کا مرکز پہچنوایا جائے

میں نے جناب امیرؑ کے واقعات کو بھی ساتھ ساتھ بیان کرتے جانا اس لیے ضروری سمجھا تھا کہ اس موقع پر یہ کہہ سکوں کہ یہ وہ مرکز تھا جسے رسولؐ نے مُسلمانوں کے لیے چھوڑا تھا۔ نہ اس لیے کہ قرابت کا کمزور خیال تھا۔ بلکہ اس لیے کہ علیؑ کو ان مختلف حیثیتوں سے پہچان چکے تھے جن حیثیتوں سے پہچاننا ضروری تھا۔ ان کے اخلاص اور خدمات کی خبریں حجاز و عرب میں شائع ہو چکی تھیں۔ ان کا نفس وہ شیشہ تھا جس پر رسولؐ نے قلعی کی تھی۔ ممکن نہ تھا کہ اس میں کوئی عکس آتا اور رسولؐ اس سے مطلع نہ ہوتے۔

دُعا کی دُنیوی اور رُوحانی حیثیت

واقعہ غدیر کے رسومات اس طرح ختم ہوئے کہ چونکہ رسولؐ دنیوی اور دینی حاکم تھے اس لیے جانشین کرنے اور دعا دینے کی خدمتیں بھی انھیں کو بجا لانی تھیں جو "مولیٰ" اور "وال" کے الفاظ سے ظاہر ہیں۔ لوگوں نے اس کا اس طرح استقبال کیا جس طرح فطرۃً کوئی جانشینی کے موقع کا استقبال کرتا ہے۔ لوگوں میں تعظیمانہ مسرت پائی جاتی تھی۔

اسکے وجوہات کہ کیوں رسول نے غدیر کی ایسی رسم آخری وقت کے لیے اٹھا رکھی

لیکن اس کے کوئی معنی ہیں کہ رسولؐ نے علیؑ کے متعلق اگرچہ پہلے قوی اشارے جانشینی کے کیے لیکن کبھی ایسے واضح عمل سے تائید نہ کی۔ بلکہ اسے آخر کے لیے اٹھا رکھا۔ کیوں؟

اس لیے کہ جماعت اسلامی اب تک دوسروں کے مقابل آزمائی گئی تھی اب تک جامع قوم سر پر موجود تھا۔ ابھی وہ

آپس کے اِمتحان خیز مواقع سے نہ گزرے تھے۔ ابھی انھیں آپس کا معتدلانہ برتاؤ اگر آیا بھی تھا تو اس کے یقین کی کوئی وجہ نہ تھی کہ ان میں جاہلیت کی خصوصیات مُردہ ہو گئی ہیں۔ جو اعتدال کو جوش اور زیادتی سے نہ بدل دیں گی۔ یا جو ذاتی فوائد اور حوصلہ کے مقابلہ میں اطاعت اور حق شناسی پر عمل کریں گے۔

اس لیے کہ اسے اصول اسلامی پر قائم ہوئے زیادہ زمانہ گزرا تھا۔ اگرچہ وہ حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے تھے لیکن یہ سمجھنے کی گنجائش نہ تھی کہ وہ شارع اسلام کی خواہش کے موافق مدارج ایمان بھی طے کر چکے ہیں۔ اگرچہ زمانہ کے گزرنے اور عمل کی ترقی کے ساتھ ان کا پختہ یقین اور ایمان ہو جانا بہت ممکن تھا۔

اس لیے کہ اکثر عرب داخل اسلام ہو گئے تھے لیکن ان کے اعزا حالت کفر میں تھے اور اسلام اور رسُولؐ کے خلاف تلواریں اٹھاتے تھے اور قتل ہوتے تھے۔ پس اگرچہ اسلام میں داخل ہونے والے اسلام کے اپنے خیال پر غالب آجانے سے کفر کی طرف رجعت نہیں کرسکتے تھے لیکن ان میں سب کے سب ایسے نہ ہو گئے تھے جو اپنے مشرک بھائیوں کے قتل پر متاسف نہ ہوتے یا کیسی ہی مُشکل پڑتی لیکن خوف کے موقع پر جان دیتے اور رسُولؐ کو چھوڑ کر نہ بھاگتے۔

اس لیے کہ ایک جماعت تھی جو یہ دیکھ رہی تھی کہ ہم بہت سے داغ اٹھا چکے ہیں اور نہ ہم اب اِنتقام لینے کے قابل ہیں اور نہ اب پہلی حالت پر قائم رہ سکتے ہیں۔ پس اِقتضائے مصلحت یہ تھا کہ جماعتِ اِسلامی میں اپنا نام لکھوائیں، جس کے اقبال میں شرکت کی قوی امید ہے۔ اس لیے کہ ایک جماعت تھی جسے حالت کفر میں اپنی قوم پر ایک وقار اور اثر تھا جسے اِسلامی جماعت کے نشو نے فنا کر دیا۔ شخصی اثر جاتا رہا اور حلقۂ اسلام میں کل داخل ہونے والوں کا ایک دینی اور دنیوی رہنما تھا۔ ان کا اپنی پرانی حالت پر اڑے رہنا بے سود ٹھنڈی سانس بھرنا تھا۔ لہٰذا اس کے نزدیک بھی قسمت آزمائی کا میدان مُسلمانوں کے ہاتھ تھا۔ اقبال اور قسمت کی کنجی پر مُسلمان قابض تھے۔

زیرِ دامن آگ اور اس کا اثر

لیکن ان تمام واقعات کا تعلق دو ذات سے تھا جس میں اگر حکم رسُولؐ کے متعلق تھا تو بجالانا علیؑ سے متعلق تھا۔ اور جس قدر سردارانِ عرب کے سر کچلے گئے اور ان کے جس قدر افسر قتل ہوئے وہ زیادہ تر علیؑ کی تلوار سے اس لیے اگر کفار کو علیؑ سے دشمنی اور انتقام کا جوش تھا تو وہ لوگ جو متذکرہ صدر لحاظ سے مُسلمان ہو گئے تھے لیکن اپنے پہلوؤں میں عداوت کو رینگتا ہوا دیکھتے تھے اور دشمنی کی یاد کو کسی طرح فراموش نہ کرسکتے تھے۔ وہ بھی دشمنی اور انتقام کے لیے موقع ڈھونڈھتے تھے۔ اور سب سے زیادہ خوفناک امر یہ تھا کہ جب ایسے دہکتی ہوئی آگ کے لوگ اسلام میں داخل ہوئے تو اگرچہ انھیں اپنے لوگ اپنی پرانی بنیاد پر تو نہ ملے لیکن طبیعت کے بہت سی روش اور خیال کی بے چینی میں یکساں نظر آئے۔ خصوصاً انھیں موقع بینی اور انتقام میں اکثر ہم خیال لوگ ملے۔ اسلام کا خالص گروہ انھیں کل حیثیتوں میں مُسلمان سمجھتا تھا، اور اسے علم نہ تھا کہ ہم میں وہ گروہ داخل ہے جس کے سینہ میں آگ دبی ہوئی ہے۔ اور بھڑک اٹھنے کے لیے وقت تلاش کر رہی ہے اس لیے اگرچہ خالص گروہ عدداً کم تھا لیکن دوست نما دشمنوں سے ناواقف تھا، اور اپنے کو اپنی جگہ مضبوط کرنے کی کوئی فکر نہ کی تھی۔ درآنحالیکہ یہ دوست نما دشمن اگر انھوں نے اسلام میں اپنے ہم خیالوں کی باضابطہ جتھابندی نہ بھی کی ہو تاہم فطرتاً یہ لوگ اپنے حوصلوں امیدوں اور موقع بینیوں میں ایک تھے اور ان کی اس ہم خیالی نے اگرچہ وہ باطل ہی کیوں نہ ہو ان میں ایک قوت پیدا

کردی تھی۔ اور بے ترتیب خالص گروہ ان کی اس اجماع کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس گروہ کو ایک دوسری آسانی یہ تھی کہ جہاں لوگ ان کے دلی حالتوں سے واقف نہ تھی وہاں اسلام میں جم غفیر داخل ہوتا جاتا تھا اور یہ لوگوں کی رفتار اور خیال میں رسوخ حاصل کرتے جاتے تھے اور اپنے موافق موڑتے جاتے تھے۔ درآنحالیکہ بے خیال اور بے شبہ داخل ہونے والے مطلق ناواقف تھے۔ انھیں ان دوست نما دشمنوں سے پیتیرے سے کھڑے ہونے کا کوئی خیال نہ تھا۔ وہ اگرچہ جانتے تھے کہ ہم اسلامی جماعت میں حرکت کر رہے ہیں لیکن حقیقت میں وہ لوگ اپنے آئندہ خیال میں جس طرح تربیت پا رہے تھے وہ انھیں خود پسند نہ آتا۔ اگر اس عنصر سے واقف ہوتے۔

آئندہ پر اثر ڈالنے والے انداز رسولؐ سے پوشیدہ نہ تھے

لوگ واقف ہوں یا نہ ہوں لیکن رسولؐ واقف تھے۔ یہاں بھی ان کی طبیعت شناسی، خیالوں کا وزن کرنا، نفس کا تولنا، حرکات و سکنات سے یح اشارہ سمجھنا، الفاظ کی بو انھیں دل کی چھپتی ہوئی باتیں بتا دیتی تھیں۔ رسولؐ کچھ تو لوگوں کے اخلاص کا درجہ اُحد میں سمجھے تھے اور بہت کچھ خندق میں سمجھ گئے۔ حدیبیہ نے تصدیق شروع کی اور مخالف کی سرگوشی کے طنز نے وہ ذات بتا دی جس کا رسوخ پیدا کر سکتا تھا۔ واقعۂ عقبہ نے عملی مخالفت کے لوگ یا سرغنہ پہچنوا دیے اور بیماری میں حکم کی نافرمانیوں سے یہ یقین دلا دیا کہ علالت کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ ورنہ آئندہ کے متعلق رسولؐ کو کچھ خوف ظاہر کرنے اور علیؑ کو آئندہ طرز عمل کی ہدایتیں کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ابن خلدون نے کہا ہے کہ: دو شنبہ یعنی روزِ وفات کی صبح کو نماز ادا فرمانے کے بعد آپؐ نے وعظ فرمایا، جسے قابل مترجم نے حاشیہ میں نقل کیا ہے۔ اس کی یہ عبارت غور کے قابل ہے کہ: "اے لوگو آگ بھڑک اٹھی اور فتنہ آ گیا مثل اندھیری رات کے ٹکڑے کے"۔ ہدایت یہ نہ تھی کہ اپنا ساتھ چھوڑنے اور رد حقوق کرنے والوں سے بزور شمشیر معاملہ کرنا۔ نہیں۔ "جب وہ دنیا کی طرف مشغول ہوں تو تم دین اختیار کرنا"۔

مخالفت کا گمان، علم یا یقین ادائے واجب سے روک نہیں سکتا تھا

یہ خیالات اور ان کا یقین تھا کہ رسولؐ نے علیؑ بن ابی طالبؑ کی وصایت کا عملاً اعلان نہیں کیا بلکہ اسے آخر کے لیے اس وقت تک اٹھا رکھا جس کے بعد ملتوی کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے کہ مخالفت کا گمان علم یا یقین ادائے واجب سے روک نہیں سکتا تھا۔ اور جب تک وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (۵: ۶۷) (خدا تجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا) بھی تسکین اور تائید کے لیے نہیں نازل ہو لیا۔ آخر کیا ضرورت تھی خدا کو وعدۂ حفاظت کی اگر کچھ لوگوں کے مخالفانہ ارادوں سے خوف نہ تھا؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر: بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (۵: ۶۷) (پہنچا دے اس بات کو جو تیرے رب کی طرف سے تجھ پر نازل کی گئی اور اگر تو نے نہ پہنچائی تو گویا تو نے ادائے رسالت نہیں کی) یہ مطلب تھا کہ رسولؐ یہ فرماتے کہ: "تم جاہلیت کا خون معاف کر دو، یا امانت داری کرو یا عورتوں کے حقوق کا لحاظ کرو"۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو یہ باتیں تھیں، جسے رسولؐ اکثر فرما چکے تھے۔ پس یہ حکم ضرور کسی امر خاص کے متعلق تھا۔ اور وہ امر یہ تھا کہ اپنے بعد کے لیے دین اور خدا کی حکومت کے نمونہ کو جس کے یہ افسر تھے ایک مستحق اور شایان شخص کے سپرد کرتے۔

صاحبِ صواعق کے نزدیک علیؑ کے متعلق کچھ باتیں

شایان شخص وہی تھا جس کے واقعات اور خدمات کو میں نے واضح اور طویل حد تک دکھایا ہے۔ اور جسے بقول صواعق محرقہ: "ابوبکر و عمر خود بہ علی مولائے المومنین گفتہ اند"۔ (ابوبکر اور عمر نے خود علیؑ کو مومنین کا مولا کہا ہے۔)

اور جو اس مؤرخ کے نزدیک بھی واقعہ سقیفہ کے اثنا تک ابوبکر وغیرہ سے شوکت، حذر، اِستعداد، اور سماعت میں قوی تر تھا۔ اس لیے سپرد کرتے کہ عامہ ناس کی خودسری اور خود رائی اس ڈھانچہ کے شکست کا باعث نہ ہو جو صورت پذیر ہوگیا تھا لیکن جس کے کافی حد تک مضبوط ہونے کے لیے زمانہ کی ضرورت تھی اور جب اس دین کا ایک ہر طرح سے مناسب شخص کو محافظ بنادیا اور آئندہ کے متعلق اپنا فرض ادا کر چکے تو اب لوگوں کو مزید اطمینان کے لیے یہ بھی سناتا تھا کہ "الیوم اکملت لکم دینکم"۔

رسولؐ کے زمانہ میں اسلام کا نقشہ کھنچا تھا عمارت نہ بنی تھی

ہم سب اس سے واقف ہیں کہ رسولؐ کے زمانہ میں نہ قرآن کی تدوین ہوئی تھی اور نہ احادیث ایک جگہ جمع کی گئی تھیں اور ان دو اصل ذریعہ اسلام کا ہر ساتھ اور زبان کے متعلق کیا جاتا مسلمانوں میں کس اختلاف انگیزی کا محرک ہوسکتا تھا۔ اور جس کا ایک نتیجہ تو یہ تھا کہ قرآن شریف تین چار آدمیوں کی کمیٹی کے متعلق کیا جاتا کہ وہ مشتبہ مقامات کو قریش کی بولی میں منتقل کرسکیں اور پھر باوجود اس علم کے کہ علیؑ نے (وہی علیؑ جن کے متعلق یہ مستند بین الفریقین حدیث موجود ہے کہ علیؑ قرآن کے ساتھ اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہیں) رسولؐ کے بعد بھی یہ خدمت اپنے ذمہ لی ہے کہ وہ قرآن مدون کیے بغیر عبا کاندھے پر نہ ڈالیں۔ یہ تک گوارا نہ کیا جائے کہ کم سے کم ان کے جمع کیے ہوئے قرآن سے مقابلہ ہی کرلیا جائے۔ اور ابتدا ہی میں یہ ہو کہ غریب ابن مسعود دیکھیے جو کچھ اسے دیکھتا تھا۔ پھر احادیث جس کی تصنیف کے تھوڑے آثار نہیں ہیں، کس قدر اس خیال میں مشتبہ کرتے ہیں کہ رسولؐ کے الفاظ کیا تھے۔ سوچو کہ ان تمام حالتوں نے کیا طبعی اور قومی لحاظ سے افسوسناک اثر کیا، اور کر رہا ہے۔ خدا نہ کرے کہ ابدالآباد تک کرے۔ اس کے لیے کوئی چارہ نہ تھا بجز اس کے کہ رسولؐ خود لکھا ہوا چھوڑتے اور یا اسلام کی تحریری صورت کا کسی کو ذمہ دار کرتے۔ اگر اس لحاظ سے کہ رسولؐ کو بہت کم وقت ملا کہ جس میں کسی سے ایک لفظ، کسی سے ایک اشارہ اور کسی کو خاص تادیب کرتے اور ہر چیز کی تشریح اور تدوین نہ کرسکتے تو بجز اس دوسری صورت کے چارہ نہ تھا کہ وہ دوسرے کو ذمہ دار کرتے۔ وہ ذمہ داری پوری ہوجاتی ہے۔ اگر کوئی امام مقرر کیا جاتا ہے جو تعمیری حیثیت سے اسلام کو کامل کرے۔ رسولؐ نے نقشہ کھینچا تھا اس کی عمارت بنانا ابھی باقی تھا۔ لیکن چونکہ وہ نقشہ بنا سکے، نقشہ بجا سکے اور تعمیر کا ایک ایسے شخص کو ذمہ دار بنا سکے جس کے مدارج تعلیم پر انھیں اعتبار تھا تو اب اس کہنے سے کوئی امر مانع نہ تھا کہ اکملت لکم دینکم یقیناً ان صورتوں میں اکملت لکم دینکم نہیں کہا جاسکتا۔ اگر تعین امام نہ کیا گیا ہوتا۔ اب اس کے بعد یہ سوچنا آسان ہے کہ ایسے کسی شخص کے معرفت قرآن اور احادیث کا ملنا کس درجہ مفید اور قابلِ اعتبار ہوتا۔ افسوس آج مسلمان دوسرے ہوتے اس لیے کہ ان اصلی چیزوں کے متعلق اختلاف نہ ہوتا۔

مسئلہ امامت سیاسی حوصلہ مندوں کا مال یغمانہ تھا بلکہ اس کے علاوہ بہت کچھ تھا

اس سے ظاہر ہوگا کہ مسئلۂ امامت محض سیاسی حوصلہ مندوں کا مال یغمانہ تھا بلکہ حقیقتاً تعمیر اسلامی کی ذمہ داری تھی۔ یہ ہمارے لیے کم مقدس نہیں ہے۔ یہ اگرچہ توریث نبوت نہ ہو لیکن توریث فرض نبوت ضرور ہے۔ اور یہ امر بفحوائے حکم "تبلیغ رسالت تم (رسولؐ) کردیا جو تم میں سے ہو" ممکن تھا۔

مؤلف بعض باتوںؑ کی طرف توجہ دلاتا ہے

میں پھر یاد دلاؤں گا کہ واقعہ عقبہ سے رحلت رسولؐ تک جو واقعات گزرے ہیں ان کے سلسلہ پر خیال کرو۔ دیکھو کہ بعض لوگوں کا برتاؤ رسولؐ کے ساتھ کیسا ہو گیا تھا، اور خود رسولؐ انھیں کس طرح سمجھ گئے تھے۔ اکثر باتوں کی تصدیق اس آئندہ باب سے ہوگی جسے میں شروع کرتا ہوں۔ کیونکہ اب میں اس جماعت کی عملی کارروائی کے لکھنے کے موقع پر پہنچ گیا ہوں جس کے پیشتر اس کے الفاظ اور اندازسے حسن ظن اور طبیعت سمجھنے کی کوشش تھی۔

حسینؑ کی عمر کا ساتواںؑ برس

اب باب میں ہم اپنے ہیرو کی اس عمر تک پہنچے ہیں جس میں وہ واقعات کے یاد رکھنے کی حالت تک پہنچ گیا ہے اور بہت کچھ جذبات کا مالک ہے۔ اب تک وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ میرے پدر بزرگوار کی شان اور وقار عامہ ناس اور رسولؐ کی نگاہوں میں کیسی ہے۔ اور یہ سمجھنے کی عقل ہے کہ ہماری تعظیم اور محبت کی اُمت سے وصیت کی گئی ہے۔

بابِ دوم

رسولؐ کی تعمیرانہ مصلحت کا اِنہدام (تجاہل)

(اہلِ بیتؑ اور ان کے مؤیدین حقوق پر دھاک بٹھانے کی کوشش)

کون اُٹھ گیا تھا

کوئی عجب نہیں ہے کہ رسولؐ کے رحلت کی خبر سے مدینہ میں ایک عام افسردہ تاریکی پھیل گئی ہو اور لوگ یہ سوچنے لگے ہوں کہ دیکھیے اس نفس عظیم کے سایہ کے بعد جو ابھی ہمارے سروں سے اٹھ گیا اب نئی حالت کونسی شکل اختیار کرتی ہے اور اس کا قیام کیونکر ہوتا ہے۔ بہت سے ہوں گے۔ جنھیں عالم سرد مہر دکھائی دیتا ہوگا۔ اس لیے کہ اس دل کا دھڑکنا موقوف ہو گیا جس کی محبت کی گرمی کا وہ احساس کرتے تھے اور اسے تمام لطف اور راحتوں سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔ کچھ ہوں گے جنھیں اب باتوں میں عقل کی وہ روشنی نہ دکھائی دیتی ہوگی جو نہ صرف انھیں بلکہ اکثر یہود اور نصاریٰ کو بھی اپنے تصفیہ سے تسکین دیتی تھی۔ کسی کے لیے وہ خبر گیر آنکھیں جو ان کے لیے کبھی نہ جھپکتی تھیں پتھرا گئیں۔ اب کوئی اس تیز اور لپٹنے والی لطف سے توجہ کرنے والا نہ رہا جو اہلِ صفہ کے لحاظ سے اس کا بھی روادار نہ تھا کہ اس کی لاڈلی بیٹی ایک کڑا اپنے ہاتھوں میں پہن سکتی یا کوئی پردہ اپنے دروازہ پر لٹکا سکتی۔ محلہ کے بچے اب وہ چہرہ نہ دیکھتے تھے جو انھیں دیکھ کر بے ہنسے نہ رہ سکتا تھا۔ حاجت والے اس گھر میں شورِ ماتم سنتے تھے۔ جہاں انھیں اپنی ضرورتوں کی پورے ہونے کی امید تھی۔ لوگوں کی آنکھیں تھیں اور روتے تھے مُنہ تھے لیکن بات نہ تھی۔ خموشی ہو گئی تھی اور اس خموشی میں لوگوں کے پہلے ہیجان غم کے فرو ہونے کے بعد پھر کوئی بے چین چیخ یا سرد آہ آنسوؤں کا رخ آنکھوں کی طرف پھیر دیتی ہوگی۔ تھمتے تھمتے آنسو تھمے ہوں گے اور اس سکون کے عالم میں ہوش کی باتیں اور آئندہ کا خیال پھر سامنے موجود ہو جاتا ہوگا۔

طبائع کا عمل اور اس میں دیکھنے کی باتیں

جس وقت رونے والے رو رہے تھے اور سیر نہ ہوتے تھے بلکہ ان کے دلوں نے تسکین پانے سے انکار کر دیا تھا۔ اکثر طبائع تھے جو اپنا عمل کر رہے تھے لیکن ان کا عمل اپنی ساخت نتیجہ کے لحاظ سے نوعیت میں مختلف تھا۔ یہ وہ تھے جو دیکھنا چاہتے تھے کہ امارت اسلام کا تصفیہ کیونکر ہوتا ہے۔ آیا مُسلمانوں کا ولی، مولا، اور رسولؐ کا خلیفہ وہی ہوتا ہے جسے رسولؐ کہہ گئے تھے یا اور بھی موقع ہے۔ اس میں دیکھنے کی بات ہوگی کہ ان خیالات کی بنیاد حب قومی، حب وطنی اور حب دینی کی وجہ سے تھی۔ جس میں کوئی اپنی غرض شامل نہ تھی۔ یا ان چیزوں کے پردہ میں خود غرضی بھی چھپی ہوتی تھی۔ یا ان اعلیٰ احساسات کا کوئی اثر نہ تھا، بلکہ تمام کوششیں خود غرضی اور اصول منفعت یا حصول اختیار پر مبنی تھیں۔ یہ تنقیحات ہیں جنھیں یہ باب غالباً سمجھانے کے لیے کافی ہوگا۔ اور یہ اچھی طرح سمجھا جا سکے گا کہ رسولؐ کے بعد جو کچھ واقعات ہوئے اس میں وہ کوششیں ہوئیں جو اس اصول اسلامی کو ہر حیثیت سے اپنی جگہ قائم رکھتیں جو سکھایا گیا تھا، اور خیال اور عمل میں جاری

کیا گیا تھا۔ یا کوششوں کی خاصیت اور نتیجہ یہ بتاتا ہے کہ یہی امورات آئندہ جماعتِ اسلامی کے انتشار کے باعث ہوئے۔ اگرچہ کچھ وقت تک جنگی باجوں کے شور اور جوش نے دیکھنے نہ دیا ہو۔ یا آگے چل کر ثروت کی اور امارت کی ترقی اور حسین کنیزوں کی بغل گیری نے رات اور دن میں اصلی حالت کے سوچنے کے لیے کوئی وقت نہ چھوڑا ہو۔

اقدام کس نے کیا اور بنی ہاشم اور بنی اُمیہ کی اس وقت کی حالت

سب سے حیرت خیز امر یہ ہے کہ امورات خلافت کا اقدام ان دو جماعتوں سے۔ جنھیں بنی ہاشم اور بنی امیہ کہتے ہیں شروع نہ ہوا۔ اگرچہ اول الذکر جماعت وہ جماعت تھی جو رسولؐ کے سانس لینے تک حاکم تھی اور دوسری جماعت وہ تھی جو اپنی بلندی کی کوشش میں ایک زمانہ تک اسلام کو موت اور زندگی میں متردد رکھتی تھی اور بالآخر اس پر مجبور ہوئی کہ خوشی یا ناخوشی سے حکومت کے حوصلوں کو اپنے سینہ میں زور سے دبادے۔ اس آخر الذکر جماعت سے خوف کیا جانا، یا اول الذکر جماعت سے اپنے حقوق کے نفاذ کی کوشش دیکھنا امید کے باہر نہ تھا۔ لیکن ان دونوں جماعتوں کے طرزِ عمل نے یہ سمجھایا کہ اگر اول الذکر اپنے سردار اور ہادی کی لاش کا دفن کرنا پہلا فرض تھا تو دوسری جماعت اپنے دعاوی کو پسِ پشت ڈال کر مطمئن ہوگئی تھی۔ جب تک کوئی مثال اس کے سینہ کے دبے ہوئے حوصلوں کو پھر سے کھود کر نہ نکالتی اور حقیقت تو یہ ہے کہ اول الذکر جماعت کو اس کا یقین ہی نہ تھا کہ ہمارے حقوق کے درمیان کوئی جماعت حیرت خیز سرعت سے حائل ہوجائے گی۔ اور ثانی الذکر گروہ نے اس کا خواب بھی نہ دیکھا تھا کہ بنی ہاشم کا حاکم گروہ دفعتاً بے اختیار اور بے قوت ہوجائے گا۔ لیکن یہی ہونے والا تھا ایک تیسرے گروہ کے ہاتھوں۔

رحلت کے دن اور قریب وقت حضرت ابوبکر کہاں تھے

ہماری موجودہ ضرورت کے موافق واقعات یہ تھے کہ جناب رسالت مآبؐ نے بقول ابن خلدون دوشنبہ کے روز دوپہر کو اور بقول مجموعہ کامل واقدی (مغازی الرسولؐ) دن چڑھے انتقال فرمایا۔ اسی صبح کو جناب رسالت مآبؐ ایسے اچھے تھے کہ مسجد میں نماز ادا کی اور خطبہ پڑھا اور بقول ابن خلدون ابوبکر نے یہ کہہ کر کہ: "ہم دیکھتے ہیں کہ آپ اللہ کی عنایت سے بہت خوش و خرم ہیں، جیسا کہ ہم چاہتے تھے اپنے اہل کے پاس سنخ میں چلے گئے"۔ مناہج میں بھی یہی ہے۔ باوجود اس قدر صحیح ہوجانے کے جس سے ابوبکر کو اس قدر اطمینان ہوگیا کہ وہ اپنے عیال کے پاس موضع یا محلہ سنخ میں چلے جاتے درآنحالیکہ محض علالت کی خبر نے روک رکھا تھا کہ وہ لشکر کے ساتھ کوچ نہ کرتے۔ یہ ہماری سمجھ کے باہر ہے کہ کیونکر مرض میں دفعتاً اس قدر زیادتی ہوگئی کہ آنحضرت نے تھوڑی دیر کے بعد انتقال فرمایا۔ حالانکہ مرض اور خصوصیات مرض ایسی نہ تھیں جس سے وقوع موت اس قدر سریع ہوتا۔ مؤرخین نے کہا ہے کہ سبب مرض وہ زہر تھا جو خیبر کی یہودیہ نے بزغالہ بریان میں دیا تھا۔ لیکن کوئی نوالہ حلق سے نیچے نہ اترا تھا۔ صرف لعاب دہن سے جو کچھ ہوا ہو وہ غالباً ایسا نہ تھا کہ اس وقت اپنا کوئی اثر کرسکتا، چہ جائے کہ اس قدر بُعدِ زمان کے بعد ہو۔

رحلتِ رسولؐ کے بعد لوگوں کی حالت پر غور کی بعض مشکلیں

بہر حال رحلت رسولؐ کے بعد کیا ہوا جس سے انصار ایک جگہ اور ابوالہیثم وغیرہ دوسری جگہ اپنی حالتوں پر غور کرنے لگے درآنحالیکہ بنی ہاشم رسولؐ کی لاش اقدس کے قریب

تھے۔ کتنی دیر لوگ دولت سرا کے قریب رہے۔ اور اس کے بعد اپنے اپنے گھر جا کر فرقہ بندی کی۔ آیا خبریں سن کر لوگ جمع بھی ہوئے یا محض اپنی اپنی جگہ پر اظہار غم کر لیا۔ اس کے واضح آثار نہیں ہیں۔ دوسری بات جو اور زیادہ غور کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب ٹھیک کہ لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ جناب رسالت مآبؐ نے تجہیز و تکفین کی بنی ہاشم کو وصیت کی ہے لیکن پھر بھی کسی کو شرکت سے منع نہ کیا تھا۔ پس وہ کونسا امر اس کا محرک ہوا کہ وہ نماز اور دفن پر اپنے غور کو مقدم کر دیتے۔

کیا کسی گروہ کو دوسرے کی سبقت کا اندیشہ تھا

میں کہہ رہا ہوں کہ ہر ایک میں حوصلہ حکومت سہی لیکن اختیار حاصل کرنا اور اس کے لیے اس قدر جلد مستعد ہو جانا کسی ایسی وجہ سے تھا جس میں ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے سبقت کا خوف ہو۔ اور اس نے پیشتر سے یہ طے کر لیا ہو کہ ہم رسولؐ کے اِنتقال کے ساتھ ہی پہلا کام جو کریں گے وہ اس امر کا تصفیہ ہوگا کہ ہم کس طرح صاحبِ اختیار ہو جائیں۔ میں اس کی جڑ یا آغاز پر اپنی نگاہ دوڑانا چاہتا ہوں کہ ان کے اِس تصفیہ کے لیے کونسی شے محرک ہوئی۔

انصار اور مہاجرین کو ایک دُوسرے کے مُتعلّق وصیّت

اس امر کے سمجھنے کے لیے کہ کیوں بقول روضۃ الصفا اور اعثم کوفی ابوالہیثم بن تیہان اور ابوبکر وغیرہ ایک جگہ جمع ہوئے اور انصار دوسری جگہ دکھائی دیے۔ درآنحالیکہ بنی ہاشم ایک ضروری فرض ادا کر رہے تھے کوئی بات متعین نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ مناہج کی اس روایت سے مدد ملتی ہے کہ انصار رسولؐ کی زیادتی علالت سے متردد ہوئے تو آپ نے انصار اور مہاجرین کی ایک دوسرے کو وصیت کی اور سورہ والعصر کو اور اس آیت کو: فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ (۴۷: ۲۲) تلاوت فرمایا۔ انصار کے متردد ہونے کی وجہ یا تو یہ تھی کہ وہ رسولؐ کے بعد اپنے حقوق کو واضح کرانا چاہتے تھے اور یا انھیں سطح دریا کے نیچے کچھ اور دھارے بہتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ جس نے انھیں اپنے لیے خوف زدہ کر دیا تھا۔ اور وہ بھی رسولؐ کے لفظوں میں سوچ اور دیکھ رہے تھے کہ "آگ بھڑک اٹھی اور مثل اندھیری رات کے ٹکڑے کے فتنہ آگیا"۔

دفنِ رسُولؐ پر معرکہ آرائیوں کی مقدم کرنے کا کوئی جواب نہیں ہے

لیکن جو کچھ بھی ہو ان لوگوں کی فرقہ بندی نے بقول مولوی شبلی صاحب اس کا جواز کیسے کر لیا کہ: "اس بات کا بھی انتظار نہ کیا گیا کہ پہلے تجہیز و تکفین سے فراغت کر لی جائے"۔ یا اس مؤرخ کے موافق کہ: "انھوں نے سقیفہ میں پہنچ کر خلافت کے بارہ میں انصار سے معرکہ آرائی کی اور اس طرح کوششوں میں مصروف رہے کہ گویا ان پر کوئی حادثہ ہی نہیں پیش آیا تھا"۔ حالت شاعر کے ان لفظوں کی سی ہو گئی تھی کہ:

گرسنہ در خانۂ خالی و پُر خوان　　عقل باور نکند کز رمضان اندیشد

اب ہمیں پھر یہ سوچے مفر نہیں ہے کہ رسُولؐ کے اِنتقال کے ساتھ ہی کوئی فوری وجہ اس کی محرک نہ ہوئی تھی کہ لوگ رسُولؐ کی لاش سے بے خبر ہو کر معرکہ آرائیوں پر تل جاتے۔ بلکہ جو کچھ اسباب تلاش کیے جا سکتے ہیں وہ رسُولؐ کی رحلت کے قبل ہیں۔ جس نے سقیفۂ بنی ساعدہ کے دو گروہ کو دفعتہً غم ٹھونکنے پر اس طرح آمادہ کر دیا کہ گویا یہ دیر سے وقت کے منتظر تھے۔

اس کا جواب کہ اُسامہ کے لشکر کے ساتھ روانہ نہ ہونا محبت سے نہ تھا

ابن خلدون کا یہ فقرہ ہم بعض لوگوں کے متعلق نوٹ کر چکے ہیں کہ اُسامہؓ کے لشکر سے رسُولؐ کی علالت کی خبر سن کر "آتے اور دیکھ جاتے تھے"۔ کیا اس لیے کہ دیکھیں رسُولؐ کی رحلت اور اس لیے کارروائی کے آغاز میں کتنی دیر ہے جو تم کہہ سکتے ہو کہ محبت عیادت کی محرک ہوئی تھی۔ لیکن ایسا کہنے کے قبل رسُولؐ کے جنازہ کے پاس ان محبت کرنے والوں کو ڈھونڈ لو۔ اس کے بعد فطرت تمہیں بتلا دے گی کہ غرض محبت پر غالب تھی۔ ہم نفس غرض پر آگے بحث کریں گے۔

حضرت ابوبکر کی بیعت رحلتِ رسُولؐ کے دن ہوئی

اس کے بعد آگے چلنے کے لیے ہمیں صواعق محرقہ کی یہ روایت ملتی ہے کہ: "روایت کرد واقدی از چند طریق اسناد کہ بیعت ابوبکر رضی اللہ عنہ روزے شد کہ رسُول صلی اللہ علیہ وسلم رحلت فرمود"۔
ترجمہ: "ابوبکر کی بیعت وفاتِ رسُولؐ کے دن ہوئی"۔

بیعتِ عام دُوسرے دِن ہُوئی

اسی کتاب میں ہے کہ: "چوں بیعت ابوبکر رضی اللہ عنہ شد در سقیفہ روز دیگر بر منبر نشست پس مردمان بیعت کردند بیعت عام بعد از بیعت سقیفہ"۔ ترجمہ: "سقیفہ میں بیعت ابوبکر ہو چکی تو دوسرے روز منبر پر بیعتِ عام کی"۔ یہ دونوں روایتیں ہم نے اس لیے پیش کی ہیں کہ رحلت رسُولؐ کے پہلے اور دوسرے دن ان اصحاب کی مشغولیت معلوم ہو جائے جو رسُولؐ کے دفورِ محبت کی وجہ سے ان کی علالت میں ان کے ایک حکم کو ملتوی کر سکتے تھے۔

اس کے بعد مولوی عبداللہ صاحب امرتسری کی یہ عبارت بھی ملاحظہ ہو کہ: "جب حضرت ابوبکر وہاں (سقیفہ بنی ساعدہ) سے لوٹے تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم دفن ہو چکے تھے، اِس لیے شرکت جنازہ سے محروم رہے جس کا قلق ان کو تامدتِ عمر رہا"۔

کیونکر "چل گئی" اور اسؐ کے عناصر

کیا مضائقہ ہے اگر ہم ناظر کو تھوڑی دیر کے لیے اس جلسہ میں لے چلیں جس نے اسلام کے آئندہ کا ٹھیکا لے لیا تھا۔ نہ سرسید احمد خان کی اس مصلحت اور ارادہ کے ساتھ کہ: "جس کی چل گئی وہی خلیفہ ہو گیا"۔ بلکہ یہ سمجھنے کے لیے کہ کس طرح "چل گئی" اور یہ "چل گئی" طبیعتوں اور واقعات پر کیا اثر ڈالتی ہے۔ اور اس کے پس وپیش سے کیا سمجھ میں آسکتا ہے۔ جس سے اگلے زمانہ کا دور بین مدبر شاعر کہے گا کہ: "کشتہ شد حسینؑ اندر سقیفہ"۔ یعنی "حسینؑ سقیفہ میں قتل ہوئے"۔

مؤلف کو سقیفہ بنی ساعدہ کا راستہ کیونکر معلوم ہوا

مشکل سے مجھے راستہ معلوم ہوتا اگر روضۃ الصفا نے راستہ دکھانے والے کا نام نہ بتایا ہوتا۔ یہ مغیرہ بن شعبہ تھا جس کے واقعات ہم کسی حد تک لکھتے آئے ہیں۔ اور ابھی نہایت مفید حالات باقی ہیں۔ لیکن رسُولؐ کے بعد آج یہ پہلا موقع ہے کہ کسی عام مفید موقع پر دکھائی دیا ہو۔ اہلِ عرب میں ابن شعبہ مدبر اور صاحب رائے مشہور تھا۔ اس کا نام آنا تمام راستہ روشن کر دیتا ہے۔ اگرچہ یہ نہیں معلوم کہ اس نے ابن الخطاب سے اس کے علاوہ کیا گفتگو کی۔ جب وہ انصار کے ارادوں کی اطلاع دینے آیا۔ ابن الخطاب نے اس کی خبر ابوبکر کو دی اور روضۃ الصفا کے موافق:

"ہر دو باتفاق آن سرور آفاق را تنہا گزاشتہ رہ بجانب سقیفہ بنی ساعدہ آوردند و ابو عبیدہ جراح در عقب ایشان روانشد"۔
یعنی "دونوں نے مل کر سرورِ کائنات کو تنہا چھوڑا اور سقیفہ بنی ساعدہ کی راہ لی۔ ابو عبیدہ جراح ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا"۔

حضرت عمرؓ کی واقعہ خوانی

صاحب صواعق کسی مخبر کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ ابوبکر خود عمر سے انصار کی طرف چلنے کی خواہش کرتے ہیں۔ اس لیے کہ: "مرویست از عمر در زمانے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحلت فرمود حضرت علی و زبیر رضی اللہ عنہما و جمعی دیگر کہ با ایشان بودند در خانہ فاطمہ نشستہ تخلف کردہ و ہم چنیں انصار از ما تخلف کردہ در سقیفہ بنی ساعدہ گرد آمدند و مہاجرین بجانب ابوبکر شتافتند"۔ ترجمہ: "مروی ہے حضرت عمر سے کہ اس وقت سے کہ رسولِ خداؐ نے رحلت فرمائی حضرت علیؑ، زبیر اور ایک گروہ اور نے جو کہ ان کے ساتھ تھا فاطمہؑ کے گھر میں بیٹھ کر تخلف کیا اور اسی طرح انصار نے ہم سے تخلف کیا اور سقیفہ بنی ساعدہ میں آگئے اور مہاجر ابوبکر کی طرف دوڑے"۔ اور ابن خلدون بھی کہتا ہے کہ: "رفتہ رفتہ اس امر کی اطلاع ابوبکر و عمر کو ہوئی یہ دونوں بزرگ مع ابو عبیدہ جراح کے سقیفہ کو روانہ ہوئے۔ عاصم بن عدی اور عویم بن ساعدہ سے ملاقات ہوگئی۔ عاصم نے ان کو روکنے کا قصد کیا لیکن وہ لوگ ان کے روکنے سے نہ رکے جس قدر جلد ممکن ہوا سقیفہ میں جہاں پر انصار جمع تھے جا پہنچے اور باہم مباحثہ ہونے لگا"۔

حضرت ابوبکر اپنا استحقاقِ خلافت پیش کرتے ہیں اور انصار کو وزارت کی امید دلاتے ہیں

اس مؤرخ کے نزدیک ابوبکر نے اپنے حقوق کے متعلق جو کچھ کہا وہ یہ تھا کہ: ہم لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اولیاء اور ان کی عشیرت سے ہیں ان کے بعد حکومت کے حق زیادہ ہم ہیں اور اس میں بظاہر کوئی نزاع کا موقع نہیں معلوم ہوتا البتہ تم کو حقِ نصرت اور نیز سابق الاسلام ہونے کا حاصل ہے بایں لحاظ ہم لوگ امرا ہیں اور تم وزرا ہو"۔

انصار کی کمزوری

انصار کے مجمع میں ایک کمزوری یہ تھی کہ وہ خود اوس اور خزرج میں تقسیم تھے۔ سعد بن عبادہ قبیلہ خزرج کے پیشوا تھے اور اسید بن حضیر قبیلہ اوس کے۔ حباب بن منذر اور ثابت بن قیس وغیرہ امارت کے لیے سعد بن عبادہ کو تجویز کرتے تھے اور بشر بن سعد وغیرہ اس رائے کے موافق نہ تھے۔ اس لیے کہ بقول ابن خلدون: "اوس ـــ خزرج کی امارت سے کشیدہ خاطر تھے"۔

ایکؓ انصاری کی موقع بینی

اور بقول اعثم کوفی بشر بن سعد نے کہا کہ: "امروز خلافت بہ قریش مسلم دارید کہ بہ اتفاق شما باشد و اگر بر خلاف این بود مثل شما باشد"۔

ترجمہ: آج خلافت کو قریش کے لیے رہنے دو۔

عویم بن ساعد کہتا ہے کہ خلافت خاندانِ نبوتؐ میں رہنے دو

جس وقت اوس، خزرج اور ابوبکر اپنے اپنے حقوق پیش کر رہے تھے اعثم کوفی کے مواقع عویم بن ساعد نے کہا: "اول قومی کہ با دشمنان محمد علیہ السلام شمشیر کشیدند شما بودید اول کسیکہ با دوستان و خویشان او خلاف کند شما نباشید خلافت بہ خاندان نبوت باز گزارید و دست از این نزاع و نفاق بدارید"۔

یعنی: "سب سے پہلے لوگ جنھوں نے محمدؐ کے دشمنوں کے خلاف تلوار اٹھائی وہ تم تھے۔ اب ان کے دوستان اور رشتہ داروں کی سب سے پہلے مخالفت کرنے والے نہ بنو۔ خلافت خاندانِ نبوت کے پاس رہنے دو۔ اور اس جھگڑے سے دست بردار ہو جاؤ"۔

حضرت ابوبکر کا خیال کہ عربؑ خاندانِ نبوتؑ میں سے کسی کو چاہیں گے

حباب بن منذر کی تقریر میں حضرت ابوبکر کا یہ جواب بھی نہایت توجہ کے قابل ہے جو اعثم کوفی سے ملتا ہے کہ: "عرب بہ امارت شما رضا نہ دہند چوں از شما نیست و کسی را خواہند کہ از خاندان نبوت باشد"۔ "عرب تمھاری حکومت پر راضی نہیں ہوں گے۔ کیونکہ حضورؐ تم سے نہیں ہیں اور کسی ایسے کو چاہیں گے جو خاندانِ نبوت سے ہو"۔

انصار کا ابوبکر کو الزامی جوابؑ

اور طبری سے ایک نہایت مفید امر معلوم ہوتا ہے کہ جب ابوبکر نے بمقابلہ قریش کے حقوق کا تذکرہ کیا تو انصار نے جواب دیا کہ: "پھر علیؑ سے بیعت کرلو کہ وہ پسرعم رسولؐ ہیں"۔

حضرتؑ عمر کی جلدی

اس کے بعد عمر ڈرے کہ اختلاف ہوگا، اور ابوبکر سے کہا کہ: "ہاتھ بڑھاؤ تم سے بیعت کریں"۔ ابن حجر مکی کو یہ بھی کہنا ہے کہ: انصار مکروہ دانستند بیعت او ابوبکر ایشان را ملزم بساخت بخبر الائمۃ من قریش بنا بر این اطاعت و انقیاد کردند و حضرت علیؑ از روئے شوکت و عذر و استعداد و سماحت قوی تر بود از ایشان"۔ یعنی: "انصار اس کی بیعت کو ناپسند کرتے تھے۔ ابوبکر نے ان کو اس حدیث سے جواب دیا کہ امام قریش سے ہیں۔ اس وجہ سے انھوں نے اطاعت و فرمانبرداری کی جب کہ حضرت علیؑ شوکت و عذر و لیاقت و سماحت میں ان سے قوی تر تھے"۔

ابوبکر، عمر اور ابوعُبیدہ کی آپس کی نہایت مفید باتیں

مورخین نے یہ بھی کہا ہے کہ اختلاف میں زیادتی ہونے لگی تو ابوبکر نے عمر اور ابوعبیدہ جراح کا نام پیش کیا، اور اس وقت عمر نے ابوبکر کو اپنے اُوپر مقدم رکھ کر بیعت کرلی۔ لیکن اس کے مقابلہ میں صواعق محرقہ کی اس روایت کو جو مسعود نے ابراہیم تیمی سے نقل کیا ہے زیادہ قبولیت سے دیکھتا ہوں کہ: عمر نے پیشتر ابوعبیدہ کی طرف توجہ کی جس کی تائید ابن سعد کی اس روایت سے بھی کی گئی ہے کہ: "چوں ابوبکر شنید کہ عمر بہ طرف ابوعبیدہ میل دارد ابوبکر بہ عمر گفت رضی اللہ عنہما دست خود بکشا تا با تو بیعت کنم عمر گفت تو افضلی از من پس ابوبکر جواب داد قوت تو از من زیادہ است و این سخن را مکرر گردانید بعد ازاں عمر گفت قوت من ترا ہست با زیادتی فضل پس ازاں بیعت بہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کرد"۔ یعنی: "جب ابوبکر نے سنا کہ عمر ابوعبیدہ کی طرف مائل ہیں تو ابوبکر نے عمر سے کہا کہ اپنا ہاتھ بڑھا تاکہ تیری بیعت کروں۔ عمر نے کہا تو افضل ہے اس کے بعد ابوبکر نے جواب دیا تیری طاقت مجھ سے زیادہ ہے اور یہ بات دہرائی اس کے بعد عمر نے کہا کہ میری قوت تیری فضیلت کے ساتھ تیرے لیے ہی ہے۔ اس کے بعد ابوبکر کی بیعت کرلی"۔

قبیلہ اوس نے ابوبکر کا ساتھ دیا

روضۃ الصفا میں ہے کہ: "آن روز خواص بیعت کردند"۔ یعنی "اس روز خواص نے بیعت کی"۔ اسی کتاب میں ہے کہ: "قبیلہ اوس برغبتی تمام باصدیق بیعت کردند و خزرج را خجالتی تمام روی زد"۔ یعنی: "قبیلہ اوس نے پوری رغبت سے صدیق کی بیعت کرلی اور خزرج شرمندہ رہ گئے"۔

اوس و خزرج کا حسد

اعثم کوفی میں ہے کہ حباب نے بشر بن سعد کی آمادگی دیکھ کر اس سے پوچھا کہ: "تجھے کیا ہوا کہ تو نے اپنے ابن عم سعد بن عبادہ سے حسد کیا"۔ صورتِ معاملہ یہاں تک پہنچی کہ تلوار کھچ گئی اور لوگوں نے حباب کو روکا۔

ابن عوف انصار اور ابوبکر

اعثم کوفی کے موافق یہ روایت بھی دلچسپ ہے کہ بیعت کے بعد عبدالرحمٰن بن عوف کی چند انصار سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے کہا کہ تم نے کیوں ابوبکر اور عمر کے مقابلہ میں اپنے کو پیش کیا۔ انصار نے اپنے افسروں کے متعلق احادیث رسولؐ بیان کرنے کے بعد آخر میں جواب دیا کہ: "اے پسرِ عوف اگر علیؑ بن ابی طالبؑ اور بنی ہاشم سرورِ عالم کی تجہیز و تکفین میں مشغول اور کثرتِ غم میں مبتلا نہ ہوتے تو دوسروں کا کھاتا نہ لگا ہوتا۔ اور ان کا کام ناتمام رہتا۔ اب جاؤ اور ایسی باتیں نہ کرو۔ جس سے تمھارے مقتدا پر مشکل آجائے"۔ ابن عوف نے یہ باتیں ابوبکر سے کہیں اور انھوں نے جواب دیا کہ: "جب ہماری مراد کے موافق کام پورا ہو گیا تو تم اس بازخواست سے مستغنی تھے"۔

حضرت عمر کا فقرہ سعد بن عبادہ کے متعلق
عقل نے دنگل ملتوی رکھا

بیعت کے وقت سعدؓ بن عبادہ کو دھکا لگا۔ یہ علیل تھے اور اوڑھے لپیٹے بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ دیکھو سعد کچل نہ جائے۔ اس پر بقول ابن خلدون عمر نے جواب دیا کہ: "اللہ تعالیٰ ہی نے مارا ہے"۔ سعد یہ سن کر دست و گریبان ہوگئے۔ اور عمر کو بھی غصہ آگیا۔ لیکن ابوبکر کے روکنے سے رک گئے۔

سعدؓ کا بیعت سے انکار اور ان سے درگزر

اسی مؤرخ کے موافق جب سب لوگ بیعت کر چکے تو سعدؓ سے بیعت کرنے کو کہا۔ سعدؓ نے انکار کیا۔ بشیر نے کہا: "یہ تنِ تنہا آدمی ہے، اس سے درگزر کرو۔ اس کو اپنی حالت پر رہنے دو"۔ پس سعدؓ بن عبادہ اس واقعہ کے بعد نہ تو ان کے ساتھ نماز میں شریک ہوتے تھے اور نہ ان سے باتیں کرتے تھے، تاآنکہ ابوبکر کا انتقال ہو گیا۔

سعد رضی اللہ عنہ کی موت کیونکر واقع ہوئی

بعضوں نے یہ کہا ہے کہ: "بعد اس واقعہ کے سعدؓ بن عبادہ شام کی طرف چلے گئے تھے اور وہاں ٹھہرے رہے، تاآنکہ مر گئے"۔ مشہور یہ ہے کہ ان کو جن (؟) نے مارا ہے۔

اختلاف کے خوف سے ابوبکر نے دو آدمیوں پر بیعت کا زور نہیں ڈالا

صواعق محرقہ کی یہ روایت بھی دیکھنے کی

ہے: بروایت ابی اسحاق وغیر او آنکہ سائلے گفت اے ابوبکر چہ چیز ترا برایں داشت کہ والی مردمان شوی و حال آنکہ نہی میکردی ماراازان کہ بر دو کس (؟) امیر باشیم ابوبکر گفت ماراازیں چارہ نیست ترسیدم کہ امت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متفرق گردند وخلل افتد در دین"۔ یعنی: "ابواسحاق وغیرہ کی روایت کے مطابق ایک سائل نے کہا اے ابوبکر تجھے کس چیز نے آمادہ کیا کہ لوگوں کا نگران بن بیٹھے، جب کہ ہمیں تو تو دو بندوں پر بھی امیر بننے سے منع کرتا تھا۔ ابوبکر نے کہا ہمیں اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ میں ڈرا کہ امت محمدیہ منتشر ہو جائے گی اور دین میں خلل پڑے گا"۔

حضرت عمر کے لفظوں میں ابوبکر کی بیعت کیونکر ہوئی

ان حالتوں میں جب کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ: "فوری طور پر اتفاق عام ہو گیا"۔ اور کوئی کثرت اژدحام سے سعد کو کچلے ڈالتا ہے۔ دیکھنے کی یہ بات ہے کہ حضرت عمر اس کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ ابن ابی الحدید یہ کہتے ہوئے کہ عمر نے بیعت ابوبکر کو ناگہانی ہونا اور اس کے شر سے خدا کا محفوظ رکھنا کہا ہے۔ آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ: "یہ صرف ان کی تیزی زبان اور درشتی طبیعت تھی ورنہ وہ ادب کرتے تھے"۔ صاف صواعق محرقہ کا یہ محتاط طرز بیان توجہ کے قابل ہے کہ: "عمر رضی اللہ عنہ در زمانے رجوع از حج خطبہ گفت کہ بمن چنیں رسیدہ کہ فلانے از شما گفتہ است کہ عمر چوں بمیرد بہ فلانے بیعت خواہم نمود پس مغرور نشود یکے از شما بہ آنکہ بگوید بیعت ابوبکر فجاۃً واقع شد و آگاہ باشید کہ ایں چنیں نبود اِلّا آنکہ خدائے تبارک وتعالیٰ از شر آن نگاہداشت و امروز در میان شما کسی نیست کہ قطع از جانب او شود"۔ یعنی: "عمر رضی اللہ عنہ نے حج سے واپسی کے وقت خطبہ دیا کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ تم میں سے فلاں نے کہا ہے کہ عمر جب مر جائے گا میں فلاں کی بیعت کر لوں گا۔ پس تم میں سے کوئی اس دھوکے میں نہ پڑے کہ کہے ابوبکر کی بیعت اچانک ہو گئی تھی۔ آگاہ ہو جاؤ کہ اس طرح نہ تھا مگر یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے شر سے بچا لیا تھا۔ اور آج تم میں کوئی نہیں ہے کہ اس کی طرف سے قطع ہو سکے"۔

بیعت کا طرزِ عمل

اب ذرا طریقہ بیعت پر غور کیجیے جسے ابن ابی الحدید براء بن عازب کی زبانی بیان کرتے ہیں: "تھوڑی دیر کے بعد ہم نے سنا کہ قوم سقیفہ بنی ساعدہ میں ہے۔ اس کے بعد دوسرے دیکھنے والے کو سنا کہ ابوبکر کی بیعت کر لی گئی۔ تھوڑی دیر نہ گزری کہ دیکھا ابوبکر و عمر ابوعبیدہ مع ایک جماعت اصحاب سقیفہ کے چلے آتے ہیں۔ وہ کسی کی طرف سے نہیں گزرتے مگر یہ کہ اس کو دبا دیتے ہیں اور ہاتھ اس کا بڑھا کر ابوبکر کے ہاتھ سے مس کر دیتے ہیں وہ چاہتا ہو یا نہ چاہتا ہو۔ پس میرے ہوش گم ہو گئے"۔

ابوقحافہ اور ابوبکر

اب یہ ملاحظہ طلب ہے کہ خود اپنے بیٹے کی اس بیعت کے متعلق ابوقحافہ کی آمد کیا تھی۔ صواعق محرقہ میں ہے کہ: "گفت ابوبکر را کہ ہوشیار باش دریں امر کہ ایں امر محال است آیا راضی شدند بنو عبد مناف و بنو مغیرہ (؟) گفت بلے ـــــ"۔ یعنی: "ابوبکر کو کہا کہ اس امر کے بارے میں ہوش کرو کہ یہ ناممکن بات ہے۔ کیا بنو عبد مناف اور بنو مغیرہ راضی ہو گئے ہیں۔ ابوبکر نے کہا: ہاں"۔

پوست کش لطیفہ اور آبدار دُعا

ابن ابی الحدید میں اس قدر لطیفہ زیادہ ہے کہ جب ابوقحافہ کو معلوم ہوا کہ ابوبکر سے اس لیے بیعت کی گئی کہ وہ سب میں زیادہ سن کے تھے

تو کہا: "میں ان سے زیادہ سن کا ہوں"۔ ان دونوں مؤرخین نے ان کی یہ دعا بھی لکھی ہے کہ: "کوئی اسے پست نہیں کر سکتا جسے تو بلند کرے اور کوئی اسے بلند نہیں کر سکتا جسے تو پست کرے"۔

بیعت کے وقت بمقابلہ علیؑ ابوبکر کی شوکت اور اِستعداد لوگوں کی نگاہ میں کم تھی

صاحب صواعق نے ایک جگہ دلیل لاتے لاتے یہ بھی کہا ہے کہ: "ابوبکر منازعت درین باب (امامت) میکرد بہ آنکہ از علی کرم اللہ وجہہٗ از ضعف بود در شوکت و استعداد نزد مردم او را دران وقت کمتر بود"۔ یعنی: "ابوبکر امامت کے بارے میں جھگڑے، حالانکہ علیؑ سے شوکت میں کمزور تھے اور لوگوں کے نزدیک ابوبکر کی لیاقت اس وقت کمتر تھی"۔ اب اس امر کے سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ آیا جناب امیر علیہ السّلام کے الفاظ اس واقعہ کے سمجھنے میں کوئی مدد دیتے ہیں۔ اس کے لیے نہج البلاغہ کے مختلف خطبوں کا متعلق خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

نہج البلاغہ سے کیا سمجھ میں آتا ہے

جب حضرت کو خبر دی گئی کہ مہاجر و انصار سقیفہ میں جھگڑا کر رہے ہیں تو آپ نے دریافت فرمایا کہ: "انصار کیا کہتے ہیں؟"۔ عرض کی گئی کہ وہ کہتے ہیں: "منا امیر و منکم امیر"۔

انصار اور مہاجرین کی دلیل میں علیؑ کی دلیل

فرمایا: "مہاجرین نے کیوں یہ دلیل پیش نہ کی کہ رسولِ خداؐ نے وصیت فرمائی ہے کہ ان کے اچھوں سے نیکی کی جائے اور ان کے بروں سے درگزر کیا جائے"۔ اصحاب نے عرض کیا کہ: "اس میں ان کے عدم امارت کی کونسی دلیل ہے؟"۔ فرمایا: "اگر ان میں امارت ہوتی اور ان میں بھی کوئی امیر اور خلیفہ ہوتا تو یہ دوسروں کے سپرد کیوں کیے جاتے؟"۔

قریش نے پھل کو ضائع کیا

پھر فرمایا: "اچھا قریش نے کیا دلیل پیش کی؟"۔ اصحاب نے عرض کی کہ وہ یہ دلیل لائے کہ: "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے شجرے سے ہیں۔ پیغمبر کے خاندان اور قبیلہ سے ہیں"۔ اِرشاد فرمایا: "وہ اس شجرے کے ساتھ تو متمسک ہوئے مگر اس کے ثمر کو ضائع کر دیا"۔

علیؑ کی پیشین گوئی نظامِ قومی کی برہمی کے متعلق

مجلس شوریٰ میں فرمایا: "کہیں ایسا نہ ہو کہ آج کے دن کے بعد تم اس امر خلافت کو ایسی حالت میں دیکھو کہ اس میں تلواریں کھینچی جائیں، عہد شکنیاں ظہور میں آئیں، حتی کہ تم میں سے بعض لوگ اہل ضلالت و گمراہی کے امام اور اہل جہالت و نادانی کے پیرو ہو جائیں"۔

ذمہ داری کے زمانہ میں محتاط جوابؑ

زمانہ خلافت میں جب کہ معاویہ مخالفتوں پر آمادہ تھا کسی نے پوچھا کہ خلافت کے سزاوار تو آپ ہی تھے پھر کیوں قوم نے آپ کو اس سے علیحدہ کر دیا۔ فرمایا: "بے شک تیرے مرکب کا تنگ ڈھیلا ہے۔ تو صواب و سداد کے برخلاف رستوں کی طرف مہار اٹھا رہا ہے اور وہ سوال کر رہا ہے جس کا موقع اور مصلحت نہیں (لیکن) تجھے سوال کرنے کا حق بھی

حاصل ہے اور تو علم کا طالب بھی ہو رہا ہے۔ لہذا اب معلوم کر حالانکہ از روئے نسب میں سب سے اعلیٰ ہوں اور از روئے رشتہ کے رسُولِ خدا سے نہایت ہی قریب بلکہ پیوست ہوں پھر بھی مجھ پر بلند ہونے کی آرزو کرنا ظاہر ہے کہ اس قوم کے نفوس نے بخل اختیار کیا۔ حق بہ حقدار نہ پہنچایا، اور ایک دوسرے گروہ نے اپنے نفسوں پر سخاوت اختیار کی کہ حق و باطل میں حکم کرنے والا خداوند عالم ہے۔ تو اس غارت کے حالت کو چھوڑ دے جس کے اطراف میں بہت سی فریادیں بلند ہو چکی ہیں۔ اب اس ابن ابوسفیان کی شان بزرگ کو دیکھو مجھے رلانے کے بعد اس زمانہ نے ہنسا دیا، اور اگر دیکھا جائے تو قسم خدا کی یہ کوئی تعجب کا مقام بھی نہیں ۔۔۔۔ اگر ہم سے اور ان سے ان بلاؤں کے رنج والم دور ہو جاتے تو میں انھیں خالص حق پر قائم کر دیتا، اور اگر ان سے بر خلاف صادر ہو تو پھر تو ایسے لوگوں کی گمراہیوں پر حسرت و افسوس کر کے اپنے نفس کو ہلاک نہ کر۔ کیونکہ جو کچھ یہ لوگ عمل کرتے ہیں پروردگار اس سے واقف ہے۔

علیؑ قریش کے متعلق

"بار الہا! میں تجھ سے اس گروہِ قریش کے لیے اِنتقام طلب کرتا ہوں۔ کیونکہ ان لوگوں نے میرے رحم کو قطع کیا، اور اس حق پر مجھے نزاع کرنے کے لیے جمع ہو گئے جس کا میں ان سے زیادہ مستحق تھا، اور مجھ سے کہنے لگے کہ بے شک یہ خلافت تیرا حق ہے اگر تو اسے لے لے مگر اب تو حق یہی ہے کہ تجھے اس سے روک دیا جائے۔ اب تو نہایت ہی رنج والم کی حالت میں صبر کر اور نہایت متاسفانہ طریقہ سے مرجا۔ اب میں نے نگاہ دوڑائی تو اہلِ بیتؑ کے سوا کسی کو اپنا معین و مددگار اور دشمن کو دور کرنے والا نہ پایا"۔

علیؑ نے اہلِ بیتؑ کی موت سے بخل کیا

"میں نے انؑ کی موت سے بخل کیا۔ اب میں نے کدورت آمیز آنسو بہانے کے لیے آنکھوں کو بند کر لیا۔ دلی سوزش بجھانے کے واسطے لعاب دہن پی کر رہ گیا، اور خشم و غضب کے فرو کرنے کے خاطر ایسے ناگوار طریقہ سے صبر کیا جو درخت حنظل سے بھی زیادہ تلخ اور تیز چھریوں کی برش سے زیادہ قلب کو اذیت پہنچانے والا ہے"۔

شوریٰ کی تردید اور مصاحبت کی دلیل میں قرابت

"نہایت تعجب ہے کہ مصاحبت پیغمبر تو خلافت کا حق دار کر دے اور جو شخص مصاحب بھی ہو اور خویش بھی وہ خلافت سے محروم رہے۔ اگر تو شوریٰ و اجماع کے سبب سے امور مردم کا مالک ہو گیا تو یہ شوریٰ و اجماع متحقق کیونکر ہوا۔ کیونکہ صاحبان شوریٰ تو غائب ہی ہیں"۔

خاموشی اغیار کے اِستحقاق کا اقرار اور اپنا اِنکار نہ تھا

پیغمبر کی وفات کے بعد جو ہم نے جہاد اور احقاق حق میں تاخیر کی اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اغیار اس کے مستحق تھے اور ہمیں وہ حق نہیں پہنچتا تھا۔

علیؑ نے صبر کا تصفیہ کیا

"اے سننے والے خبردار ہو جا کہ فلاں شخص نے پیرہن خلافت کو زیب تن کر لیا۔ حالانکہ وہ خوب جانتا تھا، اور اسے اچھی طرح یقین تھا کہ خلافت کے لیے میرا وہ مقام ہے اور مجھے اس سے وہی نسبت ہے جو آسیا کو قطب آسیا سے ۔۔۔۔ جب ابن ابوقحافہ نے اس پیرہن کو ناحق اپنے زینت بنا لیا تو میں نے اپنے اور اس خلافت کے درمیان پردہ ڈال دیا، اور اس معاملہ میں غور کرنا شروع کیا کہ اپنے

بریدہ اور شکستہ ہاتھ سے اس پر حملہ کروں یا اس ظلمت و تاریکی پر صبر کروں۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ اس واقعہ پر میرا صبر کرنا بہت ہی بہتر اور نہایت ہی عقلمندی ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میری میراث کس طرح تاراج و غارت ہو رہی ہے"۔

"جب آپؐ کا انتقال ہو گیا تو آپؐ (رسولؐ) کے بعد مسلمانوں نے امرِ خلافت میں نزاع کی۔ قسم خدا کی ہرگز میرے دل میں یہ بات نہ تھی، مجھے اس کا گمان بھی نہ تھا کہ اہلِ عرب اس امرِ خلافت کو رسولؐ اللہ کے بعد آپؐ کے اہلِ بیتؑ سے زائل کردیں گے۔ نہ مجھے یہ خیال تھا کہ حضرتؐ کے بعد مجھے اس خلافت سے دُور کردیں گے"۔

حصولِ اختیار کا نتیجہ آگ اور تخلیہ

اب جو واقعات ہم بیان کریں گے وہ حصولِ اختیار کا نتیجہ کہا جائے گا۔ ابوالفدا کہتا ہے:

ابوبکر نے اب عمر کو علیؑ کے پاس بایں ارادہ بھیجا کہ: "جو لوگ اہلِ بیت میں سے ہمراہ ہیں انھیں مع علیؑ کے حضرت فاطمہؑ کے گھر سے نکال دو، اور اگر نکلنے سے انکار کریں تو لڑنا"۔ یہ تھوڑے لوگ لے کر بہ ارادہ گھر پھونکنے کے گئے۔

حضرت فاطمہؑ کا سوال اور عمر کا جواب

حضرت فاطمہؑ سے ملاقات پر آپ نے پوچھا: "کیا ہمارا گھر پھونکنے جاتا ہے؟"۔ "البتہ گھر پھونک ڈالوں گا، نہیں تو تم بھی ابوبکر صدیق سے بیعت کرلو۔ جس بیعت میں تمام امت داخل ہوئی تم بھی داخل ہو جاؤ"۔

مُہلت نہ دینے کی صلاح

کتاب الامامۃ والسیاسۃ میں بھی ہے کہ پہلے ابن خطاب لکڑیاں لے کر گئے اور واپس آئے۔ اس کے بعد صلاح ہوئی کہ مُہلت نہ دینی چاہیے۔

اور اس مرتبہ ایک شخص بھیجا گیا جس کا نام قنفذ تھا۔

طاہرہؑ کی فریاد نے قنفذ کو رُلا دیا

اس وقت حضرت زکیہ طاہرہؑ نے بلند آواز سے فرمایا کہ: "یا رسولؐ اللہ! آپ کے بعد ابنِ ابو قحافہ اور عمر سے کیا کیا نہیں دیکھا"۔ اس پر قنفذ اور اس کے ہمراہی رونے لگے۔

علیؑ صاحبانِ اختیار کی روش سمجھاتے ہیں

اس مؤرخ کے موافق جس وقت حضرت علیؑ دربارِ خلافت میں موجود تھے۔ آپ نے فرمایا کہ: "اس طرح دودھ دوہو کہ تمھیں بھی اس کا ایک حصہ ملے اور ان کے لیے مضبوط کرو کہ وہ کل تمھیں لوٹا دیں گے"۔

حضرت علیؑ کا سوال اور عمر کا جواب

حضرتؑ نے یہ سوال کیا کہ: "اگر ہم بیعت نہ کریں تو کیا کروگے؟"۔ عمر نے کہا: "گردن ماریں گے"۔

ابوبکر کا جواب

اور اس کے بعد ابوبکر سے مخاطب ہو کر کہا کہ: "تم کچھ حکم کیوں نہیں دیتے"۔ جس کا انھوں نے جواب دیا کہ: "جب تک فاطمہؑ ان کے پہلو میں ہیں ہم کبھی مجبور نہ کریں گے"۔

بشر بن سعد اور علیؑ کی گفتگو

اعثم کوفی کے موافق بشر بن سعد اور علیؑ میں یہ گفتگو ہوئی: بشر نے کہا: "یا علیؑ صدیق کی بیعت کے پہلے اگر تم اپنا حق ظاہر کرتے تو دو آدمیوں سے زیادہ کوئی تمھاری مخالفت نہ کرتا۔ لیکن چونکہ تم گھر بیٹھے رہے۔ سب کو خیال ہوا کہ تمھیں رغبت خلافت نہیں ہے۔

اب یہ باتیں لوگوں کے عقیدہ کے خلاف ہوں گی۔ لوگوں نے اس خوف سے کہ مبادا دینِ رسولؐ میں خلل پڑے ابوبکر کی بیعت کرلی"۔ علیؑ نے جواب میں فرمایا: "اے بشر! کیا تو اسے پسند کرے گا کہ میں رسولؐ کی لاش بے غسل و کفن چھوڑ کر ریاست کی فکر میں دوڑتا؟"۔

جوش کے وقت حضرت ابوبکر کی لاعلمانہ سادگی اور علیؑ سے بیعت کی تکلیف ساقط

اب ابوبکر جواب میں کہتے ہیں کہ: "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم مخالفت کروگے تو میں ہرگز قبول نہ کرتا۔ اب اگر بیعت کرو تو مناسب ہے۔ نہیں تو تم پر کوئی تکلیف نہیں ہے"۔ صاحب صواعقِ محرقہ نے بھی اس اعلان کو لکھا ہے۔ اگرچہ اس کی تکمیل اس طرح کی ہے کہ حضرت علیؑ نے تعریفیں کرنے کے بعد بیعت کرلی۔

ابوبکر رو رہے ہیں

اس مورخ نے یہ بھی لکھا ہے کہ: جب ابنِ ابوقحافہ حضرت علیؑ کے پاس گئے تو جناب امیر نے شکایت کی کہ: "متفرد شدی بامر یعنی مشورت را تنہا کردی و مارا دخل نہ دادی و بواسطہ قرابتے برسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مارا درین نصیبے بود مثل این نوع سخنان رفق امیزی گفت تا آنکہ ابوبکر صدیق بگریہ آمد و اشک از چشم ہائے بارید"۔ یعنی: "بغیر مشورہ کے تو نے آمریت اختیار کی اور ہمیں اس میں دخل کا موقع نہ دیا۔ رسولؐ کی قرابت کے واسطہ سے ہمارا حصہ تھا۔ اس طرح کی نرم باتیں کیں، یہاں تک کہ ابوبکر رونے لگے اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے"۔

آیا بیعت لینا حسنِ نیت اور اسلام پر احسانؐ کے خیال سے تھا

اب ہم اس امر کے سمجھنے کے لیے کہ آیا بیعت کرانے والوں نے حسنِ نیت سے مسلمانوں کی ذمہ داری قبول کرکے اسلام پر احسان کیا تھا یا اس کے خلاف تھا ابن ابی الحدید سے مدد لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس روز ابوبکر خلیفہ ہوئے اسی شب کو ابوذر، سلمان اور ابن ہیثم وغیرہ نے ایک کمیٹی کی کہ مہاجرین میں خلافت کے متعلق دوبارہ شوریٰ ہو۔

دوبارہ شوریٰ کی خبر سن کر ابوبکر مُغیرہ کے پاس گئے

یہ خبر ابوبکر وغیرہ کو معلوم ہوئی اور یہ لوگ سیدھے مُغیرہ بن شعبہ کے پاس گئے۔

بقول کتاب الامامۃ والسیاسۃ مُغیرہ نے کہا:

صلاح کہ علیؑ اور بنی ہاشم پر حُجت قائم کرنے کے لیے نسلاً بعد نسل وظیفہ مقرر کردو

کیا تمہاری صلاح ہے کہ عباسؓ کے پاس چلو اور اس امر میں ان کا اور ان کی اولاد کا بھی حصہ قرار دو۔ یہ حُجت ہوگی علیؑ اور بنی ہاشم پر جب کہ عباسؓ تمہارے ساتھ ہوں گے۔

جماعتِ خلافت کا عباسؓ سے مخاطبہ

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اور طرف مائل تھے

پس گئے ابوبکر، عمر اور ابوعبیدہ یہاں تک کہ عباسؓ کے پاس پہنچے ــــ (ابوبکر نے کہا) "ہم کو خبر پہنچی ہے ان طعنوں کی جو طعن کرنے والے اجماعِ مسلمین کے خلاف کرتے ہیں اور تم کو آڑ قرار دیتے ہیں۔ یا تم خود اس میں داخل ہو جس میں عام لوگ داخل ہوئے ہیں۔ یا روکو ان لوگوں کو جس طرف وہ

مائل ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ تمھارے لیے اس امر میں ایک حصہ قرار دیں جو تمھارے اور تمھارے بعد کے لیے ہو۔ اس واسطے کہ تم عم رسولؐ ہو۔ اگرچہ لوگوں نے تمھاری اور تمھارے اصحاب کی منزلت بھی۔ لیکن اس امر خلافت کو تم سے پھیر دیا۔ اے بنی عبدالمطلب اپنی جگہ پر قرار لو، اس واسطے کہ رسولؐ تم سے بھی ہیں اور ہم سے بھی"۔

اب عمر نے شروع کیا: "ہاں واللہ یہ مناسب ہے۔ ہم اس واسطے نہیں آئے ہیں کہ ہم کو تم سے کوئی حاجت ہے۔ لیکن ہم نے اس بات کو ناپسند کیا کہ تمھاری وجہ سے اس امر پر کوئی طعن ہو جس پر عام لوگوں نے اجماع کرلیا ہو۔ پس گھیر لیں گے مشکلات تم کو اور ان کو۔ پس اپنے اور لوگوں کے لیے غور کرو"۔

عباسؓ نے جواب دیا: "رسولؐ نے لوگوں پر ان کے امر کو چھوڑ دیا کہ وہ اپنے لیے انتخاب کریں اس طور سے کہ حق کو لیے ہوں، نہ حق سے علیحدہ ہوں، بسبب خواہش نفس کے۔ اگر بسبب رسولؐ کے تم نے اس کو طلب کیا ہے تو تم نے ہمارا حق لیا، اور اگر مومنین کے ذریعہ سے لیا ہے تو ہم بھی مومنین میں سے ہیں، اور سب میں مقدم ہیں۔ اور اگر یہ تمھارے لیے ثابت ہوا ہے مومنین کے ذریعہ سے تو وہ تمھارے لیے کیونکر ہو سکتا ہے درآنحالیکہ ہم کارہ تھے۔ جو کچھ ہم کو دینا چاہتے ہو اگر وہ تمھارا حق ہے تو ہم کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور مومنین کا حق ہے تو تم کو اس کے متعلق فیصلہ کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اور اگر ہمارا حق ہے تو ہم بعض کو چھوڑ کر بعض پر اکتفا نہیں کرسکتے۔ یہ جو تم نے کہا کہ رسولؐ ہم میں اور تم میں دونوں سے ہیں تو رسولؐ وہ درخت ہیں جس کی ہم ٹہنیاں ہیں اور تم ہمسایہ ہو"۔

بمقابلہ بنی ہاشم پہلے سے سامان کرلیا گیا تھا

حضرت عباسؓ کا یہ جواب ابن ابی الحدید نے لکھا ہے۔ جسے ابن قتیبہ نے نہیں لکھا کہ: "تمھارا یہ قول کہ تمھیں خوف ہے لوگوں کا ہمارے باب میں پس اس کا تو تم نے پہلے ہی سامان کرلیا ہے اور خدا ہمارا مددگار ہے"۔

بیعت ابوبکر سے کراہت کی مثال اور بنی امیہ

اب میں جو مثال دینا چاہتا ہوں وہ انھیں مثالوں کی ضمن میں ہے جیسی پیشتر دی گئیں کہ انصار بیعت ابوبکر کو مکروہ جانتے تھے یا سعدؓ بن عبادہ نے بیعت نہ کی۔ ابن خلدون کے مترجم کی زبانی ہم اس حکایت کو قبول کرتے ہیں جسے اور مورخین نے بھی نقل کیا ہے کہ: "ایک روز ابوسفیان مدینہ میں علیؑ کے پاس یہ کہتے ہوئے آئے کہ میں مدینہ میں ایک عجب شورش دیکھتا ہوں جس کو سوائے کشت و خون کے اور کوئی چیز فرو نہیں کرسکتی۔ اے آلِ عبدمناف ابوبکر تمھارے ہوتے ہوئے سرداری کا کیسے مستحق ہوسکتا ہے۔ کہاں ہیں وہ دونوں ضعیف و ذلیل علیؑ و عباسؓ؟ یہ عجب بات ہے کہ حکومت و سلطنت قریش کی نہایت چھوٹے اور حقیر قبیلہ میں چلی جائے"۔ یہ کہہ کر علیؑ سے مخاطب ہو کر کہا: "ہاتھ بڑھاؤ! میں تم سے بیعت کرتا ہوں۔ واللہ اگر تم چاہو تو میں ابوبکر پر اس میدان کو تنگ کردوں، اور دم زدن میں اس کو سوار و پیادہ سے بھر دوں"۔

ابوسفیانؓ کو علیؑ کا جواب

علیؑ نے یہ سن کر نہایت سختی سے جواب دیا، اور یہ کہا کہ واللہ تو نے اس سے سوائے فتنہ و فساد کے اور کسی بات کا قصد نہیں کیا۔ واللہ تو نے اسلام میں آتش فتنہ روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ جا مجھے تیری نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔

علیؑ نے قبول نہ کیا

صواعق میں ہے کہ: "حضرت عباس ارادت بیعت با علی کرم اللہ وجہٗ کردہ و علیؑ قبول این معنی نہ کرد۔ زبیر صاحب شجاعت بنو ہاشم وغیر ایشان بہ او بودند و تقویت او میکردند"۔
یعنی: حضرت عباسؓ نے علیؑ کی بیعت کا ارادہ کیا۔ علیؑ نے قبول نہ فرمایا۔ زبیر بہادر بنو ہاشم وغیرہ ان کے ساتھ تھے اور ان کی تقویت کر رہے تھے"۔

ابوبکر کی بیعت سے تخلف کرنے والوں کے نام

ابوالفدا کہتا ہے کہ بنی ہاشم، عُتبہ بن ابی لہب، خالد بن سعید بن العاص، مقداد، ابن عمر، سلمان فارسی، ابوذر، عمار بن یاسر، براء بن عازب اور ابن کعب علیؑ کے ہمراہ رہے اور ان لوگوں نے ابوبکر کی بیعت نہ کی۔ ابوسفیان بھی جو بنی امیہ تھا الگ رہا۔ ابن خلدون میں متخلفین بیعت میں طلحہ کا نام بھی ہے۔
ابن خلدون سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر نے خالد بن سعید کو جو شام کے عامل تھے اور جنھوں نے بعد وفات آنحضرتؐ چند روز بیعت ابوبکر سے تخلف کیا تھا، اور علیؑ و عثمان روسائے بنی عبد مناف کے پاس گئے تھے، معزول کر دیا۔

عُتبہ بن ابولہب کے اشعار

ابوالفدا کے موافق عُتبہ بن ابی لہب نے چند شعر اس مضمون کے کہے کہ: "میں نہ جانتا تھا کہ خلافت اور حکم اولاد ہاشم سے جاتا رہے گا اور ابی حسن کو بھی جو سب سے پہلے ایمان لائے تھے اور سب سے پہلے مُسلمان ہوئے قرآن و سُنن کو خوب جانتے تھے اور جس نے آخر وقت میں رسُولؐ خدا کو غسل دیا اسے خلافت نہ ملے گی، بلکہ ایک اور ہی شخص کو مل جائے گی"۔

بنی ہاشم کی مالی مُشکل قِصّۂ فدک

اب ہم جو کچھ کہیں گے وہ صاحب اختیار لوگوں کی یہ کوشش سمجھی جائے گی کہ وہ خاندان رسالت کو مالی حیثیت سے اپنا دست نگر بنانا چاہتے ہیں۔ یا قبضہ خلافت کے ساتھ رسُولؐ کی جائیداد خالصہ کو بھی اسی حق سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم واقعہ فدک کو زمانہ رسُولؐ میں کسی حد تک تعارف کے لیے پیش کر چکے ہیں۔

طاہرہ کا سوال اور خلیفہ کا اقرار کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی اولاد ان کی وارث ہوگی

یہاں اب اس قدر کہنا ہے کہ بقول مناہج النبوۃ "آئیں بنت رسُولؐ اللہ فاطمہؑ زہرا ابوبکر کے نزدیک اور میراث طلب کیا۔ میراث نہ دی ابوبکر نے۔ پس کہا فاطمہؑ زہرا نے: "اے ابوبکر! اگر تو مر جائے، کون وارث ہوگا تیرا؟"۔ کہا صدیق نے کہ: "میرے اہل اور اولاد وارث ہوں گے"۔ فاطمہؑ نے کہا: "پھر کیا سبب ہے جو میں وارث نہ ہوں اپنے باپ کی؟"۔ کہا ابوبکر نے کہ: "سنا ہے میں نے رسُولؐ خدا سے کہ نہیں ہوتی ہم کو میراث۔۔۔"۔

فاطمہؑ زہرا کو غضب ناک کرنے کے بعد معذرت فاطمہؑ نے اجازت نہ دی، فاطمہؑ نے منہ پھیر لیا

کتاب الامامۃ والسیاسۃ میں ہے: کہا عمر نے ابوبکر سے چلو ہم لوگوں کے ساتھ فاطمہؑ کے یہاں، اس لیے کہ ہم نے ان کو غضب ناک کیا ہے۔ پس دونوں شخص گئے اور اجازت چاہی فاطمہؑ سے ان کے پاس حاضر ہونے کی لیکن انھوں نے اذن نہ دیا تو دونوں صاحب علیؑ کے پاس گئے اور ان سے گفتگو کی اور وہ ان دونوں شخصوں کو فاطمہؑ کے پاس لے گئے۔ اور جب یہ دونوں بیٹھے ان کے پاس تو انھوں نے ان لوگوں کی طرف سے مُنہ پھیر کر دیوار کی

طرف کرلیا۔ ان لوگوں نے سلام کیا۔ فاطمہؑ نے جواب سلام بھی نہ دیا۔ پس ابوبکر گویا ہوئے اور کہا: "اے حبیبہ رسولؐ اللہ قرابت رسولؐ کی زیادہ محبوب ہے مجھے اپنی قرابت سے اور آپ میرے نزدیک میری بیٹی عائشہ سے زیادہ محبوب ہیں ۔۔۔ آیا آپ سمجھ سکتی ہیں کہ میں آپ کو اور آپ کے فضل و شرف کو پہچان کر پھر بھی آپ کا حق نہ دوں۔ اور آپ کو میراث رسولؐ سے محروم رکھوں۔ آگاہ ہوجیے کہ میں نے آپ کے والد رسولِ خدا سے سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے:

خلافت کے بعد پہلی حدیث جو ابوبکر نے بیان کی

لا نورث ما ترکناہ صدقۃ۔ یعنی: "ہم وارث نہیں بناتے ہمارا ترکہ صدقہ ہے"۔ پس فاطمہؑ نے کہا: "اگر میں تم دونوں سے رسولؐ خدا کی حدیث بیان کروں تو اس کا اقرار کروگے اور اس پر عمل کروگے۔ دونوں صاحبوں نے کہا کہ "ہاں"۔

طاہرہؑ ایک حدیث بیان فرماتی ہیں

پھر فرمایا کہ قسم دیتی ہوں تم کو اللہ کی آیا نہیں سنا ہے تم نے رسولؐ اللہ سے کہ فرماتے تھے: "رضا فاطمۃ من رضائی وسخط فاطمۃ من سخطی فمن احب فاطمۃ ابنتی فقد احبنی ومن ارضا فاطمۃ فقد ارضانی ومن اسخط فاطمۃ فقد اسخطنی"۔ یعنی: "فاطمہؑ کی رضا میری رضا ہے، فاطمہؑ کی ناراضگی میری ناراضگی ہے۔ جس نے میری بیٹی فاطمہؑ سے پیار کیا مجھ سے پیار کیا، جس نے فاطمہؑ کو راضی رکھا اس نے مجھے راضی رکھا، جس نے فاطمہ کا ناراض کی اس نے مجھے ناراض کیا"۔ دونوں صاحبوں نے کہا ہاں سنا ہے ہم نے رسولؐ خدا سے۔ پس کہا فاطمہؑ نے پس میں گواہ کرتی ہوں اللہ اور ملائکہ کو کہ تم دونوں نے مجھے ناراض کیا، اور مجھ کو راضی نہیں کیا، اور اگر رسولؐ سے ملوں گی تو تمہاری ان سے شکایت کروں گی۔ پس کہا ابوبکر نے ہم پناہ مانگتے ہیں خدا کی اس کی ناراضی اور تمہاری ناراضی سے اے فاطمہؑ۔

دوبارہ ابوبکر کو رونا آگیا

پھر ابوبکر نے رونا شروع کیا یہاں تک کہ قریب تھا کہ روح ان کی نکل جائے۔ اور سیدہ بھی کہہ رہی تھیں کہ واللہ بد دعا کیا کروں گی تیرے لیے ہر نماز میں۔

اپنی حیات تک بات نہ کی

صاحب صواعق محرقہ فرماتے ہیں: "روایت کرد بخاری از عائشہ کہ حضرت فاطمہ کسے را نزد ابوبکر فرستاد و طلب میراث خود از اعمال مدینہ و فدک و باقی خمس خیبر کہ ازاں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ماندہ بود کرد ۔۔۔۔ چوں ابابکر ابا کرد ازاں کہ چیزے ازاں اموال بہ فاطمہ دہد فاطمہ رضی اللہ عنہا غضب کرد بر ابابکر صدیق رضی اللہ عنہ ہجرت کرد و تکلم نہ کرد تا زمانیکہ حضرت فاطمہ زہرا حیات بود"۔ یعنی: "بخاری نے عائشہ سے روایت کی ہے کہ حضرت فاطمہؑ نے کسی کو ابوبکر کے پاس بھیجا اور مدینہ کے اموال اور فدک نیز حضورؐ کے خیبر کے بچے ہوئے خمس کو مانگا ۔۔۔۔ جب ابوبکر نے انکار کیا اس سے کہ ان اموال میں سے کچھ بھی فاطمہؑ کو دے تو فاطمہؑ ابوبکر پر غضبناک ہوئیں اور بولنا چھوڑ دیا۔ اور جب تک حضرت فاطمہ زہراؑ زندہ رہیں اس سے نہ بولیں"۔

قوت و معیشت کے لینے کی شکایت

مجالس الابرار ترجمہ بحار الانوار کے موافق حضرت زکیہ طاہرہؑ فرماتی ہیں کہ: "میرے باپ کے بخشے ہوئے باغ کو اور میرے فرزندوں کے قوت و معیشت کو لے لیا ہے"۔

مانعینِ زکوٰۃ کا قتل

اب میں حصولِ اختیار کے آخری نتیجہ کی طرف توجہ دلاتا ہوں یہ دردانگیز داستان ہے جسے افضل کا پر جوش لہجہ اور آنسو خوب بیان کرسکتے تھے۔ مجھے اس جگہ اہلِ ردت کی تقسیم کردینی ہوگی جس سے مطلب سمجھنے میں آسانی ہو۔

مؤرخین نے اہلِ ردتؓ اور مانعینِ زکوٰۃ کو مخلوط کردیا ہے

مؤرخین نے جہاں مسیلمہ کذاب، سجاح، اور طلحہ بن خویلد کو جائز حیثیت سے مرتدین کے خطاب سے یاد کیا ہے وہاں ان لوگوں کو بھی جنھوں نے ابابکر کو رسولؐ کا جائز خلیفہ نہ سمجھ کر زکوٰۃ اور صدقات دینا روک رکھا تھا یا انکار کیا تھا انھیں بھی اہلِ ردت کے ناجائز لقب، غلط الزام اور غلط مفہوم سمجھانے والے فقرہ سے یاد کیا ہے۔ مجھے اول الذکر گروہ سے کوئی غرض نہیں ہے۔ صرف یہ کہنا ہے کہ یہ فتوحات اگرچہ کیسے ہی قیمت معاوضہ میں کیوں نہ پیش کرتے ہوں لیکن میری دانست میں یہ فتوحات بڑی قیمت سے خریدی گئی تھیں جن میں صرف جنگ یمامہ میں سات سو حافظِ قرآن کٹوا دیے گئے۔ میں کسی حد تک اسی دوسرے گروہ کے حالات پر اکتفا کرتا ہوں۔ لیکن اس کے قبل بغیر یہ کہے نہیں رہ سکتا کہ بعد رسولؐ جو کچھ ہوا اس پر سلیم الطبعی سے رائے قائم کرنے میں ایسی وحشت خیز سطریں اڑا نہ لی جائیں کہ: "قبائل کے قبائل اسلام سے پھر گئے تھے کم ایسے قبیلہ تھے جن کے بعض مرتد ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کی وجہ سے نفاق کی تاریکی چھا گئی تھی۔ ہوائے مخالفت کے جھونکے چل رہے تھے۔ ارتداد کی سیاہ گھٹائیں اُمڈی چلی آتی تھیں۔ مسلمان غریب ایسی شب تاریک میں اپنی قلت جماعت و کثرت اعداء سے حیران و پریشان ہو رہے تھے"۔ میں قائل ہوں کہ باہر کی حالت دیکھنے کے لیے کل حروفِ تہجی مدد کے لیے صرف کردیے گئے ہیں لیکن اندر کی حالت دیکھنے کی طرف سے مُنہ موڑ لیا گیا ہے۔ اس لیے کہ جو کچھ ہم دکھا رہے ہیں اسے دیکھو، اور لسے ویسا ہی سمجھو۔ جیسا ہم سمجھا رہے ہیں۔ اس سے دو غرض پوری ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ ہمارا حق قبول کرو، دوسرے یہ کہ اس کے بعد اسی حق کے رو سے ہم جو کچھ کریں اسے بھی قبول کرو، اور ہمارا احسان مانو کہ ہم نے یہ کیا۔ حالانکہ حصول حق اور حق کا نفاذ دونوں نہایت گہرے الزام کے سایہ میں ہیں۔ مرتد جس مفہوم میں سمجھا گیا ہے اس کی ابن خلدون سے مثال دیتا ہوں: "عمر بن معاویہ نے باوجود واجب ہونے کے صدقات کے دینے سے انکار کیا۔ زیاد نے ان پر حملہ کرکے انھیں شکست دی۔ کل بنی عمر بن معاویہ اسی واقعہ سے برہم ہو کر منع صدقات پر آمادہ اور مرتد ہوگئے"۔

ان حالتوں میں بجز کسی ایسے صریح اور صاف واقعہ کے جس میں یہ لکھا ہو کہ فلاں شخص یا قبیلہ اسلام سے پھر گیا، اور اس نے ارتداد و سیاعند اور رسولؐ چن لیا۔ ہم تمام دیگر واقعات کو اسی سرخی میں لائیں گے کہ ساری دوڑ، فوجیں اور سرگرمی اپنے اختیارات تسلیم کرانے کے لیے تھی۔ ان لوگوں سے جو یہ سوال کرتے تھے کہ تم کون ہو جو رسولؐ کے بعد ہمارے درمیان حائل ہوگئے ہو اور تمھیں کیا حق حاصل ہے۔ ہم کیوں تمھیں زکوٰۃ اور صدقات کا محافظ قرار دیں۔

مؤرخین کے لیے اس سے زیادہ کونسی آسان بات ہوسکتی تھی کہ ان کو جن کے سر جھکانے کے لیے فوجیں بھیجی جا سکتی تھیں اس لیے کہ ہمیں خلیفہ تسلیم کرو اور زکوٰۃ دو انھیں اسلام سے پھرا ہوا کہہ دیتے اور ان کے قتل و غارت کو صلاح دین کہتے۔ ایسے مواقع دکھائی دیتے ہیں جہاں یہ کہا گیا ہے کہ چونکہ ایک قبیلہ نے دوسرے مسلمان قبیلہ پر حملہ کیا تھا،

وہ مرتد ہو گیا، یا چونکہ بعض قبائل سجاح اور مسیلمہ کے ساتھ ہو کر خالد کے لشکر سے لڑے اس لیے وہ کافر ہو گئے۔ لیکن میرے خیال میں یہ واقعات کا غلط پیرایہ ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم مدنی فوج کے سپاہیوں کو کیا کہیں، جو ان سے لڑنے گئے جو ابوقتادہ کے نزدیک مسلمان تھے، بلکہ واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ قبائل میں جنگ ہو جانا اپنے گزشتہ عداوتوں کی بنیاد پر تھا، ارتداد کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ اسی طرح وہ قبائل جو مسیلمہ کے ساتھ ہو کر لڑے۔ چونکہ وہ خود مرکزی حکومت کے استحقاق تحصیل زکوٰۃ کو قبول نہ کرتے تھے انھوں نے حکومت کے دوسرے دشمن کو قدر مشترک سمجھا۔ یعنی جنگ میں ساتھ لے لیا۔ زیادہ سے زیادہ ان پر یہ الزام عاید ہو سکتا ہے کہ انھوں نے باوجود اختلاف کے غیر مسلم کے شریک ہو کر مسلمانوں سے کیوں جنگ کی۔ اس کے لیے شاید حضرت ابوبکر کو ایسے لوگوں کو بھی سزا دینے اور مرتد کہنے کی ضرورت ہوتی جسے نہ وہ خود پسند کرتے اور نہ مسلمان۔ بلکہ حقیقۃً ان میں بعض کا پیرایہ یہی تھا۔ جیسا کہ بنی حنیفہ کا ایک گرفتار عمر بن شمر کہتا ہے کہ مسیلمہ نے دھوکا دیا، اور قوت پکڑی۔ "مثل خلافت شما کہ از خاندان نبوت بخدع گرفتید"۔ یعنی:
"تمہاری خلافت کی طرح کہ جسے تم نے خاندان نبوت سے دھوکے کے ذریعے لے لیا"۔ (اعثم کوفی)

ان واقعات کا مفہوم سمجھانے کے لیے میں اعثم کوفی کو منتخب کرتا ہوں جس نے مؤرخانہ سادگی اور صراحت سے یہ واقعات لکھے ہیں۔ جس کی فطری حیثیت میں مجھے کوئی شبہ نہیں ہے۔ لیکن مؤرخ مذکور سے مدد لینے کے قبل میں چاہتا ہوں کہ مشاقوہ روایتیں بھی بیان کردوں جو اور مؤرخین سے بھی ملتی ہیں جس سے یہ سمجھ میں آجائے کہ خود دار الخلافت کے اکثر ممیزین اس کے خلاف تھے۔ بقول صاحب مظاہر حق: حضرت عمر اور حضرت علیؑ مانعین زکوٰۃ کی کلمہ گوئی پر نظر کر کے سفارش کو اٹھے اور کہا کیونکر قتال کریں ہم ان سے ایسی حالت میں کہ فرمایا آنحضرت نے: "امرت اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللّٰہ"۔ یعنی: "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ "لا الٰہ الا اللّٰہ" کہنے لگیں"۔ کہا ابوبکر نے کہ قتال کروں گا ان سے کہ جو فرق کریں گے درمیان زکوٰۃ اور نماز کے۔ حضرت عمر نے کہا کہ دیکھا میں نے کہ کھول دیا اللہ نے سینہ ابوبکر کا قتال کے لیے۔ پس جانا میں نے کہ یہی حق ہے۔

صاحب صواعق محرقہ کہتے ہیں: "چون وفات پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم مشہور شد و در نواحی مدینہ طائفہ بسیار از عرب مرتد شد و منع زکوٰۃ کردند ابوبکر صدیق بقتال ایشان برخاست۔ عمر و بعضے دیگر از اصحاب گفتند صلاح در انست کہ دست از قتال ایشان باز داری۔ ابوبکر گفت بہ سوگند کہ بتقصیر نکنم در عقالے و عناقے کہ آنچہ در زمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میدادند از من منع می کنند و اوائے آن نمی کنند ہر آئینہ مقاتلہ با ایشان خواہم کرد در منع آن۔ بعد ازاں عمر گفت چگونہ با ایشان قتال میکنی و حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمود امرت ان اقاتل الناس حتی یقولو لا الہ الا اللہ و ان محمد رسول اللہ فمن قالہا عصم منی مالہ و دمہ الا بحقہا و حسابہا علی اللہ۔ مامور شدم بقتال مردمان تا زمانیکہ بگویند لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ و ہر کس کہ این کلمہ گفت منع کرد و حمایت کرد از من مال خود را و خون خود را الا بر حق این قول یا بر حق مال یا دم و حساب او بر خدا تعالیٰ است۔۔۔۔۔ ابوبکر گفت بسوگند کہ مقاتلہ خواہم کرد بکسیکہ در میان صلوٰۃ و زکوٰۃ فرق کند چرا کہ زکوٰۃ حق مال است و حال آنکہ رسول فرمود صلی اللہ علیہ وسلم الا بحقہا۔ عمر گفت بخدائے سوگند کہ نیافتم کسے دیگر را آنکہ خدائے تعالیٰ منشرح ساخت صدر ابوبکر را بقتال آن جماعت و معلوم من شد کہ حق بجانب ابوبکر و آنچہ او می گفت راست بود"۔ یعنی: "جب پیغمبرؐ کی

وفات مشہور ہوگئی اور مدینہ کے اطراف میں بہت سے گروہ عرب مرتد ہوگئے اور زکوٰۃ دینی روک دی تو ابوبکر صدیق ان سے جنگ کو اٹھے۔ عمر اور بعض دیگر اصحاب بولے کہ بہتری اس میں ہے کہ لڑائی سے ہاتھ روکے رکھیں۔ ابوبکر نے قسم اٹھا کر کہا کہ ایک رسی اور ایک بکری کے بچے کے بارے میں بھی کمی نہ کروں گا، جو وہ زمانۂ رسولؐ میں دیتے تھے۔ مجھے دینے سے مانع ہیں اور ادا نہیں کرتے میں ہر حال ان سے اس رکاوٹ میں مقابلہ کروں گا۔ اس کے بعد عمر نے کہا آپ ان سے کس طرح لڑ سکتے ہیں جب کہ رسولِ خداؐ نے فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ لا کے قائل ہو جائیں، اور اس کے کہ محمد اللہ کے رسولؐ ہیں۔ پس جو اس کا قائل ہو جائے اس کا مال اور خون مجھ سے محفوظ ہے، سوائے حق کے اور اس کا حساب اللہ پر ہے۔ ابوبکر نے قسم اٹھا کر کہا کہ میں اس سے لڑوں گا، جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے۔ کیونکہ زکوٰۃ ہمارا حق ہے اور رسولؐ نے فرمایا ہے کہ: الا بحقها۔ عمر نے کہا اللہ کی قسم جس طرح ابوبکر کا سینہ اللہ نے ان لوگوں کے قتال کے لیے کھول دیا کسی اور کو میں نے نہیں دیکھا۔ اور مجھے معلوم ہو گیا ابوبکر حق بجانب ہیں اور جو کچھ وہ کہتے تھے سچ تھا۔

ابن خلدون کے نزدیک ابوبکر کی بعض قابل شمار خدمتیں

ہم کو ابن خلدون کے کسی ایسے معرفانہ استفہام سے کوئی بحث نہیں ہے کہ "اگر ابوبکر ایسے ہنگامہ میں جس وقت کہ کسی کے ہوش حواس بجا نہ تھے پیش نہ ہو گئے ہوتے تو عمر کو ان کے پر جوش کلام سے کون روکتا۔ عائشہ کے سینہ سے سر مبارک کون اٹھاتا۔ سقیفہ میں انصار و مہاجرین کے جھگڑے کو کون ختم کرتا۔ مرتدین کا کون قلع قمع کرتا"۔ یا وہ انھیں ایسے "اہم امور" بتائیں جنھیں "دین کے ساتھ نہایت قوی تعلق تھا"۔ نہ ہمیں ابوہریرہ سے کوئی شکایت ہے کہ ہم ان سے اس کی باز پرس کریں کہ: "اگر ابوبکر خلیفہ نبودی مردم بندگی خدا تعالیٰ را بجانمی آوردند باز مرتبہ سیوم این سخن را مکرر ساخت"۔ یعنی: "اگر ابوبکر خلیفہ نہ ہوتے تو لوگ اللہ کی عبادت بجا نہ لاتے۔ تین بار یہ بات دہرائی"۔ یا ان لوگوں کا ساتھ دیں جنھوں نے یہ سن کر کہا کہ: "ساکن شو اے ابوہریرہ"۔ یعنی: "چپ ہو جا اے ابوہریرہ"۔ لیکن ہم کو ابن حجر مکی سے کہنا ہے کہ علیؑ کی زبان تمھارے قلم کی طرح اپنی خواہش سے پھرنے والی نہ تھی کہ وہ زیر بحث امر پر جس سے ان کی مخالفت ظاہر ہو چکی تھی اپنے اوپر یہ بوجھ گوارا کرتے کہ: "روایت از علی کرم اللہ وجہہ کہ از جملہ شجاعت ابوبکر قتال بود با جماعتے کہ منع زکوٰۃ کردند و عزیمت بران کسے را نباشد"۔ علیؑ سے روایت ہے کہ ابوبکر کی شجاعت میں سے ایک مانعین زکوٰۃ سے لڑائی تھی۔ اس پر کسی اور کو عزیمت نہیں۔

حضر موتؑ کا عاملِ زکوٰۃ مانگتا ہے (اعثم کوفی)

زیاد بن لبید اس وقت حضر موت کا عامل تھا۔ اس نے ایک روز منادی کرائی اور جب لوگ جمع ہوئے تو ان سے کہا کہ: "اے مسلمانان صدقات درہم آورید کہ نزدیک صدیق میفرستم کہ آنجا لشکر انبوہ است و اخراجات بسیار"۔ یعنی: "اے مسلمانو! صدقات (زکوٰۃ) اکٹھا کرکے لے آؤ تاکہ صدیق کے پاس بھیجوں کہ وہاں بہت بڑا لشکر ہے اور اخراجات بہت ہیں"۔ مال کے جمع کرنے میں زیاد نے ایک شخص کے اونٹ کو لے لیا، اور اس پریشان کر دیا اس شخص نے۔

صاحب شریعت کے بعد اس کے اہل بیت کی اطاعت کر سکتے ہیں ابوبکر کو ہم سے کیا بحث

حارثہ بن سراقہ سے سفارش چاہی کہ زیاد کوئی دوسرا اُونٹ لے لے اور وہ دیدے لیکن زیاد نے باوجود سفارش اسے منظور نہ کیا۔ اس پر حارثہ کو غصہ آیا اور اُونٹ کے مالک سے کہا کہ جا اپنا اُونٹ لے لے۔ اور اگر کوئی مزاحمت کرے تو تلوار سے جواب دینا۔ "ما بفرمان خدا پیغامبر او را مطیع بودیم تا صاحب شریعت بجائے بود چون او را فرمان حق رسید اگر از اہل بیت او کسی بجائے او نشیند آنکس را اطاعت داریم لپسر ابوقحافہ را ہرچہ فرمان رسد و باماچہ کار دارد"۔ یعنی: "ہم خدا کے حکم سے اس کے رسولؐ کے فرمانبردار تھے جب تک خود صاحب شریعت موجود تھے چونکہ انھیں حق کا بلاوا آ گیا۔ اگر ان کے خاندان سے کوئی ان کا جانشین ہو تو ہم اس کی اطاعت کریں گے ابوقحافہ کے بیٹے کا جو بھی حکم ہو ہمارے ساتھ اس کا کیا تعلق"۔

اشعث بن قیسؓ تائید کرتا ہے اور اس کی حیرت

حارثہ کا یہ جواب جس وقت اشعث بن قیس کندی کو معلوم ہوا جو ملوک عرب میں سے تھا

عرب نے بنی ہاشم کے مقابلہ میں بنی تیم کو خلیفہ کیا اور ادعا کہ اگر بنی ہاشم کے علاوہ کوئی خلیفہ ہو تو ہم کیوں نہ ہوں

تو اس نے کہا: "مرا یقین حاصل است کہ عرب بتقدیم قبیلہ ابوبکر یعنی بنی تیم تن در ندہند و ترک مہتران بطحاء یعنی از بنی ہاشم نگیرند کہ معدن رسالت و نبوت ایشانند و اگر رواست کہ خلافت بیرون بنی ہاشم کسی را باشد ہیچ کس بدان منصب سزاوار تر از ما نیست کہ ما و پدران ما ملوک زمین بودہ اند"۔ یعنی: "مجھے یقین ہے کہ عرب ابوبکر کے قبیلہ یعنی بنی تیم کو مقدم ہونا قبول نہ کریں گے اور بطحا کے سرداروں یعنی بنی ہاشم کو نہیں چھوڑیں گے۔ کیونکہ وہ معدن نبوت و رسالت ہیں۔ اگر خلافت بنی ہاشم سے باہر جانی روا ہے تو پھر کوئی بھی اس منصب کے لیے ہم سے زیادہ حق نہیں رکھتا۔ کیونکہ ہم اور ہمارے آباء و اجداد زمین کے بادشاہ رہے ہیں"۔ زیاد بن لبید نے اب چاہا کہ حضرموت کے دیگر قبائل ملائے جائیں اور اگر تقویت حاصل ہو تو قبائل کندہ اس کے بعد مجبور کیے جائیں یہ سوچ کر زیاد اب بنی ذہل کے پاس گیا۔ بنی کندہ کی شکایت کی اور ابوبکر کی اطاعت چاہی۔

قطع جماعتؓ کی کوشش اور ناکام جوابؓ

ان میں سے ایک شخص جس کا نام حارث بن معاویہ تھا کہنے لگا: "تو مرا بطاعت مردی میخوانی کہ ہیچ کس مارا بطاعت او وصیت نہ کردہ است"۔ یعنی: "تو ہمیں اس مرد کی اطاعت کی دعوت دیتا ہے کہ جس کی فرمانبرداری کی ہمیں کسی نے وصیت نہیں کی"۔ زیاد نے کہا: "راست می گوئی لیکن ما مسلمانان باتفاق او را اختیار کردیم"۔ یعنی: "تو سچ کہتا ہے لیکن ہم مُسلمانوں نے مل کر اسے چن لیا ہے"۔

کیوں اہلِ بیتِ رسولؐ کو الگ کر دیا

حارث نے کہا: "چوں اجتہاد میکردید چرا اہل بیت رسول را علیہم السلام از میان ما بیرون نہادید و این کار حق ایشانست۔ بقول خدائے جل شانہ کہ فرمود: وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ (۸: ۷۵) یعنی: اگر تم نے اجتہاد کیا ہے تو اہلِ بیتِ رسولؐ کو کیوں تم نے ہم سے باہر رکھا جب کہ یہ کام ان کا حق ہے، بدلیل فرمان خدا کہ:

خونی رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں، اللہ کی کتاب میں"۔ زیاد نے کہا: "مہاجر و انصار در کار مسلمانان از تو داناترند"۔ یعنی: "مہاجر و انصار مسلمانوں کے کام کو تجھ سے بہتر جانتے ہیں"۔ حارث نے کہا:

زکوٰۃ نہ دینے والا تاریخ بیان کرتا ہے اور دلیل لاتا ہے

"بخدائے کہ حسد کردند و حق از مستحق بیردند و ما را یقین است کہ رسولؐ علیہ السلام از دنیا بیرون نرفت تا ایشان را مقتدائے از اہل بیت خویش بموجب حکم حق تعالیٰ نصب نہ کرد روز غدیر خم وقت معاودت از حجۃ الوداع کہ یک لک و چند ہزار عرب اشراف از ہر قبائل جمع بود علی علیہ السلام را خلیفہ و جانشین خود گردانید بالائے منبر کجاوہائے شتر و خطبہ دریں باب فصیح فرمود کہ این علیؑ بعد من مولاو مقتدائے شماست این را کہ شما خلیفہ مقرر نمودہ اید ابن صدیق و عمر بن الخطاب اول آمدہ بیعت کردند و بخ بخ لک یا امیرالمومنین بہ علی علیہ السلام گفتند۔ آن کدام بیعت بود و این کدام است۔ اے زیاد از میان ما اکنوں بیرون شو کہ دعوت تو بہ قرار نیست"۔ یعنی: "اللہ کی قسم انھوں نے حسد کیا اور مستحق کا حق غصب کیا۔ ہمیں یقین ہے کہ رسولِ خداؐ اس وقت تک دنیا سے نہیں گئے جب تک کہ امت کے لیے رہنما و مقتدا اپنے اہلِ بیتؑ سے خدا کے حکم کے مطابق مقرر نہیں کر دیا۔ غدیرِ خم کے روز حجۃ الوداع سے واپسی پر جب کہ ایک لاکھ چند ہزار شرفائے عرب ہر قبیلہ سے جمع تھے، علیؑ کو اپنا خلیفہ اور جانشین بنا دیا۔ اُونٹوں کے کجاووں کے منبر پر اور اس بارے میں فصیح خطبہ دیا اور فرمایا کہ یہ علیؑ میرے بعد تمہارا مولا اور مقتدا ہے۔ یہ صدیق و عمر جنھیں تم نے خلیفہ مقرر کیا ہے سب سے پہلے آکر انھوں نے علیؑ کی بیعت کی اور "بخ بخ لک یا امیرالمومنین" کہہ کر مبارک باد دی۔ وہ کونسی بیعت تھی اور یہ کونسی ہے؟۔ اے زیاد اب ہمارے ہاں سے باہر چلے جاؤ کہ تمہارے دعویٰ کی کوئی بنیاد نہیں ہے"۔ اس کی تقریر سن کر عرفجہ عبداللہ نے تصدیق کی اور کہا: "آخر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برامت خویش مہربان تر از مہاجر و انصار بنود کہ مصالح ایشان بدین جماعت باز می گزاشت؟"۔ یعنی: "آخر پیغمبر خداؐ اپنی امت پر مہاجر و انصار سے زیادہ مہربان نہیں تھے کہ امت کی مصلحتوں کو اس جماعت کے سپرد کر جاتے"۔ اس کے بعد "زیاد مرد شناخت و جائے دید و ازاں قبیلہ بہ پرداخت و بقبیلہ دیگر شد ہمین چاشنی یافت و بہر جا کہ نزول فرمود ہم ازیں گونہ ابای نمودند"۔ یعنی: "زیاد نے لوگوں اور مقام کو بھانپ لیا اور اس قبیلہ سے دوسرے قبیلہ کی راہ لی۔ لیکن یہی کچھ پایا۔ اور جہاں بھی گیا اسی طرح کا لوگوں نے انکار کیا"۔

قبائل کی کمزوری نے اطاعت کرائی نہ طبعاً

بعضے جس وقت سنتے تھے کہ ہمارے لیے فوج بھیجی گئی ہے تو کہتے تھے کہ ادائے زکوٰۃ کی فکر کی جائے۔ بعض کہتے تھے کہ اطاعت قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن ادائے زکوٰۃ کی قوت نہیں ہے۔ ان قبائل کی یہ دل شکستگی فطری تھی۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ عامہ ناس کا در آنحالیکہ وہ اپنے امورات خانگی اور اہل و عیال کے افکار میں مشغول ہیں، کسی ایسی فوج کے مقابلہ میں جنگ کرنا ہمیشہ دشوار ثابت ہوا ہے جو محض ارادہ جنگ سے آتی ہے اور اسے کوئی دوسری فکر نہیں ہوتی اور مرکزی حکومت برابر اس کی مدد اور فکر کرتی رہتی ہے۔ کچھ اس سبب سے بھی کہ قبائل میں آپس میں کہنہ عداوتیں تھیں اور انھیں خوف تھا کہ اگر ہم مدینہ کی فوجوں سے لڑنے پر تیار ہوں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے دشمن بھی ہم پر ٹوٹ پڑیں۔ بکر بن وائل اور قبیلہ کندہ ایسے ہی خوف میں مبتلا تھے جس میں آخر الذکر قبیلہ بنی مذحج سے ہر وقت ہوشیار رہتا تھا۔

زیاد بن لبید جس کے پاس مرکزی حکومت سے چار ہزار فوج ساتھ کی گئی تھی ایک قبیلے کے بعد دوسرے سے جنگ کرنے لگا اور تاخت و تاراج میں کامیابی ہوئی۔ خلیفہ نے جو خط اشعث بن قیس وغیرہ کو لکھا اس کا مضمون دلچسپ ہے۔

خلیفہ کا خط اشعث کے نام

"تمہارے اعتقاد میں جو خلل آگیا ہے وہ زیاد پر غصہ کی وجہ سے ہے۔ ہم اسے معزول کر کے کسی دوسرے کو تمہاری امارت کے لیے بھیجیں گے کہ تم حسن معاملت بسر کر سکے۔ ہم نے قاصد سے کہہ دیا ہے کہ جب فرمان تمہیں دیدے تو تم زیاد کو واپس کر دو اور گزشتہ سے توبہ کرو"۔

اشعث کہتا ہے کہ بیعت سے توقف سے ہم کفر کے ملزم ہوئے لیکن مسلمانوں کا قاتل برا نہ سمجھا گیا

نامہ بر یعنی مسلم بن قیس سے مخاطب ہو کر اشعث بن قیس نے کہا: "تمہارے مقتدا نے اس وجہ سے ہمیں کفر سے نسبت دی کہ ہم نے اس کی بیعت میں توقف کیا، اور زیاد کو جس نے اتنے مسلمان ہمارے قبیلہ کے قتل کیے برا نہ کہا"۔

قاصد کا جوابؑ

قاصد نے جواب دیا: "توقف کی وجہ سے تمہیں نسبت نہیں دی گئی بلکہ اس وجہ سے کہ تم نے مہاجر و انصار کے اجماع کے خلاف کیا"۔ قاصد کے الفاظ ابھی منہ میں تھے کہ بنی مرہ کے ایک شخص نے جوش و غصہ میں اسے تلوار ماری، اور یہ مر کر گر پڑا۔

اشعث کا جوابؑ اُس کی قلبی حالت کا آئینہ

یہ دیکھ کر اشعث نے کہا: "خدا تیرے باپ کو بخش دے کہ اس سے اچھا جواب نہیں دیا جا سکتا تھا"۔

زیاد کو آپس کی پھوٹ سے مدد ملی

بعض لوگ قاصد کے قتل سے ناراض ہوئے اور ان میں کے پانچ ہزار آدمی زیاد بن لبید سے مل گئے۔ زیاد اور اشعث میں لڑائی ہوئی اور زیاد کا لشکر پسپا ہوا اور قلعہ بند ہوا۔ انھوں نے مرکز خلافت میں اطلاع بھیجی۔

عمر سے علیؑ کے بھیجے جانے کی صلاح اور نہایت مفید جوابؑ

خلیفہ نے اپنے دوست سے صلاح کی کہ ایسے وقت علیؑ سے جنگ کے لیے روانہ ہونے کی استدعا کی جائے۔ ابن الخطاب کا جواب سب کچھ بتا دیتا ہے۔ انھوں نے کہا: "آپ درست فرماتے ہیں، لیکن مجھے ایک بات کا خوف ہے وہ یہ کہ علیؑ آج کل کمال احتیاط کرتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ وہ نہ گئے یا اُن لوگوں کے کفر و اسلام میں توقف کیا، تو پھر کوئی لڑنے نہ جائے گا۔ مگر مجبوری ہے مصلحت یہ ہے کہ انھیں مشورہ کے لیے مدینہ میں رکھو اور عکرمہ بن ابی جہل کو بھیجو"۔

عکرمہ بن ابو جہل نے کیا کیا

عکرمہ روانہ ہوا، پہلے مارب پہنچا، جہاں کے لوگوں نے ابوبکر کے عامل کو نکال دیا تھا۔ اہل مارب نے چونکہ پیشتر سے قلعہ بندی کا کوئی سامان نہ کیا تھا، محصور ہونے پر بے سروسامانی کی وجہ سے صلح کی خواہش پر مجبور ہوئے۔ عکرمہ نے اس حیرت خیز شرط پر صلح منظور کی کہ اہل قلعہ اپنے کفر اور ہمارے حقیقت کا اقرار کریں، اور کہیں کہ ان کے مقتول جہنم میں اور ہمارے بہشت میں جاویں گے۔ بھوکے پیاسے محصورین کو کوئی دوسرا چارہ نہ تھا، اس کی منظوری پر انھیں بے ہتھیار باہر آنے کا

حکم دیا گیا۔ اور جب وہ باہر آئے تو فولاد نے ان کا استقبال کیا۔ مال اور اسیر دار الخلافت روانہ کیے گئے۔

دوسری بد عہدی

اشعث بن قیس عکرمہ اور زیاد کے لشکر سے اس طرح لڑا جس طرح بہادر کو لڑنا چاہیے لیکن آخر میں فوج کی کمی، اپنی زخم داری اور مددگاروں کی لاعلمی سے صلح کی خواہش پر مجبور ہوا۔ میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ کن شرائط پر صلح ہوئی۔ آیا تمام محصورین کی جان محفوظ رکھنے کی استدعا تھی، یا اشعث نے محض اپنے مخصوصین کے لیے آزادی چاہی، اور دوسروں کو دشمن اور ٹھنڈے فولاد کے حوالہ کر دیا۔ لیکن اہل قلعہ نے جس اطمینان سے دروازہ کھولا وہ ظاہر کرتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو اپنی جان کی طرف سے اطمینان تھا۔ لیکن جب تلوار اپنا کام کرنے لگی تو ان میں سے ایک نے سوال کیا کہ: "اے امیر کیا تو نے ہمیں امان نہیں دی ہے"۔ تو جواب دیا گیا کہ: "اشعث نے اپنے اور اپنے متعلقین کے لیے امان مانگی۔ تمہارے لیے کچھ نہیں کہا"۔ بجز معدودے چند سب قتل ہوئے اور اشعث دار الخلافت بھیجا گیا۔

بنی کندہ کے قیدی عورتیں

ابن خلدون کو کہنا ہے کہ: "اس واقعہ میں قیدیوں کی تعداد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک ہزار صرف عورتیں قید ہو کر آئی تھیں"۔

دین سے نہ پھرنے کا مکرر اعلان ارتداد کے الزام اور قتل کی دھمکی سے کیونکر مفید نہ ہوا؟

دربار خلافت میں اشعث کے پہنچنے پر عمر اسے ارتداد کا الزام لگاتے رہے، اور ابوبکر قتل کی دھمکی دیتے رہے۔ اور اشعث کہتا رہا کہ میں دین سے نہیں پھرا۔ یہ وجہ بتاتی کہ نہ وہ قتل اور استخفاف کرتا تھا۔ جسے میری غیرت قبول نہ کیا۔ اس کے بعد اشعث نے وعدہ کرنے کے بعد خلیفہ کی بہن ام فروہ سے عقد کی خواہش کی۔ خلیفہ نے تھوڑی دیر سر جھکا کر کہا: "مصلحت ہمین است"۔ یعنی: "بہتر یہی ہے"۔ بعض ظرافت پسندوں نے کہنا شروع کیا کہ: "اکان ثواب الکفر تزویجه البکر"۔ (اس کے کفر کا ثواب یہ تھا کہ اپنی کنواری بہن کے ساتھ شادی کر دی؟)

اشعث کی نئی سوانح عمری شروع ہوئی اور اس کی اولاد

اس کے بعد ہماری تاریخ میں اشعث بن قیس نہ صرف تغیر نفس کی حیرت خیز مثال پیش کرے گا بلکہ ام فروہ اور اشعث کی اولاد وہ ذریعہ ہوں گے جن سے مدبرین خاندان رسالت کا نام مٹانے کے لیے کافی اعتبار سے مدد لے سکیں۔ ان کے نام: ۱ محمد ۲ اسحاق ۳ اسماعیل اور ۴ جعدہ ہیں۔

مالک بنؓ نویرہ کا واقعہ

دوسرا افسوس ناک واقعہ جس پر میں قناعت کرتا ہوں وہ سرزمین بطاح کی غارت اور مالک بن نویرہ اور اس کے متعلقین کا قتل ہے اور بقول ابوالفدا: "مالک بن نویرہ کو رسولؐ نے اپنی قوم پر سردار کیا تھا"۔ اسی کا خوشی میں ڈوبا ہوا یہ فقرہ ہے کہ: "تعلمت الایمان برب الکعبة"۔ جس وقت رسولؐ نے اسے اسلام کی تعلیم فرمائی بقول ابن خلدون مالک ابن نویرہ بوقت وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنی حنظلہ پر عامل تھا۔ بنو تمیم کے کچھ لوگ اپنے صدقات لے کر مدینہ گئے اور کچھ لوگ نتیجہ کے منتظر رہے۔ اتنے میں سجاح نے خروج کیا۔ "مالک بن نویرہ نے اس سے مصالحت کر لی اور اس کو مدینہ پر فوج کشی کرنے سے روک کر بطون بنی تمیم پر حملہ کرنے کی تحریک کی"۔ آپس میں جنگ ہوئی اور جب مصالحت ہو گئی تو مالک بن نویرہ و وکیع بن مالک اس سے علیحدہ ہو کر

اپنی قوم میں چلے آئے۔ "مالک بن نویرہ اس حیص بیص میں مبتلا ہی تھا کہ قبیلہ تمیم سے بنو حنظلہ اس کے پاس آ کر بطاح میں مجتمع ہوئے لیکن مالک بن نویرہ چونکہ خود اپنی بابت متردد تھا، اس نے بنی حنظلہ کے مال و اسباب کو مقام محفوظ میں رکھوا دیا اور ان کو لڑائی کرنے سے منع کر کے اپنے مکان پر لوٹ آیا۔ خالد بن ولید اس خبر سے مطلع ہو کر لشکر اسلام لیے کر ان کی سرکوبی کو بڑھے۔ اگرچہ انصار نے ابتداءً خالد بن ولید سے مخالفت کی اور یہ کہا کہ جب تک خلیفہ کا کوئی حکم نہ آئے گا نہ بڑھیں گے۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اگر مجاہدین ان مرتدوں پر فتح یاب ہو گئے تو ہم اس نیکی سے محروم رہ جائیں گے اور اگر اللہ نہ کرے یہ ناکام ہوئے تو ہم پر ان کے حمایت نہ کرنے کا الزام عائد ہوگا، ہمراہ ہو گئے"۔ مالک مع دیگر اہلِ قبیلہ کے گرفتار ہوا۔ سب کے سب قتل کیے گئے۔ اور "ابوقتادہ و خالد میں اس بات پر اس قدر جھگڑا ہوا کہ ابوقتادہ ناراض ہو کر ابوبکر صدیق کے پاس چلے آئے"۔

جہاں اللہ تعالیٰ حضرتؓ ابوبکر کا مرادف واقع ہوا ہے

"پھر جب خالد بن ولید ـــ مدینہ میں آئے تو عمر بن الخطاب نے مالک بن نویرہ کے مقدمہ میں ابوبکر صدیق سے خالد بن ولید سے قصاص لینے اور ان کے معزول کرنے کو کہا۔ ابوبکر صدیق نے اس سے انکار کیا، اور جواب دیا کہ: "میں اس تلوار کو نیام میں نہیں کیا چاہتا جس کو اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے میان سے کھینچا ہو۔ بعد ازاں مالک اور اس کے ہمراہیوں کا خونبہا دیدیا، اور خالد کو پھر ان کے مقبوضہ بلاد کی طرف لوٹا دیا"۔

ایک اصول جسے مؤلف اسی موقع پر صرف مترجم ابن خلدون کے لیے پسند کرتا ہے

مترجم ابن خلدون لیلیٰ زوجہ مالک سے اس کے شوہر کے قتل کی رات کو اس کی رضامندی کے خلاف خالد کے ـــ کرنے کو اس لیے معتبر نہیں سمجھتا کہ ابن خلدون نے نہیں لکھا، اور اس کے بعد کچھ باتیں تسلیم نہ کرنے اور کچھ فرض کرانے کے بعد ایک نہایت شہتیر دلیل یہ لاتا ہے کہ: "یہ امر مسلم ہے کہ مالک بن نویرہ نے ایک مدت سے اپنی بیوی کو طلاق دیدیا تھا، لیکن رسم جاہلیت کے موافق اس کو اپنے گھر میں قید رکھا تھا۔ پس ایسی صورت میں انکار عدت کی کوئی حاجت نہیں ہے"۔ اور مالک کے کفر کی دلیل میں یہ خبر لائی گئی ہے کہ: "اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کی خبر سن کر بڑی خوشی منائی تھی"۔ میں اس موقع پر مترجم ابن خلدون کی تمام دلیل اور تاریخ نویسی کو اس لیے صحت سے دور سمجھتا ہوں کہ اسے ابن خلدون نے نہیں لکھا۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو ابن خلدون اسے ضرور لکھتا۔

قبل الاسلام خلافِ اِنسانیت فعل کی طرف سیف الخلیفہ کی رجعت

اعثم کوفی کو کہنا ہے کہ بطاح کا ایک شخص جس کا نام جہول تھا وہ لوگوں سے کہتا تھا کہ اپنا مال کسی کو نہ دو۔ تم خود اپنے مال کے بمقابلہ دوسروں کے زیادہ مستحق ہو۔ مالک بن نویرہ بھی اسی خیال کا تھا۔ ان کے خیالات سے مطلع ہو کر خالد نے قسم کھائی تھی کہ فتح یابی پر اسے قتل کرے گا، اور اس کے سر کو دیگ کی ٹھیک بنائے گا۔

صلاحِ دینِ خالد کا فتویٰ

ایک سریہ روانہ ہوا۔ سب گرفتار ہوئے۔ سیاست ہونے لگی اور سب نے کہنا شروع کیا: "ما مسلمانیم کشتن ما از چہ وجہ روا می داری؟"۔ خالد گفت

زیرا کہ کشتن شما صلاح دین است"۔ یعنی: "ہم مسلمان ہیں تو ہمارا قتل کس وجہ سے جائز سمجھتا ہے۔ خالد نے کہا اس لیے کہ تمہیں قتل کرنے میں دین کی بھلائی ہے"۔ اس کے بعد ابو قتادہ نے کہا کہ: "ہم سے ان لوگوں نے قبل جنگ مسلمان ہونے کا اقرار کیا تھا، اور ہم سب لوگوں نے ساتھ نماز پڑھی"۔ "خالد گفت فرقے نیست میان ارکان دین اگر یک رکن نگاہداشت و یک رکن بگذاشتند یعنی زکوٰۃ و چارہ نیست از کشتن ایشان"۔ یعنی: "خالد نے کہا ارکان دین میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر ایک رکن کی حفاظت کریں اور ایک رکن چھوڑ دیں یعنی زکوٰۃ۔ اور ان کے قتل بغیر کوئی چارہ نہیں ہے"۔ اس کے بعد مالک بن نویرہ کی باری آئی اور اس نے پوچھا: "مرا خواہی کشت و من مسلمانم و رو بسوئے کعبہ نماز میکنم"۔ یعنی: "مجھے تو قتل کرے گا حالانکہ میں مسلمان ہوں اور کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا ہوں"۔ خالد گفت: "اگر مسلمان بودی حق مسلمانان باز نگرفتی و زکوٰۃ اموال میدادی"۔ یعنی: خالد نے کہا: "تو اگر مسلمان ہوتا تو مسلمانوں کا حق نہ روکتا اور اموال کی زکوٰۃ دیتا"۔ مالک گفت: "واجب فوت نہ شدہ ست اگر سنت فوت شد تدارک آں سہل بر اے فوت سنت مسلمان کشتن کدام دین و جواب این عمل نزد خدا و رسولؐ او و ہر کس کہ مثل تو خدا ناسپاس را تسلط اقتدار دادہ چہ خواہند گفت"۔ یعنی: مالک نے کہا: "واجب نہیں چھوٹا ہے اگر سنت چھوٹی ہے تو اس کا تدارک آسان ہے۔ سنت چھوٹنے پر مسلمان کو قتل کرنا کون سا دین ہے۔ تیرے اس عمل کا جواب اللہ اور اس کے رسولؐ کے پاس تو اور ہر وہ کہ جس نے تجھ جیسے خدا کے ناشکرے کو تسلط دیا ہے کیا جواب دیں گے"۔ خالد گفت: "مسانہ تو از بول تہی نہ شود تا شخص تو از کلہ سر خالی نگردد"۔ یعنی: خالد نے کہا تو پیشاب کرنے سے پہلے قتل کر دیا جائے گا۔

مالک بن نویرہ ایک اسیر گھونگھٹ کی طرف دیکھتا ہے

مالک بسوی سر پوشیدہ نگریست و گفت: "اے خالد مرا این می کشد"۔ یعنی: مالک نے پوشیدہ سر بیوی کی طرف دیکھ کر کہا: "اے خالد مجھے یہ مروائے دیتی ہے"۔ اس کے بعد "بیشتر از اصحاب تاریخ برانند کہ خالد ہمانشب کہ روز آں مالک را کشت زنش بخواست و زنا کرد و او راضی نبود شعرا در این باب شعرہا گفتہ اند مبنی از ظلم خالد و مظلومی مالک"۔ یعنی: "اکثر مؤرخین کا نظریہ ہے کہ خالد نے جس روز مالک کو قتل کیا اسی رات اس کی بیوی کے ساتھ زبردستی زنا کیا۔ شعراء نے اس کے بارے اشعار کہے ہیں جو خالد کے ظلم اور مالک کی مظلومی پر مبنی ہیں"۔

مؤرخ کا قلم گرفتار عورت کو ملامت کے لیے منتخب کرتا ہے

صاحب سیرۃ الفاروق اگرچہ لکھتا ہے کہ: "مالک بن نویرہ کے مسلمان ہونے اور بے گناہ قتل ہونے کا واقعہ حضرت عمر کے نزدیک ثابت تھا" مگر پھر بھی اس کے نزدیک واقعہ بیان کرنے کا یہ ہمیں حقیقت سے نزدیک ہے کہ: "سوائے اس کے کہ مالک کی عورت کو میدان جنگ ہی میں نکاح کر لینے پر ملامت کی اور کچھ کہنا پسند نہ کیا"۔

جذبات کی برانگیختگی جو مشکل سے مسطح کیے گئے تھے

عصمت کی قدردانی، انصاف اور تاریخ نویسی کے فرائض خدا نہ کرے کہ

اس پیرایہ کے مماثل بھی ہوں۔ ابن خلدون مالک اور اس کے ہمراہیوں کا خونبہا دلوا دیتا ہے۔ رسولؐ کے بعد ہی یہ عظیم الشان واقعات تھے جنھوں نے اپنی خلاف امید نوعیت کے لحاظ سے لوگوں کو دفعتہً چونکا دیا، اور ہر شخص اپنے ان جذبات کے ساتھ کھڑا ہو گیا جن کے سدھارنے اور مسخ کرنے میں ہادی عالم نے مشقت گوارا کی تھی۔ اس لیے کہ عموماً لوگوں کو سوچنے کا وقت نہ ملا۔ ان واقعات نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آئندہ پر اپنا اثر ڈالا، اور دفعتہً پرانے تعلیمی خصوصیات کو بھلا کر ایک نئے سانچہ میں ڈھال لیا۔ یہ تھا جسے میں نے سانچہ بدلنا کہا ہے۔

دفنِ رسولؐ میں کون لوگ شریک تھے

ابھی یہ کہنا باقی ہے کہ دفنِ رسولؐ میں جو لوگ شریک تھے ان کے نام کیا ہیں۔ ابوالفدا کے نزدیک یہ حضرات تھے:

● جناب امیرؑ ● عباسؓ ● فضل بن عباسؓ ● قثم بن عباسؓ ● اُسامہؓ بن زیدؓ ● شقرانؓ ● ابوطلحہ انصاریؓ۔

حضرت علیؑ نے غسل دیا۔ ابوطلحہ نے قبر کھودی اور حضرت علیؑ اور قثم نے لاش قبر میں اتاری۔ بعض کے نزدیک ایک انصاری نے جناب امیرؑ سے خواہش کی کہ اسے قبر میں اترنے دیں اور جناب امیرؑ نے اسے اجازت دی۔ مترجم ابن خلدون اس کا نام خولی انصاری بتاتا ہے۔

ابن خلدون یا اس کے مترجم کی یہ اُبلی ہوئی عبارت جسے عدم شرکت کی دلیل سمجھنا چاہیے توجہ کے قابل ہے کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بجواب سوال فرما دیا تھا کہ مجھ کو میرے خاندان والے نہلائیں۔ پھر کون موقع تھا کہ ابوبکر دخل در معقولات کرنے شامل ہو جاتے۔ وہ لوگ تجہیز و تکفین میں مصروف ہی ہو گئے تھے، وہاں چپکے کھڑے ہونا مناسب تھا، یا ان جھگڑوں کا رفع کرنا؟"۔

محض ؟

پھر آگے چل کر جب حضرت علیؑ ابوبکر سے مشورہ میں شریک نہ کرنے کی شکایت کرتے ہیں تو بقول مترجم ابوبکر جواب دیتے ہیں کہ: "تم جب کہ تجہیز و تکفین میں مصروف تھے تو میں تم کو کیسے "محض" اس کام کے لیے وہاں سے بلواتا، اور اس بابت مشورہ کرتا"۔

علیؑ کا رسولؐ کی لاشِ مطہر سے مخاطبہ

دفن کے وقت جناب امیرؑ نے فرمایا: "میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، آپ کی وفات سے نبوت، وحی، آسمان کی خبریں منقطع ہو گئیں۔ آپ مصیبت پہنچانے کے لیے مخصوص ہوئے، جیسے کہ آپ نے غیر کی مصیبت سے ہمیں مطمئن کر دیا۔۔۔۔ اگر آپ صبر کا حکم نہ دیتے جزع فزع سے منع نہ فرماتے تو ہم اس مصیبت پر مجرائے اشک کا پانی انتہا کو پہنچا دیتے"۔

قبر سے مخاطبہ

دفن کے بعد قبر کے پاس کھڑے ہو کر فرمایا: "صبر کرنا اچھی بات ہے مگر حضرت سے صبر کرنا ممدوح نہیں ہے۔ جزع و فزع بے شک قبیح ہے مگر آپ کے بچھڑنے کی مصیبت پر نہیں۔ آپ کی مصیبت سے جو رنج و اندوہ ہے وہ نہایت ہی بزرگ ہے، اور رنج و اندوہ آپ کی مصیبت سے پہلے حقیر تھا، اور آپ کی مصیبت کے بعد بھی حقیر ہی سمجھا جائے گا"۔

جنابِ امیرؑ اپنے دیوان میں رحلتِ رسولؐ کے متعلق

جناب امیرؑ کا دیوان رحلت رسولؐ کے نتیجہ پر اکثر مفید عکس ڈالتا ہے۔ جس سے ہم کسی حد تک اقتباس کرتے ہیں۔ "وہ حضرت اپنے گھر والوں کے علاوہ ہمارے لیے مثل قلعہ کے تھے اور ان کا طنابہایت مضبوط ہے دشمنوں سے۔ بے شک چھا گئی ہم پر تاریکی ان کے انتقال کے بعد۔ گویا کہ تیرے بعد لوگوں کے کام موج کی کشتی میں رکھے گئے جس وقت وہ دریا میں بلند ہوتی اور ناگہی ہیں قومیں ورثہ مردے کا در آنحالیکہ ہمارے پاس ہدایت اور نبوت کا ورثہ ہے"۔

فقر اور علیؑ

"میں نے ہر شخص پر غلبہ چاہا اور میں اس پر غالب ہوا اور جب فقر نے مجھ پر غلبہ کیا تو مجھ پر غالب ہو گیا۔ اگر ظاہر کرتا ہوں تو رسوائی ہے اور اگر نہیں ظاہر کرتا تو مارے ڈالتا ہے"۔

حق کے متعلق اپنے غیر سے مخاطبہ

"ہمارے لیے ہے وہ امر جس کا تم بغیر حق کے دعویٰ کرتے ہو"۔

"پہچانا ہے تم نے ہمارا حق پھر اس سے انکار کیا"۔

نافرمانی کا زمانہ ہے نہ کہ حق رسانی کا

"خاک بر سر زمانہ کہ وہ وقت نافرمانی کا ہے نہ کہ حق رسانی کا"۔

ابوبکر سے مخاطبہ

"سیکھ لے ابوبکر اور جاہل نہ رہ اس بات سے کہ تحقیق علیؑ بہترین ہے پابرہنہ اور جوتا پہننے والوں کا۔ رسولؐ اللہ نے اس کے حق میں وصیت کی ہے۔ اور تلف نہ کر حق اس کا اور پھیر خلق کو اسی کی طرف"۔

امامت

میں عذر طلب کرتا ہوں اپنی قوم سے حالانکہ وہ فرض کتب سے جاہل ہیں اور پہنچے ہر اس چیز کو جو حرام ہے۔ امامت کی رسی ہمارے احمدؐ کے بعد ہمارے لیے ہے۔ نہ زمانہ نبوت میں آنجناب کے وہ صاحب پرہیزگاری تھے اور نہ رعایت رکھی ان لوگوں نے عہد و میثاق کی بعد نبی کے۔ اگر میرے لیے ان کے امر کا چھوڑنا جائز ہوتا تو چھوڑتا میں اپنی قوم کو حالانکہ وہ ایک امت ہے امتوں میں سے"۔

حضرت فاطمہؑ پر رحلتِ رسولؐ کا اثر

اب میں اپنی عزاداری حضرت فاطمہؑ زہرا زکیہ طاہرہ کے اثر غم کو دیکھتا ہوں۔ صاحب مناقب کہتا ہے کہ: "حضرت کی رحلت کے بعد فاطمہؑ زہرا کو کسی نے ہنستے نہ دیکھا"۔ پھر کہتا ہے: "فاطمہؑ زہرا اور علیؑ مرتضیٰ سب سے زیادہ مصیبت زدہ، بے کس اور زار و نالاں تھے۔ امام حسنؑ امام حسینؑ کے منہ کی طرف نگاہ کرتے تھے۔ اپنی یتیمی اور ان کی نامرادی پر نالاں و گریاں تھیں"۔

حالت اور نوحہ

دفن کرنے والے جب اپنے اندوہناک فرض سے فارغ ہوئے اور رسولؐ کی لاڈلی نے انھیں دیکھا تو پر درد سوال کیا کہ: "کیونکر تمھارے دل نے گوارا کیا کہ رسولِ خدا پر خاک ڈال دی"۔ اس کے بعد قبر شریف پر آئیں۔ قبر کی خاک اٹھائی اور اپنے چہرہ پر ڈال کر نوحہ فرمانے لگیں کہ: "مجھ پر ایسی مصیبتیں دورہ کرتی ہیں کہ اگر وہ زمانہ پر پڑیں تو تاریک رات ہو جائے"۔ فرماتی ہیں کہ: "جب شوق

زیادتی کرتا ہے تو تیرے قبر کی زیارت کرتی ہوں اور جب تو جواب نہیں دیتا تو نوحہ کرتی ہوں۔ اے خاک کے آرام پانے والے اگاہ ہو میرے رونے سے مجھے تیرا یاد کرنا تمام مصیبتوں سے محبوب ہے۔ اگرچہ تو خاک میں میری نگاہ سے غائب ہے مگر میرے دل محزون سے غائب نہیں ہے"۔ (مجالس الابرار)

طاہرہؑ کی حالت فضہ رضہ کی زبانی

اب میں ایک سرگزشت بیان کرتا ہوں جسے طاہرہؑ کی وہ کنیز بیان کرتی ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے برسوں بجز آیات کلام الٰہی کے اور کسی لفظ سے کلام نہیں کیا۔ یا جواب نہیں دیا۔ ورقہ بن عبداللہ زمانہ حج میں فضہؓ سے ملاقات کرتا ہے اور استدعا کرتا ہے کہ میری مخدومہ فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا کا حال وقت وفات و نیز بعد رحلت رسولؐ بیان کرو۔ نام آنا فضہؓ کی آنکھوں کے لیے وہ چیز تھی جس سے آنسو ٹپکنے لگتے۔ جواب دیا کہ: "تو اس غم کو ہیجان میں لایا جو ساکن ہو گیا تھا اور اس آگ کو بھڑکا دیا جو سینہ میں پوشیدہ تھی۔ میں نے دیکھا ہے ان مخدومہ کو اور سانحہ پر غم یہ ہے کہ جب جناب رسالت مآبؐ نے رحلت فرمائی میں نے کسی کو نہ دیکھا کہ وہ نالہ و بے قراری نہ کرتا ہو، مگر نالہ و زاری میرے خاتون کی اور غم ان مخدومہ کا ہر روز زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ سات دن تک گھر میں بیٹھی رہیں۔ جب آٹھواں روز ہوا طاقت صبر جاتی رہی اور وقت شب گھر سے باہر آئیں اور ہائے ہائے کے نعرے مار کر روئیں۔ اس وقت تمام خرد و کلاں عورتیں اور بچے اپنے گھروں سے باہر نکل کر ان معصومہ کے پاس جمع ہوئے اور رونے لگے۔ ہر طرف سے لوگ جمع ہوئے اور راہوں کے چراغ گل کر دیے کہ نا محرموں کی نگاہ عورتوں کے چہروں پر نہ پڑے، اور حضرت فاطمہؑ فریاد کرتی تھیں کہ اے پدر بزرگوار، اے برگزیدہ خداوند عالم کے اے محمد مصطفیٰؐ، اے پالنے والے بیوہ عورتوں کے، اے باپ یتیموں کے کون ہے قبلہ اور مصلیٰ کے لیے کہ آپ سے بہتر نماز گزار ہو۔ اور کون ہے دلداری کرنے والا آپ کی عاشق بیٹی کا کہ وہ آپ پر مثل زن پسر مردہ کے رو رہی ہے۔ اس کے بعد روضہ منور کی جانب متوجہ ہوئیں، اور غایت اضطراب سے پائے مبارک ان معصومہ کے دامن میں الجھے جاتے تھے اور کثرت اشکباری سے کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ یہاں تک کہ اس حال سے قبر منور کے پاس پہنچیں۔

فاطمہؑ زہرا زمانہ کی شکایت کرتی ہیں

جب نظر حجرۂ رسالت مآبؐ پر پڑی اور گلدستہ اذان کو دیکھا آہستہ آہستہ قدم اٹھانا شروع کیے اور اس قدر روئیں کہ غش طاری ہوا۔ عورتوں نے پانی لا کر چھڑکا۔ افاقہ ہوا۔ اٹھیں اور فرمایا کہ طاقت اور قوت میری زائل ہو گئی اور اس حال سے دشمن خوش ہوئے اور شماتت کی۔ آپ کی مفارقت سے میری زندگی خراب ہو گئی۔ اے بابا مجھ سے آپ کے خویش و اقربا پھر گئے۔ اور خوشی کا دروازہ مجھ پر بند ہو گیا۔ میں آپ کے بعد دنیا سے بیزار ہوں۔ برابر آپ کی مفارقت پر تاسف کروں گی، یہاں تک کہ آپ سے ملاقات کروں۔ آپ کے بعد ہم ضعیف و حقیر ہو گئے۔ لوگوں نے منہ پھیر لیے۔ آپ کی زندگی میں ہم خلائق کے نزدیک معظم و مکرم تھے۔ وہ منبر جس پر آپ تشریف رکھتے تھے تاریکی نے اسے ڈھانپ لیا"۔

رحلت کے دسویں دن علیؑ اور سلمانؓ

متذکرہ صدر عبارت میں جہاں سرد مہری کا تذکرہ ہے وہاں رحلت کے دسویں روز نہ صرف حضرت بتولؑ عذرا بلکہ خود مرتضیٰؑ بھی ایسے پختہ عقیدے جیسے کہ سلمانؓ تھے شکایت کرتے ہیں کہ بعد رسولؐ تو نے جفا کی اور ترک ملاقات کی۔

سلمانؓ کثرت اندوہ کی معذرت کرتے ہیں اور دولت سرائے زکیہؑ پر اس لیے حاضر ہوتے ہیں کہ وہی شکایت سنیں اور دیکھتے ہیں کہ ایک ٹکڑا عبا کا اوڑھے ہیں جس سے اگر سر ڈھانکتی ہیں تو پائے اقدس کھل جاتے ہیں اور پائے مبارک چھپاتی ہیں تو سر دکھائی دیتا ہے۔

فاطمہؑ کے رونے کے متعلق علیؑ سے لوگوں کی استدعا

عام مؤرخین نے اس کا ذکر کیا ہے کہ زکیہؑ کے کثرت گریہ سے لوگوں نے جناب امیرؑ سے استدعا کی کہ حضرت فاطمہؑ سے فرمائیے کہ صبح اور شام میں رونے کے لیے ایک وقت تجویز کریں کہ ہم ان کی صدائے گریہ سے کوئی کام نہیں کر سکتے۔

فاطمہؑ نے پیغام کا جواب دیا

جناب امیرؑ نے لوگوں کا پیغام پہنچایا اور بتول عذرا نے تمکین متانت سے جواب دیا کہ ان سے کہہ دو کہ میں تم میں بہت دن رونے کے لیے زندہ نہ رہوں گی۔ سیدہ کا یہ فرمانا مستقبل کا واقعہ تھا۔ غم کے وزن نے انھیں یقین دلایا تھا کہ ان کی روح پاک بغیر رسولؐ کی روح اقدس سے قرب و اتصال حاصل کیے تسکین نہیں پا سکتی۔

حسنینؑ ماں کے ساتھ نانا کے روضہ پر جاتے ہیں

شغل یہ رہ گیا تھا کہ بقیع میں اس جگہ جو جناب امیرؑ نے بنوادی تھی اور جس کا نام بیت الاحزان رکھا تھا حسنینؑ کی انگلی تھامے ہوئے جاتیں اور شام کو امیرالمومنین گھر واپس لاتے۔

سیدہ کی علالت

رسولؐ کا غم ان کی لاڈلی بیٹی کے لیے ایسا نہ تھا جسے زمانہ بھلاتا جاتا۔ بلکہ زمانہ نے ناگوار واقعات سے اس کو تازہ رکھنے اور زیادہ کرنے کی تحریک کی۔ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ طاہرہؑ علیل ہوگئیں۔ علالت بڑھتی گئی اور جناب امیرؑ سے وصیت کی کہ میری بیمار ہونے کی خبر چھپائی جائے اور لوگ مطلع نہ کیے جائیں۔ تیمار داری میں جناب امیرؑ مصروف رہے اور اسماء بنت عمیس اعانت کرتی رہیں۔

مجالس الابرار میں شیخ ابن بابویہ علیہ الرحمہ کی کتاب معانی الاخبار سے روایت نقل کی ہے جو فاطمہؑ بنت الحسین علیہ السلام سے ہے کہ: "جب مرض جناب سیدہ علیہا السلام کا شدید ہوا زنان مہاجر و انصار ان معصومہ کے پاس جمع ہوئیں اور کہنے لگیں کہ آپ نے کس طرح صبح کی اے دختر رسولؐ۔ جناب سیدہؑ نے جواب میں فرمایا کہ واللہ صبح کی میں نے درحالیکہ تمھاری دنیا سے کارہ ہوں اور دشمن اور بیزار ہوں تمھارے مردوں سے میں نے ترک کیا انھیں قبل اس کے کہ ان کی آزمائش کروں اور بیزار ہوئی میں ان سے بعد امتحان کے اور دریافت اور مشاہدہ کر لینے ان کی خصلتوں کے۔ پس برا حال ہو دم شمشیر ان کے کا کہ ہماری مدد میں کند ہوگئیں۔ اور برا حال ہوا ان کے نیزے کا کہ وہ بھی سست ہو گئے ہماری مدد میں اور برا حال ہو اضطراب رائے ان کے کا کہ ہماری اعانت نہ کی اور برا ہے وہ کہ ان کے نفس امارہ نے ان کے لیے آگے بھیجا۔۔۔۔ وائے ہو ان پر کہ کتنا دور ڈالا خلافت کو ان لوگوں سے کہ جو پائے استوار رسالت اور اساس نبوت ہیں اور امور دنیا و دین کے ماہر ہیں۔ اور کس سبب سے ابوالحسن پر کراہت اور عتاب کیا۔ قسم خدا کی کہ کراہت نہیں کی انھوں نے مگر بہ سبب جہاد ان کی شمشیر کے راہ خدا میں اور شدت سے حملہ کرنے ان کے۔ اگر وہ باز رکھتے

ایک دوسرے کو اس مہار کے لینے میں کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ کے ہاتھ میں سپرد کی تھی اور وہ متولی امر امامت کے ہیں تو ہر آئینہ وہ حضرت متعہد امر خلافت کے ہوتے اور لوگوں کو سہولت سے راہ حق میں لے جاتے اور وہ جناب خود منتفع نہ ہوتے نفع زائد سے مگر تھوڑا پانی لینے اور کھا لینے سے کہ سد رمق اس سے حاصل ہوتا.....

فساد کا ناقہ حاملہ ہُوا

تمہارے فساد اور فتنہ کا ناقہ بار در اور حاملہ ہوا ....." ابھی مکتب میں اکثر مفہوم سے ملتی ہوئی روایت احتجاج سے نقل کی گئی ہے جس کا راوی سوید ابن غفلہ ہے۔

مہاجر و انصار معذرت کے لیے آئے

اس روایت میں اس قدر زیادہ ہے کہ ان عورتوں نے جا کر ان شکایتوں کو اپنے مردوں سے کہا اور وہ سب حاضر ہو کر کہنے لگے کہ "اے سیدۃ النساء اگر ابو الحسن ہم سے ذکر کرتے اس امر کو قبل استوار کرنے اور محکم کرنے ہمارے عہد و عقد کے تو ہر آئینہ ہم ان جناب سے عدول نہ کرتے اور دوسرے سے رجوع نہ کرتے حضرت فاطمہ عَلَیْہَا السَّلَام نے فرمایا کہ مجھ سے دست بردار ہو اور اپنے کو مجھ سے باز رکھو کہ تمہارا عذر قبول نہیں ہے"۔ اس جگہ یہ کہنا مفید ہوگا کہ صاحب السیاسۃ والامامۃ نے اس کا تذکرہ کیا ہے کہ بعد واقعہ سقیفہ جناب امیرؑ مع حضرت فاطمہؑ انصار کے پاس گئے تھے اور انہوں نے متذکرہ صدر جواب دیا تھا۔

رسولؐ اور طاہرہؑ کی رحلت کا وقفہ

اس کے بعد کوئی کہتا ہے کہ حضرت سیدۃ النساء نے رحلت رسولؐ کے چالیسویں دن انتقال فرمایا۔ کوئی آگے بڑھتا ہوا دو ڈھائی، تین مہینہ سے چھ مہینہ تک جاتا ہے۔ جو زیادہ صحیح ہو۔ ایک دن جناب امیرؑ نماز ظہر سے فارغ ہو کر گھر واپس آرہے تھے کہ راستہ میں چند کنیزوں کو روتے ہوئے آتے دیکھا۔ پوچھا کہ تم کیوں اس قدر متغیر ہو۔ بعضوں نے جواب دیا کہ امیرالمومنین جلد خبر لیجیے فاطمہؑ زہرا کی۔ ہمیں گمان نہیں ہے کہ آپ انہیں زندہ پائیں۔

فاطمہؑ زہرا کا احتضار اور علیؑ

جناب امیرؑ جلد جلد گھر میں داخل ہوئے۔ یہاں دیکھا کہ سیدہ مصری سفید کپڑا پہنے ہیں اور سکرات کے عالم میں کبھی داہنا ہاتھ کھینچ لیتی ہیں اور کبھی بایاں ہاتھ پھیلا دیتی ہیں اور کروٹیں بدلتی ہیں۔ علیؑ نے عبا دوش مبارک سے پھینک دی۔ عمامہ سر سے اتار ڈالا اور گھنڈیاں قبا کی کھول کر سرہانے بیٹھ گئے۔ زکیہؑ کا سر مبارک گود میں لیا۔ جھکے اور پکارا "زہرا" جواب نہیں ملا۔ پھر کہا "اے بیٹی محمد مصطفیؐ کی" جواب نہیں۔ اے بیٹی اس کی جو گوشہ چادر میں زکوٰۃ باندھ کر غربا و مساکین کے گھر پہونچاتا تھا۔ خاموشی۔ پکارا (غالباً روتی ہوئی بے چینی اور کسی قدر بلند آواز سے) فاطمہؑ میں ہوں علیؑ۔ آنکھ کے ڈھیلوں میں کچھ حرکت ہوئی۔ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ علیؑ کو دیکھا اور آنسو نکل پڑے۔ پوچھا کیوں روتی ہو اے سیدہ؟۔ فرمایا: روتی ہوں ان ظلموں پر جو میرے بعد تم پر ہوں گے۔ کافی تھا کسی شوہر کے دل کے بھر جانے کے لیے یہ خیال کہ وہ بی بی جو اپنی زندگی میں محبت کرتی تھی اسے احتضار میں اپنے بعد بھی محبت کا ویسا ہی خیال ہے۔ علیؑ جواب دے سکے۔ فرمایا: "نہ رو کہ مجھ پر راہ خدا میں کل اذیتیں آسان ہیں"۔

طاہرہ کی وصیتیں

طاہرہؑ کی مخصوص نصیحتیں یہ تھیں کہ ● جناب امیرؑ امامہ بنت العاص سے عقد کریں۔ اس لیے کہ وہ "میرے بچوں کی دوست اور ان پر مہربان ہے"۔ ● دوسرے تابوت میں شب کو لاش لے جانا ● تیسرے جن لوگوں نے ظلم کیا ہے انھیں اجازت نہ دینا کہ وہ میرے جنازہ پر آئیں اور نماز پڑھیں۔ قریب کے اعزا پہلے اور اس کے بعد بمراتب اعزا اور احباب ہوں۔

بچوں کے متعلق

سیدہؑ نے اپنے بچوں کے بارہ میں وصیت میں مبالغہ کیا ہے۔ فرمایا ہے کہ: "اے ابوالحسنؑ میرے بعد حسنینؑ سے بلند آواز سے نہ بولنا۔ کیونکہ وہ شکستہ خاطر اور غریب ہو جائیں گے"۔ "ابھی کل کے دن ان کے جد امجد کا سایہ ان کے سروں سے اٹھ گیا ہے۔ آج وہ ماں کے مرنے سے اور غمگین ہوں گے"۔ اس کے بعد آپؑ نے چند اشعار فرمائے۔ جن کا مفہوم یہ تھا کہ: "اگر روتے ہو تو رو کہ آج فراق کا دن ہے۔ میرے بچے میرے بعد میری ملاقات کے مشتاق اور بے قرار ہوں گے۔ انھیں تسلی دینا کہ مجھ سے جدا ہوتے ہیں"۔

فاطمہؑ اور اہتمام رحلت

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے کچھ قبل یا کچھ بعد کی یہ حالت ہے، جسے اسماء بنت عمیس بیان کرتی ہے کہ جب وقت وفات قریب پہونچا سیدہ نے وضو کے لیے پانی منگا کر وضو کیا۔ خوشبو منگا کر کپڑے معطر کیے۔ جنھیں زیب جسم فرما کر نماز پڑھا کرتی تھیں۔ اس کے بعد سر مطہر بستر پر رکھ کر اسماء سے سرہانے بیٹھنے کی ہدایت کی اور فرمایا کہ جب وقت نماز آئے تو مجھے اٹھانا اور اگر نہ اٹھوں تو علیؑ ابن ابی طالبؑ کو بلا لینا۔ کافور سرہانے رکھوا لیا اور چادر اوڑھ لی۔

اسماء پکارتی ہے مگر جواب نہیں ملتا

وقت نماز آیا اسماء نے الصلوۃ یا بنت رسول اللہ کہا لیکن خاموشی نے جواب دیا۔ اسماء نے پھر آواز دی۔ جواب نہ ملا۔ چادر ہٹائی دیکھا کہ معصومہ عالم اعلیٰ کی طرف انتقال فرما گئیں۔ اسماء چیخ اٹھی بچے قریب دوڑے ہوئے آئے۔ حسنؑ پوچھنے لگے کہ اسماء اس وقت والدہ ماجدہ کیوں آرام کرتی ہیں۔ جواب ملا، پچھاڑیں کھانے لگے۔

حسنینؑ اور ماں کی لاش

حسینؑ ماں کے پاؤں چوم رہے تھے اور کہتے تھے اماں ہم تمھارے فرزند حسینؑ ہیں کچھ بولو۔ اس کے بعد دونوں بچے نہیں معلوم کس طرح مسجد میں باپ کو خبر دینے گئے۔

باپ کو خبر دینے گئے

اصحاب دوڑے کسی نے کہا کہ اے فرزندان رسولِ خدا تمھاری آنکھوں کو نہ رلائے کیا رسولؐ کی جگہ خالی دیکھ کر تم پر رقت طاری ہوئی ہے۔ جواب دیا کہ ہماری ماں نے رحلت کی۔

علیؑ خبر سن کر

علیؑ نے سر زمین پر رکھ دیا اور کہا اے دختر رسولؐ رسولؐ کے بعد تم سے تسکین تھی اب تمھارے بعد تمھاری مصیبت میں کس سے تسکین پاؤں گا۔

بچے ماں کی وداعی زیارت کرتے ہیں

جس وقت امیر المومنین نے چاہا کہ چادر میں لپیٹ دیں اس وقت تمام بچوں کو وداعی زیارت کے لیے بلایا اور بچوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا کہ ایک مرتبہ اور ماں کے سینہ پر لوٹ لیں۔ بچوں کی معصومانہ صدائیں ایک یہ پر درد ہم آہنگی بھی تھی کہ اے ماں

جب آپ ہمارے جد بزرگوار کی خدمت میں پہنچیں تو ہماری جانب سے سلام پہونچائیے گا۔ جناب امیرؑ نے آہستہ بچوں کو لاش سے علیحدہ کیا۔ اور بند کفن باندھ دیے۔

شرکت جنازہ کرنے والوں کو عباس کی اطلاع

خبر مدینہ میں پھیل گئی کہ دختر رسولؐ نے اِنتقال فرمایا۔ مرد اور عورتیں رونے لگیں اور عوراتِ بنی ہاشم ان معصومہؑ کی گھر جمع ہوئیں۔ لوگ پرسہ کے لیے جمع ہو رہے تھے اور انتظار میں تھے کہ مشایعت جنازہ کریں، اس وقت جولے ابوذر اور جولے عباس باہر آئے اور لوگوں سے کہا: اس وقت واپس جاؤ کہ دختر رسولؐ کا جنازہ زیادہ رات گئے اٹھایا جائے گا۔ لوگ متفرق ہو گئے اور شب آ گئی۔

شریکِ دفن لوگ

جناب امیرؑ حسنینؑ عقیلؓ اور گروہ بنی ہاشم کے علاوہ زبیرؓ ابوذرؓ سلمانؓ اور بریدہؓ جنازہ لے کر چلے۔ نماز پڑھی اور بقیع میں دفن کر کے قبر زمین سے برابر کر دی۔ لاش اطہر کو قبر میں رکھتے وقت جناب امیرؑ نے فرمانا شروع کیا۔

فاطمہؑ کی قبر اور علیؑ

"سلام ہو آپ پر اے رسولِ خدا میری طرف سے اور آپؐ کی اس دختر کی طرف سے جو آپؐ کے پہلو میں وارد ہونے والی ہے اور آپؐ سے ملحق ہونے کے لیے جلدی کر رہی ہے۔ یارسول اللہ آپ کی برگزیدہ دختر کے اِنتقال سے میرا صبر کم ہو گیا۔ اس کی مصیبت کی وجہ سے میری چستی و چالاکی جاتی رہی۔ ایک امانت واپس لے لی گئی۔ ایک یادگار نشانی اٹھا لی گئی۔ اب میرا حزن و ملال دائمی ہے۔ اب میری آنکھوں میں نیند کہاں۔ جب تک کہ پروردگار عالم میرے لیے اس مقام کا ارادہ کرے جس میں آپ مقیم ہیں عنقریب آپ کی دختر آپ کو آگاہ کرے گی۔ میری موجودہ حالت کو ان سے دریافت فرمائیے حالانکہ ابھی آپ کے اِنتقال کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔"

لوگ بنت رسولؐ کے دفن کی خبر سن کر

جب لوگوں نے سنا کہ بتولؑ عذرا خاک کے سپرد کر ڈالی گئیں تو ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے کہ رسولؐ نے صرف ایک دختر چھوڑی تھی حیف ہے کہ وہ رحلت کرے اور دفن ہو اور ہم لوگ نہ وقت وفات حاضر ہوں، نہ نماز پڑھیں اور نہ دفن میں شریک ہوں۔

قبر کب معلوم ہوئی

اور غالباً لوگوں کو صحیح نشان قبر اس وقت تک نہ معلوم ہوا جب تک زکیہؑ کا فرزند اکبر اس جگہ دفن کے لیے نہ لایا گیا۔ اور بقول تاریخ خمیس ایک لوح برآمد ہوئی جس میں لکھا تھا: "ھذا قبر فاطمہ بنت رسول اللہ"

علیؑ مرثیہ کہتے ہیں

اور کونسا زمانہ تھا جس کے متعلق جناب امیرؑ فرماتے ہیں کہ "ہم مثل کبوتر کے جوڑے کے ایک مرغزار میں جوانی اور تندرستی سے برخوردار تھے کہ زمانہ ہم پر داخل ہوا اور ہم میں جدائی ڈالی۔ زمانہ دوستوں کا جدا کرنے والا ہے"۔ "کیا ہوا مجھ کو میں قبروں پر سلام کرتا ہوا کھڑا ہوں۔ قبر پر دوست کے اور اس نے میرے سلام کا جواب نہ دیا"۔ "اے باپ مجھے تیرے نزدیک ہوا تی ہے۔ میں تیرے لیے روتا ہوں (حالانکہ مردوں میں میرا ہمسر نہیں ہے"۔ "دو دوستوں کے درمیان ہر اجتماع میں تفرقہ ہے اور ہر وہ شے جو فراق سے سوا ہے قلیل

ہے۔ بعد احمدؐ کے میرا فاطمہؑ کو کھو دینا اس کی دلیل ہے کہ کوئی دوست ہمیشہ نہیں رہتا"۔

مولوی نذیر احمد صاحب کچھ فرماتے ہیں

شمس العلماء مولوی حافظ محمد نذیر احمد خان صاحب ایل ایل ڈی اپنے تصنیف رویائے صادقہ میں فرماتے ہیں:

"جو شخص سب سے زیادہ پیغمبر صاحب کی وفات سے متاذی ہوا وہ فاطمہؑ تھیں۔ والدہ پہلے انتقال فرما گئی تھیں۔ اب ماں اور باپ دونوں کی جگہ پیغمبر صاحب تھے اور باپ بھی کیسے باپ دین و دنیا کے بادشاہ ایسے باپ کا سر سے اٹھ جانا اس پر حضرت علیؑ کا خلافت سے محروم رہنا اور نمک بر جراحت ترکہ پدری باغ فدک کا دعویٰ کرنا اور مقدمہ کا ہار جانا کسی دوسرے کو ایسے پیہم صدمات پہنچتے تو وہ زہر کھا کر مر رہتا۔ مگر ان کے صبر و ضبط انھیں کے ساتھ تھے۔ پھر بھی انھیں رنجوں میں گھل گھل کر چھ مہینہ کے اندر اندر اِنتقال فرما گئیں اور جتنے دن زندہ رہیں ان لوگوں سے جنھوں نے ان کو رنج دیے تھے نہ بولیں اور نہ بات کی یہاں تک کہ ان لوگوں کو اپنے جنازہ پر آنے کی بھی مناہی کر دی۔ اور شب کے وقت مدفون ہوئیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مانا کہ ان کا غصہ کسی قدر بے جا بھی ہوتا تاہم ان کے باپ کے حقوق کیا چاہتے تھے۔ فاطمہؑ کے دل غمزدہ کو خوش کرنے کے لیے علیؑ کو اگر وہ اہل بھی نہ تھے برائے نام خلافت دی ہوتی اور آپ انتظام کیا ہوتا۔ خیر خلافت تو کون دیے دیتا تھا۔ مگر باغ فدک کے دیدینے میں ایسی کونسی قباحت تھی۔ غایۃ ما فی الباب حدیث: "نحن معاشر الانبیاء لا نرث ولا نورث ما ترکنا صدقۃ" کے خلاف ہوتو ہو۔ گناہ اگر ہوتا تو فاطمہؑ کو ہوتا کہ وہ سیدانی ہو کر صدقہ کھاتیں۔ سخت افسوس کی بات ہے کہ اہل بیت نبوی کو پیغمبر صاحب کی وفات کے بعد ہی سے ایسے ناملائم اتفاقات پیش آئے کہ ان کا وہ ادب اور لحاظ جو ہونا چاہتا تھا اس میں ضعف آگیا اور شدہ شدہ منجر ہوا اس ناقابل برداشت واقعہ کربلا کی طرف جس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے"۔

صاحب بلاء المبین نہایت متین عبارت میں فرماتے ہیں کہ: "اگرچہ شہادت حسینؑ کا تیرہ و تار سانحہ ۶۱ھ میں واقع ہوا لیکن اس دیجور قیامت کی شام ظلمت اس وقت سے شروع ہو چکی تھی جب کہ خورشید رسالت غروب ہوا، اور جناب رسالت مآبؐ نے اس دارِ فانی سے عالم جاودانی کو انتقال فرمایا"۔

رحلت فاطمہؑ کے بعد اہلبیت کے دوستوں کی یاس

اس باب میں مجھے کچھ اور کہنا نہیں ہے بلکہ مسٹر گبن کی یہ عبارت پیش کرنی ہے کہ: "دخترِ رسولؐ کے اِنتقال کے بعد وہ دوست جو کچھ دِنوں تک ساتھ رہے تھے، دباؤ میں آتے جاتے ہیں، اور اپنے کو تباہ ہوتا ہوا دیکھ کر بیعت کر لیتے ہیں"۔

فاطمہؑ کے بعد علیؑ کی گوشہ نشینی اور لوگ

اسی کے قریب صواعق محرقہ کی یہ عبارت ہے کہ: "امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہٗ در مدت حیات فاطمہؑ الزہرا بیعت نہ کردہ بود لیکن او را عزو جاہے بواسطہ حیات حضرت خیر النساء نزد مردمان بود چوں حضرت فاطمہؑ وفات یافت حضرت علیؑ از روئے مردمان انکار نمود و عزلت اختیار کرد و کسے باو آمد و شد نہ کرد"۔

یعنی : "امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ نے زندگانی حضرت فاطمہؑ میں بیعت نہ کی تھی، لیکن حضرت خیر النساءؑ کے زندہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کے نزدیک عزت اور مرتبہ حاصل تھا۔ جب حضرت فاطمہؑ وفات پا گئیں تو حضرت علیؑ لوگوں سے منہ پھیر کر گوشہ نشین ہو گئے اور کسی کے ساتھ آمد و رفت نہ رکھی۔

بابؑ دوم کا خلاصہ

واقعاتؑ کا نشو

باب اول کے خلاصہ نے ہمیں یہاں تک پہنچایا تھا کہ ہادی عالمؐ کی ذات اور اصول وہ مرکز تھا جس کے گرد حجاز اور عرب کے سرگشتہ جمع ہوتے جاتے تھے اور دیکھتے ہے کہ نہ صرف رسولؐ نے ہمیں جن امورات کی تبعیت کے لیے بلایا ہے وہ روحانی حیثیت سے تسکین دہ ہے بلکہ جو محبت مساوات اور عادلانہ روش قائم کی ہے وہ دُنیاوی حیثیت سے بھی ایک ایسی نعمت ہے جس کی قیمت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

حوصلہ مند طبیعتوں کا نصب العین

لیکن باوجود ان دل پسند صورتوں کے دوسرا رخ بھی تھا کل طبیعتیں ایسی نہ تھیں جو محض تعلیم اور پیروی پر قناعت کرتیں اور اپنے موقع نہ ڈھونڈتیں جس میں رسوخ اور امتیاز کی امید ہوتی۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اسلام اپنی ایک حیثیت سے دنیاوی حکومت کی صورت بھی اختیار کرتا جاتا تھا۔ لیکن رسوخ کی مصنوعی کوششیں رسولؐ ایسے قدر شناس کو دھوکا نہیں دے سکتی تھیں۔

رسولؐ کے نزدیک کیسے امتیاز ہوسکتا تھا

ان کے نزدیک اسی کو رسوخ اور امتیاز ہوسکتا تھا جو دین کے لیے ایثار نفس اور خدمات یا ترقی نفس کے لیے مدارج تقویٰ طے کرسکتا تھا۔ چھچلی، کودتی ہوئی، نمائشی کاروائیوں کی قیمت رسولؐ کو معلوم تھی۔

رسولؐ نے مختلف رنگ و بُو کے پھولوں کا گلدستہ بنایا تھا

یہ بھی ہم کہہ چکے کہ اگرچہ رسولؐ کی تعلیم کا اقتضا یہ تھا کہ ایک جماعت اسلامی دکھا دیتی لیکن جو جماعتیں مختلف حالتوں میں داخل ہوئی تھی وہ ذرا سی ٹھیس سے متغیر ہوسکتی تھیں۔ موقع یا اسکانا چاہیے تھا اور بس بندھا ہوا گلدستہ ٹوٹ کر یہ دکھانے کے لیے تیار تھا کہ ہمارے پھول مختلف رنگ کے ہیں۔

یہ واقعہ تھا کہ پھول مختلف رنگ کے تھے۔ باغبان کی یہ تعریف تھی کہ اس نے مختلف رنگ اور خوشبو کے پھولوں کو ایک جگہ جمع کردیا تھا جس سے ان کے رنگ و بو کا اختلاف بجائے علیحدگی کے خوشنمائی کا نمونہ تھا۔ رسولؐ وہ حلقہ تھے جس نے انھیں الگ نہ ہونے دیا۔ وہ جانتے تھے کہ پھول مختلف رنگ و بو کے ہیں۔ انھیں خیال ہوسکتا تھا کہ ہماری یہہ محنت رائیگاں نہ ہو ان سے زیادہ کون تھا جسے اپنی محنت کی قدر ہوتی۔ اور کسے پڑی تھی کہ ان کی طرح اس کی حفاظت کے ایک ایک پہلو پر غور کرتا اور حفاظتیں کرتا۔

جسے رسولؐ عنان گیر قرار دے سکتے تھے

حفاظتیں کیں۔ دیکھنے والا مقرر کیا بتدریج اسے پہنچوایا۔ لیکن

اس کے متعلق اسے فرد یا افراد کو حسد ہوسکتا تھا جو خود اس امید میں ہوں دیکھتے تھے کہ جس جس طرح وہ اپنے کو آئندہ حفاظت اور ذمہ داری کے قابل بناتا جاتا ہے اور جس جس طرح ہم اس کی خدمات اور نفس کا اعتراف کرتے جاتے ہیں۔ لوگوں کی آنکھیں بدلتی جاتی ہیں اور ان کے چہروں پر اس افسوس کی لکیر پائی جاتی ہے کہ رسولؐ کے بعد ہمیں کچھ امید نہیں ہے۔ غور کرنے والے کے لیے یہ سوچنے کی جگہ ہے کہ اس کی کوشش کی جاتی ہو کہ ہم کس طرح کامیاب ہوں اور رسولؐ کا نامزد کس طرح لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔ اور اس کے بعد بقول مولوی نذیر احمد خان صاحب : "لے اڑے وہ جو اس کے لے اڑنے کی تدبیر کر سکتے تھے"۔

حوصلہ مند جماعت کیونکہ خالص جماعت پر غالب آئی

ہم یہ بھی دکھا چکے ہیں کہ جماعتِ اسلامی کی کونسی تقسیم ہوسکتی تھی اور اگرچہ خالص جماعت کی طرح حوصلہ مند یا منتظم جماعت بھی عدداً کچھ ایسی زائد متصور نہیں ہوسکتی لیکن جس وقت خالص جماعت خاموش تھی اور اس کی فکر نہ کرتی تھی کہ عامہ ناس پر رسوخ و اقتدار حاصل کرے اور اس کی تمام کوشش ہادی برحق کی خوشنودی اور بجاآوری احکام پر ختم ہو جاتی تھی۔ دوسری کو اس بات کا موقع تھا کہ اس "عالم حق" کو جو تمام اقرارِ اسلام کرنے والوں کو رسولؐ کی خدمت کی شرف یابی کا حاصل تھا اپنے سے کم حاضر باش اور دور کے زائرین کی نگاہ میں رسولؐ کے نزدیک اپنے رسوخ کی دلیل قرار دے اور بعض ہوں جو بعض کی تصدیق کرتے ہوں۔ درآنحالیکہ اتفاقاً سننے والے جو رسولؐ کے متعلق تمام باتوں کو کمال اخلاص اور شوق سے سننے کے لیے حاضر ہوئے تھے، وہ بغیر واقعات کی جانچ کیے ہوئے ان باتوں کو قبول کر لیتے ہوں جو ان کے کانوں میں ڈالی جاتی ہوں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کیا تھا لیکن کچھ تھا جو رسولؐ کے اقربا سے چھپایا جاسکتا اور رسولؐ کا جواب کہتا کہ انھیں قریش کی طرف سے اپنے اہلبیت کی دوستی کے متعلق کچھ شبہ ہے۔ صاحب صواعق محرقہ لکھتے ہیں : "ابن ماجہ از ابن عباس بن مطلب روایت کردہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمودہ چیست قومی را کہ چوں یکے از اہل بیت من با ایشان می نشیند قطع حدیث خود می کنند بہ آں خدائے کہ جان من بہ ید قدرت اوست کہ ایمان در دل ہیچ مومن داخل نمی شود تا وقتیکہ اہل بیت مرا دوست دارد از جہت خدائے واز جہت قرابت من"۔ یعنی : "ابن ماجہ نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ رسولِ خداؐ نے فرمایا کچھ لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ جب میرے اہلبیت میں سے کوئی ان کے پاس بیٹھتا ہے تو اپنی بات قطع کر دیتے ہیں۔ اس خدا کی قسم جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے کہ کسی مومن کے دل میں ایمان داخل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ میرے اہلبیت سے خدا کے لیے اور میری قرابت کی وجہ سے محبت نہ کرے"۔

مُنتقمانہ بے چینی کے وجوہات

سب سے بڑی وجہ منتقمانہ بے چینی کی یہ بھی تھی کہ وہ لوگ جنھیں اپنی قوم میں ایک گونہ اقتدار حاصل تھا وہ اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت سے مغلوب ہوگئے تھے اور دیکھتے تھے کہ مقابلہ سے ہمیں اپنے بہت سے اعزا کو کھونا پڑا۔ ہوسکتا تھا کہ فتح کی حالت میں وہ وقتی انتقام کے بعد بھول جاتے لیکن شکست اور مغلوبیت نے انھیں مارِ آستین بنا دیا جو اب سامنے آکر لڑنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے لیکن دیکھنا چاہتے تھے کہ ہمارے فاتح کس وقت غافل ہیں۔ لیکن باوجود ان عناصر کے رسولؐ کی ذات

اقدس کا حیرت خیز بلکہ معجز نما اثر یہ تھا کہ وہ جماعتیں جو کیسی ہی موقع بینی یا مجبوریوں سے داخل اسلام ہوئی ہوں یا کیسے ہی حوصلے اور امید نے انھیں لے دین کے سایہ میں کیوں نہ کھینچا ہو سب کے سب ایک سکون کے عالم میں تھے۔

اس سکون کو نامطلوب حرکت سے بدلنا قومی اور دینی گناہ تھا

حقیقت یہ ہے کہ ان داخل ہونے والی جماعتوں کے یہ قابل شکایت عناصر اس قدر قابل الزام نہیں تھے۔ جس قدر وہ لوگ جنھوں نے ان عناصر کو زندہ کرنے کی مثال دی یا تحریک کی۔

عداوت کا انتہائی فعل اس کا ثبوت ہے کہ علیؑ میں امامت کی قابلیت کا پورا نشو ہو چکا تھا

واقعات اپنی فطری روش پر چل رہے تھے کہ دفعتہ واقعہ عقبہ نے پچھلے سکون میں ایک ہیجان پیدا کیا اور یہ سوال پیدا کیا کہ اگر جتھابندی اور رسولؐ کے ارادوں کے خلاف بغاوت پر ایک جماعت آمادہ نہ تھی تو یہ کیا تھا تو دشمنوں کا یہ غصہ ظاہر بظاہر اس لیے تھا کہ اس ذات کو فنا کر دیں جس نے آئندہ کے لیے اپنا قائم مقام ہمارے علاوہ اس کو چنا ہے جسے ہم نہیں چاہتے نہ اس لیے کہ وہ وجہ اسلام کا سب سے بڑا حامی نہیں ہے۔ نہ اس لیے کہ وہ ان صفات سے متصف نہیں ہے جو ایک نبی کے وصی میں ہونی چاہیے بلکہ اس لیے کہ اس کا وصی ہونا آئندہ ان کی امید پر خاک ڈالتا ہے کہ ہم کچھ نہیں رہتے۔ یہ خیال اس وقت کی تمام مخالفانہ جتھابندی کی اصل تھا۔

نیا دور شروع ہوتا ہے

ذاتی طور پر مجھے اس کا یقین ہے کہ وہ چند افراد جنھیں کسی طرح رسولؐ کے بعد صاحب اختیار ہونے کا حوصلہ پیدا ہو گیا ہو اس وقت سے اس خاص شاخ کے متعلق رسولؐ کے احکام یا انداز کو نہایت غور سے دیکھنے لگے۔ جس وقت سے رسولؐ نے اپنی پارہ جگر حضرت فاطمہؑ زہرا کو علیؑ کے عقد میں دیا۔ لیکن اس وقت بجز خفیف کشیدگی کے سڑی ہوئی دشمنی اور مستحکم مخالفت کا خیال نہیں کیا جاسکتا تھا اس لیے کہ ابھی قرابت پیدا کرنے کے ذرائع ختم نہیں ہونے تھے اور اس کے بعد اولاد کی امید ہو سکتی تھی جس سے آئندہ کوششوں کا جواز ہوتا۔ کشیدگی مستحکم حد تک نہیں پہنچی جب تک یہ امید باقی رہی۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ جس جس طرح اس امید میں ضعف پیدا ہوتا گیا وہاں زوج بتول نے رسولؐ کی آنکھوں میں روز افزوں وقعت حاصل کی جو عامہ ناس کی آنکھوں کے سامنے کا واقعہ تھا۔ اس نے دیگر امیدواران میں یاس کی زیادتی شروع کی اور یاس کے ساتھ دل میں حقوق کی مخالفت کا ذخیرہ زیادہ ہوتا گیا۔

مؤلف کے نزدیک جیش اُسامہ کے حکمِ روانگی کی اصلی غرض

انتظام تھے جو رسولؐ اپنی اُمت کے مستقبل کے لیے کر رہے تھے۔ ان لوگوں کو انتظام کے لیے آمادہ ہونا چاہیے تھا جو اپنے لیے امیدیں کرتے ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ اسامہ ابن زید کو اس لحاظ سے کہ دشمن کو اس کے شرارت کی سزا دی جائے شدت بیماری میں روانہ کرنے کے لیے تیار کرنا بلحاظ سزا دینے کے ایک ایسا امر تھا جو ملتوی رکھا جا سکتا تھا اور اگر رسولؐ رحلت بھی فرماتے تو ایک لشکر کے روانگی کی وصیت فرما سکتے تھے یا آئندہ والی امر کا کام ہوتا کہ وہ ضرورت دیکھتا۔ اسی سریہ کا آراستہ کرنا زیادہ تر اس مصلحت پر مبنی تھا کہ بیقرار طبیعتوں سے مدینہ دور رکھا جائے۔ لوگ سمجھ گئے اور جانا مناسب نہ سمجھا۔ رسولؐ ان کے اس سمجھنے کو سمجھ گئے۔

رسولؐ نے کب کاغذ طلب کیا

اور اس کے بعد مزید قوت دینے کے لیے یہ امر تھا کہ اب اپنا ارادہ اور خیال تحریز اور وصیت کی صورت میں بھی امت کے حوالہ کر جائیں۔ واقعات کا سلسلہ اس طرح تھا کہ وہ طبیعتیں جو ایک خیال میں آلودہ تھیں ان کا مشتبہ رہنا اور یہ سوچنا کہ اس کی غرض کیا ہے کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔

کاغذ طلب کرنے کی غرض کا سمجھنا واقعات کے سلسلہ کی محض گرفت تھی

کاغذ کے طلب کرنے کے ساتھ ہی شبہہ کا بھڑک اٹھنا کوئی عجب خیز نہ تھا کیونکہ نہ ابا حفصہ اور ابن ابو قحافہ نے دم لیا جب حضرت عائشہ سے یہ روایتیں موجود ہیں کہ رسولؐ عبدالرحمٰن ابن ابوبکر کو بلا رہے تھے کہ ابوبکر کی خلافت کا وثیقہ لکھ ہی دیں۔ شاید یہی ہوتا لیکن حضرت عمر کی شدت نے یہ ظاہر کر دیا کہ کم سے کم وہ ایک تنہا شخص تھے جنھیں اس کا یقین تھا کہ رسولؐ ان کے متعلق کچھ تحریر نہ فرمائیں گے اور نہ انھیں اپنے دوست اور بیعت رضوان کے بھائی کے متعلق کوئی امید تھی ورنہ لکھنے نہ دینا کیا معنی رکھتا ہے۔

تحریر کے روکنے سے علیؑ کا دعویٰ کمزور نہیں ہوا بلکہ حضرت عمر نے اپنے اور ابوبکر کے دعوے کا ہمیشہ کے لیے فیصلہ کر دیا

کوئی خود سے اپنے ہاتھ نہیں کاٹتا۔ انھوں نے اس انکار اور رکاوٹ سے علیؑ کا دعویٰ کمزور نہیں کیا۔ اپنے اور اپنے مویدین یا ہم خیالوں کے دعوے کی وقعت کھو دی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت تک کسی کو ظاہر دعویٰ کی جرات ہی نہیں ہوئی تھی۔ ڈول والی حدیث۔ اینٹ والی حدیث اور طلاق سے کٹ جانے والی قرابت کا حق اور ان کا وزن سمجھنا یا وزن دینا "مرید ان می پرانند" والے زمانہ کا ہے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ رسولؐ کے زمانہ میں علیؑ کے وقار اور وجاہت کے مقابلہ میں کسی کا وقار نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔

گبن نے گھر کے اندر کی ایک بات کہنا چاہی ہے حدیث افک کے متعلق علیؑ کے صاف تصفیہ کی حدیث اور ابوبکر کے لیے سم اثری

بیرونی کارروائیاں یہ تھیں اندرونی سازشیں یہ تھیں کہ رسولؐ کو ہر وقت یہ خیال ہوتا تھا کہ ہم کوئی فعل و حرکت نہیں کرتے مگر کوئی آنکھ اسے غور سے دیکھتی ہے اور باہر اس کی خبر پہنچاتی ہے اور مسٹر گبن کے خیالات کے موافق رسولؐ کے بستر علالت کو "عائشہ نے جو علیؑ کی دشمن اور ابوبکر کی بیٹی تھیں محصور کر لیا تھا" وہی جن کے عرض کے موافق نہ ہو سکتا تھا کہ علیؑ رسولؐ سے یہ کہتے کہ آپ کو اس غم سے خلاص ہونے کے لیے بہت سی عورتیں ممکن ہیں۔ نہ میں یہ سوچ سکتا ہوں کہ حضرت ابوبکر نے طبعاً علیؑ کے اس جواب کو اس روش سے علیحدہ دیکھا ہو گا جس سے ان کی بیٹی نے دیکھا جس کے آثار ایک زمانہ تک دکھائی دیے۔

ان حالتوں میں رسولؐ کے الفاظ اور ان کا عکس

ان حالتوں نے رسولؐ سے کہلوایا کہ: "میں ڈرتا ہوں کہ دُنیا کی رغبت کرو گے اور آپس میں لڑو گے"۔ کبھی فرمایا کہ: "نہیں معلوم میرے بعد کیا فتنے تمھارے درمیان کھڑے ہوں گے"۔ اور جب سازشوں کی شدت دیکھی تو فرمایا کہ: "آگ بھڑک اٹھی اور فتنہ آ گیا مثل اندھیری رات کے ٹکڑے کے"۔ کبھی انصار سے کہا کہ: "فہل عسیتم ------"۔ (آیا تم سے امید ہے کہ اگر تم والی امر ہو تو فساد اور قطع رحم نہ کرو گے)

ایک طرف لوگوں سے یہ فرمارہے تھے، لیکن تنہا اس سے جس کی روانگی پر صحیح و سالم واپس آنے کی دعائیں مانگتے تھے اور جدائی پر افسوس کرتے تھے یہ فرماتے ہیں کہ: "میرے بعد تجھے بہت سے صدمے پہنچیں گے۔ لیکن جب لوگ دنیا کی طرف مشغول ہوں تو تو دین اختیار کرنا"۔ کیسے میں ان واقعات کی ترتیب میں اپنے کو اس یقین سے باز رکھ سکتا ہوں کہ ان تمام الفاظ میں رسولؐ کی یہ حالت ہے جیسے کوئی کسی بڑے کام کو انجام دے اور جب یہ دکھائی دینے لگے کہ اس کے آئندہ اجرا میں کوئی غلطی یا تساہل نہیں ہوئی اور اب وہ بغیر رکاوٹ کے چلے گا تو دفعتاً اسے یہ دکھائی دینے لگے کہ نہیں کچھ طبیعتیں اس پر آمادہ ہیں جو یہ چاہتی ہیں کہ اس کے چلنے کی صورت ہم درست کریں۔ غم کی اس گرانی میں واقعات کی روش نے یہ صورت اختیار کی کہ کچھ لوگ اس سے بھی پہچانے جاتے کہ رسولؐ ان کے دروازے بند کر دیتے۔ تیارداری کی اجازت نہ دیتے اور اپنے پاس سے اٹھا دیتے۔

رسولؐ کی آخری ناراضی آدمی اور گروہ پہچنواتی ہے

رسولؐ کے ایسے حلیم نے یہ نرم کشیدگی بھی اس وقت تک اختیار نہیں کی جب تک یہ یقین نہ ہو گیا کہ اظہار ناراضی میں خاموش رہنا واقعات اور امر حق کے سمجھنے میں حارج ہوگا کیونکہ اس کے بعد رسولؐ کی آمادہ ناراضی کو پہچاننا اور وجوہات سمجھنا آسان ہو جاتا۔

موقع بینی کی جلدی کا مطلب

وہ افسوس ناک وقت آیا کہ ہادی عالم سے زمانہ خالی ہو گیا۔ وہ اور اس کے متعلقین جس کے سینہ اور گردن کے درمیان رسولؐ کی روح اقدس عالم راحت کی طرف روانہ ہوئی، جسم اطہر کے آخری فرض ادا کرنے کے فکر میں رہے۔ کون سوچ سکتا تھا کہ کوئی مسلمان جسے رسولؐ سے محبت ہوگی وہ تجہیز و تکفین کے قبل موقع اور وقت کو غنیمت سمجھ کر اور فطری حق دار کو اس ناقابل تسکین غم میں مشغول دیکھ کر یہ سمجھے گا کہ اگر اس وقت کچھ نہ کیا تو پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حوصلے خاک کے سپرد ہو جائیں گے۔ کیونکہ اس کے بعد دفن کرنے والوں کو کوئی ایسی مفید آخری خدمت کا ادا کرنا اپنے ذمہ نہ ہوگا اور وہ بھی ہماری طرح آزاد ہوگا کہ ہر طرف دیکھ سکے اور ہماری ہر کوشش کو رد کر دے۔

صورت یہ پیدا ہوئی کہ یا خلافت لو یا رسولؐ کو دفن کرو

بلکہ اس کا موجود رہنا اور محض اس کی ذات بمقابلہ تمام دعویداروں اور ان کی دلیلوں کے زیادہ وزنی ہوگی۔ مسئلہ نے یہ صورت اختیار کی تھی کہ یا دفن میں شریک ہو یا خلافت حاصل کرو۔ لوگوں نے دوسری صورت اختیار کی جس سے یہ امر صاف ہو گیا کہ ان کے نزدیک کونسا فرض زیادہ توجہ کے قابل تھا۔

انصار کے متعلق مؤلف کا خیال

میں بذات خود اس امر کے مان لینے پر آمادہ نہیں ہوں کہ انصار نے کوئی جلسہ منا امیر و منکم امیر کے لیے مرتب کیا ہو۔ بلکہ مجھے اس کے متعلق دو شبہ ہیں ایک تو یہ کہ جس طرح اور لوگ رحلت کی خبر سن کر اپنی اپنی جگہ باتیں کرنے لگے ہوں اسی طرح یہ بھی باتیں کر رہے ہوں اور شیخین کے مخبر نے انھیں یہ غلط خبر دی ہو کہ لوگ امارت کا تصفیہ چاہتے ہیں اور یہ لوگ دوڑے گئے ہوں، اور اپنی دلیل پیش کی ہو اور انھیں اپنے کو آگے بڑھاتا ہوا دیکھ کر انصار نے اپنے حقوق

بھی پیش کیے ہوں اور یا حضرت ابوبکر کا نیح جانا حقیقت میں کہیں ایک جلسہ منعقد کرنے کے لیے ہو، جو آئندہ امورات پر بحث کرے، یا قبیلہ اوس کو اپنا کرنے کے لیے جن کا ذکر آتا ہے۔ انصار بھی اس مجمع میں داخل ہو گئے ہوں اور صورت معاملہ وہ پہنچی ہو جو مذکور ہے۔

مخبر نے کیوں دو ہی آدمیوں کو خبر دی اور ان دونوں آدمیوں نے مسلمانوں کو شریک نہ کیا نہ انصار کو جلسہ ملتوی کرنے کی صلاح دی

اور مؤرخین نے انعقاد جلسہ کی مصلحت کو انصار کے سر تھوپا ہو اس کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ مخبر آئے اور صرف انھیں دو آدمیوں کو مطلع کرے اور یہ صرف اپنے امین ابوعبیدہ جراح کو ہمراہ لیں اور مطلق اس کی فکر نہ کریں کہ بغیر قدم ڈھیلا کیے ہوئے ایک ہی آواز دیدیں کہ مسلمانو سقیفہ بنی ساعدہ میں اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے چلو! انصار بے عنوانی کیا چاہتے ہیں۔ یا وہاں پہنچ کر بھی انصار سے کہیں کہ تصفیہ اس وقت تک ملتوی رکھو جب تک کہ مہاجرین و انصار کے سربرآوردہ لوگوں کا مجمع نہ ہولے اور کسی کو یہ شکایت نہ ہو کہ ہمیں ہماری امورات کے مشورہ میں شریک نہ کیا صواعق محرقہ کی روایت مخبر کی بھی ضرورت نہیں سمجھتی بلکہ ابا حفصہ خود سے ابوقحافہ سے خواہش کرتے ہیں کہ انصار کے پاس چلو اور کہتے ہیں کہ انصار سقیفہ میں جمع ہوئے ہیں۔ وہ جمع ہوئے یا نہ ہوئے لیکن لطف اس میں ہے کہ "حضرت علیؑ و زبیر رضی اللہ عنہما و جمعی دیگر کہ باایشان بودند در خانہ فاطمہؑ نشستہ تخلف کردہ"۔ یعنی: "جب حضرت علیؑ و زبیر رضی اللہ عنہما اور چند اور لوگ جو ان کے ساتھ تھے نے فاطمہؑ کے گھر میں بیٹھ کر تخلف کیا"۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ تخلف کس بات سے کیا، اس لیے کہ وہ لوگ تو تجہیز و تکفین کی فکر میں تھے، اب تک سوال بیعت پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ اور اگر تخلف کرنا ہی تھا تو اس مجمع نے آپس میں کسی کو اسی طرح خلیفہ بنا لیا ہوتا جس طرح سقیفہ بنی ساعدہ میں بنایا گیا۔ اور نہیں معلوم وہ مہاجرین کا مجمع کونسا تھا جو ابوبکر کے گرد جمع ہوا۔ کیونکہ اور کسی کا نام جانے والوں میں بجز دو اور شخصوں کے نہیں ہے۔ بلکہ واقعہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ امیرالمومنینؑ اور ان کے رفقا کو چھوڑ کر انصار کو بلانے کی فکر سے روانہ ہوئے جس کے ساتھ غالباً مغیرہ ابن شعبہ کی بھی صلاح تھی کہ تم قبیلہ اوس اور خزرج کو علیحدہ کر کے ایک کو اپنی طرف کر لیتا اور جب ایک امر طے ہو جائے گا تو پھر کوئی عملی مخالفت کے لیے نہ کھڑا ہو گا اور لوگ خموشی اختیار کریں گے۔ ہم خموش رہنے کو رضامندی ظاہر کریں گے ان کا اس مجمع کے پاس کھڑا نہ ہو سکنا جہاں علیؑ موجود تھے اور دوسرا میدان تلاش کرنا موقع کو صاف دلیل سے سمجھا دیتا ہے۔

جلسہ کی دُوری

سب سے پہلی بات اس جلسہ سے مشتبہ کرنے کی یہ ہے کہ جلسہ تصفیہ امورات کے لیے ایک ایسی جگہ قرار دیا گیا جو شہر سے کئی میل پر واقعہ تھا جہاں کی خبر پہنچتے پہنچتے کئی گھنٹہ ہو جاتا یا لوگوں کے پہنچنے تک ایک بات طے ہو جاتی اور پھر "قول دے چکے" کی آڑ ہو جاتی۔

انصار زیادہ قابلِ الزام ہیں یا وہ مہاجر جو وہاں تھے

ہم نے مانا کہ انصار قابل الزام سہی لیکن وہ مہاجر جنھیں خبر ملی اور انھوں نے جماعت اسلامی کے معتبر افراد کو مطلع کرنے کی کوشش نہ کی وہ ان سے زیادہ قابل الزام ہیں۔

سقیفہ کے واقعات میں ایک بات جو نہایت غور کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ کچھ ہوا جس سے اوس خزرج کے

دو گروہ ایک دوسرے کی مخالفت پر تل گئے۔ تم زمانہ رسولؐ کے گزشتہ اوراق میں پڑھ آئے ہو کہ کس طرح رسولؐ نے ایسے ہی ایک موقع کو بملائمت طے کر دیا۔ اور خزرج کی پرانی رقابت سے صرف اس قدر کام نکلا کہ وہ آئندہ اسلامی وجہ کی مدد میں ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی کوشش کرتے اور یہ جدوجہد قومی اور مذہبی حیثیت سے مفید ہوتی۔ آج کیا ہوا؟

کشیدگی کی تفصیل اور خاص باتیں

بشر ابن سعد کہا جاتا ہے کہ وہ سعد بن عبادہ کی مخالفت کرتا تھا۔ یعنی قبیلہ اوس خزرج کو صاحب اختیار نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ اور کہہ رہا تھا کہ قریش کی حکومت کو مان لو کہ اس کے بعد تمہاری ہوگی یا اس کے مثل ہوگی۔ یعنی اگر چہ تم صاحبِ اختیار نام سے نہ بھی پکارے جاؤ تو قریش کا اس طرح ساتھ دینے سے تمہارا جو موقع ہوگا وہ کسی طرح صاحب اختیار ہونے سے کم نہ ہوگا۔ جس کی ابوبکر نے تحریک یا تصدیق کی تھی کہ: "ہم امرا ہیں اور تم وزرا ہو"۔ صورت معاملہ اس قدر ظاہر ہو گئی تھی کہ حباب بن منذر بشر بن سعد سے پوچھ سکتا کہ تو نے کیوں اپنے ابن عم سے "حسد" کیا۔ اور آپس میں تلوار کھچ جاتی۔ حباب اس کا استغاثہ کرتا کہ اے انصار میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے بچے ایک کوزہ آب طلب کرتے ہیں اور نہیں ملتا۔ اور حضرت ابوبکر کہتے ہیں کہ بھلا ہم سے تم کو ایسی امید ہے؟۔ اور مؤرخین یہ لکھتے ہیں کہ: "خزرج را خجالتے تمام روی داد"۔ یعنی: "خزرج کو بہت شرمساری ہوئی"۔

حضرت عمرؓ اور ابوبکرؓ میں سیاسی ردوبدل

اور سب سے زیادہ پُر لطف داستان تو یہ ہے کہ حضرت ابوبکر اور عمر میں بھی سیاسی چالوں کی ردوبدل ہوتی ہے کہ ابوبکر عمر کو ابوعبیدہ کی بیعت پر آمادہ دیکھ کر نہایت مخلصانہ اقدام یہ کرتے ہیں کہ تم اپنا ہاتھ بڑھاؤ ہم تمہاری بیعت کر لیں۔ اور اس اصرار میں اس قدر طول دیتے ہیں کہ ابا حفصہ بغیر یہ کہے نہیں رہ سکتے کہ تم مجھ سے افضل ہو اور اس کے بعد ابوبکر اصرار قبول کر بیعت کرا لینے میں عذر نہیں کرتے۔ "چل گئی"۔ یقیناً اس میں ابوبکر کی مصلحت قوی تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اگر بیعت ابوعبیدہ اور عمر میں رہ گئی تو ہمارا نمبر تیسرا ہو جائے گا۔ اس لیے انھوں نے ابوعبیدہ کو درمیان سے اٹھا دیا۔ اور خود اور ابا حفصہ پہلے اور دوسرے ہو گئے۔ ابا حفصہ اگرچہ اپنی پہلی مصلحت سے پیچھے نہ رہے لیکن وہ پہلے ہونے میں چوک گئے اور ابوعبیدہ تو یقیناً "چل گئی" کے موقع کو ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ اگرچہ ابا حفصہ نے اپنے زمانہ کو ختم دیکھ کر انھیں بپرباد کیا لیکن یہ اس وقت تمام ہو چکے تھے۔

کیا یہ دور اندیشانہ رقابت تھی؟

کون جانے کہ سرورِ عالمؐ کے خسر ہونے کا افتخار اس امر خاص میں دور اندیشانہ رقابت سے تھا۔ ان مواقع کو اس وقت کے دیکھنے والے کی نگاہ سے اگر سمجھنا چاہتے ہو تو تمھیں یہ فقرہ مدد دے گا کہ: "اس طرح دودھ دوہو کہ تمھیں بھی ایک حصہ ملے اور ان کے لیے مضبوط کرو کہ کل وہ تمھیں لوٹا دیں گے"۔

ظاہری اور باطنی مناظرہ

ہم کو اس پر بھی اب کچھ کہنا نہیں ہے کہ ابوبکر کی بیعت ناگہانی تھی اور ہم اسے بالکل صحیح سمجھتے ہیں کہ پہلے ان کے چند مخصوصین نے بیعت کی اور یہ لوگ

اس کام میں لانے گئے کہ ابوبکر کو یمنی لنگی بندھوا کر ساتھ ساتھ چلیں اور جو دکھائی دے اسے دیکھیں کہ اس میں ہاتھ ہے یا نہیں اور ہاتھ کھینچ کر اپنے خلیفہ کے ہاتھ سے مس کرادیں۔ اگرچہ اس حیرت خیز بیعت کو دیکھ کر براء بن عازب کے "ہوش کیوں نہ اڑ جائیں"۔ براء بن عازب کے ہوش کا فاختہ اڑ جانا اس قدر عجب کی چیز نہیں ہے جس قدر ابوقحافہ کا یہ فطری سوال اپنی منصفانہ واقعہ خوانی ہے کہ کیا بنو عبد مناف اس پر راضی ہو گئے؟۔ اور پر لطف میں اس سے اور زیادتی ہو گئی کہ "کوئی اسے پست نہیں کر سکتا جسے تو بلند کرے"۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ ابوقحافہ کی قدریت گزشتہ مثالوں کی طرح ایذا رسان نہیں ہے۔ ایسا کہنے کے وقت کہنے والے کی طبیعت کے کون سے عناصر آنکھوں کے سامنے موجود ہو جاتے ہیں اور ان سے ان کی طبعی تاریخ پر کیسا عکس پڑتا ہے۔ اس کی وضاحت سے میں اپنے کو باز رکھتا ہوں۔ لیکن یہ کہنا چاہتا ہوں کہ باپ کا منکسرانہ ادائے شکر اور موقع کو قبول کرنے کے لیے نفس کا آمادہ نہ ہونا فطری تھا۔ سوال ان کے لیے دلچسپ ہوگا جو سطح طبیعت سے خاندانی درجہ خصوصیات بجھنا چاہیں۔ اس انداز طبیعت کا کسی قدر سخت پہلو یہ تھا کہ: "انصار مکروہ داشتند بیعت او"۔ اور اس کا تیسرا درجہ یہ تھا کہ: "ابن ابوقحافہ کون ہے جس کی ہم بیعت کریں؟"۔

کہاں کہاں اور کس نے علیؑ کی ناموجودگی میں ان کی وکالت کی

نہیں اس پر بھی توجہ دلانے کے لیے کچھ وقت کی ضرورت نہیں ہے کہ انصار نے علیؑ کو بغیر کسی سفارش کے خلافت کے لیے پیش کیا درآنحالیکہ ان کی کوئی مرتب مددگار جماعت نہ تھی لیکن نام آنے کے ساتھ ہی حضرت عمر کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ بیعت کی کاروائی شروع کر کے سوچنے کا موقع نہ دیں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ پیشتر سے تیار رکھے گئے ہوں کہ اپنا عمل دکھا کر لوگوں کو تقلید پر آمادہ کریں۔ بنی امیہ کے مستند سردار نے بھی ویسا ہی چاہا۔ جو انصار نے چاہا تھا۔ ان کے علاوہ حضر موت جہاں دور کی وجہ سے علیؑ کی کسی کوشش اور اثر کا موقع نہ تھا وہاں بھی نہ صرف عام لوگوں نے بلکہ معارف نے بھی ایسی ہی خواہش کی اس لیے کہ ملوک کی اولاد امیروں کے سامنے جھکنے کو اپنی توہین سمجھتی تھی۔

علیؑ کی شہرت نے آئندہ کے لیے اس کا راستہ صاف کر دیا تھا

ان واقعات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دور دور کے مقامات پر علیؑ تشریف لے گئے ہوں یا نہ لے گئے ہوں لیکن ان کے خدمات اسلامی اور رسولؐ کے نزدیک ان کے درجہ کی شہرت ہر جگہ پہنچ گئی تھی اور جو لوگ واقف نہ بھی تھے انھیں حجۃ الوداع نے بتا دیا یا انھوں نے اپنے گھروں پر پہنچ کر اس بڑی رسم کا تذکرہ کیا اور وہ ہر وقت اس کی امید کرتے تھے کہ ہم رسولؐ کے بعد علیؑ کو اپنا امام سمجھیں گے۔ یہاں میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ ان امورات نے لوگوں کے دلوں کو اس امر کے لیے آمادہ کر دیا تھا کہ وہ علیؑ کو خلیفہ رسولؐ سن کر نہ چونکیں بلکہ ایک طے شدہ امر سمجھیں جس کا اعتبار خود رسولؐ نے قائم کیا تھا۔

ائمہ کے طرزِ عمل کا بڑا فرق

اب فرق دیکھو کہ کچھ لوگ ہیں جو ایسے موقع پیدا کرتے ہیں جو افتراق اور اختلاف پر منتہی ہوں۔ نزاع اور قتل کا بازار گرم ہو جائے۔ اور اگر خوش قسمتی سے عملاً ایسا نہ ہو تو کہا جائے کہ "خدا نے اس کے (بیعت کے ناگہانی واقع ہو جانے سے) شر سے محفوظ رکھا"۔ لیکن

علیؑ اگرچہ ہر طرح کا مرجح حق رکھتے ہیں اور فوجی مدد کی امید دلائی جاتی ہے لیکن آمادہ نہیں ہوتے اس خیال سے کہ یہ مانا کہ ہم صاحب حق سہی لیکن نتیجہ قتل وغارت اور ایک ساکن حالت کو فساد سے بدلنا ہے۔

جنابؑ امیرؑ اپنی کشمکش کا نقشہ کھینچتے ہیں

ہم کیوں اس کے محرک ہوں جناب امیرؑ ہی کے لفظوں میں حالت یہ تھی کہ "اگر میں اپنا حق طلب کرتا ہوں تو (لوگ) یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص ملک ومال پر کتنا حریص ہے اور اگر خموشی اختیار کرتا ہوں تو سرگوشیاں ہوتی ہیں کہ موت سے ڈر گیا سوچ لینا آسان ہے لیکن ایسے جوش خیز مواقع پر یہ تصفیہ کرنا اور اس پر قائم رہنا آسان نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ یہ تصفیہ ان علیؑ کو کرنا پڑے جن کی عمر طعن وضرب میں کٹی تھی۔ اپنے اس جوش کو دبا دینا تھا اگرچہ یہ صبر درخت حنظل سے بھی زیادہ تلخ اور تیز چھریوں کی برش سے زیادہ قلب کو اذیت پہنچانے والا ہو"۔ اس لیے کہ رسولؐ کی قبر سے یہ صدا آرہی تھی کہ اے علیؑ "جس وقت لوگ دنیا میں مشغول ہوں تو تم دین اختیار کرنا"۔ حیرت خیز پیشین گوئی تھی جس کے لیے حیرت خیز ذات چنی گئی تھی۔ اس پر عمل کرنا اپنے حقوق اور جائز حوصلوں کی بڑی قربانی تھی۔

علیؑ کی خاموشی کا احسانؑ اسلام پر

بزور شمشیر معاملہ نہ کرنے میں رسولؐ کے بعد علیؑ نے مسلمانوں اور لطافت اسلام کے قائم رکھنے میں پہلا اور سب سے بڑا احسان کیا جس سے ابدالاباد تک اسی شکریہ کے مستحق ہوئے کہ انھوں نے باوجود اشتعال انگیز حالتوں کے ذاتی حقوق کو اسلامی لحاظ پر قربان کر دیا۔ صرف علیؑ کا یہ طرز عمل رسولؐ کے بعد انھیں محافظ اسلام بنا دینے کے لیے کافی ہے۔ حالانکہ اس زمانہ میں بھی یہی ایک مثال نہیں ہے۔

علیؑ نے فوجی قوتؑ کا نفاذ اعلیٰ احساسات کے تابع رکھا

یہاں میں اس سے بحث نہیں کر رہا ہوں کہ علیؑ کی جنگی قوت کہاں تک تھی اور کامیابی یا کس حد تک کامیابی کی امید کی جاسکتی تھی بلکہ میں اس امر کو تسلیم کرنے کے بعد کہ وہ فوجی قوت کا اظہار کر سکتے تھے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ باوجود ایسی حالت کے جس میں فوجی کارروائی ممکن تھی علیؑ نے اسے معطل رکھا۔ اور یہ بھلانا چاہتا ہوں کہ ضرور نہیں کہ فوجی قوت کا نفاذ فوجی قوت کی موجودگی پر حتمی ہو جائے بلکہ وہ اعلیٰ احساسات کا تابع کیا جاسکتا ہے ایسی اشتعال انگیز حالتوں میں علیؑ کا کام تھا جس کی انھوں نے مثال دی۔ آج اس صورت سے اسلام پر احسان کرنا تھا۔ آئندہ مثالیں آئیں گی جو اس سے کم حیرت خیز نہ ہوں گی جن کے بیان کرنے کے لیے ہم طبیعتوں کو تیار کر رہے ہیں۔

موقع جو نیتؑ کو پوشیدہ نہیںؑ رکھتا

مغیرہ پھر سامنے آتا ہے جب ابوالہیثم، سلمان اور ابوذر کے ایسے مہاجرین یہ منصفانہ روش اختیار کرتے ہیں کہ انتخاب خلیفہ شوریٰ سے ہو تو ایک ایسا جلسہ ہونا چاہیے جس میں کسی کو ناواقفیت کی شکایت نہ ہو اور ہر طبقہ کے لوگ شامل ہوں۔ انصاف کے نزدیک یہ صلاح کیسی ہی مقبول کیوں نہ ہو لیکن ان کے نزدیک دل پسند نہ تھی جو صاحب اختیار ہو گئے تھے۔ یہ کہہ چکنے کے بعد کہ چپ چپ "عرب خاندانِ رسالت میں سے کسی کو چاہیں گے"۔ دوبارہ انعقاد شوریٰ سے کہیں یہ موقع پھر نہ آجائے اور ہم اس موقع کو کھو بیٹھیں جو اتفاقات نے ہمیں حوالہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصفیہ پر آمادہ نہ ہونا

کم سے کم اپنے کامیابی کی بے اعتباری ضرور تھی۔ اور اب مغیرہ کے صلاح سے اس پر آمادہ ہوئے کہ علیؑ ابن ابی طالبؑ کے مقابلہ میں ایک دوسرے حق دار کو کھڑا کر کے امیر المومنینؑ علیؑ کے حقوق کو کمزور کر دیں یا لوگ اور علیؑ کے درمیان ایک زبردست آڑ کر دیں۔ عباس سے اپنا اتفاقِ حق ظاہر کیا۔ دھمکایا، عزیز داری ظاہر کی، لالچ دی۔ لیکن جواب یہ ملا کہ:

● مومنین کے ذریعہ سے تمہارے لیے کیونکر ثابت ہوسکتا ہے۔ درآنحالیکہ ہم کارہ تھے (موجود نہ تھے)

● خدا ہمارا مدد گار ہے۔ ● اگر ہمارا حق ہے تو ہم بعض کو چھوڑ کر بعض پر اکتفا نہیں کرسکتے۔

● رسولؐ وہ درخت ہیں جس کی ہم ٹہنیاں ہیں اور تم ہمسایہ ہو۔ (شیخین کے امر قرابت پر مورخین نے وقعت قائم کرنے کے لیے اکثر زور دیا ہے حالانکہ اسے نہ صرف رسولؐ نے کوئی وقعت نہ دی نہ بنی ہاشم نے اسے رسولؐ کے بعد کچھ سمجھا اور نہ خود مشرکین نے صلح حدیبیہ میں اس پر کوئی توجہ کی)

مدینہ کی خاموشی مفید نہ ہوتی اگر باہر شور ہوتا رہتا

جس طرح سے کیوں نہ ہوا ہو مدینہ میں اعلانِ خلافت کے بعد اس کی ضرورت تھی کہ بیرونی صوبہ جات بھی خلیفہ تسلیم کریں۔ ورنہ ایک دن ان مقامات کی مخالفت سے پانسہ بدل سکتا تھا۔ مخالفت ہوئی۔ مخالفت کی یہی روش نہ تھی کہ ہم تمہیں خلیفہ رسولؐ نہ سمجھ کر صدقات نہیں دیتے بلکہ صورت معاملہ میں وہ خوفناک عنصر بھی مل گیا تھا جسے ابن ابوقحافہ نے انصار سے کہا تھا کہ: "عرب خاندانِ رسالت میں سے کسی کو چاہیں گے"۔

سقیفہ بنی ساعدہ کے خلیفہ کا "کسی"

ہم سب جانتے ہیں کہ خاندانِ رسالت کا "کسی" کون تھا۔ اور انصار نے یہ ہیبت ناک نام بھی لے لیا تھا۔ یعنی یہ اندیشہ تھا کہ علیؑ ہم سے بزورِ شمشیر معاملہ کریں یا نہ کریں، بیرونی مقامات پر نہ صرف ہمارا اثر نہیں ہے بلکہ وہ علیؑ کے حقوق کے حامی ہیں۔ کسی ایک کا ایسا ہونا مخدوش تھا۔ نہ کہ صاحبِ قوت قبائل کا۔ حالانکہ ان میں سے چند ایسے تھے جنھوں نے محض خاندانِ رسالت کا نام لیا تھا۔ یا یہ کہا تھا کہ بنی تیم کی تو قبائل میں کوئی وقعت نہیں ہے جسے ہم اپنا امیر قرار دیں۔ اگر ایسے بہتیرے نہ بھی ہوں تاہم مصالح اس کی مقتضی تھی کہ اس کا جلد تدارک کیا جائے کہ اور لوگ بھی اس دلیل کے حامی نہ ہو جائیں۔

قبائل کا موقع

کچھ ایسے بھی تھے جو سجاح اور مسیلمہ کا ساتھ دیتے تھے۔ نہ اس لیے کہ اسے نبی یا کچھ ایسا ہی سمجھتے تھے بلکہ دو محلے میں ان کا آشیانہ تھا۔ وہ ڈرتے تھے کہ اگر ہم نے مرتدین کا ساتھ نہ دیا تو یہ ہم پر غارت گری لائیں گے اور اگر ابن ابوقحافہ کا ساتھ نہ دیا تو وہ مخالفت پر آمادہ ہوں گے۔ اس بنا پر معمولی تصفیہ کی بات یہ تھی کہ وہ قریب کے دشمن کو دوست بنا کر دور کے دشمن سے لڑتے۔ دشمنی دونوں میں قدر مشترک تھی۔ کسی طرح جان بچانی تھی۔

ذرا سی بکنی بہت سا پانی رنگین کر دیتی ہے

ابوبکر کے لیے موقع اس قدر نازک تھا کہ وہ کیسے فوج کشی کرتے اور کیسے عامہ مسلمین میں جنگ کا جوش پیدا کر دیتے۔ اس لیے کہ اکثر قبائل کے مسلمان ہونے کے خود اپنے آدمیوں نے اعلان کیا تھا۔ نہ وہ علی الاعلان یہ کہہ سکتے تھے کہ چونکہ ان لوگوں نے علیؑ کے حقوق کی تائید کی ہے اس لیے ہمیں ان پر فوج کشی ضروری ہے۔ اس کے لیے موقع کی باتیں موجود تھیں۔ ایک تو یہ کہ مسیلمہ اور سجاح کی شورش کی خبر تھی۔ ایک پڑیا بکنی ایک بوتل پانی کے رنگنے

کے لیے کافی ہوجاتی ہے۔ اب مشکل نہ تھا کہ شورشوں اور ارتداد کا ڈھول بجادیا جاتا۔ اور بھانے کے لیے ایسے الفاظ مل جاتے کہ گھٹائیں آرہی ہیں، طوفان اٹھ رہے ہیں، بجلی چمک رہی ہے، شعلے بلند ہورہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

مُسلمانوں کی آزاد عورتیں کنیز بنائی گئیں

چھوٹے چھوٹے قبائل پر تاخت سے حوصلے بڑھائے جاتے۔ یہاں تک کہ کندہ ایک ہزار عورتوں کا چندہ دے سکتے۔ وہ عورتیں جنھیں اسلام نے آزادی عطا کی تھی وہ رسُولؐ کے بعد کے اسلام کی کنیز ہوتیں۔ یعنی منفعیت کا راستہ دکھادیا۔ دوسرا اصول تھا جس نے فوج کشی میں مدد دی، اس نے ساتھ رہنے والوں کو اپنی جگہ قائم رکھا ورنہ دُوسروں کا دوست بنانا تو درکنار خود قول دینے والے خشک خلافت کے قریب نہ رہ سکتے تھے۔ یہی کرنا ہوتا تو کسی کو بالادوئی کی کیا ضرورت تھی۔ اور دوسرا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ علیؑ کے حقوق کی تائید آج اگر نہ کچلی گئی تو کل پھر وقت نہ رہے گا اور اس کی قوت بڑھتی جائے گی یعنی سچائی اور حق کے مقلدین کے قتل سے ابتدا کی گئی۔

کون قتل کے گئے اور کیوں

یہ واقعات کیسے ہی پیرایہ اور الفاظ میں کیوں نہ ہوں اللہ سینہ کھول دے یا اصلاح امت بھی جانئے۔ تھا یہ کہ اہل بیت رسالت کے حقوق اور وصیت کے مٹانے کی یہ پہلی بڑے پیمانہ پر عملی کارروائی تھی۔ جس میں وہ گلے کاٹے گئے جن سے اہل بیت رسالت کے حقوق کی تائید کی صدا نکلتی تھی۔ اس مصلحت سے کہ اگر یہ کمزور نہ کیے گئے تو پھر ابھرنا مشکل ہے۔ ایسا فتویٰ دینا کہ "جو شخص زکوٰۃ اور صلوٰۃ میں فرق کرے گا میں اسے مُسلمان نہیں سمجھتا"۔ آسان تھا۔

رسُولؐ نے کیا کہا تھا

اگرچہ رسُولؐ فرما چکے ہوں کہ: "ہمیں اہل شہادتین کے قتل سے خدا نے منع کیا ہے"۔ اور اس سے زیادہ آسان ایسے لوگوں کا مل جانا تھا جنھیں یہ سوچنے کی پرواہ نہ تھی کہ وہ زکوٰۃ اور صلوٰۃ میں فرق نہیں کرتے، بلکہ تم کو خلیفہ رسُولؐ نہ سمجھ کر تمھیں زکوٰۃ نہیں دیتے اور کہتے کہ اگر ہمیں زکوٰۃ نہیں دیتے تو تمھارے مُسلمان ہونے اور نماز پڑھنے سے ہمیں کیا فائدہ۔ ہم بزور تم سے وصول کریں گے۔ اور کہہ دیں گے کہ سب مرتد ہوگئے تھے۔ انصاف، یک جہتی اور محبت کی حکومت مٹ گئی۔ خوف، اظہار قوت اور گروہ بندی کا دور شروع ہوا۔ ایسی فضا قائم ہوگئی جو آئندہ قومی شیرازہ کے منتشر کرنے کے لیے مذہبی روح، دینی تقدس اور امتیاز، خود غرضانہ سیاسی ضرورتوں کے نیچے کچل ڈالے۔ یہ قومی اور دینی تحفظ کے وسیع مفہوم کی اعلیٰ سیاست نہ تھی بلکہ اپنا موقع اور چہرہ محفوظ رکھنا تھا۔ یہی موقع تھا جہاں اسلام اپنے خون میں نہا رہا تھا۔

یہ نہ ہوتا اگر علیؑ خلیفہ ہوتے

یہ نہ ہوتا اگر علیؑ بن ابی طالب خلیفہ ہوتے۔ اس لیے کہ نہ لوگوں کو مخالفت ہوتی اور نہ علیؑ ایسے راستہ اختیار کرتے اور لوگوں کی طبیعتوں کو اس آب وہوا سے آئندہ کے لیے تیار کرتے۔ جس سے رفتہ رفتہ وہ تمام خصوصیات فنا ہوجاتیں جو رسُولؐ نے پیدا کی تھیں بلکہ انھیں قائم رکھتے اور ترقی دیتے۔ قومی ساخت کا کارخانہ انہدام پذیر نہ ہوتا۔

سیڈیلٹ کا نہایت درست ریمارک ہے کہ: "اگر قرابت کی وجہ سے تخت نشینی کا اصول علیؑ کے موافق ابتدا سے مانا جاتا تو وہ برباد کن جھگڑے نہ ہوتے جس نے اسلام کو مُسلمانوں کے خون میں غوطہ دیا"۔ (اسپرٹ آف اسلام)

یا بقول واشنگٹن ارونگ کہ: "سب سے زیادہ ممتاز امیدوار علیؑ تھے۔ جن کا سب سے زیادہ فطری حق تھا کیونکہ یہ رسولؐ کے ابن عم اور داماد تھے اور فاطمہؑ سے ان کی جو اولاد تھی صرف وہی رسولؐ کی یادگار رہ گئی تھی"۔ سید امیر علی صاحب اپنی تاریخ اسلام میں فرماتے ہیں کہ "آنجنابؐ نے اکثر دفعہ حضرت علیؑ کو خلیفہ کرنے کا اشارہ کیا تھا مگر کوئی ضابطہ مقرر نہیں فرمایا تھا۔ (مؤلف کے پاس شارٹ ہسٹری آف سارا سنس نہیں ہے بلکہ "وطن" کا ترجمہ ہے۔ میں اس عبارت کو انگریزی میں دیکھنا چاہتا ہوں) اس بات سے ذاتی طمع، اسلامی فساد کے خوف پر غالب آگئی اور بعد کے زمانہ میں اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ خانہ جنگیاں شروع ہوگئیں اور مذہب میں رخنہ پڑ گیا۔ اگر اس وقت حضرت علیؑ خلیفہ بنا دیئے جاتے تو مسلمانوں میں تباہی بخش خون ریزیاں ظہور میں نہ آتیں"۔ یہ مؤرخین انیسویں بیسویں صدی عیسوی کے سیاسی معلومات کے سایہ میں بول رہے ہیں۔ لیکن ہمارا امام اسلامی تباہی کے وقوع میں آنے کے صدیوں پیشتر عین دن کے دن کہتا ہے کہ: "کہیں ایسا نہ ہو کہ آج کے دن کے بعد تم اس امر خلافت کو ایسی حالت میں دیکھو کہ اس میں تلواریں کھنچی جائیں۔ عہد شکنیاں ظہور میں آئیں۔ حتی کہ تم میں سے بعض لوگ اہل ضلالت و گمراہی کے امام اور اہل جہالت و نادانی کے پیرو ہو جائیں"۔ اس وقت اور اس وقت میں عناصر کا فرق نہیں ہے تفصیل کا فرق ہے۔

اگر طبائع پیشتر سے تیار نہ تھیں تو یہ کیسے ممکن تھا کہ سرور عالم کی رحلت کے ساتھ ہی کوئی ایسا ارادہ پیدا ہو جائے جس کی غرض یہ ہو کہ ہم اپنے امور اسی کی انجام دہی کے لیے رسولؐ کے گھر جلا دینے تک باز نہ رہیں۔ مجھے اس میں کوئی عذر نہیں ہے کہ یہ خالص اور کھرا ملکی اقدام نہ تھا ایسا اقدام جو اس حد تک پہنچ گیا ہو جس میں کسی مذہبی وقعت سے چشم پوشی کی جائے یا اس کا لحاظ کرنا، ملکی غلطی یا کمزوری بھی جائے۔ بڑا ارادہ اور بڑی تصمیم تھی یہ بڑا ارادہ اور اس کی پختگی خصوصاً اسی وقت کی طرف سے تجاہل جو ایک زمانہ سے قائم تھی کوئی ایسی سانس نہ تھی جس سے پتنگا اڑ گیا ہو، بلکہ جنگل میں آگ لگانے اور قلعہ گیری کا سامان تھا۔ رسولؐ کے گھر پر قبضہ کرنا، اور دھاک بٹھانا نہ تھا۔ اسلام کے دل کو ناخون سے دبانا تھا۔ سوچو اگر تم سوچ سکو کہ یہ بھی سقیفہ کی ایسی کوئی فوری کارروائی تھی؟۔ اپنے کو بہلاؤ اگر بہلا سکو کہ قلوب پیشتر سے ناموافقت اور مخالفت پر تیار نہ تھے جو اپنی پختگی میں یہاں تک پہنچی۔

انسانؑ کی ایک چال جسے وہ اکثر خود نہیں سمجھتا

یہ غیر فطری نہیں ہے کہ اگرچہ انسان ایک گناہ کا ایک وقت ارادہ نہیں کرتا یا اس ارادہ کو محسوس نہیں کرتا لیکن اسباب گناہ کے جمع ہوتے ہی وہ اس طرح دوڑتا ہے کہ گویا وہ دیر سے پیاسا تھا۔ گناہ کرتا ہے اس لیے کہ اس میں قابلیتیں نشو و نما پاتی چلی جاتی تھیں۔ ان کے توڑنے کی کوئی فکر نہ کی تھی۔ فعل تو عیال کا نتیجہ ہے۔ جس ایک مثال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس طرح تیار ہو رہا تھا۔

آگ لگنے میں دیر نہیں ہوئی بلکہ سُلگنے میں ہوئی

سچ ہے کہ ایران اور روم کے محلوں کے پتھروں سے مسلمانوں کے بڑے بڑے قصر بن گئے لیکن یہ محل اس چنگاری پر بنے تھے جو رسولؐ کے گھر کے لیے مخصوص کی گئی تھی۔ یہ سب قصر جل گئے اور اس کی راکھ ہوا میں اڑ گئی۔ اس لیے کہ جو اصول رسولؐ کے گھر کو آگ دکھا سکتا تھا وہ مسلمانوں کے گھر کو کیسے بچا سکتا تھا۔ ایران اور

روم کی فتح اس لیے ہوئی تھی کہ الاؤ کے لیے اور بہت سی لکڑی جمع ہو جائے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ آگ لگنے میں دیر ہوئی۔ نہیں سلگنے میں دیر ہوئی۔ اس لیے کہ لکڑیوں میں گزشتہ یاد اور اس کے خصوصیات کی کچھ نمی باقی تھی۔ اور فتوحات کی دیوانگی اور جوش منفعیت نے یہ دیکھنے نہ دیا کہ خود ہمارے گھر میں سے دھواں اٹھ رہا ہے اور گھٹنے اور لہراتے ہوئے دھوئیں میں شعلے لپک رہے ہیں۔ دیکھا تو اس وقت جب کہ چارہ کار باقی نہ تھا۔ اور اب یہ کچھ بھی باقی نہ تھی کہ آگ لگنے کے اسباب پر غور کریں۔ کیونکہ اسباب ایک طویل زمانہ کے نشو میں اپنا منہ چھپائے تھے۔ ایک کفن تھا جو لاش کے گرد لپٹا تھا۔

طاہرہؑ کے فقرہ کی صدائے بازگشت

ہر حیثیت کی آتش افروزی کے تذکرہ سے نہ صرف مجھے متذکرہ صدر باتوں پر غور کرانا منظور ہے بلکہ زکیہؑ کا فقرہ بھی پیش کرنا ہے کہ: "کیا ہمارا گھر پھونکنے جاتا ہے؟"۔ پوچھنے والی رسولؐ کی بیٹی ہے۔ اس کی سوانح عمری پر غور کرو۔

شریف ترین خاندان عرب کی بیٹی جس میں ہمیشہ سے دنیاوی اور روحانی حکومت تھی۔ جس نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ باپ کے سامنے دل اور سر جھک رہے ہیں۔ وقت آتا ہے کہ وہ دنیاوی حاکم بھی ہے۔ لیکن اپنے باپ کی اس زاہدانہ روش میں شریک ہے کہ ہم دنیاوی لذتوں کے لیے پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم بہ فراغت بسر کر سکیں۔ لیکن کرتا یہ ہے کہ نہ ہو کہ کوئی بھوکا ہو اور ہم سیر ہوں۔ حاجت مند گرد تھے۔ ان کے خیال نے اپنے کو بھلا دیا تھا۔ یہاں تک کہ اس فقر و افلاس کو گوارا کیا جس سے بڑھ کر مثال نہیں دی جا سکتی۔ اور نہ اس سے بڑھ کر کسی کو اس کا اندازہ اور تجربہ ہو سکتا تھا۔ اس نے انھیں غربا کا ہمدرد بنایا۔ غربا کو غربت میں انتہائی شریفانہ وقار پر قائم رہنے کا سبق دیا۔ انھیں تسکین دی کہ غربت یا امارت فی نفسہٖ ذلت یا عزت کی چیز نہیں ہے بلکہ دونوں سے جو عیوب پیدا ہوتے ہیں وہ قابل لحاظ ہیں۔ دونوں میں عزت و ذلت ہو سکتی ہے۔ امیر بننے اور امیرانہ عزت دکھانے کے لیے ہر متنفس تیار ہو جائے گا۔ لیکن ایسے جری کم نکلیں گے جو غربت کے امتحان کا دعویٰ کریں بلکہ اسے پسند کریں۔ حالانکہ امیر ہو سکتے ہوں اور ہوں اور دعویٰ کے بعد اپنے کو ایسا دکھائیں کہ غمزدہ ان کے پاس دوڑتے تھے کہ ہمیں تسکین دی جائے گی۔ کیونکہ ان کی تسکین قابل قدر تھی۔ وزن اور اثر رکھتی تھی۔ انھیں جمع کرنا نہ تھا بانٹنا تھا۔ یہاں تک کہ ایسی ضروری اور یادگار چیزیں بھی فقرا کی راحت کے لیے صرف کر دی ہیں جسے رسولؐ نے عطا کی ہوں۔ عقد کی یادگار ہوں جس پر خود اور بچے آرام کرتے ہوں۔ ہم خاک پر سو رہیں گے لیکن یہ نہ کریں گے کہ خدا کے بندہ کا دل توڑا جائے۔

کیسے حاکم تھے؟

ان کے ایسے پختہ اور حاکمانہ وقار کے باوجود ان میں ایسی محبت، ہمدردی اور رحم کہتا ہے کہ ان کی حکومت نے ایسا جلوہ دکھایا۔ ان کی ذات اور عمل میں دکھایا اگر کبھی دکھایا۔ قاآنی مبالغہ نہیں کرتا جہاں وہ کہتا ہے کہ: "روز روشن خواجہ ہر شیر مرد شام تا رَے خادم ہر بیوہ زن"۔ واقعہ ہے شاعری نہیں ہے۔ یہ اس بی بی کے شوہر کی تعریف تھی۔ علیؑ کو اپنی آنکھوں سے مسلح ہوتے دیکھا تھا۔ رخصت کیا تھا اور منہ پھیر کر آنسو ٹپکا دیے تھے۔ صبر کیا تھا۔ خطروں میں جانے دیا۔ اس لیے کہ وہ امر جو اس کا باپ اور شوہر کرے بغیر سوال کے ان کے لیے قابل پیروی تھا۔ سمجھتی تھیں کہ بڑی وجہ ہے۔ اور پھر اپنے کانوں سے علیؑ کو کامیابی اور ادائے فرض کے بعد یہ کہتے بھی سنا تھا کہ: "لو اے فاطمہؑ یہ تلوار لو جس سے میں نے خدا و رسولؐ کی نصرت میں جنگ کی ہے"۔

اور باپ نے اس کی تصدیق کی تھی۔
مختصر یہ کہ وہ جس کی شان اور آن بغیر کسی ٹھیس کے ترقی پذیر تھی جس نے کسی مظلوم، غریب، یتیم اور اسیر کی تسکین میں کوتاہی نہیں کی آج اسے دیکھنا ہے کہ وہ لوگ جو ہمارے آستانہ کی خاک کو بہ فخر سر پر لگاتے تھے یہ کہہ سکتے ہیں کہ: "ہاں گھر پھونک ڈالیں گے، نہیں تو تم بھی بیعت کرو جس طرح اور مسلمانوں نے بیعت کی ہے"۔ رسولؐ کی لاڈلی مسلمانوں سے فریاد کر سکتی تھی لیکن موقع یہ پیدا ہو چکا تھا کہ بہت سے مسلمان قوں میں گرفتار ہو چکے تھے۔ فاتح عرب فطری مددگار تھا لیکن دیکھتی ہیں کہ شیر کو اپنے گرفتاری کی اس وقت خبر ہوئی جب کہ ہر طرف سے مضبوط سلاخوں میں گھر گیا تھا۔ اس کے بعد زور دینے کے معنی یہ تھے کہ ہم اس امکان پر بھی راضی ہیں کہ قتل ہو جاؤ۔ اور غافل بے بجھے ہوئے بہت سے مسلمانوں کو قتل کرو، یا قتل کراؤ اور اس کے بعد انتقام اور عداوت کا سود بڑھتا جائے۔

مسلح نمائش کی غرض

مسلح ہزاروں آدمیوں کو جو نئی مصلحت کے مؤید ہو گئے دیکھا کہ وہ حملہ آوروں کے جوش سے آ رہے ہیں۔ گھر کا تخلیہ کرانا ہو یا اپنے قوت کی نمائش ہو۔ اور یہ سب اس لیے کہ علیؑ بھی ہماری اطاعت اور پیروی کو واجب جانیں۔

شرفائے عالم کے غور کے قابل

یہ مسلمانوں ہی کی تاریخ کا ایک سیاہ ورق نہیں ہے بلکہ موقع وہ ہے جہاں ہر قوم کا شریف اس عبرت خیز واقعہ سے متاثر ہوگا۔ جس میں دکھی ہوئے آن والے دیکھتے ہیں کہ ہمیں صدمہ پہنچایا جا رہا ہے۔ اور ہمیں برداشت کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔ توہین میں اور زیادہ تلخی اس سے پیدا ہو گئی ہے کہ یہ ان کے ہاتھوں نہیں ہے جن پر ہمارا احسان نہ ہو بلکہ ان کے بدولت جن کے سر کے بال بقول انھیں کے ہمارے ہاتھوں اُگے ہیں۔ حالت میں کچھ ایسا ہی درد بھرا تھا کہ قنفذ جو ایک حملہ آور سپاہی کی حیثیت سے گیا تھا اس پر رو دیا کہ بیٹی باپ کو یاد کر رہی ہے۔

واقعات جن سے وہ نہ رو سکے جنھیں رونے کا سب سے زیادہ حق تھا

تم سوچو گے کہ رحلت رسولؐ کے بعد ہی ان واقعات نے ان کو اطمینان سے رونے نہ دیا ہوگا جنھیں رونے کا سب سے زیادہ حق تھا۔ بلکہ اور بہت سے غم اصلی غم میں شامل ہو گئے ہوں گے۔ ہم لوگ جن کی آنکھوں پر تیرہ لمبی اور تاریک صدیوں کا پردہ پڑا ہے۔ ان حالات کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے اور نہ یہ ہمارے امکانی غور میں ہے کہ اس سے کس درجہ نفرت اور غصہ پیدا ہوا ہوگا۔

اس وقت علیؑ کا شغل

یہ سوچتے ہوئے حلق میں سانس رکتی ہے کہ علیؑ کیا کرتے ہوں گے ابھی تک سینہ اور گردن کے قریب رسولؐ کی آخری سانس کا احساس باقی تھا۔ کفنانی ہوئی صورت بھولی نہ تھی۔ دفن کرنے کا عالم یاد تھا کہ ہر طرف سے نئے دور دورہ کے آثار دکھائی دینے لگے۔ یہ کیا کم تھا کہ اس کا سایہ اٹھ گیا جس کی گود میں آنکھ کھولی۔ جس کی زبان چوس کر بڑے ہوئے۔ جس نے فطری جوش کی زیادتی کے ساتھ ان باتوں کا جوش پیدا کرنا شروع کیا جو علیؑ کی زندگی کی خصوصیات میں ہیں۔ جس نے اپنا مثیل اور شارح بنایا۔ جس نے آئندہ کے لیے معاملات کا تجربہ کرایا، اور نفس کے لیے راستے صاف کرائے اور پہنچوا دیے۔ آج اس کی مسند اس کے قدم کے نیچے ہے "جس کی چل جائے!"۔

اور جناب فاطمہؑ کے اِس عظمت ریز بلیغ فقرہ میں دیکھنا تھا کہ: "رسولؐ کے منبر کو تاریکی نے ڈھانپ لیا"۔

زوال کی ایک لازمی بے رحم شان

لیکن صورت یہ تھی کہ محض روحانی حیثیت سے امت کی عدم مرکزیت دیکھنی نہ تھی یا یہی نہ تھا کہ ہماری گود کا پالا دین ہر زبان کی گویائی اور ہر عقل کی تاویل کا تابع ہو گیا ہے بلکہ ان کے لیے بھی یہ عالم تھا کہ ایک بڑے گھر کی تباہی اس وقت تک برابر زوال کی تابع رہتی ہے جب تک وہ اپنے کو اس کی روش کا خوگر اور اپنے کو اس کا دست نگر نہ بنائے جس کا عروج اس کی تباہی کا باعث ہوا۔ اور عروج پانے والا مطمئن ہو کر اسے بعافیت بسر کرنے کے سامان فراہم کرے۔ زوال پذیر کے لیے یہ فطری ہے کہ کچھ دنوں یا دو ایک پشتوں تک اپنی آن کو اپنے سر میں رکھے اور دست نگری یا صاحب اختیار کی خوشامد کے مقابلہ میں اپنی خاموشانہ غیرت کو زیادہ پسند کرے اور گرتے گرتے تباہی کی انتہائی حد تک پہنچ جائے اور اس درمیان میں صاحب اختیار کی مصلحت نہ صرف ختم جائے بلکہ نسلیں تیار ہو جائیں جنھوں نے اس روش کے سایہ میں بسر کرنا سیکھا ہے۔

اس وقت تازہ حادثہ تھا۔ اور دیکھنا یہ تھا کہ نہ صرف ہم کو اختیار سے دست بردار ہونا پڑا ہے بلکہ کوشش یہ بھی ہو رہی ہے کہ بقول حضرت سیدہ فرزندوں کا قوت معیشت بھی لے لی جائے۔ اہل بیت رسالت کے لیے تغیر حکومت اس لیے اور تکلیف دہ تھا کہ انھوں نے اپنے زمانہ حکومت میں اپنا گھر نہ بھرا تھا۔ اب وقت تھا کہ علیؑ دیکھیں کہ سیدہؑ کی گواہی جھٹلائی گئی اور طاہرہؑ دیکھیں کہ علیؑ کی گواہی کو وقعت نہ دی گئی۔ اس لیے کہ رسولؐ کی جانداد پر ہمارا حق قبول کرنا امارت کے لیے فطری حق دار کا سوال سامنے کھڑا کر دیتا ہے۔ یہی نہ تھا کہ ہم میں غصہ، افسوس اور نفرت پیدا ہو اور ہم صبر کریں بلکہ یہ بھی دیکھیں کہ دختر رسولؐ کا نسبتاً نازک دل کڑھ رہا ہے۔ یہی جذبات ان میں بھی پیدا ہو رہے ہیں وہ گھل رہی ہیں اور ہم دیکھ رہے ہیں اور اس سے کسی طرح کم یہ احساس نہ تھا کہ چھوٹے چھوٹے بچے ہر طرف دیکھتے ہیں کہ آج ہم سے ہمارے نانا کی امت اس پیار سے کیوں متوجہ نہیں ہوتی جو پہلے تھی۔ رسولؐ کے بعد تو ہمیں اور تسکین کی ضرورت تھی۔ ہم نے کیا کیا ہے۔ بچے کیا جانتے تھے کہ زمانہ ہمیں اب شاہزادہ نہیں سمجھتا بلکہ ہمارے اس خطاب پر ہنس رہا ہے۔ حاضر باشوں کو اب دوسرے کام ہیں، وہ اپنی حاضر باشی سے کام نکال چکے!

علیؑ تھے اور یہ روح فرسا غم تھے۔ سوچو اس تکلیف دہ کوشش کو کہ جناب امیرؑ بحیثیت افسر خاندان کے اس امر کی کوشش کرتے ہوں گے کہ ہمارے چہرہ سے غم کے آثار ظاہر نہ ہوں۔ جس سے ہمارے متعلقین افسردہ نہ ہوں۔ ہم بغیر سامانوں کے تسکین دینے کی کوشش کریں۔ علیؑ کا رونا اس قدر درد انگیز نہ ہوتا جس درجہ ان کا صبر غم آلود ہے۔ میں مولوی عباسی صاحب کے ساتھ سوچتا ہوں جہاں وہ فرماتے ہیں کہ جناب امیرؑ کا غم حسینؑ کے غم سے کسی طرح کم نہ تھا۔ افسوس ہاں۔ علیؑ تھے جنھیں غم کا دھکا پہلے لگا اور بقیہ عمر اس طرح بسر ہوئی کہ ایک سے ایک بڑھا ہوا صدمہ پہنچتا اور دیکھتے۔

کوشش اور اس کا تجربہ

جناب امیرؑ سے بیعت کرانے کی کوشش ان کی طبیعت شناسی سے اس قدر تجاہل نہ تھا جس قدر نئے نئے صاحب اختیار ہونے کے ولولہ سے تھا۔ یا اس وجہ سے ہو کہ ان کے دشمنوں کو اپنی ماتحتی میں جمع اور انھیں توہین پر آمادہ دیکھ کر انھیں روکنے کی جرأت نہ ہو سکی ہو۔ لیکن گرفتار شیر سے بھی آنکھیں ملانا آسان نہیں ہے۔ جس میں اس سے بھی مدد ملی کہ علیؑ نے مجمع میں اپنے حقوق کا

اعلان کیا۔ اب تک یہ ہوسکتا تھا کہ بنی ہاشم کی طرف سے جاہلی پیدا ہوجاتا اور لوگوں کو قول دیدیتے لیکن ابھی اس کا تجربہ نہ ہوا تھا کہ لوگ اس پر بھی آمادہ ہوجائیں گے کہ اگر وہ بیعت نہ کریں تو ان سے بزور شمشیر معاملہ کیا جائے۔

دھمکی کو عمل میں لانا مصلحت کے خلاف تھا

ایسے مخدوش تجربہ کے لیے آمادہ ہونا قرین مصلحت نہ تھا۔ اور اگرچہ یہ دھمکی دی گئی تھی کہ بیعت نہ کروگے تو گردن ماریں گے۔ لیکن یہ فقرہ بہت سی حالتیں اور اس تصفیہ کی مجبوری بجادیتا ہے کہ: "سائلے گفت اے ابوبکر چہ چیز ترا بر این داشت کہ والی مردمان شوی و حالانکہ نہی میکردی ملرا ازآنکہ بر دو کس امیر باشم گفت مارا ازیں چارہ نیست ترسیدم کہ امت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متفرق گردند و خلل افتد در دین"۔ یعنی: "کسی نے پوچھا اے ابوبکر تجھے کس چیز نے آمادہ کیا کہ لوگوں کا حکمران بن بیٹھے۔ حالانکہ تو ہمیں دو بندوں پر حاکم بننے سے روکتا تھا۔ انھوں نے کہا ہمیں مجبوری تھی۔ میں ڈرا امت محمد رسول اللہؐ کے متفرق ہونے اور دین میں خلل پڑنے سے"۔ بہتر ہے کہ راوی نے ہمیں سائل کا نام نہیں بتایا۔ نہ ہمیں کوئی ایسی ضرورت ہے کہ ہم خالد کے ایسے شکی ہوجائیں۔ لیکن اس کے کوئی معنی ہیں کہ لوگ تھے جو اس خیال سے آسانی سے سانس نہیں لے سکتے تھے کہ ہم دو آدمیوں پر امیر نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دو آدمی جناب امیرؑ اور سعدؓ تھے۔ دین کے ساتھ ہمدردی کے لحاظ سے خلل نہ پڑنے دینا شکریہ کا مستحق ٹھہراتا۔ اگر عمل اس کے خلاف کچھ نہ کہتے۔

بیعت کا تشدد بنی ہاشم کے لیے حفاظت کا مسئلہ ہوجاتا جو حکومت کے لیے رسولؐ کی رحلت کے قرب زمان سے مخدوش تھا

بلکہ بہت ظاہربات یہ تھی کہ مبادا ایسی سختی حفاظت کے خیال سے انھیں بھی بزور شمشیر مقابلہ پر آمادہ نہ کردے اور یہ تلوار علیؑ کے ہاتھ میں ہو اور اس وقت بنی ہاشم خلافت حاصل کرنے یا نہ کرنے کو چھوڑکر عرب کے عام دستور کے لحاظ سے اپنے خاص فرد کی حمایت اور حفاظت کے لیے کھڑے ہوجائیں۔ اور انھیں آمادہ جنگ دیکھ کر عامہ مسلمین کا رخ بدلنے لگے اور مغرور ابوسفیان اپنے سوار و پیادہ لے آئے۔ جسے جناب امیرؑ کے حقوق کی کچی تائید ہو یا نہ ہو لیکن وہ ایک مستند خاندان کو بنی تیم پر ترجیح دے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سعد اگرچہ عامہ مسلمین کے نزدیک کسی طرح اس وقار اور وقعت کے درجہ پر نہیں ہوسکتے تھے جیسے جناب امیرؑ تھے لیکن تاہم یہ ایک بڑے قبیلہ کے رئیس تھے۔ اب یہ سمجھنا آسان تھا کہ حکومت کے ساتھ تالی بجانے والے کسی شخص خاص کے نوکر نہیں ہوا کرتے۔ وہ اختیار اور ہوا کے غلام ہیں۔ درانحالیکہ وہ جو قبیلہ کے عہد اور قرابت کے پاس سے لڑنے کو آمادہ ہوتے ان کا جوش اور اخلاص بدرجہا زائد ہوتا۔ اب ہر شخص کو تصفیہ کا اختیار ہے کہ یہ احتیاط دین میں خلل نہ پڑنے دینے کی وجہ سے تھی یا مخدوش تجربہ سے گریز تھی کہ ان کے اقرار بیعت کے لیے اپنے اختیار میں رعشہ نہ پیدا کرو جس سے لوگوں کے خیال بدلنا شروع ہوں۔ درانحالیکہ ہم سے اختیار چھین لینے کے لیے کوئی عملی کوشش نہیں کرتے بلکہ صرف پر وقار کنارہ کشی چاہتے ہیں۔ مصلحت یہی ہے کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو، اور کہہ دو کہ اگر تم بیعت نہ کرو تو تم پر کوئی تکلیف نہیں ہے۔

سعد رضی اللہ عنہ کا قاتل جن

تم نے غالباً غور کیا ہوگا کہ سعد بن عبادہ کو کونسا جن اور کیوں قتل کرسکتا تھا۔ یقیناً کوئی جن خلافت کا رقیب نہ تھا۔

علیؑ کے بیعت نہ کرنے کا اثر

علیؑ کے بیعت نہ کرنے کا اثر سوچنا مشکل نہیں ہے۔ سرورِ عالمؐ کی رحلت کے بعد فوری جوش یا تجاہل نے کچھ ہی کیوں نہ کرا لیا ہو لیکن ایک مضبوط لہر ہر شخص اپنے دماغ سے ٹکراتی ہوئی محسوس کرتا ہو گا جس وقت سنا اور دیکھا ہو گا کہ زوجِ بتولؑ مرعوب نہیں ہوا۔ علیؑ اس سے نہ صرف اپنی جگہ قائم رہے بلکہ اپنے تمام گزشتہ وقار کو اپنی پہلی شان سے لوگوں کی نظروں میں قائم رکھا بلکہ اس اِستعجاب اور حیرت نے اس میں اور اضافہ کیا کہ ایسے اِمتحان خیز وقت میں بھی ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس سے علیؑ لوگوں کے دل اور دماغ پر بیٹھ گئے۔ کیا ہوا اگر لوگ حکومت پر بیٹھے۔ اس سے علیؑ بجائے خود ایک مرکز ہو گئے۔ جدھر لوگوں کی نگاہیں اٹھ سکتیں اور ان کی ذاتی قابلیتیں کھینچنے میں مدد دیتیں۔ واقعات ہیں جن کے مُنہ میں یہ زبان ہے کہ حکومت بھی کبھی کبھی مُشتبہ نگاہیں ہٹا کر ان کی طرف اس نگاہ سے دیکھتی تھی کہ اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔ لوگ بھی اسے دیکھتے تھے۔ اور اب علیؑ کے وقار میں روحانی زیادتی ہوتی جاتی تھی۔ یہ واقعہ تھا کہ لوگ پیٹ بھرنے حکومت کے پاس جاتے تھے اور تمام وقتوں میں ان کے حافظہ میں اس احساس کی گدگدی ہوتی ہو یا نہ ہو کہ علیؑ ہمارے دماغ میں بیٹھے ہیں۔ لیکن موقع کی چھیڑ انھیں بغیر یاد دلائے نہ رہ سکتی تھی۔

کفر اور اسلام کے مُتعلق علیؑ کے تصفیہ کا عامہ ناس پر اثر

چھوٹی بات نہ تھی کہ لوگ یہ جانیں کہ علیؑ کو حصولِ خلافت کا حق اور قابلیت ہے لیکن وہ خاموش ہیں اس لیے کہ امت بھوکے بھیڑیوں کی طرح ایک دوسرے کی جان پر حملہ نہ کرے اور امن فساد سے مبدل نہ ہو جائے۔ ہم کوئی ایسی بات اپنی طرف سے نہ کریں جو اسلام کے حق میں مضر ہو اور نقضِ امن کہا جا سکے۔ وہ جانیں اور حیرت انھیں گھیر نہ لے کہ علیؑ کسی ایسی فوج کشی کے مخالف ہیں جس میں مُسلمان ایک دوسرے پر جرأت نمائی کریں۔ جسے حکومت ان لفظوں میں ظاہر کرے کہ: "علیؑ آج کل کمال اِحتیاط کرتے ہیں اگر خدانخواستہ وہ نہ گئے یا ان لوگوں کے کفر و اسلام میں توقف کیا تو پھر کوئی لڑنے نہ جائے گا مگر مجبوری ہے"۔ علیؑ اپنی بے اِختیاری میں بھی صاحبِ اِختیار دکھائی دیتے ہیں، جہاں ایک فعل کے لیے ان کا اقدام نہ کرنا لوگوں پر یہ اثر کرتا ہے کہ کوئی اس فعل کے لیے بجز مجبوری کے اور کسی طرح آمادہ نہ ہو گا۔ یہ واقعہ آزادی اور مجبوری کا فرق بھی دکھاتا ہے۔ جناب امیرؑ کو مانعینِ زکوٰۃ پر نہ بھیجنے کی اس مصلحت کا سمجھنا بھی مشکل نہیں ہے کہ وہ ان لوگوں پر نہیں بھیجے جا سکتے تھے جو ان کے حقوق کی تائید کرتے ہیں۔ یا لوگ ہیں جو موجودہ حکومت کے مخالف ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ علیؑ کے طرف جھکیں۔ تیسرے یہ کہ علیؑ کی ماتحتی میں ایسے وقت ایک فوج دینا مخدوش ہے۔

یہ واقعات میں نے اس امر کے سمجھانے کے لیے لکھے ہیں کہ اہلِ بیت پر دھاک بٹھانے کی کوشش کی گئی اور ان کے مؤیدین حقوق سختی سے کچلے گئے۔ یہ بھی میری غرض تھی کہ باوجود تغیرِ حکومت کے ایسی مثالیں دی جا سکتی تھیں کہ بیعت نہ کی جائے اور نہ کرائی جائے اور اس سے یہ کہنے کی غرض تھی کہ ان واقعات کو حسینؑ نے دیکھا یا سنا تھا۔ جسے آگے چل کر ان کی بڑھتی ہوئی عمر نے سمجھایا اور حالات سے طبعی مس ہوا۔ اور باب دوم کے واقعات اور اس کے نشو سے یہ دکھلانا اور سمجھانا مقصود تھا کہ کس طرح حسینؑ سات برس کے سن میں اپنے حق سے محروم ہوئے جو اُن تک پہنچتا

مؤلف "سیرۃ الفاروق" کا ایک اُصول

صاحب "سیرۃ الفاروق" مسئلہ خلافت کا ذکر کرتے ہوئے حسنینؑ اور ان کی اولاد کو وارث قرار دے کر کہتا ہے کہ: "بلاشبہ عرب کے واسطے یہ سب سے بہتر اُصول ہوتا"۔

انصار نے رسولؐ کے احسانؑ کا فاطمہؑ کو کیا جوابؑ دیا

اس باب کی آخری بات پر اب توجہ دلاتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ہماری فرزادی نے جو پہلو اختیار کیا اس نے لوگوں میں طبعی ہیجان پیدا کرنے میں کہاں تک اثر کیا۔ انصار ہماری فرزادی کے پدر عالی مقدار کا یہ مشہور خاطبہ بھولے نہ ہوں گے کہ: "اگر لوگ ایک طرف جائیں تو ہم اُدھر جائیں گے جدھر اے انصار تم جاؤ گے"۔ آج یہ دیکھنا تھا کہ فرزادی باپ کے سوگ میں ان سے استغاثہ کرنے کے لیے آنے پر مجبور ہو۔ انصار نے کیسی ہی معذوری کیوں نہ ظاہر کی ہو لیکن ان کی پیشانیوں پر شرم کی نمی پیدا ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ اور کم سے کم وہ یہ سوچے ہوں گے کہ غفلت میں ہم نے یہ خیال نہ کیا تھا کہ بنت رسولؐ ہمارے سامنے اس طرح کھڑی ہو جائیں گی اور گویا پوچھیں گی کہ: کیا تمھیں یہی کرنا چاہیے تھا۔ کیا ہم نے تمھارے ساتھ کوئی برائی کی تھی؟۔ ہمیں کیوں ضعیف و حقیر کر دیا؟۔ تم نے کیوں مُنہ پھیر لیے؟۔

کیا مورخین کو بنت رسولؐ کا یہ فرمانا معلوم ہوتا بغیر ان لوگوں کے سنے ہوئے جو اس وقت موجود تھے کہ: "بابا ہم نے آپ کے بعد کیا کچھ نہ دیکھا؟"۔ لوگوں نے نہ آنکھوں پر پٹی باندھی تھی اور نہ کانوں میں روئی رکھ لی تھی جو انھیں نہ معلوم ہوا ہو کہ جناب فاطمہؑ زہرا کو ان کے پدر بزرگوار کی میراث نہ ملی۔

ہو سکتا ہے کہ ہمارا زمانہ زکیہؑ کے اس فرمانے کے اثر کا پورا اندازہ نہ کر سکے کہ میں ہمیشہ بددعا دوں گی لیکن ان پر اثر کا خیال کرو جنھوں نے رسولؐ کے زبان سے سنا تھا کہ: "فاطمہؑ کی خوشی میری خوشی اور اس کی ناخوشی میری ناخوشی ہے جس نے اسے رنجیدہ کیا اس نے مجھے رنجیدہ کیا"۔ جواب یہ سنتے ہوں گے کہ بنت رسولؐ کو ناخوش کرنے کے بعد لفظوں سے تسکین دینے کی کوشش کی گئی اور انھوں نے نہ جواب سلام دیا، اور نہ دیوار کی طرف سے مُنہ پھیرا۔

تاکید جس سے تنفر سمجھ میں آتا ہے

قصہ کو یہیں ختم ہونا تھا بلکہ غم اس سے زیادہ تھا جسے زکیہؑ کا جسم اقدس برداشت کر سکتا۔ علیل ہوئیں اور لوگوں سے تنفر اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے خبرِ علالت چھپانے کی تاکید کی۔ ہم تمھاری ہمدردی اور عیادت نہیں چاہتے۔ ہمیں غم کرنے دو۔ ہمیں مرنے دو۔ ہماری لاش کے قریب نہ آؤ۔

عیادتؑ کرنے والی عورتیں کیا سنتی ہیں اور اس کا اثر

علالت بڑھ گئی، مہاجر و انصار کی عورتیں کسی طرح قریب پہنچ گئیں لیکن یہ سننے کے لیے کہ: "بیزار ہوں تمھارے مردوں سے میں نے ترک کیا انھیں قبل اس کے کہ ان کی آزمائش کروں اور بیزار ہوئی میں ان سے بعد امتحان کے اور دریافت اور مشاہدہ کرنے ان کی خصلتوں کے"۔ اس لیے آئیں کہ عیادت کے رسمی الفاظ مُنہ میں گم ہو جائیں اور اپنے مردوں کے "اضطرابِ رائے" کی ملامت سنیں۔ اور اس پر غور کریں کہ

خلافت ان لوگوں سے دور ڈال دی گئی جو کوہ پائے استوار رسالت اور اساس نبوت ہیں، اور یہ موقع ضائع کیا کہ سہولت سے راہِ حق میں لے جائے جاتے اور یہ سب دشمنی اس لیے کہ علیؑ سے جہاد کا انتقام لیا گیا۔

مردوں میں شرم کا ہیجان

شرم اور غیرت میں ڈوبی ہوئی عورتیں اپنے مردوں کے پاس پہنچیں اور وہ سب باتیں بیان کیں۔ مجھے یہ کہہ دینا ہے کہ سننے اور بیان کرنے والیاں سیلاب خصال عرب کی مائیں تھیں جس کی حمیت اور غیرت مشہور ہے۔ جنھوں نے اپنی آنکھ اور کان سے گزرتی ہوئی یادگار رسولؐ کو یہ حزن انگیز باتیں بیان کرتے سنا تھا جسے اب انھوں نے اپنے گھروں میں دہرایا۔ اثر کو سوچو اور فوری نتیجہ یہ دیکھو کہ لوگ بنت رسولؐ کے درِ دولت پر کھڑے ہوئے عذر کر رہے ہیں کہ: "اے سیدۃ النساء! اگر ابوالحسنؑ ہم سے ذکر کرتے اس امر کو قبل استوار کرنے ہمارے عہد کے تو ہم عدول نہ کرتے"۔ اور جواب یہ سنتے کہ: "مجھ سے دست بردار ہو اور اپنے کو مجھ سے باز رکھو کہ تمھارا عذر قبول نہیں ہے"۔ یہاں تک کہ چند ہی روز کے بعد سنتے کہ بتول عذرا خاک میں چھپادی گئیں۔ اور ہر شخص یہ کہتا اور ایک دوسرے پر تاسف کرتا کہ: "رسولؐ نے صرف ایک دختر چھوڑی تھی۔ حیف ہے کہ وہ رحلت کرے اور دفن ہو اور ہم لوگ نہ وقت وفات حاضر ہوں نہ نماز پڑھیں اور نہ دفن میں شریک ہوں!"۔

جناب امیرؑ کس موقع کو کام میں نہیں لائے اور کیوں

قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ یہ باتیں بغیر گہری لکیر ڈالے ہوئے گزر گئی ہوں۔ علیؑ کی ذات نے اپنی روش سے اگر اہل بیت رسولؐ کی ذات، قابلیت، خدمت اور حق کی طرف بہکی ہوئی توجہ کو کھینچا تو جناب فاطمہؑ بیٹی رسولؐ کے خون نے لوگوں میں رحم، ہمدردی اور جوش پیدا کیا۔ کیا ہوتا اگر جناب امیرؑ اس وقت تلوار سے استغاثہ کرتے۔ لیکن جناب امیرؑ اس سے بالاتر تھے کہ وہ ان چیزوں کو حصول اختیار کے لیے مدد کو بلاتے۔ کافی تھا ان کے لیے کہ وہ اپنی جگہ چھوڑ دیے جائیں اور کسی کے فعل کے ذمہ دار نہ ہوں۔ انھیں ترتیب قرآن کی فرصت ملے۔ اگرچہ عالم کی بدنصیبی سے ایسے موقع پیش ہوں کہ باوجود اس علم کے کہ جناب امیرؑ نے قرآن جمع کیا ہے، لوگ اس سے اپنے کو مستغنی سمجھیں۔ اور آئندہ کوئی معترض یہ کہہ سکے کہ قرآن من حیث الترتیب قابل اعتراض ہے۔ بغیر یہ جانے ہوئے کہ موجودہ قرآن کی ترتیب کا کون ذمہ دار تھا۔

فاطمہؑ کی رحلت اس تسکین کا عدم تھا جس سے ہجوم غم میں راحت تھی

علیؑ کا وہ یادگار موقع تم بھولے نہ ہوگے کہ وہ ایک دفعہ کے مقرر سے کسی انصار کے باغ میں فرماتے ہیں کہ تو نے اس چیز میں حرکت دے دی جو ساکن تھی۔ اور سوتے ہوئے خیال کو جگا دیا۔ آج وہ خوشگوار دردنہ تھا کہ جناب رسالت مآب زوجیت کا افتخار عطا فرمائیں آج یہ دھڑکن تھی کہ رسولؐ کی یادگار نشانی خاک کے سپرد ہوا چاہتی ہے۔ ان تمام روح فرسا صدموں میں جس تنہا ذات سے تسکین ہے وہ بھی رخصت ہو رہی ہے۔ یہ علیؑ کی حالت ہے کہ عبا پھینک دی، عمامہ اتار دیا، اور بند قبا کھولنے لگے! سرہانے بیٹھ کر رخصت ہونے والی کی آنکھ میں آنسو دیکھے۔ وجہ پوچھی اور جواب ملا کہ: "ان ظلموں پر روتی ہوں جو تم پر میرے بعد ہوں گے"۔ میرا تصفیہ ہے کہ اس صبر شکن فقرہ کے سننے کے بعد علیؑ میں ضبط اور صبر نہیں رہ سکتا تھا۔ محبت کرنے والا اس وقت

کے لیے رو لیتا ہے جب وہ نہ ہوگا۔ محبت دم توڑتی تھی۔ محبت کی تصویر آنکھوں کے سامنے مٹ رہی تھی۔

دار النبوتؐ دار الحزنؑ تھا

کوئی گھر آج کے دن دار النبوت سے زیادہ محزون نہ تھا۔ جہاں سات آٹھ برس کے دو بچے جو ابھی ابھی دو ڈھائی مہینہ قبل نانا کو رو چکے ہیں، آج ماں کو رو رہے ہیں۔ رخصت ہوتی ہوئی ماں کو اس سے تسکین نہیں ہے کہ کون میرے بچوں کی خبرگیری کرے گا۔ جن میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں، زینب اور ام کلثوم بھی ہیں۔ وہ افسوسناک وقت آیا کہ جناب امیرؑ سر خاک پر رکھ دیتے۔ بچے آخری مرتبہ ماں کو چومتے اور سینہ پر لوٹتے اور اسماء بنت عمیس آخری مرتبہ "الصلوٰۃ یا بنت رسول اللہ" کہتی۔ علیؑ واقعہ خیالی کر رہے تھے۔ جہاں فرماتے تھے کہ: یا رسول اللہ! آپ کی دختر پاکیزہ گہر کے انتقال سے میرا صبر کم ہو گیا۔ علیؑ فرما رہے تھے۔ اور یہ ان کا صبر تھا جو کم ہو رہا تھا!

فاطمہؑ کی رحلت کے بعد علی کو کن باتوں کا سامنا تھا

تمھیں یہ فقرہ یاد ہوگا جو حکومت کی زبان سے ادا ہوا تھا کہ: "جب تک فاطمہؑ ان کے پہلو میں ہیں ہم کبھی انھیں (علیؑ کو) مجبور نہ کریں گے"۔ یعنی گزشتہ تمام صدموں کے علاوہ جناب امیرؑ کو اب اس تردد کا سامنا تھا کہ بقول صواعق: "عزو جائے کہ بواسطہ حیات حضرت خیر النساء بود در مردمان بود"۔ اب اس منزلت کا وسیلہ نہ رہا جس کا علیؑ کے پاس نہ رہنا یہ معنی رکھتا تھا کہ حکومت کو اب وہ "وقت ملا" کہ اپنے طرز عمل سے علیؑ کے وقار کو عامہ ناس کے دلوں سے زائل کرنے کی کوشش کرسکے۔

بابؑ سوم

رسولؐ اور اہلِ بیتؑ کے نام و حقوق وغیرہ کے زائل کرنے کی کوششیں (غفلت)

رسولؐ کے بعد دَورِ حکومت میں توجہ کے قابل نام

میں نے ابھی اس امر پر توجہ نہیں دلائی کہ حکومت کے نئے دور میں کون سے عمال توجہ کے قابل ہیں۔ مجھے صرف انھیں سے تعلق ہے جو گزشتہ زمانہ میں اپنے کسی خاص میلان یا آئندہ زمانہ میں ایسی ہی حالت کے لیے مخصوص ہونے ہوں۔ یہ کہا گیا ہے کہ زیاد بن لبید وہ شخص تھا جس نے نہ صرف ابن ابوقحافہ کی تائید کی بلکہ حضرموت میں شورش کی تحریک کا بھی باعث ہوا، اور آئندہ جو لوگ قبیلہ کندہ سے لڑنے کے لیے بھیجے گئے وہ عکرمہ بن ابی جہل اور مہاجر بن امیہ تھے۔ عموماً مانعین زکوٰۃ کی قسمت خالد بن ولید کے سپرد کی گئی۔ عمرو بن العاص قضاعہ سے لڑنے بھیجے گئے اور کچھ دنوں کے بعد فلسطین ان کا مرکز ہو گیا۔

آگے چل کر شام کی فوج کشی میں نہ صرف متذکرہ صدر لوگ دکھائی دیں گے بلکہ ابوعبیدہ بن جراح، یزید بن ابوسفیان، خود ابوسفیان، شرجبیل، ذوالکلاع اور ولید بن عقبہ بھی دکھائی دیں گے اور معاویہ بن ابوسفیان اپنے بھائی یزید کی مدد کو بھیجا جائے گا۔ دیوانی کے عہدوں میں ابوعبیدہ بیت المال پر، ابن الخطاب قضاء پر مامور دکھائی دیں گے۔ اور خولان پر یعلیٰ بن امیہ، زبید اور زمعہ پر ابوموسیٰ اشعری عامل ہوں گے۔

پہلی خلافت میں حضرتؓ عمر کا رسوخ

پہلے دَورِ خلافت سے ابن الخطاب کے تعلقات سمجھنے میں اس سے لطف حاصل ہوگا کہ زبرقان اور اقرع جس وقت بحرین کے لیے خلیفہ سے ایک عہدنامہ لکھوا کر ابن الخطاب کی دستخط سے تصدیق چاہتے تھے انھوں نے اس عہدنامہ کو چاک کر ڈالا۔ اس معاملہ میں طلحہ بن عبداللہ درمیانی آدمی تھے۔ بقول ابن خلدون: "طلحہ کو بے حد برافروختگی پیدا ہوئی۔ ابوبکر کے پاس آئے اور کہا: "انت الامیر ام عمر؟"۔ یعنی: "تو امیر ہے یا عمر؟"۔ ابوبکر نے جواب دیا: "عمر غیر ان الطاعۃ لی"۔ یعنی: "عمر امیر ہے، مگر فرمانبرداری میری ہے"۔

نام لینے سے مؤلف کی غرض

عمالوں اور عہدہ داروں کے نام لینے سے میری غرض یہ نہیں ہے کہ خلیفہ نے ان لوگوں کو ذمہ دار عہدوں پر مقرر کیا جنھوں نے انھیں مدد دی تھی۔ اور آئندہ سنبھالنے کی امید ہو سکتی تھی، بلکہ میں ان لوگوں کے نام کے ان عناصر کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو ایک زمانہ تک رسولؐ خدا سے مسلسل جنگ کے لیے ابھارے رہے۔ نہ میں اس کہنے سے یہ جتلانا چاہتا ہوں کہ مجھے ان کے مسلمان ہو جانے سے کوئی شکایت ہے اور میں ان کے اس گزشتہ کافرانہ تعدی پر طنز کر رہا ہوں، یا انھیں اس جرم کا

مستوجب قرار دے رہا ہوں۔ جسے اقرار اسلام نے دھو دیا۔ بلکہ میں اس سے یہ سمجھنا چاہتا ہوں کہ آیا یہ سوچنے کی گنجائش ہے یا نہیں کہ اگرچہ یہ لوگ بادی النظر میں اصولاً مسلمان ہو گئے مگر ان میں عرب کا انتقامی عنصر بھی بجھ گیا یا نہیں، جس کی واضح مثالیں آئیں گی۔

انتقامی خاصیت کس پر برانگیختہ ہو سکتی تھی

صورتِ معاملہ اس سے اور پُرپیچ ہو جاتی ہے کہ یہ انتقام یا رسولؐ کی ذات سے مخصوص ہو سکتا تھا یا اس سے جس نے سرداران قریش کو معرکہ ہائے جنگ میں قتل کیا۔ رسولؐ سے کوئی منتقمانہ اقدام اور علیؑ سے رسولؐ کے زمانہ میں ایسا ہی اقدام قریب قریب ناممکن تھا لیکن اب حالت یہ پہنچی تھی کہ وہ خلافت کے لحاظ سے خلیفہ کا رقیب تھا وہی ان کے انتقام کا مرکز تھا جو اگرچہ خلیفہ نہ تھے مگر خلیفہ کے مویدین تھے یا ہو گئے تھے، یا بنائے گئے تھے۔

انتقامی عداوت میں ایک مدد

کہا جا سکتا ہے کہ ان عمال کی تقرری اس لیے نہ تھی کہ وہ کوئی نئی تحریک مخالفت کریں یا پرانی عداوتوں کو زندہ کریں۔ ہوگا۔ مجھے تو صرف اس فطری میلان طبیعت سے بحث ہے جو ایسے مواقع پر ظاہر ہوتا ہے۔ اور قدرِ مشترک پر جمع ہونا قرین مصلحت سمجھا جاتا ہے۔ امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ آپس کی ہمدرد جماعتیں اس کے علاوہ کوئی اور ترتیب صورت اختیار کرتیں جو دکھائی دے۔ جس طرح یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر علیؑ خلیفہ ہوتے تو ترتیب جماعت کے عنصر دوسرے ہوتے یا جماعت مختلف افراد سے مرکب ہوتی۔ اور نہ اس ترتیب جماعت کے بعد جو ہوئی اس کے علاوہ کوئی نتیجہ سوچا جا سکتا تھا جو نہ صرف اس وقت بلکہ اس کے کچھ پہلے سے ایک صورت اختیار کرتا جاتا تھا۔ اور اس میں پہچاننے کے قابل نشوونما ہوتا جاتا تھا۔

بنی ہاشم کے مخالف خادمان کے خریدنے، بلکہ قوت دیے جانے کے معنی

اگر افعال سے غرض بھی جا سکتی ہے تو غالباً ابوسفیان کی مثال کافی ہے کہ وہ شخص جو دوسرے فریق کو قوت وار مدد دینے پر آمادہ تھا۔ وہ اور اس کے لڑکے اس لیے خرید لیے گئے کہ نہ انھیں مخالف آمولات کے سوچنے کی مہلت ہو اور نہ وہ آئندہ ہمارے خلاف ہمارے رقیب سے سلسلہ کلام جاری رکھیں۔ اس طرح امیہ کے خاندان کو جو بنی ہاشم کا مخالف تھا وہ بنیاد مل رہی تھی جس پر آئندہ اپنے کو مضبوط کرے۔

بنی امیہ حکومت کے مشکور خادم نہ ہو سکتے تھے

یعنی بنی امیہ کا موقع اس وقت یا اس کے بعد بنی ہاشم سے تو بالکل ہی آزاد اور دنیاوی حیثیت سے زیادہ قوت دار ہو گیا۔ بلکہ اس خیال نے کہ حکومت نے بھی ہمیں اپنا مددگار سمجھا یا بنایا انھیں حکومت کا کوئی مشکور خادم نہ بنایا۔ اور انھوں نے آئندہ اپنے لیے میدان صاف دیکھا۔

علیؑ کی غیر مخالفانہ روش نے کس درجہ مفید اثر کیا

اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ علیؑ کی غیر مخالفانہ مصلحت کس درجہ مفید تھی۔ علیؑ نے اپنے روش سے نہ صرف حکومت کے جوش مخالفت کو فرو کر دیا بلکہ اسے اطمینان ہو گیا کہ وہ بجز اس کے کچھ نہیں چاہتے کہ

ہم سے بیعت کرا کے ہمیں اس امر کا حلیف نہ قرار دو کہ ہم تمہارے افعال کے ذمہ دار اور شریک ہوں۔ بیعت نہ کرنے کے اعلان کا جو اخلاقی فائدہ تھا غیر مخالفانہ روش اس کا دوسرا انعام تھا۔ یعنی وہ لوگ بھی جو حکومت کے خوف سے علیؑ سے قطع تعلق کر دیتے اب حکومت کا جوش مخالفت نہ دیکھ کر سلسلہ ارتباط قائم کرنے میں متوحش نہ ہو سکتے تھے۔ یہ حالت علیؑ کے موافق جماعت تیار کرنے میں ایک بڑی وجہ ہوئی جو آئندہ موقع پر ٹکراؤ دکھائی دے گی۔

جمادی الثانی ۱۳ھ

ان واقعات کے تذکرہ میں اب ہم ۱۳ھ کے ماہ جمادی الثانی تک پہنچ جاتے ہیں۔ جس میں ہمارے ہیرو کی عمر دو مہینہ کم نو برس کی ہوئی ہے۔ وقت یہ ہے کہ خلیفہ علیل ہے، اور اپنا جانشین مقرر کیا چاہتا ہے۔ اور مؤرخین تالیاں بجا رہے ہیں کہ کیا انتظام کیا ہے۔

خلیفہ ثانی کے طریقہ انتخاب کے متعلق ایک سوال یا خلیفہ سازی کی دوسری صورت تصنیف ہوئی

اور کوئی مولوی شبلی صاحب کا الیسا ذی ہوش مؤلف ان فقرات کا خیر مقدم کرتا ہے کہ:

"حضرت ابوبکر صدیق کے بعد شاید بنو ہاشم کے دعوے سب سے پیش ہوتے لیکن حضرت عمر کی باضابطہ ولیعہدی نے اس کا موقع نہ دیا"۔ (الفاروق) کون ہے جس میں حافظہ اپنی صحیح حالت میں ہے اور جس نے گزشتہ جمہوریت کی جھنکار سنی ہے وہ اس "باضابطگی" کے مصنف اور تائید کرنے والے مورخ دونوں کے طرز عمل سے حیرت میں ڈوب نہ جائے گا۔ اور سوال کرے گا کہ جمہوریت کی وہ فریفتگی کہاں گئی جس نے اپنی طرز عمل کو رسولؐ کے انتخاب پر مقدم رکھا۔ ابھی کے دن ہوئے ہیں کہ سقیفہ کا میدان جمہوریت کے ادعا کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔

جمہوریت کی صورت کیا تھی

زیر بحث زمانہ اس اصول کے اندر ہی نہیں آسکتا کہ جمہور نے کسی خلیفہ کا انتخاب چاہا تھا۔ اور جمہور نے واقعی جمہوری انصاف اور طریقہ سے منتخب کیا تھا۔ دوئم یہ کہ اسی زمانہ میں اس سے روشن تر کوئی امر نہیں دکھائی دیتا کہ بعض لوگ تھے جنھوں نے کچھ لوگوں کے خیال اور عمل پر قبضہ کر لیا۔ جس کی غرض اور اخلاقی شان سے کافی بحث کی جا چکی۔ اور جب کچھ جماعت تیار ہو چکی جسے دیکھ کر جمہور مخالفت کرنا خلاف مصلحت سمجھتے تھے تو اسے عام اجماع قرار دے لیا گیا۔ یہ صورت حقیقت میں خاموش رہنے والوں کی تعریف ہے نہ ان کی جنھوں نے جماعت سازی سے امن شکنی کا سامان مہیا کیا۔

اصول میں ترمیم ہوگئی

مجھے تو اس وقت صرف ان مؤرخین اور حضرات کی خاموشی سے شکایت ہے جنھوں نے یہ اصول قرار دے لیا تھا کہ حالت مرض میں مریض کو وصیت کرنے دینا اسے "تنگ" کرنا تھا یا "تکلیف دینی تھی"۔ لیکن اب تو یہ اصول قابل عمل تھا کہ: "مستغنی بودی ازیں باز خواست چون کار برادِ ماست"۔ یعنی: "اس کی حاجت نہ تھی مگر چونکہ ہماری مراد کے مطابق کام تھا پسند کر لیا"۔

بیماری میں تفویض اختیار

واقعات یہ ہیں کہ جب خلیفہ علیل ہو گئے تو بقول ابوالفدا انھوں نے: "حضرت عمر کو حکم دیا کہ وہ نماز پڑھا دیا کریں اور خلافت بھی ان کے سپرد کی تھی"۔ طبری میں ہے کہ: اندران بیماری ابوبکر رضی اللہ عنہ ہمہ روز در غم کار مسلمانان بود کہ از پس خویش کرا خلیفہ کند پس دلش بر عمر رضی اللہ عنہ قرار یافت"۔ یعنی: "اس بیماری کے اندر ابوبکر ہر روز مسلمانوں کے کام کے غم میں تھے کہ اپنے بعد کسے

خلیفہ بنائیں۔ پھر ان کا دل عمر پر قرار پکڑ گیا"۔

عمر کے مُتعلّق رائے لی جاتی ہے

اسی مؤرخ کے موافق: "خلیفہ نے عبدالرحمٰن بن عوف اور عثمان بن عفان سے ابن الخطاب کے متعلق صلاح کی۔ ابن عوف نے ابن الخطاب کو "درشت اور تنگ دل" کہا۔ خلیفہ نے ان لوگوں سے یہ بھی تاکید کی کہ کسی سے کہنا نہیں۔

بصیغہ راز صلاح

ترجمہ ابن خلدون کے نوٹ میں ابن اثیر سے نقل کیا ہے کہ: "خلیفہ نے عبدالرحمٰن بن عوف سے صلاح لی اور ابن عفان سے پوچھا جس میں آخر الذکر نے کہا کہ: "عمر کا باطن ظاہر سے اچھا ہے"۔ ابوبکر نے یہ سن کر دونوں آدمیوں سے اخفاء راز کو کہا۔ اسی اثناء میں طلحہ بن عبداللہ آگئے۔ ابوبکر نے ان سے کہا کہ میں نے لوگوں پر عمر کو اپنا خلیفہ کیا۔ طلحہ نے جواب دیا کہ: عنقریب تم اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنے والے ہو۔ تم سے اللہ پوچھے گا کہ تم نے رعیت کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ ابوبکر نے کہا: مجھ کو اٹھا کر بٹھاؤ۔ جب لوگوں نے ان کو اٹھا کر بٹھایا تو یہ جواب دیا کہ: "میں جب اپنے رب کے سامنے جاؤں گا اور وہ مجھ سے دریافت کرے گا تو میں کہہ دوں گا کہ تیری مخلوق پر میں نے تیری بہترین مخلوق کو مقرر کیا ہے۔ طلحہ یہ سن کر خاموش ہو رہے"۔

خلافت کے مُتعلّق لوگوں کی رائے لینے کے قبل اپنا اظہار رائے

بعد ازاں عثمان کو عہد نامہ لکھنے کا حکم دیا۔ ابوبکر شدتِ علالت کی وجہ سے رک رک کر بولتے جاتے تھے اور عثمان لکھتے جاتے تھے۔ جب عہد نامہ لکھا گیا تو اس کو لوگوں میں پڑھے جانے کا حکم دیا اور خود باہر آکر لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا: کیا تم لوگ راضی ہوتے ہو اس شخص پر جس کو میں نے اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ بے شک میں نے خلیفہ نہیں بنایا اپنے کسی عزیز و قریب کو۔ میں نے اپنا خلیفہ بنایا ہے تم پر عمر کو پس اس کا کہنا سنو اور اس کی اطاعت کرو"۔

ابوبکر عمر سے خلوت میں چند وصیتیں کرتے ہیں

صاحب صواعق محرقہ واقدی سے روایت کرتا ہوا ابن عوف کے یہ جواب دلاتا ہے کہ: "از حال کسیکہ از من سوال میکنی تو عالی بحال وے از من"۔ اسی کتاب میں ہے کہ: "بعد ازاں امر فرمود تا عہد نامہ را مہر کردہ بیرون برند و مردم بیعت کردند و بدان راضی شدند و ابوبکر عمر را در خلوت طلب کردہ وصیتے چند فرمود"۔ یعنی: "اس کے بعد حکم دیا کہ عہد نامہ کو مہر لگا کر باہر جائیں اور لوگوں نے بیعت کر لی اور اس پر راضی ہو گئے اور ابوبکر نے عمر کو تنہائی میں بلا کر چند وصیتیں کیں"۔

لطیفہ

اسی کتاب میں نہایت خوش مزہ یہ مضمون ہے کہ جس وقت ابوبکر لوگوں سے پوچھ رہے تھے کہ: "آیا میرے عہد پر راضی ہو؟"۔ یہ سن کر حضرت علیؑ بن ابی طالب نے فرمایا کہ: "راضی نیستم مگر آنکہ این عہد تو در حق عمر بودہ باشد"۔ اس لطیفہ کو اسی دوسری صورت سے ہم نے کہیں دیکھا ہے کہ جس وقت سربمہر لفافہ سامنے آیا تو جناب امیرؑ نے فرمایا کہ: "میں راضی ہوں اگرچہ وہ عمر ہوں"۔

ابن حجر کے موافق حضرت عمر اور ابوبکر کے وجوہات فضیلت

صواعق محرقہ میں منجملہ ان وجوہات کے جن سے ابن الخطاب کو لوگوں پر فضیلت دی گئی ہے ایک یہ ہے کہ: "انھوں نے بیعت ابوبکر میں اجتہاد کیا اور وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ابوبکر سے بیعت کی"۔ جس طرح حضرت ابوبکر کی سائر ناس پر تفضیل شجاعت کے لیے حضرت علیؑ سے یہ روایت لائی گئی ہے کہ: "از جملہ شجاعت ابوبکر قتال بود با جماعتے کہ منع زکوٰۃ کردند"۔ یعنی: "ابوبکر کی بہادری میں سے یہ تھا کہ انھوں مانعین زکوٰۃ سے جنگ کی"۔

حضرت ابوبکر اور عمر کی معاملت

یہ سوچنا کہ ابن ابوقحافہ نے ابن الخطاب کو خلیفہ کیا، میرے نزدیک کسی حد تک آخر الذکر کے ساتھ ناانصافی ہے۔ جن وجوہات سے کیوں نہ ہو میرے اثر کے موافق ابن الخطاب نے خلیفہ کی مرضی یا عدم مرضی سے اپنا موقع ایسا بنالیا تھا جو بجائے خود اگر ایک وقت میں دوسرا خلیفہ نہ کہا جاسکے تو غلطی سمجھنے میں کچھ مخالفت کا زیادہ مصرف نہیں ہے۔ اور بغیر ایک دوسرے کے درگزر کے چارہ بھی نہ تھا۔

خلیفہ اول نے جو کچھ خلیفہ ثانی کے متعلق کیا اس کی پیشین گوئی نہایت آسان تھی

خلیفہ کے ہوتے ہوئے ابن الخطاب کا آزادانہ نفاذ اختیار اس مثال سے مؤید ہے کہ انھوں نے ایک ایسے عہدنامہ کو جس کی حکومت کی زبان نے تصدیق کی تھی بے وقعتی کے تابع کردیا۔ جس نے یہ سوال پیدا کرایا کہ ابوبکر خلیفہ ہیں یا عمر۔ اور حکومت کو بجز اس تاویل کے کوئی چارہ نہ ہوا کہ اسے اپنے سر اوڑھ لے۔ اگرچہ وعدہ کا اعتبار نقض خوردہ کیوں نہ ہوتا ہو۔ حضرت ابوبکر نے جو کچھ ابن خطاب کے ساتھ کیا وہ ایسا نہ تھا جو امید کے باہر ہو۔ جب کہ عامہ انصار کو وزارت کی تسکین دلائی جاسکتی تھی تو اس کے متعلق تو امید کہیں ٹھوکر کھا ہی نہیں سکتی تھی جس نے میدان جیت دیا ہو۔ پھر بھی میں انھیں ابوبکر کے سب سے بڑے بے غرض دوستوں میں شمار کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوں۔ میرے نزدیک یہ اشتراک منفعت تھی یا موزنی قوت۔ نہ مجھے یقین ہے کہ اگر بنی ہاشم کا علیحدہ رکھنا قدر مشترک نہ ہوتا تو صورت معاملہ آپس میں اس کے علاوہ نہ ہوتی۔

مؤلف کچھ ڈھونڈتا ہے

یہ جانتیں ادائے شکر گزاری اور جزائی احسان میں یہ کراسکتی تھیں کہ کسی معترض کے جواب دینے کے لیے بستر بیماری سے اٹھ بیٹھتے۔ لیکن صرف یہی نہیں تھا۔ جواب دینے کی یہ سبقت اور آمادگی کی شرح کسی ایسے امر میں مخفی ہے جسے میں نہیں جانتا۔ میں غالباً غلطی نہیں کرتا جہاں میں بے تابانہ انداز کے پیچھے کچھ ڈھونڈتا ہوں۔

تدبیری حجاب کیوں تھا

نہ میرے لیے اس کا تصفیہ ممکن ہے کہ ابن ابوقحافہ کے نزدیک ابن الخطاب بہترین خلق ہونے کا کیا معیار تھا۔ شاید یہ ہو کہ وہ ان کی خلافت کے پہلے صدیق تھے۔ دوسری بات اس تقرری کے متعلق یہ ہے کہ اگر ابن ابی قحافہ کو اپنے انتخاب کر لینے پر ایسا ہی وثوق تھا۔ اور وہ اس پر بھی

آمادہ تھے کہ اگر خدا پوچھے گا تو ہم جواب دے لیں گے تو پھر انھیں اس تدبیری حجاب کی کیا ضرورت تھی کہ انھوں نے اپنی ذات اور اس کے منصب کی مدد سے لوگوں کا اقرار حاصل کیا۔ انھیں کیا خوف تھا جو انھوں نے لوگوں کے اقرار پر اپنے منتخب کے نام کو مقدم نہ رکھا۔ اور کیوں اہل حل وعقد کی رائے کی ایسی بے وقعتی کی کہ انھیں آزادی سے بحث کرنے کا موقع نہ دیا، بلکہ اپنے انتخاب کو قبول کر لینے کے لیے پیش کیا۔

طلحہ کا تنہا چپ کرانا بمقابلہ عامہ ناس کے آسان تھا

شبہ کے راستے صاف ہیں کہ کہیں عامہ ناس بھی طلحہ کی زبان میں نہ کہیں کہ: "عنقریب تم اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنے والے ہو تم سے اللہ پوچھے گا کہ تم نے رعیت کے ساتھ کیا معاملہ کیا"۔ اکیلے طلحہ چپ کرائے جاسکتے تھے، عامہ ناس کو چپ کرانا مشکل ہو جاتا۔ اور یہی وجہ تھی کہ ابن عوف اور ابن عثمان کو راز کے اخفا کی تاکید کی تھی کہ کہیں افشاء اقرار کی راہ میں حائل نہ ہو جائے۔ خود ان لوگوں کا جواب بے تکلف نہ تھا بلکہ یہ بجائے اپنے خود خلیفہ کو ذمہ دار بنا رہے تھے۔ ایک صاحب اختیار کے سامنے ان کی یہ احتیاط ویسی ہی تھی جیسی عامہ ناس میں پائی جاتی ہے، تاہم ان کا یہ کہنا کہ "ان کا باطن ظاہر سے اچھا ہے"۔ باطن کی تعریف ہو یا نہ ہو لیکن ظاہر کی کوئی دلفریب نمائش نہیں ہے۔

ایک فطری سوال اور اس کا حل

ان واقعات کے پڑھنے کے بعد فطری سوال جو ہر شخص کے دل میں پیدا ہوگا وہ یہ ہے کہ ابن ابو قحافہ کو دو برس کی حکومت سے مسلمانوں کی اس درجہ فکر ہو کہ وہ بغیر اس کے کہ ایک شخص کو حکومت کا عنان گیر قرار دیں اور اس کے لیے تمام پختگی کر جائیں دنیا سے نہ گزریں اور رسولؐ جنھوں نے بہت سے ایسے لوگ بنا دیے وہ اپنے بعد کے لیے امت کی عنان گیری کو بھیڑیے کی ہوا کے سپرد کر جائیں۔ ابوبکر ایسے شخص کو اپنا جانشین بنائیں جس نے ان کے حق کا بقول مؤرخین امامتِ مسجد یا سقیفہ میں لحاظ کیا، اور رسولؐ باوجود ایسے شخص کے ہوتے ہوئے جو اپنی شہ رگ کو رسولؐ کی حیات کا پیش خیمہ کیے رہا اسے بھول جائیں؟

مؤلف نبی بدلنے کے لیے تیار ہے

اگر ایسا تھا کہ نبی عربی سے ابن ابو قحافہ میں بہبودی عامہ اور شکر گزاری یا احسان شناسی کا مادہ زیادہ تھا تو ہم اپنا نبی بدل دینے کے لیے تیار ہیں۔ خلافت کیا چیز ہے۔ ہم صفت کے قدر دان ہیں محض ذات کوئی چیز نہیں ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ یہ حالت قصہ قرطاس کو حل کر دیتی ہے۔

جنابِ امیرؑ انتخاب اور منتخب کے زمانہ کے متعلق

خطبہ شقشقیہ اس نئے انتخاب کے متعلق حسبِ ذیل عکس ڈالتا ہے۔

"یہاں تک کہ اول تو اپنے راستہ پر گزر گیا مگر اپنے بعد خلافت کے ڈول کو ابن الخطاب کے کنوئیں کی طرف پھینک گیا ...... مگر مجھے تو تعجب اور سخت تعجب ہے کہ وہ جانے والا اپنی حیات میں بیعت خلافت کے توڑ دینے کا حکم دیتا تھا، وہ اقالہ طلب کیا کرتا تھا مگر باوجود اس قول کے اپنے مرنے کے بعد دوسرے کے ساتھ خلافت کو منعقد کر دیا اور واقعی امر یہ

ہے کہ پستانِ ناقہ خلافت کو دونوں نے آپس میں خوب بانٹ لیا۔ افسوس خلافت کو ایک درشت مزاج اور تند خو کے حوالہ کر دیا۔ جس کی زبان کے زخم نہایت سخت اور کاری تھے اور جس کا چھونا بھی ناگوار تھا۔ جس کی گفتار و کردار دونوں ناہموار تھیں۔ اس کی طبیعت میں سخت لغزشیں تھیں۔ وہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا تھا اور پھر اپنی لغزشوں پر عذر خواہ بھی ہو جاتا تھا۔ ایسی طبیعت والے کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہے جو کبھی بوجھ نہ اٹھانے والے اونٹ پر سوار ہو، اگر یہ سوار اس کی مہار کھینچتا ہے تو اس کی ناک پارہ پارہ ہوتی ہے اور اگر چھوڑتا ہے تو خود گرنے کا خوف ہے۔ حیات خداوندی کی قسم ہے کہ لوگ اس کی سبب سے خبط میں مبتلا ہو گئے۔ ہر اہل و نااہل دینی و دنیوی امور میں رائے زنی کرنے لگا۔ متلون مزاجیاں دامن گیر ہو گئیں، اعتراضوں کی بوچھاڑ ہونے لگی"۔

خالد کا عزل اور ابو عُبیدہؓ کا نصب

خلیفہ اول کے زمانہ میں چونکہ امورات انتظامی کی ابتدا، یا انتہا کچھ ایسی بڑی نہ تھی اس لیے اس وقت تک اس اصول پر عمل ہو سکتا تھا کہ ملکی اور فوجی عہدے اپنے خاص خاص لوگوں کے سپرد کیے جائیں۔ خلیفہ ثانی کے زمانہ میں فتوحات کی وسعت نے اس اصول کو سالم رہنے نہ دیا۔ بلکہ اس کی مجبوری ہوئی کہ وہ بہت سے لوگوں کو اپنے اعتبار میں داخل کریں۔ تاہم انھوں نے تغیر عمال میں سب سے زیادہ جو مشہور بات کی وہ یہ تھی کہ خالد بن ولید کو معزول کر کے ابوعُبیدہ بن جراح کو شام کے لشکر کا سردار بنایا۔ بقول ابن خلدون حضرت عمر کا یہ فقرہ توجہ کے قابل ہے کہ: "اللہ ابوبکر پر رحم کرے، انھوں نے خالد کے امارت کی پردہ پوشی کر دی"۔ اور پھر آگے آنے والے زمانہ میں جب کہ خالد کی سپاہیانہ کارگزاریاں سنیں تو یہ بھی کہا کہ: "میں خالد کو اس کے نفس کا سردار مقرر کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ابوبکر پر رحم کرے وہ مجھ سے زیادہ لوگوں کو جانتے تھے"۔ خلیفہ ثانی کے ان دونوں فقرات کے تضاد پر خیال کرنے کے بعد ان کی طینت کے متعلق جناب امیرؑ کا یہ ریمارک سمجھ میں آتا ہے، جہاں آپ فرماتے ہیں کہ: "وہ اپنی لغزشوں پر عذر خواہ بھی ہو جاتے تھے"۔ حضرت عمر کا اس شخص سے ناخوش ہونا جس نے احد میں انھیں پہاڑ کی طرف جاتے دیکھا تھا، اگر محض اخلاقی وجوہات سے تھا تو پھر باوجود اس کے خالد یعنی مسلمانوں کے سپہ سالار کو "اپنے نفس کا سردار" بنا لینا اخلاقی پسند کو ضروریات ملکی کا تابع کر دینا تھا۔ نتیجہ سوچنے کا ہر شخص کو اختیار ہے۔ ان کا دورِ حکومت بمقابلہ پیشتر کے اگرچہ اعتبار کی وسعت کے لحاظ سے ممتاز تھا مگر ان کے زمانہ میں ایک نئی مصلحت کی بھی ابتدا ہوئی اور وہ یہ تھی کہ عربوں کو بمقابلہ دیگر ملک کے مسلمانوں کے زیادہ حقوق حاصل تھے۔ یہ نہ صرف اصول جمہوریت کے منافی تھا بلکہ اخوت اور مساوات اسلامی کے قوت دار بڑے اصول کو شکست کر دیتا تھا، جو رنگ اور قوم کا امتیاز درمیان سے اٹھا دیتا تھا۔

صاحب سیرۃ الفاروق کے موافق انھوں نے خلافت کے خطبہ میں کہا کہ: "قوم عرب چھدے ہوئے ناک والے اونٹوں کی قطار کے مانند ہے۔ جس کی نکیل میرے ہاتھ میں دی گئی ہے"۔ یا عمرو بن عاص سے کہا کہ: اگر قریش کی جماعت تنہا ایک غار میں گھسے گی تو اعرابی وہاں بھی ان کی پیروی کریں گے اور پیچھے چلیں گے۔ وہ ایک کم حیثیت بھیڑ ہے"۔ حضرت عمر کا یہ فقرہ شاید بجائے میری کتاب کے ناظر کے مصنف صواعق محرقہ کی زیادہ توجہ کے قابل ہوگا، جنھوں نے جمہور کی رائے میں عصمت پیدا ہونے پر شدید زور دیا ہے۔

خلیفہ ثانی کا خطبہ اور حسینؑ

صاحب تاریخ الخلفاء نے ایک واقعہ لکھا ہے جو اگرچہ زمانہ خلیفہ ثانی کا ہے لیکن اس کا ٹھیک سنہ نہیں بتایا۔ واقعہ یہ ہے جسے ابن عساکر ابوالبختری اور وہب بن وہب مدنی سے نقل کرتے ہیں کہ ایک روز خلیفہ ثانی وعظ کہہ رہے تھے اور حسینؑ مع اپنے پدر عالی مقام کے تشریف رکھتے تھے کہ آپ نے واعظ کو مخاطب کر کے فرمایا: "اترو میرے باپ کے منبر سے"۔ واعظ نے یہ سن کر جواب دیا: "ہاں یہ تمہارے باپ کا منبر ہے میرا نہیں ہے"۔ علیؑ نے چشم نمائی کی۔

خان بہادر شیخ احمد حسین صاحب اپنے قابل قدر رسالہ "البلاء المبین" میں ابن عساکر وغیرہ کے اسناد سے تحریر فرماتے ہیں کہ: "امام حسینؑ سے روایت ہے کہ عمر بن خطاب منبر پر تھے، میں بھی چڑھ گیا اور ان سے کہا کہ: "میرے باپ کے منبر سے اترو، اور اپنے باپ کے منبر پر جاؤ"۔ حضرت عمر نے کہا کہ: "میرے باپ کا تو کوئی منبر بھی نہ تھا"۔ پھر مجھے اپنے ساتھ بٹھالیا اور جب اپنی قیام گاہ کی طرف گئے تو مجھ سے دریافت کیا کہ: "یہ تم کو کس نے سکھایا تھا؟"۔ میں نے کہا کہ: "کسی نے نہیں سکھایا"۔

۱۵ھ ترتیبِ دیوان

ہجرت کا پندرھواں سال شروع ہوا اور اب چونکہ غنائم اور محاصل کی آمدنی اس قدر ہوگئی تھی کہ وظائف مقرر کیے جاسکتے۔ لہٰذا ترتیبِ دیوان کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس محکمہ میں جو بات سب سے پہلے مجھے متوجہ کرتی ہے وہ جبیر بن مطعم کا نام ہے۔

جبیرؓ بن مطعم مہتمم دیوان

تم واقعات خیبر میں پڑھ آئے ہو کہ عثمان بن عفان اور جبیر بن مطعم یہ دو شخص تھے جنھوں نے سرورِ عالم سے عذر کیا تھا کہ خمس محض بنو ہاشم کو دیا گیا۔ وہی جبیر اب محکمہ مال کا ایک افسر ہے۔ اگرچہ مخرمہ بن نوفل اور عقیل بن ابی طالبؑ کے نام بھی ماہرین حساب میں لکھے گئے ہیں۔ ہم ابھی اس پر توجہ دلائیں گے کہ اس دورِ حکومت میں قاعدہ خمس قابلِ نفاذ سمجھا گیا یا نہیں۔

رجسٹر میں عباسؓ کا نام پہلے لکھا گیا

کہا گیا ہے کہ رجسٹر میں نام کی ترتیب اس طرح ہوئی کہ پہلے بنو ہاشم، پھر ابوبکر اور پھر عمر کا قبیلہ تھا۔ بقول ابن خلدون: "عمر فاروق نے اس کو ناپسند فرمایا اور ارشاد کیا: "یوں نہیں، پہلے آنحضرت کے چچا سے شروع کرو۔ کیونکہ وہ رسولؐ سے زیادہ قریب ہیں، بعد ان کے درجہ بدرجہ قرب و بعد قرابت کے لحاظ سے ہر قبیلہ کو لکھتے چلے آؤ، اور جب میرے قبیلہ کی نوبت آئے تو مجھ کو بھی لکھو"۔ ابوالفداء بھی عم رسولؐ کو مقدم کرنے کے بعد لکھتا ہے: "پھر جو قریب تر رشتہ کا رسول اللہ سے تھا اس کے لیے بہت عطا مقرر کی"۔ بقول ابن خلدون یا مترجم: "عمر فاروق کی یہ تجویز نہایت قابل قدر و لحاظ ہے۔ کیونکہ اگر ترتیب سابق قائم رہ جاتی تو خلافت خود غرضی کا وسیلہ بن جاتی"۔ اور اس کے بعد "ازواج مطہرات کی تنخواہیں دس دس ہزار مقرر کی گئیں اور عائشہ صدیقہ کو علاوہ مقررہ تنخواہ کے دو ہزار زائد دیے گئے"۔

حسنینؑ اور وظیفہ

نوٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ "امام حسنؑ و حسینؑ و ابوذر و سلمان فارسی (رضی اللہ عنہم) کو باستثناء اپنے اہل کے اہل بدر میں شریک کر کے پانچ پانچ ہزار درہم تنخواہیں دی تھیں"۔

مُغیرہ بن شعبہ کی مصلحت دُوسری صورت میں کامیاب ہوئی

مجھے نہ ترتیب دیوان کی کسی تفصیل سے بحث ہے نہ اس کے عام اصول سے، بلکہ مجھے صرف اس قدر کہنا ہے کہ مُغیرہ بن شعبہ کی مصلحت دہرائی گئی جو ایک زمانہ میں ناکامیاب ہوئی۔ اس وقت عباس نے کوئی وظیفہ اس لیے منظور نہ کیا کہ وہ اظہارِ حق کی قیمت قرار دیا گیا تھا، جسے غالباً اب اس لیے منظور کیا کہ مُسلمانوں نے اپنی فتوحات میں ہمیں مُسلمان سمجھ کر حصہ دیا ہے اور اس کے عوض میں ہم سے کوئی عہد نہیں لیا گیا ہے۔ لیکن بلاشبہ حکومت کا سیاسی قدم آگے بڑھا جہاں اسے اب اس کا موقع ملا کہ:

بنی عباس کا سنگِ بنیاد

وہ بنی ہاشم میں سے ایک کو پسند کرکے اسے علیؑ اور مُسلمانوں کے بیچ میں کھڑا کردے۔ اور اس طرح گویا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے علیؑ اور آلِ فاطمہؑ کی طرف سے چشم پوشی سے ایک مستقل دفتر اور عملی اصول قرار دیا جائے۔ اور کون جانتا تھا کہ یہ اقدام آئندہ بنی امیہ کی بنی عباس کے ہاتھوں تباہی کا سنگِ بنیاد ہوگا۔

حضرت عائشہ کا ممتاز وظیفہ

اگر عدم مساوات کی ضرورتیں تسلیم کی جاسکتی ہیں تو پھر یہ بھی کسی طرح قابلِ عذر نہیں ہے کہ بنت ابوبکر کو تنخواہ میں حسنین پر ممتاز کیا۔ مجھے جس قدر کہنا ہے وہ یہی ہے کہ میں صرف نام کی طرف توجہ دلاؤں۔ اس کی بیٹی جس نے وصیت کی تھی اور کیا کیا نہیں معلوم۔ مجھے اس شخص سے بھی کوئی بحث نہیں ہے جو اسے خلیفہ کی انکساری سمجھتا ہو کہ انھوں نے اپنا نام سب کے آخر میں لکھوایا۔ لیکن نہ یہ بھول سکتا ہوں کہ وہ خلیفہ ہے، نہ یہ نظر انداز کرسکتا ہوں کہ اسے محکمہ مال پر تسلُّط حاصل ہے۔

حضرت عمر اپنے لیے "امیر المؤمنین" کا خطاب تجویز کرتے ہیں

ایک دُوسرا مفید قدم یہ اٹھایا گیا کہ لوگوں نے ابن الخطاب کو "خلیفہ خلیفہ رسُول" کہنا شروع کیا۔ اس پر بقول ابن خلدون: "عمر فاروق نے کہا اس طور سے رفتہ رفتہ کلام طول ہوجائے گا۔ کیونکہ جب کوئی خلیفہ ہوگا اس کو خلیفہ خلیفہ خلیفہ رسُول اللہ کہو گے، مناسب یہ ہے کہ تم لوگ مؤمنین ہو اور میں تمھارا امیر ہوں۔ تم لوگ مجھے آج سے "امیر المؤمنین" کہا کرو"۔ ابن حجر کے پاس ایک روایت یہ ہے کہ: "بعضے گفتہ اند اول کسیکہ عمر را مبتلا باین رسم کردہ مغیرہ بن شعبہ بود"۔ یعنی: "بعض نے کہا کہ عمر کو اس رسم میں مبتلا کرنے والا پہلا شخص مغیرہ بن شعبہ ہے"۔

ایک مقدمہ جس میں پیشتر کے حقوق ادا کیے گئے ہیں اور جو اس کے بعد دوستی یا دشمنی کا مقدمہ ہوا

۱۷ھ میں ام جمیل اور مغیرہ بن شعبہ کے مقدمہ کی ظرافت خیز شہادت سے مجھے بحث نہیں ہے، بلکہ اس واقعہ سے کہ جب تین گواہ گزر گئے اور خاتمہ کی چوتھی شہادت رہ گئی جس کے بعد مغیرہ کو حکم رجم دیا جاتا تو خلیفہ نے چوتھے گواہ یعنی زیاد کو دیکھ کر اس کے شہادت دینے کے قبل کہا کہ: "ایک آدمی سے مجھ کو امید ہے کہ بسبب اس کے ایک صحابی رسُول اللہ کا جان سے شاید بچ جائے"۔ اس لیے زیاد نے گواہی دی کہ ---- (ابوالفدا)

خلیفہ کے اشارہ پر عمل کرنے سے زیادہ کو جگہ ملی اور پھر میر منشی ہوا

ابن خلدون سے معلوم ہوگا کہ زیاد تقع میں رہا

اور خلیفہ نے اسے "ایک خدمت سپرد کی جس کو زیاد نے نہایت کفایت شعاری اور امانت و دیانت سے انجام دیا"۔ اور "ابوموسیٰ اشعری نے اپنے زمانہ حکومت بصرہ میں اس کو میر منشی کا عہدہ دیا"۔ مشکل سے مجھے یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ اگر خلیفہ اول خالد بن ولید کو اس لیے بچا سکتے تھے کہ وہ اچھا عامل تھا تو مغیرہ کو بچا لینے کی اس سے زیادہ فکر ہونی چاہیے تھی جو ان کے لیے مفید مصالح کا موجد تھا۔ ایسے قصے اس کے بعد بھی ملیں گے۔

معاویہ کی ۱۸ھ میں شام میں تقرری

۱۸ھ ہمارے لیے اس وجہ سے نہایت مفید ہے کہ اس میں معاویہ بن ابی سفیان دمشق کا عامل مقرر ہوا۔ عام حالت سید امیر علی صاحب کی تاریخ اسلام سے معلوم ہوگی، جہاں وہ فرماتے ہیں کہ: "دمشق کا دستہ فوج یزید بن ابوسفیان کے ماتحت بھیجا گیا، جو پہلے دشمن اسلام تھا، اور اب رسولؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے کے تلے لڑنے مرنے پر تیار تھا۔ یزید کی فوج مکہ اور تہامہ کے عربوں پر زیادہ تر مشتمل تھی اور ان میں سے بہتیرے لوگ فتح مکہ سے پہلے رسولؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لڑائی کر چکے تھے۔ لوٹ مار کی لالچ سے اب وہ یزید کی فوج میں بطور والنٹیر شامل ہو گئے۔ مکہ اور تہامہ کے عربوں اور مدینہ کے لوگوں میں سخت دشمنی تھی، جس کا نتیجہ بد نکلا سو نکلا۔۔۔ ابوسفیان کا دوسرا بیٹا معاویہ جس نے آخر خلافت کو غصب کر لیا، ریزرو فوج کا کمانڈر مقرر ہوا"۔ یزید بن ابی سفیان کے مرنے کے بعد اس کی جگہ معاویہ کو دی گئی۔

اس دور حکومت کے بعض نام جو بنی ہاشم کے مخالف تھے

اس کے علاوہ اس دور حکومت میں ابوالاعور اسلمی، حصین بن نمیر، معاویہ بن خدیج اسکونی، شرجیلی، ولید بن عقبہ وغیرہ بحیثیت افسران فوج دکھائی دیے گے۔ عمرو بن العاص مصر کا افسر اعلیٰ تھا جس کی ماتحتی میں عبداللہ بن سعد بن ابی سرح دیا گیا۔ ابوموسیٰ اشعری مکہ معظمہ کا عامل تھا۔ یعلیٰ بن امیہ یمن کا اور عمر بن سعد حمص کا حاکم تھا۔ اور سمرہ بن جندب سوق الاہواز پر حکومت کر رہا تھا۔

بعض نام جو موافق ثابت ہوئے

اسی دور میں عبداللہ بن بدیل ورقہ الخزاعی، جریر بن عبداللہ البجلی، احنف بن قیس، مالک اشترؔ، براء بن عازب، ہاشم بن عتبہ، قعقاع بن عمر وغیرہ بھی اکثر نہایت مفید فوجی عہدوں پر دکھائی دیے گے۔ یہ لوگ جناب امیرؑ کے بڑے حامی تھے اور ان میں کسی کی دوستی بہ استثنائے جریر مشتبہ نہیں ہوئی۔ یہ لوگ سپاہی تھے اور انھیں اپنے لیے کوئی کام اور راستہ نکالنا چاہیے تھا۔ ان کے سپاہیانہ حوصلوں کے لیے بلاد مختلفہ میں کام مل رہے تھے۔

۱۶ھ فتح مدائن اور حضرت شہربانوؑ

فتح مدائن جو طبری کے موافق صفر ۱۶ھ میں ہوئی، ہمارے لیے خاص دلچسپی رکھتی ہے۔ اس لیے کہ مؤرخین کے موافق فتح میں مسلمانوں کو جو چیزیں ہاتھ لگیں ان میں شہربانوؑ دختر یزدجرد بھی تھیں۔ بقول مؤلف تاریخ الاسلام: "اس کے بدن کے زیورات تقسیم کرنے کے لیے عربوں نے اُتارنا چاہے۔ وہ بے بسی میں تھی، لیکن پھر بھی بادشاہ کی لڑکی تھی۔

عربوں کا یہ ندیدہ پن اس نے نہایت مکروہ سمجھا۔ اس کے چہرہ کی رنگت غصہ سے متغیر ہو گئی۔۔۔ عمر نے اس کی مکافات یوں کی کہ مع زیورات کے اسے حضرت امام حسنؑ (غالباً کاتب کی غلطی سے بجائے حسینؑ کے حسنؑ لکھا گیا) ابن فاطمہؑ کے حوالہ کیا۔ اور اس طرح وہ جوان حسین شاہزادی شاہِ دارین کے نواسہ کی زوجیت میں آئی۔ حضرت عمر نے کہا بھی کہ: "شہزادی شہزادہ ہی کو مناسب ہے"۔

قعقاع بن عمر اور قصر ابیض کا محاصرہ

واقدی کے فتوح عجم کے ترجمہ میں ہے کہ فتح مدائن کے بعد جب مسلمان آگے بڑھے تو کچھ مرزبان قصر ابیض میں داخل ہوئے اور اسے اپنا قلعہ بنایا تو پھر مسلمانوں نے قعقاع بن عمر کی ماتحتی میں اس کا محاصرہ کیا۔ تیروں سے لڑائی ہوتی رہی۔ اور جب غالباً عرصہ ہوا تو سعد بن ابی وقاص نے سلمان فارسی کو قصر ابیض کی طرف اس لیے بھیجا کہ وہ مصالح مسلمین کے لیے کوئی تدبیر سوچیں۔ یہ گئے اور انھوں نے اہلِ قلعہ کو مخاطب کر کے کہا کہ: "تم لوگ کیوں جان دیتے ہو"۔ اور جب ایرانیوں نے انھیں دیکھا تو ان پر یہ اثر پڑا کہ یہ اکابر اہلِ اسلام سے ہیں۔ اور ان لوگوں نے کہا کہ: "ہمارے لڑنے کا یہ سبب ہے کہ ہمارا بادشاہ کسریٰ نہاوند کی طرف چلا گیا"۔

کسریٰ کی بیمار لڑکی قصر میں تھی

اور چونکہ اپنی بیمار لڑکی کو اپنے ساتھ لے جانے سے متعذر رہا اسے ہمارے سپرد کر گیا۔ ہم نے اس کی حفاظت اپنے ذمہ واجب کی ہے۔ اگر تم ہم کو اس کے لیے امان دو تو ہم اسے تمھارے سپرد کر دیں۔ سلمان نے سعد سے مشورہ کیا۔ اور مرزبانوں سے کہا گیا کہ مسلمانوں کا لشکر اطراف میں پھیلا ہوا ہے۔ یم پر کوئی قبضہ کرلے گا۔ اگر ہماری امان میں نہ آجاؤ گے۔ اس پر ان میں سے بعض نے خفیہ راستہ سے ان لوگوں کو بلالیا۔

ہاشم بن عتبہ اور کسریٰ کا تعاقب

اسی کتاب میں موسیٰ بن عبداللہ سے اس نے عمر سے اس نے اپنے دادا یحییٰ سے روایت کی ہے کہ جب کسریٰ پسپا ہوا تو ہاشم بن عتبہ نے حلوان تک تعاقب کیا۔

ہودج اور محمل

اور ایک جگہ دیکھا کہ کچھ ایرانی مسلح سپاہی بہت سی ہودج اور محمل کی محافظت کرتے ہیں۔ ان میں زنانی سواریاں تھیں۔ بہت سے خدام اور کنیزیں تھیں اور وہ سب محافہ کے گرد تھے۔ محافہ چوب رطب کا بنا تھا۔ رنگ برنگ کی پوششیں پڑی تھیں۔ اس کا تار تار زرین تھا۔ اور اس کے بیل بوٹے طلائی اور مرصع بجواہر تھے۔ ہاشم نے اپنے گروہ کے ساتھ اس پر حملہ کیا۔ ایرانی بڑے استقلال سے اپنی ملکہ کی محافظت میں لڑے۔ مسلمانوں نے آخر میں ان محافوں پر قبضہ کرلیا۔

شاہی اُسرا مدینہ بھیجے گئے

سعد بن وقاص نے جب فتح مدائن کی خبر خلیفہ کو بھیجی تو ان شاہی اسیروں کو بھی اسی کے ساتھ بشر کی نگہداشت میں روانہ کیا۔ بنت کسریٰ کے خدام اور پرستار ساتھ ساتھ تھے۔ بشر یہ چیزیں لے کر مدینہ پہنچا۔ اور خلیفہ جب تقسیم غنائم سے فارغ ہو چکے تو دربارہ بنت کسریٰ حکم کیا کہ اس کو سامنے لاؤ۔

خلیفہ نے شہربانوؑ کے جسم سے زیورات اُتار لینے کا حکم دیا

چنانچہ وہ شاہزادی روبرو جو آئی تو اس کے تن پر پوشاک نفیس اور زر و جواہر سے بہت کچھ تھا۔ تب ایک شخص کو حکم کیا کہ متاع زیور وغیرہ اس کے بدن سے اتار لے، تا اس کی قیمت میں لوگوں کے لیے اضافہ کیا جائے۔ آخر وہ شخص شاہزادی کی طرف آگے بڑھا، تا کہ وہ سب اسباب اتار لے۔

شہربانوؑ کی غیرت اور خلیفہ کا غصہ

مگر شاہزادی نے اس کو منع کیا اور اس کے سینہ پر دو ہتھڑ مارا کہ وہ باز رہے۔ یہ دیکھ کر عمر رضی اللہ عنہ غیظ و غضب میں آئے اور لوگ اس ملکہ مکرمہ پر تازیانہ بلند کیے ہوئے منتظر حکم کے تھے اور وہ روتی تھی۔

جناب امیرؑ کی وساطت نے رنگ بدل دیا

اس وقت علی علیہ السلام بولے اے امیرالمومنین مہلا یعنی غصہ نہ کرو اور افروختہ خاطر نہ ہو۔ بہ تحقیق کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ فرماتے تھے: "ارحموا عزیز قوم ذل وغنی قوم افتقر"۔ یعنی جو عزیز و رئیس قوم کہ ذلیل و خوار ہو جائے اور جو غنی و تونگر کسی قوم کا محتاج و نادار ہو جائے تو ان پر رحم کرو۔ یہ کلام سن کر طیش عمر رضی اللہ عنہ کا فرو ہو گیا۔

شہربانوؑ حسینؑ کی طرف دیکھ رہی تھیں

اور پھر جو اس شاہزادی کی طرف نگاہ کی تو دیکھا وہی مصداق بالنظر الی الحسین بن علی علیہما السلام۔ یعنی وہ خزادی گوشہ چشم سے بانظر تیز سے حسینؑ بن علی علیہما السلام کو دیکھ رہی ہے۔

اب حضرت عمر ایک قابلِ قدر حدیث بیان کرتے ہیں اور شہربانو کے حسینؑ کی طرف میلان کی وجہ بتاتے ہیں

اس وقت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ فرماتے تھے: "اتقوا فراسۃ المومن فانہ ینظر بنور اللہ"۔ یعنی فراست و فطانت مومن سے ڈرتے رہو اور ملحوظ خاطر رکھو کہ وہ بہ قوت نور خدا مشاہدہ کرتا ہے۔ چنانچہ میں جو دیکھتا ہوں تو یہ لڑکی حسینؑ بن علیؑ کو بچشم التفات اور تیز نگاہ سے تکتی ہے۔ سو مجھ پر یہ بات ثابت ہوئی کہ یہ دختر سائر مردم میں سے طرف حسینؑ کے ارادت و عقیدت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ لوگوں میں از روئے صباحت و وجاہت کے حسینؑ سے کوئی بہتر نہیں ہے"۔ بعد ازاں کہا: "اے ابا عبداللہ اس لڑکی کو لو۔ یہ میری طرف سے تمہارے لیے ہدیہ و تحفہ ہے"۔ چنانچہ علی علیہ السلام اور جو لوگ مسلمین میں سے حاضر وقت تھے وہ سب اس امر میں شکر گزار و منت پذیر عمر رضی اللہ عنہ کے ہوئے"۔ عمر بن محمد الواقدی کے سامنے مسجد اقصیٰ میں ۲۹۰ھ میں یہ روایت پڑھی گئی۔

شریف قوم کے ساتھ برتاؤ کے متعلق باوجود تخالف مذہب

صاحب بحار تحریر فرماتے ہیں کہ: "عمر نے چاہا کہ عورتوں کو بیچ ڈالیں اور مردوں کو غلامی میں دیں کہ بڈھے حاجی ان کی پیٹھ پر طواف خانہ کعبہ کریں"۔ جناب امیرؑ نے فرمایا کہ: "جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ جو شخص اپنی قوم کا بزرگ ہو اس کی بزرگی کرنا چاہیے۔ اور عزیز رکھنا چاہیے۔

اگرچہ تمھارے دین کے مخالف ہو۔ یہ قیدی صاحب ریاست و شرافت ہیں۔ انھوں نے تمھاری اطاعت کی اور اسلام کی طرف رغبت ہے۔ میں نے اپنا حق اور بنی ہاشم کا ان کی گردنوں سے ساقط کیا۔ اکثر مہاجر و انصار نے بھی بخشا۔

جنابؓ امیرؑ عورتوںؓ کی آزادیٔ رائے قائم رکھتے ہیںؓ

اب اکثر لوگوں نے عورتوں سے عقد کی خواہش کی۔ جناب امیرؑ نے فرمایا کہ اسے عورتوں کی رائے پر چھوڑ دو۔ اور جبر و اکراہ نہ کرو۔ کسی نے یزدجرد کی بیٹی کی خواہش کی، وہ خاموش ہوگئی۔

شہربانوؓ زبانؓ سے بھی حسینؑ کو پسند کرتی ہیںؓ

لوگوں نے پوچھا کہ: "اے شہربانوؓ تم اپنے خواستگاروں میں سے کسی کو چاہتی ہو کہ زوجہ اس کی بنو"۔ جناب امیرؑ نے کہا: "اس کی خاموشی عین اقرار ہے"۔ پوچھا کسے چاہتی ہو؟ کہا: "اگر مجھے اختیار ہے تو میں نے حسینؑ کو اختیار کیا"۔ جناب امیرؑ نے حذیفہ بن الیمان کو خطبہ پڑھنے کا حکم دیا، اور نکاح کر دیا۔

بحار کی ایک روایت و نیز جامع التواریخ کے موافق یہ خبر ہے کہ جناب امیرؑ نے اپنے دورِ حکومت میں حریث بن جابر حنفی کو بلادِ مشرق کی طرف بھیجا، اور یزدجرد کی تین لڑکیاں ان کے ہاتھ لگیں۔ جن میں سے ایک عبداللہ بن عمرؓ، دوسری محمد بن ابی بکر اور تیسری حسینؑ کی زوجیت میں دی گئیں۔

اس واقعہ کے زمانہ کے متعلق مجھے شبہ ہے۔ ایسی صورت میں کہ سنہ قائم ہونے کے قرائن اس کے بعد کے زمانہ کے ہیں۔ جیسا ابن خلدون سے پایا جاتا ہے کہ تعین سنہ کی ضرورت ۱۶ھ میں ہوئی اور بلحاظ اس کے کہ مختلف تواریخ میں واقعات مختلف ترتیب اور سنہ کے اختلاف سے لکھے گئے ہیں، میں سوچتا ہوں کہ فتح مدائن یا دو تین برس قبل لکھی گئی ہے یا شہربانوؓ کی اسیری کا واقعہ فتح مدائن سے متعلق نہیں ہے۔ جیسا ابن خلدون سے پایا جاتا ہے کہ: "یزدجرد نے اپنے حرم اور خاندان شاہی کو اس سے پہلے جس قدر مال و اسباب اٹھا سکتا تھا اٹھا کر روانہ کر دیا تھا"۔ بلکہ میں سوچتا ہوں کہ یہ واقعہ ۲۲ھ یا ۲۳ھ کا ہے، جب کہ مرو شاہجہان میں خود یزدجرد کے امرا نے یزدجرد کی مخالفت کر کے اس کا مال و اسباب چھین لیا اور یزدجرد بھاگا، اور امرائے لشکر نے تمام چیزیں احنف بن قیس کو دے کے صلح کر لی"۔ فتح مدائن اگر ۱۶ھ میں ہوئی تو اس وقت حضرت امام حسین علیہ السلام کا سن اقدس زیادہ سے زیادہ ۱۲ برس کا تھا، اور یہ سن غالباً عقد کے انتخاب کے لیے موزوں نہ تھا۔ اس امر پر لحاظ کرنے کے بعد بھی کہ بنی ہاشم کی آزاد و آندار اور کچھ دن قبل کی حاکم قوم کا نشو و نما جلد ہوتا تھا، سرزمین عرب بھی معین ہوتی ہے اور جناب امیرؑ جسمانی قوت میں نہایت ممتاز تھے پھر بھی مجھے حسینؑ کے بارھویں یا حد تیرھویں برس عقد کا ہونا بہت ممکن القیاس نہیں معلوم ہوتا۔ خصوصاً جب کہ عورت نے خود اپنی پسند کا اعلان کیا۔

عربؓ۔ قیدی۔ اور جنابؓ امیرؑ کی حالتیں

کون جانتا ہے کہ شہربانوؓ کو روپیہ کے شکل میں بھنا کر قیمت کے تقسیم کرنے کا ارادہ کیا گیا ہو۔ خوش نصیبی سے جناب امیرؑ وہاں موجود تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ہزاروں برس کے شخصی اصول سے متاثر بادشاہ کی بیٹی مجبور ہے کہ وہ فاتح عربوں کی فقرانہ بے لحاظی برداشت کرے۔ شہربانوؓ کی حالت کا قیاس کرنا ممکن نہیں ہے۔ اور اسی طرح اس کی شرم کے ساتھ اس کی غیرت اور نفرت کا قیاس بھی خیال کے اندر ہے کہ وہ عرب جو اس کے ذہن میں کبھی اس کے دست نگر

تھے۔ آج اتفاقات سے اس پر قابو پا کر اس کی گزشتہ عظمت اور شرافت کی طرف سے لاپروا ہو گئے ہیں اور اس کے ساتھ وہی اصول برتنا چاہتے ہیں جو عام اسرائے جنگ کے لیے تھا میں کچھ نہیں سوچ سکتا۔ مگر یہ کہ جس وقت عام عرب تقسیم غنیمت میں ایک دوسرے سے لڑ رہے ہوں گے یا فاتحانہ شان میں ڈوبے ہوں گے جناب امیرؑ اس شریف قیدی کی حالت کا غور سے مطالعہ کر رہے ہوں گے اور ان میں ہمدردی کے وہ جذبات پیدا ہو رہے ہوں گے جو شریف کی مصیبت دیکھ کر ہر شریف میں ہونی چاہیے۔

قیدی مجمع میں ہمدردی کا مرکز پالیتا ہے

یہ بھی عجب خیز نہیں ہے کہ مجبور قیدی نے جس وقت وہ مجمع میں ہر طرف کسی ہمدرد کو ڈھونڈنا چاہتی ہو جناب امیرؑ کے بشرہ اور آنکھوں میں امید کے آثار پائے ہوں اور حسینؑ کو پہلو میں بیٹھا ہوا دیکھ کر وہ مرکز پالیا ہو جہاں اس انتشار کے عالم میں اپنے کو ٹھہرا سکے۔ (میں یہ پیراگراف ونیز بعد کا لکھ چکا تھا کہ محمد الواقدی کی روایت دیکھی جس نے میرے خیال کی تصدیق کی اور میں نے اسے واقعات کے سلسلہ میں پیشتر درج کر دیا)

شاہزادی کی خصوصیاتؑ عمل کرتی ہیںؑ

اب ایک شاہزادی کی خصوصیات اور احساسات کے عمل کا وقت تھا۔ اس کی آنکھیں تھیں اور امتیاز تھا اسے مجمع میں چہروں پر وہ لکیریں اور خصوصیات کی وہ اعلیٰ تحریریں تلاش کرنی تھیں جو پہچاننے والوں سے چھپی نہیں رہتیں۔ خصوصاً شاہی خاندان کے کسی فرد کی منجھی ہوئی نگاہ کے لیے جس کے سامنے ملک اور مختلف اقوام کے شرفا کا گلدستہ بندھا ہوا رہتا ہے۔ نہ یہ سوچنا ممکن ہے کہ شہربانوؑ کو یہ معلوم نہ ہو گیا ہو کہ یہ دونوں بزرگ کون ہیں۔ اس نے انتخاب اور پسند میں مدد دی۔ جناب امیرؑ کے صلاح سے عربوں نے پہلے اپنے قیدیوں کی شرافت کی طرف توجہ کی اور دوبارہ جناب امیرؑ ہی کی صلاح سے ان مجبور قیدیوں کی آزادی انتخاب اور عقد کی خواہش کسی کے نزدیک قابل عذر نہ ٹھہری۔ ایسے نازک وقت میں ان کے غرور اور آن کی اس سے اچھی اور کسی طرح حفاظت ممکن نہ تھی۔ قیدیوں کی طرح بیچ ڈالنا ان کا کوئی قابل وقعت لحاظ نہ ہوتا۔

مردوں کا پسند کرنا عورتوں کی اسیری سے بہتر نہ ہوتا

مردوں کا ایسے وقت خواہش عقد کرنا اور پسند کر لینا اسیری سے کسی طرح بہتر نہ ہوتا بجز اس کے کہ عورتیں عقد کرنے میں مختار قرار دی جاتیں۔ اور ان کا انتخاب کرنے والا زر فدیہ ادا کر کے بیت المال کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ کرتا۔ یا حکومت مصلحت کے اعلیٰ احساس سے اس کی کوئی قیمت نہ لیتی۔

عامہ ناس کی خوشنودی

جب کہ وہ لوگ جو بیت المال کے اس ایک جزو سے نفع اٹھاتے انھوں نے اس پر خوشنودی ظاہر کی کہ وہ شے ان کے پاس گئی جن کا سب کو لحاظ تھا۔

حوالگی نہ کہ اسیری

اور حق تو یہ ہے کہ شہربانوؑ کو اسیر جنگ کہنا ہی غلط ہے جب کہ ان کے محافظین نے ان کے جان و آبرو کی حفاظت کا عہد لے کر حوالہ کیا تھا۔ جسے انھوں نے اس وقت ظاہر بھی کیا جس وقت اس اصول کے خلاف خلیفہ کے حکم سے کسی عرب نے ان کے زیورات لینا چاہے۔ اور چونکہ حکومت کے ایک حکم پر مواقع نے انھیں فتح دی ان کی آزادی میں کسی وقت شکستگی نہیں پیدا ہوئی۔ جناب امیرؑ کی صلاح حکومت اور

جمہور کی رضامندی اور خود شہربانوؑ کی آزادانہ لفظ خواہش یہ سب موجودہ نظام سے ان کے متاثر نہ ہونے اور اپنی حالت پر قائم رہنے کی مزید تائید ہے۔

سویمبریگ

مجھے یقین ہے کہ شہربانوؑ نے جناب امیرؑ کی صلاح کے لطافت لحاظ کا اندازہ کیا۔ یہ اندازہ ان کے جواب سے ظاہر ہے جس نے سویمبریگ (ہندو راجاؤں میں کبھی کبھی یہ رسم برتی جاتی تھی کہ ان کی وہ لڑکی جس کی شادی ہونے کو ہوتی تھی وہ اس راجا کے گلے میں ہار ڈال دیتی تھی جسے وہ پسند کرتی تھی) پر آمادہ کردیا۔ اور پسندیدگی کا ہار فاتح عرب اور شاہ کونین کے نواسے کے گلے میں ڈالا گیا۔ مظلوم عورت کی حمایت اصول شجاعت میں داخل ہے۔ جس کی بنیاد پر جناب امیرؑ اس کے عزت کے وکیل بنے تھے۔ شہربانوؑ نے اپنی پسند میں غلطی نہ کی تھی۔ اور نہ وکالت کے بعد جناب امیرؑ اور حسینؑ سے یہ ممکن تھا کہ شہربانوؑ کے اس پر امید یا ایسے ہی فقرہ کو کہ: "اگر مجھے اختیار ہے تو میں نے حسینؑ کو اختیار کیا"۔ یاس سے بدل دیتے یا ایسی بیان خیز اور پر معنی نظر کو جو خلیفہ کو یہ سمجھا دیتی کہ: "یہ دختر سائر مردم میں سے طرف حسینؑ کے ارادت و عقیدت رکھتی ہے"۔ قبولیت کی پناہ سے علیحدہ رکھتے۔

شہربانوؑ کی تباہ شدہ عظمت کی تلافی

قدر دانی اور حمایت کا اقتضاء یہ تھا کہ اگر جناب امیرؑ بہو بنانا منظور کرتے تو حسینؑ انھیں زوجیت میں قبول کرتے۔
شہربانوؑ کی تباہ شدہ عظمت نے اگرچہ دنیاوی حکومت پر قبضہ نہ کیا لیکن اس سے کہیں زیادہ پر اثر عظمت مسلمانوں کی نگاہ میں حاصل کی کہ وہ بادشاہ قلوب کے فرزند کی بی بی ہوئیں۔

کیا قلبی میلان کا تصادم ہو رہا تھا

کوئی عجب نہیں ہے کہ اس عقد کے لیے دونوں طرف سے قلبی میلان پیدا ہو گیا ہو۔ شہربانوؑ کی مسرت کا اندازہ روضۃ الشہدا کی اس روایت سے ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس سو کنیزیں تھیں، اور بعد زفاف انھوں نے راہ خدا میں پچاس کنیزیں آزاد کیں۔

شہربانوؑ کی عقد کے بعد خوشی

شہربانو کے ذکی الحس ہونے کی مثال اور آپس کے احساسات کا لحاظ

شہربانوؑ کے ذکی الحس ہونے کے اشارے اس روایت سے بھی مؤید ہیں جو روضۃ الشہداء سے ملتی ہے کہ شہربانوؑ کی ایک نہایت حسین کنیز تھی جس کا نام شیریں تھا۔ ایک روز حضرت سبط اصغر شہربانوؑ کے پاس تشریف رکھتے تھے کہ شیریں سامنے آگئی۔ حسینؑ نے شہربانوؑ سے مخاطب ہو کر فرمایا: "شہربانوؑ! شیریں کی آنکھیں کیسی برافروختہ ہیں؟"۔
شہربانوؑ نے سنا اور تھوڑی دیر کے بعد شیریں کو پر تکلف لباس سے آراستہ کر کے سبط اصغرؑ کی خدمت میں بھیج دیا۔ اور جب حسینؑ نے تعجب سے اس طرح آنے کا سبب پوچھا تو شہربانوؑ نے جواب دیا:

زن وشو کا ایک دوسرے کی خاطر کا لحاظ

"شیریں کی خوش چشمی کی تعریف سے میں آپ کا میلان طبیعت سمجھی میں نے اسے آپ کو بخش دیا"۔ حسینؑ ہنسے اور فرمایا: "اگر تمھارا یہ خیال ہے تو میں نے اسے راہِ خدا میں آزاد کر دیا"۔
تھوڑی دیر کے بعد شیریں عمدہ لباس اور زیورات میں نظر آئی تو حسینؑ نے پھر پوچھا: "شہربانوؑ! تم نے بہت سی کنیزیں آزاد کیں، لیکن کسی کو اس تکلف سے آراستہ نہیں کیا تھا"۔ شاہِ زنان نے جواب دیا: "اس وجہ سے کہ وہ

میری آزادی کی ہوئی تھیں اور شیریں کو آپ نے آزاد کیا ہے۔ مجھ میں اور آپ میں امتیاز ہونا چاہیے"۔

شیریں کنیزی کو آزادی پر ترجیح دیتی ہے

اگرچہ شیریں کو آزادی کا خوشگوار حکم سنادیا گیا لیکن اس نے خاندان رسالت کی کنیزی کو آزادی پر ترجیح دی اور اس گھر سے اس وقت تک اپنا تعلق قطع نہیں کیا جب تک کہ ہم ایک اندوہناک واقعہ کے قریب نہ پہنچیں۔

خلیفۂ ثانی اور حسنین کی نسبی عظمت

خلیفۂ ثانی کے زمانہ کے واقعات میں صاحب سیرۃ الفاروق، ازالۃ الخفاباب گشت سے نقل کرتا ہے کہ: "ایک دن مال غنیمت تقسیم کرنے لگے تو امام حسنؑ سے شروع کیا، اور ان کو ہزار درہم دیے۔ پھر امام حسینؑ کو بھی ہزار درہم دیے۔ جب ان کے بیٹے عبداللہ کی باری آئی تو پانچ سو درہم ان کو کہا۔ انھوں نے کہا: یاامیرالمومنین میں قوی آدمی ہوں جس نے رسولؐ اللہ کے سامنے تلواریں ماری ہیں امام حسنؑ اور امام حسینؑ دو لڑکے ہیں جو مدینہ کی گلیوں میں کھیلتے پھرتے تھے، ان کو ہزار ہزار درہم دیا گیا، اور مجھ کو پانچ سو۔ یہ میرے حق سے کم تھا۔ حضرت عمر جوش میں آئے اور فرمانے لگے کہ: جا تو بھی ان کے باپ جیسا باپ، ان کی ماں جیسی ماں، اور ان کے نانا جیسے نانا، اور ان کی نانی جیسی نانی، ان کے چچا جیسا چچا، ان کے ماموں جیسے ماموں اور ان کی خالہ جیسی خالہ لے آ۔ جس کو نہیں لاسکے گا۔ تجھے معلوم نہیں کہ ان کا باپ علیؑ مرتضیٰ، ان کی ماں فاطمہؑ زہراؑ، ان کے نانا محمد مصطفیٰؐ، ان کی نانی خدیجہؑ کبریٰ، ان کا چچا جعفرؑ بن ابی طالبؑ طیار، ان کا ماموں ابراہیم بن رسولؐ اللہ اور ان کی خالہ اُمّ کلثومؑ اور رقیہؑ رسولؐ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ عبداللہ یہ سن کر خاموش ہوگئے۔

خلیفۂ ثانی اور خاندانِ رسالت کے احسانات کا اعتراف

اسی طرح ایک دن امام حسنؑ یا امام حسینؑ گئے اور دیکھا کہ عبداللہ اپنے بیٹے کو اس وقت اندر نہیں بلایا تو وہ لوٹ گئے۔ حضرت عمر کو جب معلوم ہوا تو آدمی بھیج کر ان کو بلایا، اور کہا کہ: اے میرے بھائی کے بیٹے! تم کیوں لوٹ گئے۔ کیا میرے سر کے بال تمہارے ہی اگائے ہوئے نہیں ہیں؟"۔

اور ایسے ہی ایک موقع پر یہ کہا ہے کہ "ہماری بزرگی تو خدا کے بعد تمھیں سے ہے"۔

خلیفہ ثانی نے کبھی اہلِ بیت کو خمس نہیں دیا

ابن الخطاب کے زمانہ کے واقعات میں سے ایک یہ ہے جسے مولوی شبلی صاحب "الفاروق" میں بیان کرتے ہیں: "حضرت عمر کے نسبت لوگوں کا بیان ہے کہ وہ قرابت داران پیغمبر کو مطلقاً خمس کا حق دار نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اہل بیت کو کبھی خمس میں سے حصہ نہیں دیا"۔ ذوالقربیٰ کے حق کے لحاظ سے یہ کہتے ہوئے کہ ساتھ دینے کی وجہ سے مصلحت تھی کہ حصہ مقرر کیا جاتا۔ آگے بڑھ کر لکھتے ہیں کہ: "لیکن یہ قرار دینا کہ قیامت تک آپکے قرابت داروں کے لیے پانچواں حصہ مقرر کردیا ہے اور گو ان کی نسل میں کسی قدر ترقی ہو اور گو وہ کتنی ہی دولت مند اور غنی ہوجائیں، تاہم یہ رقم ہمیشہ ملتی رہے گی۔ ایسا قاعدہ ہے جو اصولِ تمدن کے بالکل خلاف ہے۔ اگر کوئی بانی شریعت ایسا کرے گا تو اس میں اور خود غرض برہمنوں میں کیا فرق ہوگا"۔ اور اس کے بعد اگرچہ یہ آیت لکھی ہے کہ: وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ (۸ : ۴۱) لیکن پھر انھیں یہ اجتہاد

بھی کرنا پڑا ہے کہ یہ تمام احکام نقد و اسباب سے متعلق تھے۔ زمین اور جائداد کے لیے کوئی قاعدہ نہیں قرار پایا تھا"۔

خمس میں ذوی القربیٰ کا حصہ

صاحب مناہج نے یمن میں قبیلہ ہمدان کے اسلام لانے اور جناب امیرؑ کی ایک کنیز اپنے حق میں لینے اور بریدہ کے اعتراض پر جناب امیرؑ سے جواب دلوایا ہے کہ: "نہیں دیکھتا تو اس جاریہ کے تئیں کہ سبایا سے خمس میں آئی ہے اس واسطے میں نے اس سے نزدیکی کی گویا حضرت علیؑ نے حضرت سے اذن پایا ہی تھا خمس کی قسمت کا اور ذوی القربیٰ کو اس میں حصہ ہے"۔ بریدہ کو اس سے غالباً تسکین نہ ہوئی اور انھوں نے جناب رسالت مآب کے سامنے واقعہ بیان کیا، اور آپ نے فرمایا کہ: "اے بریدہ حصہ علیؑ کا اس خمس سے زیادہ اس سے تھا"۔

مسئلہ خمس کا سباق اور سیاق

اصول خمس کے متعلق سوال یہ نہیں ہے کہ ابن الخطاب بنی ہاشم کو حق دار سمجھتے یا نہ تھے یا یہ کہ ایسے توہمات کی گنجائش ہو کہ: "گو ان کی نسل میں کسی قدر ترقی ہو اور گو وہ کتنی ہی دولت مند اور غنی ہو جائیں تاہم یہ رقم ہمیشہ ملتی رہے گی"۔ بلکہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہدایت نامہ مُسلمین نے کیا حکم دیا تھا، اور رسولؐ کا طرز عمل کیا تھا۔ اس کے بعد یہ سمجھنا ہوگا کہ ابن الخطاب کا طریقہ کیا تھا، اور اس کی کیا وجہ ہو سکتی تھی۔ آیہ قرآنی متذکرہ خمس سے جواز خمس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ رسولؐ کا طرز عمل کہ آنحضرت نے بنی ہاشم کو خمس خیبر سے عطا فرمایا مزید تائید ہے جسے جبیر بن مطعم اور ابن عفان کے اعتراض نے اور صاف کر دیا، اور پھر جناب امیرؑ کا یمن میں طرزِ عمل مسئلہ خمس کی ایک طے شدہ شان رکھتا ہے جسے بریدہ کے اعتراض پر رسولؐ کا جواب ہمیشہ کے لیے صاف کر دیتا ہے۔ بعد رحلتِ رسولؐ حضرت سیدہ کا بقیہ خمس خیبر میں سے اپنا حصہ طلب کرنا قائم شدہ حق کا اظہار یقین تھا۔ کوئی عجب نہیں ہے اگر ابوبکر نے دینے سے انکار کیا، اور کوئی حیرت نہیں ہے اگر ابوبکر کے جانشین نے بھی اپنے پیشرو کی مصلحت پر عمل کیا۔

فدک اور خمس مسئلۂ خلافت کی دو چھوٹی شکلیں ہیں

حقیقت میں فدک اور خمس مسئلۂ خلافت کی دو چھوٹی شکلیں ہیں۔ قابل مؤلف "الفاروق" نے بنی ہاشم کی محرومیت اور ابن الخطاب کی مصلحت کی حمایت میں مبالغہ نہ کیا ہوتا، اگر انھیں یاد رہتا کہ اگرچہ وہ "قیامت تک" اور "نسل کی ترقی" کی بنیاد پر اصولِ خمس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ لوگ جن کی مصلحت کی حمایت کی جا رہی ہے۔ خود سے ایسی مصلحت کی بنیاد ڈالنے عباس کے پاس گئے تھے کہ: "ان کی اولاد کا بھی حصہ قرار دیں، اس لیے کہ یہ حجت ہوگی علیؑ اور بنی ہاشم پر جب کہ عباس ساتھ ہوں گے"۔

مؤلف الفاروق ایسے اصول کی ترمیم چاہتا ہے جسے عمر اور ابوبکر نے ہی جاری کیا

مجھے اس پر بھی حیرت نہ ہوگی اگر اس کے بعد بھی خلفا کے تصفیہ کی حمایت کی جائے درانحالیکہ وہ نسلاً بعد نسل کا مؤلف "الفاروق" کے نزدیک قابل اعتراض اصول جاری کرنے گئے تھے۔ بحث تو اس سے ہے کہ بنی ہاشم کے حقوق کی طرف سے کسی طرح آنکھ جھپک جائے اس کے بعد یہ سوچنے کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ ابوبکر اور عمر تو اس لیے بیت المال کو رقیق بنا دیں کہ ایک شخص کی زبردست آڑ سے یہ خلافت پر قائم رہتے ہیں۔

رسولؐ کو وہ حق حاصل نہ تھا جو خلفا کو تھا

اور رسولؐ کو یہ حق حاصل نہ ہو کہ وہ ان کے لیے وظیفہ مقرر کردیں جنھوں نے شیوعِ اسلام، وقارِ اسلام کی محافظت اور رسولؐ پر جاں نثاری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اور جو اس وقت محافظ رہتے تھے اور اپنے خون بہاتے تھے جس وقت دلیل لانے والوں کے دوست "جان ہے تو جہان ہے" پر عمل کرتے تھے۔

تمدن کا ایک ہیبت ناک اُصول

میں اسے اصولِ تمدن کہوں، یا تمدن کش اصول، کہ اگر کوئی دولت مند اور غنی ہوجائے تو اسے اس کا حق نہ ملے۔ حالانکہ خدانہ کردہ بنی ہاشم میں کوئی اسلامی تاریخ کے مفہوم میں "غنی" نہ تھا۔ یہ بھی صاف امر ہے کہ کسی دولت مند کے ذرائع آمدنی کا باقی رہنا اسے مالی اِنحطاط یا زوال سے بچاتا ہے اور حکومت کا فرض ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے تموّل کو باقی رکھے بلکہ اس میں ترقی دی جائے جس سے نہ صرف حکومت بلکہ جماعت کے کچھ افراد کو بھی مدد ملتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ کسی ہمدرد حکومت کا یہ فرض ہوتا ہے کہ کسی جگہ مالی مرکزیت سے ایسی حالتیں نہ پیدا ہوجائیں جس سے اوسط یا پست درجہ کی حالت کو اور پست ہوتے جانے کا خوف ہو۔ تصفیہ کو اس وقت سے تعلق تھا، قیامت سے نہ تھا۔ کوئی مدبر قیامت کا ذمہ دار نہیں ہے، بلکہ اپنی وقت کی مصلحت اور اس کے اثر کا۔ اصول خمس سے اِنکار کرنے کے وقت بنی ہاشم کے تموّل کی حالت ایسی نہ تھی جس سے یہ اندیشہ ہو کہ ان کے کچھ ذرائع بند کیے جائیں، ورنہ انھیں عامہ ناس پر غیر مفید مالی تفوق حاصل ہوجائے گی۔ بلکہ بنی ہاشم کی یہ حالت ظاہر تھی کہ انھوں نے حیاتِ رسولؐ میں اپنے ہادی کی تقلید سے زندگی کی نہایت ضروری چیزوں کے تلطف سے بھی کمال ایثار سے اپنے کو محروم رکھا تھا۔ اِنقلابِ اِختیار نے اب ان کی حالت ایسی پہنچا دی تھی کہ جناب امیرؑ اپنے دیوان میں یہ فرماسکتے کہ: "میں نے ہر سختی پر غلبہ چاہا اور میں اس پر غالب ہوا اور جب فقر نے مجھ پر غلبہ کیا تو غالب ہوگیا اگر ظاہر کرتا ہوں تو رسوائی ہے اور اگر نہیں ظاہر کرتا تو مارے ڈالتا ہے"۔ صحیح ہے کہ اس شعر کا وقت نہیں معلوم ہے لیکن یہ سوچنا سہل ترین امر ہے کہ کوئی دوسرا زمانہ رحلت رسولؐ کے بعد کے سوا نہیں ہوسکتا تھا اور حضرت سیدۃ النساءؑ کے اس فقرہ کا تو وقت بھی معلوم ہے کہ: "میرے فرزندوں کے قوت و معیشت کو لے لیا ہے"۔

بنی ہاشم کو خمس کا حقدار نہ سمجھنے کی غرض

اب میں کیا سوچ سکتا ہوں بجز اس کے کہ بنی ہاشم کا ایک مخصوص حق جو ان کے مخلصانہ جانبازی کا اعتراف یا تائیدی صلہ تھا۔ وہ ان سے نہ صرف اس لیے لے لیا گیا کہ ان کا یہ جائز امتیاز چھین لیا جائے اور انھیں اس صورت میں ہر درجہ کے مسلمان کے برابر کردیں، عام اس سے کہ اس سے برائے نام خدمت بھی اسلام کے متعلق سرزد نہ ہوئی ہو بلکہ اس لیے بھی کہ یا بنی ہاشم ہمارے دست نگر رہیں اور یا افلاس اور اس کے لازمی تنگی اور بے اثری میں بسر کریں۔ اصول خمس کو بنی ہاشم پر نافذ نہ کرنا رسولؐ کے شہنشاہانہ حقوق کا انکار تھا۔ رسولؐ کی پسند کا انکار تھا۔ اور بنی ہاشم کے ان حقوق کا انکار تھا جنھیں انھوں نے اپنے خون اور اعتبار اور خدمت سے حاصل کیا تھا۔ کیا عجب ہے کہ اس سے اِنکار نہ کیا جاتا۔ اگر خمس کا تعلق بنی ہاشم یا خلافت کے فطری حق دار سے نہ ہوتا۔ حکومت کی تبدیل ہیئت نے اس مسئلہ کی صورت بھی اس طرح بدلنی چاہی تھی جو تغیر کے موافق ہوسکے۔ پیشتر کے اِسلامی جانباز اپنے حق کی محرومیت سے یہ

سمجھائے جائیں کہ اب آئندہ کے لیے تم اپنے کو بے تعلق سمجھو ہم اپنے محافظ بنالیں گے۔ ایک دُوسری ضمنی بات کو بھی مولوی شبلی صاحب نے ظاہر کیا ہے۔ جس میں واقع ذاتی رائے کے ساتھ پیوند دیا گیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

واقعہ رائے اور دلیل کا اختلاط

بنو ہاشم کو جو عہدے نہیں دیے اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کو خوف تھا کہ بنو ہاشم چونکہ خمس میں اپنا حصہ ایک شرعی حق سمجھتے ہیں اس لیے باوجود دولت مند ہو جانے کے خمس میں سے حصہ لے لیں گے۔ حالانکہ عمر کے نزدیک خمس کے مصارف امام وقت کی رائے پر منحصر ہیں"۔ اس میں واقعہ صرف اس قدر ہے کہ عمر نے بنو ہاشم کو عہدے نہیں دیے۔ اس کے بعد یہ فقرات کہ باوجود دولت مند ہو جانے کے، اور "امام وقت کی رائے پر منحصر ہیں"۔ یہ اپنی صورت میں ویسی ہی بالغ دلیلیں نہیں ہیں جیسی واقعہ خمس میں پیش کی گئی تھیں۔

کیوں بنی ہاشم کو عہدے نہیں دیے گئے

بنی ہاشم کو عہدے دینا یا نہ دینا بھی حضرت عمر کے زمانہ کی کوئی مخصوص مصلحت نہ تھی بلکہ اس کی ابتدا ابوبکر کے زمانہ سے ہو چکی تھی اور جو وجوہات ان کے زمانہ میں انھیں علیحدہ رکھنے کے تھے اس وقت اگرچہ اس میں ویسی قوت باقی نہ تھی اور کسی قدر اسباب بھی مختلف تھے تاہم اصل مصلحت میں فرق نہ تھا کہ بنی ہاشم کو کسی گروہ نہ کہ مسلح گروہ سے ملنے نہ دو جس سے انھیں اپنا اثر ڈالنے کا موقع ملے اور خلافت ان کی تلوار کے سایہ میں تھراتی رہے۔ حالانکہ یہ بات ہی دوسری ہے کہ بنی ہاشم کوئی ایسی شورش پسند کرتے یا نہ کرتے اور ایسے عہدے قبول کرتے یا نہ کرتے جس میں انھیں ابوبکر اور عمر کی تاویل کا محکوم رہنا پڑتا۔

حکومت کا یہ خوف اور دلیل کس قدر مضحک ہوگی کہ چونکہ کوئی اپنے کو خمس کا شرعی حق دار سمجھتا ہے اور وہ اپنا یہ حق لے لے گا اس لیے حکومت اسے کوئی عہدہ نہیں دیتی۔ عہدہ دار کا یہ فعل محکومانہ کا ہے کہ جو تا اپنے آزادانہ اختیار کا نفاذ ہوتا اور کسی ایک یا چند کے ایسا کرنے کو حکومت منع نہ کر سکتی۔ نیز اس صورت کے جس میں حکومت کو اس کا یقین ہوتا کہ ہمارا روکنا ایک قائم شدہ قانون کی خلاف ورزی ہوگی اور جمہور کی رائے ہمارے خلاف ہو جائے گی۔ بہتر ہوگا کہ اس کا موقع ہی نہ آنے دو۔

مکالمہ جس سے گزشتہ اور موجودہ مصلحت سمجھ میں آتی ہے

اب میں ایک خوش مزہ مکالمہ کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ جس سے یہ امر اچھی طرح واضح ہو جائے گا کہ بنی ہاشم کی محرومیت کے لیے کونسی قوتیں محرک تھیں۔ اس میں یہ بھی دیکھنے کی بات ہوگی کہ ابن الخطاب اپنے پیشرو کی مصلحت کی تائید کرتے ہیں جو کسی طرح حیرت خیز نہیں ہے۔ قریش کی ان کارروائیوں کا خلیفہ کی زبان سے اعلان ایک مفید دستاویز ہے جس کی نوعیت کہتی ہے کہ راز اس وقت ظاہر کیا گیا جب کہ وہ تجویز کے درجہ سے نکل کر پوری طرح عملی صورت میں آگیا اور صاحبِ اختیار کو ان خیالات کے ظاہر کر دینے میں اب کوئی تردد نہ ہوا۔ مکالمہ شروع اس طرح ہوا کہ کسی شاعر نے کچھ اشعار پڑھے جنھیں سن کر عمر نے کہا: "خدا کی قسم میں جہاں تک جانتا ہوں اس اشعار کا مصداقِ اُولیٰ بجز بنی ہاشم کے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا"۔ ابن عباس موجود تھے، انھوں نے یہ سن کر

کہا کہ: "تم نے اس کہ میں توفیق پائی"۔ اس کے بعد مکالمہ یہ ہے:

عمر: ابن عباس کچھ جانتے ہو کہ تمھاری قوم نے تم لوگوں کو کیوں محروم رکھا؟

ابن عباس: اگر ہم نہیں جانتے تو امیرالمومنین بتلائیں گے۔

عمر: تمھاری قوم نے نہ چاہا کہ: نبوت و خلافت دونوں تمھارے خاندان میں رہیں۔ جس سے تم اپنی قوم پر فخر و مباہات کرو۔ لہٰذا قریش نے خلافت کو اپنے ہاتھ میں لیا، اور اپنی طرف سے خلیفہ بنایا۔ اس کارروائی میں قریش صواب پر ہیں اور نیک توفیق پائی۔

ابن عباس: اے امیرالمومنین اگر آپ اجازت دیں اور غصہ نہ فرمائیں تو میں کچھ کہوں؟

عمر: کہو!

ابن عباس: امیرالمومنین کا یہ کہنا کہ قریش نے خلافت اپنے ہاتھ میں لی ہے اور بہ اختیار خود خلیفہ مقرر کر لینے میں نیک توفیق پائی ہے۔ اور اچھا کیا اگر مطابق حکم و اختیار خدا ایسا کرتے تو بے شک ثواب پاتے۔ اور کوئی ان پر رد نہ کرتا، باقی یہ کہ قریش نے ہم میں نبوت و خلافت کے جمع ہونے سے کراہت کی تو خدا ایک قوم کی کراہت کے بارہ میں کہتا ہے: "اور یہ سبب اس کے ہے کہ انھوں نے کراہت کی اس چیز سے جس کو نازل کیا خدا نے۔ پس حبط کر دیا خدا نے ان کے اعمال کو"۔

عمر: ہیہات ہیہات! افسوس افسوس! اے ابن عباس! ضرور مجھ کو تمھاری بہت سی باتوں کی خبریں پہنچی تھیں جن کو اس وجہ سے تم سے نہ دہرایا کہ اس کے اقرار سے تمھارا مرتبہ میرے نزدیک زائل ہو جائے گا۔

ابن عباس: اے امیرالمومنین بتلایئے وہ کونسی باتیں ہیں؟ اگر حق ہیں تو ضرور میری منزلت گھٹنی چاہیے۔ اگر باطل خبریں پہنچی ہیں تو میں اپنی برات ثابت کروں گا۔

عمر: میں نے سنا ہے کہ تم کہتے ہو کہ خلافت ہم لوگوں سے از راہ بغاوت و حسد و ظلم چھینی گئی؟

ابن عباس: ظلم کا حال تو جاہل و عالم سب کو معلوم ہے۔ باقی رہا حسد۔ پس حضرت آدمؑ سے حسد کیا گیا، اور ہم لوگ انھیں کی اولاد ہیں، اور ہم سے لوگ حسد کرتے ہیں۔

عمر: ہیہات ہیہات! اے ابن عباس تم لوگ بنی ہاشم کے دل نے بجز حسد کے سب باتوں سے انکار کیا۔

ابن عباس: بس بس! اے امیرالمومنین جس قوم کے دلوں کی تعریف خدا نے لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (۳۳ : ۳۳) سے فرمائی ہے حسد اور کھوٹے پن سے ان کی طرف حسد اور غش کی نسبت نہ کرو۔ حضرت رسولؐ کا دل بھی انھیں بنی ہاشم سے ہے۔

عمر: تم میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔

ابن عباس: بہت خوب! جب اٹھنے لگے

عمر: اے ابن عباس ٹھہر جاؤ! خدا کی قسم میں تمھارے حقوق کی رعایت کرتا ہوں اور تمھاری خوشی کو دوست رکھتا ہوں۔

ابن عباس: اے امیرالمومنین ضرور میرا حق تم پر ہے اور ہر مسلمان پر جس نے اس کی حفاظت کی وہ نصیب کو پہنچا اور جس نے ضائع کیا اس نے اپنا نصیب کھویا۔

مولوی شبلی صاحب نے "الفاروق" میں جو مکالمہ لکھا ہے اس میں عمر کی زبانی جواب کا اس قدر ٹکڑا زیادہ ہے کہ: "شاید تم کہو گے کہ حضرت ابوبکر نے تم کو خلافت سے محروم کیا لیکن خدا کی قسم یہ بات نہیں۔ ابوبکر نے وہ کیا جس سے زیادہ مناسب نہیں ہو سکتا تھا اگر وہ تم کو خلافت دینا بھی چاہتے تو ان کا ایسا کرنا تمھارے لیے کچھ مفید نہ ہوتا"۔

مکالمہ کے متعلق مؤلف الفاروق کا استنباط اور ریمارک

اس مکالمہ سے زیادہ کھٹ مٹھا مؤلف الفاروق کا یہ ریمارک ہے کہ: "ان مکالمات سے علاوہ اصل واقعہ کے تم اس کا بھی اندازہ کر سکو گے کہ حضرت عمر کے مبارک عہد میں لوگ کس دلیری اور بیباکی سے اپنے خیالات ظاہر کرتے تھے اور زیادہ اس وجہ سے کہ حضرت عمر آزادی اور حق گوئی کو قوم میں پھیلانا چاہتے تھے"۔ اگر امیر شام کو ایسے لوگ فخر کے لیے مل سکتے تھے جو جمل اور ناقہ میں تمیز نہ کر سکتے تو مؤلفین کو ایسے پڑھنے والوں کا مل جانا عجب خیز نہیں ہے جو مکالمہ پر نظر کرنے کے بعد بھی اس نتیجہ اور ریمارک کو قبول کر لیں جو پیش کیا گیا ہے۔

قوم کو بنی ہاشم کے فخر و مباہات سے کیوں عداوت تھی

مکالمہ، اس کا مفہوم، انداز اور اس کی پیچ دار تلخی اس قدر واضح ہے جس کی شرح کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا صاف بات ہوگی کہ: "تمھاری قوم نے نہ چاہا کہ نبوت و خلافت دونوں تمھارے خاندان میں رہیں۔ جس سے تم اپنے قوم پر فخر و مباہات کرو"۔ اس میں سوال کی جس قدر بات ہے وہ یہی ہے کہ قوم کو ان کے فخر و مباہات سے عداوت کی کیا وجہ تھی اور وہ کیوں ان کے احسانات کے معاوضہ میں ایسی الٹی بات پر آمادہ ہو گئی کہ دوسرا فخر و مباہات کے موقع پر ہو تو ہو لیکن یہ نہ رہیں۔

خلیفہ کی رائے ۔ تدبر کی مقدار

اور خلیفہ خود ان لفظوں میں رائے دیں کہ: "اس کارروائی میں قریش صواب پر ہیں اور نیک توفیق پائی"۔ اس میں تھوڑا یا بہت جس مقدار میں جو تدبر صرف اس قدر ہے کہ خلیفہ "قوم" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ صاف ترین امر ہے کہ وہ کون لوگ تھے جو "اس کارروائی" (بنی ہاشم کو فخر و مباہات کے درجہ پر رہنے نہ دینے) کے محرک تھے۔ جنھوں نے "چھیدی ہوئی ناک والے قریش کو" اپنے ہاتھ میں لے لینے کا موقع پایا۔

ابنِ عباس کی شرح

ان کارروائیوں میں ابن عباس قریش کے نفس کی صحیح شرح کرتے ہیں، جہاں کہتے ہیں کہ: "ہم سے لوگ حسد کرتے ہیں"۔

بنی ہاشم میں یاس پیدا کی گئی تھی

اگرچہ یہ مکالمہ اتفاقاً شروع ہو گیا لیکن میرے خیال میں ابنِ عباس کے لیے نیا ہو تو ہو لیکن کسی طرح ابن الخطاب کے لیے نیا نہ تھا اس لیے کہ اس کے اکثر مضمون وہی تھے جسے کہنے کے لیے عباس کے پاس گئے تھے۔ اور ایک حد تک تصفیہ کی بحث ہو چکی تھی۔ آج اگر یہ کہا گیا تھا کہ تمہاری قوم نے نہ چاہا کہ خلافت اور نبوت دونوں تمہارے خاندان میں رہیں اور وجہ یہ بتائی تھی کہ جس سے تم اپنی قوم پر فخر و مباہات نہ کرو تو پہلے یہ کہہ چکے تھے کہ: "اگرچہ لوگوں نے تمہاری اور تمہارے اصحاب کی منزلت بھی لیکن اس امر خلافت کو تم سے پھیر دیا"۔ اور غرض یہ تھی کہ تم ہمارا ساتھ دو اور ہمارا پیش کش قبول کر لو۔ عباس کے پاس جو سیاسی وفد گیا تھا اسے کوئی تقریری کامیابی نہ ہوئی، ابن عباس سے جو مکالمہ ہوا اس میں حسد، ظلم، بغاوت اور حبطِ اعمال وغیرہ کے ایسے گہرے الزامات کا یہ جواب تھا کہ: "خدا کی قسم میں تمہارے حقوق کی رعایت کرتا ہوں اور تمہاری خوشی کو دوست رکھتا ہوں"۔ اور ابن عباس اس محبت نما ادعا کو بھی اپنے حق کے وقار سے ہٹا دیتے ہیں۔ میں نظر انداز نہیں کر سکتا کہ حضرت عمر کا کرخت لہجہ اس وقت ملین ہو جاتا ہے جب ابن عباس اٹھنے لگتے ہیں!

چند اور واقعات

چند واقعات مجھے اور لکھنے ہیں، جن کے من حیث الواقعہ ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ لیکن متکلمین اور مؤرخین دونوں کو ان میں ایسا حل معلوم ہوا ہے جس کی غرض بھلانے کے لیے انھوں نے کوششیں کی ہیں۔ وہ یہ ہیں:

شعائر اللہ کی تعظیم

مولوی شبلی صاحب فرماتے ہیں: "اسلام کا ایک اصول شعائر اللہ کی تعظیم ہے۔ اسی بنیاد پر کعبہ اور حجرِ اسود وغیرہ کے احترام کا حکم ہے۔ لیکن اس کی صورت صنم پرستی سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ تمام مذاہب میں اس اصول سے رفتہ رفتہ صنم پرستی قائم ہو گئی"۔

خلیفہ ثانی اور حجرِ اسود

"حضرت عمر نے مختلف موقعوں پر لوگوں کو اس غلطی میں پڑنے سے باز رکھا۔ ایک بار حجرِ اسود کے سامنے کھڑے ہو کر علانیہ کہا: "میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، نہ فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان"۔

ابن خلدون کہتا ہے: "ایک دفعہ حج کرنے کو آئے طواف کیا، اور حجرِ اسود کو بوسہ دے کر سامنے کھڑے ہو کر کہہ دیا: "میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، نہ فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، لیکن چونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو میں نے استلام کرتے ہوئے دیکھا ہے، اس وجہ سے میں بھی کرتا ہوں"۔

محدثین نے اس خیال سے کہ عمر فاروق کے دامن عزت پر اس قول سے یہ بدنما دھبہ لگ جائے گا کہ انھوں نے شعائر اللہ کی اہانت کی، جہاں عمر فاروق کا قول نقل کیا ہے وہاں اس قدر اور اضافہ کر دیا ہے کہ علیؑ بن ابی طالبؑ نے ان کو اس کہنے سے روکا تھا، اور ثابت کر دیا تھا کہ حجرِ اسود نفع و نقصان پہنچا سکتا ہے کیونکہ قیامت میں وہ شہادت دے گا۔ لیکن ناقدین فنِ حدیث نے اس اضافہ کو غلط اور بے بنیاد تسلیم کیا ہے۔

کیا شعائر اللہ کی تعظیمی صورت صنم پرستی سے ملتی جلتی ہے؟

مؤلف الفاروق نے غالباً بہت احتیاط کی ہے کہ: "ملتی جلتی" کا لفظ استعمال کر دیا ہے۔ حالانکہ اس کی افتاد قطعاً "صنم پرستی" کہلانے میں تقیہ نہیں کرتی۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ کسی مؤلف کی کتاب کا ہیرو اس کے تمام دلائل کا مرکز اور رہنما ہو۔ مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کس نے اپنے ہیرو کے انتخاب میں غلطی کی ہے۔ لیکن غالباً فردوسی نے اپنے: ؎

صنم کردہ ام رستم داستان ولے رستمے بود در سیستان

والے شعر کو اپنے ہی لیے پیٹنٹ نہیں کرا لیا تھا۔ میں جو کچھ سوچ رہا ہوں وہ کہنے والے اور شرح کرنے والے کے متعلق یہ خیال ہے کہ: "صنم پرستی" سے وہ کیا سمجھے ہیں۔ میں حقیقتاً یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ سقراط کی طرح اشیاء کی تعریفیں گھڑنے بیٹھیں۔ لیکن میں ایسے تعریف اشیا کے خزانہ کے لیے ایک رقم کا اضافہ سمجھتا اگر قابل صناع نے حضرت عمر کی زبانی کسی شرح کی ناموجودگی میں خلق کو "صنم پرستی سے ملتی جلتی صورت" کے سمجھانے کی کوئی کوشش کی ہوتی۔

موحدین اور صنم پرستی

موحدین صنم پرستی سے کیا مراد لیتے ہیں؟ یہ کہ صنم پرست اپنی صنعتوں کو وہ قوتیں حوالہ کرتے ہیں جو موحدین خدا کے لیے سمجھتے ہیں اور اس طرح ان موروتوں کی پرستش سے بجائے خالق کے مخلوقات کی پرستش ہونے لگتی ہے۔ یہی حالت اس زمانہ کی بھی تھی جس میں دریا، پہاڑ، آگ، اور طوفان وغیرہ کی پرستش ہوتی تھی۔ جس میں لوگ اگرچہ ان میں سے کسی شے کو قادر مطلق نہیں سمجھتے تھے لیکن خدا کی کسی نہ کسی قوت کا اوتار سمجھتے تھے۔ اب کیا مسلمان کعبہ یا حجر اسود کو اس وقت سے آج تک کوئی خدائی اختیار حوالہ کرتے ہیں؟ نہیں۔

بت پرستی کی ایک یہ شاخ حقیقتاً متذکرہ صدر مفہوم میں نہ ہوتی اگر یہ کہا جاتا کہ چونکہ ہم نے خدا کو کبھی نہیں دیکھا ہے اور ہم ایک ایسی چیز کے مرکز پرستش بنانے کو دشوار سمجھتے ہیں جسے ہم نے دیکھا نہیں ہے۔ اگرچہ ہم اس کے وجود کا انکار نہیں کر سکتے لہٰذا ہم نے مرکزیت کے لیے ایک صورت بنائی ہے جسے ہم خدا سمجھتے ہیں، عام اس سے کہ وہ جسم یا جسمانی ہو یا نہ ہو، خیالی حیثیت سے، ہم مادے اور صورت کو منفرداً یا مجموعاً بھی خدا نہیں سمجھتے، بلکہ ہم اسے خدا فرض کرتے ہیں، یہ صورت خیالی حیثیت سے خداوند تعالیٰ کے سوا چیزوں کے قائم مقام نہ ہوتی۔ ہم نے نہ خدا کی قوتیں گوشت اور خون کو حوالہ کی ہوتیں، نہ عناصر کی اور نہ کوئی ایک خدائی قوت کسی ایک کو۔ یہ پہلے برے مفہوم میں بت پرستی نہ ہوتی بلکہ اس مفہوم میں کہ تم نے خدا کا خیالی بت بنایا۔ لیکن چونکہ موحدین، مسلمین اور فیلسوفین کے نزدیک خدا اس سے بالاتر ہے کہ کسی خیال اور صورت کے اندر آسکے، اس لیے اس دوسری صورت کی "خدا کی بت پرستی" "فرضی" "صورت گری کے لحاظ سے قابل اعتراض ہوتی، نہ اس لحاظ سے کہ تم نے شرک کیا۔ یا دوسری چیزوں کو خدا کی عبادت میں شریک کیا، پھر بھی یہ دوسری صورت لطافت توحید کے اندر نہ آسکتی جس میں صورت گری تو دور از حال یہ بھی دور ہے کہ اس کی صفت زائد از ذات بھی جائے اور مزید غلطی یہ ہے کہ باوجود اس ادعا کے کہ ہم مادہ اور اس کی صورت کو مجموعاً یا منفرداً خدا نہیں سمجھتے بلکہ فرض کرتے ہیں، پھر بھی اس خیال کی غیر صریحی یا ظاہر صورت یہ ہے کہ ہم خدا کی پیدا کی ہوئی کسی شے یا اپنی صنعت کے نمونہ کو خدا کی عبادت کا مرکز قرار دیتے ہیں۔ اور باوجود ادعائے بے تعلقی وہ شے عبادت کے خیال کے اندر شامل ہو جاتی

ہے۔ پس اگرچہ ہمارا ارادہ غیر خدا کی پرستش کا نہ بھی ہو، تاہم عملاً ایسی چیز کی پرستش ہوتی ہے جو خدا نہیں ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلمین کعبہ و حجرِ اسود کو اس دوسری صورت کے کسی مفہوم میں سمجھتے تھے یا سمجھتے ہیں؟ نہیں۔

تاریخی صورت

اب تاریخی اور مذہبی صورت کی طرف توجہ کرو۔ "تب خداوند نے ابرام (ابراہیم) کو دکھلائی دے کے کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا، اور اس نے وہاں خداوند کے لیے جو اس پر ظاہر ہوا ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں سے روانہ ہو کے اس نے بیت ایل کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرا کھڑا کیا۔ بیت ایل اس کے پچھم اور عی ان کے پورب تھا، اور وہاں اس نے خدا کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور خداوند کا نام لیا"۔ (توریت کتاب پیدائش باب ۱۲ آیت ۷، ۸) اور اگر تو (موسیٰ) میرے لیے پتھر کی قربان گاہ بنائے تو تراشے ہوئے پتھر کی مت بنائیو، کیونکہ اگر تُو اُسے اوزار لگائے گا تو تُو اُسے ناپاک کرے گا"۔ (توریت کتاب خروج باب ۲۰ آیت ۲۵) کون نہیں جانتا جس نے توریت پڑھی ہے کہ حضرت ابراہیم، یعقوب اور اسحاق کسی پتھر کو قربانی کے لیے مخصوص کرتے تھے اور چونکہ اس پتھر سے خدا کی قربانی اور خدا کا نام منسوب رہتا تھا لوگوں کو نہ صرف خدا بلکہ مقدس قربانی کرنے والا بھی یاد آجاتا تھا۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ کی کسی مدت تک مطمئن حالت نے قوم اسرائیل کے مخصوص قربان گاہ بنائی جس کے علاوہ بنانے کی اجازت نہ ہوتی نہ اس لیے کہ قربان گاہ بنانا کسی عقیدۂ شرک کے لحاظ سے برا تھا بلکہ قومی، معاشرتی اور سیاسی اغراض سے کہ عدم مرکزیت نہ ہو۔ بعد کے زمانہ میں اسرائیل اور یہود کی حکومتوں کی جنگ کے اسباب میں ایک یہ بھی تھا کہ انھوں نے الگ اپنی قربان گاہ بھی بنالی تھی۔ اس سے الگ جو موسیٰ اور سلیمان نے بنادی تھی۔ توریت سے بت پرستی کا جو مفہوم سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ پتھر کو لوہا لگا کر کوئی صورت نہ بنائی جائے جو پرستش کے کام یا متعلقات میں لائی جاسکے۔ نہ یہ کہ بیت المقدس کا سا کوئی گھر نہ بنایا جائے جس میں تعمیری حیثیت سے پتھروں کے گھڑنے کی ضرورت ہو۔ آگے چل کر گوسالہ پرستی کی تردید بتاتی ہے کہ کسی ایک یا چند دھاتوں سے کسی جانور کی صورت بھی پرستش کے لیے نہ بنائی جائے۔ اور اس کے بعد بعل، زہرہ اور اشتروت کے بتوں سے بنی اسرائیل کا باز رکھا جانا یہ بتاتا ہے کہ سیاروں اور ایسے ہی قدرتی نمونوں کے بت بنا کر ان کی پرستش نہ کی جائے۔ کیا حجرِ اسود کی یہی صورت توریت کے کسی اعتراض کے اندر تھی؟ نہیں۔

قرآن شریف اور بت پرستی کی قسمیں

ہمارا ہدایت نامہ بھی یہ تین باتیں پیش کرتا ہے کہ: اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳: ۶۴) (سوا اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں۔ کسی چیز کو اس کی طاعت میں شریک نہ کریں۔ اور سوائے خدا کے اپنے میں سے کسی کو اپنا خدا نہ بنالیں) ظاہر ہے کہ قرآن پاک کو اپنی تیسری صورت کی جو ضرورت محسوس ہوئی تھی وہ اس غلو کے لحاظ سے جو مسیحیوں میں حضرت عیسیٰ کے اپنے متعلق بعض کمی احتیاط کے فقروں سے پیدا ہوگئی۔ حضرت موسیٰ جانتے تھے کہ فراعنہ مصر اپنے کو سجدہ کراتے ہیں جس کا متاخرین انبیاء نے بنی اسرائیل کو اپنے دو فاتحین یعنی اہل بابل اور اہل روم سے بھی تجربہ ہوا۔ قطع نظر اس خیال کے کہ قوموں نے جو کم ترقی علمی اور عقلی زمانہ میں تھیں انھوں نے اپنے بعض مشاہیر کی بت سازی میں جو پیشتر ان کی یاد اور وقعت کے لحاظ سے ہو آئندہ یہ ترقی کی کہ انھیں خدا کا کوئی اوتار سمجھنے لگے۔ بنابرایں اس ضروری امر کو بھی جس کے طرف یہودیت اور مسیحیت میں خاص توجہ نہیں دلائی گئی تھی اسے اسلام نے پورا کیا۔

جو ملل ماضیہ کا متمم تھا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہم مسلمان کعبہ یا حجر اسود کی عبادت کرتے ہیں؟ آیا ہم اسے خدا کی عبادت میں شریک کرتے ہیں؟۔ نہیں۔ اور تیسری صورت یعنی "اپنے میں سے خدا بنا لینے کی" محض انسان کے لیے مختص ہے جو کعبہ اور حجر اسود کے لیے صادق نہیں آسکتی۔ بیت المقدس میں تو یہ بھی جائز رکھا گیا تھا کہ ایک صندوق قانون کی لوحیں رکھنے کے لیے بنایا جاتا اور دو فرشتوں کی مورتیں ہوتیں جو اپنے پروں سے صندوق پر سایہ کیے ہوتے۔

"جس میں" نہ کہ "جس کی"

کعبہ تو وہ گھر ہے جس میں عبادت کی جاتی ہے نہ کہ جس کی عبادت کی جاتی ہو، اور اس میں حجر اسود ہے جس کا تمام قابل اعتراض احترام مس کرنے اور بوسہ دینے تک محدود رہا اور ہے۔

کعبہ کی قدیم تاریخ

کارلائل کہتا ہے کہ ڈیوڈورس سیکولس سنہ مسیحی سے نصف صدی قبل کا ذکر کرتا ہے کہ وہ اس کے زمانہ کا نہایت ہی قدیم اور محترم معبد ہے۔ "بے شمار عبادت کرنے والوں کی آنکھیں آج بلکہ ہمیشہ دن میں پانچ مرتبہ اس کی طرف پھرتی ہیں۔ انسانی مساکن میں مشہور ترین مرکز ہے"۔

کعبہ اور حجر اسود کی تعظیم کے متعلق ابتدائے اسلام سے آج تک مسلمانوں کا کیا طرز عمل رہا

حضرت سرور عالم نے کیا کیا اور تیرہ صدیوں کے ابتدا سے آج تک مسلمان کیا کرتے رہے۔ منہاج النبوۃ دیکھو کہ حضرت نے فتح مکہ کے بعد "جب حجر اسود کے برابر پہنچے اِستلام کیا اسے یعنی ہاتھ سے مس کیا اور بوسہ دیا اس کے تئیں ــــ اور بعد استلام حجر سرور عالم نے شروع کیا طواف کرنا"۔ اس کتاب میں حجۃ الوداع کے زمانہ میں ہے کہ: "اور حالت استلام یہ کہتے تھے: بسم اللہ اللہ اکبر اور کبھی پیشانی اس پر رکھتے تھے اور اس جگہ سجدہ کرتے اس وقت بوسہ دیتے اس کے بعد "جب صفا کے نزدیک آئے یہ آیہ پڑھا: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ــــ (۲: ۱۵۸) پس صفا کے اوپر چڑھے ایسے کہ کعبہ کو دیکھ سکے ــــ اور تکبیر کی اور کہا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" ــــ مسلمانوں نے اس وقت سے آج تک کعبہ اور حجر اسود کو کیا سمجھا۔ نہ ان میں سے کسی کو خدا سمجھا۔ نہ خدا کا اوتار سمجھا، اور نہ ان میں سے کسی کو خدا کی کوئی قوت یا قوتیں حوالہ کیں۔ کعبہ کو اگر بیت اللہ سمجھا یا بیت الحرام کہا تو حجر اسود کو حجر اسود کہا۔ حج اس طرح کیا جس طرح اپنے ہادی کو دیکھا تھا یا جس طرح حکم ملا تھا۔

فلسفہ حج اور علیؑ

مولانا امیر المومنین اپنے خطبہ قاصعہ میں تعصب اور تکبر سے پرہیز کرنے اور تواضع اور فروتنی اختیار کرنے کی مثالیں دیتے ہوئے فرماتے ہیں: "کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ پروردگار عالم نے اپنے بندگان اولین کو ابتدائے حضرت آدم صلوۃ اللہ وسلامہ علیہ سے لے کر اس عالم موجودہ کے آخرین تک پتھروں کے ساتھ آزمایا، ایسے پتھر جو نہ ضرر پہنچا سکتے تھے نہ نفع، نہ دیکھتے سنتے تھے۔ ان پتھروں کو اپنا ایسا بیت الحرام بنایا جسے لوگوں کی منفعت کے لیے قرار گاہ اور تکیہ گاہ قرار دیا۔ اور بہ لحاظ پتھر کے قطعات زمین میں سے نہایت ہی سخت قطعہ۔ بروئے کلوخ و زمین خشک دنیا کے شہر، سخت پہاڑوں، ریگ کے ٹیلوں، کم آب چشموں اور متفرق قریات کے درمیان اسے ایک نہایت ہی تنگ وادی قرار دیا۔ نہ شتر اس میں پرورش پا کر تر و تازہ اور فربہ ہو سکتے ہیں نہ سمدار حیوان

نہ گھروں والے۔ پھر آدم اور اس کی اولاد کو حکم دیا کہ قصد اور توجہ کو اس کی طرف مائل کریں۔ پس وہ (بیت الحرام) ان لوگوں کے منافع سفر کا مرجع۔ ان کے بوجھ اتار دینے کے مکان کی انتہا ہو گیا منقطع ہو جانے والے سمندروں کے جزیروں، گہری غاروں میں واقع ہونے والے مکانوں، بے آب و گیاہ اور دور و دراز بیابانوں سے سفر کرتے ہوئے دلوں کے میوے اس کی خواہش کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ نہایت شوق کے ساتھ اطاعت کی حالت میں اپنے شانوں کو حرکت دیتے ہیں۔ اس کے اطراف میں خوشنودی خدا کے لیے صدائے لبیک بلند کرتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ کے لیے بالوں کو پریشان اور غبار آلود کیے ہوئے ایسی حالت میں اپنے پاؤں پر دوڑتے ہیں کہ اپنے پیراہنوں اور لباسوں کو پشت پر لاد رکھا ہے۔ اپنے بدن کے حسین مقامات کو بال نہ ترشوانے کے سبب سے زشت اور بد روپ کرلیا ہے اور یہ حکم، امتحان عظیم، آزمائش شدید، ایک بین جانچ پڑتال اور انتہائی رستگاری کے لیے متعین فرمایا اور اس امتحان و آزمائش کو اپنی رحمت کے سبب سے جنت تک پہنچ جانے کا سبب اور وسیلہ قرار دیدیا۔ اگر پروردگار عالم اپنے بیت الحرام اور اپنی عبادت کے بزرگ مقامات کو باغات، نہروں، نرم اور ہموار زمینوں، میوے کے قریب پہنچے ہوئے درختوں کے جھنڈ، گندم کے دانوں سرسبز مرغزاروں، باغات والے کشت زاروں، پانی سے سیراب رہنے والے اطراف، تروتازہ زراعتوں، اور آباد رستوں کے درمیان واقع ہونے والے قریات میں قائم کرتا۔ تو بے شک اس امتحان کی نرمی کی بنا پر جزا اور ثواب کی مقدار بھی بالکل قلیل کر دیتا۔ وہ بنیادیں جن پر بیت الحرام محمول ہے۔ وہ پتھر جن کے سبب سے بیت اللہ بلند اور رفیع ہے اگر سرسبز زمرد، سرخ یاقوت اور نور و روشنی کے درمیان واقع ہوتے تو بیشک اس کے سبب سے سینوں میں شبہات کے غلبے کو خفیف اور ضعیف، ابلیس کی کوششوں کو قلوب سے الگ اور شک و شبہ کے مقامات کو لوگوں سے دور کر دیتا لیکن پروردگار عالم اپنے بندوں کو طرح طرح کی سختیوں سے آزماتا ہے۔ قسم قسم کی مشقتوں سے ان کی عبادت کی تحقیق کرتا ہے انواع انواع کے مکروہات میں مبتلا کرتا ہے۔ کیوں؟ ان کے دلوں سے تکبر کو خارج کرنے کے لیے، فروتنی، ذلت اور انکساری کو ان کے نفوس میں جگہ دینے کے لیے اور اس لیے کہ اس امتحان و آزمائش کو اپنے فضل و کرم کے طرف کھلے ہوئے دروازے، اپنی بخشش اور معافی کے لیے آسان سبب مقرر فرمانے"۔

حج تقویت دین کے لیے ہے

ایک دوسرے خطبہ میں فرضیت حج "تقویت دین کے لیے"۔ فرماتے ہیں۔

ان تمام باتوں کے لکھنے سے میں خلیفہ کے تجربہ بت پرستی کا منکر نہیں ہوں لیکن میری غرض یہ ہے کہ ناحق خلیفہ نے حجر اسود کو پتھر کہنے کی تکلیف گوارا کی۔ اس کا نام ہی حجر ہے اور اندھا بھی اسے ٹٹول کر پتھر کہہ سکتا ہے۔

بے کار ریمارک کا بُرا اثر

ایسی صورت میں کہ خلیفہ نے اپنے اس برہنہ ریمارک کی تاویل کسی وجہ سے نہیں کی۔ ہم کوئی مورخ یا متکلم وہ کھوٹی نہیں دکھا سکتا جس میں اس کی دلیل اٹکائی جا سکتی ہو۔ لیکن خلیفہ نے جس خیال سے کیوں نہ کہا ہو جس میں اہانت شعائر اللہ ایک ایسی فربہ بات ہے جسے ہر شخص دیکھتا ہے۔ متکلمین اور مورخین نے اپنی تاویل میں اس قدر حمایت نہیں کی جس قدر اور پردہ ہٹا دیا اور دلیلیں وہ لائے جو نہ صرف خدا کے حکم، رسول کے طرز عمل، مسلمانوں کی بجا آوری حکم اور عمل کے مخالف ہے۔ بلکہ کسی طرح

عقل کے نزدیک ادنیٰ توجہ کی چیز نہیں ہے۔ فلسفیانہ نقطہ خیال، اور توحید مذہب دونوں "صنم پرستی" کے الزام کو مغرورانہ نفرت سے ٹال دیتی ہے۔ مُسلمان جانتے ہیں کہ ان کے ہادی کی تعلیم اور مُسلمانوں کے عمل سے توحید کامل ہوئی۔ استلام اور اعمال حج کی اس شان نے بھی معترضین کو باز نہیں رکھا کہ مس کرتے وقت مس کرنے والا خدا کے نام سے شروع کرتا ہے اور خدا کے بزرگ ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ صفا اور مروہ کو شعائر اللہ کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ سوا خدا کے کوئی خدا نہیں ہے، وہ اکیلا ہے اور اس کا شریک نہیں ہے، اسی کا ملک ہے اسی کے لیے تمام حمد ہے اور وہی تمام چیزوں پر قادر ہے۔

کعبہ اور حجر اسود کے احترام کی وجہ

یہ واقعہ ہے کہ اوائل اسلام سے آج تک نہ صرف ہادی اسلام نے حجر اسود اور کعبہ کا احترام کیا، بلکہ مُسلمان بھی کرتے رہے۔ نہ اس وجہ سے کہ ڈیوڈورلس نے اسے قدیم کہا ہے یا پولوس یعنی ابن مریمؑ کا حواری اپنے سفر عرب کے زمانہ میں یہاں گیا ہوگا، نہ اس وجہ سے کہ سالوسٹوڈی سالسی کہتا ہے کہ قرینہ ہے کہ اجرام سماوی میں سے کسی جرم کا کوئی شکستہ ٹکڑا ہے۔ نہ اس وجہ سے کہ حضرت ابراہیم نے اس پتھر پر خدا کے نام کے لیے قربانی کی ہوگی، یا یہ ٹکڑا بہشت سے آیا ہوگا۔ یا اس لیے کہ یہود، نصاریٰ، موحدین، اور صابئین نے منفرداً اور مجموعتاً اسے اپنا معبد قرار دیا، اور ایک نا معلوم زمانہ سے اس جگہ کو عبادت گاہ بننے کی خصوصیت حاصل ہوئی۔ اور اس وجہ سے اسے خدا کی خالص عبادت گاہ بنانا اس مفہوم میں مفید ہوا کہ اس مرکز سے خیال تقدس کا سلسلہ شکست نہ ہونے پائے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ عالم کے سب سے بڑے نقیب توحید نے اس مقام کو عبادت الٰہی کے لیے مخصوص کیا، اور اس وجہ سے کہ ہمارے ہادی کے دست اقدس اس سے مس ہوئے۔ ہم کو اپنے ہادی کا عمل اور حکم معلوم ہے۔ اگرچہ تخصیص کے وجوہات معلوم نہ ہوں۔

انسان بہت سی چیزوں کی تعظیم کرتا ہے لیکن کوئی اسے بت پرستی نہیں سمجھتا

ہم کس کس چیز کی فہرست دیں جن کی انسان تعظیم اور احترام کرتا ہے۔ کیا انسان اپنے والدین کی تعظیم اور احترام نہیں کرتا ہے۔ یہاں تو نہ صرف تصویر ہے بلکہ گوشت اور خون بھی ہے اور ہماری تخلیق کی ایک بڑی وجہ ہے انسان جھکتا ہے۔ وہ سب جھکتا ہے جو انسان میں اچھا ہے اور اپنے اس اطاعت احترام اور تعظیم کو سعادت سمجھتا ہے۔ سوچو ایک ایسے وقت کو جب کہ انسان ایک بڑے پہاڑ کے نیچے کھڑا ہے، ٹھوس، سیاہ مادے کا ڈھیر جو ہمارے قد سے ہزار ہزار درجہ بلند اور عریض ہے۔ کیا معلوم ہوتا ہے۔ محسوس خوف، ہماری کیا حالت ہوتی ہے۔ اگر ہم بہتے ہوئے صاف، عمیق اور چوڑے دریا کے قریب کھڑے ہوتے ہیں، دیکھتے ہیں کہ ایک چوڑا سیال جسم لہریں لیتا اور ٹھکراتا ہوا بڑھتا چلا جاتا ہے، ایک کیفیت لطف اور محویت طاری ہوتی ہے۔ ہم اس کی عظمت سے مرعوب ہوتے ہیں۔ سب نہ ہوتے ہوں گے، جو مادے کی ان مختلف اور جسیم شکلوں کو دیکھ کر فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (۲۳ : ۱۴) کہہ دیتے ہوں۔ لیکن ان احساس کے منکر نہیں ہو سکتے۔ کیا ہم لوگ اپنے اس احساس سے عناصر پرستی کے حد کے اندر آتے ہیں؟۔ بے شک بغیر ارادہ بھی ہمارا تمام خاصہ جسمانی اور روحانی خوف اور عظمت سے متغیر اور منقلب ہو گیا۔ ہماری فطرت ہیجان میں آ گئی۔ کیا یہ احساسات فلسفہ توحید کی اعلیٰ ترین ترقی میں کبھی شرک اور بت پرستی کے حد کے اندر آئے۔ نہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ:

"ملتے جلتے" کے وسیع المعنی فلسفے کے بالمقابل ہے۔

حج کا منظر

حج کا فلسفہ اور اس کی صورت جن روشن لفظوں میں دکھائی گئی ہے وہ جناب امیر کا حق تھا۔ بندہ عجز، فروتنی اور انکساری سے اپنے معبود کی عبادت کے لیے دل و جان سے آمادہ ہوتا ہے۔ اس کی سراسیمگی اور حیرانی، اس کا عین ہوش ہے۔ وہ لبیک کہتا ہے۔ گویا مالک کی صدا پر خادم صدا دے رہا ہے۔ یہ عبادت کا سب سے عظیم اور اظہار عبودیت، اخلاص اور محبت کا وہ ٹکڑا ہے جس کے بے شمار عناصر کی تشریح نہیں ہو سکتی۔ اور ہو سکتی ہے تو اس کا لطف اور خوبصورتی قائم نہیں رہ سکتی۔ ایک نہیں ہزاروں نہیں لاکھوں بندے اس طرح خدا کی عبادت میں مشغول ہیں۔ اس کا تماشہ نہیں ہے کہ لوگ کیا کر رہے ہیں، بلکہ توحید کا تماشہ ہے کہ کس طرح مختلف صداؤں، لہجوں، زبانوں ترتیب اور جماعتوں سے وحدانیت اپنے کو بلند کرا رہی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ کعبہ، حجر اسود، صفا اور مروہ ان میں سے کوئی یا سب مل کر توحید کا کوئی جزو نہیں ہے۔ نہ توحید بغیر اس کے ناکامل ہے۔ ہم اپنے کمرہ کے تمام دروازے اور سوراخ بند کر کے اقرار توحید کر سکتے ہیں۔ اسلام نے عبادت کے لیے کسی مخصوص مقام کی قید نہیں کی ہے۔ خدا محیط کل ہے۔ اس کی عبادت ہر جگہ ہو سکتی ہے۔ نہ فرضیت حج اس کے منافی ہے، بلکہ اس کے فرض ہونے کے وجوہات میں اصل وہی وجہ ہے کہ "تقویت دین" کے لیے ہے۔ قوت خیالی ہو یا عملی، تنہائی میں نہیں ہے بلکہ مجموعہ میں ہے۔ عمر بھر گوشہ میں عبادت کرنے والا ایک مرتبہ دیکھتا ہے کہ ہم ہی نہیں، بلکہ ہماری طرح اور بندے بھی اسی طریقہ سے عبادت کر رہے ہیں۔ جس طرح ہم کرتے ہیں۔ وہی خیال جو ہماری روح کی تسکین ہے دوسروں کا بھی رہنما ہے۔ نوعیت انسانی، رسم و رواج، زبان، لہجہ، آب و ہوا، کوئی چیز ایسی نہ تھی جو اس خیال سے مغلوب نہ ہو جاتی۔ یہ اعتقاد کی بلندی اور تقویت کا باعث ہوتا ہے اور اس کے بعد ان ہم خیالوں میں جو محبت پیدا ہوتی ہے وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں رہتی۔ یہ حالت ساخت قومیت کے اس نظریہ کی تابع نہیں رہتی کہ مذہب، زبان، نوعیت اور رسم و رواج اور آب و ہوا ایک ہو، بلکہ محض مذہب وہ حکومت ہو جاتی ہے۔ جس کی ماتحتی دیگر عناصر کی ناموجودگی میں بھی پاشان جسم اور اعضا کو ایک رکھ سکتی ہے۔ یہ قوت ہے بلکہ وہ قوت ہے جو کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ کسی اور کا ایسا جاندار خالص مرکز نہیں ہے۔ اس کا مرکز قرار دینا بانی ملت و مذہب کی مؤید من اللہ عقل کا کام تھا۔ جس سے مسلمان ابدالآباد تک اصول معاشرت کی ہر قسم کی ترقی کے باوجود مذہبی، معاشرتی، سیاسی نفع اٹھا سکتے تھے اور اٹھا سکتے ہیں۔ اس مرکز کی تحقیر کرنا یا اس کے ساتھ عدم مرکزیت کے باعث خیالات کو ملا دینا نہ صرف اس کے تقدس پر حملہ ہے بلکہ اس کل کے پرزے علیحدہ علیحدہ کر دینا ہے جو نہ صرف قوم بناتی ہے بلکہ شکستگی دور کرتی ہے۔

کعبہ کے اسبابِ آرائش کے فروخت کرنے کی تجویز

اب جو روایت میں بیان کرتا ہوں وہ متذکرہ صدر واقعہ کا ایک ضمن سمجھا جا سکتا ہے میں نے اسے تہذیب المتین فی سیرۃ امیر المومنینؑ اور نیرنگ فصاحت ترجمہ نہج البلاغہ میں دیکھا ہے۔ جسے میں آخر الذکر سے نقل کرتا ہوں: "زمانہ عمر خطاب میں لوگوں نے کعبہ کی آرائشوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کعبہ کو ان آرائشوں کی کیا ضرورت ہے۔ اگر آپ انھیں وہاں سے اٹھا کر کسی لشکر کی تیاری میں صرف کریں تو یقیناً باعث ثواب ہوگا۔ خلیفہ صاحب نے بھی یہ رائے پسند کی اور ارادہ کر لیا کہ کعبہ کی تمام آرائشوں کو برطرف کر دیا جائے۔ اور حضرت

امیر المومنین علیہ السلام سے بھی اس بارہ میں رائے دریافت کی حضرت نے فرمایا: بے شک قرآن نبی پر نازل کیا گیا ہے اور مال کی چار قسمیں تھیں (مسلمانوں کا مال فی، خمس، زکوٰۃ) اور کعبہ کی آرائشیں اس روز (نزول قرآن کے وقت) بھی ایسی ہی تھیں جیسے آج ہیں۔ مگر خداوند عالم نے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اب سوچنا چاہیے کہ خداوند عالم سے سہو و نسیان کے باعث یہ فرد گزاشت نہیں ہوئی۔ نہ اس کا مکان اس کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔ پس تو بھی ان آرائشوں کو وہیں قائم رکھ جہاں خداوند عالم اور اس کے رسول نے انھیں قائم رکھا ہے"۔

وہ درخت کٹوا دیا گیا جس کے سایہ میں رسول نے جہاد کی بیعت لی تھی

دوسرے ایک واقعہ کو ابن خلدون بیان کرتا ہے کہ "فتح مکہ سے پیشتر جس درخت کے نیچے بیٹھ کر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں سے جہاد پر بیعت لی تھی۔ اور زمانہ عمر فاروق میں لوگ اس کو متبرک سمجھ کر زیارت کرنے کو آنے لگے تھے۔ انھوں نے یہ دیکھ کر اس کو کٹوا دیا کہ آئندہ مبادا اس کی پرستش ہونے لگے۔ اور رفتہ رفتہ اس کے ذریعہ اسلام میں شرک نہ ہو جائے۔ اصل یہ ہے کہ اسلام انھیں غلطیوں کے مٹانے اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت سکھانے کو آیا ہے۔ آج کل کا زمانہ ہوتا تو بے چارے عمر فاروق پر خدا جانے کس چیز کو فتویٰ دیدیا جاتا"۔

مذکرہ عبارت میں مترجم اور مورخ کی دلیل اور کوشش کو دور کرنے کے بعد واقعہ صرف اس قدر رہ جاتا ہے کہ "فتح مکہ سے پیشتر جس درخت کے نیچے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے جہاد پر بیعت لی تھی اسے انھوں (عمر) نے کٹوا دیا"۔

تاریخی حیثیت ہوگئی تھی

اس میں بات کوئی غیر معمولی نہیں ہے جس پر توجہ دلانی ضرور ہو۔ بجز اس کے کہ یہ درخت وہ نشان تھا جہاں ایک سخت وقت میں ہمارے ہادی کو تجدید عہد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور وہ عہد جہاد کے لیے تھا۔ اس لحاظ سے اب اس مقام کو نہ صرف ایک تاریخی واقعہ کی یاد سے تعلق تھا بلکہ نبیؐ عربی کی ذات اقدس نے اس میں اور بھی محبت کا جز شامل کر دیا تھا۔ کوئی عجب نہیں ہے کہ لوگ اس مقام کو دیکھنے آتے ہوں اور دم لیتے ہوں اور ایک مہتم بالشان واقعہ کی تمام کارروائی ان کے نگاہ کے سامنے گزر جاتی ہو۔ خبریں کہتی ہیں کہ خلیفہ نے پہلے لوگوں کو اس کے قریب جانے سے دھمکایا اور پھر کٹوا دیا۔ یہاں تک کہ مناہج النبوۃ اور قرۃ العیون میں باختلاف الفاظ یہ خیال پایا جاتا ہے کہ: "حدیبیہ نام ایک کنویں یا درخت کا ہے کہ اس مکان (جگہ) میں تھا ــــ اور وہ مکان حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمان ہدایت نشان میں متعین اور معلوم تھا۔ اور صحابہ کے عہد مبارک میں وہ مبہم اور مجہول ہو گیا۔ اب آدمی زیارت اس کی سے محروم ہیں۔ اس کی جہت مسافت کی معلوم ہے مگر مخصوص اور متعین نہیں ہوتا"۔

اور اگرچہ تھوڑے ہی زمانہ کے بعد لوگوں نے موضع شجرہ میں ایک مسجد بنا لی لیکن سعید بن مسیب کو شجرہ کے صحیح مقام کا تعین نہ ہوا اور انھوں نے اپنے باپ کا قول نقل کیا جو بیعت رضوان میں شریک تھے کہ: "جب بالہر آئے ہم سال آئندہ فراموش کیے گئے ہم اس موضع کے تئیں جو شجرہ تھا پس قدرت نہ پائی ہم نے اس کے دریافت پر اور مشتبہ ہوا وہ مکان او پر ہمارے"۔

ہمارے جو آثار رسول کے ساتھ بے لحاظی کی وجہ سے بڑے ہو جاتے ہیں

ہم مسلمان اس واقعہ پر باوجود صدیاں گزر جانے کے اس محبت اور عقیدت کے لحاظ سے متاسف ہو سکتے ہیں جو ہمیں وراثۃً اور عملی حیثیت سے ملے ہیں اور سوچ سکتے ہیں کہ آثار رسولؐ کے ساتھ یہ بے رحمی بھی جائے گی۔ اگر وہ چیزیں نیست و نابود کر دی جائیں جو ان کے یاد آنے کا ایک وسیلہ تھیں۔ لیکن حقیقتاً ہم پر ویسا اثر نہیں پڑ سکتا جیسا ان لوگوں پر جنھوں نے جناب اقدس نبوی کی زیارت کی تھی۔

قرآن میں ذکر کیے جانے کے قابل درخت

اور اس قرآن میں ذکر کیے جانے کے قابل درخت ﴿ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ ﴾ (۴۸ : ۱۸) کے نیچے بیعت کی تھی۔ اور جنھیں وہ تمام حالتیں یاد آجاتی ہوں گی جنھیں اس عہد کی ضرورت ہوئی تھی۔

تاریخی مماثلتیں

ہم لوگ جو میموریل اور اسٹیچو کے زمانہ میں ہیں ہر روز دیکھتے اور سنتے رہتے ہیں کہ قومیں کس طرح اپنے افراد کی یاد قائم رکھنے کے لیے ایسے سامان ضروری سمجھتی ہیں اور اہتمام کرتی ہیں، خلیفہ کا یہ فعل ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ عبد الوہاب نجدی کے ایسے مسلمان کے علاوہ مسلمانوں کو بھلے معلوم ہوں جن کے مزید واقعات تاریخ روم (ترک) میں مل سکتے ہیں۔ حقیقتاً عبد الوہاب کا نہایت مشہور فعل مسلم بن عقبہ کی شاگردی تھی اور اس کے بعد ناظرین اور طلبائے تاریخ کے سمجھنے کی بات ہے کہ ابن عقبہ اور ابن نمیر وغیرہ نے یہ اور اس کے بعد خانہ کعبہ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ کس مصلحت کا نشو تھا!

ایسی الزام دہی جس کے مسلمان کبھی مرتکب نہ تھے

وہ متکلمین جو نبی عربی کی تعلیم توحید اور قلع شرک کے بعد ہم پر اس کے عود کرنے کا خوف طاری کرتے ہیں غالباً نہ انھوں نے یہ خیال کیا کہ عقیدہ توحید کے کامل نشو کی ابتدا اس زمانہ میں ہو چکی، نہ انھوں نے اس پر غور کیا کہ ایک عقیدہ باطل کا ترک طبعاً اس کی طرف عود کرنے سے روکتا ہے۔ نہ انھوں نے یہ سوچا کہ نفرت شرک جس درجہ کی مسلمانوں کی پہلی نسل کے خیال میں ذخیرہ کر دی گئی تھی وہ کبھی قیامت تک صرف اور ختم نہ ہوگی۔ مسلمانوں کی خدا پرستی کا وہ سب سے کم بین مورخ ہوگا جو اس سے خوف کرے کہ وہ شجر پرستی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ غالباً حفاظت مذہب اور ترقی کی یہ حیرت خیز کوشش ہوگی کہ مسلمانوں کو اس گناہ کا الزام لگائے جس کے وہ مرتکب نہ تھے۔ اس خوف سے کہ آئندہ زمانہ میں وہ مبتلا نہ ہو جائیں اور یہ اس لیے کہ انھیں کسی کے فعل کی حفاظت کے لیے کوئی اور کارگر دلیل نہیں ملتی تھی۔

خلیفۂ ثانی اور احادیثِ رسولؐ

اس کے بعد مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ شعائر اللہ یا آثار رسولؐ کے متعلق نہیں ہے بلکہ عین جناب رسالت مآب کی احادیث کے متعلق ہے۔ اور جس طرح متذکرہ صدر امورات کے متعلق جو کچھ خیالات خلیفہ کے ظاہر کیے گئے ہیں ان کی کوئی وجہ اور غرض خلیفہ کی زبانی نہیں ہے جو متکلمین اور مورخین نے بیان کی ہے۔ اسی طرح پیش نظر امر کے متعلق بھی خلیفہ نے ریمارک کرنے میں اپنی غرض کو ظاہر نہیں کیا ہے، بلکہ صرف مورخین نے ریمارک کے ساتھ کوئی غرض لگا دی ہے۔

صاحب سیرۃ الفاروق فرماتے ہیں: "احادیث کے نسبت حضرت عمر کا ایک ممتاز اصول جو دکھائی دیتا ہے وہ یہ ہے کہ حدیثوں کی کثرت روایت کو روکتے تھے"۔ پھر فرماتے ہیں: "حضرت عمر کی روایت حدیث کی مخالفت صرف ان کی قلت روایت ہی سے نہیں ظاہر ہوتی بلکہ وہ اس کی علانیہ طور پر مخالفت کرتے تھے۔ اور دانستہ حدیثوں کی کثرت کو روکتے تھے"۔ کوفہ اور عراق جانے والوں کو احادیث کم بیان کرنے کی وصیت کرتے ہوئے کہا کہ: "ان کو حدیثوں میں نہ پھنسا لینا"۔

قرآن کی تفسیر کم کرنے کا حکم

اسی مؤرخ نے آگے چل کر ان کے اقوال میں لکھا ہے کہ: "قرآن کی تفسیر اور رسول اللہ سے روایت تھوڑی کیا کرو، اس میں میں بھی تمہارا شریک ہوں"۔

مؤلف الفاروق حکم کی غرض بتاتے ہیں

مولوی شبلی صاحب الفاروق میں خلیفہ کے حکم کو مع وجہ کے بیان فرماتے ہیں کہ: "حضرت عمر اس ڈر سے کہ صحابہ آنحضرت سے روایت کرنے میں غلطی نہ کریں صحابہ کو حکم دیتے تھے کہ رسول اللہ سے کم روایت کریں"۔

حکم اور غرض پر نظر

اس میں غور طلب امر یہ ہے کہ آیا کم روایت کرنا غلطی کے خوف کو مرتفع کر دیتا ہے؟ نہیں۔ اس لیے کہ یہ بہت ممکن ہے کہ کسی کی کم گوئی اسے غلط بیانی سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ ہوا صرف اس قدر کہ اگر اس کم گو لیکن غلط بیان شخص سے کم گوئی کی حالت میں تھوڑی غلطیاں ہوئیں تو زیادہ گوئی کی مقدار کے لحاظ سے غلطیاں وزن میں زیادہ ہوتی جاتیں۔ یعنی اس حکم نے کسی طرح غلط بیانی کا انسداد نہیں کیا۔ یہ حکم کم بیان کرنے کے متعلق ہے۔ قابل سوانح نویس کہیں یہ حکم نہیں لکھتے کہ صحیح روایات بیان کرو اگرچہ تمہیں زیادہ یاد ہوں۔ اور اس سے مقدار بڑھ جائے۔ اس کم گوئی کے حکم میں اگرچہ صحیح گوئی کے لیے کوئی رعایت ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے لیکن میں بحث کے لیے اسے قبول کر لیتا ہوں کہ غیر صریح منشا یہی تھا مگر اس کا معیار کیا تھا کہ اس کے بعد جو کہے گا وہ صحیح کہے گا۔ اور یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ اگرچہ کوئی کیسا ہی صحیح کیوں نہ کہے لیکن جہاں کچھ زیادہ کہا وہ غلط بیانی کے میدان میں آ گیا۔ یہ ایک حکم تھا جس نے کسی طرح صحیح گوئی کی مدد نہ کی، بلکہ اپنے ہیئت سے جس کی غرض مقصود ہے صحیح گوئی پر لگام چڑھا دی۔

اس کا اثر

غلط بیانی کا روکنا کسی طرح امکانی بات نہ تھی جو کچھ انسداد ممکن تھا وہ یا تو کسی حد تک تقریر و تحریر سے یا خلاف ورزی کا ثبوت ملنے پر سزا کرنے سے بلکہ جو طرز عمل کہ نہایت منصفانہ اور ناقابل اعتراض معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جس میں زیادہ تر اصحاب رسول زندہ تھے اور یہ تمام لوگ اگرچہ کل احادیث کی تصدیق نہ بھی کر سکتے ہوں اور باوجود اس کے کہ رسول کے بعض اصحاب کو معلوم ہوں لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ وہ امورات جو شرع اور عامہ مسلمین سے متعلق ہوں اس کے متعلق وہ لوگ رسول کے احکام اور اصول نہ سن چکے ہوں۔ اس لحاظ سے یہ بہت آسان تھا کہ کوئی حدیث جو کسی صحابی کے زبانی غیر معمولی معلوم ہوتی وہ جانچ کے لیے ان اصحاب کے حوالہ کی جاتی اور وہ انکار یا تصدیق کرتے۔ نہ کہ ایک ایسا حکم صادر کر دیا جاتا جس سے لوگ احادیث بیان کرنا حکومت کے حکم کے خلاف سمجھ کر خوف زدہ ہوتے۔ حضرت عمر کے لیے کافی تھا کہ وہ ایک ایسی تحریک کے باعث ہوتے جس سے آخری وقت کے

ایسے مفید موقع پر رسُولِ مسلمانوں کے لیے ہدایت کی مخصوص وصیتیں نہ لکھوا سکتے۔ نہ کہ انھوں نے اپنے دورِ خلافت کو اس سے بھی مخصوص کیا کہ کچھ لوگ ہوں جنھیں مفید شارع کے متعلق احادیث یاد ہوں اور وہ بیان نہ کر سکے ہوں اور زبان کھلنے کے قبل دنیا سے گزر گئے ہوں۔ یہ انسداد شبہات کے جواز کے ساتھ یہ خیال بھی دلاتا ہے کہ کیا خلیفہ نے کسی یا چند مخصوص امورات کے متعلق رسُول کی احادیث کو بیان کرنے سے روکا تھا؟

ان تذکروں کے بعد جس میں خلیفہ ثانی کا خود رسُول کی احادیث کے متعلق طرزِ عمل واضح ہو جاتا ہے ہمیں الفاروق کی اس عبارت پر کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ: "حضرت علیؑ کے ہم صحبت اکثر وہ لوگ تھے جو فنِ حدیث میں بلند پایہ نہ تھے۔ حضرت علیؑ سے جن لوگوں نے روایتیں کیں ان پر اعتبار نہیں کیا جاتا تھا"۔ نہ ہمیں اس پر سوال کرنے کی ضرورت ہے کہ آیا یہ ممکن ہے کہ بزازے کا کوئی معمولی دلال مانچسٹر کے کسی کارخانہ کے منیجر سے اصول تجارت کو بہتر سمجھتا ہو۔ ہمارا یہ خیال کہ آیا کسی یا چند مخصوص امورات کے متعلق رسُول کی احادیث کو بیان کرنے سے روکا تھا۔ الفاروق کی عبارت سے بہت کچھ صاف ہو جاتا ہے۔

خلیفہ ثانی کا مخاطبہ اور علیؑ

مؤلف تہذیب المتین صاحب کشف سے نقل کرتے ہیں کہ علی بن عیسیٰ اردبیلی اور ابوالموید خوارزمی نے محمد بن خالد الجہنی سے روایت کی ہے کہ ایک روز عمر بن الخطاب نے منبر پر خطبہ کہا کہ: "اے امت محمدؐ! اگر ہم تم کو اس چیز سے جس کو تم پہچانتے ہو (یعنی اسلام) اس شے کی طرف پھیر دیں جس کے تم منکر ہو (یعنی کفر) تو تم کیا کرو گے؟ راوی کہتا ہے کہ لوگ خاموش ہو گئے۔ عمر نے تین مرتبہ اعادہ کیا۔ علیؑ اس وقت گوشہ مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے۔ یہ سن کر چپ ہو گئے، اور کہا: ایسا ہو تو ہم تجھ سے توبہ کرائیں گے۔ اگر تو توبہ کرے تو تیری توبہ قبول کریں گے۔ عمر نے کہا اگر نہ مانیں؟ فرمایا: اس وقت گردن ماریں گے۔ اب کہا عمر نے: شکر خدا کا کہ اس نے اس امت میں ایسے شخص کو مقرر کیا ہے کہ جب ہم راہِ راست سے منحرف ہوں تو وہ ہماری کجیوں کو درست کرے اور ہم کو سیدھے راستہ پر لا دے"۔

میں نہیں جانتا کہ مؤرخین اس واقعہ کے متعلق کیا کہنا پسند کرتے ہیں۔ غالباً کم لوگ ہوں گے جو یہ تصفیہ کریں کہ حضرت عمر کے مزاج کے اس میلان کے لحاظ سے جو متذکرہ صدر مثالوں سے ظاہر ہوا "اس روایت کے خیالات بھی بعید نہیں ہیں"۔ حضرت عمر جانیں۔ خدا جانے یا شارحین جانیں کہ روستے کے اس پر اصرار سوال میں کیا لم تھا۔ لیکن غالباً اس وقت نہ تو ارتداد کی بجلی کڑکڑا رہی تھی، نہ بادل گرگرا رہا تھا، نہ طوفان اٹھ رہا تھا، نہ سیاہی نور پر غالب آئی جاتی جس سے کہا جا سکے کہ لوگوں کے قلوب میلان کو دھمکی سے روک رہے تھے۔

خلیفہ ثانی کا قاتل مُغیرہ بن شعبہ کا غلام ہوا

یہ باب اس حیرت خیز اتفاق پر ختم ہوتا ہے کہ ابا حفصہ کا قاتل مغیرہ بن شعبہ ہی کا غلام تھا۔ صاحب صواعق محرقہ ابولولو کو مجوسی بتاتے ہیں۔ درانحالیکہ ابن خلدون کے نزدیک نصرانی تھا۔ اسی نے خلیفہ سے شکایت کی کہ میرا مالک مجھ سے زیادہ محصول لیتا ہے، اسے کم کرا دیجیے۔ محصول ابن عمر کے نزدیک چار درہم روزانہ اور ابن خلدون کے حساب سے صرف دو درہم (سات آنہ) تھا۔ ابولولو لوہاری، نقاشی اور بڑھئی کا کام جانتا تھا۔ خلیفہ نے فیصلہ کیا کہ:

"ان صنعتوں کے مقابلہ میں یہ محصول زیادہ نہیں ہے"۔

ابولولو گھورتا ہے

فیروز اس رقم کو گراں محسوس کرتا تھا۔ جو فیصلہ سننے کے بعد اس کے اس حالت اور قول سے ظاہر ہے۔ جو ابن حجر مکی نقل کرتے ہیں کہ: "آنگاہ غلام خشم گرفت و رفت و گفت عدل او بہمہ کس رسیدہ است غیر از من"۔ یعنی: "اس وقت غلام غصہ میں آگا اور چلا گیا اور کہا کہ اس کا عدل میرے سوا سب کو پہنچا ہے"۔

یا چکی بنانے کے حکم پر: "ابولولو روئے ترش کردہ خصمانہ بجانب عمر نظر کرد و گفت آسیا بیعت تو سازم کہ مردم سالہا ازان بازی گفتہ باشند"۔ یعنی: "ابولولو نے ترش رو ہو کر دشمن کی طرح عمر کی طرف دیکھا اور کہا تیرے لیے ایسی چکی بنادوں گا کہ لوگ سالوں تک اس کی باتیں کرتے رہیں گے"۔ اس نے ایک روز موقع پاکر وار کیا۔ زخم مہلک تھا۔

نبیذ مفید نہ ہوئی زخم کھانے کے وقت خلیفہؓ کی حالت

بقول ابن خلدون: "ایک طبیب بلایا گیا اس نے عمر فاروق کو نبیذ پلائی"۔ لیکن زخم کی راہ سے باہر نکل گئی۔ اور بقول مجر و بخاری سے ابن محزمہ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ: "چون عمر را زخم خنجر زدند۔ متالم بود و جزع می کرد و ابن عباس گفت اے امیرالمومنین مبالغہ مکن در جزع"۔ یعنی: "جب عمر کو خنجر کا زخم مارا گیا درد محسوس کر رہے تھے اور جزع کر رہے تھے اور ابن عباس نے کہا اے امیرالمومنین جزع میں مبالغہ نہ کرو۔

بابؑ چہارم

مرکزی خلاف ورزیوں کی ترقی اور اس کا اثر

انتخابِ خلافت کی تیسری شکل اور اُس کی ترکیبؑ

ابا حفصہ نے دنیا سے کوچ نہیں کیا مگر یہ کہ انھوں نے خلافت کے لیے جو کچھ انتظام کیا اگرچہ اس کی غرض کتنے ہی زمانہ تک کیوں نہ پوشیدہ رہی ہو لیکن جاننے والوں سے نہ اس وقت پوشیدہ تھی جس وقت اس کا انتظام ہوا اور نہ اس زمانہ میں مبہم رہ سکتی ہے جب کہ طریقہ انتخاب کی مختلف صورتوں سے زمانہ واقف ہوتا جاتا ہے۔ اس کے خوفناک نتائج کا نشو ونما ہمارے اس باب سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ناظرین کے غور کی بات ہوگی کہ رحلت رسولؐ کے بعد سے اس وقت تک جو روش مصلحت تھی اس کے بعد کی روش کو اس کی ترقی کہنا زیبا ہے یا نہیں۔

خلیفہ ثانی کے ذہن میں انتخابؑ کی یہ تجویز پیشتر سے تھی

خلیفہ کے زخمی ہونے کے بعد جو کچھ واقع ہوا وہ یہی تھا کہ انھوں نے اپنے جانشین مابعد کی فکر کی۔ اگرچہ عموماً یہ کہا گیا ہے کہ اپنی آخری وقت خلافت کے لیے چھ شخص منتخب کیے لیکن اگر صواعق محرقہ کی یہ روایت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ: "حاکم روایت کرد کہ عمر خطبہ خواندہ گفت کہ در خواب دیدم گویا خروس مرا یک منقار یا دو منقار زد و گمان می کنم مگر آنکہ اجل مرا نزدیک شدہ و قومی مرا ماموری سازند بہ آنکہ شخص را خلیفہ سازم و تحقیق خدائے تعالیٰ دین خود را و خلافت خود را ضائع نخواہد گردانید۔ اگر امر من بسبیل تعجیل واقع شود خلافت شوری باشد میانی این شش کس یعنی عثمان و علی المرتضیٰ و طلحہ و زبیر و عبدالرحمٰن ابن عوف و سعد بن ابی وقاص کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم از ایشان راضی بود"۔ یعنی: "حاکم نے روایت کی ہے کہ عمر نے خطبہ پڑھا اور کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا مرغ نے مجھے ایک یا دو چونچیں ماریں اور میں گمان کرتا ہوں کہ میری موت قریب ہے ۔۔۔۔۔۔۔ کچھ لوگ مجھے اس امر پر پابند کر رہے ہیں کہ میں کسی شخص کو خلیفہ بنادوں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے دین اور خلافت کو ضائع نہ کرے گا۔ اگر میرے معاملے میں جلدی ہوگئی تو خلافت شوریٰ ہوگی ان چھ شخصوں کے درمیان یعنی عثمان و علی المرتضیٰ و طلحہ و زبیر و عبدالرحمٰن بن عوف و سعد بن ابی وقاص۔ کیونکہ رسولِ خداؐ ان سے راضی تھے"۔ تو اس سے ظاہر ہے کہ یہ اسکیم پیشتر ان کے ذہن میں موجود تھی۔

حضرتؓ عمر ابو عُبیدہ بن جراح سالم یا ابن عوف کو پسند کرتے

لیکن اپنے بعد کے لیے یہ طرز عمل بھی ان کی اکیلی خواہش نہ تھی جیسا طبری وغیرہ سے ظاہر ہے کہ جس وقت انھوں نے اپنے منتخب لوگوں کو بلایا اور معلوم ہوا کہ طلحہ نہیں ہے اور

انھوں نے کہا کہ مقررہ وقت میں اگر وہ آجائیں تو خیر ورنہ تم اپنا کام کرنا۔ اور جب لوگوں نے کہا کہ تم خود ہی کسی کو خلیفہ بنا دو جس طرح ابوبکر نے کیا تو کہا کہ: "اگر ابو عبیدہ بن جراح زندہ بودے او را دادی"۔ یعنی: "اگر ابوعبیدہ بن جراح زندہ ہوتے تو خلافت ان کو دے دیتا"۔

بعض نے سالم کا نام بھی لیا ہے اور بعض نے ابن عوف ہی کو منتخب کیا ہے۔ لیکن انھوں نے انکار کیا۔ طبری ہی کے موافق یہ حکم بھی ضروری سمجھا کہ اگر پانچ آدمی موافق اور ایک ناموافق ہو تو اسے قتل کر ڈالنا، اور اگر دو شخص ناموافق ہوں تو رائے اودھر ہوگی جدھر عبدالرحمٰن بن عوف ہو۔ روضۃ الصفا میں بھی ابن عوف کا موقع مقدم اور نصف مخالف کے لیے قتل کا حکم لکھا ہے۔ ابوالفدا کے نزدیک عبدالرحمٰن بن عمر اس طرف رکھے گئے جدھر عبدالرحمٰن بن عوف ہوں جس کی وضاحت ابن خلدون سے ہوتی ہے کہ:

خلیفہ ابن عوف سے کچھ عہد کیا چاہتے ہیں

"آپ (عمر) نے عبدالرحمٰن کو بلا کر فرمایا: میں تم سے کچھ عہد کیا چاہتا ہوں۔ عبدالرحمٰن نے کہا: کیا آپ مجھ سے کچھ عہد کریں گے؟ فرمایا: نہیں بخدا میں ایسا نہ کروں گا۔ جاؤ میں ان لوگوں سے عہد لوں گا جن سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) راضی و خوش تشریف لے گئے ہیں۔ یہ کہہ کر آپ نے علی و عثمان و زبیر و سعد اور خود عبدالرحمٰن بن عوف کو بلایا اور ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا: تین روز تک تم لوگ طلحہ کا انتظار کرنا، اگر وہ آجائیں تو فبہا ورنہ تم لوگ مشورہ کر کے کسی کو اپنے میں سے امیر بنا لینا۔۔۔ اور ابوطلحہ انصاری و مقداد بن الاسود کو طلب کر کے حکم دیا کہ ان لوگوں کے دروازہ پر جا کر کھڑے رہنا، اور کسی کو ان کے پاس جانے نہ دینا، جب تک وہ باہم مشورہ نہ کر لیں۔۔۔ اور عبداللہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: اگر لوگ انتخاب خلیفہ میں مختلف ہوں تو تم کثرت رائے سے موافقت کرنا، اور اگر فریقین برابر ہوں تو تم اس گروہ کے رائے سے اتفاق کرنا جس میں عبدالرحمٰن بن عوف ہوں۔

خلیفہ ولیعہد منتخب کر چکے

چنانچہ لوگوں نے عمر فاروق سے کہا: آپ اپنا ولی عہد منتخب کر جائیے۔ جواب دیا: میں کر چکا۔ ابن خلدون میں ہے کہ: "در صورت مساوات عبداللہ بن عمر حکم بنائے جائیں۔ اور عبداللہ بن عمر اس فریق سے اتفاق رائے کریں جس میں عبدالرحمٰن بن عوف ہوں"۔

علی اور عباس نے نتیجہ انتخاب ظاہر ہونے سے قبل کیا کہا اور کیوں

اب مجھے یہ کہنا ہے کہ اس انتخاب کے متعلق علی و عباس کا کیا خیال تھا۔ ابوالفدا کہتا ہے: "علی عباس کے پاس گئے اور کہا خلافت مجھ سے گئی، کیونکہ سعد عبدالرحمٰن سے مخالفت نہ کرے گا اس لیے کہ وہ چچا کا بیٹا ہے اور عبدالرحمٰن خسر ہے۔ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو خلیفہ بنالیں گے۔۔۔ اس گروہ کو چین نہ آوے گا جب تک امر خلافت ہم سے دفع نہ کرلیں"۔ یہی مضمون روضۃ الصفا میں بھی ہے کہ: "عبداللہ عثمان کا داماد ہے اور سعد بن ابی وقاص ابن عوف کا ابن عم ہے۔ اگر طلحہ و زبیر ہمارا ساتھ بھی دیں تو بے کار ہے"۔ اور ابن عباس کہتے ہیں کہ: از مکر ابن طائفہ ایمن مباش کہ ہمت بر دفع ما مقصور دارند تا دیگرے را بر مسند حکومت نشانند"۔ یعنی: "اس گروہ کے مکر سے بے خوف نہ رہو کہ ہم کو دور رکھنے پر ہمت مرکوز کیے ہوئے ہیں تا کہ ہماری مسند پر کسی اور کو بٹھائیں"۔

طبری کہتا ہے کہ: "علی با عباس گفت مارا ہمی خوانند۔ عباس گفت مگو۔ گفت چرا۔ گفت بدانکہ عمر بہ بنی ہاشم ندہد مگر کہ ہمہ گرد آیند و یک تن را خلیفہ کنند۔ تو مباش چگویم کہ کسی از بنی ہاشم آنجا نبود" یعنی: علیؑ نے عباسؓ سے کہا ہمیں بلا رہا ہے عباس نے کہا نہ جا کہا کیوں کہا جان لے کہ عمر بنی ہاشم کو نہ دیں گے جب تک کہ سب لوگ جمع ہو جائیں اور ایک کو خلیفہ بناویں تو نہ جا کہ کہہ سکوں کہ بنی ہاشم سے وہاں کوئی نہ تھا۔

صاحب تہذیب المتین نے ابن الحدید کی زبانی ایک دلچسپ موقع دکھایا ہے۔ جس میں گزرتے ہوئے خلیفہ نے طلحہ زبیر ابن عوف جناب امیر اور عثمان کے متعلق کچھ ریمارک کیے ہیں صرف آخر الذکر کے متعلق ریمارک سے بحث ہے۔ عثمان کو مخاطب کرکے کہا:

عثمانؓ کے متعلق ریمارک انتخاب کی پیشین گوئی کرتا ہے

ھاھا الیك (ایک کلمہ جس سے اونٹ ہنکاتے ہیں) میں دیکھتا ہوں کہ قریش نے بسبب محبت کے تیرے ساتھ تجھ کو فرمانروا مقرر کیا اور تو نے بنی امیہ اور پسران معیط کو خلائق کی گردنوں پر سوار کیا اور اموال فیٔ کو ان کے لیے مخصوص کرایا پس ایک گروہ گرگان عرب نے آکر تیرے فراش پر تجھ کو قتل کیا قسم بخدا کہ اگر تجھ کو خلافت ملی تو تو بغیر ایسا کیے نہ چھوڑے گا اور تو نے یہ کیا تو وہ تجھے قتل کیے بغیر نہ چھوڑینگے۔ پھر ان کی پیشانی کو ہاتھ سے پکڑ کر فرمایا جب یہ باتیں ہوں اور ضرور ہونگی تو اس وقت مجھے یاد کرنا"۔

۲۳ھ امیدواروں کے متعلق اظہار رائے

ابن عوف، علی اور عثمان

شب چہار شنبہ، ۲۸ ذالحجہ ۲۳ھ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ابن عوف کی جدت اور ذہانت پر نظر کی جائے۔ صاحب صواعق محرقہ فرماتے ہیں:

"بعد از فراغ از دفن جماعت مذکورہ یعنی اصحاب شوریٰ در یک جا جمع شدند۔ عبدالرحمٰن بن عوف گفت امر خود را بسہ کس باز گذارید زبیر گفت من امر خود را با میر المومنین امام برحق علی گذاشتم۔ و سعد گفت من امر خود را بعبدالرحمٰن بن عوف گذاشتم و طلحہ گفت رجوع امر خود را بعثمان کردم۔ چون این سہ کس بیرون شدند عبدالرحمٰن بہ عثمان و علی گفت من ارادہ این امر خلافت ندارم ہر یک از شما کہ تبرا کند ازین امر خلافت بدست او میدہم۔ و عہد خدائی و اسلام بروباد کہ در نفس خود ملاحظہ افضل کند و حریص باشد بر اصلاح حال امت آنگاہ عثمان و امیر المومنین علی رضی اللہ عنہما ہر دو سکوت درین امر اختیار فرمودند باز عبدالرحمٰن گفت اگر شما درین امر سکوت اختیار میکنید رجوع بمن کنید و خدا ایاست بر من کہ تقصیر نمی کنم از فضل ایشان ہر یک گفتند بلے بتو رجوع کردیم۔ بعد از ان عبدالرحمٰن با میر المومنین حضرت علی خلوت کردہ گفت عہد و میثاق خدائے تعالیٰ از تو میگیرم اگر ترا امیر سازیم طریقہ عدل مرعی داری۔ و اگر دیگرے بر تو امیر گردانم اطاعت و انقیاد پیش آری علی فرمود بلے قبول دارم۔ باز با عثمان رضی اللہ عنہ خلوت کرد ہمین طریق گفت۔ بعد از عہد و میثاق بیعت کرد بعثمان"۔ یعنی: "دفن سے فراغت کے بعد مذکورہ گروہ یعنی اصحاب شوریٰ ایک جگہ جمع ہوئے۔ عبدالرحمٰن نے کہا اپنے معاملہ کو تین شخصوں کے حوالے کردو۔ زبیر بولے میں نے اپنے امر عبدالرحمٰن بن عوف کے حوالہ کیا۔ طلحہ نے کہا میں نے اپنا معاملہ

عثمان کی جانب موڑا۔ جب یہ تین شخص (اس امر سے) باہر ہوگئے عبدالرحمٰن نے عثمان و علیؑ سے کہا میں اس خلافت کا ارادہ نہیں رکھتا جو کوئی تم میں سے اس امر خلافت سے اپنی بیزاری کرے اس کو خلافت اسلامی خدائی عہد اس پر ہونا چاہیے جو نفس میں افضل کا لحاظ کرنے اور امت کے حال کی اصلاح پر حریص ہو۔ عثمان اور علی دونوں اس وقت خاموش رہے۔ پھر عبدالرحمٰن بولے اگر تو اس امر میں خاموشی اختیار کرتے ہو تو میری طرف رجوع کرو۔ میرے اوپر یہ اللہ کا حق ہے کہ کوتاہی نہ کروں۔ ہر ایک نے کہا ہم نے رجوع کیا۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن نے امیرالمومنین حضرت علیؑ سے تنہائی میں بات کی کہ تجھ سے خدائی عہد و میثاق لیتا ہوں کہ اگر تجھے امیر بناؤں تو عدل کا طریقہ ملحوظ رکھو گے۔ اور اگر دوسرے کو تجھ پر امیر بناؤں تو اطاعت و انقیاد سے پیش آئیں گے۔ علیؑ نے فرمایا قبول ہے۔ پھر عثمان سے خلوت کی اور اسی طرح کی بات کی اور عہد و میثاق کے بعد عثمان کی بیعت کر لی"۔

غالباً جہاں "ذی رائے" قریش کا مرادف ہے

اسی مولف کے موافق: "ابن عساکر روایت کرد کہ مردم درین ایام نزد عبدالرحمٰن مجمع شدہ درین باب مشورت می کردند و ہیچ مرد ذی رائے (؟) نیافت کہ مائل بہ خلافت عثمان نباشد"۔ یعنی: "ابن عساکر نے روایت کیا کہ لوگ ان دنوں عبدالرحمٰن کے پاس جمع ہو کر اس بارے مشورہ کرتے تھے اور کوئی صاحب رائے مرد نہیں پایا کہ عثمان کی خلافت کی طرف مائل نہ ہوتا"۔

علی سنت خلفا کی پیروی سے انکار کرتے ہیں عثمان کی خلافت گزشتہ کی فرع تھی

اسی کے موافق: "در مسند امام احمد از ابی وائل مرویست کہ گفت عبدالرحمٰن بن عوف را گفتم چگونہ بیعت با عثمان کردید و حضرت علی را گزاشتید عبدالرحمٰن گفت گناہ من نیست۔ ابتداء بحضرت علی خلوت کردہ گفتم با تو بیعت میکنم بشرط کتاب اللہ تعالیٰ و سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اگر سیرت ابوبکر و عمر بداری و بطریق ایشان عمل میکنی۔ گفت کہ نہ دارم پس عثمان را گفتم عمل ابوبکر و عمر بروے خود قبول داری گفت قبول دارم"۔ یعنی: مسند امام احمد میں ابووائل سے مروی ہے کہ میں عبدالرحمٰن بن عوف سے کہا تم نے عثمان سے کس طرح بیعت کی اور علیؑ کو چھوڑ دیا۔ عبدالرحمٰن نے کہا یہ میرا گناہ نہیں ہے میں نے پہلے علیؑ سے خلوت کی اور کہا کہ میں تیری بیعت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر کرتا ہوں اگر تو ابوبکر و عمر کی سیرت رکھے اور ان کے طریق پر عمل کرے۔ بولے نہیں کروں گا۔ پھر میں نے عثمان سے کہا کہ عمل ابوبکر و عمر کو اپنے اوپر لازم رکھنا قبول کرتے ہو۔ اس نے کہا قبول کرتا ہوں"۔

اچھا کیا کہ ابن حجر نے یہ بھی کہہ دیا: "واضح شد کہ خلافت عثمان فرع خلافت عمر است کہ آن فرع خلافت صدیق است"۔ واضح ہے کہ خلافت عثمان خلافت عمر کی فرع ہے اور وہ خلافت صدیق کی فرع ہے۔

انتخاب کہاں ہوا

ابن خلدون کے نزدیک: انتخاب گاہ یا دار الشوریٰ مسور بن مخرمہ یا ام المومنین عائشہ کا گھر تھا۔ یہاں ابن عوف نے اہل شوریٰ سے کہا: "تم میں سے ایسا کوئی شخص ہے جو اپنے کو ان لوگوں میں سے نکال لیوے جو خلافت کے لیے نامزد کیے گئے ہیں تاکہ وہ اس امر کا منصرم مقرر کیا جائے کہ تم میں سے جو افضل و لائق ہو اس کو خلیفہ بنائے۔ کسی نے اس کا جواب نہ دیا"۔

خود ساختہ منصرم

اس کے بعد ابن عوف نے اپنے کو نکالا اور اپنے کو منصرم بنایا۔ سب اس پر راضی ہو گئے اور علی نے کچھ نہ کہا۔ اس پر ابن عوف نے پوچھا: "یا ابا الحسن آپ کیا کہتے ہیں؟"۔

علی کے شرائط اور اس کا عکس

میں بھی راضی ہوں بشرطیکہ تم اقرار کرو کہ حق کرو گے۔ اپنے ہوائے نفس کی پیروی نہ کرو گے نہ کسی کے رشتہ داری کا پاس و لحاظ کرو گے حق کہنے میں کسی کی ملامت و نصیحت کا خیال نہ کرو گے"۔

علی کے حقوق کا اقرار

عہد و پیمان کے بعد ابن عوف نے علی کو "علیحدہ" لے جا کر کہا: "تم قرابت داری رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور سابق الاسلام اور حسن مساعی دین کی وجہ سے خلافت کے زیادہ مستحق ہو اور تم سے زیادہ موزون کوئی اور شخص خلافت کے لیے نہیں ہے۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ ان لوگوں میں جو خلافت کے لیے نامزد کیے گئے ہیں تمہارے بعد کون زیادہ مستحق ہے۔ جواب دیا عثمان ابن عفان۔ پھر عثمان کو خلیہ میں لے جا کر ان سے بھی ایسا ہی کہا انھوں نے کہا: علی"۔ اس قدر باتیں ہونے کے بعد جلسہ ختم کر دیا گیا اور ان سے خلافت کے بابت چوتھے روز کی صبح تک دریافت کرتے رہے۔

زبیر اور سعد علی کو منتخب کرتے ہیں

پھر مسور بن مخرمہ کے مکان پر آنے اور زبیر و سعد کو بلا کر کہا لوگوں کا اتفاق علی و عثمان کی خلافت پر ہوتا ہے تم لوگ کیا کہتے ہو۔ ان دونوں بزرگوں نے علی پر اتفاق کیا"۔

عمار یاسر علی کی طرف

"نماز فجر کے بعد مہاجرین اور سابقین اسلام انصار و امراء لشکر کو طلب کیا ایک ساعت میں ساری مسجد پر ہو گئی تل رکھنے کی جگہ باقی نہ رہی عبدالرحمن نے حاضرین سے کہا جس کو تم لوگ خلافت کے لیے منتخب کیا چاہتے ہو اس کی طرف اشارہ کرو۔ عمار نے علی کی طرف اشارہ کیا۔ ابن ابی سرح نے کہا۔ اگر قریش کے اختلاف کا اندیشہ نہ ہو تو عثمان کے خلافت پر بیعت کی جائے۔ عبداللہ ابن ربیعہ نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ عمار و ابن ابی سرح میں گفتگو بڑھ گئی سخت کلامی کی نوبت آ گئی۔

ابن عوف نے اپنے ذہن میں خلیفہ چن لیا

سعد نے اٹھ کر کہا: اے عبدالرحمن اس سے پیشتر کہ لوگوں میں فتنہ برپا ہو جائے تم جس کو چاہو خلیفہ منتخب کر لو۔ عبدالرحمن نے جواب دیا میں نے اپنے ذہن میں خلیفہ منتخب کر لیا اور رائے قائم کر لی۔ اے لوگو ذرا دم بھر کو خاموش ہو جاؤ پھر علی کی طرف مخاطب ہو کر اور انکا ہاتھ پکڑ کر کہا تم کو اس شرط پر خلافت دی جاتی ہے کہ تم کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی تعلیم دینا اور خلیفتین (جو ان کے بعد ہوئے ہیں ان کی اتباع کرنا۔ علی نے جواب دیا کہ میں امید کرتا ہوں کہ میں اپنے مبلغ علم و طاقت کے موافق عمل کروں گا۔ یہ جواب پا کر انہوں نے عثمان سے مخاطب ہو کر یہی کلمات کہے۔ عثمان نے کہا ہاں میں اقرار کرتا ہوں کہ عین ایسا ہی کروں گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

ابن عوف عثمان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چھت کی طرف دیکھتے ہیں

عبدالرحمن نے یہ سنتے ہی سقف مسجد کی طرف سر اٹھالیا اور ان کا ہاتھ عثمان کے ہاتھ میں تھا"۔ اسی مؤرخ کے موافق مغیرہ ابن شعبہ اور عمرو

عاص دار الشوریٰ کے پاس آکر بیٹھے مگر سعد نے یہ کہہ کر اٹھا دیا کہ تم کہو گے کہ ہم بھی اراکین شوریٰ میں تھے۔ ابوالفدا میں سنت وغیرہ کے سوال پر ابن خلدون کے ثقیل اللفظ "مبلغ" کے علاوہ سب وہی جواب ہے۔ روضۃ الصفا میں اس قدر زیادہ ہے کہ مقداد الاسود نے عمار یاسر کی تائید کی۔

عثمانؓ کے دل میں علیؑ کے متعلق رائے دینے والوںؓ سے کینہ

طبری کے موافق بھی سعد اور زبیر نے علی کے لیے ووٹ دیا۔ اور اس وجہ سے "عثمان را از سعد کینہ در دل بماند"۔

بنی امیہ کی کوششیں

اسی مورخ کے موافق: "ابوسفیان عزد عمرو بن عاص شد و گفت عبدالرحمٰن عزد من شد و گفت کرا خواہی گفتم عثمان را۔ عمرو گفت من نیز عثمان را خواستم۔ ابوسفیان گفت اکنوں چہ کنم کہ او مرد نرم است و این کار بیفگند و علی بربائید۔ عمرو گفت اندیشہ مدار کہ امشب جہد و زا بہ بینم و چنان کنم کہ کار بعثمان"۔ یعنی: "ابوسفیان عمرو بن عاص کے قریب ہوا اور کہا کہ عبدالرحمٰن میرے قریب ہوا اور بولا کسے چاہتے ہو؟ میں نے کہا عثمان کو۔ عمرو نے کہا میں بھی عثمان کو چاہتا ہوں۔ ابوسفیان بولا اب کیا کروں کہ وہ نرم آدمی ہے اور یہ کام گرا بیٹھے گا اور علی چھین لے جائے گا۔ عمرو نے کہا فکر نہ کر آج رات دونوں سے ملوں گا اور ایسا کروں گا کہ عثمان کا کام بن جائے گا"۔

اس کے بعد والی روایت بھی ہے کہ ابن عاص نے علی سے کہا کہ تم سے اتباعِ سنت خلفا کے لیے کہا جائے گا تم قبول نہ کرنا۔ اور عثمان سے جا کر کہا کہ تم سے جو کچھ کہے کہنا ہاں کریں گے۔ اور جب ابن عوف نے سوال کیا، اور علی نے جواب دیا تو ابن عوف نے "دست علی را رہا کرد و گفت بدیں ضعیفی نہ خواہم"۔ یعنی: "علی کے ہاتھ کو چھوڑ دیا اور کہا میں اس کمزوری کے ساتھ نہیں چاہتا"۔

اور عثمان نے کہا: "پذیرفتم"۔ یعنی: "میں نے قبول کیا"۔

کیوں علی کو سنت خلفا منظور نہ تھی

صاحب نظام عثمانی فرماتے ہیں کہ علی کو رغبت خلافت تھی۔ لیکن یہ شرط کہ سنت خلفاء کی پیروی کریں، منظور نہ تھی۔ "اس وجہ سے کہ انھیں بہت سی باتیں پسند نہ تھیں"۔

رائٹ آنریبل مولوی سید امیر علی صاحب بالقابہٖ "اسپرٹ آف اسلام" میں فرماتے ہیں: "علی بن ابی طالب کو خلافت پیش کی گئی لیکن حکم خدا و رسول کے علاوہ سنت شیخین کی جو شرط لگائی گئی تھی وہ بنی امیہ کو معلوم تھا کہ علی منظور نہ کریں گے۔ علی نے اپنی مخصوص جبلی آزادی سے اپنی تجویز کو مقید کرنے سے انکار کیا"۔ واشنگٹن آرونگ اپنی کتاب مکسیرس آف محمدؐ میں بھی یہی کہتے ہیں۔

ابنِ عوف اور مقداد کی گفتگو

ابوالفدا کے موافق مقداد بن الاسود اور عبدالرحمٰن بن عوف میں بیعت کے بعد یہ گفتگو ہوئی۔

مقداد: تو نے قسم خدا کی علی کا حق ان کو نہ دیا، حالانکہ یہ شخص ان لوگوں میں ہے کہ اس کا حق پورا دینا چاہیے

اور انصاف کرنا چاہیے۔

ابن عوف : اے مقداد میں نے بہت کوشش کی مسلمان نہ مانیں تو کیا کروں؟

مقداد : تعجب ہے قریش سے کہ ایسے شخص کو پسند نہ کیا۔ میں تو یہی نہ کہوں گا۔ میرے نزدیک علم اور عمل میں کوئی شخص اس سے بہتر نہیں ہے۔

عبدالرحمٰن : اے مقداد خدا سے ڈر کہیں تو کسی فتنہ میں گرفتار نہ ہو جائے۔

عثمان کی بیعت کے بعد علی نے کیا کہا

اب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بیعت کی اس کارروائی کا علی پر کیا اثر ہوا۔ ابوالفدا کے موافق : "علی نے کہا کہ یہ وہی روز اول ہے کہ دکھلانے کو تجت کی ہے تو نے اس لیے بیعت کی کہ خلافت تیری طرف عائد ہو"۔ روضۃ الصفا کے موافق : "اے پسر عوف غرض تو ازیں حرکت آن بود کہ مرجع خلق کردی این نہ اول روز است کہ شما بر من غلبہ کردہ باشید"۔ یعنی : "اے عوف کے بیٹے اس حرکت سے تیری غرض یہ تھی کہ جو سب لوگ جانتے ہیں یہ پہلا دن نہیں ہے کہ جس میں تم نے مجھ پر زیادتی کی"۔

ابن عمر نے حکم قتل یاد دلایا

طبری کے موافق : "علی بر پائے ماند و گفت خدعۃ وای خدعۃ ست عبدالرحمٰن گفت عمر گفت کہ ہر کس مخالفت عبداللہ کند بکشید"۔ یعنی : "علی پر ستمار ہے اور فرمایا یہ دھوکا ہے کھلا دھوکا۔۔۔ عبدالرحمٰن نے کہا کہ : عمر کا فرمان ہے کہ : جو بھی مخالفت کرے قتل کر دینا"۔

تسلیم و رضا کی مفید شرط

نہج البلاغۃ میں ہے کہ : "تم خوب جانتے ہو کہ میں اپنے غیر سے زیادہ حکومت اور بیعت کے لیے قابل اور مستحق ہوں۔ میں تسلیم کرتا ہوں جب تک امور مسلمین سلامت رہیں اور اس کے ایام خلافت میں کھلم کھلا ظلم و جور نہ ہو۔ گو خاص مجھ پر ظلم و ستم ہوتے رہیں۔ میں اس تسلیم و رضا کو اس لیے اختیار کرتا ہوں کہ مجھے خداوند تعالیٰ کی جانب سے اس کا اجر و ثواب عطا ہو، اور تقرب خداوندی نصیب ہو۔ کیونکہ جس چیز کے سبب سے تم اس کے طالب ہو اور اس پر راغب ہو، میں اس سے پرہیز کرتا ہوں"۔

قریش اور عثمانؓ

صاحب صواعق محرقہ زہری سے روایت کرتے ہیں کہ : "نزد قریش دوست تر عثمان بود از عمر رضی اللہ عنہ زیرا کہ عمر شدت و غلظت بہ ایشان میکرد چون عثمان والی شد بہ ایشان بہ لینت و نرمی سلوک می نمود و طریق مواصلت و موافقت پیش گرفتہ بود"۔ یعنی : "قریش عمر کی نسبت عثمان کو زیادہ پسند کرتے تھے کیونکہ عمر ان کے ساتھ شدت و سختی سے پیش آتے تھے جب عثمان والی ہوئے تو ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا اور ان کے ساتھ بنا کر رکھتے تھے"۔

عثمانؓ کا انتخاب اسلام کی تباہی کا باعث ہوا

رائٹ آنریبل سید امیر علی صاحب بالقابہ اپنی تاریخ اسلام میں فرماتے ہیں : "اس متعلق (جانشین کی تقرری) اپنے پیش روؤں کے نقش قدم پر نہ چلنے میں ان سے ایسی غلطی سرزد ہوئی جس نے بنی امیہ کی سازشوں

کے جلیے رابطہ صاف کردیا۔ بنی امیہ اب مدینہ میں نہایت زبردست ہو گئے تھے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان ہاشمیوں کے مدت سے رقیب تھے اور ان سے سخت نفرت رکھتے تھے۔ چند دنوں کی بحث مباحثہ کے بعد بنی امیہ خاندان کے ممبر حضرت عثمان بن عفان کو منتخب کیا گیا۔ ان کا انتخاب آخر میں اسلام کی تباہی کا باعث ہوا"۔

عثمانؓ کی بیعت کے بعد ابوسفیانؓ اور حسینؑ

اس وقت کے متعلق علامہ مجلسی بحار میں ایک مفید روایت نقل کرتے ہیں جسے میں محاسن الابرار سے لکھتا ہوں کہ: "ابوسفیان نے امام حسین علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ لیا جب کہ عثمان کی بیعت کی گئی اور ان سے کہنے لگا کہ اے بیٹے میرے بھائی کے تم میرے ساتھ بقیع غرقد کو چلو۔ وہ نکلا یہاں تک کہ جب وہ قبروں کے بیچ میں آیا تو آواز بلند سے چیخا یہ کہہ کر کہ اے اہل قبور وہ ملک کہ جس پر تم ہم سے مقابلہ کرتے تھے وہ ہمارے ہاتھ میں ہو گیا اور تم خاک میں بوسیدہ ہو گئے۔ پس حسین بن علی علیہ السلام نے فرمایا کہ خدا تیرے بڑھاپے کا برا کرے اور تیرے منہ کو برا کرے۔ پھر حسین علیہ السلام نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور اسے وہیں چھوڑ دیا۔ پس اگر نعمان بن بشیر نے اس کا ہاتھ نہ پکڑ لیا ہوتا اور انھیں مدینہ میں نہ پھیر لائے ہوتے تو ابوسفیان اسی روز ہلاک ہوتا"۔

پہلا خطبہ

ابوالفدا کو ایک مفرح واقعہ لکھتا ہے کہ: "جب کہ بیعت ان سے لوگوں نے کی اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ منبر پر چڑھے اور خطبہ پڑھا۔ پہلے حمد اللہ کی کی اور کلمہ شہادت ادا کیا۔ بعدہ بند ہو گئے، اور پھر یہ کہا کہ اول ہر شے کا سخت ہوتا ہے اور اگر میں جیتا رہوں گا تو بہت سے خطبے سنو گے۔ بعد ازاں منبر سے نیچے اترے"۔ اسپرٹ آف اسلام میں ڈوزی کی زبانی ایسے ہی خیالات کا اظہار ہے۔

قتل ہرمزان

خلافت عثمان کا پہلا واقعہ جو ابن خلدون میں ملتا ہے وہ قتل ہرمزان ہے۔ جسے مولوی شبلی صاحب اپنے رسائل میں ان لفظوں میں بیان کرنے کا موقع پاتے ہیں: "عبداللہ (ابن عمر) تلوار ہاتھ میں لے کر نکلے، فیروز کے بیٹے اور جفینہ اور ہرمزان کو جن پر سازش کا شبہ تھا قتل کر دیا۔ ان میں سے ہرمزان مسلمان ہو گیا تھا۔

مہاجرین نے ابن عمر کے قتل کا فیصلہ کیا

تمام مہاجرین نے کہ ان بزرگواروں نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وطن چھوڑ کر چلے آئے تھے اور تمام صحابہ کی نسبت افضل سمجھے جاتے تھے ایک زبان ہو کر کہا کہ عبداللہ کو قتل کر دینا چاہیے۔ حضرت علی علیہ السلام بھی اس مجمع میں موجود تھے، اور انھوں نے بھی یہی رائے دی۔

فیصلہ کی عدم تعمیل اور بیت المال

اگرچہ حضرت عثمان بعض مصلحتوں کی وجہ سے اس فیصلہ کی تعمیل نہ کر سکے ۔۔۔ تاہم انھوں نے تینوں مقتولوں کے بدلے بیت المال سے خون بہا دلایا"۔

بقول ابن خلدون قتل کی رائے کے بعد عمرو بن عاص کے اس جواب پر کہ: "ایسا نہ ہوگا کل اس کا باپ مارا گیا ہے اور آج لڑکا مارا جائے۔ عثمان نے کہا: میں اس کا ولی ہوں اور اس کا خون بہا ادا کرتا ہوں"۔

غیر معمولی ہیں وہ واقعات جن کے قریب اب ہم اپنے کو دیکھ رہے ہیں اور اس سے زیادہ مشکل ہے کہ بہت بھی

ہاں ہمیں ہر وقت اپنے دانتوں کی تیزی کا لحاظ رکھنا ہوگا کہ کہاں تک ہم انھیں اس طرح چلا سکتے ہیں جس سے ہماری اس راہ کی روشنی قائم رہے، جس کے دکھائے بغیر ہم گویا اسباب شہادت حسینؑ سے جو سوانح عمری کے حصہ اول کی سب سے ضروری چیز ہے عمداً اعراض کر دیں گے۔

یہ باب اس کا خاکہ ہے کہ اس زمانہ کے واقعات گزشتہ بارہ برس پر کیا عکس ڈالتے ہیں؟

بنی امیہ کی تقرری شروع ہوئی

قتل ہرمزان کی واقعہ نگاری کے بعد ابن خلدون مغیرہ بن شعبہ کو "حسب وصیت عمر" معزول کر کے سعد بن ابی وقاص کو کوفہ کا گورنر مقرر کرتا ہے۔ چونکہ خلیفہ ثانی کے انتقال کا واقعہ آخر ماہ ذی الحجہ ۲۳ھ کا ہے لہٰذا غالب قرینہ ہے کہ سعد ۲۴ھ کے کسی مہینہ میں مقرر کیے گئے ہوں لیکن ۲۵ھ میں وہ معزول بھی کر دیے گئے اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ سعد نے ابن مسعود سے کچھ روپیہ قرض لیا تھا جسے وہ باوجود تقاضے کے ادا نہ کر سکے، اور ان کی جگہ ولید بن عقبہ بن ابی معیط مقرر کیا گیا۔ اسی سنہ میں عتبہ بن ابی فرقد آذربائیجان کا گورنر ہٹا لیا گیا جس کے ساتھ ہی بغاوت ہوئی اور فوج کشی کرنی پڑی۔ اعثم کوفی کے مطابق عثمان نے "عمر بن الخطاب کے عاملوں کی جگہ دوسرے عامل بھیجے"۔ اور اسی ضمن میں بجائے ابوموسیٰ کے عبداللہ بن عامر کریز کو جو خالہ زاد بھائی تھا بصرہ کا عامل مقرر کیا۔

مالِ غنیمت کے لیے مسلمان سپاہی آپس میں لڑے

ان سرایا میں جو دور دور کے ممالک فتح کرنے کے لیے روانہ کیے گئے تھے ارمینہ کی مہم قابل ذکر ہے جس میں خلیفہ نے عامل شام یعنی معاویہ کو اس کی فتح کا فرمان بھیجا۔ معاویہ نے حبیب بن مسلمہ فہری کو روانہ کیا۔ قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ رومیوں نے ایک بڑا لشکر مہیا کیا ہے جس کے مقابلہ کے لیے اسلامی لشکر عدداً کافی نہیں ہے۔ حبیب نے معاویہ کو خبر دی۔ امیر شام نے خلیفہ کو لکھا اور خلیفہ نے ولید بن عقبہ کو مدد بھیجنے کا حکم روانہ کیا۔ ولید نے سلمان بن ربیعہ کی ماتحتی میں ایک لشکر بھیجا۔ مدد پہنچنے کے قبل حبیب نے رومیوں پر حملہ کیا اور فتح ہوئی۔ مال غنیمت ملا اور تقسیم ہوا۔ مددگار لشکر پہنچا، اور اس نے اس زبردست ادعا سے اپنا حصہ طلب کیا کہ تم نے ہماری مدد کی خبر سن کر ہمت کی۔ فاتح لشکر نے کہا کہ ہم نے محنت اور خون سے جو چیز حاصل کی ہے وہ تمھیں کیونکر مل سکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ ہوئی اور بقول اعثم کوفی: "یہ پہلی جنگ تھی جس سے اہل شام اور عراق میں دشمنی پیدا ہوئی"۔

بنی امیہ اور خلیفہ

اعثم کوفی زمانہ خلافت عثمانی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ: عثمان نے کچھ دنوں تک تو عمر کے عمال کو رکھا، اس کے بعد اس ولایت کو بنی امیہ کو دے دیا، اور مثال میں عبداللہ بن عامر عامل بصرہ، ولید بن عقبہ عامل کوفہ، معاویہ بن ابوسفیان عامل شام، عمرو بن عاص اور ابن ابی سرح وغیرہ کو پیش کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ تقسیم غنائم میں ایک مرتبہ عبداللہ بن خالد بن اسد بن ابی العاص بن امیہ جو موجود تھا اسے حاضر ہونے پر تین لاکھ درہم دیے۔ اور حکم بن العاص جسے رسولؐ نے مدینہ سے نکال دیا تھا عثمان نے اسے بلایا، اور ایک لاکھ درہم انعام دیا، اور خمس افریقہ اسے عنایت کیا، اور اس کے لڑکے حارث بن حکم کو بھی بہت کچھ دیا۔ اصحاب کو یہ امورات ناگوار ہوئے اور انھوں نے ابن عوف سے شکایت کی اور کہا کہ یہ سب ہمیں تمھاری بدولت دیکھنا پڑا ہے۔

تم نے عثمان کو خلافت دیتے وقت ہم لوگوں سے ان امورات کا اقرار نہیں لیا تھا۔ ابن عوف نے لاعلمی اور عدم رضامندی ظاہر کی اور علی نے فرمایا کہ: "صورت معاملہ یہ نہ ہونی چاہیے اور واجب نہیں ہے"۔ ابن عوف نے کہا: "یا ابوالحسن اگر ایسا ہے جیسا یہ لوگ کہہ رہے ہیں تو ہم اور تم دونوں آدمی تلوار پکڑیں"۔ ابن عوف کی یہ باتیں خلیفہ کے کانوں تک پہنچیں

خلیفہ گر اور خلیفہ

اور انھوں نے ابن عوف کو "منافق" کہا۔ خلیفہ کے اس ریمارک کو ابن عوف نے بھی سنا اور کہا: "مجھے گمان نہ تھا کہ میں ایسے زمانہ تک پہنچوں گا کہ عثمان ہمیں منافق کہیں"۔ اور اس کے بعد قسم کھائی کہ: "پھر کبھی عثمان سے بات نہ کریں گے"۔ ابوالفدا بھی کہتا ہے کہ: "جب لوگوں نے عبدالرحمن بن عوف سے عمال کی تقرری کے نسبت شکایت کی تو ابن عوف نے بات کرنا عثمان سے چھوڑ دیا"۔ طبری کہتا ہے کہ: "ہمہ شہر عمال عثمان بنی امیہ بود چون یکے را از ایشان باز کردی دیگرے را ہم از ایشان قرار کردی"۔ یعنی: "تمام شہروں میں عثمان کے گورنر بنو امیہ میں سے تھے اگر کسی کو ہٹاتے تو انھیں میں سے کسی کو مقرر کر دیتے تھے"۔

جنابؑ امیرؑ اس وقت کی مصوری کرتے ہیں

اس وقت کی عام حالت مختصر لفظوں میں جناب امیر کے خطبہ شقشقیہ کے موافق جہاں خلیفہ ثالث کے زمانہ کے ذکر کیا گیا ہے یہ تھی کہ: "اس کی یہ حالت تھی کہ اس نے اپنے معدے اور امعاء کو حلق تک دنیا کے مال سے بھر لیا۔ تن پروری اختیار کی۔ لوگوں کے مال کھانا شروع کیے اور پھر اس کے ساتھ ہی اس کے باپ کے بیٹے بھی کھڑے ہوگئے اور خدا کے مال کو اس طرح کھا گئے جیسے اونٹ فصل بہار کی گھاس کو چر جاتا ہے"۔

صورتِ معاملہ یہ ہوتی جاتی تھی کہ اصحاب رسولؐ نے اپنی شکایتیں لکھیں جس میں یہ فقرہ بھی تھا کہ: "اگر یہ بے قاعدگیاں ترک نہ کی گئیں تو ہم تمھیں معزول کر کے دوسرے کو خلیفہ بنائیں گے"۔ پہلے یہ صلاح ہوئی کہ سب لوگ چلیں۔ آخر میں طے یہ ہوا کہ عمار بن یاسر لے جائیں۔ عمار لے گئے۔ خط دیا اور جواب مانگا۔ خلیفہ نے چند سطریں پڑھ کر کاغذ پھینک دیا۔ عمار نے کہا: اسے اصحاب رسولؐ نے لکھا ہے۔ پھینکنا مناسب نہیں ہے۔ بلکہ جو لکھا ہے اس پر غور اور تامل لازم ہے۔ ہم تمھارے خیر خواہ ہیں۔ یہ باتیں تم سے مصلحت اور نصیحت کے لیے کہی جاتی ہیں۔ اس پر عمار جھوٹے بنانے لگے اور غلاموں کو مارنے کا حکم دیا گیا۔ عمار گر پڑے اور اب خلیفہ نے بھی تبرکاً چند لاتیں پیٹ اور حلق پر ماریں۔ عمار بے ہوش ہوگئے اور عارضہ فتق میں مبتلا ہوگئے۔ بنی مخزوم آکر اٹھا لے گئے اور قسم کھائی کہ اگر عمار جانبر نہ ہوئے تو عثمان کو قتل کروا لیں گے۔

ابوذر شام میں کیا دیکھتے ہیں

یہ خبر ایسی تھی کہ مدینہ میں بند نہ رہ سکتی اور ابوذر غفاری کے پاس شام پہنچی۔ بات ایسی نہ تھی کہ ابوذر چپ رہ سکتے جب وہ ایسی باتیں بھی دیکھتے رہتے تھے کہ شام کے بیت المال کو بیت المال اللہ کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ امیر کو اس کے تصرف پر پورا اختیار ہو۔ اور مومنین کو باز پرس کا کوئی حق نہ رہے۔

امیر شام ابوذر کے اخراج کے لیے لکھتا ہے اور خلیفہ کا حکم

معاویہ نے ان کی حالت خلیفہ کو لکھی جن میں اس کا تذکرہ مناسب سمجھا کہ ابوذر کا شام میں رہنا مناسب نہیں ہے، وہ لوگوں کو تم سے پھیرتے ہیں۔ مبادا کوئی فتنہ کھڑا ہو جائے۔ عثمان نے حکم بھیجا کہ فوراً ایک سخت اونٹ پر بٹھاؤ، ساربان شب و روز ہنکاتا ہوا آئے کہ ابوذر پر نیند غالب ہو جائے، جس سے بیمار اور تیراذکر بھول جائے۔ معاویہ نے ایک درشت خو شتربان کے حوالہ کیا۔ اس نے برہنہ کوہان پر سوار کر کے مدینہ کا رخ کیا۔ مدینہ پہنچتے پہنچتے بڑھے ابوذر کا گوشت ہڈیوں سے علیحدہ ہو گیا تھا۔

ربذہ میں جلاوطنی

اس کے بعد ابوذر اور خلیفہ میں گرم گفتگو رہی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ ابوذر کو ربذہ میں جلاوطنی کا حکم دیا گیا۔ مروان کو ہدایت کی گئی کہ ابوذر کو اونٹ پر بٹھا کر مدینہ کے باہر لے جاؤ، اور کوئی شخص ان کے رخصت کرنے کو نہ جائے۔

مشایعت کی شکایت

اصحاب کو یہ امر بہت ناگوار گزرا اور ابوذر کی مشایعت کے لیے علی، ابن عباس، حسنین، مقداد اور عمار یاسر وغیرہ گئے۔ مروان نے خلیفہ سے ان لوگوں کی مشایعت کا ذکر کیا۔

علی کا ابوذر سے مصافحہ

ابوذر کے ساتھ خلیفہ کے برتاؤ نے علی کو بہت متاثر کیا تھا اور مشایعت کے وقت یہ الفاظ فرمائے جو نہج البلاغہ میں ملتے ہیں:

"اے ابوذر تو محض خدا کی وجہ سے خشم ناک ہوا تھا اب اسی سے امیدوار رہ جس کی خاطر تو نے خشم اختیار کیا۔ اس قوم نے تیری طرف سے اپنی دنیا کا خوف کھایا اور تو نے ان کی طرف سے اپنے دین کا خوف کیا۔ اب تو اس چیز کو انھیں کے ہاتھوں میں چھوڑ دے جس کے زوال سے یہ خائف ہو رہے ہیں اور تو اس چیز (دین) کو ان سے بچا کر نکل جا جس کے بارے تجھے ان کا ڈر ہے"۔

رحلت ابوذر اور ان کی تجہیز و تکفین

مقدس صحابی اس ویران جگہ رہنے لگا۔ مددگار یا صرف بی بی تھی اور یا لڑکی تھی۔ یہاں تک کہ غربت میں موت آ گئی۔ بی بی سر راہ بیٹھ کر رونے لگی۔ اتفاقاً کچھ لوگ حج سے فارغ ہو کر واپس آ رہے تھے جن میں مخصوص لوگ حنیف بن قیس الیمی، عبد اللہ بن مسلمہ، علقمہ بن قیس، صعصعہ بن صوحان اور بلال بن مالک، جریر بن عبد اللہ البجلی، اسود بن زید وغیرہ تھے۔ جن کے میر کارواں مالک اشتر تھے۔ جب یہ قریب پہنچے تو متعید کھڑے ہو گئی اور کہنے لگی کہ: "اے مسلمانو! ابوذر نے جو رسول کے صحابی تھے یہاں رحلت کی۔ میں ان کی بی بی ہوں اور اس جگہ غربت میں کوئی میرا مددگار نہیں ہے۔ جو دفن کرے۔ اگر تم لوگ اس کام کو انجام دیدو تو خدا تمھیں اجر دے گا"۔ یہ سن کر لوگ رو دیے، افسوس کرنے لگے۔ ٹھہرے اور طلب آمرزش کی۔ اور ہر شخص نے خواہش کی کہ اس کے مال سے کفن دیا جائے۔ نماز اور دفن کے بعد مالک اشتر قبر پر کھڑے ہوئے اور بقول اعثم کوفی یہ یادگار دعا کی:

مالک اشتر کی یادگار دعا: خداوندا! ابوذر غفاریؓ تیرے رسولؐ کے ساتھ رہا۔ تیری کتاب اور تیرے رسولوں پر ایمان لایا۔ تیری راہ میں لڑا اور جادہ اسلام پر ثابت قدم تھا۔ اس نے شرع میں کوئی تغیر نہیں کیا۔ اس نے کچھ باتیں

دیکھیں جو سنت رسولؐ کے موافق نہ تھیں اس نے ان سے انکار کیا۔ اس وجہ سے اسے لوگوں نے حقیر کہا اور اسے روضہ رسولؐ کے طواف کی دولت سے محروم کر کے نکال دیا، اور اسے ضائع چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ غربت میں مر گیا۔ خداوندا اسے بہشت عطا کر جس کا تو نے مومنین سے وعدہ کیا ہے۔ اور اسے بھی سزا و جزا دے جس کا وہ مستحق ہو جس نے اسے حرم رسولؐ سے نکال دیا۔ لوگوں نے آمین کہی۔

بعض اور زیادتیاں جن پر اعتراض ہوا

بقول ابن خلدون منجملہ ان امور کے جن سے مخالفین کو موقع انتقاض ملا یہ بھی تھا کہ امیرالمومنین عثمان نے نماز ثالث مجمعہ میں زیادہ کر دی تھی۔ اور منیٰ و عرفہ میں پوری نماز پڑھی تھی۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک مہد اور شیخین کے دور خلافت میں نماز قصر کی جاتی تھی۔ اس کے بعد مکالمہ ہوا اور آخر میں "امیرالمومنین عثمان نے کہا یہ میری رائے ہے اور میرے نزدیک یہی مناسب ہے"۔

سعید بن العاص کی تقرری اور اس کے آئندہ نتائج

ولید معزول کیا گیا اور سعید بن العاص اموی جو فتح شام میں معاویہ کے ساتھ تھا اور جس نے عثمان کے گود میں پرورش پائی تھی اور جسے مدینہ بلا کر عقد کر دیا تھا بجائے اس کے گورنر مقرر ہوا۔ ہونے والا تھا کہ عثمان کے اپنے معتمد سے انھیں بے ارادہ وہ سب دیکھنا پڑتا جو آئندہ بیان کیا جانے والا ہے اور جس کا دور حکومت عثمان کے اسباب خلع اور قتل میں بڑا سبب ہوا۔

طبرستان اور حسنینؑ

ابن خلدون ہی کے پاس یہ روایت بھی ہے کہ سعید بن العاص نے جب طبرستان پر حملہ کیا تو اس لشکر کے ساتھ حسنین علیہما السلام بھی تھے۔ میرے وجوہات وہی ہیں جو افریقہ کے متعلق لکھے گئے ہیں۔

اسی مورخ کے موافق: "امیرالمومنین عثمان حج کو گئے اور مقام منا میں خیمہ نصب کرایا۔ یہ پہلا خیمہ ہے جو اسلام میں مقام منا پر نصب کیا گیا۔ اسی واقعہ سے لوگوں نے کھلم کھلا امیرالمومنین عثمان پر حرف گیری کرنی شروع کی"۔

قرآن کے ساتھ معاملہ

۳۰ھ کا ایک دوسرا نازک معاملہ قرآن کے نسخوں کا پارہ پارہ کرنا، اور جلوا دینا تھا۔ ابن خلدون ایسے حذیفہ سے شروع کرتا ہے۔ جنھیں اس کا تجربہ ہوا تھا کہ قرامت قرآن میں اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک حمص کے لوگوں نے مقداد سے قرامت سیکھی تھی۔ اہل دمشق اس کے خلاف کہتے تھے۔ بصری کہتے تھے کہ ہم نے ابوموسیٰ سے سیکھا ہے اور کوفی ابن مسعود کو اپنا معلم بتاتے تھے۔ حذیفہ نے قرآن مجید کو ایک قرامت و صورت پر جمع کرنے کی خواہش کی اور ابن مسعود سے بھی کہا لیکن انھوں نے منظور نہ کیا۔ حذیفہ نے مدینہ میں آکر خلیفہ سے کہا۔ خلیفہ نے وہ قرآن جو خلیفہ اول کے حکم سے زید بن ثابت نے جمع کیا تھا اور جو حفصہ کے پاس امانت تھا منگوایا۔

قرآنؐ کی نقل و ترتیب کے ذمہ دار اور ایک حکم

اور زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعید بن العاص، عبدالرحمن بن الحرث

بن ہشام کو اس کی نقل و ترتیب پر مامور کیا۔ اور یہ ارشاد کیا کہ اگر تم کو کسی لفظ میں اختلاف واقع ہو تو محاورۂ قریش کے مطابق لکھنا کیونکہ قرآن مجید انھیں کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ پس ان بزرگواروں نے ایسا ہی کیا۔ اور متعدد نسخے قرآن مجید کے لکھے۔

خلافت کے مرتبہ قرآن کے علاوہ اور نسخے جلوا دیے گئے

امیر المومنین عثمان نے اسی قرآن کے نسخے تمام بلاد اسلامیہ میں بھیج دیے اور یہ حکم دیا کہ اسی پر اعتماد و بھروسہ کیا جائے۔ اس کے سوا اور جو نسخے تھے ان کو صحابہ نے جلا دیا۔

ابنِ مسعود حکومت کا قرآن نہیں لیتے

کوفہ میں جب یہ قرآن پہنچا تو صحابہ رضی اللہ عنہم بہت محظوظ ہوئے لیکن عبداللہ بن مسعود نے اس قرآن کے نسخے کے لینے سے انکار کیا۔ اور لوگوں کو اپنی ہی قراءت پر رکھا۔

ابن خلدون خلیفہ کی مختار حفاظت لیکن مدین کی قابل افسوس بے لحاظی سے ان نسخوں کو صحابہ کے ہاتھوں جلواتا ہے۔

حالانکہ خود احیاء علوم و جمع قرآن کی سرخی میں بخاری کی روایت بھی نقل کرتا ہے جس کی آخری عبارت یہ ہے کہ:

"تا آنکہ مصحف کے متعدد مصاحف میں نقل ہو گئی۔ عثمان نے اس مصحف کو حفصہ کے پاس واپس کر دیا۔ اور منقول کو اطراف و جوانب میں بھیج دیا۔ اور سوا اس قرآن کے اور صحیفہ اور مصحف کے جلا دینے کا حکم دیا"۔

ابن مسعود کے ساتھ خلیفہ کا برتاؤ

ابوالفدا بھی قرآن کے جلائے جانے اور "قریش کی بولی" میں لکھنے کے حکم کا تذکرہ کرتا ہے۔ ابن خلدون ابن مسعود کا کچھ تذکرہ نہیں کرتا۔ جو اعثم کوفی میں اس طرح ہے، جب کہ طلحہ و زبیر لوگوں کی شکایت لے کر خلیفہ کے پاس گئے تھے:

"گفتند ترا با عبداللہ بن مسعود چہ کار بود کہ فرمودی کہ قراءت او مہجور است و او قراءت از مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آموختہ است و چندان بر شکم او زدی کہ این ساعت در خانہ خویشتن افتادہ است و تن ندادہ ہمانا کہ برخیزد"۔ یعنی: "بولے تجھے عبداللہ بن مسعود کے ساتھ کیا تھا کہ تم نے کہا کہ اس کی قراءت متروک ہے۔ حالانکہ اس نے قراءت مصطفیٰؐ سے سیکھی ہے اور تم نے اس کے پیٹ پر اتنا مارا کہ اس گھڑی گھر میں گرا پڑا ہے اور اٹھنے کی بھی سکت نہیں رکھتا"۔

صاحب صواعق محرقہ صرف اشارہ دیتے ہیں۔ یہ لکھتے کہ جب عثمان کا غلام مصر جاتے وقت پکڑا گیا: "ہیچ کس از اہل مدینہ نماند مگر آنکہ بر عثمان دل تنگی و خشم نمودند و جمیع کہ بواسطہ ابن مسعود و ابوذر و عمار در غضب بودند غیظ و غضب ایشان زیادہ گشت"۔ یعنی: "اہل مدینہ کے ہر شخص عثمان پر دل تنگ اور غصہ ہوا اور تمام لوگ جو کہ ابن مسعودؓ و ابوذر و عمار کی وجہ سے غضب ناک تھے ان کا غیظ و غضب اور زیادہ ہو گیا"۔

اس کے کچھ پہلے بھی اسی کتاب میں ابن حجر نے لکھا ہے: "و قبل ازیں میان عثمان و عبداللہ بن مسعود و ابوذر و عمار یاسر نزاع واقع شدہ بود"۔ یعنی: "اس سے پہلے بھی عثمان اور عبداللہ بن مسعود و ابوذر و عمار میں جھگڑا واقع ہوا تھا"۔

حسنینؑ اور افریقہ

ابن خلدون کہتا ہے کہ ۲۵ھ میں فتح افریقہ کے لیے جو لشکر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی ماتحتی میں روانہ کیا گیا تھا اس میں حسنین علیہما السلام بھی تشریف لے گئے تھے

اعثم کوفی میں ہے کہ خلیفہ نے اکابر صحابہ مثل حضرت علیؑ، طلحہ، زبیر، سعد، اور سعد بن زید وغیرہ سے صلاح لی، لیکن ان میں سے "زیادہ تر کی رائے تھی کہ اہل افریقیہ سے کوئی تعرض نہ کیا جائے"۔ یہ مؤرخ بھی نہیں کہتا کہ حضرت علی کی کیا صلاح تھی۔ اگر حضرت بھی کثرت کی طرف تھے تو بہت کم قرینہ ہے کہ حسنین افریقیہ کی طرف روانہ ہوئے ہوں۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جسے عموماً مؤرخین نے نقل نہیں کیا ہے۔ علاوہ بریں اس کے آثار بھی ہیں کہ جناب امیر حسنین کو صفین میں لے جانے سے متردد تھے۔ جس کی وجہ ظاہر ہے کہ وہ فرزندان رسولؐ کو خطرہ میں گرفتار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور دوسرے فرزند محمد حنفیہ کو جنگ کے لیے روانہ کرتے تھے۔ نظر برین مجھے روانگی کے بہ نسبت عدم روانگی کے قرائن زیادہ قوی معلوم ہوتے ہیں۔

بقول ابن خلدون عثمان نے ابن ابی سرح کو اس شرط پر فتح افریقیہ پر مقرر کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کامیابی و فتح یابی عنایت فرمائے گا تو مال غنیمت کے خمس کا خمس حسن خدمت کے صلہ میں دیا جائے گا۔ اسی کتاب میں ہے کہ "ابن زبیر فتح کی خبر اور خمس لے کر مدینہ کو آئے۔ جس کو مروان بن حکم نے پانچ لاکھ کو خریدا۔ بعضے کہتے ہیں کہ افریقیہ کا خمس اس کو دیا گیا۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ ابن ابی سرح کو افریقیہ کی پہلی لڑائی کا خمس الخمس دیا گیا"۔

ابن عاص اور مغیرہ خلیفہ کے مخالف ہو گئے

۲۶ھ شروع ہوا اور اس میں مصر کا فاتح مشہور عمرو بن عاص معزول کیا گیا۔ اور بقول روضۃ الصفا: ابن عاص نے اس طرح انتقام لیا کہ عثمان کی بہن کو جو اس کی زوجیت میں تھیں "طلاق دیدیا"۔ اسی مؤرخ کے موافق: مغیرہ اور ابن عاص یہ دونوں خلیفہ پر طعن کرنے لگے۔

جزیرہ قبرس کی فتح اور ابوذر کا تاسف

جزیرہ قبرس معاویہ کے اہتمام میں فتح ہوا۔ جس وقت سپاہی مال غنیمت آپس میں تقسیم کر رہے تھے ابوذر غفاری انھیں دیکھ کر مغموم تھے۔ کسی نے ایسے مبارک وقت ان سے ان کے بے موقع تاسف کی وجہ پوچھی اور ابوذر نے جواب دیا: "تم جو کچھ کہہ رہے ہو صحیح ہے۔ لیکن میں جس وقت ان عورتوں اور بچوں (اسیر) کو دیکھتا ہوں، مجھے خیال آتا ہے کہ یہ امت کے گناہگاروں کی بدولت اس تکلیف میں مبتلا ہوئے ہیں۔ یہ لوگ نعمت اور فراغت میں بسر کر رہے تھے اور جب گناہ کیا اور حکم خدا کو عزیز نہ رکھا اس ذلت میں گرفتار ہوئے۔ جسے خدا اپنے بندوں کا بندہ قرار دیتا ہے، وہ ایسی ہی مخذول و مقہور ہوتے ہیں"۔

تقسیم غنیمت کے وقت خصومتیں

اعثم کوفی کے موافق تقسیم غنیمت دیانت داری سے نہ ہوئی اور آپس میں خصومتیں پیدا ہوئیں، وہ وقت اور اس کے تعلیم کی فضا دور ہو گئی تھی کہ کوئی سپاہی کوئی سوئی کپڑا سینے کے لیے سئین کی غنیمت سے بغیر حکم رسولؐ نے لیتا اور رسولؐ اسے عدم مساوات کے لحاظ سے واپس کر لیتے۔

ابوذر کے علاوہ عبادہ بن الصامت، سداد، واثلہ بن الاشقع اور ابوامامہ وغیرہ نے دیکھا کہ ایک شخص دو دراز گوش ہنکائے لیے جاتا ہے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ معاویہ نے دیا ہے۔ ان لوگوں نے کہا کہ نہ معاویہ کو دینا اور نہ تمھیں

لینا جائز ہے۔ یہ واقعہ بھی معاویہ سے کیا گیا یہ لوگ بلائے گئے اور انھوں نے صلاح دی کہ صفات تدین امانت اور حسن سیرت سے متصف کوئی شخص تقسیم غنیمت کے لیے مقرر کیا جائے۔

غنیمت کی ایک کنیز اور اہلیہ عثمانؓ

معاویہ نے خمس میں خلیفہ کے لیے جہاں بہت کچھ نقد بھیجا منجملہ اس کے ایک نہایت ہی حسین اور خوش ادا کنیز بھی تھی لیکن اہلیہ عثمان نے اہتمام کیا کہ وہ دار الخلافہ میں نہ رہ سکے اور شام روانہ کردی جائے۔ بہر حال معاویہ کی اہلیہ کوئی بغاوت نہ کرسکی۔

زمانہ عثمانؓ میں معاویہ کے اقتدار کی وسعت

معاویہ اس وقت نہ صرف اضلاع شام بلکہ فلسطین، قبرس اور صقلیہ کا بھی حاکم تھا اور شام کے علاوہ مقامات بھی زمانہ عثمان میں اس کی حکومت میں شامل کیے گئے تھے۔

ولید کی شکایت کا وفد

ولید بن عقبہ کی شکایت کے لیے کوفہ سے ایک وفد آیا اور اس نے ولید پر شراب خوری، بدمستی اور غفلت کا الزام لگایا۔ شکایت کے وقت دربار میں ایک شخص ابوزینب حاضر تھا۔ اس نے ایک انگوٹھی پیش کی اور کہا کہ میں ایک دن کوفہ تھا اور ولید اس درجہ بدمست تھا کہ میں نے انگوٹھی اتار لی اور اسے خبر نہ ہوئی اور لوگوں نے بھی تصدیق کی اور جناب امیر کی صلاح سے طے یہ پایا کہ ولید اپنی صفائی کے لیے طلب کیا جائے۔ ولید حاضر ہوا اور صفائی نہ دے سکا۔ بعض جنھوں نے شراب پیتے نہ دیکھا تھا انھوں نے شراب کی قے کرنے کی شہادت دی۔ عثمان نے سعید بن العاص (آئندہ گورنر کوفہ) کو درہ لگانے کا حکم دیا۔ بعض کے نزدیک حسن یا عبداللہ بن جعفر نے درہ لگایا۔

علی شرع کے موافق حد جاری کرتے ہیںؑ

اور بقول ابن خلدون: "جب چالیس درہ پر پہنچے تو علی بن ابی طالب نے کہا: بس اب درہ نہ لگاؤ۔ آنحضرت اور ابوبکر نے چالیس چالیس درے مارنے کا حکم دیا۔ اور عمر نے اسی درے شراب خوار کو مارے تھے۔ اور یہ سب سنت ہے۔

مشکل سے سوچا جاسکتا ہے کہ کسی ایک شارع کے متعلق مورخین کے پاس کے درجن سنت ہے جب کہ یہ ظاہر کر دیا گیا کہ رسولؐ کا کیا حکم تھا اور جناب امیر بھی اسے پسند فرماتے تھے۔ ولید کا حالت نشہ میں صبح کی نماز کے بعد خواہش کرنا کہ کہو تو دو چار رکعت اور پڑھادوں۔ کوئی ازالہ نہ تھی جب کہ حضرت عمر نے سزا صرف دوئی کردی تھی۔

سعید بن العاص کی سیاسی بے تمیزی

کوفہ میں یہ ہو رہا تھا کہ بقول ابن خلدون: "سعید بن العاص نے کوفہ میں پہنچ کر روسائے شہر اور اہل قادسیہ سے ایسے مراسم بڑھائے کہ مثل مالک ابن کعب، اسود بن زید، علقمہ بن قیس نخعی، ثابت بن قیس ہمدانی، جندب بن زہیر، جندب بن کعب ازدی، عروہ بن الجعد، عمرو بن الحمق خزاعی، صعصعہ و زید پسران صوحان، ابن الکوا، کمیل بن زیاد، عمیر بن ضابی، طلحہ بن خویلد وغیرہم راتوں کو لوگوں کے انساب اور عرب و اسلام کے ایام و اخبار کے مذکرے اور باہم ہنسی مذاق کرنے کو سعید کی صحبت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اکثر ہنسی مذاق ہوتے ہوتے نوبت طعن و تشنیع و سخت کلامی کی پہنچ جاتی تھی۔

ایک روز اتفاق سے سعید نے اثنائے کلام میں کہا: "ھذا سواد بستان قریش"۔ اشتر نے جواب دیا: جس سواد کو اللہ تعالیٰ نے ہماری تلواروں کے زور سے عنایت فرمایا ہے تم اس کو اپنا اور اپنی قوم کا بستان خیال کرتے ہو۔ اشتر کے اس جواب سے اور حاضرین نے بھی کچھ کہنا شروع کیا۔ عبدالرحمٰن اسدی (سعید بن العاص کے پولیس کے افسر) نے ان لوگوں کو شور و غل مچانے اور لاحاصل تقریر کرنے سے بہ تشدد منع کیا۔ لوگ اس پر ٹوٹ پڑے اور اس قدر مارا کہ وہ بے ہوش ہو گیا"۔

ابن خلدون نے اس کے پہلے کا ایک واقعہ نہیں لکھا ہے جس طرح اس نے عمار، ابوذر اور ابن مسعود کے اصل واقعات کو اپنے لیے بلا ضرورت سمجھ کر ترک کیا ہے ہم اسے اعثم کوفی سے نقل کرتے ہیں۔

سعید اور ہاشم بن عُتبہ

سعید بن العاص اور ہاشم بن عُتبہ بن ابی وقاص میں کچھ گفتگو ہوئی اور سعید نے اسے "کانا" کہا۔ اور بات یہاں تک بڑھ گئی کہ سعید نے اپنے آدمیوں سے مارنے کا حکم دیا۔ اور گھر جلوا دیا۔ جب یہ خبر سعد بن ابی وقاص کو ہوئی تو بہت برافروختہ ہوئے اور عثمان سے شکایت کی اور انھوں نے بھی سعید بن العاص کے گھر میں آگ لگادی۔ اس کے بعد کا واقعہ ہے کہ ایک روز زمینوں اور ان کی پیداوار کا ذکر ہو رہا تھا کہ مالک اشتر نے کوفہ کی تعریف کی، اس پر عبدالرحمٰن بن خنیس الاسدی نے کہا کہ: "عراق اور اس کا سواد قریش کے لیے بمنزلہ بوستان ہے۔ جس قدر ہم چاہیں لے لیں اور جس قدر نہ چاہیں چھوڑ دیں"۔

قوم نے اشترؒ کے جوابؒ کو پسند کیا

اس واقعہ کے بعد سے بدمزگیاں بڑھنے لگیں۔ اشتر کی ان کے ہم خیالوں نے تعریف کی کہ اگر تم نے ایسا نہ کیا ہوتا تو یہ گروہ اس کے بعد ہمارے گھر بار میں تصرف شروع کرتا اور ہمیں ہمارے آباء اجداد کی میراث سے محروم کر دیتا۔ سعید نے عثمان کو حالات لکھے اور ان لوگوں کے جلاوطنی کی خواہش کی۔

مالک اشتر کی جلاوطنی

سعید اور خلیفہ دونوں آدمیوں نے اشتر وغیرہ کے متعلق اچھے الفاظ استعمال نہ کیے اور انھیں شام روانہ کر دیا۔

طنز اور اسؒ کا جوابؒ

روانگی کے وقت سعید نے کہا کہ: "جاتے ہو تو ان شفہا اور اوباشوں کو بھی لیتے جاؤ جو تمھیں برانگیختہ کرتے ہیں"۔ اشتر نے اس کا نہایت ہی مدبرانہ جواب دیا کہ: "کوفہ میں جتنے لوگ ہیں سب میرے ہوا خواہ ہیں اور کوئی اس پر راضی نہ ہوگا کہ تو ان کے شہر اور گھروں کو اپنا بستان قرار دے"۔

معاویہ اور جلاوطن

یہ لوگ معاویہ کے پاس پہنچے معاویہ نے مدبرانہ پہلو سے قریش کی تعریف شروع کی کہ اگر جلاوطن لوگ خاموش رہیں تو گویا اپنا کام کیا، اور عذر کریں تو رسول کا نام بھی قریش میں شامل کر دیا۔ ان لوگوں نے بھی چبھتی ہوئی تقریریں کیں۔ معاویہ نے دھمکایا، اور جب دیکھا کہ یہ لوگ رعب میں آنے والے نہیں ہیں تو خلیفہ کو لکھ بھیجا کہ: "ان سے نیکی کی کم امید اور برائی کا زیادہ اندیشہ ہے"۔

شام سے بھی نکالے گئے

یہ لوگ حمص میں عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کے پاس بھیجے گئے اور بقول ابن خلدون عبدالرحمٰن نے "ان کے ساتھ ایسا سختی کا برتاؤ کیا کہ یہ لوگ مرعوب ہو کر کہنے لگے ہم اپنے اقوال سے رجوع کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرتے ہیں"۔

دوسرا شکایتی وفد

زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ کچھ مشاہیر کوفہ نے آکر اشتر وغیرہ کے جلاوطنی اور سعید بن العاص کے نسبت شکایت کی۔ اتفاقاً کچھ بصری بھی آئے تھے اور ان لوگوں نے عبداللہ بن عامر کریز کی شکایت کی۔ اعثم کوفی کے موافق عثمان نے اپنے عاملوں کو طلب کیا اور انھیں نصیحتیں کر کے واپس کیا لیکن یہ لوگ اپنے پرانے رنگ پر رہے۔ اہل کوفہ نے پھر خط لکھا اور اس کے ساتھ ساتھ بقول ابن خلدون عامر بن عبداللہ تمیمی کو روانہ کیا۔ اس نے پہنچ کر عام مجمع میں کہا:

لوگوں نے خلیفہ کی باتوں پر نظر شروع کی

اے عثمان لوگوں نے تمھارے افعال پر نظر کرنا شروع کیا ہے۔ تم نے بڑے بڑے ناروا کام کیے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور توبہ کرو۔

خلیفہ کا اللہ تعالیٰ

امیرالمومنین عثمان نے فرمایا: "تم لوگ سنتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے؟ لوگ اس کو زاہد و متورع سمجھتے ہیں اور یہ مجھ سے بالمواجہ ایسی ایسی باتیں نالائم کہہ رہا ہے۔ واللہ یہ اللہ تعالیٰ کو نہیں جانتا کہ کیسا ہے"۔ عامر نے جواب دیا: "میں اللہ تعالیٰ کو نہیں جانتا؟ بیشک اللہ تعالیٰ ظالموں پر قابو پانے والا ہے"۔

عرضداشت کے ساتھ سلوک

اعثم کوفی کے موافق جو شخص کہ اہل کوفہ کا خط لایا تھا اس کی خوب مرمت کرائی گئی اور قید کا حکم دیا گیا۔ جن لوگوں نے عرضداشت بھیجی تھی وہ سفہاء اہل بغی اور حسد کہے گئے۔ کعب بن عُبیدہ جنھوں نے اہل کوفہ کے ساتھ خط بھیجا تھا بلائے گئے انھیں کوڑے مارے گئے اور کہیں پہاڑ پر قید کیے گئے۔

معتمد کی صلاح

ابن خلدون کے موافق: "عثمان نے معاویہ، عبداللہ بن سعد، ابن ابی سرح، سعید بن العاص، عبداللہ بن عامر، عمرو بن العاص کو مشورہ کی غرض سے طلب کر کے ارشاد کیا: تم لوگ میرے وزیر، میرے ناصح، میرے معتمد علیہ ہو۔ تم پر مجھے اطمینان ہے کہ تم لوگ نیک نیتی سے رائے دو گے۔ تم لوگ اور لوگوں کا برتاؤ دیکھتے ہو۔ طرح طرح کے الزامات مجھ پر قائم کرتے ہیں۔ میرے عمال کی معزولی چاہتے ہیں اور جس کو وہ دوست رکھتے ہیں مجھے اس کا پابند اور اس کی طرف لوٹانا چاہتے ہیں۔ اس امر میں غور کر کے بتلاؤ کیا کیا جائے۔ جس سے یہ یورش فرو ہو جائے۔ **ابن عامر نے کہا:** میرے نزدیک ان لوگوں کو جہاد میں مصروف کر دیجیے۔ کیونکہ جب فارغ بیٹھیں گے تو طرح طرح کے خیالات پیدا کر کے آئے دن ایک نہ ایک فتنہ اٹھاتے رہیں گے۔ **سعید نے کہا:** مناسب یہ ہے کہ ان کے سرداروں کی معقول گرفت کی جائے۔ جب ان کے سردار ہلاک ہو جائیں گے تو یہ لوگ خود بخود متفرق ہو جائیں گے۔ **امیرالمومنین عثمان نے فرمایا:** یہ رائے ضرور مناسب ہے لیکن اس پر عمل کرنا کسی قدر مشکل ہے۔ **معاویہ بولے:** امیرالمومنین اس کام کو امرائے لشکر کے سپرد کیجیے۔ میں شام کو ان لوگوں سے

صاف کردوں گا۔ آپ مدینہ کو سنبھالیے اور امرا اپنے متعلقہ صوبہ کو صاف کریں۔ عبداللہ نے کہا: یہ لوگ طمعی ہیں۔ ان کو مال و زر دے کے اپنا بنا لیجیے۔ اس سے زیادہ تالیف قلوب اور کسی صورت سے ممکن نہیں ہے۔

تصفیہ جو گزشتہ مصالح کی تقلید تھی

امیرالمومنین عثمان نے ان لوگوں سے رائے لینے کے بعد ان کے صوبجات کی طرف واپس کیا، اور یہ حکم دیا کہ: "لوگوں کو جہاد پر روانہ کرو، تاکہ اس کی مصروفیت ان کو اور خیالات سے روک دے"۔ بعض کے موافق معاویہ نے صلاح دی کہ علیؑ اور طلحہ و زبیر قتل کردیے جائیں۔

اہلِ کوفہ کی صلاحین

جس وقت مدینہ میں خلیفہ اپنے معتمدین سے اپنے قیام اختیارات کے متعلق مشورہ کر رہے تھے اہل کوفہ انھیں معزول کرنے کی صلاحوں میں سرگرم تھے۔ چنانچہ سعید ابھی کوفہ واپس بھی نہ آیا تھا کہ زید بن قیس نے خروج کیا، اور ان لوگوں کو بھی بذریعہ خط کے طلب کیا جو حمص میں عبدالرحمٰن بن خالد کے پاس نظر بند تھے۔

مالک اشتر اور فوجی انتظام

اعثم کوفی کے موافق مالک اشتر ولایت شام سے کوفہ تیرھویں دن پہنچ گئے۔ انھوں نے موضع جرعہ کو اپنا فوجی مرکز بنایا، اور مختلف کار آزمودہ لوگوں کو سپاہیوں کے ساتھ بصرہ، عین التمر، حلوان، مدائن وغیرہ اس حکم کے ساتھ روانہ کیا کہ اگر سعید بن العاص کوفہ کا قصد کرے تو اسے مدینہ لوٹا دیں۔ عمر بن حریث السکونی نے جب سعید اپنا قائم مقام کر گیا تھا تقریروں سے روکنا چاہا۔ لیکن قعقاع نے جو فوجی افسر تھا یہ کہہ کر اسے روکا کہ: "تم سیلاب کا حالت جوش میں روکنا چاہتے ہو، صبر کرو، یہ لوگ بغیر فساد کیے ہوئے نہ رکیں گے۔ (ابن خلدون) خلیفہ کو یہ خبریں پہنچیں اور انھوں نے سعید بن العاص کو روانہ کیا۔

سوادبستانِ قریش کا جواب

اعثم کوفی کے موافق عذیب کے قریب عبداللہ کنانہ نے تین سو سواروں سے روک کر کہا: "اے دشمن خدا کہاں جاتا ہے لوٹ جا جہاں سے آیا ہے۔ اب دوسری چیزوں کا کیا ذکر ہے تو فرات کا ایک قطرہ نہ پی سکے گا"۔

خلیفہ نے کب عامل بدلا

بقول ابن خلدون: سعید کے نوکر نے کچھ تکرار کی اشتر نے اس کی ٹانگ گھسیٹ کر ایک ہاتھ مارا اور کہا: "جاؤ عثمان سے کہہ دو کہ ابوموسیٰ کو بھیج دے"۔ خلیفہ نے ابوموسیٰ کو بھیج دیا، اور یہ غالباً اس وقت تک کوفہ کا برابر عامل رہا جب تک مالک اشتر نے امارت سے نہ ہٹایا۔ جس کا ذکر آنے والا ہے۔

اہل کوفہ کے نام خلیفہ کا خط

اعثم کوفی نے سعید بن العاص کی روانگی کے وقت اہل کوفہ کے نام عبدالرحمٰن بن ابی بکر معرفت عثمان کا ایک خط بھیجا ہے اور اشتر نے اس کا جواب دیا ہے۔ جسے دلچسپ سمجھ کر ہم اس کا لفظی ترجمہ پیش کرتے ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ عبداللہ عثمان امیرالمومنین۔ یہ خط مالک اشتر اور اس جماعت مسلمین کو لکھتے ہیں جو اس کے موافق ہیں۔ تمھیں جاننا چاہیے کہ خلیفہ وقت پر طعن کرنا ایک بڑا وبال ہے۔ اور ظاہری

نقصان۔ جو شخص ایسے گناہ پر اقدام کرتا ہے اس کا نتیجہ بجز بلا، سختی، عذاب اور مشقت کے کچھ نہیں ہوتا۔ تم نے میرے نائب کی جو بے حرمتی کی وہ مجھے معلوم ہوئی۔ تم کو جاننا چاہیے کہ تم نے جو ظلم کیا وہ خود اپنے اوپر کیا، اور اس وجہ سے تم نے خدا کے غضب کے دروازہ کو اپنے اوپر کھول دیا۔ تم نے عوام کو فتنہ میں مبتلا اور اپنے کو عیب ونقص کا خوگر کر دیا ہے۔ رعیت میں سے پہلا فرقہ جس نے مخالفت شروع کی اور اپنا طریقہ علیحدہ مقرر کیا، وہ تم ہو۔ صورت یہ ہے کہ امت کا کوئی گروہ تمارے اس مناقشہ اور مخالفت میں تمھارا ساتھ نہ دے گا۔ اور اس ناپسندیدہ کام میں تمھاری موافقت نہ کرے گا، اور اس کا وبال تمھارے اوپر رہے گا۔ اے بندگان خدا خدا سے ڈرو اور حق کی طرف پھرو۔ اعمال ناپسندیدہ سے توبہ کرو کہ رستگار ہو۔ تمھاری جو غرض اور شکایت ہو مجھے لکھو۔ اگر تم اس امیر کو نہیں چاہتے جسے میں نے مقرر کیا ہے تو اسے معزول کر دو، ہم اسے مقرر کریں گے جسے تم چاہتے ہو"۔

اہلِ کوفہ نے مالک اشتر کو جواب کا ذمہ دار کیا

عبدالرحمن بن ابی بکر نے یہ خط دیا، اہل کوفہ کے سامنے پڑھا گیا، اور لوگوں نے اشتر سے جواب دینے کو کہا۔ اشتر نے یہ جواب دیا۔

یادگار جوابؓ

یہ خط مالک بن حارث اور مسلمانوں کی جماعت کی طرف سے خلیفہ ــــــ کے نام ہے جو سنت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پھر گیا ہے۔ اما بعد خط پہنچا۔ اس میں لکھا تھا کہ خلیفہ اور ایک جماعت کی مخالفت اور ائمہ پر طعن کرنا وبال عظیم اور ظاہر خسران ہے۔ یہ بات سچی ہے، بشرطیکہ خلیفہ عادل ہو، اور امورات کو طریقہ حق پر انجام دے اور اگر ایسا نہ کرے اور راہ صلاح پر نہ چلے تو اس کے خلاف کرنا، اور اس سے مفارقت کرنا خدا کے نزدیک ایک بڑا وسیلہ اور قربت ہے۔ اپنے عامل کی جو بات تو نے ذکر کی ہے اور کہا ہے کہ ہم نے ظلم کیا اور احترام نہ کیا۔ ہم نے تیرے عامل پر ظلم نہیں کیا، بلکہ اپنے اور بندگان خدا پر سے اس کا ظلم دفع کیا۔ تجھے چاہیے کہ تو اپنے اور اپنے عاملوں کو ظلم سے منع کرے کہ ہم تیرے مطیع اور فرمانبردار رہیں اور امر حق میں تیری مدد کریں۔ اور یہ جو لکھا تھا کہ تیرے عامل پر جو کچھ ہوا اس سے ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ یہ ایک گمان ہے جو تیرے نقصان کا باعث ہوگا کہ انصاف اور طلب انصاف کو ظلم کہتا ہے۔ ہم لوگ خدا کے فضل سے راہ راست پر ہیں اور اچھے آدمیوں کے ساتھ سلوک کرتے ہیں اور اس میں کوئی شک اور شبہ نہیں کرتے۔ ہم لوگ اپنے اس شیوہ جمیل میں کوئی تغیر اور تبدل نہ کریں گے۔ جو شخص ہماری اقتدا کرے گا، راہ راست پر رہے گا، اور سعادت حاصل کرے گا، دنیا اور آخرت میں عزیز اور مکرم ہوگا، اور ان لوگوں میں ہوگا جو ظالموں کو مدد نہیں دیتا، اور قیام سنت اور فرائض میں مداہنت نہیں کرتا۔ یہ جو لکھا تھا کہ ہم توبہ کریں، اور راہ حق کی طرف لوٹ آئیں۔ ہمارا تیری طاعت کی طرف لوٹنا ضلالت ہے اور تقویٰ سے دور ہو جانا ہے۔ تو نے کہا ہے کہ جو ہماری مراد ہو اور جسے ہم امیر چاہتے ہوں مقرر کیا جائے تو پہلی خواہش ہماری یہ ہے کہ تو خدا سے طلب امرزش کرے۔ اپنے جرم و گناہ اور تعدی اور ظلم سے جو ہم پر کیا ہے۔ ہمیں اپنے گھر بار، بچوں اور اعزا سے چھڑا کر دور

پھینک دیا" اور جو فاسق نائب اور عامل ہم پر مقرر کیے ان سے توبہ کرے۔ اگر اس طریقہ پر چلے جو ہم نے کہا ہے تو ہم تیرے اس وقت تک مطیع رہیں گے جب تک تو خدا و رسولؐ کا مطیع رہے گا، ورنہ تیرے مخالف ہوں گے اور اس پر اصرار کریں گے، جب تک خدا ہم میں اور تجھ میں فیصلہ نہ کرے۔ اگر ہماری یہ نصیحتیں قبول ہوں اور ناپسندیدہ کاموں سے توبہ کرے تو عبداللہ بن قیس کو ہمارے شہر میں بھیج کہ ہم میں مساوات جاری رکھے اور شرائع اسلام کو قائم کرے۔ حذیفہ بن الیمان کو افسر مال مقرر کر کہ وہ رعیت سے اپنا معاملہ کرے۔ سعید بن العاص اور ولید بن عقبہ کے ایسے لوگوں کو جو تیرے عزیز ہیں اور رعیت پر اپنے خواہشات نفس کی پیروی سے ظلم اور مخالفت شروع کرتے ہیں اپنے پاس رکھ کہ ہم ان کی امارت کے خواہش مند نہیں ہیں"۔

کمیل بنؓ زیاد کا زبانی جوابؓ

جو لوگ یہ خط عثمان کے پاس لائے ان میں کمیل بن زیاد بھی تھے اور جب پوچھا گیا کہ تم لوگ کیا چاہتے ہو تو انھوں نے کہا کہ: ہمیں وطن مالوف سے باہر نہ کرو کہ ہم اپنے اعزا اور اولاد سے جدا ہو جائیں۔ ہمارے وظیفے دو۔ اپنے نوجوان عزیزوں کو جو ہوائے نفس اور شہوات کی تتبع کرتے ہیں ہمارا امیر نہ بناؤ۔ اور اچھے لوگوں کے ہوتے ہوئے برے کو منتخب نہ کرو"۔

خلیفہ کے ہاتھوں سے رسولؐ کی انگوٹھی گر گئی

ابن خلدون کہتا ہے کہ: "منجملہ ان امور کے جن سے لوگوں کے قلوب پر خاش پر مائل ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتری کا امیرالمومنین عثمان کے ہاتھ سے چاہ اریس میں گر جانا تھا۔ جو مدینہ سے دو میل کے فاصلہ پر تھا۔ بہت تلاش کرائی لیکن نہ ملی"۔

عام مخالفت

بقول اسی مؤرخ کے جب "چاروں طرف علانیہ طعن و تشنیع کا بازار گرم ہو گیا۔ روزانہ اس کی متواتر خبریں مدینہ میں پہنچنے لگیں۔ مدینہ میں بھی لوگوں میں سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ امیرالمومنین عثمان اور ان کے عمال پر زبان طعن دراز ہو گئی"۔

ایک گروہ علیؑ کے پاس خلیفہ کی شکایت کے لیے گیا

تو ایک گروہ عوام کا مجتمع ہو کر علیؑ بن ابی طالب کے پاس گیا" اور امیرالمومنین عثمان کی شکایات اور بنائے مخالفت بیان کی۔

علیؑ نے خلیفہ کو متنبہ کیا

علیؑ بن ابی طالب ان لوگوں کے کہنے سے امیرالمومنین عثمان کے پاس گئے اور لوگوں کے خیالات اور ان کی شکایات و اسباب مخالفت بیان کر کے ــــ اور امیرالمومنین عثمان کا انجام کار اور جن خطرات کا اندیشہ ہوتا تھا اس سے مطلع کیا۔

جناب امیرؑ کی تقریر

اسی کتاب کے نوٹ میں جناب امیرؑ کی جو تقریر لکھی ہے اس کے بعض عبارت توجہ کے قابل ہے کہ: "تم اپنے بابت غور کرو۔ بخدا تم بے بصیرتی سے نہیں دیکھتے اور نہ تم جہالت سے کچھ نہیں جانتے۔ اور بے شک راستہ واضح ظاہر ہے اور بے شک اعلام دین قائم ہیں۔ سمجھو اے عثمان بے شک اللہ تعالیٰ کے بندوں میں افضل امام عادل ہے۔ خود ہدایت پایا (ہوا) اور (جس نے) دوسروں کو ہدایت دی۔

پس اس نے سنت معلومہ کو قائم اور بدعت متروکہ کو مردہ کیا۔ بخدا یہ دونوں امور کھلے ہوئے ہیں اور بے شک سنتیں قائم ہیں ان کے لیے اعلام ہیں اور بے شک بدعتیں بھی قائم ہیں اور اس کے لیے بھی اعلام ہیں اور بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک شریر آدمیوں سے امام ظالم ہے (جو) گمراہ ہوا اور (جس نے) گمراہ کیا۔ پس مردہ کیا اس نے سنت معلومہ کو اور زندہ کیا بدعت متروکہ (کو) اور میں تم کو اللہ تعالیٰ کی سطوت اور انتقام سے ڈراتا ہوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب نہایت شدید و دردناک ہے۔ اور میں تم کو اس سے ڈراتا ہوں کہ تم اس امت کے امام مقتول ہو کہ تمہارے قتل سے اس پر قتل و قتال کا دروازہ قیامت تک کے لیے کھل جائے اور اس پر اس کے واقعات ملتبس اور مشتبہ ہو جائیں گے۔ اور ایک گروہ چھوڑ دیے جائیں گے جو حق کو بوجہ علوئے باطل نہ دیکھ سکیں گے۔ اور اس مباحثہ میں خلط ملط بے حد ہوگا۔ اضطراب و اختلال اس میں پیدا ہوں گے"۔

عثمانؓ منبر پر

عثمان اس کے بعد منبر پر گئے اور کہا کہ: "تم لوگ میری نرمی اور الطاف کی وجہ سے جری ہو گئے ہو۔ ایسی جرأت تم کو ابن خطاب کے زمانہ خلافت میں نہیں ہوئی۔ تم کو مناسب ہے کہ تم لوگ اپنے خیالات تبدیل کر دو، اپنی رائے سے رجوع کرو، اور اپنے کاموں کو اپنے امرا پر چھوڑ دو، جن کو میں نے مامور کیا ہے"۔ علیؑ نے کہا: "بخدا اگر تم میری جگہ پر ہوتے تو تم کو میں قرابت داروں کے پاس و لحاظ کرنے پر کچھ بھی نہ کہتا"۔

اہل مصر کا وفد

اعثم کوفی کے موافق اہل مصر آئے اور انھوں نے بھی وہی شکایتیں کیں جو اور صوبجات کے لوگ کر چکے تھے اور عثمان نے ایک حکم جاری کیا کہ جہاں جہاں کے لوگوں کو شکایت ہو وہ میرے پاس حاضر ہو کر اپنے عذر پیش کریں۔ ابن خلدون کے موافق خلیفہ نے ایام حج میں اپنے عمال کو طلب کیا اور سبھوں کو فہمائش کی۔

علیؑ طلحہ اور زبیر سے معاویہ کی پر معنی تقریر

اور جب یہ لوگ مدینہ آئے تو معاویہ نے کہا: (علی، طلحہ و زبیر بلوائے گئے تھے) "تم لوگ ارباب حل و عقد ہو، اور اس امت کے سرپرست و والی ہو۔ تم نے اپنے دوست (عثمان) کو بلا رو رعایت اس کام کے لیے منتخب کیا، اور اب وہ بڈھا ہو گیا، اور اس کے حق میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہو رہی ہیں۔ تم لوگوں نے اس امر میں اگر کچھ فیصلہ کیا ہے تو میں موجود ہوں۔ باقی رہا یہ امر کہ اگر کوئی شخص خلافت و امارت کی طمع کرے تو واللہ تم لوگ سوائے پیٹھ پھیر کر بھاگنے کے اس سے اور کچھ نہ دیکھو گے"۔ عثمان نے بھی اثنائے گفتگو میں کہا کہ: "میرے اعزہ و اقارب غریب اور کم مایہ والے ہیں۔ میں نے اپنا ہاتھ ان کے لیے کھول دیا۔ پس اگر اس میں تم لوگ میری غلطی دیکھو تو اس کو واپس لے لو"۔

معاویہ کی آخری صلاح

جلسہ برخاست ہونے پر معاویہ نے کہا: امیر المومنین! اس سے پہلے کہ آپ پر حملہ ہو جس کا آپ تحمل نہ کر سکیں مناسب ہوگا کہ آپ میرے ساتھ شام چلے چلیں۔ کیونکہ کل اہل شام میرے مطیع ہیں"۔ اس کے بعد معاویہ شام رخصت ہو گیا۔

اعثم کوفی کے موافق عثمان کے طلب کرنے پر کوفہ، بصرہ اور مصر سے لوگ آنے لگے اور وہ لوگ ان کے ساتھ مل گئے جو مہاجر و انصار میں سے تھے اور جنھیں عثمان سے شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ اور ان میں مشورہ ہوا کہ خلیفہ سے کہو کہ

وہ عزل گوارا کریں یا باہم قتل کر ڈالیں گے۔

ابن خلدون کے تین گروہ

ابن خلدون کے موافق: "مصریوں کی تعداد ایک ہزار تھی"۔ اسی مورخ کے موافق: "اہل بصرہ کی طبیعتیں طلحہ کی طرف مائل تھیں، اور کچھ لوگ بلوائیان کوفہ کے اپنے گروہ سے نکل کر اعوص میں آکر مجتمع ہوئے۔ ان لوگوں کا رجحان زبیر بن العوام کی جانب تھا۔ اس گروہ کے ساتھ کچھ لوگ اہل مصر کے بھی تھے اور عام بلوائی ذوالمروہ میں ٹھہرے رہے۔ مصریوں کی طبیعت علیؑ ابن ابی طالب کی جانب تھی"۔

دارالامارت کا محاصرہ

اس کے بعد ابن خلدون کے موافق "مخالفین عثمان نے علیؑ، طلحہ اور زبیر کو خلیفہ منتخب کیا۔ لیکن ان لوگوں نے جھڑک دیا، اور یہ لوگ اپنے اپنے کیمپ میں واپس گئے۔ صبح ہوتے دیکھا تو امیرالمومنین عثمان کا مکان محاصرہ میں تھا۔ بلوائیوں نے اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا، اور یہ منادی کرائی تھی کہ جو شخص اپنا ہاتھ مقابلہ سے روک لے گا وہ مامون ہے۔ چند ایام تک امیرالمومنین لوگوں کو نماز پڑھاتے رہے اور اہل مدینہ اپنے اپنے مکانوں میں گوشہ گزین رہے"۔

صاحب صواعق محرقہ ابن عساکر سے زمانہ عثمان کے وجوہاتِ انقلاب بیان کرتے ہوئے جس میں ان کی خلاف ورزیاں بنی امیہ کی تقرری، ابوذر، عمار اور ابن مسعود اور ان کے قوم کی ناخوشی کا ذکر کیا ہے، کہتے ہیں: "چون اہل مصر شکوہ عبداللہ بن ابی سرح کردند عثمان کتابتے نوشت او را تہدید دنہی از ان اعمال فرمود۔ عبداللہ مذکور ابا کرد از آنکہ سخن عثمان بشنود درباب آن جماعت و آن کس کہ کتابت از جانب عثمان آمدہ بود او را بقتل رسانید اہل مصر چون مشاہدہ این حال نمودند ہفت صد کس متفق شدہ بمدینہ آمدند و در مسجد نزول کردند و نزد اصحاب پیغمبر شکوہ آغاز کردند در مواقیت صلوۃ از انچہ عبداللہ بن ابی سرح باشان کردہ بود"۔ یعنی: "جب اہل مصر نے عبداللہ بن ابی سرح کی شکایت کی تو عثمان نے اس کی طرف تحریر لکھی اور اسے تہدید اور ان کاموں سے نہی فرمائی۔ عبداللہ مذکور نے اس جماعت کے بارے میں عثمان کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور جو شخص عثمان کی جانب سے تحریر لایا تھا اسے قتل کر دیا۔ اہل مصر نے یہ صورت حال دیکھی تو سات سو آدمی اکٹھے ہو کر مدینہ میں آئے اور مسجد میں اتر پڑے۔ اصحاب پیغمبر کے پاس اوقات نماز میں اس کی شکایت کا آغاز کیا جو کچھ عبداللہ بن ابی سرح نے ان کے ساتھ کیا تھا"۔

طلحہ عثمان کو سخت باتیں کہتے ہیں

آنگاہ طلحہ بن عبداللہ برخاستہ متکلم شد و سخنے سخت بعثمان گفت۔

یعنی: "اس وقت طلحہ بن عبداللہ اٹھ کر بولنے لگا اور عثمان کے ساتھ سخت باتیں کیں"۔

عائشہ اور علیؑ بھی نصیحت کرتے ہیں

باز عائشہ کسے را نزد عثمان فرستاد و گفت اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نزد شما آمدہ اند و التماس می کنند کہ این عامل را عزل کنید و این معنی را ابا می نمائید و حال آنکہ آن مرد شخصے از ایشان را کشتہ است باید ایشان را طریق عدل و انصاف مرعی دارند و دیگر آنکہ علی کرم اللہ وجہہٗ آمدہ گفت این جماعت ارادہ نہ دارند مگر آنکہ شخصے را بجائے شخصے نصب کنی و حال آنکہ قبل ازین دعویٰ خون خودی کردند۔ این عامل را عزل کن و میان ایشان حکم کن اگر حقے بر او ثابت کنند طریق عدالت مرعی دار"۔

یعنی: پھر عائشہ نے کسی کو عثمان کے پاس بھیجا اور کہا اصحاب رسولؐ تمھارے پاس آتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ اس حاکم کو ہٹا دو اور تم اس بات سے انکار کرتے ہو۔ حالانکہ اس مرد نے ان میں سے ایک شخص کو قتل کیا ہے۔ چاہیے کہ ان کے ساتھ عدل و انصاف کا لحاظ رکھیں۔ دیگر حضرت علیؑ آئے اور کہا کہ یہ لوگ صرف ایک شخص کی جگہ کسی دوسرے کو نصب کرنے کو چاہتے ہیں، حالانکہ اس سے پہلے اپنے قصاص کے مدعی تھے۔ اس گورنر کو معزول کردو اور ان کے درمیان فیصلہ کرو۔ اگر اس پر ان کا حق ثابت ہو جائے تو عدل کی راہ کا لحاظ رکھو۔

محمد بن ابی بکر کی تقرری

عثمان گفت ہر کس را کہ ایشان اختیار کنند بجائے او نصب کنم آن جماعت محمد بن ابی بکر را اختیار کردند۔ عثمان او را والی گردانید۔ فرمان جہت او نوشتہ بجانب مصر متوجہ شد و بعضے از مہاجران و انصاریان باتفاق ایشان بیرون آمدند تا ملاحظہ نمایند کہ صحبت میان ایشان و عبداللہ بن ابی سرح بچہ انجر خواہد شد۔ یعنی: عثمان نے کہا کہ یہ لوگ جسے پسند کریں میں اسے اس کی جگہ نصب کردوں گا۔ ان لوگوں نے محمد بن ابی بکر کو پسند کیا۔ عثمان نے اسے گورنر بنا دیا۔ اس کے بارے میں فرمان تحریر کردیا۔ وہ مصر کی طرف چلے۔ کچھ مہاجرین و انصار ان کے ساتھ باہر نکلے تاکہ دیکھیں عبداللہ بن ابی سرح اور ان کے درمیان بات کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

شتر سوار

چون محمد بن ابی بکر با رفیقہا سہ روز راہ از مدینہ دور شدند در اثناء راہ غلامے سیاہ دیدند کہ بر شترے سوار است و شتر را بسرعت تمام می راند گویا کسی را میجوید یا از کسے میگریزد۔ آنگاہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باو گفتند حال قصہ تو چیست باین مانند کہ از کسے می گریزی یا کسے را میجوئی گفت من غلام امیرالمومنین علی ام کہ مرا نزد عامل مصر فرستادہ است گفتند او درین مقام حاضر است بیا نزد او رو گفت مرا باین عامل کار نیست بلکہ نزد عامل اول میروم۔ آنگاہ محمد بن ابی بکر را خبردار گردانیدند۔ او شخصے را طلب غلام فرستاد او را گرفتہ آوردند چون از او پرسیدند کہ غلام کیستی گاہ می گفت کہ غلام حضرت امیرالمومنین عثمان ام و گاہے می گفت غلام مروانم۔ یعنی: جب محمد بن ابی بکر ساتھیوں سمیت مدینہ سے تین روز کی مسافت دور ہو چکے تھے کہ دیکھا کہ ایک سیاہ فام غلام اونٹ پر سوار ہے اور اونٹ کو پوری تیزی سے بھگائے جا رہا ہے، گویا وہ کسی کی تلاش میں ہے یا کسی سے بھاگا جا رہا ہے۔ اصحاب رسولِ خدا نے اس سے پوچھا کہ تیرا کیا قصہ ہے کہ یا کسی سے بھاگ رہا ہے یا ڈھونڈ رہا ہے۔ اس نے کہا میں امیرالمومنین علیؑ کا غلام ہوں۔ آپؑ نے مجھے مصر کے گورنر کے پاس بھیجا ہے۔ انھوں نے کہا اس مقام پر موجود ہے۔ آ اس کے پاس چلیں۔ اس نے کہا مجھے اس گورنر سے کام نہیں، بلکہ پہلے گورنر کے پاس جا رہا ہوں۔ اس وقت انھوں نے محمد بن ابی بکر کو آگاہ کیا۔ اس نے اسے بلوایا۔ اسے پکڑ کر لائے۔ جب اس سے انھوں نے پوچھا کہ کس کے غلام ہو تو کبھی کہتا حضرت امیرالمومنین عثمان کا غلام ہوں، کبھی کہتا مروان کا غلام ہوں۔

عثمان کا غلام اور خط

اتفاقاً مردے در آنجا حاضر بود و آن غلام را می شناخت گفت غلام مروان است پرسیدند بچہ مہم بمصر میروی و کتابتے میداری یا نہ گفت برسالتے میروم و کتابتے ندارم چون تفتیش کردند غیر از اداوہ (کوزہ) خشک شدہ باو چیزے دیگر نہ بود۔ چون اداوہ را متحرک ساختند چیزے دران بود و بیرون نمی آمد آنگاہ آن اداوہ را شگافتند و کتابتے از انجا بیرون آمد۔ یعنی: اتفاق سے ایک مرد وہاں موجود تھا

جو غلام کو پہچانتا تھا۔ اس نے کہا یہ مروان کا غلام ہے۔ انھوں نے پوچھا کس غرض سے مصر جا رہے ہو اور کوئی خط تمہارے پاس ہے یا نہیں۔ اس نے کہا ایک پیغام لے جا رہا ہوں اور خط کوئی نہیں ہے۔ جب تلاشی لی تو بغیر خشک چھوٹے مشکیزے کے اس کے پاس کچھ نہ تھا جب مشکیزے کو ہلایا تو اس میں کوئی چیز تھی جو نکل نہیں رہی تھی تب انھوں نے اسے چیرا اور ایک خط اس سے باہر نکلا۔

خط کا مضمون

محمد بن ابی بکر جمعی کہ از مہاجر و انصار درانجا حاضر بودند ایشانرا طلب نمودہ آن کتابت را خواندند و مضمون آن کتابت این بود کہ: "از عثمان نوشتہ شد بجانب ابی سرح کہ محمد بن ابی بکر و فلان فلان کہ باین جانب می آیند در قتل ایشان حیلہ کن و کتابت ایشان را باطل سازی و بر عمل خود باقی مانی و برقرار باشی۔ تا وقتیکہ پیغامے ویا نامہ من بتو رسد و اگر کسے بہ تظلم تو و شکایت بہ طرف من آید .... بس کن تا وقتیکہ خبر بتو رسد انشاء اللہ تعالیٰ"۔ یعنی: محمد بن ابی بکر نے مہاجر و انصار کی جو جماعت وہاں موجود تھی اسے بلایا اور اس خط کو انھوں نے پڑھا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا: "عثمان کی طرف سے ابن ابی سرح کی جانب لکھا گیا کہ محمد بن ابی بکر اور فلاں فلاں کہ جو ادھر آ رہے ہیں ان کے قتل کا حیلہ کر اور ان کے پاس جو تحریر ہے اس کو باطل کر اور اپنی گورنری پر باقی و برقرار رہ۔ جب تک کہ میرا کوئی پیغام یا خط تجھ تک نہ پہنچے۔ اگر کوئی تیری طرف سے ظلم کا گلہ یا شکایت لے کر میرے پاس آئے گا تو............

محمد بن ابی بکر مدینہ واپس ہوئے

"آنگاہ محمد بن ابی بکر و اصحاب فارغ شدند از خواندن کتابت آنرا بہ مہر جمع کہ ہمراہ بودند رسانیدند و بہ کسے این سپردند و بجانب مدینہ مراجعت نمودند"۔ یعنی: "اس وقت محمد بن ابی بکر اور اصحاب نے اس خط کے پڑھنے سے فارغ ہو کر ساتھ میں موجود جماعت کی مہر لگوائی اور کسی کے سپرد کر دیا اور مدینہ کی طرف لوٹے"۔

کوئی نہ رہا جو عثمان سے خفا نہ ہوا

جب اصحاب کو یہ حال معلوم ہوا تو "ہیچ کس از اہل مدینہ نماند مگر آنکہ بر عثمان دل تنگی و خشم نمودند۔ و اصحاب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمیعاً غم ناک شدہ بمنزلہائے خود رفتند و جماعت مذکور عثمان را محاصرہ کردند و محمد بن ابی بکر جماعت بنی تیم و غیر ایشان بروے لشکر کشیدند"۔ یعنی: "اہل مدینہ میں سے کوئی نہ رہا مگر عثمان پر غصہ اور دل تنگی کا اظہار کیا۔ اور اصحاب محمد مصطفیٰؐ تمام غم ناک ہو کر اپنے گھروں میں گئے اور مذکورہ جماعت نے عثمان کا محاصرہ کر لیا۔ اور محمد بن ابی نے تیم اور دوسرے لوگوں کی جماعت سے عثمان کے خلاف لشکر کشی کی"۔

مقدمہ

چون علیؑ مشاہدہ این امر نمود۔ طلحہ و زبیر و سعد و عمار را و جمعی دیگر از اصحاب را کہ جمع ایشان از اہل بدر بودند طلب نمود و نزد عثمان رفت و شتر و کتابت مذکورہ۔ آنگاہ بجانب عثمان التفات نمود گفت این غلام ملک شماست۔ گفت بلے۔ باز گفت این شتر شماست۔ عثمان گفت بلے۔ باز گفت این کتاب شما نوشتہ اید۔ عثمان قسم یاد کرد بخدائے کہ این کتابت من نہ نوشتہ ام۔ و کسے را امر نہ کردہ ام بنوشتن آن و بہ این علم نہ دارم۔ علیؑ گفت مہریکہ بر این کاغذ است مہر شماست۔ عثمان گفت بلے مہر من است باز علیؑ گفت چگونہ غلام شما با شتر و کتابتے و مہر و سکہ

شماست بیرون میروید و شما خبر نہ دارید"۔ یعنی : "جب علیؑ نے یہ بات دیکھی کہ طلحہ، زبیر، سعد، عمار، اور صحابہ کی ایک اور جماعت کے کہ جو اہلِ بدر سے تھے بلوایا اور عثمان کے پاس گئے اور اونٹ اور مذکورہ خط بھی لے گئے۔ اس وقت عثمان کی طرف ملتفت ہو کر کہا یہ غلام تمھاری ملک ہے؟۔ وہ بولے جی ہاں۔ پھر کہا یہ اونٹ تمھارا ہے؟۔ عثمان نے کہا ہاں۔ پھر کہا یہ خط تم نے لکھا ہے۔ عثمان نے خدا کی قسم اٹھا کر کہا کہ یہ خط میں نے نہیں لکھا ہے۔ اور نہ اس کے لکھنے کا کسی کو حکم دیا ہے۔ اور نہ مجھے اس کا علم ہے۔ علیؑ نے کہا اس کاغذ پر جو مہر ہے تمھاری مہر ہے؟۔ عثمان بولے ہاں میری مہر ہے۔ پھر علیؑ نے کہا کس طرح تمھارا غلام تمھارے اونٹ، خط، مہر اور سکہ کو لے کر باہر جا سکتا ہے۔ جب کہ تمھیں اس کی خبر ہی نہ ہو۔

مروان کے دینے سے اِنکار اور اصحابؓ پر اثر

گفتند مروان را بما تسلیم کن و مروان چون در خانہ عثمان بود از تسلیم نمودن او امتناع نمود و اصحاب بواسطہ امتناع از تسلیم شاکی و غضب ناک از منزل عثمان بیرون آمدند۔ و نزد ایشان ظاہر و واضح بود کہ عثمان سوگند دروغ یاد نمی کند و ازین معنی خبر نہ دارد۔ ولیکن قومے گفتند کہ ابراء ذمہ عثمان نمی شود مگر آنکہ مروان را بما تسلیم نماید و باو مباحثہ کنیم و بدانیم کہ چون امر نمودہ است بہ قتل دو مرد از اصحاب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بغیر حق۔ از دو حال بیرون نیست۔ اگر عثمان نوشتہ باشد او را عزل می کنیم۔ و اگر مروان از زبان عثمان نوشتہ در امر مروان نظر خواہیم کرد۔ وبعد ازین حکایت اصحاب از خانہ خود بیرون نیامدند و عثمان مروان را نزد ایشان نہ فرستاد از قتل او اندیشید بنابراین آن گروہ محاصرہ عثمان کردند و آب از وے منع نمودند"۔ یعنی : "انھوں نے کہا مروان کو ہمارے حوالے کرو۔ مروان چونکہ عثمان کے گھر میں تھا انھوں نے اس کو حوالہ کرنے سے انکار کیا اور اصحاب اس انکار سے شاکی اور غضب ناک ہو کر عثمان کے گھر سے نکل آئے اور ان کے نزدیک واضح تھا کہ عثمان جھوٹی قسم نہیں اٹھا سکتے اور انھیں اس بات کی کوئی خبر نہیں ہے۔ لیکن ایک گروہ نے کہا کہ عثمان جبھی بریٔ الذمہ ہو سکتے ہیں کہ مروان کو ہمارے حوالے کریں اور ہم اس سے مباحثہ کریں اور جان لیں کہ چونکہ محمد مصطفیٰؐ کے دو اصحاب کو ناحق قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہ دو حال سے خالی نہیں۔ اگر عثمان نے لکھا ہو تو اسے معزول کر دیں، اور اگر مروان نے لکھا ہو تو مروان کے بارے میں غور کریں گے۔ اس حکایت کے بعد اصحاب اپنے گھروں سے باہر نہ آئے اور عثمان نے مروان کو ان کے پاس نہ بھیجا۔ اس کے قتل کیے جانے کا اندیشہ کیا۔ اس وجہ سے اس گروہ نے عثمان کا محاصرہ کر لیا اور اس سے پانی کو روک دیا"۔

محاصرہ کرنے والوں نے عثمان کے پیچھے نماز پڑھنا ترک کر دی

اس واقعہ کا اثر اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ بقول ابن خلدون : "اس وقت تک بلوایانِ مصر و کوفہ و بصرہ امیر المومنین عثمان کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ لیکن اس واقعہ کے بعد انھوں نے لوگوں کو امیر المومنین عثمان کے پاس جانے اور ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے روکنا شروع کیا"۔

عثمان اپنے عاملوں کو مطلع کرتے ہیں

"امیر المومنین عثمان نے والیان ممالک اسلامیہ کے نام متعدد فرامین بھیجے اور ان کو ان واقعات سے مطلع کیا"۔

ابنِ عمر کی صلاح کہ جماعت کو عزل کا اختیار نہ دو

اعثم کوفی کے موافق زمانہ محاصرہ میں عثمان نے عبد اللہ بن عمر سے کہا:

"تم دیکھتے ہو کہ مخالفین میری عزل کی نسبت کہتے ہیں"۔ اس پر عبد اللہ نے کہا: "یہ طریقہ جاری نہ کرو کہ جس وقت جماعت خلیفہ سے راضی نہ ہو، اسے معزول کردے، اور دوسرے کو اس کی جگہ بٹھائے۔ جس لباس کو خدائے تعالیٰ نے تمھیں پہنایا ہے اسے محفوظ رکھو، اور جدا نہ کرو۔ اس قوم سے کہو کہ: ہم کتاب خدا اور سنّتِ محمّد مصطفیٰؐ پر عمل کریں گے۔ اگر مانیں تو دونوں کے لیے بہتر ہے اور اگر انکار کریں تو تمھارے لیے اچھا اور ان کے لیے بُرا ہوگا۔

عمروؓ بن عاصؓ اور مُغیرہ کی سفارتؓ بے کار ہوئی

عثمان نے مغیرہ بن شعبہ کو بلایا، اور انھیں سفارت پر روانہ کیا لیکن ان کے اِستقبال کو فاتحانہ کامیابی مُطلق نصیب نہ ہوئی۔ عمرو بن عاص بھیجے گئے اور یہ بھی "شرمندہ" واپس ہوئے۔ اب ابن عمر کی صلاح سے علیؑ کو بھیجنا طے پایا، اور جناب امیرؑ نے اس شرط پر سفارت منظور کی کہ: "مجھ سے عہد کرو کہ جو کچھ تم کہتے ہو اس پر وفا کروگے"۔

جنابؓ امیرؑ کی وساطت لوگوں کا صافؓ جوابؓ اور رضامندی

جناب امیرؑ تشریف لے گئے۔ اور لوگوں نے کہا:

"اے ابا الحسنؑ آپ بہ سعادت واپس چلے جائیے اور اس میں تکلیف نہ اٹھائیے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ معاملہ طے نہ ہوگا۔ اس قوم کا ارادہ دوسرا ہے۔ ہم لوگوں کو آپ کی عزت ہے۔ آپ کی عزت واجب ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری طرف سے آپ کی حرمت میں کوئی تقصیر نہ ہو"۔

جناب امیرؑ کی ذات نے انھیں راضی کیا۔ عثمان پاس آئے صلح نامہ ہوا اور اس کے بعد غلام اور خط کا قصہ تھا۔ اس کے بعد عثمان نے خطبہ پڑھا، اور برائت ظاہر کی۔ مجمع کی حالت بہت جوش کی تھی۔ اثنائے تقریر میں عثمان پر ڈھیلے پڑے اور یہ منبر پر نہ رہ سکے۔ ابن خلدون نے بھی یہ کہا ہے کہ جب علیؑ کے بھجانے سے لوگ واپس ہوئے تھے تو مروان نے خلیفہ سے کہا کہ: آپ منبر پر تقریر کیجیے کہ اہل مصر اس وجہ سے واپس ہوئے کہ انھیں جھوٹ خبریں ملی تھیں۔

واقعاتؓ کے خلافؓ تقریر پر لوگوںؓ کی صدا

جوں ہی عثمان نے تقریر شروع کی: "چاروں طرف سے آواز آنے لگی:

"اتق اللہ یا عثمان وتب الی اللہ"۔ "سب سے پہلے اس فقرہ کو عمرو بن العاص نے کہا تھا"۔

لوگوں سے سختی کرنے کا حکم

اسی مؤرخ نے یہ بھی کہا ہے کہ جب توبہ والی تقریر کرچکے تو بنی امیہ نے عثمان کو ملامت کی اور جب اس کے بعد چند آدمی رخصت ہونے یا اور کسی غرض سے دروازہ پر جمع ہوئے تو عثمان نے مروان سے فرمایا کہ تو جا کر ان لوگوں سے ہم کلام ہو اور گفتگو کرنے میں درشتی سے کام لے۔ چنانچہ مروان نے نکل کر کہا:

بنی امیہ اپنے ذاتی اختیار کے لیے لوگوں کی صداقت سے لاپرواہ تھے

تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے تمہاری کیا حالت ہے۔ تم لوگ ہمارے قبضہ سے ہمارے ملک کو چھیننے کو آئے ہو۔ بخدا اگر تم نے کسی قسم کا قصد کیا تو ہم تم پر ایسا بوجھ ڈالیں گے کہ جس کو تم اٹھا نہ سکو گے۔ جاؤ اپنے اپنے مکانات کی طرف لوٹ جاؤ بخدا جو ہمارے قبضہ میں ہے اس میں ہم تم سے مغلوب نہیں ہیں۔

یہ تقریر سن کر علیؑ پر اثر

اسی مؤرخ کے موافق جب جناب امیرؑ نے یہ تقریر سنی تو فرمایا: "تم نے عثمان کا خطبہ کل اور مروان کا کلام آج سنا ہے۔ میں جب گھر میں بیٹھ رہا تو عثمان نے مجھے کہا کہ تم نے مجھے چھوڑ دیا، تم نے میری قرابت و حق کا پاس نہ کیا، اور جب میں نے دخل دیا، اور لوگوں کو سمجھا بوجھا کر دور کیا تو مروان کے کہنے سے لڑکوں کے کھیل کی طرح اس کو الٹ دیا۔ تعجب ہے کہ عثمان باوجود مسن ہونے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت سے مشرف ہونے کے مروان کے قبضہ میں ہے جس طرح وہ چاہتا ہے اس طرف پھیر دیتا ہے"۔

علیؑ عثمانؓ کے پاس نہ جانے کا عہد کرتے ہیں

اس کے بعد جناب امیرؑ نے عثمان کو مروان کے تسلّط پر ملامت کی اور کہا کہ: "آج سے اب میں پھر تمہارے پاس نہ آؤں گا"۔

نائلہ کی صلاح

نائلہ زوجہ عثمان یہ تقریر سن رہی تھیں۔ انھوں نے بھی "مروان کی پابندی پر نصیحت اور علیؑ بن ابی طالب سے صلاح و مشورے لینے کی رائے دی"۔

عثمان کس بات کو باعثِ ننگ جانتے ہیں

اس روایت کے موافق کہ وقت محاصرہ جناب امیرؑ خیبر میں تھے۔ جب واپس آئے اور عثمان ملاقات کو گئے تو کہنے لگے: "اے علی! میرے حقوق تم پر بہت ہیں۔ بھائی ہونے کا حق ہے۔ قرابت داری کا حق ہے۔ ہم حلف ہونے کا حق ہے اور بفرض تقدیر اگر جاہلیت ہی کا زمانہ ہوتا تو بھی بنی عبد مناف کے لیے یہ امر باعث ننگ تھا کہ بنو تیم ان کے قبضہ سے حکومت چھینے"۔

طلحہ اور علیؑ

علیؑ بن ابی طالب یہ سن کر طلحہ کے پاس گئے۔ دریافت کیا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ جواب دیا: کیا بعد اس کے کہ تنگ نے مس کیا چھاتیوں کو اے ابوالحسنؑ (کسی کام کے حد سے تجاوز ہونے کا محاورہ۔ یہ ظاہر ہے کہ جب تنگ چھاتیوں تک پہنچ جائے کا تو زین پشت پر نہیں ٹھہر سکتا) علیؑ بن ابی طالب لوٹ کر بیت المال کی طرف آئے۔ لوگوں کو جو کچھ مناسب تھا دیا۔ لوگ طلحہ کے پاس سے اٹھ کر چلے گئے۔ اکیلے طلحہ رہ گئے۔ امیرالمومنین عثمان کو اس سے مسرت ہوئی۔ بعد اس کے طلحہ امیرالمومنین عثمان کے پاس آئے۔ آپ نے فرمایا میں تائب نہیں ہوا لیکن مغلوب ہوا ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ اے طلحہ تم کو کافی ہو"۔

اہل مصر جس وقت غلام کو گرفتار کر کے واپس آئے تو انھوں نے شکایتیں پیش کیں اور کہا: "تعجب کا مقام ہے کہ اس قسم کے خطوط تمہاری مہر سے لکھے جائیں اور تمہارا غلام لے کر جائے اور تم کو اس کی اطلاع نہ ہو؟۔ پس تم جھوٹے ہو یا سچے ہو، اور بہر دو تقدیر تم سے خلافت لے لینا مناسب ہے۔ کیونکہ جھوٹے کو مسلمانوں کا والی بنانا جائز نہیں ہے،

اور اگر سچ ہو تو تمہارا ضعف اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ تمہارے بغیر اجازت و اطلاع جس کا جو جی چاہتا ہے کرتا ہے۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ تم خلافت چھوڑ دو"۔

جہاںؓ عثمانؓ خلیفہ بنانے والے اللہ تعالیٰ کے مرادف ہیںؓ

امیرالمومنین عثمان نے فرمایا: "میں اس لباس کو نہیں اتارا چاہتا جس کو اللہ تعالیٰ نے مجھے پہنایا ہے۔ یعنی میں خود منصب خلافت ترک نہیں کروں گا۔ ہاں یہ ہوگا کہ اگر مجھ سے غلطی ہوئی تو میں توبہ کروں گا اور اپنی غلط رائے سے رجوع کروں گا"۔ ابن عدیس نے کہا: "ہم بارہا دیکھ چکے ہیں کہ تم توبہ کرتے ہو اور پھر وہی کام کرتے ہو۔ اب ہم پر فرض ہے کہ ہم تم سے خلافت چھین لیں۔ یا تم کو قتل کر ڈالیں اور اگر تمہارے دوستوں میں سے کوئی مزاحمت کرے تو اس سے بھی لڑیں گے اور جب تک ہم زندہ ہیں لڑتے جائیں گے۔ پس یا تم تک پہنچیں یا مرجائیں گے"۔۔۔ علیؑ بن ابی طالب اٹھے اور بلوائیوں کو امیرالمومنین عثمان کے پاس سے نکال کر اپنے مکان پر چلے آئے۔

معاویہ وغیرہ سے عثمانؓ مدد طلب کرتے ہیں

اور مصریوں نے امیرالمومنین عثمان کے مکان کا دوبارہ محاصرہ کرلیا۔ دوبارہ محاصرہ کرنے کے بعد معاویہ و ابن عامر کو امداد کے لکھا۔

معاویہ کا جوابؓ

اعثم کوفی کے موافق معاویہ نے جواب دیا کہ خدا نے جس سے کوئی نعمت چھین لی ہو میں اسے واپس نہیں کرسکتا۔ اگر میں یہاں سے جاؤں گا تو دشمنانِ اسلام اس صوبہ پر حملہ کردیں گے۔ عبداللہ بن عامر کریز نے بصرہ میں لوگوں کو آمادہ کرنا چاہا، لیکن کوئی نہ گیا۔

پھر علیؑ کی وساطتؓ اور تین دنؓ کی بے کار مہلتؓ

پھر امیرالمومنین عثمان کے مشیروں نے رائے دی کہ علیؑ بن ابی طالب کو ان لوگوں کے روکنے کے لیے بھیجو کہ وہ ان کو سمجھا بوجھا کر واپس کردیں اور ان سے وعدہ کردیں کہ ان کی مرضی کے موافق عمال کی بحالی و معزولی کی جائے گی۔ چنانچہ علیؑ بن ابی طالب بلوائیوں کے پاس گئے۔ وعظ و پند کرکے ان کی درخواستوں کے موافق عمل درآمد کرنے کا وعدہ کیا۔ بلوائیوں نے کہا: آپ ایک میعاد مقرر کیجیے۔ علیؑ بن ابی طالب لوٹ کر امیرالمومنین عثمان کے پاس آئے۔ امیرالمومنین عثمان نے تین دن کی مدت مقرر فرمائی۔ علیؑ بن ابی طالب نے ایک عہدنامہ لکھ کر بلوائیوں کو دیا۔ جس میں اقرار تھا کہ تین یوم کے اندر ان کی مرضی کے موافق عمال کی تقرری و معزولی اور ان کی شکایت رفع کردی جائے گی۔ بلوائی اس اقرار نامہ سے بلا جنگ و جدل رکے رہے۔ لیکن امیرالمومنین عثمان نے کسی وجہ سے کسی قسم کا تغیر و تبدل نہ کیا۔ بعد انقضاء میعاد بلوائیانِ مصر ذی خشب سے مدینہ میں ایفاء عہد کی غرض سے آئے۔ امیرالمومنین عثمان نے انکار کیا۔ بلوائیوں نے برہم ہوکر چاروں طرف سے محاصرہ کرلیا"۔

عثمانؓ کا لوگوںؓ سے خطابؓ

اس کے بعد ابن خلدون ہی کے موافق عثمان نے سب لوگوں کو بلوا بھیجا جس میں بلوائی اور غیر بلوائی سب تھے۔ اس کے بعد کہنا شروع کیا:

"اے اہلِ مدینہ! میں تم کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں اور اس سے دعا کرتا ہوں کہ میرے بعد تم پر کسی اچھے کو خلیفہ بنائے"۔ یہ کہہ کر تھوڑی دیر تک خاموش رہے، پھر سر اٹھا کر بولے: "تم کو میں اللہ تعالیٰ کی قسم دلاتا ہوں کیا تم جانتے ہوں کہ عمر کے زخمی ہونے کے وقت تم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کسی کو منتخب کردے اور تمہارے بہترین شخص پر تم کو مجتمع کردے۔ کیا تم کہوگے کہ یہ نہیں قبول کیا یا کہوگے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو اس دین کا ولی کیا ہے اس کو ابتلا میں نہیں ڈالا۔ یا کہوگے کہ امت نے مکابرہ سے یا بغیر مشورہ کے ولی کیا ہے۔ پس اپنے کام کو اس کے سپرد کردیا بغیر میرے انجام بینی کے۔ پھر میں تم کو اللہ کے قسم دلاتا ہوں تم لوگ میرے سوابق کو جانتے ہو جس کا حق واجب ہے پس درگزر کرو۔ کیونکہ تین آدمیوں کے سوا اور کسی کا قتل کرنا جائز نہیں ہے، زانی محصن اور مرتد اور قاتل بغیر حق کا"۔

لوگوں کا جواب

بلوائیوں نے جواب دیا کہ جو تم نے بعد عمر فاروق کے استخارہ کے نسبت کہا ہے تو اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس میں کیا اچھا کیا۔ لیکن درحقیقت اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک بلا بنایا ہے جس میں اس نے اپنے بندوں کو مبتلا کیا ہے۔ اور حق اور سابقیت اسلام کو جو تم کہتے ہو تو وہ صحیح ہے اور تم ضرور اس کے مستحق تھے لیکن تم نے بہت سی باتیں ایسی کی ہیں جس سے تم کو ہم حق قائم کرنے کے لیے بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ اس خیال سے کہ مبادا سال آئندہ اور فتنہ و فساد برپا نہ ہو، اور باقی رہا یہ کہنا کہ تین ہی آدمیوں کو قتل کرنا چاہیے، اس کے نسبت ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سوائے ان تینوں آدمیوں کے اور لوگوں کا قتل کرنا بھی جائز دیکھتے ہیں۔ ازانجملہ ان آدمیوں کا قتل کرنا روا ہے، جو دنیا میں باعث فساد ہوں، یا بغاوت پر جو شخص لڑے یا حق و راستی کو منع اور اس پر مکابرہ کرے۔ اور تم نے بے شک بغاوت کی اور حق پر مکابرہ کیا، اور جو لوگ فساد کے باعث ہیں ان کے طرفدار ہوئے اور بلاشبہ تم نے امارت کا زور و دباؤ ہم پر ڈالا، اور بے شک جو لوگ ہم سے لڑے اور لڑنے کو آتے ہیں وہ تمہاری امارت کی وجہ سے لڑتے ہیں۔ پس اگر تم خلافت چھوڑ دو تو وہ لوگ برسرِ مقابلہ نہ آئیں گے۔

کھانا پانی بند کرنے پر علی لوگوں کو ملامت کرتے ہیں

اس کے بعد خلیفہ کے پاس پانی پہنچنا مشکل ہوگیا۔ اور بقول ابن خلدون:

"عثمان نے علیؑ و طلحہ و زبیر و امہات المومنین کے پاس کہلا بھیجا کہ بلوائیوں نے میرا پانی بند کردیا ہے۔ اگر تم لوگ مجھ کو پانی پہنچا سکتے ہو تو مجھے پانی بھیج دو۔ علیؑ بن ابی طالب اس دردناک خبر کے سنتے ہی علی الصباح سوار ہو کر بلوائیوں کے پاس گئے اور ان کو مخاطب کرکے فرمایا: "اے لوگو! تمہارا یہ فعل نہ مسلمانوں سے مشابہ ہے نہ کافروں سے۔ تم لوگ اس شخص (عثمان) کا پانی و کھانا نہ بند کرو۔ بلاشبہ رومی اور ایرانی اپنے قیدیوں کو کھلاتے پلاتے ہیں"۔

حضرت عائشہ حج کو چلیں

واقعات کی یہ صورت تھی کہ بقول ابن خلدون: "ام المومنین عائشہ صدیقہ بقصد حج نکلیں اور اپنے بھائی محمد کو ہمراہی کی غرض سے بلایا۔ محمد نے ساتھ جانے سے انکار کیا۔ حنظلہ کاتب وحی بولے: تم کو ام المومنین اپنی ہمراہی کے لیے بلاتی ہیں۔ تم ان کے ساتھ نہیں جاتے ہو اور سفہاء عرب کی اتباع کرتے ہو، جو تمہارے شایان شان نہیں ہے۔

بنو عبدِ مناف کے تسلّط کا خوف

بفرض محال اگر اس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ امیرالمومنین عثمان مغلوب ہوں تو تم پر بنو عبد مناف مسلط ہو جائیں گے۔

یہ واقعہ اعثم کوفی نے جس وضاحت سے موجود ہے اس سے اس وقت حج کی روانگی اور اس کے بعد حیرت خیز جذبہ ہمدردی کا پیدا ہونا دونوں اچھی طرح سمجھ میں آنے کا وہ لکھتا ہے :

حضرت عائشہؓ اور عثمانؓ میں کشیدگی تھی

"پیش ازیں درمیان عائشہ و عثمان گفتگوے رفتہ بود و عائشہ از و ناخوش دل گشتہ خشم گرفتہ سبب آنکہ مکرر روزے چند در وظیفہ ارزاق کہ عائشہ را معین بود تاخیرے افتادہ و بمتعلقان او واصل نہ شدہ۔ عائشہ او را گفت اے عثمان امانت بخوردی و رعیت را ضائع گزاشتی و جماعتے بد مردمان را از خویشاوندان خویشتن بر سر نیک مردان و ضعیفان مسلط گردانیدی خدائے تعالیٰ ترا از آسمان آب ندہاد و از برکات زمین محروم بگرداناد۔ اگر حرمت پنج نماز نیستی کہ می گزاری واللہ ترا چنان کشتندے کہ شتران را کشند"۔ یعنی : "اس سے پہلے عائشہ و عثمان کے درمیان گفتگو ہو چکی تھی۔ عائشہ اس سے ناراض اور غضبناک تھیں۔ کیونکہ عائشہ کا جو وظیفہ مالی مقرر تھا اس میں کئی بار چند روز کی تاخیر کی گئی اور آپ کے متعلقین تک نہ پہنچا۔ عائشہ نے فرمایا : اے عثمان! تو نے امانت کھائی اور ضائع کر دی اور اپنے رشتہ داروں میں سے برے لوگوں کے ایک گروہ کو نیک اور کمزور لوگوں پر مسلط کر دیا۔ اللہ تعالیٰ تجھے آسمان سے پانی نہ دے اور زمین کی برکتوں سے محروم کر دے، اگر نماز کی حرمت و عزت نہ ہوتی جو کہ تو پڑھتا ہے تو تجھے اس طرح قتل کر دیتے جیسے اونٹوں کو کاٹ ڈالتے ہیں"۔

حضرت عائشہؓ کا فتویٰ

عثمان این آیت از قرآن مجید در جواب عثمان او برخواند : ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ (۶۶ : ۱۰) یعنی : "عثمان نے آپ کے جواب میں قرآن مجید سے یہ آیت پڑھی : (ترجمہ) "اللہ نے نوحؑ کی بیوی اور لوطؑ کی بیوی کو ان لوگوں کے لیے بطور مثل بیان فرمایا جو کافر تھے۔ وہ دونوں ہمارے دو بندوں کے تحت تھیں۔ ہمارے صالح بندوں میں سے پس ان دونوں نے ان سے خیانت کی تو یہ دونوں انھیں اللہ سے نہ بچا سکے اور کہا گیا کہ دونوں داخل ہو جاؤ جہنم میں داخل ہونے والوں کے ساتھ"۔

"ازین معنی خاطر اندیشہ مردمان بر عثمان بنہایت (؟) و میگفت بکشید این پیر کفتار را کہ ہنوز پیراہن حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کہنہ نہ شدہ است کہ سنت او را کہنہ کردند۔ بکشید این پیر کفتار را و زندہ مگزارید۔ در جملہ چون مردمان بمنازعت عثمان بر خواستند و بر در سرائے او گرد آمدند و او را سرائے نیافتند عائشہ کار ساختہ کرد و راحلہ مرتب گرد آمدند و جانب مکہ بر عزیمت حج گزاردن روان شد"۔ یعنی : "اس سوچ سے لوگوں کو عثمان پر برانگیختہ کرتیں اور کہتیں کہ اس بوڑھے بجو کو مار ڈالو کہ ابھی حضرت مصطفیٰ کا قمیص پرانا نہیں ہوا ہے کہ آپ کی سنت کو پرانا کر دیا۔ اس بوڑھے بجو کو قتل کر دو اور زندہ نہ چھوڑو۔ جب لوگ عثمان سے جھگڑنے کو اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ کی سرائے کے آس پاس اکٹھے ہوئے آپ کو گھر پر نہ پایا، عائشہ نے ایک کام کیا تھا سواری تیار کروائی اور مکہ کی طرف حج کرنے کے قصد سے روانہ ہو گئیں"۔

مروان اور عائشہ

مروان حکم بخدمت او رفت و گفت اے مادر مومنان اگر عزیمت حج در توقف داری و در معنی این واقعہ کہ عثمان را افتادہ است بآن قوم کلمہ گوئی تا شر این قوم از و دفع شود ہمانا اولیٰ تر باشد و ثواب آن از حج زیادت۔ عائشہ گفت آن ساعت این سخن با من مگوی کہ حج بر من فرض شدہ است واللہ کہ مقام نتوانم کرد۔

یعنی: "مروان آپ کی خدمت میں گیا اور بولا اے مومنوں کی ماں! اگر قصدِ حج موقوف کرو اور عثمان کو جو کچھ پیش آگیا ہے اس واقعہ کے بارے میں ان لوگوں کو کوئی بات کہو تا کہ اس قوم کے شر کو عثمان سے دُور کر دو تو یقیناً بہتر ہوگا اور اس کا ثواب حج سے زیادہ ہوگا۔ عائشہ نے کہا: اس وقت یہ بات مجھ سے نہ کرو کہ حج مجھ پر واجب ہو چکا ہے اللہ کی قسم میں ٹھہر نہیں سکتی"۔

مروان جھلا کر شعر پڑھتا ہے

مروان حسب حال این بیت بخواند: ضرب قیس علی البلاد اذا اضطرب اججا یعنی قیس آتش فتنہ در شہرہا زد چون آتش در گرفت و شعلہ فتنہ بلند گشتہ قیس سر خویش گرفت و برفت۔ عائشہ گفت میدانم کہ این چہ مثل است کہ میزنی۔ مرا در دفع طائفہ از امیرالمومنین عثمان مقصر دانی و راست پنداری کہ من در عثمان بشکم و او را امین نمی شناسم این بگفت و بجانب مکہ معظمہ زادہا اللہ شرفا روانہ شد"۔ یعنی: مروان نے حسب حال یہ شعر پڑھا: (ترجمہ) "قیس نے فتنہ کی آگ شہروں کو لگائی جب آگ لگ گئی اور فتنہ کے شعلے بلند ہوئے تو قیس خود کو بچا کر چلا گیا"۔ عائشہ نے کہا کہ میں جانتی ہوں کہ یہ کونسی کہاوت ہے جو تو کہہ رہا ہے۔ تو سمجھتا ہے کہ میں عثمان سے اس گروہ کو دور کرنے میں کوتاہی کرنے والی ہوں اور اسے امین نہیں سمجھتی۔ یہ کہا اور مکہ (زادہا اللہ شرفا) کی طرف چلی گئیں۔

توبہ یا خلع

طبری کہتا ہے: "حضرت عائشہ بجنگ بود چون او را (عثمان) حصار گرفتند او بحج می رفت و می گفت عثمان رضی اللہ عنہ را کہ توبہ بایستے کردن و یا خویشتن را خلع کردن"۔

یعنی: حضرت عائشہ جنگ پر تھیں اور جب عثمان کا محاصرہ ہوا اور وہ حج پر جا رہی تھیں تو کہہ رہی تھیں عثمان کو کہ تجھے توبہ کرنی چاہیے یا خلافت سے خود کو الگ کر لینا چاہیے۔

رسولؐ کے کپڑے پرانے نہیں ہوئے سنت کہنہ ہوگئی

صاحب روضۃ الصفا کہتا ہے کہ: عائشہ آزردہ تھیں، اور "مروان را بر مخالفت می گماشت و میگفت ہنوز جامہ رسولؐ نو است کہ سُنّت او کہنہ و متروک شد"۔ یعنی: لوگوں کو مخالفت پر ابھارتیں اور کہتی تھیں کہ ابھی رسولؐ کا لباس نیا ہے کہ ان کی سنت کہنہ ہوگئی اور چھوڑ دی گئی۔

مدد کی خبر سن کر محاصرہ کی سختی

بقول طبری: جس وقت محاصرہ کرنے والوں کو معلوم ہوا کہ عثمان نے اپنے عاملوں سے مدد طلب کی ہے تو انھوں نے محاصرہ میں سختی شروع کی۔ طلحہ نے بیت المال پر قبضہ کر لیا اور کہا کہ: "عثمان را سخت گیرید کہ فوج نزدیک او آمد"۔ یعنی: عثمان پر سختی کرو کہ فوج اس کے نزدیک آگئی۔ اور عثمان نے یہ سن کر کہا کہ: "یہ سب طلحہ کا کیا ہوا ہے کہ خود خلیفہ ہو جائے"۔

بقول روضۃ الصفا: "عثمان گفت کہ طلحہ این فتنہ انگیختہ است"۔ عثمان نے کہا کہ طلحہ نے یہ فتنہ اٹھایا ہے۔

طلحہ، زبیر اور سعد محاصرہ سے عثمانؓ کے پاس آئے

اعثم کوفی کہتا ہے کہ ایام محاصرہ میں جو پچاس روز تک قائم رہا، ایک روز عثمان کوٹھے پر آئے اور سلام کیا، اور پوچھا کہ تم میں طلحہ، زبیر اور سعد ہیں؟۔ اور جب یہ لوگ سامنے آئے تو شکایت کی کہ ہمیں گمان نہ تھا کہ تم کسی مجمع میں ہو۔ ہم سلام کریں اور تم جواب نہ دو۔ اس کے بعد خلیفہ نے علیؑ کو پیغام بھجوایا کہ ہمارے پاس پانی نہیں ہے اور بقول صاحب صواعق و اعثم کوفی وغیرہ علیؑ نے تین مشکیں بھیج دیں۔

حسنینؑ زخمی ہوئے

حسنینؑ، قنبر اور اکثر بنی ہاشم کو حکم دیا کہ مخالفین میں سے کسی کو گھر میں داخل نہ ہونے دو۔ اور روایتیں یہ بھی کہتی ہیں کہ اس کشمکش میں حسنینؑ زخمی بھی ہوئے۔

اعثم کوفی نے یہ بھی کہا ہے کہ جس وقت محاصرہ کی شدت ہوئی، عثمان نے چند شعر علیؑ کو لکھ بھیجے۔ جس کا مفہوم تھا کہ کیا تم اسے گوارا کرو گے کہ تمہارا ابن عم قتل ہو جائے۔ جب علیؑ نے یہ شعر پڑھا مسجد میں آئے۔ بنی ہاشم اور خدام جمع ہوئے اور جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ علیؑ مدد کے لیے آتے ہیں، تو لوگوں نے طلحہ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ طلحہ نے اپنے کو تنہا دیکھ کر عثمان کے پاس جا کر عذر کرنا مناسب سمجھا۔ عثمان نے عذر قبول نہ کیا، اور جواب دیا کہ "تمہاری معذرت اس وقت شروع ہوئی جس وقت تم نے دیکھا کہ لوگ تمہیں چھوڑ کر علیؑ کے پاس چلے گئے اور وہ مدد کے قصد سے آتے ہیں"۔

اس درمیان میں محاصرہ کرنے والوں نے دروازہ میں آگ لگا دی اور کچھ لوگ پشت سے گھر میں داخل ہو گئے۔ صواعق محرقہ ہو، ابن خلدون ہو، یا اعثم کوفی ہر شخص اس کا تذکرہ کرتا ہے کہ محمد بن ابی بکر گئے اور عثمان سے گفتگو ہوئی۔ "اگر عثمان نے کہا کہ تمہارے باپ ہوتے تو میرے بڑھاپے کی قدر کرتے"۔ تو محمد بن ابی بکر نے کہا کہ: "میرا باپ تم کو یہ کام کرتے دیکھتا تو وہ ان کاموں کو پسند نہ کرتا، اور مجھ سے زیادہ سختی سے تمہاری ڈاڑھی پکڑتا"۔ اور اس کے بعد چلے گئے۔

۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کوئی قاتل عثمان کا نام نہ جانتا تھا

اب کچھ لوگ داخل ہوئے اور انھوں نے قتل کر ڈالا۔ قاتل کا نام نہ مؤرخین کو معلوم ہے اور نہ علیؑ کے سوال پر نائلہ بنت الفرافصہ بتا سکیں۔ اور اس کی بھی تصدیق کی کہ محمد بن ابی بکر قاتل عثمان نہیں ہیں۔

باپ کا انتقام ابن خلدون کہتا ہے کہ: "بیان کیا جاتا ہے کہ ... عمیر بن صابی نے ٹھوکریں ماریں جس سے چند پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ ٹھوکریں لگانے کے وقت یہ کہتا جاتا تھا: "تم نے میرے باپ کو قید کیا تھا جو بے چارہ حالت قید ہی میں مر گیا"۔

قتلِ عثمانؓ کے وقت عمال

اسی مؤرخ کے موافق بوقت شہادت ممالک اسلامیہ میں عمال اس تفصیل سے تھے: مکہ میں عبداللہ ابن الحضرمی، طائف میں قاسم بن ربیعہ ثقفی، صنعا میں یعلی بن منبہ، جند میں عبداللہ بن ربیعہ، بصرے میں عبداللہ بن عامر، شام میں معاویہ بن سفیان، اور حمص میں عبدالرحمن بن خالد، قنسرین میں حبیب بن مسلمہ، اردن میں ابوالاعور اسلمی، فلسطین میں علقمہ بن حکیم کندی معاویہ کی طرف سے، اور بحرین میں عبداللہ بن قیس فرازی عامل تھے، قضا ابوالدرداء کے سپرد تھی، کوفہ میں امامت ابوموسیٰ اشعری کرتے تھے،

جنگی افسری قعقاع بن عمر کے قبضہ میں تھی، خراج سواد پر جابر مزنی اور سماک انصاری مامور تھے، اور قرقیسا میں جابر بن عبداللہ، آزربائیجان میں اشعث بن قیس، حلوان میں عتبہ بن نہاش، اصفہان میں سائب بن اقرع، سیدان میں خنیس گورنر تھے، مدینہ منورہ میں بیت المال کے افسر عقبہ بن عمر اور قضا پر زید بن ثابت تھے۔

باب چہارم کا نشو

اور واقعات کا خلاصہ

گزشتہ افسوسناک حالت کے لکھنے اور اس پر تنقیدی نظر ڈالنے میں ذاتی طور سے مجھے کیسے ہی کراہت کیوں نہ ہو لیکن ایک مؤرخ کی دیانت اس کی مقتضی ہے کہ وہ واقعات لکھے۔ واقعات کسی نوعیت کے کیوں نہ ہوں، اور دیکھے اور دکھلائے کہ ان واقعات اور شخص سے کیا نسبت ہے، جس کا دکھانا اصل مقصود ہے۔

مشغولیت سے اپنے ہاتھ خالی رکھے اور دوسروں کو غور کا موقع نہ دیا

رسُول کے بعد سے ہم نے اس کا ضروری اہتمام کیا ہے کہ ہم یہ دکھاتے آئیں کہ کون کون سے لوگ کن کے مددگار اور ہم خیال تھے۔ اور ان لوگوں کا ضروری تعارف بھی کسی حد تک کرایا جاچکا ہے۔ ان لوگوں میں جس حد تک آپس کی مشورت اور یک جہتی غرض کیوں نہ ہو چونکہ ان کا واقعہ حکومت ایک انقلابی شکل کا تھا اور بلحاظ اس کے کہ فوراً ہی عامہ ناس کو اہل ردت اور مانعین زکوٰۃ کی طرف جھکار دیا اس لیے صاحب اختیار لوگوں کو اس کا کافی موقع ملا کہ وہ نہ صرف اپنے کو اپنی جگہ مضبوط کرتے بلکہ لوگوں کو جو ان کے قریب یا دور تھے امید وبیم میں مبتلا کر کے اور باتوں کی طرف غور کا موقع نہ دیتے۔ خلیفہ اول کا دو برس یا کچھ زیادہ زمانہ ایسا نہ تھا جس میں لوگوں کی یہ مشغولیت تمام ہو گئی ہوتی، بلکہ یہ زمانہ وہ تھا جس میں انھیں ایسی مشغولیت کی چاٹ پڑ گئی اور ان کے ذہن میں یہ بات سما گئی کہ حقیقۃً جو کچھ ہے وہ تو باہر ہے مدینہ میں کیا دھرا ہوا ہے۔ اس نے مدینہ کی بچی بچائی پرانی فضا سے علیحدہ کر دیا۔

بنی امیہ کو شام کا صوبہ دکھا دیا گیا۔ ظاہراً ان سے کام نکالا گیا، اس لیے کہ وہ علیؑ کی طرف رخنہ کر سکیں۔ اور صدر مقام سے حتی الوسع دور بھی رہیں۔ ان کی ماتحتی میں لوگ تھے۔ فتح، نام آوری، اور غنیمت تھی۔ خالد دیکھ رہا تھا کہ ہم نے جس تصفیہ سے اسلام قبول کیا تھا وہ کسی طرح غلط نہ تھا۔ آج حکومت ہمارے سیف اللہ ہونے کا اعلان کر رہی ہے۔ ہمارے ہاتھ اور تلوار کی آزادی میں کوئی شے حائل نہیں ہے۔

ابن حارثہ اور خالد کے معزولی کی سرکاری وجہ

ابوبکر اور عمر کی پسند کے عناصر میں کوئی فرق نہ ہو سکتا تھا۔ حقیقتاً یہ دونوں آدمی ایک اتفاق میں بسر کر رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کے معاون تھے۔ تعین عمال میں ابوبکر کی پسند اور عمر کی قبولیت میں جس قدر اختلاف دکھائی دیا وہ صرف خالد کے متعلق تھا۔ کچھ دنوں تک تو عمر اور خالد کا معاملہ ذاتی حیثیت کا رہا۔ لیکن اس کے بعد خالد یا مثنّیٰ ابن حارثہ کی معزولی تقول خلیفہ اس حد کے اندر بھی آئی کہ ان میں فتوحات کی وجہ سے غرور پیدا ہو گیا تھا۔ یا مغیرہ بن شعبہ اس وجہ سے ہٹایا گیا کہ وہ بنو ایاد میں بہت صاحب اثر ہو گیا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان جوابوں میں

ان لوگوں کے صاحب قوت ہونے کا خوف چھپا ہوا نہیں تھا۔

عموماً شرکتِ جنگ سے کوئی امر مانع نہ تھا

خلیفہ ثانی کے زمانہ میں نئے لوگ بھی آزمائے گئے۔ نئے سے میرا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے بنی ہاشم کے حقوق سے کوئی مخالفت نہ ظاہر کی تھی اور جنھوں نے ابتدائی یورش یا مانعین زکوٰۃ کے قتل میں کوئی شرکت نہ کی تھی اور جو آخر میں بنی ہاشم کے بڑے مؤید اور دوست ثابت ہوئے۔ جنھیں میں نے خلیفہ ثانی کے مخصوص عمالوں کے علاوہ دکھایا ہے۔ مثلاً عبداللہ بن بدیل، جریر، اشتر، براء وغیرہ۔ میں سوچتا ہوں کہ اب حالت یہ پہنچ گئی تھی کہ نہ حکومت کو بغیر دائرہ اعتبار بڑھائے مفر تھا اور نہ ان لوگوں کو پیش قدمی بغیر چارہ تھا جو کچھ زمانہ تک خاموشی اور بے کاری سے سوکھتے رہے تھے۔ اور موقع تو اب یہ تھا کہ خسرو اور قیصر سے جنگ کی جائے جن میں سے اول الذکر مقام اگر اس الزام سے بری نہ تھا کہ اس نے رسُول کے نامہ کی خفت کی تو آخر الذکر نے مُسلمانوں کے سفیر اور مُسلمانوں کو قتل کیا لہٰذا یہ حالتیں ایسی نہ تھیں جن میں کام لینے میں حکومت کو کسی غیر ضروری شبہ پسندی کی ضرورت ہوتی۔ تاہم یہ ہوا کہ یہ لوگ کسی بڑی فوجی افسری یا ملکی نگہداشت کے لیے کام میں نہیں لائے گئے جس سے میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ شاید حکومت کے نزدیک ان کی تقرری تجربہ کی ابتدائی حالت میں ہو۔

خلیفہ ثانی اپنے کو بستر احتضار پر بنی امیہ میں گھرا ہوا پاتے ہیں

خلیفہ اول کے زمانہ میں جب اس کا موقع آ ہی گیا تھا کہ بنی امیہ کا رخ شام کی طرف پھیر دیا جاتا تو حضرت عمر کے نزدیک بھی ابوسُفیان، یزید بن ابوسُفیان اور معاویہ کی کوششوں کے بعد اب اور کوئی چارہ نہ تھا کہ معاویہ شام کے صوبہ میں مستقل کر دیا جاتا۔ اور اگر شرحبیل، ذوالکلاع، معاویہ، عمرو بن عاص، ولید بن عقبہ، یعلیٰ بن امیہ اور ابوموسیٰ زمانہ خلافت اول میں دکھائی دیتے تو خلیفہ ثانی کے زمانہ میں ان میں سے زیادہ تر لوگ شام کے صوبہ میں سکونت پذیر ہوتے جس سے شام ایسے لوگوں کی ایک نوآبادی ہو جاتا جن کے اور متعلق تذکرے ہمارے اصل تذکرہ سے بہت تعلق رکھتے ہیں، بلکہ حضرت عمر کی عمالوں کی فہرست میں ایسے ہی اور لوگوں کا اضافہ ہوتا جن کے نام ابوالاعور اسلمی حصین بن نمیر، معاویہ بن خدیج اور عمر بن سعد ہیں۔ عجب نہیں ہے کہ خلیفہ ثانی نے اپنے کو بستر موت پر دیکھ کر جب تین میں کے تیسرے (ابوعبیدہ بن جراح) کو نہ پا کر آہ سرد کھینچی ہو اور خلیفہ منتخب کرنے کے لیے نظر دوڑائی ہو تو اپنے کو بنی امیہ میں گھرا ہوا دیکھا ہو۔ اب نہ چارہ تھا اور نہ غم تھا۔

اپنے افعال کے نتائج کی لاعلمی نہ تھی

مجھے یقین ہے کہ وہ بنی امیہ کے صاحب اختیار ہونے کو کسی خوف سے نہ دیکھتے تھے اور یہ امورات ان کے ذہن میں تھے کہ بنی امیہ کا صاحبِ اختیار ہونا ان کا صاحب اختیار ہونا ہے جو ایک زمانہ تک اسلام اور مُسلمین کے سخت ترین دشمن تھے اور انھیں صاحب اختیار بنانا گویا ان کی بھولی ہوئی انتقامی خاصیتوں میں گدگدی پیدا کرنا ہے۔ کسی وقت تک شاید یہ امر نظر پڑنے کی قابل نہ ہوتا کہ ابوسُفیان یزید بن ابوسُفیان اور معاویہ کی تقرری ہوش کے اندر تھی یا بے بجھے ہوئے اتفاقی کارروائی تھی۔ خاندان کے ایک فرد کے بعد دوسرے کی تقرری اور اکثر بنی امیہ پر ایسی ہی توجہ ایسے اتفاقی حیثیت میں

زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتی تھی لیکن آخری وقت ان کی عثمان سے وہ تقریر جو ہم نے ابن ابی الحدید سے نقل کی ہے خصوصاً اس کا یہ فقرہ کہ: "جب یہ باتیں ہوں اور ضرور ہوں گی" کوئی شبہ نہیں رہنے دیتا کہ رسولؐ کے بعد جس طرزِ حکومت کا نشو ہوا تھا اس نے قریش (بہ استثناء بنی ہاشم) کو اس درجہ مضبوط کر دیا تھا کہ اب ان کے علاوہ دوسرے کے نام قرعۂ فال نہ گرنے کی پیشین گوئی کی جا سکتی تھی۔ اور اگر یہ تمام باتیں نظر انداز بھی کر دی جائیں تو حضرت عمر نے مرتے مرتے خلیفہ نامزد کرنے کے لیے جو طریقہ اور لوگ مقرر کیے تھے اس نے یہ اچھی طرح سمجھا دیا کہ ان کی مرضی بھی یہی تھی کہ بنی امیہ ہی صاحبِ اختیار ہوں۔

گورنمنٹ پارٹی ہر حال میں قوی تھی

آخر کیا وجہ ہو سکتی تھی علیؑ کو انتخاب کے قبل یہ کہنے کی کہ ہم منتخب نہیں ہوں گے۔ اس لیے کہ سعد، عبدالرحمٰن، عبداللہ اور عثمان میں ایسی قرابت ہے کہ وہ آپس میں ابن عم، اور داماد تھے۔ اب ان روایات کے موافق کہ طلحہ نہ تھے، علیؑ کی طرف صرف زبیر رہ جاتے ہیں اور چونکہ طلحہ نے آخر میں عثمان کے لیے رائے دی اور سعد نے ابن عوف کے بعد علیؑ کے متعلق رائے دی۔ پھر بھی گورنمنٹ پارٹی نہ صرف صدہا زیادہ تھی بلکہ جناب صدر انجمن صاحب بھی اسی اضافہ کے طرف تھے۔

ابنِ عوف کے پس و پیش کے معنی

لیکن اس کے بعد بھی ابن عوف کا پس و پیش صاف صاف کہہ رہا ہے کہ وہ صورت معاملہ کو سمجھ رہے تھے۔ اگرچہ انھیں یہ معلوم تھا کہ عبداللہ یا عثمان کا داماد میری رائے کا مقلد بنا دیا گیا ہے اور کچھ ہی دن کے بعد تاریخ کے سینہ پر یہ واقعہ بھی ثبت ہونے والا تھا کہ ان منتخب لوگوں میں سعد، طلحہ، زبیر اور ابن عمر علیؑ کی بیعت سے اکراہ کرتے۔ اگرچہ ابن عمر زید کی بیعت نہ کرنے کو اجماع مسلمین کے خلاف گناہ تصور کر سکے، حقیقت یہ ہے کہ ابن عوف کا پس و پیش ہی اس امر کی بھی ہے کہ وہ علیؑ کو خلیفہ نہیں بنانا چاہتے تھے۔ اور ایک ایسے پہلو کی فکر میں تھے جس سے یہ نہ کہا جا سکے کہ انھوں نے خسر ہونے کی وجہ سے عثمان کی جنبہ داری کی۔ ورنہ زبیر اور سعد کے علیؑ کے لیے رائے دینے پر صرف طلحہ عثمان کے حامی رہ جاتے تھے اور اب ابن عوف کو اپنا میلان ظاہر کرنا رہ گیا تھا۔ لیکن ابن عوف نے اب کیا کیا۔ بقول ابن حجر "ذی رائے" لوگوں سے صلاح لی اور یہ سب عثمان کے لیے کہتے تھے۔ طبری ان ذی رائے حضرات کے نام بتاتا ہے اور وہ ابوسفیان اور عمرو بن عاص ہیں۔ یہ بھی بمقابلہ علیؑ عثمان کی کمزوریوں کے قائل ہیں۔ اور یہ تینوں مدبر یہ طے کرتے ہیں کہ علیؑ سے نامزدگی کی شرط سنت خلفاء کی پیروی قرار دو، جسے وہ منظور نہ کریں گے اور اس طرح عثمان خلیفہ ہو جائیں گے۔ بلاشبہ عامہ ناس کو اپنی معذوری دکھانے کے لیے انھوں نے ایک بات سامنے کھڑی کر دی اور اسی طرح اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ علیؑ نے اس شرط پر خلافت قبول نہ کرنے سے عام مجمع میں یہ بھی ظاہر کر دیا کہ سنت خلفا کی پیروی ہمارے نزدیک قابل عمل نہیں ہے۔

عمار کی صدا مرتب مخالفت کے سامنے بے اثر ہوئی

وہ وقت آیا کہ اب مشورہ تمام ہوتا، اور عام مجمع میں انتخاب کا اعلان کیا جاتا۔ مہاجرین، انصار، اور امرائے لشکر جمع تھے۔ ابن عوف نے "حاضرین سے کہا جس کو تم لوگ خلیفہ منتخب کیا چاہتے ہو اس کی طرف اشارہ کرو"۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ابن خلدون کے "حاضرین" سے عام مجمع مراد ہے یا وہ لوگ

جوازِ باب شوریٰ قرار دیے گئے تھے۔ اس لیے کہ عامہ ناس کو انتخاب میں کوئی اختیار نہیں دیا گیا تھا۔ غالباً ابن عوف کا یہ خلاف عام نہ ہو لیکن کوئی عجب نہیں ہے اگر اس سے عام دکھاوا مقصود ہو۔ غالباً ابن عوف کی امید کے خلاف جس وقت اس کا نتیجہ اور نمائش اس اطمینان پر تھی کہ ایک بڑی جماعت ہمیں سنبھالے گی، مجمع میں سے عمارؓ بن یاسر کے ایسے مشہور صحابی کی آواز علیؑ کے لیے بلند ہوئی۔ کون جانتا ہے کہ اس صدا سے بنی امیہ کو سردی معلوم ہونے لگی ہو اور سبھوں نے انتشار اور بے چینی سے ابن عوف کی طرف دیکھا ہو۔ کون جانتا ہے کہ مقدادؓ کے تائید کرنے سے مجمع کا رنگ بدلنے لگا ہو ـــــ لیکن یہ صدا بھی ویسی ہی تھی جیسی سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار میں سے کسی نے بلند کی تھی اور اس پر مرتب مخالفت غالب آگئی۔ اس لیے کہ نہ اس نے اپنے لیے کوئی پخت پز کی تھی جس کے لیے یہ صدا بلند ہوئی تھی اور نہ آواز دینے والے نے اپنے کو قوت دینے کے لیے اہتمام کیا تھا۔ بلکہ یہ بات تھی جو بغیر غور اور اہتمام کے منہ سے نکل پڑی تھی۔

علیؑ نے حصولِ اختیار کے لیے ترتیب جماعت نہ کی تھی

سب نے دیکھا کہ مرتب مخالفت اور مقابل اس پر غالب آگیا۔ مقداد کی صدا ویسی ہی تھی اور اس وقت بھی علیؑ نے کوئی نظام اپنے صاحب اختیار ہونے کے لیے درست نہ کیا تھا۔ کیونکہ علیؑ کے نزدیک یہ فریب اور چال کا امام ہونا ہوتا۔ بلکہ ابن عباس کا ایسا اثر دار ہاشمی علیؑ کو کنارہ کشی کی صلاح دے رہا تھا۔ جس سے یہ کہنے کا موقع ملے کہ کوئی بنی ہاشم تمہارے مشورہ میں شریک نہ تھا جو دلیل وہ سقیفہ بنی ساعدہ کے بعد پیش کر رہے تھے۔ پھر بھی علیؑ گئے۔ نہ اس امید سے کہ وہ کامیاب ہوں گے۔ اس کی تو وہ پیشین گوئی کر چکے تھے۔ بلکہ سقیفہ بنی ساعدہ اور انصار کی اس صدا کا جواب دینے کہ اگر علیؑ ہوتے تو تمہارا کام ناتمام رہ جاتا یا یہ کہ اگر ہمیں پہلے تمہارا خیال معلوم ہوتا تو ہم دوسرے کی بیعت نہ کرتے۔ وہ دکھا رہے تھے کہ ہمارے خلاف ایک مرتب مخالفت ہے۔ علیؑ خاموش بیٹھ کر اب یہ نہیں دکھا سکتے تھے۔ اس کے برخلاف دن اور راتیں گزری تھیں کہ بنی امیہ اور وہ جوان کے امید دار اور شنفتقین تھے اس امر میں سرگردان تھے کہ ہم کس مکر یا کس فریب سے صاحب اختیار ہو جائیں۔ اور گویا اس قطعی تصفیہ کے میدان میں آنے کے قبل وہ طے کر چکے تھے کہ ہم کیا کریں گے۔

کس نے عثمانؓ کی تائید کی تھی اور کیوں

اگرچہ عامہ مہاجرین اور انصار کا مجمع تھا جس میں مدبرین، سپاہی، روسا اور ہر طبقہ کے لوگ موجود تھے، لیکن قضا و قدر نے پھر اس شخص کے کسی کے حلق میں آواز نہ پیدا کی جسے خیانت وحی کے لحاظ سے جلاوطن اور عثمانؓ کے ہاتھوں امیر مصر ہونا تھا۔ عمار کو سچائی کی حمایت کا غصہ آیا اور انھوں نے حقارت کے طنز سے کہا کہ: "چپ رہ او مرتد تجھے مسلمانوں کے امورات میں دخل کا کیا حق ہے"۔ لیکن آج کا دن وہ زمانہ اور وقت ظاہر کر رہا تھا جس میں ابن ابی سرح کو جرأت ہوتی اور رسولؐ کے مقدس صحابی منہ دیکھتے رہتے۔ کیونکہ ہر شخص کے منہ کے الفاظ وہ کوئی اور کیسا ہی کیوں نہ ہو قومی گروہ بندی کے مقابلہ میں سننے کے قابل نہ تھے فقط اقدام یہی تھا۔

ابن ابی سرح کی جرأت آزادانہ نہ تھی

ابن ابی سرح کی جرأت آزادانہ جرأت نہ تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ مجمع زیادہ تر کون سے افراد سے مرکب ہے اور لُے

عثمان کے نزدیک جیسی قربت حاصل تھی اس سے یہ خیال کرنا کہ ابن عوف، ابوسفیان اور عمرو بن عاص وغیرہ کے مشوروں سے وہ ناواقف تھا، معمول سے زیادہ بھولا پن ہوگا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ارباب رائے کون ہیں اور وہ عدداً کیسے قوی ہیں۔ اب اسے مجمع پر اپنی رائے ٹھونس مارنے میں کسی پس و پیش کی وجہ باقی نہ رہ گئی تھی اور نہ عبداللہ بن ربیعہ کو تائید کرنے میں کسی تردد کی ضرورت تھی۔

علیؑ موقع کے عناصر کا نام گنوا رہے تھے

صورت معاملہ پر مزید روشنی علیؑ کے ان فقرات سے پڑتی ہے جس سے وہ اس کو مخاطب کرتے ہیں جو بظاہر ایثار نفس دکھا رہا ہے اور اپنے کو ان لوگوں کی فہرست میں سے باہر نکال رہا ہے جس سے خلیفہ منتخب کیا جا سکتا تھا کہ: "اقرار کرو کہ حق کرو گے۔ اپنے ہوائے نفس کی پیروی نہ کرو گے نہ کسی کے رشتہ داری کا پاس و لحاظ کرو گے۔ حق کے کہنے میں کسی کی ملامت و نصیحت کا خیال نہ کرو گے"۔ بادی النظر میں یہ ایک اقرار ہے لیکن حقیقتاً موقع کے عناصر کا نام گنوانا اور واقعہ خوانی ہے۔

علیؑ کے فقراتؑ کا ترجمہ

ہو سکتا ہے کہ ابتداءً "ہوائے نفس" کہنے میں علیؑ نے اس میں مبتلا نہ ہونے سے صرف ہوشیار کیا ہو اور ان کی نگاہ میں صریحاً ایسا کہنے کے وجوہات ہوں یا نہ ہوں، لیکن یہ فقرہ کچھ ہی دیر کے بعد شرح کی صورت میں سامنے آیا۔ جب عثمان کے انتخاب پر علیؑ نے کہا کہ: "تو نے اس لیے بیعت کی کہ خلافت تیری طرف عائد ہو"۔ علیؑ کا یہ کہنا گزشتہ واقعات کا ترجمہ تھا۔ تجربہ کہلوا رہا تھا یا تاریخ اپنے کو دہرا رہی تھی۔ "رشتہ داری" ظاہر بات تھی۔ "ملامت" سے ان کی طرف اشارہ کر رہے تھے جو یہ کہتے کہ گزشتہ حکومت کے اصول کے مؤیدین اور بنی امیہ کے ہوتے ہوئے تم نے کیوں دوسرے کو چنا، اور "نصیحت" سے یہ مراد ہو کہ "خلافت اور نبوت ایک خاندان میں نہ ہونی چاہیے!"۔

ضرر کی دھمکی تھی

اس جماعت کی قوت بلکہ ضرر رساں روش بھی معلوم ہوگئی، جس وقت مقداد نے ابن عوف سے علیؑ کو منتخب نہ کرنے کی شکایت کی اور انھوں نے جواب دیا کہ: "خدا سے ڈر کہیں تو کسی فتنہ میں گرفتار نہ ہو جائے"۔ مشکل سے سمجھ میں آئے گا کہ جب خدا کے اختیارات ایسے پر معنی شوریٰ میں منتقل ہوگئے تھے تو پھر اس سے ڈرنے کی غیر ضروری دھمکی کیوں دی جاتی تھی بجز اس کے کہ ان لوگوں سے ڈرا رہے ہوں جو اپنے کو اختیارات کا حامل اور اس کے مددگار سمجھ رہے تھے۔ اور اپنے فوائد کے کسی مخالف سے انتقام لینے کے لیے آمادہ ہو سکتے تھے۔

نشو جماعت کیونکر ہوا تھا

کون امید کر سکتا تھا کہ رسولؐ کے انتقال کے بارہ برس کے بعد حالت یہ ہو جائے گی کہ علیؑ کے لیے کچھ کہنا "خدا سے ڈرنے اور فتنہ میں گرفتار ہونے" کا مستوجب ٹھہرائے!۔

عملی مثالیں

ہونے والا یہ تھا کہ یہ دھمکی بغیر مثال دیے نہ رہے۔ اگر سعد بن ابی وقاص کے علیؑ کے لیے رائے دینے پر طبری کو لکھنا ہے کہ: "عثمان را از سعد کینہ در دل ماند"۔ اور ہم لوگوں نے دیکھا کہ وہ کس طرح معزول کیا گیا۔ اور ہاشم ابن عتبہ بن ابی وقاص آماج توہین قرار دیا گیا تو بوڑھا عمار علیؑ کی گرما گرم حمایت کرنے کی بدولت

دربارِ خلافت میں اس اِستقبال کا شایان قرار دیا گیا جو عثمان کے خلاف بدمزگی کا ایک بڑا سبب ہوا۔ اس میں بھی کوئی نئی بات نہ تھی۔ جب بیمار سعد ابن عبادہؓ کو مجمع میں کچل جاتے اور ابن الخطاب کو یہ کہتے سن چکے ہیں کہ: "اس کو اللہ تعالیٰ ہی نے مارا ہے"۔ اور یہ بھی دکھا چکے ہیں کہ خالد بن سعید معزول کیا گیا اور اس وقت تک مورد الطاف نہ ہوا جب تک اس نے موجودہ حالت پر رضامندی ظاہر نہ کی اور بنی ہاشم خصوصاً علیؑ بن ابی طالبؑ کا تو ذکر ہی بے کار ہے۔

کیوں عثمانؓ ہی کے زمانہ میں انقلابؑ ہوا پیشتر کیوں نہ ہوا

سوال ہوگا کہ پھر اس وقت بدمزگیاں کیوں پیدا نہ ہوئیں اور کیوں عثمان کا زمانہ ہی طبیعتوں میں ایک انقلاب عظیم کا باعث ہوا۔ ● اس لیے کہ کام اور کام کرنے والوں اور اس کے دیکھنے والوں کی ابتدا تھی۔ ● اس لیے کہ انھیں دیکھنے اور رائے پختہ کرنے کا مشغولیت کی وجہ سے وقت نہ ملا ● اس لیے کہ رحلتِ رسُول کے سانحہ عظیم اور اس کے بعد فوری انقلاب نے نہ کسی کے منہ میں لفظ رکھے تھے اور نہ ہاتھوں میں حرکت تھی۔ ● اس لیے کہ ابتدائی اختیار حاصل کرنے والوں کی جماعت جن افراد سے مرکب تھی ان میں کیسی ہی یک جہتی غرض اور عمل کیوں نہ پائی جاتی ہو لیکن وہ قریبی قرابت اور ایک قبیلہ کے افراد کی حیثیت سے نامزد نہیں کی جاسکتی تھی۔ جو نسبت عثمان کو بنی امیہ سے تھی۔ اور جب لوگوں نے یہ دیکھا کہ ہر وہ شخص جو حکومت کے افعال میں اس کی مدد کرے تو فائدہ اور اعتبار کا شایان ہوتا ہے تو فوری منافع کی امید نے حرکات طبعی اور اخلاقی پر غلبہ حاصل کیا۔ برخلاف اس کے عثمان کے زمانہ میں ہر شخص بنی امیہ کے قوی ہونے اور انھیں کو زیادہ تر مورد الطاف دیکھ کر اپنے موقع اور نفع کے لیے خوف زدہ ہوا۔ اور صورتِ حال: ؎

کس نیاموخت علم تیر از من که مرا عاقبت نشانہ نکرد

کی ایسی ہوگئی۔ ● علاوہ اس کے عثمان اپنے پیش رووں کے ایسے مستعد اور ہوشیار نہ تھے۔ اور سب کے آخر میں اس وقت اس لیے بدمزگی پیدا نہ ہوئی کہ وہ جسے عملی مخالفت کا حق ہوسکتا تھا اسے یہ عزیز وصیت یاد تھی کہ: "جس وقت لوگ دنیا میں مشغول ہوں تم دین اختیار کرنا"۔ اس وقت خاموش رہنا، دین تھا، اور شروع ہی شروع میں مُسلمانوں پر تلوار آزمانا انھیں برا سبق دینا تھا۔ بلکہ کسی مددگار کے پیش کش کو بھی رد کردیا۔ اور وجہ بھی ظاہر کردی۔ عثمان کے خلیفہ ہونے کے وقت بھی بہ اِختلافِ الفاظ لیکن اسی معنی میں یہ فقرہ اِرشاد فرمایا کہ: "میں تسلیم کرتا ہوں جب تک امورِ مُسلمین سلامت رہیں، اور اس کے ایام خلافت میں کھلم کھلا ظلم و جور نہ ہو، گو خاص مجھ پر ظلم و ستم ہوتے رہیں"۔ افسوس تاریخ کے سینہ میں داغ ہیں کہ کھلم کھلا ظلم و جور بھی ہوا، اور علیؑ پر ظلم و ستم بھی ہوتے رہے۔ اور زمانہ نے جناب امیرؑ کے ان فقرات کے سمجھنے میں بھی مدد دی کہ: "جس چیز کے سبب سے تم اس کے طالب اور راغب ہو میں اس سے پرہیز کرتا ہوں"۔

خودساختہ مُنصرم کا پیترہ

عبارت کی رو میں میں خود ساختہ مُنصرم یا حکومت کے بنائے ہوئے پنچ کے ایک خاص پیترے اور اس کے مضحک انتشار سے دور ہو گیا علیؑ کے شرائط کہتے ہیں کہ انھوں نے ابن عوف کو غیر مشروط طاقت کا شایان نہ سمجھا، اور یہ تو یاد دلانا ہی بے کار ہے کہ عثمان کو کیا عذر ہوسکتا تھا۔ پھر بھی ابن عوف نے بقول ابن خلدون علیؑ کو "علیحدہ" لے جا کر ان کی ان تمام صفات اور دعاوی کو جو

اپنی خلافت کے لیے پیش کر سکتے قبول کر لیا۔ جس طرح سقیفہ بنی ساعدہ کے بعد عمر ابوبکر اور عبیدہ بن جراح نے عام مجمع میں علیؑ کے تمام دعاوی کو قبول کر لیا تھا۔

بے پردہ اور پس پردہ اقبال کی وجہ

مدبرین اولین کو "عام مجمع" میں قبول کرنے میں اب کوئی خوف نہ تھا۔ اس لیے کہ مسئلہ خلافت اب عامہ ناس کی نگاہ میں ایک شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس وقت ابن عوف نے "علیحدہ" یعنی مجمع کے کان اور آنکھ سے دُور اقرار کیا۔ اس لیے کہ ابھی انتخاب خلیفہ باقی تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ علیؑ کے حقوق کی سچائی اور اثر کے لیے اس سے زیادہ کوئی قوی دلیل اور ان کے خوف زدہ نفس کی حالت چھپانے کے لیے جو عامہ ناس کے خیال پر پردہ ڈالنے کے لیے آمادہ تھے، اس سے اچھی کوئی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔

اول اور آخر کی مناسبت

ابن عوف کو جرأت نہ تھی کہ قبل اعلان انتخاب وہ علیؑ کو علیؑ کی صفات کے ساتھ مجمع میں یاد کرتا۔ جس طرح سقیفہ بنی ساعدہ میں نام آتے ہی علیؑ کے علاوہ کسی شخص سے فوراً بیعت کی ضرورت بجھ لی گئی۔ اسی طرح اس مجمع میں علیؑ کا نام آتے ہی خصوصاً عمار کے وکالت کرنے سے کچھ کیفیت پیدا ہوئی کہ سعد کو جلد تصفیہ کرنے کے لیے ابن عوف سے کہنا پڑا اور ابن عوف نے جواب دیا کہ: "میں نے اپنے ذہن میں خلیفہ منتخب کر لیا"۔ کیا ابن عوف کے "ذہن" میں علیؑ تھے؟ نہیں۔ "سنت خلفا کی شرط" کہتی ہے کہ نہ تھے۔ وہی امر جس پر اراکین بنی امیہ غور اور بحث کر چکے تھے کہ علیؑ قبول نہ کریں گے۔

اگر علیؑ اقرار ہی کر لیتے تو عثمان سے پوچھنا اور پنچ کا تصفیہ باقی تھا

تم کہو گے کہ سب کچھ غور اور بحث سہی لیکن ابن عوف کو یقین کیا تھا کہ علیؑ انکار ہی کریں گے۔ مناسب۔ لیکن سوچو کہ علیؑ اقرار بھی کر لیتے تو عثمان کو ابھی اقرار کرنے کا موقع باقی تھا۔ اس لیے کہ علیؑ سے پہلے سوال کیا گیا تھا۔ اور پھر اس کے بعد بھی تصفیہ کا اختیار ابن عوف کو حاصل تھا۔ اور اس کا تصفیہ قطعی تھا۔ سوال پہلے عثمان سے نہ کیا گیا۔ اس لیے کہ اقرار کے بعد ابھی تصفیہ نہ کر سکتے۔ کیونکہ علیؑ باقی رہ جاتے اور ان سے نہ پوچھنے کی ایک ظاہر شکایت رہ جاتی۔ اس لیے "منتخب کر لیا" کے یقین سے علیؑ سے پہلے سوال کیا کہ ان کے انکار کرتے ہی عثمان کا آخری اقرار انھیں خلیفہ منتخب کرنے کے اعلان کو بے عذر منصفانہ اعلان بنانے کا سب کچھ تھا مگر اسی وقت علیؑ کو بھی کہہ دینا تھا کہ "خدعۃ"۔

حکم قتل کس کے لیے ہو سکتا تھا

معاملہ انتخاب جس شکل میں تھا، اس کی آخری مہیب بات ابھی باقی ہے، اور وہ یہ ہے کہ: "اگر پانچ آدمی موافق اور ایک ناموافق ہو تو اسے قتل کر ڈالنا"۔ یہ ناموافق کون ہوتا۔ کیا سعد، عبداللہ، عثمان اور ابن عوف میں سے جو ایک دوسرے کے عزیز تھے کوئی قتل کیا جاتا؟۔ اور طلحہ تو عثمان کے لیے رائے دے ہی چکے تھے۔ کون رہ جاتا ہے۔ زبیر اور علیؑ۔ یعنی ایک وہ جو ہمیشہ سے صاحب حق تھا، اور دوسرا وہ جس نے اس کی اول معرکہ کے بعد بھی تائید کی تھی۔ میں شدت کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اصول انتخاب کا تعزیری دفعہ زبیر پر سختی سے نافذ کیا جاتا۔ شاید یہ محض دھمکی اور شاید انتہائی ضرورت کے لیے رکھا گیا ہو۔ اب کون رہ جاتا ہے مجھے نام لینے کی جرأت نہیں ہے۔ لیکن وہ جس کے متعلق ایک مرتبہ پہلے بھی

کہا جاچکا ہے کہ اگر بیعت نہ کروگے تو گردن ماریں گے۔ ہمارے یہ خیالات واقعات سے کیسا ہی قریبی عکس کیوں نہ لیے ہوں پھر بھی ہم سب کو متوہمانہ شاعری بے جانفرس خیال اور بے اعتبارانہ الزام سے متاثر قبول کرلیں گے۔ مگر ہم واقعہ کے اس ٹکڑے کا کیا جواب دیں گے جو عبدالرحمٰن بن عمر کا فتویٰ ہے کہ: "ہر کس مخالفت عبداللہ کند بکشید"۔ یعنی: "جو عبداللہ کی مخالفت کرے اسے قتل کردو"۔ ابن عمر کو بھی نام لینے کی جرأت نہ ہوئی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ "کس" کون تھا! کیا اتفاقاً ابن عمر کا ریمارک متعلق ہوگیا تھا۔ کیا قضا و قدر کو بھی اس مرحوم سے عداوت تھی کہ اس کے انکار پر یہ کہا جاسکتا۔ یقیناً نہیں۔ ایک جماعت کی مرتب مخالفت اور سوچے ہوئے نظام کی موافقت یہ سب کچھ کر رہی تھی۔

انتخاب اس کے اصول اور طرز عمل کے متعلق مجھے کچھ اور کہنا نہیں ہے۔ نہ قریش کے نزدیک عثمان کے "دوست تراز عمر" ہونے میں مجھے شبہ ہے۔ جب کہ ایسے زمانہ میں بھی کہ مسلمان اور مشرکین میں جنگ ہو رہی تھی۔ ان کے مکہ بھیجے جانے پر انھیں قریش کے ساتھ گھوڑے پر چڑھے چڑھے پھرنے کا موقع مل سکا، اور حضرت عمر سفارت قبول نہ کرسکے۔ نہ ہم اپنی کتاب میں مقررین کی فصاحت بلاغت یا ظرافت کا موازنہ کرنے بیٹھے ہیں کہ حضرت عثمان کی بحیثیت خلیفہ پہلے مختصر تقریر کے متعلق یہ کہیں کہ سب کچھ آج ہی پر موقوف تھا۔ اس کے لطف میں کوئی آورد نہ تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ آج کا ناقابل تعریف حالت میں منبر سے اترنا آئندہ تخت سے اترنے کی پیش گوئی تھی۔

کیوں ابتدائی چھ برس شورش نہ ہوئی

مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ یہ ہے کہ خلیفہ ثالث کے چھ برس نسبتاً امن سے گزرے اور ان میں نظام حکومت کے متعلق کوئی شورش پیدا نہ ہونے پائی۔ کیا اس لیے کہ اس زمانہ تک ان کا طرزِ حکومت اچھا تھا، اور آخر میں نقص پیدا ہوگیا؟ نہیں۔ بلکہ ہم شدت کے ساتھ ابن حجر کے اس فقرہ کے موافق ہیں کہ: "عثمان کی خلافت عمر کے خلافت کی اور عمر کی خلافت ابوبکر کے خلافت کی فرع ہے"۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ عثمان کو جو کچھ دیکھنا پڑا وہ پہلی دو خلافتوں میں بھی ہوتا، اگر ان کا موقع بھی عثمان کا ایسا ہوتا۔ اور وہ موقع کیا تھا؟ وہ یہ تھا کہ عثمان کی خلافت کا چھ برس تک وہ زمانہ جس میں قوم اور سپاہی اسکندریہ، ارمینہ، آذربائیجان، افریقہ، قبرس، خراسان، کابل، زابلستان، طبرستان وغیرہ کی فتح یا شورش فرد کرنے اور دوبارہ فتح کرنے میں مشغول رہے۔ (جس طرح ابوبکر اور عمر کا زمانہ گزرا تھا) اس وقت نظام حکومت پر کسی کو نظر اٹھانے کا موقع نہ ملا۔ لیکن اس کے بعد اس کے آسان مواقع نہ رہے، اس لیے کہ مرکز سے بہت دور دور کے مقامات پر فوجیں پہنچ چکی تھیں۔ میں اور آگے بڑھنا ناممکن نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ اب ان دور دور کے مقامات پر فوج کشی کرنے یا انتظام درست رکھنے میں ویسی آسانیاں نہ تھیں جیسی ان مقامات پر جو اب تک فتح کیے جاچکے تھے۔ سچ پوچھو تو عمر کے زمانہ میں فتوحات کا دائرہ اس قدر وسیع ہوچکا تھا کہ انحطاط کی امید کی جاسکتی تھی لیکن قضا و قدر کے نزدیک عثمان کا زمانہ ہونے والے واقعات کے لیے مخصوص ہوا تھا۔ نتیجہ کیا ہوا۔ قوم کی قوم جس کا مشغلہ صرف جنگی کارگزاری پر موقوف تھا مصروفیت کے ذرائع ڈھونڈھنے لگی۔ سچ یہ قصور قوم کا نہ تھا بلکہ ان کا جنھوں نے اس شغل میں مبتلا کرنے کی تو کوشش کی لیکن انھیں اپنی صفات قومی میں نہ ترقی کا کوئی ذریعہ حوالہ کیا، نہ اس جوش کو آپس کے لیے معتدل رکھنے کی کوئی کوشش کی۔ نہ مصروفیت کے لیے کچھ سامان کیے۔ دوسروں سے لڑنے میں وہ قدر مشترک پر جمع

تھے لیکن آپس میں صلح اور اتحاد سے رکھنے کے لیے انھیں کسی قدر مشترک پر توجہ نہ دلائی گئی۔ اب شاید حکومت کرنے والوں کی مصلحت یہ ہو کہ جماعت کو حصوں میں تقسیم کرنے سے حکومت کرنا ممکن ہوگا۔ اور نہ کوئی ذمہ دار ذات تھی جس کے طرز عمل کا لوگوں پر کوئی وزن ہو۔ فطری ہے یہ امر کہ جس وقت قوم کو جنگی نام آوریوں کے لیے ایک وسیع حلقہ ملتا ہو تو اس نے تجارت اور صنعت و حرفت یا زراعت کی طرف سے آنکھ بند کرلی ہو، بلکہ انھیں بے قدر سمجھنے لگی ہو۔ لیکن قوم کے عنان گیروں نے اشتغال صلح کی قدر کے لیے کیا سامان کیے تھے؟۔

فتوحات کب تک چلتیں اور ان کے پاؤں کس قدر لمبے ہوجاتے کہ وہ طی الارض میں مشغول رہتے۔ فاصلہ انھیں تھکاتا، جوش کم ہوتا، مفتوحہ ممالک کی غنیمت اور حاصل امارت کے سامان مہیا کرتی، آرائش اور لذتوں کا لطف انہماک پیدا کرتا، اور رفتہ رفتہ تلوار کی جھنکار اور طبل کی جگہ دلفریب صدائیں لے لیتیں۔ یہ بھی بعد کی باتیں تھیں، ابھی تو سپاہی جنگی کیفیت محسوس کر رہے تھے کہ رُکے۔ رُکے اور پرانی عشقیں عود کرنے لگیں۔ اب قوم کی مہار رسُول کے ایسے کسی مخلوق الٰہی کے ہاتھ میں نہ تھی، بلکہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں جن کے زمانہ نے مُسلمانوں کو قتل حق دار کو محروم، فرقہ بندیوں کو تازہ اور بغض و حسد کو زندہ اور خود غرضیوں کو پیدا ہوتے دیکھا تھا۔ یقیناً مُسلمانوں نے غیر اقوام کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا بہادر ثابت کیا۔ لیکن افسوس کہ آپس میں شجاعت آزمائی نے انھیں ایسا تباہ کیا کہ وہ دوسرے کے مقابلہ سے غافل ہوگئے۔ فتح کرنے باہر گئے تھے، اب تو گھر ہی میں افتخار سے خالی جنگی مشغلہ حاصل ہو رہا تھا!

قوم کے خیال کی شارح مثال

اس کے آثار عثمان کے ابتدائی زمانہ میں بھی دکھائی دیے۔ مثلاً ارمینہ کی فتح میں جو حبیب بن مسلمہ فہری نے بقول اپنے "محنت اور خون سے" حاصل کی تھی سلیمان بن ربیعہ اور اس کے لشکر نے اس دلیل سے حصہ طلب کیا کہ "تم نے ہماری آمد کی خبر سن کر ہمت کی"۔ ظاہر ہے کہ فوجی امداد سے دشمن پر جو اثر پڑ سکتا تھا، اور لازماً اپنے لوگوں میں مدد سے جو ہمت افزائی ہو سکتی تھی وہ بغیر خود غرضانہ اصول منفعت کے ناگزیر ہے بلکہ اس کا دام لینے کے لیے آپس کے بہت سے سپاہی لڑے اور مارے گئے۔ ایک نے اس غرض سے پیش قدمی کی کہ غنیمت میں حصہ دینا نہ پڑے تو دوسرے نے اپنے رفقاء کے فوجی کارناموں کی اس وقت تک داد دینی مناسب نہ سمجھی جب تک غنیمت میں شرکت حاصل نہ ہولے۔ آپس کی فتح اور نام آوری قومی افتخار کا سرمایہ نہ رہی تھی جب تک کہ اپنا نفع، نام اور شہرت اس میں داخل نہ ہولے۔ کیوں ہوتا جب نقطہ اقدام یہ تھا کہ: "ہم کیوں نہ ہوں"۔ ذمہ دار مدبرین ایثار نفس اور حب قومی کی کیسے امید کرتے اور لوگ کس کے نمونہ پر چلتے؟۔ جب کہ انفرادی تشخص کا قوم شکن بھوت سر پر سوار تھا۔

اس وقت کی باتوں میں یہی ایک واقعہ نہ تھا جس میں خود غرضیوں سے آپس میں جنگ ہوئی ہو۔ جنھیں ملکی ضرورتوں نے کوفہ اور شام میں رکھا تھا۔ بلکہ جزیرہ قبرس کی غنیمت بھی اس طرح تقسیم نہ ہوئی جس کی شکایت آج تک باقی نہ رہ گئی ہو۔ میرا عذر نہ کبھی دراز گوش پر سوار ہے اور نہ میں کسی شیریں ادا اور دل فریب کنیز کے پیچھے دوڑ رہا ہوں، نہ میں اس کی شکایت کر رہا ہوں کہ امیر شام نے کیوں کسی کو اپنی عنایات کے صرف میں ممتاز کیا۔ بلکہ میں یہ موقع دکھا رہا ہوں کہ یہ حالت ظاہر ہونے لگی تھی کہ مال لڑائی کی ہڈی اور حوصلوں کا مرکز ہو سکتا۔ لیکن یہ بھی خفیف ہی بمقابلہ اس کے کہ سپاہیوں

اور عامہ ناس کو اپنے افسروں کی تقسیم پر اعتبار نہ رہا تھا۔

چند برسوں میں فرق ظاہر ہو گیا تھا

اعثم کوفی کا ایک واقعہ نہایت پر معنی ہے کہ جب امیر شام جزیرہ سقلیہ پر حملہ کرتا ہے تو یہاں کا مسیحی بادشاہ قناریہ کے شکست خوردہ بادشاہ کے ساتھ عربوں کی آمد دیکھ کر متعجب ہوتا ہے کہ عربوں کے پاس عمدہ عمدہ اسلحہ اور آرائش و زیبائش کی چیزیں جو نمود اور نمائش کے کام آتی ہیں کہاں سے آ گئیں۔ اور ملک قناریہ اپنا واقعہ بیان کرتا ہے کہ ہم سے جو جماعت جنگ کرنے آئی تھی وہ "غریب، صاحب نیت صادق، صالح اور یقین واثق کی تھی جو اپنے تقویت دین کے لیے جنگ کرتی تھی اور اسباب دنیاوی کی زیادہ گرویدہ نہ تھی اور یہ جماعت جو آج آئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اسباب دنیاوی اور مال کی طمع رکھتی ہے۔ اگر یہ ملک و مال سے دفع کیے جا سکیں تو اس سے اچھا ہے کہ جنگ کی جائے"۔ یہ تغیر تھا جو مسلمین کی روش مذاق میں ایک غیر مسلم نے دیکھا تھا۔

ابوذر کی آہِ سرد کے معنی نظام قومی کی درستی اور حفاظت تھی

مجھے ایک مسلمان کی حالت لکھنی ہے جس کے زہد اور ورع کے سب قائل تھے اور جسے رسول نے "اصدق" فرمایا تھا۔ میں ابوذر کو کہہ رہا ہوں۔ فاتح لشکر قبرس کی غنیمت تقسیم کر رہا ہے۔ خوش ہے۔ مال اور اسرائے جنگ سامنے ہیں لیکن ابوذر کا چہرہ بھر بھرایا ہوا، اور آنکھیں پر نم ہیں۔ اور کسی کے غالباً پر طنز غصہ سے ٹوکنے پر کہتے ہیں کہ: "جس وقت ان عورتوں اور بچوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ یہ امت کے گناہگاروں کی بدولت اس تکلیف میں مبتلا ہوئے ہیں۔ یہ لوگ نعمت اور فراغت میں بسر کر رہے تھے اور جب گناہ کیے اور حکم خدا کو عزیز نہ رکھا تو اس ذلت میں گرفتار ہوئے جسے خدا اپنے بندوں کا بندہ قرار دیتا ہے وہ ایسے ہی مخذول و مقہور ہوتے ہیں"۔ کونسی قوم تباہ ہوتی ہے مگر یہ کہ اس میں وہ صفات جو قومی یک جہتی کے باعث ہوتے ہیں ضعیف اور معدوم ہو جاتے ہیں۔ ہوتا ہے کہ قومیں جو فلسفہ اخلاق کے لحاظ سے پست درجہ ہوتی ہیں ملکی یا سیاسی اخلاق میں ایسی ذکی الحس ہوتی ہیں کہ وہ اعلیٰ اخلاقی مقاصد کے تقابل پر بھی اپنے قومی حیات کو نوعی طریقوں سے قائم رکھتی ہیں اس کی مثالیں ہمارے زمانہ کو اس قدر حاصل ہیں جس پر ہمیں کچھ کہنے کی اس شخص کے لیے کوئی ضرورت نہیں ہے جو واقعات عالم کو ہوش سے دیکھتا ہے۔ بلکہ زمانہ کو تو اس حد تک تجربہ ہو رہا ہے کہ ماہرین فلسفہ سیاست دوسروں کو اس لیے فلسفہ اخلاق کا سبق پڑھاتے ہیں کہ وہ بے کھٹکے ہماری تدبیر کا شکار ہو سکیں۔

ابوذر کی اس حالت کا مجھ پر جو اثر پڑ رہا ہے وہ محض یہ نہیں ہے کہ وہ انسانی ہمدردی سے بے قرار ہو گئے۔ یا محض بحیثیت ایک ناصح کے انھوں نے قبل از وقت اپنی قوم کو ان نتائج سے آگاہ رکھنا چاہا جو غفلت، کاہلی، حب الوطنی اور حب قومی کی ناموجودگی یا اضمحلال کی بدولت دیکھنا پڑتا ہے یا بغض و حسد سے جو کچھ عدم مرکزیت پیدا ہو جاتی ہے بلکہ باوجود اس کے وہ اس وقت کے غالب فاتحین میں وہ آثار دیکھ رہے تھے جو ان کے نزدیک ایسے نہ تھے جو ایسی خوشی کے موقع پر بھی انھیں خوش اور شریک کر سکتے۔ انھوں نے قوم کو ایسے وقت مطلع کیا ہے جس وقت مغلوب قوم مع اپنے مال کے سامنے کھڑی ہے اور دوسری حصول دولت میں نہ صرف انہاک ظاہر کر رہی ہے بلکہ عدم سوسائٹی خود غرضی، بغض و حسد

سے بھی پاک نہیں کہی جا سکتی تھی۔ جو کچھ دنوں کے بعد اس حالت پر پہنچی ہو سکتی تھیں جو مفتوح قوم کی دکھائی دے رہی تھی۔ ابوذر نے جو باتیں صاف صاف محض قومی درد سے کہی تھیں مجھے ان سب پر نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن یہ کہنا ہے کہ ان کی ایسی قوت دار اور گہرے لہجہ کی نصیحت نہ صرف بے توجہی کے حوالہ کی گئی بلکہ مسلمانوں کی بدنصیبی سے ذمہ دار مدبرین نے درستی اور حفاظت قومیت کی اس آہ سرد کو اپنے اغراض ذاتی اور نفاذ اختیار کے حق میں مضر سمجھا اور دشمن ہو گئے اور مصلح اپنی نصیحتوں کے ساتھ ایسی جگہ جلاوطن کیا گیا جس سے قید تنہائی مقصود تھی کہ کوئی اس کی بات سننے کے لیے موجود نہ رہے! اس کے معنی اور کیا ہیں کہ کسی مصلح کا قوم کو اپنی مرکز پر لانا بھی قوم اور حکومت کے نزدیک قابل لحاظ نہ رہا تھا۔ قومی حس فنا ہو گیا تھا۔

حکومت کا پہلا فیصلہ نہ صرف غیر منصفانہ ہوا بلکہ بیت المال میں بے جا دخل دیا گیا

عثمان کے زمانہ کو "سالے کہ نکوست از بہارش پیداست" کا موقع نہ ملا بلکہ غالباً ان کے حکم قضا کو عام رائے اور انصاف کے خلاف بیت المال سے مدد لینی پڑی۔ اگرچہ یہ جزو تاریخ نہیں ہے کہ عامہ ناس نے اس فیصلہ کا کس حیثیت سے استقبال کیا لیکن سوچنا آسان ہے کہ جب انھوں نے دیکھا ہوگا کہ خلیفہ کے عزیز کے لیے نہ صرف جنایت خون معاف ہے بلکہ ایسے قابل عذر حالت کے دفعیہ کے لیے پبلک فنڈ کام میں لایا جا رہا ہو تو اس زمانہ کے انصاف کی طرف سے اعتبار اٹھ گیا ہوگا۔ اور سب تو سب خود ان مہاجرین و انصار نے کیا کہا ہوگا جنھوں نے "یک زبان ہو کر کہا کہ عبداللہ کو قتل کر دینا چاہیے"۔ کیا انھوں نے سوچا ہوگا کہ خلیفہ ہو جانے کے بعد خلیفہ کو "اجماع" کی پابندی لازمی نہیں ہے؟۔ میرے نزدیک خالد بن ولید یا مغیرہ بن شعبہ کا بچا لیا جانا اس سے کم قابل اعتراض نہیں ہے۔ بچانے کے اغراض ایک تھے۔ اس لیے کہ یہ مددگار اور حکومت کے نزدیک قابل اعتبار تھے۔

مغیرہ اور عمرو عاص کی معزولی ان کے اثر میں کمی نہ کرتی تھی

عثمان کے پہلے چھ برس کے زمانہ میں یہ بھی ہوا کہ پہلے زمانہ کے اکثر گورنر معزول کیے گئے اس لیے کہ خلیفہ اپنے قابل اعتبار بنی امیہ کو ان کی جگہ مقرر کر سکیں ان واقعات میں اگرچہ عمرو بن عاص اور مغیرہ بن شعبہ بھی داخل ہیں لیکن ان کا معزول ہونا ان کے اختیار اور اثر میں میرے نزدیک کوئی کمی نہ کرتا تھا۔ اس لیے کہ یہ لوگ اگرچہ کسی خاص صوبہ کے حاکم نہ رہے ہوں لیکن یہ وزارت کے رکن رہے جیسا اکثر مفید مواقع پر ان کی کارگزاری اور کاربراری سے معلوم ہوتا ہے۔

عثمان سے مخالفت کے ذاتی وجوہات

سعد بن ابی وقاص اور ہاشم بن عتبہ

سعد بن وقاص جن کی سپاہیانہ قابلیت سب کو معلوم ہے ان لوگوں میں پہلے شخص تھے جن کو اتفاقات نے خلیفہ کے ساتھ ہمدردی نہ رکھنے پر مجبور کیا۔ اس کی وجہ یہی نہ تھی کہ خلیفہ کو ان کی طرف سے خیال پیدا ہو گیا تھا کہ انھوں نے ہمیں اپنی رائے انتخاب کے متعلق نہ دی۔ بلکہ یہ بھی کہ مضافات فارس کے وہ مقامات جو ان کی کوششوں سے فتح ہوئے تھے ایک سال کے اندر ہی قبضہ سے نکال لیے گئے۔ لیکن یہ ذاتی نقصان بھی جس کے ساتھ شہرت کو نقصان پہنچتا ہو گوارا کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ یہاں تک کہ سعید بن العاص کی ناقابل برداشت

انانیت نے ہاشم بن عتبہ کے ایسے بہادر سپاہی کو جس نے لڑائیوں میں بڑے بڑے کام کیے تھے اور تلوار سے شیر کو قتل کر سکتا تھا، اپنے آدمیوں سے ذلیل کرایا۔ بہادر بھتیجے کی ایسی ذلت سعد کے نزدیک قابل برداشت نہ تھی اور اس کے بعد ان کی حالت کہتی ہے کہ وہ کمال غیظ میں آگئے تھے۔ یہ سب اس کے ہاتھوں (سعید بن العاص) جو جوان (سعد بن ابی وقاص) کی جگہ قائم کیا گیا تھا۔ ہم نہیں جانتے کہ سعید بن العاص نے "عثمان را از سعد کینہ در دل بماند" کا بحیثیت ایک وفادار خادم کے کچھ معاوضہ کرنا چاہا تھا یا نہیں۔

سعد صرف سپاہی تھے۔ عثمان نے ایک سپاہی مدبر، بیسویں صدی کے معیار کے مدبر، عمرو بن عاص کو جس نے ان کے خلیفہ بنا دینے میں بہت کچھ کیا تھا، ناخوش کر دیا۔ اس نے بھی اپنے بے اختیار ہو جانے کو اسی طرح محسوس کیا ہو گا جس طرح سعد نے۔ اس لیے کہ مصر اس کے ہاتھوں فتح ہوا تھا۔ اس نے مفتوحہ کا انتقام مفتوحہ سے لیا۔ لیکن پھر بھی کچھ زمانہ تک لٹکا رہا۔ جب تک وہ یادگار موقع نہ آیا کہ خلیفہ بجائے اپنے قول کی پابندی کے ان کو دھمکاتے جنھیں زبان دی تھی اور ابن عاص ہی وہ شخص ہوتا جو مجمع سے بول اٹھتا کہ: "خدا سے ڈرو اور توبہ کرو"۔ اس وقت تک ابن عاص میں اتنا حس باقی تھا کہ عدم ایفائے وعدہ پر ٹوکتا اور خدا سے ڈراتا۔ لیکن آئندہ زمانہ اس کے سیاسی خاصہ اور روش میں اسے طفرانہ حد تک پختہ کرنے والا تھا۔ مغیرہ، ابن عاص سے کسی طرح کم درجہ کا نہ تھا۔ بلکہ گزشتہ خلافتوں پر اس کے بڑے پایہ کے تعلیم کردہ سیاسی اصول کی مدد کا احسان تھا۔ یہ بھی تخفیف میں آیا۔ اور یہ بھی باوجود تخفیف کے جو میرے ذہن میں عامہ ناس کے مخالفت کی قوت اور انھیں خوش کرنے کی نیت سے عمل میں آئی تھی حکومت کی کل کا ایک پرزہ رہا۔ لیکن اس کے ایسے موقع بین شخص کی ذات سے یہ ناممکن نہ تھا کہ تخفیف اور دوبارہ امورات مملکت کی شرکت کے درمیانی زمانہ میں روضۃ الصفا کے خیال کے موافق خلیفہ کے خلاف اپنی طعن کسی قدر بلند کر دی ہو۔ اس کا ایک یہ پہلو بھی غور کے قابل ہے کہ مغیرہ "حسب وصیت عمر" معزول کیا گیا تھا۔ یعنی خلیفہ دوئم کے مصالح اس کے مقتضی نہ تھے کہ وہ معزول کرتے، بلکہ دوسرے کو وصیت کی تھی۔

مروانؑ کی رعایت

شاید ان امورات نے بھی لوگوں کی نگاہ میں غور اور انقلاب کی کوئی وجہ پیش نہ کی ہو لیکن یہ بھی ہونے والا تھا کہ مروان کی ذات اور غیر معمولی رعایت یا انعام لوگوں میں مذہبی جوش اور حسد دونوں پیدا کر دیں۔ مذہبی جوشش اس لیے کی خلیفہ نے نزدیک مورد عنایت وہ ٹھہرا تھا جسے رسول جلاوطن کر سکتے تھے۔ حسد اس لیے کہ عرب کو یہ گوارا نہ تھا کہ عثمان کا عزیز تو اپنی آسان فطرت کے لحاظ سے بڑے انعام کا مستحق ٹھہرے اور ہم باوجود ملک گردی کے خشکی کی شکایت میں مبتلا رہیں۔ یہ کل باتیں اس کا آئینہ ہیں کہ ہم اس وقت تک دوست ہیں جب تک نفع میں شرکت ہے۔

خمس افریقہ خریدنے کے لیے مروان کے پاس روپیہ کہاں سے آیا

باوجود عام مؤرخین کے اس اتفاق کے کہ عثمان نے ابن حکم کو افریقہ کا خمس دیدیا۔ ہم ابن خلدون کے اس کہنے کو ماننے کے لیے آمادہ ہیں کہ جب ابن زبیر خمس افریقہ لائے تو مروان نے اسے پانچ لاکھ کو خرید ا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ابن حکم کب کا قارون تھا کہ اس کے پاس اتنا روپیہ رہتا جب کہ خود خلیفہ کا یہ فقرہ موجود ہے کہ میں نے اپنے کم مایہ اعزا کے لیے اپنا ہاتھ کھول دیا۔ نیز

اس صورت میں کہ مروان کے پاس بیت المال کے نام کوئی چیک تھا۔ خمس دیدینا یا اس کا دام ادا کر دینا دونوں برابر تھا۔

ولید بن عقبہ

خلیفہ کا کوفہ کا خلیفہ ولید بن عقبہ موردِ الزام ٹھہرایا گیا۔ الزام مسلمانوں کی نگاہ سے نہ صرف سخت بلکہ قابل نفرت تھا۔ اس لیے کہ اسلام نے شراب کی طرف سے جو نفرت دلائی تھی اور جس پر سختی سے عمل ہو رہا تھا، اس کی خلاف ورزی جماعت کے ایک مفید اصول سے اعراض تھا۔ شراب پینا، پلانا، بیچنا، شراب بنانے کی چیزوں کا شراب بنانے کی نیت سے کاشت کرنا وغیرہ وغیرہ سب ممنوع تھا۔ ہم مسلمان اس کے (ممانعت) کی پورے منافع حاصل کرتے اگر ولید بن عقبہ کے ایسے گورنر اور اکثر غیر محتاط لذت پسند مسلمان بادشاہوں نے سبق نہ دیا ہوتا۔

زمانہ عثمانؓ میں جماعت کی اخلاقی حالت

ولید بن عقبہ تو صرف انگلی سے دکھانے کے قابل ہو گیا تھا، حالانکہ مولوی سید امیر علی صاحب باقاعدہ کے موافق بیساوہ اپنی تاریخ اسلام میں فرماتے ہیں: "حضرت عثمان کے تخت خلافت پر جلوہ افروز ہوتے ہی نوجوانوں اور خاص کر بنی امیہ کے نونہالوں نے وہی عیاشانہ زندگی اختیار کرلی۔ ان کے اپنے بھتیجے نے ایک قمار خانہ جاری کیا، اور عورتوں کا عاشق معشوق کرنا ایک فیشن ہو گیا۔ مکہ کی عیاشی بنی امیہ کے عہد میں دمشق میں بدترین صورت میں نمودار ہوئی"۔

مثالیں جن کا خلیفہ کی ذات سے غیر صریح تعلق کہا جاسکتا ہے

یہ واقعات تھے جن کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ انھیں خلیفہ کی ذات سے غیر صریح تعلق تھا۔ یعنی عمال کی بے عنوانیاں صرف اس قدر قابل اعتراض تھیں کہ کیوں انھوں نے عامہ ناس کے مقابلہ میں بنی امیہ ہی کو اعتبار کا شایان سمجھا۔ کیوں ایسے لوگ مقرر کیے جنھوں نے لوگوں کو خوش نہ رکھا، اور پھر شکایت پر یا تو توجہ نہ کی اور یا ویسا ہی دوسرا شخص مقرر کیا۔

صریح تعلق کی مثالیں

لیکن بدنصیبی سے زیادہ تر واقعات ایسے ہوئے جن کی ایجاد مصلحت بھی خلیفہ کی ذات سے ہوئی جس کا نفاذ ان کے حکم سے ہوا۔ اور بعض اوقات خلیفہ کے غور اور لحاظ کی کمی نے ان کے خلاف سخت برافروختگی پیدا کردی۔

رسومات کی خلاف ورزی

اگرچہ خلیفہ ہونا ایک موثر موقع پیدا کرتا تھا کیونکہ منجملہ اور وجوہات کے کسی نہ کسی طرح تمدن اور مذہب کا نظام ابھی ایک ہی شخص میں مجتمع تھا، اور ابھی حکومت نے اپنے کو اس قدر مذہب کے ذمہ داری سے مطلق العنان نہیں کیا تھا کہ وہ اس شاخ کو علیحدہ کر دیتی۔ اور امام سازی کی طرف متوجہ ہو کر مذہب کو حکومت کا ماتحت کرلیتی۔ پھر بھی رسومات کی خلاف ورزی نے خلیفہ کو آماج اعتراض بنا دیا۔

ابھی کچھ ایسا زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ لوگ رسومات مذہبی کو بھول گئے ہوں جس طرح وہ رسول کے ساتھ یا ان کی تعلیم سے بجالاتے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ندائے ثالث جمعہ میں زیادہ کردی گئی۔ منیٰ اور عرفہ میں نماز قصر نہ کی گئی۔ منیٰ میں شان و شوکت سے خیمے نصب کیے گئے۔ لوگوں نے خلیفہ کر سے شکایت کی اور اسے کہنا پڑا کہ: "میں نے تمھیں اس لیے خلیفہ بنایا ہے کہ سنت کے موافق کرو گے، نہ کہ اس کے خلاف کرو"۔

قرآن کے ساتھ طرزِ عمل لوگوں کی خواہش کے موافق نہ تھا

کہا جاسکتا ہے کہ یہ بہت بڑے درجہ کی خلاف ورزی نہ تھی بلکہ تھوڑا سا فرعی ڈھیلا پن تھا۔ ہو۔ لیکن قضا و قدر کو یہ بھی منظور تھا کہ خلیفہ نے ترتیب قرآن کیسی ہی عمدہ غرض سے کیوں نہ کی ہو اور کسی کو لفظی اختلاف کے لحاظ سے قریش کی بولی میں لکھنے کا آسان حکم دیدیا ہو مگر پھر بھی حکومت کے اس مرتبہ نسخہ کے علاوہ نسخوں کے جلادینے کا حکم برافروختگی پیدا کرے۔ مسلمانوں کو گوارانہ تھا کہ وہ اپنے مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی ہدایت نامے کے ساتھ کسی نوعی توہین کو دیکھ سکیں۔ ایک طبعی انقلاب ہوا۔ یہاں تک کہ ام المومنین عائشہ نے قرآن جلانے والے کے قتل کا فتویٰ بھی دیدیا۔

ابنِ مسعود کی مخالفت کے کچھ معنی تھے

اس علم کے بعد بھی کہ موجودہ ترتیب قرآن میں کم وبیش گزشتہ خلافتوں نے اہتمام کیا تھا، یہ حالت توجہ کے قابل ہے کہ "ابن مسعود نے اس قرآن کے نسخہ کے لینے سے انکار کیا، اور لوگوں کو اپنی ہی قرامت پر رکھا"۔ اور لوگوں نے اقرار کیا کہ انھوں نے خود رسُول سے قرامت سیکھی ہے۔ یقیناً کچھ اختلاف تھا کہ ان پر مرتبہ حکومت قرآن کے لینے کا زور ڈالا گیا، اور یقیناً کچھ اختلاف تھا کہ انھوں نے نہ لیا، اور انھیں اپنے اوپر باوجود دباؤ کے اعتبار رہا۔ ورنہ اگر ایک صورت ہوتی تو نہ دباؤ کی ضرورت تھی نہ انکار کی۔ اور یہ تو کہنا ہی نہیں ہے کہ گزشتہ دو خلافتوں نے باوجود علم کے علیؑ کا مرتبہ قرآن نہ لیا، اور نہ تیسری خلافت کی قرآن مرتب کرنے والی جماعت میں علیؑ کا نام ہے۔

احراقِ مصاحف کے حکم میں علیؑ کا مرتبہ قرآن بھی اُصولاً داخل تھا

اور چونکہ تمام دیگر نسخوں کے جلنے کا حکم دیدیا گیا تھا، علیؑ کا مرتبہ نسخہ اس حکم کے اندر آگیا، وہ حقیقتاً جلا ہو یا نہ جلا ہو۔

کیوں دو گزشتہ خلافتوں میں اِشاعت نہ کی گئی

میں خود اس امر پر بھی بغیر رکے آگے نہیں بڑھ سکتا کہ اگر گزشتہ دو خلافتوں میں ترتیب قرآن کا کام پورا ہو چکا تھا تو کیوں نہ اس کی نقل اور اشاعت کی گئی۔ کیا انھیں رسُول سے قریب تر زمانہ میں ہونے کے لحاظ سے اپنی ترتیب کے خلاف یورش پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اگرچہ جنگ یمامہ میں سات سو حافظ قرآن شہید ہو چکے تھے۔

اصحابؓ کی توہین

لیکن واقعہ قرآن تنہا نہیں گزرا بلکہ اس میں رسُول کے معتبر صحابی کی توہین بھی ضم ہوگئی۔ ہم نہیں جانتے کہ غریب ابن مسعود سے پیشتر سے بہرے ہونے کی کوئی اور وجہ تھی یا نہ تھی۔ ہمیں اس وقت کا کلام بھی نہیں معلوم جس کے بعد ان کے پیٹ پر غالباً قے کرانے کے لیے لاتیں ماری گئیں۔ یقیناً اس وقت کا مکالمہ معاملہ کے سمجھنے میں بہت معین ہوگا۔ بہر حال یہ پہلا موقع تھا جس میں اختلاف رائے (جس کے علاوہ ہمیں کچھ نہیں معلوم) رسُول کے صحابی کو سزا کا مستوجب ٹھہراتا۔

وقت بدلا

اب سید امیر علی صاحب کی تاریخ اسلام کے اس فقرہ کا وقت گزر چکا تھا کہ: "ان کے عہد کے پہلے چھ سال میں اگرچہ نئے گورنروں کے ظلم سے ناک میں دم آگیا تھا (مگر) لوگ

چپ چاپ رہے"۔ بلکہ اب وہ وقت آیا جیسا وہ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ: "اس اثنا میں خلیفہ کی کمزوری اور ان کے مُنہ لگوں کی شرارتیں لوگوں میں سخت غیظ و غضب پیدا کر رہی تھیں۔ ان کے گورنروں کے ظلم و تعدی کی پُرزور شکایتیں دھڑا دھڑ دار الخلافۃ میں موصول ہونے لگیں۔۔۔۔ آخر نوبت بہ اینجا رسید کہ صوبوں سے انصاف کا تقاضا کرنے کے لیے وفد آنے شروع ہوئے، وعدہ وعید پر ٹال کر ان کو واپس کیا گیا"۔

اصحابؓ کی لطافت

انھیں مواقع میں سے ایک تھا جس میں اصحاب رسُول نے غالباً تقریر کی گرمی کی احتیاط سے شکایتیں کاغذ کے حوالہ کیں اور مزید لحاظ سے بہ یک جسم جانا بھی نمود قوت کی دھمکی سمجھ کر ترک کیا، بلکہ ایک شخص کو اپنا وکیل کیا۔ وہ شخص وہی تھا جس کے متعلق رسُول کی یہ حدیث کہ: "اے عمار تجھ کو ایک فرقہ باغی قتل کرے گا"۔ اور مورخین کی طرح ملا جامی بھی "شواہد النبوۃ" میں نقل کرتے۔ نہ صرف رسُول کے ساتھ عمار کی محبت اور وجہ اسلام کی حمایت ہر شخص کو معلوم تھی، بلکہ ان کے پدر بزرگوار اور مادرِ گرامی اوائل مُسلمین اور مُسلمات میں کفار کی تعدی کے شکار اور حیرت خیز اسلامی استقلال کے نمونے تھے۔

کس کے ساتھ نامُلائم برتاؤ ہوا

کون کہہ سکتا ہے کہ مستغیثین نے انھیں بجز صلح اور داد رسی کے اور کسی نیت سے اپنا وکیل بنایا تھا۔ گئے۔ لیکن ایسے وزنی استغاثہ اور مقدس وکیل کی اس طرح توہین کی گئی کہ چند سطریں پڑھ کر کاغذ پھینک دیا گیا۔

عمار سنجیدگی سے اصحابؓ کی وکالت کر رہے تھے

پھر بھی وکیل غصہ میں نہ آیا۔ لیکن اسے ایک فرض ادا کرنا تھا۔ وہ اور اصحاب رسُول کے وقار کا بھی وکیل تھا۔ کہا کہ: "اسے اصحاب رسُول نے لکھا ہے۔ پھینکنا مناسب نہیں ہے"۔ لیکن اس کے علاوہ بھی ایک اور نازک فرض تھا، اور وہ ناصح ہمدرد اور مُسلمان کی حیثیت سے کہنا تھا کہ: "اس پر غور اور تامل لازم ہے۔ ہم تمھارے خیر خواہ ہیں۔ یہ باتیں (جو کچھ لکھی ہیں) تم سے مصلحت اور نصیحت کے لیے کہی جاتی ہیں"۔ کون کہے گا کہ ان الفاظ میں کوئی گرمی یا سختی ہے یا آدابِ شاہی کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔

یہ سب کچھ نہ تھا بلکہ صورت معاملہ یہ پہنچ گئی تھی کہ یہ کہنا بھی کہ ہم عذر یا داد خواہ ہیں حکومت کے خوشگوار سر میں ایک تکلیف دہ پیچ مخلوط کر دیتی تھی۔ عمار کے سابق میں ایک اور ناگوار بات تھی، جسے خلیفہ کا حافظہ دماغ سے خارج نہ کر سکا ہوگا۔ یہی تھے جنھوں نے خلیفہ سازی کے مجمع میں علیؑ کی وکالت کی تھی۔ کسی کا بڑا صاحب اخلاق حمیدہ اور مذہباً مقدس ہونا اسے سیاسی جرم سے محفوظ نہیں کر سکتا۔ نہ کہ سیاسی حیثیت کے رقیب کا وکیل ہونا۔ اگرچہ اس کے بعد ان کے دل میں اس واقعہ کی کوئی یاد باقی نہ رہی ہو۔ آج قبضہ میں تھے۔

عمارؓ کے ساتھ برتاؤ، اثر اور اس کی وجہ

اس کے بعد خلیفہ کی حرکت کی قدر دانی کے لیے میں ابن خلدون یا مترجم ابن خلدون کے لیے ووٹ دیتا ہوں۔ نتیجہ کیا ہوا۔ بنی مخزوم نے قسم کھائی کہ اگر عمار جانبر نہ ہوئے تو عثمان کو قتل کر ڈالیں گے۔ تم کہو گے کہ یہ ان کی گستاخی تھی کہ انھوں نے خود انتقام کا قصد کیا، اور عدالت میں نہ گئے۔ عدالت کہاں تھی؟ جب داماد کے لیے بیت المال تھا

تو اپنے لیے ممالک محروسہ فروخت کیے جاسکتے تھے۔ کیا عدالت کی طرف سے یہ بے اعتباری انصاف کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کافی وجہ نہ تھی؟ یہ موقع تو خیر گزر گیا۔ محمد بن ابی بکر کو ابھی ایسا ہی موقع باقی ہے۔ صرف برخاستگی کا جوش بڑھتا جارہا ہے۔

ابوذر غفاریؓ

کسی طرح ابن مسعود اور عمار بن یاسر کے واقعہ سے کم جوش خیز ابوذر غفاریؓ کا واقعہ نہ تھا۔ ابوسفیان کا بیٹا کب خوش ہو سکتا تھا کہ حکومت اور فتوحات کا تلذذ تسویہ، انصاف اور احتیاط کی تلخی میں ڈبویا جائے۔ اور تصرف کے وقت کھٹکا لگا رہے کہ کوئی دیکھنے والا آگاہی کی صدا لگایا چاہتا ہے۔

نازک موقع

معاویہ کو اس صورت میں کہ وہ اپنے لوگوں کو مخصوص توجہ سے نہ دیکھ سکے، ایک مضبوط تائید سے مشتبہ ہونا پڑتا۔ اور اس صورت میں کہ عامہ ناس پر ابوذر غفاریؓ کی تقریر اور فقرات کا اثر پڑتا۔ کیونکہ وہ حقوقِ مسلمین اور عامہ ناس کی وکالت کرتے تھے۔ اسے لوگوں کی طرف سے بھی اطمینان کی امید نہ تھی۔ یہ بھی وکالت کی قوت تھی کہ تنہا آدمی نے حکومت کے خود غرضانہ نفاذِ اختیار کا موقع اس قدر نازک کر دیا تھا۔ کیا کیا جاتا۔ معاویہ کے حوصلے اس سے کہیں بڑے تھے کہ وہ اپنے کو مساوات اور احتیاط کا پابند کرتا۔ صرف اب یہ رہ گیا تھا کہ وہ خلیفہ کو مدد کے لیے پکارتا، اور کہتا کہ ابوذر کو اس قدر جرأت ہو گئی ہے کہ وہ نہ صرف میرے افعال پر معترض ہے بلکہ وہ خلیفۂ وقت سے بھی جواب طلب کرنے کا اپنے کو مستحق سمجھتا ہے۔ وہ حکومت کا رفیق نہیں ہے، بلکہ قانون اور عامہ ناس کا اپنے کو وکیل سمجھتا ہے۔ خلیفہ نے نہ صرف ابوذر کے قول کی صدق یا کذب کے سمجھنے کی مطلق کوشش نہ کی بلکہ قطعاً اپنے عامل کی مصلحت کے پیرو ہو گئے اور سختی شروع کر دی۔ ابوذر کی اسلامی منزلت بھی حکومت کی روش کے لحاظ سے کسی سفارش کے قابل نہ ہوئی۔ حکومت کا درشت مذاق تھا کہ مسلسل دوڑتے ہوئے اونٹ پر اپنے ملزم کو قلابازیاں کھلائے۔ اس لیے کہ: "ہمارا (حکومت) اور تیرا (عامل) ذکر بھول جائے"۔ لیکن درد انگیز بھی تھا کہ سچ کہنے میں اپنے جسم کا گوشت بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ بوڑھا مقدس صحابی اس طرح آدھ موا دار الخلافہ پہنچا کہ حکومت تحقیر اور طنز سے استقبال کرے۔

نیکی اپنا آپ انعام ہے

نہ سفر کی جھنجوڑ اور نا ملائم برتاؤ اور نہ خلیفہ کا رعب اور سختی ابوذر کو یہ کہنے سے روک سکے کہ: "مجھے جہاں چاہے بھیجو جہاں رہوں گا سچ کہوں گا"۔ ابوذر نے اس اعتبار کی وقعت قائم رکھی جس کی بنا پر رسولؐ نے انھیں "اصدق" فرمایا تھا۔ طبیعت شناس رسولؐ نے فرمایا تھا۔

سزا کے بعد عداوت ختم نہ ہوئی

چند بھیڑ اور ایک آدھ اونٹ کے ساتھ جو ان کی بقیہ زندگی تک کے گزارہ کے لیے دیا گیا تھا، ان کی خاص ملکیت تھی۔ بوڑھا صحابی ربذہ کی طرف جلاوطن ہوا۔ جو مقام اسے نہایت ناپسند تھا۔ جلاوطنی کے حکم کے بعد بھی حکومت کے دل میں خنکی نہ پیدا ہوئی، اور وہ وقت بھی کہ جس میں کوئی، یا چند آدمی تھوڑی دور مشایعت کرتے، ابوذر کی ہمراہی کے لیے مخدوش سمجھا گیا کہ مبادا وہ لوگوں کے کان میں ایسے لفظ پھونکیں جو برا اثر کریں۔ اور حکم دیا گیا کہ کوئی مشایعت نہ کرے۔ یہی مصلحت تھی کہ ایک غیر آباد مقام ان کی سکونت کے لیے مخصوص کیا گیا۔

ابوذرؓ سے علیؑ کے مخاطبہ کی شرح

نہ اس لیے کہ علیؑ نے فرمایا ہے، بلکہ حالات پر غور کے بعد ان فقرات پر نظر کرو جو علیؑ نے ابوذر سے اس وقت کہے تھے جس وقت وہ مدینۂ نبی کو وداعی نگاہ سے دیکھ رہے تھے کہ اس سے زیادہ مناسب لفظوں میں اس وقت کی صحیح حالت نہیں بیان کی جاسکتی۔ ابوذر کو خواہش اصلاح میں کوئی خود غرضانہ وجہ محرک نہ ہوئی تھی، بلکہ وہ "خدا کی وجہ سے خشم ناک" ہوئے تھے لیکن چونکہ ایسا چاہنا بنی امیہ کی بے مہار خواہش حکومت کے نزدیک دلپذیر نہ تھا، اس لیے "اس قوم نے ان کی طرف سے اپنی دنیا کا خوف کھایا"۔ آسان تھا کہ وہ بھی حکومت کے ساتھ تالیاں بجاتے لیکن یہ ابوذر کے ضمیر کے خلاف تھا۔ اور اپنے "دین کا خوف کیا" ورنہ "اگر یہ ان کی دنیا کو قبول کر لیتے تو البتہ بنی امیہ ان کے ساتھ دوستی سے پیش آتے، اور اگر دنیا کو ان سے (بنی امیہ سے) قرض لیتے تو ابوذر کو اپنی مضرتوں سے پناہ دیتے"۔ اب جب کہ ابوذر چلے جا رہے ہیں تو انھیں اس سے بہتر کیا تسکین ہو سکتی کہ "اب تو اس چیز کو ان کے ہاتھوں میں چھوڑ دے جس کے زوال سے یہ خائف ہو رہے ہیں"۔ انھیں فصل بہار کی گھاس اطمینان سے چرنے دے کہ ان کی انتڑیاں حلق تک بھر جائیں، اور "تو اس چیز (دین) کو لے کر فرار کر جا جس کے زائل ہو جانے کا تجھے ان کی طرف سے خوف تھا"۔

روزِ جزا کے آثار

روزِ جزا کی آمد کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ ساز بنا ہوا تیار تھا، چھیڑنے کی دیر تھی۔ غریب ابوذر باوجود مظلوم ہونے کے نہیں معلوم حامئینِ حکومت اور اس کے مداحوں کے نزدیک کس قدر موردِ الزام ہوتا اگر اس کی زندگی میں ان کا کوئی لفظ کسی پر یہ اثر کرتا، جو حکومت کی طرف سے نفرت آمیز غصہ پیدا کر دیتا، اور کہا جاتا کہ بغاوت ایک زمانہ سے بپا ہو رہی تھی۔ زندگی نے کچھ نہیں کہا موت نے کہا۔

موت کی زبان کا اثر

اِتفاق تھا جس نے جریر بن عبد اللہ البجلی، صعصعہ اور مالک اشتر کے مادہ کے لوگوں کو اس وقت پہنچا دیا جس وقت حالت یہ تھی کہ ایک کمزور عورت گویا لاش سے پوچھ رہی تھی کہ ہم کیا کریں۔ نہ ہم تنہا مراسم دفن ادا کر سکتے ہیں اور نہ رسمی کفن ہے جو تمھارا آخری لباس ہو۔ یہ محض وصیت نہ تھی کہ ضعیفہ سرِ راہ بیٹھ گئی، بلکہ موقع کا بڑھتا ہوا انتشار تھا، جس نے اس جگہ کھینچا جہاں سے لوگوں کے گزرنے کی امید تھی۔ یہ پرسہ کی معمولی رسم نہ تھی کہ جریر، اشتر اور صعصعہ کے ایسے سپاہی ادا کرتے بلکہ گزری ہوئی باتوں کی یاد۔ موجودہ موقع اور ایک غریب عورت کی صدائے اِستِغاثہ تھی جس نے پتھر پگھلا دیا۔ سپاہی اٹھ گئے۔ اور بے چینی سے روئے۔ لیکن صرف ہمدردی سے رو دینا عورتوں کے کمزور رونے سے کسی طرح اچھا نہیں ہے۔ نہ یہ اس طرح روئے تھے۔ آئندہ قربت سے مطالعہ اور خیالات کی تشریح کھل جائے گی۔ ان کی وداعی دعا کو غور سے دیکھو؟

دُعا پر نظر

میں اس کا کوئی لفظ ایسا نہیں دیکھتا جو نظر انداز کیے جانے کے قابل ہو، اور عین واقعہ یا واقعہ کے متعلق بے تکلف خیال نہ ہو۔ ابوذر کے ایمان لانے، رسُول کے ساتھ رہنے، مشرکین سے جنگ، اسلام پر ثابت قدم رہنے کے حقوق یاد کیے گئے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ انھوں نے "شرع میں کوئی تغیر نہیں کیا"۔ یہ ابوذر کے مخالفین پر عکس تھا جس کی شرح آئندہ فقرات سے ہوتی ہے جہاں زمانہ کے واقعات بیان کیے جاتے ہیں کہ: "اس نے کچھ باتیں دیکھیں جو سنت رسُول کے موافق نہ تھیں۔ اس نے ان سے انکار کیا"۔ اس کے بعد وہ فقرہ ہے

جسے ہم آئندہ کی تنجی بھی کہہ سکتے ہیں کہ: "اس وجہ سے اسے لوگوں نے حقیر سمجھا اور اسے روضہ رسُول کے طواف کی دولت سے محروم کر کے نکال دیا، اور اسے ضائع چھوڑ دیا، یہاں تک کہ غربت میں مر گیا"۔ اور آخر میں دعا تھی کہ: "اُسے بھی سزا دو جزا دے جس کا وہ مستحق ہو، جس نے اسے حرم رسُول سے نکال دیا"۔

اتفاقات

قسمت کی حیرت خیز مخالفت تھی کہ یہ لوگ کوفہ کے تھے جہاں ہاشم بن عتبہ کی توہین ہوتی اور سعید بن العاص سے وہ معاملات پیش آئے جنھیں ہم بیان کرتے ہیں۔ سعید بن العاص اموی عثمان کی گود کا کھلایا، جس کا عقد بھی عثمان نے کرایا، جو گویا معاویہ کی فوجی شاگردی میں تھا۔ کوفہ کے ایسے مفید مقام کا اپنے کو حاکم دیکھ رہا تھا۔ اس سے زیادہ کون اپنا موقع قوی سمجھ سکتا تھا جس کا ایک استاد شام کے صوبہ میں حاکم اور ولی مدینہ میں خلیفہ ہو۔ اس نے اس میں ناگوار رعونت اور حاکمانہ تجبّر پیدا کیا۔ یہاں تک کہ اس کے مُنہ سے نہ صرف موجودہ بلکہ گزشتہ مصلحت کے بھی بالکل خلاف یہ فقرہ نکل گیا کہ: "عراق اور اس کا سواد قریش کے لیے بمنزلہ بوستان ہے۔ جس قدر ہم چاہیں لے لیں اور جس قدر نہ چاہیں چھوڑ دیں"۔ یہ خود غرضانہ فقرہ نہ صرف ان کے روبرو تھا جواب گزشتہ اور موجودہ حکومت کے زمانہ کے فتوحات میں حصہ لینے والے سپاہی تھے لیکن قریش نہ تھے۔ بلکہ وہ جن کا وطن عراق تھا۔ انھوں نے کیا سوچا، یہ کہ کوشش ہماری لیکن نام آوری بنی امیہ یا حاکم گروہ کے چند متنفس کی جو ہمیں دھمکی دے رہے ہیں کہ ہمیں مغز کھاتے دیکھتے رہو، اور اس کی دعائیں مانگو اور مُنہ دیکھتے رہو کہ ہم ہڈی بھی تمھاری طرف پھینکتے ہیں یا نہیں! سعید کو سننا پڑا کہ: "جس سواد کو اللہ تعالیٰ نے ہماری تلواروں کے زور سے عنایت فرمایا ہے تم اس کو اپنا اور اپنی قوم کا بستان خیال کرتے ہو؟"۔ بات یہیں تک ختم نہ ہوئی بلکہ واقعہ کا اثر اس سے سمجھ میں آئے گا کہ سعید بن العاص کا پولیس کا افسر مجروح ہوا۔ اور لوگوں نے اشتر کی تعریف کی اس لیے کہ: "اگر ایسا نہ کیا ہوتا تو یہ گروہ اس کے بعد ہمارے گھربار میں تصرف شروع کرتا اور ہمیں ہمارے آباء و اجداد کی میراث سے محروم کر دیتا"۔

معاویہ اور سعید کے طرزِ عمل کی موافقت

سعید بن العاص نے وہی مصلحت اختیار کی جو معاویہ نے کی تھی۔ اگرچہ دونوں کے شکاروں کی حالت میں فرق تھا۔ اور ایک گروہ پر مخصوص الطاف غالباً قدر مشترک تھی۔ لیکن ابوذر محض بحیثیت ایک مُسلمان اور مصلح کے نصیحت کرتے تھے انھیں اپنی کسی جائداد پر حکومت کی دستبرد کا اندیشہ نہ تھا، درآنحالیکہ اہل کوفہ کو سعید بن العاص کے فقرات نے ذاتی نقصان کا خطرہ دلایا تھا۔ یعنی صورت معاملہ کسی خاص گروہ کے مورد عنایت ہونے سے بڑھ کر اب اس دہرے خوف کی بھی محرک ہوگئی تھی کہ ہمارا اماال اور معاملہ عمّال کے رحم اور مزاج کے اعتدال یا عدم اعتدال پر موقوف ہے۔ جب ایک عامل دوسرے عامل کے عمل کی تقلید کر رہا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ خلیفہ اپنے پیشتر کے دستور العمل سے انحراف کرتے۔ اس مرتبہ انھوں نے ملزموں کو مدینہ نہ بلایا۔ کون جانے کہ اس لیے کہ اصحاب رسُولؐ محض ان کے عمّال کا بیان کیا ہوا الزام نہ سنیں گے بلکہ خود ملزمین سے بھی کچھ پوچھیں گے اور اگر ان کے نزدیک الزام درست نہ نکلا تو پھر ان میں ویسی ہی بددلی پیدا ہوگی جیسی ابوذر کے متعلق پیدا ہو چکی تھی۔ اس لیے مناسب سمجھا کہ ان لوگوں کو شام یعنی وہاں کے بیدار مغز عامل کے نگاہ کے نیچے بھیج دیں۔ سعید نے ان لوگوں کو جلا وطنی کا حکم سنایا، اور برافروختگی میں جو کچھ کسر باقی

رہ گئی تھی اُسے یہ کہہ کر پورا کر دیا کہ: "جاتے ہو تو ان سفہا اور اوباشوں کو بھی لیتے جاؤ جو تمھیں برانگیختہ کرتے ہیں"۔

جائز نکتہ چینی پر تشدد

لیکن سچ حکومت نے جن لوگوں کو جائز نکتہ چینی پر خاموش اور ذلیل کرنے کا ارادہ کیا تھا اس کی غرض کیسی ہی کیوں نہ ہو کسی طرح کجی کی جھلک اس میں نہ پائی جاتی تھی۔ اشتر محض کند سپاہی نہ تھا، سردار قبیلہ، مقرر، مدبر، اور نہایت ذکی الحس تھا۔ اپنے ان تقریروں میں جو امورات سیاست کے متعلق تھیں نہایت محتاط تھا۔

سعید کے فقرہ کے بعد اس کا کہنا کہ: "کوفہ میں جتنے لوگ ہیں سب میرے ہوا خواہ ہیں اور کوئی اس پر راضی نہ ہوگا کہ تو ان کے شہر اور گھروں کو اپنا بستان قرار دے"۔ اسی قدر سچ تھا جیسا مدبرانہ تھا۔ اس نے ایسے موقع پر نہ صرف اہل کوفہ کو اپنا ہوا خواہ بنایا بلکہ یہ بھی ذکر کے قابل سمجھا کہ حکومت کی بے مہار اور غیر محتاط تقریر پر اہل کوفہ راضی نہیں ہو سکتے اور سب میرے ہم خیال ہیں۔ معاملہ جوش خیز تھا۔ اشتر نے ساز کے اس تار پر انگلی رکھی تھی جو حکومت کو بھلا نہ معلوم ہوتا لیکن عام رائے جس کا طبعی اقرار کرتی۔

دسترخوان کی مخدوش زینت دُور کی گئی

مدبر معاویہ نے مالک اشتر وغیرہ کو اپنا کرنے کے لیے دسترخوان کو مدد کے لیے بلایا۔ تقریری مغالطے دیے۔ دھمکی اور لالچ سے کام نکالنا چاہا۔ لیکن اس کے تمام تدبر کو کامیابی نہ ہوئی۔ جب ابوذر کا ایسا بے غرض مصلح شام میں رکھے جانے کے قابل نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ وہ خدا کے لیے خاموش جم غفیر کے حقوق کی آزادانہ وکالت کرتا تھا تو ایسے حوصلوں میں بسر کیے ہوئے لوگ، جنھیں آئندہ کا حوصلہ ہو سکتا تھا کب ایسے مہان ہو سکتے تھے جو زور دسترخوان کی مخدوش زینت ہوتے۔ دوبارہ امیر شام گوتم بدھ سے زیادہ متین الصلوۃ فلسفی اور دین کی حمایت کا مجسمہ بن کر خلیفہ کو صدا دیتا ہے اور ان لوگوں کی موجودگی سے انصاف، حق، دین اور نیکی سب کو معرض خطر میں مبتلا دیکھتا ہے اور یہ چند جری صاف گو، دمشق سے اس لیے نکالے جاتے ہیں حمص روانہ کیے جائیں۔

شخص نہ کہ مقام

لیکن یہ جگہ نہیں تھی جہاں ان کا بھیجا جانا کوئی خصوصیت رکھتا ہے، بلکہ حقیقتاً اس کا تعلق شخص سے تھا۔ وہ شخص دور اول کے دست راست اور شمشیر کا فرزند تھا۔ میری غرض خالد بن ولید کے فرزند عبد الرحمٰن سے ہے۔

عبد الرحمٰن بن خالد بن ولید کے برتاؤ نے آگ بھڑکائی

یہ اپنے باپ کا بیٹا کریہہ الفاظ سے اس گروہ کا استقبال کرتا ہے، اور "ایسی سختی" کا برتاؤ کرتا ہے جس سے کوئی عجب نہیں ہے اگر ان لوگوں نے اپنا موجودہ موقع دیکھ کر مجبوری سے "توبہ" کی ہو۔ زمانہ نے بتایا کہ یہ توبہ ایک آگ تھی، جو وقت پر بھڑکنے کے لیے دبا دی گئی۔

وجہ کی یک جہتی

ہم نہیں جانتے کہ اہل کوفہ اس سے واقف تھے یا نہ تھے کہ مالک اشتر اور صعصعہ وغیرہ شام اور حمص میں ہر طرح کی ذلتوں میں بسر کر رہے ہیں اور ان کا مدینہ میں آ کر خلیفہ سے عامل اور اپنے لوگوں کی جلاوطنی کی شکایت محض فریاد رسی کی حیثیت سے تھی۔ اور وہ اور جوش میں آتے اگر انھیں سچ حالات

معلوم ہوتے۔ جو کچھ بھی ہوا اہلِ کوفہ کے وفد نے اپنے کو تنہا نہ دیکھا بلکہ اہلِ بصرہ کو بھی موجود پایا۔ ان وفود کا اس قدر نتیجہ ہوا کہ عاملوں کو "نصیحت" کی گئی۔ عمال نے یا تو نصیحت کو اس قابل نہ سمجھا جسے وہ اپنے اپنے عمل میں لے جاتے، یا خلیفہ نے دریافت پر ان عاملوں کی روش کو حکومت کے نقطۂ نگاہ سے قابلِ چشم نمائی نہ سمجھا، اور واپس کیا۔ اہلِ کوفہ کو تشفی نہ ہوئی اور انھوں نے دوبارہ ایک متقی آدمی کو اپنا سفیر بنایا، اور دوسرے ایک مقدس بزرگ نے علیحدہ سے بھی ایک خط بھیجا۔ مجھے سفیر کے اس فقرہ سے بحث ہے کہ: "اے عثمان لوگوں نے تمھارے افعال پر نظر کرنا شروع کیا ہے"۔

خلافِ مصلحت الفاظ

کسی ہوشیار حکومت کے لیے لوگوں کا امورات حکومت پر نظر کرنا حکومت کی آنکھیں کھولنے کا باعث ہوتا۔ لیکن افسوس ناک ضد نے خلیفہ کے مُنہ سے یہ خیالات ظاہر کیے کہ "ایسی باتیں نا ملائم" ہیں اور ایسا کہنا کہنے والے کے "زاہد اور متورع" ہونے کو مشتبہ کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا تعارف کرایا گیا

ساتھ ہی ساتھ حکومت کے خوفناک "اللہ تعالیٰ" کو بھی پہچنوانا چاہتے ہیں۔ اور جواب ملتا ہے کہ: "میں اللہ تعالیٰ کو نہیں جانتا، پر بے شک اللہ تعالیٰ ظالموں پر قابو پانے والا ہے!"۔ اس کے بعد خلیفہ نے تصفیہ کیا کہ: فریاد خواہ "سُفہاء اہلِ بغی اور حسد" ہیں۔ سفیر پر "اللہ تعالیٰ" نے توجہ کی بلکہ اس طرح پہچنوایا گیا کہ بغیر کسی ایسی ہولناک مزاج کے ایجاد کیے ہوئے جو ابوذر کے لیے اختیار کیا گیا تھا کسی طرح نہ ہوسکتا۔ کعب بن عُبیدہ کوفہ گرفتار کر کے بلوائے گئے۔ اور کوڑے کی ساٹھیں یا خون آلود نشان کے مٹانے کے لیے پہاڑ تجویز ہوا۔

نازک حالت اور مُعتمد لوگ

حالت ضرور نازک تھی کہ خلیفہ نے معاویہ، ابن ابی سرح، سعید، ابن عامر اور ابن عاص کو طلب کیا۔ اس لیے کہ یہ لوگ وزیر، ناصح، مُعتمد علیہ تھے۔ ان پر "اطمینان" تھا کہ یہ لوگ "نیک نیتی" سے رائے دیں گے۔ رائے زنی کا مضمون یہ تھا کہ لوگ "طرح طرح کے الزامات مجھ پر قائم کرتے ہیں۔ میرے عمال کی معزولی چاہتے ہیں اور جس کو وہ دوست رکھتے ہیں مجھے اس (امر) کا پابند اور اس کی طرف لوٹانا چاہتے ہیں"۔ چونکہ ابن ابی سرح کی لالچ دینے والی رائے قبول نہ ہوئی۔ ہمیں اس سے کوئی واسطہ نہیں، نہ سعید کی اس رائے سے کہ "سرداروں کی ہلاکت" سے لوگ خود بخود منتشر ہو جائیں گے"۔ باوجود اس کے کہ خلیفہ نے "ضرور مناسب" سمجھی۔ ہمیں کوئی بحث ہے۔ اس لیے کہ مورخ نے یہ بھی بتایا ہے کہ "اس پر عمل کرنا مشکل" تھا۔

تاریخ اپنا حل آپ ہی کر رہی تھی

اور ہم اپنے کو اسی صلاح پر متوجہ کرتے ہیں جو عبداللہ بن عامر کریز نے دی کہ: "ان کو جہاد میں مصروف کر دیجیے۔ کیونکہ جب یہ فارغ بیٹھیں گے تو طرح طرح کے خیالات پیدا کر کے آئے دن ایک نہ ایک فتنہ اٹھاتے رہیں گے"۔ خلیفہ نے یہ رائے منظور کی اور حکم دیا کہ: "لوگوں کو جہاد پر روانہ کرو، تا کہ اس کی مصروفیت ان کو اور خیالات سے روک دے"۔

اب وقت نہ تھا

یہ دکھانے کے لیے مشکل سے میں کوئی اور دلیل لا سکتا ہوں کہ رسُولؐ کے بعد کامیابی کا یہی ایک بڑا راز تھا جس کے تجربہ پر اب پھر توجہ ہوئی تھی۔ لیکن جہاد کی آسانیاں اب دور ہو چکی تھیں، اس لیے کہ فتوحات کا دائرہ وسیع سے بھی کچھ زیادہ ہو چکا تھا۔ دور دراز مقامات پر فوجیں بھیجنا آسان نہ تھا، بلکہ خود

مفتوحہ ممالک میں ذرا سی غفلت بغاوتیں کھڑی کر دیتی تھی اور عمال پر نظر رکھنا ایک اور مشکل کام ہو گیا تھا۔

اہل کوفہ کی کوشش

خلیفہ اور ان کے نیک نیت ناصح جس وقت آئندہ کا دستور العمل درست کرکے انجمن مشورت برخاست کر چکے تھے اور ہلکے دل سے اپنے اپنے عمل کی طرف واپس جا رہے تھے کہ اب یزید بن قیس نے اپنا موقع پایا، اور مالک اشتر وغیرہ کو ولایت شام سے طلب کیا، اور یہ لوگ رات دن مسافت طے کرتے ہوئے کوفہ میں داخل ہو گئے۔ کوفہ کی عام برافروختگی اس سے سمجھ میں آئے گی کہ بہت سے کار آزمودہ سپاہیوں کی ماتحتی میں فوراً بہت سے سپاہی مفید فوجی مقامات پر بھیجے جاسکے اور جرعہ فوجی مرکز قرار دیا گیا۔ یہ اشتر کی فوجی قابلیت، ہوشیاری، مستعدی اور کار آزمودگی تھی، عام حالت اس سے بھی سمجھ میں آئے گی کہ اگرچہ کوفہ میں حکومت کی طرف سے قعقاع بن عمر کا ایسا تجربہ کار اور بہادر سپاہی موجود تھا، لیکن اس نے بھی حکومت کے موجودہ قائم مقام عامل عمر بن حریث اسکونی کو صلاح دی کہ "سیلاب کو حالت جوشش میں" نہ روکے۔ سعید جس وقت سرداروں کی "معقول گرفت" کی صلاح صادر کرکے کوفہ واپس آرہا تھا، اور عذیب پہنچا اسے عبداللہ بن کنانہ کے تین سو سواروں کی فولادی صف سامنے دکھائی دی، جو یہ کہہ رہی تھی کہ: "اے دشمن خدا کہاں جاتا ہے، لوٹ جا جہاں سے آیا ہے۔ اب دوسری چیزوں کا کیا ذکر ہے تو فرات کا ایک قطرہ نہ پی سکے گا"۔ اور دردانگیز منظر تھا کہ لمبی شان والا سعید چھینکتا ہوا چلا کہ خلیفہ سے فریاد کرے کہ جس کی "معقول گرفت" اور "ہلاکت" کی ہم صلاح دے رہے تھے انھوں نے ہماری "معقول گرفت" کی اور ہمارے وقار کو "ہلاک کیا" اور اگر ہم اپنے کو حلم کا مجسمہ نہ دکھاتے تو ہلاکت دور نہ تھی۔ یہی نہ تھا۔ فریاد کرنے اور عرضداشتیں بھیجنے کا وقت گزر چکا تھا۔ دلیل منہ سے اب داہنے ہاتھ میں آگئی تھی، زبانی گفتگو کا موقع نہ رہا تھا۔ تلوار کے بولنے کا وقت تھا، اور اشتر کو اب حکم دینا تھا کہ: "جاؤ عثمان سے کہہ دو کہ ابو موسیٰ کو بھیج دے"۔ اور خلیفہ کو تعلق قائم رکھنے کے لیے راضی ہو جانا تھا۔ نہ اس کے قبل کہ وقار کو صدمہ پہنچ چکا، اور اس سے زیادہ قابل افسوس یہ ہے کہ یہ تمت نہ تھی۔

اب جو خط خلیفہ نے اہل کوفہ کو بھیجا اگر اس کا مفہوم یہ تھا کہ وہ لوگوں کی جرأت بازپرس پر شاندار حیرت صرف کر رہے تھے بغیر لوگوں کا حق قبول کیے ہوئے اور اس کی نصیحتیں کر رہے تھے کہ پس تم اطاعت کے سوا کوئی خیال ہی دل میں نہ لاؤ تو اہل کوفہ اپنے جواب میں خلیفہ کی بے رعایت نکتہ چینی کر رہے تھے اور اپنی پسند کے قابل امام کی تعریف کر رہے تھے اور اس امر کو قوت سے ظاہر کر رہے تھے کہ ہم اپنے خیال پر قائم ہیں، اگرچہ اس سے ہم میں اور تمھارے روابط میں شکستگی ہی کیوں نہ ہو جائے۔ وہ ایسے خود غرض، بے لحاظ اور ناشنو عامل نہیں چاہتے تھے جو حکومت کو اپنی خواہش کا پرتو دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ حکومت کی روش سے مشتبہ ہو گئے تھے کہ وہ ایسے لوگ بھیجتی ہے۔ جنھیں اس نے ہمارے ساتھ سب کچھ کرنے کا اختیار دیا ہے، لیکن ہمیں کسی اعتراض کرنے کا حق نہیں دیا ہے، بلکہ ہمارا اعتراض وہ کیسی ہی فریاد رسی اور داد خواہی کے لہجہ میں کیوں نہ ہو اس لیے ناگوار گزرتا ہے کہ ہم نے کیوں داد خواہی کے لیے اپنی صدا بلند کی۔ اور حکومت کو اپنے عاملوں پر یہ اعتبار تو ہے کہ وہ حکومت کے ساتھ فائدہ کے اشتراک کے لحاظ سے کوئی بدمعاملگی نہ کریں گے۔ لیکن اسے مطلق اس کی فکر نہیں ہے کہ وہ عام رعایا کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کریں گے اور ان کا برتاؤ قابل بازپرس

بھی ہے یا نہیں۔ بلکہ انھیں خیال تھا کہ خلیفہ اپنے عاملوں سے اس لیے باز پرس نہیں کرتے کہ مبادا وہ حکومت سے برافروختہ ہو کر اپنے کو اپنی جگہ آزاد اور خود مختار دیکھنا چاہیں اور اس لیے عمال کی ناخوشی پر انھوں نے رعایا کی ناخوشی کو گوارا کر لیا ہے۔ پھر بھی اہل کوفہ نے اپنی آواز سنانے کے بعد خاموشی سے حکومت کے ہر حکم کو اپنے اوپر گوارا کیا اور اس وقت تک مصمم عملی مخالفت کا ارادہ نہ کیا، جب تک وجوہات میں اضافہ نہ ہوتا گیا، اور انھیں یہ یقین نہ آ گیا کہ موجود نظام حکومت سے کسی اصلاح کی امید کرنا اپنے کو تباہ کرتے جانا ہے۔

وہ ضرور ہوتا جو کچھ ہوا

کیا یہ ممکن تھا کہ ایسا نہ ہوتا جیسا ہوا۔ نہیں۔ ضرور ہوتا۔ وہ حوصلہ خیز مصلحت جو رسولؐ کے بعد ایجاد ہوئی تھی اس کا اور کوئی نتیجہ نہ ہوتا بجز اس کے جو کچھ ہوا، کچھ عثمان ہی کے ساتھ موقوف نہ تھا۔ کوئی دوسرا ان کی جگہ ہوتا یا خلیفہ ثانی کو کچھ اور زمانہ ملتا جس میں انھیں دم لینا پڑتا، میں سمجھتا ہوں کہ خلیفہ ثانی کے زمانہ میں ایرانی سلسلہ کوہ کے سرحد قرار دیے جانے اور صلح کے بعد فارس پر دوبارہ فوج کشی کیسی ہی وجوہات پر کیوں نہ مبنی ہو لیکن سپاہیوں کو مشغول رکھنے کی ضرورت نے دوبارہ فوج کشی کے تصفیہ پر قوی اثر ڈالا ہوگا۔ اس ناگوار نتیجہ کے جلد واقع ہونے میں ضرور حضرت عثمان کی کمی احتیاط نے جلدی کی۔ جو کچھ ممکن تھا وہ یہی تھا کہ نتیجہ آئندہ کے لیے ٹالا جاتا۔ اس کے لیے ابن ابو قحافہ یا ابن الخطاب چاہیے تھے۔

بنی ہاشم کی پامالی کے بعد بنی اُمیہ کا صاحبِ اختیار نہ ہونا ممکن نہ تھا

ضمناً میں یہ بھی سوچنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ ممکن تھا کہ بنی ہاشم کے حقوق اور تقدس کی طرف سے تجاہل اور ان کے اختیارات کی پامالی کے بعد بنی امیہ صاحب اختیار نہ ہوتے۔ نہیں۔ اس لیے کہ اگر عرب کی جماعت سے بنی ہاشم نکال دیے جاتے تو بنی امیہ کو ثروت اور عدد کی جو مدد ملتی اور ان کے جاہلیت کے اثر کی یاد جس قدر معین ہوتی وہ دوسرے کو حاصل نہ تھی۔ ابوبکر یا عمر اپنے اپنے لڑکوں کو خلیفہ منتخب نہیں کر سکتے تھے۔ نہ کر سکنا ان کے اس ہوش پر مبنی تھا کہ بنو تیم اور بنی عدی کی وقعت ایسی نہیں ہے کہ ہمارے لڑکوں کے مدد کے لیے صرف خلیفہ کا لڑکا ہونا کافی ہو۔ اور لوگ اور بہت سے اعتراض لے کر کھڑے ہو جائیں، در آنحالیکہ ان لڑکوں کے پاس نہ خلیفہ ہو جانے کے وہ اتفاقات ہوں اور نہ دلائل ہوں جو ہمارے لیے لائے جا سکتے تھے۔ جیسا خود سعید کے ایک سوال پر کہ ابن عثمان کو خلیفہ بناؤ زبیر نے اپنے حوصلوں کے زمانہ میں بقول ابن خلدون جواب دیا کہ: "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اکابر و شیوخ مہاجرین کو چھوڑ کر ان لڑکوں کو حاکم بنائیں"۔ نہ حضرت ابوبکر حضرت عمر کی موجودگی سے چشم پوشی کر سکتے تھے اور نہ علیٰ ہذا القیاس حضرت عمر اپنے گرد و پیش کے واقعات سے غافل تھے۔ اس لیے انھیں (اولاد کو) نہ صرف ان قیاسات کے حوالہ کرنا تھا کہ ان کی مخالفت ہو بلکہ انھیں اس لحاظ سے بھی محروم کر دینا تھا جو اس سے پیدا ہوتا کہ خلفا نے اپنے اعزا کو اپنا جانشین نہیں کیا، اگرچہ کسی کی دانست میں محض "ممکن ہو"۔ بہت سی باتیں ممکن ہیں لیکن سب قابل عمل نہیں ہیں۔ اور نہ خلفا کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ بنی امیہ کو علیحدہ رکھتے جس طرح بنی ہاشم کو علیحدہ رکھا تھا۔ ایسا کرنا ان دو زبردست گروہ کو ایک کر دینا ہوتا۔ بلکہ دیکھا یہ گیا کہ عملاً ایسا موقع آتے ہی ایک جو قبضہ میں کیا جا سکتا تھا یعنی بنی امیہ کا گروہ خرید ا گیا، اور خواہی نخواہی قوی ہوتا گیا۔

انگوٹھی کا گرنا تخت سے گرنا تھا

جہاں یہ سب ہو رہا تھا عقیدت کے لحاظ سے عامہ ناس میں خلیفہ کی طرف سے ایک اور توحش پیدا ہوا۔ اور وہ یہ تھا کہ کہا جاتا ہے کہ جس انگوٹھی سے جناب رسالت مآبؐ اپنے فرامین پر مہر فرماتے تھے اور جو غالباً اپنے اعلان نیابت کے لیے خلفا نے اپنے قبضہ میں رکھنا مذہبی پہلو سے مفید سمجھا تھا، عثمان کے ہاتھ سے گر گئی۔ انگوٹھی کا گرنا ان کا تخت سے گرنا، یا لوگوں کے قلب سے گرنا تصور کیا گیا۔ چاہ عریش نہ کچھ زیادہ گہرا تھا، اور نہ پانی تھا۔ خاک چھانی گئی لیکن انگوٹھی کہیں نہ تھی۔

ایک حیرت خیز نشو

ان واقعات میں کسی قدر حیرت خیز صورت ایک یہ بھی تھی کہ لوگوں کی توجہ جناب امیر کی طرف مائل ہوتی اور اکثر موقع پر صرف انھیں کو مداخلت یا وساطت کا شایان سمجھتے۔

لوگ کیوں علیؑ کے پاس جاتے تھے

ان واقعات میں یہ دیکھنا ہے کہ ایسے موقع پر جب کہ لوگوں کو حکومت سے کوئی اذیت پہنچتی تھی وہ کیوں علیؑ کو ڈھونڈتے تھے۔ کیا اس لیے کہ ایک غم زدہ دوسرے درد رسیدہ کو ہمدردی کے لیے تلاش کرتا ہے۔ کیا لوگوں کی توجہ اس کی نتیجی ہے کہ سیاسی بے چینیوں سے قطع نظر کر کے علیؑ کی وقعت عامہ ناس کی نگاہوں میں کبھی کم نہیں ہوئی تھی، اور وہ ایک مشکل وقت جب انھیں کسی اور سے تسکین نہ ہو علیؑ کو تلاش کرتے تھے۔ کیا اس لیے کہ زمانہ گزرا تھا جس میں پیش پیش لوگ اپنے خیالات اور معاملت کے لحاظ سے اس طرح سمجھ میں آ گئے تھے کہ وہ اخلاقی اعتبار کے مرکز نہ ہو سکتے اور ان شور انگیز وقتوں نے علیؑ کو موقع دیا تھا کہ وہ اپنے کو اپنی حقیقی شان سے دکھاتے اور ان کی خوبیاں دلوں میں گہری جڑ پکڑتیں اور وہ لوگوں کی آخری امید ہوتے۔ اور ہم لوگ یہ دیکھتے کہ ایسے نازک وقتوں میں جب کہ اعتبار ایک نہایت مفید شے ہوتی ہے اور جس کے بغیر کسی بڑے معاملہ کی ابتدا ہی نہیں ہو سکتی، بغیر کسی سفارش یا نمائش کے لوگوں کو کوئی ذات ہی نہیں دکھائی دیتی۔ علیؑ کی ذات کے سوا جو اعتبار اور اطمینان دلا سکے۔

خلق اللہ کے میلان سے حکومت بھی علیؑ کی وساطت چاہتی تھی

معاملت کی یہ صورت اسی طرح تمام نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے عکس میں ایک اور پرتو اختیار کرتی ہے۔ یعنی پہلی صورت تو یہ تھی کہ لوگوں کو حکومت سے معاملہ تھا، اور وہ لوگوں کی کم قوتی ہو، انصاف پسندانہ خواہش اصلاح ہو، یا محض خاموشی سے شکایت ہو کہ انھیں ایک پنچ کی ضرورت تھی لیکن واقعات کا نشو اس طرح بھی ہونے والا تھا کہ حکومت بھی علیؑ کی وساطت پر مجبور ہوتی۔ وہ حکومت کی کمزوری ہو، یہ سمجھ کر ہو کہ اعضائے حکومت اس قدر مرفوع الاعتبار ہو گئے ہیں کہ اب ان سے کوئی کام لینا لوگوں کو اور جوش دلانا ہے۔ یا اس لیے ہو کہ علیؑ (یا وہ ذات جس پر لوگوں کو اطمینان تھا) کو درمیان میں لا کر وقت حاصل کیا جائے۔ اور لوگ علیؑ کی وساطت کو بھی غیر مفید سمجھ کر حکومت کے ساتھ علیؑ سے بھی ناخوش ہوں۔

علیؑ نے کب تک اس نازک دھرے منصب سے براءت کا اعلان نہیں کیا

دکھایا جائے گا کہ آخری موقع کو علیؑ سمجھ چکے تھے اور اس اخلاقی حد سے آگے نہ بڑھے جس سے فریقین کے تصفیہ کی امید ہو سکتی تھی۔ اور جب یہ امید منقطع ہو گئی تو اپنے پنچ کے منصبؑ سے استعفا دیدیا۔

غالباً پہلا موقع وہ تھا کہ بنی مخزوم نے عمار کے ساتھ تشدد کی علیؑ سے شکایت کی اور انھوں نے جا کر سمجھایا۔ اس کے بعد اگرچہ کسی نہ کسی طرح عمار اور عثمان میں التوائے جنگ کی حالت پیدا ہو گئی۔ لیکن ابوذر کی رحلت کی خبر سن کر جب خلیفہ نے "رحمہ اللہ" کہا، اور عمار نے پوچھا کہ کیا یہ دل سے کہا ہے؟ تو اس پر عثمان نے جواب دیا کہ: "کیا تجھے شک ہے کہ میں نے جو نکال دیا تو اب شرمندہ ہوں"۔ عمار نے جواب دیا: "واللہ نہیں!"۔ اس پر عثمان نے انھیں بھی نکال دینے کا حکم دیا، تو پھر بنی مخزوم علیؑ کے پاس شکایت لائے اور جناب امیر نے دوبارہ عثمان سے فرمایا کہ: "ابوذر کے واقعہ سے لوگ ناخوش ہیں اور عمار کے لیے بھی جو حکم دیا گیا ہے وہ "مناسب نہیں ہے"۔ اس پر جواب ملا کہ: "پہلے تمھیں شہر بدر کرنا چاہیے"۔ یہی مجمع تھا جن میں مغیرہ بن اخنس ثقفی ان لفظوں میں علیؑ کی تائید کرتا کہ: "رسُول کی خدمت میں جو تیرا مرتبہ ہے وہ کسی کا نہیں ہے"۔ اور مغیرہ بن شعبہ کہتا کہ: "تم چاہو یا نہ چاہو تمھیں محکوم رہنا ہوگا"۔

آگ اس قوت سے نہیں لگی تھی کہ وہ ایک چھینٹے اسے بجھا سکتے یا بجھی درانحالیکہ بجھانے کی مناسب کوشش ہی نہ کی جاتی۔ اس وقت تک "چاروں طرف علانیہ طعن و تشنیع کا بازار گرم ہو گیا۔ روزانہ اس کی متواتر خبریں مدینہ میں پہنچنے لگیں اور مدینہ میں بھی لوگوں میں سرگوشیاں شروع ہو گئیں"۔ اب پھر علیؑ تھے اور لوگ تھے جو علیؑ سے کہتے تھے کہ ہماری شکایتیں خلیفہ سے کہہ دیجیے اور اصلاح کرا دیجیے۔

علیؑ کی حیثیتیں

موقع کی صریح صورت یہ ہے کہ جناب امیر کی آنکھ واقعات کو دیکھ رہی ہے اور عثمان کو سمجھا رہی ہے۔ علیؑ کے لحن اور الفاظ پر غور کرو کہ آیا اس سے زیادہ شریفانہ متانت ایک ایسے شخص سے ممکن ہے جس کا حکومت کے نزدیک اپنے حق کے لحاظ سے نہایت ہی نازک موقع رہا۔ پھر بھی وہ اس وقت جماعت کے ایک فرد، ایک گروہ کی زبان، اپنے علم اور اپنے یقین کے لحاظ سے ناصح کی حیثیت سے آیا ہے۔ اور معلوم نہیں ہوتا کہ سطح سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی لہر بلند ہو رہی ہے جس میں ناگوار نغمہ ہو، بلکہ وہ اس وقت انسانی "حق" کے وکیل تھے اور اپنا "فرض" ادا کر رہے تھے۔

شاید جناب امیر کے یہ الفاظ کہ: "اپنے بابت غور کرو" یا یہ چبھتی ہوئی جھنجوڑ کہ: "تم بے بصیرتی سے نہیں دیکھتے اور نہ تم جہالت سے کچھ نہیں جانتے"۔ یا فرمانا کہ: "راستہ واضح ظاہر اور اعلام دین قائم ہیں"۔ بعض کے نزدیک محض استعارہ ہو۔ اگر کسی کی دانست میں یہ صورت ہو تو آگے چل کر یہ فقرہ استعارہ کی سرحد سے نکل کر صراحت کی صورت اختیار کرتا ہے کہ: "میں تم کو اس سے ڈراتا ہوں کہ تم اس امت کے امام مقتول ہو"۔ اور اس کا ایک نتیجہ یہ ہو کہ: "قتل و قتال کا دروازہ قیامت تک کھل جائے"۔ جس سے "واقعات ملتبس اور مشتبہ ہو جائیں گے"۔ اور لوگ "حق کو بوجہ علوے باطل نہ دیکھ سکیں گے"۔ اور اضطراب و اختلال اس میں پیدا ہوں گے"۔ امت کی بدنصیبی سے جناب امیر کے یہ الفاظ ایسے سچ ہوئے کہ گویا وہ جناب آئندہ کو اس طرح دیکھ رہے تھے کہ اس نے صورت اختیار کر لی تھی جس کا تذکرہ ہمارے آئندہ باب میں کیا جائے گا۔

کسی وقت بھی خلیفہ نے اپنے افعال پر نظر ثانی نہ کی

اگر کوئی اور دلیل نہیں بھی لائی جا سکتی تھی تو غالباً امت رسُولؐ میں

"واقعات کے ملتبس اور مشتبہ ہو جانے سے" قتل و قتال اور اضطراب و اختلال پیدا نہ ہونے کا واسطہ ایسا تھا جس کے لحاظ سے خلیفہ کو اپنے روش پر نظر ثانی کی ضرورت تھی۔ لیکن ایسا ہونے والا نہ تھا۔

سوچو اگر تم سوچ سکتے ہو کہ خلیفہ کو اپنی روش پر اصرار کے علاوہ کچھ اور بھاتا تھا جب کہ علیؑ کی وکالت کے تمام ہونے پر وہ منبر پر گئے۔ آج فصاحت ان کا ساتھ دے رہی تھی اور وہ داد خواہوں سے کہہ رہے تھے کہ: "تم لوگ میری نرمی اور الطاف کی وجہ سے جری ہو گئے ہو"۔ "تم لوگ اپنے خیالات تبدیل کر دو...... اور اپنے کاموں کو اپنے امرا پر چھوڑ دو۔ جن کو میں نے مامور کیا ہے"۔

پہلا موقع جس سے معاویہ کا حوصلہ خلافت ظاہر ہوا

ان واقعات میں مدبر معاویہ کو بھی دہرے وار کرنے کا موقع ملا۔ جن میں سے ایک تو یہ تھا جو علی، طلحہ اور زبیر کے سامنے آزمایا گیا کہ: "تم لوگوں نے اس امر میں کچھ فیصلہ کیا ہے تو میں موجود ہوں"۔ اس سے یا تو یہ غرض تھی کہ یہ لوگ ٹٹولے جائیں کہ آیا ان میں عثمان کو معزول کرنے کا کوئی تصفیہ ہوا ہے یا نہیں، اور اگر ہوا ہو، اور یہ لوگ آئندہ کے لیے کوئی دستور العمل مرتب کر چکے ہوں تو اپنی رضامندی ظاہر کر کے اس کے ایک معقد حصہ دار بن جائیں۔ اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ ایسا ہی خیال کعب الاحبار کے سامنے معاویہ نے ظاہر کیا تھا کہ: "اگر مجھے معلوم ہو تا کہ عثمان کے بعد کون خلیفہ ہو گا تو میں اس کی بیعت کرتا"۔ چلتے چلاتے عثمان سے بھی ایک بات کہہ لی کہ: "اس سے پہلے کہ آپ پر حملہ ہو جس کا آپ تحمل نہ کر سکیں، مناسب ہو گا کہ آپ میرے ساتھ شام چلے چلیں۔ کیونکہ کل اہل شام میرے مطیع ہیں"۔ اس فقرہ میں خوش خلقی اور محبت یا احسان کی تحریر واضح سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن میرے خیال میں آج پہلا موقع تھا جس میں معاویہ کا آئندہ خلیفہ بن جانے کا حوصلہ ظاہر ہوا۔ وہ خلیفہ کو نہ صرف بھلے یا برے ہوا خواہوں نے اثر سے نکال رہا تھا، بلکہ انھیں شام میں خلیفہ دکھا کر تمام اختیارات اور اثر پر خود قابض ہو جانا چاہتا تھا۔ اور اس کے بعد خلیفہ کے رحلت پر مطیع اہل شام کے سامنے اپنے کو خلیفہ کہنا کچھ مشکل نہ تھا۔

یہ مصلحت حضرت عمر اور ابن عوف کی مصلحت سے قطعاً مشابہ تھی صرف اتفاقات کی قوت کا فرق تھا۔ یعنی معاویہ وہاں خلیفہ کو قائم رکھنا چاہتا تھا جہاں وہ حاکم بھی تھا، اور اسے آئندہ کے لیے نہ صرف احسان بلکہ اپنی قوت سے بھی امید تھی۔ لیکن یہ آخر موقع تھا کہ معاویہ عثمان کی حیات میں مدد کا وعدہ کرتا، اس لیے کہ خلیفہ کے آخری وقت ان کے اِستغاثہ مدد کو یہ جواب پانا تھا کہ: "خدا نے جس سے کوئی نعمت چھین لی ہو میں اسے واپس نہیں کر سکتا!"۔ اور بقول جناب امیر کے معاویہ وہاں ابن عفان کی مدد کرتا تھا جہاں اسے اپنے نفع کی امید تھی۔

آخری وقت قریب آتا جا رہا تھا، اور اہل مصر کے ابن سرح کی شکایت پر جب عامل کے نام خلیفہ نے تہدیدی خط روانہ کیا تو عامل مصر نے بجائے اس کے کہ کوئی اصلاح کرتا اس شخص ہی کو رفع کر دیا جو خط لایا تھا، اور جس جماعت کی طرف سے شکایت کی گئی تھی اس کی بازپرس شروع کی۔ اب بقول ابن عمر مصر سے سات سو آدمی آئے اور اوقات نماز میں صحاب رسول سے مسجد میں جا کر شکایت کی۔ طلحہ نے عثمان کو "سخت" باتیں کہیں۔ خود حضرت عائشہ نے بھی ابن ابی سرح کو معزول کرنے کے لیے کہلوایا، اور جناب امیرؑ نے بھی ایسا ہی فرمایا۔

اب خلیفہ نے لوگوں کی خواہش سے محمد بن ابی بکر کو مصر کا عامل مقرر کرنا منظور کیا۔ لوگ روانہ ہوئے اور کچھ مہاجر و انصار بھی صورت معاملہ دیکھنے کے لیے ساتھ چلے۔ مدینہ سے ابھی تین دن کا راستہ طے کیا تھا کہ ایک حبشی غلام دکھائی دیا، جو "کسی کو ڈھونڈتا تھا، یا کسی سے بھاگتا تھا"۔ اسے روکا تو اس نے اپنے کو کبھی عثمان اور کبھی مروان کا غلام بتایا۔ لیکن جو بات اس نے لوگوں کے توجہ کے قابل کہی وہ یہ تھی کہ ہم "مصر کے عامل کے پاس جاتے ہیں"۔ لوگوں کا استعجاب اس سے اور بڑھ گیا، اور انھوں نے کہا کہ چلو عامل مصر کے پاس لے چلیں، وہ تو یہیں ہیں۔ تو اس نے کہا کہ نہیں "عامل اول" سے کام ہے۔ شبہ ہوا، تلاشی لی گئی اور مُہلک خط برآمد ہوا۔ جو عامہ ناس کے سامنے پڑھا گیا۔

خط گرفتار کرنے والوں کی احتیاط

آسان تھا کہ یہ خط خلیفہ کے سامنے پیش ہوتا، اور حکومت اس سے انکار کر جاتی، اس لیے اس پر حاضرین کی دستخط یا مہر کرائی گئی، اور ایک مُعتمد کے پاس حفاظت سے رکھا گیا۔ یہ لوگ الٹے پاؤں مدینہ واپس گئے۔ ابھی بعض مقامات کے داد خواہ وفود واپس بھی نہ گئے تھے کہ انھیں یہ حقیقت معلوم ہوئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ: "اہل مدینہ میں کوئی نہ رہا جو عثمان سے دل تنگ اور غصہ نہ ہوا ہو"۔

لوگ رفع نزاع چاہتے تھے

پھر بھی خلیفہ کے خلاف کوئی سخت کارروائی اختیار نہ کی گئی۔ بلکہ اس کے پہلے لوگوں نے تصدیق اور رفع حجت چاہی۔ اور عثمان نے اس کا اقرار کیا کہ: "اونٹ، مہر اور غلام ہمارا ہے"۔ لیکن مضمونِ خط سے انکار کیا۔ اس کے بعد بھی لوگ مان لینے پر آمادہ تھے، بشرطیکہ عثمان اپنے سیکرٹری کو حوالہ کر دیں جس کے علاوہ کوئی تیسرا یہ مضمون نہیں لکھ سکتا تھا۔ لیکن عثمان نے مروان کو حوالہ کرنے سے انکار کیا۔ مشکل سے یہ موقع سمجھنے کے قابل ہے۔

مروان کی حفاظت کے معنی

ایسے موقع پر یا تو عثمان اس لیے حوالہ کرنے سے انکار کر سکتے تھے کہ مروان نے جو کچھ لکھا تھا وہ ان کے ایما سے لکھا تھا، اور اگر اپنے موقع کے بچانے کے لیے خلیفہ نے انکار کر کے مروان پر عکس ڈالا تھا تو اس کا بچا لینا بھی ان کا فرض تھا۔ اور یا اس لیے بچا سکتے تھے کہ اگرچہ انھیں علم نہ تھا کہ کیا لکھا گیا ہے لیکن معلوم ہونے پر اس کے بچا لینے کی کوشش سے یہ سمجھایا کہ جو کچھ اس نے کیا، اسے ہم پسند کرتے ہیں۔ جس کی مثال پیشتر گزر چکی تھی کہ خلیفہ اول کے عہد کو جب ابن الخطاب چاک کر ڈالتے تو ابوبکر ان کے اس فعل سے کوئی اظہار ناراضی نہیں کرتے، بلکہ اسے اپنی طاعت کے شایان سمجھتے ہیں۔

کسی فرد قومی کی حفاظت کے لحاظ سے حضرت عثمان نے مروان کا بچا لینا کیسا ہی ضروری کیوں نہ سمجھا ہو۔ لیکن اگر وہ اس پر راضی تھے کہ ان کا مکار سیکرٹری بے گناہوں کو قتل اور حبس کرا دیتا۔ اگر اس کی چل جاتی تو انھیں اب اس پر راضی ہو جانا تھا کہ سلطنت کا اعتبار قائم رکھنے کے لیے ان کا یہ مخدوش دوست قربان کرا دیا جائے۔ ایسے پرجوش موقع پر اسے بچا کر اپنا اعتبار کھوتا تھا۔ اور ایسا کرنا اپنے نظام سیاست کو شکستگی اور جلتی ہوئی آگ کے حوالہ کرنا تھا۔ میں اس پر نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ بحیثیت خلیفہ رسول کے ان کا یہ فعل کس نگاہ سے دیکھے جانے کے قابل تھا۔ ابن خلدون احتیاط کرتا ہے کہ ان طرز عمل کے تذکرہ کے وقت بھی نام کے ساتھ "امیر المومنین" کا لفظ چھوٹنے نہ پائے اگرچہ وہ یہ بھی

دیکھ رہا ہو کہ مہاجر و انصار گھر سے باہر نہیں نکلتے اور اہل مصر کوفہ اور بصرہ نہ خود خلیفہ کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں نہ دوسرے کو پڑھنے دیتے ہیں!۔

جنگی تیاری

کوئی حیرت کی بات نہیں ہے اگر ایسے وقت میں خلیفہ نے بقول ابن خلدون: "والیان ممالک اسلامیہ کے نام متعدد فرامین بھیجے اور انھیں واقعات سے مطلع کیا"۔ کیا غرض ہو سکتی تھی ان فرامین کی بجز اس کے کہ اپنے کو اپنی جگہ قائم رکھنے کے لیے فوجی امداد طلب کی جاتی کہ شکایت کرنے والوں کا نہ گلا رہے نہ آواز رہے۔ اور حقیقتاً فوجیں روانہ بھی ہوئیں لیکن قضا و قدر نے انھیں وقت پر نہ پہنچایا اور اسی زمانہ میں خلیفہ نے عبداللہ بن عمر کی یہ یادگار صلاح بھی پسند کی کہ "یہ طریقہ جاری نہ کرو کہ جس وقت جماعت خلیفہ سے راضی نہ ہو اسے معزول کردے"۔ اور اس کا یقین دلایا کہ جماعت کی ضرورت اور عصمت محض نصب تک تھی۔ میں نہیں جانتا کہ علامہ ابن حجر اس موقع پر کیا فرماتے۔ اور اس فقرہ میں عصمت دیکھتے یا نہ دیکھتے کہ: "تم جھوٹے ہو یا سچے ہو اور بہر تقدیر تم سے خلافت لے لینا مناسب ہے۔ کیونکہ جھوٹے کو مسلمانوں کا والی بنانا جائز نہیں اور اگر سچے ہو تو تمھارا ضعف اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ تمھارے بغیر اجازت و اطلاع جس کا جو جی چاہتا ہے کرتا ہے"۔ اور اس کے بعد نہیں معلوم مولوی شبلی صاحب اپنے "حاکمانہ لیاقت" والے فقرہ میں عدد کے لحاظ سے کوئی ترمیم مناسب تصور فرمائیں گے یا نہیں جس کو انھوں نے (حضرت عمر کے چھ منتخب لوگوں میں جن میں عثمان بھی تھے) حضرت عثمان کے لیے بھی استعمال فرمایا ہے۔ اگر "جس کی چل گئی" کا فلسفہ سیاست درست ہے تو کیسے اس سیاسی اخلاق کے بنا پر ان لوگوں پر کوئی اعتراض کرے گا جنھوں نے خلیفہ کو محصور کر لیا؟ درانحالیکہ ان کے افسروں کو اس کا اندیشہ تھا کہ اگر خلیفہ یا ان کے مویدین کی چل گئی ہوتی تو ہم کو یا تو ملک الموت کے جلد آنے کی دعا مانگنی ہوتی اور یا ابن بلائے ہیں مجبوراً ان کا استقبال کرنا ہوتا۔ اور اب بھی وہ اندیشہ رفع نہ ہوا تھا، جیسا طلحہ کی زبان نے بتایا کہ: "عثمان را سخت گیرید کہ فوج او نزدیک آمد"۔

ان تمام امورات کے برداشت کے بعد بھی جو علیؑ پر گزر چکے تھے اور اس فرمانے کے بعد بھی کہ: "قسم خدا کی میں نے محاصرہ کو اس سے دفع کیا حتی کہ اب مجھے گنہگار ہونے کا خوف ہے"۔ وہ فریقین کی اصلاح کے لیے آمادہ تھے صرف اس کی ضرورت ان کی نگاہ میں تھی کہ: "مجھے عہد کرو کہ جو کچھ تم کہتے ہو اس پر وفا کرو گے؟"۔ کیونکہ بغیر کسی ایسے اطمینان کے ان کے پاس جانا بے سود تھا۔ جو اس لیے "نہیں چھوڑ سکتے" تھے کہ: "مبادا سال آئندہ اور فتنہ و فساد برپا نہ ہو"۔ اور جو ان تینوں باتوں میں سے کسی ایک پر ارادے مصمم کر چکے تھے کہ: "خلع، موقوفی عمال، یا قتل"۔ عثمان جب خلیفہ ہو جانے کے لیے تمام شرائط قبول کر سکتے تھے جو عائد کی جاتی تو لذت حکومت حاصل ہونے کے بعد کیا کچھ اقرار نہیں کر سکتے تھے۔ اگر اس کا شدید تزلزل مائل بہ سکون ہو جائے لیکن وہ مداخلت جس کے لیے علیؑ بغیر اکراہ آمادہ نہ ہوئے تھے اور جس کے بغیر ایسا بڑا نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا کہ ایسے مصمم لوگ جو گویا اپنے قتل کے فریب کا انتقام لینا چاہتے تھے ہتھیار روک رکھتے۔ ان کا اپنے جوش کو حکومت کے بار بار عہد شکنی کے بعد بھی اصلاح کی امید پر روک لینا بے انتہا تعریف کا مستحق تھا۔ اب اس تمام کوشش کا یہ تاسف خیز مذاق تھا کہ "امیرالمومنین عثمان نے کسی وجہ سے کسی قسم کا تغیر و تبدل نہ کیا"۔ یا ایک مرتبہ معذرت اور اصلاح کا وعدہ کرنے کے بعد پھر منبر پر بیٹھ کر انکار کرتے اور لوگ پکار اٹھتے کہ:

"خدا سے ڈرو اور توبہ کرو"۔ یا جب کسی وعدہ کے بعد لوگ خوش خوش رخصت ہونے کے لیے آتے تو سیکرٹری کو "درشتی" کی ہدایت ہوتی اور وہ لوگوں سے کہتا کہ: "تم لوگ ہمارے قبضہ سے ہمارے ملک کو چھیننے آئے ہو"۔ اس طنز پر بھی تسکین نہ ہوتی اور رجعام بن سلیمان بن داؤد کے لہجہ میں جس کی "چھنگلیا اپنی باپ کی کمر سے زیادہ دلدار تھی" مروان جواب دیتا کہ: "اگر تم نے کسی قسم کا قصد کیا تو ہم تم پر ایسا بوجھ ڈالیں گے کہ جس کو تم اٹھا نہ سکو گے"۔ اور غرہ یہ ہوتا کہ: "جو ہمارے قبضہ میں ہے اس میں ہم تم سے مغلوب نہیں ہیں"۔

حالت اب ایسی پہنچ گئی تھی کہ جناب امیر خلیفہ کے پاس جا کر کہہ دیتے کہ: "آج سے اب میں پھر تمہارے پاس نہ آؤں گا"۔ کب تک علیؑ مداخلت کرتے رہے اور اپنے کو اس مخدوش شبہ میں مبتلا کرتے کہ وہ تنہا شخص جس کا اب تک تمام فریق اعتبار کرتے رہتے کہیں حکومت کے امورات میں شریک تو نہیں ہے اور ان افعال کو پسندیدگی سے تو نہیں دیکھتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ "اب گنہگار ہونے کا خوف تھا"۔ یعنی حکومت کے افعال بہ تکرار صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے ثابت ہو چکے تھے اور اب مصلحانہ مداخلت کے معنی یہ تھے کہ ایسے ہی افعال کے صدور کے لیے دوبارہ وقت اور موقع دیا جائے۔

خلیفہ کا سیاسی مجموعہ

کیا یقین تھا کہ آئندہ ایسے ہی امور پھر سرزد نہ ہوں گے۔ اس لیے کہ خلیفہ کے سیاسی مجموعہ میں لوگوں کے حقوق کا کہیں موقع نہ تھا۔ بلکہ اگر انھیں علیؑ سے بھی کچھ کہنا تھا تو یہ کہ: "اگر جاہلیت ہی کا زمانہ ہوتا تو بھی بنی عبد مناف کے لیے یہ امر باعث ننگ تھا کہ بنی تیم ان کے قبضہ سے حکومت چھینے"۔ میں ان تمام لوگوں کو جو سقیفہ بنی ساعدہ کے مجمع کو اسلام کے جمہوریت کی شرح سمجھتے ہوں، اس سمجھنے کے لیے اپنی مدد کو بلاتا ہوں کہ وہ اس میں جمہوریت تلاش کریں۔ افسوس میں کہاں کہاں دکھاؤں کہ جمہوریت شعبدہ باز کا وہ کھلونا تھا جو دیکھتے دیکھتے اپنی صورت بدل دیتا ہے۔ ابن ابوقحافہ کو بمقابلہ انصار نہ قریش یا مہاجرین کی افضلیت کے ادعا کا حق تھا نہ ابن الخطاب یہ کہہ سکتے تھے کہ: "قبیلہ زہرہ کو خلافت و حکمرانی سے کوئی نسبت نہیں"۔ نہ عثمان کے پاس بجز اس کے کوئی دوسری وجہ بمقابلہ بنی تیم بنی عبد مناف کے "ننگ" کی ہو سکتی تھی کہ وہ خود بنی عبد مناف میں واقع ہوتے تھے۔ نہ یہ بنی عبد مناف کی حاکمانہ قابلیت کی تعریف کا موقع تھا جس کی غرض استغاثہ مدد یا خودستائی بھی جاتی حقیقتاً بنی عبد مناف کی تعریف نہ ہوتی۔

توبہ

اور وہ تمام لوگ جو نفس انسانی کے اس نادمانہ انقلاب کو جسے توبہ کہتے ہیں اصلاح کا پہلا زینہ سمجھتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے بعد جو اب تک ہو چکی تھیں خلیفہ کے اس فقرہ کو غور سے پڑھیں جو طلحہ کے سامنے کہا گیا کہ: "میں تائب نہیں ہوا لیکن مغلوب ہوا ہوں" کہ آیا اس پر اصلاح کا کوئی شوب پڑا ہے بلکہ اپنے فعل پر اصرار کے لیے اس سے زیادہ قوت سے کچھ کہنا ممکن نہ تھا۔

رحم

یہ سب کچھ تھا لیکن ابھی انسانیت کا حق باقی تھا۔ انصاف اور فیصلہ دوسری چیز ہے اور ایسا رحم جو فیصلہ پر اثر نہ ڈال سکے دوسری چیز ہے۔ یہ کہنا ہمارا کام نہیں ہے کہ اگر مصلحین ایک طرف اور خلیفہ دوسرے فریق ہو کر علیؑ سے ان کے مقدمہ کے فیصلہ کی خواہش کرتے تو وہ کیا تجویز سناتے۔ اس وقت خلیفہ نے پانی طلب کیا تھا۔

علیؑ نے اپنے آدمیوں سے سمجھا دیا، بلکہ محاصرہ کرنے والوں کو بھی اس "حق بشری" سے منع نہ کرنے کی نصیحت کی۔ نائلہ نے غلطی نہ کی تھی اگر اپنے خلیفہ شوہر کو علیؑ کے مشورہ پر عمل کرنے کی صلاح دی تھی۔ خلیفہ اگر مردوں کے سیاسی حقوق قبول نہ کرتے تھے تو عورتوں کے ایسے حقوق کا تسلیم کرنا ان سے صدیوں دور تھا۔

بہ استثنا علیؑ کے عثمانؓ کی کوئی مدد نہیں کرتا تھا

ان چھ آدمیوں میں جو خلافت کے لیے نامزد کیے گئے تھے چار آدمی خلیفہ کے مخالف ہوگئے تھے۔ ابن عوف کی ناخوشی زیادہ تر اپنی انتخاب کی ذمہ داری پر مبنی تھی۔ سعد بن ابی وقاص کے ساتھ بھی ذاتی وجہ تھی اور طلحہ و زبیر نے عام جوش و خروش دیکھ کر تیار چیز میں شرکت نہ کرنا موقع بینی کی مصلحت کے خلاف سمجھا جس میں طلحہ کو خلیفہ بھی اچھی طرح سمجھ گئے۔ کبھی کہا کہ: "اللہ تعالیٰ تم کو اے طلحہ کافی ہو"۔ اور کبھی کہا کہ: "یہ سب تمھارا کیا ہوا ہے"۔ اور کبھی افسوس ظاہر کیا کہ "طلحہ، زبیر اور سعد مجمع میں ہوں اور ہمارے سلام کا جواب نہ دیں"۔

اس وقت علیؑ کی ذات نے کیا کیا

عبداللہ بن عمر کا قریبی نازک رشتہ کی وجہ سے کسی مخالفت پر آمادہ نہ ہونا زیادہ قابل تعریف نہ تھا۔ اگرچہ ہم اس میں متردد ہیں کہ انھوں نے خلیفہ کو عزل منظور نہ کرنے کی صلاح دے کر کہاں تک شدنی امر کے واقع ہونے میں مدد دی اور کہاں تک صلاح دینے کی ذمہ داری محسوس کی۔ اب علیؑ رہ جاتے ہیں اور اپنے اس تمام زمانہ کے افعال میں سخت سے سخت جارح کو چیلنج دیتے ہیں کہ وہ امور مسلمین میں کسی بے عنوانی کے باعث ہونے کے اشارہ بھی تلاش کر سکے۔ کیا ان کی یہ روش اس لیے تھی کہ حکومت نے ان کے ساتھ احسان اور نرمی کا برتاؤ جائز رکھا تھا؟

افسوس زمانہ جانتا ہے کہ رسولؐ کے بعد سے اس وقت تک وہ کس طرح کے برتاؤ کے شکار تھے۔ لیکن وہ اس سے نہایت بلند تھے کہ ذاتیات انھیں احسان کرنے سے باز رکھ سکتی، بلکہ اس لیے کہ جب آئندہ زمانہ کی نسلیں ان تمام حالتوں پر نظرِ ثانی کریں اور سوال کریں کہ آیا اس وقت کوئی محبِ قوم، محبِ وطن اور محبِ مذہب تھا تو انھیں وہ ذات دکھائی دے جس نے اپنے ہادی کے اعتبار کے ساتھ خیانت نہیں کی کہ "جب لوگ دنیا میں مشغول ہوں تو تم دین اختیار کرنا"۔ دین کو بہت محدود کردے گا وہ شخص جو اس سے محض چند رسومات مراد لے۔

حضرت عائشہؓ کی مخالفت کا اثر

بلا شبہ حضرت عائشہ کی مخالفت عورت کی مخالفت تھی اور ابھی مخالفت کی ترتیب میں انھوں نے وہ انتظامی قابلیت نہیں دکھائی تھی جو چند مہینوں کے بعد دکھانے والی تھیں اور ابھی وہ زمانہ بھی کچھ دنوں بعد آنے والا تھا جن میں وہ روایتیں نمودار ہوتیں جو اثر کی زیادتی میں معین ہو سکتیں۔ لیکن یہ امر کم قابل لحاظ نہ تھا کہ وہ ایک گزرے ہوئے خلیفہ کی صاحبزادی تھیں اور رسولؐ کا شرف زوجیت بھی حاصل ہو چکا تھا۔ سوچو صدیقہ کے اس سچے ریمارک کے اثر کو کہ: "ابھی رسولؐ کا کپڑا پرانا نہیں ہوا ہے کہ ان کی سنت کہنہ ہو گئی"۔ اس فقرہ کا طنز نہایت پر حرارت عنصر سے مرکب تھا۔ ان کا فتویٰ اگرچہ عثمان کے عبرت ناک نتیجہ کا تمام تر سبب نہ تھا لیکن ایک قوی سبب ضرور تھا۔ میں مروان بن حکم کے اس مثل کہنے پر غور کرتا ہوں جب وہ ام المومنین سے ٹھہرنے اور کلمۂ خیر کی استدعا سے مایوس ہو جاتا ہے کہ: "قیس نے آگ لگائی اور جب دیکھا کہ شعلے

بلند ہوگئے تو اپنی راہ لی" حضرت عائشہ نے مروان کو مثل کہنے کے معنی بجھا دیے اور بغیر معذرت یا انکار کیے اپنی راہ لی۔

عثمانؓ کے خلاف انقلابؓ کی نوعیت

ایک آخری لفظ اور بس میں یہ باب تمام کرچکا اور وہ یہ ہے کہ اکثر انقلاب اس کے باعث ہوتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے تمام بھلائی اور برائیوں کو اپنی جگہ سے اکھیڑ دیں اور جب انقلاب تمام ہو تو چاروں طرف ایک غبار سی حالت دکھائی دے۔ لیکن پیشِ نظر انقلاب کی اٹھان ہی اس لیے تھی کہ وہ ان تمام برائیوں کے دور کرنے کی وکالت کرے اور اچھی حالت کو اپنی جگہ قائم کرے۔ اس کے طرز عمل کی کوئی بڑی فہرست نہ تھی جس نے موجودہ حالت کا تار تار علیٰحدہ کردیا ہو، بلکہ وہ چند آدمیوں کی برطرفی اور اسی نتیجہ کے حاصل کرنے پر مصر اور کوشاں تھی۔ انقلاب اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا۔ کامیابی کے لیے جو ذرائع اختیار کیے وہ پس پردہ نہ رکھے گئے بلکہ اعلان کردہ ضرورتوں سے کسی قسم کی خلاف ورزی نہ کی۔ ان کا طرز عمل کس قدر انصاف سے دیکھے جانے کے قابل ہے اب اس قدر واقعات لکھنے اور ان کی شرح کے بعد مجھے خود کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

انقلابؓ اور پس بینی

اسی طرح یہ بھی ناظر کے تصفیہ کی چیز ہوگی کہ کہاں تک یہ انقلاب اس گزشتہ نظام کے خلاف مدرکانہ یا بے ہوشانہ انقلاب تھا جس کی عثمان کا زمانہ حکومت ایک فرع تھا عثمان کو اس اصول نے قتل کیا جس کے معتدل مصرف نے ان کے پیشروں کو اپنی جگہ قائم رکھا، اور اس مصلحت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے لوگوں میں اپنے خود غرضانہ حوصلوں کے آزمانے کی اس وقت تک جرأت نہ ہوئی جب تک خلق اللہ کی ہم آہنگی انھیں شرکت کے لیے دکھائی نہ دی۔ اس طرح عثمان کے خلاف دو قوتیں مختلف نقطۂ خیال سے متحد تھیں۔ ان وقتوں میں حسینؑ کی قابلیتوں کا فطری نشو اس حد تک ہوچکا تھا کہ وہ بغیر کسی کی مدد کے واقعات کو دیکھتے اور سمجھتے۔

میں نے ان واقعات میں زیادہ وقت صرف کیا،
مجھے اس کے سوا چارہ نہ تھا۔
اس سے بھی کمی کرنا گزشتہ
اور آئندہ واقعات کی
زبان کاٹ لینا
ہوتا۔

○

باب پنجم

رسولؐ کے بعد کے نظام کا سکون اور دوبارہ حرکت

اس باب کا آہنگ

اس باب کے شروع کرنے کے ارادہ کے ساتھ ہی مجھے خیال ہوتا ہے کہ میری کتاب کا ناظر جس نے عثمان کے اختتامی واقعات پڑھے وہ سوچتا ہوگا کہ میں اب جناب امیرؑ کی حیات کے اس زمانہ کے واقعات بیان کرنے کے لیے یہ آہنگ اختیار کروں گا جس سے جناب امیر علیہ السلام سمجھے جاسکیں۔ نہیں، بلکہ صرف اس محدود حیثیت تک کہ انھوں نے نظام قومی اور روح دینی کے قائم رکھنے کے لیے اپنے زمانہ میں کون سے وسائل اختیار کیے۔ خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ اس کی مخالفانہ کوششیں تھیں کہ یہ کچھ نہ کرسکیں۔ گزشتہ ابواب میں جس حد تک کوئی واقعہ یا سلسلہ واقعات پیش کیے گئے ہیں وہ محض اس نقطہ خیال سے کہ وہ کون سے اسباب اور آثار تھے جو بالارادہ یا بے ارادہ شہادت حسینؑ کے باعث اور موجب ہوسکتے۔ اور اگر میں نے جناب رسالت مآبؐ، جناب فاطمہؑ زہرا اور جناب امیر علیہ السلام یا نشو و نمائے اسلام کا ذکر کیا تو اس کی غرض تھی کہ میں آئندہ حسینؑ کی روش اور تعلق دکھا سکوں اور حسینؑ کے افعال میں جو عکس دکھائی دیتے اس کی ابتدا تلاش کرنے میں شاعرانہ تخیل سے کام نہ لینا پڑے۔

دو متضاد جماعتوں کا اثر

ان نفوس قدسی کے حالات اس لیے لکھے گئے کہ یہ سمجھایا جاسکے کہ حسینؑ کس روح اور مادے سے بنے تھے۔ لیکن یہ باب اس کے سمجھنے میں مدد دے گا کہ حسینؑ کو اپنے مشہور دنوں میں اپنے پدر بزرگوار کے کون سے افعال اور روش سے اپنے روش کے اختیار کرنے میں مدد ملی۔ اس کے مقابل میں میں یہ بھی دکھاتا آرہا ہوں کہ ان کی روش کے خلاف بھی کچھ افراد یا جماعتیں کچھ کررہی تھیں یا نہیں؟۔ اور ان دونوں کوششوں کی جو باہمی نوعیت میں متضاد تھیں، کیا صورت ہوتی جاتی تھی، اور کیا نتیجہ دکھائی دیتا تھا۔ حسینؑ کی سوانح عمری نہیں ہے مگر یہ کہ افراد اور ایک جماعت کا خروج اور مخالفت ہے۔

رسولؐ کے بعد کے نظام کے سکون کا نتیجہ

بنی ہاشم کے حقوق سے یہ واقعات تھے جن کے حیرت خیز کہنے میں مجھے کوئی کلام نہیں ہے، اور ان کا نتیجہ یہ تھا کہ رسولؐ کے بعد جو نظام دکھائی دیتا تھا اس میں دفعتاً سکون پیدا ہوگیا۔ اگر اس وقت تک کے ابواب یہ سمجھانے کے لیے کافی ہوئے ہوں کہ ان کی غرض یہ تھی کہ: "نبوت اور خلافت ایک خاندان میں نہ ہونی چاہیے"۔ تاہم اس کے سکون سے یہی نتیجہ نکلتا کہ لوگوں کی فطری خواہش سے خلافت اور نبوت ایک خاندان میں ہو ہی جاتی۔ اعتقادی یقین کی حد کے اندر آتا۔ لیکن یہ ایک ایسا معاملہ تھا جو محض تخیل کے آئینہ میں اپنی صورت نہیں دیکھتا رہا۔

بلکہ دن اور رات نے بھی ایسا ہی دیکھا۔ گویا زمانہ کو اس کا انتظار تھا کہ طبیعتوں کی روش اپنی فطری شان میں دکھائی دے اور کچھ دخل دینے والے اور درمیان میں آجانے والے خود ساختہ منصرم نہ دکھائی دیں تو ہم اپنی خواہش ظاہر کریں۔

عامہ ناسؓ کی بلافصل خواہش

یہ حالت اس سوال کو پیش نظر کرتی ہے کہ اگر منصرمین کا زمانہ مداخلت کا زمانہ کچھ کر نکال دیا جائے تو لوگوں کی خواہش کے بلافصل کہنے میں کسی مبالغہ کی کوشش نہ کرنی پڑے گی۔ باوجود اس حالت کے علیؑ کو خلیفہ دیکھ کر اس زمانہ کو علیؑ کا زمانہ حکومت سمجھنا واقعہ فہمی کی غلطی ہوگی یا واقعہ کی مقدار سمجھنے میں مبالغہ کرنا ہوگا۔

علیؑ کا زمانہ حکومتؑ تمام تر انؑ کی حکومتؑ کا زمانہ نہ تھا

واقعہ اس قدر تھا اور بس کہ گزشتہ نظام کے خلاف ایک انقلاب ہوا، اور انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نظام میں سکون پیدا ہو گیا، اور علیؑ سامنے دکھائی دیے۔ لیکن علیؑ کے سامنے دکھائی دیتے ہی گزشتہ نظام میں ایک منتقمانہ جوش سے حرکت پیدا ہو گئی۔ اور اس نے علیؑ کو اس کے علاوہ کوئی موقع نہ دیا کہ وہ اسے ساکن کرنے کے لیے اپنے ممکن ذرائع سے کوشش کرتے۔ یہ حقیقتاً اس قدر جناب امیرؑ کی خلافت کا زمانہ نہ تھا جس قدر رسُولؐ کے بعد کا نظام اپنی کچھ دیر کی کھوئی ہوئی قوت کے حاصل کرنے کے لیے جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔

علیؑ کو ترتیب جماعت کا موقع نہ ملا

علیؑ اس کے ساکن کرنے میں پورے کامیاب نہیں ہوئے۔ نہ اس وجہ سے کہ انھوں نے جو طریقے اختیار کیے تھے وہ غلط تھے۔ نہیں۔ بلکہ سامان اور زمانہ کا فرق تھا۔ پچیس برس تک جو حالت ان کے خلاف پیدا ہوئی تھی اور اس نے جو صورت قائم کرلی تھی اس کے مقابل ان کے موافق ایک فوری انقلاب سے یہ امید کرنا کہ وہ اس طرح کامیاب ہو جاتا کہ گزشتہ کوششوں کے زمانہ پر غالب آجاتا، ایک غیر معمولی امید ہوگی۔ دونوں کی قوت کا اندازہ تو اس وقت ہو سکتا جب کہ علیؑ کو بھی لوگوں کو اپنے رنگ میں رنگنے کا موقع ملتا۔

چند مفید تنقیحاتؑ

علیؑ کا اختیار بے اختیاری سے صرف ظاہری صورت میں مختلف تھا۔ لیکن وہ اختیار ہو یا بے اختیاری، علیؑ کو لوگوں کے کانوں تک یہ صدا پہنچا دینی تھی کہ خلافت ملے یا نہ ملے ہم سنّتِ خلفا کی پیروی نہیں منظور کریں گے۔ کیا یہ انکار سیاسی حیثیت سے علیؑ کے مفید تھا۔ نہیں۔ اب تو نسبتاً بڑی بھاری سلطنت ملتی۔ بہرحال میرا یہ باب بھی یہی دکھائے گا کہ علیؑ کے موافق انقلاب پر غالب آنے کے لیے گزشتہ نظام نے کیا طریقے اختیار کیے اور یہ سکون کیونکر حرکت سے بدلا۔ اور یہ حرکت آیا صورت اور غرض میں اس سے مختلف کہی جا سکتی ہے جو رسُولؐ کے بعد سے علیؑ کے خلیفہ دکھائی دینے تک جاری رہی۔ اور جب یہ کچھ میں آجائے گا تو پھر یہ سمجھنے کا موقع ہوگا کہ علیؑ کے دورِ حکومت سے مخالفت آیا اس اصول کے رُوح اور طرزِ عمل سے مخالفت تھی یا نہ تھی جو گزشتہ تین خلافتوں کے پہلے تھا۔ اور جب علیؑ نے سنت خلفا کا اتباع منظور نہ کیا، اور قرآن اور سنت رسُولؐ کی شرائط کو منظور کیا، اور بدعتوں کے متغیر کرنے کی حسرت ظاہر کی تو آیا علیؑ کے طرزِ عمل کے کوئی اور معنی بجز اس کے ہو سکتے تھے کہ وہ اس راہ کو روشن کرنے کی کوشش میں تھے جو تین خلافتوں کے پہلے تھی؟۔ علیؑ کے مخالف جو قوتیں حرکت میں تھیں آیا ان کے عناصر کے سمجھنے

کے لیے علیؑ کے پہلے کا زمانہ اور ان کا طرزِ عمل کوئی مدد دیتا ہے؟

علیؑ کی گزشتہ اور آئندہ روش

اسی طرح یہ بھی کہہ دوں کہ جس طرح علیؑ نے از ابتدائے بعثت تا رحلتِ رسُول بے کسل ایثار سے کام کیا، اور اس کے بعد رحلتِ رسُول سے آج تک جب کہ جماعتِ اسلامی کی موت اور زندگی اکثر موقع پر علیؑ کے طرزِ عمل پر موقوف ہوتی تھی اور مسلمانوں کا شیرازہ منتشر ہو سکتا تھا، علیؑ نے اپنے حق کو تجاہل میں دفن ہو جانے دیا، جس سے کوئی شکستگی ان کی وجہ سے نہ پیدا ہوئی۔ اسی طرح اب بھی آپ دیکھیں گے کہ ایسے وقت میں بھی جب کہ عناصر تفرقہ اپنے پورے جوش و خروش کے عالم میں تھے علیؑ نے کس احتیاط سے قدم اٹھایا، بلکہ ناشنود دشمنوں کو اتنی بار سمجھایا جسے ایک ایسا حاکم جو اپنے موقع کو محض حاکمانہ سمجھتا ایسی بار بار استغاثہ امن کو کسرِ شان سمجھتا۔

دشمنوں کا کوئی فریب علیؑ پر کارگر نہ ہوا بلکہ ان کے نافہم ہمراہیوں پر

یہ باب دکھانے والا ہے کہ دشمنوں کا کوئی فریب علیؑ پر غالب نہ آیا لیکن ان کے نافہم ہمراہی فریب یا لالچ میں آ گئے جس سے انھوں نے وجہ اسلام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تباہ کر دیا۔ ہم "نافہم ہمراہی" کا لفظ مجبوراً استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ایسے لوگ جو بظاہر علیؑ کے ساتھ ہو گئے تھے لیکن ان کی ترتیب خصائل قطعاً دوسری ہواؤں میں ہوئی تھی اور وہ نہ خود سمجھنے کی قابلیت رکھتے تھے نہ سمجھانے پر عمل کرتے تھے۔ ان کے لیے ہم بجز اس فقرہ کے اور کیا کہیں۔ لیکن کسی طرح وہ "ہمراہی" کے وسیع اور پورے مفہوم میں نہیں آ سکتے تھے۔ اگرچہ کچھ وقت ملنے اور علیؑ کی تعلیم کے زیرِ اثر رہنے پر ان کا ویسا ہو جانا ممکن تھا جیسے علیؑ کے پہچاننے والے دوست اور پیرو تھے۔

لوگ بیعت کے لیے علیؑ کے پاس گئے

اب ہم واقعات کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ ابن خلدون کہتا ہے: "بعد شہادت عثمان بن عفان طلحہ و زبیر اور مہاجرین و انصار (رضی اللہ عنہم) کا ایک گروہ علیؑ بن ابی طالبؑ کے پاس بیعت کے واسطے گیا۔ علیؑ نے کہا میں تمھارا وزیر ہوں گا۔ اس سے بہتر ہے کہ میں امیر ہوں۔ تم جس کو منتخب کرو گے میں اس سے راضی ہو جاؤں گا۔ ان لوگوں نے منت و سماجت سے کہا ہم تم سے زیادہ کسی کو اس کا مستحق نہیں پاتے اور نہ تمھارے سوا کسی کو منتخب کر سکتے ہیں۔ علیؑ بن ابی طالبؑ ان لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر مسجد کی طرف تشریف لائے اور صحابہ کرام کے مواجہہ میں طلحہ و زبیر سے کہا: میں تمھیں اختیار دیتا ہوں اگر تم پسند کرتے ہو تو میں تمھارے ہاتھ پر بیعت کروں ورنہ راضی ہو تو تم میرے ہاتھ پر بیعت کرو۔ انھوں نے کہا: نہیں ہم تمھارے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔ یہ کہہ کر طلحہ و زبیر نے بیعت کی ---- بعد طلحہ و زبیر کے اور لوگوں نے بیعت کی۔

سعد بن ابی وقاص اور ابن عمر کا توقف

پھر لوگ سعد ابن ابی وقاص کو لائے اور بیعت کرنے کو کہا۔ سعد نے جواب دیا لوگوں کو بیعت کر لینے دو تو میں بیعت کروں۔ علیؑ نے کہا رہنے دو۔ پھر ابن عمر لائے گئے۔ ابن عمر نے بھی ایسا ہی کہا۔ لوگوں نے کہا کوئی ضامن لاؤ۔ ابن عمر بولے کہ میں ضامن نہیں دے سکتا۔ اشتر نے کہا مجھے اجازت دیجیے، میں اس کو قتل کر ڈالوں۔ علیؑ بن ابی طالبؑ

نے فرمایا: چھوڑ دو، میں اس کا ضامن ہوں۔ بعد اس کے انصار نے بیعت کی۔ مگر چند لوگوں نے بیعت سے تخلف کیا۔

انصار متخلفین بیعت کے نام

ازانجملہ انصار سے: حسان بن ثابت، کعب بن مالک، مسلمہ بن مخلد، ابوسعید خدری، محمد بن مسلمہ، نعمان بن بشیر، زید بن ثابت، رافع بن خدیج، فضالہ بن عبید، کعب بن عجرہ، سلمہ بن سلامہ بن وقش۔

مہاجرین متخلفین بیعت کے نام

مہاجرین میں سے عبداللہ بن سلام، صہیب بن سنان، اسامہ بن زید، قدامہ بن مظعون، مغیرہ بن شعبہ تھے۔

عثمان کا کرتہ شام گیا

نعمان بن بشیر نائلہ زوجہ عثمان کی انگلیاں اور ان کا قمیص خون آلودہ لے کر شام چلے گئے۔

علیؑ کب بیعت لینے پر راضی ہوئے

یہی مؤرخ لکھتا ہے کہ جب علی، طلحہ، زبیر، سعد اور ابن عمر نے بیعت لینے سے انکار کیا تو بلوائیوں نے اہل مدینہ کو جمع کر کے کہا کہ اگر تم امام نصب نہ کرو گے تو ہم فلاں فلاں کو قتل کر ڈالیں گے۔ ابن اثیر نے بجائے فلاں فلاں کے علی، طلحہ، اور زبیر کا نام لیا ہے۔ تو "اہل مدینہ یہ سن کر علیؑ بن ابی طالب کے پاس گئے۔ انھوں نے خلافت سے انکار کیا۔ ان لوگوں نے اسلام کے انجام سے ڈرایا۔ تب علیؑ نے مجبور ہو کر اگلے دن کا وعدہ کیا۔ صبح ہوتے ہی وہ لوگ پھر آپہنچے۔ اور حکم بن جبلہ مصریوں کے ساتھ اور اشتر کوفیوں کے ہمراہ حاضر ہوا۔ حکم بن جبلہ نے زبیر کو اور اشتر نے طلحہ کو بہ اکراہ لاکر پیش کیا۔ چنانچہ لوگوں نے علیؑ بن ابی طالب کے ہاتھ پر بیعت کی۔

علیؑ کا خطبہ

علیؑ بن ابی طالب مسجد میں آئے اور منبر پر چڑھ کر فرمایا: "اے لوگو! ہماری بابت کسی کو کوئی حق سوائے اس کے نہیں ہے کہ مجھ کو تم نے امارت کے لیے منتخب کیا۔ کل تم لوگ میرے پاس پریشان ہو کر آئے تھے اور میں خلافت و امارت سے گریز کر رہا تھا۔ لیکن تم لوگ اس پر مصر ہوئے کہ میں تمھارا امیر ہوں اور تمھاری کنجی میرے ہاتھ میں ہو"۔ حاضرین نے کہا: "ہاں ہم لوگ اپنے اسی کل کے خیال پر ہیں"۔ علیؑ بن ابی طالب بولے: "اللھم اشھد"۔ بعد اس کے وہ لائے گئے جنھوں نے بیعت سے تخلف کیا تھا۔ پس انھوں نے بھی کتاب اللہ و سنت رسولؐ اللہ و اقامۃ الحدود پر بیعت کی۔ پھر عوام کی بیعت کرنے کے بعد علیؑ بن ابی طالب نے خطبہ دیا۔

جمعہ ۲۰ ذی الحجہ ۳۵ھ

ابن حجر نے صواعق محرقہ میں لکھا ہے: آنگاہ آن جماعت بجانب علیؑ شتافتند وگفت دست بکشا تا با تو بیعت کنیم۔ علیؑ گفت شمارا این رجوعے نیست

یعنی: اس وقت وہ جماعت علیؑ کی طرف دوڑی اور بولی کہ ہاتھ پھیلاؤ تا کہ آپ کی بیعت کریں۔ علیؑ نے فرمایا تمھارے لیے یہ رجوع نہیں ہے۔

اہل بدرؓ کے نزدیک علیؑ سے احق کوئی نہ تھا

بلکہ این امر برائے اہل بدر منوط است۔ بہر کس کہ ایشان باو راضی شوند آن کس خلیفہ باشد۔ آنگاہ از اہل بدر ہیچ کس باقی نماند مگر آنکہ نزد علیؑ آمدند گفتند ما احق و اولی از شما نمیدانم۔ دست بکشا تا بیعت کنیم۔ علیؑ قبول کرد

وبا او بیعت کردند۔ یعنی: بلکہ یہ امر اہلِ بدرؓ کی رائے کے ساتھ تعلق رکھتا ہے جس پر وہ راضی ہوں وہ خلیفہ ہوگا۔ اس وقت اہلِ بدرؓ میں سے کوئی بھی باقی نہ رہا مگر علیؑ کے پاس آئے اور کہا کہ ہم آپ سے زیادہ کسی کو حق دار اور اولیٰ نہیں جانتے۔ ہاتھ پھیلائیں تاکہ آپؑ کی بیعت کریں۔ علیؑ نے قبول کرلیا اور سب نے آپؑ کی بیعت کرلی۔

مروان بھاگا: مروان و ولد مروان فرار را بر قرار اختیار نمودند"۔ یعنی: مروان اور اس کے بیٹوں نے ٹھہرنے پر بھاگنے کو ترجیح دی۔

بیعت کا وقت: ابن سعد گوید: "بیعت علیؑ وقت صبح روز دوم از قتل عثمان بود در مدینہ و جمع اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم در مدینہ بودند با او بیعت کردند"۔ گفتہ اند کہ طلحہ و زبیر بیعت حضرت اسد اللہ الغالب علیؑ را کارہ بودند و بعد از آنکہ بہ کرہ بیعت کردند از مدینہ بیرون رفتند و بمکہ آمدند و چون عائشہ در مکہ بود او را برداشتہ بجانب بصرہ توجہ نمودند و طلب خون عثمان کردند"۔ یعنی: ابن سعد کہتا ہے کہ علیؑ کی بیعت عثمان کے قتل کے دوسرے روز مدینہ میں ہوئی اور تمام اصحاب رسولِ خداؐ مدینہ میں تھے۔ انھوں نے آپ کی بیعت کرلی۔ کہا گیا ہے کہ طلحہ اور زبیر حضرت اسد اللہ الغالب علیؑ کی بیعت ناپسند کرنے والے تھے اور ناپسندیدگی کے باوجود بیعت کرنے کے بعد مدینہ سے باہر چلے گئے اور مکہ آگئے۔ چونکہ عائشہ مکہ میں تھیں انھیں اٹھا کر بصرہ کی طرف چلے اور عثمان کے خون کا مطالبہ کرنے لگے۔

علیؑ نائلہ سے عثمانؓ کے قاتل کا نام پوچھتے ہیںؑ اور نائلہ کی لاعلمی

علیؑ نزد زوجہ عثمان آمد و از وے سوال کرد کہ قاتل عثمان کہ بود گفت نمی دانم دو مرد آمدند کہ ایشان را نہ شناختم و محمد بن ابی بکر با آن دو مرد ہمراہ بود و بیان آن واقعہ بہ تفصیل نزد علیؑ نمود۔ یعنی: علیؑ عثمان کی زوجہ کے پاس آئے اور اس سے پوچھا کہ عثمان کا قاتل کون تھا۔ اس نے کہا میں نہیں جانتی۔ دو مرد آئے جنھیں میں نہیں پہچانتی اور محمد بن ابی بکر ان دو مردوں کے ساتھ تھا اور اس واقعہ کو تفصیلاً علیؑ سے بیان کیا۔

محمد بن ابی بکر کی طلبی

آن گاہ علیؑ کس را بہ طلب محمد بن ابی بکر فرستاد چون حاضر شد از و سوال کرد از آن چہ زوجہ عثمان گفتہ بود۔ گفت آن چہ او می گوید راست است واللہ کہ من داخل بر عثمان شدم و ارادہ قتل او داشتم لیکن نام پدر من بر زبان راند و او را گزاشتم و تائب شدم بسوئے خدا واللہ کہ او را نکشتم و نگاہ نہ داشتم کہ کدام کس کشت۔ یعنی: اس وقت علیؑ نے محمد بن ابی بکر کو بلوایا۔ جب وہ آیا تو اس سے پوچھا اس کے بارے میں جو زوجۂ عثمان نے کہا تھا۔ وہ بولا جو وہ کہتی ہے سچ ہے۔ میں عثمان پر داخل ہوا اور اس کے قتل کا ارادہ رکھتا تھا لیکن وہ میرے باپ کا نام زبان پر لایا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اور اللہ کی بارگاہ میں تائب ہو گیا۔ اللہ کی قسم میں نے اسے قتل نہیں کیا اور نہیں دیکھا کہ کس نے انھیں قتل کیا۔

نائلہ محمدؓ بن ابی بکر کے قول کی تصدیق کرتی ہیںؑ

زوجہ عثمان گفت محمد بن ابی بکر راست میگوید و لیکن او آن دو مرد را بہ اندرون خانہ آورد باین تشنیع ترغیب فرمودہ۔ یعنی: عثمان کی بیوی نے کہا محمد بن ابی بکر سچ کہہ رہا ہے لیکن وہ ان دو مردوں کو گھر میں لایا اور اس کام کی ترغیب دی۔

صاحب روضۃ الاحباب کہتا ہے کہ بیعت سے "علیؑ علیحدہ می داشت زیرا کہ اختلاف مشاہدہ می فرمود"۔ یعنی: علیؑ خود کو علیحدہ رکھ رہے تھے۔ کیونکہ وہ اختلاف دیکھ رہے تھے۔

اس مؤرخ نے بھی علیؑ، نائلہ اور محمد بن ابی بکر کی روایت کو ابن حجر کی طرح لکھا ہے۔

علیؑ بیعت لینے کے شرائط پیش کرتے ہیں

اور بیعت کے "الحاح" پر علیؑ نے فرمایا ہے کہ: "از حد شرع تجاوز نہ کنم میل و محاباً از من واقع نہ شود فصل امور بمشاورت جمہور ــــ یک درم از بیت المال برائے خود تصرف نہ کنم و میان شما ترجیح نہ نہم"۔ یعنی: شریعت کی حد سے تجاوز نہ کروں گا۔ کسی کی طرف جھکاؤ یا لحاظ مجھ سے نہ ہوگا۔ امور کے فیصلے جمہور کے مشورہ سے کروں گا۔ بیت المال سے ایک درہم بھی نہ لوں گا۔ تمہارے درمیان کسی کو کسی پر ترجیح نہ دوں گا۔

اس کے بعد خلافت کا قصیدہ پڑھا گیا۔ اور علیؑ نے طلحہ و زبیر کے طلب قصاص کے جواب میں فرمایا ہے کہ: خونِ عثمان میں بہت سے متہم ہیں، جب کسی کی نسبت گواہی سے تصدیق ہو تو ہم حکم دیں۔

بنی اُمیہ شام چلے گئے عثمان کا مال اُن کے وُرثا پر تقسیم ہُوا

اسی مؤرخ کے موافق بنی اُمیہ کچھ عائشہ کے پاس چلے گئے۔ کچھ شام کی طرف چلے اور کچھ مخفی ہو گئے۔ دوسرے دن بیت المال تقسیم کر دیا گیا۔ عثمان کی ذاتی جائداد ان کے ورثاء پر تقسیم کی گئی اور حکومت کا مال علیحدہ کر دیا گیا۔

طلحہ کا علیؑ سے قبول خلافت کا اظہار

اعثم کوفی زیادہ بیان خیز ہے اور امور خانہ تیز نگاہی سے واقعات دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک جب لوگ بیعت کی استدعا سے جناب امیر کے پاس آتے ہیں تو آپ انھیں طلحہ و زبیر کے پاس لے جاتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ:

"اے ابوالحسن تو بدین کار اولی تری و خلافت حق تست بحکم سوابق جمیل و فضائل بسیار کہ تراست و شرف قرابتے کہ با رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم داری"۔ یعنی: اے ابوالحسنؑ آپ اس کام کے لیے سب سے اولیٰ ہیں اور خلافت آپ کا حق ہے۔ آپ کے جمیل کارناموں اور بہت سے فضائل اور رسولِ خداؐ کے ساتھ قرابت کی وجہ سے۔

علیؑ کو خدشہ

اور یہ سن کر جناب امیرؑ نے فرمایا کہ: از ان می اندیشم کہ اگر این کار قبول کنم و دران شروع نمایم مناقشے و منازعتے ظاہر شود"۔ یعنی: میں اس سے ڈرتا ہوں کہ اگر اس کام کو قبول کر لوں اور شروع کر دوں کوئی جھگڑا اور تنگی ظاہر ہو۔

یہ سن کر طلحہ نے بڑی زبردست "استغفر اللہ" کہی، اور عہد کے بعد زبیر سے بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ اب جناب امیرؑ مسجدِ رسولؐ میں تشریف لائے۔ یہاں علاوہ اور لوگوں کے ابوالہیثم، رافع بن رفاعہ، مالک بن عجلان، ابوایوب، خالد بن زید اور خزیمہ بن ثابت تھے۔ ان لوگوں نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا:

بعض اصحابؓ کا عامہ ناسؓ سے مخاطبہ

تم لوگ جانتے ہو کہ تمہارے ساتھ عثمان کا کیا طریقہ برتاؤ تھا۔ اب وہ گزر گیا۔ علیؑ کی فضیلت، کرامت،

اور قربت آفتاب سے زیادہ ظاہر ہے۔ جن علوم، محاسن اخلاق اور خوش خصلتی پر ان کی ذات شریف حاوی ہے وہ شرح اور بیان سے مستغنی ہے۔ انھیں دقائق حلال و حرام پر جیسا وقوف ہے اور ہمیں اور تمھیں ہر روز بلکہ ہر لمحہ ان سے جو احتیاج پڑتی ہے اسے جانتے ہو۔ اگر امورات خلافت کی انجام دہی کے لیے ہم علیؑ سے زیادہ کسی کو فاضل، پرہیزگار اور خدا ترس جانتے تو ہم اس کی طرف اشارہ کرتے۔ لیکن آج تمام روئے زمین پر ان خصائل خیر کے لیے ہم علیؑ سے زیادہ معتبر کسی کو نہیں پاتے۔ اب تم اس معاملہ میں کیا کہتے اور سوچتے ہو۔

بلا اختلاف راضی

اس کے بعد "جملہ متفق اللفظ و المعنی گفتند کہ علیؑ علیہ السّلام را راضی و مطیعیم و فرمانبردار بطوع و رغبت نہ باکراہ و اجبار این سخن میگوئیم۔ از سر ایقان و بصیرت نہ زوجہ تردد و تحیر"۔

یعنی: سب نے بیک زبان و دل کہا کہ علیؑ سے ہم خوش ہیں اور اس کے مطیع و فرمانبردار ہیں۔ یہ بات ہم بخوشی و رغبت کہہ رہے ہیں جبر و اکراہ سے نہیں۔ یقین و بصیرت سے کہہ رہے ہیں تردد و تحیر سے نہیں۔

علیؑ کا سوال

اور علیؑ یہ سن کر پوچھتے ہیں کہ: "یہ جو کچھ تم کہتے ہو محض اپنی حسن رائے کی وجہ سے یا خدائے تعالیٰ کی جانب سے میرا حق واجب جانتے ہو؟"۔ جواب دیا: "بلکہ ہم اس حق کو خدائے تعالیٰ کے حکم سے اپنے اوپر واجب جانتے ہیں"۔ یہ سن کر فرماتے ہیں:

پھر سوچنے کا وقت دیتے ہیں

"اچھا آج جاؤ اور اس پر سوچ کر کل پھر آؤ اور تم جو کچھ طے کرو گے اس طرح اس کا انجام ہو گا"۔ دوسرے دن پھر لوگ جمع ہوئے اور آج پھر حکومت اور اختیار پر مسکرانے والا بے ارادہ اپنے نفس پر اپنا اختیار دکھاتا ہے۔ جب کہ وہ کہتا ہے کہ:

دوبارہ آگاہی

"ابھی کام کا آغاز ہے اور اس کا رشتہ تمھارے ہاتھوں میں ہے۔ قبل اس کے کہ کام تمھارے ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ خوب غور کر لو۔ تم جسے چاہو اور لائق سمجھو اسے اختیار کرو۔ میں تمھارے موافق ہوں اور مجھے کوئی جھگڑا اور مناقشہ نہیں کرنا ہے"۔ لیکن

عام آواز

"از ہر گوشہ مسجد آواز ہا بر آمد کہ ما امروز ہم برانیم کہ دیروز بودہ ایم و در اہتمام مہم خلافت بر تو مزیدے نہ داریم بسعادت دست بیرون کن تا با تو بیعت کنیم"۔ یعنی: مسجد کے ہر گوشہ سے آوازیں آئیں کہ ہم آج بھی اسی رائے پر ہیں جس پر کل تھے اور آپ کی خلافت کے لیے کسی اور اہتمام کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ سعادت کے ساتھ ہاتھ باہر نکالیے کہ آپ کی بیعت کر لیں۔

اس وقت علیؑ کا انداز

امیر المومنین علی علیہ السّلام چون حال بران جملہ دید و سخن مہاجر و انصار برین سوال شنید، خاموش ایستاد"۔ یعنی: حضرت علیؑ نے جب سب کا یہ حال دیکھا اور مہاجرین و انصار کا اس سوال پر جواب سنا تو خاموش کھڑے ہو گئے۔

اب اس مجمع میں کوئی نفس ایسا ذی نہ تھا جو علیؑ کو اتمام حجت کے بعد اس کیفیت میں دیکھتا اور نہ کھچتا۔ دنیا کے تمام فصیحوں کی خوش بیانی اس "چپ کھڑے ہو جانے کی" ادا پر صدقے تھی۔ میں بیعت کی حالت کو علیؑ کے لفظوں میں بیان کر کے ہنستا ہوں اور روتا ہوں۔ فرماتے ہیں:

علیؑ اور بیعت کے وقت کی مصوری

"تم نے بیعت کے لیے میرا ہاتھ پھیلا دیا۔ میں نے اسے کھینچ لیا۔ تم نے میرا ہاتھ کھینچا، میں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ پھر تم میرے گرد ہو کر اس طرح ایک دوسرے کے مزاحم ہونے لگے جیسے کہ پیاسے اونٹ اپنی آبگاہوں پر وارد ہو کر ایک دوسرے کی مزاحمت کیا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ میری نعلین کے تسمے ٹوٹ گئے۔ ردا میرے کاندھے سے گر پڑی۔ ضعیف آدمی اس ہلچل میں پس گیا، اور لوگوں کی خوشی کی اس بیعت میں یہ نوبت پہنچی کہ چھوٹے تو خوش ہوئے، کبیر السن بے چارے بیعت کے لیے آتے آتے راہ میں گر پڑے۔ بیماروں نے اس بیعت کے مقام تک پہنچ کر رنج اٹھایا، اور اس بیعت کے لیے لڑکیوں تک نے اپنے گھونگھٹ الٹ دیے"۔

مساواتؑ کی تلخ تفریح

اعثم کوفی کے موافق: تقسیم بیت المال میں ہر شخص کو تین دینار ملے۔ جب میں کہہ رہا ہوں کہ ہر شخص کو تین دینار ملے تو میں یہ بجا رہا ہوں کہ امتیاز اٹھا دیا گیا، اور مساوات قائم کی گئی۔ نہ کسی کو خمس یا خمس الخمس دیا گیا، اور نہ حکومت کی جائداد کسی کو جاگیر میں عطا ہوئی۔ میں ان چہروں کے دیکھنے کے لیے جو امتیاز کے عادی اور بڑی بڑی رقمیں پاکر روغنی نگاہ کے ہو گئے تھے کیا کچھ قربان نہ کرتا جو کچھ کر سکتا کہ انھوں نے کس طرح تین دینار چٹکی میں دبائے ہوں گے۔ مشکل سے میں امید کر سکتا ہوں کہ میرے زمانہ کا سب سے بڑا مسخرا ایکٹر اس کو فطری شان سے نباہ سکتا ہو گا۔

مساواتؑ پر اعتراضؑ اور علیؑ کا جوابؑ

اور زمانہ یہ پہنچ گیا تھا کہ مساوات کا برتا جانا قابلِ شکایت تھا، اور وہ شکایت کرنے والے طلحہ و زبیر ہوتے۔ جنھیں علیؑ جواب دیتے کہ: "یہ مساوات کے بارہ میں جو تم ذکر کر رہے ہو تو یہ ایک ایسا امر ہے جس میں میں نے اپنی رائے سے حکم نہیں کیا، نہ اپنی خواہش نفس سے اس کا مرتکب ہوا ہوں، بلکہ میں نے اور تم دونوں نے اس حکم کو پالیا ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم لائے تھے جس سے آپ فارغ کر دیے گئے ---- جس کی تقسیم سے خداوند عالم فارغ ہو چکا ہے اور اس بارہ میں اس کا حکم نافذ ہو چکا ہے۔ اب تمھارا اور تمھارے اغیار کا کوئی حق نہیں کہ مجھے اس معاملہ میں معتوب کریں"۔

ولید بن عقبہ بنی ہاشم کی ہجو کرتا ہے اور فضل بن عباس جوابؑ دیتے ہیں

روضۃ الاحباب کے موافق ولید بن عقبہ نے آلِ ہاشم کی مذمت میں اشعار کہے اور فضل بن عباس نے اس کا جواب دیا کہ: ؎

وکان ولی الامر بعد محمد علی و فی کل موطن صاحبہ

وصی رسول اللہ حقاً و صہرہ و اول من صلی و ما دام جانبہ

یعنی: محمدؐ کے بعد امر کا ولی علیؑ اور ہر مقام پر آپؐ کے ساتھی تھے۔ آپؐ رسولِ خداؐ کے برحق وصی ہیں۔ آپؐ کے داماد ہیں اور آپؐ نے سب سے پہلے نماز پڑھی اور ہمیشہ حضورؐ کے پہلو میں رہے۔

عمارؓ یاسر کی ایک صلاح اور علیؑ کا جواب

اعثم کوفی کے موافق عمار یاسر اور اشترؓ نے امیرالمومنین کی خدمت میں عرض کی کہ اگر اجازت ہو تو وہ لوگ جو اب تک شریک بیعت نہیں ہوتے ہیں وہ بھی لائے جائیں کہ انھیں عذر نہ ہو۔ لوگ اپنی صلاح کار کے لیے آپ سے بیعت کرتے ہیں۔ آپ بھی اپنے صلاح کار محفوظ رکھیے۔ جناب امیرؑ نے فرمایا کہ اے عمار اور مالک جس کو ہماری رغبت نہیں ہے ہمیں بھی اس کی احتیاج نہیں ہے۔ ہم آدمیوں کو تم سے اچھا پہچانتے ہیں۔ رہنے دو یا مجھے اپنی رائے پر چلنے دو۔ زیاد بن حنظلہ تیمی نے جناب امیرؑ کی تائید اور شرح میں کہا کہ ایسے لوگ جن سے باکراہ بیعت لی جائے گی اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اگر وہ بہ رغبت بیعت کریں تو مناسب ہے ورنہ ان سے ہاتھ اٹھالو۔

علیؑ اور سعد بن ابی وقاصؓ

سعد بن ابی وقاص نے کہا کہ مجھے کوئی شک نہیں ہے کہ آپ کی خلافت برحق ہے۔ مگر یہ بھی ہے کہ ہم میں سے ایک جماعت اس معاملہ میں آپ سے لڑے گی اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم بیعت کریں تو ہمیں ایک تلوار دیجیے کہ اسے زبان اور دو ہونٹ ہوں اور بات کرسکے اور حق و باطل میں فرق کرسکے۔ جناب امیرؑ نے جواب دیا کہ مہاجر و انصار اور کافۂ مسلمین سے کتاب اور سنت پر عمل کرنے کی شرط ہے اگر تمھیں خواہش ہے تو بیعت کرو ورنہ گھر میں بیٹھو کہ ہم تمھیں کسی امر پر مجبور نہ کریں گے۔

علیؑ بنی اُمیہ سے وجہِ مخالفت پوچھتے ہیں

جناب امیرؑ نے مروان بن حکم، سعید بن العاص اور ولید بن عقبہ کو طلب کیا، اور ان سے تخلف کی وجہ دریافت کی۔

جواب

ولید نے کہا: "اے ابوالحسن! ہم آپ سے کس امید پر بیعت کریں اور کس آنکھ سے دیکھیں۔ آپ نے ہمارے پر و بال کو نوچا، اور ہمارے سینہ کو کینہ سے بھر دیا۔ ہمارے باپ کو بدر میں قتل کیا، اور عثمان کو جو خلیفہ اسلام تھے غوغا میں چھوڑ دیا، اور مدد نہ کی۔ یہاں تک کہ وہ قتل ہوگئے۔ سعید بن العاص کے باپ کو بھی جو بنی امیہ کا سردار تھا بدر میں قتل کیا، اور مروان بن حکم کے باپ کو جب عثمان مدینہ میں لائے تو آپ نے کہا جو کچھ کہا۔ عثمان کی رائے کو ضعیف اور غلط سمجھا۔ ہم نے تینوں آدمیوں کے حال کو بتا دیا۔ اب ہم کس طرح بیعت کریں، اور کس دل سے آپ کو دوست رکھیں۔ اور اگر بیعت کرنی ہی ہوگی تو اس شرط سے بیعت کریں گے کہ قاتلان عثمان کو قتل کیجیے اور اگر ہم سے کوئی سہو اور خطا ہو تو اسے معاف کیجیے۔ اور اگر آپ سے ہم اپنے ابن عم معاویہ کے پاس شام جانے کی اجازت طلب کریں تو اجازت دیجیے اور منع نہ کیجیے"۔

علیؑ کا جواب

جناب امیرؑ نے فرمایا کہ تمھارا مجھ سے کینہ رکھنا بجا نہیں ہے۔ وہ حکم خدا تھا، اور مروان کے باپ کے حق میں بھی میں نے کوئی ناحق بات نہیں کہی۔ اور کشندگان عثمان کو اگر آج قتل کرسکوں تو کل پر نہ اٹھا رکھوں گا۔ میں تمھارے خوف کو دور کرتا ہوں۔ ان لوگوں نے بیعت کی اور چلے گئے۔

مروان کے اشعار

لیکن جناب امیرؑ کو ان کے بے اطمینانی کی خبریں پہنچتی رہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن مروان بن حکم کے چند شعر پڑھے گئے جو اس نے بیعت کی عدم رضامندی اور اپنے تردد کی حالت کے متعلق کہے تھے۔ جناب امیرؑ نے ان لوگوں کو پھر طلب کیا، اور فرمایا کہ اگر تم لوگ یہاں

ڈرتے ہو تو تمہیں اجازت ہے کہ جہاں چاہو چلے جاؤ۔ یہ لوگ یہ کہہ کر واپس ہوئے کہ ہمیں اطمینان ہو گیا۔ ہم اب مدینہ ہی میں رہیں گے۔ چند روز نہ گزرے تھے کہ مروان نے پھر شعر کہے۔ جن کا مفہوم یہ تھا کہ قاتلان عثمان مدینہ میں بعافیت بسر کر رہے ہیں۔ علیؑ دیکھتے ہیں اور خاموش ہیں۔ مسلمانوں نے مروان سے باز پرس چاہی لیکن جناب امیرؑ نے منع فرمایا۔

معاویہ اور حجاج بن خزیمہ

اس زمانہ میں امیر شام بنی امیہ کا حال دریافت کرتا تھا۔ یہاں تک کہ مدینہ کا ایک شخص جس کا نام حجاج بن خزیمہ تھا، شام گیا، اور اس نے یہ کہنے کے بعد کہ: "علیؑ سے اشراف حجاز، اعیان یمن اور اکابر و معارف مصر بیعت کر چکے اور اب تک اہل بصرہ نے بھی بیعت کر لی ہوگی۔ کہا: اس وقت شام میں تیرے پاس جس قدر لشکر اور سامان ہے وہ علیؑ سے بہت زیادہ ہے ابھی ان کا انتظام جما نہیں ہے کہ وہ مدینہ سے جنبش کر سکیں۔ لشکر تیرے موافق ہے۔ تھوڑا سا یک دل اور موافق لشکر اس فوج پر غالب آجاتا ہے جو موافق نہ ہو۔ اگرچہ عدد میں زیادہ ہو، حالانکہ تیرا لشکر خود علیؑ کے لشکر سے زیادہ ہے۔ اگر تو علیؑ سے مخالفت کرنا چاہتا ہے تو اس کے قبل جنگ کر کہ ان میں قوت پیدا ہو جائے۔ جب وہ اپنا انتظام کر لیں گے تو ہمیں یقین ہے کہ وہ عراق و حجاز پر بغیر شام کے راضی نہ ہوں گے۔

مغیرہ بن شعبہ کو معاویہ کے اشعار سے ان کا خیال معلوم ہوا

خزیمہ کی تقریر سن کر جو گویا معاویہ کے دل کی باتیں کہہ رہا تھا، معاویہ نے اس کی تعریف اور عثمان کی مدد نہ کرنے کی شرمندگی ظاہر کی۔ عثمان کے غم میں شعر کہے اور یہ اشعار مدینہ میں پہنچے اور مغیرہ بن شعبہ کو معلوم ہوئے۔

مغیرہ علیؑ کو صلاح دیتا ہے اور علی قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں

اور اس نے جناب امیرؑ کے پاس حاضر ہو کر بقول ابن خلدون کہا کہ: "جب تک حکومت و خلافت کو استقلال حاصل نہ ہو اس وقت تک عمال عثمان کو برقرار رکھو بعد استقلال و استقرار حکومت جس کو چاہنا معزول و تبدیل کرنا۔ علیؑ بن ابی طالب نے اس سے انکار کیا"۔ اور اس کے بعد اسی مؤرخ کے موافق: "چونکہ مغیرہ بن شعبہ نے نصیحت کی تھی اور علیؑ بن ابی طالب نے اس کو قبول نہ کیا تھا اس وجہ سے ناراض ہو کر مکہ چلا آیا"۔ مؤرخین نے اہتمام کیا ہے کہ ابن عباس کو بھی مغیرہ ابن شعبہ کا ہم خیال بنا دیں اور ابن خلدون نے ایک بھلا چنگا مکالمہ درج کر دیا ہے جس میں ابن عباس علیؑ کو یہ صلاح دیتے ہیں کہ: "واللہ اگر تم میرے کہنے پر عمل کرو تو میں تم کو ایسے راستہ پر چلا دوں کہ وہ انجام کار پر غور ہی کرتے رہ جائیں اور پیش افتادہ امور ان کو نہ سوجھ پڑیں"۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ بھی کہا یا نہیں کہ جب تک وہ سمجھیں ہم پھر ایسا ہی ایک امر اور پیش کر دیں علیؑ کا یہ جواب خوش ذائقہ ہے کہ: "مجھ میں نہ تمہاری خصلتیں ہیں نہ معاویہ کی"۔

ابن خلدون کو یہ بھی کہنا ہے کہ: "مروان اور بنی امیہ شام کی طرف بھاگ کر چلے گئے۔ علیؑ بن ابی طالب قریش کو خروج سے نہ روک سکے۔ تیسرے دن اعراب کو ان کے بلاد کی طرف واپس جانے کا حکم دیا۔ ان لوگوں نے اس سے انکار کیا، اور اس کے ساتھ سبیہ نے فتنہ و فساد کی آمادگی ظاہر کی"۔

طلحہ و زبیر بصرہ اور کوفہ جانے کی اجازت مانگتے ہیں

"اس اثنا میں طلحہ و زبیر آئے اور کہا ہم کو آپ کوفہ و بصرہ جانے کی اجازت دیجیے تاکہ لوگوں کے منتشر خیالات کو ہم مجمع کریں۔ علیؑ ابن ابی طالب نے کسی مصلحت سے ان کو روک لیا"۔

علیؑ حصول اجازت کی غرض بتادیتے ہیں

اعثم کوفی کے موافق جب طلحہ و زبیر نے جناب امیرؑ سے عمرہ کے لیے مکہ جانے کی اجازت طلب کی تو امیرالمومنین نے ان کے تمام دلی ارادے بتا دیے اور : "ایشان سرہا زیر افگندہ بودند"۔ اور اس کے بعد واشنگٹن آرونگ کے لفظوں میں : "ایسی حالت میں کہ لب پر تقویٰ اور دل میں مکر تھا۔ یہ عائشہ سے جا ملے جو مخالفت کے لیے تیار تھیں"۔

زینب بنت ابوسفیانؓ کے اشعار

اسی مؤرخ کے موافق شب کو یہ واقعہ گزر چکا تھا کہ جناب امیرؑ کسی راستہ سے تشریف لا رہے تھے اور جب زینب بنت ابوسفیان کے گھر کے قریب پہنچے تو سنا کہ کوئی دف پر شعر گا رہا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ : "طلحہ و زبیر نے عثمان کے قتل میں کوشش کی اور فتنہ کھڑا کیا۔ اگر آج علیؑ کی بیعت کی ہے تو اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ آخر میں مخالفت کریں گے۔ ظاہر میں دوست ہیں اور باطن میں دشمن ہیں"۔

کوئی حضرت عائشہ کے تغیر پر اعتراض کرتا ہے

حضرت عائشہ مکہ معظمہ سے حج کر کے واپس آرہی تھیں اور جب مقام سرف میں پہنچیں تو بقول ابن خلدون : ایک شخص عبید بن ابی سلمہ سے ملاقات ہوئی۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ عثمان شہید ہوگئے اور لوگوں نے علیؑ کی خلافت کی بیعت کی ہے۔ ام المومنین عائشہ نے ارشاد کیا : "واللہ عثمان مظلوم مارے گئے ہیں، میں ان کے خون کا معاوضہ لوں گی"۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا : "آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں، اور اس سے پیشتر آپ کیا کہتی تھیں؟"۔ جواب دیا : "بے شک ان لوگوں نے پہلے عثمان سے توبہ کرائی پھر ان کو شہید کیا"۔ غرض ام المومنین عائشہ صدیقہ اس مقام سے لوٹ کر مکہ واپس آئیں۔ لوگوں کا ایک مجمع ہو گیا ---- عبداللہ بن عامر حضرمی (عثمان کی طرف سے مکہ کا عامل تھا) بولے : "میں سب کے پہلے خون عثمان کا بدلہ لینے والا ہوں"۔ اس کلام کے تمام ہوتے ہی بنی امیہ نے (جو بعد شہادت عثمان مکہ کی طرف بھاگ گئے تھے) سمعاً و طاعۃً آمادگی ظاہر کی ازانجملہ سعید بن العاص، ولید بن عقبہ وغیرہما تھے۔

مخالفین علیؑ کا مجمع اور مرکز

اس عرصہ میں عبداللہ بن عامر بصرہ سے اور یعلیٰ بن منبہ یمن سے چھ سو اونٹ اور چھ لاکھ دینار لے کر مکہ میں آئے۔ بعد ازاں طلحہ و زبیر مدینہ سے وارد مکہ ہوئے ---- ام المومنین عائشہ نے کہا : "ہمارے ساتھ ان کی طرف خروج کرو"۔ حاضرین میں سے بعضوں نے رائے دی کہ : "شام کی طرف چلنا چاہیے"۔ اس پر ابن عامر بولے : "شام میں معاویہ ہیں، وہ اس کے لیے کافی ہیں، بصرہ کی طرف چلو۔ میری وہاں بات بنی ہوئی ہے اور لوگوں کا رجحان طلحہ کی جانب ہے۔ لوگوں نے بصرہ سے ابن عامر کے چلے آنے کو غیر مستحسن سمجھ کر بصرہ کے طرف جانے پر اتفاق کر لیا۔

ڈگڈگی پیٹ دی گئی

ام المومنین حفصہ نے ہمراہی کا قصد کیا لیکن اپنے بھائی عبداللہ بن عمر کے کہنے سے رک گئیں۔ غرض ابن عامر اور یعلیٰ بن منبہ نے اپنے مال و اسباب سے قافلہ کی روانگی کا ساز و سامان درست کیا اور یہ ندا کرا دی کہ: "ام المومنین عائشہ اور طلحہ و زبیر بصرہ کی طرف جا رہے ہیں۔ پس جو شخص اسلام کی ہمدردی کرنا اور خونِ عثمان کا بدلہ لینا چاہتا ہو اور اس کے پاس سواری نہ ہو وہ آئے اس کو سواری دی جائے گی"۔

امامتِ نماز کا جھگڑا، حضرت عائشہ کا کام

جب نماز کا وقت آیا تو مروان نے اذان دی اور طلحہ و زبیر کے پاس آ کر کہا: "تم دونوں میں سے اِمامت کس کے سپرد کی جائے"۔ ابن زبیر نے کہا: "میرے باپ کو"۔ ابن طلحہ بولے: "میرے باپ کو"۔ ام المومنین عائشہ نے یہ سن کر مروان کے پاس کہلا بھیجا کہ: "کیا تم ہمارے کام کو درہم و برہم کیا چاہتے ہو، اِمامت میرا بھانجا عبداللہ بن زبیر کرے گا"۔

علیؑ کی بیعت کی خبر اور حضرت عائشہ پر اثر

اعثم کوفی کو کہنا ہے کہ جب عائشہ نے سنا کہ: "عثمان قتل ہو گئے"۔ تو پوچھا کہ: "پھر اس کے بعد کیا ہوا؟"۔ کہا: "علیؑ سے بیعت کی گئی"۔ عائشہ نے کہا: "کاش آسمان پھٹ پڑتا کہ یہ برا دن نہ دیکھتے"۔ اور عُبید نے کہا کہ: "اے ام المومنین اچھا نہیں کرتی ہو کہ لوگوں میں شورش پیدا کر رہی ہو"۔

عُبید نے حضرت عائشہ کو ان کا فتویٰ یاد دلایا

روضۃ الاحباب میں ہے کہ جب عُبید بن سلمہ نے عائشہ سے خونِ عثمان کا دعویٰ سنا تو کہا کہ: "کیا تمھیں ان کی شان میں "اقتلوا نعثل فانہ قد کفر" (یعنی: نعثل کو قتل کر دو، کیونکہ یہ کافر ہو گیا ہے) نہیں کہتی تھیں"۔ اور جب عائشہ نے حضرت ام سلمہ کو بھی اپنے موافق بنانا چاہا تو ان کے "تعجب کی آواز گھر کے ہر شخص نے سنی"۔ اور انھوں نے کہا کہ: اے دختر ابوبکر کیا تو نے رسُول کی یہ حدیث نہیں سنی کہ: "علیٌ خلیفتی علیکم فی حیاتی و فی مماتی فمن عصاہ فقد عصانی"۔ یعنی: "علیؑ تم پر میری زندگی میں خلیفہ ہے اور موت کے بعد بھی۔ جو اس کی نافرمانی کرے گا وہ میرا نافرمان ہو گا"۔ اور عائشہ نے تصدیق کی۔

لیکن عبداللہ بن زبیر کی محبت سے پھر اپنا خیال بدل دیا۔

طلحہ و زبیر کب علیؑ کے منکر ہوئے

اسی مؤرخ کے موافق: طلحہ و زبیر نے بیعت سے اس وقت اِنکار کیا جب کہ ریاست بصرہ و کوفہ نہ دی گئی۔ اور عبداللہ بن عامر کریز نے یہ سمجھ کر کہ علیؑ اسے نکال دیں گے بصرہ میں برافروختگی پیدا کرنے کا قصد کیا۔ اس پر جاریہ بن قدامہ سعدی نے جواب دیا کہ تو بہ اکراہ حاکم ہوا ہے، اس لیے کہ عثمان نے تجھے یہاں بھیجا تھا۔ اب اگر علیؑ تجھے نکال دیں گے تو ماخوذ ہو گا۔ یہ سن کر بصرہ سے بھاگا اور طلحہ سے ملا۔

اعثم کوفی نے بھی بالکل یہی لکھا ہے اور جب ابن عامر طلحہ کے پاس آیا تو آخر الذکر نے کہا کہ: "تو کیوں آیا کہ بصرہ کا مال ہاتھ سے جاتا رہا۔ تجھے اس قدر صبر کرنا چاہیے تھا کہ ہم پہنچ جاتے"۔ اور ولید بن معیط نے بھی ایسا ہی کہا۔

معاویہ کے اشعار اور عائشہ

اسی مؤرخ کے موافق جب معاویہ نے سنا کہ عائشہ اور ان کے رفقا شام کا قصد رکھتے ہیں تو اس نے چند شعر لکھ کر مکہ میں بھجوا دیے کہ وہ لوگ ادھر آنے کا ارادہ فسخ کر دیں۔ اگرچہ اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ عائشہ اور ام سلمہ سے گفتگو ہو چکنے کے بعد۔

ابن زبیر اور حضرت ام سلمہؑ

ابن زبیر نے حضرت ام سلمہ سے کہا: "اے ام سلمہ! ہم نے اپنے بارہ میں تمھاری دشمنی دیکھی ہے اور جانتے ہیں کہ ہمیں دوست نہ رکھوگی"۔ حضرت ام سلمہ نے جواب دیا: "اے ابن زبیر! آیا تیرے نزدیک یہ مصلحت ہے کہ مہاجر و انصار اور اشراف صحابہ علیؑ کو جو مسلمانوں کے والی ہیں چھوڑ کر تیرے باپ سے بیعت کریں گے۔ تجھے اور تیرے باپ کو جو یہ فتنہ کھڑا کر رہا ہے یقین کرنا چاہیے کہ اس سے کوئی مطلب نہ نکلے گا"۔ ابن زبیر نے کہا: "ہم نے کبھی رسول سے یہ نہیں سنا کہ علیؑ مسلمانوں کے والی ہیں"۔ حضرت ام سلمہ نے فرمایا: "اگر تو نے نہیں سنا تو تیری خالہ نے جو یہاں بیٹھی ہے سنا ہوگا اس سے پوچھ لے۔ میں بالمشافہ کہہ رہی ہوں کہ آیا رسول نے یہ نہیں کہا ہے کہ: "علیؑ میرا خلیفہ ہے، میری زندگی میں اور میری وفات کے بعد"۔ "اے عائشہ تم نے رسول سے یہ سنا ہے یا نہیں؟ اور گواہی دوگی یا نہیں؟"۔ عائشہ نے گواہی دی اور تصدیق کی۔

حضرت عائشہ کے متعلق ایک مشہور حدیث

اس کے بعد حضرت عائشہ سے حضرت ام سلمہ نے وہ مشہور حدیث بیان فرمائی جسے عامہ مؤرخین نے نقل کیا ہے کہ: "اے عائشہ! ہرگز تو وہ عورت نہ ہونا جسے دیکھ کر آب حوأب کے کتے بھونکیں"۔

مؤرخ تاریخ الاسلام اور حضرت عائشہ کی روش

مؤلف تاریخ الاسلام مولوی عباسی صاحب گورکھپوری کو اقرار ہے کہ: "ایک بڑی فساد کی بنیاد عائشہ کی ذات سے قائم ہوئی"۔

اہلِ کوفہ اور ابو موسیٰ

کوفہ کا یہ حال تھا کہ جناب امیرؑ کے خلیفہ ہونے کی خبر پہنچی تو لوگ ابو موسیٰ کے پاس آئے اور اس سے پوچھا کہ: "تو کیوں علیؑ کی بیعت نہیں لیتا؟" اس نے جواب دیا کہ: "ہم ابھی توقف کرتے ہیں۔ دیکھیں اس کے بعد کیا ہوتا ہے"۔ ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص نے یہ سن کر کہا: "اب تجھے کیا خبر ملے گی۔ عثمان قتل کیے گئے اور مہاجر و انصار خاص و عام نے علیؑ سے بیعت کی۔ اس سے نہ ڈر کہ اگر تو علیؑ سے بیعت کرے گا تو عثمان اس جہان سے واپس چلے آئیں گے"۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے داہنے ہاتھ میں بایاں ہاتھ لیا اور کہا: "بایاں ہاتھ میرا ہے اور داہنا علیؑ کا ہے۔ میں نے علیؑ سے بیعت کی، اور ان کی خلافت پر راضی ہوا"۔ اب ابو موسیٰ کوئی عذر نہ کر سکا، اور اس نے اور اس کے بعد تمام اہلِ کوفہ نے بیعت کی۔

اہلِ یمن اور بیعت

اہل یمن نے جناب امیرؑ کی خلافت کا ذکر سن کر برسم تہنیت مدینہ کا قصد کیا، اور ان کا استقبال کیا گیا۔ جناب امیرؑ نے اپنے جو عمال روانہ کیے اس کا حسب ذیل نتیجہ ہوا:

● عثمان بن حنیف بصرہ بھیجے گئے۔ اور حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ ● عمارہ بن شہاب کوفہ بھیجے گئے۔ راہ میں طلحہ بن خویلد نے کہا کہ ہم بجز ابو موسیٰ کے کسی کو نہیں چاہتے۔ تم جاؤ نہیں تو قتل کر ڈالیں گے۔ یہ واپس ہوئے۔ ● عبید اللہ بن عباس

یمن گئے اور اختیار اپنے ہاتھ میں لیا۔ ● قیس بن سعد مصر گئے اور جناب امیرؑ کا فرمان پڑھا کچھ نے ساتھ دیا۔ کچھ نیوٹرل رہے۔ کچھ نے عثمان کا قصاص طلب کیا۔ ● سہیل بن حنیف شام جا رہے تھے۔ انھیں تبوک میں چند سوار ملے، اور کہا کہ اگر تمھیں عثمان کے علاوہ کسی نے بھیجا ہو تو واپس چلے جاؤ۔

جناب امیرؑ کا خط معاویہ کے نام

ابن خلدون کے موافق: علیؑ نے سبرہ جہنی کے ہاتھ معاویہ کے پاس خط بھیجا۔ اس نے تین مہینہ تک کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بعد قبیصہ عبسی کے ہاتھ ایک سربمہر خط روانہ کیا جس کا عنوان تھا: "من معاویة الی علی"۔ اور جب لفافہ چاک کیا گیا تو اس میں کوئی خط نہ تھا۔ علیؑ نے قاصد کی طرف دیکھا، اور اس نے کہنا شروع کیا:

معاویہ کا قاصد شام کا حال بتاتا ہے

"میں شام میں ایسے لوگوں کو چھوڑ آیا ہوں جو سوائے رو کنے کے کسی طرح راضی نہ ہوں گے۔ میں نے ساٹھ ہزار شیخ کو دیکھا ہے کہ وہ عثمان کے قمیص خون آلودہ پر رو رہے ہیں، جو اسی غرض سے جامع دمشق کے منبر پر رکھا ہے"۔ اعثم کوفی میں اس قدر زیادہ ہے کہ: "پہلے وہ شیطان پر لعنت کرتے تھے، اب قاتلانِ عثمان پر لعنت کرتے ہیں"۔ جناب امیر نے پوچھا کہ: "اور وہ لوگ قتل عثمان سے کسے متہم کرتے ہیں؟"۔ قاصد نے کہا: "تمھیں"۔

جنابِ امیر کا ایک صحابی

یہ سن کر خلیہ بن زفر العبسی نے کہا: "تو عجب بے شرم ہے کہ امیرالمومنین اور مہاجر و انصار کو اس جرم میں متہم کرتا ہے، جو انھوں نے نہیں کیا۔ اگر جہال کی کوئی جماعت عثمان کے کرتے پر روتی ہے تو نہ وہ کرتہ "پیراہن یوسف" ہے اور نہ وہ رونا "گریۂ یعقوب" ہے۔ اگر قتل عثمان پر رونا تھا تو اس وقت مدد کیوں نہ کی جب وہ مدد طلب کرتے تھے؟"۔

سکونتِ عراق کا خیال

ابن خلدون کے موافق: اب جناب امیرؑ نے شام کی طرف روانگی کے لیے تیار ہو جانے کا حکم دیا۔ اعثم کوفی کے موافق: ابوایوب انصاری کی صلاح نہ ہوئی اور جناب امیرؑ نے فرمایا کہ: "خزانہ اور لشکر کے لحاظ سے ہم کو عراق میں رہنا چاہیے۔ اس سے ہم شام کی طرف سے مطمئن رہیں گے"۔ تاہم جناب امیر نے کچھ دنوں کے لیے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔

دیگر عمال کی روانگی

اور مختلف مقامات پر عمال روانہ کیے۔ اس کے بعد جب ہر طرف سے شورشوں کی خبر آنے لگی تو فرمایا:

شورش کے متعلق خیال

"جس امر کا مجھے اندیشہ تھا وہ ظاہر ہوا، اور لوگ مخالفت کرنے لگے۔ فتنہ کی مثال آگ کی ایسی ہے کہ بھڑک اٹھنے کے بعد شعلے زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ جہاں تک میرے امکان میں ہے میں اس فتنہ کے فرو کرنے اور اس آگ کے بجھانے میں کوشش کروں گا۔ اگر حالت درست ہوگئی تو خیر ورنہ بجز جنگ کے چارہ نہ ہوگا"۔

حضرت ام سلمہ کا خط جناب امیر کے پاس آیا

جناب امیرؑ ان افکار میں مبتلا تھے کہ انھیں حضرت اُمّ سلمہؓ کا خط ملا جس میں مکہ کے حالات کی خبر لپنے

فرزند عمر بن سلمہ کے ہاتھ روانہ کی تھی اور لکھا تھا کہ: "اگر جناب رسالت مآبؐ نے عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے کو منع نہ کیا ہوتا تو میں بھی تمہارے لشکر کے ساتھ اس طرف حرکت کرتی جدھر تم جاتے۔ میں اپنے فرزند کو بھیجتی ہوں، یہ آپ کا تابع فرمان رہے گا"۔

ام الفضل کی اطلاع

اسی طرح ام فضل بنت الحرث ام عبداللہ بن عباس نے قبیلہ جہینہ کے ظفر نامی ایک شخص کی زبانی عائشہ کے خروج کی خبر امیرالمومنین کے پاس بھیجی۔

طلحہ و زبیر کی مخالفت سن کر آئندہ کی مصلحت ظاہر کرتے ہیں

بقول ابن خلدون: جب اس خروج کی خبر معلوم ہوئی تو جناب امیرؑ نے خطبہ میں فرمایا کہ: "بلاشبہ طلحہ و زبیر و عائشہ نے میری خلافت و امارت کے درہم و برہم کرنے پر در پردہ اتفاق کر لیا ہے اور بظاہر لوگوں کو اصلاح کی طرف بلایا ہے اور میں تحمل کروں گا جب تک تمہاری جماعت پر مجھے کسی امر کا اندیشہ نہ ہوگا اور میں رکا رہوں گا اگر وہ لوگ رکے رہے"۔ اعثم کوفی کے موافق: منجملہ اور امورات کے جناب امیرؑ نے محمد بن ابی بکر سے فرمایا کہ: "سنتے ہو تمہاری بہن نے کیا ارادہ کیا ہے؟"۔ اور انھوں نے کہا: "اے امیرالمومنین! مسلمان آپ کے موافق ہیں۔ خدا آپ کو فتح دے گا"۔

ابن عثمان کو خلیفہ بنانے کے متعلق طلحہ و زبیر سے سوال اور اس کا جواب

ایک اور دلچسپ واقعہ یہ تھا کہ بقول ابن خلدون: سعید بن العاص طلحہ و زبیر کے پاس آئے اور کہا: "اگر تم فتح مند ہو گے تو کس کو صاحب الامر بناؤ گے"۔ جواب دیا: "ہم دونوں میں سے جس کو لوگ منتخب کریں گے"۔ سعید نے کہا: "نہیں بلکہ عثمان کے لڑکے کو حکومت دینا کیونکہ تم لوگ خون عثمان کا معاوضہ لینے کو نکلے ہو"۔ جواب دیا کہ: "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اکابر و شیوخ مہاجرین کو چھوڑ کر ان لوگوں کو حاکم بنائیں"۔ سعید بولے: "میں گمان کرتا ہوں کہ ایسی حالت میں میں کوشش نہ کر سکوں گا مگر یہ کہ بنی عبد مناف سے حکومت نکالنے کی کوشش کی جائے"۔ طلحہ و زبیر نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ سعید لوٹ کھڑے ہوئے۔ ان کے لوٹتے ہی عبداللہ بن خالد بن سعید اور مغیرہ بن شعبہ اور جو لوگ اس کے ہمراہ قبیلہ ثقیف کے تھے، واپس ہوئے، اور طلحہ و زبیر بقیہ لوگوں کو ہمراہ لیے ہوئے آگے بڑھے۔ ان کے ہمراہ ابان و ولید پسران عثمان تھے۔

حضرت عائشہ کا خط بعض روسائے بصرہ کے نام اور اس کا جواب

حضرت عائشہ اپنی "اصلاح" کے لشکر کے ساتھ بقول ابن خلدون: آب حواب پر ایک شبانہ روز ٹھہری تھیں کہ لشکر میں "علیؑ پہنچ گئے" کا غل اٹھا اور سبھوں نے "نہایت تیزی سے بصرے کا رخ کیا"۔ اور روسائے بصرہ کو جن کے نام احنف بن قیس اور صبرہ بن شیمان وغیرہ ہیں مدد کے لیے خط لکھا۔ احنف وغیرہ نے اس کا انھیں کو الزام دیا اور ان کی شرکت نہ کی۔

علیؑ کا عامل

عثمان بن حنیف کو جب خبر معلوم ہوئی تو اس نے ابوالاسود وغیرہ کو عائشہ اور طلحہ و زبیر کے پاس دریافت حال کے لیے بھیجا اور اگر کسی نے اپنے آنے کی غرض "اصلاح" بتائی تو کسی نے

"انتقام خون عثمان" بتایا۔ اور اگرچہ انھیں بیعت شکنی کا الزام دیا گیا لیکن یہ ان کے لیے کافی نہ تھا۔ عثمان بن حنیف نے سن کر کہا: "رب کعبہ اسلام کی چکی چلی"۔ دنیز یہ کہ: "میں ان کو روکوں گا تا آنکہ امیرالمومنین علیؑ آئیں"۔

جاریہ بن قدامہ اور حضرت عائشہ

حضرت عائشہ مربد تک آپہنچیں۔ عثمان بن حنیف مقابلہ کو پہنچ گیا اور طلحہ و زبیر نے اپنی اپنی صف سے نکل کر خون عثمان کے انتقام کے لیے ابھارنے میں فصاحت کا کوئی کونہ بے چھوئے نہ چھوڑا۔ اور حضرت عائشہ نے بھی ایسی ہی کوشش کی۔ جاریہ ابن قدامہ سعدی نے بقول عامہ مورخین کہا: "اے ام المومنین! واللہ عثمان کا قتل ہونا زیادہ پسندیدہ تھا اس سے کہ تم اس ملعون اونٹ پر سوار ہو کر لڑائی کے لیے مکان سے نکلتیں۔ تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے پردہ و حرمت تھی۔ تم نے پردہ کی ہتک کی اور حرمت کو مباح کیا۔ اور بے شک جو شخص تم سے لڑنا چاہتا ہو اس کا قتل کرنا مناسب ہے۔ پس اگر تم اپنی طبیعت سے آئی ہو تو بہتر ہے کہ اپنے مکان پر واپس جاؤ۔ اور اگر بہ جبر و اکراہ آئی ہو تو اللہ تعالیٰ سے استعانت چاہو اور لوگوں سے واپس چلنے کو کہو"۔

جنگ اور التوا

فریقین میں خوب جنگ آزمائی ہوئی۔ آخر میں تھک کر صلح کی اور ہتھیار روک رکھنے کا معاہدہ ہوا۔ طلحہ و زبیر نے عثمان سے شہر خالی کرنے کو کہا۔ مگر اس نے انکار کیا۔ اور بقول ابن خلدون: "طلحہ و زبیر نے لوگوں کو جمع کیا اور شب تاریک میں بعد نماز عشا مسجد کی طرف آئے۔

عہد کے بعد مسجد پر شبخون اور ابن حنیف کے ساتھ برتاؤ

عبدالرحمٰن بن عتاب نے بڑھ کر حملہ کیا۔ تلواروں کی جھنکار سے مسجد گونج اٹھی۔ تقریباً چالیس آدمی اس وقت مسجد میں موجود تھے۔ لڑائی ہوئی، مارے گئے۔ بالآخر عثمان بن حنیف کے گھر میں گھس کر اس کو نکال کر طلحہ و زبیر کے پاس لائے۔ اس حالت میں کہ اس کے چہرے کے کل بال نوچ ڈالے گئے تھے۔ اسی مورخ کے موافق بعض کے نزدیک عثمان بن حنیف کی گرفتاری نماز پڑھانے کی حالت میں عمل میں آئی۔ اور عائشہ نے انھیں مارنے اور شہر بدر کرنے کا حکم دیا۔ مجاشع بن مسعود اس کے لیے مامور کیا گیا۔

طلحہ اپنے خطبہ میں جھٹلائے گئے

بصرہ میں داخل ہو کر طلحہ نے کہا: "اے اہل بصرہ توبہ گناہ کے لیے ہم چاہتے تھے کہ امیرالمومنین عثمان کو راضی کرلیں۔ اس اثنا میں کمینوں بلوائیوں نے بلوہ کر کے ان کو شہید کر ڈالا"۔ حاضرین نے طلحہ کو مخاطب کر کے کہا: "ہمارے پاس تو تمہارے خطوط اس کے خلاف آتے تھے"۔ زبیر بولے: "ہم نے یقیناً ایسے خطوط نہ لکھے ہوں گے"۔

جناب امیرؑ نے کوچ کیا حسینؑ سردار میسرہ

امیرالمومنین نے مدینہ پر ابن عباس یا سہیل بن حنیف کو اور مکہ پر قثم بن عباس کو اپنا نائب کر کے کوچ فرمایا۔ اس وقت کی ترتیب لشکر کے موافق حسینؑ افسر میسرہ تھے۔ ربذہ میں قبیلہ طے اور اسد نے شرف قدم بوسی حاصل کیا، اور رکاب میں چلنے کو عرض کیا۔ آپ نے فرمایا: اپنے اقرار پر تم لوگ ثابت و قائم رہو۔ مہاجرین کافی ہیں۔ اسی مقام پر ایک شخص شیبانی کوفہ سے آیا۔ آپ نے اس سے ابوموسیٰ کو دریافت فرمایا۔ اس نے جواب دیا: اگر صلح کا

قصد رکھتے ہو تو وہ تمہارا ہمراہی ہے اور اگر قصد جنگ ہے تو وہ تمہارا شریک نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا: واللہ ہمارا قصد سوائے صلح کے اور کسی امر کا نہیں ہے۔ جب تک ہم پر کوئی وقعہ نہ ہو۔ راہ میں عثمان بن حنیف وغیرہ کے واقعہ کی خبر معلوم ہوئی۔ ذی قار میں قبیلہ بکر بن وائل نے حاضر ہو کر ہمراہی کے لیے گزارش کی اور آپ نے متذکرہ صدر جواب دیا۔

ابو موسیٰ کا خیال

امیرالمومنین نے محمد بن ابی بکر اور محمد بن جعفر کو کوفہ روانہ کیا تھا۔ ابو موسیٰ نے انھیں جواب دیا کہ: "لڑائی کے لیے خروج کرنا دنیا کی راہ ہے۔ اور بیٹھ رہنا آخرت کی --- واللہ عثمان کی بیعت میری گردن میں ہے اور علیؑ کے گردن میں بھی ہے۔ اگر لڑائی ضروری امر ہے تو قاتلین عثمان سے جہاں کہیں ہوں لڑنا چاہیے"۔ یہ واپس گئے جناب امیرؑ نے مالک اشتر اور ابن عباس کو روانہ کیا۔ یہ بھی واپس آئے اور اب جناب امیرؑ نے حسن اور عمار کو روانہ کیا۔ ابو موسیٰ نے عمار سے کہا: "اے ابوالیقظان! تم نے امیرالمومنین کی مخالفت مخالفین کے ساتھ ہو کر کی اور اپنی ہمراہی کو فجار کے ساتھ جائز رکھا"۔

حضرت عائشہ کے خطوط

پھر زید بن صوحان مسجد میں ام المومنین عائشہ کا ایک خط اپنے نام کا اور ایک بنام اہل کوفہ لیے ہوئے آئے۔ اور ان کو بمواجہہ حاضرین علیٰ سبیل انکار پڑھا۔ (نوٹ میں لکھا ہے: "ہر دو خطوط کا مضمون یہ تھا کہ: "اس زمانہ میں تم لوگ کسی کی مدد نہ کرو، اپنے اپنے مکان میں بیٹھ رہو، یا ہماری نصرت پر آمادہ ہو۔ ہم خون عثمان کا معاوضہ لینے کو آئے ہیں"۔) ابو موسیٰ یہ کہتے جاتے تھے کہ: "میری اطاعت کرو اور عرب کے ٹیلوں میں سے ایک ٹیلہ بن جاؤ تاکہ مظلوم تمہارے سایہ میں آکر پناہ گزین ہو"۔

زید بن صوحان اہل کوفہ کو علیؑ کی مدد کے لیے اُبھارتے ہیں

زید بن صوحان نے کھڑے ہو کر کہا: "اے عبداللہ بن قیس! فرات کو لوٹا دو جس طرف سے بڑھ کر آتا ہے اور امیرالمومنین و سید المسلمین علیؑ کی مدد کو چلو"۔ قعقاع بن عمر نے کھڑے ہو کر اس کلام کی تائید کرتے ہوئے بیان کیا: "امیر نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ سب درست و بجا ہے۔ لیکن میں تم لوگوں کو نصیحتاً کہتا ہوں اور سوائے حق کے اور کچھ نہیں کہتا ہوں کہ امیرالمومنین علیؑ کی مدد کرو۔ حق تک پہنچ جاؤ گے"۔ عبد خیر نے بھی اسی قسم کی تقریر کی اور ابو موسیٰ سے مخاطب ہو کر کہا: "تم جانتے ہو کہ طلحہ و زبیر نے علیؑ کی بیعت کی تھی؟"۔ جواب دیا: "ہاں"۔ پھر دریافت کیا: "کیا علیؑ نے کوئی ایسا کام کیا ہے جس سے ان کی بیعت توڑ دی جائے؟"۔ جواب دیا: "میں نہیں جانتا"۔ اس پر عبد خیر نے خشونت سے کہا: "تم یہ نہیں جانتے ہو تو ہم تم کو چھوڑ دیتے ہیں۔ تا آنکہ تم جان جاؤ!"۔ "اے لوگو! تم کو امیرالمومنین نے بلایا ہے، تاکہ جو معاملات ان میں اور ان کے دونوں رفیقوں (طلحہ و زبیر) میں ہیں ان کو دیکھو اور وہ (علیؑ) امت پر فتنہ دین میں مامون ہیں۔ پس جو شخص ان کی مدد کو جائے گا اس کے ہمراہ چلنے کو تیار ہوں"۔ عمار بولے: "علیؑ نے تم لوگوں کو حق کے دیکھنے کو بلایا ہے۔ چلو اور ان کے ہمراہ ہو کر لڑو"

حسنؑ کا مخاطبہ

حسن بن علیؑ نے کہا: "تم لوگ ہماری دعوت قبول کرو اور ہماری اطاعت کرو اور جس بلا میں تم اور ہم بھی مبتلا ہو گئے ہیں اس میں ہماری مدد کرو اور بے شک امیرالمومنین کہتے ہیں کہ: ہم اگر مظلوم ہیں تو ہماری امداد کرو اور اگر ہم ظالم ہیں تو ہم سے حق لو۔ واللہ طلحہ و زبیر نے سب سے پہلے میری بیعت کی

اور سب کے پہلے مجھ سے بے وفائی کی"۔

نو ہزار سپاہی تیار ہوئے

لوگوں کے دلوں پر اس تقریر سے ایک فوری اثر پیدا ہو گیا۔ سبھوں نے آمادگی ظاہر کی۔ عدی بن حاتم نے اپنی قوم کو اور حجر بن عدی نے اسی طرح تحریک کی۔ چنانچہ حسنؑ بن علیؑ کوفہ سے نو ہزار کی جمعیت سے روانہ ہوئے۔

اعثم کوفی میں اس قدر زیادہ ہے کہ ابو موسیٰ نے کہا کہ عائشہ کا ہمارے پاس خط آیا ہے اور اس میں ہدایت ہے کہ ہم اہل کوفہ سے گھروں میں خاموش بیٹھنے کو کہیں۔ اس پر عمار نے کہا کہ اگر عائشہ نے تجھے یہ کہا ہے تو امیر المومنینؑ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ لوگوں کو جمع کر کے ان کی خدمت میں لے جائیں۔

جناب امیرؑ نے اِمدادی لشکر کا اِستقبال کیا

اسی اثناء میں مالک اشتر بھر کوفہ پہنچ گئے اور دار الامارت سے ابو موسیٰ کا مع ثقیل طبل کے کامل اسقاط ہو گیا، اور جب روسائے کوفہ اور سرداران لشکر ذی قار میں آئے۔ آپ (امیر المومنین) ان کے استقبال کو سوار ہو کر گئے۔ ان پر مرحبا کہا اور یہ ارشاد فرمایا: اے اہل کوفہ ہم نے تم کو اس غرض سے بلایا ہے کہ ہمارے ساتھ اپنے بھائیوں اہل بصرہ سے مقابل ہو۔ اگر وہ لوگ اپنی رائے سے رجوع کر لیں تو فہوالمراد اور اگر اپنے خیال پر اصرار کریں گے تو ان کا علاج ہم نرمی کے ساتھ کریں گے۔ تاکہ ہماری طرف سے ظلم کی ابتداء نہ ہو، اور ہم کسی کام کو جس میں ذرہ بھر فساد ہوگا بغیر اصلاح کیے نہ چھوڑیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ پس اہل کوفہ نے امیر المومنین کے پاس ذی قار میں قیام کیا، اور عبد القیس جن کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی بصرہ اور امیر المومنینؑ کے درمیان ٹھہرے ہوئے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر امیر المومنین علیؑ نے قعقاع بن عمر کو اہل بصرہ کی طرف طلحہ و زبیر کے پاس سمجھانے اور اتفاق کرنے روانہ کیا۔

حضرت عائشہ کے لشکر کی تعداد

بقول اعثم کوفی ذی قار میں انیس ہزار لشکر جمع ہو گیا اور اب جناب امیرؑ بصرہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے آنے کی خبر سن کر طلحہ، زبیر، عبداللہ بن زبیر، مروان بن الحکم، عبد الرحمٰن بن عتاب بن اسید، ہلال بن وکیع، عبد الرحمٰن بن حارث، عبداللہ بن عامر کریز، حاتم بن بکر الباہلی، عمر بن طلحہ اور مجاشع بن مسعود نے بقیہ لشکر درست کیا۔ لشکر کی تعداد تیس ہزار تھی۔ امیر المومنین نے سنا اور اپنے لشکر سے خبر کی، اور اہل لشکر نے بھی درستی کی صلاح دی۔

احنف کی وکالت اور علیؑ کا جواب

اس اثنا میں احنف بن قیس نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ: "اہل بصرہ میں افواہ ہے کہ اگر علیؑ کو فتح ہوئی تو وہ ہمارے مردوں کو قتل کر کے ہمارے بچوں اور عورتوں کو غلام بنائیں گے"۔ جناب امیرؑ نے جواب میں فرمایا کہ: "میں ہرگز یہ نہ کروں گا اہل بصرہ مسلمان ہیں"۔ (اعثم کوفی) اس کے بعد دریافت کیا کہ: "میں نہیں جانتا کہ تو نے کیا سوچا ہے۔ تو ہمارے موافق ہے یا نہیں؟ احنف نے موافقت کا یقین دلا کر کہا کہ: اگر آپ فرمائیں تو دو سو بہادروں سے ہم آپ کے ہمراہ رہیں، یا چار ہزار جنگجو سپاہیوں کو آپ سے دفع کریں۔ امیر المومنین نے شق ثانی کو پسند فرمایا۔ اس کے بعد خطبہ فرمایا کہ:

مخالف کے عناصر کا اندازہ

"مجھے اپنے بھائیوں سے نقض عہد، بغاوت اور ظلم و حسد سے سامنا ہوا ہے۔ میرے بھائی اور دوست مجھے خلیفہ رسولؐ نہیں دیکھ سکتے۔ حاسد محمود فیہ کے زوال کے علاوہ کچھ نہیں چاہتا۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ لباس خلافت کو جو خدا نے مجھے پہنایا ہے مجھ سے اتار کر خوش ہوں ۔۔۔ اس لیے مختلف حیلے اختیار کیے ہیں۔۔۔ اور سخت تر امر یہ ہے کہ چار شخص جو چار باتوں میں بے ہمتا ہیں، میرے مخالف ہیں۔ رسولؐ کے بعد ایسے چار آدمیوں سے کسی کو سامنا نہیں ہوا۔ ان میں سے پہلا زبیر بن عوام ہے، جس سے زیادہ کسی بہادر نے رکاب میں پاؤں نہیں رکھا۔ دوسرے طلحہ بن عبداللہ جس سے بڑھ کر کوئی مکار نہیں ہے۔ تیسرے عائشہ جن سے زیادہ کسی کے فرمانبردار نہیں ہیں۔ چوتھے یعلیٰ بن منبہ کہ جس سے زیادہ اس زمانہ میں کسی نے مال دنیا جمع نہیں کیا۔ اول الذکر تین شخص میری مخالفت میں صرف کرنے کے لیے جس قدر روپیہ اس سے طلب کریں گے دے گا"۔

خزیمہ بن ثابت نے یہ سن کر علیؑ کی سچائی، شجاعت اور علم کی تعریف کی۔ لوگوں کی اطاعت کا ذکر کیا، اور کہا کہ:

"ان لوگوں نے ظلم سے جو مال جمع کیا ہے اس سے جہل اور فساد کی شکم پری کریں گے"۔

جناب امیر کا خط جس میں اہلِ مدینہ کو حکم بنانے کا خیال ظاہر کرتے ہیں

اس کے بعد جناب امیرؑ نے طلحہ و زبیر کو خط لکھا جس میں واقعات بیان کیے تھے۔ فرمایا کہ: "اہل مدینہ کو حکم بناؤ جو اس وقت کسی کے ساتھ نہیں ہیں۔ تم نے بہت سے مسلمانوں کو قتل کیا، اور عائشہ کو لے آئے۔ تمہیں عثمان سے کوئی قرابت نہیں کہ تم خون کا دعویٰ کرسکو۔ عثمان کے لڑکوں کو پہلے میری بیعت کرنی چاہیے، اس کے بعد جس پر انھیں دعویٰ ہو پیش کریں کہ موافق انصاف شریعت کا حکم نافذ کیا جائے"۔

اسی طرح عائشہ کو بھی خط لکھا کہ: "تم کہتی ہو کہ ہم اصلاح کے لیے آئے۔ عورتوں کو لشکر کشی اور مردوں کے درمیان اصلاح سے کیا کام۔ تم میں اور عثمان میں کوئی قرابت نہیں ہے۔ عثمان بنی امیہ سے تھے اور تم بنی تیم بن مرہ بن کنانہ ہو۔ تم گھر سے باہر نکلیں اور خلق کو معرض بلا میں ڈالا"۔

طلحہ و زبیر کا جواب

طلحہ و زبیر نے جواب دیا کہ تم نے شہرت کی غرض سے لشکر کشی کی ہے۔ ہم تمہاری اطاعت نہ کریں گے۔ اور ابن زبیر نے تقریر کی کہ: "اپنے زن و فرزند اور حسب و نسب کی حفاظت کے لیے لڑو"۔

حسن کا لشکر سے خطبہ

کسی نے حسن سے یہ تقریر نقل کی اور انھوں نے جواب میں اپنے لشکر کے سامنے تقریر کی جس کا مخصوص مضمون یہ تھا کہ: "تم لوگ جانتے ہو کہ زبیر نے عثمان کو کیا کچھ نہیں کہا، اور طلحہ نے بیت المال پر کیا تصرف نہیں کیا۔ ہمیں انصار عثمان سے کوئی غرض نہیں ہے۔ بلکہ ہم شتر نشیں کے رفقا سے آمادہ جنگ ہیں۔ ہر شخص نے اس خطبہ کو پسند کیا"۔

علیؑ اور صلح کی کوشش

دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل پہنچے اور سپاہیوں میں جنگی کیفیت پیدا ہونے لگی تھی کہ کعب بن سوار نے عائشہ سے کہا: "بہت خون بہا چاہتا ہے اے مادر مومنان! کچھ فکر کرو ورنہ پھر تسکین ممکن نہ ہوگی"۔ یہ سن کر ہودج میں بیٹھ کر آئیں اور دیکھا کہ علیؑ اپنے

سپاہیوں کو جنگ سے روک رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر واپس آئیں۔ جناب امیرؑ نے دوبارہ ابن صوحان اور ابن عباس کو سمجھانے کے لیے بھیجا۔ لیکن عائشہ نے جواب دیا کہ: "ہم کوئی جواب نہیں دیں گے۔ اس لیے کہ ہم حجت میں علیؑ پر غالب نہیں آسکتے"۔ یہ سن کر جناب امیرؑ نے سرداران لشکر کو طلب فرمایا اور جب حاضر ہوئے تو فرمایا:

جنابؑ امیر کا لشکر سے جنگی خطبہ

"جہاں تک میرے امکان میں تھا میں نے نرمی اور تسالی کی۔ جنگ کی سختیوں سے ڈرایا۔ قسم دی۔ کسی کا نتیجہ نہ ہوا بلکہ مجھ سے کہا ہے کہ "لڑائی کے لیے آمادہ ہو" اور مردوں کے سامنے آؤ"۔ ہم سے یہ کہا ہے جس کا نشوونما میدانِ جنگ میں ہوا ہے۔ میں وہی علیؑ ہوں جس نے ان کی صفیں توڑی ہیں، ان کے آباء و اجداد کو قتل کیا ہے اور ان کی صف کو پریشان کیا ہے۔ وہی تلوار میرے قبضہ میں ہے۔ میرا دل اور بازو متین ہیں۔ جو قتل نہ ہوگا مرے گا ضرور۔ مرنے سے قتل ہونا بہتر ہے۔ مجھ پر تلوار کے ہزار زخم عورتوں کی طرح فراش پر مرنے سے زیادہ آسان ہیں"۔

اس کے بعد علیؑ نے مناجات کی۔ مسلمانوں کے درمیان جنگ کرانے والوں کی شکایت کی۔ نقض عہد اور بے وفائی کا شکوہ کیا۔ اور اپنے کو لڑائی چھڑنے سے معذور کر کے تعبیہ کا حکم دیا۔ عمار یاسر، شریح بن ہانی، سعید بن قیس، رفاعہ بن شداد البجلی، محمد بن ابی بکر، عدی بن حاتم، زیاد بن کعب، حجر بن عدی، عمر بن الحق اور جندب بن زہیر کو افسران لشکر مقرر کر کے حکم دیا کہ ہر قبیلہ اپنے افسر کے حکم پر توجہ رکھے۔ لیکن خواہش اصلاح سے علیؑ سیر نہیں ہوتے۔

صلح کے لیے علیؑ غیر مسلح میدان میں آئے اور زبیر کو حدیث یاد دلائی

رسولؐ کا کرتہ پہنا، رسولؐ کی ردا اوڑھی، سیاہ عمامہ سر پر رکھا اور رسولؐ کے مرکب دلدل پر سوار ہو کر، غیر مسلح میدان جنگ میں آئے اور آواز دی: "زبیر کہاں ہے میرے سامنے آئے"۔ زبیر آگے بڑھے اور عائشہ نے فریاد کی کہ: "کیا اسماء کو بیوہ کر ڈالے گا؟"۔ زبیر نے جواب دیا: "مطمئن رہو۔ علیؑ مسلح نہیں ہیں۔ وہ بہ قصد جنگ نہیں آئے ہیں۔ شاید مجھ سے کچھ کہنا ہے"۔ جب زبیر پہنچے تو علیؑ نے فرمایا: "اے ابا عبداللہ! یہ کس بات کے لیے تم آمادہ ہوئے ہو؟"۔ جواب دیا: "طلب خون عثمان کے لیے"۔ فرمایا: "سبحان اللہ! تم نے اور تمہارے دوستوں نے عثمان کو قتل کیا۔ قصاص کس سے طلب کرتے ہو؟"۔

اس کے بعد جناب امیرؑ نے جناب رسالت مآبؐ کے اقوال یاد دلائے۔ زبیر پر اثر پڑا اور یہ واپسی کا عہد کر کے پلٹے۔

حضرت عائشہ اور ابن زبیر کا زبیر سے مکالمہ

عائشہ نے مضمون گفتگو دریافت کیا۔ بتلایا اور کہا کہ "لڑائیوں میں مجھے بصیرت اور قوت رہتی تھی۔ لیکن آج علیؑ کے مقابلہ میں گویا تردد اور تحیر سے اپنے قدم اپنی جگہ نہیں دیکھتا۔ عائشہ نے جواب دیا کہ تم علیؑ کی تلوار سے ڈر گئے۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ تم سے پہلے بڑے بڑے ڈر چکے ہیں۔

ابن خلدون بھی حدیث بیان کرنے کے بعد عبداللہ بن زبیر سے کہلواتا ہے کہ: "ہاں جب دونوں فریق کو مجتمع کر لیا اور ایک کو دوسرے کی عداوت پر ابھار دیا تو اب چھوڑ کر جانے کا قصد کرتے ہو"۔ زبیر نے کہا: "میں نے قسم کھائی ہے"۔ جواب دیا کہ: "اپنی قسم کا کفارہ دیدو۔ اپنے غلام مکحول کو آزاد کر دو"۔

لڑائی شروع ہوئی

جنگ شروع ہوئی۔ اصحاب جمل نے تیر مارنا شروع کیا۔ علیؑ کے سپاہی خاموش کھڑے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے کہا: امیرالمومنین! اب ان کی شوخی حد سے گزر گئی اور ہمارے آدمی زخمی ہو گئے۔ اب کیا انتظار ہے؟۔ فرمایا: میں اپنی معذوریت چاہتا تھا۔ اب علیؑ نے اسلحہ جنگ زیب جسم فرمایا۔

قرآن بردار سپاہی

اور ایک جوان کو قرآن دے کر فرمایا کہ جاؤ اور اس کے اوامر و نواہی یاد دلاؤ۔ قرآن بردار سپاہی گیا، اور بہادر کی طرح اس نے ہاتھ کٹوائے اور جان دی۔ جناب امیرؑ نے اپنے فرزند محمد بن حنفیہ کو علم دیا، اور حملہ کرنے کا حکم دیا۔

مروان اور طلحہ

اثنائے گرمیٔ جنگ میں بقولِ اعثم کوفی: مروان بن حکم نے طلحہ کو ترغیب جنگ دیتے ہوئے دیکھ کر غلام سے کہا کہ: "مجھے عجب ہے کہ قتل عثمان میں طلحہ سے زیادہ کوئی حریص نہیں کرتا تھا۔ آج کہتا ہے کہ میں خون عثمان کا انتقام لیتا ہوں۔ میں مسلمانوں کو اس سے خلاص کرتا ہوں۔ تو میرے سامنے کھڑا ہو جا کہ کوئی نہ دیکھے۔ میں اسے تیر مارتا ہوں"۔ یہ کہہ کر زہر آلود تیر مارا۔ تیر طلحہ کو لگا، اور اس کے صدمہ سے بے ہوش ہو کر گرے اور کچھ دیر کے بعد مر گئے۔ عائشہ کو صدمہ ہوا۔

مولوی عباسی صاحب گورکھپوری اور روضۃ الصفا و جامع التواریخ وغیرہ نے بھی اس کا تذکرہ فرمایا ہے۔

مقتولینِ جنگ کی تعداد، منادی

جناب امیرؑ اور ان کے سرداران لشکر نے تصفیہ کیا کہ جب تک عائشہ کا اونٹ زندہ رہے گا مسلمان قتل ہوتے رہیں گے۔ اس لیے اونٹ کے پاؤں کاٹنے پر سپاہیوں کو مشغول کیا۔ اونٹ گرا۔ لڑائی ختم ہوئی، نہ اس کے قبل کی عائشہ کے نو ہزار اور علیؑ کے ایک ہزار ستر سپاہی قتل ہو چکے ہوتے۔ جناب امیرؑ نے قبل آغاز جنگ منادی کرا دی تھی کہ: "کوئی شخص اس معرکہ میں بھاگنے والے کا تعاقب کر کے اس سے نہ لڑے اور نہ کسی زخمی پر حملہ کرے اور نہ کسی کا مال و اسباب چھینے"۔ بعد ختم جنگ بھی یہی منادی کرائی۔ جس میں اس قدر زیادہ تھا کہ کوئی "کسی کے گھر میں نہ گھسے"۔ بقول روضۃ الاحباب اپنی فوج سے فرمایا کہ: "ہماری نیت دفاعی ہے نہ کہ قتل کی۔ تم ابتداء بہ جنگ نہ کرو اور مجروح یا مریض کو قتل نہ کرو"۔

عائشہ بھائی کی حفاظت میں

بعد ختم جنگ جناب امیرؑ نے بقول ابن خلدون: مقتولین کے درمیان سے عماری اٹھا لینے اور محمد بن ابی بکر کو اس پر قبضہ کرنے کا حکم دیا، اور یہ ارشاد کیا کہ: "دیکھو اُمّ المومنین کو کہیں زخم تو نہیں لگا؟"۔

عائشہ کی حسرت

جب لوگ عائشہ کے پاس گئے تو کہا: "مجھے محبوب و منظور تھا کہ آج کے واقعہ سے بیس برس پہلے میں مرجاتی"۔

زبیر بھی اس جنگ کے بعد زندہ نہ رہے۔ حضرت عائشہ ابن خلف کے مکان پر ٹھہرائی گئی تھیں۔ امیرالمومنینؑ یہاں تشریف لے گئے۔ اور بقول ابن خلدون: "چونکہ اس واقعہ میں عبداللہ بن خلف کام آئے تھے، ان کی ماں اور نیز بعض اور عورتوں نے امیرالمومنین علیؑ کو سخت و سست کہا۔ آپ نے مطلق توجہ نہ کی۔ بعض مصاحبین نے آپ کو برخلاف ان کے ابھارنا چاہا۔ آپ نے فرمایا: "چونکہ عورتیں ناقص العقل ضعیف البنیان ہوتی ہیں، اس وجہ سے ہم ہمیشہ عورت

مشرکات سے تعرض کرنے کو منع کرتے ہیں چہ جائے کہ مسلمان عورتوں سے ہم متعرض ہوں"۔

حضرت عائشہ سے مدینہ جانے کو کہا گیا

عائشہ نے عبداللہ بن زبیر کے لیے امان طلب کی اور جناب امیرؑ نے فرمایا کہ: "ہم نے تمام عالم کو پناہ دی ہے"۔ اس کے بعد جناب امیرؑ نے ابن عباس کو عائشہ کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ: "تم اب مدینہ جاؤ۔ بصرہ میں زیادہ قیام کی ضرورت نہیں ہے"۔ کچھ دیر تک آپس میں گرم کلام ہوتے اور "امیرالمومنینؑ" کے لفظ سے انکار کرتی رہیں۔ آخر میں کہا:

حضرت عائشہ کا بنی ہاشم کے متعلق خیال

"اچھا۔ اس شہر سے چلی جاؤں گی۔ مجھے کوئی گھر اس سے زیادہ دشمن نہیں ہے، جہاں اے بنی ہاشم تم ہو"۔ بقول روضۃ الاحباب کہا: "اب وہاں جائیں گے جہاں اے بنی ہاشم تم نہ ہو"۔ اور یہ سن کر ابن عباس اس کو تفصیلاً کہتے رہے کہ تمھیں تمام شرف بنی ہاشم سے حاصل ہوئے ہیں۔ اور آخر میں یہ سن کر عائشہ نے کہا کہ: "تم اطمینان رکھو کہ علیؑ تمھاری ان باتوں پر توجہ نہ کریں گے اور تمھیں اس پر مُسلّم نہ رکھیں گے"۔ ابن عباس نے جواب دیا کہ "ہم علیؑ سے ان امورات میں کوئی مضائقہ نہ کریں گے۔ اور انھیں مُسلّم رکھیں گے کہ وہ بہ نسبت میرے قریب تر ہیں"۔

حسنؑ بھیجے گئے اور انؑ کے ایک اِشارہ نے اثر کیا

ابن عباس نے واپس آکر تمام مکالمہ علیؑ سے عرض کیا۔ علیؑ نے دُوسرے دن حسنؑ کو بھیجا اور انھوں نے کہا: "امیرالمومنین سوگند یاد می کند بداں خدائے کہ خلق آفریدہ اوست کہ اگر ایں ساعت برنہ خیزی و بجانب مدینہ باز نہ گردی تخے کہ میدانی در حق تو بگوئم و عائشہ دراں ساعت سر را شانہ می کرد و گیسوئے راست بافتہ بود و چپ ماندہ۔ چوں حسن رضی اللہ عنہ ایں بگفت گیسوئے چپ نابافتہ بگذاشت و برپائے جست و گفت بشتابید و راحلہ من بیارید تا بجانب مدینہ روم"۔ یعنی: "امیرالمومنینؑ قسم اٹھاتے ہیں اس خدا کی جس نے کائنات کو پیدا کیا ہے کہ اگر اس گھڑی تو نہ اٹھی اور مدینہ کی طرف واپس نہ ہوئی تو وہ بات جو تو جانتی ہے تیرے بارے میں کہہ دوں گا۔ عائشہ اس وقت سر کو کنگھی کر رہی تھیں اور دائیں گیسو کو گوندھ چکی تھیں اور بایاں گیسو رہتا تھا۔ جب حسنؑ نے یہ کہا تو بائیں گیسو کو گوندھے بغیر چھوڑ دیا اور پاؤں پر اچھل پڑیں اور بولیں جلدی کرو میری سواری لاؤ تاکہ مدینہ کی طرف چلوں"۔

صاحب روضۃ الاحباب نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک عورت اس وقت موجود تھی اس نے کہا کہ آپ نے ابن عباس اور خود امیرالمومنینؑ کو سخت جواب دیے اس لڑکے کے کہنے سے اس قدر مضطرب ہونے کی کیا وجہ ہے اور قسم دی۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: "جس رمز کا علیؑ نے اشارہ کیا ہے اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک دن تقسیم غنیمت میں ہم لوگ زیادتی کی درخواست کر رہے تھے کہ علیؑ نے منع کیا۔ اور ہم نے سختی سے جواب دیا۔ علیؑ نے یہ آیت پڑھی کہ: عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ (۶۶ : ۵) پھر ہم نے سختی کی اور رسولؐ نے فرمایا کہ: "ایں زنان را بد ست تو کردیم ہر کرا از ایشان طلاق دہی ہیچ کس از من نباشد و از حبالہ من بر طرف گردد و ایں طلاق را وقتے

معین نہ کردہ کہ در حالت حیات من یا بعد از وفات من دہی ازاں می ترسم کہ اگر ایں ساعت اشارت علیؑ گوش نہ دارم علیؑ طلاق گوید آن گاہ ہیچ کس مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم را نباشم و از دولت ابدی محروم باشم"۔ یعنی: میں نے ان عورتوں کو تیرے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ جس کو بھی تو نے ان میں سے طلاق دے دی وہ میری بیوی نہ رہے گی۔ اور میرے حبالہ عقد سے نکل جائے گی۔ اور اس طلاق کا کوئی وقت مقرر نہ کیا تھا کہ میری زندگی میں دے یا میری وفات کے بعد دے۔ اس وجہ سے میں ڈرتی ہوں کہ اگر اس گھڑی علیؑ کے اشارہ کو نہ سنا تو علیؑ طلاق دے دیں گے۔ اس وقت مصطفیٰؐ سے میرا کوئی تعلق نہ رہے گا اور ہمیشہ کی دولت سے محروم ہو جاؤں گی۔

فتح جمل کا فائدہ

جمل کی فتح نے جناب امیرؑ کو اس قدر موقع دیا کہ وہ گرد و پیش کے دشمنوں سے ایک گونہ مطمئن ہو جائیں اور انھیں اچھی طرح پہچان لیں۔ یہ بھی ہوا کہ عطائے امان سے بہت سے زخمی دشمنوں، دشمنوں اور متوقفین نے بیعت کی اور کہا جاسکتا تھا کہ بجز شام کے تمام تمام صوبجات پر جناب امیرؑ کو اختیار حاصل ہو گیا۔ جناب امیرؑ نے بقیہ مقامات پر اپنے عامل روانہ بھی کیے۔

رجب ۳۶ھ کوفہ اور استقبال

امرا اور سرداران لشکر نے بعد ختم جنگ سوال کیا کہ: "امیرالمومنینؑ اب کس طرف توجہ فرمائیں گے کہ ہم بھی مستعد رہیں اور جواب ملا کہ اس وقت کوفہ چلنے کی صلاح ہے۔ اس کے بعد جو مصلحت ہوگی ویسا کیا جائے گا۔ اور نہ صرف وہ روساء شرفا اور امرائے لشکر جو کوفہ کے تھے اور اس وقت شریک فوج تھے خوش ہوئے۔ بلکہ خود جو کوفہ میں تھے انھوں نے نہایت مسرت اور خوشی سے استقبال کیا۔ جناب امیرؑ قصر امارت میں فروکش نہ ہوئے، بلکہ جعدہ بن ہبیرہ کے مکان کو پسند فرمایا۔ اور یہاں عمار بن سلام کے ملنے کے لیے حاضر ہوئے۔ اور جناب امیرؑ نے اکثر سے فرمایا کہ: "اگرچہ تو بھی ہمارے مخالفین میں سے تھا مگر آج مخلص ہے"۔

جنگ صفین کا مقدمہ جزیرہ کی چھیڑ چھاڑ

جناب امیرؑ کو معلوم ہوا کہ ولایت جزیرہ کے لوگوں نے عثمان کی ہوا خواہی کے لحاظ سے یہ مناسب سمجھا کہ معاویہ سے بیعت کر لیں۔ امیرالمومنینؑ نے مالک اشتر کو اس کا عامل مقرر فرما کر روانہ کیا۔ ضحاک بن قیس الفہری معاویہ کا معتمد سردار اس وقت حران میں تھا۔ اس نے اہل رقہ سے مدد طلب کی اور لکھا کہ مالک اشتر کو داخل نہ ہونے دو۔ رقہ اور حران کے لشکروں نے مل کر مالک اشتر پر حملہ کیا لیکن اشتر نے شکست دی اور ضحاک کو امیر شام سے کمک طلب کرنی پڑی۔ اشتر کے پرانے "دوست" عبدالرحمن بن خالد بن ولید فوج شام کی مدد کے لیے آئے لیکن شام کے مجموعی لشکر کو آج وہ موقع نہ ملا جو اشتر کے ساتھ حمص میں ملا تھا۔ شام سے پھر مدد آئی اور پھر اشتر کی تلوار نے سب کو شام کی سڑک دکھا دی۔ جزیرہ قبضہ میں آگیا اور اشتر نے واقعات کی باضابطہ اطلاع بھی دی۔ حالات کے ملاحظہ پر امیرالمومنینؑ نے حسب ذیل خطبہ فرمایا:

فتح جزیرہ کی اطلاع پر جناب امیرؑ کا خطبہ

خداوند عالم اپنے بندوں سے بجز اس کے راضی نہیں ہوتا کہ وہ راہ حق کے سالک ہوں اور جب تک آپس میں دوستی اور موافقت رہتی ہے اور ایک دوسرے پر طعن و تشنیع نہیں کرتے اس وقت تک ان کے قبضہ سے انتظام

اور حکومت نہیں نکلتی۔ جب اس کے خلاف کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو افعال ناپسندیدہ اور اقوالِ ناستودہ سے نسبت دیتے ہیں کاموں میں خلل واقع ہوتا ہے جس کا نتیجہ تباہی ہے۔ ضرورت خطاب یہ ہے کہ معاویہ نے اہلِ شام کو شک میں ڈال رکھا ہے۔ اور ان کے دلوں کو میری اطاعت اور بیعت سے پھیر دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ علیؑ بن ابی طالب نے عثمان کو قتل کیا۔ یہ بڑا کام میرے سپرد کیا ہے۔ اس بنیاد پر میری مخالفت میں اس نے مالک اشتر سے لڑنے کے لیے فوج بھیجی۔ جو جزیرہ کا عامل ہو کر گیا تھا، اور لشکر جمع کر کے مجھ سے لڑنے کا قصد کر رہا ہے۔ یہ صلاح معلوم ہوتی ہے کہ اسے نصیحت کروں اور خط لکھوں۔ شاید اس پر اثر ہو اور لڑائی کے خیال کو فسخ کر دے۔ اس میں تمھاری کیا صلاح ہے؟"۔ حاضرین نے جواب دیا کہ: "امیرالمومنین کی رائے نہایت مناسب ہے۔ ہم لوگ آپ کے ویسے ہی مطیع ہیں جیسے رسولؐ کے تھے"۔

معاویہ سے خط و کتابت

جناب امیرؑ اور معاویہ میں جس قدر خط و کتابت ہوئی وہ بہت زیادہ ہے۔ جو نہ صرف عام تاریخوں میں ملتی ہے بلکہ وہ نہج البلاغہ میں بھی موجود ہے۔ اس کا کوئی نتیجہ نہ ہوا، اور فریقین تلوار سے فیصلہ کے لیے آمادہ ہوئے۔

جناب امیرؑ اپنے عمال سے مدد طلب کرتے ہیں

جناب امیرؑ نے اپنے عاملوں کو اپنی ممکن فوج کے ساتھ حاضر ہونے کا حکم بھیجا۔ اور

علیؑ کا فرمان اور اشعث بن قیس

انھیں میں اشعث بن قیس کندی کے نام بھی تھا جو ان دنوں آذربائیجان کا عامل تھا۔ اسے عبد اللہ بن عامر کریز نے اس وقت مقرر کیا تھا جب کہ ابن عامر عثمان کے پاس مشورہ کے لیے آیا تھا۔ یہ اس وقت سے برابر آذربائیجان میں رہا۔ جب امیرالمومنینؑ کا فرمان پہنچا تو بقول اعثم کوفی وہ سوچنے لگا کہ امیرالمومنین کے پاس جائے یا معاویہ سے مل جائے کہ حسب فہمی سے محفوظ رہے۔ اس نے اپنے اعزا اور مقربین سے اپنا تردد بیان کیا اور سب نے اسے امیرالمومنین کی خدمت میں حاضر ہونے کی تسابلی پر ملامت کی اور یہ شرما کر مع سامان روانہ ہوا۔ اور شرف قدم بوسی حاصل کیا۔ جریر بن عبد اللہ البجلی عامل ہمدان بھی حاضر ہوا، اور یہ معاویہ کے پاس بغرض فہمائش روانہ کیا گیا۔

عمرو بن عاص پر علیؑ کی بیعت کا اثر

اس اثنا میں عمرو بن عاص بھی انتظار کا جوا کھیل رہا تھا، اور بقول ابن خلدون جب "علیؑ کی بیعت کا حال سنا سخت رنجیدہ ہوئے"۔ اور جب عائشہ کے خروج کی خبر لگی تو "اس سے ایک گونہ ان کی طبیعت کو شگفتگی ہوئی"۔ اور جب عائشہ کو شکست ہوئی تو "ان کے حالات میں تذبذب واقع ہوا"۔ اور "جب اہلِ شام اور معاویہ کو خون عثمان کا معاوضہ طلب کرتے ہوئے پایا، دل ہی دل میں خوش ہوئے"۔ اس کے بعد عمرو بن عاص کا بیٹوں سے صلاح لینا، ان کی رائے، غلام کا فقرہ، عمرو عاص کا جناب امیرؑ کی مدح کرنا، معاویہ کے پاس جانا، مکالمہ اور شرکت کے صلہ میں مصر کی دستاویز کا لکھا جانا، قریب قریب تمام تاریخوں میں پایا جاتا ہے۔

معاویہ اور عمرو بن عاص کے تصفیہ کے بعد ابن عاص کے ایک چچا زاد بھائی نے اسے ملامت کی کہ تو نے دین کو دنیا کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ اس پر ابن عاص نے ہنس کر جواب دیا: "اے برادر کارِ دُنیا حکم تقدیر سے وابستہ ہیں، نہ یہ معاویہ

اور نہ علیؑ کے ہاتھ میں ہاتھ دیں۔ میں نے کوشش کی ہے۔ شاید موافق ہو جائے اور نام و نصیب حاصل ہو"۔

ابن عباس کا ابن عم شام سے روانہ ہو کر کوفہ میں آیا، اور امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہو کر صورت معاملہ عرض کی۔ اگرچہ خود جناب امیر طے کر چکے تھے کہ معاویہ کی فوراً خبر لینی ضرور ہے لیکن صلاح لینے پر معلوم ہوا کہ کچھ لوگ عجلت اور اکثر لوگ توقف چاہتے تھے۔ بنابراس کے جناب امیرؑ نے فرمایا:

اثنائے سفارتؓ میں تیاری جنگ

"اہل شام سے لڑائی کے لیے میرا مستعد ہو جانا حالانکہ میرا قاصد جریر ان کے پاس موجود ہے۔ گویا ان لوگوں کے لیے در محبت بند کر دیتا ہے اور گویا میں اہل شام کو اگر وہ اطاعت کا ارادہ بھی رکھتے ہوں روک رہا ہوں---- ہاں میں تمھاری تیاری جنگ کو برا اور مکروہ نہیں سمجھتا"۔

جریر کو تاکیدی حکم

اس کے بعد جناب امیرؑ نے جریر کے نام حکم بھیجا کہ معاویہ سے گفتگو ختم کی جائے اور جریر نے معاویہ کو امیر المومنین کے حکم کی اطلاع دی۔ معاویہ نے عمرو بن عاص سے صلاح کی۔ سوچا گیا کہ علیؑ سے بیعت نہ کرنے میں خطرہ ہے۔ لیکن۔

شرجیل کے لیے گواہوں کی تیاری

طے یہ کیا گیا کہ شرجیل بن سمط الکندی جو روسائے شام میں سے اس وقت حمص میں سکونت پذیر تھا بلایا جائے اور چند مقبول القول گواہ تیار رکھے جائیں جو یہ کہیں کہ علیؑ نے عثمان کو قتل کیا۔ بشر بن ارطاۃ، حمزہ بن مالک، حابس بن سعد الطائی، ابوالاعور السلمی، یزید بن انس وغیرہ شہادت دینے پر راضی کیے گئے۔ شرجیل بلایا گیا، اور تیار شدہ نقل بغیر غلطی کے کی گئی۔ اور شرجیل نے جواب دیا کہ: "اب ہم میں اور علیؑ میں بجز تلوار کے اور کسی چیز سے معاملہ نہیں ہو سکتا"۔ جریر نے اس کی تقریر سنی اور اسے سمجھایا لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اب معاویہ نے جریر سے کہا: "تو نے اہل شام کی رائے سنی اور دیکھی اب تو نے جو کچھ دیکھا یا سنا ہے اسے جا کر علیؑ سے بیان کر"۔

علیؑ کے خلاف برانگیختگی کے لیے الزاماتؓ کا اعلانؓ

اس کے بعد شرجیل نے صلاح دی کہ اس امر میں بغیر موافقت عوام کام نہ چلے گا، اور اپنے زیر اثر شہروں میں تقریریں کیں، اور منادی کر دی کہ: "علیؑ بن ابی طالب نے عثمان کو قتل کیا۔ امت رسولؐ میں تفرقہ ڈالا، بصرہ میں قتل عام کیا، اب تمھاری طرف رخ کیا ہے کہ تمھیں گھروں سے نکال دے اور رنج و مشقت میں گرفتار کرے۔ کوئی بجز معاویہ کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس لیے تم سب لوگ ایسے دشمن کے دفع کرنے کے لیے معاویہ کی مدد کرو"۔ اسی زمانہ میں عبداللہ بن عمر خطاب بھی شام تشریف لائے اور امیر شام نے کمال اظہار مسرت سے عمرو بن عاص سے کہا: "مجھے معلوم ہوا کہ عمر بن خطاب پھر سے زندہ ہو گئے (لوگوں سے مخاطب ہو کر) اگر یہ علیؑ سے کشیدہ نہ ہوتے تو ہرگز میرے پاس نہ آتے۔ اب ہمارے پاس ان کی موجودگی سے لوگوں کا اعتقاد بڑھے گا"۔ عمرو بن عاص نے کہا: "یہ تیری موافقت سے نہیں بلکہ علیؑ سے بھاگ کر آئے ہیں"۔ اس کے بعد ابن عمر کے لیے تقریریں مٹھاس اور وعدہ وعید کا اہتمام کی حد تک اہتمام کیا گیا، اور ان سے چاہا گیا کہ تم منبر پر علیؑ کی مذمت کرو، اور کہو کہ انھوں نے

عثمان کو قتل کیا۔ ابن عمر نے شق ثانی کو قبول کیا۔ لیکن منبر پر جا کر ہکا بکا ہوگئے اور اتر آئے۔ جب پوچھا گیا تو کہا کہ: "میں نے نہ چاہا کہ منبر پر جھوٹ بولوں"۔

کس نے معاویہ کی دعوت قبول کی اور کس نے نہ کی

امیر شام نے عبداللہ بن عمر، سعد بن ابی وقاص، محمد بن مسلمہ انصاری وغیرہ کو اپنا ساتھ دینے کے لیے بلایا۔ لیکن ان سب لوگوں نے اسے سخت جواب دیے۔ بقول روضۃ الصفا مشہور ابوہریرہ، ابودرداء، ابو اسامہ اور نعمان بن بشیر انصاری نے معاویہ کی دعوت قبول کی اور اب معاویہ نے اہل شام کے سامنے خطبہ دیا اور کہا: "تم لوگ بیان کرو کہ علیؑ کو مجھ

معاویہ علیؑ کے مقابلہ میں اپنی فضیلتوں کا رجز پڑھتا ہے

پر کس بات سے فضیلت ہے۔ میں رسولؐ کا منشی تھا، میری بہن ان کے گھر میں تھی، میں عثمان کا نائب اور عامل تھا، میری ماں ہندہ دختر عتبہ بن ربیعہ ہے۔ اگر اہل حجاز و عراق نے علیؑ سے بیعت کی ہے تو اہل شام نے میری بیعت کی ہے۔ ہم میں اور علیؑ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر دو شخص کسی چیز کے بارے میں جنگ کریں تو وہ چیز اس کی ہے جو غالب ہو"۔ اور پھر علیؑ کو خط لکھا کہ: "پہلے اہل حجاز اجرائے احکام حق کے حاکم تھے، اب وہ اختیارات شام میں منتقل ہوگئے"۔ اور بہت سی خط و کتابت کے بعد علیؑ نے جواب دیا کہ "تو اپنے باپ کا بیٹا نہ ہوتا اگر اس کے افعال کی تقلید نہ کرتا"۔ اگر معاویہ نے لکھا کہ ہم اتنے تلوار اور سپاہی رکھتے ہیں، لڑنے کو تیار رہو، تو علیؑ نے جواب دیا کہ: "وہ ہاتھ جس نے تیرے نانا عتبہ، ماں کے چچا شیبہ، ماموں ولید اور بھائی حنظلہ کو قتل کیا ہے ابھی ویسا ہی سالم ہے"۔ یا کبھی فرمایا کہ: "حقیقت یہ ہے کہ تو نے عثمان کی وہاں مدد کی جہاں تجھے اس کی مدد سے فائدہ پہنچا اور اس مقام پر اس کی امداد سے ہاتھ اٹھا لیا جہاں اسے تیری امداد سے فائدہ پہنچ سکتا تھا"۔

مروان بن حکم عثمان کی تلوار لگائے تھا

فوجیں روانہ ہوئیں، معاویہ کے انتظام فوج میں لحاظ طلب بات یہ تھی کہ مروان بن حکم عثمان کی تلوار حمائل کیے ہوئے فوج کے آگے آگے رکھا گیا تھا۔ جناب امیرؑ نے فوجی احکام کے ساتھ اپنے سرداران لشکر کو روانہ کرنا شروع کیا۔ اپنے مقدمہ لشکر کے افسر زیاد بن نضر اور شریح بن ہانی سے فرما دیا کہ "دیکھنا قبل اس کے کہ دشمن تمہیں لڑائی کے لیے میدان میں طلب کریں قبل اس سے کہ ان کے عذر تمام ہوں کہیں ان کے سینوں میں جوش کھانے والی دشمنیاں تمہیں ان کے ساتھ قتل و قتال پر آمادہ نہ کریں"۔ اور یہ احتیاط تھی افسروں میں کہ مالک اشتر نے ابوالاعور کا انکاری خط ثبوت کے لیے امیرالمومنین کے دکھانے کو اپنے پاس رکھ لیا۔

صفین میں جناب امیرؑ کا خواب

جناب امیرؑ کا خواب جسے میں نے مقدمہ کتاب میں ذکر کیا ہے صفین کی روانگی کے زمانہ میں تھا جسے ملا جامی ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں: بکربلا رسید براست و چپ نگریست و گریان گریان ازانجا بگزشت۔ پس گفت واللہ این ست محل خوابانیدن شتران ایشان و موضع مردن ایشان۔ اصحاب گفتند اے امیرالمومنین این چہ موضع است؟ فرمود کہ این کربلا است۔ این جا قومے رابکشند کہ بے حساب در بہشت درانید بعد ازان برفت و ہیچ کس تاویل سخن وے ندانست تا آن روز کہ

واقعہ امیرالمومنین حسین رضی اللہ عنہ واقع شد"۔ یعنی: کربلا پہنچے، دائیں بائیں دیکھا اور روتے روتے وہاں سے گزر گئے۔ پھر فرمایا اللہ کی قسم یہ مقام ہے ان کے اونٹوں کو بٹھلانے کا اور ان کے قتل ہونے کا۔ ساتھیوں نے کہا اے امیرالمومنینؑ یہ کونسا مقام ہے۔ فرمایا یہ کربلا ہے۔ اس جگہ ایک ایسے گروہ کو قتل کریں گے کہ جو بلا حساب جنت میں داخل ہوں گے۔ اس کے بعد چلے گئے اور کسی کو اس بات کی تاویل معلوم نہ ہوئی، اس دن تک کہ امیرالمومنین حسینؑ کا واقعہ پیش آیا"۔

صاحب سرالشہادتین فرماتے ہیں کہ: "اور برملا ذکر کیا امیرالمومنین کرم اللہ وجہہ نے صفین کے سفر میں"۔

اعثم کوفی یہ ذکر کرتے ہوئے کہ فرات کے کنارہ تشریف رکھتے تھے اور نیند آگئی تھی۔ "ہمدران زمان بیدار گشت چنانکہ کسی از چیزے ترسیدہ باشد ہمدران حالت ابن عباس را بخواند و فرمود اے عبداللہ عجب خوابے دیدہ ام ۔۔۔ دیدم کہ جماعتے از مردان سپید روئے از آسمان می آمدند ۔۔۔ پس این درختان خرما را دیدم کہ شاخہائے خویشتن بر زمین میزدند و جوئے دیدم کہ پر از خون تازہ می رفت و حسینؑ پسر من او را دیدم در میان جوئے خون افتادہ و فریاد می خواست و او راکس بفریاد نمی رسید و مدد می جست وکسے او را مدد نمی کرد پس آن مردان سپید روئے را دیدم کہ منادی می کردند و می گفتند صبر کنید اے فرزندان رسولؐ خدا و بدانید کہ بر دست بد ترین خلق کشتہ می شوید"۔ یعنی: اسی وقت بیدار ہو گئے جیسے کوئی کسی چیز سے ڈرا ہو، اسی حالت میں عبداللہ بن عباس کو بلایا اور فرمایا اے عبداللہ عجیب خواب دیکھا ہے۔ دیکھا کہ سفید رو مرد آسمان سے آئے۔ پھر ان کھجور کے درختوں کو دیکھا کہ اپنی شاخیں زمین پر مار رہے ہیں۔ اور ایک نہر دیکھی کہ تازہ خون سے پر بہہ رہی ہے۔ اپنے بیٹے حسینؑ کو دیکھا کہ خون کی نہر میں گرا فریاد کر رہا ہے اور کوئی بھی اس کی فریاد کو نہیں پہنچتا اور مدد طلب کرتا ہے مگر کوئی اس کی مدد نہیں کرتا۔ پس اس سفید رو مردوں کو دیکھا کہ منادی کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں اے رسولِ خداؐ کی اولاد صبر کرو اور جان لو کہ بد ترین مخلوق کے ہاتھ سے شہید ہو گے۔

حسینؑ کو صبر اور مُصیبت آنے کے پہلے تیار ہونے کی نصیحت

اس کے بعد حسینؑ کو قریب بلایا اور فرمایا: "اے فرزند صبر کر اور صبر میں ثابت قدم رہ کہ دنیا محنت و بلا کی جگہ ہے"۔ میں نہیں جانتا کہ جناب امیرؑ کے دیوان کا یہ شعر کہ:

حسین اذا کنت فی بلدۃ غریباً فعاشر بآدابہا

یعنی: اے حسینؑ کسی شہر میں مسافر ہو تو اس کے آداب کے مطابق معاشرت کرو۔

اور اس کے بعد کے اشعار اسی موقع کے لیے یا اس کے بعد کے لیے تھے۔ جن کا مفہوم یہ ہے کہ: "خوشی نہ کر دنیا کے اسباب پر اور پریشان نہ ہو اس کے رنج و غم سے۔ قیاس کر آنے والے کل کو گزشتہ کل پر تاکہ تو راحت پائے۔ اور عربیوں کی طرح تلاش نہ کرے گویا کہ میں بذات خود مع اپنی اولاد کے کربلا اور کربلا کے مقام جنگ میں ہوں۔ رنگین ہیں ہماری ڈاڑھیاں خون سے مثل رنگین ہونے عروس کے اپنے لباس میں۔ چند مصیبتیں ہیں کہ آمادہ کریں گی تجھ کو پھر جانے پر۔ پس آمادہ ہو ان کے آنے سے پہلے ۔۔۔ اے حسینؑ پریشان نہ ہو فراق احباب سے کہ دنیا تیری بربادی کے لیے پیدا ہے"۔

اہل شام نے فرات کا پانی روکا

معاویہ کا لشکر فرات سے قریب اترا تھا۔ جب امیرالمومنینؑ کے سپاہی پانی لینے گئے تو انھیں شامیوں نے روکا۔ یہ خبر جناب امیرؑ کو ہوئی۔

آپ نے شبث ربعی اور صعصعہ بن صوحان کو بلا کر فرمایا کہ تم لوگ معاویہ کے پاس جاؤ اور کہو کہ: تیرے لشکر نے ہمارے خدمت گار اور چار پایوں کو پانی سے روک دیا ہے۔ لشکر کے ساتھ ضعیف، کمزور اور بوڑھے بھی ہیں۔

جناب امیرؑ پانی کو وجہِ جنگ نہیں قرار دینا چاہتے تھے

یہ مناسب نہ ہوگا مسلمانوں سے پانی باز رکھا جائے۔ اگر ہم تیرے پہلے وارد ہوتے تو ہرگز منع نہ کرتے۔ اس وقت دو باتوں میں سے ایک کرنی ہوگی یا تو ہمارے خادموں کو پانی لینے دے اور تیرا لشکر بھی بقدر ضرورت سیراب ہو۔ دونوں طرف سے ایک دوسرے کو پانی کی روک نہ ہو۔ اور اگر مضائقہ ہے تو جس وجہ سے جنگ کی تیاری ہے اسے ترک کر کے پیشتر پانی کے واسطے جنگ کریں جسے فتح ہو اس پر قبضہ کرے"۔

صعصعہ اور ولید کی گرم گفتگو

یہ لوگ گئے اور معاویہ سے کہا۔ لیکن ولید بن عقبہ کی یہ صلاح پسند کی گئی کہ: "اے معاویہ! یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے چالیس روز تک عثمان کو پانی نہ دیا۔ یہ لوگ مستحق عذاب ہیں۔ خدا انھیں اس عالم میں بھی پانی نہ دے گا"۔ یہ سن کر صعصعہ نے کہا: "اے پسر عقبہ خدا تیرے ایسے کافروں کو جس نے گناہ کیے اور بدکاریں، پانی نہ دے گا تو نے شراب پی۔ مسجد جامع کوفہ میں بحالت مستی پیش نمازی کی اور صبح کی نماز چار رکعت پڑھی، اور سلام پھیرنے کے بعد کہا کہ آج بہت خوش ہوں کہو تو دو چار رکعت اور اضافہ کر دوں۔ عثمان نے تجھے حد ماری۔ تو نے علیؑ سے مناظرہ کیا جس پر تیرے لیے کفر اور علیؑ کے لیے مومنیت کی آیت نازل ہوئی اور تو مہاجر و انصار کے سامنے ذلیل ہوا"۔ اس پر ابن ابی سرح نے ولید کی حمایت کی اور تلوار کھینچی لیکن بیچ بچاؤ کر دیا گیا۔

ابوالاعور گھاٹ کا محافظ تھا

ان لوگوں نے امیرالمومنین سے حالت بیان کی اور اجازت جنگ طلب کی۔ اجازت دی گئی۔ ابوالاعور نے روکا لیکن آخر میں بقول ابن خلدون:

"ہمراہیان امیرالمومنین نے اس تیزی سے حملے شروع کیے کہ لشکر شام کے پاؤں اکھڑ گئے۔ دریائے فرات سے ان کا قبضہ اٹھ گیا۔ اشتر اور ان کے ہمراہی پانی پر قابض ہو گئے۔

فتح کے بعد علیؑ نے دشمن کے ساتھ حق بشری کا لحاظ کیا

ان لوگوں کا بھی یہی قصد تھا کہ ہمراہیان معاویہ کو پانی نہ دیں۔ لیکن امیرالمومنین علیؑ نے اس سے منع کیا"۔

امیرالمومنین گویا ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ ہم کب موقع پائیں اور نصیحت کریں، نہ صرف اس واقعہ کے بعد آپ نے اپنے بعض نامی افسروں کو معاویہ کے پاس روانہ کیا، بلکہ محرم تک لڑائی کو سختی سے جاری نہ کرنے کی وجہ بیان فرمائی کہ: "شاید معاویہ سوچے اور مخالفت سے باز آئے"۔ اور پھر عدی بن حاتم وغیرہ کو بھیجا اور انھوں نے کہا: "اے معاویہ امیرالمومنین علیؑ کی اطاعت قبول کر لو۔ شاید اللہ تعالیٰ تمہارے بیعت کرنے سے مسلمانوں میں اتفاق پیدا کر دے، اور واقعی تمہارے سوا کسی اور شخص نے بیعت سے تخلف نہیں کیا"۔ یزید بن قیس نے کہا: "ہم تم کو نصیحت نہیں کرنے آئے ہیں لیکن اس امر کی ضرور کوشش کریں گے کہ تفرق جماعت نہ ہونے پائے اور آپس میں ربط و اتحاد بڑھے"۔ اس کے بعد آپس میں سختی سے کلام ہوئی۔

معاویہ کی پس پردہ کار روائی

اور معاویہ نے بقول ابن خلدون: "زیاد بن حفصہ کو تنہائی میں لے جا کر امیرالمومنین کی شکایت کی اور ان کے قبیلہ سے مدد طلب کی اور یہ کہا کہ: "دونوں شہروں میں جس کو پسند کرو گے اس کا میں تم کو والی کردوں گا"۔ زیاد نے اس سے انکار کر کے کہا: "میں موید من اللہ ہوں گنہگاروں کا معین نہیں ہو سکتا"۔

اس وقت علیؑ کے رفقا کی ہم آہنگی

اس کے بعد "معاویہ نے عمرو بن العاص سے کہا میں ان میں سے جس سے کچھ بات کہتا ہوں وہ ایک ہی جواب دیتا ہے۔ گویا ان سبھوں کے دل ایک ہی ہیں"۔

قاتلانِ عثمان کی فہرست

معاویہ نے بھی امیرالمومنین کے پاس شرحبیل وغیرہ کو بھیجا۔ اعثم کوفی نے قاتلان عثمان کی حوالگی کا سوال ابوہریرہ اور ابودردا کی معرفت کرایا ہے۔ جناب امیرؑ نے ان کے ناموں سے لاعلمی ظاہر فرما کر کہا کہ: "اگر تجھے یقین ہو تو جس نے قتل کیا ہو اسے گرفتار کر کے لے جا"۔ روضۃ الصفا نے ابودردا وغیرہ کی فہرست میں قریب قریب ان تمام لوگوں کو داخل کیا ہے جو جناب امیرؑ کے بڑے جان نثار تھے۔

دس ہزار نے اپنے کو قاتلِ عثمان کہا، اور قتل کی وجہ بتائی

ابوہریرہ کسی ایک کے پاس گئے اور صورت معاملہ بیان کی۔ لشکر میں شور ہوا اور قریب دس ہزار سپاہی آمادہ جنگ ہو کر کہنے لگے: "ہم سب نے عثمان کو قتل کیا ہے۔ وہ جب تک قاعدہ پر تھے اور حکم خدا و رسولؐ کی اطاعت کرتے تھے ہم سب مطیع تھے۔ جب اس سے تجاوز کیا، اور مسلمانوں کو رنج دینا شروع کیا اور بنو امیہ کو مسلمانوں پر مسلط کردیا تو ہم سب نے بالاتفاق قتل کیا اور سب شریک ہیں"۔

حسینؑ کا مشترک عہدہ

محرم کے بعد کے اعلان جنگ پر جو فوجی انتظام ہوا، ان میں حسینؑ سواران میمنہ کی افسری میں اپنے برادر معظم کے شریک تھے۔

محرم ۳۷ھ صفین اعلانؑ

ابن خلدون نے بھی منہزمین منعفا اور عورتوں کے متعلق صفین میں جناب امیرؑ کے حکم کو نقل کیا ہے۔ جس میں یہ زیادہ ہے کہ: "کسی کا ستر نہ کھولنا" اور نہ مثلہ کرنا، اور نہ کسی عورت پر غصہ سے دست اندازی کرنا، اگرچہ وہ تم کو گالیاں دیں۔ کیونکہ وہ ضعیف النفس و القویٰ ہیں۔

محمد بن حنفیہ کو ابن عمر کے مقابلہ سے روکا

ابن خلدون اور اعثم کوفی نے اس روز کی جنگ میں جس میں معاویہ نے عُبیداللہ بن عمر کو میدان جنگ میں بھیجا ہے اور امیرالمومنین نے محمد بن الحنفیہ کو حملہ اور لشکر کا افسر مقرر کیا تھا لکھا ہے کہ: "عُبیداللہ بن عمر نے صف لشکر سے علیحدہ ہو کر محمد بن الحنفیہ کو مقابلہ کے لیے للکارا۔ محمد بن الحنفیہ جوش مردانگی میں آکر نکلے لیکن امیرالمومنین علیؑ نے گھوڑا دوڑا کر واپس کرلیا"۔

حسنؑ کو نہ روکا

اعثم کوفی کو ایک دوسرا واقعہ لکھنا ہے کہ: عُبیداللہ بن عمر نے حسنؑ کو طلب کیا۔ حسنؑ میدان میں تشریف لے گئے اور انھیں مسلح دیکھ کر ابن عمر نے کہا:

حسنؑ اور ابن عمر کا مفید مکالمہ

"تم نے اسلحہ کیوں پہنا۔ معاذاللہ مجھے تم سے مخالفت نہ تھی، بلکہ صرف ملاقات کرنی تھی اور اس کے ضمن میں کچھ نصیحت کرنا چاہتا تھا"۔

حسنؑ نے کہا: تمھیں جو کچھ کہنا ہو کہو۔

کہا: تمھارے باپ نے قریش کے ساتھ اچھی زندگی بسر نہیں کی۔ اس لیے لوگ ان کے دشمن ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ عثمان کو قتل کیا۔ مصلحت یہ ہے کہ تم علیؑ کا ساتھ چھوڑ کر ہمارے پاس چلے آؤ کہ ہم لوگ اتفاق کر کے خلافت تمھارے سپرد کریں۔ سب مطیع ہو جائیں اور خصومت برطرف ہو جائے۔

فرمایا: تو چاہتا ہے کہ میں خلاف حکم رسولؐ کروں اور خلیفہ و وصی رسولؐ کا مخالف بنوں۔ تیری آنکھوں میں بصیرت نہیں رہی۔ تو دین سے نکل کر ظالم، بدکردار، فاسق و مکار کے پاس گیا۔ شاید تو بھول گیا کہ وہ اور اس کا باپ ہمیشہ مسلمانوں کا دشمن رہا۔ یہ سب خدا و رسولؐ پر ایمان نہیں لائے۔ صرف مصلحت وقت پر نظر ڈال کر اپنی حفاظت کے لیے ان لوگوں نے کلمہ پڑھ لیا۔ تو اب واپس جا۔ اور مجھ سے جہاں تک ہو سکے کوشش کر کہ ہم خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں اور جب تک ممکن ہوتا ہے کسی کو نہیں ستاتے۔

اور سپاہیوں کو ملانے کی کوشش

معاویہ اب نہ صرف علیؑ کے اکثر سپاہیوں کے ملانے کی کوشش میں رہا۔ مثلاً خالد بن معمر السدوسی کو امارت خراسان کی لالچ دی۔ جس وقت وہ شام کی فوجوں کو معاویہ کے خیمہ تک ہٹا لایا تھا اور اس کے بعد تساہلی کرنے لگا بلکہ اب امیر شام نے یہ دیکھ کر کہ ہمارے سپاہی اور افسر علیؑ کے سپاہی اور افسروں کے ایسے شجاع اور پرجوش نہیں ہیں۔ اور ترکیبیں اختیار کیں۔ مثلاً

معاویہ آخری حیلے کر رہا تھا

نعمان بن جبلہ تنوخی کو جس کا میلان علیؑ کی طرف تھا اور امیر شام سے صاف نہ تھا بلایا۔ استفسار کیا۔ بیٹا بنایا اور چاہا کہ تو اپنے بڑے قبیلہ سے ہماری مدد کر۔ نعمان مارا گیا۔

ابن عمر قتل ہوئے

اور کبھی ابن الخطاب سے کہا کہ آج تمھیں کچھ کرو کہ اہل شام خوش ہوں۔ یہ بھی مارے گئے نہ اس کے قبل کہ بقول ابن خلدون یہ کہہ چکے ہوتے کہ: "اے اہل شام یہی لوگ امیرالمومنین عثمان کے قاتلین ہیں، ذرا خدا کا خیال کرو۔ ایسی مردانگی پر امیرالمومنین عثمان کے خون کا بدلہ لینے کو آئے تھے"۔

معاویہ کو موقع ملا

ان کے مارے جانے سے وہ موقع ملا جس کے حاصل کرنے کے لیے انھیں قتل کرا دینا مفید تھا۔ معاویہ نے اظہار غم میں مبالغہ کیا۔ اور سرداران لشکر نے متاثر ہو کر انتقام پر آمادگی ظاہر کی۔ اسی نشان فوج کے نیچے فوجیں جمع ہوئیں، اور ایک بڑا نشان آگے چلا۔ عبرت ناک جنگ ہوئی۔ جس میں تلواریں، نیزے اور چھریاں ٹوٹیں اور بے کار ہوئیں۔ یہاں تک کہ سپاہیوں نے دانتوں سے بوٹیاں کاٹیں۔

قومی تمیز

عمار یاسر بلند آواز سے کہہ رہے تھے کہ: "جو شخص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرے اسے چاہیے کہ وہ مال و اولاد کی طرف واپس جانے کی امید نہ رکھے"۔ اور امیرالمومنین کے سپاہی جواب دیتے تھے کہ: "ہمارے ساتھ ہو کر ان لوگوں پر حملہ کرو جو خون عثمان کے طالب ہیں اور اس ذریعہ سے اپنے دلی باطل خواہشات کے مکر کو پھیلاتے ہیں"۔ ان کے ساتھ اصحاب رسولؐ کی سیل چلی۔ ابن عاص دکھائی دیا اور اس سے کہا: "اے عمرو! تف ہو تجھ پر تونے اپنے دین کو مصر کے عوض فروخت کر ڈالا"۔

رسولؐ کی پیشین گوئی پوری ہوئی

جنگ ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ رسولؐ کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی کہ: "عمار کو گروہ باغی مارے گا"۔

جناب امیرؑ کا شغل

امیرالمومنین کا یہ شغل تھا کہ: کبھی ان کی تلوار گرد و پیش موت برساتی تھی۔ کبھی گھوڑے سے اتر کر کسی مقدس مجاہد کو دم توڑ لینے کے لیے اپنا زانو عنایت فرماتے تھے اور کبھی کسی مرتے ہوئے سپاہی کا آخری سلام لیتے تھے۔

لشکرِ شام کی حالت

لشکر شام کی ہمتوں کے پرزے جدا ہو گئے تھے اور ان پر عام یاس اور خوف طاری تھا۔ یہاں تک کہ معاویہ کو ان لفظوں سے تسکین کی ضرورت ہوئی کہ: "اگر ذوالکلاع (حمیری) ہمارے لشکر سے مارا گیا تو علیؑ کے لشکر سے عمار یاسر قتل ہوا۔ اگر حوشب (ذوالظلیم) کا حادثہ ہوا تو ہاشم بن عتبہ بھی زندہ نہیں ہے۔ اگر عبیداللہ بن عمر بن الخطاب قتل ہوئے تو عبداللہ بن بدیل بھی مارے گئے"۔

معاویہ کو علیؑ کے لشکر میں کن کی فکر تھی

"اولیٰ یہ ہے کہ ہم لوگ دل تنگ نہ ہوں بلکہ خوش ہوں کہ تین آدمی سے جن کا عرب میں نظیر نہ تھا خلاص مجھے اب تین آدمی اور رہ گئے ہیں: اشتر نخعی، اشعث بن قیس و عدی بن حاتم۔ کوشش کرو کہ یہ بھی تمام ہو جائیں"۔

مالک اشتر اور علیؑ

میدان جنگ میں اب شام کا تعبیہ اور نظام فوج بھی قائم نہ رہتا تھا اور غالباً اشتر کی مخلصانہ رقابت گوارا نہ کرتی تھی کہ اس کی شمشیر زنی جناب امیر کے ناقابل مقابلہ قوی نفس کی موجودگی سے اپنے درجہ سے دھندلی پڑ جائے۔ اور وہ مطیعانہ لجاجت سے کہہ اٹھتا تھا کہ: "یا امیرالمومنین خوش ہو جیے کہ میدان ہمارے ہاتھ ہے۔ نزدیک ہے کہ ہم بعنایت ایزدی فتح یاب ہوں۔ آپ بہ سعادت واپس ہوں کہ سرداران لشکر آپ کو ڈھونڈھ رہے ہیں"۔

حسینؑ شریکِ جنگ ہیں

بہادر اشتر دیکھتا ہے کہ حسن، حسین، محمد حنفیہ، محمد بن ابوبکر اور عبداللہ بن جعفر کی تلواریں سرخ ہو رہی ہیں اور اب اپنے رجز میں ان کی مدح بھی شامل کر لیتا ہے۔

اعثم کوفی کے موافق معاویہ اب امیرالمومنینؑ کو خط لکھتا ہے۔ جس میں قتل عام کے تذکرہ کے بعد گزارش کرتا ہے کہ ہم اپنے صوبہ پر رہنے دیے جائیں اور ہم سے بیعت طلب نہ کی جائے تو لڑائی موقوف ہو جائے۔ اور جناب امیرؑ فرماتے ہیں کہ ابھی یہ معرکہ تمام نہیں ہوا۔ تونے کونسا نیا حق قائم کر لیا ہے کہ دوبارہ یہ استدعا کرتا ہے۔ شام پر تیرے قائم رہنے کی درخواست بغیر میری بیعت کیے ممکن نہیں ہے۔

معاویہ علیؑ سے دست بدست جنگ سے دور رہا

جناب امیرؑ نے علاوہ خطوط اور متواتر سفارت کے یہ بھی چاہا کہ خود اور معاویہ میں دست بدست جنگ سے فیصلہ ہو جائے اور عمرو بن عاص نے بھی جو اپنے مشہور غیرت دارانہ تفنن سے علیؑ کے ہاتھ سے بھاگ نکلا تھا، امیر شام کو غیرت دلائی لیکن معاویہ نے ہنس کے ٹال دیا۔

علیؑ مجموعی حملہ کے لیے لشکر کو آمادہ کرتے ہیں

امیرالمومنینؑ فیصلہ کن جنگ کے لیے آمادہ ہوئے اور اپنے سپاہیوں سے فرمایا:

"یہ قوم اگر دین کے حدود کو منتقل نہ چھوڑتی، باطل کی سعی اور وسوسہ شیطانی سے خدا کی نعمتوں کا کفران نہ کرتی تو میں کبھی میدان میں قدم نہ رکھتا۔ لیکن میں مجبور ہوں کہ بہ ضرورت اس قوم کی ہدایت کرنی ہوگی اور طریقہ دین کی طرف بلانا ہوگا۔ حالت یہ پہنچی ہے کہ بغیر جنگ کیے چارہ نہیں۔ صبر نہایت اچھی چیز ہے۔ علی الخصوص جنگ میں عجز اور کاہلی سے کسی کا کام نہیں ہوا۔ ان دو خصلتوں سے ادبار اور رنج ہوتا ہے۔ نصیب اور اقبال کارکنی اور محنت کشی سے حاصل ہوتا ہے۔ صبر اور نصرت کو ایک دوسرے سے قریبی تعلق ہے۔ ثبات اور وقار سے مشکل کام سہل ہو جاتے ہیں"۔

اٹھارہ ہزار کا حملہ اور اس کا اثر

اس وقت اٹھارہ ہزار سپاہی جان دینے اور جنگ کرنے کے لیے مستعد ہوئے۔ اشتر آل مذحج کو بڑھاتا ہوا، ابن عباس بصرہ کے سپاہیوں کے ساتھ، قیس بن سعد اپنی قوم اور علیؑ حجازیوں کی فوج کے ساتھ بڑھے۔ عدی بن حاتم رکاب میں حاضر رہا اور اس حکم نے فوج میں گشت کی کہ جوں ہی میں حملہ کروں یہ اٹھارہ ہزار آدمی اس طرح حملہ کریں کہ سب کا حملہ ایک کا حملہ سمجھا جائے۔ یہ خاموش لیکن منظم لشکر بڑھا۔ ذوالفقار کی نرم خمیدگی نے کسی طرح اس کی ہیبت میں کمی نہ کی تھی۔ اٹھارہ ہزار تلواریں پیچھے چمک رہی تھیں، جن پر سپاہیوں کے ہاتھ کی گرمی اور جوش نے صیقل کیا تھا۔ اس افسوس سے کام نہیں چلتا کہ عکسی متحرک تصویر کے فن کی ایجاد کیوں نہ ہوئی تھی کہ یہ جلالت خیز منظر دکھائی دیتا۔ سوچو کہ لشکر شام دل کی کس حالت سے اس امڈتے ہوئے دریا کا انتظار کرتا ہوگا؟

عمرو بن عاص کی چیخ

شاعرانہ تصویر کشی کی ضرورت نہیں ہے۔ جس وقت اس لشکر نے پہلا حملہ کیا تو عمرو بن عاص چیخ اٹھا کہ: "اگر علیؑ نے ایک حملہ ایسا ہی کیا تو لشکر کا کہیں نشان نہ ملے گا"۔

ایک دن کے مقتول

ان لڑائیوں میں کوئی لڑائی ایسی بھی تھی جس میں فریقین کے چھتیس ہزار مارے گئے اور غالباً وہ کوئی دوسری لڑائی لیلۃ الہریر کی آخری لڑائیوں کے علاوہ نہیں ہو سکتی تھی۔

مالک اشتر نے شام کے علمدار کو قتل کیا۔ شاہی نشان سرنگوں ہو گیا اور امیرالمومنینؑ نے "پیہم مددینجی شروع کی"۔

اہلِ شام کی فریاد

اہل شام کی آوازیں رحم کے لیے بلند ہوئیں۔ اور بقول ابن خلدون: "عمرو بن عاص اشتر کے حملہ سے گھبرا گئے اور اپنے ہمراہیوں کے کشت و خون سے ڈر کر معاویہ سے کہا:

حیلۂ قرآن

"کیا دیکھتے ہو، تمہارے ہاتھ میدان نہ آئے گا۔ لوگوں کو حکم دو کہ قرآن شریف کو نیزوں پر اٹھائیں اور آواز بلند سے کہیں ہمارے تمہارے درمیان یہ قرآن شریف ہے اگر اس کو

وہ لوگ منظور کریں گے تو سرِدست لڑائی بند ہو جائے گی۔ کشت و خون سے نجات مل جائے گی اور اگر ان میں سے بعض لوگوں نے اس سے اختلاف کیا تو ان کے اختلاف سے بھی ہم کو فائدہ پہنچے گا"۔ چنانچہ مصاحف نیزوں پر اٹھائے گئے۔ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا: "ہم کتاب اللہ کے فیصلہ کو منظور کرتے ہیں"۔

علیؑ دشمن کے فریب سے آگاہ اور حصول حق کے لیے آمادہ کرتے ہیں

امیرالمومنین علیؑ نے للکارا: اے اللہ کے بندو! اپنے حق کے حاصل کرنے کو بڑھو اور دشمنوں سے جنگ کرنے میں تامل نہ کرو۔ کیونکہ معاویہ، ابن ابی معیط، حبیب، ابن ابی سرح، ضحاک نہ صاحب دین و قرآن ہیں اور نہ صاحب ایمان ہیں۔ ہم ان کی حالت سے بخوبی واقف ہیں۔ ہم ان کے لڑکپن اور بڑے ہونے کے بعد بھی صحبت میں رہے ہیں۔ لڑکپن میں وہ نہایت شریر لڑکوں میں سے تھے اور سن شعور میں پہنچ کر بھی بے حد شریر آدمیوں سے ہوا۔ افسوس ہے تم کو کچھ نہیں پڑتا۔ ان لوگوں نے قرآن شریف کو براہِ مکر و فریب اٹھایا ہے۔

لشکر کی مخالفت

لوگوں نے کہا: "ہم سے یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم کتاب اللہ کی طرف بلائے جائیں اور اس کو منظور نہ کریں"۔ امیرالمومنین نے ارشاد کیا: "ہم لوگوں سے اس لیے لڑتے ہیں کہ کتاب اللہ پر عمل کریں۔ کیونکہ انھوں نے اس کو پس پشت ڈال دیا ہے"۔ مسعر بن فدک تمیمی اور زید بن حصین الطائی مع ان لوگوں کے جو بعد کو خوارج ہو گئے تھے بولے: "اے علیؑ کتاب اللہ کو منظور و قبول کرو ورنہ ہم تم کو چھوڑ دیں گے اور تمہارے ساتھ وہی برتاؤ کریں گے جو ابن عفان کے ساتھ ہم نے کیا تھا"۔ امیرالمومنین علیؑ نے فرمایا: "اگر تم میرے مطیع ہو تو برابر لڑتے رہو اور اگر باغی ہوا چاہتے ہو تو جو تمہاری سمجھ میں آئے وہ کرو"۔

اشترؒ کی طلبی اور اس کا جواب

خوارج نے اب اشتر کو میدانِ جنگ سے واپس بلانے پر زور دیا۔ اور اشتر نے جن پر اب تک واقعات واضح نہ ہوئے تھے نہایت پیچ کہا کہ: "یہ وقت میری طلبی کا نہیں ہے اور نہ یہ مناسب ہے کہ میں موقع جنگ سے ہٹایا جاؤں۔ مجھے قوی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے فتح و نصرت عنایت فرمائے گا"۔ خوارج نے پھر زور دیا۔ پھر قاصد گیا

آخری پیغام اور اشترؒ کا جواب

اور جناب امیرؑ نے کہلوایا کہ: "جہاں تک جلد ممکن ہو میرے پاس آجائے۔ کیونکہ فساد کا دروازہ کھل گیا"۔ اشتر نے دریافت کیا: "کیا قرآن شریف کے اٹھانے سے؟"۔ زید (قاصد) نے جواب دیا: "ہاں"۔ اشتر بولے: "مجھے اس کا خیال پہلے ہی ہوا تھا کہ لوگوں میں اختلاف پڑ جائے گا۔ اور مجموعی حالت جماعت کی باقی نہ رہ جائے گی۔ میں کیسے ان لوگوں کو چھوڑ کر واپس چلوں اللہ تعالیٰ کی عنایت سے فتح ہوا ہی چاہتی ہے"۔ زید نے کہا: "کیا تم اسے دوست رکھتے ہو کہ تم تو فتحیاب ہو اور امیرالمومنین دشمنوں کے حوالہ ہو جائیں یا شہید کر ڈالے جائیں؟"۔ اشتر یہ سنتے ہی مسعر وغیرہ کے پاس چلے آئے اور ان سے مخاطب ہو کر کہا: "اے اہل عراق! بڑے افسوس کا مقام ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے تم کو ان لوگوں پر غالب کیا اس وقت تم لوگ اہل شام کے فریب میں آگئے ..... عجب نہ تھا کہ باہم جنگ چھڑ جاتی۔ لیکن امیرالمومنین علیؑ کے ڈانٹنے سے وہ شور و غل فرو ہو گیا"۔

کس نے پہلے مخالفت کی

اعثم کوفی کے موافق: پہلا شخص اشعث بن قیس کندی تھا۔ جس نے لڑائی روک دینے کا زور ڈالا۔ اور اس شور انگیز گفتگو کو سن کر

علیؑ کل اور آج کا فرق بتاتے ہیں

جناب امیرؑ نے جواب دیا کہ: "اے قوم کیا وہ پہلا شخص جس نے قرآن کو قبول کیا میں نہیں ہوں، اور کیا میں شروع ہی سے یہ نہیں کہتا تھا لیکن فرق یہ ہے کہ کل حکم دیتا تھا لیکن آج مامور ہوں۔ کل منع کرتا تھا۔ آج منع کیا جاتا ہوں۔ میں کیا کہوں کہ تم میں اختلاف دیکھ رہا ہوں۔ کہہ رہا ہوں کہ یہ معاویہ کا فریب ہے اور وہ اپنے کو اس حیلہ سے خلاص کیا چاہتا ہے۔ میں نے تم سے اصل بات کہہ دی، آئندہ تمہیں اختیار ہے"۔

مالک اشتر اور علیؑ کیا دیکھتے ہیں

یہی مورخ اشتر کو یہ خبر بتا کر کہ "اگر جلدی نہ چلے تو علیؑ کو زندہ نہ پاؤ گے" تصویر کھینچتا ہے کہ "اشتر نے تلوار پھینک دی، اور غصہ میں بھرا ہوا لوٹا۔ سر ہلاتا جاتا تھا۔ اور کہتا جاتا تھا کہ: "اے گروہِ عاق اور اے اہلِ نفاق! یہ کیا بیہودہ حرکت ہے۔ جس وقت دوستوں کی مراد بر آئے اس وقت تم نے فتنہ کھڑا کر دیا"۔ امیرالمومنین نے اشتر کو اور اشتر نے امیرالمومنین کو دیکھا۔ اور یہ بھی دیکھا کہ بیس ہزار مسلح سپاہی جن کے مشہور افسر اشعث اور سفیان بن ثوری البکری ہیں۔ گویا آئندہ طرزِ عمل کے متعلق احکام صادر کر رہے ہیں۔ اشتر نے قاتل مقتول کرنا چاہا۔ میدانِ جنگ میں جانے کی خواہش کی جو لجاجت کے قریب بھی جا لگے۔ گرم الفاظ کہے۔ کوڑے چلے اور حالت متردد ہونے لگی تھی کہ امیرالمومنین نے مداخلت کی

حکم کے انتخاب میں بھی علیؑ کی مخالفت کی گئی اور ابوموسیٰ چنا گیا

حکمین کے تقرر کی صلاح ہوئی۔ معاویہ نے عمرو بن عاص کو منتخب کیا۔ اور اشعث اور اس کی جماعت نے ابوموسیٰ اشعری کو اپنا حکم تجویز کیا۔ اور ابن خلدون کے موافق امیرالمومنین علیؑ نے ارشاد کیا: "میں اس انتخاب سے راضی نہیں ہوں"۔ اور وجہ بتائی کہ "میں اس کو ثقہ نہیں سمجھتا۔ اس نے میری رفاقت ترک کی، لوگوں کو میرے ساتھ جمل میں جانے سے روکا۔ مجھ سے منتشر ہو کر بھاگا۔ پھر بھی میں نے ایک مہینہ کے بعد اسے امن دیا۔ میں اس کو حکم ہرگز نہ بناؤں گا۔ البتہ ابن عباس کو میں اپنی طرف سے حکم منتخب کر سکتا ہوں"۔

مخالفین نے کہا: "ابن عباس تمہارے عزیز ہیں۔ ہم ان کو حکم نہ بنائیں گے"۔

جناب امیرؑ: "اچھا اشتر تو میرا عزیز نہیں ہے"۔

مخالفین: "کیا اشتر کے سوا روئے زمین پر کوئی اور شخص نہیں ملتا؟"۔

جناب امیرؑ: "پھر کیا تم لوگ سوائے ابوموسیٰ کے اور کسی کو حکم نہ بناؤ گے؟"۔

۱۳ر صفر ۳۷ھ

اور اس کے بعد بقول ابن خلدون: "امیرالمومنین علیؑ ان مباحث سے تنگ ہو گئے اور مجبور ہو کر ارشاد کیا: "اچھا جو چاہو اور جو تمہاری سمجھ میں آئے وہ کرو"۔ اب "عمرو بن العاص امیرالمومنین علیؑ کے پاس اقرار نامہ لکھنے کو حاضر ہوئے۔ کاتب نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد لکھا:

علیؑ کا وہ موقع جو رسولؐ کے لیے صلح حدیبیہ میں تھا

هذا ما تقاضى عليه امير المؤمنين عمرو بن العاص نے جھٹ قلم پکڑ لی۔

بولے : یہ ہمارے امیر نہیں ہیں۔ تمھارے امیر ہوں تو ہوں۔

احنف : اس لفظ کو محو نہ کرو۔ مجھے اس کے محو کرنے سے بدفالی کا خیال ہوتا ہے۔

اشعث : امیرالمومنین کا لفظ ضرور محو کرو۔

امیرالمومنین : اللہ اکبر۔ صلح حدیبیہ میں بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ کفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک کے ساتھ "رسول اللہ" کو نہیں لکھنے دیا تھا۔ کیوں عمرو بن العاص اس واقعہ میں تم بھی ایسا ہی جانتے ہو؟۔

عمرو بن العاص : سبحان اللہ! آپ کفار سے ہماری تشبیہ دیتے ہیں؟۔ حالانکہ ہم لوگ مومن ہیں۔

امیرالمومنین : اے ابن النابغہ! تو کب فاسقین کا ولی اور مومنین کا دشمن نہ تھا؟۔

اشتر نے عہد نامہ پر دستخط نہ کی

عہد نامہ لکھا گیا دستخطیں ہوئیں۔ لیکن اشتر نے دستخط کرنے سے انکار کیا۔ اشعث مصر ہوئے۔ اسی مورخ کے موافق احنف بن قیس نے امیرالمومنین سے یہ خواہش ظاہر کی کہ مجھ کو بھی ابوموسیٰ کے ساتھ حکم بنائیے۔ لیکن لوگوں نے اس سے مخالفت کی۔

احنف ساتھ نہ رکھے گئے

اعثم کوفی کے موافق احنف اور شریح بن ہانی کچھ دور ابوموسیٰ کو پہنچانے گئے۔ لیکن شرجیل بن سمط الکندی نے ابوموسیٰ سے کہلوایا کہ جو لوگ تیرے وداع کرنے کو آئے ہیں انھیں رخصت کر دے۔ اس کے بعد امیرالمومنین کوفہ کی طرف اور معاویہ شام کی جانب روانہ ہو گئے تھے۔ جناب امیرؑ نے عمال کو اپنے اپنے عمل پر واپس کر دیا۔

حکمین کے فیصلہ کے وقت حاضرین کے نام

فیصلہ کا دن آیا۔ اور بقول ابن خلدون حکمین کے ساتھ مجلس حکم میں عبداللہ بن عمر، عبدالرحمٰن بن ابی بکر، عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمٰن بن الحرث بن ہشام، عبدالرحمٰن بن عبد یغوث زہری، ابوجہم بن حذیفہ عدوی، مغیرہ بن سعد، سعد بن ابی وقاص موجود تھے۔

عمرو بن العاص نے کہا : اے ابوموسیٰ! تم جانتے ہو کہ عثمان براہِ ظلم مارے گئے ہیں، اور معاویہ اور ان کی قوم اولیا و ورثاء عثمان ہیں۔

ابوموسیٰ نے کہا : ہاں۔

عمرو بن العاص بولے : پس (پھر) کون امر تم کو ان کی خلافت قبول کرنے سے روکتا ہے۔ حالانکہ وہ قبیلہ قریش سے ہیں۔ جیسا کہ تم جانتے ہو، اگرچہ سابق الاسلام نہیں ہیں، لیکن انھیں سیاست و ملک داری کا مادہ بہت بڑا ہے اور وہ ام المومنین ام حبیبہ زوجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی ہیں، اس سے زیادہ قریب قرابت اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور مدتوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب رہے ہیں اور شرفِ صحبت سے بھی ممتاز ہوئے ہیں۔

ابو موسیٰ کے لیے حکومت کی پیش کش

اس قدر کہنے کے بعد کہا: "اگر تم میری رائے سے موافقت کروگے تو تم کو جس شہر کی حکومت پسند کروگے فوراً دی جائے گی"۔

ابن عاص اپنے لڑکے کو خلیفہ بنایا چاہتا ہے

اسی مورخ کے موافق ابو موسیٰ نے عبداللہ بن عمر کو والی و حاکم بنانے کا خیال ظاہر کیا، اور ابن عاص نے کہا: "تم کو میرے لڑکے کے والی مقرر کرنے میں کیا عذر ہے۔ تم اس کی حالت و صلاحیت و فضیلت سے بخوبی واقف ہو"۔ اور یہ بھی کہا کہ: "یہ کام تو ایسے شخص کو سپرد کرنا چاہیے کہ جس کے دانت ہوں۔ جس سے وہ کھاتا پیتا ہو"۔ آخر طے یہ پایا کہ علیؑ اور معاویہ دونوں معزول کردیے جائیں اور مسلمان جس کو چاہیں شوریٰ کر کے مقرر کریں۔

ابو موسیٰ کا اعلان

اعلان کا وقت آیا، اور صحبت رسولؐ کے شرف اور بزرگی سن کے لحاظ سے عمرو بن عاص نے چاہا کہ ابو موسیٰ پہلے اعلان کرے اور ابو موسیٰ نے کہا: "ہم لوگوں نے بہت کچھ غور وفکر کیا لیکن سوائے اس کے جس پر ہم نے اتفاق کیا ہے اور کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ ہم اور عمرو بن العاص دونوں باتفاق رائے علیؑ و معاویہ کو معزول کریں اور مسلمانوں کو اختیار دیں، جن کو وہ چاہیں باتفاق رائے خلیفہ بنائیں۔ چنانچہ میں نے علیؑ اور معاویہ دونوں کو معزول کردیا۔ پس تم جس کو لائق سمجھو اس کو خلیفہ بناؤ"۔

عمرو بن عاص کا اعلان

ابن عاص نے کہا: "تم لوگ گواہ رہنا (ابو موسیٰ کی طرف اشارہ کر کے) کہ اس شخص نے اپنے رفیق (علی) کو معزول کردیا ہے۔ اور بے شک میں بھی اس کو معزول کرتا ہوں۔ جیسا کہ اس نے معزول کیا ہے اور معاویہ کو بحال رکھتا ہوں کیونکہ وہ عثمان بن عفان مظلوم خلیفہ کا ولی ہے اور اس کے قائم مقام ہونے کا مستحق ہے"۔

حکمین کی گرم گفتگو اور تصفیہ کا اثر

اس کے بعد ابو موسیٰ اور ابن عاص میں جنگ زرگری ہوئی۔ اور شریح بن ہانی نے عمرو بن العاص پر تلوار چلائی۔ عمرو بن العاص نے جواب ترکی بہ ترکی دیا۔ لوگ درمیان میں پڑ گئے۔ اعثم کوفی کے موافق بھی: "نزدیک بود کہ اصحاب امیرالمومنین علی علیہ السلام ولشکر معاویہ بایک دگر جنگ کنند"۔ اہل شام خوش تھے اور عراقیوں پر طنز کرتے تھے اور سعید بن قیس ہمدانی کہتا تھا کہ: "اگر ہم لوگ راہ راست پر رہتے اور اس قوم سے جنگ کرتے تو یہ شماتت سننے میں نہ آتی۔ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے اور نہ ہم میں سستی آئی ہے"۔

وقف علیؑ الاولاد اور حسینؑ

صفین سے واپس تشریف لا کر جناب امیرؑ نے اپنے جائداد خاصہ کے متعلق ایک دستاویز تحریر فرمائی کہ: "اس حکم کے ساتھ حسنؑ بن علیؑ قائم ہو۔ موافق شرع اس مال میں تصرف کرے اور حسب شرع اس مال کو فقرا و مساکین میں تقسیم کرے۔ اگر حسنؑ کو کوئی حادثہ پیش آئے اور حسینؑ زندہ ہو تو اس کے بعد وہ اس حکم کے ساتھ قیام کرے۔ اور اس وصیت کو اس کے مصدر

اور موقع کے متعلق جاری کرے۔ بے شک علیؑ کے اس مال میں فاطمہؑ کے بیٹوں کا وہی حق ہے جو تمام اولاد علیؑ کا ہے"۔ فرمایا ہے کہ بوجہ قربت رسولؐ اور ان کے احترام کے (تولیت) اولاد فاطمہؑ کے متعلق رکھی گئی ہے۔ اصل کی حفاظت اور منافع کے تقسیم کا حکم دیا گیا ہے۔

ایک دوسری وصیت ہے جس میں جناب امیرؑ نے حسنؑ کی تعلیم کا تذکرہ کیا ہے۔ انھیں مضر تعلیم کے اثر سے محفوظ رکھنے اور ایک شفیق باپ کی طرح ہر کام میں توجہ لازم سمجھنے کا تذکرہ فرمایا ہے۔ کتاب خدا کی تعلیم اس کی تاویل پر عبور اور اسلام کے طریقے اور اس کے حلال و حرام کا اہتمام فرمایا ہے۔ اور بہت سے مسائل فلسفہ پر مفید نکتہ سنجیاں کی ہیں۔

جناب امیرؑ حکمین کے فیصلہ سے بیزاری اور تیاریٔ جنگ کا حکم دیتے ہیں

حکمین کے فیصلہ کے بعد جناب امیرؑ نے خطبہ میں فرمایا: "حکمین نے قرآن کے حکم کو چھوڑ کر ہر ایک نے اپنی خواہش کی اتباع کی اور دونوں نے فیصلہ کرنے میں اختلاف کیا، اور دونوں راہِ راست سے علیحدہ رہے۔ پس اس حکم و فیصلہ سے اللہ اور اس کا رسولؐ اور صُلحاء امت بری ہیں۔ لہٰذا تم لوگ شام پر حملہ کرنے کی تیاری کرو"۔

خطبہ کی نقل خوارج کو بھیجی

اسی زمانہ میں خوارج کا گروہ برسرِ فساد ہوا۔ سمجھایا گیا۔ لیکن رو براہ نہ ہوا۔ جناب امیرؑ نے متذکرہ صدر خطبہ کی نقل ان کے پاس بھیج دی اور یہ بھی تحریر فرمایا کہ: "ہم اسی پہلی رائے پر ہیں جس پر اس سے پیشتر تھے۔ یعنی اہل شام سے جنگ کریں گے"۔ اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ ہوا، اور جناب امیرؑ نے مدائن کے گورنر کو ان کے روکنے کا حکم بھیجا، اور اس نے نہروان کے قریب انھیں روکا۔

جو لشکر شام کے لیے جمع ہوا

بصرہ کے خوارج مسعر بن فدک تیمی کی ماتحتی میں چلے (جو قصہ تقرر حکم اور قرآن کے بلند کرنے کے وقت اشعث کا ہم آواز تھا) اور عبداللہ بن عباس نے روکا، اور یہ بھی نہروان چلا آیا۔ اس زمانہ میں جناب امیرؑ کے حکم سے شام کی طرف روانگی کی تیاری میں بصرہ سے احنف بن قیس اور حارثہ بن قدامہ کی ماتحتی میں تین ہزار ایک سو سپاہی آئے اور کوفہ کی فہرست کے رو سے چالیس ہزار تجربہ کار سپاہی، سترہزار نو عمر، اور آٹھ ہزار خادم میدان جنگ میں جانے کے قابل پائے گئے۔

ابن خلدون کے موافق باوجود لوگوں کی اس خواہش کے کہ پہلے خوارج سے جنگ کی جائے، فرمایا: "اہل شام پر فوج کشی کرنا زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ انھوں نے تم سے مقابلہ کیا، برابر لڑتے رہے اور اس کا مقصود یہ ہے کہ وہ بزور و جبر بادشاہ بن جائیں اور بندگان خدا کو اپنا غلام بنائیں"۔ لیکن اس کے بعد خبریں آنے لگیں کہ خوارج نے عبداللہ بن خباب کو ذبح کر ڈالا، اور ان کی بی بی کا پیٹ پھاڑ ڈالا، اور قبیلہ طی کی تین عورتوں کو قتل کیا۔ جناب امیرؑ نے حرث بن مرہ کو دریافت حال کے لیے بھیجا، اور یہ بھی مارے گئے۔ اب یہ طے کئے ہوئے چارہ نہ تھا کہ پہلے ان کی فکر کی جائے۔ مقابل پہنچے ہمارے بھائیوں کے قاتلین کو ہمارے حوالہ کردو۔ ہم ان کے عوض میں ان کو قتل کریں گے۔ تاکہ ہم تم کو چھوڑ کر اہل مغرب کی طرف جائیں اور تم سے اس وقت تک جنگ نہ کریں گے جب تک ہم جنگ اہل شام سے واپس نہ آئیں گے۔ شاید اللہ تعالیٰ اس اثنا میں تم کو راہ راست کی ہدایت کرے۔ خوارج نے جواب دیا ہم سب نے مل کر

ان کو مارا ہے اور ہم سب تمہارے خون اور ان کے خون کو مباح سمجھتے ہیں"۔

امان کا علم

اب جناب امیرؑ نے حجر بن عدی، شبث ربعی، معقل بن قیس، ابوایوب انصاری، ابوقتادہ اور قیس بن سعد کو افسر مقرر کیا۔ اور ایک امان کا علم ابوایوب انصاری کے حوالہ کیا گیا۔ اور یہ اعلان کیا گیا کہ: "جو شخص بلا جنگ کیے ہوئے آئے گا اس کو امن دیا جائے گا، اور جو شخص متعرض نہ ہو گا اس کو بھی امن دیا جائے گا۔ اور جو شخص کوفہ یا مدائن کی طرف لوٹ جائے گا اس کو بھی امن دیا جائے گا"۔

اس کا نتیجہ

خونریزی سے بچنے کے اس اعلان کا یہ نتیجہ ہوا کہ: "فردہ بن نوفل اشجعی پانچ سو سواروں کو لے کر خوارج سے علیحدہ ہو کر دسکرہ میں جا کر قیام پذیر ہوا۔ کچھ لوگ کوفہ کی طرف چلے، کچھ لوگ امیرالمومنین علیؑ کے لشکر میں آملے۔ ان سبھوں کی تعداد تقریباً چار ہزار تھی"۔ اب امیرالمومنینؑ کے فوجی نظام نے خوارج کو بیچ میں لے لیا۔ سواروں نے دو طرف سے دبایا، اور پیادوں نے تلواروں سے حملہ شروع کیا، اور خوارج کے کل نامی سردار مارے گئے۔ بلکہ خوارج کے عوام بھی اگر بچے ہوں تو صرف معدودے چند۔ صرف اسباب حرب اور مویشیان لشکر پر تقسیم کیے گئے۔ غلاموں اور عورتوں کو واپس کر دیا۔ امیرالمومنینؑ کے مقتولین کی تعداد صرف سات سپاہی تھی۔

شام کی طرف کوچ کا حکم لشکر کا تساہل

جناب امیرؑ نے اب شام کی طرف بڑھنے کا قصد فرمایا لیکن اہل لشکر نے کسل اور زخم کا عذر پیش کیا اور بقول ابن خلدون: "اس گفتگو کرنے پر اشعث بن قیس مامور کیے گئے تھے"۔ امیرالمومنینؑ نے اسے منظور نہ کیا لیکن کوفہ واپس ہوتے نخیلہ میں قیام کیا۔ اور "عام حکم دیدیا کہ کوئی شخص اپنے مکان پر نہ جائے جب تک دشمنوں کی طرف خروج نہ کر کے فتح یاب ہو آئے"۔ باوجود اس حکم کے اکثر لوگ چھاؤنی سے گھروں کو واپس گئے۔ اور جب جناب امیرؑ نے تاخیر کی وجہ دریافت فرمائی "تو ان لوگوں میں سے نہایت کم آدمیوں نے شام پر فوج کشی کی خوشی ظاہر کی"۔

۱۵ر جمادی الاولیٰ ۳۸ھ امام زین العابدینؑ کی ولادت

پندرہ جمادی الاولیٰ ۳۸ھ میں حضرت شہربانو کے بطن سے حضرت امام زین العابدینؑ کی ولادت ہوئی اور بعض مورخین کے موافق حضرت شہربانو نے اسی زمانہ میں رحلت کی۔

مالک اشترؒ کی شہادت

تحکیم کے فیصلہ کے بعد معاویہ نے مصر کی طرف دیکھا۔ محمد بن ابی بکر یہاں کے والی تھے۔ معاویہ ابن خدیج اور عثمان کے خونخواہ شورش کر رہے تھے۔ اور محمد بن ابی بکر کے ایک افسر ابن مضاہم کو شکست بھی دی تھی۔ معاویہ نے ابن خدیج وغیرہ کو خط لکھ کر بلایا۔ اور "امیرالمومنین علیؑ کی مخالفت کرنے پر شکر گزاری ظاہر کی" اور عمرو بن عاص کی ماتحتی میں چھ ہزار آدمی روانہ کیے۔ عمرو بن عاص نے محمد بن ابی بکر کو خط لکھا، اور انھوں نے وہ خط مع مدد کی عرضداشت کے امیرالمومنینؑ کے پاس بھیج دیا۔ جناب امیر نے جزیرہ سے مالک کو بڑھنے کا حکم دیا۔ اور بقول ابن خلدون جب "معاویہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے یہ سمجھ لیا کہ اب مصر پر قبضہ کرنا کارے دارد کا مضمون ہے۔ کیونکہ اس کا محافظ جدید (اشتر) اس کو بیرونی حملہ سے بچا لے گا۔ لیکن اتفاق یہ پیش آیا کہ اشتر جوں ہی حاکم خراج قلزم کے پاس آکر اترا انتقال کر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ معاویہ کی سازش سے حاکم

خراج قلزم نے اشتر کو زہر دیدیا تھا۔ اس طرح سے کہ اس سے خراج معاف کر دیا جائے گا"۔ اس کے بعد مؤرخ کا اموی میلان بغیر کسی دلیل کے اس سے یہ بھی کہلوا دیتا ہے کہ "لیکن یہ دور از قیاس اور خلاف واقعہ ہے"۔ واشنگٹن آرونگ اور اوسبورن، ابن خلدون کی طرح معاویہ کے محافظ نہیں ہیں، اور نہ طبری اور روضتہ الصفا یا جامع التواریخ نے یہ لکھنے میں کمی کی ہے کہ معاویہ کے ایما سے زہر دیا گیا۔ اعثم کوفی اشتر کی محض شہادت اور ابوالفدا زہر دیے جانے کا تذکرہ کرتا ہے۔

مالک کی خبر شہادتؑ سن کر جنابؑ امیرؑ کے الفاظ

اپنے اس وفادار خادم اور بہادر دوست کی اس افسوس ناک موت کی خبر سن کر یہ کہا علیؑ نے کہ "عورتیں مثل اس کے دوسرا نہ جنیں گی، اور اس کی مثال دوسرا موجود نہیں ہے"۔ علیؑ کا داہنا ہاتھ کٹ گیا، اور بایاں ہاتھ بھی باقی نہ رہا۔ کوشش کی، ترغیب دی کہ سپاہی مصر کی طرف مدد کے لیے روانہ ہوں۔

محمدؓ بن ابی بکر کی عبرتؓ ناک شہادتؓ

دو ہزار آدمی دیر میں تیار ہوئے۔ لیکن اس درمیان میں محمد بن ابی بکر کو دشمن کی کثیر تعداد نے گھیر لیا تھا، گرفتار ہوگئے۔ بقول ابن خلدون: "دشمنوں نے پیاس کی حالت میں انھیں ایک مردار گدھے کی کھال میں بھر کر جلا دیا"۔

بصرہ سے شامی بھاگے

اس کے بعد عبد اللہ بن حضرمی بصرہ بھیجا گیا کہ وہاں کے لوگوں کو جناب امیرؑ سے برافروختہ کرے۔ عامل نے خبر دی۔ جناب امیرؑ اعین بن ضبیعہ کی ماتحتی میں کچھ سپاہی بھیج سکے۔ ابن الحضرمی کو شکست ہوئی اور مارا گیا۔

زیاد نے فارس کا انتظام کیا

ایرانیوں نے کچھ شورش کی، جناب امیرؑ نے زیاد کو بھیجا اور اس نے باغیوں کو سزا دی اور حالت اپنی جگہ قائم رہی۔ معاویہ نے عین التمر میں اس کے بعد قسمت آزمائی کی۔ گورنر مضطر ہوا۔

شامی عین التمر سے بھاگے

اور اگرچہ مدد بھیجنے میں علیؑ کی کوششیں بے کار ہوئیں لیکن اتفاق سے عبد الرحمن بن مخنف پچاس آدمیوں کے ساتھ مالک بن کعب (گورنر) کی مدد کے لیے پہنچا۔ شامی سمجھے کہ کوفہ سے بڑی مدد آئی اور خوف سے بھاگ گئے۔

اہلِ شام کے ہیت کو لوٹنے کی خبر سن کر جنابؑ امیرؑ کا خطبہ

اس کے بعد اہل شام نے ہیت اور انبار کو لوٹا، علیؑ کا عامل حسان البکری مارا گیا۔ جناب امیرؑ نے خبر سن کر خطبہ دیا: "قتل اور غارت تم پر گر جائیں۔ تمھارے مال تاراج ہوں گے۔ تمھارے گھروں پر قبضہ کر لیا جائے گا۔۔۔ سوار ولایت انبار میں داخل ہو رہے ہیں۔ وہاں کے عامل حسان البکری کو قتل کر ڈالا ہے۔ تمھارے سواروں کو تمھارے اسلحہ خانوں سے ہٹا دیا ہے۔ مجھے ان حملہ آوروں کے ظلم و جور کی یہاں تک خبر پہنچی ہے کہ ان میں سے ایک شخص کسی مسلمہ یا ذمیہ عورت کے گھر میں داخل ہوتا، اس کے پازیب، اس کے کڑے، اس کا گلوبند، اس کے گوشوارے یہ سب زیورات نہایت بے رحمی کے ساتھ چھین لیتا تھا۔ وہ عورت اس مرد کو نہ روک سکتی۔ مگر ہاں وہ برابر صدائے گریہ بلند کر رہی تھی اور قبیلہ والوں کو بلا رہی تھی۔ اور یہ لشکر ایک کثیر

اور وافر مال غنیمت لے کر واپس گیا۔ نہ تو ان میں سے کسی کو زخم پہنچا نہ کسی کے خون کا ایک قطرہ زمین پر گرا۔

دشمن باطل پر متفق لیکن تم حق سے پراگندہ

اب اگر کوئی مسلمان اس سانحہ دل خراش پر افسوس کرتا کرتا مر جائے تو اسے ملامت نہیں کی جا سکتی، بلکہ وہ اس مرگ کا سزاوار ہے۔ آہ! تعجب اور سخت تعجب ہے۔۔۔۔ کہ وہ مخالف تو سب کے سب اپنے فعل باطل پر اس قدر اجماع کر رہے ہیں اور تم امر حق سے یوں متفرق و پراگندہ ہو۔ وہ تم سے لڑائی کرتے ہیں اور تم لڑائی سے جان چراتے ہو۔ خدا کی نافرمانیاں اور معصیتیں کی جا رہی ہیں اور تم راضی ہو بیٹھے۔۔۔۔ اے مرد صورتو حالانکہ مرد تم میں کوئی نہیں ہے۔

رائے اور تدبیر بغیر عمل بے سود ہے

اے خوابہائے اطفال۔ اے عقول زنان حجلہ نشین! میں اس بات کو دوست رکھتا تھا کہ تمھیں نہ دیکھوں اور تمھیں نہ پہچانوں۔۔۔۔ تم نے اپنے عصیان و نافرمانی کی وجہ سے میری رائے اور تدبیر کو بھی فاسد کر دیا۔۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ رائے اور تدبیر اس شخص کے لیے سود مند نہیں جو اس پر عمل کرنے والا نہیں"۔

جناب امیرؑ تنہا روانہ ہونے کا قصد کرتے ہیں

اب جناب امیرؑ نے اپنی ذمہ داری کے لحاظ سے تنہا روانہ ہونے کا قصد فرمایا۔ قیس بن سعد نے روکا اور کچھ سپاہیوں کو لے کر روانہ ہوئے۔ لیکن دشمن ان کے آنے کے پہلے روانہ ہو چکا تھا۔

شامی تیما سے بھاگے

معاویہ نے ایک فوج تیما بھیجی۔ امیر المومنین نے مسیب فزاری کی ماتحتی میں دو ہزار سپاہی روانہ کر کے۔ شامی محصور ہوئے اور آخر میں بھاگے۔

حاجی بھگائے گئے اور ان کے محافظ سپاہی قتل کیے گئے

غالباً زمانہ حج قریب تھا کہ معاویہ نے ضحاک بن قیس کو چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ کیا۔ اس نے حاجیوں کو یہ کہہ کر واپس کرنا شروع کیا کہ کوئی امام نہیں ہے، کس کے ساتھ حج کرو گے۔ اور شرطہ کے ان سپاہیوں کو قتل کر ڈالا جنھیں امیر المومنین نے حاجیوں کی حفاظت کے لیے ریگستانی راہوں میں تعینات فرمایا تھا۔ اب جناب امیرؑ نے حجر کندی کی ماتحتی میں چار ہزار سپاہی بھیجے۔ ضحاک کو شکست ہوئی اور یہ شام بھاگا۔

ابو ہریرہ مدینہ کے عامل ہوئے

بشر بن ارطاۃ مدینہ آیا اور قبضہ کر لیا اور ابو ہریرہ کو بھی عامل بن جانے کا موقع ملا۔ امیر المومنین نے وہب بن مسعود کو روانہ کیا اور انھوں نے دوبارہ قبضہ کر لیا۔

ابن عباس کے دو بچے دشمن نے ذبح کر ڈالے

بشر بن ارطاۃ یمن گیا اور یہاں عبداللہ بن عباس کے دو صغیر السن بچوں کو ذبح کر ڈالا۔
یہ خبر سن کر جناب امیرؑ نے فرمایا: "مجھے بشر بن ارطاۃ کی خبر ملی ہے کہ اس نے یمن پر قبضہ کر لیا۔ تم اپنے برحق امام سے مخالفتیں کر رہے ہو۔ تم میں تفرقے ظاہر ہو رہے ہیں۔ مجھے اس قوم کی طرف سے یہ گمان ہے کہ وہ تمھاری بد عنوانیوں سے فائدہ اٹھا کر تمھیں اپنی رعایا بنا لے گی اور تم اس کے فرمانبردار ہو جاؤ گے۔

جناب امیرؑ پیشین گوئی کرتے ہیں

بنی امیہ کے متعلق کہیں اور فرماتے ہیں: "وہ تمھیں برابر اذیت پہنچاتے رہیں گے، یہاں تک کہ ایک شخص کو بھی تم میں سے ایسا نہ چھوڑیں گے جو انھیں نفع نہ پہنچائے یا اس کے نزدیک اس کا نفس بے مضرت ثابت نہ ہو۔ ان کی بلائیں تم پر مسلط رہیں گی جب تک کہ تم میں سے ایک ایک شخص ان کا غلام اور خدمت گار نہ بن جائے۔

سجستان کی شورش فرو کی گئی

سجستان میں شورش ہوئی اور وہ فرو کی گئی۔ بنی ناجیہ کے نصرانی فرقہ نے خوارج سے مل کر جنگ کی اور وہ بھی اپنی حالت پر لائے گئے۔

شام پر فوج کشی کے لیے علیؑ کی آخری کوشش اور شہادت

باوجود ان تمام شورشوں کے جناب امیرؑ اپنے اس پہلے خیال پر قائم رہے کہ جب تک امیر شام اپنی جگہ قائم رہے گا شورشوں کا سوراخ بند نہ ہوگا۔ اور علیؑ کی آخری کوشش دکھائی دیتی ہے کہ وہ لوگوں کو آمادہ کر کے دس ہزار سپاہی اپنے فرزند حسینؑ کی ماتحتی میں دیتے ہیں۔ قیس بن سعد اور ابوایوب انصاری بھی دس دس ہزار سپاہیوں کے افسر ہوتے ہیں اور دیگر سرداران لشکر کو اور سپاہی سپرد کیے جاتے ہیں۔ تیاری قریب بہ تمام اور کوچ کا وقت نزدیک آگیا تھا کہ اسلام کی امید ہمیشہ کے لیے زہر آلود تلوار سے ذبح ہوگئی۔

۴۰ھ حالتِ نماز میں زخم کھا کر علیؑ نے کیا فرمایا

کون مسلمان نہیں جانتا کہ انیسویں رمضان کی نامبارک تاریخ کو جس وقت یہ رضائے الٰہی کا شہید امامؑ کو مسجد میں نماز پڑھنے اور پڑھانے جارہا تھا کوئی محافظ سپاہی نہ تھا۔ کسی چھپے ہوئے قاتل کا اندیشہ نہ تھا کہ عین حالتِ نماز میں جب کہ سر مبارک سجدہ سے اٹھا بھی نہ تھا کہ تین قاتلوں نے یکے بعد دیگرے اپنی زہر کی بجھی ہوئی تلوار سے وار کیے۔ ایک تلوار اسی جگہ لگی جہاں احزاب میں عمرو بن عبد ود کے ہاتھ سے لگی تھی۔ قاتل نے ابھی سر مبارک سے تلوار کھینچی بھی نہ تھی کہ علیؑ نے فزت برب الکعبۃ (خدائے کعبہ کی قسم فتح یاب ہوا) فرمایا۔

جراح نے زخم دیکھا

شور ہوا، لوگ دوڑے، قاتل گرفتار ہوا، حسنینؑ آئے۔ دیکھا کہ در و دیوار پر باپ کے خون کے چھینٹے پڑے ہیں۔ خود خون میں نہائے اور درد سے پہلو بدل رہے ہیں۔ عمر بن نعمان جراح نے زخم دیکھا اور کہا: "زخم علاج پذیر نہیں ہے۔ تلوار زہر آلود معلوم ہوتی ہے"۔ یہ سن کر لوگوں پر یاس اور تاریکی چھا گئی۔ اپنے زخمی ہونے اور رحلت کے درمیانی زمانہ میں جناب امیرؑ نے فرمایا:

لوگوں کو نصیحت

اپنے درمیانی تنازعات کے مصلح بنو۔ آنحضرتؐ فرماتے تھے کہ اپنی ذات اور گروہ کی اصلاح تمام روزہ و نماز سے افضل ہے۔

بنی عبد المطلب کو نصیحت

بنی عبد المطلب سے فرمایا: "اے اولاد عبد المطلب! میں تمھیں ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ تم مسلمانوں کے خون میں سر سے پاؤں تک رنگین ہوتے پھرو، اور کہتے جاؤ کہ امیر المومنین قتل ہوگئے۔ آگاہ رہو کہ میرے قاتل کے سوا کوئی دوسرا شخص قتل نہ ہونا چاہیے۔

اس کے بعد جناب امیرؑ نے اپنے دونوں فرزندوں حسنؑ و حسینؑ کو جو مخصوص نصیحت فرمائی وہ یہ تھی کہ: "تم دنیا کو طلب نہ کرنا اگرچہ وہ تمھیں طلب کرے اور تمھاری طرف مائل ہو اور کبھی اس چیز پر حسرت و افسوس ظاہر نہ کرنا جو از قسم مال دنیاوی تم تک پہنچنے سے روک دی جائے۔ سچی باتوں پر زبان کھلے اجر و ثواب کے لیے عمل کرنا۔ ظالم کے دشمن رہنا اور مظلوم کے مددگار"۔

یہ نصیحتیں نہج البلاغہ میں ملتی ہیں۔ جن کا خلاصہ ابن خلدون نے بھی دیا ہے۔ آخر الذکر مؤرخ کے موافق حسنین اور محمد حنفیہ کو ایک دوسرے کے لحاظ کی وصیت فرمائی۔ اور پھر حسنؑ کو تھوڑی دیر تک سمجھاتے رہے۔

برک اور معاویہ کی گفتگو

اسی مؤرخ کے موافق برک بن عبداللہ جب معاویہ کے ارادہ سے گیا اور گرفتار ہوا تو اس نے کہا: "میں تم کو ایک خوشخبری سنایا چاہتا ہوں، اگر تم اس سے مجھے مستفید کرو اور وہ یہ ہے کہ آج ہی شب کو میرے ایک بھائی نے علیؑ کو مار ڈالا"۔ معاویہ نے استعجاب سے کہا: "شاید وہ اس امر پر نہ قادر ہوا ہوگا"۔ برک نے جواب دیا: "یہ غیر ممکن ہے۔ کیونکہ اس کے ساتھ کوئی محافظ نہیں رہتا"۔

معاویہ کی ایک غور طلب کوشش اور جناب امیرؑ کے الفاظ

صاحب شواہد النبوۃ نے ایک روایت لکھی ہے جو میں ناظر کے غور کے لیے پیش کرتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ: معاویہ نے اپنے "عاقبت کار" کے معلوم کرنے کے لیے اپنے مصاحبین سے صلاح لی، اور پھر خود ہی تصفیہ کیا کہ اسے "علیؑ سے معلوم کرلیں گے"۔ اور تین آدمیوں کو کوفہ بھیجا اور ان تینوں نے یکے بعد دیگرے کہنا شروع کیا کہ معاویہ نے انتقال کیا۔ یہ خبر جناب امیرؑ کو پہنچائی گئی لیکن "بآں التفات نہ نمود"۔ یعنی: اس طرح توجہ نہ کی۔ اور لوگوں کے اصرار پر کہا: "کلا کہ وے نمیرد مادام کہ ایں (و اشارت بمحاسن خود کرد) ازیں (و اشارت بسر خود کرد) خضاب کردہ نہ شود و رنگین نہ گردد و ابن اکلۃ الاکباد بآں ملاعبہ نکند۔ و آں سہ تن ایں خبر را بمعاویہ بردند"۔ یعنی: ہرگز نہیں، وہ نہیں مرے گا جب تک کہ یہ (اس سے اپنے ریش مبارک کی طرف اشارہ کیا اور اس سے اپنے سر مبارک کی طرف اشارہ کیا) خضاب نہ کی جائے اور رنگین نہ ہو جائے اور جگر چبانے والی کا بیٹا اس سے خوش نہ ہو اور وہ تینوں یہ خبر معاویہ کے پاس لے گئے۔

تجہیز و تکفین

اب مجھے اور یہ کیا کہنا ہے بجز اس کے جو میں الکرار میں کہہ چکا ہوں کہ: رمضان کی اکیسویں کو متصوفین کا "ولایت مآب" شیعوں کا "امام اول" دُنیا کا "بہادر ولی" رضائے الٰہی کا شیدا، مسجد کوفہ کا عابد، دشمن پر رحم کرنے والا۔ دنیا سے گزر گیا..... حسنینؑ نے غسل دیا اور وصیت کے موافق دفن کیا۔ بغیر کسی نمائش اور شان کے غالباً چنے ہوئے تھوڑے سے لوگ اس مقدس اور متبرک بوجھ کو اپنے کاندھوں پر لے گئے۔ اسلام کے علانیہ مدد کرنے والے کو دشمنانِ اسلام کے خوف سے (پوشیدگی سے) زمین میں دفن کر دیا۔ کوئی نشان قبر، کوئی لوح، کوئی کتبہ نہ رکھا گیا۔ بلکہ زمین برابر کر دی گئی۔ لوگوں کو دفن کی خبر اس وقت ہوئی جب یہ لوگ گھر واپس آرہے تھے۔ عامہ ناس کو یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ مشتاق رضائے الٰہی کو کس جگہ زمین میں چھپایا ہے!۔

باب پنجم کا نشو

(جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ)

کس کے خلاف انقلاب ہوا

کیا ہوا کہ گزشتہ باب میں نہ کہیں بالا دوئی دکھائی دی نہ کہیں اپنا پہلو مٹھی میں مضبوط دبا کر بحث کی گئی۔ نہ پلک جھپکنے کا موقع غنیمت سمجھا گیا نہ زبان کاٹنے کے لیے اقرار لیا گیا اور نہ اس کا موقع دیا گیا کہ ایک حکم کے سامنے کوئی عذر کی ضرورت سمجھتا اور نہ کچھ لوگ تصفیہ خلافت کے لیے مقرر کیے گئے، جن کی مجموعی صورت کسی سمجھنے والے کو دھوکا نہیں دے سکتی تھی۔ انقلاب ہوا کس کے خلاف۔ رسولؐ کے بعد جو نظام دکھائی دینے لگا تھا اس کے خلاف۔ اس کی فرع کے خلاف۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ اس پہلے نظام کے قائم ہوتے ہی یا اس کے بعد کیوں انقلاب نہیں ہوا۔ اور یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ جوں جوں دن گزرتا جاتا تھا انقلاب کا ذخیرہ زیادہ اور انقلاب کا وقوع قریب ہوتا جاتا تھا۔

بنی اُمیہ بغیر کوشش کے باز نہ رہتے

میں نے یہ بھی کہا ہے کہ رسولؐ کے بعد جو روش تھی وہ کسی صورت پر تھمتی نہیں ہو سکتی تھی مگر یہ کہ بنی امیہ صاحب اختیار ہو جاتے لیکن اب میں تذکرہ اور واقعات کے اس حد تک نشو کے قریب آ گیا ہوں جہاں بے تردد یہ کہہ سکوں کہ اگر ایسے ذرائع نہ بھی اختیار کیے جاتے جس سے بنی امیہ کو حصول اختیار میں سہولت ہوئی تاہم وہ بغیر کوشش کیے باز نہ رہتے۔ سہولت پیدا کرنا تو دفع الوقتی تھی اگر میں رشوت کا لفظ استعمال نہ کرنا چاہوں۔

کیونکر نظام الٹ گیا

میں انقلاب کا ذکر کر رہا ہوں۔ حیرت کی جا سکتی ہے کہ جس وقت عناصر قومی کے منتشر کر دینے والی کل چلتے چلتے اس حد تک نتائج دیکھا چکی تھی کہ بے لگام جذبات کے پیچھے نہ دوڑنا ناکامی بھی جاتی اور محض فوجی جوش۔ حوصلہ مال اور شہرت کی نہ بجھنے والی پیاس ان کا ایمان ہوئی اور وہ اس پر مطلق غور نہ کرتے کہ اس کے ضبط۔ احتیاط اور اعتدال پر رکھنے کی بھی کوئی کل ہے یا نہیں جو آئندہ انتشار قومی اور بے مشغلہ بیکاری کے خطرات سے محفوظ رکھے۔ جس وقت بغیر ترجیحی سلوک کے حکومت اپنی بنیاد مضبوط نہیں کر سکتی تھی اور اپنے اغراض قیام اور استحکام کے لیے معتدین کی زیادتیوں سے چشم پوشی کر سکتی تھی اور جس وقت حکومت کا افراد اور جماعت کی موافقت حاصل کرنے کا عکس یہ تھا کہ ایسی جماعت اور افراد رسوخ اور اقتدار کی امید کرتے اور اپنے کو عامہ ناس سے اس اعتبار سے بلند رتبہ سمجھتے۔ ان حالتوں میں قومی عناصر میں سے کونسا عنصر نیست ہونے سے بچ رہا تھا۔ جسے مدبرین کی نگاہ نہ دیکھ سکی اور چھپا چھپایا رہ گیا۔ اور جو لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور اس میں یہ قوت پیدا ہو گئی کہ وہ ایک نظام کو الٹ دیتا۔

کیا علیؑ کے سوا مدینہ میں کوئی نہ تھا

لیکن میری حیرت اس غور اور استفہام پر ختم نہیں ہو جاتی۔ میں آگے بڑھتا ہوں اور اب سوال کرتا ہوں کہ کیا تمام مدینہ میں بجز علیؑ کے اور کوئی نہ تھا جس کی طرف لوگوں کی نظر اٹھ سکتی، جسے بنو امیہ بھی اپنی دقتوں میں اپنا مشکل کشا سمجھتے۔ جس سے عثمان استغاثہ کرتے جنھیں نائلہ اپنے شوہر کے موت سے آزادی دہندہ سمجھتیں اور جو عثمان کو مروان پر قربان ہونے سے بچا لیتا۔ ایسے جوش کے عالم میں جب کہ قعقاع بن عمرو کا ایسا فاتح ایران بہادر نسبتاً لوگوں کے کم تعداد کے جوش میں بھی ان سے باز پرس کرنا موقع کے خلاف سمجھتا۔ ہاں، قعقاع سپاہی مدبر تھا۔ رسولؐ کا پیارا، رسولؐ کا ممدوح اور رسولؐ کا مرکز امید نہ تھا!

ان میں کوئی علیؑ نہ تھا

اصحاب تھے۔ کوئی شخص جو اسلام لایا ہو، کسی عقل، کسی تقویٰ، کسی نفس اور کسی علم کا کیوں نہ ہو لیکن رسولؐ کی خدمت میں حاضری کا شرف اسے صحابی سمجھا سکتا تھا لیکن خدا کا بزرگ نام کروڑ مرتبہ رٹو، یا تمام عمر کاغذ پر لکھا ہوا دیکھتے رہو۔ عبادت محض رسمی حیثیت کی ایک چیز ہو کر بجا لاتے رہو۔ لیکن تم نہ ایک انچ بڑھو گے نہ بلند ہو گے۔ گریموفون کا متواتر صدا دینا اس میں کوئی شعور نہیں پیدا کرتا۔ ان مقدس چیزوں کے خصلت گر اثر کے استقبال کی نوعیت اور انداز وہ حالت ہے جس سے "جمال ہم نشین در من اثر کرد" صحیح ہو سکتا ہے۔ یہ تمہاری قبولیت کی قابلیت پر موقوف ہے ورنہ "من ہمان خاکم کہ ہستم"۔ صحابی بہت سے تھے۔ بہت سے ایسے تھے جو کسی مذہب اور مجموعہ مذاہب صفات کے ناز تھے لیکن ان میں کوئی علیؑ نہ تھا۔ اور لوگوں میں اس کا جوش تھا۔

کوئی علیؑ کا منکر صفات ہو کر ان کا مخالف نہیں ہوا

انھیں اصرار تھا کہ ہم علیؑ نہیں ہیں۔ یہ بھی تھا کہ کچھ صحابی علیؑ کے خلاف ہو گئے لیکن یہ ان کی انکار صفات کی بنیاد پر نہ تھا بلکہ جیسا صاحب صواعق محرقہ فرماتے ہیں:

"امام الحرمین گفتہ کہ اعتداد و اعتباری نیست بر قول کسی کہ گفتہ است اجماع بر امامت علیؑ منعقد نہ شدہ زیرا کہ ہیچ کس انکار امامت وارث الانبیا علیؑ نہ کرد۔ این فتنہ و فسادی کہ در میان ایشان واقع شدہ بواسطہ دیگر امور بود نہ بسبب امامت او"۔ یعنی: امام الحرمین نے کہا ہے کہ اس شخص کی بات قابل لحاظ و اعتبار نہیں ہے کہ جس نے کہا ہے کہ علیؑ کی امامت پر اجماع منعقد نہیں ہوا۔ کیونکہ کسی شخص نے بھی وارث انبیاء علیؑ کی امامت کا انکار نہیں کیا۔ یہ فتنہ و فساد کہ جو درمیان میں آپڑا یہ دیگر باتوں کی وجہ سے تھا نہ کہ امامت کی وجہ سے۔

اس وقت امت امام ڈھونڈنے نکلی تھی درآنحالیکہ اس سے قبل امام اپنی امت ڈھونڈ رہے تھے

کہاں گئے لوگ جس وقت نظم امور کے لیے کوئی نہ دکھائی دیا۔ مصری، بصری، کوفی، مدنی کہاں جا رہے تھے۔ مدینہ دار الخلافت تھا یعنی ایک مرکز تھا۔ جہاں ممالک محروسہ کے لوگ اکثر حیثیتوں سے موجود رہتے ہوں گے۔ ان لوگوں کا بار بار اس گھر کی طرف جانا جو کبھی مہبط جبرئیل تھا۔ لیکن رسولؐ کے دفن کے قبل سو تقی ہو گیا تھا۔ سوال پیدا کرتا ہے کہ آیا اب رسولؐ کے بعد پچیس برس تک صاحب خانہ کی اکثر امور سے ناموافقت اور علیحدگی اسے مزید تشدد کا مستوجب ٹھہرا رہی تھی اور یہ لوگ گئے تھے کہ اب اس مکان اور مکین کا نام و نشان باقی نہ رکھیں؟ نہیں اس مجمع کا جانا نہ اپنے حصول اختیار کے لیے تھا۔ اور نہ اپنے اختیارات کے طوق کا یا کہا

ملاقات کی غرض سے تھا یہ امام ڈھونڈھنے نکلے تھے۔ دارالخلیفہ اس کے قبل امام اپنی رعایا ڈھونڈھنے نکلتے تھے!۔

آج کا خلیفہ شرائط لکھوا رہا تھا

یہی نہیں بلکہ آج کا مرکز نگاہ "سب قبول ہے" والا خلیفہ نہیں بنتا تھا بلکہ خود شرائط لکھوا رہا تھا۔ شرائط قائم کرتے وقت علیؑ کے چہرہ پر غم کا سایہ دکھائی دیتا ہے۔

کب نہ ہوئے اور کب ہوئے

وقت آیا کہ علیؑ اس وقت خلیفہ نہ ہوتے جس وقت نہ ہونے کا گمان بھی نہ ہوتا۔ زمانہ ڈھلکتا اور اس طرح کہ گویا اس کا سارا وزن بنی ہاشم اور ان کے مؤیدین حقوق کو پیس ڈالنے کے لیے ہے۔ یہ بھی گزرتا، اور اب پھر زمانہ اس وقت علیؑ کو خلیفہ بنتا یاد کرتا جس وقت علیؑ کو خلیفہ ہونے کا ادنیٰ گمان باقی نہ رہ سکتا لیکن یہ کوئی عالم خیال کی تصویریں نہ تھیں، نہ خواب کے تماشے تھے۔ بلکہ عقلی لوگوں کو اور لوگ علیؑ کو دیکھ رہے تھے۔ علیؑ کا وقار خلافت پر خود کے بل گرا نہیں پڑتا تھا۔ اور اب میں علیؑ کی آنکھوں میں لوگوں کی استدعا پر طنز دیکھتا ہوں اور ان کا بار بار رد کرنا بتاتا ہے کہ یہ خلافت خلافت کی مشہور حیثیت سے علیؑ کی نظروں میں "بکری کی چھینک" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی۔

علیؑ کا عہد ایک اظہارِ تاسف تھا

غم اس خیال سے شروع ہوتا ہے کہ پیغمبر الٰہی کی نیابت کا مسئلہ اب کس صورت سے لوگوں کے خیال میں قائم ہو گیا ہے۔ اور اس نے کیا کچھ اثر کر لیا ہے۔ نہ ہو کہ لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ گزشتہ طرز عمل کو ہم بھی طے شدہ امر سمجھتے ہیں اور آئندہ اپنے طرز عمل کو رسولؐ کے بعد کے کسی نظام سے متاثر نہ ثابت کرنے کے لیے اپنے روش کے آزاد رکھنے کا عہد لیتے ہیں اور لوگ بھی محض کتاب اور سنت پر عہد لیتے ہیں۔ "سنتِ خلفا" کا نام بھی نہیں لیتے۔ یہ حالت تھی جو ہم سے کہلواتی ہے کہ نہ صرف لوگ یہ سمجھتے تھے کہ علیؑ کیا پسند کریں گے اور کیا پسند نہ کریں گے بلکہ ہم اسے رسولؐ کے بعد کے کل نظام کے خلاف ایک انقلاب کہتے ہیں۔

جائز نوعی طریقہ کے بعد روحانی اثر کی طرف عود کرتے ہیں

جناب امیر اس پر قناعت کرنے کے لیے آمادہ نہ تھے بلکہ انھیں یہ بھی کہہ دینا تھا کہ: "تم مجھے خلیفہ بالوحی اور بالنص اور وزیر از جانب خدا تسلیم کرو۔ یہ اس سے بہتر ہے کہ تم اپنی بیعت کے سبب سے خلیفہ مانو"۔ کیا اس کے بعد بھی اس شبہ کی جگہ رہتی ہے کہ جناب امیرؑ گزشتہ طرز انتخاب کو دلوں سے دھو نہیں رہے تھے؟ کیونکر ایسا نہ کہتے جب انھیں فرمانا تھا کہ "ابر جہالت آفاق پر چھایا ہوا ہے اور شاہراہیں متروک اور ناپید ہو گئیں"۔ اور بغیر ایسی باتوں کے ہوئے کیسے یہ حسرت ظاہر کی جاسکتی تھی کہ: "اگر میری خلافت اور امارت کے پاؤں لڑائیوں کے لغزش کرنے والے مقامات سے قرار پاگئے تو بیشک بدعتوں کو متغیر کردوں گا"۔

علیؑ کا تجربہ

کیا یہ نہ تھا کہ قوم عرب کی درستگی اس وقت شروع ہوئی تھی جب کہ علیؑ بالغ اور سمجھ دار ہو چکے تھے اور کوئی کام ایسا نہ ہوتا تھا جو علیؑ سے پوشیدہ ہو یا ان کا اس میں عملی حصہ نہ ہو۔ فوجی، اخلاقی، قانونی، سیاسی، اور مذہبی امورات تھے۔ جنھیں رسولؐ نے تخصیص کے ساتھ علیؑ کے سپرد کیا۔ اور کبھی رسولؐ کو

شکایت خود ہوئی بلکہ علیؑ کے انجام دہی امورات پر رسولؐ نے شکریہ ادا فرمایا۔ رسولؐ کی تعلیم ایک ایسی قوم کو بنا رہی تھی جو بالو کے ذرات سے زیادہ علیحدہ تھی۔ بلاشبہ قوم اور افراد کے اختیارات سوخت ہو کر رسولؐ کی تنہا ذات میں مجتمع ہو گئے تھے اور علیؑ نے رسولؐ کی اس ذات کو اپنا فرض انجام دیتے دیکھا تھا۔ یہ ذات اور اس کا طرز عمل وہ محور تھا جس پر قوم گھومتی تھی اور یہی قومی حرکت کی روح تھی۔ اس نے قومی جسم کو جن انداز سے بنایا تھا وہ علیؑ کی آنکھوں کے سامنے کا تماشہ تھا اسی کے اصول نہ صرف دیکھے تھے بلکہ رسولؐ نے سمجھائے بھی تھے۔ رازدار تھے۔ اب تیسری حالت پیدا ہوئی یعنی سانچہ بدلا اور اب قوم کے خصائل جو صورت اختیار کرتے جاتے تھے۔ وہ بھی علیؑ سے پوشیدہ نہ تھے۔ علیؑ کا گزشتہ تجربہ رسولؐ کی ساخت قومی اور موجودہ روش کے مقابل سے یہ تصفیہ کر رہا تھا کہ شاہراہیں یعنی خصائل سازی کے بڑے اصول متروک اور ناپید ہو گئے۔ اور ابر جہالت آفاق پر چھا گیا۔ یعنی وہ روشنی کی روح جو دکھائی دیتی تھی غفلت یا تجاہل سے متاثر ہو گئی۔ ان متضاد حالتوں کا تمیز کر سکنا بجائے خود تمیز کر سکنے والے کی طرف امید کی نگاہیں اٹھا سکتا تھا۔ خصوصاً جب کہ وہ کہہ بھی رہا تھا کہ: "خوب جان لو۔ اگر میں تمہاری التماس کو قبول کروں اور تم سے بیعت لوں تو تمہیں احکام خداوندی کا تحمل بنا دوں گا۔ جنھیں میں اچھی طرح سے جانتا ہوں"۔ اگر ایسا تھا کہ علیؑ یہ سمجھ رہے تھے کہ لوگ اپنی ترقی کے اصل گر کو بھول کر ظاہر فریب چیزوں کے طرف دوڑ رہے ہیں جس سے وہ گہری تباہی کی طرف جا رہے ہیں تو اس میں بلا خوف مبالغہ اس یقین کی جگہ ہے کہ اگر کوئی تھا جو بقول ابن خلدون: "علی منہاج النبوۃ" چلا سکتا تو وہ علیؑ تھے۔ اور علیؑ نے قومی ساخت کو دوبارہ شروع کیا بغیر اس کے کہ وہ "لوم لائم" کی پرواہ کرتے۔ لیکن ایک مرتب مخالفت ابتدا ہی سے پے در پے سامنے آنے لگی۔ مخالفت دفعتہً نہ پیدا ہو گئی تھی بلکہ اس کی ابتدا اس وقت سے برابر جاری تھی جس کے دکھانے کے لیے میں نے طوالت گوارا کی۔

دو صفیں

میں نے کتاب میں ابتدا ہی سے اس کا اہتمام کیا ہے کہ ان لوگوں کے نام احتیاط سے لکھتا آؤں جن کا میلان کسی خاص امر کی طرف دکھائی دیا ہے اور اس سے میری غرض ظاہر ہے کہ تشخص واقعات کے سمجھنے میں معین ہو۔ اب اس باب میں یہ غور سے پڑھو کہ وہ کون لوگ یا کس کے قائم مقام یا اوتار تھے جنھوں نے اپنے میلان کو عملی مخالفت کی صورت میں دکھایا۔ زمانہ نے اس واقعہ میں رنگ طبیعت کی دو صفیں سامنے کھڑی کر دی ہیں جو اپنی اپنی روش اور خیال کی نقابت کر رہے ہیں۔

عینک

جناب امیرؑ کو یہ واقعات پیش نہ آتے اگر ان کی خلافت کے پہلے اس نوعیت کی حکومتیں نہ گزر چکی ہوتیں جو گزریں اور اگر جناب امیرؑ کو یہ واقعات پیش نہ آتے تو یہ دکھانا اس قدر آسان نہ ہوتا کہ کچھ افراد اور جماعت تھی جو ان کے حقوق کی مخالفت کا بیج اس وقت سے اپنے دل میں بو چکی تھی جس وقت تیر سے تیز آنکھ جو منافقت یا مخالفت کے تمیز میں مہارت رکھتی ہے پہچاننے کا کوئی اقدام نہ کرتی۔ حقیقتاً یہ باب وہ عینک ہے جس سے دور کی چیزیں اور وہ خرد بین ہے جس سے ادنیٰ ذرات مخالفت دکھائی دے جاتے ہیں۔

کس نے حقوق بشری کا لحاظ کیا

ماہرین اصول انقلاب سے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ رسولؐ کے بعد باوجود اد جانے انقلاب آیا اس پہلے یا تیسرے انقلاب میں

باقاعدگی، دیانت، اور اس کی فطرت پائی جاتی تھی یا اس وقت جب کہ وہ منتخب کیا گیا جس نے اصول انتخاب کو تسلیم نہ کیا تھا۔ نہ مجھے اس کی تفصیل کی ضرورت ہے کہ یہ فقرہ کہ خدا کے بندوں کو اپنا بندہ نہ بناؤ اعلان کنندہ کان جمہوریت کا قول نہ تھا بلکہ اس کا جس نے اپنے استاد کی طرح انسان کی پیدائشی حقوق کا لحاظ اور اس کی ہمیشہ کوشش کی تھی۔

پس وپیش کے معنی

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جناب امیرؑ نے کئی دن تک خلافت قبول نہ فرمائی۔ اور جب "لوگوں نے اسلام کے انجام سے ڈرایا" تو کبھی اہل بدر کو بلایا، کبھی لوگوں سے مسجد میں اپنی خواہش ظاہر کرنے کو کہا، کبھی وزارت قبول کر لینے پر قناعت کی اور کبھی طلحہ و زبیر کے خلیفہ بن جانے کا اِستمزاج لیا۔ کیا یہ علیؑ کا پرمذاق طنز تھا۔ اس پر کہ ہم کسی بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر بیعت نہیں کروالیتے۔ کہیں شہر سے کوسوں دور نہیں بیعت کراتے بلکہ مسجد میں طلب کرتے ہیں۔ کئی دن انکار یا تامل سے لوگوں کو غور کا موقع دیتے ہیں۔ اور اس امر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صاف کر دیتے ہیں کہ ہم نے موقع دیا کہ ہر قسم کے لوگ اِستشارہ اور اِظہارِ خیال میں شریک ہوسکیں۔ اور امر بیعت بلائے ناگہانی کا مرادف نہ ہو جائے۔

کیا پس وپیش تھا؟ کوئی مؤرخ مثل صاحب "سیرۃ الفاروق" کہہ دے گا کہ خلافت کی عظیم الشان ذمہ داری کے لحاظ سے کوئی قبول نہیں کرتا تھا۔ اور ابوبکر نے قبول کر کے اِسلام اور مُسلمانوں پر احسان کیا۔ ایسا خیال "پس وپیش" کے لفظ کی مؤلفانہ قواعد بھی جانے گی۔ کیونکہ رسولؐ کے بعد نہ علیؑ کو خلافت قبول کرنے کا موقع دیا گیا، اور نہ انھوں نے کوئی پس وپیش ظاہر کی۔ پس وپیش انھوں نے اپنے اِنتخاب کے وقت یعنی رسولؐ کے رحلت کے چوبیس برس بعد ظاہر کیا جب کہ لوگ اس نظام سے متاثر ہو چکے تھے جس کا ذکر کیا جاتا رہا۔ اور اب اس نظام سے نہ صرف پرانی قوم متاثر ہو چکی تھی بلکہ ایک پشت سموچی اس میں نشو ونما پا چکی تھی۔ بلکہ دوسری تیار ہو رہی تھی۔ اور مزید کمی یہ تھی کہ اس زمانہ میں جو ممالک فتح ہوئے تھے اور ان میں جس قدر لوگ اسلام لائے تھے وہ جناب امیرؑ کے مُتعلق نہ حضرت رسولؐ کے خیالات اور تعلق قلبی سے واقف تھے، نہ انھیں علیؑ کے درجہ اور ان کے اسلامی خدمات کے واقفیت کے آسان ذرائع حاصل تھے۔ انھیں جو کچھ تعلق تھا موجودہ سیاسی نظام سے تھا، اور جس طرح کا اسلام انھوں نے سیکھا تھا۔ اسی نظام کے سایہ میں سیکھا تھا۔ یہ تھا کہ علیؑ رسولؐ کے بعد خلافت نہ ملنے پر متاسف ہوتے اگرچہ انھیں تھوڑی رعایا اور ریگستانی خطوں پر حکومت کرنی پڑتی۔ انھیں تو اس درجہ خصائل پر لوگ چاہییں تھے جس پر رسولؐ چھوڑ گئے تھے لیکن اس خلافت کے قبول کرنے میں پس وپیش کرتے جس میں کسریٰ اور قیصر کے ملک جوڑے جا چکے ہوتے اور جسے عمرو بن عاص و معاویہ اور خالد بن ولید کے ایسے لوگوں نے اضافہ کیا ہوتا۔ اور صرف عدداً مُسلمان بڑھ گئے ہوتے بغیر اس کے کہ ان پر اسلامیت کا قابلِ اعتبار سایہ پڑا ہوتا۔

متخلفین کے لیے علیؑ اور انؑ کے اصحابؓ کی مصلحت

زوج بتول نے جو بقول سید امیر علی صاحب جیسا وہ تاریخ اسلام میں فرماتے ہیں "انتخابی حق کے پہلو بہ پہلو موروثی حق بھی رکھتا تھا" خلافت کے قبول کرنے کا اعلان کیا "گی" اپنے ہاتھ میں لی۔ معلوم ہوا کہ کچھ لوگ بیعت سے آنکھیں چرا رہے ہیں۔ خاموش رہے۔ پرجوش مخلصین نے غالباً گزشتہ مثال کے لحاظ سے گزارش کی کہ ہمیں منکرین کے ساتھ سخت برتاؤ کی اجازت دیجیے۔ دلیل یہ لائے کہ

"لوگ اپنے صلاح کار کے لیے اپنی بیعت کرتے ہیں آپ بھی اپنے صلاح کار محفوظ رکھیں"۔ اس جوڑ توڑ کی صلاح کے معنی اور کیا تھے کہ اقرار کے بوجھ سے دبا دیجیے کہ آخر میں وہ انکار نہ کر سکیں لیکن اجازت نہ دی کیونکہ علیؑ کے نزدیک یہ رسمی بیعت بے سود تھی جب تک "رغبت" نہ ہو۔ فرماتے ہیں کہ "ہم آدمیوں کو تم سے اچھا پہچانتے ہیں"۔

یہ بھی فرماتے ہیں کہ: "مجھے اپنی رائے پر چلنے دو"۔ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ جناب امیرؑ نے ان لوگوں کے متعلق کسی برتاؤ اور معاملت کو اپنے ذہن میں طے کر لیا تھا۔ ابھی کے دن گزرے تھے کہ اس کا اثر محسوس ہوتا یا وہ کوئی مصلحت جاری کر چکے ہوتے۔ یہ ایک امر تھا جسے زمانہ اور وقت طے کرتا۔ ممکن ہے کہ جناب امیرؑ وقت اور اپنی حکومت کے جم جانے کے منتظر ہوں جس کے بعد نظام کا وزن انھیں دبا دیتا۔ ممکن ہے کہ جناب امیرؑ وقت دے رہے ہوں اور امید ہو کہ ہمارا برتاؤ دیکھ کر رو براہ ہو جائیں گے۔ ممکن ہے کہ جناب امیرؑ سوچتے ہوں کہ ان پر تشدد انہیں بھگا دینے کا سبب نہ ہو جس سے دور و دراز مقامات پر جا کر یہ غلط فہمیاں پھیلائیں۔ ممکن ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ ان لحاظ کے اس لیے ضرورت محسوس ہوئی ہو کہ وہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ مکہ اور دمشق کدھر کروٹ لیتا ہے۔

کچھ لوگ جو بڑے حوصلوں والے تھے لیکن فی الجملہ متانت پسندی ظاہر کیا چاہتے تھے اگرچہ انھیں یقین نہ تھا کہ ہم امیرالمومنینؑ پر پھیل جائیں گے لیکن تاہم بغیر تجربہ کیے وہ کوئی اور واضح راہ اپنے لیے اختیار نہ کیا چاہتے تھے۔ وہ لوگ سوچتے تھے کہ اگر ہم ایسے ظاہر ہو سکے جس سے یہ سمجھا جا سکے کہ ہم خلافت کے رسمی یا غیر رسمی مشیر ہیں تو یہ بھی کچھ زیادہ ذیلی بات نہ ہوگی، اور اس طرح ہم خلقت کی نگاہ میں دوہرے قد و قامت کے دکھائی دیں گے، اور خود خلافت بھی اصرار کے ساتھ ہمیں شریک دیکھ کر ہمارے تخلیہ کی کوشش نہ کرے گی بلکہ لگا رکھے گی۔ اور اگر ایک دفعہ امتیاز کا عکس ہم پر پڑ گیا اور تو اب سے کہاں تک ہم زیادہ نفع میں نہ رہیں گے۔ اس ڈیل ڈول کے ساتھ لوگ جناب امیرؑ کے قریب گئے۔ صلاحوں کی گٹھڑی بندھی تیار تھی لیکن یہاں کی فضا سخت روکھی دکھائی دی۔

علیؑ کی اسکیم

علیؑ کے پاس کوئی ایسی اسکیم نہ تھی جس سے ایسے لوگوں کو لگائے رکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی اس کے وقت گئے گزرے۔ علیؑ کی اسکیم یہ تھی کہ وہ قومی اندرونی اصلاح کریں جو مدتوں سے غفلت کے حوالہ تھی خصائل قومی کی عدم مرکزیت کو دور کریں اور مرکز پر قائم کریں۔ علیؑ چاہتے تھے کہ انفرادی جائز حوصلے اس طرح نکلیں کہ قومی خصائل اس میں جذب یا معدوم نہ ہو جائیں۔ مختصر لفظوں میں علیؑ چاہتے تھے کہ لوگوں کو رسولؐ کی طرف پھیر لائیں۔

بہر حال اور کسی کو کوئی امتیاز حاصل ہوا ہو یا نہ ہو طلحہ و زبیر کو یہ امتیاز ضرور حاصل ہوا کہ نہج البلاغہ کا ایک خطبہ اس مضمون پر ہے جس میں امیرالمومنینؑ صلاح نہ لینے یا مساوات برتنے کا جواب دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے تو بہتر یہ ہوتا کہ ایک خلیفہ ہوتا جو ان کی رائے اور رہنمائی کا محتاج ہوتا۔ اور انھیں مساوات کی خفت نہ برداشت کرنی ہوتی۔ عجب نہ تھا کہ اگر جناب امیرؑ کو خاموشی سے حکومت اور اندرونی اصلاح کا موقع ملتا تو اکثر لوگوں کے سنگ مرمر کے محل رہن یا بیع ہو جاتے اور اکثر جو مال حکومت سے خواہ مخواہ کے زمیندار بن گئے تھے اب اپنے ہاتھوں میں آبلے دیکھتے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جناب امیرؑ سے مخالفت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ایسے لوگ سمجھ چکے تھے کہ اب ہمارے ہاضمہ میں فتور پیدا ہو جائے گا۔ جناب امیرؑ سے یہ ممکن نہ تھا کہ انفرادی مالی مرکزیت کے مقابلہ میں قومی نقصان اور ناانصافی گوارا کر سکتے۔

یہی لوگ اکیلی مثال نہ تھے بڑے بقراط مغیرہ بن شعبہ بھی ایک عدد مشورہ کے ساتھ تشریف لائے اور صلاح اس سے کم نہ تھی کہ معاویہ بن ابوسفیان اپنی جگہ رہنے دیا جائے۔ ان کے اسلام لانے کا موقع تاریخوں میں مذکور ہے اس کے سیاق کا ہم تذکرہ کرچکے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ گزشتہ حکومتوں کو انھوں نے جو صلاحیں دی تھیں وہ محض اپنے نفع اور سلطنت کی وفاداری کے لحاظ سے تھیں یا ذاتی طور پر انھیں بھی بنی ہاشم سے کوئی شکایت تھی۔ اگرچہ آگے چل کر ایسے مواقع پیش ہوگئے جن سے ذاتیات کا معاملہ درپیش ہوجاتا۔ یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ بنی ہاشم ان کی حرکات کو استحسان کی نظر سے دیکھتے تھے۔ نہ مغیرہ کو بنی ہاشم کی اس حالت میں اس کی بڑی کوئی فکر تھی کہ ہمیں یہ کن نگاہوں سے دیکھتے ہیں جب کہ ایسے زبردست مددگار موجود تھے جو اس کے خلاف سخت شہادت کو مجروح کردیتے اور سنگسار ہونے سے بچا لیتے۔ اگرچہ ممکن سے دور نہیں ہے کہ اس وضع کا مدبر اب اس صلاح کے ساتھ آنے کے وقت اس فکر سے خالی نہ ہو کہ اگر امیرالمومنینؑ نے ہمیں امید دلائی تو ہم اپنے پہلے دوستوں کے خلاف چھری چلانے لگیں۔ لیکن علیؑ کا دورِ حکومت وہ دور نہ تھا جس میں ایسے خصائل کے مدبرین کی قدر کی جاسکتی۔

مغیرہ کی صلاح ممکن العمل نہ تھی

قطع نظر اس کے و نیز اس کے کہ علیؑ اور بنی ہاشم کو اس سے کسی نیک صلاح کی امید نہ ہوسکتی تھی ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی صلاح نہ صرف قابلِ عمل نہ تھی بلکہ معاویہ کی تحریک تھی جسے وہ بحیثیت ایجنٹ کے ادا کر رہا تھا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ کیونکر حجاج بن خزیمہ شام پہنچا اور اس نے معاویہ سے ظاہر کیا اور صلاح دی کہ: "شام میں تیرے پاس جس قدر لشکر اور سامان ہے وہ علیؑ سے بہت زیادہ ہے۔ ابھی ان کا انتظام جما نہیں ہے کہ وہ مدینہ سے جنبش کرسکیں۔ لشکر تیرے موافق ہے اگر تو علیؑ سے مخالفت کرنا چاہتا ہے تو اس کے قبل جنگ کر کہ ان میں قوت پیدا ہوجائے۔ جب وہ اپنا انتظام کرلیں گے تو یقین ہے کہ وہ عراق و حجاز پر بغیر شام کے راضی نہ ہوں گے"۔ معاویہ کے خیالات مغیرہ کو معلوم ہوئے اور اب یہ اس "نیک نیتی" کی صلاح سے لدے ہوئے امیرالمومنینؑ کے پاس پہنچے۔ کیا جناب امیرؑ کے لیے بنی امیہ کے حالات سے پوری واقفیت ہونے کے بعد و نیز اس علم پر کہ بنی امیہ کے افراد جو مدینہ میں موجود تھے وہ انھیں خلیفہ دیکھ کر پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ یہ ممکن تھا کہ وہ معاویہ یعنی اصل مخالف اور بنی امیہ کے مرکزِ امن کو اپنی جگہ قائم رہنے دیتے نہیں۔ یہ علیؑ کی حکومت اور اختیار کے لیے ہمیشہ ایک دھمکی ہوتی۔ وہ کبھی معاویہ کی طرف سے مطمئن نہ ہوسکتے تھے۔ اور ہر وقت انھیں اندیشہ ہوسکتا تھا کہ وہ اپنی قوت کے آزمانے کو مستعد ہوجائے گا۔ علیؑ کا خلیفہ ہونا، اور ایک زبردست صوبہ کا مخالفت پر تلے رہنا، یا اطاعت کی آمادگی ظاہر نہ کرنا، بلکہ حکومت کے بھیجے ہوئے نائب کو واپس کردینا، اعلانِ جنگ تھا۔ اور اب حکومت کا فرض تھا کہ باغی عامل کو سبق دے۔ معاویہ سے ایسی حالت میں چشم پوشی کرنا، اور اسے اپنی مخالفتوں پر آمادہ ہوتے دیکھتے رہنا، دوسرے عاملوں کو ایک تحریک ہوتی کہ تم بغاوت پر کیوں آمادہ نہیں ہوتے۔ اور جب ایسا سبق دے چکتے تو خود دارالسلطنت کی کون ذمہ داری کرتا، اور کیوں نہ ہر شخص ہر روز حکومت کا امیدوار بن کر آ جاتا، اور وہ کامیاب ہوتا۔ جس کے ساتھ زیادہ ہتھیار اور آدمی ہوتے۔ پھر ایک صوبہ کا عامل دوسرے سے جنگ کرتا۔ تمام ملک میں بے امنی اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوجاتا۔ یہاں تک کہ ان میں سب سے زیادہ قوی

اپنی حکومت منوالیتا۔ یا دو تین چار برابر کے اپنی اپنی حکومتیں اور سرحدیں قائم کرالیتے۔ اس کے معنی یہ ہوتے کہ وہ جسے اپنے اختیارات کو آئندہ اور موجودہ بھلائی کے لیے صرف کرنے کا موقع تھا۔ وہ اس لیے خاموش ہوتا کہ تیس چالیس برس کی متواتر خونی جنگیں قائم ہوں اور مخالفتوں کا ذخیرہ برابر تقسیم ہو کر ابدالآباد تک جاری رہے۔ نہ رسُولؐ کے خلیفہ کا نظام یہ چاہ سکتا تھا کہ ایک ایسا عامل حکومت کا نائب سمجھا جائے جو خلاف حق اور خلاف راستی ذرائع اپنے کو اپنی جگہ مضبوط کرنے کے لیے بے تکلفی سے وہ ذرائع اختیار کرے۔ اخلاق اور مذہب پس پشت ڈال کر محض حکومت سامنے ہو اور اس کی حفاظت کے لیے بے تکلفی سے وہ ذرائع اختیار کیے جائیں جس سے اسلام کے بڑے اصول اخوت، مساوات، راستی، اعتبار اور محبت پر مکارانہ تدبیر کی قینچی چلتی رہی۔ لوگوں کو بے عنوانیوں کے باز پرس کی آزادی نہ رہے، اور حکومت اپنے اختیار سے ان کے منھ بند کردے، ان پر تشدد کرے، اور مختلف قسم کے مصیبتوں میں گرفتار کردے۔ اس لیے کہ کسی نے حکومت کو شخصی مال نہ سمجھ کر اپنے اور حکومت کے حق اور فرائض سمجھنا چاہے ہوں۔ وقت تھا کہ مُسلمان کسریٰ اور قیصر کے نظام سیاسی کو طنز اور نفرت کے اظہار کے لیے مثال میں لاتے تھے۔ آج اس پر پورا عمل ہو رہا تھا۔

لیکن محض حکومت اور اخلاق ہی کے نقطہ خیال سے ضروری نہ تھا کہ وہ لوگ جنھیں عامل نہ رہنا چاہیے تھا عامل رہ سکتے بلکہ انقلاب کی اصل غرض یہ تھی کہ جن کے خلاف شکایتیں ہیں وہ اپنی جگہ قائم نہ رہیں اور خلیفہ ثالث کو قتل یا معزول کی شرط اس لیے پیش کی گئی تھی کہ وہ قابل شکایت عمال کی کارروائیوں سے چشم پوشی کرنا چاہتے تھے۔ جناب امیرؑ کا خاموش رہنا گویا اس کا اعلان ہوتا کہ ہم بھی اسی مصلحت کے حامل ہیں جس مصلحت کے خلاف انقلاب ہوا جو خلیفہ کے قتل پر منتہی ہوا۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ تھے کہ اصلاح کے خواہش مند اپنی تلوار اس وقت تک نیام میں نہ رکھتے جب تک علیؑ سے بھی تصفیہ نہ کر چکے ہوتے۔ اب ہر شخص کو فیصلہ کا اختیار ہے کہ جناب امیرؑ کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ معاویہ، ابن ابی سرح، ولید اور سعید بن العاص وغیرہ کو اپنے ساتھ لیتے یا ان لوگوں کو جن کی تمام شکایتیں اب ملک اور قوم کی زبان پر تھیں اول الذکر گروہ کے ساتھ اخلاقی سیاسی مذہبی اور خاندانی تجربہ کے اعتبار سے کوئی امید نہ تھی۔ آخر الذکر گروہ نے جو کچھ کیا تھا یا جو کچھ چاہا تھا اسے یا تو لوگوں نے پسند کیا، اور ساتھ دیا، یا متوقف رہے۔ یہ سچ ہے کہ جناب امیرؑ نے بجز کتاب اور سنت کے کوئی شرط اپنے ذمہ نہ لی تھی بلکہ یہ ایک شرط تھی جو خود ان کا عین منشا تھا، اور لوگوں سے صاف صاف کہہ بھی دیا تھا کہ: "ہمارے بابت کسی کو کوئی حق سوا اس کے نہیں ہے کہ مجھ کو تم نے امارت کے لیے منتخب کیا ہے"۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تم نہیں ہو جو مجھے مصلحتیں کمتر کر دیا کرو گے بلکہ یہ میں ہوں جو تمھیں کسی امر کا حکم دوں گا، اور تمھیں بجالانا ہوگا"۔ اور اس خیال کے ظاہر کرنے کے بعد بھی وہ یہی تصفیہ کر سکے کہ ہم ان عمال کو معزول کریں۔ بغیر اس کے کوئی دوسری مصلحت علیؑ کی مصلحت نہیں ہو سکتی تھی۔ کسی نے اس کی مخالفت نہ کی بجز مغیرہ بن شعبہ کے اگرچہ بعض مؤرخین نے یہ بھی مصلحت سمجھی کہ اس کی فربہ تائید کے لیے ابن عباس کا نام بھی لیویں۔ کیا مشکل تھا ان مؤرخین کے لیے جب انھوں نے خود حسنؑ کی زبانی اپنے مقدس باپ کو نصیحت کرادی ہے!

مجھے اس کے بعد کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مغیرہ بن شعبہ نے اپنے صلاح کا بھانڈا خود پھوڑ دیا۔ کیا یہ صلاح کا پسند نہ آنا تھا کہ وہ دفعتہً مکہ چلا جاتا، اور پھر شام سے صفین میں آتا؟ اس سے زیادہ کوئی امر صاف نہیں ہے کہ وہ معاویہ کی

وکالت کر رہا تھا، یا بذاتِ خود بنی امیہ کی قوت اور صیانت کا کوشاں تھا۔ اور امید کرتا تھا کہ اگر صلاح کارگر ہو گئی تو ہم معاویہ کی فوجوں کو مدینہ کے قریب دیکھیں گے۔ اور جب دیکھا کہ علیؑ اس دام میں گرفتار نہ ہوئے جس کے معنی معاویہ کی طرف سے ہوشیاری اور آگے حرکت کرنے کا ارادہ ہے تو اب مصلحت نہ تھی کہ وہ علیؑ کی نگاہ کے نیچے رہتا۔

یہ حالتیں کہتی ہیں کہ کچھ لوگ باوجود اس کے کہ جناب امیرؑ سے اچھی طرح واقف تھے اور جانتے تھے کہ ہر صلاح اور صلاح دینے والا ایسا نہ ہوگا جو ان کے خیال میں دخیل ہو سکے لیکن پھر بھی کچھ تھے جو گئے اس امید پر کہ شاید حکومت کے ترددات اور ضرورتیں علیؑ کو اس قدر ڈھیلا کر دیں کہ وہ بعض ایسی روش کو گوارا کر لیں جو عدم حکومت کی حالت میں ان کے نزدیک قابل اعتراض ہوتیں اور جب دوبارہ تجربہ ہوا کہ علیؑ کی حکومت اور نظام سیاسی اخلاق کی حدود شکن نہیں ہیں، اور انھیں اپنے نام و نمود سے یاس ہو گئی تو انھوں نے اپنے حوصلے پورا کرنے والا گھر ڈھونڈھ لیا اور ڈھونڈھتے رہے۔ تاریخ اپنے کو دہرا رہی تھی کہ اگر ایک مرتبہ باپ ہوتے جو لوگوں کے ان جذبات کے سہارے سے اختیار حاصل کر سکتے تو دوسری مرتبہ بیٹی ہوتی جو ایسے لوگوں کی مرکز امید ہو سکتی۔ حضرت ابوبکر کے حِلم کے معترفین کے لیے حضرت عائشہ کا فوجی میلان حیرت خیز ہوگا لیکن ان کی تمام حیرت، صفات کا اثر دیکھنے والوں کی حیرت سے بڑھ نہ جائے گی جب وہ غور کریں گے کہ حضرت ابوبکر کے حِلم نے بنی ہاشم کے حقوق کے ساتھ جو کچھ کیا وہی حضرت عائشہ کے آج کی فوجی جوش کا باعث ہوا۔ متضاد صفات ایک نتیجہ کے لیے تھیں۔ بنی ہاشم کی بے اختیاری۔

حضرت عائشہ نے کیوں دار الخلافت سے علیحدہ مرکز قرار دیا

میں اس لیے نہیں کہتا ہوں کہ اس پر کوئی اصرار کروں لیکن سوچتا ہوں کہ حضرت عائشہ مروان بن حکم کے اِستغاثہ کے باوجود اس وقت مکہ تشریف لے گئیں جس کے چند ہی روز بعد حضرت عثمان کو سانحہ درپیش ہوا۔ یا عین اس وقت کے قریب جب سے محاصرہ کرنے والوں کا تشدد بڑھ گیا، یا محاصرہ کرنے والوں کا مصمم اِرادہ معلوم ہو گیا۔ اور کوئی شبہ کی گنجائش نہ رہی کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ طلحہ و زبیر بغاوت کی کسی نہ کسی شاخ کے سالار یا ایک جزو تھے۔ یہ حضرت عثمان کو بھی معلوم تھا۔ حضرت عائشہ اور حضرت عثمان کی آپس کی ناموافقت نہ اب بصیغہ راز تھی اور نہ صدیقہ کے فتوے نے اس کی سچائی میں کوئی شبہ باقی رکھا تھا۔ ان حالتوں میں یہ سوال آسانی سے پھینک دینے کا نہ ہوگا کہ کیا حضرت عائشہ اپنی ہی تجویز یا طلحہ و زبیر کی صلاح سے ایسی جگہ گئی تھیں جہاں انھیں عثمان کے بعد اپنے آئندہ ارادوں کے نفاذ کی پوری آزادی حاصل رہے، اور انھیں مناسب قرینہ معلوم ہوا ہو، یا امید ہی نہ ہو کہ لوگ علیؑ کی طرف میلان ظاہر کریں گے اور اگر ایسا نہ ہوا تو ظاہر لوگوں میں کوئی ایسا اثر دار نہ ہوگا جیسا طلحہ زبیر اور عائشہ کی تثلیث سے متصور ہو سکتا تھا۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ اس طرح اختیار ہاتھ میں آجائے گا۔ انھیں اس کے کامیابی کی اس لیے بھی امید ہوگی کہ جو کچھ انقلاب ہے وہ بنی امیہ کے خلاف ہے۔ اس لیے بنی امیہ کا کوئی ذی اثر سامنے آنے کی جرأت نہ کرے گا۔ نظر بریں جو کچھ پیش بندی کی ضرورت محسوس ہوئی ہو انھیں اپنی کامیابی کے لیے بنی ہاشم اور بنی امیہ سے کوئی بڑا خوف نہ تھا، اور گویا وہ اپنی کامیابی کو حتمی سمجھتے تھے۔ دیر اسی قدر تھی جس قدر وقت عثمان کے قتل میں صرف ہو۔ طلحہ اور زبیر اگرچہ خود کوشاں تھے اور انھیں امید ہو سکتی تھی لیکن انھیں عائشہ کی ایسی ذی اثر ذات کے سایہ میں پناہ لینا مفید تھا، اور اس لیے

بھی ضروری تھا کہ وہ ان دونوں آدمیوں میں ہم وزنی قوت قائم رکھ سکتیں۔

طلحہ اور زبیر کی آپس کی دشواریاں

تم کہو گے کہ اگر طلحہ و زبیر اور خلافت کے درمیان ٹھنڈی سانسوں کا جزر و مد تھا تو انھوں نے اس وقت خلافت کیوں نہ قبول کر لی جس وقت جناب امیرؑ نے ان کا استمزاج لیا۔ لیکن اس کی ذمہ داری کون کرتا ہے کہ طلحہ یا زبیر ایک دوسرے سے بھی یہ تصفیہ کر چکے تھے کہ ہم میں سے کوئی خلیفہ ہو جائے بلکہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ طلحہ و زبیر عائشہ کے زیر اثر ایک نظام درست کرتے جو نظام شنوی (ڈولسٹک) کہا جا سکتا۔ آپس میں کسی کو کوئی ترجیح نہ ہوتی اور انھیں حد پر رکھنا عائشہ کا کام ہوتا۔ اس کے علاوہ کچھ اور نہ ہو سکتا۔ اس لیے کہ ان دو حضرات کے دو فرزند تھے جن میں گرم خون اور بلند حوصلہ تھا جس سے ہر تصفیہ کی موقت امید کر لی جا سکتی۔ لیکن اس پر اعتبار کر لینے کا کوئی اعتبار نہ تھا۔

جناب امیرؑ کے فرمانے کے وقت کیوں طلحہ و زبیر نے خلافت قبول نہ کی

دوسرا امر یہ تھا کہ جناب امیرؑ کا بالفرض محال یہ فرمانا کہ: "اگر تم پسند کرتے ہو تو میں تمھارے ہاتھ پر بیعت کروں"۔ ان کا ایک ذاتی اعلان تھا۔ اس کے بعد یہ لوگوں کی خواہش ہوتی کہ وہ بھی ان میں سے کسی کو پسند کرتے یا نہ کرتے، یا باوجود ان کی پسند کے علیؑ ہی سے خلافت قبول کرنے کی استدعا کرتے۔ طلحہ و زبیر نے علیؑ کے ایسا فرمانے پر اپنے اعلان پسند کی سبقت نہ کی۔ اس لیے کہ وہ لوگوں کے موج خیز میلان کو علیؑ کی طرف دیکھ رہے تھے اور یہ محض بشرہ اور دل میں نہ تھا بلکہ صدا تھی جو ایک بڑے دور میں سنائی دیجا چکی تھی۔ مجھے کوئی شبہ نہیں کہ ان کی بیعت خوشی سے نہ تھی لیکن میں حسن کے خیال کو دہرانا چاہتا ہوں کہ حکم شرع ظاہر پر ہے۔ وہ اپنے اقرار بیعت کے ذمہ دار تھے اور یہ تو کہنا ہی نہیں ہے کہ اگر طلحہ و زبیر کو علیؑ کی بیعت سے اکراہ تھا تو کس وجہ اور کس کی طرف رغبت کے لحاظ سے۔

ان اتفاقات میں انھیں بجز اس فوری عمل کے کوئی چارہ نہ تھا کہ یہ دیکھتے کہ ہم امورات خلافت میں کس درجہ دخیل ہو سکتے ہیں درآنحالیکہ انھیں اپنی اندرونی فکروں سے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔

کچھ تھا جس سے زینب بنت ابوسفیان یہ کہہ سکتی کہ: "طلحہ و زبیر نے عثمان کے قتل میں کوشش کی اور فتنہ کھڑا کیا۔ اگر آج علیؑ کی بیعت کی ہے تو اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ آخر میں مخالفت کریں گے۔ ظاہر میں دوست اور باطن میں دشمن ہیں"۔ یہ لطیفہ نہیں ہے کہ ان کا دل اپنے کو اس درجہ ظاہر کر چکا تھا کہ بے شعور دف بھی منھ چڑھانے کی کوشش کرتا۔ تجربہ ہوا۔ دیکھا کہ علیؑ کو ان کے اس اعلان سے کہ: "میل و محاباز من واقع نہ شود"۔ اور "میان شما ترجیح نہ نہم"۔ ہٹا نہیں سکتے ہیں تو اب اپنی دل کی دبی ہوئی آگ کو فرو کرنا ممکن معلوم نہ ہوا۔ نہ اس کے قبل کہ طلحہ بصرہ کی اور زبیر کوفہ کی حکومت کے خواستگار ہو چکے ہوتے۔ عالم سیاسیات کا اقتضا یہ نہیں ہے کہ چیزیں اپنی ظاہری صورت میں قبول کر لی جایا کریں۔ یا اعلان اپنے الفاظ کے اعتبار اور شکل سے قابل وثوق ہو جایا کریں۔ اس میں اعتبار سب سے آخر چیز ہوا کرتی ہے۔ بلکہ ظاہری صورت کی جگہ اس کی تہ اعلان کی جگہ غرض اور نیت الفاظ کی جگہ عمل اور اس کا اثر دیکھا جاتا ہے اور گزشتہ یا آئندہ قرائن کا وزن کیا جاتا ہے۔ سیاق اور سباق پر متلاشی۔ چھانتی ہوئی نظر چھوتی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد حکومت کی

کشتی کھینے والے کا وہم اسے اس طرف لے جاتا ہے۔ جدھر اسے طوفان کا سب سے کم قرینہ اور اپنے تجویز کے محفوظ اور مفید مقام پر اتار دینے کا یقین ہوتا ہے۔

حکومت کو اس کا مشکور ہونا چاہیے تھا کہ طلحہ و زبیر نے اس لیے بصرہ اور کوفہ جانے کی خواہش کی کہ: "لوگوں کے منتشر خیالات کو مجتمع کریں"۔ اور جناب امیرؑ نے بعض مورخین کے موافق یہ فرمایا کہ: "تمہارا میرے پاس رہنا مناسب ہے"۔ کیا اس لیے کہ انھیں تسکین ہوتی اور مشکل امورات میں ان کی صلاح لیتے۔ نہیں۔ صلاح قبول کی جانے کے لیے یہی ضروری نہیں ہے کہ صلاح دینے والا بڑا سمجھ دار ہو، بلکہ کوئی صلاح قابل عمل نہیں ہے، جب تک کسی مخصوص صلاح کے متعلق صلاح لینے والے کو اعتبار نہ ہو۔ کیا یہ موقع تھا کہ جناب امیرؑ اس صلاح کو قبول کرتے؟۔ کیا جناب امیرؑ نے کوئی صلاح طلب کی تھی؟۔ نہیں۔ بلکہ بصرہ اور کوفہ کے "منتشر خیالات" ہی قابل سوال تھے۔ بصرہ پر جناب امیرؑ کا عامل قابض ہو چکا تھا، اور اسے کوئی شکایت نہ تھی۔ کوفہ میں ابوموسیٰ بیعت کر چکا تھا، اور اگرچہ جناب امیرؑ کو اس کی طرف سے اطمینان نہ تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی معلوم تھا کہ اہل کوفہ زیادہ تر ہمارے مؤید حقوق ہیں۔ یہ جناب امیرؑ کے سمجھنے اور دیکھنے کی بات تھی کہ وہ کوفہ کے ساتھ کیا کریں گے۔ اور کس طرح اپنا اطمینان کریں گے۔ اور یہ بھی ذکر کیا گیا کہ جب بغیر اطمینان کیے ہوئے آگے بڑھنا قرین مصلحت نہ نظر آیا تو جناب امیرؑ نے مسلسل کوشش سے اس وقت تک ہاتھ نہ اٹھایا جب تک انھیں کامیابی نہ ہوئی۔ یہ کامیابی فوجی ذرائع سے نہ تھی، بلکہ خالص سیاسی تھی۔ پھر کیا تھا کہ اب طلحہ و زبیر ان دونوں مقامات پر جا رہے تھے۔ اس لیے کہ انھیں امید تھی۔ ایک جگہ ابوموسیٰ تھا جسے اپنا ہم خیال اور ہم عمل بنا سکتے تھے اور اس کے علاوہ بہتے ہوئے دریا میں پرند جانوروں کے بیٹھ جانے کے لیے بہت سی لاشیں مل جاتی ہیں۔ عبداللہ بن عامر ابھی چند روز ہوئے تھے کہ بصرہ سے بھاگا تھا۔ وہاں بھی ...... تھا اور راز تو یہاں تک ظاہر تھا کہ یہ حضرات ابن عامر کے بھاگ آنے پر یہ کہہ سکتے کہ تو نے جلد چلے آنے میں غلطی کی۔ تجھے ہمارے آنے تک انتظار کرنا چاہیے تھا! اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ کیا علیؑ یا ان کے موقع پر کسی دوسرے مدبر کا یہ موقع تھا کہ وہ انھیں ان کے امن اور صلح کے الفاظ کا شکریہ ادا کر کے روانہ کر دیتا اور اس کا منتظر رہتا کہ نقض امن یا حکومت کے خلاف فساد کی خبر آتی اور اس کے بعد نہ صرف معاویہ کی فکر ہوتی بلکہ بصرہ اور کوفہ کے ایسے دو مفید مقامات بھی قبضہ سے نکل جاتے۔ بفرض محال طلحہ و زبیر نہایت نیک نیتی سے صلاح دے رہے تھے۔ اور یہ سب غلط کہ جناب امیرؑ ان کے دلی راز سے واقف تھے اور جب انھوں نے مکہ جانے کی اجازت چاہی اور جناب امیرؑ نے ساری باتیں کھول کر رکھ دیں تو انھوں نے سر جھکا لیا لیکن سوال تو یہ ہے کہ صلاح کے قبول نہ کیے جانے پر انھیں مدینہ رہنا کیوں ناگوار ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ آئندہ کے الزامات گھڑنے کے لیے آمادہ ہوئے۔ اگر پہلی غرض یہ تھی کہ علیؑ کو راہ سے ہٹا دیں اور جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس کے عکس یعنی لوگوں پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ کیا، اور دنیا کو اس کا کافی تجربہ ہے کہ جم غفیر پر قبضہ کر لینا خصوصاً ایسے ذرائع سے کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ دونوں کا نتیجہ ایک تھا، یا دونوں چالیں ایک ہی نتیجہ کے لیے تھیں۔

مدبرین کے نزدیک یہ ہمیشہ ناقابل معافی گناہ رہا ہے نہ ان کی مصلحت اور اس کی غرض کو وہ کیوں سمجھے جن پر رہا کی گئی تھی اور اس کے اجرا تک سخت احتیاط کرتے ہیں اور اس کے بعد طرح طرح کے عذرات سے تجاہل پیدا کرتے ہیں،

یہاں تک کہ ان کی مصلحت اپنے مرکز پر پہنچ جاتی ہے اور ڈھانک لیتی ہے۔ کیسے بھلا معلوم ہوتا طلحہ و زبیر کو جب وہ نہ صرف دیکھتے بلکہ جناب امیرؑ کو فرماتے ہوئے بھی سنتے کہ: "میں وہ کفتار (ایک جانور) نہیں ہوں جو دیر تک صیاد کے آہستہ آہستہ زمین پر لکڑی مارنے سے سو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا طالب اس تک پہنچ جاتا ہے اور اس کا منتظر اسے دھوکا دیتا ہے۔

شاید ہم میں سے بعض یہ خیال کریں کہ اصحاب جمل میں دفعۃً کیسے یہ ہم آہنگی پیدا ہو گئی کہ وہ سب کے سب مکہ میں جمع ہو جاتے اور وہ کرتے جو کچھ کیا۔ ضرور ان میں آگے پیچھے جمع ہو جانے کی ہم آہنگی پیدا ہوتی۔ لیکن ان کی یہ ہم آہنگی کہ وہ اس غرض کے لیے جمع ہو جاتے جس کے لیے جمع ہوئے کوئی فوری انقلاب طبیعت نہ تھا۔ جس کی تاریخ نہ صرف ہم واضح کرتے رہے بلکہ واقعات کے قریب قریب یکساں نوعیت کی تکرار نے اسے اچھی طرح ذہن نشین کر دیا۔ یہ کچھ نہ تھا، مگر یہ کہ واقعات کا نشو تھا۔ مجھے اس وقت ان لوگوں کا جمع ہونا حیرت میں نہیں ڈال سکتا جب کہ مجھے رسولؐ کی رحلت کے بعد ہی حاکمانہ اختیار سے لدی ہوئی صورتیں رسولؐ کے گھر کا محاصرہ کیے ہوئے دکھائی دیتی ہیں۔ اور جب یہ لوگ اس طرح صریحاً دن کو رات کہنے پر آمادہ تھے تو کیا غم تھا کہ کوئی یہ کہتا کہ "رسولؐ کو یہ زیادہ گوارا ہوتا کہ عثمان قتل ہو جاتے بہ نسبت اس کے کہ تم اس طرح باہر آتیں"۔ یا یہ کہ "تم نے اپنی بیبیوں کو پس پردہ بٹھایا ہے اور زوجہ رسولؐ کو اس طرح لیے پھرتے ہو"۔ اس وقت تک نسوانی بے حجابی غیرت سے اس درجہ بلند نہ ہو گئی تھی کہ اس کے بہت سے حامی ہوتے۔ شاید یہ بے حجابی موقت ہو اور منافع ایسے واضح ہوں جس پر غیرت قربان کی جا سکتی ہو۔

حضرتؑ حفصہ کو ابنِ عمر کے روکنے کے اسبابؑ

کوئی حیرت کی جگہ نہیں ہے اگر حضرت حفصہ نے حضرت عائشہ کی ہمراہی گوارا کی اور اسی طرح اس میں بھی کوئی عجب کی بات نہیں ہے کہ حضرت ام سلمہ نے حضرت علیؑ کا ساتھ دیا۔ کیسے صاف ہوتا کہ حیاتِ رسولؐ میں بعض ازواج کا ایک گروہ تھا، اور بعض کا دوسرا۔ جس میں یہ کہا جا چکا کہ حضرت عائشہ اور حفصہ ایک طرف تھیں اور حضرت ام سلمہؓ دوسری طرف۔ اور صورتِ معاملہ جو ہو رہی تھی اس سے حضرت عائشہ اور حفصہ کا اپنے اپنے باپ کو مفید حالات سے مطلع کرنا اور اپنے موقع کے لحاظ سے ان کی کامیابی پر اثر ڈالنا بعید نہ تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ عبداللہ بن عمر نے اپنی بہن کو روکا۔ اس کا تصفیہ کر سکنا کہ اس سے ان کی کیا غرض تھی کسی قدر مشکل ہے۔ لیکن یہ امر واضح ہے کہ کسی طرح ابن عمر کو مساوی یا اولیٰ نصیب کی امید نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے کہ خونِ عثمان کے بہانہ سے انتقام لینے کی صلاح میں ابن عمر کا کوئی ہاتھ نہ تھا، بلکہ مصلحت گھڑنے والا گروہ محض موقع کے تقدس کے اضافہ کے لیے حضرت حفصہ کو بھی ساتھ لے لینا چاہتا تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ یہ کون کون لوگ ہیں اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ طلحہ و زبیر اور عائشہ میں جو ایک دوسرے کا لحاظ ہے اس میں ہمیں یا ہماری بہن کی شرکت کو کوئی امتیاز نہیں دیا جا سکتا۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ طلحہ وہ شخص ہیں جنھوں نے میرے باپ کی نامزدگی پر عذر کیا، اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ ہمارے باپ قریش میں ایسے مقبول نہ تھے کہ اب کسی سہارے کی امید کی جائے۔ وہ اس سے بھی واقف تھے کہ اپنے دورانِ خلافت میں میرے باپ کی سخت دیکھ بھال یا بے اعتباری نے اکثر صاحبِ اثر لوگوں کو جو ان کے وقت میں معزول ہوئے ان کی طرف سے کبیدہ کیا۔ ان خیالات کے باوجود میں اسے بھول نہیں جاتا کہ ابنِ عمر گوشہ نشین اور عابد

مشہور تھے اور ممکن ہے کہ انھوں نے ایسی شور انگیزی میں اپنی بہن کی شرکت سے احتیاط کی ہو۔ میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ انھیں اصحاب جمل کی اس کوشش کے عدم حقیقت کا یقین تھا جو ان کے بعد کے اس خیال سے ظاہر ہے، جسے میں "سیرۃ الفاروق" میں پاتا ہوں کہ: "اپنے مرنے کے قریب کہا کرتے تھے کہ میں اپنی زندگی میں کوئی چیز ایسی نہیں پاتا جس پر افسوس کروں، اور اب اس کے کرنے کا موقع نہ رہا ہو بجز اس کے کہ حضرت علیؑ کے ساتھ مل کر باغی گروہ سے لڑائی نہ کی"۔

صورت حال کے متعلق جنابؑ امیر کے خطبہ کا حوالہ

تمام تاریخوں اور روایات و حدیث کی کتابوں میں جناب امیرؑ کے وہ جواب لکھے ہیں جو انھوں نے اپنے متعلق الزام پر دیے ہیں۔ میں نے اسے الکرار میں کافی حد تک نہج البلاغہ سے نوٹ کیا ہے۔ جناب امیرؑ کہیں اہل مدینہ کو بیخ بناتے ہیں۔ کہیں طلحہ و زبیر کے حوصلہ حکومت کا ذکر فرماتے ہیں۔ کہیں طالبان خون عثمان سے اس مسئلہ کے متعلق مختلف جماعتوں کے خیال بتاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ایسے کام نہ کرنا جس سے قوت متزلزل ہو جائے۔ امید دلاتے ہیں کہ میں عنقریب امر خلافت سے اس طرح تمسک کروں گا جس سے یہ محکم و استوار ہو جائے اور جب کوئی چارہ کار نظر نہ آئے گا تو پھر آخر ش درد کی دوا داغ ہے۔

مخالفین کی حرکات پر صبر کا وعدہ فرمایا ہے جب تک موافق جماعت کے ضرر کا اندیشہ نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ اس جماعت نے احکام اسلام کو اس کے پشت سر کی طرف لوٹانے کا ارادہ کیا ہے۔ اب تمھیں لازم ہے کہ کتاب خدا و سنت رسولؐ کے ساتھ ہمارے طریقہ پر عمل کرو۔ رسولؐ کے حق کو قائم کرو۔ اس کی شریعت کو بلند و برتر بناؤ۔ فرماتے ہیں کہ طلحہ طلب خون عثمان سے لوگوں کو مغالطہ میں ڈال رہے ہیں کہ بلحاظ اس سرگرمی کے جو ان سے مخالفت عثمان میں ظاہر ہو چکی ان سے مطالبہ خون عثمان نہ کیا جائے۔

کون خلیفہ ہوتا اگر حضرت عائشہ کو فتح ہوتی

باوجود اس کے کہ جناب امیرؑ نے منصفانہ طریقہ سے ان لوگوں کو قاتلان عثمان کا تصفیہ کرنے کے لیے مقرر کیا جو کسی طرف شریک نہ تھے لیکن اگر ایسا ہی ہوتا اور مدینہ کے لوگ حکم بن کر تصفیہ کر دیتے تو آئندہ طلحہ و زبیر کے لیے آگے بڑھنے اور ہاتھ پاؤں مارنے کی کونسی سبیل رہ جاتی۔ جناب امیرؑ یہ جانتے تھے لیکن چونکہ غلط فہمیوں کے جواب کی ضرورت تھی اس لیے کہ بقول مؤلف "تاریخ الاسلام": "لوگ واقعات سے واقف نہ تھے اس (معاویہ) کا یہ کہنا کہ علیؑ قاتلان عثمان کے سردار ہیں اثر کر جاتا تھا"۔ جناب امیرؑ بھی اس زہریلے الزام کو حتی الوسع صاف کر دیتے تھے: جناب امیرؑ کا یہ فرمانا کہ: "ان دونوں میں سے ہر ایک اپنی امارت کی امید رکھتا ہے"۔ یہ کبھی ایسا صاف نہیں ہوا جیسا اس وقت جب کہ امامت نماز کا سوال درمیان میں آیا اور صورت معاملہ یہاں تک پہنچی کہ حضرت عائشہ کی ذات کو یہ کہہ کر دخل کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کیا: "ہمارے کام کو درہم برہم کیا چاہتے ہو"۔ اور یقیناً یہ کہنا بھی لفظ لفظ پورا ہوتا اگر خدا نخواستہ اس کا موقع آتا کہ: "اگر یہ اس چیز تک پہنچ جائیں جس کا یہ ارادہ کر رہے ہیں تو بے شک ان میں سے ہر ایک دوسرے کی جان لے لے"۔ واقعات نے صاف کر دیا کہ حضرت عائشہ کو ابن زبیر کی زیادہ محبت تھی اور اس سے بشرط کامیابی یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہ تھا کہ کون خلیفہ بنایا جاتا۔ اگرچہ بعض مؤرخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ امامت نماز کے لیے

ایک دن طلحہ اور دوسرے دن زبیر کو مقرر کیا۔ کیا میں سوچ سکتا ہوں کہ یہ محض امامت نماز تھی جس کے لیے یہ اہتمام جائز رکھا گیا؟ اور کیا کسی کا یہ نماز پڑھادینا تھا جس سے "کام درہم و برہم" ہو سکتا۔ نہیں۔ بلکہ اپنے پیشرو کے ایک خود ساختہ اصول کے اثر سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا کہ خلیفہ وہ ہوگا جو امامت نماز کرے۔ میں نہیں تصفیہ کر سکتا کہ "اگر یہ مسلمہ اصول تھا تو آگے چل کر ولید ثانی کی بی بی کیونکر خلیفہ نہیں ہو سکتی تھی؟"۔

کیا قاتلین عثمان سے انتقام لینا ممکن تھا

نظام حکومت کی اس برہمی کی حالت میں جس وقت کہ جناب امیرؑ نے اختیار اپنے ہاتھ میں لیا اور جس کے متعلق صاحب سیرۃ الفاروق تصانیف احمدیہ جلد اول سے یہ عبارت نقل فرماتے ہیں کہ: "حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام تک جب خلافت پہنچی تو ایسی ابتر و خراب ہو گئی تھی جس کا درست ہونا اگر ناممکن نہ تھا تو قریب قریب ناممکن تھا"۔ آیا کسی طرح یہ قرین عقل تھا کہ جناب امیرؑ کسی بڑے پیمانہ پر قاتلان عثمان کی تفتیش کر سکتے؟ جب کہ یہ ہر ایک کو معلوم تھا کہ صوبے، قبیلے، شہروں اور خود مدینہ کے لوگ عثمان کے قتل کے محرک اور مؤید تھے۔ کیا یہ ممکن تھا کہ جناب امیرؑ ایسی مشتبہ حالت میں طلحہ زبیر اور عائشہ سے قاتلین عثمان کی فہرست طلب کرتے اور ان لوگوں کو جن کے نام لکھے ہوں ایک ایک کرکے قتل کرنا شروع کرتے؟ درآنحالیکہ اس فہرست میں طلحہ و زبیر کا نام نہ ہوتا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ طلحہ و زبیر جو جناب امیرؑ کے نزدیک شریک شورش تھے جناب امیرؑ کی طلب پر کہ تم بھی ان لوگوں میں ہو جو مستحق سزا ہیں اپنے کو امیرالمومنینؑ کے حوالہ کردیتے کہ قانون اور انصاف ہم پر جاری کیا جائے؟ کیا کسی حاکم کی مصلحت اس کی مقتضی ہے کہ وہ ایسے مُبہم فعل کے لیے آمادہ ہو جائے درآنحالیکہ اس کی رعایا میں سے چند اس سے انصاف نہیں چاہتے۔ نہ استغاثہ کرتے ہیں، بلکہ بہ نوک شمشیر اپنے شرائط لکھواتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ ان کی خواہش پوری کرنے پر بھی ان کی اطاعت کی کوئی امید نہ ہو اور دوسرے طرف وہ جو بغیر تحقیقات کے مستوجب سزا ٹھہریں اپنے حق میں یہ ناانصافی دیکھ کر خود بھی انصاف کو اپنے ہاتھ میں لے لیں اور اس طرح حکومت دو بغاوتوں کے درمیان کروٹیں بدلے؟ بلکہ عقل، انصاف اور مصلحت کا تقاضا اس سے بہتر نہیں ہو سکتا جیسا جناب امیرؑ نے فرمایا کہ: "عثمان کے لڑکوں کو پہلے میری بیعت کرنی چاہیے اس کے بعد جس پر انھیں دعویٰ ہو پیش کریں کہ موافق انصاف شریعت کا حکم نافذ کیا جائے"۔

کون پیش کیا جاسکتا جب کہ خود نائلہ کو کوئی معلوم نہ تھا۔ انھیں تو انتقام چاہیے تھا۔ اس سے کیا بحث تھی کہ علیؑ اسے "زمانہ جاہلیت کے جاہلوں کا کام" سمجھتے، اور چاہتے کہ لوگ مطلق العنانی چھوڑ کر حکومت سے تصفیہ کی خواہش کریں۔ نہ ان لوگوں کو اس معاملہ کو اس وسعت سے دیکھنے کی ضرورت تھی جس ذمہ دارانہ حیثیت کے لحاظ سے امیرالمومنینؑ ملاحظہ فرمارہے تھے کہ تم انتقام کا غل مچارہے ہو۔ دوسرا فرقہ انھیں واجب القتل سمجھتا تھا۔ تیسرا متوقف ہے اور انتقام کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ نہ انھیں اس انتظار میں کوئی فائدہ نظر آتا تھا کہ: "دل اور رائیں اپنے مقام پر قائم ہو جائیں پھر حقوق آسانی سے لیے جاسکیں گے"۔ کیا نتیجہ ہوتا اس کا؟ اس کے کہ قاتلان عثمان قتل کیے جاتے۔ بس۔ اور پھر ہم؟ علیؑ خلیفہ ہو جائیں؟ ___ قتل ہونے کے لیے بہت سے مسلمان ملتے ہیں!

کس نے علیؑ کو وقت دیا۔ کس نے ان کی تائید کی اور کون اس تلخ صبر کے قابل ٹھہرا جو بیعت کر لینے کے شوق اور

جوش کے بعد اس ہوش کو اپنے سامنے رکھتا کہ بیعت کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہم اس راہ پر چلیں جدھر ہم چلائے جائیں۔ راہ خشک تھی۔ لیکن انھیں پتھر کی طرح سخت بنانے والی تھی۔ عادتیں جس طرح بگڑ گئی تھی ان کے بعد اس پر چلنا اور بھی دشوار ہو گیا تھا۔ لوگ تھرا گئے، قدم ثابت نہ رہے۔ یعنی یہ لوگ تھے جنھوں نے اپنے کو ناکامیاب کیا۔ نہ وہ جو انھیں کامیابی کی طرف لے جا رہا تھا۔ وہ تو اپنی مصلحت کی ناکامی کا اس وقت ذمہ دار ہوتا جس وقت لوگ اس کی خواہش پر چلتے اور ناکامیاب ہوتے۔ واقعات کہتے ہیں کہ یہ علیؑ کی مصلحت نہ تھی جو ناکامیاب ہوئی، بلکہ لوگوں کی عدم اطاعت اور تساہلی تھی جو ناکامی پر مصر ہوئی۔ انھیں ابتدا کی تھوڑی سی تکلیف جو آزادی اور اختیار کی طرف لے جاتی بھلی معلوم نہ ہوئی اور وہ غلامی پر منھ کے بل گرے۔

نتائج کی تنبیہ

جناب امیرؑ نے انھیں قبل اس کے کہ کوئی واقعہ ہو تا پیشتر سے تمام نتائج سے مطلع کر دیا، اور اس طرح وہ اپنے تمام فرائض سے سبکدوش ہو گئے جسے ہم آگے ذکر کریں گے۔ بیان کیے جانے والے واقعات جناب امیرؑ کے اس فرمانے اور طرز عمل کا ثبوت ہوں گے کہ: "جب کوئی چارہ نہ ہوگا تو پھر آخر ش درد کی دوا داغ ہے"۔ یا "میں ابھی ان لوگوں کی حرکات پر صبر کرتا ہوں جب تک تمہاری جمعیت کو ضرر پہنچنے کا خوف مجھے لاحق نہ ہو"۔ اور یہ بھی بغیر فرمائے نہ رہ سکتے تھے کہ مخالفین کے ضعف عقل اور بے جا ضد سے مُسلمانوں کے کاموں کا انتظام بگڑ جائے گا"۔ اور ان لوگوں کے طرز عمل کے لحاظ سے اور کیا نتیجہ نکالا جا سکتا تھا مگر یہ کہ: "اس جماعت نے احکام اسلام کو اس کے پشت سر کی طرف لوٹانے کا ارادہ کیا ہے"۔!

چونک اُٹھنے میں ایک طویل زمانہ کی تاریخ مضمر ہے

چونک اٹھے جو اسے خلاف امید امر بجھتا ہو کہ حضرت ام المومنین نے قتل عثمان کی خبر بغیر کسی جذبہ کے سنی اور جب معلومات میں اس سے اضافہ ہوا کہ "اور علیؑ خلیفہ ہوئے"۔ تو زبان نے یہ الفاظ اور فقرہ مرتب کر لیا کہ "کاش آسمان پھٹ پڑتا کہ یہ برا دن نہ دیکھتے"۔ طبعاً حضرت عائشہ کا چونک اٹھنا فطری تھا۔ لیکن ان کا چونک اٹھنا واقعات کی شرح بھی تھی کہ اب جناب امیرؑ کا خلیفہ رسولؐ ہونا اس قدر بعید از قیاس ہو گیا تھا کہ حیرت اور عجب کے انسداد کے لیے کوئی ارادہ احتیاطاً بھی پیشتر سے موجود نہ ہوتا۔ مکہ کا اموی عامل مددگار ہو گیا۔ مکہ بنی امیہ کا مرکز ہو گیا اور سامان کی درستی کے لیے یعلیٰ بن منبہ چھ لاکھ دینار لے آیا۔

مخالفت کے عناصر کا اندازہ

جناب امیرؑ نے اصحاب جمل کی اصلی قوت کا نہایت صحیح اندازہ کیا تھا۔ جہاں وہ فرمارہے تھے کہ جمل کے حقیقی عناصر طلحہ زبیر عائشہ اور یعلیٰ بن منبہ ہیں جس میں ایک پر تفنن مدبر، دوسرا بہادر سپاہی، تیسرا مرکز تقدس اور چوتھا مالی تائید ہے۔ اور جب یہ باتیں جو فوجی آراستگی کے لیے مفید اور ضروری ہو سکتی تھیں موجود تھیں تو کون امر اس اعلان سے مانع تھا کہ: "جو شخص اسلام کی ہمدردی کرنا اور خون عثمان کا بدلہ لینا چاہتا ہو اور اس کے پاس سواری نہ ہو وہ آئے اس کو سواری دی جائے گی"۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ کوئی مدبر ایسی "اسلام کی ہمدردی" کا اور کیا عملی ترجمہ کر سکتا ہے بجز اس کے کہ ہمیں صاحب اختیار بنانے کے لیے اپنی جانیں دو۔ اور علیؑ بن ابی طالب کو اختیار سے ہٹا دو۔ سواری دینے کے لیے ہم تیار ہیں اور پھر

ہم کامیاب ہوئے تو کبھی تمھاری گردن کو یہ شکایت نہ ہوگی کہ اس پر بوجھ نہیں ہے۔ اسے کون دکھاتا؟۔

اصحاب جمل اور بنی امیہ میں ردوبدل

محرکین جمل کے لیے تھوڑی دیر سوچنے کی بات پیدا ہو گئی تھی جس وقت سعید بن العاص نے ان سے سوال کیا کہ :

"اگر تم فتح مند ہو گئے تو کس کو صاحب الامر بناؤ گے"۔ اب تک طلحہ و زبیر جو سوال کا مطلب نہ سمجھے تھے اطمینان سے کہنے لگے کہ : "ہم دونوں میں سے جس کو لوگ منتخب کریں گے"۔ اور یہ سن کر سعید نے ایک بدمزہ تجویز پیش کی کہ "نہیں۔ بلکہ عثمان کے لڑکے کو حکومت دینا"۔ اور تائید اس سے کی کہ : "کیونکہ تم خون عثمان کا معاوضہ لینے کو نکلے ہو"۔ طلحہ و زبیر نے جواب دیا کہ : "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اکابر و شیوخ مہاجرین کو چھوڑ کر ان لڑکوں کو حاکم بنائیں"۔ ہم نہیں جانتے کہ ان کا یہ جواب سن کر کسی بوڑھے بدری صحابی نے ابوقحافہ کے لفظوں میں یہ خیال ظاہر کیا تھا یا نہیں کہ : "اگر بزرگی سن سے کوئی خلیفہ ہو سکتا ہے تو ہم کیوں نہ ہوں"۔ اور سعید نے جواب دیا کہ : "ایسی حالت میں میں کوشش نہ کر سکوں گا"۔ اور یہ کہہ کر مع عبداللہ بن خالد اور مغیرہ بن شعبہ کے الگ ہو گئے۔ اور پھر شام۔ کیا یہ اس کی ایک مثال نہ تھی کہ ہر مضبوط گروہ اور اس کے افراد میں یہ خود غرضانہ خیال مضمر تھا کہ : "ہم کیوں نہ ہوں" بنی امیہ اب وہ بنی امیہ نہ تھے جنھیں تھوڑی سی لالچ موافق بنانے رہتی۔ اب معاویہ اپنے اِختیار سے شام کا عامل تھا۔ بنو امیہ کی نو آبادی اس کی معین تھی اور سلطنت اور اس کے اِختیارات کو قومی حیثیت سے بچانے پر مستعد تھی۔

اصحاب جمل کی فتح بنو امیہ سے جنگ کا مقدمہ ہوتی

یہ واقعہ ہے کہ اصحاب جمل نے شام کو اپنا مرکز نہیں بنایا، بلکہ اپنے لیے ایک دوسرا میدان تلاش کیا، اور کچھ تھا کہ ان لوگوں نے یا تو معاویہ سے مدد طلب نہ کی یا معاویہ نے ان کی طلب پر انھیں کھرا جواب دیا، اور یہ خاموش ہو رہے۔ اب کیا یہ سوچا جا سکتا ہے کہ اگر طلحہ و زبیر کو فتح ہوتی تو یہ ابن سفیان کو اپنے ماتحت بنانے کی کوشش نہ کرتے یا اسے معزول نہ کرتے، یا مدد نہ کرنے کی سزا نہ دیتے۔ بنی امیہ اور ان کے حوصلے اب اس سے کہیں بڑھ گئے تھے کہ وہ حضرت عائشہ یا طلحہ و زبیر کی صاحب الامری گوارا کرتے وہ علیؑ سے اپنے اِختیارات کے لیے لڑے، وہ طلحہ و زبیر سے لڑتے اگر یہ صاحب اِختیار ہوتے۔

ساز و سامانوں کی درستی کے بعد اُونٹ اپنے عالم پسند خوش رفتاری سے آگے بصرہ کی جانب بڑھا

جناب امیرؑ کے آمد کی خبر نے اس اصلاح پسند لشکر کو تھوڑی دیر کے لیے اِنتقام خون عثمان بھلا دیا، اور بصرہ پہنچنے کی جلدی کی گئی۔ احنف بن قیس کے ایسے بہادر سمجھ دار اور تجربہ کار افسر کو ملانے کی کوشش کی گئی لیکن الٹے نقضِ عہد کا اِلزام سننا پڑا۔

اصحاب جمل نے وہ طریقہ اختیار کیا جو ڈمی یہوُد کے ساتھ کرتے تھے

عثمان بن حنیف کا ایسا مقدس صحابی جو عائشہ کے لشکر کشی کی خبر سن کر ایسا موافق واقعہ پر مغز فقرہ کہہ سکتا تھا کہ اب "اسلام کی چکی چلی"۔ اس سے امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ کوئی ایسی روش اِختیار کرے جس میں قومی مضرت کا شائبہ پایا جائے اور اس نے نہایت یخ تصفیہ

کیا کہ: "میں ان کو روکوں گا، تاآنکہ امیرالمومنینؑ آئیں"۔ لیکن اس لشکر کے فاتحانہ حوصلوں کو اس میں کامیابی کی صورت زیادہ نظر آئی کہ کسی مقامی عامل اور اس کی موجودہ فوج سے لڑنا آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ انتظار کے بعد فوجیں اس کی مدد کو آجائیں۔ جنگ ہوئی عثمان بن حنیف نے شہر کی حفاظت اور اپنی ذمہ داری کے فرض کو خوب ادا کیا۔ یہاں تک کہ فاتح لشکر نے بھی امیرالمومنینؑ کے آنے تک ہتھیار روک رکھنا گوارا کیا۔ لیکن یہ عہد صرف دھوکا دینے کے لیے تھا۔ اور جس وقت کہ بوڑھا صحابی عشرہ مبشرہ کے دو اصحاب اور ایک ام المومنین کے قول پر ایک مسلمان کے یقین کے ساتھ مطمئن ہو کر مسجد میں خدا کی عبادت کر رہا تھا یہ لوگ روم کے سپاہیوں کے طرزِ عمل کو اختیار کر رہے تھے۔ جو اس کے منتظر رہتے تھے کہ یہود یوم السبت کو عبادت میں مشغول ہوں تو ہم حملہ کریں۔ شاید یہ پہلا موقع تھا کہ خانہ خدا میں مسلمانوں نے مسلمانوں کا خون بہایا۔ مسجد میں خدا کا بزرگ نام بلند نہیں کیا گیا بلکہ "تلواروں کی جھنکار سے مسجد گونج اٹھی"۔ کیا عجب ہے کہ قتل کے جوش اور خوشی میں "اللہ اکبر" منھ سے نکل گیا ہو۔ کون تھا جو عبرت سے کہتا! آئندہ ذکر کیا جائے گا جس سے بڑھ کر کسی بڑے موقع پر تکبیر نہیں کہی گئی۔ اور سب جانتے ہیں کہ عثمان بن حنیف کس کے حکم سے کس سزا کا مستوجب ٹھہرا۔ اور پھر فاتحانہ داخلہ کے بعد طلحہ نے خطبہ کہا اور معاملہ عثمان میں اپنی برات کی کوشش کرنی چاہی تو کسی نے صاف منھ پر کہہ دیا کہ: "ہمارے پاس تو تمہارے خطوط اس کے خلاف آتے تھے"۔ کیا مشکل تھا کہ یہ سن کر زبیر جواب دیتے کہ: "ہم نے یقیناً ایسے خطوط نہ لکھے ہوں گے"۔ اقرار کرنا موجودہ موقع کے خلاف بلکہ مضر ہوتا۔ یہ مذہب کے سایہ میں اس وقت نہ تھے مدبر تھے۔ اس وقت سیاسی اخلاق پر عمل کرنا پڑ گیا تھا۔

جناب امیرؑ حلقہ جنگ کو وسعت نہ دینا چاہتے تھے

میں نہیں کہہ سکتا کہ کیوں لیکن غالباً جنگ اور اس کے نتائج کو وسعت نہ دینے کا خیال تھا کہ امیرالمومنینؑ نے قبیلہ طے، اسد اور بکر بن وائل کی شرکت جنگ کی خواہش کو منظور نہ فرمایا۔ اور اسی طرح احنف بن قیس کے متوقف رہنے اور لوگوں کو کسی طرف شریک ہونے سے علیحدہ رہنے کو پسند کیا۔ اہل کوفہ کو بھی یہ پیغام نہیں دیا کہ تم میرے شریک ہو کر لڑو بلکہ: "جس بلا میں تم اور ہم بھی مبتلا ہو گئے ہیں اس میں ہماری مدد کرو۔۔۔۔ اگر ہم مظلوم ہیں تو ہماری امداد کرو اگر ہم ظالم ہیں تو ہم سے حق لو"۔ اور روسائے کوفہ کی حاضری پر خود فرمایا کہ: "اگر وہ لوگ اپنی رائے سے رجوع کرلیں تو فہو المراد، اور اگر اپنے خیال پر اصرار کریں گے تو اس کا علاج ہم نرمی کے ساتھ کریں گے تا کہ ہماری طرف سے ظلم کی ابتدا نہ ہو"۔ اور یہ بھی فرمایا کہ: "ہم کسی کام کو جس میں ذرہ بھر فساد ہو گا بغیر اصلاح کیے نہ چھوڑیں گے"۔

احنف کا سوال پہلے خلیفہ کے طرزِ عمل سے پیدا ہوا تھا

ان واقعات میں ایک نہایت مفید عکس ڈالنے والا سوال احنف بن قیس کا تھا جس نے امیرالمومنینؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر اہل بصرہ کا یہ خوف بیان کیا کہ: "اگر علیؑ کو فتح ہوئی تو وہ ہمارے مردوں کو قتل کر کے ہمارے بچوں اور عورتوں کو غلام بنائیں گے"۔ مجھے اس سوال کی وجہ کے لیے اور کوئی ماخذ بجز اس برتاؤ کے نہیں دکھائی دیتا جس میں مانعین زکوٰۃ مبتلا ہوئے تھے۔ لوگ سوچتے تھے کہ جب ایک خلیفہ مسلمان کنیزوں کی کھیپ کو پسندیدگی سے دیکھ سکتا ہے تو دوسرے کو کونسا امر مانع ہے۔ شاید ان کو معلوم یا یاد نہ تھا کہ نہ صرف علیؑ نے

ابتدا ہی میں ان سے اس جنگ کو پسند نہ فرمایا تھا بلکہ ایک مرتبہ سنت خلفاء کو منظور نہ کرنے پر خلافت سے محروم ہوئے تھے اور اس مرتبہ بغیر اس شرط کے خلیفہ ہوئے تھے۔ اہل بصرہ بھی ان لوگوں میں تھے جنھیں علیؑ کے متعلق زمانہ رسولؐ کے واقعات معلوم نہ ہو سکتے۔ انھیں کیا ذریعہ تھا بجز ان چند لوگوں کے جو یہاں قیام پذیر ہو گئے ہوں یا جنھوں نے کچھ اور ہم خیال بنائے ہوں اور جن کے ذہن میں دیکھے اور سنے ہوئے واقعات رہ گئے ہوں۔ بہر حال جناب امیرؑ نے یہ فرما کر اس وقت بھی اپنے پہلے خیال کی تصدیق کر دی کہ: "میں ہرگز ایسا نہ کروں گا، اہل بصرہ مسلمان ہیں"۔

ابو موسیٰ

ہر شخص جس نے کوفہ میں ابو موسیٰ کے بیعت اور مدد کرنے کے تردد اور انکار پر غور کیا ہے وہ اس میں ذرا شبہ نہیں کر سکتا کہ وہ کسی طرح وجہ علیؑ کا حامی نہ تھا۔ محض اس کی خاموشی بھی علیؑ کے لیے تندوش تھی۔ وہ نہ جانتے کہ ہم کیا کریں اور آئندہ اپنے طرز عمل کو کس طرح درست کریں جب کہ ایک خوفناک بغاوت تمام سامانوں سے سامنے کھڑی ہے۔ ابو موسیٰ حیرت خیز نظریہ پیش کر رہا تھا کہ میری گردن میں عثمان اور علیؑ دونوں کی بیعت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی عثمان والی بیعت علیؑ کے مخالف نہ ہوتی لیکن اس کی ذمہ داری کون کر رہا تھا کہ اسے ان لوگوں سے ہمدردی نہ تھی جو انتقام خون عثمان چاہتے تھے اور علیؑ کے مخالف تھے۔ یہ صورت اس قدر علیؑ کی اطاعت نہ تھی (اگرچہ علیؑ کی بیعت کا زبانی اقرار تھا) جس قدر علیؑ کے مخالفین کی تسکین تھی۔ حضرت عائشہ سے جو خط و کتابت جاری تھی اس سے یہ قیاس کرنا کہ ابو موسیٰ امیر المومنینؑ کے وکلاء کو بلطائف الحیل اس وقت روک رہا تھا جب تک حضرت عائشہ کوفہ میں داخل نہ ہو جائیں۔ ایک ظاہر بات تھی۔ ابو موسیٰ نے ایک لفظ منھ سے ایسا نہیں نکالا جو امیر المومنینؑ کے لیے امید خیز ہوتا۔ ایسی صورت میں اصحاب جمل سے ابو موسیٰ کی اخلاقی ہمدردی ہو یا عملی، علیؑ کے لیے خوشگوار نہ تھی کہ وہ اگر بڑھتے تو ایک بغلی دشمن سے مشتبہ رہتے اور اگر فتح پاتے تو خوف تھا کہ کہیں کوفہ ہارے بھاگے ہوئے دشمنوں کا نشیمن نہ ہو۔ جس سے انھیں جنگ اور خونریزی کی دوبارہ قوت حاصل ہو جائے۔ اب اس تمام گفتگو کے لکھنے کے بعد جو جناب امیرؑ کے بھیجے ہوئے لوگوں یا ان کے مؤیدین نے کی ابو موسیٰ کے پہچنوانے کے لیے اس قدر اور کہتا ہوں کہ وہی جو علیؑ اور اسلام کے فوائد کی پامالی چہرے کے مرتب ریشوں سے دیکھ سکتا تھا، عجز اور انکسار کا پتلا بن گیا جب اسے یقین ہو گیا کہ سرائے سلطانی ہمیں اپنے سایہ میں قبول نہ کرے گی۔ اور مالک اشتر سے اپنے مال و اسباب کے مل جانے کی استدعا کی۔ یہی ابو موسیٰ آئندہ علیؑ اور اسلام کا وکیل بنایا گیا!

باپ اور بیٹے کی گفتگو نفس اور واقعات کی شرح تھی

باوجود اس کے کہ جناب امیرؑ نے مقابل پہنچ کر خطوط، وکیل، ملاقات اور ہر طریقہ سے اصلاح چاہی جس سے کشت و خون کی نوبت نہ پہنچے لیکن ان لوگوں سے صلح کرنے کی امید بہت دور تھی جو جان بوجھ کر تلبیس حق سے اپنے حوصلے پورے کرنا چاہتے تھے۔ یا جو اپنے ساتھ دینے والوں کو ان الفاظ سے آمادہ کرتے تھے کہ: "اپنے زن و فرزند اور حسب و نسب کی حفاظت کے لیے لڑو"۔ اگر زبیر پر دو بدو گفتگو کا اثر پڑا بھی تو اس لیے کہ تھوڑی ہی دیر میں غلام قسم کی قربانی قرار دیا جائے۔ اور یہ تلخ سچائی اپنے بیٹے کے منھ سے سننی پڑی کہ: "جب دونوں فریق کو جمع کر لیا اور ایک کو دوسرے کی عداوت پر ابھار دیا تو اب چھوڑ کر جانے کا قصد کرتے ہو"۔ بہادر زبیر کے لیے یہ آسان امر نہ تھا کہ وہ اپنے ہی فرزند سے سنتا کہ: "تم میں نامردی آ گئی ہے"۔

جنابؑ امیرؑ نے برے وقتؑ کو کبؑ تکؑ دُور رکھا

وہ برا وقت آگیا کہ بجز جنگ کیے چارہ نہ ہوتا۔ جناب امیرؑ نے اس قدر صبر کیا تھا کہ دوست یا دشمن کوئی اس الزام کا خیال بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ہم تو معاملہ کے سمجھنے اور صلح پر آمادہ تھے علیؑ کے فاتحانہ جوش نے ہمیں موقع ہی نہ دیا۔ دشمن کے تیروں کے مینھ سے سپاہی گرے اور زخمی ہوئے۔ سپاہی دیکھتے رہے اور اب اپنے افسر کے حکم کے قبل تیار از جوش جنگ سے بے چین ہو گئے اور خود بھی دشمن کے زیادتی کو روکنے کی اجازت چاہی اور علیؑ کا قرآن بردار سفیر قتل کیا گیا۔ رکتے ہوئے لفظوں میں جناب امیرؑ نے جنگ کی ضرورت کا اقرار کیا۔ اور جب یہ تصفیہ کر چکے تو اب علیؑ کا تمام خاصہ جنگ ہی سے فیصلہ کرنے پر تیار ہو گیا۔ اور وہ جو برسوں سے علیؑ کی تلوار سے بے خوف ہو گئے تھے حیرت سے دیکھنے لگے کہ ذوالفقار میں کوئی دندانہ نہیں پڑا ہے اور نہ علیؑ کے نفس کی اس قوت میں کوئی فرق آیا ہے جس سے مقابل ہو کر دشمن اپنے کو حواس سے معرا پاتا تھا۔ وہی ام المومنین جن کے ساتھ رسولؐ کا غلوے محبت ظاہر کرنے کے لیے کسی کے پاس اس وضع کی روایتیں ہیں کہ رسولؐ نے اپنے کاندھے پر انھیں حبشیوں کا ناچ دکھلایا اور دف سننے دیا، جمل میں مسلمان بسملوں کا عبرتناک رقص اور دل شگاف کراہ سن رہی تھیں۔ جس وقت زخمی اینٹھتے تھے تڑپتے تھے اور کرب میں اپنی ہتھیلیاں رگڑتے تھے۔ یقیناً یہ استقبالی تالیاں نہ تھیں!

مروانؑ کا تیر ایک قلم تھا جو اصحابؑ جمل کے دلائل کو کاٹ رہا تھا

جناب امیرؑ، قعقاع بن عمر یا عمار یاسر تھے جنھوں نے اونٹ کی لنگڑی کو مسلمانوں کا قاتل سمجھا اور اگرچہ حضرت عائشہ کے تشریف فرما ہونے سے کیسا ہی تقدس کیوں نہ آگیا ہو لیکن ان کے ذہن میں وہ مسلمانوں کے خون سے زیادہ مقدس نہ تھا جس کا بہنا روکا جانا ضروری تھا۔ لڑائی ختم ہوئی لیکن نہ اس کے قبل کہ مروان بن حکم طلحہ کو اپنے زہر آلود تیر کا شکار کر چکا ہوتا۔ کون انکار کرے گا کہ یہ تیر وہ قلم تھا جو اصحاب جمل کے دلائل کو کاٹ رہا تھا۔ وہ زبان تھی جو سچی واقعہ خوانی کر رہی تھی۔ افسوسناک تھا یہ امر کہ طلحہ کا ایسا شخص مروان کی اس مکاری کا شکار ہوتا۔ لیکن کسی گناہ گار قاتل نے اپنے مقتول کے واقعات کو قتل سے اس صفائی سے نہیں دکھایا۔ کون جانتا تھا کہ یہ (فعل قتل) طلحہ کے خلاف قطعی دلیل ہو جائے گا، اور خود بقول طلحہ اس خون سے ضائع تر کوئی خون نہ ہوگا۔

دشمنوںؑ کے ساتھ جنابؑ امیرؑ کا برتاؤ

لڑائی ختم ہوئی، بھاگے ہوئے دشمنوں کے ساتھ جناب امیرؑ نے جو رحم کیا شاید ہی کوئی قوم اس کا جواب لا سکتی ہو۔ امیر المومنینؑ اس کے بعد میدان جنگ میں تشریف لے گئے۔ کیوں اور کس نیت سے۔ نہیں معلوم۔ نہ کسی مورخ نے جناب امیرؑ کی اس وقت تصویر کشی کی ہے اور نہ واقعات لکھے ہیں۔ جو خفیف اشارہ مل سکتا ہے وہ محض اس فقرہ سے کہ:
"افسوس لوگ یہ سمجھے تھے کہ ہم پر عوام الناس نے صرف خروج کیا تھا، حالانکہ ان میں یہ لوگ موجود تھے"۔ تشریف لے گئے تھے کہ جنگ کے نتیجہ کے تالیف حسی کریں اور اس عبرتناک عالم پر غور کریں جہاں گیارہ ہزار سے زیادہ زخمی و مقتول سپاہی جنگ آزمائی کر کے پڑے ہیں اور اس افسوسناک وجہ کے لیے جسے ہر شخص جانتا تھا۔

حضرت عائشہؓ کے فقرات

میں حضرت عائشہ کا اس وقت کا فقرہ نہیں سمجھا کہ: مجھے محبوب و منظور تھا کہ آج کے واقعہ سے بیس برس پہلے میں مرجاتی"۔ کیا اس لیے کہ اس خوفناک قتل اور اس کے ضمنی نتائج سے متاثر ہوئی تھیں۔ کیا اس لیے کہ طلحہ و زبیر کے قتل نے ایسے مفید مددگاروں سے محروم کردیا تھا۔ کیا اس لیے کہ باوجود تمام کوششوں کے یہ ناممکن ہوا کہ علیؑ اپنے اختیارات سے ہٹادیے جاتے۔ اور یہ فقرہ اس کی شرح تھا کہ مجھے کوئی گھر اس سے زیادہ دشمن نہیں ہے جہاں اے بنی ہاشم تم ہو"۔ اور اس جوش نے یہ کہلوایا کہ: "اب وہاں جاؤں گی جہاں اے بنی ہاشم تم نہ ہو"۔ کونسی جگہ تھی جہاں اب بنی ہاشم صاحب اختیار نہ ہوتے بجز صوبہ شام کے۔ جس سے قیاس ہوتا ہے کہ اس فقرہ میں دھمکی تھی کہ اب ہم معاویہ کی شرکت سے تم سے سمجھیں گے۔ معاویہ کو اب انھیں ساتھ لے لینے میں کیا عذر ہوسکتا تھا، بلکہ یہ اس کے اغراض پورے کرنے کے کام آسکتی تھیں اور اصحاب جمل کی شکست سے پر پرزے ٹوٹ چکے تھے جو کسی خوف کے باعث ہوسکتے۔ یہ معنے اور دھمکی تھی ورنہ کیا تھا کہ حضرت عائشہ باوجود متواتر فہمائش کے مدینہ کی طرف واپس ہونے کے لیے مستعد نہ تھیں۔ لیکن حضرت عائشہ کے ان تمام اظہار خیال میں سب سے زیادہ خطرناک یہ کوشش تھی کہ انھوں نے اس فقرہ میں کہ: "تم اطمینان رکھو کہ علیؑ تمھاری ان باتوں پر توجہ نہ کریں گے اور تمھیں اس پر مُسلّم نہ رکھیں گے"۔ ابن عباس کو بمقابلہ علیؑ اپنا موقع درست کرنے اور اختیار حاصل کرنے کے لیے ابھارا تھا۔ یا علیؑ کی وفادارانہ وکالت ادا کرنے پر طنز کیا تھا۔ ابن عباس نے صاحبزادی کو وہی جواب دیا جو قریب قریب عباس نے باپ کو دیا تھا۔

جنگ جمل کے بعد کیا پیشین گوئی کی جاسکتی تھی

اصحاب جمل کی شکست اس ہمت اور جوش کی شکست تھی جو علیؑ کو صاحب اختیار نہ دیکھ سکتا تھا، اور اس شکست سے بنی ہاشم کے ہم خیال مددگاروں کو امید ہوسکتی تھی کہ آئندہ ہماری روش بغیر کسی ایسی مزاحمت کے کامیابی سے اپنے مقصد پر پہنچے گی۔ جس قدر ظاہر خطرہ تھا وہ معاویہ کا تھا۔ یعنی برگد کے درخت کا اصل تنا گر چکا تھا لیکن اس کی دوسری شاخ بڑھتے بڑھتے زمین گیر ہوکر اصل سے زیادہ قوی ہوگئی تھی باوجود اس خطرہ کے علیؑ کو لوگوں کی اس وقت تک کی اطاعت اور لوگوں کو علیؑ کی رہنمائی کا جو یقین تھا اس سے یہ امید ہوسکتی تھی کہ آئندہ کسی مخالفت کا آسانی سے مقابلہ کیا جاسکے گا، اور جب بجز شام کے تمام صوبجات ہماری اطاعت کریں گے تو ہم مالی اور شخصی مدد کے لحاظ سے نسبتاً زیادہ قوی ہوں گے۔ یا دوسرے لفظوں میں جب ہم نے تھوڑے سامان اور ابتدائی حالت سے ایسے خوفناک بغاوت کو فرو کردیا اور اس آہستہ قدمی اطمینان اور رحم کے ساتھ تو مزید سامان اور جمی ہوئی حالت میں ہم اس سے کہیں بڑے پیمانے کی سرکشی کو بھی دبا سکتے ہیں۔

تقسیم غنیمت

طبری نے کہا ہے کہ جناب امیرؑ نے مال منقولہ کو فوج کی غنیمت نہ قرار دیا، اور اعلان کیا کہ جو جس کا مال ہو پہچان کرلے جائے۔ روضۃ الصفا نے بھی غنیمت کی واپسی کا ذکر کیا ہے۔

ابن خلدون کہتا ہے: "امیرالمومنین علیؑ نے بیت المال کو کھولا، چھ ہزار سے زائد نقد موجود تھا۔ آپ نے اس کو حاضرین معرکہ پر تقسیم کردیا۔ ہر شخص کو پانچ پانچ سو ملے۔ وقت تقسیم آپ نے حاضرین سے مخاطب ہوکر کہا: اگر تم لوگ ملک شام پر

فتح یاب ہوئے تو تمہارے وظائف کے علاوہ اسی قدر اور دیا جائے گا۔ یہ سن کر فرقہ سبیئہ نے آپ پر بھی درپردہ طعن و تشنیع شروع کر دیا، اور اس سے پیشتر بھی آپ پر ان لوگوں نے طعنہ زنی کی تھی جس وقت آپ نے مال و اسباب کے لوٹنے سے منع فرمایا تھا"۔ ابن خلدون کے "چھ ہزار" سے ہم نہیں سمجھے کہ وہ دینار تھا یا درہم تھا یا ابن خلدون کی چھ ہزار جلدیں تھیں۔ اور یہ تو میری ہندسوی معلومات سے کہیں زیادہ ہے کہ کیسے یہ چھ ہزار اٹھارہ ہزار سپاہیوں پر اس طرح تقسیم ہوتے کہ ہر ایک کو پانچ پانچ سو ملتے۔ مجھے درہم و دینار سے بحث نہیں ہے۔ بلکہ میں صرف یہ سمجھنا چاہتا ہوں کہ آیا کچھ بیت المال کی رقم وصول ہوئی اور وہ تقسیم ہوئی اور تقسیم کو سپاہیوں اور افسروں نے کس طرح قبول کیا۔ یا لوٹ سے روکے جانے کو انھوں نے کس نظر سے دیکھا۔ میں جو کچھ سمجھ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ یعلیٰ بن منبہ کی پس ماندہ رقم یا بصرہ کا بیت المال ملا اور وہ تقسیم ہوا۔ لیکن اس تقسیم کو جس طرح جناب امیرؑ نے جائز رکھا آیا اس طریقہ کو ہر ایک نے اِستحسان سے دیکھا۔ ابن خلدون کہتا ہے کہ کچھ بدگو لوگوں نے طعن و تشنیع کیا۔ کیوں؟ نہیں معلوم۔ اور یہ بھی اسی مؤرخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی ہی لوگوں نے لوٹ نہ کرنے کے حکم پر طعن و تشنیع کی۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ ایک گروہ نے لوٹنے کی اجازت نہ پا کر طعن و تشنیع کی اور جناب امیرؑ کے طریقۂ تقسیم پر راضی نہ ہوا تو ہم صاف صاف وہ سرا پاتے ہیں جس سے صفین کے آخری واقعات سمجھیں کہ کیونکر کچھ لوگ مل گئے یا اس کے بعد کے واقعات میں ان لوگوں کے کافرانہ طرز عمل کی حقیقت اور وجہ سمجھ میں آ جائے۔ یہ طرز عمل اس کا ایک ثبوت ہوگا کہ لوگ اگرچہ بظاہر جناب امیرؑ کی بیعت میں تھے لیکن من حیث الواقعہ وہ ابھی اس فضا سے علیحدہ نہ ہوئے تھے جو انھیں ایسی روش کا خوگر بناتی یا باز پرس نہ کرتی۔ یہ ایک انکار تھا کہ ہم ذاتی فوائد کے معاملات میں جناب امیرؑ کے اس بے رعایت انصاف پر راضی نہیں ہیں۔ اور ہم اس طرح چلیں گے کہ ہم ادھر جائیں گے جہاں ہمیں امتیاز، زیادہ فائدہ اور خصوصیت نصیب ہو۔ ہم دوسروں پر فخر کریں، حسد، بغض، قطع و برید، ہر وقت ہمارے مددگار آئے ہوں۔ اور اس طرح ہم میں کے تھوڑے سے مخلوقات الٰہی کے جزی تعداد کو اپنے ناخونوں میں رکھیں۔ انھیں بجز ہماری اطاعت ہم سے خوف کرنے اور مرعوب رہنے کے کوئی کام نہ ہو۔

اس جگہ یہ نہایت مفید روایت بیان کی جاتی ہے جو ابن ابی الحدید نے فضل بن جعد سے نقل کی ہے کہ: "بہت بڑا سبب نصرت جناب امیرؑ میں عرب کے بیٹھ رہنے کا امر مال ہے۔ کیونکہ نہ وہ حضرت شریف کو مشروف پر اور عربی کو عجمی پر فضیلت دیتے تھے اور نہ کبھی روسا اور امرائے قبائل کو رشوت دیتے تھے جیسا کہ ملوک دیا کرتے ہیں اور نہ کبھی کسی کو اپنی طرف مائل کرتے تھے اور معاویہ اس کے برخلاف تھا"۔

جناب امیرؑ کا کوفہ کو دارالخلافت قرار دینا ان کے اس پہلے خیال کو قوت کے ساتھ پیش کر رہا تھا کہ وہ امیر شام سے بغیر معاملہ طے کیے ہوئے خاموش نہ رہیں گے اور اگر درمیان میں اصحاب جمل اپنے خصائل اور نشو خیالات کے مقلد نہ بن جاتے تو کوئی شبہ نہ تھا کہ امیر شام سے معرکہ آرائیاں شروع ہو گئی ہوتیں۔

کس نے چھیڑ کی ابتدا کی

مغیرہ بن شعبہ کے مصلحت اور صلاح پر وجد کرنے والے غور کریں گے کہ یہ علیؑ نہ تھے جنھوں نے عملاً چھیڑ چھاڑ شروع کی، بلکہ یہ امیر شام ہی تھے جنھوں نے ولایت جزیرہ کو اپنے قبضہ میں لانا چاہا۔ اور ضحاک بن قیس نے ان لوگوں کو ملانے اور میدان جنگ میں

اپنا شریک کرنے کے لیے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی۔ یہ واقعات جب اس عمل کے ساتھ ملا کر غور کیے جاتے ہیں کہ ابتدا ہی سے عثمان کا خون آلود کرتہ اور انگلیاں جامع مسجد میں رکھی گئی تھیں۔ فصیح مقرر اپنی تمام طاقت لوگوں کے جوش دلانے میں صرف کر رہے تھے اور معاویہ نہ صرف بنی امیہ بلکہ مدینہ کے اکثر لوگوں کے خیال دریافت کر رہا تھا۔ اور خبر لے رہا تھا کہ کہاں کہاں کے لوگوں نے علیؑ کی بیعت کی ہے تو کون اس صلاح کو بتجربہ اطمینان کہہ سکتا تھا کہ جب تم کچھ دنوں کے بعد صاحب اختیار ہو جاؤ گے تو معاویہ کو آسانی سے نکال سکو گے اور وہ تسلیم و رضا سے تمہاری بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھے گا اور خوش ہوگا۔ نیز اس کے کہ علیؑ کو دھوکا دیا جا رہا تھا کہ وہ غافل رہیں اور معاویہ ہاتھ پاؤں بلا کر دروازہ کھٹکھٹائے اور اس وقت کوئی چارہ نہ ہو۔ بلکہ جناب امیرؑ نے اعثم کوفی کے موافق اپنے خطبہ میں یہ بھی فرمایا کہ: "معاویہ قیصر سے دوستی کر کے آیا ہے اگر اسے شکست ہوئی تو قیصر سے مدد لے گا"۔ جیسا روضۃ الصفا میں بھی اس کا تذکرہ ہے کہ: "جس وقت عمرو بن عاص اور معاویہ میں پیش نظر واقعات کی گفتگو ہوئی تو قیصر سے دوستی رکھنے کے لیے یہ طے کیا گیا کہ اس کے قیدی واپس کیے جائیں"۔ میں آخری شخص ہوں گا جو اس میں شبہ کرے گا کہ معاویہ کی خراد کا مدبر اس میں ذرا پس و پیش کرتا کہ وہ مسلمانوں پر فتح پانے کے لیے غیر مسلم کو اپنا شریک نہ کرتا۔ او سبورن نے کوئی رعایت یا مبالغہ نہیں کیا ہے جہاں وہ کہتا ہے کہ: "بنی امیہ کا یہ پہلا فطرتی بے رحم اور بے لحاظ خلیفہ کسی ایسے گناہ سے نہ ہچکچاتا تھا جو اسے اس کی جگہ پر مضبوط کر دے"۔ (اسپرٹ آف اسلام) اور کیا آخر میں اس نے یہ نہیں کہا کہ: "اگر اہل حجاز و عراق نے علیؑ سے بیعت کی ہے تو اہل شام نے میری بیعت کی ہے۔ ہم میں اور علیؑ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر دو شخص کسی چیز کے بارہ میں جنگ کریں تو وہ چیز اس کی ہے جو غالب ہو"۔ اور نہ صرف یہ کہا کہ: "میری بہن رسولؐ کے عقد میں تھی بلکہ یہ بھی کہا کہ ارباب حل و عقد کے اختیارات مدینہ سے شام میں منتقل ہو گئے۔ وہ سرِ عام یہ فقرہ منہ سے نہیں نکال سکتا تھا اگر اسے یہ یقین ہوتا کہ زیادہ تر اصحاب رسولؐ کو اپنے ملاحظہ کا پاس ہے۔ اور کیا اس سب کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ ان تمام نکات پر غور کر رہا تھا جو ملایا استدلال کی حیرت زا قلابازی سے توڑ مروڑ کر لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کر دے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ جب ایک بی بی اپنے حق زوجیت سے کہیں بڑا حوصلہ کرتی ہے اور سامان مہیا کر لیتی ہے بغیر اس کے کہ اس کا ایک پیسہ اپنے پاس سے خرچ ہو یا اپنا کوئی آدمی ضائع ہو تو پھر وہ اپنی بہن کا وکیل کیوں نہ ہوتا" درآنحالیکہ ایک صوبہ پر اختیار تھا اور در صورت ہر ممکن تباہی کی بھی نہ اس کی ذاتی جائداد کا کوئی تل بھر ٹکڑا ضائع ہوتا تھا اور نہ لاکھوں کے قتل عام پر ٹھنڈی سانس کی کوئی لہر اس کے دل پر سے گزرتی۔

یہ سب پھر ہوا کہ مثل اپنی مثل کی طرف کھنچنے لگا۔ تمام بنی امیہ شام چلے گئے اور عمرو بن عاص کو بھی فلسطین بھلا معلوم نہ ہوا۔ فوج کشی کی عملی کارروائی شرحبیل بن سمط الکندی کی مذکورہ پر فریب کارروائی سے شروع ہوئی اور شام کا یہ رئیس اپنی وجاہت اور اعتبار کو ناواقف مخلوقات کی جہالت پر صرف کرنے لگا۔ وہ تمام الفاظ صرف کیے گئے جس سے کسی بے رحم حملہ آور کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے اور کوئی ترکیب اثر ڈالنے کے لیے اٹھا نہ رکھی گئی جس سے عثمان کی مظلومیت ثابت ہو۔ اور لوگ ایک خلیفہ رسولؐ کے بے گناہی سے مارے جانے کا قاتلوں سے بدلہ لیں۔ اور جب یہ عمل جاری ہو گیا تو پُر اطمینان زہر خندہ سے جریر سے کہا کہ: تُو نے اہل شام کی رائے دیکھی اور سنی اب تو نے جو کچھ دیکھا یا سنا ہے اُسے جا کر علیؑ سے بیان کر"۔

سادے کاغذ کے معنی بھی یہ تھے کہ ہم تمہارا کوئی جواب نہیں دینا چاہتے۔ تم جو کر سکتے ہو کرو۔ اور سفید کاغذ جو کچھ نہ بتا سکتا تھا اسے قاصد کی زبان نے پورا کر دیا۔

جنابؑ امیرؑ جنگی انتظام شروع کرتے ہیںؑ

جزیرہ نسبتاً کم سامان سے اشتر کے قبضہ میں آگیا اور اس طرح ابتدا امید خیز ثابت ہوئی۔ جناب امیرؑ نے اپنے پرجوش انداز سے خاموشانہ عمل شروع کیا۔ اور آہستہ آہستہ پے در پے ایک ایک افسر کو روانہ کرنا شروع کیا۔ مقدمہ لشکر میں زیاد بن نضر، شریح بن ہانی، ہاشم بن عتبہ ایسے لوگ تھے جن کی افسری ہر سپاہی کے لیے مایہ ناز تھی اور یہ اس پر خوش تھے کہ ہم سب مالک اشتر کے ماتحت ہیں۔ اب تک جناب امیرؑ کے حکم کا اس درجہ لحاظ تھا کہ نزاعی روش اختیار نہ کرنے کے ثبوت میں شام کے افسر کا انکاری خط رکھ لیا جاتا کہ امیرالمومنینؑ کو دکھایا جائے۔ ابوالاعور کو جو ایک تجربہ کار افسر اور معاویہ کا مایہ ناز تھا ضحاک بن قیس کی طرح شکست ہوئی اور یہ بھاگا کہ شام کے اصل لشکر میں مل جائے۔ قبل اس کے کہ مالک اشتر سے سامنا ہو جائے۔ مالک اشتر کا تو کیا ذکر ابھی تک سپاہیوں میں یہ جوش تھا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ ہم تنہا پہاڑ پر حملہ کر دیں ابوالاعور کیا چیز ہے۔ اسی طرح شامیوں کی چھیڑ چھاڑ میں یہ دوسری فتح تھی جو امیرالمومنینؑ کو حاصل ہوئی۔ امیرالمومنینؑ کی یہ بھی دور اندیشی تھی کہ انھوں نے خود کوچ فرما کر نہ صرف سپاہیوں کی ہمت بڑھائی بلکہ قریب پہنچ کر دشمن کو مرعوب کیا۔ صفین شام سے زیادہ قریب تھا۔ اور تیسری نمایاں فتح فرات کے کنارہ حاصل ہوئی جب کہ شامیوں نے پہلی مرتبہ فرات کا پانی بند کیا۔ بنی ہاشم کو آج اختیار تھا کہ وہ بنوک شمشیر شامیوں کو گھاٹ سے ہٹا دیتے اور اختیار رکھتے تھے کہ شامیوں کو پانی نہ دینے کا جواب دیتے لیکن رحمۃ للعالمین کے اس جانشین سے امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ انسان کو اس کے حق بشری سے باز رکھے۔ علیؑ کا یہ احسان رسولؐ اور علیؑ کے عام احسانوں کی طرح آگے ذکر کیے جانے والے زمانہ میں بالکل بھلا دیا گیا۔

علیؑ فتح سے کیا کام لیتے تھے

کوئی فاتح فوج جس وقت فتح کے جوش میں کمزور سے ناقابل برداشت رعونت کا برتاؤ کرتی ہے اور آئندہ کمزور کرتے رہنے کے لیے رحم اور ایمان کے خلاف کارروائیاں کرتی رہتی ہے۔ علیؑ اپنی قوت اور فتح کو حصول صلح کے لیے صرف کرتے ہیں۔ فتح کرتے ہیں اور رکتے ہیں۔ اس لیے کہ: "شاید دشمن سوچے اور مخالفت سے باز آئے"۔ بار بار سفیر بھیجتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ "شاید اللہ تعالیٰ تمہارے بیعت کرنے سے مسلمانوں میں اتفاق پیدا کر دے"۔ یا "تفریق جماعت نہ ہونے پائے اور آپس میں ربط و اتحاد بڑھے"۔ سچ ہے کہ ربط و اتحاد کا مفہوم وہ اعلیٰ امنج ہے جس پر پہنچنے کے لیے قومی حکومتیں جان توڑ کوششیں کرتی ہیں۔ لیکن اتفاق اور اتحاد اس کے لیے زہر سے زیادہ کڑوا ہے جو تفریق جماعت میں اپنی کامیابی دیکھتا ہو۔ امیرالمومنینؑ اور ان کے رفقا صلح اور اتحاد کی کوششیں کر رہے ہیں۔ اور ابھی ان کے منھ کے الفاظ تمام نہیں ہوتے ہیں کہ معاویہ زیاد بن حفصہ کو علیؑ کے خلاف ابھارتا ہے۔ مدد مانگتا ہے اور کسی شہر کی حکومت کی لالچ دیتا ہے اور جب اس وقت مایوس ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ "جس سے بات کرتا ہوں وہ ایک ہی جواب دیتا ہے گویا ان سبھوں کے دل ایک ہی ہیں"۔ کاش سبھوں کے دل ایک ہی رہنے پاتے!

ابوہریرہ اور فہرست

اسی زمانہ کی یہ روایت بھی ہے کہ ابوہریرہ نے۔ وہی ابوہریرہ جو باوجود کئی ہزار احادیث یاد رکھنے کے معاویہ کے بلانے پر اس کے شریک ہوگئے تھے اور آئندہ ابواب میں بھی دکھائی دیں گے۔ تجویز کیا کہ اگر قاتلانِ عثمان مل جائیں تو آپس میں تصفیہ ہوجائے۔ مشکل سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ان کی یہ تجویز معاویہ کی صلاح یا علم کے باہر تھی لیکن جو کچھ بھی ہو ابوہریرہ اگر اپنے شکار پہچانتے تھے تو انھیں کیا ہوا تھا کہ وہ امیرالمومنینؑ کو اس وقت ان قاتلوں کی فہرست نہ دیتے جس وقت تک انھوں نے معاویہ کی دعوت قبول نہ کی تھی۔ درمیان میں نہ صرف کئی مہینہ تک علیؑ کی خلافت بغیر کسی جنگ کے گزری بلکہ جمل کی جنگ ہوئی اور ختم ہوئی لیکن کبھی انھوں نے پہچنوانے اور نام لینے کی جرأت نہ کی، نہ کہیں عثمان کے محاصرہ کے وقت اس کا تذکرہ ہے کہ وہ قتل عثمان کے زمانہ میں قصر امارت میں تشریف رکھتے تھے اور انھیں پہچانتے کا کوئی موقع حاصل تھا۔ لیکن کیا کم تھا کہ یہ کسی کو پہچانتے یا نہ پہچانتے اور اس تجویز میں عثمان کا قاتل قتل ہوتا یا وہ گمان سے دور رہتا۔ انھیں تو ایک فہرست پیش کرنی تھی کہ اگر یہ لوگ ہمارے حوالہ کردیئے جائیں تو صلح ہوسکتی ہے۔ اور فہرست اس سے کیا کم ہوتی کہ ہر وہ ذی اثر شخص جس پر علیؑ کی محبت کا شبہ بھی ہو حوالہ کردیا جائے۔ بے شک یہ صلح کی سب سے اچھی ترکیب تھی۔ علیؑ کس طرح قبائل کو اپنا شریک کرسکتے تھے جب ان کے سرداروں کو دشمن کے حوالہ کردیتے اور غالباً ان لوگوں کے قصور معاف ہونے کی بھی ایک ہی ترکیب تھی اور وہ یہ کہ معاویہ کے شریک ہوکر علیؑ سے جنگ کرتے۔ جس شرط پر آخر زمانہ میں عمرو بن الحمق اور حجر بن عدی وغیرہ کی جان بخشی کی جاتی تھی۔ مختصر یہ کہ اس سے کہیں زیادہ لوگوں نے اپنے کو قاتل عثمان کہا۔ جس عدد میں ابوہریرہ کو حدیثیں یاد تھیں۔ ان لوگوں نے قتل کرنے کے وجوہات میں ایک یہ وجہ بیان کی تھی کہ عثمان نے "بنوامیہ کو مسلمانوں پر مسلط کردیا تھا"۔ خوفناک وجہ تھی جس سے معاویہ قبر میں بھی ٹہلنے لگتا۔

دشمن کی ترکیبیں اور جنابِ امیرؑ کی ذکاوتِ حس

اگر یہ واقعہ ہے گو اس میں ذکاوتِ حس غور طلب ہے کہ جناب امیرؑ نے کس طرح اپنے فرزند محمد بن حنفیہ کو عبیداللہ بن عمر کے مقابلہ میں جانے سے روکا۔ حالانکہ اس کے بعد یا پہلے اپنے فرزند حسنؑ کو نہ روکا۔ کیا اس جگہ موازنہ جرأت تھا کہ ایک فرزند کو جانے دیا اور ایک کو نہ جانے دیا۔ نہیں۔ کیا محمد بن حنفیہ سے بہ نسبت حسنؑ کے زیادہ محبت تھی کہ روکا۔ نہیں۔ قیاس کے باہر ہے۔ بلکہ جب دشمن للکار چکا تھا تو اب مارا جانا سوچنے سے بعید ہوگیا تھا۔ بلکہ یہ عبیداللہ بن عمر کی ذات تھی جس کے متعلق سوچنا تھا کہ اگر وہ قتل ہوں تو کس کے ہاتھ سے۔ محمد بن حنفیہ اور حسنؑ کے وقار میں بڑا فرق تھا۔ ایک محض علیؑ کے فرزند تھے، دوسرا علیؑ و فاطمہؑ کا فرزند تھا۔ جسے رسولؐ اپنا فرزند کہتے تھے۔ اگر ابن عمر محمد بن حنفیہ کے ہاتھ سے قتل ہوتے تو معاویہ کو جناب امیرؑ کے خلاف جوش مخالفت پیدا کرنے کا ایک نیا وسیلہ ہاتھ آتا۔ لیکن اگر وہ حسنؑ کے ہاتھ سے قتل ہوتے تو معاویہ کو فرزند رسولؐ کے خلاف لوگوں کو بھڑکانے کی آسانی متصور نہ تھی۔ ابھی تک لوگ فرزندان رسولؐ کی مخالفت پر صریحاً آمادہ نہیں ہوئے تھے۔ حالانکہ یہ تمام واقعات غیر صریح طریقہ سے اس طرح روش اختیار کرتے جاتے تھے جو ان کی خلاف ایک ہندسوی اندازہ سمجھا جائے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ جس طرح یقیناً جناب امیرؑ نے ابن عمر کو محمد بن حنفیہ کے ایسے شجاع فرزند کے ہاتھ سے قتل ہونے سے بچایا معاویہ نے

انھیں قتل ہونے کے لیے محمد بن حنفیہ سے جنگ کرنے کی صلاح دی تھی یا نہیں، جیسا آخر میں ان سے کار نمایاں کرنے کا استغاثہ کر کے انھیں لڑوایا، اور یہ قتل ہوئے اور کچھ دیر کے لیے اس ترکیب سے بنی فوج میں ایک مجموعی حیثیت کا ہیجان پیدا کر دیا۔ ابن عمر حسنؑ کے مقابلہ میں نہ صرف بہ حیثیت سپاہی کے آئے تھے بلکہ حقیقت میں وہ ایک بڑی تدبیر کے ایجنٹ بن کر آئے تھے۔ ان کا مشن بمقابلہ ابوہریرہ اور ابوزر دا زیادہ مدبرانہ اور لطیف ہونا بھی چاہیے تھا۔ پہلی ترکیب اگر فوجی حیثیت سے سے علیؑ کو کمزور کرنے کی ہو سکتی تھی تو اب کمال اظہار اخلاص سے حسنؑ کو خلافت حوالہ کی جا رہی تھی مگر یہ اس وقت جب کہ حسنؑ اپنے پدر بزرگوار کا ساتھ چھوڑ کر امیر شام کے لشکر میں چلے جاتے اور اس طرح علیؑ کے لشکر میں یا تو پھوٹ ڈالی جاتی اور یا لوگ اس شبہ میں مبتلا کرائے جاتے کہ ہم نواسہ رسولؐ کا ساتھ دیں یا امیرالمومنین کا۔ اور جب ایک مرتبہ علیؑ کا موقع کمزور ہو جائے تو پھر حسنؑ کا خلیفہ بنانا یا نہ بنانا تو ہمارے اختیار میں ہے۔ تھوڑا سا وظیفہ یا در صورت انکار تھوڑا سا زہر فیصلہ کر دے گا۔ مگر ان لوگوں نے مجتبیٰ طیبہ کے خصائل کا نہایت ہی غلط اندازہ کیا تھا کہ وہ ایسی چالوں سے فریب دینا چاہتے تھے جو بقول امیرالمومنینؑ ایسی تھیں جیسا بچوں کو دودھ چھڑانے کے لیے دیا جاتا ہے۔ موقع تھا کہ حسنؑ نفرت اور حقارت سے تلخ سچائی ظاہر کر دیتے۔ اور جس وقت معاویہ نے کبھی نعمان بن جبلہ، کبھی عبیداللہ بن عمر سے استغاثہ اور ان کے قتل ہو جانے کے جوش سے وقت ٹال رہا تھا، اور کبھی اپنے لشکر کو اس سے تسکین دیتا تھا کہ علیؑ کے نامی افسر بھی قتل ہوئے اور ہر ممکن ذرائع سے اپنے سپاہیوں کو تلوار کی باڑھ پر جھونک رہا تھا کہ کسی طرح جنگ کی صورت موافق ہو جائے۔ کبھی علیؑ کے کسی افسر کو جب وہ اس کے خیمہ تک حملہ کرتا ہوا پہنچ جاتا تھا لالچ اور رشوت دیتا تھا۔ جناب امیرؑ اس قتل عام سے متاثر ہو رہے تھے اور چاہتے تھے کہ مجھ میں اور معاویہ میں تصفیہ ہو جائے۔ معاویہ کے لیے اس سے اور کونسا عمدہ موقع ہو سکتا تھا کہ وہ علیؑ سے نہ صرف عثمان بلکہ اپنے اولین کی فہرست سامنے رکھ کر انتقام لیتا لیکن پھر آگے چل کر فریب کے جال کون بچھاتا۔ وہ اب اس سے بڑا مدبر تھا کہ عمرو بن عاص کے غیرت دلانے سے ذوالفقار کی چمک میں اپنی صورت دیکھنے جاتا۔ ایسے وقت اپنی جان بچانا بھی جو اس کی بات تھی۔ اور دوسرے عمرو بن عاص کا غیرت دلانا بھی اس قدر پر معنی ہو سکتا تھا کہ مسکرا دیتا۔ وہ کیوں عمرو بن عاص کے لیے میدان خالی کرتا۔ اور ان تمام باتوں کے ساتھ یہ کوشش بھی کی کہ علیؑ سے اپنے کو شام میں رہنے دیے جانے کی گزارش کر لے۔ علیؑ اس درخواست کو منظور کر کے اپنی آپ ہی تردید کرتے۔

جناب امیرؑ نے جس عنوان سے جنگ شروع کی اس سے ظاہر ہے کہ وہ ابتدا ہی سے یہ فیصلہ نہیں کر چکے تھے کہ تصفیہ محض جنگ سے ہوگا بلکہ متین اور پر ہوش تساہل اور آہستگی کی غرض کو جناب امیرؑ نے خود بھی اپنی زبان مبارک اور افعال سے ظاہر فرما دیا۔ اس آہستگی کی دوسری غرض یہ ہو سکتی تھی کہ شامیوں کی طریقہ جنگ کا مطالعہ کیا جائے، جو ایک ایک دو دو دستہ کی جنگ اور متواتر چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھا سکتی تھیں، جن میں اکثر کچھ زیادتی بھی ہو جاتی تھی۔

نصیب اور اقبال کیونکر حاصل ہوتا ہے

اور واقعات بتاتے ہیں کہ علیؑ کی آنکھ اپنے اور دشمن کے سپاہیوں اور موقع کو دیکھنے سے سیر نہ ہوتی تھی۔

اور جب نصیحت اور مطالعہ اتمام حجت تک پہنچ گیا تو جناب امیرؑ نے اپنے فوج سے مخاطبہ فرمایا کہ ہم اب پورے ارادے

سے جنگ شروع کریں گے۔ سپاہیوں کو عجز اور کاہلی کی مضرتیں بتائیں۔ کارکنی اور محنت کشی سے نصیب اور اقبال کے حصول کا خیال دیا۔ صبر اور فتح کے قریبی تعلق کو دکھایا، اور مشکل کاموں کا صبر اور وقار سے آسان ہو جانا ارشاد فرمایا، اور اب اپنے نامی سرفروش افسروں کو اس گرمی سلسلہ اور موقع سے روانہ فرمانا شروع کیا کہ دشمن اپنی جگہ پہچاننا بھول گیا، اور سب سے بڑا مرتب حملہ وہ تھا جو خود جناب امیرؑ کے افسری میں اٹھارہ ہزار سپاہیوں نے کیا۔ اس نے شام کے لشکر پر کاری ضرب لگائی۔ جنگ دیر تک جاری رہی اور اب معاویہ کا خیمہ نہ اپنی جگہ تھا، اور نہ خود اسے اپنے ٹھہرنے کے لیے محفوظ جگہ معلوم تھی۔ کیونکہ علیؑ کے افسر کسی سپاہی یا افسر پر معاویہ کے شبہ سے بھی حملہ کر دیتے تھے اور ہٹاتے ہٹاتے ٹیلوں پر لائے تھے اور ٹیلوں سے پستیوں کی طرف دھکیل دیا تھا۔ شام کا لشکر ڈھلک رہا تھا، زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل چکی تھی اور غالباً اس میں مبالغہ نہیں ہے کہ شام کے زیادہ تر سپاہی رحم کے لیے فریاد کر رہے تھے۔ عمرو بن عاص کا گھبرانا اور یہ کہنا کہ اگر ایک حملہ اور ایسا ہی ہوا تو ہمارا نشان نہ ملے گا۔ یا معاویہ سے کہنا کہ کیا دیکھتے ہو میدان تمہارے ہاتھ نہ آئے گا۔ یا حیلہ قرآن یہ سب بجائے خود لشکر شام کے واقعہ خوان ثبوت ہیں۔

علیؑ کے زمانہ حکومت کی مقدار اور اس کی کامیابی

اب میں کہنا چاہتا ہوں کہ ذی الحجہ ۳۵ھ سے صفر ۳۷ھ تک کا وہ زمانہ ہے جس میں علیؑ حکم دیتے تھے اور لوگ سنتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے یہی زمانہ ایک برس کئی مہینہ کا تھا جس میں ایسے منتشر وقتوں میں علیؑ خلیفہ ہوئے۔ ہر جگہ عمال بھیجے، انھیں مختلف قسم کی مفید ہدایتیں کرتے رہے اور دو ایسی بغاوتوں پر کامیاب ہوئے۔ علیؑ نے جو کچھ کیا اس کی کامیابی اور ناکامی محض اسی زمانہ سے بھی جا سکتی ہے جس میں ان کے کامیابی پر شبہ کرنا بھی سطحی باتوں کے سمجھنے سے انکار ہوگا۔ اس زمانہ میں علیؑ کے تمام افعال کی کامیابی نہ صحابہ کی کسی کونسل کی صلاح تھی اور نہ محض خلیفہ ہونے کے لحاظ سے تمام کامیابیوں کا سہرا انھیں کے سر چڑھتا، اگرچہ مسلمان سپاہی، ان کا اسلامی مزاج، خالد بن ولید، سعید بن ابی وقاص، نعمان بن مقرن اور قعقاع بن عمر کے ایسے قابل فوجی افسر فتح کرتے۔ کوئی صاحب شعور انسان اس زمانہ کو کسی حاکم کا زمانہ نہیں کہہ سکتا جن میں اس کی اطاعت نہ کی گئی ہو۔ اور نہ اسے کسی ایسے فعل کا ذمہ دار ٹھہرا سکتا ہے جو اس کی صلاح سے نہ ہوا ہو بلکہ اس کا انکار اور اس کے خلاف صلاح موجود ہو۔ اور نہ یہ واقعات اور حالات ہوں کہ چونکہ ہمارے افسر نے ہمیں غلط حکم دیا تھا، اور وہ اس درجہ ناقابل عمل اور غلط تھا کہ ہم اس کی اطاعت نہیں کر سکتے تھے۔

علیؑ کی حکومت کا دوسرا دور

قصہ قرآن سے ایک نئی صورت پیدا ہو گئی اور اب ایک دور شروع ہوا جس میں کبھی علیؑ کی اطاعت کی گئی اور کبھی خلاف ورزی یا تساہل یا لاپرواہی کی گئی۔ جب اطاعت کی گئی تو انھوں نے اپنے مقابل دشمنوں کو بھاگتے اور ذلیل ہوتے دیکھا، اور جب حکم نہ سنا تو سرحدی مقامات یا بعض اندرونی شہروں پر دشمنوں کی غارت گر فوج کو حملہ آور دیکھا۔ لوگ قتل ہوئے، وقار قومی کو ٹھیس پہنچی اور بے امنی مع اپنے بے مہار افواہوں کے ہوائیں اڑتی رہی۔ ہمتیں اور پست ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ زمانہ آگیا جو اپنے قومی وقار کے محفوظ نہ رکھنے اور لاپرواہی یا خطرہ سے خوف زدہ ہونے کا لازمی نتیجہ تھا۔ اور جس سے انکا ناخدا بار بار ان کے منھ پر انھیں متنبہ کر چکا تھا۔ ان کا ناخدا اسی اکیلے ذریعہ کو سمجھ چکا تھا جو انھیں دشمن کی شورانگیزیوں سے محفوظ اور آئندہ

کے سلیے گرم و سرو چشیدہ قوم بنا دیتا۔ لیکن اب تو وہ یہ فرما رہا تھا کہ رائے اور تدبیر بے کار ہے۔ جب اس پر عمل کرنے والا نہیں یا یہ فرمانے کے بعد کہ جنگ کی رائے نہایت محکم تھی کہتا: "مگر میں کس طرح ایسا حکم دیتا کس کے بھروسہ پر یہ فرمان نافذ کرتا۔ میرا ارادہ تھا کہ امت کی ضلالت کے آلام کا تمہارے ساتھ علاج کروں مگر تم خود میری نافرمانی کے درد میں گرفتار ہو۔ پھر نوک خار سے خار کیونکر نکلے۔ حالانکہ خار نکالنے والا جانتا ہے کہ یہ نیش خلش کیے بغیر نہ رہے گا۔ اور گمان غالب ہے کہ اس کی نوک بھی ٹوٹ کر بدن میں پیوست ہو جائے"۔

قرآن بلند کیا گیا۔ اس مصلحت سے کہ منظور کرنا اور اختلاف کرنا دونوں معاویہ کی نازک حالت کے سلیے مفید ہو گا۔ اسے وقت مل جائے گا۔ علیؑ، مالک اشتر اور ابن عباس سب نے دیکھا۔ آخرالذکر نے چیخ کہا کہ جنگ ختم ہوئی اور فریب شروع ہوا۔ اشتر فوجی چارج میں تھا مگر کو بھا۔ اگر رکتا تو گویا دشمن کا فریب کھا گیا۔ سپہ سالار نے دیکھا اور فرمایا کہ: اے اللہ کے بندو اپنے حق حاصل کرنے کے سلیے بڑھو اور دشمن سے جنگ کرنے میں تامل نہ کرو۔ معاویہ، ابن ابی معیط، حبیب، ابن ابی سرح، ضحاک نہ صاحب دین و قرآن ہیں نہ صاحب ایمان۔ حیرت خیز ہے کہ ادھر مکر شروع ہوا، اور ادھر جناب امیرؑ کے سپاہیوں نے کہنا شروع کیا کہ "ہم کتاب اللہ کے فیصلہ کو منظور کرتے ہیں"۔ اور جناب امیرؑ نے فرمایا: "افسوس ہے تم کو کچھ نہیں پڑتا۔ ان لوگوں نے قرآن شریف کو براہِ مکر و فریب اٹھایا ہے"۔ یا "یہ ایسا امر ہے جو ظاہر آتو ایمان معلوم ہوتا ہے مگر اس کے باطن میں ظلم اور حیلۂ فریب ہے اس کا اول تو یہ ہے کہ ان پر رحم کرو، اور آخر یہ ہے کہ تمھیں پشیمانی اور ندامت نصیب ہو"۔ اور اب علیؑ کے مار آستین یہ کہہ رہے تھے کہ: "کتاب اللہ کو منظور کرو، ورنہ ہم تم کو چھوڑ دیں گے۔ اور تمہارے ساتھ وہی برتاؤ کریں گے جو ابن عفان کے ساتھ ہم نے کیا تھا"۔ اور علیؑ فرماتے ہیں کہ: "اگر تم میرے مطیع ہو تو برابر لڑتے رہو اور اگر باغی ہوا چاہتے ہو تو جو تمھاری سمجھ میں آئے کرو"۔

مالک اشتر

کوئی فاتح سپاہی اپنی فتح کے عالم میں اس افسوسناک استقبال کا مستوجب نہیں ٹھہرایا گیا جو اشتر کو اپنی قوم اور اکثر اپنے ماتحت سپاہیوں کے ہاتھوں نصیب ہوا۔ اس کا استفہام وردانگیز حیرت کا نمونہ تھا جو وہ میدان جنگ سے ایسے وقت طلبی کے متعلق کر رہا تھا۔ بے چین تھراہٹ اس کے تمام الفاظ اور انداز میں پائی جاتی تھی۔ موت کا کرب اسے اس وقت کی بے کاری سے زیادہ آرام دہ تھا۔ افسوس ہاں۔ ایسے موقع قوم کی تاریخوں اور تجربہ میں ہیں جب کہ وہ اپنی قوم یا فرد کے حسنِ صفائی کی طرف سے بہری ہو جاتی ہے۔ اس کی ترقی کو بھول جاتی ہے۔ ترقی کی کوشش کو اپنی بے حیثی یا پست ہمتی سے بے کار یا مصلحت کے خلاف سمجھتی ہے یا اس قوم فروشی کی قیمت پا چکی ہوتی ہے کہ تم تو تی کیا تھی، ترقی میں یاس اور جڑ میں آرہ لگا دو وہ مفلوج ہو جاتی ہے اور مرض اس کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کرتا جاتا ہے کہ آخر میں اس کی زبان بھی حرکت سے باز آتی ہے اور خوبیوں کے اعتراف کی جرأت نہیں رہتی۔ اور اپنی اس مفلوجانہ خاموشی کو انتہائی عقلی وقتی یا تدبر سمجھتی ہے۔ وہ مرتی جاتی ہے بغیر اس ہوش اور درک کے کہ ہم مر رہے ہیں۔ بلکہ کسی میں زندگی کے آثار یا زندہ ہونے کے سلیے ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کو آخر میں اس مضحک نگاہ اور ابلہانہ انداز سے دیکھتی ہے کہ گویا کوئی ایسی کوشش ناقابل معافی گناہ ہے۔

کہتا اشتر جس قدر کہہ سکتا کہ: "اے اہل نفاق یہ کیا بیہودہ حرکت ہے کہ جس وقت دوستوں کی مراد بر آئی اس وقت

تم نے فتنہ کھڑا کر دیا"۔ کہاجت کرتا جس قدر چاہتا کہ ہمیں تھوڑی دیر اور کوشش کی مہلت دو لیکن قوم فروش دام پاچکے تھے اور اپنے زیر اثر لوگوں کو اپنے روش سے باندھ چکے تھے۔ وہ کیوں کوشش کرتے یا کرتے رہتے۔ وہ دور کے فتح کو تھوڑی سے موجودہ نفع پر کیوں ترجیح دیتے۔ اگرچہ بعد کے نتائج خود ان کے یا ان کی اولاد کے لیے کیسے ہی افسوسناک کیوں نہ ہوتے۔ ایسے انتشار اور جوش کے وقت میں یہ سن کر کہ "کیا تم اسے دوست رکھتے ہو کہ تم تو فتح یاب ہو اور امیرالمومنینؑ دشمنوں کے حوالہ ہو جائیں یا شہید کر ڈالے جائیں"۔ اب اشتر کا فوراً رک جانا اخلاص اور وابستگی کی ایک مثال تھی جس کی نظیر نہیں ملائی جاسکتی۔ اشتر کا یہ چشم زدن کا لحاظ عالم کے ایک زمانہ کے علیؑ کی محبت سے کہیں زیادہ وزنی تھا۔ اور یہ فعل اس امر کے سمجھنے کی کنجی ہے کہ اشتر کی یہ کوشش، جوش اور توجہ کس لیے تھی؟ رکا فتح کس کے لیے کرتا جب علیؑ نہ سنتے! فتح تو علیؑ کی خوشی کے لیے تھی علیؑ فتح کے ضمن میں نہ تھے۔ اب تلوار کیا کرتا! اشتر چاہتا کہ میں زندہ واپس جاکر علیؑ کی صورت نہ دیکھتا لیکن اسے پسند کرتا کہ علیؑ کو زندہ دیکھ لیتا۔ اس وقت علیؑ کی ایک نگاہ اس کے لیے تسکین ہو سکتی تھی۔ علیؑ کی ایک سانس اس کا مایۂ حیات اور علیؑ کی ایک نظر اس کے روح کی گرمی تھی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اپنے کثیر التبسم (جناب امیرؑ کا حلیہ) کا چہرہ افسردہ دیکھ کر اشتر کا جوش کھاتا ہوا خون رگوں میں سرد نہ ہو گیا ہوگا! اپنے پھول کو بیس ہزار کانٹوں میں گھرا دیکھ رہا تھا۔ اور وقت نہ تھا کہ کسی فوجی نقل و حرکت سے اپنے بت کو اپنے سپاہیوں کے حلقہ میں لے لیتا۔

نازک موقع

سراغ گم نہیں ہوتا کہ کس جگہ سے ایسی قوم فروشانہ کارروائی شروع ہوئی جب کہ اشعث بن قیس مع اپنی گستاخانہ ضد اور اپنے پیشتر کے واقعات کے سامنے کھڑا ہے۔ وہی اشعث جو کبھی وجہ علیؑ کا حامی تھا۔ جس نے پھر اپنے کو فروخت کر دیا۔ جو پھر علیؑ کے زیر نگاہ آیا۔ نہ اس کے قبل کہ علیؑ کی شرکت کرنے یا نہ کرنے میں متردد ہوتا۔ اسے بیت المال کے متعلق دھمکی دی گئی تھی۔ پھر شریک ہوا اور اب پھر وہ گیا جس سے بڑھ کر کسی نے نقصان نہیں پہنچایا۔ اس کے انداز میں کہیں سے سمجھنے اور محض استدعا کرنے کا میلان نہیں پایا جاتا بلکہ اس کی اس امر پر مستعدی کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہی کرو۔ صاف ظاہر کرتی ہے کہ اسے اسی امر کا دام ملا تھا کہ تم جس طرح ہو سکے جنگ کو موقوف کراؤ۔ اس وقت کے متعلق اکثر ایسے آثار ملتے ہیں جس سے یہ سمجھا جاسکے کہ کچھ لوگ تھے جنھیں ایک بھلا چنگا روزگار مل گیا تھا کہ وہ معاویہ سے اس دھمکی سے روپیہ وصول کریں کہ علیؑ سے نہ مل جائیں اور علیؑ کے لشکر میں رہ کر معاویہ کے روپیہ سے نمک حرام بنے رہیں۔ اشعث کی بے جا ضد بہت صبر آزما تھی۔ عجب نہ تھا کہ اشتر سے سخت کلامی ہوتی اور دور نہ تھا کہ آپس میں تلوار چل جاتی۔ اور پھر ایک افسر دوسرے سے جنگ کرتا۔ یہاں تک کہ امیرالمومنینؑ کے لشکر میں دو صفیں ہو جاتیں، اور ایک خوفناک جنگ شروع ہو جاتی۔ وقت تھا کہ جناب امیرؑ ہی کی ذات اقدس اور اس کا وزن کام آتا۔ اور کوشش فرماتے کہ باوجود اس صاف بگڑی ہوئی صورت اور باغیوں سے رشتہ کی قطع ہونے کی حالت کے یہاں تک بات بنی رہ سکتی ہے اور لگام ہاتھ میں رکھی جاسکتی ہے کہ اس نقصان میں یہ مزید خطرہ شامل نہ ہو جائے کہ معاویہ باغیوں کو اس طرح ملالے کہ وہ فوراً جنگ پر مستعد ہو جائیں۔ علیؑ کامیاب ہوئے اور اس جوش خیز حالت کو سرد کیا۔ اور اب باغیوں نے اپنے چہرہ سے علیؑ کی مخالفت اور ان کے ساتھ بے ایمانی کا رہا سہا پردہ بھی ہٹا دیا جب کہ انھوں نے مسلمانوں کے امن کے تصفیہ اور جناب امیرؑ کے وکالت کے لیے ابوموسیٰ کو نہ صرف منتخب کیا، بلکہ اصرار کیا۔ اور پھر جناب امیرؑ نے فرمایا کہ: "جو چاہو اور جو تمھاری

سمجھ میں آئے وہ کرو"۔ یہ بھی ہونے والا تھا کہ عہدنامہ سے "امیرالمومنین" کے لفظ کے محو کرنے پر اشعث ہی اصرار کرتا۔ کیسے ہوسکتا تھا کہ اشتر اس عہدنامہ پر اپنے دستخط کرتا۔

سوچو اگر تم سوچ سکو کہ یہ عہدنامہ جناب امیرؑ کی طرف سے تھا اور اس کے نتائج کے ذمہ دار جناب امیرؑ ہیں یا ان پر اس عہدنامہ کی پابندی لازمی تھی۔ پھر بھی جناب امیرؑ نے رشتہ کو اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیا، جب تک کہ قاتل کے خنجر نے اسے کاٹ نہ دیا۔

ناقابلِ بیان حالت

جناب امیرؑ اس طرح واپس ہوئے کہ صفین کے میدان میں اپنی فتح کو چھوڑ آئے۔ جناب امیرؑ کا لشکر اس طرح واپس ہوا کہ پہلے تو وہ اپنے خون بہاتا کہ فتح کرے اور جب فتح پر ہاتھ رکھنے کا موقع ہوتا تو ہاتھ اور فتح کے درمیان اپنی تلوار رکھ دیتا اور منہ پھیر لیتا۔ کیسے کہوں کہ جناب امیرؑ میں اس سے دل شکستگی نہ پیدا ہوئی ہوگی اور ان کے بہی خواہوں کو یاس اپنی صورت نہ دکھا رہی ہوگی۔ کیونکر نہ کہوں کہ شمع امامت کے پروانے اپنے مرکز قربانی کی اداسی سے سر ٹکرا رہے ہوں گے، جھلاہٹ، غصہ اور افسوس پیدا ہو رہا ہوگا۔ اور وہ گم ہوگئے ہوں گے کہ اب ہم کیا کریں۔ چوٹ لگی تھی۔ بغیر اس کے کہ اس چوٹ کھانے کے لیے تیار ہوں۔ سادہ مزاج سپاہی بہادروں کی طرح جنگ کرنے گئے تھے۔ مکاروں کی طرح فریب دینے اور فریب کھانے نہ گئے تھے۔ ان کے گمان سے دور تھا کہ ہمارے ہمراہی ہماری وجہ، ہماری فتح، ہماری آئندہ بہبودی، اور اسلام کی امید کو اپنی ضد اور ناشنوی سے ذبح کر دیں گے!۔

کامیابی اور ناکامی

معاویہ یہ کہتا ہوا واپس ہوا کہ "بچ گئے"۔ علیؑ کے سپاہیوں کی تلوار اپنے گردن سے دور دیکھ کر اطمینان سے سانس لیتا ہوگا۔ چند گھنٹے تھے کہ شام اور اس کی حکومت ہمیشہ کے لیے اس سے رخصت ہوتی۔ اس وقت کو اس نے بچا لیا۔ یہی اس کی کامیابی تھی۔ علیؑ کو اپنی فتح نہ ملی یہی ان کی ناکامی تھی۔ معاویہ اس مفید تجربہ کے ساتھ واپس جا رہا تھا کہ علیؑ اور ان کے لشکر پر تلوار سے فتح نہیں حاصل کی جاسکتی، بلکہ اب اسے دوسرے ذرائع معلوم ہوگئے تھے۔ یہ نسبتاً کم مخدوش اور زیادہ مفید تھے۔ اور اس میں ذرا شبہ نہیں کہ صفین کے بعد یہی مصلحت اپنا عمل کر رہی تھی۔

مجھے حکم کی کارروائی کی کوئی شرح نہیں کرنی ہے۔ نہ اس کی ابتدا پوشیدہ ہے نہ اس کے کارکن پوشیدہ ہیں۔ مجھے اس وقت صرف حضرت عمرو بن عاص کی چوکھی کوششوں سے بحث ہے کہ معاویہ کی وکالت کے بعد فردی بندہ زادہ کی سفارش سے نہیں چوکتے۔ اپنے اس اظہارِ مصلحت کی موافقت سے کہ کارِ دُنیا حکمِ تقدیر سے وابستہ ہیں۔ کوشش کی ہے شاید کارگر ہوجائے۔ لیکن بہت کچھ اس سیلان کے پھریری سے جس کے آثار دکھائے جاتے رہے کہ ہم کیوں نہ ہوں چل گئی تو خیر ورنہ ایک ٹھکانا تو ہے ہی۔ اور اس سے کم مضحک یہ کوشش نہ تھی کہ: "یہ کام تو ایسے شخص کو سپرد کرنا چاہیے کہ جس کے دانت ہوں جس سے وہ کھاتا پیتا ہو"۔ اپنے موقع کے لحاظ سے ابن عاص یا اس کے ہم خیالوں کا یہ کہنا کسی طرح غلط نہ تھا۔ جب کوئی خود کھانے سے احتیاط کرے گا تو اس کا کب روادار ہوگا کہ دوسرا کھا سکے۔ ضرورت تھی کہ دانت والا تلاش کیا جائے۔ شکستہ دندان لوپلا متقی ان کے لیے کبھی خوش ادا نہیں ہوسکتا تھا۔ ایسے لوگوں کے ہوتے ہوئے یہ سوچنا کہ علیؑ

والی امر ہوں یا علیؑ کے والی امر ہوتے ہوئے ان کو دانت چباتے ہوئے دیکھنا دن اور رات کو ایک وقت دیکھنا ہوگا۔

حکمین کی کارروائی کا نتیجہ معاویہ کے لیے مفید نہ تھا

حکمین کی کارروائی سے زیادہ سے زیادہ اہل شام اس پر خوش ہو گئے کہ ہمارے وکیل کو ایک سیاسی فتح حاصل ہوئی۔ لیکن یہ ایک فتح تھی جس سے اہل شام کو کوئی مزید نفع نہیں حاصل ہو سکتا تھا۔ وہ معاویہ کو اس کے پیشتر بھی اپنا مرکز امید اور امیر سمجھتے تھے۔ علیؑ کے لشکر کو اس فریب سے جھلاہٹ پیدا ہوئی اور یہ لوگ اسی جگہ بنوک شمشیر تصفیہ پر آمادہ ہوئے۔ ان میں اور تمام لوگوں میں اہل شام کی مکارانہ کارروائیوں کا جو اثر پڑا وہ اخلاقی حیثیت سے معاویہ کے مخالف تھا۔ اس کے عکس میں یہ جناب امیرؑ کے لیے مفید تھا جن کی رائے اور روش کی صحت اب عام لوگوں پر ظاہر ہوتی جاتی تھی۔ اور وہ تاسف کر رہے تھے کہ کیوں ہم نے امیرالمومنینؑ کے حکم کو نہ سنا اور تساہلی جائز رکھی۔ جناب امیرؑ نے اعلان فرمایا کہ: "اس حکم و فیصلہ سے اللہ اور اس کا رسولؐ اور صلحائے امت بری ہیں، لہٰذا تم لوگ شام پر حملہ کرنے کی تیاری کرو"۔

نئے جوش سے علیؑ نے تیاری شروع کی۔ صرف بصرہ اور کوفہ کے فوجی مقامات نے جس قدر جنگ دیدہ اور ردیف مہیا کر دیے اور وہ اس کے لیے بہت کافی تھے کہ معاویہ کی اس قدر فوج کا جو وقت ملنے کے قبل میدان میں لائی جا سکے، کامیابی سے مقابلہ کرے۔ حالانکہ نہ ابھی ان دونوں مقامات کے ذرائع ختم ہوئے تھے اور نہ دیگر صوبجات سے مدد طلب کی گئی تھی۔ اس زمانہ میں خوارج کی سرگرمی زیادہ ہونے لگی۔ جناب امیرؑ کی نگاہ ان کے ساتھ ساتھ تھی اور جو مقامات فوجی حیثیت سے انھیں روک سکتے تھے۔ خبردار کر دیے گئے تھے۔ یہاں تک کہ خوارج گھیر کر نہروان میں لائے گئے۔ معافی اور پناہ کا نشان قائم کیا گیا جس نے ہزاروں جانیں بچائیں۔ اور جب بجز جنگ کے چارہ نہ ہوا تو دشمن کو دو طرف سے سواروں نے دبایا اور پیادے جنگ کی عملی صف میں لیے۔ یہاں تک کہ خوارج کو ان کی ناشنوی نے تباہ کیا۔ اور خوارج کی ان سختیوں اور انحراف کے باوجود جناب امیرؑ نے ان کے زخمیوں کو اپنے جراح کے حوالہ کیا۔ غنیمت میں صرف اسلحہ جنگ اور مویشیاں تقسیم کی گئیں۔ گرفتار مرد اور عورتیں رہا کر دی گئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ گروہ نہ پیدا ہوتا اگر قصہ قرآن نہ ہوتا۔

سپاہیوں کے عذر کے معنی

خوارج کی جنگ کے بعد جو فوجی کارگزاری کی حیثیت سے ایک بڑی شاندار فتح تھی، جب جناب امیرؑ نے شام کی روانگی کا قصد فرمایا تو کسل اور زخم کا عذر کیا گیا اور آج بھی کوئی فوج کا مقرر اشعث بن قیس تھا۔ جناب امیرؑ نے توقف کے عذر کو منظور نہ فرمایا۔ لیکن پھر بھی فوج کے عذر کا لحاظ کر کے کوفہ تشریف لائے اور نخیلہ کو مرکز قرار دینے کے بعد عام حکم دیدیا کہ "کوئی شخص اپنے مکان پر نہ جائے جب تک دشمنوں کی طرف خروج نہ کر کے فتح یاب ہو لے"۔ لیکن ملاحظہ کیا کہ اکثر لوگ اپنے گھروں کو واپس گئے تھے اور "نہایت کم آدمیوں نے شام پر فوج کشی کی خوشی ظاہر کی"۔ ان واقعات سے سمجھ میں آتا ہے کہ اگر جناب امیرؑ نہروان ہی سے شام کی طرف روانگی کا اصرار کرتے تو جس طرح نخیلہ سے لوگ خلاف ورزی پر آمادہ ہو گئے اسی طرح اثنائے راہ یا شام پہنچ کر کنارہ کشی کرتے۔ جناب امیرؑ نے انھیں جانچنے کے لیے نخیلہ تک اپنے حکم پر اصرار کیا اور یہاں فوج کی سرتابی سے انھیں وہ نقصان نہ ہونے پایا جو دشمن کے مقابلہ میں متصور ہو سکتا تھا۔ کیا یہ واقعات کہیں سے اس میں شبہ

رکھتے ہیں کہ علیؑ کے اکثر افسران فوج اس کی تنخواہ پاتے تھے کہ تم شام پر حملہ آوری کے لیے کبھی آمادگی ظاہر نہ کرنا بلکہ آگے چل کر تو یہ بھی طے پاگیا کہ اور شام کے لشکر سے بھی کہیں جنگ نہ کرنا یقیناً یہ شام کے لشکر کی شمشیر زنی کا خوف نہ تھا جس کا علیؑ کے سپاہیوں پر سکہ جما ہو۔ جنھیں یہ ایک دو دفعہ نہیں بلکہ اکثر روند کر آزما چکے تھے۔

جناب امیرؑ کے داہنے اور بائیں بازو

یہ کہا جا چکا ہے کہ علیؑ کے سرداران لشکر میں معاویہ کی نظر خصوصیت سے اشعث بن قیس، مالک اشتر اور محمد بن ابی بکر پر تھی۔ اشعث بن قیس کے حالات دین اور قوم فروشی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ یعنی اس نے معاویہ کو اپنی طرف سے مطمئن کردیا۔ بقیہ دو مشاہیر میں سے ایک دور کے مصر میں خفیہ سازشوں کا اس طرح شکار ہوا کہ مصری باغی اور شامی فوجوں میں گھر جاتا، اور پیاس کی حالت میں "مردار گدھے کی کھال میں بھر کر جلادیا"۔

جناب امیرؑ مصر کے واقعات سے واقف تھے۔ اور بہترین انتظام یہ کرسکتے تھے کہ اپنے بہترین عامل کو اس کے انتظام کے لیے روانہ کرتے۔ لیکن افسوس وہ بہادر جسے تلواروں کے سایہ میں مرنے کی عید ہوتی جو اس طرح مرنے پر مرتا تھا اس کی موت کو نامرد اور مکار دشمن زہر کے چند خاموش قطروں سے خرید تا کہ اس کی تلوار سے محفوظ رہے اور بہادر اشتر اس طرح دم توڑتا کہ اس کا سر جناب امیرؑ کے زانو پر نہ ہوتا۔ اور جس وقت اس لاثانی شجاع، مدبر اور عامل کی خبر موت سن کی علیؑ چونک اٹھتے اور یہ فقرہ اشتر کے سمجھنے میں مدد دیتے کہ: "عورتیں مثل اس کے دوسرا نہ جنیں گی"۔ امیر شام کہتا کہ: "خدا کا لشکر شہد کی مکھیوں میں ہے"! ان دونوں وفادار دوست اور خادموں کی موت نے علیؑ کا موقع کمزور کردیا۔ ایسے قحط الرجال میں اس سے کم تسکین نہ ہوگی کہ ہمارے داہنے اور بائیں بازو جزیرہ اور مصر کے ایسے زرخیز اور مفید مقام پر ہمارے مطیع اور دوست ہیں اور ضرورت کے وقت ہم انھیں اپنی مدد اور تسکین کے لیے طلب کرسکتے ہیں۔ امیر المومنینؑ ایک کو "مہربان ناصح" اور دوسرے کو "پسر مہربان" فرماتے تھے۔ لیکن افسوس کہ یہ امید ہمیشہ کے لیے منقطع ہوگئی۔ یہ دونوں دل جو علیؑ کی محبت کی گرمی سے دھڑکتے تھے سرد ہوگئے بغیر اس کے کہ آنکھیں ایک دوسرے پر الوداعی نظر ڈالتیں۔ اور جیر سے جدا ہوتیں۔ کھچتیں مگر پھر لپٹ جاتیں۔ ان دونوں شریف النفس حق پسندوں کی خبر موت سن کر جو کچھ جناب امیرؑ نے فرمایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب امیرؑ کا ایسا قوی النفس ہمدرد کس طرح روتا ہے ـــــ میں تصفیہ نہیں کرسکتا کہ اسے مرثیہ کہوں یا مدح کہوں، یا خصائل نگاری کہوں یا سب کہوں۔ اور سب میں متین درد کا آہنگ محسوس کروں۔ تاسف اور زیادہ شدید ہوجاتا ہے جب امیر کی یہ شکایت بھی ملتی ہے جو جناب نے ابن عباس کو تحریر فرمائی تھی کہ: "میں لوگوں کو اس سے ملحق ہونے کی تحریص اور اس واقعہ شہادت سے پہلے اس کی فریادرسی کے لیے حکم کرتا تھا بعض تو ان میں سے کراہت اور بے رغبتی کے ساتھ اس حکم کو قبول کرتے تھے۔ بعض جھوٹے عذر کے ساتھ اعتذار سے کام لیتے تھے۔ بعض تارک جہاد ہو کر اپنے گھر سے بھی نہ اٹھتے تھے"۔

جناب امیرؑ کام کرنے والے نہیں پاتے

گزر گئے یہ لوگ اور آئندہ ضرورتیں پیش آئیں کہ کچھ حکم بجا لانے والے ہوتے اور اس وقت جناب امیرؑ اپنے ان مثالی دوستوں کو تلاش کرتے اور ان کی ناموجودگی کو سختی سے محسوس کرتے۔ اب لوگ ہوتے جنھیں فرماتے کہ:

"اے مرد صورتو۔ حالانکہ تم میں کوئی مرد نہیں ہے۔ اے خواہہائے اطفال، اے عقول زنان حجلہ نشین، میں اس بات کو دوست رکھتا تھا کہ تمھیں نہ دیکھوں اور تمھیں نہ پہچانوں۔ تمھاری اس جان پہچان نے پشیمانی کے دروازے کھول دیے ہیں۔ تم نے اپنے عصیان اور نافرمانی کی وجہ سے میری رائے اور تدبیر کو بھی فاسد کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رائے اور تدبیر اس شخص کے لیے سودمند نہیں جو اس پر عمل کرنے والا نہیں"۔ کیسے نہ فرماتے جب یہ ملاحظہ کرتے تھے کہ دشمن کے چھوٹے چھوٹے دستہ شہروں اور سرحدی مقامات پر نقص امن کے لیے حملہ کرتے رہتے ہیں۔ ہم آدمی تلاش کرتے ہیں اور نہیں ملتے۔ خصوصاً جب کہ دشمن کی جرأت اور شجاعت محض حملہ تک رہتی ہے اور اس وقت شکست کھا کر بھاگتا ہے جب حجر بن عدی اور قیس بن سعد وغیرہ کے ایسے بچے ہوئے وفادار فوج لے کر سر پر پہنچ جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دشمن کی جرأت اس علم پر تھی کہ ہم نے اکثر سرداران لشکر کو خرید لیا ہے۔

ادائے فرض کی مثال

علیؑ ادائے فرائض کی تنہا مثال دکھائی دیتے ہیں۔ جب وہ ہیت کے تاراج کی خبر سن کر ایک مسلمہ یا ذمیہ کی فریاد سے متاثر ہوتے ہیں اور خود روانہ ہونے کا ارادہ ظاہر فرماتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ان خبروں کو سن کر اگر "کوئی مسلمان افسوس کرتا کرتا مر جائے تو اسے ملامت نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ وہ اسی مرگ کا سزاوار ہے"۔ فرماتے ہیں کہ: "مجھے اس قوم (بنی امیہ) کی طرف سے یہ گمان ہے کہ وہ تمھاری بد عنوانیوں سے فائدہ اٹھا کر تمھیں اپنی رعایا بنا لے گی اور تم اس کے فرمانبردار ہو جاؤ گے"۔ ارشاد کرتے ہیں کہ: "تم میرے بعد بنی امیہ کو بہت برے حاکم اور خداوند پاؤ گے اس کاٹنے والی اونٹنی کی طرح جو اپنے منھ سے کاٹتی ہو اپنے ہاتھوں سے زمین کو کوٹتی ہو اپنے پاؤں سے لاتیں مارتی ہو اور اپنے دودھ سے منع کرتی ہو۔ وہ تمھیں برابر اذیت پہنچاتے رہیں گے یہاں تک کہ ایک شخص کو بھی تم میں سے ایسا نہ چھوڑیں گے جو انھیں نفع نہ پہنچائے یا ان کے نزدیک اس کا نفس بے ضرر نہ ہو۔ ان کی بلائیں تم پر مسلط رہیں گی۔ جب تک کہ تم میں سے ایک ایک شخص اس کا غلام نہ بن جائے۔ اس وقت تمھیں میری قدر معلوم ہوگی۔ اور اس وقت تمنا کرو گے کہ تم سے اس چیز کو بالکل قبول کروں جس کے بعض حصوں کو طلب کر رہا ہوں اور یہ بھی مجھے دینے سے انکار کرتے ہو"۔ افسوس کہ اس کا ایک ایک لفظ صحیح ثابت ہوا بعد شہادت امیرالمومنینؑ لوگوں کے یہ اقوال ملتے ہیں کہ: "اس وقت ہم بعینہ ان بکریوں کے گلہ کی طرح تھے جس کا کوئی گلہ بان نہ ہو اور بھیڑیے ہر طرف سے لیے جا رہے ہوں"۔ کیونکہ اب وہ نہ تھا جس کے لیے تاریخ الخلفاء میں یہ روایت مل سکتی کہ: "آپ نے خلافت کو زینت دی خلافت نے آپ کو زینت نہیں دی، اسے آپ کی بڑی ضرورت تھی بہ نسبت اس کے کہ آپ کو اس کی ضرورت ہوتی"۔ علیؑ ملامت کرنے سے چپ نہیں ہوئے جب تک اپنے سننے والوں سے یہ بھی نہ کہہ لیا کہ: "میں اس چیز سے خوب واقف ہوں جو تمھارے فتنہ و فساد کی اصلاح کر سکتی ہے۔ تمھاری کجی کو سیدھا کر سکتی ہے۔ جابر اور ظالم بادشاہوں کی سیاستوں کا تمھارے ساتھ عمل در آمد ہو سکتا ہے۔ مگر میں اپنے نفس کو فاسد کر کے تمھاری اصلاح نہیں چاہتا!"۔

علیؑ کی حالت کس قدر مثالی رہی

اس بلند اظہار خیال کو یہ فخر حاصل ہے کہ اہل عالم کی زبانوں میں علیؑ ہی کی زبان ادا کرتی۔ نافرمانی کی ان حالتوں میں وہ کچھ دار

دوستوں کی کمی یا کم ہوجانے سے ہو۔ لوگوں کے فریب کھاجانے سے ہو۔ اس خیال سے ہو کہ ہم میں مساوات برتی جاتی ہے۔ یا اس وجہ سے ہو کہ جب ہم فتح کرتے ہیں تو امیرالمومنینؑ ہمیں دشمنوں سے پورا نفع نہیں اٹھانے دیتے بلکہ خلاف امید رحم فرماتے ہیں۔ پھر بھی ایسا گمان نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ایسا ہی کہیں ہوگا کہ دشمن بجز مصر کے تمام مقامات سے نکال باہر کیا جاسکے۔ اس لیے کہ جناب امیرؑ خاموش نہ ہوں گے جب تک انتظام نہ کرلیں۔ انھیں ہر مقامات سے متواتر خبریں ملتی رہیں گی اور برابر بدایتیں جاری رکھیں گے غریب سے غریب کس مپرس عورت اور بڑے سے بڑے صوبہ کا عامل دونوں ان کی نگاہ کے سامنے رہیں گے۔ ایک کی داد رسی کرلینے کے بعد اگر نماز شروع کی جائے گی تو دوسرے کو صاف بے لوث ملامت کی جائے گی اگرچہ وہ ابن عباس یا عقیل بن ابی طالب کیوں نہ ہوں۔ ہمیں کوئی خبر نہیں معلوم کہ جناب امیرؑ نے مصر پر دوبارہ اختیار حاصل کرنے کے متعلق کیا ارادہ فرمایا تھا۔ لیکن جو بات واضح ہے وہ یہ ہے کہ جناب امیر یہ سمجھ رہے تھے کہ جب تک امیر شام قائم رہے گا ہر روز اسی طرح کی ایک نئی شورش برپا کرے گا۔ اس پر کاری ضرب لگا ان چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کا انسداد ہوگا۔ جناب امیرؑ اس کوشش سے کبھی باز نہیں آتے تھے یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ قیس بن سعد اور ابوایوب انصاری دس دس ہزار سپاہیوں پر افسر مقرر کیے جاتے اور اب حسینؑ بھی معرکہ جنگ میں اس درجہ اور اس حیثیت سے شریک ہوچکے تھے کہ ان کی تنہا ذمہ داری پر دس ہزار سپاہی ماتحت کیے جاتے۔ جناب امیرؑ کے پاس اب تک ان کے علاوہ بھی ایسے سردار تھے جن پر اعتبار کیا جاتا۔ کوئی شبہ روانگی میں نہ تھا بلکہ چند ہی روز غالباً دس روز باقی رہ گئے تھے۔ غالباً اختتام ماہ رمضان کا انتظار ہو کہ ابن ملجم اپنا کام کرگیا۔

میں ابن ملجم کی عشق بازی کی داستانوں کو یا ان روایتوں کو کہ ایک ہی دن قاتلوں نے جناب امیر، معاویہ، اور ابن عاص کو قتل کرنا چاہا۔ وہ داستانیں سمجھتا ہوں جو واقعہ کے چھپانے کے لیے سننے کے قابل بنائی گئی ہیں۔ بلکہ میرا قطعی تصفیہ ہے کہ یہ تینوں شخص معاویہ کے بھیجے ہوئے تھے کہ وہ جناب امیرؑ پر پوشیدگی سے وار کریں۔ اور ان لوگوں نے ایسی جگہ رہنا پسند کیا تھا جہاں نہ صرف ان قاتلوں کی موجودگی کی خبر جناب امیرؑ کو نہ پہنچ سکتی بلکہ وہ خارجیہ بھی ہوتی۔ قاتل رئیس قبیلہ نہ تھا کہ وہ ایک ہزار کی تلوار رکھ سکتا۔ اور اگر رکھ بھی سکتا اور ہوتا بھی تو سپاہیوں کا یہ قاعدہ نہیں ہے کہ وہ اپنی تلوار کو زہر آلود کیا کریں۔ اور اس پر زہر چڑھانے کے لیے ایک ہزار اور صرف کریں، ایسا ہی ہو۔ لیکن قطامہ کے اظہار انتقام کے وقت ابن ملجم کا جواب کہتا ہے کہ اس میں جناب امیرؑ پر حملہ کرنے کا مطلق خیال ہی نہ تھا۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہ تھا کہ وہ پیشتر سے ایسی تلوار رکھتا اور اگر نہ تھی تو کہاں سے دفعتہً پیدا ہوگئی۔ اور اگر یہ بھی فرض کیا جائے تو صرف ابن ملجم میں عاشقانہ دیوانگی ایسی پیدا ہوسکتی تھی کہ وہ جان پر کھیل کر مستعد ہوتا کیسے ممکن تھا کہ دو اور عاشق بھی دفعتہً تیار ہوجاتے اور پھر نری رقابت کے باوجود سبھوں میں حملہ کی ہم آہنگی پیدا ہوجاتی۔ اور اگر دوسرے دونوں عاشق نہ تھے تو بلاوجہ ان میں ایسی مہم کا پیدا ہوتا دنیا ہی بعید از عقل ہے۔

اب سوچیے کہ جو شخص عبداللہ بن بدیل، ہاشم بن عتبہ اور عمار یاسر کی شہادت سے اس لیے خوش ہوتا کہ وہ علیؑ کے دوست تھے۔ اور یہ سن کر کہ اشتر کے مصر میں پہنچ جانے پر کوئی افسوں کارگر نہ ہوگا اہتمام کرتا ہے کہ سرراہ کے زمیندار کو بلائے اور زہر آلود شہد مہیا رکھے کہ یہ غیر متوہم مہمان سانس تک نہ لے۔ جو وجہ علیؑ کے کمزور کرنے

کے لیے ہر اس شخص کو جس کی مدد علیؑ کے حق میں مفید سمجھتا ہے روپیہ اور حکومت کی لالچ دیتا ہے وہ خود اس شخص کے معدوم کرنے کے لیے کس سرگردانی میں مبتلا ہوگا جو مرکز تھا اور جس کے گرد تمام ایسے لوگ جمع ہوئے تھے جن کی موجودگی معاویہ میں تزلزل پیدا کرتی تھی۔ حقیقت میں یہ خبریں کہ معاویہ نے تین آدمی بھیجے کہ وہ کوفہ جاکر دریافت کریں کہ معاویہ پہلے مرے گا یا علیؑ، اور اس کے لیے کوفہ جاکر معاویہ کی موت کی افواہ مشہور کریں۔ ہوسکتا ہے کہ اسی طرح مشہور کی گئی ہوں جس کا باطنی منشا علیؑ کا قتل ہو، اور جناب امیرؑ کو اس وقت بھی یہ فرمانا ہو کہ: "معاویہ نہیں مرے گا جب تک میرا سر خون سے رنگین نہ ہولے اور وہ اس سے ملاعبہ نہ کرے"۔ اور کس قدر عام ہوگی یہ خبر کہ معاویہ کو علیؑ کے انتقال یا قتل سے خوشی ہوگی جس سے یہ روایت ہوسکتی کہ برک معاویہ کو شہادت علیؑ کی "خوشخبری" دیتا ہے اور معاویہ اس درجہ اپنے اُوپر حملہ کرنے والے کو سزا دینا بھول جاتا ہے بلکہ فوراً مُنہ سے یہ فقرہ نکلتا ہے کہ: "شاید وہ اس امر پر قادر نہ ہوا ہوگا"۔ جس کا لحن اس ترجمہ کا محتاج نہیں ہے کہ اے کاش وہ اس امر پر قادر ہوا ہو۔ اور قاتل اس امکان سے تسکین دیتا ہے کہ: "ان کے ساتھ کوئی محافظ نہیں رہتا"۔ کیا اس جواب میں جناب امیرؑ کی نقل و حرکت کا مطالعہ مخفی نہیں ہے۔

میرے نزدیک اس سے صاف کوئی امر نہیں ہے کہ جو تین قاتل امیرالمومنینؑ کے لیے تجویز ہوئے تھے ان میں سے ابن ملجم گرفتار ہوا اور بقیہ بھاگ گئے جن میں سے برک نے امیرالمومنینؑ کی شہادت کی خبر دی۔ یہ محض اہتمام ہے کہ "آج ہی شب" کا فقرہ کہا گیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ معاویہ نے اس خبر دینے والے کو مصلحت کی شدید احتیاط سے قتل کر ڈالا ہو اس لیے کہ کہیں اس کے زبان سے راز ظاہر نہ ہو جائے اور آخر میں اس خبر کی شہرت سے پیروان امیرالمومنینؑ انتقام پر آمادہ ہو جائیں۔ قاتلوں کی تثلیث صاف صاف مدبرانہ احتیاط اور اپنے ارادے پر اصرار ہے کہ اگر ایک ناکام ہو تو دوسرا اور دوسرا نہ ہو تو تیسرا اپنا کام کر جائے۔ اور کیا یہ دنیا کا اہم ترین حادثہ اس وقت نہیں ہوا جس وقت امیرالمومنینؑ شام کی طرف فوج کشی کی کوششوں میں مشغول تھے؟۔

بقول ابن خلدون "شہادت سے چند دنوں پیشتر امیرالمومنین علیؑ نے بقصد شام ایک لشکر مسلمانوں کا مرتب کیا تھا اور چالیس ہزار آدمیوں سے موت کی بیعت لی تھی لیکن اتفاق وقت سے لشکر کشی کی نوبت نہ آنے پائی تھی کہ شہید ہوگئے"۔ معاویہ لشکر کشی اور جنگ آزمائی اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ سمجھتا تھا کہ علیؑ کے دوستوں میں جس درجہ صفین کے التوا سے جھلاہٹ پیدا ہوگئی ہے اور جس درجہ مکاریوں کی خبر مشہور ہوگئی ہے اس سے کسی نئے فریب کا کارگر ہونا دشوار ہے اور اب بجز اختیار سے دست بردار ہونے یا مارے جانے کے کوئی چارہ نہ ہوگا اگر اس مرتبہ علیؑ مضافات شام تک اپنا لشکر لے آئے، زہر کا موقع نہ تھا اس لیے کہ ان دنوں جناب امیرؑ ایک روز اپنے فرزند حسنؑ اور دوسرے روز اپنے فرزند حسینؑ کے گھر افطار فرماتے تھے۔ پھر ایسے آدمی کیوں نہ تلاش کرتا جو کعبہ کے مولود اور کعبہ کے پاک کرنے والے کو قتل کرسکتا، خانۂ خدا میں شہید کرتا، آئندہ باب میں معاویہ کی ایسی ہی کوششوں کی اور مثالیں دی جائیں گی۔

مصلح بنی آدمؑ کے جانشین کے آخری وصایا

لیکن اس بندہ مافوق الانسان کو اس کے قبل گزرنا نہ تھا جب تک وہ اپنے فرمانے کے قابل اپنے اسلاف کی ایک نصیحت کو حاضرین سے نہ کہہ لیتا کہ: "اپنے درمیانی تنازعات کے مصلح ہو"۔ آنحضرتؐ فرماتے

تھے کہ: "اپنی ذات اور اپنے گروہ کی اصلاح تمام روزہ و نماز سے افضل ہے"۔ علیؑ کا تمام ایام ہوش اسلام اور مسلمانوں کی فکر بہبودی میں صرف ہوا تھا، کیسے علیؑ گوارا کرتے کہ جس قدر دیر موت کا عالم طاری ہونے میں باقی ہے اسے ایسی بڑی نصیحت میں صرف نہ کریں جس کے بغیر نہ کوئی قوم قوم ہے، نہ کوئی اخلاق اخلاق ہے، نہ کوئی مذہب مذہب ہے، نہ کوئی فرد انسان کہے جانے کے قابل ہے۔ کاش ہم بیسویں صدی کے مسلمان اسے سنتے۔ آج سنتے۔ کل سنتے۔ یہ کچھ کر اب اپنی حیات کے سلیے سنتے کہ جس قدر دیر کریں گے اسلامی اتحاد و اتفاق کو ہنسوائیں گے اور اپنے پرزے زیادہ کرتے جائیں گے۔ لیکن اس محسن اسلام کو ایک اور بڑی نصیحت اور آخری احسان کرنا تھا، اور جس کا تعلق محض اپنی ذات سے تھا۔ اور وہ یہ موقع تھا کہ کہیں بنی ہاشم ہماری شہادت کو ویسا ہی ذریعہ نہ بنالیں جو بنی امیہ اور بنی تیم وغیرہ نے پسند کیا تھا۔ قوت دی ہے اپنے لہجہ میں جہاں فرمایا ہے کہ:

"اے اولاد عبد المطلب! میں تمھیں ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ تم مسلمانوں کے خون میں سر سے پاؤں تک رنگین ہوتے پھرو، اور کہتے جاؤ کہ امیر المومنینؑ قتل ہوگئے امیر المومنینؑ قتل ہوگئے"۔

میرے قیاس سے باہر ہے کہ خونخواہان عثمان کی کارروائیوں پر اس سے زیادہ کسی واقعہ تاریخی سے روشنی پڑ سکتی ہے۔ کیسا موقع ہے۔ کیا فرمایا ہے۔ کس طرح فرمایا ہے۔ طنز ہے، افسوس ہے، حقارت ہے اور نصیحت ہے۔ بادی النظر میں اس قدر فرمانا کافی تھا مگر نہیں، جناب امیرؑ نے شرح بھی کردی۔ اور فرمادیا کہ:

"آگاہ رہو کہ میرے قاتل کے سوا کوئی دوسرا شخص قتل نہ ہونا چاہیے"۔

یہ سب اس سلیے کہ میرے بعد بھی مسلمان قتل نہ ہوں۔ آپس میں نہ لڑیں، ان کا رحم و کرم اپنے قاتل کو بھی نہ بھولا۔

کہاں سے اپنے الفاظ میں یہ درد لاؤں جو یہ اثر پیدا کرسکے کہ زمانہ
اس مسلمان سے خالی ہوگیا جس کی عظیم الشان منزلت پر
تیرہ صدیوں کے گہرے پردے پڑنے اور بڑے بڑے
تغیرات کے بعد آج بھی عالم کے تیس کروڑ
سے زیادہ مسلمان ادب، اخلاص،
اور احسان شناسی سے
متفق ہیں

○

باب ششم

بنی ہاشم کا دائمی زوال

۴۰ھ رمضان المبارک

اس باب میں اب ہم ان تذکروں تک پہنچے ہیں جہاں یہ کوشش اپنے کمال کو پہنچ گئی کہ صاحب اثر لوگ خاندان بنی ہاشم کی کوئی ایسی مدد نہ کرسکیں جس سے ان میں اپنے اختیارات پر قابض رہنے کی قوت باقی رہے۔ پیشتر اگر وقت تھا کہ بنی ہاشم سے تجاہل پیدا کیا جاتا اور لوگ اس طرح مشغول کیے جاتے کہ وہ بنی ہاشم سے اپنی ضرورتوں میں مستغنی ہو جائیں اور مشغولیت انھیں ان کی طرف مائل نہ ہونے دے تو اب وقت آیا یا ایسی مصلحت کا نشو ہوا کہ بنی ہاشم کے قطعاً ضعیف اور بے اثر کرنے کے لیے ان کے سب وشتم کا عام اعلان ہوا اور ان کا ذکر الحاد اور سیاسی جرائم سے بھی زیادہ سنگین سمجھا جائے۔ از پھر اس کے بعد ان کے دوستوں سے متواتر اور مسلسل وہ برتاؤ کیا جائے جو ان کی محرومیت کا باعث ہو۔ بلکہ قتل اور زہر اس وقت تک مخفی یا علانیہ طور سے استعمال کیا جاتا رہے۔ جب تک علیؑ اور فاطمہؑ کی اولاد میں سے کوئی امام باقی نہ رہے۔

حسنؑ مجتبیٰ کی سوانح عمری

امیر المومنینؑ کے دفن سے فارغ ہو کر آپ کے فرزند اکبر حضرت امام حسنؑ نے خطبہ فرمایا جس میں نہایت صحیح اور توجہ کے قابل یہ بات کہی تھی کہ:

"تم میں سے وہ شخص اٹھ گیا جس کے مثل متقدمین نے نہ دیکھا تھا اور متاخرین اس جیسا نہ دیکھیں گے"۔ اس کتاب میں کسی حد تک حسنؑ کا تعارف کرایا گیا ہے جس قدر ہماری کتاب کو ضرورت تھی اور وہ اس سمجھانے کے لیے کافی ہے کہ حسنؑ نے اپنے سینتیسویں برس تک عالم کے اس قدر تغیرات دیکھنے تھے جیسے کم دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ کم سنی میں اپنا اختیار پھر فوری بے اختیاری اور پھر اس میں قیام اور سختیاں اور اس کے بعد پھر اختیار اور ترقی اور پھر یکایک انحطاط اور زوال دیکھا تھا۔ زوال کی رکی ہوئی حالت تھی کہ اپنے کو اپنے پدر بزرگوار کا جانشین دیکھا۔ اس حالت میں کہ لوگوں کو تمام تر اپنی اطاعت پر آمادہ دیکھا ہو اور خطرات گرد وپیش نہ دکھائی دیتے ہوں۔ بلکہ اپنی قوت کے زوال کے اسباب کو اپنی آنکھوں سے لوگوں کی نافرمانی کی بدولت دیکھا تھا۔

ان امورات سے میری یہ غرض ہے کہ حسنؑ کے متعلق کوئی فیصلہ ان کے ایسے واقعات پر نظر ڈالے بغیر ممکن نہیں ہے جن میں کبھی وہ کوفہ کے لوگوں کو ایسی مخدوش حالت میں اپنے موافق کر لیتے ہیں کبھی جنگ جمل میں تقریریں کرتے ہیں اور لوگ جن میں بوڑھے صحابی، مدبر اور تجربہ کار سپاہی ہیں، جن کے وقت رسولؐ اور جناب امیرؑ کی تقریریں، کلام اور انداز دیکھنے اور سننے میں صرف ہوئے تھے۔ ان کی تقریروں کو پسند کرتے ہیں۔ مزید براں میدان جنگ کا تجربہ بھی عملاً حاصل تھا۔ جس طرح جناب امیرؑ نے اہتمام کیا تھا کہ انھیں ایام ہوش سے تقریر کرنا سکھائیں جس سے زبان اور خیال رواں ہو جائے

اسی طرح اپنی نگاہ کے سامنے انھیں میدان جنگ میں شریک ہونا، جنگ کرنا، اور فوجی افسری بھی سکھائی تھی۔ جس طرح تاویل قرآن اور علوم اخلاق کو اپنی زبان سے تعلیم فرمایا تھا۔

یہ تھے حسن۔ یعنی علیؑ اور رسولؐ کے ولی عہد اور جانشین۔ اور وہ ان تمام قابلیتوں میں ممتاز دستگاہ رکھتے تھے جس کی کسی ولیعہد کو اپنے موقع پر ضرورت ہوا کرتی ہے۔

بیعت کے وقت کی مخصوص حالت

بیعت شروع ہوئی اور سب کے پہلے اس نے بیعت کی جس نے صفین میں معاویہ کے خیمہ کو گھوڑ دوڑ کا میدان بنا دیا تھا۔ جس پر امیرالمومنینؑ کو اعتبار تھا، اور جو ایک دستہ کا افسر تھا۔ میری غرض بلند بالا اور قوی ہیکل قیس بن سعد بن عبادہ انصاری سے ہے۔ کہا گیا ہے کہ قیس نے بیعت کرتے وقت کہا کہ: "اپنے ہاتھ کو کتاب خدا، سنتِ رسولؐ اور قتالِ ملحدین کے لیے بڑھاؤ"۔ اس پر حضرت سبط اکبر نے فرمایا کہ: "کتاب خدا اور سنت رسولؐ میں دیگر شرائط بھی شامل ہیں۔ تفصیل کی ضرورت نہ تھی"۔ اس پر بقول ابن خلدون لوگوں کو شبہ سا پیدا ہو گیا۔ آپس میں سرگوشیاں کرنے اور کہنے لگے: "یہ تو تمھارا امیر نہیں ہے اور نہ یہ جنگ کا قصد رکھتے ہیں"۔

امیرالمومنین حسنؑ، معاویہ کو اپنے بیعت کے لیے لکھتے ہیں

بیعت کے بعد حضرتؑ نے معاویہ کو اطلاع دی کہ لوگوں نے میری بیعت کی ہے اور معاویہ کے عدم استحقاق کو ظاہر کرنے کے بعد خواہش کی کہ وہ بھی بیعت میں داخل ہو جائے۔ لیکن بقول ابن خلدون: "امیرالمومنین علیؑ کی شہادت کا حال معاویہ کو معلوم ہوا تو انھوں نے اپنی خلافت کی بیعت اہلِ شام سے لے لی، اور اسی روز امیرالمومنینؑ کے مبارک لقب سے پکارے جانے لگے لیکن اصل یہ ہے کہ معاویہ نے بعد اجتماع حکمین بیعت خلافت لی تھی"۔ اور بقول علامہ مجلسی حسنؑ کے جواب میں معاویہ کا یہ فقرہ توجہ کے قابل ہے کہ: "میرا اور آپ کا امر مشابہ ہے امر ابوبکر اور آپ حضرات کے امر سے بعد وفات رسولؐ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے"۔

جہاد پر آمادہ کرنے کا خطبہ اور لوگ

اس کے بعد حضرت نے خطبہ فرمایا، اور لوگوں سے جہاد کی فضیلت بیان کی اور انھیں آمادہ کرنے کی کوشش کی اور حکم دیا کہ لوگ لشکر گاہ کی طرف نکلیں۔ لیکن لوگوں میں بجز خاموشی کے تعمیل حکم نہ دکھائی دی۔ جس پر عدی بن حاتم نے کہا: "سبحان اللہ! تم لوگ اپنے امام کو کیوں نہیں جواب دیتے۔ خطباء مصر کہاں ہیں؟"۔ اس پر کچھ لوگ تیار ہوئے۔

معاویہ کی خفیہ کارروائی

بقول علامہ مجلسی ارشاد شیخ مفید علیہ الرحمہ میں ہے کہ معاویہ نے "ایک شخص کو قبیلہ حمیر سے کوفہ کی طرف اور ایک شخص کو ابن قیس سے بصرہ کی طرف خفیہ طور سے بھیجا۔ تاکہ یہ دونوں وہاں کی خبریں اسے لکھ بھیجیں اور امور حکومت امام حسنؑ علیہ السلام میں خلل انداز ہوں"۔ بصرہ اور کوفہ کے یہ دونوں شخص گرفتار ہوئے اور حضرت نے معاویہ کو تحریر فرمایا کہ: "تو نے پوشیدہ طور سے قتل کرنے اور فریب کے لیے لوگوں کو بھیجا ہے تو نے جاسوس بھیجے ہیں گویا تو لڑائی چاہتا ہے اور اس میں میں شک نہیں کرتا۔ پس تو جنگ کے لیے مستعد رہ"۔

علامہ مجلسی کے نزدیک حضرت امام حسنؑ کے لشکر کے عناصر

اس کے بعد بہت سے خطوط کا تبادلہ ہوا اور معاویہ نے شام سے ساٹھ ہزار فوج کے ساتھ حرکت کی اور حضرت نے بھی حجر بن عدی کو منظم فوج مقرر کیا۔ خود حضرت لوگوں کو جہاد پر آمادہ کرتے تھے۔ مگر لوگوں میں نامستعدی ایک ظاہر شان تھی۔ لشکر جن لوگوں سے مرتب ہوا اس کے یہ عناصر بقول علامہ مجلسی یہ تھے کہ: "بعض تو ان جناب کے اور ان کے پدر بزرگوار کے شیعہ تھے اور بعض خارجی تھے اور بعض ان میں کے بڑے فتنہ پرداز اور لالچی تھے غنیمتوں میں۔ اور بعض ان میں کے بڑے شکی تھے اور بعض ان میں سے اصحاب تعصب تھے کہ انھوں نے اپنے قبیلہ کے رئیسوں کی متابعت کی وہ دین کی جانب رجوع نہیں کرتے تھے"۔

۴۱ھ مقابلہ کے لیے قیس کی روانگی

حضرت کو جب معاویہ کی حرکت کی خبر ہوئی تو آپ نے قیس بن سعد کو بارہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ انبار کی طرف روانہ فرمایا۔ اور خود کوچ کرتے ہوئے مدائن پہنچے۔

اس کے بعد موقع کے لحاظ سے روایتیں اس قدر مختلف ہیں کہ ابتدا کے لیے کسی کی اولیت پر اطمینان نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً صاحب صواعق محرقہ حسنؑ بصری سے روایت کرتے ہیں (جنھوں نے صحیح بخاری سے نقل کی ہے) کہ جب امام حسنؑ کا لشکر معاویہ کے مقابلہ میں پہنچا تو عمرو بن عاص نے کہا کہ میں لشکر دیکھ رہا ہوں جو کبھی پیٹھ نہ پھیرے گا تاوقتیکہ اپنے مقابل کو قتل نہ کرے اور پھر اس کے بعد اس میں اس درجہ انسانیت حب قومی اور وطن پرستی بھی پیدا ہوئی جس سے یہ کہہ سکتا کہ پھر: "امور مسلمین کے لیے کوئی نہ رہے گا جوان کی عورتوں اور ان کی زمینوں کی محافظت کرے"۔ اور اس بنیاد پر دو شخصوں کو مصالحت کے لیے بھیجا۔ اس کے علاوہ اسی مؤلف نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ لشکروں کے مقابل ہونے پر خود سے حسنؑ نے تحریک صلح کی۔ ابن خلدون کہتا ہے کہ: "یہ مشہور ہو گیا کہ قیس بن سعد مارے گئے۔ اس خبر کے مشہور ہوتے ہی لوگ بھڑک کر ایک دوسرے سے الجھ گئے۔ چند لوگ امام حسنؑ کے خیمہ کی طرف جھپٹے، جو کچھ پایا لوٹ لیا۔ اندر گھسے تو اس بساط اور چادر کو بھی چھین لیا جس پر آپ بیٹھے اور جس کو آپ اوڑھے ہوئے تھے۔ بعضوں نے ناعاقبت اندیشی سے آپ کی ران میں نیزہ بھی مارا۔ ربیعہ و ہمدان آپ کی حمایت پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اوباشوں کا مجمع منتشر کیا۔ آپ کو ایک سریر پر اٹھا کر مدائن میں لائے۔ چنانچہ آپ قصرِ ابیض میں داخل ہوئے"۔

معاویہ کا مقدمہ لشکر اور حسن کے سپاہیوں کا انتشار

روضۃ الصفا کو کہنا ہے کہ معاویہ نے قیس بن سعد کو انبار میں محصور کیا۔ اور عبداللہ بن عامر کی ماتحتی میں ایک فوج مدائن کی طرف روانہ کی۔ امام اس لشکر کے مقابل ہوئے اور یہ دیکھ کر ابن عامر نے آواز دی کہ: "اے اہلِ عراق! میں معاویہ کا مقدمہ ہوں۔ میری غرض جنگ نہیں ہے۔ معاویہ کثیر فوج کے ساتھ انبار میں ہے۔ ابو محمد (کنیت حسن) کو میری طرف سے سلام کہو کہ عبداللہ آپ کو قسم دیتا ہے کہ آپ اپنے نفس اور اس جماعت کی ہلاکت کے لیے کوشش نہ کیجیے"۔ یہ سن کر حسنؑ کے لشکر پر خوف طاری ہوا، اور وہ بے کار ہو گئے۔ حسنؑ نے مدائن کی طرف مراجعت کی اور ابن عامر نے محاصرہ کیا۔

معاویہ کی کوششیں

اعثم کوفی کو کہنا ہے کہ: "معاویہ، امیرالمومنینؑ کے وفات کی خبر سن کر بہت خوش ہوا اور لشکر جمع کر کے اطراف ولایت میں بھیجا اور ولایت جزیرہ، عراق، یمن اور بصرہ کے کچھ حصہ پر قبضہ کرلیا۔ معاویہ لوگوں کو عطیہ دیتا تھا۔ اس وجہ سے سب نے اس کے طرف رجوع کیا اور موافق ہو گئے۔ اس کے بعد وہ بصرہ آیا اور لوگوں سے بیعت لی۔ امیرالمومنین حسنؑ نے یہ دیکھ کر خطبہ کہا، اور معاویہ کے ساتھ جنگ کرنے کی تحریک کی اور جب دیکھا کہ لوگ سستی اور تقصیر کرتے ہیں تو عبداللہ بن حارث بن نوفل معاویہ کے بھانجے کو اس کے پاس شرائط صلح کے ساتھ بھیجا"۔

حسنؑ کے خالص دوست عدداً اتنے نہ تھے جو دشمن کا مقابلہ کر سکتے

علامہ مجلسی کہتے ہیں کہ مدائن کے لوگ معاویہ سے مل گئے تھے۔ حضرتؑ کے ساتھ کوئی ایسا شخص کہ جس کے فریبوں سے حضرتؑ مامون ہوں باقی نہ رہا۔ مگر مخصوص شیعہ ان کے پدر بزرگوار کے اور خود آنجنابؑ کے اور وہ ایسے قلیل تھے کہ مقاومت لشکران شام کی نہ کر سکتے تھے۔ پس آنجناب کو معاویہ نے صلح کرنے کے بارہ میں لکھا، اور وہ خطوط حضرتؑ کے دوستوں کے (؟) جو انھوں نے معاویہ کو حضرتؑ کے غفلت سے قتل کر ڈالنے اور حضرت کو معاویہ کے سپرد کرنے کے بارے میں لکھے تھے معاویہ نے حضرت کو بھیج دیے"۔

حسنؑ کا خطبہ جو عزت کی موت یا ذلت کی زندگی کا تصفیہ تھا

اس کے بعد مؤرخین کے موافق حضرت امام حسنؑ نے بعض شرائط صلح لکھ کر معاویہ کے پاس بھیجے، جسے اس نے تمام قبول کیا، بلکہ ایک سادہ کاغذ پر اپنی مہر وغیرہ کر کے حسنؑ کے پاس بھیج دیا کہ تم اپنے شرائط اس پر لکھ دو۔ اور جب ایفا کا وقت آیا تو اس نے پہلے خط کو قابل عمل کہا۔ اب بقول ابنِ خلدون: "آپ نے اہل عراق کو جمع کر کے خطبہ دیا جس میں بعد حمد و درود کے بیان فرمایا کہ

> اے اہل عراق! میں نے تین بار تم سے درگزر کیا۔ تم نے میرے باپ کو مارا، مجھے نیزہ مارا، میرا گھر لوٹا، آگاہ رہو کہ تم نے دو مقتولوں کے درمیان جمع کیا۔ ایک مقتول صفین کے جس کے لیے تم رو رہے ہو اور ایک مقتول نہروان کے جس کا معاوضہ طلب کر رہے ہو، اور جو باقی ہیں وہ خاذل ہیں اور رونے والے بدلہ لینے والے ہیں اور معاویہ نے ایک امر پیش کیا ہے جس میں نہ تو عزت ہے اور نہ انصاف۔ پس اگر تم موت پر راضی ہو تو ہم اس امر کو قبول نہ کریں اور ان سے اللہ تعالیٰ کے بھروسہ تیز تلواروں سے محاکمہ کریں اور اگر زندگی دوست رکھتے ہو تو ہم اس کو قبول کرلیں اور تمھارے لیے خوشنودی حاصل کریں۔ لوگوں نے یہ سن کر ہر طرف سے چلا کر کہا صلح قائم رکھیے صلح قائم رکھیے"۔

لوگ ذلت کی زندگی پر راضی ہو گئے

اسی مؤرخ کے موافق: "امام حسنؑ نے قیس بن سعد کو جو مقدمۃ الجیش کے افسر تھے امیر معاویہ کی اطاعت قبول کرنے اور ان کی بیعت کرنے کو لکھ بھیجا۔ قیس نے اپنے ہمراہیوں کو جمع کر کے اس خط کو پڑھا، اور بنظر مشورہ ان کو مخاطب

کر کے کہا: ہم لوگوں کا بغیر امام کے لڑنا مناسب ہے یا کہ امام گمراہ کی اطاعت کرنا۔ لوگوں نے پچھلی شق کو اختیار کیا"۔

لشکر سے قیس کا مخاطبہ اور جواب

اس کے بعد نہیں معلوم مترجم کے قصر کرنے یا خود مؤلف کی ناقص ترتیب کے لحاظ سے دفعۃً یہ عبارت نظر آتی ہے کہ:

"قیس بن سعد بوجوہ امیر معاویہ کی بیعت سے رکے ہوئے تھے اور عبیداللہ بن عباس بھی اس رائے سے متفق تھے لیکن جب امیر معاویہ نے عبداللہ بن عامر کو بسر کردہی ایک لشکر جرار عبیداللہ بن عباس کی طرف روانہ کیا، اور عبیداللہ بن عباس نے خط و کتابت کر کے امان حاصل کر لی اور شب کے وقت تن تنہا اپنے لشکر سے نکل کر عبداللہ بن عامر کے خیمہ میں اور پھر ان کے ہمراہ امیر معاویہ کے پاس چلے آئے اور روانگی کے بعد قیس بن سعد امیر لشکر ہوئے تو انھوں نے از سر نو کل لشکریوں سے امیر معاویہ سے باایں شرط جنگ کرنے کا عہد و پیمان لیا کہ جب تک امیر معاویہ امیرالمومنین علیؑ کے گروہ کو ان کے جان و مال کا امن نہ دیں اور جو کچھ پچھلے واقعات میں ان سے سرزد ہوا ہے اس سے درگزر نہ کریں۔

قیس کے شرائطِ صلح کو معاویہ نے منظور کیا

رفتہ رفتہ امیر معاویہ تک یہ خبر پہنچ گئی۔ عمرو بن العاص نے جنگ کرنے کی رائے دی۔

امیر معاویہ نے کہا اس میں بہتری نہیں ہے۔ جنگ کرنے میں انھیں لوگوں کے برابر اہل شام بھی کام آئیں گے۔ پھر ایک قاصد کو بلا کر سادہ کاغذ پر مہر و دستخط کر کے قیس بن سعد کے پاس بھیج دیا کہ: "جو شرط تم کو منظور ہو لکھ دو"۔ قیس نے اپنے اور کل ہمراہیوں کے لیے امان طلب کیا۔ مال وغیرہ کچھ نہیں مانگا۔ امیر معاویہ نے ان کو امان دیدیا۔ اور قیس نے مع اپنے کل ہمراہیوں کے بیعت کر لی"۔ اسی صفحہ میں مؤرخ اس حصہ کتاب کو ختم کرتا ہوا یہ عبارت لکھتا ہے کہ: "میں نے بعض جزئی حالات سوائے طبری کے اور لوگوں کی کتابوں سے بھی بقدر طاقت جمع کر کے اخذ کیا ہے"۔ اور "حق یہ ہے کہ معاویہ کا شمار خلفاء میں ہے"۔

لوگ کس بات پر راضی ہو گئے تھے

روضۃ الصفا نے قیس بن سعد کو خبر پہنچانے کے بعد اس سے لوگوں سے کہلوایا ہے کہ: "یا بغیر امام کے جنگ کرو، یا بیعت باضلالت پر اقدام کرو"۔ اور لوگوں نے کہا کہ: "ہم بیعت باضلالت کو اس سے زیادہ پسند کرتے ہیں کہ ہم قتل ہوں۔ ہمارے اموال تلف اور اہل و عیال ضائع ہوں"۔

جہاں ایک دوست عزیز سے بلند تر ہے

علامہ مجلسی نے بھی بحار میں روایتیں نقل کی ہیں کہ کس طرح معاویہ نے ابن عباس کو دس لاکھ درہم کا وعدہ کر کے ملا لیا، اور قیس بن سعد نے جو عبیداللہ بن عباس کے بعد امیر لشکر ہوئے تھے امام حسنؑ کو خبر دی اور پھر معاویہ نے قیس کو ملانا چاہا، مگر انھوں نے لکھا کہ: "تو مجھ سے کبھی ملاقات نہ کرے گا مگر یہ کہ میرے اور تیرے درمیان میں نیزہ ہوگا"۔

صلح کی خبر اور قیس کی حالت

اور جب قیس کو صلح کی خبر پہنچی تو انھوں نے اشعار پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے کہ: "مجھے مسکن کی زمین سے مقام عال میں یہ خبر پہنچی کہ امام حق نے صلح فرمائی۔ جب سے مجھے یہ خبر معلوم ہوئی ہے میں متحیر ہوں اور چپکا غمگین قلب کی

عاجزی کی حالت میں بیٹھا بیٹھا تارے گنا کرتا ہوں"۔

شرائطِ صلح

اب میں تمام معاملات میں سب سے زیادہ مفید امر کی طرف آتا ہوں اور وہ شرائطِ صلح ہے۔ اور یہ جگہ ہے جہاں حیرت اور غصہ کا مؤرخین سے دور رکھنا معمول سے کہیں زیادہ دشوار ہے۔ بعض ان میں سے دفعات شرائط تک کا ذکر نہیں کرتے۔ بعض چند پر قناعت کرتے ہیں اور کبھی کبھی کہیں دوران تذکرہ میں کہہ دیتے ہیں کہ یہ شرط بھی تھی۔

بقول ابن خلدون: "امام حسنؑ نے لوگوں کی خود رائی اور نفاق کی وجہ سے امیر معاویہ کو لکھ بھیجا کہ میں خلافت و حکومت سے دست کش ہوا چاہتا ہوں۔ بشرطیکہ مجھ کو جو کچھ مال بیت المال کوفہ میں ہے دیدو۔ (اس وقت بیت المال میں پانچ لاکھ موجود تھا) اور داراب جرد (مقامات فارس) کا خراج مجھے معاف کردو اور علیؑ کو میرے سامنے سخت و ناملائم کلمات سے نہ یاد کرو۔ خط روانہ کرنے کے بعد اپنے بھائی حسینؑ و عبداللہ بن جعفر سے اس کا تذکرہ کیا۔ ان لوگوں نے سمجھایا بجھایا، لیکن وہ اپنی رائے سے نہ پھرے۔ جب یہ خط امیر معاویہ کے پاس پہنچا تو انھوں نے اس خط کو لے لیا، اور اس سے پیشتر ایک سادہ کاغذ پر دستخط و مہر کر کے عبداللہ بن عامر اور عبداللہ بن سمرہ کی معرفت امام حسنؑ کی خدمت میں بھیج چکے تھے، اور علیحدہ یہ تحریر کیا تھا کہ آپ کو جو شرط منظور ہو اس سادہ کاغذ پر لکھ دیجیے۔ ہم اس کو منظور کرلیں گے"۔ امام حسنؑ نے اس سادہ کاغذ پر جس کے نیچے امیر معاویہ کا دستخط و مہر تھی ان شرائط سے دو چند شرائط لکھے جو اس کے پہلے اپنے خط میں لکھ چکے تھے۔ پس جب امام حسنؑ بعد تفویض امارت ان شرائط کے ایفا کے خواستگار ہوئے تو امیر معاویہ نے پہلے خط کے شرائط پر عمل کیا، اور یہ کہا کہ یہ وہی تو ہے جو تم طلب کرتے تھے"۔

صاحب صواعق محرقہ عہد نامہ لکھے جانے کے پہلے یہ شرائط لکھتا ہے کہ معاویہ حسنؑ کے تمام دیون کو ادا کرے اور اہل عراق و حجاز سے کوئی مطالبہ نہ کرے۔ معاویہ نے کہا کہ ہم صرف عشر لیں گے۔ حسنؑ نے اصرار کیا اور معاویہ نے سادہ کاغذ بھیج دیا کہ اپنے مدعا کو صلح نامہ میں لکھ دو ہم قبول کریں گے۔ اس کے بعد حسب ذیل صلح نامہ لکھا گیا:

"یہ صلح نامہ ہے حسنؑ بن علیؑ اور معاویہ بن ابی سفیان میں۔ ان لوگوں نے مصالحت کی ہے اس بات پر کہ مسلمانوں کے امورات کی ولایت اس شرط سے معاویہ کو تسلیم کی جائے کہ وہ کتاب اللہ، سنت رسولؐ اور سیرتِ خلفائے راشدین پر عمل کرے۔ اور دوسری شرط یہ ہے کہ معاویہ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنے بعد کسی کو اپنا ولیعہد بنائے بلکہ یہ امر مسلمانوں کے مشورہ پر رہے۔ وہ جسے چاہیں اپنا امیر بنائیں۔ اور شرط یہ ہے کہ خدا کی زمین میں لوگ اس سے بے خوف ہوں۔ شام ہو، عراق و حجاز ہو یا یمن اور اصحاب و شیعہ علیؑ اپنے نفس مال اور اولاد سے بے خوف رہیں۔ اور معاویہ بن ابی سفیان پر خدا کی طرف سے یہ عہد ہے کہ وہ حسنؑ بن علیؑ اور ان کے بھائی حسینؑ بن علیؑ یا اہل بیت رسولؐ میں کسی سے ظاہر و باطن میں کوئی کدورت نہ رکھے۔ وہ کہیں ہوں۔ شہادت فلاں فلاں، اور کافی ہے شہادت حق سبحانہ تعالیٰ کی"۔

اعثم کوفی کو کہنا ہے کہ حسنؑ نے پیشتر خط میں تحریر فرمایا کہ: "اگر بندگان خدا کے ساتھ اچھی زندگی بسر کرے اور انھیں

مال اور زن و فرزند کی طرف سے بے خوف کردے اور خدا کے اوامر و نواہی اور آداب رسولؐ پر عمل کرے تو امارت تجھے سپرد کردوں۔ اور اگر تو مسلمانوں سے رعونت اور تکبر کرے گا اور انصرام امورات موافق شرع نہ کرے گا بلکہ اپنے مذاق کے موافق جاری رکھے گا تو میں جہاں تک ممکن ہوگا کوشش کروں گا جب تک خدا ہم میں اور تجھ میں فیصلہ نہ کرے"۔

اس کے بعد حسنؑ کے وکیل عبداللہ بن حارث نے معاویہ سے کہا کہ: امیرالمومنین "برآن قرار خلافت تسلیم میکند کہ اگر ترا پیش از وے وفات رسد خلافت ازان او باشد و بعد از تو کار بدست گیرد و در مدتے کہ تو بخلافت قیام نمائی ہر سال پانصد ہزار درہم از بیت المال بدو دہی و خراج دارالجبرد و فارس ازان او باشد تا ہر سال خراج آن را برقانونے کہ ہست می ستاند معاویہ جلب داد کہ برین جملہ رضا دادم"۔ اس کے بعد مہر اور دستخط والا کاغذ بھیجا۔ عبداللہ بن عامر اور عبداللہ بن سمرہ بھی ساتھ آئے ان لوگوں نے معاویہ کی منظوری بیان کی اور حسنؑ نے کہا کہ: "معاویہ سے جو کہا گیا ہے کہ اس کے بعد خلافت ہماری طرف آئے گی بہتر نہیں ہے، میں اسے نہیں چاہتا۔ اگر مجھے اس کی خواہش ہوتی تو میں حوالہ نہ کرتا۔ اب میں خراج دارالجبرد اور دیگر مال بھی نہیں چاہتا۔ اور اس سے بیعت کرتا ہوں"۔ یہ کہہ کر صلح نامہ لکھا کہ:

"یہ صلح نامہ ہے حسنؑ بن علیؑ اور معاویہ بن ابی سفیان میں اس سے امر پر صلح کی گئی ہے اور خلافت سپرد کی ہے کہ: ● جب وہ وفات کرے اور نزدیک بہ ارتحال ہو تو خود کسی کو ولیعہد نہ بنائے بلکہ مسلمان شوریٰ سے اس کا تصفیہ کرلیں۔ ● دوسری شرط یہ ہے کہ عامہ مسلمین اس کے ہاتھ اور اس کی زبان سے بے خوف ہوں۔ اور خلق اللہ کے ساتھ اچھی زندگی بسر کرے۔ ● تیسری شرط یہ ہے کہ علیؑ بن ابی طالب کے شیعہ ان کے متعلقین اور ان کے زن و فرزند ہر جگہ محفوظ اور بے خوف رہیں، اور ان سے کم و زیادہ کسی طرح کا تعرض نہ کیا جائے"۔

اس پر معاویہ نے عہد کیا اور اسے قبول کیا کہ: "اس اقرار پر وفا کرے گا اور شرائط بھی بجالائے گا اور کسی طرح کا مکر و کید نہ کرے گا۔ اور حسنؑ بن علیؑ اور ان کے بھائی حسینؑ بن علیؑ اور ان کے زن و فرزند اعزا اور اقربا اور اہل بیت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ظاہر و باطن بدی نہ کرے گا اور ایسا کرنے کا حکم نہ دے گا۔ یہ لوگ جہاں رہیں محفوظ رہیں۔ انھیں کسی طرح کی دھمکی نہ دی جائے گی۔ گواہ ہوئے عبداللہ بن حارث بن نوفل، عمر بن ابی سلمہ وغیرہ"۔

روضۃ الصفا کے موافق حضرت امام حسنؑ نے علاوہ اور شرط کے ابن عامر سے جو مخصوص شرط لکھوائی وہ یہ تھی کہ:

"در عطایا و صلات بنی ہاشم را بر اہل بیت خویش تفضیل و ترجیح کند"۔ عطیوں اور صلوں میں اپنے خاندان والوں پر بنی ہاشم کو ترجیح دے۔

اسی مؤرخ کے موافق معاویہ نے بجز "سب علی" کے تمام شرائط منظور کیے اور کہا کہ جس جگہ حسنؑ موجود ہوں وہاں سب نہ کی جاوے۔ اور پھر یہ بھی لکھا ہے کہ: "یکے از شرائط صلح آنکہ تعین خلیفہ بعد از معاویہ بے مشورت امیرالمومنین حسنؑ نباشد"۔ یعنی: "معاویہ کے بعد حسنؑ کے مشورہ کے بغیر خلیفہ معین نہ ہو"۔

علامہ مجلسی کے موافق ایک شرط یہ تھی کہ معاویہ اپنے کو امیرالمومنین کے خطاب سے یاد نہ کرے۔ رائٹ آنریبل مولوی سید امیر علیؒ بالقابہ اپنی تاریخ الاسلام میں فرماتے ہیں کہ: "صلح کے شرائط میں جو معاویہ اور حضرت حسنؑ کے مابین

ہوئی تھیں حضرت حسینؑ کا حق خلافت بین طور پر محفوظ رکھا گیا تھا"۔
کامل ابن اثیر میں علاوہ عام حالات کے مخصوص باتیں بھی ہیں کہ معاویہ نے ایفائے شرائط سے انکار کرتے وقت کہا کہ: ہم "پہلے خط کے موافق عمل کریں گے نہ کہ سفید مہر والے کاغذ کے موافق"۔
اسی مؤرخ کے موافق معاویہ نے "سب و شتم علیؑ نہ کرنے سے انکار کیا"۔ اور اب حسنؑ نے یہ شرط پیش کی کہ میرے سامنے سب نہ کرنا۔ معاویہ نے "اس کا اقرار کیا لیکن وفا نہ کی"۔ اور "خراج بھی نہیں دیا"۔
تاریخ خمیس کے موافق حسنؑ کی شرط تھی کہ معاویہ "نہ طلب کرے اہل مدینہ حجاز و عراق سے کوئی ایسی چیز کہ ان کے باپ کے زمانہ میں تھی، اور یہ کہ اس کے بعد ولیعہد ہم میں سے ہو، اور یہ کہ اختیار دے کہ ہم بیت المال میں سے بقدر ضرورت لے لیں۔ اس پر معاویہ خوش ہوا"۔ نیز اسی میں ہے کہ معاویہ نے "دس آدمیوں کو امان دینے سے انکار کیا، اور حسنؑ نے اس بارہ میں مراجعت کی۔ پھر معاویہ نے لکھا کہ: "قیس بن سعد کو پاؤں گا تو قتل کروں گا"۔ اس پر بھی حسنؑ نے مراجعت کی کہ بیعت نہ کروں گا۔ اور اب معاویہ نے سفید کاغذ بھیج دیا کہ: "جو لکھو گے اسے قبول کروں گا"۔ اور "لکھا حسنؑ نے کل ان باتوں کو جو پہلے لکھا تھا"۔ اور معاویہ نے "سب کو قبول کیا"۔ اب حسنؑ نے خلع کیا اپنی نفس کو اور امارت معاویہ کو تسلیم کیا"۔
ابو اسحاق اسفرائینی اپنے رسالہ نور العین فی مشہد الحسینؑ میں معاویہ کی رحلت کے وقت یزید کے اس سوال پر کہ: "آپ کے بعد کون خلیفہ ہوگا"۔ جواب دلواتے ہیں کہ: "خلیفہ تو ہی ہوگا"۔ لیکن پھر آگے یہ وصیت بھی کراتے ہیں کہ: "رعیت کے متعلق کوئی کام حسینؑ رضی اللہ عنہ کے مشورہ بغیر نہ کرنا۔۔۔ اس لیے کہ اے بیٹا خلافت ہمارا حق نہیں ہے۔ یہ حق ان کا ہے اور ان سے پہلے ان کے باپ اور ان کے نانا کا تھا، اور ان کے بعد ان کے اہل بیت کا حق ہوگا۔ بیٹا! تم تھوڑے ہی مدت تک خلافت کرنا، یہاں تک کہ حسینؑ رضی اللہ عنہ بالغ ہو جائیں، اور اچھی حالت میں مکہ جائیں۔ پھر وہ خود خلیفہ ہوں، یا جس کو چاہیں اہل بیت میں سے خلیفہ بنائیں۔ اور خلافت اپنے حق دار کے پاس جا پہنچے"۔
انسائیکلو پیڈیا (حسنؑ و حسین) میں یہ عبارت ہے کہ: "علیؑ کی رحلت پر ان کے فرزند اکبر حسنؑ خلیفہ منتخب ہوئے لیکن وہ اس شرط پر معاویہ کے حق میں مستعفی ہوئے کہ وہ اس کے بعد پھر خلیفہ ہوں گے"۔
مولوی حسنؑ میاں پھلواری صاحب اپنے قابل مطالعہ رسالہ "غم حسین" میں فرماتے ہیں: "تمام کتب تاریخ و سیر وغیرہ سے ثابت ہے اور تمام محققین علمائے اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ سیدنا امام حسنؑ علیہ السلام نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلافت صرف ان کے حیات تک کے لیے سپرد کی تھی اور اسی شرط پر ان کو خلافت سونپ دی تھی کہ تمہارے بعد خلافت ہماری ہی طرف لوٹے گی۔ تم کو ہرگز یہ حق نہ ہوگا کہ کسی کو اپنا ولیعہد بناؤ۔ یا اس کو میراث سمجھو"۔
اس کے بعد ابن عبد البر اندلسی کی استیعاب جلد اول صفحہ ۱۴۴ سے فرماتے ہیں: "باتفاق عام علمائے اہل سنت کے نزدیک یہ امر مسلم ہے کہ امام حسنؑ نے امیر معاویہ کو صرف ان کی حیات تک کے لیے خلافت سپرد کی تھی۔ نہ مابعد کے لیے بھی، اور اسی پر ان دونوں کے مابین صلح ہوئی تھی"۔
کتاب الامامت و السیاست ابن قتیبہ دینوری سے نقل فرماتے ہیں: "امام حسنؑ نے امیر معاویہ صاحب سے

اس بات پر صلح کی کہ امامت (خلافت) امیر معاویہ کے لیے ہے جب تک وہ زندہ رہیں۔ پھر جب وہ مرجائیں تو ان کے بعد خلافت و امامت حسنؑ کی ہوگی"۔

صاحب شواہد النبوۃ فرماتے ہیں: "معاویہ با امیرالمومنین حسنؓ رضی اللہ عنہ در سر مصالحہ کرد و عہد بست بر آنکہ اگر ویرا حادثہ پیش آید خلیفہ امیرالمومنین حسنؑ باشد"۔ یعنی: "معاویہ نے امیرالمومنین حسنؑ سے اس پر معاہدہ کیا تھا اور عہد کیا تھا کہ اگر اسے کوئی حادثہ پیش آجائے تو خلیفہ امیرالمومنین حسنؑ ہوں گے"۔

صلح کے بعد کی گفتگو اور حسنؑ سے خطبہ کی خواہش

مصالحت کے بعد قیس بن سعد کوفہ چلے آئے اور معاویہ بھی آیا حسنؑ اور معاویہ کی گفتگو میں مخصوص بات یہ تھی کہ معاویہ نے بقول شواہد النبوۃ و اعثم کوفی حضرت امام حسنؑ سے کہا کہ: ابتدائے آفرینش سے کسی نے ایسی شجاعت نہیں کی۔ یہ جود و سخاوت خاندان بنی ہاشم کے لحاظ سے حیرت خیز نہیں ہے۔ اور آزادوں کی طرح امر خلافت مجھے حوالہ کردیا ہے۔ اس کے بعد کہا: "جب آپ یہ احسان کرچکے۔ ممکن ہے کہ ابھی لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو اور سمجھتے ہوں کہ آپ کو رغبت خلافت ہے۔ اگر مصلحت سمجھیے تو کچھ فرما دیجیے کہ لوگ میرے بارہ میں آپ کے احسان سے واقف ہوجائیں"۔

تاریخ خمیس کے موافق حسنؑ کے خطبہ کہنے کے لیے عمرو بن عاص نے معاویہ کو اس لیے صلاح دی تھی کہ "دخل نہ ہونے کی وجہ سے نقص ظاہر ہوگا"۔ معاویہ نے اسے مکروہ سمجھا لیکن آخر میں حسنؑ سے خواہش ظاہر کی۔

حسنؑ کا خطبہ

اور جب حسنؑ اپنے خطبہ میں معاویہ کو مخاطب کرکے اس جگہ پہنچے کہ: "تیرے وجہ سے فساد اور خون ہوا"۔ تو معاویہ نے کہا کہ: "میں نہیں خیال کرتا تھا مگر اسی بات کا"۔

بقول ابن خلدون: "امیر معاویہ نے آپ کو بٹھالیا۔ کیونکہ انھوں نے ان کے خلاف خیال بیان فرمایا تھا۔

ابن حجر مکی صاحب صواعق محرقہ کے موافق فرمایا: "تم لوگ جانتے ہو کہ خدا نے تمھیں گمراہی اور جہالت سے میرے نانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بدولت آزاد کیا، اور ذلت و خواری کے بعد تمھیں عزیز کیا، اور قلت کے بعد تمھیں کثرت عطا کی۔ جانو کہ معاویہ نے مجھ سے ایک ایسے امر میں نزاع کی جو میرا حق تھا۔ اس کا نہ تھا۔ میں نے صلاح امت پر غور کیا، اور فتنہ کو منقطع کیا۔ حالانکہ تم نے مجھ سے بیعت کی تھی کہ تم اس سے صلح کروگے جس سے میں صلح کروں گا، اور جنگ کروگے جس سے میں جنگ کروں گا۔ لیکن میری رائے یہ قرار پائی ہے کہ معاویہ سے صلح کرلوں اور جو جنگ کہ واقع ہے اسے برطرف کروں۔ اس لیے کہ لوگ قتل سے محفوظ رہیں۔ ان کے خون کی محافظت اس سے بہتر ہے کہ ان کا خون بہایا جائے۔ میں نے اس صلح کا ارادہ نہیں کیا مگر تمھاری صلاح اور بقا کے لیے"۔ بعض مورخین کے موافق حضرت نے اپنی تقریر میں شرائط صلح بھی بیان کردیے تھے۔

عمرو بن عاص کی صلح شکن تقریر

اعثم کوفی کے موافق عمرو بن عاص کھڑا ہوا اور کہنے لگا: "اے اہلِ عراق! ہم اور تم راہ راست پر تھے کہ مختلف ہواؤں نے ہم لوگوں کو جدا کردیا۔ لڑائیاں ہوئیں۔ آخر میں حکمین نصب ہوئے اور سب لوگ ان کے ایسے حکم پر

جو موافق کتاب خدا و سنت رسولؐ ہو راضی ہوئے۔ حکمین نے اس پر یہ طے کیا کہ تم لوگ ہم پر ظلم اور ترجیح کا دعویٰ کرتے تھے۔ آج حق اپنے مرکز میں قائم ہوا' اور جنگ سے فارغ ہوئے۔ تم کو گزشتہ کا عذر اور گزشتہ نافرمانی اور عصیان کا موافقت اور اطاعت سے تدارک کرنا چاہیے کہ دین اور دنیا کے امورات اور مصالح کا انتظام ہو اور پراگندگی رفع ہو"۔

معاویہ کی ویسی ہی تقریر

اس کے بعد معاویہ نے کہا: "..... اب تک جو کچھ لڑائیاں اور کوششیں ہوئیں اور جس قدر خون بہا' اور مسلمانوں کے امورات میں جو کچھ خلل واقع ہوا یہ سب باتیں گزر گئیں۔ نظم ظاہر ہوا' اور پریشانی و تفرقہ دور ہوا۔ بڑے تزلزل کے بعد حق اپنے مرکز میں ہوا' اور فتنہ کی آگ بجھی۔ ہماری دعوت عزیز ہوئی۔ میں نے جو شرطیں کی ہیں اس کا سرا میرے ہاتھ میں ہے۔ چاہوں وفا کروں خواہ نہ کروں۔ تمھیں اس سے کوئی مطلب نہیں۔ تم کو اطاعت سے کام رکھنا چاہیے"۔

یہ تقریر سن کر بقول اعثم کوفی: "تمام آدمی برہم اور غضب ناک ہوگئے اور معاویہ کو گالیاں دینے لگے اور قصد کیا کہ اسے مار ڈالیں۔ قریب تھا کہ بہت بڑا فساد اور خونریزی واقع ہو' معاویہ ڈر گیا' اور اپنی گفتگو سے پشیمان ہوا"۔

قیس اور معاویہ

اس کے بعد ایک نہایت پرجوش روایت یہ ہے کہ قیس بن سعد جب معاویہ کے دربار میں گئے تو اس نے کہا کہ: "اے قیس میں نہیں چاہتا تھا کہ میں امیر ہوں اور تو زندہ رہے"۔ قیس نے جواب دیا: "میں بھی نہیں چاہتا تھا کہ میں زندہ رہوں اور تو حکومت کرے"۔

بقول علامہ مجلسی: قیس کے قول کے موافق جب یہ معاویہ کے پاس آئے تو درمیان میں نیزہ اور تلوار رکھ دی گئی تھی اور معاویہ نے خود اپنا ہاتھ بڑھا کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیا"۔

حسینؑ سے بیعت کی خواہش اور ان کا انکار

بقول روضۃ الصفا: معاویہ نے حسینؑ کے پاس طلب بیعت کے لیے آدمی بھیجا۔ حسینؑ نے انکار کیا۔ امام حسنؑ نے معاویہ سے کہا کہ: "اے معاویہ حسینؑ کو بیعت کے لیے مجبور نہ کر' اس لیے کہ ان کے نزدیک قتل ہو جانا تیری بیعت کرنے سے بہتر ہے۔ تو انھیں نہیں قتل کر سکتا جب تک ان کے اہل بیتؑ کو قتل نہ کرے' اور اہل بیت قتل نہیں ہو سکتے جب تک ان کے شیعہ قتل نہ ہوں"۔ معاملہ طول کھینچے گا۔ یہ سن کر معاویہ نے خاموشی اختیار کی۔

صلح اور حسینؑ

بقول کامل ابن اثیر حضرت امام حسینؑ نے اپنے بھائی سے کہا: "اپنے باپ کی تکذیب اور معاویہ کی تصدیق نہ کیجیے"۔ حسنؑ نے کہا: "چپ رہو' میں تم سے زیادہ جانتا ہوں"۔

بقول اعثم کوفی: حسینؑ نے حسنؑ کی طرف دیکھا' اور کہا: "اب کوئی تدارک نہیں ہو سکتا' اور نہ کوئی اصلاح ہو سکتی ہے۔ جو کچھ آپ نے کیا' مجھے اس سے بہت کراہت تھی۔ لیکن میں نے نہ چاہا کہ آپ کے خلاف کروں۔ آپ کی خوشنودی کے لیے خاموش رہا"۔ بقول علامہ مجلسی: "امام حسینؑ علیہ السلام اپنے برادر عالی وقار کی خدمت میں روتے ہوئے حاضر ہوئے۔ پھر حضرت کی خدمت سے ہنستے ہوئے باہر آئے۔ امام حسینؑ علیہ السلام کے دوستوں نے حضرت سے پوچھا کہ یہ کیا امر ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ عجب ہے میرے جانے سے ایسے امام کی خدمت میں کہ ان کو میں سکھانا چاہتا

تھا۔ پس میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ نے کس وجہ سے حکومت سپرد کردی؟۔ انھوں نے فرمایا کہ جو وجہ تمہارے پدر بزرگوار کو داعی ہوئی تھی اس زمانہ سے پیشتر کے زمانہ میں"۔

صلح کے متعلق حسنؑ سے مسیبؓ کا سوال وجوابؓ

اعثم کوفی کے موافق معاویہ کی تقریر کے بعد مسیب بن نخبۃ الفزاری کھڑے ہوگئے اور حسنؑ کے قریب جاکر کہا کہ: "جہاں تک غور کرتا ہوں یہ مشکل حل اور میری حیرت تمام نہیں ہوتی کہ آپ نے کیوں معاویہ سے بیعت کی اور چالیس ہزار مردان شمشیرزن کو مہمل چھوڑ دیا۔ نیز آپ نے اپنے زن و فرزند اور دوستوں کے لیے کوئی مضبوط عہد نہیں لیا اور ایسا صلح نامہ لکھا جو آپ اور اس کے درمیان ہے لوگوں کو اس کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اس وجہ سے معاویہ منبر پر جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے جو عہد کیا ہے اس کا سرا میرے ہاتھ میں ہے چاہوں وفا کروں یا نہ کروں۔ یہ آپ کی موجودگی میں کہتا ہے۔ یہ وہ آپ ہی سے کہہ رہا تھا، اس کا مخاطب کوئی دوسرا نہ تھا۔ یہ امر عظیم آپ سے سرزد ہوا۔ اس کی عاقبت بخیر ہو"۔ حسنؑ نے جواب دیا: "اے مسیب یہ چالیس ہزار مردان شمشیرزن جو بظاہر ہمارے ساتھ تھے تجھے معلوم ہے کہ مطلق حکم نہیں مانتے تھے اور جسے معاویہ کے مقابلہ میں جنگ کے لیے بھیجا جاتا تھا اس سے مل جاتے تھے یا اس کے پاس چلے جاتے تھے۔ یہ حال دیکھ کر صلح کی گئی۔ اگر ایسا نہ کرتا تو کیا کرتا۔ اب تمھیں اس کا بہتر تدارک کیا معلوم ہوتا ہے؟"۔ مسیب نے جواب دیا: "اے امیرالمومنین اگر آپ کی خواہش ہو تو تدبیر یہ ہے کہ اس بیعت سے باز آئیے اور اپنی پہلی حالت پر عود کیجیے۔ اور اس سے کہیے کہ تو نے میرے سامنے یہ کہہ کر کہ چاہے اپنے عہد پر وفا کروں چاہے نہ کروں عہد کو توڑ ڈالا"۔

عُبیدہ کندی اور حسنؑ

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ بصرہ کا ایک شخص جس کا نام عُبیدہ بن عمر الکندی تھا قریب آیا۔ اس کے چہرہ پر ایک گہرا زخم تھا۔ امیرالمومنین حسنؑ اسے پہچانتے تھے۔ پوچھا کہ: "تجھے یہ زخم کب لگا تھا"۔ کہا: "قیس بن سعد کی موافقت میں جب معاویہ سے جنگ کی تھی"۔

حجر اور عُبیدہ کا تاسف

یہ سن کر حجر بن عدی الکندی نے کہا: "کاش تو اور ہم اس روز ہلاک ہوجاتے کہ یہ برا دن نہ دیکھتے کہ دشمن کی مراد برآئی اور ہم لوگ دل تنگ اور غضب ناک ہوئے۔ موت اس زندگی سے کہیں بہتر تھی"۔

حسنؑ تسکین دیتے ہیں

یہ سن کر حسنؑ کا چہرہ متغیر ہوگیا اور اٹھ کر اپنے گھر چلے گئے۔ یہاں سے حجر بن عدی کو بلوایا، اور فرمایا: "حجر مجھے تمھاری شفقت اور اپنے بارہ میں تمھارا اعتقاد معلوم ہے۔ تم نے معاویہ کے مجلس میں جو باتیں کہیں اس کا وہاں موقع نہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تمھیں وہیں تسکین دوں۔ لیکن اغیار وہاں موجود تھے۔ تم اپنے کو خوش کرو اور رنجیدہ نہ ہو کہ میں نے تمھاری بہتری کے لیے صلح کی۔ اس لیے کہ تم آرام پاؤ۔ اور مسلمانوں کا خون نہ بہے۔ مجھے طمع جاہ اور زیادتی مال کی خواہش نہیں ہے۔ میں نے اپنے کو اس کام سے سبکدوش کیا کہ عبادت خدا میں بسر کروں۔ تم کو میری رضا پر توجہ کرنی چاہیے اور ایسی باتیں نہ کرنی چاہییں"۔

سُفیان بن ابی لیلیٰ اور حسنؑ

اس وقت سُفیان بن ابی لیلیٰ التمیمی داخل ہوا اور کہنے لگا: "سلام ہو تم پر اے ذلیل کرنے والے مومنین کے۔ یہ تم نے کیا کیا۔ کاش ہم اور تم مرجاتے کہ یہ کاشانہ چھٹتا"۔

اس کے بعد حسنؑ کی متذکرہ صدر تقریر تھی جس سن کر شیب بن نخبہ نے بقول روضۃ الصفا کہا: "ہمارے لیے مشکل نہیں ہے اس لیے کہ معاویہ کو ہم لوگوں کی ضرورت ہے اور ہمارے ساتھ رعایت کرے گا۔ لیکن ہمارا دل تمہاری طرف لگا ہوا ہے کہ مبادا معاویہ تم سے نقض عہد کرے اور کوئی لحاظ نہ کرے"۔

متذکرہ صدر واقعات بہ اختلاف وقت و مقام عام تواریخ میں پائے جاتے ہیں۔

علیؑ بن بشر اور حسینؑ

علیؑ بن بشر حضرت امام حسنؑ کی وجہ مصالحت سننے کے بعد حضرت امام حسینؑ کے پاس گیا اور جو کچھ سنا تھا بیان کیا۔ اس پر سبط اصغر نے فرمایا: "ابو محمد نے جو کچھ فرمایا وہ حق اور مطابق صدق ہے۔ جب تک معاویہ زندہ ہے اب بجز اس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہر شخص اپنے گھر میں بیٹھا رہے"۔

اہل بصرہ کی اِستقامت کا درجہ

اعثم کوفی کے موافق جس وقت اہل بصرہ نے سنا کہ حسنؑ نے امارت معاویہ کو تفویض کردی، ان لوگوں کو بہت رنج ہوا، اور بہت سے لوگوں نے جمع ہو کر کہا کہ ہم اس پر راضی نہ ہوں گے۔ کہ فرزندان علیؑ و رسولؐ کے ہوتے ہوئے ہم معاویہ کی خلافت کو قبول کرلیں۔ حمران بن آبان نے جو روسائے کوفہ میں سے ایک تھا لوگوں کو تسکین دی اور شہر پر حسنؑ کے نام سے قبضہ کیا (ابن خلدون بھی قبضہ کا ذکر کرتا ہے) معاویہ کو یہ خبر معلوم ہوئی اس نے عمر بن ارطاۃ کو لشکر کثیر کے ساتھ بھیجا۔ جس قدر لوگ حمران کے ساتھ جمع ہوئے تھے منتشر ہو گئے۔

عمر بن ارطاۃ اور ابوبکرہ

دوسرے روز عمر بن ارطاۃ قصر الامارۃ سے مسجد میں آیا، اور جس قدر نالائم الفاظ علیؑ اور اولاد علیؑ کے لیے استعمال کر سکتا تھا کیے۔ اس وقت ابوبکرہ کھڑے ہو گئے اور کہا: "جھوٹ کہتا ہے اے دشمن خدا ـــــ"۔ ابن ارطاۃ نے ان کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن بن ضبہ بیچ میں پڑے اور انھیں اٹھالے گئے۔ ابن ارطاۃ چھ مہینہ تک حاکم رہا۔ اس کے بعد عبد اللہ بن عامر کریز اور اس کے بعد زیاد بن ابیہ عامل مقرر کیا گیا۔

مصلحت صلح پر مزید عکس

علامہ مجلسی اِحتجاج طبرسی سے زید بن وہب جہنی کے زبانی ایک روایت نقل کرتے ہیں جس سے مصالح صلح پر کچھ اور عکس پڑتا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

جب حسنؑ بن علیؑ علیہ السلام مدائن میں مجروح ہوئے تو میں ان جناب کی خدمت میں حاضر ہوا اور وہ جناب درد میں مبتلا تھے۔ میں نے عرض کیا کہ یا ابن رسول اللہ کیا رائے ہے آپ کی کیونکہ لوگ متحیر ہیں۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں قسم بخدا معاویہ ان لوگوں سے میرے لیے بہتر ہے۔ یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ یہ میرے شیعوں میں سے ہیں۔ میرے قتل کے در پے ہوئے۔ میرا اسباب لوٹا، میرا مال لے لیا۔ واللہ اگر میں معاویہ سے ایک عہد لے لوں کہ میں اس کے سبب سے اپنی خونریزی کو روکوں اور اس کے سبب سے میں اپنے اہل میں امن سے رہوں تو یہ امر بہتر ہے اس سے کہ یہ لوگ مجھے قتل کریں اور میرے اہلِ بیتؑ

اور اہل ضائع ہوں۔ قسم بخدا کہ اگر میں معاویہ سے مقابلہ کروں تو یہ لوگ میری گردن پکڑ کر مجھے معاویہ کے سپرد کر دیں گے صلح کی راہ سے۔ پس واللہ اگر میں اس سے صلح کروں اس حال میں کہ میری عزت قائم رہے یہ میرے نزدیک بہتر ہے اس امر سے کہ وہ مجھے قتل کرے اس حال میں کہ میں اس کا اسیر ہوں یا وہ منت رکھ کر چھوڑ دے اور یہ امر باعث عار ہو۔ بنی ہاشم کے لیے قیامت تک اور معاویہ اور اس کی اولاد ہمیشہ احسان جتائے اس کا ہمارے ہر زندہ اور مردے پر"۔

آگے بڑھ کر حضرت امام محمد باقرؑ سے ایک روایت ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغہ سے نقل فرماتے ہیں کہ۔۔۔۔ "پھر ان کے فرزند امام حسنؑ علیہ السلام سے بیعت کی گئی اور عہد کیے گئے آنجناب سے۔ پھر آنجناب سے غدر کیا گیا اور ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ پھر ان حضرت پر اہل عراق نے حملہ کیا۔ یہاں تک کہ ان جناب کے پہلو پر زخم خنجر لگایا گیا اور آنجناب کے لشکر کو لوٹ لیا اور آنجناب کے کنیزوں کی خلخالیں بہ ظلم چھین لی گئیں۔ پس حضرت نے معاویہ سے مصالحہ کر لیا اور آنجناب نے اپنے اور اپنے اہل بیت کی خون ریزی کو رد کیا اور وہ انتہا درجہ قلیل تھے"۔ بحار ہی میں حضرت امام حسنؑ ابوسعید عقیص سے ہم کلام ہیں اور فرماتے ہیں: اے ابوسعید علت میرے مصالحہ کی معاویہ سے وہ علت ہے کہ جس علت سے رسولؐ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی ضمرہ اور بنی اشجع سے صلح کی تھی اور اہل مکہ سے صلح کی تھی۔ جب وہ جناب حدیبیہ سے پھرے۔ وہ لوگ کفار تھے، بہ تنزیل اور معاویہ اور اس کے اصحاب۔۔۔ ہیں بتاویل۔۔۔ نہیں واجب ہے یہ امر کہ میری رائے پر سفاہت کا الزام لگایا جاوے اس امر میں کہ جس کو میں بجا لاؤں صلح کر لینے یا محاربہ کرنے سے اگرچہ وجہ حکمت اس امر کی جس کو میں نے کیا ہے معلوم نہ ہوتی ہو"۔

نواسۂ رسولؐ کی توہین کے لیے بنی امیہ کی بے چینی اور اس کی وجہ

علامہ مجلسی نے کتاب احتجاج سے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دن معاویہ کے پاس عمر بن عثمان، عمرو بن عاص، عتبہ بن ابی سفیان، ولید بن عتبہ اور مغیرہ بن شعبہ بیٹھے تھے، ان میں سے ابن عاص نے معاویہ سے کہا کہ حسنؑ نے اپنے باپ کی سیرت کو زندہ کیا ہے۔ لوگ ان کے پیچھے ادب و اطاعت سے چلتے ہیں اور ان کی تصدیق کرتے ہیں اور یہ باتیں انھیں اس چیز کی طرف لے جائیں گی جو ان سب سے زیادہ بلند ہے تو انھیں یہاں بلا اور ہم لوگ کہیں کہ تم دونوں اس مرتبہ کمال پر پہنچنے سے قاصر ہو اور ان کی ذلت کریں۔ حسنؑ بلائے گئے۔ سلامتی اور بے خوفی کا اقرار ہوا، اور معاویہ نے کہا کہ ان لوگوں نے آپ کو بلایا ہے کہ یہ کہیں کہ عثمان مظلوم قتل کیے گئے اور آپ کے پدر بزرگوار نے انھیں قتل کیا۔ آپ انھیں جواب دیجیے جیسا یہ کلام کریں اور میری موجودگی جواب دینے سے باز نہ رکھے۔

گفتگو شروع ہوئی۔ جس میں ابن عاص نے کہا کہ ہم نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ آپ اور آپ کے باپ کے بارہ میں بے ادبی کریں اور آپ اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ ہم پر عتاب کر سکیں اور نہ اس قدر استطاعت رکھتے ہیں کہ ہماری تکذیب کر سکیں۔ اس کے بعد حاضرین نے بدگوئی اور پرانے قصے یاد کر کے جس طرح انتقام لے سکتے تھے لیا، اور حسنؑ نے ہر ایک کی حقیقت جواب اور نسب کو جس طرح ظاہر کر دیا اس نے سبھوں کی گردنیں جھکا دیں۔ اور حسنؑ وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔ اس جلسہ میں مروان نہ تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ بنی امیہ کو حسنؑ نے ذلیل کیا تو اب یہ آیا اور یہ دعویٰ

کیا کہ میں انھیں اس قدر ذلیل کروں گا کہ قریش کے لونڈی اور غلام اسے گاتے رہیں گے۔ پھر حسنؑ بلائے گئے اور اب کی مروان نے پھپھولے توڑے اور حسنؑ نے اس کے متعلق بھی جو کچھ کہا اس سے مروان کو بھی سیری حاصل ہو گئی۔

حضرت امام حسنؑ کا آخری زمانہ

اب میں اس مصلح بنی آدم کے آخری زمانہ پر آتا ہوں اور ان واقعات کو ترک کرتا ہوں کہ عہدنامہ کے موافق جو رقم ہر سال ملنی چاہیے تھی وہ برسوں نہ ملی۔ سختی اور تنگی برداشت کریں اور غالباً متعلقین کی ضروریات سے مجبور ہو کر بقول صواعق محرقہ: معاویہ کو لکھنے کے لیے کبھی قلم و دوات طلب کریں لیکن پھر غالباً غیرت سے واپس کریں اور خاموش رہ جائیں۔

شہادتِ حسنؑ

جامع التواریخ ابوالفدا، روضۃ الصفا، طبری، رسالہ نجات، شواہد النبوۃ، روضۃ الشہدا، انسائیکلوپیڈیا، اوسبورن، صواعق محرقہ اور اعثم کوفی۔ یہ سب مؤرخین ان میں سے کسی امر پر متفق ہیں کہ جعدہ بنت اشعث کو ملا کر معاویہ نے حسنؑ کو زہر دلوایا کہ یزید کو ولیعہد کرے۔ یا یہ کہ یزید نے جعدہ کو ملا کر زہر دلوایا، اور کسی نے اگر بہت اِحتیاط کی ہے تو کہا ہے کہ "مشہور" یہ ہے کہ معاویہ کے ایماء سے زہر دیا گیا۔ صواعق کی ایک روایت کے موافق تین مرتبہ اور روضۃ الشہداء کے موافق سات مرتبہ زہر دیا گیا۔ لیکن پیشتر یا تو استفراغ کی وجہ سے اثر نہ ہوا یا علاج سے صحت ہو گئی۔ صاحب روضۃ الشہدا کے موافق مروان بن حکم نے جو اس وقت مدینہ میں تھا جعدہ بنت اشعث کے پاس ایک رومی کنیز کے معرفت جس کا نام الیسونیہ تھا پیغام بھجوایا کہ اگر تو حسنؑ کو زہر دیدے تو تجھے نہ صرف اس قدر روپیہ ملے گا، بلکہ یزید بن معاویہ جو اس وقت ایسا صاحب اثر ہے تجھے اپنے عقد میں لے لے گا۔

بھائی کا آخری وقت اور حسینؑ

مشہور باپ اور ماں کی بیٹی پر فریب کارگر ہوا اور اس نے سودہ الماس پانی میں ملا دیا۔ امام نے شب کو یہ پانی پیا، اور حلق سے نیچے اترنا تھا کہ فرمایا: "آہ کیسا پانی تھا کہ حلق سے ناف تک ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا"۔ اس کے بعد حسینؑ کو طلب کیا، اور سینہ سے لگا لیا۔ حال کہا۔ حسینؑ اپنے لب اقدس تک جام آب لے گئے تھے کہ امام نے جلدی سے چھین لیا، اور زمین پر پھینک دیا۔ اس کے بعد درد شکم سے زمین پر لوٹنے لگے۔ آفتاب طلوع ہو رہا تھا کہ طشت جگر کے ٹکڑوں سے بھر گیا، اور رنگ میں سبزی آنے لگی۔ دوبارہ فاطمہؑ کے پارہ جگر ایک دوسرے سے لپٹے اور رخسار آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ حسینؑ نے اپنے برادر معظم سے پوچھا کہ: "آپ کو کس پر زہر دینے کا گمان ہے"۔ اس پر امام نے سوال کیا کہ: "کیا اسے قتل کرو گے؟"۔ اور جب اثبات میں جواب سنا تو بقول عام مؤرخین کے فرمایا کہ: "اگر وہی ہے جس پر میرا گمان ہے تو خدا کا غضب سب سے زیادہ سخت ہے۔ اور اگر وہ نہیں ہے تو مجھے پسند نہیں ہے کہ کوئی بے گناہ میرے لیے قتل ہو"۔

بقول روضۃ الشہدا اس کے بعد بنت اشعث کو خلوت میں طلب کر کے ملامت کی اور اس کے بعد منہ پھیر لیا۔ اور زمانہ رسولؐ کے بڑے نواسہ سے خالی ہو گیا۔

بقول اعثم کوفی: "ثقہ راویوں سے سنا گیا ہے کہ جس وقت معاویہ نے مصمم اِرادہ کر لیا کہ اپنے بیٹے کو اپنا ولیعہد مقرر کرے تو اس نے خیال کیا کہ اِمام حسنؑ کی زندگی میں یہ بات وقوع میں نہ آسکے گی۔ اس لیے اس نے ہمہ تن کوشش کی کہ اس مسند نشین اِمامت کو دُنیا سے رخصت کر دے"۔ اس کے بعد مروان کی کوشش اور جعدہ کو فریب دینے کی تفصیل ہے۔

طبری کہتا ہے : "چون حسنؑ علیہ السلام برفت معاویہ در تدبیر ہلاک او ایستاد تا او را بہ چہ روئے ہلاک کند تا مردان ندانند کہ او را ہلاک کردہ است"۔ یعنی : "جب حسنؑ گئے تو معاویہ ان کو اس طرح مار دینے کی تدبیر میں لگ گیا کہ لوگوں کو پتا نہ چلے کہ اس نے مار ڈالا ہے"۔ (حاشیہ پر غالباً مترجم نے اسے "مفتریاتِ شیعہ" کہہ کر تنقید تاریخ کا حق ادا کر دیا ہے اور یزید و مروان کو بل بکرا بنایا ہے)

دفن کے متعلق وصیت

حضرت نے بقول تاریخ خمیس وغیرہ یہ بھی وصیت فرمائی کہ : "میں نے عائشہ سے کہا تھا کہ اگر میں شہید ہو جاؤں تو خانہ رسولؐ میں دفن کرنا، اور اس نے اقرار کیا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ بات ہو بعد میرے۔ اگر وہ خوشی سے کہہ دے تو دفن کرنا۔ میں جانتا ہوں کہ لوگ تم سے مزاحمت کریں گے۔ اگر ایسا ہو تو بقیع میں دفن کر دینا"۔ بقول علامہ مجلسی فرمایا : "دیکھو میرے لیے ایک چلو خون نہ گرے"۔

دفن کے واقعات

حسینؑ مع بنی ہاشم کے جنازہ کو قبرِ رسولؐ پر لائے لیکن کہا گیا ہے کہ بنی امیہ نے ہتھیار بندی کی اور بقول روضۃ الصفا : قبل از دفن عائشہ ازیں معنی وقوف یافتہ بر استرے سوار شدہ بہ آن موضع رفت و بہ منع مشغول گشت۔ شیعہ امیرالمومنین علیؑ بنیاد غوغا کردہ گفتند اے عائشہ روزے بر شتر نشستہ محاربت کنی و روزے بر استر سوار شدہ بر سر جنازہ نبیرۂ پیغمبر منازعت آغاز نہی و تنگزاری کہ او را دفن کنند و چندان کہ سعی نمودند مفید نیفتاد چہ مردم بہ دو فرقہ متفرق شدند و بہ جانب یک دگر تیر انداختند چند تیر بہ جنازہ رسید"۔ یعنی : دفن سے پہلے حضرت عائشہ اس بات سے مطلع ہو کر ایک خچر پر سوار ہو کر اس جگہ گئیں اور روکنے میں مشغول ہو گئیں۔ امیرالمومنینؑ کے شیعوں نے شور مچا کر کہا اے عائشہ! کسی دن آپ اونٹ پر سوار ہو کر جنگ کرتی ہو، کسی دن خچر پر سوار ہو کر پیغمبر کے نواسے کے جنازہ پر جنازہ پر جھگڑا شروع کرتی ہو اور انھیں دفن ہونے نہیں دیتیں۔ جتنی کوشش کی گئی بے فائدہ رہی۔ کیونکہ لوگ دو حصہ میں بٹ گئے تھے اور ایک دوسرے کی طرف تیر چلاتے تھے، چند تیر جنازہ کو بھی لگے۔

بقول اعثم کوفی : "جب امام حسنؑ کی روح اقدس جوار رحمت الٰہی میں چلی گئی تو غسل اور کفن کے بعد آپ کا جنازہ اٹھایا گیا اور حضرت رسولؐ خدا کے روضہ مقدس کی طرف لے چلے تا کہ اپنے بھائی کو عالی مرتبہ نانا کے پہلو میں دفن کریں۔ سعید بن العاص مدینہ کے حاکم نے عائشہ کے پاس پہنچ کر اطلاع کی کہ جنازہ کو وہاں دفن نہ ہونے دے۔ ام المومنین عائشہ صدیقہ اونٹ پر سوار ہو کر اور کسی قدر عثمانی گروہ کے آدمی ہمراہ لے کر روکنے میں مشغول ہوئیں" ...... امام حسینؑ نے حسب وصیت اپنے مقدس بھائی کا لاشہ نانی (دادی) فاطمہؑ بنت اسد بن ہاشم کے پاس دفن کر دیا"۔

طبری کہتا ہے : "چون حسنؑ رضی اللہ عنہ بمرد چہل و شش سالہ بود پس او را گورے کنند ہم پہلوئے گور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و بر جنازہ اش نہادند کہ او را گور کنند حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آگاہ شد بیامد و بر استرے نشستہ و رہا نکردش کہ آن جاش در گور کنند۔ مردمان مدینہ بر عائشہ شوریدند کہ نیکو میکنی یک روز بر اشتر ہمی جنگ کنی و دیگر روز بر استر از بہر جنازہ منازعت ہمی کنی۔ و راہ نہ میدہی کہ نبیرہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم را بگور کنند و ہر چند کہ بگفتند عائشہ رضی اللہ عنہا رہا نہ کرد کہ او را بگور کنند و مردمان بدو گروہ شدند گروہی کہ شیعت عائشہ بودند تیر انداختن گرفتند تا جنازہ امیرالمومنین حسنؑ پر تیر گشت"۔ یعنی : جب حسنؑ نے وفات پائی آپ چھیالیس سال کی عمر کے تھے۔ آپؑ کی قبر پیغمبرؐ کے پہلو میں بنایا چاہی اور

آپؑ کو چارپائی پر رکھا گیا کہ دفن نہ کرنے دیا۔ مدینہ کے لوگوں نے عائشہ پر شور کیا کہ خوب کرتی ہو، ایک دن اونٹ پر لڑتی ہو اور دوسرے روز خچر پر چڑھ کر جنازہ کے لیے جھگڑتی ہو اور پیغمبرؐ کے نواسے کو دفن نہیں ہونے دیتی ہو۔ جتنا کچھ بھی کہا گیا عائشہ رضی اللہ عنہا نے نہ چھوڑا کہ انھیں دفن کریں۔ لوگوں کے دو گروہ ہو گئے۔ جو لوگ عائشہ کے طرفدار تھے تیر برسانے لگے، یہاں تک کہ حسنؑ کا جنازہ تیروں سے بھر گیا۔

بقول علامہ مجلسی مروان نے حضرت عائشہ سے کہا کہ: "اگر امام حسنؑ علیہ السلام رسولؐ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ دفن ہوئے تو تیرے باپ کا فخر اور اس کے ساتھ ہی عمر کا فخر بالکل روز قیامت تک محو ہو جائے گا"۔ اور اس کے بعد حضرت عائشہ نے اپنے کو قبر پر خچر سے گرا دیا، اور کہنے لگیں: "واللہ امام حسنؑ یہاں پر ہرگز دفن نہ کیے جائیں گے۔ یہاں تک کہ یہ تراش ڈالی جائیں"۔ اور اپنے ہاتھ سے اپنے بالوں کی طرف اشارہ کیا۔ پس بنی ہاشم نے لڑنے کا ارادہ کیا۔ پس امام حسینؑ علیہ السلام نے فرمایا کہ ڈرو خدا سے میرے بھائی کی وصیت کو ضائع نہ کرو اور ان کا جنازہ بقیع کی طرف پھیر لے چلو"۔

بقول تاریخ خمیس: بنی امیہ کی مسلح شورش دیکھ کر ابوہریرہ نے کہا کہ: "یہ ظلم ہے کہ ابن رسولؐ دفن نہ کیا جائے"۔ اور انھوں نے مقابلہ کا ارادہ دیکھ کر وصیت حسنؑ یاد دلائی۔

خبر علالت وشہادتؑ اور معاویہ

یہی مؤرخ ابن خلکان سے نقل کرتا ہے کہ جب امام علیل ہوئے تو مروان نے معاویہ کو اطلاع دی اور اس نے جواب بھیجا کہ مجھے برابر خبر بھیجتے رہنا۔ اور جب شہادت کی اطلاع ہوئی تو اس کے تکبیر کی صدا خضرا سے سنی گئی۔ اور یہ صدا سن کر اہل شام نے تکبیر کہی۔ اس پر فاختہ بنت قرظہ نے پوچھا: تیری آنکھ ٹھنڈی ہو کیوں تکبیر کہی؟۔ کہا: مر گیا حسن۔ کہا: کیا ابن فاطمہؑ کی موت پر؟ کہا: نہیں۔ نہ بلحاظ شماتت، بلکہ میرا دل ٹھنڈا ہو گیا"۔ اس وقت ابن عباس معاویہ کے پاس گئے اور اس نے کہا: جانتا ہے کہ تیرے اہل بیت میں کیا ہوا؟۔ جواب دیا نہیں لیکن تو خوش معلوم ہوتا ہے۔ کہا: "حسنؑ مر گئے"۔

اسی مؤرخ کے موافق خبر شہادت سن کر معاویہ نے کہا: "حسنؑ سے تعجب ہے کہ ایک گھونٹ شہد اور رومانی پیا، اور مر گئے"۔

اسی مؤرخ و نیز روضۃ الصفا کے موافق معاویہ کی شماتت پر ابن عباس نے جواب دیا کہ: "جو گڑھا تیرے لیے مقدر ہوا ہے وہ حسنؑ کی رحلت سے مسدود نہ ہو جائے گا"۔ اور یہ کہہ کر اٹھ گئے۔ علامہ مجلسی نے یہ واقعات ربیع الابرار زمخشری اور کتاب العقد ابن عبد ربہ سے نقل کیے ہیں۔

بقول اعثم کوفی: ایک دن عبداللہ بن عباس معاویہ کی محفل میں موجود تھا۔ معاویہ نے ملامت کی راہ سے کہا: "اے عباس تو نے سنا کہ حسنؑ بن علیؑ نے ملک پر مرگ کو ترجیح دی"۔

امیر شام عبداللہ بن جعفر یا ابن عباس کو بمقابلہ حسینؑ افسر بنی ہاشم بنانا چاہتا ہے

امیر شام اس کے قبل بقول علامہ جیسا احتجاج طبرسی سے نقل کیا ہے: عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب کو حسنین کی تعظیم پر طعنہ دے چکا تھا اور سخت جواب سنا تھا اور اب حضرت امام حسنؑ کی رحلت پر وہی چال ابن عباس پر آزمائی اور کہا کہ اب تو تم سردار قوم قریش ہو گے۔ جس پر ابن عباس نے کہا کہ ابوعبداللہ الحسینؑ علیہ السلام باقی ہیں۔

حسنؑ کا مرثیہ

فضل بن عباس نے حضرت امام حسنؑ کا جو مرثیہ کہا اس کا ترجمہ ہے کہ : " آج کے دن ابن ہند حسنؑ کی رحلت سے اظہار نخوت میں بے خوف ہو گیا۔ ان کے بعد معاویہ کو راحت ہوئی اور وہ جناب حوادثات زمانہ سے قبر میں مقیم ہوئے۔ اے ابن ہند تو بے خوف چراگاہ میں چر۔ حمار وحشی کا موٹا ہو جانا اس کے اچکنے کا سبب ہو جاتا ہے "۔

حسینؑ مرثیہ کہتے ہیں

اپنے بھائی کی لاش کو لحد میں رکھنے کے وقت حضرت امام حسینؑ نے جو مرثیہ فرمایا اس کے بعض اشعار کا ترجمہ یہ ہے : " کیا میں اپنے سر میں تیل ڈالوں یا میری مجلسیں غم سے خالی ہوں درآنحالیکہ سر مبارک آپ کا خاک آلودہ اور آپ کے جسم کا لباس اتارا ہوا ہو۔ دنیا کی کسی محبوب شے سے کیا فائدہ اٹھاؤں۔ مجھے وہ چیز محبوب ہے جو آپ سے قریب کرے۔ میں آپ پر برابر روتا رہوں گا جب تک کہ کبوتری گونجے اور جب تک صبا اور باد جنوب چلے۔ جب تک میری آنکھ سے ایک قطرہ اشک نکلے اور جب تک کہ حجاز کے بڑے بڑے درختوں میں کوئی ڈالی سرسبز ہو۔ لٹا ہوا وہ شخص نہیں ہے جس کا مال لوٹ لیا جائے، بلکہ وہ ہے جو اپنے بھائی کو زیر خاک کرے "۔

علیؑ کے دوست اور معاویہ

مجھے بالتفصیل یہ کہنا نہیں ہے کہ معاویہ نے علیؑ کے دوستوں کو ذمہ سے بری کرنے کا اعلان کیا، اور وہ تہمت گمان اور شبہ پر قتل کیے گئے۔ ہاتھ پاؤں کاٹے اور آنکھیں نکلوائی گئیں نہ مجھے اس پر کسی بسط کی ضرورت ہے کہ معاویہ نے کس طرح فضائل علیؑ کو رد کا اور اس کے مقابل کون سے لوگوں کے لیے حدیثیں گھڑوائیں، اور آخر میں یہ نتیجہ ہوا کہ دوستان علیؑ کا قتل کرنا اور کرانا حصول تقرب کا ذریعہ بن گیا یا حدیث سازی کا محکمہ بڑی شد و مد سے جاری رہا۔ اور کچھ دنوں کے بعد یہ نوبت پہنچی کہ ایک مردود بقول ابن ابی الحدید حجاج سے یہ کہہ سکتا کہ : " ہم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس سے ابوتراب پر سب وشتم کرنے کو کہا جائے اور وہ ان کے ساتھ ان کے فرزند حسنؑ و حسینؑ اور ان کی ماں فاطمہؑ زہرا کو ناسزا نہ کرے "۔ میں نہایت مخصوص لوگوں اور حالتوں کے تذکرہ پر قناعت کروں گا۔

۴۱ھ عدی بن حاتم

ابن خلدون اگرچہ اس قصہ کا کوئی زمانہ نہیں لکھتا لیکن قیاس آسان ہے کہ وہ عام الجماعۃ کے قریب کا ہو کہ : " ایک روز عدی بن حاتم امیر معاویہ کی صحبت میں بیٹھے ہوئے تھے امیر معاویہ نے از راہ مذاق امیر المومنین علیؑ کی مصاحبت کی چٹکی لی (ہم " مصاحبت کی چٹکی لی " کا ٹھیٹ عربی فقرہ دیکھنا چاہتے ہیں) عدی نے ترش رو ہو کر کہا : واللہ وہ قلوب جن سے ہم نے تم سے عداوت کی تھی ہمارے سینوں میں ہیں اور بے شک وہ تلواریں جن سے ہم تم سے لڑے تھے ہمارے قبضہ میں ہیں، اگر تم ایک بالشت بھی بدعہدی سے ہماری طرف بڑھو گے تو ہم برائی سے تمہاری طرف پانچ ہاتھ بڑھیں گے۔ بلاشبہ موت کا غرغرہ اور حالت نزع کا گھرہ ہمارے لیے آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ ہم علیؑ بن ابی طالب کے حق میں کوئی کلمہ ناملائم سنیں۔ اے معاویہ تلوار کی بو سے تلوار اٹھائی جاتی ہے۔ معاویہ نے یہ سن کر حاضرین سے خطاب کر کے کہا : یہ باتیں نہایت ٹھیک ہیں۔ ان کو لکھ لو۔ پھر عدی کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت نرمی و ملاطفت سے گفتگو کرتے رہے "۔

۵۰ھ لیکن ۵۰ھ کے قریب جب کہ زیاد بن ابیہ بصرہ اور کوفہ کا حاکم تھا اس نے "عدی بن حاتم کو (جو مسجد میں تھے) گرفتار کرلیا اور یہ دباؤ ڈالا کہ عبداللہ بن خلیفہ (رفیق حجر بن عدی) کو حاضر کرو، یا اس کا پتا بتلاؤ۔ عدی بن حاتم نے جواب دیا: کیا میں اپنے چچا کے لڑکے کو حاضر کردوں کہ تو اسے قتل کرڈالے۔ واللہ اگر وہ میرے قدموں کے نیچے ہوتا تو میں ان کو ہرگز نہ اٹھاتا۔ زیاد نے جھلا کر ان کو بھی قید کردیا۔ لوگوں کو اس سے ناراضی پیدا ہوئی۔ آپس میں صلاح مشورہ کرکے زیاد کے پاس پہنچے اور اس سے کہا کہ بڑے غضب کی بات ہے کہ تو یہ فعل اصحاب رسولؐ صلی اللہ علیہ وسلم اور سردار طے کے ساتھ کرتا ہے۔ زیاد نے بنظر اشتعال طبع عوام یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ اچھا میں عدی کو چھوڑے دیتا ہوں۔ لیکن اس شرط پر کہ یہ اپنے چچازاد بھائی کو کوفہ سے نکال دے"۔

عمرو بن عاص اور مُغیرہ بن شعبہ کی سیاسی جنگ

معاویہ نے حصول اختیار کے بعد عبداللہ بن عمرو بن عاص کو کوفہ کی حکومت دی۔ یہ دیکھ کر مُغیرہ بن شعبہ نے کہا: مصر میں ابن عاص اور کوفہ میں اس کا لڑکا ہے۔ "گویا اب شیر کے دو دانتوں کے درمیان میں ہیں"۔ امیر معاویہ نے عبداللہ کو معزول کرکے بجائے ان کے مُغیرہ کو مقرر کیا۔ اس کی خبر عمرو بن عاص کو پہنچی تو انھوں نے امیر معاویہ سے عرض کیا تم نے ایسے شخص کو کوفہ کا حاکم بنایا ہے جو مال کو ہڑپ کرجائے گا۔ اور تم اس سے کچھ وصول نہ کرسکو گے۔ مناسب یہ ہے کہ ایسے شخص کو تم اس کے ساتھ مامور کرو جس سے یہ ڈرے۔ چنانچہ امیر معاویہ نے مُغیرہ کو نماز پڑھانے پر متعین کیا"۔

زیاد زیاد کو جس کو اس کی مجہول النسبی کی وجہ سے "ابن ابیہ" یا "ابن سمیہ" (زیاد کی ماں کا نام) کہتے تھے۔ عبداللہ بن عباس نے فارس کا گورنر مقرر کیا تھا۔ اس نے برابر عمدہ انتظام کیا۔ اور اسی زمانہ میں اس کی انتظامی قابلیت دیکھ کر معاویہ نے اسے اپنی طرف ملانا چاہا۔ اور زیاد کو جو خط لکھا اس میں ظاہر کیا کہ تو ابوسُفیان کے نطفہ سے ہے۔ (ابن خلدون نے ابن اثیر اور عقد الفرید سے لکھا ہے کہ سمیہ کسی ایرانی دہقان کی کنیز تھی جو حرث بن کندہ طبیب کو دی گئی اور کیونکر سمیہ کی آوارگی کی خبر سن کر اس نے اپنے غلام عُبید کو دیدیا۔ اور پھر کیونکر ابوسُفیان ایک خمار کے پاس پہنچا۔ اور سمیہ سے تعلق ہوا۔ جن صورتوں کے بعد تصفیہ آسان نہیں ہے کہ یہ کس کے نطفہ سے تھا) زیاد نے خط پڑھ کر لوگوں کو جمع کرکے خطبہ دیا۔ جس میں امیر معاویہ کی دھمکی سے تعجب ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ معاویہ مجھے ڈرانا چاہتا ہے۔ حالانکہ میرے اور اس کے درمیان میں ابن عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مع مہاجرین و انصار کے ہیں۔ امیرالمومنین علیؑ بن ابی طالبؑ کو جب اس سے آگاہی ہوئی تو لکھ بھیجا کہ میں نے تم کو والی مقرر کیا ہے اور میرے نزدیک تم اس کے سزاوار ہو اور ابوسُفیان میں خباثت نفس اور ایک جہالت تھی جس کی میراث تم کو نہ ملنا چاہیے اور نہ تمہارا نسب اس سے ملحق ہونا مناسب ہے۔ اور معاویہ انسان کے آگے پیچھے دائیں بائیں سے آتا ہے۔ پس اس سے احتراز کرو۔ پھر احتراز کرو"۔ (ابن خلدون)

عُبیداللہ بن زیاد کیونکر قتل سے بچا

امیرالمومنین کی شہادت کے بعد معاویہ نے کبھی زیاد کو بیت المال بھیجنے، کبھی حساب فہمی کے لیے اور کبھی یونہی طلب کیا۔ لیکن زیاد برابر انکار کرتا رہا۔ یہاں تک کہ بشر بن ارطاۃ نے بصرہ میں اس کی اولاد پر قبضہ کرلیا۔ جن میں عبدالرحمٰن،

عباد اللہ اور عُبید اللہ کا نام ہے۔ اور سبوں کے قتل کا قصد کیا۔ ابوبکرہ زیاد کے مادری بھائی نے (جس کے بشر بن ارطاۃ کے ساتھ سبِ علیؑ کے معاملہ کو ہم لکھ چکے) بشر سے کہا: "تو نے ان کو بغیر کسی جرم کے گرفتار کرلیا ہے حالانکہ امام حسنؑ بن علیؑ نے معاویہ سے مع ہمراہیان علیؑ کے جس حیثیت سے تھے صلح کرلیا ہے۔ تجھ کو نہ ان کے اور نہ ان کے باپ کے گرفتار کرنے کا کوئی حق حاصل ہے"۔ بشر نے مہلت دی۔ ابوبکرہ معاویہ کے پاس گئے۔ رہائی کا پروانہ لیا، اور قتل میں ایک گھنٹہ باقی تھا کہ ابوبکرہ پہنچے اور رہا کرا لیا۔ میں نہیں جانتا کہ ابوبکرہ کیا کرتے۔ اگر انھیں معلوم ہوتا کہ جس عُبید اللہ کو انھوں نے امیر المومنین کا دوست سمجھ کر صلح حسنؑ کے ایک دفعہ سے رہا کرایا وہ کچھ دن کے بعد کیا کرنے والا تھا۔

زیاد نے کچھ مال عبد الرحمٰن ابوبکرہ کے پاس امانتاً رکھا تھا، اور انھوں نے اسے بصرہ کے قریب رکھا۔ معاویہ کو خبر ملی اور اس نے مُغیرہ بن شعبہ کو قبضہ کرنے کے لیے لکھا۔ مُغیرہ نے عبد الرحمٰن سے کہا: اگرچہ تمھارے باپ نے میرے ساتھ برائی کی تھی لیکن تمھارے چچا نے میرے ساتھ سلوک کیا ہے۔ یہ کہہ کر عبد الرحمٰن کو لوٹا دیا، اور امیر معاویہ کے پاس ایک خط معذرت کا لکھ بھیجا۔ بعد اس کے خود حاضر ہوکر سمجھانے اور معذرت کرنے لگے۔ امیر معاویہ نے کہا جب سے فارس میں زیاد نے قیام کیا ہے اور میری طلبی پر نہیں آیا ہے اس وقت سے شب کو مجھے نیند نہیں آتی۔ مُغیرہ نے عرض کیا: زیاد کی حقیقت کیا ہے؟۔ امیر معاویہ بولے: "یہ نہ کہو وہ عرب کا ایک بڑا شخص ہے۔ اس کے پاس فارس کا مال ہے۔ حیلہ سازی اور چال بازی میں اس کو بڑی مہارت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اہلِ بیت میں سے کسی شخص کی وہ بیعت کرلے اور لڑائی پھر از سرِ نو چھڑ جائے"۔

مُغیرہ نے زیاد کے لانے کا وعدہ کیا۔ زیاد کے پاس گیا، اور کہا: "تم کو معلوم ہے کہ حسنؑ بن علیؑ نے ان کی بیعت کرلی ہے۔ حالانکہ یہی ایک شخص ایسے تھے کہ جو امیر معاویہ کی مخالفت کرسکتے تھے۔ پس میرے نزدیک تم اپنی فکر کرلو اس سے پیشتر کہ معاویہ کو تمھاری پرواہ نہ باقی رہ جائے"۔ زیاد بولا: "تم کچھ مجھے رائے دو"۔ مُغیرہ نے جواب دیا: "میرے نزدیک تم امیر معاویہ کے پاس چلے چلو، اور مناسب یہ ہے کہ تم اپنے کو ان کی ذات سے وابستہ کرکے واپس آجاؤ"۔ زیاد نے اس کو قبول کرلیا۔ معاویہ کے پاس گیا۔ ایک لاکھ درہم پر مصالحت کرلی اور اجازت حاصل کرکے کوفہ میں آٹھہرا۔ مُغیرہ بن شعبہ زیاد کی کمال عزت و احترام کرتا تھا۔ پھر امیر معاویہ نے مُغیرہ کو لکھ بھیجا کہ: "زیاد، حجر بن عدی، سلیمان بن صرد، شبث بن ربعی، ابن الکواء، ابن الحمق کو بالالتزام نماز جماعت میں شریک کیا کرو"۔

علیؑ کے دوست اور زیاد

۴۵ھ میں زیاد بصرہ کا گورنر مقرر ہوا۔ اور ۵۰ھ کے قریب کوفہ بھی اس کے عمل میں شامل کیا گیا، اور اس نے قاعدہ مقرر کیا کہ چھ مہینہ بصرہ اور چھ مہینہ کوفہ میں رہتا تھا۔ اعثم کوفی کے موافق کوفہ میں: "دوستانِ علیؑ کو گرفتار کرتا تھا، قتل کرتا تھا، ہاتھ پاؤں کٹوا تا تھا اور آنکھیں نکلوا لیتا تھا"۔ بقول ابن خلدون اوفی بن حصن کی گرفتاری اور قتل کے بعد عمارہ بن عقبہ بن ابی معیط نے عمرو بن الحمق کی چغلی کی کہ اس کے پاس شیعیان علیؑ کا مجمع ہوتا ہے۔ زیاد نے عمرو بن الحمق کو اس مجمع کرنے سے منع کردیا۔

بصرہ میں آٹھ ہزار کا قتل

اور سمرہ بن جندب جس کو بصرہ میں اس نے اپنا نائب بنایا تھا اس کی غیر حاضری میں خونریزی پر کمر بستہ ہوگیا۔ بے شمار عورتوں کو بیوہ اور بے حد لڑکوں کو یتیم کردیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آٹھ ہزار آدمی اس کے ظلم کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارے گئے۔

حجر بن عدی

اسی مؤرخ کے موافق: "مغیرہ بن شعبہ نے یہ عادت اختیار کر لی تھی کہ اپنے زمانہ گورنری میں اکثر مجالس اور خطبوں میں امیرالمومنین علیؑ پر تعریضیں کرتا تھا، اور امیرالمومنین عثمان کی تعریف۔ حجر بن عدی کو یہ امر شاق گزرتا تھا۔ بسا اوقات کھڑے ہو کر کہہ اٹھتے تھے: خدا تم سے سمجھے تمہاری ہی ذات سے یہ سب کچھ ہوا۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ جس کی تم مذمت کر رہے ہو وہ فضیلت کا مستحق ہے اور جس کی تم بڑائیاں بیان کرتے ہو وہ مذمت کا مستحق ہے۔۔۔۔ اتفاق سے مغیرہ اپنے آخر زمانہ حکومت میں حسب عادت قدیم منبر پر کھڑے ہوئے وہی کلمات کہہ رہے تھے حجر نے ایسا ڈانٹ کر کہا کہ کل مسجد والوں نے سنا۔ اے شخص ہمارے روزینہ دیدے تو نے اس کو کیوں روک رکھا ہے۔ اس سے تجھ کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تو نے امیرالمومنین کی سختی سے مذمت کرتے ہوئے صبح کی۔۔۔ الغرض مغیرہ بعد چندے مر گئے اور زیاد بجائے ان کے گورنر مقرر ہو کر کوفہ میں آیا۔ اثنائے خطبہ میں امیرالمومنین عثمان کی تعریف بیان کی اور ان کے قاتلین پر طعن کیا۔ حجر نے حسب عادت قدیم جو کہتے تھے کہا۔ زیاد خاموش ہو گیا، اور بجائے اپنے عمر بن حریث کو مقرر کر کے بصرہ واپس آیا۔ بعد چندے یہ خبر پہنچی کہ حجر کے پاس شیعیان علیؑ کا مجمع ہوتا ہے اور وہ لوگ امیر معاویہ پر لعن کرتے ہیں اور نیز ان لوگوں نے عمر بن حریث کو کنکریاں ماری تھیں۔ زیاد یہ سنتے ہی کوفہ کو روانہ ہوا۔ مسجد میں خطبہ دیا۔ حجر بھی موجود تھے۔ زیاد نے نہایت سختی سے ان کو مخاطب کر کے کہا: لست بشیئ ان لم امنع الکوفۃ من حجر و ادعہ نکالا لمن بعدہ۔ بعد اس کے حجر کو بلا بھیجا۔ حجر نے آنے سے انکار کر دیا۔ تب زیاد نے شداد بن الہیثم ہلالی صاحب شرطہ کو چند لوگوں کے ہمراہ حجر کے لانے کو بھیجا۔ حجر اور ان کے ہم نشینوں نے ان کو گالیاں دیں۔ زیاد نے اہل کوفہ کو ایک جا کر کے دھمکایا ڈرایا۔ لوگوں نے حجر سے علیحدگی و برات ظاہر کی۔ زیاد نے کہا یوں نہیں تم لوگوں کے جو اعزہ و اقربا حجر کے پاس ہوں ان کو تم لوگ بلا لو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ حجر کے پاس سوائے اس کی قوم کے اور کوئی نہ رہ گیا۔ اس وقت زیاد نے شداد بن الہیثم کو حکم دیا کہ حجر کے پاس جاؤ اور اس کو طوعاً و کرہاً جس طرح ممکن ہو حاضر لاؤ۔ شداد گیا، حجر نے چلنے سے انکار کیا۔ بحث بڑھی۔ حجر نے بڑھ کر اس پر حملہ کر دیا۔ ابوالعمر کندی نے حجر سے کہا: تمہاری حمایت کو سوائے میری تلوار کے اور کوئی نہیں ہے اور میری تلوار تم کو ان لوگوں سے نہ بچا سکے گی۔ بہتر یہ ہے کہ تم کندہ میں جا کر پناہ گزین ہو جاؤ۔ اس وقت عمرو بن الحمق زخمی ہوئے اور سنبھل کر ازد میں پناہ لی اور حجر مع ابوالعمر کے سوار ہو کر کندہ آئے۔ زیاد نے مذحج و ہمدان کے قبیلوں کو ان کی گرفتاری کے لیے بھیجا، اور یہ ازد ربیعہ وغیرہ قبائل میں پناہ لیتے رہے۔

محمد بن اشعث بن قیس کندی حجر کو زیاد کے پاس لایا

اور آخر میں محمد بن اشعث کے ذریعہ سے یہ طے پایا کہ زیاد حجر کو معاویہ کے پاس بھیج دے۔ اور جب حجر آئے تو زیاد نے اس کو قید کر کے اس کے ہمراہیوں کی جستجو شروع کر دی۔ عمرو بن الحمق مع رفاعہ بن شداد کے ساحل کی طرف بھاگ گیا، اور ایک پہاڑ میں جا کر چھپ رہا، ان دونوں کا مقدمہ عامل موصل عبدالرحمٰن بن عثمان ثقفی ہمشیرہ زادہ امیر معاویہ معروف بہ ابن ام الحکم کے پاس بھیج دیا گیا۔

عمرو بن الحمق

عبدالرحمٰن ان کی تلاش میں نکلا۔ رفاعہ تو ہاتھ نہ آیا لیکن عمرو بن الحمق کو گرفتار کر کے امیر معاویہ کی خدمت میں ایک اطلاعی عرضداشت بھیجی۔ امیر معاویہ نے کہا کہ چونکہ اس نے امیرالمومنین عثمان کو

سات نیزے مارے تھے پس اس کے بھی اسی قدر نیزے مارے جائیں۔ غرض اول یا دوسرے ہی میں عمرو بن الحمق مر گیا۔

عمرو بن الحمق کا سر اور ان کی بی بی

بعض کے موافق عمرو بن الحمق جس غار میں چھپے تھے اس میں انھیں سانپ نے کاٹا، اور جب سوار انھیں باہر کھینچنا چاہتے تھے تو گوشت کا ٹکڑا ہاتھ میں آجاتا تھا۔ ان کا بند بند جدا کیا گیا، اور سر ان کی بیوہ کے پاس بھیج دیا گیا۔ سر دیکھ کر بیگم نے معاویہ کو پیغام بھجوایا کہ: "تو نے اسے قتل کیا جو نہ کسی کا دشمن تھا نہ جس سے کسی کو دشمنی تھی وہ بہت دن تک تیرے خوف سے پوشیدہ رہا۔ تو نے ایک پرہیزگار کا مارا اور اس کا سر میرے پاس ہدیہ بھیجا"۔

معاویہ اور عمرو بن الحمق کی بی بی

معاویہ نے انھیں بلوایا، اور پوچھا: "تو نے یہ پیغام بھیجا تھا؟"۔ جواب دیا: "ہاں ہم نے۔ نہ ہم انکار کریں گے اور نہ کوئی عذر کرنا چاہتے ہیں۔ معاویہ نے کہا: "ہمارے ملک سے چلی جا"۔ بیگم نے کہا: "اچھا۔ قسم خدا کی جلاوطن ہوتی ہوں اور اب اسے اپنا وطن نہ بناؤں گی اور نہ وہاں بات کروں گی۔ کیونکہ میری بے خوابی کو طول ہو گیا۔ میری عزت معرض خطر میں ہے۔ میرا قرض زیادہ ہو گیا۔ بلا اس کے کہ کبھی خوشی کا منھ دیکھوں"۔ یہ سن کر ابن ابی سرح نے کہا: "اس منافقہ کو اس کے شوہر کے پاس بھیج دو"۔ ضعیفہ نے اس کی طرف دیکھا، اور جواب دیا: "وہ منافق ہے جو جھوٹ بولتا ہے اور بندگانِ خدا کو اذیت دیتا ہے، اور اس کا کفر کتاب خدا میں مذکور ہے"۔ اس کے بعد ضعیفہ دربار سے نکلوا دی گئی۔ (ناسخ التواریخ)

اور شہداء

پھر زیاد نے ہمراہیانِ حجر کی جستجو کمال سرگرمی سے شروع کر دی۔ چنانچہ قبیصہ بن ضبعہ عبسی کو امن حاصل کر کے حاضر کیا۔ زیاد نے اس کو بھی قید کر دیا، اور قیس بن عباد الشیبانی اپنے قوم کے ایک شخص کے ہمراہ آیا۔ زیاد نے اس سے امیرالمومنین علیؑ کی بابت دریافت کیا۔ قیس نے تعریف و توصیف کی۔ زیاد نے اس کو مار کر قید کر لیا۔۔۔۔ پھر حجر کے ہمراہیوں میں سے کریم بن عفیف خشعمی پیش کیے گئے۔

(ابن خلدون)

حجر کے خلاف مقدمہ تیار کرایا جا رہا ہے

قصہ مختصر جب زیاد نے رفتہ رفتہ حجر کے ہمراہیوں میں سے بارہ آدمیوں کو قید کر لیا تو سرداران ارباع عمر بن حریث، خالد بن عرفطہ، قیس بن ابو ولید، ابوبردہ بن ابو موسیٰ کو بلایا، اور ہمراہیان حجر و خود حجر کا مقدمہ پیش کیا۔ ان لوگوں نے شہادت دی کہ حجر نے لشکر مجتمع کیا، اور امیرالمومنین معاویہ کو گالیاں دیں اور لوگوں کو ان کے خلاف جنگ کرنے پر ابھارا، اور یہ زعم کیا کہ خلافت آلِ ابی طالب میں ہونی چاہیے اور نیز شہر میں بلوہ کیا، اور امیرالمومنین کے عامل کا نکال دیا، اور علی بن ابی طالب کی ہواخواہی اور محبت ظاہر کرتے ہوئے ان کے مخالفین سے استبرا کیا اور یہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں اس کے لشکر کے سردار اور اس کے مشیر ہیں۔ زیاد نے ان شہادتوں کے لینے کے بعد اور شہادتیں طلب کیں۔ چنانچہ اسحٰق و موسیٰ پسران طلحہ بن عبداللہ، منذر بن الزبیر، عمارہ بن عقبہ بن ابی معیط، عمرو بن سعد بن ابی وقاص وغیرہم نے شہادتیں دیں۔ انھیں شہادتوں میں شریح بن الحرث و شریح بن ہانی کے نام بھی تھے۔ زیاد نے ایک عرضداشت میں ان گواہوں کے نام لکھے

اور وائل بن حجر الحضرمی و کثیر بن شہاب کو ملا کر حجر اور اس کے ہمراہیوں کو مع عرضداشت امیر معاویہ کی خدمت میں لے جانے کے لیے سپرد کیا۔

رفقائے حجر کے نام

حجر بن عدی کے ہمراہیوں کے نام تھے : ① ارقم بن عبداللہ کندی، ② شریک بن شداد حضرمی، ③ صیفی بن فضل شیبانی، ④ قبیصہ بن ضبعہ عبسی، ⑤ کریم بن عفیف خشعی، ⑥ عاصم بن عوف البجلی، ⑦ ورقا بن سمی البجلی، ⑧ کرام بن حیان العنبری، ⑨ عبدالرحمٰن بن حسان العنبری، ⑩ محرز بن شہاب التمیمی، ⑪ عبداللہ بن حویۃ السعدی۔ پھر زیاد نے ان گیارہ آدمیوں کے بعد سعد بن بکر سے عُتبہ بن الاخنس اور سعد بن عوات ہمدانی کو گرفتار کر کے امیر معاویہ کے پاس روانہ کیا۔

شریح بن ہانی گواہوں کی مرتبہ فہرست کی حقیقت کھولتے ہیں

تھوڑی مسافت طے کی ہوگی کہ شریح بن ہانی آپہنچے اور ایک بند لفافہ میں امیر معاویہ کے نام کا خط وائل بن حجر کو دے کر واپس آئے۔ جس وقت یہ لوگ مرج عذرا (قریب دمشق) پہنچے وائل و کثیر نے آگے بڑھ کر امیر معاویہ سے ملاقات کی۔ واقعات بتلائے اور شریح کا خط دیا۔ امیر معاویہ نے کھولا۔ لکھا ہوا تھا کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ زیاد نے میری شہادت حجر کے مقدمہ میں لکھ دی ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ حجر ان لوگوں میں سے ہے جو نماز پڑھتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، عمرہ و حج ہمیشہ کرتے ہیں، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے ہیں اور خون حرام و مال حرام سے اِحتراز کرتے ہیں۔ پس اگر آپ چاہیں تو ان کو قتل کر ڈالیں اور اگر مناسب سمجھیں تو رہا کر دیں۔۔۔۔ بعد اس کے امیر معاویہ نے ہدبہ بن فیاض قضاعی، حسین بن عبداللہ کلابی، ابوشریف بدری کو حجر اور اس کے ہمراہیوں کے قتل پر مامور کیا۔

علیؑ سے بیزاری قتل سے رہائی کی قیمت قرار دی جاتی ہے

پس یہ لوگ حجر کے پاس شام کے وقت آئے اور کہا تم لوگ اگر علیؑ سے بیزاری ظاہر کرو اور ان کو طعن و تشنیع سے یاد کرو تو ہم تم کو رہا کر دیں گے ورنہ قتل کر ڈالیں گے۔

حجر کا شجاعانہ ہوش

حجر اور ان کے ہمراہیوں نے اس سے انکار کیا۔ تمام رات نمازیں پڑھتے، مغفرت کی دعائیں مانگتے رہے۔ صبح ہوتے ہی فیاض وغیرہ قتل کے لیے آگے بڑھے۔ حجر نے وضو کیا، نماز پڑھی، پھر ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا : واللہ میں نے اس سے زیادہ چھوٹی نماز کوئی نہیں پڑھی۔ اگر مجھے یہ شبہ نہ ہوتا کہ تم لوگ یہ سمجھو گے کہ میں موت سے ڈر رہا ہوں تو میں دیر تک نماز پڑھتا رہتا۔۔۔۔ فیاض نے لپک کر حجر پر تلوار چلائی اور اس کے ہمراہیوں نے اوروں پر وار کیا۔ حجر کے ساتھ جو اس واقعہ میں راہی ملک بقا ہوئے ان کے نام یہ تھے :

شہدا

شریک بن شداد، صفی بن فضیل، قبیصہ بن ضبیعہ، محرز بن شہاب، کرام بن حیان۔ قتل کرنے کے بعد فیاض نے ان لوگوں کو دفن کر دیا۔ اور عبدالرحمٰن بن حسان عنبری اور کریم بن عفیف خشعی کو امیر معاویہ کے پاس لائے۔ پہلے کریم پیش کیے گئے۔ ان سے کہا گیا کہ تم امیرالمومنین علیؑ سے استبراء کرو۔ کریم نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ سمرہ بن عبداللہ خشعی نے کھڑے ہو کر ان کی سفارش کی۔ امیر معاویہ نے اس شرط پر منظور کر لیا کہ آئندہ یہ کوفہ نہ جائیں۔ غرض کریم رہا ہو کر موصل میں مقیم ہوئے۔ باقی رہے عبدالرحمٰن بن حسان، ان سے دریافت کیا

گیا: تم علیؑ کے بابت کیا کہتے ہو۔ جواب دیا میں ان کو بہت اچھا اور نہایت افضل سمجھتا ہوں۔ پھر استفسار کیا: عثمان کیسے تھے؟۔ جواب دیا: سب کے پہلے جس نے ظلم کا دروازہ کھولا اور حق کا دروازہ بند کیا وہ یہی تھے۔ امیر معاویہ نے اس کو زیاد کے پاس لوٹا دیا، اور یہ کہلا بھیجا کہ اس کو نہایت اذیت سے قتل کرنا۔ پس زیاد نے اس کو زندہ دفن کر دیا"۔

حجر کیوں شہید کیے گئے

مالک بن ہبیرہ سکونی نے حجر کی سفارش کی تھی لیکن امیر معاویہ نے جواب دیا: "وہ سردار ہے۔ اگر میں اس کو چھوڑ دوں گا تو آئندہ خوف فساد کا ہے"۔

عبدالرحمٰن بن حرث نے جنھیں حضرت عائشہ نے حجر کی گرفتاری کی خبر سن کر سفارش کے لیے بھیجا تھا، اور بعد قتل حجر پہنچے، معاویہ سے کہا: کیوں معاویہ! حجر کے قتل کے وقت ابوسفیان کا حلم کہاں غائب ہو گیا تھا۔ امیر معاویہ نے جواب دیا: "جہاں تم جیسے قوم کے حلیم غائب ہو گئے تھے۔ اور مجھ کو تو اس امر پر ابن سمیہ نے آمادہ کیا تھا۔ اس وجہ سے میں حجر کے قتل پر تل گیا"۔

شہادتِ حجر کے متعلق ایک سچا قول

ربیع بن حرث جو ولایت خراسان کے عامل تھے حجر کی شہادت کی خبر سن کر کہنے لگے: "عرب ہمیشہ حجر کے بعد سے یوں ہی قتل کیا جائے گا اگر وہ لوگ حجر کے قتل سے رک جاتے تو اپنے کو اس قتل عام سے بچا لیتے لیکن انھوں نے ایسا نہ کیا، اور ذلیل ہو گئے"۔

شہادتِ حجر اور اہلِ کوفہ

صاحب روضۃ الصفا کہتا ہے: "جس وقت اہل کوفہ نے سنا کہ حجر اور ان کے رفقا مارے گئے تو بہت ہی مضطرب ہوئے اور ان کے اکثر مشاہیر

مروان کی اِطلاع

مدینہ میں حاضر ہوئے اور حسینؑ کی مجالست اختیار کی۔ والی مدینہ نے یہ خبر پا کر معاویہ کو اطلاع دی کہ "کچھ اہل عراق مدینہ میں آئے ہیں اور حسینؑ کے پاس جایا کرتے ہیں۔ مجھے ان لوگوں کے فتنہ کا اندیشہ ہے"۔ معاویہ نے اس کا جواب دیا کہ: "حسینؑ سے کوئی تعرض نہ کرو کہ انھوں نے ہم سے بیعت کی ہے۔ اور ظن غالب ہے کہ وہ نقضِ عہد نہ کریں گے"۔ اس کے بعد حسینؑ کو بھی خط لکھا کہ: "تمھارے متعلق مجھے کچھ خبر ملی ہے کہ جو آپ کے لائق حال نہیں ہے۔ جس نے کسی سے بیعت کی اسے مناسب ہے کہ وفا کرے۔ ہمیں امید ہے کہ جب تک ہماری جانب سے تمھیں کوئی برائی نہ پہنچے مجھے بھی تمھاری طرف سے کوئی مکروہ امر واقع نہ ہو۔ مناسب یہ ہے کہ ان سفہا کے کہنے پر عمل نہ کرو جو طالبِ فتنہ ہیں"۔

حسینؑ کا جواب

حسینؑ نے جواب دیا کہ: "میں کسی طرح تیری مخالفت اور جنگ کی رغبت نہیں رکھتا تو مطمئن رہ"۔

مروان، معاویہ اور حسینؑ

اسی مؤرخ کے موافق: حجر کے خلاف گواہی دینے والوں میں ابوموسیٰ، اور ابوہریرہ کے نام بھی ہیں۔ دنیز یہ کہ زیاد نے محمد بن اشعث کی معرفت حجر کو بلوایا۔ حجر اور ابن اشعث میں قرابت تھی لیکن اِن دِنوں گفتگو قطع تھی۔ ناسخ التواریخ کو کچھ اور کہنا ہے کہ: معاویہ نے ابن حکم کو مخصوص ہدایت کی کہ: "جب تک حسینؑ سلطنت سے متعرض نہ ہوں گے ہم ان سے متعرض

نہ ہوں گے۔ اور جب تک ان سے خطرہ ہو اپنے راز ان پر ظاہر نہ کر"۔ حسینؑ کو لکھا کہ: "اگر تم مجھ سے انکار کرو گے تو میں بھی انکار کروں گا، اور نزدیکی اختیار کرو گے تو میں قربت چاہوں گا۔ اس سے پرہیز کرو کہ شق امت یا فتنہ کے باعث ہو۔ تم نے لوگوں کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور امتحان کر لیا ہے۔ اپنی جگہ قائم رہو"۔ حسینؑ نے جواب لکھا: "خط پہنچا۔ لکھا تھا کہ میں نے تیری مخالفت میں کچھ کیا ہے۔ جس کے علاوہ تجھے امید تھی ---- یہ خوشامدی اور جھوٹے لوگوں نے افترا کیا ہے۔ میں نہ تیری مخالفت پر آمادہ ہوں اور نہ جنگ کا قصد رکھتا ہوں ---- آیا تو وہ شخص نہیں ہے جس نے حجر کندی کو قتل کیا۔ جو نماز گزار اور پرہیزگار تھا، اور جو ظلم و بدعت کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اور جسے دین میں کسی کے سرزنش کی پرواہ نہ تھی۔ تو نے اسے ظلم سے تباہ کیا۔ بعد اس کے کہ قسموں سے عہد کو پختہ کیا تھا، اور بغیر اس کے کہ اس نے تیرے ملک میں کوئی فتنہ برپا کیا ہو۔ کیا تو وہ نہیں ہے کہ جس نے عمرو بن الحمق کو جو بڑا عابد اور پرہیزگار تھا، خط امان دینے کے بعد قتل کیا ---- آیا تو وہ نہیں ہے کہ زیاد ابن سمیہ کو جو ایک عبد ثقیف تھا بھائی کہا۔ اگرچہ حکم رسولؐ اس کے خلاف تھا۔ تو نے اپنی مصلحت کے لحاظ سے سنت رسولؐ کو دور پھینک دیا، اور اسے عراقین پر بھیجا۔ اس نے مسلمانوں کے پاؤں کاٹے اور درختوں میں لٹکایا۔ گویا تو اس امت سے نہ تھا۔ آیا تو وہ نہیں ہے کہ زیاد ابن سمیہ نے تجھے لکھا کہ حضرمیین علیؑ کے دین پر ہیں اور تو نے اسے حکم بھیجا کہ ان میں سے ایک کو زندہ نہ چھوڑے۔ اس نے سب کو قتل کیا۔ حالانکہ اسی دین کے لیے علیؑ نے تجھے اور تیرے باپ کو دستوش شمشیر بنایا تھا۔ آج تو نے خلافت کو غصب کیا ہے۔ ورنہ تیری اور تیرے باپ کی منزلت سوا لکوار کے دوسری نہ تھی۔ اور یہ جو تو نے لکھا ہے کہ اپنے دین اور امت کی فکر میں رہوں اور فتنہ کھڑا نہ کروں تو میں اس امت میں کسی فتنہ کو تیری حکومت اور خلافت سے زیادہ تصور نہیں کر سکتا۔ اپنے نفس اور امت محمدی کے خیال سے اس سے اچھی کوئی بات مجھے معلوم نہیں ہوتی کہ تجھ سے جنگ کروں۔ اگر تجھے شکست دی تو درگاہ خدا میں مجھے تقرب حاصل ہو گا۔ سستی کرنے میں مجھے خدا سے طلب استغفار کرنا پڑے گی۔ یہ جو تو نے لکھا ہے کہ اگر میں تجھ سے انکار کروں گا تو تو بھی مجھ سے انکار کرے گا، اور اگر میں تجھ سے عداوت کروں گا تو تو بھی مجھ سے عداوت کرے گا۔ افسوس ہے تجھ پر یہ تیرا کیا خیال ہے۔ مجھے امید ہے کہ مکر کسی مخلوق کو نقصان نہیں پہنچاتا مگر یہ کہ اسی کے نفس کی طرف بازگشت کرتا ہے۔ تو جہل پر سوار اور نقض عہد پر حریص ہوا۔ خدا کی قسم تو نے کسی عہد کو وفا نہ کیا۔ مسلمانوں کو قتل کیا، بعد اس کے کہ ان سے وعدے کیے تھے، اور بغیر اس کے کہ انھوں نے تجھ سے کوئی مناقشت کی ہو۔ ان کا قصور بجز ہمارے فضائل اور تعظیم حقوق کے کچھ نہ تھا۔ انھیں تو نے اس خوف سے قتل کیا کہ اگر یہ زندہ رہیں تو تو خود نہ تباہ ہو جائے۔ جان اے معاویہ کہ قیامت ہو گی اور قصاص کا وقت قریب آ رہا ہے۔ جان کہ کوئی گناہ صغیرہ و کبیرہ ایسا نہیں ہے کہ جو کتاب خدا میں نہ لکھا ہو۔ خدا دیکھتا ہے کہ تو نے لوگوں پر بہتان کیا۔ دوستان خدا کو تہمت لگائی۔ بہتیروں کو قتل اور جلاوطن کیا، اور لوگوں سے بیعت کرائی۔ تو نے اپنا دین خراب اور رعیت کو پریشان کیا، پارساؤں کو ڈرایا، اس لیے کہ آرزو کی گردن پر سوار ہو"۔

۵۳ھ شروع ہوا تھا کہ زیاد کی انگلی میں ایک پھوڑا نکلا اور زہر پھیلنے لگا۔ اور ہاتھ کٹانے کی صلاح ہوئی۔ لیکن وہ دشمن انسانیت جو ہزاروں بندگان خدا کو معاویہ کے خوش کرنے اور اپنے کو اپنی جگہ قائم رکھنے کے لیے بغیر کسی شکن کے قتل کر سکتا تھا خود "جس وقت آگ اور آلۂ قطع پر نظر پڑی ڈر کر ہاتھ کٹانے سے رک گیا"۔ اسی مرض نے زمانہ کو اس کے

وجود سے پاک کیا، اور ضحاک بن قیس کوفہ کا گورنر ہوا۔ اور ۵۵ھ میں عُبیداللہ بن زیاد بصرہ کا گورنر مقرر کیا گیا۔

معاویہ اور شہدائے اُحد کی قبریں

معاویہ کے دورانِ حکومت کا یہ واقعہ ہے کہ شہدائے احد کی قبریں مکشوف ہوئیں جسے میں مناہج النبوت سے نقل کرتا ہوں:

"اکثر قبور شہیدوں کی اس جہت سے مکشوف ہوئیں کہ معاویہ ابوسفیان کے بیٹے نے اپنی امارت کے وقت میں ایک نہر کھدوائی اس مشہد مقدس کی راہ میں۔ یعنی اس نہر کو ان شہیدوں کی قبروں کی راہ سے روانہ کیا، اور اکثر قبریں اس سبب سے مکشوف ہوئیں اور شہیدوں کو قبروں سے باہر نکالتی تھیں اور مدینہ کی تاریخ میں امام تاج الدین سبکی سے شفاء السقام سے لاتا ہے کہ جب معاویہ نے نہر نکالی اور حکم کیا شہیدوں کے نکالنے کا ان کی قبروں سے تب مساحی سید الشہداء حمزہؓ بن عبدالمطلب کے قدم کو پہنچے اور خون اس سے جاری ہوا، اور روایت کرتے ہیں کہ اس کے عامل نے اس نہر کے گڑھا کھدانے کے روز مدینہ میں منادی کی کہ نہر امیرالمومنین کی آتی ہے جس کا مردہ احد میں ہو سو آوے اور اسے وہاں سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لے جائے"۔

ولیعہدی یزید کی کوششوں کی ابتدا مُغیرہ یا عمرو عاص کے دماغ سے

۴۹ھ کے قریب سے ایک بڑے تغیر کی ابتدا ہو رہی تھی۔ روضۃ الصفا اور ابن خلدون کے موافق یہ مُغیرہ بن شعبہ اور اعثم کوفی کے موافق عمرو بن عاص تھا جس نے اس معاملہ کو شروع کیا، اور ان دونوں کا اس قصہ کو اٹھانا کچھ تو معاویہ کی خوشنودی اور میلان اور کچھ اموی خاندان کے اقتدار کے لحاظ سے اپنی قدر دانی اور اقتدار کو محفوظ کرنا تھا۔

ابتدا ذاتی وجاہت سے تھی

ہوا یہ کہ مُغیرہ نے ضعف کی وجہ سے استعفا دیا، اور جب اس کے دوستوں نے سنا تو کہا کہ: "تم کو امیر معاویہ نے نکال دیا ہے"۔ اس سے مُغیرہ کے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور اسی وقت سے بحالی کی فکر ہو گئی۔ (ابن خلدون) اسی غور میں ایک روز یزید کے پاس جا پہنچے اور اس سے کہنے لگے: "تم امیر معاویہ سے اپنی ولیعہدی کے بیعت لینے کو کیوں نہیں کہتے۔ کیونکہ اجل صحابہ اور سرداران و بزرگان قریش انتقال کر چکے ہیں اب ان کی اولادیں باقی ہیں اور تم ان لوگوں سے رائے، سیاست میں افضل ہو۔ میرے نزدیک امیرالمومنین کو تمہاری ولیعہدی کی بیعت لینے سے کوئی امر مانع نہ ہوگا"۔ یزید نے مُغیرہ کی تقریر کا معاویہ سے اعادہ کیا۔ معاویہ نے مُغیرہ کو طلب کیا، اور مُغیرہ نے کہا: "آپ اس کی ولیعہدی کی بیعت لوگوں سے لیجیے آپ کے بعد مُسلمانوں کا یہ ماوا اور ملجا ہوگا، اور اس میں نہ کوئی فتنہ ہوگا، اور نہ فساد۔ میں اس کام کی انجام دہی کو کوفہ میں کافی ہوں گا، اور زیاد بصرہ میں۔ اور ان دونوں شہروں کے بعد پھر کوئی ایسا شہر نہیں ہے جو آپ کے حکم سے مخالفت کرے"۔ امیر معاویہ نے اس تقریر کو غور سے سن کر مُغیرہ کو بحالی کی سند دی اور دوبارہ کوفہ کی طرف واپس کیا۔ اور یزید کی ولیعہدی کی بیعت کی کارروائی کرنے کا حکم دیا۔

مُغیرہ وفد تیار کرتا ہے

مُغیرہ نے کوفہ میں پہنچ کر ہوا خواہان دولت بنی امیہ سے اس کا ذکر کیا۔ ان لوگوں نے بہ کمال خوشی منظور کر لیا۔ مُغیرہ نے ان لوگوں میں ایک گروہ کو

بطور وفد اپنے لڑکے موسیٰ کے ساتھ دارالخلافت دمشق کو روانہ کیا۔ اہل وفد نے حاضر ہو کر ولیعہدی یزید کی بیعت کی درخواست پیش کی۔۔۔ بعد اس کے زیاد کو یہ کل حالات لکھ بھیجے اور اس سے مشورہ طلب کیا۔

یزید کے متعلق زیادؓ کے خیالات

زیاد نے ضبید بن کعب نمیری کو بلا کر کہا: "۔۔۔ امیرالمومنین نے مجھے یہ خط لکھا ہے اور ولیعہدی یزید کے بابت مشورہ طلب کیا ہے۔ اس وجہ سے کہ لوگوں کے تنفر سے وہ خائف ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ لوگ اس امر میں ان کی اطاعت کریں۔ لیکن مسلمانوں کا اِس امر پر راضی ہونا ایک امر اہم ہے۔ یزید میں آوارگی، بے ہودگی، نااہلی ہے۔ میرے نزدیک تم امیرالمومنین سے جا کر ملو اور یزید کے افعال سے مطلع کرو اور صاف صاف کہہ دو کہ یہ کام ہونا دشوار ہے"۔

لیکن جو کچھ زیاد کے نزدیک ناممکن تھا دوسرے ہوا خواہ کے نزدیک ایسا کہنا خلافِ مصلحت تھا۔ اس لیے کہ "معاویہ کی رائے سے مخالفت" اور "یزید کو بدخواہ بنانا" ہوتا۔ اور تجویز کیا کہ یزید سے کہا جائے کہ "اگر تم مناسب سمجھو تو تم ان افعال و حرکات کو چھوڑ دو تاکہ لوگوں کو قائل معقول کرنے کا موقع مل جائے اور جو تم چاہتے ہو وہ امر حاصل ہو جائے"۔ یہ رائے پاس ہوئی اور معاویہ کو توقف کی صلاح دی گئی۔

"جب زیاد مر گیا تو امیر معاویہ نے یزید کی ولیعہدی کی بیعت لینے کا مصمم قصد کر کے کارروائی شروع کر دی۔ پہلے عبداللہ بن عمر کے پاس ایک ہزار درہم بطور نذر کے بھیجا۔ عبداللہ بن عمر نے اس کو قبول کر لیا۔ بعد اس کے ولیعہدی یزید کی بیعت کا تذکرہ کیا گیا۔ عبداللہ بن عمر نے ارشاد کیا: "میں اپنے دین کو بعوض دنیا نہ فروخت کروں گا"۔ یہ کہہ کر دراہم واپس کر دیے اور ولیعہدی یزید کی بیعت سے انکار کر دیا"۔

مروان بن حکم اہلِ مدینہ سے ولیعہدی یزید کا مشورہ لیتا ہے

اس کے بعد معاویہ نے مروان حاکم مدینہ کو ولیعہدی کے متعلق لکھا اور کہا کہ اہلِ مدینہ کا خیال معلوم کرو۔ جواب گیا کہ: بہتر ہے امیرالمومنین کسی کو ہمارے لیے منتخب کریں"۔ اب جواب بھیجا گیا کہ: "یزید کو میں اپنے بعد ولیعہد کرتا ہوں"۔ مروان نے اسے اہلِ مدینہ سے کہا۔ یہ سن کر عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے کہا: "واللہ! اے مروان تو جھوٹا ہے اور معاویہ بھی جھوٹ بولتا ہے۔ تم دونوں نے اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کیا بہتری ڈھونڈی ہے۔ بلکہ تم خلافت کو حکومتِ ہرقلیہ بنانا چاہتے ہو کہ ایک ہرقل جب مر جائے تو اس کی جگہ پر دوسرا ہرقل قائم ہو"۔ حسینؑ بن علی، عبداللہ بن عمر، ابن زبیر نے اس کلام کی تائید کی۔ مروان نے معاویہ کو صورتِ حال کی خبر دی۔

حکومت عام خواہش دکھانے کے لیے وفود تیار کراتی ہے

اس وقت امیر معاویہ نے اپنے عمال و گورنروں کو لکھ بھیجا کہ:

"تم لوگ یزید کی ثنا و صفت لوگوں میں بیان کرو اور اطراف و جوانب بلاد اسلامیہ سے یزید کی ولیعہدی کی درخواست پیش کرنے کی غرض سے وفود بھیجو"۔ وفود جمع ہوئے اور اب معاویہ نے ضحاک بن قیس الفہری سے کہا کہ: "میں تمہیداً کچھ بیان کروں گا۔ جس وقت میں تقریر کر کے خاموش ہو جاؤں اس وقت تم اٹھ کر ولیعہدی یزید کے بیعت کی تقریر کرنا، اور لوگوں کو اس امر پر ابھارنا"۔ ضحاک، عمر بن سعید الاشدق وغیرہ نے دھواں دھار سپیچیں دیں۔

حکومت کے نزدیک خطیبوں کا سردار

اور یزید بن المقنع عذری نے کھڑے ہو کر کہا: (امیر المومنین کی طرف اِشارہ کرکے) یہ امیر المومنین ہیں۔ اگر یہ مرجائیں تو (یزید کی طرف اِشارہ کرکے) یہ امیر المومنین ہیں۔ اور جو شخص اس سے اختلاف کرے گا تو (تلوار کی طرف اِشارہ کرکے) یہ ہے"۔ امیر معاویہ نے یزید بن المقنع سے کہا: "بیٹھ جاؤ۔ تم خطیبوں کے سردار ہو"۔

احنف بن قیس کی تقریر سے رنگ بدل گیا

احنف بن قیس خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ امیر معاویہ نے کہا: "تمھاری کیا رائے ہے؟"۔ عرض کیا: "مجھے خوف ہے کہ میں جو کہوں گا اس کی تم تصدیق کروگے اور اللہ تعالیٰ کا خوف یہ ہے کہ وہ تکذیب کرے گا۔ اے امیر المومنین تم یزید کے شبانہ روزی حالات سے بخوبی واقف ہو۔ اس کے ظاہر و باطن، آمد و رفت سے کما حقہ آگاہ ہو۔ اگر تم جانتے ہو کہ اس میں اللہ تعالیٰ اور امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بہتری ہے تو کسی سے مشورہ نہ کرو، اور اگر تم اس کے خلاف جانتے ہو تو دنیا کی زیادہ فکر نہ کرو۔ سفر آخرت قریب ہے۔ باقی رہے ہم۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ آپ جو کچھ کہیں اس کو بسر و چشم منظور کرلیں۔۔۔۔"۔ احنف کی تقریر لوگوں میں پھیل گئی اور بظاہر یہ معلوم ہوا کہ اب یہ کام نہ ہوگا۔ لیکن امیر معاویہ برابر اپنی کوشش میں لگے رہے۔ ہر شخص سے مدارات و سلوک کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد اہلِ عراق و شام کے اکثر آدمیوں سے ولیعہدی یزید کی بیعت لے لی۔

معاویہ مدینہ میں

اہل عراق و شام سے ولیعہدی یزید کی بیعت لینے کے بعد امیر معاویہ ایک ہزار سواروں کی جمعیت سے مدینہ منورہ پہنچے۔ حسینؑ بن علی، عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمٰن بن ابی بکر، عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہم) اس خیال سے کہ امیر معاویہ کا ہمارے کہنے پر عملدرآمد نہ ہوگا، مکہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ امیر معاویہ نے لوگوں کو جمع کرکے خطبہ دیا۔ یزید کی تعریف کی اور یہ بیان کیا کہ کوئی شخص اس سے زیادہ مستحق خلافت نہیں ہے۔۔۔ کسی نے اس تقریر کا کچھ جواب نہ دیا۔ امیر معاویہ منبر سے اتر کر ام المومنین عائشہ کی خدمت میں گئے اور اس سے پیشتر ان کو یہ معلوم ہوچکا تھا کہ حسینؑ بن علیؑ اور ابن عمر (رضی اللہ عنہم) وغیرہ بخوف بیعت ولیعہدی یزید مکہ چلے گئے ہیں۔ آپ نے ارشاد کیا میں نے سنا ہے کہ تم نے ان لوگوں کو قتل کی دھمکی دی ہے۔ جواب دیا:

ایک چھوٹا سا "لیکن"

اے ام المومنین وہ لوگ مجھے یزید سے زیادہ عزیز ہیں۔ لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں اس بیعت کو ناقص کردوں جو ولیعہدی یزید پر میں نے لی ہے اور پوری ہوگئی ہے۔ اس پر ام المومنین عائشہ خاموش ہورہیں۔

۵۶ھ معاویہ مکہ میں

امیر معاویہ تھوڑے دن مدینہ میں ٹھہر کر مکہ روانہ ہوئے۔ امیر معاویہ کی خبر آمد سن کر اہل مکہ ملنے کو آئے۔ حسینؑ اور ابن عمر رضی اللہ عنہم وغیرہما بھی یہ خیال کرکے کہ شاید معاویہ اپنے فعل سے نادم ہوکر آئے ہیں، ملنے کو گئے۔ معاویہ نے اپنی رعایتوں کے ذکر کے بعد یزید کی ولیعہدی پیش کی۔ اور ابن زبیر نے خلیفہ ثالث تک کے اصول انتخاب یا خلافت کا تذکرہ کیا۔

حق گوئی تلوار کی باڑھ کے نیچے

امیر معاویہ نے کہا: "تم لوگ یہی کہتے ہو جاؤ لیکن میں یزید کو ولیعہد ضرورت بناؤں گا۔ خدا کی قسم اگر کسی نے میری بات رد کی تو خیر نہ ہوگی۔ یہ کہہ کر اپنے صاحب شرط کو بلا کر کہا کہ جو شخص میرے بیان کی تکذیب کرے اس کی گردن فوراً اڑا دینا"۔ ابن علی، ابن عمر، ابن زبیر، ابن ابی بکر رضی اللہ عنہم اٹھ کر باہر آئے۔ امیر معاویہ بھی اندر سے نکل کر منبر پر چڑھ گئے اور حمد وثنا کے بعد کہا: "صاحبو! ابن علی، ابن ابی بکر، ابن زبیر وغیرہم مسلمانوں کے روحی پیشوا اور بہترین امت ہیں۔ کوئی کام ان کے بغیر مشورہ انجام کو نہیں پہنچ سکتا۔ یہ لوگ ولیعہدی یزید پر راضی ہو گئے ہیں اور بیعت کر لی ہے۔ آؤ تم لوگ بھی اللہ تعالیٰ کا نام لے کر بیعت کرلو"۔ اہل مکہ چونکہ انھیں لوگوں کی بیعت کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ سنتے ہی بیعت پر آمادہ ہو گئے۔

فریب ظاہر ہوگیا

اہل مکہ سے بیعت لے کر امیر معاویہ مع ان بزرگوں کے مدینہ پہنچے۔ اہل مدینہ ان لوگوں سے ملنے کو آئے۔ برسبیل تذکرہ کہا: "تم لوگ تو بیعت ہی کے خوف سے مکہ بھاگ گئے تھے، یہ کیا معاملہ پیش آیا کہ یزید کی بیعت پر راضی ہو گئے؟"۔ ان لوگوں نے کہا: "واللہ ہم نے بیعت کی ہی نہیں"۔ پھر اہل مدینہ نے کہا: "تم نے معاویہ کو اس سے کیوں نہ روکا؟"۔ سبھوں نے جواب دیا: "مسلمانوں کی خونریزی کے خیال سے"۔ بعد اس کے امیر معاویہ اہل مدینہ سے بھی بہ حکمت عملی بیعت لے کر شام کو روانہ ہو گئے۔

مکہ میں حسینؑ کا خطبہ

صاحب ناسخ التواریخ نے ۵۸ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ حضرت امام حسینؑ نے ایام حج میں ایک خیمہ نصب فرمایا اور قریب ایک ہزار بنی ہاشم اور اصحاب جمع ہوئے۔ حضرت نے خطبہ فرمایا۔ جس میں حمد ونعت کے بعد ارشاد کیا کہ معاویہ نے ہمارے اور ہمارے دوستوں کے ساتھ جو کچھ کیا اسے تم لوگوں نے سنا اور دیکھا۔ میں تم سے کچھ پوچھتا ہوں۔ اگر سچ ہو تو اس کی تصدیق ورنہ تکذیب کرنا۔ اور اسے اپنے ذہن میں محفوظ رکھ کر اپنے وطن میں بیان کرنا اور سننے والوں سے کہنا کہ وہ دوسروں سے بیان کریں۔ ہمیں خوف ہے کہ دین خدا ضائع ہوگا۔ اس کے بعد رسولؐ کا جناب امیر کو اپنا بھائی فرمانا، مسجد کا دروازہ ان کے لیے کھلا رکھنا، بعض کا حسد کرنا، غدیر کی حدیث، ہارون فرمانا، نصاریٰ نجران کے مباہلہ میں علیؑ کو اپنا نفس فرمانا، خیبر میں کرار کہنا، سورۂ برائت حوالہ کرنا، یا علیؑ انت منی وانا منک فرمانا۔ بیان کرنے کے بعد پوچھا کہ کیا رسولؐ نے یہ حدیثیں نہیں فرمائیں؟۔ کیا حضرت فاطمہؑ سے نہیں کہا کہ تیرا شوہر "خیر اهل بیت اقدمهم سلماً واعظمهم حلماً واکثرهم علماً" سے متصف ہے۔ کیا رسولؐ نے اپنے کو سید عالم اور علیؑ کو سید عرب نہیں فرمایا۔ فاطمہؑ کو سیدۃ نساء اهل الجنة اور ہم لوگوں کو سیدا شباب اهل الجنة نہیں کہا۔ کیا تم لوگوں کو حدیث ثقلین یاد نہیں ہے۔ سب نے تصدیق کی اور یہ احادیث اور موعظہ سن کر منیٰ سے متفرق ہوئے۔

روضۃ الصفا کے موافق سعید بن عثمان نے خراسان کی امارت چاہی، معاویہ نے عذر کیا کہ عبید اللہ بن زیاد وہاں کا حاکم ہے۔ اس پر ابن عثمان کچھ گرم ہوئے، اپنے باپ کے حقوق یاد دلائے۔ آخر گورنری لے کے ہی چھوڑی۔

گبن نے ڈکلائین اینڈ فال آف رومن امپائر میں لکھا ہے کہ: "حسینؑ نے جنھیں اپنے باپ کے تقوے کی طرح شجاعت کا ورثہ بھی ملا تھا، مسیحیوں کے خلاف قسطنطنیہ کے محاصرہ میں قابل تعریف خدمت ادا کی"۔ اور مؤلف

برلیف ہسٹری آف سار سینس کہتا ہے کہ: "حسینؑ خلیفہ کی فوج کے ساتھ مسیحیوں سے برابر جنگ کرتے رہے"۔

اعثم کوفی اور روضۃ الصفا کے موافق صلاح کی ابتدائی مدارج میں یزید حج کرنے آیا، اور لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے بہت داد و دہش کی۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ معاویہ یزید کو ولیعہد کرنا چاہتا ہے تو لوگوں نے جو کچھ جی میں آیا کہا، اور شعرا نے ہجو لکھی۔

ابن ابی بکر اور مروان

اور جب مدینہ میں ابن حکم منبر پر سے یزید کی تعریف کر رہا تھا۔ عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے اسے جھٹلایا اور اور ٹانگ پکڑ کے اتار لیا۔ بنی امیہ غصہ میں آئے اور اس وقت حضرت عائشہ آ گئیں۔ اور مروان کو سخت سست کہا۔ جس سے وہ خاموش ہو گیا۔

روضۃ الصفا کے موافق مدینہ پہنچ کر معاویہ نے حسینؑ سے کہا کہ: "تمھاری مثال اس شخص کی ہے جس کا خون جوش میں آ گیا ہو۔ خدا تمھارا خون بہائے گا"۔ اعثم کوفی کے موافق کہا کہ: "ہم تمھارے حسد اور عداوت کو جانتے ہیں"۔ اور حسینؑ نے جواب دیا: "چپ رہ اے معاویہ کہ ہم اس کے اہل نہیں ہیں"۔ معاویہ نے کہا: "تم اسے کے اور اس سے بدتر کے اہل ہو"۔ تم لوگ ایسی بات چاہتے تھے خدا جس کے خلاف چاہتا تھا"۔

انھیں مؤرخین کے موافق معاویہ نے اپنی عام تقریر میں بیعت نہ کرنے والے لوگوں کو ہر طرح کی دھمکیاں دیں۔ اور یہ سن کر کہ عبداللہ بن عمر وغیرہ مکہ چلے گئے "متفکر ہوا"۔ اس کے بعد کچھ دیر تک ابن عباس سے گرم و سرد گفتگو ہوئی اور بنی ہاشم کے وظائف جاری کرنے پر اس وقت تک آمادہ نہیں ہوا جب تک ابن عباس نے یہ دھمکی نہ دی کہ پھر ہم جو کچھ تمھارے متعلق جانتے ہیں اس سے لوگوں کو مطلع کرنا شروع کریں گے۔ معاویہ اس کے بعد مکہ روانہ ہوا۔ اور حضرت عائشہ نے اپنے بھائی کے مظلومانہ موت کے عوض میں معاویہ کو قتل کرنے کی دھمکی دی۔ مکہ میں پہنچ کر ان لوگوں سے خوش اخلاقی کا برتاؤ کیا اور کہا کہ: "دل من چناں میخواست کہ شما نام خلافت بر او (یزید) نہید و کار بدست شما باشد آنچہ خواہید و مراد دل داشتہ میکنید"۔ یعنی: میرا دل چاہتا تھا کہ تم نام کی خلافت یزید کو دو اور کام تمھارے ہاتھ میں ہو جو چاہو کرو۔

تحائف بھیجے لیکن حسینؑ نے اُسے قبول نہ فرمایا۔ چند روز کے بعد حسینؑ کو طلب کیا۔ زیر بحث گفتگو شروع کی۔ اور اعثم کوفی کے موافق کہا: "مَیں نے مدینہ کی بیعت کو ملتوی رکھا تھا، اس لیے کہ مَیں جانتا تھا کہ یہ یزید کا گھر ہے، اور اس کے اعزا بہت ہیں۔ اگر میں یزید سے کسی کو اچھا دیکھتا تو اسی کو منتخب کرتا"۔ حسینؑ نے جواب دیا کہ: "اے معاویہ یزید سے کسی بہتر شخص کو امورِ خلافت کے لیے منتخب کر۔ جو اُسے انجام دے سکے اور جو اپنی ذات اور اپنے ماں باپ کی طرف سے بہتر ہو"۔ معاویہ نے کہا: "کیا اس "کسی" سے تم اپنے کو مراد لیتے ہو"۔ فرمایا: "اگر میں مراد لوں تو بعید نہیں ہے"۔ معاویہ نے کہا: "اس میں شبہ نہیں کہ تم نسباً یزید سے اچھے ہو لیکن امورات خلافت کے لیے وہ تم سے اچھا ہے"۔

حسینؑ کو نانا کی امت اپنے نفس سے زیادہ عزیز تھی

حسینؑ نے فرمایا: "اِنصاف سے بات کر لے معاویہ۔ وہ کون ہے جو میرے نانا کی امت کے لیے مجھ سے بہتر ہو۔ کیونکہ مجھے اپنے نانا کی امت اپنی ذات سے زیادہ عزیز ہے"۔

معاویہ نے کہا: "اے حسینؑ واپس جاؤ۔ اپنی جان کو ڈرتے رہو اور اہلِ شام سے پرحذر رہو"۔

اس کے بعد ان دونوں مؤرخین نے لکھا ہے کہ: "دوسرے دن معاویہ نے ان چاروں آدمیوں کو بلایا، اور خود منبر پر چڑھ کر کہا: "میں بہت سی باتیں سنتا ہوں لیکن اسے معتبر نہیں سمجھتا۔ میں نے سنا ہے کہ یہ چاروں بزرگ یزید کی بیعت پر راضی نہیں ہیں اور بیعت نہیں کی۔ مجھے تعجب ہوا، اور ان بزرگ زادگانِ عرب کو جو اخیارِ مسلمین ہیں طلب کیا، اور ان سے بیعت یزید کی گفتگو چھیڑی۔ انھوں نے لطف اور طوع و رغبت سے یزید سے بیعت کی ہے۔ یہ باتیں میں ان کے سامنے کہہ رہا ہوں کہ کسی کو شبہ ہو تو تحقیق کرلے کہ انھوں نے یزید کی بیعت کی ہے یا نہیں۔ اس کے بعد امرا اور معارفِ شام کو اشارہ کیا۔ یہ تلواریں کھینچ کر کھڑے ہوگئے اور کہا: "کب تک تو ان چار شخصوں کی تعریف اور عزت کرے گا۔ ان کا موقع ایسا عظیم نہیں ہے کہ تو ان سے خوف کرے۔ حکم دے کہ ابھی ان کی گردنیں ماریں اور تجھے اس دغدغہ سے فراغت حاصل ہوجائے۔ یا یہ لوگ سب کے سامنے بیعت کریں۔ یزید کے غلبہ کے لیے ان چار شخصوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔ معاویہ نے خاموش کرایا۔ اور جب مجلس برخاست ہوئی تو لوگوں نے تردد اور حیرت ظاہر کی۔ اس پر حسینؑ نے فرمایا: "واللہ ہم نے سراً یا علانیاً کسی طرح یزید کی بیعت نہیں کی ہے۔ لیکن معاویہ نے ہم سب کو فریب دیا، اور جو کچھ تم نے دیکھا اور سنا، اس نے کیا اور اہلِ شام نے اس کے کہنے سے اس قدر غلو کیا، اور تلواریں کھینچیں، البتہ ہم خاموش تھے۔ نہ تم نے کچھ پوچھا نہ ہم نے جواب دیا، اور ہم تم دونوں حیرت میں رہ گئے۔ اصل واقعہ یہ ہے۔ لوگوں کو اس مکر سے تعجب ہوا"۔

عبدالرحمٰن بن خالد اور حضرت عائشہؓ کی موت کیونکر واقع ہوئی

چونکہ ہم معاویہ کے زمانہ امارت کے اختتام تک پہنچ گئے ہیں۔ ہم دو واقعات کو اور لکھنا چاہیے ہیں، جو روضۃ الصفا اور ابن خلدون میں ہیں۔ ❶ پہلا یہ ہے کہ عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید جنھوں نے معاویہ کے حکم سے نواحِ روم میں قیام کیا تھا، حمص میں واپس آئے۔ عبدالرحمٰن بہادر اور باتدبیر تھے۔ یہاں کے لوگ خالد بن ولید کی کارگزاریوں کے لحاظ سے ان کی تعظیم کرتے تھے۔ اس سے معاویہ خوف زدہ ہوا، اور ابن آثال نصرانی سے کہا کہ اگر تو عبدالرحمٰن کو ہلاک کرڈالے تو تجھ سے خراج نہ لیا جائے گا، اور حمص کے خراج کا والی قرار دیا جائے گا۔ ابن آثال نے مسموم شربت سے ہلاک کیا۔ معاویہ نے وعدہ وفائی نہ کی، اور آخر میں عروہ بن زبیر کے طعنہ سے خالد بن عبدالرحمٰن نے ابن آثال کو قتل کیا، اور معاویہ نے انھیں کچھ دنوں قید میں رکھا۔ ❷ دوسرا واقعہ حضرت عائشہ کی رحلت کا ہے۔ ابن خلدون کہتا ہے: "آپ کو مروان اور اس کے خاندان والوں نے شہید کیا تھا۔ اس وجہ سے کہ اس کی مخالفت کرتی تھیں۔ اس نے دعوت کے بہانہ سے اپنے گھر بلایا، اور پہلے ایک گڑھا عمیق کھود کر نیزے، تلواریں، چھریاں وغیرہ رکھ دی تھیں، اوپر سے ایک فرش بچھا دیا تھا۔ ام المومنین جب تشریف لائیں تو ان کو وہیں بٹھلایا۔ بیٹھنا تھا کہ نیچے گر پڑیں۔ معمر اور کمزور تھیں۔ ایسی چوٹ آئی کہ پھر اس سے جانبر نہ ہوسکیں۔

معاویہ شام کی طرف واپس جارہا تھا کہ مقام ابوا کے ایک کنویں کے برے پانی سے بیمار ہوگیا۔ اور شام پہنچتے پہنچتے نوبت غشی کی پہنچنے لگی۔ پریشان خوابی اور غشی سے چونک کر اکثر کہہ اٹھتا تھا کہ: "کیا کیا میں نے اے حجر بن عدی اور عمرو بن الحمق اور کیوں اختلاف کیا میں نے تجھ سے اے ابن ابوطالب"۔ اس حالت میں یزید اس کے پاس آیا، اور کہا کہ:

"میرے تجدید بیعت کے لیے کوشش کرو، ورنہ خوف ہے کہ اگر لوگوں نے مجدداً بیعت نہ کی تو آلِ ابوتراب سے مجھے رنج پہنچے"۔ دوسرے روز ضحاک بن قیس اور مسلم بن عقبہ نے یزید کی سفارش کر کے کہا: "ہم راضی نہیں ہیں کہ حکومت ابوسفیان کے خاندان سے آلِ ابوتراب میں منتقل ہو"۔ اس کے بعد بہت سے لوگوں کو بلوایا، اور سبھوں نے یہی خواہش کی۔ معاویہ نے علامات شاہی حوالہ کیں اور عثمان کا خون آلود کرتا پہنایا، ضحاک اور مسلم سے بیعت کرائی۔ اس کے بعد یزید مسجد میں آیا اور خطبہ پڑھا، اور پھر معاویہ کے پاس واپس گیا۔ اس وقت معاویہ نے یزید کو اپنے وصایا حوالہ کیے۔

اعثم کوفی کے موافق اس میں یہ مضمون بھی تھا کہ: "خلیفہ مقتول کے ورثا کو آلِ ابوتراب پر مقدم رکھنا، اور بنی امیہ اور بنی عبدالشمس کو بنی ہاشم اور دوسرے لوگوں پر حاکم مقرر کرنا۔ اپنے دوستوں کے قاتلوں کو اپنے پاس سے دور رکھنا۔ جس شخص پر یہ عہد نامہ پڑھا جائے وہ اپنے امیر یزید کی اطاعت کرے اور جو شخص کچھ یا انکار کرے یزید کو اختیار ہے کہ اس پر تلوار کھینچے اور انھیں قتل کرے جب تک کہ وہ اس کی خلافت اور امارت کا اقرار نہ کریں اور مطیع نہ ہو جائیں"۔ ضحاک اور مسلم نے مجمع کو وصیت نامہ سنا دیا۔

سنہ ۶۰ھ

بعض مورخین اور ابن خلدون نے بھی کہا ہے کہ: طبری نے ہاشم ہی سے روایت کی ہے کہ جب سنہ ۶۰ھ میں امیر معاویہ کا زمانہ وفات قریب آ گیا، اور اس وقت یزید موجود نہ تھا تو امیر معاویہ نے ضحاک بن قیس فہری اور مسلم بن عقبہ المزنی کو بلا کر کہا: "میری وصیت یزید تک پہنچا دینا"۔ اور روضۃ الصفا کی ایک روایت کے موافق یزید "شکار چھوڑ کر ملک کے شکار کو چلا"۔ اسی مورخ کے موافق یزید نے اپنی تخت نشینی کی تقریر میں اہالیان فوج سے کہا کہ: "عنقریب ہم میں اور ہمارے دشمنوں میں جنگ ہوگی"۔ اور فوج نے خدمت گزاری کا یقین دلایا۔

معاویہ کی موت کے وقت سرجان رومی میر منشی تھا۔ مدینہ میں ولید بن عقبہ بن ابی سفیان، مکہ میں عمرو بن سعید بن العاص، بصرہ میں عبیداللہ بن زیاد، کوفہ میں نعمان بن بشیر گورنر تھا۔

اس باب کے متعلق سیاسی واقعات ہم لکھ چکے، لیکن اپنے ہیرو کے متعلق
ہمیں بعض روایتیں ابھی لکھنی ہیں، جن کا کوئی صحیح زمانہ
معلوم نہیں ہے۔ لیکن جو اب کے بعد نہیں
ہو سکتی تھیں۔ اس لیے ہم اس
باب کو اس کے لیے
مختص کرتے
ہیں۔

○

حسینؑ کے متعلق روایتیں

صحیح طریقۂ وضو کی تعلیم

ایک روز حسنینؑ ایک بوڑھے کے پاس سے گزرے جو غلط وضو کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر حسنینؑ نے آپس میں گفتگو شروع کی اور ایک نے دوسرے سے کہا کہ تم اچھی طرح وضو کرنا نہیں جانتے اور یہ کہتے ہوئے بوڑھے کے پاس آئے اور کہا:

ایہا الشیخ! تو ہم دونوں کے درمیان حکم ہو جا۔ ہم میں سے ہر ایک وضو کرتا ہے تو دیکھ کہ کون اچھا وضو کرتا ہے۔ اس کے بعد دونوں صاحبوں نے وضو کیا۔ بوڑھے نے جواب دیا: آپ دونوں حضرات اچھا وضو کرتے ہیں۔ صرف میں نادان ہوں اور اس وقت آپ دونوں بزرگواروں سے سیکھ گیا، اور توبہ کی آپ کے ہاتھ پر بوجہ آپ کی برکت اور شفقت کے جو آپ حضرات کو اپنے نانا کی امت پر ہے۔

عبداللہ بن عمرو بن عاص اور حسینؑ

ایک دن عبداللہ بن عمرو بن عاص اور ابوسعید خدری چلے جاتے تھے کہ حسینؑ سے ملاقات ہو گئی۔ ابن عمرو بن عاص نے کہا: جو شخص کہ اہل آسمان و زمین کے نزدیک محبوب ترین زمانہ کو دیکھنا چاہتا ہے وہ اس جانے والے کو دیکھے۔ ابوسعید نے ابن عاص کو حسینؑ کی خدمت میں پیش کیا۔ حسینؑ نے فرمایا: تیرا خیال ہے کہ میں فاضل ترین زمانہ ہوں۔ میرے پدر بزرگوار مجھ سے افضل تھے۔ لیکن صفین میں تو ہم دونوں سے لڑا۔ ابن عمرو بن عاص نے کہا: یا ابن رسول اللہؐ معذرت چاہتا ہوں۔ رسول اللہؐ نے اطاعت والدین کا حکم فرمایا ہے۔ فرمایا: عبداللہ! کیا تو نے حکم خدا نہیں سنا کہ اگر تیرے والدین تجھے میرا شریک اختیار کرنے کو کہیں جسے تو نہیں جانتا، تو ان کی اطاعت سے منھ پھیر لے۔ خود رسولؐ کا حکم ہے: "انما الطاعة طاعة المعروف لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق"۔ (اطاعت کارہائے معروف و پسندیدہ میں چاہیے نہ کہ خدا کی معصیت کرنے کے لیے کسی مخلوق کی اطاعت کرے)

حسینؑ کی میزبان بڑھیا

ایک مرتبہ حسینؑ اور عبداللہ بن جعفر حج کو تشریف لیے جا رہے تھے۔ اسباب پیچھے آ رہا تھا کہ آنحضرت پر گرسنگی اور تشنگی طاری ہوئی۔ قریب کی گھاٹی میں انھیں ایک خیمہ دکھائی دیا۔ اس میں ایک بڑھیا تھی۔ ان حضرات نے پانی مانگا۔ بڑھیا نے بکری کی طرف اشارہ کیا، اور ان لوگوں نے دودھ دوہ کر پیا۔ اب کچھ کھانے کو مانگا اور بڑھیا نے کہا کہ میرے پاس بجز بکری کے کچھ نہیں ہے۔ بکری ذبح کی گئی۔ بڑھیا نے پکایا۔ یہ لوگ سیر ہوئے اور چلتے وقت کہا کہ ہم قریش سے ہیں اور حج کرنے جا رہے ہیں۔ واپسی کے وقت ہم سے ملنا کہ تجھ سے نیکی کریں گے۔ کچھ دنوں کے بعد یہ عورت افلاس سے مجبور ہو کر مدینہ آئی۔ حسنؑ نے اسے دیکھا، اور ایک ہزار بکریاں اور ایک ہزار دینار عطا فرما کر حسینؑ کے پاس بھیج دیا۔ حسینؑ کا عطیہ بھی اس کے برابر تھا، اور انھوں نے بھی عبداللہ بن جعفر کے پاس بڑھا دیا۔ یہاں بھی وہ ایسے ہی عطیہ سے مسرور ہوئی۔

کنیز سے حسینؑ پر کاسۂ طعام گر پڑا

حسینؑ ایک روز کھانا نوش فرما رہے تھے کہ ایک کنیز کے ہاتھ سے گرم کاسۂ طعام حسینؑ کے چہرہ پر گر پڑا، اور حسینؑ نے

اس کی طرف دیکھا۔ اس کے منھ سے نکلا: وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ

فرمایا: کظمت غیظی

لونڈی نے کہا: وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ

فرمایا: عفوت عنك

لونڈی نے کہا: وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ

فرمایا: انت حرة لوجه الله سبحانه

محمد حنفیہ اور حسینؑ

حضرت محمد حنفیہ اور حضرت امام حسینؑ میں کسی وجہ سے کشیدگی ہوگئی۔ محمد حنفیہ نے حسینؑ کو لکھا: اے بھائی! میرے اور تمھارے پدر بزرگوار علی بن ابی طالب ہیں۔ اس امر میں نہ تو میں تم سے افضل ہوں نہ تم مجھ سے۔ تمھاری مادر گرامی فاطمہ زہرا رسولِ خدا کی بیٹی ہیں۔ اگر تمام روئے زمین کے موافق سونا میری ماں کی ملک ہو تب بھی وہ تمھاری ماں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ پس جب تم یہ خط پڑھو تو میرے پاس آؤ اور مجھے راضی کرو۔ کیونکہ تم بہ نسبت میرے احق بالفضل ہو۔ تم پر سلام ہو اور خدا کی رحمت اور اس کی برکتیں نازل ہوں"۔ حسینؑ نے جونہی خط ملاحظہ فرمایا محمد حنفیہ کی شیریں شکایت اور ان کے فروانہ نازِ تحکم کے موافق تشریف لے گئے اور منالیا۔

ایک کنیز کا تحفہ اور حسینؑ کا جواب

کسی کنیز نے ایک مرتبہ شاخِ ریحان کا گلدستہ پیش کیا۔ حسینؑ نے اسے آزاد کردیا۔ کسی نے تحفہ کی بے حقیقتی اور آزادی کے بڑے نعم البدل پر اعتراض کیا۔ فرمایا: خدا فرماتا ہے: اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا۔ (۴: ۸۶) (جب تمھیں کوئی تحفہ دے تو یا تو اسے اس سے اچھا تحفہ دو یا رد کردو)

اثنائے نماز میں سائل آیا

ایک روز حضرت امام حسینؑ نماز پڑھتے تھے کہ کسی سائل نے آواز دی: جس نے تم سے امید رکھی اور کنڈی کھٹکھٹائی وہ محروم نہیں ہوا۔ تم بخشش کرنے والے ہو۔ تم پر بھروسہ کیا جاتا ہے اور تمھارے باپ فاسقوں کے قتل کرنے والے تھے۔ اگر وہ امر (اجرائے سلام) نہ ہوتا جو تمھارے اسلاف کر گئے تو جہنم ہمارے محیط ہوتی۔ حسینؑ نے نماز ختم کی۔ کچھ عطا فرماتے وقت کہا: ان درہموں کو لے اور معاف کر، اور جان لے کہ میں تجھ پر شفیق ہوں۔ اگر مجھے قدرت حاصل ہوتی تو میرا آسمانِ بخشش تجھ پر منطبق ہوتا۔ لیکن حوادثاتِ زمانہ تغیرات پیدا کرنے والے ہیں۔ ابنائے زمان نے ہمارے حق کی رعایت نہ کی اور حقوق ہمارے تلف کیے اس لیے ہاتھ ہمارا اموال دنیا سے تہی ہے۔

محتاجوں کے متعلق قول

آپ کا قول تھا کہ محتاج نے جب تم سے سوال کیا تو اس نے تمھیں اپنی آبرو حوالہ کردی اور کچھ اکرام اپنی آبرو کا نہ کیا۔ لیکن تم اسے محروم واپس کرکے اپنی آبرو زائل نہ کرو اور اپنے چہرہ کی تکریم کرو۔

سائل کا روپیہ پرکھنا اور حسینؑ کی تصدیق

حضرت نے ایک شخص کو ہزار دینار یا درہم عطا فرمائے۔ وہ شخص روپیہ کو پرکھنے لگا۔ حضرت کے

خازن نے اس کہا کہ کیا تو نے کوئی شے فروخت کی ہے کہ روپیہ پر کھ رہا ہے۔ حاضر جواب سائل نے کہا کہ ہاں آبرو بیچی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ تو نے سچ کہا، اور ارشاد فرمایا کہ اسے تین ہزار درہم یا دینار دو۔ ایک سوال کے لیے ایک آبرو کے لیے، ایک اس لیے کہ ہمارے ہی پاس سوال کے لیے آیا ہے۔

عرضی پڑھنے کے قبل حاجت روائی

ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت کو عرضی دی۔ حضرت نے فرمایا کہ قبل اس کے کہ تیرا رقعہ پڑھا جائے تیری حاجت روا ہے۔ کسی نے کہا کہ کیوں آپ نے رقعہ نہ پڑھا اور ایسا فرمایا۔ ارشاد کیا کہ حق تعالیٰ مجھ سے سوال کرے گا کہ کیوں خط پڑھنے تک اسے انتظار میں رکھا۔

حسینؑ کی تعدادِ حج

کہا گیا ہے کہ حضرت نے پیادہ پچیس حج کیے تھے۔ ایک مرتبہ پیادہ حج کو تشریف لیے جارہے تھے کہ راستہ میں حاجیوں کا اور قافلہ ملا۔ لوگ بوجہ احترام اپنی سواریوں سے اتر گئے۔ لیکن پیدل چلنے میں تکلیف محسوس ہوئی۔ سعد بن وقاص نے سوار ہوجانے کی گزارش کی کہ ہم لوگ آپ کے ادب کی وجہ سے سوار نہیں ہوتے۔ یہ سن کر حسینؑ نے وہ راہ ترک کردی۔

ایک بدگو اور حسینؑ

ایک روز حسینؑ مدینہ کے باہر کہیں تشریف لے جارہے تھے کہ ایک شخص نے کسی سے ان کے نسبت سوال کیا۔ جواب دیا گیا کہ یہ نواسہ رسولؐ ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ پسر علیؑ ہیں۔ جواب دیا گیا ہاں۔ اب اس نے سب علیؑ شروع کردی۔ حسینؑ نے سنا، مسکرادیے اور فرمایا: اے عزیز کیا صحرانوردی سے تیرے دماغ میں خشکی آگئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں تیرا علاج کردوں اور اگر تیری بی بی نے تجھے ستایا ہے تو یہ روپیہ لے اور جا۔ کسی نے اس کی گستاخی پر اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ آپ نے روکا، اور فرمایا ہم بڑے حلیم ہیں۔ کوئی چیز ہمیں طیش نہیں دے سکتی۔

بے ادب کے ساتھ حلم

کسی مجلس میں حسینؑ تشریف رکھتے تھے کہ کسی شخص نے آپ کی شان میں بے ادبی کی۔ حاضرین نے سزا دینا چاہی لیکن دیکھا کہ حسینؑ کے چہرہ پر شکن تک نہیں ہے اور فرما رہے ہیں: فرشتے اس گھر میں نہیں جاتے جہاں کتا ہوتا ہے۔ (آپ نے غصہ کو کتے سے تشبیہ دی ہے)

ام کلثوم بنت عبداللہ بن جعفر کی یزید کے لیے خواستگاری اور حسینؑ

معاویہ نے مروان بن حکم کو عبداللہ بن جعفر کے پاس اس لیے بھیجا کہ وہ ام کلثوم بنت عبداللہ کی یزید کے لیے خواستگاری کرے۔ عبداللہ نے حسینؑ پر ٹالا۔ مروان حسینؑ کے پاس آیا اور کہا کہ اگر ام کلثوم کا یزید سے عقد ہوجائے تو بہتر ہے اور معاویہ نے کہا ہے کہ جس قدر مہر ہوگا میں ادا کروں گا۔ آج کل ان دونوں خاندانوں میں صلح ہے۔ اس عقد کی وجہ سے یہ بات قائم رہے گی اور میں لکھوں گا کہ عبداللہ پر جس قدر قرض ہے وہ بھی ادا کیا جائے۔ اے حسینؑ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ بہ نسبت یزید کے آپ کو اچھا سمجھنے والے کم ہیں اور یزید کو بہ نسبت آپ کے اچھا سمجھنے والے زیادہ ہیں اور بڑے تعجب کی بات ہوگی کہ یزید سے مہر طلب کیا جائے حالانکہ وہ ایسا شخص ہے جس کا مثل و ہمسر نہیں۔

حسینؑ نے فرمایا: شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اپنے نفس پر اختیار دیا۔ اپنے دین کے لیے پسند کیا، اور اپنی مخلوقات میں ہمیں بزرگی دی۔ تو نے کہا ہے کہ ام کلثوم کا باپ جس قدر مہر مانگے دوں گا۔ میرا منشا تو یہ ہے کہ میں وہی طریقہ جاری رکھوں جو رسولؐ اللہ کی بیٹی بی بی اور دیگر اہل بیت کی عورتوں کا مہر ہوا ہے۔ یعنی بارہ اوقیہ (چار سو اسی درہم) یہ جو کہا ہے کہ اس کے باپ کا قرض بھی ادا کیا جائے گا۔ یہ بتا کہ کب ہمارے خاندان کے بیبیوں نے ہمارا قرض ادا کیا ہے۔ صلح کے بابت یہ سمجھ لے کہ ہم جو تم لوگوں سے مخالفت کرتے ہیں تو یہ محض خوشنودی خدا کے لیے ہے۔ دنیا کے لیے ہم کبھی صلح نہیں کریں گے۔ جب نسبی قرابت سے کچھ فائدہ نہ ہوا تو سببی قرابت اور شادی بیاہ کب مصالحت کرا سکتے ہیں۔ تو نے یہ جو کہا کہ تعجب ہوگا۔ اگر یزید سے مہر طلب کیا جائے تو اس کی کیا ہستی ہے۔ اس سے اور اس کے باپ دادا سے جو لوگ افضل تھے ان لوگوں نے تو دیا ہی ہے اور ان سے مہر لیا گیا ہے۔ تو نے کہا ہے کہ یزید کا کوئی ہمسر نہیں تو سمجھ لے کہ اس کا وہ ہمسر ہے جو آج سے پہلے تھا۔ اس کی امارت نے اس کی ہمسری میں کچھ زیادتی نہیں کی ہے۔ یہ جو کہا کہ آپ کو اچھا سمجھنے والے کم ہیں تو کچھ پرواہ نہیں۔ جاہل اسے اور عاقل مجھے اچھا سمجھتے ہیں۔ (اپنے مختار کی طرف متوجہ ہو کر) سب لوگ گواہ رہیں کہ میں نے ام کلثوم بنت عبد اللہ کا عقد اس کے چچازاد بھائی قثم بن محمد بن جعفر سے چار سو اسی درہم پر کیا، اور انھیں اپنی مدینہ والی زمین دی جس کی آٹھ ہزار اشرفیاں سالانہ محاصل ہیں۔ یہ ان کی بسر اوقات کے لیے کافی ہوگی۔ مروان نے خفا ہو کر کہا: بنی ہاشم اپنی عداوت نہیں چھوڑتے۔ آپ نے فرمایا: وہ واقعہ یاد نہیں ہے کہ جب بھائی حسنؑ نے عائشہ بنت عثمان سے عقد کی خواہش کی تو تم نے کہا کہ عائشہ کا عقد عبد اللہ بن زبیر سے ہوگا۔

ارینب بنت اسحٰق کا قصہ معہ تنقید مؤلف

ملا حسینؒ الکاشفی کی روضۃ الشہدا میں ایک واقعہ ملتا ہے جسے ناموں کے اختلاف کے ساتھ ابن قتیبہ نے کتاب الامامۃ و السیاسۃ میں تفصیل سے لکھا ہے۔ جو اصلاح نمبر ۱ جلد ۱۵ میں بھی شائع ہوا۔ میں خلاصہ پیش کروں گا۔ روضۃ الشہدا میں میرے غور کے قابل صرف یہ عبارت ہے کہ: "عداوت فرعی یزید بہ دو سبب بود یکے آنکہ امام حسینؑ از بیعت او ابا کرد۔۔۔۔ دوم آنکہ عبد اللہ زبیر زنے داشت کہ دراں عصر بحسن و جمال او نشان نمی دادند و خبر غائبانہ او بہ یزید رسید۔ انواع حیلہا ساختند و تدبیر ہا پرداختند۔ ابن زبیر آں زن را بے جہت طلاق داد و از شام وکالت نامہ بہ ابی موسی اشعری رسید کہ مطلقہ ابن زبیر را برائے وے بخواند"۔ یعنی: یزید کی فرعی عداوت دو وجہ سے تھی۔ ایک یہ کہ امام حسینؑ نے اس کی بیعت سے انکار کیا تھا، دوسرا یہ کہ عبد اللہ بن زبیر کی ایک بیوی تھی کہ اس کے حسن و جمال کی اس زمانے میں مثال نہ تھی۔ اس کی خوبصورتی کی خبر یزید کو پہنچی۔ طرح طرح کے حیلے اور تدبیریں کی گئیں۔ ابن زبیر نے بلا وجہ اس عورت کو طلاق دے دی اور شام سے ابو موسیٰ اشعری کے نام وکالت نامہ آیا کہ ابن زبیر کی مطلقہ کو اس کے لیے دعوت دے۔

ابو موسیٰ نے اسے اپنا، یزید، ابن عمر اور حسینؑ کا پیغام دیا۔ اور جب مطلقہ ابن زبیر نے حسینؑ کو پسند کیا تو "عداوت امام حسینؑ در دل یزید زیادہ شد"۔ یعنی: امام حسینؑ سے دشمنی یزید کے دل میں زیادہ ہو گئی۔

کتاب الامامۃ میں ہے کہ یزید ارینب بنت اسحٰق کی یاد میں بہت بے قرار تھا۔ آخر اسی حالت میں معاویہ کے پاس گیا۔ بہت سے شکوے شکایت آپس میں ہوئے۔ آخر میں باپ نے بیٹے کو صبر اور راز کے مخفی رکھنے کی تاکید کی

اور اس کے بعد عبداللہ بن سلام یعنی ارینب کے شوہر کو جسے بصرہ کا حاکم مقرر کیا تھا دمشق میں طلب کیا، اور ابوہریرہ اور ابودرداء کو اس پیغام کے ساتھ عبداللہ کے پاس بھیجا کہ میں اس سے اپنی لڑکی کا عقد کرنا چاہتا ہوں اور ادھر اپنی لڑکی سے کہہ دیا کہ جب ابودرداء وغیرہ عبداللہ بن سلام کا پیغام لائیں تو اس کی شرافت و نجابت کا اقرار کرنا، اور ارینب کی طلاق اپنے عقد کی شرط قرار دینا۔ ابوہریرہ وغیرہ نے جب عبداللہ بن سلام سے معاویہ کی خواہش بیان کی تو اس نے بڑی خوشی سے ان لوگوں کو نکاح کر دینے کا وکیل بنایا۔ یہ لوگ بنت معاویہ کے پاس گئے۔ اس نے سکھائی ہوئی باتیں کہیں۔ یہ لوگ پھر عبداللہ کے پاس آئے حال کہا اور انھوں نے فوراً طلاق دیدیا۔ ابوہریرہ اور ابودرداء گواہ ہوئے۔ اور جب ان دو معزز گواہوں نے معاویہ کو طلاق ہو جانے کی اطلاع دی تو اب وہ بہت خفا ہوا اور کہا کہ اگر وہ جلدی نہ کرتا تو بہتر تھا۔ جاؤ پھر کہا جائے گا۔ لڑکی کو بھی ایسا ہی بھجا دیا اور کہلوا بھی دیا کہ تحقیق کی جائے گی، جلدی مناسب نہیں ہے۔ اب معاویہ نے یزید کو صورت معاملہ کی خبر دی اور شام میں معاویہ کے حیلہ کی خبر مشہور ہوگئی۔ اور جب پھر ابن سلام نے اپنے ذکر مشاطہ کو بھیجا تو جواب ملا کہ مشورہ میں کچھ لوگ موافق ہیں اور کچھ ناموافق۔ یہ ہماری طبیعت کے موافق نہیں ہے۔ یہ خبر بھی مشہور ہوئی اور لوگوں نے کہا کہ کس قدر برا ہے وہ شخص جسے خدا بادشاہ بنائے اور اپنی رعایا کو اس کے سپرد کرے وہ ایسا فریب اور دھوکا دے۔ جب عدۃ کا زمانہ تمام ہوا تو معاویہ نے ابودردا کو عراق بھیجا کہ یزید کے لیے ارینب کی خواستگاری کرے۔ ابودردا سے عراق میں پہلے امام حسینؑ سے ملاقات ہوئی اور جب ان کے ورود کی وجہ ظاہر ہوئی تو حسینؑ نے بھی انھیں اپنا وکیل بنایا۔ ابودردا ارینب کے پاس پہنچے اور دونوں پیغام دیے۔ ارینب نے بھی اپنے کو ان کے بھائی کی بیٹی کہہ کر انھیں اپنا وکیل بنایا۔ اور صلاح پوچھی اور انھوں نے مجبوراً کہا کہ "اے بیٹی فرزند رسولؐ ہم کو زیادہ احب ہے کہ خود رسولؐ اللہ کو دیکھا ہے کہ ان کے لبوں کو چومتے تھے۔ لہٰذا تو بھی اپنا لب وہیں رکھ جہاں رسولؐ اللہ لب رکھتے تھے"۔ ارینب نے منظور کیا۔ نکاح ہوا۔ معاویہ کو خبر ہوئی اور جھلاہٹ میں اپنے وکیل کو جو کچھ کہہ سکتا تھا کہا۔ عبداللہ بن سلام نے اپنے زمانہ عقد میں ارینب کو کچھ موتی دیے تھے۔ جب معاویہ کو اپنی کارروائیوں میں ناکامی ہوئی تو ابن سلام کی طرف سے توجہ کم ہوگئی، جس کا نتیجہ افلاس ہوا۔ ابن سلام عراق آیا۔ حسینؑ سے ملاقات کی۔ سارا قصہ بیان کیا۔ حضرت نے سکوت فرمایا، اور اس کے بعد ارینب سے قصہ بیان کیا۔ اور فرمایا کہ وہ تمھارا امداح ہے۔ اگر اس کی امانت ہو تو اسے واپس کر دو۔ ارینب نے تصدیق کی۔ حضرت نے ابن سلام کو خبر دی، اور ساتھ ہی اجازت دی کہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنا مال لے لے۔ ابن سلام گیا۔ ارینب نے موتی سامنے رکھ دیے۔ حسینؑ باہر تشریف لے گئے۔ ابن سلام نے چند موتی معاوضہ میں پیش کیے، اور چیخ کر رونے لگے۔ حسینؑ دونوں کے رونے کی صدا سن کر اندر تشریف لائے اور فرمایا: "ہم خدا کو گواہ کرتے ہیں ہم نے اس عورت کو طلاق دیا، اور وہ خوب جانتا ہے کہ ہم نے بہ خیال حسن و جمال عقد نہیں کیا تھا بلکہ اس خیال سے کہ وہ اصلی شوہر پر حلال ہو جائے۔ خداوندا تو ہمیں اس کا اجر عطا کر"۔ حضرت نے جو کچھ مہر دیا تھا۔ اس میں سے باوجود ابن سلام کے اصرار کے کچھ واپس نہ لیا۔ عدۃ تمام ہونے پر ابن سلام نے پھر عقد کیا۔ دونوں نہایت خوشی و آرام سے رہنے لگے اور یزید محروم رہا"۔

بلاشبہ میں سوچتا ہوں کہ یہ شیکسپیئر کے قابل کمیڈی ہے اور اس قدر قانون طلاق کا لحاظ ہے۔ جس قدر یہ قصہ ہر طرح سچائی کا رنگ لیے ہوئے ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی ایک امر ہے جس سے اس کی سچائی میں اشتباہ ہوتا ہے۔

دوسری زبردست بات یہ ہے کہ معاویہ کے دور ان حکومت میں جو لوگ بصرہ کے عامل مقرر کیے گئے ان کے نام مجھے یہ ملتے ہیں۔ بشر بن ارطاۃ، عبداللہ بن عامر، حرث بن عبداللہ ازدی، زیاد بن سمیہ، عبداللہ بن عمر خیلان اور عبیداللہ بن زیاد۔ عبداللہ بن سلام کا کہیں نام نہیں ہے۔ ابن خلدون کے موافق ایک عبداللہ بن سلام کا سنہ وفات ۴۳ھ ہے۔ یعنی اگر یہ وہی ابن سلام تھے تو زیر بحث قصہ تک زندہ نہ رہے تھے۔ تیسرے دو مؤرخین کا مفید اختلاف۔ لیکن یہ سب باتیں اس خیال کے سامنے بے حقیقت ہیں کہ یہ یزید کے دل میں دشمنی پیدا ہونے کی ایک وجہ بتائی گئی ہے اور اس کی غرض یہ ہے کہ ان فطری اور مسلسل اسباب کو آنکھ سے اوجھل کردے۔ جو شہادت حسینؑ پر منتج ہوسکتے تھے۔ یزید کے گناہ کو اگر دھو نہ سکے تو کم سے کم عاشقانہ رقابت کا خیال دلا کر اس کے جرم کو ہلکا کردے۔ اور اس طرح حسینؑ کے عظیم کارناموں کو خفیف یا دوسرے رنگ میں دکھلانے کے لیے اگر کلی نہیں تو جزی کامیابی ہو اور معاملہ صرف عورت کا رہ جائے جیسا کہ حقیقت میں ایک عیسائی نے مجھ سے کہا۔ صحیح ہے کہ ایک سمجھ دار کے لیے جسے واقعات سے واقفیت ہے یہ واقعہ باوجود صحیح ہونے کے بھی کسی طرح ان وجوہات کے مقابل ہونے کا جثہ نہیں رکھتا جو شہادت حسینؑ پر منتج ہوئے۔ لیکن کسی زمانہ میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جن کے کانوں کی گہرائی کبھی تقین کرنے سے سیری ظاہر کرے۔ یزید کی عداوت کی وجہ واقعہ کی صحت کی حالت میں بھی اپنے کو "وجہ" ہونے کی منزلت سے گرادیتی ہے۔ جبکہ یزید کی تمام کارروائیاں اور خیالات حسینؑ کی حیات میں اور بعد کبھی اسے عداوت کی وجہ ظاہر نہیں کرتے نہ کوئی ہم عصر دیکھنے والا کہتا ہے اور ایسی صورت میں کہ کچھ دنوں کے بعد حسینؑ نے اپنی کریم النفسی سے شوہر اولیٰ کی طرف واپس کردیا۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ حسینؑ کے لیے توجہ ہو جائے اور ابن سلام انتقامی سلسلہ میں نہ آئے۔ حالانکہ یزید نسبتاً کم خوف اور اندیشہ سے اسے قتل کرا کے اپنی خواہش پوری کرسکتا تھا۔ حالانکہ یزید کے دوران حکومت میں کہیں اس کا ذکر نہیں ہے۔ شاید اس متلاشی کی محنت بے کار نہ جائے جو یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ اس روایت کے راوی کس زمانہ تک پہنچتے ہیں اور ابن قتیبہ نے خود کونسی کتابوں سے یہ روایت پائی ہے۔ اور روایت کا ہموار سلسلہ کم سے کم واقعہ کا اس قدر وزن قائم رکھے کا جس کا وہ شایان ہے۔

تلاوتِ قرآن کا طریقہ

اسحاق بن عمار نے روایت کی ہے ابو عبداللہ علیہ السلام سے پوچھا میں نے یا ابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حافظ قرآن ہوں تلاوت اس کی از روئے قرآن کروں یا از ظہر قلب۔ فرمایا: "از روئے مصحف کے (کیا) نہیں سنا تو نے کہ قرآن میں نظر کرنا عبادت ہے"۔ (توضیح مجید فی تنقیح کلام اللہ الحمید)

وجوبِ روزہ کی وجہ

کسی نے حضرت امام حسینؑ سے پوچھا کہ روزہ کیوں واجب کیا گیا فرمایا: اس لیے کہ امیروں کو بھوک کا مزہ معلوم ہو کہ غریبوں پر رحم کریں۔

خدا مرید ہے یا عالم وقادر

کتاب توحید ابن بابویہ میں ہے کہ راوی نے ابی عبداللہ علیہ السلام سے سوال کیا کہ: آیا خدا ہمیشہ مرید (ارادہ کرنے والا) ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ: "مرید نہیں ہوتا ہے مگر یہ کہ مراد اس کے ساتھ ہو۔ بلکہ وہ ہمیشہ عالم اور قادر ہے"۔ (توضیح۔۔۔)

حسینؑ کے خطبہ کے بعض الفاظ میں اثبات وجود باری کے متعلق طریقہ استدلال

سید الشہداء نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا کہ: "سب تعریفیں اس خدا کے لیے زیبا ہیں جو کسی شے سے موجود نہیں ہوا، حدوث اشیاء اس کے ازلی ہونے پر گواہی دینے والی ہیں۔ صنعت کی مضبوطی اس کے نشان کے لیے کافی ہے"۔ دعائے عرفہ میں فرمایا: یا اللہ میں تیری ہی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور تیرے رب ہونے کی گواہی دیتا ہوں اور اقرار کرتا ہوں تیرے ہی طرف ہماری بازگشت ہے۔ تو نے ابتدا کی اپنے بخشش کی قبل اس کے کہ میں موجود تھا (کفایۃ الموحدین)

ہر خیر کی اصل

فضل بن شاذان سے روایت ہے کہ ابی عبداللہ علیہ السّلام نے فرمایا کہ ہم اصل ہیں ہر خیر کی اور ہر نیکی ہماری فرع ہے۔ ازانجملہ توحید، صلوٰۃ، صیام، غصہ کا فرد کرنا، عفو، فقیر پر رحم، ہمسایہ کی مدارات، اور فضلا کا اقرار فضیلت ہے اور ہمارا دشمن اصل ہر شر ہے اور اس کی فروع کل برائیاں ہیں ازانجملہ جھوٹ، بدگوئی، بخل، قطع رحم، سود کھانا، بغیر حق کے یتیم کا مال لینا، خدا کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنا، ظاہر اور باطن فواحش کا مرتکب ہونا۔ ازآں جملہ سرقہ، زنا، اور جو چیزیں کہ اس قسم کی ہوں، وہ شخص جھوٹا ہے جو کہے کہ ہمارے ساتھ ہے درآنحالیکہ وہ ہمارے غیر کی فرع سے تعلق رکھتا ہو"۔ (توضیح ۔۔۔)

خدا اور خیر و شر

ابوبصیر نے حضرت ابوعبداللہ سے روایت کی ہے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ خدا برائی کا حکم دیتا ہے اس نے خدا کی تکذیب کی اور جو شخص کہتا ہے کہ خیر و شر خدا کی طرف سے ہے اس نے خدا کی تکذیب کی۔ (توضیح ۔۔۔)

فقرا مدعو کرتے ہیں

ایک مرتبہ حسینؑ کہیں تشریف لے جا رہے تھے، راستہ میں دیکھا کہ بہت سے فقیر راستہ میں بیٹھے ہوئے کچھ کھا رہے ہیں۔ ان لوگوں نے حسینؑ کو بلایا۔ حسینؑ کمال خلق سے ان کے پاس بیٹھ گئے۔ اور فرمایا: ان اللہ لا یحب المتکبرین ثم قال قد اجبتکم فأجیبونی۔ اس کے بعد آپ سب کو اپنے دولت سرا لے گئے۔ اور سبھوں کے ساتھ رعایت کی۔

حسینؑ کا ایک لقب

صاحب جنات الخلود کے موافق حضرت کی کنیت میں ایک "ابوالمساکین" بھی تھی۔ اس لیے کہ حضرت مساکین اور غرباء پر بے حد لطف فرماتے تھے اور وظائف عطا کرتے تھے۔

پشت اقدس کے نشان کی واقعہ خوانی

بعد شہادت حضرت کی پشت اقدس پر نشان پائے گئے۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السّلام سے دریافت کیا گیا، اور آپ نے فرمایا کہ یہ نشان اس بار کے ہیں جسے پوشیدہ پشت پر رکھ کر یتیموں اور بیواؤں کے گھروں پر پہنچاتے تھے۔ شاعر کہتا ہے۔ ؎

و ان ظہرہا غدا للبر ینقلہ سرا الی اہلہ مکسورا

(وہ پشت اقدس جو فقرا کے لیے راتوں کو صدقات اٹھاتی تھی ایک دن پامال سم اسپان تھی)

اسامہ کا قرض ادا کرتے ہیں

اسامہ بن زید بیمار ہو گئے۔ حسینؑ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اسامہ کی باتوں سے ان کی پریشانی ظاہر ہوئی اور وجہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان پر ساٹھ ہزار درہم قرض ہیں۔ فرمایا: "ہم ادا کردیں گے"۔ اسامہ نے کہا: "یہی خوف ہے کہ آپ ہمارے مرنے کے بعد ادا کریں"۔ یہ سن کر حسینؑ نے اسے فوراً ادا کردیا، اور فرمایا: "بادشاہوں کی خصلت میں سے سب سے زیادہ بری اور ناقابل تعریف بات یہ ہے کہ وہ دشمن سے ڈریں، غریبوں پر سخت دلی سے رحم نہ کریں اور بخل کریں۔

ایک اعرابی کا اثر حسینؑ کی سخاوت سے

کسی اعرابی نے حسینؑ کے سخاوت کی شہرت سنی اور حاضر خدمت ہوا۔ حسینؑ نے قنبر سے دریافت کیا کہ کچھ موجود ہے۔ کہا چار ہزار دینار موجود ہیں۔ فرمایا اسے دیدو۔ جو ہم سے زیادہ مستحق ہے۔ حضرت نے اپنے کو چھپا کر اپنے دست مبارک سے دیا، اور عذر کیا۔ اعرابی رونے لگا۔ حضرت نے سبب پوچھا تو کہا: میں تمہارے ایسے شخص پر روتا ہوں کہ تمہارے زیر خاک چھپنے پر یہ دست جود ناپید ہو جائے گا۔

معلم کی قدردانی

عبدالرحمٰن بن سلمی حسینؑ کے بعض بچوں کے استاد تھے۔ ایک روز جب بچوں نے گھر آکر سبق سنایا تو حسینؑ نے استاد کو ایک ہزار دینار اور حلہ عطا فرمایا۔ کسی نے زیادتی سخاوت پر اعتراض کیا تو فرمایا: "میری مختصر بخشش اس کی کثیر عطا کے ہم پلہ نہیں ہے"۔

حسینؑ اور خوفِ خدا

ایک مرتبہ حسینؑ پیادہ حج کرنے تشریف لے جا رہے تھے اور سواری ساتھ تھی۔ کسی شخص نے کہا: "یا ابن رسول اللہ! آپ بہت خوف خدا کرتے ہیں"۔ فرمایا: "قیامت میں وہ بے خوف نہیں ہے جو دنیا میں نہیں ڈرتا"۔

قلتِ اولاد مشغولیتِ عبادت سے

کسی شخص نے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کی قلت اولاد کے بارہ میں سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ: "مجھے تعجب ہے کہ میں کیونکر پیدا ہوا اس لیے کہ وہ جناب تو شب کو ہزار رکعت نماز ادا فرماتے تھے۔

ایک غلام کیونکر حسینؑ کی وساطت سے آزاد ہوا

حسینؑ فرماتے ہیں کہ: میں نے ایک مرتبہ ایک غلام کو کتے کے ساتھ کچھ کھاتے دیکھا میں نے اس سے سبب پوچھا۔ اس نے کہا: یا ابن رسول اللہ! میں ایک درد رسیدہ ہوں۔ دل خوش کرنے کو اس کتے کے ساتھ کھیل رہا ہوں۔ حسینؑ اسے لیے ہوئے اس کے آقا کے پاس گئے جو یہودی تھا اور دو سو دینار زر رہائی پیش کیا۔ یہودی نے کہا: آپ کی تشریف آوری کے ضمن میں میں نے اسے آزاد کیا۔ اپنا ایک باغ اسے دیا، اور آپ کا روپیہ واپس کرتا ہوں۔ حسینؑ نے فرمایا: میں روپیہ تجھے ہبہ کرتا ہوں۔ یہودی نے قبول کیا۔ لیکن روپیہ بھی غلام کو دیدیا۔ یہودی کی بی بی پر حسینؑ کے رحم و عطا کا یہ اثر ہوا کہ اس نے اپنے شوہر کا مہر معاف کردیا۔ یہودی اور اس کی بی بی مسلمان ہوئی اور شوہر نے اپنا مکان عورت کے نام ہبہ کردیا۔

بخشش موافق معرفت

ایک اعرابی حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا یا ابن رسول اللہؐ میں دیت کا ضامن ہوا ہوں۔ مجھے اس قدر مرحمت فرمائیے۔ فرمایا: اے برادر اعرابی میں تجھ سے تین سوال کروں گا۔ اگر ۱/۳ بتایا تو ۱/۳ زر دیت اور ۲/۳ بتایا تو ۲/۳ اور ۳/۳ بتایا تو کل ادا کردوں گا۔ اس نے عرض کی: یا ابن رسول اللہؐ آپ کا ایسا صاحب علم و شرف مجھ سے پوچھے! فرمایا: نانا رسولؐ نے فرمایا ہے کہ بخشش معرفت کے موافق ہونی چاہیے۔ اس کے بعد پوچھا: فاضل ترین اعمال کیا ہے؟۔ جواب دیا: اقرار توحید۔ پوچھا: کونسی چیز انسان کو ہلاکت سے بچاتی ہے؟۔ جواب دیا: خدا پر بھروسہ۔ پوچھا: کس چیز سے انسان کی زینت ہے؟۔ جواب دیا: علم سے۔ جس میں حلم ملا ہو۔ فرمایا: اگر یہ نہ ہو تو؟۔ کہا: پھر مال اور مروت ہو۔ پوچھا: اگر یہ بھی نہ ہو تو؟۔ کہا: تو فقر میں صبر ہونا چاہیے۔ فرمایا: اگر اس پر بھی قدرت نہ ہو؟۔ کہا: تو ایسا شخص مستحق ہے کہ اس پر بجلی گرے۔ حضرت ہنسے اور اعرابی کو ایک ہزار دینار اور ایک انگوٹھی عنایت کرکے۔ فرمایا: ایک سے دیت ادا کر اور دوسرے کو نفقہ میں صرف کر۔

حسنؑ کا ادب اور ایک فقرہ

حسینؑ حسنؑ کے سامنے ادب سے بات نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا (کاش) اے بھائی آپ کی زبان میری اور میرا قلب آپ کا ہوتا۔

نانا کے انداز اور نقل و حرکت سے حسینؑ کی دلچسپی اور واقفیت

رسالہ البرہان بابت ماہ مارچ ۱۹۳۱ء میں حلیہ مبارک آنحضرتؐ کے فاضل مضمون نگار مولوی خواجہ غلام حسینؑ صاحب پانی پتی نے تحریر فرمایا ہے کہ "ہند بن ابی ہالہ یعنی حضرت امام حسن علیہ السلام کے ماموں حلیہ مبارک بیان کر رہے ہیں۔ اور حضرت سن رہے ہیں"۔ جب یہ حدیث سن چکے تو آپ فرماتے ہیں چند روز تک میں نے اس کا ذکر اپنے بھائی امام حسینؑ سے نہ کیا۔ پھر جب میں نے ان سے یہ حدیث بیان کی تو معلوم ہوا کہ وہ پہلے ہی اس کی تحقیق کر چکے تھے، اور جو بات میں نے دریافت کی تھی وہ خود اس کو دریافت کر چکے تھے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے والد بزرگوار سے آنحضرتؐ کے مدخل (گھر میں تشریف لانے) اور مخرج (گھر سے باہر تشریف لے جانے) اور شکل (طرز روش) کا کل حال دریافت کرلیا تھا۔ کوئی بات باقی نہ چھوڑی تھی۔ اس کے بعد فاضل مضمون نگار نے خود حضرت امام حسینؑ سے روایت فرمائی ہے کہ وہ حضرت اپنے پدر بزرگوار سے آنحضرتؐ کے مدخل مخرج اور مجلس کا حال دریافت فرماتے ہیں اور جناب امیرؑ ہر جگہ کی حالت کو بہ تفصیل ارشاد فرماتے ہیں۔

کبر یا عزت

کسی نے حضرت کو کبر سے نسبت دی۔ فرمایا: کبر خدا کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ لیکن خدا فرماتا ہے کہ: "عزت مومنین اور رسولؐ کے لیے ہے"۔

مروان کو عملی دلیل دکھائی گئی

ایک دن مروان نے حضرت سے کہا کہ اگر فاطمہ (علیہا السلام) تمہارے لیے باعث فخر نہ ہوتیں تو پھر تم کس سے فخر کرتے۔

حضرت نے ہاتھ بڑھا کر مروان کا ٹینٹوا پکڑا اور زمین دکھا کر فرمایا: اگر جواب ہو گیا ہو تو تصدیق کر۔

معاویہ کے دورہ کے زمانہ میں ایک سائل آیا اور اس نے سوال کیا۔ معاویہ نے حسینؑ سے صلاح کی اور آپ نے سفارش کی۔ معاویہ نے کچھ دیا، اس پر اعرابی نے شعر پڑھے جو ان کے آبائے طاہرین اور ان کی مدح پر مشتمل تھے۔

اشعار سن کر معاویہ نے کہا کہ: دیا ہم نے اور تو حسینؑ کی تعریف کرتا ہے۔ اس نے جواب دیا: تو نے ان کا حق غصب کیا اور ان کی سفارش سے بخشش کی۔

مروان بن حکم نے اپنے دورِ حکومت میں فرزدق شاعر کو نکلوا دیا۔ جب یہ حسینؑ کے پاس آیا تو آپ نے اسے چار ہزار دینار عطا فرمائے۔ جب مروان کو معلوم ہوا تو اس نے آپ سے کہا: یا ابن رسول اللہؐ! ایک دروغ گو شاعر کو اس قدر عطا کی ضرورت نہ تھی۔ فرمایا: بہترین مال وہ ہے جس کی عطا سے عزت محفوظ رہے۔ رسولؐ نے بھی عباس بن مرداس کو اس کی زبان سے محفوظ رہنے کے لیے کچھ عطا فرمایا تھا۔

حضرت کا قول ہے کہ: "دنیا کے لوگ مال کے بندے ہیں، اور دین ان کی زبان پر ایک مُہمل لفظ ہے۔ جب تک دین سے ان کی معاش حاصل ہے، اس وقت تک اس کے گرد رہتے ہیں، مگر جب آزمائش کے لیے خالص کیے جاتے ہیں اس وقت دین دار کم رہ جاتے ہیں"۔ (اخلاق حسینی)

روایت ہے کہ حضرت کے زمانہ میں مدینہ میں کوئی ایسا مسکین نہ تھا جسے حضرت سے وظیفہ نہ ملتا ہو۔ (جنات الخلود)

جناب امیرؑ اور طاہرہؑ کے اوقاف اور حسینؑ

حضرت امام حسنؑ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسینؑ از روئے وصیت ان اوقاف کے متولی ہوئے جو جناب امیرؑ اور حضرت فاطمہؑ زہرا نے کیے تھے۔

انگوٹھی کا نقش

حضرت کی انگوٹھی پر نقش تھا کہ: "ان اللہ بالغ امرہ"۔ (خدا اپنے حکم کا خود بجا لانے والا ہے) یا "ثقتی باللہ" (میرا بھروسا خدا پر ہے)

عدد اولاد

بقولے چار لڑکے اور دو لڑکیاں۔ بقولے چھ لڑکے اور دو لڑکیاں۔ بقولے چھ لڑکے اور چار لڑکیاں۔

علیؑ اکبر، لیلیٰ بنت ابی مرہ سے، علیؑ اوسط ملقب بہ امام زین العابدین شاہ زنان سے، علیؑ اصغر ماں کا نام معلوم نہیں۔ محمد ماں معلوم نہیں۔ جعفر اور عبداللہ رباب بنت امرا القیس سے تھے۔ فاطمہ ام اسحٰق سے۔ زینب ماں کا نام معلوم نہیں۔ ایک اور لڑکی ماں کا نام معلوم نہیں۔ (جنات الخلود)

تاریخ خمیس کے موافق حضرت کی اولاد کے نام: علیؑ اکبر، علیؑ اصغر، جعفرؑ، فاطمہؑ اور سکینہؑ ہیں۔ یہی مورخ ذخائر العقبیٰ سے چھ بیٹے تین بیٹیاں لکھتا ہے۔ علیؑ اکبر، علیؑ اصغر، علیؑ زین العابدین، محمدؑ، عبد اللہؑ، جعفرؑ، زینبؑ، سکینہؑ، فاطمہؑ۔

زوجات

سوائے کنیزانِ خاصہ کے تمام عمر میں پانچ عقد کیے۔ شہر بانو بنت یزدجرد، لیلیٰ بنت ابی مرہ بن عروہ بن مسعود ثقفیہ، رباب بنت امرا القیس بن عدی کلبیہ، ام اسحٰق بنت عبداللہ تمیمہ، قضاعیہ (باپ کا نام معلوم نہیں) (جنات الخلود)

بابِ ششم کا نشو

امیر شام جنگ کرنے کی غرض ظاہر کرتا ہے

ان باتوں کے کہنے کے بعد جن کا گزشتہ ابواب سے تعلق تھا ہم اب اس کے ایسے نشو پر پہنچے ہیں جس کی صورت حال ابن ابی الحدید کی اس روایت سے بہت اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے جسے میں بکار سے نقل کرتا ہوں کہ معاویہ نے نخیلہ میں خطبہ دیا اور اس میں کہا: "خدا کی قسم میں نے تم سے اس امر پر مقاتلہ نہیں کیا کہ تم نماز پڑھو اور نہ اس لیے کہ روزہ رکھو اور نہ اس لیے کہ تم حج کرو اور نہ اس لیے کہ زکوٰۃ دو۔ کیونکہ یہ امور سب تم بجالاتے ہو۔ بلکہ میں نے تم سے اس لیے مقاتلہ کیا کہ تم پر امیر ہو جاؤں"۔ ابن خلدون ۸۰۸ھ میں بنی امیہ کے متعلق لکھتا ہے کہ: "یہ وہ زمانہ تھا کہ لوگ شانِ نبوت اور اور خوارق کو بھلا کر قومی حمیت اور غلبہ پر آرہے تھے اور یہ بات کل عرب اور مصر پر بنو امیہ کو حاصل تھی"۔

معاویہ کے پیشتر مصلحت کی مماثلت

کیا اگر بنی امیہ کی جنگ اپنے امارت کے قبول کرانے کے لیے تھی اور رسومات دین کی بجا آوری کے لیے نہ تھی تو میں غور کرتا ہوں کہ معاویہ کے پیشرو لوگوں کے بعض افعال امورات شریعت کے قیام کے لیے تھے؟۔ کیا وہ لوگ قتل نہیں کیے گئے جنھیں اصحاب رسولؐ نے قتل ہونے کے قبل نماز پڑھتے دیکھا اور اذان دیتے سنا تھا۔ کیا مانعین زکوٰۃ اصولاً ادائے زکوٰۃ کے مخالف تھے اور شریعت میں ترمیم کرنا چاہتے تھے؟ نہیں وہ خود ساختہ امتیاز کی مخالفت کر رہے تھے جسے نہ جمہور نے کسی کو عطا کیا تھا اور نہ ان کے مستند رہنما نے اسے آئندہ کا امام قرار دیا تھا جس نے اس علم پر ان کے قتل کرنے کے لیے فوجیں روانہ کی تھیں کہ وہ "ہمیں" خلیفہ تسلیم نہیں کرتے ہیں۔

علامہ سید رشید رضا کی متعلق تقریر

اسی موقع پر علامہ سید رشید رضا ایڈیٹر "المنار" کی تقریر کے ایک جزو کا پیوند لگانا چاہتا ہوں جو انھوں نے ندوہ ۱۹۱۲ء کے جلسہ میں فرمائی تھی۔ مجھے ان کی تقریر کے موقع کا لحاظ ہے اور ان کی احتیاط کا معترف ہوں، جہاں وہ فرماتے ہیں: "اگر" ہم اس موقع پر خلفاء راشدین کی حکومت سے قطع نظر کریں کیونکہ وہ پیغمبر اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے جانشین تھے اور ان پر ہم دیگر حکومتوں کو قیاس نہیں کر سکتے تو "کم سے کم" بنی امیہ اور عباسیوں کی حکومتوں کو تو پیش نظر لا سکتے ہیں۔ بلاشبہ یہ دونوں حکومتیں قانون اور انتظام کے لحاظ سے رعایا پر سب سے زیادہ مہربان اور فیاض تھیں مگر دیکھو کہ انھوں نے ان اشخاص کے ساتھ کیا جابرانہ برتاؤ کیا جو ان کے اقتدار کے مخالف تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے آلِ رسولؐ (علیہ السلام) کو ذبح کرنے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ اور "آلِ نبیؐ" میں سے جس کو جہاں پاتے تھے اس "وہم" سے کہ "مبادا" وہ ان کی حکومت میں خلل انداز ہوں "بے تکلف" قتل کر ڈالتے تھے"۔ اس تقریر کے الفاظ "اگر"

"کم سے کم" "آلِ نبی" "وہم" "مبادا" "بے تکلف" اپنی آپ ہی شرح ہیں۔

وہ کڑی جو بنی تیم اور بنی امیہ کی مصلحت کو جوڑتی ہے

حضرت امام حسن علیہ السّلام نے مغیرہ بن شعبہ کے متعلق یہ فرمانے کا موقع پایا تھا کہ وہ "اِسلام کو ہلاک کرتا رہا"۔ ہم نے احتیاط کی ہے کہ مغیرہ بن شعبہ کے اساس مصلحت کو لکھتے ہیں۔ اور یہ دکھاتے آئیں کہ وہ کونسے لوگ تھے جنھیں ان ذات شریف سے صلاحیں لینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور سچائی کو اپنی صورت دکھائی تھی کہ اس کی بھی مثال ملتی کہ اور وہ کون تھا جس نے اسلام کے اس ہلاک کرنے والے کی صلاح قبول نہ کی۔ اگر یک جہتی مصلحت اور اتحاد غرض سے چشم پوشی بھی کی جائے تو یہ امر خیال کرنے کے قابل ہوگا کہ گزشتہ تین دور اور بنی امیہ کے حصول اختیار میں مغیرہ بن شعبہ کی ذات نہ صرف جوڑنے والی کڑی تھی بلکہ اس کی دونوں میں شرکت ایک چیز تھی جو ان دونوں حکومتوں میں قوی مماثلت کے قرائن سے پر تھی اور یہ تو صاف ظاہر ہے کہ قرون ثلاثہ کی مصلحت بنی امیہ کو وراثت میں ملی تھی۔

بنی امیہ کو قُرون ثلاثہ کی مصلحت ورثہ میں ملی تھی

میں نے کہا ہے کہ قرون ثلاثہ کی مصلحت بنی امیہ کو وراثت میں ملی تھی۔ یہ اس خیال سے ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ بنی ہاشم صاحب اختیار ہو جا سکتے بنی امیہ خاموش تھے اور بنی عدی یا تیم اس کے خلاف ایک مصلحت کے موجد ہوئے اور جب سے انھوں نے بنی امیہ کو اپنے لیے خریدا بنی امیہ اپنے اس اظہار خیال سے باز آئے کہ بنی عدی اور تیم قریش میں کوئی ذی اثر قبیلہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ اب بنی ہاشم کے خلاف انھیں (عدی و تیم کو) اپنی جگہ مضبوط کرنے لگے اور انھیں (بنی امیہ کو) خود اپنے لیے کھڑے ہونے کی جگہ مل گئی اور آئندہ تجربہ نے بتایا کہ ہم بنی ہاشم کے دل نشین تقدس اور عظمت کے مقابل اگر ٹھہر سکتے ہیں تو اس مصلحت کی پیروی سے جو ہمارے بحال کرنے والے کرگئے' لاز ماً بنی امیہ جب تک بنی عدی اور تیم کے ماتحت رہے نہ انھیں شہنشاہی کے بڑے مصالح خود گھڑنے پڑے اور نہ وہ بنی ہاشم کے متعلق مصلحت کی اس صورت میں زیادہ پر جوش ہو سکے جس قدر موقع کی مصلحت کے لحاظ سے بنی عدی اور تیم نے سختی جائز رکھی تھی بلکہ بنی ہاشم کی دفعۃً بے دست و پائی اور عدی و تیم کی قوت کے باوجود نا مقبولیت کے خوف نے غیر محتاط سختی سے آپس میں ایک یہ سمجھوتا کر دیا کہ نہ تم ہمارے اختیار کے خلاف کوشش کرو اور نہ ہم تمھیں آئندہ کسی مزید آزمائش کی تکلیف دیں۔ یہ مصلحت معاویہ کے زمانہ تک قائم رہی' اگرچہ دور ثالث یعنی بنی امیہ کے عود اختیار سے جو کرخت تحرک ہو سکتا تھا اس کا تذکرہ کیا گیا۔

قرونِ ثلاثہ کی مصلحت بھی بنی امیہ کے جوشِ عداوت کا ورثہ تھی

لیکن یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قرون ثلاثہ کی مصلحت ورثہ تھی بنی امیہ کے اس جوشِ عداوت کا جو حصول اختیار کے لیے تھا۔ ممکن ہے کہ بنی امیہ کی عداوت میں جو انھیں نبی برحق سے تھی مذہبی عنصر کا بھی کوئی جزو ہو لیکن بنی امیہ اور بنی ہاشم کی عداوت نبی عربی کی بعثت سے بہت قبل کی تھی جس میں مذہب کا کوئی جزو نہ تھا۔ بلکہ اگر تھا تو نام اور نمود کا جس نے امیہ کی اولاد میں حسد پیدا کیا' اور وہ برابر بنی ہاشم کی بیخ کنی میں مبتلا

رہے۔ نہ بنی امیہ اسلام کے لیے اسلام لائے اور نہ کبھی اسلام کے سیاسی اقتدار کی ذرا سی لغزش دیکھ کر انھیں طنز کرنے میں تکلف ہوا اور عثمان کے خلیفہ ہوتے ہی ابوسفیان جیسے بیں چیخا جو اسے کہنا تھا۔ یہ اس کی تمام ساخت تمام فطرت اور تمام خیال کا آئینہ تھا۔

عداوت اور بے لحاظی کی انتہا

اور ہم ایک موقع پر پہنچنے والے ہیں جہاں یہ کہا جائے گا کہ: " بنی ہاشم نے ملک کے ساتھ کھیل کھیلا نہ کوئی خبر آئی تھی نہ وحی نازل ہوئی تھی"۔ ہم میں سے بعض سوچ سکتے ہیں کہ یہ ایک اظہارِ خیال ہے جس سے مذہب کی بوسخت ترین احتیاط بلکہ دشمنی کے طنز سے دُور کی گئی ہے۔ لیکن کوئی کہہ سکتا ہے کہ سیاسی حیثیت سے اس کی بے تمیزی ظاہر ہے۔ جس میں اس کا لحاظ نہیں کیا گیا کہ سننے والے کون تھے لیکن میں ان دونوں باتوں سے الگ سوچتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ موقع آیا تھا جس میں لوگ اس درجہ دینی حرارت سے خالی ہو گئے تھے کہ وہ اپنے قومی مذہب کی ایسی سخت جھنجوڑ پر بھی اپنے کو بے حس پاتے۔

اس کے نشوو پر نظر

یہ خالی ہونا ایک دن کا کام نہ تھا۔ ان کا یہ حس اس وقت ضائع نہیں ہوا تھا جس وقت یہ انتہاء پسند فقرہ کہا گیا بلکہ ان کے حس کا ضعف اس وقت سے شروع ہوا تھا جس وقت سے انھوں نے یا ان کے آباو اجداد نے اسے گوارا کر لیا تھا کہ اپنے ہر طرح کے محسن کے آخری فرض کے ادا کرنے کے قبل ہم اپنا موقع طے کر لیں۔ نہ ہو کہ اس کے دفن کے ساتھ ہماری آرزوئیں دفن ہو جائیں۔ اور کیا یہ اس کے قبل ہو سکتا تھا جب تک وہ اپنے محسن کے ان تمام اقوال کو جو عدم خود غرضی اور عدم موقع بینی کا سبق سکھاتے ہوں اپنی توجہ اور اطاعت کے شایان نہ سمجھتے ہوں؟۔ جماعت انسانی کا کوئی عاجز اور دنی الطبع انسان ذلت کا پہلا بت نہیں ہے، بلکہ وہ ایسے اتفاقات میں بسر کر چکا ہے کہ زمانہ نے اسے اپنی قوتوں کو اس طرح صرف نہ کرنے دیا جس طرح وہ پیدا ہوا تھا۔ اور جس طرح اس کے نشو کا فطری اقتضا تھا بلکہ وہ ایسے بوجھ سے دبا تھا کہ ہل نہ سکتا۔ اور اگر چلنے کی راہ بھی پاتا تو ایسے راستوں سے جو اس سے بہتر موقع کے کسی نفس کے لیے ذلت کی انتہا ہوتی۔ تم چاہتے ہو کہ گھنا بیج اچھا درخت اگائے۔ اور شاید یہ بھی تمھارے مشاہدہ یا کمی تجربہ میں ہو کہ ضعیف البصر باپ کا فرزند بھی ضعیف البصر اور بہرے باپ کا بیٹا بھی اکثر بہرا ہوا ہے۔ یا بسا اوقات بیٹا اپنے ماں باپ کے امراض وراثۃً پاتا ہے۔ تم نے کب خدا کا قانون یہ دیکھا ہے کہ لونڈی نے شیر کا بچہ جنا ہو۔ میں اس سے اِنکار نہیں کر سکتا کہ اگر کسی شجاع قوم سے جرأت کا احساس دُور کیا جا سکتا ہے تو بودی قوم، یا وہ جو جرأت کھو چکی ہے، کیوں نہ شجاع بنائی جا سکتی ہو۔

اور کیا یہ اِنسانی تجربہ میں ہے کہ کوئی شخص کسی امر میں فوراً انتہا پسند ہو جائے، جب تک کچھ وقت اُسے ہنکاتا ہوا ایک جگہ قائم نہ کر دے۔ وہ شخص جو یہ کہہ سکتا تھا کہ بنی ہاشم نے ملک کے ساتھ کھیل کیا، وہ تخت شاہی پر تھا۔ اس نے اپنے پہلے بادشاہ کے طرزِ عمل کو دیکھا تھا۔ اور وہ روایتیں اور ترکیبیں سنی اور دیکھی تھیں جو اس کے پیشروؤں نے اپنے کو اپنی جگہ مضبوط کرنے کے لیے کی تھیں اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ذاتی منفعت یا احتیاط کی مصلحت نے لوگوں کو بھی اپنی جگہ پر رکھا۔ اور اب نسبتہً اس آب و ہوا میں پرورش پاتے ہوئے اس قدر زیادہ زمانہ گزرا ہے کہ کسی مخالف اِحساس کے پیدا ہونے کی امید نہیں ہے۔ یعنی اس کی جرأت لوگوں کے مُردہ اِحساس پر مبنی تھی۔

اور اگر یہ انتہا پسندانہ بے تمیزی تھی تو اس کے قبل اعتدال کے زمانہ میں کیا ایسی باتیں نہ گزری تھیں جو ایک ذکی الحس کے لیے اینٹھنے کو ناکافی ہوتیں؟۔ نام اور غرض بھول جاؤ اگر چاہو لیکن کون سے مراحل باقی تھے جو طے ہونے سے بچ رہے تھے۔ آج سے کچھ ہی قبل تک ایسی صدا آ سکتی تھی کہ رسولؐ، سیدۃ النساءؑ اور ولایت مآبؑ کے دفن میں شرکت نہ ہونے سے شرم اور انابت کی دلیل سنائی دے۔ اور لوگ سمجھیں کہ علیؑ اور فاطمہؑ نے ہمیں شرکت تجہیز و تکفین کے قابل نہ سمجھا وہ اس لیے ہو کہ ہم نے ان کے ساتھ تجاہل جائز رکھا تھا یا اس لیے کہ ہم ان کی کار گردگی کے دیکھنے میں الجھے ہوئے تھے۔ جنھوں نے دفن رسولؐ پر بعض سرگرمیوں کو مقدم رکھا۔ لیکن ہمارے زیر تبصرہ باب میں واقعات کا نشو اس طرح ہو رہا تھا کہ نبیؐ کے نواسہ کا دفن ایک عبرت ناک تاریخی واقعہ ہو جاتا۔ اور اس سے کہیں بڑھ کر واقعات تو ابھی باقی ہیں۔ صرف مدارج اور مراتب کو زیر نظر رکھو۔

علیؑ و فاطمہؑ کا فرزند (جو اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۶۸ : ۴) کے مصداق کا فرزند تسلیم کیا جاتا، اگر لڑکے سے مراد ذات و صفات کے فطری انتقال کا سلسلہ ہے، جو خود بھی اپنے خلق کے لیے مشہور ہوتا) اس کا قائم مقام ہوا جس نے فرمایا تھا کہ: "مجھے صلح سب سے زیادہ محبوب ہے"۔ اس سرچشمہ شرافت و تہذیب (حسنؑ) نے اپنی عمر میں ایک مرتبہ جو سب سے سخت جملہ استعمال کیا وہ یہ تھا کہ: "تیرے لیے میرے پاس بجز ذلت سکے کچھ نہیں ہے"۔

حسنؑ اور ان کا موقع

لیکن رسولؐ کا قائم مقام اس قوم کا امام ہوا جس سے اسے شکایت تھی۔ "جس کے مثل متقدمین نے نہ دیکھا تھا اور متاخرین جیسا نہ دیکھیں گے"۔ حسنؑ نے اپنی آنکھوں سے اس قوم کے بہت سے انداز دیکھے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ اسے اگر کچھ پسند ہے تو روپیہ اور احتیاطاً اسے کچھ غم نہیں ہے کہ تم بہ حیثیت رہنما ہونے کے اپنی روش میں حق کی پیروی کرو یا حق کا خلاف جاؤ لیکن ہمارا شکم تمھاری آنکھوں سے اوجھل نہ ہو۔ حسنؑ کو تجربہ تھا کہ کس طرح عین فتح کے وقت یہ لوگ پھر جا سکتے ہیں بلکہ دشمن کے حوالہ کر دینے کی دھمکیاں دے سکتے ہیں۔ خوفناک ہوگا وہ وقت جب ان کے ساتھ شکست ہوا! پھر بھی یہ تو دور پہنچے ہوئے زمانہ کا قصہ تھا۔ حسنؑ اپنے کو اس وقت کون سے عناصر میں گھرا ہوا دیکھتے تھے اور وہ کس درجہ امید افزا یا ہمت شکن تھا۔ پرانے دشمن نے قصہ حکم کے بعد "بیعت خلافت" لی تھی یا کم سے کم جناب امیرؑ کی شہادت کی خبر سن کر اپنے کو "امیرالمومنین" مشہور کیا۔ اپنی بیعت خلافت ہو رہی ہے۔ قیس بن سعد جوش وفاداری میں بیعت کرتے وقت "قتال ملحدین" کی شرط کا عام مجمع میں نام لیتے ہیں۔ امام تفصیل کو احتیاطاً سے دور سمجھ کر روک دیتے ہیں کہ "کتاب خدا و سنت رسولؐ میں دیگر شرائط بھی شامل ہیں"۔ یقیناً اس خیال سے کہ جب تک قیس کے علاوہ اور لوگوں کا میلان اور آمادگی ظاہر نہ ہو لے اس وقت تک ایسی کسی شرط کا اعلان مصلحت کے خلاف ہے۔ اس سے ہم تیار دشمن کو اور تیاری کا موقع دیں گے بلکہ وہ ہماری تیاری کے قبل پیش قدمی کر سکتا ہے، درانحالیکہ ہم اس کے دفاع تک کے لیے اپنے پاس سامان نہ دیکھیں۔ اور قوم کے غیر قائم متانت اور ہلکے فیصلہ پر غور کرو کہ اسے یہ احتیاط اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ کیا اس لیے کہ وہ جوش جنگ سے بھری ہوئی تھی؟ یہی تو نہ تھا۔ ایسے نہ صرف صفین کے بعد کی تاریخ، قوم کے موجودہ افراد کی ترکیب، حسنؑ کے ساتھ معاملت، ان کا سوال، اس کا جواب، حسنؑ کا تصفیہ یہ بھانپے بغیر نہیں رہتا کہ قوم کے قومی حس میں گھن لگ گیا تھا۔ غیرت اور حمیت کی جگہ روپیہ اس کی نگاہوں کے

سامنے تھا، اور ذلیل زندگی انھیں میدان جنگ کی پر افتخار موت سے زیادہ پسند آنے لگی تھی۔ حیات کا یہ نسخہ قومی ہوش اور خصوصیات سے خارج ہو گیا تھا کہ: "جنت تلواروں کے سایہ میں ہے"۔ قومی خیال اور اعلیٰ حوصلوں کا کوئی مرکز نہ رہا تھا، اور اپنے قومی وقار اور غرور کی قیمت بھول گئے تھے۔ کوئی چمکتی ہوئی چیز دکھا دو وہ اس کے پیچھے ہیں۔ کہیں ظاہری شان کا ڈھیر ہو اور ان کی حریص زبان چاٹ لینے کو لپکتی ہے اور غلامانہ ذلیل انداز دور سے بلائیں لے رہی ہیں۔ کوئی اس قوم سے پوچھتا کہ آخر وہ چاہتی کیا تھی کہ جب اسے جنگ کے لیے بلایا جاتا تھا تو موت کا ایسا سکوت اس کی ہر سانس سے پیدا ہو تا تھا، اور جب ملامت کے طنز سے کہا جاتا تھا کہ اگر تم جنگ کے لیے آمادہ نہیں ہو تو میں تمھیں ایسی بات پر مجبور نہیں کرتا جس سے تمھیں کراہت ہے تو وہ اس بچھونے تک کو لوٹ لیتے تھے جس پر ان کا امام بیٹھا ہو۔ نتیجہ دونوں کو معلوم تھا کہ جنگ کے وقت جنگ نہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے اور اس جواب کو سنو جو انھوں نے دیا۔ کوئی تسکین نہیں دیتا، کوئی جلن دینے والا دکھائی نہیں دیتا۔ کوئی لفظ ایسا نہیں سنائی دیتا جس میں ہمت کی گرمی ہو۔ جواب یہ ہے کہ ان کی آنکھیں چیزیں تلاش کرتی ہیں جو وہ لے جاسکتے ہوں۔ انھیں یہ خیال نہیں ہوا کہ وہ یہ دیکھتے کہ ایسے وقت اپنے اقتدار کی حفاظت اور ذلت سے بچنے کے لیے ہمارے پاس تلوار ہے یا نہیں۔ انھیں اقتدار اور ذلت سے کیا بحث تھی۔ انھیں مال اور چیز کی ضرورت تھی۔ انھوں نے وہ بساط نہیں کھینچی تھی جس پر رسولؐ کا نواسہ بیٹھا تھا۔ وہ بچا رہے تھے کہ دین کا اقتدار ہم الٹ رہے ہیں۔ کیوں۔ اس لیے کہ کچھ پا جائیں۔

حسنؑ ایسے مجبور رہے تھے۔ ان کے لیے ذلت تھی کہ وہ اپنے کو ایسی قوم کا امام کہتے۔ کہاں ہے وہ سپہ سالار جو اس ذلیل مواد کو سپاہیوں کی فوج کہتا۔ کون ہے وہ جارح جو یہ سوال کرتا ہے کہ حسنؑ نے جنگ کیوں نہ کی۔ مانا کہ قیس بن سعد کے ماتحتی میں بارہ ہزار سپاہی تھے اور دشمن کی فوج جو روانہ ہوئی؟ ساٹھ ہزار تھی۔ اور خبریں ہیں کہ قیس محاصرہ میں آگئے تھے۔ ان کا محاصرہ میں آجانا نہ ان کی فوجی غلطی تھی اور نہ دشمن کی کوئی تعریف۔ پھر بھی شجاعت اور وفاداری کے اس روشن چراغ نے اپنے گروہ اور اپنے وقار کو محفوظ رکھا جو کسی کمزور دل یا حریص سے ہر طرح ممکن تھا کہ یا وہ دشمن کی کثرت اور یا دولت سے مرعوب اور مغلوب ہو جاتا۔ کمزور طبیعت موقع بین مدبر ابن عباس اپنے کو اپنے قومی استقلال کے درجہ سے گرا دیتا ہے لیکن مشہور انصاری اپنے عہد اور خلوص کو نہیں بھولتا۔ یہ قیس کی ذات تھی جس نے معاویہ پر اس درجہ اثر کیا کہ اس نے باوجود اس کے کہ اس کی فوج پانچ گنی زیادہ تھی اور مزید کمک کی امید کرسکتا تھا۔ لیکن پھر بھی جنگ چھیڑنے کی جرأت نہ کی۔ بلکہ ایک دوسری فوج حسنؑ کی طرف روانہ کی۔ امید کی جاسکتی تھی کہ اگر بارہ ہزار سپاہی شام کے ساٹھ ہزار سپاہیوں کو مستعد جنگ نہ کرسکتے تھے تو امام کا اصل فوجی مرکز شام کی تمام فوجی قوت کا آسانی سے مقابلہ کرسکتا تھا، اور چونکہ اس وقت تک ایسے پر زعم طمرانہ خیال نہ پیدا ہوئے تھے کہ "خدا سب سے بڑے دستہ فوج کی طرف ہے" بلکہ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً (۲: ۲۵۰) کو جانتے تھے۔ غالب قرینہ تھا کہ امیر شام اپنے گھر کا راستہ آسانی سے لیتا۔ یہ سب کچھ تخئیلاً ہے لیکن لوگ کہاں تھے۔ جنھیں یہ یاد ہوتا۔ وہ تو ان خبروں کے سننے کے عادی ہو گئے تھے کہ امیر شام نے بغیر نکسیر پھوٹے یمن، عراق، بصرہ، اور جزیرہ پر قبضہ کرلیا۔ نہ انھیں کروٹ لینے کی ضرورت تھی کہ ہم اپنے ان مقامات کو محفوظ اور واپس کریں، نہ اس کا غم تھا کہ ہم بقیہ کی فکر کریں، وہ ابن عامر کی تقریر سنتے ہیں اور منتشر

ہونا شروع ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ امام مدائن کی واپسی پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ ران میں نیزہ کا زخم کھانے کے بعد اگر ربیعہ اور ہمدان حفاظت کے لیے کھڑے نہ ہو جائیں تو آج ہی ہماری شہادت میں کوئی شبہ نہیں۔

اور جب امیر شام جناب امیرؑ کے معتمد دوستوں کو پھلجڑی چھوٹنے کا تماشہ دکھا سکتا تھا جس سے سفید اور زرد رنگ کے پھول گرتے وہ دیکھتے یا نہ دیکھتے تو اب تو معاویہ کو اپنی اس مصلحت میں کافی تجربہ ہو چکا تھا، اور بقول علامہ مجلسی: "حضرت (حسنؑ) کے ساتھ کوئی ایسا شخص کہ جس کے فریبوں سے حضرت مامون ہوں باقی نہ رہا، مگر مخصوص شیعہ ان کے پدر بزرگوار کے اور خود آنجناب کے اور وہ ایسے قلیل تھے کہ مقاومت لشکران شام کی نہ کر سکتے تھے"۔ اور اطمینان دیکھو امیر شام کا کہ اب اسے ایسے صیغہ راز کے کاغذات کو چھپانے کی بھی ضرورت نہیں ہے جس میں لوگ حسنؑ کو غفلت سے قتل کر ڈالنے یا سپرد کر دینے کو لکھتے ہیں۔ اس لیے کہ چھپانے کی تو اس وقت ضرورت ہوتی ہے جس وقت یہ اندیشہ ہو کہ نہ چھپانے سے ہماری غرض میں کامیابی نہ ہوگی۔ اس کے برعکس وہ لوگ معلوم نہ تھے جو حسنؑ کی حفاظت کر سکتے۔ اب اس کے بعد ان بے وفائی کے اسناد کا حسنؑ کے پاس بھیجنا کسی طرح معاویہ کی سیاسی غلطی نہ تھی۔ بلکہ بجائے خود ایک سیاسی اقدام تھا جس سے حسنؑ میں یاس اور شبہ پیدا کر سکتا۔

صلح حسنؑ پر نظر

اب حسنؑ کیا کر سکتے تھے؟۔ جہاں تک واقعات کی بنا پر رائے قائم کی جا سکتی ہے حسنؑ کے لیے دو راستے تھے۔ ایک یہ کہ اپنے لا معلوم یا معلوم چند دوستوں کے بھروسے پر تلوار ہاتھ میں لیتے اور برابر جنگ کرتے رہتے۔ یہاں تک کہ یا تو ان کا مختصر گروہ نیست و نابود ہو جاتا اور یا یہ معاویہ کو متواتر شکستیں دے کر ملک کا کوئی حصہ اپنے لیے مخصوص کر لیتے اور یا لڑتے لڑتے ایک لا معلوم طویل زمانہ کے بعد جب کہ حسنؑ اور معاویہ ہوتے یا نہ ہوتے حسنؑ کے قائم مقام اپنے کو والی امر دیکھتے۔ لیکن ان تمام باتوں کا جواب کیا حسنؑ کے اس مخاطبہ میں نہیں ہے جو اہل عراق سے فرماتے ہیں جس سے صاف لفظوں کا حالت بیان کرنے کے لیے تلاش کرنا غیر ضروری ہے کہ: "معاویہ نے ایک امر پیش کیا ہے جس میں نہ تو عزت ہے اور نہ انصاف۔ پس اگر تم موت پر راضی ہو تو ہم اس امر کو قبول نہ کریں اور ان سے اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر تیز تلواروں سے محاکمہ کریں اور اگر زندگی کو دوست رکھتے ہو تو ہم اس کو قبول کر لیں اور تمہارے لیے خوشنودی حاصل کریں"۔

صلح اور جنگ کا تصفیہ

قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ایک ایسا مجمع ہو جس میں تمام تر دوست یا تمام تر دشمن ہوں۔ بلکہ کم ہی سہی لیکن کچھ ایسے ہوں گے جنھیں ان کے حقوق کی حمایت پسند ہوگی لیکن وہ اس خیال سے کیوں نہ ہو کہ زیادہ تر کو خاموش دیکھ کر بولنے کی جرأت نہ کر سکے۔ کم سے کم اپنی خاموشی سے صلح اور جنگ کے مسئلہ کا فیصلہ کر رہے تھے۔ اور جو بولے بھی وہ یہ کہ "صلح قائم رکھیے!"۔

آزادی اور غلامی کا تصفیہ

آگے بڑھو اور اس شجاع افسر قیس بن سعد کے مخاطبہ پر غور کرو جس کا جواب بھی یہ نہیں دیا گیا کہ ہم لڑیں گے، بلکہ امام گمراہ کی اطاعت کریں گے۔ اس لیے کہ بجائے قتل ہونے کے اپنے مال اور عیال کی محبت تھی۔ یہاں قوم اپنی آزادی اور غلامی کا تصفیہ کر رہی تھی۔

بے سود کوشش

یہاں اب سوال کیا جاسکتا ہے کہ اگر حسنؑ تلوار ہاتھ میں لیتے تو کس قوم کے لیے؟ فتح کرتے کہ پھر یہ قوم حکومت کرے یا اس کی ذلیل اولاد اپنے کو حکومت کا شایان قرار دے۔ جب کہ اولاد کے بزرگوں سے سختیوں کے مقابلہ کرنے کی قوت جاتی رہی تھی!۔

دُوسرا پہلو

اب میں اس کو دوسرے پہلو سے دیکھتا ہوں اور وہ یہ تھا کہ کیوں نہ حسنؑ نے اپنے ممکن آدمیوں سے اختیار پر قائم رہنے کی کوشش کی۔ لوگ اس قابل ہوتے یا نہ ہوتے۔ اور رفتہ رفتہ وہ کوئی صورت ایسی پیدا کر دیتے جس سے دوران عمل کی کمی آئندہ پوری ہو جاتی۔ یہ طرز عمل بجائے اس کے کہ رسولؐ علیؑ اور ان کی اولاد سے چاہا جائے، دور الحاد کا طرز عمل ہوتا۔ یا زیر ذکر زمانہ میں معاویہ نے اپنے کو اس قابل ثابت کیا۔ اس کا پہلا قدم یہ ہوتا کہ اپنے حصول اختیار کے لیے مخلوقات الٰہی بز قربانی بنائی جاتی۔ سپاہیوں کو قائم رکھنے کے لیے صریح یا غیر صریح طریقوں سے رعایا پر ہر طرح کا تشدد ہوتا۔ اور محاصل کے لیے ایجاد اپنی خوفناک تراش خراش سے ان کے سر پر سوار کی جاتی یا حصول زر کے لیے عام اس سے کہ کوئی اپنے کو رعایا کہتا یا نہ کہتا اپنے تلوار کا خوفناک وزنی سایہ منوایا جاتا۔ اور دھاک قائم رکھنے کے لیے طریقے اختیار کیے جاتے جسے دیکھ کر انسانیت الامان کی پُر درد لیکن بے سود صدائیں دیتی رہتی۔ اپنے خلقت کش سپاہیوں کو متاثر نہ ہونے دینے کے لیے کہانیاں گھڑی جاتیں۔ دوڈ از راہ جواب دیے جاتے۔ تجاہل آفرینی، ناحق کوشی، غلط اندازی اور حق کشی کا چرخہ چلتا رہتا۔ اور مدبرین کو تسکین اس سے ہوتی کہ کم سے کم ہمارے ساتھ دینے والے صاحب اختیار ہیں جو بجائے خود ایک بڑی نعمت ہے۔ اور ان برائیوں سے محفوظ ہیں جو محکومیت کا لازمی نتیجہ ہیں۔ مختصر لفظوں میں شارع اسلام اور اس کے ذمہ دار شارحین کا یہ طرز عمل نہ تھا کہ برائیوں کو قبول اور ان پر عمل کر کے اس سے بھلائیوں کے پیدا ہونے کی امید کی جائے۔ نشو صفات کا یہ نظریہ دہریت کے دور کا ہے۔ وہ ایسے عجمی نظریہ سے متاثر ہو یا نہ ہو کہ انسان بالطبع گنہگار ہے' یا خدا کا آماج غضب ہے۔ یا پیدائشی شودر ہے۔ حسنؑ "کل مولود یولد علیٰ فطرۃ الاسلام"۔ کے قائل اور عامل تھے۔ زیر بحث مصالح فطرۃ اسلامی کے پابند از نہیں ہو سکتے تھے۔ اسلام انسان کے احساس شرافت کے لیے ایک تحریک تھا۔ دنی الطبع بنانے نہیں آیا تھا۔ بغیر نظام سازی کے وہ اپنا ایک عنصر کھوتا تھا۔ لیکن اپنی اسپرٹ کے خلاف نظام سیاسی اختیار کر کے مذہب اور سیاست دونوں کے لیے مضر تھا۔

کیا خالص تخم کا فنا کر دینا قرینِ مصلحت تھا

اب میں اسے قبول کیے لیتا ہوں کہ حسنؑ کو کچھ آدمی ملتے۔ لیکن جو واقعات کہ بیان کیے گئے اور جس قدر زمانہ سے کہ معاویہ کی زہرپاشانہ ترکیبیں چل رہی تھیں اس سے یہ قرینہ بہت کم ہے کہ زیادہ آدمی دستیاب ہو سکتے۔ یعنی دشمن کے مقابلہ کے لیے جس قدر لوگ حسنؑ کے ساتھ ہوتے ان سے کسی طرح زیادہ دیر تک مقاومت کرنے اور فتح کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ اور اگر یہ قیاس نہ بھی کیا جائے کہ خلوص کے انتہائے جوش سے یہ مختصر گروہ ساتھ نہ بھی چھوڑتا تاہم اس خالص تخم کا فنا کر دینا کسی طرح ایک اصول انسانیت کے پیرو اور صاحب شعور سپہ سالار کے نزدیک مناسب نہ تھا۔ جب کہ آخری حجت باقی تھی۔ وہ حجت عزت سے صلح تھی۔

لیکن صلح پر نظر کرنے کے قبل ابھی زیر بحث مضمون پر کچھ اور کہنا ہے اور وہ صلح کے خلاف بے چین ہونے والوں کی تعداد ہے۔ ان کا شمار انگلیوں سے زیادہ نہ تھا۔ کیا حسنؑ ان چند نفوس کے اعتبار پر صلح نہ کرتے۔ ان کے جسم کے تلوار اور نیزوں کے لیے کافی ہوتے اور ان کے تھوڑے سے اور رقعا شام کے ریلوں کو کتنی دیر تک روکتے۔ یہ بھولنا نہ ہوگا کہ قوم کے غرور اور آن کی یہ زندہ تصویریں جس قدر افسوس اور طنز پر مجبور ہوئی تھیں ان میں سے ہر ایک کا جوش اپنی ذات کے اعتبار پر تھا۔ یہ اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔ بڑا ناقدر شناس ہوگا جو ان کے جوش کو گستاخی کہے۔ یہ موقع کی گرمی کا جنون تھا کاش ایسا جنون چند ہزار آدمیوں میں ہوتا! اور جہاں تک میں سوچ سکتا ہوں حسنؑ کو بھی ان کی وفاداری میں کوئی شبہ نہ تھا۔ ایسے جوش کے وقت جب کہ ایک وفادار سپاہی ضبید بن عمر الکندی کے ایک زخم کے متعلق سوال پیدا ہوجاتا ہے اور حجر کا یہ فقرہ کہ: "کاش تو اور ہم اس روز ہلاک ہوجاتے کہ یہ برا دن نہ دیکھتے کہ دشمن کی مراد بر آئی اور ہم لوگ دل تنگ اور غضب ناک ہوئے۔ موت اس زندگی سے کہیں بہتر تھی"۔ گزرتے ہوئے اختیار اور آزادی کا مرثیہ پڑھتا ہے۔ کیا اس وقت حسنؑ یہ نہیں فرماتے کہ: "حجر مجھے تمہاری شفقت اور اپنے بارہ میں تمہارا اعتقاد معلوم ہے"۔ اور کہتے ہیں کہ: "میں نے تمہاری بہتری کے لیے صلح کی"۔ ان میں سے ایک شبیب بن نخبہ اس کا ذکر بھی زبان پر لاتا ہے کہ آپ نے چالیس ہزار سپاہیوں کو بے کار کیا اور جب جواب سنتا ہے کہ: "جسے معاویہ کے مقابلہ کے لیے بھیجا جاتا تھا اس سے مل جاتے تھے۔۔۔۔ اگر ایسا نہ کرتا تو کیا کرتا"۔ تو کوئی قابل اطمینان جواب نہیں دے سکتا۔ اور قیس جو معاویہ سے کہہ سکتا کہ: "میں نہیں چاہتا تھا کہ میں زندہ رہوں اور تو حکومت کرے"۔ کیا اپنے جوش اور شجاعت کے باوجود اس کا موقع دیکھ رہا تھا کہ وہ حسنؑ سے ان کے تصفیہ کے خلاف جنگ کرنے کا اصرار کرسکتا۔ کیا ہوا عمران بن ابان کے بصرہ پر حسنؑ کے نام سے قبضہ کرلینے کا نتیجہ جنگ اور اس کا کامیابی سے جاری رکھنا محض تنہا یا چند کا کام نہیں ہے۔ اگر سپاہی بغیر سپہ سالار کے بے کار ہے تو سپہ سالار بغیر سپاہیوں کے کیا کرسکتا ہے؟۔

کس حالت میں صلح کی

اب جب کہ حسنؑ نے دیکھا تھا کہ زیادہ تر ایسے لوگ میرے گرد ہیں جنھوں نے میرے باپ کو مارا، مجھے نیزہ مارا، میرا گھر لوٹا اور مقتولین نہروان کا معاوضہ طلب کر رہے ہیں اور جو باقی ہیں وہ خاذل ہیں اور بدلہ لینے والے ہیں۔ اور اگر میں معاویہ سے مقابلہ کروں تو یہ لوگ میری گردن پکڑ کر مجھے معاویہ کے سپرد کردیں گے۔ تو آپ نے اپنے دوست نما دشمنوں کو ترک کر کے اپنے دشمن سے عہد کیا۔ اس لیے کہ: "اگر میں معاویہ سے ایک عہد لے لوں کہ میں اس کے سبب سے اپنی خون ریزی کو روکوں اور اس کے سبب سے اپنے اہل میں امن سے رہوں تو یہ امر بہتر ہے اس سے کہ یہ لوگ مجھے قتل کریں"۔ دیگر اس لیے کہ: "اگر میں اس سے صلح کروں اس حال میں کہ میری عزت قائم رہے۔ یہ میرے نزدیک بہتر ہے اس امر سے کہ وہ مجھے قتل کرے اس حال میں کہ میں اس کا اسیر ہوں یا وہ منت رکھ کر چھوڑ دے اور یہ امر باعث عار ہو۔ بنی ہاشم کے لیے قیامت تک اور معاویہ اور اس کی اولاد ہمیشہ احسان جتاتے اس کا ہمارے ہر زندہ اور مردہ پر"۔

متذکرہ صدر فقرات میں حسنؑ اپنی حالت کا اندازہ کر رہے ہیں۔ اور دیکھ رہے ہیں کہ یا تو میرے ہمراہی مجھے معاویہ کی خوشامد میں دشمن کے حوالہ کردیں گے اور یا میں کمی اسباب کے وجہ سے گرفتار ہوجاؤں گا۔ وہ مجھے گرفتاری کی حالت میں

قتل کرے، یا گرفتاری کی حالت سے رہا کردے گا۔ آخر الذکر صورت بنی ہاشم کی دائمی ذلت اور بنی امیہ کے دائمی افتخار کا ایک سبب ہو جائے گی۔ اس لیے صلح کر کے کیوں نہ عزت قائم رکھی جائے۔ ظاہر ہے کہ حقوق کے لحاظ سے اس سے بہتر کوئی تصفیہ نہیں ہو سکتا تھا۔ معاویہ ضرور تمام ممالک اسلامی پر قابض ہو جاتا۔ اور اس وقت جب کہ اپنی کوششوں سے حاکم ہو جاتا بغیر اس کے کہ حسنؑ نے کوئی رعایت کی ہوتی۔ تو اس وقت حسنؑ کے پاس نہ کوئی رعایت باقی رہتی اور نہ قطعی مجبوری میں ان کی صلح صلح کہی جاتی بلکہ وہ سیاسی مغلوبیت سمجھی جاتی۔ اس وقت کی صلح کو معاویہ بھی یہی کہہ سکا کہ: "آزادوں کی طرح امر خلافت مجھے حوالہ کر دیا ہے"۔ نظر بریں اپنے اور قوم کے حقوق کو مدنظر رکھ کر اس سے اچھی کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی تھی کہ شیشہ مباحث سے تمام بال کے گر جانے کے قبل رہے سہے ذرات سے وقت کا اندازہ کیا جاتا۔ باعزت اور حفاظت کے لیے ممکن موافق شرائط لکھوائے جاتے۔

اس وقت جنگ اختیار میں نہ تھی لیکن صلح تھی

اب تک اگر جنگ کی قوت نہ تھی تو صلح کا اختیار تھا۔ ایک شکست کا ہو جانا جس کا موجودہ حالت کے لحاظ سے ہر طرح قرینہ تھا صلح کو بھی اختیار کے باہر کر دیتا۔ چونکہ اب تک لوگ جانتے تھے کہ قیس، حجر، ابن حمق، عدی، وغیرہ چند ایسے لوگ ہیں جو قتل اور نہر سے بچ گئے ہیں اور چونکہ یہ سرداران قبیلہ ہیں جو کچھ نہ کچھ فوجیں حسنؑ کے لیے میدان میں لے آئیں گے اور بنی ہاشم کے افراد جن کی تیغ پا بہ تیار ہوتی ہے جوش شجاعت میں اس فوج کی روح اور استقامت ہوں گے اس لیے یہ قیاس نہیں کیا جا سکتا تھا کہ باوجود اپنی تمام کوششوں اور اس کے اثر کے غلبے کے بھی معاویہ ہوا سے نڈر تا جب کہ وہ اور اس کے بعد اموی اور عباسی عالمگیر بادشاہ کسی گوشہ نشین امام کے تنہا وجود کو بھی اپنے لیے خدوش سمجھتے تھے۔ یہ حسنؑ کے لیے مفید تھا اور اس سے اگر جنگ ممکن نہ تھی تو عزت سے صلح ممکن تھی۔

نامساوی قوت اور اخلاقی ہتھیار

سوال کیا جا سکتا ہے کہ فریقین میں جب نامساوی قوت تھی تو صلح قبول کرنے والے کمزور فریق کو کیا اعتبار تھا کہ زبردست منتقم وفائے عہد کرے گا۔ کوئی اعتبار اور ذمہ داری نہ تھی بجز اس کے کہ اس صورت میں عہد کے اخلاقی اعتبار پر بھروسہ کیا جا سکتا بہ نسبت اس حالت کے جب کہ ظاہر بہ ظاہر مغلوب ہو کر شرائط قبول کیے جاتے۔ اب تک شرائط لکھوا بھی سکتے تھے۔ اس وقت محض شرائط قبول کرتے۔ یہ بھی یہی ہے کہ کوئی عہد عوامل سیاست میں وزن نہیں رکھتا جب تک قوت اس کی محافظ نہ ہو لیکن کیا تمہاری دانست میں اس طرح کا عہد ہونا قطعاً نہ ہونے کے برابر ہے؟

حسنؑ کے انداز

ان تمام چشم کشا سامانوں کی موجودگی میں شرائط صلح کو حتی الوسع اپنے موافق کرنے میں حسنؑ نے ایسے منطقی انداز اختیار کیے جس کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ انھوں نے نہ صرف اپنے پدر بزرگوار کے اور اپنے دوستوں کے لیے جو اطراف مملکت اسلام میں تھے عہد لیا بلکہ دس آدمیوں کے متعلق بھی اس عہد کے غیر موثر ہونے کو قبول نہ کیا۔ یہاں تک کہ ایک آدمی کو بھی جس سے انتقام لینے کے لیے معاویہ کا سینہ کھول رہا تھا از روئے عہد معاویہ کے لیے نہ چھوڑا۔ اور بنی امیہ کے صاحب اختیار ہوتے ہوئے یہ امید کرنا کہ وہ جناب امیرؑ کے اسم مقدس سے انتقام نہ لیتے ناممکن تھا۔ پھر بھی یہ عہد میں داخل تھا اور اگرچہ قبول نہ بھی کیا گیا تھا تاہم یہ استحسب کو

معلوم تھی کہ وہاں احتیاط کی جائے جہاں فرزند رسولؑ موجود ہوا۔

ایک بہت انتہا مفید دفعہ جسے "واشنگٹن آرونگ" شہادت حسینؑ کی وجہ قرار دیتے ہیں

لیکن ہماری کتاب کی اصل غرض کے لحاظ سے سب سے مفید شرط یہ تھی کہ معاویہ کے بعد حسنؑ یا حسینؑ کا حق خلافت محفوظ کیا گیا تھا۔ سوچو اس شرط کے مفید گہرے اثر کو کہ وہ دشمنانِ آلِ ہاشم جو ان کے حقوق سے نہ صرف اعراض بلکہ تجاہل پیدا کرتے رہے اور ہمیشہ احتیاط کی کہ کسی عام مجمع میں ایسا کوئی اقرار نہ کریں جس سے لوگوں کی ان کی طرف توجہ ہو، وہ آج ان کے حق کو مہر اور دستخط اور گواہی کے حوالہ کرتے ہیں۔ اور کس وقت جب کہ لوگ یہ بھی جانتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ سب شرط قبول لیکن پہلے ہم حاکم ہو لیں۔ اس سے حقیقی مقبولیت اور نامقبولیت کا اندازہ کرو۔ سیاسی لحاظ تو ایک موقت اور گزرتے ہوئے لحاظ ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ گویا معاویہ کے طرزِ عمل کو اس کی حیات تک کے لیے اس شرط سے گوارا کر لینا آئندہ اس کی مصلحت کے کسی سلسلہ کو منقطع کر دیتا تھا۔ اس کا اثر یہ تھا کہ معاویہ باوجود اپنے اجتہاد اور تدبیروں کے جوہروں کے جب تک مسلسل کاوش خصوصاً زرپاشی سے اس قابل ہو سکا کہ وہ یزید کو اپنا ولی عہد قبول کروا سکا۔ اور پھر بھی لوگ بہ استثنائے بنی امیہ اس اقدام سے ہیبت ناک ہوتے رہتے۔ اور معاویہ کی دور از راستی کارروائیوں کو سمجھتے جاتے۔

کیا دیا اور کیا لیا

ہاتھوں سے گزرتے ہوئے اختیار کے اس زمانہ میں حسنؑ کو انسانیت، اخلاق اور احکام اسلامی بھی یاد دلا دیتے تھے اور مثالیہ حکومت بھی بتائے جاتے تھے جہاں فرماتے ہیں کہ: "اگر بندگانِ خدا کے ساتھ اچھی زندگی بسر کرے" تو امارت سپرد کر دوں اور اگر تو" مسلمانوں سے رعونت اور تکبر کرے گا اور انصرام امورات موافق شرع نہ کرے گا بلکہ اپنے مذاق کے موافق جاری کرے گا تو جہاں تک ممکن ہوگا کوشش کروں گا جب تک خدا ہم میں اور تم میں فیصلہ نہ کرے"۔ اہل عراق و حجاز کو کہ جس سے تم اس سے محفوظ کر لیا کہ ان پر نئے محاصل قائم نہ کیے جاتے۔ یہ امورات تھے جو ایک مصلح بنی آدم اور اس کے جانشین کے دیکھنے کے تھے۔ جب تک لوگ اسے اپنے امورات کے انصرام کا والی قرار دیتے اور ایسی حالت میں بھی جب کہ لوگ اپنی حرکتوں سے اپنے کو اس قابل نہیں قرار دے رہے تھے کہ وہ ایسی ذمہ داری قبول کرتے وہ اپنی حقیقی ذمہ داری کا لحاظ کر کے ان اصول پر عمل کا عہد لیتا ہے اور اپنے کو حکومت سے اس لیے علیحدہ کر لیتا ہے کہ دشمن اپنی جوشِ عناد کے ظاہر کرنے کے لیے جب کوئی مرکز نہ پائے گا تو اسے رعایا سے کوئی بحث نہ ہوگی اور کشت و خون رفع ہو جائے گا۔ در آنحالیکہ لوگوں کی موجودہ حالت سے تھوڑا سا کشت و خون گوارا کرنا بھی کوئی ایسی امید نہیں پیدا کرتا کہ وہ اپنے پاؤں کھڑے ہونے کی اس وقت یا کچھ بعد صلاحیت رکھتے ہیں یا رکھیں گے۔

آخر میں یہ بھی کہہ دوں کہ مؤرخین کے الفاظ "صلح" "تفویض امارت" اور "خلع" ہیں۔ کہیں "بیعت" نہیں ہے۔ اور جن لوگوں نے اپنے روش کی احتیاط سے اسے ضمن قرار دیا ہے یا ایک شرط یہ قرار دی ہے کہ معاویہ سنت خلفاء پر عمل کرے انھوں نے اپنے حافظہ کی قوت کی تعریف کرانی نہیں چاہی ہے۔ جب کہ پیشتر بیعت نہ کرنے اور علیحدہ رہنے کی مثالیں گزر چکی ہیں اور جب کہ اس وقت اس کا بھی ذکر ہے کہ حسینؑ نے بیعت نہیں کی۔ امید کرے جس کا جی چاہے کہ جب جناب امیرؑ اس شرط پر خلافت قبول نہیں کر سکتے تھے تو کیا ان کا فرزند سکہ دو شی یا ترک امارت کے وقت دوسرے

سے یہ شرط کرا سکتا تھا؟ بغیر شرط کے بھی معاویہ کو اس سنت کی پیروی بغیر چارہ نہ تھا۔

عہد ناموں کا اخلاقی اثر کب تک ہے

یہ دوسری بات بھی فراموشی کے قابل نہیں ہے کہ یہ ایک عہد تھا جو دو آدمیوں میں ہوا تھا۔ یعنی اس وقت یہ عہد عہد نہیں ہے۔ جس وقت فریقین میں سے کوئی خلاف ورزی کرے اور کسی شرط یا شرائط سے اعراض کرے۔ وفات مشروط تھی۔ عہد کی ادنیٰ خلاف ورزی اس کی اخلاقی حالت سوخت کر دیتی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ قوت کی عدم مساوات سے مضبوط فریق خلاف ورزی کے بعد بھی کمزور کے لیے یہ عہد قائم رکھنا اپنے لیے مفید سمجھے یہ حالت عہد کی پابندی لازم نہیں ٹھہراتی بلکہ سیاسی مجبوری کے لحاظ سے اپنی آئندہ روش قائم کراتی ہے۔

ان تذکروں سے ذہن یہ دکھلانا مقصود تھا کہ کس طرح بنی ہاشم کی قوت کا زوال ہوا۔ جہاں میں بنی ہاشم کا لفظ استعمال کرتا ہوں وہاں اس سے میری غرض رسولؐ کے بعد ذمہ دار ائمہ سے ہے جو علیؑ اور فاطمہؑ سے ہوں ورنہ غیر ذمہ دار بنی ہاشم کا خالصاً سیاسی جد و جہد صدیوں قائم رہا اور ملوک فاطمہ (مصر) نے صفحاتِ تاریخ پر اپنا دائمی نقش چھوڑا۔

مجھے اس کے وسیع مفہوم سے کوئی بحث نہیں ہے۔ میں ماورائے الامامت شاخوں سے بحث نہیں کر رہا ہوں باوجود اس کے کہ پانچ چھ مہینہ کی برائے نام حکومت کسی حاکم کی سوانح اور زمانہ حکومت کے لحاظ سے قریب وقت بھی نہیں ہے۔ تاہم خیال کیا جا سکتا ہے کہ حسنؑ نے اپنے اختیار کو قربان کر کے ان چنگاریوں کو بجھا دیا جن میں آتش افروزی کی پوری قوت تھی۔ سب بے سود کوشش کا نتیجہ غیب کے پردہ میں چھپا تھا لیکن اگر ظاہر اسباب سے نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں تو شاید انسان کو سیاسی شہرت کی ہوس کے لیے بغیر یہ کہنا ممکن ہے کہ بجز انسانی خون اور گوشت کی ارزانی کے اور کچھ نہ ہوتا۔ وقت نہ تھا کہ قربانی کسی نتیجہ کی امید دلاتی۔ اس لیے کہ معاویہ کی طرف سے لوگوں میں کیسی ہی بے اعتباری کیوں نہ ہو لیکن کچھ تو فائدہ تھا اور کچھ ابھی لوگوں کو اس کا تجربہ نہ تھا کہ کسی عہدنامہ کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ جس سے نفاذِ عہد کی امید نہ رہتی۔ کچھ اس لیے کہ معاویہ پس پردہ مصالح سے کام لیتا تھا اور سرد مزاج متین بے رحم تھا۔ اس وقت کسی خفیف کوشش کے معنی یہ ہوسکتے کہ دشمن اپنے جذباتِ انتقام کو رہا کر دیتا اور شاید پھر اس کے بعد اولادِ رسولؐ کا کوئی غیر مشروط دوست دنیا میں دکھائی نہ دیتا۔ یہ صحیح ہے زیاد اور اس کے نائب نے جو قتلِ عام کیا اس کی مثال زمانہ معتصم میں کرخ ہی کی لائی جا سکتی ہو لیکن غالباً اس وقت کا تشدد زیادہ تر مشاہیر کے خلاف تھا اور اگرچہ معاویہ کی غرض اپنے احکام سے یہ کیوں نہ ہو کہ علیؑ اور فاطمہؑ کی اولاد کے دوست دنیا میں نہ دکھائی دیں۔ تاہم یہ بادبیت محض تلوار کے ذریعہ سے عمل میں نہیں لائی گئی بلکہ لوگوں کے خیال خریدنے یا انھیں موجودہ نظام کے قبول کرانے کی بھی بڑی کوشش ہوئی اور اس وقت تقیہ کے زریں بلکہ فطری اصول نے لوگوں کو ایک آڑ حوالہ کی یہ سودا بھی نہ تھا اگر جنگ سے لوگوں میں عام مخالفت پیدا کر دی جاتی اس وقت کا جوشِ انتقام اس وقت سے کہیں زیادہ ہوتا۔

اب غالباً میں اپنا خیال بتلا سکا ہوں گا کہ وقت ہوتا ہے جب کہ حکومت اور اقتدار سے بہت سے کام ہوتے ہیں۔ یہ وقت تھا کہ برائے نام اختیار سے اس لیے دست برداری کی جائے کہ دشمن کے جوشِ عداوت اور انتقام کا مزاج بدل دیا جائے۔ وہ کسی خلاف ورزی پر مستعد ہونے کے قبل ایک برائے نام رکاوٹ بھی دیکھے۔ یعنی اس کا کوئی خیال سالم حیثیت

سے نہیں بلکہ فطری شکستگی کے بعد عمل کرے۔
اب ہر شخص کو چاہیئے خود تصفیہ کا موقع ہے کہ حسنؑ کی ذات کا اس ناچیز وقت میں محض سامنے آجانا تمام تر مفید ہوا یا نہیں۔

صلح حسنؑ کا تصفیہ معاویہ کی روش سے

اب میں صلح کے پہلو کے متعلق معاویہ کے طرز عمل سے بحث کرتا ہوں جس سے یہ استنباط آسان ہو جائے گا کہ اگر حسنؑ نے اس وقت صلح قبول کرنے کا تصفیہ کیا ہوتا تو اتنا بھی موقع نہ رہتا۔ اور وہ یہ ہے کہ معاویہ نے خود سے صلح کی پیش قدمی کی جو یا حسنؑ نے بھی اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ معاویہ تمام شرائط کو قبول کر لیتا ہے بلکہ ایک سادہ کاغذ پر مہر اور دستخط کر کے بھیج دیتا ہے کہ اپنے شرائط تحریر کر دو۔ کسی کے نزدیک اس کی اس درجہ آمادگی اور عجلت عہد کے عدم وفا کا بین ثبوت ہو سکتی ہے۔ ایسا ہی ہو۔ لیکن عجلت اور آمادگی میں محض عدم وفا کا حصر مضمر نہیں ہو سکتا تھا۔ بلکہ اس میں خوف کا جزو بھی شامل تھا۔ اس لیے کہ اگر اطمینان ہوتا اور معاویہ کو تمام تر اپنی فتح اور کامیابی ہی کی امید ہوتی تو اس کی کوئی ایسی عجلت اس کے لیے غیر ضروری اور غیر مفید بے تمیزی ہوتی۔ جس میں وہ خواہ مخواہ عدم وفا کا شبہ پیدا کر کے فریق ثانی کی طرف سے انقباض کا خوف کرتا۔ دوسرے لفظوں میں کون ایسا ہوگا کہ فتح کی بے خوف حالت میں بجائے اس کے کہ اپنی مرضی اور خواہشات قبول کروائے الٹے اپنے کو ایسے شرائط میں پھنسائے جس کی طرف سے کوئی بد عہدی عدم مقبولیت کی محرک ہو۔ بلکہ اس کا حل کچھ تو معاویہ کے ایسے مدبر کے غیر قائم تیقن یا شکی طبیعت میں ہے اور کچھ حسنؑ یعنی فرزند رسولؐ اور علیؑ کے مقابل شخصیت میں ہے۔ جس کی طرف سے معاویہ کو ہمیشہ خوف ہو سکتا تھا کہ مبادا لوگوں کی غفلت اور لاپروائی پر اعتقاد اور یقین غالب آجائے اور پھر وہ ایک مرکز پر جمع ہو کر ہماری طرف ان تیوروں سے نہ دکھائی دیں جس طرح صفین کے میدانوں میں دکھائی دیتے تھے۔ دنیا بھر کے شرائط منظور اگر ہم صاحب اختیار قبول کر لیے جائیں۔ یا شرائط کیسے ہی کیوں نہ ہوں اس کے مقابل کم خدوش ہیں کہ ہمارے خلاف ہیجان کا کوئی موقع پیدا ہو جائے اور امید میں التوا یا زوال کے آثار دکھائی دینے لگیں۔

ایسا بھی ہو کہ بنی امیہ جنہیں حصول امارت کا خواب دیکھتے ہوئے زمانہ گزر اتھا اور گویا کبھی اپنی کوششوں سے بجز اس کے کہ باز آتے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اور پھر اتفاقات کی موافقت سے یہ دن نصیب ہو تا کہ اپنے بل کھڑے ہو کر جنگ آزمائیاں کر سکتے۔ آج بغیر لڑے بھڑے حکومت کو اپنے طرف آتا ہوا دیکھ کر خوشی کے بل گر رہے تھے اور ان کے اپنے حریص اور بندہ جاہ کے لیے یہ قیاس کے باہر تھا کہ کوئی ایسا بھی ہو سکتا ہے جو بغیر نکیر پھوٹے حکومت حوالہ کر دے سکتا ہے اور اسی خیال سے امیر شام حسنؑ سے کہتا ہے کہ: "ابتدا سے آفرینش سے کسی نے ایسی شجاعت نہیں کی۔ یہ جود و سخاوت خاندان بنی ہاشم کے لحاظ سے حیرت خیز نہیں ہے۔" غلطی ہوگی اگر اس موقع پر یہ کہا جائے کہ امیر شام یہ فقرات کہہ رہا تھا یا خلیفہ رسولؐ سے کہہ رہا تھا۔ نہیں، بلکہ بنی امیہ کی پستی طبیعت بنی ہاشم کے علوئے نفس کے سامنے اقرار بھی کر رہی تھی۔ غلطی ہوگی اگر معاویہ کے ان فقرات کو مفتر اور طنز کہا جائے۔ اس لیے کہ معاویہ کے لیے انکار کا کوئی موقع نہیں تھا بلکہ انکار تو ایثار اور تفویض میں ہے۔ معاویہ بھی خود اسے "احسان" کہتا ہے۔ اب ہم ان حالتوں کی طرف آتے ہیں جن میں کوئی غیر شجاع دشمن اپنے شجاع دشمن کو قبضہ میں دیکھ کر جرأت نمایاں کرتا ہے، یا جسے اختیارات کے موسم سے یہ غرض

ہو جاتا ہے کہ سوتے جاگتے اپنی حکومت منوا تا رہے اور شریف دشمن کی شکستہ عظمت اس کی امانِ ذلت ہو۔

تخت کے بعد منبر پر

مشکل سے ابھی عہد نامہ کی سیاہی خشک ہوئی تھی کہ مشہور ماں کے بیٹے نے اپنی بے لگام شرارت سے مجبور ہو کر ابن ابو سفیان کو صلاح دی کہ وہ حسنؑ سے برسرِ منبر کہلوائے کہ: "مجھے رغبت خلافت نہیں ہے"۔ اس سے کچھ تو لوگ اپنی امیدوں کو حسنؑ کی طرف توڑ دیں گے اور کچھ اس غرض سے کہ چونکہ حسنؑ بہت صاحبِ حیا ہیں تقریر میں لکنت ہونا یا دانستہ کر سکنا موجبِ نقص ہو گا اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ لوگوں کی نگاہ میں حسنؑ کی منزلت خفیف ہو جائے گی۔ پھر بھی معاویہ اس سے رک رہا تھا کہ لوگوں کی خاص توجہ کو نواسہ رسولؐ کے ہاتھ میں دیدے۔ لیکن اس کا لالچ ہے کہ شاید موقع کی مرعوبیت اور لحاظ یا مروت کی کمزوریوں سے حسنؑ میرے خواہش کے موافق ہی کہیں۔ یہی طے کیا کہ حسنؑ کچھ کہیں۔ لیکن واقعات اپنی حیرت خیز رفتار سے اس لیے اختیار کر رہے تھے کہ نواسہ رسولؐ خلافت کے تخت سے اس لیے ایک پاؤں اتارے کہ دوسرا پاؤں منبر پر جا رہے جو اس کا اصل مرکزِ حکومت ہو۔ موقع کی محدودیت کے باوجود رسولؐ کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ان کا جانشین اس وقت ان کے منبر پر جاتا جس وقت اختیار ان کے قبضہ میں نہ ہوتا لیکن کس نے اندازہ کیا تھا کہ یہ ائمہ دنیا کے تمام اختیار اور تخت منبر پر جانے کے لیے صدقے کرتے۔ وہ اپنے لیے تخت پر نہیں جاتے تھے۔ ان کا اصل تخت انسانی دل اور دماغ تھا لیکن اس لیے تخت پر گئے کہ وہ یہ بھی دکھا دیں کہ حقوقِ بشری کی اس طرح عدل کے ساتھ حفاظت چاہیے۔ لوگ پیدا ہوتے جو اس سے بغاوت کرتے۔ یہاں تک کہ دنیاوی تخت ان کے قابل نہ رہ جاتا۔ اس لیے کہ لوگ بدل گئے تھے۔ اس کی مثال پاؤ گے جہاں امام رابع بن خمیر کی صلاح کو رد کریں گے۔ یا ابو سلمہ کا خلافت پیش کرنے والا خط بغیر ملاحظہ شمع میں جلا دیا جائے گا۔ مدینہ نے ایسا موقع ہی نہ آنے دیا تھا۔ آج اس لیے موقع دیا گیا ہے کہ وہ "لوگوں کو اپنے احسان سے واقف کریں"۔ معاویہ پر امید دہشت نگر رہا ہوا تھا اور حصولِ اختیار کے بعد ایک سیاسی فتح کے انتظار میں تھا لیکن گزشتہ کی طرح اس موقع نے بھی ظاہر کر دیا کہ رسولؐ کے بعد کسی مدبر نے ائمہ میں سے کسی پر سیاسی فتح حاصل نہیں کی، جہاں تک ان کی تہذیبات کو تعلق تھا جیسا احسان سے کوئی بحث نہیں ہے۔

گئے حسنؑ منبر پر۔ مشتاق لوگوں کو مخاطب کیا۔ واقعات اور ان کی سچائیوں کے ذکر سے مخاطب کیا۔ کون تھا جو گزرے ہوئے زمانہ کی باتوں کا انکار کرتا۔ اور کس کی گردن کے ریشے اس قدر سخت تھے کہ بار احسان سے اپنے کو جھکا ہوا نہ دیکھتے۔ جس وقت رسولؐ کا نواسہ کہہ رہا تھا کہ: "تم لوگ جانتے ہو کہ خدا نے تمھیں گمراہی اور جہالت سے میرے نانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بدولت آزاد کیا اور ذلت و خواری کے بعد تمھیں عزیز کیا اور قلت کے بعد تمھیں کثرت عطا کی"۔ کوئی استفہام نہ تھا لہجہ کے کوئی رفتار بجز اس کے نہیں ہو سکتی کہ اقرار کرو کہ ایسا ہی ہے۔ شروع اس مرکز سے کیا جس میں کسی کو مخالفت نہ ہو سکتی اور گویا موافق اور مخالف چند لمحوں کے لیے کھچ کر ایک نقطہ پر بغیر سوچے پہنچ جاتے۔ کوئی طبعی رفتار بجز اس کے غیر فطری ہوتی۔ لیکن تقریر کی اس ابتدا اور ان باتوں کے ذکر میں کیا یہ غم انگیز طنز تھا جسے امام کی غیرت نے لفظوں میں ظاہر کرنا پسند نہ کیا کہ: "تم اس لیے آزاد ہوئے کہ ہمیں گرفتار کرو۔ اور ذلت و خواری سے عزیز ہو کر تم نے اپنے بلند کرنے والوں کی اولاد کے لیے ذلت و خواری مہیا کرنا مناسب سمجھا اور جب تمھاری حالت

قلت سے کثرت میں بدل گئی تو تم نے یہ روش اختیار کی کہ رسولؐ کی اولاد کی اور بنی ہاشم کی کثرت کو قلت سے بدلنے کی کوشش کرتے رہو۔ یا تم اپنے تمام تمدنی، نظامی اور اخلاقی ترقی کا سلسلہ تک یہ دے رہے ہو کہ ان قوتوں کو ہمارے خلاف صرف کر دیا"۔ (خاموشی بلکہ پر حجاب سکوت مجمع پر طاری رہا) اب فرمایا: "جانو! کہ معاویہ نے مجھ سے ایک ایسے امر میں نزاع کی جو میرا حق تھا۔ اس کا نہ تھا"۔ اس کے ساتھ یہ فقرہ بھی ضم کر لو کہ معاویہ کی طرف مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ: "تیری وجہ سے فساد اور خون ہوا"۔ اور اس وقت معاویہ کے موقع پر غور کرو۔ مدبرین، سپاہی، محدثین ٹھہرتے ہوئے جمہورہ سلام کرنے والے خوشامدی۔ کون تھا جو نہ ہوگا۔ خصوصاً جب کہ مجمع صاحب اختیار کا مرکب کیا ہوا ہو۔ لیکن نعرے اور انفاس سے خالی رہے۔ سناٹا اس وقت تک قائم رہا جب تک حسنؑ نے سلسلہ کلام جاری نہ کیا۔ کیا اس وقت ایسا ہوا ہوگا کہ علیؑ و فاطمہؑ اور ان کے حقوق کا دشمن سے دشمن یہ سن کر دل میں کہہ اٹھا ہو کہ: "برا کیا"۔ بظاہر حسنؑ نے یہی کہا تھا بلکہ میرے خیال میں احتیاط کی تھی کہ "حق" اور "نزاع" میں اپنا اور معاویہ کا نام لیتے۔ لیکن کیا حسنؑ کی تقریر کا یہ ایک گزشتہ تاریخ پر تبصرہ نہ تھا۔ اور کیا یہ سالہا سال نہ تھا یعنی رسولؐ کو رحلت کیے ہوئے صرف تیس برس ہوئے تھے۔ یہ زمانہ تو ایسا نہ تھا جس میں دشتیں زمین میں دفن ہو جائیں۔ اور پہلے کے واقعات حافظہ کی تازگی کے زیادہ محتاج ہوتے، یا نسیان یہیں اس درجہ غالب ہوتا کہ اشارہ کی ادنیٰ ٹھوکر سے کام نہ چلتا۔ نہیں زمانہ کا پردہ ایسا گہرا نہ تھا جس میں نگاہیں نہ پہنچ سکتیں۔ اور خیال آتا کہ یہ تنہا معاویہ تو نہ تھا جسے حق کے نزاع میں اولیت کا امتیاز حاصل ہو!

جھنجھوڑنے اور رُلا دینے والی غیر ظاہر شکایت کے بعد جس کی متانت نے تقریر کو اور زیادہ صبر شکن بنا دیا تھا۔ تیسرا درجہ پھر احسان کا تھا۔ فرماتے ہیں: "میں نے صلاح اُمت پر غور کیا اور فتنہ کو منقطع کیا"۔ اس کی شرح اس طرح کی جاسکتی ہے کہ گویا فرما رہے تھے کہ جس وقت کوئی اس اُدھیڑبن میں مبتلا تھا کہ کس طرح میرا حق لے لینے کے لیے مجھ سے نزاع کرے، میں سوچ رہا تھا کہ صلاح امت اس میں ہے کہ میں اپنے حق پر قائم رہوں یا اپنے حق کو منتقل کر دوں۔ اور اگر کبھی وقت تھا کہ خلافت قبول کرتا تو اب وقت ہے کہ اسے ترک کروں۔ اب بھی ممکن تھا کہ لوگوں کا کچھ ہی میلان کیوں نہ ہو لیکن ہم اپنے اختیار کے لیے کوشش کریں اور اگر ہمارے لوگ قتل ہوں اور شکست ہو جب بھی ہمارا کوئی ذاتی نقصان نہیں ہے اور اگر فتح ہوئی تو یہ عین خواہش کے موافق ہوگا۔ لیکن ہم سے فتنہ کی پرورش ممکن نہیں ہے۔ اور ہم اپنے حق اور حوصلوں کی قربانی سے فتنہ کو منقطع کرتے ہیں۔ صلاح امت ہمارے لیے مقدم ہے۔ ہم دُنیاوی اِختیار کے مالک ہوں یا نہ ہوں۔

آگے بڑھتے ہیں۔ اپنے ساتھ لوگوں کے نزاعی اور دفاعی عہد کا ذکر کر کے لوگوں کے متعلق کچھ اور نہیں فرماتے۔ اگرچہ ایسے ذلیل النفس لوگ جو ایسے اطاعت پر آمادہ نہ ہوتے تھے جو خود ان کے لیے مفید ہوتی اور حکومت کے امورات میں بدرجہ اولیٰ ان کا حق قائم رکھتی اور وہ اس پر آمادہ ہو گئے تھے کہ ہم بنی امیہ کے دست نگر ہو کے رہیں۔ اس قابل نہ تھے کہ ان کا کوئی وقار قائم رکھنے کے لیے اہتمام کیا جاتا۔ لیکن اس معاملہ میں خاموشی کا لحاظ لوگوں ہی تک محدود نہ تھا بلکہ علاوہ اس امر کے کہ ان کے امام کچھ دن کے گئے ہیں مصلحت کی نہایت کامل دوربینی اس میں تھی کہ دشمن کے مجمع میں اپنی نامزد جماعت کی تفریق اور پاشانی خیال کی ہوا تک زبان پر نہ آنے دیں۔ جس سے کچھ تو خود اپنی جماعت سوچے اور اس میں اس شان سے پسندیدگی لحاظ پیدا ہو اور قوی تر مفید امر یہ تھا کہ ہم اپنی کمزوری ظاہر کر کے دشمن کے سامنے اپنی زبان

سے اقرار نہ کریں جس سے دشمن کی جسارت زیادہ بے لحاظ نہ ہو جائے اور اب تک جتنا بھرم بنا ہوا ہے اور جس قدر بھی اسے تلوار سے معاملہ پڑ جانے کا خوف ہے جاتا رہے۔ ضرورت تھی کہ یہ اثر نہ صرف اس وقت قائم رکھا جائے جس سے شرائط صلح طے ہو جائیں بلکہ حتی الامکان برابر جاری رہے۔ اور اگر کچھ وجہ ظاہر فرمانا مناسب سمجھتے ہیں تو صرف یہ قطع کن تصفیہ کہ: "میری رائے یہ قرار پائی ہے کہ معاویہ سے صلح کر لوں اور جو جنگ کہ واقع ہے اسے قطع کروں۔ اس لیے کہ لوگ قتل سے محفوظ رہیں"۔ اسے قوی تر الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں اور گویا ایک اصول تسلیم یا قائم کرتے ہیں کہ: "ان کے خون کی حفاظت اس سے بہتر ہے کہ ان کا خون بہایا جائے"۔ اور یہ سب "تمہاری صلاح اور بقا کے لیے"۔ اس تقریر میں یہ دیکھنے کی بات بھی ہے کہ امام محض اپنی جماعت کی بہبودی کا تذکرہ نہیں کرتے بلکہ خون کی محافظت اور صلاح و بقا کی تعمیم فرماتے ہیں۔ ذرا سلسلہ دیکھو کبھی رسولؐ نے اس لیے ملتوی کر دیتے ہیں کہ نوبت بہ جنگ نہ آئے۔ کبھی جناب امیرؑ قصہ حکمین کی ظاہر لغویت اور اس لیے اپنے انکار کے باوجود کہتے ہیں کہ: "شاید ہم بنتیجہ دین و شرایعت پر متحد ہو جائیں"۔ آج حسنؑ تفریق امارت کرتے ہیں، اس لیے کہ اس وقت صلاح اور بقائے امت اسی میں ہے۔

معاویہ کا اضطراب تقریر کا اثر سمجھاتا ہے

امام اپنی تقریر میں یہاں تک پہنچے تھے کہ عام مؤرخین کے موافق معاویہ نے حضرت کو بٹھا لیا۔ بقول روضۃ الصفا "بے طاقت" ہو گیا اور عمرو بن عاص کی طرف سے دل میں کینہ پڑ گیا لیکن مؤرخین میں سے کسی نے اس مفید امر کے متعلق کوئی معلومات یا وجہ اعلیٰ ظاہر نہ کی کہ سامعین پر کیا اثر پڑا۔ اس کے سمجھنے کے ذرائع مفقود ہیں، نیز اس کے کہ معاویہ کی بے بسی اور ابن عاص کی خجالت سے سمجھا جائے کہ کچھ اور کہنا اس کے لیے مفید نہ تھا یا ان تقریروں سے سمجھا جائے جو ابن عاص اور معاویہ نے کیں۔ اور دھمکیوں سے کام لینا پڑا۔ اور چونکہ اپنی از خود رفتہ امید میں اس درجہ ناکامی ہوئی جس درجہ کامیابی کی امید نہ کی جا سکتی تھی متعاقبہ بے قراری سے کھڑے ہو کر اپنے اختیارات کی تعلیاں کرتا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ خصوصاً وہ جو ایک زمانہ کی جدوجہد کے بعد آج اپنے کو تنہا صاحب حکومت دیکھتا ہے۔

عمرو بن عاص کی تقریر

کھڑا ہوا ابن عاص اور حکمین کے متعلق اپنی کارروائیاں بیان کیں اور جناب امیرؑ کا فقرہ حسنؑ کے جواب کے لیے تجویز کیا کہ: "حق اپنے مرکز میں قائم ہوا"۔ اور حکومت کے وفادار خادم کی طرح بزرگانہ نصیحت بھی کر دی کہ: "تم کو گزشتہ نافرمانی اور عصیان کا موافقت اور اطاعت سے تدارک کرنا چاہیے"۔

معاویہ کی تقریر

آیا معاویہ اور اس نے ابن عاص کا تعاقب کیا۔ مخصوص بات یہ کہی کہ: "ہماری دعوت عزیز ہوئی"۔ دعوت کے معنی اس وقت بھی اگر پلاؤ قورمہ تھے تو اس میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن نہ یہاں معاویہ اپنے دسترخوان کی تعریف کر رہا تھا اور نہ اپنی دسترخوانی عادات کو چھپا رہا تھا بلکہ حقیقۃً آنکھوں میں چھائی ہوئی دھول جھونک رہا تھا۔ وہ وقت پا رہا تھا کہ اپنی اور اپنی خاندانی کارروائیوں کو "دعوت" اور آج کے موقع کے لحاظ سے اسے "عزیز" کہے۔ یہ اس کی اطمینان کی سانس تھی۔ وہ کسی قتل عام کو بھی قیام امن اور تہذیب و شائستگی کا نام حوالہ کر سکتا تھا یا کسی انتہائی تشدد کو احسان سے موسوم کر سکتا تھا۔ بلکہ یہ بھی کر اسکتا تھا کہ ظلم سہنے

والے لے احسان کا اوتار رحم و کرم کا پتلا اور انسانیت کا مجسمہ کہتے۔ یہاں تو صرف اتنا ہی ہوا کہ چپکے سنتے رہے۔ لیکن بقول حسنؑ کے کہ وفادار بچوں کا حلم ہی کیا"۔

مدبر معاویہ کا غیر مدبرانہ فقرہ

لیکن ابھی اس سے بھی زیادہ کچھ کہنا تھا، اور وہ یہ تھا کہ: "تین لے جو شرطیں کی ہیں اس کا سرا میرے ہاتھ میں ہے۔ چاہوں وفا کروں خواہ نہ کروں۔ تمھیں اس سے کوئی مطلب نہیں۔ تم کو اطاعت سے کام رکھنا چاہیے"۔ اس فقرہ کا اثر اس سے سمجھا جاسکے گا کہ یہ حسنؑ کی تقریر تھا اور اس کے اثر کے بعد تھا۔ مشکل سے میری دانست میں مدبر معاویہ نے کبھی ایسا غیر مدبرانہ فقرہ کہا ہوگا۔ اس لیے کہ اگر وہ شرائط کی خلاف ورزی ہی پر آمادہ تھا تو اسے بغیر کچھ کہے بھی اختیار حاصل تھا لیکن حق اور باطل روشن کس طرح ہو جاتے۔ اس سے معاویہ نے اپنا اعتبار کھو دیا۔ اور مشکل سے کوئی عہد نامہ اس قدر قلیل الحیات ہوا ہو۔ معاویہ کی اس گفتگو کے معنی یہ تھے کہ اس عہد کے دوسرے فریق پر وہ حسنؑ ہوں حسینؑ ہوں ان کے دوست ہوں یا وہ تمام لوگ جو خلافت اسلامی میں تھے اور جن کے حقوق کے بارہ میں عہد کیا گیا تھا۔ اب اپنے کسی طرز عمل میں کسی عہد کے پابند نہ تھے۔ اگر انھیں ایسا کرنے کی قوت ہوتی۔

معاویہ کی صلح کش تقریر کے بعد بھی حسنؑ کے لیے کیا مناسب تھا

تاہم اپنی حالت کے اعتبار سے حسنؑ اور ان کی جماعت کے لیے یہی مناسب تھا کہ وہ خاموشی اختیار کرتے۔ اس لیے کہ معاویہ کی تقریر میں یہی فقرہ نہ تھا کہ: "چاہے نہ کروں" بلکہ "چاہے کروں" بھی تھا۔ اور یہ "چاہے کروں" حسنؑ اور ان کی جماعت کے لیے مفید تھا اور اسی نتیجہ کے پیدا کرنے کے لیے انھیں ایسی روش اختیار کرنی تھی۔ اسے مسیب بن نجبہ کے سوالات کے بعد بھی حسینؑ کی روش نے ظاہر کردیا۔ گفتگو کے بعد درمیانی وقفہ نے کب ایسی اشتعال انگیز حالت پیدا کی تھی کہ حسنؑ اپنے تصفیہ پر قائم نہ رہتے۔

ان تمام باتوں میں جو اس وقت تک توہین یا تضحیک کے لیے کی گئی ہوں، وہ صورت نئی تھی جو احتجاج سے نقل کی گئی ہے۔ موجد مصلحت معاویہ نہ تھا بلکہ اجزائے حکومت نے اختراع کی تھی۔ ناموں کی فہرست پر نگاہ ڈالنا صورت معاملہ کے سمجھنے کے لیے کافی ہوگا۔ چونکہ ان لوگوں کی دانست میں معاویہ کی اطلاع اور شرکت بغیر کچھ کرنا مناسب نہ تھا لہذا اس سے کہا گیا کہ: "حسنؑ نے اپنے باپ کی سیرت کو زندہ کیا ہے۔ لوگ ان کے پیچھے ادب و اطاعت سے چلتے ہیں اور ان کی تصدیق کرتے ہیں، اور یہ باتیں انھیں اس چیز کی طرف لے جائیں گی جو ان سب سے زیادہ بلند ہے۔ تو انھیں یہاں بلا اور ہم لوگ کہیں کہ تم دونوں اس مرتبہ کمال پر پہنچنے سے قاصر ہو اور اس کی ذلت کریں"۔

مجمع کی نوعیت

وہ مجمع جس میں عمرو بن عاص، مغیرہ بن شعبہ، ولید اور عتبہ بن ابوسفیان ہوں اور جس میں نہیں معلوم کیوں عمر بن عثمان نے بھی شرکت پسند کی ہو وہ کوئی بات کریں جو معاویہ کے دکھانے سنانے اور شرکت کے قابل ہو، اور وہ اولاد رسولؐ کے کسی قسم کی اذیت پر ختم نہ ہو۔ عجب خیز ہوگا۔ اس مجمع کا عمل بہت سے عہدوں پر مشتمل تھا۔ کچھ تو یہ تمسخر پارٹی تھی۔ کچھ حکومت کی خوشامد تھی کہ ہم سوتے جاگتے اس کے فوائد سے غافل نہیں ہیں۔ کچھ یہ قوم کی بے قوتی یا عدم مرکزیت کا خود ساختہ کمیشن تھا۔ اس مجمع کے لیے یہ فخر کی بات تھی کہ حسنؑ اپنے پدر بزرگوار

کی سیرت کو زندہ کرتے ہیں۔ قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ: "سیرت" کا محض اخلاقی مفہوم مدبرین کے لیے زیادہ غور کی بات تھی۔ لیکن اوصیائے رسولؐ کی سیرت کا وہ حصہ جو قوم گری کے بہترین عناصر کا جامع تھا۔ مدبرین کے احتیاط کے قابل بجا گیا۔ انھیں کب بھلا معلوم ہوسکتا تھا کہ کوئی ان کے اختیار اور ثروت کے ذلیل اطمینان یا مضحک نمائش سے مرعوب نہ ہوتا۔ انھیں گوشہ چشم عاریت بھی نہ دیتا، اور اگر دیکھتا تو بہ نظرِ نفرت اور کسی چیز کا ترجیح نہ ہوتا۔ ایک کے لیے اختیار اور ثروت دنیا کا خدا تھا، تو دوسرے کے نزدیک شیطان کا بہترین آلہ تھا۔ اگر اس میں شریفانہ اعتدال یا احتیاط کے ساتھ خدا کی قادر مطلقیت کا حس شامل نہ ہو؛ اس مجمع کے افراد اپنے کو صاحب اختیار دیکھ کر حضرت پہنچانے اور توہین کرنے میں کسی چیز کو مانع نہ دیکھتے تھے اور اس پر خوش تھے۔ لیکن ان کے لالچ غضب ان کی اس بڑھتی ہوئی خوشی سے زیادہ ملفوظات کے ہونے کے لیے کوئی چیز نہیں دیکھتے تھے۔ اور جس وقت حضرت پہنچانے والے اپنے ایذا رسانی کی فہرست دیکھ کر جھلاتے تھے اور گویا کہتے تھے کہ: "یہ لوگ اب بھی سیدھے نہیں ہوتے؟"۔ یہ لوگ اسی تسلیم و رضا سے اس ذہنیت کو برداشت کرتے تھے۔ نہ افلاس انھیں ان کے ٹکڑوں کی طرف کھینچتا تھا، اور نہ کوئی صبر شکن شرارت انھیں اپنی جگہ سے ہٹا ہوا دیکھتی تھی۔ اس لیے کہ لالچ اور خوف کے تمام توہمات سے ان کے خصائل زیادہ وزنی تھے۔ یہ ان چیزوں کی طرف تو اسی وقت اڑتے پھرتے جس وقت خود ہلکے ہوجاتے۔ اور جب مدبرین دیکھتے تھے کہ ہم اس قوم کے خصائل کو اس کے مرکز سے ہٹا کر اپنی خواہش کے موافق نہیں لاسکے تو آخری ذرائع سے انھیں نیست و نابود کردینے پر آمادہ ہوتے تھے۔ یہ قتل اور زہر کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ اگرچہ افلاس بھی جو ان حالتوں کا نتیجہ ہے اپنے خوفناک اثر سے انھیں بجائے نام سے زیادہ زندگی کے قابل نہیں رکھتا۔

کیا معنی ہیں حسنؑ کی اس حالت کے کہ کبھی قلم اٹھانے پر مجبور ہوتے اور غیرت پھر ہاتھ روک دیتی ہے۔ اور نہ صرف اس قوم کو اس کی شکایت تھی کہ کس طرح حسنؑ کا میلان ہماری طرف نہیں ہے اور ہماری خو بو سے متاثر نہیں ہیں، اور وہ روش اختیار کی ہے جو ان کے محسن اسلام پدر عالی مقدار نے رحلتِ رسولؐ کے بعد سے ایک زمانہ تک اختیار کی۔ بلکہ ان کے لیے اور زیادہ اینٹھنے کی بات یہ تھی کہ: "لوگ ان کے پیچھے ادب و اطاعت سے چلتے ہیں اور ان کی تصدیق کرتے ہیں"۔ یعنی بتانے مقامات کا درسہ جاری ہے۔ بغیر اس کے کہ حکومت نے اپنی روش کا کوئی استاد مسلط کیا ہو۔

یہ سوچنے کے بعد قیاس آسان ہے کہ ان کے دشمن وہ کسی زمانہ میں کیوں نہ ہوں جب دیکھتے تھے کہ حضرت پہنچانے کی کوششیں اس مفہوم میں بے کار گئیں کہ وہ ہمارے سامنے نہ صرف نہیں جھکے بلکہ اور زیادہ سیدھے ہوگئے اور لوگوں کی نگاہ میں اور زیادہ بلندی حاصل کی تو انھیں یہ تسکین نہیں حاصل ہوتی تھی کہ ہم نے ایک بے ثروت اور بے اختیار کی گردن جھکادی، بلکہ پیچ و تاب بڑھتا جاتا تھا۔

کیوں خوف تھا

ظاہر ہے کہ سیرت کا زندہ کرنا، لوگوں کا ادب و اطاعت یا اس کے بعد تصدیق۔ یہ سب تمہید تھی اس وہم کی کہ: "یہ باتیں انھیں اس چیز کی طرف لے جائیں گی جو ان سب سے زیادہ بلند ہے"۔ مشکل سے مجھے کہنے کی ضرورت ہے کہ وہ "چیز" کیا تھی۔ کیا غم تھا بنی امیہ کو اگر ائمہ میں تمام خوبیاں ہوتیں، اور ساتھ ہی بنی امیہ کو یقین بھی ہوتا کہ وہ کبھی خلیفہ ہونا پسند نہ کریں گے۔ بظاہر جس قدر باطن کا تجربہ کیا جاسکتا ہے

جناب امیرؑ کی خاموشانہ اور حسنؑ کی مفوضانہ حالت بنی امیہ کو یہ بتا دینے کے لئے کافی ہونی چاہیے تھی کہ ان نفوس قدسی کو خود کوئی خواہش حکومت نہیں ہے لیکن کیا تجربہ تاریخی یہ نہیں بتاتا کہ حکومت کے ساتھ رقابت کا وہم ایک جزو لاینفک ہے۔ یہ وہم کسی سلطنت کو محفوظ رکھتا ہے اور کبھی یہ وہم نہ صرف دوسروں کو واسطہ بناتا ہے بلکہ ذمہ داروں کا خلو اکثر ایسی ناگوار حالتیں پیدا کرتا ہے جس کے مقابل اظہار اعتبار کہیں زیادہ نافع ہوتا۔ میں مدبرین کے اختیار تمیزی کو مجبور نہیں کر سکتا کہ کہاں وہ اعتبار اور کہاں وہم کا موقع دیکھیں مگر نہ اپنی تاریخ میں مجھے عام حالتوں سے کوئی بحث ہے بلکہ مجھے تو یہ دکھانا ہے کہ یہ نفوس قدسی ایسے تمام توہمات کے اہل ہونے سے بالاتر تھے۔ گذشتہ تجربہ بتا رہا تھا کہ امیرالمومنین علی بن ابی طالبؑ کی صلاح ابن الخطاب کے فاتحانہ یا انتظامی دور میں کہاں تک موجود تھی۔ یا دور ثالث کے ویسے ہی نازک موقع پر ان کی نیک نفسانہ صلاحوں کا کیسا اثر تھا۔ یہ صلاحیں علیؑ کے ایسے قوی منافست سے نہیں لی جا سکتی تھیں جب تک ان کی حیرت خیز دیانت کا یقین نہ ہوتا۔

مؤلف کے نزدیک صحیح قیاس

بنی امیہ کا کوئی وکیل کہہ سکتا ہے کہ مدبر کے لیے یہ حفاظت لازمی تھی کہ گو آل رسولؐ کو اس کی رغبت نہ تھی کہ منصب خلافت کے حصول کے لیے خود سے کوئی صریح کوشش کرتے لیکن لوگوں کی خواہش انھیں مجبور کر سکتی تھی۔ میں فی نفسہ اس قیاس کو صحیح سمجھتا ہوں۔ اور بنی امیہ کو اس خیال کی ذلت میں چھوڑ دیتا ہوں کہ وہ لوگوں کو ان کی فطری خواہش سے روک کرانے کو مسلط کرنا چاہتے تھے۔ بالنتیجہ اختراعات ظلم کے لیے قبل وقوع واقعہ مستعد ہو جاتے تھے، بلکہ اس کے قبل کہ کسی ایسی غرض یا اثر کا شائبہ پایا جائے، یا اس کا قرینہ ہو۔ اور تاریخ کے لیے عبرت ہے کہ یہ احتیاط بھی بنی امیہ کو سیاسی یا اخلاقی حیثیت سے زندہ جاوید نہ بنا سکے۔ بنی امیہ اپنی ظالمانہ روش کے فطری اقتضا میں زندہ جاوید ہیں۔

جلائے گئے حسنؑ اور اس سے زیادہ عبرت ناک سلامتی اور بے خوفی کا اطمینان دلانا تھا اور یہ جماعت موقع پا رہی تھی کہ یہ کہہ سکتی کہ جلانے سے ہماری غرض ہی یہ ہے کہ: "آپ اور آپ کے باپ کے بارہ میں بے ادبی کریں!"۔ اور اپنے اظہار جرأت کی وجہ بھی بتا دیں کہ آپ "اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ ہم پر عتاب کر سکیں اور نہ اس قدر استطاعت رکھتے ہیں کہ ہماری تکذیب کر سکیں"۔ یقین کو اپنی چیز سے شرم آتی ہے کہ اس حد تک کوئی ایسا خیال لا سکے کہ ایک وقت تھا جس میں لوگ آل رسالت پر اس لیے پیش پیش تھے کہ ان کی ایسی توہین کی جائے کہ لونڈی غلام کہتے رہیں!۔ اور توہین وہ لوگ کریں جن کے واقعات اور نام و نسب پوشیدہ راز نہیں ہیں۔

مصلحت کہاں ختم ہوئی

لیکن ایسی شرمناک کارروائی سے بھی دشمنوں کو تسکین نہ تھی، کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ ابھی ذات فنا نہیں ہوئی۔ اور اب یہ حالت تھی کہ فریدالدین عطار کا ہمہ حسنؑ و ہمہ خلق و ہمہ حلم، ہمہ لطف و ہمہ جود و ہمہ علم کبھی موصل جاتا ہے اور تین تین بار زہر دیا جاتا ہے لیکن مہلک ثابت نہیں ہوتا۔ پریشان اور مجبور ہو کر نانا کے مدینہ آتے ہیں کہ یہاں زہر آلود رطب کھلایا جاتا ہے۔ بیمار اور پھر پریشان ہو کر تبدیل آب و ہوا کے لیے موصل جاتے ہیں اس لیے کہ پاؤں میں عصا کا زہر آلود لوہا چبھو دیا جائے۔ آخری مرتبہ مدینہ آتے ہیں اس لیے کہ اس مرتبہ ایسے زہر کو نوش فرمائیں جو ہلاک کرنے میں کبھی خطا نہیں کرتا۔ اور احتیاط یہ ہے کہ اگر

ابن خالد غیر مسلم کے ہاتھ فنا کر دیا جاتا ہے اس لیے کہ شاید مسلمان کو مسلمان کے زہر دینے میں تردد ہو اور راز فاش ہو جانے تو رومی الیسونیہ کی معرفت نواسہ رسولؐ کو جام زہر پلانے کی رازدارانہ گفتگو شروع کی جاتی ہے۔ اور اگر باپ سے یہ کام لے سکتا ہے کہ شکست کو فتح سے بدل دینے میں مدد دے جس سے حکومت پر قائم ہو جانے تو بیٹی سے یہ کام انجام دلایا جاتا ہے کہ آئندہ کسی ایسے توہم کی گنجائش نہ رہے کہ ہم حکومت پر قائم نہ رہیں گے۔ اور پھر مزید اہتمام یہ ہے کہ جعدہ بھی ٹھنڈی کر دی جاتی ہے اس لیے کہ راز حتی الوسع ظاہر نہ ہو۔

ان کا بستر احتضار گہوارہ امن تھا

کرب اور نزع کے بستر پر اس کے نواسہ کو دیکھو جو منافقین کے نام کو بتا دینا اس خیال سے گوارا نہیں فرماتا کہ لوگ کہیں گے کہ رسولؐ نے اپنے اصحاب کو قتل کرنا شروع کیا۔ اس کے فرزند کو دیکھو جو نصیحت کرتا ہے کہ دیکھو تم مسلمانوں کے خون میں آلودہ نہ ہونا۔ کروٹیں بدلتا جاتا ہے اور اپنے چھوٹے بھائی سے جواب میں کہہ رہا ہے کہ اے حسینؑ میرے بزرگ قصاص نہ تھے۔ دیکھو میرے لیے ایک چلو خون نہ گرے۔

تینوں خیالاتؑ کی اہمیت اور حسنؑ کا ہوش

اس محافظ امن اور انسانیت کی یہ آخری وصیت مذکورہ صدر دونوں وصیتوں کے موقع اور اہمیت کے درجے کے لحاظ سے صد درجہ بہتر تھی۔ ہر ایک کو اپنے آخری وقت رفع فساد اور قیام امن کی وصیت ضروری تھی۔ لیکن حضرت امام حسنؑ علیہ السلام کا نام نہ بتانا ایسے بے ایثار نفس اور دور بینی کا ثبوت ہے جس کے مقابل بجز ان کے پدر بزرگوار اور جد عالی مقدار کے اور کوئی مثال نہیں لائی جا سکتی۔ حضرت کو یہ معلوم تھا کہ جعدہ بنت اشعث نے ہمیں زہر دیا۔ حضرت کا یہ قیاس فرمایا کہ جعدہ کی یہ حرکت اپنی تجویز نہیں ہے، بلکہ اس کی صلاح ہے جس کے خیال میں مجھے زہر دیا جانا مفید ہے۔ کوئی عجب خیز بات نہیں ہے۔ اس کے بعد یہ سوچنا کہ مجھے موصل میں کس کی تحریک سے زہر دیا گیا جو مراسلت (بقول روضۃ الشہدا) حضرت کے ہاتھ لگی، کوئی بڑے غور کی چیز نہ تھی۔ حضرت کو یہ معلوم تھا کہ مدینہ میں بجز مروان بن حکم کے اور کسی کو ابن ابوسفیان کی ایجنٹی کا فخر نہیں ہو سکتا۔ یہ سلسلہ اور اس کی قوت ایک طرف تھی اور دوسری طرف حسینؑ اور ان کے چند رفقا تھے۔ اس وقت اگر جعدہ کا نام بتایا جاتا اور یہ سلسلہ عام طور سے ظاہر ہو جاتا تو محمد بن اشعث اور اس کے اہل قبیلہ، حاکم مدینہ بنی امیہ اور سب سے زیادہ معاویہ مخالفت کے لیے تیار ہو جاتا۔ نواسہ رسولؐ کے انتقام لینے کا جوش پیدا ہوتا، یا نہ ہوتا لیکن یہ سب سے زیادہ واضح تھا کہ اس وقت ہم نام بتا کر اپنی اس چھوٹی سے راسخ الاعتقاد جماعت کو قتل کرانے کے محرک ہو جائیں گے جسے ہم نے صلح کر کے بچایا۔

توریت کتاب پیدائش کے ۲۳۔ ۲۵۔ ۳۵۔ ۴۹۔ اور ۵۰ باب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ ابراہیم اور آل ابراہیم کو اپنے خاندانی مقبرہ میں دفن ہونے کا خاص لحاظ تھا۔ نظر بریں یہ قیاس کرنا آسان ہے کہ سرزمین عرب جو دیگر بنی اسرائیل کے عروج و زوال سے زیادہ متاثر نہ ہوئی تھی اور جہاں ابراہیم اسماعیل اور ہاجرہ کے علامات کی حفاظت کی گئی تھی اور جہاں ان کی اولاد اپنے اولین رسومات و خیالات پر زیادہ قائم تھی اسے ابراہیم اور آل ابراہیم کے دفن کا یہ پسندیدہ طرز فراموش نہیں ہو سکتا تھا۔ اب مجھے حسنؑ کی وصیت کا یہ ٹکڑا لکھنا ہے کہ: "اگر میں شہید ہو جاؤں تو خانہ رسولؐ میں دفن کرنا"۔

اور اگرچہ حضرتؑ کو بنصّ ابوبکر سے کہنے کی ضرورت ہوئی تھی اور انھوں نے "اقرار کیا تھا" لیکن پھر حضرتؑ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ: "میں نہیں جانتا کہ یہ بات جو بعد میرے"۔ اگر ایسا ہی ہو سکتا تو کیوں نہ حضرت فاطمہؑ اپنے پدرِ عالی مقدار کے پہلو میں دفن ہوتیں۔ خانہ رسولؐ بنی ہاشم کے قبضہ میں نہ تھا۔ اور دفن یا عدم دفن سے ملکیت کا خیال مانع نہ تھا بلکہ جیسا ہمارے زمانہ کے ایک قادیانی رسالہ خلافت راشدہ اور خود ابوحنیفہ اور فضال بن حسنؓ کے ایک مکالمہ سے ظاہر ہے (دیکھو تہذیب المتین) کہ جب محض دفن کر دیا جانا افضلیت کا ایک باعث قرار دیا جا سکتا تھا تو ہماری تاریخ کے زمانہ میں کیا کچھ ممکن نہ تھا جب کہ خود عائشہ مع اپنے تمام حافظہ کے ذخیرہ کے موجود تھیں اور جس وقت حکومت ہر طرح کی کاررروائیاں آلِ رسولؐ یاد فراموشی اور تخفیف منزلت بلکہ رسولؐ سے ان کی بے تعلقی ظاہر کرنے کے لیے اختیار کرتی تھی۔

نواسۂ رسولؐ کا جنازہ

اب عالمِ خیال میں ایک مظلوم کے جنازہ کے ساتھ ساتھ رسولؐ کے روضۂ مطہر تک چلو۔ جو مظلوم رسولؐ کا نواسہ تھا۔ تم کیوں چاہتے ہو کہ اس جنازہ کے ساتھ دفن کے لیے بہت سے آدمی ہوتے جب کہ رسولؐ، علیؑ اور فاطمہؑ زہرا کے دفن کی تاریخ لکھی جا چکی۔ یہ اس کے کہ جس قدر بنی ہاشم کی تعداد بڑھ گئی ہو یا جس قدر دوست اس قدر بے خوف ہو گئے ہوں کہ انھیں اپنا پہچوانا اور اس کے نتائج بھگتنا زیادہ گوارا ہو بہ نسبت اس کے کہ اس یادگارِ رسولؐ کے آخری فرض میں شریک نہ ہوں، اس مقدس بوجھ اٹھانے والوں کے قلبی اثرات کے علاوہ ان کی افسردہ صورتیں صاف اس فکر اور خوف کو ظاہر کر رہی ہوں گی جس کا انھیں اب سامنا تھا۔ جب کہ صلح نامہ کے ایک فریق سے زمانہ خالی ہو گیا اور حسنؑ کے محض وجود نے ظلم کی انتہا کو روک رکھا تھا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ جنازہ نے پہلے خانۂ رسولؐ کی زیارت کی یا پہلے مسلح گروہ سے ملاقات ہوئی۔ ہر شخص کو اختیار ہے اپنے تصفیہ کا کہ کبھی اونٹ کا سوار آج خچر پر سوار ہو سکتا تھا یا نہیں اور وہ گفتگو ہو سکتی تھی یا نہیں۔ لیکن اس سے کسی کو انکار ممکن نہیں کہ مروان بن حکم کو خانۂ رسولؐ کے متعلق کسی کوشش تصفیہ اور ارادہ کا حق نہیں ہو سکتا تھا۔ بنی امیہ کی سرگروہی مروان موجود گی بلکہ اغوا تو ظاہر ترین بات ہے۔ اس وقت بنی ہاشم کے خفی غیظ کا قیاس آسان نہ ہے۔ اور اگر یہ روکے نہ گئے ہوتے تو دفن کے لیے کچھ شہیدوں کی قبریں عدد میں زیادہ ہو جاتیں۔ لیکن غالباً بنی امیہ ایک بے کار ضد پر زیادہ جرأت اور ثباتِ قدم کی تکلیف نہ دے سکتے۔

حسنؑ کا اصل مرثیہ

بنی ہاشم نے تصفیہ کیا کہ اگر کبھی تلوار کھینچنے کا وقت ہے تو آج ہے لیکن ذمہ دار کے کانوں میں جنازہ سے صدا آ رہی تھی کہ: "میرے لیے ایک چلو خون نہ گرے"۔ حسنؑ نے خون کی قے کی تھی۔ اس وقت امن قائم رکھنے کا ذمہ دار خون کے گھونٹ پی کر بنی ہاشم سے کہہ رہا تھا کہ: "میرے بھائی کی وصیت کو ضائع نہ کرو۔ اور ان کا جنازہ بقیع کی طرف پھیر لے چلو"۔ اس وقت حسنؑ کی مظلومی کے اظہار میں حسینؑ کے صبر اور حکم کی گرفتہ صدا سے زیادہ دردانگیز مرثیہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ حسینؑ نے نہ تیروں کے پھل کو جنازہ کی آرائش کا کوئی جزو قرار دیا تھا اور نہ سفید کفن پر سرخ دھبہ ڈالنا مسلمانوں کا اصول ہے۔ بقیع کی طرف واپسی کے وقت تیروں کے پر صندوق کو ڈھانکے تھے۔ اور شیرِ فاطمہؑ سے بنے ہوئے (اس وقت کے سرد خون کے) ہلکے گلابی دھبے کفن پر پڑے تھے۔ سچ کہا ابوہریرہ نے کہ: "یہ ظلم ہے کہ ابن رسولؐ (رسولؐ کے پہلو میں) دفن نہ کیا جائے"۔ آج انھیں بھی یاد نہ تھا کہ حسنؑ کے قاتلوں کی فہرست بناتے لیکن وہ تھیں اولادِ رسولؐ کو رحلت کے بعد بھی انھیں لوگوں کے خیال میں

رسولؐ سے علیحدہ رکھنا تھا وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کوئی بقیع میں کوئی نینوا میں کوئی مشہد میں دفن ہو۔

عبرت خیز تکبیر

امام کا علیل ہونا ایک خبر تھی جو امیر شام کو دی جاتی اور وہ اس قدر دلچسپی ظاہر کرتا کہ برابر خبر بھیجنے کی تاکید کرتا۔ اسے اور کیا سننے کی بے چینی تھی بجز اس کے کہ زمانہ حسنؑ سے خالی ہو گیا۔ خبر سنی۔ تکبیر کہہ اٹھا۔ بلکہ چیخ اٹھا۔ اس طرح کہ اہل شام سنتے اور نادانستہ بلکہ تکبیر کی غرض اور مفہوم سے اعادہ کرتے۔ نانا نے تکبیر اس لیے سکھائی تھی کہ نواسے کو زہر دے کر خوشی سے تکبیر کہی جائے!۔ اور اب کوئی سبب پوچھتا اور وہ اسے اطمینان سے کہتا کہ: "مر گئے حسنؑ"۔ اس سے اس کا "دل ٹھنڈا ہو گیا"۔ اور پھر اس کے بعد ابھی اس ذلیل وحشیانہ تبسم اور طنز کی جھلک باقی تھی کہ "حسنؑ سے تعجب ہے کہ ایک گھونٹ شہد اور پانی پیا اور مر گئے؟"۔ فضل بن عباس نے مرثیہ میں معاویہ کی طبیعت کا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔

جب معاویہ حسنؑ کی حیات ہی میں عبد اللہ بن جعفر میں حسینؑ کی تعظیم کے طعنہ سے خیال رقابت پیدا کرنا چاہتا تھا جو خاندانی اختلاف پر منتج ہوتا اگر یہ دام میں آ جائیں تو کم سے کم بنی ہاشم کی سرداری بظاہر دو آدمیوں میں تقسیم ہو جائے تو پھر حسنؑ کے بعد کیوں معاویہ پر فریب سنجیدگی ابن عباس پر صرف کرتا کہ: "اب تو تم سردار قوم قرار پاؤ گے"۔ غالباً یہ چوتھی کوشش تھی جس میں حکومت بنی ہاشم کے کسی فرد کو قوم کا سردار قبول کر کے آلِ علیؑ و فاطمہؑ کو پست کرنا چاہتی تھی۔ مقیرہ اب تک زندہ تھا اور اسے اپنی ابتدا کی آخری کوشش میں بھی ناکامیابی دیکھنی تھی۔

کب سے دوبارہ پرزے جدا کیے جانے لگے

اگرچہ حضرت امام حسنؑ کی حیات ہی میں جناب امیرؑ پر سب و شتم کی جاتی تھی لیکن حسنؑ کی موجودگی ابھی اس سے روکتی تھی کہ ایک ایک پرزہ جدا کیا جائے۔ یعنی ان کے صاحب اثر مؤیدین حقوق قتل کیے جائیں جو بنی امیہ کی اطاعت پر خوشی سے آمادہ نہیں تھے۔ جب زکوٰۃ نہ دینا خلیفہ قبول نہ کرنے کے ہم معنی اور جناب امیرؑ کی تائید کا مرادف اور اس لیے قتل کا مستوجب ہو سکتا تھا تو اس وقت تو ان لوگوں کو ہٹانا تھا جو ایک عہد کے رو سے وظائف پاتے تھے۔ اور یہ وظائف حکومت کے نزدیک ان پر بہتر صرف کیے جا سکتے تھے جو حمایت پر آمادہ ہوں۔ یہ عناصر تھے جنہیں معاویہ اپنے آزادانہ غلط اختیار کی راہ میں حائل دیکھتا تھا۔ شاخیں کاٹتا تھی شاخوں کے نکلنے کا مقدمہ ہوتا۔ اگر جڑ اپنی جگہ رکھی جاتی۔ دوست پھر پیدا ہو سکتے تھے لیکن کسی حسنؑ کا پیدا ہونا محال تھا۔ اس لیے جڑوں کی مسلسل کوشش کی گئی کہ کسی طرح نواسۂ رسولؐ تمام ہو جانے۔ اسے بر آئی۔

نیا پرزہ

یہ کافی نہ تھا کہ معدوش لوگ کم کیے جاتے بلکہ جتنے دوست بھی پیدا کیے جاتے اس لیے زیاد کے ملانے کی کوشش کی گئی۔ اس کی تیز فہمی اور انتظامی قابلیت کام لینے کی چیز تھی۔ جس طرح اشعث بن قیس کی سیاہ باطن کار گزاریاں اور اس کا افسر قبیلہ ہونا اسے دور اول میں قرابت کی قیمت سے خرید سکتا تھا اور آئندہ اسے خود ابن ابوسفیان لاکھوں روپیہ دے سکتا تھا۔ زیاد کی طرف توجہ کی وجہ سعید کی تاریخ تھی۔ امیر شام تو بہت کچھ کر سکتا تھا۔ اگر موقع چاہتا اس وقت تو صرف بھائی ہی بنانا تھا۔ ان کوششوں کے دوران میں عبید اللہ اور عبید اللہ بن زیاد کو بشر بن ارطاۃ نے گرفتار کر لیا۔ اور قتل کا قصد کیا۔ لیکن ابوبکرہ نے صلح کا دفعہ یاد دلایا۔ مزید کوشش یہ کی کہ

معاویہ سے رہائی کا پروانہ لائے اور رہا کروایا۔ کبھی کسی اچھی غرض نے اس معاملہ سے زیادہ برا چولا نہیں بدلا اور نہ کبھی احسان کا بدلہ بدرجہا زیادہ ناشکری سے دیا گیا۔ کون وہ کور نمک ابن نمک حرام تھا جس نے آلِ رسالت کے نام مٹا دینے کا پر اصرار ذمہ لیا۔ یہ اسی ابن زیاد کے۔

اسی زمانہ میں مغیرہ بن شعبہ کو زیاد کا ایک احسان اتارنے کا موقع مل گیا۔ اور اس نے اس مال پر قبضہ نہیں کیا جو عبدالرحمن بن ابوبکرہ کے پاس زیاد نے رکھوایا تھا۔ اور کہہ بھی دیا کہ: "تمہارے باپ نے میرے ساتھ برائی (شہادت زنا) کی تھی لیکن تمہارے چچا نے میرے ساتھ سلوک (خلیفہ کے اشارہ پر جرم ثابت نہ کرنے والی شہادت مدعی تھی) کیا تھا"۔ اور اس کے بعد جب مغیرہ سے ابن ابوسفیان نے زیاد کے ملانے کی وجہ بھی ظاہر کر دی کہ: "ایسا نہ ہو کہ وہ اہل بیت میں سے کسی شخص کی بیعت کرلے اور لڑائی پھر از سرِ نو چھڑ جائے"۔ (مؤلف کے نزدیک امیر شام اس وقت خلیفہ اول کی زبان سے بول رہا تھا) اس لیے اسے "شب کو نیند نہیں آتی تھی"۔ مغیرہ نے لانے کا وعدہ کیا۔ اس سے زیادہ کسی کو حق بھی نہ ہو سکتا تھا۔ زیاد سے کہا یہ کہ: "اپنی فکر کرلو، اس سے پیشتر کہ معاویہ کو تمہاری پرواہ نہ باقی رہے"۔ مغیرہ اس سے کہہ رہا تھا جو ابوموسیٰ اور حضرت عمر کی گورنمنٹ کا سیکرٹری رہ چکا تھا۔ مزید اہتمام یہ تھا کہ وہ "ایک لاکھ درہم پر مصالحت کے بعد چھوڑ نہ دیا گیا تھا۔ بلکہ "عزت و احترام" ہوتا تھا۔ اور "باحترام جماعت میں شریک" کیا جاتا تھا۔ یا دوسرے لفظوں میں مغیرہ کے مدرسہ کا شاگرد بنایا گیا تھا۔ اور جناب امیرؑ کے اس فقرہ کو بھلا دینے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ: "ابوسفیان میں خباثت نفس اور ایک جہالت تھی جس کی میراث تم کو نہ ملنی چاہیے"۔ معاویہ جو کچھ کر رہا تھا یہ رومیوں کی اس مصلحت کی شاگردی تھی جو وہ یہود کے ساتھ کرتے تھے۔ جب یہود کا کوئی فرد اپنی بے قومی میں اس درجہ ترقی کر جاتا تھا کہ اسے اپنی قوم کی خوبو سے مغایرت ہو جاتی تھی۔

اس درمیان میں بشر بن ارطاۃ بصرہ میں اور مغیرہ کوفہ میں علیؑ اور آلِ علیؑ کے متعلق اپنی دل کے بخار اس نکال رہا تھا۔ اور خود معاویہ نے عدی بن حاتم سے اس لیے علیؑ کی محبت پر معرکہ شروع کیا کہ کوئی میدان نہ تھا جہاں عدی کی تلوار جواب دیتی۔ پھر بھی عدی کی زبان تلوار سے زیادہ گہرا زخم لگانے کے قابل ہو چکی تھی۔ معاویہ ان کی تقریر سے سہم گیا۔ تقریر تھکوائی۔ "تندی اور ملاطفت" سے گفتگو شروع کی۔ ہم اس وحشت کا قیاس نہیں کر سکتے جو یہ سن کر لاحق ہوئی ہوگی کہ "بلاشبہ موت کا غرغرہ اور حالت نزع کا گھونٹ ہمارے لیے آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ ہم علیؑ بن ابی طالبؑ کے حق میں کوئی کلمہ ناملائم سنیں"۔ سچ ہے کہ کسی چیز کے نسبت خلوص محبت اور اعتقاد کی بہترین کسوٹی موت ہے۔ علیؑ کی محبت اس پر پوری سے زیادہ اتری۔

یہود اور پیروانِ علیؑ

ہو سکتا ہے کہ یہود کو اپنی بقائے قومی کے جدوجہد میں دیگر اقوام پر افتخار کا موقع ہو لیکن پیروان علیؑ کے مقابلہ میں یہ ادعا کوئی ترجیحی حق قائم نہ کر سکے گا۔ اس لیے کہ یہود صدیوں کے بننے کے بعد بگڑے اور اس کے بعد انھیں اپنے زوال کے روکنے کی کوشش آسان تھی برخلاف پیروان علیؑ کے جو اس وقت سے بگڑی کہ ان کے بننے کا زمانہ قابل شمار نہ تھا۔

زیاد کب گورنر مقرر کیا گیا

۵۰ھ میں سبط اکبرؑ نے رحلت فرمائی اور اس وقت تک زیاد بن ابیہ جس درجہ مسخ ہو چکا تھا وہ معاویہ کے اس ود جد توجہ کے قابل تھا کہ اسے

بصرہ اور کوفہ کے دو مفید صوبے حوالہ کر تا۔ یعنی امیر شام کی یہ عنایتیں زیاد کے اعمال کی قدر دانی اور مزید ایسی ہی کارروائیوں کے لیے ایک اشارہ تھا۔ اور خود اس کی آرزو کر سکتا تھا۔

۵۱ھ میں اس نے بوڑھے صحابی (عدی) کو اس لیے زیرِ حراست لے لیا کہ وہ عبداللہ بن خلیفہ طائی کو حاضر کریں۔ عبداللہ حجر کے رفیق تھے اور حجر نہ صرف سردارِ قبیلہ تھے بلکہ حضرت امام حسنؑ کی طرف سے فوجی بھرتی اور انتظام کے افسر تھے۔ اور مصالحت کے مخالف تھے۔ عدی نے اس کی ذمہ داری نہیں لی۔ اس لیے کہ انھیں خوف تھا کہ عبداللہ قتل کر دیے جائیں گے۔ زیاد نے کوئی انکار نہیں کیا۔ یہ ان کے قید کرنے کا ایک سبب ہو سکتا تھا۔ لیکن جب دیکھا کہ لوگوں میں ان کی صحابیت اور سردار سلے ہونے کی وجہ سے برافروختگی ہے تو انھیں ایک شرط سے رہا کر دیا۔ لیکن کیا سب صحابی اور سردار سلے تھے؟ نہ تھے اور اس لیے ان کے ہاتھ پاؤں، گردن، زبان، اور آنکھیں، تلوار، نیزے اور رسیوں کی خوراک تھیں۔ سولیاں، درخت اور قید خانے ان کی شہادت کے تماشائی تھے۔

فوج کشی کا بے بنیاد الزام برہنہ ہو گیا

آسان تھا کہ ابی معیط کے لڑکوں سے کم درجہ کا بھی کوئی شخص علیؑ کے کسی دوست کے متعلق کہتا کہ اس کے گھر "مجمع" ہوتا ہے اور یہ لفظ اس قدر بھیانک صورت اختیار کرتا جو قتل کا فتویٰ دلا سکتا۔ اوفیٰ بن حصین گرفتار اور قتل کیے گئے۔ عمرو بن الحمق کی تادیب ہوئی اور ایک روز جب زیاد کہہ رہا تھا جو کچھ بنی امیہ کا وظیفہ تھا تو حجر نے روکا۔ زیاد خاموش رہا۔ بصرہ گیا اور عمرو بن حریث کو کوفہ بھیج دیا۔ سیدی ابن حریث جس نے آٹھ ہزار آدمیوں کو بصرہ میں قتل کر ڈالا تھا معلوم ہوتا ہے کہ ایسے بھی حجر کے گرفتار کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ زیاد پھر کوفہ آیا۔ اور ایک دن اپنے صاحب شرطہ کو کچھ سپاہیوں کے ساتھ حجر کی گرفتاری کو بھیجا۔ لیکن وارنٹ عدم تعمیل واپس آیا۔ اب زیاد نے "اہلِ کوفہ کو ایک جا کر کے دھمکایا ڈرایا"۔ اور جب لوگوں نے بے تعلقی کا اقرار کیا۔ جس کے سوا چارہ نہ تھا۔ تو اب زیاد نے صاحب شرطہ میں ہمت کے کچھ اور قطرے ٹپکائے۔ لیکن ہمت کا مصرف کہاں تھا۔ جب کہ دوسری جانب مقابلہ کا سامان ہی نہ تھا۔ یہ تمام الزام برہنہ ہو گئے کہ مجمع ہوتا ہے اور لشکر کشی کا سامان ہے وغیرہ وغیرہ۔ جب صاحب شرطہ حجر کی تنہا تلوار سے زخمی ہو کر گرا، اور ابوالعمر کندی نے حجر سے کہا کہ: "تمہاری حمایت کو سوا میری تلوار کے اور کوئی تلوار نہیں ہے اور میری تلوار تم کو ان لوگوں سے نہ بچا سکے گی"۔ ظاہر ہے کہ ابوالعمر کا یہ کہنا یا عمرو بن الحمق کا حجر کی حفاظت میں زخمی ہونا، عرب کے اس مسلمہ قانون کی بنا پر تھا کہ اہلِ قبیلہ اپنے کسی فردِ قبیلہ کی حفاظت کرتے تھے۔ حالانکہ اس وقت ان کا قبیلہ بھی حفاظت کے لیے جمع نہ تھا۔ غالباً گرفتاری کے حکم کے لیے انتہائی وقت مناسب سمجھا گیا ہے۔ حجر، رفاعہ بن شداد، اور عمرو بن الحمق مختلف قبائل میں پناہ لیتے رہے اور زیاد نے چند قبائل کو ان کی گرفتاری کے لیے مخصوص کیا۔ یعنی ایک قبیلہ کو دوسرے پر چھوڑ دیا۔ پھر بھی یہ لوگ گرفتار نہ کیے۔ لیکن جو کچھ قوت سے ممکن نہیں ہو سکتا۔ مکر سے آسان ہو جاتا ہے۔ اگرچہ حجر کندہ کے رئیس تھے لیکن حکومت نے بھی کندہ میں ایک رئیس اپنا بنا لیا تھا۔ اور یہ کون تھا؟ مشہور باپ کے بیٹے کے۔ حجر نے اپنے کو محمد بن اشعث کے حوالہ کر دیا۔ بارہ سردار اور قید کیے گئے۔ مقدمہ پیش ہوا۔ اور ہم تصفیہ نہیں کر سکتے کہ جو الزامات ان لوگوں پر عائد کیے گئے وہ ابن خلدون کے فلسفۂ تاریخ کے تجزکا نتیجہ ہے، یا اس کے مترجم کی بیسویں صدی تک کی معلومات کا بھی کچھ حاشیہ ہے۔

کس دل کے لوگ علیؑ پر قربان ہونے کے شایان تھے

لیکن بغیر کسی ادنیٰ کوشش کے مقدمہ کافی سے زیادہ کچھ میں آجانے کا سبب جب اس کے دو عنصر پر نظر ڈالی جائے گی۔ اول یہ کہ گواہی دینے والے طلحہ، زبیر، ابن ابی معیط اور ابن ابی وقاص کے لڑکے تھے۔ اور ابو بردہ اور ابوہریرہ کے نام سے فہرست پر قبضہ لیا گیا تھا۔ دوسرے شریح بن ہانی کا نام گواہوں میں بغیر ان کے علم و اطلاع کے لکھا گیا تھا جس کی انھیں تردید کرنی پڑی۔ لیکن فوج کشی ہو یا معاویہ کی خدمت سب کچھ قابلِ معافی بھی تھی اگر یہ لوگ "علیؑ سے بیزاری ظاہر کریں"۔ شجاع اور وفادار حجر اور ان کے رفقا نے اس سے "انکار کر دیا" حجر کی سپاہیانہ غیرت ہی کا حس یہ کہنے کا شایان تھا کہ: "اگر مجھے یہ شبہ نہ ہوتا کہ تم لوگ یہ سمجھو گے کہ میں موت سے ڈر رہا ہوں تو میں دیر تک نماز پڑھتا رہتا"۔ اور اس کے بعد حجر علیؑ کے وفادار خادم کی طرح علیؑ کے نام پر قربان ہو گیا۔ شریک، صیفی، قبیصہ، محرز، کرام زندۂ جاوید ہوئے۔ اور عبدالرحمٰن بن حسان جنھوں نے مخدوش موقع کی صاف گوئی کی جرأت کر کے معاملہ کے سمجھنے کے لیے روشن تاریخ چھوڑ دی "زندہ دفن" کر دیے گئے۔ عمرو بن الحمق کو یا نیزے مار کر شہید کیا، یا دشمنوں کے تعاقب میں ہلاک ہوئے۔ پھر بھی ان کا سر معاویہ کے لیے اس قدر قیمتی تھا کہ اسے دیکھ کر تسکین ہوئی۔

اس طرح وہ جڑ اور شاخیں نیست و نابود کر دی گئیں جن کا سرسبز رہنا معاویہ کو سوہانِ روح تھا۔ اور جن کے ہوتے یہ حقیقتاً اپنے کو بادشاہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن میں سے ہر ایک معاویہ کو اپنی تلوار سے قتل کرنا تلوار کی ذلت سمجھتا لیکن شاید اس لیے قتل کر ڈالا کہ خلق کو اس کے سایہ سے محفوظ کر دے۔ لیکن ابن ابوسفیان نے ایسے موقع پر احتیاط کی تھی کہ ان کی تلوار کے سایہ کا ادب کرتا۔ اور آج جب کہ وہ عہد اور اس کے لحاظ سے بے تعلقی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور اپنی تلواریں اپنے ہاتھ سے رکھ چکے تھے وہ نقضِ عہد کے شکار اور انتقام کے مورد ہوئے۔ یعنی مرتب مگر غیر منظم حق روی پر غالب آ گیا۔

ربیع بن حرث کے فقرہ کے معنی

ان شہادتوں کی خبر سن کر نفس موقع اور قومی طبائع کی بہترین مصوری کی تھی جب کہ ربیع بن حرث نے کہا کہ:

"عرب ہمیشہ حجر کے بعد سے یوں ہی قتل کیا جائے گا۔ اگر وہ لوگ حجر کے قتل سے رُک جاتے تو اپنے کو اس قتلِ عام سے بچا لیتے لیکن انھوں نے ایسا نہ کیا اور ذلیل ہو گئے"۔ ہو، کہ یہ طنز یا مرثیہ سمجھا جائے یا ایک منتقمانہ تنبیہ کی کیفیت ہو۔ لیکن یہی بس نہیں تھا بلکہ قومی خصائل کی تاریخ بیان کی جا رہی تھی۔ جہاں کوئی گروہ اس درجہ ذلیل ہو گیا تھا کہ اپنے فطری سردار کے قتل کو ٹھنڈے دلوں سے دیکھ رہا تھا بلکہ اپنی بے تعلقانہ خاموشی اور خوشامد سے آسانیاں پیدا کر رہا تھا۔ اس سے اگر کسی افسرِ قوم کے ساتھ ایسی بے انصافانہ بے رحمی کی جا سکتی تھی تو غیر ممتاز عام کی حالت کا قیاس آسان ہے۔ قتل نہ تھا بلکہ قوم کے خصائص کی زندگی یا موت کی کسوٹی تھی۔ آنکھوں میں ذلت اور نامردی یا خوشامد کی قدر نہیں ہو سکتی۔ ایسا ہونا قانونِ قدرت کا انکار ہو گا۔ اگرچہ مدبرین کی زبان اقرار سے لتھڑی ہو۔ پھر بھی عزت انفرادی خصائل کی قوت میں ہے اور جب کہ قوم کی قوم ایسے ہی افراد کا مجموعہ ہو۔

عمرو بن الحمق کی بی بی کے ساتھ برتاؤ کے معنی

اور جب یہ ممکن ثابت ہوا تھا کہ نواسۂ رسولؐ سے تمسخر کیا جاتا، اور اقران قوم قتل کیے جاسکتے تو اس سے کونسا امر مانع تھا کہ عمرو بن الحمق کی بیگم کے ساتھ سخت کلامی نہ کی جاتی۔ اس غیور بی بی نے اپنے کو عمرو بن الحمق کی بی بی ثابت کیا۔ یہ خاتون نہ جزع و فزع کرتی ہے، نہ اس میں خوف اور خوشامد کے آثار ہیں، بلکہ اپنے شہید شوہر کی تعریفیں کرتی ہے اور کہتی ہے کہ تو نے "اس کا سر میرے پاس ہدیہ بھیجا"۔ عرب ہمیشہ اپنی عورتوں کے احساسات کی عزت کرتا تھا۔ اور اس کی بہت کچھ شجاعت اپنی عورتوں کی وجہ سے تھی۔ عورت کی فریاد پر جان دینے کے لیے مستعد ہو جانا، اور اس کی مدد کرنا بہترین اصول شجاعت میں داخل تھا، اور اس کا تو ذکر ہی عبث ہے کہ اسلام نے کیا سکھایا تھا۔ ایک شریف بی بی کو اس کے بوڑھے شوہر کا سر تحفہ بھیجا گیا ہے اور وہ اصول کی خلاف ورزی پر اظہار حیرت دے جس سے غم علیحدہ نہیں ہو سکتا تھا شماتت کر رہی ہے۔ اسے جلاوطنی کا حکم ہوتا ہے۔ وہ گویا پیشتر سے مستعد تھی اس لیے کہ بے خوابی کو طول ہو گیا تھا۔ عزت معرض خطر میں تھی۔ قرض زیادہ ہو گیا تھا، اور خوشی کا ثمر دیکھنا دور از حال تھا۔ لیکن جلاوطنی کے قبل ابھی باقی تھا کہ خائن وحی بھی کچھ کہہ لیتا۔

حجرؓ کی شہادت کا ہیجان

حجر کی شہادت نے اس قدر ہیجان پیدا کیا کہ مالک بن ہبیرہ سکونی نے ان کی سفارش کی تھی لیکن معاویہ نے کہا کہ: "وہ سردار ہے اگر میں اس کو چھوڑ دوں گا تو آئندہ خوف فساد کا ہے"۔ (ابن خلدون) مالک نے گھر پہنچ کر اپنی قوم کو ایک جا کیا، اور حجر کو چھڑانے چلا۔ جب قاتل حجر قتل کر کے آ رہا تھا تو مالک سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے حجر کا حال پوچھا۔ اس نے واقعہ بیان کیا۔ "مالک کو اس کا یقین نہ ہوا"۔ سیدھے عذرا گئے، وہاں یقین ہوا۔ سواروں کو قاتلوں کی گرفتاری کے لیے بھیجا۔ لیکن وہ ہاتھ نہ آئے اور معاویہ کو معلوم ہوا تو اس نے کہا: "یہ جوش تھا جو اس کے دل میں بھرا ہوا تھا۔ مجھے امید ہے کہ وہ اب فرو ہو رہا ہوگا۔ رات ہوئی تو ایک ہزار درہم مالک کے پاس بھیجے"۔ حضرت عائشہ نے بھی سفارش کے لیے آدمی بھیجا لیکن یہ بھی شہادت کے بعد پہنچا۔ کچھ طنزیہ کلام ہوئے۔ آخر میں معاویہ نے کہا کہ: "مجھ کو اس امر پر ابن سمیہ نے آمادہ کیا تھا"۔ اہل کوفہ میں بھی کچھ ہیجان ہوا۔ اور اکثر مشاہیر ترک وطن کر کے مدینہ آئے اور حضرت سیدالاصغر کے پاس حاضر ہونے لگے۔

معاویہ کے خط کے معنی

جب مروان کو معلوم ہوا کہ کچھ اہل کوفہ مدینہ آئے ہیں اور حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے ہیں تو اس نے معاویہ کو خبر دی۔ معاویہ نے یہ خبر پا کر جو خط حضرت کو لکھا اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مروان نے اپنے دماغ پر کس قدر زور دیا تھا۔ اس میں سب سے زیادہ توجہ کے قابل یہ فقرہ ہے کہ: "مجھے امید ہے کہ جب تک ہمارے جانب سے تمھیں کوئی برائی نہ پہنچے، تمھاری طرف سے بھی کوئی مکروہ امر واقع نہ ہو"۔ اس فقرہ میں معاویہ اپنی تقریر کے اس موقع کو دہرا رہا تھا جو مصالحت کے بعد کی تھی کہ: "جو شرطیں میں نے کی ہیں ان کا سرا میرے ہاتھ میں ہے چاہوں وفا کروں خواہ نہ کروں تمھیں اس سے کوئی مطلب نہیں تم کو اطاعت کا کام رکھنا چاہیے"۔ یعنی معاویہ لوگوں کے ساتھ اپنے کیے ہی عمل کو قابل بازپرس نہ ٹھہرا رہا تھا بلکہ دوسروں کو اتحاد عمل سے روکتا تھا، اور انھیں انفرادی معاملت کا منتظر رکھتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں معاویہ کو اختیار تھا کہ وہ ایک ایک کو

قتل اور زہر کے لیے چنتا جائے لیکن دوسرا اس میں کوئی دخل نہ دے۔ دوسرے کے قتل کے وقت وہ اس سے مطمئن رہے کہ ہم بچے ہیں، یہاں تک کہ معاویہ کا وہم اسے بھی درمیان سے چن لے۔ ظاہر ہے کہ کوئی تنہا شخص سلطنت کے انتظام اور سامان کے مقابل میں کچھ نہیں کر سکتا۔ نہ کہ جب اسے فوراً اپنے کو نیز غضب میں گرفتار دیکھ کر اپنی فکر کرنی پڑی حسینؑ کے جس قدر جواب ملتے ہوں اس میں مخصوص اور مشترک یہ ہے کہ: "میں نہ تیری مخالفت پر آمادہ ہوں اور نہ جنگ کی رغبت یا قصد رکھتا ہوں"۔ حسینؑ نہ دوسرا اور نہ اس سے اچھا جواب دے سکتے تھے۔

خود غرضیوں کی جنگ اور ناز

اور جس زمانہ میں بنی امیہ اور ان کے ہوا خواہ اس پر مستعد تھے کہ کس طرح صریح یا غیر صریح طریقہ سے آل ہاشم کو نقصان پہنچائیں ابن عاص اور مغیرہ کے واقعات بھی کم دلچسپ نہیں ہیں کہ کبھی مغیرہ ابن عاص کے لڑکے کو کوفہ کا حاکم نہیں دیکھ سکتا اور کبھی ابن عاص مغیرہ سے انتقام لے کر اسے بھی معزول کرا دیتا ہے۔ برابر کی چوٹ اور برابر کی جوڑ تھی۔ ان کے طبائع کی دو الفہ خوانی کے لیے ان کے افعال کی مثالوں سے زیادہ قوی زبان نہیں پیدا کی جا سکتی۔ لیکن اس موقع پر جہاں تک شخصی فوائد کا تعلق ہے دونوں اچھے رہے بری صرف نماز رہی۔

ولیعہدی یزید کے اہتمام پر نظر

اگرچہ بنی ہاشم اور ان کے پر پرزوں کے جدا کرنے کے یہ ضروری معنی نہیں ہو سکتے کہ یہ ولیعہدی یزید کے نتیجہ کے لیے سبب قرار دیا گیا تھا لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب از روئے عہد نامہ معاویہ کو اپنی حیات تک اپنے حاکم رہنے کا یقین تھا تو پھر ان لوگوں کے فنا کر دینے کا کیوں اس قدر اہتمام تھا جو طبعاً اس کی حکومت پر راضی نہ ہو سکتے تھے۔ عام حکومتوں کا یہ اصول ہو یا نہ ہو لیکن کم سے کم معاویہ کا نہ تھا کہ سب میری حکومت پر خوشی سے راضی ہوں۔ جبر ہی میں اسے کیا کراہت تھی۔ برسوں پہلے مغیرہ بن شعبہ عثمان کے سامنے علیؑ سے کہہ چکا تھا کہ: "تم چاہو یا نہ چاہو تمہیں محکوم رہنا ہوگا"۔ اب رہا یہ وہم کہ باوجود پیرانہ سالی کے اسے امید نہ تھی کہ وہ لوگ میری بقیہ عمر تک بھی مجھے حکومت کرنے دیں گے۔ یہ قیاس معاویہ کے ایسے اندازہ کے آدمی کے لیے محال تھا۔ جو قوتوں کی بیخ تشریح کر سکتا تھا۔ اسے اپنی قوت معلوم تھی اسے ان لوگوں کی قوت بھی معلوم تھی جو اس کے مخالف ہو سکتے تھے وہ مہینوں جناب امیر کے مقابل لشکر آرائی کر چکا تھا۔ اور اسے بنی امیہ کی تائید کی آخر دم تک اس لیے امید تھی کہ ان کا اور کہیں گزر نہ تھا۔ اور اس لیے اب اس خوف کی گنجائش نہ تھی کہ ایک آدھ شکست کے بعد تخت الٹ جائے گا۔ ایسی صورتوں میں بنی ہاشم کے دوستوں کا کوئی خفیف ہیجان بھی امیر شام کی طرف سے ایسی سخت کارروائیوں کا مقتضی نہیں ہو سکتا تھا۔ جس میں دشمن کی معدومیت کے سوا چارہ نہ ہو۔ انتقام کا جوش بھی سہی لیکن جو کچھ کیا گیا وہ بجز "اطاعت یا قتل" کے اور کوئی اصول نہیں بتاتا تھا۔ اور آخرہ ایک مستقل مصلحت کا سواد تھا۔ اور ایسا ہونا یا پیشتر سے اپنے اور اپنے خاندان کو مضبوط کرنے کے خیال سے تھا یا میدان صاف دیکھ کر یہ خیال شدید ہو گیا۔

لیکن بات ایسی تھی جسے پہلے پہل خود منہ سے نکالتے ڈرتا تھا۔ معاویہ کی خود تحریک ہو یا مغیرہ کے دل پر طمع سے حکومت کی لہر آگئی ہو کہ اس نے اپنے دوبارہ بحالی کے لیے یہ ترکیب نکالی کہ یزید کی ولیعہدی کا مسئلہ چھیڑ دے۔ بہر حال

مسئلہ چھڑا اس بنا پر کہ: "اجل صحابہ اور سرداران و بزرگان قریش انتقال کرچکے ہیں"۔ اور اس لیے کہ ولیعہدی یزید کی بیعت لینے میں "نہ کوئی فتنہ ہوگا اور نہ فساد"۔ یہ آخری فقرہ قوم کی اخلاقی حالت کا آئینہ تھا کہ: "مسلط کردو جسے چاہو ہمیں دیکھنے کا کوئی حق نہیں ہے!"۔ اب رہ گیا کوشش کرنے والا آدمی تو یہ بھی کہہ دیا کہ میں کوفہ میں اور زیاد بصرہ میں کام کرے گا۔ اور اس کے بعد یہ بات بھی بہت غور کی کہی کہ "ان دونوں شہروں کے بعد پھر کوئی ایسا شہر نہیں ہے جو آپ کے حکم کی مخالفت کرے"۔ اس لیے کہ خلیفہ ثانی کے وقت سے کوفہ اور بصرہ کی حیثیت نہ صرف بہ لحاظ شہریت کے بڑھ گئی تھی بلکہ فوجی عنصر کی زیادتی نے اسے ایسا موقع دے رکھا تھا کہ مصلحت کے کسی اساس کے قبل اس پر نظر ڈالنا نہایت ضروری تھا۔ کوشش شروع ہوئی اور "ہوا خواہان دولت بنی امیہ" سے ابتدا کی گئی۔ لیکن زیاد یزید کی حرکتوں سے اس کی ولیعہدی کی امید نہ کرسکتا تھا۔ اور اگرچہ اس کا صلاح کار عبید بن کعب نمیری بھی نامقبولیت میں اس کا ہم خیال تھا لیکن صاف جواب دینے کی جرأت "معاویہ کی رائے کی مخالفت" اور "یزید کو بدخواہ بنانے" کے خوف سے نہ کی بلکہ معاملہ کو سردست ملتوی رکھنے کی صلاح دی گئی۔ اور اس طرح گویا پہلی کوشش کا زور ٹوٹ گیا۔ یہاں تک کہ زیاد سے زمانہ پاک ہوا۔

زیاد کے بعد کوشش کا دوسرا دور شروع ہوا۔ ابن عمر کے پاس ایک ہزار درہم بھیجے گئے جسے انھوں نے قبول کرلیا لیکن ولیعہدی یزید کا تذکرہ سن کر واپس کردیا۔ مروان کو لکھا گیا۔ مروان نے لوگوں کے سامنے تقریر کی اور جب یزید کا نام آیا تو عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے مروان اور معاویہ دونوں پر گرمی ظاہر کی۔ بعض کے نزدیک ابن ابی بکر کا پنجہ مروان کی ٹانگ تک پہنچ گیا۔ بنی امیہ گرم ہوتے۔ یہاں تک کہ حضرت عائشہ کو قیام امن کے لیے تشریف لانا پڑا۔ مروان نے معاویہ کو حالات کی اطلاع دی اور ابن ابوبکر کی درازی عمر ان کی محافظ ہوئی۔

اس سے زیادہ مشروطیت نما کارروائیاں کیں۔ وفود بھیجنے کے حکم نے گشت کی اور ہر صوبہ دار نے وفد تیار کیے اور وہ امیر شام کی دلی خواہش اپنی زبان سے بیان کرنے لگے۔ معاویہ کے خاص مقربین نے حاضرین اطراف کے سامنے اظہار اخلاص و وفا کی تقریریں کیں اور سب سے زیادہ پرجوش کو خطیبوں کے سردار کا خطاب دیا گیا۔ لیکن جس وقت یہ ہو رہا تھا تجربہ کار احنف بن قیس جس کا پیشتر تعارف کرایا گیا ہے اور جس سے ایک صلح کی حالت تھی۔ خاموش سنتا رہا۔ یہاں تک کہ معاویہ نے اسے چپ نہ رہنے دیا۔ غالباً اس امید سے کہ اس کا کہنا بلحاظ اس کی وجاہت، سنجیدگی اور نیوٹرل حالت کے زیادہ اثر کرے گا۔ لیکن جو کچھ اس نے کہا اپنے موقع کا بہ نسبت معاویہ کے زیادہ لحاظ کیا۔ جو گویا معاویہ کی تمام کارروائیوں کے ایک مرتبہ اور شکست کا باعث ہوا۔ یہاں تک کہ زمانہ نے پھر ایسی مثال میں عدد کا اضافہ کیا کہ کیسا ہی مکروہ کام بھی مسلسل کوشش سے خواہش کے موافق پورا ہو جاتا ہے۔

مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں معاویہ کے داخلہ کی وجہ

شیریں کلامی، مدارات، سلوک، دھمکی کام لائی جاتی رہی اور آخر میں ایک ہزار سواروں سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں پرامن داخلہ کی تیاری کی۔ وقت تھا کہ رسولؐ مکہ معظمہ سے اس لیے بتوں کا تخلیہ کرتے کہ اگر کعبہ میں ان کا وجود رہا تو عقیدہ شرک کا مرکز مشرکین عرب کا خیال میں قائم رہے گا۔ اب وقت تھا کہ

حصول مدعا کے لیے اہل حرمین شریفین پر اپنے شان و شوکت سے مرعوب کر کے اثر ڈالا جاتا۔ یعنی جس قدر بھی ان میں مذہبی لطافت کے لحاظ سے یزید کے ایسے شخص کو ولیعہد قبول کر لینے میں تردد ہوتا' یہ بھی ان سامانوں کی وجہ سے دور کر دیا جاتا اور یہ سب اس لیے کہ یہ دونوں مرکز اسلام اگر اپنی روش انکار اور کراہت پر مصر رہے تو خواہش کا نفاذ آسان نہ ہوگا اور یہ دونوں مقدس مقامات' مقامات مختلفہ پر اپنا اثر ڈالتے رہیں گے۔ غالباً یہ مثالیں ان مقدس مقامات کے متعلق ہمیشہ کے لیے ہماری چشم کشا ہو سکتی ہیں۔

مدینہ پہنچ کر معاویہ نے حضرت امام حسینؑ سے مخاطب ہو کر جو کچھ کہا وہ ایک صریح دھمکی تھی اور یہ فقرہ نہیں کہا جا سکتا تھا مگر اس کے بعد کہ وہ حاکم مدینہ کی بتائی ہوئی خبروں سے خوب بھر جاتا کہ: "تمہاری مثال اس شخص کی ہے جس کا خون جوش میں آگیا ہو"۔ اور پھر یہ جملہ پیشتر کی مثال دی ہوئی حالتوں کی طرح اس خوفناک انداز بیان سے تمام کیا گیا جس میں اپنے ارادوں کے نفاذ کے لیے خدا کے نام کو کارکن قرار دے لیا جاتا تھا۔ یقیناً یہ کوستا نہ تھا کہ: "خدا تمہارے خون کو بہلائے گا"۔ کوستا تو کمزور ہے۔ اور "حسد و عداوت" کا الزام اس لیے دینے کی ضرورت تھی کہ کیوں نہ تم نے ولیعہدی یزید کا تذکرہ سنتے ہی قبول کر لیا۔ سختی سے حسینؑ نے جھڑکا لیکن اسے پھر یہ کہنے کا موقع تھا کہ: "تم اس کے اور اس سے بدتر کے اہل ہو"۔ اور اتفاقات کی موافقت اس کہنے سے مانع نہ تھی کہ: "تم لوگ ایسی بات چاہتے تھے جو ان کے خلاف چاہتا تھا"۔ پھر بھی مدینہ کی تمام تقریر اور دھمکی' یزید کی سخاوت وغیرہ نے کچھ نہ کیا' بلکہ الٹے شعرا نے ہجو کہی۔

امیر شام کیوں عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کی رحلت کی وجہ

ناممکن تھا کہ امیر شام کا ایسا سیاسی پیش بندی اور احتیاط کا آدمی مدینہ آتا اور حضرت عائشہ کی زیارت نہ کرتا۔ خصوصاً ان کی ان قابلیتوں کے علم پر جو ان سے ظاہر ہو چکی تھیں۔ اثنائے گفتگو میں حضرت عائشہ نے معاویہ کو اس کی دھمکیوں پر ملامت کی اور اس نے جواب دیا کہ: "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس بیعت کو ناقص کر دوں جو ولیعہدی یزید پر میں نے لی ہے"۔ معاویہ نے ام المومنین کی زبان سے مرحوم محمد بن ابی بکر کے قصاص کا ذکر بھی سنا۔ یہ گزشتہ تاریخ تھی کہ حضرت ام المومنین نے ابن زبیر کی محبت کا کھلم کھلا اظہار کیا۔ اور یہ ابن زبیر بہت جلد خلافت کے قریب پہنچ جاتے اگر جمل میں فتح نصیب ہوئی ہوتی۔ حکمرانی اور خلافت کی سرد آہ ان کے دل میں تھی اور خود معاویہ نے یزید کے نصائح میں خاص طور سے ابن زبیر پر نگاہ رکھنے کی وصیت کی' بلکہ قتل کر ڈالنے تک کی اجازت دی۔ ایسی صورت میں کہ وہی ابن زبیر اور وہی حضرت عائشہ زندہ تھیں۔ اور وہ کچھ کہہ چکی تھیں جو کہنا تھا۔ یقین کر لے جس کا جی چاہے کہ حضرت عائشہ کا عبرتناک حادثہ محض مروان کا جوش انتقام تھا جس نے طلحہ کے بعد ام المومنین کو بھی فنا کر دیا۔ اور پھر امیر شام اس کی کوئی باز پرس تک گوارا نہ کرے۔ ذاتی طور سے۔ اگر میری آنکھ سے زمانہ اور اس وقت کا سیاسی پردہ اٹھ بھی جائے تو میرا یقین بڑھ نہ جائے گا کہ حضرت عائشہ کی موت معاویہ کے حکم سے تھی۔ یہ ہو' یا خالد اور مغیرہ کا عزل' عبد الرحمن بن خالد کا زہر دیا جانا۔ یہ سب اس روح کی حرکت تھی کہ: "ہمارے حوصلہ اور اختیار میں کوئی دخل دیتا ہے"۔ جو دوسری شکل میں کم ذمہ داروں سے اس طرح ظاہر ہوتی تھی جیسے مغیرہ اور ابن عباس کی آپس کی جنگ تھی۔ بہر حال حضرت عائشہ کا درمیان سے اس طرح اٹھا دیا جانا بنی امیہ کی ہمہ گیریت اور بے جنبش حالت کی

مثال تھی اور وہ اب اس قابل ہوگئے تھے کہ اس مصلحت کے تشخص کو فنا کرسکتے جو آج انھیں تخت پر لانے کے سبب ہوئی۔ یہ بنی تیم کا دیا ہوا سبق تھا جو انھوں نے رسولؐ کی احسان شناسی اور اہل بیت کے ساتھ طرزِ عمل سے دیا تھا۔

معاویہ کی فکر اور اس کی وجہ

مدینہ کے سناٹے اور اس خبر نے کہ حضرت امام حسینؑ، ابن زبیر، ابن عمر مکہ گئے ہیں۔ معاویہ کو "متفکر" کردیا۔ فکر کی وجہ ظاہر تھی۔ مکہ ایک مرتبہ ایک زبردست فوجی تیاری کا مرکز ہوچکا تھا۔ اور ان افراد میں جو مکہ گئے تھے ہر فرد کم وبیش اس درجہ اثر رکھتا تھا کہ کچھ جمعیت فراہم کرلے سکتا۔ لیکن معاویہ کا یہ فکر وہم ہی وہم تھا۔ کسی نے سراً و علانیاً کوئی ایسا خیال ظاہر نہیں کیا۔ اور نہ کوئی ادنیٰ کوشش ان کے کسی ایسے خیال کی ترجمان ہوسکی۔ لیکن اگر "موقع بینی" کے مشہور مفہوم کا لحاظ کیا جائے تو یقیناً کسی ایسی کارروائی کے لیے جو معاویہ کی مخالفت میں کی جاسکتی اس سے بہتر موقع ملنا دشوار تھا۔ جب کہ معاویہ کے پاس صرف ایک ہزار سوار تھے اور جب کہ مکہ کا عامل صرف تھوڑے سے سپاہی مہیا کرسکتا۔ ابن زبیر نے یہ کیا لیکن اس سے کم مناسب وقت کو منتخب کیا۔ حسینؑ نے نہ اس وقت کوئی ایسی کارروائی کی اور نہ اس کے بعد کسی ایسی کارروائی کو پسند کیا جس کا ذکر آئے گا۔

امیر شام کی کارروائی جو مکہ کے لحاظ سے اور زیادہ افسوسناک تھی

پہنچ گیا امیر شام مکہ میں اور ان لوگوں سے ملاقات کرکے کوئی تذکرہ ماہی گزشتہ خواہش کا نہ کیا لیکن کچھ وقت کے بعد تذکرہ آیا۔ اور اب گزشتہ مصلحت کی جس کی مثالیں دی جاچکیں۔ پھر تقلید کی گئی اور کہا گیا کہ "تم لوگ صرف برائے نام خلیفہ تو یزید کو قرار دے لو باقی تمام کام اپنی خواہش کے موافق کرو"۔ میں تصفیہ نہیں کرسکتا کہ معاویہ اس شرط سے بیعت کراکے ان لوگوں کی زبانیں کاٹ رہا تھا یا کچ ایک مشکل کارروائی کو آسان بنانے کے لیے دب رہا تھا۔ نہ میں یہ سوچ سکتا ہوں کہ معاویہ اس کہنے کے بعد یہ امید کرسکتا تھا کہ حسینؑ ہمارا کہنا مان لیں گے بلکہ اگر میرا استنباط غلط نہیں ہے تو یہ انتخاب عثمان میں حکم کی کارروائی کا کھیل تھا جو دوبارہ کھیلا گیا تھا جس کی اصلی غرض یہ تھی کہ سب نہیں تو نصف نصف باتیں اور ایک ہی موافق اور مخالف ہوگئے تو وہی مسلکی فوجی مخالفین کے قتل یا تشدد کے لیے کام میں لایا جاسکے گا۔ حسینؑ نے تو رد ہی کیا۔ لیکن بقیہ لوگ بھی راضی نہ ہوئے۔ صرف خلیفہ مقتول کے ایک صاحبزادے صوبہ داری میں مگن تھے اور اس طرح وہ موقع ہاتھ نہ آیا کہ ان ذی اثر لوگوں میں سے چند کو خرید کر آئندہ مخالفت کے توہم کو کم کردیا۔

آخری ترکیب

لیکن اگر زمانہ میں ایسے لوگوں کی مثالیں ہیں جن سے تقویٰ کبھی علیحدہ اور جن کی نیکیوں کا ذخیرہ کبھی کم نہیں ہوتا تو ایسی باغیوں کی مثالیں کیوں نہ ہوں جو مقطوع النسل فریب کے مرغ ہوں، خصوصاً جب کہ دنیاوی اقتدار ان کا داہنا ہاتھ ہو۔ تم جان ہی کر کیا کروگے کہ تمہارے ساتھ فریب ہورہا ہے۔ جب کہ تمھیں نشانہ بنے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن فریب جتنا بڑھتا جائے گا بقیہ نیکی اتنی ہی گراں قدر ہوتی جائے گی۔ اس مرتبہ یہ آخری ترکیب اپنے اظہار مطلب کے لیے نکالی گئی کہ ان کے سروں پر ننگی تلواریں کھچی رہیں جن کے انکار کرنے کا شبہ ہو۔ اور پھر اس کے بعد جس قدر دروغ بیانی مفید ہو، اس میں کسی طرح بخل سے کام نہ کیا جائے۔

کیا کہنا ہے اس زبان کی روانی کا جس پر نہ خدا کے خوف کا کوئی کھٹکا ہو، نہ اپنا نفس ملامت کرتا ہو، نہ کوئی دنیاوی سزا کا خوف ہو اور نہ جسے مخلوقات کے واقف ہو جانے سے کوئی شرم آتی ہو۔ چلی زبان، کہا گیا کہ چاروں حضرات کے متعلق خبریں مشہور ہیں کہ وہ بیعت سے کنارہ کش ہیں لیکن دریافت اور طلب کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ لطف، اطاعت اور رغبت سب کو بیعت یزید کے لیے صرف کرنا چاہتے ہیں اور شبہ ہو تو یہ لوگ بیٹھے تو ہیں ہیں پوچھ لو۔ یہ فقرہ سروں پر تلواروں کے چمکنے کا اشارہ تھا اور سپاہی کہہ رہے تھے کہ: "ان کا موقع ایسا عظیم نہیں ہے کہ ان سے خوف کیجیے"۔

ہو سکتا ہے کہ یہ محض جھنکار ہو لیکن کاٹنے سے کونسا امر مانع تھا جب کہ وہ ان کے موقع کو عظیم نہیں سمجھ رہے تھے، اور نہ ان کے نزدیک یزید کے غلبہ کے لیے ان چار شخصوں کی کوئی ضرورت تھی۔

کتنا ہی وقت اس تماشہ میں کیوں نہ صرف ہوا ہو لیکن اس آنکھوں میں خاک ڈالنے سے ضرور کچھ لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ امیر شام سچ کہہ رہا ہے، بلکہ کم ہوں گے جو اسے اس درجہ کا فریب سمجھتے ہوں، اور اظہار اطاعت کیا ہوگا اور کون جانتا ہے کہ معاویہ کے دوبارہ مدینہ پہنچنے کے قبل یہ خبر پہنچ گئی ہو کہ ان چاروں آدمیوں نے بیعت کر لی اور جو لوگ ان کی وجہ سے رکے ہوں وہ معاویہ کے پہنچتے ہی اب انکار بے سود سمجھ کر راضی ہو گئے ہوں۔

شہدائے اُحد کی لاشوں سے اِنتقام

اور جب گزشتہ مظالم کی مثالیں دی جا چکی تھیں تو یہ کیوں باقی رہتا کہ وہ شہدائے راہِ خدا، خصوصاً حضرت حمزہ جنھوں نے احد میں اپنا خون بہا کر اسلام کے فہرست شہدا میں ہمیشہ قائم رہنے والا کارنامہ ثبت کیا تھا اُموی مظالم سے بچ جاتے اگر وہ نہ تھے تو ان کی مقدس بوسیدہ ہڈیاں ابھی انتقام کے لیے کام میں لائی جا سکتی تھیں۔ قصور یہ تھا کہ یہ لوگ بنی امیہ کے ظاہری کفر کی حالت میں ان سے بہادر سپاہی کی طرح لڑے تھے۔ بنی امیہ کا آج ظاہری اسلام انھیں اپنی شہادت کے وقت کے بوسیدہ ملباس میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے لیے اہتمام یہ کیا گیا تھا کہ ٹھیک اسی راستہ سے نہر نکالی جاتی جہاں یہ شہدا زندہ جاوید ہوئے تھے اور منادی کرائی جاتی کہ: "جس کا مردہ احد میں ہو سو آوے اور اسے وہاں سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لے جائے!"۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کیا کچھ بے ادبی نہ کی جاتی اگر زوجِ بتول نے اپنی قبر کے چھپانے کی وصیت نہ فرمائی ہوتی!۔ حضرت حمزہ نے تو صرف ایک آدھ اعزائے معاویہ کو قتل کیا تھا زیادہ تر تو شیرِ خدا کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔

امیرِ شام کی موت

لیکن سب بے سود تو بہ کا دن نزدیک آ چکا تھا بیمار ہوا، اور دماغ یا یوں فریب کا کارخانہ متاثر ہوا۔ سرسامی حالت میں کہہ اٹھتا تھا کہ: "کیا کیا میں نے اے حجر بن عدی اور عمرو بن الحمق اور کیوں اختلاف کیا میں نے تجھ سے اے ابن ابوطالب"۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر یزید اور بنی امیہ کا سرگرم موید ضحاک بن قیس آئندہ موقع کے لیے متردد ہوا۔ اور چاہا کہ معاویہ کا دوبارہ اظہار ولیعہدی بلکہ خلافت کی بیعت آئندہ کے لیے مفید ہوگی اور اس طرح نہ صرف اس کی موجودگی جو اسباب "غلبہ" کا مالک ہے بلکہ ایک گزرے ہوئے حاکم کا فعل لوگوں کو اپنی جگہ رکھنے کا باعث ہوگا علامات شاہی حوالہ کیے گئے تخت نشینی کی تقریر ہوئی اور آئندہ کے لیے پیشتر کے تیار کردہ وصایا حوالہ کیے گئے۔

شہید اعظم حصہ اول کی غرض

یہاں میری کتاب کا پہلا حصہ ختم ہوتا ہے۔ جس میں میں متعلق چیزوں کے قلم سے متاثر ہونے کے واقعات کو دکھا رہا تھا۔ یہ اگرچہ مختلف ناموں اور مختلف اغراض اور مختلف زمانہ کی کارروائیاں ہوں لیکن غالباً میں دکھا سکا ہوں گا کہ یہ سب ایک غرض کے لیے تھا کہ: "خلافت اور نبوت دونوں ایک خاندان میں نہ ہوں"۔ اور اس لیے بنی ہاشم ان کے دوست ان کے یاد دلانے والی چیزیں ان کے حقوق، ان کے کارنامے؛ غرض کہ ایک جسم کے مشترک الحس اعضا مختلف تشدد کے تابع تھے اور کمزور کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ کبھی اس تشدد کا مزاج معتدل تھا اور کبھی اعتدال سے بڑھا ہوا تھا۔ اس نے ہمارے اس حصہ کتاب تک جو کچھ کیا اس سے سوچا جا سکتا ہے کہ اب کیا باقی تھا جو کیا جاتا! ہماری کتاب کا دوسرا حصہ وہ باتیں دکھانے والا ہے جو اب تک باقی تھیں۔ یہ دوسرا حصہ نہیں لکھا جا سکتا تھا اگر پہلا حصہ نہ لکھا گیا ہوتا۔ کیسے بغیر ایام طفولیت گزرے ہوئے کوئی انسان جوانی کی حد تک پہنچ سکتا ہے یا کیسے کوئی واقعہ بغیر اسباب مہیا ہوئے ہو جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اسباب ختم ہوئے جو شہادت حسینؑ پر منتہی ہوتے اور اب شہادت حسینؑ کے واقعات لکھے جائیں گے۔ میں نے تمام شعار مصلحت کو اس حصہ میں اس لیے ختم کرنے کا اہتمام کیا کہ یہ باتیں آئندہ کے تذکروں کے سمجھنے میں حارج نہ ہوں۔ میرے نزدیک حسینؑ کی حیات کی فطری تقسیم ایک ولادت سے سنہ ۶۰ھ تک ہے۔ اور دوسری مدت کی جلوہ گری ہے شہادت تک اور اسی بنیاد پر میں نے اپنی کتاب کے دو حصے کیے۔

سنہ ۶۰ھ تک حسینؑ کے واقعات پر تبصرہ اسی حصہ کتاب کا جز ہے

اب تک میں نے حسینؑ کے متعلق کچھ کہنے سے عمداً احتیاط کی۔ اب موقع دیکھتا ہوں کہ اس وقت تک اس حصہ کتاب میں حسینؑ کے متعلق جو کچھ واقعات لکھے گئے اور انھیں دیگر متعلق واقعات سے جو ربط تھا اس کا خلاصہ ایک باب میں پیش کروں کہ ایک مرتب صورت آگے کے واقعات کے سمجھنے میں معین ہو۔

باب ہفتم

حسینؑ رجب سنہ ۶ھ تک

زمانہ ولادتؑ کا گرد و پیش

محض یہ کہنا کہ حسینؑ سنہ ۴ھ میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۴ھ کا کوئی تعارف نہیں ہے بلکہ ایک گونگا بیان ہے۔ اس سے یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ یہ کوئی زمانہ تھا لیکن یہ زمانہ اور وقت کا مختصر حصہ حسینؑ کے خاندان کے لحاظ سے کیسی اہمیت رکھتا تھا، اور اس خاندان کے گرد و پیش واقعات سے اس کو کیا ربط تھا، یہ سب کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ جس طرح یہ کہنا کہ حسینؑ نبی عربی کے نواسہ تھے، نسبی سلسلہ کے علاوہ کوئی تعارف نہیں ہے۔

شرح

زمانہ کے لحاظ سے وہ زمانہ جس تک کچھ دن پہلے ایک نبی کی بعثت ہوئی اور مدینہ میں ... تھا، جہاں سے ایک دین جو عالمگیر ہونے والا تھا پہلے عربی زبان بولنے اور سمجھنے والوں میں پھیلا اور جس وقت مدینہ کے علاوہ مقامات جاہلیت کے اشغال میں مصروف اور اخلاق کے ادنیٰ ترین احساسات سے متاثر نہ تھے اور خدا کی زمین اور اس کے قانون کو خوفناک صورت میں دکھا رہے تھے۔ مدینہ امن اور محبت کا گھر تھا اور جس وقت یہودی خیالات اپنے قدیم معبودوں کی ہیبت اور شیوخ قبائل کی متکبرانہ زیادتیوں سے اپنے تشخص کو کھو بیٹھے تھے۔ مدینہ اخوت، مساوات اور آزادی کا سبق دے رہا تھا۔ نہ اس فلسفہ اخلاق کے استاد کی طرح جس کا دل اور زبان اور عمل ایک دوسرے سے بے ربط ہے بلکہ آسان مختصر تعلیم اور متواتر عمل سے۔

قوتِ استقامت

اس فضا میں بسر کرتے ہوئے مدینہ کو پورے چار برس گزرنے کے لیے چار پانچ مہینہ باقی تھے اس کی قوتِ استقامت کا اندازہ اس سے کافی حد تک ہو سکے گا کہ اسے بدر، قینقاع اور نضیر میں بڑی فتح حاصل ہوئی تھی اور کچھ سرایا کے لیے کامیابی کے ساتھ پیش قدمی کی جا سکی تھی۔ بلکہ احد کے فتح نہ ہونے یا فتح کے مائل بہ شکست ہو جانے نے بھی اس کے نظام کے ستے دور پر کوئی اثر نہ کیا تھا۔ نہ اس کا نظام معاشرت شکست ہوا۔ نہ آپس کے اعتبار اور محبت میں شکستگی ہوئی اور نہ اپنے رہنما پر بھروسا میں کوئی جنبش پیدا ہوئی، بلکہ ایسے وقت میں کہ ان میں کے اکثر زخمی اور کسل مند تھے وہ پھر اپنے ہادی کے محتاط اور منتظمانہ حکم پر خوشی سے مسلح ہو گئے۔ اس لیے کہ دشمن کے دوبارہ حملہ کی افواہ تھی۔ بہت ممکن ہے کہ ان کی مستعدی کو اس خیال سے اور مدد ملی ہو کہ احد کی فتح کو ہاتھ سے کھو دینا اپنے ہادی کے ایک حکم کی تجاہل سے تھا۔

کیونکر متمدن بن رہے تھے

اس زمانہ میں وہ متمدن بنے تھے اور اس کی عافیتوں کے لطف لے رہے تھے نہ اس طرح کہ کسی نے ان کے امورات انتظامی کا خود

ٹھیک سے کہ انھیں اعتبار سے علیحدہ رکھا ہو، اور ان پر غفلت کی سی نیند طاری ہو۔ اور اس غفلت میں ان کی حاملانہ قوتیں سلب ہوتی جا رہی ہوں، بلکہ ایک نگاہ کے نیچے جو ان سے کام لیتی تھی اور انھیں اپنے امورات پر اپنے ہاتھ سے کیے دھرے کا اطمینان تھا، اور وہ اس نگاہ میں کہیں سے حاکمانہ رکھ رکھاؤ نہ پاتے تھے بلکہ پدرانہ بیچ شفقت سے کہیں زیادہ عزیز تھی۔ نہ ان میں تمدن کی حالت نے ایک دوسرے سے بے ہمدردانہ لاپروائی اور اصول منفعیت کی خود غرضانہ روش پیدا کی تھی بلکہ انھیں تو اگر کوئی سبق معلوم تھا تو آپس کے بھائی چارہ، محبت، لحاظ، حسن ظن، درگزر اور اتحاد عمل کا اور اس میں ہر لحظہ ترقی ہو رہی تھی اس لیے کہ ہادی ان کی ان امورات کی درستگی ہی کو اپنا فرض جانتا تھا۔ وہ خلق اللہ کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ انصار نہیں بلکہ اہل مدینہ شستہ ہی میں تو کہہ رہے تھے کہ:

"اگر آپ کا وجود ہم میں نہ ہوتا تو ہم میں اور دوسروں میں فرق نہ ہوتا۔ ہم آپ کی وجہ سے معزز اور سرفراز ہوئے۔ ہماری خوبیاں آپ کے سبب سے ہیں"۔

کیوں اہل مکہ دشمن ہو گئے

یہ عظیم الشان ذات جس کے احسانات کی داستان انصار بیان کرتے تھے اور جو ان کے نزدیک تمام اسباب ثروت سے زیادہ عزیز تھی ہر جگہ لطف الٰہی کا نمونہ اور رفع فساد کی تصویر تھی۔ اہل مکہ نے اس کے احسانات کو اس لیے فراموش کیا کہ یہ ان کے خیال کی پاشائی کو بجر کر ان کی غلطی انھیں بتا رہا تھا اور ایک اصول پر لے چلنا چاہتا تھا جو ان تمام ضروریات پر حاوی ہو تا جس کی انسان کو دنیا میں ضرورت ہوتی ہے۔ یہ اس کے دشمنوں کو اس لیے گوارا نہ تھا کہ ان کے شخصی اختیارات ضائع ہو جاتے اور وہ اس کو اپنا رہنما قرار دیتے۔ جس کے بزرگوں سے سربرآوردگی کی رقابت میں ان کے بزرگ مشہور ہو چکے تھے۔

تضاد

آزمایا جس طرح آزمایا لیکن انھوں نے ہاشم، عبدالمطلب اور عبداللہ کے فرزند کو ہر روز زیادہ ہر دلعزیز اور اس کی قابلیتوں کو آزمائش کے بعد زیادہ روشن دیکھا۔ اس کی مؤید من اللہ ضد دشمنوں کی سختیوں سے بڑھتی گئی۔ اور ابتدائے دعوت سے سنہ ہجرت تک یعنی تیرہ برس میں نہ صرف انھوں نے یہ دیکھا کہ مکہ میں وہ اپنی صداقت کا تخم دلوں میں مضبوط کر گیا، بلکہ اسی زمانہ نے مدینہ کے زیادہ تر حصہ کو اس کا بنا لیا۔ اگرچہ اس کے جمال جہاں آرا کی زیارت بھی معدودے چند کے سوا کسی نے نہ کی تھی لیکن جس حالت میں کہ نبی برحق کو اس تیرہ برس کے بعد اور چار برس ملے تھے کہ اپنے مشن کو پورا کرتا جائے۔ اس سترہ برس میں دوسرے رخ سے یہ خصوصیت تھی کہ اس کے دشمن اس کی بیخ کنی کے لیے مسلسل کوشاں تھے۔ اور جس وقت ہر صبح و شام اس مقولہ کا ثبوت اور اس کے جزم و استقلال کی مثال پائی جاتی تھی کہ:

"اگر قریش میرے ایک ہاتھ پر آفتاب اور دوسرے پر ماہتاب رکھ دیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا"۔

بزرگ قریش اپنے تمسخر اور سنگ افگنی سے بڑھ کر کبھی قتل کے لیے صلاحیں کرتے تھے۔ کبھی غیر ملکی بادشاہوں کے لیے سفارت مہیا کرتے تھے کبھی حملہ کے لیے چھوٹی چھوٹی جماعتیں تیار کرتے تھے۔ کبھی بڑے پیمانہ پر سامان کرتے تھے اور کبھی کوئی بزرگ قوم اپنے زیر اثر لوگوں کو اس نئے دین کے پھیلنے نہ دینے کے لیے مرتے وقت وصیتیں کرتا تھا۔ بدر کی شکست چونکہ پہلی بڑی شکست تھی اس کے ساتھ ہی دشمنوں کا ڈھیلا پڑ جانا ممکن نہ تھا۔ وہ لڑتے رہے۔ یہاں تک کہ احد کے موقع نے ان کی ٹوٹتی ہوئی ہمتیں پھر جوڑ دیں اور وہ نہ صرف رجیع وغیرہ میں نزاعی روش کی مثال دیے گئے

کہاں دو تھے اور کہاں دو ایک تھے

بلکہ انھوں نے گویا یہود کو ابھرنے پر ختم کر دیا۔ اور جس وقت "ایزد" و "اہرمن" اپنے اپنے کام میں منیر ذکر زمانہ تک خود فروشانہ استقلال ظاہر کر رہے تھے نبی عربیؐ کا کوئی واقعہ نگار فروگذاشت کا الزام قبول کیے بغیر ان کی سوانح عمری نہیں لکھ سکتا تھا جب تک ان کے نوجوان چچازاد بھائی کے خلوص، جانبازی، وجہ حق کی مدد کے نقطے شد و بند اور اس طرح گویا معلوم ہوتا تھا کہ عبدالمطلب یعنی محافظ کعبہ کو حضرت عبداللہ اور حضرت ابوطالب اس لیے عطا کیے گئے تھے کہ ان دونوں بزرگواروں کے مشہور عالم فرزند ایک دوسرے کی تقویت کے لیے دو رہیں لیکن طریقہ حق کی اشاعت اور شناسائی کی کوششوں میں ایک ہوں، کوئی اگر حکم دینے والا ہو تو دوسرا حکم کے ہر لفظ اور شائبہ کی اطاعت کی کامل مثال ہے۔ اور رسولؐ کے مشہور ایذا رساں اور تکلیف دینے والوں کے مشہور مددگاروں کا اس حامی دین کے ہاتھوں سے سر کچلا جائے۔

عرب کے خاصہ انتقام کے علم کے بعد علیؑ کی کوشش کا درجہ

علیؑ عربوں کے مزاج، رسم و رواج اور خیالات سے واقف تھے۔ وہ سمجھ سکتے تھے کہ سرداران قریش کا ہمارے ہاتھوں آج یا کل قتل ہونا کیا کچھ ہمارے اور ہمارے خاندان کے لیے کر سکتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ عرب کے انتقام کا اثر بوسیدہ ہڈیوں تک پہنچتا ہے جو خیال حضرت آمنہ خاتونؑ کی قبر کے متعلق دشمنوں نے ظاہر بھی کیا تھا۔ لیکن اس تمام علم کے ساتھ علیؑ کو اپنے وجہ کی قیمت بھی معلوم تھی۔

علیؑ اور ان کی اولاد بلاؤں میں مبتلا نہ ہوتی جس میں گرفتار ہوئی اگر ایک تیسری جماعت دفعۃً سامنے آ کر بنی امیہ کے بجھے ہوئے حوصلے اور گری ہوئی قوت کو زندہ نہ کر دیتی بلکہ اپنا مددگار قرار دے لیتی۔ لیکن علیؑ اس علم پر بھی کوشش کرتے کہ ہماری کوشش ہماری اور ہماری اولاد کی یقینی تباہی ہے۔ اس لیے کہ وجہ بہت عظیم تھی۔ ان کی کوشش کے اکثر مواقع ایسے تھے جس میں اس علم بغیر چارہ نہ تھا۔

آلِ ہاشم کی خاندانی محبت کی تاریخ

بے شک مثال ہے کہ حضرت ابوطالبؑ کو اپنے بھائی حضرت عبداللہ سے بڑی محبت تھی۔ لیکن میرے یقین میں ان دونوں بھائیوں کی محبت ان اسباب محبت کے سامنے مثال میں نہیں لائی جا سکتی جو علیؑ اور رسولؐ میں واقع تھے۔ میری غرض تقابل نہیں ہے بلکہ سلسلہ ہے۔ اور جس طرح حضرت عبداللہؑ اور حضرت آمنہؑ کی محبت مؤید بہ تاریخ ہے حضرت ابوطالبؑ اور حضرت فاطمہؑ بنت اسد کی آپس کی محبت اور خوش وقتی کی مثال ملتی ہے یہاں تک کہ حضرت خدیجہؑ اور نبی برحق کے واقعات ایک دوسرے کی محبت اور مشکورانہ لحاظ کی ظاہر تصویر ہوتی ہیں۔

محبت لحاظ اور پاکیزگی کی یہ فضا تھی جس میں نبی عربی کی دختر نیک اختر پرورش پا رہی تھی۔ بڑے بوڑھوں میں حضرت ابوطالبؑ زندہ تھے۔ حضرت فاطمہؑ بنت اسد موجود تھیں۔ مادرِ گرامی تھیں۔ جنھوں نے اپنی تمام ثروت امر حق کی اشاعت میں صرف کر دی تھی۔ اور سنہ بعثت یعنی حضرت ابوطالبؑ اور حضرت خدیجہؑ کی رحلت تک سن شریف پندرہ برس کا ہو چکا تھا۔ اپنے پدر عالی مقدار کے سرمایہ حیرت افعال دیکھ اور سن رہی تھیں۔ خود اپنی تربیت میں اس درجہ کمال حاصل کر چکی تھیں کہ ہادی عالم تعظیم کیا کرتا۔ یہ بھی جانتی تھیں کہ علیؑ نے میرے باپ کی خدمت اور جانبازی میں کیا کرنا چاہیے تھا جو نہیں کیا۔

بلکہ بستر خواب کی مشہور سرفروشی کے بعد مدینہ لے جانے میں حضرت زکیہؑ کی حفاظت کے لیے بھی علیؑ کو تلوار سے مدد لینے کی ضرورت ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ ۲ھ میں موقع نے طاہرہؑ سے عقد کے متعلق علیؑ کا بے چین خیال ظاہر کر دیا۔ جس کے سننے کے خود رسولؐ مشتاق تھے۔ اس لیے کہ علیؑ کے سوا فاطمہؑ کا کوئی کفو نہ تھا۔ ہاشم کی نسل کی یہ دو شاخیں پھر مل گئیں۔ چار ہزار مہاجر و انصار نے دعوت ولیمہ نوش کی اور رسولؐ نے پاکیزگی نسل کی دعا دی۔ علیؑ کا مرثیہ اور خود علیؑ و فاطمہؑ کے واقعات آپس کی محبت اور لحاظ کی زندہ تاریخ ہیں۔ ۲ھ گزرا تھا کہ سردار عرب کے فرزند اور ملکہ عرب کی یادگار کے گھر عقد کا نتیجہ ظاہر ہوا۔ جس میں نبی کی نگاہیں "اپنا علم و وقار" پاتی تھیں۔ اب تک حضرت فاطمہؑ بنت اسد حیات تھیں کہ گودیوں میں کھلائیں۔

۳؍شعبان سنہ ۴ھ کے زمانہ نے ایک حیرت خیز مولود کا استقبال کیا

واقعات اور جذبات کا یہ جزر و مد تھا کہ زمانہ ۳؍شعبان سنہ ۴ھ تک بڑھا اور مخلوقات الٰہی میں سے ایک حیرت خیز وجود کا استقبال کیا۔ مبارک ہے وہ مولود جس کے انتظار میں رحمۃ للعالمین پس در گھڑا ہمہ اضطراب اور بے چین اشتیاق کی ایک حالت تھی۔ بے چینی رفع ہوئی۔ رسولؐ نے سجدہ کیا۔ لیکن اشتیاق اس قدر بڑھ گیا کہ ابھی سجدہ سے سر نہیں اٹھایا تھا کہ اسماء کو پکار ا پکارا کہ: "میرے فرزند کو لا"۔ غالباً اس وقت وہ معظمہ حیات نہ تھیں جنھیں رسولؐ "ای بعد امی" فرماتے تھے، ورنہ وہ خوشی خوشی اپنے فرزند کے فرزند کو رسولؐ کی گود میں دیتیں۔ جس طرح اپنے فرزند کو پہلے امین کی پر محبت آغوش اور زبان کے حوالہ کیا تھا۔

رسولؐ نے دیکھا

لائی اسماء چھوٹا چھوٹا ایک بچہ ریشمی کپڑے میں لپٹا ہوا۔ آنکھیں اس چھوٹی سی ہیکل کے گرد پھر یہ قبل اس کے کہ سینہ مس کرتا نگاہوں نے بڑھ کر اپنے میں اُتار لیا۔ اس سے پہلے کہ پہلو اپنی پُر لطف گرمی کی قلب کو خبر دیتا۔ رسولؐ کے ہاتھ بڑھے اور گود میں لے لیا۔ لب اقدس ننھے ننھے کانوں کے قریب لے گئے اور خدا کا بزرگ نام اپنی صفت عظمت کے ساتھ بچہ کی قوت سامعہ کے حوالہ کیا گیا۔ تکبیر، وہی تکبیر جو حسینؑ کو شہید کرنے کے بعد کہی گئی تھی۔ صرف کہنے کا فرق تھا۔

رسولؐ سے مشابہت

اس بچے نے جس کا نام رسولؐ نے حسینؑ رکھا رسولؐ کی تصویر کو پورا کیا۔ روایتیں ہیں کہ حسنؑ رسولؐ کے نصف بالائی حصہ سے اور حسینؑ نصف زیریں سے مشابہ تھے۔ اگرچہ دیکھنے والوں کو شباہت میں قریب ہونے سے رسولؐ یاد آجاتے تھے۔ اور خود طاہرہؑ کے شعر سے کہ:

انت شبیہ بابی لست شبیہا بعلی

ظاہر ہوتا ہے کہ حسینؑ اشبہ بہ رسولؐ تھے۔

عطا کے لفظ میں قیافہ پسند انتخاب اور تحریک مضمر ہے

عقیقہ اور چاندی تصدق کرنا اظہار مسرت تھا لیکن خدا سے بندے کا اظہار خلوص نہ صرف قربانی کے پیش کش سے ظاہر تھا بلکہ خیرات کرنے کے اصول سے۔ جن میں کسی نادار کو

کچھ دیا یا حق الصحت ادا کرنا بھی تھا۔ ماں کی خوشنودی اپنے پدر بزرگوار سے اپنے بچے کے لیے کچھ طلب کرتی ہے اور رسولؐ اسے اپنا جود و شجاعت عطا کرتے ہیں۔ "عطا" کے لفظ کا استعمال زیادہ جرح کا محتاج نہیں ہے، بلکہ اس موقع پر رسولؐ کے فرمانے سے کہ میری شجاعت اور جود حسینؑ میں ہے۔ کہا گیا کہ رسولؐ نے یہ صفات اسے عطا کیں۔ حالانکہ صفات ایسی چیز نہیں ہیں جو زبان اور الفاظ سے منتقل کی جاسکیں۔ لیکن میں اس لفظ کو بھی قبول کرتا ہوں۔ اس لیے کہ اگر جذبات اپنے نشو و ارتقا کے لیے خارجی محرکات کے محتاج ہیں تو رسولؐ کے فرمانے سے زیادہ حسینؑ کے لیے کوئی قوی تر تحریک نہیں ہو سکتی تھی۔ اور اس طرح کسی صفت کی پرورش کی ایسی قوی زبان سے تحریک کسی طرح عطا سے کم نہ تھی۔

حسینؑ کا قیافہ اور رسولؐ

رسولؐ کا یہ فرمانا اس زمانہ میں تھا جسے ہم ہندوستانیوں کا مذاق چھٹی چلا کہتا ہے۔ علم قیافہ جاننے والوں اور قیافہ شناسوں کے لیے یہ حیرت اور دلچسپ غور کی بات ہوگی کہ اس مختصر عمر میں بچے کے چہرہ پر جود و سخا کی تحریریں کس قدر قابل شناسائی حد تک واضح ہو سکتی ہیں۔ درآنحالیکہ نہ ابھی اس کی آنکھیں اپنے حلقہ میں قائم ہوتی ہیں۔ نہ ابھی گردن میں ایسی سختی آتی ہے کہ وہ دونوں شانوں پر سنبھل سکے، اور نہ گرم و سرد ہوا نے چہرہ پر کوئی نقش ڈالا ہے یا رنگ میں پختگی آتی ہے، نہ کاسۂ سر ابھی اس حد تک سخت ہوا ہے کہ اس کے ٹکڑے آئندہ اپنی صورت میں بے جنبش کے اور کسی طرح کی تغیر کی محتاج نہ رہے ہوں۔ یہ سچ ہے کہ بچہ اپنے تمام سامانوں میں رحم مادر سے علیحدہ ہونے کے بعد وہی ہے جیسا اس وقت جب کہ وہ سو برس کا ہو کر آغوش لحد میں واپس جاتا ہے۔ لیکن اس تمام زمانہ میں اس کے محرکات طبعی اس کے محتاج ہوتے ہیں کہ شناسائی کے قابل صورت اختیار کریں اور قیافہ میں اپنی تصویر کھینچیں۔ حسینؑ کا قیافہ عجب خیز ہوگا کہ وہ چند دنوں کی عرصہ میں اپنے خصوصیات کے پہچاننے کے قابل ہو گیا۔ اسی طرح رسولؐ کی قیافہ شناسی حیرت خیز ہے کہ انھوں نے ایک نوزائیدہ بچہ کی غیر متکلم آنکھ اور قیافہ میں جس میں سادگی کی گہرائی کے علاوہ کچھ نہ ہونا چاہیے، وہ جگہ دریافت کر لی جہاں جود و شجاعت کے آثار تھے۔ گویا وہ اعضائے جسمانی کی طرح صاف صاف دیکھ لینے کی کوئی چیز تھی۔ رسولؐ کا یہ فرمانا محض خصائص قومی کے علم سے نہ تھا ورنہ اگر ایسا ہی ہوتا تو وہی الفاظ جو حسنؑ کے لیے فرمائے تھے اپنے فرزند حسینؑ کے لیے بھی کہتے۔

حسینؑ کو ہارونؑ کے فرزندوں سے موسوم کرنے کا عکس

ہم پچھلے اوراق میں اس پر نظر ڈال چکے ہیں کہ سعد بن ابی وقاص کی زبانی بیان کی ہوئی اس مسلمہ بین الفریقین حدیث کا کیا عکس ہو سکتا ہے جس میں رسولؐ نے علیؑ کو ہارونؑ سے نسبت دی۔ اس کے بعد اب ہمیں کہنا ہے کہ رسولؐ کا حسینؑ کے نام کو ہارونؑ کے فرزندوں سے نسبت دینا بجز سلسلہ کے تعارف کے اور کوئی امر نہیں ہے۔ یہ دونوں حدیثیں ایک دوسرے کی مؤید ہیں اور زمانہ آئندہ پر کافی روشنی ڈالتی ہیں کہ اس سے بجز وصایت کے کوئی اور نتیجہ اخذ کرنا مناسبت کے ساتھ ایک غیر متعلق کھیل ہے۔ ان میں سے کسی حدیث کا پہلے یا پیچھے بیان کیا جانا اصل خیال کی موجودگی پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔

رسولؐ اور حسینؑ کی روایات محبت آبا بزرگانہ محبت کے علاوہ کوئی تاریخی حیثیت رکھتی ہیں

خیال کیا جا سکتا ہے کہ کسی بچہ کے والدین یا اولیا کا صغر سنی خصوصاً زمانہ رضاعت میں محبت کا تذکرہ

ایک بے سود بیان ہے۔ اس لیے کہ ہر شخص جسے خدا نے اولاد عطا کی ہے وہ جانتا ہے کہ وہ بچے سے کیونکر کھیلتا ہے اور بچے کیونکر کھیلتے ہیں اور کیسا بیان سے بالاتر لطف ہے جو بزرگوں کو ان طفلانہ حرکتوں اور محفل غالی میں حاصل ہوتا ہے۔ لیکن حسینؑ کی طفلانہ ادائیں اس نگاہ سے دیکھی جائیں یا نہ جائیں ان کے اس زمانہ کی روایتوں کو اس لحاظ سے امتیاز حاصل ہے کہ ان کا بہلانے اور کھلانے والا رسولؐ تھا بلکہ حقیقتاً جس نے ان بچوں کے وہ رسومات بھی ادا کیے جو دوسرے گھروں میں والدین ادا کرتے اور موقع کے لحاظ سے رسولؐ کی عنایات اور توجہ ایک ملکی اور مذہبی اثر رکھتی تھیں جسے اصحاب دیکھتے تھے۔ اور اس طرح یہ واقعات اپنی بعض حیثیتوں سے ایک تاریخی صورت رکھتے ہیں۔ آئندہ واقعات نے اس کا ثبوت دیا کہ رسولؐ کی محبت کے افعال لوگوں کے حافظہ سے اس طرح خارج نہیں ہو گئے تھے جس طرح اور بچوں کے ساتھ طفلی میں بزرگوں کی مہربانیاں ایک وقت کی باتیں سمجھ کر آئندہ یاد رکھنے کی چیزیں نہیں سمجھی جاتیں بلکہ لوگوں نے اسے اثر خیز نتیجے سے یاد کیا اور یاد کروایا۔ حسینؑ کی یہ ابتدا ان کی انتہا سے تعلق رکھتی تھی۔ اور اس کے بعد سے آج تک وہ حسینؑ کے واقعہ خوان ہوں، قصیدہ گو ہوں یا مرثیہ کہنے والے ان میں سے کوئی بھی اسے بے ضرورت نہ سمجھ سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعات حسینؑ کی سوانح عمری کے جزو لاینفک ہیں۔

حسینؑ کے متعلق رسولؐ کا ارشاد اور اس کا عکس

حسینؑ کے متعلق اس کے ارشادات پر اگر تھوڑی سی غور کی نظر ڈالی جائے جس کا ایک خلاب شافع روز جزا بھی ہے تو باوجود محبت کے اکثر فقرات سے ظاہر ہوگا کہ اس سے کچھ اور غرض بھی تھی۔ مثلاً مجمع میں فرماتے ہیں کہ حسینؑ کے دوست اہل بہشت ہیں۔ حسینؑ کو سید شباب اہل بہشت فرماتے ہیں۔ ارشاد کرتے ہیں کہ جس نے انھیں اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔ کہتے ہیں کہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اصحاب موجود ہیں اور چھوٹی چھوٹی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اٹھا لیتے ہیں۔ کھلی ہوئی کلیوں کو جوش سے چوم لیتے ہیں۔ اور چھڑواتے ہیں۔ شعرا رسولؐ کے ارشاد کو نظم کر ڈالتے ہیں، اور لوگ اس سے واقف ہوتے ہیں۔ ان تمام فقرات اور اس کی ادا میں محبت کی گہری لکیر ہے۔ لیکن دوستی دعائیں اور دشمنی کے انتقامی فقرات، مجمع شناسائی یہ اشارے ہیں جو اسے واضح کرتے ہیں کہ ان بچوں کے لیے رسولؐ لوگوں کے دل و دماغ میں کوئی جگہ قائم کر رہے تھے۔

اس موقع میں خصوصیت یہ ہے کہ ایک قوم کا ہر ضروری حیثیت کا ہادی جو تمام اخلاقی، مذہبی، سیاسی اور تمدنی اختیارات کا مرکز ہے ایک بچہ کے متعلق محبت چاہتا ہے۔ اب محبت کے معنی صاف ہو جاتے ہیں۔ وہ لوگوں میں ایک قلبی وابستگی پیدا کرتا ہے۔ محبت کرو کے یہ معنی ہیں کہ کم سے کم دشمنی نہ کرو۔ لیکن وہ دشمنی سے باز رہنے کی بھی ہدایت کر کے محبت کی طرف بڑھاتا ہے۔ ایسے شخص کی کسی کے متعلق یہ کوششیں اپنی آپ ترجمان ہیں۔ محبت کی سفارش اس کے لیے کی جاتی ہے جو محبت کے قابل ہو۔ یہاں ہرگز سفارش وہ ہے جس کی صفات کا نشو و نما بھی نہیں ہوا۔ اور اس لیے بادی النظر میں "قابل" ہونے سے پہلے سفارش ہے۔ اس پر اعتراض کا موقع ان کو حاصل تھا جو سفارش کے وقت موجود تھے نہ کہ ہم کو جو حسینؑ کے صدیوں بعد زندہ ہیں۔ لیکن وہ جن کی آنکھوں اور جن کے کانوں سے رسولؐ سفارش کر رہے تھے انھیں اپنے تمام ظاہری اور باطنی حواس سے زیادہ رسولؐ کے ارشاد پر اعتبار تھا۔ انھیں اس سفارش اور اس کے علاوہ اکثر غیر وقتی ہدایتوں کے متعلق تجربہ

ہوا کہ ان کے ہادی کا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوا۔ اور ان واقعات کا تاریخی مجموعہ حسینؑ کے بعد لوگوں سے یہ کہلوا سکتا تھا کہ رسولؐ نے اپنی سفارش میں جلدی کی۔ عظیم الشان تھی وہ ذات جس کی تعریف اس کے قاتل کریں اور احسان تھا اس عالم محرکات انسانی کا جس نے ایک امام کی امامت کے زمانہ کے قبل اسے پہچوا کر حقوقات کے لیے آسانی پیدا کی تھی۔

"انا من الحسینؑ" کا زمانہ اور اس کے معنی

میں سوچتا ہوں کہ رسولؐ کا یہ فرمانا کہ: "میں حسینؑ سے ہوں"۔ حسینؑ کے ابتدائی زمانہ میں نہ تھا بلکہ رسولؐ کے آخری زمانہ میں کہنا مناسب ہوگا جس وقت رسولؐ کی کوئی اولاد باقی نہ تھی بجز حضرت فاطمہ زہرا کے اور اس لیے اس کے ظاہر معنی یہ تھے کہ میرا (یعنی محمد عربی ہاشمی کا بلحاظ نسب) نام حسینؑ سے باقی رہے گا لیکن اگر "میں" یعنی ذات میں منصب ہدایت کا خیال بھی مضمر تھا تو حسینؑ اپنی تربیت اور تعلیم اور عمل کے لحاظ سے ہدایت خلق کے قابل ٹھہرائے گئے تھے اور اس طرح رسولؐ کے منصب ہدایت نے حسینؑ کی ذات سے اپنا تشخص قائم رکھا۔ آگے چل کر حسینؑ کے آخری واقعات نے رسولؐ کے اس ارشاد میں جو معنی پیدا کیے اگرچہ وہ ایک مورخ کی نگاہ سے نشو واقعات تھے لیکن حسینؑ کے طرز عمل کی قوت نے اس مفہوم ثانوی کو معنی اصلی قرار دیدیا۔ یعنی اپنے نانا کے دین کی اصلی صورت کو اپنے عمل، حق روی، اور جزم و استقلال سے دکھا کر اس بگاڑی ہوئی صورت کو پہچنوا دیا۔ جسے لوگ اس دین کی اصلی صورت سمجھتے تھے کہ وہ صاحب اقتدار لوگوں کی بنائی ہوئی تھی اور اس لیے وہ وقت نہ آنے دیا جس میں کوئی زمانہ مذہب کی حقیقی روح کی کامل فنا سمجھا جاتا۔ اور صورت معاملہ جیسی ہو گئی تھی اس کے لحاظ سے جو جری اور ایکلی قربانی پر مسرت شوق سے گوارا کی گئی اس کے علاوہ کسی اور طرح ہمیشہ کی حد بندی ممکن نہ تھی۔ دین کی لطافت کو اس طرح قائم رکھنا رسولؐ کے نام کی بے داغ روشنی کو قائم رکھنا تھا۔ یہ حسینؑ نے قائم رکھی۔ کیسے قتل ہوجاتے زین العابدین جب رسولؐ کا نام رہنے والا تھا اور کیونکر دین کی لطافت ضائع ہوجاتی جب رسولؐ کی شجاعت سے ممتاز ایک نفس دنیا میں موجود تھا۔

حسینؑ کا گہوارہ اور ماں

ابھی ہم گہوارہ کی عمر سے آگے نہیں بڑھے۔ کون جانے کہ ان نفوس قدسی کی ضرورتوں کی کمی کے باوجود طاہرہ خانہ داری کی مشقتوں میں مشغول رہتی ہوں اور حسینؑ ماں کی گود میں پہنچنے کے قبل چیختے رہتے ہوں۔ روایت ہے کہ جناب امیرؑ نے حضرت زکیہؑ سے خواہش کی تھی کہ وہ رسولؐ سے ایک کنیز طلب کریں لیکن طلب کا وہ وقت بجائے کنیز کی عطا کے تسبیح فاطمہؑ کی تعلیم کے لیے مشہور ہے۔ غالباً یہ عقد کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے۔ اور اگرچہ حضرت فضہ ہماری خاتون کی مشہور کنیز ہیں لیکن ولادت حسینؑ کے وقت ان کا کہیں تذکرہ نہیں ہے۔ یہ بھی تذکرہ ہے کہ رسولؐ حسینؑ کے رونے کی صدا سن کر بے چین ہوجاتے تھے اور ان کے اس سوال کے معنی کہ کیا تم نہیں جانتیں کہ حسینؑ کے رونے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ یہ ہیں کہ حسینؑ کو بہلائے رہا کرو۔ صورت دوسری ہوتی ہوگی جس وقت زنان ہاشمی ہاتھ بٹانے کے لیے موجود رہتی ہوں گی۔ یا ام ایمن اور اسما کچھ مدد دیتی ہوں گی۔ بے چاری ام ایمن کی تو ایک مرتبہ اس لیے تادیب بھی کی گئی کہ انھوں نے حسینؑ کو رسولؐ کی گود سے کسی قدر بے احتیاطی سے کھینچا تھا۔

کون اندازہ کرسکتا ہے سیدہ کی اس تسکین اور خوشی کا جب وہ تم خلط کھیلنے کے لیے جھولے کے پاس کھڑی ہوجاتی

ہوں گی، ماں اور اس کی آنکھیں بے کسل شوق سے تازہ بچہ پر گڑی رہتی ہوں گی اور دیکھنے سے سیر نہ ہوں گی۔ نہ پیار کی تکرار ذائقہ میں کوئی کمی کرتی ہو گی۔ بچہ متین آنکھوں اور سنجیدہ چہرہ سے ماں کی طرف دیکھتا ہوگا۔ یہاں تک کہ ماں کا تبسم چھوٹے سے چہرہ میں منتقل ہو کر وہ عالم پیدا کرتا ہوگا جو بچہ کی بھولی ہنسی کہی جائے۔ ع: "تبسم تھا کہ جنت کی فضا کا اِک نمونہ تھا"۔ مجسم ہو گئی تھی یا بہار عالم فانی۔ اور ماں دنیا کے تمام خوشیاں اس ایک ادا پر صدقہ کرتی ہو گی۔ راتوں کا جاگنا اور تمام تکلیفوں کا علاج اس ایک نسخہ سے ہو جاتا ہوگا اور لوریاں دینے میں فطر کے ساتھ دل بڑھتا ہوگا۔ اور حسینؑ کے دل کے لیے یہی زمانہ ہوگا جب کہ وہ ماں کے رحم و کرم، نرمی، حلم اور پاکیزگی سے اثر لیتا ہوگا۔

ایک اندوہناک عکس

یہ وقت تھا جب کہ بتول عذرا کے ہاتھ حسینؑ کی نرم گردن کو شانوں پر استوار کرتے تھے کون جانتا تھا کہ اس لیے کہ ایک دن ابن کے خون سے بے حس اور بے اوبا ایک فولاد رنگا جائے۔ لیکن نہ اس کے قبل کہ وہی نرم گردن جو گہوارے میں زکیہؑ کے دست اقدس کے سہارے پھرتی تھی۔ ایک دن ایسی سخت ہو جاتی کہ تیس ہزار شامی تلواروں کا وزن اسے جھکا نہ سکتا۔ فاطمہؑ کو اپنے محنتوں کی داد ملی۔ ہمارا ہندوستانی شاعر بھی خون کے ذریعہ سے توارث صفات کا قائل ہے۔ جہاں وہ کہتا ہے کہ: ؎

زیر خنجر بھی نہ تڑپا پسر شیر خدا   یہ تکلف تو فقط فاطمہؑ کے شیر میں ہے

جھولے کے بعد

گود اور جھولے کی عمر اس طرح ختم ہوئی کہ حسینؑ کبھی رسولؐ کے دست اقدس پر اور کبھی شانے سے لگے ہیں۔ گھٹنوں چلنے کھڑے ہونے اور چلنے کی کوشش کے متعلق خبریں ہیں کہ لڑکھڑائیں گے اور رسولؐ پکار اٹھیں گے کہ اے فاطمہؑ سنبھالو حسینؑ کو۔ لڑکھڑاتے ہوئے آہستہ آہستہ مسجد میں پہنچ جائیں گے۔ رسولؐ وعظ فرماتے ہوں گے۔ دیکھیں گے اور اس خوف سے کہ مبادا گر کر بسورنے نہ لگیں، منبر سے اتر آئیں گے۔ گود میں لیں گے۔ حسینؑ ہنستے ہوئے منھ کھول دیں گے۔ رسولؐ پیار کریں گے اور ساتھ ہی اپنے دفور محبت کا احساس کر کے لوگوں سے کہیں گے بلکہ اقرار کریں گے کہ ہم سے صبر نہ ہو سکا اور ہم نے اپنی تقریر ختم کر دی۔ رسولؐ کے ازدیاد محبت پر کبھی کسی یہودی نے طعنہ بھی دیا، اور آپ نے فرمایا کہ: "اگر تم خدا اور رسولؐ پر ایمان لاتے تو بچوں کو موجب رحمت و راحت سمجھتے"۔

پاؤں میں کچھ اور قوت آئی، اب کھڑے ہو سکتے ہیں۔ ماں کی محبت نے سرخ کپڑا پہنا دیا ہے۔ نانا کے پاس چلے۔ کاندھا انتظار میں تھا۔ جھومنے لگے۔ رسولؐ سونگھتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ یہ میرا ریحان ہے۔ ابھی حسینؑ کو کیا فکر ہے کہ نانا کی محویت عبادت میں دخل نہ دیں۔ ممکن نہ تھا کہ یہ قریب پہنچیں اور گود پہلو شانے اور پشت کو جولانگاہ نہ بنا دیں۔ کوئی مرکب کی تعریف کرے لیکن رسولؐ فوراً راکب کی تعریف پر آمادہ ہو جائیں۔

کم عمری کے واقعات کا اثر

ابھی برس ڈیڑھ برس کے ہوئے تھے اور اس وقت تک یقیناً ماں نے کچھ الفاظ زبان پر جاری بھی کرا دیے تھے کہ غزوہ بنی مصطلق میں لشکر اسلام کو فتح حاصل ہوئی اور سنہ تمام نہ ہوا تھا کہ خندق کی بڑی جنگ میں لشکر اسلام کی نازک حالت کو خدا نے اس درجہ فتح اور قوت سے بدل دیا کہ آئندہ کے لیے رسولؐ یہ اعلان فرما سکتے کہ مشرکین اب پیش قدمی نہ کریں گے۔

یہ ان (قریش اور یہود) کی مجموعی کوشش کی ناکامی تھی اور اس کا اثر یا اس ان سب پر طاری ہوتا تھا۔ حسینؑ ابھی اس قابل نہ تھے کہ اس جنگ کے بڑے نتائج سمجھ سکتے یا اس لڑائی کے مفید نکات کے احساس کے قابل ہوتے۔ لیکن ہوش کا سن آنے والا تھا۔ اس وقت بھی یہ جنگ بغیر اس کے کہ حسینؑ کے بھولے دل پر اثر ڈالتی یوں ہی نہ گزری۔ بچے ماں باپ اور کھلانے والوں کو چند مہینہ کے بعد سے پہچانتے لگتے ہیں جو ان کے ہنسنے، ان کے بہکنے اور گود میں قلقاریوں سے ظاہر ہے۔ دور آنکھا لیکہ نئے آدمیوں یا پہچانے ہوؤں کی صورت کے ذرا سے تغیر کو دیکھ کر نہ صرف بھیانک ہوتے ہیں بلکہ پاس تک نہیں جاتے۔

جنگِ خندق میں باپ کا زخمِ سر اور حسینؑ

حسینؑ اپنے پدر بزرگوار کے صحیح و سالم چہرہ کے دیکھنے کے عادی تھے۔ ابھی زخمی، خون آلود یا پٹی بندھا ہوا چہرہ ان کے تجربہ کے باہر تھا۔ دردِ سر، چہرہ کی زردی، اور بے چینی سے چہرہ کے عالم اور تغیر کے خوگر نہ تھے۔ غالباً میں بچپن کے مطالعہ حرکات میں غلطی نہیں کرتا کہ جناب امیرؑ کے گہرے زخم اور چہرہ کے تغیر کو دیکھ کر جناب امیرؑ کے ہاتھ پھیلانے اور خود گود میں جانے کی خواہش کے باوجود حسینؑ گود میں نہ گئے ہوں، بھیانک ہو کر "اب" (بابا) کہا ہو اور پھر رونے بھی لگے ہوں۔ جب تک کئی مرتبہ کی کوشش یا چند دنوں کی عادت نے بے خوف نہ کر دیا ہو۔ حسینؑ کو ابھی معلوم نہ تھا کہ باپ کا یہ زخم کھانا کیسی عبادت تھی اور اس نے جو نتیجہ حاصل کیا اس کے لیے وہ ایک سے زیادہ زخم خوشی سے کھا سکتے اور کھاتے۔ نہ انھیں یہ معلوم تھا کہ یہ یا اس کے علاوہ زخم نے علیؑ کی ہمت، استقلال اور وجہِ حق کی مدد میں کوئی ضعف نہیں پیدا کیا تھا۔ نہ ان کے چہرہ کے غیر فانی تبسم نے ان سے دوری اختیار کی تھی۔ لیکن علیؑ کی طبیعت کے سکون اور چہرہ کا اطمینان حسینؑ کے اثر پذیر نفس کے لیے ایک غیر فانی نقش تھا اور ہمت افزا فتح کا وقار طبیعت کو بلند کیے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ اور اسلام کے یہ ادکار اپنی بلندی اور فخر کو انکساری اور تسلیم و رضا میں غرق کر دیتے تھے۔ ان کے لیے یہ ان کا خاصہ تھا۔ ہمارے لیے ان کا عمل سب بے اعتدالی اور خود غرضی سے بچنے کا نسخہ تھا اور ابد الآباد تک فاتحانہ تکبر کی نصیحت تھی۔ بلندی کا امتیاز قانونِ الٰہی کے امتیاز سے کیوں بے ہوش کر دے جس میں عظمت کے ساتھ خود بخود قدم بہکا پڑنے لگتے ہیں۔

یہ سنہ تمام نہ ہوا تھا کہ بنی قریظہ اور بنی سعد کی موقع بینی کو سزا دی گئی اور اس سے حسینؑ کے پدر بزرگوار کی بدولت مسلمانوں کی مالی حالت میں کچھ اضافہ ہوا۔ سنہ ۶ یا حسینؑ کی عمر کا دوسرا برس شروع ہو رہا تھا کہ ہر وقت آمادہ ضرر مشرکین کو حدیبیہ کی چھوٹی سی شکست کے بعد عہد کرنا پڑا جو اگرچہ رسولؐ کی صلح پسندی کی بدولت برابر کا عہد تھا لیکن یہ اسلام کے لیے "فتح مبین" تھی۔ اس لیے کہ اب مشرکین اپنے چہرے بگاڑ رہے تھے و نیز اس لیے کہ اب بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ اس عہد میں دوسری خصوصیت اس لیے تھی کہ مشرکین کو کسی ایسے عہد پر اعتبار نہ تھا جو علیؑ کے ہاتھ سے نہ لکھا جائے۔ وہ یا اس قرابت ہو۔ علیؑ کی ذات کا اعتبار ہو یا رسولؐ کے فوجی عنصر کا اقرار شریک کرتا ہو۔

دیکھنے چلنے اور تتلانے کی عمر اور جنگِ خیبر

حسینؑ اب پورے ڈھائی برس اور حسنؑ ساڑھے تین برس کے تھے کہ خیبر کے لیے فوج کشی کی گئی۔ اب تک یہ عمر بہت کچھ سمجھنے اور سمجھانے کی نہ تھی لیکن پاؤں پاؤں چلنے، تتلانے اور دیکھنے کی

ضرور تھی۔ قوی الجثہ اور صحیح الحواس والدین کے بچے نہ صرف جلد بڑھتے ہیں بلکہ ان کا نشو و نما بھی نسبتاً ناموافق حالتوں کے بچوں سے جلد ہوتا ہے۔ علیؑ اور فاطمہؑ کے یہ بچے دیکھتے ہیں کہ آتش مزاج گھوڑوں کے پیچھے گھوڑے اور سواروں کے پیچھے ویسے ہی پر ولولہ سوار بیٹھے ہیں۔ پیادے اور ان کی گھنی صفیں دور تک پھیلی ہیں۔ نیزوں کا جنگل، سواروں کی زین اور پیادوں کے ہاتھوں میں اُگ آیا ہے۔ نقل و حرکت سے تلواروں کی جوش خیز صدا نیاموں سے بلند ہے۔ چہروں پر آگ کا غازہ ہے۔ پدر بزرگوار کامل سکون و وقار سے اسلام کا علم لیے ہیں۔ اگر چہ ہوا پھریرہ سے کھیل رہی ہے اور یہ باتیں مل جل کر ایک عالم پیدا کرتی ہیں جو اثر کی ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ حسینؑ حیرت آلود چہرہ سے یہ دیکھ کر نانا کے پاس دریافت حال کے لیے دوڑے ہوں گے اور اس وقت انھیں اس ضد سے مشکل پڑ گئی ہوگی کہ ہمیں کاندھے پر بٹھالو۔ اور رسولؐ اس طرح فوجی تیاری اور روانگی کا معائنہ کر رہے ہوں کہ یہ لوگ آویزہ دوش ہوں اور فوج نے اپنے ہادی اور قوم گر کو اس صورت سے دیکھ کر خوشی کے نعرہ بلند کیے ہوں یا نعرہ تکبیر گونج اٹھا ہو۔ اور حسینؑ اپنی اس راحت جاں نشست کی بلندی سے کبھی طفلانہ جھجک انکساری اور کبھی حیرت کی پیش قدمی سے اسلام کے اس بڑھتی ہوئی فوجی قوت کو دیکھ رہے ہوں۔

حسینؑ کے سوالاتؑ اور ماںؑ کا جوابؑ

بڑھ گیا لشکر اسلام یہاں تک کہ مشتاق دیکھنے والوں کی نگاہ سے آخری صف کی سیاہی اور بلند سے بلند نشان فوج او جھل ہو گیا۔ دلچسپ ہوتی وہ تقریر اگر موجود ہوتی جس سے حضرت فاطمہؑ زہرا اپنے ان بچوں کو بہلاتی ہوں گی جس وقت وہ نانا کے لیے مچلتے ہوں گے یا کہتے ہوں گے کہ ہمیں بھی پہنچا دو۔ یا جب آپس میں بات کرتے ہوں گے۔ طفلی کے بھولے سوال اور سادگی کی زیادتی آئندہ کے لیے بچوں کی تیزی عقل اور نیک نفسی کے آثار میں ہے۔ یہ وقت ہے کہ اگر بری طبیعتوں سے دور رکھے جائیں اور اچھے صاف نفس سے مس ہوتے رہیں تو آئندہ ان کی اچھائی کے لیے پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ ان کے بھولے سوال کا معقول جواب مفید ہوتا ہے اور ان میں جاننے کی سرگرمی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ کسی طریقہ کی، پسند یا عدم پسند کا یہ بہترین وقت ہے اگر انھیں راستہ بتایا جاتا رہے۔

حسینؑ کیا پوچھ سکتے بجز اس کے کہ باپ اور نانا کہاں گئے ہیں۔ اور زکیہؑ کیا فرماتی ہوں گی۔ بجز اس کے کہ اسلام اور قوم کے عزت کی حفاظت کے لیے دشمنوں کو دفع کرنے گئے ہیں۔ فتح کی دعا کے لیے فرما کر انھیں وہ مرکز بتاتی ہوں گی جو وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ جہاں سے انسان کے تمام ذرائع ختم ہو جاتے ہیں۔ اور طریقہ بتانے کے لیے چھوٹے چھوٹے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر دیتی ہوں گی اور کیا یہ بھی فرماتی ہوں گی کہ جب تم بڑے ہوگے اور ایسا ہی وقت آئے گا تو تم بھی ہتھیار سنبھال کے حفاظت اسلام کے لیے لڑنے جاؤ گے اور بچے بے سوچے خوش خوش کہتے ہوں گے کہ ہاں جائیں گے اور ماں کا دل یہ سن کر آپ سے آپ بھر آتا ہوگا۔!

نتیجہ نہ سمجھتے تھے لیکن کیا دیکھتے تھے

حسینؑ کی عمر ابھی فتح و شکست کے نتائج سمجھنے کی نہ تھی نہ ابھی یہ جانتے تھے کہ مخدوش موقع پر تنہا جرأت کس درجہ دشوار چیز ہے۔ نہ اس کا اندازہ تھا کہ پدر بزرگوار کی کارگزاریوں کے صلہ میں رسولؐ کے اِستقبال، بغل گیر ہونا، اور پیشانی پر بوسہ دینے کا طبعی ترجمہ کیا تھا لیکن یہ دیکھ سکتے تھے کہ لوگ اب کس طرح ان کی تعظیم کرتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہوں گے کہ یہ لوگ کیسے

خوش خوش واپس آتے ہیں۔ یہ سننے کے دن تو آنے والے تھے کہ اس واقعہ نے اسلام کو کس درجہ قوت دی۔

خمس اور فدک کا نام سنتے ہیں اور مثالی چچا کو پہچانتے ہیں

ان کی اس عمر کا واقعہ تھا کہ بنی ہاشم خمس سے مخصوص کیے جاتے اور حضرت عثمان باوجود طلب اس میں شریک نہ کیے جاتے، اور ابھی حسینؑ پورے تین برس کے نہ ہونے پائے تھے کہ فدک کا وثیقہ ان کی مادرِ گرامی کے نام لکھا گیا جس کے لیے ساتویں برس انھیں بحیثیت مدعی کے مدعا علیہ ابن ابو قحافہ کی عدالت میں جانا پڑے گا۔ اس جنگ نے بھی نہ صرف مسلمانوں کے مالی حالت میں اضافہ کیا جو ان کا مایۂ حیات ہو سکتا تھا بلکہ مسلمانوں کو آلاتِ حرب بھی بہت سے ملے۔ حسینؑ نے اسی زمانہ میں اپنے چچا حضرت جعفر بن ابی طالب کو دیکھا جن کی صفات اور ان کے آئندہ شجاعانہ کارروائیوں کے سمجھنے کا زمانہ آنے والا تھا۔ اگرچہ حالات اسی وقت بہت کچھ سنے ہوں گے۔

مضبوط کھڑے ہونے، چلنے اور دوڑنے کی عمر

اس طرح ہم حسینؑ کی ساڑھے تین برس کی عمر تک پہنچ گئے اور عجب نہیں ہے کہ حسنینؑ کے آپس میں کشتی لڑنے کی روایت اسی زمانہ سے متعلق ہو۔ یہ روایت اس وقت کی ہے جس وقت حسینؑ اپنے پنجوں پر مضبوط کھڑے ہو سکتے تھے اور اس کے بعد یہ روایت ہوگی کہ رسولؐ کہیں تشریف لے جاتے ہیں اور حسینؑ کو گھر کے باہر بچوں کے ساتھ کھیلتا دیکھتے ہیں۔ یعنی اب وہ گھر کے قریب قریب مقامات کے پہچاننے کے قابل ہو گئے تھے۔ رسولؐ کا پیار سے دوڑنا کہتا ہے کہ انھوں نے جس طرح کے مشغلہ میں حسینؑ کو دیکھا تھا وہ قابلِ چشم نمائی نہ تھا۔ اس وقت کی صورت یہ تھی کہ رسولؐ نے ایک ہاتھ پشت اور ایک ٹھڈی پر رکھ کر سیدھا کر دیا تھا کہ طفلانہ ناز انھیں بھاگنے نہ دے۔ جس سے پیار کرنے میں ہرج واقع نہ ہو۔ اور یہ روایت اس سے سن کی ترقی ہے کہ اب گھر یا گھر کے

مضطربانہ تلاش

متصل نہ تھے بلکہ بنی جذعان میں چلے گئے۔ ہم نہیں جانتے کہ اس محلہ میں کون سے لوگ آباد تھے۔ جس سے یہ معلوم ہو سکتا کہ ابو درداء سے ٹھکانا معلوم کر کے لانے کے لیے رسولؐ کا روانہ ہونا محض ماں کی تسکین اور بچے کے مضطرب نہ ہونے کے لیے تھا یا خود بھی اس اضطراب سے تھا کہ مبادا وہ کسی دشمن خصوصاً کسی چھپے ہوئے یہودی کے ہاتھ میں نہ پڑ جائیں جن کے متعلق وہ صحیح ہو یا غلط یہ الزام ہے کہ وہ غیر قوم بچوں کو قربانی کے لیے گرفتار کر لیتے تھے، اور روح فرسا ہے یہ خیال کہ یہ چار برس کے قریب کا بچہ اس لیے گھر سے باہر نکل گیا تھا کہ بھوک نے رہنے نہ دیا تھا۔ اس لیے کہ ان کے گھر نے، حکومت اختیار، مال اور رنج کو ذاتی آرام سے نسبت نہ دی تھی اور اس بلند ترین درجہ پر تھے کہ اس سے دوسروں کو راحت دیں۔ ان کے سوا تاریخ عالم میں کوئی دنیاوی یا روحانی رئیس نہ تھا جس کی خدا سے یہ دعا ہوتی کہ: "ایک دن دے کہ تیرا شکر کریں اور ایک دن بھوکا رکھ کہ تجھ سے طلب کریں!"۔

ان کا خود پسند فقر مذاہب عالم کے روسائے روحانی سے اس لیے ممتاز تھا کہ یہ تارک الدنیا اس مفہوم میں نہ ہوتے تھے کہ انھیں معتقدین کا اعتقاد نوالے دیا کرے۔ انھوں نے عالم اور اہل عالم کو اپنا باورچی خانہ اور باورچی نہ بنایا تھا۔ یہ سخت کراہت اور نفرت سے ان کی طرف دیکھتے تھے جو جائز طریقہ سے حصول معاش سے تساہلی کرتے تھے بلکہ حصول معاش کی خود مثال دیتے تھے۔ اسی طرح وہ ان کو بھی نفرت سے دیکھتے تھے جو اپنی ثروت کو نسبتہً کم موقع مخلوق کے امداد

رعونت بنانے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

حدیقہ بنی نجار کا مفید موقع

دوسرا موقع آیا، اور اس مرتبہ حسینؑ حدیقہ بنی نجار میں پہنچے۔ وہی محلہ جس نے سب سے پہلے مدینہ میں رسولؐ کا استقبال کیا۔ نبی اللہؐ کے ساتھ نہ صرف اصحاب تھے بلکہ جناب امیرؑ بھی تھے۔ کون جانے کہ اس مرتبہ گھر سے اتنی دیر غائب رہے ہوں کہ جناب فاطمہؑ زہرا کو گم ہو جانے کا اضطراب پیدا ہو گیا اور ان کے رفعِ انتشار کے لیے جس قدر خود اپنی محبت سے رسولؐ تشریف لے گئے ہوں اور اس حالت نے نہ صرف جناب امیرؑ بلکہ اصحاب کو بھی ساتھ کر دیا ہو۔ اس حالت کے معنی یہ ہیں کہ حسینؑ کے ساتھ رسولؐ کے قلبی میلان کو اصحاب اس قدر جانتے تھے کہ مروت ہی سے سہی لیکن ساتھ رہنا ان کی خوشنودی کا سبب سمجھتے تھے۔ اور حسینؑ کے متعلق رسولؐ کے کسی اضطراب میں شرکت کرتے تھے۔ مل گئے حسینؑ اور سب سے پہلے جس نے گود میں اٹھا لیا رسولؐ تھے اور دونوں کاندھوں پر دونوں صاحبزادوں کو بٹھا کر چلے۔

حسینؑ کا احساس اور امتیاز

اصحاب سے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس کی خواہش نہ کرتے کہ رسولؐ کو سبکدوش کر دیں۔ حسینؑ نہ اترے۔ اب علیؑ نے خواہش کی۔ لیکن حسینؑ نے رسولؐ کو نہ چھوڑا۔ اور جو جواب ملتا ہے وہ یہ ہے کہ: "نہیں نانا کا کاندھا زیادہ محبوب ہے"۔ ہو سکتا ہے کہ "محبوب" کا لفظ کسی راوی کا ترجمہ جذبات ہو۔ لیکن یہ صحیح ہے۔ حسینؑ کا محض یہ کہنا کہ: "ہم نانا کے کاندھے پر رہیں گے"۔ یا کچھ نہ کہنا اور رسولؐ کے کاندھے سے نہ اترنا، بجز متذکرہ صدر خیال کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس روایت کی دلچسپی اپنے موجودہ درجہ پر نہ پہنچتی اگر علیؑ نہ ہوتے، یا ہوتے مگر ان کی گود میں لے لینے کی خواہش نہ ہوتی۔ یہاں ایک قانون قدرت ظاہر ہے اور وہ یہ ہے کہ بہ نسبت علیؑ کے رسولؐ میں محبت کا عنصر زیادہ ہے۔ اس کا معیار چھوٹے بچوں کا قلبی میلان ہے۔ وقت ہوتا ہے کہ علم نفس کے جاننے والے اور تجربہ کار جذبات شناس معاملات میں حکم قرار دیے جاتے ہیں لیکن ایسا بھی وقت ہوتا ہے جہاں ایسے بچے جن کے دل پر جذبات کے بہت سے نقوش نہیں ہیں کسی خاص جذبہ کے لیے اپنی فطری میلان سے حکم کسوٹی ہو سکیں۔ یہی قانون تھا کہ ہمارا ہادی اپنے گہوارہ میں حضرت حلیمہ کو منتخب کرتا۔ اور یہ ہر اس گھر میں سمجھا جا سکتا ہے جسے خداوند تعالیٰ نے بچوں سے موردِ رحمت قرار دیا ہو۔ اکثر تو یہ دیکھا گیا ہے کہ باپ میں ماں سے زیادہ محبت ہے۔

اس لحاظ سے کہ بچوں کے تتلانے کا سن عموماً تین چار برس تک ہوتا ہے ہم اس روایت کے لیے بھی یہی زمانہ تجویز کرتے ہیں کہ رسولؐ کو نماز کے لیے مستعد دیکھ کر حسینؑ بھی کھڑے ہو گئے اور تکبیر کا اعادہ کرنا چاہا۔ لیکن زبان سے صاف نہیں نکلتی۔ رسولؐ دہراتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ساتویں مرتبہ صاف اور صحیح ادا ہوئی۔ بڑا ہے وہ خدا جس کی بڑائی رسولؐ نے حسینؑ کو سکھائی ہو۔ اور بڑا تھا وہ خدا جس کے سوا حسینؑ نے اپنے دفتوں میں کسی کی بڑائی کا اقرار نہ کیا۔ اس وقت کی سکھائی ہوئی نماز حسینؑ کو زیرِ خنجر بھی یاد تھی۔

۲۰ رمضان ۸ھ فتح مکہ اور حسینؑ

حسینؑ نے پانچویں برس میں قدم رکھا تھا کہ اسلام کے دائمی قیام کا واقعہ ظہور میں آیا۔ رسولؐ مکہ میں داخل ہو رہے ہیں جو کہ رسولؐ کو خدا کی زمینوں میں سب سے زیادہ پیاری تھی اور جہاں سے بہ جبر جلاوطن ہوتے تھے۔

بنی امیہ کے ساتھ رسولؐ کا احسان

ابوسفیان رسولؐ کے جاہ و جلال سے کانپتا ہے اور سعد ابن عبادہ کے گرم لفظ سے تھرا جاتا ہے۔ رسولؐ نے علیؑ کو "نرمی سے داخل ہونے کا حکم دیا" اور مزید تالیف کے لیے ابوسفیان یعنی معاویہ کے باپ اور یزید کے دادا کے گھر کو امان دی۔ قریش آج مفتوحانہ شکستہ خاطری اور یاس سے رسولؐ کے منھ کو دیکھ رہے تھے اور باوجود اپنی گزشتہ کارروائیوں کے اپنے کرم کرنے والے بھائی کے بیٹے سے بھلائی چاہ رہے تھے۔ رسولؐ انھیں بھائی کہنے سے منع نہیں کرتے۔ لیکن برادران یوسفؑ کا استعارہ استعمال فرماتے ہیں، اور اعلیٰ ترین کریم النفسی سے فرماتے ہیں کہ: "جاؤ سب لوگ آزاد ہو"۔ اور یہ حیرت خیز اتفاق بھی اس کے بعد تھا کہ وہ جلا وطن جسے کوہِ صفا کی چوٹیاں اپنے اعلانِ ہدایت میں پناہ نہ دے سکتیں، آج انھیں پر جلوہ افروز ہوتا۔ انسانوں کی بہتی ہوئی ندی پستی سے بلندی کی طرف جاتی، اس لیے کہ نبی اللہ کے ہاتھوں کو بوسہ دے لے۔ کوہِ صفا کا یہ دُوسرا نظارہ تھا۔ ہم ایک تیسرے حیرتناک نظارہ پر بھی توجہ دلائیں گے۔

اگرچہ یہ کہیں مذکرہ نہیں ہے کہ حسینؑ کہاں تھے۔ لیکن یہ یقینی امر ہے کہ وہ بھی اس وقت اپنے نانا اور دادا کے قدیم وطن کو دیکھنے آئے تھے۔ ان کی موجودگی اس خیال سے نہیں ہے کہ رسولؐ اور جناب امیرؑ تھے، بلکہ اس وجہ سے کہ جناب فاطمہ زہراؑ بھی تشریف لائی تھیں۔ جن کی تشریف آوری اس روایت سے مصدق ہے جب کہ حضرت ام ہانی اپنے برادر معظم کی پرلطف شکایت کرنے گئی تھیں اور بھاوج نے انھیں شکایت پر ٹوکا، جو تعلیمی انداز کی نرم تنبیہ کہی جائے۔ غالباً پہلا موقع تھا کہ حسینؑ کسی فوج کے ساتھ روانہ ہوئے تھے۔ ایک آدھ چھوٹی لڑائی کا عالم اور گرم شور دیکھا یا قریب سے سنا تھا اور کیا عجب ہے کہ اطاعت اور اظہار عقیدت کے عام ہیجان کو اس طرح دیکھا ہو کہ وہ اپنی مستند نشست پر ہوں یا پہلوؤں میں کھڑے ہوں۔ حسینؑ کے عزم انگیز مستقبل کے لیے یہ واقعات ناقابل سہو تھے۔ خصوصاً جب کہ یہ مکہ سے متعلق ہوں!۔

یکم شوال ۸ھ

حسینؑ کی عمر میں چند دنوں کا اضافہ ہوا تھا کہ حنین کا مخدوش موقع آیا۔ جس کی مخصوص صورت یہ تھی کہ مسلمانوں کا خلوص سخت کسوٹی پر کسا گیا۔ مؤلفۃ القلوب میں سے ابوسفیان مسلمانوں کو منہزم دیکھ کر خوش ہو رہا تھا کہ "محمد کا خاتمہ ہو گیا"۔ اور شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہ جس کا باپ احد میں مارا گیا تھا، آج باوجود رسولؐ کے ہمراہ جانے کے رسولؐ سے انتقام لینے کے لیے بے چین ہو گیا تھا

حسینؑ اور طائف کی صدائے بازگشت

اور ان لوگوں کی یہ حرکتیں دیکھ کر صفوان بن امیہ یہ اصول تسلیم کر رہا تھا کہ: "میرے نزدیک یہ زیادہ عزیز ہے کہ میرا مربی کوئی قرشی ہو اس سے کہ ہوازن کے کسی شخص کے پالے پڑوں"۔ لیکن اولاد عبدالمطلب موجود تھی، ان کی حیات میں رسولؐ کے نزدیک کسی کو پہنچنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ علیؑ، جعفرؑ، عقیلؑ، عباسؑ، قثم اور فضل بن عباس، ربیعہ، ابوسفیان بن حارث، عبداللہ بن زبیر بن عبدالمطلب موجود تھے۔ پیش و پس راست و چپ لگام اور رکاب تھامنے والے پروانے کی طرح شمع رسالت کے گرد پھر رہے تھے۔ اسامہ بن زید اور ایمن بن ام ایمن بھی حق نمک ادا کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے میدان جنگ کے مخدوش موقع کو چند لمحہ کے لیے اپنی آنکھوں اور ہاتھوں میں لے لیا تھا کہ عباس کی بلند آواز کی گرج سنائی دی، اور "ایک سو انصار" پر اخلاص اطاعت سے "لبیک لبیک" کہتے ہوئے

دوڑ پڑے۔ اب میدانِ جنگ کا رنگ بدل گیا یہاں تک کہ تقسیم غنیمت کے وقت تو ہاشمثانے چند مقتولین کے وہ پوری بارہ ہزار کی جماعت تھی جو روانگی کے وقت تھی۔ اس کے بعد رسولؐ نے مشرکین کے اس گروہ کی طرف توجہ فرمائی جو غالباً سب سے قوی اور خدوش تھا اور طائف کی طرف بھاگا تھا۔ یہاں کی تمام مفید خدمتیں علیؑ کے حوالہ تھیں۔ اور کارگزاری کے بعد واپسی اس حیثیت کی تھی کہ رسولؐ علیؑ کو دیکھ کر تکبیر کہہ اٹھتے اور دیر تک بصیغہ راز گفتگو فرماتے۔

ان تمام واقعات کے بعد رسولؐ کا واپس تشریف لانا چاہتا ہے کہ رسولؐ اپنی اس بیٹی کو جسے سفر سے واپس آکر پہلے دیکھنے جاتے تھے دیر تک دیکھتے رہے ہوں۔ نگاہ میں سب کچھ ہوگا لیکن کون تھا جو پہلی نگاہ کے تمام جذبات کی شرح کر سکتا۔ اشتیاق تھا، محبت تھی، خوفناک یادداشت کا گزرتا ہوا عکس تھا، خدا کے ادائے شکر کی آہستہ حرکت تھی۔ نتیجہ کی خوشی تھی اور اب ان سب کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے تھے۔ جس کی سب سے زیادہ محبت تھی لیکن سوچو اس وقت کو جب کہ حسینؑ ہفتوں کے چھوٹے ہوتے ناز بردار کے گزرے ہوئے خوف کی حالت کو سنتے ہوں گے ان کے چھوٹے چھوٹے دل دھڑکتے ہوں گے۔ خوف کی تاریکی اور سامنے موجود دیکھنے کی خوشی عالم پیدا کرتی ہوگی کہ کبھی چاند پر بادل آگیا ہے اور کبھی ہٹ گیا ہے۔ رسولؐ کی نگاہیں دیکھتی ہوں گی اور یا تو ذکر سے احتیاط کی ہوگی یا بہلانے اور خوش کرنے کی فکر کی ہوگی۔ اور بچے اس ذات کو ناشکستہ نظر اور مسلسل ہوش سے دیکھتے ہوں گے جس کے لیے کوئی خوف خوف نہ تھا، اور جو ایسی خدوش حالتوں میں اپنے عظیم الشان وجود کی طرف سے اپنی وجہ کے لیے بے پرواہ ہو جاتا تھا۔ اور پھر یہ بھی سنتے ہوں گے کہ ہمارے پدر بزرگوار نے ایسے وقت کیا کیا، اور ساتھ ساتھ اپنے اور عزیزوں کی وفادارانہ بے جگری سے بھی خوش اور متاثر ہوں گے۔ اور ان خبروں میں حسینؑ نے اپنی کھلائی ام ایمن کو اپنے بھائی کے غم میں افسردہ دیکھ کر اثر لیا ہوگا۔

جمادی الاولیٰ ۸ھ

حضرت جعفر بن ابی طالب کی شہادت اور آئندہ کا ایک اشارہ

یہ زمانہ خاندانِ رسالت کے لیے سخت غم کا تھا۔ اس لیے کہ اپنے دین کے ولی اور محافظ کا فرزند اسلام کے بڑے مددگاروں کی فہرست سے کم ہو گیا۔ میری غرض حضرت جعفر بن ابی طالب سے ہے۔ ہم ان کے قبل الاسلام خیالات کا کہیں تذکرہ کر چکے ہیں۔ جس سے معلوم ہوگا کہ یہ اپنے خیالات اور خصائل میں کس درجہ قابل تعریف تھے۔ یہ پہلے نقیب تھے جس نے اصولِ اسلامی کی ماوراء الوطن نقابت کی اور اثر ڈالا۔ اور ایک زمانہ تک ہجرت اور جلاوطنی کی تکلیفیں اٹھاتے رہے۔ خیبر کی فتح کے بعد ان کی واپسی رسولؐ سے کہلوا سکے کہ: "مجھے نہیں معلوم کہ میں خیبر کی فتح سے زیادہ مسرور ہوں یا جعفر کی واپسی پر۔" لیکن انھیں دنیا میں زیادہ رہنا نہ تھا۔ بالو کے تودوں اور گرم ریگستانوں کی ہوا میں جسے اس لیے راحت تھی کہ وہ ایک اعلیٰ اصول کا سالک ہے اور سیکڑوں منزلیں طے کر سکتا تھا بغیر اس کے کہ کہیں راحت کی بگڑی ہوئی صورت بھی تسکین کے لیے ہو، وہ اب اس لیے بے چین تھا کہ اس کی روح راحت ابدی کی وسیع فضا (جنت) میں طیران کرتی پھرے۔ جعفر سے زیادہ اس کا کون مستحق تھا خصوصاً جب اس سیکڑوں اصلاب شامخہ اور ارحام مطہرہ کے نایاب موتی نے اپنی حیات دُنیاوی اس طرح ختم کی ہو جس پر شجاعت اور استقلال کو دائمی ناز ہو۔ تاریخ شجاعت میں اسلام کے لیے یہ واقعہ مایۂ افتخار تھا، جب اس کا ایک فرد اس کی روح کا ایسا مجسمہ ہو سکتا تھا۔ ایک ہاتھ کٹتا، دوسرا بھی قطع ہو جاتا، اور ان دونوں سے خون کا

پرنالہ بہتا نشانِ اسلام کی حفاظت میں ضعف نہیں پیدا کرسکتا تھا۔ اے کاش حضرت فاطمہؑ بنت اسد ہوتیں، اور گرے ہوئے ہاتھ، اور کٹے ہوئے ٹکڑے کو چوم لیتیں۔ یہ حضرت جعفرؑ کی بہترین داد اور حضرت فاطمہؑ بنت اسد کے شیر کا بہترین صلہ ہوتا۔ گھوڑا دشمنوں کی سیکڑوں تلواروں سے قیمہ ہو کر گر گیا۔ بے شمار تلواریں اس شیر پر اپنی برش آزما رہی ہیں۔ سر سے پاؤں تک بہتے ہوئے خون نے اعضاء کو چھپالیا ہے۔ لیکن شارع اسلام کے محافظ کا فرزند اس طرح کھڑا ہے کہ اس کے جسم کا ٹکڑے ہوتا اس کی روح پر کوئی صدمہ نہیں پہنچا رہا ہے۔ جعفرؑ کے خون سے رنگے ہوئے علم کا پھریرا اب تک وجد کر رہا ہے کہ ہم ایسے ہاتھوں اور ایسے شانوں اور ایسے سینہ سے لپٹے ہیں۔ ہم تصفیہ نہیں کرسکتے کہ یہ حالت دیکھ کر حضرت فاطمہؑ بنت اسد پہلے روتیں یا چیخ کر تعریف کر اٹھتیں۔ اگرچہ اس تعریف سے زیادہ پر درد مرثیہ نہ ہو سکتا۔ علم شجاعت کا یہ نظارہ اور ارادہ کا یہ معجزہ اس وقت تک دکھائی دیا جب تک تلوار نے کمر سے دو ٹکڑے نہ کر دیا۔ کسی خاندان کسی قوم اور کسی ملت کے لیے یہ کارنامہ ایسی جاندادنہیں ہے جو تباہ ہو جائے۔ اسلام کی تاریخ اسی خاندان کی تاریخ نے اس واقعہ کو دہرایا، ایسے وقت میں جب کہ مشکلیں بدرجہا بڑھ گئی تھیں!۔

جعفرؑ کی شہادت کا تعلیمی اثر

بنی ہاشم کو جعفرؑ کی شہادت کی خبر اس طرح معلوم ہوئی کہ رسولؐ نے اولاد جعفرؑ کو طلب کیا، اور سب کو پیار کرنا شروع کیا۔ اس طرح کہ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے تھے۔ اب حضرت فاطمہؑ زہرا بھی چیخ کر رو رہی تھیں۔ یہ وقت تھا کہ حسینؑ بسورتے ہوئے ماں کو لپٹ جاتے اور حال پوچھتے اور اس وقت انھیں معلوم ہوتا کہ میرے چچا نے کس طرح شہادت پائی۔ حسینؑ نے اپنے چچا کا کارنامہ شجاعت اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا تھا لیکن کیا سننے کے بھی قابل نہ تھے؟۔ زمانہ آنے والا تھا۔ حسینؑ جعفر ثانی یعنی حضرت عباس بن علیؑ نے اسے دہرا دیا۔ یہ حسینؑ بھی دیکھ رہے تھے۔ اس وقت ممکن نہ تھا کہ حسینؑ اپنے چچا کو یاد نہ کرتے اور حسرت ہوتی کہ کاش اس وقت چچا اپنے اس ہو کے پیاسے بھتیجے کا حواس اور استقلال دیکھتے۔

بنی خزیمہ

یہی زمانہ تھا جس میں حسینؑ رسولؐ کو اس لیے غم و افسوس میں دیکھتے کہ ان کے ایک آدمی نے ان کے حکم کی خلاف ورزی کر کے بدنام کرنا چاہا۔ جس کا ہر طرح برا اثر پڑتا۔ اس لیے خلاف ورزی کی کہ اس وقت کچھ اختیار حاصل تھا کہ ایام جاہلیت کا انتقام لے سکتا۔ اور پھر حسینؑ نے یہ بھی دیکھا کہ ان کے پدر عالی مقدار بھیجے گئے اور وہ اپنے طرز عمل سے رسولؐ کی خوشنودی اور شکریہ کے مستحق ہو سکے اس لیے کہ نرمی اور ہمدردی سے مظلوم جماعت کی اشک شوئی کی تھی۔

متضاد باتیں اور ان کا اثر حسینؑ کی سماعت

یہ موقع تھا کہ بچے متضاد افعال سنتے اور خیال کرتے کہ انسان میں یہ جذبات بھی ہو سکتے ہیں اور اگر ایک سے انسانوں کو یہ مصیبتیں اٹھانا پڑتی ہیں تو دوسرے سے تلافی ہوتی ہے۔

سنہ ۹ھ
مثال جو شریفانہ برتاؤ کی تعلیم تھی

حسینؑ پورے پانچ برس کے ہو چکے تھے کہ قبیلہ طے پر مسلمانوں کو تسلط حاصل ہوا۔ علیؑ کی بدولت ہوا، اور اس میں رسولؐ نے دختر حاتم کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ حاتم کے شکاری بیٹے عدی کی

اس درجہ پسندیدگی کے قابل تھا کہ وہ شام سے آتا اور مسلمان ہوتا۔ حسینؑ تصفیہ کرتے ہوں گے کہ شریف قوم عورتوں کے ساتھ اگرچہ وہ مفتوح ہوں اور غیر مذہب کے کس طرح کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔

وادی الرمل کا عصابہ اور کربلا کا کرتہ

یہی زمانہ سریہ وادی الرمل کا تھا جس کی اہمیت بعض تجربہ کار افسروں کی ناکامی سے ظاہر تھی۔ جناب امیرؑ کا عصابہ طلب کرنا بھی ایک نشانی سمجھی گئی تھی کہ صورتِ معاملہ کسی قدر سخت ہے۔ جناب امیرؑ کو اپنی آنکھوں کے سامنے عصابہ باندھتے اور مسلح میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوتے دیکھ کر طاہرہؑ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کون جانے کہ حسینؑ کس طرح دیکھ رہے تھے اور ماں کو چشم پُر آب دیکھ کر سُرخ گھوڑے کے اگلے سموں سے لپٹ گئے تھے یا نہیں جو روکنے کی طفلانہ کوشش سمجھی جائے۔ لیکن یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ پدر بزرگوار کو فاطمہ زہراؑ کے آنسو اور ہم لوگوں کی بھولی صورتیں اور باتیں نہ روک سکیں۔ کیا معلوم تھا علیؑ اور فاطمہؑ کو کہ ایک دن آنے والا ہے کہ ان کا حسینؑ زخموں سے چور اس طرح اپنے اہل و عیال کے سامنے آئے گا کہ پہچانا نہ جائے۔ اس وقت ایک جامہ کہنہ طلب کرے گا اور اسے اور چاک کر ڈالے گا۔

تبوک اور حسنینؑ

اس وقت سے جب سے حسینؑ باپ اور نانا کو پہچاننے لگے ہوں، اب تک صورتِ حال یہ تھی کہ کسی موقع پر جب کہ ان بزرگواروں میں کوئی گھر سے باہر جاتا تھا، دوسرے کا جانا ویسا ہی یقینی تھا۔ لیکن تبوک میں بچوں کو تسکین تھی کہ اگر نانا نہیں ہیں تو باپ ہیں۔ نانا کے فرائض کے ساتھ ہیں۔ اور عجب نہیں ہے کہ لوگ بھی علیؑ کی خوشنودی کے لیے بچوں کے ساتھ زیادہ اظہارِ ارادت جائز سمجھتے ہوں۔ اور پھر بچوں نے یہ بھی دیکھا کہ دفعتہً پدر بزرگوار کچھ خاموش اور کبیدہ سے ہو گئے اور مدینہ سے چلے گئے۔ لیکن پھر آ گئے اور اب وہ پیشتر سے زیادہ مطمئن اور خوش تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ جناب امیرؑ نے اپنے فرزندوں کو اس زمانہ میں اس درجہ ذی ہوش خیال کیا یا نہیں کہ وہ بتا سکتے کہ انھیں لوگوں میں جو ہمارے اظہارِ اطاعت اور خلوص میں مبالغہ کرتے ہیں کچھ منافقین بھی ہیں۔ جو ظاہر دشمنوں سے زیادہ مخدوش ہیں اور ہمارے یہاں رہنے کی اغراض میں ایک یہ بھی ہے کہ ہم ان کے حرکات و سکنات کو دیکھتے رہیں۔

رسولؐ کا تشریف لانا مسلمانوں اور خصوصاً اہل بیت کے لیے سب سے زیادہ باعثِ مسرت تھا لیکن اس خوف سے مطلق خالی نہ تھا کہ دشمن ہر وقت تاک میں رہتے ہیں کہ کسی طرح ان کی ہلاکت کے باعث ہوں۔ اس نے مخلصین کے دلی اظہارِ عقیدت اور صحیح و سلامت واپسی پر خاموش شکریہ کی سنجیدگی اور بڑھا دی ہوگی۔ اور رسولؐ نے حسنینؑ کو پھر ایک مرتبہ اس طرح بھینچ کر سینے سے لگایا اور پیار کیا ہوگا جس طرح کوئی خطرہ کے بعد اپنے کو محفوظ دیکھ کر فطرتاً ان کی طرف اپنا قلبی میلان ظاہر کرتا ہے جو سب سے زیادہ محبوب ہوتے ہیں۔ رسولؐ بچوں سے زیادہ اور کسی پر توجہ نہیں فرما سکتے تھے، جن پر تصنع کی کوئی چھینٹ نہیں پڑی ہوتی۔ کیا حذیفہ کے علاوہ رسولؐ نے ان بچوں کو منافقین کے نام بھی بتا کر انھیں ہوشیار رہنے کی تاکید کی ہوگی؟

ابتدائی تعلیم کے آغاز کے آثار

میں سوچتا ہوں کہ غالباً یہی زمانہ ہوگا جس میں حسنینؑ کی تعلیم کا آغاز کیا گیا ہو۔ اگرچہ اس کے باضابطہ آثار اور خبریں نہیں ہیں کہ کسی خاص وقت بسم اللہ کی گئی لیکن اس غیر صریح اطلاع سے ہم کام لیتے ہیں کہ رسولؐ بچوں کے طفلانہ حوصلہ ترجیح کا تصفیہ بجائے کشتی لڑنے کے وصلیاں لکھوا کر کرنا چاہتے ہیں۔ وصلیاں لکھنے یعنی کتابت کی ابتدائی حالت سے تعلیمی ابتدا کا اندازہ کیا

جاسکتا ہے۔ رسولؐ کی احادیث حصول علم کے متعلق جس قدر ہیں اور خود جو کچھ ان کے اس عمل سے ظاہر ہے کہ وہ اسیران اُحد میں سے پڑھے لکھوں کو انصار کے بچوں کی تعلیم کے لیے مقرر فرماتے ہیں۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ آنحضرت نے اپنے محبوب نواسوں کی تعلیم کو ضروری وقت سے زیادہ ملتوی نہ کیا ہوگا۔ اور چونکہ اس کا کہیں اشارہ نہیں ہے کہ کوئی شخص حسنینؑ کا معلم مقرر تھا، میں بجز اس کے تصفیہ نہیں کر سکتا کہ خود جناب امیرؑ نے ان کی تعلیم ابتدا سے اپنے ذمہ لی تھی۔ جیسا اس کے بعد حسنینؑ کے زمانہ شباب کے متعلق آثار ہیں کہ جناب امیرؑ نے تاویلِ قرآن خود تعلیم فرمائی۔

زمانۂ رسولؐ میں حسنینؑ کی تعظیم کے آثار

حسنینؑ کی تعظیم کا خیال لوگوں میں کس درجہ ہوگا، اس کا اندازہ اس روایت سے کیا جاسکے گا کہ حسنینؑ گھوڑے پر سوار ہوتا عباس سے سیکھتے ہیں اور وہ رکاب تھام کر سوار کرنے کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتے ہیں، اگرچہ وہ خود ہاشمی ہیں۔

حسینؑ کی طفلی اور ذہانت

حسینؑ کے زمانہ طفلی کی ذہانت کے آثار میں جو روایت ملتی ہے وہ غالباً اسی پانچ چھ برس کے سن کی ہے اور وہ اپنی طفلی کی منطق میں اپنے کھیل کے فریق پر غالب تھے۔ ابو رافع جو حسینؑ کی دلیل سے لڑکپن میں مغلوب ہوجاتے ہیں آئندہ زمانہ میں حسینؑ کے تاریخ بنا کرانے گئے ہیں۔ جس پر ہم نظر کریں گے۔

مباہلہ میں حسنینؑ کی روشن ہیئت

حسینؑ نے چھٹے برس میں قدم رکھا تھا کہ رسولؐ نے انھیں رسمی طور پر مباہلہ میں شریک کیا۔ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہوگا یہ عالم جس وقت یہ پانچ نفوس قدسی خدائی فیصلہ کے لیے تیار ہو کر گئے ہوں گے۔ ان کا خدا پر بھروسا، اپنی سچائی کا یقین، اپنی فتح کی امید، ایک شان رکھتی تھی جو فریقِ مخالف سے یہ کہلوا سکے کہ: "میں چند آدمیوں کے چہرے دیکھتا ہوں کہ اگر وہ خدا سے پہاڑ کے ٹل جانے کی دعا کریں تو پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے گا"۔

میں سوچتا ہوں کہ نصاریٰ نجران پر سب سے زیادہ دو بھولے بھولے، چاند سے متین معصوم بچوں کی موجودگی سے اثر پڑا۔ میرے لیے یہ سوچنا ممکن نہیں ہے کہ اساقفہ جن کے طرزِ عمل کی تاریخ آج ریشیل برس کی اماج ہے، وہ ان معصوموں کے سامنے کھڑے ہوسکتے تھے۔ اس کے بعد واقعتاً مباہلہ ہوتا یا نہ ہوتا پنج تن پاک فتح یاب ہوگئے۔ فریقِ مخالف کا انکار اس کی طبعی شکست تھی۔ وہ ان نفوس قدسی کی عظمت اور جلالت کے مقابل کھڑے ہونے کا اپنے میں استقلال اور ارادہ نہ پاتے تھے۔ یہ موقع اسی قدر قانونِ الٰہی کا اظہار تھا جس قدر اور صاف مواقع ہوتے ہیں۔ کس میں ذرا احساس ہے اور وہ نہیں جانتا کہ ہم اپنے سے پست نفس کے سامنے اپنی نفس کی بلندی اور قوی کے سامنے اپنے نفس کی پستی کا احساس کرتے ہیں اور بغیر اس کے کہ ان میں سے کوئی کچھ کہے ایک قلبی تصفیہ ہوجایا کرتا ہے۔ اس حالت کو خود جناب امیرؑ نے ظاہر فرمایا ہے۔ جب کہ کسی نے آپ سے سوال کیا کہ آپ اپنے ہمسروں پر کیسے غالب ہوئے۔ اور فرمایا کہ: "میں کسی شخص سے ملاقی نہیں ہوا مگر یہ کہ اس نے اپنے نفس پر قبضہ دینے کے لیے میری اعانت کی"۔

حسینؑ کاندھے پر ہے اور وہ موقع نہ آیا کہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ بلند کرتے۔ آنکھیں آسمان کی طرف اٹھتیں اور بے گناہ لب و زبان سے آمین کی صدا بلند ہوتی۔ خدا کے بلند کیے ہوئے یہ بندے واپس نہیں ہوسکتے تھے مگر یہ کہ اپنے فتح یابی

سے پاکیزگی کی عظمت اور اس کی بلند کرنے والی لہریں محسوس کرتے۔ کون روکنے والا تھا حسینؑ کو کہ ذرا سا کاندھے پر تن نہ جاتے۔ اس کے بعد یہ کہنا ہے کہ نصرانیوں نے حسینؑ کی شرکت کے اس موقع پر جو صلح کی وہ مسلمانوں کے لیے مالی حیثیت سے مفید تھی۔

لڑکپن میں دوسروں کے لیے بھوک کا سخت اندازہ

کب؟ نہیں معلوم۔ لیکن غالباً اسی سے کچھ قبل یا بعد کے زمانہ میں وہ واقعہ ہوا جو ھل اتی سے ممتاز کیا جاتا۔ اس لیے کہ نزول قرآن کا زمانہ تھا۔ لامحالہ یہ حسینؑ کی سات برس کی عمر تک کا ہوگا جس کی تصدیق حضرت فاطمہؑ کے اس لفظ سے بھی ہوتی ہے جہاں آپ فرماتی ہیں کہ: "میرے بچے بھوکے ہیں"۔ چھ یا سات برس کا سن اگرچہ اس پورے اندازہ کا نہ ہو کہ دوسروں کی تکلیف کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھنا کس قدر بلند خیالی اور انسانیت کا اعلیٰ درجہ ہے۔ لیکن بھوک ایسی چیز ہے جو اپنی حالت سے بار بار اندازہ پر مصر ہوتی ہے اور اس لیے بچے ایسے موقع پر جس میں خود اپنے تجربہ سے اندازہ کرنا ہو بغیر حسی علم کے نہ رہ سکتے تھے۔ موقع کی خصوصیت یہ تھی کہ اپنی تکلیف سے ان کی لاپرواہی اس درجہ تھی کہ جوں جوں ان کا امتحان بڑھتا جاتا تھا یہ امتحان دینے پر مصر ہوتے جاتے تھے۔ ان مرجھائے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر رسولؐ چشم پر آب ہوگئے۔ اور زبان مبارک پر جاری ہوا: "واغوثاہ اھل بیت محمّد یموتون جوعاً"۔ (اے پروردگار تیرے نبی کے اہل بیت بھوک سے مر رہے ہیں)

آیۂ تطہیر اور حسینؑ، سورۂ براءت اور حسینؑ

یہ بندے تھے جنھیں تطہیر کا یقین دلایا جاتا اور ان کی آئندہ امتحان خیز تاریخ بھی ان کی تطہیر پر مشتبہ نہ ہوتی۔ اس موقع کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ رسولؐ یہ دعا بھی فرماتے کہ: "میں اس سے جنگ کروں گا جو ان سے جنگ کرے گا اور صلح کروں گا جو ان سے صلح کرے گا اور دشمن ہوں گا جو ان کا دشمن ہوگا"۔ ہم نہیں جانتے کہ اس تمام موقع پر حسینؑ نچلے بیٹھے ہوں گے یا نہیں لیکن میرا طبعی تصفیہ یہ ہے کہ موقع کے نئے پن اور طفلانہ حیرت اور سفیر الٰہی کے نفس کی اس سنجیدہ حالت نے جو دعا اور استقبال احکام کے وقت ہوتی تھی سب کو بے جنبش رکھا ہوگا۔

سورۂ براءت کے پڑھنے کے لیے جس کی مختلف حیثیتوں پر توجہ دلائی گئی جناب امیرؑ کا تشریف لے جانا حسینؑ کے لیے اس لحاظ سے بالکل نیا نہ ہوگا کہ ایک تو وہ خود مکہ ہو آئے تھے دوسرے یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ پدر بزرگوار اکثر باہر بھیجے جاتے ہیں اور ان کی اس ناموجودگی میں یہ بھی دیکھتے تھے کہ کبھی رسولؐ دعا فرماتے ہیں کہ علیؑ کی واپسی تک مجھے نہ اٹھانا۔ کبھی خود استقبال کر کے لاتے ہیں اور کبھی بھیجتے ہیں لیکن فرماتے ہیں کہ میں غمگین ہوں اور اس طرح مفارقت پر صبر کرنے کی لڑکپن سے عادت ہوتی جاتی تھی۔ اگرچہ یہ وقتی کیوں نہ ہو۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ حسینؑ کے نزدیک بھی یہ کوئی مخصوص بات تھی یا نہ تھی کہ ان کے پدر بزرگوار کے قبل ایک بزرگ بھیجے گئے اور وہ بلا لیے گئے اور ان کے بعد جناب امیرؑ بھیجے گئے۔ ممکن ہے کہ صغر سنی نے اس کا زیادہ لحاظ نہ کیا ہو لیکن رسولؐ کے کچھ ہی دن بعد حسینؑ کو ان سے جو معاملت لاحق ہوئی تھی اس کے اعتبار سے انھیں پچھلی حالتوں کا یاد آجانا بہت ممکن تھا اور یہ پس بینی مزید پیچ و تاب کی باعث ہو سکتی تھی۔

یمن کی روانگی کا نظارہ اور حسینؑ

وہ وقت آیا کہ حسینؑ اپنے پدر بزرگوار کو آخر بڑی سفارت کے لیے رسولؐ کے حکم سے مستعد دیکھتے اور اس کے لیے مستعد

رہتے کہ وہ ایک لامعلوم زمانہ تک مدینہ واپس تشریف نہ لائیں گے۔ موقع یہ تھا کہ اس وقت جناب امیرؑ کی ذات کئی منصب کا مرکز تھی۔ وہ مدینہ سے یمن بھیجے جا رہے تھے۔ درمیانی مقامات کا معائنہ پیشتر بھیجے ہوئے افسر یعنی خالد بن ولید سے حالات دریافت کرنا اور اسے ہمراہ لے لینا یا واپس کرنا۔ درصورت اہل یمن کی مخالفت کی آخری چارہ کے لیے مستعد رہنا۔ تبلیغ اسلام دینی امورات کی تعلیم ان پر حکومت یہ خدمتیں تھیں جو علیؑ کے سپرد تھیں۔ جو حبیب کے تصفیہ کے لیے علیؑ کو اپنی تلوار دے کر رخصت کیا تھا۔ بڑھتے ہوئے تلطف نے یمن بھیجتے وقت مزید نشانات امتیاز کو ضروری بنایا ضرورت بھی تھی ایک بڑے اور زرخیز صوبہ پر حکومت کے لیے بھیجتے تھے۔ غالباً علیؑ کے پہنچنے کے قبل ان پر اپنی توجہ اور محبت کی خبر پیشتر بھیجی ہو اور ان تین سو سواروں کو جو ہمراہ رکاب جانے کے لیے کھڑے تھا اطاعت اور لحاظ کا اشارہ ہو کہ نشان مرتب کرنے کے علاوہ اپنے دست اقدس سے عمامہ باندھتے ہیں اور دیکھ کر کہتے ہیں کہ: "اے علیؑ میں تمہیں بھیجتا ہوں مگر تمہاری جدائی پر افسوس کرتا ہوں"۔ باوجود اس کے بھیجتے ہیں۔ جس سے معاملہ کی اہمیت ظاہر ہے۔ روانگی دیکھنے کے لیے کون نہ ہوگا جسے جناب امیر سے محبت ہوگی۔ خاموشی اور اس میں جذبات محبت کا تصادم۔ بے چینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنا اور پھر آنکھیں نیچی کر لینا۔ کچھ کہنے کا ارادہ اور پھر وفور جذبات سے گویائی کی کمی۔ سناٹے میں وزنی سانس کی پرغم تخیید گی۔ یہاں تک کہ وہ صبر شکن موقع آگیا کہ وداعی نظر پرنمی سے پردہ پڑ جاتا۔ گھوڑوں کی صدا خاموش دیکھنے والوں کو چونکاتی۔ یہ شاندار دستہ کچھ دیر کے لیے غم کا ایک جلوس ہو جاتا، اور چاہنے والے اس وقت تک کھڑے رہتے، جب تک کہ اس جلوس کا آخری نشان یا صدا کی خفیف آہٹ بھی ملتی۔ جلوس روانہ ہوتا اور قلبی تعلق رکھنے والے خاموش دیکھتے رہ جاتے۔ غرض!

حجۃ الوداع اور حسینؑ

چند ماہ اس طرح گزرے تھے کہ رسولؐ کا حکم نامہ یمن پہنچا۔ رسولؐ مدینہ سے اور علیؑ یمن سے چلے۔ مرکز ملاقات مکہ تھا۔ طاہرہؑ بھی تشریف لے گئی تھیں، اور اس سے یقین کیا جاسکتا ہے کہ حسنینؑ بھی گئے تھے۔ اور اگر اس کے قبل شان سے روانہ ہوتے دیکھا تھا تو مکہ میں اسی شان سے داخلہ دیکھا ہوگا۔ اسلام کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس قدر مسلمان حج کرنے جمع ہوئے اور اسی وجہ سے آخری بھی تھا کہ نبی اللہ نہ اس کے بعد تشریف لے گئے اور نہ اب تک اجتماع کے لیے اس قدر اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ موقع تھا جسے زمانہ اب نہ دیکھے گا۔ اگرچہ اس سے بدرجہا زیادہ تعداد میں مسلمان حج کرنے ہر سال جاتے رہتے ہیں اور باوجود بعض وقتوں کے آمد و رفت کی سہولتیں تعداد میں اور اضافہ کرتی رہیں گی۔ حسینؑ نے یہ اثر خیز منظر دیکھا، اور کیا عجب ہے کہ مسکرا کر پوچھا ہو کہ: "نانا یہ سب تمہاری امت ہے؟"۔

حج ختم ہوا، لوگ چلے، اور متفرق ہونے کے قبل دوسرا منظر بھی ان مسلمانوں کو دیکھنا تھا۔ اس لیے کہ رسولؐ خدا نے نقطہ تفرق کو اپنی نگاہ کے تابع رکھنا چاہا۔ وہ کسی ایسی جگہ سے جہاں بہت سے راستے ہوں۔ لوگوں کو اپنی خوشی سے منتشر نہیں ہونے دیتے۔ بلکہ اس کا لحاظ فرماتے ہیں کہ انھیں ایک مرکز پر جمع کر کے کسی مادی اور خیالی افتراق کا موقع نہ دیں اور آج حسینؑ ایک تماشہ دیکھتے ہیں، جو اگر غبطہ سے بڑھ گیا ہو تو تقاضائے سن کے لحاظ سے اور زیادہ دل پسند ہو جاتا ہے۔ یہ علیؑ کے لیے نیا نہ تھا۔ اس لیے کہ انھیں بھی رسولؐ نے اپنے "کنار و بغل" میں پالا تھا، اور زبان چوسائی تھی۔

لیکن حسینؑ کی حیرت تبسم اور پر مسرت بے چینی مصور کے اندازہ کے باہر ہے جب وہ دیکھتے ہوں گے کہ منبر ہے، نانا ہیں اور لوگ ہیں۔ لیکن آج ہم نہیں بلکہ پدر بزرگوار رسولؐ کے ہاتھوں پر بلند ہیں!۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ حسینؑ اس وقت یا اس کے بعد کی مبارک بادوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہی ہو رہے تھے یا کبھی کبھی کسی کے پُر تصنع تبسم اور اس کی تلخی کو بھی محسوس کرتے تھے۔ بچوں کو خیال ہی کیوں ہونے لگا کہ آدمی کا ظاہر و باطن ایک نہیں ہوا کرتا اور ہنسی کے نیچے زہر بھی بھرا رہتا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر ایسی ہنسی حسینؑ کی نگاہ کے نیچے آگئی ہوگی تو وہ بغیر چونکے نہ رہے ہوں گے۔

وداعی حالت کا حسینؑ پر اثر

نبی عربیؐ کا حجۃ الوداع کے قبل اہتمام کرنا کہ ایک وداعی مجمع ہو۔ مجمع سے کہہ بھی دینا، اور اس کے بعد بقیہ اسی نوے دن کا طرز عمل اسی پر راز قانون کے اندر آتا ہے جس کا نام الہام یا وحی یا سامعہ باطنی ہے کوئی بعید از قیاس امر نہیں ہے کہ رسولؐ کی اس قلبی حالت نے بچوں پر اثر کیا ہو۔ وہ چپ اور مغموم رہتے ہوں، بغیر اس کے کہ انھیں وجہ معلوم ہو، وہ والدین کی غمگین خاموشی سے احتیاط کے باوجود اشارہ پاتے ہوں اور دل بھر آتا ہو اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہو کہ والدین ان بچوں پر نظر گڑا دیتے ہوں اور ضبط کی کوشش کے قبل آنکھوں میں آنسو ڈھلک آتے ہوں، بچے دیکھتے ہوں۔ دل میں کڑھ جاتے ہوں۔ ان کی آنکھ میں بھی آنسو آجاتا ہو اور اب ماں باپ انھیں زور سے لپٹا لیتے ہوں۔

ہادیؐ کا آخری وقت اور حسینؑ

کچھ دنوں تو خوف کا وہم تھا، لیکن ۱۱ھ کا ماہ صفر ابھی ختم نہیں ہونے پایا تھا، اور نہ حسینؑ ابھی پورے سات برس کے ہوئے تھے کہ وہ دن آیا جس کا خوف تھا۔ ہادی عالمؐ کو مرض الموت لاحق ہوا۔ محض علالت حیات کی امید منقطع نہیں کر دیتی۔ لیکن علالت میں دنوں کا گزرنا اور مرض میں اضافہ اہل بیت رسالت کی افسردگی کو بڑھاتا جاتا ہوگا اور حسینؑ اپنے اوپر نانا کے ہر وقت ہنستے ہوئے چہرہ اور لطف آمیز نگاہوں کو افسردہ اور ساکت پاتے ہوں گے۔

ہادی عالمؐ کے آخری دنوں کے متعلق ہم کافی سے زیادہ اشارے کر چکے کہ وہ انتشار آمیز تاسف سے خالی نہ تھے۔ سیاسی پیش بندیوں کے سمجھنے کے لیے حسینؑ کی عمر بہت کم تھی۔ ان کے سن کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ اس کے اسباب نشو اور نتائج کو سمجھ سکتے اور اس لیے ہم محض یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر حسینؑ کی سماعت تک کسی یا چند کی خلاف ورزی کی خبر پہنچی ہوگی تو وہ محض ایک انفرادی حیثیت کی بے طاعتی سمجھتے ہوں گے اور اس سے اس قدر روٹھے ہوں گے جس قدر توجہ لڑکپن کا بے قرار خیال حوالہ کر سکتا ہے۔ اور کچھ عجب نہیں ہے کہ اپنے اور اپنے والدین کے ساتھ رسولؐ کی بڑھتی ہوئی توجہ کو دیکھ کر ان بے طاعتی کی مثالوں کو مطلق کسی توہم سے نہ دیکھتے ہوں۔

ہادی برحقؐ کی علالت بڑھتی گئی اور غم کی موجیں اس قدر قوی ہو گئیں کہ پہلے طاہرہؑ کے صبر کو بہا لے گئیں۔ فطری تھا۔ کیسے حق تھا کہ رسولؐ بر فاطمہؑ کے پہلے کوئی روتا۔ کس کے گرم آنسو اس قابل تھے کہ ہادی برحقؐ کے رخساروں پر ٹپکتے، اور آنکھیں کھلوا سکتے۔ صبر شکن نگاہ لاڈلی بیٹی کی طرف اٹھی اور ساتھ ہی بشدت، ضعف اور جذبہ محبت سے تھرتھراتے ہوئے ہاتھ آخری مرتبہ اٹھے کہ طاہرہؑ کے آنسو پونچھتے اور تسکین دلانے کی یہ کوشش سیلاب اشک کو اور تیز کر دیتی۔

لیکن محبت کا یہ غم انگیز منظر آخری نہ تھا بلکہ اس میں بچوں کا بھولا پن کچھ اور اضافہ کرنے والا تھا۔ ہادیؐ نے آنکھیں کھولتے ہی اپنے فرزندوں کو طلب کیا۔ کئی روز کی شدید بیماری نے جس قدر خاموش کر دیا تھا۔ اب اس وقت کی طلبی نے حسنینؑ کو یہ خیال دلایا ہو کہ رسولؐ کی ناشکستہ توجہ صحت سے پھر عود کر آئی۔ یا بلانے کے لیے جانے والوں کی افسردہ صورتیں دیکھ کر پہلا اثر خوف کا ہو اور اس نے دوڑا دیا ہو۔ میرے نزدیک دوسری صورت زیادہ قریب الامکان ہے۔ آئے حسنینؑ۔ اس لیے کہ رحمۃ للعالمین کی محبت سے بھرے ہوئے سینہ کی گرمی آخری مرتبہ محسوس کریں۔ رسولؐ کی آنکھیں کھلی تھیں۔ ہاتھ پھیلے تھے اور سینہ لپٹا لینے کے لیے بے چین تھا۔ لپٹ گئے۔ رسولؐ نے ان کے بھولے رخساروں پر لب اقدس سے محبت کی مہر کی، ریحانتین کو سونگھا۔ اور اس وقت بھی تعظیم احترام اور محبت کے باب میں اصحاب اور تمامی امت کو وصیت کی۔ حسینؑ کی عمر اس کی کافی صلاحیت رکھتی تھی کہ رسولؐ کی ان وصیتوں کو جو اپنے متعلق تھی یاد رکھتے اور اس وقت لوگوں میں اپنا جو احترام تھا اس کا امتیاز کر سکتے۔

وہ تمام نفوس جنھیں رسولؐ سے محبت تھی قریب تھے، خوف اور اضطراب سے ناگزیر نتیجہ کے منتظر تھے۔ جناب امیرؑ کے سینہ مبارک یا زانوئے اقدس کو اس کا افتخار تھا کہ سر مطہر اس پر رکھا تھا۔ علیؑ چاہتے کہ ہمیشہ ہمیں یہ فخر اور راحت نصیب ہو۔ لیکن مشیت ایزدی جاری ہونے والی تھی۔ رسولؐ کے لب اطہر میں آخری جنبش ہوئی۔ "الرفیق الاعلیٰ" کی خاص روحانی قربت کا شوق تھا۔ جو ان کے آخری سانس سے ظاہر تھا۔ ادھر اظہار شوق تمام ہوا ادھر فاتح عرب کا صبر ختم ہوا۔ سر اقدس کا وزن اٹھانے کی اب قوت نہ رہی۔ چیخ اٹھے۔ عباس کو پکارا کہ "میں بے خود ہو رہا ہوں میری خبر لے"۔ قیاس آسان ہے کہ اس وقت نسبتاً کمزور دل کی طاہرہؑ اور بچے کیا کر رہے ہوں گے اور کیا کہہ رہے ہوں گے؟ لیکن انھیں کیا معلوم تھا کہ ابھی رسولؐ دفن

رحلتِ رسولؐ کے بعد واقعات کے لحاظ سے اہلِ بیتؑ کی طبعی حالت

نہ ہونے پائیں گے اور نہ ہم رونے سے سیر ہوں گے کہ ہم ایک مرتب جماعت کے قبضہ میں اس طرح آجائیں گے کہ ہمارے حقوق، ہماری تعظیم اور ہمارا احترام ایک خواب کی بات ہو جائے گی۔ اور دفعتہً یہ باتیں اس طرح بھلا دی جائیں گی کہ گویا ہمارے لیے کبھی نہ گئی تھیں، بلکہ ہم سے چاہا یہ جائے گا کہ ہم اس طرح ان کی تعظیم و احترام کریں۔ جنھیں ہماری تعظیم و احترام کا حکم دیا گیا تھا۔ بچے بے خبر تھے۔ طاہرہؑ بے خبر تھیں، جناب امیرؑ بے خبر تھے کہ طوفان کی دبی آواز کان میں آنے لگی۔ میرے خیال میں تمام اس مجمع نے جو اس وقت علیؑ کے پاس دفن رسولؐ کی فکر میں ہو کسی نئی متوحش خبر کے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ قبول کیا جانا تعجب خیز اعتقاد ہو تا۔ لیکن زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ان لوگوں کو یقین بغیر چارہ نہ ہوا۔ اور اب سوچا جا سکتا ہے کہ ان کے غم غصہ اور نفرت کا کیا درجہ ہو گا۔ خصوصاً جب کہ انھیں دفعتہً اپنے خیالات کا راستہ بدلنا تھا۔ ابھی جوش غم میں کمی نہ ہوئی تھی، آنسو تھمے اور خشک نہ ہوئے تھے کہ وہ خبریں سنتے ہیں کہ مسند رسولؐ کا انتظام رسولؐ کے گھر سے کوسوں دور کر لیا گیا۔ بغیر اس کے کہ بنی ہاشم یا اہلِ بیتِ رسولؐ میں سے کوئی وہاں موجود ہو تا۔ کوئی عجب نہیں ہے اگر اہلِ سقیفہ کی کارروائیوں کی خبر نے اہلِ بیت اور ہوا خواہانِ اہلِ بیت کے آنسو خشک کر دیے ہوں اور وہ اپنے دماغوں پر چوٹ کھانے کی جھنجھناہٹ محسوس کرتے ہوں اور کچھ دیر کے لیے گم ہو گئے ہوں کہ ہم کیا کریں۔

بنی ہاشم انسانیت کے حقوق ادا کر رہے تھے کہ انھیں عالم سیاست نے جھنجوڑا۔ یہاں عالم سیاست سے میری غرض اس کی نرم اور معمولی روش نہیں ہے بلکہ وہ عالم جس میں رحم اور دل نہیں ہوتا۔ جو جذبات اور احساسات کو وہ کیسے ہی اعلیٰ کیوں نہ ہوں اپنی بعض ضروریات کے لیے اپنا دشمن سمجھ کر کچلنے سے بھی زیادہ کچلتا ہے۔ کون سوچ سکتا ہے اس تکلیف کو جو جناب امیرؑ کو ہوئی ہوگی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جناب امیرؑ ایک ہاتھ سے رسولؐ کی لاش تھامے ہوں اور دوسرا ہاتھ دفعتہ سر تک پہنچ گیا ہو۔ میرے آخری فقرہ کی غرض یہ نہیں ہے کہ جناب امیرؑ کا اس وقت یہی انداز تھا، بلکہ میں بیچ بیچ انسانی دماغ کی اضطراب، بیچ اور گرتی ہوئی حالت کجھا رہا ہوں۔ جناب امیرؑ اس سے بہت بلند تھے کہ ان سے اضطراب کی کوئی ظاہر حالت ایسے وقتوں میں طاری ہوتی جس میں وہ ایک فریق اور دوسرا انسان دوسرا فریق ہو جب کہ ان جناب کے اس احساس کے متعلق ان کا کسی موقع پر یہ اظہار خیال پایا جاتا ہے کہ "یہ امر مجھ پر نہایت ہی دشوار ہے کہ کسی قسم کے اندوہ وملال کی جھلک مجھ میں نظر آئے تاکہ دشمن کو شماتت کا موقع ملے یا دوست اس کی حالت دیکھ کر محزون ہو"۔ یا چہرہ پر دیگر جذبات کے اثر کو اس فقرہ میں ظاہر فرماتے ہیں کہ: "کسی شخص نے محبت وعداوت کو دل میں پوشیدہ نہیں کیا مگر یہ کہ وہ اس کی زبان، غفلتوں اور چہرہ کے صفحات میں ظاہر ہو گئی"۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ جناب امیرؑ کس طرح کوشش کرتے ہوں گے کہ میرے اثر غم سے میرے متعلقین محزون نہ ہوں۔ یہ کوشش بجائے خود ایک مرثیہ تھی۔ درآنحالیکہ یہ بات ابھی باقی ہے کہ محض چہرہ سے ظاہر نہ ہوسکتا کیا اس کے لیے کافی ہے کہ قلب کی کسی کیفیت کا اثر دوسرے قلب پر نہ ہو۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ایک یا چند ایک ہی جذبہ سے متاثر ہوں۔ اور پھر کے گھڑی جناب امیرؑ اپنے اس ہوش پر مصر رہتے کہ ہمارے چہرہ سے آثار حزن تو ظاہر نہیں ہیں۔ قلب کی ذرا سی نرمی، چہرے کے ریشوں کا خفیف ساڈھیلا پن اور اس کا وہ عالم جو غم سے متاثر ہونا کہا جائے کافی تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا مینہ برسا دیتا۔ اور جناب امیرؑ یا تو نگاہیں نیچی کر لیتے یا اپنے چہرہ کو حد پر لانے کے لیے منھ پھیر لیتے۔ آخر کون تھا جس کی طرف زکیہ دیکھتیں اور ہمارے غم زادے اور غمزادیاں کسے اپنا تسکین دینے والا سمجھتیں۔

لیکن جناب امیرؑ کا ضبط کرنا تو اس خیال سے تھا کہ میری افسردگی میرے متعلقین کو اور بے چین نہ کر دے۔ اس کی غرض یہ نہ تھی کہ وہ لوگ بھی میری ہی طرح ضبط کریں۔ جناب فاطمہؑ زہرا کی یہ مشہور حالت سب کچھ کہتی ہے کہ ان معصومہ کو رسولؐ کے بعد اپنی رحلت تک کسی نے ہنستے نہ دیکھا۔ ہنستے نہ دیکھنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کوئی انھیں روتے دیکھتا لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ معظمہ اس وقت تک سیر نہ ہوئیں جب تک ان کی روح اقدس نے اس عالم کی طرف ہجرت نہ کی جہاں وہ اپنے پدر عالی مقدار کی روح مطہر سے قربت حاصل کرتی۔ ایک دریا تھا جو امنڈ رہا تھا۔ ایک جوش تھا جس نے سکون پانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور ایک متعدی درد تھا جس نے سننے والوں کو اس درجہ بے چین کیا کہ وہ جناب امیرؑ سے درخواست کرتے کہ رونے کا وقت مقرر کیا جائے اور ظلم من اللہ کی صاحبزادی انھیں جواب دیتی کہ مجھے تم میں بہت دنوں نہیں رہنا ہے!۔

پھر بھی جناب امیرؑ نے عموماً کیسا ہی ضبط کیوں نہ کیا ہو انھوں نے نظم ونثر میں وقت دفن اور بعد دفن جو کچھ فرمایا اس کی خوبصورت شاعری (جذبات کی مصوری) اس لیے بہت موثر ہے کہ وہ ایک ضابطہ کا اظہار خیال ہے۔ علیؑ قبر کے پاس

ٹکڑے ہیں۔ صبر اور رونے کی متضاد حالتوں پر ان کا دماغ غور کر رہا ہے اور کہہ رہے ہیں : "صبر کرنا اچھی بات ہے مگر حضرت سے صبر کر لینا ممدوح نہیں ہے۔ جزع و فزع بے شک قبیح ہے مگر آپ کے بچھڑنے کی مصیبت پر نہیں۔ آپ کی مصیبت سے جو رنج و اندوہ ہے وہ نہایت ہی بزرگ ہے۔ یہ رنج و اندوہ آپ کی مصیبت سے پہلے حقیر تھا اور آپ کی مصیبت کے بعد بھی حقیر سمجھا جائے گا"۔ یا فرماتے ہیں کہ : "آپ نے غیر کی مصیبت سے ہمیں مطمئن کر دیا"۔

حسنینؑ کی نامرادی

اور باوجود ان باتوں کے اس اندوہناک استثنا کی بھی خبر ہے کہ جب جناب امیر اور طاہرہؑ "امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے منھ کی طرف نگاہ کرتے تھے تو اپنی یتیمی اور ان کی نامرادی پر" روتے تھے۔ حالت یہ تھی کہ بچوں کا رونا صبر شکن تھا۔ نہ رونا اور کڑھنا یا سانسے اور بھولے چہرہ سے دیکھنا اور زیادہ غم افزا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ایک پیاری چیز کھو گئی ہے بغیر اس کے کہ اس کے اظہار کے لیے منھ میں لفظ پاتے ہوں۔ ان کا دل کچھ ڈھونڈ تا تھا مگر پاتے نہ تھے۔

خطرہ اور اسؑ کا احساس

اب ذرا اس تاریکی پر توجہ کی جائے جسے علیؑ فرماتے ہیں کہ : "چھا گئی تاریکی ان (رسُولؐ) کے انتقال کے بعد"۔ یا جیسا حضرت طاہرہؑ فرماتی ہیں کہ : "وہ منبر جس پر آپ (رسُولؐ) تشریف رکھتے تھے تاریکی نے اُسے ڈھانپ لیا"۔ اور دیکھیں کہ حسینؑ کی "نامرادی" یا ان کی مادرِ گرامی کے اس خیال کو کہ : "آپ کے بعد ہم ضعیف و حقیر ہو گئے۔ لوگوں نے منھ پھیر لیے۔ آپ کی زندگی میں ہم خلائق کے نزدیک معظم و مکرم تھے"۔ کس درجہ تعلق ہے۔ سوچے کوئی اگر سوچ سکے کہ کبھی کے بچے یہ دیکھتے ہوں کہ سیکڑوں آدمی حملہ آوروں کے جوش سے ہمارے گھر کی طرف آ رہے ہیں۔ اپنی ماں سے کسی کی یہ دھمکی سنی ہو کہ ہم گھر پھونک ڈالیں گے۔ اس وقت بھی دیکھا ہو کہ آگ اور لکڑی موجود ہے۔ محاصرہ اور اطاعت کرنے کا شور سنا ہو اور پھر وہ یہ نہ سمجھتے ہوں کہ ہم خطرہ میں ہیں اور سب سے زیادہ افسوسناک یہ امر ہو کہ آج ان کے یہ انداز دیکھتے ہوں جو کل دست نگر تھے اور جنھیں آنکھیں چار کرنے کی جرأت نہ تھی اور جن سے نانا نے تعظیم و احترام کی وصیت کی تھی۔ حالت ایسی ہوئی کہ قنفذ یعنی حملہ آوروں میں کا ایک سپاہی رو دیتا اور بچے سہم نہ جاتے اور ماں کے سینہ میں اپنے منھ نہ چھپاتے؟۔ یہ سن تو ایسا نہیں ہے جن میں بچے محبت اور غصہ کی نگاہیں نہ پہچان سکتے ہوں۔ انھوں نے اطاعت کرنے والی صورتیں دیکھی تھیں اور یہ حالت اس وقت کی صورت خوب سمجھا سکتی تھی۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اس وقت والدین کے بشرے ویسے بشاش نہیں ہیں جیسے اصحاب کی حاضری کے وقت رہا کرتے تھے اور یہ ان کے خوف زدہ کرنے کے لیے بہت کافی تھا۔ کچھ بعید نہیں ہے کہ حیرت اور خوف سے اس وقت پوچھا ہو کہ : اماں ! کیا یہ میرے نانا کی امت نہیں ہیں؟۔ ان سے پوچھو تو کہ کیا ہمارے ہی احترام کے لیے کل وصیت نہیں کی گئی ہے۔ ام الفضل سے پوچھتے ہوں گے کہ دادی تم ہمیں یہ شعر پڑھ کر کھلاتی تھیں کہ :

"یا ابن رسول اللہ یا ابن کثیر الجاہ"

آج ہمارا جاہ کہاں ہے؟۔ تمھاری یہ دعا کہ : "خدا تمھیں مصیبتوں سے پناہ میں رکھے"۔ قبول نہیں ہوئی!۔ اور یہ سن کر ماں اور دائی کے لب جواب نہ دیتے، بلکہ آنکھوں میں آنسو ڈھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہو۔

بچوںؑ کا پہلا اندوہناکؑ اتفاق

حملہ آوروں اور دھمکانے والوں کا واپس جانا کوئی تسکین نہ تھی بلکہ حسنینؑ دیکھ رہے تھے کہ اب وہ ہمارے سامنے نہیں ہے جو نانا کے بعد ہماری پناہ ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر رسولؐ کے بعد کبھی جناب فاطمہؑ زہرا کے آنسو تھمے تھے تو اس وقت اور غالباً اس سے زیادہ ان کے روحانی تکلیف کا دوسرا وقت نہیں تھا جب وہ دیکھتی تھیں کہ علیؑ مرتضیٰ ان لوگوں کے پاس گئے ہیں جو ہمیں اپنے حاصل کردہ اختیار سے مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ ان سے یہ بات چھپی نہ رہ سکتی تھی کہ بیعت نہ کرنے سے قتل کی دھمکی دی گئی۔ اور خود یہ بھی خبر ہے کہ حسنینؑ کو کوئی درشت خو شخص راستہ میں ملتا اور انھیں الزام دیتا کہ تم جاسوسی کرنے گئے تھے۔ بچے کرخت انداز اور درشت چہرہ کو پہلی مرتبہ دیکھتے اور غالباً گھر آکر شکایت کرتے اور جناب امیرؑ کچھ نہ کرسکتے۔ اس لیے کہ انھیں تنہا اس تنہا شخص سے جواب طلب کرنے کا اختیار نہ ہوتا کیونکہ وہ حکومت کی حمایت کے لحاظ سے حکومت کو اپنی مدد کے لیے بلا سکتا۔

تنگیٔ معیشتؑ

مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جناب امیرؑ کے دیوان کے وہ اشعار جن میں آپ افلاس اور تنگیٔ معیشت کا تذکرہ کرتے ہیں وہ متصلاً بعد رسولؐ زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسا طاہرہؑ کا یہ فقرہ کہ: "میرے فرزندوں کا قوت و معیشت بھی لے لی گئی"۔ کون قیاس کرسکتا ہے ان سرچشمہ شرافت نفوس کی دشواریوں کا جنھوں نے اپنے حکومت و اختیار کو خلق اللہ کے راحت و آرام کے لیے اس طرح صرف کیا کہ اپنے کو مفلس ترین فرد عالم کی حیثیت میں ڈالا جس سے وہ غریب کی حالت کے اندازہ اور یکجہدردی کے قابل ہوں۔ انھوں نے اپنے شرعی حصہ غنیمت یا محاصل کو تو کیا معنی خود اپنی کسی جائداد کی آمدنی کو بھی زیادہ تر غربا کے لیے صرف کردیا۔ اب وہ دیکھتے ہیں کہ ہم بے اختیار ہیں اور قبل اس کے کہ ہم نے زمانہ اختیار میں اپنے بسر اوقات کا بے اختیاری کی حالت میں خیال کیا ہو بے اختیاری نے ہمیں بغیر کسی ذریعہ کے چھوڑ دیا اور زمین کا وہ ٹکڑا جو ہمارے کام آتا اسے حکومت نے اپنے "اختیار" کی دلیل سے ہم سے چھین لیا۔ اب بظاہر اگر کوئی صورت تھی تو یہ کہ علیؑ اپنے اور فاطمہؑ اپنے حقوق سے دست بردار ہوتیں اور حکومت کی ہر روش کو تسلیم کرکے رفاقت کا اعلان کیا ہوتا۔ لیکن علیؑ و فاطمہؑ سے یہ ممکن ہو یا نہ ہو خود حکومت کی سیاسی بے اعتباری فوری اعتبار کی مقتضی نہ ہوتی۔ ان باتوں کے لحاظ سے ہم کوئی تصفیہ نہیں کرسکتے کہ اس وقت ان کے بسر اوقات کا کیا خاص ذریعہ رہ گیا تھا۔ جب کہ فدک ان سے لے لیا گیا۔ ایسا ہے کہ جناب زکیہؑ نے و نیز جناب امیرؑ نے اپنی زمینداری اور باغ کو اپنے بعد وقف کیا۔ جس سے مجھ میں آتا ہے کہ جناب امیرؑ اور زکیہؑ کو حضرت ابوطالب اور رسالت مآبؐ کی خاندانی جائداد سے کچھ حصہ ملا۔ اس صورت میں اگرچہ فاقہ اور اس سے بچنے کے لیے شدید محنت کا غالباً موقع نہ ہو لیکن مقدار نہیں معلوم اور گزشتہ فقرات کے بنا پر خیال ہوتا ہے کہ ان کی آمدنی اس قدر کافی نہ تھی کہ وہ بغیر فدک کے محاصل کے بسر اوقات کے لیے کافی ہوتی۔

انصافؑ یا سیاست

اللہ کی شان تھی کہ جناب امیرؑ اور طاہرہؑ مع حسنینؑ اور ام ایمن کے ابن ابوقحافہ کے پاس بحیثیت مدعی کے جاتے اور اتفاقات کا نامنصفانہ انتظام تھا کہ یہ دیکھتے کہ ضرور نہیں ہے کہ انصاف اور سیاست ساتھ ساتھ چلے۔ یہ واپس آتے اور حسنینؑ کے چھوٹے چھوٹے دلوں پر چوٹ لگتی۔ وہ دیکھتے

یا نہ دیکھتے ان کا دماغ جو اطاعت اور اظہار اخلاص کا عادی تھا گزرے ہوئے دو تین دنوں سے دیکھتا کہ ہماری آن چوٹ کھا رہی ہے اور زمانہ ہمیں پست حالتی کی طرف کھینچ رہا ہے!۔ ہم نہیں جانتے کہ جناب امیرؑ اور زکیہؑ نے حسنینؑ کو کس طرح بہلایا اور چپ کرایا ہوگا۔ جب بچے اپنی گزشتہ شان اور وقار کے فطری اثر سے ان کو جو آج چہرہ پر حاکمانہ رد کھاپن اوڑھے تھے دیکھ کر کہتے ہوں گے کہ یہ تو وہی ہیں جن کے جبڑے ہر وقت اظہار عجز و انکسار میں جھکے رہتے تھے، آج آپ انھیں کچھ کیوں نہیں کہتے!۔

ایک حالت جسے ہماری شہزادیاں بھولی نہ ہوں گی

رسولؐ کے رحلت کے ساتویں دن یعنی بیعت کی یورش کے بعد طاہرہؑ کا اشتیاق زیارت میں گھر سے شب کو باہر نکلنا اب تک لوگوں میں اس آزادانہ فوری لحاظ کا سبب ہوسکا کہ اہل مدینہ راستوں کے چراغ گل کر دیتے اور انصار و مہاجرین کی عورتیں اپنے حلقہ میں لے لیتیں۔ یہ حسنینؑ کے دیکھنے اور یاد رکھنے کی چیز اس قدر نہ تھی جس قدر ہماری دونوں شہزادیاں حضرت زینب اور کلثوم کے نہ بھولنے کی چیز تھی!۔

حسنینؑ کے لیے اب تک دو ذات باقی تھیں

باوجود اس بڑے نقصان کے جو حسنینؑ کو ہادی عالم کی رحلت سے ہوا تھا اب تک وہ عظیم الشان ذات باقی تھی جو بنی برحق کی پوری شرح کہی جائے۔ عرب کا ہادی اول اب نہ تھا لیکن فاتح عرب کی ذات میں وہ ہیج چہرہ تھا جو رسولؐ کو یاد دلائے۔ اور محبت کا دوسرا مجسمہ طاہرہؑ کی ذات میں موجود تھا۔ لیکن افسوس رسولؐ کی رحلت کے بعد کوئی دن نہ گزرتا تھا جو اس خوف اور یقین میں اضافہ نہ کرے کہ "ماں" بھی ہم کو چھوڑا چاہتی ہیں۔ شاید بچے نہ سمجھتے ہوں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس پرغم خوف کے آثار جناب امیرؑ کے دل اور نظر میں نہ تھے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ جناب فاطمہؑ زہرا کی مایوس شکستگی نے بچوں کے چہرہ پر اندوہناک غم نقش نہ کر دیا ہو۔

ماں کی وہی حالت جو نانا کی تھی

اس طرح دن گزر رہے تھے۔ اس کی رحلت کو جس کی نظر اور سایہ میں سات آٹھ برس کی عمر ہوئی تھی ستائیس دن پورے نہ ہوئے تھے کہ ماں کو اسی حالت میں دیکھا جس میں نانا کو مفارقت کے بارہ دن قبل دیکھا تھا۔ بچوں کے لیے علالت اب کوئی نئی بات نہ تھی اور اس کا جو خوف طاری تھا کیا عجب ہے کہ اندیشہ خیز یقین کی صورت ابتداء ہی میں اختیار کرتا جاتا ہو خصوصاً جب کہ وہ ماں کی بے کسل محبت اور توجہ میں علالت کو حارج دیکھتے ہوں۔ برے وقت علالت کا آغاز ہوا تھا کہ اس میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ کیونکر کمی ہوتی جب کہ درمیان میں اور اس کے قبل ایسے اسباب پیدا ہوتے تھے کہ اس کی شدید ضرب گرا دیتی اور حیات معرض خطر میں گرفتار ہو جاتی۔

بنت رسولؐ کے مکالمات کا لہجہ اور مضمونؐ اور حسینؑ

یہ حالت تھی بلکہ یوں کہنا ہوگا کہ وہ دن بہت قریب تھا کہ طاہرہؑ بھی اپنے پدر بزرگوار سے جا ملتیں کہ بچوں نے آج پھر دیکھا کہ دو آدمی اس طرح مادر گرامی سے عذر خواہی کر رہے ہیں جس طرح وہ حیات رسولؐ میں اظہار اخلاص و ادب کو جائز رکھتے تھے۔ میں امید نہیں کرتا کہ حسنینؑ ان کی عذر خواہی کے درجہ پر

غور کی ضرورت سمجھتے ہوں گے یا انھوں نے خیال کیا ہوگا کہ وہ اپنی گزشتہ نامقبولیت کا علاج کرنے آئے ہیں، بلکہ بچے تو اس پر خوش ہو رہے ہوں گے کہ اس وقت کا صاحب اختیار اپنی مشغولیتوں کے باوجود ہمارے در پر پھر آیا، اور یہ بھی دیکھتے ہوں گے کہ مادر گرامی کے لہجہ اور شانِ خطاب میں کوئی لغزش نہیں ہے۔ میں نہیں سوچ سکتا کہ بچے اس وقت کے مشہور مکالمہ کو کبھی بھول سکتے تھے۔ اور نہ چند روز کے بعد وہ اس گفتگو کو بھول سکتے تھے جو حضرت فاطمہؑ نے انصار و مہاجرین کی عورتوں سے کی۔ نہ یہ حافظہ سے خارج ہونے والی بات تھی کہ اس کے بعد مہاجرین و انصار دار الشرف پر حاضر ہو کر عذر خواہی کرتے ہیں۔ یہ وقت تھے جن میں ان مرجھائے ہوئے دلوں کی طبعی عظمت اپنے وقار کی لطیف لہر سے ذرا سی تسکین پاتی۔

ماں اپنے بچوں کا آخری لحاظ کرتی ہے

اپنی رحلت کے ایک آدھ دن یا چند ساعت قبل سیدہ نے اپنے کو اس سے تسکین دی تھی کہ بچوں کے لیے کھانا تیار کرا دیں، نہلا دیں اور سر میں کنگھی کر دیں۔ آخری وقت ان افعال محبت کا محرک ایک غالب تھا جس سے جناب فاطمہؑ کو یقین تھا کہ وقت قریب ہے کہ ہم اپنے پدر بزرگوار سے ملاقات کریں۔ غم کا طوفان اس سے زیادہ بے رحم تھا کہ وہ بچوں کی بھولی صورت اور جناب امیرؑ کی تنہائی سے متاثر ہوتا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ سیدہ نے اپنی آخری وقت اس کا لحاظ رکھا تھا کہ بچے زیادہ تر ان کی آخری تسکین یعنی روضہ رسولؐ پر رہیں۔ سیدہ کے ضعف اور نقاہت کی انتہا ہو گئی اور جناب امیرؑ پر وہ حالت طاری ہوئی کہ بند قبا کھولتے اور عمامہ سر مبارک سے اتارتے ہوئے سرہانے بیٹھ جاتے۔ لیکن باوجود بولنے کی طاقت نہ ہونے کے زکیہؑ کی آنکھ میں آنسو کا ایک قطرہ اس فقرہ کے ترجمہ کے لیے تھا کہ: "روتی ہوں ان ظلموں پر جو میرے بعد تم پر ہوں گے"۔ اور دوسری یہ بھولی نہ جانے والی وصیت تھی کہ: "حسنینؑ سے بلند آواز سے نہ بولنا کہ وہ شکستہ خاطر اور غریب ہو جائیں گے"۔ یا "میرے بچے میرے بعد میری ملاقات کے مشتاق اور بے قرار ہوں گے انھیں تسلی دینا کہ مجھ سے جدا ہوتے ہیں"۔

اس کے بعد غالباً جناب امیرؑ مسجد میں اور بچے کہیں اور تھے کہ اسماء کو "الصلوٰۃ یا بنت رسول اللہ" کا جواب نہ ملا۔ حسنینؑ پہنچ گئے۔ بچے ماں ہو رہی ہے۔ پوچھا اور پکارا لیکن جواب سے رسولؐ کے ان خوبصورت کھلونوں کو زمین پر لوٹتے دیکھ کر تڑپنے اور چیخنے سے تسکین نہ ہوئی۔ چھوٹے بچوں کو یقین نہ تھا کہ موت ماں کو بولنے نہ دے گی۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ان قدموں کو تھام لیا جنھیں موت نے سرد اور خاکستری بنا دیا تھا۔ چومنے لگے۔ کہہ رہے تھے: "اماں ہم تمھارے فرزند حسنینؑ ہیں کچھ بولو"۔ لیکن افسوس موت میں یہ قوت نہ تھی کہ وہ اس طفلانہ ناز محبت کا جواب دلا سکتی۔ ماں کی خاموشی ویسی ہی دل شکستہ رہی۔ چہرہ اور تمام اعضا کے رگ و ریشہ نے پھیلنے سے انکار کیا جو زندگی میں اس کا اشارہ ہوتا کہ آؤ گود میں آ جاؤ۔ بچے ماں کی اس خلاف امید سرد مہری پر اور کڑھے اور اب شاید انھیں اس کا یقین آنے لگا کہ ماں اب نہ بولے گی۔ اس نے بید کی طرح تھرتھرا دیا اور ناقابل بیان خوف نے اپنی آخری امید کی طرف دوڑا دیا۔ سر کے بال جن میں کچھ دیر پہلے ماں نے کنگھی کی تھی گرد آلود تھے۔ آنکھیں ابلی اور اشک آلود۔ چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ آواز میں غم کا بے ہنگم آہنگ تھا کہ مسجد کے قریب پہنچے۔ کچھ ضرور نہ تھا کہ حسنینؑ اس دل شکن خبر کو اپنی زبان سے ادا کرتے۔ انھیں روتے اور اس صورت

سے گھبراتے اور دوڑتے ہوئے آتے دیکھنا کافی تھا کہ جناب امیرؑ کو سب کچھ بتا دیتا اور حقیقت امر کی یاد دینے والی چوٹ لگی کوئی تھا جو پوچھتا کہ: "اے فرزندانِ رسولِ خدا تمہاری آنکھوں کو نہ رُلائے کیا رسولؐ کی جگہ خالی دیکھ کر تم پر رقت طاری ہوئی؟" اور حسنینؑ بسورتے اور باپ کو دیکھتے ہوئے کہتے کہ: "ہماری ماں نے رحلت کی" اور یہ سن کر وہ سر جسے ابن عبدود کی تلوار کا زخم نہ جھکا سکتا جھکتا۔ جہاں تک کہ زمین اسے سنبھالتی۔!

ماں کی وداعی زیارت

اگرچہ ماں کی محبت آلود آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور تسکین دہ الفاظ معدوم ہو گئے تھے تاہم اب تک بچے ماں کو دیکھ رہے تھے لیکن وداعی زیارت کا وقت قریب آیا جس کے بعد حضرت فاطمہؑ زہرا کا روئے مبارک چادر سے چھپا دیا جاتا۔ کون اس بے تصنع اور بھولے جوشِ گریہ کا نقشہ کھینچ سکتا ہے۔ جس میں یہ بچے مشغول تھے۔ جن میں کوئی سینہ اور سرد آغوش پر لوٹ رہا تھا اور کوئی ہاتھ پاؤں اور پیشانی کو چوم رہا تھا۔ درد انگیز چیخ تھی۔ اور اس میں یہ الفاظ سمجھ میں آتے تھے کہ: "اے ماں جب آپ ہمارے جد بزرگوار کی خدمت میں پہنچیں تو ہماری جانب سے سلام پہنچائیے گا"۔ جناب امیرؑ زیادہ دیر تک اس روح فرسا نظارہ کی تاب نہ لا سکے۔ بڑھے اور بغیر اس بے رحمی کے چارہ نہ ہوا کہ چھوٹے چھوٹے رونے والوں کو لاش سے ہٹاتے کہ غش نہ کھا جائیں!۔

کبھی کا مستقبل حال ہو گیا

ہم یہ فقرہ کسی موقع پر لکھ چکے ہیں کہ: "جب تک فاطمہؑ ان (علیؑ) کے پہلو میں ہیں ہم مجبور نہ کریں گے"۔ اب اس کے بعد جناب امیرؑ مجبور کیے گئے ہوں یا نہ کیے گئے ہوں کم سے کم ان کا موقع اس درجہ کمزور تھا کہ مجبور کیے جا سکتے۔ ظاہر ہے کہ موقع کی یہ کمزوری اس وجہ سے تھی کہ دختر رسولؐ کی قوی الاثر ذات اب نہ تھی۔

جناب امیرؑ کی روش اور حسنینؑ کا مطالعہ

اس غم کے متعلق جناب امیرؑ کے خیالات اور مؤرخین کے اشارہ جو مناسب موقع ملتے ہیں لکھے گئے۔ حالت یہ تھی کہ جناب امیرؑ گوشہ نشین تھے اور کسی سے ملاقات نہ کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ حسینؑ نے موقع کی روش کا احساس اس سے زیادہ کبھی نہ کیا ہوگا۔ اس لیے کہ بچے تو سادگی، صاف دلی، محبت اور سیدھی سیدھی باتیں جانتے ہیں۔ کشیدگی، دو رنگی، قلب و زبان کی ناموافقت کیا جانیں یا کیسے سمجھ جائیں کہ دنیا میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس وقت تک سلام فروش ہیں جب تک انھیں امید اور توقع ہے ورنہ ان سے ..... زیادہ تکلیف دہ علیحدہ کوئی نہیں ہے۔ وہ کیسے سمجھتے کہ کبھی کے جھکنے والے اس وقت کیوں آنکھیں چراتے ہیں اور اپنے چہرہ بچاتے ہیں اور عجب نہیں کہ اب گستاخانہ اور پر توہین انداز اختیار کرتے ہوں۔ بچے انھیں شناسا لہجہ میں پکارتے ہوں اور وہ منہ بنا کر ہٹ جاتے ہوں۔ اس کے بعد کا زمانہ بظاہر خلافت کی طرف سے جناب امیرؑ کے لیے نزاعی نہ تھا بلکہ ایک متوقفانہ حالت تھی۔ خلافت اپنے کو اپنی جگہ اپنے نقطہ نگاہ سے مضبوط کر رہی تھی۔ یہ استحکام اگرچہ جناب امیرؑ کے موقع کو اس معنی میں کمزور کر رہا تھا کہ ان کے پاس کوئی ویسی چاشنی نہ تھی جیسی خلافت کے پاس لوگوں کی دلچسپی کے لیے مہیا ہو سکتی تھی۔ اور جناب امیرؑ متاسف ہو سکتے تھے۔ جیسا کہ ہوئے کہ قوم اپنے خصائص کا پوست اتار کر آہستہ آہستہ ایک لباس پہن رہی ہے جس سے کچھ زمانہ کے بعد پہچانے نہ جا سکی لیکن اس لحاظ سے کہ اس وقت وہ قوم کی درستگی اور حفظ مسائل کے ذمہ دار نہ تھے۔ انھیں یہ

ذاتی تاسف کے دخل کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ ان کی یہ بڑی خاموشی کبھی کبھی اس طرح ٹوٹتی تھی کہ وہ بعض مواقع پر اپنے کو ایسے امور اتک کے لیے حکومت کو قرض دیدیتے تھے جہاں وہ سمجھتے تھے کہ ایسا کرنا ہمارے خیال اور دین کی روح کے منافی نہیں ہے بلکہ نظام قومی کے لیے مفید ہے۔ وہ ناموافقت ظاہر کرتے تھے جہاں انھیں ایسا کرنا مستحسن معلوم ہوتا تھا۔ مثلاً قتل مانعین زکوٰۃ جناب امیرؑ کی یہ روش حسنینؑ کے مطالعہ بغیر نہ گزر سکتی تھی۔ انھیں انفرادی رائے کے وثوق، اپنے وقار کے اعتبار اور حقیقی ادب اور اطاعت کا راز، سمجھ میں آتا تھا۔ وہ اپنے پدر بزرگوار کے طرزِ عمل کو دیکھتے تھے اور چونکہ ان کا موقع ایسا نہ تھا کہ وہ متضاد اثر سے متاثر ہوتے۔ جناب امیرؑ کی یہ روش ہر خیال، ہر ادا حسنینؑ کی جزوِ عادت ہوتی جاتی تھی۔

بچوں کی حیرت مشہور اور تجربہ کی عام چیز ہے۔ یہ سن کر کہ لشکر روانہ ہو رہے ہیں۔ وہ دیکھتے ہوں گے اور آکر پوچھتے ہوں گے کہ یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں اور آپ کیوں نہیں جاتے۔ اور اکثر جواب پاتے ہوں گے کہ یہ لشکر ان سے جنگ کے لیے جاتا ہے جو ہمارے حامی حقوق ہیں اور صاحب اختیار لوگوں کی اطاعت اور جیب گرم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ فرماتے ہوں گے کہ ہم اس لیے نہیں جاتے کہ اپنے ہم خیالوں سے لڑنا کیسا اور حکومت ایسے موقع پر ہمیں فوج کیوں دینے لگی جس سے اس کا موقع مخدوش ہو جائے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ حسنینؑ نے یہ سوال کیا ہوگا یا نہیں کہ پھر آپ مانعین زکوٰۃ کی مدد کیجیے اور اس وقت بجز اس کے اور کیا جواب ملا ہوگا کہ ہم حق الوسع امت رسولؐ کے قتال میں شریک نہیں ہونا چاہتے۔ اس طرح زمانہ گزرا ہوگا۔ مال اور قیدیوں کا آنا مدینہ میں مشہور ہوا ہوگا اور حسنینؑ ان گرفتاروں کو رحم اور ہمدردی کی نگاہ سے دیکھتے ہوں گے جو خلافت کے تسلیم نہ کرنے اور اہل بیت رسولؐ کی پیروی کے ادعا میں گرفتار ہوئے ہوں گے۔

عناصر جو حسنینؑ کے ہوش کو مدد دیتے ہیں

یہ سچ ہے کہ اب تک حسنینؑ بہت کم سن تھے اور ہم اس ادعاء صریح کا موقع نہیں دیکھتے جس سے یہ کہہ سکیں کہ ان تمام واقعات کے پہلو کے متعلق حسنینؑ استنباط اور استخراج کی پوری استعداد رکھتے تھے۔ لیکن یہ بغیر کہے نہیں رہ سکتے کہ آٹھواں برس ایسا بھی نہ تھا جس کے استثنا کے اعتبار سے یہ کہنے کی گنجائش ہو کہ واقعات کا نظارہ کسی طرح نفس کا تابع تھا بلکہ کانوں اور آنکھوں جبکہ حسنینؑ نے جس فضا میں پرورش پائی تھی وہ اس درجہ ہوش پرور تھی جس سے یہ امید کی جا سکتی کہ جو کچھ دیکھتے تھے وہ سالم حیثیت سے ان کے حافظہ میں محفوظ ہوتا جاتا تھا اور ان سے جو کچھ نتیجہ نکالتے تھے اس کا طول و عرض کتنا ہی کم کیوں نہ ہو لیکن وہ صحیح ہوتا تھا۔ اس کے لیے یہ باتیں معین تھیں۔ معائنہ طفلانہ حیرت کا استفہام اور جناب امیرؑ کی موجودگی۔ یعنی اگر حسنینؑ نے واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جناب امیر سے سوال نہ کیا تو کم سے کم اصل واقعہ یاد رہا اور اگر سوال کیا تو واقعہ کے اسی قدر نتیجہ یا ممکنہ پیش کے سمجھنے میں مدد ملی جس قدر تشریح جناب امیرؑ نے مناسب سمجھی۔

تاریخ کی خاموشی

یہ امورات مورخین کے صحیح استنباط میں بہ سوی ثبوت کی طرح معین ہوتے اگر بچوں کے سوالات موجود ہوتے۔ یا اس کے متعلق جناب امیرؑ کے جواب ملتے۔ اس سے حسنینؑ کی اس وقت کی روشِ خیال اور اس کے درجہ کے سمجھنے میں مدد ملتی۔ لیکن ظاہر ہے کہ رسولؐ کے بعد حسنینؑ جو واقعات دیکھ رہے تھے اور اس کے متعلق فطرتاً ان کے جو سوالات یا جواب ہو سکتے تھے وہ ایسے نہ تھے جو عام موقع پر ہوتے یا جناب امیرؑ اسے ہر ایک سے کہتے پھرتے۔ اور چونکہ زمانہ ایسا تھا جس میں اہل بیت بہت کم لوگوں پر اپنے راز کے متعلق اعتبار

کر سکتے تھے اس لیے یہ امید کرنا کہ اور لوگوں سے کیوں معلوم نہ ہوا عبث ہے۔

حسینؑ کے نویں برس خلافت کا دوسرا دور

اس طرح یہ زمانہ گزرا اور حسینؑ نو برس کے ہوئے۔ انھیں معلوم ہوا کہ مرکز خلافت بدلا۔ غالباً ان واقعات کی بنا پر جو حسینؑ کو معلوم ہوں یا جن کی دھندلی یاد باقی ہو حسینؑ کو بھی یہ امید ہو کہ ہمارے پدر بزرگوار نانا کی امت کے عنان گیر ہوں اور اس خبر کے مشہور ہونے کے ساتھ کہ کوئی دوسرا حاکم ہوا، جناب امیرؑ اور بنی ہاشم کے بشروں سے حسینؑ کو اپنے موقع کی مایوسی ظاہر ہوئی ہو۔

اس دوسرے دور نے بھی جناب امیرؑ کی متوکلانہ حالت میں کوئی زیادہ نازک موقع نہ پیدا کیا۔ اگرچہ اس وقت کے مرکز خلافت کی گزشتہ گرمی طبیعت سے اس کا خوف ہونا ممکن تھا بلکہ اس کے برخلاف اس لحاظ سے کہ امورات ملکی اور انتظامی کی اہمیت بڑھتی جاتی تھی خلافت کو نازک ملی موقع پہ جناب امیرؑ کی صلاح پر عمل کیے بغیر چارہ نہ ہوا۔ خلافت کے موقع کے اعتبار سے جناب امیرؑ کا ایثار ان کے فنائی القوم ہونے کی بہترین دلیل ہے، اور فرقِ اسلامی کے لیے ہمیشہ کی ایک نصیحت ہے کہ کہاں وہ باوجود اختلاف کے دینی اور ملی موقع پر اپنے کو متحد دکھا سکتے ہیں اور مل کر کام کر سکتے ہیں۔

ابن عمر کا ایک فقرہ

اس زمانہ کے واقعات میں اس خیال کے نشوونما کا ثبوت ملا کہ وہ مساوات جو اسلام نے سکھائی تھی خاندان رسالت پر اس کے استعمال کا دعا ہوتا۔ اگرچہ دوسرے کے مقابلہ میں اس اصول کی کوئی باز پرس نہ کی جاتی یہ حالت خلیفہ زادے سے ظاہر ہوئی اور غالباً انھیں سے اس لیے ظاہر ہوئی کہ وہ اپنے باپ کو خلیفہ دیکھتے تھے اور تقسیم غنیمت کے وقت کہہ رہے تھے کہ: "حسنؑ وحسینؑ دو لڑکے تھے جو مدینہ کی گلیوں میں کھیلتے پھرتے تھے"۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں مساوات کی مخالفت کر رہا ہوں، بلکہ مجھے عادلانہ مساوات کے نہ برتے جانے کی شکایت ہے کہ کیوں حضرت عائشہ کے بڑے وظیفے اور ہر پہلو سے پر اعتراض نہیں ہوا۔ ہاں میں یہ بھی کہہ رہا ہوں کہ مساوات پسندی کے معنی احسان فراموشی نہیں ہے۔ اور سچ پوچھو تو میرے نزدیک یہ اور مانع مساوات کا موقع تھا نہ قرابت احسان شناسی کا۔ بلکہ اس موقع کی روح یہ ہے کہ خاندان رسالت کے ساتھ کوئی کھوٹ آنکھ سے دیکھنے کی چیز ہوتی اور اعتراض کیا جاتا۔ یہ میرے قیاس کے باہر ہے کہ حسینؑ نے اسے محسوس نہ کیا ہو۔

حسینؑ کا خلیفہ ثانی سے منبر پر خطاب قبل بلوغ تھا

کس سنہ اور موقع پر یا کس سن میں حسینؑ نے خلیفہ دوم کو مخاطب کیا جس وقت وہ منبر پہ تھے۔ نہیں معلوم۔ میں اس روایت میں علامہ سیوطی کے اجتہاد کی بنا پر آگے بڑھتا ہوں۔ اس کے سمجھنے کے لیے موقع اور الفاظ کی بو کے علاوہ اور کسی چیز سے مدد نہیں مل سکتی۔ الفاظ کہتے ہیں کہ وہ واعظ کو پہچانتے ہیں۔ منبر کو پہچانتے ہیں۔ اپنے باپ کے منصب اور حقوق سے واقف ہو گئے ہیں۔ کون جانے کہ حسینؑ نے کتنے دیر سنا۔ سننے کے بعد انھیں الٹی میٹم دینے میں کتنی دیر لگی اور کہنے یا نہ کہنے کا تصفیہ ارادہ کی کس قدر جنگ کے بعد ہوا۔ لہجہ اور الفاظ کہتے ہیں کہ حسینؑ کو اپنے الفاظ کے نتیجہ کا ملکی احساس نہ تھا۔ لیکن اگر مجھے حسینؑ کی اس وقت کی حیات سے تصفیہ کرنا ہو تو کہوں گا کہ ایسے واقعات حسینؑ کی کمی ہوشی نہ بے ہوشی میں گزرے تھے جن سے امید کی جاتی کہ وہ جانتے ہوں اور

باوجود اس کے ان کا جوشِ بیان کے اس وقت کے جذبات سے بڑھ گیا ہو۔ یہ موقع بھی تصفیہ میں آسانی پیدا کرتا اگر یہ معلوم ہوتا کہ واقعات کا بحث کیا تھا اور تقریر کے کس خاص موقع پر حسینؑ سے اُٹھ کے بغیر نہ رہا گیا لیکن مورخین نے واقعہ کی اس مفید کڑی کو کھو دیا۔ غالباً اس لیے کہ حسینؑ کی طفلانہ جھلاہٹ اور ابن الخطاب کی بزرگانہ بردباری کے علاوہ اور کسی پہلو کا دکھانا ان کے نزدیک غیر مفید تھا۔ حکومت کا یہ سوال توجہ کے قابل ہے کہ: "یہ تمھیں کس نے سکھایا ہے؟" ۔ جو کچھ بھی ہو الفاظ آمدِ شباب کی بو دے رہے ہیں اور باوجودیکہ سرزمین عرب خطِ استوا کے قریب ہے، جہاں معتدل یا سرد ملکوں سے بہ نسبت جلد بلوغ ہوتا ہے، میں گیارہ یا بارہ برس سے زیادہ عمر کا تصفیہ نہیں کرسکتا۔

سن کے سمجھنے میں ترتیبِ دیوانؓ کے واقعہ سے مدد

عمر کا یہ تصفیہ اس لحاظ سے بھی ہے کہ ترتیب دیوان کا قصہ ۲۰ھ میں بتایا گیا ہے۔ جس کے اعتبار سے حسینؑ اس وقت ساڑھے گیارہ برس کے تھے۔ اور چونکہ خلیفہ نے حسینؑ کے وظیفہ میں لحاظ کیا تھا طبعی لحاظ یہ چاہتا ہے کہ حسینؑ اس کے بعد رد کا یہ جائزہ نہ رکھتے۔ لیکن میرا یہ قطعی تصفیہ نہیں ہے۔ حالت اس کے بالعکس بھی ہوسکتی تھی۔ اس لیے کہ ترتیب دیوان میں حسینؑ کا حصہ کوئی اس کی رشوت نہ تھی کہ وہ کچھ کہہ نہ سکتے۔ لیکن اگر طبعی لحاظ حسینؑ کے آئندہ خاموشی کا باعث ہوسکتا تھا تو میرے خیال میں یہ روایت بھی قصہ منبر کے بعد کی ہے کہ: "میرے سر کے بال تمھارے ہی اگائے ہوئے ہیں" ۔ لیکن ابھی سیاسی نقطۂ نگاہ بھی ہے جو اس کا مؤید ہے کہ قصہ منبر ترتیب دیوان اور متذکرہ بالا روایت کے پہلے کا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ:

خلیفہ کی خاموشی الفاظ کے بے پردہ سیاسی موقع سے

اگرچہ حسینؑ بہت کم سن تھے اور انھیں نہ خود کوئی اختیار تھا نہ ان کے پدر بزرگوار کا ایسا موقع تھا کہ لوگ خوشامد میں ساتھ دیتے تاہم ایک کم سن بچہ کا جو رسولؐ کا نواسہ بھی ہو بھری محفل میں یہ کڑوا سچ فقرے سے نکالنا کہ: "میرے باپ کے منبر سے اترو"۔ ایک ایسی بڑی حرکت قلوب میں پیدا کرسکتا تھا جو خلافت کے مفید نہ ہوتی۔ خلافت کی طرف سے کوئی چشم نمائی نامقبولیت کی محرک ہوتی۔ کیونکہ کوئی دلیل حسینؑ کے قول کے رد میں نہ لائی جاسکتی۔ اس لیے بجز اس کے کوئی مصلحت نہ تھی کہ ہنستے ہوئے چہرہ سے انصاف پسندانہ اقرار کیا جاتا کہ: "ہاں تمھارے باپ کا منبر ہے"۔ جس سے لوگوں میں تردید کے لیے مستعد ہوجانے کی حرکت نہ ہوتی، بلکہ خلافت کی انصاف پسندی انھیں اپنی جگہ رکھتی۔ اور چونکہ اس فقرہ نے یہ سمجھا دیا تھا کہ یہ بچہ کس طرح کا بے خوف صاف گو ہے اس لیے ضرورت ہوئی کہ اس کی دلجوئی اور خاموشی کے لیے ہمیشہ توجہ اور لحاظ سے کام لیا جائے۔ جس سے لوگوں میں مقبولیت بھی پیدا ہوتی جائے، اور کبھی انھیں حقیقت امر کا بے نقاب احساس نہ ہو۔

حسینؑ کے الفاظ اور جنابِ امیرؑ

حسینؑ کے اس کہنے سے جناب امیرؑ کا موقع نازک ہو گیا تھا۔ خیالات اور الفاظ بے لگام ہوجاسکتے تھے۔ اس لیے کہ سننے والوں میں ہر شخص خلیفہ کا ایسا مخلص بردہ تھا نہ یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ہر شخص حسینؑ کا ساتھ دیتا۔ وہ کیسا ہی سچ کیوں نہ کہتے ہوتے بلکہ کم ہی سہی لیکن حکومت کے ساتھی بے بجے ہوئے حمایت میں اپنی آواز بلند کرسکتے تھے۔ موقع کی

جبلّی لطفی کو جناب امیرؑ کی چشم نمائی نے دفع کیا ہوگا، اور شاید اس کے بعد حسینؑ کو اس کی نصیحت کی گئی ہو کہ اگرچہ کچی بات کہنا تعریف کا مستحق ہے لیکن ایسا بھی موقع ہوتا ہے کہ قطعاً خاموشی قرینِ مصلحت ہوتی ہے اور پھر اس کے بعد حسینؑ کی بے تکلف صاف گوئی پر انھیں پیار بھی کرلیا ہو۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ملکہ بنِ معاویہ کی اس تقریر پر کہ حسینؑ نے مجھ سے بیعت کی حسینؑ کا خاموش رہنا اس وقت کی تعلیم سے متاثر تھا یا نہ تھا۔

حسینؑ اور شہر بانو

زمانہ گزرتا گیا، یہاں تک کہ حسینؑ کی عمر کے اس مشہور حصہ تک پہنچا جس میں اتفاقات نے انھیں اور یزدجرد کی لڑکی کو یکجا کیا۔ تعجب خیز موقع اور حیرت انگیز پسند کا حسنِ اتفاق تھا۔ شہربانو خاندانِ کسریٰ کی یادگار نہ ہوتی اگر بنی ہاشم کے علاوہ کسی کو چنتی۔ اس وقت اسیر سہی، لیکن اسیری نے شاہانہ پسند میں فرق نہ کیا تھا۔ بلند نظری اسیر نہ ہوئی تھی۔ مغرور آن دار دل سینہ میں تھا۔ اور نگاہ میں وہ ملکہ تھا جو بہترین شے کے علاوہ کسی پر ٹھہرتی نہ تھی۔ یہ اِستعداد دوسرے میں مقابل خصوصیت کا اِمتیاز اور اِنتخاب کر سکتی تھی۔ بلند شاندار بشرے کا پہچاننا جس پر شرافت اور نجابت کی تحریریں ہوں چھپ جانے کی چیز نہیں ہیں، ان کے مٹنے کے لیے صدیوں کی ظلم، افلاس اور لازمی پستی میں رہنے اور یہاں تک ذلیل ہو جانے کی ضرورت ہے کہ اسے طبعاً قبول ہی کرلے یہاں تک کہ ذلت کو ذلت نہ سمجھے کے دن نمونے تھے کہ شہربانو ملکہ فارس نہ رہی تھی اور کچے دن ہونے تھے کہ حسینؑ شاہزادے تھے۔

شہربانو کا دربار میں داخلہ

موقع کا خیال کرو کہ ایک قوم فتح کی خوشخبری اور مفتوحہ اسباب کی نادر چیزیں دیکھنے کی مشتاق ہے جن میں مغرور کسریٰ کی ایک شاہزادی بھی ہے۔ داخل ہوتی ہے۔ اس کی نگاہیں مجبور ہیں کہ موجودہ منظر دیکھیں۔ شاہانہ نامرعوبیت اور ناشکستہ تحمّل سے مجمع کو دیکھتی ہے لیکن فطرت نے اس کے ساتھ اتنی نرمی اور حسن کی لطافت عطا کی ہے۔ جسے زیورات اور لباس نے اور زیادہ دل کش بنایا ہے۔ اور ان سب کے باوجود وہ موقع بھی عین حقیقت ہے جس سے مایوسی اور دل شکستگی کے نقش کا چہرہ پر نہ ہونا ممکن نہ تھا۔ شہربانو کے داخل ہوتے ہی مجمع میں ایک قلبی حرکت کا ہونا فطری تھا لیکن اس عبرت خیز منظر سے متاثر ہونا بھی ویسا ہی فطری تھا۔ اس نے کچھ کو خاموش کردیا ہوگا۔ کچھ نے اپنے اِفتخار کے خوامی جوشش کو روکا ہوگا اور کچھ عملی ہمدردی کے اِظہار پر آمادہ ہوگئے ہوں گے۔ ہم نہیں جانتے کہ کسی کی ہمدردی کی لہریں اور قیافہ اس وقت ان جذبات کا اس وقت سے مظہر تھا یا نہ تھا جو شہربانو کو متوجہ کر سکتے اور وہ اس کی گرفت کرتیں۔ ہم نہیں جانتے کہ ہاشم بن عتبہ ہوں یا احنف بن قیس، انھوں نے ان شاہی اسرائے اہلِ بیت نبوت کے حسنؑ صفات اور نام کا تعارف کرایا یا نہیں، جو اس وقت مدد دیتا۔ لیکن وقت آرہا تھا کہ دماغی حرکات کا مسئلہ حل ہوتا اور آئندہ اشارے اس کی شرح ہوتے۔

خلیفہ کا حکم اور شہربانو

وہ مہلک حکم صادر ہوا جس سے دربار کے کسی خادم کو یہ آزادی حاصل ہوئی کہ وہ شہربانو کے جسم سے آخری علامات شاہی کو دُور کردیتا۔ اور بھرا مجمع اسے دیکھتا۔ شہربانو کی گردن جھکی لیکن تعمیلِ حکم کرنے والے کو قریب دیکھ کر پھر اٹھی اور بلند ہوئی۔ شریفانہ آن عود کر آئی اور اپنے گرفتار ہاتھوں کی کمزور قوت یا کمزور ہاتھوں کی گرفتار قوت سے سینہ پر "دو ہتھڑ" مارا۔ ایران کی شرافت یہ آخری لڑائی لڑ رہی تھی۔ کسی شریف اور شجاعت سے متاثر دل کے لیے اس سے زیادہ اندوہناک

منظر کمیں نہ تھا لیکن افسوس ہے موقع کی تحکمانہ برہمی اور اقتدار کے عدم اعتدال پر جس نے شریف قیدی کے حس کا احساس نہ کیا۔ اور " عمر رضی اللہ عنہ غیظ و غضب میں آنے اور لوگ اس ملکہ مکرمہ پر تازیانہ بلند کیے ہوئے منتظر حکم کے تھے اور وہ روتی تھی "۔

اندوہناک خاموشی اور جناب امیرؑ کی صدا

اس سناٹے اور قیدی کی ہچکی کے کسی وقفہ میں ایک آواز بلند ہوئی جو کہہ رہی تھی کہ ٹھہرو! " غصہ نہ کرو"۔ لوگ مخاطب ہوئے اور ہر ایک کے دل سے تسکین کی ٹھنڈی سانس نکلی۔ جب نقیب حکمت سے رسولؐ کی یہ حدیث سنی کہ: " جو عزیز و رئیس قوم کہ ذلیل و خوار ہو جائے اور جو غنی و تونگر کسی قوم کا محتاج و نادار ہو جائے تو ان پر رحم کرو"۔ ہم نہیں جانتے کہ بھولے ہوئے رحمۃ للعالمینؐ کے صدائے بازگشت اور موقع کی افسردگی نے "رحم" کے لفظ کو یاد دلا کر کتنوں کو چشم پر آب کر دیا ہوگا۔ لیکن ہم سوچتے ہیں کہ شہربانو کے لیے اشہد ان محمد ارسول اللہ کہنے کا دوسرا وقت نہیں ہو سکتا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ملا۔ ہوش آگیا اور شہربانو نے جناب امیرؑ کو دیکھا۔ اب مخصوص توجہ کے بعد اس وقت کے جذبات کا صاف پڑھ لینا آسان سے بھی زیادہ سہل تھا۔ پہلی نظر کے بعد اپنے شرافت اور عزت کے وکیل کو پھر دیکھنا استغاثہ تھا۔

دوسرا رنگ

جناب امیرؑ کی تقریر سننے مجمع کا اب رنگ دیکھنے اور شہربانو پر نگاہ جانے میں جس قدر عرصہ ہوا ہو لیکن خلافت کی نگاہ اب موقع کو علیؑ کی تقریر سے متاثر ہو کر دیکھ رہی تھی، اور اب یہ تماشہ دیکھا کہ فارس کی شاہزادی شاہِ کونین کے نواسہ کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس فراست ہے جس کے معنی سمجھنے میں کوئی غور کی مشقت نہ ہو۔ خلیفہ بھی اس کے معنی "التفات" ہی سمجھے۔ جس وقت شہربانو کی نگاہ نے اس سبزہ آغاز کو دیکھا، وہی وقت ان کی حقیقی اسیری کا تھا۔ اس لیے کہ "لوگوں میں از روئے صباحت و وجاہت کے حسینؑ سے کوئی بہتر نہ تھا"۔ ایک کھلتا ہوا پھول، اپنی فطری تازگی اور اپنے خاندانی خصوصیات کی روشن تحریروں کے ساتھ نرمی سے اپنی اصل کے سایہ میں اگا ہوا تھا۔ سن کی بے خبری شباب کی لطافت اور آتی ہوئی جوانی کی گوارا تختی کے ساتھ غزالانہ حیرت نے شہربانو سے کہا کہ ہمیں دیکھو اور شریفانہ بلند بشرہ کی ہمدردی نے شاہزادی کو اسیری کا آزادانہ جوش دلایا۔ وہ کچھ دیر کے لیے بھول گئی کہ ہم کہاں ہیں۔ کھوئی ہوئی چیز مل گئی تھی۔ لبوں میں حرکت نہ تھی۔ دل تھا جو کہہ رہا تھا کہ کیا ہمیں اپنی کنیزی میں قبول کرو گے؟۔ آنکھیں جذبات کی ترجمان تھیں۔ اور دل ہی تھا جو معنی خیز حرکت کا احساس کر رہا تھا۔

متذکرہ صدر طبعی حالت کے استنباط کے عناصر

یہ حسینؑ کی موجودگی کے ان کے قیافہ کی کھلی شان، انداز کی کوئی صورت اور الفاظ کی کسی بھی صدا کا ہمیں علم نہیں۔ اس لیے ہم کسی استنباط کی جرأت نہیں کرتے۔ ہم اب تک جو کچھ دیکھ رہے تھے وہ جناب امیرؑ کی موجودگی اور اظہار خیال، خلیفہ کے فقرات، شہربانو کے انداز، موقع کی مناسبت اور اس کی فطری شان تھی جن کی تاریخی حیثیت باب سیوم میں دکھائی گئی ہے۔

مصلحت حال

اب بغیر اس کے کہ موقع کی نزاکت اس کی سیاسی شان، جناب امیرؑ کے فقرات کی قوت اور شہربانو کے میلان وغیرہ پر زیادہ دور دوسری کی جائے یہ کہنا غلیفہ کے ساتھ انصاف ہوگا کہ انھوں نے چند لحہ پیشتر کی روش کو ایسے طرزِ عمل سے بدلا جو مقبولیت کا باعث ہوگا۔ اگر حاضر الوقت "مطمئن" "شکر گزار اور منت پذیر" ہو سکتے تھے تو جناب امیرؑ خوش تھے کہ کسریٰ کی لڑکی میری وکالت سے موجودہ اسیری سے اس درجہ بلند ہو سکی کہ اب میری بہو ہے۔ کیا اس وقت طاہرہ یاد آ گئی ہوں گی کہ ہوتیں تو اپنی بہو دیکھتیں؟۔ اور حسینؑ تو اب خلیفہ کا "ہدیہ اور تحفہ" لیے ہوئے جا رہے تھے

پس ماندہ اسباب شاہی

حضرت شہربانو کے محافظین نے اس شرط پر اپنے کو ہاشم کے حوالہ کیا تھا کہ انھیں امان دی جائے گی۔ اس شاہی گروہ کے پاس اب تک بہت سا سامان امارت اور خدام اور کنیزیں تھیں انصاف یہ چاہتا ہے کہ ان کے ساتھ اسیران جنگ کا برتاؤ نہ کیا جاتا اور ان کے جان مال اور عزت و آبرو دار الحرب کے اصول کے ماتحت نہ ہوتے۔ ان واقعات کے بنا پر ان کے داخلہ مدینہ میں جس قدر بے عنوانی ابتداءً پیش ہوئی، آخر میں ایسا ہونا ممکن تھا کہ یہ اپنی رائے اور موقع میں آزاد رکھے جاتے۔ اگرچہ اس کے لیے جناب امیرؑ کو وکالت کی ضرورت ہوتی۔ اور ایسا ہونے کے بعد کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ تمام اسباب جو شہربانو سے متعلق تھا وہ ان کے حوالہ نہ کیا جاتا۔ اس لیے کہ یہ غنیمت میں داخل نہ تھا۔ میں سوچتا ہوں کہ ایسا ہی ہوا۔

کنیزوں کی آزادی کے معنی

اور روضۃ الشہدا کی یہ روایت مبنی بہ واقعات ہے کہ حضرت شہربانو نے اپنی سو کنیزوں میں سے پچاس کنیزیں اپنی کنیزی کے دوسرے دن آزاد کر دیں۔ پچاس کنیزوں کی آزادی بجائے خود ایک شاہانہ بلند حوصلگی ہے۔ لیکن یہ محض شاہانہ بلند حوصلگی نہ تھی جس سے شہربانو نے ایسا کیا، بلکہ ایک "لڑکی" جو اپنے شاہانہ تزک و احتشام کے آئندہ خواب دیکھنے کی بھی امید نہیں کر سکتی اپنے بھلے دنوں کی خوش آئند علامات کو خود سے دور کر رہی ہے۔ وہ اپنے کو اپنی موجودہ حالت کے موافق بنا رہی ہے۔ ایسا کرنا قیاس کے اندر نہ تھا جب تک اس میں وہ کیفیت نہ پیدا ہوتی جسے "خوشی" اور اطمینان کہتے ہیں۔ اور اسلام کی تاریخ میں غلام یا کنیز کی آزادی اظہارِ شکر اور امتنان کے علاوہ کوئی معنی نہیں رکھتی۔ حضرت شہربانو کی پسند جس امید کی ابتدا تھی کنیزوں کی آزادی عملی مسرت کا ضمیمہ تھا۔ ان کی اسیری کے اتفاقات اور گزشتہ کی افسوس ناک یاد کے لحاظ سے ان کی موجودہ حالت کے علاوہ ان کی تسکین کا اس سے زیادہ کوئی حل نہیں ہو سکتا تھا۔ حسینؑ ان کی تسکین، حسینؑ ان کے وقار، اور حسینؑ ان کی راحت تھے۔ وہ پست نہ ہوئی تھیں، بلند ہوئی تھیں۔ کم مثالیں ہوں گی جس میں کسی افسوس ناک ابتدا کی ایسی انتہا ہو۔

خوشگوار تعلقات کی کافی مثال

اگرچہ ہمیں اس کے بعد حضرت شہربانو اور حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کے آپس کے تعلقات کی خبریں بہت کم معلوم ہیں لیکن شیریں کی روایت اس تصفیہ کے لیے بہت کافی ہے کہ یہ تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ یہ روایت بتاتی ہے کہ یہ لوگ کس درجہ ذکی الحس تھے کس درجہ ایک دوسرے کی خاطر کا لحاظ تھا اور کس درجہ حضرت شہربانو حسینؑ کی خاطر اور اطاعت کو اپنے خیال کی حد تک بجا لاتی تھیں۔

دنیاوی اور روحانی شہنشاہی کا فرزند

حضرت شہربانو کے واقعات ہمارے لیے اس وجہ سے اور توجہ کے قابل ہیں کہ انھیں کو یہ افتخار حاصل ہوا کہ

ان کے بطن سے ۳۸ھ میں امام چہارم کی ولادت ہوئی۔ وہ امام جن کے سراپا حیرت صبر نے حسینؑ کے صابرانہ فرض کو کربلا سے کوفہ، کوفہ سے دمشق اور دمشق سے مدینہ تک پورا کیا اور تمام عمر صبر اور برداشت کی زندہ تصویر بنے رہے۔ امام چہارم کو نہ صرف اپنے پدر بزرگوار کی صفات بلکہ اپنی مادر گرامی کی اسیری کے اتفاقات کا بھی ورثہ ملا۔

انیسواں برس

خلافت کے اس دور کے اختتام یعنی ذی الحجہ ۳۵ھ تک حسینؑ کا سن اقدس انیس برس کئی مہینہ کا تھا۔ اس میں جس قدر واقعات گزرے وہ نہ صرف حسینؑ کے ہوش کے زمانہ کے تھے بلکہ وہ اب ان تمام قوتوں کے مالک تھے جس سے کوئی واقعات کو دیکھتا اور اس سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ اور یہ زمانہ سرکار حسینؑ کا وہ زمانہ تھا جس میں انھیں گزرے ہوئے واقعات جو کچھ ہوش کے زمانہ کے تھے بتائے جاتے اور وہ موجودہ کے قابل سے ہر ایک کو سمجھ لیتے۔

دورِ ثانی کی خصوصیات اور حسینؑ

یہ زمانہ مُسلمانوں کی ملکی فتوحات اور اس کی لازمی مشغولیتوں کا وقت تھا۔ اگرچہ خود اس میں ایسے واقعات نہیں معلوم جس میں حسینؑ کی کوئی عملی شرکت ہو لیکن چونکہ یہ خبریں ہیں کہ جناب امیرؑ سے شام اور فارس کی فوجی صلاحیں، زمینوں کی پیمائش، محاصل کی تقرری، تعین حد، مناسب قابلیتوں کے آدمیوں کا انتخاب، مقدمات کا فیصلہ، متعلق ہو گیا تھا۔ ناممکن تھا کہ یہ امورات اور ان کے اصول حسینؑ کے لیے سبق نہ ہوتے۔ حسینؑ اس وقت کے جنگی شور میں شریک نہ تھے لیکن ناممکن تھا کہ فاتح عرب کی جنگی خصوصیات نے حسینؑ میں ایک سخت جاگتا ہوا جوش نہ پیدا کیا ہوتا۔
اور گو کہ زمانہ تھا جس میں خلافت کی کوئی توجہ ان کے ساتھ رعایت کی جاتی لیکن کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ جو اپنے باپ کا منبر پہچانتے تھا علاوہ منصب اور حقوق نہ پہچانتا ہوتا، یا یہ نہ جانتا کہ یہ میرے نانا کی امت ہے جو گمراہی ہے کہ وہ اس وقت ہماری نگرانی سے مستغنی ہے۔ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اور مُسلمانوں کی طرح فہرست میں ہوتا اور یہ نہ سوچتا کہ رسولؐ نے جو کچھ ہمارا حصہ قرار دیا تھا وہ اس سے الگ تھا جو اس وقت حکومت نے مناسب سمجھا ہے۔

حسینؑ کے ملاحظہ کی چیزیں فتوحات کے شور کے پیچھے تھیں

لیکن حسینؑ کے دیکھنے اور سمجھنے کے لیے اس سے بڑے مسائل تھے کہ انھیں کوئی فوجی عہدہ ملا یا نہیں یا وہ خمس کے حق دار سمجھے گئے یا نہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ بغیر حسینؑ کی توجہ کے نہیں گزرے۔ اس لیے کہ اس کے متعلق ان کے پدر بزرگوار کے خیالات ہیں کہ وہ کیا دیکھ رہے تھے۔ جیسی غرض فتوحات کے شور کے پیچھے ہے۔ قوم اپنے بعض خیالات اور احساسات سے اس قابل ہوئی تھی کہ بڑھ سکتی۔ بڑھنے کی یہ قابلیت اس تعلیم کا ورثہ تھا جو انھیں ہادی برحق سے ملا تھا۔ اس نے انھیں اس قدر ممالک نہیں دیے تھے جس قدر قومی صفات کے عناصر عطا کیے تھے۔ اب قوم ملک میں ڈوب گئی تھی اور یہ دیکھنے والا نہ تھا کہ تم صفات قومی کو زیادہ کرتے جاتے ہو یا کھوتے جاتے ہو۔ مدبرین زیادہ سے زیادہ مشوش ممالک کے سنبھالنے کی فکر میں تھے لیکن قومی ڈھانچہ؟ اس کا کوئی محافظ نہ تھا۔ اور جس جس طرح مشغولیتیں بڑھتی جاتی تھیں، اگرچہ صفات قومیت کی ضرورتیں بڑھتی جاتی تھیں لیکن سنئے اسباب اسے گھٹاتے جاتے تھے۔

حصولِ علم کے ذرائع

مجھے اس کا بھی لحاظ ہے کہ ممکن ہے کہ شباب نے باریک سیاسی مسائل میں الجھنا گوارا نہ کیا ہو، اور اس سے واقعات کا تمام تر گھنا اور ان کے نتائج اپنی کوشش سے نہ ہو، بلکہ صرف اسی قدر ہو جس قدر جناب امیرؑ کے اشاروں سے ممکن تھا یا جہاں تک دور دور سے نظر جا پڑی تھی لیکن بہت جلد زمانہ آنے والا تھا جو بڑی قوت سے تجربہ کرتا، اور اس وقت لوگوں کے واقعات گویا ہوئے بغیر نہ رہتے۔ اس وقت کے باریک نگاہ کے محتاج اسباب تھے تو اس وقت ظاہر نتائج تھے۔ اکثر مواقع کے متعلق حسینؑ کے خیالات کا موجود نہ ہونا کچھ تو اس وجہ سے ہو کہ کوئی ان کے ہر اشارے، الفاظ اور خیال کا ضبط کرنے والا نہ تھا، اور کچھ اگلے وقتوں کے اس اصول کی بنا پر کہ افسرِ خاندان کے ہوتے ہوئے ماتحت متعلقین معاملات میں ذمہ دار نہ سمجھے جاتے تھے۔ حسینؑ کا یہ موقع ان کی عمر کے چھیالیس برس تک رہا۔ لیکن اس عالمِ اسباب میں اپنے گرد و پیش کے واقعات کے جاننے کا ہمیشہ یہی ذریعہ نہ تھا کہ کوئی ہر امر میں دخیل بھی ہوتا رہے، بلکہ کچھ تو بزرگوں کی تعلیم، کچھ ان کی نگرانی کے اثر، کچھ ان کی پیروی، کچھ مستند بزرگواروں کے طرزِ عمل اور گرد و پیش کی فضا کی نوعیت، اور پھر اس کے بعد اپنی موجود قابلیتوں سے اس کا دیکھنا اور سننا تھا۔

میں اس پر کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا کہ آیا بزرگ کے سایہ میں رہنا زیادہ مفید ہے یا ہر امر کا خود فیصلہ کرنا، اور دخیل ہوتے رہنا۔ میرا تصفیہ ہے کہ وہ لوگ جنہیں فطرت نے یہ صحیح قابلیتیں عطا کی ہیں کہ وہ حتی الوسع خود پیش آنے والے واقعات کا تصفیہ کرتے رہیں انھیں کئی باتوں سے اپنے فیصلہ پر زیادہ اعتبار ہوتا ہے، اور ان میں رفتہ رفتہ ایک استعداد کا نشو ہوتا ہے جو آئندہ صحیح تصفیہ میں مدد دیتی ہے۔ لیکن بے چارہ انسان اپنے فخر کے وقتوں میں یہی کیوں نہ سوچے کہ اس کی سانس کے اشارہ پر زمانہ چل رہا ہے۔ لیکن اکثر وقت آتا ہے جس میں اسے ہوش آتا ہے کہ ہماری سانس تنگی میں مبتلا ہو سکتی ہے اور ہم سانس لینا چاہتے ہیں اور نہیں لے سکتے اور جس وقت ہم داہنا ہاتھ دیکھ رہے تھے لیکن یہ ہوش نہ تھا کہ بایاں ہاتھ بھی ہے۔ اس کا محدود ہوش اسے اس سے زیادہ گرا دیتا ہے جس قدر وہ خود میں مبتلا ہو سکا تھا۔ کتنی باتیں وہ خود سے سوچ سکے گا اور کہاں تک وہ گزشتہ کے تجربہ سے اپنے کو مستغنی سمجھے گا کہ آئندہ ہر قدم پر ٹھوکر نہ کھائے۔ ہمارے زمانہ کی مثالیں سمجھاتی ہیں کہ وہ جو پرانی تعلیم کے اثر کے باعث زمانہ کی روش سے واقف ہوتے وہ ان سے اچھے رہے جو زمانہ گزشتہ کی سہولت میں گرفتار رہے اور وہ ان سے بھی عقلی اعتدال کے دائرہ میں رہے جنھوں نے ہر قسم کے اثر سے خارج ہو کر ہر جگہ اپنے اجتہاد سے کام لینے کو بہتر سمجھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ابتدائی عمر کے بڑا حصہ تک مناسب اور محتاط تعلیم کے زیرِ اثر ہونا، اگرچہ اس میں کسی طرح کی آزادانہ جنبش نہ ہو آئندہ کے لیے آگے بڑھنے کا ایک مرکز حوالہ کرتا ہے جس کے بعد ہم ہر ہوا کے ساتھ اڑتے نہ پھریں اور خیالات اور ان کے اثر کے حدود سے واقف ہو جائیں۔ اس سے ہمارے کامل مختار انسان ہونے میں کوئی ضعف لاحق نہیں ہوتا۔ تو اگرچہ حسینؑ کی عمر کے بڑے حصہ تک ہمیں معلوم نہ ہو سکا ہو کہ حسینؑ کے خیالات کی رفتار کیا تھی۔ لیکن یہ معلوم ہے کہ ان کے آبائے طاہرینؑ کے خیالات اور عمل کیا تھے۔ اور اس فضا سے جو اثر حسینؑ کے خیالات اور عمل پر پڑ سکتا تھا وہ اس قدر اطمینان خیز ہے کہ اس کی موجودگی میں ہر موقع پر حسینؑ کے خیالات کا موجود نہ ہونا کوئی کمی نہیں ہے۔

ناناؐ کی یاد دلانے والی چیزوں کے ساتھ بے لحاظی اور حسینؑ

ان جیسی باتوں میں جس پر نظر کرنا تھا میرے خیال میں یہ واقعہ حسینؑ کے لیے کم افسوسناک نہ ہوگا جب انھیں معلوم ہوگا کہ میرے ناناؐ کا یادگار درخت کٹوا دیا گیا۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ہر وہ چیز جو ناناؐ کو یاد دلاتی حسینؑ کو عزیز ہوگی۔ اس کے علاوہ احادیث کے متعلق انھوں نے خلیفہ کا خیال سنا ہوگا اور بہت کم قرینہ ہے کہ انھوں نے اس مصلحت کو پسندیدگی سے دیکھا ہو، جسے خلیفہ نے ظاہر کیا تھا۔ انھیں کعبہ کے متعلق حضرت عمر کا خیال معلوم ہوا ہوگا اور پھر اپنے پدر بزرگوار کا جواب سنا ہوگا۔ اور یہ بھی ان سے چھپا نہ ہوگا کہ خلیفہ کعبہ کے مال کا کچھ مصرف چاہتے ہیں، جسے علیؑ مرتضیٰ نے اپنی حیثیت سے قائم رکھنے کی صلاح دی۔ اور حسینؑ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ خلیفہ نے کسی غرض سے کیوں نہ کہا ہو کہ: "اگر ہم تم کو اس چیز سے جس کو تم پہچانتے ہو اس شے کی طرف پھیریں جس کے تم منکر ہو تو تم کیا کرو گے"۔ اور ان کے پدر بزرگوار نے یہ قوت دار پر جوش اور صریح جواب دیا کہ: "اگر تو توبہ کرلے تو تیری توبہ قبول کریں گے"۔ اور اس سوال پر کہ: "اگر نہ مانیں؟" تو فرمایا کہ "گردن ماریں گے"۔ ظاہر ہے کہ اس کہنے کی جرأت اس وقت صرف مولانا امیر المومنینؑ میں تھی۔ وہ اپنے جواب کے وقت سوال کرنے والے کی قوت جانتے تھے اور وہ اپنے جواب اور مسلمانوں کی تائید کی بھی قوت جانتے تھے۔ لیکن یہ ایسی بات نہ تھی جسے اور مسلمان نہ سمجھے ہوتے، صرف وہ اخلاقی جرأت اور لوگوں میں نہ تھی جو سید العرب میں تھی۔ باپ کی طبیعت کی یہ جھلک بیٹے کے پسند کی چیز تھی اور وہ سوچ سکتے تھے کہ اگر ہم دوسرے کو ایسی غلط راہی سے روکنے کے لیے قتل کی دھمکی دے سکتے ہیں تو ہمیں بھی اس تصمیم کے لیے جان دینا ہوسکتا ہے۔

اور باوجود خلیفہ کی ان تمام شہریں توجہ کے جن کی مثالیں حسینؑ کے متعلق ملتی ہوں، ایسے خیالات ہمیشہ کی حد بندی کرنے کے لیے کافی تھے جو ابن عباس سے مکالمہ میں حضرت عمر سے ظاہر ہوئے۔ اس کے بعد قریش اور ان کے گزشتہ اور موجودہ سرگروہ کی روش سمجھنے میں یا یہ سمجھنے میں حسینؑ کی عمر کو دشواری نہ ہونا چاہیے کہ ہمارے ساتھ کہاں تک بے غرض اور حقوق شناسانہ رعایت ہے۔ اسی طرح کسی ہاشمی سے یہ امید کرنا کہ وہ بنی امیہ کی ان کارروائیوں کو بھول گیا جو اسلام کے انسداد اور ہادیؐ کی ایذا دہی کے متعلق ان سے سرزد ہوئیں، ان کے سیاسی اور قومی حس کو قبل از وقت مردہ تصور کرنا ہوگا۔ قومی حافظہ انفرادی حافظہ سے زیادہ دیرپا ہوا کرتا ہے۔ درآنحالیکہ متواتر ٹھیس نے زخم کو ہرا رکھا تھا اور نہ وہ حیرت خیز اتفاق ان سے پوشیدہ رہ سکتے تھے جس سے شام کا صوبہ بنی امیہ کی نوآبادی اور ایک خود مختار صوبہ کی حیثیت اختیار کرتا جاتا تھا یا جس حیثیت سے وہ رسولؐ کے بعد سے گزشتہ نظام میں دخیل دکھائی دیتے تھے

لوگ جنھیں بغیر پہچانے چارہ نہ تھا

اور جب بنی امیہ کے ایسے گروہ کی شرکت اور ان کا اقتدار حکومت نے گوارا کرلیا تھا تو ایسی ہی روش کے وہ عمال بھی اس دور کی فہرست میں کیوں دکھائی نہ دیتے جو آئندہ بنی ہاشم کے سخت ترین دشمن ثابت ہوئے۔ انھیں نہ صرف حسینؑ نے اس وقت دیکھا بلکہ اس کے بعد بھی اور پھر انھیں اپنے زمانہ اقتدار میں برسرجنگ پایا اور ان میں سے اکثر کو اپنے آخری زمانہ میں اپنے قتل پر اس طرح مستعد دیکھا کہ یا وہ اس پر ایک زمانہ سے مستعد تھے اور یا ان کے نزدیک کوئی ایسی

لحاظ کی بات نہ تھی۔ ان کی مثال اس گورکن کی تھی جو قبر کھودتے وقت گاتا ہے، یا اس جلاد کی ایسی تھی جو خوش خوش اپنے مکروہ کام میں اس لیے جلدی کرتا ہے کہ کچھ انعام کی امید رکھتی ہے۔

خلیفہ ثانی کا بنا کردہ اصولِ انتخاب اور حسینؑ

اس دور حکومت کا آخری تماشہ قریب آگیا جس نے خواہی نہ خواہی خلافت بنی امیہ کو سپرد کر دی۔ اس کا ذکر کیا گیا کہ بنی امیہ کی جماعت اور ان کے افراد جو معاملات میں غور کی قابلیت رکھتے تھے حصول اختیار کے سلسلے بے کسل کوششوں میں مصروف تھے۔ وہ اپنی جماعت کو تعلیم دیتے رہتے تھے اور ذمہ دار مدبرین اپنی مصلحت طے کر رہے تھے کہ کیسی حکمت کرنا ہوگا۔ انھیں اپنی آئندہ کامیابی اور طرز عمل کے درست کرنے میں خلیفہ کے انتخاب سے پوری مدد ملتی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حصول اختیار کے جزو اعظم کا تصفیہ ان کے موافق ہو چکا تھا۔ صرف وہ طریقہ اور موقع باقی تھا جس سے یہ بغیر کسی شورش کے حاکم دکھائی دینے لگیں۔ اس کے مقابل کہیں یہ تذکرہ نہیں ہے کہ بنی ہاشم مجموعاً یا منفرداً اپنے لیے کوئی کوشش کر رہے تھے۔ بلکہ اگر کچھ تذکرہ ہے تو صرف اس تصفیہ کا جو بنی ہاشم کے دو بزرگ یعنی عباس اور جناب امیرؑ نے طریقۂ انتخاب کو سن کر اپنی جگہ کیا تھا اور یہ حالت بجائے خود اس کا تصفیہ ہے کہ آئندہ اپنے موافق کوئی امید کرنا ان کے نزدیک بے سود تھا۔ اس سے حسینؑ کی روش سمجھ میں آجاتی ہے۔ بہت ممکن تھا کہ بنی ہاشم کے ابھرتے ہوئے نوجوان "امید" کے فریب و مغالطہ کو تیرہ ظاہر ہونے تک شوق سے دیکھ رہے ہوں۔ اور ایک مرتبہ امید کا پیدا ہو جانا اس خواب کی مادی تعبیر کا منتظر رکھتا ہو جو یہ دیکھتے ہوں۔ ان کی مجبول ہوئی قوتیں عود کر آئی ہوں۔ دل کا سینہ تنگی کرنے لگا ہو، اور رگیں گرم خون کے غیر معمولی سریع ہیجان سے پھٹی جاتی ہوں۔ ہو سکتا تھا کہ ان کا ایسا کوئی جوش مخدوش ہوتا لیکن علیؑ اور عباس کے سکون نے انھیں غیر متحرک رکھا اور یہ مشروطیت کے بیچ ایمانداری سے صورت معاملہ کو دیکھتے رہے۔ موقع کا علم اور تجربہ حسینؑ کے توجہ کی چیز تھی۔

دو آتشہ نظام

نتیجہ سامنے آیا۔ مجھے یقین ہے کہ بنی ہاشم کو اس وجہ سے اس کی پوری چوٹ نہ لگی ہوگی کہ وہ ایسے دو اور دو چار کی طرح جانتے تھے لیکن اب انھیں اپنا تلخ موقع اس وجہ سے اور زیادہ نازک معلوم ہوتا ہوگا کہ اب وہ صاحب اختیار ہیں جن کی مصلحت دو آتشہ ہو جانے کی وجہ سے یہ صورت اختیار کرے گی کہ ان کے ہوتے ہوئے ہم قطعاً نہ ہوں۔ پہلی حکومتیں محض سیاسی موقع کے لحاظ سے مشتبہ تھیں۔ اب نہ صرف سیاسی موقع ہے بلکہ گزشتہ عداوتوں کا پرجوش انتقام بھی ہے۔ آخری صورت بنی ہاشم کے لیے عثمان کے زمانہ میں الفاظ اور انداز کی دھمکیوں اور توہین سے بڑھ کر خون کی حد تک نہ پہنچی جس نے معاویہ کے زمانہ میں اس کی احتیاط کی وجہ سے زہر کا بھیس بدلا اور آخر میں احتیاط کو اختیار کی موجودگی میں کمزوری سمجھ کر تلوار کھنچی گئی۔ اس نے شورش پیدا کی اور پھر آئندہ کے صاحب اختیار لوگوں نے زہر کی مصلحت کی طرف عود کیا۔

ابوسفیان کی بے اختیار چیخ کا حسینؑ پر اثر

نئی حکومت شروع ہوئی۔ جب ایک شخص کے حاکم بننے کے قبل لوگ اس لیے اس کا ساتھ دے سکتے تھے کہ وہ ہمارے حقوق کا لحاظ کرے گا تو قیاس آسان ہے کہ اس کے بعد ان لوگوں کے انداز کس درجہ برداشت کے

باہر ہو گئے ہوں گے۔ مثال خلافت کے اعلان کے بعد ہی لی۔ اور تعجب خیز اتفاق یہ تھا کہ حسینؑ اس کی تلخی کو پہلے محسوس کرتے اور وہ بھی ابوسفیان کی زبان سے۔ اموی ابوسفیان کا جوش شاعرانہ حسن بیان اختیار کرتا ہے جو متمانہ تلخی کو اور بڑھا دیتا ہے۔ جب وہ حسینؑ کو بنی ہاشم کے مقبرہ میں لے جا کر مردوں کو آواز دیتا ہے۔ ابوسفیان رجز پڑھ رہا تھا۔ بنی امیہ کی فتح کے گیت گا رہا تھا اور مردوں پر طنز کر رہا تھا۔ بڑھاپے نے اسے تفاخر کی دیوانگی سے مستثنیٰ نہ کیا تھا۔ حسینؑ ابھی پورے بیس برس کے نہ ہوئے تھے۔ انھیں ساتھ لانا ایسی باتیں سنانا جو بنی امیہ کا عین خواب اور بنی ہاشم کے لیے ان کی روش کا لفظاً مفہوم تھا کہ وہ ملک کے لیے مقابلہ کرتے تھے۔ حسینؑ کے لیے چیلنج تھا۔ عجب نہیں ہے کہ اس نے ایک نوجوان کے خون میں اس درجہ جوش پیدا کر دیا ہو کہ اس نے اپنا توہین کرنے والے کے ان الفاظ کو اس کے زندگی کے وداعی الفاظ قرار دے دینے کی آمادگی کی ہو۔ خیریت ہوئی کہ نعمان بن بشیر موجود تھا اور اس نے نازک موقع کو دور رکھا۔ کیسے ہو سکتا تھا کہ ابوسفیان یہ سوچ کر نہ علیحدہ ہوتا کہ کل بنی ہاشم اس مقبرہ میں نہیں ہیں اور کیسے حسینؑ واپس ہو سکتے تھے بغیر اس کا خلیفہ وہ اندازہ کیے ہوئے کہ بنی امیہ اپنی عداوتوں کو نہ صرف نہیں بھولے ہیں بلکہ اب موقع نے انھیں ایذا رسانی پر مستعد کیا ہے دیا گیا لیکن ہم میں پہلی سی مقابلہ کی قوت نہیں ہے۔ لیکن موقع کی عبرتناک پیش بندی یہ ہے کہ آج اگر ابوسفیان حسینؑ سے یہ فقرات کہہ سکتا تھا تو دن آنے والے تھے کہ ابوسفیان کا پوتا حسینؑ کے سر مبارک سے قریب یہی الفاظ کہتا۔

حسینؑ کی سیاسی تعلیم

اب تک اگر یہ سوچا بھی جا سکتا ہو کہ گرد و پیش کے سیاسی مسائل حسینؑ کی خاص توجہ کے اندر نہ تھے تو ابوسفیان کی چی فقرات بجز اس بغیر اس کا پیچ و تاب پیدا کیے ہوئے نہ رہ سکتی تھی جو حسینؑ کو موجودہ مواقع کے دیکھنے کے لیے ہمہ تن ہوش نہ بنا دیتا۔ علم سیاست بادی النظر میں روکھا غیر ظاہر اور بے لطف ہے لیکن سلیم توجہ کے ہو جانے کے بعد یہ ویسا بے مزہ نہیں رہتا بلکہ مسئلہ کی وسعت کے لحاظ سے دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ عام اس سے کہ یہ توجہ نظریات سے بڑھ کر عملیات میں داخل ہونے کا موقع پائے یا نہ پائے۔ باہر وہ روش جو علم کے اندر عدم پسندیدگی سے تعلق رکھتی ہو جاتی ہے۔ مثالیں گزریں جو اس کا تصفیہ کر سکیں کہ حسینؑ بہت سریع الفہم اور ذکی الحس تھے اور ان مثالوں کی ناموجودگی بھی اس امر کے سمجھنے میں مانع نہ ہوتی کہ ان کا قاعدہ مسائل سیاسی سے دلچسپی لینے کی قابلیت رکھتا تھا یا نہ تھا۔ جب ان کے خاندان اور ان لوگوں کی کافی سے زیادہ مثالیں ہیں جن کی عقل اور عمل کی فضا حسینؑ کے گرد محیط تھی اور جب اس کی مثالیں نہیں ہیں کہ وہ اپنے خاندانی درجہ عقل سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ بلکہ اس کے واضح اشارے ہیں کہ وہ گزشتہ تجربہ سے پورے واقف تھے اور اسی طرح اس پر عمل کرتے تھے جو بچا ہوا عمل کہا جائے۔ یہ باتیں اس امر کے سمجھنے میں معین ہیں کہ حسینؑ کی فطری سیاسی تعلیم کی ابتدا بہترین لوازمات کے ساتھ ہوئی اور ان کا آئندہ بھی اس لیے خوش نصیب تھا کہ وہ ہمیشہ تجربہ کار نگاہ کے سایہ میں تھے جس نے قوم کی درستی اور اس کی ضروریات میں اس قدر حصہ لیا تھا جس قدر اس وقت تک ممکن تھا اس لیے یہ اندیشہ بھی نہ تھا کہ حسینؑ اپنے کسی غور اور نتیجہ میں کسی سے اصلاح کی امید نہ کر سکتے تھے۔ آگے وقت آنے والا ہے کہ حسینؑ اپنے پدر بزرگوار کے خالصاً سیاسی خطبات سنتے اور عملی شرکت کرتے۔ اس کے علاوہ حسینؑ کی سیاسی تعلیم کے دوسرے رفیق حسنؑ تھے جن کی سلیم الطبعی کی مثال دی جاتی ہے۔ ممکن نہ تھا کہ حسینؑ اپنے برادر بزرگوار کے تصفیہ کے اثر سے متاثر نہ ہوتے اور اس کی مثالیں ہیں کہ وہ ان کے آخر دم تک

متاثر رہے اور ان کے بعد بھی ان کے احکام کی بجا آوری سے اعراض نہیں کیا۔

ابن عوف سے علیؑ کے الفاظ اور حسینؑ

یہ الفاظ حسینؑ کی حد سماعت کے باہر نہ تھے جو جناب امیرؑ نے ابن عوف سے ان کی مُنصری کے وقت کہے تھے، یا جس سے عثمان کے انتخاب کے بعد مخاطب کیا تھا۔ اس میں عثمان کے منتخب کرنے کی غرض اور وجہ بتائی تھی۔ اس سے اپنے انتخاب کی وقعت اور مصلحت چھپی نہ رہ سکتی تھی نہ یہ غیر ظاہر تھا کہ ہم پر ایک جماعت مسلط ہے جو ہمارے لحاظ کو ہمیشہ دور ہٹانے کا خاص اہتمام کرتی رہتی ہے۔ لیکن حسینؑ نے اپنے پدر بزرگوار سے یہ بھی سنا تھا کہ: "میں تسلیم کرتا ہوں کہ جب تک امور مُسلمین سلامت رہیں اور اس کے ایام خلافت میں کھلم کھلا ظلم و جور نہ ہو گو مجھ پر ظلم و ستم ہوتے رہیں"۔ کون جانتا تھا کہ جناب امیرؑ کا اپنے موقع کے لحاظ سے یہ فرمانا آئندہ کے لیے حسینؑ کے عمل کرنے کا ایک اصول ہو جائے گا۔ کسے حق تھا کہ وہ حسینؑ سے زیادہ جناب امیرؑ کی مصلحت کا محافظ اور پیرو ہو سکتا۔

بنی امیہ کی بڑھتی ہوئی قوت اور بنی ہاشم

وہ تمام باتیں ہونے لگیں جنھوں نے ابن عفان کو داخلی اور خارجی نا مقبولیت میں مبتلا کیا۔ یقیناً بنی ہاشم بنی امیہ کی بڑھتی ہوئی قوت کو ٹھنڈے دل سے نہ دیکھ رہے ہوں گے اور ان کا خوف بڑھتا جاتا ہوگا۔ اس اموی جہانگیری سے یہ نتیجہ نکلتا کہ ہمارا اثر ضائع اور دور ہوتا جاتا ہے اور اس کی جگہ ہم سے ان لوگوں کی عداوت بڑھتی جاتی ہے جنھوں نے ہمیں بنی امیہ کی زبان سے سنا ہے۔ بنی ہاشم کے لیے کوئی غور طلب بات نہ تھی۔ اور یہ عمل ان تمام ممالک میں جاری تھا جو فتح ہوتے جاتے تھے اور جنھیں اسلام کی واقفیت اس وقت سے شروع ہوئی جب بنی ہاشم اور اہل بیت امورات اسلامی کی ذمہ دار نگرانی سے دست بردار کر دیے گئے تھے۔

دیکھنے کے علاوہ اور کیا کر سکتے تھے کہ کوئی شخص مستوجب سزا ہوتا لیکن بعض حیثیت کی رعایتیں نفاذ حکم شرع سے زیادہ مفید بھی جاتیں۔ دیکھتے کہ وہ لوگ امت رسولؐ کے عنانگیر ہیں جن کا کسی جماعت انسانی میں ہونا انگشت نمائی کے لیے کافی ہے۔ لیکن دم نہ مار سکتے۔ دیکھتے کہ خلافت ورزیاں ہیں اور اس پر طرہ یہ ہے کہ تحکم اور غرور کے علاوہ اور کسی دلیل نے اس کے اثر کو کم نہیں کیا ہے اور اس کے بعد یہ بھی دیکھتے کہ دُنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی غرض حیات بجز اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ اختیار کی کریہ ترین باتوں پر آمنا و صدقنا کے علاوہ کچھ کہنا نہ جانیں اور اس طرح نہ صرف اپنے کو ذلیل کرتے رہیں بلکہ ذلت اور کج روی کو آئندہ کے لیے قوم کا شعار قرار دیں۔ وہ سب کچھ ہیچ جو صاحب اختیار کرے اور وہ سب کچھ غلط جو بے اختیار سے سرزد ہو۔ کوئی نکتہ چینی وہ کیسی ہی ہیچ اور کیسی ہی کم اور غصہ سے کیوں نہ کی گئی ہو جو قوم کو متنبہ کرے۔ ان خوشامدیوں کے پُر حیرت اور دکھی دینے والی نفرت آلود نگاہ کی آماج اور کیسی ہی رکیک اور جماعت انسانی کے لیے مضر روش جو مرکز اقتدار سے سرزد ہوتی ہو تو تعریفوں سے زمین اور آسمان سر پر اٹھا لینے کی شایان قرار دی جاتی رہی۔

ہوتا رہا جو کچھ ہونا تھا یہاں تک کہ اس کی باری آئی کہ مصلحت کے اس پہلو پر قناعت نہ کی جاتی کہ اپنی وسعت دینے والی اور موافق چیزوں کو بلند کرتے جانا۔ اپنے ناموافق چیزوں کو چھپانا اور پستی کی طرف خود بخود دبانا ہے بلکہ اب اس کا بھی موقع دیکھا کہ اپنی چیزوں کو بلند کرنے کے ساتھ اپنے ناموافق چیزوں کو سختی سے دبانے کا بھی ویسا ہی اہتمام کیا جائے۔

کرتی خلافت جو کچھ چاہتی لیکن افسوسناک یہ ہے کہ وہ اسے اپنے احکام کی بے پرسش روش کے منافی سمجھنے لگی کہ کوئی عمار ابوذر یا ابن مسعود اپنے میں یہ جرأت پاتا کہ وہ سوال کرنے اور ملی حقوق کی حفاظت کا اپنے لفظوں میں ادعا پیدا کرتا اور وہ بے مہار غصہ سے مسلط کر دیا جاتا۔ کون سوچ سکتا ہے کہ حسینؑ اپنے نانا کے ان ممتاز خادموں کو ذلت و توہین میں مبتلا دیکھتے اور ان کے تمام خلصہ میں ایک سخت ہیجان نہ پیدا ہوتا۔ لیکن جو کچھ بھی ہوتا انھیں یہ دیکھنا تھا کہ ایسا بھی ممکن ہے کہ خلافت اگر خالد، مغیرہ اور ابن عمر کو رہا کر دے اس لیے کہ یہ لوگ خلافت کے موید تھے تو ان بوڑھوں کو وہ رسولؐ کے کیسے ہی معتمد رصحابی کیوں نہ ہوں کرخت باز پرس کا مستوجب قرار دیتے۔ کیونکہ یہ خالصتاً اصول اسلامی اور خلق اللہ کے موید تھے یہ مثالیں ایسی نہ تھیں کہ جو حسینؑ کے مستقبل روش پر بغیر گہرا نشان ڈالے گزر جاتیں۔

خلق اللہ کی بلند ہوتی ہوئی صدا اور حسینؑ

اور جب انھیں ان تمام باتوں کے دیکھے اور سمجھے بغیر چارہ نہ تھا جن کا نہ ہونا انھیں پسند ہوتا اسی دوران میں وہ خلق اللہ کی صدا کے مدارج دیکھتے جو کبھی پست، معتدل اور بلند ہوتی جاتی۔ کبھی منتشر اور ناقابل فہم رہتی لیکن رفتہ رفتہ مجمع محسوس اور پر عظمت ہو جاتی اور آخر میں اس کا پر اسرار استقلال انتہائی ہوگی سے کم نہ ہوتا۔ وہ سنتے کہ وفود آ رہے ہیں جو اصلاح کی استدعا کر رہے ہیں۔ وہ ان وفود کے جذبات برتاؤ، ان کے ممتاز افراد کے ساتھ نہ صرف اجزائے حکومت بلکہ مرکز حکومت کا سلوک دیکھتے اور سمجھتے کہ ظلم سیاسی ایک حالت پیدا کرتا ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اعتبار اور اطمینان دلانا صرف دفع الوقتی کا نام ہے۔ اور طے کرتے کہ نظام حکومت بہ لحاظ اسے گوارا نہیں کرتا کہ وہ عامہ ناس کے کسی اختیار کو تسلیم کرے۔ اگرچہ وہ کسی ایسے کے نزدیک جسے اس نظام سے تعلق نہ ہو کیسا ہی حق پرستانہ ادعا کیوں نہ ہو۔ اور اگرچہ حکومت کے لیے اپنے اختیار کی اس وقتی دست برداری سے انکار کا یہی نتیجہ کیوں نہ ہو کہ وہ بہت سے اختیار سے بہ جبر دست بردار کی جائے۔ حقیقتاً زمانہ آئندہ نے اس مسئلہ کو حل کیا کہ حکومت کی اس روش کو حسینؑ کس درجہ ناپسند کرتے تھے۔

علیؑ کی وکالت اور حسینؑ

یہ حالتیں اگرچہ اس کی محتاج نہ تھیں کہ کوئی اور زیادہ تجربہ کار اپنے خیال اور انداز سے حسینؑ کے اخذ نتائج میں سہولت پیدا کرتا لیکن جناب امیرؑ کے خیالات اور روش حسینؑ کے آنکھوں کے سامنے تھی اور یہ عجب خیز نظارہ تھا کہ کبھی ان کی صلاح پر حکومت ملتفت ہے اور اسے گوارا نہیں کرتی کہ کوئی بے غرض مصلح ایسی بات کہے جو ہماری روش کے علاوہ ہو اگرچہ وہ مفید ہی کیوں نہ ہو۔ کبھی پھر امت رسولؐ کی صدا کی قوت سے دبتی ہے اور جناب امیرؑ کو مدد کے لیے پکارتی ہے اور پھر دم لینے کے بعد بے پروا ہو جاتی ہے۔ غرض کہ ایک حالت سامنے آتی ہے جس میں کبھی امت رسولؐ انھیں اپنی طرف کھینچتی ہے اور کبھی خلافت ان کے سایہ میں پناہ لیتی ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ امت رسولؐ کیوں کھینچتی تھی اور خلافت کیوں مدد کے لیے پکارتی تھی۔ کسی تنہا شخص پر دو متضاد جماعتوں کے اعتبار کا اس سے بڑا معجزہ تلاش کرنا بیکار ہے۔ کیا تھا یہ علیؑ کی بے نفسی، بے غرضی، حق روی اور اصلاح کی سچی خواہش کے جو لوگوں کو ایک قومی ہم دوش موقع پر ان کے قریب کھینچتی تھی۔ ان کے پاس دونوں کی اصلاح اور خانہ جنگی کے روکنے کے لیے لفظ تھے۔ وہ نہ خلافت اور نہ ملتجیان اصلاح کے کیمپ میں تھے بلکہ خدا کے اس حصہ زمین پر

کھڑے تھے جہاں ان کے پاؤں تھے۔ ایک شمع تھی جو نہ صرف خود روشن تھی بلکہ تاریکی دور کر رہی تھی۔ مشکل حالت تھا آل ہاشم کے لیے جس سخت امتحان میں انھوں نے اپنے بہترین قومی خصوصیات کو جس پر نبوت کا گہرا عکس تھا موافق اور مخالف دونوں کے نزدیک خالص دکھایا۔

اور پھر اسی زمانہ میں ان کے لیے یہ بھی کہا جاتا کہ تم کو جلا وطن کرنا چاہیے اور یہ صاف بے خوف جواب دیتے۔ کبھی معاویہ بن ابوسفیان ان کے قتل کی صلاح دیتا اور کبھی یہ دیکھتے کہ حکومت ہماری مدد اور وساطت کو اپنے محفوظ کر لینے کے لیے استعمال کرتی ہے جس کے بعد حکومت کا اپنے وعدوں کو پورا نہ کرنا ہماری وساطت کی وجہ سے لوگوں کو بدظن کر سکتا ہے۔ اور اس سے علیحدگی اختیار کرتے۔ لیکن جس جس طرح حکومت اور خلائق کو وساطت کے اعتبار کی ضرورت بڑھتی یہ اسی قدر زیادہ کھنچے جاتے۔ یہ حالت کشمکش کی ضرور تھی لیکن اپنے پہچانتے اور اس تسکین کی ضرور تھی کہ ہماری روش کسی کے نزدیک قابل اعتراض نہیں ہے بلکہ ہر ایک کو ہم پر بھروسہ ہے۔ اس لیے کہ ہم نے "حق" اور "عدل" کو اپنے سامنے رکھا ہے۔ کون کہتا کہ اس لحاظ سے شریفانہ تغیر کا ہونا قابل اعتراض ہوتا۔ ہونا فطری تھا۔

خلق اللہ کے میلان سے بنی ہاشم کا نازک ترین موقع

بہت ممکن ہے کہ بنی ہاشم کے نوجوانوں کے لیے یہ وقت اس لیے اور نازک ہو کہ وہ خلق اللہ میں اپنی طرف فطری میلان دیکھ رہے تھے۔ ان کے حوصلوں کا جوش اس قدر سخت ہو سکتا تھا کہ اس کے روکنے کے لیے احتیاط کو دشواری ہوتی۔ وہ اپنی موقع بینی کو اپنی جائز سیاسی حق طلبی کہتے۔ لیکن ان کے لیے بڑی دشواری یہ تھی کہ وہ جسے سب سے زیادہ سیاسی اور روحانی حق تھا وہ علیحدگی کی مثالیں دیتا آتا تھا۔ اور اپنے عملی احساسات سے کیسی ہی جائز حق طلبی کو اعتنا کے قابل نہ سمجھتا تھا۔ جب تک خلق اللہ خود اس کی خواہش نہ کرے کہ تم ہمارے عنانگیر ہو۔ ہم اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ غیر ذمہ دار بنی ہاشم کے لیے یہ صابرانہ روش شیریں نہ ہو سکتی ہو لیکن حسینؑ کے فرائض انھیں بجز اس کے اور کسی خیال کی جرأت نہ دلا سکتے تھے کہ اپنے پدر بزرگوار کو خوف سے خفیف حس میں اپنا امام سمجھیں۔ اور ہمیں کوئی شبہ نہیں کہ حسینؑ کی عقل اور تربیت کے ساتھ ان کا پاکیزہ نفس اس روش کو بڑا امتحان کے اور کسی نظر سے نہ دیکھ سکتا تھا۔

خلیفہ کے آخری استغاثہ پر اپنے اس ہمدردانہ حس سے جو ہر مجبور کی مدد کے لیے آمادہ کر دیتا تھا۔ جناب امیرؑ نے اس وقت بھی جس طرح کی مدد دی وہ اس کا ثبوت ہے کہ ہر موقع کے لیے جناب امیرؑ کی تیز نظر کیسا بہترین حل تلاش کر لیتی تھی۔ حل یہ تھا کہ رسولؐ کے نواسوں کو حفاظت کے لیے بھیجتے۔ ظاہر ہے کہ یہ مدد کسی دستہ فوج سے زیادہ موثر تھی اگرچہ بڑی تدردشی بھی تھی۔ جس کا اثر ظاہر ہوا کہ باوجود اس جوش کے جو لوگوں میں تھا۔ اور باوجود اس کے کہ اس حالت میں لوگوں نے یہ نہ دیکھا ہو کہ کون در دار الامارت کی حفاظت کر رہا ہے اور اس سے یورش میں کسی طرح انھیں کوئی زخم لگا ہو یا کسی دور کے رہنے والے کی نادانستہ اور ناشناسانہ حرکت ہو، تاہم کوئی شخص یا اشخاص اصل دروازہ سے دار الامارت میں داخل نہ ہو سکے۔ لیکن ایک وقت میں ان نوجوانوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایسی حالت میں چاروں طرف کی حفاظت کر سکتے، جب کہ ہر طرف سے محاصرہ کرنے والوں کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ ہوا جو کچھ ہونا تھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ حسینؑ نے

اپنے اس فرض کو جس میں غالباً پہلے پہل تلوار اٹھائی تھی اچھی طرح انجام دیا۔ اور وہ ایک برافروختہ گروہ کے بلہ کو ثابت قدمی سے برداشت کر گئے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ حسینؑ کا فرض محض حفاظت اور دفاع تھا، خود حملہ کرنا نہ تھا، ایسا کرنا موجودہ موقع کے لحاظ سے فوجی بے قاعدگی ہوتی۔

عثمان کے بعد پھر بھی ابھی یہ اصل سوال طے نہ ہوا تھا کہ آئندہ کے لیے امت رسولؐ کا عنانگیر کون ہو؟ اس مہیب سناٹے میں بیشتر کا خلیفہ ساز گروہ سانس لینے سے ڈر رہا تھا۔

عثمان کی رحلت کے بعد بھی آل ہاشم کی خاموشی

بنی ہاشم خاموش تھے۔ اس لیے کہ علیؑ اپنی پُر وقار کنارہ کشی کو حرکت سے بدلنا نہیں چاہتے تھے۔ بنی ہاشم کے لیے اپنے رہنما کی یہ روش بے معنی خیز ہو سکتی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ نوجوان یہ سوچ رہے ہوں کہ جناب امیرؑ کو کیا ہوا ہے کہ ایسے وقت جب کہ ان کے خلیفہ تسلیم کرنے میں عذر کی خفیف صدا بھی نہیں ہے وہ اس طرح خاموش ہیں، اور اس وقت تو ان کی بے صبری کی انتہا نہ ہوگی جب وہ پے در پے وفود کو خلافت کے پیش کش کے ساتھ آتے دیکھتے ہوں گے اور انکار سن کر واپس جاتے ہوں گے۔ پہاڑ گھڑیاں گزر رہی تھی، دن گزرا، رات گزری، کئی دن اور راتیں گزریں۔ مگر علیؑ ہیں کہ اپنے انکار میں کوئی نرمی نہیں کرتے۔ بہت سے نہ ہوں گے جو یہ سوچتے ہوں گے کہ علیؑ نے ہماری پیش کش کو اتفاقی پیش کش نہ رہنے دیا۔ بعض کی پیش کش نہ رکھا۔ پیش کش کی حیثیت نہ رہی۔ بلکہ وہ حیثیت قبولیت پر منتقل ہو گئی۔ بعض نہ رہے۔ اکثر نہ رہے، بلکہ تمام افراد کے مسلسل وفود نے اصرار کو سطح بلکہ ایک سیال جسم بنا دیا جو حقیقی جمہوریت اور قومی خواہش کہی جائے۔ قومی ہم آہنگی دیکھ رہی تھی کہ محض ہمارا جسم وہ پوری ہیکل نہیں ہے جس سے نظام قومی درست کہا جائے بلکہ وہ ایک ذات کو اب اس کی پوری شان سے دیکھ رہی تھی جو اپنی رائے پر اعتبار کی تنہا مثال دے رہی تھی اور پیروی کے شرائط طے کر رہی تھی اور کیسے آدمی تھے جو اس کا لطف اٹھاتے کہ علیؑ نے ذمہ داری کے اقرار کے پہلے قومی سانچے کے درستی کی ابتدا کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف کی ناموجودگی کے ساتھ قومی ہم آہنگی کے علاوہ اب اور کوئی بات علیؑ کو ذمہ داری کے مواقع پر نہ دیکھ سکتی تھی۔

امیر المومنینؑ کی بیعت کے وقت بنی ہاشم کی طبعی کیفیت اور حسینؑ کے دیکھنے کا تماشہ

بنی ہاشم کی اس وقت کیا حالت تھی جس وقت جناب امیرؑ مسجد میں اظہار قبولیت کے لیے تشریف لے جا رہے تھے؟۔ گرفتار آزاد ہو رہے تھے۔ مظلوم قوم صاحب اختیار ہو رہی تھی۔ مفلوج اعضا میں حرکت پیدا ہو رہی تھی۔ تمام وہ قوائے لطیف جن کا حسن عالم خواب کی باتیں تھیں بیدار ہو رہے تھے۔ خلق اللہ کہہ رہی تھی کہ "منہاج النبوۃ" کا دوسرا دور شروع ہوا۔ راستوں میں بچوں، بوڑھوں، لڑکیوں اور جوانوں کا دریا بہہ رہا تھا۔ ایک دوسرے پر پھیرا پڑتا تھا کہ کسی طرح امیر المومنین کے دست اقدس کو چوم لیں۔ بے اصول حوصلہ مند سوچ رہے تھے کہ ہم کس طرح علیؑ کے خیالات میں دخیل ہو جائیں۔ دشمن مخالفت کا مرکز تلاش کر رہے تھے اور علیؑ سوچ رہے تھے کہ کس طرح "بدعتوں کو منتشر" اور ان "شاہراہوں کو جو متروک اور ناپید ہو گئی ہیں" روشن کر دیں۔ یہ تماشہ تھا جو حسینؑ کے

ہوش اور آنکھوں کے سامنے گزر رہا تھا۔ حسینؑ اس وقت اکتیس برس چار مہینہ کے تھے اور پھر اب شاہزادے سے اگرچہ انھیں اس کے دنیاوی مفہوم سے کراہت ہو۔

پرانے مخالفین کے پہچاننے کا وقت

نہ صرف یہ وقت تھا کہ وہ لوگ جو طبعًا جناب امیرؑ کی ولایت کے قائل تھا بشاش بشاش حاضر ہوئے اور اطمینان سے سانس لیتے بلکہ وہ بھی جنھیں کسی دور حکومت سے کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ اس وقت کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے نہ صرف بیعت سے انکار کیا بلکہ ان کو ایسی جگہ رہنا بھی گوارا نہ ہوا جہاں علیؑ کی حکومت ہو۔ یہ کوئی آسمان سے ٹپکے ہوئے لوگ نہ تھے بلکہ وہ جو ایک زمانہ سے اپنی روش اپنا خیال اور میلان صاف صاف ظاہر کرتے آتے تھے۔ ان میں کے اکثر وہ تھے جن کے دل میں زمانہ رسولؐ میں علیؑ کے رسوخ کا حسد اور دشمنی سڑ رہی تھی، بلکہ ایک زمانہ تک وہ علیؑ کو بے دست و پا بھی دیکھ چکے تھے۔ اور اسی کل کے پرزے سے تھے جس نے علیؑ کو اختیار سے علیحدہ رکھا۔ اب پردہ تخت تاج کے عالم میں دیکھ رہے تھے ہم وہ کچھ دیکھ رہے ہیں جن کے دیکھنے کی اب کوئی امید نہ تھی۔ اور جن میں کے اکثر اس کے بعد اس پر آمادہ ہوئے کہ ہم اس عالم کے نہ دیکھنے کے لیے بزور شمشیر معاملہ کرنے میں دریغ نہ کریں۔

اگر یہ قیاس کیا جاسکے کہ حسینؑ اس کے لیے بے چین تھے کہ کسی طرح ان کے پدر بزرگوار ان کے جد طلی مقدار کی مسند پر جلوس فرمائیں تو ان حالتوں کی موجودگی سے جناب امیرؑ کے تردد کا سمجھ لینا جن کے اشارے کیے گئے ان کے لیے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لیکن موقع ایسا نہ تھا جس طرح خواہی نخواہی بہت سے باتیں انسان کے آنکھ اور کان کے سامنے سے گزر جاتی ہیں۔ بلکہ ان واقعات کا شمار خصلت گری اور تصفیہ سازی کے ان آلات میں تھا جنھیں گہرا اثر ڈالنے میں فطری مہارت ہے۔ میرا تصفیہ ہے کہ امید خیز ابتدا اور گئی ہوئی چیز کے حاصل ہوجانے سے جو کچھ وقتی ہیجان ہوا وہ نہ صرف ان کی قوت دار اعلیٰ ظرفی سے پست ہوا بلکہ پیش نظر مخالف عناصر نے بھی دبا دیا، اور ان دونوں متضاد قوتوں نے انھیں اپنی جگہ اس طرح رکھا کہ گویا کوئی نئی بات ہی نہ تھی اور یہ اپنی موجودہ ذمہ داریوں کو بے جذبہ احتیاط سے ادا کرنے لگے۔

حسینؑ پر اُن کا اثر جو جناب امیرؑ کے وفادار دوست یا علیؑ کی پسند کے قابل تھے

سچے دوست اور ان کا اخلاص چھپنے کی چیز نہیں ہوا کرتی اور اس لیے ہم امید کرتے ہیں کہ وہ تمام لوگ جنھیں ہم گزشتہ واقعات کے ضمن میں دکھا آئے ہیں حسینؑ سے شرف تعارف حاصل کرچکے تھے، میں بھول نہیں سکتا ہوں کہ مثال ہے کہ حسینؑ کسی یا چند اصحاب کو "چچا" کہتے تھے اور یہ بھی صاف ہے کہ حسینؑ جنھیں "عم" فرماتے تھے وہ قریش کے بڑے (دنیاوی مفہوم میں) لوگوں میں نہ تھے۔ انھیں ایسا کہنا یا بنی ہاشم میں سے کسی کو اس طرح پکارنا قبیلہ یا خاندان کے مراسم کے لحاظ سے ہوتا۔ بلکہ وہ عرب بھی نہ ہوتا۔ مثلاً سلمان یا کوئی غیر ممتاز ابتدا کا جیسے مقداد۔ اس لیے کہ یہ فرزندان اسلام تھے اور اس لیے کہ یہ اسلام کے اوتار میں اس طرح جذب ہوگئے تھے جس سے انھیں اس کے مظہر ہونے کا امتیاز حاصل ہوتا اور نہ بحیثیت ایسے مورخ کے جسے زیادہ تر شخصیات کے آثار اور گردوپیش کی حالتوں سے بحث ہے۔ میں اسے فروگزاشت کرسکتا ہوں کہ حسینؑ کے خیالات اور عادات ان تمام بڑے بوڑھوں کی پاکیزگی خیال،

پاکیزگی عمل، صدق، توکل بخدا، استقلال، شجاعت، ایثار نفس وغیرہ سے متاثر نہ ہوتے۔ یا ان کی موجودگی اور نگاہیں حسینؑ کو اپنی احتیاط، حفاظت اور ارتقا کا خیال نہ دلاتیں۔ ظاہر ہے کہ میرے آخری ریمارک کا زیادہ موقع حسینؑ کے لیے اپنے پدر بزرگوار کے زمانہ خلافت سے شروع ہوتا تھا۔ اس لیے کہ خلافت ان ممتاز افراد عالم کو اپنے گرد جمع کر سکتی تھی۔ "توریث صفات" اور "فضا" دونوں حسینؑ کے لیے ایسی تھی جس حد تک پاکیزگی خیال کا ہمارے عالم میں قیاس ممکن ہے۔

شورشوں میں جناب امیرؑ کی متانت کا حسینؑ پر اثر

اس زمانہ کے واقعات میں جناب امیرؑ کا عادلانہ برتاؤ اور مستند دشمنوں سے درگزر منجملہ ان باتوں کے تھی جسے حسینؑ دیکھتے اور خصوصاً تردد خیز حالتوں میں جناب امیرؑ کا اپنی جگہ قائم رہنا اور اس طرح قدم اٹھانا کہ گویا ان تمام شورشوں میں اتنی قوت نہ تھی کہ جناب امیرؑ کے افعال، خیال اور الفاظ میں کوئی ادنیٰ لغزش پیدا کر سکیں۔ دیکھنے والے کے لیے پوری خصائل ساز تھیں۔ اسی طرح معاملات کا ان کے سامنے آنا اور اس کے متعلق حکم جو عین حقیقت امر کی وضاحت ہوتی تھی حسینؑ کے لیے ان کے قوائے عقلی اور طول نظر کی ترقی کی بہترین تحریک تھی کہ اس طرح معاملات پر غور اور تصفیہ کیا جاسکتا ہے۔

جنگ جمل میں حضرت عائشہ کا موقع حسینؑ کے لیے گزشتہ کا واقعہ خوان تھا

واقعہ جمل میں کچھ ذاتوں کا سامنے آجانا جس کا شخص نیا نہ تھا نہ جاننے والے میں بھی مستفسرانہ حالت پیدا کر سکتا تھا اور اگر ہم یہ قیاس کر سکیں کہ انھیں قریب سے دیکھنے کا وقت حسینؑ کے لیے سات برس کی عمر تک تھا تو کچھ گزشتہ کی یاد کچھ خاندانی حیثیت کی اطلاعیابی کچھ درمیانی کسی موقع پر کوئی مفید خبر اور پھر اس وقت کی پرجوش تیاری اور پر اصرار نزاع، تمہی ہوش کی ان باتوں کو بھی روشن کر دے سکتی تھیں جو دھندلی ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس موقع کا علم جس میں مخصوص ذات حضرت عائشہ کی جو ان تمام مواقع اور ضمنی حالات کی آگاہی بغیر نہیں گزر سکتی تھی جس کا موجودہ حالت ایک فطری نتیجہ تھی۔

اور باوجود ان باتوں کے جو اپنی روش خیال اور جماعت کے لیے پریشان کن نظر آتیں حسینؑ کو واقعات کے اس مذاق کا بھی علم ہوتا کہ ہماری ناموافق جماعتیں کبھی مال کے لیے آپس میں جنگ کرتی ہیں، کبھی آپس میں عدم امتیاز کی بنا پر کشیدگی ہوتی ہے اور کبھی شرکت جنگ کے لیے ہر جماعت اپنا آدمی پیش کرتی ہے جو فتح کے بعد والی امر قرار دیا جائے۔ اموی دور میں حضرت عائشہ کا کمی امتیاز اس کی ظاہر پیشین گوئی تھی کہ امیر شام انھیں حصول اختیار کی کوشش میں مدد نہ دیتا۔ انھیں صاف اختیار کر دینا اپنے کو اپنی جگہ کمزور کر دینا تھا۔ ان کی شرکت جتنی دیر کے لیے نافع تھی اس کا وقت گزر چکا تھا۔ اور اس خیال میں اموی گروہ کو اس سے اور مدد ملی کہ ابن عثمان کا فتح کے بعد والی امر قرار دیا جانا اصحاب جمل کے نزدیک مناسب نہ تھا۔

جناب امیرؑ کی صلح پسندانہ روش اور حسینؑ

نہ یہ حسینؑ کے نہ دیکھنے کی چیز تھی کہ کس طرح جناب امیرؑ اطمینان شکن خبروں کو اطمینان سے سنتے ہیں، لوگوں کو اطلاع دیتے ہیں۔ گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہیں۔ اہل کوفہ کی روش سمجھنے اور انھیں پہلے اپنے قبضہ میں لانے کی

کوشش کرتے ہیں اور باوجود قابلِ اعتبار فوج اور افسروں کی موجودگی کے امن کا مصمم ارادہ ظاہر کرتے ہیں کہ مُنصفانہ دلائل سے پہلے تلوار فیصلہ نہ کرے۔ اس کوشش کے تمام اقدام حسینؑ کی نگاہ میں نپے تلے تھے۔ اور وہ نہ صرف جانتے تھے کہ مخالف گروہ باوجود عہد کے مُسلمانوں کے ساتھ کیا کرسکتا ہے بلکہ وہ اس یقین سے باز نہ رہ سکتے تھے کہ اسے کوئی دلیل نہیں سمجھا سکتی جب تک وہ ہمیں صاحبِ اختیار دیکھ رہا ہے۔

اپنا اختیار گزشتہ کی دُھندلی یاد کو روشن کر رہا تھا

اور پھر ساتھ ہی ساتھ آج یہ دُھندلی یاد نہ تھی کہ کس طرح رسُولِ خداؐ کا لشکر دشمنانِ دین سے جہاد کرنے جاتا تھا۔ اور ہم ان کے کاندھے پر بیٹھ کر دیکھتے تھے کہ پدرِ بزرگوار اسلام کا نشان لیے جا رہے ہیں۔ آج دیکھ رہے ہیں کہ محمدؐ ابنِ حنفیہ یا خود امیرالمومنینؑ علمدارِ لشکر ہیں۔ ہم افسرِ میمنہ ہیں اور آج نظامِ اسلام کو اپنی حد پر قائم رکھنے کے لیے کوشش کرنے والوں کے ایک ہیں۔ ہر فوجی پڑاؤ پر نواح کے لوگ اظہارِ اطاعت اور شرکت کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور امیرالمومنین انھیں جنگ اور اس کے خوفناک نتائج سے حتی الوسع دُور رکھتے ہیں۔

جنابِ امیرؑ کے فوجی نصائح اور حسینؑ

اور پھر یہ بھی دیکھا کہ دلیل اور بحث کا موقع گزرا۔ صفوں میں موت طلب سناٹا چھایا۔ امیرالمومنین اپنے غیر جنگی لباس میں صف سے باہر نکلے اس لیے کہ دشمن کے سب سے بہادر سپاہی سے بات کریں۔ پھر بھی خون بہانہ رکا۔ دشمن نے ابتدا کی۔ اپنے سپاہی زخمی ہوئے اور وہ دشمن سے جنگ کرنے کی اجازت طلب کرنے لگے۔ اور اب امیرالمومنین نے ان کے چھوٹے بھائی بیس بائیس برس کے ابھرتے ہوئے نوجوان محمدؐ ابنِ حنفیہ کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اور یہ ہدایت کی کہ "بیٹا پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں سربہ فلک چوٹیاں سرک جائیں مگر تو اپنے مقام سے نہ ہٹنا۔ اپنے سر کو عاریۃً خدا کے حوالہ کر۔ اپنے قدموں کو زمین پر گاڑ دے۔ اس قوم کے منتہی پر نظر کر۔ بیشک فتح و نصرت خدا کی جانب سے ہے" حسینؑ اپنے پدرِ بزرگوار کے پہلو سے یہ الفاظ سن رہے تھے۔

محمدؐ ابنِ حنفیہ کی جنگ کا منظر اور حسینؑ

ہم اس وقت کا نقشہ کھینچنے اور حسینؑ کے جذبات کی مصوری کے لیے اپنے الفاظ یا ترکیب الفاظ کو ناکافی پاتے ہیں جس وقت شیر کا فرزند اپنے اور دشمن کی فوج کے درمیانی میدان کو طے کر رہا تھا۔ یا جس وقت اس کی تلوار کسی اجل رسیدہ پر پہلے پڑی۔ حسینؑ کے متعلق تو یہ خبریں بھی ہیں کہ وہ افریقہ اور طبرستان کی مہمات میں شریک ہوئے، محمدؐ ابنِ حنفیہ کا شاید یہ پہلا موقع تھا۔ پھر بھی انھوں نے نہایت بے جگری اور حواس سے اپنے پہلے مشغلہ کو انجام دیا۔ اور اس سے زیادہ دشوار ہے میرے لیے یہ بیان کرنا کہ حسینؑ کس طرح اس کا احساس کر رہے تھے کہ کوئی باپ اپنے بیٹے کو میدانِ جنگ میں جاتے ہوئے کس آنکھ اور دل سے دیکھتا ہے اور اس کے جذبات کی کیا کیفیت ہوتی ہے اور آیا کچھ ایسے دل بھی ہوتے ہیں جو کسی اعلیٰ خیال اور وجہ کے لیے ان جذبات سے بے پرواہ ہوتے جاتے ہیں۔ اور پھر محمدؐ ابنِ حنفیہ کی واپسی پر جنابِ امیرؑ کی آنکھوں نے کس طرح ان کا استقبال کیا۔ نہیں معلوم جنابِ امیرؑ کی فوجی ترتیب کی کماظ سے یہ ممکن تھا یا نہ تھا کہ حسینؑ انھیں بغل گیر کرسکتے۔

شیرِ خداؑ کی جنگ کا منظر اور حسینؑ

اور پھر اس کے بعد اگر اب تک اپنے پدر بزرگوار کو جنگ کرتے نہ دیکھا تھا تو اس وقت دیکھا کس کے منہ میں زبان ہے کہ جناب امیرؑ کے انداز بشرہ اور نفس کی اس قوت کا نقشہ کھینچ سکے جو دشمن کو مرعوب کر دیتا تھا لیکن آنکھ دیکھ سکتی تھی اور بیان نہ ہو سکنے والی حالت سمجھ میں آسکتی تھی۔ حسینؑ اب سمجھ سکتے تھے کہ جد بزرگوار کے سامنے کی لڑائیوں میں میرا باپ کس طرح لڑا تھا جس وقت ان کا تمام فرض یہ تھا کہ لڑتے اس وقت تو خود حکم دینا اور حکم کی ذمہ داریاں بھی تھیں۔

جنگ کی مختلف حالتیں اور حسینؑ

تنور جنگ گرم اور ٹھنڈا ہوا، ترتیب لشکر، تعبیہ، لڑوانا، لڑنا، فتح و شکست، فاتح اور مفتوح کی حالت غرض کہ جنگ کے تمام تنوعات آنکھ کے سامنے سے گزرے، دوست، دشمن، سمجھے ہوئے اور ناسمجھ جوش کو دیکھا۔ اور پھر دنیا کی وہ شریف ترین ٹھنڈی سانس سنی جو مقتولین کے ملاحظہ کے وقت جناب امیرؑ کے منہ سے برآمد ہوئی اور آخر میں یہ بھی دیکھا کہ رحمۃ للعالمین کا جانشین اسرائے جنگ کے علاوہ مخصوص مخالفین کے ساتھ کیا برتاؤ کرتا ہے۔

جمل کی فتح کے بعد حسینؑ کی اُمید

میں بے تردد سوچتا ہوں کہ جنگ جمل کے اختتام پر حسینؑ اس عام خیال میں شریک ہوں گے کہ خدا کی حکومت اب پائیدار ہوگی اور خدا کے سفیر کا جانشین حدودِ خداوندی کے قائم کرنے میں کامیاب ہوگا۔ اس لیے کہ یہ ایک زبردست مخالفت تھی جو صاحب اثر لوگوں کے ذریعہ سے ہوئی تھی اور جناب امیرؑ نے اسے نہایت کم وقت اور عدم تیاری کے عالم میں روبراہ کیا۔ نہ میں یہ سوچ سکتا ہوں کہ جناب امیرؑ کو ایسی ہی امید نہ ہوگی۔ لیکن جناب امیرؑ اپنی امید میں محتاط تھے۔ اس لیے کہ جناب امیرؑ نے بہت کچھ دیکھا تھا جو حسینؑ نے نہ دیکھا تھا۔ ونیز اس وجہ سے کہ حسینؑ اس وقت ذمہ دار نہ تھے علی ابن ابی طالبؑ ذمہ دار تھے۔

کوفہ میں حسینؑ شاہزادہ کی حیثیت سے داخل ہوتے ہیں

جناب امیرؑ کے لشکر میں کوفہ کے اکثر عملدرین تھے۔ جمل کی فتح کے بعد کوفہ میں جناب امیرؑ کی تشریف آوری سے اہل لشکر اور اہل کوفہ خوش ہوئے اور خوبی سے جناب امیرؑ کا "اِستقبال" کیا۔ اس طرح حسینؑ اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ اس شہر میں بحیثیت شاہزادے کے داخل ہوئے جسے ان کی آئندہ حیات یا حیات کے بعد سے عبرت خیز تعلق ہے۔ اور چونکہ کوفہ میں ایک غیر محدود وقت کے لیے قیام تھا۔ میں تصفیہ کرتا ہوں کہ حضرت زینب اور ام کلثوم بالخصوص اور دیگر بنی ہاشم نے بالعموم اسے اپنا گھر بنایا۔ جن میں میں خصوصیت سے اولاد جعفر و عقیل کا نام لیتا ہوں۔ جنھیں جناب امیرؑ کی دامادی کا شرف حاصل تھا۔

کوفہ کا قصرِ امارت اور حسینؑ

یہ معلوم ہے کہ جناب امیرؑ نے قصر امارت میں سکونت اختیار نہ کی۔ ظاہر ہے کہ یہ فعل جناب امیرؑ کے اس عمل تقویٰ کی بنا پر تھا جس سے وہ جناب دنیاوی تلذذ کے کسی مفہوم سے اپنے کو آلودہ نہیں کرتے تھے لیکن واقعات کی فطری روش تفہیم میں کچھ ذرات عادت مستمرہ سے الگ شامل کرنے ہوں گے۔ اگر یہ کہا جائے کہ زمانہ آئندہ کے پردرد واقعات کے علم نے انھیں اس کے انتخاب سے باز رکھا۔ اور ایک گومگو کی حالت ہوگی۔ جو غیر فطری نہیں کہی جاسکتی۔ اگر یہ سوچا جائے کہ علیؑ کا قلب مصفا

زمانہ آئندہ کے متعلق بعض لہریں محسوس کرتا تھا جس کے معنی صاف ہوں یا نہ ہوں لیکن افسردگی سے یہ تصفیہ کر رہا تھا کہ نہ رہو یہاں۔ کیا ضرور ہے کہ کوئی خیال آج ہی بجھ میں آجائے۔ زمانہ بہترین شارح ہے!۔

قصر امارت میں نہ رہنے کی احتیاط لوگوں اور خصوصاً بنی ہاشم کے لیے جن کے دل امید اور حوصلے کے تھے ایک تنبیہ تھی کہ اپنی جگہ پہچانو۔ اس نے اگر بنی ہاشم کے طرز عمل کو درمیانی زمانہ نے مبہم بھی کر دیا ہو تو اب اپنے افسر خاندان اور امام کی بین روش نے انھیں پھر سنبھال دیا۔ لیکن رہنا یا نہ رہنا اس کا مانع نہ تھا کہ تصفیہ امورات وہاں نہ ہوا کرتا۔ قصر امارت خلافت کی ضرورتوں میں آیا علیؑ ابن ابی طالبؑ کے لیے نہ تھا۔ اس طرح حسینؑ نے اپنی حیات میں نہ صرف اس جگہ کو دیکھا بلکہ حکم کے تابع پایا۔ جسے آئندہ زمانہ میں محض ان کا سر مبارک دیکھنے والا تھا۔

خطبات نہج البلاغہ اور حسینؑ

اس طرح ہم حسینؑ کی حیات کے اس زمانہ تک پہنچ گئے جس میں ان حیرت خیز خیالات کا اظہار ہوا جو اب اسلام کی خوش نصیبی سے خطبات نہج البلاغہ کے نام سے ہمارے پاس موجود ہے۔ جس کی تدوین شرح اور مطالعہ سے علامہ سید رضی، علامہ ابن ابی الحدید، اور علامہ ابن عبد ربہ کو تسکین ہوتی۔ اور جو کتاب خدا کے بعد دوسری سمجھی جاتی۔ لیکن اسلام کے ان مشہور محسن علماء نے کاغذ پر ان حروف کو پایا تھا جن کے خاموش معنی کا سمجھنا ہر ایک کی تمیز، درجہ معلومات اور بلندی خیالات پر موقوف تھا۔ وہ یقین کے ساتھ اکثر یہ طے نہیں کر سکتے تھے کہ حکیم اسلام کے انداز کسی مخصوص لفظ یا فقرہ کے کیا معنی سمجھا رہے تھے۔ انھیں یہ فخر نصیب نہ تھا کہ آواز کی گرمی اور لہجہ کی راستی سے سمجھتے اور روح مبارک کا قریبی عکس خیالات کو روشن کرتا جاتا۔ بہت سے اشارہ ایسے ہیں جن کے متعلق واضح تاریخ نہیں لکھی گئی۔ جس کا اس وقت جاننا آسان تھا۔ لیکن حسینؑ اس زمانہ میں تھے۔ علیؑ کے زیر تعلیم ہونے کا فخر تھا۔ الفاظ اور فقرات کو اپنے کانوں سے سنا اور انداز بیان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور تقریر کا وہ اثر یا لہجہ کی وہ ادا جو کبھی سننے والے کے دماغ سے نہیں نکلی حسینؑ کا غیر فانی خزانہ تھی۔

لیکن محض یہ کہنا کہ حسینؑ نے خطبات نہج البلاغہ کو سنا تھا یہ سمجھانے کے لیے کافی نہیں ہے کہ حسینؑ نے کیا سنا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا مضمون نظر ہے جس کی میں یہاں جرأت نہیں کر سکتا۔ بلکہ حافظہ سے چند مضامین کے نام لیتا ہوں جس سے یہ سمجھا جائے کہ کس حیثیت کے مضامین حسینؑ کے اس دور تعلیمی پر مؤثر تھے۔ مقولے، توحید، رسالت، اسلام، حیات بعد الموت، عبادت، انسانی ذمہ داری، حقوق اور فرائض دنیا اپنے ہر پہلو سے، امید اور عقل، سچائی اور نجات، حسد اور صحت، وجہ خلقت، عورت، مرد، انسان کی کمزوریوں پر نظر، رحم اور در گزر مذاہب کی حالت حدوث و قدم، تکوین خلقت، بلغی رویت قومی ترقی اور زوال کے اشارے مثالیہ حکومت، جابر بادشاہوں کا طرز عمل، بہبودی عام، رعایا اور بادشاہ طریقہ خراج محصلان زکوٰۃ کو حکم، دیوانی، اور فوجی عہدوں کے متعلق ہدایتیں، ذمی، مجاہدہ نفس، فرشتہ، قرآن، غرض کہ اتنی باتیں جس کی پیچ فہرست اس وقت دی جا سکتی ہے جب محض مضامین کی فہرست بنانے کے لیے کتاب لکھی جائے اور کوئی تعجب نہیں ہے کہ کثرت کار کی وجہ سے باوجود ابو رافع کی موجودگی اور خود توقیعات تحریر فرمانے کے اس کا موقع آتا ہو کہ مفید احکام خود حسینؑ سے بھی لکھوائے جاتے ہوں۔ نہ حسینؑ اس محتاط خط و کتابت سے ناواقف تھے جو جناب امیرؑ اور معاویہ میں ایک زمانہ تک جاری رہی۔ اس کے علاوہ نہج البلاغہ بجائے خود اس زمانہ کا فلسفہ تاریخ ہے جس سے نہ صرف بہت سی

باتوں کے اسباب و نتائج سمجھ میں آتے ہیں بلکہ اکثر واقعات اس وضاحت سے معلوم ہوتے ہیں جس کے بعد تشکیک کی گنجائش نہیں رہتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ زیرِ ذکر واقعہ کا نفس چاک کر کے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ تو اگر اب تک بھی اس قیاس کی گنجائش ہو کہ کچھ واقعات تھے جو اپنی پوری حیثیت سے حسینؑ کے علم کے باہر تھے تو ان تقریروں کے بعد ان کے علم کے اندر تھے۔ اور جن استعارات کو ہم اس وقت تاریخی شرح کے نہ ہونے یا اس طرح زمانہ کے گزر جانے سے نہیں سمجھ سکتے۔ قربِ زمان نے اسے حسینؑ کو پوری طرح سمجھایا ہوگا۔

جناب امیرؑ کی چند سال حکومت کا اثر

اس زمانہ میں جناب امیرؑ کو اس قدر مہلت ملی کہ وہ بہ استثنائے شام ان تمام صوبجات پر عامل روانہ فرما سکتے جہاں اب تک خانگی سخت مشغولیت کی وجہ سے نہ بھیج سکے تھے۔ یہ استحکام کا ایک فطری اقدام تھا۔ اور انھیں وقتوں کی تھوڑی سی مہلت میں بغیر کسی واگزاشت کے جس قدر کام ہو سکے اس نے جناب امیرؑ کی روشِ خیال کے اس قدر لوگ پیدا کر دیے جن کا فنا کر دینا اموی اور عباسی حکومتوں کے لیے ناممکن ہوا۔ اور پھر کچھ زمانہ کے بعد ملوکِ دیالمہ اور خلفائے فاطمی کے زمانہ نے پھر اس میں ایک حیات کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ یقیناً ہم ان باتوں کے متعلق جن میں سے چند کے اوپر نام لیے گئے انھیں جان سکتے تھے کہ "نفسِ رسولؐ" کا کیا خیال تھا؟ اگر ایسا وقت نہ آتا جس میں انھیں بغیر کسی سیاسی احتیاط کا دباؤ محسوس کیے ہوئے کچھ کہنا نہ ملتا۔ علیؑ کی روش نے جیسے سخت امتحان دیے وہ اپنی قوی نفسی کا بہترین ثبوت ہے۔ ایک نظام جو تین چار برس قائم رہا، ایک ذات کی بدولت رہا، وہ حیات کے ایسے قوی عناصر سے مرکب تھا جسے صدیاں متغیر نہ کر سکتیں۔! اس قوت کی وجہ اولیٰ بلاشبہ رسولؐ کی حیات کے اس زمانہ میں قائم ہو چکی تھی۔ جس میں علیؑ کو حصولِ تعلیم اور اظہارِ صفات کا موقع ملا تھا۔

معاویہ کا تدبر اور علیؑ

عمال اپنے اپنے عمل پر جا رہے تھے۔ اور ادھر جناب امیرؑ یہ خبریں بھی سن رہے تھے کہ ابن ابوسفیان کس تاک میں ہے۔ معاویہ کیسا ہی مدبر اور لوگوں کی نگاہ میں اپنی خاندانی قدامت کے لحاظ سے کیسا ہی اثر کیوں نہ رکھتا ہو لیکن وہ اپنے تمام تدبر اور وقار میں علیؑ کے سامنے بے پردہ کھڑا رہتا۔ علیؑ اسے ابتدائی زمانہ سے اس وقت تک ہر صورت اور خیال میں دیکھ چکے تھے۔ ان کے نزدیک اس کی تمام سیاسی چالیں ایسا فریب تھیں جو بچوں کے دودھ چھڑاتے وقت کیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کا کوئی فریب مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یا کہتے ہیں کہ "اگر مکاری اور دھوکا ناپسند نہ ہوتا تو میں مدبر ترین مردم ہوتا"۔ تو کیسی ہی خبر کا آنا کہ معاویہ مخالفت، تیاری اور جنگ کے لیے سامان کر رہا ہے۔ علیؑ کے نزدیک کوئی ایسی خبر نہ تھی جو ان کے تحیر کی باعث ہوتی۔ معاویہ وہی تھا جسے آج سے تیس برس قبل لڑتے دیکھا تھا۔ علیؑ وہی تھے جس نے اس کے گھر کو صاف کر دیا تھا۔ بنی امیہ اس وقت کفر کی حفاظت اور اپنے اظہارِ اقتدار کے لیے لڑ رہے تھے۔ آج حفاظتِ کفر کا اعلان ممکن نہ تھا۔ تدبیر بالضد نہیں ہو سکتی تھی، تدبیر بالمثل ہو سکتی تھی۔ لیکن اصل وجہ یعنی اپنے اقتدار کی حفاظت اور بنی ہاشم کو صاحبِ اقتدار نہ دیکھ سکنا ویسی ہی تھی۔ علیؑ آج بھی حفاظتِ اسلام کر رہے تھے لیکن کفر کے مقابلہ میں نہیں بلکہ اس سے مضر تر دشمن سے جو علی الاعلان اصولِ اسلامی کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا، بلکہ جو اپنے طرزِ عمل کو جو ایک معاملہ تاریخی ہے بلحاظ ایک بڑی

جماعت کے سیاسی حاکم ہونے کے صریحاً یا غیر صریحاً اسلام کا قائم مقام سمجھا جاتا تھا اور اتفاقات نے عوام الناس کو بھی ایسا ہی سمجھا دیا تھا۔ اس کا مذہب ہمارے زمانہ کے دور الحاد کی سیاست تھی اس کا ایمان اختیار تھا، اور اس کے اصول وہ تھے جس سے وہ کسی طرح اپنی جگہ مضبوط رہ سکے اور چونکہ اس کی مثالیں گزر چکی تھیں کہ کوئی راست گو نکتہ چین صاف گوئی کی جرأت پر اپنا تمہ سلا ہوا دیکھتا اور چونکہ زمانہ حق پسندی کی قوت کو اپنی روش اور مدت کے لحاظ و نیز ان نسلوں کی کمی معلومات کی وجہ سے کمزور کرتا جاتا تھا جنھوں نے تغیرات نہ دیکھے تھے اور بچے ہوئے لوگ خوف سے اصل واقعات ودیعت رکھا کرتے تھے یہ امید موہوم ہوتی جاتی تھی کہ اس منجمد تاریکی میں کسی طرح کسی خفیف روشنی سے کوئی شگاف ہو سکے۔ کسی کا شریعت اسلامی کا پابند ہونا اس کی تلوار سے محفوظ ہونے کا پروانہ نہ تھا جب تک وہ اظہار اطاعت میں بھی سرگرم نہ ہو جس طرح شریعت اسلامی کا پابند ہونا اور زکوٰۃ نہ دینا یہ سیاسی فتوے شائع کر سکتا تھا کہ ان سے قتال جائز ہے۔ اس کے نزدیک لوگوں کا حق یہ نہ تھا کہ کچھ دخل دے سکیں بلکہ دیکھیں کہ کیا کیا گیا اور بس۔ اس کے عمال اور اہل شوریٰ کی فہرست دی گئی جس سے سمجھا جاسکے کہ یہ لوگ کس قماش کے تھے اور ان کی مصلحت کا شعار کیا ہو سکتا تھا۔ اور اگر کبھی آئندہ جمہور نما کارروائی بھی کی گئی تو ایسی جس پر استبداد کو ناز ہو۔ جس سے بڑھ کر خلق اللہ کو غیر فطری صدا سے چھپانا نہیں سکھایا جاسکتا اور نہ کبھی وہ جس پر لوگوں کو بھروسہ ہو کہ ہمارا حاکم ہونے کی وجہ سے ہمیں اچھی راہ چلائے گا۔ اس سے بڑھ کر اپنی ذاتی راحت کے لحاظ سے لوگوں کو غلط راہ لے جاسکتا ہے۔ نہ اس سے زیادہ خلق اللہ کے اعتبار اور بول نہ سکنے والے ناسمجھوں کے ساتھ مہیب کھیل کھیلا جاسکتا ہے۔

تو معاویہ کے دورِ حکومت سے امید کرنا کہ وہ ارسطو کی مثالیہ حکومت کا نمائندہ ہوتا امید کو فریب دینا ہے۔ جس میں اگلے زمانہ کا وہ فلسفی اسٹیٹ کو وہ مرکز سمجھتا ہے جہاں انسان کی غرض خلقت تکمیل کو پہنچتی ہے اور اسٹیٹ مجموعہ ہے ان تمام محرک کا جس میں انسان کو اپنے قوائے ذہنی اور خارجی کے استعمال کا موقع ملتا ہے اور اسٹیٹ ذمہ دار ہوتی ہے کہ وہ عامہ ناس کی بہبودی کی فکر کرے۔

ہم نہیں جانتے کہ علامہ ابن خلدون جن سے بڑھ کر ابن ابوسفیان کا بھاٹ تلاش کرنا ان کے ساتھ ناانصافی ہے اپنے اس دعویٰ کو معاویہ کے لیے کوئی قرار دیں گے یا نہیں کہ: "امام ایسا شخص ہونا چاہیے جو جمہور کے حقوق کا لحاظ کرے اور سب کے لیے نیکی کی راہیں آسان کر دے، خواہ وہ ذمی ہو یا مسلمان"۔ میں کیسے انکار کروں کہ مسلمانوں کے لیے نیکی کی راہیں آسان کی ہوں یا نہ کی ہوں کم سے کم ذمیوں کے لیے اس قدر آسان کر دی تھیں کہ وہ کسی مسلمان کو زہر دے کر اپنے عقائد سے آخرت کی بڑی نیکی اور دنیا میں حاکم اسلام کے مردم شناس خزانہ سے ناشناس نہ ہوتا۔ اور اس طرح امام اپنے لیے ایک محدوش اثر دار شخص کو دور کرنے کے لیے ذمی کو بھی اپنے مشورہ میں شریک کرتا ہے۔ بلکہ آگے چل کر وہ عورتوں کے حقوق کو بھی بیسویں صدی سے اس قدر نمایاں حیثیت سے تسلیم کرتا ہے کہ ذمیہ کو بھی شریک کر کے اس کے نواسے کو زہر دینے کے لیے کام میں لاتا ہے۔ جس نے عملاً ارسطو اور افلاطون کے نظریات کو اس طرح دکھایا جس پر یورپ کا بہترین قوم گر حیرت کیے بغیر نہیں رہ سکتا جس وقت وہ اپنی سیاسی احتیاط اور تعصب سے پاک ہوتا ہے۔

جناب امیرؑ بنی امیہ کی روش اور اس کے ممتاز افراد کو نہ صرف ان کے قبل الاسلام کارروائیوں سے جانتے تھے بلکہ اپنی خلافت کے قبل انھیں پورا موقع ملا تھا کہ اختیار کی حالت میں بنی امیہ کا ہاتھ پاؤں مارنا بھی دیکھتے اور ان کے طریقہ حکومت سے خلق اللہ کی بے اختیار چیخ بھی سنتے۔ اور اپنے حاکم ہونے پر یہ دیکھتا تھا کہ اب شام ان کا مرکز ہوتا ہے۔ جناب امیرؑ کا پہلے یہ موقع تھا کہ وہ خاموش دیکھتے لیکن اب خلق اللہ کی صدا نے انھیں اپنا امام تجویز کیا تھا، اور اب انھیں احساس تھا کہ ہم عملاً ذمہ دار ہیں۔ اور اس لیے کہ ہم مثالیہ حکومت کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ ہمارا یہ چاہنا کہ ہم جناب امیرؑ کی مثالیہ حکومت کو کچھ پیش کریں، یہ بھلانے کا ایک ذریعہ ہوتا کہ جناب امیرؑ اس دور سیاسی کو گوارا نہیں کر سکتے تھے جس کا خوف تھا۔ اور خود بھی ایک نظام حکومت کو نافذ کرنا چاہتے تھے جو اپنی اسپرٹ اور عمل میں قطعاً دوسرے مرکز پر تھا۔ طوالت کا خوف ہمیں فہرست مضامین اور مقابلہ یا شرح کی اجازت نہیں دیتا۔

حاکم مصر قرار دینے کے وقت مالک اشترؒ کو جناب امیرؑ کی ہدایات

میں ایک بیس بائیس صفحات کے فرمان کا محض نام پیش کرتا ہوں اور بیسویں صدی کے سخت ترین بے رحم سیاسی نقاد کو مدعو کرتا ہوں کہ وہ امام اول کے مظہرہ ہدایات پر حملہ کا کوئی جوف تلاش کرے۔ اے کاش کہ مسلمان ہمیشہ اس پر عمل کرتے اور اے کاش کہ دنیا کی وہ قومیں جنھیں اختیارات ودیعت کیے گئے ہیں اس کی اسپرٹ سے فائدہ اٹھاتیں اے کاش کوئی مسلمان ایسا نہ ہو جو اس خطبہ کا اصل یا ترجمہ پڑھ سکتا ہو اور نہ پڑھے۔ اگر وہ تمام خطبات نہیں پڑھ سکتا۔ میری غرض ان وصایا سے ہے جو جناب امیرؑ نے مالک اشتر کو حاکم مصر مقرر کرتے وقت کیے تھے۔ اس وصیت کا وقت بعد جنگ صفین ہے۔ جب بظاہر یہ امید تھی کہ اب اندرونی اصلاحات میں مشغول ہو سکیں گے اور وصیت اس شخص کو کی گئی ہے جس کے سیاسی خیالات ہم گزشتہ ابواب میں لکھ چکے اور جس کی جنگی کارروائیوں کے متعلق بھی ہم بہت کچھ کہہ چکے ہیں۔

کوئی کہے گا کہ حسینؑ کے سوانح نویس کو مثالیہ حکومت کے ذکر اور کسی نظام حکومت کی تفصیلی مثالوں سے یا اس کے تخلیق شیعوں کی کارروائیوں سے کیا بحث ہے در آنحالیکہ وہ مثالیہ حکومت حسینؑ کا شائع کردہ نہ تھا۔ ہاں حسینؑ کا شائع کردہ نہ تھا لیکن ان کے پدر بزرگوار کے غور، تجربہ اور مخلوقات الٰہی کے ساتھ ہمدردی اور ان کے حقوق کی نگرانی کا اظہار تھا جس میں چند اہل جاہ اور ثروت منظور نظر قرار نہیں دیے گئے تھے اور عامہ ناس کی وزنی لاش اپنی جگہ نہیں چھوڑ دی گئی تھی جس کا قلعی قومی اعضا میں التیام نہ پیدا کر سکے بلکہ دبتا جائے اور معاشرتی طبقات پیدا ہوتے جائیں بلکہ یہ سننا تھا کہ:
"عوام الناس کا غضب خواص کی خوشنودی کو باطل کرتا ہے اور خاص لوگوں کا خشم عوام کی خوشنودی کے ساتھ بخشا جا سکتا ہے"۔ یا سن رہے تھے کہ "قوت اور طاقت عامہ ناس ہی میں ہے"۔ بظاہر ایک ناہموار قومی زمین کے ہموار کرنے کے لیے یا پست بلند کیے جا سکتے ہیں یا بلند پست کیے جا سکتے ہیں۔ شق اول جہاں رعایا کے قابل ہمدردی طبقہ کی دستگیری ہے وہاں شق ثانی مصالح کے لحاظ سے کیسی ہی مفید کیوں نہ ہو نا انصافی سے خالی نہیں ہے۔ بنی امیہ اور وہ جن سے انھوں نے امورات سیاسی میں سبق لیا تھا بلند کو بلند کرتے تھے اور پست کو اپنی جگہ چھوڑ دیتے تھے جس کا نتیجہ قومی معاشرت کے لحاظ سے ایک بدنما افتراق تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ صاحب اثر واقف اور شریک تھے عامہ ناس جاہل اور بے اثر رہتے تھے۔

یہ قومی عناصر کے قوی کرنے کے اصول نہ تھا بلکہ قومی ناہمواری بڑھتی جاتی تھی۔ فطری انفرادی عروج و زوال سے اجزا علیحدہ ہوتے جاتے تھے جس سے ایک قوم سیاسی عدم مساوات کی بدولت اپنے ٹکڑے کرتی جاتی تھی۔ حکومت ایک مزاحم تھی التیامجاہدانہ تھی۔ اس کے برخلاف اسلام پست کو بلند کرتا تھا اور بلند کی بلندی سے کوئی تعرض نہ کرتا تھا۔ جس سے کسی کو کوئی منصفانہ اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔ حسینؑ کا موقع چاہتا تھا کہ وہ اس سے واقف ہوتے کہ چرواہا بھیڑوں کے کمالنے کے لیے نہیں ہے بلکہ ان کی ہر طرح کی حفاظت کے لیے ہے۔ اس لیے نہیں ہے کہ ان کا رزق کھا جائے بلکہ ان کی آسودگی کی فکر کرے۔ حسینؑ کو رومی اور ایرانی نظام حکومت اور ایک ایسے نظام کو بھنا اور فرق کرنا تھا جو منھم من اللہ کا جاری کردہ قانون یا اس کے احکام کی روح سے متاثر تھا جسے جناب امیرؑ نے فرصت پاتے ہی جاری کیا۔ اور جس سے مغائر نظام کے نفاذ سے اس کے پیشتر وہ خوش نہ تھے۔ پڑھو اور تم پر اثر ہوگا کہ خدا کے سفیر کا شاگرد بول رہا ہے۔ اسلام بول رہا ہے۔ خدا کا نمائندہ حکومت، حکومت اور مخلوقات کے فرائض بیان کر رہا ہے۔ جناب امیرؑ کا یہ نظام تھا جس کے علاوہ حسینؑ کی پسند کے لیے کوئی موجود کرنا مغالطہ کی سب سے بھدی کوشش ہوگی۔ یہ نہ صرف حسینؑ کے گھر کا شائع کردہ اصول تھا بلکہ انھیں ایسے نظام حکومت میں بسر کرنے کا بھی موقع ملا۔

آئندہ کے سیاسی موقع کا انعکاس

حسینؑ کو جناب امیرؑ کے بعد بہت کچھ دیکھنا تھا جس سے بڑھ کر ان کے لیے کوئی روح فرسا اور نفرت خیز منظر تلاش کرنا بے سود ہوگا۔ بلکہ حسینؑ کے اتفاقی یا ارادی نظام تربیت سے عدم تالیف کی مثال ہوگی۔ آگے موقع آنے والا ہے جہاں شاید بعض کے موافق حسینؑ پر سلطنت طلبی کا خیال عائد کیا جاسکے۔ اور بحث کے لیے اسے منظور کر لینے پر یہ سوال پر لطف ہوگا کہ تو پھر حسینؑ کی نگاہ میں کونسا مثالیہ حکومت ہوسکتا تھا؟ اور اس صورت میں بھی یہ کوشش ممدوح تھی یا نہ تھی۔ حالانکہ یہ زبردست سوال اس کے پیچھے رہے گا کہ آیا اپنے موجودہ سامان کے لحاظ سے حسینؑ کے لیے یہ اپنی قربانی کے یہ سوچنا ممکن تھا یا نہ تھا کہ اس سے ہمیں کوئی نفع ہوگا یا نہیں بلکہ اس کے بعد بھی یہ قربانی رہے گی۔ قربانی کے حقیقی مفہوم میں۔

یہ تو ناظر کے بطور خود تصفیہ کی چیز ہوگی کہ حسینؑ اپنے غیر کے نظام حکومت سے کب سے متنفر ہونے لگے اور کون کونسی حالتوں نے نفرت کے مدارج میں ترقی دی۔ اس وقت تو مثالیہ حکومت کے ضمن میں ہمیں یہ کہنا ہے کہ یہ ہونے والا نہ تھا کہ علیؑ کا عامل اپنے امام کے وصایا کے ساتھ اپنے عمل پر پہنچتے ہی پا تا چہ جائے کہ وہ اس مرکز سے حکومت شروع کرتا۔ اور اس کی باضابطہ اطلاع ان مضامین کے متعلق پائی جاتی۔ زہر کے ایک قطرے نے عالم سیاست کے اس پر امید تجربہ کا موقع نہ آنے دیا۔ اور لازماً اس کے اقتصادی نتائج نہ دکھائی دیے۔ حسینؑ اس سے واقف ہوتے۔ حسینؑ زہر دینے والے اس کی غرض اور خیال کو جانتے تھے بلکہ اس کے باپ کے بے احتیاط جوش کو دیکھ چکے تھے۔

لیکن ایسے تو ابھی دیر تھی کہ حسینؑ اپنے علم اور ارادہ کے ساتھ کھڑے ہوتے ابھی تو انھیں یہ دیکھنا تھا کہ میرے پدر بزرگوار اپنی ذمہ داری کے فرض کے ادا کرنے کے لیے مستعد ہو رہے ہیں۔ اور اپنے ایسے دشمنوں کے مقابلہ میں جس کی روش نصف صدی کے تجربہ پر اتر چکی ہے۔ نہ صرف بے جذبہ احتیاط سے کام لے رہے ہیں بلکہ ان کے کسی فعل کی نیت بجز اصلاح، عدم تفرقہ اور پابندی احکام الٰہی کے کچھ اور نہ تھی۔

حسینؑ اپنی قوت کا معائنہ کرتے ہیں

رقہ اور حران میں مالک اشتر کی کارروائیاں اپنے دشمن کے مقابلہ میں سنیں، جو گویا عملی تمہید تھی صفین کی نبرد آزمائی کی۔ اپنے پدر بزرگوار کو اپنے مختلف عمال کے پاس فرامین ارسال فرماتے دیکھا، اور یہ سلسلہ دیکھتے رہے کہ مختلف مقامات سے حکام فوج اور سامانوں کے ساتھ پہنچنے لگے۔ پرجوش فوج کا جاہ، اخلاص پسند افسروں کا شاندار معائنہ، تجربہ کار سپہ سالاروں کی مشغولیت اور انتظام اور پھر سب کا امیرالمومنین کے سامنے اس طرح جھکنا اور اطاعت کی وہ ناقابل بیان شان جو خوف اور تنخواہ سے ممتاز ہو ایک ایسا منظر تھا جسے دنیا نے بہت نہیں دیکھا ہے۔ میرے پاس اس استنباط کی وجہ نہیں ہے کہ موسیٰ، یوشع اور داؤد کو ایسا پراخلاص منظر کبھی دکھائی دیا۔ اگرچہ وہ فوجوں کے افسر رہے۔

مقدمہ فوج کو تجربہ کار افسروں کی ماتحتی میں روانہ ہوتے دیکھا اور دشمن کے مقدمہ کے شکست کی خبر سنی، راستہ میں فوج فوج لوگوں کو استقبال کے لیے حاضر ہوتے دیکھا۔ یہاں تک کہ پانی کے اس جسم بسیط کے پاس پہنچے جس کا نام فرات تھا اور جس کی نرم اور صاف لہریں نینوا کے ریگستانی ساحل کو ٹکراتی اور مغنی صدا پیدا کرتے ہوئے اس وقت کے تھکے ہوئے سپاہیوں کا آرام وہ استقبال کر رہی تھیں۔ فوجی افسر جانکاہ کوچ اور کسل مند سفر کے بعد ایسے موقع پر اپنے بچوں پر سے نظامی تربیت کی نگاہ اٹھا لیتے ہیں۔ دم لینے دیا جاتا ہے اور پیاسے سپاہیوں میں ٹھنڈے پانی کا ایک گھونٹ پھر سے حواس پیدا کر دیتا ہے۔ سپاہیوں کے بے قاعدہ جھنڈ لب ساحل پر پہنچتے ہیں اور اطمینان سے فطرت کی فیاضی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ ٹھنڈی، لطیف، کھیلتی ہوئی ہوا جان ڈالتی ہے اور خود بخود ایک سکون کا سناٹا چھا جاتا ہے۔

فرات کے دو منظر اور حسینؑ

کون جانتا ہے کہ اس وقت کہیں ساحل پر پہنچ کر جناب امیرؑ نے گھوڑے کی لگام روک لی ہو۔ حسینؑ بغل میں موجود ہوں اور ٹھنڈی ہوا کے ایک تموج کے لیے بند قبا کھول دیے ہوں۔ خاموش کچھ دیر گرد و پیش کے منظر دیکھتے رہے ہوں اور گھوڑے کنوتیاں بدل رہے ہوں۔ کون جانتا ہے کہ یہ وہی جگہ ہو جس سے حسینؑ کے آخری وقت کو تعلق تھا، اور وہ ایک جم غفیر سے جنگ کر کے بڑھتی ہوئی پیاس میں یہاں پہنچے۔ اسی گھوڑے کی لگام ڈھیلی کر دی اور بند قبا کھول دیے۔

کنارِ فرات کے ذبیحہ کے متعلق مختلف زمانوں کے مماثل خواب اور ملتے ہوئے الفاظ

کونسا مورخ ہے جس نے اس کے بعد جناب امیرؑ کے خواب کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ خواب جس میں دکھائی دیتا ہے کہ کھجور کے درختوں کی شاخیں زمین پر اپنے سر پٹک رہی ہیں۔ میدان میں خون جوش مار رہا ہے۔ اور حسینؑ اس میں غوطے کھا رہے ہیں۔ اور پھر نائب رسولؐ اس یقین کی حد تک متاثر ہے کہ حسینؑ کو طلب فرمایا ہے۔ صبر اور ثابت قدمی کی نصیحت کرتا ہے اور مصیبتوں کے پہلے تیار رہنے کی ہدایت فرماتا ہے۔

ہم کیوں حیرت زدہ ہوں اور تخیل کی جولانگاہ میں کھو جائیں جب یرمیاہ ۴۶ باب کی دسویں آیت کہتی ہے کہ:

"خداوند رب الافواج کے لیے اُتر کی سرزمین میں دریائے فرات کے کنارہ ذبیحہ مقرر ہے"۔

یا مکاشفات یوحنا میں "برہ" اور اس کی مصوری اس کی صفات اور حقوق کا تذکرہ ہے۔ کیا حق تھا توریت اور

انجیل کے اوصیا کو جو قرآن کے نبیؐ کے وصی کو نہ ہو سکتا اور ایسے ہی مکاشفات اسے نہ ہوتے۔ اگر یہ تینوں باتیں کسی کے لیے حیرت خیز مناسب تاریخی رکھتی ہیں اور تین پیشین گوئی کے اکثر الفاظ ملتے ہیں تو وہ محض حسینؑ کی شہادت ہے۔ یرمیاہ کا زمانہ دور تھا یوحنا کا زمانہ دور تھا۔ اگر ان سے سوال بھی کیا جاتا تو وہ صریح جواب نہ دے سکتے تھے۔ لیکن زیرِ ذکر زمانہ تھا کہ یرمیاہ کے "ذبیح" اور یوحنا کے "برہ" کو "ید اللہ" اپنی ہتھیلی کی سایہ میں لے لیتا اور فرما سکتا کہ دیکھو خدا کے حقیقی تخت کا مالک میرا یہ فرزند ہے!۔

يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ

ہم بعض سلسلہ خیال کی وضاحت کے لیے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے قصہ کا اپنے "ہدایت نامہ" سے ترجمہ پیش کرتے ہیں کہ: "اے فرزند میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں۔ پس تو سوچ کہ تیرا دل کیا کہتا ہے۔ کہا: اے باپ! جو کچھ تم کو حکم دیا جاتا ہے کرو۔ تم دیکھو گے کہ انشاء اللہ میں اس کو برداشت کروں گا۔ پس جب دونوں راضی ہو گئے اور (ابراہیم نے اسمٰعیل کو) ماتھے کے بل لٹایا تو ہم نے اسے پکارا کہ اے ابراہیم تو نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا۔ بے شک ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں احسان کرنے والوں کو۔ بلاشبہ یہ تو بہت ہی سخت امتحان ہے۔ اور ہم نے اسے ایک بڑی قربانی کے بدلے بچا لیا اور اس کو پیچھے آنے والوں میں چھوڑا"۔ (والصافات ۳۷ : ۱۰۲ تا ۱۰۸)

کون جانتا تھا کہ ابراہیمؑ کا رویائے صادقہ ایک آگ ہوگی جس کی چنگاریاں تخفیف نفوس مذکی سے نکلیں گی۔ شواہد النبوۃ میں حضرت ام سلمہ سے روایت ہے کہ انھوں نے جناب رسالت مآبؐ کو متحیر اور پریشان دیکھا اور حضرت ام سلمہ کے سوال پر فرمایا کہ: "امشب مرا بہ موضعے بردند از عراق کہ آن را کربلا گویند و جائے قتل حسین رضی اللہ عنہ و جماعۃ از فرزندان من نمودند"۔

یعنی: آج رات مجھے عراق میں ایک مقام پر لے گئے جسے کربلا کہتے ہیں اور حسینؑ اور میرے بچوں کی ایک جماعت کی قتل گاہ دکھائی۔

رسولؐ اس کے اس زخم کو بھی دیکھیں گے کہ ان کے منبر پر بندر چڑھ آئے ہیں۔ مکاشفات ہوں گے اور حسینؑ کی رسولؐ کے زمانہ کی مختصر حیات کئی مرتبہ شہادت کی پیشین گوئی کا مرکز ہو جائے گی۔ جناب امیرؑ ٹھیک اسی جگہ فطرت کے نامعلوم ذرائع سے ایسے اشارے پائیں گے جس سے کچھ زمانہ بعد کا آنے والا واقعہ ان کی نگاہوں کے سامنے پھر جائے گا۔ اور وہ ابراہیمؑ کے فرزند کو آئندہ ذبح عظیم کے لیے تیار کریں گے، جو آخرین کے لیے اٹھا رکھا گیا تھا۔ طبعاً جناب امیرؑ اور ابراہیمؑ کے جذبات محبت اور اثر میں یک جہتی تھی۔ ضرور حضرت ابراہیمؑ نے سخت امتحان دیا۔ لیکن آخر میں خوش ہوئے۔ مولانا علیؑ بن ابی طالبؑ کی بے چینی ایسی نہ تھی جو زائل ہو جاتی۔ کیونکہ شخص، زمانہ اور مقام معلوم تھا۔ باپ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور ذبیح کے سرِ اقدس پر دستِ شفقت پھیر رہا تھا۔

یہ بھی اتفاق تھا کہ شام کا لشکر فرات پر قبضہ کر لیتا اور جناب امیرؑ کے افسران لشکر پہلی مرتبہ یہ سن کر کہ "جنھوں نے چالیس روز تک عثمان کو پانی نہ دیا یہ لوگ مستحق عذاب ہیں"۔

بنی اُمیہ سے نہرِ فرات کا چھینا جانا اور حسینؑ

آج بزورِ شمشیر پانی کو اپنے قبضہ میں لاتے اور پھر جناب امیرؑ کے بشری حق شناسی اور رحم سے دشمن کو محروم نہ رکھتے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ فرات پر قبضہ کرنے کی جنگ میں حسینؑ شریک تھے یا نہ تھے۔ صاحبِ ماتم کدہ کے نزدیک گھاٹ چھیننے والی فوج کے افسر حسینؑ تھے۔ لیکن شریک جنگ نہ بھی تھے تو یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ غور سے دیکھتے نہ ہوں۔

میدانِ جنگ میں باپ اور بھائی کی بعض مثالیں اور حسینؑ

یہ بھی ہونے والا تھا کہ جناب امیرؑ عرب کے رسم اور حکم قرآن کے لحاظ سے محرم میں جنگ ملتوی رکھتے۔ اور اس زمانہ کے ختم ہونے کے بعد حسینؑ سواران میمنہ کی افسری میں اپنے برادر معظم کے شریک رکھے جاتے۔ کسی موقع پر دیکھتے کہ ان کے برادر معظم سے کسی سیاسی فریب کی باتیں کی گئی ہیں اور ان کے جواب سے قوت حاصل کرتے۔ ملاحظہ فرماتے کہ امیر شام ابن عمر اور ان کے خاتمہ کو کسی کام میں لایا۔ لیکن سب سے دلچسپ مطالعہ کی چیز جناب امیرؑ تھے، جن کی ایک شان یہ بھی تھی کہ مرتے اور مرتے ہوئے کی کس درجہ دلدہی اور سرفرازی فرماتے ہیں۔ حسینؑ کو سخت ترین موقع پر یہ فرض ادا کرنا تھا۔

صفین میں حسینؑ کے جنگ کی شان

باوجودیکہ اس کی تفصیلی خبر نہیں ہے کہ حسینؑ صفین میں کیونکر لڑے اور ان کی شرکت جنگی حیثیت سے کوئی نمایاں شان رکھتی تھی یا نہیں لیکن مالک اشتر کی تعریف کا موجود ہونا اس کی بہترین سند ہے کہ حسینؑ کی جنگ بھی ایسی تھی جس کا تذکرہ یہ وحید عصر شجاع اپنے رجز میں شامل کرلیتا۔

صفین کا تغیر اور حسینؑ

کس نے خواب دیکھا تھا کہ بنی ہاشم اور ان کے ہوا خواہوں کے بڑھے ہوئے دل، ان کی فاتحانہ شان اور آئندہ کے درستی نظام کی امیدیں دفعتًہ یاس کی سخت اور خلاف امید چوٹ کھائیں گے۔ ایسی چوٹ جس کے بعد پھر نہ سنبھل سکتے۔ اس کے بعد حسینؑ تھے ان کی آنکھیں تھیں۔ قصہ قرآن تھا، حکمین تھے اور ان کی ضمنی کارروائیاں تھیں۔ کچھ دیر قبل کے مطیع سپاہی اور لوگ تھے جو سخت دشمن سے زیادہ مضر ثابت ہوئے۔ اس کے بعد قیاس آسان ہے کہ فریب میں آنے والے اور فریب دینے والوں سے حسینؑ کا تنفر کس درجہ کا ہوگا۔

باپؑ کے بعد کی ذمہ داریوں کا احساس

جناب امیرؑ کوفہ واپس تشریف لائے۔ اس کا شکر کرتے ہوئے کہ وہ گزشتہ امتحانوں میں حق سے نہیں ہٹے اور اب وقت تھا کہ علیؑ کی اولاد جناب امیرؑ کے وداع کا پہلا جانگداز پیام سنتے اس لیے کہ وہ جناب اپنی اولاد کے لیے آئندہ کا انتظام فرما رہے تھے اور وصیتیں کر رہے تھے۔ اور پہلی مرتبہ وصیت نامہ کے اس فقرہ سے کہ: "اگر حسنؑ کو کوئی حادثہ پیش آئے اور حسینؑ زندہ ہو تو اس کے بعد وہ اس حکم کے ساتھ قیام کرے" حسینؑ آئندہ بعض ذمہ داریوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے صورت پذیر ہوتے دیکھ رہے تھے۔

جناب امیرؑ کی اپنے فرزندوں کی تعلیم پر توجہ اور حسینؑ

اور اگرچہ جناب امیرؑ اپنی وصایا میں خاندان کے آئندہ ذمہ دار کو مخاطب فرمارہے تھے لیکن یہ قیاس نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے اپنی اور اولاد خصوصاً حسینؑ کو اس سے علیحدہ رکھا ہو۔ کیونکہ حسینؑ کی عمر میں کوئی زیادہ فرق نہ تھا۔ جس سے قیاس کیا جاسکتا کہ حسینؑ اس قدر چھوٹے تھے کہ اپنے بڑے بھائی کی تعلیم سے فائدہ نہ اٹھاسکے۔ روایتیں تو چھ سات مہینہ کا فرق بتاتی ہیں، مگر برس ڈیڑھ برس کا فرق بھی کوئی فرق نہ ہوتا۔ اس بنا پر یہ صاف ہے کہ جناب امیرؑ حسنؑ کی طرح تمام اولاد خصوصاً حسینؑ کے لیے فرماتے ہیں کہ "تیرے ہر کام میں ہر جگہ میں نے اپنی توجہ کو لازم کیا جیسا ایک شفیق باپ کا فرض ہے۔ میں نے تیرے کام کے موافق تیرے ادب سکھانے کا عزم بالجزم کر لیا تھا کہ جب تو نوجوان ہو، صاحب نیت سلیم ہو اور ایک صاف و شفاف نفس کا مالک ہو تو تجھے کتاب اللہ عزوجل کی تعلیم دوں۔ اس کی تاویل پر عبور کرادوں۔ اسلام کے طریقے اور اس کے حلال و حرام تجھے سکھادوں اور اس تعلیم کے غیر کی طرف تجھے تجاوز نہ کرنے دوں۔ پھر مجھے خوف ہوا کہ مبادا تجھ پر وہ علوم و معارف مشتبہ ہوجائیں جن میں لوگوں نے اپنی نفسانی خواہشوں اور فاسد رایوں کے سبب سے اختلاف کیا ہے اور وہ ان پر مشتبہ ہوگئے ہیں۔ پس میں نے اس کو مضبوط و محکم کردیا۔ اس لیے کہ تجھے آگاہ کردینا میرے نزدیک اس سے محبوب تر تھا کہ میں تجھے ایسے امر کے حوالہ کردوں جس میں تیری ہلاکت سے بے خوف نہیں ہوں"۔

جماعت کی ابتری کا نظارہ اور حسینؑ

تحکیم کی کارروائی کے بعد جناب امیرؑ کو یہ فرماتے سنا کہ: "دونوں راہ راست سے علیحدہ رہے۔ پس اس حکم و فیصلہ سے اللہ اور اس کا رسولؐ اور صلحاء امت بری ہیں لہٰذا تم لوگ شام پر حملہ کرنے کی تیاری کرو"۔ خوارج کا انقلاب طبیعت اور ناشنوی اور اپنی فوج اور نظام کی دوبارہ فتح دیکھی اور پھر یہ حیرت خیز تماشہ دکھائی دیا کہ شام پر کوچ کرنے کے لیے عذر مہیا ہوگئے۔ اور عذر بیان کرنے کا وکیل اشعث بن قیس قرار دیا گیا۔

انفرادی عزم اور حسینؑ

اس کے بعد تساہلی گویا قوم کا ایک مستقل مرض ہوگیا۔ جو ان خبروں سے ظاہر ہوتا گیا کہ امیر شام نے سرحدی مقامات اور اندرونی شہروں پر چھاپے مارے لیکن کوئی جناب امیرؑ کی ملامتوں نصیحتوں اور انجام نمائی سے اس طرح متاثر نہ ہوا کہ شام کے ایسے حملے ہمیشہ کے لیے روک دیے جاتے جن میں سب سے زیادہ افسوسناک نتیجہ یہ تھا کہ محمدؒ بن ابی بکر شہید ہوگئے اور انھیں واقعات میں یہ بھی دیکھا کہ جناب امیرؑ نے ہیت یا انبار کی طرف تنہا روانہ ہونے کا عزم ظاہر فرمایا۔ یہ صورت اس تعلیمی قابلیت سے پر تھی کہ انسان اپنے فرائض کے انجام کے لیے اپنا انفرادی عزم ظاہر کرسکتا ہے۔ اگرچہ وہ اس حیثیت سے زیادہ مفید نہ ہو کہ تنہا کے عزم سے زیادہ کار بھاری نہیں ہو سکتی۔ لیکن کسی نتیجہ کا موافق ہوتا یا نہ ہوتا اپنی ذمہ داری سے بری نہیں کرسکتا۔ جناب امیرؑ کا یہ عظیم الشان عزم حسینؑ کے ناقابلِ مثال ارادے کا پیشرو تھا۔

دشمن کی بعض حرکتوں کا معائنہ

اگر اپنی روش کی پختگی تجربہ سے ثابت ہوتی تھی تو لوگوں کے عدم اطاعت کے نتائج بھی دیکھے تھے۔ دشمن کے فریب جو رشوت،

سازش اور زہر کی شکل میں ظاہر ہوتے تھے کوئی پوشیدہ خبر نہ تھی لیکن یہ واقعات بھی تجربہ میں آنے والے تھے کہ دشمن با وجود انکارِ اسلام نہ کرسکنے کے حاجیوں کے محافظ سپاہیوں کو قتل کرسکتا ہے اور لوگوں کو فریضہ حج سے اس لیے مانع ہوسکتا ہے کہ اس کی سیاسی شہرت کے لیے مفید ہے۔

اور سب پر طرہ یہ تھا کہ ایسے وقتوں میں مدینہ کی وقتی گورنری کے موقع کو ابوہریرہ ضائع نہ جانے دے سکتے تھے اگرچہ وہ ابن ابوسفیان کے ہاتھ سے ملا ہو۔ جس کی قبضہ کی دلیل یہ تھی کہ اب تک وہب بن مسعود فوج لے کر جناب امیرؑ کی طرف سے نہ پہنچے تھے۔

ارادہ کا استقلال اور حسینؑ کا فوجی عہدہ

ہوتا جو کچھ ہوتا لیکن جناب امیرؑ اپنی جگہ پر موجود تھے۔ شورشیں اور ان کا مجموعہ ایسا نہ تھا جو جناب امیرؑ کے سکون اور اطمینان پر اس قدر اثر کرسکتا کہ وہ اپنے عزم سے باز آتے۔ نہروان کی جمع کی ہوئی فوج عذر کرچکی تھی تو کیا درمیانی خلاف ورزیاں اور تساہلی ظاہر ہوچکی تھی۔ ہوئی لیکن انھیں وقتوں میں جناب امیرؑ نے یہی کیا کہ ۴۰ھ میں ابوایوب اور قیس بن سعد کے ایسے معتبر افسروں کے علاوہ دس ہزار فوج اپنے فرزند حسینؑ کی ماتحتی میں نامزد کرسکتے۔ نہ اس کے قبل کہ حسینؑ جمل، صفین اور نہروان کے معرکہ دیکھ چکے ہوتے اور ان میں شرکت کی ہوتی۔ اے کاش یہ فوج روانہ ہوجاتی کہ اسلام بعد کے برے دن نہ دیکھتا۔

جناب امیرؑ کی حالت زخمداری، الفاظ، عمل اور حسینؑ

روانگی کا دن نہ آیا۔ زہرآلود تلوار حائل ہوگئی جو ملک اور عورت نے تیار کی تھی۔ حسینؑ کے علم میں یہ بھی آتا تھا کہ انسان اپنے ملعون ارادے کے اجرا کے لیے نماز کی مشغولیت سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور وہ غفلت میں شہید کیا جاسکتا ہے جس کے میدانِ جنگ میں شہید نہ ہونے پر شجاعت روتی۔ حسینؑ اس وقت پہنچے جب کہ شملی، صحن مسجد اور محراب شہید کے خون سے مقدس ہوچکے تھے۔ اور باپ کے سر سے خون کی چادر نے چہرہ اقدس کو پہچاننے کے قابل نہ رکھا۔ لباس رنگین ہوچکا تھا۔ لیکن حسینؑ کے سننے کی بات یہ تھی کہ ادھر تلوار مغز سر پر پہنچی اور ادھر زبان نے "فزت برب الکعبۃ" کہا۔ اور مراسم دین کے اجرا کا یہ لحاظ دیکھنا تھا کہ حسنؑ کو نماز تمام کرنے کا حکم دیا جاتا۔

شدید ضرب اور اس کا ضمنی کرب ہوتا۔ ہوتا لیکن علیؑ ہوتے اور وہ اپنے فرض کو دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھتے، یہ ناممکن تھا۔ قاتل آتا ہے اور خدا کے رحم و کرم کا مجسمہ اس کے ساتھ برتاؤ سے خلق خدا کو حیرت زدہ کرتا ہے۔ وہی جو جمل میں حالت جنگ میں پیاس کے وقت شہد کا شربت پی رہا تھا اور اس پر متاسف تھا کہ دشمن بھی پیاسا ہوگا۔ وقت تھا کہ "اپنی ذات اور اپنے گروہ کی اصلاح تمام روزہ و نماز سے افضل" بتائی جاتی۔ اور کہا جاتا کہ: "اے اولاد عبدالمطلب! میں تمھیں ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ تم مسلمانوں کے خون میں سر سے پاؤں تک رنگین ہوتے پھرو۔۔۔۔۔"۔ فرماتے کہ: "سچی باتوں پر زبان کھلے"۔ یا "ظالم کے دشمن رہنا اور مظلوم کے مددگار"۔

وہ نہ رہا جس نے حسینؑ کو حسینؑ بنایا تھا

حسینؑ کے لیے اپنے پدر بزرگوار کی شہادت قریب قریب ویسی تھی جیسے جناب امیرؑ کے لیے

رسولؐ کی رحلت تھی حسینؑ پر اپنے جد بزرگوار اور مادر عالی مقدار کا جیسا اور جس درجہ اثر پڑا وہ جوش کی کیسی ہی کمی کے زمانہ کا کیوں نہ ہو لیکن کسی طرح تھوڑا نہیں سمجھا جاسکتا۔ لیکن ابتدا سے آج تک جب کہ حسینؑ چھتیس برس کے ہو چکے تھے ان کی خصائل سازی زیادہ تر علیؑ کی آنکھ، علیؑ کی زبان اور علیؑ کی موجودگی اور ان کے واقعات سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ نہ رہا جس نے حسینؑ کو حسینؑ بنایا تھا۔

جناب امیرؑ اور حسینؑ کی حالتوں میں ایک فرق یہ تھا کہ رسولؐ کے بعد جناب امیرؑ کو امید تھی اور دفعۃً یاس دکھائی دی۔ پھر بھی تشدد کا مسلسل ظلم درست نہ ہوا تھا۔ لیکن حسینؑ تک پہنچتے پہنچتے زمانہ نے تجربہ سے مدد کی تھی اور اب دشمن "رہنے دو" پر عمل کے لیے آمادہ نہ تھا بلکہ رہنے دینا اپنی سیاسی حیات کے لیے مخدوش سمجھتا تھا۔ منازعت کا سلسلہ جاری تھا اور صفات قومی کے وہ تغیرات دیکھ چکے تھے اور دیکھ رہے تھے جو کسی طرح امید افزا نہ تھے۔ قوم اب حیات سے ہر طرح جینے کی ذلتوں پر آمادہ تھی موت سے پر عزت حیات خریدنے پر آمادہ نہ تھی۔ اس کی کارکنی کی قابلیت پر تساہلی کا فالج گرا تھا۔ اور دوا پینے سے انکار کر رہی تھی۔

صحیح ہے کہ شبیب بن نخبہ، حجر بن عدی اور قیس بن سعد کے ایسے چند بے مثال دوستوں کی نگاہ میں چالیس ہزار بلکہ اس سے زیادہ مسلح سپاہی دکھائی دے رہے تھے لیکن ان کی غیرت اور اخلاص کا جوش حالت کے سمجھنے میں مبالغہ کر رہا تھا۔ وہ بے کار غول کو باکار سمجھنے کی امید کر رہے تھے۔

ترغیب جہاد پر آمادہ نہ ہونا، الٹے عذر ڈھونڈتے رہنا، اور بات بات پر بگڑنا قوم کی حالت کو اچھی طرح بتا رہا تھا۔ اور وہ جو قومی حیات کے سرپر تھا، اسے ایسے مواد سے بہتری کی امید اور دشمن سے مقابلہ کرنے کا عزم کرنا خودکشی سے بہتر نہ معلوم ہوتا تھا۔ جو قوم اپنے رہنما کو لوٹ سکتی تھی اور اسے زخمی کر سکتی تھی کہ آئندہ وہ نہ رہے جو ہمیں کچھ حکم دے سکے وہ اس قابل نہ تھی کہ اس کے بھروسے پر قومی دشمن کے مقابلہ میں تلوار سے فیصلہ کیا جاسکتا۔ مختصر یہ کہ حسنؑ کا زمانہ اور اس کے تمام اتفاقات جن کی ضروری حیثیتوں سے کافی بحث کی جاچکی، اس کا بہترین نمونہ تھا کہ کیونکر کوئی قوم اپنے ہاتھ سے اپنے اختیار اور آزادی اور صفات قومی کو تباہ کرنے کے لیے آخری ضرب لگاتی ہے۔ اور بقول تاریخ خمیس اس کا یقین تھا کہ یہ "لشکر غالب نہ آئے گا"۔ جس نے حسنؑ کو ایسی افسری سے دست بردار ہونے پر مصمم کردیا، اس لحاظ سے کہ امیرالمومنین نے قوم کی امامت ان کی امید اطاعت اور پیروی کے خیال سے اپنے ذمہ لی تھی۔ جب کہ وہ خود ہم آوازی سے ایسا کہہ رہے تھے۔ اس کا یقین ہے کہ مسلسل خلاف ورزیاں رہنے کی صورت میں امیرالمومنین بھی دست بردار ہو جاتے بلکہ انھوں نے ان لفظوں سے ابتدا بھی کردی تھی کہ "میں اس بات کو دوست رکھتا تھا کہ تمھیں نہ دیکھوں اور تمھیں نہ پہچانوں"۔ یہ حالتیں حسینؑ کے لیے پرغور تجربہ کی چیزیں تھیں۔ آئندہ حالتیں بتائیں گی کہ اس کا حسینؑ پر بڑا اثر تھا۔

صلح کے متعلق حسنؑ اور حسینؑ کے خیال میں

لیکن صلح کے وقت حسینؑ کے بعض الفاظ اور انداز ہیں جس سے قیاس کیا جاسکے کہ ان کا

تناقض نہ تھا بلکہ موقع کا فرق تھا

تصفیہ متذکرہ صدر خیال سے الگ تھا یا مختصر لفظوں میں وہ اس سے الگ سوچتے تھے جو کچھ بظاہر حسنؑ نے تصفیہ کیا تھا۔ باوجود ایسی مختصر خبروں کے جن پر حتمی تصفیہ نہ کیا جاسکے مجھے اس کے قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے کہ حسینؑ وہی کچھ سوچتے تھے جیسا قیس بن سعد، مسیّب، عُبید بن عمر، حجر یا سفیان بن لیلی کا خیال تھا۔ مجھے عجب ہوتا اگر حسینؑ یا معدودے چند لوگوں کا ایسا خیال موجود نہ ہوتا اور اس وقت میں یہ تصفیہ کرتا کہ قوم میں ایک شخص بھی باقی نہ رہا تھا جسے اپنے قومی وقار کی حفاظت کا خیال ہوتا اور گزرتی ہوئی سیاسی حیات پر ٹھنڈی سانس لیتا۔ لیکن کسی ایسے معترض کی غلطی وہاں ہے جہاں وہ حسنؑ اور حسینؑ کی تصفیہ میں تناقض خیال کرتا ہے۔ وہ تناقض کے نہ صرف درجہ مفہوم میں مبالغہ کرتا ہے بلکہ وہ انفرادی فرائض کو بھی بھول جاتا ہے۔ حسینؑ ہوں یا یہ چند مخلصین یہ عامہ مسلمین کی طرح ایک حیثیت رکھتے تھے۔ جنھیں اپنے اخلاص، ارادے اور جوش کے ظاہر کرنے سے کوئی امر مانع نہ تھا لیکن حسنؑ کی حیثیت بہ لحاظ ذمہ دار امام ہونے کے دوسری تھی۔ انھیں زیر نظر امورات کا تصفیہ چند بے خوف مخلصین کے اظہار ارادت پر کرنا ناممکن تھا۔ اور ناممکن تھا کہ وہ بقیہ قوم کی تساہلی اور بے کاری کا لحاظ نہ کرتے۔ کون سوچ سکتا ہے کہ حسنؑ کے تمام خیال اور امید میں یہ نہ تھا کہ اے کاش تمام قوم اس وقت ان چند مخلصین کی غیرت قومی کی مظہر ہوتی۔ اب یہ تصفیہ آسان ہے کہ چند آدمیوں کے اعتبار اور بھروسے پر وہ صلح نہ کرتے یا اپنی اس حالت پر قیام کرنا قطعاً بے سود کچھ کر چند مفید شرائط کی اخلاقی قوت پر اعتبار کرکے صلح کرتے۔ سیاسی اقتدار کا قائم رکھنا چند آدمیوں اور فوج کی بے قوتی سے ممکن نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ قوم سے اپنے سیاسی حیات کا حسن جاتا رہا ہو۔

ان صورتوں کے لحاظ سے جن میں حسنؑ نے صلح کی کون کہہ سکتا ہے کہ خود حسنؑ کو اس صلح سے ویسی ہی "کراہت" نہ تھی جیسی حسینؑ کو تھی۔ لیکن جس وقت موقع یہ تھا کہ حسینؑ بحیثیت جماعت قومی کے ایک فرد ہونے کے اپنی کراہت اور صلح سے ناخوشی ظاہر کرسکتے تھے۔ حسنؑ کی مصلحت کی روح یہ تھی کہ ہم اس ناگزیر موقع سے اظہار کراہت کرکے اس صلح کے اس قدر اثر کو بھی کھو نہ دیں جو چند روز کے بعد دشمن کے جبر سے حاصل نہ ہو اور پھر زبانی باتوں کا بھی موقع نہ رہے۔ حسنؑ کا کوئی اظہار کراہت اقدام صلح کی آپ ہی تردید تھی درآنحالیکہ عدم صلح میں قومی حقوق کی حفاظت کا کوئی سامان نہ تھا۔ اس قدر بھی نہ تھا جیسا اس صلح کے بعد ہو۔ یہاں وہی کراہت جس کا ظاہر کرنا حسینؑ کا فرض تھا۔ حسنؑ کے لیے ظاہر نہ کرنا فرض تھا۔ کراہت دونوں میں قدر مشترک تھی۔

کوئی اور آگے بڑھ سکتا ہے کہ بہ لحاظ اس کے کہ حسنؑ نے ایک امر کیا تھا کسی طرح مناسب نہ تھا کہ حسینؑ اظہار کراہت بھی جائز رکھتے۔ ایسا سوچنے والے نے اس پر غور نہیں کیا کہ صلح کا اخلاقی اثر صلح کے اعلان تک رہا، اور بس، اور اس کے ساتھ ختم ہوگیا جب معاویہ نے صلح کا "سرا میرے ہاتھ میں ہے اس پر وفا کروں یا نہ کروں" حسینؑ کی کراہت اس اعلان کے یقیناً بعد تھی۔ اس کے بعد نہ صرف حسینؑ بلکہ کسی کو اظہار کراہت کا حق تھا۔ حسنؑ بھی اظہار کراہت کرتے اگر کرسکتے۔ صلح حدیبیہ اس وقت تک تھی جب تک شرائط پر عمل درآمد تھا۔ صفین اور حکمین کا مجھوتا اس وقت تک نافذ رہتا جب کوئی تصفیہ ہوتا جس پر فریقین عمل کرسکتے۔ اگر نقض عہد پر رسولؐ فتح مکہ اور جناب امیرؑ دوبارہ فوج کشی کے

سامان کرسکتے تھے تو حسنؑ بھی نقض عہد کے بعد فوج کشی کرتے اگر کرسکتے۔
نہ کسی کا آمادہ ہو کر جنگ کرنا انفرادی حیثیت سے امام کے خلاف ہوسکتا، اس لیے کہ انھوں نے وجہ ظاہر کرکے کہ ہم تمھاری جانوں کی حفاظت کے لیے صلح کرتے ہیں ہر شخص کو اپنی جگہ سوچنے کا موقع دیا تھا کہ اگر تم جان کی حفاظت ضروری نہیں سمجھتے تو تمھیں اختیار ہے۔ اس طرح کسی کا کسی اہتمام سے جنگ کرنا عمومیت صلح کی اس وقت تک نفی نہ کرتا جب تک خود حسنؑ شرکت جنگ نہ کرتے۔ اور اس طرح اس کے بعد بھی وہ شرائط صلح کی نفاذ پر زور دے سکتے تھے۔ باوجود ایسی صورت کے وہ حسنؑ کی خوشنودی کے لحاظ سے ہو یا اپنی کراہت کے باوجود حسنؑ کے تصفیہ کی پختگی کے طبعی اقرار پر ہو۔ حسینؑ کسی ایسے امر پر آمادہ نہ ہوئے جو حسنؑ کے تصفیہ کے خلاف روش کہی جاسکتی۔
ابن اثیر کے اس فقرہ میں کہ "اپنے باپ کی تکذیب اور معاویہ کی تصدیق نہ کیجیے" اگر "تکذیب" اور "تصدیق" کے الفاظ حسینؑ کے استعمال کردہ الفاظ نہیں ہیں، بلکہ کسی قریب المفہوم لیکن کم کرخت الفاظ کے اس لیے قائم مقام قرار دیے گئے ہیں کہ حسینؑ کی مخالفت ظاہر کریں تو زیادہ بحث کی چیز نہیں ہے لیکن اگر بالفرض محال یہی الفاظ استعمال کیے گئے تو یہ فقرہ غالباً جوش کی پہلی لہر کا تھا۔ جس میں سختی سے یہ کہہ رہے تھے کہ اپنے پدر بزرگوار کی اس روش کے خلاف نہ کیجیے کہ وہ برابر معاویہ سے جنگ کرتے رہے اور انھوں نے اس کی امارت کی تصدیق نہیں کی۔ جو آپ کررہے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ہی موقع کی حقیقت سامنے آگئی اور اب حسینؑ کا تصفیہ ان کی خاموشی سے ظاہر تھا۔ اگرچہ حسینؑ کے اس فقرہ کا جواب بھی دیا گیا کہ ہم نے اس مصلحت سے معاویہ کو حکومت سپرد کردی " جو وجہ تمھارے پدر بزرگوار کو داعی تھی۔ اس سے پیشتر کے زمانہ میں "حسینؑ روتے ہوئے حسنؑ کے پاس گئے تھے لیکن ہنستے ہوئے باہر آئے۔
اب تک جو کچھ میں کہہ رہا تھا اس امر کے تسلیم کرنے پر تھا کہ حضرت امام حسینؑ اپنے برادر عالی مقدار کے تصفیہ پر اس قدر ناخوش تھے کہ صلح نامہ کو اپنے اوپر نافذ نہ سمجھتے۔ لیکن اگر روضۃ الصفا پر اعتبار کیا جائے جس کے موقع اور لہجہ کو میں زیادہ تر مطابق واقعہ سمجھتا ہوں تو حسینؑ کی روش میں حسنؑ کے تصفیہ سے کوئی ادنی اختلاف نہیں دکھائی دیتا کہ علیؑ بن بشر وجہ مصالحت یا شرائط سننے کے بعد حسینؑ کے پاس جاتا ہے اور انھیں بیان کرتا ہے اور حسینؑ مدبرانہ خنک مزاجی سے فرماتے ہیں کہ "ابو محمد (حسنؑ) نے جو کچھ فرمایا وہ حق اور مطابق صدق ہے، جب تک معاویہ زندہ ہے اب بجز اس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہر شخص اپنے گھر میں بیٹھا رہے"۔ اس جگہ مجھے ان فقرات میں کوئی ایسے انداز نہیں معلوم ہوتے جیسے کوئی خرد اپنے کسی بزرگ کے ہر فعل کو تسلیم و رضا سے دیکھتا ہے۔ بلکہ حضرت امام حسنؑ کی تقریر پوری آنکھ سے دیکھی گئی ہے۔ اور تقریر کے پرانے حوالے "حق" اور جن وجوہات پر صلح کی ضرورت محسوس ہوئی وہ "مطابق صدق" کہے گئے ہیں۔ اور چونکہ شرائط کے بموجب معاویہ کے بعد خلافت حسنؑ یا حسینؑ کی طرف عود کرتی تھی۔ و نیز اس وجہ سے کہ اس کے بعد لوگ پھر ایسا کچھ سوچ سکتے تھے جو بنی ہاشم کی طرف میلان کہا جائے اس صورت میں زیادہ مناسب یہ سمجھا گیا کہ اس وقت اپنی بے قوتی اس فقرہ میں چھپائی جائے کہ "جب تک معاویہ زندہ ہے ـــــ" یعنی معاویہ کے ایسے صاحب اثر اور سیاسی تفنن کے آدمی کے برسر حکومت نہ ہونے کے بعد اگر خلاف ورزی ہوئی تو اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ یہ بجائے خود جس قدر پابندی عہد تھی اسی قدر مدبرانہ انتظار تھا، اور چونکہ اپنے صلح کے اقدام اور اپنے بے مثل اظہار ایثار سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف

مائل کر چکے تھے اور اپنی روش سمجھا چکے تھے۔ زیادہ قرینہ تھا کہ زمانہ انتظار ان کے لیے مفید ہوتا اور یہ زمانہ اعراف ان کے دوست تیار کرتا۔ معاویہ بھی اسے سمجھتا تھا اور پوری سیاسی بے اعتباری سے آئندہ اپنے خیال کے لیے برسوں راستہ تیار کرتا رہا۔ لیکن اس وقت تک پہلا قدم نہیں اٹھا سکتا تھا جب تک حسنؑ دنیا میں موجود تھے۔

حسینؑ سے معاویہ کی طلب بیعت اور بھائی کے متعلق بھائی کا بیانؑ

حسنؑ یعنی ذمہ دار امام تو کجا حسینؑ نے بھی بیعت نہ کی۔ معاویہ نے حسینؑ سے بیعت کرانی چاہی۔ انکار عجب خیز نہ تھا اور نہ معاویہ نے اصرار مناسب سمجھا جیسا کہ معاویہ کے پیشتر جناب امیرؑ اور اکثر لوگوں سے بیعت کا اصرار ضروری نہ سمجھا گیا تھا۔ اور اگرچہ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو لوگوں کو معلوم نہ ہوتی لیکن کسی ذمہ دار زبان سے اس کی وجہ اس قوت سے نہ بیان ہوئی تھی جیسی اس وقت ہوئی۔ اس لیے کہ موقع آ گیا تھا کہ وجہ ظاہر کی جائے۔ حسنؑ نے فرمایا: "اے معاویہ حسینؑ کو بیعت کے لیے مجبور نہ کر۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک قتل ہو جانا تیری بیعت کرنے سے بہتر ہے۔ تو انھیں قتل نہیں کر سکتا جب تک ان کے اہل بیت کو قتل نہ کرے، اور اہل بیت قتل نہیں ہو سکتے جب تک ان کے دوست قتل نہ ہوں۔ معاملہ طول کھینچے گا"۔ یہ نہ صرف اس وجہ سے قابل اعتبار ہے کہ ایک بھائی اپنے بھائی کا خاصہ بیان کر رہا ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ یہ اس قدر مطابق واقعہ تھا کہ معاویہ اسی پر عمل کرنے کو بیعت کے تشدد سے زیادہ محفوظ مصلحت سمجھتا۔

مؤرخین اور لوگوں کی عام غلطی

یہ حالتیں بتلائی ہیں کہ حسینؑ معاویہ کی بیعت کو کیا سمجھتے تھے۔ ان کا یہ "کیا سمجھنا" سوال پیدا کرتا ہے کہ کیوں ایسا سمجھتے تھے؟ اور جواب ہے کہ اس لیے کہ وہ اپنے کو اس سے بالاتر سمجھتے تھے کہ ایسے لوگوں سے بیعت یا اطاعت اور موافقت کا عہد کریں جنھیں وہ اچھی طرح سے پہچانتے تھے۔ و نیز اس لیے کہ انھیں اپنے پدر بزرگوار کے طرز عمل اور تعلیم سے اس کے علاوہ اور کچھ نہ کرنا چاہیے تھا جو کیا۔ حسن یا حسینؑ کا بیعت کرنا اپنے پدر بزرگوار کی تکذیب اور معاویہ کی تصدیق ہوتی۔ وہ لوگ اپنی اس ظاہر غلطی پر پھر غور کریں گے جو یہ سمجھتے ہیں کہ بیعت نہ کرا سکنے کے معنی یہ ہیں کہ تو پھر خود بیعت کی ہوگی۔ یا ترک امارت کے معنی یہ ہیں کہ جب وہ ایک ایسی چیز پر اختیار نہ رکھ سکے جس پر قابض رہنے کے لیے ایک جماعت کی پیروی اور اطاعت ضروری ہے تو وہ اپنے نفس پر قابو اور امتیاز حق و باطل بھی نہ کر سکے جس کے لیے اپنے سوا کسی خارجی مدد کی ضرورت نہ تھی۔

نہ بیعت نہ کرنے کے معنی یہ تھے کہ وہ مخالفت پر آمادہ تھے۔ مخالفت پر آمادہ ہونے کے لیے جن باتوں کی ضرورت ہوتی ہے اگر وہ موجود ہوتی تو آج تفویض امارت کا موقع نہ آتا۔ اور اس کے بعد بھی اگر ان کے لیے ایسے مواقع پیدا ہوتے جس سے کامیاب مقابلہ کی امید کی جا سکتی تاہم محض سامانوں کی موجودگی انھیں مقابلہ پر آمادہ نہ کرتی جب تک یہ نہ سمجھتے کہ خلق اللہ کے فائدہ کے لحاظ سے قتل اور خون کے لیے آمادہ ہونا مناسب ہے یا نہیں اور اس کے بعد لوگوں میں امر حق پر قائم رہنے کی صلاحیت ہے یا نہیں۔ یہ امورات تھے جس کے لیے بھی انھیں اپنے پدر بزرگوار کے طرز عمل سے کافی مثال مل چکی تھی۔ اس لیے ان کی موجودہ روش یہ تھی کہ تم حکومت کرتے ہو کرو۔ لیکن اپنی روش کی ہم سے موافقت اور تصدیق نہ چاہو۔ ہم الگ تھلگ رہیں گے اور اگر ہم پر کچھ لازم ہے تو یہ کہ ہم مخالفت نہ کریں۔ یہ صورت

اس وقت تک چلی جس کی طرف ہم رفتہ رفتہ بڑھ رہے ہیں۔
اہل بیت رسالت کے چند پر جوش دوست جو اپنے موقع کی حقیقت کو اب تک نہ سمجھے ہوں ان کے لیے اہل بصرہ کی روش ایک آئینہ تھی۔ آسانی سے ان لوگوں نے معاویہ کی حکومت سے انکار کیا اور آسانی سے اپنے وعدے بھول گئے۔ گویا وہ سمجھے نہ تھے کہ معاویہ اس لیے مستولی ہے کہ ایک قوم اس کا ساتھ دے رہی ہے، اسے اختیار سے دست بردار کرنے اور آلِ رسولؐ کو صاحب اختیار کرنے کے لیے ایک قوم کی حمایت اور ضمنی قربانیوں کی ضرورت ہے۔ وہ سمجھے نہ تھے کہ وعدہ اور عمل کی مطابقت بغیر تجربہ کی امید کرنا غلطی ہے۔

چند نام اور اُنؑ کے کاموںؑ کا اثر

ترک امارت کے بعد ایسے لوگوں کو حاکم پاتے ہوئے جن کے نام بشر بن ارطاۃ، عبداللہ بن عامر کریز یا ابن زیاد، مروان بن حکم، مغیرہ، ابن عاص وغیرہ ہوں۔ یہ امید کرنا کہ وہ جناب امیرؑ اور بنی ہاشم کو اچھے ناموں سے یاد کرتے۔ ان افراد کے ساتھ سب بے تعارفی ہوگی جن کے سیاق کے تذکرے ہم کرتے آئے ہیں کہ اتفاقات کون سے سایہ میں ان کی پرورش کرتے رہے اور پھر اس وقت کس قطب آسیا کے گرد یہ صدقے ہو رہے تھے۔ ایسا آدمی ایسے وقت کیونکر کسی صوبہ اور مشہور شہر کی حکومت کے لیے منتخب ہو سکتا تھا جو آلِ ہاشم کی عداوت اور اسباب عداوت میں ممتاز نہ ہو تا کہ اس کے ذریعہ سے دبانے اور مٹانے والے اصول جاری کیے جائیں۔ حقیقۃً ایک زمانہ تک بنی امیہ اور بنی عباس کی سیاست کا اصل اصول ہی یہ تھا کہ وہ کس کس طرح آلِ ہاشم کا نام مٹا سکتے ہیں۔ کہیں مسلمان مؤرخین اور مدبرین جو چاہیں لیکن مسلمانوں کے صفات قومی کے مٹانے والے اسباب ایسے ہی دور تھے جنھوں نے ذاتی اقتدار کی حفاظت میں ان نفوس کو مٹا دیا جو اسلام اور تعلیم اسلامی کی زندہ تصویریں تھیں اور جو تمام اخلاقی نظریات کے مقابلہ میں جو دنیا میں ہوں محض اپنی ذات اور عمل سے بہترین تعلیم دے سکتے تھے۔ ان کا ضائع جانا ان ستونوں کا گرنا تھا جو قوم گر تھے۔ ان کے بعد قومی لامرکزیت کا دکھائی دینا یا بقیہ قوم میں صفاتِ اسلامی کا نہ پایا جا سکنا مطلق حیرت خیز نہیں ہے۔ اور پھر ریڑھ کی ہڈی تلاش کرنا اس سے زیادہ بے سود۔
حسنؑ تھے اور انھیں یہ سب سننا تھا حسینؑ تھے اور وہ اپنے برادر عالی مقدار سے ذکر کرتے تھے ان بے عنوانیوں کا جو دشمنوں کے ہاتھوں، ان کے نام ان کے ذکر اور ان کی فضیلت اور حقوق کے خلاف جاری تھیں۔ ان حالتوں کے متعلق خیال کیا جا سکتا ہے کہ حسینؑ کا موقع اپنے پدر بزرگوار سے زیادہ نازک تھا۔ یہ دونوں یادگار رسولؐ تھے اور دور اموی اور اس کے پیشتر کے سربرآوردہ لوگ تھے جو اپنے صحبتوں میں انھیں اس لیے طلب کرتے تھے کہ ان کی توہین کریں۔ اس لیے کہ ان کے خلاف انھیں کچھ کہنے کی قوت نہیں اور کوئی یہ دعویٰ کرے گا کہ ہم ایسی تحریک کریں گے کہ لونڈیاں اور غلام کہلائیں گے۔ اور کبھی مدینہ ہی سے تاریخ اسلامی کا مستند مردود جو آخر الذکر دعویٰ کرتا تھا حسینؑ سے پوچھنے کی جرأت کرے گا کہ اگر "فاطمہ (علیہا السلام) تمھارے لیے باعث فخر نہ ہوتیں تو پھر تم کس سے فخر کرتے"۔ حسینؑ کا ہاتھ آہستہ سے بڑھ کر مروان کی گردن پر قبضہ کرلے گا۔ اس کا دھڑ فضا میں جھولا جھولے گا اور ابھی پینگ مارنے سے فرصت نہ ہوئی ہوگی کہ اسے تصدیق لغیبہ چارہ نہ ہوگا۔
رفتہ رفتہ یہ کوششیں شروع ہوئیں کہ حضرت سبط اکبر درمیان سے ہٹا دیے جائیں۔ بہ ظاہر معاویہ کو حصولِ اختیار

اور حسنؑ کی بے اختیاری پر تسکین ہو جانی چاہیے تھی کہ وہ اپنی گزشتہ بے عنوانیوں میں ایک ایسے اور اسلامی نگاہ سے ناقابل معافی گناہ کا اضافہ نہ کرتا۔ ایسا سوچنا اس حد بندی کا دعویٰ ہوگا کہ انسان کہاں تک گناہ کر سکتا ہے۔ یا سیاسی بے مہار خوف کو حسنِ ظن کی لگام دینی ہوگی۔ یا کہنا ہوگا کہ ہندہ اور ابوسفیان کے بیٹے کے دل سے انتقام کی گدگدی جاتی رہی تھی۔ کس پر دنیا میں حسنؑ اس درجہ بار ہو سکتے تھے کہ وہ چھ چھ مرتبہ زہر دینے کی مسلسل کوشش کرتا۔ اور کس کے اختیار میں مدینہ اور موصل وغیرہ تھے کہ نواسہ رسولؐ ایک جگہ سے دوسری جگہ اس لیے تشریف لے جاتا کہ دوسری جگہ بھی زہر کی تخم محسوس کرتا۔ کیوں زہر کو حسنؑ سے ایسی محبت ہو گئی تھی کہ وہ ساتھ ساتھ پھرتا تھا۔ کیا حسینؑ ان تمام دلخراش واقعات سے بے خبر رہ سکتے تھے۔ کیا وہ اس کی غرض سے ناواقف رہ سکتے تھے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ جس کو زہر دینے کے مسلسل کوششیں کی جاتی ہوں وہ حسنؑ ہوں!۔

لبفرضِ محال یہ مروان ہی تھا جس نے حضرت عائشہ کی موت کا سامان مہیا کیا۔ لبفرضِ محال یہ مروان ہی تھا جو ہر جگہ ایسا آدمی ڈھونڈتا پھرا جو چند روپیہ کے لیے نواسۂ رسولؐ کو زہر دینے کے لیے آمادہ ہوتا۔ اگرچہ حسن اس کی گورنری کے رقیب نہ تھے لیکن پھر معاویہ نے اس سے کہیں کوئی باز پرس کی؟ یا ہم اس کی اس وقت تک امید نہ کریں جب تک کہ کوئی مصنف یا مترجم کسی کتاب میں اس قدر اضافہ کا اہتمام نہ کرے کہ امیر معاویہ کے حکم سے مروان بن حکم کو اسی دُرّے مارے گئے۔ یا چوک گئے مدبر معاویہ کہ کسی ایسے آدمی کو جو مستوجب قتل ہوتا اس الزام سے قتل نہ کیا کہ اس نے زہر دینے میں سازش کی تھی۔ تو مدبر مؤرخین تالیاں بجانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ اور اس وقت ایک صحیح نتیجہ مشتبہ ضرور ہو جاتا۔

ایسا نہ ہونے کی صورت میں مروان کا اطلاع دہی کا اہتمام، خبر بھیجتے رہنے کی ہدایت اور ایسی لمبی تکبیر جو دور دور سنائی دیتی بادی النظر میں بھی سیاسی تنگ ظرفی ہے۔ اور پھر استنباط کے لیے تو جگہ ہی باقی نہیں ہے جب کہ اس کے ظاہر الفاظ ہیں کہ "دل ٹھنڈا ہو گیا"۔ ابن عباس کی نگاہوں کو معاویہ "خوش معلوم ہوتا ہے"۔ اور آپس میں طنز کی باتیں ہوتی ہیں۔ نہیں تو اس سے عجب ہے کہ ایسے مفید سیاسی امورات آج بھی معلوم ہو گئے۔ یقیناً اس غرہ کے بدولت کہ کوئی ہمارا کرلے گا۔ جعدہ، السونیہ اور مروان کی آپس کی مشاورت، جعدہ کا مروان کے پاس بھاگ جانا، اور پھر شام روانہ کیا جانا۔ اس کے لیے کافی تھی کہ ہر زمانہ میں بغیر کسی ظاہری اقرار کے بھی صحیح استنباط کیا جاسکتا۔ جیسا کہ ہوا نہ کہ جب معاویہ کے انداز نے اپنے ہاتھ سے پردہ ہٹا دیا ہو۔

حسینؑ کا اندوہناک موقع

بنی ہاشم اور خصوصاً حسینؑ کے اس جانکاہ غم کا خیال کرو کہ انھوں نے فوراً مجرم افراد کو جان لیا ہو یا واقعات کے منتظر ہونے میں کچھ دیر لگی ہو لیکن انگلی نہ اٹھا سکتے ہوں۔ ایسے وقت میں محض زبان سے کچھ کہنا نہ صرف بے سود بلکہ مہلک تھا۔ حسنؑ سے بہتر موجودہ حالت کا جاننے والا دوسرا نہ تھا، اور انھوں نے وہی کیا جو انھیں بحیثیت ایک خیر اندیش کے کرنا چاہیے تھا۔

حسینؑ کے صبر اور صحیح تصفیہ کی پہلی بڑی مثال

میں سوچتا ہوں کہ صبر کی پہلی سخت جھنجوڑ حسینؑ کو اس وقت اٹھانی پڑی جب انھوں نے لوگوں کو مانع دفن دیکھا، اور ساتھ ہی بھائی کی وصیت یاد آئی۔ اس تصفیہ کی دشواری کا احساس آسان ہے کہ

وصیت کی ناموجودگی میں حسینؑ کیا کرتے۔

وقت کی جوشش خیز حالت اس جواب کا جواز چاہتی ہے کہ حسینؑ جنگ کرتے۔ لیکن اب حسینؑ کی ذمہ داری یہ بھی چاہتی ہے کہ وہ یہ سوچتے کہ اس کا وقت آیا ہے یا نہیں کہ اپنی تھوڑی سے راسخ الاعتقاد جماعت موقع پر قربان کر دی جاتی۔ لیکن اس بات نہیں کی گئی۔ غالباً وصیت نے بھی اسے روکا۔ اور جب قاتلوں سے جنگ نہیں کر سکتے تھے تو دفن نہ کرنے دینے والوں کا تو نسبتاً کم قصور تھا۔ اور بنی امیہ اور بنی کندہ کے علاوہ بنی تیم کو پھر مخالفت کے لیے للکارنا تھا۔ حسینؑ کی ذمہ داری کی ابتدا اپنی جوش خیز نوعیت کے لحاظ سے ایسی صبر شکن تھی حسینؑ کا صبر اور ان کے تصفیہ کی پختگی ویسے ہی حیرت خیز تھی!۔

ہم پیشتر صلح حسنؑ پر بحث کرتے ہوئے کہیں یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں کہ معاویہ کی صلح کے لیے پیش قدمی اس خوف سے خالی نہ تھی کہ مبادا ایسا نہ ہونے کی صورت میں ایک سخت جنگ کے اتفاقات جمع ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ خوف حسنؑ کی ذات کی وجہ سے تھا۔ فضل بن عباس نہایت سمجھے ہوئے اور موقع پر روشنی ڈالنے والے خیالات ظاہر کرتے ہیں، جہاں وہ مرثیہ کہتے ہیں کہ: "آج کے دن ابن ہند حسنؑ کی رحلت سے اظہار نخوت میں بے خوف ہو گیا"۔ اب بے خوفی کی وجہ ظاہر ہے۔ اس لیے کہ وہ ذات جو ہر حیثیت سے چند روز پیشتر منصب امامت کی مرکز تھی طبعاً خلق اللہ کی نگاہ میں بے عنوانیوں کے متعلق سوال اور کسی انداز کے اختیار کرنے کا حق رکھتی تھی اور اس میں قابلیت تھی کہ وہ منتشر قوت کو "تنگ آمد بجنگ آمد" کے لحاظ سے جمع کرنے کی کوشش کرتی۔ ایسی کوئی کوشش اس کے لیے بہ مقابل کسی دوسرے کے زیادہ آسان تھی۔ یہ طبعی اثر حسینؑ کو حسنؑ کے برابر رسولؐ کے بعد کی سیاسی دستور العمل کے لحاظ سے اس لیے حاصل نہ تھا کہ حسنؑ خلیفہ ہو چکے تھے۔ حسینؑ کو محض حق تھا، اور یہ بعد خیال ایک ایسا عنصر تھا جس سے بمقابلہ حسینؑ کے معاویہ کو مفید استحصال کا زیادہ موقع تھا۔

حسینؑ اور فطری شاعری

حسینؑ فطرۃً شاعر تھے۔ جنھیں اپنے اظہارِ خیال کے لیے آورد اور خوبصورتی ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ صاف اور غیر آلودہ تصنع تصویر کھینچتے تھے۔ جذبات کی مصوری ایسی فطری اور بے لوث ہوتی تھی جس کے سمجھنے میں شبہ نہ ہو۔ الفاظ کے ساتھ دماغ وہ کیفیت محسوس کرتا ہے اور وہ صورت سامنے موجود ہو جاتی ہے جس کے دکھانے کا ارادہ کیا گیا ہے۔ مرثیہ ہے، قبر میں لاش اتار رہے ہیں اور کہتے جاتے ہیں۔ شروع کرتے ہیں کہ: "کیا میں اپنے سر میں تیل ڈالوں یا میری مجلسیں خوشگوار ہوں درآنحالیکہ سر مبارک آپ کا خاک آلودہ اور آپ کے جسم کا لباس اتارا ہوا ہو"۔ حسرت، دل برداشتگی، اور یاس کا اظہار اس استفہام سے زیادہ نہیں ہو سکتا تھا جیسا "کیا" سے ابتدا کرنے سے ہوا۔ اس کی افتاد اس تمام سامانِ راحت کو ڈھلکتی ہے جو ایک انسان کو اپنی حیات میں میسر ہوتے ہیں اور اسے غم آلود کر دیا ہے۔ طرز ادا نے غم کی چوٹ کا اثر دور دور تک پہنچایا ہے۔ حیات کی آرائشوں اور موجودہ حالت کا مقابلہ کیا ہے جو عبرت خیز ہے اور ساتھ ہی ساتھ اظہارِ ادب اور محبت کی لپک نے اسے اور درد انگیز کر دیا ہے اور متانت میں گرفتگی کی ہوا لگنے نہیں پائی ہے۔ فرماتے ہیں: "دنیا کی کسی محبوب شے سے کیا فائدہ اٹھاؤں، مجھے وہ چیز محبوب ہے جو آپ سے قریب کرے"۔ چیزوں کی محبوبیت پر بے ثباتی کا سایہ پڑ گیا۔

بیچ ہوگئیں۔ جب تم سا محبوب نہ رہا۔ تم دُور ہوگئے دل کہتا ہے کہ تم سے قریب ہوجائیں۔ وفورِ محبت یہ ہے کہ وہ تمام چیزیں جو تم سے نزدیک کریں محبوب ہیں۔ مرتبہ یہ ہے کہ یہ قربت زمانہ حیات کی نہیں ہے بلکہ موت کے قربت کی آرزو ہے۔ فرماتے ہیں: "میں آپ پر برابر روتا رہوں گا جب تک کہ کبوتری گونجے۔ جب تک صبا اور بادِ جنوب چلے۔ جب تک کہ حجاز کے بڑے بڑے درختوں میں کوئی ڈالی سرسبز ہو"۔ یہاں حسینؑ فطرت کے شاعر ہیں۔ وہ فطرت کی ان چیزوں کو اپنے غم کا گواہ قرار دیتے ہیں۔ ان چیزوں کو اپنے سلسلہ غم کے تازہ کرنے کی علامت قرار دیتے ہیں۔ کبوتری کا گونجنا اس کی بے آزار اور حلیم خوش وقتی کا بیان ہے۔ اس کی مغرورانہ ادا اس کی حرکت طبعی بتا رہی ہے کہ وہ خوش ہے۔ اس کی لاپرواہ مسرت نے اسے اور قابلِ رحم قرار دیا ہے۔ اس کا چھیڑنا جس سے وہ اپنے غافلانہ مشغولیت سے باز آئے۔ کسی ذی رُوح سے اس کے خوشی کے عالم کو چھین لینا ہے جو طبعی اِحساس کے لحاظ سے مکروہ ہے۔ فطرت کا یہ پُر لطف تماشہ۔ یہ غم غلط کرنے والا منظر۔ یہ خوشی کی تصویر حسینؑ کے لیے اپنے غم کے یاد دلانے کا ایک ذریعہ ہے۔ اسی طرح ہر معتدل اور گرم ملک کے لیے صبا اور بادِ جنوب کے چلنے کا موسم اور اس کا ایک جھونکا رُوح افزا ہوتا ہے۔ خصوصاً عرب جہاں زیادہ تر وقتوں میں سموم چلتی ہو۔ اور جہاں نایابیِ آب سبزہ کی کمی کی وجہ ہو۔ غالباً حسینؑ بادِ صبا اور بادِ جنوب کے چلنے یا ڈالیوں کے سرسبز ہونے سے زمانہ بہار کی رُت یاد دلاتے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا کی متین نازک خرامی سے سبز ڈالیاں جھوم رہی ہیں۔ پتیوں کی سنسناہٹ عام وقتوں میں دماغ کو تھپکیاں دیتی ہے۔ سرسبز شاخیں آنکھوں کو خنکی اور فرحت دیتی ہیں لیکن ان سب کو حسینؑ محرکِ غم قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ چیزیں ان کی حقیقی بہار پر خزاں کے چھا جانے کی یاد دلانے والی ٹھیس ہیں۔ اور پھر ان سب کے بعد سخت ترین مرثیہ یہ ہے جہاں دو صورتیں دکھائی ہیں۔ قوت اس سے آ گئی ہے کہ اِستعارہ سے کام نہیں لیا ہے بلکہ صاف صاف کہا ہے کہ: "لٹا ہوا وہ شخص نہیں ہے جس کا مال لوٹ لیا جائے بلکہ وہ ہے جو اپنے بھائی کو زیرِ خاک کرے"۔ کوئی لفظ ان الفاظ سے زیادہ اس عالمِ غم میں نہیں ڈبو سکتا جو "لٹا ہوا" مال سے نہیں بلکہ "جو اپنے بھائی کو زیرِ خاک کرے" سے مترشح ہے۔

حسینؑ نے اکثر اشعار فرمائے ہیں خصوصاً ان وقتوں میں جس وقت لطافتِ خیال کی موزونیت کے لیے انسان میں حواس نہ ہونا چاہیے۔ نہیں معلوم ایسے وقتوں میں حسینؑ کے خیالات کی تعریف کی جائے یا ان کے ہوش کی۔ ہم اس مضمون کو اس پر ختم کرتے ہیں کہ حسینؑ میں ایسی قابلیتِ شاعری کا ہونا اس وجہ سے بھی عجب خیز نہیں ہے کہ ان کی مادرِ عالی مقدار اور پدرِ بزرگوار کے اشعار اور ان کے خیالات کی نفاست ایک مستند اور مشہور امر ہے۔

رحلتِ حسنؑ سے حسینؑ کا نقصان

حسینؑ کے افسردہ چہرے اور ان کے غم و غصہ کا نقشہ کھینچنا لفظوں کے امکان سے باہر ہے۔ وہ ان حسنؑ کو دفن کر رہے تھے جو نبیؐ و فاطمہؑ و علیؑ کے فرزند تھے۔ وہ ان حسنؑ کو دفن کر رہے تھے جو ایک ذمہ دار امام تھے۔ وہ اپنے بھائی کو دفن کر رہے تھے، وہ لڑکپن سے اس وقت تک کے رفیق اور دوست کو دفن کر رہے تھے۔ اور سب کے آخر میں وہ اپنی سیاسی پناہ کو دفن کر رہے تھے!

حسینؑ کی تنہائی کی قوت شہرت اور تعارف

تنہائی بے کسی، بے اختیاری اور مظلومیت تھی اس کے عکس میں کچھ نہ تھا۔ لیکن کچھ تھا بھی اور وہ یہ تھا کہ بچے بچائے دوست پنج تن میں اب صرف حسینؑ کو دیکھ رہے تھے۔ یہ بقیہ تھے اس سب کچھ کے جوان نفوس

ھری میں تھا۔ اس لحاظ سے حسینؑ کی ذات کوئی ایسا مرکز نہ ہو سکتی تھی جو عدم شناسائی اور عدم شہرت کی وجہ سے کم موثر ہوتی۔ سچ تو یہ ہے کہ رسولؐ نے اہلِ مدینہ اور مدینہ آنے والوں کو حسینؑ سے اس طرح شناسا کر دیا تھا کہ عدم شناسائی کا کوئی عذر مستوجبِ سماعت نہیں ہو سکتا۔ یہ ہوا کہ اس وقت تک ایک پشت کج دار اور ایک قریب بلوغ تیار ہو گئی ہو اور اتفاقات کا جو رنگ تھا اس نے ان کے متعلق روایات کو حافظہ کے قریب نہ رکھا ہو لیکن ادھر کے چار پانچ برس اس طرح کے نہ گزرے تھے کہ حسینؑ ایسے موقع پر نہ ہوتے کہ کوئی نہ دیکھ سکتا۔ جناب امیرؑ کے خلیفہ ہوتے ہوتے ہوئے کون تھا جو ان شاہزادوں کو نہ پہچانتا اور پھر جمل کے مشہور میدان میں اور مدینہ سے صفین تک کے کوچ اور اس کے مشہور میدانوں میں کونسی جگہ تھی جہاں حسینؑ نہ تھے اور جہاں ہزار ہزار آدمی انھیں نہ دیکھ رہے تھے۔ ممکن ہے کہ ان لاکھوں دیکھنے والوں میں سے ہر ایک کو حسینؑ سے شرفِ تعارف حاصل نہ ہو، اور یہ لوگ ذات کے اثر کی کیفیت محسوس نہ کرتے ہوں جو تعارف اور قربت سے حاصل ہوتا ہے لیکن ان کا سب سے بڑا تعارف یہ تھا کہ یہ فرزندِ رسولؐ تھے اور بس اس کے بعد ان کا شرف و فضیلت پوشیدہ رہنے کی چیز نہ تھی۔ کون جانتا ہے کہ حسینؑ کی اس شناسائی اور آنے والے سفر سے خدا کو کچھ کام لینا تھا۔ بُعدِ خیال سہی لیکن ہر جاننے والے شخص میں یہ خیال موجود تھا کہ حسینؑ کا حق معاویہ کے مرجانے کے بعد ان کی طرف عود کرے گا۔ نہ صلح حسنؑ کے بعد حسینؑ کے بیعت نہ کرنے کی شہرت ایسی تھی جس سے ان کی طرف نگاہیں نہ اٹھتیں۔ درآنحالیکہ اس کے آثار ہیں کہ اکثر مشاہیر حسینؑ کی خدمت میں اس کے بعد حاضر ہوئے اور کچھ عجب نہیں ہے کہ انھوں نے حسینؑ کو اپنی آخری امید قرار دیا ہو۔ اور سب کے آخر میں حسن کے دفن کی مظلومانہ شان اور حسینؑ کا پُر جوش صابرانہ تصفیہ بغیر اس کے کہ لوگوں کی ہمدردی ان کی طرف منعطف کرتا اور وہ حسینؑ میں اپنا ذمہ دار رہنما پاتے۔ بے اثر نہیں گزر سکتا تھا۔

کونسی مصلحت قوت کے ساتھ ظاہر ہوتی جاتی تھی

ابوبکرہ، عدی بن حاتم اور حجر بن عدی وغیرہ کی حمر بن ارطاۃ معاویہ اور مغیرہ سے گفتگو اور وجہ گفتگو حسنؑ کے زمانہ حیات کی بات تھی اور اگرچہ زیاد ۴۵ھ سے ۵۳ھ تک بصرہ اور کوفہ کا گورنر رہا جس دوران میں بصرہ کوفہ اور حضر موت میں شیعیان علیؑ کا ہزاروں کی عدد میں قتل عام ہوا لیکن غالب قرینہ ہے کہ گو بعض غیر مشہور اشخاص یا جماعت حسنؑ کی حیات تک (۴۹ھ) میں قتل کی گئی ہو لیکن قتل عام اور مشاہیر کی شہادت زیادہ تر امام دوئم علیہ السّلام کی شہادت کے بعد وقوع میں آئی۔ اس لیے کہ ان آخر الذکر امورات کے متعلق حضرت امام حسین علیہ السّلام اور معاویہ کی خط و کتابت کا نشان ہے۔ یہ مراسلت بجائے حسینؑ کے حسنؑ کے نام سے ہوتی، اگر وہ جناب حیات ہوتے۔

حسینؑ عزمِ شہادت کا گہوارہ

یہ زمانہ اور اس کی مصلحت اس بات کا آئینہ تھی کہ حکومت کے لیے اہل بیت کے دوستوں کا زندہ رہنا برداشت کے باہر تھا۔ عہد اور وعدہ وفا کے قابل نہ رہا تھا۔ ایک سردار قوم درمیان سے چن لیا جاتا تھا اور بقیہ اس کے منتظر رہتے تھے کہ دیکھیں موت اب کس کے نام قرعہ ڈالتی ہے۔ یہ حالت ہر ایسے شخص کے لیے لڑنے اور مارے جانے کو جائز کیے دیے رہی تھی عام اس سے کہ کوئی لڑتا یا نہ لڑتا۔ ظاہر ہے کہ یہ حالت نہ ہوتی اگر قوم اس سے پہلے موت کے اس وقت کی حیات خریدتی۔ اس وقت لوگوں میں مارے جانے کے قبل مرجانے کا ارادہ نہ پایا جانا کچھ عجب خیز نہ تھا۔ عزم کی قابلیت فنا ہو گئی تھی۔ مظالم کا یہ سلسلہ

حسینؑ کے نہ بدلنے والے ارادہ کے سمجھنے میں معین ہوگا اور تمام حالتیں حسینؑ کے عزم شہادت کا گہوارہ کہی جائیں گی۔

بے قوت ہیجان

پھر بھی نام لینے کو ایسی حالتیں تھیں کہ عدی کے ساتھ برے برتاؤ پر لوگ اظہار ناخوشی کرتے۔ حجر کو گرفتار دیکھ کر چھڑانے کی کوشش اور شہادت کے بعد لوگ حسینؑ سے شکایت کرتے اور بقیہ مشاہیر حسینؑ کے پاس آتے۔ یہ تمام اٹھان اشتنا سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی کیونکہ اگر اس میں اجماعی قوت اور ناقابل تغیر ارادہ ہوتا تو یہ حالت اپنی تاریخ کچھ اور لکھواتی۔ کروٹ بدلنا خواب کی مشتبہ حالت سے زیادہ کچھ نہیں ہے چہ جائے کہ وہ ہوش اور کھڑے ہونے کا عالم کہا جائے۔

ذمہ دار ائمہ کے چپ رہنے اور بولنے کا مطالعہ

حسینؑ خاموش تھے، ذمہ دار ائمہ کی خاموشی اور عمل کی حالتیں پر غور مطالعہ کی چیزیں ہیں کہ کب تک وہ چپ رہتے تھے اور کب اپنی آواز بلند کرتے تھے یا حرکت کرتے تھے۔ جناب امیر اگر صداؤں کی ہم آہنگی اور پر استقلال عزم دیکھے بغیر خلافت منظور نہ کرسکتے تھے تو حسنؑ کب بغیر ایسی حالت کے خلیفہ رہنا پسند کرسکتے تھے۔ یا پھر ایسی حالت کی ناموجودگی میں حسینؑ کیونکر کوئی ایسا ارادہ کرسکتے تھے جس میں حسینؑ اور عامہ ناس کے اشتراک کی ضرورت ہو۔ اگر ایسا ہی تھا کہ انفرادی اظہار عزم کا وقت آگیا تھا تو اس کا اختیار تمیزی اس شخص کے لیے تھا جو تیار ہوتا اور ہمارے دیکھنے کی یہ بات ہے کہ اختیار تمیزی کے مصرف کا یہ وقت تھا یا وہ جسے حسینؑ نے چنا، جس کا تذکرہ آوے گا۔

حسینؑ چپ نہیں رہنے دیے جاتے

حسینؑ میں قطعاً خاموشی کا کیسا ہی ارادہ کیوں نہ ہوتا، لیکن وہ خاموش نہ رہنے دیے گئے۔ حکومت کی وہ آنکھ جو مدینہ میں تھی اس کے بھیانک کرنے کے لیے یہ تماشہ کافی تھا کہ لوگ اور مشاہیر حسینؑ کے پاس آرہے ہیں۔ اپنے شرفا اور فطری سرداروں پر ظلم کی شکایت کر رہے ہیں۔ مروان نے معاویہ کو "فتنہ کے اندیشہ" سے مطلع کیا۔ معاویہ نے حسینؑ کو لکھا اور ان خبروں کو ان کے "لائق حال" نہ سمجھ، وفائے عہد (!) کی امید اور نصیحت کی۔ اور گویا ایک نیا سمجھوتہ یہ پیش کیا کہ: "جب تک ہماری جانب سے تمھیں کوئی برائی نہ پہنچے مجھے بھی تمھاری طرف سے کوئی امر مکروہ واقع نہ ہو"۔ یہ عہد اس لیے قابل لحاظ نہ رہ گیا تھا کہ معاویہ اور حسینؑ کی قابلیت دفاع برابر نہ تھی۔ اس کا فائدہ عدم مساوات قوت کے لحاظ سے تمام تر معاویہ کے لیے تھا۔ وہ ہر وقت اختیار رکھتا تھا کہ کوئی نزاعی روش اختیار کرتا، اور حسینؑ دفعتہً ایک قوت دار مخالفت دیکھ کر مقابلہ کی قوت نہ پاتے۔ معاویہ کی مسلسل روش نے اس کے ایسے کسی وعدہ کو قابل اعتبار نہ رکھا تھا بجز اس کے کہ کمزور یہ کہے بغیر چارہ نہ دیکھتا کہ مجھے تم پر اعتبار ہے۔ کیونکہ ایسا نہ کہنے کی صورت میں قوی دشمن کا زبانی اقرار بھی نہ رہ جاتا۔ مقتولین کے مجبور، ہمدردوں کے متعلق معاویہ کے "عنفہا" اور "طالب فتنہ" کہنے میں مجھے اختیار کے ہاتھوں الفاظ کے مسخ ہونے اور خیال کے ناجائز ولادت کے علاوہ کچھ نہیں دکھائی دیتا۔

حسینؑ کے الفاظ اور ان کا عکس

حسینؑ کا جواب مختصر اور صاف ہے کہ: "میں کسی طرح تیری مخالفت اور جنگ کی رغبت نہیں رکھتا، تو مطمئن رہ"۔ اس میں

بجز "مخالفت" "رغبت" اور "مطمئن" کے الفاظ ہی نہیں ہیں، جو غور طلب ہوں۔ مخالفت نہ ہونے کے معنی موافق ہونا نہیں ہے۔ "رغبت" کا استعمال مظہر اختیار ہے جو اپنی بے وقتی کا عکس نہ ڈالے۔ اور "مطمئن" کرنے سے مخالفت کے عملی تحرک کو سلا دینے کی کوشش کی ہے۔

مفصل جواب پر نظر

اب میں حسینؑ کے اس مختصر جواب کے علاوہ ناسخ التواریخ کے طویل جواب پر نظر ڈالتا ہوں۔ یہ خط ایک تنقیدی حیثیت کا جواب ہے۔ شروع ہی میں حسینؑ نے فرمایا ہے کہ اس خبر کو "جھوٹے اور خوشامدی لوگوں نے افترا کیا ہے"۔ "من از تو در مخالفت نیستم و نہ در محاربت"۔ جس کے معنی یہ ہوں گے کہ میں تجھ سے حالت مخالفت یا جنگ میں نہیں ہوں۔ اس کے بعد صاف لفظوں میں حجر اور ابن الحق پر ظلم کا تذکرہ کیا۔ جس کی مخصوص بات یہ تھی کہ: "بغیر اس کے کہ انھوں نے تیرے ملک میں کوئی فتنہ برپا کیا ہو"۔ مجھے اس میں شبہ نہیں ہے کہ وعدہ امن کے بعد بے وفائی یاد دلا کر غیر صریح طور سے حسینؑ یہ کہہ رہے تھے کہ میرے ساتھ بھی تیرے کسی عہد پر کیا اعتبار ہے۔ اس کے بعد زیاد کے مظالم اور خلاف اسلام کارروائیاں یاد دلانے کے بعد فرمایا: "گویا تو اس امت میں نہ تھا"۔ اس کا مخ پر تو غالباً یہ ہے کہ تو بحیثیت حاکم ہونے کے ایسے حکم دے رہا تھا کہ گویا تو مسلمان نہ تھا۔ اور نہ تجھے اس کی فکر تھی کہ مسلمان خلاف انسانیت طریقوں سے شہید کیے جا رہے ہیں۔ یہ قیاس آگے کی اس عبارت سے صاف ہو جاتا ہے کہ "حالانکہ اسی دین کے لیے علیؑ نے تجھے اور تیرے باپ کو دستخوش شمشیر بنایا"۔ جماعت اسلامی اس بے دردی سے تباہ کی جا رہی ہے کہ گویا اس جماعت کے مہیا کرنے کے لیے کوئی کوشش ہی نہ کرنی پڑی تھی۔ اور موقع کا طنز اس فطری واقعہ خوانی میں ادا ہو گیا کہ تو اور تیرا باپ جو جماعت اسلامی کی ترتیب میں بارج تھا اور اس لیے علیؑ تجھے دستخوش شمشیر بنا رہے تھے۔ آج پھر تو اس بنی ہوئی حالت کو بگاڑ رہا ہے۔ کیونکہ تو نے "غصب خلافت کیا ہے"۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان تمام خیالات میں اظہار تاسف کا حسینؑ سے زیادہ کسی کو حق تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے جد بزرگوار کے تیار کیے ہوئے بہترین نمونے برباد کیے جا رہے تھے۔ اور پھر سیاسی تفنن کا دباؤ ان سے ایسا جواب چاہتا تھا جو حالت کی سلامت روی کا اقرار ہو۔ حسینؑ اپنی غیر نزاعی روش کا اطمینان دلا سکتے تھے لیکن ان کی حق گوئی سے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایک قابل اعتراض حالت کو سیاسی دباؤ کی وجہ سے ناقابل اعتراض کہہ سکتے۔ خصوصاً جبکہ وہ کچھ کہنے کے لیے مجبور کیے جا رہے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ جماعت کی جماعت ظلم کی ان ایجادوں سے تباہ کر دی گئی جسے اسلام نے ممنوع قرار دیا تھا اور پھر انھیں اس کی الٹے دھمکیاں دی جا رہی تھیں کہ تم چپ اور بے حرکت نہیں ہو۔

باوجود اس کے کہ ان الفاظ اور خیالات کے لیے اس وقت ناسخ التواریخ کے علاوہ مجھے اور کوئی سند نہیں معلوم لیکن ذاتی طور سے مجھے اس کے ماننے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ اگر موجودہ حالت اور واقعات کا ظاہر کرنے والا کوئی خیال اور الفاظ، طرز بیان، انعکاس، بو، لہجہ اور اس کا خاصہ کہنے والے کے خیالات کا تعارف، کوئی معیار قرار دیا جا سکتا ہے تو نہ صرف متذکرہ صدر صاف گوئی بلکہ یہ الفاظ بھی کہ "تو نے لکھا ہے کہ اپنے دین کی فکر میں رہوں اور فتنہ کھڑا نہ کروں تو میں اس امت میں کسی فتنہ کو تیری حکومت اور خلافت سے زیادہ تصور نہیں کر سکتا۔ اپنے نفس اور امت محمدی کے خیال سے اس سے اچھی کوئی بات مجھے نہیں معلوم ہوتی کہ تجھ سے جنگ کروں"۔ حسینؑ نے کہے اس وقت مجبور کیے جانے پر ایسا

نہ کہنا معاویہ کی مصلحت کی کامیابی ہوتی اور گویا خاموشی کے اصرار سے اس کی تعدی کے سلسلہ میں ترقی دینا ہوتا۔ میں سوچتا ہوں کہ اس جواب کا یہ اثر ہوا کہ معاویہ کو اپنی تمام کارروائیوں میں اب یہ پیش نظر رہتا ہوگا کہ کوئی دیکھ رہا ہے۔ اگرچہ وہ کیسا ہی بے قوت ہو۔

اور اس قدر تنگ آ گئے تھے کہ یہ بغیر فرمائے نہ رہ سکتے کہ جنگ سے "سستی کرنے میں مجھے خدا سے طلب اِستغفار کرنا پڑے گا"۔ کب تک دیکھتے اور خاموش رہتے کہ شریعت اسلامی جس نے مثلہ کرنے اور آگ سے جلانے سے کفار تک کو منع کیا تھا۔ اسلام کے ہمیشہ کے دشمنوں کے ہاتھوں جاہلیت کی طرف لوٹائی جا رہی ہے اور مُسلمان ان خلاف انسانیت اذیتوں کے شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اور عداوت کے اُلٹے الزام کے جواب میں نہایت بلیغ فقرہ ارشاد فرماتے ہیں کہ: "مکر کسی مخلوق کو نقصان نہیں پہنچاتا مگر یہ کہ اسی کے نفس کی طرف بازگشت کرتا ہے"۔ یہاں حسینؑ اس عارضی نقصان کو نقصان نہیں سمجھتے جو کسی کے مکارانہ اختراع سے کسی کو پہنچا ہو۔ بلکہ حقیقی نقصان اسی مکار کے نفس کو پہنچا جس نے مکر کیا تھا۔ مطابق واقعہ تیز فقرہ تحریر فرماتے ہیں کہ: "تو جہل پر سوار تھا اور نقض عہد پر حریص ہوا"۔ بے وفائی کی مثالیں اور مقتولین کا ذکر کر کے "ان کا قصور بجز ہمارے فضائل اور تعظیم حقوق کے کچھ نہ تھا۔ انھیں تو نے اس خوف سے قتل کیا کہ اگر یہ زندہ ہیں تو تو خود تباہ نہ ہو جائے"۔ شاید ہی واقعات کا خلاصہ اس سے بہتر کیا جاسکتا ہو یا ان کی حقیقت اور ظالمانہ غرض اس سے بہتر لفظوں میں سمجھائی جاسکتی ہو۔ اس کے بعد حسینؑ اپنے حقیقی منصب کے لحاظ سے عذاب خدا سے ڈراتے ہیں۔ رعیت کی پریشانی کا تذکرہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تو نے "پارساؤں کو ڈرایا کہ آپ کی گردن پر سوار ہو"۔ کیسے ممکن تھا کہ وہ جو اپنے کو خلیفۃ المسلمین کہتا ہے بلا کسی جھجک کے خلاف حق امورات میں مصروف ہوسکتا جب تک ان کی زبانیں خوف سے بند نہ کرا دیتا جو اعتراض کرسکتے۔

زہر اور تلوار سے مرنے والے مر چکے تھے۔ اب گُر سے مارے جانے کے قابل لوگ رہ گئے تھے کہ مدبرین یہ کہہ سکے کہ چونکہ اکابرین قریش مر چکے ہیں، ولیعہدی یزید کا اہتمام کیا جائے، اس لیے کہ اب کوئی فتنہ یا فساد نہ ہوگا۔ شام موافق تھا۔ عراق معترضین سے پاک کر دیا گیا تھا۔ حجاز یعنی اسلامیت کا گہوارہ اور دینی روایات کا مولد کیوں زیر اثر نہ لایا جاتا۔ خصوصاً جب کہ چار صاحب اثر لوگوں کی ناموافقت کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔

بعض کے موافق مدینہ میں معاویہ کے آمد کی خبر سنتے ہی چاروں حضرات مکہ چلے گئے لیکن میں ان مؤرخین کے قول کو زیادہ باور کرتا ہوں جن کے نزدیک یہ لوگ مدینہ میں تھے اور معاویہ سے گفتگو کے بعد مکہ روانہ ہوئے۔ ان کا روانہ ہونا ایسی دھمکیاں اور فقرات سننے کے بعد تھا کہ: "خدا تمھارا خون بہائے گا"۔ پھر بھی حسینؑ نے معاویہ سے "حسد اور عداوت" کے الفاظ سن کر اس کی امید کے خلاف ڈانٹ بتائی تھی کہ: "چپ رہ ہم اس کے اہل نہیں ہیں"۔ اور اس نے کہا کہ: "تم اس کے اور اس سے بدتر کے اہل ہو۔ تم لوگ ایسی بات چاہتے تھے خدا جس کے خلاف چاہتا تھا"۔

ہم اس کے پیشتر مثالیں دے چکے ہیں کہ مدبرین کو اس کی عادت ہو گئی تھی کہ ہر ایسی سختی کو جو وہ اور ان کی جماعت کسی فرد یا جماعت سے جائز رکھے وہ خدا کے عمل کے حوالہ کر دی جائے۔ اس کی غرض کچھ تو یہ ہوسکتی تھی کہ اپنے طرز عمل کو لوگوں کا آماج تنقید نہ بنائیں اور کچھ ملزم نفس کی تسکین مقصود تھی۔ اس کے عکس میں ادنیٰ سے ادنیٰ بات جو ان کے خلاف کی

یا کبھی جانے کرہ میں باندھ لی جاتی تھی اور کسی طرح اس میں قدریت سے تسلیم و رضا کا سبق نہ پڑھا جاتا تھا۔ ان تمام گفتگو کے بعد جس سے خون کی بو آتی تھی یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ منکرین بیعت حضرات اب مدینہ سے روانہ ہوئے ہوں۔ جسے سن کر امیر شام "متفکر" ہوسکتا تھا۔ تفکر کی وجہ ظاہر تھی۔ اس لیے کہ حضرت عائشہ نے بھی یہی ظاہر کیا کہ: "تم نے ان لوگوں کو قتل کی دھمکی دی ہے"۔ اور جب یہ دھمکی دی جاچکی تھی تو دھمکیاں سہنے والے مجاز تھے کہ درصورت موافقت نہ کرنے کے یا قتل ہونا گوارا کرتے اور یا کوئی ایسی فکر کرتے جس سے وہ ان دھمکیوں سے محفوظ ہوجاتے۔ کوئی تنہا نہ تھا۔ چار تھے اور سب صاحب اثر تھے۔

مکہ کی روانگی سے منکرین بیعتِ یزید کی کیا غرض تھی

میرے نزدیک عبداللہ بن زبیر کا بغرض حفاظت مکہ تشریف لے جانا مدینہ رہنے سے بہتر مصلحت نہ تھی نہ محض اس لحاظ سے کہ حضرت عائشہ مدینہ میں موجود تھیں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ وہ عامہ ناس پر اپنے وقار کو اب اس قدر مسلم الثبوت سمجھتی تھیں جس سے وہ معاویہ کو محمد بن ابی بکر کے طلب قصاص میں قتل کی دھمکی دے سکتیں۔ ان کی یہ روش بھی ہر طرح مناسب تھی کہ انھوں نے ان چاروں حضرات کے متعلق معاویہ سے اس کے الفاظ کی باز پرس کی۔ اور معاویہ کا جواب کہتا ہے کہ اسے اپنی غرض کی تکمیل کے لیے کیسی ہی بات کرنے سے کوئی تردد نہ تھا۔

مکہ میں حسینؑ کا موقع

لیکن اگر ابن زبیر اور ابن ابوبکر کا مکہ جانا دشمن کے خیال کے دو جگہ تقسیم کرنے کے لیے تھا کہ اگر وہ مدینہ میں حضرت عائشہ سے پیش آمد میں قابل اعتراض ثابت ہو تو ہم مکہ میں فکر کرسکیں اور اگر وہ مکہ پہنچ کر ہمارے ساتھ کوئی ناملائم برتاؤ کرے تو حضرت عائشہ مدینہ میں رہیں تو ہم پہلے خیال کو واپس لیں گے۔ ابن عمر اور حسینؑ کا موقع ایسا نہ تھا جیسا ان دونوں حضرات کا۔ اس لیے کہ ان کا حضرت عائشہ کا ایسا کوئی زبردست مددگار نہ تھا۔ موقع نہ ہونے کے علاوہ ہم یقین کرلیتے ہیں کہ ابن عمر خلافت کے حوصلوں سے پاک اور جنگی آدمی نہ تھے۔ حسینؑ ایسی کسی کوشش میں جو حضرت عائشہ کی مرکزیت سے شروع ہوتی۔ غالباً کوئی حصہ نہ لیتے کہ انھیں سب سے بہتر تجربہ تھا کہ حضرت عائشہ کو ابن زبیر کے خلیفہ بنانے کا کس قدر حوصلہ ہے۔ ہرصورت میں ایسی کسی کوشش اور کامیابی کا نتیجہ ابن زبیر کا خلیفہ ہونا ہوتا۔ حسینؑ اور ان کے پدر بزرگوار جب اپنے لیے بزور شمشیر معاملہ نہیں کرسکتے تھے تو استیلا کے لیے جگہ خالی نہیں ہے کہ وہ اوروں کا حوصلہ پورا کرنے کے لیے مخلوقات کے خون سے اپنا ہاتھ بھرتے۔ نظر بریں میرا تصفیہ ہے کہ حسینؑ کا مکہ تشریف لے جانا محض رفع شر اور حفاظت کی غرض سے تھا۔ جیسا اس کے بعد بھی انھوں نے ایسا ہی کیا۔ لیکن غالباً ان کا آئندہ موقع اسی وقت آجاتا۔ اگر اس وقت بھی اس پر بیعت یا قتل کا زور ڈالا جاتا جیسا اس کے بعد ہوا۔

معاویہ اور مکہ کی یاد داشت

معاویہ کے تفکر کے لیے اور کوئی چارہ نہ تھا بجز اس کے کہ وہ مکہ جاتا۔ یقیناً نہ اس لیے کہ وہ یاد کرتا تاکہ جو شخص خانہ ابوسفیان میں داخل ہوگا اسے امن ہوگا، نہ اس جگہ کی زیارت کرنے جارہا تھا جہاں حیوانی اور نباتی قتل جائز نہیں ہے۔ بلکہ ان لوگوں کی آزادی نفس کو قتل کرنے جارہا تھا جو ایسے کو خلیفہ تسلیم نہیں کررہے تھے جس کے عادات نے خود اس کے باپ

اور عاملوں کو متردد کر رکھا تھا اور اصولاً خلاف تھا۔ اور اس کیفیت لطف کے محسوس کرنے کے لیے جو ایک اموی کو اس خیال میں حاصل تھا کہ پشتوں کی جدوجہد کے بعد آج ہم بے مداخلت غیرے وطن میں شاہی داخلہ دیکھ اور دکھا سکے۔ داخل ہوا۔ منکرین بیعت سے ملاقات ہوئی۔ ایک طرف سے اصرار دوسری طرف سے انکار ہوا۔ اور معاویہ نے کہا: "خدا کی قسم اگر کسی نے میری بات رد کی تو خیر نہ ہوگی"۔ باغ سبز بھی دکھلا لیا۔ تحائف بھیجے۔ لیکن حسینؑ سے دور تھا کہ وہ اس رشوت پر نظر ڈالتے۔ بلکہ گفتگو میں جب حسینؑ نے امورات خلافت کے لیے کسی "بہتر شخص" کو منتخب کرنے کی صلاح دی اور معاویہ نے پوچھا کہ کیا تم اس سے اپنے کو مراد لیتے ہو تو فرمایا کہ: اگر "مَیں مراد لو تو بعید نہیں ہے"۔ اور پھر فرمایا کہ: "وہ کون ہے جو میری نانا کی امت کے لیے مجھ سے بہتر ہو"۔ یا فرمایا کہ: "مجھے اپنے نانا کی امت اپنی ذات سے زیادہ عزیز ہے"۔ پہلا فقرہ عین صدق ہے، دوسرے کو آئندہ زمانہ نے ثابت کیا کہ امت رسولؐ کا دینی وقار اور خصائل کی عظمت قائم رکھنے کے لیے حسینؑ نے اپنی عزیز جان اور ان کی جانوں کی جن کی جانیں حسینؑ کو عزیز تھیں کوئی پرواہ نہ کی۔

پہلے جواب میں حسینؑ نہ صرف اس تعلیمی استفادہ کی طرف اشارہ کر رہے تھے جو مہمات خلافت کی انجام دہی کے متعلق انھیں باسلسلہ حاصل تھا بلکہ اپنے فطری حق کو بھی ظاہر کرتے تھے۔ اور یہ باتیں اس لیے کافی ہونی چاہییے تھیں کہ امت محمدی ان کی خلافت پر راضی ہو جاتی۔ لیکن اب جواب یہ تھا کہ جاؤ اور اہل شام سے اپنی جان کو ڈراتے رہو!

سر ولیم میور اپنی لائف آف محمد کے دوسرے حصہ میں اس کا ذکر کرتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ نے معاویہ کے افعال کے متعلق حلف الفضول کا واسطہ دیا۔

مکہ کی سیاسی محفل

معاویہ کے لیے یہ مایوسانہ حالتیں کم پریشان کن نہ تھیں۔ نہ اس کی جھولی خالی ہو چکی تھی۔ مدینہ کی طرح لوگوں کو جمع کر کے منبر پر چڑھ جانا بے سود تھا۔ اس لیے کہ لوگوں نے تقریر کا کچھ جواب نہ دیا تھا۔ اب محض اقتدار کی نمائش ہی مقصود نہ تھی بلکہ اپنے صاحب شرطہ کو بلا کر کہا کہ: "جو شخص میرے بیان کی تکذیب کرے اس کی گردن فوراً اڑا دینا"۔ مکارانہ نقل اس کے بعد شروع ہوئی۔ جس میں خون کا حمل تھا۔ کمال ہوشمندی سے ان چاروں آدمیوں کے بیعت نہ کرنے کے واقعہ کو ناقابل اعتبار افواہ کہا۔ انھیں بزرگ زادگان عرب، اخیار مسلمین، مسلمانوں کے رومی پیشوا وغیرہ کہا: "جس کے مشورہ بغیر کوئی کام انجام کو نہیں پہنچ سکتا"۔ اور اب شاہی اطمینان سے انکے بیعت کرنے کا اعلان کیا۔ اور سب پر طرہ یہ تھا کہ: "یہ باتیں میں ان کے سامنے کہہ رہا ہوں کہ اگر کسی کو شبہ ہو تو تحقیق کر لے کہ انھوں نے یزید کی بیعت کی ہے یا نہیں"۔ کوئی عجب نہیں ہے کہ لوگ حیرت میں ڈوب گئے ہوں اور ایک دوسرے کا منھ دیکھ رہے ہوں۔ وہ اپنے میں "یا بہ آں شور اشوری یا بہ این بے نمکی" کا عالم محسوس کرتے ہوں۔ ان کی نگاہ میں ان لوگوں کے انکار کی وقعت گھٹ گئی ہو اور سوچنے کے لیے آمادہ ہو گئے ہوں کہ تو پھر ہم شاہی غضب کے آماج کیوں ہوں۔ مجھے شک نہیں ہے کہ لوگوں نے معاویہ کے کہنے کو سچ سمجھا۔ موقع کی بے لکنت دروغ گوئی نے ہر لفظ کو سچا دکھایا۔ ایسے افسوس ناک موقع پر جب کہ سچائی ذبح ہو رہی تھی میرے دانست میں مذاق کا عنصر غیر موجود نہ تھا۔ حسینؑ کی جھلاہٹ اور تنفر، لوگوں کی حیرت اور خفت سے دیکھنا، مقرر کے اعتبار انڈیلنے والے انداز اور اعتبار کے ڈھیلے پڑنے کے لیے قتل پر تیار رہنا۔ ان تمام باتوں میں تلخ ہنسی کی جگہ تھی۔ لیکن لفظوں میں بیان کرنا جس قدر

وقت کا محتاج ہے سرعت خیال اور نظر سے اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کل حالتیں اس قدر جلد گزریں جو وقفہ نہ کہا جاسکے، بلکہ حقیقۃً وقفہ کا نہ ہونا ہی معاویہ کے لیے مفید تھا۔ اس کی تقریر کے بعد لوگ حیرت سے چونکے نہ تھے کہ منتظر حکم وفادار جلاد اشارہ پاگئے اور تلواریں کھینچ کر ان کے سروں پر کھڑے ہو گئے جن سے انکار کا اندیشہ تھا۔

معاویہ کی تقریر کے عجب خیز مضمون کے بعد اس سے کسی طرح کم موثر سپاہیوں کا انداز نہ تھا۔ کون تھا جو اپنے پہلے سلسلہ خیال کو قائم رکھتا، اور اس نئے تماشہ کو دیکھنے نہ لگتا۔ معاویہ کی تقریر اگر ایک "طے شدہ" امر پر لوگوں کو راضی کر رہی تھی تو رہی سہی آڑ کو اس وقت تلوار اور خوف نے دور کر دیا تھا۔ سپاہیوں کی آمد انداز کے اعتبار سے کسی طرح بری نہ تھی نہ ان کے الفاظ بے کار تھے۔ الفاظ سپاہیوں کے نہ تھے۔ وہ نقال تھے۔ اس کے مُصنف نہ تھے۔ ان سے ایسے انعکاس سے کیا بحث جو احساسات کے جزر و مد کے لیے تیار اور پیش کیا گیا ہو۔ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ سپاہی معاویہ کی تقریر کے ایک ایک لفظ کو ایک مدبر کی طرح تول رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ معاویہ اس لیے تعریف کر رہا ہے کہ ان چاروں آدمیوں کے موقع کو عظیم سمجھتا ہے۔ عظیم سمجھنا خوف پیدا کرتا ہے اور وہ خوف قتل یا "سب کے سامنے" بیعت کرنے سے دُور ہو سکتا ہے۔ اور گویا تنگ آکر کہہ اٹھتے ہیں کہ: "کب تک تو ان چار شخصوں کی تعریف اور عزت کرے گا۔ ان کا موقع ایسا عظیم نہیں ہے کہ تو ان سے خوف کرے"۔ بظاہر یہ ایک منصفانہ تنقید تھی یا شاید مؤلف الفاروق کے لفظوں میں باستثنائے نام حالت بیان کی جاسکے کہ: "تم اس کا بھی اندازہ کر سکو گے کہ حضرت ..... کے عہد میں لوگ کس دلیری اور بے باکی سے اپنے خیالات ظاہر کرتے تھے۔ اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ حضرت ..... آزادی اور حق گوئی کو قوم میں پھیلانا چاہتے تھے!"۔

(ناظر کا جی چاہے تو نقطوں کی جگہ معاویہ کا نام لکھ دے)

معاویہ کے لحاظ سے تدبر یہ تھا کہ "بوسہ چند بیامیز بہ دشنامے چند" کے اصول پر مصلحت تیار کی گئی تھی اور "اخیار مُسلمین" کے اعتبار سے مرثیہ یہ تھا کہ حکومت خود میٹھی میٹھی بات کر کے اپنے دست و بازو سے ایسا کچھ کہلواتی تھی جو ان کی شان کے خلاف تھا۔ اور اس سے یہ سمجھاتی تھی کہ دیکھو یا تم میرے قدر شناسی پر مائل ہو اور یا اس پر راضی ہو جو میرے خیر خواہ چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ نرم گرم باتیں ایک ہی تقیہ کے لیے تھیں۔

اس کے بعد طے شدہ تدبیر میں یہ بھی داخل تھا کہ معاویہ ان اہل شرطہ کو "خاموش" کراتا۔ یہ ٹکڑا بھی نہایت خوب تھا۔ اس لیے کہ سرِ حکومت نہ صرف عام حاضرین بلکہ مُنکرین بیعت پر بھی اپنی ختم نہ ہونے والی عنایت کا اثر ڈال رہا تھا۔ اور پھر کیا ان دھمکیوں کے علاوہ قتل کرا دینے سے کوئی مزید فائدہ متصور تھا؟ نہیں۔ بلکہ مضر ہو سکتا تھا۔ اور یہ غرض حاصل ہوئی تھی کہ "لوگ بیعت پر آمادہ ہو گئے"۔ پھر کیوں اس وقت تک کی مفید مصلحت سے اعراض کیا جاتا کہ بہ جبر بیعت لی جاتی یا بیعت اور قتل کے علاوہ تیسری صورت نہ ہوتی۔

حسینؑ سے معاویہ کے اعلانؑ کے مُتعلق سوال اور انؑ کا جواب

یہ حقیقت کش نقل جسے مورخ یا مترجم ابن خلدون "حکمت عملی" کہتا ہے، ختم ہوئی۔ اب وہ فطری موقع آیا کہ عام لوگ ان چاروں حضرات خصوصاً حسینؑ سے

ان کی روش اور معاویہ کے اعلان کے متعلق سوال کرتے۔ حسینؑ نے اس کا جواب دیا: "واللہ ہم نے سراً علانیاً کسی طرح یزید کی بیعت نہیں کی ہے۔ لیکن معاویہ نے ہم سب کو فریب دیا، اور جو کچھ تم نے دیکھا اور سنا اس نے کیا۔ اور اہل شام نے اس کے کہنے سے اس قدر غلو کیا اور تلواریں کھینچیں۔ البتہ ہم خاموش تھے۔ نہ تم نے کچھ پوچھا نہ ہم نے جواب دیا"۔ اور اب لوگوں نے کہا کہ پھر آپؑ نے معاویہ کو اس سے کیوں نہ روکا؟۔ جواب دیا: "مسلمانوں کی خونریزی کے خیال سے"۔ "لوگوں کو اس مکر سے تعجب ہوا"۔

حسینؑ کی روش کے متعلق سوال اور جواب

سوال یہ ہے کہ ایسے موقع پر حسینؑ کو خاموش رہنا مناسب تھا یا نہیں۔ خاموش رہنے کے خلاف جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ باوجود اس قدرت کے کہ وہ لوگوں کو فریب میں نہ آنے دیتے اس وجہ سے فریب میں آنے دیا کہ وہ خاموش نہ رہنے کی صورت میں قتل کر ڈالے جاتے۔ یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ آیا ایک شخص کے لیے یہ زیبا ہے کہ وہ اپنے کو معرض ہلاکت میں گرفتار کرے یا فریب میں آنے دے۔ میں اس سے انکار نہ کروں گا کہ یہ درجہ اعلیٰ ہے کہ فریب میں نہ آنے دینے کے لیے کوشش کرے۔ اگرچہ ایسا کرنا اپنے کو ہلاکت ہی میں گرفتار کرا دینا کیوں نہ ہو۔ نہ ایسا تھا کہ حسینؑ نے فریب میں نہ آنے دینے کی کوشش نہ کی۔ ضرور عین موقع پر نہ کی۔ لیکن کچھ ضرور نہ تھا کہ اسی وقت مطلع کرتے۔ جب کہ اس وقت خاموش رہ کر نہ صرف اپنی جان بچا رہے تھے بلکہ اس کا بھی یقین تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگوں کو اصل حقیقت سے مطلع کر سکیں گے اور اس وقت اس کا اس سے زیادہ اثر ہوگا۔ جیسا اس وقت ہوتا اس لیے کہ اس وقت تو یہ بھی مشتبہ تھا کہ ہم انکار اور اس کے وجوہات بیان کر سکیں گے اور بہت ممکن تھا کہ جنبش کرتے ہی تلوار اپنا کام کر چکی ہوتی اور وہ مفید اطلاع بھی ختم ہو جاتی جو در صورت حیات لوگوں کے حوالہ کی جا سکتی تھی اور لوگ ایسے مجرمانہ فریب سے متنفر ہو سکتے تھے۔ جیسا اطلاع کے بعد ہوئے۔ اس وقت ظاہر کر دینے کی صورت میں دوسرا نقصان یہ تھا کہ شاید کچھ لوگ اور انکار کرتے اور وہ بھی تلوار کے نذر ہوتے بلکہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا۔ آخر یہ سب کیوں کیا جاتا جب کچھ دیر کے بعد بغیر کسی خونریزی کے یہ نتیجہ حاصل ہو سکتا تھا۔

دوسرے پہلو سے جواب کے لیے حسینؑ کو نہ معاویہ نے ذمہ دار بنایا تھا اور نہ لوگوں نے، بلکہ لوگ تھے جنہیں در صورت اشتباہ حسینؑ سے پوچھنے کا حق تھا۔ حسینؑ خود سے جواب دینے کے ذمہ دار نہ تھے۔ حسینؑ کا موقع ابن مریم کا ایسا نہ تھا کہ پائی لیٹ کے اس سوال کے جواب کے وہ ذمہ دار تھے کہ تو ہی وہ ہے جو اپنے کو یہود کا بادشاہ کہتا ہے؟۔ اور یہ جواب دیتے ہیں "تو کہتا ہے"۔ اگر سننے والے ایسے ہی خوش اعتقاد تھے کہ ہر چیخنے والے کے پیچھے دوڑ جاتے تھے درانحالیکہ کوئی آنکھوں کے سامنے تھی تو کیا امید تھی کہ ان کا انکار ایسے لوگوں پر کچھ اثر کرتا جو محض پوچھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے بلکہ دوسرے کو اپنے قتل کے اقدام پر آمادہ کرتے ہیں۔

نیز یہ کہ کیا وہ تمام لوگ جو یہاں موجود تھے حسینؑ کی بیعت میں تھے؟ بلکہ بہ استثنائے چند سب تھے جو معاویہ کی بیعت میں تھے۔ یعنی ایسے لوگ جو نواسۂ رسولؐ کے ہوتے ہوئے ایسے شخص کی حکومت پر راضی تھے جن سے اور جس کے اکثر حالات کو وہ جانتے تھے تو حسینؑ کو کیا امید تھی کہ وہ بمقابلہ معاویہ میری بات کی طرف زیادہ مائل ہوں گے۔ اور کیا یقین

تھا حسینؑ کو کہ میرا ایسے تشدد وقت اپنی زبان کو قابو میں نہ رکھنا اس قدر مفید ہوگا کہ لوگ ایک برے کام سے رُک جائیں گے۔ کچھ نہ تھا۔

پھر یہی حسینؑ کا جواب کہ: "نہ تم نے کچھ پوچھا نہ میں نے جواب دیا" بتاتا ہے کہ اگر لوگ پوچھتے تو حسینؑ اپنے اس اعلیٰ احساس سے جو ان میں تھا جواب دینا اپنے اوپر فرض کر لیتے اگرچہ وہ مخلوقات الٰہی کو فریب سے بچانے کی کوشش میں اسی وقت شہید ہی کیوں نہ ہو جاتے۔ مجھے کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ فقرات حسینؑ کے مصمم ارادہ کو بتا دیتے ہیں۔

میں سوچتا ہوں کہ ایسے موقع پر حسینؑ کا خاموشی کا تصفیہ کسی طرح اس پُر آسائش تصفیہ سے کم نہ تھا کہ بھائی کو بزورِ شمشیر روضۂ رسولؐ میں دفن کریں یا واپس جائیں۔ حسینؑ نے یہاں بھی دکھلایا کہ انھیں اپنے اوپر کس درجہ قابو حاصل تھا، اور یہی موقع تھا کہ حسینؑ نے اپنے پیشرو بزرگوں کی طرح مُسلمانوں کے خون کو بچایا۔

تقیہ کا مُسلمہ بین الفریقین موقع

میں ضمناً یہ بھی سوچتا ہوں کہ حسینؑ کے ساتھ ابن ابوبکر، ابن عمرؓ ابن زبیر کی خاموشی سے تقیہ کی غالباً یہ بہترین مثال مُسلمہ بین الفریقین قرار پائی۔ (تقیہ موقت ہے، نہ کہ غیر موقت)

بعض باتیں جو حسینؑ کے تجربہ میں آئیں

یہ بھی حسینؑ کے علم میں آنے والا تھا کہ حضرت عائشہ کی ضعیف العمری انھیں دشمنوں کے خلافِ اِنسانیت اِرادوں سے باز نہ رکھتی اور کیوں۔ وہ جانتے کہ شہدائے احد اپنے افکار کے اس خواب گاہ میں آرام نہ کر سکتے جسے انھوں نے اپنی زندگی کی قیمت اور سرفروشی کے حق سے حاصل کیا تھا۔

مکہ میں حسینؑ کا ایک کام

ممکن ہے کہ مکہ تشریف لانے کا یہی زمانہ ہو جس میں معاویہ کے آنے کے قبل حسینؑ نے ان کوششوں اور اس کے اثر کو دیکھ کر جو حکومت کی طرف سے جاری تھیں اس کی ضرورت دیکھی ہو کہ وہ ایک مرتبہ اس مجمع کو جو ان کے پاس ہو وہ احادیث رسولؐ یاد دلا دیں جو ان کے پدر بزرگوار، مادر گرامی، خود اپنے اور اپنے برادر عالی مقدار کے لیے تھیں۔ مجمع کی تعداد ایک ہزار کہی گئی ہے۔ جس میں حسینؑ نے خطبہ فرمایا، اور ان باتوں کو یاد دلایا جو معاویہ کی طرف سے ان کے اور ان کے دوستوں کے متعلق سرزد ہوئی تھیں۔ حالت کا صحیح اندازہ اس فقرہ سے کیا جاسکے گا کہ: "ہمیں دین خدا کے ضائع ہونے کا خوف ہے"۔ اس کی تاکید فرمائی کہ جو کچھ میں کہتا ہوں اسے اپنے وطنوں میں جا کر لوگوں سے کہنا، اور اسے محفوظ کر لینا۔ ظاہر ہے کہ یہ کوشش اس لیے تھی کہ اصل باتیں بھی لوگوں کے ذہن میں رہیں اور ان مسلسل شہرتوں سے متاثر نہ ہو جائیں جو حکومت کے قوی ہاتھ اور زبان سے ہو رہی ہیں۔ نہایت ضروری تھا کہ جس وقت ممالک اسلامیہ کے تمام منبروں سے حامی اسلام پر سب وشتم ہو رہی تھی وہ باتیں یاد دلائی جاتیں جو اس مظلوم کے متعلق شارعِ اِسلام فرما گیا تھا:

ان کل باتوں کے یاد دلانے پر جس میں سے ایک بھی کسی مُسلمان کے لیے مایہ ناز ہوتی۔ حاضرین نے اِرشادِ نبوی کی تصدیق کی اور سب لوگ منیٰ سے متفرق ہو گئے۔ یہ جماعت اگرچہ عدداً کچھ بہت زیادہ نہ تھی جس کا دشمنوں سے مقابلہ کیا جاسکتا۔ لیکن اگر حسینؑ ان میں اپنی سرگرمی پھونک سکے اور وہ لوگ بھی موقع کے لحاظ سے اپنی ذمہ داری

محسوس کرسکے ہوں تو کوئی شبہ نہیں کہ ان میں آلِ نبی کے حفظِ عزت کا عزم ارادہ پیدا ہو گیا ہو اور دینِ خدا کے ضائع نہ ہونے پر ہر شخص بجائے خود آمادہ ہو گیا ہو۔ جہاں تک اس کے حلقہ اثر میں ممکن ہو۔ حسینؑ کا یہ ہوش اور جوش مسلمانوں کے لیے ابدالآباد تک کے لیے نصیحت ہے۔

اموی لشکر کے ساتھ حسینؑ کے تشریف لے جانے کا عدمِ امکان

دونوں میں کی مورخین نے جنھوں نے یہ لکھا ہے کہ حسینؑ معاویہ کی فوجوں کے ساتھ رہے یا قسطنطنیہ کے محاصرہ میں شرکت کی، کوئی سند نہیں دی۔ یہ ایک واقعہ ہے جس کا بطلان اس سب سے بہتر طریقہ سے ہو سکتا ہے کہ معاویہ کی جو روش حسینؑ کے ساتھ تھی وہ ہرگز اس کی مقتضی نہ تھی کہ وہ معاویہ کی معرفت ایسے کسی کام کو طبعاً قبول کرتے۔ جب کہ خود حسنؑ کے متعلق اس کا پتا چلتا ہے کہ معاویہ نے خوارج کے خروج پر اس کی خواہش کی کہ وہ ان سے جنگ کریں اور انھوں نے اسے منظور نہ کیا۔ قسطنطنیہ کی فوج کشی ۵۰ھ کا واقعہ ہے یعنی جب کہ چند روز ہوئے تھے کہ حضرت امام حسنؑ کا واقعہ پیش آیا تھا اور جس زمانہ سے بیعت یزید کا مسئلہ چھڑا ہوا تھا۔ اسی زمانہ میں نہ معاویہ کی مصلحت مقتضی ہو سکتی تھی کہ وہ کوئی فوج حسینؑ کے حوالہ کرتا۔ اور نہ حسینؑ پر فراموشی اس قدر غالب آسکتی تھی کہ وہ شامی لشکر اور خصوصاً اس کے افسروں کے ساتھ ساتھ جاتے۔ مورخین خصوصاً ابن خلدون نے ابن عباس، ابن زبیر، ابوایوب انصاری اور ابن عامر کا نام لیا ہے۔ لیکن کہیں حسینؑ کا نام نہیں ہے۔ کم قیاس ہے کہ مورخین ان لوگوں اور اکثر افسران فوج کا نام لیتے اور حسینؑ کے نام کو فراموش کرسکتے اگر وہ شریک ہوتے۔

اس وقت تک کے مذکورہ واقعات اور حسینؑ

اب تک ہم جن واقعات پر نظر کر رہے تھے وہ اس درجہ مختلف خاصیت اور وسعت کے تھے جن میں سے اگر ہر ایک پر خصوصیت سے توجہ دلائی جاتی تو یقیناً سلسلہ بیان بے لطف ہو جاتا اور اکثر حافظہ مدد نہ کرتا کہ بڑے بڑے مضامین اور بعض غیر صریح اشاروں سے کہاں تک متعلق اثر ڈالنا ہماری غرض کے اندر رہے۔ واقعات میں کچھ ایسے تھے جو حسینؑ کے علم و تجربہ میں قبولیت کے آتے اور کچھ ایسے جو نامقبول اور ان سے دور رہنے کا اہتمام کیا جاتا۔ طبیعتیں تھیں جن میں سے بعض ایسی تھیں جن میں اصول خیر کا بہترین پرتو تھا اور ایسے نفس بھی تھے جن کا سایہ کانپ جانے کے لیے کافی ہوتا۔ اصول تھے مختلف مفہوم کے جو اپنے محور پر دورہ کر رہے تھے۔ اس میں ایک نتیجہ کے لیے نشو ہو رہا تھا اور ہر ایک کا کمہار اپنے خیالیہ پر صورتیں تیار کر رہا تھا۔ ان کے ضمنی اثر تھے اور وہ واقعات کی صورت اور جماعت انسانی کے اظہار حال کی زبان میں ظاہر ہو رہے تھے۔ کبھی اخلاقی قوت تھی جس نے معاشرت اور سیاست کو اپنے زیر سایہ رکھا تھا اور کبھی سیاست تھی جو اخلاقی قوت کا جزو بڑھ رہی تھی اور اپنے لیے تمام اصول کو اپنا بارکش بنا لیا تھا۔ محکوم اصول تیز دھار کے نیچے دست و بسمل میں مبتلا تھے اور زبان نہ تھی۔ دل تھے لیکن قوت نہ تھی۔ آنکھیں تھیں لیکن تیزی ضائع ہو گئی تھی۔ تھرائی تھیں اور برابر نہ دیکھ سکتی تھیں۔

یہ تمام حالتیں مولف نے اگر وضاحت سے نہیں تو مختصر اشاروں سے اس لیے دکھلائی تھیں کہ اس کے نزدیک حسینؑ کے واقعات اور سوانح سے انھیں کسی طرح کا تعلق تھا۔ ان میں اب تک زیادہ تر اسی نوعیت کی تھیں۔ جنھیں صریح یا غیر صریح

عکس ڈالتا تھا۔ اور کم حالتیں ایسی تھیں جو خود حسینؑ کی ذات سے ظاہر ہوتی تھیں۔ کم ظاہر ہونا اس وجہ سے تھا کہ ۴۹ھ تک حسینؑ کا موقع خود مختارانہ نہ تھا۔ اور نہ واقعات کی روش ان کے ساتھ ویسی تھی جس زیادتی کے ساتھ جناب امیرؑ کے لیے تھی۔ یہ باب جو محض اس لیے تھا کہ حسینؑ اور ان کی حیات پر عکس اور ان کی حیات پر عکس ڈالنے والے واقعات اس طرح دکھائے جائیں جس سے حسینؑ کا نفس، ان کی تربیت اور علم و تجربہ سے ان کی ساخت بھی جاسکے ختم ہوا۔ اور یہ اہتمام اس لیے کیا گیا کہ ۶۰ھ کے بعد چند روز کے واقعات کا تصفیہ بغیر اس کا خیال کیے نہ کیا جاسکے کہ اتفاقات نے ایسے اور اس قدر مختلف نوعیت کے واقعات کی حسینؑ کو تعلیم دی تھی جس سے بڑھ کر شاید ہی کسی کو موقع مل سکتا ہو۔ اور چونکہ یہ سمجھنے کی ضرورت کے موافق کہا جاچکا کہ حسینؑ کس قدر سریع الفہم اور ذکی الحس تھے۔ یہ قیاس کرنے کی گنجائش نہ رہی کہ وہ واقعات تو ان کی حیات میں بہت ہوتے لیکن وہ ان کے ہوش کے اندر نہ آتے۔ بلکہ اس طرح آتے کہ ہوش کو بے عمل کیے چارہ نہ تھا۔ مختصر لفظوں میں یہ تھے حسینؑ جو اس دن کے لیے ان قوتوں اور علم و تجربہ کے ساتھ تیار اور کھڑے ہوئے جس کا ذکر کیا جانے والا ہے۔

حسینؑ کے متعلق روایات کی شرح

اس باب میں جو کچھ باقی ہے وہ حسینؑ کے رحم و کرم، نیک نفسی، عفو، حلم، بخشش، تہذیب، شائستگی، خود داری اور اخلاقی عظمت کی جھلک ہے۔ اس کی مثال ہے کہ وہ کسی طرح مخلوقات الٰہی کے لطیف احساسات کا لحاظ کرتے تھے اور انھیں دکھانا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی قدر دانی علم اور اعلیٰ خیالی کی داد ہے اور اس کی کوشش ہے کہ وہ کس طرح اچھی باتوں پر انگلی رکھ کر ان میں ترقی دیا چاہتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ وہ باتیں ہیں جنھیں حسینؑ اپنی جگہ کرتے ہیں اور جسے کوئی خارجی اثر سے نسبت نہیں ہے۔ یہ بجائے خود وہ ضروری اشارہ ہیں جن سے حسینؑ کی طبیعت کے مختلف پہلو صفائی اور سادگی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ بغیر اس کے کہ اس پر کوئی سیاسی ملمع ہو۔

لطافتِ لحاظ اور حسنِ تعلیم

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس روایت کو کون سے وقت سے نسبت دوں۔ جس میں ایک بڑھے وضو کرنے والے کی غلطی بتانے کے لیے لطافتِ لحاظ کا اہتمام کیا گیا۔ اس سے یہ نہیں کہا کہ تم غلطی کرتے ہو بلکہ صحیح طریقہ اسے دکھایا۔ بڑھے نے ان کے حسنِ تعلیم کی داد دی۔

حسینؑ اور عمرو بن عاص کے فرزند میں الفاظ کا پُرلطف ردوبدل

جو غرض بھی ہو جس سے ابن عمرو بن عاص نے حسینؑ کے لیے محبوب اور فاضل ترین زمانہ کے الفاظ استعمال کیے لیکن حسینؑ کو موقع مل گیا کہ وہ اس کے الفاظ اور خیال و عمل کی عدم مطابقت پر اسے ٹوکتے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر عبداللہ کے الفاظ میں طنز تھا تو خود حسینؑ نہایت گوارا تلخی سے اس کے تیر کو اس کی طرف اس جھپتی ہوئی حیرت سے واپس کر رہے تھے کہ بڑا قدر دان فضل ہے کہ تو مجھ سے افضل سے لڑ گیا۔ اور اگر عبداللہ سچی بات اقراری لہجہ میں ادا کر رہا تھا تو یقیناً اسے اس بے خیالی کی سزا ملی کہ وہ پیشتر کیا کرچکا تھا۔ اور گویا حسینؑ اسے انابت کی طرف لا رہے تھے۔ چوٹ کھانے اور جست کرنے کے بعد عبداللہ نے معذرت کی لیکن پھر سنبھلا اور گزشتہ لغزش کے ڈھانکنے کے لیے اسے اس دلیل میں ایک پردہ مل گیا کہ رسولؐ نے اطاعت والدین کا حکم دیا ہے۔ میں نہیں

جانتا کہ اسے گھبراہٹ نے اس دلیل کو صحیح سمجھایا تھا یا بالارادہ مغالطہ کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ ایک جواب تھا جس میں سچائی غلط جگہ بٹھائی گئی تھی۔ لیکن عبداللہ کا مقابل کوئی ایسا نہ تھا جسے اپنے کسی ممتاز بزرگ سے محض نسبی سلسلہ کا ادعا ہو اور بس۔ حسینؑ اپنے جد بزرگوار کے صفات اور خیالات کے نواسہ بلکہ فرزند تھے۔ حسینؑ نے اپنے جواب میں پہلے قرآن شریف سے ایک وسیع اصول پیش کیا جس میں اس کی مثال تھی کہ والدین کی پیروی سے انحراف ہو سکتا ہے مثلاً شرک میں۔ اور پھر اور قریب آئے کہ اطاعت امر معروف میں ہوتی ہے نہ کہ ایسے امر میں جو خدا کی اطاعت سے منحرف کرے۔

یہ مکالمہ علاوہ حسینؑ کی زندہ دماغی اور نقادی کے بتاتا ہے کہ حسینؑ کو قرآن شریف اور اقوال رسولؐ پر کس درجہ تبحر تھا۔ تبحر نہ ایسا کہ ہر کالے کالے حرف اور صدا کی بے ہوشانہ تقلید کی جائے بلکہ جہاں غور اور عقل کو مذہب نے طلاق نہیں دیا ہے۔ عبداللہ نے اپنی ذمہ داری دوسرے کے سر دھکیلنے میں اپنی پناہ سمجھی تھی۔ لیکن حسینؑ اسے جھنجوڑتے ہیں کہ خدا اور رسولؐ نے تجھے اپنی ذمہ داری سے معذور نہیں کر دیا تھا۔ یہ اشارے حسینؑ کے گزشتہ کو روشن کرتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ ہوش سے گرد و پیش کے اثرات میں محض مقلد نہ تھے بلکہ موافقت یا مخالفت کرتے تھے اپنی ذمہ داری کے احساس سے اور اس مکالمہ کا دوسرا انداز یہ ہے کہ اگر عمرو بن عاص کا تقش علیؑ پر غالب نہ آیا تو بیٹے کی دلیل کب حسینؑ پر کوئی اثر کر سکتی تھی۔

سادی زندگی اور احسان کا صلہ

اس روایت میں اس زمانہ کی سادی اور بے تکلف زندگی کا نقشہ ہے کہ حج کرنے چلے جا رہے ہیں سامان سے آگے بڑھ آئے ہیں کہ بھوک پیاس معلوم ہوئی۔ ایک جھونپڑا دکھائی دیا۔ چلے گئے۔ پانی مانگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جگہ عرب کے ان مقامات میں تھی جہاں کوئی چشمہ یا کنواں قریب نہ تھا۔ دودھ دوہنے کی اجازت ملی اور ان لوگوں نے دودھ کر پیاس بجھائی اور سیر چشم بڑھیا نے یہ بھی گوارا کر لیا کہ اس کی بکری اس اتفاقی ضیافت میں صرف ہو جائے۔ ان لوگوں نے اپنا نام و نشان نہ بتایا بجز اس کے کہ ہم لوگ قریش سے ہیں۔ ہم سے مدینہ میں ملاقات کرنا۔ غالباً اس لیے کہ ہمیں پہچان کر بڑھیا کو ہماری ضیافت اور خاطر داری میں اپنی بساط سے زیادہ اہتمام کرنا پڑے اور کچھ اسباب اسے اندوہناک کرے۔ بڑھیا کو تنگی معیشت نے کچھ دنوں کے بعد مجبور کیا کہ وہ اپنی موجودہ پناہ سے نکل پڑی۔ اس کا فکر میں باہر نکلنا افلاس کی دوری کا سبب ہو گیا۔ اور حسنؑ نے بڑھیا کو پہچان کر اس قدر دیا جس کا وہ خواب نہ دیکھ سکتی تھی۔ حسینؑ اور عبداللہ بن جعفرؓ نے سبط اکبر کی تقلید کی اور شاید اس کے بعد بقیہ عمر بڑھیا آلِ ہاشم کے سخی اور خدمت شناس ہاتھوں کی مدد سے فکر رزق کی مشقت سے بے پرواہ ہو گئی۔

معافی اور وقت کی طبعی کیفیت

ہر شخص جانتا ہے کہ اگلے زمانہ میں آقا کو اپنے غلام اور کنیز پر کس درجہ قدرت حاصل تھی۔ اور نہ وہ برتاؤ معلوم ہیں جو روم، یونان، ایران، مصر، بابل وغیرہ میں ان مجبور ذی روحوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ اسلام نے ان کی حالت کا مطالعہ کیا اور ان کے ساتھ جس رحم و انسانیت کے برتاؤ کو اصول قرار دیا۔ اس سے انکار کرنا اس کو بھول جانا ہوگا کہ اس وقت کے غلام اپنی غلامی کو آزادی پر ترجیح دیتے تھے۔ میرے خیال میں ابھی دنیا نے حقیقی تہذیب اور شائستگی میں اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ وہ اس پر اعتراض کر سکے کہ اسلام نے غلامی کو قطعاً ممنوع کیوں قرار نہیں دیا۔ تہذیب اور شائستگی کی حقیقی ترقی اسلام کی

ایک صورت ہوگی اور اس وقت اسلئے اور متعصبانہ روش کے الزام خود ساقط ہو جائیں گے۔ کون سے حقوق تھے جو انھیں نہ دیے گئے تھے۔ اور کون سا انعام اور احسان تھا جو ان سے اٹھا رکھا جاتا تھا۔ اسلام کے ذمہ دار ہادیوں کی نہ صرف مثالیں ہیں بلکہ اس کی بھی کہ عامہ ناس نے بھی اس سے سبق حاصل کیا۔ یہ بات دوسری ہے کہ اسلام پر اعتراض کرتے وقت اس کے برتاؤ فراموش کر کے اپنے برتاؤ جو غلاموں کے ساتھ تھے پیش نظر رکھ کر اسلام پر اعتراض کیا جائے۔ ہمارے زمانہ کے متکلمین اسلام نے اس پر بحث کی ہے اور میں اس وقت اس سے زیادہ کہنا نہیں چاہتا بلکہ ذمہ دار ہادی کے حلم اور آزاد کرنے کا بہانہ ڈھونڈنے کی مثال دیتا ہوں کہ ایسے موقع پر جب کہ اپنی اور اپنے کپڑوں کی شان سے خود ہی مرعوب ہو جانے والے نہیں معلوم غیظ و غضب کا کیا اہتمام کرتے دیکھو حسینؑ کیا کرتے ہیں۔ کھانا کھا رہے ہیں یا کھانے کا تہیہ ہے کنیز لائی ہے کہ کسی وجہ سے کاسہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ پڑا۔ حسینؑ کی نگاہ اس پر اٹھ گئی۔ او ز کنیز کے الفاظ کہتے ہیں کہ وہ تمام روح و جسم سے تھرا گئی۔ لیکن اس نے بیچ اور حسینؑ کے دل پسند الفاظ میں (آیہ قرآنی) معافی کا استغاثہ کیا۔ اور ابھی اتنا ہی منھ سے نکلا تھا کہ: "وہ لوگ جو غصہ فرو کرتے ہیں" کہ غالباً حسینؑ نے اس کی خوف زدہ حالت دیکھ کر اس کا انتظار نہ کیا کہ وہ فقرہ تمام کرتی اور جلدی سے کہہ دیا کہ: "میں نے اپنا غصہ فرو کیا"۔ اب اس کی جان میں جان آئی اور اس نے بعد کا فقرہ کہا کہ: "اور جو لوگوں کو معاف کرتے ہیں"۔ فرمایا: "میں نے تجھے معاف کیا"۔ معافی کی خوشخبری سن کر اس نے تیسرا ٹکڑا بھی ادا کر دیا کہ: "خدا احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔ اور اب حسینؑ نے اسی بے جنبش حالت بلکہ بڑھتے ہوئے رحم و کرم سے فرمایا کہ: "میں نے تجھے خداوند تعالیٰ کی راہ میں آزاد کیا"۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ چار سو درہم بھی عطا کیے۔

مارکس ڈاڈ ڈاکٹر آف ڈیوی نی ٹی مصنف "محمد بدھ اینڈ کرائسٹ" زیر نظر روایت کے ذکر کے قبل کہتے ہیں:

"مذہب کا اثر سمجھنے کے لیے انفرادی مزاج کا بھی ضرور لحاظ کرنا ہوگا۔ ہم خونخوار خالد کو اسلامی اثر کا نمونہ اسی طرح کم قبول کریں گے جس طرح شریف النفس حسینؑ کو"۔ اس کتاب کے قابل مصنف کی روش اسلام اور شارع کے سمجھنے کے لیے ویسی ہی دور افتادہ اور دور افگن ہے جیسے کسی رقیب مذہب کے روسائے روحانی سے امید کی جا سکتی ہے اور جو خصوصاً بالعموم مسیحی مصنفین نے اختیار کی ہے۔ مسیحیت کے طریقہ اشاعت کی تاریخ جاننے والوں کے لیے یہ روش عجیب خیز نہیں ہے۔ قابل مصنف ان کے سامنے لیکچر دے رہا ہے جن میں جیسا خود اس نے حوالہ دیا ہے کہ "خود تعلیم یافتہ" اسلام کے متعلق "اس سے زیادہ نہیں جانتے کہ ترک تعدد ازدواج کے مرتکب ہوتے ہیں"۔ یا بہت سے اس علم پر قانع ہیں کہ اس کی (اسلام کی) ابتدا محمد سے ہوئی یہ اپنے معتقدین کو تعدد ازدواج پر برانگیختہ کرتا اور قدریہ بنا دیتا ہے اور مسلمان شراب سے نفرت کرتے ہیں"۔ مسیحیت کا لیکچر دیتے وقت ڈاکٹر آف ڈیوی نی ٹی سے امید کرنا کہ اسلامی خوبی کے ذکر کے وقت وہ ایسا ڈھیلا ہوگا کہ ایسی جماعت کو یہ سمجھنے دے کہ اسلام نے ایسی خصائل سازی کی دور از حال تھا بلکہ وہ قابل تعریف صنعت سے توڑ مروڑ کر دو متضاد حالتیں ایک ہی سانس میں پیش کرتا ہے۔ جن میں ایک نیک نفسانہ ہے تو دوسری "خونخواری" کے لحاظ سے ویسی ہی درجہ کی کریہہ ہے۔ یہ ویسی ہی متناقض مثالیں ہیں جیسے ایک کلمہ سے صلح اور دوسرے سے سانس بھوؤں کے لڑوانے کا اعلان ہو۔ حالانکہ اسلام خونخواری کو منع اور عفو کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن قابل لیکچرر

انفرادی مزاج کے حوالہ کر کے دونوں کو اسلام جھاڑ دیتا ہے۔ نہ صاف صاف یہ سمجھنے دیتا ہے کہ انفرادی مزاج کی تربیت کے لیے مذہب کی ضرورت اس کے نزدیک ہے یا نہیں۔ یا وہ مذہب کو اس کے خالص اصول سے سمجھا چاہتا ہے۔ اسے حقیقۃً کراہت کے ذکر سے بحث نہ ہوتی۔ اگر نیک نفسی کو اسلامی اثر سے دور رکھنے کا اہتمام مد نظر نہ ہوتا۔ وہ برائی کے ساتھ بھلائی کو بھی معیار سے خارج کر کے اپنی منصفانہ روش کا اقرار لیا چاہتا ہے۔

مجھے کوئی شبہ نہیں کہ وہ اس موقع پر روکھی عالمانہ اور عقلی روش پسند کرتا ہے جہاں وہ "انفرادی مزاج" کو مذہب کے اثر کے سمجھنے میں کامل خود مختاری عطا کرتا ہے۔ نہ میں غلامی کا محرک ہوں لیکن یہ سوال لطف سے خالی نہ ہوگا کہ اگر ابن مریم کا رحم حلم اور محبت جس کی روایتیں ہم تک ان کی زبانی پہنچی ہیں جن میں سے اکثر نے انھیں دیکھا نہ تھا نہ کوئی سلسلہ روایات تھا۔ اور سب پر طرہ یہ ہے کہ واقعات کے لیے الہام کی مدد لینے کی ضرورت ہوئی ہے۔ اگر ان کے اصول سے خارج کر کے انفرادی مزاج کے حوالہ کر دیا جائے تو مسیحیت کہاں رہتی ہے۔ نہ مسیحیت کے لیے میرے نزدیک یہ انصاف ہوگا اگر یہ پسند حتمی مثال میں پیش کی جائے کہ اس نے جوڑا استغراق بنائے' یا جیسا خود مصنف نے کہا ہے کہ: "بدنام اور عیاش مزاج قطعی راہبوں سے مسیحیت کا اندازہ کرنا بے انصافی ہوگی"۔ نہ مجھے کوئی غم ہوگا اگر مسیحیت مذہب کو انفرادی خصائل کی درستی کے لیے نمونہ اور آلہ نہ قرار دے۔ انفرادی خصائل کی آزادی سوخت نہیں ہوتی اگر وہ مذہب کے کسی اصول کو پسند کرتا ہے اور نہ مذہب انفرادی مزاج کی قابل تعریف خوبی کے اعتراف سے باز رہتا ہے اگرچہ وہ خوبی بظاہر کسی مذہب کے اثر سے پیدا نہ ہوئی ہو۔ اور یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ یہ مزاج کس سایہ سے متاثر ہوا۔ اور اگر انفرادی مزاج قابل تعریف ہے اور مذہب کے اصول کو پسند کرتا ہے تو گویا ایک دوسرے کے مداح ہیں۔ جماعت انسانی میں بلا قید مذہب بھی اچھے اور برے خصائل کے لوگ پائے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ اس حالت میں پابندی اخلاق اس کے لیے محض پسند کرنے یا نہ کرنے کی چیز ہوگی در آنحالیکہ مذہب کی پابندی نہ صرف انفرادی مزاج درست کر سکتی ہے جس سے وہ پابند اخلاق ہو بلکہ اس کے علاوہ پابندی اخلاق کو پیروی مذہب سے اور زیادہ روحانی سند عطا کرتی ہے۔ یہ عام حالت ان سے متعلق نہیں کی جاسکتی جو ذمہ داران مذہب ہوں۔ اور جن کی ہر روش میں یہ قوت ہو کہ قوم اسے اپنے لیے نمونہ قرار دے۔ حسینؑ اسلام کے اس سلسلہ میں تھے جو اسلام کے ذمہ دار رہنما تھے اور ان کا ہر فعل اسلامی روشنی سے دیکھا جاتا تھا۔ اس لیے انھیں بھی اپنے صفات میں اسلامی اثر سے علیحدہ کر کے محض انفرادی مزاج کے حوالہ کر دینا ان کے واقعات سے منفرد غلطی ہوگی۔ اس کے علاوہ حسینؑ کے انفرادی مزاج کا اس وقت سے جب سے کہ وہ رحم مادر میں تھے اور اس وقت تک جب کہ ان سے رحم و عفو کی یہ مثال ظاہر ہوئی اسلام اور شارع کے زیر اثر نشو ہوا تھا۔ خالد اپنی حیات کے زیادہ حصہ تک اس اثر میں نہ تھے اور اگرچہ وہ مسلمان ہوئے مگر انھوں نے اس احتیاط سے تعلیم اسلامی کی پیروی نہ کی جس سے ان کا انفرادی مزاج اسلامی تعلیم کا نمونہ کہا جاسکتا۔ بلکہ وہ اپنی پہلی روش پر قائم رہا۔ بلکہ واقعہ بنی خزاعہ میں رسولؐ نے یہ کہہ کر "خالد نے جو کچھ کیا میں اس سے راضی نہ تھا"۔ اس جگہ انگلی رکھ دی جہاں کوئی انفرادی مزاج پیروی اسلام سے علیحدہ رہا۔

اس سب کا نتیجہ یہ ہے کہ انفرادی مزاج جو کچھ کرتا ہے مذہب ان تمام حرکات کے متعلق کچھ حکم دیتا ہے اگر وہ انفرادی مزاج حلقہ مذہب میں بھی داخل ہے تو اس کے افعال اس مذہب کے معیار حکم سے دیکھے جائیں گے یا مذہب

اپنے اصول سے دیکھا جانے گا اور عمل سے سمجھا جانے لگا۔ اور چونکہ حسینؑ سے جو عفو و رحم ظاہر ہوا وہ تعلیم اسلامی کے اندر ہے اور چونکہ خود حسینؑ ان لوگوں میں کے ایک تھے جو تعلیم اسلامی کے نمونے تھے اور چونکہ وہ خود ہمیشہ اسلامی اثر میں رہے اس لیے انھیں اسلامی اثر کے سمجھنے میں نہ قبول کرنا کسی مذہب کی خوبیوں سے عارفانہ تجاہل ہوگا، اور یہ موقع تو وہ تھا جہاں حسینؑ آیہ قرآنی سے متاثر ہوئے تھے۔ ایک انفرادی مزاج مذہب کی ایک اعلیٰ پیش کش کو قبول کر رہا تھا۔

پرلطف کشیدگی اور صلح

نہیں معلوم کیا وجہ ہوئی جس سے یہ روایت تیار ہوئی کہ حسینؑ اور محمد ابن حنفیہ میں کشیدگی ہو گئی ہو یہی جاتا ہے۔ خصوصاً اعزا میں اور چھیڑ یا شکایت کا کمزور تار اس وقت تک بڑھتا جاتا ہے جب تک در گزر اور صاف دلی سے اس کے دور کر دینے کا ارادہ اور پیش قدمی نہ کی جائے۔ زیر ذکر حالت کچھ ایسی معلوم نہیں ہوتی جس میں کشیدگی زیادہ ہوتی جاتی اور موافقت کا کوئی راستہ نہ ہوتا۔ اس روایت میں لطف یہ ہے کہ تحریک صلح محمد ابن حنفیہ کرتے ہیں اور تحریک موافقت حسینؑ سے چاہتے ہیں۔ اس میں انصاف تھا اور دونوں حضرات کی بات برابر رہنے سے کسی کی آن کو ٹھیس پہنچنے کا بھی موقع نہ تھا۔ لیکن چونکہ منانے کی ذمہ داری حسینؑ کے حوالہ کی گئی تھی اس کے لیے ایک نہایت خوبصورت وجہ بھی لکھی تھی کہ "تم احق بالفضل ہو"۔ اور یہ اس وجہ سے کہ اگرچہ پدری سلسلہ سے ہم تم برابر ہیں لیکن مادری سلسلہ سے تم اشرف ہو۔ آپس کا یہ شیریں لحاظ حسینؑ کے ایسے ذکی الحس سے چاہتا تھا کہ وہ اس فردانہ ناز تحکم کی قدر کریں۔ کشیدگی جاتی رہی۔ مبارک۔

کنیز کا تحفہ اور طبائع کا عمل

ایک کنیز اپنے مالک کو تحفہ دیتی ہے۔ یہ حالت میرے نزدیک بے حد قابل رحم اور غم آلود ہے۔ ایک دست نگر اسے کچھ پیش کر رہا ہے جو اس کا سہارا ہے۔ غالباً وہی یا اس کی کوئی دوسری صورت تحفہ میں دیتا ہے جو اسے مل چکی تھی۔ اپنے اور اپنے تحفہ کے حقیر موقع کو دیکھتا ہے لیکن پھر چاہتا یہی ہے کہ پیش کرے۔ اس موقع میں مساوات کی ایک مجھی ہوئی صورت ہے۔ اب امید ہے۔ بیم ہے۔ چہرے کے رنگ اڑے ہوئے ہیں۔ عجز ہے دل ہے جو ٹوٹ جانے اور گری ہوئی میں ٹھہرا رہا ہے۔ نہیں معلوم مالک ہمارا دل رکھے یا نہ رکھے۔ ظاہر کہ حسی لحاظ سے مالک کی ہر ادا کے لیے یہ ایک نازک سا اور محتاط موقع ہے۔ حسینؑ الفقر فخری کے فرزند تھے۔ جس نے اپنے خاندان سمیت بالارادہ اس حالت کا مطالعہ اور اندازہ کیا تھا۔ حسینؑ اس کے فرزند تھے جس کے احکام طبائع انسانی کے کامل ملاحظہ اور گہرے مطالعہ پر مبنی تھے۔ حسینؑ کی سریع الفہمی، احساس شناسی اور رحم کے سمجھنے کے لیے اس کے بعد کسی مثال کی ضرورت نہیں ہے کہ ہاتھ گلدستہ کی طرف بڑھ رہا تھا اور زبان مبارک آزادی کا حکم سنا رہی تھی۔ کنیز کی خوشی تو جانے دو۔ موقع ایسا تھا کہ دیکھنے والا چونک پڑا اور کہہ اٹھا کہ تحفہ اور جواب میں کوئی نسبت نہیں ہے۔ ایک بے حقیقت شے ایسے انعام کی مستوجب نہیں ہے۔ یہاں حسینؑ اور ان کا غیر سامنے ہے۔ دونوں نے ایک حالت کو ایک وقت دیکھا تھا۔ ایک محض ریحان کا ڈنٹھل اور چند پتیاں دیکھتا ہے۔ حسینؑ اس کے پیچھے ایک مچلا ہوا دل دیکھتے ہیں۔ جس کا مرجھانا اور ہرا ہونا حسینؑ کے انداز اور جواب پر موقوف تھا۔ خوش کرنے کے لیے کافی تھا کہ قبول کر لیتے۔ اور بس معترض خوش ہو جاتا، اور شاید ایک آدھ مرتبہ خود بھی گلدستہ پر اپنی ناک رگڑ لیتا، اور اظہارِ اطمینان و خوش وقتی کے لیے بنتا۔ جیسا وہ بن سکتا، اور غالباً اِدھر اُدھر دیکھتا کہ کوئی قدر دان ہے یا نہیں۔ حسینؑ کا علوی نفس

یہ تھا کہ جیسا انھوں نے قرآن مجید کی آیت میں ظاہر فرمایا۔ حکم عام تھا۔ یہاں اگر رد کرتے تو دل شکستگی ہوتی۔ رد نہ کرتے تو تعمیل ارشاد قرآنی کی حسینؑ کے نزدیک اس سے بہتر صورت نہ تھی جو کی۔ مثال میں آیۂ قرآنی وہ پیش کیا جس میں عبدیت یا غیر عبدیت کی کوئی قید نہیں ہے۔

بخشش اور عذر

ہوسکتا ہے کہ سائل اپنے لیے مہربان کرنے کو تعریفیں کر رہا ہو۔ لیکن اس کا کہنا کہ جس نے تم سے امید رکھی وہ محروم نہیں ہوا۔ یا تم پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ یا تمھارے پدر بزرگوار نے فاسقوں کو قتل اور اجرائے احکام میں جوش و سرگرمی ظاہر کی۔ یہ سب گزری ہوئی باتوں کو یاد کرنا تھا۔ جس نے خلق کو ان بداعمالیوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ مغفرت کی دشواریاں ہیں۔ ابھی ایک طرح کی عبادت (نماز) ختم کی تھی کہ حاجت برآری کی دوسری عبادت میں مشغول ہوگئے۔ اظہار انکساری کے ساتھ معافی کی خواہش بھی ضم کردی اور چونکہ سائل کی پس بینی خیال دلا سکتی تھی کہ اسے حسینؑ کی دنیاوی حالت کے سمجھنے میں واقعہ سے زیادہ مبالغہ ہوسکتا ہے اس لیے یہ بھی فرمادیا کہ میری شفقت میں کمی نہیں ہے۔ لیکن تغیرات زمانہ کی وجہ سے مال کی کمی ہے۔ میں اور زیادہ بخشش کرتا اگر مجھے قدرت ہوتی۔

سوال اور عطا کا نفس

سوال اور عطا کی حالتوں کو چیر کر حسینؑ نے دکھادیا جس وقت سوال کی حالت کو آبرو حوالہ کرنا یا دوسرے لفظوں میں آبرو کا اکرام نہ کرنا فرمایا ہے۔ اور یہ فرمایا کر کہ سائل کو "محروم واپس کر کے اپنی آبرو زائل نہ کرو"۔ ایک نہایت لطیف جزرومد کا نقشہ کھینچا ہے۔ محروم واپس کرنا دوسرے کی اس حالت کے ساتھ ہمدردی نہیں ہے جس میں وہ اس پر مجبور ہوا کہ وہ سوال سے اپنے کو تمھارے سامنے بے عزت کرتا۔ اسے تم سے امید تھی۔ تمھارا انکار اس اعتماد کا بطلان ہے جو کسی کو تم سے تھا۔ درآنحالیکہ ہمدردی کرنا اپنے "چہرہ کی تکریم" بھی ہوتی۔ لطیف خیال ہے جو لطیف لفظوں میں ادا کیا گیا ہے۔ جس کی پشت پر ہدایت ہے۔

دوسروں کے لحاظ کو اپنی تکلیف سے راحت دی

آپؑ نے نہ صرف بہت سے حج کیے بلکہ پیدل تشریف لے گئے۔ حاجیوں کا قافلہ مل گیا۔ اس میں پہچاننے والے لوگ بھی تھے۔ جس میں سب سے مشہور سعد بن ابی وقاص تھے۔ (یہ واقعہ ۵۵ھ کے قبل کا ہے اس لیے کہ سعد نے اسی سنہ میں انتقال کیا) یہ تعظیماً اپنی سواری سے اتر پڑے اس لیے کہ معلم حج کا فرزند سواری پر نہ تھا۔ ممکن ہے کہ جاننے والوں کو دیکھ کر نہ پہچاننے والے بھی پہچان گئے ہوں اور تھوڑی دیر میں قافلہ کا قافلہ اپنی سواریوں سے اتر گیا ہو۔ ممکن ہے کہ قافلہ کے ساتھ مریض اور ضعیف ہوں یا لوگ ہوں۔ جنھیں اگرچہ کسی قسم کا ضعف لاحق نہ ہو مگر ثروت اور آرام طلبی کا مرض لاحق ہوگیا ہو اور اب ان سے دھوپ میں تھوڑی دیر پیدل نہ چلا جاتا ہو۔ سعد ضعیف آدمی تھے۔ جناب امیرؑ سے بھی ایک آدھ برس عمر میں زیادہ تھے۔ انھوں نے نواسہ رسولؐ سے سوار ہوجانے کی گزارش کی۔ یہ درخواست حسینؑ کو بٹھادینے کے لیے کافی تھی کہ یہ یا اور چند لوگ پیادہ چلنے سے متاذی ہورہے ہیں۔ حسینؑ کو کب گوارا تھا کہ کسی کو ان کی وجہ سے کوئی تکلیف ہوتی لیکن چونکہ حسینؑ پیدل تشریف لے جارہے تھے اور اس حالت میں لوگوں کو سوار ہونے میں تکلف ہوتا آپؑ نے وہ راہ ترک کردی اور دوسرے راستہ سے تشریف لے گئے۔

حسینؑ کے اثر کا اثر

ایسا ہی موقع ایک مرتبہ آیا کہ سواری آگے آگے جا رہی تھی اور خود پیدل تشریف لے جاتے تھے کہ کسی نے کہا کہ آپؑ خدا کا بہت خوف کرتے ہیں اور آپؑ کا جواب بتاتا ہے کہ سزا و جزا کا کس درجہ اثر تھا۔ ایسے خاصان خدا کا مالک یوم الدین کی درگاہ میں عجز و انکسار مذہب کے خلوص اور قوت و اثر کی نوعیت بتاتا ہے۔

قدرت کے وقت اپنے اُوپر اختیار اور درگزر

مجھے ایسی نصیحتیں سن لینے میں کوئی عذر نہیں ہے کہ اگر کوئی تمہارے ایک کلہ پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی سامنے کر دو۔ نہ مجھے رشی گوتم کی کسی ایسی تعلیم سے چونکنا ہے کہ تمام جذبات کو فنا کر دو۔ کیونکہ بہت سی بڑی مثالوں میں چند خوشنما اگرچہ ناقابل عمل نصیحتوں کا ہونا نفع اور ضرر کی درمیانی حالت میں ہے۔ کم سے کم انھیں جذبات کے لگام دینے کے لیے کام میں لانا مفید ہو سکتا ہے۔ میرے لیے یقین کے اسباب نہیں ہیں کہ ابن مریمؑ اپنے کو اپنی نصیحت کا مثالیہ ثابت کر سکے اور نہ مثالیں ہیں کہ رشی گوتم کے لیے ایسا موقع آیا اور ان میں جذبات کی کوئی حرکت محسوس نہ ہوئی۔ دوسروں کو قربانی اور قتل سے منع کرنا اور خود گوشت کھانا کچھ کلاً بہت حوصلہ افزا نہیں ہے۔ یہ خبر تو ہے کہ متمول پورنا گوتم بدھ کے سامنے اقرار کرتا ہے کہ وہ سروں پر ہاتھ کے وحشیوں کے ظلم اور سختی کو محبت اور درگزر سے دیکھے گا لیکن اس کے بعد محبت اور درگزر کے واقعات نہیں ہیں جن سے خیال اور عمل کی تطبیق بھی جا سکے۔ اس کے علاوہ محبت اور درگزر کا صحیح اندازہ اس وقت کیا جا سکے کا جب یہ سمجھا جا سکے کہ اس کے خلاف بھی کچھ کرنے کی قوت تھی ورنہ گرفتار بندوں کے حلم کی تعریف سے بہتر نہ ہوگی۔ بقول حضرت امام حسین: "سب سے بڑھ کر معاف کرنے والا وہ ہے جو اپنے قابو کے وقت معاف کرے"۔ یہ باتیں علاوہ اس لحاظ کے ہوں گی کہ کیوں جذبات ہمیشہ بری ہی نظر سے دیکھے جائیں، بلکہ صحیح جذبات کا مخلوط اور مناسب مصرف ہماری عملی نہ کہ خیالی دنیا کے لیے زیادہ تر قابل قبول ہے۔ میرے نزدیک کنگفوزی کا خیال بہ نسبت مسیحؑ اور بدھ کے زیادہ تر اس دُنیا کا خیال ہے اور اسلام کے تصفیہ اور طرز عمل سے قریبی مناسبت ہے۔ ان چند تمہیدی سطروں سے ہماری غرض اس روایت کی شرح ہے کہ ایسی حالت میں جب کہ حسینؑ اس کے لیے مطلق تیار نہ تھے کہ کوئی ان کی شان میں پُر اصرار اور دل آزار گستاخی کیا چاہتا ہے، دفعۃً ایک شخص سامنے آتا ہے اور انھیں پہچانتے کے بعد انھیں اور ان کے پدر بزرگوار کو برا بھلا کہنا شروع کرتا ہے۔ حسینؑ سنتے رہے۔ اندازِ آواز اور الفاظ میں کوئی تغیر دکھائی نہ دیا۔ یہاں تک کہ بدگو کا منھ تھکا اور چپ ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام دوران میں حسینؑ کی نگاہیں اس پر تھیں۔ "مسکرا رہے تھے"۔ نظر اور تبسم کے نیچے وہ چمک تھی جو حقیقت حال کے سمجھنے کے لیے محرک ہوتی ہے اور اپنے سایہ سے چیزوں کو روشن کر دیتی ہے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ بھرا ہوا بدگو اپنے جوش میں اس وقت تک بکتا رہا جب تک اس نے غور سے حسینؑ کا چہرہ اقدس نہ دیکھا اور اس کے بعد اسے اپنے الفاظ کی کراہت سے زیادہ حسینؑ کے انداز نے شرمندہ کر کے چپ کر دیا۔ کب اسے امید ہوگی کہ کوئی برے الفاظ اس اچھے انداز سے سنے گا اور خیال بھی نہ ہوگا کہ اگر اس کے بعد جواب دے گا تو اس سے رحم، درگزر اور محبت کے قطرے ٹپکتے ہوں گے۔ بلکہ احسان اور انعام کا امیدوار کرتا ہوگا۔ اسے "عزیز" کے لفظ سے مخاطب فرماتے ہیں۔ دماغ کے علاج کرا دینے کا امیدوار کرتے ہیں" یا

نقد روپیہ دیتے ہیں۔ اگر مزاح کا عدم اعتدال بی بی کے ستانے سے پیدا ہو گیا ہو۔ حسینؑ کے جواب میں مزاح ہے اور یہ ان کے مزاج کی اس وقت کی یہ صورت دکھاتا ہے۔ بدگو کی گستاخی رفقا کو برافروختہ کرتی ہے۔ سزا دینے پر آمادہ ہوتے ہیں لیکن حسینؑ اپنا حلم یاد دلاتے اور تسکین دیتے ہیں کہ: "کوئی چیز ہیں جنبش نہیں دے سکتی"۔ اللہ اکبر!۔

(ازام کرشن پرم ہنس نے اپنے امریکا کے سلسلہ لیکچر میں اس حالت کا ذکر کیا ہے جس کی سنسکرت اصطلاح میرے حافظہ کے لیے ثقیل تھی۔ قابل لیکچرر نے بھی وہ ظرف نہیں دکھایا جس میں یہ حالت پائی گئی ہو)

ایسے زمانہ میں جب کہ آل عبا کی توہین کے علاوہ حکومت اور اس کے روشناسوں کو دین و دنیا میں کوئی دوسرا کام ہی نہ رہ گیا تھا کچھ عجب نہیں ہے۔ اگر ایسے موقع آجایا کرتے ہوں کہ کوئی اسلام فراموش ان کے منہ پر انھیں کچھ کہہ کر اپنی جراَت آزمائی چاہتا ہو۔ یہ دوسری مثال بھی متذکرہ صدر ریمارک کے تابع ہے کہ سب دشتم کے دوسرے موقع پر حسینؑ کے چہرہ مبارک پر کوئی شکن نہیں دکھائی دیتی۔ اور آپؑ ان کو جو سزا دینا چاہتے تھے ان الفاظ سے منع فرماتے ہیں کہ: "فرشتے اس گھر میں نہیں جاتے جہاں کتا ہوتا ہے"۔ اس سے اور کیا سمجھ میں آتا ہے بجز اس کے کہ غصہ وہ ذریعہ ہے جو اعتدال طبیعت کو جو بجائے خود رحمت خدا ہے اور جو حالت مزید رحمتوں کی مستوجب ہو سکتی ہے، دور کر کے غیر مفید رجعت کا باعث ہوتا ہے۔ اور اتنی دیر تک خدا کی مزید رحمتوں سے محروم رکھتا ہے۔

خواہش عقد کے معنی

پیشتر اس کے اشارے کیے جا چکے ہیں کہ کس طرح عبد اللہ بن عباس اور عبد اللہ بن جعفر کو اپنا کر کے بنی ہاشم کی معاشرتی سیاست یا سیاست منزل میں رخنہ اندازی کی کوشش کی جا چکی تھی۔ اس مرتبہ اس اقدام سے کہ ام کلثوم بنت عبد اللہ کی خواہش کی جائے کسی قدر زیادہ جراَت سے ایک صلح پسندانہ صورت اختیار کی گئی تھی۔ مضمون سفارت ضمنی گفتگو، لہجہ اور انداز سب پر شیرینی کی دبیز تہ جمانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مروان وکیل تھا۔ عبد اللہ بن جعفر نے پھر پوری وفاداری کا ثبوت دیا اور اس معاملہ کو حسینؑ پر محمول کر دیا۔ مروان نے کل باتیں سوچ سوچ کر اگل دیں۔ عقد ہو جانے کو بہتر کہا۔ معاویہ کو ادائے مہر کا (جس قدر ہو) ذمہ دار قرار دیا۔ خاندانوں کی موجودہ صلح اور آئندہ امید صلح کا یقین دلایا۔ عبد اللہ کے قرض ادا کرنے کی امید دلائی اور کسی قدر رغبیہ کی شان سے کہا کہ: "اے حسینؑ آپؑ کو معلوم ہونا چاہیے کہ بہ نسبت یزید کے آپؑ کو اچھا سمجھنے والے کم ہیں اور بہ نسبت آپؑ کے یزید کو اچھا سمجھنے والے زیادہ ہیں"۔ کہہ چکا طرید رسولؐ اور اس کے انتظار جواب کی صورت مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ نواسہ رسولؐ سنتا رہا۔ حسینؑ کس طرح سنتے رہے اور اس وقت ان کی طبیعت کی صورت کیا تھی۔ یہ میرے نزدیک ان کے ابتدائی فقرہ کی چھوٹ سے صاف ظاہر ہے۔ جہاں وہ جناب شروع فرماتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ جواب کے لیے بے چین ہیں کہ وہ جلد گفتگو ختم کرے۔ ابتدا تھی کہ: "شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمیں اپنے لیے اختیار کیا اور اپنی مخلوقات میں ہمیں بزرگی دی"۔ یزید بادشاہ تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اگر ہم بنی ہاشم سے شادی بیاہ کے مراسم قائم کرنے کی خواہش کریں گے تو وہ خوش ہوں گے اور اپنی بڑائی سمجھیں گے۔ حسینؑ کے جواب کی ابتدا ظاہر کرتی ہے کہ وہ جس کے خاندان کو خدا نے اپنا وکیل قرار دیا ہو جو مخلوقات پر فضیلت کی ایک دلیل ہو وہ کسی صاحب اختیار کے اظہار وابستگی کو اپنے لیے کوئی منزلت نہیں سمجھ سکتا۔ اسی مشکورانہ سلسلہ میں اپنی دوسری ذاتی اور خاندانی وجاہت کا نام

لیتے ہیں کہ: "خدا نے ہمیں اپنے دین کے لیے پسند فرمایا"۔ وہی بات جس کے مٹانے کے لیے حکومت کے تمام سامان صرف ہو رہے تھے۔ ایک آگ جس کے بجھانے کے لیے کبھی اس کے آثار پر نہر کاٹ کر لائی جاتی تھی اور کبھی ٹھنڈا فولاد استعمال کیا جاتا تھا اور کبھی خنک مزاجی سے تدبیریں سوچی جاتی تھیں۔ اور یہ فقرہ تھا جس کا عامہ مُسلمین تو انکار کر ہی نہیں سکتے تھے لیکن معاویہ بھی مع اپنی حکومت کے ان کے زیر سایہ آجاتا تھا اور اگر احسان شناسی سے نہیں تو کم سے کم مُسلمانوں میں نامقبولیت کے خوف سے انکار نہ کر سکتا۔ اسی طرح یہ فقرہ تھا جس میں حسینؑ اظہارِ شکر فرما رہے تھے کہ خدا نے ان کو اور ان کے آبائے کرام کو خلق میں چن لیا۔ ظاہر ہے کہ یہ فقرے اظہارِ شکر میں کہتے تھے۔ سچے اور عین واقعہ کی زبان تھے۔ لیکن دوسرے پرتو سے حسینؑ ایسی شان پر کھڑے ہو کر بول رہے تھے جو بڑی سے بڑی بادشاہی کو نصیب نہیں ہوئی اور بادشاہوں نے اسی میں اپنی تسکین پائی کہ وہ اپنے کو مذہب کا بھی رکن اعلیٰ قرار دیں۔ حسینؑ کا انداز بیان بھی ملوکانہ نہ تھا۔ جس کی متانت میں اوچھے دبدبہ کا کہیں سے کوئی جھٹکا نہیں ہے۔ ساتھ ہی ساتھ دُنیاوی سامان ایک طرف تھے۔ جس کے مقابلہ میں حسینؑ اپنے تنہا نفس کے اختیار اور پسند کا تشخص قائم کر رہے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ابتدائی فقرات کی آمد ہی سے مروان کے کانوں میں کھلبلی پیدا ہوگئی ہوگی۔ لیکن تفصیلی جواب ابھی باقی تھا۔ اور جواب کو ایک خاص مضمون سے تعلق تھا۔

مروان نے کسی قدر سخیانہ شان سے کہا کہ: "جس قدر مہر ہوگا" معاویہ ادا کرے گا۔ حسینؑ نے فرمایا: "میرا منشاء یہ ہے کہ میں وہی طریقہ جاری رکھوں جو رسُولؐ اللہ کی بیٹی، بی بی اور دیگر اہل بیت کی عورتوں کا مہر ہوا ہے"۔ یہاں بھی شاہانہ عنایات کے مقابلہ میں حسینؑ نے اصول اسلامی اور سنت رسُولؐ کا وقار قائم کیا ہے۔ ادائے قرض کے متعلق فرمایا:

"یہ بتا کہ کب ہمارے خاندان کی بیبیوں نے ہمارا قرض ادا کیا ہے؟"۔ اس فقرہ میں مجھے طنز معلوم ہوتا ہے لیکن مثال معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ہم تصدیق نہیں کر سکتے۔ صلح کے جواب میں حسینؑ وہی فرماتے ہیں جو ان کے پدر بزرگوار فرما چکے تھے۔ "سمجھ لے کہ ہم جو تم لوگوں سے مخالفت کرتے ہیں تو محض خوشنودی خدا کے لیے ہے۔ دنیا کے لیے ہم کبھی صلح نہ کریں گے"۔ اس جواب میں حسینؑ نہ صرف حقیقت امر کو واضح فرما رہے ہیں بلکہ بنی امیہ کے اس جوش انتقام پر پانی ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں جو انھیں اپنے مقتولین بدر و احد وغیرہ کے متعلق تھا۔ یہ لڑائیاں جو دجہ اسلام کے لیے ہوئیں اور جن میں حکم اور خوشنودی خدا کے لیے جناب امیرؑ نے کوشش فرمائی کسی انتقامی جذبہ سے نہ تھی اور اب چونکہ بنی امیہ کو نہ صرف ادعائے اسلام بلکہ خلافت اسلامی کی عنانگیری کا دعویٰ تھا انھیں اس معاملہ کو کوئی قومی عداوت نہ سمجھنا چاہیے تھا۔ اسی فقرہ میں حسینؑ ایسے کسی خیال کی بھی تردید کر رہے ہیں جو نئی نسلوں یا خود فراموش بوڑھوں میں پیدا ہوگئی ہو کہ حسینؑ یا ان کے مقدس پیشرو بنی امیہ سے حصول اختیار کی رقابت سے جنگ کر رہے تھے۔ یا اس وقت ان کی کنارہ کشی گزشتہ اسباب مخالفت سے تھی۔ وجہ مخالفت اگر پہلے یہ تھی کہ بنی امیہ محافظ کفر تھے تو اس وقت اپنی روش اور خصائل کے اعتبار سے ایسے نہ تھے جو مُسلمانوں کے امام کہے جاسکتے، یا جوہر اسلام ان کے ہاتھوں میں اپنی ہیئت سے محفوظ رہ سکتا۔ اور چونکہ بنی امیہ میں اپنی گزشتہ خاصیت کے لحاظ سے کوئی تغیر نہ ہوا تھا بلکہ حصول اختیار کے حوصلے اور نفاذ اختیار کے مظالم نے انھیں اور مہیب دکھانا شروع کیا تھا۔ یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہادی برحق کا سلسلہ اس صلح کی کسی پیش آمد کا خیر مقدم کر سکتا۔ جس کی موجودہ صورت یہ ہوتی کہ ہمارے انعام و اکرام پر شکریہ ادا کرتے رہو اور ہماری کیسی ہی

روش پر آنکھ نہ اٹھاؤ۔ ہوتا کہ حسینؑ یا ان کے مقدس پیشرو عام حالتوں میں خاموش رہتے۔ لیکن یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ اپنے کو موافق دکھا کر بنی امیہ یا ان کے پیشروؤں کو سند عطا کرتے۔

سچ فرمایا حسینؑ نے کہ: "جب نسبی قرابت سے کچھ فائدہ نہ ہوا تو سببی قرابت اور شادی بیاہ کب مصالحت کرا سکتے ہیں"۔ اس میں حسینؑ مروان اور معاویہ کی دلیل گزشتہ تجربے سے کاٹ رہے تھے اور اسے آئندہ کے لیے طریقہ روش قرار دے رہے تھے۔ نسبی سلسلہ کے باوجود یہ ہوا کہ ایک کو دوسرے کا طرز عمل مختلف اغراض اور نقطہ خیال سے پسند نہ آیا اور جب گزشتہ سلسلہ غیر مفید ہوا تو عارضی سبب صلح کی قوی امید نہیں دلا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ تاریخ سیاست میں بھی یہ کوئی مفید نسخہ صلح ثابت نہیں ہوا۔ بلکہ اکثر آکہ ناموافقت ہوا ہے۔ مزید برآں بنی امیہ اور بنی ہاشم کی تاریخ ایسی واقع ہوئی تھی کہ بنی امیہ کو بنی ہاشم کی صداقت کا یقین تھا۔ اگرچہ ان کے عمل کو اپنے لیے پسند نہ کرتے ہوں۔ اس لیے کہ اس میں امتیاز اور نفع نہ تھا۔ لیکن بنی ہاشم کو بنی امیہ کی صداقت اور عمل دونوں پر اعتماد نہ تھا۔ اس لیے کہ طبعاً انھیں کسی ایسے نفع سے نفرت تھی جو خلاف راستی کارروائیوں سے حاصل ہو۔ نظر بر ایں گزشتہ تجربہ کچھ بھی کیوں نہ کہتا بنی ہاشم کو اس کا کیا اعتبار تھا کہ بنی امیہ کا یہ اقدام صلح ایماندارانہ اقدام صلح ہے اور اپنی کسی غرض کے پورا کرنے کے لیے نہیں ہے۔ کچھ نہ تھا۔ بلکہ اس کے برخلاف موجودہ صورت واقعات یہ کہہ رہی تھی کہ بنی امیہ اس قرابت کی سلسلہ جنبانی سے سیاسی تقویت حاصل کر رہے ہیں جو آئندہ اس کام میں لائی جا سکی کہ کوئی ناموافق ہاشمی اور آسانی سے زہر یا تلوار کے حوالہ کیا جاسکے۔ حضرت عبداللہ بن جعفر سے قطع نظر کر کے حضرت جعفر بن ابی طالب کا درجہ اسلام میں غیر معمولی تھا۔ اور اس لیے ایسے صاحب اثر کے حاصل کرنے کے لیے اہتمام کی طرح اہتمام کیا جا رہا تھا۔ کیوں؟ اس لیے کہ پنج تن میں کا پانچواں دبایا جاسکے!۔

اور جس طرح تعین مہر کے متعلق حسینؑ شارع علیہ السّلام کے صاف اور قابل عمل (بلکہ اس وقت تک کے مبالغہ خیز رقم کے لحاظ سے غیر مضر) طریقہ کو اپنی پسند سے قوت دے رہے تھے اسی طرح اس کے نسبت "طلب مہر" کے دوسرے قاعدہ کو بھی امارت یا غربت کے لحاظ سے کوئی امتیاز نہیں دے رہے تھے۔ بلکہ مبنی بہ امارت استعجاب کو اس فقرہ سے جھڑک رہے تھے کہ "اس کی کیا ہستی ہے اس سے اور اس کے باپ دادا سے جو لوگ افضل تھے ان لوگوں نے تو دیا ہی ہے اور ان سے مہر لیا گیا ہے"۔ حسینؑ نے یہاں مساوات شرع قائم رکھی۔ غربت اور امارت کے لیے دو حالت پسند نہیں فرمائی نہ امارت کو شرع پر غالب آنے دیا یا شرع کو امارت کے ہاتھ بیچ نہیں کر دیا۔

مروان کا تمام لہجہ تقریر کی اس شان کا نمونہ تھا جس طرح عموماً شادی بیاہ کی گفتگو میں ایک فریق دوسرے پر اپنی وجاہت قائم کرنے کی مبالغہ آمیز کوشش کیا کرتا ہے۔ اور اس وقت اہتمام میں اور زیادہ جد وجہد اس لیے تھی کہ گفتگو "بڑی ناک والے بنی ہاشم" سے تھی۔ جنھوں نے قبل الاسلام بھی کسی کو اپنی نسب، شرافت اور وجاہت کے مقابل نہیں سمجھا۔ اسی لحاظ سے مروان نے کہا تھا کہ "وہ (یزید) ایسا شخص ہے جس کا مثل و ہمسر نہیں ہے"۔ حسینؑ نے غالباً اس طرح کہ گویا انھیں زبان سے ادا کرنا بھی خفیف معلوم ہوتا ہے۔ قاطع لہجہ میں جواب دیا کہ "اس کا وہ ہمسر ہے جو آج سے پہلے تھا۔ اس کی امارت نے اس کی ہمسری میں کچھ زیادتی نہیں کی"۔ زیادتی نہ کرنا کمی نہیں ہے لیکن وہ کبھی ہمسر نہ سمجھا جاتا تھا۔ اس موقع پر لفظ کا جواب اسی لفظ سے دیا گیا ہے اس لیے حسینؑ کے فرمانے کے معنی یہ تھے کہ کب مقابل سمجھے تھے

جو امارت کی وجہ سے آج ہمسر سمجھیں گے تو وہی ہے جو کبھی تھا تشخص قوی نہیں ملتا ہے۔

غالباً مروان کی تمام تقریر میں سب سے زیادہ مدبرانہ فقرہ یہ تھا کہ یزید کو بہ نسبت آپ کے اچھا سمجھنے والے زیادہ ہیں۔ اس فطرت کے بہت سے فقرات اب تک جرح و تنقید کے حوالہ ہو چکے ہیں جن میں ایسی غیر واضح دھمکیاں دی گئی ہیں کہ صورتِ حال کے خلاف کیوں کسی خیال پر جمے ہو در آنحالیکہ تمہارا حلقہ دینے والے عدداً بہت کم ہیں۔ اور جب ہم ایسی کوششوں میں کامیاب ہو سکے کہ تمہارے نسبی ذاتی اور صفاتی لحاظ کے باوجود ہم ایسی جماعت تیار کر سکیں جو یزید کو بہتر سمجھنے لگے تو ہمارا تشخص ہمارے لیے ممکن اور تمہارا ممکن تمہارے لیے ناممکن ہو گیا ہے اور اب تمہارے لیے بجز غیر مفید یاس کے اور کیا رہ گیا ہے۔ اب اگر تمہارے لیے کوئی امید ہے تو یہ کہ ہمارا ساتھ دو اور ہمارے اعمال کی رفاقت کرو۔

تشخص کی دو صورتیں

قیاس کے قابل ہے کہ یہ تمام انعکاس حسینؑ کے لیے دل خراش تھے۔ موقع کی حقیقت تھی جس میں سو میں سو آدمی ناموافقت بے سود سمجھتے۔ اگرچہ انھیں طبعاً گوارا نہ ہوتا اور اگرچہ ایسا کرنے میں وہ اپنا تشخص کھو بیٹھتے اور یہ اس موٹی سی ظاہری وجہ سے کہ جب لوگوں کو ہماری وقعت فراموش ہو گئی تو اب ہم اپنے تشخص کے محافظ کب تک رہیں گے اور یہ ہمارا تشخص ہی کس کام کا۔ یعنی ہمارا تشخص اور عامہ ناس کی قدر دانی دو مرادف حالتیں ہیں۔

لیکن اگر وجوہات ہو سکتے ہیں جس سے عامہ ناس یزید کی بہتری کے معترف ہو سکے اور ایسی کوئی حالت تشخص کے تحفظ کی تسکین ہو تو بہتر ہو گا کہ تشخص کا لفظ ایسے برے مفہوم میں استعمال نہ ہو۔ ورنہ مثالوں کی کمی نہ ہو گی جس میں ایسے لوگ جن کا پیشہ ہی اخلاق خلاف ورزی ہے اپنی جماعت بلکہ ہر جگہ کی ایسی ہی طائفہ کے نزدیک اپنے تشخص کے لحاظ سے بڑے بڑے معلم اخلاق اور عالم کے مقابلہ میں زیادہ وقیع ہیں۔ تشخص کوئی تشخص ہی نہیں ہے اگر وہ اپنی حقیقی صفات کے علم پر مبنی نہ ہو۔ اور جسے اپنی ذات و صفات پر اعتبار ہو وہ اس کا محتاج نہیں ہے کہ لوگ ہماری قدر کریں تو ہماری صفت صفت ہے ورنہ وہ کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ ہر زمانے میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو تشخص کی وجاہت حکومت کے انداز نظر میں دیکھتے رہتے ہیں۔ حالانکہ حکومت کے انداز نظر کچھ ضرور نہیں ہے کہ اخلاقی احساسات پر مبنی ہوں اور وہ شخص جو اپنے تشخص کا اندازہ لوگوں کے اس معیار سے دیکھتا ہے وہ حقیقتاً اپنے کو ان سے بہتر ثابت نہیں کر رہا ہے۔ ایک اگر صفت شناسی کے لیے ایسے کا محتاج ہے جس کے مصالح کے نزدیک اکثر عیب مفید ہیں تو دوسرا خود اپنے کو نہیں پہچانتا اور اپنی حقیقت کو ان سے پوچھتا ہے جو حقیقت سمجھنے کے اہل نہیں ہیں۔

حسینؑ اس سے بالاتر تھے کہ وہ کسی ایسے فقرہ سے کہ: "یزید کو بہ نسبت آپ کے اچھا سمجھنے والے زیادہ ہیں"۔ مایوس ہوتے۔ یا انھیں اس کی زیادہ فکر ہوتی کہ چونکہ ہمیں اچھا سمجھنے والے کم ہیں ہم بھی اپنے اچھا سمجھوانے کے لیے ویسے ہی کوششیں کریں جیسے یزید کے لیے کی گئی ہیں۔ حسینؑ دونوں طرح کے سمجھنے والوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اور وہ اپنے کو بھی سمجھتے تھے۔ اس سے مروان کے تمام مدبرانہ فقرات نے حسینؑ کی نگاہ میں اپنے تشخص کو سبک نہیں کیا تھا کہ وہ مروان کی پیش کش کو شوق کی نگاہ سے دیکھتے اور اپنے وقار کی زیادتی بنی امیہ کی موافقت میں تلاش کرتے۔ حسینؑ کا تشخص ان کی صفات ان کے علم اور اس کے اعتبار پر تھا۔ وہ اسے ذلت سمجھتے تھے کہ ہم بنی امیہ کے ہاتھ سے کوئی عزت چاہیں جسے لوگ بھی عزت سمجھیں۔

اسے حسینؑ نے اپنے وقار کے اطمینان سے بہترین واقعہ خوان الفاظ میں ادا کیا کہ "جاہل اسے اور عاقل مجھے اچھا سمجھتے ہیں"۔
باوجود ان تمام جواب کے عبداللہ بن جعفر اور حسینؑ کے سمجھنے کا ایک موقع یہ بھی تھا کہ مروان کی وکالت کا قبول کرنا عبداللہ بن جعفر کے لیے امید افزا تھا جسے حسینؑ نے اس قوت سے رد کر دیا اور چونکہ ابن جعفر نے معاملہ کو حسینؑ ہی کے حوالہ کر دیا تھا ان کی ذمہ داری بڑھ گئی تھی۔ اس لیے حسینؑ نے اپنی اس تجویز کے ساتھ کہ ام کلثوم کا عقد قثم بن محمد بن جعفر سے ہو ساتھ ہی اپنے مختار کو حکم دیا کہ ان کے بسر اوقات کے لیے حسینؑ کی مملوکہ زمین دیدی جائے جس کی آمدنی کافی سے زیادہ تھی۔ اگرچہ اپنی آن کی جائز حفاظت اور سخاوت ناقابل اعتراض ہے لیکن ہمارے اوپر کے ریمارک کی مثال ابھی موجود ہے کہ مروان بھن گیا اور کہنے لگا کہ "بنی ہاشم اپنی عداوت نہیں چھوڑتے"۔ دوستی تو اس کے نزدیک یہ ہوتی کہ بنی ہاشم ہر بات پر سر تسلیم خم کیے رہتے لیکن مروان کی سفارت کی ناکامی کے لیے میں غالب (بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے) یا عرفی (ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرمان رفتم) کے مصرعہ میں پسند کا تصفیہ نہیں کر سکتا۔ اگر یہ خالصاً سیاسی اقدام تھا تو میں غالب کے مصرعہ کو مناسب سمجھوں گا۔

کبر سے حسینؑ کو نسبت دیا جانا طبیعت کے اعلیٰ شان کی ناشناسی سے تھا

حسینؑ کے اس تشخص کو کچھ عجب نہیں ہے کہ نہ سمجھنے والے جنھیں کبر اور خودداری میں تمیز نہ تھا کبر سے منسوب کرتے ہوں اور حضرت انھیں سمجھاتے ہوں کہ: "کبر خدا کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ لیکن "عزت" مومنین کے لیے ہے"۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ جس کا خطاب ابوالمساکین ہو جس کا فقرا کے ساتھ رحم و کرم اور مستحقین کے ساتھ عفو اور درگزر لاجواب مثالوں کا ذخیرہ ہو اس کی نسبت کبر کا خیال کرنا احساس شناسی سے دور افتادگی ہے۔ مثالیں جو کچھ بتاتی ہیں وہ یہ ہے کہ حسینؑ غربا اور مجبور لوگوں پر بے حد شفیق تھے لیکن وہ جو خود بینی کو اپنی شان سمجھتے تھے اور حسینؑ سے اس کی قدر دانی چاہتے تھے وہ حسینؑ کو سرو کا سا سیدھا اور بے لوچ پاتے تھے۔ اور جس جس طرح خود بین اینٹھتے جاتے تھے حسینؑ کا پر وقار سکون بڑھتا جاتا تھا بلکہ شاید نظر اور چہرہ کے عکس میں حقارت کا جزو شامل ہوتا جاتا ہو۔ یہ سب اس لیے کہ بھولے بھولے اوچھے طبیعت کے لوگ اعتدال کی طرف عود کریں۔ اس کے بعد عود کرنے والے یا تو حسینؑ کو نرم ہوتا ہوا دیکھ کر مطمئن ہو جاتے تھے۔ یا جو بے اعتدالی طبیعت کو اپنی شان سمجھتے تھے اپنے کو اپنی سطح پر نہ پا کر پیچ میں مبتلا ہو جاتے تھے اور انتقام کے لیے حسینؑ کو کبر سے نسبت دیتے تھے یا وہ جو اینٹھ جانے کے علاوہ اور کسی خوش ادائی کے مرتکب نہ ہو سکتے تھے وہ اپنے کو بھول کر حسینؑ کی خودداری میں قابل اعتراض کبر دیکھ لیتے تھے۔

اسامہ کے وہی انداز جو رسولؐ کے سامنے تھے اور حسینؑ کی وہی عنایت جو رسولؐ کی تھی

جو کچھ میں اوپر کہہ رہا تھا اس کے سمجھنے کے لیے حسینؑ کے خیالات اور بھی ہیں۔ مثلاً جو کچھ آپ اسامہ بن زید کے ادائے قرض کے وقت فرماتے ہیں کہ: "بادشاہوں کی

خصلت میں سب سے زیادہ بری اور ناقابل تعریف بات یہ ہے کہ وہ دشمن سے ڈریں اور غریبوں پر بخت دلی سے رحم نہ کریں"۔ میں سمجھتا ہوں کہ "دشمن سے ڈریں"۔ وہ مقابل کسی طرح کے مقابل۔ سے۔ کسی طرح کا دبنا ہے۔ حسینؑ ذی اقتدار لوگوں کی شان سے اثر لینا معیوب سمجھتے تھے لیکن اس بے اثری کو اگر وہ غربا کے ساتھ بے رحمی ہو تو اسے سخت دلی سے تعبیر فرماتے تھے۔

ہر شخص جسے اسلامی تاریخ سے رغبت ہے جانتا ہے کہ زید اور اسامہ بن زید کو خاندان رسالت سے کیا نسبت تھی۔ پھر بھی یہ واقعات کی یہ صورت ہونے والی تھی کہ جناب امیرؑ کے اِستقرار خلافت کے وقت اسامہ متخلفین بیعت میں کے ایک ہوتے۔ غالباً ان کا تخلف نیوٹرل رہنے سے زیادہ نہ تھا۔ اس لیے کہ اصحاب جمل وصفین میں ان کا نام نہیں دکھائی دیتا۔ پھر بھی ان کے موقع کے آدمی سے خاندان رسالت کے اقتدار کے وقت کوئی وقتی کشیدگی بھی حیرت خیز تھی۔ اس کی وجہ غالباً اسلام کا وہ برتاؤ تھا جس نے عطائے حقوق میں انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کیا تھا۔ اور چونکہ زید اور اسامہ پر رسولؐ کی توجہ اس سے بھی آگے بڑھی ہوئی تھی اس لیے اسامہ "ایاز قدر خود بشناس" سے آگے بڑھ گئے تھے۔ اس پردہ حالتیں اور تازیانہ ہوگئی تھیں جس نے "ہم کیوں نہ ہوں" ایک زندہ اصول قرار دے رکھا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ کب انھوں نے صورت حال کو تسلیم کیا۔ اور کب ان کے تعلقات تجوہتہ کی حد تک قائم ہوئے۔ لیکن باوجود اس گرہ کے حسینؑ کا عیادت کے لیے تشریف لے جانا اور زندگی ہی میں اسامہ کے بار کو ہلکا کر دینا کہتا ہے کہ حسینؑ اس سلسلہ عنایت کو فراموش نہیں کرنا چاہتے تھے جو کسی وابستہ خاندان کے ساتھ تھی۔

فقرا کا حسینؑ کو دعوت دینا، غربا کے ساتھ حسینؑ کے نرم بشرہ کی وجہ سے تھا

حسینؑ کا خاصہ جو انھیں ہر پیش افتادہ حالت کے سمجھنے پر آمادہ کر دیتا تھا۔ اور ان کی وہ ہمدردی جو خلق اللہ خصوصاً غربا کے لیے تھی۔ غالباً اس وقت رحم اور غیر متاذی نگاہوں سے ان فقیروں کو دیکھنے لگے جو بیٹھے ہوئے اپنی بھوک دور کر رہے تھے۔ اور حسینؑ کے ان انداز نے غالباً بے سرو سامانوں کو یہ جرأت دلائی کہ وہ قریب بلا لیتے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ سوسائٹی، فیشن، غربت کا نام لینا ذلت اور غربت کا اندازہ اور ذکرہ لینی بھی شان کے خلاف وغیرہ کا فرعون بے سامان مفہوم پیدا ہوا تھا یا نہیں۔ اگر تھا تو اس کا اثر حسینؑ پر نہ تھا۔ اور وہ جناب اپنے جد بزرگوار کی اسی نصیحت سے متاثر تھے کہ غربت سرایت نہیں کر جاتی۔ ان کے نزدیک غربت اور امارت ایک اتفاقی چیز تھی جو درجہ انسانی پر اثر نہیں کرتی۔ نہ اسے جماعت کا دور کردہ قرار دیتی ہے۔ بیٹھ گیا نیک نفس رحیم اور رحمۃ للعالمین کا فرزند اور غالباً اس کا یقین کر کے کہ اب فقرا کو تسکین ہوگئی اور وہ ہمارا اٹھ چلنا تکلیف کے ساتھ محسوس نہ کریں گے، اس طرح اٹھے کہ انھیں بھی اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئے اور احسان فرمایا۔ میرے خیال میں ساتھ لے جانا بھی کسی احسان کرنے کی آن سے نہ تھا بلکہ فقیروں کے خوشگوار وقت کی یاد کو رفاقت سے دیرپا کرنا تھا۔

حسینؑ کی رُوحانی زیارت

حسینؑ کو پہچانو کہ کہاں تھے اور کس طرح تھے جب وہ اعرابی کو اس کی امید سے بدرجہا زیادہ عطا فرماتے ہیں۔ اس طرح کہ سامنے نہیں آتے ہیں بلکہ صرف ہاتھ بڑھا دیا ہے جس میں تھیلی ہے۔ خود پس پردہ ہیں اور عذر کر رہے ہیں۔ دقت ہوتا ہے کہ پردہ چھپاتا ہے۔

یہ وقت تھا کہ پردہ حسینؑ کو ظاہر کر رہا تھا۔ حسینؑ کی یہ غیرت شرح سے بالاتر ہے جہاں وہ اپنا چہرہ اور آنکھیں سائل کے سامنے نہیں کرتے۔ کیا اس لیے کہ وہ سوال کرنے والے کی خفت نہ دیکھیں۔ یا اس لیے کہ وہ امید بر آنے کے بعد اظہار شکر میں بسر نہ آئے۔ حسینؑ کسی کے ایک دردانگیز عالم اور اپنی ذاتی تسکین کے نظارہ سے اپنے کو کھینچ رہے تھے!۔

بادی النظر میں یہ ایک روایت ہے لیکن حسینؑ کے نفس کے شارح اور ان کے مصور مورخ کے لیے یہ چھوٹی سی روایت گونگے واقعات کی تمام سوانح عمری سے زیادہ روشن تاریخ ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ حسینؑ آج ہمارے سامنے اس وقت اس طرح نہیں ہیں جیسے اپنے اس انداز سخا کے وقت تھے۔ لیکن کون ایسی بے ہوش اور تاریک نظر ہوگی جو ایسے واقعات کو پڑھے گی اور حسینؑ کا اس وقت کا نقشہ اس کے سامنے نہ پھر جائے گا۔ یہ نقشہ ایسے جسم اور روح سے کھنچا ہے جسے زمانہ اور اس کے تغیرات مٹا نہیں سکتے۔ اس وقت تک نہیں جب تک کہ حرف کاغذ کے کسی ٹکڑے پر بولیں گے۔ یا یہ واقعہ انسانی حافظہ سے منتقل ہوتا ہوا آخری انسان تک پہنچے گا۔ اور برابر اس وقت تک حسینؑ اپنی صورت اور اس کے ضمنی اثر سے مخلوقاتِ الٰہی کو دکھائی دیں گے۔ روایت یہیں ختم نہیں ہو گئی بلکہ سائل اعرابی کے ریمارک نے اس میں تھوڑا سا اور رد اور شامل کر دیا۔ اسے حسینؑ کی بے نفسانہ عنایت نے رلا دیا۔ مشکور حاجت مند "ایسے شخص" کے "زیرِ خاک چھپنے" اور "دستِ جود کے ناپید ہو جانے" کا پیشتر سے مرثیہ کہہ رہا تھا۔ اس کے نزدیک اپنے احساس کے بجلانے کا یہ بہترین طریقہ تھا۔ اور شاید بہترین فطری تعریف بھی تھی۔

دور کردہ جماعت پر حسینؑ کی نظر

یہ دوسری روایت بھی کم موثر نہیں ہے کہ حسینؑ ایک انسان کو کتے کے ساتھ اس طرح کچھ کھاتے اور کھیلتے دیکھتے ہیں کہ گویا وہ کسی آدمی یا کسی بچے کے ساتھ خوش فعلی کر رہا تھا۔ فوراً حسینؑ کو خیال ہوا ہوگا کہ کیا اسے آدمیوں سے نفرت ہے۔ کیا کوئی آدمی اسے جی بہلانے کو نہیں ملتا۔ اس کے چہرہ پر افسردگی اور مایوسی دیکھ کر اس کی حالت اور موقع سمجھیں گے۔ اس کے لیے مفت کے برے لفظ استعمال نہ کیے۔ دور نہ ہٹے۔ اس کی حالت خود اسی سے پوچھی۔ جواب یہ تھا کہ "میں ایک درد رسیدہ ہوں۔ یہ دل خوش کرنے کو اس کتے کے ساتھ کھیل رہا ہوں"۔ مواقع ہوتے ہیں کہ انسان کو انسانوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ موقع تھا کہ انسانوں نے ایک انسان کو جماعت کے میل جول سے دور ڈال دیا تھا۔ اس لیے کہ اس کا موقع اچھا نہ تھا۔ لیکن فطرت نے اسے اپنے رحمت کی مساوات سے دور نہیں کیا تھا۔ اس میں میل جول کی خواہش تھی اور دکھ سکھ کا احساس تھا۔ اگر آدمی اس کے غم غلط کرنے کے قابل نہ تھا تو جانور تھا اس کے نگاہ میں آدمیوں سے جانور اس وقت بہتر ہوگا۔ حسینؑ کی ایک نگاہ سمجھ گئی۔ دل نے اثر لیا۔ رک گئے۔ ہمدردی کی۔ اپنے باپ اور نانا کے سچے فرزند کی طرح سفارش اور آزادی دلانے کے لیے اس کے آقا کے پاس چلے۔ ان کی بے غرض عنایت اور حقوق عباد کے لحاظ نے جو اثر کیا وہ کسی شرح کا محتاج نہیں ہے۔

طریقہ سخا کی جدت اور تفریح

اس روایت میں طریقہ سخا کی جدت ہے کہ سائل سے چند سوالات کیے جاتے ہیں۔ یہاں بھی مجھے تھوڑا سا مزاح معلوم ہوتا ہے۔ ہادی برحق بھی اپنی افسردگی کے وقت ایک بے وقوف کریہہ منظر اعرابی کو تلاش فرمایا کرتا تھا۔ جس کی مضحک صورت، انداز اور گفتگو

سے تھوڑی سی تفریح ہو جاتی تھی۔ حسینؑ اعرابی کی مضحک گھبراہٹ دیکھنا چاہتے ہیں یا اسے اپنے سوالات کے جواب بتا کر اس کا مشنری بنانا چاہتے ہیں۔ چند سوالات ہیں لیکن نہایت مفید خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ حصول علم کی آسانیاں نہ تھیں اور جب کہ ریگستانی اور پہاڑی مقاموں میں کوئی استاد نہ جایا کرتا تھا۔ ایسے موقع کو حسینؑ کیوں ضائع کرتے۔ پہلے ہی فرمایا کہ ”بخشش موافق معرفت ہونی چاہیے“۔ پہلے کچھ سیکھو اس کے بعد انعام چاہو۔ تعلیمی سوال شروع کیے۔ اور فاضل ترین اعمال پوچھا۔ جواب ملا کہ اقرار توحید۔ توحید جو بہت کچھ پرستی اور اوہام باطلہ سے بچاتی ہے خصوصاً صحراؤں میں جہاں سادہ مزاج مخلوق کو شاعرانہ وحشت اعتقاد کی بہت گنجائش ہے ایک خدا جو نہ اونگھتا ہے نہ سوتا ہے جو ہر جگہ ہے جو تمام بندوں کے افعال دیکھتا ہے اور جو اعرابی کے صحرائی جھونپڑے اور اس کے اونٹ کے گلہ سے دور نہیں ہے۔ اور جو اصل اعتقاد ہے۔ خدا ہی جانے کہ برادر اعرابی کو توحید کے فاضل ترین اعمال ہونے کی شرح بھی معلوم تھی یا نہ تھی لیکن حسینؑ کیوں اس کے معدے سے زیادہ خوراک دیتے جب اصل بات پیٹ میں اتر پڑی تھی۔ اور اس طرح بے خوف تھی کہ وہ کسی طرح کا مشرک نہ ہوگا یعنی اسلامیت کی پہلی زبردست اصلیت اس میں موجود ہے۔ کہہ دیا کہ بھئی تم ⅓ جواب دے چکے یعنی تصدیق سے اسے اپنے خیال میں راسخ کر دیا۔ غریب ڈر رہا ہوگا کہ پاس بھی ہوتے ہیں یا نہیں اور پاس فیل جاتا جہنم میں غم تو اسے انعام کا ہوتا۔ اب تو ذرا ناشتا ہو کر جواب کے لیے مستعد ہوا ہوگا۔ اب پوچھا: ”کونسی چیز انسان کو ہلاکت سے بچاتی ہے؟“۔ پہیلی ٹیڑھی تھی۔ لیکن برادر اعرابی نے سوچ ساچ کر بڑی پکی بات کہدی کہ: ”خدا پر بھروسا“۔ دہریت اور لا ادریت کی بے اعتباری بے قناعتی اور ان بے لگام کوششوں کا خیال کر و جس میں خدا پر بھروسہ نہ کرنے سے انسان مبتلا ہوتا ہے۔ خدا پر بھروسا کے معنی ”جگ ناتھ جی“ (ہندوؤں کے اوتار کا ایک بت جس کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوتے ہیں) بن جانا نہیں ہے۔ بھروسا کے معنی قوائے فکریہ اور اعضائے جسمانی کا تعطل نہیں نہ کوشش سے باز آنا مقصود ہے بلکہ بھروسا خدا کی شان ربوبیت کا ایک طبعی اطمینان ہے اور نتائج کے موافق ہونے یا نہ ہونے میں تسلیم و رضا کا اظہار ہے۔ اور ساتھ ہی اس کی تائید کی امید ہے۔ ذرا سی دعا اور اس کی کامیابی یا ناکامی خدا کے وجود یا عدم وجود کا معیار نہیں قرار دی جاتی۔ الٹی میٹم نہیں دیا جاتا کہ اگر میرے موافق مزاج بات نہ ہوئی تو ہم تیرا انکار کریں گے بلکہ غم واندوہ آتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ہم ایسے مخلوق کے پاس آئے ہیں جو اپنی ہستی ہم سے منوانا چاہتا ہے بجائے اس کے کہ ہم اس پر غالب آجائیں۔ اس لیے کہ وہ مخلوق، خدا کے انصاف پر راضی اور اس کے ارادے پر شاکر ہے۔ جنبش اس سے ساقط ہو گئی ہے وہ اب اپنی تخیل سے اوڑا اوڑا نہیں پھرتا بلکہ ایک زبردست مرکز سے بندھا ہے یہ اس کی طبیعت اور خیال کا اعتدال ہے اور یہ حالت ہلاکت سے بچانے والی ہے۔ برادر اعرابی دو حصہ پاگئے۔

تیسرا سوال ہوا کہ ”کس چیز سے انسان کی زینت ہے؟“۔ ہم ہوتے تو بے ساختہ سنت زمانہ کے لحاظ سے عبا، عمامہ، ٹائی کالر، کف مفلر وغیرہ وغیرہ کہہ دیتے۔ پسند کرنا دوسرے کے اختیار کی چیز تھی۔ لیکن جاہل عرب نے بھی ہم سے اختلاف رائے کیا۔ غالباً اس کے نزدیک مستند بین الفریقین تھا کہ آدمی نے چیتھڑے بنائے ہیں چیتھڑوں نے آدمی نہیں بنایا، جواب دیا کہ: ”علم سے جس میں حلم ملا ہو“۔ ہم کو ذرا سی وجہ شبہ کی ہو تو ہم انکار کر جائیں کہ جاہل بدوی یہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اسے عالمانہ مذاق ہی نہیں بلکہ حلم سے علم کا مزاج درست کرنے سے کیا بحث۔ بہر حال اس کا ذاتی تعین ہو

سنی ہوئی بات ہو یا کسی نے شاید حسینؑ ہی نے بتا دیا ہو بات اچھی تھی۔ لیکن حالت استثنا چاہتی تھی۔ اس لیے کہ علم بغیر حلم اور حلم بغیر علم ہو سکتا ہے۔ یہ ناقص صورت تھی یا یہ دونوں حالتیں عموماً نہیں پائی جا سکتی تھیں اور اس طرح یہ مخصوص لوگوں کے زینت کا ایک ذریعہ ہوتا۔ یہ کمزوری ایسی تھی جو فوراً حسینؑ کے سامنے آجاتی اور وہ سوال کر بیٹھے کہ اگر یہ نہ ہو تو؟۔ اعرابی دوسری مرکب صفت مالداری کے ساتھ مروت کو پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت بھی پیشتر کے اعتراض سے خالی نہ تھی۔ پھر وہی سوال کیا گیا اور اب اعرابی نے فقر کے ساتھ صبر کی قید لگائی۔ انسانی حیات کی تین واضح صورتوں کی مثالیں دی جا چکی تھیں جن سے انسان کی زینت ہو سکتی ہے۔ اعرابی کا ہر جواب اچھا تھا لیکن پہلی حالت پر اگر حسینؑ قناعت کرتے تو دو اور حالتیں ظاہر نہ ہوتیں اور بغیر ٹوکے خاموشی بھی غیر مفید تھی۔ کون جانے کہ حسینؑ اسے چھیڑ رہے ہوں۔ اور آخر مرتبہ وہ جھلا بھی گیا لیکن آخری جواب بھی کم قوت دار نہ تھا کہ اگر یہ صورتیں نہ ہوں تو کسی کے زندہ رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ حسینؑ ہنس دیے اور نہ صرف زرِ دیت ادا کیا بلکہ اس کے نفقہ کا بھی لحاظ فرمایا۔ اب برادر اعرابی غالباً فاتحانہ شان سے رخصت ہوئے۔

حسینؑ ایک قوت دار زبان خریدتے ہیں

اس روایت میں کہ حسینؑ نے فرزدق کو کچھ عطا فرمایا در آنحالیکہ مروان نے اسے نکلوا دیا تھا، عطا فرمانا خالصتاً سخا سے نہ تھا بلکہ ایک قوت دار زبان کا خریدنا تھا۔ زیر ذکر زمانہ میں کوئی مشہور شاعر ہمارے زمانہ کے کسی مشہور اخبار کے ایڈیٹر سے غالباً اثر میں کم نہ تھا، بلکہ خصوصیات زمانہ زیادتی کا حکم لگا سکتی ہیں۔ حسینؑ اسے "عزت محفوظ" رکھنے کے لحاظ سے خرید رہے تھے۔ اور اس کے لیے ان کے پاس اپنے جد بزرگوار کی مثال تھی۔ عزت محفوظ رکھنے کا خیال نہ صرف شعرائے عرب کی ہجا گوئی کے لحاظ سے تھا بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ اگر کوئی آزاد شاعر بنی امیہ کا بندہ ہو جاتا تو غلط خیال پھیلانے میں اور زیادہ اثر کرتا۔ اب چونکہ وہ بنی امیہ سے برافروختہ ہو کر آیا تھا، قرین مصلحت تھا کہ وہ سنبھالا جاتا۔ آئندہ ذکر آئے گا کہ فرزدق خبر دینے کے کام آیا بلکہ ہشام بن عبدالملک کے حج کرنے کے زمانہ میں اس نے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی شان میں جس موقع پر فی البدیہہ قصیدہ :

هذا الذی یعرف البطحاء وطأته   و البیت یعرفه و الحل و الحرم

کہا اس نے بڑا اثر کیا۔

وجوب صوم کی وجہ اور اس کا طنز

وجوب صوم کی وجہ بیان فرماتا کہ: "امیروں کو بھوک کا مزہ معلوم ہو کہ غریبوں پر رحم کریں"۔ اپنے دین کے ایک حکم کی عام فہم تفسیر تھی۔ یہ شرح خود حسینؑ کے رحم پسند اور غریب پرور نفس کی شرح ہے۔ حسینؑ اس سے زیادہ شرح فرما سکتے تھے شاید اسی وقت کی ہو لیکن ہم تک صرف اسی قدر پہنچا۔ ظاہر ہے کہ اس میں حسینؑ وجوب صوم کی وہ وجہ بیان فرماتے ہیں جس کا فائدہ خود صائم کے لیے بجز ثواب عطا کے اور کچھ نہیں ہے۔ بلکہ فائدہ اور وکالت زیادہ تر غرباء کی ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ سوال کرنے والا ذی مقدرت لیکن بخیل تھا جسے غرباء پر رحم کے تعلیم کی ضرورت تھی۔ یہ نکتہ صاف ہو جاتا اگر سائل کا نام اور خصلت معلوم ہو سکتی۔ میں اس خیال سے خالی نہیں ہوں کہ اس میں تعلیمی حیثیت کا طنز بھی ہو۔

حسینؑ کی قدردانی علم نہ صرف اس سے معلوم ہوتی ہے کہ اپنے بچوں کے معلم کو بہت کچھ عطا کیا، بلکہ اس سے زیادہ اس سے کہ اپنی کثیر عطا کو معلم کی کثیر عطا (تعلیم) کے ہم پلہ نہ سمجھا۔ اس کے نواسہ سے جو پڑھے لکھے اسیران جنگ کو آزاد معلم بنا دیتا تھا، یا اس کے فرزند سے جو "پوچھ لو قبل اس کے کہ مجھے نہ پاؤ"۔ فرما سکتا تھا، ایسا خیال ظاہر ہونا مطلق حیرت خیز نہ تھا۔

متکلمین میں اس پر تھوڑی درد سری نہیں ہوتی ہے کہ ارادہ خدا حادث ہے یا قدیم ہے۔ اشاعرہ قدامت کے قائل ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اگر ارادہ خدا علم خدا ہے تو اس کی صفت ذات ہے اور یہ قدیم ہے لیکن عموماً بلکہ اجماعاً پیروان آل رسالت اس کے قائل ہیں کہ ارادہ خدا حادث ہے۔ وہ ہمیشہ اور تمام باتوں کے متعلق ارادہ نہیں کیا کرتا۔ کیونکہ اگر خدا ہر امر میں مرید (ارادہ کرنے والا) ہوتا تو تمام برائیاں یا کافر کا کفر بھی ارادہ خدا سے ہوتا، اور اس طرح کفر مراد خدا ہوتا۔ پیروان آل رسالت حسن اور قبح عقلی کے قائل ہیں۔ ظاہر میں بھی ارادہ ایک صفت فعلی ہے۔ حسینؑ نہایت فلسفیانہ احتیاط سے اسے "عالم اور قادر" فرماتے ہیں۔ یعنی وہ چیزوں کو جانتا ہے اور ارادہ کی قدرت رکھتا ہے۔ علم شے ارادہ شے نہیں ہے۔ اب وہ کس امر کا ارادہ کرتا ہے یا کس کا ارادہ نہیں کرتا، اسی کا تصفیہ ہر چیز کی موجودہ صورت پر کیا جائے گا۔

ناظرہ پر زور دینے کی وجہ

باوجود اس کے کہ اسحاق بن عمار حافظ قرآن تھے لیکن حضرت ابو عبداللہ علیہ السّلام نے انھیں اپنے حافظہ سے پڑھنے کی اجازت نہ دی بلکہ لکھے ہوئے کے پڑھنے کا حکم دیا، اور یہ حدیث یاد دلائی کہ: "قرآن کا دیکھنا عبادت ہے"۔ یہ حدیث یا حدیث کا یاد دلانا دونوں کا مفہوم ایک تھا، اور وہ یہ کہ حافظہ اصل کتاب سے بے پرواہ نہ کردے۔ دوسرے لفظوں میں کتاب کی مرکزیت کو نقص کے لحاظ سے بچایا تھا۔ اگر جناب امیرؑ ملوکانہ شان کے باوجود قرآن کی اظہار عظمت کے لیے اسے حکم بنانے کے لیے جنگ صفین کے بیچ میں لائے تھے تو حسینؑ کیوں کر اس کے احترام کے لحاظ کو ٹھوس نہ بناتے۔ یہ تھے جنھوں نے ہر طرح قرآن، نفس قرآن کی بھی حفاظت اور شرح کی اور اس پر عمل کیا۔

خطبہ کی مختصر شرح

حسینؑ اس خدا کی تعریف کرتے ہیں جو "کسی شے سے موجود نہیں ہوا"۔ جو قائم بالذات ہے جو علت العلل ہے۔ چیز اور صورتیں نمودار اور فنا ہوتی ہیں اور یہ سب گویا اپنے مسبب کے ازلی ہونے کی گواہی دیتی جاتی ہیں۔ خلق شدہ چیزوں میں صنعت کا نمونہ دکھائی دیتا ہے اور یہ سب اپنے صانع کا نشان دے رہے ہیں۔ حسینؑ اپنے خدا کو صفت ربوبیت سے یاد کرتے ہیں۔ اور اسی خدا کی طرف واپسی کا اقرار بھی کرتے ہیں اور دعا اور اظہارِ شکر کو نہایت خوبصورت اور تصور خیز فقرہ میں ادا کرتے ہیں کہ: "تو نے ابتدا کی اپنی بخشش کی قبل اس کے کہ میں موجود تھا"۔ یہ الفاظ اگرچہ بہت مختصر تھے لیکن ماہرین فلسفہ جانتے ہیں کہ اس میں وجود باری تعالیٰ کے استنباط کے کئی طریقوں کا ذکر ہے۔ مجھے اس کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ مجھے تو یہ کہنا ہے کہ ایک نقطہ ہے جو عالم اور اس کے تغیرات و تنوعات پر غور کر رہی ہے ایک ذات جو فطرت کے قوانین میں بے ہوش نہیں کھڑی ہے بلکہ کچھ دیکھ رہی ہے اور جو کچھ دیکھتی ہے اس سے کچھ استدلال کر رہی ہے۔ علت دیکھ رہی ہے۔ معلول دیکھ رہی ہے۔ صنعت ہے اس میں مضبوطی کی شان ہے جو بغیر شعور نہیں ہوسکتی۔ کچھ غیر مدرک آلات ہیں جن میں کوئی چیز کام کر رہی ہے۔ دو نوعیت کی چیزیں حیرت خیز

امتزاج کا نمونہ ہیں۔ ایک وقت تھا کہ یہ امتزاج نہ تھا۔ اس وقت ہے اور پھر نہ ہوگا۔ لیکن یہ قانون برابر عمل کرتا رہے گا۔ تماشہ کا ختم ہونا تماشہ گر کا ختم ہونا نہیں ہے بلکہ اس قدر تماشے ہیں جس کی ایک کنہ دریافت کرنا مزید کنہ کے دریافت کرنے کا مقدمہ ہے۔ جس طرح کا بھی ہو ان چیزوں میں حدوث ظاہر ہے۔ ان چیزوں کی علت فاعلی ایسی حدوث پسند نہیں ہوسکتی وہ ان سے الگ ہے وہ کسی چیز سے موجود نہیں ہوئی۔ اب یہ نگاہ اپنی علت فاعلی کو پہچان کر اس کی طرف متوجہ ہوجاتی ہے۔ اور دیکھتی ہے کہ وہ ہمارا پالنے والا ہی ہے۔ محبت کا ہیجان ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی ابتدا کے بعد انتہا بھی دکھائی دیتی ہے۔ ابتدا کی پرورش بازگشت کے اقرار سے اپنے کو آئندہ رحمت کا امیدوار بناتی ہے۔ اس لیے کہ ہم نے اپنے وجود کے لیے کوئی حق قائم نہ کیا تھا اور پھر بھی تو نے ہمارے موجود ہونے کے قبل اپنی رحمت کو مہیا کردیا۔ تو بڑا منظم ہے۔ تو جانتا ہے کہ ہم کو اپنے موجود ہونے پر کونسی چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ تیرے شعور نے ہمیں ہماری بے ہوشی میں تنہا نہ چھوڑا نہ اس کا انتظار کیا کہ میں مانگنے کے قابل ہوتا تو تو دیتا۔ تو ہم تیری طرف اپنی بازگشت کے اقرار سے کیوں مطمئن نہ ہوں۔

خدا کو خیر و شر سے نسبت نہ دیے جانے کی شرح

میری دانست میں شر کو خدا سے منسوب کرنا اہرمن کے قائل ہونے سے کسی طرح بہتر نہیں ہے۔ یا ایک ہی خدا کو شر کے ساتھ خیر کا خالق قرار دینا "انید" اور "اہرمن" کو مخلوط کردینا ہے۔ خدا خیر محض ہے اس نے خیر اور شر کا کہیں دو ڈھیر نہیں لگا دیا ہے۔ خدا کے قانون کی موافقت خیر اور اس کی مخالفت شر ہے۔ خیر اور شر دو حالتیں ہیں، جن کی حُسن اور قبح کے سمجھنے کا معیار عقل ہے۔ نہ خیر اور شر یا حُسن اور قبح کا سمجھنا محض مذہب پر موقوف ہے بلکہ خیر اور شر یا حُسن اور قبح کے وہ بھی قائل ہیں جو مذہب کی پیروی نہیں کرتے۔ انسان کا خاصہ اخلاقی اسے بری باتوں سے متنفر کرتا ہے اور بھلی باتوں سے مطمئن کرتا ہے۔ وہ جو برائی کا مرتکب ہوتا ہے اسے اچھائی سمجھ کر نہیں بلکہ برائی کو برائی ہی کہتا ہے۔ اگرچہ وہ مرتکب ہوا ہو۔ اور اگرچہ وہ کسی ایسی حالت میں ہو جس کی کوئی برائی سوسائٹی کے نزدیک "خود مرض و جملہ مرض را دواست" ہی کیوں نہ ہو۔ تاہم انفرادی ضمیر بغیر چٹکی لیے نہیں رہتا اگر حس فنا نہیں ہوگیا ہے۔ یہ صورتیں تھیں خیال کی رو سے جو اس وقت اس وقت کے پہلے اور اس وقت کے بعد رہیں گی۔ جس کی نسبت حسینؑ سے سوال کیا گیا۔ حسینؑ کے زمانہ کو خصوصیت یہ تھی کہ اس وقت تک حکومت کا فیشن ہوگیا تھا کہ وہ جو کچھ کرے اور لوگوں پر اس کا کیسا ہی اثر کیوں نہ پڑا ہو لیکن آسانی سے یہ کہہ دیا جائے کہ آدمی کیا کرتا ہے۔ خدا ہی کے نزدیک تم اس برائی کے مستحق تھے اگر خدا کو منظور نہ ہوتا تو بھلا ممکن تھا کہ تم اس بلا میں رہتے اور کوئی تمہارے ساتھ کچھ کرسکتا۔ کیا کرتا کوئی مغالطہ سمجھ کر جب کہ مغالطہ کی حفاظت کے لیے تلوار تھی۔ ہوتا جو کچھ بھی ہوتا لیکن جب حسینؑ سے پوچھا جاچکا تھا تو وہ اس وقت دار اور صاف جواب دینے کے لیے اپنے منصب کے لحاظ سے مجبور تھے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ خدا برائی کا حکم دیتا ہے اس نے خدا کی تکذیب کی۔ یہ ذات خداوندی سے بعید ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ: "جو شخص کہتا ہے کہ خیر و شر خدا کی طرف سے ہے اس نے خدا کی تکذیب کی"۔ سچ مچ خدا کی تکذیب ہے۔ اس لیے کہ کیا خداوند تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایک صاحب ارادہ نفس اور حق و باطل کا تمیز نہیں عطا کیا ہے کہ وہ اپنے لیے اپنی راہ اختیار کرلے؟۔

بلند ادعا جو مؤید بہ تاریخ ہے

یہ تھے جنھیں اس کا ادعا ہو سکتا تھا کہ ہم اصل (جڑ) ہیں ہر خیر کی اور ہر اور نیکی ہماری فرع ہے۔ اور جب یہ کہہ سکتے تھے تو یہ دوسرا فقرہ اس کا دوسرا پہلو ہے کہ "ہمارا دشمن اصل ہر شر ہے اور اس کی فروع کل برائیاں ہیں"۔ ان کی تاریخ یہ کہتی ہے کہ یہ بیز واقعہ کے اور کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔ حسینؑ ہی تو تھے جو معاویہ کو چیلنج دے رہے تھے کہ اگر یزید کو میری برائیاں معلوم ہوں تو وہ بلا تردد بیان کرے۔ ایسے پاک، ایسے خالص، ایسے طاہر اگر معصوم من الخطا سمجھے جاتے ہیں تو یہ کوئی ادعائے اعتقادی نہیں ہے بلکہ ان کے روز مرہ کی کہانی ہے۔ ان کا روز مرہ ایک دن، ایک مہینہ، ایک برس ایک صدی نہیں بلکہ صدیاں اس طرح گزرا کہ انھیں اپنی نیک نامی کے قائم رہنے کی امید نہ ہونی چاہیے تھی۔ کیا یہ حالت اس خیال کی گنجائش رکھتی ہے کہ "وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے"۔ بجھانے کی تو انتہائی کوشش ہوئی جس قدر ہو سکتی ہے۔ لیکن نہیں بجھی اور اس کا نور اب تک ہے جس میں زردی نہیں آئی۔ زندہ ہے اور حیات بخشی کی قابلیت رکھتی ہے صرف شرط یہ ہے کہ "غیر کی فرع سے تعلق نہ رکھتا ہو"۔ میں نہیں سوچتا کہ مذہب کے کسی پیرو کو اپنے امام کی علویت اور مجسمہ خیر ہونے سے بہتر کیا آماج ہو سکتا ہے۔ بانیان مذاہب گزرے اور ایک اصول کی بنیاد ڈال گئے۔ وہ گزر گئے، ان کی ذات فراموش ہو گئی۔ اصول رہ گیا جو زمانہ کے ہاتھوں متغیر ہوتا رہا۔ لیکن اس دین پر جس کے متعلق مشیت ازدی مقتضی ہوئی تھی کہ وہ غار حرا کے طالب علم اور اس کی اولاد امجاد کے ہاتھوں شائع ہوتا۔ ان نفوس قدسی کا وہ گہرا نقش ہے کہ اصول ذات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں اپنے اصول مذہب کے مرکز اشاعت سے جو ذاتی محبت کا جوش ہے اس کا دوسرے مذہب میں تلاش کرنا تاریخ کو پھر سے لکھنا ہے۔

اپنی کتاب کے اس حصہ میں ہم وہ سب کہہ چکے جس کا ہماری دانست میں کہنا ضروری تھا۔ اگرچہ طوالت کے لحاظ سے ہم نے بہت کچھ قلم زد کر دیا جو لکھا تھا۔ اے کاش کہ یہ طویل داستانیں اور ان کا ضمنی عکس یہ کام دے سکا ہو کہ ان تمام کی روشنی کا رخ حسینؑ کی ذات اقدس کا تعارف کروا رہا ہو۔ داستانیں داستان فہمی کے لیے نہ تھیں بلکہ حسینؑ فہمی کے لیے۔ ہماری آخری چھوٹی چھوٹی روایتیں وہ تھیں جو حسینؑ سے درجہ ثانوی کا تعلق نہ رکھتی تھیں۔ کسی بزرگ کے موجود اثر یا اور کسی طرح کے اثر کا اظہار نہ تھا بلکہ جو کچھ تھا اس سے حسینؑ اس طرح ظاہر ہو رہے تھے جیسے وہ اس وقت تھے۔ اور وہ اپنے نشو صفات میں اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ اپنے کو ہر خیر کی اصل اور ہر نیکی کو اپنی فرع فرما سکتے۔ یعنی نیکیاں ان کے لیے اب تقلیدی اور تعلیمی حیثیت سے بڑھ کر عین ان کا خاصہ ہو گئی تھیں۔ ہمارا دوسرا حصہ جن واقعات کو دکھلانے والا ہے وہ حسینؑ کے اس ادعا کا ثبوت ہوگا کہ حقیقۃً برائی کے مثل بھی کسی خیال کی طرف ان کا قدم اٹھنا ان کے لیے محال تھا۔ اور ان صبر شکن اور جانکاہ حالتوں میں جو حسینؑ کے پہلے اور حسینؑ کے بعد کسی کے لیے نہیں ہوئیں۔ اور جو واقعات سامنے آئے وہ ایسے نہ تھے جن کے متعلق حسینؑ کا علم تجربہ اور خاصہ تصفیہ کی غلطی کرا سکتا۔

(حصہ اول تمام شد)

شہیدِ اعظمؑ

حصہ دوم

یعنی

حضرتؑ امام حسین علیہ السلام کی سوانحِ عمری

مؤلفہ

سید ریاض علی ریاض (بنارسی)

مؤلف: "الکرار" و "امامت تاریخی حیثیت سے" وغیرہ

باہتمام ضیاء محمود عباد علی نیر و مالکان کے

مطبع اکسیر اعظم واقع محلہ مقیم گنج بنارس میں چھپی

ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ مطابق نومبر ۱۹۱۳ء

بار اول ایک ہزار

نام کتاب "شہید اعظمؑ" (حصہ دوم)

یعنی حضرت امام حسین علیہ السلام کی سوانح عمری

مؤلفہ سید ریاض علی ریاض (بناری)

مؤلف: "الکرار" و "امامت تاریخی حیثیت سے" وغیرہ

باہتمام ضیاء محمود عباد علی منیجر و مالکان کے

مطبع اکسیر اعظم واقع محلہ مقیم گنج بنارس میں چھپی

تعداد: بار اول ایک ہزار

تاریخ اشاعت: ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ مطابق نومبر ۱۹۱۳ء

اشاعت ثانی: ۱۴۳۰ھ مطابق ۲۰۰۹ء

کمپوزنگ: سید محسن رضا نقوی
الضطاط کمپیوٹرز ۲۸۲۔ جوہر کالونی سرگودھا
فون: 048_3764705

قیمت: روپے

ملنے کے پتے:

شہیدِ اعظمؑ (حصہ دوئم)

انڈکس ابوابؑ

مؤلف کے عذرات اور مسئلۂ زبان

بابؑ ہشتم

رجب سنہ ۶۰ھ کے بعد

پہلے حصہ کتاب کو اسباب شہادت حسینؑ سے تعلق تھا۔ یہ حصہ شہادت حسینؑ کا ہے

رجب سنہ ۶۰ھ معاویہ کے وداعی انتظاماتؑ

اب ہم جو کچھ لکھیں گے وہ نتیجہ ہوگا ہماری گزشتہ تحریر کا۔ اور اسے زیادہ تر معاویہ کے وداعی انتظامات سے تعلق ہوگا۔ جس کا باب ششم میں تذکرہ کیا گیا۔ اس وقت کے بعض الفاظ وہ معاویہ کی وصیت کے ہوں، یزید کے ہوں، یا ضحاک بن قیس کے۔ ظاہر کرتے ہیں کہ اموی حکومت کے یہ اراکین باوجود ان تمام باتوں کے جو آل ہاشم کے کمزور بلکہ نیست و نابود کرنے کے لیے ہو چکی تھیں بنی ہاشم کے عود اختیار سے خوف زدہ تھے۔ اس سے زیادہ صاف اور غیر مشتبہ لفظ کیا ہوں گے جو یزید معاویہ سے کہتا ہے کہ: "میری تجدید بیعت کے لیے کوشش کرو ورنہ خوف ہے کہ اگر لوگوں نے مجدداً بیعت نہ کی تو آل ابوتراب سے مجھے رنج پہنچے"۔ یا ضحاک کی پر رسوخ ہوا خواہی اور سفارش کہ: "ہم راضی نہیں ہیں کہ حکومت ابوسفیان کے خاندان سے آل ابوتراب میں منتقل ہو"۔ کیا رہ گیا تھا اب بنی ہاشم کے پاس جس کا خوف تھا۔ فوج، روپیہ یا حکومت کچھ تو نہ تھی۔ لیکن ایک حکومت تھی۔ حکومت قلب۔ اور اسلام پر ان کی ذات کا ایسا گہرا نقش تھا جو کسی چٹکی سے مٹایا نہیں جاسکتا تھا۔ نہ مٹا لیکن مدبرین اپنی اس بے خواب کوشش سے کیوں باز آتے کہ عامۂ ناس اور اس اثر کے درمیان پردہ ڈالتے اور حتی الوسع اس میں ربط نہ ہونے دیتے۔

ایکؑ اُصول کا اِستقرار

تجویزیں پیش کرنا یا توجہ دلانا ہوا خواہوں کا کام اور اساس مصلحت سرحکومت کا فرض تھا۔ معاویہ نے واقعہ کو تسلیم کیا اور چلتے چلاتے تاکید کردی کہ: "خلیفہ مقتول کے ورثا کو آل ابوتراب پر مقدم رکھنا اور بنی امیہ اور بنی عبدالشمس کو بنی ہاشم اور دوسرے لوگوں پر حاکم مقرر کرنا"۔ معاویہ کوئی نئی بات نہ کہہ رہا تھا بلکہ اس مصلحت کی تجدید کر رہا تھا کہ بنی ہاشم اختیارات میں شرکت سے دور رکھے جائیں۔ اور اسے معاویہ سے بہتر کون کچھ سکتا تھا کہ یہی شرکت تھی جس نے اسے آج ممالک اسلامی کا فرمانروا بنا دیا اور دوسری مصلحت بھی وہی مصلحت تھی جس کی مثالیں دی جاچکیں کہ کوئی رقیب بنایا جاوے اور وہ کسی طرح اس کام آئے کہ علیؑ اور اولاد رسولؐ کو فراموش کرا سکے۔ لیکن معاویہ محض اسی پر قانع نہ تھا کہ بنی ہاشم بے اختیار رہیں، بلکہ اس کا بھی اہتمام کیا کہ ان کے دشمن ان پر حاکم رہیں، اور ان کے علاوہ اور لوگوں پر بھی یعنی حکومت کے لیے بنی امیہ کو چن لیا تھا۔ ہم اسے گزشتہ صفحات میں دکھا چکے ہیں کہ کس طرح رسولؐ کے بعد سے اصول مساوات مسخ ہوتا جاتا تھا۔ اور اختیار و حکومت میں وہ لوگ شریک کیے جاتے تھے جنھوں نے حصولِ اختیار میں مدد دی ہو۔ عثمان کے زمانہ میں بنی امیہ ہر اعلیٰ عہدہ پر دکھائی

دینے لگے تھے لیکن حکومت نے اور لوگوں کے تخلیہ کی کوئی نوٹس نہیں دی تھی۔ اگرچہ طرزِ عمل اس سے الگ نہ تھا لیکن معاویہ کے لیے رفتہ رفتہ وہ زمانہ آگیا تھا کہ اب نہ کوئی اعتراض کرسکتا اور نہ اسے اس وصیت میں ادنیٰ تردد ہوتا کہ بنی امیہ حاکم قوم قرار دی جائے۔ مجھے کچھ نہیں کہنا ہے کہ یہ مصلحت کیسی تھی، اس لیے کہ اس کے ماضی کا بجز اس کے کوئی دوسرا مآل نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن مجھے یہ کہنا ہے کہ حکومت اسلامی کی یہ صورت ہوگئی تھی کہ بجز اس گروہ کے جو برسرِ حکومت تھا اور اسلامی گروہ اس کے نفاذ اختیار میں شریک ہونے کے قابل نہ تھا۔

اس اصول کی وجہ، بے اعتباری

بے اعتباری کی یہ ترجیح مصلحت اس لیے تھی کہ انھیں اور مسلمانوں سے اس کی امید نہ ہوسکتی تھی کہ وہ ہر امر میں موافقت کریں گے۔ موافقت نہ کرنا نظام کی اموی رُوح میں ابتری کرے گا جس کا نتیجہ یہ ہوسکتا ہے کہ بنی امیہ کے ہاتھ سے اختیار جاتا رہے اور یہ تو بحث کے میدان سے بہت دُور ہے کہ وہ بنی ہاشم سے کہاں تک اپنی روش میں موافقت کی امید کرسکتے تھے۔

آلِ رسالت کے بیخ کنی کی وجہ

لیکن آلِ رسولؐ کی بیخ کنی کی کوششیں کچھ اس بنا پر نہ تھیں کہ وہ موافقت نہ کریں گے یا ان کی مخالفت کا اندیشہ تھا، بلکہ تجربہ تھا کہ وہ مخالفت نہ کریں گے اور خاموش رہیں گے۔ خوف ان کے کسی عملی مخالفت سے نہ تھا بلکہ ان کا دنیا میں لوگوں کے سامنے رہنا ہی افرادِ حکومت کے نزدیک خطرہ کی چیز تھی۔ آلِ رسولؐ کے پاس اس کا کوئی علاج نہ تھا کہ وہ کیوں ایسے ہیں۔ اس کے لیے وہ اپنی روش سے اطمینان دلاسکتے تھے۔ حکومت کا اندیشہ دور کرنے کے لیے قومی خودکشی نہ کرسکتے تھے۔

ایک حکم

اور جب معاویہ اپنے کو اپنی جگہ مضبوط دیکھ رہا تھا اور ہر شاخ حکومت بنی امیہ کے لیے مُسلّم کردی تھی تو اس کے نزدیک اب یہ حکم دیا جاسکتا تھا کہ: "جس شخص پر یہ عہدنامہ پڑھا جائے وہ اپنے امیر یزید کی اطاعت کرے اور جو شخص کچھ یا انکار کرے یزید کو اختیار ہے کہ اس پر تلوار کھینچے اور اسے قتل کرے جب تک کہ اس کی خلافت اور امارت کا اقرار نہ کرے اور مطیع نہ ہوجائے"۔ یعنی حکومت کو اپنی قوت پر اب اس درجہ اطمینان تھا کہ ناموافق اور نیوٹرل لوگوں کو مخالف سمجھ سکتی اور بغیر اقرار لیے نہ چھوڑتی۔ یہاں یہ دیکھنے کی بات ہے کہ یہ ایک ایسا تجربہ تھا جس سے معاویہ نے اپنی حیات تک پرہیز کیا۔ یعنی اسے عملی سیاست قرار نہ دیا تھا۔

کونسے لوگوں سے ناموافقت کا خوف تھا

یہ کہا جاچکا ہے کہ معاویہ کو کون سے لوگوں سے ناموافقت کا خوف ہوسکتا تھا۔ گزشتہ زمانہ میں چار آدمی اس کے لیے مخصوص تھے۔ لیکن یزید کے دورِ حکومت تک عبدالرحمٰن بن ابی بکر نہ رہے تھے۔ ابنِ عمر نے نہ صرف بیعت کرلی تھی بلکہ وہ حسینؑ سے بھی ایسا ہی چاہتے تھے۔ اب بظاہر یہ وصیت بجز عبداللہ ابن زبیر اور حسینؑ بن علیؑ کے کسی دوسرے کے لیے نہ ہوسکتی تھی۔

یزید کی حکومت کے اسباب

یزید سے بڑھ کر کسے اپنی حکومت کا یقین اور اطمینان ہوسکتا تھا جس کے پہلے ایک سیاسی ہوش کا آدمی حکومت کرچکا تھا، اور ان سامانوں کو مُہیا کرتا رہا جو اپنے کو مضبوط اور کسی مخالفت کو کمزور کرتا رہے۔ اور سب سے مفید بات یہ تھی کہ بنی امیہ میں نہ صرف حکومت کی

لذت پیدا ہو گئی تھی بلکہ وہ دیگر بنی امیہ میں اپنی قوی اور سیاسی قوت دیکھتے تھے اور ہر ایک کو اس کی فکر تھی کہ اختیار ہمارے حلقہ سے نکل کر باہر نہ جانے پائے۔ سیاست ان کا مذہب، سیاست ان کا اخلاق اور سیاست ان کی فضا تھی۔ اب جس فضا میں ان کے اختیارات کا نشو ہوا تھا اس کے لحاظ سے ان کی سیاست کی نوعیت بجز اس کے نہ ہو سکتی تھی جس سے زیادہ ظاہر شاید ہی اسلامی تاریخ میں کوئی اور بات کہی جاسکے۔

یزید کا ایک اعلان جس سے آئندہ پر روشنی پڑتی ہے

سامانوں کا غرہ اور معاویہ کی وصیتوں کی رہنمائی تھی جس سے اس نے اپنی آئندہ روش بے کھٹکے ظاہر کر دی کہ: "عنقریب ہم میں اور ہمارے دشمنوں میں جنگ ہوگی"۔ آئندہ واقعات بتائیں گے کہ یزید کے دشمن کون تھے۔ میں یہ کہہ چکا کہ میرا پہلا حصہ اسباب شہادتِ حسینؑ کا تھا۔ اب پیشِ نظر حصہ شہادتِ حسینؑ کا ہے۔ اور حقیقتاً یہ حصہ میرے پہلے حصہ کا نہ صرف لازمی نتیجہ بلکہ طبیعتوں اور ان کے عناصر کا آئینہ بھی ہے۔

مؤلف اب واقعات لکھتا ہے

اب میں واقعات کی طرف بڑھتا ہوں۔ ابن خلدون کہتا ہے:

یزید کا حکم

امیر معاویہ کے مرنے کے بعد بیعت خلافت یزید کے ہاتھ پر کی گئی..... اس کی توجہ پوری اس طرف تھی کہ ان لوگوں سے بیعت لینی چاہیے جنھوں نے اس کی ولیعہدی کی بیعت سے امیر معاویہ کے زمانہ میں انکار کیا تھا۔ چنانچہ اس نے ولید بن عُتبہ کو امیر معاویہ کے اِنتقال کا حال لکھا۔ اور نیز یہ تحریر کیا کہ: "بلا تاخیر حسینؑ بن علی، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر سے بیعت لے لو"۔

کامل ابن اثیر کے موافق اطلاعی خطوط کے علاوہ اک دوسرا نوشتہ تھا جس میں حاکم مدینہ کو تاکید کی گئی تھی کہ: "نہ چھوڑنا یہاں تک کہ بیعت کریں"۔ اعثم کوفی کہتا ہے کہ: "اگر وہ بخوشی بیعت کرلیں تو اچھا ہے ورنہ ان سے بجبر بیعت لے اور ان میں سے جو شخص بیعت نہ کرے اسے قتل کر کے سر میرے پاس روانہ کر"۔

بعض مؤرخین کی ایک روش

ابو اسحاق اسفرائنی نے عام مؤرخین سے الگ واقعہ خوانی کی ہے۔ جہاں وہ دو صفوں میں معاویہ سے وصیتیں کراتا ہے جو زیادہ تر حسینؑ کے ساتھ حسن سلوک کی نصیحتیں ہیں اور غالباً مزید تائید کے لیے حسینؑ کو معاویہ کے ہمراہ دمشق میں رکھتا ہے۔ اور معاویہ کے انتقال کے بعد دمشق ہی میں یزید اور امام حسین علیہ السّلام سے خط و کتابت ہوتی ہے۔ قابل واقعہ نویس کی روش ان لوگوں کی سی ہے جن کے نزدیک قاتل و مقتول دونوں برابر ہیں یا جیسا صاحب صواعق محرقہ نے اذا ذکر اصحابی فامسکوا کی شرح میں ایک راستہ دکھایا ہے۔ یا جو ان روایات کے قائل ہیں کہ معاویہ حدیث سن کر شادی ہی نہیں کرتے تھے کہ مبادا یزید پیدا ہو اور اس کے بعد تقدیر کا پھیر کہ پیدا ہی ہو گیا۔ اب چارہ ہی کیا تھا۔

تفرق سے حکومت کا اصول۔ ولید اور مروان میں مشورہ

کامل کے موافق ولید بن عُتبہ معاویہ کی خبر موت سن کر گھبرایا اور اس نے مروان بن حکم کو طلب کیا، جو ان دنوں اس کی ماتحتی میں کام کرتا تھا۔ ان دونوں میں کچھ بے لطفی بھی تھی۔ جیسے

ابن خلدون نے لکھا ہے کہ: کس طرح معاویہ ایک کا گھر دوسرے کے ہاتھوں کھدوانا چاہتا تھا۔ لیکن چونکہ معاویہ کی موت اور حسینؓ سے اخذ بیعت دونوں بڑی باتیں تھیں ولید نے مناسب سمجھا کہ اس وقت گزشتہ کشیدگیوں کا لحاظ نہ کیا جائے۔

شبِ یکشنبہ ۲۸ رجب ۶۰ھ

تاریخ خمیس کے موافق آج شب یکشنبہ تھی اور رجب کے مہینہ میں دو دن باقی تھے۔

مروان قتل کی صلاح دیتا ہے

مروان آیا، ولید نے خط دیا۔ پڑھا اور اب بقول ابن خلدون: "ولید نے ان لوگوں سے بیعت لینے کی بابت اس سے مشورہ طلب کیا۔ مروان نے رائے دی کہ: "اسی وقت وہ لوگ بلوائے جائیں۔ اگر یزید کی بیعت کر لیں تو بہتر ورنہ اس سے پیشتر کہ وہ امیر معاویہ کے انتقال سے واقف ہوں قتل کر ڈالے جائیں۔ کیونکہ انتقال امیر معاویہ سے واقف ہو جانے پر ہر شخص ان میں کا مدعی خلافت ہو جائے گا۔ ہاں ابن عمر ایک ایسے شخص ہیں جو لڑائی جھگڑے سے بھاگتے ہیں اور خلافت کو پسند نہیں کرتے۔ مگر یہ کہ کل مسلمان متفق ہو کر ان کو خلیفہ بنائیں"۔

حسینؑ کے متعلق خیال

اعثم کوفی اس کے بعد آگے بڑھتا ہے کہ "اس لیے بالفعل اسے (ابن عمر کو) تو رہنے دے اور کچھ نہ کہہ حسینؓ اور عبدالرحمٰن اور عبداللہ بن زبیر کو بلا کر بیعت لینے کی تدبیر کر۔ اور خوب سمجھ لے کہ حسینؓ ہرگز یزید کی بیعت اختیار نہ کرے گا۔ خدا کی قسم اگر میں تیری جگہ ہوتا تو حسینؓ سے کچھ بھی نہ کہتا اسے قتل ہی کر ڈالتا اور ذرا نہ ڈرتا"۔ ولید کو متردد دیکھ کر: "اے امیر تو غمگین نہ ہو اپنے کام کی طرف متوجہ ہو۔ آل ابوتراب ہمیشہ کی ہماری دشمن ہے۔ انھوں نے عثمان کو مارا ہے۔ معاویہ کے ساتھ جو معرکہ آرائیاں کی ہیں وہ تو نے بھی دیکھی اور ملاحظہ کی ہیں۔ اگر جلدی نہ کرے گا اور حسینؑ کو معاویہ کی وفات کی خبر ہو جائے گی تو وہ تیرے ہاتھ نہ آئے گا۔ یزید کی طرف سے تیری عزت اور مرتبہ کو نقصان پہنچے گا۔!"۔

ولید کے قاصد کا نام بلانے کا وقت

آخر بلانا طے پایا۔ روضۃ الصفا اور ناسخ التواریخ کے موافق جس کو بلانے کے لیے بھیجا اس کا نام عمر بن عثمان تھا۔ طبری کے موافق نبیرۂ عثمان تھا۔ تاریخ خمیس کے موافق "رات کو بلایا"۔ کامل کہتا ہے کہ: "جس وقت حسینؓ وغیرہ کو طلب کیا وہ وقت ولید کے دربار کا نہ تھا"۔ ابن خلدون کہتا ہے کہ: "ولید نے اسی وقت عبداللہ بن عمر ابن عثمان ایک نوعمر لونڈے کو ان لوگوں کے بلانے کو بھیجا۔ پس حسینؓ و ابن زبیر کے پاس مسجد میں یہ اس وقت پہنچا جس وقت کہ ولید اجلاس عام نہ کرتا تھا۔ اور ان دونوں بزرگوں سے کہا کہ: "چلیے آپ کو امیر بلاتے ہیں"۔ حسینؓ و عبداللہ بن زبیر نے کہا: "تم جاؤ ہم آتے ہیں"۔

حسینؑ کہاں تھے، جواب

اعثم کوفی کے موافق یہ لوگ قبر رسولؐ کے پاس بیٹھے تھے اور حسینؓ نے قاصد کو جواب دیا کہ: "جب ہم گھر جائیں گے تو وہاں بھی ہوتے جائیں گے"۔

حسینؓ اور ابن زبیر میں مضمون طلب پر گفتگو، حسینؓ کا صحیح استنباط اور تصفیہ

اس کے بعد عبداللہ بن زبیر نے امام حسینؓ سے کہا کہ اے ابا عبداللہ یہ وقت تو امیر کے اجلاس کرنے اور

امورات سلطنت میں مشورہ لینے کا نہیں نہ معلوم اس نے اس وقت ہمیں کیوں بلایا ہے۔ میرے دل میں گھبراہٹ پیدا ہو گئی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ امام حسینؑ نے کہا کہ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ معاویہ مر گیا۔ عبداللہ بن زبیر نے کہا: تو ہمیں اس لیے بلاتا ہو گا کہ یزید کے واسطے ہم سے بیعت لے۔ تم اس معاملہ میں کیا کرو گے؟۔ امام حسینؑ نے کہا: "میں یزید کی بیعت اختیار نہ کروں گا۔ کیونکہ معاویہ نے میرے بھائی کے ساتھ اس شرط پر عہد کر لیا تھا۔ اور قسم کھائی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد خلافت مجھے ملے گی اور وہ ہرگز اپنی اولاد میں سے کسی کو خلیفہ مقرر نہ کرے گا۔ اگر معاویہ مر گیا ہے اور اس نے اپنے قول و اقرار کو پورا نہیں کیا ہے تو بڑا اہم کام واقع ہوا ہے۔ کیا تیرا خیال ہے کہ میں یزید کی بیعت اختیار کرلوں۔ یزید شرابی، جھوٹا اور علانیہ فسادی شخص ہے۔ وہ کتوں اور چیتوں سے کھیلتا ہے ہم رسولؐ خدا کے اہل بیت ہیں ہم سے ایسی بات وقوع میں نہیں آسکتی"۔

قاصد کی دوبارہ مداخلت اور حسینؑ کا جواب

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دوسرا قاصد آیا اور کہا: "امیر تمہارا منتظر ہے"۔ امام حسینؑ نے کہا: "تجھ پر تف ہے کب تک بلانے جائے گا"۔ اگر کوئی نہ آئے تو نہ آئے میں ابھی آتا ہوں"۔ ولید کا قاصد الٹا چلا گیا اور (جا کر) کہا کہ: "حسینؑ نے تیرے کہنے کو منظور کر لیا ہے۔ ابھی میرے پیچھے آتا ہے"۔ مروان نے کہا: "وہ نہ آئے گا۔ تجھے دھوکا دیا ہے"۔

حسینؑ کی خصلت اور ولید

ولید نے کہا کہ: "ایسی بات نہ کہہ کہ حسینؑ بے وفا نہیں۔ جو کہتا ہے اسے پورا کرتا ہے"۔ روضۃ الصفا کے موافق ولید نے کہا کہ: "حسینؑ غدار نہیں ہیں"۔

حسینؑ اور ولید کے پاس جانے کا انتظام

اب امام حسینؑ نے ہمراہیوں سے کہا: "تم چلے جاؤ میں بھی اپنے گھر جاتا ہوں۔ پھر ولید کے پاس جاؤں گا۔ دیکھوں کیا کہتا ہے"۔ عبداللہ بن زبیر نے کہا: "میری جان تم پر سے فدا ہو مجھے اندیشہ ہے کہ مبادا جب تم اس کے پاس جاؤ (تو) وہ تمہیں قید کر لے۔ یا خدانخواستہ مار ڈالے"۔ امام حسینؑ نے کہا: "میں اس کے پاس تنہا نہ جاؤں گا۔ اپنے دوستوں میں سے کچھ لوگ ہمراہ لوں گا۔ اور کہہ دوں گا کہ ہتھیار لے لیں اور زیر دامن چھپا لیں۔ پھر اگر کسی نے میری طرف بری نگاہ سے دیکھا تو میں اسے فنا کر دوں گا۔ تو جس قدر آسان بات سمجھتا ہے اس قدر آسانی سے کوئی مجھ پر قابو نہیں پاسکتا، بلکہ سخت مشکل کام ہے۔ اور جو لکھا جا چکا ہے وہ ہو کر رہے گا"۔

"پھر سب رسولؐ خدا کی قبر پر آئے اور ایک دوسرے کو رخصت کر کے اپنے اپنے گھر گئے۔ امام حسینؑ نے غسل فرمایا۔ عمدہ لباس پہنا، دو رکعت نماز ادا کی پھر کسی شخص کو بھیج کر اپنے دوستوں اور عزیزوں کو بلایا۔ سب حال سنا کر کہا کہ اپنے اپنے اسلحہ زیر دامن چھپا کر میرے ساتھ چلو۔ ولید کے دروازہ پر ٹھہرے رہنا۔ اگر سنو کہ میں بلند آواز سے بول رہا ہوں اور تمہیں طلب کرتا ہوں تو بلا روک ٹوک تم اندر چلے آنا۔ جسے میرے در پے دیکھنا اسے ہٹا دینا اور اگر کسی کو میرے قتل پر آمادہ پاؤ تو اسے مار ڈالنا۔ جب تک تمہیں یہ امر معلوم نہ ہو کہ کوئی میرے قتل کا ارادہ رکھتا ہے تو خاموش بیٹھے

رہنما ذرا تھامنا۔ اس کے بعد رسولؐ خدا کی عصا لے کر گھر سے باہر تشریف لائے۔ تیس یکتا بہادر ساتھ تھے"۔

مروانؔ اور ولید کی صلح پر حسینؑ خوشی ظاہر کرتے ہیں

رفقا کو دروازے پر بٹھا کر تاکید کردی۔ خود اندر تشریف لے گئے۔ ولید نے مناسب خیر مقدم کیا اور حسینؑ نے مروان اور ولید کو ایک جگہ دیکھ کر بقول کامل فرمایا: "صلہ رحم کرنا قطع رحم سے اور صلح فساد سے بہتر ہے"۔ ولید اور مروان خاموش رہے۔ اس کے بعد حسینؑ نے وجہ طلبی دریافت کی۔ اور معاویہ کا حال پوچھا۔

سوالِ بیعت اور حسینؑ کا جوابؔ

ولید نے معاویہ کی موت کی خبر دی اور آپ نے بقول اعثم کوفی فرمایا: "اللہ تعالیٰ اس کی موت سے تمھیں ثواب عظیم عطا کرے"۔

سوال بیعت یزید کے متعلق بقول ابن خلدون فرمایا: "میرے نزدیک یہ مناسب نہیں ہے کہ مجھ ایسا شخص خفیہ طور سے بیعت کرے اور یہ کچھ موزوں اور کافی بھی نہ ہوگا، بلکہ جب میں یہاں سے اٹھ کر لوگوں میں جاؤں اور تم ان سبھوں کو بیعت کے لیے بلاؤ گے اور میں بھی ان لوگوں میں ہوں گا تو سب کے پہلے میں ہی جواب دینے والا ہوں گا"۔

ولید کی رضا مندی

ولید نے حسینؑ کے اس جواب کو پسند کیا۔ مجھے بھی ولید کے الفاظ اور انداز کے لحاظ سے مؤرخین کے اس ریمارک سے اتفاق ہے کہ ولید "عافیت پسند تھا"۔ لیکن مروان کا تعارف اب تک جس حد تک ہو چکا ہے اس سے اس کا طبعی خلیہ صیغہ راز کی چیز نہیں ہے۔

مروان کا اِختلاف

مروان کو ولید سے اختلاف ہوا اور اس نے کہا: "ان کو بغیر بیعت کیے نہ جانے دو ورنہ ان ایسے شخص سے بیعت نہ لے سکو گے جب تک تم میں اور ان میں خون کا دریا نہ رواں ہوگا، اور اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو میں لپک کر ان کی گردن اڑا دوں گا"۔ (ابن خلدون)

حسینؑ مروان کو ڈانٹتے ہیں

اب بقول اعثم کوفی: "امام حسینؑ خفتہ ہو کر اس کی طرف چلے"۔ بقول کامل: "اچھل پڑے"۔ اور بقول ابن خلدون: "ڈانٹ کر کہا: "تو یا وہ مجھے قتل کرے گا؟ واللہ تو جھوٹا ہے"۔ مروان یہ سن کر دب گیا"۔

حسینؑ کی آواز اور رُفقاء

بقول اعثم کوفی: "آپ کی زبان سے یہ الفاظ بلند آواز سے نکلے اور آپ کے دوستوں نے جو آواز کے منتظر تھے سنتے ہی تلواریں نکال لیں اور چاہا کہ ولید کے گھر میں گھس جائیں کہ اتنے میں امام حسینؑ باہر چلے آئے اور کہا بس ٹھہر جاؤ"۔ اب امام حسینؑ اپنے گھر تشریف لائے۔

ولید اور مروانؔ

بقول ابن اثیر مروان کی صلاح قتل پر جب ولید نے کہا کہ: "حسینؑ کو قتل کر کے جو حساب دینا ہوگا وہ بہت ہی خفیف المیزان ہوگا"۔ تو مروان نے طنزاً کہا کہ: "سچ کہتے ہو"۔

راستہ کا مکالمہ

اعثم کوفی دوسرے دن پھر حسینؑ اور مروان کا ایک مکالمہ لکھتا ہے۔ جس کے بعض خوبصورت خیالات میں درج کرتا ہوں: "امام حسینؑ دوسرے دن اپنے مکان سے باہر تشریف لائے کہ دیکھیں کیا کیفیت ہے۔ مروان کوچہ میں ملا۔ کہا اے ابا عبداللہ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں اور تیری بھلائی کی بات کہتا ہوں کہ یزید کی بیعت منظور کر لے تاکہ تجھے کچھ صدمہ اور رنج نہ پہنچے اور یہ فساد مٹ جائے۔ یزید بھی یہ خبر سن کر تمہارے

ساتھ بہت اچھے سلوک کرے گا۔ اگر میری بات مان لوگے تو دین اور دنیا دونوں جگہ تمہارا بھلا ہوگا۔ امام حسینؑ نے فرمایا: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔ آج اسلام کمزور ہوگیا اور آدمی مصیبت میں پھنس گئے۔ اے مروان! یزید کون شخص ہوتا ہے جس کی بیعت کے واسطے تو مجھے نصیحت کرتا ہے تو اسے خوب جانتا ہے کہ وہ شراب خور اور جھوٹا ہے۔ تُو نے یہ بات بہت ہی بے وقوفی اور نادانی کی کہی۔ میں تجھے اس نصیحت کے واسطے جو ہزار ہا ملامتوں سے زیادہ ہے، برا نہیں کہتا۔ کیونکہ تجھ سے اسی قسم کے امور سرزد ہوں گے۔۔۔۔ اے دشمن خدا تجھے معلوم نہیں کہ ہم رسولؐ خدا کے اہل بیت ہیں۔ ہم ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ میں نے اپنے نانا محمد رسولؐ اللہ سے سنا ہے کہ آل ابوسفیان اور طلقا کے لیے خلافت حرام ہے۔ جب معاویہ کو میرے منبر پر بیٹھے دیکھو اس کا پیٹ پھاڑ ڈالنا۔ خدا کی قسم مدینہ والوں نے اسے میرے نانا کے منبر پر بیٹھے دیکھا اور کچھ نہ کہا۔ اس لیے خدا نے انھیں یزید کے پنجے میں ڈالا"۔ اس کے بعد کچھ دیر اور اور طنز کی باتیں ہوتی رہیں اور آخر میں حسینؑ نے فرمایا: "میرے سامنے سے دور ہوجا"۔ اور مروان نے ولید کو اس مکالمہ کی خبر دی۔

عبداللہ بن زبیر اور ولید

مجھے عبداللہ بن زبیر کے متعلق انعکاس مصلحت بھانے کے لیے اس قدر کہنا ہوگا کہ مؤرخین کے موافق ابن زبیر اپنے اعزہ کو ایک جا جمع کرکے گھر میں چھپ رہے اور ولید کے پاس نہ گئے۔ ولید نے اپنے غلاموں کو گرفتاری کے لیے بھیجا۔ ابن زبیر کے گھر کا محاصرہ ہوا، اور انھیں سخت و سست کہا۔ آخر میں ابن زبیر نے اپنے بھائی جعفر کی زبانی کہلا بھیجا کہ ہم گھبرا گئے ہیں کل ضرور آئیں گے۔ اپنے غلاموں کو بلوالو۔ ولید نے منظور کیا، اور اب ابن زبیر نے متعلقین کو شاہ راہ سے مکہ جانے کی ہدایت کی اور خود دوسرے راستہ سے مکہ روانہ ہوئے۔ صبح کو ولید کو خبر ہوئی تو اس نے تیس اموی سانڈنی سواروں کو تعاقب میں بھیجا۔ لیکن گرفتار نہ ہوئے۔ ولید نے اب ابن زبیر کے تمام رشتہ داروں کو قید کرلیا۔ (اعثم کوفی)

عالمگیر کمند

یزید کو حالات کی اطلاع دی گئی اور جواب یہ آیا کہ "عبداللہ بن زبیر کو اس کے حال پر چھوڑ دو وہ جہاں کہیں جائے گا ہماری کمند اس کے گلوگیر رہے گی۔ لومڑی چاند سے بھاگ کر کہاں جاسکتی ہے"۔ اسی خط میں تھا کہ: "اس خط کے جواب کے ساتھ حسینؑ بن علیؑ کا سر میرے پاس بھیج دے"۔

عمال کا تبادلہ رمضان ۶۰ھ

آخر میں ولید معزول ہوا۔ اور عمر بن سعید الاشدق اس کی جگہ عامل مدینہ مقرر کیا گیا۔ جو ابن زبیر کے مکہ پہنچنے کے وقت وہاں کا عامل تھا۔ اور جس سے انھوں نے کہا تھا کہ: ہم "خانہ کعبہ کی پناہ لینے آئے ہیں"۔ بقول کامل عمال کا تبادلہ رمضان کے مہینہ میں ہوا۔ بقول ابن خلدون: "ان دنوں مکہ کا عامل عمر بن سعید تھا۔ اس کے ساتھ نہ تو وہ نماز پڑھتے تھے اور نہ اس کے ساتھ طواف کرتے۔ یہ اور ان کے ہمراہی علیحدہ کھڑے رہتے"۔

ابن حجر مکی صواعق محرقہ میں لکھتے ہیں کہ: "سبب خروج حسینؑ آن بود کہ یزید پلید چوں در سنہ ۶۰ھ بمسند حکومت نشست رسولؐ خود را نزد عامل خود کہ در مدینہ بود فرستاد کہ بیعت وے از حسینؑ بگیرد۔ حسینؑ بر این معنی اطلاع یافتہ بر نفس خود ترسید و بجانب مکہ توجہ نمود"۔ یعنی: امام حسینؑ کے مدینہ سے نکلنے کی وجہ یہ تھی کہ یزید پلید جب سنہ ۶۰ھ میں مسند حکومت پر بیٹھا تو اپنے قاصد کو اپنے گورنر مدینہ کے پاس بھیجا کہ حسینؑ سے بیعت لے۔ حسینؑ اس بات سے آگاہ ہوکر

جان کے ڈر سے مکہ روانہ ہو گئے۔ اس کی تفصیل یہ ہے: کامل اور اعثم کے موافق ابن زبیر کی شب روانگی کو حسینؑ سے کوئی تعرض نہ ہوا۔ حسینؑ اسی رات کو روضہ رسولؐ پر تشریف لے گئے۔ اور بقول اعثم کوفی فرمایا:

حسینؑ کا روضۂ رسولؐ سے مخاطبہ

"السلام علیک یا رسولؐ اللہ! میں آپ کی فاطمہؑ کا بیٹا اور تمہارا فرزند ہوں۔ جس کو دنیا سے رحلت فرماتے وقت آپ نے امت کے حوالہ کیا۔ اور ان کو میری عزت اور حرمت کرتے رہنے کے لیے وصیت فرمائی تھی۔ واضح ہو کہ انھوں نے آپ کی وصیت کو بھلا دیا۔ مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ میں آج کی رات آپ سے آپ کی امت کی شکایت کرتا ہوں۔ اور جب آپ کے پاس آکر ملوں گا تو درد دل کا مفصل حال عرض کروں گا"۔

یہی مورخ کہتا ہے: "ولید نے اس دن بوقتِ شب آدمی بھیج کر امام حسینؑ کا حال معلوم کرنا چاہا۔ اور یہ سن کر کہ آپ گھر میں موجود نہیں ہیں ولید نے کہا: "شکر خدا کہ آپ اس شہر سے تشریف لے گئے اور مجھے یزید کے حکم کی تعمیل نہ کرنی پڑے گی"۔ (اعثم)

دوسری رات کو حسینؑ پھر روضۂ مطہر پر تشریف لے گئے۔ نماز پڑھی اور مناجات کی کہ: "اے خدا! یہ تیرے پیغمبر محمدؐ کی خاک ہے۔ اور میں اس کی بیٹی کا بیٹا ہوں۔ مجھے ایسا کچھ معاملہ درپیش ہے جس سے تو ہی آگاہ ہے۔ اور میرے حالات اور دلی کیفیتوں سے بخوبی واقف ہے کہ میں نیکی کو عزیز رکھتا ہوں اور برائی سے بیزار ہوں۔ اے ذوالجلال والاکرام اس خاک پاک کے طفیل اور اس شخص کے واسطے جو اس تربت میں مدفون ہے مجھے اپنی اور اپنے رسولؐ کی رضامندی کرامت فرما"۔

حسینؑ کا خواب روضۂ رسولؐ پر

اس کے بعد آپ بہت روئے اور قبر مطہر پر سر رکھ کے سو رہے۔ خواب میں اپنے نانا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ (بہت سے فرشتوں کے ساتھ جو آپ کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے موجود ہیں) تشریف لائے امام حسینؑ کو اپنے سینہ سے لگالیا۔ پھر پیشانی پر بوسہ دے کر فرمایا کہ: "تو عنقریب ایسے شخصوں کے ہاتھ سے جو اسلام کا دعویٰ کرتے ہوں گے زمین کربلا میں شہید ہو گا۔ اس وقت تو پیاسا ہو گا اور وہ تجھے ایک قطرہ پانی نہ دیں گے—— میرے پیارے حسینؑ تمہارے ماں باپ میرے پاس ہیں اور تیرے دیدار کے مشتاق ہیں اور بہشت میں تیرے واسطے عالی شان درجے مقرر ہیں جو بغیر شہادت حاصل نہیں ہو سکتے"۔ اب امام حسینؑ خواب ہی میں جواب دیتے ہیں کہ: "اے نانا مجھے اپنے پاس ہی رکھ لیجیے۔ مجھے دنیا میں واپس جانے کی ضرورت نہیں ہے"۔ آپ نے فرمایا: "تجھے شہادت کی سعادت حاصل کرنی ضرور ہے"۔

نصف شب

حسینؑ بیدار ہوئے اور اہل بیت سے یہ خواب بیان کیا روضۂ مطہرہ سے پھر رخصت ہوئے اور اب غالباً حضرت محمد ابن حنفیہ سے باتیں ہوئیں۔ یہ صبح کا وقت تھا۔

محمدؒ ابن حنفیہ اور حسینؑ کی گفتگو

بقول ابن خلدون محمد ابن حنفیہ نے کہا: "یزید کی بیعت سے اعراض کر کے کسی دوسرے شہر میں چلے جاؤ اور وہاں سے اپنے دعاۃ کو اطراف و جوانب بلاد اسلامیہ میں روانہ کرو۔ اگر وہ لوگ تمہاری بیعت منظور کرلیں تو اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنا اور اگر تمہارے سوا انھوں نے متفق ہو کر کسی دوسرے کو امیر بنالیا تو تم کو اس سے کوئی نقصان نہ ہوگا۔ نہ تمہارے دین کو مضرت

پہنچے گی اور نہ تمھاری عقل کو نہ اس میں تمھاری آبروریزی ہوگی۔ مجھے اندیشہ اس کا ہے کہ کہیں تم ایسے شہر یا ایسی قوم میں نہ چلے جاؤ جس میں سے کچھ لوگ تمھارے ساتھ اور کچھ تمھارے مخالف ہوں اور جس سے بدی کی ابتدا تم ہی سے ہو"۔ امام حسینؑ نے دریافت کیا: "اچھا ہم کہاں جائیں؟"۔ جواب دیا: "مکہ جاؤ۔ اگر تم کو اطمینان کے ساتھ یہ باتیں حاصل ہو جائیں تو فبہا ورنہ ریگستان اور پہاڑوں کی گھاٹیوں میں چلے جانا' اور ایک شہر سے دوسرے شہر کا رخ کرنا۔ یہاں تک کہ کوئی امر لوگوں کے اجماع و اتفاق سے طے ہو جائے"۔ بقول کامل: محمد ابن حنفیہ نے کہا: "جب تک ممکن ہو یزید سے بیعت نہ کیجیے"۔ اعثم کوفی کے موافق کہا: "آپ اپنے کو یزید اور اس کے شہروں سے جس قدر ممکن ہو دور رکھیں"۔ اور اگر لوگ بیعت کر لیں تو "رسولؐ خدا کی سنت اور علیؑ مرتضیٰ کی سیرت کے ساتھ زندگانی کیجیے"۔ امام حسینؑ نے فرمایا: "خدا کی قسم اگر دنیا بھر میں میرا ایک دوست بھی نہ ہوگا' اور کسی جگہ بھی امن و امان نہ پاؤں گا تب بھی یزید کی بیعت اختیار نہ کروں گا"۔ پھر فرمایا: "میں اس وقت مکہ جانے پر کمربستہ ہوں۔ بھائی بھتیجوں اور دوستوں کو اپنے ہمراہ لیے جاتا ہوں۔ وہ سب اس امر میں مجھ سے متفق ہیں اور مخالفت نہ کریں گے۔ اگر تم مدینہ میں رہنا چاہو گے تو کچھ دقت کی بات نہیں تمھیں کوئی نہ ستائے گا۔ مگر لازم ہے کہ ان لوگوں کے قول و فعل اور حالات سے خبردار رہ کر جو کچھ واقعات پیدا ہوں ان سے برابر مجھے مطلع کرتے رہو۔ یزید اور اس کے دوستوں کی کوئی بات مجھ سے پوشیدہ نہ رکھو"۔ اس کے بعد وصیت نامہ لکھا: "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ وصیت حسینؑ بن علیؑ نے اپنے بھائی محمد ابن حنفیہ کے واسطے لکھی ہے۔ اور گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور محمدؐ اس کا بھیجا ہوا پیغمبر ہے جو آنحضرتؐ نے فرمایا سب سچ ہے۔ بہشت اور دوزخ برحق ہے۔ قیامت آنے والی ہے۔ اس کے واقع ہونے میں ذرا شک نہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام آدمیوں کو قبروں سے زندہ کر کے اٹھائے گا۔ میں حسینؑ ہوں۔ کسی ظلم یا فساد یا خواہش دوری حق کے اندیشہ کے سبب سے مدینہ سے باہر نہیں جاتا ہوں۔ بلکہ محض امت محمدیؐ کی درستی کے واسطے جاتا اور چاہتا ہوں کہ نیکی کی ہدایت اور بدی کی ممانعت کے شرائط لوگوں پر ظاہر کروں۔ میں نے جناب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس امر کو سنا ہے کہ حسینؑ کی عمر کا خاتمہ قتل سے ہوگا"۔

ابن عباس اور حسینؑ کا مکالمہ

اس قدر تحریر فرمایا تھا کہ ابن عباس نے کہا: "میری یہ رائے ہے کہ آپؑ یزید کی بیعت اختیار کر لیں اور جس طرح معاویہ کے زمانہ میں صبر کیا ہے یزید کے عہد میں بھی صبر کرتے رہیں۔ یہاں تک کہ کوئی ایسا عمدہ موقع پیدا ہو جائے جس سے آپؑ کو فائدہ پہنچے"۔

فرمایا: "یہ کیا کہتے ہو! میں وہ شخص نہیں ہوں جو یزید کی بیعت اختیار کروں اور اس کے کہنے پر چلوں"۔

کہا: اے ابا عبداللہ! آپ نے جو کچھ فرمایا وہ سچ ہے۔ میں نے بھی آنحضرتؐ سے سنا ہے۔ اے حسینؑ میں دنیا میں کسی شخص کو رسولؐ خدا کی بیٹی کا فرزند آپ کی ذات کے سوا نہیں پاتا اور اس امت پر حضور کی امداد ایسی فرض ہے کہ اس بغیر اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کی نماز اور زکوٰۃ کو بھی قبول نہ فرمائے گا"۔

فرمایا: "اے ابن عباس تو اس گروہ کو کیسا سمجھتا ہے جو رسولؐ خدا کے فرزند کو اس کے گھر' وطن اور جائے پیدائش سے نکال دے اور حرم میں رہنے اور تربت رسولؐ کی زیارت کرنے سے محروم کرے اور

اس قدر ڈرائے کہ وہ کسی مکان اور جگہ میں نہ ٹھہر سکے پھر اس کے قتل کا ارادہ کرلے۔ حالانکہ اس کی کچھ خطا اور قصور نہ ہو۔ نہ وہ مشرک ہو"۔

کہا: "اس کے سوا اور کیا سمجھوں کہ وہ لوگ کافر اور خدا و رسولؐ کے دشمن ہیں۔ اے فرزند رسولؐ تم امیر اور سردار اور بزرگ شخص ہو۔ رسولؐ خدا کے بیٹے اور رسولؐ کی بیٹی کے نور نظر اور علیؑ مرتضیٰ کے جگر گوشہ ہو۔ یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کے افعال سے بے خبر رہے گا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ جو شخص تیرے نانا کے راستہ اور طریقہ سے پھرے گا اسے عاقبت میں کچھ نصیب نہ ہوگا"۔

فرمایا: "اے خدا میں بھی گواہی دیتا ہوں"۔

کہا: "میری جان آپ پر فدا ہو معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنی وفات سے مطلع کرتے اور مجھے اپنے واقعات کی خبر دیتے ہو۔ اور امداد و استعانت کے خواستگار ہو۔ اسی خدا کی قسم جس کے سوا کوئی اور خدا نہیں کہ میں آپ سے آگے بڑھ کر اس قدر شمشیر زنی کروں گا کہ میرے دونوں ہاتھ کٹ کر گر جائیں اور پھر بھی آپ کے حق مجھ سے ادا نہ ہوں گے"۔

ابن عمر اور حسینؑ کا مکالمہ

اب ابن عمر بول اٹھے: "اے ابن عباس اس بات سے باز آ۔ پھر امام حسینؑ کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ اے ابا عبداللہ! تم اس ارادہ کو جو پیش نظر ہے ترک کردو اور ہمارے ساتھ مدینہ کو پھر چلو اور جس طرح اور لوگوں نے یزید کی بیعت کرلی ہے تم بھی اس سے بیعت کرلو۔ اور اپنے مکان اور اپنے نانا کی تربت سے آپ علیحدہ نہ ہوں۔ اور اپنے اوپر اس گروہ کی حجت قائم نہ ہونے دو جس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ یزید سے بیعت نہ کرو تو تمھیں اس کے لیے ضرور مجبور کریں گے۔ اور وطن میں اطمینان سے بیٹھنے نہ دیں گے تاوقتیکہ آپ اس کی بیعت اختیار نہ کریں اور ممکن ہے کہ یزید کی عمر بہت تھوڑی ہو اور ہم اس کی طرف سے مطمئن ہو جائیں"۔ فرمایا: "ایسی باتوں پر تف ہے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں۔ کیا تو کچھ سکتا ہے کہ میں غلطی پر ہوں اسے بیان کر کہ میں باز آجاؤں"۔ کہا: "آپ غلطی پر نہیں ہیں۔ نہ آپ سے ایسا ہونا ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کی دختر کے فرزند کو غلطی یا سہو میں مبتلا کرے۔ مگر آپ نے بھی سنا ہوگا کہ زمانہ کا رنگ بدلا ہوا ہے مبادا آپ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور کوئی ایسی حرکت کر بیٹھیں جس کے مقابلہ کی طاقت آپ میں نہ ہو۔ اس لیے مناسب ہے ہمارے ساتھ مدینہ کو واپس چلے چلو"۔ فرمایا: "میں ہرگز یزید کی بیعت نہ کروں گا بلکہ اپنے نانا رسولؐ خدا کی سنت اور اپنے باپ علیؑ مرتضیٰ کی خصلت پر چلوں گا۔ جو شخص میری اطاعت کرے گا اور حق بات کو سنے گا نیکی اور سلامتی حاصل کرے گا۔ اور جو شخص انکار کر کے دائرہ اطاعت سے باہر ہوگا تو میں اس پر صبر کروں گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ مجھ میں اور اس میں فیصلہ کردے گا۔ اور وہی سب سے اچھا حاکم ہے۔ میری یہی وصیت ہے۔ پھر اپنے بھائی محمد کی طرف متوجہ ہو کر کہا: اللہ تعالیٰ تم کو توفیق نیک عطا کرے۔ اے بھائی اب میں تم سے رخصت ہوتا ہوں۔ اس پر سلام ہے جس نے ہدایت پائی اور خدائے بزرگ اور برتر کے سوا اور کسی میں کچھ قدرت و طاقت نہیں ہے۔ اب وصیت نامہ لپیٹ کر اپنے بھائی کو دے دیا"۔ ابن خلدون کے موافق: جب ولید نے ابن عمر کو بیعت کے لیے طلب کیا تو انھوں نے کہا:

جلدی کیا ہے جس کے ہاتھ پر سب مُسلمان بیعت کرلیں گے گو وہ حبشی کیوں نہ ہو میں بھی بیعت کرلوں گا"۔ بعض کے موافق یہ روایت لکھتے ہوئے کہ ابن عمر سے حسینؑ سے مکہ کی راہ میں ملاقات ہوئی ابن عمر نے کہا: "مُسلمانوں کی جماعت کو مُتفرق نہ کرتے جاؤ"۔ اور "بیعت عامہ کے بعد ان دونوں بزرگوں (ابن عباس اور ابن عمر) نے بیعت بھی کرلی"۔

حضرت اُمّ سلمہؓ اور حسینؑ

صاحب خصائص حُسینیہ فرماتے ہیں: جب کہ حضرت نے ارادہ مدینہ منورہ سے سفر کا فرمایا پس حضرت اُمّ سلمۃؓ خدمت میں حضرتؑ کے حاضر ہوئیں اور عرض کی: اے فرزند مجھے محزون و مغموم نہ کرو عراق کے جانے سے۔ کیونکہ میں نے تمہارے جد امجد سے سنا ہے کہ فرزند میرا عراق میں شہید ہوگا ـــــ فرمایا: اے مادر میں بھی جانتا ہوں اس امر کو اور ضرور مجھے قتل کریں گے اور کوئی چارہ و علاج نہیں ہے ـــــ پس جناب اُمّ سلمۃؓ بہت چیخ چیخ کر روئیں۔ اور آخر الامر سپرد خدا کیا۔ پس فرمایا: اے مادر خدا کو منظور ہوا کہ مجھے کشتہ اور آغشتہ بخاک و خون دیکھے اور میرے عیال کو اسیر و دربدر اور اطفال کو میرے مذبوح دیکھے اور مظلوم اس وقت کہ اِستغاثہ کریں اور کوئی ان کی فریاد کو نہ پہنچے"۔ اسی مؤلف کے موافق: "مجلس اماِم حضرت کی بیرون مدینہ تھی جب کہ اہلِ مدینہ خدمت میں حضرت کے حاضر ہوتے اور مشغول نوحہ و بکا ہوتے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم کو قسم دیتا ہوں خدائے عزو جل کی کہ اس راز کو فاش نہ کرو کہ معصیت خدا ہے۔ کہا انھوں نے کہ آج اگر ہم نہ روئیں تو پھر کس دن کے واسطے رونا اٹھا رکھیں۔ آج مثل اس روز کے ہے کہ پیغمبر خدا اور علیؑ مرتضیٰ اور فاطمہؑ زہرا اور امام حسنؑ مجتبیٰ نے دنیا سے رحلت کی۔ آپ کو قسم دیتے ہیں کہ آپ اپنے تئیں قتل سے بچائے"۔

عمر بن علیؑ اور حسینؑ

صاحب ناسخ التواریخ اور لہوف کے موافق: "محمد بن عمر راوی ہیں کہ میرے باپ عمر بن علیؑ بن ابی طالب میرے ماموں و آل عقیل سے یہ بیان فرماتے تھے کہ جب میرے بھائی حسینؑ بن علیؑ نے مدینہ میں یزید کی بیعت سے انکار کیا تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا وہ تنہا تھے۔ میں نے ان سے عرض کیا یا اباعبداللہؑ میں آپؑ پر فدا ہوں آپؑ کے بھائی ابو محمد حسنؑ نے اپنے باپ سے روایت کی ہے (اتنا میں کہنے پایا تھا کہ دل بھر آیا اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور دھاڑیں مار کر رونے لگا) حضرتؑ نے مجھ کو لپٹا لیا اور فرمایا کہ: مقتول؟۔ پھر حضرتؑ نے پوچھا کہ تم سے حدیث بیان کی ہے کہ میں مقتول ہوں؟ تب میں نے عرض کی حاشا للہ یا ابن رسول اللہ۔ پھر حضرتؑ نے کہا کہ: "میں تم کو تمہارے باپ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ میرے قتل کی تم کو خبر دی ہے"۔ میں نے جواب دیا کہ "ہاں"۔ پھر میں نے کہا کہ: "کاش آپ بیعت کرلیتے!"۔

دنائت نفس حسینؑ کو پسند نہ تھی

حضرت نے فرمایا کہ: "مجھ سے میرے باپ نے حدیث بیان فرمائی ہے کہ جناب رسولِ خدا نے ان کو میرے اور ان کے قتل کی خبر دی ہے اور یہ بھی خبر دی ہے کہ میری اور میرے باپ کی قبر قریب قریب ہوگی۔ پس کیا تم کو گمان ہے کہ تم اس امر کو جانتے ہو جس کو میں نہیں جانتا ہوں۔ بخدا کبھی میں نے دنائت نفس کو نہیں پسند کیا ہے"۔

یزید کے متعلق خیالات

صاحب سر الشہادتین یزید کی طرف سے ولید کی طلب بیعت کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں: "انکار کیا حسینؑ علیہ السلام نے اس کی بیعت سے اس واسطے کہ

تھا یزید مرد فاسق شرابی، ظالم۔ اور کوچ کیا امام حسینؑ نے مکہ کی طرف"۔

رائٹ آنریبل سید امیر علیؒ صاحب بالقابہ اپنی "تاریخ اسلام" میں فرماتے ہیں: "یزید ظالم اور دغاباز تھا۔ رحم و انصاف نے تو اس کو مس سے مس تک بھی نہ کیا تھا۔ اس کی دل لگی کے سامان اس کے مصاحبوں کی طرح کمینہ اور لغو ہوتے تھے۔ وہ علمائے دین کی توہین و ہتک اس طرح کرتا کہ جہاں جاتا ایک سجائے ہوئے شامی گدھے پر ایک بندر کو علما کے سے کپڑے پہنا کر ساتھ لیے پھرتا۔ سارا دربار مےخواری و عیش میں ڈوب گیا اور دار الخلافہ کے گلی کوچوں میں قدرتاً اس کی تقلید ہونے لگی۔ حضرت علیؑ کے دوسرے فرزند حضرت حسینؑ اپنے باپ کے اوصاف حمیدہ اور خصائل پسندیدہ سے مملو تھے۔

سیڈی لٹ حسینؑ کے متعلق

اور بقول سیڈی لٹ صاحب ان میں صرف ایک صفت کی کمی تھی کہ امیہ کی اولاد کی طرح سازش کے جال بچھانا نہیں جانتے تھے۔

ان کو خلافت کا حق رسولؐ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؑ دونوں کی طرف سے پہنچتا تھا۔ صلح کے شرائط میں جو معاویہ اور حضرت حسنؑ کے مابین ہوئی تھیں۔ حضرت حسینؑ کا حق خلافت بین طور پر محفوظ رکھا گیا تھا۔ حضرت حسینؑ نے دمشق کے ظالم کی خلافت کو کبھی تسلیم نہیں کیا تھا اس کی برائیوں سے وہ نفرت رکھتے تھے اور اس کی بدچلنی سے سخت بیزار تھے"۔

مسٹر گبن اپنی کتاب ڈیکلائین اینڈ فال آف رومن امپائر میں قریب قریب متذکرہ صدر آخری سطریں لکھتے ہیں۔

صاحب تاریخ الخلفاء کے موافق واقدی روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن حنظلہ فرزند غسیل الملائکہ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں نے یزید کی اس وقت تک مخالفت نہیں کی جب تک ہمیں یہ خوف نہ ہوا کہ ہم لوگوں پر آسمان سے پتھر برسیں گے۔ اس لیے کہ وہ سوتیلی ماؤں سے عقد کرتا تھا اور جے لڑکیوں اور بہنوں سے پرہیز نہ تھا۔ جو شراب پیتا تھا اور تارک الصلوٰۃ تھا"۔ صاحب صواعق نے بھی متذکرہ صدر روایت نقل کی ہے اور اس کے قبل یہ بھی لکھا ہے کہ: "ہرچند علماء در کفر و اسلام یزید اختلاف کردہ اند اما محققین امراو را بخدائے تعالیٰ مفوض نمودہ اند ولیکن در فسق و شر و ظلم و تکبر سخنی نیست"۔

ماںؑ کی قبر سے رخصت ہوتے ہیںؑ

بہرحال صاحب روضۃ الشہدا کے موافق: حسینؑ۔ "بزیارت برادر خود امام حسنؑ رفت بمقبرہ بقیع و برادر را وداع کرد و بسر تربت مادر بزرگوار خود آمد و گفت السلام علیک یا اماہ حسینؑ بوداع تو آمدہ است و این آخرین زیارت است ـــ امام حسینؑ این جا زمانے بگریست و وداع فرمود"۔

حضرتؑ خدیجہ کبریٰ کی قبر پر مناجاتؑ

صاحب ناسخ التواریخ کے نزدیک حضرت نے قبر حضرت خدیجہ پر نماز پڑھ کر یہ مناجات کی۔ (مؤلف کا نوٹ مدد نہیں دیتا کہ یہ مناجات ہجرت مدینہ کے وقت تھی یا اس کے پہلے)

یا رب یا رب انت مولاہ	فارحم عبیدا الیک ملجاہ
یا ذا المعالی الیک معتمدی	طوبیٰ لمن کنت انت مولاہ
طوبیٰ لمن کان خائفا ارقا	یشکو الی ذی الجلال بلواہ
و ما بہ علۃ و لا سقم	اکثر من حبہ لمولاہ

اذا اشتکی بثہ و غصتہ اجابہ اللہ ثم لباہ
اذا ابتلا بالظلام مبتلا اکرمہ اللہ ثم ادناہ

اے پروردگار اے پروردگار تو اس کا مولا ہے۔ رحم کر اس بندے پر جس کی پناہ تیری طرف ہے۔ اے صاحب عظمت (خداوند) تجھی پر میرا اعتماد ہے۔ خوشا حال اس کا جس کا تو مولا ہو۔ خوشا حال اس کا جو خدا کے خوف سے شب بیدار رہے۔ اور صاحب جلال خداوند ہی کو اپنی بلا کی شکایت کرے۔ اسے کوئی دکھ اور بیماری نہیں ہے۔ اسے تو اپنے مولا سے سب سے زیادہ محبت ہے۔ جب وہ اپنے غم و غصہ کی شکایت کرتا ہے تو اللہ اس کو قبول فرماتا اور لبیک کہتا ہے۔ جب وہ رات کی تاریکی میں تضرع و زاری کرے تو اللہ اس کو عزت اور اپنے قرب میں جگہ دیتا ہے۔

۴ر شعبان ۶۰ھ

تعجب خیز اتفاق یہ تھا کہ اپنی پیدائش کی تاریخ اور مہینہ میں جب کہ غالباً چوتھی تاریخ کے چاند کی روشنی کے آثار کچھ کچھ افق غربی پر باقی تھے کہ مدینہ کی شاہراہ سے بقول تاریخ خمیس اہل بیت یا غیر اہل بیت کے "ستر سوار" مکہ کی طرف چلے جا رہے تھے اور حسینؑ کی زبان مبارک پر جاری تھا کہ: فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (۲۸ : ۲۱) (پس نکلے شہر سے خائف دشمنوں کی آمد سے اس وقت کہا پروردگار مجھے قوم ظالمین سے نجات دے) اس وقت بقول صاحب روضۃ الشہدا: "بعضی از موالیان و ہوا داران گفتند یا ابن رسول اللہ از سر تربت جد خود کجا میروی ـــ جواب داد کہ من بہ اختیار نمیروم"۔ بقول صاحب ناسخ التواریخ روانگی کے وقت یہ اشعار حضرت کے ورد زبان تھے: ـــ

اذ المرء لا یحمی بنیہ و عرسہ و عترتہ کان اللئیم المسببا
و من دون ما یبغی یزید بنا غدا نخوض بحار الموت شرقاً و غرباً
و نضرب ضرباً کالحریق مقدماً اذا ما راہ ضیغم فر ھاربا

راستہ کے متعلق مسلمؑ کی صلاح اور حسینؑ کا تصفیہ

بقول اعثم کوفی: "آپ کے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل نے کہا اگر ہم شارع عام سے علیحدہ ہو کر غیر معین راستہ سے عبداللہ بن زبیر کی طرح چلیں تو بہتر ہے کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ ولید کچھ آدمیوں کو ہمارے پیچھے ضرور بھیج دے۔ ہم شارع عام پر ہوں گے تو بآسانی انھیں مل جائیں گے۔ اور مشکل واقع ہوگی۔ امام حسینؑ نے فرمایا شارع عام اور سیدھے راستہ پر ہی چلنا اچھا ہے۔ ہم اسی راستہ سے چلیں گے اور مکہ کے مکانات پر نظر جا پڑیں گے"۔

عبداللہ بن مطیع کی صلاح

اس کے بعد حضرت بقول اعثم کوفی چند فرسخ آگے تشریف لے گئے تھے کہ عبداللہ بن مطیع عدوی حاضر ہوا۔ اور کہا: میری جان آپ پر فدا ہو اے فرزند رسول خدا! کہاں کا ارادہ ہے۔ اور کس غرض سے؟ آپ نے فرمایا: فی الحال تو مکہ جانے کا قصد ہے اور وہاں پہنچنے کے بعد اپنے معاملات پر غور کر کے جیسا کچھ مناسب معلوم ہوگا اس کے مطابق عمل در آمد کروں گا۔ عبداللہ نے کہا: سلامتی اور بہبودی خدا کرے آپ کے ارادہ اور تجویز کے شامل حال رہے۔ اگر حکم ہو تو جو کچھ میرے دل میں ہے وہ بھی عرض کر دوں۔ امام حسینؑ نے کہا: ہاں کیا کہنا چاہتا ہے، بیان کر۔ عبداللہ نے کہا: مکہ میں پہنچ کر آپ اسی جگہ قیام رکھنا اور اہل کوفہ پر زنہار بھروسہ نہ کرنا۔ آج آپ سردار اور عرب کے سربرآوردہ شخص ہیں خدا کے گھر میں قیام رکھیں۔

کوفیوں کا کچھ اعتبار نہیں اور نہ ان کے کسی قول و قرار کا بھروسہ۔ اگر خدا نخواستہ آپ کو کوئی حادثہ پیش آنے کا تو تمام اہل بیت ہلاک ہو جائیں گے۔ حضرت اسے دعائے خیر دے کر آگے روانہ ہو گئے۔

ابن خلدون متذکرہ صدر باتوں کے علاوہ اس قدر اور لکھتا ہے کہ: "جن کو آپ کی ہوا خواہی منظور ہوگی وہ یہیں رہیں گے جب تک حجاز کے لوگ آپ سے استدعا نہ کریں اس وقت تک بیت اللہ کو نہ چھوڑیے گا"۔ کامل ابن اثیر ان کا نام عبداللہ بن مطیع کہتا ہے اور اس سے یہ مخصوص بات کہلواتا ہے کہ: "ہر طرف سے لوگ بلائیں گے مگر حرم کو پکڑے رہیے گا۔ آپ سید عرب ہیں۔ اگر آپ ہلاک ہوں گے تو ہم ابد آپ کے غلام ہو جائیں گے"۔ اس کے بعد لوگ آتے اور ملتے جاتے تھے۔

صاحب روضۃ الشہدا کہتا ہے: من (ابن مطیع) میدانم کہ ایشان (کوفی) ترا خواہند خواند مگر بزودی ترا تنہا خواہند گزاشت از طریقہ وفا دور اند۔ عہد نگاہ نخواہند داشت"۔ یعنی: "میں جانتا ہوں وہ کوئی آپ کو بلائیں گے مگر جلد چھوڑ جائیں گے وفا کی راہ سے دور ہیں، عہد کی پاسداری نہ کریں گے"۔

مکہ کی پہاڑیاں

اب بقول اعثم کوفی: "جب مکہ کے قریب پہنچے اور وہاں کے پہاڑ نظر آنے لگے تو یہ آیت پڑھی: وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (۲۸ : ۲۲) (جب (حضرت موسیٰؑ) شہر مدین کی طرف متوجہ ہوئے تو کہا: امیدوار ہوں کہ پروردگار میری ہدایت کرے اور منزل مقصود تک پہنچائے)

مکہ کا استقبال

امام حسینؑ علیہ السلام کے مکہ میں داخل ہونے کے وقت لوگوں نے استقبال کیا۔ جن میں عبد اللہ بن زبیر بھی تھے۔

عامل مکہ یزید کو حسینؑ کی آمد کی اطلاع دیتا ہے

آخر ماہ شعبان ۶۰ھ

بقول روضۃ الشہدا: "مؤذن امام حسینؑ پنج وقت نماز در غایت بلندی (اذان) می گفت و قوم عظیم بردے نماز می گزاردند۔ سعید (ابن العاص حاکم مکہ) بترسید در موسم حج بر مردم (کہ) از اطراف و جوانب جمع شدند (و) ہوا داری شاہزادہ اور ہلاک کنند بگریخت و بمدینہ رفت و بہ یزید مکتوبے نوشت از آمدن حسینؑ بمکہ و میل مردم بوے در آنجا یاد کرد"۔ یعنی: "مؤذن امام حسینؑ بہت اونچی اذان دیتا اس پر عظیم جماعت نماز پڑھتی۔ سعید موسم حج میں اطراف و جوانب کے لوگوں کے اجتماع اور شاہزادہ کی طرف ان کے میلان سے ڈر کر مدینہ بھاگ گیا اور یزید کو حسینؑ کی آمد مکہ اور لوگوں کا ان کی طرف جھکاؤ ذکر کیا"۔

بقول اعثم کوفی: شعبان کے مہینہ کے چند روز باقی تھے کہ امام حسینؑ مکہ میں تشریف لا کر مقیم ہوئے۔ اور رمضان و شوال و ذیقعدہ کا مہینہ آپؑ نے مکہ میں گزارا۔

ابن زبیر کا موقع بمقابلہ حسینؑ

بقول کامل: "بہ نسبت اور مخلوقات خدا کے حسینؑ کا مکہ میں رہنا ابن زبیر کو گراں گزرتا تھا کیونکہ جب تک حسینؑ تھے اہل حجاز (ابن زبیر کی) بیعت نہیں کرتے تھے"۔ لیکن بقول اعثم کوفی وغیرہ: "لیکن اس مطلب کو ظاہر نہ ہونے دیتا تھا۔ خود بھی ہر روز آپ کی

خدمت میں آنے جانے لگا اور آپ کے پیچھے نماز پڑھتا تھا اور ہمراہ رہ کر حالات سنا کرتا"۔ بقول ابن خلدون "اور ابن الزبیر خانہ کعبہ کے ایک گوشہ میں شب و روز نماز پڑھتے تھے۔ طواف کرتے تھے۔ حسینؑ بن علیؑ اکثر لوگوں کے حالات ظاہر کرکے ان سے مشورہ لیا کرتے تھے اور ان کو یہ معلوم تھا کہ اہل حجاز حسینؑ بن علیؑ کے ہوتے میرے ہاتھ پر بیعت نہ کریں گے"۔

ابنِ زبیر کے خلاف فوجی روانگی اور انؑ کے ہواخواہوںؑ کے ساتھ برتاؤ

بقول ابن خلدون: ان واقعات کی اطلاع یزید کو ہوئی تو اس نے ولید بن عتبہ کو مدینہ کی والی گری سے معزول کرکے عمر بن سعید الاشدق کو مامور کیا۔ چنانچہ عمر بن سعید ماہ رمضان المبارک ۶۰ھ میں داخل مدینہ منورہ ہوا۔ اور اس کے پولیس کی افسری عمر بن زبیر کو دی گئی کیوں کہ ان میں اور ان کے بھائی عبداللہ بن زبیر میں کسی وقت سے ناچاقی وکشیدگی تھی۔ اس بنا پر اس نے مدینہ کے چند لوگوں کو جو ہواخواہ عبداللہ بن زبیر تھے گرفتار کرا کے چالیس پچاس ساٹھ دُرّے تک پٹوائے۔ بعد اس کے عمر بن سعید نے سات سَو آدمیوں یا اس سے کسی قدر زیادہ کو مکہ کی طرف روانہ کرنے کو مسلح و مرتب کرکے عمر بن زبیر سے ان کی افسری کے بابت دریافت کیا۔ عمر بن زبیر نے جواب دیا مجھ سے زیادہ کوئی شخص موزوں اس کام کے لیے نہ ہوگا۔ پس عمر بن سعید نے عمر بن زبیر کو بسر افسری سات سو جنگ آوروں کے جن میں انیس بن عمر الاسلمی بھی تھا مکہ معظمہ کی طرف روانہ کیا۔ اتنے میں مروان بن الحکم آ گیا مکہ معظمہ پر فوج کشی کرنے پر ملامت کرکے کہنے لگا۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ بیت اللہ کی حرمت کو حلال نہ کرو۔ عبداللہ بن زبیر سے درگزر کرو۔ ساٹھ برس کی اس کی عمر ہو گئی وہ کیا مخالفت کرے گا۔ عمر بن الزبیر بولا واللہ میں اس سے عین خانہ کعبہ میں لڑوں گا۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ابوشریح خزاعی آ گئے اور عمر بن سعید کو مخاطب کرکے کہا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے مجھے ایک ساعت کے لیے مکہ معظمہ میں جنگ کرنے کی اجازت ہوئی تھی بعد ازاں اس کی حرمت ویسا ہی ہو گئی جیسا کہ کل تھی۔ عمر بن زبیر نے ترش رو ہو کر کہا: "اے بڈھے ہم تجھ سے زیادہ مکہ کی حرمت کو جانتے ہیں"۔ اور بعضوں کا یہ بیان ہے کہ یزید نے عمر بن سعید کو لکھا تھا کہ عمر بن زبیر کو ایک لشکر جرار کے ساتھ اس کے بھائی کی طرف روانہ کرو۔

یزید کی قسم

پس اس نے بسرداری دو ہزار جنگ آوروں کے روانہ کیا۔ مقدمۃ الجیش پر انیس بن عمرو الاسلمی تھا۔ مکہ معظمہ کے قریب پہنچ کر انیس نے ذی طویٰ میں عمر بن زبیر نے ابطح میں ڈیرے ڈال دیئے۔ اور اپنے بھائی سے کہلا بھیجا کہ: "یزید نے قسم کھائی ہے کہ تمہاری بیعت نہ قبول کی جائے گی جب تک تم حاضر نہ آؤ گے"۔ کامل کا بھی یہی مضمون ہے۔ لیکن دونوں مؤرخین نے اس جنگ آزمائی کی تاریخ اور مہینہ نہیں لکھا ہے۔ جن میں ابن زبیر نے گرفتار کرنے والوں کو بھگا دیا۔

ابن زبیر کو حسینؑ کی صلاح

صاحب روضۃ الصفا لکھتا ہے: تا امیر المومنین حسینؑ در مکہ بود ابن زبیر ملازمت آنجناب می نمود و از خلافت و ریاست دم نمیزد۔ و برخے گفتہ اند دراں آوان کہ ہر دو در مکہ بودند ابن زبیر را داعیہ آن شد کہ خروج کند و مکہ را در حیطہ ضبط و تصرف خویش آرد۔ دریں باب با امام حسینؑ مشورت نمودہ۔ گفت کہ وقت این کار نیست چہ در مکہ مردے کہ متابعت تو نمایند و شائستہ حرب

باشد نیست۔ عبداللہ را این سخن موافق نیفتادہ خروج کرد وعامل یزید از شہر بیرون رفت وبادر گوشہ مختفی گشت۔ علی اختلاف الروایتین وبہ این قول کہ عبداللہ مخالفت یزید کردہ مکہ را تصرف نمود امیرالمومنین حسینؑ در خانہ خویش نشستہ بیرون نمی آمد وگماشتہ یزید از کماہی حالات مکہ یزید را اعلام داد ویزید نامہ بعمرو بن سعید نوشتہ کہ لشکرے بمکہ فرستد ــــ"۔

یعنی: جب تک امیرالمومنین حسینؑ مکہ میں تھے ابن زبیر آپؑ کے ساتھ لگا رہتا تھا اور خلافت و ریاست کا دعویٰ نہیں کرتا تھا۔ اور کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ ان دنوں جب دونوں مکہ میں تھے ابن زبیر کو یہ سوجھی کہ خروج کرے اور مکہ پر قبضہ کر کے اپنے تصرف میں لائے۔ اس بارے امام حسینؑ سے مشورہ کیا۔ آپؑ نے فرمایا کہ اس کام کا وقت نہیں ہے۔ کیونکہ مکہ میں تیری متابعت کرنے والے اتنے لوگ نہیں ہیں جو لڑائی کے قابل ہوں۔ عبداللہ کو یہ بات پسند نہ آئی اور خروج کر دیا۔ یزید کا گورنر شہر سے باہر چلا گیا اور کسی گوشہ میں پوشیدہ ہو رہا۔ دونوں روایتوں میں اختلاف کی بنا پر اس قول کے مطابق کہ عبداللہ نے یزید کی مخالفت کی اور مکہ پر متصرف ہو گیا۔ امیرالمومنین حسینؑ گھر میں بیٹھے رہے اور باہر نہیں آتے تھے۔ اور یزید کے کارندے نے مکہ کے حالات جیسے تھے یزید کو اطلاع دی اور یزید نے عمرو بن سعید کو خط لکھا کہ ایک لشکر مکہ بھیجے۔

طبری کے موافق بھی یہی حالت تھی۔ یہ کہتا ہے کہ مکہ کا عامل حارث بن طرقا تھا۔ اور ابن زبیر نے ذی الحجہ ۶۰ھ میں قبضہ کیا۔ اس کے بعد عبداللہ بن زبیر کے سلسلہ حالات میں لکھتا ہے: "یزید عمر بن سعید العاص را بمکہ امیری دادہ بود و ولید بن عتبہ بن ابی سفیان را بمدینہ۔ چوں عبداللہ بن زبیر از مدینہ بمکہ آمد عرب (؟) باو حرب کرد یزید او را تہمت کرد و از حکومتش باز کرد و مکہ و مدینہ ہر دو بہ ولید (؟) داد و ولید بمدینہ نشست و بمکہ خلیفہ فرستاد و عبداللہ بن زبیر خلیفہ او را از مکہ بیرون کرد او ہمانجا ہی بود۔ مردمان مکہ گروہے با عبداللہ بن زبیر بیعت کردہ بودند و ہوا خواہ یزید بودند و نزد عبداللہ بن زبیر نیامدندے و عبداللہ بمسجد نماز جدا کردے و محبان یزید جدا۔ چوں وقت حج بودے یزید ولید را فرمودے تا بمکہ شدے و با مردمان حج کردے و بمدینہ باز شدے و عبداللہ بن زبیر بمکہ ہمی بودے تا حسین رضی اللہ عنہ بمکہ ہمی بودے او را حرمت ہمی داشت بظاہر و کس را بہ بیعت نخواندے از بہر خویش و چوں حسین رضی اللہ عنہ از مکہ بیرون رفت عبداللہ ہمی کرد تا بہ بیند کہ کار او بکجا میرسد چوں خبر کشتن حسین رضی اللہ عنہ بشنید دانست کہ کسے نماند کہ با او منازعت کند آنگاہ مردمان مکہ را بظاہر بہ بیعت خواند"۔ یعنی: "یزید نے عمرو بن سعید العاص کو مکہ کی گورنری دی ہوئی تھی اور ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کو مدینہ میں۔ جب عبداللہ بن زبیر مدینہ سے مکہ آیا عرب اس کے ساتھ ہو کر لڑے۔ یزید نے عمرو کو متہم جانا اور اس کو حکومت سے ہٹا دیا اور مکہ و مدینہ دونوں ولید کو دے دیے۔ ولید خود مدینہ میں بیٹھا اور مکہ میں اپنا نائب بھیج دیا۔ عبداللہ بن زبیر نے اس کے نائب کو مکہ سے نکال دیا۔ وہ وہیں کہیں رہ گیا۔ مکہ کے لوگوں میں ایک گروہ نے عبداللہ بن زبیر کی بیعت کر لی تھی۔ اور دوسرے یزید کے خیر خواہ تھے اور عبداللہ بن زبیر کے پاس آتے نہیں تھے۔ عبداللہ مسجد میں الگ نماز پڑھتا تھا اور یزید پسند الگ۔ چونکہ حج کا وقت تھا۔ یزید نے ولید کو حکم دیا کہ مکہ جائے اور لوگوں کو حج کروائے اور مدینہ واپس آجائے۔ عبداللہ بن زبیر مکہ میں ہی تھے اور جب تک حسینؑ مکہ میں رہے اس نے مکہ کی حرمت بظاہر برقرار رکھی اور کسی کو بھی اپنی بیعت کی دعوت نہیں دی اور جب حسینؑ مکہ سے باہر چلے گئے تو عبداللہ یہ دیکھ رہا تھا کہ ان کا انجام کار کیا ہوتا ہے جب حسینؑ کے قتل ہونے کی خبر سنی تو جان لیا کہ اب اس کے ساتھ منازعت کرنے والا کوئی

نہیں رہا تو اس وقت مکہ کے لوگوں کو علی الظاہر اپنی بیعت کی دعوت دی۔

ابن خلدون کے موافق: "مکہ سے حسینؑ کی روانگی کے وقت عمر بن سعید العاص حاکم تھا"۔

اہل کوفہ کی استدعا کی ابتدا

ابن خلدون کے موافق: "جب کوفیوں کو بیعت خلافت یزید اور حسینؑ بن علیؑ کے مکہ چلے جانے کا حال معلوم ہوا تو شیعیان امیرالمومنین علیؑ سلیمان بن صرد کے مکان پر مجتمع ہوئے اور چند لوگوں کی طرف سے جن میں سلیمان و شیب بن محمد و رفاعہ بن شداد و حبیب بن مظاہر وغیرہم تھے۔ حسینؑ بن علیؑ کو خط لکھا اس مضمون کا کہ آپ یہاں تشریف لائیے ہم لوگوں نے نعمان کے ہاتھ پر یزید کی بیعت نہیں کی۔ نہ تو جمعہ میں اس کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور نہ عید میں۔ اگر آپ آجائیں گے تو ہم اس کو نکال دیں گے"۔

خط کی عبارت یہ تھی:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ خدا کی رحمت تم پر ہو۔ ہم اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہیں جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ بعدہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے تمہارے دشمن جبار و سرکش کو خواب مرگ میں سلادیا۔ جس نے اس امت پر جبراً حکومت جتلائی تھی اور اس پر بلا استحقاق حاکم بن گیا تھا اس کے مال کو غصب کرلیا تھا اور بغیر رضامندی امت اس پر امارت کرتا تھا۔ بایں ہمہ اس میں جو اچھے تھے، ان کو اس نے مار ڈالا اور اشرار کو باقی رکھا۔ اب ہم پر کوئی امام نہیں ہے۔ آپ آئیے شاید آپ کے ذریعہ سے ہم کو اللہ تعالیٰ حق پر مجتمع کردے۔ اگرچہ نعمان بن بشیر قصر امارت میں ہے۔ لیکن ہم اس کے ساتھ نہ تو شریک جمعہ ہوتے ہیں اور نہ عیدین۔ اگر ہم کو یہ معلوم ہوجائے کہ آپ تشریف لائیں گے تو ہم اس کو ایسا نکال دیں کہ شام ہی میں جاکر دم لے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ والسلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"۔

ماریہ بنت سعد کا مکانؑ

ابن خلدون یا غالباً اس کا مترجم یہ روایت بھی کامل ابن اثیر سے نوٹ کرتا ہے کہ: "اسی زمانہ میں شیعیان بصرہ بھی ایک عورت ماریہ بنت سعد (قبیلہ عبدالقیس) (اسی کتاب کا میرا نوٹ ہے کہ یہ امراء القیس کی بی بی تھی) کے مکان پر مجتمع ہوتے تھے لیکن خط لکھنے کی نوبت نہ آئی البتہ ان میں یزید بن ثبیط نے حسینؑ بن علیؑ کی خدمت میں حاضر ہونے کی غرض سے اٹھ کر کہا تم میں سے کون شخص میرے ساتھ چلے گا؟ اس کے دس لڑکے تھے۔ منجملہ ان کے دو عبداللہ و عبیداللہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ پس یہ تینوں شخص مکہ پہنچے پھر وہاں سے امام حسینؑ کے ساتھ کربلا گئے اور انھیں کے ساتھ شہید ہوئے"۔

کوفہ کا دوسرا وفد دو راتوںؑ کے بعد

ابن خلدون لکھتا ہے: پھر دو راتوں کے بعد دوبارا خط تقریباً ڈیڑھ سو آدمیوں کی جانب سے بمضمون بالا لکھا گیا۔ پھر سہ بارا اس مضمون کا روانہ کیا سب کو شبث بن ربعی، حجار بن ابجر، یزید بن الحرث، یزید بن رویم، عروہ بن قیس، عمر بن حجاج الزبیدی، محمد بن عمیر التمیمی وغیرہم نے بڑے شد و مد سے لکھا تھا"۔

دوسرے وفد کو بھی جوابؑ نہ دیا

روضۃ الشہدا کے موافق: نہ حسینؑ نے ہاں نہ نہیں فرمایا نہ جواب لکھا۔ دوسرے وفد کا بھی جواب نہ دیا۔ اعثم کوفی کے موافق: امام حسینؑ انھیں پڑھ کر اور حال دریافت کرکے خاموش ہو رہے نہ قاصدوں سے کچھ فرمایا نہ خطوں کا جواب لکھا۔

وفود نے کوفہ جا کر حال بیان کیا

صرف ان کو خوش کر کے واپس کر دیا۔ انھوں نے کوفہ میں پہنچ کر تمام حال عرض کیا۔

تیسرے وفد کو بھی جواب نہ دیا

اب کوفہ کے بڑے بڑے سردار بجانب مکہ روانہ ہوئے۔ امام حسینؑ نے کوفہ جانے میں تامل کیا، اور انھیں بھی کچھ جواب نہ دیا۔

چوتھا وفد

اب دو قاصد اور آئے اور کوفیوں کے خط لائے۔ یہ آخری خط تھے جن میں امام کو بلایا تھا اور ہانی بن ہانی سبعی، سعد بن عبداللہ حنفی نے اس مضمون کے خط لکھے کہ امیر المومنین علیؑ کے دوستوں کی طرف سے امیر المومنین حسینؑ کو معلوم ہو کہ تمام کوفہ والے آپ کی تشریف آوری کے منتظر ہیں۔ سب کے سب آپ کی خلافت اور امامت پر متفق ہیں۔ اب ذرا تامل نہ کرنا چاہیے۔ بہت جلد تشریف لائیے۔ یہاں پہنچنے اور فوج کشی کرنے کا یہی وقت ہے۔ صحرا سرسبز ہیں۔ میوے پک رہے ہیں۔ دیہات میں چارہ بکثرت ہے۔ فی الفور آنا چاہیے۔ کسی قسم کا پس و پیش نہ فرمائیں۔ جس وقت آپ کوفہ میں داخل ہو جائیں گے تو وہ تمام فوجیں جو آپ کے لیے فراہم کی گئی ہیں آپ کے پاس حاضر ہو جائیں گی۔ اور خدمت گزاری اور جاں نثاری کے لیے کمربستہ ہوں گی۔ والسلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

صاحب لہوف کے موافق: اہلِ کوفہ کو جب حسینؑ کا بیعتِ یزید سے انکار اور مکہ کی تشریف آوری معلوم ہوئی تو وہ لوگ سلیمان بن صرد کے مکان پر جمع ہوئے، اور سلیمان نے مخصوص باتیں یہ کہیں: "اس وقت وہ (حسینؑ) تمھاری مدد کے محتاج ہیں۔ اگر تم جانو کہ تم ان کی مدد کر سکو گے، اور ان کے دشمنوں سے جہاد کر سکو گے، تو ان کو خط لکھو، اور اگر تم کو کاہلی وسستی و نامردی کا خوف ہو تو ان کو فریب نہ دو"۔ اس کتاب کے موافق حضرت کے پاس بارہ ہزار خط جمع ہو گئے۔ اس کے بعد آخری خط آیا"۔

اہلِ کوفہ کے نزدیک حسینؑ کے انتخاب کی وجہ

ابو اسحاق اسفرائنی کے موافق اہلِ کوفہ کی مشاورت میں یزید کی بے اعتدالی اور مظالم کا ذکر ہوا۔ کہا گیا کہ حسینؑ کو خلافت کے لیے لکھا جائے۔ "کیونکہ یہ انھیں کا حق ہے"۔ وہ اللہ کے پہچاننے والے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسل سے ہیں اور عدل و ایمان والے ہیں۔ ظلم و جور اور بہتان کو پسند کرنے والے نہیں۔ یزید اور کسی دوسرے کی نسبت وہ ہم پر زیادہ مہربان ہیں"۔ اس پر اتفاق کے بعد خط لکھا گیا۔

حسینؑ کا زبانی جواب

حسینؑ نے قدرے تامل کے بعد خط پھینک دیا۔ قاصد کو فرمایا چلے جاؤ۔ اور کوئی جواب نہ دیا۔ نہ کسی قسم کی اور کوئی بات کی۔ قاصد ناکام واپس گیا، اور اہلِ کوفہ کے پاس آ کر تمام واقعہ بیان کیا۔ خطوط کے اصرار پر ہر مرتبہ یہی کہا کہ: "میں مکہ سے باہر نہ نکلوں گا یہاں تک کہ میری زندگی ختم ہو جائے، اور میں اسی جگہ مروں۔ مجھے خلافت کی اور لوگوں پر جبر و تعدی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں"۔

ایک خط اور اس کا مضمون

اسی مورخ کے موافق: ایک دن امام حسینؑ رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں تشریف فرما تھے۔ ایک سوار آیا اور آپ کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ آپ نے پوچھا کون ہے۔ عرض کی یا ابا عبداللہ میں ایک قاصد ہوں۔ آپ نے اندر آنے کی اجازت بخشی۔ وہ اندر آیا۔ سلام کیا، اور ہاتھوں کو

بوسہ دیا۔ پھر ایک خط نکال کر آپ کو دیا۔ جو اہل کوفہ نے بھیجا تھا۔ آپ نے کھول کر پڑھا تو اس میں یہ عبارت درج تھی:

یا حسینؑ یا ابن بنت رسولؐ اللہ!

"یزید بن معاویہ سخت ظلم و ستم کر رہا ہے۔ لوگوں کو قتل کر ڈالتا ہے۔ ان کے مال لوٹ لیتا ہے۔ عبیداللہ بن زیاد بن مرجانہ نامی ایک شخص کو اس نے ہم پر حاکم مقرر کیا ہے جو ایک جبار و ستم گار اور غدار شخص ہے۔ اس کا ظلم تمام ملک میں پھیل گیا ہے۔ وہ نیک باتوں سے منع کرتا ہے اور بری باتوں کا حکم دیتا ہے۔ شراب پیتا ہے۔ خدا سے نہیں ڈرتا۔ سرعام فسق و فجور کرتا ہے۔ رعایا کو تیر بلا کا ہدف مصائب بنا رہا ہے۔ لوگوں کو ناحق قتل کرتا ہے اور بلاوجہ ان کے مال ضبط کر لیتا ہے۔ کسی امر میں خدا کا لحاظ نہیں کرتا۔ رعایا سے عدل و انصاف اس نے روپوش کر رکھا ہے اور ظلم و طغیان عام کر دیا ہے۔

اے ابو عبداللہ! ہم قبل ازیں ایک ہزار کے قریب عرضیاں آپ کی خدمت میں بھیج چکے ہیں۔ جن میں ہم نے التجا کی ہے کہ آپ تشریف لائیں۔ ہم آپ کی امداد و اعانت کو آمادہ ہیں۔ یزید کو قتل کر کے آپ کے باپ اور نانا کی خلافت آپ کو دلا دیں گے۔ پھر خواہ آپ خود خلیفہ بنیں یا اپنے اہل بیت میں سے کسی اور کو بنائیں۔ ہم آپ کے نانا مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ دے کر آپ سے ملتجی ہیں کہ آپ ضرور تشریف لائیں اور خلافت پر قبضہ فرمائیں۔ اگر آپ نہ آئے تو کل بروز قیامت اللہ تعالیٰ کے حضور میں ہم آپ پر دعویٰ کریں گے اور کہیں گے: الٰہی حسینؑ نے ہم پر ظلم کیا تھا۔ کیونکہ ہم پر ظلم ہوتا دیکھ کر یہ خاموش بیٹھے رہے۔ اور تمام لوگ فریاد کریں گے کہ ہمارے پروردگار حسینؑ سے ہمارا بدلہ دلا۔ تو اس وقت آپ کیا جواب دیں گے؟ اور خلق اللہ کے حقوق سے کس طرح سرخروئی حاصل کریں گے"۔

جب امام حسینؑ رضی اللہ عنہ نے یہ خط پڑھا تو خدا کے خوف سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور خلق اللہ کی مظلومی پر اور ان کے نانا کا واسطہ ڈالنے سے ان کا دل پانی پانی ہو گیا۔ فوراً اٹھے۔ بحالیکہ ان کے آنسو رخساروں پر بہ رہے تھے اور دوات و قلم و کاغذ لے کر اہل کوفہ و عراق کی طرف یہ جواب لکھا:

حسینؑ جوابؑ تحریر فرماتے ہیں

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ حسینؑ بن علیؑ بن ابی طالبؑ کی طرف سے اہلِ کوفہ و عراق کی طرف۔ آپ لوگوں کو معلوم ہو کہ آپ کے بھیجے ہوئے ایک ہزار خطوط ہمارے پاس پہنچے۔ مگر ہم نے ان پر توجہ نہیں کی۔ میری مراد یہی تھی کہ ہمیشہ بیت اللہ کے پاس رہوں اور مرتے دم تک وہاں بسر کروں۔ اب یزید وغیرہ کے ظلم کی آپ لوگوں نے شکایت کی ہے۔ میں ان شاء اللہ عنقریب تمھاری طرف آنے والا ہوں۔ مسلمؑ بن عقیلؑ میرا یہ خط لے کر تمھارے پاس آتا ہے۔ وہ کوفہ کی مسجد میں تمھاری امامت کرائے گا اور شرعی فیصلہ کیا کرے گا۔ نعمان میرے آنے تک تم میں احکام جاری کرے گا"۔

ابن خلدون کے موافق: متواتر خطوط آنے سے حسینؑ بن علیؑ کے خیالات کچھ کے کچھ ہو گئے۔ جواب میں لکھا: جو تم لوگوں نے لکھا ہے میں اسے سمجھ گیا۔ بالفعل میں اپنے بھائی چچازاد اور اپنے معتمد ترین اہل بیت مسلمؑ بن عقیلؑ کو بھیجتا ہوں۔ یہ تمھارے رنگ ڈھنگ دیکھ کر مجھے اطلاع دیں گے۔ پس اگر تمھارے رؤسائے ملت نے جیسا کہ اس کے پیشتر تم نے لکھا ہے اس پر اتفاق کیا۔ اور اس پر مجتمع ہو گئے تو میں عنقریب آجاؤں گا۔ اپنی قسم امام وہی ہے جو کتاب اللہ پر عمل کرتا ہے اور عدل پر قائم ہے اور حق پر چلتا ہے۔ والسلام۔

دسویں رمضان سنہ ۶۰ھ کو کوفیوں کا پہلا خط آیا تھا

علامہ مجلسی کے موافق اہلِ کوفہ کا پہلا قاصد دسویں رمضان کو حسینؑ کے پاس آیا۔

مسلمؑ ابن عقیلؑ کی روانگی اور وصیت

اب بقول اعثم کوفی مسلمؑ بن عقیلؑ سے فرمایا: میں تجھے کوفہ بھیجتا ہوں۔ وہاں جاکر دریافت کرنا کہ ان لوگوں کی زبانیں اپنی ان تحریروں کے مطابق ہیں یا نہیں۔ وہاں پہنچنے کے بعد ایسے شخص کے گھر پر اترنا جو سب سے زیادہ اعتماد کے لائق اور ہماری دوستی میں پورا ثابت قدم معلوم ہو۔ وہاں کے باشندوں کو میری بیعت اور فرمانبرداری کی ہدایت کرنا۔ ان کے دلوں کو آل ابوسفیان کی طرف سے پھیر دینا۔ اگر یہ بات معلوم ہو کہ ان کے اقرار سچے ہیں اور جو کچھ کہتے اور لکھتے ہیں اس کو پورا کریں گے تو بہت جلدی مجھے لکھ بھیجنا اور جو امور مشاہدہ سے گزریں انھیں مفصل درج کر دینا۔ میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور تجھے شہادت کا درجہ عطا فرمائے گا۔ اس کے بعد آپس میں بغل گیر ہو کر ملے اور روتے ہوئے ایک دوسرے کو رخصت کیا۔

۱۲؍ ذیقعدہ سنہ ۶۰ھ کو مسلمؑ روانہ ہوئے تھے

ابو اسحٰق اسفرائینی فرماتے ہیں: ادھر امام حسینؑ رضی اللہ عنہ مسلمؑ اور قاصد کے روانہ ہونے کے بعد فوراً اپنی بہن سکینہ کے پاس گئے اور ان کو اہلِ کوفہ و عراق کی مظلومی، یزید اور عبید اللہ بن زیاد کے ظلم اور اہلِ کوفہ و عراق کے خط و کتابت وغیرہ تمام حالات سنائے اور ان کی آخری چٹھی اور اپنے جواب کا بھی ذکر کیا۔ اور مسلمؑ کو ان کا امام و قاضی مقرر کرنے اور اپنے تشریف لے جانے تک کو ان کا حاکم بنانے کا حال بھی بتایا۔ پھر فرمایا: اے بہن اٹھ کھڑی ہو اور سفر کا سامان کر۔ جب بہن نے یہ بات سنی تو اہلِ عراق و کوفہ کے حالات سن کر سخت متأثر ہوئیں اور آبدیدہ ہو کر کہا: بھائی! یہ سفر کا وقت نہیں ہے۔ یوں تو ہم تیار ہیں مگر ادھر محرم الحرام کا مہینہ آ رہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں عاشورا کے روز بیت الحرام میں ہوں۔ اس روز بارہ ذیقعدہ کی تاریخ تھی۔

حضرت مسلمؑ سفر کی دشواری کی اطلاع دیتے ہیں

اس کے بعد بقول اعثم کوفی: مسلمؑ نے کوفہ کا راستہ لیا۔ پوشیدہ سفر کیا کہ بنی امیہ میں سے کسی کو اس حال کی خبر نہ ہو جائے۔ مبادا وہ یزید کو خط لکھ کر تمام حالات سے مطلع کر دے۔ جس وقت مسلمؑ مدینہ میں داخل ہوئے تو مسجدِ رسولؐ میں آ کر دو رکعت نماز پڑھی۔ آدھی رات کے وقت اپنے عزیزوں اور دوستوں سے رخصت ہو کر سفر کوفہ اختیار کیا اور قیس بن غیلان کے قبیلہ کے دو رہبر ساتھ لیے کہ غیر معروف راستہ سے کوفہ پہنچا دیں۔ کچھ دور چل کر دونوں راہبر راستہ بھول گئے اور غلطی سے ایسے میدان میں جا پہنچے جہاں پانی کا نام و نشان نہ تھا۔ انجام کار دونوں رہبر پیاس کی شدت سے مر گئے۔ اب مسلمؑ بہت ہراساں ہو کر ادھر ادھر پانی کی تلاش میں دوڑے مگر کسی جگہ پانی نہ پایا۔ آخر کار ایک گاؤں مضیق نام میں پہنچ کر پانی پیا۔ ساتھیوں اور مویشیوں اور گھوڑوں کو بھی پانی دیا۔ پھر کچھ دیر آرام لے کر امیر المومنین حسینؑ کے نام خط لکھا۔ تمام کیفیت درج کر کے یہ بھی تحریر کیا کہ یہ سفر مجھے مبارک نہیں ہوا۔ فال بد معلوم ہوتی ہے۔ آپ مجھے اس سفر سے معاف رکھیں۔ والسلام۔

حضرتؑ کا جواب

جس وقت مسلمؑ کا یہ خط امام حسینؑ کے پاس پہنچا، احوال مندرجہ سے واقف ہو کر یہ جواب تحریر فرمایا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ حسینؑ بن علیؑ امیرالمومنین کی طرف سے مسلمؑ بن عقیلؑ کو معلوم ہو کہ تمہارا خط آیا۔ مضمون معلوم ہوا۔ تمہارا یہ لکھنا کہ مجھے اس سفر سے معاف رکھو بڑے تعجب کی بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے سستی اور شکستہ دلی کی وجہ سے یہ خط لکھا گیا ہے۔ تم اپنے دل کو مضبوط رکھو۔ کسی امر کا خوف نہ کرو۔ اور جس کام کا حکم ہے اسے انجام دو۔ والسلام علیک ورحمۃ اللہ۔

کامل ابن اثیر کے موافق حسینؑ نے جواب دیا: "ڈرتا ہوں کہ تمہیں بددلی نے اس خط کے بھیجنے پر آمادہ کیا ہے۔ پس بہتر ہے کہ تم روانہ ہو"۔

یکم ذی الحجہ ۶۰ھ

بعض الفاظ جس میں ابن خلدون یا اس کے مترجم نے ابوہریرہ کا اضافہ کیا ہے

ابن خلدون کے موافق: "مسلمؑ بن عقیلؑ بہ تعمیل ارشاد پہلی ذی الحجہ ۶۰ھ کو کوفہ میں داخل ہوئے۔ شیعوں کے دل میں کھلبلی پڑ گئی۔ پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔ جب ان میں سے چند لوگ مجتمع ہو جاتے تو مسلمؑ بن عقیلؑ ان کو امام حسینؑ کا خط پڑھ کر سناتے تھے اور وہ لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے تھے۔ اور امداد کا وعدہ کرتے تھے"۔ بقول مورخین: "حضرت مسلمؑ مختار بن ابوعبیدہ ثقفی کے گھر فروکش ہوئے"۔

مسلمؑ کا استقبال

بقول اعثم کوفی: امیرالمومنین علیؑ کے دوست مطلع ہو کر آپ کے پاس حاضر ہوئے۔ مسلمؑ نے امام حسینؑ کا خط پڑھ کر سنایا۔ جب انھوں نے حسینؑ کا خط اور علیؑ کا نام سنا خوب زور سے روئے اور "واشوقاہ الی لقاءہ" زبانوں سے ادا کیا۔

عابس بن ابی سلیب

پھر ایک شخص عابس بن ابی سلیب نے مسلمؑ کے پاس آکر کہا: میں اور لوگوں کے دلوں اور بھروسہ سے بے خبر ہوں جو کچھ مجھے کہنا ہے محض اپنی طرف سے کہتا ہوں کہ میرا دل اور جان فرزند رسولؐ کی دوستی کے لیے وقف ہیں۔ خدا کی قسم یہی بات ہے میں تمہارے آگے کھڑے ہو کر شمشیرزنی کروں گا۔ تمہارے دشمنوں کو ماروں گا۔ یہاں تک کہ میری تلوار کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور صرف قبضہ ہاتھ میں رہ جائے اور اس خدمت گزاری اور دوستی سے صرف خوشنودی خدائے تعالیٰ مطلوب ہوگی۔

حبیب بن مظاہر

پھر حبیب بن مظاہر اسدی نے اٹھ کر کہا: خدا کی قسم میں بھی تمہاری دوستی میں ایسا ہی نکلوں گا جیسا عابس نے بیان کیا ہے۔ اب لوگوں کی ٹولیاں آنی شروع ہو گئیں۔ اور سب اسی قسم کی گفتگو کرتے تھے۔۔۔۔ مسلمؑ کے لیے ہر شخص طرح طرح کے تحفے پیش کرتا تھا۔ مگر آپ نے کسی کا تحفہ قبول نہ کیا۔

بقول ابن خلدون: اس کی خبر نعمان بن بشیر گورنر کوفہ تک پہنچی۔ چونکہ طبیعت میں حلم و صلح پسندی تھی، لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا اور فتنہ و فساد برپا ہونے سے ڈرایا۔ اور صاف صاف لفظوں میں یہ کہا کہ مجھ سے جب تک کوئی نہ لڑے گا میں اس سے نہ لڑوں گا۔ اور نہ کسی کو محض شبہ و بدگمانی سے گرفتار کروں گا۔ ہاں اگر تم نے ابتدا کی اور نقض بیعت کی اور امام کے مخالف ہوئے تو واللہ جب تک میرے ہاتھ میں تلوار کا قبضہ رہے گا۔ برابر تم کو مارتا رہوں گا۔ گو میرا کوئی معین و مددگار نہ ہو۔ تقریر ختم ہونے پر بعض حلفاء بنی امیہ نے کہا: تم کو اس مضمون کا خطبہ نہ دینا تھا جو تمہاری رائے ہے

وہ کمزوروں کی رائے ہے۔ دشمنوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ اس میں دشمنوں کو جرأت ہوگی۔ نعمان نے جواب دیا: مجھے کمزور ہو کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں رہنا زیادہ محبوب ہے۔ اس سے کہ میں اللہ تعالیٰ کا گنہ گار ہو کر عزت والا بنوں۔ یہ کہہ کر نعمان منبر سے اتر آئے۔

یزید کو اطلاع

عبد اللہ بن مسلم، عمارہ بن ولید بن عقبہ، عمرو بن سعد بن ابی وقاص نے مسلم بن عقیلؑ کے آنے، لوگوں کی بیعت کرنے اور نعمان بن بشیر کے خطبہ دینے کا حال یزید کو لکھ بھیجا اور یہ بھی تحریر کیا کہ اگر تم کو کوفہ کی ضرورت ہو تو کسی زور دار شخص کو مامور کرو جو تمہارے احکام کو استقلال اور قوت کے ساتھ جاری اور تمہارے ملک کی حفاظت اور تمہارے دشمنوں کو زیر کرے۔

حضرت امام حسینؑ کا خط اہل بصرہ کے نام

اسی زمانہ میں حسینؑ بن علیؑ نے روساء اہل بصرہ مالک بن مسمع بکری، احنف بن قیس، منذر بن جارود، مسعود بن عمر، قیس بن الہیثم، عمر بن عبید اللہ بن معمر وغیرہم کے پاس ایک خط روانہ کیا تھا۔ جس میں ان لوگوں کو کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی دعوت دی تھی۔ سبھوں نے اس خط کو چھپا لیا لیکن منذر بن جارود نے یہ سمجھ کر کہ شاید ابن زیاد کا مکر نہ ہو نامہ بر اور خط کو ابن زیاد کے روبرو پیش کر دیا۔

اعثم کوفی کے موافق: منذر بن جارود کی بیٹی عبید اللہ کے نکاح میں تھی۔ صاحب لہوف کے موافق: اس کا نام بحریہ بنت منذر تھا۔

یزید ابن زیاد کو کوفہ کا عامل مقرر کرتا ہے

اپنے کوفی نامہ نگاروں کے مضمون خطوط سے مطلع ہو کر یزید نے اپنے باپ کے وزیر سرجون رومی سے مشورہ کیا۔ اور اس نے عبید اللہ بن زیاد کے لیے بصرہ کے ساتھ کوفہ کی گورنری کی صلاح دی۔ بعض مورخین کے نزدیک یزید ان دنوں ابن زیاد سے کچھ ناخوش تھا پھر بھی یہ صلاح اسے پسند آئی۔ اور بقول اعثم کوفی اس نے ابن زیاد کو خط لکھا کہ: مسلم بن عقیلؑ کو اس طرح تلاش کر کہ جس طرح بخیل آدمی گرے ہوئے روپیہ کو ڈھونڈتا ہے۔ جس وقت اسے گرفتار کر لے تو فوراً قتل کر کے سر میرے پاس بھیج دے۔ خوب یاد رکھ کہ میں اس معاملہ کی نسبت تیرے کسی عذر اور حیلہ کو نہ سنوں گا"۔ یہ خط مسلم ابن عمر الباہلی کو دے کر کہا کہ "بہت جلدی یہ خط بصرہ لے جا کر عبید اللہ کے حوالہ کر اور راستہ میں کسی جگہ نہ ٹھہرنا"۔

بصرہ میں فرزند رسولؐ کے قاصد کی شہادت

ابن زیاد نے حسینؑ کے قاصد سلیمان کو قتل کیا اور غالباً اسی روز یزید کا حکم ملا پہنچا جیسا اعثم کوفی کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن زیاد منبر پر گیا اور کہا: "آج یزید کا ایک فرمان آیا ہے اس نے ولایت کوفہ بھی مجھے عطا کر دی ہے۔ میں کل کوفہ کو جاؤں گا۔ اپنے بھائی عثمان کو تمہارا امیر مقرر کرتا ہوں۔ لازم ہے کہ تم سب اس کو عزت اور حرمت سے رکھنا۔ ہر امر میں اس کی رضامندی اور اطاعت کو اختیار کرنا۔ خدائے واحد کی قسم اگر میں نے سنا کہ تم میں سے کسی نے خلاف ورزی کی اور فرمانبرداری سے منہ پھیرا تو اسے مع اس شخص کے جو اس کا شریک حال ہوگا قتل

کر ڈالوں گا اور جب تک اِنتظام ٹھیک نہ ہو گا دشمن کو دوست کے عوض گرفتار کروں گا"۔

شریک بن اعور

ابن زیاد دوسرے ہی دن کوفہ کی طرف روانہ ہوا۔ مسلم بن عمر الباہلی، منذر بن جارود اور شریک بن اعور ہمدانی کو اپنے ہمراہ لے لیا۔ کوفہ کے قریب پہنچ کر ایک جگہ ٹھہر گیا، اور اتنا انتظار کیا کہ آفتاب غروب ہو جائے۔ دو گھنٹہ رات گزری تھی کہ اس نے سیاہ عمامہ سر پر رکھا، اور بیابان کی راہ سے داخل کوفہ ہونے کے لیے کوچ کیا۔ بقول ابن خلدون شریک اثنائے راہ سے علیحدہ ہو گئے۔ بقول کامل شریک ابن اعور ابن زیاد کے لشکر سے جدا ہوئے اور یہ خیال کیا کہ اسے کوفہ جانے میں کچھ توقف ہو کہ حسینؑ پہنچ جائیں لیکن ابن زیاد پہنچ گیا۔

اہل کوفہ کو دھوکا ہوا

بقول اعثم کوفی: اب چاند پوری روشنی ڈال رہا تھا۔ لوگوں کو خیال تھا کہ امام حسینؑ تشریف لائیں گے۔ عُبیداللہ کے ترک و احتشام کو دیکھ کر خیال کیا کہ امام حسینؑ تشریف لائے ہیں۔ گروہ در گروہ لوگ آنے شروع ہو گئے۔ اور عُبیداللہ کو سلام کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ: اے فرزند رسولؐ مبارک ہو مبارک ہو۔ آپ کی تشریف آوری مبارک ہو۔ عُبیداللہ ان کے سلام کا جواب دیتا تھا۔ آخر کار مسلم بن عمر باہلی نے ایک شخص سے کہا: یہ عُبیداللہ بن زیاد ہے، حسینؑ بن علیؑ نہیں۔ تم کو محض دھوکا ہوا ہے۔ کوفہ والے اس حال سے مطلع ہو کر بھاگے اور منتشر ہو گئے۔

بقول صاحب سر الشہادتین: پس پیشوائی کی (ابن زیاد کی) لوگوں نے اندھیری رات میں۔

کوفہ میں ابن زیاد کی تقریر

عُبیداللہ بن زیاد قصر امارت میں داخل ہوا۔ دوسرے روز منادی کرائی کہ سب لوگ مسجد جامع میں حاضر ہوں۔ لوگ آئے اور ابن زیاد نے "بوسہ چند بد دشنامے چند" کی اسپیچ دی۔ رفاقت کرنے والوں کو انعام اور احسان اور مخالفت کرنے والوں کی گردن اور پیٹھ کو تلوار اور درہ کا امیدوار بنایا۔ بقول مترجم ابن خلدون جیساوہ (کامل ابن اثیر، تاریخ الخلفاء، معارف ابن قتیبہ اور عقد الفرید سے) نوٹ کرتا ہے: "ان لوگوں کی تعداد صحیح صحیح ظاہر کرو جن کے دلوں میں اختلاف و بغاوت کا مادہ بھرا ہو۔ پس جو شخص صاف صاف لکھ دے گا وہ بری ہے اور جو شخص نہ لکھے گا تو اس کا ذمہ دار سمجھا جائے گا۔ اگر اتفاق سے اس کے دوستوں آشناؤں میں سے کسی نے ہماری مخالفت کی یا ہم سے باغی ہوا تو ہم اس سے بری الذمہ ہیں۔ اس کا خون و مال ہم کو مباح ہو گا۔ اور جس کے علم میں امیر المومنین کا باغی و مخالف ہو اور اس نے نہ ظاہر کیا ہو تو ہم اس کو سولی دیدیں گے اور اس کا وظیفہ منبط کر لیں گے"۔

عصر کی نماز کے وقت حضرت مسلم کے رفقاء

صاحب نور العین فی مشہد الحسینؑ لکھتے ہیں کہ: "جب عصر کا وقت آیا تو مسلمؑ اپنے گھر سے نکلے اور عصر کی نماز کے لیے جامع مسجد میں آئے اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے تو کوئی شخص ان کے پیچھے کھڑا نہ ہوا، اور جس نے ان کو دیکھا، ادھر ادھر ٹل گیا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے اور مسجد سے نکلنے لگے دیکھا تو ایک غلام کھڑا ہے۔ اس سے پوچھا اہل کوفہ کا کیا حال ہے۔ اس نے کہا: حضرت اہل کوفہ نے امام حسینؑ رضی اللہ عنہ کی بیعت توڑ ڈالی ہے اور سب یزید کی بیعت میں داخل ہو گئے ہیں اور ابن زیاد کے خطبہ کے حال سنایا۔ مسلمؑ نے

دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر مار کر کہا: "لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم"۔ اور کسی ایسے شخص کی تلاش میں مصروف ہوئے جو ان کو پناہ دے۔ کوفہ میں ایک شخص مسمی ہانی بن عروہ تھا۔ جس کی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت کی محبت میں گزر گئی تھی۔ وہ کوفہ کے سربرآوردہ لوگوں میں تھا۔ اور سلاطین وقت کے نزدیک اس کی بڑی عزت تھی۔ مسلمؑ اس کو جانتے تھے۔ اس کا گھر پوچھتے پوچھتے گئے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک لونڈی باہر آئی اور پوچھا کیا کہتے ہو؟ انھوں نے کہا اپنے آقا سے کہو کہ بنی ہاشم میں سے ایک شخص مسلمؑ بن عقیلؑ نام آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ لونڈی نے اندر جا کر اپنے آقا سے کہا۔ تو اس نے ان کو اندر بلالیا۔ انھوں اندر جا کر سلام کیا۔ وہ اس وقت بیمار تھے۔ مسلمؑ ایک طرف بیٹھ گئے اور تمام حال بیان کیا۔ اور کہا کہ ابن زیاد میرے قتل کے درپے ہے۔ ہانی نے کہا: "کوئی خوف کی بات نہیں ہے۔ یہ آپ کا گھر ہے۔ میں ان شاء اللہ آپ کے بچاؤ کی کوئی صورت نکالوں گا"۔

تجدیدِ بیعت شروع ہوئی

بعض مؤرخین کے نزدیک جس وقت حضرت مسلمؑ پہنچے تو ہانی بن عروہ کو تردد ہوا لیکن آخر میں انھوں نے پناہ دی۔ اور اب بقول اعثم کوفی: لوگ پوشیدہ طور پر مسلمؑ کے پاس حاضر ہوتے اور اس سر نو بیعت کرتے تھے۔ مسلمؑ ان پر حجت قائم کرتے تھے کہ تم اپنے اقراروں پر ثابت قدم رہنا۔ بے وفائی نہ کرنا۔ وہ قسمیں کھاتے اور عہد و پیمان کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بیس ہزار سے زیادہ آدمی بیعت کے حلقہ میں آ گئے۔

شریک بن اعور کی علالت

اعثم کوفی اور روضۃ الصفا کے موافق: شریک بن اعور ہمدانی ہانی بن عروہ کے گھر بیمار ہو کر ٹھہرے اور یہ مسلمؑ کی درست امورات میں بہت سرگرم تھے۔ ابو اسحاق اسفرائنی کے موافق: ہانی بن عروہ بیمار کہے گئے ہیں۔ ابن زیاد نے شریک کا حال پوچھا اور جب معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہیں تو اس نے عیادت کے لیے جانے کی اطلاع دی۔

شریک بن اعور مُسلمؑ کو ابنِ زیاد کے قتل کی صلاح دیتے ہیں

شریک نے مسلمؑ سے کہا کہ تمھیں اس سے بہتر موقع نہ ملے گا۔ میں اسے باتوں میں مشغول کروں گا تم اسے قتل کر ڈالنا۔ کوفہ تمھارے قبضہ میں آجائے گا۔ اور اگر میں جیتا رہا تو بصرہ بھی تمھارے تصرف میں آجائے گا۔

شریک کی بے چینی

ابن زیاد آیا۔ شریک بے چینی سے اس کا انتظار کرتے رہے کہ مسلمؑ نکلیں اور قتل کریں لیکن مسلمؑ نہ آئے۔ شریک اس وقت بعض اشعار پڑھنے لگے جس کا مفہوم ہے کہ: "اے میری روح معشوقہ سلمیٰ کو سلام کر اور اس کے سلام کرنے والوں کو سلام کر۔ سلمیٰ کے سلام کرنے کا مجھے کیوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کیا کوئی شیریں پانی کا گھونٹ ہے جو میں پیاس کی حالت میں پی لوں، اگرچہ میں ہلاک ہو جاؤں۔ اور اس میں میری بدبختی ہو۔ پس اس کی طرف آ اور فیصلہ میں دیر نہ کر۔ اگر پیالہ میں کچھ پانی ہو تو لا پلا دے"۔

بعض کے موافق: ابن زیاد کو شبہ ہوا اور چلا گیا۔ اور بعض کے موافق اس نے ہانی سے کہا کہ یہ ہذیان بک رہا ہے اور ہانی نے جواب دیا کہ یہی اشعار صبح سے اس کی زبان پر جاری ہیں۔ ابن زیاد کے جانے کے بعد شریک نے مسلمؑ سے

وجہ پوچھی کہ تم نے کیوں ایسے نادر موقع کو ضائع کیا جس کے بعد تمہیں کوفہ پر قبضہ کرنے میں کوئی تردد نہ ہوتا۔

مُسلمؑ قتل نہ کرنے کی وجہ بتاتے ہیں

مُسلمؑ نے بقول مترجم ابن خلدون شریک کے جواب میں کہا کہ: دو وجہ سے میں نے قتل نہیں کیا۔ ایک یہ کہ ہانی کو ناگوار تھا کہ اس کے مکان پر وہ قتل کیا جائے۔ دُوسرے یہ کہ امیرالمومنین علیؑ نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ: ان الایمان قید الفتك فلا یفتك مومن بمومن۔ (ایمان دھوکے کی خونریزی سے مانع ہے اس لیے ایک مُسلمان دوسرے مُسلمان کا اس طرح خون نہیں بہاتا) شریک کی رائے اس سے مختلف تھی۔ اور وہ ابن زیاد کے قتل کو موجب تقرب خدا سمجھتے تھے۔

حسینؑ کے نام مُسلمؑ کے خط کی گرفتاری

اعثم کوفی کہتا ہے: ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ عُبیداللہ کا ایک خدمت گار مالک بن یربوع تیمی آیا اور کہا: اللہ تعالیٰ امیر کو محفوظ رکھے۔ ایک خوفناک حادثہ کی خبر ہے۔ اس نے کہا: بیان کر۔ مالک نے کہا: میں سیر کے ارادہ سے شہر کے باہر گیا ہوا تھا۔ اس کے گرد پھر رہا تھا۔ ایک شخص کو دیکھا کہ گرد سے نکل کر نہایت تیز روی سے مدینہ کی طرف جا رہا ہے۔ میں نے اس کے پیچھے گھوڑا ڈالا اور جا لیا۔ پوچھا تو کون شخص ہے، اور کہاں جا رہا ہے۔ اس نے کہا: میں مدینہ کا رہنے والا ہوں۔ پھر میں نے گھوڑے سے اتر کر دریافت کیا: تیرے پاس کوئی خط ہے۔ اس نے اقرار نہ کیا۔ تو میں نے اس کے کپڑوں کی تلاشی لی۔ ایک سربند خط پایا۔ وہ یہ ہے، اور اس شخص کو امیر کے دروازہ پر پہرہ کے اندر دیدیا ہے۔ عُبیداللہ نے خط لے کر کھولا۔ مضمون یہ تھا۔

"مُسلمؑ بن عقیل کی طرف سے حسینؑ بن علیؑ بن ابی طالب کو معلوم ہو کہ میں کوفہ پہنچا۔ تمام شیعہ لوگوں سے ملا۔ ان سے آپ کے لیے بیعت لی۔ بیس ہزار شخصوں نے دلی رضا و رغبت سے آپ کی بیعت اختیار کر لی ہے۔ میں نے ان کے نام لکھ لیے ہیں۔ آپ اس خط کے مضمون سے مطلع ہوتے ہی فوراً چلے آئیں۔ کسی وجہ سے دیر نہ کریں۔ کیونکہ کوفہ والے دل سے آپ کے خیر خواہ اور دوست ہیں اور یزید سے متنفر"۔

ابن زیاد نے خط دینے والے کا نام دریافت کیا۔ لیکن عبداللہ بن یقطین (یا یقطر) نے بتانے سے انکار کیا۔ صرف یہ کہا کہ میں بنی ہاشم کا ہوا خواہ ہوں اور مجھے ایک بڑھیا نے یہ خط دیا ہے۔ اور باوجود اس دھمکی کے کہ نام نہ بتانے کی صورت میں قتل کیے جاؤ گے، قتل ہونا گوارا کیا۔

علامہ مجلسی نے بھی بحار میں اس خط کی گرفتاری کا ذکر کیا ہے۔

شریک نے تین دن کے بعد انتقال کیا۔ بقول اعثم کوفی: یہ شخص بصرہ کے بزرگوں اور ارکین میں سے تھا۔ امیرالمومنین علیؑ کا مداح شاعر تھا۔ اپنے کلام کو پوشیدہ رکھتا تھا۔ معتمد اشخاص کے سوا کسی غیر کو نہ سناتا تھا۔ بقول ابن خلدون جنگ صفین میں جناب امیرؑ کے ہمراہ رکاب تھے۔

جاسوسی

ابن زیاد مُسلمؑ کی تلاش میں مشغول ہوا اور آخر اس نے اپنے غلام معقل کو تین ہزار درہم کی تھیلی دے کر کہا کہ تو جا کر علیؑ کے دوستوں سے میل جول پیدا کر اور کہہ کہ میں حسینؑ کا دوست ہوں اور مُسلمؑ کے لیے کچھ روپیہ لایا ہوں۔ مجھے ان کے پاس پہنچا دو کہ داخل ثواب ہوں۔ معقل روپیہ لے کر مسجد اعظم میں گیا اور متردد تھا کہ کس سے بات کرے کہ مُسلمؑ بن عوسجہ اسدی سے ملاقات ہوئی اور اس سے یہ باتیں کہیں مُسلمؑ نے قسمیں لینے کے بعد اس سے دوسرے دن لے چلنے کا اقرار کیا۔ معقل نے ابن زیاد کو خبر دی اور اس نے تاکید کی کہ مردوں کی طرح اس کام کو انجام دینا۔ دوسرے دن پھر مُسلمؑ بن عوسجہ سے ملاقات ہوئی اور یہ اسے ہانی کے گھر لے گئے مُسلمؑ سے بیعت ہوئی اور یہ دن بھر باتیں کرتا رہا۔ اور شام کو ابن زیاد کو خبر دی۔

ہانی کی طلبی کے لیے کچھ لوگ مقرر ہوئے

اب ابن زیاد نے محمد بن اشعث بن قیس کندی، اسماء بن خارجہ فزاری اور عمر بن حجاج الزبیدی کو بلایا۔ (صاحب لہوف کے موافق عمر بن حجاج الزبیدی کی بیٹی رویحہ ہانی کی بی بی تھی) اور ہانی کے نہ آنے کا سبب پوچھا۔ ان لوگوں نے علالت کی وجہ بتائی اور اصرار پر لانے کا وعدہ کیا۔ دار الامارت سے نکل کر اب یہ لوگ سیدھے ہانی کے گھر آئے اور ابن زیاد سے جو باتیں ہوئی تھیں بیان کیں۔ اس کے بعد بہ اصرار سوار کر کے لے چلے۔ قصر کے قریب پہنچ کر ہانی نے کہا مجھے ابن زیاد سے تشویش پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن محمد بن اشعث اور اسماء بن خارجہ نے تسکین دلائی کہ یہ محض وہم ہے اور اس کے بعد یہ لوگ دار الامارت میں داخل ہوئے۔ ابن زیاد نے ہانی کو دیکھ کر کہا کہ میں تیری حیات چاہتا ہوں اور تو میرے قتل کی فکر میں ہے؟

ابن زیاد صورتِ معاملہ ظاہر کر دیتا ہے

ہانی نے پوچھا کہ امیر نے کیا کہا؟ اور ابن زیاد نے کہنا شروع کیا کہ: معاملہ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ تو نے مُسلمؑ بن عقیلؑ کو اپنے گھر پناہ دی ہے۔ لوگ اور ہتھیار جمع کیے ہیں۔ تو سمجھتا ہے کہ میں تیرے کاموں سے ناواقف ہوں۔ (معقل کی طرف اشارہ کر کے) اس کو پہچانتا ہے؟

ہانی کا عذر

ہانی اب سمجھے کہ معقل جاسوس تھا۔ اور کہا کہ اے امیر میں نے مُسلمؑ بن عقیل کو خود طلب نہیں کیا بلکہ رات کی تاریکی میں وہ میرے گھر میں داخل ہو گئے اور میری پناہ چاہی۔ حیا کے خلاف تھا کہ میں ان کو نکال دیتا۔ اب وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے گھر جا کر نکال دوں گا اور پھر امیر کے پاس حاضر ہوں گا۔

ابن زیاد نے مُسلم کی گرفتاری ہانی کی رہائی کی شرط قرار دی

ابن زیاد نے کہا تم اس وقت تک باہر نہ جا سکو گے جب تک مُسلمؑ کو حاضر نہ کرو۔ ہانی نے کہا کہ ہر گز مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ مروت میں یہ جائز نہیں ہے کہ پناہ گیر اور مہمان دشمن کے حوالہ کر دیا جائے کہ وہ قتل کر ڈالا جائے۔ یہ عرب کی سیرت نہیں ہے۔ اگر میں ایسا کروں گا تو یہ شرم مجھ سے کبھی دور نہ ہوگی اور ہمیشہ میں برے نام سے یاد کیا جاؤں گا۔

اس وقت مُسلمؑ بن عمر الباہلی نے ہانی سے کچھ بات کرنے کی اجازت مانگی اور ابن زیاد نے اس شرط پر اجازت دی کہ

قصر کے باہر نہ لے جائے۔ مسلمؑ بن عمر الباہلی ہانی کو کنارہ لے گیا اور کہا ہانی! افسوس ہے تم پر کہ تم اپنی جان سے سیر ہو گئے ہو اور مسلمؑ کے لیے اپنے اہل و عیال اور قبیلہ کو مورد بلا کرتے ہو۔ ہم میں سے اگر کوئی مسلمؑ کو طلب کرتا تو تمھارا حوالہ کرنا عیب میں داخل تھا لیکن جس وقت ایک زبردست دشمن تم سے طلب کر رہا ہے مسلمؑ کا حوالہ کر دینا شرم کی بات نہیں ہے۔ ہانی نے جواب دیا کہ مسلمؑ کے حوالہ کر دینے میں ہزار عیب ہے میں فرزند رسولؐ اور اپنے مہمان کو کبھی دشمن کے حوالہ کرنے کی رسوائی گوارا نہ کروں گا۔ مسلم بن عمر نے مایوس ہو کر ابن زیاد سے گفتگو دہرائی اور اب ابن زیاد نے غصہ میں ہانی سے کہا:

گرم گفتگو

"اے ہانی اگر تم مسلمؑ کو حاضر نہ کرو گے تو تمھیں قتل کروں گا"۔ ہانی نے جواب دیا: "کس کی مجال ہے کہ میرے ساتھ ایسی حرکت کر سکے۔ اگر تو اپنے اس خیال پر عمل کرے گا تو لوگوں کا انبوہ کثیر تیرے قصر کا محاصرہ کر لے گا"۔ ابن زیاد نے کہا: "تو مجھے اپنے قبیلہ اور دوستوں سے ڈراتا ہے"۔

ہانی کے ساتھ برتاؤ اور برافروختگی

ابن زیاد کے ہاتھ میں ایک آہنی لکڑی تھی اس نے ہانی کے منہ پر کھینچ ماری جس سے ناک سے خون جاری ہوا۔ ہانی نے ایک سپاہی کے قبضہ پر ہاتھ ڈالا جو قریب کھڑا ہوا تھا۔ لیکن اس نے ہاتھ پکڑ لیا اور اب ابن زیاد نے کہا کہ اے ہانی اب تیرا خون ہم پر مباح ہو گیا۔ اور اس کے بعد انھیں قید کرنے کا حکم دیا۔ اسماء بن خارجہ جو ہانی کو چچا کہتا تھا ابن زیاد کا یہ برتاؤ دیکھ کر برافروختہ ہوا اور کہنے لگا کہ اے امیر! ہانی کے آنے کے قبل تو اچھی اچھی باتیں کرتا تھا۔ اور وعدہ وعید کرتا تھا۔ لیکن جب ہانی آیا تو تو نے نہ صرف خلاف امید باتیں کیں بلکہ اس کی ناک بھی توڑی جس سے اس کی داڑھی خون سے سرخ ہو گئی اور اب اس کے قتل کی دھمکی دے رہا ہے۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ ابن زیاد کو یہ بھی برا معلوم ہوا اور اس نے اسماء کو مارنے کا حکم دیا کہ یہ قریب المرگ ہو گئے تو ہانی کی طرف دیکھ کر کہا: انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اے ہانی اب ہم تجھے موت کا پیغام دیتے ہیں۔ اب یہ معاملہ ہاتھ سے نکل چکا"۔

مددگاروں کی نوعیت اور ہیئت

اس وقت بقول ابن خلدون: "رفتہ رفتہ عمرو بن الحجاج تک یہ خبر پہنچی کہ ہانی مار ڈالا گیا۔ جوش میں آ کر مذحج کو لے کر دار الامارت کا محاصرہ کر لیا اور بلند آواز سے کہا: ہم عمرو بن الحجاج ہیں اور یہ سواران مذحج اور ان کے سردار۔ ہم نہ تو اطاعت امیر المومنین سے منحرف ہوئے ہیں اور نہ تفریق جماعت کی ہے۔ ابن زیاد نے گھبرا کر قاضی شریح سے کہا: آپ ذرا ان کے دوست (ہانی) کے پاس تشریف لے جائیے اور اس کو دیکھ کر ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ وہ زندہ ہے۔ چنانچہ شریح قاضی نے ایسا ہی کیا اور وہ لوگ یہ سن کر کہ ہانی زندہ ہے لوٹ گئے۔

طبری کہتا ہے کہ قتل ہانی کی خبر سن کر جو لوگ مسلمؑ کے پاس آئے وہ: "مردمان درویش بے سلاح (بودند) و از اں مہتران کسے بیرون نیامد۔ مسلمؑ ایشان را گفت بروں آئید بیعت دریں روز باید کردن۔ ہر کسے بگفت ما بیعت با حسینؑ نی گفتہ کردہ ایم۔ یا اور سیلید ما پیش او حرب کنیم ترا صبر باید کردن تا او بیلید"۔ یعنی: "غریب لوگ بغیر ہتھیار کے تھے۔ بڑے لوگوں میں سے کوئی نہ نکلا۔ مسلمؑ نے ان سے کہا باہر آؤ۔ آج بیعت کرنی چاہیے۔ سب نے کہا ہم نے حسینؑ کی

بیعت کی ہے وہ آئیں گے تو ہم ان کے سامنے جنگ کریں گے۔ تمھیں ان کے آنے تک صبر کرنا چاہیے"۔

مُسلمؑ یا منصور امت کی صدا کراتے ہیں

مُسلم بن عقیلؑ نے یہ واقعات سن کر اپنے اصحاب میں یا منصور امت کی ندا کردی۔ اس وقت تک ان کے ہاتھ پر اٹھارہ ہزار آدمی بیعت کر چکے تھے جس میں چار ہزار مکان میں موجود تھے تھوڑی دیر میں ایک انبوہ کثیر جمع ہو گیا۔ آپ نے عبداللہ بن عزیز کندی کو کندہ پر مامور فرما کر آگے بڑھنے کا حکم دیا اور مُسلم بن عوسجہ اسدی کو مذحج و اسد پر۔ ابی ثمامہ صائدی کو تمیم و ہمدان پر۔ عباس بن جعدہ حربی کو مدینہ پر متعین کر کے قصر امارت کا قصد کیا۔ ابن زیاد نے دروازے بند کرا لیے۔ قصر امارت کا کل صحن اور مسجد و بازار آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔۔۔۔ ابن زیاد کے ساتھ اس وقت قصر امارت میں تیس آدمی پولیس کے اور بیس آدمی اور تھے جن میں چند شرفاء کوفہ اور کچھ اس کے خود خادم و خاندان والے تھے۔ شام تک یہی کیفیت رہی۔۔۔

مُسلمؑ کے رفقاء منتشر ہو گئے

تب ابن زیاد نے ان کے منتشر کرنے کی یہ تدبیر نکالی کہ کثیر بن شہاب حارثی کو مذحج کی طرف محمد بن الاشعث کو کندہ و حضر موت کی جانب قعقاع بن شور الذہلی و شبث بن ربعی تیمی و حجار بن ابحر عجلی کو و شمر بن ذی الجوشن ضبابی وغیرہم کو حکم دیا کہ قصر امارت کی کھڑکیوں اور بالا خانہ سے کھڑے ہو کر لوگوں کو بجھا بجھا کر مُسلم بن عقیلؑ سے علیحدہ ہونے کو کہو، اور اعلان کردو کہ جو شخص اس وقت علیحدگی اختیار کر لے گا اس کو امان دی جائے گی اور جو شخص اس حکم سے سرتابی کرے گا وہ عقوبت شاہی میں گرفتار کیا جائے گا اور نہایت بری سزا اس کو دی جائے گی۔ اہل کوفہ کے کان میں جوں ہی یہ آواز پڑی اور انھوں نے اپنے روسا و سرداروں کو یہ کہتے ہوئے دیکھا ایک ایک دو دو پانچ پانچ دس دس علیحدہ ہونے لگے۔ اخیر اخیر یہ نوبت پہنچی کہ عورت و مرد سب کے سب گھروں سے نکل پڑے اور وہ اپنے بیٹوں اور بھائیوں کو بلا لے گئے یہاں تک کہ مُسلم بن عقیل کے پاس مسجد میں صرف تیس آدمی باقی رہ گئے۔ اس وقت آپ مسجد سے نکل کر ابواب کندہ کی طرف روانہ ہوئے۔ کندہ کے دروازہ تک پہنچتے پہنچتے یہ تیس نفر بھی علیحدہ ہو گئے۔

ایک اور بیان

صاحب روضۃ الشہداء کے موافق ہانی کی خبر سن کر مُسلمؑ نے دار الامارت کا محاصرہ کیا اور قریب تھا کہ اس پر قبضہ کر لیں کہ ابن زیاد نے لوگوں کو دھمکایا، اور سب منتشر ہو گئے۔ یہاں تک کہ مُسلمؑ تنہا رہ گئے۔ اب انھوں نے چاہا کہ ہم کوفہ سے نکل جائیں کہ سعید بن احنف نے اس نیاد پر منع کیا کہ کوفہ کے تمام راستوں کی محافظت ہو رہی ہے جانا ممکن نہیں ہے۔ اس کے بعد مُسلمؑ کو محمد کثیر کے گھر لے آئے۔ ابن زیاد کو خبر معلوم ہوئی اور اس نے محمد کثیر اور ان کے لڑکے کو گرفتار کرا لیا۔ لیکن مُسلمؑ کو نہ پایا۔ محمد کثیر کی قوم نے پھر دار الامارت کا محاصرہ کیا۔ اور اب ابن زیاد نے محمد کثیر کو چھوڑ دیا۔ اور ان کے لڑکے کو ضمانت میں رکھ لیا۔ محمد کثیر گھر آئے۔ اب سلیمان بن صرد، مختار بن ابو عبیدہ ثقفی، ورقا بن عازب وغیرہ روسائے کوفہ جمع ہوئے اور صلاح ہوئی کہ ہم لوگ مُسلمؑ کو قبائل عرب میں لے جا کر لشکر جمع کریں اور حسینؑ کے پاس جا کر دشمنوں سے جنگ کے لیے آمادہ ہوں۔

لیکن صبح کو عامر ابن طفیل شام سے دس ہزار سواروں کی جمعیت سے ابن زیاد کے پاس آیا۔ صبح کو ابن زیاد نے

محمد کثیر کو طلب کیا۔ یہ مع اپنے خادموں کے مسلح ہوئے اور ان کے قبیلہ کے ہزاروں آدمیوں نے قصر کو گھیر لیا۔ ابن زیاد نے محمد کثیر سے مسلمؑ کو طلب کیا لیکن انھوں نے انکار کیا۔ ابن زیاد نے دوات ان کی پیشانی پر کھینچ ماری جس سے خون جاری ہوا۔ محمد کثیر نے تلوار کھینچی لیکن لوگ لپٹ گئے اور تلوار لے لی۔ معقل جاسوس تلوار لگانے قریب کھڑا تھا۔ محمد کثیر نے اس کی تلوار نکال لی اور اسے وہیں ٹھنڈا کر دیا، اور حملہ شروع کیا۔ ابن زیاد بھاگ گیا۔ آٹھ دس آدمی قتل کیے تھے کہ گرفتار ہو گئے۔ محمد کثیر کے لڑکے نے یہ دیکھ کر حملہ کیا، اور کئی کو قتل کیا تھا کہ کسی نے پشت سے نیزہ مارا۔ اور یہ گر گیا گرفتار ہوا۔ اور ابن زیاد کے حکم سے دونوں کے سر ان کی قوم کے سامنے پھینک دیے گئے۔ قوم نے اب جنگ بے سود سمجھ کر گھر کا راستہ لیا۔ مختار نے قبیلہ کر میں شلیمان بن صرد نے بنی زید میں ارورقا نے قاضی شریح کے محلہ میں پناہ لی۔ مسلمؑ ھلاوں کی فوجوں سے بچتے ہوئے طوعہ کے گھر پہنچے۔

مُسلمؑ طوعہ کے گھر

بقول ابن خلدون: "تن تنہا ہوتے بھٹکتے بنی کندہ کی ایک عورت کے مکان پر پہنچے (جس کا نام طوعہ تھا۔ اس کا لڑکا بلال لوگوں کے ساتھ سپاہی بن کر گیا تھا) مُسلمؑ بن عقیلؑ نے اس کو سلام کر کے پانی طلب کیا۔ طوعہ نے پانی پلایا۔ آپ اسی کے دروازہ پر بیٹھ گئے۔ طوعہ نے کہا: اے خدا کے بندے کیا تم نے پانی نہیں پیا؟ جواب دیا: ہاں۔ پھر طوعہ نے کہا: تم اپنے گھر جاؤ۔ تین بار اس فقرہ کو اس نے دہرایا۔ آپ نے کچھ جواب نہ دیا۔ تب طوعہ بولی: سبحان اللہ میں تم کو گھر جانے کو کہتی ہوں اور تم خاموش بیٹھے ہو۔ اٹھو اپنے گھر جاؤ۔ مجھے تمہارا یہاں بیٹھنا پسند نہیں ہے۔ آپ نے ایک سرد آہ کھینچ کر ارشاد کیا۔ اس شہر میں میرا نہ مکان ہے نہ کوئی عزیز قریب ہے۔ کیا تم مجھ کو اپنے گھر میں پناہ دے سکتی ہو؟۔ اور میرے ساتھ کچھ بھلائی کر سکتی ہو۔ شاید اس کے بعد کبھی میں تم کو اس کا معاوضہ دے سکوں۔ طوعہ بولی: آپ ہیں کون؟ فرمایا: میں مُسلمؑ بن عقیلؑ ہوں۔ مجھے کوفہ والوں نے دھوکا دیا ہے۔ طوعہ نے کہا: اچھا آپ میرے مکان میں تشریف لائیے"۔

طوعہ لڑکے کے اصرار پر راز بتاتی ہے

غرض مُسلمؑ بن عقیلؑ کو طوعہ نے اپنے مکان کے دوسرے احاطہ میں ٹھہرایا۔ کھانا لائی۔ لیکن آپ نے تناول نہ کیا۔ اس عرصہ میں اس کا لڑکا آ گیا۔ اور طوعہ کو بار بار دوسرے احاطہ میں آتے جاتے دیکھ کر سبب دریافت کیا۔ بڑے اصرار سے عہد و پیمان لے کر مُسلمؑ بن عقیلؑ کے آنے اور ٹھہرانے کا ماجرا بتلا دیا۔ بلال سن کر خاموش ہو رہا۔ ابن زیاد مجمع منتشر ہونے کے بعد مع اپنے احباب کے مسجد میں آیا، اور محلہ محلہ ندا کرا دی کہ سب لوگوں کا قصور معاف کر دیا گیا کسی پر کوئی الزام باقی نہیں ہے۔ عشا کی نماز مسجد میں آ کر پڑھو۔ تھوڑی دیر میں آدمیوں سے مسجد بھر گئی۔ ابن زیاد نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھی اور منبر پر کھڑے ہو کر اس مضمون کا خطبہ دیا کہ ابن عقیل نے تم لوگوں میں اختلاف و نفاق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کے گھر میں ہم اس کو پائیں گے وہ بری الذمہ ہے اور جو شخص اس کو گرفتار کرائے گا اس کو ہم انعام دیں گے۔ بعد اس کے حصین بن تمیم کو حکم دیا کہ اسی وقت کوفہ کی ناکہ بندی کر لو۔ صبح ہوتے ہوتے تمام مکانات کی تلاشی لینا۔ صبح ہوئی۔ ابن زیاد نے ایک جلسہ عام منعقد کیا۔ اور بلال (طوعہ کے لڑکے) نے پہنچ کر

بلال دربار میں آ کر اطلاع دیتا ہے

عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث سے مسلم بن عقیلؑ کے آنے اور مکان میں چھپانے کے ماجرا بیان کیا۔ عبدالرحمٰن نے اپنے باپ محمد سے جس وقت وہ ابن زیاد کے پاس دربار میں بیٹھا تھا۔ اور محمد بن اشعث نے ابن زیاد سے بتلایا۔ ابن زیاد نے مسلم بن عقیلؑ کی گرفتاری کے لیے محمد کو مع عروہ بن عبداللہ ابن عباس اسلمی اور قیس کے ستر آدمیوں کے روانہ کیا۔

مسلمؑ کی جنگ

مسلم بن عقیلؑ ان لوگوں کی آوازیں سن کر تلوار کھینچ کر نکل آئے اور نہایت مردانگی سے ان کو گھر کے باہر نکال دیا۔ مکرر سہ کرر وہ لوگ حملہ آور ہو کر آتے تھے اور مسلم بن عقیلؑ دم بھر میں ان کو نکال دیتے تھے۔ روضۃ الصفا اور اعثم کوفی کے موافق ابن زیاد نے محمد بن اشعث سے پوچھا کہ تیرے بیٹے نے تجھ سے کیا بات کہی۔ اس پر محمد بن اشعث نے کہا: اللہ تعالیٰ امیر کو عظمت بخشے بڑی خوشخبری کی بات ہے۔ عبیداللہ نے کہا میں ہمیشہ تیری زبان سے خوشخبری کی باتیں سنتا رہتا ہوں۔ اس نے کہا میرا بیٹا کہتا ہے کہ مسلم بن عقیل ایک عورت طوعہ کے گھر میں پوشیدہ ہے۔ عبیداللہ بہت خوش ہوا اور کہا تجھے بہت بڑا انعام اور خلعت دیا جائے گا۔ جا اسے پکڑ لا۔ عمر بن حریث مخزومی کو جو اس کا نائب تھا حکم دیا کہ تین سو نامور بہادر فوج میں سے چھانٹ کر محمد بن اشعث کے حوالہ کردے کہ انھیں ہمراہ لے جائے اور مسلمؑ کو گرفتار کرائے۔ محمد تین سو سواروں کو ہمراہ لے کر جب اس گھر کے قریب پہنچا۔

فوج دیکھ کر مسلمؑ کی آمادگی کی صورت

مسلمؑ نے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سن کر جان لیا کہ میری گرفتاری کے لیے آتے ہیں۔ اٹھ کر اپنی زرہ پہنی۔ اب وہ لوگ بھی دروازہ پر آپہنچے تھے اور گھر کو آگ لگادی تھی کہ اندر آئیں۔ مسلمؑ نے یہ حال دیکھ تبسم کیا۔ اور کہا اے نفس مرنے کے لیے مستعد ہوجا۔ آدم کی اولاد کا یہی انجام ہے۔ پھر طوعہ سے کہا تجھ کو خدا بخشے گھر کا دروازہ کھول دے اس نے دروازہ کھولا مسلمؑ غضب ناک شیر کی طرح جھپٹ کر گھر سے باہر نکلے اور ایک ہی حملہ میں کئی شخصوں کو مار گرایا۔

لوگوں نے عبیداللہ سے کہا کہ مسلمؑ مقابلہ سے پیش آیا۔ اور کئی شخص مار ڈالے۔ اس نے محمد سے کہلا بھیجا کہ تجھے صرف ایک شخص کی گرفتاری کے لیے تین سو سوار جرار دیے گئے تھے کہ تو اسے پکڑ لائے تو نے اسے کیوں جنگ کرنے اور کئی شخصوں کے ہلاک کرنے کا موقع دیا۔ یہ کیسی کمزوری اور عاجزی کی بات ہے۔ مسلم اگرچہ بہادر ہے مگر ایک شخص سے زیادہ نہیں ہے۔ محمد نے جواب میں کہلا بھیجا کہ کیا تو خیال کرتا ہے کہ مجھے کسی بنیے کے مقابلہ پر بھیجا ہے۔ خدا کی قسم وہ ایک ہزار بہادر جوانوں کے ہم پلہ ہے اور اگر ایسے شخص کا کوئی ساتھ دیتا تو دنیا کو ہماری نگاہوں میں تاریک کردیتا۔ مسلم آسانی سے گرفتار نہیں ہوسکتا۔ کوئی اور تدبیر کرنی چاہیے۔ عبیداللہ نے کہلا بھیجا کہ اسے پناہ دے کہ بہ آسانی قبضہ میں آجائے۔

مسلمؑ سے امان کا تذکرہ اور جواب

ابن اشعث کے تذکرہ امان پر بقول لہوف آپ نے کہا کہ: "غداروں اور فجاروں کی امان کیا"۔ بقول ابواسحٰق اسفرائنی فرمایا: "اے خدا و رسولؐ کے دشمنو! تم کو امان نہیں ہے"۔ بقول روضۃ الصفا: "مجھے تمھاری امان کی احتیاج نہیں ہے۔ تم فاسقوں کی بات پر کیا اعتماد ہے۔ تم مجھ پر اس طرح پتھر پھینک رہے ہو کہ جس طرح کافروں پر پھینکا جاتا ہے۔ کیا نہیں جانتے کہ ہم اہل بیت رسولؐ ہیں"۔ بقول ابن خلدون اور لہوف اشعار پڑھتے تھے جس کا مطلب ہے کہ: میں نے قسم کھائی ہے کہ سوا بہادر کے کسی کو قتل نہ کروں گا۔ اگرچہ موت کو میں نے ایک بری چیز دیکھا مکروہ

جانتا ہوں کہ کسی کو فریب دوں۔ مجھے خوف ہے کہ میں جھٹلایا یا دھوکا دیا جاؤں گا، یا ٹھنڈی چیز میں گرم کڑوی چیز ملا دی جائے، آفتاب کی شعاع لوٹا دی جائے اور وہ ٹھہر جائے ہر شخص کو ایک دن مرنا ہے۔

محاصرہ اور گرفتاری

لشکر آواز دے رہا تھا کہ تم سے نہ جھوٹ بولیں گے نہ فریب کریں گے لیکن مسلمؑ نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی اور پھر حملہ کیا۔ لشکر نے بھی حملہ کر دیا۔
اس وقت بکیر بن حمران اسدی کو موقع مل گیا کہ وہ تلوار کا وار کرتا۔ اس سے مسلمؑ کا بالائی لب کٹ گیا۔ اور دو دانت ٹوٹ گئے لیکن یہ بھی مسلمؑ کے قریب آچکا تھا۔ انھوں نے بھی اس پر وار کیا اور وہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ اب بکیر کے رفقا چھت پر چڑھ گئے اور پتھر اور آگ پھینکنے لگے مسلمؑ بھی جست کر کے قریب پہنچے اور تلوار اپنا کام کرنے لگی۔ اب بعض کے موافق دشمن نے گڑھا کھودا۔ جس وقت مسلمؑ دشمنوں کو پیچھے ہٹاتے چلے جاتے تھے اس میں گر پڑے اور بعض کے موافق کسی نے پشت پر سے نیزہ مارا کہ آپ منھ کے بل گر پڑے اور دشمنوں نے ہجوم کر کے پکڑ لیا۔ اسلحہ چھین لیا گیا اور کسی نے عمامہ بھی اتار لیا۔ جوش جنگ اور زخم سے پیاس کی شدت تھی۔ آپ نے پانی طلب کیا اس وقت عمر الباہلی نے کہا: "قطرہ آب نہ چشی مگر در نار"۔ مسلمؑ نے کہا: "تف ہے تجھ پر تو نے نہایت ہی نازیبا بات کہی۔ تجھے قریشی کہنا غلطی ہوگی تو کسی قریشی باپ کی اولاد نہ سمجھا جائے گا"۔ عمر الباہلی نے کہا تو کون ہے مسلمؑ بن عقیل نے کہا میں وہ شخص ہوں جس نے اس وقت خدا کو پہچانا جب کہ تو منکر تھا۔ اور اس وقت امام کی متابعت کی جس وقت تو گناہ کر رہا تھا۔ میں مسلمؑ بن عقیل ہوں۔ اے باہلہ کے بچے تو جہنم کا زیادہ سزاوار ہے کہ تو نے آل رسولؐ کی متابعت پر آل ابو سفیان کو ترجیح دی۔

حضرت مسلمؑ امامؑ کے لیے متاسف تھے

اس وقت پھر آپ نے پانی طلب کیا کوئی کوزہ آب لایا لیکن پانی لب اور دانتوں کے خون سے سرخ ہو گیا اور دو دانت بھی اس میں گر گئے۔ پانی نہ پیا۔ مؤرخین نے کہا ہے کہ اس وقت آپ کے چہرہ پر آثار حزن ظاہر ہوئے جسے دیکھ کر عبد اللہ اسلمی نے کہا کہ مصیبت کے وقت رونے سے کیا فائدہ لیکن آپ نے جواب دیا کہ میں اپنے لیے نہیں روتا بلکہ میں حسینؑ کے لیے متاسف ہوں۔ اس کے بعد آپ نے محمد بن اشعث سے کہا کہ تو مجھے امان دہی سے عاجز ہے لیکن میری خواہش ہے کہ تو حسینؑ کو میرے حالات سے مطلع کر دے۔
اب زخمی اور مجبور شیر ابن زیاد کے دربار میں لایا گیا۔ اور بقول ابو اسحٰق آپ نے فرمایا: اس شخص پر میرا سلام ہے جو ہدایت پر چلتا ہے۔ موت کے سرانجام سے ڈرتا ہے اور اس سچے اور برتر بادشاہ کی اطاعت کرتا ہے۔ نقیب (بقول ابن خلدون حرسی ازدی) نے کہا: اے مسلمؑ تم نے امیر کو سلام نہیں کیا۔ مسلمؑ نے جواب دیا کہ: امیر تو صرف میرا آقا میرا مالک میرے آقا کا بیٹا میرا پیارا میری آنکھوں کی ٹھنڈک میرے چچا کا بیٹا امام حسینؑ رضی اللہ عنہ بن علیؑ ابن ابی طالبؑ ہے اور کوئی نہیں ہے۔ میں مسلمؑ ابن عقیلؑ ہوں۔ موت سے مجھے کوئی خوف نہیں ہے۔ (نور العین) بقول لہوف فرمایا: وائے ہو تجھ پر چپ رہ وہ میرا حاکم نہیں ہے۔ بقول روضۃ الشہدا جواب دیا کہ اس سلام میں نہ دنیا کا فائدہ ہے نہ عقبیٰ کا۔ بقول ابن خلدون فرمایا: اگر یہ میرے قتل کا قصد رکھتا ہے تو میرا اسلام ہی کیا ہے اور اگر میرے قتل کا ارادہ نہیں ہے تو بہت سلام ہو جائیں گے۔
ابن زیاد بولا میں تجھ کو ضرور ضرور قتل کروں گا۔ مسلمؑ نے کہا میں بھی ایسا ہی خیال کرتا ہوں۔ اچھا تم مجھے

اجازت دو کہ میں اپنی قوم میں سے کسی کو کچھ وصیت کر دوں۔ ابن زیاد نے اجازت دی۔ آپ نے عمرو بن سعد کی طرف متوجہ ہو کر کہا میری اور تمہاری عزیز داری ہے میں تم سے کچھ پوشیدہ بات کیا چاہتا ہوں۔ عمرو بن سعد نے ابن زیاد کی طرف دیکھا۔ ابن زیاد نے کہا جاؤ تخلیہ میں سن لو۔ میں تم کو تمہارے ابن عم کی بات سننے سے نہیں روکتا۔

حضرتِ مُسلمؑ ابن سعد سے وصیت کرتے ہیں

عمرو بن سعد اور مسلم ابن عقیلؑ اٹھ کر ایک گوشہ میں گئے۔ مسلمؑ نے کہا میں نے کوفہ میں فلاں فلاں شخص سے سات سو درہم قرض لے کر اپنی ضرورتوں میں صرف کیا ہے۔ تم اس کو میری طرف سے ادا کر دینا اور بعد میرے قتل ہونے کے میری نعش کو اجازت لے کر دفن کر دینا اور حسینؑ کے پاس پیغام بھیج دینا کہ وہ کوفہ میں نہ آئیں۔

عمرو بن سعد نے یہ سب باتیں ابن زیاد سے بتلائیں۔ ابن زیاد نے کہا تم امین ہو اس میں خیانت نہ کرو۔ مال کی بابت تم کو اختیار ہے جو چاہو کرو۔ حسینؑ کی نسبت یہ کہتا ہوں کہ اگر وہ میری طرف آنے کا ارادہ نہ کریں گے تو میں بھی ان کا قصد نہ کروں گا۔ باقی رہا اس کا لاشہ میں اس بارہ میں تمہاری سفارش نہ سنوں گا۔

ابن زیاد اور حسینؑ کی آمد

ابو اسحٰق، اعثم کوفی اور روضۃ الصفا وغیرہ کے موافق حضرت مسلمؑ نے کہا تھا کہ میرا اسلحہ اور گھوڑا بیچ کر قرض ادا کر دینا۔ اور ابو اسحٰق کے موافق: ابن سعد نے کہا: "زرہ کی فروخت کے نسبت ہم کو اختیار ہے فروخت کریں یا نہ کریں۔ حسینؑ کو یہاں آنے دینا چاہیے تا کہ وہ بھی موت کا ذائقہ چکھ لے"۔ بقول روضۃ الصفا ابن زیاد نے کہا: "واما الحسینؑ فلا کرامۃ"۔

حضرت مُسلمؑ اور ابن زیاد کی گفتگو

اس کے بعد ابن زیاد نے مسلمؑ سے مخاطب ہو کر کہا: تم نے کوفہ میں آ کر گروہ بندی کی۔ لوگوں کو ہمارے برخلاف جمع کیا اور ان میں نفاق ڈالنے کی کوشش کی۔

مسلم ابن عقیل: یہ ہرگز نہیں ہوا لیکن ان شہر والوں نے یہ خیال کیا تھا کہ تمہارے باپ نے ان کے اچھوں کو مار ڈالا ہے۔ خون ریزی کی ہے اور ان کے ساتھ کسریٰ و قیصر کے سے برتاؤ کیے ہیں۔ ہم ان کے بلانے سے ان کے پاس اس غرض سے آئے تھے کہ ان میں عدل و انصاف کریں اور کتاب و سنت پر عمل کرنے کی ہدایت کریں۔

ابن زیاد: تو اور یہ کام۔ کیا ان میں عدل و انصاف نہیں کیا گیا۔ تو مدینہ میں شراب پیتا تھا۔ اور اب یہاں انصاف کرنے کو آیا ہے۔

مسلم ابن عقیل: میں شراب پیتا تھا؟ واللہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ تو جھوٹا ہے۔ میں ایسا نہیں ہوں جیسا تو کہتا ہے۔ بجائے میرے شراب پینے کا وہ شخص مستحق ہے جو مسلمانوں کے خون سے اپنے ہاتھوں کو رنگتا ہے۔ اور اللہ کے بندوں کو غضب و عداوت سے قتل کرتا ہے۔ اور اس کو اس نے لہو و لعب سمجھ لیا ہے۔

ابن زیاد: مجھے اللہ مارے، اگر میں تجھے اس طرح پر قتل نہ کروں کہ آج تک اسلام میں اس طرح کوئی قتل نہ کیا گیا ہو۔

مُسلم: بے شک یہ لیاقت تجھ ہی میں ہے کہ اسلام میں بدعات و بد خلقی و خیانت کا موجد ہو۔

ابن زیاد یہ سن کر جھلا اٹھا۔ ان کو اور حسینؑ و علیؑ و عقیل (رضی اللہ عنہم) کو سخت و سست کہنے لگا۔ مُسلمؑ بن عقیلؑ نے کچھ جواب نہ دیا خاموش رہے۔ بعد اس کے ابن زیاد نے حکم دیا کہ بالائے قصر لے جا کر مُسلمؑ بن عقیلؑ قتل کیے جائیں اور سر کے ساتھ لاشہ بے گور و کفن پھینک دیا جائے۔۔۔۔ لوگ آپ کو بالائے قصر لے گئے۔ آپ اِستغفار کرتے اور تسبیح پڑھتے ہوئے گئے۔ مقام حدائین کے مقابل شہید کیے گئے۔ شہید کرنے والا بکر بن حمران ہے۔ جس پر آپ نے تلوار چلائی تھی۔ اور سر کے ساتھ لاشہ پھینک دیا گیا۔

ضربت اور مُسلم کے الفاظ

صاحب ناسخ التواریخ کے موافق قاتل کی پہلی ضرب نے کام نہیں دیا تو مُسلمؑ نے کہا کہ: یہ خراش کافی نہیں ہے۔ اور ابن زیاد نے سن کہا کہ مرتے وقت مُسلمؑ نے مفاخرت کی۔

ہانیؓ کی شہادت

مُسلمؑ بن عقیلؑ کے شہید ہونے کے بعد محمد بن اشعث نے ہانی کی سفارش کی۔ ابن زیاد نے نا منظور کر کے حکم دیا کہ سر بازار لے جا کر ہانی کی گردن ماری جائے۔ چنانچہ اس کے ایک ترکی غلام نے اس کی تعمیل کی۔ (ابن خلدون) اعثم کوفی کے موافق قاتل ہانی کا نام رشید تھا۔

شہادت کے بعد لاشوں سے برتاؤ

بقول ابی اسحاق: پھر ابن زیاد کے لوگوں نے مُسلمؑ اور ہانی کے جسموں کو بازاروں میں کھینچنا شروع کیا۔ اس کے بعد ابن زیاد نے ان دونوں کے سر کو کاٹ کر ہانی بن جبلہ اور زبیر بن ارواح کے ساتھ یزید کے پاس بھیج دیا۔ بقول اعثم کوفی: بحکم ابن زیاد ہانیؓ اور مُسلمؑ کی لاشیں سولی پر الٹی لٹکا دیں۔

مرثیہ

عبد اللہ ابن زبیر اسدی، فرزدق یا سُلیمان حنفی نے یہ اشعار کہے جس کا ترجمہ ہے کہ: اگر تو نہیں جانتا کہ موت کیا چیز ہے تو ہانی اور فرزند عقیل کی طرف بازاروں میں دیکھ۔ ایسے بہادر کی جانب جس کا منھ تلوار نے توڑا اور دوسرا قتل کر کے کوٹھے سے گرا دیا گیا۔ ان دونوں کو ایک زانی کے بچے نے تکلیف دی۔ اب وہ دونوں ہر راہ گیر کے زبان زد ہو رہے ہیں۔ دیکھتے ہو کہ موت نے بدن کے رنگ کو بدل دیا ہے۔ یقینی خون خالص راستوں میں بہ رہا ہے۔ وہ جوان ایسا باحیا تھا کہ جیسے جوان عورت شرمیلی ہوتی ہے اور ذو دھاری تلوار سے بھی زیادہ کاٹنے والا تھا۔ آیا امن کے ساتھ لوگ اونٹوں پر سوار ہوتے ہیں۔ حالانکہ واقعی قبیلہ مذحج نے اس کے خون کا عوض طلب کیا ہے۔

قبیلہ مراد کے لوگ اس کے ہر طرف پھر رہے ہیں اور ہر ایک ان کے سائل اور مستول کی گردنوں پر ہے۔ اگر تم نے اپنے بھائی کے خون کا عوض نہ لیا تو پھر تم رنڈیاں بن جاؤ جو تھوڑی خرچی پر راضی ہو جاتی ہیں۔

۳ یا ۸ ذیحجہ ۶۰ھ شہادت کی تاریخ

صاحب لہوف کے موافق حضرت مُسلم ۸ ذیحجہ کو شہید ہوئے۔ صاحب سر الشہادتین کے موافق ۳ ذیحجہ کو شہید ہوئے۔ میں نہیں سمجھا کہ ابن خلدون کا کیا منشا ہے جہاں وہ کہتا ہے کہ: "مُسلمؑ بن عقیلؑ کی روانگی کوفہ کی جانب آٹھویں اور بعض

بقول کامل ابن اثیر کے خروج کی تاریخ

کہتے ہیں نویں شب کو ذیقعدہ ۶۰ھ میں ہوئی تھی"۔ درآنحالیکہ وہ پہلے کہہ چکا ہے کہ: "مسلم بن عقیل بہ تعمیل ارشاد پہلی ذی الحجہ ۶۰ھ کو کوفہ میں داخل ہوئے"۔ غالباً اس سے خروج مراد ہے۔ جیسا تاریخ کامل ابن اثیر میں ہے۔

یزید کو اطلاع

اس کے بعد بقول ابواسحاق اسفرائنی ابن زیاد نے یزید کو لکھا: "شکر ہے خدا کا جس نے امیرالمومنینؑ کا حق دلایا اور اس کے دشمن کی شر دفع کی۔ اے امیر! مسلمؑ بن عقیلؑ، ہانی بن عروہ کے گھر میں آیا۔ لوگوں نے دیکھ لیا۔ میں نے ان دونوں کو گرفتار کرایا۔ یہ ان دونوں کے سر ہیں جو ہانی بن جبلہ رواعی اور زبیر بن ارداح یمنی کے ہاتھ ارسال ہیں اور یہ دونوں شخص تابع فرمان ہیں۔ جو کچھ آپ پوچھنا چاہیں ان سے دریافت فرمائیں اور جو چاہیں حکم دیں کیونکہ ان دونوں کو صحیح صحیح حالات معلوم ہیں"۔

یزید کا جواب

یزید نے جواب لکھا: "اے امیر! تم نے ویسی ہی کارروائی کی جو میں چاہتا تھا۔ اور تم نے شیر کی طرح حملہ کیا۔ اب میں نے سنا ہے کہ حسینؑ اپنے اہل و عیال اور قبیلہ سمیت روانہ ہو گیا ہے اور عراق کی طرف آرہا ہے۔ تم کو اس کی طرف جانا چاہیے اور جب تک اس کو قتل کر کے اس کا سر اور اس کے رفیقوں کا سر میری طرف نہ بھیج دو اس وقت تک تم کو تکیہ لگانا اور سیر ہو کر طعام کھانا نہیں چاہیے"۔

بقول اعثم کوفی جب ان دونوں شخصوں نے شہیدوں کے سر اور خط یزید کے حوالہ کیے تو اس نے خط کا مطالعہ کر کے حکم دیا کہ "یہ سر دمشق کے دروازہ پر لٹکا دیے جائیں"۔ اور خود جواب میں لکھا کہ: "تیرا خط آیا۔ مسلمؑ اور ہانی کے سر پہنچے۔ میں بہت خوش ہوا۔ تو مجھے بہت ہی عزیز ہے۔ جیسا میں چاہتا تھا تو ویسا ہی نکلا۔ میں تجھ سے کسی امر کی بازپرس نہیں کرتا۔ جو کچھ تو نے کیا خوب کیا۔۔۔ ہاں یہ بھی سنتا ہوں کہ حسینؑ بن علیؑ مکہ سے نکل کر عراق کا ارادہ رکھتا ہے۔ تجھے بہت ہی احتیاط رکھنی لازم ہے۔ خبرداری کے ساتھ راستوں کو اپنی نگرانی اور حفاظت میں لے لینا چاہیے۔ اور جس شخص کو فسادی سمجھے خواہ قتل کر یا قید میں ڈال، تجھے اختیار ہے۔ اور حسینؑ کی جو جو خبریں تجھے معلوم ہوتی رہیں وقتاً فوقتاً مجھے ان سے مفصل اطلاع دیتا رہ"۔

حسینؑ کے نام جعلی خط

ابواسحاق اسفرائنی کے موافق جب ابن زیاد کو یزید کا خط ملا تو اس نے "جعلی طور پر مسلم کی زبان سے امام حسینؑ کی طرف یوں خط لکھا:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اما بعد اے ابن عم عراق میں ہم کو کامیابی حاصل ہو گئی۔ تمام لوگ مطیع ہیں جلد آئیے، دیر نہ کیجیے۔ لوگوں کے دل ہمارے ساتھ ہیں اور وہ آپ کی امداد کے لیے چشم براہ ہیں۔ جلد اٹھیے اور جلد آئیے"۔

پھر ابن زیاد نے خط لپیٹا اور اہل کوفہ میں سے ایک شخص کو دے کر حکم دیا کہ حسینؑ سے ملو۔ راستہ میں مدینہ میں یا مکہ میں جہاں ملو یہ خط اس کو دیدو۔ اس نے کہا بسر و چشم۔ خط لیا اور روانہ ہوا۔ جب مدینہ تک ایک منزل رہ گئی تو اس کو امام حسینؑ ملے جو اسی روز مدینہ سے روانہ ہوئے تھے۔ تمام عصر کا وقت تھا۔ قاصد نے وہ خط ان کو دیا جس کو امام حسینؑ نے لے کر پڑھا اور سمجھا اور نہایت خوش ہوئے۔ پھر باقی تمام لوگوں کو بھی سنایا۔ پھر امام حسینؑ نے تمام لوگوں کو اسی جگہ

۱۵ ذی الحجہ

مقام کرنے اور دن کا باقی حصہ اور رات گزارنے کا حکم دیا۔ اس روز ذوالحجہ کی پندرھویں تاریخ تھی۔ ابن زیاد کا قاصد ان سے رخصت ہو گیا اور جنگلوں اور بیابانوں کو طے کرتا ہوا ابن زیاد کے پاس پہنچا۔ اور اس کو امام حسینؑ کے حالات بتانے کہ وہ خط کو پڑھ کر بہت خوش ہوئے اور عنقریب کوفہ آنے والے ہیں۔ ابن زیاد نے فوراً کھڑے ہو کر حصین بن نمیر کو ایک ہزار سوار دے کر امام حسینؑ کی نگرانی کے لیے بھیجا کہ ان کو کوفہ تک لے آئے۔ تاکہ وہ کہیں مسلمؑ کی خبر سن کر بھاگ نہ جائیں اور قتل سے نہ بچ جائیں۔ حصین یہ حکم لے کر روانہ ہوا اور قادسیہ پہنچا

۳ یا ۸ یا ۱۰ ذی الحجہ کو حسینؑ کوفہ روانہ ہوئے

واقعات نے اپنی ترتیب اس طرح قائم کی تھی کہ حسینؑ یا تو مکہ معظمہ سے مسلم بن عقیلؑ کی شہادت کے روز روانہ ہوئے اور یا ایک آدھ روز قبل یا ایک آدھ روز بعد۔ مثلاً صاحب لہوف اور روضۃ الصفا کے موافق ۳ یا آٹھویں کو اور موافق ابن خلدون دسویں ذی الحجہ ۶۰ھ کو روانہ ہوئے۔ صاحب سرالشہادتین کے نزدیک تیسری کو حضرت مسلمؑ شہید ہوئے اور "جس دن مسلمؑ شہید ہوئے اسی دن چلے امام حسینؑ علیہ السلام مکہ سے کوفہ کی طرف

منگل کا دن

اور بعضوں نے کہا ہے کہ آٹھویں ذی الحجہ کو"۔ اعثم کوفی کے موافق "ترویہ کے وقت ۹ ذی الحجہ کو منگل کے دن مکہ سے نکلے"۔ اور اسی طرح حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کے مکہ سے روانگی کے وجوہات بھی مورخین میں اختلاف کی چیز ہیں۔ مثلاً عموماً مورخین نے یہ وجہ بتائی ہے کہ حضرت امام حسینؑ علیہ السلام مسلم بن عقیلؑ کا یہ خط پا کر روانہ ہوئے کہ ہمارے ہاتھ پر اٹھارہ ہزار آدمیوں نے بیعت کی ہے۔ آپ جلد تشریف لائیے۔ لیکن

حضرت نے کب سفر عراق کا ارادہ کیا

اعثم کوفی کے موافق کوفہ کا کوئی شخص وارد ہوا اور اس سے مسلمؑ کی خبر شہادت معلوم ہوئی اور "اسی وقت سفر عراق کا مصمم ارادہ کر لیا"۔ اور پھر مولف خصائص حسینیہ کے موافق حضرت امام حسینؑ علیہ السلام حضرت محمد ابن حنفیہ کے جواب میں فرماتے ہیں کہ: "اے بھائی ڈرتا ہوں میں کہ یزید ملعون مکر سے مجھے یہاں قتل کرے اور بسبب میرے قتل کے حرمت خانہ خدا ضائع ہو جائے"۔ لہوف کے نوٹ میں بھی یہی ہے۔

ابن عمر مکہ کے لوگوں کے متعلق

اور اعثم کوفی میں جس وقت ابن عباس اور ابن عمر مکہ سے مدینہ کی طرف روانگی کا قصد کرتے ہیں تو آخری مرتبہ حسینؑ کے پاس آ کر ابن عمر کہتے ہیں: "لوگوں نے یزید سے بیعت کر لی ہے اور مکہ والے بھی دولت و زر کی لالچ سے اسی کی طرف جھکیں گے۔ آپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے یا شہید کر دیں گے"۔

حضرت کا جواب کہ دشمن مکہ میں نہ رہنے دیں گے

امام حسینؑ نے فرمایا: اے ابن عمر افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہ لوگ مجھے گھر میں بھی بیٹھنے نہ دیں گے۔ مجھ سے الجھیں گے اور اگر میں ان میں سے نکل کر کسی نامعلوم جگہ چلا جاؤں گا تو بھی ڈھونڈھ نکالیں گے اور بیعت یزید کے لیے مجبور کریں گے۔ اور اگر انکار کروں گا تو قتل کر دیں گے۔۔۔۔ اے ابا عبدالرحمٰن خدا سے ڈر اور میرا ساتھ نہ چھوڑ اور امداد سے منہ نہ موڑ تو میرا مددگار رہ اور بعد نماز دعائے خیر سے یاد کرتا رہ۔ اگر تو اس وقت مجبور ہے اور

میرے ساتھ نہیں رہ سکتا تو میں تجھے معاف رکھتا ہوں۔۔۔ ان لوگوں کی بیعت اختیار کرنے میں جلدی نہ کرنا۔ اس قدر ضرور توقف کرنا چاہیے کہ تجھے انجام کار کی اطلاع ہوجائے۔۔۔۔ اب ان حضرت نے ابن عباس کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا:

حضرت مکہ میں اپنا موقع ظاہر فرماتے ہیں

میں مکہ ہی میں رہوں گا جب تک یہاں کے لوگ میرے دوست رہیں گے اور میری مدد کریں گے۔ جب یہ معلوم ہوجائے گا کہ ان کے ارادے بدل گئے اور میرا ساتھ نہ دیں گے تو میں بھی اس کلمہ کو یاد کروں گا جو ابراہیم پیغمبر آگ میں ڈالے جانے کے وقت فرماتے تھے کہ: حسبنا اللہ و نعم الوکیل۔ اور پھر میں کسی اور جگہ چلا جاؤں گا۔ صاحب البلاء المبین تاریخ ابن جریر طبری سے نقل فرماتے ہیں کہ: "حضرت نے فرمایا کہ اے فرزدق اگر میں جانے میں عجلت نہ کروں تو دشمن گرفتار کر کے لے جائیں گے"۔ صاحب وسیلۃ النجات فرماتے ہیں کہ:

"چوں یزید پلید جمعے را فرستادہ بود کہ بزمانۂ حج آں حضرت را گرفتہ نزد او برند یا بہ قتل آرند حضرت احرام حج را بہ عمرہ عدول نمودہ و اعمال عمرہ بجا آوردہ محل شد و متوجہ عراق گردید"۔ یعنی: چونکہ یزید نے ایک گروہ کو بھیجا تھا کہ حج کے وقت آپ کو پکڑ کر اس کے پاس لے جائیں یا قتل کردیں۔ حضرت نے حج کو عمرہ میں بدلا اور عمرہ کے اعمال بجالانے کے بعد محل ہوگئے اور عراق کی طرف روانہ ہوئے۔

صاحب ناسخ التواریخ طریحی کی منتخب سے نقل کرتے ہیں کہ یزید نے تیس آدمیوں کو حاجیوں کے بھیس میں بھیجا تھا کہ حسینؑ کو گرفتار کرلیں اور اگر گرفتار نہ ہوں تو قتل کرڈالیں۔

اعثم کوفی کے موافق جس وقت حضرت امام حسینؑ علیہ السلام مکہ سے کوچ فرماچکے ہیں کہ منزل ثعلبیہ پہنچنے کے دوسرے دن صبح کو "ایک کوفی ابوہریرہ ازدی نے حسینؑ بن علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوکر سلام کیا اور کہا اے فرزند رسولؐ تم کس لیے حرم خدا و رسولؐ سے چلے آئے۔ آپ نے فرمایا اے اباہریرہ بنی امیہ نے ہمارا مال مارلیا۔ ہم نے صبر کیا ہمیں سخت وسست کہا ہم نے صبر کیا۔ اب قتل کرنا چاہا تو میں وہاں سے نکل آیا۔ اے اباہریرہ خدا کی قسم میں باغیوں کے ہاتھ سے مارا جاؤں گا اور میری ہلاکت کے بعد اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ذلت و خواری کا لباس پہنائے گا۔ ایک زبردست قوم ان پر مسلط ہوگی جو انھیں ایسا ذلیل و خوار کرے گی جیسا زبردست کمزور کو خراب کرتا ہے"۔

بقول روضۃ الشہدا کسی کے بھگانے پر کہ مکہ سے کوفہ نہ جائیں۔ فرمایا کہ:

"آنجا از الزام حجت ایشان اندیشہ مندم و این جا از بیم اعادی در گزندم"۔

یعنی: "وہاں نہ جاؤں تو ان کی حجت پوری ہوجانے سے فکر مند ہوں۔ اور یہاں دشمنوں کی طرف سے خوف سے تکلیف میں ہوں"۔

باب ہشتم

واقعات کا نشو

مفید تنقیحات واقعات کا اس حد تک پہنچنا یہ دو نتیجے پیدا کر دیتا ہے کہ : ● آیا حضرت امام حسین علیہ السلام کی روش نزاعی تھی دفاعی؟ ● اور حضرت مسلمؑ کا خط کوفہ سے حضرت امام حسین علیہ السلام کے نام اس مضمون کا پہنچا یا نہیں کہ آپ کوفہ تشریف لائیے لوگ آپ کی خلافت کے لیے آمادہ ہیں؟۔ میں یہ بھی ضمنی نتیجے قائم کرتا ہوں کہ اگر بفرض محال حسینؑ نے یزید کی سلطنت کے الٹ دینے کا قصد کیا تو یہ کوشش کب تھی، کیسی تھی اور حضرت نے کامیابی کے لیے کونسے وسائل اختیار کیے؟۔

میں دوسرے نتیجے سے ابتدا کرتا ہوں۔

حضرت مسلمؑ کا کوئی خط بنا بر طلب حضرت امام حسینؑ کے پاس نہیں پہنچا اس کے متعلق میرا تصفیہ ہے کہ حضرت مسلمؑ بن عقیل کو اس کا موقع ہی نہیں ملا کہ وہ حضرت امام حسین علیہ السلام کو اطلاع دیتے اور اگر اطلاع دی بھی تو وہ حضرتؑ تک نہیں پہنچی۔ پس اگر ایسا ہوا کہ حضرت مسلمؑ بن عقیل کی کوئی اطلاع بنا بر طلب حضرت امام حسین علیہ السلام کے پاس نہ پہنچی تو یہ خیال قطعاً غلط ہو جائے گا کہ کوفہ میں حصول خلافت کے لیے ایک جماعت کو اپنا مددگار پا کر حضرت امام حسین علیہ السلام نے مکہ سے کوچ فرمایا۔ اس کے لیے میرے وجوہات یہ ہیں :

حضرت مسلمؑ کے خط کی عبارت۔ زمانہ اور مقام کون ہے وہ مورخین جنھوں نے متذکرہ صدر گمان کیا ہے انھوں نے وہ وقت اور جگہ اور عبارت نہیں بتائی ہے جب اور جہاں اور جن لفظوں میں حضرت خامس آل عبا علیہ التحیۃ و الثنا کو حضرت مسلمؑ کا خط ملا۔ بلکہ روا روی میں کہیں ضمنی تذکرہ کر دیا ہے کہ حضرت کو مسلمؑ کا خط ملا، اور اس وجہ سے وہ کوفہ روانہ ہوئے۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جب نسبتاً غیر مفید واقعات کی اکثر صراحت موجود ہے تو وہ وقت اور جگہ ذکر کے قابل تھی جہاں حضرتؑ کو ایک ایسا خط ملتا جس کے بعد کا کوئی اقدام مسلمانوں، تاریخ اسلام اور تاریخ حجاز و عرب و شام میں خصوصیت سے دیکھا جاتا۔ اس لیے کہ ایسی صورت میں حضرتؑ کا روانہ ہونا غور سے دیکھنے کی بات ہوتی کہ دیکھیے حسینؑ کا حرکت کرنا ان کے یا دمشق کے تخت کے لیے کیا کرتا ہے۔

بڑے مسائل حسینؑ کا کوئی اقدام نہ صرف سیاسی حیثیت سے ایک مفید مسئلہ ہوتا بلکہ حسینؑ کی ذات کا کسی ایسے امر کے لیے آمادہ ہونا یہ امید و بیم پیدا کرتا کہ دیکھیے حسینؑ کے نانا کا نظام پھر اپنی جگہ پر قائم ہوتا ہے یا بنی امیہ اپنی جگہ بے جنبش ثابت ہوتے ہیں۔

کیا کہیں مُسلم کے خط کا اِشارہ ملتا ہے

وہ لوگ جو حضرتؑ کو صلاحیں دیتے ہیں وہ یہ اس کے کہ ایسی مُبہم باتیں کہیں کہ اہلِ کوفہ پر اعتبار نہ کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ ان کا سیاق آپ کے بھائی اور پدرِ بزرگوار کے متعلق امید خیز نہیں ہے۔ یا یہ کہیں کہ اللہ نہیں چاہتا کہ نبوت اور خلافت ایک خاندان میں ہوں۔ کہیں مُسلمؑ بن عقیل کے خط کا تذکرہ نہیں ہوتا اور کوئی اس کی تنقید یا تائید نہیں کرتا نہ اس کا تذکرہ کرتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ حضرتؑ نے اس خبر کو بصیغہ راز رکھا۔ لیکن اس خبر کا موجود ہونا کہ کبھی مکہ معظمہ میں مُسلمؑ کا خط آیا، اور اس میں اٹھارہ ہزار آدمیوں کے بیعت کرنے اور بلانے کی خبر تھی اس کی تردید کرتا ہے کہ یہ بصیغہ راز رکھا گیا۔ حالانکہ یہ بجائے خود ایک غور طلب بات ہے کہ ان باتوں کو حضرت امام حسینؑ ظاہر کرسکتے تھے یا نہیں ظاہر فرماسکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ مکہ معظمہ میں جہاں سے یزید کا عامل خارج نہ ہوا تھا ایک ایسی خبر کا شائع کردینا کسی طرح قرین مصلحت نہ تھا کہ یزید کی عملداری کے ایک حصہ کے لوگ اس کی حکومت کو الٹ دینے کی فکر میں ہیں اور جسے اپنا مرکز قرار دینا چاہتے ہیں، وہ مکہ میں موجود ہے اور پھر بھی عامل مکہ کوئی باز پرس جائز نہ سمجھتا یا یہ کہ اپنے ولی نعمت یزید کو اس کی اطلاع نہ دیتا۔ اور پھر سب پر طرہ یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ ایک ایسے صیغہ راز کی خبر ظاہر ہوجاتی ہے۔ جس سے یزید کو حسینؑ کے روکنے یا کوفہ میں انتظام کرنے کا وقت ملے تاہم مؤرخین کے پاس نہ اس خط کی نقل ہے نہ وہ مقام اور وقت معلوم ہے جس وقت کہ مُسلمؑ کا یہ مفید خط حسینؑ کے پاس آیا۔ اور نہ کوئی حسینؑ کو اس کی مبارک باد دیتا ہے کہ اہلِ کوفہ اتنی بڑی جماعت سے آپ کی مدد کے لیے تیار ہیں۔ اگر درمیانی آفت سے محفوظ کوفہ پہنچ گئے تو کامیابی میں دیر نہیں ہے۔ لوگوں کا روکنا اہلِ کوفہ کے خطوط کے لحاظ سے تھا۔ اور نہ کہیں یہ تذکرہ ہے کہ کسی نے حضرتؑ سے یہ کہا ہوتا کہ یہ اطلاع جو مُسلمؑ نے اٹھارہ ہزار آدمیوں کے متعلق آپ کے پاس بھیجی ہے یہ تمام یا زیادہ تر آدمی ناقابلِ اعتبار ہیں۔

مُسلمؑ کے خط کی تمام فطری صُورتیں مفقود ہیں

اور اب بھی ہم کو ان کی مدد کا یقین نہیں ہے۔ آپ یقین کرنے کے لیے کچھ اور وسائل اختیار کیجیے۔ غرض کہ اس یقین کی تمام فطری صورتیں جس سے یہ سمجھا جاتا کہ مُسلمؑ کا خط آیا یا نہیں مفقود ہیں اور سمجھ میں یہ آتا ہے کہ وہ جگہ اور وقت ہی خلق نہیں ہوا جہاں اور جب حضرتؑ کو مُسلمؑ کا خط ملتا۔

اگر عوام کو نہیں تو کم سے کم ابنِ عباس اور محمد ابنِ حنفیہ مطلع ہوتے اور خط کے مُتعلق گفتگو کرتے

بفرضِ محال ایسا ہوا کہ حضرتؑ نے اسے عامہ ناس کو نہیں دکھایا لیکن مورخین نے اس کا تذکرہ کب کیا ہے کہ حضرتؑ نے ابنِ عباس اور حضرت محمد ابنِ حنفیہ کو یہ خط دکھایا، اور انھوں نے مضمون خط پر مطلع ہو کر اس کے متعلق یہ یہ کہا۔ کچھ نہیں۔ بلکہ جو کچھ باتیں ہوئیں وہ اس تذکرہ اور اس خط کے تعین سے بالکل علیحدہ ہیں۔

نا ممکن

مؤرخین میں اعثم کوفی نے یہ اختنا کی ہے کہ حضرتؑ کو مُسلمؑ کی شہادت کی خبر مکہ ہی میں دلوائی ہے۔ یہ مؤرخین کے اس عام اعتراف کے منافی ہے کہ حضرت امام حسینؑ نے مکہ سے اسی دن کوچ کیا جس دن

کوفہ میں حضرت مسلمؑ شہید ہوئے۔ یہ قطعاً ناممکن تھا کہ جس روز حضرت مسلمؑ شہید ہوتے اسی روز حضرتؑ کو مسلمؑ کی شہادت کی خبر معلوم ہو جاتی اور اسی روز روانہ ہو جاتے اور اگر شہادت کے چند روز بعد خبر معلوم ہوتی ہے تو یہ خبر قطعاً غلط ہو جاتی ہے کہ حضرتؑ دس ذی الحجہ تک روانہ نہیں ہو گئے حالانکہ یہ مستند امر ہے کہ حضرتؑ حج نہیں کر سکے۔ اس کے علاوہ اسے کوئی شخص قبول نہ کرے گا کہ ایسی حالت میں جب کہ حضرتؑ کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ حضرت مسلمؑ شہید ہو چکے اور ان کا شہید ہونا اس وجہ سے تھا کہ اہلِ کوفہ نے ان کی مدد نہ کی تو وہ فوراً ہی کوفہ کی روانگی کا قصد فرماتے۔

جعلی خط بھی قریب مدینہ ملا

ابو اسحٰق اسفرائنی نے ایک دوسری صورت پیش کی ہے کہ ابن زیاد نے ایک جعلی خط حضرتؑ کے پاس بھیجا۔ اس سے ہمارے اس سوال پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ حضرتؑ نے حصول خلافت کی کسی امید پر مکہ کے قیام کو ترک کیا۔ بلکہ یہ جعلی خط حضرتؑ کو مدینہ کے قریب ملا۔ یعنی خط اس وقت ملا جس وقت کہ حضرتؑ مکہ کے قیام کو ترک کر چکے تھے۔ کیوں ترک کیا تھا اس کی وجہ بیان کی جاتی ہے۔

گرفتار شدہ خط کے مُرسلہ مُسلم ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے

اعثم کوئی میرے اس گمان کے صاف کرنے میں مدد دیتا ہے کہ اگر مسلمؑ نے کوئی اطلاع بھیجی تھی تو وہ حضرتؑ تک نہ پہنچی۔ میں نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ابن زیاد کے ایک خادم مالک بن یربوع تمیمی نے مسلمؑ کے قاصد عبداللہ بن یقطین کو گرفتار کیا اور وہ خط جس میں یہ اطلاع تھی کہ بیس ہزار آدمیوں نے بیعت کی ہے گرفتار ہو گیا۔ حالانکہ اس خط سے یہ یقینی تصفیہ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ مسلمؑ نے لکھا تھا۔ اس لیے کہ یہ خط مسلمؑ کی طرف سے حسینؑ کے نام تھا۔ کسی کی طرف سے کسی کے نام خط ہونا اس شخص کی طرف سے خط ہونے کا حتمی ثبوت نہیں ہے تاوقتیکہ ثبوت کے دیگر ذرائع سے جانچ نہ ہو۔ اور کہیں اس کا تذکرہ نہیں ہے کہ کسی نے کہا کہ اس خط میں مسلمؑ کے دستخط ہم پہچانتے ہیں۔

اگر ابن زیاد مسلمؑ کی طرف سے کوئی جعلی خط لکھ سکتا تھا کہ حسینؑ ہمارے قبضہ میں آجائیں تو اسی طرح یہ ممکن تھا کہ حسینؑ کا کوئی دوست اپنی غرض سے ایک جعلی خط مسلمؑ کی طرف سے حسینؑ کے نام بھیج دیتا اور یہ اس کا جذبہ شوق سمجھا جاتا۔ اس وقت جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ قرینہ ہے کہ خط مسلمؑ نے لکھا ہو۔ جو کچھ بھی ہو اگر مسلمؑ ہی نے یہ خط بھیجا تو یہ اس وقت تھا جب کہ وہ دار مختار سے ہانی کے گھر منتقل ہو چکے تھے۔ یعنی اپنی شہادت کے صرف ایک آدھ دن قبل۔ خط کی عبارت سے یہ بھی کچھ میں آتا ہے کہ حسینؑ کی طلب کے متعلق یہ پہلا خط تھا۔ جو حسینؑ تک نہ پہنچا۔ اگر ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ

دارِ ہانی سے روانہ شدہ خط حسینؑ کو مکہ میں نہیں مل سکتا تھا

مسلمؑ کا خط جو دارِ ہانی سے روانہ ہوا تھا گرفتار نہیں ہوا تاہم یہ خط کوفہ سے ۶ یا ۷ کو روانہ ہوتا ہے۔ اور اس صورت میں کسی اور منزل پر ملے تو ملے مکہ میں حسینؑ کو نہیں مل سکتا تھا۔ اور اس سے بھی اس کی تردید ہو جاتی ہے کہ حسینؑ نے اس سامان کے بھروسے پر قیام مکہ نہیں ترک کیا۔

فاصلہ اور معلومہ تاریخ

اب میں اس سوال کو فاصلہ اور معلومہ تاریخ کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ نور العین فی مشہد الحسینؑ میں ابو اسحٰق اسفرائنی حضرت مسلمؑ کی روانگی کی تاریخ

۱۲ ذیقعدہ ۶۰ھ بتاتے ہیں۔ اور ابن خلدون کے موافق حضرت مسلمؑ یکم ذی الحجہ ۶۰ھ کو کوفہ میں داخل ہوگئے تھے،

اٹھارہ دن میں مکہ سے کوفہ

اس حساب سے حضرت مسلمؑ مکہ سے کوفہ اٹھارہ دن میں پہنچے۔ مکہ سے کوفہ اٹھارہ دن میں پہنچنے کی تصدیق قریب قریب اس حساب سے بھی ہوجاتی ہے کہ حضرت امام حسینؑ ۹ ذالحجہ کو مکہ سے روانہ ہوئے اور ۳ محرم کو کربلا پہنچے تو اس لحاظ سے قریب ۲۳ دن کے ہوتے ہیں۔ یعنی پانچ دن زیادہ ہیں۔ اس میں چونکہ کربلا کوفہ سے ایک منزل پیچھے ہے۔ اس لیے ایک دن کم ہوگیا۔ چار دن یا تو کہیں مقام کیا گیا یا بوجہ اس کے کہ حضرتؑ کے ساتھ ایک پورا قافلہ تھا۔ کہیں کچھ عرصہ ہوا۔

مدینہ سے کوفہ چھ دن میں

یہ تمام حاجی جانتے ہیں کہ مکہ سے مدینہ میں قافلہ بارہ یا تیرہ دن میں پہنچتا ہے۔ اگر مسلمؑ کے لیے بارہ دن بھی تجویز کیے جائیں تو گویا مدینہ سے کوفہ کا راستہ چھ دن میں طے ہوتا ہے۔ اس چھ دن کی مدت کی تصدیق غالباً ابو اسحٰق اسفرائنی کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ ابن زیاد کا جعلی خط ۱۵ ذی الحجہ کو حسینؑ کے پاس قریب مدینہ پہنچا۔ یعنی حضرت مسلمؑ آٹھ ذالحجہ کو شہید ہوئے۔ اسی روز قاصد روانہ کیا گیا۔ اور چھ دن میں حسینؑ کے پہنچ گیا۔

حضرت امام حسینؑ ۱۶ شعبان کو مکہ میں موجود تھے

حضرت امام حسین علیہ السّلام چوتھی شعبان کو مدینہ سے مکہ روانہ ہوئے اور چونکہ حضرتؑ بھی انتشار کے عالم میں تھے۔ ہم حضرتؑ کے مکہ پہنچنے کے لیے بھی بارہ دن تجویز کرتے ہیں اور اس لحاظ سے حضرتؑ ۱۶ شعبان کو مکہ میں موجود تھے۔

ایک مہینہ چھ دن اور اس کا حساب

اب علامہ مجلسی کے موافق کوفہ کا پہلا قاصد حضرت امام حسینؑ کے پاس مکہ میں دسویں رمضان کو پہنچا۔ یعنی حضرتؑ کی مدینہ سے تاریخ روانگی اور مکہ میں کوفہ کا قاصد پہنچنے کے درمیان ایک مہینہ چھ دن کا وقفہ ہے۔ چونکہ مدینہ سے کوفہ خبر پہنچنے تک چھ دن صرف ہوتے ہیں اور اٹھارہ دن میں آدمی کوفہ سے مکہ پہنچتا ہے۔ اس لیے چوبیس دن کا حساب معلوم ہے۔ اب ایک مہینہ چھ دن میں چوبیس دن کی تفریق کرنے سے بارہ دن باقی رہتے ہیں۔ یہ بارہ دن غالباً اس طرح صرف ہوئے کہ کچھ تو حضرت امام علیہ السّلام کے مدینہ سے مکہ روانہ ہونے کے ساتھ ہی کوئی مدینہ سے کوفہ روانہ نہیں ہوا۔ اور دو چار دن کا عرصہ ہوا۔ یا مدینہ سے کوفہ آدمی چھ دن سے ایک آدھ دن زیادہ میں پہنچتا ہے، یا بقیہ دن ان دونوں لحاظ کے بعد اہل کوفہ کے غور و مشورت میں بسر ہوئے۔ اور چونکہ اہل کوفہ نے متواتر تین وفد روانہ کیے جن میں کا پہلا روانہ ہوچکنے کے بعد دوسرا دو راتوں کے بعد روانہ ہوا۔

تیسرا وفد ۱۴ رمضانؑ کو مکہ میںؑ

ہم قیاس کرتے ہیں کہ تیسرا بھی دو ہی دن کے بعد روانہ ہوا، اور اس طرح تیسرا وفد مکہ میں ۱۴ رمضان المبارک کو پہنچا۔ حضرتؑ نے یا کچھ نہ فرمایا، یا بہ لطف واپس کیا۔

۲ر شوال کو کوفہ واپس پھر اکیس شوال کو مکہ میں

اس لیے اگر یہ پندرہ رمضان ہی کو روانہ ہو گیا تو کوفہ میں اٹھارہ دن کے بعد یعنی ۳ر شوال کو پہنچا۔ اب بلحاظ اس کے کہ اہل کوفہ بہت سرگرم تھے، ان کے روساء کا وفد اسی روز روانہ ہو گیا۔ اور پھر اکیس شوال کو مکہ پہنچ گیا۔ اب اگر یہ اٹھارہ دن میں انکاری جواب سے واپس کیے جائیں تو یہ کوفہ ۹ر ذیقعدہ کو پہنچیں گے۔ اور اس لیے آخری قاصد کا وقت نہیں رہے گا۔

چوتھے قاصد کے لیے وقت کی کمی اور رعایت

اس لیے ہم فرض کرتے ہیں کہ جس روز یہ کوفہ پہنچے اسی روز کوفہ کا آخری قاصد مکہ پہنچا۔ اور دو روز کے غور کے بعد ۱۲ر ذیقعدہ کو حضرتؑ نے مسلمؑ کو کوفہ کی طرف روانہ کر دیا۔ اور یکم ذی الحجہ کو کوفہ پہنچ گئے۔

مدت اور کاموں کی فہرست

ہم نے تاریخ اور دنوں کی مدت میں اس لیے رعایت کی ہے کہ یہ سمجھائیں کہ باوجود ان لحاظ کے بھی یا اور جو کچھ ہم سے چاہا جائے یہ ناممکن ہے کہ پہلی ذی الحجہ (یعنی مسلمؑ کے کوفہ پہنچنے کی تاریخ سے ۳ر تاریخ یا آٹھویں تاریخ جس درمیان میں وہ شہید ہوئے یا دسویں تاریخ تک جس روز حضرت امام حسینؑ مکہ سے روانہ ہوئے) سے آٹھ ذی الحجہ تک حضرت مسلمؑ کوفہ پہنچے ہوں۔ لوگوں کو خبر ہوئی ہو یزید کے جاسوس نے دمشق خبر بھی ہو۔ (واقعات عثمان میں ہم کہہ چکے ہیں کہ مالک اشتر شام سے کوفہ تیرہ دن میں پہنچے تھے) یزید نے ابن زیاد کو بصرہ خبر دی ہو۔ ابن زیاد بصرہ سے کوفہ آیا ہو۔ مسلمؑ کے نظام میں ابتری ہوئی ہو۔ جاسوس ڈھونڈتا رہا ہو۔ پھر سے مسلمؑ نے بھرتی شروع کی ہو۔ اطمینان ہو گیا ہو کہ لوگ ثابت قدم رہیں گے اور پھر اس کے بعد حسینؑ کو خط روانہ کیا ہو، اور یہ خبر پا کر حضرتؑ روانہ ہوئے ہوں!۔

ممکن کمزوری کا اقرار

مجھے اس کا اقرار ہے کہ ممکن ہے کہ میرے معلومہ فاصلہ اور تاریخ کے لحاظ سے لا معلوم فاصلہ اور مدت کا استنباط غلط ہو۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان مقامات کے مقامی اور صوبہ کے نقشہ اور اس کا اسکیل نہ ہونے کی وجہ سے کوئی یقینی صحیح بنیاد کھڑے ہونے کے لیے نہیں ہے۔ اور نہ طریقہ سفر یا شرح طے مراحل ہے کہ کس قدر مسافت کس قدر عرصہ میں طے ہوتی ہے۔

مؤرخین کے غلط استنباط کی وجہ

لیکن چونکہ عرب آج بھی ویسا ہے جیسا ہماری تاریخ کے وقت تھا۔ خصوصاً اس کا طریقہ سفر، اس لحاظ سے ممکن ہے کہ کسی جغرافیہ نویس حاجی اور زائر کا سفرنامہ مفید ہوتا لیکن ایسا مکمل سفرنامہ یا تو موجود نہیں ہے یا میری نظر سے نہیں گزرا۔ تاہم اگر کوئی بڑی مضبوط اور یقینی وجہ میرے حساب کی نہ بھی ہو تاہم مجھے یقین ہے کہ میں موٹی موٹی باتوں میں یقین سے دور نہیں ہوں اور میری اس تنقیح کا جواب اطمینان تک ہو جاتا ہے کہ حضرت مسلمؑ کے کسی خط کی وجہ سے حضرتؑ نے قیام مکہ کو ترک نہیں کیا۔ مؤرخین کا یہ گمان یا مفروضہ اس بنیاد پر ہے کہ چونکہ حضرت مسلمؑ روانہ ہو چکے تھے اور چونکہ حضرت امام حسینؑ بھی کوفہ ہی روانہ ہوئے اس لیے انھوں نے حضرت امام حسینؑ کی روانگی کو حضرت مسلمؑ کی کسی اطلاع کا نتیجہ سمجھ لیا۔ اس طریقہ استنباط پر مجھے بے ساختہ انجیل کی ایسی ہی منطق یاد آجاتی ہے کہ: "مسیح ایسا ایسا کرے گا۔ عیسیٰ مسیح ہیں اس لیے

انھوں نے ایسا ایسا کیا ہوگا"۔

اب میں اس تنقیح پر نظر ڈالتا ہوں کہ آیا حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کی روش نزاعی تھی یا دفاعی؟

پہلی تنقیح کے متعلق مؤلف دیگر مؤرخین کے خیالات پیش کرتا ہے

اس کے متعلق خود کچھ عرض کرنے کے قبل میں سید مرتضیٰ علم الہدیٰ اور علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ کے ارشاد کو بکار سے نقل کرتا ہوں۔ گبن کے خیالات ڈکلائن اینڈ فال آف رومن امپائر سے مسیو ماربین کے فلسفہ شیعہ سے اور علی بن عیسیٰ اربلی کے کشف الغمہ فی معرفۃ الائمہ سے پیش کرتا ہوں۔ میں اس کے علاوہ اقوال بھی پیش کروں گا۔ اقوال نقل کرنے سے میری غرض محض اطلاعاً نقل ہوگی اور بس۔

علم الہدیٰ کا ارشاد

سید مرتضیٰ علم الہدیٰ رضی اللہ عنہ تنزیہ الانبیا میں فرماتے ہیں اگر کوئی سوال کرے کہ حضرت امام حسینؑ کو کیا عذر شرعی داعی ہوا کہ مکہ معظمہ سے حضرتؑ نے مع اہل و عیال سفر عراق فرمایا۔ حالانکہ دشمنان حضرتؑ وہاں مستولی تھے۔ اور حاکم وہاں کا یزید پلید کی طرف سے قابض و متصرف تھا اور زمام امر و نہی اس کے دست اختیار میں تھا اور حضرتؑ کوفیوں کے مکر و غدر سے بسبب اپنے پدر بزرگوار و برادر والا مقدار کے خوب واقف تھے۔ اور کیونکر اس جناب نے خلاف مشورہ احباب عمل فرمایا۔ چنانچہ ابن عباس وغیرہ مانع سفر ہوتے اور حضرتؑ سے اظہار ہلاکت کرتے تھے اور عبداللہ بن عمر جب حضرتؑ کے وداع کو آئے استودعك من قتيل کہا یعنی میں تمھیں خدا کو سونپتا ہوں اور جانتا ہوں کہ قتل ہو گے۔ اسی طرح ایک جماعت کثیر نے اس جناب کو مشورہ سفر کا نہ دیا۔ اور جب حضرتؑ نے شہادت مسلم ابن عقیل کی سنی تھی اثنائے راہ سے کیوں نہ پھرے اور اس قوم کے مکر و حیلہ پر کیوں متفطن نہ ہوئے اور کیونکر ان کے لیے جائز ہوا کہ باوجود قلت انصار کے اس جمع کثیر و جم غفیر کے محاربہ پر پیش قدمی کی جس وقت ابن زیاد نے امان کا وعدہ کیا۔ اور بیعت یزید چاہی کس لیے حضرتؑ نے قبول نہ کیا۔ اور کیوں اپنے خون اور اپنے اہل بیت و اصحاب اور اپنے شیعوں کے خون کی محافظت نہ فرمائی۔ اور کیوں حضرتؑ نے اپنے نفس کو تہلکہ میں ڈالا۔ حالانکہ ان کے برادر بزرگوار حضرت امام حسنؑ نے بسبب ادنیٰ خوف کے حضرتؑ نے خلافت معاویہ کے سپرد کی تھی۔ پس کس طرح جمع کیا جائے فعل حضرتؑ اور ان کے برادر نامدار کے باب میں اس جہت سے کہ محمول بہ صحت ہوں؟

جواب: ہم کہتے ہیں کہ معلوم ہے کہ جب امام کو گمان قوی ہو اپنے غالب ہونے اور اپنے حق کو پہنچنے اور قائم ہونے امور ولایت و خلافت کے تو اس پر اس وقت واجب ہوتا ہے کہ جو امر باعث وصول حق ہو اسے عمل میں لاوے اگرچہ وہ امر تعب و مشقت شدید پر مشتمل ہو۔ لیکن آقا ہمارے امام حسینؑ نے کوفہ کو سفر نہیں کیا مگر بعد ظہور عہد و پیمان مستحکم کے اہل کوفہ سے اور بعد اس کے کہ اہل کوفہ نے بہت سے خطوط بطوع و رغبت بے جبر و کراہت اس جناب کو لکھے اور تحریر خطوط میں انھوں نے خود ابتدا کی نہ یہ کہ حضرتؑ کے جواب میں لکھا ہو۔ اور معاویہ کے وقت میں بعد اس صلح کے جو مابین معاویہ و امام حسنؑ واقع ہوئی تھی اکابر و اشراف اہل کوفہ نے اس جناب کو نامہ لکھے تھے۔ لیکن حضرتؑ نے اس وقت قبول التماس ان کا صلاح نہ جانا۔ اور جو جواب باصواب تھا عمل میں لائے۔ جب امام حسنؑ نے وفات پائی تو پھر اہل کوفہ نے نامے لکھے اس وقت حضرتؑ نے ان کی امید برلانے کا وعدہ کیا۔ چونکہ ایام سلطنت معاویہ بہت صعب تھے اور احتمال غلبہ کا

اس پر نہ تھا لہذا حضرتؑ نے سکوت اختیار فرمایا۔ اور جس وقت معاویہ۔۔۔ واصل ہوا تو پھر اہل کوفہ نے بہت خطوط لکھے اور حضرتؑ کے بلانے میں حد سے زیادہ اصرار کیا، اور رغبت اپنی حضرتؑ کی تشریف آوری پر اپنے ناموں میں مندرج کی، اور دیکھا حضرتؑ نے کہ والی و حاکم کوفہ جو یزید کی طرف سے معین ہے نہایت ضعیف اور مغلوب ہے اور اہل کوفہ اس پر نہایت تسلّط اور غلبہ رکھتے ہیں۔ اور اس کے کہنے پر اعتنا نہیں کرتے۔ بنابر اس کے حضرتؑ کو ظن غالب ہوا کہ اب کوفہ کی طرف جانا واجب ہے پس اس سبب سے حضرتؑ پر لازم ہوا جو کچھ حضرتؑ عمل میں لائے اپنے اعتقاد حق میں۔ اور حضرتؑ کو گمان نہ تھا کہ اہل کوفہ باوجود ایسی عہود و مواثیق کے غدر و مکر کریں گے۔ اور اہل حق نصرت میں سہولت و نرمی کریں گے اور وہ امور عجیب و غریب کہ تصور میں نہیں آسکتے پیش آئیں گے۔ اس لیے کہ جب حضرت مسلمؑ کوفہ میں داخل ہوئے تو اکثر لوگوں سے بیعت لی اور جب ابن زیاد بدنہاد اس شہر میں وارد ہوا، اور خبر ورود مسلمؑ سے مطلع ہوا اور سنا کہ حضرت مسلمؑ ہانی بن عروہ مرادی کے گھر میں اترے ہیں جیسا کہ کتب تواریخ میں مذکور ہے پس وہ ملعون شریک بن اعور کی عیادت کو کہ وہ بھی ہانی کے مکان میں تھا، آیا اور یہ شریک بن اعور موافق اور شریک رائے حضرت مسلمؑ تھا، قتل ابن زیاد میں اور حضرت مسلمؑ سے اقرار لیا تھا کہ جب ابن زیاد میری عیادت کو آئے تو تم اسے قتل کرنا، اور حضرت مسلمؑ نے باوجود امکان ابن زیاد کو قتل نہ کیا، اور بعد اس کے جانے کے حضرت مسلمؑ نے اس کا عذر اس طرح بیان کیا کہ جناب رسالت مآبؐ نے فریب و مکر سے قتل کرنے کو منع کیا ہے۔ پس اگر اس وقت حضرت مسلمؑ موافقت شریک سے ابن زیاد کو قتل کر ڈالتے تو فتنہ و فساد زائل ہو جاتا اور حضرت امام حسینؑ بے خوف و خطر کوفہ میں تشریف لاتے اور ہر شخص نصرت دیاری میں حضرتؑ کے سرگرم ہوتا، اور جو لوگ کہ باطن میں قصد نصرت رکھتے تھے اور ظاہر میں معاندین سے رسم و راہ رکھتے تھے وہ بھی شریک ہو جاتے اور حضرتؑ کے دائرہ بیعت میں داخل ہوتے۔ اور جس وقت ابن زیاد نے ہانی بن عروہ کو بلا کر اپنے پاس قید کیا، اس وقت حضرت مسلمؑ گروہ کوفہ اپنے ہمراہ لے کر جانب قصر دارالامارت تشریف لے گئے اور اسے گھیرا کام اس پر تنگ کیا یہاں تک کہ بسبب خوف و نامردی کے اس شقی نے دروازہ قصر کے بند کر لیے اور ہر طرف سے لوگوں کو اہل کوفہ کے ترغیب دینے اور ڈرانے کو بھیجا، اور حضرت مسلمؑ کے مخذول اور مغلوب کرنے میں کوشش کی۔ اس وقت اکثر اہل کوفہ متفرق ہو گئے۔ اور حضرت مسلمؑ کی نصرت سے باز رہے۔ یہاں تک کہ سوا چند شخصوں کے کوئی ان کے ساتھ نہ رہا۔ اور لاچار ہو کر حضرت مسلمؑ وہاں سے پھر آئے۔ غرض ان امور کے ذکر سے یہ ہے کہ اسباب فتح و ظفر واضح و لائح تھے لیکن سوء اتفاق نے اس مقدمہ کو منعکس کر دیا، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضرتؑ شہید ہوئے۔ تحقیق کہ سید و آقا ہمارے امام حسین علیہ السلام نے جس وقت اثنائے راہ میں خبر شہادت مسلم بن عقیل سنی سب نے مشورہ دیا کہ پھر چلیے اس وقت حضرتؑ نے مراجعت کا قصد کیا۔ فرزندان مسلم بن عقیل اٹھ کھڑے ہوئے۔ کہنے لگے قسم بخدا ہم نہ پھریں گے جب تک کہ اپنے پدر بزرگوار کے خون کا عوض نہ لے لیں۔ یا یہ کہ جس طرح حضرت مسلم نے ذائقہ شہادت سے اپنے کام و زبان کو شیریں کیا، ہم بھی اسی ذائقہ سے اپنی زبان کو آشنا کریں۔ پس اس وقت حضرتؑ نے فرمایا: "لا خیر فی العیش بعد ھولاء"۔ یعنی زندگانی دنیائے فانی میں بعد ایسے عزیزوں کے کچھ لطف و مزا نہیں۔ بعد اس کے حر بن یزید نے مع لشکر بحکم ابن زیاد حضرتؑ کو عدول و مراجعت سے ممانعت شدید کی اور چاہا کہ حضرتؑ کو ابن زیاد کے پاس

لے جائے۔ اور حضرتؑ کو ان کا محکوم گردانے۔ حضرتؑ نے اس شقی کے پاس جانے سے انکار کیا جب حضرتؑ نے دیکھا کہ مراجعت کی کوئی صورت نہیں اور ابن زیاد کے پاس جانا بھی مناسب نہ تھا۔ اس وقت لاچار وہ امام عالی مقام شہر شام محنت انجام کی طرف متوجہ ہوئے اور یزید کے پاس جانے کا قصد کیا اس لیے کہ حضرتؑ جانتے تھے کہ یزید بہ نسبت ابن زیاد مجھ سے نرمی کرے گا پس یہ گمان کر کے جانب شہر شام روانہ ہوئے۔ یہاں تک کہ عمر بن سعد بد اختر مع لشکر ضلالت اثر حضرتؑ سے ملاقی ہوا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جیسا کتب سیر و تاریخ میں مذکور ہے۔ پس یہ توہم کیونکر کیا جائے کہ حضرتؑ نے اپنے ہاتھ سے آپ کو تہلکہ میں ڈالا در انحالیکہ منقول ہے کہ حضرتؑ نے عمر سے فرمایا:
اے عمر تو میرے تین سوالوں سے ایک سوال کو قبول کر۔

- مجھے رخصت دے کہ میں جس مقام سے آیا ہوں وہاں پھر چلا جاؤں۔
- یا مجھے یزید کے پاس لے چل۔ تا میں اپنے امور اسے سپرد کردوں کہ وہ مجھ سے قرابت رکھتا ہے۔ پس جس چیز پر اس کی رائے قرار پائے میرے باب میں عمل میں لائے۔
- یا مجھے رخصت دے تا کسی سرحد بلاد اسلام سے جاؤں۔ اور میرا حال نفع و ضرر میں مثل اور مسلمانوں کے حال کے رہے۔

عمر بن سعد نے یہ ماجرا ابن زیاد کو لکھ بھیجا اس شقی نے قبول نہ کیا۔ اور کہا: جب ہمارے چنگل میں آگئے تو ایسی باتیں کرتے ہیں اور آرزوئے نجات رکھتے ہیں۔ حالانکہ اب ان کو کچھ چارہ نہیں ہے۔ پس جب ان جناب نے اصرار ان اشرار کے اپنے قتل اور ہتک حرمت پر مشاہدہ کیا۔ اور بے دینی ان کی معائنہ کی جانا کہ اگر حکم ابن زیاد قبول نہ کروں گا تو بہ کمال ذلت ہتک حرمت میری ہوگی۔ بایں ہمہ قتل سے نجات نہ پاؤں گا۔ پس بہ جان و دل لڑنا اختیار فرمایا۔ اس وقت حضرتؑ دو خصلت جمیلہ میں متردد تھے۔ ایک یہ کہ اس جہاد میں اعدائے دین پر فتح یاب ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ گروہ قلیل اور جماعت ضعیف گروہ کثیر اور جم غفیر پر ظفر پائے۔ دوسرے یہ کہ سعادت شہادت سے فائز ہوں اور کرامات اخرویہ کو پہنچیں۔ لیکن مخالفت کرنا حضرتؑ کا مشورہ صحابہ سے مانند ابن عباس وغیرہ کے پس سبب یہ ہے کہ ظنون بحسب علامات و آثار قوت و ضعف میں مختلف ہوتے ہیں۔ کبھی ہوتا ہے کہ امر بہ نسبت بعض اشخاص کے بنظر قوت و علامات و آثار بظن قوی مظنون ہوتا ہے۔ اور بہ نسبت بعض اشخاص کے ضعیف ہوتا ہے۔ اور شاید ابن عباس عہد و میثاق اور نامہ و پیام اہل کوفہ پر مطلع نہ ہوئے ہوں۔ اور یہ امر منجملہ ان امور کے ہے کہ حال لوگوں کا اس میں مختلف ہوتا ہے اور تفصیل اس کی احاطہ تحریر میں نہیں آسکتی۔ لیکن مراجعت نہ کرنا حضرتؑ کا بعد شہادت حضرت مسلمؑ۔ پس سابق میں اس سے ہم نے بیان کیا۔ اور ذکر کیا کہ اکثر روایتوں میں وارد ہوا ہے کہ اس جناب نے قصد مراجعت کیا تھا۔ لیکن لوگ مانع ہوئے۔ اور لڑنا جماعت قلیل کا کثیر سے۔ پس ہم نے بیان کیا کہ ضرورت داعی اسی کی تھی اور مقتضی شرع و احتیاط کا اس وقت یہی تھا جو حضرتؑ نے کیا۔ اور وعدہ ابن زیاد در باب امام زبانی تھا۔ اور فیما بین عہد و پیمان ایسا نہ تھا کہ قابل وثوق و اعتماد ہو۔ اور غرض اس کی اظہار امان سے سبکی اور ہتک حرمت حضرتؑ منظور تھی۔ بعد اس تذلیل کے آخر کار شہید اور قتل کرنا مد نظر تھا۔ اور اگر حقیقت میں اس کی نیت بخیر ہوتی اور امان دینے میں صدق و راستی چاہتا اور خیال کسی ایذا رسانی کا نہ ہوتا اور وہ ملعون خود بھی یزید کے نزدیک معذور ہوتا تو البتہ حضرتؑ کو یزید کے پاس بھیج دیتا۔ لیکن اس وقت عداوت روز بدر و احد عناد عہد رسولؐ

اس گئے اور اس کے اصحاب کے سینہ پر کینہ سے ظاہر ہوا اور گمان ہے کہ اس وقت حضرتؑ نے اس احتمال کو تجویز فرمایا ہو کہ جن لوگوں نے حضرتؑ کو خطوط لکھے تھے اور عہد و پیمان کیے تھے شاید حضرتؑ کی طرف رجوع کریں۔ اور بسبب مشاہدہ کرنے قوت صبر حضرتؑ کے اور قلت اعوان و انصار کے حق کی طرف مائل ہوں۔ خواہ بسبب رعایت دین خواہ بوجہ حمیت عرب جیسا کہ بعض اہل کوفہ نے لشکر عمرو سعد سے ہدایت پائی اور اس جناب کی خدمت میں حاضر ہو کر سعادتِ شہادت سے فائز ہوئے اور ان احتمال کی ایسے اوقات میں اکثر توقع ہوا کرتی ہے۔ لیکن وجہ جمع اور مطابقت مابین حضرتؑ اور فعل امام حسنؑ پس واضح و لائح ہے۔ اس لیے کہ امام حسنؑ نے صلح اختیار نہیں فرمائی مگر واسطے رفع فتنہ و فساد کے اور بخوف قتل اہل بیت و شیعیان و بوجہ عدم وثوق و اعتماد اصحاب کہ غدر و مکر ان کا مشاہدہ فرما چکے تھے۔ بخلاف حضرت امام حسینؑ کے وہ جناب جانتے تھے جن لوگوں نے خطوط لکھے ہیں اور عہد و پیمان مستحکم کیے ہیں میری نصرت سے انکار و چشم پوشی نہ کریں گے۔ اور اسباب کے وجود سے حضرتؑ پر واجب و لازم ہو گیا تھا کہ اپنے حق کو اعدائے دین سے طلب فرمائیں اور خروج کریں۔ اور جب مقدمہ منعکس ہو گیا اور آثار و علامات غدر و نفاق اور سوء اتفاق ظاہر ہوئے تو قصد مراجعت فرمایا۔ اور چاہا کہ طلب حق سے دست بردار ہوں اور امر خلافت ظاہری یزید کو سپرد کر دیں۔ اور صلح کر لیں۔ جس طرح ان کے برادر بزرگوار نے صلح کی تھی لیکن اس وقت دشمنوں نے نہیں مانا اور اس امر پر راضی نہ ہوئے۔ پس دونوں بزرگوں کا حال بعینہٖ ایک دوسرے سے مطابق اور موافق ہے۔ لیکن چونکہ حضرت امام حسینؑ نے بعد ظاہر ہونے آثار خوف و ضعف کے اور احاطہ لشکر مخالف کے صلح چاہی لہٰذا اس فرقہ گمراہ نے صلح قبول نہ کی اور درپے عزت و آبرو کے ہوئے۔ اس وقت حضرتؑ نے مجبور و لاچار ہو کر ان سے لڑنے میں اور ان کے دفع کرنے میں سعی و کوشش فرمائی۔ یہاں تک کہ درجہ رفیعہ شہادت کو پہنچے اور بہشت عنبر سرشت اور رحمت رضوان پروردگار عالم سے فائز ہوئے اور یہ سب جو مذکور ہوا اس تامل کرنے والے پر جو اخبار و احادیث سے مطلع ہے واضح و لائح ہے۔

علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں

اکثر حدیثیں دلالت کرتی ہیں اس بات پر کہ ہر ایک ائمہ معصومین میں سے خدائے عزوجل کی طرف سے احکام خاصہ پر مامور تھے اور وہ احکام صحیفہ ہائے آسمانی میں جو کہ رسولؐ پر نازل ہوئے تھے مندرج تھے۔ پس ہر ایک ائمہ طاہرینؑ سے ان احکام پر عمل فرماتے تھے اور سزاوار نہیں ہے کہ انھیں اپنے احکام پر قیاس کریں۔ اور جو شخص احوال انبیاء مرسلین پر مطلع اور آگاہ ہوا ہے کہ خدا نے اکثر پیغمبروں کو تن تنہا ہزاروں کفار پر مبعوث فرمایا اور وہ پیغمبر ان کے بتوں کو اور خداؤں کو برا کہتے تھے۔ اور طرف دین حق کے دعوت کرتے تھے اور مصائب و مکروہات دنیا کی پروا نہ کرتے تھے اور ضرب قید و قتل و احراق سے اور مانند اس کے دیگر عقوبات دنیوی سے ذرا خوف و بیم نہ رکھتے تھے تو وہ شخص البتہ جانتا ہے کہ ائمہ معصومین پر مقام اعتراض نہیں ہے اور یہ بھی ہے کہ عصمت ائمہ طاہرینؑ گناہان صغیرہ و کبیرہ سے بدلیل و برہان اور بہ نصوص متواترہ قرآن ثابت ہو چکی ہے۔ پس کسی طرح مجال اعتراض ان پر نہیں ہے۔ بلکہ قول و فعل ان کا حجت ہے جو کچھ کہیں اور جو کچھ کریں اس کو تسلیم و قبول کرنا واجب و لازم ہے۔ علاوہ یہ کہ اگر کوئی منصف خوب غور و تامل کرے یقین کر سکتا ہے کہ حضرتؑ نے جان اپنے جد کے دین مبین پر نثار کی اور یہ تزلزل جو ارکان دولت بنی امیہ میں ظاہر ہوا بعد شہادت حضرتؑ کے

واقع ہوا اور کفر و ضلالت ان کا ظاہر نہ ہوا مگر بعد اس بات کے حضرتؑ درجہ شہادت سے فائز ہوئے اور اگر حضرتؑ اشقیا سے مصالحہ کر لیتے تو قوت و شوکت ان کی زیادہ ہوتی اور امر ان کا لوگوں پر مشتبہ ہو جاتا اور دین کے نشان پوشیدہ اور آثار ہدایت کے کہنہ ہو جاتے اور یہ بھی اخبار سابقہ سے واضح ہوا کہ حضرتؑ مدینہ منورہ سے نہیں نکلے مگر خوف قتل سے اسی طرح مکہ معظمہ سے نہیں نکلے مگر بعد غلبہ ظن کے اس بات پر کہ وہ غدار و مکار بمکر و غدر در پے قتل ہیں۔ یہاں تک کہ حضرتؑ کو ارکان حج تمام کرنا ممکن نہ ہوا تا آنکہ حضرتؑ محل ہوئے اور حج کو عمرہ سے بدل کر بکمال خوف و دہشت وہاں سے نہضت فرمائی۔ فدا ہو حضرتؑ پر جان و مال اور ماں باپ اور اولاد میری کہ آپؑ کو اتمام حج کی مہلت نہ دی اور حالت خوف میں سفر اختیار کیا۔ اور اعدا نے عرصہ زمین کو ان پر تنگ کیا۔ اور راہ چارہ مسدود کی اور جائے امن و محل پناہ باقی نہ رکھا۔ بہ تحقیق کہ ہم نے بعض کتب معتبرہ میں دیکھا ہے کہ یزید نے عمر بن سعید کو لشکر عظیم کے ساتھ کر کے جانب مکہ معظمہ روانہ کیا اور اس کو سردار حجاج کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ حضرتؑ کو بہ اخفا گرفتار کرے اور اگر ممکن ہو تو حضرتؑ کو بمکر و حیلہ قتل کرے۔ اور اسی سال تیس ملعونوں کو اشرار بنی امیہ میں سے بہ اخفا حاجیوں کے ساتھ بھیجا تھا کہ جس طرح ممکن ہو حضرتؑ کو قتل کریں۔ جب وہ جناب اس پر مطلع ہوئے تو احرام حج سے محل ہوئے اور حج کو عمرۂ منفردہ سے بدل فرمایا۔ اور باسناد متعددہ منقول ہے کہ محمد ابن حنفیہ نے اس جناب کو سفر سے منع کیا تو حضرتؑ نے ارشاد کیا: واللہ اے برادر اگر میں کسی جانور کے سوراخ میں چھپوں گا تو بھی مجھے ڈھونڈ کر نکالیں گے اور قتل کریں گے ۔۔۔ ظاہر یہ ہے کہ اگر وہ جناب مصالحہ و بیعت اختیار کرتے جب بھی وہ ملعون بسبب شدت عداوت قتل حضرتؑ سے دست بردار نہ ہوتے اور بہر صورت مکر و غدر سے پیش آتے۔ اور خواہش بیعت محض بہانہ تھا۔ اس لیے کہ جانتے تھے کہ حضرتؑ قبول نہ کریں گے۔ مقام غور ہے کہ مروان ملعون نے حاکم مدینہ کو مشورہ دیا تھا کہ حضرتؑ کو قبل تذکرہ بیعت قتل کر۔ اور ابن زیاد کہتا تھا کہ پہلے حضرتؑ کو ہماری بیعت و اطاعت کی تکلیف دو بعد اس کے جو کچھ ہماری رائے میں مستحسن ہو گا عمل میں لائیں گے۔ اور واضح تر یہ قریب ہے کہ اشقیا نے پہلے حضرت مسلمؑ کو امان دی بعد اس کے قتل کیا۔ لیکن معاویہ اگرچہ بغض و عداوت شدید اہل بیت سے رکھتا تھا لیکن نہایت مدبر و ۔۔۔ در فنون تھا۔ اور جانتا تھا کہ علانیہ اہل بیت کو قتل کرنا باعث روگردانی خلق اور باعث زوال تخت ہو گا۔ اور لوگ مجھ پر خروج کریں گے۔ اس لیے وہ ۔۔۔ بظاہر طریقہ صلح و دوستی رکھتا تھا۔ اس سبب سے حضرت امام حسنؑ نے اس سے صلح کی تھی اور امام حسینؑ بھی اس سے متعرض نہ ہوئے۔ اور اسی جہت سے اس نے یزید کو نصیحت کی تھی کہ امام حسینؑ سے متعرض نہ ہونا۔ اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ ان کے متعرض ہونے سے بادشاہی اس کی ۔۔۔ زائل ہو جائے گی۔ اور اس کے ملک میں خلل واقع ہو گا۔

مسٹر گبن

مسٹر گبن ڈکلائن اینڈ فال آف رومن امپائر میں کہتے ہیں: "وہ (حسین) ہاشم کے سلسلہ خاندان سے تھے اور بلحاظ اس کے کہ وہ نبی اللہ کے نواسہ تھے یہ مقدس شخص ان کی ذات سے وابستہ تھا۔ اور وہ مجاز تھے کہ اپنے دعاوی کو یزید یعنی دمشق کے ظالم کے مقابلہ میں پیش کر سکتے جس کی برائیوں سے وہ متنفر تھے اور جس کے حق کو انھوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ کوفہ سے چودہ ہزار مسلمانوں نے ایک فہرست خفیہ طور پر مدینہ بھیجی۔ جنھیں ان کی ذات سے وابستگی تھی اور جو اس پر آمادہ تھے کہ فرات کے کنارہ ان کے پہنچتے ہی (ان کی حمایت میں) اپنی تلواریں کھینچ

لیں گے۔ اپنے ہمدرد دوستوں کے مشورہ کے خلاف انھوں نے مستحکم ارادہ کرلیا کہ وہ اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال کے متعلق بے وفا لوگوں پر اعتبار کریں۔ انھوں نے ریگستان عرب کو بچوں اور عورتوں کے (مرتعش) ہمراہی میں طے کیا۔ اور حدود (عراق) میں پہنچ کر وہ اس مقام کی مخاصمانہ صورت یا تنہائی سے بھیانک ہونے اور وہ لوگوں کے ارتداد یا اپنے خاندان کی تباہی سے متوہم ہوئے۔ ان کا خوف درست تھا۔ عُبیداللہ کوفہ کے گورنر نے بغاوت کے پہلے شراروں کو بجھا دیا تھا۔ اور حسینؑ کربلا کے میدان میں پانچ ہزار سواروں میں گھر گئے جنھوں نے دریا اور شہر کے درمیان ان کا سلسلہ آمد و شد منقطع کردیا۔ وہ اب بھی ریگستان کے ایک قلعہ میں پناہ لے سکتے تھے جس نے قیصر اور خسرو کی طاقتوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اور قبیلہ طے کی وفاداری پر اعتماد کرسکتے تھے جو محافظت کے لیے دس ہزار جنگجو جمع کرسکتے تھے۔ دشمن کے سردار سے دوران مشورت میں انھوں نے تین باعزت شرائط میں اپنے کو مختار رہنا تجویز کیا۔۔۔۔۔ لیکن خلیفہ یا اس کے نائب کے احکام سخت اور قطعی تھے اور حسینؑ کو اطلاع دی گئی کہ یا وہ بحیثیت مجرم اور قیدی کے اپنے کو حوالہ کریں اور یا اپنی بغاوت کے نتائج قبول کریں۔

مسیو ماربین

مسیو ماربین اپنے رسالہ "فلسفہ مذہب شیعہ" میں فرماتے ہیں: بہت بڑی دلیل اس بات پر کہ حسینؑ قتل گاہ تک گئے ارہر گز ان کا قصد سلطنت اور ریاست حاصل کرنے کا نہ تھا یہ ہے کہ حسینؑ اپنے اس علم سیاست و تجربہ سے جو انھیں پدر بزرگوار اور برادر عالی مقدار کے زمانہ سے بنی امیہ کے ساتھ جنگ و جدل کرنے کے متعلق حاصل تھا خوب جانتے تھے کہ بحالت نہ مہیا ہونے اپنے اسباب کے اور بسبب اس اقتدار و عظمت یزید کے اس کے ساتھ مقابلہ کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ حسینؑ اپنے پدر بزرگوار کے مقتول ہونے کے بعد اپنے مقتول ہونے کی ہمیشہ پیشین گوئی کیا کرتے تھے اور جس وقت کہ مدینہ سے آپ نے حرکت کی صاف صاف اور بہ آواز بلند کہتے تھے کہ میں مقتول ہونے کے لیے جارہا ہوں اور اپنے سب ہمراہیوں سے بھی محض اتمام حجت کے لیے یہی بیان کرتے تھے تاکہ جو کوئی جاہ و جلال کے حرص و طمع میں ہمراہی چاہتا ہو جدا ہوجائے اور یہی بات ان کے ورد زبان تھی کہ قتل گاہ کا راستہ میرے سامنے ہے اور یہ بھی ہے کہ حسینؑ کا اگر یہ ارادہ نہ ہوتا یعنی غور و فکر اور علم و ارادہ کے ساتھ مقتول ہوجانے پر آمادہ نہ ہوتے تو اس طرح اپنا قتل گوارا نہ کرتے اور لشکر کے جمع کرنے میں بقدر امکان کوشش عمل میں لاتے۔ نہ یہ کہ جو ہمراہ تھے انھیں بھی متفرق و پراگندہ کردیتے۔۔۔۔ ظاہر ہے کہ وہ محبوبیت کا مرتبہ جو اس زمانہ میں حسینؑ کو مسلمانوں میں حاصل تھا اگر اس کے ساتھ اپنی قوت بڑھانا چاہتے تو ایک بڑا لشکر فراہم کرسکتے تھے مگر اس صورت میں اگر وہ مقتول بھی ہوتے تو یہی کہا جاتا کہ سلطنت و بادشاہی کی خواہش میں مقتول ہوئے اور وہ مظلومیت جس کا نتیجہ عظیم الشان انقلاب تھا حاصل نہ ہوتا کہ اپنے پاس سوائے ان لوگوں کے جن کی جدائی امکان کے باہر تھی کسی کو اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ مثل فرزند و برادر اور بھتیجوں اور بنی اعمام اور چند مخصوص احباب باوفا کے۔ تاآنکہ ان سے فرمایا کہ تم بھی چھوڑ کر جدا ہوجاؤ۔ مگر انھوں نے منظور نہ کیا۔ اور وہ بھی ایسے حضرات تھے کہ مسلمانوں کے نزدیک تقدس اور جلالت قدر کے اوصاف رکھتے تھے۔۔۔۔ اور یہ مصائب انھوں نے سلطنت و بادشاہی کے لیے برداشت نہیں کیے۔ اور نہ بغیر بجھے ہوئے اس مہلکہ عظیم میں انھوں نے قدم رکھا ہے۔ جیسا ہمارے بعض مورخین نے خیال کرلیا ہے۔۔۔۔ حسینؑ نے اپنی زندگی کے آخری وقت میں اپنے طفل شیر خوار کے باب میں وہ کام کیا کہ زمانہ کے فلاسفہ کے عقول کو حیران

دستخیر کردیا۔۔۔ گویا اس عمل سے حسینؑ کی غرض یہ تھی کہ تمام اہل عالم واقف ہوجائیں کہ بنی امیہ کی عداوت بنی ہاشم کے ساتھ کس حد تک تھی اور تصور کرلیں کہ یزید دفاع کے لیے ایسے ظلم و ستم کرنے پر مجبور نہ تھا۔ اس لیے کہ شیرخوار بچہ کا ایسی حالت میں اس وحشت ناک طریقہ سے قتل کردینا سوائے وحشت اور بیمانہ عداوت کے جوہر دین اور مذہب و قانون و قاعدہ کے منافی ہے اور کچھ ظاہر نہ کرتا تھا۔۔۔ ان خیالات عالیہ کے ساتھ جو حسینؑ کے مدنظر تھے بوجہ اس عقل عالی اور سیاست کے جو ان کے لیے مسلم تھی جب تک مقتول ہوں کوئی کام ایسا نہیں کیا جس سے یہ ظاہر ہوسکے کہ بنی امیہ اس کے دور کرنے میں مجبور ہیں۔ یہاں تک کہ باوجود اس اقتدار کے جو مسلم تھا اور باوجود کمال بااثر ہونے کے حسینؑ نے کسی ایک شہر پر بھی بلاد اسلامیہ میں سے قبضہ نہیں کیا۔ اور نہ کسی حکومت پر مملکت یزید سے حملہ کیا۔ اور انجام میں قبل اس کے کہ حسینؑ سے کوئی مخالفانہ یا غیر مطیعانہ حرکت یا شورش و بلوہ ظاہر ہونے پائے انھیں ایک بیابان بے آب و گیاہ میں محاصرہ کرلیا۔ حسینؑ نے ہرگز نہ کہا تھا کہ میں بادشاہ ہوں گا۔ یا میں بادشاہی کا طالب ہوں فقط بنی امیہ کے اعمال قبیحہ کا اظہار کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ ان کی وضع و طرز سلوک باعث اضمحلال اسلام ہے اور اپنے مقتول ہونے کی خبر دی تھی۔ اور اپنی مظلومیت پر خوش و مسرور تھے اور جب انھیں جنگل میں گھیر لیا تھا اس وقت بھی کہتے تھے کہ اگر مجھے چھوڑ دو تو میں آمادہ ہوں کہ میں اپنے عیال و اطفال کو لے کر سلطنت یزید یعنی مملکت اسلامیہ سے باہر چلا جاؤں۔ اسی ایک نکتہ نے جس سے حسینؑ کی سلامت نفس واضح ہے مسلمانوں کے دلوں میں برخلاف بنی امیہ کے انتہا درجہ کا اثر کیا۔

جناب خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب رئیس قادیان اپنے قابل قدر دلچسپ رسالہ "یادگار حسینؑ" میں مسٹر ارتھران واشنگٹن کی آئی ای کے ترجمہ کے نوٹ میں فرماتے ہیں: (مدینہ سے مکہ جانے کا تذکرہ کرکے) "کیا یہ باتیں ایسی ہیں جن سے کوئی شخص یہ نتیجہ نکال سکے کہ نعوذ باللہ حضرت امام حسینؑ نے ملک کی ہوس میں خود بھی جان دی اور اپنے کنبہ کو بھی کٹوا دیا۔ حاشا و کلا۔ اگر آپؑ کے دل میں ملک گیری کی امنگیں تھیں تو آپؑ کو بار بار یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ میں یا تو گوشہ نشینی میں عمر بسر کروں گا اور یا کسی دوسرے ملک کو چلا جاؤں گا۔ میرے واسطے دشمن راستہ چھوڑ دیں اور میرے متعرض نہ ہوں۔ کیا جب حضرت امام حسینؑ کعبہ کو گئے یا کعبہ سے چلے تو اس وقت کسی فوج کشی کا سامان کیا گیا۔ کیا منادی کی گئی کہ ہم یزید کے مقابلہ کے واسطے جاتے ہیں۔ جانا ایک بادشاہ کے مقابلہ میں اور ساتھ کل بہتر آدمی ہوں۔ دانا اور منصف لوگ اس سامان سے خیال کرسکتے ہیں کہ کیا ملک گیری کے خیالات کا شروع ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ اگر حضرت امام حسینؑ کو جنگ دنیوی کی ضرورت ہوتی تو یقیناً آپؑ مدینہ اور مکہ کی قوموں میں ایک آسانی سے اثر پیدا کرسکتے اور ممکن نہیں تھا کہ ایک لڑائی کی صورت میں یزید کعبۃ اللہ پر حملہ آور ہوکر امامؑ کے برخلاف فتح یاب ہوتا۔ امامؑ کا نہایت غربت اور مسکینی سے روانہ ہونا صاف طور پر ثابت کرتا ہے کہ آپؑ کے پاک دل میں ایسے خیالات کا اثر بھی نہ تھا"۔

اسی کتاب میں مسٹر جان لونگ کی پوئٹری (نظم) سے جو حضرت امام حسینؑ کے حالات میں لکھی گئی ہے نقل کیا ہے کہ: "وہ شخص (حسینؑ) دین دار، خدا پرست، فروتن، خلیق اور بے مثل بہادر تھا۔ وہ سلطنت اور حکومت کے واسطے نہیں لڑتا تھا۔ بلکہ خدا پرستی کے جوش میں وہ یزید سے اس واسطے بیزار تھا کہ وہ اسلام اور دین احمدی کے خلاف تھا۔

علی بن عیسیٰ اربلی

وزیر سعید علی بن عیسیٰ اربلی فرماتے ہیں: "مخفی مباد کہ احوالات سید الشہدا علیہ السلام و شہادت آن حضرتؑ آنچہ در کتب بہ نظر رسیدہ مطالب آنہا غالباً منحصر بود بہ تمہیدات در تحصیل حزن و گریہ و زاری بدون این کہ در جمیع نکات و اسرار کلمات و اقوال ایشان بسط مقالے دہند و شرح حالے کنند و بیاناتے بحکمت ہائے اعمال و افعال آن حضرتؑ نمایند کہ آیا حکمت و مصلحت چہ بود کہ جناب سید الشہداء روحنا فداہ باہمہ اطلاع بہ کثرت اعداء و قلت انصار و باہمہ بصیرت بحالت کوفہ و منع یاران و خیر خواہان در مدینہ و مکہ از عزیمت خود صرف نظر نہ نمود و ہر قدر ضعف در کار اعوان و انصار مشاہدہ می کرد عزم خود را بیش تر محکم و استواری نمود و آشکارا دل بر ہلاک نہاد بہ این حالت اہل و عیال و اطفال را نیز با خود برد و باوجود ظہور آثار ہلاکت و یقین داشتن بشہادت خود و متعلقان دست بیعت بہ یزید نہ داد و چرا مثل جناب امیر مومنان و امام حسنؑ کہ در عہد خود شان با دشمنان دین مواسات و مدارا کردند آن حضرتؑ این شیوہ را پیش نہاد نہ فرمود و با یزید و اتباع یزید باہمہ آگاہی بر قوت ظاہر ایشان و قلت ناصر خود ہمیشہ درشتی نمود ـــ بدانکہ حکمت عظیم و مصلحت عمدہ در شہادت آن حضرتؑ ثبوت حقیقت دین مبین و ظہور بطلان دعوی مخالفین و حفظ بیضہ اسلام و نگہداری طریقت حضرتؑ سید انام در آن جزو زمان و بعد ازاں تا امروز منوط و موقوف براں بود و این حکایت شہادت در واقع نبوت خاصہ را ثابت و بمردم مدلل کردہ است۔ یعنی: پوشیدہ نہ رہے کہ سید الشہداء علیہ السلام اور آپؑ کی شہادت کے حالات جو کچھ کتب میں نظر آتے ہیں، ان کے مطالب زیادہ تر حزن اور گریہ و زاری کی تمہیدات میں منحصر تھے۔ بغیر اس کے کہ تمام نکات اور ان کے کلمات و اقوال کے اسرار کے بارے میں بسیط گفتگو اور شرح حال کریں اور آنجنابؑ کے اعمال و افعال کی حکمتوں کے بارے میں بیانات فرمائیں کہ اس میں کیا حکمت و مصلحت تھی کہ جناب سید الشہداءؑ دشمنوں کی کثرت اور انصار کی قلت کے کامل علم اور کوفہ کی حالت کی مکمل بصیرت اور دوستوں اور خیر خواہوں کے مدینہ و مکہ میں روکنے کے باوجود اپنے عزم بالجزم سے نہیں ہٹے اور اعوان و انصار کے کام میں جتنی بھی کمزوری مشاہدہ کرتے تھے اپنے عزم کو مزید پختہ اور استوار کرتے تھے اور کھلم کھلا دل کو شہادت پر آمادہ کر رکھا تھا اور اس حالت میں بھی اپنے اہل و عیال اور اطفال کو بھی اپنے ساتھ لے گئے اور اپنی بربادی کی شہادت کے یقین کے باوجود یزید کی بیعت نہیں کی اور جناب امیر المومنینؑ اور امام حسنؑ کی طرح کہ انھوں نے اپنے عہد میں دشمنانِ دین کے ساتھ مواسات اور مدارا کا برتاؤ کیا تھا آپؑ نے ان کے اس طریقہ کی پیروی کیوں نہیں کی۔ اور یزید اور اس کے تابعین کے مقابل باوجود ان کی ظاہر طاقت اور اپنے مددگاروں کی قلت کے ہمیشہ سخت رویہ اپنایا۔ تم جان لو کہ عظیم حکمت اور عمدہ مصلحت آنجنابؑ کی شہادت میں دین مبین کی حقیقت کا ثبوت، مخالفین کے دعویٰ کے بطلان کا ظہور، بیضہ اسلام کی حفاظت، حضرت سرورِ عالم کی طریقت کی نگہداری زمانے کے اس حصہ میں اور اس کے بعد آج تک آنجنابؑ کے اسی طرزِ عمل پر منوط و موقوف تھی۔ درحقیقت اس واقعہ شہادت نے نبوت خاصہ کو ثابت کیا ہے اور لوگوں کے لیے مدلل بنا دیا ہے۔

(اس کے بعد مؤلف جناب رسالت مآبؐ کی دعوت، واقعہ غدیر، منافقین کا حسد، واقعہ سقیفہ، ارتداد اور منع زکوٰۃ کے واقعات بیان کر کے کہتا ہے کہ اگر امیر المومنینؑ آمادہ جنگ ہوتے تو اکثر لوگ اسلام سے علانیہ پھر جاتے۔ حضرت امام حسنؑ نے خلافت ظاہری کو، لوگوں کی بے وفائی دیکھ کر ترک کیا۔ امیر شام نے ہوا خواہان اہل بیت کو ہر قسم کی تکلیفیں دیں۔

اس کے بعد معاویہ کی منادی کہ کوئی فضائل علیؑ نہ بیان کرے۔ علیؑ کے دوستوں کا نام شبہ پر دیوان سے خارج کیا جانا۔ ان کا قتل، بصرہ اور کوفہ میں بمقابل دیگر مقامات شدائد بڑھ گئے۔ اور لوگوں کو مذمت اہل بیت کی تعلیم دی گئی۔ حضرت امام حسنؑ کے بعد حالت اور سخت ہو گئے اور جب یزید بادشاہ ہوا تو اس نے ظاہر شرع اور اسلام کو ترک کیا اور کوئی نامشروع کام ایسا نہ تھا جو نہ کیا)

"سید الشہداء نیز اگر با یزید مصالحت میکرد و در معارضہ او مساہمہ می نمود یقیناً بیضہ اسلام مرتفع می شد و مسلمین باطرو شبہ ناک و متزلزل می ماندند و با این تجاہر یزید بامور نامشروع مدارے بہ او اسباب خرابی ارکان دین می گردید۔ پس آن حضرتؑ بر حسب تکلیف خدا مصلحت در مصالحت ندید خاصہ این کہ درین بین جمعے از خلص مومنین پیدا شد تا بکشتہ شدن خود و اسیری اہل و عیال و تمامی مال و منال در رضائے خداوند متعال با قدم ثابت اطمینان جو استاوگی آنہا بود۔ پس آنجناب باین چنیں اغلب لوائے نصرت دین را بیفراشت و خواستگاری کند و اسبابے فراہم نہاید کہ ہمہ مردم معلوم شود کہ از اعلائے آنجناب و اسلاف طاہرینش دعوائے سلطنت و ریاست بنودہ و برائے مال و منال و حظ حظوظ نفسانیہ معارضہ نمی کند و محقق گردد کہ یزید و اتباع و اسلاف او دشمنی و خصومت با خاندان رسالت داشتہ دعوی آنہا دعوائے سلطنت و ریاست دنیویہ بودہ و کشف این معنی معلوم نمی شد مگر بشہادت سید الشہداء لہٰذا آن حضرتؑ خواست کہ عزیمت و خروج خود و ردبیعت یزید را بمسلمین و معظم بلاد اسلام معلوم کند تا ہر کس از روئے فطرت و طینت میل موافقت و نفرت دارد بمیل و اختیار بہ آنجناب ملحق شود و بر آنہا کہ مخالفت دارند حجت تمام گردد نتوانند بگویند کہ ما از عزیمت آن حضرتؑ بے خبر بودیم۔ با این کہ تکلف بیعت بہ آن حضرتؑ در مدینہ شد توقف در مدینہ نہ فرمودہ بمکہ روانہ شد چہ ہر گاہ شہادت آن حضرتؑ در مدینہ اتفاق افتادہ بود بہ اغلب ولایات اسلام خبر نمی رسید۔ آن حضرتؑ از مدینہ خارج شد حتی اہل و عیال را ہمراہ برد تا این شہرت بہ اطراف برود و ہر چہ خیر خواہان منع کردند عزیمت را موقوف نہ فرمود و گفت خداوند خواستہ است مرا قتیل و شہید و اہل و عیال مرا اسیر بیند۔ پس از آنکہ آن حضرتؑ بمکہ تشریف بردند نظر براین کہ مردمان آنجا تردد داشتند و از آنجا بہ اطراف و اکناف اخبار میرفت چند ماہ در مکہ توقف فرمودند۔

دریں عرصہ از کوفہ نامہائے متعدد و رسولان چندے رسیدند حتی این کہ در یک روز ششصد نامہ بہ آن حضرتؑ رسید و مبالغہ ایشان از حد گزشت و بدین واسطہ در کوفہ عزیمت آن حضرتؑ شہرے گرد و سائر ولایت ہا شہرت افتاد۔ با این ہا کنگانہ کردہ مسلمؑ بن عقیل را پیش از خود فرستاد تا بواسطہ او بر اعالی و ادنی کوفہ معلوم گردند کہ آمدہ کیست و مقصود و مرام چیست و آن فتنہ ہا کہ بسر مسلمؑ آوردند و علی روس الاشہاد او را شہید نمودند ہمہ دانستند کہ سید الشہداء می آید و بیعت یزید نمی کند و قصد یزید کشتن او و استیصال بنی فاطمہ و ذریت رسولؐ است۔

بعد از چندے توقف در مکہ کہ موسم حج رسید و ہمہ حجاج از عزیمت آن حضرتؑ مطلع شدند آن حضرتؑ دیگر توقفے نہ فرمود حتی آنکہ حج را بہ عمرہ مبدل گردانید و روز ترویہ حرکت فرمود تا ہمہ ملتفت شوند و بدانند بسبب مہمے آن حضرتؑ روز ترویہ عزیمت فرمودہ است دیگر آنکہ خواست نوعے اسباب فراہم نماید کہ ہر کس بہ فہمد کہ تارک بیعت یزید و خروج کنندہ باو آن حضرتؑ است تا ہمہ معلوم شود کہ جنگ با کیست و مقصود یزید چیست تا بعد از شہادت مردم را

اِشتباہ نماند و بدانند کہ مقتول و شہید سید الشہدا بود نہ خارجی و اسرا اولاد و عیال او بودہ اند نہ عیال خارجی و سراین کہ ہنگام معرکہ این ہمہ رجز خوانیہا و فرمودن او من عرفنی فقد عرفنی و من لم یعرفنی فانا اعرفه بنفسی و مکرر آمدن بہ کارزار و مکالمہ کردن بآن قوم اشرار و ہم چنین بردن عیال و اطفال بہمراہی خود کہ بعد از شہادت دیدن آنہا ہمہ جا اسباب تعریف آن حضرتؑ باشد چنانکہ در بازار کوفہ و شام میان این ہمہ جمعیت و اژدہام جمعے آنہارا نہ شناختند و یک سراین بود در تحل سرانور اطہر بر نیزہ کہ آنہارا ہر کس بہ بیند بشناسد تا امر و مطلب بمعظم ناس مشتبہ نماند و ہم چنین تکلمات مجلس یزید و ظہور عتاب و خطاب او با سر مطہر در حضور جمعے از ملل مختلفہ و یک سراین بود کہ آن حضرتؑ قبل شہادت اہل غاضریہ را طلبید خود را بآنہا شناسانید و از آنہا زمین خرید و در دفن خود شان وصیت بآنہا کرد تا بعد از شہادت شبہ نماند و جائے قبر مطہر نیز معلوم و معین باشد و نتوانند آن آثار را محو نمایند چنانچہ متوکل خواست آثار قبر را محو کند قادر نشد دیگر آنکہ وضع عزیمت را قسمے نمود کہ شخص منصف بے غرض اگر تامل کند در حالات آن حضرتؑ بفہمد و بداند کہ مرام و مقصود او امر دنیا نبود بلکہ محض ترویج دین و معلوم کردن حقیقت خود و بے پردہ کردن کار ظلم و خلاف معاندین تن بقضا داد و بہ اختیار و میل خود قدم بہ عرصہ بلا نہاد و تحمل جمیع صدمات شد کہ آنہا آنچہ دلشان بخواہد بتوانند و ظلم و بے حیائی کنند و حالات باطنی را بروز دادہ بتوانند مصدر اعمالے شوند کہ مقتضائے سرائر و ضمائر آنہا بود۔ چنانکہ مرتکب شدند بکارہائے کہ از دیدن و شنیدن آنہا بر ہمہ جہانیاں شقاوت و ملعنت ایشان واضح و آشکارا گردید و این قضیہ بالمآل بر تمامی بنی امیہ گردید کہ بعد از شہادت آن حضرتؑ مسلمانان از ایشان بالطبع متنفر گشتہ و از اعمال ایشان تبرا و بیزاری جستند و از ہر طرف ہنگامہ برپا شد و مردم نقض بیعت یزید را نمودند بلا خروج کردند و با ابراہیم اشتر و مختار ثقفی چہ قدر مردم از ہر طرف ہمراہی نمودند تا این کہ سلطنت بنی امیہ در قلیل مدت منقضی شد و سب جناب امیرؑ کہ سالہا بحکم معاویہ و یزید در مساجد و منابر مسلمانان رسم و معمول شدہ بود مرتفع گردید۔ و این ہا رفع نمی شد مگر بواقعہ شہادت سید الشہداء۔ نوشتہ اند در کربلا از اولاد و اصحاب آن حضرتؑ سوائے امام زین العابدین دیگر کسے نماندہ بود و از بنی امیہ دراں روز تا ہزار طفل در گہوارہ طلا موجود بود و حالا از ایشان اثرے نماندہ و چندیں ہزار سادات (صرف ہندوستان کی مردم شماری میں کئی لاکھ ہیں۔ مؤلف) از سلسلہ جلیلہ حُسینیہ موجود اند و این محقق نمی شد مگر بہ این طریق کہ آنجناب پیش نہاد فرمود بدوں این کہ منع اعدے را قبول نماید خود و اہل و عیال را دانستہ و فہمیدہ بآں ورطہ بلا انداخت پس این ہمہ ایستادگی و رد بیعت یزید از بدو امر کہ ہر گونہ وسعت در کار بود تا روزے کہ عرصہ بآن حضرتؑ تنگ شد و ہمہ یار و اصحاب او شہید گردید و عیال و اطفالش بے صاحب ماند و ہمہ منتظر اسیری شدند و ہیچ وقت دریں بین سستی در عزیمت او دیدہ نہ شد بر ہمہ بینندگان با انصاف و بمعظم ناس واضح کرد کہ خیال و دعوائے او دعوائے باطل نبودہ است و خود را برحق میدانست و باقتضائے دینداری و ملاحظہ امر اخروی باین مقامات اقدام نمود چہ اگر قصد او از این ایستادگی یا سلطنت و ریاست بود بہ آن عقل کامل کہ داشت لا محالہ در وقتے از اوقات سستی از جانب او مشاہدہ می شد چندانکہ عادت بر ایں جاریست و حالانکہ ہمہ دیدند و فہمیدند و یقین کردند کہ ہر چہ بلا بسرش آوردند تا نفس آخر از عزیمت خود تقاعد نہ کرد و فوق العادۃ ایستادگی نمود حتی اذن مرخصی بہ اصحاب خود داد و بیعت را از ایشاں برداشت پس ہر کس نکات و دقائق حالات آن حضرتؑ موافق روایت عامہ و خاصہ بدقت امعان نظر کند یقین خواہد کرد کہ کسے کہ دعوی باطل و قصد سلطنت ظاہریہ و خیال

ریاست دنیویہ داشتہ باشد عادۃً ہرگز مرتکب این گونہ کارہائی شود واین اقدامات را کہ از بدو امر بہمہ حقائقہا آخر او رابہ ہلاک او قرار می دادند بمیل واختیار اقدام نمی کند پس آن حضرتؑ اسباب را در ین عزیمت و حرکت نوعے واضح فراہم کرد کہ برہمہ جہانیان واضح شد کہ او این کارہا را بہ ہوائے نفس و خیال باطل نہ کردہ بلکہ بر حسب تکلیف خدائے بودہ آن جناب در ان جز و زمان کہ ظلمت شکوک و شبہات احاطہ بہ اطراف عالم کردہ بود باشراق طلیعہ خود آن ظلمات را زائل کرد تا کلمہ حق برور آشکار و حق از باطل ممتاز و متمیز شد۔ پس ہر کس در ہر جز و زمان اسباب یاد آوری این قضایا را فراہم آرد و نگزارد کہ این وقائع از نظرہا محو گردد و در حقیقت نصرت دین کردہ"۔

یعنی: سید الشہداءؑ بھی اگر یزید کے ساتھ مصالحت کر لیتے اور اس کے مقابلہ سے تساہل کرتے تو یقیناً دین اسلام دنیا سے اٹھ جاتا اور مسلمان یکایک سب کے سب مشتبہ اور متزلزل ہو کر رہ جاتے اور یزید کے کھلم کھلا خلاف شریعت افعال کے باوجود اس کے ساتھ مدارات ارکان دین کی خرابی کا باعث ہو جاتی۔ پس آنجناب نے خدا کی جانب سے اپنے فریضہ کے مطابق مصالحت میں مصلحت نہ دیکھی۔ خصوصاً یہ کہ اس دوران خالص و مخلص مومنین کی ایک جماعت پیدا ہو گئی کہ رضائے خدا میں ثابت قدمی کے ساتھ خود شہید ہونے، اہل و عیال کے اسیر ہونے اور مال و منال کے برباد ہونے کے بارے ان کے قیام پر اطمینان تھا۔ اس لیے آنجنابؑ ان جیسے ساتھیوں کے ساتھ نصرت دین کے جھنڈے کو بلند فرماتے ہیں اور چاہتے ہیں اور اس کے اسباب فراہم کرتے ہیں کہ تمام لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ آنجناب اور ان کے اسلاف طاہرینؑ کا دعویٰ سلطنت و ریاست کا دعویٰ نہ تھا اور آپ مال و منال اور نفسانی فوائد کے حصول کے لیے معارضہ نہیں کر رہے۔ اور یہ ثابت ہو جائے کہ یزید اور اس کے اسلاف اور پیروکار خاندان رسالتؐ کے ساتھ دشمنی اور خصومت رکھتے ہیں اور ان کا دعویٰ سلطنت اور حکومت دنیویہ کے لیے ہے۔ اور یہ معنی شہادت سید الشہداء کے بغیر مکشوف و معلوم نہیں ہو سکتا تھا لہذا آنجناب نے چاہا کہ اپنے عزم و خروج اور رد بیعت یزید سے مسلمانوں اور معظم بلاد اسلام کو آگاہ کر دیں تا کہ ہر شخص جو از روئے فطرت میل موافقت و نفرت رکھتا ہے اپنے میل و اختیار سے آنجناب سے مل جائے اور جو لوگ آنجناب سے مخالفت رکھتے ہیں ان پر حجت تمام ہو جائے اور یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم آنجناب کی عزیمت سے بے خبر تھے۔ اس لیے کہ بیعت کا مطالبہ آنجنابؑ سے مدینہ میں کیا گیا تھا۔ آپؑ نے مدینہ میں توقف نہ کیا مکہ روانہ ہو گئے کیونکہ اگر آپؑ کی شہادت مدینہ میں ہو جاتی تو اکثر اسلام کے صوبوں میں خبر نہ پہنچتی۔ آنجنابؑ مدینہ سے نکل آئے حتی کہ اہل و عیال کو بھی ہمراہ لیا تا کہ یہ شہرت اطراف میں پھیلے اور خیر خواہان نے جتنا بھی روکا عزیمت موقوف نہیں فرمائی اور فرمایا کہ اللہ نے چاہا ہے کہ میں مقتول و شہید ہو جاؤں اور میرے اہل و عیال کو قیدی دیکھے۔ اس کے بعد کہ آپؑ مکہ تشریف لے گئے اس بات کے پیش نظر کہ لوگ وہاں آمد و رفت رکھتے تھے اور وہاں سے خبریں اطراف و اکناف میں پہنچ جاتی تھیں چند ماہ مکہ میں قیام فرمایا۔

اس عرصہ میں کوفہ سے متعدد خطوط اور کئی قاصد پہنچے یہاں تک کہ ایک دن میں حضرتؑ کو چھ سو خط موصول ہوئے اور ان کا مبالغہ حد سے بڑھ گیا۔ اس ذریعہ سے حضرتؑ کی عزیمت کی کوفہ میں شہرت ہو گئی اور تمام صوبوں میں شہرت پھیل گئی۔ صرف اس پر اکتفا نہیں کی بلکہ مسلم بن عقیل کو اپنے سے پہلے بھیجا تا کہ ان کے واسطہ سے کوفہ کے ہر ادنیٰ و اعلیٰ

کو معلوم ہو جائے کہ آنے والا کون ہے اور مقصد و غرض کیا ہے اور وہ واقعات جو حضرت مسلم پر لائے گئے اور سرعام آپ کو شہید کیا گیا ان سے سب لوگ جان گئے کہ سید الشہداء آرہے ہیں اور وہ یزید کی بیعت نہیں کرتے اور یزید کا قصد ہے کہ آپ کو قتل کر ڈالے اور بنی فاطمہؑ اور ذریت رسولؐ کو جڑ سے اکھاڑ دے۔

مکہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد موسم حج آگیا اور تمام حاجی حضرتؑ کی عزیمت سے مطلع ہو گئے حضرتؑ نے پھر توقف نہ فرمایا حتی کہ حج کو عمرہ میں تبدیل کر دیا اور روز ترویہ سفر کر گئے، تاکہ سب متوجہ ہوں اور جان لیں کہ کسی اہم وجہ سے ہی حضرتؑ نے روز ترویہ عزیمت فرمائی ہے۔ دوسرا یہ کہ آپ نے چاہا کہ ہر شخص سمجھ جائے کہ یزید کی بیعت سے انکار کرنے اور اس کے خلاف انقلابی قدم اٹھانے والے آنحضرتؑ ہیں تاکہ سب کے علم میں آجائے کہ جنگ کس کے ساتھ ہے اور مقصود یزید کیا ہے، تاکہ شہادت کے بعد لوگوں کو اشتباہ نہ رہے اور جانتے ہوں کہ مقتول و شہید سید الشہداءؑ تھے نہ کہ خارجی اور قیدی۔ آپ کے اہل و عیال اور اولاد تھے نہ کہ عیال خارجی اور بوقت معرکہ یہ سب رجز خوانیاں اور فرمانا کہ جو مجھے جانتا ہے وہ تو جانتا ہی ہے جو نہیں جانتا میں اسے اپنی پہچان کرواتا ہوں اور بار بار میدان کارزار میں آنا اور اس شریر قوم کے ساتھ مکالمہ کرنا ان سب کا یہی راز تھا اور اسی طرح عیال و اطفال کو اپنے ہمراہ لے جانا کہ آپ کی شہادت کے بعد ان کا دیکھا جانا ہر جگہ حضرتؑ کی شناخت و پہچان کے اسباب ہوں، جیسا کہ بازارِ کوفہ و شام میں اس سارے بڑے ہجوم اور بھیڑ میں کچھ لوگ ان کو نہیں پہچان سکے تھے اور سر اطہر و انور کا نیزے پہ اٹھائے جانے کا ایک راز یہ بھی تھا کہ جو بھی انھیں دیکھے پہچان جائے تاکہ امر و مطلب زیادہ لوگوں پر مشتبہ نہ رہے۔ اسی طرح دربار یزید میں تکلمات اور اس کا سر انور مختلف قوموں اور مذاہب والوں کے سامنے سر مطہر سے گستاخی عتاب اور خطاب کرنا۔ ایک راز یہ تھا کہ آنحضرتؑ نے شہادت سے پہلے غاضریہ بستی والوں کو بلوایا۔ انھیں اپنی شناخت کروائی اور ان سے زمین خریدی اور اپنے دفن کے بارے میں انھیں وصیت کی تاکہ شہادت کے بعد شبہ نہ رہ جائے اور قبر مطہر کی جگہ بھی معلوم و معین ہو اور ان آثار کو مٹا نہ سکیں۔ جیسا کہ متوکل نے چاہا تھا کہ قبر کے نشانات کو مٹا دے مگر قادر نہ ہو سکا۔ دوسرا یہ کہ عزیمت کی وضع اس طرح بنائی کہ بے غرض صاحب انصاف اگر آپ کے حالات میں غور کرے تو سمجھ جائے اور جان لے کہ آپ کا مقصد و مرام امر دنیا نہ تھا بلکہ محض دین کی ترویج اور اپنی حقیقت و حقانیت معلوم کروانے اور معاندین کی مخالفت اور کار ظلم کو بے پردہ کرنے کے لیے جان دی تھی اور اپنے ارادے اور اختیار سے میدان بلا میں قدم رکھا تھا اور تمام صدموں کو برداشت کیا تھا کہ وہ لوگ جیسے ان کا جی چاہے کر سکیں اور ظلم و بے حیائی کر لیں اور اپنے باطنی حالات کے اظہار سے ایسے اعمال کے صادر ہونے کا مقام بنیں کہ جو ان کے اندرونی (ضمائر و سرائر) کا مقتضی ہے جیسا کہ وہ ایسے ایسے کاموں کے مرتکب ہوئے کہ ان کے دیکھنے اور سننے سے تمام اہل جہان پر ان کی شقاوت اور لعنتی ہونا واضح و آشکار ہو گیا۔ اور آخر کار یہ حالت تمام بنی امیہ کی ہو گئی کہ آنجناب کی شہادت کے بعد مسلمان ان سب سے بالطبع متنفر ہو گئے اور ان کے کاموں سے برائت اور بیزاری کرتے تھے اور ہر طرف ہنگامہ برپا ہو گیا اور لوگوں نے یزید کی بیعت کو توڑ دیا اور اس کے خلاف خروج کیا اور ابراہیم اور مختار ثقفی کے ساتھ کس قدر لوگ ہر طرف سے آملے تھے یہاں تک کہ بنی امیہ کی سلطنت قلیل مدت میں ختم ہو گئی اور جناب امیر پر سب جو معاویہ و یزید کے حکم سے سالہا مساجد میں اور

مسلمانوں کے منبروں پر رسم و معمول بن گیا تھا، ختم ہو گیا اور یہ سب کچھ شہادت سید الشہداءؑ کے بغیر ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ کربلا میں اولاد و اصحاب امام حسینؑ سے امام زین العابدین کے سوا کوئی باقی نہیں رہ گیا تھا اور بنی امیہ سے اس روز ہزار بچے سنہری گہوارے میں موجود تھا۔ اب ان کا نشان تک نہیں رہا۔ اور کتنے ہزار سادات (صرف ہندوستان کی مردم شماری میں کئی لاکھ ہیں) سلسلہ جلیلہ حسینیہ سے موجود ہیں اور یہ سب کچھ وجود میں نہیں آسکتا تھا مگر اس طریق سے جسے آپ نے پیش نظر رکھا تھا۔ کسی کے روکنے سے نہ رکے۔ خود کو اور اہل و عیال کو سوچ کر ورطہ بلا میں ڈالا۔ پس بیعتِ یزید کی رد میں آپ کی یہ ساری استقامت ابتدائے امر سے کہ بہت گنجائشیں موجود تھیں، آخر امر تک کہ آپ پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا تھا، اور آپ کے سارے یار و انصار شہید ہو چکے تھے اور عیال و اطفال بے سرپرست رہ گئے تھے اور سب اسیری کے انتظار میں تھے۔ اس سارے عرصے میں کسی وقت بھی آپ کی عزیمت میں کمزوری نہیں دیکھی گئی۔ اس نے انصاف کی نظر سے دیکھنے والے تمام لوگوں پر اور اکثر ناس پر واضح کر دیا کہ آپ کی فکر اور دعویٰ باطل دعویٰ نہ تھا۔ آپ خود کو حق پر جانتے تھے اور دینداری کے تقاضا اور آخرت کے معاملہ کو سامنے رکھ کر آپ نے یہ اقدام کیا تھا۔ کیونکہ اگر آپ کا قصد اس قیام و استقامت سے سلطنت و ریاست ہوتی اس عقل کامل کا حامل ہوتے ہوئے یقیناً کسی نہ کسی وقت اس میں کمزوری مشاہدہ میں آتی، جیسا کہ عادت جاریہ اسی طرح ہے۔ حالانکہ سب نے دیکھا اور سمجھا اور یقین کر لیا ہے کہ جتنی بھی مصیبت آپ کے سر پر آئی آخری سانس تک اپنی عزیمت سے پیچھے نہ ہٹے اور خارق العادۃ استقامت دکھائی۔ اپنے ساتھیوں کو اذن رخصت دیا اور ان سے بیعت اٹھالی۔ پس جو کوئی بھی آنحضرتؑ کے حالات کے دقائق و نکات پر عامہ و خاصہ کی روایات کے مطابق دقت سے نگاہ ڈالے گا تو یقین کرلے گا کہ جو شخص باطل دعویٰ اور سلطنت ظاہریہ کا قصد اور ریاست دنیویہ کا خیال رکھتا ہو عادۃً ہرگز اس قسم کے کاموں کا مرتکب نہیں ہوتا۔ اور ان اقدامات کو کہ جو شروع سے ہی تمام لوگ عقلاً اس کے نتیجہ آخر کو اس کی ہلاکت قرار دیتے ہوں اپنے اختیار اور ارادہ سے بکار نہیں لاتا۔ پس آنحضرتؑ نے اس عزیمت اور حرکت میں اسباب کو اس طرح واضح فراہم کیا کہ تمام جہان والوں پر واضح ہو گیا کہ آپ نے ان کاموں کو خواہش نفسانی اور خیال باطل سے نہیں سرانجام دیا، بلکہ اللہ کی طرف سے آپ اس کے مکلف تھے اور آنجناب نے اس عرصہ زمان میں کہ جب شکوک و شبہات کی تاریکیاں اطراف عالم کو گھیرے ہوئے تھیں، اپنے نور طلیعہ کی چمک سے ان تاریکیوں کو کافور کر دیا۔ تاکہ کلمۂ حق زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ آشکار، حق باطل سے جدا اور مشخص و ممیز ہو گیا۔ پس جو کوئی بھی جس عرصۂ زمان میں بھی ان قضیتوں کے یاد آوری کے اسباب فراہم کرے اور ان وقائع کو نظر سے محو نہ ہونے دے تو حقیقت میں وہ دین کی نصرت کرتا ہے۔

حضرتؑ کی روش دفاعی تھی مؤلف کے دلائل

میں نے اپنی تحقیق کے متعلق اب تک مؤرخین کے موافق اور مخالف خیالات پیش کیے۔ اب میں خود اس سوال کا جائزہ لیتا ہوں۔ میرے نزدیک حضرت امام حسین علیہ السلام کی روش ہرگز نزاعی نہ تھی اس کے لیے میرے وجوہات یہ ہیں:

حسینؑ اور یزید کے معاملات کی ابتدا مکہ سے نہ تھی بلکہ مدینہ سے

حضرت امام حسینؑ اور یزید کی مخالفت مکہ

سے شروع نہیں ہوتی بلکہ مدینہ سے۔ مکہ سے حضرت مسلمؑ کو کوفہ روانہ ہوتے دیکھ کر اس نتیجہ پر جست کی جاتی ہے کہ حضرتؑ نے طلب خلافت کے لیے نزاعی روش پر پیش قدمی شروع کی۔ اور یہی غلطی کی ابتدا ہے۔ جس میں سلسلہ واقعات کی طرف سے بے خیالی ایک غلط استنباط کی محرک ہوتی ہے۔ حالانکہ اگر واقعات کی ابتدا بجائے مدینہ کے مکہ ہی سے ہوتی ہوتی تاہم یہ سوچنے کی کافی جگہ تھی کہ جن اتفاقات میں حضرتؑ نے مسلمؑ بن عقیل کو روانہ کیا ان کے لحاظ سے یہ کہنا کہ حضرتؑ نے نزاعی روش اختیار کی انصاف اور نظر کو الٹا لٹکا دیتا ہے۔ مجھے ان مورخین سے شکایت لاحاصل ہے۔ جنھوں نے حضرت امام حسینؑ کی رفتار اور ان کے الفاظ کے سلسلہ کو اس طرح پیش نظر رکھا ہے کہ کبھی انھوں نے کچھ ہی کیوں نہ فرمایا ہو لیکن سب سے مکہ سے مسلمؑ کی روانگی کو طلب خلافت کے سمجھنے کے لیے مدد میں لائیں۔ اور اس کے مقابلہ میں یزید کے سیاق اور رفتار و گفتار کی ولادت اس وقت سے سمجھیں جس وقت سے وہ ابن زیاد کو کوفہ کے انتظام کے لیے روانہ کرتا ہے! یہ نامنصفانہ یکسوئی خصائل شناسی اور خاصہ فہمی کے لحاظ سے جس درجہ قابل کشیدگی ہے خصائل کی خوبی اور برائی کے سمجھنے کا وسیلہ ہونے کے لیے ویسی ہی ناموزوں ہے۔ اخلاق لطافت ذبح کی گئی ہے۔ اور سمجھایا یہ گیا ہے کہ کانٹوں سے کلیاں پھوٹ نکل سکتی ہیں۔ یا فطرت آرا کلیاں بار نظر ہو سکتی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ حسینؑ کی مجروح بے گناہی مورخین کی عمداً یا سہواً کوتاہ نظری سے فریاد کرتی ہے۔ حسینؑ کی اعلیٰ خیالی یزید کے مقابلہ میں یزید کی مصلحت کی شبیہ بنائی گئی ہے!

ابتدا ازیزید کے حکم سے

کیا یہ حسینؑ تھے جنھوں نے مدینہ میں رہنے پر قناعت نہ کی یا انھوں نے مدینہ میں بیٹھ کر سامان حرب کی فراہمی شروع کی؟ نہیں۔ بلکہ یہ یزید تھا جس نے اپنے عامل کو یہ حکم بھیجا کہ حسینؑ کو یا زندہ گرفتار کرلے اور یا ان کا سر میرے پاس بھیج دے۔ اگر وہ میری بیعت سے انکار کریں۔ نہ یہ حسینؑ تھے جنھوں نے یہ فرمایا ہو کہ عنقریب ہم میں اور ہمارے دشمنوں میں جنگ ہوا چاہتی ہے اور ایسے خیالات کے اظہار سے وہ اپنے مددگاروں اور دوستوں کو آئندہ جنگ و جدل کے لیے تیار کر رہے ہوں۔ ان میں فوجی جوش یا حکومت اور فتوحات کا حوصلہ پیدا کر رہے ہوں۔ نہیں بلکہ یہ یزید تھا جس نے ایسی خیالات اپنی فوج اور افسروں کے سامنے ظاہر کیے اور ان سے مستعدی کا عہد لیا۔

اہل کوفہ کی مدد سے خلافت طلبی کے لیے مدینہ سے کوفہ جانا آسان تر تھا

اگر حضرت امام حسین علیہ السّلام قیام مدینہ سے قیام مکہ تک یہ طے کرچکے ہوتے کہ ہم کوفہ جائیں گے اور اہل کوفہ سے مدد لے کر یزید کی سلطنت اور حکومت کو الٹ دیں گے تو ان کے لیے یہ نسبتاً آسان تھا کہ وہ مدینہ سے کوفہ روانہ ہوگئے ہوتے بہ نسبت اس کے کہ وہ پہلے مکہ جا کر اس کا انتظار کرتے کہ کہیں مدینہ کی کوئی متعاقب فوج یا خود عامل مکہ کی حکومت یزید کے حکم سے گرفتار کرلے۔ کہیں اس کا تذکرہ نہیں ہے کہ معاویہ کی موت سے اس وقت تک جب تک کہ حضرتؑ پر ولید کا بیعت کے لیے اصرار ہوا یا مدینہ سے مکہ تک اثنائے سفر میں یا مکہ کے قیام کے زمانہ میں حضرتؑ نے یہ کبھی ظاہر کیا کہ وہ مکہ کو فوجی مرکز قرار دیا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اگر حضرت امام حسینؑ کی یہ غرض ہوتی کہ وہ وطن میں اپنے مددگاروں کے جمع کرنے کی کوشش کرتے یا مکہ میں ایسی ہی روش اختیار کرتے تو ان دونوں

مقامات میں بہ نسبت کوفہ کے تھوڑی ہی سہی، لیکن مدد کی قوی امید ہوتی۔ جس میں سے ایک اگر وہ مقام تھا جس کی عالمگیر شہرت اور شہرت کے وجوہات ان کے جد بزرگوار کی ذات اقدس سے پیدا ہوئے تھے تو دوسری جگہ اطراف بلاد اسلامیہ سے ان کے نانا کے کلمہ گو مجمع ہو رہے تھے کہ ارکان حج بجا لاویں۔ حضرتؑ نے نہ صرف اس وقت تک جب تک کہ چوتھی شعبان کو مدینہ سے جلاوطن ہوئے کوئی ایسی کوشش نہ کی جس سے آپ پر نزاعی روش کا حرف رکھا جاتا بلکہ مکہ معظمہ میں بھی آپ نے جب جب کچھ فرمایا وہ یا تو یہ تھا کہ میں مکہ میں رہوں گا۔ جب تک رہنے دیا جاؤں گا

خلافت طلبی کا حوصلہ وعدہ قبول کر لیتا

یا ایسے وقت جب کہ ابن زبیر مدد کا وعدہ کرتے فرمایا کہ مکہ میں خونریزی جائز نہیں ہے۔ یا فرمایا کہ میں وہ مینڈھا نہیں ہوا چاہتا جس سے حرمت خانہ کعبہ ضائع ہو۔ میں ہر عقل سلیم والے کو عقل اور انصاف کا واسطہ دیتا ہوں کہ کوئی شخص جو کسی مقام کے متعلق ایسے خیالات رکھتا ہو کیا وہ ایسی جگہ کو اس لیے پسند کرے گا کہ اسے فوجی مرکز قرار دے۔ اور اگر ایسا ہی تھا کہ حضرتؑ نے اسے فوجی مرکز قرار دینے کا ارادہ کیا تھا تو اس کے آثار کہاں ہیں۔ میں اس کے ثبوت میں ایک لفظ کو بھی قبول کر لوں گا اگر تمام اسلامی تواریخ یا روایات میں سے میرے سامنے پیش کیا جائے کہ حسینؑ نے مسلمانوں کے مجمع کو جو حج کے لیے جمع ہو رہا تھا اس لفظ سے یا فقرہ سے یزید کے خلاف برانگیختہ کیا یا اپنی مدد کا استغاثہ کیا۔

خلافت طلبی حاجیوں سے استغاثہ مدد کراتی

میرے لیے یہ سوچنا محال ہے کہ کوئی شخص جو خلافت حاصل کرنے کی سرد آہیں بھرا کرتا وہ ایسے موقع کو ضائع کرتا جس سے بڑھ کر اس وقت سے آج تک مسلمانوں کے لیے کوئی موقع نہیں ہے۔ جہاں مسلمان اس قدر تعداد اور عبادت کی ہم خیالی سے جمع ہوتے ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے کسی لفظ کا وجود نہیں ہے۔ وہ لفظ اور موقع ہی پیدا نہیں ہوا۔ اور حج کے مجمع کو بھی جانے دو، جہاں نبی کے نواسہ کا مسلمانوں سے پناہ لینے کا استغاثہ بہت کچھ کر سکتا تھا اور وہ سوچ سکتے تھے کہ ہم رسمی عبادت بجا لا کر ہی کیا کریں گے جب ہم سے وہ فریاد کر رہا ہے جو شرع سکھانے والے کا گوشت خون اور روح ہے۔ اسے دشمن گھیرے ہیں۔ اس کی مدد اس وقت کا اہم ترین فرض ہے۔ حج تو ہر سال بجا لاتے رہیں گے۔ سب نہ سہی تھوڑے ہی سے متاثر ہوتے اور حسینؑ اسی کو غنیمت سمجھتے کہ کچھ نہیں سے کچھ ہی بہتر ہے۔ ہم اس خیال سے بھی باز آتے ہیں اور پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ مؤرخین اس کے قائل ہیں کہ حضرتؑ کے مکہ پہنچتے ہی لوگوں کا ہجوم ہونے لگا اور لوگ شرف قدم بوسی کے حاصل کرنے کے لیے حاضر ہونے لگے۔ کیا کوئی لفظ کوئی فقرہ یا کوئی خطبہ پیش کیا جا سکتا ہے جس سے حضرتؑ نے اس مجمع کو مخاطب کیا ہو اور ان سے مدد چاہی ہو۔ نہیں ہے۔

کوفہ کے قاصدوں کی واپسی کے معنی

جو کچھ ہم نے اب تک کہا اس سے یہ امر بھی صاف ہو گیا کہ کوفہ ہو یا کوئی اور مقام اس سے کوئی تحریک حضرتؑ کی خلافت طلبی کی زمانہ قیام مدینہ میں نہ ہوئی تھی اور اگر ہوئی بھی تھی جسے حضرتؑ روک نہ سکتے تھے، تو خود حضرتؑ نے اسے منظور نہ کیا تھا۔ اور یہ صورت مکہ میں باوجود اہل کوفہ کی تحریک کے قائم رہی کہ یا حضرتؑ نے ان کے قاصدوں کو کوئی جواب نہ دیا۔ خطوط پھینک دیے یا صاف انکار کر دیا۔ مدینہ میں حضرتؑ کے طرز عمل سے جو کچھ واضح ہے وہ یہ ہے کہ:

حضرتؑ متوقفانہ مصلحت اختیار کرتے

حضرتؑ اگر بلا بیعت کے چھوڑ دیے جاتے تو وہ بحیثیت ایک نیوٹرل فرد کے سکونت گزیں رہتے اور ہرگز ترک وطن اختیار نہ کرتے۔ انھیں یزید کی حکومت سے نہ موافقت ہوتی اور نہ مخالفت۔ اور ان کی یہ روش ویسی ہی ہوتی جیسے رحلت رسولؐ کے بعد ایک زمانہ تک جناب امیرؑ کی یا ترک اختیار کے بعد حضرت امام حسنؑ کی تھی۔

اپنی جلاوطنی کے معنی

اگرچہ حضرت امام حسین علیہ السلام ولید بن عُتبہ اور مروان بن حکم کے برتاؤ میں جو ان کے ساتھ تھا فرق کر رہے تھے لیکن تاہم وہ سمجھتے تھے کہ ولید باوجود لحاظ اور احترام کے اس کے لیے اپنے کو معذور نہیں سمجھتا کہ وہ بیعت لینے کے متعلق مزید تشدد جائز نہ رکھے۔ پھر بھی حضرتؑ نے جلا وطنی منظور کی۔ لیکن لوگوں سے اپنے متعلق تائید کے کسی اِستغاثہ کی کوشش روانگی کے آخری وقت تک نہ کی۔

حفاظت جان و آبرو کی کوشش

خطرہ کے وقت اپنی جان بچانے کی کوشش فطرت انسانی میں داخل ہے۔ حضرتؑ نے یہی کیا۔ لیکن کسی ایسے مقام پر فوراً پہنچ جانا جو آل ابوسفیان کی حکومت سے علیحدہ ہو ممکن نہ تھا۔ اپنے جد بزرگوار کا یہ حکم جانتے تھے کہ:

مکہ معظمہ جانے کے معنی

مکہ میں حیوانی یا انسانی قتل جائز نہیں ہے اور اس لیے موقع کے انتشار کے باوجود حضرت نے یہ تصفیہ فرمایا کہ مکہ روانہ ہوں جہاں یہ امید ہو سکتی تھی کہ یزید جو مسلمانوں پر حکومت کر رہا تھا شاید مسلمانوں کے خیال سے خانہ کعبہ کی حرمت کو قتل سے ضائع نہ کرے۔ ہم اس پر مطلق زور نہیں دے سکتے کہ حضرتؑ حتمًا یہ سمجھتے تھے کہ مکہ پہنچتے ہی ہم محفوظ ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ اگر یہاں قتل واجب العمل نہ سمجھا جاتا تو گرفتاری ممکن تھی۔ میرے نزدیک مکہ تشریف لے جانا مجبوراً ایک صورت کا دیکھنا تھا۔ میرا یہ خیال اس لیے ہے کہ حضرتؑ نے ابن عباس سے فرمایا کہ میں اس وقت تک مکہ میں قیام کروں کا جب تک رہنے دیا جاؤں۔ یعنی حضرتؑ اس امکان سے غافل نہ تھے کہ ہو سکتا ہے کہ میں مکہ رہنے نہ دیا جاؤں۔

عامل مدینہ کی طرح عامل مکہ کے نام بھی یزید کا حکم آسکتا تھا

ایسا فرمانے کے لیے کوئی وجہ ہونی چاہیے تھی۔ وجہ تھی۔ وطن اور اس کا اثر جب اس قابل ثابت نہ ہو سکا کہ حضرتؑ کو جلا وطنی پر مجبور نہ کرتا تو مکہ نسبتًا دور تھا اور بمقابلہ مدینہ مکہ پر اثر اور تعلق بھی کم تھا۔ مکہ کبھی کا وطن تھا۔ اور جس طرح مدینہ کے عامل کے نام یزید کا ایک خط آسکتا کہ حسینؑ کو بیعت پر مجبور کرو ایسا ہی یا اس خط کی ایک نقل عامل مکہ کے پاس بھی آسکتی تھی اور حسینؑ کا موقع یا تو یہاں بھی ویسا ہی ہو جاتا جیسا مدینہ میں ہوا یا اس سے بھی زیادہ مخدوش ہو جاتا۔ صورت معاملہ اس سے بھی زیادہ مائل بہ سختی تھی اور یہ تجربہ ہو چکا تھا یا ہوا ہی چاہتا تھا کہ ابن زبیر کی گرفتاری کے لیے ایک فوج آئی۔ جنگ اور کشت و خون ہوتا اور ابن زبیر اس طرح اپنے لیے یزید کی کسی مزید کوشش تک اس موقع کو حاصل کر لیتے کہ مکہ میں جس صورت سے تھے اس سے بہ ذلت خارج نہ کیے جا سکتے۔ یہ مثال ایسی نہ تھی کہ حسینؑ کی توجہ بغیر گزر جاتی اور اگر اب تک واقع نہ ہوئی ہوتی تو اس کا امکان کہ کوئی فوج ہماری گرفتاری یا قتل کے لیے آئے ہو ظاہر سے بھی زیادہ ظاہر تھا۔

عمر بن سعید کے سپاہیوں کے ساتھ جنگ نہ کرنے کے معنی

تم نہیں جانتا کہ حسینؑ کیا کرتے اگر ان کا موقع بھی ویسا ہی ہوتا جیسا ابن زبیر کا تھا۔ لیکن میرا تصفیہ یہ ہے کہ نہ حسینؑ ان ذرائع کو اپنے لیے پسند کرتے جو ابن زبیر نے پسند کیے ہوں اور نہ مکہ میں جنگ کرتے بلکہ وہ ہر وقت اس خبر کے متلاشی رہتے کہ اگر ہم کسی فوج کی آمد کی خبر سنیں تو قیام مکہ کو بھی مدینہ کی طرح ترک کریں۔ میرا آخری خیال اس روایت سے مؤید ہے کہ عمر بن سعید الاشدق کے سپاہیوں کے روکنے پر حضرتؑ اپنے رفقاء کو تلواروں سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ بلکہ یا تو کوڑوں سے دور ہٹاتے ہیں یا پسپا ہوتے چلے جاتے ہیں جس کی دو غرض ہو سکتی ہے ایک تو یہ کہ ہم ممنوعہ حدود کے باہر نکل جائیں اور یا اس کا موقع پا جائیں کہ جنگ کی نوبت نہ آئے اور ہم آگے بڑھ جائیں۔ میر تصفیہ آخر الذکر خیال پر ہے۔

اگر یہ بھی تسلیم کیا جائے کہ عمر بن سعید کا تبادلہ اس وقت مدینہ میں ہو چکا تھا۔ اور اس نے مدینہ سے حضرتؑ کو امان نامہ لکھا تو اس کا امان نامہ اس لیے قابل نظر ہے کہ کسی عامل کے کسی انفرادی فعل کی مرکزی حکومت ہمیشہ ذمہ دار نہیں ہوا کرتی خصوصاً جب کہ کسی عامل کے فعل سے مرکزی حکومت کا حکم مختلف ہو۔ یزید ولید کو حسینؑ کی گرفتاری یا قتل کا حکم دے چکا تھا۔ اور تساہل کی وجہ سے ولید کو معزول کیا تھا۔ ایسی صورت میں اگر عمر بن سعید کا امان نامہ یزید کے حکم کی لاعلمی پر مبنی تھا تو اس کا کیا یقین ہے کہ وہ یزید کے حکم کے علم پر بھی اپنے اس امان نامہ پر قائم رہتا۔ اور اگر قائم بھی رہتا تو اس کیا ذمہ داری ہے کہ یزید بھی اس کو قبول کر لیتا۔ درآنحالیکہ اس امان نامہ سے حسینؑ نے کسی شرط کا اپنے کو پابند نہ کیا ہوتا۔ اس کے علاوہ عمر بن سعید کے خط کو دیکھتے ہی حسینؑ کا قبول کر لینا بغیر ثبوت کے سیاسی بے احتیاطی ہوتی۔ کون جانتا ہے کہ وعدۂ امان سے حسینؑ کو دھوکا نہیں دیا جا رہا تھا۔

مکہ کا موقع

مجھے ذاتی طور پر اس کا بھی یقین ہے کہ حضرتؑ کسی ایسے موقع پر جب کہ وہ دشمنوں میں گھر جاتے ہرگز خانہ کعبہ میں پناہ نہ لیتے۔ یہ شجاعت حسینیہ اور خصائل حسینی کے خلاف ہوتا۔ حسینؑ کا نفس اسے ہرگز قبول نہ کرتا کہ وہ اپنی جان کے لیے لوگوں کے اعتقاد میں پناہ لیتے۔ یا محض پناہ لیتے، ناممکن تھا بلکہ وہ ایسے موقع کے قبل ممنوعہ حدود کے باہر نکل جاتے اور وہاں وہ کچھ ہوتا جو کربلا میں ہوا۔ حالانکہ اس کے علاوہ حرمت خانہ کعبہ کی حفاظت بھی ایک چیز تھی۔ جس کے لحاظ سے حضرتؑ فرما رہے تھے کہ: "اگر میں (حدود مکہ سے) ایک بالشت ہٹ کے شہید ہوں تو مجھے یہ زیادہ محبوب ہے کہ میں مکہ میں مارا جاؤں"۔

عامل مکہ کی اطلاع کے معنی

اب میں اس امر پر نظر کرنا چاہتا ہوں کہ مکہ میں حضرتؑ کا کیا موقع تھا۔ ترتیب واقعات میں میں کہہ چکا ہوں کہ جب حضرتؑ مکہ پہنچے اور لوگ شرف قدمبوسی اور ادائے حاجات کے لیے حاضر ہونے لگے تو عامل مکہ نے یزید کو ان حالات کی خبر دی میں فرض کرتا ہوں کہ اس کی یہ اطلاع اس بنیاد پر نہ تھی کہ اسے حضرتؑ سے کوئی ویسی ہی عداوت تھی جیسے مروان بن حکم کو اور وہ اس اطلاع سے گویا اس امر کا حکم حاصل کیا چاہتا تھا کہ ہمیں حسینؑ سے استحصال بیعت اور تشدد کی اجازت دی جائے۔ میں اسے بھی فرض کرتا ہوں کہ وہ یزید کے اس حکم سے ناواقف تھا کہ یزید نے عامل مدینہ کو حسینؑ کے متعلق کوئی حکم بھیجا تھا۔ اور

اس حکم سے حسینؑ نے قیام مدینہ کو قیام مکہ سے بدلا تھا۔ حالانکہ حضرتؑ کا مکہ آجانا اس خبر کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتا تھا کہ حضرتؑ کونسے اتفاقات میں تشریف لائے ہیں۔ میں اس سے بھی چشم پوشی کرتا ہوں کہ واقعات کی غیر رسمی اطلاع پر عامل مکہ نے حسینؑ کے ساتھ کسی برتاؤ کا ارادہ کیا۔ بلکہ محض اطلاع دی۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ مکہ کا عامل تھا۔ اور بحیثیت اس کے وہ اس کا ذمہ دار تھا کہ اپنے رقبہ اختیار کے واقعات کے لیے آنکھیں کھولے رہتا۔ حسینؑ کی آمد کو اس نے ایک غیر معمولی واقعہ سمجھا۔ جس کی اطلاع دینا ضروری ہوتا۔ اطلاع اپنے ولی نعمت یزید کو دیتا۔ اس کا نام عمر بن سعید الاشدق تھا۔ یہ اموی تھا۔ اپنے کو امیدوار سلطنت سمجھتا تھا۔ اور اسی میں قتل کیا گیا۔

نواسۂ رسولؐ کا فرق مطہر رسولؐ کے منبر پر

یہی تھا کہ جب یہ مدینہ منتقل ہوگیا تو اس وقت حضرتؑ شہید ہو چکے تھے۔ ابن زیاد نے اسے اطلاع دی اور اسی کے ہاتھوں عالم نے یہ عبرت خیز منظر دیکھا کہ مسجد نبی کے اسی منبر سے جس پر حسینؑ نبی برحقؐ کی گود اور پشت پر سوار ہوجاتے آج عمر بن سعید الاشدق اہل مدینہ کو حسینؑ کے شہادت کی اطلاع دیتا اور حسینؑ کا سر اقدس یا اس کے ہاتھ میں ہوتا اور یا منبر کے کسی زینہ پر رکھا ہوتا! (اگر یہ روایات صحیح ہیں کہ حسینؑ کا سر اقدس مدینہ بھیجا گیا)

عمر بن سعید کے الفاظ

اور اس کی اطلاع پر جب محلہ بنی ہاشم یا حاضرین میں کہرام مچتا تو یہ کہتا کہ: "ایک روز ہماری عورتیں روتی تھیں آج ہمارے دشمنوں کی عورتیں روتی ہیں"۔

امان کی کیا ضرورت تھی اگر محفوظ تھے

یہی عمر بن سعید الاشدق تھا کہ جب حضرتؑ مکہ سے روانہ ہوگئے تو حضرت عبداللہ بن جعفر اس کے پاس آئے اور بقول کامل ابن اثیر اس سے خواہش کی کہ: "حسینؑ کو امان دیدو اور نیکی اور صلہ رحم سے واپس آنے کا سوال کرو"۔ اگر حضرتؑ مکہ میں محفوظ تھے اور کوئی خطرہ نہ تھا تو سوال "امان" کی کیا ضرورت تھی؟۔

سواروں کی واپسی کے معنی

عمر بن سعید الاشدق گرم مزاج نہ تھا بلکہ نہایت خنک مزاج مدبر تھا جو اس ایک مثال سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے سواروں کو پہلے تو بھیجتا ہے کہ حسینؑ کو روک دو۔ اور جب دیکھتا ہے کہ حضرتؑ آمادہ نہیں ہیں اور نوبت بجنگ آسکتی ہے تو اپنے سپاہیوں کو واپسی کا حکم دیتا ہے۔ اس لیے کہ زمانہ حج اور مسلمانوں کے مجمع نے اسے کسی تحت کارروائی سے احتیاط کا خیال دلایا۔ جو واقعات کہ اب تک پس پردہ تھے تلواروں کی جھنکار کے بعد پردہ میں نہ رہ سکتے اور صورت معاملہ ممکن تھا کہ بالکل بدل جاتی۔ میں کہتا ہوں کہ وہ خنک مزاج مدبر تھا۔ اور مجھے اس کے آثار اور بھی ملتے ہیں۔ اور میں سوچتا ہوں کہ یہ آثار حضرت کے زمانہ قیام مکہ میں ایک ظاہر راز ہیں۔ عمر بن سعید الاشدق کا موقع یہ تھا کہ حضرتؑ ایک ایسی جگہ سے تشریف لائے تھے جہاں یزید کا ایک حکم عام ہوگیا تھا۔ اور اس کی کارروائی سے کسی نہ کسی طرح محفوظ ہوکر حضرتؑ اب مکہ پہنچے تھے۔ بنا بریں اس کا قیاس نا ممکن ہے کہ مکہ میں بھی کوئی ایسی کارروائی اسی طرح کی جاتی کہ جو یا تو ظاہر ہوجاتی۔ اور بے سود ہوتی۔ یا کوئی ایسی شورش ہوتی جو حکومت کے مفید نہ ہوتی۔ یہ مصلحت اس بنا پر بھی نا قابل حل تھی کہ ابن زبیر یا تو مکہ میں ایک گونہ اقتدار بزور شمشیر حاصل کر چکے تھے اور یا محض تھے۔ آخر الذکر صورت میں بھی یہ نہیں سوچا جاسکتا کہ حسینؑ پر کسی ظاہر تشدد سے یا تو حسینؑ کو

اس پر مجبور کرتے کہ وہ ابن زبیر سے کسی قسم کی مدد لیتے اور یا ابن زبیر حسین پر کسی تشدد کو اپنے اوپر ایسے ہی تشدد کا مقدمہ سمجھ کر خود سے حسین کے شریک ہو کر اس دشمن کو مغلوب کرتے جو دونوں کا عام دشمن تھا۔ ہو سکتا ہے کہ حسینؑ کے لیے یہ ناممکن ہو کہ وہ کسی کی مدد قبول کریں۔ خصوصاً ایسے حوصلہ مند کی جو مدد کا صلہ حصولِ اقتدار قرار دے سکے۔ نہ میں اس وجہ سے متذکرہ صدر خیال ظاہر کر رہا ہوں بلکہ عمر بن سعید الاشدق کے سیاسی موقع کے لحاظ سے جسے بغیر ایسا سوچے چارہ نہ تھا۔ اس کے علاوہ کوئی قدم اٹھانا سیاسی بے تمیزی ہوتی۔ نہ عمر بن سعید الاشدق یہ کھیل کھیل سکتا تھا کہ ابن زبیر اور حسین کو آپس میں لڑوا دیتا۔ اس لیے کہ ایک طرف حسین تھے اور ابن زبیر کو تجربہ ہو چکا تھا کہ حسینؑ ہماری کسی کوشش میں دخل نہ دیں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہر صورت میں لوگ بمقابل ہمارے حسین کا زیادہ احترام کرتے ہیں۔ اور موقع کی ہمدردی بھی جیسی حسینؑ اور ابن زبیر میں ممکن تھی یزید کے عامل اور ان میں سے کسی میں ممکن نہ تھی۔ یہ جواب دینا میرا کام نہیں ہے کہ اگر ابن زبیر کو یزید کی رعایتوں کا یقین ہو جاتا تو کس حد تک وہ اس کے خلاف کسی روش سے باز آتے یا نہ آتے۔

خفیہ طور سے قتل یا گرفتاری

ان امورات کے لحاظ سے یہ سوچنے کے علاوہ چارہ نہیں ہے کہ یا تو زہر دینے اور یا پوشیدگی سے قتل کرنے کی صلاح ہو رہی تھی۔ اور یا اس قدر خاموشی گوارا کی گئی تھی کہ زمانہ حج ختم ہو اور حاجی اپنے گھروں کو واپس جائیں تو اس وقت نسبتاً تھوڑے سے سپاہیوں سے کام چل سکے گا۔ اگر گرفتاری منظور ہو، اور یا یزید کی بھیجی ہوئی فوج پہنچ جائے گی اور ہم اپنی خواہش کے موافق حسینؑ کے ساتھ برتاؤ کر سکیں گے۔

اب تاریخ نہ صرف اس کوشش کا ذکر کرتی ہے کہ خفیہ قتل یا گرفتاری کی تیاری ہو رہی تھی بلکہ اس کا تذکرہ بھی ہے کہ فوج مکہ سے قریب پہنچ جاتی تھی اور سختی سے حضرتؑ کے نقل و حرکت کی نگرانی ہو رہی تھی اور حضرتؑ کے لیے نہ صرف قیام مکہ بلکہ کہیں اور جانا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ اس کے قبل میں ان آثار سے بھی چشم پوشی نہیں کر سکتا جو اگرچہ مطلق ثبوت نہ بھی ہوں تاہم تائیدی ثبوت ضرور ہیں کہ ابن عمر حضرتؑ سے کہتے ہیں کہ: "لوگوں نے یزید سے بیعت کر لی ہے۔ مکہ والے بھی دولت و زر کی لالچ سے اسی کی طرف جھکیں گے آپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے یا شہید کر دیں گے"۔ یا تاریخ کامل کے موافق حضرت عبداللہ بن جعفر حضرتؑ کا تصفیہ سفر معلوم کر کے کہتے ہیں کہ میں "آل محمد کی تباہی دیکھ رہا ہوں"۔ یا اعثم کوفی کے موافق عبداللہ بن جعفر حضرتؑ کو لکھتے ہیں کہ: "میں آپ کے واسطے یزید اور بنی امیہ کی اور امیروں کی طرف سے امان حاصل کرا دوں گا۔ پھر اطمینان کے ساتھ حرم محترم میں رہنا"۔ یا حضرت امام حسینؑ علیہ السلام ابن عباس، ابن عمر اور محمد حنفیہ سے کہتے ہیں کہ: افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہ لوگ مجھے گھر میں بیٹھنے نہ دیں گے۔ مجھ سے الجھیں گے اور اگر میں ان میں سے نکل کر کسی نامعلوم جگہ جاؤں گا تو بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ اور بیعت یزید کے لیے مجبور کریں گے اور اگر انکار کروں گا تو قتل کریں گے۔

کہا جا سکتا ہے کہ یہ الفاظ خطرہ کے گمان سے بڑھ کر نہیں ہیں۔ ہم اس کو تسلیم کر لیتے ہیں اور خدا کے اس بڑے قانون سے چشم پوشی کرتے ہیں کہ خطرہ کے وقت انسان کی قوتِ حس تیز ہو جاتی ہے یا بغیر سلسلۂ خیال کے بھی دفعتہً ہم خطرہ یا غم محسوس کرتے ہیں اور کچھ وقت کے بعد دیکھتے ہیں کہ ہمارا کبھی کا وہم تھوڑی دیر بعد کا واقعہ تھا۔ لیکن یہ وہم یا گمان کی حالت

دیر تک قائم نہیں رہتی بلکہ وہ یقین کی صورت اختیار کرتی ہے جب حضرت فرزدق سے فرماتے ہیں کہ: "اگر میں جانے میں عجلت نہ کروں تو دشمن گرفتار کر کے لے جائیں گے"۔ یا ابوہریرہ ازدی سے کہتے ہیں کہ: "اب قتل کرنا چاہا تو میں وہاں (حرم خدا و رسولؐ) سے نکل آیا"۔ یا اپنے آخری وقت کسی معصوم بچے کے اس سوال پر: "پھر ہمیں مدینہ پہنچا دو"۔ فرماتے ہیں کہ اگر کوے کو آشیانے میں رہنے دیتے تو آرام سے سوتا۔ اور ان واضح خبروں کو تو جانے دو کہ کچھ آدمی حاجیوں کے لباس میں حسینؑ کے شہید کرنے کی فکر میں تھے۔ کوئی عجب نہیں ہے۔ میں اسے بھول نہیں سکتا کہ یزید معاویہ کا بیٹا تھا اور نہ یہ سوچ سکتا ہوں کہ یزید کو یہ معلوم نہ تھا کہ میرے مدبر باپ نے انھیں کس طرح راستہ سے ہٹا دیا۔ تھیں وہ بظاہر قتل یا گرفتار نہیں کر سکتا تھا۔ اور چونکہ یہ کوششیں مدینہ کے ظاہر حکم کے بعد تھیں میں سوچتا ہوں کہ یا تو مدینہ یزید کا خیال ثانوی تھا اور یا یہ عمر بن سعید الاشدق کی صلاح سے تھا۔

مؤلف اپنے بعض الفاظ کا ترجمہ کرتا ہے

اس جگہ میں یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ حصہ اول میں وہ موقع جب رسولؐ اپنے فرزند ابراہیم اور حسینؑ کی حیات کا تصفیہ کرتے ہیں اور میں نے اسے "ہولناک خیال" کہا ہے۔ یا اس موقع پر جب کہ حضرت امام حسینؑ کے احساس خطرہ کو میں نے وہم یا گمان تسلیم کرنا گوارا کیا ہے۔ یہ حقیقتہً "وہم" "گمان" اور "خیال" کے الفاظ کے اس حیثیت کے اِستعمال کی مجبوری سے ہے۔ جس کے بغیر ہم ان الفاظ کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے۔ ورنہ میرے نزدیک ان نفوس قدسی میں کسی خیال کا کوندنا حقیقتہً فطرت کے قوانین کے موافق الہام تھا۔ یہ اس سے بالاتر تھے کہ ان کے ساتھ وہم، گمان یا خیال کا وہ مصرف جائز رکھا جائے جس طرح ہم آلودہ انسان اپنی حالتوں کے اِظہار کے لیے ان الفاظ کو استعمال کرتے ہیں۔

میں یہ کہنے کے قابل نہیں ہوں کہ نفس یا دماغ کا کس حد تک نکھرنا اس قابل کرتا ہے کہ اس میں اس حرکت کی ابتدا ہو کہ وہ دوسروں کے جذبات کا صحیح احساس کرے یا اپنے خیالات اور جذبات کو دوسرے کے نفس پر نقش کر دے۔ وہ کس طرح عالم اثیری سے ان صداؤں اور حالتوں کو جذب کرتا ہے اور کونسے طریقوں سے سروش غیبی ان کے سامعہ باطنی سے مس ہوتی تھی۔ آیا کسی امر کے متعلق ان کا تصفیہ ایسے ہی کسی قانون کا نشو تھا جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک انسان باوجود سمجھانے کی تمام کوششوں کے نہیں سمجھتا اور کوئی ہے جو خفیف سا اشارہ پا کر دیکھتا ہے کہ اس امر کے متعلق تمام پہلو روشن ہو گئے۔ یا صحیح احساس کے لیے کوئی اور سار کوئی کرانک طریقہ تھا۔

لیکن تھا۔ ان کی تاریخ بتاتی ہے۔ نہ خواب ان کے لیے خواب تھا نہ خیال ان کے لیے خیال تھا۔ یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں خبر ملی اور اسی کے یقین پر اپنے عمل کو مبنی کرتے تھے۔ عالم کی تاریخ پتا دیتی ہے اور نفس انسانی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ اگرچہ ہم قانون کو نہ سمجھے ہوں لیکن قانون کا احساس یا وہم و گمان ہم میں ضرور ہے۔ اور اگر ہمیشہ نہیں تو یہ نور کبھی کبھی انسان پر چمک جاتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ کچھ ایسے نفوس قدسی اور دماغ مظہر ہوں جن پر ایسے عکس کی تکرار ہوتی ہو۔

سواروں کے بھیجنے کے معنی

آخر کیا ضرورت تھی عمر بن سعید الاشدق کو سواروں کے بھیجنے اور حضرتؑ کو بہ جبر مکہ میں واپس لانے کی۔ اگر مکہ کی حکومت حسینؑ کو اپنے جانے اور رہنے میں ایک مختار انسان سمجھتی تھی؟۔ یہ بینش قدری کہتی ہے کہ اب تک اپنے منصوبوں کو ناتمام دیکھ کر جلدی سے سوار بھیجے

کہ انھیں اپنے قبضہ سے نکل نہ جانے دیں، اور یا حسینؑ کو ان کی خواہش اور نفس کے خلاف یزید کی بیعت کرنے پر مجبور کریں۔

صلاحوں کی حیثیت

ان اتفاقات کی موجودگی میں ابن عباس اور ابن عمر مدینہ واپس چلنے یا مکہ میں رہنے کی صلاحیں دیتے ہیں۔ میں ان کی رائے کو بجز محبت اور نیک نیتی کے اور کسی غرض پر محمول نہیں کرتا۔ لیکن بغیر یہ کہے بھی نہیں رہ سکتا کہ یہ یا تو واقعات سے ناواقف تھے اور یا ان سے چشم پوشی کر رہے تھے۔ کیا حسینؑ مدینہ ہی سے جلاوطن ہو کر نہ آئے تھے؟ غالباً وہ لوگ اس سے واقف نہ تھے کہ عمر بن زبیر کہتا کہ میں عبداللہ بن زبیر سے "عین خانہ کعبہ میں لڑوں گا"۔ یا نہ جانتے تھے کہ یزید نے ولید بن عتبہ کو ابن زبیر کے مکہ روانہ ہونے کی اطلاع پر لکھا تھا کہ: "عبداللہ بن زبیر کو اس کے حال پر چھوڑ دو وہ جہاں کہیں جائے گا ہماری کمند اس کے گلوگیر رہے گی"۔ اور یہ تو انھیں ایک آدھ برس کے بعد دیکھنا تھا جب یزید مسلم بن عقبہ کو مدینہ کی تاراجی اور مکہ میں ابن زبیر سے جنگ کے لیے بھیجتا اور مسلم بن عقبہ اپنے بستر موت پر حصین بن نمیر کو ان لفظوں میں وصیت کرتا کہ: "چوں بمکہ رسی باید کہ از سر جد و جہد و اجتہاد بحرب ابن زبیر قیام نمائی و باید کہ بر خاطر تو خطور نہ کند کہ این خانہ خداست و من چگونہ باہل خانہ محاربہ کنم۔ وظیفہ آنکہ مجانیق نصب کنی و از ویران شدن خانہ کعبہ باک نہ داری کہ سخن امیر زیادہ است از کعبہ"۔ یعنی: "تو جب مکہ پہنچے تو ابن زبیر سے لڑائی میں بہت جد و جہد سے کام لو اور تیرے دل میں یہ خیال نہ گھسنا چاہیے کہ یہ خدا کا گھر ہے۔ اور میں کس طرح خدا کے گھر والوں سے لڑوں۔ تیرا فریضہ یہ ہے کہ منجنیق نصب کرے اور خانہ کعبہ کے ویران ہونے کی پرواہ نہ کرے۔ کیونکہ امیر کی بات کعبہ سے بڑھ کر ہے"۔

ان پیش و پس حالات کی موجودگی میں اگر ابن عباس اور ابن عمر کو یہ تصفیہ کرنے کا موقع نہ بھی ہو کہ حسینؑ کے ساتھ درمیانی حالت میں بھی یہی ہو سکتا تھا تو ہم لوگ جو دونوں گزرے ہوئے واقعات سے واقف ہیں اس تصفیہ سے دور نہیں رہ سکتے۔ حسینؑ بیعت نہ کرتے اور ضرور شہید ہوتے۔ جہاں ہوتے۔ لیکن اس وقت یہ ان کے اختیار میں تھا کہ خانہ کعبہ کی حرمت ضائع نہ کرتے اور یہ انھوں نے کیا۔ جو لوگ انھیں حرم میں رکھنا چاہتے تھے وہ بے ہوشی میں اس کے مشتاق تھے کہ حرم کو حسینؑ کے خون سے سرخ دیکھتے۔ جو کچھ ہو حجاز کی غیر محفوظ حالت میں کلام نہیں ہو سکتا۔ ورنہ حسینؑ حج پر طلب خلافت ہی سہی، کوچ یا ایک دن کے لیے ترجیح نہ دیتے۔

ایک سوال کا جواب

لیکن ابن عمر اور ابن عباس حسینؑ کی حالت خوف اور یزید کی طرف سے تشدد ہونے کے قرائن سے ناواقف نہ تھے۔ بلکہ یہ کہہ رہے تھے کہ یزید سے بیعت کر کے بلا ٹالو۔ اور ابن عمر جانتے تھے اور کہہ رہے تھے کہ: "اگر تم یہ چاہتے ہو کہ یزید سے بیعت نہ کرو تو تمھیں اس کے لیے ضرور مجبور کریں گے اور وطن میں اطمینان سے بیٹھنے نہ دیں گے تاوقتیکہ آپ اس کی بیعت اختیار نہ کریں"۔ اگر مؤرخین کے نزدیک "سمجھ دار" ہونے کا معیار یہی ہے کہ کوئی شخص اپنی زندگی کے لیے کیسے ہی ذلیل فعل کے آگے سر جھکا دے تو مجھے "حسینؑ کا جواب" ہی لکھ دینا ہو گا اور بس کہ: "ایسی باتوں پر تف ہے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں"۔ حسینؑ نے اپنے علم و ارادہ سے عزت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اگر عالم میں سمجھ داری کے سبب ایسے ہی نقیب ہوتے تو علوے نفس، ایثار و حمیت اور کسی بڑی وجہ کے لیے قربانی یا شہادت کا شریف ترین مفہوم

اور مثالیں دنیا میں موجود ہوتیں یا نہ ہوتیں۔ اور حیف کہ حسینؑ کے فلسفۂ شہادت کی عظمت و شرافت ایسی غلط خیالی یا دور از راہ احتمال آرائی کی آماجگاہ ہوا۔

غالباً میں اپنی اس بحث کا جواب دے چکا کہ: "آیا حضرت امام حسین علیہ السلام کی روش نزاعی تھی؟ نہ تھی"۔ اب میری یہ ضمنی بحث شروع ہوتی ہے: "اگر بفرض محال حسینؑ نے یزید کی سلطنت کے الٹ دینے کا قصد کیا تو یہ کوشش کب تھی۔ کیسی تھی اور حضرتؑ نے کامیابی کے لیے کونسے وسائل اختیار کیے؟"۔

یہ سوچنا سامنے کی بات ہے کہ ایسے خوف اور تشدد کی حالت میں جس میں حضرتؑ بسر کر رہے تھے کسی انسان کے لیے کیا موقع رہ گیا تھا۔ یہ کہ وہ خاموشی سے اپنے کو دشمن کے حوالہ کر دیتا کہ یا تو وہ کسی تاریک گوشہ میں ناقابل برداشت مصیبتیں گوارا کرتا رہے اور یا قتل کیا جاتا۔ حسینؑ کی غیرت و حمیت نے اسے گوارا نہ کیا کہ اپنے کو مسیح ابن مریم کی طرح گرفتار کرا دیتے اور دشمن کو اپنی گرفتاری پر متحکہ کرنے دیتے۔ مسیح ابن مریمؑ سے یہود ہوں یا رومی۔ ان میں سے کسی کو نہ کوئی دیرینہ عداوت تھی اور نہ بجز اس کے کہ وہ ان کی مذہبی مداخلت کو خلاف ورزی سمجھتے تھے اور کوئی مخاصمت تھی، برخلاف اس کے حسینؑ اور ان کے دشمنوں کی معاملت وہ تھی جو طویل حد تک پہلے حصہ میں دکھائی گئی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان امورات کی ناموجودگی میں حسینؑ کیا کرتے۔ لیکن ان اسباب حالت کی موجودگی میں حضرتؑ نے اپنے کو ان کے ہاتھوں میں گرفتار دیکھنا پسند نہ کیا۔ حسینؑ کے اسباب مدافعت اور دشمن کے سامان منازعت کا مقابلہ کرنے کے بعد حسینؑ کی یہ غیرت ایک عدیم المثال جرأت تھی۔ یعنی تصفیہ کی ابتدا ہی نہایت غیورانہ اور شاہانہ تھی اور واقعات جس جس طرح صورت اختیار کرتے گئے ان حالتوں میں حسینؑ کے اس ابتدائی پر غیرت تصفیہ میں استقلال اور اصرار کا ترقی کرتے جانا ایک ایسی حالت تھی جو تاریخ عالم میں حسینؑ ہی کے لیے مخصوص تھی۔

حسینؑ اس لیے اب تک گرفتار یا شہید نہیں ہوئے تھے کہ ولید بن عتبہ کے پاس جانے کے وقت مسلح وفاداروں کو ہمراہ لے گئے تھے۔ اور اس کے بعد بھی مدینہ میں رہنے کی جس قدر مہلت ملی اس میں ولید ابن عتبہ خواہی نخواہی صورت معاملہ کو دیکھ رہا تھا کہ حسینؑ سوال بیعت کے متعلق کیا تصفیہ کرتے ہیں۔ مجھے اپنے اس میلان کے ظاہر کرنے میں بھی عذر نہیں ہے کہ ولید بن عتبہ جس طرح حضرت امام حسین علیہ السلام کے اس موقع کے لحاظ سے جو انھیں مدینہ میں حاصل ہونا چاہیے تھا کسی سختی کی پیش قدمی سے رکتا تھا۔ اسی طرح ممکن ہے کہ وہ رعایت کر رہا ہو، اور اس موقع کا منتظر ہو کہ اگر حسینؑ مدینہ سے باہر چلے جائیں تو حدود اختیار سے باہر ہو جانے کی وجہ سے میں نواسہ رسول پر سختی کے لیے مجبور نہ ہوں گا۔ مکہ میں پہنچے، اور کئی مہینہ رہے۔ اور کسی کو اس میں عذر کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ نصف شعبان سے بارہ ذیقعدہ تک کوئی لفظ اور انداز اور کوئی حرکت ایسی ظاہر نہ ہوئی جس سے یہ سمجھا جاسکتا کہ حسینؑ کسی نزاعی روش کا خیال رکھتے ہیں۔ لیکن یہی زمانہ ان کے لیے موقع کے احساس، تجربہ اور تصفیہ کا تھا۔ اور حسینؑ نے بڑھ کر اپنے موقع کے سمجھنے کا نہ دوسرے کو موقع تھا اور نہ حق تھا۔ وہ اگر اپنے موقع کو سمجھتے تھے تو یہی سمجھتے تھے کہ یزید میرے متعلق اپنے حکم کو بھولا نہیں گیا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ میرے اثر اور ذات کو دشمن سمجھتا ہے اور اس لحاظ سے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مکہ کوئی فوجی چھاؤنی نہیں ہے بلکہ میرے لیے ایسی کسی سخت کارروائی کے لیے بصرہ یا کوفہ سے فوج منگانے کی ضرورت ہوگی یا ہو سکتی ہے۔

یہ وقت حاکم مدینہ کے انتظار کی ایک وجہ تھا اور حضرتؑ کی شہادت کا درمیانی زمانہ۔

اِستدعا کا لہجہ اور فطرتِ انسانی

یہ انتظار تھا کہ اہل کوفہ کی مراسلتوں نے ایک دوسرا لہجہ اختیار کیا۔ اور اگر لہجہ نہ بھی بدلتے تاہم اضطراب کی حالت میں ذریعہ تسکین کی طرف نگاہ اٹھنا فطرت انسانی میں داخل ہے۔ وہ تسکین حقیقۃً تسکین ہو یا نہ ہو۔ حسینؑ بغیر اس حالت کی موجودگی کے جس میں ان کا ہونا ظاہر بات ہے۔

اِستغنائے نفس

ریاست و امارت پر مائل ہوتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ ابتدا ہی میں اہل کوفہ کے قاصدوں اور مراسلتوں کا ویسا ہی جواب نہ دیتے جیسا کوئی شخص دیتا ہے جسے حکومت کی فریفتگی ہوتی۔ حسینؑ میں حکومت و ریاست کی فریفتگی کا نہ ہونا صرف ان کی ایسی صبر آزما حالتوں میں خاموشی سے ظاہر ہے۔ بلکہ ایسے وقت جب کہ مدد کا وعدہ ہو رہا تھا اور غالب قرائن تھے کہ مدد مل سکتی۔ پھر بھی ویسی ہی لاپرواہی پر قائم رہنا حسینؑ کی قوتِ نفس کا ثبوت ہے۔

حضرتؑ کی آمادگی ایک عہد کے نفاذ کے لیے ہوتی

حالانکہ اگر محض طلب خلافت کے لیے حضرتؑ اس وقت آمادگی ظاہر بھی کرتے تو وہ اس بات کے لیے آمادہ ہوتے کہ ہم اس عہدنامہ کو نافذ کریں جو حضرت امام حسنؑ اور معاویہ میں ہوا تھا اور جس کے رو سے حسینؑ کو معاویہ کے مرنے کے بعد خلیفہ ہونا چاہیے تھا۔ یہ معاویہ اور یزید کی بدعہدی تھی کہ اس نے حسینؑ کے حقوق کا لحاظ نہ کیا نہ یہ کہ حضرت امام حسینؑ پر کوئی عذر ہو سکتا کہ تم نے اپنے حق کے طلب کرنے کے لیے کیوں آمادگی ظاہر کی۔

پیشتر کی مثالیں اور ہم آہنگی

باوجود اس کے کہ ایسا کرنے میں حسینؑ اپنے حق کے اندر رہتے لیکن حسینؑ سے یہ امید کرنا کہ وہ خلافت طلبی کے لیے بزور شمشیر کوشش پر آمادہ ہو جاتے پیشتر کی مثالوں سے چشم پوشی ہوگی جو حسین کے کسی طرز عمل کے لیے نمونہ تھی۔ یعنی ہادی برحق نے اپنی ریاست روحانی میں لوگوں کے انصرام امورات کو اس وقت تک شریک نہ کیا جب تک کہ لوگ ہم آہنگی سے اس امر پر مصر نہ ہوئے کہ ہادی برحق ان کے تمام دینی اور دنیاوی امورات کے ذمہ دار ہوں۔ حقیقۃً کوئی تنہا معترض بھی نہ تھا۔ جناب وصی برحق نے باوجود اپنے پامالی حقوق اور باوجود امید دحق اور باوجود ابوسفیان کے وعدہ مدد کے اس پر آمادگی ظاہر نہ کی کہ وہ بزور شمشیر حاصل کرتے۔ جب تک کہ لوگوں نے ہم آہنگی سے خلافت کو لا کر ان کے قدموں پر ڈال نہ دیا۔ اور جناب امیرؑ کو اس کی امید ہوئی کہ لوگ اطاعت کریں گے اور مخالفت نہ ہوگی۔ حضرت امام حسنؑ نے اس وقت خلافت کو ترک کیا جب انھیں لوگوں کی اطاعت سے تساہل کو ملاحظہ فرمایا۔ اگرچہ ایسی حالت تھی جو بظاہر قوت مدافعت کا عدم تصور نہ کیا جائے۔

حسینؑ کے لیے اکثر حالتوں کا اجتماع اور خاموشی

حضرت امام حسینؑ باوجود اپنے حقوق اور باوجود اپنے حقوق اور باوجود اہل کوفہ کی استدعا اور باوجود حالت اضطراب کے ان تمام باتوں کو پائے اقدس کے نیچے مضبوطی سے دبائے رہے اور اگر اس حالت

میں ان کی اس خاموشی کے نیچے حصول خلافت کا خیال پوشیدہ ہوتا بھی تاہم ان کی یہ ادا ان کے تدبر پر دلالت کرتی۔ جس سے وہ اپنے آغاز کوشش تک اپنے اوپر کمال احتیاط سے کوئی حرف آنے نہیں دیتے تھے۔ کسی کا وہم دوسری چیز ہے۔ حالانکہ ایسا نہ تھا بلکہ واقعات، الفاظ، انداز اور ان کے نفس کے پر غور مطالعہ سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اگر وہ نانا کے روضہ کی مجاوری سے دور ہٹائے جانے سے متاسف تھے تو مکہ سے جلاوطنی ان کے لیے ویسی ہی پر تاسف تھی۔

ترکؑ مکہ کے وجوہات

اب جب کہ متواتر تجربہ سے انھیں اس امر کا یقین ہوتا جا رہا تھا کہ انھیں کسی طرح بیعت کی ذلت سے مفر نہ ہوگا اور ضرور قتل کیے جائیں گے تو دوسری طرف اہل کوفہ کی ہم آہنگی ایک ایسی صورت اختیار کر رہی تھی جو عام صدا بھی جائے اور یہ عام صدا اس کا اِستغاثہ کر رہی تھی کہ ہمیں مظالم اور بے دینی سے بچاؤ۔ ان کا یہ فقرہ سچائی کی بو سے خالی نہ تھا کہ: "اگر آپ نہ آئے تو کل بروز قیامت اللہ تعالیٰ کے حضور میں ہم آپ پر دعویٰ کریں گے اور کہیں گے: الٰہی! حسینؑ نے ہم پر ظلم کیا تھا کہ ہم پر ظلم ہوتا ہوا دیکھ کر یہ خاموش بیٹھے رہے اور تمام لوگ فریاد کریں گے کہ ہمارے پروردگار حسینؑ سے ہمارا بدلہ دلا"۔ اہل کوفہ نے صحیح مقام پر انگلی رکھی تھی۔ اس اِستغاثہ کے بعد حسینؑ کا آمادہ ہونا کسی اہل نظر کے نزدیک خود غرضی اور جاہ طلبی کے احساسات سے نہیں ہو سکتا بلکہ مظلوم کی مدد، ہدایت اور ایثار سے۔ حسینؑ کی شجاعت، ہمدردی اور ان کے حقیقی منصب کے لحاظ سے اب مدد کے لیے کوئی عذر نہ رہ گیا تھا۔ اس کے بعد حسینؑ کا کوئی عذر یا ان کے اِستغاثہ کی طرف سے لاپروائی جماعت انسانی کے افسوسناک حالت کی طرف سے لاپروائی اور غیر شجاعانہ روش سمجھی جاتی۔ اس لیے کہ یہ گمان کیا جاتا کہ حسینؑ نے ایک کوشش سے اس لیے اعراض کیا کہ اس میں امکان خطرہ تھا۔

اخلاقی اور روحانی شجاعت

اب حسینؑ کے لیے کیا چارہ تھا۔ یہ کہ وہ مسیحؑ ابن مریم کی طرح اپنے کو دشمن کے رحم اور انصاف کے حوالہ کر دیتے۔ اور اس کے منتظر رہتے کہ کانٹوں کا تاج پہنا کر تمسخر کیا جاتا اور یا اخلاقی اور روحانی شجاعت کے لیے آمادہ ہوتے۔ اگرچہ سامانوں کی کمی ایک ظاہر بات تھی۔ ابن مریم کو بجز اس کے چارہ نہ تھا۔ کیونکہ ان کے موقع کے وقت ان کا کوئی قابل لحاظ وقار کہیں نہ تھا۔ حسینؑ کی حالت اس کے خلاف تھی۔ اور حقیقۃً حسینؑ کی یہی اخلاقی اور روحانی شجاعت تھی جس نے ان کی شہادت کے بعد فطرت انسانی میں ہمدردی کی کنجی کو اینٹھ دیا۔ اور ایک ایسا زبردست ہیجان ہوا جو بنی امیہ کی عظیم الشان سلطنت کو الٹ دیتا۔ برخلاف اس کے ابن مریمؑ کے واقعہ نے وہ ظاہری مصلوبیت ہو اور حقیقۃً اس سے شہید نہ ہوئے ہوں یا مصلوبیت ذریعہ شہادت ہو۔ جس پر انجیل نے زور دے کر کلام کا موقع دیا ہے۔ کوئی مقامی ہیجان بھی پیدا نہ کیا۔

مکہ اور کوفہ میں شہادت کا فرق

اگر حسینؑ اہل کوفہ کے اِستغاثہ پر توجہ نہ کرتے تو انھیں مکہ میں یا اس کے بعد کہیں کب مفر تھا۔ تو مکہ میں حسینؑ اس طرح شہید ہوتے کہ انھوں نے ایک قوم کے اِستغاثہ پر توجہ نہ کی ہوتی اور اگر کوفہ میں شہید ہوتے تو ایک قوم کی مشکوریت اور اپنی بلند حوصلگی پر عالم کو ابد الآباد تک کے لیے گواہ اور ہمدرد بناتے۔ اس کے علاوہ مکہ یا کسی دوسرے مقام میں بجز شہید ہونے کوئی چارہ نہ تھا۔ کوفہ میں کچھ امید بھی تھی۔ کامیابی خلافت اسلامی کی ہیئت بدل دیتی۔ ان تمام صورتوں کے تذکرہ سے

میری غرض یہ تھی کہ حضرتؑ اشرف الشرفاء ایک غیر محفوظ مقام پر دوسرے غیر محفوظ مقام کو ترجیح دینے میں فطری حقوق کی حد میں تھے جو انسان کو اپنے اعزا، اقربا، احباب اور خود اپنی جان کے لیے حاصل ہیں۔ ایک مظلوم قوم سے ہمدردی کر رہے تھے۔ اور تیسرے ایک غیر شایان شخص کی اطاعت کے عہد سے انکار کر کے اخلاقی لحن کو بلند کر رہے تھے۔

طرز عمل

پھر بھی حضرتؑ نے کیا کیا۔ مسلمؑ کو اس ہدایت سے روانہ کیا کہ وہ مسجد میں امامت کریں۔ اور شرعی فیصلہ کریں۔ نعمان بن بشیر جو رئیس کوفہ اور یزید کی طرف سے حاکم تھا حاکم رہنے دیا جائے۔ یعنی حسینؑ نے بجز امورات شرعی کے اور کسی امر میں دخل دینے کا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ نعمان کے متعلق کسی ایسی ہدایت کا نہ ہونا جس سے اس کے اختیارات میں دخل ہو۔ یا تو اس وجہ سے تھا کہ بجز امورات شرعی کے اور امورات انتظامی میں دخل کا ارادہ نہ تھا۔ اور معلوم تھا کہ نعمان ہماری طرف مائل ہے یا کم سے کم ہمارا دشمن نہیں ہے اور چونکہ وہ کوفی ہے اس کا اپنی جگہ قائم رکھنا حالت کو حتی الوسع غیر متحرک رکھے گا۔ جس سے کسی قسم کا اضطراب انگیز ہیجان نہ ہوگا۔ یہ حالت بھلانے کے لیے کافی ہونی چاہیے کہ حضرتؑ کا ارادہ کیا تھا۔ اور اگر حضرتؑ کسی دخل پر آمادہ تھے تو صرف اس قدر کہ ان کی موجودگی روح مذہب کی نگرانی کر سکے اور بس۔ نہ کہ وہ حکومت کی تفصیل میں بھی ارادہ شرکت رکھتے تھے۔ حکومت کی یہ نوعیت ایک شہنشاہانہ شان رکھتی ہے۔ لیکن چونکہ شاہنشاہانہ حقوق کے ادا کرنے کے لیے دُنیاوی سامان نہ تھے اس لیے کوئی ایسی صورت کے معنی بجز اخلاقی اور روحانی ہدایت کے دوسرے نہیں ہوسکتے۔

حسینؑ جب یہ صاف دیکھ ہی رہے تھے کہ ہم کس حالت میں ہیں تو کیوں نہ بصرہ کی نبض بھی ٹٹولتے۔ اور یہاں بھی قابل لحاظ امر یہ ہے کہ وہ اپنے خط میں جو مخصوص بات تحریر فرماتے ہیں وہ یہ ہے کہ: ”میں تم کو کتاب اللہ و سُنّت رسول اللہ کی دعوت“ دیتا ہوں۔ یہ خط اہل بصرہ کو غالباً آخر ماہ ذیقعدہ میں ملا ہوگا۔ حسینؑ اپنے ان اطلاعوں میں یا اس کے بعد ایسے ہی اِستِغاثوں سے اتمام حجت کر رہے تھے جس کی ایک غرض یہ تھی کہ لوگ اس سے ناواقف نہ رہیں کہ اسلام کی لگام کون سے ہاتھوں میں ہے۔ اور ذوالقربیٰ اور اسلامی روح کے مقلدین کے ساتھ کیا برتاؤ ہو رہا ہے۔ اور دوسری غرض یہ تھی کہ لوگ آئندہ کے ظاہر نتائج سے واقف ہو کر صورت معاملہ سے ناواقفیت کا عذر نہ کر سکیں اور انھیں قوت دار ندامت اور جوش انابت پیدا ہو۔ اور تیسری کوشش جو حسینؑ نے کی وہ ابن عمر یا ابن عباس سے گفتگو کا یہ انداز تھا جس سے وہ لوگ یہ سمجھیں کہ حسینؑ ہمیں اپنی حالت بتا رہے ہیں جس کے معنی گویا مدد کا اِستِغاثہ ہے۔

اس دور بینی اور دور اندیشی کے لحاظ سے جو حضرت خامس آل عبا کے ہر انداز سے ظاہر تھی باوجود کسی ایسے خیال کی ناموجودگی کے کہ ہم کس حال میں ہیں اور صورت معاملہ کیا ہوسکتی ہے۔ حسینؑ کی ذات اقدس میں نواسہ رسولؐ اور فرزند علیؑ و فاطمہؑ کی خصوصیت کا ہونا و نیز معاویہ کے بعد یزید کا مسند نشین خلافت ہونا اس خیال کا محرک ہوسکتا تھا کہ دیکھیں اہل مکہ اور ان کے علاوہ اقصائے بلاد اسلامی کے وہ افراد جو مکہ میں جمع ہوئے ہیں ان پر ہماری ذات کا اثر اس پہلو کے متعلق کیسا ہے کہ خلافت اپنے پہلے مرکز پر چلی جائے۔ یا لوگ پہلے غیر طبعی اِنقلاب کی روش پر اب بھی قائم ہیں۔ و نیز یہ کہ مکہ اس وقت دو قسم کے اثر سے متاثر تھا۔ ایک اثر خارجی جو کوفہ کی انجمنوں کی طرف سے تھا اور دوسرا خود مکہ کا داخلی اثر تھا۔ جہاں یزید کا عامل لوگوں کو ابھرنے نہ دیتا تھا۔ حسینؑ نے ملاحظہ فرمایا کہ غالب قرینہ ہے کہ لوگ جو مصارف کثیر اور زحمتیں اٹھا کر یہاں حج

کرنے آئے ہیں اس وقت ہمارے کسی خطبہ پر اپنی مشغولیت کی وجہ سے متوجہ نہ ہوں۔ اس سلیے حضرتؑ نے ترک مکہ کا ارادہ فرمایا اور کسی دوسری جگہ کا قصد کیا جہاں وہ محفوظ ہوں (اس پیراگراف میں زیادہ تر مؤلف نے نجف اشرف کے اخبار العلم کے فاضل ایڈیٹر السید ہبۃ الدین الشہرستانی کا خیال اپنے الفاظ میں ضرب دیا ہے۔ جسے موصوف نے مؤلف سے دوبدو گفتگو میں ظاہر کیا۔ مؤلف ان کے الفاظ سے اس قدر موافق ہے جو کچھ اس مضمون کے متعلق اس کے سلسلۂ خیال سے ظاہر ہے)

تین راستے

اس آخری نتیجہ کا لب لباب یہ ہے کہ حسینؑ نے بلحاظ اس ذکاوت حس، روشن ضمیری، پختگی عقل اور صاف نتیجہ بینی کے جو انھیں فطرۃً تعلیماً اور تجربۃً حاصل تھی تصفیہ کیا کہ میں کہیں رہوں لیکن قتل سے بچ نہیں سکتا۔ حسینؑ کے لیے اب تین راہیں تھیں۔ یا وہ یزید کی بیعت کرتے۔ یا محض قتل ہو جاتے۔ اور یا اس کی کوشش کرتے کہ ہم آئندہ کے صاف نتیجہ کو بدل دیں۔ نتیجہ سے یہاں میری مراد قتل ہے۔ یہ آخری امر ممکن تھا۔ اگر حضرت کو مدد مل سکتی۔

صاف نظری اور اس کی عظمت

لیکن جس تھوڑے وقت میں حسینؑ حلقہ گیر ہوتے جاتے تھے اس کے لحاظ سے و نیز اس لحاظ سے کہ لوگ ایک زمانہ سے اہل بیت رسالت کے اثر سے دور ہوتے جاتے تھے اتنے وقت میں جو حسینؑ کو مل سکتا تھا کسی کامیابی کا قرینہ نہ تھا۔ اب یہ امر بھی حسینؑ کی نگاہ میں یقینی تھا۔ اور یہی یقین تھا جس سے وہ حضرتؑ کچھ ہی کوشش کیوں نہ فرماتے ہوں وہ یہ بھی فرماتے جاتے تھے کہ عنقریب میں شہید ہوں گا۔

۲ دو نتائج

اور اگر شہید ہونے کو صاف لفظوں میں نہ بھی فرماتے تھے تو ایسے الفاظ استعمال فرماتے تھے کہ عنقریب ایک وعدہ پورا ہونے والا ہے۔ یا مجھے کچھ حکم دیا گیا ہے جو ضرور ہوگا۔ اس وعدہ اور حکم کے اظہار میں حسینؑ کی عظمت کا احساس ہمارے اندازہ کے باہر ہے۔ تو اب حسینؑ اپنے آخر الذکر خیال میں ایک دوسرے نتیجہ کو حتی الوسع ٹال رہے تھے اور انھیں اس دوسرے نتیجہ میں حد سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ اگرچہ پہلا نتیجہ اسباب کی کمی سے حاصل نہ ہو سکا ہو۔

عظیم الشان قربانی اس دوسرے نتیجہ کے لیے تھی

یہ دوسرا نتیجہ یہ تھا کہ حسینؑ کی شہادت کے بعد چونکہ یزید اور اس کے مددگاروں کو ظاہری فتح ہو چکی ہوتی اور حسینؑ کے چند ظاہر رفقاء شہید ہو چکتے اسے نہ صرف یہ ظاہر کرنے کا موقع ملتا کہ حسینؑ (معاذ اللہ) اپنی بغاوت میں ناکام رہے بلکہ جو لوگ حسینؑ کی طرف دیکھتے ہوں کہ دیکھیں صورت معاملہ کیا ہوتی ہے وہ بھی شہادت کے بعد کشیدگی کو عدد دش اور بے سود سمجھ کر یزید کی بیعت اور اطاعت پر گر پڑتے اور اس طرح وہ آخری امید اور تھوڑا سا مخلصانہ یا شجاعانہ قیام جو اہل بیت اور اسلام کی محبت کے متعلق تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتا اور یہ گویا اہل بیت کے علاوہ نظام کی فتح اور اہل بیت اور اسلام کے نظام روحانی کی شکست ہوتی لیکن حسینؑ نے اپنی تمام شکستوں کو اس شکست کے مقابلہ میں ہیچ مجمل سب کو بھول گئے اور اس آخری شکست کو فتح سے بدل دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ حسینؑ نے عظیم الشان قربانیاں کیں کہ اس عظیم الشان وجہ کی قوت کو کمزور نہ ہونے دیں اور انھیں قربانیوں کی سادی فطری

عظمت نے ایک ایسا ہیجان اور تموج پیدا کیا جو لوگوں میں حسینؑ کی مدد نہ کرسکنے کی ندامت اور بنی امیہ سے نفرت پیدا کرنے میں کامیاب ہوا۔ جو کچھ یزید اپنی تمام فوج، خزانہ، اثر اور تدبر سے نہ کرسکا، اسے حسینؑ نے اپنی قربانی، سچائی، استقلال، ایک بڑی وجہ کی حیرت انگیز حمایت اور مظلومیت سے پورا کیا۔ ممکن ہے کہ حسینؑ نے جس غلطیِ اقدام کا تصفیہ کیا اسے اور سیاسی دماغ بھی طے کرسکتے لیکن حسینؑ نے جو کچھ کیا اس کے لیے حسینؑ ہی چاہیے تھے۔

مزید شرح کا التوا

اس وقت تک میں نے حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کی شرحِ عمل کو زیادہ تر اس باب کے تنقیحات تک محدود رکھا اور کسی مزید نظر کو آخری باب تبصرہ تک ملتوی رکھتا ہوں لیکن چونکہ مؤرخین نے زیرِ بحث سوالات کے ضمن میں آگے آنے والے اس واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے کہ حضرتؑ نے آئندہ کچھ شرائط پیش کیے جس سے وہ محفوظ ہوجائیں۔ اس لیے میں اسے اسی سلسلہ میں قبول کرلیتا ہوں۔ میرے لیے اس مسئلہ پر غور کی ابتدا میرے عزیز اور مکرم دوست خواجہ غلام محمود صاحب اقبال بی اے کے ان سوالات سے ہوئی کہ:

بعض سوالات جو نہایت مفید ہیں

● حضرت امام حسینؑ کو جس وقت حضرت مسلمؑ کے شہادت کی خبر ملی تو کیوں نہ پلٹے اور کوفہ ہی کیوں روانہ ہوئے جہاں سے ایسی متوحش خبر ملی تھی؟۔ ● حر سے ملاقات ہونے کے بعد کیوں مراجعت کا قصد کیا۔ جب کوفہ کا قصد کرچکے تھے؟۔ ● نویں تاریخ یا دسویں کو واپسی کی اجازت کیوں مانگی؟۔

کہاں پلٹتے

بے شک حضرتؑ کو حضرت مسلمؑ بن عقیل کے شہادت کی خبر راہ میں ملی جسے حضرتؑ نے سچ باور فرمایا۔ لیکن "کیوں نہ پلٹے؟"۔ کے لیے سوال کیا جاسکتا ہے کہ "کہاں پلٹتے؟"۔ اگر اس سے مراد مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ ہو تو اس کے حالات بیان کیے جاچکے کہ کسی شخص کے لیے، جس کا موقع حضرتؑ کا ایسا ہو تا اس کے لیے ناممکن تھا کہ وہ وہاں سے نکل سکتا اور نہ نکلتا۔ درآنحالیکہ حضرتؑ جس طرح بغیر اعلان جلد ان مقامات سے نکلے اس سے ظاہر ہے کہ انھیں مقامات سے نکلنے میں اگر ذرا سی بے احتیاطی ہوتی تو گرفتاری یا قتل سے کوئی شے مانع نہ تھی۔ اب حضرتؑ کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کہیں اور جاتے۔ اس لیے کہ آگے کے مقامات پر فوجیں پڑی تھیں اور تمام ریگستانی مقامات کو بھی حصین بن نمیر اور حر کے سواروں نے چھان ڈالا تھا۔ اور چھان رہے تھے۔ اور یہ حلقہ بڑھتا ہوا مکہ کی طرف آرہا تھا۔ اور اگر یہ ممکن بھی ہوتا کہ حضرتؑ اس لشکر سے بچا کر اپنے کو کہیں لے بھی جاتے تو ابن زیاد کا جاسوس جو مکہ معظمہ میں تھا یا مکہ کی مقامی حکومت آگے کے عامل کو حسینؑ کے نقل و حرکت کی خبر دے رہی تھی، اور چونکہ حضرتؑ تنہا نہ تھے بلکہ سوا سو کے قریب عزیز ترین رفقاء ہمراہ تھے۔ اس لیے اتنے بڑے قافلہ کا مخفی رہنا بھی ایک متلاشی جماعت سے ممکن نہ تھا۔ اب یہ سوال ہے کہ "کوفہ ہی کیوں روانہ ہوئے"۔

کوفہ ہی جانے کی وجہ

کوفہ ہی روانہ ہونے کی وجہ بجز اس کے کچھ نہ تھی کہ حضرتؑ ایک غیر محفوظ مقام پر دوسرے غیر محفوظ مقام کو ترجیح دے رہے تھے اور حسینؑ کو اپنے موقع کے احساس کے لحاظ سے اپنے اس اختیار تمیزی کے صرف کا بہترین حق حاصل تھا۔ خصوصاً اس حالت میں کہ کامل ابن اثیر کے موافق جب مسلمؑ کی شہادت کی خبر ملی اور صلاح ہوئی کہ کہاں جائیں تو بعض اصحاب نے یہ بھی عرض کی کہ "آپ مثل مسلمؑ

نہیں ہیں، لوگ آپ کی مدد کریں گے"۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگرچہ حضرتؑ کا موقع اب امید اور اس کے یقین کا نہ تھا۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ نہ تھا۔ نہ یہ ممکن تھا کہ حضرتؑ درمیانی مقامات میں سکونت اختیار فرماسکتے۔

درمیانی مقامات کا جغرافیائی موقع

اس لیے کہ عرب کے جغرافیائی موقع کے علاوہ جس میں بے آبی کی وجہ سے ہر جگہ قیام ممکن نہیں ہے اور وہیں آبادیاں ہوتی ہیں جہاں کھانے پینے کی چیزیں دستیاب ہوسکتی ہیں۔ فوجی حیثیت سے بھی حسینؑ کے تصفیہ سے دور ہوتا کہ وہ اپنے کو ایسے فوجی موقع میں رکھتے جس کے آگے اور پیچھے دشمنوں کی فوجوں یا فوادی حلقہ میں گھر جاتے۔

وجدان یا شعور

اب میں خود سے۔ قطع نظر ان حالات کے۔ سوچتا ہوں کہ حضرتؑ کا بنی عقیل کے ایسے فیصلہ پر کہ یا ہم باپ کا عوض لیں گے یا شہید ہوں گے۔ آگے بڑھنا آیا ایک وجدانی تصفیہ تھا یا انسانی شعور کے پاس اس کے علاوہ پیش نظر مسئلہ کا کوئی دوسرا حل نہ تھا۔ میرا ذاتی تصفیہ یہ ہے کہ وجدان ہمیشہ اس خفت کا مستوجب نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ عقل سے دور سمجھا جائے بلکہ اس کے مدارج بھی انسانی تربیت پر موقوف ہیں۔ اور اکثر وجدانی حالت کا تصفیہ اس درجہ مفید ہوتا ہے جو کمال عقل سمجھا جائے۔ یہ ہمیشہ کاہلانہ یا غیر شجاعانہ پیش و پس نہ تھا جس نے دنیا میں بڑے بڑے کام کیے ہیں بلکہ وجدانی حالت بھی ہوئی۔ اب یہ کہ ایک حالت کو اس کی ظاہری وجدانی حالت کے لحاظ سے حقیقۃً وجدانی حالت سمجھ لینا اور یہ طے کرلینا کہ اسے انسان کے صحیح روش خیال اور صحیح ملکہ تصفیہ سے بحث نہ تھی جس سے کوئی ایسی حرکت وجدان صحیح بھی جائے ایک دوسری غلطی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہم ایک وقت اپنی دور بینی سے ایک حالت کو طے کریں اور اپنے خیال یا تصفیہ کا نفاذ اور اظہار ضروری نہ سمجھیں لیکن اس کے بعد ہی موقع کی ایک خاص کیفیت ہم میں ایک وجدانی امنگ پیدا کردے جو تصفیہ کے لحاظ سے ویسا ہی ہو جو کچھ ہم نے ٹھنڈے غور میں طے کیا تھا۔ لیکن اس وقت ہم میں یہ کیفیت نہ پیدا ہوئی تھی جسے وجدانی حالت کہہ سکیں۔ اس حالت کے پیدا ہونے تک انتظار وہ بالا رادہ ہو یا بے ارادہ حقیقۃً وجدان صحیح اور سلیم میں داخل ہے نہ کہ کوئی دارفتہ تصفیہ جسے شعور سے کوئی بحث نہ ہو۔ حالانکہ یہ کیفیت بعض حیثیتوں سے نہ صرف تسکین بلکہ اس سے بالاتر ذرائع سے بھی سمجھی جاسکتی ہے۔

ایک فرض اور اس کے حیثیات

ہم اس سے کافی بحث کرچکے کہ حضرتؑ کے سلیے کوئی چارہ ہی نہ تھا بجز اس کے کہ جب ایک مقام غیر محفوظ ہوجاتا تو اسے آئندہ کسی مقام کے تجربہ میں آنے تک ترک کرتے اور علی ہذا القیاس اس حالت کے بین اور سب سے زیادہ واضح ہونے کے بعد بھی حضرتؑ کو کوئی امر اس سے مانع نہ تھا کہ وہ اپنے دیگر فرائض کو اس سلسلہ حالات کی موجودگی کے لحاظ سے ملتوی کردیتے۔ بلکہ ان حالتوں میں حضرتؑ کا اپنے قبیلہ، ملک، روایات اور خدمات کے لحاظ سے اور خود انتہائی لطافت لحاظ کی وجہ سے سب سے پہلے مسلمؑ کی خبر شہادت سن کر بنی عقیل سے صلاح لینا ان کے کمال ہوش، خلق، مروت اور ادائے فرض پر دلالت کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر حضرتؑ بنی عقیل سے پوچھے بغیر کوئی تصفیہ کرتے تو بنی عقیل کو لحاظ اور ادب سے اختلاف کی کوئی جرأت نہ ہوتی۔ لیکن حسینؑ کی طبیعت شناسی کا یہ موقع کب پیدا ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ حضرتؑ بنی عقیل سے پوچھتے یا نہ پوچھتے لیکن بجز اس تصفیہ کے جو کیا گیا اور کوئی تصفیہ ممکن نہ تھا۔ پھر بھی اگر بنی عقیل کا

استمزاج نہ لیا جاتا تو اصول معاشرت کی یہ بہترین لطافت ظاہر نہ ہوتی۔ بے شک حر بن یزید ریاحی سے اور حضرتؑ کی باتیں

حر سے سوال مراجعت کے معنی

ہوئیں جس میں حضرتؑ کی ایک تجویز یہ تھی کہ بعض مؤرخین کے موافق: "ہمیں جانے دو جہاں ہمارا جی چاہے"۔ یا "ہمیں مکہ جانے دو"۔ یا "ہم جہاں سے آئے ہیں وہاں چلے جائیں"۔ لیکن حر اسے قبول نہ کر سکا اور طے یہ ہوا کہ "آپ ایسے راستہ سے چلیے جو نہ حجاز کی طرف لے جاتا ہو اور نہ کوفہ کی طرف"۔ حضرتؑ کے اس سوال کا موقع یہ تھا کہ پہلے پہل آج دشمن کے کسی دستہ سے ملاقات ہوئی تھی اور حضرتؑ اس سے یہ سوال کر کے اس امر کی تصدیق کیا چاہتے تھے کہ حقیقۃً دشمن اس پر راضی ہیں یا نہیں کہ ہم ان کی نگرانی اور تصفیہ سے محفوظ رہ سکیں۔ لیکن حر کے انداز اور جواب نے یہ طے کر دیا کہ حضرتؑ مکہ یا کہیں نہیں جاسکتے یعنی حضرتؑ مکہ میں یا کہیں آزادی اور بے خوفی سے بسر نہیں کر سکتے۔ بلکہ حر کو ابن زیاد کا بجز اس کے کوئی دوسرا حکم نہ تھا کہ: "حسینؑ کو نہ چھوڑنا یہاں تک کہ میرے پاس لے آئے"۔ اب حضرتؑ کے لیے پھر وہی سوال تھا کہ یا بیعت کرو۔ یا گرفتار ہو۔ یا جنگ کرو۔ حضرتؑ یہ سوال پیش کر چکے کہ ہمیں کہیں جانے دو اور اس سے غیر نزاعی روش کا ثبوت دیا۔

حر کے عدم ارادۂ جنگ کو حضرتؑ منظور کرتے ہیں

لیکن جب دیکھا کہ دشمن اس پر آمادہ نہیں ہے اور اب ہم بیعت یا جنگ کی حالت میں ہیں تو حضرتؑ جنگ کے لیے تیار ہوئے لیکن حر تیار نہ ہوا۔ اور طے یہ ہوا کہ آپ ایسے راستہ سے چلیے جو نہ موصل بہ حجاز ہو اور نہ بہ کوفہ۔ حضرتؑ نے اسے منظور کر کے اس کا ثبوت دیا کہ ہم اس وقت تک جنگ کے لیے آمادہ نہیں ہیں جب تک مجبور نہ کیے جائیں۔ اور ایسے گھر جائیں کہ نکل نہ سکیں۔ اور جب یہ سامنے تھا کہ ہم گھرتے جاتے ہیں تو حضرتؑ پھر کوفہ ہی کے سامنے کیوں نہ گھرتے جہاں برائے نام ہی سہی لیکن امید تھی اور شہید ہونے کی صورت میں ابدالآباد تک کے لیے اہل کوفہ میں شرم اور غیرت پیدا کرنا تھا۔ ان کی وعدہ خلافی اور اپنی صادق الوعدی کے علاوہ حمایت وجہ حق کا ثبوت دینا تھا۔

ابن سعد سے گفتگو کے معنی

بیشک حضرتؑ نے ابن سعد سے دوران گفتگو میں یہ شرط بھی پیش کی کہ وہ واپس جانے دیے جائیں۔ "واپسی کے سوال" کی نوعیت کے لحاظ سے حر اور ابن سعد دونوں سے گفتگو کا آنا ایک حیثیت کا تھا۔ صرف درجہ کا فرق تھا۔ بلکہ موقع کا فرق بھی تھا۔ درجہ کا فرق اس مفہوم میں کہ حر بن یزید ریاحی اگر تھا تو محض اپنے دستہ کا سپہ سالار تھا۔ اور اگرچہ حر کا منصب اس لحاظ سے کہ اس سے بخط راست ابن زیاد خط و کتابت تھی کسی کے ماتحت نہ تھا لیکن تاہم حر کا موقع عمرو بن سعد کا ایسا نہیں ہو سکتا تھا جو نہ صرف کربلا کی تمام موجود افواج کوفہ و شام کا سپہ سالار تھا بلکہ اسے یہ موقع بھی حاصل تھا کہ وہ سعد بن ابی وقاص کا لڑکا تھا اور خود اکثر احادیث کا راوی بھی کہا گیا ہے۔ بلکہ اکثر نے تو اسے مجتہدین میں شمار کیا ہے۔ موقع کا فرق یہ تھا کہ اگرچہ حضرتؑ کے روک رکھنے اور گرفتار کرانے کے لیے ابن زیاد نے حر کو حکم دیا تھا لیکن اب تک اس نے حر کو جنگ کا کوئی مخصوص حکم نہ دیا تھا۔ اور نہ حضرتؑ کو اب تک کلا یقین تھا کہ بجز جنگ اور کشت و خون کے ہمارے دشمن کسی اور امر پر راضی نہیں ہیں۔ لیکن کربلا میں اب یہ موقع نہ رہا تھا بلکہ متواتر فوجوں کی آمد اور ابن سعد کے نام ایسے ہی سخت احکام نے کوئی شبہ نہ رکھا تھا کہ دشمن حضرتؑ سے کیا چاہتے ہیں۔ حر کے انداز سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسے یہ تک اجازت

نہ تھی کہ حضرتؑ کی اس تجویز کو ابن زیاد تک پہنچا سکتا۔ برخلاف اس کے عمرو بن سعد اپنے موقع کو ایسا سمجھتا تھا کہ وہ اکثر امورات کے متعلق سلسلہ مراسلات جاری کر سکتا۔

حضرتؑ کا واپس ہونا ایک عہد ہوتا

نظر برایں اگر حر کے زمانہ ملاقات میں نبض شناسی کے لیے ایسا سوال تھا تو ایسے موقع پر جب کہ بظاہر بیعت یا جنگ کے علاوہ کوئی صورت نہ رہ گئی تھی اور اب حضرتؑ کم سے کم اکیس ہزار اور بائیس ہزار دشمنوں کے سامنے تھے تو اس شرط پر حضرتؑ کا واپس ہونا ایک عہد ہوتا جو حضرتؑ ایک فریق اور یزید کے وکیل دوسرے فریق میں ہوتا۔ یعنی اس عہد کے بعد از روئے عہد نامہ حضرتؑ اپنے کو کہیں رہنے میں مختار سمجھتے اور حالت خوف جس میں وہ حضرتؑ مبتلا تھے برطرف ہو جاتی۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یا اپنے محفوظ رہنے کے عوض میں حضرتؑ گویا اپنی طرف سے یہ عہد کرتے کہ وہ حکومت یزید سے متعرض نہ ہوں گے۔ متعرض ہونے کا خیال تو تنگ آمد بجنگ آمد سے پیدا ہوتا ہے۔ جس میں حضرتؑ کے لیے بجز بیعت کے کوئی صورت نہ رکھی گئی تھی۔

مصلحت کی یک رنگی

اور جب بغیر بیعت کیے جانے دیے جاتے تو حضرتؑ پھر اپنی اسی نیوٹرل حالت پر عود کرتے جس میں سوال بیعت کے قبل تھے اور یہ سنت تھی جسے حضرتؑ کے برادر معظم اور پدر بزرگوار نے منظور کیا تھا۔ اور ان کی ہم عصر حکومتوں نے اس سے زیادہ ظاہری تشدد خلاف مصلحت سمجھا تھا۔ لیکن یزید اپنے پیشروؤں کی مصلحت سے آگے بڑھا تھا۔ اور اس لیے حسینؑ کا موقع بھی اب وہ نہ تھا جو ان کے برادر عالی مقدار اور پدر بزرگوار کا تھا۔ اور حسینؑ اپنے طرز عمل سے بتا رہے تھے کہ ہم خاموش رہیں گے مثل اپنے بزرگوں کے اگر ہمارے ساتھ بھی وہی مصلحت برتی جائے گی جو برتی جا چکی ہے۔ یعنی جس طرح انھوں نے بیعت کر کے حکومت کے افعال کا اپنے کو پیرو اور ذمہ دار بننا قبول نہیں کیا۔ اسی طرح ہم یزید کی بیعت کر کے اس کے افعال کو خلق اللہ کی نگاہ میں اپنی بیعت سے مستند نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ اتنی آڑ کا رہنا بھی اگرچہ اس وقت روح اسلامی کی ترقی کا سبب نہیں ہو سکتا تھا لیکن تاہم لوگ ان کے عدم بیعت یا علیحدگی کی واقفیت سے یہ سوچ سکتے تھے کہ آخر کسی خاص روش میں اہل بیتِ رسولؐ کا کیا خیال ہے۔ اسلام کی حقیقی روح کی اسی قدر اس وقت بقا تھی لیکن حسینؑ کا بیعت کر لینا اس روح کو فنا کر دینا تھا جسے علیؑ اور حسنؑ نے اِمتحان خیز وقتوں میں قائم رکھا تھا۔ فاطمہؑ نے حسینؑ کو اس لیے دودھ نہیں پلایا تھا کہ حسینؑ اس وقت روح اسلام کی شہ رگ کاٹ دیتے۔ رسول اللہؐ نے اس لیے زبان نہیں چوسائی تھی کہ حسینؑ کے دہن اقدس سے یزید کی بیعت کا اقرار نکلتا۔ جب حکومت نے اپنی مصلحت میں اپنے کو اس حد پر دیکھا کہ وہ بیعت کا آخری تشدد کر کے جواب تک نہیں ہوا تھا تو اسلام نے اپنی قربان گاہ پر حسینؑ کو کمال خندہ پیشانی اور لاپروائی سے قربان ہونے کے لیے تیار پایا۔

بابؑ نہم

یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (۸۹ : ۲۷-۳۰)

(مکہ سے ہجرتؑ)

عمر بن عبدالرحمٰن کی خیر خواہانہ نصیحت

اعثم کوفی کہتا ہے کہ عمر بن عبدالرحمٰن بن حرث بن ہشام مخزومی نے حاضر ہو کر کہا اے فرزند رسولؐ میں آپؑ کو کچھ نصیحت کرنا چاہتا ہوں اور محض آپؑ ہی کے فائدہ کے لیے ہے۔ تمام عمر میں ایک لحہ کے واسطے بھی آپؑ کی بھلائی کے خیال سے علیحدہ نہیں رہا ہوں نہ آپؑ سے کسی نصیحت کو چھپایا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپؑ میری نصیحت سن لیں اور بالکل خیر خواہی پر محمول کریں۔ اگر آپؑ کی رائے میں بھی درست ہو تو اس پر عمل فرمائیں۔ امیر المومنین حسینؑ نے کہا: "تو جس امر میں بہبودی اور بھلائی جانتا ہے بیان کر"۔ عمر نے کہا: "میں نے سنا ہے کہ آپؑ نے عراق تشریف لے جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ مجھے آپؑ کے اس ارادہ اور سفر سے اندیشہ ہے۔ کیونکہ:

اہل کوفہ کی حالت

جس شہر کا قصد ہے وہاں سب امیر اور بڑے مالدار ہیں۔ تمام آدمی مال و زر کے دلدادہ ہو رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ عوام لوگ بھی روپیہ پیسہ کی تمنا میں امیروں کے شریک حال ہو جائیں۔ اور آپؑ کے مخالف بن جائیں۔ آپؑ اپنی جان کا خیال فرمائیں۔ اس ہلاکت کے بھنور سے بچیں۔ اِس حرمت والی جگہ پر اطمینان اور فراغت سے قیام رکھیں"۔

حضرتؑ اِعتراف فرماتے ہیں

امیر المومنین نے فرمایا: "نہایت ہی اچھی نصیحت ہے اور میں خوب سمجھتا ہوں کہ محض از راہ خیر خواہی و شفقت دلی تو نے یہ بات کہی ہے۔ اور اپنی کوئی غرض شامل نہیں کی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ایک حکم لگا دیا ہے اور میرے واسطے جو مقرر کرنا تھا مقرر کر دیا ہے۔ میں تیری نصیحت مانوں یا نہ مانوں وہ حکم ٹل نہ سکے گا۔ موت ہر ایک برائی اور بھلائی کے ساتھ خلقت کی باگ ڈور اس طرح کھینچ رہی ہے کہ اس کے خلاف ہر ایک کوشش بے کار ہے"۔ عمر سن کر چپ ہو رہا۔ اور واپس چلا گیا۔ کامل ابن اثیر کے موافق فرمایا کہ: "تو نے نصیحت پوری کی اور سچی بات کہی"۔

ابن زیاد زر پاشی سے اہل کوفہ کو ملاتا ہے

اس کے بعد ابن عباس آئے۔ انھوں نے اہل کوفہ کے گزشتہ حالات بیان کیے۔ ابن زیاد کی موجودگی اور "تمام لوگوں کو زر و سیم دے کر اپنا طرفدار بنا لینے" کا تذکرہ کیا۔ اس کے جواب میں حضرتؑ نے بعض کے موافق فرمایا: "میں غور کروں گا"۔ یا "خدا سے اِستخارہ کروں گا"۔ (اعثم کوفی، روضۃ الصفا، کامل ابن اثیر، روضۃ الشہدا)

ابنِ عباسؓ کو جواب

اور بعض کے موافق قرآن کی فال دیکھی۔ اور یہ آیت نظر پڑی کہ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ ۔ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔ (۳ : ۱۸۵) اس آیت کے ملاحظہ کے بعد حسینؑ نے فرمایا: "صدق اللہ و رسولہ"۔ اور بعض کے موافق فرمایا کہ: "مجھے عراق میں مارا جانا مکہ میں قتل ہونے سے زیادہ پسند ہے"۔

ابنِ عباسؓ کی دوبارہ نصیحت

اس کے بعد جو کچھ اور مؤرخین نے لکھا ہے اس کے سلسلے میں ابن خلدون کی عبارت درج کرتا ہوں کہ: "پھر دوبارہ اگلے دن عبداللہ بن عباس آئے۔ سمجھانے لگے: برادر من! مجھے بغیر نصیحت کیے ہوئے صبر نہیں آتا۔ مجھے خوف اس کا ہے کہ اس میں تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ تمھارا خاندان تباہ و برباد ہو جائے گا۔ اہل عراق بڑے بے وفا، عہد شکن، مکار ہیں۔ تم ان کے قریب نہ جاؤ۔ اسی شہر میں قیام کرو۔ تم ان کے سردار ہو اور اگر اہل عراق اپنے دعوے میں سچے ہیں تو ان کو لکھ بھیجو کہ تم اپنے گورنر کو نکال دو۔ بعد اس کے تم ان کے شہر میں جاؤ اور اگر تمھارا جی مکہ سے بغیر نکلے ہوئے نہیں مانتا ہے یمن کی طرف چلے جاؤ۔ وہ بہت وسیع سرزمین ہے۔ پہاڑی گھاٹیاں بکثرت ہیں۔ قدرتی محفوظ قلعہ ہیں۔ وہاں سے تم اپنے دعاۃ کو اطراف و جوانب میں بھیجو اور لوگوں سے بیعت لو"۔

دوبارہ حضرتؑ کا جواب

آپؑ نے جواب دیا "میں تو مصمم قصد کر چکا۔ اب کسی طرح نہیں رک سکتا"۔ عبداللہ بن عباس بولے: "خیر۔ اگر جاتے ہی ہو تو اپنے لڑکوں، عورتوں کو نہ لے جاؤ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ عثمان کی طرح تم شہید نہ کیے جاؤ اور تمھارے لڑکے اور عورتیں دیکھتی رہیں"۔ آپؑ نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ بقول روضۃ الصفا فرمایا: "میری رائے ہے کہ میرے اہل و عیال اس سفر میں میرے ساتھ رہیں"۔ یا جیسا بقول روضۃ الشہدا فرمایا: "ایشان را کجا بگزارم و بکہ سپارم اولیٰ آنکہ با من باشند"۔ یعنی: "انھیں کس کے سپرد کروں اور کہاں؟ بہتر ہے کہ میرے ساتھ ہوں"۔

ابن زبیر اور حسینؑ

بقول کامل ابن اثیر: اس کے بعد ابن زبیر آئے اور جو مخصوص گفتگو تھی وہ یہ تھی کہ: "آپؑ مکہ میں اقامت کیجیے اور ہمیں اپنے امر کا والی کر دیجیے"۔ اور حضرتؑ نے کہا کہ: "میں یہ بھی نہیں چاہتا"۔ اس کے بعد کچھ "پوشیدہ" بات ہوئی۔

ابن زبیر وعدہ مدد کرتے ہیں

حضرتؑ نے لوگوں سے فرمایا کہ: "تم لوگ جانتے ہو کہ ابن زبیر نے ہم سے کیا کہا؟"۔ اور جب لوگوں نے اپنی لاعلمی ظاہر کی تو فرمایا کہ: ابن زبیر کہتا تھا کہ: "آپؑ اسی مسجد میں اقامت کریں اور ہم لوگوں کو آپؑ کے لیے جمع کریں۔ بخدا اگر میں قتل کیا جاؤں مکہ سے ایک بالشت باہر تو یہ میرے لیے اس سے بہتر ہے کہ میں مکہ میں قتل کیا جاؤں۔ اور اگر میں قتل ہوں دو بالشت باہر تو زیادہ بہتر ہے اس سے کہ میں ایک بالشت پر قتل کیا جاؤں۔ اگر میں سوراخ میں ہو تو یہ لوگ مجھے نکال لیں گے۔ اپنا مطلب پورا کریں گے اور مجھ پر زیادتی کریں گے"۔

حضرت عبداللہ بن جعفر کا خط

اعثم کوفی کے مواقف جب حضرتؑ کی روانگی عراق کی خبر حضرت عبداللہ بن جعفر کو پہنچی تو انھوں نے حضرت امام حسینؑ کے نام خط لکھا کہ:

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپؑ بہ سمت عراق تشریف لے جانا چاہتے ہیں۔ اس ارادہ کا عمل میں لانا مناسب نہیں۔ میں آپؑ کو قسم دلاتا ہوں کہ ہرگز آپؑ عراق نہ جائیں۔ مکہ ہی میں قیام رکھیں۔ کیونکہ آپؑ کے اس ارادہ سے اندیشہ ہے کہ وہاں کے لوگ آپؑ کو شہید کریں اور سب دوست اور عزیز و متعلقین تباہ ہو جائیں گے۔ اگر

نور اسلام

خدا نخواستہ آپؑ کو شہید کردیا تو نورِ اسلام گم ہو جائے گا۔ مسلمانوں کے دل جو آپؑ سے وابستہ ہیں شکستہ ہو جائیں گے۔ اپنی جان پر رحم کرو عراق کی طرف نہ جاؤ۔۔۔۔"

خط کا جوابؑ

حضرتؑ نے جواب لکھا: "تمھارا خط آیا۔ میری نسبت جس قدر محبت و شفقت کا اظہار کیا گیا ہے مجھے سب معلوم ہے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ میں نے اپنے نانا حضرت محمد مصطفیٰ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے سن رکھا ہے کہ میں چیونٹیوں کی بلوں میں بھی جا چھپوں تب بھی یہ قوم مجھے نہ چھوڑے گی۔ اور ڈھونڈ نکالے اور قتل کرے گی۔ اور میری ہلاکت میں ایسی بے رحمی اختیار کرے گی جیسی یہودیوں نے ہفتہ کے دن کی تھی"۔

عمر بن سعید کا خط

اس کے بعد عمر بن سعید کا خط تھا جسے اس نے اپنے بھائی یحییٰ بن سعید کے ہاتھ بھیجا تھا کہ:

"آپؑ مدینہ چلے آئیں۔ یہاں پر امن و امان سے رہیں۔ آپؑ کے اہل بیتؑ کے لیے بھی امان ہے۔ اس کے علاوہ احسان و صلہ اور اچھا ہمسایہ بھی ہو گا۔ میں اس امر پر خدا کو گواہ کرتا ہوں اور وہی وکیل و کفیل ہے۔ والسلام۔

حضرتؑ نے جواب دیا: "جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت اور محمد مصطفیٰؐ کی سنت کی ترغیب دلاتا ہو ہرگز اس کی مخالفت نہیں کرتے۔ اور تو نے بھی کچھ کمی نہیں کی کہ مجھے احسان و صلہ اور امان کی طرف بلایا۔ مگر سب سے اچھی خدا کی پناہ ہے۔ اور جو شخص دنیا میں خدا سے نہ ڈرے گا وہ قیامت کے دن پناہ نہ پائے گا۔ میں اپنے اور تیرے واسطے خدا سے نیک عمل کا خواستگار ہوں۔ جس سے خدا رضامند ہو۔ اللہ تجھے دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں جزائے خیر عطا کرے۔ والسلام"۔

کامل ابن اثیر میں اس قدر زیادہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن جعفر نے یہ خط عون و محمد کے ہاتھ بھیجا۔ اور لکھا کہ میں بھی خط کے ساتھ آتا ہوں۔ اس کے بعد خود عمر بن سعید کے پاس جا کر امان دینے اور نیکی و صلہ رحم سے پلٹ آنے کے لیے لکھنے کی خواہش کی اور حضرتؑ نے اس کے جواب میں لکھا کہ: "میں نے ایک خواب دیکھا ہے اور مجھے ایسا حکم دیا گیا ہے جو میں بجا لانے والا ہوں۔ میں نے وہ خواب کسی سے نہیں کہا۔ اور نہ کہوں گا جب تک اپنے خدا سے ملاقات نہ کروں"۔

بقول ابن خلدون حضرتؑ نے "عون و محمد کو بھی ہمراہ لے لیا اور آگے بڑھے"۔

یزید کے اشعار

اس کے بعد بقول اعثم کوفی "اسی اثنا میں ایک منظوم تحریر مدینہ میں آئی۔ نہایت ہی عمدہ اشعار تھے اور ہر قسم کی باتیں مذکور تھیں۔ حسینؑ بن علیؑ کو تعظیم و تعریف سے یاد کیا تھا۔ اپنا عزیز و رشتہ دار بیان کر کے کچھ فضائل مناقب خاندانی فضیلت اور اخلاق حسنہ کا ذکر بھی کیا تھا۔ اس کے بعد یہ التجا تھی کہ حسینؑ مجھ سے موافقت کر کے آتش جنگ و جدل کو سرد کر دے۔ دوستی و رضامندی سے پیش آئے۔ مدینہ والوں نے یہ اشعار پڑھ کر ایک معتمد شخص کے ہاتھ امیر المومنین حسینؑ کی خدمت میں بھیج دیے۔ امام حسینؑ سمجھ گئے کہ یہ اشعار

یزید نے لکھے ہیں۔ ان کے جواب میں کلام الٰہی کی یہ آیت تحریر فرمادی: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ٥ وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـــُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ٥ (۱۰ : ۴۱)

روانگی کے وقت حضرتؑ کا خطبہ

اس کے بعد بقول نور العین ترجمہ خصائص الحسینؑ اور لہوف، جو میں آخر الذکر سے نقل کرتا ہوں کہ: حضرت امام حسینؑ نے جب ارادہ سفر کیا تو آپؑ کھڑے ہوئے اور یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

"الحمد للہ و ما شاء اللہ و لا قوۃ الا باللہ و صلی اللہ علی رسولہ۔ آگاہ ہو کہ جس طرح گلوبند ہر وقت جوان عورت کے گلے میں رہتا ہے اسی طرح موت انسان کے ساتھ ہر وقت ہے۔ مجھے کس قدر مفتون و مشتاق کردیا ہے میرے اسلاف کی طرف اس اشتیاق نے جو مثل اس کے ہے جو یعقوبؑ کو یوسفؑ کی طرف تھا۔ اور میرا جو مقتل مقرر ہوا ہے اس طرف میں جاتا ہوں۔ گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ اس جنگل کے بھیڑیے میرے بدن کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں جو درمیان نواویس و کربلا کے ہے۔ وہ مجھ سے اپنے خالی معدوں کو بھر رہے ہیں اور اس دن سے گریز نہیں ہے جو لکھا گیا ہے۔ رضائے خدا ہم اہل بیت کی رضا ہے۔ ہم اس کی بلاؤں پر صبر کرتے ہیں جس کا وہ پورا پورا اجر دے گا۔ صابروں کا اجر دے گا۔ رسولؐ خدا کے گوشت کا ٹکڑا ان سے جدا نہ ہوگا۔ وہ سب کا سب حظیرہ قدس میں جمع ہوگا۔ اس کی وجہ سے چشم رسولؐ خدا روشن ہوگی۔ اور اس کے سبب سے اللہ اپنے وعدہ کو پورا کرے گا۔ جو ہمارے لیے جان نثاری کرنا چاہے اور لقائے خدا کا یقین رکھتا ہو وہ ہمارے ساتھ چلے خدا نے چاہا تو میں صبح کوچ کروں گا"۔

ابن عمر بوسہ گاہ رسولؐ کو بوسہ دیتے ہیں

اسی زمانہ کے متعلق صاحب خصائص حسین کہتے ہیں کہ "عرض کی عبداللہ بن عمر نے کہ یا ابن رسولؐ اللہ کھول دیجیے اس موضع مطہر کو جس مقام پر رسولؐ خدا بوسہ دیتے تھے۔ پس سینہ مبارک کو کھول دیا اور عبداللہ بن عمر نے بوسہ دیا اس مقام مطہر کا اور رونے لگا اور رخصت کیا"۔

روانگی عراق اور انتظام

اب بقول اعثم کوفی: "امیر المومنین حسینؑ نے عراق کا قصد کیا۔ جس شخص کو ہمراہ لینا تھا دس دس دینار سرخ اور ایک ایک اونٹ دے کر کعبہ اور صفا و مروہ کا طواف کیا۔ پھر اہل بیت کے لیے کجاوے درست کیے۔ ترویہ کے وقت ۹ ذی الحجہ کو منگل کے دن مکہ سے نکلے۔ عزیز رشتہ دار، دوست اور ملازم سب مل کر بیاسی آدمی ہمراہ تھے۔ بقول تاریخ خمیس حضرتؑ کے ساتھ اہل بیت یا غیر اہل بیت مل کر بہتر سوار تھے: بقول روضۃ الشہدا: "امیر المومنین حسینؑ نے اپنے اعزا و اقربا اور ہواداروں کو جمع کیا۔ بچوں اور عورتوں کے لیے محملیں مرتب کیں اور اتفاق سے اسی دن جس روز مسلم بن عقیل شہید ہوئے تھے مکہ سے باہر نکلے"۔

مکہ کا گورنر روانگی سے روکتا ہے

بقول ابن خلدون یزید کی طرف سے حجاز کا گورنر عمرو بن سعید بن العاص تھا۔ اس کے آدمیوں نے حسینؑ بن علیؑ اور

ان کے ہمراہیوں کو روانگی کوفہ سے روکا۔ بحث و تکرار ہوئی۔ آپس میں خفیف سی مار پیٹ بھی ہو گئی۔ لیکن آپؑ اور آپؑ کے ہمراہی نہ رکے۔

سرہنگ کو بلالیا گیا

بقول روضۃ الصفا: عمر بن سعید کے سرہنگ کے روکنے سے جب صورت معاملہ اس کے قریب پہنچی کہ لڑائی ہو جائے اور یہ حال ابن سعید کو معلوم ہوا تو اس نے اپنے سرہنگ کو واپس بلالیا۔

کوچ کا وقت اور حضرت محمد ابن حنفیہ

صاحب خصائص الحسینؑ اور لہوف کے نوٹ میں ہے کہ جس صبح کو حضرتؑ نے کوچ کیا اس کے قبل شام کو حضرت محمد ابن حنفیہ نے سمجھایا تھا۔ اور حضرتؑ نے غور کا وعدہ فرمایا تھا۔ اور جب صبح کو حضرتؑ نے کوچ کیا۔ یہ خبر محمد حنفیہ کو پہنچی وہ فوراً آئے اور اس ناقہ کی مہار پکڑلی جس پر امام حسینؑ سوار تھے اور کہا: "اے بھائی! آپ نے میرے کہنے پر غور نہ کیا"۔

حضرتؑ نے فرمایا: "میں نے خوب غور کرلیا"۔

تب انھوں نے کہا کہ: "آپؑ کے جلدی کوچ کرنے کیا سبب ہے"۔

حضرتؑ نے فرمایا کہ: "تمھارے جانے کے بعد رسول خدا خواب میں میرے پاس آئے اور فرمایا کہ اے حسینؑ کوچ کرو۔ کیونکہ خدا نے چاہا ہے کہ تمھیں مقتول دیکھے"۔

تب ابن حنفیہ نے کہا: "انا للہ و انا الیہ راجعون"۔

پھر پوچھا کہ: "آپؑ اہل بیت کو کیوں ساتھ لیے جاتے ہیں"۔

حضرتؑ نے فرمایا کہ: "مجھ سے جناب رسول خدا نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اللہ نے چاہا ہے کہ ان کو مقید دیکھے"۔

جغرافیائی دشواری

اب میں اپنی تاریخ میں ایسی جگہ پہنچا ہوں جس کے سلسلہ مقامات کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ایک مؤرخ کسی مقام کا نام پہلے لیتا ہے دوسرا اس کے خلاف اس سے آخر میں ذکر کرتا ہے۔ نہ میں ان کے جغرافیائی مقامات کی صحت کی ذمہ داری کر سکتا ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ موجودہ ذرائع سے یہ بھی تصفیہ نہیں کر سکتا کہ حضرت امام حسینؑ علیہ السلام مکہ سے مدینہ ہو کر کوفہ تشریف لے گئے یا مکہ سے سیدھے کوفہ تشریف لے گئے۔ مثلاً ابو اسحٰق اسفرائنی کہتے ہیں کہ حضرتؑ کو ابن زیاد کا قاصد قریب مدینہ ملا۔ اور دیگر مؤرخین بعض منزلوں کا نام لینے کے یہ تک نہیں بتاتے کہ حقیقتہً وہ ہیں کہاں۔ حاجی اور زائرین سے بھی اس کا پتا نہیں مل سکا۔ اس لیے کہ وہ لوگ زیادہ تر جہاز کی راہ سے جاتے ہیں۔ اتفاق سے مجھے السید ہبۃ الدین الشہرستانی صاحب مجلۃ العلم فی النجف بالعراق سے گفتگو کا موقع ملا۔ اور میں نے اپنے اس تفتیش کے موقع کو ضائع نہیں کیا۔ ان سے مجھے اس قدر معلوم ہوسکا کہ حضرتؑ مکہ سے نجد تک غیر معروف راہ سے گئے۔ اور اس کے بعد معروف راستہ سے کوفہ پہنچے۔

نقشے جو ولایتی کارخانوں کے میرے سامنے ہیں ان سے بھی کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ اس لیے کہ کسی منزل کا نام ان میں نہیں پایا جاتا۔ جس سے میں سمت روانگی دریافت کر سکتا۔ غالباً میرے بعد کا مؤرخ ایسا خوش نصیب ہو جسے عرب حجاز

اور عراق کے نقشے اور گزیٹیر مل سکیں نہ بہرحال میں مناسب سمجھتا ہوں کہ بعض تواریخ سے سلسلہ منازل کو لکھ دوں جس حیثیت سے وہ پائے جاتے ہیں :

مقامات

کامل ابن اثیر	ابن خلدون	اعثم کوفی	روضۃ الشہدا	بحار	روضۃ الصفا
تنعیم	تنعیم	عراق کا دیہات	صفاح	ذات عرق	ذات عرق
صفاح	صفاح	خزیمیہ	بطن رمہ	ثعلبیہ	صفاح
حاجز	حاجز	ثعلبیہ	ذات عرق	حاجز	بطن رمہ
گاون	ثعلبیہ	سقوق	زرود	تالاب	زرود
ثعلبیہ	بطن عقبہ	قصر بنی مقاتل	سقوق	خزیمیہ	زبالہ
زبالہ	شراف	عذیب الہجانات	دریا	زرود	قصر بنی مقاتل
بطن عقبہ	ذو خشم		قصر بنی مقاتل	ثعلبیہ	عقیق
ذو خشم	عذیب		ثعلبیہ	زبالہ	سرا
عذیب الہجانات	قصر بنی مقاتل		قلقطانیہ	منزل رماد	کربلا
قصر بنی مقاتل	نینویٰ		کربلا	ذو خشم	
				عذیب الہجانات	
				قصر بنی مقاتل	
				نینویٰ	

بائیس منزلیں ان ناموں سے حسب ذیل بائیس نام نکلتے ہیں اور نویں ذوالحجہ سے دوسری محرم تک بائیس منزلیں ہونی چاہییں۔ (۱) ذات عراق (۲) تنعیم (۳) صفاح (۴) حاجز (۵) گاون (۶) تالاب (۷) خزیمیہ (۸) بطن الرمہ (۹) زرود (۱۰) ثعلبیہ (۱۱) زبالہ (۱۲) منزل اباد (۱۳) سقوق (۱۴) بطن عقبہ (۱۵) شراف (۱۶) ذو خشم (۱۷) عذیب الہجانات (۱۸) قصر بنی مقاتل (۱۹) عقیق (۲۰) قلقطانیہ (۲۱) نینویٰ (۲۲) کربلا (مؤلف سلسلہ مقامات کا ذمہ دار نہیں ہے)

خیمے برپا کرنے کے وقت ایک مرتبہ سب کو دیکھتے تھے صاحب نور العین ترجمہ خصائص الحسینؑ لکھتے ہیں کہ ورود کربلا کے قبل تک "جب خیموں کو نصب کرتے تھے تمام اولاد و برادران و اہل بیتؑ کو جمع فرماتے تھے اور ایک نظر سب کو ملاحظہ فرماتے تھے"۔

یمن کا ایک قافلہ

اس کے بعد بقول ابن خلدون : "رفتہ رفتہ منزل تنعیم میں پہنچے۔ یہاں پر ایک قافلہ سے ملاقات ہوئی۔ یمن سے آرہا تھا جس کو بحیر بن ایسان والی یمن نے یزید کی طرف اسباب قیمتی پارچہ جات و زیورات لے کر روانہ کیا تھا۔ آپؑ نے اس کو گرفتار کر کے اہلِ قافلہ سے اِرشاد کیا کہ جو شخص ہمارے ساتھ عراق چلنا چاہتا ہو ہم اس کو بکمال خوشی اپنے ساتھ رکھیں گے اور اس میں سے اس کو حصہ دیں گے اور جو شخص ہم سے علیحدہ ہونا پسند کرتا ہو وہ اپنا اس میں سے حصہ لے کر علیحدہ ہو جائے۔ چنانچہ جن لوگوں نے علیحدگی پسند کی ان کو علیٰ قدرِ مراتب حصہ دے کر رخصت کر دیا۔ اور جنھوں نے ہمراہی منظور کی ان کو بھی حصہ دے کر ہمراہ لے کر آگے بڑھے"۔

صاحب لہوف فرماتے ہیں : "منزل تنعیم میں پہنچے۔ حضرتؑ نے دیکھا کہ ایک قافلہ بحیر بن ریان حمیری عامل یمن کی طرف سے کچھ چیزیں یزید کے لیے ہدیہ لیے جاتا ہے۔ حضرتؑ نے وہ ہدیہ خود لے لیا کہ امورِ مُسلمین کے آپؑ حاکم تھے۔ آپؑ نے ساربانوں سے فرمایا کہ جو کوئی ہمارے ساتھ عراق چلنا پسند کرے ہم اس کو پورا کرایہ دیں گے اور اس سے اچھا برتاؤ کریں گے اور جو نہ جانا چاہے اس کو ہم یہاں تک کا کرایہ دیدیں"۔

حصین بن نمیر کا لشکر

ابن خلدون عبداللہ بن جعفر کے خط کے تذکرے کے بعد لکھتا ہے : ابن زیاد کو آپؑ کی روانگی کا حال معلوم ہوا تو اس نے جلوگیری کے خیال سے حصین بن نمیر تمیمی افسر اعلیٰ پولیس کو روانہ کیا۔ اس نے مقام قادسیہ میں پہنچ کر ڈیرے ڈال دیے۔ اور سواروں کو قادسیہ سے خفان تک ایک جانب اور دوسرے جانب قادسیہ سے قطقطانہ و کوہ لعلع تک پھیلا دیا"۔

مکہ میں ابن زیاد کا جاسوس

صاحب روضۃ الشہدا کہتا ہے کہ : "ابن زیاد جاسوسے بمکہ فرستادہ بود کہ چوں امام حسینؑ بیرون آید و متوجہ کوفہ شود مرا خبر کن دریں وقت کہ جاسوسے در رسیدہ خبر رسانید کہ شانزدہ روز است کہ امام حسینؑ از مکہ بیرون آمدہ و امروز در قبیلہ بنی سکون ست"۔

بشیر بن غالب کا فقرہ

حضرتؑ ذات عراق میں پہنچے تھے کہ "بشیر بن غالب سے ملاقات ہوئی جو عراق سے آرہا تھا۔ آپؑ نے اس سے عراق والوں کا حال پوچھا۔ اس نے کہا کہ : "ان کے دل آپؑ کے ساتھ ہیں مگر تلواریں بنی امیہ کے ساتھ ہیں"۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ بنی اسد کا بھائی سچ کہتا ہے۔ (لہوف)

حضرتؑ شرح فرماتے ہیں

غالباً اعثم کوفی اسی شخص سے سوال کراتا ہے کہ : اے فرزند رسولؐ اس آیت کے کیا معنی ہیں؟ : يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍۭ بِإِمَامِهِمْ۔ (۱۷ : ۷۱)

آپؑ نے فرمایا : "امام دو ہیں۔ ایک سیدھی راہ کی ہدایت کرتا ہے، دوسرا گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ اور جو گروہ اس (گمراہی کے امام) کی پیروی کرتا ہے وہ دوزخی ہے"۔

فرزدق شاعر

صفاح تک پہنچے ہوں گے کہ فرزدق شاعر سے ملاقات ہوئی۔ آپؑ نے اس سے دریافت کیا : تمھارے پیچھے (یعنی کوفہ والے) جو لوگ ہیں ان کا کیا حال ہے۔ عرض کیا : واللہ آپؑ نے واقف کار ہی شخص سے اِستفسار فرمایا ہے۔ اچھا میں عرض کرتا ہوں۔ سنیے : "لوگوں کے قلوب آپؑ کے ساتھ ہیں، اور ان کی تلواریں بنی امیہ کے ساتھ۔ قضا آسمان سے اتر رہی ہے اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے"۔

آپؑ نے فرمایا: "تو سچ کہتا ہے اللہ تعالیٰ ہی کل امور کا مالک ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اگر حکمِ الٰہی ہماری مرضی کے موافق صادر ہوا تو ہم اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کریں گے، حالانکہ وہ ادائے شکر سے مستغنی ہے۔ اور اگر قضائے خداوندی خلافِ توقع نازل ہوئی تو ہم صبر کریں گے"۔

کامل ابن اثیر کے موافق فرمایا: "اگر قضائے الٰہی ہمارے موافق ہوئی تو ہم شکر کریں گے اور اگر ہماری امید میں حائل ہوئی تو اس کے لیے کوئی خرابی نہیں ہے جس کی نیت حق اور تقویٰ اس کا شعار ہو"۔

فرزدق کے قول کی شرح

صاحب روضۃ الشہدا نے فرزدق کا قول مع شرح کے لکھا ہے کہ: "اہل کوفہ کا دل آپؑ کے ساتھ ہے اس لیے کہ آپؑ راہ حق پر ہیں اور تلواریں بنی امیہ کے ساتھ ہیں، اس لیے کہ مال دنیا ان کے پاس ہے"۔

حضرتؑ کے اشعار

صاحب لہوف اور خصائص الحسینؑ کے موافق حضرتؑ نے اس وقت یہ اشعار انشا فرمائے:

فان تکن الدنیا تعد نفیسۃ ۔۔۔ فان ثواب اللہ اعلیٰ و انبل
و ان کانت الارزاق قسماً مقدرا ۔۔۔ فقلۃ حرص المرء فی السعی اجمل
و ان تکن الاموال للترک جمعہا ۔۔۔ فما بال متروک بہ المرء یبخل
و ان تکن الابدان للموت انشأت ۔۔۔ فقتل بالسیف فی اللہ افضل

(اگر دنیا اچھی بھی جانے تو حقیقت میں ثواب اللہ کا اعلیٰ اور اشرف ہے۔ اور اگر روزی انسان کی تقدیر کے موافق ہے تو رزق کی سعی میں کم حرص کرنا بہتر ہے۔ اور اگر مال دنیا سب کا سب چھوڑ جانے کے لیے ہے تو کیا حال ہوگا اس متروکہ کا جس کے ساتھ ایسا بخل ہوتا ہے اور اگر جسم موت کے لیے بنائے گئے ہیں تو تلوار سے راہِ خدا میں مارا جانا افضل ہے)

مُسلم کی خبر سن کر حضرت کا اِرشاد

انھیں مورخین کے موافق حضرتؑ نے مُسلم بن عقیل کی خبر سن کر فرمایا: "فمنھم من قضیٰ نحبہ و منھم من ینتظر" جو ان پر ہونے والا تھا وہ گزر چکا اور اب ہم پر جو باقی ہے وہ بھی ضرور ہوگا۔ اعثم کوفی کے موافق مسلمؑ کو دعائیں دینے کے بعد یہ بھی فرمایا کہ: "اس کا جو فرض تھا اس نے پورا کر دیا۔ ذرا کمی نہیں کی"۔

حضرت مُسلم کی خبر سن کر اکثر ہمراہی چلے گئے

صاحب لہوف کے موافق "منزل زبالہ میں حضرت مُسلم کی خبر شہادت حضرتؑ کو معلوم ہوئی اور جب آپؑ نے اصحاب کو مطلع کیا تو "لالچ" اور طمع والے چل دیے صرف اچھے اور چنے ہوئے اصحاب اور اہل بیت آپؑ کے ساتھ رہ گئے"۔ صاحب روضۃ الصفا کے موافق یہ خبر حضرتؑ کو منزل زرود سے روانگی کے بعد ملی اور خبر دہندہ نے کہا کہ: "ہم جس وقت کوفہ میں تھے کہ مُسلم اور ہانی قتل کیے گئے اور میں نے دیکھا کہ لڑکے ان کے پاؤں پکڑ کے کھینچتے پھرتے ہیں"۔ کامل اور ابن خلدون کے موافق یہ خبر منزل ثعلبیہ میں ملی۔

خبر شہادت اور صلاحیں

آخر الذکر مؤرخ کہتا ہے: بعضوں کی رائے ہوئی کہ آپؑ یہیں سے واپس چلیے کوفہ میں آپؑ کا کوئی یار و یاور نہیں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ بجائے آپؑ کی نصرت کرنے کے آپؑ کے مخالف نہ بن جائیں۔ بنو عقیل بولے واللہ ہم سرزمین کوفہ کو اس وقت تک نہ چھوڑیں گے جب تک مُسلم کے خون کا بدلہ نہ لے لیں گے۔ یا جیسا کہ مُسلم نے ذائقہ موت چکھا ہے ہم بھی نہ چکھ لیں گے۔ حسینؑ بن علیؑ نے ارشاد کیا تم لوگوں کے بعد پھر زندگی کا کیا لطف ہوگا۔

بنو عقیل کی حالت

ہمراہیوں میں سے چند لوگ کہنے لگے واللہ آپؑ مُسلم بن عقیل جیسے نہیں ہیں جوں ہی آپؑ کوفہ میں پہنچیں گے سب لوگ آپؑ کے مطیع ہو جائیں گے۔

تاریخ کامل ابن اثیر کے موافق: واپسی کی صلاح اور باپ کی خبر شہادت سن کر بنو عقیل "اچھل پڑے"۔

یتیمہ مُسلم اور حسینؑ

صاحب روضۃ الشہدا کے موافق منزل شقوق میں حضرتؑ تنہا ایک جگہ تشریف فرما تھا کہ کوفہ سے ایک شخص آتا ہوا دکھائی دیا۔ اور اس سے مُسلم کی خبر معلوم ہوئی۔ ابھی تک کوئی مطلع نہیں ہوا تھا کہ حضرت مُسلم کی ایک لڑکی جو حضرتؑ کے ہمراہ تھی اور جو ہر منزل میں حضرتؑ کے پاس حاضر ہوا کرتی تھی حسب معمول قریب آئی۔ حضرتؑ نے آج معمول سے زیادہ نوازش فرمائی۔ غور سے اسے دیکھتے تھے اور سر پر ہاتھ پھیرتے تھے۔ لڑکی کی فراست نے آج کی غیر معمولی عنایت سے اثر لیا۔ اور پوچھا کہ آج آپؑ مجھ پر ایسی عنایت کر رہے ہیں جو یتیموں پر کی جاتی ہے۔ اب حسینؑ بھی ضبط نہ کر سکے اور فرمایا بیٹی تم رنج نہ کرو میں تمھارا باپ ہوں۔ میری بہن زینب تمھاری ماں ہیں۔ میری لڑکیاں تمھاری بہنیں ہیں اور میرے لڑکے تمھارے بھائی ہیں۔ لڑکی کے رونے سے پسران مُسلم کو خبر ہوئی اور عام گریہ وزاری نے سب کو مطلع کر دیا۔

حضرتؑ کے قاصد کی گرفتاری اور شہادت

روضۃ الشہدا اور روضۃ الصفا کے موافق حضرتؑ نے بطن الرمہ سے اور لہوف و ابن خلدون کے موافق حاجز سے ایک خط اہل کوفہ کو (جس میں اپنی تشریف آوری کا حال لکھا تھا۔ اور ان لوگوں کو مستعد و تیار کیا تھا) قیس بن مصہر صیداوی کے معرفت روانہ کیا۔ قیس جوں ہی قادسیہ پہنچے حصین بن نمیر نے گرفتار کر کے ابن زیاد کے پاس کوفہ بھجوایا۔ ابن زیاد نے قیس سے کہا کہ تم قصر امارت پر چڑھ کر ـــــ حسینؑ بن علیؑ کو گالیاں دو، تمھاری جان بخشی کی جائے گی۔ پس قیس قصر پر گئے۔ حمد و ثنا کے بعد کہا: "اے لوگو! حسینؑ بہترین خلائق فاطمہؑ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لڑکے ہیں اور میں ان کا قاصد ہوں وہ اب حاجز سے شاید آگے بڑھ آئے ہوں گے۔ تم ان کی اطاعت کرو"۔ یہ کہہ کر ابن زیاد پر لعن کیا اور زیاد کو سخت و سست کہہ کر علیؑ بن ابی طالبؑ کے لیے دعائے مغفرت کی۔ ابن زیاد نے جھلا کر حکم دیدیا کہ اس کو قصر سے نیچے گرا دو۔ گرتے ہی قیس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے۔ دماغ پھٹ گیا۔ اِنتقال کر گئے۔

صاحب لہوف کے موافق قیس جب قادسیہ پہنچے اور شہر میں داخل ہونا چاہا تو حصین ابن نمیر رفیق بن زیاد نے ان کو راستہ ہی میں روک لیا۔ اور تلاشی لینی چاہی۔ تب قیس نے خط نکال کر پھاڑ ڈالا۔ حصین ان کو ابن زیاد کے پاس لے گیا۔ جب وہ اس کے پاس کھڑے کیے گئے تو اس نے قیس سے پوچھا تو کون ہے۔ انھوں نے کہا: میں علیؑ بن ابی طالبؑ اور ان کے فرزند کا

دوست اور شیعہ ہوں۔ اس نے پوچھا تم نے خط کیوں پھاڑا۔ انھوں نے جواب دیا: تاکہ اس کا مضمون ظاہر نہ ہو۔ اس نے پوچھا کہ خط کس کا اور کس کے نام تھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ امام حسینؑ کا تھا اور سرداران کوفہ کے نام تھا۔ جن کے نام مجھے معلوم نہیں ہیں۔ اس پر ابن زیاد آگ ہوگیا اور قسم کھا کر کہا کہ جب تک تو مجھے ان لوگوں کے نام نہ بتائے گا تجھ کو ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ جب تک منبر پر جا کر حسینؑ بن علیؑ اور ان کے باپ بھائی پر تبرا نہ کرے گا.....

اعثم کوفی کے موافق جس وقت قیس کی خبر سن کر حضرتؑ متاسف تھے اور انا للہ وانا الیہ راجعون فرما رہے تھے۔ آپؑ کے اصحاب میں سے ایک شخص ہلال بن نافع نے عرض کی کہ یا ابن رسول اللہ! تمھارے نانا محمد مصطفےٰ تمام لوگوں کو اپنا دوست نہ بنا سکے۔ بعض آدمی ہمیشہ آپؑ کے دوست تھے اور کچھ منافق تھے۔ ظاہر میں زبانوں سے دوستی کا دعویٰ کیا کرتے تھے اور کچھ لوگ اپنے دلوں میں عداوت کو پوشیدہ رکھتے تھے۔ یہی آپؑ کے والد علیؑ مرتضیٰ کی کیفیت تھی۔ کچھ آدمی آپؑ کے ہوا خواہ اور دوست تھے، فرمانبردار اور اعانت سے پیش آتے تھے اور بعض زبانی دعویٰ کیا کرتے تھے۔ اب جو شخص اپنے عہد کو توڑ ڈالے اور آپؑ کے خلاف ہو جائے وہ اس کا بدلہ دیکھ ہی لے گا۔ اللہ تعالیٰ آپؑ کو ان سے بے پرواہ کردے۔ آپؑ مشرق و مغرب جس طرف جانا چاہیں گے ہم خدمت گزاری کے لیے موجود ہیں۔ ہرگز آپؑ سے جدا نہ ہوں گے اور حکم الٰہی پر راضی رہیں گے۔ ہمارا دوست وہی شخص ہوگا جو آپؑ کو عزیز سمجھے گا۔ اور جو شخص آپؑ کو دشمن جانے گا وہ ہمارا بھی دشمن ہوگا۔ حضرتؑ نے اسے دعائے خیر دی۔

تاریخ کامل کے موافق ایسی ہی صورت عبداللہ بن یقطر کے لیے ہوئی۔ قصر سے گرنے کے بعد ان میں کچھ جان باقی تھی کہ کسی دوسرے شخص نے ذبح کر ڈالا۔ اور لوگوں نے یہ کہہ کر پسند کیا کہ "راحت دیدی"۔

خصائص الحسینؑ کے موافق عبدالملک بن عمر نے ذبح کیا۔ لوگوں نے ملامت کی تو اس نے جواب دیا کہ میں نے چاہا کہ راحت دے دوں۔ اسی مؤرخ کے موافق حضرتؑ نے لوگوں کو اس خبر سے مطلع کردیا۔ اور جس قدر اعراب تھے وہ چلے گئے صرف وہ لوگ ہمراہ رہ گئے جو مکہ سے ہمراہ ہوئے تھے۔ یہ خبر زبالہ میں ملی تھی۔

کوفہ کا خط جو قیس بن مسہر کی معرفت روانہ کیا گیا تھا وہ سلیمان بن صرد، مسیب بن نخبہ اور عبداللہ بن دال رفاعہ بن شداد اور جماعت مؤمنین کے نام تھا۔ مضمون خط میں نور العین ترجمہ خصائص الحسینؑ سے نقل کرتا ہوں۔

اہل کوفہ کے نام خط کا مضمون

جانتے ہو تم کہ جناب رسول خدا نے فرمایا ہے کہ جو شخص دیکھے بادشاہ جور کو کہ حلال خدا کو حرام اور حرام کو حلال کرتا ہو اور عہد خدا کو شکستہ کرتا ہو اور مخالفت کرتا ہو سنت کی اور بندگان الٰہی سے بہ ظلم و عدوان پیش آتا ہو پس جو لوگ ایسے ظالم بادشاہوں سے راضی ہیں اور ان کے افعال و اقوال میں انکار نہ کریں تو حق تعالیٰ ان لوگوں کو اس کے شریک کرے گا اس کے افعال میں اور تم لوگ خوب جانتے ہو کہ اس جماعت یعنی بنی امیہ نے روگردانی کی اطاعت خدا سے اور عبادت شیطان اختیار کی ہے اور بالاعلان فساد کیا ملک خدا میں اور بے کار کر دیا حدود خدا کو اور مسلمین کا مال اپنے واسطے مخصوص کیا اور احکام الٰہی کو حلال و حرام سے متغیر کر دیا۔ بہ تحقیق کہ میں زیادہ سزاوار خلافت ہوں تمام خلق سے بہ سبب اس قرابت کے جو کہ پیغمبر خدا سے رکھتا ہوں۔ خطوط اور قاصد تمھاری جانب سے میرے پاس آئے تھے۔ اس مضمون کے کہ ہم نے

بیعت کی آپؑ کی اس امر پر کہ آپؑ کو نہ چھوڑیں گے اور آپؑ کی نصرت کریں گے۔ پس اگر اپنی بیعت اور قول پر وفا کرو تو البتہ رشد و ہدایت سے فائز ہو گے اور حال تمہارا اور تمہارے عیال کا مثل حال میرے اور میرے عیال کے ہوگا اور اگر اقرار پر اپنے ثابت نہ رہو گے اور بیعت شکنی کرو گے تب بھی تم سے بعید نہیں ہے کیونکہ میرے پدر بزرگوار اور برادر عالی وقار اور پسر عم مسلم سے بھی یہی کیا تم نے۔ اور مغرور وہ شخص ہے کہ تم پر مغرور ہوئے اور اگر ایسا ہی کرو گے اجر اپنا ضائع کیا تم نے اور راہ حق و صواب سے منہ پھیر لیا تم نے اور اپنا نقصان و ضرر کیا تم نے اور خدا تم سے بے نیاز ہے۔ والسلام۔

ابن خلدون کے موافق قریب قریب متذکرہ صدر خط کے الفاظ میں حضرتؑ نے لشکر حر کے سامنے خطبہ دیا۔

منزل ثعلبیہ میں حضرتؑ خواب دیکھتے ہیں

اعثم کوفی، روضۃ الشہدا اور لہوف کے موافق حضرتؑ جب منزل ثعلبیہ پر پہنچے تو آپؑ کو نیند آگئی اور تھوڑی دیر کے بعد نیم خوابی کے عالم سے بے چین اٹھے۔ حضرتؑ کی بے قراری اور حزن سے اہل بیت متاثر ہوئے۔

حضرت علی اکبرؑ کا سوال اور جوابؑ

حضرت علی اکبر قریب تھے۔ پوچھا: بابا آپؑ کی بے چینی کی کیا وجہ ہے۔ آپؑ نے بعض کے نزدیک فرمایا کہ:

میں نے "ہاتف" کو بعض کے نزدیک ایک "سوار" کو یہ کہتے سنا کہ: "اے حسین تم عراق کی طرف جانے کی جلدی کر رہے ہو اور موت تمہارے تعاقب میں جلدی کر رہی ہے کہ بہشت میں لے جائے۔ اس سے مجھے معلوم ہو گیا کہ موت قریب ہے"۔ حضرت علی اکبر نے پوچھا کہ: "اے بابا کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟"۔ حضرتؑ نے فرمایا: "بے شک ہم حق پر ہیں۔ اور حق ہمارے ساتھ ہے"۔ حسینؑ کے فرزند نے کہا کہ: "اگر ہم حق پر ہیں تو موت سے کیا ڈرنا"۔ (اعثم کوفی) بقول روضۃ الشہدا کہا: "تو پھر کوئی پرواہ نہیں ہے کہ ہم موت کی طرف جائیں یا موت ہماری طرف آئے"۔ بقول اعثم کوفی یہ سن کر حضرتؑ نے فرمایا: "اے فرزند تو نے دل خوش کر دیا۔ اللہ تعالیٰ تجھے جزائے خیر عطا کرے"۔ بقول لہوف فرمایا: "اے فرزند خدا تجھے وہ بہترین جزا دے جو باپ کی طرف سے فرزند کو دی جاتی ہے"۔

کوفہ سے آتا ہوا ایک آدمی

اسی منزل کے متعلق صاحب خصائص الحسینؑ روایت نقل کرتے ہیں کہ: عبداللہ بن سلیمان اور منذر بن مشمعل کہ دونوں قبیلہ بنی اسد سے تھے روایت کرتے ہیں کہ جب کہ حج سے فارغ ہوئے ہم تو ہم کو کوئی کام نہ تھا اس کے سوا کہ ان حضرتؑ سے ملحق ہوں اور دیکھیں کہ انجام کار کیا ہوتا ہے۔ پس بہت جلد چلے ہم یہاں تک کہ ان حضرتؑ سے ملحق ہوئے۔ ناگاہ دور سے دیکھا ہم نے ایک شخص کو کہ کوفہ کی طرف سے آتا تھا۔ جب کہ نزدیک پہنچا وہ اور امام حسینؑ کو دیکھا اس نے تو راہ اس نے چھوڑ دی اور دوسری راہ کی طرف مائل ہوا۔ پس حضرتؑ نے بھی اسے دیکھ کر توقف فرمایا اور قافلہ کو روک دیا۔ گویا حضرتؑ اس سے کچھ خبر کوفہ کی دریافت فرمانا چاہتے تھے۔ لیکن پھر حضرتؑ نے اعراض فرمایا۔ اور روانہ ہوئے۔ پس ہم دونوں اس شخص کے پاس گئے اور سلام کیا۔ اس نے جواب سلام دیا۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ کس قبیلہ سے ہو تم۔ اس نے کہا کہ ہم قبیلہ بنی اسد سے ہیں۔ ہم نے کہا کہ ہم بھی اسدی ہیں۔ تم کون ہو۔ اس نے کہا کہ میں بکر ہوں پسر فلاں۔ پس آپس میں

نسب کو بیان کیا ہم نے۔ پھر کہا ہم نے کہ اہلِ کوفہ کی خبر بیان کرو۔ اس نے کہا کہ ہاں کوفہ سے نہیں نکلا میں مگر یہ کہ مُسلم وہاں قتل ہو چکے ہیں۔ اور رسی ان کے پاؤں میں باندھ کر بازاروں میں کھینچتے تھے۔ پس ہم اس سے رخصت ہوئے اور قافلہ میں حضرتؑ کے داخل ہوئے یہاں تک کہ منزل ثعلبیہ پر پہنچے اور بہت جلد خدمت میں حضرتؑ کے حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا۔ جواب سلام حضرتؑ نے دیا۔

حضرتؑ کا لشکر رازدار تھا

پھر عرض کی ہم نے کہ ہمارے پاس ایک خبر ہے اگر حکم ہو تو مخفی عرض کریں ورنہ علانیہ عرض کریں۔ حضرتؑ نے ہماری طرف نظر فرمائی اور پھر اپنے اصحاب کی طرف ملاحظہ فرمایا۔ اور پھر فرمایا کہ: "مَیں ان سے کوئی شے پوشیدہ نہیں کرتا ہوں"۔ ہم نے عرض کیا: "اس سوار کو جو کوفہ سے آتا تھا اسے آپؑ نے ملاحظہ فرمایا تھا؟"۔ فرمایا: "ہاں! دیکھا تھا مَیں نے اسے اور اس سے کچھ حال دریافت کرنا چاہا تھا مَیں نے"۔ ہم نے عرض کی کہ: "ہم دُور سے آپؑ کے توقف فرمانے سے سمجھ گئے تھے کہ حضرتؑ کو اس سے کچھ حال دریافت فرمانا ہے۔ اس لیے ہم اس سے ملحق ہوئے"۔۔۔۔ پس حضرتؑ نے نظر فرمائی طرف اولادِ عقیل کے اور فرمایا: "تم کیا کہتے ہو؟"۔۔۔۔ پس جانا ہم نے کہ حضرتؑ واپس نہ ہوں گے۔

صحرا نشین عربوں سے ملاقات

صاحب بحار کے موافق جب حضرتؑ حاجز سے ایک تالاب پر پہنچے اور آگے بڑھے تو چند صحرا نشین عربوں سے ملاقات ہوئی۔ ان سے احوال کوفہ پوچھا گیا۔ اور انھوں نے اپنی لاعلمی ظاہر کرنے کے بعد کہا کہ اس قدر معلوم ہے کہ کسی شخص کو ان راہوں سے آمد و شد نہیں کرنے دیتے۔

عبداللہ بن مطیعؓ کے خیالات

مؤرخین نے عبداللہ بن مطیع کو پھر پیش کیا ہے اور بعض کے نزدیک حاجز کے بعد عرب کے چشمہ سے بڑھے تھے کہ ملاقات ہوئی اور بعض بطن الرمہ کے بعد بتاتے ہیں۔ بقول ابن خلدون وہ دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: میرے ماں باپ آپؑ پر فدا ہوں، آپؑ کہاں تشریف لیے جاتے ہیں۔ حسینؑ بن علیؑ نے کوفیوں کے خط لکھنے اور اپنی روانگی کا مفصل حال بتلایا۔ عبداللہ بن مطیع نے عرض کیا: "خدا کے واسطے اے ابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آپؑ کوفہ کا قصد نہ فرمائیے۔ یہ لوگ بڑے پیمان شکن و بدعہد ہیں۔ ان میں اسلام کی ہتک، قریش کی آبرو ریزی (؟) عرب کی عزت جاتی رہے گی۔ واللہ اگر آپؑ اس چیز کی خواہش کریں گے جو بنی امیہ کے ہاتھ میں ہے (یعنی حکومت و خلافت) تو بے شک وہ لوگ آپؑ کو شہید کر ڈالیں گے۔ اور پھر آپؑ کے شہید کرنے کے بعد کسی سے نہ ڈریں گے"۔

زہیر بن قین

اس مؤرخ کے موافق زہیر بن قین بجلی ہوا خواہ عثمان سے حج کر کے آپؑ کے ساتھ ہی ساتھ واپس جا رہا تھا۔ ایک منزل و ایک مقام پر قیام نہ کرتا تھا۔ ایک روز آپؑ نے اس کو بلا بھیجا۔ بہ اکراہ تمام آیا۔ کچھ باتیں ہوئیں۔ لیکن واپس ہو کر اپنی فرودگاہ پر گیا تو اپنے ہمراہیوں سے خطاب کر کے کہا: "جس کو میرے ساتھ چلنا ہو چلے میں حسینؑ کے ساتھ جاتا ہوں۔ وہ میرا آخری عہد ہے۔ میں تم لوگوں سے رخصت ہوتا ہوں۔ یہ کہہ کر بیوی کو طلاق دے کر بولا تم اپنے میکا (یعنی ماں باپ کے مکان) چلی جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ تم قید و گرفتار کی جاؤ۔ اور اپنے ہمراہیوں

سے رخصت ہوکر حسینؑ بن علیؑ کے پاس چلا آیا۔ اور انھیں کے ساتھ رہا۔ یہاں تک کہ کربلا میں یہ بھی شہید ہوا۔

زوجہ زہیر

روضتہ الصفا کے موافق: "امام حسینؑ او را طلبید۔ زہیر بن قین اجابت نہ نمود۔ زوجہ او گفت سبحان اللہ! پسر رسولؐ خدا بطلب تو میفرستد و تعلل مینمائی۔ این سخن ماثر افتادہ زہیر بخدمت سید جوانان بہشت شتافت و بعد از لحظہ بارنگ افروختہ از خیمہ امام حسینؑ بیرون آمدہ فرمود تا خیمہ او رابر کنند و قریب بہ خیمہ امام مظلوم شہید بردہ بزدند"۔ یعنی: "امام حسینؑ نے اسے بلایا، وہ نہ مانا۔ بیوی نے کہا: سبحان اللہ رسولؐ کا بیٹا تجھے بلاتا ہے اور تو بہانے کرتا ہے۔ اس بات کا اثر ہوا۔ زہیر جوانانِ جنت کے سردار کی خدمت میں دوڑا اور لحظہ بعد اڑے ہوئے رنگ کے ساتھ خیمۂ حسینؑ سے باہر آیا۔ خیمہ اٹھانے اور امام مظلوم کے خیمہ کے ساتھ لگانے کا اہتمام کیا"۔

خوف کا اندازہ

صاحب لہوف فرماتے ہیں: "ایک گروہ فزارہ و بجیلہ نے روایت کی ہے کہ ہم زہیر بن قین کے ہمراہ مکہ سے روانہ ہوئے۔ ہم امام حسینؑ کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ حضرتؑ ایسے مقام پر اترے کہ ہم کو سوائے حضرتؑ کے ساتھ ہم منزل ہونے کے کوئی چارہ کار نہ ہوا۔ ہم کھانا کھا رہے تھے کہ یکایک قاصد امام حسینؑ آیا، اور بعد سلام کہا کہ: اے زہیر بن قین! اباعبداللہ حسینؑ نے مجھے تم کو بلانے کے لیے بھیجا ہے۔ یہ سن کر ہمارے ہاتھوں سے لقمے گر گئے۔ اور ہم ایسے خاموش ہوگئے گویا ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ تب زوجہ زہیر جس کا نام دلیم بنت عمر تھا کہنے لگی......."۔

صاحب روضتہ الشہدا ان واقعات کے بعد ایک روایت یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ جس وقت زہیر طلاق اور ادائے مہر کے خیال میں تھے عورت نے کہا کہ اے صاحب ہمت تو چاہتا ہے کہ حضرت علیؑ مرتضیٰ کے فرزندوں کی خدمت کرے، میں بھی چاہتی ہوں کہ دخترانِ فاطمہؑ زہرا کی ملازمت میں رہوں۔ اور یہ کہہ کر دونوں باتفاق حاضر ہوئے۔

عبداللہ بن حرا لجعفی

حضرتؑ قصر بنی مقاتل کے قریب خیمہ زن تھے کہ آپؑ نے کچھ دور پر ایک سراپردہ ملاحظہ فرمایا۔ اس کے سامنے ایک نیزہ زمین میں گڑا تھا۔ تلوار لٹکی تھی اور گھوڑا بندھا تھا۔ حضرتؑ نے دریافت فرمایا کہ یہ کس کا سراپردہ ہے۔ جواب دیا گیا کہ یہ ایک کوفی کا ہے جس کا نام عبداللہ بن حر الجعفی ہے۔ حضرتؑ نے اسی کے قبیلہ کے ایک شخص کو جس کا نام حجاج بن مسروق جعفی تھا۔ اس کی طلب میں بھیجا۔ حجاج نے عبداللہ سے کہا کہ اے عبداللہ اگر تو حسینؑ کے دشمنوں کو ان سے دفع کرے گا تو ثواب عظیم کا مستحق ہوگا۔ اور اگر مارا گیا تو شہید ہوگا۔ اعثم کوفی کے موافق عبداللہ نے جواب دیا کہ میں اسی لیے کوفہ سے نکل آیا ہوں کہ امام حسینؑ وہاں تشریف لائے اور میں نے مدد کرنی چاہی تو نہ کرسکوں گا۔ کیونکہ تمام کوفہ والوں کی نیتیں بدل گئی ہیں۔ دنیا کی محبت میں مبتلا ہوکر عبداللہ ابن زیاد کے طرف دار ہوگئے ہیں۔ سعادت مندی کے ساتھ واپس جاکر میرا سلام پہنچاؤ اور آپؑ کو یہ سب حالات سنادے۔ حجاج نے امیرالمومنین کے پاس جاکر جو کچھ دیکھا اور سنا تھا عرض کردیا۔ امیرالمومنین حسینؑ اپنے چند رشتہ دار اور بھائی بند ہمراہ لے کر اس کے پاس گئے۔ عبداللہ حضرتؑ کو تشریف لاتے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ تعظیم و تکریم سے پیش آیا۔ امام حسینؑ کا دست مبارک پکڑ کر صدر جگہ بٹھایا۔ آپؑ نے حمد و ثنائے الٰہی کے بعد فرمایا: "اے عبداللہ تیرے شہر کے آدمیوں نے جو سب کے سب نامور اور رکن شہر ہیں ہمیں خط بھیج کر وعدے کیے کہ ہم سب آپؑ کے ہوا خواہ

ومعاون ومددگار ہیں۔ آپؑ ہمارے پاس چلے آئیے۔ میں نے اس امر کے قبول کرنے میں تامل کیا۔ کسی خط کا جواب نہ دیا تو مکرر خط آئے۔ ناچار میں نے ان لوگوں کے قول و قرار کی وجہ سے حرم خدا سے سفر کیا۔ اور اس طرف آیا۔ اب دگرگوں معاملہ دیکھتا ہوں۔ میرے چچازاد بھائی مسلمؑ کی بیعت اٹھارہ ہزار آدمیوں نے کی اور جنگ کے لیے نکلے۔ جب لڑائی شروع ہو گئی تو عین معرکہ میں اس سے علیحدہ ہو گئے۔ اسے تنہا چھوڑ دیا۔ اور پسر زیاد کے حوالہ کر دیا۔ اس نے بڑی ایذا دہی کے ساتھ شہید کیا۔ اب سنتا ہوں کہ یزید کی فرمانبرداری کے ساتھ پسر زیاد کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ اے عبداللہ تو خوب جانتا ہے کہ تجھ سے جو کچھ نیکی و بدی ظہور میں آئے گی اللہ تعالیٰ ویسی ہی جزا دے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تو اس وقت توبہ کر کے تمام گزشتہ گناہوں سے بری ہو جائے۔ ہم رسولؐ خدا محمد مصطفےٰؐ کے اہل بیت ہیں۔ ہماری امداد کر۔ اور اس معاملہ میں ہمارا ساتھ دے۔ جس قدر ہو سکے ہمارے دشمنوں کو ہمارے مقابلہ سے دفع کر"۔ عبداللہ نے کہا: "اے فرزند رسولؐ اگر کوفہ میں آپؑ کے کچھ ایسے دوست ومددگار ہوتے جو آپؑ کا ساتھ دیتے تو میں سب سے پہلے آپؑ کے واسطے جنگ کرتا۔ مگر آپؑ کے تمام دوست ومددگار اور شیعہ اعتقاد بدل چکے اور عبیداللہ سے مل گئے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپؑ یہ گھوڑی تحفہ نام لے لیں۔ خدا کی قسم اس گھوڑی کو میں نے جس جانور کے پیچھے ڈالا ہے اسے جا لیا ہے۔ اور جب اس پر سوار ہو کر بھاگا ہوں تو کوئی شخص مجھ تک نہیں پہنچ سکا۔ اور یہ تلوار بھی جس پر لگائی ہے صاف اس سے نکل گئی ہے۔ یہ دونوں چیزیں آپؑ میری طرف سے قبول فرمالیں"۔ آپؑ نے فرمایا: "میں تیرے پاس اس گھوڑی اور تلوار کی لالچ سے نہیں آیا ہوں، بلکہ یہ مدعا ہے کہ تو میرا ساتھ دے اور میرے دشمنوں سے لڑے۔ اگر تو اپنی جان کو ہم سے عزیز رکھنا چاہتا ہے تو ہمیں تیرے مال کی بھی ضرورت نہیں ہے"۔ یہ فرما کر آپؑ اپنے قیام گاہ پر چلے آئے۔ صاحب روضۃ الصفا کے موافق حضرتؑ منزل عقیق میں پہنچے تھے کہ بنی عکرمہ کا ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ ابن زیاد نے آپؑ کی تلاش میں لشکروں کو ہر طرف پھیلا دیا ہے اور اس وقت وہ قادسیہ سے عذیب تک آپؑ کا انتظار کر رہا ہے۔ مصلحت یہ ہے کہ آپؑ واپس جائیں۔ قسم خدا کی آپؑ نہیں جاتے مگر نیزوں اور تلواروں کی طرف۔ یقین فرمائیے کہ اہل کوفہ کی باتیں قابلِ اعتماد نہیں۔ بلکہ آپؑ سے جنگ کرنے کے لیے ان لوگوں نے لشکر یزید سے اتفاق کیا ہے۔ اور آپؑ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ سن کر حضرتؑ نے فرمایا کہ: خدا تجھے جزائے خیر دے کہ تو نے شرط نصیحت پوری کر دی۔

حر کا لشکر

اس کے بعد مورخ کے موافق منزل سراۓ آرام فرما کر بڑھے تھے کہ حر کے لشکر سے ملاقات ہوئی جو دواب سے اتر کر اس جگہ پہنچا تھا۔ تاریخ کامل کے موافق یہ ملاقات بطن عقبہ کے بعد ہوئی۔ ابن خلدون کے موافق منزل شراف کے بعد تھی۔ روضۃ الشہدا کے موافق منزل سراب تھی۔ (غالباً سرا، سراب، شراف ایک ہی منزل ہے) صاحب لہوف کے موافق کوفہ دو منزل رہ گیا تھا۔ سیر الائمہ کے موافق کوفہ کے قریب پہنچ گئے تھے۔

دوپہر کا وقت

وقت کے متعلق تمام مورخین متفق ہیں کہ آفتاب وسط سما میں پہنچ چکا تھا۔ ملاقات ہونے کی صورت میں اس قدر اختلاف ہے کہ بعض کے موافق حضرتؑ چلے آرہے تھے کہ آپؑ نے دور سے ایک لشکر کو دیکھا کہ وہ اپنے گھوڑوں کے سایہ میں بیٹھا ہے۔ اور جب اس نے حضرتؑ کو مع رفقا کے آتے دیکھا

جنھوں نے یہ خط تحریر کیے ہیں۔ اور عُبید اللہ بن زیاد نے ہمیں حکم دیا ہے کہ آپؑ کو اس کے پاس لے جائیں۔

حسینؑ کا تبسم اور قصدِ روانگی

امیرالمومنین حسینؑ نے مسکرا کر کہا: "تم یہ کام نہیں کر سکتے"۔ پھر حکم دیا کہ: "عورتوں کو کجاووں میں سوار کرا دو۔ اور سوار ہو کر چلو۔ دیکھیں یہ لوگ ہمارا کیا کر سکتے ہیں"۔ لوگوں نے آپؑ کے حکم کے موافق اہل و عیال اور بچوں کو سوار کر دیا، اور چل نکلے۔ کوفی لشکر نے راستہ روکا اور جانے سے مانع آئے۔

حسینؑ تلوار پر ہاتھ ڈالتے ہیں

اہل بیت کا راستہ روکتے ہی امام حسینؑ نے قبضۂ شمشیر پر ہاتھ ڈالا، اور کہا: "اے پسرِ یزید! کس لیے تو ان لوگوں کو نہیں جانے دیتا۔ تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے"۔ حر نے جواب دیا: "یا ابن رسول اللہ! اگر کوئی اور شخص میری ماں کا نام لیتا تو میں تلوار کی دھار سے جواب دیتا۔ مگر آپؑ اور آپؑ کے ماں باپ کی حرمت بہت بڑی ہے۔ کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن تمھیں عُبید اللہ کے پاس ضرور لے چلوں گا"۔ حسینؑ نے کہا: "میں ہرگز نہ جاؤں گا، اور تیرے ارادہ کی مجھے ذرا پرواہ نہیں۔ تو کیا کر سکتا ہے"۔ حر نے کہا: "اگر میری اور میرے لشکر کی جانیں بھی اس معاملہ میں جاتی رہیں تو بھی مجھے گوارا ہے۔ میں عُبید اللہ کے پاس ضرور لے چلوں گا"۔

حسینؑ حر کو تنہا جنگ کے لیے بلاتے ہیں

امام حسینؑ نے کہا: "اچھا اپنے لشکر سے نکل کر سامنے آ اور میں بھی اپنے ہمراہیوں سے علیٰحدہ ہو کر تیرے سامنے آتا ہوں کہ دونوں آپس میں جنگ کریں۔ اگر تو نے مجھے مار ڈالا تو تیرے امیر کی اور تیری مراد بر آئے گی اور تو مارا گیا تو خلقت تیرے پنجہ سے آزاد ہو جائے گی"۔

حر کا حکم اور ذاتی عقیدہ

حر نے کہا: "یا اباعبداللہ! مجھے آپؑ سے جنگ و جدل کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ یہ کہہ دیا ہے کہ آپؑ کے ساتھ سے علیٰحدہ نہ ہوں۔ یہاں تک کہ آپؑ کو عُبید اللہ کے پاس پہنچا دوں۔ خدا کی قسم مجھے سخت ناگوار ہے کہ کوئی ایسی بات کہوں یا کوئی ایسی حرکت کروں جو آپؑ کو ناخوش معلوم ہو۔ مگر کیا کروں دوسرے کا مقرر کیا ہوا ہوں۔ اور محکوم مجبور ہوتا ہے۔ میں نے اس گروہ سے بیعت کر رکھی ہے اور ان کے حکم سے آپؑ کے پاس پہنچا ہوں اور خوب جانتا ہوں کہ قیامت کے دن تمام خلقت کو آپؑ ہی کے نانا کی شفاعت کی ضرورت پڑے گی۔ میں حیران و پریشان و خوف زدہ ہوں کہ آپؑ سے لڑنے کی نوبت نہ آئے پھر شفاعت کی امید کیا خاک ہو سکتی ہے۔ خدانخواستہ مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوگی جس سے حضرتؑ کے جسم مبارک کو کچھ تکلیف پہنچی تو دنیا اور آخرت دونوں جگہ میرے واسطے خرابی موجود ہے۔ اور اگر آپؑ کو عُبید اللہ بن زیاد کے پاس نہ لے جاؤں تو میں کوفہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ہاں دنیا دیتا ہے۔ خدا کی پناہ۔ قیامت کے دن آپؑ کے نانا کی شفاعت سے محروم رہ جانے کی نسبت یہی بہتر ہے کہ اور کسی طرف نکل جاؤں۔ آپؑ شارعِ عام سے نہیں بلکہ کسی اور غیر مشہور راستہ سے کسی سمت کو چلے جائیں، اور میں عُبید اللہ کو لکھ دوں گا کہ حسینؑ کسی اور طرف چلا گیا۔ مجھے نہیں ملا۔ پھر تو مجھے آپؑ کے نانا کی شفاعت کی کچھ امید باقی رہے گی اور اے حسینؑ میں قسم دلاتا ہوں کہ اپنی جان پر رحم کرو کوفہ نہ جاؤ"۔

حضرتؑ کا استفسار اور اشعار

آپؑ نے کہا: "اے حر کیا تو یہ بات اس لیے کہتا ہے کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے؟" حر نے کہا: "ہاں اے فرزند رسولؐ، اس میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں ہے۔ آپؑ سلامتی سے مکہ کو واپس چلے جائیں"۔ ابن خلدون کے موافق حر کا کلام سن کر حضرتؑ نے فرمایا: "کیا تو مجھ کو موت سے ڈراتا ہے؟" اور اس کے بعد یہ اشعار ورد زبان فرمائے: ؎

سأمضي و ما في الموت عار على الفتى اذا ما نوى خيرا و جاهد مسلما

(میں تو اپنا قصد پورا ہی کروں گا اور مرنے میں جوانمرد کو عار نہیں ہے۔ جب اس نے نیکی کی نیت کرلی اور مسلمان ہو کر جہاد کیا)

و واسى رجالا صالحين بنفسه و خالف مثبورا و فارق مجرما

(اور اچھے لوگوں سے بذاتہ محبت پیدا کی۔ گردن زدنیوں کی مخالفت کی اور باغیوں کا ساتھ چھوڑ دیا)

فان عشت لم اندم و ان مت لم الم كفى بك ذلا ان تعيش و ترغما

(پس اگر میں زندہ رہا تو مجھے کچھ ندامت نہ ہوگی اور اگر مرگیا تو میں اپنی ملامت نہ کروں گا۔ تجھے ذلت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ تو زندہ رہے اور تیری ناک رگڑی جاتی رہے)

کامل ابن اثیر کے موافق حر کے کلام پر حضرتؑ نے فرمایا کہ: "میں تجھ سے وہی کہتا ہوں جو بھائی اوسی نے کہا تھا اپنے ابن عم سے جب وہ نصرت رسولؐ کا ارادہ کر رہا تھا کہ کہاں جاتا ہے قتل کیا جائے گا تو اس نے جواب دیا کہ: میں جاؤں گا اور موت سے کوئی عار نہیں جب کہ نیت خیر اور جہاد ہو"۔ حر نے جب یہ سنا تو ہٹ گیا۔

غالباً اسی موقع پر جب کہ حر ضد کر رہا تھا زہیر بن قین نے حضرتؑ سے عرض کیا کہ اس وقت اجازت جنگ دیجیے کیونکہ اس وقت لڑنا آسان ہے بہ نسبت ان فوجوں کے جو آرہی ہیں۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ: "تم سچ کہتے ہو

وقتی تصفیہ

لیکن ہم ابتدا بجنگ نہ کریں گے"۔ اس کے بعد یہ تصفیہ ہوا کہ حضرتؑ ایسے راستہ سے تشریف لے چلیں جو نہ موصل بہ حجاز ہو اور نہ موصل بہ کوفہ۔ (ابن خلدون)

عذیب الہجاناتؑ

رفتہ رفتہ عذیب میں پہنچے جہاں پر نعمان کی اونٹنیاں چرا کرتی تھیں۔ کوفہ کے چار آدمی آتے ہوئے دکھائی دیے۔ جو تیز اونٹنیوں پر سوار نافع بن ہلال کے گھوڑے کے پیچھے تیزی کے ساتھ آرہے تھے۔

طرماح بن عدی اور سوال رفاقت

اور ان کے ہمراہ ان کا رہبر طرماح بن عدی بھی تھا۔ حسینؑ بن علیؑ کے قریب نہ پہنچنے پائے تھے کہ حر نے بڑھ کر کہا: میں ان کو گرفتار کروں گا۔ یا کوفہ کی طرف لوٹا دوں گا۔ آپؑ بولے ایسا نہ ہونے پائے گا۔ یہ میرے معین و مددگار ہیں اور میرے قائم مقام ہیں۔ اگر تم نے ان سے کچھ بھی تعرض کیا تو ہمارے اور تمہارے کوئی دقیقہ نہ اٹھا رہے گا۔ حر خاموش ہو رہا۔ حسینؑ بن علیؑ نے ان لوگوں سے دریافت کیا تم ان لوگوں کا کچھ حال بتلاؤ جن (یعنی اہل کوفہ) کو تم چھوڑ آئے ہو۔ ان میں سے مجمع بن عبداللہ العامری نے عرض کیا: "شرفاء کوفہ کی رشوت خواری بڑھ گئی۔ دنیا کی طمع میں پڑے ہوئے

ہیں۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ وہ ایک زبان ہو رہے ہیں۔ باقی رہے عوام الناس ان کے قلوب تمہاری طرف مائل ہیں لیکن ان کی تلواریں کل تم پر کھنچی جائیں گی۔۔۔۔" اس کے بعد طرماح بن عدی نے کہا:

طرماح کوہ آجا چلنے کی صلاح دیتے ہیں

"آپؑ کے ہمراہ بہت کم آدمی ہیں اور یہ تھوڑی دل ہیں۔ صبح نہ ہونے پائے گی کہ کل کوفہ دریا کی طرح امنڈ آئے گا۔ اگر آپ یہ چاہتے ہوں کہ کسی محفوظ شہر میں قیام کریں تو آپؑ ہمارے ساتھ چلیے ہم آپؑ کو کوہ آجا میں ٹھہرائیں گے جو ہم کو ملوک غسان و نعمان بن منذر اور کل سرخ و سفید کے حملوں سے بچاتا ہے۔ واللہ وہاں پر کسی قسم کی رسوائی و مضرت نہ آنے پائے گی۔ پھر وہاں سے ان لوگوں کی طرف دعاۃ روانہ کرنا جو آجا و سلمی میں طے والے مقیم ہیں۔ خدا کی قسم دس روز بھی نہ گزرنے پائیں گے کہ بے حد طے کے سوار و پیادہ آکر مجتمع ہو جائیں گے۔ اس وقت اگر کوئی شخص آپؑ کے مقابلہ پر آئے گا تو صرف طے کی بیس ہزار تلواریں نیام سے نکل پڑیں گی جو آپؑ کے روبرو دشمنوں سے لڑیں گی"۔

صلاح کا جواب

آپؑ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ تم کو بہتر جزا دے۔ ہم میں اور ان لوگوں میں کچھ ایسے امور حائل ہو گئے ہیں کہ جس سے ہم لوٹ چلنے پر قادر نہیں ہیں اور ہم یہ نہیں جانتے کہ آئندہ ہم میں اور ان میں کیا واقعہ پیش آئے گا"۔

قصر بنی مقاتل

غرض طرماح آپؑ سے رخصت ہو کر اپنے اہل کی طرف روانہ ہوا اور امام حسینؑ پھرتے پھراتے قصر بنی مقاتل میں پہنچے۔ شام ہو گئی تھی، قیام کر دیا۔ نماز صبح پڑھ کر جھٹ پٹ سوار ہو کر چلنے کا قصد کیا۔ حر نے پہنچ کر روکنا شروع کیا۔

نینویٰ

اسی رد و کد میں نینویٰ تک پہنچے جہاں پر آپؑ اتر پڑے اور ایک سانڈنی سوار نے آکر ابن زیاد کا خط حر کو دیا جس میں لکھا ہوا تھا: "میرے اس خط و قاصد کے پہنچتے ہی حسینؑ کو روک کر ایک کھلے ہوئے میدان میں ٹھہرانا، جہاں نہ پانی ہو اور نہ کوئی محفوظ مقام ہو۔ میں نے اس قاصد کو حکم دیدیا ہے کہ تاتعمیل وہ تم سے جدا نہ ہو گا"۔ حر نے خط پڑھ کر حسینؑ بن علیؑ سے مخاطب ہو کر کہا: "یہ خط امیر کا آیا ہے۔ مجھے ہدایت ہوئی ہے کہ میں آپؑ کو کھلے میدان میں ٹھہراؤں اور تاتعمیل حکم یہ قاصد مجھ سے علیحدہ نہ ہو گا۔ لہذا آپؑ نینویٰ سے اٹھ کر ایسے میدان میں فروکش ہوں جہاں نہ سایہ ہے نہ پانی ہے"۔ آپؑ نے ارشاد کیا: "تم ہم کو اب زیادہ تکلیف نہ دو۔ نینویٰ ہی میں رہنے دو، یا اجازت دو تو غاضریہ یا شفیقہ میں جا کر ہم قیام کریں"۔ حر بولے: "میں ایسا نہیں کر سکتا۔ ابن زیاد نے مجھ پر ایک شخص کو اس امر کی مخبری کو مقرر کیا ہے"۔

زہیر بن قین کی صلاح

زہیر بن قین نے عرض کیا: "واللہ اس کے بعد جو آئے گا وہ اس سے زیادہ سخت ہو گا۔ اے ابن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس وقت اس سے لڑ جانا آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ جو آئندہ آنے والا ہے"۔

جنگ میں سبقت نہیں چاہتے

آپؑ بولے: "ہم جنگ کرنے میں سبقت نہیں کر سکتے"۔ زہیر نے رائے دی: "آپؑ اس قریہ میں ہمارے ساتھ

ومعاون ومددگار ہیں۔ آپؑ ہمارے پاس چلے آئیے۔ میں نے اس امر کے قبول کرنے میں تامل کیا۔ کسی خط کا جواب نہ دیا تو مکرر خط آئے۔ ناچار میں نے ان لوگوں کے قول وقرار کی وجہ سے حرمِ خدا سے سفر کیا اور اس طرف آیا۔ اب دگرگوں معاملہ دیکھتا ہوں۔ میرے چچازاد بھائی مسلمؑ کی بیعت اٹھارہ ہزار آدمیوں نے کی اور جنگ کے لیے نکلے۔ جب لڑائی شروع ہو گئی تو عین معرکہ میں اس سے علیحدہ ہو گئے۔ اسے تنہا چھوڑ دیا۔ اور پسر زیاد کے حوالہ کر دیا۔ اس نے بڑی ایذا دہی کے ساتھ شہید کیا۔ اب سنتا ہوں کہ یزید کی فرمانبرداری کے ساتھ پسر زیاد کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ اے عبداللہ تو خوب جانتا ہے کہ تجھ سے جو کچھ نیکی وبدی ظہور میں آئے گی اللہ تعالیٰ ویسی ہی جزا دے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تو اس وقت توبہ کر کے تمام گزشتہ گناہوں سے بری ہو جائے۔ ہم رسولِ خدا محمد مصطفےٰؐ کے اہل بیت ہیں۔ ہماری امداد کر۔ اور اس معاملہ میں ہمارا ساتھ دے۔ جس قدر ہو سکے ہمارے دشمنوں کو ہمارے مقابلہ سے دفع کر"۔ عبداللہ نے کہا: "اے فرزندِ رسولؐ اگر کوفہ میں آپؑ کے کچھ ایسے دوست ومددگار ہوتے جو آپؑ کا ساتھ دیتے تو میں سب سے پہلے آپؑ کے واسطے جنگ کرتا۔ مگر آپؑ کے تمام دوست ومددگار اور شیعہ اعتقاد بدل چکے اور عبیداللہ سے مل گئے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپؑ یہ گھوڑی تحفتہً نام لے لیں۔ خدا کی قسم اس گھوڑی کو میں نے جس جانور کے پیچھے ڈالا ہے اسے جا لیا ہے۔ اور جب اس پر سوار ہو کر بھاگا ہوں تو کوئی شخص مجھ تک نہیں پہنچ سکا۔ اور یہ تلوار بھی جس پر لگائی ہے صاف اس سے نکل گئی ہے۔ یہ دونوں چیزیں آپؑ میری طرف سے قبول فرمالیں"۔ آپؑ نے فرمایا: "میں تیرے پاس اس گھوڑی اور تلوار کی لالچ سے نہیں آیا ہوں، بلکہ یہ مدعا ہے کہ تو میرا ساتھ دے اور میرے دشمنوں سے لڑے۔ اگر تو اپنی جان کو ہم سے عزیز رکھنا چاہتا ہے تو ہمیں تیرے مال کی بھی ضرورت نہیں ہے"۔ یہ فرما کر آپؑ اپنے قیام گاہ پر چلے آئے۔ صاحب روضۃ الصفا کے موافق حضرتؑ منزل عقیق میں پہنچے تھے کہ بنی عکرمہ کا ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ ابن زیاد نے آپؑ کی تلاش میں لشکروں کو ہر طرف پھیلا دیا ہے اور اس وقت وہ قادسیہ سے عذیب تک آپؑ کا انتظار کر رہا ہے۔ مصلحت یہ ہے کہ آپؑ واپس جائیں۔ قسم خدا کی آپؑ نہیں جاتے مگر نیزوں اور تلواروں کی طرف۔ یقین فرمائیے کہ اہل کوفہ کی باتیں قابلِ اعتماد نہیں۔ بلکہ آپؑ سے جنگ کرنے کے لیے ان لوگوں نے لشکر یزید سے اتفاق کیا ہے۔ اور آپؑ کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ یہ سن کر حضرتؑ نے فرمایا کہ: خدا تجھے جزائے خیر دے کہ تو نے شرطِ نصیحت پوری کر دی۔

حر کا لشکر

اس کے بعد مورخ کے موافق منزل سرا سے آرام فرما کر بڑھے تھے کہ حر کے لشکر سے ملاقات ہوئی جو دواب سے اتر کر اس جگہ پہنچا تھا۔ تاریخ کامل کے موافق یہ ملاقات بطن عقبہ کے بعد ہوئی۔ ابن خلدون کے موافق منزل شراف کے بعد تھی۔ روضۃ الشہدا کے موافق منزل سراب تھی۔ (غالباً سرا، سراب، شراف ایک ہی منزل ہے) صاحب لہوف کے موافق کوفہ دو منزل رہ گیا تھا۔ سیر الائمہ کے موافق کوفہ کے قریب پہنچ گئے تھے۔

دوپہر کا وقت

وقت کے متعلق تمام مورخین متفق ہیں کہ آفتاب وسط سما میں پہنچ چکا تھا۔ ملاقات ہونے کی صورت میں اس قدر اختلاف ہے کہ بعض کے موافق حضرتؑ چلے آرہے تھے کہ آپؑ نے دور سے ایک لشکر کو دیکھا کہ وہ اپنے گھوڑوں کے سایہ میں بیٹھا ہے۔ اور جب اس نے حضرتؑ کو مع رفقا کے آتے دیکھا

تو گھوڑوں پر سوار ہو گیا اور صف باندھ کر قریب پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں اسے کم قرین قیاس سمجھتا ہوں کہ کوئی لشکر ٹھیک دوپہر کے وقت اس طرح کہیں دم لے بلکہ میں اس دوسری روایت کو ترجیح دیتا ہوں جس طرح وہ کامل ابن اثیر اور ابن خلدون میں ہے۔ حضرتؑ تشریف لے جا رہے تھے کہ: دور سے گرد دیکھ کر ہمراہیوں میں سے کوئی تکبیر کہہ اٹھا۔ کسی نے تکبیر کی وجہ دریافت کی جواب دیا کہ گنجان درختوں کا باغ دکھائی دیتا ہے۔ بنی اسد کے دو شخصوں نے کہا اس میدان میں گھنا درخت نہیں ہے۔ حسینؑ بن علیؑ بولے یہ تو سواروں کی گرد ہے۔ پھر ان دونوں بنی اسد سے متوجہ ہو کر ارشاد کیا۔ کیا اس مقام پر کوئی ایسا ملجا و مامن ہے کہ جس میں ہم پناہ گزین ہوں اور ان لوگوں سے ایک رخ ہو کر ملیں۔

کوہِ ذوخشم

ان دونوں نے جواب دیا: سامنے یہ تمہارے پہلو پر ذوخشم ہے۔ اپنے بائیں جانب سے مڑ کر اس کی طرف چلے جاؤ۔ اگر یہ لوگ تم سے پہلے اس طرف چلے جائیں گے تو تمہارا مقصود حاصل ہو جائے گا۔ حسینؑ بن علیؑ یہ سنتے ہی سرعت کے ساتھ ذوخشم کی طرف جھکے۔ لیکن ذوخشم پر پہنچنے کے پہلے سواروں کی فوج آ پہنچی۔ آپؑ ٹھہر گئے۔ کامل کے موافق حضرتؑ نے ایسی پناہ کے متعلق دریافت فرمایا جہاں اس لشکر سے سامنے سے مقابلہ کیا جا سکے۔ ذوخشم کا نام بتا کر کہا گیا کہ اگر آپؑ وہاں اس قوم سے پہلے پہنچیں گے تو وہ ایسی جگہ ہے جیسی آپؑ چاہتے ہیں۔ حضرتؑ نے جلدی کی۔ وہ لوگ بھی ادھر جھکے لیکن حضرتؑ جلد پہنچے اور اتر پڑے۔ اس وقت چونکہ سخت گرمی کا وقت تھا حضرتؑ نے پانی لانے اور پلانے کا حکم دیا۔

حضرتؑ حر کو طلب کرتے ہیں

اس کے بعد بقول اعثم کوفی حضرتؑ نے قاصد کو بھیجا کہ دریافت کرے ان کا سردار کون شخص ہے۔ لوگوں نے کہا: "حر بن یزید ریاحی"۔ امام نے اسے طلب کر کے پوچھا: "اے حر تو ہماری مدد کے واسطے آیا ہے یا ہم سے جنگ کرنے کے ارادہ سے"۔ حر نے کہا: "مجھے عبیداللہ نے آپؑ سے لڑنے کے واسطے بھیجا ہے"۔ حر کا یہ کلام سن کر آپؑ نے فرمایا: لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

نمازِ ظہر

ظہر کی نماز کے وقت امام حسینؑ نے حجاج بن مسروق سے کہا: اذان دے کر نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ کہ ہم نماز پڑھ لیں۔ حجاج نے اذان دی اور امام حسینؑ نے حر سے کہا: "تو اپنی جگہ پر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ نماز پڑھے گا یا ہمارے پیچھے کھڑے ہو کر ادا کرے گا"۔ حر نے کہا: "میں تمہارے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھوں گا"۔ امام حسینؑ نے دونوں فوجوں کو نماز پڑھائی، اور نماز سے فارغ ہو کر تلوار کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے اور خطبہ پڑھا۔ حمد و ثنائے الٰہی کے بعد محمد مصطفٰیؐ پر درود بھیجا اور کہا: "اے لوگو! میں تم سے عذر کرنے کے لیے کھڑا نہیں ہوا، اور نہ میں نے اس شہر کی طرف اس وقت تک قصد کیا اور یہاں تک آیا جب تک میرے پاس تم لوگوں کے خط نہ پہنچے۔ اور تم نے میرے بلانے کے لیے درخواستیں نہیں بھیجیں۔ اور تمہارے قاصد جن میں بہت سے نامور اور رکن اشخاص شامل تھے اہل کوفہ کی طرف سے خط لے کر میرے پاس نہ آئے۔ انھوں نے کہا تھا کہ بہت جلدی کوفہ میں پہنچنا چاہیے۔ کیونکہ یہاں کوئی امام موجود نہیں ہے، جو نمازیں پڑھائے اور دینی اور دنیوی امور کی اصلاح کرتا رہے۔ اگر تم آجاؤ گے تو شاید اللہ تعالیٰ ہمارے ابتر کاموں کو درست کر دے۔ اب اگر تم اپنے قول و قسم پر

ثابت قدم ہو تو میں آ بھی گیا ہوں اور تم پر اعتماد کرنا چاہیے تو میں تمہارے ساتھ شہر میں داخل ہوں۔ اگر تم اپنے عہد سے پھر گئے اور قول و قرار سے شرمندہ ہوئے ہو اور میرے آنے کو برا سمجھتے ہو تو میں مکہ کو واپس چلا جاؤں"۔ حضرتؑ کا یہ کلام سن کر سب کے سب خاموش اور سر جھکائے ہوئے تھے کچھ نہ بولے۔

خاموشی اور ابن زیاد کا دوسرا خط

اب حر نے اپنا خیمہ کھڑا کیا، اور اس کے اندر جا بیٹھا۔ امام حسینؑ بھی اس کے مقابل بیٹھے اور تمام آدمی بھی اپنے اپنے گھوڑوں کی باگیں پکڑے ہوئے بیٹھے تھے کہ اتنے میں حر کے پاس کوفہ سے اس مضمون کا خط آیا کہ حکم ہذا سے مطلع ہوتے ہی حسین بن علی اور اس کے اصحاب کو نظر بند کر لینا اور خود ان کے ساتھ سے علیحدہ نہ ہونا۔ یہاں تک کہ اسے میرے پاس حاضر کر اور میں نے اس قاصد کو حکم دیا ہے کہ تیرے ساتھ رہے جب تک کہ تو اس حکم کو پوری طرح انجام نہ دے لے۔ اور میری فرمانبرداری کا حق ادا نہ کرے۔

حر کا میلان

حر نے مضمون خط سے مطلع ہو کر اپنے لوگوں کو بلایا، اور کہا یہ مردود کم بخت ابن زیاد مجھے خط لکھتا ہے کہ حسینؑ بن علیؑ کو گرفتار کر کے حاضر کر۔ اور جہاں تک میں سوچتا ہوں میرا دل مجھے ایسے کام یا بات پر آمادہ نہیں ہونے دیتا جس سے امام حسینؑ رنجیدہ ہوں۔ میں اس امر سے سخت پریشان ہوں۔

ابو شعشا اور قاصد

حر کا ایک ہمراہی ابو شعشا عبید اللہ کے قاصد کی طرف مخاطب ہو کر بولا: "تیری ماں تیری جدائی میں روئے۔ تو کیسے کام کے لیے یہاں آیا ہے"۔ اس نے کہا: "میں نے اپنے امام کی فرماں برداری کی اور اپنی بیعت کو پورا کیا ہے۔ اپنے امیر کا حکم پہنچا دیا ہے"۔ ابو شعشا نے کہا: "مجھے اپنے سر اور جان کی قسم تو اپنے امام کی فرمانبرداری کے سبب خدا کی درگاہ میں گنہگار ہو گیا۔ تو نے اپنے آپ کو تباہ کر دیا۔ دنیا اور آخرت دونوں خراب کر لیں۔ اور دوزخ کی آگ اپنے واسطے سلگائی۔ تیرے امام کی یہ تعریف ہے جو اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے: وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ لَا یُنْصَرُوْنَ (۲۸ : ۴۱)

عصر کی نماز

ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ نماز عصر کا وقت آ گیا۔ امام حسینؑ نے مؤذن سے کہا: اذان دے۔ اور نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ آپ نے لشکر کو نماز پڑھائی اور نماز سے فارغ ہو کر حمد و ثنائے الٰہی کے بعد کہا: اے لوگو! ہم تمہارے پیغمبر محمد مصطفےٰؐ کے اہل بیت ہیں اور تمہارے شہر میں جو لوگ امام اور والی بنے ہوئے ہیں ہم خلافت اور امامت کے لیے ان سے بہتر ہیں۔ اگر تم ہمارا حق سمجھو گے اور خدا سے ڈرو گے تو اللہ تعالیٰ تم سے راضی ہوگا، اور اگر میرے آنے کو برا جانو گے اور اپنے خطوط کی تحریروں اور اپنے قاصدوں کی زبانی وعدوں کو پورا نہ کرو گے تو میں تمہیں کچھ نہیں کہتا، اور نہ تمہیں کسی بات کے لیے مجبور کروں گا۔ تم صاف صاف کہہ دو کہ میں مکہ کو واپس چلا جاؤں"۔

حر کی خطوط سے لاعلمی اور عرض

حر بن یزید نے جو لشکر کا سردار تھا، آگے بڑھ کر عرض کی: "اے فرزند رسولؐ! آپ نے دو مرتبہ خطوں اور قاصدوں کا ذکر کیا مگر مجھے خبر نہیں کہ کن لوگوں نے خط لکھا اور کون شخص قاصد بن کر حاضر ہوئے تھے۔ امام حسینؑ نے اپنے غلام عقبہ بن سمعان کو بلا کر کہا: خطوں کی خرجیاں اٹھا لا۔ عقبہ جا کر خرجیاں اٹھا لایا۔ خط نکال کر زمین پر رکھ دیے اور پیچھے ہٹ بیٹھا۔ فوج کے نامور اشخاص آگے بڑھے۔ لفافوں کو پڑھا۔ حر بن یزید ریاحی نے بھی انھیں دیکھا اور کہا ہم ان شخصوں میں نہیں ہیں

جنھوں نے یہ خط تحریر کیے ہیں۔ اور عبید اللہ بن زیاد نے ہمیں حکم دیا ہے کہ آپؑ کو اس کے پاس لے جائیں۔

حسینؑ کا تبسم اور قصدِ روانگی

امیر المومنین حسینؑ نے مسکرا کر کہا: "تم یہ کام نہیں کر سکتے"۔ پھر حکم دیا کہ: "عورتوں کو کجاوں میں سوار کرادو۔ اور سوار ہو کر چلو۔ دیکھیں یہ لوگ ہمارا کیا کر سکتے ہیں"۔ لوگوں نے آپؑ کے حکم کے موافق اہل و عیال اور بچوں کو سوار کر دیا، اور چل نکلے۔ کوفی لشکر نے راستہ روکا اور جانے سے مانع آئے۔

حسینؑ تلوار پر ہاتھ ڈالتے ہیں

اہل بیت کا راستہ روکتے ہی امام حسینؑ نے قبضہ شمشیر پر ہاتھ ڈالا، اور کہا: "اے پسر یزید! کس لیے تو ان لوگوں کو نہیں جانے دیتا۔ تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے"۔ حر نے جواب دیا: "یا ابن رسول اللہ! اگر کوئی اور شخص میری ماں کا نام لیتا تو میں تلوار کی دھار سے جواب دیتا۔ مگر آپؑ اور آپؑ کے ماں باپ کی حرمت بہت بڑی ہے۔ کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن تمھیں عبید اللہ کے پاس ضرور لے چلوں گا"۔ حسینؑ نے کہا: "میں ہرگز نہ جاؤں گا، اور تیرے ارادہ کی مجھے ذرا پرواہ نہیں۔ تو کیا کر سکتا ہے"۔ حر نے کہا: "اگر میری اور میرے لشکر کی جانیں بھی اس معاملہ میں جاتی رہیں تو بھی مجھے گوارا ہے۔ میں عبید اللہ

حسینؑ حر کو تنہا جنگ کے لیے بلاتے ہیں

کے پاس ضرور لے چلوں گا"۔ امام حسینؑ نے کہا: "اچھا اپنے لشکر سے نکل کر سامنے آ اور میں بھی اپنے ہمراہیوں سے علیحدہ ہو کر تیرے سامنے آتا ہوں کہ دونوں آپس میں جنگ کریں۔ اگر تو نے مجھے مار ڈالا تو تیرے امیر کی اور تیری مراد بر آئے گی اور تو مارا گیا تو خلقت تیرے پنجہ سے آزاد ہو جائے گی"۔

حر کا حکم اور ذاتی عقیدہ

حر نے کہا: "یا ابا عبد اللہ! مجھے آپؑ سے جنگ و جدل کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ یہ کہہ دیا ہے کہ آپؑ کے ساتھ سے علیحدہ نہ ہوں۔ یہاں تک کہ آپؑ کو عبید اللہ کے پاس پہنچا دوں۔ خدا کی قسم مجھے سخت ناگوار ہے کہ کوئی ایسی بات کہوں یا کوئی ایسی حرکت کروں جو آپؑ کو ناخوش معلوم ہو۔ مگر کیا کروں دوسرے کا مقرر کیا ہوا ہوں۔ اور محکوم مجبور ہوتا ہے۔ میں نے اس گروہ سے بیعت کر رکھی ہے اور ان کے حکم سے آپؑ کے پاس پہنچا ہوں اور خوب جانتا ہوں کہ قیامت کے دن تمام خلقت کو آپؑ ہی کے نانا کی شفاعت کی ضرورت پڑے گی۔ میں حیران و پریشان و خوف زدہ ہوں کہ آپؑ سے لڑنے کی نوبت نہ آئے پھر شفاعت کی امید کیا خاک ہو سکتی ہے۔ خدانخواستہ مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوگئی جس سے حضرتؑ کے جسم مبارک کو کچھ تکلیف پہنچی تو دنیا اور آخرت دونوں جگہ میرے واسطے خرابی موجود ہے۔ اور اگر آپؑ کو عبید اللہ بن زیاد کے پاس نہ لے جاؤں تو میں کوفہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ہاں دنیا دیتا ہے۔ خدا کی پناہ قیامت کے دن آپؑ کے نانا کی شفاعت سے محروم رہ جانے کی نسبت یہی بہتر ہے کہ اور کسی طرف نکل جاؤں۔ آپؑ شارع عام سے نہیں بلکہ کسی اور غیر مشہور راستہ سے کسی سمت کو چلے جائیں، اور میں عبید اللہ کو لکھ دوں گا کہ حسینؑ کسی اور طرف چلا گیا۔ مجھے نہیں ملا۔ پھر تو مجھے آپؑ کے نانا کی شفاعت کی کچھ امید باقی رہے گی اور اے حسینؑ میں قسم دلاتا ہوں کہ اپنی جان پر رحم کرو کوفہ نہ جاؤ"۔

حضرتؑ کا استفسار اور اشعار

آپؑ نے کہا: "اے حر کیا تو یہ بات اس لیے کہتا ہے کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے؟"۔ حر نے کہا: "ہاں اے فرزند رسولؐ، اس میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں ہے۔ آپؑ سلامتی سے مکہ کو واپس چلے جائیں"۔ ابن خلدون کے موافق حر کا کلام سن کر حضرتؑ نے فرمایا: "کیا تو مجھ کو موت سے ڈراتا ہے؟" اور اس کے بعد یہ اشعار ورد زبان فرمائے: ـــــ

سا مضی و ما فی الموت عار علی الفتی — اذا ما نوی خیرا و جاھد مسلما

(میں تو اپنا قصد پورا ہی کروں گا اور مرنے میں جوانمرد کو عار نہیں ہے۔ جب اس نے نیکی کی نیت کرلی اور مسلمان ہو کر مجاہدہ کیا)

و واسی رجالا صالحین بنفسه — و خالف مثبورا و فارق مجرما

(اور اچھے لوگوں سے بذاتہ محبت پیدا کی۔ گردن زدنیوں کی مخالفت کی اور باغیوں کا ساتھ چھوڑ دیا)

فان عشت لم اندم و ان مت لم الم — کفی بك ذلا ان تعیش و ترغما

(پس اگر میں زندہ رہا تو مجھے کچھ ندامت نہ ہوگی اور اگر مرگیا تو میں اپنی ملامت نہ کروں گا۔ تجھے ذلت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ تو زندہ رہے اور تیری ناک رگڑی جاتی رہے)

کامل ابن اثیر کے موافق حر کے کلام پر حضرتؑ نے فرمایا کہ: "میں تجھ سے وہی کہتا ہوں جو بھائی اوسی نے کہا تھا اپنے ابن عم سے جب وہ نصرت رسولؐ کا ارادہ کر رہا تھا کہ کہاں جاتا ہے قتل کیا جائے گا تو اس نے جواب دیا کہ: میں جاؤں گا اور موت سے کوئی عار نہیں جب کہ نیت خیر اور جہاد ہو"۔ حر نے جب یہ سنا تو ہٹ گیا۔

غالباً اسی موقع پر جب کہ حر ضد کر رہا تھا زہیر بن قین نے حضرتؑ سے عرض کیا کہ اس وقت اجازت جنگ دیجیے کیونکہ اس وقت لڑنا آسان ہے بہ نسبت ان فوجوں کے جو آرہی ہیں۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ: "تم سچ کہتے ہو

وقتی تصفیہ

لیکن ہم ابتداءً جنگ نہ کریں گے"۔ اس کے بعد یہ تصفیہ ہوا کہ حضرتؑ ایسے راستہ سے تشریف لے چلیں جو نہ موصل بہ حجاز ہو اور نہ موصل بہ کوفہ۔ (ابن خلدون)

عذیب الہجاناتؒ

رفتہ رفتہ عذیب میں پہنچے جہاں پر نعمان کی اونٹنیاں چرا کرتی تھیں۔ کوفہ کے چار آدمی آتے ہوئے دکھائی دیے۔ جو تیز اونٹنیوں پر سوار نافع بن ہلال کے گھوڑے کے پیچھے تیزی کے ساتھ آرہے تھے۔

طرماح بن عدی اور سوال رفاقت

اور ان کے ہمراہ ان کا رہبر طرماح بن عدی بھی تھا۔ حسینؑ بن علیؑ کے قریب نہ پہنچنے پائے تھے کہ حر نے بڑھ کر کہا: میں ان کو گرفتار کروں گا۔ یا کوفہ کی طرف لوٹا دوں گا۔ آپؑ بولے ایسا نہ ہونے پائے گا۔ یہ میرے معین و مددگار ہیں اور میرے قائم مقام ہیں۔ اگر تم نے ان سے کچھ بھی تعرض کیا تو ہمارے اور تمہارے کوئی دقیقہ نہ اٹھا رہے گا۔ حر خاموش ہو رہے۔ حسینؑ بن علیؑ نے ان لوگوں سے دریافت کیا تم ان لوگوں کا کچھ حال بتلاؤ جن (یعنی اہل کوفہ) کو تم چھوڑ آئے ہو۔ ان میں سے مجمع بن عبداللہ العامری نے عرض کیا: "شرفاء کوفہ کی رشوت خواری بڑھ گئی۔ دنیا کی طمع میں پڑے ہوئے

ہیں۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ وہ ایک زبان ہو رہے ہیں۔ باقی رہے عوام الناس ان کے قلوب تمہاری طرف مائل ہیں لیکن ان کی تلواریں کل تم پر کھنچی جائیں گی ــــــ"۔ اس کے بعد طرماح بن عدی نے کہا:

طرماح کوہ آجا چلنے کی صلاح دیتے ہیں

"آپؑ کے ہمراہ بہت کم آدمی ہیں اور یہ ٹڈی دل ہیں۔ صبح نہ ہونے پائے گی کہ کل کوفہ دریا کی طرح امنڈ آئے گا۔ اگر آپؑ یہ چاہتے ہوں کہ کسی محفوظ شہر میں قیام کریں تو آپؑ ہمارے ساتھ چلیے ہم آپؑ کو کوہ آجا میں ٹھہرائیں گے جو ہم کو ملوک غسان ونعمان بن منذر اور کل سرخ و سفید کے حملوں سے بچاتا ہے۔ واللہ وہاں پر کسی قسم کی رسوائی و مضرت نہ آنے پائے گی۔ پھر وہاں سے ان لوگوں کی طرف دعاۃ روانہ کرنا جو آجا وسلمی میں طے والے مقیم ہیں۔ خدا کی قسم دس روز بھی نہ گزرنے پائیں گے کہ بے حد طے کے سوار وپیادہ آکر مجتمع ہو جائیں گے۔ اس وقت اگر کوئی شخص آپؑ کے مقابلہ پر آئے گا تو صرف طے کی بیس ہزار تلواریں نیام سے نکل پڑیں گی جو آپؑ کے روبرو دشمنوں سے لڑیں گی"۔

صلاح کا جواب

آپؑ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ تم کو بہتر جزا دے۔ ہم میں اور ان لوگوں میں کچھ ایسے امور حائل ہو گئے ہیں کہ جس سے ہم لوٹ چلنے پر قادر نہیں ہیں اور ہم یہ نہیں جانتے کہ آئندہ ہم میں اور ان میں کیا واقعہ پیش آئے گا"۔

قصر بنی مقاتل

غرض طرماح آپؑ سے رخصت ہو کر اپنے اہل کی طرف روانہ ہوا اور امام حسینؑ پھرتے پھراتے قصر بنی مقاتل میں پہنچے۔ شام ہو گئی تھی، قیام کر دیا۔ نماز صبح پڑھ کر جھٹ پٹ سوار ہو کر چلنے کا قصد کیا۔ حر نے پیچ کر روکنا شروع کیا۔

نینویٰ

اسی رد و کد میں نینویٰ تک پہنچے جہاں پر آپؑ اتر پڑے اور ایک سانڈنی سوار نے آکر ابن زیاد کا خط حر کو دیا جس میں لکھا ہوا تھا: "میرے اس خط و قاصد کے پہنچتے ہی حسینؑ کو روک کر ایک کھلے ہوئے میدان میں ٹھہرانا، جہاں نہ پانی ہو اور نہ کوئی محفوظ مقام ہو۔ میں نے اس قاصد کو حکم دیدیا ہے کہ تاتعمیل وہ تم سے جدا نہ ہو گا"۔ حر نے خط پڑھ کر حسینؑ بن علیؑ سے مخاطب ہو کر کہا: "یہ خط امیر کا آیا ہے۔ مجھے ہدایت ہوئی ہے کہ میں آپؑ کو کھلے میدان میں ٹھہراؤں اور تاتعمیل حکم یہ قاصد مجھ سے علیحدہ نہ ہو گا۔ لہذا آپؑ نینویٰ سے اٹھ کر ایسے میدان میں فروکش ہوں جہاں نہ سایہ ہے نہ پانی ہے"۔ آپؑ نے ارشاد کیا: "تم ہم کو اب زیادہ تکلیف نہ دو۔ نینویٰ ہی میں رہنے دو، یا اجازت دو تو غاضریہ یا شفیقہ میں جا کر ہم قیام کریں"۔ حر بولے: "میں ایسا نہیں کر سکتا۔ ابن زیاد نے مجھ پر ایک شخص کو اس امر کی مخبری کو مقرر کیا ہے"۔

زہیر بن قین کی صلاح

زہیر بن قین نے عرض کیا: "واللہ اس کے بعد جو آئے گا وہ اس سے زیادہ سخت ہو گا۔ اے ابن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس وقت اس سے لڑ جانا آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ جو آئندہ آنے والا ہے"۔

جنگ میں سبقت نہیں چاہتے

آپؑ بولے: "ہم جنگ کرنے میں سبقت نہیں کر سکتے"۔
زہیر نے رائے دی: "آپؑ اس قریہ میں ہمارے ساتھ

تشریف لے چلیے۔ وہ ایک محفوظ مقام لب دریائے فرات واقع ہے۔ اگر وہ روکے گا تو ہم اس سے لڑ پڑیں گے"۔ آپؑ نے مقام کا نام دریافت فرمایا۔ عرض کیا: "کربلا نام ہے"۔ فرمایا: "یہ زمین کرب وبلا کی ہے"۔ بعض مؤرخین کے موافق حضرتؑ نے اپنے پدر بزرگوار کا خواب بیان فرمایا۔ اور صاحب کنزالاعمال (از شہادت حسینؑ) کے موافق فرمایا: "صدق رسول اللہ ﷺ ارض کرب وبلا"۔

باب دہم

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ○ وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ○ وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ○ الَّذِیْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ○ اُولٰٓىِٕكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۫ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ○ (۲ : ۱۵۳-۱۵۷)

مشہد اعظم

۲ر محرم ۶۱ھ پنج شنبہ

ابن خلدون کے موافق: "یہ دن پنج شنبہ کا تھا اور محرم ۶۱ھ کی دوسری تاریخ تھی"۔ اعثم کوفی کے موافق: اب دریائے فرات کے کنارہ اسباب اتارا گیا، خیمے کھڑے کیے گئے۔

مقام

بھائی اور چچا زاد بھائی ہر ایک اپنے اپنے واسطے خیمہ لگانے لگا۔ حضرت کے خیمہ کے گرد احباب اور اعزا کے خیمے کھڑے ہو گئے۔ سب تو اپنے خیمہ میں آرام سے لیٹ رہے۔ اور

حضرتؑ کا شغل اور اشعار

امام حسینؑ اپنی تلوار کی صفائی میں مصروف ہوئے۔ غلام ابوذر غفاریؓ آپؑ کے پاس حاضر تھا اور حضرتؑ بحالت تفکر یہ اشعار پڑھ رہے تھے: ؎

یا دھر اف لك من خليل	كم لك بالاشراق و الاصيل
من طالب و صاحب قتيل	ما اقرب الوعد من الرحيل
و كل حی سالك السبيل	و انما الامر الى الجليل

(اے زمانہ تجھ ایسے دوست پر اف ہے۔ کتنے لوگ اپنے حق کے طلب کرنے والے صبح و شام تجھ میں قتل ہوتے ہیں۔ کیا کوچ کا وعدہ قریب پہنچ گیا ہے۔ کل زندہ راہ پر چل رہے ہیں اور یقیناً سب امر خدا کی طرف ہیں)

حضرت زینبؑ سنتی ہیں

آپؑ کی بہنوں زینبؑ اور ام کلثومؑ نے آواز سن کر کہا: "اے بھائی! یہ کس کی آواز ہے جو اپنے قتل کا یقین کیے ہوئے ہے"۔ حضرتؑ نے فرمایا: "اے بہن! "لو ترك القطا لنام"۔ تاریخ کامل کے موافق: یہ اشعار سن کر حضرت زینبؑ نے فرمایا: "کاش موت آج میری حیات کو معدوم کر دیتی۔ اے خلیفہ گزرے ہوؤں کے اور نشان پچھلوں کے"۔ حضرتؑ نے فرمایا: "اے بہن تمہارے حلم اور بردباری کو شیطان لے نہ جائے"۔ حضرت زینبؑ نے فرمایا: "میرے ماں باپ فدا ہوں کیا آپؑ نے اپنے نفس کے فدیہ کرنے کا قصد کر لیا ہے"۔ حضرتؑ کی آنکھ ڈبڈبا آئی۔ حضرت زینبؑ بے ہوش ہو کر گر پڑیں۔ حسینؑ کھڑے ہو گئے اور پانی چھڑکا۔

نزول کے وقت کے الفاظ

صاحب نور العین اس وقت کے متعلق لکھتا ہے کہ: جب حضرتؑ نے نزول فرمایا، کہتے جاتے تھے کہ: "یہی ہمارے قافلہ کی فرودگاہ ہے۔ اسی جگہ ہمارے خون بہائے جائیں گے۔ اسی جگہ ہمارے حرم قید کیے جائیں گے۔ اسی جگہ ہمارے آدمی قتل ہوں گے۔ اسی جگہ ہم معزز لوگ ذلیل ہوں گے۔ واللہ اسی جگہ میری رگیں کٹیں گی اور میری داڑھی خون میں رنگی جائے گی۔ آسمان کے فرشتے میرے نانا اور والد اور ماں سے ماتم پرسی کریں گے۔ واللہ اسی جگہ کا وعدہ میرے نانا سے اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اور اس کا وعدہ خلاف نہیں ہوتا"۔

حضرت علیؑ بن الحسینؑ

لکھا ہے علیؑ بن الحسینؑ کہتے تھے کہ میرے والد نے جب یہ باتیں کہیں تو میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ میں تو خاموش رہا مگر میری پھوپھی نے جب یہ باتیں سنیں تو نہایت اندوہگین اور خائف ہوئیں۔ اور دامن سمیٹ کر ان کے پاس گئیں اور کہا: "اے میری آنکھوں کے تارے، اے خلیفۃ الماضین و حمایۃ الباقین، یہ باتیں تم نے ایسی کہی ہیں جیسے موت کا وقت قریب آ گیا ہے"۔

حضرتؑ سمجھاتے ہیںؑ اور وصیت فرماتے ہیںؑ

اس کے بعد جب مخدرات عصمت پر عالم حزن طاری ہوا تو اعثم کوفی کے موافق:

حضرتؑ نے فرمایا: "اے خواہر صبر کرو اور مرضی الٰہی پر راضی رہو۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ نے زمین سے لے کر آسمان تک کسی شے کو ہمیشگی کی زندگی عطا نہیں کی نہ کسی کو عطا کرے گا سب فنا ہو جائیں گے۔ صرف ایک ذات پاک خدا کے سوا تمام مخلوقات ہلاک ہونے والی ہے۔ سب کو اس نے اپنی قدرت کاملہ سے پیدا کیا ہے اور سب کو اپنی مرضی اور ارادہ کے موافق نیست و نابود کر دے گا۔ میرے نانا، ماں، باپ، اور بھائی مجھ سے بہتر اور زیادہ عزیز تھے۔ اسی طرح وہ بھی جام فنا پی کر مٹی میں مل گئے۔ تمام دنیا والوں کو حضرت محمد مصطفیٰؐ ہی کی وفات کا خیال اپنی موت پر صبر دلاتا ہے"۔ پھر ارشاد کیا: "اے بہنو، اے ام کلثومؑ، اے زینبؑ اور اے فاطمہؑ! جب مجھے مار ڈالیں تو ہرگز کپڑے نہ پھاڑنا، منہ نہ نوچنا اور ایسے کلمے زبان سے نہ نکالنا جن سے خدا راضی نہیں ہے"۔

حر ابن زیاد کو اطلاعی خط بھیجتا ہے

اس مؤرخ کے موافق: حر نے حضرتؑ کے خیموں کے برابر اپنا خیمہ لگایا، اور عبیداللہ بن زیاد کو خط لکھ کر حسینؑ کے وارد کربلا ہونے اور قیام کرنے سے مطلع کیا۔

حضرتؑ کے پاس ابن زیاد کا خط

عبیداللہ بن زیاد نے امام حسینؑ کو خط لکھا کہ: "اے حسین! میں نے سنا ہے تم نے کربلا کے منقبل قیام کیا ہے۔ اور آج ہی یزید کا خط میرے پاس پہنچا ہے اور حکم دیا ہے کہ جب تک آپؑ کو واصل حق نہ کر دوں نہ بستر پر سوؤں نہ کھانے کا مزا چکھوں۔ یا آپؑ اس کی فرمانبرداری اختیار کر کے بیعت کریں۔ والسلام

جوابؑ

جب یہ خط آپؑ کے پاس پہنچا، پڑھ کر ہاتھ سے ڈال دیا، اور کہا: "وہ قوم ہرگز فلاح نہ پائے گی جو مخلوق کی رضامندی کے لیے خالق کی ناراضی اختیار کرتی ہے"۔ عبیداللہ کے قاصد نے خط کا جواب مانگا۔ آپؑ نے

فرمایا: "اس کا کچھ جواب نہیں۔ وقد حقت علیہ کلمۃ العذاب"۔

ابن زیاد کا لوگوں سے مخاطبہ

قاصد جواب لیے بغیر واپس گیا اور جو کچھ دیکھا اور سنا تھا ابن زیاد سے بیان کر دیا۔ وہ زیادہ غضب ناک ہو کر اپنے ملازموں اور دوستوں سے بولا کہ: "حسینؑ کو جس طرح ہو سکے قتل ہی کر دینا چاہیے۔ تم میں سے کون اس خدمت کو اپنے ذمہ لیتا ہے۔ اور حسینؑ کو قتل کرتا ہے۔ میں اس کے صلہ میں جو جاگیر اور علاقہ مانگو گے دوں گا۔ کسی شخص نے اس بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ اسی دن عمرو بن سعد (مؤلف۔ میری تاریخ میں ان مواقع کا ذکر کیا گیا ہے جہاں جہاں یہ دکھائی دیا ہے) کے نام ایک فرمان جاری کیا۔ اور شہر رے اور اس کا نواح عطا کر کے حکم دیا کہ وہاں جا۔ اور خرابیوں کو دور کر۔ عمرو بن سعد نے فرمان لے کر اس طرف جانا چاہا۔ ابن زیاد نے کہا: "اے عمر تو نے دیکھا کہ کسی نے حسینؑ سے جنگ کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ بہتر ہے کہ تو اس مہم کو انجام دے۔ اور حسینؑ سے لڑنے کے واسطے جا۔ اور اس طرف سے مجھے مطمئن اور فارغ کر کے پھر شہر رے کی حکومت پر جانا"۔ اس نے کانپ کر کہا: "اے امیر! اگر تو مجھے حسینؑ بن علیؑ کے مقابلہ پر جانے سے معاف رکھے تو بہت ہی بڑا احسان مانوں گا"۔ ابن زیاد بولا: "اچھا میں نے معاف کیا۔ مگر یہ فرمان واپس دے کر اپنے گھر میں جو بیٹھ۔ کیونکہ یہ علاقہ اسی شخص کا حق ہے جو حسینؑ بن علیؑ کا کام تمام کرے گا"۔ عمر نے کہا: "تو مجھے ایک دن کی مہلت دے کہ اس امر کو اچھی طرح سوچ سمجھ لوں"۔

ابن زیاد نے اجازت دی اور عمر نے اپنے گھر آ کر دوستوں عزیزوں اور بھائی بندوں سے مشورہ کیا۔ کسی نے اچھا نہ جانا کہ وہ حسینؑ کے قتل کے واسطے جائے۔ سب نے اسے ڈرایا۔ حمزہ بن مغیرہ جو اس کی بہن کا بھائی تھا۔ اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا: "ہرگز تو حسینؑ سے لڑنے اور اسے قتل کرنے کا فعل اپنے ذمہ نہ لینا۔ ورنہ تو گناہ عظیم کا مرتکب ہو گا۔ خدا کی قسم اگر دنیا میں تیرے پاس کچھ بھی باقی نہ رہے تو اس سے بہتر ہے کہ تو آخرت میں حسینؑ کا خون اپنی گردن پر لے جائے"۔ عمر سن کر خاموش تھا۔ اور اس کا دل حکومت رے سے باز نہ آتا تھا۔ دوسرے دن بوقت صبح ابن زیاد کے پاس آیا۔ اس نے پوچھا: "تیری کیا رائے قرار پائی؟"۔ کہا: "اے امیر! تو نے پہلے انعام عطا کیا۔ بعدہ حسینؑ بن علیؑ کا تذکرہ کیا۔ لوگ مجھے مبارک باد دے چکے۔ اگر تو آج مجھ سے فرمان واپس لے لے گا تو مجھے ندامت حاصل ہو گی۔ تو مہربانی فرما کر مجھے قتل حسینؑ کے واسطے نہ بھیج۔ اور رے کی حکومت میرے پاس رہنے دے۔ کوفہ میں اور بہت سے نامور سردار، اسماء بن خارجہ و محمد بن اشعث اور کثیر بن شہاب وغیرہ موجود ہیں۔ ان میں سے ہر شخص اس خدمت کو منظور کر کے امیر کے دل کو اس طرف سے مطمئن اور فارغ کر دے گا۔ براہ مہربانی مجھے امام حسینؑ کے قتل سے معاف رکھ"۔

دھمکی اور منظوری

ابن زیاد نے کہا: "تو میرے سامنے سرداران کوفہ کا نام لیتا ہے، وہ سب میری نظر میں ہیں۔ اگر تو اس فکر سے مجھے مطمئن کر دے گا تو میرے نزدیک تو بہت عزیز ہو گا، ورنہ رے کا فرمان واپس کر کے اپنے گھر جا بیٹھ۔ پھر میں تجھے کسی کام کی تکلیف نہ دوں گا"۔ عمر سن کر چپ ہو رہا۔ اور ابن زیاد نے زیادہ ناراض ہو کر کہا: "اگر تو نہ جائے گا اور حسینؑ سے جنگ کر کے میرا حکم بجا نہ لائے گا تو میں تجھے ابھی قتل کرا دوں گا۔ اور گھر لٹوا دوں گا۔ بعد میں کچھ ہی کیوں نہ ہو"۔ عمر نے کہا: "جب معاملہ کی یہ صورت آ پڑی اور ضرورت

ابن سعد کے چار ہزار سوار

لاحق ہو گئی میں امیر کا حکم بجالاؤں گا"۔ پس زیاد نے اس کی تعریف کی اور انعام و اکرام میں اور بھی ترقی کر کے چار ہزار سوار ہمراہ کر دیے اور رے کی حکومت برقرار رکھی۔

ابن خلدون کے موافق: سعد ابن ابی وقاص کا بیٹا رات بھر پڑا ہوا سوچتا رہا۔ صبح کو ذیل کے اشعار پڑھتا ہوا ابن زیاد کے پاس گیا:

ا اترك ملك الری و الری رغبة — ام ارجع مذموماً بقتل حسینؑ

و قتله النار القی لیس دونها — حجاب و ملك ری قرة عین

(کیا میں ملک رے کو چھوڑ دوں اور ملک رے ہی کی مجھے خواہش ہے۔ یا حسینؑ کو قتل کر کے میں مذموم واپس آؤں۔ لیکن ان کے قتل کرنے میں تو میں دوزخ میں جاؤں گا۔ جس کا کوئی مانع نہیں ہے اور ملک رے کی حکومت میں میرے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے)

اُمیدِ مغفرت کا وقت

ابو اسحٰق اسفرائنی نے یہ چند اشعار اس کے بعد زیادہ لکھے ہیں:

الا انما الدنیا لخیر معجل — و ما عاقل باع الوجود بدین

و لکن رب العرش یغفر ذلتی — و لو کنت فیها اظلم الثقلین

(یاد رکھو دنیا بہت اچھی ہے جو جلد حاصل ہوتی ہے اور عقل مند نقد کو ادھار کے عوض نہیں دیتا۔ ہاں اللہ میرے گناہ کو بخش دے گا۔ گو میں اس کام سے جن و انس میں سب سے بڑھ کر ظالم بن جاؤں)

ابن خلدون اور کامل ابن اثیر دونوں کے موافق: ابن سعد نے اس وقت قتل حسینؑ کے لیے جانے کا تصفیہ کر دیا جب ابن زیاد نے کہا کہ: "میں مشورہ نہیں چاہتا، نہ میں تیرا مطیع ہوں، اور نہ تجھ کو اس امر پر مجبور کرتا ہوں۔ اگر تو نہیں جانا چاہتا تو سند گورنری واپس کر دے"۔

روضتہ الشہدا کے موافق: خلعت، گھوڑا مع سامان زری، اور "پچاس خروار زر" بھی دیا۔

مہاجرین و انصار کی اولاد

ابو مخنف کے نزدیک جب عمرو بن سعد گھر آیا تو اولاد مہاجرین اور انصار اس کے پاس آئے، اور کہا: اے ابن سعد! تو حسینؑ سے جنگ کرنے جاتا ہے، حالانکہ تیرا باپ سادس الاسلام اور صاحب بیعت رضوان تھا!۔

اب بقول ابن خلدون: "عمرو بن سعد نے حکومت رے کی طمع میں پڑ کر امام حسینؑ کے مقابلہ پر جانا منظور کر لیا۔ چنانچہ انھیں چار ہزار فوج کو لیے ہوئے آپؑ کے مقابلہ پر جا پہنچا"۔ اعثم کوفی کہتا ہے کہ ابن زیاد نے "اُسے سخت تاکید کی کہ ہرگز ہرگز حسینؑ بن علیؑ اور ان کے اصحاب دریائے فرات کے پاس تک نہ آنے پائیں۔ اور ایک گھونٹ پانی نہ پی سکیں"۔ عمر نے کہا: "میں ایسا ہی کروں گا"۔

حر کے ایک ہزار سوار

جس وقت عمرو بن سعد چار ہزار سوار لے کر کربلا میں پہنچا، حر ایک ہزار سوار لے کر اس کے ساتھ جا ملا۔ عمر نے اپنے ایک ہمراہی عمر بن قیس احمسی

کو بلا کر کہا کہ: حسینؑ کے پاس جا کر دریافت کر کہ تم مکہ سے جو امن و امان اور حرمت کا مقام ہے کیوں نکلے اور میدان کربلا میں آئے۔ (ابو مخنف)

کثیر بن شہاب

اس نے کہا: اے امیر انھیں دنوں میں میرے اور ان کے خط و کتابت ہوتی رہی ہے اور میں نے ہر قسم سے ان کی دوستی اور محبت کے دعوے کیے تھے۔ وہ پورے نہ ہو سکے۔ اس لیے مجھے آپؑ کے سامنے ہونے سے شرم آتی ہے۔ عمر نے کہا میں نے تجھے اس خدمت سے معاف کیا۔ پھر ایک شخص عبداللہ سبعی کو بلایا۔ یہ شخص بڑا بہادر تھا۔ حاضر ہوا تو کہا امام حسینؑ کے پاس جا کر پوچھ تم کس لیے مکہ جیسے مقام امن سے نکل کر اس دشت کربلا میں آئے اور یہاں قیام کرنے سے تمہارا کیا مطلب و مدعا ہے۔ سبعی ملعون جو خاندان رسالت کا سخت ترین دشمن تھا۔ بولا اسی طرح حکم بجا لاؤں گا۔

اصحاب نے قاصد کو حضرتؑ تک مسلح نہ جانے دیا

پھر آنحضرتؑ کے خیمہ کی طرف چلا۔ قریب پہنچا تو ابو ثمامہ صائدی نے دیکھ کر حضرتؑ سے عرض کیا:

یا ابا عبداللہ! میری جان آپؑ پر فدا ہو، خاندان مصطفیٰؐ کا سب سے بڑا دشمن جو روئے زمین پر موجود ہے اور خلائق میں بدترین شخص ہے اس طرف آرہا ہے۔ آپؑ یہ سن کر کھڑے ہو گئے اور اس کی طرف نظر کی۔

ابو ثمامہ نے کہا تلوار ہاتھ سے رکھ کر آگے بڑھ۔ اور جو بات کہنی ہو عرض کر۔ سبعی نے کہا میں ایلچی ہوں ایک پیغام لایا ہوں۔ اگر سنو تو بیان کروں مگر تلوار ہاتھ سے علیحدہ نہ کروں گا۔ ابو ثمامہ نے کہا تلوار مجھے دے میں حفاظت سے رکھوں گا اور جب پیغام پہنچا کر تو واپس جانے گا تو تیرے حوالہ کر دوں گا۔ اس نے کہا میری تلوار تک کسی کا ہاتھ نہیں جا سکتا۔ اور نہ میں کسی کو دوں گا۔ ابو ثمامہ نے کہا اسی جگہ ٹھہر کر جو پیغام دینا ہے امام حسینؑ کو سنا دے۔ سبعی نے کہا ایسا نہیں ہو سکتا۔ اور ناراض ہو کر واپس چلا گیا۔ عمرو بن سعد سے کہا مجھے امام حسینؑ کے پاس جانے نہیں دیا کہ پیغام پہنچاتا۔

ابو مخنف کے نزدیک عمرو بن سعد نے کثیر بن شہاب کو بھیجا تھا۔ اور اسے دیکھ کر زہیر بن قین نے کہا: "ہتھیار رکھ دے اور داخل ہو۔ اس نے کہا: "میں ایسا نہ کروں گا"۔ تو زہیر نے کہا: "واپس جا۔ جس طرح آیا ہے"۔ کثیر واپس ہوا اور ابن سعد کو خبر دی۔

اب عمرو بن سعد نے قرہ بن قیس حنظلی کو بھیجا۔ جب قرہ آیا امیر المومنین نے اسے دیکھ کر اصحاب سے پوچھا تم اسے پہچانتے ہو۔ یہ کون شخص ہے۔ حبیب بن مظاہر اسدی نے کہا میں جانتا ہوں وہ بنی تمیم میں سے ہے اور اچھے اعتقاد والا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی اس لشکر کے ساتھ آیا ہو گا۔ الغرض قرہ نے آنحضرتؑ کے سامنے حاضر ہو کر سلام کیا اور پیغام پہنچایا۔ اس کے بعد جواب میں حضرتؑ نے وہ واقعات بیان فرمائے جیسا اس کے پہلے فرما چکے تھے۔ مخصوص بات یہ فرمائی کہ آج زمانہ کا رنگ دگرگوں دیکھ کر وہ (اہل کوفہ) اپنے قول و قرار سے پھر گئے اور اپنے وعدوں سے شرمندہ ہو کر منحرف ہو بیٹھے اب میرا ارادہ ہے کہ مراجعت کر کے مکہ کو چلا جاؤں۔ (ابن خلدون)

قاصد نے عمرو بن سعد سے حضرتؑ کا قول نقل کیا۔ اور کوئی عجب نہیں ہے کہ عمر بن سعد اس خیال سے اپنی گرانی میں کمی دیکھتا ہو کہ نواسہ رسول سے جنگ کی نوبت نہ آئے گی۔ اب ابن سعد نے یہ تمام واقعات ابن زیاد کو لکھے۔

عمرو بن سعد کا صلح کا خط اور ابن زیاد کا خیال

ابو مخنف کے نزدیک عمرو بن سعد نے دوسرا قاصد بنی خزیمہ میں سے بھیجا تھا۔ جب یہ حضرتؑ کے پاس پہنچا تو دست و پائے مبارک کو بوسہ دیا، اور عرض کی کہ یا مولا آپؑ اس طرف کس طرح تشریف لائے ہیں۔ فرمایا تم نے بلایا تھا کہ خدا ان پر لعنت کرے جنھوں نے آپؑ کو لکھا تھا۔ آج وہ خواص ابن زیاد ہیں۔ فرمایا جا اور ابن سعد کو اس کی خبر کر۔ کہا یا مولا وہ کون ہے جو بہشت پر دوزخ کو اختیار کرے۔ واللہ میں اب علیحدہ نہ ہوں گا جب تک آپؑ کے سامنے مارا نہ جاؤں۔ فرمایا خدا تجھے اپنے قریب کرے جس طرح اس نے ہمیں تجھ سے قریب کیا۔

ابن زیاد ابن سعد کا خط پڑھ کر کچھ دیر تک سوچتا رہا، اور بولا اب ہمارے پنجہ میں پڑ کر واپس جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ چاہتا ہو گا کہ اس حیلہ سے ہمارے ہاتھ سے بچ کر نکل جائے۔ جواب لکھا: "اس کی باتوں پر ذرا توجہ نہ کر اس خط کے دیکھتے ہی حسینؑ سے یزید کی بیعت کے لیے کہہ۔ اگر وہ منظور اور قبول کر کے بیعت یزید اختیار کر لے تو مراد بر آئی، ورنہ جس طرح ہو سکے اسے میرے پاس پہنچا"۔

بیعت کے بعد بھی "پھر" ہے

کامل ابن اثیر کے موافق ابن سعد کا خط پڑھ کر ابن زیاد نے یہ شعر پڑھا کہ: جب چنگل ہمارا مضبوط ہو گیا تو اب چھٹکارا چاہتا ہے حالانکہ یہ نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے بعد ابن سعد کو لکھا کہ: بیعت یزید پیش کر۔ اگر منظور کرے تو پھر ہم دیکھیں گے۔

ابن زیاد یزید کی تعریف کرتا اور لوگوں کو لالچ دیتا ہے

اب بقول اعثم کوفی ابن زیاد نے دوسرے دن جامع مسجد کوفہ میں جا کر لوگوں کو طلب کیا۔ جب سب حاضر ہو گئے منبر پر چڑھ کر حمد و ثنائے الٰہی کے بعد مصطفٰیؐ پر درود بھیجا اور کہا: "اے لوگو! تم نے اکثر دفعہ آل ابوسفیان کو آزما لیا ہے۔ ان کو ظاہر و باطن، سختی اور نرمی ہر حالت میں دیکھ لیا ہے کہ تمھاری دلداری کرتے رہے ہیں۔ یزید کی نیک خوئی، نیک چلنی اور خوش اعتقادی سے اور رعیت کے حق میں اس کے لطف و کرم اور جود و سخا، رحم و انصاف اور حسنِ سلوک سے بھی تم آگاہ ہو۔ تمام اقسام کے فتنہ و فساد اور بلاؤں کو استحکام سلطنت کے واسطے دور کیا اور ہر طرف راحت و آرام کا دَور ہو گیا۔ راستوں کا خطرہ جاتا رہا۔ اپنے زمانہ میں مفسد اور سرکشوں کے قلعے مسمار کر دیے۔ مال و دولت کی کثرت، محاصل کی فراوانی، ہر قسم کی برکتوں کا نزول، تنخواہوں اور وظیفوں کی ترقیاں، معاش اور رزق کے طریقوں کا دوامی انتظام جو محض اس کے اخلاق حسنہ اور عادات کریمانہ سے وقوع میں آتے ہیں تم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ آج اس کا فرمان آیا ہے۔ مجھے حکم ہے کہ تمھارے حال پر زیادہ مہربانی کروں۔ تنخواہوں اور وظیفوں میں ایک دینار کی جگہ سو سو دینار بڑھا کر تکمیل کروں اور تمھیں اس کے دشمن حسینؑ بن علیؑ سے لڑنے کے لیے بھیجوں۔ تم ان باتوں کو سن رکھو اور اطاعت و فرمانبرداری سے پیش آؤ"۔

مددگار فوجیں

منبر سے اتر کر حکم دیا کہ فوجوں کو زر و مال اور رسد کا سامان عطا کیا جائے کہ وہ جنگ کی تیاریاں کر کے دشت کربلا میں عمرو بن سعد سے جا ملیں۔ حسینؑ بن علیؑ سے لڑنے کے لیے جو نامور شخص آمادہ ہوا وہ شمر ذی الجوشن تھا۔ چار ہزار سوار لے کر عمرو بن سعد سے جا ملا۔ اب اس کے پاس نو ہزار سپاہ ہو گئے۔

یزید بن رکاب کلبی دو ہزار کی جمعیت لے کر گیا۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے ایک سردار حصین بن نمیر سکونی چار ہزار آدمی لے کر پہنچا۔ مصائر بن مرتبیہ مازنی تین ہزار، ایک اور شخص دو ہزار کی جمعیت سے جا ملا۔ پھر اور سردار یکے بعد دیگرے روانہ ہوئے۔ عمرو بن سعد کی فوج کی تعداد بیس ہزار ہو گئی۔

شبث ربعی ایک ہزار سوار

اب عُبید اللہ نے آدمی بھیج کر شبث ربعی سے کہلا بھیجا حسینؑ بن علیؑ سے جنگ کرنے کے لیے مستعد ہو جا۔ وہ سخت ناراض ہوا۔ کوئی بہانہ نہ پایا۔ انجام کار اپنے آپ کو مریض بنایا، اور جواب میں کہلا بھیجا کہ میں امیر کا فرمانبردار ہوں مگر مجھے ضعف لاحق ہے۔ مہربانی فرما کر مجھے اتنی مہلت دی جائے کہ عارضہ جاتا رہے۔ جس وقت صحت حاصل ہو گی امیر کے فرمانے کے مطابق جا کر خدمت بجا لاؤں گا۔ عُبید اللہ نے لکھا تیری بیماری کا حال مجھے خوب معلوم ہے۔ بیمار نہ بن اور اس گروہ میں شامل نہ ہو جس کی نسبت کلام مجید میں خدا فرماتا ہے: وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (۲ : ۱۴) اگر حسینؑ سے لڑنے اور عمرو بن سعد سے جا ملنے کے ساتھ میری فرمانبرداری مدنظر ہے تو بلا عذر بعجلت تمام چلا جا۔ یہ پیغام سن کر شبث سمجھ گیا کہ بہانہ کارگر نہ ہو گا۔ اور عُبید اللہ میری بناوٹ سے واقف ہو گیا ہے۔ ڈرا نماز عشا کے وقت کہ اس کے چہرہ اور رنگ کو تمیز نہ کر سکے۔ عُبید اللہ کے پاس گیا۔ وہ اسے آتے دیکھ کر خوش ہوا۔ مرحبا کہہ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور کہا لازم ہے کہ تو آج رات ہی کو سامان سفر درست کر کے علی الصباح ایک ہزار سواروں کے ساتھ جلد جا اور عمرو بن سعد سے جا مل۔ شبث نے کہا امیر کا جو حکم ہے اسے بجا لاؤں گا۔ دوسرے دن صبح کے وقت ایک ہزار سوار لے کر چلا گیا۔

حجار بن حر کے ایک ہزار (کل بائیس ہزار)

عُبید اللہ نے ایک ہزار سوار اور فراہم کر کے حجاز بن حر کو ان کا سردار مقرر کیا اور حکم روانگی دے دیا۔

الغرض عمرو بن سعد کی فوج میں بائیس ہزار سوار اور پیدل ہو گئے۔

ابن سعد کے نام خط

اب عُبید اللہ نے عمرو بن سعد کو خط لکھا کہ: "حسینؑ سے جنگ کرنے کے لیے اب کوئی بہانہ نہیں رہا۔ فوج کی کمی کی شکایت تھی، سو اب وہ بھی نہیں رہی۔ تیرے پاس بائیس ہزار سوار و پیدل کی جرار فوج موجود ہے۔ جو ہر طرح سے ساز و سامان اور اسلحہ سے مکمل اور آراستہ ہے۔ اب تیرا انتظام درست ہو گیا۔ لازم ہے کہ تمام حالات سے جو امام حسینؑ کے ساتھ تجھے پیش آئیں مثل جنگ و جدال وغیرہ سب سے مجھے مطلع کرتا رہے۔ ہر روز صبح و شام کے وقت میرے پاس تیرے قاصد پہنچتے رہیں۔ اور تیری تحریریں مشتمل حالات و واقعات مجھے ملتی رہیں۔ اس انتظام کو نہایت ضروری اور فرض سمجھنا۔ والسلام"۔

غرض اس قسم کی اور ضروری تاکیدیں لکھ کر اور معتمد قاصد بھیج کر عمر سعد کے حالات سے مطلع ہوتا اور اس مہم سے بسرعت و عجلت فارغ ہونے کی تنبیہ کرتا رہا۔

واپس آنے والوں کی سزا

صاحب روضۃ الصفا کہتا ہے کہ: "اگرچہ ابن زیاد جماعت کثیر کو حسینؑ سے جنگ کے لیے بھیجتا تھا۔ لیکن اکثر لوگ مکروہ سمجھ کر واپس آتے تھے۔

جب ابن زیاد کو معلوم ہوا تو اس نے سعد بن عبدالرحمن کو حکم دیا کہ وہ کوفہ کے محلوں میں گشت کرے اور تخلف کرنے والوں میں سے جسے دیکھے میرے پاس بھیج دے سعد نے ایک شامی کو دیکھا جو ابن سعد کے لشکر سے اپنی میراث لینے کوفہ واپس آیا تھا۔ سعد نے اسے دارالامارت بھیج دیا۔ ابن زیاد نے اس کے قتل کا حکم دیا۔ یہ سیاست دیکھ کر جو لوگ واپس آئے تھے وہ ابن سعد کے پاس چلے گئے"۔

اس کے بعد بقول روضۃ الصفا: ابن زیاد نے عمرو بن سعد کو لکھا کہ حسینؑ کو نہر فرات سے اس بہانہ سے دور رکھنا کہ بنی ہاشم نے عثمان سے پانی روک لیا تھا۔

اعثم کوفی کے موافق ابن زیاد نے تاکید کی کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ حسینؑ بن علیؑ اور ان کے ہمراہیوں نے کنوئیں کھود کر پانی حاصل کیا ہے۔ اور انھیں کوئی تکلیف اور دقت پیش نہیں آئی ہے۔ اس قاصد کے پہنچتے ہی حسینؑ بن علیؑ اور ان کے دوستوں کو کنوئیں کھودنے سے روک دے۔ اور ایک قطرہ پانی حاصل نہ کرنے دے۔ جس طرح انھوں نے عثمان کو پانی نہیں دیا تو بھی ان کو پانی کا ایک قطرہ دریائے فرات سے نہ پینے دے۔ اس حکم کے پہنچتے ہی اس نے حسینؑ بن علیؑ کے خلاف زیادہ سختی اور سختی اختیار کی اور دریائے فرات پر پہرے بٹھا دیے کہ ان کی نظر تک پانی پر نہ پڑے۔ پھر اپنے گروہ میں سے عمر بن حجاج الزبیدی کو سوار اور پیدل دے کر کہا کہ تو فرات کے کناروں کی حفاظت کر اور حسینؑ یا کسی ہمراہی کو ہرگز ایک قطرہ نہ لینے دے۔ پھر ایک اور شخص کو بلا کر منادی کرادی کہ اے پسر فاطمہؑ فرزند رسولِ خداؐ تجھے اس پانی کا ایک قطرہ نصیب نہ ہوگا تاوقتیکہ موت کا ذائقہ چکھے گا یا عبیداللہ ابن زیاد کی فرمانبرداری نہ کرے گا۔

اور ابواسحٰق اسفرائنی کے موافق وہ جو ابن سعد کی مدد کو آئے تھے دریائے فرات اور امام حسین رضی اللہ عنہ کی فرودگاہ کے درمیان جا اترے۔ عمرو بن سعد نے حجر بن حر کو بلا کر ایک جھنڈا دیا اور دو ہزار سوار ساتھ کیے اور حکم دیا کہ فلاں راستہ کی حفاظت کر۔ حسینؑ اور اس کے ساتھیوں کو فرات کا پانی پینے سے روکتے رہو۔ اور ابن ربعی کو ایک جھنڈا اور چار ہزار سوار دے کر دوسرے راستہ پر تعینات کیا اور حکم دیا کہ تم ادھر سے حسینؑ اور اس کے ساتھیوں کو پانی پینے سے روکنا۔ یہ دونوں فوجیں اپنے اپنے مقام پر آگئیں اور امام حسینؑ کو پانی پینے سے روکنے لگیں۔

حضرتؑ کا مخاطبہ

جب امام حسین رضی اللہ عنہ نے یہ حال دیکھا تو ان لوگوں کے قریب گئے اور تلوار ٹیک کر کھڑے ہوگئے اور فرمایا اے لوگو تم مجھے جانتے ہو؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ فرمایا: میں کون ہوں؟ کہا: تم حسینؑ بن علیؑ مرتضیٰ ہو۔ فرمایا: میرے نانا کون ہیں؟ کہا: محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ فرمایا: میری ماں کون ہیں؟ کہا: فاطمہؑ زہرا ہیں۔ فرمایا: جب تم کو یہ سب کچھ معلوم ہے تو پھر کیوں کر میرا خون بہانا حلال سمجھتے ہو اور کس لیے مجھے پانی سے روکتے ہو۔ حالانکہ میرے والد حوض کوثر کے ساقی ہوں گے۔ اور قیامت کے روز ان کے ہاتھ میں لوائے حمد ہوگا۔ اور میرے نانا سے مروی ہے کہ حسنؑ و حسینؑ جنتی جوانوں کے سردار ہیں۔ اور انھوں نے فرمایا ہے کہ اے جن وانسان کی جماعتو میں تم میں اللہ کی کتاب کو اور اپنے عزیز اور اہل بیت کو چھوڑ چلا ہوں اور واللہ ہم ہی آنحضرتؐ کے عزیز اور اہل بیت ہیں۔

ان لوگوں نے کہا ہم یہ سب جانتے ہیں مگر ہم تم کو پیاس کے ساتھ مارے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ امام حسین رضی اللہ عنہ

نے فرمایا میں پناہ مانگتا ہوں اللہ کی جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ ہر متکبر شخص سے جو یوم الحساب پر ایمان نہیں رکھتا۔ پھر واپس آئے اور اپنے عیال کے خیمہ میں چلے گئے۔ اس وقت ان کو سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ جب عورتوں نے ان کی یہ حالت دیکھی تو رونے لگیں۔ آپؑ نے فرمایا خاموش رہو۔ کیونکہ رونا تمہارے آگے ہے۔ پھر آپؑ ان کے پاس بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ رات آ گئی۔

۷ر تاریخ اس کے بعد یا اس کے کچھ قبل عمر بن الزبیدی بھی پانچ سو سواروں سے نہر فرات پر متعین کیا گیا اور یہ لوگ فرات اور امام حسینؑ کے درمیان حائل ہو گئے۔ یہ واقعہ آپؑ کی شہادت سے تین روز پہلے کا ہے۔ (ابن خلدون)

۸ر تاریخ حضرت عباسؑ پانی لائے

روضۃ الشہداء، تاریخ کامل، روضۃ الصفا، ابن خلدون اور اعثم کوفی سب نے لکھا ہے کہ اس کے بعد (غالباً آٹھویں تاریخ کو) حضرت عباسؑ بن علیؑ پانی لائے۔ میں اعثم کوفی کی صراحت کو پسند کرتا ہوں کہ جب حسینؑ اور اصحاب پر تشنگی کا بہت غلبہ ہوا آپؑ نے اپنے عزیز بھائی عباسؑ بن علیؑ کو بلا کر اور بیس سوار اور تیس پیدل دے کر کہا بیس مشکیں لے جاؤ اور دریائے فرات سے بھر لاؤ۔ عباسؑ بن علیؑ نے منظور کر لیا اور اس گروہ کو لے کر دریائے فرات کے کنارہ آئے۔ عمر پہرہ دار تھا۔ پکارا کون شخص پانی لیتا ہے۔ ہلال بن نافع نے کہا: میں تیرے چچا کا بیٹا پانی پینے آیا ہوں۔ عمر نے کہا پی لے تجھے گوارا ہو۔ ہلال نے کہا: اے عمر تجھ پر تف ہے۔ میں کس طرح پانی پی سکتا ہوں جب کہ حسینؑ بن علیؑ اور اس کے فرزند پیاس سے ہلاک ہوئے جاتے ہیں۔ عمر نے کہا مجھے یہ حالات معلوم ہیں مگر میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں مقرر کیا ہوا ہوں اور محکوم مجبور ہوتا ہے۔ ہلال نے اپنے دوستوں سے کہا آؤ پانی بھر لو۔ عمر بھی سمجھ گیا کہ حسینؑ کے دوست پانی لینے آئے ہیں۔ روکنے کے لیے جنگ سے پیش آیا۔ حسینؑ کے دوستوں میں کچھ لڑنے لگے اور بعض مشکوں کے بھرنے میں مصروف ہوئے۔ اور پانی سے سیراب ہو کر بھری ہوئی مشکیں لیں اور صحیح سلامت واپس چلے آئے۔ ان میں سے کوئی شخص شہید نہیں ہوا۔ اور عمر کے چند طرفدار مارے گئے۔ امام حسینؑ کے ساتھی ان مشکوں کا پانی پی کر سیراب ہو گئے۔ روضۃ الصفا کے موافق پیادے مشکیں بھر رہے تھے اور عباسؑ اپنے سواروں سے ان کی مدد کر رہے تھے۔ بہ استثنائے ابومخنف قریب قریب تمام مؤرخین کے نزدیک حضرت عباسؑ پانی لا سکے۔ ابومخنف کے نزدیک شہید ہوئے۔

حضرتؑ نے ابنِ سعد کو طلب فرمایا

ابن خلدون کہتا ہے: بعد اس کے امام حسینؑ نے عمر بن قرظہ بن کعب انصاری کی معرفت عمرو بن سعد کے پاس کہلا بھیجا کہ آج شب کو دونوں لشکروں کے درمیان مجھ سے ملنا۔ عمرو بن سعد حسب وعدہ آیا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ پھر دونوں آدمی لوٹ کر اپنے اپنے لشکر میں آئے۔ دو چار بار ملاقات کرنے کے بعد عمرو بن سعد نے عبید اللہ بن زیاد کو لکھا: بعد حمد و ثنا کے واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے آتش فتنہ فرو کر دیا۔ اور اختلاف دفع کر کے سبھوں میں اتفاق پیدا کر دیا ہے۔

شرائطِ صلح حسینؑ نے یہ درخواستیں پیش کی ہیں کہ یا وہ جہاں سے آئے ہیں واپس کر دیے جائیں یا جس سرحد کی طرف ہم چاہیں ان کو بھیج دیں یا ہم ان کو امیر المومنین یزید کے پاس بھیج دیں تا کہ

ان کی یہ بیعت کریں۔ اس میں تمہاری خوشنودی اور امت محمدیہ کی رضامندی ہے۔ ابن زیاد نے خط پڑھ کر کہا: میں اس کو منظور کرتا ہوں۔ یہ خط ایسے شخص کا ہے جو امیر در عیت کا ناصح مشفق ہے۔

شرائطِ صلح سے اِنکار

شمر ذی الجوشن نے اٹھ کر کہا: کیا تم اس درخواست کو قبول کرلوگے۔ وہ (حسینؑ) تمہارے ملک میں آگیا ہے تمہارے قبضہ میں ہے۔ واللہ اگر وہ یہاں سے کوچ کرکے چلا گیا اور اس نے تمہارے ہاتھ پر بیعت نہ کی تو وہ تم سے زیادہ قوی و معزز ہوگا اور تم بمقابلہ اس کے ضعیف و ناتواں ہوگے۔ میرے نزدیک مناسب ہے کہ تم اس کو اپنے حکم کے ماننے پر مجبور کرو۔ پس اگر عدول حکمی کرنے پر تم اس کو سزا دوگے تو تم کو اس کا حق حاصل ہے اور اگر در گزر کروگے تو اس کا الزام تم پر آئے گا۔ واللہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حسینؑ و عمرو تمام رات دونوں لشکروں کے درمیان باتیں کرتے رہے ہیں۔

عقبہ بن سمعان کا قول اور قرین قیاس شرائط

کامل ابن اثیر کے موافق عمرو بن سعد سے حضرتؑ نے جو باتیں کیں وہ یہ تھیں کہ ہم اور تو لشکروں کو چھوڑ کر یزید کے پاس چلیں یا یہ شرطیں پیش کیں کہ میں واپس ہوں۔ یا یزید کے پاس جاؤں۔ اس کی جو رائے ہو۔ یا یہ کہ مُسلمانوں کی سرحد پر چلا جاؤں۔

اس مؤرخ و نیز روضۃ الصفا نے لکھا ہے کہ عقبہ بن سمعان کہتا ہے کہ: "پیوستہ ملازم امام حسینؑ بودم تا آن زمان کہ شہادت یافت و ہرچہ می گفت می شنیدم بخدا سوگند کہ ہرگز بر زبان نیاورد کہ مرا بگزارید کہ پیش یزید یا ثغرے از ثغور اسلام روم بلکہ ہمیں قدر پیغام داد کہ مرا بگزارید تا بجائے باز گردم کہ از آنجا آمدہ ام یا دست از من باز دارید تا سر در این جہاں عریض نہادہ در مہاجرت اوطان و مفارقت روزگار گزرانم"۔ یعنی: "میں امام کی شہادت تک ان کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ جو کچھ وہ فرماتے تھے میں سن رہا ہوتا تھا۔ آپ نے اپنی زبان سے ہرگز نہیں کہا کہ مجھے چھوڑو کہ یزید کے پاس یا کسی سرحد پر چلا جاؤں، بلکہ یہی کہا کہ مجھے چھوڑ دو جہاں سے آیا ہوں چلا جاؤں، یا کشادہ جہان میں جہاں سر سمائے زندگی گزاروں"۔

شب کی ملاقات میں عباسؑ اور علی اکبرؑ حضرت کے ساتھ رہے

اعثم کوفی کے موافق امام حسینؑ نے عمرو بن سعد کے پاس آدمی بھیج کر پیغام دیا کہ تجھ سے کچھ کہنا ہے۔ رات کے وقت مجھ سے ملنا۔ اور میری باتیں سن لینا۔ عمرو ایک سو بیس سوار ہمراہ لے کر اپنے لشکر گاہ سے نکلا۔ امیر المومنین حسینؑ نے اپنے ہمراہی سواروں سے کہا: تم پرے ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ وہ پرے سرک گئے۔ عباسؑ بن علیؑ اور علی اکبرؑ آپؑ کے ساتھ رہے۔ عمرو نے بھی اپنے ساتھ کے سواروں کو اسی طرح پیچھے ہٹا دیا۔ اس کا غلام لاحق اور بیٹا حفص اس کے پاس ٹھہرے رہے۔ امام حسینؑ نے فرمایا: "اے عمرو بن سعد تجھ پر افسوس ہے کیا تو اس خدا سے جس کی طرف تمام مخلوق مر کر رجوع کرنے والی ہے نہیں ڈرتا۔ اور مجھ سے جنگ کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ تو جانتا ہے کہ میں کون شخص ہوں۔ تو اس ناواجب اور ناسزا کام سے باز آ۔ اور جس کام میں دین اور دنیا کی بھلائی شامل ہے اسے اختیار کر۔ میرے پاس چلا آ۔ اس گمراہی سے نکل۔ اس انکار دنیا نے مجھ اور تجھ جیسے بہت شخصوں کو

دیکھا ہے۔ اس پر مغرور نہ ہو۔ اور یقین کر کہ نیکی اور سلامتی اسی پر موقوف ہے جو میں تجھ سے کہہ رہا ہوں"۔

ابنِ سعد کے عذر کی نوعیت

اس نے کہا: سبحان اللہ آپ نے بہت ٹھیک بات کہی ہے۔ لیکن آپ کے پاس چلے آنے میں اس بات کا اندیشہ ہے کہ میرے مکان کو برباد کریں گے۔ حسینؑ نے کہا: سبحان اللہ یہ کیا ہوس ہے۔ اگر خاندان مصطفےٰ کی دوستی کے سبب دنیا میں تیرا مکان برباد کیا جائے تو بھی کچھ نقصان کی بات نہیں۔ اس کے عوض بہشت میں تیرے لیے کئی محل مقرر کیے جائیں گے۔ علاوہ ازیں جب تو میرے ہمراہ رہے گا تو میں تیرے موجودہ گھر سے بھی اچھا گھر بنوا دوں گا۔ عمرو نے کہا: میرے پاس زرخیز و شاداب جاگیر ہے۔ ابن زیاد اسے ضبط کر لے گا اور میری اولاد محروم رہ جائے گی۔ امام حسینؑ نے کہا: اس بات سے بھی مطمئن رہ۔ تجھے اس کے عوض اس سے بھی زیادہ زرخیز اور سرسبز و شاداب جاگیر وجہ حلال سے حجاز میں عطا کروں گا۔ عمرو سن کر خاموش ہو رہا۔ کچھ جواب نہ دیا۔ امیر المومنین حسینؑ یہ حال دیکھ کر واپس چلے آئے۔ اور فرماتے تھے: اللہ تعالیٰ تجھے ہلاک کرے اور عاقبت میں نہ بخشے۔ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے امید کرتا ہوں تجھے عراق کے گیہوں کھانے نصیب نہ ہوں گے۔ عمرو نے کہا: "اے حسینؑ! اگر گیہوں نہ ملیں گے تو اس کے عوض جو ہی کھا لوں گا"۔ یہ کہہ کر اپنے لشکر گاہ کو واپس چلا گیا۔ روضۃ الصفا کے موافق ابتداء کلام حضرتؑ نے کی تھی۔

دشمنوں کے انکارِ صلح پر حضرتؑ اپنے جد بزرگوار کا اصول یاد دلاتے ہیں

تاریخ خمیس کے موافق حضرتؑ نے ابن سعد سے مخصوص بات یہ کی کہ: "تم مجھ سے وہ بات کیوں نہیں قبول کرتے جو رسولؐ مشرکوں سے قبول کرتے تھے"۔ اور سوال پر کہا کہ جب مشرکین صلح چاہتے تھے تو رسولؐ اسے قبول کر لیتے تھے۔

ابن سعد کو ابنِ زیاد کے خلافِ انسانیت احکام

اس گفتگو کی خبر سن کر ابن زیاد نے عمرو بن سعد کو بقول ابن خلدون لکھا: میں نے تجھ کو حسینؑ کی طرف اس غرض سے نہیں بھیجا تھا کہ تو اس سے لیت و لعل میں اوقات گزاری کرے اور اس کی سفارش مجھ سے کرے۔ میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ اگر حسینؑ اور اس کے ہمراہی ہمارے حکم کی اطاعت کریں تو صلح نامہ لکھ کر ہمارے پاس ان کو بھیج دو اور اگر انکار کریں تو حملہ کرو۔ یہاں تک کہ ان کو قتل کر کے مثلہ کر ڈالو۔ کیونکہ وہ اس کے مستحق ہیں اور بعد قتل کے جسم و سینہ کو گھوڑوں کے سموں سے پامال کرانا۔ وہ بڑا ظالم، جفا کار، خود سر، نافرمان ہے۔ پس اگر تو ہمارے حکم کی تعمیل کرے گا تو تجھ کو تابعداروں جیسا صلہ دیا جائے گا اور اگر کچھ بھی سرتابی کرنے کا قصد ہو تو ہم تجھ کو معزول کرتے ہیں اور بجائے تیرے شمر کو لشکر کی سرداری دیتے ہیں۔

حکم کے نفاذ کے لیے دوسرا حکم

پھر شمر سے مخاطب ہو کر بولا: عمرو بن سعد اگر ہمارے اس حکم کی تعمیل پر مستعد ہو تو فبہا۔ تم اس کی اطاعت کرنا۔ ورنہ وہ معزول اور تم اس پر اور کل لشکر پر امیر ہو۔ ساتھ ہی اس کا سر کاٹ کر میرے پاس بھیج دینا۔

حضرت عباسؑ اور ان کے بھائیوں کے لیے امان نامہ

اس خط کے لکھتے وقت اتفاق سے عبداللہ بن ابی محل بن حزام بیٹھے ہوئے تھے۔ (ان کی پھوپھی ام البنین بنت حزام امیرالمومنین علیؑ کے عقد میں تھیں، جن سے عباسؑ و عبداللہ و جعفر و عثمان پیدا ہوئے تھے) انھوں نے ابن زیاد سے کہا: ہمارے بھانجوں کے لیے امان نامہ لکھ دو۔ چنانچہ ابن زیاد نے لکھ دیا۔ جس کو

حضرت عباسؑ امان سے انکار کرتے ہیں

عبداللہ بن ابی محل نے اپنے ایک غلام کی معرفت بھیج دیا۔ عباسؑ و عبداللہ وغیرہم پسران امیرالمومنینؑ نے کہا: ہم کو تمھاری امان کی ضرورت نہیں ہے۔ ابن سمیّہ کی امان سے اللہ تعالیٰ کی امان بہتر ہے۔

ابن خلدون نے قرابت میں غلطی کی ہے۔ اگر حضرت ام البنین عبداللہ بن ابی محل کی پھوپھی تھیں تو حضرت عباسؑ وغیرہ ان کے بھانجہ نہیں ہو سکتے تھے بلکہ پھوپھی زاد بھائی۔ اعثم کوفی ابن ابی محل سے حضرت ام البنین کو چچازاد بہن اور حضرت عباسؑ وغیرہ کو بھانجے کہلواتا ہے۔ نیز اس مؤرخ کے موافق امیرالمومنینؑ نے یہ عقد کوفہ میں کیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد شمر پہنچا۔ ابن زیاد کا خط دیکھ کر ابن سعد نے کہا: "افسوس میں تو یہ سمجھا تھا کہ میری درخواست قبول کرلی گئی اور تو صلح کرنے کی اجازت لے کر آیا ہے"۔ شمر بولا: "یہ تو تمھاری سمجھ کی غلطی ہے۔ اب بتلاؤ کیا کرو گے"۔ جواب دیا: "مجبوراً تعمیل کروں گا"۔ (ابن خلدون)

ابن سعد حضرت کے متعلق

کامل ابن اثیر کے موافق ابن سعد نے شمر سے کہا: "تو نے بات خراب کی۔ وہ (حسینؑ) بیعت نہ قبول کرے گا۔ اس لیے کہ اس کے باپ کا نفس اس کے پہلو میں ہے اور وہ کبھی ذلت گوارا نہ کرے گا"۔

حضرتؑ کا دفاعی انتظام

اب بقول صاحب سرالشہادتین جب حضرتؑ کو یقین ہوا کہ لوگ لڑیں گے تو آپؑ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ ان کے لشکر کے گرد خندق کھود دیں۔ اور صرف ایک دروازہ رکھا جائے جس سے نکل کر جنگ کی جائے۔

کامل ابن اثیر کے موافق حضرتؑ نے اصحاب کے خیمہ کا معائنہ کیا، اور حکم دیا کہ خیموں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیں۔ دشمنوں سے جنگ کے وقت ایک طرف سے خیموں کے آگے سے مخاطب ہوں کہ خیمے داہنے بائیں اور پیچھے رہیں۔

ابن خلدون اور گبن نے یہ بھی کہا ہے کہ خیموں کی رسیاں ایک دوسرے سے ملا دو۔

صاحب روضۃ الشہدا بنی اسد کو آمادہ مدد کرتا ہے

روضۃ الشہدا کے موافق حبیب بن مظاہر اسدیؓ نے حضرتؑ کی خدمت میں عرض کی کہ اس علاقہ میں بنی اسد رہتے ہیں۔ اگر آپؑ کی اجازت ہو تو آپؑ کی مدد کے لیے بلاؤں۔ حضرتؑ نے اجازت دی۔ حبیبؓ گئے اور کہا: اے لوگو! نواسۂ رسولؐ کو بائیس ہزار دشمنوں نے گھیرا ہے۔ تم میرے عزیز ہو۔ میں تمھیں نصیحت کرنے آیا ہوں کہ اگر تم شفاعت رسولؐ کے مستحق ہونا چاہتے ہو تو ان کی مدد کرو۔ ان کی بات سن کر عبداللہ بن بشر کھڑا ہو گیا، اور کہنے لگا کہ پہلا شخص جو محبت کا دعویٰ اور دعوت قبول کرتا ہے میں ہوں۔ حبیبؓ نے مبارک باد دی

اور نوے آدمی مسلح ہو کر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور چلے۔ اتفاق سے ان میں سے کسی نے ابن سعد کو خبر دی اور اس نے ارزق شامی کو ایک ہزار سوار کے ساتھ روکنے کو بھیجا۔ فرات کے کنارہ جنگ ہوئی۔ بنی اسد کے کچھ لوگ شہید ہوئے۔ بقیہ اپنے قبیلہ کی طرف واپس گئے۔

ابن زیاد کو معلوم ہوا کہ حسینؑ نے قبائل سے مدد طلب کرنی شروع کی ہے تو اس نے ابن سعد کو لکھا کہ: "اگر تو ابھی حسینؑ سے جنگ نہ شروع کرے گا تو مستوجب سیاست ہو گا"۔ یہ محرم کی نویں تاریخ تھی۔

مشورۂ جنگ اور بُریرؓ

اگر حضرتؑ نے مشورہ جنگ آٹھویں شب کو کیا تو اس کی مخصوص صورت یہ تھی کہ بُریرؓ بن خضیر۔۔۔۔ نے کہا (جو بڑے عابد و زاہد مشہور تھے) کہ اے نواسۂ رسولؐ کام نہایت سخت آپڑا ہے۔ اس کے نزدیک بجز اس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ جاؤں اور ابن سعد کو نصیحت کروں۔ شاید اس پر کچھ اثر ہو۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ تمھاری صوابدید پر کسی کو کچھ اضافہ کرنا نہیں ہے۔ اجازت پر بُریرؓ گئے۔

بُریرؓ اور ابنِ سعد

ابن سعد اپنے خیمہ میں بیٹھا تھا۔ بُریرؓ بے اجازت داخل ہوئے اور بغیر سلام کیے ایک طرف بیٹھ گئے۔ ابن سعد کو غصہ آیا۔ اور کہا کہ: "کیا میں مسلمان نہیں ہوں جو تو نے مجھے سلام نہیں کیا"۔ بُریرؓ نے کہا جناب رسولؐ نے فرمایا ہے: المسلم من سلم المسلمون من لسانہ و یدہ۔ (مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہیں) تو نے اہلِ بیتؑ نبیؐ پر پانی بند کیا ہے۔ ان پر زبان تیری کی ہے۔ فرزند رسولؐ سے ارادۂ جنگ رکھتا ہے اور ان کی عترت کے مقابل میں صف کشی کی ہے۔ (روضۃ الشہدا و اعثم کوفی وغیرہ)

یہ سن کر ابن سعد دیر تک سر جھکائے رہا۔ اور اس کے بعد کہنے لگا: "اے بُریرؓ تم سچ کہتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ جو ان سے لڑے گا اور ان کے حقوق کو غصب کرے گا اس کی جگہ جہنم میں ہے۔ مگر اے بُریرؓ رے کا علاقہ بہت وسیع اور زرخیز ہے۔ مجھ سے وہ نہیں چھوڑا جاتا۔ میرا دل حکومت اور فرمانبرداری کی ہوس سے باز نہیں آتا۔

ابنِ سعد کا انداز

ابو مخنف کے نزدیک انس بن کاہل گئے تھے اور ان کے سوال پر ابن سعد نے اپنا منہ ایک طرف پھیر لیا اور کہا: "خدا کی قسم میں جانتا ہوں کہ ان کا قاتل جہنم میں جائے گا لیکن لازماً مجھے ابن زیاد کا حکم نافذ کرنا پڑے گا"۔

بُریرؓ واپس آئے اور حضرتؑ سے عرض کی کہ: "عمرو بن سعد سخت گمراہی میں مبتلا ہو گیا ہے۔ حکومت کرنے کی لالچ میں آپؑ کے قتل کو آسان بات سمجھتا ہے۔ میں نے دیکھ لیا کہ وہ اپنے ارادہ سے باز نہ آئے گا اور جو خدمت اس کے سپرد کی گئی ہے اسے عمل میں لائے گا"۔

دشمن کا طعنہ

صورت معاملہ کی اطلاع پر حضرتؑ نے خیمہ کے گرد کی خندق میں لکڑی بھروادی اور اس میں آگ دیدینے کا حکم دیا کہ شب خون نہ مارا جائے۔ آگ روشن دیکھ کر ایک سوار جس کا نام مالک بن عروہ یا مالک بن حوزہ تھا خندق کے پاس آکر کھڑا ہوا اور بولا کہ: "اے حسینؑ بن علیؑ تم نے آگ کی طرف بہت جلدی کی۔ آتش دوزخ میں جانے سے پہلے اس دنیا میں اپنے گرد آگ جلائی"۔ ایک دوسرے نے آواز دی کہ: "اے حسینؑ تمھیں محمد مصطفےٰؐ سے کیا قرابت ہے"۔ تیسرا کہتا تھا کہ: "اے حسینؑ دیکھو دریائے فرات کس طرح موج مار رہا ہے۔ یہ پانی

تمھیں ہرگز نہ ملے گا یہاں تک کہ تم پیاس سے ہلاک ہو جاؤ گے۔ !!!"

حسینؑ کی دعا اور اصحاب کی تکبیر

مؤرخین جنھوں نے متذکرہ صدر روایتیں لکھی ہیں اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ پہلے کی گفتگو سن کر حضرتؑ نے فرمایا:

"کذبت یا عدو اللہ"۔ جھوٹ کہا تو نے اے دشمنِ خدا۔ تو گمان کرتا ہے کہ میں دوزخ میں جاؤں گا اور تو بہشت میں جائے گا۔ مسلم بن عوسجہ نے کہا کہ: "مجھے اجازت دیجیے کہ میں تیر سے اسے ہلاک کروں۔ لیکن حضرتؑ نے یہ فرما کر روکا کہ میں جنگ میں پیش دستی نہیں کرنا چاہتا۔ یہ کہا اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے۔ زبانِ اقدس پر جاری تھا کہ: "اللھم احرق بالنار"۔ (خداوندا اسے آگ سے جلادے) اور یہ ہوا کہ اس کے گھوڑے کا سم سوراخ میں چلا گیا اور بھڑکا اور بھڑکنے میں وہ گھوڑے کی پیٹھ سے اس آگ میں گر پڑا، جسے اس نے ذریعہ طعن بنایا تھا۔ اور جل گیا۔

(ابو مخنف اور ابن خلدون نے یہ بھی لکھا ہے کہ: "مسروق وائل حضرمی جو اس کے ساتھ میدان میں آیا تھا، یہ دیکھ کر کہتا ہوا لوٹا میں اس خاندان سے نہ لڑوں گا۔ ان کی بددعا میں بہت بڑا اثر ہے) اصحابِ حسینؑ نے یہ دیکھ کر تکبیر کہی۔!

دوسرے کا کلام سن کر کمال غیرت سے آپؑ نے آسمان کی طرف دیکھا اور عرض کی کہ خداوندا یہ کہتا ہے کہ تیرے پیغمبر سے میری کوئی قرابت نہیں ہے۔ تو اسے بھی آج ہی ذلیل کر اور بہت جلد اسے اس کہنے کی سزا دے۔ اور ایسا ہوا کہ یہ شخص قضائے حاجت کے لیے گیا اور ایک بچھو نے اسے ڈنک مارا۔ یہ اپنی نجاست میں لوٹتا رہا، اور شدید زہر کی تکلیف سے وہیں مر گیا۔

تیسرا بھی گھوڑے سے گرا۔ پیاس کا غلبہ ہوا اور پانی پیتے پیتے مر گیا۔

۹ر محرم ابن سعد کا لشکر حرکت کرتا ہے

کامل ابن اثیر کے موافق: نویں تاریخ کو حضرتؑ نماز صبح پڑھ چکے تھے کہ ابن سعد کے لشکر میں حرکت ہوئی اور وہ آگے بڑھا۔ بعض مؤرخین نے بعد عصر بھی کہا ہے۔ اور چونکہ آج جنگ کی ابتدا تھی اور سپہ سالار لشکر خود فوج کے ساتھ تھا۔ قیاس آسان ہے کہ نمائش اور اظہار شوکت کے لیے قریب قریب تمام فوجیں ترتیب اور انتظام سے بڑھائی جا رہی ہوں گی۔ سواروں اور پیادوں کی گھنی صفیں بڑھ رہی ہوں گی۔ اکیس بائیس ہزار سوار اور پیادوں کی یہ فوجی آمادگی بجائے خود ایک مہیب منظر ہوگا۔ اور جنگی باجوں کے شور نے ایک عالم پیدا کیا ہوگا۔ یقیناً یہ موقع نہ تھا جب کہ شجاعت کو شام کے لشکر کی آمادگی پر ناز ہوتا۔

بہن کی اِطلاع

حضرتؑ خیمہ کے آگے تلوار لیے بیٹھے تھے اور نیند کے عالم میں تھے۔ حضرت زینبؑ قریب بیٹھی تھیں کہ ہتھیاروں کی جھنکار سموں کی آواز اور سواروں کے شور سے آپ نے حضرتؑ کو مطلع کیا۔

بقول ابن خلدون: "عباسؑ بن علیؑ نے عمرو بن سعد کو آتے دیکھ کر کہا: بھائی اٹھو۔ مخالفین آپہنچے۔ آپؑ نے فرمایا: چلو ہم بھی سوار ہو کر چلتے ہیں۔

عباسؑ کی پیشروی

عباسؑ بن علیؑ نے کہا: "نہیں میں ہی جاؤں گا"۔ امام حسینؑ نے اس رائے کو پسند فرما کر ارشاد کیا: "بہتر ہے تمھیں جاؤ۔ دریافت کرو: کیوں آئے ہیں؟۔

غرض کیا ہے؟"۔ غرض عباسؑ بیس آدمیوں کے ساتھ سوار ہو کر تشریف لے گئے۔ آنے کی وجہ دریافت کی۔ عمرو بن سعد نے لفظ بلفظ ابن زیاد کے خط کا مضمون بتلا دیا۔ عباسؑ نے کہا: "ٹھہرو۔ عجلت نہ کرو۔ ابو عبد اللہ حسینؑ کو اس خبر کی اطلاع کرتا ہوں"۔ یہ کہہ کر عباسؑ لوٹ کر امام حسینؑ کی خدمت میں آئے اور ان کے ہمراہی عمر بن سعد کے مقابلہ پر کھڑے ہوئے اللہ جل شانہ کا ذکر کرتے رہے۔

ایک شب کی مہلت

حضرت امام حسینؑ نے عباسؑ سے کہا جاؤ ابن سعد سے جا کر کہہ دو کہ ہم کو شب بھر کی مہلت دے کہ ہم استغفار و دعا کر لیں۔ اپنے رب کی نماز پڑھیں تلاوت کریں۔ صبح کو جو ہونے والا ہو گا ہو گا۔ عباسؑ نے واپس ہو کر ابن سعد سے کہا: اس وقت تو تم لوگ واپس چلے جاؤ صبح تک ہم کو مہلت دو ان شاء اللہ تعالیٰ کل یا تو تمہاری اطاعت کر لیں گے یا جو مناسب ہو گا کیا جائے گا۔ عمرو بن سعد نے شمر سے استمزاج کیا۔ شمر بولا: تم امیر ہو جو چاہو کرو۔ یا لوگوں سے اس بابت دریافت کرو۔ عمر بن حجاج الزبیدی نے قطع کلام کر کے کہا: سبحان اللہ اگر حسینؑ اہل دیلم سے ہوتے اور یہ درخواست پیش کرتے تو بھی تم کو قبول کرنا ضروری تھا۔

قیس کی پیشین گوئی

قیس بن اشعث بن قیس بولا: "منظور کر لو۔ لیکن اپنی قسم وہ صبح کو تم سے ضرور لڑیں گے"۔ عمرو بن سعد نے جھلا کر کہا: "اگر ہمیں یہ یقین ہو جاتا تو بھی ہم یہ وقت ٹال جاتے"۔ اس کے ہمراہی یہ سن کر خاموش ہو رہے۔ اور عمر بن سعد واپس ہو کر اپنے لشکر گاہ میں چلا آیا۔

اس وقت کی حالت

کامل ابن اثیر کے موافق: حضرت عباسؑ نے دشمن کے مقابل پہنچ کر فرمایا کہ جلدی نہ کرو ہم ابی عبد اللہ کے سامنے پیش کریں اور آپؑ حائل رہے اور خدا کو یاد دلاتے رہے۔ اعثم کوفی کے نزدیک حضرت عباسؑ اپنے بھائیوں کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے۔ دشمن کا پیام سن کر حضرتؑ غور میں رہے۔ عباسؑ کھڑے تھے اور اصحاب ان لوگوں سے گفتگو میں مصروف تھے۔ حبیب بن مظاہر اسدی نے کہا: قیامت کے دن جب تم اللہ تعالیٰ کے سامنے جاؤ گے تو بہت بری قوم ہو گے اور پیغمبر کے فرزند اور اہل بیت اور متقی عابد زاہد نیک لوگوں کے قاتلوں میں شمار ہو گے۔ امام حسینؑ پیاسے بیٹھے ہوئے ان لوگوں سے لڑنے کی تدبیر سوچ رہے تھے۔

التوائے جنگ اور محاصرہ

ناسخ التواریخ اور روضۃ الشہدا کے موافق: اس گفتگو کے بعد اگرچہ جنگ نہ چھڑی لیکن عمرو بن سعد کا لشکر وہیں اتر پڑا۔ اور گویا حضرتؑ کا چھوٹا سا لشکر اس وقت سے خصوصیت سے فوجی محاصرہ میں آ گیا۔ اور ابن سعد کے کثیر لشکر کے لیے بیس اکیس خیموں اور سو سوا سو آدمیوں کا محصور کر لینا آسان سے بھی زیادہ آسان تھا۔

حضرتؑ کا خطبہ

غالباً اسی کے بعد امام حسینؑ نے اپنے ہمراہیوں کو جمع کر کے خطبہ دیا۔ جس کا مضمون یہ تھا: "میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتا ہوں اور اس کی تعریف ظاہر و پوشیدہ کرتا ہوں۔ اے خدا میں تیری تعریف کرتا ہوں کہ تو نے ہمارے جد کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔ اور ہم کو گوش و چشم و قلوب (؟) عطا کیے اور قرآن کی تعلیم اور دین کی سمجھ دی۔ پس ہم تیرا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اما بعد میں اپنے ہمراہیوں سے نہ زیادہ کسی کو بہتر جانتا ہوں اور نہ میرے اہل بیت سے کوئی زیادہ نیک اور نہ ان سے کوئی شخص رشتہ کا زیادہ لحاظ رکھنے والا ہے۔ پس تم سبھوں کو

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ آگاہ ہو جاؤ مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ کل یہ اعدا مجھ سے ضرور لڑیں گے۔ میں تم کو خوشی سے اجازت دیتا ہوں جس کا جس طرف جی چاہے چلا جائے۔ میرا کچھ حق اس پر نہیں ہے۔ لیکن مناسب ہے کہ تم میں سے ہر شخص میرے اہل بیت میں سے ایک ایک کو اپنے ہمراہ لے لے۔ تم سب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا کرے گا اور اپنے اپنے شہروں اور ملکوں کی طرف منتشر ہو کر چلے جاؤ۔ شاید اللہ تعالیٰ تم کو اس تکلیف سے بچا لے۔ کیونکہ شامی میرے خون کے پیاسے ہیں۔ اگر مجھے پا جائیں گے تو دوسرے کی جستجو نہ کریں گے"۔ (ابن خلدون)

دیگر مؤرخین نے بھی یہی کہا ہے صرف بعض میں لحن کا تھوڑا سا فرق ہے۔ اور کسی نے تھوڑی سی کوئی نئی بات لکھی ہے۔ مثلاً صاحب روضۃ الشہدا کہتا ہے کہ حضرتؑ کرسی ساج پر میدان میں تشریف رکھتے تھے اور فرمایا کہ: میں نے کسی کو اپنے اصحاب سے زیادہ باوفا نہیں پایا (یا تم) اور اپنے اہل بیت سے زیادہ کسی کو زیادہ رحیم اور نیکو کار نہیں دیکھا۔ میں نے تم پر سے اپنے بیعت اٹھالی اور یہ مہلت میں نے تمہارے لیے طلب کی تھی۔

مہلت کی غرض

اعثم کوفی میں اصحاب سے فرماتے ہیں کہ: "تم نے میرے حق میں ذرا کمی نہیں کی اور میں تمہاری بہتری و بھلائی اسی بات میں سمجھتا ہوں کہ جب رات ہو جائے، اے میرے دوستو رفیقو اور خاندان والو بھائی بند اور ملازمو! تم میں سے ہر شخص میرے بھائیوں اور فرزندوں میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر جس طرف دل چاہے چلا جائے کیونکہ جہاں کہیں جاؤ گے لوگ اچھی طرح پیش آئیں گے کوئی شخص تم سے تعرض نہ کرے گا۔ تم مجھے اس جگہ تنہا چھوڑ جاؤ۔ کیونکہ ان لوگوں کو صرف مجھ سے دشمنی ہے وہ مجھے تنہا پا کر قتل کریں گے۔ اور تم سے کچھ نہ کہیں گے۔ میرے مارے جانے کے بعد تم زندہ رہو گے"۔

شہید اسلام کے فاضل مؤلف کے موافق: "حسینؑ نے خطبہ کے بعد شمع گل کر دی کہ جانے والوں کو حجاب نہ ہو"۔

اصحابؓ کا جوابؓ

اب شروع ہوا اصحاب اعزا اور خدام کا وہ جواب جو اپنے موقع کے لحاظ سے تاریخ عالم میں عدیم المثال ہے۔ اور جو ایثار نفس، محبت اور قربانی کے لحاظ سے اپنا آپ ہی نظیر ہے۔ بقول ابن خلدون: "اس فقرہ کا تمام ہونا تھا کہ سب کے سب چلا اٹھے۔ آپؑ کے بھائی، اور لڑکوں اور بھتیجوں اور عبداللہ بن جعفر کے لڑکوں نے رو کر کہا: "ہم ایسا نہیں کر سکتے کہ آپ کے بعد ہم باقی رہ جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو یہ دن نہ دکھائے"۔

امام حسینؑ نے فرمایا: "اے بنی عقیل! بس بس۔ مسلم کی شہادت کافی ہے۔ تم لوگ جاؤ۔ میں نے تم کو خوشی سے اجازت دی"۔

بنی عقیل بولے: "آپؑ سے علیحدہ ہو کر ہم لوگوں سے کیا کہیں گے کہ ہم اپنے شیخ اپنے سردار اپنے بہترین چچا کے بہترین لڑکے کو دشمنوں کے قبضہ میں چھوڑ آئے اور ان کے ساتھ ایک تیر بھی نہ پھینکا۔ اور نہ ان کے ساتھ تلوار چلائی۔ واللہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ وہ کیا کریں گے اور نہ آپؑ کو تنہا چھوڑ جائیں گے، بلکہ ہم اپنے کو اور اپنے مال کو اور اپنے اہل کو آپؑ پر فدا کر دیں گے اور آپؑ کے ساتھ ہو کر لڑیں گے۔ یہاں تک کہ ہم تمہارے ساتھ جہاں تم جاؤ گے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس عیش کو نہ دکھائے جو تمہارے بعد ہم کو ملے"۔

مسلم بن عوسجہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا: "کیا آپؑ کو تنہا چھوڑ کر ہم چلے جائیں؟ حالانکہ ہم آپؑ کے حق سے ادا نہیں ہوئے۔ خدا کی قسم ہم آپؑ کو اس وقت تک نہیں چھوڑ سکتے جب تک آپؑ کے دشمنوں کے سینوں میں اپنے نیزوں کی نوک نہ چبھولیں گے۔ اپنی تلواروں سے جب تک وہ ہمارے قبضہ میں ہے۔ ان کی گردنوں کو تن ناپاک سے نہ جدا کرلیں گے۔ خدا کی قسم اگر میرے پاس کوئی آلہ حرب نہ ہوتا تو میں آپؑ کی حمایت میں پتھروں سے سے مارتا یہاں تک کہ میں اپنے آپ کو آپؑ پر فدا کردیتا"۔

مسلم بن عوسجہ کی اس پرجوش تقریر سے سبھوں کے دل بھر آئے اور وہ بھی بالاتفاق یہی کہنے لگے آپؑ نے ان لوگوں کو دعائیں دے کر رخصت کیا۔ خیمہ میں تشریف لے گئے۔ شام کا وقت تھا۔ طبیعت بھری ہوئی تھی، دردناک اشعار پڑھنے لگے۔

بعض کے موافق مسلم بن عوسجہ نے کہا کہ ہم دشمنان دین اور دشمنان فرزند رسول سے لڑیں گے کہ لوگ دیکھیں کہ فیبت رسول میں آپؑ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ یہ تو ایک دفعہ کا مرنا ہے اور یہاں سے ایسی جگہ جانا ہے جہاں کی کرامتوں کی نہایت نہیں ہے۔

صاحب لہوف کے موافق سعید بن عبداللہ حنفی کھڑے ہوئے اور عرض کی: بخدا یا ابن رسول اللہ ہم آپؑ کو تنہا نہ چھوڑیں گے یہاں تک کہ خدا نے پاک جانے کہ ہم نے ان کے بارہ میں اس اصول وصیت کے ساتھ حفاظت کی جس کو جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما گئے تھے اگر میں اس بات کو جان لوں کہ میں آپؑ کی مدد میں قتل کیا جاؤں گا اور پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر مارا جاؤں میری راکھ بھی اڑا دی جائے اور اس صورت سے ستر مرتبہ میرے ساتھ عمل کیا جائے تو بھی میں آپؑ سے جدا نہ ہوں گا یہاں تک کہ آپؑ کے قدموں کے نیچے مرجاؤں اور کیونکر نہ میں ایسا کروں حالانکہ صرف ایک مرتبہ مرنا، اور قتل ہونا ہے اور پھر میں ایسی کرامت کو پہنچوں کا جس کی انتہا کبھی نہیں ہے۔

پھر زہیر بن قین کھڑے ہو کر کہنے لگے: یا ابن رسول اللہ بخدا میری خواہش ہے کہ میں ہزار بار مارا جاؤں اور زندہ کیا جاؤں مگر خدائے توانا آپؑ کو اور آپؑ کے ان نوجوان بھائیوں اور فرزندوں اور اہل بیت کو قتل وغارت سے بچاوے۔

اس کے بعد سب نے اسی طرح کے کلام کیے اور کہا کہ ہماری جانیں آپؑ پر فدا ہوں ہم آپؑ کو اپنے ہاتھوں اور چہروں سے بچاویں گے۔ پس ہم جب آپؑ کے حضور میں قتل ہو جاویں گے اس وقت ہم اپنے خدائے برحق کی درگاہ میں اپنا وعدہ وفا کریں گے اور جو ہم پر فرض تھا اس کو ادا کرچکیں گے۔

محمد بن بشیر حضرمی کے لڑکے کی گرفتاری

اسی حالت میں محمد بن بشیر حضرمی سے کہا گیا کہ تمہارا فرزند حدود رے پر قید کرلیا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ خدا کے حضور میں اس کو ثواب پیش کرتا ہوں اور اپنی جان کو بھی خدا کی نذر کرتا ہوں۔ ہاں مجھے پسند نہ تھا کہ میں رہوں اور وہ قید کرلیا جاوے۔

حضرتؑ کی اجازت

یہ بات ان کی سید الشہدا نے سنی اور فرمایا کہ خدا تم پر رحمت کرے تم میری بیعت سے آزاد ہو۔ اپنے فرزند کی رہائی میں کوشش کرو۔ ابن بشیر نے جواب دیا کہ مجھ کو درندے کھا جائیں اگر میں آپؑ کو چھوڑ دوں۔ سید الشہدا نے فرمایا کہ اپنے فرزند کو یہ چادریں دو کہ اس کے ذریعہ سے

اپنے بھائی کو رہا کرالیوے۔ پھر حضرتؑ نے پانچ چادریں ان کو دیں۔ جن کی قیمت ایک ہزار اشرفی تھی۔
اعثم کوفی کے موافق: یہ باتیں سن کر بھائیوں اور اہل بیت نے کہا: "معاذ اللہ ہم اس امر سے ہرگز رضامند نہیں کہ آپؑ کے دوست ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہر جگہ لیے پھریں......"۔

شبِ عاشور

شبِ عاشور یا شہدائے کربلا کی حیات کی آخری رات، زمانہ کے اس ٹکڑے میں ہے جسے چند آمادگانِ شہادت نے اس لیے مختص کیا تھا کہ اس میں خدا کی عبادت کریں۔ محفوظ ہو جانے کے لیے نہیں۔ تدبیروں کے لیے وقت حاصل کرنے کو نہیں۔ لذاتِ دنیاوی میں آخری مرتبہ مصروف ہونے کے لیے نہیں۔ عبادت کے لیے عموماً مؤرخین اعثم کوفی کے ہم زبان ہیں کہ: لشکر کے واپس جانے کے بعد امیر المومنین حسینؑ نے تمام رات اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزاری، رکوع و سجود میں مصروف رہے۔ اور گریہ و زاری کے ساتھ اپنی بخشش اور نجات کی دعا مانگتے تھے۔ اسی طرح آپؑ کے بھائی اور فرزند اور تمام اہل بیت اور دوست رات بھر مصروفِ عبادت رہے۔ دم بھر کے لیے بھی کوئی نہ سویا۔ سب اپنی مغفرت کے لیے دعائیں مانگتے اور تسبیح و تہلیل میں محو تھے۔ اس شب کو حسینؑ کے فرائض اور اشغال کے تذکرہ میں شاعر خوب کہتا ہے کہ: ؎

گاہ فرمودے پرستاری فرزند علیل   گاہ کردے مرحمت نسبت بہ اولاد عقیل
گاہ شستے ز اشک چشم از گیسوئے قاسم غبار   گہ سر عباس را گریاں گرفتے در کنار

اس بات کے سمجھنے کے لیے کہ یہ شب انصار کے لیے افسردہ غور اور مایوسی کی تھی یا وہ صبح اور اس کے ناگوار حوادث کے لیے بے چین تھے۔ میں لہوف سے یہ روایت پیش کرتا ہوں کہ بریر بن خضیر ہمدانی اور عبد الرحمٰن بن عبد ربہ انصاری در خیمہ پر کھڑے تھے۔ اس وقت بریر ہمدانی عبد الرحمٰن انصاری سے مذاق و خوش طبعی کرنے لگے عبد الرحمٰن نے بریر سے کہا کہ یہ وقت ایسے امر باطل کا نہیں ہے۔ بریر نے کہا کہ میری قوم خوب جانتی ہے کہ میں نے کبھی بڑھاپے اور جوانی میں بری بات نہیں پسند کی نہ اس وقت لیکن میں اس کو حصول بشارت کے لیے کرتا ہوں کہ جس کی طرف میں جاتا ہوں بخدا وہ بشارت یہ ہے کہ ہم اس قوم سے تلوار لے کر ملیں گے۔ تھوڑی دیر لڑیں گے اور پھر حوروں سے بغل گیر ہوں گے۔

صبح ہو گئی۔ دنیا کی سب سے مشہور صبح۔ وہ صبح جسے ابد الآباد تک آنے والی اور الست تک گزر جانے والی صبحوں پر فخر ہے کہ ہم وہ تھے جس نے عالم کا یہ سرمایہ حیرت تماشہ دیکھا کہ ہزاراں ہزار مطمئن دشمنوں کے مقابلہ میں چند نفوس کو بھوک اور پیاس نے دل شکستہ نہیں کیا۔ انھیں شب کی عبادت نے سیر نہیں کیا۔ بقول روضۃ الشہدا: "چوں آثار صبح ظاہر شد امام حسینؑ بانگ نماز گفت یاران جمع شدہ و تیمم کردہ سنت ادا کردند و فرض را بجماعت گزاردند"۔ اور وہ آخری مرتبہ کمر بندی کے قبل اپنے امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں۔ وہ مایوس نہیں ہوئے۔ وہ اپنے اعتقاد میں متزلزل نہیں ہوئے۔ وہ ایک تالاب تھے۔ جنھیں محیطِ زمین نے ہوا اور موجوں سے مستغنی کر دیا تھا۔ ان کے سکون میں تغیر لانے والی کوئی قوت پیدا نہ ہوئی تھی۔ وہ ایک پہاڑ تھے جسے تیز اور تند ہوائیں متحرک نہیں کرتیں۔ وہ تھے اور عبادت تھی۔ عبادت تھی اور وہ تھے۔ کاش ابن مریم انھیں دیکھتے۔ کاش موسیٰ بن عمران ان کی زیارت کرتے۔ کاش داؤد ان کا مطالعہ کرتے۔ کاش رشی گوتم غور کرتے کہ ان کی شانتی کا تصور اپنے درجہ میں اس سے کہاں تک مقابل تھا۔ ان کے لیے کوئی خوف نہ تھا۔

ان کے لیے کوئی آرزو آرزو نہ تھی۔ صرف ان کے خاموش چہروں میں آنکھیں تھیں جو ادھر ادھر پھرتی تھیں۔ جدھر امام حرکت فرماتے تھے۔ دل میں ایک حرکت تھی کہ ہم کس طرح اپنے امام کی بہتر طریقہ سے حفاظت کر سکیں۔ اس کی فکر نہ تھی کہ ہم نہ رہیں گے۔ غم اس کا تھا کہ ہمارے بعد امام پر کون قربان ہو کر امام پر آنچ نہ آنے دے گا۔

حسینؑ کا آخری خواب

لیکن نماز صبح کے قبل حسینؑ کے آخری خواب کا واقعہ ہے جسے روضۃ الصفا اور روضۃ الشہداء وغیرہ سے نقل کرتا ہوں کہ: "حسینؑ کو ذرا سی جھپکی آ گئی تھی کہ پھر اٹھ بیٹھے۔ اور فرمایا کہ ابھی میں نے خواب دیکھا ہے کہ بہت سے کتے مجھ پر بھونک رہے تھے اور چاہتے تھے کہ کاٹیں۔ ان میں سے ایک ابلق کتا سب سے زیادہ جرأت کر رہا تھا۔ ظن غالب ہے کہ میرا قاتل مبروص ہوگا۔ اسی وقت میں نے اپنے جد بزرگوار کو دیکھا اور وہ فرما رہے تھے کہ اے فرزند تو شہید آل محمد ہے۔ ملائکہ اعلیٰ علیین تیرے استقبال کے لیے مستعد ہیں۔ آج میرے پاس افطار کرنا۔ جلدی کرو اور ناخوش دل نہ ہو۔ اے میرے عزیز اور احباب میری موت قریب ہے اور زندگی کی کوئی امید نہیں ہے"۔

تعبیہ لشکرِ شام

سعد ابن ابی وقاص کا لونڈا تعبیہ لشکر میں مصروف ہوا۔ اور یقیناً کوئی کثیر لشکر اپنے اسلحہ اور سامان اپنے سپاہیوں اور انتظام کے باوجود اپنی ترتیب کے وقت ویسا ذلیل نہیں ہو سکتا تھا جیسا شام کے حاکم کا یہ لشکر شاید ہی کسی لشکر کو اپنی فتح کا ایسا یقین ہو جیسا عمرو بن سعد کے لشکر کو تھا۔ اور شاید کوئی لشکر اپنی فتح کے یقین کے بعد بھی ایسا ذلیل ہوا ہو جیسا یہ لشکر ہوا۔ آخر یہ کون سے مقابل لشکر کے لیے صفیں درست کر رہا تھا۔ مقابل کون تھا۔ کوئی لشکر کہاں تھا۔ جو تیس یا اکیس ہزار سپاہیوں کی گھنی صفوں سے ٹکراتا۔ کہے کوئی اگر کوئی کہہ سکے کہ حسینؑ کے چند رفقا کا شمار لشکر میں ہے۔ خوب کہتے ہیں ابو الفضل بادشاہ حسینؑ صاحب بی اے اپنے رسالہ حسینؑ ان فلاسفی آف ہسٹری میں کہ: "حسینؑ کے تمام لشکر میں مشکل سے ایک آدمی لڑنے کے قابل تھا۔ ضعیف اور متزلزل ڈھانچوں کو جن کو شدت عطش اور نقاہت سے بغیر ٹھوکر کھائے چلنا دشوار ہوتا اب اپنے عالم نزع میں ان سپاہیوں سے لڑنا تھا جسے شجاعوں پر عرب فخر کر سکتا تھا۔ تاہم حسینؑ ان کی آخری وصیت تھے نوجوان نمو پاتے ہوئے جن کا شباب بھی ابھی پورا نہ ہوا تھا۔ اور نہ جن کی شادی کی حنا کی سرخی مٹی تھی ان سے ان کی ماؤں اور بہنوں نے شہید ہو جانے کی خواہش کی تھی۔ قاسم کے ایسے بارہ برس کے بچے۔ جنھیں گھوڑے پر سوار ہونے کے لیے دوسرے کی مدد کی ضرورت تھی۔ ایک امادت شہادت کو دیو خصال کافروں کے مقابلہ میں بچانے کے لیے کھڑے تھے"۔

حسینؑ کے لشکر کا شش ماہہ جانباز

مجھے اس قدر اور کہہ دینا ہے کہ شام کے انبوہ کثیر کے مقابل میں حسینؑ کے سپاہیوں کی تعداد اس وقت پوری ہوتی ہے جس وقت حسینؑ کے لشکر میں حضرت علی اصغرؑ کا جھولا بھی رکھ دیا جاتا ہے!۔

اور کیا یہ بھی مجھے کہنا ہوگا کہ: "اور دنیا میں کوئی چھوٹا سا لشکر اس شان سے نہیں کھڑا ہوا جیسے حسینؑ کے یہ چند بچے، جوان اور بوڑھے رفقا کھڑے تھے۔ ہاں وہ زمین، وقت اور اتفاق پیدا نہیں ہوا۔ جس میں اتنے آدمی اتنے لشکر کے مقابلہ میں باوجود شدید بھوک اور پیاس کی شدت کے لیے اس طرح تیار اور منتظر ہوتے۔

شاید ہی کسی لشکر کو اپنی شکست اور سپاہی کو اپنے قتل کا ایسا یقین ہو جیسا حسینؑ کے لشکر اور سپاہیوں کو تھا۔ اور شاید ہی کوئی لشکر اس یقین کے بعد اس استقلال اس شان اور شہادت کے شوق میں موت کا ایسا منتظر ہو۔ اور ان کی یہ بے خوفی، مصائب پر صبر، استقلال اور جان سے لاپرواہی نہ ہوتی۔ اگر وجہ ایسی عظیم نہ ہوتی، اور شاید باوجود وجہ کے بھی دنیا کا یہ حیرت خیز واقعہ، واقعہ کی صورت میں نہ آتا۔ اگر مرکز ایسا نہ ہوتا جیسے حسینؑ تھے۔

میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس جگہ مسٹر واشنگٹن ارونگ کی عبارت درج کر دوں: "اپنی چھوٹی سی جماعت کو اپنی یاس آلود قسمت کی شرکت کے لیے ایسا مصمم دیکھ کر حسینؑ ان کی جانوں کو گراں قیمت پر بیچنے کے لیے تیار ہوئے اور انھوں نے ان کی موت کو یادگار قربانی بنانے کی تیاری کی --- صبح کو حسینؑ جنگ کے لیے تیار ہوئے۔ ان کی تمام فوج چالیس پیادے اور تیس سواروں پر مشتمل تھی۔ لیکن ہر ایک میں شہیدانہ جوش تھا۔ حسینؑ اور ان کے مخصوص رفقاء نے غسل کیا۔ تیل لگایا اور اپنے کو معطر کیا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ: "تھوڑی دیر میں ہم جنت کی سیاہ چشم حوروں کے ساتھ ہوں گے"۔ (مورخ کا آخری فقرہ یہی مورخین کے لحن کا ہم آہنگ ہے)

عمرو بن سعد کا تعبیہ لشکر میمنہ عمر بن حجاج الزبیدی، میسرہ شمر ذی الجوشن، افسر رسالہ عروہ بن قیس، افسر پیادگان شبث ربعی، علم دار زید۔ سپہ سالار عمرو بن سعد بن ابی وقاص تعداد لشکر کم سے کم (۲۱۰۰۰) بقول کامل بن اثیر ابن سعد نے اہل مدینہ پر عبداللہ بن زبیر اسدی کو مقرر کیا۔ بقول ابن خلدون ربیعہ و کندہ پر اشعث بن قیس مقرر ہوا۔

حسینؑ کا تعبیہ لشکر میمنہ زہیرؓ بن قین۔ میسرہ حبیب بن مظاہر۔ علمدار عباسؑ بن علیؑ۔ سپہ سالار حسینؑ بن علیؑ بن ابی طالب علیہما السلام تعداد لشکر کم سے کم (۷۲)

ابی مخنف کے نزدیک حسینؑ کے افسر میسرہ ہلال بن نافع بجلی تھے اور ہر ایک کے پاس بیس بیس مجاہد تھے۔ باقی حضرتؑ کے ماتحت تھے۔ بچے اور اہل بیت خیمہ میں تھے۔

ان روح فرسا وقتوں میں جو حسینؑ اور ان کے ہر ہمراہی پر گزر رہے تھے ظاہر ہے کہ اقربا اور اصحاب حسینؑ کا صف جنگ درست کرنا بجائے خود ایک مرثیہ تھا۔ لیکن اس سے بڑھ کر رجز اور افتخار کا موقع بھی دوسرا نہ تھا۔ کون تھا جو انھیں داد دیتا۔ لیکن نیکی داد کی منتظر نہیں رہتی۔ نیکی اپنا آپ ہی انعام ہے۔ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا اس اطمینان اور مسرت کا جو تصفیہ شہادت اور آمادگی کے بعد ان سرتاج شہدائے عالم کو حاصل تھی۔ لیکن میں بھول جاؤں گا اگر یہ کہوں کہ انھیں کسی نے داد نہ دی۔ داد ملی۔ بہترین داد جو مل سکتی تھی۔ ہاں داد کے لیے میری غرض فضائے جنگ کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ میں خیام حسینؑ کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ میں اس وقت اہل بیت حسینؑ کو اہل بیت حسینؑ کے نام سے یاد نہیں کر رہا ہوں بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ خاندان ہے جو سرچشمۂ شجاعت و حمیت عرب کا مایہ ناز اور افتخار ہے۔ عرب کی شجاعت میں عورتوں کا بڑا حصہ ہے۔ اب سوچو کہ نہ صرف زنان بنی ہاشم بلکہ اکثر مجاہدین کی بیبیاں جو خیام حسینؑ میں ہیں وہ دیکھ رہی ہیں کہ ہمارے ورثا اس وقت آمادہ جنگ ہیں۔ کبھی کوئی مجاہد ان سے بہتر دیکھنے والوں کی امید نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی دنیا میں کوئی آنکھ اس طرح جنگ دیکھنے کے لیے نہ اٹھی ہوگی اور نہ کبھی دل میں پردہ پوری فطری حرکت ہوگی جیسی اس وقت جب کہ یہ بیبیاں آفرین کہتی تھیں۔ میرا یہ تصفیہ ہے کہ اس وقت جب کہ یہ یادگار افراد عالم پیش آنے والے واقعات کو

بھول کر جنگی صف میں کھڑے ہو رہے تھے۔ بیبیاں بھی اپنے مددگاروں کی اس پر افتخار مشغولیت کے نظارہ میں اپنے دردناک مستقبل کو بھول گئی تھیں۔

اختلافات

اس جگہ یہ بھی کہہ دوں کہ آغاز جنگ اور شہدا کی شہادت کا سلسلہ بھی ہر مؤرخ کے نزدیک یکساں نہیں ہے۔ مثلاً کوئی کہتا ہے کہ لڑائی تیسری چوتھی سے شروع ہوگئی۔ کسی کے نزدیک دسویں کو شروع ہوئی اور مغلوبہ کی جنگ میں اکثر اصحاب حسینؑ شہید ہوگئے۔ کسی کے نزدیک اکثر رفقائے حسینؑ یکے بعد دیگرے شہید ہوئے۔ کسی کے نزدیک حضرت عباسؑ غالباً آٹھویں کو شہید ہوئے اور حر بن یزید کا نمبر بجالانے پہلے شہید کے آخری کے قریب تھا۔

بُریر کا خطاب

اعثم کوفی کہتا ہے: "جس وقت طرفین کی صفیں قائم ہوگئیں بریر بن حصین (خضیر) ہمدانی نے آگے بڑھ کر عمرو بن سعد سے کہا: کیا تو امیرالمومنین حسینؑ سے جنگ کرے گا؟ اس نے جواب دیا: ہاں لڑوں گا۔ اور اس معرکہ میں بہت سے تن بے سر ہوں گے۔ بریر بن حصین نے کہا: تم انھیں واپس کیوں نہیں جانے دیتے کہ مکہ یا مدینہ چلے جائیں۔ اے کوفہ والو کیا تم نے ہی خط بھیج کر امیرالمومنین کو طلب نہیں کیا تھا؟۔ کیا تم بھول گئے اور اس مضبوط عہد و پیمان کو جن میں خدا کو گواہ کیا تھا توڑ ڈالنا جائز رکھتے ہو۔ پھر آپؑ کی طلبی میں اس قدر مبالغہ اور تاکید کس لیے تھی؟ تم تو یہ کہتے اور دعویٰ کرتے تھے کہ: جس وقت تم یہاں آجاؤ گے، ہم سب تمہارا ساتھ دیں گے، اور خدمت گزاری سے پیش آئیں گے۔ تمہارے اقراروں پر بھروسہ کر کے یہاں آئے تو تم ان کے دشمنوں کے دوست بن گئے، اور تلواریں سونت کر مقابلہ پر آجمے۔ آپؑ کی اولاد پر پانی بند کر دیا۔ آب فرات جس سے عام آدمی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہودی، مجوسی، ترسا اور جنگلی چرند و پرند سب پانی پیتے ہیں۔ اور تم کتوں اور وحشیوں تک کو اس سے نہیں روکتے۔ کیا سبب ہے کہ پیغمبر کی ذریت اور اطفال کو پیاسا مارتے۔ ایک قطرہ پانی نہیں دیتے ہو۔ یہ کون سا مذہب ہے اور قیامت کے دن محمد مصطفےٰؐ کو کیا جواب دو گے۔ اور اس گناہ کا کیا عذر کرو گے؟۔ مالکم لا سقاکم اللہ یوم القیامۃ فبئس القوم انتم۔ عمر کے لشکر میں کچھ لوگوں نے آواز دی۔ اے بُریر! ہم نہیں سمجھتے کہ تو کیا کہہ رہا ہے۔ بُریر نے کہا: "میں تمھیں جس قدر سمجھاتا ہوں اسی قدر تمہاری گمراہی اور زیادہ ہوتی جاتی ہے اور مجھے تمہارے افعال سے زیادہ عبرت ہوتی ہے۔ اے خدا تُو خوب جانتا ہے کہ میں اس قوم سے بیزار ہوں، تو انھیں ہلاک کر اور ان کے ظلموں کی سزا دے۔ ان لوگوں نے تیر کمان پر ہاتھ ڈالا، اور کئی تیر اس کی طرف چھوڑے۔ بُریر واپس چلا آیا۔

زہیرؒ بن قین کی تقریر اور مکالمہ

ابن خلدون میں زہیر بن قین کی تقریر ہے کہ: "اے اہل کوفہ! مسلمانوں پر مسلمانوں کا یہ حق ہے کہ ایک دوسرے کو نصیحت کریں اس وقت ہم اور تم بھائی بھائی ہیں۔ اور ایک ہی دین پر ہیں۔ جب تک ہم میں اور تم میں جنگ نہ ہو۔ پس جب کہ ہمارے اور تمہارے لڑائی ہو جائے گی تو عصمت اٹھ جائے گی۔ ہم اور تم ایک ہی گروہ میں ہیں۔ ہم کو اور تم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذریت میں امتحان اور آزمائش کی غرض سے مبتلا کیا ہے۔ ہم تم کو ان کی مدد اور گمراہ بن گمراہ عبیداللہ بن زیاد کے ذلیل کرنے کو بلاتے ہیں۔ بے شک تم اس سے سوائے بدی کے اور کچھ نہ دیکھو گے وہ تمہارے ہاتھوں کو کاٹے گا

تم کو مثلہ کرے گا۔ تمہارے معزز اور ممتاز سرداروں حجر بن عدی اور اس کے ہمراہی ہانی بن عروہ جیسے کو قتل کرے گا۔

لشکر کا جواب

کوفیوں نے زہیرؓ کو گالیاں دیں اور ابن زیاد کی صفت وثنا کر کے کہا: واللہ جب تک ہم تجھ سے اور تیرے دوست (یعنی حسینؑ) اور اس کے ہمراہیوں سے نہ لڑیں گے۔ یا اس کو گرفتار کر کے اپنے امیر عبیداللہ بن زیادہ کے پاس نہ لے جائیں گے۔ اس وقت تک یہاں سے نہ ٹلیں گے۔

زہیرؓ نے کہا: اے اللہ کے بندو! ابن سمیہ کی نسبت ابن فاطمہؑ امداد و محبت کا زیادہ مستحق ہے۔ پس اگر تم اس کی مدد نہیں کر سکتے ہو تو اس کو اس کے ابن عم یزید بن معاویہ کے پاس بھیج دو۔ خدا کی قسم بغیر قتل حسینؑ کے بھی یزید تمہاری اطاعت سے راضی ہو جائے گا۔

شمر بن ذی الجوشن نے تیر مار کر کہا: "اللہ تیرا منھ بند کرے تو نے بک بک کر کے دماغ پریشان کر دیا"۔

زہیرؓ: اے کمینہ بد خصال! تو وحشی جانور ہے۔ میں تجھ سے خطاب نہیں کرتا۔ خدا کی قسم تجھ کو کتاب اللہ سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ تجھے قیامت کی رسوائی اور عذاب الٰہی کی بشارت دیتا ہوں"۔

شمر: اللہ تعالیٰ تجھے اور تیرے دوست کو عنقریب شربت مرگ پلائے گا۔

بے مثل اظہار اخلاص

زہیرؓ: کیا تو ہم کو موت سے ڈراتا ہے۔ خدا کی قسم تیرے ساتھ کی حیات ابدی سے حسینؑ کے ساتھ مرجانا بہتر ہے۔

یہ کہہ کر زہیرؓ تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ پھر بلند آواز سے کہا: اللہ کے بندو تم اس کمینہ بے دین کے دھوکہ میں نہ آجانا۔ خدا کی قسم اس گروہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت نہ نصیب ہوگی جو خون اس کے اہل بیت کا بہائے گا۔ اور اس کے اعوان و انصار کو قتل کرے گا۔

حضرتؑ نے واپس بلا لیا

زہیرؓ کچھ اور بھی کہنے کو تھے کہ حضرت نے واپس بلا لیا۔ (کامل ابن اثیر کی بھی یہی عبارت ہے)

بعض مورخین مثل کامل ابن اثیر، ابن خلدون اور ابی مخنف نے حضرتؑ کے خطبہ کے بعد زہیرؓ بن قین کو فہمائش کے لیے بھیجا ہے۔ لہوف اور اعثم کوفی نے ان کا پہلے ذکر کیا ہے۔

حضرتؑ کا لشکرِ شام سے مخاطبہ

بہر حال اس سے کوئی مفید حالت نہیں پیدا ہوئی۔ بقول اعثم کوفی: امیر المومنین حسینؑ آگے بڑھ کر اس گروہ کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور لشکر کوفہ پر نظر ڈالی۔ عمر کو دیکھا کہ سرداران لشکر کے بیچ میں کھڑا ہے۔ تھوڑی دیر تک تعجب سے دیکھا۔ پھر فرمایا: الحمد للہ کہ دنیا فانی اور نیست و نابود ہونے والی جگہ ہے۔ سب نیک و بد گزر جاتے ہیں۔ محنت اور راحت کسی شئے کو قیام نہیں۔ نیک بخت وہ شخص ہے جو اس دنیا کی نمائش اور بے اصل چیزوں کی طرف میل نہیں کرتا۔ اور بد نصیب وہ ہے جو اس کے فنا ہونے والے بے قیام امور کی خواہش رکھتا اور اس کی وفاداری کے بھروسہ پر ہتھیلی سیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کی نعمتیں ہمیشہ برقرار رہیں گی۔ غرض اسی قسم کی باتیں اپنے دل سے فرما رہے تھے۔ پھر بآواز بلند ان کو نصیحتیں کرنے لگے

اور نہایت عمدہ تقریر کی اور نیکوکاری کی تاکید فرمائی۔

فصاحت کا اعتراف اور خون

عمر بن سعد نے کہا: آپؑ کا کلام قطع کرو۔ کیونکہ وہ اپنے باپ کا بیٹا ہے اگر اسے بولنے دو گے تو دن اور رات اسی میں گزر جائے گا۔ اور بولنے سے ذرا نہ رکے گا۔

کامل ابن اثیر کے موافق: جب حضرت سوار ہوئے تو مصحف آگے رکھ لیا تھا۔ اور فرمایا: "خداوندا ہر امر اور ہر سختی جو مجھ پر نازل ہو مجھے تیرا ہی اعتماد اور تجھی پر بھروسا ہے۔ جس رنج سے دل ضعیف ہو۔ میں اس میں تیری ہی مدد مانگتا ہوں۔ جس میں حیلہ نہ ہو اور دوستوں سے کام نہ نکلے۔ میں صرف تجھ ہی سے کہتا ہوں اور تیرے سوا ہر ایک سے اعراض کرتا ہوں تو ولی ہے ہر نعمت کا"۔ (ابن خلدون)

خطبہ کی تفصیل

اس کے بعد حضرتؑ کا خطبہ تھا کہ: "اے لوگو! تم میری بات سنو عجلت نہ کرو۔ تا آنکہ جہاں تک مجھ پر واجب ہے تم کو سمجھا نہ لوں۔ اور میں اپنے آنے کا عذر تم سے بیان نہ کر لوں۔ پس اگر تم میرے عذر کو قبول کر لو گے اور میری بات کی تصدیق کرو گے اور حق پسندی کرو گے تو تمہاری اس میں سعادت مندی ہے اور تمہارا اس میں کوئی حرج نہ ہوگا۔ اور اگر تم میرے عذر کو نہ قبول کیا چاہتے ہو تو تم لوگ مجمع ہو اور اپنے شرکاء کو ایک جا کرو تا کہ تم پر کوئی امر مشتبہ نہ رہے۔ بعد اس کے میرے سامنے آؤ اور بے رو رعایت دیکھو۔ بے شک میرا ولی اللہ ہے جس نے کتاب اتاری ہے اور صالحین کا ولی ہے (آپؑ کی بہن یہ آواز سن کر رو اٹھیں۔ آپؑ نے اپنے بھائی عباسؑ اور لڑکے علیؑ کو ان کے چپ کرانے کو بھیجا۔ جب وہ لوگ خاموش ہو گئے تو آپؑ نے حمد و ثنا کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجا۔ بعد ازاں پھر ان کو مخاطب کر کے ارشاد کیا) اما بعد تم لوگ میرا نسب بیان کرو اور دیکھو کہ میں کون ہوں۔ پھر اپنی طبیعتوں (انفسکم) کی طرف رجوع کرو اور اس کو جھڑکو اور غور کرو"۔ کیا میرا قتل کرنا اور میری آبرو ریزی تمھیں روا اور جائز ہے؟ کیا میں تمھارے نبیؐ کا نواسہ نہیں ہوں اور اس کے چچازاد بھائی اور افضل ترین مومنین باللہ و تصدیق کنندۂ رسولؐ کا بیٹا نہیں ہوں؟ کیا حمزہؑ سید الشہدا میرے باپ کے چچا نہ تھے۔ کیا جعفرؑ شہید طیار فی الجنۃ میرے چچا نہیں ہیں۔ کیا تم کو یہ خبر نہیں پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے اور میرے بھائی کے حق میں فرمایا ہے کہ تم دونوں سردار جوانان جنت ہو۔ اور اہل سنت کے آنکھ کی ٹھنڈک ہو۔ پس جو میں نے تم سے کہا ہے اس کی تصدیق کرو اور یہی سچ ہے۔ بخدا میں نے جھوٹ کبھی نہیں بولا۔ جب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوتا ہے۔ اور اگر تم مجھے جھوٹا جانتے ہو تو تم میں ایسے لوگ موجود ہیں جن سے یہ دریافت کرو گے تو وہ تم کو اس سے آگاہ کریں گے۔ جابر بن عبد اللہ یا ابوسعید یا سہیل بن سعد اور زید بن ارقم یا انس سے دریافت کرو۔ وہ تم کو بتلائیں گے کہ انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ سنا ہے۔ کیا تم میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو تم کو میری خونریزی سے روکے۔ پس اگر تم لوگ میرے کہنے پر مشکوک ہو یا میرے نواسۂ رسولؐ ہونے پر شک کرتے ہو تو واللہ مابین مشرق و مغرب میرے سوا تمھارے نبیؐ کا تم میں اور نہ کسی غیر میں کوئی نواسہ نہیں ہے۔ اگر ہو تو بتلاؤ۔ کیا میں نے تم میں سے کسی کو مار ڈالا ہے جس کا عوض مجھ سے طلب کرتے ہو یا کسی مال کو میں نے ضائع کر دیا ہے جس کا معاوضہ مانگتے ہو یا کسی زخم کا

قصاص مانگتے ہو؟"۔

یزید کے لشکریوں میں سے کسی نے اس کا کچھ جواب نہ دیا تو آپؑ نے شبث بن ربعی، حجار بن الحر، قیس بن الاشعث، زید بن الحرث کو نام بنام پکار کر فرمایا: الم تکتبوا الی فی القدوم الیکم۔ ان لوگوں نے خط لکھنے اور بلانے سے انکار کیا۔ آپؑ نے ارشاد کیا: ﴿بلی فعلتم ایھا الناس! اذکرھتمونی فدعونی انصرف الی مأمنی من الارض﴾ بے شک تم نے یہ کیا ہے۔ اے لوگو! تم کو مجھ سے نفرت ہے تو مجھے چھوڑ دو میں کسی محفوظ سرزمین کی طرف چلا جاؤں"۔

حضرت علیؑ کا یادگار فقرہ

قیس بن الاشعث بولا: تم اپنے چچا کے لڑکے، ابی مخنف کا فقرہ ہے کہ انزل علی حکم الامیر ابن زیاد۔ یعنی امیر ابن زیاد کے حکم کی کیوں اطاعت نہیں کرتے وہ تمہاری برائی کا خواہاں نہ ہوگا۔ آپؑ نے جواب دیا: "کیا تیرا یہ مقصد ہے کہ بنی ہاشم تجھ سے مسلم بن عقیل کے سوا اوروں کا خون بہا طلب کریں؟ خدا کی قسم میں ذلیل و خوار ہو کر تمہارا مطیع نہ ہوں گا۔ اور نہ میں غلاموں کی طرح مجبور ہو کر اس کی امارت کا اقرار کروں گا۔ اے اللہ کے بندو میں اپنے اور تمہارے رب سے امن کا خواستگار ہوں اور ہر متکبر اور اس شخص سے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا ہے اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں"۔ (اس قدر فرمانے کے بعد آپؑ نے اونٹنی بٹھلا دی اور اتر پڑے)

وضع

ابو مخنف کہتا ہے: جب صبح ہوئی آپ نے اذان و اقامت کہی اصحاب کے ساتھ نماز پڑھی۔ درع رسول پہنا۔ عمامہ سحاب فرق مطہر پر رکھا اور ذوالفقار حمائل کر کے سامنے آئے۔

عمر بن سعد کی کارگزاری

عموماً مورخین یہ کہتے ہیں کہ جس وقت صف کشی ہوئی عمر سعد نے پہلا تیر حسینؑ کے لشکر کی طرف چلایا اور لوگوں کو اپنی اس حرکت پر گواہ کیا۔ کسی ظریف نے یہ بھی کہا کہ: "اور پہلا شخص جو جہنم میں جائے گا وہ تو ہوگا"۔

تیروںؑ کی بارش اور حضرتؑ کا اپنے اصحابؑ سے خطابؑ

اس کے بعد بقول صاحب لہوف پھر تو برابر فوج عمر بن سعد سے ایسے تیر چلے کہ گویا بارش ہو رہی تھی۔ سید الشہدا نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ خدا تم پر رحمت کرے تم بھی لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاؤ کہ سوائے اس کے اب کوئی چارہ نہیں ہے کہ یہ تیر ہماری طرف اس قوم کے قاصد ہیں کہ پیام مرگ لاتے ہیں۔ پس وہ اصحاب ایک گھنٹہ تک حملہ کر کے لڑے یہاں تک کہ سید الشہدا کی ایک جماعت قتل ہوگئی۔ اس وقت حضرتؑ سید الشہدا نے اپنے محاسن پر دست اقدس رکھا اور فرمانے لگے کہ سخت غضب ہوا خدا یہود پر جب کہ انھوں نے خدا کے لیے فرزند قرار دیا۔ اور بہت ہی قہر کیا خدا نے مجوس پر جب کہ انھوں نے سوا اس کے چاند و سورج کی پرستش کی اور بے انتہا غضب کیا خدا نے اس قوم پر جو کہ اپنے نبی کے نواسہ کے قتل پر مستعد و متفق ہوگئی۔ بخدا میں وہ بات ہرگز نہ مانوں گا جو وہ لوگ چاہتے ہیں۔ یعنی ذلت نہ گوارا کروں گا۔ یہاں تک کہ اپنے خون کا خضاب لیے ہوئے خدا سے جا کر ملوں۔

حر بن یزید ریاحی اور ابن سعد

بقول ابن خلدون: جس وقت عمر بن سعد نے امام حسینؑ پر حملہ کرنے کا قصد کیا حر بن یزید اس کے پاس آئے۔ اس نے دریافت کیا:

خدا تیرا بھلا کرے کیا تو حسینؑ سے لڑنے کو جاتا ہے؟ حر نے جواب دیا ۔۔۔۔ واللہ اس کی لڑائی سے یہ آسان ہے کہ لوگوں کے سر کٹ کٹ کر گریں اور ہاتھ شل ہو جائیں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ اس نے جو درخواستیں پیش کی تھیں ان میں سے کس کو منظور کیا؟ اور اس کے منظور کرنے میں تمھیں کیا عذر ہے؟ عمر بن سعد نے کہا: خدا کی قسم اگر میرے اختیار میں کچھ ہوتا تو میں اس کو منظور کر لیتا لیکن تمھارا امیر حسینؑ کی کسی درخواست قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔

حر کی دماغی کیفیت

حر یہ سن کر آہستہ آہستہ امام حسینؑ کی طرف چلے۔ ایک شخص نے انھیں کے قبیلہ سے جس کا نام مہاجر بن اوس تھا چلا کر کہا: واللہ مجھے تمھارا کام مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ تم کو میں نے کسی لڑائی میں اس طرح لرزاں چلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اگر کوئی شخص اہل کوفہ میں سے یہ فقرہ تمھاری نسبت کہتا تو مین اس سے لڑ مرتا۔ حر نے جواب دیا: میں اپنے کو جنت و دوزخ کے لیے تول رہا ہوں۔ اور حق یہ ہے کہ میں جنت کے مقابلہ میں کسی چیز کو نہیں سمجھتا۔ چاہے مجھے کوئی مار ڈالے یا جلا ڈالے۔

حر حسینؑ کے پاس تائب ہو کر آتا ہے

یہ کہہ کر گھوڑے کو ایک اڑ لگائی اور دم زدن میں امام حسینؑ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ عرض کیا:

"اے ابن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ مجھے آپ پر فدا کرے۔ میں وہی ہوں جس نے تم کو واپس جانے سے روکا تھا جو تم کو ہیر پھیر کر اس راہ پر لایا تھا۔ اور جس نے شامت اعمال سے آپ کو اس مقام پر لا کر چھوڑا تھا۔ خدا کی قسم مجھے یہ امید نہ تھی کہ یہ لوگ آپکے ساتھ یہ برتاؤ کریں گے اور آپ کی ایک بات بھی نہ مانیں گے۔ میں نے یہ رنگ دیکھ کر اپنے جی میں کہا چونکہ بعض باتوں میں ان کی میں اعانت کر چکا ہوں وہ مجھے آپ کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر اپنا مخالف نہ سمجھیں گے۔ پس اگر اب بعض امر میں ان کے خلاف میں کروں کوئی ہرج نہیں ہے۔ واللہ اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ آپ سے وہ نہ لڑیں گے تو میں ہرگز آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہوتا۔ میں خدا کی قسم آپ کی خدمت میں جو لغزش مجھ سے ہو چکی ہے اس سے تائب ہو کر آیا ہوں تا کہ آپ کی اعانت کروں یہاں تک کہ آپ کے روبرو میں جان بحق تسلیم کروں۔ کیا آپ کے نزدیک میرا یہ توبہ مقبول ہوگا؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ اللہ تعالیٰ یہ توبہ قبول فرمائے گا۔ اور تمھاری لغزش سے درگزر کرے گا۔

حر کا لشکر سے خطاب

حر نے یہ سن کر اپنے ہمراہیوں سے مخاطب ہو کر کہا: اے لوگو! تم لوگ حسینؑ کی ان درخواستوں میں سے جو وہ پیش کرتے ہیں کیوں نہیں قبول کرتے۔ اللہ تعالیٰ تم کو دارین میں فلاح عنایت کرے گا اور تم کو ان کی لڑائی اور قتل سے نجات دے گا۔ عمر بن سعد بولا میں خود اس امر کا خواہاں تھا۔ لیکن کیا کروں مجبور ہوں۔ بعد اس کے حر نے لشکریوں کو مخاطب کیا۔ اے اہل کوفہ! بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم نے خود ان کو بلایا۔ جب وہ آئے اس غرض سے کہ تم ان کی اعانت کرو اور ان کے ہمراہ ہو کر لڑو تو تم ان کے قتل پر کمربستہ ہو گئے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ تم نے اس غریب کو اس طرح پر روک رکھا ہے کہ کہیں وہ جا نہیں سکتے۔ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ تم نے ان کو قیدیوں کی طرح گرفتار کر لیا ہے۔ کسی ملجا و مامن کی طرف جانے نہیں دیتے۔ نہ وہ کوئی نفع حاصل کر سکتے ہیں اور نہ کسی مضرت کے دفع کرنے پر قادر ہیں۔ تم نے ان کو آب فرات سے بھی روک دیا ہے۔ جس سے یہودی اور نصرانی اور مجوسی سیراب ہوتے ہیں۔ کتے، سور اور کل چرند و پرند اس کو پیتے ہیں۔ کیا وہ (حسینؑ) اس قابل

بھی نہیں ہیں اور ان کے ہمراہی شدت تشنگی سے بے ہوش ہو رہے ہیں۔ تم لوگوں نے اچھا بر تاؤ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد ان کے اہلِ بیتؑ کے ساتھ کیا۔ اگر تم لوگ اپنے اس فعل سے توبہ نہ کرو گے اور مخالفین کو دریائے فرات سے نہ ہٹاؤ گے تو اس روز جب کہ شدت تشنگی سے لوگ بے چین ہوں گے اللہ تعالیٰ تم کو بھی سیراب نہ کرے گا۔

ابن سعد کے لشکریوں نے جواب میں تیر مارا اور حر واپس آ کر جاں نثاران حسینؑ میں کھڑے ہو گئے۔ اس مؤرخ کے موافق حر تمام عرصہ جنگ میں سے زیادہ تریں شریک تھے۔ کبھی تنہا اور کبھی کئی اصحاب کے ساتھ دشمنوں سے جنگ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آخر میں شہید ہوئے۔

حجر بن حر

ابو اسحٰق اسفرائینی کہتے ہیں کہ پھر ابن سعد کے لشکر سے ایک سوار نکلا اور کہنے لگا: اے ابو عبداللہ میں حجر بن حر ہوں۔ اب میں آپ کے سامنے شہید ہوتا ہوں۔ پھر اس نے ابن سعد کی فوج سے

بیٹے کی شہادت پر حر کا شکر

نکل کر اس پر حملہ کر دیا۔ اور لڑتے لڑتے ایک سو بیس سپاہی قتل کیے۔ جس کے بعد وہ خود بھی مارا گیا۔ جب اس کے باپ نے دیکھا تو بڑا خوش ہوا۔ اور بولا شکر ہے اللہ کا جس نے میرے بیٹے کو شہادت کا درجہ عطا کیا۔ پھر وہ امام حسینؑ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہنے لگا: یا حضرتؑ میرا بیٹا آپ کے سامنے شہید ہو گیا ہے اب میں بھی تیار ہوں۔

حسینؑ لاش لائے

امام حسینؑ رضی اللہ عنہ نے کہا: ٹھہرو میں اسے لاتا ہوں۔ یہ کہہ کر آپ نے مخالفین پر حملہ کیا۔ اور لڑتے لڑتے آٹھ سو مخالف قتل کیے۔ اور حجر کو اٹھا لائے اور اس کو خیمہ کے سامنے رکھ دیا۔ حر نے کہا: اب مجھے بھی نکلنے کی اجازت دیجیے۔ امام حسینؑ رضی اللہ عنہ نے اجازت دی، اور کہا خدا تمھارے کام کی قدر کرے۔

صاحب روضۃ الشہدا نے حر کی جو کیفیت لکھی ہے اس سے اس کا عمل طبعی کچھ زیادہ معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ مہاجر بن اوس یا حر کے بھائی مصعب بن یزید کے متذکرہ سوال و جواب کے بعد "ناگاہ نعرہ از جگر بر کشید و گفت اے برادر بشارت باد کہ نفس من بہشت را اختیار کرد۔ پس تازیانہ بر اسپ زد و نزد امام حسینؑ آمد و از مرکب پیادہ شد۔۔۔ امام حسینؑ از بالائے اسپ دست مبارک بر سر و روے او مالید۔۔۔ اما چوں مصعب برادر حر دید کہ حر آخرت را بر دنیا گزید و دست ولا در دامن آل عبا زد اسپ بر انگیخت و دست در فتراک امام حسینؑ آویخت۔ لشکر عمر سعد گمان بردند کہ بجنگ برادر میرود۔ چوں بمیدان رسید گفت اے برادر خضر راہ من شدی و مرا از ظلمت گمراہی بسر چشمۂ آب حیات معرفت رسانیدی من ہم با تو موافقت کردہ از اہل مخالفت بیزار شدم فردا ہر دو گواہ معاملہ یکدگر باشیم و باہم از امام حسینؑ بہرہ شہادت گیریم حر برادر خود را نزد یک امام حسینؑ آورد و صورت حال را بموقف عرض رسانید امام مظلوم او را در بر گرفت و بنواخت"۔ اسی مؤرخ کے موافق حر کے اجازت طلب کرنے پر حضرتؑ نے فرمایا: تو میرا مہمان ہے، صبر کر۔ کوئی دوسرا جائے۔ لیکن حر حسینؑ کی طرف لذتِ حیات کے حصول کے لیے نہ آئے تھے کہ ٹھہرتے۔ فوجی عہدہ میں زیادتی کی امید نہ تھی جو ادھر کھینچ لائی تھی۔ یہ سب تو امیر شام کی طرف سے تھا جہاں حر چار ہزار سواروں کا افسر تھا۔ حر اس لیے حسینؑ کی طرف آیا تھا کہ اسے اپنے پہلے موقع میں جینے سے اس موت میں شرکت زیادہ

دل کش تھی جس کے لیے حسینؑ آمادہ تھے اور عمرو بن سعد کے لشکر میں ہزاروں سواروں کی سپہ سالاری سے یہ زیادہ قابلِ افتخار تھا کہ حسینؑ کے بھوکے پیاسے سپاہیوں کی صف میں ایک لحہ کھڑا ہو جائے۔ آمادگانِ شہادت جنھیں اپنی موجودہ حیات اپنے ہوش پر بار معلوم ہوئی تھی۔ اپنی حقیقت کا ثبوت اس سے بہتر کیا چاہ سکتے تھے جو حر کی آمد سے ظاہر تھی۔

حر کو اجازت دینے کے وقت حسینؑ کے الفاظ

بقول ابو اسحاق اسفرائنی حضرتؑ اجازت دی۔ "اور کہا خدا تمھارے کام کی قدر کرے۔

حر کا رجز

حر یہ شعر پڑھتا ہوا نکلا: میں حر ہوں اور مہمان نوازی کے لیے مشہور ہوں۔ تمھاری گردنوں سے تلوار کو لہو پلاؤں گا۔ میں اس شخص کی طرف سے جو تمام اس اونچی سرزمین میں اترنے والوں سے اچھا ہے تم کو ماروں گا۔ اور ہرگز کچھ خوف نہ کروں گا۔

حر صفوان کو قتل کرتے ہیں

روضۃ الشہدا کے موافق ابن سعد نے صفوان بن حنظلہ کو جو ایک نہایت مشہور سوار تھا۔ اس ہدایت کے ساتھ بھیجا کہ اسے سمجھا بجھا کر لے آئے، اور اگر وہ نہ مانے تو اسے قتل کرے۔ صفوان بڑے ٹھاٹھ سے سامنے آیا۔ حر نے اسے دیکھ کر کہا:

حر: صفوان تیری ہنرمندی اور فرزانگی سے عجب ہے کہ تو یزید کے فسق اور علانیہ کو جان کر اور حسینؑ کی پاکیزگی اور پاک زادگی سے واقف ہو کر آمادۂ جنگ ہے۔

صفوان: میں یہ سب جانتا ہوں اور ابن زیاد بھی واقف ہے لیکن مال دولت اور جاہ یزید کے پاس ہے۔ ہم لوگ سپاہی آدمی ہیں۔ ہمیں گھوڑا۔ اسلحہ مرتبہ اور منصب چاہیے۔ تقویٰ طہارت، علم اور فضیلت کیا فائدہ۔

حر: تو حق کو پہچان کر اسے چھپاتا ہے۔

رد و بدل ہوئی۔ حر کا نیزہ صفوان کا سینہ توڑ گیا۔ صفوان کے تین بھائیوں نے یکبارگی حملہ کیا۔ حر نے آگے والے کو زین سے اٹھایا اور پٹکا کہ پھر نہ اٹھا۔ دوسرے کو تلوار سے قتل کیا۔ تیسرا بھاگا۔ مگر سنان نیزہ نے اسے بھی چن لیا۔ حر کی ہیبت سے اب کسی تنہا کو جرأت آزمائی کا حوصلہ نہ ہوا۔ اور حر نے اب دشمن کی صفوں پر حملہ شروع کیا۔ گرمی جنگ میں حر کا گھوڑا مارا گیا۔ اور یہ پیدل جنگ کرنے لگا۔

حضرتؑ۔ حر کے لیے گھوڑا بھیجتے ہیں

حسینؑ نے دیکھا اور ایک گھوڑا بھیجا۔ حر نے دیکھا۔ رکاب کو بوسہ دیا۔ سوار ہوا اور جولان کیا۔ رجز خوانی شروع کی۔ حر تھا اس کا ہاتھ تھا اور تلوار کے لیے دشمن کا انبوہ تھا۔ دشمن کے گروہ کو متفرق کرنے کے اثنا میں خیال ہوا کہ ایک مرتبہ حسینؑ کے پاس ہو آئیں لیکن اب تو اس کے کانوں میں یہ صدا آرہی تھی کہ اے حر میدانِ شہادت سے اب کہاں جاتا ہے۔ یہیں سے یہ تصفیہ کی آواز دی کہ: "یا ابن رسول اللہ آپ کے جد بزرگوار کے پاس جاتا ہوں کوئی پیغام ہے؟"۔ حسینؑ نے گرفتہ آواز سے یہ صاف جواب دیا: "مطمئن رہو ہم بھی تمھارے پیچھے آتے ہیں"۔ ان دونوں صداؤں نے اصحاب میں سے اکثر کے منھ سے کراہ نکال دی۔ اب حر نے اپنے کو سپاہیانہ ہوش نہیں بلکہ شہادت کے جوش اور موت کی جلدی کے لیے دشمنوں پر دے مارا۔ اور ارادہ کی قوت کا تماشہ شروع ہوا۔ مرنے والے کے سامنے جانا آسان

نہیں ہے۔ خصوصاً ایسے سپاہیوں کا جن کی اخلاقی جرأت اپنے انبوہ پر ہو۔

عام حالت

لیکن حر اپنے ہاتھ ارادہ اور گوشت و خون کی حد سے زیادہ معجزہ نہیں دکھا سکتا تھا۔ انبوہ اور ہجوم کو بھی کچھ فائدہ حاصل ہے۔ جو تلوار کو سپاہیانہ فرسے نہیں اٹھا سکتے تھے وہ نیزہ مارنے میں دوری کے لحاظ سے کچھ محفوظ تھے اور تیر انداز اس سے بھی زیادہ حقیقتہً دشمن نے تیروں سے ہی جنگ کی۔ اکیلا تیروں کے مینہ کا کہاں تک جواب دے سکے۔ گھوڑا اور سوار دونوں چھلنی ہو کر گرتے تھے اور دشمن خوش ہو لیتا تھا کہ ہم نے نتیجہ حاصل کر لیا۔ اگر کوئی بہادر باوجود تیروں اور بے شمار حربوں کے زخم کے گرتے ہوئے گھوڑے سے سنبھلنا چاہتا تھا تو اس کو انبوہ میں اس قدر وقت ملنا بہت دشوار اور پھر سنبھلا بھی تو کہاں تک۔ مگر صرف دل اور ارادہ سے بحث ہے فولاد اور گوشت کا مقابلہ نہیں ہے۔ گوشت تو فولاد کی غذا ہو ہی جائے گا۔ لیکن کہنا یہ ہے کہ نفس انسانی میں تصمیم کی یہ قابلیت ہے۔ جو دنیا کے ہر ممکن القیاس آکہ قتل سے تمسخر کرے۔ موت کی ہیبت اس کے لیے ہیبت نہیں ہے۔ نزع کی تکلیف اس کے لیے شیریں اشتیاق کا لذت بخش درد ہے۔

دشمن کی تعداد جو حر نے کم کی

صاحب روضۃ الصفا ابو الموفق خوارزمی کی زبانی کہتا ہے کہ حر نے چالیس سوار اور پیادوں کے قتل کرنے کے بعد شہادت پائی۔

ابو اسحٰق اسفرائنی مقتولین کی تعداد پانچ سو سپاہی بتاتا ہے۔

صاحب صواعق محرقہ کے نزدیک حر اس وقت میدان میں آئے جس وقت حضرتؑ کے پاس رفقاء شہید ہو چکے تھے۔

ابو مخنف کے نزدیک حر نہ ابتدا میں شہید ہوئے اور نہ درمیان میں بلکہ جس وقت صرف حضرت قاسم ان کے برادر عالی مقدار احمد اور حضرت علیؑ بن الحسینؑ (علیؑ اکبر) باقی تھے۔ اور موسیٰ بن عقیل کے بعد احمد بن محمد الہاشمی شہید ہو چکے تھے کہ حضرتؑ نے اپنی تنہائی دیکھ کر بلند آواز سے اِستغاثہ فرمایا اور جس وقت حر کے کان میں حضرتؑ کی صدا پہنچی یہ اپنے چچا ابن قرہ کے پاس آئے اور کہا: اے چچا کیا تم نہیں دیکھتے کہ حسینؑ اِستغاثہ کر رہے ہیں اور کوئی ان کی مدد نہیں کرتا۔ ان کے انصار اور اولاد شہید ہو چکی۔ کیا تمہارا ارادہ ہے کہ ان کی طرف چلو کہ ان کے سامنے مارے جائیں۔ دنیا میں آدمی مسافر کی حیثیت رکھتا ہے اور دنیا کی کرامتیں فانی ہونے والی ہیں۔ شاید ہم لوگ شہادت سے بہرہ یاب ہوں اور اہل سعادت میں محسوب ہوں۔ اس نے کہا: ہمیں اس کی کیا حاجت ہے۔ پس حر نے اسے ترک کیا اور اپنے بیٹے کے پاس آیا۔ اور کہا: اے فرزند کیا تو حسینؑ کو نہیں دیکھتا کہ وہ اِستغاثہ کر رہے ہیں اور کوئی ان کی مدد نہیں کرتا۔ اے فرزند چلو ان کی طرف چلیں اور ان کے سامنے جنگ کریں۔ شاید شہادت سے بہرہ یاب اور اہل سعادت میں محسوب ہوں۔ لڑکے نے کہا: حباً وکرامۃً۔ اس کے بعد یہ دونوں آدمی ابن زیاد کے لشکر سے اس طرح نکلے گویا جنگ کے ارادہ سے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ حسینؑ کے پاس پہنچے۔ پس حر اپنے گھوڑے سے اترے۔ سر جھکایا اور حضرتؑ کے دست و پائے مبارک کو مس کر کے چیخ مار کر روئے۔ پس حضرتؑ نے کہا: یا شیخ اپنے سر کو اٹھا۔ پس اس نے اپنا سر اٹھایا۔ (اس کے بعد گفتگو عام ہے) پھر حر نے اپنے فرزند سے حملہ کرنے کو کہا۔ اس نے حملہ کیا۔ یہاں تک کہ ستر سپاہیوں کو قتل کیا۔ اور اس کے بعد شہید ہوا۔ جس وقت باپ نے بیٹے کو شہید دیکھا بہت خوش ہوا۔ اور کہا: خدا کا شکر ہے کہ مجھے میرے مولا

حسینؑ بن امیرالمومنین کے سامنے شہادت نصیب ہوئی۔ اب حر بڑھے اور عرض کیا کہ مجھے پسند ہے کہ میں آپ کے سامنے مارا جاؤں۔ پس فرمایا حضرتؑ نے کہ جاؤ خدا تمھیں اس میں برکت دے۔

اس مؤرخ کے موافق جب حر نے بہتیروں کو قتل کیا تو عمر بن سعد نے اپنے سپاہیوں کو آواز دی ویل ہو تم پر اس پر تیرباران کرو۔ پس ان پر تیر برسنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کی جلد ساہی کے ایسی ہو گئی اور گرفتار کر لیے گئے۔ اور ان کا سر کاٹ کر پھینک دیا گیا۔ حسینؑ نے اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ چہرہ اور دانتوں سے خون پاک کیا اور کہا واللہ تیری ماں نے غلطی نہیں کی تھی کہ تیرا نام حر رکھا تھا۔ واللہ تو دنیا میں حر اور آخرت میں سعید ہے۔ پس ان کے لیے طلب اِستغفار فرمائی اور اس پر روئے اور یہ اِشعار فرمائے:

کیا اچھا حر تھا حر بن ریاح جو نیزہ پڑنے کے وقت صبر سے کام لیتا تھا۔ بلاؤں کی گرم بازاری میں جب کہ بہادر نیزے لیے ہوئے چل رہے ہوں۔ حر بھی خوب آدمی تھا۔ اس نے حسینؑ کو پکارا۔ اور صبح کے وقت اس نے اپنی جان سے سخاوت کی۔ کامیاب ہوئے وہ لوگ جنھوں نے حسینؑ کی مدد کی اور ہدایت اور فلاح حاصل کی۔ (اس مرثیہ سے شہادت صبح کے وقت ثابت ہوتی ہے)

اس کے بعد حر کا سر اپنے مقتولین میں رکھ دیا۔ صاحب سر الشہادتین کے موافق وقتل معہ اخوہ وابنہ ومولاہ (اور اس کے ساتھ اس کا بھائی بیٹا اور غلام شہید ہوئے)

روضۃ الشہدا کے موافق حر کی شہادت کے بعد حضرتؑ دوبارہ دونوں صفوں کے درمیان کھڑے ہوئے اور فرمایا:

"اے اہلِ کوفہ و شام! میں نے لڑائی کی ابتدا نہیں کی بلکہ تم نے میری طرف تیر پھینکے۔ میں اب بھی تم سے جنگ کے لیے آمادہ نہیں اور اب تک میرے لشکر سے کوئی مارا نہیں گیا۔ حر اس کا بھائی، بیٹا اور غلام تمھارے آدمی تھے جنھوں نے میری مدد کی۔ میں دوبارہ اتمام حجت کرتا ہوں کہ آئندہ تمھیں عذر نہ رہے۔ اے گروہ آؤ اور ان تین باتوں میں سے ایک کو اختیار کرو۔ اول یہ کہ مجھے جانے دو کہ یزید سے بغیر مکابرہ بحث کروں۔ اگر سمجھوں گا کہ وہ حق پر ہے تو اس سے بیعت کروں گا۔ ورنہ وہ جانے گا۔ یہ سن کر کسی نے آواز دی کہ تمھیں یزید کے پاس نہ جانے دیں گے اس لیے کہ تم شیریں زبان اور تیز بیان شخص ہو۔ تم دل پذیر عذرات سے اسے فریفتہ کر لو گے اور اس وقت خلاص ہو کر فتنہ کھڑا کرو گے۔ اور دوبارہ ملک میں فتنہ کھڑا ہو گا۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ جب یہ نہیں کرتے تو چھوڑ دو کہ میں اپنے نانا کے روضہ کی مجاوری کروں اور اپنی عمر زہد اور عبادت میں بسر کروں۔ جواب دیا کہ ہم اس پر بھی راضی نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ اجلاف عرب تمہارے گرد جمع ہوں اور تم پھر طلب خلافت کرو۔ فرمایا کہ اگر یہ دونوں باتیں تمھیں منظور نہیں تو مجھے اور میرے رفقا کو پانی دو کہ تمام آدمیوں کو پانی میں حق بشری حاصل ہے۔ جواب دیا کہ پانی کا ذکر نہ کرو کہ اگر تم لوگ بوسیدہ بھی ہو جاؤ تو بغیر بیعت یزید کے ایک قطرہ فرات کا نہ دیں گے۔ ہمیں تم سے بجز جنگ کے کوئی راہ نہیں ہے۔ فرمایا: جب یہ نہیں کرتے تو جنگ کے لیے ایک ایک آدمی نکلو کہ شجاعت اور ہنرمندی ظاہر ہو۔ کہا: ہاں، اے ابنِ فاطمہؑ ہم ایسا کریں گے۔

بریر بن خضیر

ابن خلدون کے موافق یزید بن معقل حلیف عبدالقیس جوش مردانگی میں آ کر للکارتا ہوا میدان میں آیا اور بریر بن خضیر سے بلا کر کہا: دیکھا اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیا کیا؟ بریر نے جواب دیا:

واللہ اس نے میرے ساتھ بہت بڑی بھلائی کی ہے اور تیرے ساتھ برائی، یزید بولا تو جھوٹ کہتا ہے۔ اس سے پیشتر تو جھوٹ نہ بولتا تھا خدا کی قسم تو گمراہی میں پڑ گیا۔ ابن خضیر نے کہا: اگر تجھے اپنی سچائی کا دعویٰ ہے تو آ ہم اور تو مقابلہ کریں اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کریں کہ ہم میں سے جھوٹے اور گمراہ پر اللہ تعالیٰ اپنی پھٹکار بھیجے۔ یزید سے اس کا جواب کچھ نہ بن پڑا۔ تلوار کھینچ کر دوڑا۔ فریقین میں کمال تیزی سے دو دو ہاتھ چل گئے۔ یزید بن معقل نے تلوار چھوڑ کر نیزہ کا وار کیا۔ بریر نے خالی دے کر تلوار چلائی جو خود پھاڑ کر سر میں تیر گئی۔ بریر تلوار نکالنے میں مصروف تھے کہ رضی بن منقذ عبدی نے لپک کر وار کیا۔ ابن خضیر لپٹ پڑے۔ تھوڑی دیر تک زور آزمائی ہوتی رہی۔ بالآخر ابن خضیر نے رضی کو مار لیا۔ سینہ پر چڑھ کر خنجر نکالنے لگے۔ اس اثنا میں کعب بن جابر ازدی نے پہنچ کر ابن خضیر کی پشت میں نیزہ مارا ابن خضیر زخم کے صدمہ سے بے تاب ہو کر اٹھ آئے۔ کعب نے نیزہ چھوڑ تلوار کا وار کیا جس سے ابن خضیر شہید ہو گئے اور رضی اپنی قبا جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ واپسی کے بعد کعب کی بیوی نے ملامت کرتے ہوئے کہا۔ تف ہو تجھ پر۔ تو ابن فاطمہؑ کے خلاف لڑنے کو آیا، اور پھر اس پر طرہ یہ ہوا کہ بریر سید القراء کو تو نے شہید کیا۔ جا تیرا رو سیاہ ہوا۔ میں تجھ سے اب ہرگز نہ بولوں گی۔ بقول روضۃ الشہدا حضرتؑ نے بریر کی شہادت پر فرمایا کہ بریر خدا کے بندگان صالحین میں سے تھے۔

اعثم کوفی اور روضۃ الشہدا کے موافق بریر کے قاتل کا ایک پسر عم ضبید بن جابر تھا۔ وہ قاتل سے کہنے لگا کہ تو نے بریر کو قتل کیا جو خواص اہل اللہ اور مقربان درگاہ خدا میں سے تھا۔ اس کے علاوہ لوگوں نے بھی ملامت کی۔ قاتل بریر شرم سے لشکر سے چلا گیا اور تھوڑے دنوں میں مر گیا۔ اس کے اشعار بھی ہیں جو اس نے اظہار ندامت میں کہے ہیں۔

عبداللہ بن عمیر کلبی

لشکر شام سے یسار غلام زیاد اور سالم غلام عبداللہ نکل کر میدان میں آیا۔ مقابلہ کے لیے للکار کر لڑنے والے کو طلب کیا۔ امام حسینؑ کی طرف سے عبداللہ بن عمیر کلبی میدان جنگ میں آئے۔ یہ کوفہ سے مع اپنی بیوی کے آپ کی خدمت میں آئے تھے۔ یسار و سالم نے نام و نسب دریافت کیا۔ عبداللہ نے نام بتلایا۔ یسار و سالم بولے ہم تم کو نہیں جانتے۔ ہمارے مقابلہ پر زہیر بن قین یا حبیب بن مظاہر، بریر بن خضیر جیسے لوگوں کو آنا چاہیے۔ عبداللہ نے ترش رو ہو کر یسار کو مخاطب کیا: اے حرامی بچہ۔ تیرے مقابلہ پر وہ لوگ آئیں گے؟ تو اس قابل نہیں ہے کہ تو ان کی تیغ تیز سے ہلاک کیا جائے۔ تیری روح و تن کے فیصلہ کے لیے میری تلوار کافی ہے۔ یسار یہ سن کر حملہ کی نیت سے آگے بڑھا۔ عبداللہ نے وار خالی دے کر تلوار چلائی۔ تھوڑی دیر تک فریقین میں ایک دوسرے پر وار چلا کیے۔ سالم اپنے ہمراہی کو کمزور دیکھ کر عبداللہ کی طرف جھپٹا۔ عبداللہ نہایت تیزی سے یسار کا کام تمام کر کے سالم کی طرف مڑے۔ سالم نے وار پر وار کرنے شروع کر دیے۔ عبداللہ روکتے اور حملہ کا بھی جواب دیتے جاتے تھے۔ بالآخر عبداللہ کے بائیں ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئیں۔ اور پھر انھوں نے لپک کر ایسا وار کیا کہ سالم بھی اسی جگہ ٹھنڈا ہو گیا۔ ان کی بیوی ام وہب ایک لکڑی لے کر یہ کہتی ہوئی دوڑی میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں رسول اللہؐ کے نواسوں کے لیے لڑتے لڑتے اپنے کو تصدق کر دو۔ عبداللہ نے میدان جنگ میں آنے سے روکا۔ ام وہب نے جانے سے انکار کر کے کہا: میں تمھارا ساتھ جب تک زندہ ہوں نہ چھوڑوں گی۔ امام حسینؑ نے آواز بلند سے کہا: تم لوگوں نے اہل بیت رسالت کے ساتھ بہت بڑی بھلائی کی اللہ تعالیٰ تم کو جزائے خیر دے گا۔ اے ام وہب تجھ پر اللہ تعالیٰ رحم کرے لوٹ آ۔

عورتوں پر جہاد نہیں ہے۔ ام وہب یہ سن کر واپس آ گئیں۔
ابن خلدون اتنا کہہ کر چپ ہو جاتا ہے۔ لیکن روضۃ الشہدا میں تھوڑی تفصیل اور ہے۔ وہ یہ کہ جب یسار اور سالم میدان میں آئے تو بریر اور حبیب نے میدان میں جانا چاہا۔ لیکن حضرتؑ نے انھیں روکا اس وقت عبداللہ بن عمیر کلبی آگے بڑھے اور عرض کی کہ یا ابن رسول اللہ مجھے اجازت جنگ دیجیے۔ حضرتؑ نے دیکھا کہ ایک گندم گوں دراز بالا قوی بازو، کشادہ سینہ ایک شخص ہے جس کے چہرہ سے شان مبارزت ظاہر ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ یہ ان دونوں غلاموں کو قتل کرے گا اور اجازت دی۔ عبداللہ پیادہ ان کی طرف گئے۔ دونوں نے کہا تم کو ہم نہیں پہچانتے۔ تم جاؤ اور بریر یا زہیر بن قین کو بھیجو۔ عبداللہ نے کہا کہ اب تم اس قابل ہو گئے ہو کہ سرداران لشکر اور مبارزان دلاور کو بلانے کی جرأت کرو۔ تمہارا قتل کرنے والا مثل تمہارے غلام ہونا چاہیے۔ اگر یہ پاس نہ ہوتی تو ہم لوگوں کو تم سے جنگ کرنا شرم کی بات تھی۔ یسار نے غصہ میں عبداللہ کو نیزہ مارا۔ عبداللہ نے رد کیا۔ اور تلوار کا وار کیا کہ وہ گھوڑے سے گرا۔ عبداللہ دوڑے کہ اس کا کام تمام کر دیں کہ سالم پشت کی طرف آیا۔ اور عبداللہ پر تلوار مارنی چاہی۔ امیرالمومنین حسینؑ کے لشکر سے لوگوں نے عبداللہ کو ہوشیار کیا۔ عبداللہ نے آوازوں پر التفات نہ کی اور اپنی تلوار یسار کے سینہ پر رکھ کر زور کیا کہ نوک پشت سے نکل آئی۔ اب سالم کی تلوار سر کے قریب پہنچ گئی تھی۔ عبداللہ نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ جس سے انگلیاں قلم ہو گئیں۔ عبداللہ نے ذرا پرواہ نہ کی اور یسار کے سینہ سے تلوار نکال کر سالم کے پاس پہنچے اور ایک ہی ہاتھ میں اس کا کام تمام کر دیا۔ یہ دیکھ کر ابن زیاد کے غلاموں نے عبداللہ کو گھیر لیا۔ اس بہادر نے بہتیروں کو قتل کیا۔ بالآخر شہید ہوئے۔

وہب بن عبداللہ کلبی

بریر کے بعد ایک نوخیز نوجوان میدان میں آیا۔ جس کا نام روضۃ الصفا اور روضۃ الشہدا میں وہب بن عبداللہ کلبی ہے۔ ان کی ماں کا نام قمر بتایا گیا ہے۔
ابن خلدون سے عبداللہ بن عمیر کلبی کی جنگ لکھی گئی ہے۔ اور اس مؤرخ نے ان کی زوجہ کا نام ام وہب کہا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ عبداللہ مع اپنی بی بی کے کوفہ سے کربلا میں آئے تھے۔ میں سوچتا ہوں کہ وہب اسی شہید کے فرزند تھے جس کا نام عبداللہ بن عمیر کلبی تھا۔ اور قمر کی کنیت ام وہب تھی۔ پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر وہب عبداللہ ابن عمیر کلبی ہی کے فرزند تھے تو کیا ہوا کہ یہ اپنے بہادر باپ کے بعد ہی فوراً میدان میں نہ دکھائی دیے۔ بلکہ بریر نے جنگ کی اور شہادت پائی۔ حضرتؑ نے چھوٹے سے لشکر میں اگر جنگ کے لیے جانے کا اب تک کوئی اصول تھا تو یہ کہ ایک شخص جاتا وہ کوئی ہو۔ دوسرے یہ کہ حضرتؑ سے اجازت لیتا یا اپنی جگہ سے السلام علیک یا ابن رسول اللہ کہتا اور میدان کی طرف بڑھ جاتا۔ اس کے علاوہ عرب کیا معنی دنیائے قدیم کا یہ مسلمہ اصول تھا کہ اگر کوئی بہادر کسی کو بلاتا تھا تو وہی اس سے جنگ کرتا تھا۔ اگرچہ اس میں درجہ امتیاز کی استثنا ہو جایا کرتی تھی۔ یزید بن معقل بریر کو طلب کر چکا تھا۔ اس لیے بریر بڑھ گئے۔ جس طرح حصین بن نمیر نے حبیب بن مظاہر کو طلب کیا۔ اور انھوں نے بھی للکار قبول کی۔ اس کے علاوہ رفقائے حسینؑ میں ہر شخص جس طرح آمادہ شہادت تھا اس سے پیش و پس کا سوال ہی درمیان سے اٹھ گیا تھا۔ جو بڑھ گیا۔ حسینؑ تو اس وقت روکتے جب یہ جانتے کہ روکنے سے صورت واقعہ دوسری ہو گی۔ اگر کوئی ان حضرات میں مجبور تھا کہ اپنی جگہ نہ چھوڑے تو صرف حضرتؑ کے چھوٹے سے لشکر کے افسران میمنہ و میسرہ یا حضرت عباس علم دار تھے۔ نظر بریں پیش روی یا پس روی کا خیال زیادہ قوی نہیں ہے۔

تاہم میرے نزدیک بھی کہا جاسکتا ہے کہ "غالب قرینہ ہے" "یقین" کا لفظ استعمال نہیں کرسکتا۔
بہرحال اس بہادر کا دردانگیز قصہ شہادت یوں شروع ہوتا ہے کہ وہب کی عروسی کو صرف سترہ روز ہوئے تھے اور یہ مع اپنی نئی دلہن اور ماں کے خیام حسینؑ میں تھے کہ جنگ شروع ہوچکی تھی۔ (روضۃ الشہدا) بربر شہادت پاچکے تھے کہ قمر وہب کے پاس گئیں۔ میں روضۃ الشہدا کے بعض خوبصورت الفاظ اور جذبات قرض لیتا ہوں۔ وہ کہتی ہیں: اے فرزند باوجود اس محبت کے جو مجھے تیرے ساتھ ہے۔ میں تجھ سے چاہتی ہوں کہ تو جگر گوشہ مصطفےٰ کی حالت پر غور کر کہ وہ کربلا میں کس طرح بے وفاؤں میں گھر گئے ہیں۔ "میخواہم کہ مراز خون خود شربتے دہی تاشیرے کہ از پستان من خوردہ ای بر تو حلال گردد"۔ میری تمنا ہے کہ حسینؑ پر اپنی جان نثار کر کہ قیامت میں تجھ سے راضی ہوں۔ اے جان مادر جا۔ اور اس سرور پر اپنا سر فدا کر اور مردان راہ خدا کی طرح ہوا و ہوس کو ترک کردے۔
روضۃ الصفا کے لفظوں میں وہب نے جواب دیا کہ: افعل یا اماہ ولا اقصر ان شاء اللہ۔ (یعنی اے ماں میں ایسا ہی کروں گا۔ اور خدا نے چاہا تو کمی نہ کروں گا) وہب نے کہا: اے اماں مجھے فرزند رسولؐ پر جان نثار کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ لیکن مجھے نئی دلہن کا خیال ہے کہ اس نے اس غربت میں ہم سے موافقت کی اور ابھی اسے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اگر اجازت دو تو اس سے رخصت لے لوں۔ ماں نے کہا: جاؤ لیکن عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں فریب دے اور تو سعادت جاوید سے محروم ہوجائے۔ وہب نے کہا: اے ماں خاطر جمع رکھو حسینؑ کی محبت میں اس طرح کمر نہیں باندھی ہے کہ کوئی اسے فریب سے کھول دے۔ اس کے بعد یہ نوجوان اپنی بی بی کے پاس آیا۔ اور کہا اے بانوئے دمساز آج حسینؑ دشت کربلا میں گھر گئے ہیں اور غریب و تنہا ہیں۔ چاہتا ہوں کہ اپنی جان ان پر نثار کروں کہ قیامت میں رضائے الٰہی اور شفاعت رسولؐ سے محروم نہ رہوں۔ بتولؑ عذرا کی خوشنودی اور علیؑ مرتضیٰ کی مدد میرے شامل حال رہے۔ یہ سن کر عروس کے دل سے آہ نکل گئی۔ اور کہا: اے میرے غمگسار میری ہزار جان حسینؑ پر صدقے ہو۔ کاش عورتوں پر بھی جہاد واجب ہوتا کہ میں بھی اپنی جان فدا کرتی۔ (اس کے بعد دونوں حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عروس نے عرض کی) میری التجا یہ ہے کہ میں یہاں غریب اور بے مددگار ہوں۔ میں خیمہ حرم محترم میں رہنے دی جاؤں کہ میری عصمت محفوظ رہے گی۔ حضرتؑ اور اہل بیت اس عورت کی بات پر چشم پر آب ہوگئے۔ اور جوان نے کہا کہ یا حضرتؑ میں نے اسے آپ کے سپرد کیا۔ حضور اسے مخدرات عصمت و طہارت کے حوالہ کردیں۔ یہ کہہ کر رخصت ہوا۔ میدان میں پہنچا اور حضرتؑ کی مدح میں شعر کہا: ؎

امیری حسینؑ و نعم الامیر له لمعة کالسراج المنیر

شہسواری اور سپہ گری کے فن دکھاتے بہتیروں سے جنگ کی اور واپس آکر کہا۔ اے ماں تجھ سے راضی ہوئی؟۔ ماں نے کہا: ہاں تو نے بہتیری بہادری دکھائی لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ جب تک زندہ ہے لڑائی سے ہاتھ نہ اٹھا۔ وہب نے جواب دیا: اے ماں میں ایسا ہی کروں گا۔ لیکن اگر تو اجازت دے تو عروس کو رخصت کرلوں۔ ماں نے اجازت دی۔ آیا۔ نوازش کی ابھی باتیں کررہا تھا کہ ھل من مبارز کی صدا آئی۔ اٹھا۔ روانہ ہوا۔ عروس دیکھتی رہ گئی۔ وہب نے ایک بڑے شہسوار کو جس کا نام حکم بن طفیل تھا مارا۔ اب نرغہ میں آگیا۔ اس کی تلوار اپنے جوہر دکھاتی رہی۔ یہاں تک کہ بازو بے کار

ہوگئے۔ اور گرا۔ دشمنوں نے سر کاٹ کر حضرتؑ کے لشکر کی طرف پھینک دیا۔ "مادرش در جست و سر پسر برداشتہ رو بروئے نہاد و گفت احسنت نیکو کردی اے جان مادر واے حلال زادہ مادر اکنوں رعنائے من ترا حاصل شد۔ و بشہدائے راہ خدائے تعالیٰ واصل گشتی"۔ یہ کہہ کر سر کو عروس کی گود میں رکھ دیا۔ عروس نے کوئی تنکا یا سلائی خون میں ڈبوئی آنکھ میں کھینچی۔ آہ کی اور مر گئی۔ یہ بھی روایت ہے کہ جب وہب کا ہاتھ کٹ گیا تو چوب خیمہ لے کر دوڑی اور شمر نے اپنے غلام کو اشارہ کیا۔ اس نے زوجہ وہب کے سر پر ایک گرز مارا کہ تیورا کر گری اور مر گئی۔ یہ بھی روایت ہے کہ ماں وہب کا سر لے کر میدان میں گئی اور قاتل کے سینہ پر اس زور سے کھینچ مارا کہ وہ گرا اور مر گیا۔ حسینؑ نے واپس بلا لیا۔ ضعیفہ نے عذر کیا کہ بہو اور بیٹے کے غم میں میں نے ایسا کیا۔

ظہیر بن حسانؓ اسدی

صاحب روضۃ الشہدا کے موافق لشکروں کی آراستگی کے بعد ابن سعد نے ساحہ زیدی کو میدان میں بھیجا۔ اور یہ بڑے ٹھاٹ سے میدان میں آیا۔ اور اپنا نام و نسب ظاہر کیا۔ اسے دیکھ کر ظہیر بن حسان جو قبیلہ بن اسد کے مشہور شجاع تھے حضرتؑ کے پاس آئے اور عرض کی کہ یہ مشہور بہادر ہے مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس سے مقابلہ کروں۔ اجازت لی گھوڑا اڑاتے ہوئے ساحہ کے قریب پہنچے۔ ساحہ انھیں دیکھ کر کانپ گیا۔ اور نصیحت شروع کی کہ اے بہادر تجھے شرم نہیں آتی کہ اپنے اہل و عیال اور مال کو چھوڑ کر حسینؑ کی مدد کو گیا۔ ظہیر نے کہا: اے کمینہ تجھے شرم نہیں آتی کہ تو نعمت فانی کے لیے عقوبت دائمی اختیار کرتا ہے۔ اور اہل بیت پیمبر پر تلوار کھینچتا ہے۔ ساحہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ ظہیر نے اس کے منہ پر نیزہ مارا اور وہ کھوپڑی توڑ کر باہر نکل گیا۔ اور ساحہ گرا اور ادھر ظہیر عمر سعد کے سامنے گئے اور نعرہ کیا کہ اے اہل عراق جو مجھے جانتا ہے وہ جانتا ہے۔ اور جو نہیں جانتا میں ظہیر بن حسان اسدی ہوں۔ کون آتا ہے کہ بخت آزمائی کی جائے۔ اہل عراق و شام ظہیر کا آوازہ شجاعت سن چکے تھے کوئی نہ ہلا۔ ابن سعد نے للکارا اور اس کی صدا پر نصر بن کعب نخعی جو فن سپہ گری کا بڑا مشاق تھا۔ آگے بڑھا۔ اور ظہیر سے کہنے لگا کہ ایک بہادر تو اپنی نعمات اور قبیلہ سے جدا ہو گیا۔ چل تجھے ابن زیاد کے پاس لے چلوں کہ تیری تکلیفیں دور ہوں اور راحت نصیب ہو۔ ظہیر نے کہا: اے مردود ابن زیاد دین میں بدعتیں کرتا ہے میں آل رسولؐ کی خدمت میں ان کی صحبت اور معرفت سے بہرہ مند ہوں۔ مجھے دشمنوں سے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ نصر سوچ رہا تھا کہ ظہیر کو گفتگو میں مشغول کر کے وار کرے۔ ظہیر سمجھ گئے اور اب نصر بھی نیزہ کے زخم سے زمین پر لوٹنے لگا۔ اس کا بھائی صالح بن کعب بھائی کے انتقام کے لیے آیا۔ ظہیر نے اسے بھی نیزہ مارا اور ابن کعب بچا لیکن گھوڑا بھڑکا۔ رکاب میں الجھا اور گھوڑے کی لاتوں سے تمام ہو گیا۔ اس کا لڑکا کعب بن نصر میدان میں آیا اور ظہیر کا خون آشام نیزہ ناف سے گزر کر پشت سے جھلکنے لگا۔ ظہیر نے مقتولین میں سے کسی کے اسلحہ کی طرف توجہ نہ کی۔ اور پیادوں پر حملہ کیا۔ بہتیروں کا قتل کرنے کے بعد پھر میدان میں آئے اور مقابل طلب کیا۔ اور تھوڑی دیر میں ستائیس سپاہیوں کو قتل کیا۔ ابن سعد نے حجر بن الاحجار کو غیرت دلائی۔ حجر نے تنہا دست بدست جنگ سے اعراض کیا۔ لیکن صلاح دی کہ میں تین سو سواروں کو تین جگہ بٹھاتا ہوں اور اس کے مقابل جا کر پسپا ہوتا ہوں وہ پہلی کمین میں پھنسے گا۔ ورنہ دوسری اور تیسری سے جانبر نہ ہوگا۔ ظہیر ان مکاریوں سے بے خبر میدان میں کھڑے تھے۔ پیاس نے ہونٹ خشک کر دیے تھے اور خاک سے سانس لینا دشوار تھا کہ جو سامنے

گیا لیکن کسی قدر دور کھڑا ہوا۔ ظہیر نے کہا کہ یا ابن الاحجار آگے بڑھ کہ تھوڑی کوشش کی جائے۔ حجر نے کہا میں تجھ سے جنگ کرنے نہیں آیا ہوں بلکہ یہ کہنا ہے کہ باوجود اس شجاعت کے تو ابن زیاد کے پاس کیوں نہیں آتا کہ تجھے مال دنیا سے غنی کردے گا۔ تو جانتا ہے کہ حسینؑ کے پاس مال، اختیار اور اقتدار نہیں ہے۔ ہمت بلند کا اقتضا یہ ہونا چاہیے کہ اہل دولت کے پاس جائے۔ ظہیر نے کہا دولت امام حسینؑ سے طلب کرنی چاہیے کہ وہ ہمائے اوج ولایت ہیں۔ میری علوے ہمت مجھے ان کے قریب رکھتی ہے۔ ابن زیاد نابکار ہے اور جن لوگوں نے اختیارات اس کے حوالہ کیے ہیں وہ بھی ایسے ہیں۔ حجر چپ ہو گیا اور خوف سے آگے نہ بڑھا۔ ظہیر نے باگ لی تھی کہ حجر نے پیٹھ پھیری۔ ظہیر کو غیرت آئی کہ دشمن اس طرح قبضہ سے نکل جائے۔ گھوڑے کو ڈانٹا اور پیچھے دوڑے کمین کے پاس پہنچ کر حجر جا ملا اور مددگاری سوار داہنے بائیں سے آگئے اور طعن و ضرب شروع ہو گئی۔ ظہیر نے نیزہ سیدھا کیا اور نہایت بے جگری سے جنگ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ پہلی کمین دوسری میں مل گئی اور تھوڑی دیر میں دوسری تیسری میں شامل ہو گئی۔ اکیلا ظہیر تین سو سواروں اور نیزوں سے کھیل رہا تھا۔ شبث ربعی نے ظہیر کے کندھے پر نیزہ مارا کہ زرہ کو توڑ کر انی شانہ میں پیوست ہو گئی۔ ظہیر نے بھی غالباً نیزہ اٹھانے کی قوت نہ دیکھ کر تلوار لی اور لڑنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے پچاس سواروں کو گرا دیا۔ لیکن ان پر بھی چھوٹے اور بڑے نوے زخم لگے۔ حسینؑ نے دیکھا اور حکم دیا کہ ظہیر کو نکال لاؤ۔ سعد غلام امیرالمومنین مع دس رفقا کے بڑھے اور اکثر کو قتل کرکے ظہیر کو لے آئے۔ زرہ کی کڑیوں میں متعدد تیر پیوست تھے اور زخموں سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ حضرت پیادہ سرہانے کھڑے ہوئے۔ کچھ دیر کے بعد ظہیر نے آنکھ کھولی۔ دیکھا حسینؑ کھڑے ہیں۔ اتنی قوت تھی کہ سر اٹھایا اور حسینؑ کے قدموں پر رکھ دیا۔ حسینؑ نے کہا: اے ظہیر کچھ کہو اور جو کچھ دل میں ہے ظاہر کرو کہ اس کا لحاظ اور تمھاری حق گزاری کروں تم نے خدمت گزاری میں کوئی تقصیر نہیں کی اور حق شجاعت ادا کیا۔ لیکن ظہیر میں اب باتوں کی قوت نہ تھی البتہ منہ میں اس طرح حرکت تھی کہ جو احتضار کے عالم کی حرکت کہی جائے۔ یا اس وقت پیاس کے خیال سے اشارہ کر رہے ہوں یا انھیں یہ آخری تسکین ملی ہو کہ گویا یہ وہ پانی پی رہے ہیں جو حوض کوثر سے ان کے لیے لایا گیا ہو۔

عمر بن خالد، خالد بن عمر
سعید بن حنظلہ تمیمی

عمر بن خالد اور ان کے فرزند خالد بن عمر ازدی میدان میں آئے۔ (روضۃ الشہدا کے موافق وہب بن خالد اور ان کے بعد خالد بن عمر) اور شہید ہوئے۔ ان کے بعد سعید بن حنظلہ تمیمی جو ایک جنگ دیدہ سپاہی اور لشکر حسینؑ کے ممتاز لوگوں میں تھے میدان میں آئے اور رجز پڑھا: ؎

صبراً علی الاسیاف و الا سنۃ   صبرا علیہ لدخول الجنۃ

میں نے تلواروں اور نیزوں پر دخول جنت کے لیے صبر کیا۔ (بعض اور اشعار کا مطلب) بے شبہ یہ نعمتیں اس شخص کے لیے ہیں جو حصول نجات کا ارادہ کرے۔ اے نفس راحت کے لیے کوشش اور طلب خیر میں رغبت کر۔

سعید نے خوب جنگ کی اور راحت جاوید کی طرف رحلت کی۔

عمر بن عبداللہ مذحجی، حماد بن انس، شریح بن عُبید

عمر بن عبداللہ مذحجی، اور حماد بن انسؓ نے عالم اعلیٰ کی طرف انتقال کیا۔ شریح بن عُبید قربان گاہ پر پہنچے۔ اثنائے جنگ میں ان کا گھوڑا گرا ابھی سنبھلے نہ تھے کہ دشمنوں نے موقع پا کر نیزوں اور تلواروں سے شہید کر دیا۔

مُسلم بن عوسجہ

اب مُسلم بن عوسجہ اسدی میدان میں تشریف لائے۔ ضعیفی تھی۔ ہاتھ پاؤں قابو میں نہ تھے مگر دل اختیار میں تھا۔ جنگ کی۔ ابن خلدون کے نزدیک مُسلم بن عوسجہ کی جنگ کا موقع تھا کہ شامی فوجیں اپنے جوانمردوں کے پیہم مارے جانے سے سہم سی گئیں۔ ہر شخص ان دونوں دلیروں (عمر بن یزید اور نافع بن ہلال) کے مقابلہ پر جانے سے جی چرا رہا تھا۔ عمر بن حجاج نے چلا کر کہا: اے لوگو! تمہارے مقابلہ پر آدمی ہی ہیں۔ یہ کچھ شیر نہیں ہیں کہ تم کو میدانِ جنگ میں جاتے ہی پھاڑ ڈالیں گے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم لوگ باوجود اس کثرت کے ہمت ہارے جاتے ہو۔ تمہارے مخالفین کی تعداد اس قدر کم ہے کہ اگر تم لوگ ان پر ایک ایک کنکریاں بھی پھینکو تو ان کے مرجانے کو کافی ہو۔

اس سے ظاہر ہے کہ یا کچھ لوگ بھاگ رہے تھے یا حسینؑ کی مدد کا ارادہ تھا یا علیحدہ ہو رہے تھے

اے اہلِ کوفہ! اپنے امیر کی اطاعت کرو۔ جماعت سے علیحدہ نہ ہو۔ جو شخص دین سے باہر اور امام کے مخالف ہو گیا ہے اس کے قتل کرنے میں کچھ شک و شبہ نہ کرو۔ دیکھو ایک ایک لڑنے کو میدان میں نہ جاؤ بلکہ سب کے سب جھرمٹ باندھ کر مجموعی قوت سے حملہ کرو۔ عمر بن سعد نے اس رائے کو پسند کیا، اور فرادیٰ فرادیٰ نکل کر لڑنے کو منع کر دیا۔ امام حسینؑ بولے: اے عمر بن حجاج کیا تو ہمارے خلاف لوگوں کو ابھارتا ہے۔ کیا ہم دین سے باہر ہو گئے ہیں، یا تم؟ خدا کی قسم اگر تمہاری روحیں قبض کرلی جائیں اور اسی حالت میں تم لوگ مرتے جاؤ تو معلوم ہو جائے گا کہ کون شخص دین سے باہر تھا۔ عمر بن حجاج نے بجائے جواب دینے کے فرات کی جانب سے حملہ کر دیا۔ مُسلم بن عوسجہ سے لڑائی ہوتی رہی۔ آخر الامر یہ زخمی ہو کر گرے اور عمر بن الحجاج اپنے لشکر میں لوٹ آیا۔ امام حسینؑ مُسلم کے پاس تشریف لائے جس وقت وہ دم توڑ رہے تھے۔ فرمایا: اے مُسلم! اللہ تجھ پر رحم کرے۔ جس کا وقت آ گیا ہے وہ تو جا رہا ہے اور جو باقی ہے وہ وقت کا اِنتظار کر رہا ہے۔ تم اندیشہ نہ کرو۔ ہم بھی عنقریب تم سے آ کر ملا چاہتے ہیں۔ حبیب بن مظاہر قریب گئے۔ ارشاد کیا: "میں اس زخمی کے جنتی ہونے کی بشارت دیتا ہوں"۔ مُسلم نے یہ سن کر آنکھیں کھول دیں۔ حبیب بن مظاہر بولے: امام حسینؑ تمہارے جنتی ہونے کی بشارت دیتے ہیں۔ مُسلم نے مسکرا کر جواب دیا: "میں تم کو نیکی کی بشارت دیتا ہوں"۔ حبیب نے مُسلم کا سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ کر کہا: اے بھائی اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میں تمہارے بعد کچھ دنوں بھی زندہ رہوں گا تو تم سے میں وصیت کی خواہش کرتا۔ لیکن میں یہ یقیناً جانتا ہوں کہ دو ہی چار ساعت کے بعد میں تم سے آ کر ملا چاہتا ہوں۔

مُسلم بن عوسجہ کی آخری وصیتؒ

مُسلم نے کہا: "تاہم میں تم کو ایسی وصیت کرتا ہوں جس کے تم سزاوار ہو، اور وہ یہ ہے کہ: تم امام حسینؑ کا ساتھ نہ چھوڑنا، اور جب تک بقید حیات رہنا ان بدبختوں بے دینوں سے لڑتے رہنا"۔ مُسلم تو اس قدر وصیت کر کے راہیِ ملک بقا

ہوئے ـــ"۔ (تاریخ کامل کے موافق مُسلم نے اشارہ سے حبیب کو وصیت کی)

صاحب روضۃ الصفا کہتا ہے: "مُسلم کے گھوڑے سے گرنے کے وقت اصحاب عمرو بن سعد نے قل کیا کہ ہم نے مُسلم کو مارا۔ شبث بن ربعی نے یہ سن کر قل کرنے والوں کو گالیاں دیں اور کہا کہ: "تم ایسے شخص کے مارنے کا فخر کر رہے ہو جس نے جنگ آذربائیجان میں صفوں کے ملنے کے قبل چھ مشرکین کو قتل کیا تھا"۔

صاحب روضۃ الشہدا کہتا ہے کہ مُسلم نہ صرف شجاع اور لشکر آرائی میں ماہر تھے بلکہ چند قرآن (غالباً اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے!) جناب امیرؑ کی خدمت میں پیش کیے تھے اور جناب امیرؑ نے انھیں "بھائی" فرمایا تھا۔

عمر بن قرظہ انصاری

عمر بن قرظہ انصاری نے اجازت جنگ حاصل کی اور بقول صاحب لہوف اس طور سے لڑے کہ جیسے مشتاقانِ جزا بڑے زور شور سے لڑتے ہیں۔ یہاں تک کہ فوج ابن زیاد سے ایک گروہ کثیر کو قتل کر ڈالا۔ راستبازی اور جہاد کو جمع کر دکھایا۔ کوئی تیر حضرت امام حسینؑ کی طرف ایسا نہ آتا تھا کہ جس کو وہ اپنے ہاتھ سے نہ روکتے تھے۔ کوئی تلوار حضرتؑ کی طرف نہیں آتی تھی جس کو اپنے سینہ پر نہ لیتے تھے۔ کوئی برائی حضرتؑ تک نہ پہنچنے دی۔ یہاں تک کہ سخت زخمی ہوئے۔ تب انھوں نے سید الشہدا کی طرف رخ کیا، اور عرض کی: "یا ابن رسول اللہ! کیا میں نے آپ کا عہد پورا کیا؟"۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ: "ہاں تو ہی مجھ سے پہلے بہشت کو جا رہا ہے"۔ اچھا رسولؐ خدا سے میرا اسلام کہنا اور بتلا دینا کہ تیرے بعد میں بھی آ رہا ہوں۔ پھر انھوں نے لڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ شہید ہوئے۔

ابن خلدون کہتا ہے: ان (عمر بن قرظہ انصاری) کا بھائی عمر بن سعد کے ہمراہ تھا۔ اس نے بآواز بلند کہا: "یا حسینؑ ـــ تو نے میرے بھائی کو گمراہ کیا، اور اس درجہ اس کو گرویدہ کر لیا تھا کہ وہ مارا گیا"۔ آپ نے جواب دیا: "اللہ تعالیٰ نے اس کو گمراہ نہیں کیا بلکہ راہ راست کی رہنمائی کی، ہاں تو البتہ گمراہ ہو گیا"۔ عمر بن قرظہ کا بھائی یہ سن کر طیش میں آیا، اور یہ کہتا ہوا کہ: "اللہ تعالیٰ مجھے مارے جو میں تجھ کو نہ ماروں۔ یا تیرے پاس مر نہ جاؤں"۔ آگے بڑھا نافع بن ہلال مرادی نے لپک کر نیزہ چلایا۔ جس سے وہ زخمی ہو کر گرا۔ نافع نے نیزہ چھوڑ کر تلوار کھینچی لیکن اس کے ہمراہی یورش کر کے اٹھا لے گئے۔ علاج معالجہ کر کے اچھا ہو گیا۔

عمر بن الحجاج کے دستہ کا حملہ

جنگ کی یہ صورت تو تھی ہی کہ ایک ایک سے لڑتا لیکن عمر بن حجاج الزبیدی کی صلاح نے ابن زیاد کو باوجود کثرت سپاہ جنگی بدعہدی کی ذلت میں مبتلا کیا، اور اس نے عمر بن الحجاج کو سپاہیوں کی ایک جماعت سے حملہ کرنے کا حکم دیدیا۔ اس کے حملہ میں مُسلم بن عوسجہ کی شہادت لکھی گئی۔ اس کے حملہ میں حسینؑ کی طرف سے یہی بزرگ شہید ہوئے ہوں یا کچھ اور زخمی ہوئے ہوں۔ عمر بن حجاج مع اپنے سپاہیوں کے موجود ہو یا واپس گیا ہو۔ یا محاصرہ اور نئے حملہ کا انتظار کر رہا ہو۔

شمر اور ابن نمیر کا حملہ

بیچ میں کوئی تنہا حسینؑ کا سپاہی کسی سے جنگ بھی کر رہا ہو۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کس قدر وقفہ کے بعد یا متصلاً شمر نے حملہ کیا۔ اور ابھی شمر کا حملہ پسپا ہوا تھا یا نہیں یا ابھی جنگ کی شدت ہی تھی کہ حصین بن نمیر اور پانچ سو تیر اندازوں سے بڑھا اور اس نے بھی حملہ شروع کر دیا۔

اصحاب نے کس طرح حملہ روکا

کامل ابن اثیر کے موافق: "جس وقت ابن حجاج نے لشکر بڑھایا تو رفقائے حسینؑ "سب گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئے" اور تیر برسانے کہ دشمن آگے نہ بڑھ سکا"۔ بقول ابن خلدون: "حصین بن نمیر قریب پہنچ کر تیر برسانے لگا۔ تھوڑی دیر میں آپ کے سواروں کے کل گھوڑے زخمی ہو کر مر گئے۔ اس وقت کل ہمراہی پیادہ ہو کر لڑنے لگے۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی۔ لڑائی نہایت تیزی اور سختی سے جاری تھی اور لشکر شام باوجود کثرت کے ان لوگوں کے حملہ کا جواب نہ دے سکتا تھا۔ اور نہ ان کے قریب پہنچ کر حملہ آور ہو سکتا تھا۔ عمر بن سعد نے مجبور ہو کر چند لوگوں کو آپ کے خیموں کی طرف سے حملہ کرنے کو بھیجا۔ آپ کے ہمراہیوں میں سے صرف چار آدمی مخالفین کے روکنے پر مامور ہوئے۔

آتش بازی

جو دستہ فوج سواروں یا پیادوں کا لشکر شام سے نکل کر خیمہ کی طرف بڑھتا دکھائی دیتا تھا خیمہ تک پہنچنے کا کیا ذکر ہے راستہ ہی میں ڈھیر ہو جاتا تھا۔ تب عمر بن سعد نے خیموں پر دور سے آگ برسانے کا حکم دیا۔ امام حسینؑ نے فرمایا: "تم لوگ مجھ سے لڑتے ہو تو مجھ سے لڑو۔ خیموں میں عورتوں اور بچوں کے سوا کوئی مرد نہیں ہے۔ وہ غریب نکل کر نہ بھاگ سکیں گی اور نہ ہم خیموں میں آتش زدگی کے باعث تم سے لڑ سکیں گے"۔ عمر بن سعد یہ سن کر خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد شمر ذی الجوشن حملہ کر کے امام حسینؑ کے خیمہ تک پہنچ کر کہنے لگا: مجھے دوزخ ہی میں جلنا نصیب ہو اگر میں اس خیمہ کو نہ جلا دوں"۔ عورتیں چلا کر نکل آئیں۔ امام حسینؑ نے ڈانٹ کر کہا: "اللہ تعالیٰ تجھے جلائے تو میرے خیمہ کو جلائے گا جس میں میرے اہل بیت ہیں؟"۔ شمر نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ حمید بن مسلم اور شبث بن ربعی نے بھی اس کو اس فعل شنیع سے روکنا چاہا۔ لیکن بدبختی سے وہ نہیں مانتا تھا۔ برابر خیمہ کی طرف آگ لگانے کی غرض سے بڑھا جاتا تھا۔ زہیر بن قین نے دس آدمیوں کو ہمراہیان امام سے علیحدہ کر کے شمر اور اس کے رکاب کی فوج پر حملہ کر دیا۔ ابو عزہ ضبابی جو اس کے ہمراہیوں میں تھا۔ اور بہت سے سپاہی مارے گئے۔ بالآخر مجبور ہو کر شمر ذی الجوشن کو واپس آنا پڑا۔ چونکہ لشکر شام کی تعداد زیادہ تھی کثرت کی وجہ سے دو چار پانچ دس بیس کا مارا جانا محسوس نہ ہوتا تھا۔ اور امام حسینؑ کی طرف بوجہ قلت جماعت ایک دو آدمیوں کے بھی کام آجانے کا احساس ہو جاتا تھا۔

حملوں کے وقت اصحابؓ کی تعداد

ان حملوں کے وقت علامہ مجلسی اور کامل کے موافق حضرتؑ کے صرف تیس اصحاب باقی تھے۔ آخر الذکر مؤرخ کے موافق ان لوگوں نے "لشکر کوفہ کی جانب حملہ نہیں کیا۔ مگر یہ کہ اس کو کھول دیا"۔ اسی مؤرخ کے موافق عروہ بن قیس نے جو کوفہ کے لشکر کا سردار تھا یہ دیکھا تو اس نے کسی کو عمر سعد کی طرف بھیجا اور کہلوایا کہ: "کیا تو نہیں دیکھتا کہ اس تھوڑے سے لشکر سے تیرا لشکر کس طرح لڑ رہا ہے۔ پیادوں اور تیر اندازوں کو اس کی طرف بھیج!"۔

علامہ مجلسی کے موافق: جس وقت دشمن نے آگ لگانے کا ارادہ کیا تو حضرتؑ نے اپنے رفقا کو حکم دیا کہ دشمن کو آگ لگا دینے دو۔ اس طرف سے دشمن کی آمد مسدود ہو جائے گی۔ ایسا ہی ابی مخنف نے کہا ہے کہ جب دوپہر ہو گئی اور ایک طرف سے لڑائی ہو رہی تھی کہ یہ دیکھ کر ابن سعد نے خیمہ جلانے کا حکم دیا۔ پس حضرتؑ نے فرمایا کہ انھیں ایسا کرنے دو۔ کیونکہ اس کے بعد وہ ادھر سے تمہاری طرف نہ آسکیں گے۔ اور ایک ہی طرف سے لڑائی ہو گی۔ پس شمر نے حملہ کیا۔ اور عورتوں

کے خیموں کے قریب پہنچا اور آگ کے لیے آواز دی۔ پس حضرتؑ کے اصحاب نے اس پر حملہ کیا اور اس کو خیمہ سے ہٹا دیا۔ اس کے بعد حضرتؑ نے شمر کو آواز دی۔ "وائے ہو تجھ پر کیا تیرا ارادہ ہے کہ رسولؐ اللہ کے خیمہ کو جلا دے"۔ اس نے کہا: ہاں۔ پس حضرتؑ نے چہرہ مبارک آسمان کی طرف بلند کر کے شمر کو بد دعا دی۔ اس پر شمر اور غصہ میں آیا۔ اور اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان پر سب مل کر حملہ کرو اور ان کے آخری شخص کو فنا کر دو۔ اور اس کے بعد یہ لوگ داہنے اور بائیں منتشر ہو کر اصحاب حسینؑ پر تیر مارنے لگے۔ جس سے اکثر اصحاب شہید ہوئے۔ اس وقت ابوثمامہ الصیداوی بڑھے اور عرض کی:

ابوثمامہ صیداوی

اے میرے مولا! ہم لوگ لامحالہ قتل ہوں گے۔ نماز کا وقت آگیا ہے میری آرزو ہے کہ آخری نماز آپ کے ساتھ پڑھ لوں۔ شاید ہمیں اس طرح لقائے الٰہی حاصل ہو کہ اس موضع عظیم میں ہم نے فرائض میں سے ایک فرض ادا کر دیا ہو۔ حضرتؑ نے فرمایا: اذان دے خدا تجھ پر رحم کرے۔ (بعض کے موافق: حضرت نے آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ: "تو نے نماز کا ذکر کیا، خدا تجھے نماز گزاروں میں قرار دے۔ ہاں یہ اول وقت ہے"۔ پس جس وقت اذان سے فراغت ہوئی حضرتؑ نے آواز دی: "اے عمر سعد کیا تو نے شرائع اسلام کو بھلا دیا۔ کیا تو اس قدر صبر نہ کرے گا کہ نماز پڑھ کر جنگ کی جائے"۔ اس نے قبول نہ کیا۔ اور حصین بن نمیر نے آواز دی: "اے حسینؑ پڑھو لیکن تمہاری نماز قبول نہ کی جائے گی"۔

حبیب اور ابن نمیر

حبیب نے اسے جواب دیا۔ "وائے ہو تجھ پر حسینؑ کی نماز نہ قبول کی جائے گی لیکن تجھ سے ابن خمارہ کی نماز مقبول ہوگی۔ ابن نمیر دونوں لشکروں کے درمیان یہ سن کر غصہ میں آیا۔ میدان میں آیا۔ رجز خوانی کی اور آواز دی کہ اے حبیب آؤ طعن و ضرب کے لیے میدان میں نکل آؤ۔ حبیب نے اس کا کلام سنا۔ حضرتؑ کے قریب گئے اور کہا: یا مولا مجھے امید ہے کہ میں نماز پڑھوں گا اور آپ کے پدر نامدار و جد بزرگوار اور برادر عالی مقدار کو آپ کا سلام پہنچاؤں گا۔ یہ کہہ کر نکل آئے اور رجز پڑھا۔ حصین نے حملہ کیا اور حبیب نے جواب میں وار کیا۔ تلوار حصین کے گھوڑے کے سر پر پڑی اور زخم کی وجہ سے گھوڑے نے حصین کو زمین پر گرا دیا۔ پس اس کے رفقا دوڑے اور اسے اٹھا لیا۔ حبیب نے ایک تیمی پر حملہ کیا اور اسے قتل کر ڈالا۔ یہاں تک بیتیس آدمی قتل کیے۔ اب دشمنوں نے ان پر غلبہ کیا اور انھیں حسینؑ کے سامنے شہید کر ڈالا۔ ابو مخنف کہتا ہے کہ عباس بن علیؑ سلام اللہ علیہ اور حبیب بن مظاہر کی شہادت کے وقت حضرتؑ کے چہرہ پر انکسار کے آثار معلوم ہوئے اور فرمایا کہ حبیب مرد فاضل تھے۔ جو ایک رات میں قرآن ختم کرتے تھے۔

زہیر بن قین

پس زہیر بن قین کھڑے ہوئے اور کہا: "میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں یا ابن رسولؐ اللہ! یہ کیسا انکسار ہے جو میں آپ کے چہرہ پر دیکھ رہا ہوں۔ کیا ہم حق پر نہیں ہیں"۔ فرمایا: "واللہ ہمارا علم علم الیقین ہے۔ ہم اور تم حق اور ہدایت پر ہیں"۔ زہیر نے کہا: "پھر ہمیں کیا پروا ہے ہم جنت اور اس کے نعمات کی طرف جا رہے ہیں۔ یا مولا اب ہمیں میدان میں نکلنے کی اجازت دیجیے"۔ آپ نے فرمایا: "اچھا جاؤ"۔ نکلے زہیر اور رجز پڑھا:

انا زھیر و انا ابن قین و فی یمینی مرھف السعدین
اذب بالسیف عن الحسینؑ ابن علی الطاھر الجدین
اضرکم محامیاً عن دینی و عن الامام الصادق الیقین
اضربکم ضرب غلام زین الیوم یقضی الدین اھل الدین
و یستقی من اھل الشین بابیض و صارم الحدین

پس جنگ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ پچاس آدمیوں کو قتل کیا۔ اس کے بعد ڈرے کہ حسینؑ کے ساتھ نماز فوت ہو جائے گی۔ پس لوٹے اور کہا یا مولا مجھے خوف ہے کہ میری نماز آپ کے ساتھ فوت ہو جائے گی۔ پس حسینؑ کھڑے ہوئے اور اصحاب کے ساتھ نماز ظہر پڑھی۔

حبیب

ابن خلدون کے موافق حبیب اس طرح شہید ہوئے کہ جب حصین بن نمیر کو اس کے ساتھیوں نے بچا لیا تو حبیب لڑنے لگے۔ بدیل بن حریم نامی جنگجو کو قتل کیا۔ ایک دوسرے شخص نے پیچھے سے نیزہ چلایا۔ حبیب جوں ہی اس کی طرف متوجہ ہوئے حصینؑ بن نمیر نے تلوار کا وار کر دیا۔ جس سے حبیب تیورا کر گر پڑے۔ تمیمی نے اتر کر سر اتار لیا۔ امام حسینؑ کو سخت صدمہ ہوا۔ بنفسِ نفیس جانے پر تیار ہوئے۔

حر اور زہیر کی جنگ کا طریقہ

حر و زہیر نے بڑھ کر کہا: "ہم آپ پر سینہ سپر ہو کر فدا ہونے کو موجود ہیں۔ ہمارے ہوتے ہوئے آپ میدان جنگ میں نہ جائیے"۔ امام حسینؑ یہ سن کر رک گئے اور حر و زہیر نے لشکر شام پر حملہ کر دیا۔ جب ایک شخص ان میں سے لڑتے لڑتے فریق مخالف میں چھپ جاتا تھا تو دوسرا اس سختی و تیزی سے حملہ کر دیتا کہ اس کو مخالفین کے نرغہ سے نکال لاتا تھا۔ تھوڑی دیر تک لڑائی کا عنوان اسی طرح پر رہا۔ بہت سے آدمیوں کا دم زدن میں وارا نیارا ہو گیا۔ عمر بن سعد نے للکارا پیادوں نے چاروں طرف سے گھیر کر حر بن یزید کو شہید کیا۔ اور ابو ثمامہ نے اپنے چچازاد بھائی کو جو شاہی لشکر میں تھا قتل کر ڈالا۔ بعد اس کے امام حسینؑ مع اپنے ہمراہیوں کے "صلوٰۃ الخوف" پڑھ کر پھر لڑنے لگے۔

زُہیرؓ بن قین کی شہادت

مخالفین چاروں طرف سے تیر باری کر رہے تھے اور آپکے ہمراہی اپنی اپنی جانبازی دکھا رہے تھے۔ زُھیر بن قین لڑتے بھڑتے بلا خیال پس و پیش لشکر شام میں گھستے چلے گئے۔ کثیر بن عبداللہ شعبی اور مہاجر بن اوس آنکھیں بچا کر دفعتہً زُھیر پر ٹوٹ پڑے اور ان کو شہید کر ڈالا۔

نمازِ ظہر کے بعد حضرتؑ کا خطبہ

قیاس کیا جا سکتا ہے کہ پچیس تیس آدمیوں نے ایسا بڑا کام کیا تھا کہ کم سے کم پندرہ سو سوار اور پیادے اور تیر اندازوں کے حملہ کو اس حد تک رد کیا تھا کہ کسی طرح نماز پڑھنے کی مہلت ملی۔ لیکن عالم شجاعت کی اس حیرت خیز مثال کے بعد انھیں یہ امید نہ تھی کہ ہم دم لے سکیں گے۔ (ابی مخنف) نہیں۔ لڑائی منقطع نہ ہوئی تھی۔ ادھر نماز ختم ہوئی اور ادھر حضرتؑ اصحاب کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا: "اے میرے اصحاب! جنت نے اپنے دروازے کھول دیے ہیں۔ نہریں بہ رہی ہیں۔ جنت کے میوے تیار ہیں۔ اور اس کے قصور آراستہ ہیں۔ حوریں تمھاری منتظر ہیں اور یہ رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

مع ان شہدا کے ہیں جو ان کے اور میرے پدر بزرگوار کے ساتھ شہید ہوئے۔ تمھاری آمد کے منتظر اور مشتاق ہیں۔ اور ایک دوسرے کو بشارت دے رہے ہیں۔ پس دین خدا کی حمایت اور حرم رسولؐ خدا کی حفاظت کرو۔"

مخدراتِ عصمت کا اِستغاثہ

اس وقت مخدرات نکل آئیں اور انھوں نے آواز دی کہ "اے معشر المسلمین اور اے عصبۃ المومنین دین خدا کی مدد کرو اور حرم رسول خدا اپنے امام اور اپنے نبی کی بیٹی کے بیٹے سے دشمنوں کو دفع کرو۔ خدا نے ہماری وجہ سے تمھارا امتحان کیا ہے۔ تم ہمارے جد بزرگوار کے ہمسایہ ہو اور ہمارے دوست ہو۔ دور کرو دشمنوں کو خدا تمھیں برکت دے۔

اہل بیت کا اِستغاثہ سن کر اصحابؓ کی حالت

جس وقت اصحاب نے اہل بیت کا یہ کلام سنا چیخ مار کر روئے۔ اور عرض کی: ہمارے نفس آپ کے نفوس پر ہمارا خون آپ کے خون پر اور ہماری روحیں آپ کی ارواح پر فدا ہیں۔ قسم خدا کی ہماری حیات تک کسی کی برائی آپ تک نہ پہنچ سکے گی۔ یہاں تک کہ ہمارے جسم تلواروں اور طائروں کی خوراک ہو جائیں اس وقت ہم آج کے کسب خیر سے فتح یاب ہوں گے۔

سعید بن عبداللہ حنفی

ان لاثانی شجاعوں میں کوئی سعید بن عبداللہ الحنفی کا ایسا فدائے راہ حسینؑ تھا۔ جس نے اپنا فرض یہی قرار دیا تھا کہ ادھر جائے جدھر حسینؑ جائیں۔ اور اپنے سینہ اور جسم کو ان تیر اور نیزوں کا نشانہ قرار دے جو حسینؑ کے ارادے سے چلائے گئے ہوں۔ انھوں نے دُنیا کے حوادث پر اس وقت تک اپنے عزم و استقلال کی مہر کی جب تک حسینؑ ظہر کی نماز سے فارغ ہوئے۔ اِدھر سلام پھیرا اُدھر سعید میں کھڑے ہونے کی طاقت نہ رہی سلام کیا اور عالم راحت کی طرف رخصت ہو گئے۔

نافع بن ہلال بجلی

نافع بن ہلال بجلی کو بھی صاحب روضۃ الشہدا نوذاماد کہتا ہے۔ ان کے ارادہ جنگ کے وقت عروس نے دامن پکڑ لیا۔ اور کہا نہ جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ مارے جاؤ۔ ہلال نے کہا: "اے نادان مجھ سے دور ہو میں کیوں دوسروں سے کم رہوں۔ کیا میرا دعویٰ محبت زبانی ہے"۔ یہ باتیں حسینؑ تک پہنچیں اور آپ نے فرمایا: "اے بھائی میں نہیں چاہتا کہ جوانی میں تم لوگ مبتلائے فراق ہو"۔ عرض کی: "آج اگر آپ کو اس بلا میں چھوڑ دوں تو قیامت میں آپ کے جد عالی وقار کو کیا جواب دوں گا"۔ اِصرار کیا۔ رخصت حاصل کی۔ میدان میں آئے اور رجز پڑھا۔

انا الغلام الیمنی انا علیٰ دین علی

و دینہ دین النبی

نافع مشہور تیر انداز تھے اور ہر تیر پر اپنا نام کندہ کیا تھا۔ روضۃ الصفا کے موافق ایک شخص مقابلہ کے لیے آیا اور اس نے کہا: انا علیٰ دین عثمان۔ نافع نے کہا: بل علیٰ دین الشیطان ۔۔۔

جنگ ہوئی اور نافع نے اپنے مقابل کو مار لیا۔ روضۃ الشہدا کے موافق ان کے ترکش میں اسی تیر تھے۔ اور ان میں سے کوئی خالی نہ گیا۔ تیروں کے ختم ہونے پر تلوار لی۔ داد شجاعت دی اور وہ انعام حاصل کیا جن کا تلواروں کے سایہ کے بعد وعدہ کیا گیا ہے۔ ابی مخنف کے موافق انھوں نے ستر آدمیوں کو قتل کیا۔ ابن خلدون کہتا ہے: "مجروحین کے سوا

بارہ آدمیوں کو مارا۔ بالآخر لڑتے لڑتے صدمہ زخم سے ان کا بازو ٹوٹ گیا گرفتار کر لیے گئے۔ شمر ذی الجوشن پکڑ کر عمر بن سعد کے پاس لے گیا چہرہ سے خون کے فوارے جاری تھے۔ عمر بن سعد دیکھ کر مسکرایا۔ نافع بولے میں نے زخمیوں کے علاوہ تم میں سے بارہ آدمیوں کو قتل کیا ہے۔ اگر میرے بازو سلامت رہتے تو تم مجھ کو بہر گز گرفتار نہ کر سکتے۔ شمر نے قتل کی غرض سے تلوار کھینچی۔ نافع نے نے کہا: خدا کی قسم اگر تو مسلمان ہوتا تو تجھ کو یہ شاق ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے روبرو ہمارے خون کے ساتھ جاتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہماری موت بدترین خلائق کے ہاتھ پر لکھی ہے۔ شمر یہ سن کر جھلا اٹھا اور ایک وار سے نافع کا کام تمام کر دیا۔

عبداللہ و عبدالرحمٰن مزنی و عبداللہ و عبدالرحمٰن غفاری

عبداللہ و عبدالرحمٰن مزنی نے شہادت پائی۔ عبداللہ و عبدالرحمٰن پسران عروہ غفاری آئے اور شجاعت کا حق ادا کیا۔ (روضۃ الشہدا)

مالک بن انس

مالک بن انس میدان میں گئے اور ابن سعد کوئی کو طلب کر کے کہا کہ اگر سعد بن وقاص کو معلوم ہوتا کہ آج تجھ سے یہ حرکت سرزد ہوگی تو وہ اپنے ہاتھ سے تیرے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالتا۔ اور عالم کو تجھ ایسے ننگ وجود سے پاک کرتا۔ عمر سعد نے شرمندہ ہو کر جلدی سے کسی کو مقابلہ کے لیے بھیج دیا۔ مالک نے بھی عالم شہادت میں حصہ لیا۔

اور شہدا

عمر بن مطاع الجعفی میدان میں میں آئے۔ حسینؑ کی مدح میں شعر پڑھا تیس آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد عالم آخرت کی طرف سفر کیا۔ قیس بن امیہ راہی ملک بقا ہوئے۔ ابو مخنف کے موافق: یزید بن مظہر اسدی نے جنگ کی اور پچاس دشمنوں کو قتل کیا۔ ان کے رجز کا ایک مصرع یہ تھا کہ: ع

یا رب انی للحسین ناصر

دوسرے شعر کا پہلا مصرع یہ تھا:

و ابن المند تارك و هاجر

علی بن مظاہر نے جنگ کی اور ستر کو عالم انصاف کی طرف رخصت کیا۔

طرماح بن عدی

ابو مخنف طرماح بن عدی کو بھی شہید کراتا ہے۔ حالانکہ کامل کے موافق حسینؑ سے اثنائے سفر کی ملاقات کے بعد وطن واپس گئے۔ ان کی شہادت ناممکن نہ ہوگی، اگر یہ دوبارہ واپس آئے ہوں۔ صاحب روضۃ الشہدا ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص کو بھی لاتا ہے اور سخت جنگ کراتا ہے۔ میرے نزدیک یہ صفین میں شہید ہو چکے تھے۔

یحییٰ بن کثیر

یحییٰ بن کثیر انصاری میدان میں آئے اور رجز پڑھا اس کے بعد حملہ کیا۔ پچاس کے قریب شامیوں کو قتل کیا اور عالم راحت کی طرف رخصت ہوئے۔ (ابن خلدون)

سیف اور مالک

سیف بن الحرث بن سریع اور مالک بن عبد بن سریع روتے ہوئے حاضر خدمت ہوئے۔ آپ نے فرمایا: "تم روتے کیوں ہو۔ مجھے امید ہے کہ عنقریب تم لوگوں کی

آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی"۔ سیف و مالک نے عرض کیا: "ہم اپنے لیے نہیں بلکہ ہم کو اس پر رونا آتا ہے کہ ہم اپنی جان دے کر بھی آپ کو نہیں بچا سکتے۔ آپ نے دعائیں دیں اور یہ دونوں بھائی رخصت ہو کر شیر غراں کی طرح میدان جنگ میں ڈکارتے ہوئے جا پہنچے۔ لشکر شام نے ہر چہار طرف سے گھیر کر تھوڑی دیر میں شہید کر ڈالا۔

حنظلہ بن اسعد الشیبانی

بعد اس کے حنظلہ بن اسعد شیبانی میان صف سے نکل کر امام حسینؑ کے روبرو کھڑے ہوئے اور لشکر شام کو مخاطب کر کے بولے۔ "اے لوگو! مجھے خوف ہے کہ تم پر یوم احزاب کی طرح عذاب نہ آئے۔ جیسے قوم نوح و عاد و ثمود اور وہ لوگ جو ان کے بعد ہوئے اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کیا چاہتا۔ اے لوگو مجھے روز قیامت کا خوف ہے جس دن کہ تم مقابلہ نہ کر سکو گے اللہ کا۔ تم کو اللہ کے سوا کوئی بچانے والا نہیں ہے۔ اور جس شخص کو اللہ گمراہ کرتا ہے اس کا کوئی ہادی نہیں ہے۔ اے لوگو تم حسینؑ کو قتل نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ عذاب سے تمہاری بیخ کنی کر دے گا اور جو شخص اللہ پر افترا کرے گا وہ خائب ہو گا۔

لشکر شام میں سے کسی نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ امام حسینؑ بولے: "اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم کرے۔ یہ لوگ مستحق عذاب اسی وقت ہو چکے جب کہ میں نے ان کو حق کی طرف بلایا اور یہ لوگ اس کی مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوئے اور اب کیوں یہ کلمہ حق پر عمل کریں گے۔ جب کہ تمہارے نیک بھائیوں کو قتل کر چکے ہیں"۔ حنظلہ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ اور آپ سے رخصت ہو کر درود پڑھتے ہوئے میدان جنگ میں جا پہنچے۔ دشمنوں نے ہر طرف سے گھیر کر تیر باری شروع کر دی۔ بالآخر لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ صاحب لہوف کے موافق: پھر حنظلہ سید الشہدا کی طرف پھرے۔ عرض کی: "یا ابن رسول اللہ کیا میں اپنے رب کی طرف نہ جاؤں اور اپنے بھائیوں سے نہ ملوں"۔ حضرتؑ نے فرمایا: "ہاں ہاں بہتر ہے خدا کی طرف چلو جو تمہارے لیے دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ اور اس ملک کو جاؤ جو فنا نہیں ہو سکتا"۔

معلی

ابو مخنف معلی کو میدان میں لاتا ہے اور کہتا ہے: "و کان معروفاً بالشجاعۃ"۔ اور رجز پڑھا:

انا المعلی حافظاً لاجلی — دینی علی دین احمد و علی

قریب پچاس دشمنوں کے قتل کیے یہاں تک کہ خون کے بکثرت جاری ہونے سے زمین پر گر پڑے۔

جونؑ

ان کے بعد جون، غلام ابوذر غفاری میدان میں آئے۔ رجز پڑھا۔

بالسیف صلنا عن بن محمد — ارجو بذاک الفوز الموعد

مع الامام و الشفیع احمد

حضرتؑ کا جونؑ سے خطاب اور جونؑ کا جواب

ان کے متعلق صاحب لہوف فرماتے ہیں: یہ حبشی تھے۔ ان سے حضرتؑ نے فرمایا کہ:

"میں تم کو اجازت دیتا ہوں کہ تم چلے جاؤ کیونکہ تم لوگ اپنے آرام کے لیے میرے ساتھ ہوئے تھے۔ پس میری رفاقت میں تم اپنے کو مبتلائے بلا نہ کرو۔ جون نے عرض کی: "یا ابن رسول اللہ! میں آپ کے اچھے وقت کا کاسہ لیس تھا، اب برے وقت میں آپ کو میں چھوڑ دوں؟۔ ہاں بخدا میرے جسم میں بدبو ہے۔ میرا حسب بہت خراب ہے اور میرا رنگ سیاہ ہے۔ پس مجھے جنت میں بھیج دیجیے کہ میرا بدن خوشبودار ہو جائے۔ میں صاحب حسب شریف ہو جاؤں۔ اور میرا منہ

روشن و سفید ہو جاوے۔ بخدا میں آپ سے جدا نہ ہوں گا یہاں تک کہ میرا خون سیاہ آپ کے خون پاک میں مل جاوے۔
پھر جون نے بہ اجازت حملہ کیا، اور لڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ شہید ہوئے۔

ایک نوجوانؓ

ابو مخنف کہتا ہے: پھر ایک نوجوان میدان میں آیا جو اور جس کی ماں حسینؑ کے ہاتھ پر اسلام لائی تھی۔ جنگ کی۔ چالیس آدمی قتل کیے اور دارالسلام کی طرف راہی ہوا۔

جابر بن عروہ غفاری

اپنی صورت کا ایک اور عبرت خیز منظر یہ تھا جسے ابو مخنف کے الفاظ کی سادگی بہتر ادا کر سکتی ہے کہ: "و برز بعدہ جابر بن عروۃ الغفاری و کان شیخا کبیرا وکان قد شھد مع رسول اللّٰہ یوم بدر و واقعات غیرھا و جعل یعصب حاجبیہ عن عینیہ والحسینؑ ینظر الیہ ویقول شکر اللّٰہ سعیك یا شیخ"۔ (پھر جابر بن عروہ غفاری نکلے اور وہ بہت بڑھے تھے اور انھوں نے رسولؐ اللّٰہ کے ساتھ بدر اور ان کے علاوہ واقعات کو دیکھا تھا۔ انھوں نے اپنی بھنویں اپنی آنکھوں سے اٹھالی تھیں۔ حسینؑ نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا: خدا تمھاری سعی کو مشکور کرے یا شیخ) جابر نے رجز پڑھا: ؎

قد علمت حقاً بنو غفار　　و خندف ثم بنو نزار
بنصرنا لاحمد المختار　　یا قوم حاموا عن بنی الاطہار
الطیبین السادۃ الاخیار　　صلی علیہم خالق الابرار

رعشہ دار ہاتھوں سے جنگ کی اور ابو مخنف کہتا ہے کہ اسی آدمی دشمنوں کے لشکر سے کم کر دیے۔

مالک بن داود

مالک بن داوٗد میدان میں گئے اور دشمنوں کے ساتھ مددگاروں کو راہی کر دیا۔

عابس و شوذبؓ

میدانِ کربلا کے واقعات میں عابس بن شبیب الشاکری کی شان جنگ اور گفتگو میں کچھ نیا پن تھا۔ صاحب روضۃ الصفا کہتے ہیں کہ عابس نے اپنے غلام (شوذب) سے پوچھا کہ: "آج میرے ساتھ تیرا کیا مقام ہے"۔ غلام نے جواب دیا کہ: "تیری رکاب میں شمشیر زنی کروں گا۔ یہاں تک کہ مارا جاؤں"۔ عابس نے کہا کہ: "تجھ سے میرا ایسا ہی گمان تھا۔ اب قدم آگے بڑھا کہ آج وہ دن ہے کہ خدا سے اپنے عمل کی بڑی مزدوری طلب کریں گے۔ اور آج کے بعد پھر ہم کوئی عمل نہ کریں گے"۔ یہ کہہ کر حسینؑ کے پاس گئے اور کہا: "یا اباعبداللّٰہ! میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ روئے زمین پر کوئی شخص آپ سے زیادہ دوست اور عزیز نہیں ہے۔ اگر میں اپنے نفس سے کوئی نفیس تر چیز پاتا تو اسے آپ کی ذاتِ مقدس اور نفسِ مکرم پر فدا کرتا۔ یا اباعبداللّٰہ! میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اپنے پدر بزرگوار کی طرح سالک راہِ مستقیم ہیں"۔

ربیع بن تمیم کہتا ہے کہ میں نے لڑائیوں میں عابس کے ہنر دیکھے تھے۔ جب میں نے دور سے اسے آتے دیکھا لشکریوں سے کہا کہ تمھاری طرف وہ متوجہ ہوا ہے جو شیر اور ہاتھی پر غالب آتا ہے۔ خبردار کوئی اس کے پاس نہ جائے۔ استے میں عابس پہنچ گئے۔ اور مقابل طلب کیا۔

عابس کے لڑنے کی شانؓ

عمر بن سعد نے فوج کو پتھر اور تیر مارنے کا حکم دیا۔ عابس نے جب یہ حالت دیکھی اپنا خود اور زرہ اتار کر پھینک دی اور شام کے لشکر میں ڈوب گئے۔

(ربیع بن تمیم جس سے عابس کی ملاقات تھی کہتا ہے) میں نے دیکھا کہ دو سو آدمیوں سے زیادہ کو گرا کر برابر گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہر جانب سے گھر گیا اور شہید ہوا۔ روضۃ الشہدا کے موافق غلام ان کا محافظ پشت تھا۔ ابن خلدون کے موافق شوذب کے ساتھ ہی شہید ہوگئے۔ اس مؤرخ و نیز ابن اثیر کے موافق عابس کے مقابلہ پر کسی کو جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ابن خلدون کے موافق "لشکر شام میں سے کسی کی ہمت مقابلہ پر جانے کی نہ پڑی۔ ایک دوسرے کا منھ تکنے لگا۔ عمر بن سعد نے کہا اے پست ہمتو اگر اس کے مقابلہ پر نہیں جاسکتے ہو تو اس کو چاروں طرف سے تیر و پتھر سے مارو۔ عابس نے لڑائی کا یہ نرالا رنگ دیکھ کر تلوار کھینچ لی اور کمال تیزی سے برق کی طرح آن واحد میں مخالفین پر جاپڑے۔ اور ان کو مار کر پسپا کردیا۔ پھر مخالفین نے چاروں طرف سے یورش کر کے گھیر لیا اور تیر و نیزوں سے شہید کر ڈالا۔

ابوالشعثا یزید بن ابی زیاد کندی

اس مؤرخ کے موافق سب کے پہلے (؟) آپ کے ہمراہیوں میں سے جو لڑے اور شہید کیے گئے وہ ابوالشعثا یعنی یزید بن ابی زیاد ہیں۔ وہ عمر بن سعد کے ہمراہیوں میں سے تھے۔ جب ان لوگوں نے امام حسینؑ کی درخواست صلح نامنظور کی تو یہ ان سے علیحدہ ہو کر آپ سے آملے۔ حضرتؑ سے اجازت حاصل کر کے جاں نثاری کی انھوں نے دشمنوں کو ایک سو تیر مارے جن میں سے پانچ نے بھی خطا نہ کی۔ ہر بار امام حسینؑ فرماتے جاتے تھے: "اے اللہ اس کے بازوؤں میں قوت عطا فرما اور اس کے ثواب میں جنت عطا کر"۔ (روضۃ الشہدا)

حجاج بن مسروق الجعفی اور ایک ترک

حجاج بن مسروق الجعفی حضرتؑ کے لشکر کے مؤذن لڑے اور شہید ہوئے۔ اس کے بعد ایک ترکی غلام جو قاری اور حافظ تھا حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اجازت جنگ طلب کی۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ میں نے تجھے اپنے فرزند زین العابدینؑ کے لیے خریدا تھا اور انھیں بخش دیا۔ تو ان سے اجازت طلب کر۔ ترک گیا اور اجازت چاہی۔ حضرت علیؑ بن الحسینؑ نے فرمایا کہ میں نے تجھے آزاد کردیا۔ اس کے بعد تجھے اختیار ہے۔ ترک اب تمام خیموں کے گرد پھرا عفو تقصیر کرائی اور پھر فرزند رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعات بیان کیے اور اب اجازت لے کر میدان کی طرف گیا۔ حضرت امام زین العابدینؑ نے اگرچہ بیمار تھے مگر یہ سن کر کہ ترک میدان میں گیا ہے، خیمہ کے پردے اٹھوا دیے۔ دیکھا کہ: ترک باعذارے چوں گل شگفتہ و رخسارے چوں ماہ دو ہفتہ درمیان ہر دو صف بہ ایستاد ـــ گاہے بہ عربی رجز میخواند و گاہے بہ لفظ ترکی کلامے بر زبان میراند و ترجمہ بعضے رجزہائے او بنظم ابوالمفاخر این است: ؎

اے حسینؑ اے گہر روحانی — نسخہ مکرمت سبحانی
منم آن ترک کہ سلطان ہاشم — گر تو ام ہندوے حضرت خوانی
چہ شود گر تو بروے خوش خویش — سرخ روئے ابدم گردانی

یادگار جنگ کے بعد پیاس کے غلبہ سے پھر خیمہ کی طرف واپس آیا۔ "امام زادہ بروے آفرین گفت ـــ ترک صادق دل دست و پائے امام زین العابدینؑ را بوسہ داد و دیگر بارہ از مخدرات حجرات عصمت بحلی طلبید و از سوز مفارقت خدمت ایشان بہ بانگ ہائے ہائے گریست ـــ در اکثر کتب مذکور است کہ آن ترک زخم گراں یافتہ از پائے در آمد و امام حسینؑ

بسروے رسیدہ او را بہ خیمہ امام زین العابدینؑ رسانید و از مرکب فرود آمد و سرش در کنار گرفت و روئے بر روئے وے نہاد و امام زین العابدینؑ باوجود مرض بر سر بالیں وے ایستاد غلام دیدہ باز کرد سر خود در کنار شاہ شہیداں دید و امام زین العابدینؑ را بر سر بالیں خود مشاہدہ فرمودہ تبسم کناں بر پدر و پسر سلام کردہ و بحدیقہ دار السلام آورد"۔ یعنی : فرزندِ امام نے اسے آفریں کہی۔ صادق دل ترک نے امام زین العابدینؑ کے ہاتھوں اور پاؤں کو بوسہ دیا اور دوبارہ اہلِ حرم سے اجازت مانگی اور ان کی خدمت سے الگ ہونے کی جلن سے ہائے ہائے کر کے رو دیا۔ اکثر کتابوں میں مذکور ہے کہ وہ ترک بھاری زخم کھا کر گر پڑا اور امام حسینؑ اس کے سر پر پہنچے اور اسے اٹھا کر امام زین العابدینؑ کے خیمہ میں پہنچایا۔ سواری سے اترے اور اس کے سر کو گود میں لے لیا اور اپنا چہرہ اس کے چہرہ پر رکھ دیا۔ امام زین العابدینؑ بیماری کے باوجود اس کے سرہانے کھڑے ہوگئے۔ غلام نے آنکھ کھولی اپنے سر کو شہیدوں کے شہنشاہ کی گود میں دیکھا اور امام زین العابدینؑ کو اپنے سرہانے مشاہدہ فرمایا۔ مسکراتے ہوئے باپ بیٹے پر سلام کیا اور باغ دار السلام کا رخ کیا۔

سعد بن عبداللہ الجعفی جنادہ اور عبداللہ بن جنادہ

سعد بن عبداللہ الجعفی جو اقربائے مادر محمد بن حنفیہ سے تھے لڑے اور شہید ہوئے۔

جنادہ حارث انصاری اور عبداللہ بن جنادہ نے شہدا کی فہرست میں اپنا نام لکھوایا۔ برزل انصاری، مرہ بن ابی مرہ غفاری گئے اور کامیاب ہوئے۔

ابراہیم

ابو مخنف ابراہیم بن الحسینؑ (الحصین) سے جنگ کراتا ہے۔ یہ پچاس کے قریب دشمنوں کو قتل کر کے شہید ہوتے ہیں۔

اصحاب حسینؑ عالم راحت کی طرف رخصت ہو چکے۔ اب ان وفاداروں میں سے کوئی باقی نہ رہا۔ اب صرف بنی ہاشم باقی رہ گئے۔ کامل ابن اثیر اور اس کی نقل سے ابن خلدون حضرت علی اکبر کو پہلا شہید آل ابی طالب میں قرار دیتا ہے۔ اگرچہ مجھے شہداء کی ترتیب میں بہت اصرار نہیں ہے لیکن دیگر مؤرخین اور ابو مخنف حضرت علی اکبر کو آخر شہداء میں لاتا ہے اور میں اسی کو قبول کرتا ہوں۔

عبداللہ بن مسلم

عام مؤرخین نے یہ سلسلہ اختیار کیا ہے کہ وہ بنی ہاشم میں سے پہلے عبداللہ بن مسلم بن عقیل کو میدان میں لاتے ہیں۔ ابو مخنف کے نزدیک یہ حسینؑ کے پاس جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں : "یا مولا مجھے میدان میں جانے کی اجازت دیجیے"۔ آپ فرماتے ہیں کہ : "اے فرزند اپنے اور اپنے اہل کو قتل سے بچاؤ"۔ عبداللہ کہتے ہیں کہ : "اے چچا! میں کس منہ سے آپؑ کو چھوڑدوں اور کس طرح اپنے جد محمد مصطفےٰؐ سے ملاقات کروں گا۔ واللہ اے میرے سردار یہ ہرگز نہ ہوگا بلکہ میں شہید ہو کر خدا سے ملاقات کروں گا"۔ میدان میں نکلے اور رجز پڑھا:

نحن بنو هاشم الكرام نحن ابناء السيد الهمام
سبط رسول الملك العلام نسل علی فارس الضرغام

اس کے بعد حملہ کیا۔ یہاں تک کہ نوے دشمنوں کو ڈھیر کر دیا۔ اس وقت ایک تیر لگا۔ اور "وا ابتاہ" کی آواز دی۔

اب گھوڑے پر نہ سنبھل سکے۔ حسینؑ نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا: "خدایا! آل عقیل کے قاتل کو قتل کر۔" یہ کہنے کے بعد انا للہ وانا الیہ راجعون فرمایا۔ اور دشمن پر حملہ کرنے کا حکم فرما دیا اور دعا دی اور فرمایا کہ: "جنت کی طرف چلو! اس سفر کے رنج سے دار الامان بہتر ہے۔"

صاحب روضۃ الشہدا ایک عجیب بات کہتا ہے کہ جب عبداللہ بن مسلم نے رخصت مانگی اور حضرتؑ نے انہیں اپنے کو محفوظ کرنے کی صلاح دی تو عبداللہ نے جواب دیا کہ "اس معبود کی ذات پاک کی قسم جس نے آپ کے جد کو مبعوث برحق کیا مجھے میدان میں جانے دیجئے اور دشمنوں سے باز نہ رکھیے تاکہ میں آپ کی خدمت میں اپنے باپ کے درجہ پر پہنچوں۔ جس طرح کہ اقربا میں سے پہلے میرے باپ نے آپ کی ہوا داری میں اپنی جان فدا کی ہے میں اقربا میں سے اس وقت سب سے پہلے آپ پر اپنا سر فدا کروں۔" حضرتؑ نے ان کا سر سینے سے لگایا اور فرمایا کہ: "اے میرے بھائی کے یادگار تیرے چہرے سے میری آنکھیں روشن اور دل خوش تھا۔ اب اس سے بھی محروم ہوا اور دنیا میں مصائب تمام ہوئیں۔" اجازت ملی اور ابن سعد نے قدامہ بن اسد فزاری کو مقابلہ کے لیے بھیجا۔ عبداللہ نے قدامہ پر نیزہ سے حملہ کیا۔ قدامہ نے اپنا گھوڑا ہٹا لیا۔ عبداللہ جب حملہ کر رہے تھے تو قدامہ اپنا گھوڑا ہٹا لیتا تھا اور عبداللہ کا گھوڑا بوجہ بھوک اور پیاس کے تعاقب کا کام نہ دے سکتا تھا۔ تنگ آکر عبداللہ نے نیزہ پھینک دیا اور تلوار نیام سے نکالی۔ قدامہ نے یہ دیکھ کر خوشی خوشی نیزہ سے حملہ کیا۔ عبداللہ نے بچ کر تلوار سے قدامہ کے سر پر کاری زخم لگایا۔ اور دوسرا ہاتھ لگا کر قدامہ کو گھوڑے سے گرا دیا۔ خود اس کے گھوڑے پر سوار ہو گئے اور اپنا گھوڑا غلام کے حوالہ کر دیا۔ عبداللہ کچھ دیر ٹھہرے رہے۔ جب کوئی مقابل نہ آیا تو پیاس سے مضطرب ہو کر یکبارگی لشکر پر حملہ کیا اور عمیر حمیری کو جو خوارج نہروان میں سے تھا قتل کیا اور اس کے لڑکے کامل بن عمیر کو بھی اس کے باپ کے پاس پہنچا دیا۔ بعد قلب لشکر پر حملہ کیا اور صالح بن نصر کے علاوہ بیس آدمیوں کو قتل کیا۔ اب میمنہ کی طرف رخ کیا اور حماد حبشی کو جو عمر سعد کے لشکر کا پہلوان تھا نیزہ سے قتل کیا۔ اسی وقت مرداس دمشقی نے پشت کی طرف سے آکر عبداللہ کا گھوڑا پے کر دیا۔ عبداللہ پیدل ہو گئے۔ اتنے میں نوفل بن مزاحم حمیری نے نیزہ سے گرا دیا اور بعض کے قول کے مطابق عمرو بن صبیح صیداوی کے تیر سے شہید ہو گئے۔

جعفر و عبداللہ بن عقیل

پھر جعفر بن عقیل بن ابی طالب نے گھوڑے کو مہمیز کیا اور رجز خوان ہو کر اس گروہ سے مقابلہ کیا۔ اور دشمنوں کا قتل و قمع کرتے ہوئے درجہ شہادت حاصل کیا۔ ان کے بعد بھائی عبداللہ نے بھی رجز خوان ہو کر حملہ کیا اور اس کا فروں سے خوب مردانہ جنگ کی۔ انجام کار شہادت پائی۔

موسیٰ اور عبدالرحمن بن عقیل

ابومخنف موسیٰ بن عقیل کی شہادت بھی لکھتا ہے اور ابن خلدون عبدالرحمن بن عقیل کو شہدا کی فہرست میں داخل کرتا ہے۔

محمد و عون بن عبداللہ بن جعفر

اس کے بعد محمد بن عبداللہ بن جعفر طیار میدان میں گئے اور جام شہادت نوش کیا۔ اور صاحب روضۃ الشہدا کہتا ہے کہ:

"تو زیب خواہر امام حسینؑ دو فرزند داشت و لیکن خود جدید امام حسینؑ از ایشان را تسلی داد و دعا و خوشی گردانید۔"

اب پیاس کی شکایت کرتے ہوئے بھائی کے پاس آ گئے۔ یہاں شاید عون کی شہادت ہو گئی جنگ کی آخری ساعت میں زید
نے پانی کی بیلنے سے انکار کیا چاہا کہ ابن سعد نے لکن ہائے۔ اتنے میں بھی کچھ نہ ہوا حضرت عباسؑ نے دیکھا جنگ کرتے
ہوئے گئے اور نہر کی طرف بڑھ رہے تھے کہ زید بن ورقا جہنی نے پشت پر تلوار ماری جس سے گر گئے عباسؑ نے پلٹ کر اس پر
گھوڑا روک کر ایک ضرب میں زید کا کام تمام کر دیا۔ عون بن ... نے عباسؑ کا تیر مارنا چاہا لیکن عون بن علیؑ نے اس کا
کام تمام کر دیا۔ عبداللہ بن حسنؑ خیمہ تک نہ آ سکے لیکن اثر پائی۔

اس جگہ یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ صاحب عمدۃ الطالب فی انساب آل ابی طالب اور ناسخ التواریخ اور صاحب
جلاء العیون کی ایک روایت کے موافق حسنؑ مثنیٰ (فرزند حضرت امام حسنؑ) نے میدان کربلا میں جنگ کی اور سخت زخمی
پڑے تھے کہ اسماء بن خارجہ بن عیینہ بن حصن بن حذیفہ بن بدر الفزاری ان کے قریب پہنچا جب لشکر عمر سعد
شہداء کے سر کاٹنے لگا اسماء نے انہیں مانگ لیا علاج ہوا اور یہ اچھے ہو گئے حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کی
صاحبزادی فاطمہ بنت الحسینؑ ان کے عقد میں تھیں۔

لیکن بعض مورخین نے حسنؑ بن الحسنؑ (حسنؑ مثنیٰ) کی جنگ کا ذکر نہیں کیا ہے اگر کیا ہے تو قاسم بن الحسنؑ کا اور کبھی
بنی عبداللہ بن حسنؑ کا مگر ممکن تھا کہ یہ کہا جاتا کہ مورخین نے عبداللہ بن حسنؑ کو حسنؑ مثنیٰ قرار دیا ہے لیکن نسابین نے
اولاد امام حسنؑ میں صاف صاف عبداللہ اور حسنؑ کہا ہے یعنی یہ علیحدہ علیحدہ دو فرزند تھے ایک اور مشکل یہ
ہے کہ جس وقت حضرت امام حسین علیہ السلام سخت زخمی ہو چکے تھے ایک بچہ جس کا نام عبداللہ بن حسنؑ تھا حضرتؑ کی طرف
دوڑا ... کوئی ... کے فرق مبارک پر ... کیا چاہتا تھا کہ اس بچہ نے اپنے چھوٹے ہاتھ آگے کر دیئے
اور وہ ضرب تلوار سے کٹ گئے۔

احمد و قاسم

ابو مخنف ایک اور بھی بات کہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب حضرتؑ کے پاس تین چار اقرباء کے
علاوہ کوئی نہ رہا اور حضرتؑ منتظر رہے تھے کہ کون ہماری مدد کرتا ہے کون حرم پر حملہ سے
دشمنوں کے شر کو دفع کرتا ہے اس وقت فخرج الیہ من الخیمۃ غلامان کانہما قمران احدہما احمد والآخر اسمہ
القاسم بن الحسن بن علی بن ابی طالب وہما یقولان لبیک لبیک یا سیدنا ها نحن بین یدیک مرنا بامرک
صلوات اللہ علیک فقال لہما احملا فحاما عن حرم جدکما ما انقی الدہر غیرکما بارک اللہ فیکما۔

۱۴ برس

فبرز القاسم ولہ من العمر اربع عشرۃ سنۃ وحمل علی القوم ولم یزل یقاتل حتی قتل سبعین
ملعونا فارسا وکمن لہ ملعون فضربہ علی ام راسہ ففجرہا منہ فانصرع یخور فی دمہ فانکب
علی وجہہ وہو ینادی یا عماہ ادرکنی فوثب الیہ الحسین فرقم عنہ ووقف علیہ وہو یضرب الارض
برجلیہ

۱۶ برس

حتی قضی نحبہ وحول الیہ وحملہ علی ظہر جوادہ — ثم نظر الی القاسم وبکی علیہ وقال
یعز واللہ علی عمک ان تدعوہ فلا یجیبک — وبرز من بعدہ اخوہ احمد ولہ
من العمر ستۃ عشرۃ سنۃ۔ اس سے ظاہر ہے کہ احمد ابن حسنؑ بھی میدان تک تشریف لے گئے اور ان قاسم تھے کہ

نیز لیکن جب ان لوگوں کے سوار ان دشمنوں پر حملہ آور ہوئے تو ان کا داہنا ہاتھ کٹ گیا اور لوگوں نے شور و غل برپا کر دیا۔ اے خدا
[illegible])۔

عباسؑ رضی اللہ عنہ اسی طرح حملہ پر حملہ کئے جا رہے تھے اور ان کے بازوؤں سے خون ٹپکتا جاتا تھا۔ آخر ان کی طاقت سلب ہو گئی... اتنے میں لوگوں نے ان پر مجموعی حملہ کیا اور ایک شخص نے ان کے سر پر لوہے کی ایک ماری جس سے ان کا سر پھٹ گیا اور وہ زمین پر آ رہے۔ اس وقت ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے: بھائی حسینؑ تم کو میری طرف سے سلام۔ امام حسینؑ رضی اللہ عنہ نے لوگوں پر شدت سے حملہ کیا پھر عباسؑ رضی اللہ عنہ کی لاش کی طرف گئے اور اس کو اٹھا کر اپنے مقتولوں کے ڈھیر میں رکھ دیا اور نہایت زور و شور سے رونے لگے۔ عورتیں بھی باہر نکل آئیں اور سب نے رونا شروع کیا یہاں تک کہ ان کا شور و شیون سن کر آسمان کے فرشتے بھی رونے لگے۔ امام حسینؑ نے عورتوں کو خیمہ میں داخل کیا۔ اب رات بھی آ گئی تھی۔ امام حسینؑ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے تسبیح پڑھتے پڑھتے اور اپنی مصیبتوں پر شکر کرتے کرتے رات گزاری۔ بعض حضرت عباسؑ کی شہادت کی کوئی تاریخ نہیں لکھتے لیکن اسی ضمن میں لکھا ہے جب کہ نویں تاریخ کو دشمنوں کا حملہ ہوا ... کی اور حضرتؑ نے انہیں واپس بلا لیا۔

ابو مخنف کے نزدیک مخصوص واقعہ یہ ہیں کہ جب حضرتؑ اور متعلقین پر پیاس نے غلبہ کیا تو حضرتؑ نے عباسؑ کو بلایا اور فرمایا کہ اے بھائی کنواں کھودو۔ کنواں کھودا گیا لیکن اس میں سے پانی نہ نکلا جس سے پیاس بجھائی جاتی۔ اب حضرتؑ نے فرمایا کہ فرات کی طرف جاؤ اور رسول اللہ کا علم عباسؑ نے سنبھالا اور علم عطا فرمایا۔ روانہ ہوئے۔ کچھ لوگ اور بھی ساتھ تھے۔ رجز پڑھا اور حملہ کیا اور دشمنوں کو داہنے بائیں منتشر کر دیا اور اکثر بہادروں کو قتل کیا یہاں تک کہ قریب فرات پہنچے۔ جب اصحاب ابن زیاد نے دیکھا تو پوچھا تم لوگ کون ہو؟ کہا ہم لوگ حسینؑ کے اصحاب ہیں۔ [illegible]۔ پوچھا کیوں آئے ہو؟ کہا پیاس بجھانے آئے ہیں۔ اور ہم لوگوں پر حسینؑ کی پیاس سب سے زیادہ دشوار ہے۔ پس ان لوگوں نے جب حضرت عباسؑ کا کلام سنا تو حملہ کر دیا۔ اور بڑی لڑائی ہوئی۔ عباسؑ نے رجز پڑھ کر حملہ کیا۔ یہاں تک کہ راستہ کھول دیا اور پانی کی مشکیں بھر لیں۔ اس کے بعد پانی پینے کا ارادہ کیا۔ پس حسینؑ کی پیاس یاد آ گئی۔ اور فرمایا: واللہ لا ذقت الماء وسیدی الحسین عطشان ثم رمی الماء من یدہ وخرج والقربۃ علی ظہرہ۔ (واللہ میں پانی نہ پیوں گا میرے سید حسینؑ تو پیاسے ہیں۔ یہ کہہ کر پانی اپنے ہاتھ سے پھینک دیا اور نکل آئے درآنحالیکہ مشک ان کی پشت پر تھی)

گھاٹ سے نکلے تو سب ہر طرف سے ٹوٹ پڑنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کی زرہ کی کڑیاں سیاہی کے کانٹے کی طرح ہو گئیں۔ عباسؑ لڑ رہے تھے کہ اوس بن شیبان نے حملہ کیا اور داہنا ہاتھ مع تلوار کے گرا دیا۔ پس عباسؑ نے بائیں ہاتھ میں تلوار لی اور حملہ کیا اور دشمنوں کے کثیر التعداد بہادروں کو قتل کیا۔ اب بھی مشک آپ کے پشت پر تھی۔ یزید چیخ کر ابن سعد پکارا کہ تم پر وائے ہو مشک کو تیروں سے چھید ڈالو کیونکہ اگر حسینؑ نے پانی پی لیا تو پھر تم ان کو قتل نہ کر سکو گے۔ وہ شجاع بن شجاع علی بن ابی طالبؑ کے فرزند ہیں۔ پس ان سب نے عباسؑ پر سخت حملہ کیا اور عباسؑ نے ایک سو اسی (۱۸۰) سپاہیوں کو قتل کیا۔ پس عبداللہ بن یزید شیبانی نے ان کے بائیں ہاتھ پر حملہ کیا اور اسے مع تلوار کے گرا دیا۔ پس آپ نے ہاتھ کٹے ہوئے حصہ سے تلوار تھامی اور قلب پر حملہ کر دیا۔ اس وقت کسی نے عمود آہنی سے

ترجمہ: "یہ تیرے جد پیغمبرؐ ہیں، یہ امیر المومنین علیہ السلام ہیں، یہ میری جدہ فاطمہ زہراؑ ہیں، یہ خدیجہ کبریٰؑ ہیں اور فرما رہی ہیں کہ اے فرزند آنے میں جلدی کر ہم تیرے مشتاق ہیں"۔ حضرتؑ نے دشمنوں پر حملہ کیا اور انھیں متفرق کر کے حضرت علی اکبرؑ کی لاش پر پہنچے۔ ان کے چہرہ اقدس کو ہاتھوں سے خون پونچھتے جاتے تھے اور فرماتے تھے: "اے فرزند خدا اس پر لعنت کرے جس نے تجھے قتل کیا۔" عمارہ بن سلمان حمید بن مسلم سے روایت کرتا ہے کہ میں نے ایک بی بی کو دیکھا جو حسینؑ کے خیمے سے نکلیں اور ان کا چہرہ چاند کی طرح تھا اور وہ آوازیں دے رہی تھیں کہ اے فرزند اے قتیل کس روز ہم مددگاروں کی قلت ہے اور ہم کیسی غریب ہیں کاش ہم آج کے دن سے پہلے گزر گئے ہوتے۔ حسینؑ انھیں دیکھ کر چلے اور انھیں خیمہ میں پہنچایا اور دریافت پر معلوم ہوا کہ وہ بی بی حضرت امیر المومنینؑ کی صاحبزادی ہیں۔ حضرتؑ ان کے رونے سے رو دیے اور انا للہ وانا الیہ راجعون فرمایا۔ اپنے فرزند کی لاش کو ایک خیمہ میں لے گئے اور فرمایا: "اے فرزند تو دنیا کی تکالیف سے عظیم راحت کو پہنچا۔ تیری پھوپھی دو رہی ہے اور تیرا باپ باقی ہے اور جلد تیری طرف آ رہا ہے۔"

صاحب روضۃ الشہداء روایت لکھتا ہے کہ جب اہل مدینہ کو جناب رسالتمآبؐ کی زیارت کا شوق ہوتا تھا یا جب ان حضرتؐ کے لب مبارک کے مشتاق ہوتے تھے تو حضرت علی اکبرؑ کو دیکھتے تھے اور ان کی باتیں سنتے تھے۔ یہی مورخ ابو الوید سے لکھتا ہے کہ حضرت علی اکبرؑ جب میدان میں تشریف لائے تو آپ کے دو گیسو چہرہ کے آگے اور دو پشت کی طرف دبے تھے۔ (قریش عرب خصوصاً بنی ہاشم میں یہ رسم تھی)

کشف الغمہ کے مطابق حضرتؑ نے جناب علی اکبرؑ کو خود مسلح فرمایا اور "شعشعۂ طلعتش از جمال پیغمبر خبر میداد و قصہ بازوش چون حیدر صفدر اثری بود"۔ یعنی: "آپؑ کے رخ انور سے جمال پیغمبرؐ کی جھلک آتی تھی اور بازو کی طاقت حیدر صفدر کی طرح ہوتی تھی۔"

روضۃ الشہداء کے مطابق عمر بن سعد نے طارق بن شیث کو موصل کی امارت دے کر حضرت علی اکبرؑ سے جنگ کے لیے بھیجنا چاہا۔ اور اس نے کہا کہ: میں ڈرتا ہوں کہ فرزند رسولؐ کو قتل کروں اور تو اپنا وعدہ وفا نہ کرے۔ عمر سعد نے قسمیں کھائیں لیکن حکومت موصل کی آرزو پوری نہ ہوئی اور وہ مع اپنے دیگر اقرباء کے مارا گیا۔

یہ بھی روایت ہے کہ جس وقت حضرت علی اکبرؑ لشکر میں غائب ہو گئے، حضرتؑ تلاش میں چلے اور پکارتے جاتے تھے کہ "یا ابتاہ ادرکنی" کی آواز نہ آئی۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ حضرت علی اکبرؑ سخت زخمی ہو چکے تھے اور بمشکل اپنے کو گھوڑے پر سنبھالے ہوئے تھے۔ عنان چھوڑ دی تھی اور عیال اسپ تھام لی تھی، گھوڑا خیمہ کی طرف چلا۔ تھوڑی دور چلا تھا کہ حضرت علی اکبرؑ پشت زین سے گر گئے اور گھوڑا میدان کی طرف چلا۔ حضرتؑ عقاب کو خالی دیکھ کر علی اکبرؑ کو تلاش کرنے لگے اور اس کے ساتھ چلے۔ یہاں تک کہ وہ لاش کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ حسینؑ نے علیؑ کو پھر کر تڑپتے دیکھا۔

صاحب لہوف فرماتے ہیں: لیکن جب اصحاب سید الشہداءؑ سے کوئی باقی نہ رہا صرف اب اقرباء باقی رہ گئے تو جناب علی ابن الحسینؑ صف سے نکلے۔ وہ بہت گورے تھے۔ ان سے بہتر اس زمانہ کوئی حسین نہ تھا۔ انھوں نے حضرتؑ سے اجازت جہاد چاہی۔ سید الشہداءؑ نے اجازت تو دی مگر پھر حسرت و یاس سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر حضرتؑ نے آنکھیں نیچی کر لیں اور رو دیے۔ بعد شہادت سید الشہداءؑ وہاں پہنچے اور کھڑے ہو گئے۔ پھر جھک کر علی اکبرؑ کے منہ پر اپنا منہ رکھا اور کہا کہ:

کہ ناگاہ ایک تیر اس بچے کے سینہ پر لگا۔ اسی وقت جان بحق تسلیم ہو گیا۔ آپ نے کہا: میرے نانا محمد مصطفیٰ کی دشمنی کی وجہ سے اس قوم کی حالت پر سخت افسوس ہے۔ پھر گھوڑے سے اتر کر تلوار سے گڑھا کھودا اور اس بچے کی نعش دفن کر دی۔

علی اصغر

علی اصغر علیہ السلام ۔۔۔۔۔ اور اس کے بعد اپنے شیر خوار بچے علی اصغر کو جو پیاس کی شدت سے نہایت مضطرب تھا اپنے آگے زین پر رکھ کر صفوں کے سامنے لے گئے اور آواز دی: اے ظالم قوم! اگر تمہارے خیال میں میں گنہگار ہوں تو اس بچے نے تو کوئی خطا نہیں کی ہے۔ اسے ایک گھونٹ پانی پلا دو۔ حسین بن علیؑ کی آواز بھی کر ان میں سے ایک شقی نے حضرتؑ کی طرف تیر مارا جو شیر خوار کے گلے کو چھید کر حضرتؑ کے بازو میں پیوست ہو گیا۔ تیر کے نکالتے ہی بچے کی روح پرواز کر گئی۔ امیر المومنین لاش لے کر واپس آ گئے اور اس کی ماں کو دیکھ کر کہا: تیرا بچہ حوض کوثر سے سیراب ہو گیا۔ صاحب غم حسینؑ کے موافق فرمایا: اے رب اگر تو نے ہم سے مدد روک لی ہو تو جو مناسب ہو وہ کر۔ اور ان ظالموں سے انتقام لے۔ روضۃ الشہداء کے موافق فرمایا: حضرت زینبؑ سے آپ نے فرمایا کہ اس کو لے لو۔ یہ کہہ کر سید الشہداء نے خون اس کا چلو میں لیا اور جب چلو خون سے بھر گیا تو آپ نے اس کو آسمان کی طرف اچھال دیا اور فرمایا کہ یہ سب آفت جو میرے اوپر نازل ہو رہی ہے آسان ہے کیونکہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔

ابو اسحٰق اسفرائنی کہتے ہیں: اس کے بعد آپ خیمہ میں داخل ہوئے اور فرمایا: اے زینب اے پیاری بہن میرے چھوٹے بچے کو اور مہیا کر دیں۔ اسے وداع کر دوں۔ زینبؑ نے کہا کہ اس بچے نے تین روز سے پانی نہیں پیا۔ آپ اگر اس کے لیے پانی مانگیں تو شاید لوگ اس بچے پر ترس کھا کر اس کو پانی دے دیں۔ امام حسینؑ رضی اللہ عنہ نے بچے کو گود میں لے کر چاہا مگر وہ پیاس کا مارا ان کے ہاتھوں میں تڑپ رہا تھا۔ پھر آپ اس بچے کو لے کر ظالمین کے سامنے گئے اور کہا تم نے میرے ساتھیوں کو قتل کر ڈالا ہے۔ اب اس بچے کے سوا کوئی باقی نہیں رہا۔ اس نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔ یہ پیاس سے بے تاب ہے۔ دیکھو نہیں تو اس کو پانی پلا دو۔ آپ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ کسی بدکار ناہنجار باغی نے ایک زہریلا تیر مارا جو اس بچے کے گلے میں آ کر لگا اور یہ معصوم بچہ وہیں دم توڑ کر رہ گیا۔ دردمند باپ اس کا خون پونچھتا جاتا تھا اور یہ الفاظ منہ سے نکل رہے تھے: اللھم اشھد علی ھولاء القوم۔ الٰہی تو ان لوگوں کے سلوک کا گواہ ہے۔ پھر آپ واپس آئے اور بچے کی لاش ام کلثوم کو دے دی جس کو انہوں نے سینہ سے لگایا اور رونے لگیں اور ان کے ساتھ سب کے سب حتی کہ ملائکہ نے بھی رونا شروع کیا۔ ام کلثوم روتے روتے یہ اشعار پڑھتی جاتی تھیں۔

(میرا دل اس پیاسے خورد سال بچے پر افسوس کرتا ہے جسے دودھ چھوٹنے کے قبل ہی دشمنوں کے تیر نے شہید کر دیا۔ ابھی وہ بچہ ہی تھا کہ اسے خون کی کلی کرا دی۔ میرا دل اس پر ہمیشہ افسوس کرتا رہے گا۔ ان ظالموں نے اس کے ماں باپ کا دل اس کے غم میں جلا دیا اور انتقام لینے کے لیے اسے تیر مارا)

ابو مخنف کے نزدیک حضرت علی اصغر کی عمر چھ مہینہ کی تھی۔ آپ یہ چھوٹی سی لاش لیے ہوئے آ رہے تھے اور خون حسینؑ کے سینہ پر بہہ رہا تھا۔ اور فرما رہے تھے:

(اے میرے پروردگار! مجھے تنہا نہ چھوڑ ان لوگوں کے درمیان جو انصاف کے منکر ہیں۔ جنہوں نے ہم کو درماندہ بنا دیا ہے اور جو اپنے افعال سے یزید کو خوش کر رہے ہیں۔ تمام میرے ساتھی شہید ہو گئے ہیں اور حالت

● جنھوں نے رسولؐ کے ساتھ جہاد میں سعی کی کہ بہادروں کو قتل کیا اور قرض ادا کرنے والے ہیں۔ ● جنھوں نے بتوں کو پست اور سرنگوں بنا دیا اور دین کو شمس و قمر سے بھی بلند کر دیا۔ ● میں ایسی آنکھ اور کان کا فرزند ہوں جسے مشرق و مغرب کے لوگوں نے مانا ہے۔ ● جبریل کو ہماری وجہ سے فخر حاصل ہوا اور ہمارے باپ نے ہماری طرف سے تمام دین ادا کر دیے۔ (مؤلف کے نزدیک دین یعنی قرض کا مفہوم فرض سے ادا ہوتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اشاعت اسلام اور وہ بڑے بڑے کام جو امیرالمومنین نے کیے ان کے بعد ہمارے لیے کوئی اس درجہ کا فرض باقی نہیں ہے۔ اس سے جناب امیر کے کاموں کی وقعت قائم کی ہے بمقابلہ ان خدمات دین کے جو ان کے بعد کی جائیں) ● پس اللہ ان کو ہماری طرف سے جزائے خیر دے۔ جو خالق عالم اور مولائے دو جہان ہے۔

مقتل ابی مخنف میں کچھ اشعار زیادہ ہیں جن کے مخصوص یہ ہیں:

و امی الزہرا حقاً و ابی	وارث العلم و مولی الثقلین
خصۃ اللہ بفضل و تقی	فانا الزہرا و ابن الازہرین
مع رسول اللہ سبعاً کاملا	ما علی الارض مصل غیر ذین
ترک الاصنام مستد حصۃ	و رقاً بصمد فوق المنبرین
فلہ الحمد علینا واجب	ما جری بالفلک احد النیرین
نحن اصحاب العبا خمستنا	قد ملکنا شرقًا و المغربین
ثم جبریل لنا سادسا	و لنا للبیت کذا و المشعرین
و کذا المجد بنا مفتخرا	شامخاً یعلوبہ فی الحسین
فجزا اللہ عنا صالحًا	خالق الخلق و مولی المشعرین
عروۃ الدین علی المرتضی	صاحب الحوض مفر الحرمین
یفرق الصفان من ہیبتہ	و کذا افعالہ فی الخافقین
و الذی صدق بالخاتم منہ	حین ساوی ظہرہ فی الرکعتین
شیعۃ المختار طیبوا نفساً	فغدا تسقوا من حوض اللجین
فعلیہ اللہ صلی ربنا	حبا تحفہ بالحسین

حضرت علیؑ آخری لباس پہنتے ہیں

کامل بن اثیر کہتا ہے: جب تین چار آدمی حضرتؑ کے لشکر میں باقی تھے اس وقت حضرتؑ نے ایک ایسا پائجامہ پہنا جسے کوئی نہ لوٹے کسی نے کہا کہ ایک جانگیا پہن لیجیے۔ فرمایا کہ یہ لباس ذلت ہے اسے نہ پہنوں گا۔

لباس چاک کیا

صاحب لہوف فرماتے ہیں سید الشہدا نے فرمایا کہ میرے لیے ایسا لباس لاؤ کہ جسے کوئی پسند نہ کرے۔ میں اسے اپنے کپڑے کے نیچے پہن لوں تاکہ بعد قتل برہنہ نہ کیا جاؤں۔ تب حضرتؑ کی خدمت میں ایک لنگوٹ یا جانگیا لائے تو حضرتؑ نے فرمایا کہ نہیں یہ پوشاک ذلیلوں کی ہے۔ پھر

حضرتؑ نے ایک پرانا لباس لیا اور اس کو جابجا سے پھاڑ کر پہن لیا۔ مگر جب حضرتؑ شہید ہو گئے تو ان ملعونوں نے وہ کپڑا بھی حضرتؑ کے جسم سے اتار لیا۔ اس کے سوا سید الشہدا نے ایک پائجامہ حبرہ کا منگوایا اور اس کو بھی چاک کر کے پہن لیا۔ اس لیے اس کو پھاڑا تھا کہ اس کو کوئی نہ اُتارے۔ مگر جب حضرتؑ شہید ہو گئے تو اس کو بحیر بن کعب شقی لعین نے اتار لیا۔

حضرت شہربانو سے اسلحہ طلب فرمایا

صاحب روضۃ الشہدا کے موافق حضرتؑ نے اسلحہ جنگ حضرت شہربانو سے طلب کیا لیکن ناسخ التواریخ کے موافق حضرت شہربانو کی رحلت حضرت علی ابن الحسینؑ کی ولادت کے بعد ہوئی۔

صاحب بحار علامہ شہر آشوب علیہ الرحمۃ سے نقل فرماتے ہیں کہ اشقیا اہل بیت کو قید کرانے پر حضرت شہربانو کے جنھوں نے اپنے کو فرات میں گرا دیا۔ شاہ عبد العزیز صاحب سر الشہادتین کے ضمیمہ میں فرماتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کی ازواج شریفہ میں اس وقت حضرت شہربانو رضی اللہ عنہا اور مادر پسر سوم شیر خوارہ حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کے ہمراہ تھیں۔ حضرتؑ جس وقت خود جہاد کے لیے تشریف لائے اس وقت کی حالت شاعر کے ان اشعار سے خوب ادا ہوتی ہے کہ: ؎

ورائے پردہ نشیناں و کودک بیمار نماند ہیچ کس دیگر از تبار حسینؑ
حسینؑ گریہ کناں در فراق فرزندان ستادہ لشکر بے حد در انتظار حسینؑ

یعنی: بیبیوں اور بیمار بچے کے سوا حسینؑ کا کوئی نہ رہا۔ حسینؑ بچوں کی جدائی پر رو رہے تھے اور آپ کے انتظار میں لشکر کھڑا تھا۔

حضرتؑ جنگ کر رہے تھے اور فرماتے تھے "القتل اولی من رکوب العار و العار اولی من دخول النار"۔ (مارا جانا ارتکاب عار سے اور عار مستوجب نار ہونے سے بہتر ہے) اگرچہ میں یہ جانتا ہوں کہ اکثر مضمون نگار اور واقعہ نویس حضرات نے مسٹر جیمس کار کرن مؤلف تاریخ چین کے وہ فقرات جو انھوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے متعلق لکھے ہیں نوٹ کیے ہیں۔ لیکن چونکہ ایک غیر قوم مؤرخ کے حسن پسندی کا اعتراف نہ کرنا میرے نزدیک مستحسن نہیں ہے۔ اور کتاب بھی میرے پاس موجود ہے۔ میں بھی اس موقع کو ضائع نہیں کرتا کہ اس قابل مؤرخ کے پر غور فقرات کو ناظرین کے دلچسپ غور کے حوالہ کروں۔ قابل مؤرخ نے زبان اردو میں جو مہارت اور قوت اظہار حاصل کی ہے اس نے مجھے نہ صرف ترجمہ کی زحمت سے بچایا بلکہ اس سے بڑی بات یہ ہے کہ کوئی شخص ان الفاظ کو دیکھ کر یہ نہ کہے گا کہ ترجمہ میں مناسب لفظوں کے استعمال سے اثر کے درجہ میں زیادتی کی گئی ہے۔ بلکہ یہ الفاظ خود مؤرخ کا آئینہ خیال ہے۔ قابل مؤرخ واقعہ کربلا کو "سر دفتر تاریخ" کہتا ہے اور لکھتا ہے:

دنیا میں رستم کا نام بہادری میں مشہور ہے لیکن کئی شخص ایسے گزرے ہیں کہ ان کے سامنے رستم کا نام قابل لینے کے نہیں چاہیے۔ چنانچہ اول درجہ میں حسینؑ بن علیؑ کا مرتبہ بہادری میں ہے۔ کیونکہ میدان کربلا میں ریت پر تشنگی اور گرسنگی میں جس شخص نے ایسا کام کیا ہو اس کے سامنے رستم کا نام وہی شخص لیتا ہے جو تاریخ سے واقف نہیں ہے۔ کس کے قلم کو قدرت ہے کہ حسینؑ کا حال لکھے۔ کس کی زبان میں یہ لطافت و بلاغت ہے کہ ان بہتر بزرگوں کی ثابت قدمی اور تہور و شجاعت اور بیس ہزار سوار خونخوار شامیوں کے جواب دینے اور ایک ایک کے ہلاک ہو جانے کے باب میں مدح

جیسا کہ چاہیے کرسکے۔ کس کی نازک خیالی کی یہ رسائی ہے کہ ان لوگوں کے دلوں کے حال کو تصور کرے کہ کیا کیا ان پر گزرا۔ اس وقت سے جب عمر سعد نے دس ہزار سوار سے انھیں گھیر لیا۔ اس وقت تک جب کہ شمر ملعون نے سر کاٹ لیا۔ کیونکہ ایک کی دوا دو مثل مشہور ہے۔ اور مبالغہ کی حد بھی ہے۔ جب کسی کے حال میں یہ کہا جاتا ہے کہ دشمن نے چار طرف سے گھیر لیا۔ لیکن حسینؑ اور بہتر تن کو آٹھ قسم کے دشمنوں نے تنگ کیا تھا اور اس پر بھی قدم نہ ہٹا۔ چنانچہ چار طرف سے تو دس ہزار فوج یزید کی تھی جن کے تیروں اور نیزوں کی بوچھار مثل آندھی کے آتی تھی۔ اور پانچواں دشمن عرب کی دھوپ تھی جس کی مثال کسی شے میں زیر فلک نہیں ملتی۔ اور یہی کہنا ہوتا ہے کہ عرب کی دھوپ کے مانند عرب ہی کی دھوپ ہے۔ اور چھٹا دشمن وہ ریگ کا میدان تھا جو آفتاب کی تمازت میں شعلہ زن اور تنور خاکستر سے زیادہ پر سوز تھا بلکہ اس کو دریائے قہر کہنا چاہیے۔ جس کے بلبلے بنی فاطمہ کے پاؤں کے آبلے تھے۔ اور دو دشمن سب سے ظالم بھوک اور پیاس مثل دغاباز ہمراہی کے جس کے برابر عدو نہیں۔ ساتھ تھے۔ اور تشنگی سے جب زبان پھول کے پھٹ جاتی تھی۔ تب ہی ان دو کی خواہش مٹتی تھی۔ پس جنھوں نے ایسے معرکہ میں ہزارہا کافروں کا مقابلہ کیا ہو ان پر خاتمہ بہادری کا ہوچکا الغرض سر دفتر تاریخ اس رزم کو جا کر۔۔۔۔"۔

مسٹر گبن کہتے ہیں: دشمن کا بہادر سے بہادر سپاہی اس مرتے ہوئے بہادر کے حملہ سے ہر طرف بھاگنے لگا۔ اور بے رحم شمر جس سے مسلمانوں کو نفرت ہے سپاہیوں کو ملامت کرنے لگا۔

حر کی لاش لانے کے وقت حضرتؑ کی جنگ

ابو اسحاق اسفرائنی حضرتؑ کی ایک جنگ کے متعلق لکھتے ہیں: جب حضرتؑ حر کی لاش لینے گئے تھے کہ امام حسینؑ رضی اللہ عنہ شیرانہ جوش میں قلب لشکر کی طرف حملہ آور ہوئے اور دائیں بائیں ہر طرف تیغ چلانی شروع کی۔ اس وقت آپ کی تیغ زنی آپ کے والد شیر خدا حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ کی نبرد آزمائی کا سماں باندھ رہی تھی۔ ایک سوار کو گردن سے پکڑ کر دوسرے سوار کے ساتھ اس طرح ٹکراتے تھے کہ دونوں مر جاتے۔ اور دو سواروں کو گردن سے پکڑ کر دو سواروں کے ساتھ اس زور سے ٹکراتے کہ چاروں کی جان ہوا ہو جاتی تھی۔ آپ کا ذوالجناح گھوڑا بھی برابر کام میں مشغول تھا۔ کسی سوار کو دانتوں سے پکڑتا اور جھنجوڑ کر ہلاک کرتا۔ کسی کو دولتّا رسید کرتا اور پرخچے اڑا دیتا۔ کسی کو دم اس زور سے مارتا کہ وہ اس کی جان کے لیے خدائی تازیانہ بن جاتی۔ دیر تک یہی حالت رہی تھی کہ دشمن کی فوج کا یہ حال ہو گیا کہ کوئی زخمی پڑا ہے کوئی خاک و خون میں ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ کوئی بھاگ جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے مخالفوں کے دل پر رعب ڈال دیا۔ امام حسین رضی اللہ عنہ یہ اشعار پڑھتے اپنے خیمہ کو واپس آئے: ؎

انا ابن علی الطھر من ال ھاشم | کفانی بھذا مفخر حین افخر

و جدی رسول اللہ اکرم خلقہ | و نحن سراج اللہ فی الخلق اظھر

و فاطمۃ امی سلالۃ احمد | و عمی یدعی ذو الجناحین جعفر

و فینا کتاب اللہ انزل صادقا | و فینا الھدی و الوحی و الخیر یذکر

و نحن امان اللہ للخلق کلھم نقول بھذا للانام و نخبر

و شیعتنا و اللہ اکرم شیعۃ و مغبضنا یوم القیامۃ یخسر

● میں بنی ہاشم میں سے علیؑ طاہر کا فرزند ہوں۔ اگر میں فخر کروں تو یہی فخر میرے لیے کافی ہے۔ ● اور میرے جد رسولؐ ہیں جو خلق خدا میں سب سے مکرم ہیں۔ اور ہم خلق میں روشن چراغ ہیں۔ ● اور فاطمہؑ حضرت محمد مصطفیٰؐ کی دختر نیک اختر میری مادر گرامی ہیں۔ میرے چچا جعفرؑ ہیں جن کا لقب ذوالجناحین ہے۔ ● اللہ کی سچی کتاب ہم پر نازل ہوئی اور ہم میں ہدایت وحی اور خیر ہے۔ ● ہم تمام خلق کے لیے خدا کی امان ہیں اور ہم اسے تمام خلق سے پکار پکار کر کہتے ہیں۔ ● اور ہمارے شیعہ تمام لوگوں کے رفتار میں زیادہ مکرم ہیں اور ہمارے دشمن روز جزا نقصان اٹھانے والے ہیں)

دست بدست جنگ

صاحب روضۃ الشہداءؒ اور کشف الغمّہ کہتے ہیں کہ: حضرتؑ جب میدان جنگ میں آئے تو آپؑ نے ایک شرط یہ پیش کی کہ: "مجھے مدینہ جانے دو"۔ جب اسے دشمنوں نے منظور نہ کیا تو فرمایا کہ: "مجھے تھوڑا سا پانی دو"۔ جب اسے بھی قبول نہ کیا تو فرمایا کہ: "تیسری شرط یہ ہے کہ مجھ سے ایک ایک کر کے جنگ کرو"۔ ابن سعد نے اسے مان لیا۔ حضرتؑ نے رجز پڑھا اور مقابل طلب کیا۔

"اول کس تمیم بن قحطبہ کہ از ابطال شام بود چوں پلنگ خون آشام آہنگ جنگ ساخت سید الشہداءؑ چوں برق خاطف بر او تاخت و سرش را با تیغ بپرانید۔ ہمچناں ابطال رجال از دنبال مردے بآں حضرتؑ روئے در روئے شدند و سخت بکوشیدند و از شربت نختین بنوشیدند عدد مقتولین از شمار آمد۔ ابن سعد دانست کہ در پہن دشت آفرینش ہیچکس را آں توش و توان نیست کہ با سید الشہداءؑ کاوش و کوشش آغازد۔ و گر کار بدینگونہ رود تمام لشکر را با تیغ بپردازد سپاہیان را بانگ زد و گفت وائے بر شما یاد آیا میدانید کہ با کدام کس قتال می دہید۔ این پسر انزع البطین غالب کل غالب علیؑ بن ابی طالب است این پسر کسی است کہ شجاعان عرب و دلیران اقوام را یک تن بجائے نگذاشت۔

یعنی: سب سے پہلے تمیم بن قحطبہ نے کہ جو شام کے بہادروں میں سے تھا خون آشام چیتے کی مانند جنگ کے لیے آمادہ ہوا۔ سید الشہداءؑ برقِ خاطف کی طرح اس پر جھپٹے اور اس کے سر کو تلوار سے اڑا دیا۔ اسی طرح بہادر مرد یکے بعد دیگرے حضرتؑ کے سامنے آتے گئے اور سخت کوشش کرتے رہے اور پہلے والے شربت ہی کو پیتے گئے۔ مقتولین کی تعداد شمار سے باہر ہو گئی۔ ابن سعد نے جان لیا کہ دشتِ کائنات کی وسعت میں کسی میں اتنی طاقت و توانائی نہیں ہے کہ سید الشہداءؑ کے مقابل کد و کاوش کر سکے۔ اور اگر کام اسی طرح چلا تو تمام لشکر کو تلوار کے گھاٹ اتار دیں گے۔ سپاہیوں کو آواز دی اور بولا وائے ہو تم پر آیا جانتے ہو کہ کس شخصیت سے لڑ رہے ہو۔ یہ انزع البطین غالب علیؑ کل غالب علی بن ابی طالبؑ کا بیٹا ہے۔ یہ اس کا بیٹا ہے کہ جس نے عرب کے بہادروں اور اقوام کے دلیروں میں سے کسی کو نہیں چھوڑا۔

لشکر کا مجموعی حملہ

حکم داد کہ لشکر یک مرتبہ حملہ بر آں برند پس لشکر یک بار بجنبش آمد و سید الشہداءؑ چوں شیر ژیان دست از جان شستہ و دل بر خدائے بستہ بر میمنہ و میسرہ لشکر حملہ افگند۔ و لشکر پیش روئے آں حضرتؑ چوں گوزن از شیر و گلہ از گرگ می رمیدند۔ و در پہن دشت حسرتگاہ می پراگندند۔ یعنی: اس نے حکم دیا کہ تمام لشکر یک بارگی حملہ کر دے۔ پس لشکر یک بارگی حرکت میں آیا۔

اور سید الشہداءؑ نے جان سے ہاتھ دھو کر دل کو اللہ سے لگا کر شیر بیشہ کی طرح لشکر کے میمنہ اور میسرہ پر حملہ کیا، اور لشکر آپؑ کے سامنے اس طرح بھاگنے لگا جیسے ہرن شیر سے اور بکریوں کا ریوڑ بھیڑیے سے بھاگتا ہے۔ اور میدان جنگ کی وسعت میں منتشر ہو گئے۔

میدان خالی ہو گیا

تا این وقت ہزار و نہصد و پنجاہ کس از کفار را با تیغ در گزرانید۔ اطراف آن حضرتؑ از دشمن تہی گشت پس اندکے از قلب حرب گاہ کنار میگرفت و ایستاد۔

یعنی: اس وقت تک آپؑ نے کفار کے ایک ہزار نو سو پچاس لوگوں کو سپرد تیغ کر دیا تھا۔ آپؑ کی چاروں اطراف دشمن سے خالی ہو گئیں۔ پس تھوڑی سی دیر کے لیے آپؑ میدان جنگ کے ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے۔

افسران فوج نے پھر سپاہیوں کو جمع کیا

دیگر بارہ سرہنگان سپاہ بانگ بر لشکر کوفہ زدند و پراگندگان لشکر را جمع و ہمگان را بسرزنش بیازردند و بمقالت تحریص دادند مرتبہ دیگر سی ہزار تن ہم دست و ہمداستان آہنگ آن یک تن کردند۔ سید الشہداءؑ با آن زخمہائے تیغ و تیر و زحمت تشنگی چوں برق جہندہ خود را در میان آن لشکر بیکران افگند۔ کس ندانست کہ آن دست و بازو چہ صنعت می کند۔ چہار ہزار کمان خدنگہا بزہ بر نہادند و کمین بر کشادند۔ سواران حملہا متواتر ساختند و پیادگان بہ رمی احجار پرداختند و آن حضرتؑ را دائرہ کردار در میان آوردند۔ و صف از پس صف زدہ بستند۔ دفعۃ واحدۃ راکب و راجل بر آن حضرتؑ حملہ کردند۔ سید الشہداءؑ چوں شیر منغضب حملہ بر ایشان آورد و آن گروہ را بزخم تیغ و طعن نیزہ بخاک می افگند ہیچ کس بروے نگزشت کہ حلقہ شمشیر او گلشت و ہیچ طرفے روئے نکرد کہ لشکریان پشت ندادند۔

یعنی: دوبارہ لشکر کے سرداروں نے لشکر کوفہ کو صدا دی اور بکھرے ہوئے لشکر کو اکٹھا کیا، اور سب کو ڈانٹا اور لڑنے پر ابھارا۔ دوسری مرتبہ تیس ہزار کے لشکر نے ایک ساتھ ہو کر یک بارگی اس یکہ و تنہا کا قصد کیا۔ سید الشہداءؑ نے باوجود تیغ و تیر کے زخموں اور پیاس کی شدت کے لپکتی بجلی کی طرح اس بے کراں لشکر کے درمیان اپنے آپ کو ڈالا۔ کوئی نہ سمجھ سکا کہ وہ دست و بازو کیا کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں۔ چار ہزار تیر چلّہ کمان پر چڑھائے گئے اور چلا دیے گئے۔ سواروں نے متواتر حملے کیے اور پیادے پتھر برسانے لگے، اور آنجنابؑ کو اپنے دائرے کے درمیان لے کر صفوں کے پیچھے صفیں باندھ لیں، اور آنحضرتؑ پر یک بارگی پیدل اور سوار سب حملہ آور ہو گئے۔ اور سید الشہداءؑ نے غضب ناک شیر کی طرح ان پر حملہ کیا اور تلوار اور نیزہ کے زخم لگا کر زمین پر گراتے گئے۔ اور کوئی بھی آپؑ کے سامنے نہ آتا مگر تلوار کا شکار ہو جاتا تھا۔ اور کسی طرف آپؑ رُخ نہیں کرتے تھے مگر لشکری پیٹھ پھیر کر بھاگ اٹھتے تھے۔

گھاٹ کی طرف رُخ کیا

از شدت عطش جانب فرات روئے نمود۔ ہمگان بر طریق شریعہ آمدند و صف از پس صف راست کردند و طریق شریعہ را بستند۔ ابو الاعور اسلمی و عمر بن حجاج کہ با چہار ہزار مرد کماندار نگہبان شریعہ بودند بانگ بر سپاہ زدند کہ سید الشہداءؑ را راہ بر شریعہ ندہید۔ آن حضرتؑ بر ایشان حملہ افگند۔ صفوف را بشگافت و طریقہ شریعہ را از دشمن بپرداخت و اسپ را بفرات راند۔ و دست فرا برد و کفے آب برگرفت کہ بنوشد۔ یعنی: پیاس کی شدت سے

فرات کا رخ کیا۔ سب گھاٹ کے راستے پر آگئے اور صف بصف پس صف باندھ لیں اور گھاٹ کا راستہ روک لیا اور عمرؔ بن حجاج جو چار ہزار سپاہیوں کا کماندار اور گھاٹ کا نگہبان تھا اس نے لشکر کو آواز دی کہ سید الشہداءؑ کو گھاٹ کی طرف نہ جانے دیں۔ آنحضرتؑ نے ان پر حملہ کیا۔ صفوں کو چیرا اور گھاٹ کو دشمن سے چھین لیا اور گھوڑے کو فرات میں ڈال دیا۔ ہاتھ نیچے کر کے اور چلو پانی سے بھر لیا کہ پییں۔

دہن مبارک پر تیر لگا

دشمن کا عاجزانہ فریب

ناگاہ حصین بن نمیر تیرے بجانب آن حضرتؑ کشاد داد و آن تیر بر دہان مبارکش آمد و خون جاری شد۔ در این وقت سواری فریاد برداشت کہ اے حسینؑ تو آب می نوشی و لشکر بسراپردہ تو دری رود۔ حضرت سید الشہداءؑ چون این سخن را بشنید آب از کف بریخت واز شریعہ بیرون تاخت و بایتغ سپاہ کوفہ را پراگندد و بسراپردہ خویش آمد۔ مکشوف شد کہ گوینده این خبر مکرے کردہ و غدرے اندیشیدہ۔ یعنی: اچانک حصین بن نمیر نے آنحضرتؑ کی طرف تیر چلایا۔ وہ تیر دہانِ مبارک پر لگا اور خون بہنے لگا۔ اس وقت ایک سوار زور سے پکارا کہ "اے حسینؑ تو پانی پیتا ہے، جب کہ لشکر تیرے خیام میں داخل ہو گیا ہے"۔ حضرت سید الشہداءؑ نے جب یہ آواز سنی تو پانی چلو سے پھینک دیا اور گھاٹ سے تیزی کے ساتھ باہر آئے، اور تلوار سے لشکر کوفہ کو منتشر کیا، اور اپنے خیموں میں پہنچے۔ ظاہر ہوا کہ اس خبر دینے والے نے مکر کیا تھا، اور غدر کا سوچا تھا۔

اہل بیتؑ کو اسیری کے لائق لباس کی ہدایت

دیگر بارہ اہل بیت را وداع نمودہ بصبر و سکون وصیت فرمود و فرمان داد تا جامہ کہ در خور اسیری باشد در پوشید۔ پس ازان عنان بگردانید و آہنگ قتال نمود۔ یعنی: دوبارہ اہل بیتؑ کو الوداع کہی۔ صبر و سکون کی وصیت کی اور فرمایا کہ اسیری کے لائق لباس پہنیں۔ اس کے بعد باگ موڑی اور جنگ کا قصد کیا۔

گھوڑے سے خطاب

جس وقت حضرتؑ فرات کے کنارہ پہنچے آپؑ نے گھوڑے کی لگام ڈھیلی کر دی اور بحار و ناسخ التواریخ کے موافق گھوڑے سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ:

"میں پیاسا ہوں اور تو بھی پیاسا ہے۔ بخدا میں نہ پیوں گا جب تک تو نہ پی لے"۔

ابو مخنف کے موافق جب حضرتؑ فرات کے کنارہ پہنچے گھوڑا پیاسا تھا۔ گھوڑے نے جب پانی کی ٹھنڈک محسوس کی تو اس نے اپنی گردن بڑھائی اور حضرتؑ کو کراہت ہوئی کہ اس پر غصہ کریں۔ آپؑ نے صبر کیا یہاں تک کہ گھوڑے نے پانی پی لیا اور اپنی پیشانی پانی پر رگڑنے لگا۔ اب حضرتؑ پانی پیا چاہتے تھے کہ لوگوں نے آواز دی کہ اے حسینؑ خیمہ کی طرف دوڑ کہ اس میں دشمن داخل ہو گئے ہیں۔ حضرتؑ نے پانی ہاتھ سے پھینک دیا اور خیمہ کے قریب پہنچے تو اسے سالم پایا اور اسے دشمن کا مکر خیال کیا۔ پھر حضرتؑ فرات کی طرف چلے اور پھر دشمن حائل ہوئے۔ اس وقت حضرتؑ نے یہ اشعار فرمائے: ؎

اشعار

فان تکن الدنیا تعد نفیسة	فان ثواب اللہ اعلیٰ و اجزل
و ان تکن الارزاق قسماً مقدرا	فقلة سعی المرء فی الرزق اجمل

و ان تکن الاموال للترک جمعها — فما بال متروک به المرء یبخل
و ان تکن الاجساد للموت انشئت — فقتل الفتی بالسیف فی اللہ اجمل
علیک سلام اللہ یا آل احمد — فانی ارانی عنکم الیوم ارحل
اری کل ملعون کفور منافق — یروم فنانا جملة ثم یأمل
لقد غرهم حلم الالہ لانہ — کریم حلیم لم یکن قط یعجل

● اگر دنیا ایک نفیس چیز بھی جاتی ہے تو اللہ کا ثواب اس سے اعلیٰ اور زیادہ عمدہ ہے۔ ● اور اگر روزی تقسیم کی ہوئی اور مقدر ہے تو رزق میں آدمی کی تھوڑی کوشش زیادہ اچھی ہے۔ ● اور اگر مال کا جمع کرنا چھوڑ جانے کے لیے ہے تو اس متروکہ کا کیا حال ہوگا جس سے انسان نے بخل کیا تھا۔ ● اگر جسم موت کے لیے بنائے گئے ہیں تو بہادر کا تلوار سے راہ خدا میں مارا جانا زیادہ پسندیدہ ہے۔ ● اے آلِ احمدؐ تم پر سلام ہو کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ میں آج تم سے رخصت ہوں گا۔ ● دیکھیں تمام ملعون جنھوں نے ناشکری کی ہے اور منافق ہیں کہ اپنے جہل سے مجھے فنا کر کے کیا پائیں گے۔ ● اللہ کے حکم نے انھیں مغرور کر دیا ہے اللہ جو کریم و حلیم ہے اور کبھی جلدی نہیں کرتا۔

ایک حسینؑ کے جسم کے لیے حربوں کی قسمیں

آپؑ نے پھر حملہ کیا اور خلق کثیر کو قتل کیا تھا کہ شمر عمرو بن سعد کے پاس گیا اور کہا: اے امیر یہ شخص ہمارے آخری آدمی کو فنا کر دے گا۔ ابن سعد نے کہا کہ پھر کیا کرنا چاہیے۔ شمر نے کہا کہ: تین دستوں کو ان پر پھیلا دو جو تیروں، نیزوں، تلواروں، آگ اور پتھر سے حملہ کریں۔ یہاں تک کہ زخموں سے مجبور کر دیں۔۔۔

تین ساعت تک غش میں رہے

(جب حضرتؑ زخموں سے چور ہو گئے) چاہا کہ جنگ کریں لیکن اب قوت باقی نہ تھی۔۔۔۔ حضرتؑ دن کی تین ساعت باقی رہنے تک حالت غشی میں پڑے تھے اور لوگ اس حیرت میں تھے کہ مبادا زندہ ہوں۔

حضرتؑ کے الفاظ

حضرتؑ تین ساعت تک اپنے خون میں پڑے رہے۔ آپؑ کا چہرہ آسمان کی طرف تھا اور فرما رہے تھے: "صبرا علیٰ قضائک یا رب لا الٰہ سواک یا غیاث المستغیثین"۔

دشمن بلور کے پیالوں میں پانی چھلکاتے تھے

صاحب "غم حسینؑ" مولانا حسن میاں صاحب پھلواروی فرماتے ہیں کہ: "ظالموں نے یہاں تک شقاوت و سنگ دلی کو راہ دیا کہ بلور کے پیالہ میں پانی بھر بھر کر (دور سے) امام حسین علیہ السلام کو دکھاتے تھے اور حضرتؑ امام مظلوم ان سے اپنے جد امجد حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ دے کر وہ پانی مانگتے۔ لیکن کسی کو رحم نہ آتا اور وہ اشقیا سامنے سے وہ بھرا ہوا بلوری پیالہ ہٹا لیتے تھے۔ اس لیے بزرگان دین اور محبین اہل بیت نے جام بلور میں پانی پینا مکروہ خلاف ادب جانا ہے۔ چنانچہ حضرت عبدالوہاب شعرانی قدس اللہ نفسہ و طیب رمسہ نے کتاب العہود و المواثیق میں جہاں آداب منقولہ اہل بیتؑ و بزرگان دین نقل فرمائے ہیں۔ اس دل سوز واقعہ کا یوں ذکر فرمایا ہے کہ۔۔۔ یعنی اور بلور کے کوزہ میں پانی نہ پینا (جو بزرگوں سے منقول ہے) تو یہ اس لیے کہ: بیہقی نے نقل کیا ہے کہ:

"جب امام حسین علیہ السّلام پیاسے ہوئے، ان دنوں میں جب کہ دشمنوں میں آپؑ گھرے ہوئے تھے تو وہ لوگ بلور کے کوزہ میں پانی بھر کر آپؑ کو دکھاتے تھے اور امام مظلوم ان سے فرماتے تھے کہ (اپنے برگزیدہ رسولؐ) میرے نانا (ساقیِ کوثر) کے واسطے ہمیں ایک گھونٹ پانی پلادو۔ پس وہ لوگ کوزہ لوٹا لیتے۔ اور امام حسین علیہ السّلام کو پانی نہ پلاتے تھے"۔
پس (بزرگوں کے بلوری پیالہ میں پانی پینے کو برا جاننے کی یہی وجہ ہے اور) ایسے اعمال نیتوں پر موقوف ہیں۔ "انما الاعمال بالنیات"۔

حضرتؑ کے حملہ کے وقت دشمنوں کی حالت

ابن اثیر یہ لکھتے ہوئے کہ لشکر نے داہنے اور بائیں سے حملہ کیا۔ حضرتؑ نے داہنی طرف حملہ کیا اور وہ لوگ منتشر ہو گئے۔ بائیں طرف حملہ کیا وہ بھی منتشر ہو گئے۔ روایت کرتا ہے کہ: "ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا گیا جس کے بھائی اور بیٹے مارے گئے ہوں اور وہ ایسا جری ہو۔ دشمن اس طرح پھٹ جاتے تھے جس طرح بھیڑیے کے حملہ سے بکریاں پھٹ جاتی ہیں"۔ یہی مؤرخ کہتا ہے کہ: "حضرتؑ ریشمی کپڑا پہنے تھے۔ عمامہ باندھے تھے اور وسمہ کا خضاب لگائے تھے۔ پیدل اس طرح لڑے کہ سوار نہیں لڑ سکتا۔ تیروں کو بچاتے تھے اور لشکر پر سختی کرتے تھے"۔

بددعا

یہی مؤرخ کہتا ہے کہ: جب فرات کے کنارہ تیر لگا تو خدا کا شکر کیا۔ اور بددعا دی کہ: "خداوندا دشمنوں کو قتل اور منتشر کر کہ ان میں کا کوئی باقی نہ رہے"۔ اور جب شمر مع اپنے آدمیوں کے حضرتؑ اور خیمہ کے بیچ میں حائل ہو گیا تو آپؑ نے فرمایا کہ: "اگر تمھیں دین و معاد کا خوف نہیں ہے تو تم لوگ صاحب احساب ہو میرے خیموں سے اپنے جاہلوں اور سرکشوں کو روکو۔ یہ سن کر دشمنوں نے کہا کہ یہ درست ہے اے ابن فاطمہؑ حضرتؑ جب سنان بن انس، خولی بن یزید اور شمر پر حملہ کرتے تھے تو یہ لوگ پھٹ جاتے تھے۔

صاحب ناسخ التواریخ کہتے ہیں کہ زخمیوں کے علاوہ حضرتؑ نے انیس سو پچاس دشمنوں کو قتل کیا۔ اور لشکر کی ایک سمت خالی ہو گئی۔ اور جب دشمن بھاگتے تھے تو حضرتؑ قلب لشکر سے لا حول ولا قوۃ الا باللہ فرماتے ہوئے کنارہ چلے آتے تھے۔ اس مؤرخ کے موافق جب حضرتؑ وداعِ آخری کے لیے خیمہ میں تشریف لے گئے تو آپؑ نے اہل بیتؑ سے وصیت کی کہ اب نزولِ بلا کے لیے مستعد ہو جاؤ۔ اور جانو کہ خدا تمھاری محافظت کرے گا تمھیں دشمن کے شر سے نجات ملے گی اور تمھاری عاقبت بخیر ہوگی۔ تمھارے دشمن عذاب و بلا میں گرفتار ہوں گے۔ شکوہ نہ کرنا اور کوئی بات ایسی نہ کہنا جو تمھاری منزلت میں نقصان پیدا کرے۔

ابن خلدون کہتا ہے: پھر شمر ذی الجوشن تقریباً دس آدمیوں کو لے کر امام حسینؑ کے خیمہ کی طرف بڑھا۔ آپؑ نے فرات کی طرف سے مڑ کر ان کو روکا اور یہ فرمایا: "تف ہو تم پر اگر تم میں دینداری نہیں ہے اور نہ آخرت سے ڈرتے ہو تو شرافت کیوں چھوڑے دیتے ہو۔ اپنے لشکریوں کو روکو اور ہمارے اہل و عیال کو ان کی بے ہودگیوں سے بچاؤ"۔ جب کسی نے اس کا کچھ جواب نہ دیا تو آپؑ ادھر سے تلوار کھینچ کر جھپٹے۔ دوسری طرف سے شمر نے اپنے پیادوں کو جس میں عبد الرحمن جعفی، قشم بن نذیر جعفی، صالح بن وہب مزنی، سنان بن انس نخعی، خولی بن یزید اصبحی وغیرہ تھے۔ للکارا سبھوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا لیکن آپؑ جس طرف رخ کرتے تھے جی چرا چرا کر لوگ ایک دوسرے کے اوپر منھ کے بل گرتے پڑتے بھاگ کھڑے ہوتے

تھے۔ اور پھر جرمٹ باندھ کر ہر طرف سے گھیر کر دائیں بائیں آگے پیچھے سے مجموعی قوت سے حملہ آور ہوتے تھے۔ اس اثنا میں جنگ کا زور شور سن کر خیمہ سے زینبؑ (ان کی بہن) "کاش آسمان زمین پر ٹوٹ پڑتا" کہتی ہوئی نکل آئیں۔ اتفاق سے عمرو بن سعد کا سامنا ہو گیا۔ فرمایا: "کیوں ابن سعد؟ ابوعبداللہ حسینؑ اس بے کسی سے مارے جائیں اور تم دیکھتے رہو"۔ ابن سعد کا دل اس فقرہ سے بھر آیا۔ آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ اشک نہ رک سکے۔ داڑھی پر چند قطرے گر پڑے۔ مجبور ہو کر زینبؑ کی طرف سے چہرہ پھیر لیا۔ امام حسینؑ کمال سرگرمی سے لڑ رہے تھے۔ شیروں کی طرح سواروں پر جھپٹتے تھے اور پیادوں کی صفوف کو اپنے پرزور حملوں سے الٹ پلٹ دیتے تھے اور بار بار یہ فرماتے تھے: "کیا تم لوگ میرے ہی قتل کے لیے جمع ہوئے ہو۔ خدا کی قسم میرے قتل کرنے سے اللہ تعالیٰ سخت ناراض ہو گا۔ مجھے پوری امید ہے کہ میرے قتل سے تم کو سرفروئی حاصل نہ ہوگی۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ تم سے میرے خون کا ایسا بدلہ لے گا کہ تم کو اس کی خبر تک نہ ہوگی۔ خدا کی قسم اگر تم لوگ مجھے قتل کر ڈالو گے تو تم میں خونریزی کا دروازہ کھل جائے گا اور تم پر اللہ تعالیٰ اپنا عذاب نازل کرے گا۔ تم لوگ ناحق اپنے ہاتھوں کو میرے خون سے نہ رنگو۔ دیکھو میں بے گناہ ہوں۔ میرا قتل کرنا تم کو روا نہیں"۔ کوئی شخص اس کا جواب نہ دیتا تھا اور آپؑ ان کے حملہ سے اپنے کو بچاتے ہوئے میدان جنگ میں دادِ مردانگی دے رہے تھے۔ اور تقریباً کل لشکری آپؑ کے قتل کرنے سے جی چراتے تھے۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ دوسرا شخص آپؑ کو شہید کرے۔

دشمن اپنے سپاہیوں کو نام اور خاندان کا واسطہ دیتے تھے

شمر لشکر کا یہ رنگ دیکھ کر چلا کر بولا: "تمھاری مائیں مر جائیں۔ تم لوگ ایک پیادے کو نہیں مار سکتے ہو۔ تف ہے تمھاری مردانگی پر۔ اگر تم لوگ ایک ایک کنکری پھینکو تو حسینؑ دب کر مر جائیں۔ یہ بسملانہ حرکت کر رہے ہیں، ان میں کچھ دم باقی نہیں ہے۔ بڑھو اپنے نام و خاندان کو رسوا نہ کرو"۔ لشکریوں کے دل میں اس پرجوش تقریر سے ناحق کوشی کا ایک ناجائز جوش بھر گیا۔ شمشیر بکف ہو کر پیادوں نے ہر طرف سے حملہ کر دیا اور سواروں نے تیر برسانے شروع کیے۔ اسی طرح جنگ ہو رہی تھی۔ اب بقول اعثم کوفی ابوالحتوق نے ایک تیر آپؑ کی پیشانی پر مارا۔ آپؑ نے وہ تیر نکال کر پھینک دیا۔ خون سے تمام چہرہ اور ریش مبارک تر ہو گئی۔۔۔۔ بھگوڑوں نے تیر برسانے شروع کیے۔

امام کا سوال اور دشمن کا جواب

آپؑ ان کے تیر اپنے سینہ پر کھاتے اور فرماتے تھے کہ: اے بدبخت امت تو نے اپنے پیغمبر کا ذرا پاس نہ کیا۔ اور اس کی اولاد کو قتل کرنے میں بڑی بے باکی سے کام لیا۔ خدا کی قسم اس ذلت کے عوض مجھے درگاہ الٰہی سے بہت بڑی عزت کی امید ہے اور بہ یقین جانتا ہوں کہ تم ذلیل و خوار ہو گے۔ اور خدا تم سے میرا بدلہ لے گا۔ حصین بن نمیر اسکونی نے پکار کر کہا: اے پسر فاطمہؑ! کس طریق سے اللہ تیرا بدلہ ہم سے لے گا؟۔ آپؑ نے فرمایا کہ: "تم میں دشمنی اور عداوت ڈالے گا۔ اور تم آپس میں ایک دوسرے کو مار مار کر مر جاؤ گے۔ اس کے بعد وہ تم پر اپنا عذاب نازل فرمائے گا"۔

زخموں کی بوچھاڑ

شمر ذی الجوشن نے کہا: تم کیوں دیر لگا رہے ہو۔ یہ شخص زخموں کی کثرت سے بہت ناتواں ہو گیا ہے۔ اور ایک آدمی سے زیادہ بھی نہیں۔ سب مل کر اس پر حملہ کرو۔ سب چار طرف سے ٹوٹ پڑے اور گھیر کر نیزے اور تلواریں مارتے تھے، ایک ملعون ارعہ بن شریک نے آپؑ کے بائیں ہاتھ پر

تلوار ماری اور ایک بدبخت عمر بن ضیفہ نے پشت کی جانب ہو کر دوش مُبارک پر تلوار لگائی اور ایک تیسرے لعین نے جسے سنان بن انس نخعی کہتے تھے سینہ پر تیر مارا۔ چوتھے بدکار صالح بن وہب مزنی نے پہلو پر نیزہ رہا کیا

حضرتؑ اپنا خون چہرہ مُبارک پر ملتے ہیں

امیرالمومنینؑ گھوڑے سے گر پڑے اور زمین پر بیٹھ کر سینہ سے تیر نکالا۔ خون بہ نکلا۔ دونوں ہاتھ ملا کر زخم کے نیچے رکھتے تھے اور جب لپ بھر جاتی تھی تو اپنے منھ اور ریش مقدس پر ملتے تھے اور فرماتے تھے: "میں اسی طرح چہرہ پر خون لگائے اور داڑھی کو خون سے رنگین کیے ہوئے اپنے نانا کے پاس جاؤں گا"۔ عمرو بن سعد نے آپؑ کا یہ حال دیکھ کر گھوڑا بڑھایا اور سر مُبارک کے قریب پہنچ کر اپنی سپاہ سے کہا: "گھوڑوں سے اتر کر اس کا کام تمام کردو اور سر تن سے اتار لو"۔ نصر بن خوشہ ضبابی گھوڑے سے اتر کر آگے بڑھا۔ وہ برص کی بیماری میں مبتلا تھا۔ حضرتؑ کے قریب پہنچ کر ریش مُبارک پکڑلی اور چاہا کہ سر تن سے جدا کرے۔ امام حسینؑ نے کہا تو وہی مبروص کتا ہے جسے میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ نصر نے کہا تو میری نسبت ایسا کہتا ہے۔ تلوار نکال کر گلوئے مُبارک پر رگڑنے لگا اور کہنے لگا: ؎

اشعار ابی مخنف سے

اقتلك اليوم و نفسى تعلم علماً يقيناً ليس فيه مزعم
ان اباك خير من تكلم بعد النبى المصطفىٰ المعظم
اقتلك اليوم و سوف اندم و ان مثواى عذاب جهنم
افيض دمك بالتراب بعضبة و لا لاولاد النبى ارحم

(آج میں تمھیں قتل کر رہا ہوں۔ اور میرا نفس بغیر کسی شبہ کے یہ یقین جانتا ہے کہ تمھارا باپ کل بولنے والوں میں ممتاز ہے نبی مُصطفےٰ کے بعد۔ آج میں تمھیں قتل کر رہا ہوں اور عنقریب مجھے ندامت ہوگی اور اس کے بعد عذاب جہنم بھگتنا پڑے گا۔ تمھارا خون زمین پر گرا رہا ہوں اور اولادِ نبی پر رحم نہیں کرتا)

ہر چند تلوار کو خوب زور سے رگڑتا تھا مگر وہ کاٹ نہ کرتی تھی۔ عمر سعد نے غصہ ہو کر ایک شخص خولی بن یزید اصبحی ملعون کو جو جانب راست کھڑا تھا کہا تو جا حسینؑ کا کام تمام کر۔ خولی نے گھوڑے سے اتر کر فرزند رسول خدا قرۃ العین علی مرتضیٰ اور راحت جان فاطمہؑ زہرا کا سر مُبارک بدن سے علیحدہ کردیا۔

اٹھنے کی کوشش

مختلف زخم کھا کر جب حضرتؑ میں گھوڑے پر بیٹھنے کی طاقت نہ رہی اور حضرتؑ زمین پر تشریف لائے اس وقت جب کہ ہر طرف سے دشمن زخم لگا رہے تھے۔ کامل ابن اثیر کے موافق حضرتؑ کبھی کھڑے ہونے کی کوشش کرتے تھے اور کبھی گھٹنے کے بل کھڑے ہوجاتے تھے۔ یہ بھی عموماً مورخین نے لکھا ہے کہ جس وقت حضرتؑ گھوڑے سے گر پڑے اس وقت ایک کم عمر خوبصورت بچہ حضرتؑ کی طرف دوڑا۔ اگرچہ بیبیوں نے روکنا چاہا مگر نہ رکا۔

ایک بچہ

اس وقت کوئی بے رحم نامرد حضرتؑ پر تلوار سے حملہ کیا چاہتا تھا کہ یہ بچہ چلایا کہ: "او جہنم نصیب ابن خبیثہ کیا میرے چچا کو قتل کرے گا"۔ اور اپنے دونوں ہاتھ حسینؑ پر پھیلا دیے۔ تلوار چلی اور دونوں

چھوٹی چھوٹی کلائیاں کٹ کر حسینؑ پر گریں اور اس بے گناہ کا خون اصول خیر پر چڑھایا گیا۔ ابھی چچانے گود میں اچھی طرح نہ لیا تھا کہ ایک تیر لگا اور بچہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ بچہ نے زخم کھا کر واعماہ کی صدا بلند کی تھی اور حضرتؑ فرما رہے تھے کہ اے فرزند صبر کر اس مصیبت پر جو تجھ پر نازل ہوئی ہے۔ بائیں پہلو پر مہلک نیزہ کا زخم لگا تھا۔ جس سے آپؑ داہنی ران کی طرف گر رہے تھے کہ ساتھ ہی خیمہ سے واخاہ وسیداہ وامصیبتاہ کی صدا بلند ہوئی۔ یہ حضرت زینبؑ خاتون کی صدا تھی جو خیمہ سے اپنے محترم بھائی کی حالت ملاحظہ فرما رہی تھیں۔

اکثر مورخین یہی کہتے ہیں کہ خولی بن یزید ارادہ قتل سے قریب گیا لیکن ہیبت طاری ہوئی اور ہٹ گیا۔ صاحب کشف الغمہ فرماتے ہیں کہ چالیس آدمی حضرتؑ کو گھیرے تھے۔ درعہ بن شریک، شمر، حصین بن نمیر، ابوایوب غنوی، نصر بن خرشہ، صالح بن وہب، شبث ربعی، سنان بن انس وغیرہم تھے۔ "اول کس شبث بن ربعی با شمشیر کشیدہ پیش تاخت سید الشہداءؑ بجانب او نظرے افگند شبث بلرزید و شمشیر از کفش بیفتاد و بگریخت۔ سنان بن انس کہ مردے مبروص و کوسج بود از شماتت روئے بشبث کرد و گفت چرا از قتل حسینؑ دست باز داشتی۔ گفت چون چشم بکشود مرا نظارہ کرد چشم ہائے رسول خدا را معاینہ کردم اندام بلرزید۔ گفت شمشیر بمن دہ کہ برائے قتل او من شائستہ تر از توام۔ تیغ بگرفت و قصد سید الشہداءؑ کرد۔ چوں نزدیک شد رعبے عظیم او را بگرفت و ترسید چنانکہ شمشیر از دست او بیفتاد و بگریخت۔ شمر او را سرزنش کرد و گفت چہ ترسندہ مردم کہ شما بودہ اید۔ ہیچ کس سزاوار تر از من نیست در قتل او و شمشیر بگرفت و بر سینہ سید الشہداءؑ بنشست۔ آن حضرتؑ چشم بکشود و بر او نظر افگند۔ شمر گفت من از آں مردم نیستم کہ از قتل تو باز گردم سید الشہداءؑ فرمود تو کیستی گفت من شمر بن ذی الجوشن۔ گفت مرا ہی شناسی گفت نیکو ہی شناسم تو حسینؑ پسر علیؑ و مادرت فاطمہؑ و جدت محمدؐ است۔ آن حضرتؑ فرمود وائے بر تو بایں شناس کہ ترا است چگونہ مرا ہی کشی۔ گفت تا یزید مرا عطا و جائزہ گرامی بدارد۔ پس حضرتؑ را در روئے در انداخت و بدوازدہ ضرب سر مبارک آن حضرتؑ را از قفا برید۔ یعنی: سب سے پہلے شبث بن ربعی نے تلوار کھینچی، آگے دوڑا۔ سید الشہداءؑ نے اس کی طرف نگاہ ڈالی۔ شبث کانپا اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی اور بھاگ گیا۔ سنان بن انس نے جو برص زدہ اور کوسج تھا، شماتت سے شبث کی طرف منہ کیا اور کہا: قتل حسینؑ سے کیوں ہاتھ کو روکا۔ اس نے کہا: "جب آپؑ نے آنکھ کھولی مجھے دیکھا تو مجھے رسولؐ کی آنکھیں دکھائی دیں۔ میرا بدن لرز گیا"۔ اس نے کہا تلوار مجھے دے کہ اسے قتل کرنے کے لیے میں تجھ سے زیادہ قابل ہوں۔ تلوار لی اور سید الشہداءؑ کا قصد کیا۔ جب قریب ہوا تو بڑے رعب نے اُسے آلیا اور وہ اس طرح سے ڈر گیا کہ تلوار ہاتھ سے گر گئی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ شمر نے اسے ڈانٹا اور کہا: تم لوگ کس قدر ڈرپوک ہو۔ اس کے قتل کا مجھ سے زیادہ کوئی سزاوار نہیں ہے۔ اس نے تلوار لی اور سید الشہداءؑ کے سینہ پر بیٹھ گیا۔ آنحضرتؑ نے آنکھ کھولی اور اس پر نگاہ کی۔ شمر بولا: "میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں کہ تیرے قتل سے باز آجاؤں"۔ سید الشہداءؑ نے فرمایا: "تو کون ہے"۔ اس نے کہا: "میں شمر بن ذی الجوشن ہوں"۔ آپؑ نے فرمایا: "مجھے پہچانتا ہے"۔ اس نے کہا: "خوب پہچانتا ہوں۔ تو حسینؑ ہے علیؑ کا بیٹا۔ تیری ماں فاطمہؑ اور نانا محمدؐ ہے"۔ آنحضرتؑ نے فرمایا کہ: "تجھ پر وائے ہو تو اس طرح پہچاننے کے باوجود کس طرح مجھے قتل کرتا ہے"۔ بولا: "تا کہ یزید مجھے بڑا انعام اور عطیہ دے"۔ پس اس نے حضرتؑ کو منہ کے بل گرایا اور بارہ ضربوں کے ساتھ آنحضرتؑ کے

سرِ مبارک کو پس گردن سے جدا کر دیا۔

اس مؤرخ نے ابو مخنف کا خلاصہ ترجمہ کیا ہے۔ اس میں و نیز ابو اسحٰق اسفرائنی میں اس قدر زیادہ ہے کہ حضرتؑ نے کہا کہ: "تجھے میرے نانا کی شفاعت زیادہ محبوب ہے، یا یزید کا انعام"۔ اور اس نے کہا کہ: "مجھے تمہارے باپؑ اور نانا کی شفاعت سے یزید کی ایک دمڑی زیادہ پسند ہے"۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ: "اگر تو مجھے قتل ہی کرے گا تو مجھے تھوڑا سا پانی دے"۔ اس نے کہا کہ: "پانی تو نہ پیو گے لیکن موت ایک ایک گھونٹ پیو گے"۔ "اے ابن ابی تراب! کیا تمہارا گمان نہیں ہے کہ تمہارے باپؑ حوضِ کوثر سے اپنے دوستوں کو سیراب کریں گے؟۔ اتنا صبر کرو کہ تمہارے باپؑ تمہیں پانی پلائیں"۔ آپؑ نے فرمایا: "ذرا اپنے منہ سے دہان بند ہٹا دے کہ میں تیری صورت دیکھوں"۔ پس اس نے ہٹا دیا اور وہ کوڑھی (مبروص) تھا۔ بھینگا تھا۔ اس کا دہانا کتے کی طرح تھا اور سور کے ایسے بال تھے۔ دیکھا تو فرمایا کہ: "میرے نانا رسولؐ نے سچ فرمایا تھا"۔ شمر نے کہا کہ: "تمہارے نانا رسول اللہؐ نے کیا کہا تھا؟"۔ فرمایا: "میرے باپ علیؑ سے کہا تھا کہ: "اے علیؑ تمہارے فرزند کو وہ قتل کرے گا جو مبروص اور بھینگا ہوگا۔ اس کا منہ کتے کا ایسا اور بال سور کے مانند ہوں گے"۔ شمر نے کہا کہ: "تمہارے نانا نے مجھے کتے سے تشبیہ دی ہے۔ میں اس کے عوض میں تمہیں پس پشت سے قتل کروں گا"۔

صاحب روضۃ الشہداءؒ لکھتا ہے کہ امام محمد بن اِسمٰعیل بخاری نے لکھا ہے کہ: "جس وقت حضرتؑ زمین پر تشریف رکھتے تھے کوئی شخص آیا اور اس نے قتل کا اِرادہ کیا۔ حضرتؑ نے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ: "تو میرا قاتل نہیں ہے۔ اور مجھے افسوس ہے کہ تو مبتلائے عذاب ہو"۔ وہ شخص روتا ہوا اور یہ کہتا ہوا واپس ہوا کہ: "یا ابن رسول اللہؐ! اس حال میں بھی آپؑ کو ہمارا غم ہے"۔ اب یہ اسی تلوار کو جو اس نے قتل حسینؑ کے لیے کھینچی تھی گھماتا ہوا عمرو بن سعد کی طرف دوڑا۔ عمرو بن سعد نے پوچھا کہ: "کیا تو نے حسینؑ کا کام تمام کر دیا"۔ کہا: "نہیں، اِس لیے آرہا ہوں کہ تیرا کام تمام کردوں"۔ یہ کہہ کر حملہ کیا۔ لوگ بیچ میں آگئے۔ اور اُسے زخمی کرنے لگے۔ اس نے آواز دی کہ: "یا ابن رسولؐ اللہؐ! مجھے آپؑ کی دوستی میں قتل کر رہے ہیں۔ بروزِ قیامت مجھے اپنے شہدا میں شمار کیجیے گا"۔ حضرتؑ نے جواب دیا اور تسکین دلائی۔

آخری سجدہ

بعض کے نزدیک جب قاتل حضرتؑ کے قریب پہنچا اور حضرتؑ نے آنکھیں کھولیں دریافت فرمایا کہ: "کونسا وقت ہے"۔ اور جب معلوم ہوا کہ نماز کا وقت ہے تو حضرتؑ نے اس قدر صبر کرنے کو کہا کہ نماز پڑھ لیں۔ لیکن ابھی سجدہ ختم نہیں ہوا تھا کہ نماز سکھانے والے کے فرزند کا وہ گلا کٹ گیا جس سے ابھی نماز کے الفاظ تمام نہ ہونے تھے۔ (روضۃ الشہدا)

بابؑ یازدہم

بعد شہادتؑ (اہلِ بیتؑ کوفہ میں)

لشکر نے تکبیر کہی

حضرتؑ کا سر مبارک جسم اقدس سے علیحدہ کرنے کے بعد ایک طویل نیزہ پر بلند کیا گیا۔ اور بقول ابی مخنف فکبر العسکر ثلث تکبیرات! (اور لشکر نے تین مرتبہ تکبیر کہی)

تکبیر اور اشعار

ان تکبیروں کو سن کر کسی نے کہا:

و یکبرون اذ قتلت و انما   قتلو بك التکبیر و التھلیل

(آپ کو قتل کر کے تکبیر کہہ رہے ہیں حقیقۃً آپ کو قتل کر کے انھوں نے تکبیر اور تہلیل کو قتل کر ڈالا)

(یہ شعر دیک الجن شاعر سے منسوب ہے)

مؤرخین وقتی تغیر فطرت کا ذکر کرتے ہیں

عموماً مؤرخین مثل علامہ جلال الدین سیوطی (تاریخ الخلفا) ابو اسحاق اسفرائنی (نور العین فی مشہد الحسین) ابی مخنف، روضۃ الصفا وغیرہ وغیرہ اس کا تذکرہ کرتے ہیں کہ شہادت حسینؑ کے بعد ایک سخت طوفان آیا جو سرخی مائل تھا۔ اور ہر طرف تاریکی سی چھا گئی۔ اور اکثر لوگوں نے یہ گمان کیا کہ خدا نے اپنا غضب نازل کیا۔ یہ طوفان تھوڑی دیر تک قائم رہا۔ (کامل ابن اثیر، اعثم کوفی) بعض نے اس سے زیادہ تغیرات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

عمر سعد کو مبارکباد اور مقتول کا بیان

ابو اسحٰق اسفرائنی کہتے ہیں کہ: "ہلال بن نافع کہتا ہے کہ میں عمرو بن سعد کے پاس کھڑا تھا کہ اتنے میں ایک شخص نے پکار کر کہا: "اے امیر مُبارک ہو حسینؑ قتل ہو گیا"۔ بخدا میں نے کوئی مقتول اس قدر خون آلودہ نہیں دیکھا۔ پھر بھی اس کے چہرہ کا نور، اس کا جمال اور اس کی ہیبت مجھے اس کے حادثہ قتل پر غور نہیں کرنے دیتی تھی۔ پھر ان کے زخموں کا شمار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ تلواروں، نیزوں اور تیروں کے ایک سو بیس زخم کھائے تھے۔

قتل حسینؑ کا شور اور سوید بن مطاع کی دوبارہ شہادتؑ

لشکر فتح کی خوشیوں میں شور کر رہا تھا کہ سوید بن مطاع نے جو رفقائے حضرتؑ میں سے تھے جنگ کر کے لوگوں کی دانست میں شہید ہو چکے تھے مگر حقیقۃً حالت غش میں تھے اور زخموں سے چور تھے۔ قتل الحسین کی آواز سنی۔ یہ اچھل پڑے۔ ان کے پاس ایک چھری تھی۔ اسے لے کر کھڑے ہو گئے۔ ایک ساعت تک جنگ کی اور دوبارہ شہید ہو گئے۔ (کامل ابن اثیر)

حسینؑ کا گھوڑا

جب گرد و غبار فرو ہوا تو لوگوں نے دیکھا کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کا گھوڑا ہنہناتا اور مقتولین کی لاشوں کو روندتا ایک ایک مقتول کو دیکھتا پھرتا تھا۔ یہاں تک کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کے جسم کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ تو دیکھا کہ سر نہیں ہے۔ وہ اس جسم کے گرد چکر لگانے لگا اور اس کے خون میں اپنی پیشانی ملنے لگا۔ جب عمر سعد نے یہ حال دیکھا تو لوگوں کو کہا اسے ادھر لاؤ۔ لوگوں نے اسے پکڑنا چاہا۔ یہ گھوڑا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھوڑوں میں سے تھا اور صحیح یہ ہے کہ اس کا نام میمون تھا۔ جب میمون نے لوگوں کو اپنے پیچھے دیکھا تو اس نے دولتیاں جھاڑنا اور منہ سے کاٹنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ چھبیس سوار مار گرائے اور نو گھوڑے ہلاک کر دیے۔ عمر بن سعد نے پکار کر کہا اس کو جانے دو۔ چھوڑ دو دیکھیں کیا کرتا ہے۔ لوگ پیچھے ہٹ گئے تو میمون پھر جسم کے پاس آیا اور اپنا ماتھا زمین پر ملنے اور لاش کو چومنے لگا۔ اور اس زور سے ہنہناتا تھا کہ تمام جنگل گونج اٹھا۔ پھر حرم کے خیمہ کی طرف گیا۔ (ابی مخنف، اعثم کوفی، نور العین) جب مستورات نے اس کی آواز سنی تو زینبؑ نے سکینہؑ سے کہا: پانی آگیا۔ چلو پئیں۔ مستورات باہر نکلیں تو زین خالی پایا۔ اور گھوڑے کے بار بار دردناک آواز کے ساتھ ہنہنانے سے معلوم ہو گیا کہ امام حسین رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ تو پھر سب نے رونا چلانا شروع کیا۔ سکینہؑ نے میمون سے مخاطب ہو کر یہ اشعار پڑھے: ؎

حضرت سکینہ کے اشعار

فویلك یا میمون فارجع بسرعة   واخبر عن السبط الشریف هدی العلا

وائے ہو تجھ پر اے میمون۔ جلدی جا اور سبط شریف اور بلند مرتبہ ہادی کی خبر لا

و این ترکت السبط میمون قل لنا   و این الذی قد کان للخطب حاملا

اے میمون ہمیں بتا کہ تو نے سبط رسول کو کہاں چھوڑا۔ وہ کہاں ہے جو مصیبت برداشت کر رہا تھا

ا میمون تغدر بالحسین و ما لنا   کفیل للحمل الثقیل تجملا

اے میمون تو نے حسینؑ سے بے وفائی کی۔ اب ہمارا کفیل کون ہوگا ذرا خیال کیجیے ہم میں بھاری بوجھ اٹھانے کی قوت نہیں ہے

ا میمون ضیعت الحسین و جئتنا   تحمحم فی خیامنا ثم تصهلا

اے میمون تو نے حسینؑ کو کھو دیا اور اب ہنہناتا اور چیختا ہوا ہمارے خیمہ کی طرف آیا ہے

ا میمون القیت الحسین حمامه   و بین الاعادی فی دماء تجندلا

اے میمون تو نے حسینؑ کو موت کا پیالہ پلا دیا۔ اور وہ دشمنوں میں خون میں لتھڑے پڑے ہیں

ا میمون فارجع لا تطیل خطابنا   فما عدت ترجو و دنا و توملا

اے میمون واپس جا اور کلام کو طول نہ دے۔ اور اب ہم سے محبت کی امید نہ رکھنا

اخی من تری من بعد فقدك یا اخی   یدافع عنا من یصول من الملا

اے بھائی تیرے کھو جانے کے بعد اب کون ہے جو حملہ کرنے والے دشمنوں کو ہم سے دور کرے

اخی من نراہ حامیاً و مناصراً   لقد هد هذا الیوم عزمی و عطلا

اے بھائی اب ہم کسے اپنا حامی و مددگار پائیں گے۔ آج کے دن میرا عزم ٹوٹ گیا اور بے کار ہو گیا

حضرت فاطمہؑ بنت الحسینؑ کے اشعار

اس کے بعد اس مورخ کے موافق فاطمہؑ بنت الحسینؑ اور ابومخنف کے موافق سکینہؑ بنت الحسینؑ نے یہ مرثیہ کہا:

مات الفخار و مات الجود و الکرم و اغبر الارض و الآفاق و الحرم

آج فخر جود و کرم مر گیا۔ اور زمین دنیا اور حرم پر غبار چھا گیا

غاب الحسین فوالهفی لغیبته و صار یعلو علینا بعده الظلم

حسینؑ غائب ہوئے افسوس ہے ان کی غیبت پر۔ اور ان کے بعد ظلم نے ہم پر غلبہ پا لیا

یا قوم هل من فداء یا قوم هل عوض تفدیه و الله هذا الناس و الامم

اے قوم کیا فدیہ اور عوض ممکن ہے۔ تو بجا یہ قومیں اور لوگ ان پر فدا ہوں

حضرت ام کلثومؑ کے اشعار

دختر امام کے بعد حضرت ام کلثومؑ نے فرمایا: ؎

مصیبتی فوق ان ادلی باشعاری و ان یحیط بها علمی و افکاری

میری مصیبتیں اس سے بلند ہیں کہ میرے اشعار انھیں ادا کرسکیں۔ یا میرا علم اور فکر اس کا احاطہ کرے

حضرت زینبؑ کے اشعار

حضرت زینبؑ خاتون نے فرمایا: ؎

لقد حط فینا من زمان نوائبه و فرقنا انیابه و مخالبه

ایک زمانہ سے ہمیں زمانہ کی مصیبتوں نے گھیر لیا ہے اور اس کی کچلیوں اور ناخنوں نے ہم کو متفرق کر دیا ہے

و جار علینا الدهر فی ارض غربة و دبت علینا بالرزایا عقاربه

پردیس میں ہم پر زمانہ نے ظلم کیا۔ اور اس کے بچھو ہم پر مصیبتیں لیے چلے آتے ہیں

ارادوا اخی بالقتل عمدا و خیبة و ما خلفوه ذا الاسی و نوائبه

انھوں نے دیدہ و دانستہ میرے بھائی کے قتل کا ارادہ کیا۔ اور اس کے بعد جو کچھ چھوڑا وہ بھی غم و مصائب ہیں

حسینٌ لقد امسی قتیلا مجدلا و اظلم من دین الاله مذاهبه

آج حسینؑ مقتول ہوکر زمین پر گر پڑا ہے۔ اور اللہ کے دین کی راہیں تاریک ہوگئیں

فلم یبق لی رکن الوذ بظله و من ذا یعانی الدهر من ذا یغالبه

اب میرے لیے کوئی سہارا نہیں ہے جس کے سایہ میں پناہ لوں۔ کون ہے جو زمانہ کا مقابلہ کرے اور اس پر غالب آئے

(اسفرائنی کے نزدیک کوفہ جانے کے وقت لاش حسینؑ پر یہ مرثیہ کہا)

اہل بیتؑ کی حالت

اہل بیتؑ نے جس وقت یہ تمام اشعار سنے اور گھوڑے کا زین خالی پایا اپنے رخساروں پر طمانچے مارے۔ اور وا محمداہ، وا علیاہ، وا حسناہ اور وا حسیناہ کی آوازیں بلند کیں۔ اور کہا: الیوم مات علی المرتضی الیوم مات فاطمة الزهراء۔ (آج علی مرتضیٰ

نے رحلت کی اور آج فاطمہؑ زہرا نے اِنتقال فرمایا)

خیمہ سے واپس ہونے کے بعد گھوڑے کی حرکات

عبداللہ بن قیس کہتا ہے کہ میں نے دیکھا گھوڑا حرم کے پاس سے واپس گیا۔ اور مخالفین پر حملہ آور ہوا۔ یہاں تک کہ جسم شریف کے پاس پہنچا تو اس کے قدموں پر اپنا ماتھا ملنے لگا اور ساتھ ہی ہنہناتا جاتا تھا۔ پھر دریائے فرات پر گیا اور غوطہ لگایا۔ (یہی راوی کہتا ہے کہ صفین میں حسینؑ نے ابوالاعور اسلمی سے گھاٹ چھین لیا تھا اور امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے فرمایا: "ولدی هذا یقتل بکربلا عطشاناً" (میرا یہ بیٹا کربلا میں پیاسا مارا جائے گا) یہ بھی روایت ہے کہ گھوڑے نے اپنی تھوتھنی اور پیشانی اس قدر زمین پر ماری کہ وہیں مر گیا۔

لاش کی لوٹ

قیاس کیا جاسکتا تھا کہ حسینؑ اور ان کریم النفس رفقا کے تمام ہوجانے کے بعد جس قدر عداوتیں کہ ان کے ساتھ ہوں تمام ہوجائیں گی۔ لیکن اگر ایسا ہی ہوتا تو خاندان رسالت کے ساتھ دشمنی کے ذخیرہ کا پورا اندازہ نہ ہوسکتا۔ ابھی حسینؑ کی لاش اقدس سرد بھی نہ ہوئی تھی کہ عمامہ مبارک، درع، پائجامہ، جوتا، چادر، کپڑے، تلوار، زرہ لوٹ لی گئی۔ اور خبریں تو یہاں تک ہیں کہ ایک ذلیل شخص انگوٹھی اتار رہا تھا، اور جب اتارنے میں تردد ہوا تو اس نے تلوار کے ایک ٹکڑے سے انگلی کاٹ ڈالی۔ اور پھر بقول ابن خلدون:

خیمہ کی لوٹ اور آتش زدگی

آپ کے شہید ہونے کے بعد دشمنوں کا لشکر مال و اسباب لوٹنے کی طرف متوجہ ہوا۔ اُونٹ، اسباب فرش یہاں تک کہ عورتوں کی چادریں لوٹ لیں۔

بقول اعثم کوفی: اب عمر مستورات کے خیموں کے پاس آکر کھڑا ہوا اور فوج کو حکم دیا کہ گھوڑوں سے اتر کر خیموں میں گھس جاؤ۔ جو شے کم یا زیادہ پاؤ سب لوٹ لو۔ لشکر والے خیموں میں گھس گئے اور جو چیز دیکھی اٹھالی۔

علی بن الحسینؑ کا بستر بیماری اور شمر

شمر نے علی بن الحسینؑ کے خیمہ میں جاکر دیکھا کہ وہ بستر بیماری پر پڑے ہیں تلوار کھینچ کر چاہا کہ انھیں بھی قتل کردے۔

حمید بن مسلم نے کہا: سبحان اللہ اس بیمار کے قتل سے تو باز آ۔ یہ تو بیمار ہے۔ شمر نے کہا عبیداللہ بن زیاد کے یہی حکم ہے۔ ابن مسلم نے کہا: تجھ پر افسوس ہے محمد مصطفےٰؐ کو کیا جواب دے گا۔ آخر تو کیا یہ نہیں جانتا کہ یہ پیغمبر کے اہل بیتؑ ہیں۔ شمر ان باتوں سے شرمندہ ہوکر پلٹ گیا۔ علی بن الحسینؑ کے قتل سے باز آیا۔ پھر حکم دیا کہ رسولِ خدا کے اہل بیتؑ کے خیموں کو آگ لگادو۔ لوگوں نے آگ لگا کر خاندان نبوت کو برباد کردیا۔

ابو مخنف کہتا ہے کہ جس وقت عورتیں رو رہی تھیں ابن سعد آیا اور بلند آواز سے پکارا کہ وائے تم پر ان خیموں میں جاؤ۔ جو چیزیں ہوں لے لو۔ اور ان خیموں کو اور جو کچھ اس میں ہو آگ لگادو۔ ان میں سے کسی نے کہا ویل ہو تجھ پر اے ابن سعد کیا تیرے لیے حسینؑ ان کے اہل بیتؑ اور اصحاب کا قتل کافی نہیں ہوا کہ ان کے بچوں اور عورتوں کو بھی جلادینے کا حکم دیتا ہے۔ اور تو چاہتا ہے کہ دنیا سے ان کا نام مٹ جائے۔ اس کے بعد لشکر لوٹ کے لیے داخل ہوا۔

حضرت زینبؑ سے ایک روایت

حضرت زینبؑ فرماتی ہیں کہ اس وقت ایک ازرق چشم خیمہ میں داخل ہوا اور خیمہ کی چیزیں لوٹنے لگا۔ اس نے علی بن الحسینؑ کی

طرف دیکھا جو کھال پر بچھاری کی حالت میں پڑے تھے۔ اس نے وہ کھال کھینچ لی اور علی بن الحسینؑ زمین پر آگئے۔ اب وہ ہماری طرف متوجہ ہوا۔ میری چادر چھین لی۔ پھر میرے کانوں میں اس نے گوشوارہ دیکھا (اور دانتوں سے کاٹ کر نکال لیا) جس سے میرا کان کٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ پھر اس نے فاطمہؑ کے پاؤں میں کڑے دیکھے تو ان کو نکالنے لگا اور توڑ کر نکال لیا۔ فاطمہؑ بولی: "تو ہماری چیزیں چھین رہا ہے اور روتا بھی ہے"۔ (ابی مخنف) اس نے کہا کہ: "اے اہلِ بیتؑ میں تمہاری مصیبت دیکھ کر روتا ہوں"۔

قبیلہ بکر بن وائل کی ایک عورت

حمید بن مسلم کہتا ہے کہ میں نے قبیلہ بکر بن وائل کی قوم سے ایک عورت کو دیکھا جو اپنے شوہر کے ساتھ لشکر عمر بن سعد میں تھی جب اس نے دیکھا کہ فوج ٹوٹ پڑی ہے اور حسینؑ کے خیموں اور عورتوں کو لوٹ رہی ہے تو اس نے ایک تلوار لی۔ پھر حضرت کے خیمہ کا رخ کیا اور پکاری کہ: "اے آلِ بکر بن وائل! کیا تم رسولِ خدا کی لڑکیوں کے کپڑے لوٹتے ہو۔ خدا سے ڈرو"۔ اس وقت اس کے شوہر نے اس کو پکڑ لیا اور لوٹا لے گیا۔

لاشوں کی پامالی

ابن خلدون کہتا ہے: بعد اس کے عمر بن سعد کے حکم سے دس سواروں نے آپ کے لاشہ کو گھوڑوں کے سموں سے پامال کیا۔

پامالی کے بعد لاشوں کی حالت

ابی مخنف اور کامل کے موافق ابن سعد نے پکارا کہ کون حسینؑ کی لاش روندتا ہے۔ اس پر دس سوار آگے بڑھے اور انھوں نے لاشوں کو پامال کیا یہاں تک کہ پشت اور سینہ چور چور ہو گیا۔ ابن زیاد کے دربار میں ان ملعون سواروں نے اسی مضمون کا رجز پڑھا اور کوئی بہ فخر کہتا تھا کہ ہم نے لاش حسینؑ پر گھوڑے دوڑائے اس طرح جیسے چکی گیہوں کو پیستی ہے۔ صاحب لہوف کے موافق ابن زیاد نے ان لوگوں کو تھوڑا سا انعام دلوایا۔

سنان بن انس کے اشعار اور اس کا صلہ

کامل ابن اثیر کے موافق سنان بن انس نے عمر بن سعد کے خیمہ کے پاس کھڑے ہو کر بلند آواز سے پکارا:

املا رکابی فضۃ و ذھباً انا قتلت الملک المحجبا

میرے اونٹوں کو سونے اور چاندی سے بھر دے کہ میں نے ایک غیور بادشاہ کو قتل کیا ہے

و من صلی القبلتین فی الصبی قتلت خیر الناس اما و ابا

و خیرھم اذ یذکرون النسبا

جس نے لڑکپن میں دو قبلوں کی طرف نماز پڑھی اور اپنے ماں اور باپ کی طرف سے خیر الناس ہے اور وہ اپنے نسب میں سب سے بہتر ہے

ابن سعد نے کہا وہ مجنون ہے اسے میرے پاس لاؤ۔ جب وہ آیا تو اسے لکڑیاں ماریں۔ اور کہا: اے پاگل تو جن الفاظ میں کلام کرتا ہے اگر ابن زیاد سن لے گا تو تیری گردن مارے گا۔

بعض کے نزدیک بکیر بن مالک نے یہ اشعار ابن زیاد کے سامنے پڑھے۔ اور ابن زیاد نے خفا ہو کر اس کے قتل کرنے کا حکم دیا۔

قتل کرنے پر فخر کرنے والے

بقول ابی مخنف: وجاء خولی والشمر والسنان الی ابن سعد ومعهم راس الحسین یفتخرون بقتله (خولی، شمر اور سنان ابن سعد کے پاس آئے اور یہ سب قتل حسینؑ پر فخر کر رہے تھے)

دشمن کی بے غیرتی ناخدا ترسی اور خلاف انسانیت حرکتوں کے لحاظ سے اس روایت کے قبول کرنے میں ہمیں کوئی تردد نہیں ہے کہ "شاخ نیزہ اور تازیانوں سے اہل بیتؑ رسالت کا تمام جسم سیاہ ہو رہا تھا۔

مردوں میں جو بچ رہے تھے

ابن خلدون کہتا ہے کہ اس واقعہ میں صرف دو شخص عقبہ بن سمعان آپ کی بیوی رباب بنت امرء القیس کلبیہ کے آزاد غلام اور مرقع بن ثمامہ ازدی جانبر ہوئے۔ علی بن الحسینؑ عمران بن حسینؑ اور حسنؑ مثنیٰ اہل بیتؑ میں باقی رہے۔

اعثم کوفی کہتا ہے: "امیرالمومنین حسینؑ کو شہید کر کے اور سر مبارک عبیداللہ کے پاس روانہ کرنے کے بعد وہ ملعون اس شب کو کربلا میں رہے۔ دوسرے دن کوفہ کی طرف پلٹے۔ اہل بیتِ رسولِ خدا کو ہمراہ لیا"۔

ابن خلدون کہتا ہے: عمر بن سعد نے اپنے ہمراہیوں کو جمع کر کے نماز جنازہ پڑھی اور دفن کر کے راہی کوفہ ہوا۔ دوسرے دن بنو اسد غاضریہ سے آئے اور انھوں نے امام حسینؑ اور ان کے ہمراہیوں کو دفن کیا۔ امام حسینؑ کا سر مبارک مع آپ کے ہمراہیوں کے خولی بن یزید و حمید بن مسلم ازدی کے ہمراہ ابن زیاد کے پاس روانہ کیا گیا۔ رات ہو گئی تھی۔ قصر امارت کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔ مجبور ہو کر خولی سر مبارک لیے ہوئے واپس آیا۔ (بقول کامل: چولہے میں رکھ دیا۔ اور بی بی سے کہا کہ ایسی چیز لایا ہوں کہ عمر بھر کے لیے بے پرواہ ہو جائے گی۔ اس کی بی بی نے کہا کہ لوگ سونا اور چاندی لاتے ہیں اور تو حسینؑ کا سر لایا ہے۔ بخدا اب میں اور تو ایک جگہ جمع نہ ہوں گے) صبح ہوتے ہی ابن زیاد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بعضوں کا یہ خیال ہے کہ شمر و قیس بن الاشعث و عمر بن الحجاج و عروہ بن قیس سر لے کر گئے تھے۔

کشف الغمہ میں ہے کہ: "بعد از روانگی عمر سعد اہل قریہ غاضریہ اجساد شہدا دفن کردند"۔

یہی مورخ ابن کے قبل کہتا ہے جس کا خلاصہ ہے کہ ابن سعد نے سر مبارک کو پہلے ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔ دیگر شہدا کے سر کو قوم پر تقسیم کیا کہ وہ ابن زیاد سے جائزہ طلب کریں۔ اور تقرب حاصل کریں۔ قبیلہ کندہ (قیس بن اشعث کندی) ہوازن (شمر) بنی تمیم، بنی اسد، بنی مذحج اور کچھ دیگر قبائل پر تقسیم کیے گئے۔ عاشورہ کے بقیہ دن اور گیارھویں کی دوپہر تک اپنے کشتے دفن کیے۔ نماز پڑھی، اور جسد ہائے شہدا کو یوں ہی ترک کر دیا۔ خیمہ میں آگ لگا دی کہ بیبیاں باہر نکل آئیں اور مقتل کی طرف دوڑ کر شہدا کی لاشیں گود میں اٹھائیں اور زار زار رونا شروع کیا۔ ابن سعد نے حکم دیا کہ بیبیوں کو بہ جبر لاشوں سے دور کرو۔ اس کے بعد انھیں بے مقنعہ مکشوف الوجہ بے ہودج کے اونٹوں پر سوار کیا۔ سید سجادؑ کے گردن مبارک میں طوق ڈال دیا۔ اور چونکہ بیماری سے بہت ضعیف تھے ان کے دونوں پاؤں کو اونٹ کے پیٹ میں باندھ دیا کہ گر نہ جائیں۔

کامل ابن اثیر کے موافق: حضرت زینبؑ خاتون کے بین پر دوست دشمن سب روتے تھے۔ (اینا مثیر الاحزان)

ابواسحٰق اسفرائنی کے نزدیک جب حضرت زینبؑ نے سنا کہ اب ابن زیاد کی طرف جانا ہوگا۔ تو ابن سعد سے کہا کہ حسینؑ کا جسم تو دکھا دے اور مقتل میں پہنچ کر بیبیوں نے مرثیے کہے۔ اس کے بعد راوی کہتا ہے کہ زینبؑ سر پر ہاتھ رکھ کر

کہتی تھیں یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیکھیے حسین رضی اللہ عنہ آغشتہ و سر بریدہ کربلا میں پڑے ہیں۔ آپ کی بیٹیاں قید ہو گئیں ---- پھر انھوں نے امام حسینؑ کی چھوٹی بیٹی فاطمہؑ کا ہاتھ پکڑا جو امام رضی اللہ عنہ کو بڑی پیاری تھی۔ اور اس کے چہرہ اور بالوں کو اس کے باپ کے گلے پر ملنا شروع کیا۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا رو رو کر کہتی ہیں: "پیارے ابا! میں بلاتی ہوں تم جواب کیوں نہیں دیتے؟"

راوی کہتا ہے کہ اس کے بعد ابن سعد نے حکم دیا کہ عورتوں کو جبراً لاش سے ہٹا دیا جائے۔ پھر ان کو برہنہ سر اور بے حجاب اونٹوں پر سوار کیا گیا۔ جن پر خالی پالان پڑی تھی۔ اور دشمنوں میں ان کی سواریاں اس طرح جاری تھیں جس طرح ردی کنیزوں کی سواریاں ہوتی ہیں۔

حضرت سجادؑ کی زبانی ایک حالت

ناسخ التواریخ کے موافق حضرت سید سجاد فرماتے ہیں کہ باپ اور اعزا کو شہید اور خون میں لتھڑا ہوا، اور ماں بہنوں کو اسیر دیکھ کر میرا سینہ تنگی کرنے لگا اور قریب تھا کہ روح پرواز کر جائے کہ پھوپھی زینبؑ نے دیکھا اور فرمایا کہ اے میرے بزرگوں کے یادگار میں تجھے کس حالت میں دیکھ رہی ہوں۔ کیا تیرا ارادہ ہے کہ دنیا سے گزر جائے۔ حضرت سجادؑ نے فرمایا اے پھوپھی کیونکر میری یہ حالت نہ ہو کہ میرے سب اعزا مارے گئے اور وہ برہنہ تن اور بے کفن پڑے ہیں۔ فرمایا قسم ہے خدا کی کہ تیرے بزرگوں سے اس کا عہد لیا گیا تھا۔

ابن زیاد اور حضرتؑ کا سر مبارک

ابن خلدون کہتا ہے: ابن زیاد نے دربار عام کیا۔ شہدائے کربلا کے سر طشتوں میں رکھ کر پیش کیے گئے۔ ابن زیاد کے ہاتھ میں ایک بید کی چھڑی تھی بار بار دندان امام پر مار رہا تھا۔ زید بن ارقم سے ضبط نہ ہو سکا۔ چلا کر بولے: اے ابن زیاد! اس چھڑی کو ان داتوں پر نہ مار۔ خدا کی قسم میں نے بارہا دیکھا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لبہائے مبارک ان داتوں اور لبوں کو بوسہ دیا کرتے تھے۔ ابن زیاد نے کہا: خدا تجھے ہمیشہ رلائے۔ اگر تو بڈھا فاتر العقل نہ ہوتا تو ابھی تیری گردن مارنے کا حکم دیتا۔ زید بن ارقم یہ کہتے ہوئے مجلس سے باہر آئے۔ اے گروہِ عرب تم لوگ سخت نالائق ہو کہ ابن فاطمہؑ کو شہید کر کے ابن مرجانہ کو اپنا حاکم بنایا جو اخیار و صلحاء امت کو قتل کر رہا ہے۔ اور شریر فتنہ انگیزوں کو خلعت دیتا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ تم لوگ ذلت و رسوائی پر راضی ہو گئے۔ تف ہو ان پر جو اس ذلت و رسوائی پر راضی ہوں۔ اس کے دوسرے دن عمر بن سعد اہل بیتؑ امام کو بازنجیر لیے ہوئے آپہنچا جس میں علی بن الحسینؑ بھی تھے۔

زید بن ارقمؓ کا ابن زیاد سے خطاب

صاحب صواعق محرقہ زید بن ارقم کے اس خطاب کے بعد اس قدر اور بڑھاتے ہیں کہ انھوں نے کہا کہ اے ابن زیاد میں کچھ اور کہتا ہوں جس سے تیرا غصہ بڑھے گا اور وہ یہ ہے کہ میں نے رسولِ خدا کو دیکھا کہ حسنؑ کو داہنے اور حسینؑ کو بائیں زانو پر بٹھائے تھے۔ اور اپنے دست مبارک کو دونوں کے سروں پر رکھ کر فرما رہے تھے کہ: "بار الہا میں نے انھیں تجھے اور مومنین صالح کے سپرد کیا"۔ تو اے ابن زیاد دیکھ کہ رسولؐ کی ودیعت اور امانت تیرے پاس کس طرح ہے (اس کا راوی ابن ابی دینار ہے) اس کے قبل کی سطروں میں لکھا ہے کہ: "روایت کردہ کہ چوں سر حسینؑ نزد ابن زیاد آوردند آن را در طشتے نہادہ و چوبے در دست داشت دندان مبارک او را چوب میزد و بضنب میگر دانید او را در بینی

او وی گفت نیکو روئے مثل ایں نہ دیدہ ام چہ دندان نیکو دارد انس فرود او حاضر بود او گریہ کرد و گفت حسینؑ شبیہ ترین مردم است برسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم روایت کیا کہ جب سر حسینؑ ابن زیاد کے پاس لایا گیا طشت میں رکھوایا، ہاتھ میں چھڑی تھی، جسے دندان مبارک پر مارتا اور ناک مبارک میں چھڑی سے پھراتا اور کہتا تھا اتنا خوبصورت چہرہ نہیں دیکھا کتنے خوبصورت دانت ہیں۔ انس موجود تھا۔ وہ رویا اور بولا حسینؑ رسُول اللہ کے ساتھ تمام لوگوں سے زیادہ مشابہ تھے۔ (اس کے بعد ابن دینار سے زید بن ارقم کی روایت ہے)

حسینؑ کا سر اہل بیت کے قافلہ کے آگے رکھا گیا

مؤرخین نے لکھا ہے کہ جب اہل بیتؑ کا قافلہ کوفہ پہنچا تو ابن زیاد نے حضرت کا سر مبارک بھیج دیا کہ اس قافلہ کے ساتھ لاؤ۔

صاحب کشف الغمہ کے موافق ابن زیاد نے دس ہزار سپاہیوں کو شہر کی محافظت کے لیے مقرر کیا تھا کہ مبادا شیعیان علی جوش میں نہ آئیں۔ اور حکم دیا تھا کہ کوئی شخص ہتھیار لے کر نہ نکلے۔

صاحب نور العین کہتے ہیں: مسلم معمار کہتا ہے کہ میں اس روز ابن زیاد کے گھر گچ کا کام کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ میں اپنے کام میں مشغول تھا کہ اس اثنا میں کوفہ کے ایک جانب سے شور و غوغا سنائی دیا۔ میں نے ایک خادم سے پوچھا: کیا ہے؟۔ اس نے کہا: "ایک باغی کا سر آرہا ہے"۔ میں نے پوچھا اس کا نام کیا ہے۔ وہ بولا: "حسین"۔ میں یہ سنتے ہی اس سے پرے ہٹ گیا اور ہاتھ اور منہ اور پاؤں دھو کر عمامہ اور کپڑے پہن کر محل سے نکلا تو میری نگاہ سر پر پڑی۔ اور میں زار و قطار رونے لگا۔ اہل کوفہ کو میں نے دیکھا کہ عید مناتے تھے۔ اور اچھے اچھے لباس زیب تن کیے تھے۔ امام حسینؓ رضی اللہ عنہ کے سر کے منتظر تھے۔ اتنے میں اونٹوں کی قطاریں شہر میں داخل ہوئیں۔ جن پر امام حسین رضی اللہ عنہ کے حرم سوار تھے۔ زین العابدینؑ ایک اونٹ پر سوار تھے۔ ابھی وہ کمزور بچہ تھے۔ ان لوگوں کی رانیں خون آلود ہو رہی تھیں۔ جب امام زین العابدینؑ نے اہل کوفہ کو امام حسین رضی اللہ عنہ کے سر کا منتظر پایا تو بہت روئے۔

راوی کہتا ہے کہ اس وقت کوفہ والے اہل بیتؑ کے بچوں کو روٹیاں دینے لگے تو ام کلثوم رضی اللہ عنہا نے چلا کر کہا: اے اہل کوفہ پتھروں کے لائق ہے اس شخص کا سر جو ہم کو صدقہ دے۔ پھر انھوں نے ان لوگوں کی دی ہوئی روٹیاں لے کر انھیں کی طرف پھینک دیں۔ اس وقت ان کو دیکھ کر لوگ زار و قطار روتے تھے اور شور و شیون سے حشر برپا تھا۔

ام کلثومؑ نے ان کو دیکھ کر کہا ہماری طرف کوئی نہ دیکھے۔ جو پردہ نشین عورتیں محلات پر سے اس دردناک سین کو دیکھ رہی تھیں وہ اس بات کو سن کر بے تابانہ رونے لگیں۔ ام کلثومؑ نے کہا ارے کم بختو تمھارے مرد تو ہم کو قتل کرتے ہیں، تم ہمارے حق میں رو رہی ہو۔ واللہ دنیا میں ہم کو اس لیے فتح حاصل نہیں ہوئی کہ آخرت کی نعمتیں ہم کو میسر ہوں۔ کم بخت تم لوگ جانتے ہو کہ کن لوگوں کے خون تم نے بہائے ہیں اور کن لوگوں کو تم نے تہ تیغ کیا ہے؟۔

اسیرانِ آلِ محمدؐ

صاحب لہوف فرماتے ہیں: راوی کہتا ہے کہ ایک عورت کوفہ اپنے کوٹھے سے جھانکی اور پوچھا کہ: "تم کون ہو کیسے قیدی ہو" تو ان اسیروں نے جواب دیا کہ: "ہم قیدی آلِ محمدؐ ہیں"۔ اس گھڑی وہ عورت اپنے چھت سے اتری اور ان بے چاریوں کے لیے چادریں پائجامے، ردائیں اور مقنعوں کو جمع کیے

اور اکٹھا کر دیا۔ اس وقت ان اسیروں نے اسے لے کر پہنا۔ (ایضاً مثیر الاحزان)

ابی مخنف کہتا ہے کہ ابو جدیلہ اسدی سے روایت ہے کہ زمانہ قتلِ حسینؑ میں میں کوفہ میں تھا۔ میں نے کوفہ کی عورتوں کو چاک گریبان بال پریشان دیکھا جن کے رخساروں پر طمانچوں کے نشان تھے۔ میں ایک بڑھے کے پاس گیا اور پوچھا کہ یہ شور و غل اور گریہ و زاری کس بات کی ہے۔ اس نے کہا کہ: "یہ حسینؑ کے سر کی آمد کی وجہ سے ہے"۔ اتنے میں لشکر آپہنچا۔ اور اس کے ساتھ کچھ اسرا بھی تھے۔ پس میں نے ایک کنیز کو دیکھا جو بغیر محمل کے اونٹ پر بیٹھی تھی۔ پس میں نے اس سے حال پوچھا اس نے کہا: "یہ ام کلثوم حسینؑ کی بہن ہیں"۔ میں نے ان سے کہا کہ اپنا حادثہ بیان فرمائیے۔ انھوں نے فرمایا کہ: "تو کون شخص ہے"۔ میں نے کہا میں بصرہ کا ایک آدمی ہوں۔ انھوں نے فرمایا کہ: "ہم لوگ خیمہ میں تھے کہ گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنی۔ جب ہم باہر نکلے تو دیکھا کہ گھوڑا خالی ہے۔ اس وقت ہم لوگ رونے لگے اور ہمارے ساتھ اور عورتیں بھی رونے لگیں۔ اس وقت ہم نے کسی کو ایک مرثیہ پڑھتے سنا لیکن دیکھا نہیں"۔

امام زین العابدینؑ کے اشعار

اس کے بعد ایک بے محمل کے اونٹ پر علی بن الحسینؑ دکھائی دیے۔ جن کی زبان خون آلود تھی اور وہ کہہ رہے تھے: ؎

تسیرونا علی الاقتاب عاریۃ کاننا لم نشید فیکم دینا

تم لوگ ہمیں برہنہ پالانوں پر اس طرح لیے جاتے ہو کہ گویا ہم نے تمھارے لیے کسی دین کو مستحکم ہی نہیں کیا تھا

دوسرا شعر: تم ہمارے مصائب پر خوشی سے تالیاں بجا رہے ہو۔ وئل ہو تم پر کیا رسول اللہ ہمارے جد نہ تھے؟

حضرت ام کلثومؑ کے اشعار

حضرت ام کلثومؑ نے جس وقت اپنے بھائی کا سر دیکھا تو گریبان چاک کیا اور فرمایا: ؎

ما ذا تقولون اذ قال النبی لکم ما ذا فعلتم و انتم اٰخر الامم

تم لوگ کیا کہوگے جب نبی تم سے پوچھیں گے کہ تم تو آخر الامم تھے تم نے کیا کیا

بعترتی و باھلی بعد مفتقدی منھم اساری و منھم ضرجوا بدم

میرے اہل اور عترت کے ساتھ بعد میرے وہ قیدی بنائے گئے ہیں اور ان سے خون ٹپک رہا ہے

ما کان ھذا جزائی اذ نصحت لکم ان تخلفونی بسوء فی ذوی رحمی

کیا میری نصیحتوں کا یہی بدلہ ہے کہ تم میرے اہلِ بیتؑ سے اس طرح مخالفت کرو

اہلِ بیتؑ پر صدقہ حرام ہے

اس مؤرخ کے موافق بھی جب اہل کوفہ نے بچوں کو خرمے دینے چاہے تو حضرت ام کلثومؑ نے چلا کر فرمایا: "یا اھل الکوفۃ الصدقۃ علینا حرام"۔ اے اہلِ کوفہ صدقہ ہم لوگوں پر حرام ہے۔ اور یہ فرما کر اسے زمین کی طرف پھینک دیا۔

ایک راوی اور اہلِ بیتؑ کا کوفہ میں داخلہ

سہل شہرزوری کہتا ہے کہ میں اس زمانہ میں حج سے کوفہ آیا۔ میں نے دیکھا کہ بازار یں سونی پڑی ہیں اور دکانوں میں قفل دیے ہیں اور لوگ کچھ رو رہے ہیں اور کچھ ہنس رہے ہیں۔ میں ایک شخص کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ

یہ کیا ماجرا ہے کہ کچھ لوگ روتے ہیں اور کچھ لوگ ہنستے ہیں۔ اگر تو جانتا ہو تو مطلع کر۔ یہ سن کر وہ شخص زور سے رونے لگا اور کہنے لگا: اے شیخ کوئی عید تو نہیں ہے لیکن رونا وہ دو لشکروں کی وجہ سے ہے جس میں ایک فتح یاب ہوا اور دوسرا مقتول ہوا۔ میں نے کہا وہ کون سے دو لشکر تھے۔ اس نے کہا: حسینؑ کا لشکر برباد اور ابن زیاد کا لشکر فتح یاب ہوا۔ یہ کہہ کر رویا اور اشعار پڑھے۔ اس کے بعد طبل بجنے لگے اور فوجی نشان ظاہر ہوئے اور لشکر کوفہ میں داخل ہوا۔ اس وقت بڑا شور و غل ہوا۔ اور حسینؑ کا سر دکھائی دیا۔ جس سے نور ساطع تھا۔ یہ دیکھ کر مجھ پر عبرت طاری ہوئی۔ اس کے بعد قیدی دکھائی دیے جن کے بعد علی بن الحسینؑ تھے۔ ان کے بعد حضرت ام کلثومؑ تھیں۔ اور وہ آواز دے رہی تھیں کہ اے اہل کوفہ ہماری طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لو۔ کیا تمھیں خدا اور ان کے رسولؐ کا خوف نہیں ہے کہ تم رسول اللہؐ کے حرم کی طرف نگاہ اٹھاؤ۔

صاحب رسالہ "غم حسینؑ" فرماتے ہیں: جاحظ نے اپنی کتاب البیان والتبیین میں ابی اسحاق اور انھوں نے خزیمۃ الاسدی سے روایت کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں ہم لوگ کوفہ میں (جب کہ علی بن حسینؑ بن علی (امام زین العابدین) رضی اللہ عنہم کا قافلہ کربلا سے ابن زیاد کے پاس چلا آتا تھا) داخل ہوئے۔ میں نے نساء کوفہ کو دیکھا کہ چاک گریبان، مغموم (تم رسیدہ قافلہ کے استقبال کے لیے) کھڑی ہیں (اور تمام کوئی موجود ہیں) امام زین العابدین علیہ السلام نے جو شدت مرض سے بالکل نحیف اور بہت ہی لاغر ہو رہے تھے دھیمی آواز سے فرمایا: اهل الکوفة انکم تبکون علینا فمن قتلنا غیرکم (ترجمہ) اے اہل کوفہ! تم لوگ ہم کو روتے ہو؟ تمھارے سوا کس نے ہم لوگوں کو قتل کیا؟

حضرت زینبؑ کے خطبہ کے متعلق ایک راوی

اور میں نے زینبؑ بنت علی کرم اللہ وجہہ الشریف کو دیکھا اور واللہ میں نے ان سے بڑھ کر کسی پردہ نشین عورت کو ایسا فصیح و بلیغ بولنے والی نہیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ امیر المومنین کی زبان ان کے منھ میں ہے۔ آپ نے لوگوں کو اشارہ کیا کہ چپ رہو۔ چپ رہو۔ سبحان اللہ کیا ارشاد تھا کہ ہر طرف سکوت طاری ہو گیا۔ گویا سانس تک بند ہو گئی اور اونٹوں کے گھنٹ وغیرہ بجنا سب موقوف ہو گئے۔ آپ نے حمد و نعت کے بعد فرمایا: (خطبہ)

وہ راوی کہتے ہیں کہ پھر قافلہ آگے بڑھا اور لوگ حیرت زدہ اور تعجب سے منھ پر ہاتھ رکھے تھے۔ اور میں نے ایک بڈھے آدمی کو دیکھا کہ حضرت زینبؑ کے قریب ہی کھڑے تھے اور اس قدر روتے تھے کہ ان کی داڑھی تر ہو گئی تھی۔ پھر انھوں نے حضرت زینبؑ سے یہ کہا: کھولکم خیر الکھول و شبابکم خیر الشباب ونسلکم لا یبور ولا یخزی ابداً۔ غالباً یہ بزرگ زید بن ارقم صحابی رضی اللہ عنہ ہوں گے جو امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے یاران باختصاص سے تھے۔

حضرت زینبؑ خاتون کا خطبہ نہ صرف صاحب غم حسینؑ نے نقل فرمایا ہے بلکہ وہ یادگار خطبہ علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ، صاحب لہوف، صاحب مثیر الاحزان، اور ناسخ التواریخ نے بھی نقل کیا ہے۔ ابو اسحاق نے اختصار کیا ہے۔ اور اس آخر الذکر مورخ نے حضرت زینبؑ کے متعلق بشیر اسدی سے روایت کی ہے کہ: میں نے حضرت علی کی بیٹی زینبؑ کو دیکھا وہ بالکل اپنے باپ کے مشابہ تھیں۔ میں نے دیکھا کہ انھوں نے لوگوں کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ لوگ خاموش ہو گئے تو انھوں نے کہا ۔۔۔

لہوف، بحار، اور ناسخ التواریخ میں حضرت زینبؑ کے خطبہ کے بعد حضرت فاطمہؑ صغریٰ، حضرت ام کلثومؑ اور حضرت

امام زین العابدین علیہ السلام کا خطبہ بھی لکھا ہے۔ صاحب لہوف کی اصل عبارت یہ ہے: و روی زید بن موسی قال حدثنی ابی عن جدی قال خطبت فاطمۃ الصغری بعد ان وردت من کربلا۔ اس کا ترجمہ کیا گیا ہے کہ: "زید بن موسی کاظمؑ فرماتے ہیں کہ: مجھ سے میرے باپ نے اور ان سے میرے دادا نے روایت کی ہے کہ کربلا سے لوٹ کر کے جناب فاطمہؑ صغرا نے یہ خطبہ پڑھا"۔ بحار کا ترجمہ ہے کہ: "حضرت فاطمہؑ صغریٰ نے بعد مراجعت کربلا سے۔۔۔"۔ "کربلا سے لوٹ کر" یا "بعد مراجعت کربلا سے" یا "بعد وردت من کربلا" کا مفہوم سمجھنے سے میں اپنے کو قاصر پا رہا ہوں۔ اگر اس کا مطلب ہے کہ جس وقت کربلا سے کوچ ہو رہا تھا اس وقت سے اس وقت تک جب کہ کوفہ پہنچے تو اس میں ایک دشواری یہ ہوتی ہے کہ حضرت فاطمہؑ صغریٰ کے خطبہ کا موقع اور مخاطب "اہل کوفہ" معلوم ہوتے ہیں نہ کہ وہ کوئی جو لشکر ابن زیاد کے ساتھ تھے اور اگر اس کا منشا یہ ہے کہ کوفہ کے لوگوں سے کوفہ میں مخاطبہ تھا تو "بعد وردت من کربلا" کے لکھنے اور کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی وہ تو حضرت زینبؑ کے خطبہ کے سلسلہ میں تھا ہی جو کوفہ میں ہوا۔ اس کے لیے ابن نما علیہ الرحمہ کا طرز بیان مناسب ہوتا کہ حضرت زینبؑ کے خطبہ کے بعد فرماتے ہیں: "و خطبت فاطمۃ الصغریٰ فقالت۔۔۔" اس سے بعد ورود کربلا کا ابہام باقی نہیں رہتا اور کم سے کم ایک شبہ صاف ہو جاتا ہے۔ بہر حال میں اسے اس یقین کے ساتھ نہیں لکھ رہا ہوں کہ مجھے اس کے موقع اور شخص کا یقین ہے بلکہ اس لیے کہ خطبہ کے واقعات وہ ہیں جو کبھی کسی نے ظاہر کیے ہوں اور وہ واقعات قابل انکار نہیں ہیں۔ اس خطبہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ سب میں زیادہ طویل ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک چھوٹی سی صاحبزادی نے کہا ہے۔ جن کے اقتضائے سن کی بنا پر خطبہ کے مذکورہ واقعات کا لحن اور ترتیب قابل لحاظ ہو سکتا ہے۔ میں اس کو اسی سلسلہ میں اس لیے لکھتا ہوں کہ مجھے اس موقع کے متعلق نہ کہے جانے کا یقین بھی نہ کرنا چاہیے اس اقرار اور شبہ کی درمیانی حالت کے لحاظ سے محض شبہ اس کا مقتضی نہیں ہے کہ میں اسے درج نہ کروں۔ (یہ بھی کہہ دوں کہ تخلیف مؤرخین کے الفاظ میں بجز چند فقرات یا بعض الفاظ کے کمی بیشی کے کوئی اختلاف نہیں ہے) یہ خطبات میں لہوف سے نوٹ کرتا ہوں۔ جناب زینبؑ علیا مقام نے فرمایا:

"بہترین حمد و ثنا خدائے قادر کے لیے ہے اور بہتر سے بہتر درود و سلام محمد رسول اللہؐ اور ان کی آل پاک اور بزرگ پر ہے۔ آگاہ ہو اے اہل کوفہ۔ اے اہل غدر و مکر اب تم روتے ہو۔ تمہارے آنسو نہ تھمیں۔ تمہارا رونا چلانا بند نہ ہو۔ تمہاری مثال اس عورت کی سی ہے کہ جس نے اپنا سوت کات کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہوں۔ تم اپنے عہدوں میں ایک حیلہ بناتے ہو۔ آگاہ ہو کہ تم میں نہیں ہیں مگر ایسے لوگ کہ جو بے ہودہ اور رذیل ہیں۔ تم میں ایسے سینے ہیں کہ جن میں کینے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ لونڈیوں کی طرح خوشامدی ہیں۔ دشمنوں کے مثل کینہ ور ہیں۔ تم کمینہ پن میں اس سبزی کی صورت ہو کہ جو نجاست پر اگے۔ تم اس قبر کی صورت بے فائدہ اور بے حاصل ہو کہ جو چاندی سے آراستہ کی گئی ہے۔ تمہارے نفسوں نے برے اعمال پیش کیے کہ جس کی وجہ سے تم قہر و غضب و عذاب الٰہی اور جہنم میں داخل ہونے کے مستحق ہوئے ہو۔ اب روتے چلاتے ہو۔ بخدائے توانا تم بہت روؤ اور کم ہنسو گے کہ عار و ننگ و بے شرمی و عیب امت تم نے حاصل کیے ہیں۔ وہ تم سے ہرگز ہرگز جدا نہیں ہو سکتے۔ پس تم کیونکر نجات پا سکتے ہو اور کیونکر

بچ سکتے ہو کہ تم نے سلالہ خاتم الانبیاء، سردار جوانان بہشت، ملجاء ماوائے نکوکاران، وجائے پناہ اہل مصیبت، و ستون حجت خدا اور اپنے راہ نما کو قتل کرڈالا ہے۔ برا ذخیرہ لے چلے ہو تم رحمت حق سے دور ہو۔ اصل تو یہ ہے کہ تمہاری کوشش بے جا اور سعی بے فائدہ ہوئی۔ اعمال تمہارے برے ہوئے۔ تم نے اپنی جانوں کو ہلاک کیا۔ تمہارے کمال میں نقصان آیا۔ تمہاری کمائی میں ٹوٹا ہوا۔ تم مبتلائے ذلت و خواری و مورد قہر و غضب الٰہی ہوئے۔ اے اہل کوفہ! تم پروائے ہو کہ کیسا تم نے پیغمبر خدا کا جگر کاٹا ہے۔ کیسی اپنی عداوت جناب رسالت مآبؐ سے تم نے ظاہر کی ہے۔ عجب طرح کا خون تم نے بہایا ہے اور حرمت و آبرو ضائع کی ہے۔ ان کے کیسے پیارے فرزند کو قتل کیا ہے۔ واقعی تم نے بڑے امر عظیم کا ارتکاب کیا ہے۔ عجب نہیں ہے کہ آسمان پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ اور زمین پھٹ جائے اور پہاڑ پاش پاش ہو جائیں"۔ بروایت دیگر یہ فرمایا: تم نے ایک بڑی آفت اور حادثہ عظیم برپا کیا کہ اس سے فضائے آسمان و زمین تنگ ہو گئی۔ اس امر سے تعجب کرتے ہو کہ آسمان خون رویا۔ آگاہ ہو کہ عذاب آخرت زیادہ رسوا کرنے والا ہے اور اس دن کوئی معین و مددگار نہ ہوگا۔ اس مہلت چند روزہ پر گھمنڈ نہ کرو، مغرور نہ ہو۔ ہاں البتہ بدلہ لیا جائے گا اور یہ خون پائمال اور ضائع نہ ہوگا۔ عذاب خدا تمہارے سروں پر ہے۔

راوی کہتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ سب لوگ اس دن حیران و بھوچکے ہو گئے۔ اپنے ہاتھوں کو منہ پر رکھے کاٹتے تھے۔ میں نے (ایک) بوڑھے آدمی کو دیکھا کہ جو میرے برابر کھڑا تھا اور ایسا رو رہا تھا کہ اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں۔ تمہارے بزرگ بہترین بزرگان ہیں۔ جوان تمہارے بہترین جوانان ہیں۔ عورتیں تمہاری بہترین عورت اور نسل تمہاری بہترین نسل ہے۔ کبھی تمہاری نسل رسوا اور خفیف نہ ہوگی نہ ذلیل ہوگی۔

حضرت فاطمہؑ صغریٰ کا خطبہ اور اثر

حضرت فاطمہؑ صغریٰ نے فرمایا: خدائے توانا کے لیے بے حد و پایاں شکر ہے۔ اور اس قدر سپاس ہے کہ جس قدر زمین و عرش کے درمیان چیزیں ہیں۔ خدا کا شکر ادا کرتی ہوں اور اس پر توکل و بھروسا و یقین و اعتقاد رکھتی ہوں۔ اس کی وحدانیت اور جناب رسولِ خداؐ کی رسالت پر گواہی دیتی ہوں اور اس بات پر گواہی دیتی ہوں کہ ان کی اولاد امجاد کو اشقیائے امت نے ناحق قتل کرڈالا فرات کے کنارے۔ حالانکہ وہ کسی سے بغض و عداوت نہیں رکھتے تھے۔ نہ کسی کا خون بہایا تھا۔ خدا سے پناہ مانگتی ہوں۔ اس بات سے کہ اے خدا تجھ پر بہتان کروں۔ اور اس امر کے خلاف جو تو نے عہد و پیمان علی بن ابی طالب وصی رسولِ خداؐ کے لیے لیا ہے۔ وہ علی کہ جس کا حق چھین لیا گیا اور بے جرم و گناہ اس کو تیرے گھر میں مسلمانوں کے سامنے قتل کیا۔ جیسا کہ کل ان کے فرزند کو قتل کیا۔ تو نے اس جناب کو وقت حیات سے وقت ممات تک پابند اپنی مرضیوں کا رکھا تھا کہ ان کے نفس نفیس و ذات اقدس کو بہ مناقب حمیدہ اور خصائل پسندیدہ تو نے اٹھا لیا اور کسی بات میں گرفت و ملامت کا موقع ان پر نہ ہوا۔ کم سنی میں ان کو ہدایت کی اور جوانی میں پاک و صاف فضیلتیں اور عزتیں دیں۔ وہ ہمیشہ خیر خواہی امت میں اور تیرے پیغمبر برحق کے امور میں سعی اور کوشش کرتے رہے۔ اور آخرت کی طرف رغبت اور دنیا سے نفرت رکھتے تھے۔ اور تیری راہ میں جہاد کیا اور تو نے ان کو تمام خلائق سے برگزیدہ کیا اور فوقیت دی۔ وہ راہ راست کی طرف رہنمائی کرتے رہے اور ہدایت فرماتے رہے۔ اس حالت میں جہان فانی سے

دار بلا کی طرف کوچ کیا۔ اے اہل کوفہ! اے اصحاب مکر و حیلہ! آگاہ ہو کہ (خدا نے) ہم اہل بیتؑ کو تمہارے ہاتھ میں مبتلا کیا اور تمہارا امتحان ہم سے کیا۔ ہماری بلا کو اچھا جانا اور ہم کو اپنے علم و حکمت عطا کی۔ پس ہم خزانہ علم و فہم اور صندوقِ حکمت الٰہی اور حجت خدا ہیں روئے زمین پر۔ اس نے اپنی کرامت سے ہم کو معزز کیا اور بوجہ اپنے رسولؐ کے تمام خلق پر ہم کو عزت و شرافت بخشی۔ تم نے اپنے پیغمبرؐ کی تکذیب کی۔ ان کو جھٹلایا۔ ہمارے خون و مال کو جائز و حلال جانا گویا ہم اولاد ترک و کابل تھے۔ کل ہمارے جد کو قتل کیا اور آج تمہاری تلواریں ہمارے خون سے آلودہ ہیں۔ یہ سب تمہاری پرانی عداوت و کینہ کی وجہ سے ہے کہ تم ہمارے قتل سے خوش و خرم ہو۔ خدا کے ساتھ مکر و فریب کرتے ہو حالانکہ وہ مکر کا باطل کرنے والا ہے۔ تم ہمارے قتل سے خوش نہ ہو کہ یہ وہ مصیبتیں اور بلائیں ہیں جو قبل از وقوع واقعہ خدا نے کتاب میں لکھی ہیں۔ خدائے پاک کے نزدیک یہ سہل و آسان ہے۔ (ہمارا شعار ہے کہ) جو چیز جاتی رہے اس پر رنجیدہ نہ ہوں اور جو جاہ ملے اس پر خوش نہ ہوں۔ خدائے پاک کسی مغرور متکبر کو دوست نہیں رکھتا۔ خدا تم کو ہلاک کرے۔ تم عذاب و لعنت خدا کے منتظر رہو۔ گویا تم پر پے در پے غضب خدا اور عذاب شدید آسمان سے نازل ہوا ہے۔ اور تم کو کردار زشت کی پاداش نے ہلاک کر دیا ہے۔ بعض کو تم میں سے بعض کے عذاب میں گرفتار کر دیا ہے۔ تمہارے لیے ہمیشہ عذاب و سزا ہے۔ ظالموں پر خدا کی لعنت ہو۔ تمہارا برا ہو۔ آیا کچھ جانتے ہو کہ کن ہاتھوں سے تم نے ہم کو نیزے مارے اور تم میں کون لوگ ہمارے قتل پر مستعد ہوئے اور کن قدموں سے ہماری لڑائی کو آئے۔ تمہارے دل نہایت ہی سخت و غلیظ ہیں۔ تمہارے دلوں پر مہر کی ہوئی ہے۔ شیطان نے برے کاموں کو تمہاری نظروں میں رونق دی ہے۔ تمہارے لیے ایسا سامان مہیا کر دیا ہے کہ تمہارے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ راہِ راست پر نہیں آتے ہو۔ اے اہل کوفہ تم رسولِ خدا سے کیسی عداوت رکھتے ہو کہ ان کے بھائی علی بن ابی طالب اور ان کی اولاد سے کہ ذریت رسولؐ ہیں تم نے اس کا بدلہ لیا۔ چنانچہ تم میں سے ایک شقی فخریہ کہتا ہے کہ: "ہم نے علی اور اولاد علی کو نیزہ اور شمشیر ہندی سے قتل کیا۔ اور ان کے حرم کو مثل اسیران ترک کے قید کیا اور کیسی کیسی لڑائیاں کیں"۔ پس اے کہنے والے تیرے منہ میں خاک ہو۔ ایسے بزرگوں کے قتل پر تو فخر کرتا ہے کہ جن کو خدائے پاک نے رجس و ناپاکی سے پاک و صاف کیا ہے۔ چپ ہو جس طرح تیرا باپ چپ رہا۔ ہر شخص کے لیے اس کے افعال کے مطابق اور جو اس نے جمع کیا ہے جزا و سزا ہے۔ تم نے ہمارے فضائل و مناقب پر حسد کیا۔ تف ہے تم پر کہ جو فضیلت خدا نے ہم کو دی ہے اس کو نہیں جانتے۔ یہ قول شاعر: ؎

فما ذنبنا ان جاش دھرا بحورنا و بحرك ساج لا یواری الدعا مصا

ہمارا کیا قصور ہے کہ زمانہ نے ہمارے دریاؤں کو جوش زن کیا۔ اور تمہارا دریا حرکت نہیں کرتا اور ایک جانور کو چھپا نہیں سکتا یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ وہ صاحب فضل عظیم ہے۔ جس کو خدا نے نور نہ دیا اس کو نور کہاں سے مل سکتا ہے۔

راوی کہتا ہے کہ شور و فغاں و گریہ و زاری کے ساتھ آوازیں بلند ہوئیں اور ان لوگوں نے کہا کہ بنت طیبین تمہارے لیے بس اسی قدر کافی ہے تم نے ہمارے دلوں کو جلا دیا اور سینوں کو چھنکا دیا ہمارے پیٹ میں آگ لگا دی۔ تب آپ خاموش ہو گئیں۔

راوی کہتا ہے کہ اس روز ام کلثومؑ بنت علی علیہ السلام نے پس پردہ سے خطبہ پڑھا اور بہ آواز بلند رو کر کہنے لگیں:
اے اہل کوفہ! برا حال ہو تمہارا کس لیے تم نے حسینؑ کو قتل کیا، اور ان کا مال اسباب لوٹ کر اس کو اپنا ورثہ بنایا۔ ان کے اہل بیتؑ کو اسیر کیا۔ ہلاک ہو تم۔ وائے ہو تم پہ۔ رحمت خدا سے تم دور رہے۔ آیا جانتے ہو تم کس بلا میں گرفتار ہوئے۔ کیسے کیسے خون تم نے بہائے۔ کیسے کیسے بچوں کو تم نے برہنہ کیا۔ کیسے کیسے مال لوٹ لیے۔ تم نے ایسے شخص کو مارا ہے کہ بعد پیغمبر خدا کے تمام عالم سے اشرف و افضل تھا۔ تمہارے دلوں سے رحم جاتا رہا۔ بہر صورت مردان خدا رستگار ہیں اور پیروان شیطان زیاں کار ہیں۔ پھر آپ نے یہ اشعار پڑھے:

قتلتم اخی ظلماً فویلکم غداً — ستجزون ناراً حرها یتوقد

عذاب ہو تم پر کہ تم نے میرے بھائی کو قتل کیا۔ جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ تمہارے لیے سزا ہوگی

سفکتم دماء حرم الله سفکها — و حرمها القرآن ثم احمد

تم نے ایسا خون بہایا جس کا بہانا خدا قرآن اور رسول اللہ نے حرام کیا تھا

و انی لابکی فی حیاتی علی اخی — علی خیر بعد النبی یولد

اور میں یقیناً عمر بھر اپنے بھائی کو رویا کروں گی۔ ایسا بھائی جو بعد نبی سب سے بہتر تھا

راوی کہتا ہے کہ تمام حاضرین اس کلام حزن انجام سے گریہ وزاری و شور و نالہ کرنے لگے۔ تمام عورتوں نے بال کھول دیے۔ خاک سر پر ڈالی۔ چہرے ناخون سے نوچے۔ طمانچے گالوں پر مارے اور مردوں نے اپنی داڑھی نوچ ڈالیں۔ روتے جاتے تھے۔ راوی کہتا ہے کہ اس روز سے زیادہ رونے والیاں اور رونے والے میں نے نہیں دیکھے۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کا خطبہ اور اثر

اس کے بعد حضرت امام زین العابدینؑ نے ان سب کو خاموش کیا جب سب چپ ہوئے تو آپ کھڑے ہوئے۔ بعد حمد وثنائے الٰہی و نعت حضرت رسالت پناہی فرمایا: "جو کوئی مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے اور جو نہیں پہچانتا ہے وہ اب پہچان لے۔ میں علی بن الحسینؑ ہوں۔ اس کا فرزند ہوں کہ جو راہ خدا میں بے جرم و خطا فرات کے کنارہ ذبح کیا گیا۔ میں اس کا فرزند ہوں کہ جس کی عزت و حرمت ضائع کی گئی۔ اس کے اہل حرم کو اور چھوٹے بچوں تک کو قید کر لیا ہے۔ میں اس کا فرزند ہوں جس کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ میں اس کا فرزند ہوں کہ جو صابر و شاکر شہید ہوا، اور اس کا فخر میرے لیے کافی ہے۔ اے لوگو! میں تم کو قسم دیتا ہوں خدائے خالق کی۔ آیا تم جانتے ہو جو کچھ تم نے مکر کیا میرے پدر عالی مقدار کو خطوط لکھے۔ عہد و پیمان کیے اور آخر کو قتل کر ڈالا۔ ان کی مدد و نصرت نہ کی۔ کس قدر برے اعمال تم نے اپنے لیے جمع کیے۔ تم نے بری رائے اختیار کی۔ کن آنکھوں سے تم رسولِ خدا کو دیکھو گے۔ جس وقت وہ حضرتؐ فرمائیں گے کہ تم نے میری اولاد کو قتل کیا۔ میری ہتک حرمت کی۔ تم میری امت سے نہیں ہو"۔ پس ہر طرف سے لوگوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ سب روتے تھے اور آپس میں ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ ہم سب ہلاک ہوئے۔ ہم نے غفلت کی۔ (پھر حضرت سجادؑ نے فرمایا کہ) "خدا کی رحمت اس پر ہے جو گوش دل سے نصیحت سنے اور قبول کرے۔ در باب خدا و رسولؐ و ذریت رسولؐ میری وصیت یاد رکھے کہ ہم کو رسولِ خداؐ کے ساتھ اقتدائے نیک ہے"۔

(سب نے بالاتفاق کہا کہ یا ابن رسول اللہ ہم تمہارے عہد کے نگہبان ہیں جو چاہو حکم کرو۔ ہم انکار نہیں کرتے تمہارے دشمنوں کے دشمن اور دوست کے دوست ہیں۔ یزید سے اس کا مواخذہ کریں گے۔ اور ان ظالموں سے بیزار و ناخوش ہیں جنھوں نے آپ پر ظلم کیا) حضرتؑ نے فرمایا: ہیہات ہیہات اے گروہ غدار و مکار! تم اپنے نفس کی ہوا و ہوس میں پھنسانا چاہتے ہو کہ میرے ساتھ بھی وہی سلوک کرو جو کل میرے باپ کے ساتھ کیا ہے۔ بخدا ابھی زخم نہیں بھرا ہے اور حرارت نہیں گئی ہے کل کی بات ہے کہ میرے باپ کو مع اقربائے باوفا کے قتل کیا ہے۔ مجھے میرے جد و پدر کی موت نہیں بھولی غم و غصہ کی تلخی و گرمی میرے گلے میں ابھی باقی ہے۔ اب میری خواہش تم سے صرف یہ ہے کہ تم ہم کو نفع و ضرر کچھ نہ پہنچاؤ۔

لا غرو ان قتل الحسینؑ فشیخہ قد کان خیرا من حسینؑ و اکرما

کچھ عجب نہیں ہے اگر حسینؑ قتل ہوئے۔ اس لیے کہ ان کے بزرگ جو ان سے اچھے اور اکرم تھے قتل ہوئے

فلا تفرحوا یا اہل الکوفۃ بالذی اصیب حسین کان ذالک اعظما

اے اہل کوفہ اس پر خوش نہ ہو کہ تم نے حسینؑ کو بڑی مصیبت پہنچائی

قتیل بشط النھر روحی فداوہ جزاء الذی ارداہ نار جھنما

ان پر میری جان قربان ہو وہ تو نہر فرات کے کنارے مارے گئے اور جس نے انھیں قتل کیا اس کی جزا دوزخ کی آگ ہے

پھر فرمایا کہ: "ہم راضی ہیں خدا کی رضا پر۔ ہم تم سے آج فائدہ و نقصان کچھ نہیں چاہتے"۔

سرِ اقدس دوبارہ دربار میں

اعثم کوفی کہتا ہے: جب دوبارہ امام حسینؑ کا سر مقدس ابن زیاد کے سامنے لائے تو وہ بدبخت لعین چہرہ اور بالوں کو اٹھا کر دیکھنے لگا۔ ناگاہ اس کے منحوس ہاتھوں کو رعشہ ہوا۔ اس نے وہ مقدس سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اس وقت گلوئے مبارک سے خون کا ایک قطرہ نکل کر زانو پر گرا جو کپڑوں سے گزرتا اور ران میں ناسور کرتا ہوا نکل گیا۔ وہ ناسور سخت بدبودار تھا۔ ہر چند جراحوں اور طبیبوں نے علاج کیا کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اس لیے وہ شقی ہمیشہ اس ناسور پر مشک رکھتا تھا۔ (ابراہیم بن مالک اشتر نے جس وقت ابن زیاد کو قتل کیا تو بوئے مشک سے تصدیق ہوئی کہ مقتول ابن زیاد تھا)

دربار ابن زیاد

معلوم ہوتا ہے کہ ابن زیاد نے آج دربار میں کچھ زیادہ آراستگی کی تھی یا کچھ قاعدے آسان کر دیے تھے۔ مثلاً لہوف سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلبیتؑ کے داخل دربار ہونے کے وقت ابن زیاد نے لوگوں کو "اذن عام دیا تھا"۔ صاحب کشف الغمہ کے موافق: "حضرت زینبؑ ایک گوشہ میں بیٹھ گئیں۔ اور کنیزوں نے ہر طرف سے حضرتؑ کو گھیر لیا"۔ ابو اسحاق اسفرائنی اور ابی مخنف سے واقعات کا ایک نہایت باموقع ٹکڑا یہ معلوم ہوتا ہے کہ سامنے کھڑے ہوتے ہی حضرت سید سجادؑ نے سوال کیا: "عنقریب تم بھی اسی طرح کھڑے کیے جاؤ گے۔ اور تم سے سوال کیا جائے گا لیکن رسول اللہ کو تم کوئی جواب نہ دے سکو گے"۔ ابن زیاد چپکا ہو رہا اور اسے یہ پسند نہ آیا۔

حضرت ام کلثومؑ اور ابن زیاد کی گفتگو

اسی مؤرخ کے موافق: ابن زیاد نے پوچھا کہ ان میں ام کلثومؑ کون ہے؟ حضرت ام کلثومؑ نے کوئی جواب نہ دیا۔

ابن زیاد نے دوبارہ سوال کیا۔ پھر خاموش رہیں۔ تیسری مرتبہ اس نے کہا: قسم ہے تمھیں اپنے جد کے حق کی کہ کلام کرو۔ فرمایا: "کیا چاہتا ہے؟"۔ ابن زیاد نے کہا: "خدا نے تمھیں اور تمھارے جد کو جھٹلایا اور انھیں رسوا کرکے مجھے ان کی طرف سے مطمئن کیا"۔ فرمایا: "اے دشمن خدا! خدا فاسق کی تکذیب اور جھوٹے کی فضیحت کرتا ہے۔ اور واللہ تو کذب اور فجور کا حامل ہے تجھے جہنم کی بشارت ہو"۔ ابن زیاد ہنسنے لگا اور کہا: "اگر میں جہنم میں جاؤں تو میری مراد برآئے"۔ حضرت ام کلثومؑ نے فرمایا: "او کم بخت تو نے اہل بیتؑ کے خون سے زمین کو نہلا دیا"۔ ابن زیاد نے کہا: "اے شجاع کی بیٹی اگر تو عورت نہ ہوتی تو میں تیری گردن مار تا"۔ ابی اثق کے موافق حضرتؑ نے فرمایا: "اگر میں شجاع نہ ہوتی تو میں اس طرح بے نقاب نہ کھڑی ہوتی"۔

حضرت زینبؑ اور ابن زیاد کا مکالمہ

ابی مخنف کے موافق حضرت زینبؑ بابال پریشان آستین میں اپنے منھ کو چھپائے تھیں۔ ابن زیاد داہنے بائیں دیکھ رہا تھا اور سرنیزوں پر گرد تھے۔ ابن زیاد نے حضرت زینبؑ کو دیکھ کر اپنے حاجبوں سے پوچھا کہ یہ کون ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ زینبؑ حسینؑ کی بہن ہیں۔ ابن زیاد نے کہا: "اے زینبؑ بحق اپنے جد کے کلام کرو"۔ فرمایا: "اے دشمن خدا و رسولؐ کیا چاہتا ہے؟"۔ تو نے نیکوں اور بدوں میں ہماری ہتک کی"۔ کہا: "تم نے اپنے اور اپنے بھائی کی شان میں خدا کو کیسا دیکھا تمھارے بھائی نے ارادہ کیا تھا کہ یزید سے خلافت لے لے۔ ان کی امید ٹوٹ گئی اور ہمیں خدا نے مطمئن کیا"۔ فرمایا: "وائے ہو تجھ پر اگر میرے بھائی نے طلب خلافت کی تو وہ ان کے باپ اور نانا کی میراث تھی۔ لیکن تو اپنے نفس کو جواب کے لیے مستعد رکھ جب کہ خدا قاضی، محمدؐ تیرے دشمن اور جہنم تیرا قید خانہ ہوگا"۔

حضرت علی بن الحسینؑ اور ابن زیاد

اس وقت حضرت زین العابدینؑ نے حضرت زینبؑ کو چپ کرایا اور فرمایا: "کب تک او ابن زیاد تو میری پھوپھی کی توہین کرے گا؟"۔ ابن زیاد کو اس پر غصہ آیا۔ اور اس نے اپنے حاجب کو حکم دیا کہ گردن مارو۔ حضرت زینبؑ امام زین العابدینؑ سے لپٹ گئیں۔ حاجب نے چاہا کہ حضرتؑ کو لے جائے۔ اس وقت اہل بیتؑ میں شور ہوا اور حضرت زینبؑ نے ابن زیاد سے فرمایا کہ: "کیا تو چاہتا ہے کہ نسل رسولؐ میں سے کوئی باقی نہ رہے۔ اگر تیرا یہی ارادہ ہو تو مجھے بھی اس کے ساتھ قتل کر ڈال"۔ حاجب کو بلا لیا گیا۔ ابی اثق وغیرہ کے موافق حضرت سجادؑ نے فرمایا: "تو مجھے قتل کی دھمکی دیتا ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ قتل ہمارے لیے شہادت اور خدا کی طرف سے درجہ ہے"۔

ابن خلدون بعض پہلو کے متعلق زیادہ صاف ہے۔ وہ کہتا ہے: ابن زیاد نے تین بار زینبؑ (آپ کی بہن) کی طرف اشارہ کرکے دریافت کیا۔ "یہ کون ہے؟"۔ چوتھی بار کسی نے کہا: "یہ زینبؑ بنت فاطمہؑ ہیں"۔ ابن زیاد نے مخاطب ہو کر کہا: "اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تم کو رسوا و ذلیل کیا۔ اور جھوٹے کو اس کے کذب کی سزا دی"۔ زینبؑ نے جواب دیا: "اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ہم کو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات مبارک سے سرفراز کیا اور ہمارے بزرگوں کی شان میں آیۂ تطہیر نازل فرمائی۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ یہاں کی ذلت و رسوائی کا کوئی اعتبار نہیں۔ آخرت میں فاسق و فاجر کو اللہ تعالیٰ ذلیل و خوار کرے گا اور ہم کو سرفراز و ممتاز"۔ ابن زیاد بولا: "کیا خوب۔ تم نے

کیا نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ابھی ابھی کس کو ذلیل و رسوا کیا ہے۔ کیا تمہارے خاندان والے خوار نہیں ہوئے"۔ زینبؑ یہ سن کر رو پڑیں۔ ابن زیاد نے علی بن الحسینؑ کی طرف متوجہ ہو کر نام دریافت کیا۔ جواب دیا: "علی بن الحسینؑ"۔ ابن زیاد نے متعجب ہو کر کہا: "کیا اللہ تعالیٰ نے علی بن الحسینؑ کو نہیں مارا ہے"۔ آپؑ یہ سن کر خاموش رہے۔ پھر ابن زیاد نے کہا: "تم کیوں جواب نہیں دیتے"۔ ارشاد کیا: "میرا ایک بھائی علی نامی تھا۔ اس کو لوگوں نے شہید کر ڈالا ہے"۔ ابن زیاد ہنس کر بولا: "اس کو اللہ تعالیٰ نے مار ڈالا ہے"۔ آپؑ خاموش ہو رہے۔ پھر ابن زیاد نے کہا: "تم کو یہ کیا ہو گیا ہے کہ تم کچھ نہیں بولتے"۔ آپؑ نے فرمایا: اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا (۳۹ : ۴۲) وَمَاکَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ (۳ : ۱۴۵) ابن زیاد نے کہا: واللہ تو بھی انھیں میں کا ہے۔ پھر اپنے ایک مصاحب سے کہا دیکھو شاید یہ بالغ ہو گیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں ابھی اس سے سمجھ لیتا ہوں۔ ابن معاذ نے دیکھ کر کہا: ہاں یہ بالغ ہو گیا ہے۔ ابن زیاد بولا: اس کی بھی گردن مار دے۔ آپؑ نے فرمایا: "میرے بعد کون ان عورتوں کی کفالت کرے گا"۔ زینبؑ رو کر لپٹ گئیں اور ابن زیاد سے خطاب کر کے کہا: "اے ابن زیاد کیا تیرا جی ابھی ہماری خونریزی سے نہیں بھرا۔ کیا تو ہم میں ایک مرد کو بھی زندہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں تجھ سے اگر مومن ہے، یہ کہتی ہوں کہ اگر تو اس کو قتل کیا چاہتا ہے تو مجھ کو بھی اس کے ساتھ قتل کر دے"۔ پھر آپؑ نے ارشاد کیا: اے ابن زیاد اگر ان عورتوں میں اور تجھ میں کوئی قرابت ہو تو کسی مرد متقی باخدا کو ان کے ہمراہ کر دینا کہ مسلمانوں کی طرح ان کے ساتھ رہے۔ ابن زیاد تھوڑی دیر تک زینبؑ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر کچھ سوچ سمجھ کر بولا: "مجھے اپنے رحم پر تعجب آتا ہے۔ واللہ اگر میں اس کو (امام زین العابدینؑ کی طرف اشارہ کر کے) قتل کرتا تو اس کو بھی (زینبؑ کی طرف اشارہ کر کے) قتل کر ڈالتا۔ اس شخص کو عورتوں کے ساتھ رہنے کے لیے چھوڑ دو"۔

ابن خلدون نے جو عموماً کامل ابن اثیر سے نقل کرتا ہے۔ اپنی آخری سطروں میں کامل ابن اثیر سے کچھ اختلاف کیا ہے۔ مثلاً آخر الذکر مورخ نے یہ فقرہ کہ ایسے شخص کو ان (اہل بیت) کے ساتھ بھیج جو اسلام سے واقف ہو۔ امام کی زبانی کہلوایا ہے۔ ایسا ہی "ذخم حسین" میں ہے۔ اور کسی مورخ نے "قرابت" کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ اور ابن زیاد کے آخری فقرہ کا مفہوم یہ ہے کہ "رحم سے تعجب ہے کہ یہ عورت اس لڑکے کے ساتھ قتل ہونے کے لیے آمادہ ہے"۔

سر مبارک خولی کی سپردگی میں

اس کے بعد ابن زیاد نے خولی بن یزید اصبحی کو حکم دیا کہ: "تو حسینؑ کا سر لے جا اور اس وقت تک اپنے پاس رکھ جب تک تجھ سے طلب نہ کیا جائے"۔

اہل بیتؑ ایک گھر میں

بقول اعثم کوفی ابن زیاد نے حکم دیا کہ: "مجھے اس گروہ کی دردسری سے بچاؤ یہاں سے نکال کر اس مکان میں لے جاؤ"۔

مسجد جامع میں ابن زیاد کی تقریر اور عبداللہ بن عفیف

ابو مخنف کے موافق ابن زیاد نے لوگوں کو مسجد جامع میں طلب کیا۔ خود منبر پر چڑھ گیا۔ اور حضرت علیؑ اور حسنؑ اور حسینؑ علیہم السلام کی شان میں ناسزا الفاظ استعمال کیے۔ اس وقت ایک شخص جس کا نام عبداللہ بن عفیف ازدی تھا۔ اور وہ بہت بوڑھے ہو گئے تھے جس سے ان کے آنکھوں کی بینائی خراب ہو گئی تھی۔

کھڑے ہو گئے۔ یہ صحابیٔ رسولؐ تھے۔ انھوں نے کہا تجھ پر اور تیرے باپ دادا پر خدا لعنت کرے۔ انھیں معذب کرے۔ اور جہنّم میں ان کا مسکن قرار دے۔ کیا تیرے لیے قتل حسینؑ کافی نہ تھا کہ تو منبر پر ان کی سب بھی کر رہا ہے۔ میں نے رسول اللہؐ کو کہتے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ: "جس نے علی کی سب کی اس نے میری سب کی جس نے میری سب کی اس نے اللہ کی سب کی۔ اور جس نے خدا کو ناسزا کہا وہ قیامت تک جہنّم میں رہے گا"۔ یہ سن کر ابن زیاد نے ان کی گردن مارنے کا حکم دیا۔ ان کی قوم مانع ہوئی اور انھیں گھر پہنچا آئی۔ جب رات ہوئی تو ابن زیاد نے خولی بن یزید آگی کو بلایا اور اس کے ساتھ پانچ سو سوار کیے اور کہا کہ ازدی کی طرف جا اور اس کا سر لے آ۔ پس یہ سب روانہ ہوئے۔ اور ان کے گھر پہنچے۔ ابن عفیف کی ایک چھوٹی لڑکی تھی۔ جب اس نے گھوڑوں کی آواز سنی تو کہا: بابا دشمنوں نے تم پر ہجوم کیا ہے۔ ابن عفیف نے کہا: میری تلوار لے آ۔ اور مجھے ایک جگہ بٹھا دے۔ اور ہم سے کہتی جاؤ کہ داہنے، بائیں، آگے، پیچھے دشمن کہاں ہیں۔ لڑکی نے انھیں ایک تنگ جگہ بٹھا دیا، اور ابن عفیف حملے کرنے لگے۔ (لڑکی بتاتی جاتی تھی اور کہہ رہی تھی کہ کاش میں مرد ہوتی اور تمھارے سامنے ان ظالموں اور عترت پاک کے قاتلوں سے لڑتی) اور پچاس آدمیوں کو قتل کیا، اور یہ اس وقت اشعار پڑھ رہے تھے۔ جن کے پہلے شعر کا مطلب یہ تھا کہ اگر میری بصارت ہوتی تو میں تمھارے مورد اور مصدر کو تنگ کر دیتا۔ آخر بڑھا پے جو ہجوم سے گرفتار ہو گیا۔ اور اسے ابن زیاد کے پاس لے گئے۔ ابن زیاد نے دیکھ کر کہا کہ: "خدا کا شکر ہے کہ جس نے تیری آنکھوں کو اندھا کر دیا"۔ ابن عفیف نے کہا: "شکر ہے خدا کا جس نے تیرے قلب کو اندھا کیا۔ اور آنکھوں کو کھلا رکھا"۔ ابن زیاد نے کہا: "خدا مجھے قتل کرے اگر میں تجھ کو سب سے بری طرح قتل نہ کروں"۔ فضحک عبداللّٰہ بن عفیف۔ (پس ہنسے عبداللّٰہ بن عفیف) اور کہا جس وقت امیرالمومنین کے ساتھ صفین میں میری آنکھیں ضائع ہوئیں۔ اس وقت میں نے خدا سے دعا کی تھی کہ مجھے شرالناس کے ہاتھ سے شہادت نصیب کرائے اور میں نہیں جانتا کہ دنیا میں تجھ سے زیادہ کوئی بدبخت ہے۔ اس کے بعد اشعار پڑھے۔ فی البدیہہ۔ جس کے اٹھتیس اشعار ابومخنف نے نقل کیے ہیں۔ پر جوش الفاظ ہیں جن میں قوم ازد کو جنگ کے لیے برانگیختہ کیا ہے۔ حسینؑ کی تعریف کی ہے انھیں نسباً خیر خلق اور ابد تک عالم کا ہادی، صاحب جود و تقویٰ کہا ہے۔ قوم کی عہد شکنی کی شکایت کی ہے۔ اپنے موجود نہ ہونے اور بے بصری پر حسرت ظاہر کی ہے۔ اور اکثر اشعار "یا لیتنی" (اے کاش میں ہوتا) سے شروع ہوتے ہیں۔ قوم کو گمراہی سے توبہ کرنے کی نصیحت کی ہے۔ اور شہدا پر سلام بھیجا ہے۔ جب تک صبا چلے اور جب تک ستارے آسمان میں چمکیں، یا کوئی ستارہ ٹوٹ کر گرے۔ اس کے بعد وہ گردن جسم سے علیحدہ ہو گئی جو اصول حق کی منادی کر رہی تھی اور انھیں صلیب پر چڑھا دیا۔ ابن خلدون کہتا ہے کہ: "یہ صبح سے تا وقت عشاء مسجد ہی میں رہتے تھے"۔ اور "ابن زیاد نے انھیں گرفتار کرا کے مسجد میں صلیب پر چڑھا دیا"۔ بقول کامل ابن عفیف کا سر حسینؑ کے سر اقدس کے ساتھ پھرایا گیا اور یہ پہلا سر تھا جو لکڑی پر اٹھایا گیا۔

صاحب لہوف کہتے ہیں کہ ابن زیاد نے حکم دیا کہ جو مکان مسجد اعظم کے پہلو میں ہے اس میں ان سب کو لے جا کر قید کر دو۔ اس وقت حضرت زینبؑ نے کہا کہ: "ہمارے پاس زنان عرب سے کوئی نہ آوے۔ ہاں مگر لونڈیاں آ دیں۔ کیونکہ وہ بھی اسیر ہیں اور ہم بھی اسیر ہیں"۔ صاحب لہوف اور ابو اسحٰق نے کسی کی زبانی یہ اشعار نقل کیے ہیں جو حضرتؑ کے

سرِ مبارک کی تشہیر کے وقت کسی نے کہے تھے۔ ابواسحق کے نزدیک یہ اشعار زید بن ارقمؓ نے پڑھے :

راس الحسین ابن النبی محمد للناظرین علی القناۃ یرفع

حسینؑ نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرزند کا سر تماشائیوں کے لیے نیزہ پر بلند کیا گیا ہے

و المسلمون بمنظر و بمسمع لا منکر منہم و لا متفجع

مسلمان دیکھتے اور سنتے ہیں۔ نہ کسی کو ناگوار گزرتا ہے اور نہ کوئی رونے والا ہے

کحلت بمنظرک العیون عمایۃ و اصم شانک کل اذن تسمع

تیرے اس منظر نے کوری سرمہ کی طرح آنکھوں میں ڈال دی ہے۔ اور سننے والے کانوں کو بہرہ کردیا

ایقظت اجفانا و کنت لھا کری و انمت عینا لم تکن تھتجع

تو نے ان آنکھوں کو جگا دیا جس کا تو آرام تھا اور ان آنکھوں کو سلا دیا جو کہ تیرے فکر قتل میں نہ سوتی تھیں

ما روضۃ الا تمنت انہا لک حفرۃ و لخط قبرک مضجع

کوئی باغ نہیں ہے جسے تیری خوابگاہ قبر اور لحد بننے کی آرزو نہ ہو

کامل ابن اثیر کے موافق ابن زیاد نے ایک شخص کو عمر بن سعید حاکم مدینہ کے پاس شہادت حسینؑ کی "خوشخبری" دینے کے لیے بھیجا۔ اس سے کسی قریشی سے ملاقات ہوئی اور اس نے خبر پوچھی لیکن اس نے کہا کہ میں امیر کے سامنے خبر بیان کروں گا۔ قاصد عمر بن سعید کے پاس گیا۔ اس نے حال پوچھا اور قاصد نے کہا کہ : "امیر کے لیے قتل حسینؑ کی خوشخبری ہے"۔ اس نے کہا کہ مدینہ میں حسینؑ کے قتل کی خبر پکار دے۔

جس وقت بنی ہاشم کی عورتوں نے یہ خبر سنی چیخ اٹھیں اور حضرت عقیل بن ابی طالبؑ کی صاحبزادی اس طرح نکلیں کہ ان کا سر کھلا ہوا تھا۔ اور مرثیہ پڑھ رہی تھیں۔ جس وقت ابن سعید نے بنی ہاشم کی عورتوں کا رونا سنا تو ہنسا اور کہا : "یہ رونا مثل اس رونے کے ہے جو زمانہ قتل عثمان میں ہوا"۔ اس کے بعد وہ منبر (مدینہ اور مسجد رسولؐ کا منبر) پر چڑھا اور لوگوں کو واقعہ کی خبر دی۔ اب حضرت عبداللہ بن جعفر نے اپنے دونوں صاحبزادوں کی خبرِ شہادت سنی ان کے دوست پرسہ کے لیے آئے۔ اور ان کے غلام نے کہا کہ : "یہ ہمیں حسینؑ کی وجہ سے ملا"۔ اس پر حضرت عبداللہ نے غلام کو مارا، اور کہا کہ : "اگر میں بھی ہوتا تو اسے پسند کرتا کہ ان کے ساتھ مارا جاتا۔ بخدا یہ وہ بات تھی کہ مجھے میرے نفس کی سخاوت پر آمادہ کرتی۔ میرے نفس پر یہ آسان ہے کہ میرے بیٹے حسینؑ کے ساتھ تھے اور انھوں نے موافقت کی۔ اگر میں نہیں تھا تو حسینؑ کے ساتھ میرے بیٹے تھے"۔ ابی مخنف نے بھی قریب قریب ایسا ہی لکھا ہے۔ ناسخ التواریخ نے بھی ذکر کیا ہے۔

ناسخ التواریخ کے موافق : شہادت حسینؑ کی خوشی میں کوفہ میں چار مسجدیں بنوائی گئیں۔ جن کے نام ① مسجد اشعث، ② مسجد جریر، ③ مسجد سماک اور ④ مسجد شبث ربعی رکھے گئے۔

بابؑ دوازدہم

اہلِ بیتؑ (دمشق)

اگرچہ یہ ایک ظاہر امر ہے کہ ابن زیاد نے یزید بن معاویہ کو حضرتؑ کی شہادت اور اہلِ بیت کی اسیری کی خبر دی ہوگی۔ لیکن میں اسے قرینِ قیاس نہیں سمجھتا کہ کوفہ ایسے مخدوش مقام میں کئی روز ابن زیاد اس کا منتظر رہا ہو کہ یزید کا کوئی جواب آئے تو اہلِ بیت کو دمشق کی طرف روانہ کریں۔ ابنِ زیاد کی ذلیل خوشامد بجز اس کے کچھ نہیں چاہ سکتی تھی کہ وہ یزید کو اپنی کارگزاری دکھلائے اور چند مجبور اسیروں کو یزید کے پاس جلد سے جلد روانہ کردے کہ وہ خود دیکھ کر اپنا اطمینان کرے۔ اس لیے ابنِ زیاد نے جو کچھ لکھا ہو وہ خط غالباً اہلِ بیت کے ساتھ گیا اور وہ لوگ جو اسیروں کے ساتھ بھیجے گئے تھے انھیں میں سے کسی کو مزید حالات بتانے کے لیے تجویز کیا تھا۔ میرا سلسلہ بیان اب اور کیا ہے کا بجز اس کے کہ ابنِ زیاد نے شہدا کے سر اپنے افسروں کے ساتھ دمشق روانہ کیے۔ ان کے ساتھ کچھ فوج بھی تھی۔ اور پھر بقول ابنِ خلدون: ”عورتیں اونٹوں پر بغیر محمل کے سوار کرائی گئیں اور امام زین العابدینؑ کے ہاتھ پاؤں اور گردن میں زنجیر ڈال دی گئی۔ آپؑ نہ تو ہتھکڑی و بیڑی و طوق پہناتے ہوئے کچھ بولے اور نہ اثنائے راہ میں کچھ ان لوگوں سے ہم کلام ہوئے۔ یہاں تک کہ شام پہنچ گئے“۔

میرے لیے یہ اندوہناک ہے کہ عموماً مورخین نے کوفہ سے دمشق تک کے واقعات نہیں لکھے جو اس عبرت خیز قافلہ کے گزرنے کے زمانہ میں واقع ہوئے۔ اور نہ بعض کتابوں کے بعض واقعات کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا کوفہ سے دمشق تک گزرنا بغیر کسی اتفاق کے تھا۔ پھر بھی غنیمت ہے کہ ابی مخنف، ابو اسحاق اسفرائینی، روضۃ الشہدا اور غالباً ان لوگوں سے ناسخ التواریخ نے کچھ درمیانی حالات کا تذکرہ کیا ہے۔ میں مجبور ہوں کہ ان کی رہنمائی پر آگے بڑھوں۔ ان مقامات کے پس و پیش میں بھی اختلاف ہے بلکہ کمی زیادتی بھی ہے۔ ان منازل میں بھی ہمارے لیے تصفیہ کی وہی دشواری ہے جو حضرتؑ کے مکہ سے تشریف آوری کے بعد تھی۔ یہ دشواری کچھ زیادہ اس لیے ہے کہ اس وقت کے منازل کے نام اکثر مورخین نے درج کیے ہیں۔ درآنحالیکہ اہل بیتؑ کے سفر شام کا بہت کم لوگوں نے تذکرہ کیا ہے۔ تو میرا کسی منزل کا لکھنا اس یقین کے ساتھ نہ ہوگا کہ مجھے اس مقام کی جغرافیائی صحت کا وثوق ہے۔ بلکہ اس لیے کہ مجھے ان واقعات سے کچھ کام لینا ہے۔ میں صرف اسی وقت وثوق سے کہہ سکتا جب ان مقامات کی کوئی جغرافیہ، گزیٹر یا اسمائے دیہات و قریات کے متعلق کوئی کتاب ہوتی۔ یا کسی سیاح کا روزنامچہ ان مقامات کے نام بتاتا۔ میرے لیے کبھی یہ کافی معیار نہ تھا کہ فلاں کتاب معتبر ہے یا فلاں راوی ثقہ ہے۔ یا اس واقعہ کو شرفِ تواتر حاصل ہے۔ اور نہ میں اپنی جغرافیہ دانی کو ان لفظوں میں ظاہر کرکے اپنے کو اپنے فرض سے سبکدوش سمجھ سکتا ہوں کہ بغداد عراق عجم میں ہے اور حلب ایشیائے کوچک کا ایک شہر ہے۔ جب کہ مجھے سلسلہ مقامات، فاصلہ، وہاں کے واقعات کو اور واقعات سے یا اس کے بالعکس اور واقعات کو ان واقعات سے ربط دینا ہے۔

مقامات

ابی مخنف	نور العین فی مشہد الحسینؑ	ناسخ التواریخ	روضۃ الشہدا خلاصہ مقاتل کتاب ہے
قادسیہ	پہلی منزل کا نام نہیں لکھا	تکریت	حران
مشرقی جنالسہ کی طرف سے چلے تکریت کو عبور کیا خشکی سے اعمیٰ کی طرف آئے	حرایا	موصل	موصل
دیر عمروہ	ترکیت (تکریت؟)	قنسرین	نصیبین
صلیتا	وادی	شیرزد	ایک اور شہر (نام نہیں)
وادی نخلہ (قیام کیا)	موصل	قلعہ کفرطاب	حلب
اربینا	کفرنوبہ	سیبور	معمورہ کوہ (قریب حلب)
لینا	حلب	حماۃ	دیر
کحیل	قنسرین	حمص	عسقلان
موصل	شہر نعمان	بعلبک	دمشق
تل اعفر	کفرطاب		
جبل سنجار	شیراز	اس کتاب سے میرے	
نصیبین	حمادہ	نوٹ میں صرف وہ	
عین الورود	حمص	شہر لکھے ہیں	
دعوات	خندق الطعام	جہاں کوئی	
مسندین	جوسیہ	واقعہ پیش	
معرۃ النعمان	بعلبک	آیا	
شیراز (شیزر)	صومعہ	○	
کفرطاب	دمشق		
سیبور			
حماۃ			
حمص			
کنیسہ			
بعلبک			
صومعہ			
دمشق			

ان مؤرخین میں جن کی ہم نے فہرست دی ہے سب سے زیادہ نام ابی مخنف نے لکھے ہیں۔ اور جہاں تک معلوم ہوتا ہے اس نے اہتمام کیا ہے کہ نہ صرف بڑے بڑے مقامات کے نام دیے ہیں جن میں سے بعض اس وقت بھی نقشوں میں ملتے ہیں بلکہ ان مقامات کو بھی لکھا ہے جدھر سے یہ قافلہ گزرا۔ یہ کل مقامات ۱۸ سے زیادہ نہیں ہیں جہاں قیام بھی ہوا ہو، بلکہ قیام چند ہی مقامات پر ہوا۔ جس کا ذکر بھی ہے۔ اس کے بعد مؤرخین نے ایسی موٹی بات بھی ذکر کے قابل نہ سمجھی کہ یہ قافلہ کس تاریخ کو دمشق پہنچا۔ اس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا کہ کتنے دن راستہ میں صرف ہوئے، بلکہ منزلوں کی بھی تعداد ایک حد تک معلوم ہو جاتی۔ ہم مناسب مقام پر اس کا تذکرہ کریں گے کہ یہ قافلہ کب کربلا میں واپس ہوا اور آیا وہ تاریخ صحیح ہے یا نہیں؟ اب ہم واقعات لکھتے ہیں۔

دمشق کی طرف روانگی اور حضرت اُمِ کلثومؑ کے اشعار

ابی مخنف کے موافق ابن زیاد نے شمر ذی الجوشن اور خولی اَصبحی کو بلایا اور پانچ سو سواروں کو ان کے ساتھ کیا اور حکم دیا کہ سرہائے شہداء اور قیدیوں کے ساتھ دمشق روانہ ہوں اور انھیں تمام شہروں میں تشہیر کریں۔ سہل کہتا ہے کہ جب میں نے یہ دیکھا تو میں نے بھی سفر کا ارادہ کیا۔ تجہیز سفر کی اور روانہ ہو گیا۔ جب قادسیہ پہنچے تو حضرت اُمِ کلثومؑ نے فرمایا: ماتت رجالی وافنی الدھر ساداتی ..... "ہمارے مرد مر گئے اور زمانہ نے ہمارے سرداروں کو فنا کر دیا۔ اور ہم لوگوں کی حسرتیں بڑھ گئیں۔ ان کمینوں کو ہم سے کیا عداوت تھی جب کہ یہ جانتے تھے کہ ہم رسول اللہ کی بیٹیاں ہیں جو ہدایت کے ساتھ آئے تھے۔ دشمنوں نے ہمیں برہنہ پالانوں پر سوار کیا اور ہم ان میں غنیمت کی حیثیت سے ہیں۔ یا رسول اللہ! اے نور البریات! دشمنوں نے آپکے اہلِ بیتؑ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ آپ کے لیے اندوہناک ہے۔ وائے ہو تم پر اے دشمنو! تم نے رسولؐ کا کفران کیا جنھوں نے تمھیں ضلالت سے ہدایت کی"۔

اہلِ بیتؑ کا قافلہ اور مقامات پر اس کا اثر

سرہائے شہداءؑ کے ساتھ شرقی جناسہ کی طرف سے چلے اور تکریت کو عبور کیا اور خشکی کی راہ اختیار کی۔ پھر اعمیٰ آئے اور یہاں سے دیر عروہ ہوتے ہوئے صلیتا پہنچے۔ پھر وادی نخلہ آئے اور یہاں قیام کیا۔ پھر وادی نخلہ سے روانہ ہو کر ارمینا کی طرف پہنچے اور روانہ ہوئے یہاں تک کہ لینا کے قریب ہوئے۔ یہ ایک شہر تھا۔ یہاں عورتیں بوڑھے اور جوان نکل آئے اور حسینؑ کے سر مبارک کو دیکھ کر ان کے جد بزرگوار اور پدر نامدار پر صلوات بھیجتے تھے اور ان کے قاتلوں پر لعنت بھیج رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے کہ: "اے قاتلانِ اولادِ انبیاء ہمارے شہر سے نکل جاؤ"۔

اس کے بعد کحیل میں آئے اور عامل موصل کو لکھا کہ ہمارے پاس حسینؑ کا سر ہے۔ جس وقت اس نے خط پڑھا شہر کے لوگوں کو اطلاع دی اور آراستہ کیا۔ لوگ ہر طرف سے نکلے اور والیِ شہر نے چھ میل آگے جا کر ملاقات کی لیکن بعض لوگوں نے پوچھا کہ کیا خبر ہے۔ ان سے کہا گیا کہ "ایک خارجی کا سر ہے جس نے عراق میں خروج کیا تھا۔ اور عبید اللہ بن زیاد نے قتل کیا۔ اور اس کا سر یزید کے پاس بھیجا ہے"۔ ان میں سے کسی نے کہا کہ اے قوم حسینؑ کا سر ہے اور جب تحقیقات کی تو اوس اور خزرج کے چالیس سوار جمع ہوئے اور حلف لیا کہ ہم دشمنوں سے لڑیں گے اور ان سے امامؑ کا سر لے کر دفن کریں گے۔ اور یہ ہمارے لیے قیامت تک کے فخر کو کافی ہو گا۔ جس وقت دشمنوں نے یہ سنا شہر میں داخل نہ ہوئے اور تل اعفر کی طرف چلے گئے۔

موصل اور مشہد نقطہ

صاحب روضۃ الشہدا کے موافق جب دشمن قریب پہنچے اور حاکم شہر کو اطلاع دی اور عماد الدولہ حاکم شہر نے لوگوں کو بلا کر صورت حال کی خبر دی اور ان سے صلاح کی اور یہ بھی کہا کہ ان کا استقبال اور انکار نامناسب ہے۔ موصلی اس سے متفق ہوئے صرف رسد بھیج دی اور کہلوا دیا کہ تمہارا یہاں آنا مصلحت نہیں ہے۔ دشمنان اہل بیتؑ شہر سے ایک فرسخ پر اترے اور سر مبارک کو ایک پتھر پر رکھ دیا۔ ہر سال روز عاشورہ لوگ یہاں آکر مراسم عزا بجا لا کرتے تھے۔ وہ پتھر جس پر خون حسینؑ کا نشان تھا عبدالملک بن مروان کے زمانہ تک رہا۔ اور اس نے وہاں سے ہٹوا دیا۔ لیکن آخر میں وہاں ایک مقبرہ مشہد نقطہ کے نام سے تعمیر ہو گیا۔

پھر ابی مخنف کے موافق تل اعفر سے جبل سنجار کی طرف گئے۔ نصیبین پہنچے اور وہاں مقام کیا۔ سرہائے مبارک کی تشہیر کی اور حضرت زینبؑ نے اشعار فرمائے۔ پھر اس کے بعد عین الورود کی طرف سے گزرے۔ دعوات کے قریب پہنچے اور اس کے حاکم کو اطلاع دی کہ ہمارے ساتھ حسینؑ کا سر ہے۔ جس وقت عامل نے خط پڑھا باجے بجوائے اور شہر سے باہر جا کر ملاقات کی۔ سر کی تشہیر ہوئی اور باب اربعین سے داخل ہو کر سر مبارک کو زوال ظہر سے عصر تک رحبہ میں نصب کیا۔ اہل شہر کچھ روتے تھے اور کچھ ہنستے تھے۔ اور منادی ہو رہی تھی کہ یہ خارجی کا سر ہے۔ جس نے یزید بن معاویہ پر خروج کیا تھا۔ اس جگہ جہاں سر مبارک نصب ہوا تھا لوگ اپنی حاجات کی دعائیں مانگتے تھے۔ دوسرے دن یہاں سے کوچ ہوا۔ اور حضرت علیؑ بن الحسینؑ نے شعر فرمائے۔

پھر منذرین پہنچے۔ جس وقت اہل شہر کو خبر دی گئی ان لوگوں نے اپنے دروازے بند کر لیے۔ قاتلوں پر لعنت کی اور پتھر پھینکے۔ اور کہتے تھے کہ اے فجار اے قاتلان اولاد انبیاء ہمارے شہر میں تم داخل نہ ہو سکو گے۔ حضرت اُم کلثومؑ نے اشعار فرمائے۔

اس کے بعد معرۃ النعمان میں آئے۔ یہاں ان کا استقبال کیا گیا۔ دروازے کھولے گئے اور کھانے پینے کا سامان مہیا کیا گیا۔ یہاں دن کا بقیہ حصہ بسر کیا گیا۔ پھر یہاں سے شیراز (یا شیرزد) کی طرف گئے۔ اس جگہ ایک بوڑھا رہتا تھا۔ اس نے کہا کہ اے قوم یہ حسینؑ کا سر ہے۔ یہ سن کر لوگوں نے ممانعت کی اور شہر میں داخل ہونے نہ دیا۔ لشکر یزید نے یہ دیکھ کر داخلہ مناسب نہ سمجھا اور کفرطاب کی طرف بڑھا۔ یہ ایک چھوٹا سا قلعہ تھا۔ اہل قلعہ نے دروازے بند کر لیے۔ اس وقت خولی ان کی طرف بڑھا اور پوچھا کہ کیا تم ہماری اطاعت میں نہیں ہو۔ ہمیں پانی پلاؤ۔ ان لوگوں نے کہا کہ واللہ ہم تمہیں پانی نہ دیں گے۔ اس لیے کہ تم نے حسینؑ اور ان کے اصحاب کو پانی سے منع کیا۔ یہ سن کر یہاں سے کوچ کیا اور سیبور میں آئے۔ سیبور میں کچھ لوگ اس صلاح کے موافق تھے کہ سروں کو ہمارے شہر سے گزر جانے دیا جائے اور کچھ لوگ اس کے مخالف تھے۔ آخر الذکر گروہ پل کی طرف بڑھا اور اسے کاٹ دیا۔ اور مسلح ہو کر لشکر یزید کی طرف بڑھے۔ سخت جنگ ہوئی۔ ابن زیاد کے لشکر کے چھ سو آدمی مارے گئے اور اہل سیبور کے پانچ شہید ہوئے۔ حضرت اُم کلثومؑ نے شہر کا نام پوچھا اور دعا دی کہ یہاں کا پانی شیریں اور نرخ ستا رہے اور ظالموں کا غلبہ نہ ہو۔

پھر کوچ ہوا اور حماۃ پہنچے۔ یہاں کے لوگوں نے بھی دروازہ بند کر لیا۔ اور کہلوا بھیجا کہ تم اس وقت ہمارے شہر میں داخل ہو سکو گے جس وقت ہمارا آخر شخص قتل ہو جائے گا۔ یہ سن کر لشکر یزید کوچ کر گیا۔ اور حمص پہنچا۔

پھر حمص کی طرف چلے اور یہاں کے عامل خالد بن نشیط کو لکھا کہ ہمارے ساتھ حسینؑ کا سر ہے۔ خط پا کر اس نے شہر میں خبر مشتہر کی اور زینت کا حکم دیا۔ لوگوں کو بلایا اور تین میل استقبال کے لیے گیا۔ جب یہ لوگ واپس آئے تو اہل شہر نے پتھر مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ چھبیس آدمی مارے گئے اور دروازہ بند کر کے کہا کہ اے گروہ تو ایمان کے بعد کافر ہو گیا۔ اور ہدایت کے بعد گمراہ ہوا۔ لشکر یہاں سے بڑھا اور ایک قسیس کے کنیسہ کے پاس ٹھہرے۔ لوگوں نے اس سے بھی ممانعت کی اور ارادہ کیا کہ خولی کو قتل کر کے سرہائے مبارک شہدا کو اس سے چھین لیں۔ جب لشکر کو یہ خبر ملی تو وہاں سے بھی کوچ کیا۔ درآنحالیکہ وہ سب خائف تھے۔

بعلبک آئے۔ (عمالقہ کا شہر جہاں ان کے مشہور بت بعل کا مندر تھا) اور حاکم شہر کو اطلاع دی کہ ہمارے ساتھ حسینؑ کا سر ہے۔ اس نے شہر میں خبر دی۔ دف اور بوق بجوائے۔ اور لشکر کے لیے آب و علوفہ مہیا کیا۔ حضرت اُمّ کلثومؑ نے شہر کو بددعا دی۔

یہاں سے چل کر یہ سب ایک صومعہ کے پاس آئے۔ حضرت زین العابدینؑ نے اشعار فرمائے۔

هو الزمان فما تفنی عجائبه   عن الكرام و لا تهدى مصائبه

یہ وہ زمانہ ہے کہ اس کی نیرنگیاں شرفا سے دور نہیں ہوتیں اور نہ مصیبتیں کم ہوتی ہیں

فليت شعری الی کم یحاربنا   بصرفه و الی حکم غاربه

کیا معلوم کب تک زمانہ ہم سے لڑے گا۔ اور اس کی گردش سے کب تک ہمیں لڑنا پڑے گا

كفرتمو برسول الله ویلکم   یا امة السوء ما هذا مذاهبه

ویل ہو تم پر تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ احسان فراموشی کی اے بری امت یہ کیسے طریقے ہیں

کہا گیا ہے کہ راہب پر فرق مطہر کا ایسا اثر پڑا کہ وہ اس سے نور ساطع دیکھ رہا تھا، اور کچھ آوازیں سن رہا تھا، جو ملائکہ کی صدائیں قیاس کی گئیں اور وہ اس سر پر سلام بھیج رہے تھے۔ صبح کو جب روانگی کا شور غل ہوا تو راہب نے اہل لشکر سے ان کے سردار کا نام پوچھا اور خولی بن یزید کا نام بتایا گیا۔ اس نے پوچھا کہ تمھارے ساتھ کیا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ یہ ایک خارجی کا سر ہے جس نے عراق میں خروج کیا تھا اور اسے عبید اللہ بن زیاد نے قتل کیا۔ راہب نے نام پوچھا۔ بتایا گیا کہ حسینؑ نام تھا۔ باپ کا نام علی بن ابی طالبؑ، ماں کا نام فاطمۃ الزہراؑ اور نانا کا نام محمد مصطفےٰؐ تھا۔ راہب نے کہا: سچ کہا تھا احبار نے کہ اس شخص کے قتل پر آسمان سے خون برسے گا۔ پھر اس نے کہا کہ آیا یہ ممکن ہے کہ مجھے تم یہ سر تھوڑی دیر کے لیے دیدو۔ پھر میں تمھیں واپس کردوں گا۔ خولی نے کہا کہ یہ یزید کے اور کسی کے پاس نہیں کھولا جائے گا۔ اور اس سے جائزہ لیا جائے گا۔ راہب دس ہزار درہم دینے پر آمادہ ہوا۔ اور یہ لوگ راضی ہو گئے۔ راہب نے فرق مطہر کھولا۔ رویا اور کہنے لگا کہ: "اے ابا عبد اللہ اپنے جد بزرگوار کے سامنے میرے کلمہ شہادتین کی گواہی دیجیے گا"۔ اور تھوڑی دیر کے بعد واپس کر دیا۔ اس کے بعد کی روایت ہے کہ جب خولی نے یہ روپیہ تقسیم کرنے کا ارادہ کیا تو دیکھا کہ وہ سب ٹھیکریاں تھیں اور ان پر وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ (۲۶ : ۲۲۷) (عنقریب ظالموں کو اپنا انجام معلوم ہو جائے گا) لکھا تھا۔ سہل شہروزی کہتا ہے کہ میں نے ہاتف کو کہتے سنا کہ: ؎

اترجو امة قتلت حسيناً شفاعة جده يوم الحساب

کیا وہ گروہ کہ جس نے حسینؑ کو قتل کیا قیامت کے دن ان کے نانا کی شفاعت کی امید کرسکتا ہے

اس روایت کو اکثر مؤرخین نے مثل ابواسحاق اسفرائنی، ابومخنف اور صاحب صواعق نے بھی نقل کیا ہے۔

صاحب صواعق محرقہ کے موافق راہب نے نام وغیرہ سن کر کہا: "تم پر افسوس ہے۔ اگر عیسٰیؑ کی کوئی اولاد ہوتی تو ہم اسے آنکھوں میں بٹھاتے تم کیسے برے آدمی ہو کہ اپنے رسولؐ کے فرزند کو تم نے شہید کیا"۔ اس کے بعد روپیہ دیا اور سر کو لے کر غسل دیا۔ خوشبو سے معطر کیا اور گود میں رکھ کر روتا اور دعائیں مانگتا رہا۔ پھر مسلمان ہو گیا اور مسلمان ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے سر مطہر سے ایک نور کو آسمان کی طرف ساطع دیکھا۔ مسلمان ہونے کے بعد اس نے دیر کی سکونت ترک کی اور اہل بیتؑ کی خدمت میں رہا۔

روضۃ الشہدا اور نور العین میں ان منازل کے واقعات میں یہ زیادہ ہے کہ قنسرین میں اہل شہر نے نہ آنے دیا۔ یا کہا کہ اگر تم آؤ گے تو تم سے لڑیں گے۔ اور لشکر یزید نہ جاسکا۔

روضۃ الشہدا کے موافق نصیبین پر بجلی گری اور شہر کے بڑے حصہ کو نقصان پہنچا۔ اس سے لشکر داخل نہ ہوا۔ اور ایک مقام پر دو بھائیوں میں جو دروازہ ہائے شہر پر متعین تھے اس بات پر جھگڑا ہوا کہ کس کے دروازہ سے لشکر داخل ہو، اور اس خانہ جنگی سے لشکر یزید نے داخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔

اسی مؤرخ کے موافق جب قافلہ قریب حلب پہنچا تو اس کے قریب ایک پہاڑ تھا، جس پر ایک قلعہ تھا اور اس کا نام معمورہ تھا۔ یہاں کا کوتوال عزیز بن ہارون تھا۔ یہ اور تمام اہل قلعہ یہودی تھے اور حریر بنتے تھے۔ لشکر جب پہاڑ کے نیچے ٹھہرا تو شیریں جو اہل بیتؑ کے ساتھ تھی اس نے اپنی ملکہ حضرت شہربانو کو باحال تباہ دیکھ کر نہایت افسوس کیا اور اس کے پاس کچھ چیزیں بچ رہی تھیں اس سے اس نے ارادہ کیا کہ فروخت کر کے کچھ کپڑے خریدے۔ شیریں دروازہ حصار پر آئی۔ پکارا۔ دروازہ کھولا گیا۔ اہل قلعہ نے حال پوچھا۔ بتایا۔ (یہ بھی لکھا گیا ہے کہ عزیز ایک خواب کی بنا پر مسلمان ہو گیا تھا، اور اسے اسی عالم میں یہ کل واقعات بتائے گئے تھے) عزیز لشکر کے قریب آیا اور اپنے ساتھ کپڑے لایا۔ موکلوں کو ہزار درہم رشوت دی کہ یہ کپڑے اہل بیتؑ رسالت کو دیے جاسکیں۔ اور لشکر کے منظور کرنے پر عزیز خدمت امام سید الساجدین میں حاضر ہوا اور یہ چیزیں بصد عجز و الحاح پیش کیں۔ امام نے قبول فرمائیں اور حضرت شہربانو نے شیریں سے فرمایا کہ اگر تو میری خوشی چاہتی ہے تو عزیز کو اپنے شوہری میں قبول کر اور اس کے بعد شیریں کا عزیز سے عقد کر دیا گیا۔

اسی مؤرخ کے پاس عسقلان کے متعلق یہ قصہ بھی ہے جو میری نظر سے کہیں اور نہیں گزرا صرف اس واقعہ کے بعض ٹکڑے بلاتعین شخص اور مقام اور وقت ملتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جب یزید کا لشکر عسقلان کے پاس پہنچا تو یعقوب عسقلانی نے جو لشکر یزید کے ساتھ کربلا میں تھا اور یہاں کی حکومت اس سے متعلق تھی۔ شہر کی آرائش کا حکم دیا اور سامان نائے و نوش مہیا کیے۔ جس وقت اہل بیتؑ اور سرہائے شہدا گزر رہے تھے ایک سوداگر جس کا نام زریر خزاعی تھا عسقلان کے بازار میں کھڑا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر زریر نے کسی سے واقعہ دریافت کیا۔ اور اس نے حسب معمول کہا کہ یہ یزید کے مخالفین کا سر ہے جنھوں نے خروج کیا تھا۔ اور یہ عورتیں جو ہودجوں میں ہیں اسی کے اہل بیتؑ ہیں۔ زریر نے پوچھا کہ

یہ جماعت مسلمان تھی یا مشرک۔ جواب ملا کہ مسلمان تو تھی لیکن باغی تھی۔ زریر نے دریافت کیا کہ خروج کی کیا وجہ تھی۔ کہا کہ ان کا سردار کہتا تھا کہ میں امامت کے لیے یزید سے سزاوار تر ہوں۔ زریر نے نام و نسب پوچھا اور جب معلوم ہوا تو زمانہ اس کی آنکھوں میں تاریک ہو گیا اور یہ حضرت امام زین العابدینؑ علیہ السلام کے ہودج کے قریب گیا۔ امام کو دیکھ کر بے ساختہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ امام نے دریافت فرمایا کہ تو کون ہے۔ اس نے کہا میں یہاں مسافر ہوں۔ پوچھا تمام شہر ہنس رہا ہے تو کیوں رو رہا ہے!۔ کہا: اس لیے کہ میں آپ لوگوں کو پہچانتا ہوں۔ کاش میں یہاں نہ ہوتا کہ یہ حال نہ دیکھتا۔ افسوس میں اپنے وطن اور قبیلہ سے دور ہوں، ورنہ کچھ کرتا کہ یادگار رہتا۔ امام نے فرمایا کہ تجھ سے بوئے یک جہتی آتی ہے۔ زریر نے التجا کی کہ مجھ سے کسی امر کے متعلق فرمائش کی جائے۔ امام نے فرمایا کہ وہ شخص جو میرے پدر بزرگوار کے فرق مطہر کو اونٹوں کے محاذی لے جا رہا ہے اس سے کہو کہ وہ آگے بڑھ جائے کہ لوگ اس کے دیکھنے میں مشغول ہو جائیں گے اور ہماری عورتیں حجاب میں رہیں گی۔ زریر بڑھا اور مؤکل سر کو پچاس دینار رشوت دے کر آگے آگے چلنے پر راضی کیا۔ اور دوبارہ گزارش کر کے کچھ کپڑے پیش کش کیے۔ (یہی روایت سہل شہرزوری کے متعلق بھی ہے) اس وقت غل و شور سنائی دیا، اور زریر نے دیکھا کہ شمر ایک جماعت کے ساتھ شراب کے نشہ میں مدہوش اچھلتا کودتا چلا آتا ہے۔ زریر کی حمیت اسلام اور غیرت دینی میں جوش آیا اور اس نے اسے روک کر ملامت کی۔ شمر نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ اسے مارو۔ سبھوں نے حملہ کیا، اور اپنے دانست میں مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ آدھی رات کو زریر کو ہوش آیا۔ اٹھا۔ کوئی دکھائی نہ دیا۔ چلتے چلتے ایک گورستان میں پہنچا۔ دیکھا کہ ایک جماعت سر و پا برہنہ اندوہناک اور مغموم کھڑی ہے۔ زریر نے پوچھا کہ اہل شہر خوشی کر رہے ہیں تم کیوں اس حال میں ہو۔ ان لوگوں نے کہا کہ یہ دشمنوں کی خوشی کا دن ہے اگر تو دشمنوں میں ہے تو چلا جا۔ زریر نے اپنا حال بتایا اور دکھایا۔ یہ لوگ غم و غصہ سے کہہ رہے تھے کہ کاش ہم کربلا میں ہوتے اور دشمنوں سے انتقام لیتے۔ اس کے بعد زریر نے اپنا مال فروخت کر کے گھوڑا اور اسلحہ خریدا اور ایک سو دس آدمیوں کے ساتھ روز جمعہ خروج کیا۔ خطیب کو قتل کر ڈالا اور داروغہ شہر کو گرفتار کر لیا۔

ابی مخنف کے موافق جس روز سرہائے شہدا داخل دمشق ہوئے اس روز دوکانیں بند تھیں اور لوگ نشہ میں چور رہے تھے۔ اس وقت ایک شخص یزید کے پاس گیا اور کہا کہ اے خلیفہ تیری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ یزید نے پوچھا کس چیز سے۔ کہا حسینؑ کے سر سے۔ یزید نے کہا: تیری آنکھیں ٹھنڈی نہ ہوں۔ یہ کہہ کر اس کے حبس کا حکم دیا۔ اور ایک سو بیس نشان فوج بھیجے کہ وہ حسینؑ کے سر مبارک کے آگے آگے آئیں۔ اس وقت ان نشان فوج کے ساتھ تکبیر کہی جا رہی تھی کہ کسی نے (فضلائے تابعین میں سے) کہا:

جاؤ براسك يا بن بنت محمّد مترملا بدمائه ترميلا

اے دختر رسولؐ کے فرزند تیرا سر لے کر آئے ہیں جو اپنے خون میں لتھڑا ہوا ہے

فكانما بك يا بن بنت محمد قتلوا جهاراً عامدين رسولا

اے فرزند بنت رسولؐ تیرے قتل سے گویا علانیہ عمداً رسولؐ کو قتل کیا

و يكبرون اذا قتلت و انما قتلو بك التكبير و التهليلا

وہ اس پر مغرور ہیں کہ تجھ کو قتل کیا بچ یہ ہے کہ تیرے ساتھ تکبیر اور تہلیل کو قتل کر ڈالا

سہل کہتا ہے کہ لوگ دروازہ خیزران سے داخل ہوئے۔ آگے آگے اٹھاسی سر تھے۔ اور قیدی بغیر برقع و ردا تھے۔ حضرت کا سر مبارک شمر کے ہاتھ میں تھا اور وہ کہتا جاتا تھا کہ میں لمبے نیزہ والا ہوں۔ میں نے ابن سید الوصیین کو قتل کیا ہے اور ان کا سر امیر المومنین کے پاس لے کر آیا ہوں۔

سہل کہتا ہے کہ ایک لڑکی اونٹ پر بیٹھی تھی اور وامحمداہ واجداہ واعلیاہ واابتاہ واحسناہ واعقیلاہ وا عباساہ وابعد سفراہ (کیسی دوری سفر ہے) کہتی تھی۔ پس میں اس کے قریب گیا اور کہا کہ اے سیدہ آپ کا کوئی حکم ہے۔ لڑکی نے بلند آواز سے کہا کہ کیا تجھے خدا و رسولؐ سے حیا نہیں ہے کہ تو رسولؐ کے حرم کی طرف دیکھتا ہے۔ میں نے کہا کہ واللہ میں تمھاری طرف قابل اعتراض نگاہ سے نہیں دیکھ رہا ہوں۔ کہا تم کون ہو۔ میں نے کہا کہ میں سہل بن سعدی شہرزوری ہوں۔ میں تمھارا دوست ہوں۔ اس کے بعد میں علی بن الحسینؑ کے پاس گیا اور عرض کی کہ اے مولا کیا آپ کی کوئی خواہش ہے۔ فرمایا کہ تیرے پاس کچھ درہم ہیں۔ میں نے کہا ایک ہزار دینار۔ آپ نے فرمایا کہ اس میں کچھ حامل سر کو دے کہ وہ عورتوں سے کچھ دور ہٹ کر چلے کہ لوگ اس کے دیکھنے میں مشغول ہوں۔ سہل نے ایسا ہی کیا اور حضرتؑ نے دعا دی۔

اسرائے اہلِ بیتؑ اور ایک بوڑھا

صاحب لہوف فرماتے ہیں کہ جب اسیران پاک و ذریت رسولؐ خدا در مسجد پر کھڑے تھے ایک مرد پیر ان کے قریب آیا اور کہنے لگا شکر ہے کہ تم کو خدا نے ہلاک و تباہ کیا اور شہروں کو تمھارے مردوں سے پاک کیا۔ خلیفہ وقت کو تم پر قابو دیا۔ اس وقت امام زین العابدینؑ نے فرمایا:

زین العابدینؑ : اے مرد پیر تو نے قرآن پڑھا ہے؟

مرد پیر : ہاں پڑھا ہے۔

زین العابدینؑ : تو اس آیت کو جانتا ہے : قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (۴۲ : ۲۳)

مرد پیر : ہاں اس کو خوب پڑھا ہے۔

زین العابدینؑ : تو اب جان لے کہ قربیٰ رسول اللہ کے ہمیں ہیں۔ اور مرد پیر تو نے سورہ بنی اسرائیل میں یہ آیت پڑھی ہے : وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (۱۷ : ۲۶)

مرد پیر : ہاں ضرور پڑھی ہے۔

زین العابدینؑ : اے مرد پیر وہ ذی القربیٰ ہمیں ہیں۔ اے مرد پیر تو نے یہ آیت بھی پڑھی ہے : وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى (۹ : ۴۱)

مرد پیر : ہاں پڑھی ہے۔

زین العابدینؑ : اے مرد پیر وہ ذی القربیٰ ہمیں ہیں۔ اے مرد پیر تو نے یہ آیت بھی پڑھی ہے : اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا (۳۳ : ۳۳)

مرد پیر : ہاں پڑھی ہے۔

زین العابدینؑ : اے مرد پیر ہم وہی اہل بیتؑ ہیں جن کی شان میں خاص کر یہ آیت طہارت اتری ہے۔ پس یہ سن کر وہ مرد پیر نہایت نادم و خجل ہوا اور چپ ہو گیا۔

ابراہیم بن طلحہ اور امامؑ

صاحب ناسخ التواریخ یہ روایت لکھتے ہیں کہ ابراہیم بن طلحہ بن عبداللہ نے جب سنا کہ قیدی آتے ہیں تو یہ دوڑا اور حضرت بیمار کربلا سے پوچھا: اے علی بن الحسینؑ کون غالب آیا؟ یہ سن کر حضرت نے جو محمل میں اس وقت سر جھکائے تھے سر اٹھایا اور فرمایا: "اگر تو جاننا چاہتا ہے کہ کون غالب ہوا تو نماز کے وقت اذان اور اقامت کہہ۔

سر مبارک طشت میںؑ

شمر اس طرح یزید کے سامنے پہنچا کہ حضرت کا سر مبارک نیزہ پر تھا۔ یزید نے طشت میں رکھے جانے کا حکم دیا۔ طشت یزید کے قریب رکھا گیا۔ اس وقت وہ نشہ میں تھا۔ اہل بیتؑ اور دیگر سرہائے شہداء لائے گئے اور ایک ایک کا حال بیان کیا جانے لگا۔

یزید کے سامنے معرکہ کربلا کا طریقہ بیانؑ

بقول ابن خلدون زجر بن قیس نے کہا: "امیر المومنین کو فتح و نصرت کی بشارت دینے آیا ہوں۔ حسینؑ بن علیؑ مع اٹھارہ نفر اپنے اہل بیتؑ اور ساٹھ آدمی اپنے معاونین و انصار کے وارد کوفہ ہوئے۔ ہم لوگ یہ سن کر جلوگیری کے خیال سے ان کی طرف گئے اور یہ امر کہ امیر المومنین کی بیعت کریں یا برسر جنگ آئیں پیش کیا۔ انھوں نے دوسری شق اختیار کی پس لوگ بھی مستعد بجنگ ہو گئے۔ چنانچہ آفتاب کے بلند ہوتے ہی ہم لوگوں نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پس جب کہ چمکتی ہوئی تلواروں اور نوکدار نیزوں نے ان کو اپنے محاصرہ میں لے لیا تو جان بچا بچا کر گڑھوں اور ٹیلوں اور درختوں کی طرف بھاگنے لگے جیسا کہ باز کے خوف سے کبوتر بھاگتا ہے۔ واللہ ان کے اس بھاگنے نے ان کو کچھ کام نہ دیا۔ ہماری تیز تلواروں نے ان کو فرش زمین پر موت کی نیند سلا دیا۔ ان کی لاشیں بے گور و کفن اسی میدان میں پڑی ہیں۔ جن کے بدنوں پر نہ تو کوئی کپڑا ہے اور نہ اس پر سایہ۔ اگر سایہ ہے تو آفتاب کا ہے اور کپڑا ہے تو ریگ کا۔ بیابان کی تیز و تند ہوائیں ان کو الٹ پلٹ کر جھلسا رہی ہیں۔ ان کی زیارت کرنے والے وحشی اور درندے جانور ہیں۔ ان پر رحم کرنے والے قرب و جوار کے کتے اور گدھ ہیں"۔ اس خبر کے سننے سے یزید کی آنکھیں پراشک ہو گئیں۔ بولا: میں تم لوگوں سے بغیر قتل حسینؑ کے بھی راضی ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ کی لعنت ابن سمیہ پر ہو خدا کی قسم اگر میں اس کی جگہ پر ہوتا تو میں حسینؑ سے درگزر کرتا۔ اللہ تعالیٰ حسینؑ پر اپنی رحمت نازل کرے۔ یزید یہ کہہ کر خاموش ہو گیا اور زجر کو کچھ صلہ نہ دیا۔

یزید کی دو رنگی

اسی جگہ صاحب صواعق محرقہ کی اس روایت کا نقل کرنا حقیقت فہمی میں مدد دے گا کہ: "سبط ابن جوزی وغیرہ او گفتہ اند کہ مشہور است کہ یزید اہل شام را جمع نمودہ خبر کردہ و سر حسین را در مجلس نہادہ عصا از چوب خیزران کہ در دست داشت دراں میکوفت و جمع میان این دو قول (یزید کا ابن سمیہ پر لعنت وغیرہ کرنا) باین طریق کردہ اند کہ احتمال دارد کہ یزید بحسب ظاہر انکار بر ابن زیاد و ترحم بر حسین کردہ و اما در خلوت عمل ثانی از وے صادر شدہ بقرینہ آنکہ مبالغہ تمام در تعظیم و ترفیع ابن زیاد کرد حتی آنکہ

دیرا باندرون خانہ خود کہ زنان می بودند طلب می نمود"۔ یعنی: سبط ابن جوزی وغیرہ نے کہا ہے کہ مشہور ہے کہ یزید نے شام والوں کو جمع کر کے خبر سنائی اور سر حسینؑ کو دربار میں رکھا۔ خیزران کی چھڑی سے جو اس کے ہاتھ میں تھی اس میں ضرب لگاتا تھا۔ ان دو قولوں میں جمع اس طرح سے کی گئی ہے کہ احتمال ہے یزید نے بظاہر ابن زیادہ کے کام کو ناپسندیدہ کہا ہو اور حسینؑ کے لیے کلمۂ رحم کہا ہو۔ لیکن خلوت میں دوسرا کام اس سے صادر ہوا ہو' اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ ابن زیاد کی تعظیم اور اس کے درجہ کو بڑھانے میں یزید نے مبالغہ کیا۔ حتی کہ اسے اپنے اندرون خانہ میں جہاں عورتیں تھیں بلوایا۔

جس وقت یزید اپنے اس مکروہ فعل میں مبتلا تھا اس کے اکثر اشعار ابی مخنف اور نور العین وغیرہ میں درج ہیں' جسے حسن میاں پھلواروی نے "غم حسینؑ" میں تفسیر روح المعانی' اتحاف لحب الاشراف' وسیلۃ النجات اور مفتاح النجات سے نقل فرمایا ہے۔ ابی مخنف میں یہ اشعار مروان کی زبانی اور پھر آگے چل کر یزید کی زبانی اور نور العین میں بہ اختلاف الفاظ یزید کی زبانی منقول ہیں۔

یزید کے اشعار حرکت اور ابو برزہ اسلمی

یا حبذا بردك فی الیدین و لونك الاحمر فی الخدین

ان کا حسن ہاتھوں سے جلوہ گر ہے اور اس کے رخساروں کا رنگ سرخ ہے

شفیت نفسی من دم الحسینؑ اخذت ثاری و قضیت دینی

میرے قلب کو حسینؑ کے خون سے تسکین ہوئی میں اپنا بدلہ لیا اور قرض ادا کیا

یا لیت من شاهد فی حنین یرون فعلی الیوم بالحسین

کاش وہ لوگ جو حنین میں تھے آج حسینؑ کو دیکھتے

یزید یہ اشعار پڑھتا جاتا تھا اور حسین کے دندان مبارک کو چھڑی سے کرید رہا تھا کہ ابو برزہ اسلمی صحابی سے نہ دیکھا گیا اور انھوں نے بھی قریب قریب وہ الفاظ کہے جو زید بن ارقم نے ابن زیاد سے کہے تھے۔ یزید نے حکم دیا کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دو۔

یزید کے اور اشعار

اس وقت دیوار قصر پر ایک کوا چیخنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یزید نے اس سے فال بدلی۔ لیکن اس کے بعد وہ شعر پڑھنے لگا۔

یا غراب البین ما شئت فقل انما تندب امر قد فعل

اے کوے تیرا جو جی چاہے کہہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو گیا

لیت اشیاخی ببدر شهدوا مصرع الخزرج من وقع الاسل

کاش میرے وہ بزرگ جو جنگ بدر میں تھے خزرج کا (کربلا میں) نیزوں سے پچھاڑا جانا دیکھتے۔

فاهلوا و استهلوا فرحاً ثم قالوا یا یزید لا تشل

مارے خوشی کے ان کی باچھیں کھل جاتیں اور وہ کہتے کہ اے یزید تیرے ہاتھ شل نہ ہوں

قد قتلنا القوم من ساداتهم و عدلناه ببدر فاعتدل

ہم نے ان کی قوم کے بزرگوں کو قتل کیا بدر کا بدلہ لیا اور بدلہ برابر ہوگیا

لعبت هاشم بالملك فلا خبر جاء و لا وحی نزل

ہاشم نے ملک کے ساتھ کھیل کھیلا نہ کوئی خبر آئی تھی نہ وحی نازل ہوئی تھی

لست من خندف ان لم انتقم من بنی احمد ما كان فعل

میں خندف سے نہ ہوں اگر بدلہ نہ لوں بنی احمدؐ سے جو کچھ انھوں (احمدؐ) نے کیا تھا

ان اشعار کو نوٹ کرنے کے بعد مولوی حسن میاں صاحب پھلواروی "غم حسینؑ" میں فرماتے ہیں کہ:
"اسی لیے امام احمد بن حنبل اور ابن جوزی اور اور دیگر اکابرین محدثین یزید مرتد کے ایمان ہی کے قائل نہیں"۔

دربارِ یزید میں حضرت زینبؑ کا خطبہ

اس وقت صاحب لہوف کے موافق: "روایت ہے کہ حضرت زینبؑ نے خطبہ فرمایا جس کے مخصوص فقرات نوٹ کرتا ہوں: "اے یزید تیرا گمان ہے کہ تو نے زمین و آسمان کو ہم پر تنگ کردیا۔ ہم ذلیل ہوئے اور تو عزیز ہوا۔ اس پر خوش نہ ہو کہ دنیا تیرے لیے درست ہوگئی اور تیرے سب امور ٹھیک ہوگئے اور ملک تیرا ہوگیا۔ صبر کر۔ کیا تو ارشاد خدا بھول گیا؟ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۲۴ : ۵۷) (اور وہ لوگ یہ نہ سمجھیں جنھوں نے کفر کیا کہ ان کے نفسوں کے لیے اچھا ہوا۔ بلکہ ان کا کفر اور گناہ بڑھ گیا اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے) ان لوگوں سے کیا اُمید ہوسکتی ہے جنھوں نے پاکبازوں کا جگر کھایا ہو جن کا گوشت خون شہدا سے پلا ہو۔ تو اپنے بزرگوں کو بلاتا ہے اور گمان کرتا ہے کہ وہ سن کر آویں گے۔ ارے عنقریب تو بھی وہاں جانے کا جہاں وہ ہیں۔ اس وقت تو آرزو کرے گا کہ کاش میں لُنج ہوتا کہ جو کچھ میں نے کیا نہ کرتا اور جو کچھ کہا نہ کہتا۔ تو مومنین کی گردنوں پر مسلط ہوا ہے بہت جلد تجھے معلوم ہوگا کہ ظالموں کے لیے برا بدلہ ہے۔ اگرچہ مجھ پر مصیبتیں پڑی ہیں لیکن میں تجھ سے کہتی ہوں کہ میں تیری قدر کو ذلیل جانتی ہوں اور تیری شان و شوکت کو حقیر سمجھتی ہوں۔ اور تیری سرزنش کو دشوار جانتی ہوں۔ تعجب ہے کہ شرفا و نجبا مردان خدا گروہ شیاطین کے ہاتھ سے قتل کیے جائیں۔ خدائے تعالیٰ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ خدا ہی سے میری شکایت ہے اور اسی پر بھروسا ہے۔ تو مکر کر جو مکر کرسکے اور کوشش کر جو کرسکے۔ بخدا تو ہمارے ذکر کو نہیں مٹا سکتا۔ ہماری شرع کو تو ضائع نہیں کرسکتا۔ ہماری درازی مدت کو نہیں پاسکتا۔ اور اس ننگ و عار کو اپنے سے دور نہیں کرسکتا۔ شکر ہے خدا کا جس نے نیکی اور بخشش سے ہمارے اول کا خاتمہ اور آخر کا رحمت اور شہادت سے انجام ہوا۔
یہ سن کر یزید نے یہ شعر پڑھا ؎

یا صیحۃ تحمد من صوائح ما اھون الموت علی النوائح

سوگوار عورتوں کا نالہ و فغاں اچھا معلوم ہوتا ہے اور نوحہ گری سے ان کی موت آسان ہے

اس وقت بقول ابی مخنف اور کامل ابن اثیر: ہند بنت عبد اللہ بن عامر بن کریز جو یزید کی بی بی تھی اور جسے یہ بہت چاہتا تھا چادر اوڑھ کر دربار میں چلی آئی اور حسینؑ کا سر مبارک دیکھ کر چیخ اٹھی اور پوچھا: "یہ کیا ہے؟"۔ یزید نے کہا کہ: "حسینؑ بن علیؑ بن ابی طالبؑ کا سر ہے"۔ ہند روئی اور کہا: "اے یزید خدا تجھے رُلائے۔ میں علیؑ

وفاطمہؑ کے فرزند کا سر تیرے سامنے دیکھ رہی ہوں۔ تُو نے جو کچھ کیا اس سے اللہ و رسُولؐ کی لعنت کا مستوجب ہُوا۔ واللہ اب نہ میں تیری زوجہ اور نہ تو میرا شوہر ہے"۔ یزید نے کہا: "تجھے فاطمہؑ سے کیا کام؟"۔ ہند نے کہا کہ: "ان کے باپ، علیؑ اور ان کے فرزند کی بدولت اللہ نے ہماری ہدایت کی اور ہمیں یہ کپڑا پہنایا۔ اے یزید تو کس منہ سے اللہ اور اس کے رسُولؐ سے ملاقات کرے گا؟"۔ یہ کہہ کر وہ روتی ہوئی باہر نکل گئی۔

ابی مخنف میں یہ بھی لکھا ہے کہ جس وقت یزید خوشی میں تھا اور شراب پی رہا تھا کہ راس الجالوت داخل ہوا۔ (نور العین کے موافق یہ ایک یہودی تھا اور یزید کا طبیب تھا) اس نے یزید کے سامنے ایک سر رکھا ہوا دیکھا اور پوچھا کہ: "یہ کس کا سر ہے"۔ کہا: "حسینؑ بن فاطمہؑ بنت محمدؐ کا سر ہے"۔ پوچھا کہ: "یہ کیوں مستوجب قتل ہوا؟"۔ یزید نے کہا کہ: "اس لیے کہ اہل عراق نے اسے بلایا کہ اپنا خلیفہ بنائیں۔ اور میرے عامل عُبید اللہ بن زیاد نے قتل کیا"۔ راس الجالوت نے کہا کہ: "اس سے زیادہ مستحق خلافت کون تھا۔ اس لیے کہ وہ تمھارے نبی کی دختر کا فرزند تھا جان لے یزید کہ مجھ میں اور داؤدؑ میں ایک سو بیالیس پشتیں گزری ہیں۔ لیکن یہود اب تک میری عزت کرتے ہیں۔ میرے قدم کی خاک کو تبرکاً اٹھاتے ہیں۔ اور تمھارا حال یہ ہے کہ کل تمھارا نبی تمھارے سامنے تھا اور آج تم نے اس کی اولاد کو قتل کر ڈالا۔ تمھارا دین کیا ہے"۔ یزید نے کہا کہ: "اگر رسُولؐ نے یہ نہ کہا ہوتا کہ "جو شخص کسی معاہد کو قتل کرے گا میں بروز قیامت اس کا دشمن ہوں گا"۔ تو میں تجھے قتل کر ڈالتا"۔ جالوت نے کہا کہ: "اے یزید رسُولؐ ایک معاہد کے لیے قیامت میں تیرے دشمن ہوں گے۔ لیکن کیا اپنی اولاد کے قتل پر تیرے دشمن نہ ہوں گے۔ اس کے بعد وہ سر مبارک سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ: "یا ابا عبد اللہ آپ اپنے جد بزرگوار کے سامنے میرے کلمہ شہادتین کے گواہ ہو جائیے گا"۔ یہ سن کر یزید نے کہا کہ: "اب تُو اپنے دین سے نکل گیا۔ اور دین اسلام میں داخل ہوا۔ اب میں تیرے خون سے بری ہوں"۔ یہ کہہ کر اس کی گردن مارنے کا حکم دیا۔

ایسی ہی روایت جاثلیق نصرانی کی ہے۔ اور ایسی ہی ہم مفہوم روایت ایک کنیز کی بھی ہے۔ اس کنیز نے جاثلیق کی طرح بعض مافوق الفطرت مناظر دیکھے تھے۔ نور العین کے موافق یزید نے اس کے قتل کا حکم دیا۔ اور ایک عیسائی نے اسے قتل کر ڈالا۔

کامل ابن اثیر کے موافق حضرت کا سر مبارک عورات کی نگاہ کے سامنے نہ تھا۔ جب ان لوگوں نے گردن اٹھا کر دیکھا تو روئیں اور یزید کی عورتیں بھی روئیں۔

جس وقت اہل بیتؑ یزید کے سامنے کھڑے تھے اور ایک ایک بی بی کا نام لیا جا رہا تھا۔ یزید نے کہا: "اے ام کلثومؑ خدا نے تمھارے ساتھ کیا کیا؟"۔ فرمایا: "اے ابن طلقا تیرے حرم پس پردہ بیٹھے ہیں اور رسُول اللہؐ کے حرم بغیر پردہ کے ہیں۔ تمھیں ہر نیک و بد یہود و نصاریٰ دیکھ رہے ہیں۔ یزید غصہ میں آیا۔ لیکن بعض مصاحبین نے کہا کہ: "یہ عورتیں ہیں، ان سے مواخذہ نہ کر"۔ اب یزید نے حضرت سکینہؑ کی طرف سر اٹھایا اور کہا کہ اے سکینہؑ تیرے باپ نے امر خلافت میں مجھ سے نزاع کی اور قطع رحم کیا۔ حضرت سکینہؑ کا دل بھر آیا۔ اور فرمایا: "اے یزید میرے باپ کے قتل پر خوش نہ ہو۔ وہ بندہ خدا تھے۔ خدا نے انھیں طلب کیا اور انھیں قبول فرمایا۔ اور اس وجہ سے اپنے لیے نیکی مہیا کی۔

لیکن تو اے یزید خدا کے نزدیک مستحق عقوبت ہوا۔ اب اپنے نفس کو جواب کے لیے تیار رکھ"۔ یزید نے کہا: "چپ رہو اے سکینہؑ! حسینؑ کا کیا حق تھا؟ انھوں نے زیادتی کی اور اللہ نے انھیں عاجز کیا، اور مجھے نصرت دی"۔

اس کے بعد ایک واقعہ جسے اکثر مؤرخین نے لکھا ہے جن میں ابی مخنف کامل ابن اثیر، نور العین اور ناسخ التواریخ کا نام لیتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ اس وقت ایک شامی کھڑا ہوا، اور اس نے کہا کہ: "اے یزید میری خواہش ہے کہ تو اس لڑکی کو مجھے دیدے کہ وہ میری خادمہ ہو"۔ (بعض میں سکینہ، بعض میں فاطمہؑ صغریٰ کے متعلق ہے) حضرت سکینہؑ حضرت اُمّ کلثومؑ سے لپٹ گئیں۔ اور فرمایا کہ اے پھوپھی کیا آپ نہیں دیکھتی ہیں کہ یہ ملعون کیا کہتا ہے۔ کیا اولاد انبیاء بھی خادموں کی طرح تقسیم ہو جاتی ہے۔ حضرت اُمّ کلثومؑ یا حضرت زینبؑ نے فرمایا: "چپ رہ اے ذلیل، بنات انبیاء خادمہ نہیں ہوتیں۔ اس کا نہ تجھے اختیار ہے نہ یزید کو"۔ یزید نے کہا: "جھوٹی ہے تو مجھے اختیار ہے"۔ حضرت نے فرمایا: "ہرگز تیرے اختیار میں نہیں ہے۔ جب تک ہماری ملت سے نکل کر دوسرے دین میں داخل نہ ہو"۔ یزید غصہ میں آیا اور کہا: "تو یہ کہتی ہے۔ تیرا باپ اور بھائی دین سے نکل گیا تھا"۔ حضرت نے فرمایا: "میرے باپ اور بھائی کے دین سے تیرے باپ دادا نے ہدایت پائی"۔ یزید نے کہا: "جھوٹی ہے تو اے دشمن خدا"۔ حضرت نے فرمایا: "تو بادشاہ ہے۔ اپنی حکومت سے ہم پر جبر کر رہا ہے"۔ یہ سن کر یزید شرمایا اور چپ ہو گیا۔ (کامل)

نعمان بن بشیر اور یزید

ابن خلدون، عقد الفرید سے نقل کرتا ہے کہ: جس وقت قیدیان اہل بیتؑ امام حسینؑ یزید کے روبرو پیش کیے گئے نعمان بن بشیر انصاری نے کہا: "ذرا سوچو کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان لوگوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے تھے اگر وہ اس حالت میں ان لوگوں کو دیکھتے تو کیا کہتے؟"۔ یزید نے کہا: "تم سچ کہتے ہو۔ ان لوگوں کو آزاد کر کے رہنے کے لیے خیمہ استادہ کردو"۔

یزید اور امام زین العابدینؑ

اس کے بعد یزید علیؑ بن الحسینؑ کی طرف مخاطب ہوا۔ اور پوچھا کہ: "یہ کون ہے؟"۔ لوگوں نے کہا کہ: "یہ علیؑ بن الحسینؑ ہیں"۔ اس نے کہا: "لوگ کہتے ہیں کہ علیؑ بن الحسینؑ مارے گئے"۔ لوگوں نے کہا: "ہاں وہ بڑے تھے اور یہ ان سے چھوٹے ہیں"۔

اب یزید نے حضرت علیؑ بن الحسینؑ سے مخاطب ہو کر کہا کہ: "تیرے باپ نے ارادہ کیا تھا کہ وہ خلیفہ ہو جائے۔ شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اس پر قدرت دی اور تمھیں ہمارا اسیر کیا۔ اور تمام قریب و بعید آزاد اور غلام تمھیں دیکھ رہے ہیں اور تمہارا کوئی مددگار اور کفیل نہیں ہے"۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا کہ: "کون ہے جو میرے باپ سے زیادہ خلافت کا مستحق ہو؟۔ وہ تمہارے نبی کی دختر کے فرزند تھے۔ اے یزید کیا تو نے خداوند تعالیٰ کا کلام نہیں سنا کہ:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ (۵۷ : ۲۲۔۲۳)

(دنیا میں اور تمہارے نفس کو کوئی مصیبت نہیں پہنچتی مگر یہ کہ قبل از ظہور وہ کتاب میں مسطور ہے اور یہ خدا پر آسان ہے تاکہ تم گزشتہ پر غمگین اور عطیات سے خوش نہ ہو اور خدا ڈینگیں مارنے والے کو دوست نہیں رکھتا) یہ سن کر یزید غصہ میں آیا، اور قتل کا حکم دیا۔ (ابی مخنف) اسی وقت حضرت اُمّ کلثومؑ نے اشعار پڑھے جن کا

پہلا یہ ہے کہ :-

انادیك یا جداه یا خیر مرسل حبیبك مقتول و نسلك ضائع

میں آپ کو پکارتی ہوں اے نانا اے خیر مرسل۔ آپ کا حبیب قتل اور نسل ضائع ہوگی

اس وقت عورتیں حضرت کے گرد آ گئیں اور حضرت اُمِّ کلثومؑ نے فرمایا کہ: "اے یزید تو نے اہلِ بیتؑ کا خون گرایا اور سوا اس بچہ کے کوئی نہیں رہا ہے جو عورتوں کا محرم ہو۔

اس وقت کا مجمع حکمِ قتل کی واپسی کا موجب ہوا

ابی مخنف کہتا ہے کہ: اس وقت عورتیں مرد اور بچے ٹڈیوں کی طرح جمع تھے۔ اور دیکھ رہے تھے۔ یزید کے دل پر رعب اور خوف طاری ہوا کہ لوگوں کا اہلِ بیتؑ کی طرف میلان نہ ہو اور فتنہ نہ کھڑا ہو جائے اور قتل سے باز رہا۔

یزید کا خطیب اور امام

کون تھا جو یزید کو اس کے وحشیانہ ہنسی اور استہزا سے باز رکھتا۔ اب اس نے بقول ابو اسحاق اسفرائینی اپنا خطیب بلایا۔ جو خوش تقریر اور فصیح اللسان تو بہت تھا مگر اس کو خدا کی معرفت کم حاصل تھی۔ یزید نے اس کو حکم دیا کہ لوگوں کو جمع کر کے منبر پر چڑھ کر علیؑ اور اس کی اولاد کو گالیاں دے۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد رضوان اللہ علیہم کو پیٹ بھر کر گالیاں دیں اور یزید کی تعریف جی کھول کر کی۔ جب علیؑ ابن الحسینؑ نے یہ سنا تو چلا کر کہا: "او نامعقول خطیب تو نے اپنے رب کو ناراض کیا اور بندے کو خوش کیا"۔

امامؑ منبر پر جانے کی اجازت چاہتے ہیں

پھر یزید کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: "مجھے اجازت ہو کہ منبر پر چڑھ کر وہ باتیں سناؤں جن سے خدا راضی ہو اور لوگوں کو فائدہ پہنچے"۔ یزید نے منظور نہ کیا۔ حاضرین نے کہا: "اس کو کیوں اجازت نہیں دی جاتی"۔ یزید نے کہا: "حاضرین میں اس لڑکے کو جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ یہ اہلِ بیتؑ بڑے چھوٹے سب کے سب حکمت عملی میں کمال رکھتے ہیں۔ یہ ابوتراب کی نسل ہیں۔ سانپ کا بچہ سنپولیا ہوتا ہے"۔ لوگوں نے اصرار کیا کہ: "تجھے خدا کی قسم اس لڑکے کو بھی کچھ بیان کرنے دے"۔ یزید نے اجازت دی کہ اچھا بیان کرو۔ (بعض مؤرخین کے موافق یزید نے کہا: قل ولا تقل ھجر۔ کہو، لیکن ہذیان نہ بکنا)

امامؑ منبر پر

علیؑ ابن الحسینؑ یہ سن کر منبر پر چڑھے۔ پہلے خدا کی حمد کی پھر رسولؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجا۔ اس کے بعد یوں تقریر شروع کی: "لوگو! دنیا اور دنیا کی چیزوں سے ڈرو یہ زوال کا گھر ہے۔ اس نے گزشتہ قوموں کو ہلاک کیا۔ حالانکہ وہ مال اور عمروں میں تم سے بڑھ کر تھے۔ مٹی نے ان کے گوشت کو کھا لیا۔ ان کے نشانات مٹ گئے۔ کیا تم کو ان کے بعد ہمیشہ زندہ رہنے کی آرزو ہے؟۔ یہ بات محال ہے۔ محال ہے۔ تم کو بھی اسی راستہ پر سے ان سے جا ملنا ہوگا۔ اپنی گزشتہ عمر پر افسوس کر کے آئندہ کے لیے تلافی کی کوشش کرو۔ اور بقیہ عمر میں نیکی کما لو۔ عنقریب تم کو محلوں سے نکال کر قبروں میں داخل کیا جائے گا۔ تمہارے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ واللہ بہت سے

گنہگار حسرت سے اپنی انگلیاں کاٹیں گے۔ اور بہت سے آن بان والے مصائب میں مبتلا ہوں گے۔ مگر اس وقت افسوس وندامت کچھ کام نہ آئے گی۔ ہر شخص کا عمل اس کے آگے آئے گا"۔

"لوگو! جو شخص مجھے جانتا ہے وہ جانتا ہے اور جو نہیں جانتا اس کو یاد رکھنا چاہیے کہ میں علیؑ بن الحسینؑ بن علیؑ ہوں۔ میں فاطمہ زہراؑ کا بیٹا ہوں۔ میں خدیجہؑ کبریٰ کا بیٹا ہوں۔ میں مکہ و منیٰ کا بیٹا ہوں۔ میں مروہ و صفا کا بیٹا ہوں۔ میں اس پیغمبرؐ کا بیٹا ہوں جس نے فرشتوں کے ساتھ نماز پڑھی۔ میں اس نبیؐ کا بیٹا ہوں جس کو خدا کا قرب حاصل ہے۔ جو شفاعت کبریٰ کرے گا۔ جو حوضِ کوثر کا مالک ہے۔ جو دلائل و معجزات والا ہے۔ جو صاحب قرآن ہے۔ جو صاحب فضائل ہے۔ جو مقام محمود والا ہے۔ جو صاحب کرم و جود ہے۔ جو تاجِ پیغمبری پہننے والا ہے۔ جو براق کا سوار ہے۔ جو بنی اسماعیل میں انتخاب ہے۔ جو صاحب تاویل ہے۔ میں اس امامؑ کا بیٹا ہوں جس کو ظلم سے شہید کیا گیا ہے۔ جس کا سر گردن کی طرف سے کاٹا گیا ہے۔ جو پیاسا شہید کیا گیا۔ جو کربلا میں شہید کیا گیا۔ جس کا عمامہ اور چادر دشمنوں نے چھین لیے۔ جس کے ماتم میں آسمان کے فرشتے رو دیے۔ لوگو! اللہ تعالیٰ نے ہم کو ایک اچھی مصیبت میں مبتلا کیا ہے۔ ہم میں ہدایت کا جھنڈا نصب کیا اور ہمارے مخالفوں میں ہلاکت کا جھنڈا گاڑا۔ اور ہم کو دنیا بھر کے لوگوں پر فضیلت بخشی۔ ہم کو وہ باتیں عطا کیں جو دنیا میں کسی کو میسر نہیں ہوئیں۔ ہم میں پانچ خوبیاں ایسی جمع کیں جو مخلوق میں کسی شخص میں جمع نہیں ہوئیں۔ یعنی ① علم، ② شجاعت، ③ سخاوت، ④ خدا کی محبت، ⑤ رسولؐ کی محبت"۔

تقریر کا اثر دور کرنے کے لیے مؤذن بلایا گیا

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ اس تقریر نے حاضرین پر بجلی گرادی۔ ہر طرف آہ و بکا کا شور بلند ہوا۔ یزید نے چاہا کہ علی زین العابدینؑ کی بات کاٹے۔ اس لیے اس نے مؤذن کو حکم دیا کہ اذان کہو۔ مؤذن نے اذان شروع کی۔ اللہ اکبر (۴ مرتبہ) اشہد ان لا الہ الا اللہ (۲ مرتبہ) پھر اس کے بعد جب کہا: اشہد ان محمداً رسول اللہ (بقول ابو مخنف اس وقت امام رو دیے) تو علی زین العابدینؑ نے مؤذن سے پکار کر کہا: خدا کے لیے ذرا ٹھہرو۔ مؤذن چپ ہو گیا۔

یزید سے امامؑ کا خطاب

پھر یزید سے مخاطب ہو کر کہا: "بتاؤ محمدؐ میرے نانا ہیں یا تیرے؟"۔ یزید نے کہا: "وہ تیرے نانا ہیں"۔ انھوں نے کہا: "تو پھر کیوں تو نے ان کی اولاد کو قتل کیا، اور کیوں ان کے حرم کو قید کیا؟"۔ اس بات سے لوگوں پر رقت طاری ہو گئی۔ اور سب رونے لگے اور کہنے لگے: "یہ واقعہ اسلام کی بھاری مصیبت ہے"۔

صاحب روضۃ الشہدا کہتا ہے کہ جس وقت سید الساجدین "انا ابن" فرماتے تھے تمام دمشق چیخ اٹھتا تھا۔ اور ایک ماتم کدہ معلوم ہوتا تھا۔ (اس کے بعد بقول ابی مخنف یزید محل میں چلا گیا اور کہا: "ہمیں نماز کی ضرورت نہیں ہے"۔)

خیال بدلنے کے لیے اجزائے قرآن کی پاشانی

اسی مؤرخ کے نزدیک جب لوگ امام کے بعض فقرات سے متاثر ہوئے تو یزید ڈرا کہ امام کی محبت لوگوں کے قلوب میں پیدا نہ ہو اور فتنہ نہ کھڑا ہو۔ یزید نے ان لوگوں سے جنھوں نے امام کے خطبہ کہنے کا اصرار کیا تھا کہا کہ: "اسے منبر پر چڑھا کر تم نے میرے ملک کے زوال کا ارادہ کیا تھا"۔ یزید نے یہ بھی کیا کہ اجزائے

فتشہ آن کو مسجد میں اس غرض سے پاش پاش کرایا کہ نماز پڑھ کر لوگ اس کے دیکھنے میں مشغول ہوں اور حسینؑ کا ذکر نہ کریں۔

قتلِ حسینؑ کے مُتعلّق یزید کا تجاہل اور اِعلانِ حقیقت

ابو اسحاق کہتے ہیں: یہ حالت دیکھ کر یزید کو اپنی جان کا خوف ہوا اور کہنے لگا: "اے لوگو تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا ہے۔ حسین کو جس نے قتل کیا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔ اس کو عبید اللہ بن زیاد گورنر بصرہ نے قتل کیا ہے۔ پھر اس نے حکم دیا کہ جو لوگ حسین رضی اللہ عنہ کا سر لائے ہیں ان کو حاضر کیا جائے تاکہ ان سے دریافت کیا جائے کہ حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا واقعہ کس طرح ہوا۔ جب سب لوگ حاضر ہوئے تو ابن ربعی سے یزید نے کہا کہ: "کیوں بھئی سچ بتا کیا میں نے تجھ کو حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کے لیے کہا تھا؟"۔ اس نے کہا: "ہرگز نہیں۔ خدا کی لعنت ہو اس پر جس نے اس کو قتل کیا ہے"۔ اسی طرح وہ ہر ایک سے سوال کرتا تھا اور سب کے سب یہی جواب دیتے تھے۔ یہاں تک کہ حصین بن نمیر کی نوبت آئی تو اس نے بھی یہی جواب دیا۔ پھر وہ کہنے لگا: "اگر حکم ہو تو اس کے قاتل کا صحیح صحیح پتا بتا دوں"۔ یزید نے کہا: "ہاں بتاؤ"۔ اس نے جان کی امان مانگی۔ یزید نے کہا: "تجھے امان ہے"۔ وہ بولا: "اے امیر! یہ اس شخص کا کام ہے جس نے جھنڈے نصب کیے، مال خرچ کیا، اور لشکر تیار کیا، اور خطوط بھیج کر کسی کو ڈرایا، کسی کو ترغیب دی"۔ یزید نے پوچھا: "تو پھر یہ کام کس نے کیے؟"۔ وہ بولا: "تم نے"۔ یزید یہ سن کر غصہ کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اور اپنے گھر جا کر وہ طشت سامنے رکھا جس میں امام حسین رضی اللہ عنہ کا سر تھا، اور اپنا سر پیٹنا شروع کیا۔ بقول ابی مخنف کہتا تھا کہ: "مجھے کیا ہوا تھا کہ میں نے حسینؑ کو قتل کیا"۔ یہ روایت روضۃ الشہدا اور ابی مخنف میں بھی ہے۔

چند اشعار اور یزید

انھیں اندوہناک وقتوں میں سے کسی وقت یحییٰ بن حکم نے کچھ اشعار پڑھے جن کا مفہوم یہ تھا کہ: "زیاد کی اولاد ریگِ بیابان سے بڑھ گئی اور رسولؐ کی نسل باقی نہ رہی"۔ یہ سن کر یزید نے بقول کامل ابن اثیر اس کے سینہ پر ہاتھ مارا اور کہا: "چپ رہ"۔

رُومی دربانؑ

اہلِ بیتؑ طہارت جس قید خانہ میں تھا اس کے دربان رومی مقرر کیے گئے تھے۔ یہ بھی روایت ہے کہ کسی دن غالباً اس وقت جب کہ ان مفہوم کے فقرات ادا ہوئے تھے کہ

نمائشِ اِحسانؑ

اگر جناب رسالت مآبؐ اہلِ بیتؑ کو اس حالت میں دیکھتے تو کیا کہتے۔ یزید نے سوہان طلب کیا، اور خود سے حضرت امام زین العابدینؑ کا طوق کاٹا، اور وجہ ظاہر کی کہ میں نے نہ چاہا کہ سوا میرے اور کسی کا تم پر احسان ہو۔

منہال اور اِمامؑ

دمشق کے دوران قیام میں کسی روز منہال بن عمر سے حضرت سجادؑ سے ملاقات ہوئی۔ منہال نے پوچھا، اس پر امام نے فرمایا: اس کا حال کیا پوچھتا ہے جس کا باپ مقتول، مددگار کم اور حرم اسیر ہوں۔۔۔ عرب عجم پر اس لیے فخر کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہؐ ہم میں سے ہیں اور یہی ادعا قریش کا ہے۔ ہم ان کے اہلِ بیتؑ ہیں لیکن مقتول اور مظلوم ہیں۔۔۔ امام کے فقرات سن کر رونے کا شور بلند ہوگیا۔

نرمی اور ماتم پرسی

بہت جلد یزید کو یہ طے کرنا پڑا کہ اہل بیتؑ کے ساتھ مزید تشدد ممکن نہیں۔ اب انھیں ایک مکان دیا گیا، اور حکم دیا گیا کہ ضروریات کی کل چیزیں ان کے لیے مہیا کی جائیں۔ حکومت کی نرمی دیکھ کر تمام دمشق میں کوئی قریشی عورت نہ تھی جو سوگواروں کی صورت سے اہل بیتؑ کے پاس نہ گئی ہو اور اب حسینؑ کی شہادت کے بعد اہل بیتؑ کی آنکھوں سے آزاد آنسوؤں کی سیل پہلے دمشق میں بہی، غالباً اہل بیتؑ سات دن دمشق رہے اور دوران قیام میں ان کے لیے کوئی دوسرا مشغلہ بجز اس کے نہ تھا کہ حسینؑ اور اپنے ممتاز افراد عالم پر آنسو بہاتے۔

بابؔ سیزدہم

اہلِ بیتؑ (مدینہ)

سات دن کے بعد یزید نے ریشمی کپڑے اور روپیہ منگوایا اور حضرت اُمّ کلثومؑ سے کہا کہ: "اسے حسینؑ کے عوض میں قبول کرو۔ اور سمجھ لو کہ انھوں نے رحلت کی"۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ: "کس قدر سخت دل ہے تو کہ میرے بھائی کو قتل کر کے مجھے عوض میں مال دیتا ہے۔ واللہ یہ ہرگز ممکن نہیں ہے"۔ ابی مخنف کے موافق یزید نے ہر ایک کے لحاظ سے کچھ مال اور ریشمی کپڑے منگوائے اور ساتھ کر دیا۔ محملیں درست کی گئیں اور ایک شخص (ابن خلدون کے موافق نعمان بن بشیر جو متدین اور باایمان شخص تھا) مع کچھ سواروں کے (ابی مخنف کے موافق پانچ سو) ان کی نگہبانی اور آرام سے مدینے پہنچا دینے کے لیے مقرر کیا گیا۔

امام زین العابدین علیہ السلام کیا طلب فرماتے ہیں

بعض روایات یہ ظاہر کرتی ہیں کہ یزید نے حضرت امام زین العابدینؑ سے تین خواہشیں پوری کرنے کا وعدہ کیا۔ حضرتؑ نے پہلی خواہش یہ فرمائی کہ مجھے میرے باپ کا سر دکھا دے۔ دوسرے یہ کہ ہمارا لوٹا ہوا اسباب واپس کر دے۔ تیسرے یہ کہ اگر میرے قتل کا ارادہ ہے تو کسی کو مقرر کر کہ ذریت رسولؐ کو وطن پہنچا دے۔ یزید نے کہا کہ تم اپنے باپ کا سر کبھی نہ دیکھو گے۔ تمھارے قتل سے میں باز آیا۔ تمھارے سوا عورات کو کوئی نہ لے جائے گا۔ اور تمھارا جو اسباب لوٹا گیا ہے اس کے عوض میں المضاعف دوسرا دے سکتا ہوں۔ وہ نہیں مل سکتا۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ مجھے تیرا مال درکار نہیں ہے۔ میں اپنا اسباب اس لیے مانگتا ہوں کہ اس میں میری دادی فاطمہؑ بنت محمدؐ کا ایک چرخا ہے۔ ایک مقنع ایک گلوبند اور ایک کرتا ہے۔ تب یزید نے حکم دیا کہ وہ سب اسباب واپس کر دیا گیا۔

راہبر کا لحاظ

قافلہ دمشق سے روانہ ہوا۔ راہبر آگے آگے اور روانگی کے وقت سب کے آخر میں چلتا تھا۔ خدمات لائقہ کو اچھی طرح انجام دے رہا تھا۔

۲۰ صفر کو کربلا میں

بقول ابو اسحاق اسفرائینی: یہ قافلہ ۲۰ صفر کو کربلا پہنچا۔ یہاں جابر بن عبداللہ انصاری سے ملاقات ہوئی جو زیارت قبر حسینؑ کو آئے ہوئے تھے۔ یہاں پہنچ کر قیام کیا اور ماتم برپا کیا۔ لہوف کے موافق بنی ہاشم کے کچھ مرد بھی تھے۔ کربلا میں "کئی دن" اسی حالت سے رہے۔ اور وہاں کی عورتیں بھی رونے پیٹنے میں شریک رہیں۔

قریب مدینہ قیام اور بشیر سے شعر کہنے کی خواہش کی

صاحب لہوف فرماتے ہیں: بشیر بن جزلم (نعمان بن بشیر)

بیان کرتا ہے کہ جب ہم قریب مدینہ پہنچے تو امام زین العابدینؑ نے ایک جگہ قیام فرمایا۔ اسباب سفر اتروایا۔ خیمہ برپا کیا اور حرم محترم بھی اترے۔ حضرتؑ امام نے مجھ سے فرمایا کہ اے بشیر خدا تیرے باپ پر رحمت کرے وہ شاعر تھا تو بھی کچھ شعر کہتا ہے۔ میں نے عرض کی: "یا ابن رسول اللہ! میں بھی شعر کہتا ہوں۔ تو حضرتؑ نے فرمایا کہ تو مدینہ میں جا اور حضرت ابا عبداللہ الحسینؑ پر شعر کہہ۔ بشیر کہتا ہے کہ میں گھوڑے پر سوار ہوا اور مہمیز کیا۔ یہاں تک کہ میں مدینہ میں پہنچا۔

بشیر کے اشعار

جب میں مسجد رسولؐ کے قریب آیا تو آہ و فغاں و شور و فریاد (ترجمہ میں غم کے الفاظ کی کثرت نے رفعت صوتی بالبکاء (میں نے رونے کے لیے اپنی صدا بلند کی یا چیخ کر رویا) کا مرثیہ ضائع کر دیا ہے) جاکر یہ اشعار پڑھے: ؎

یا اہل یثرب لا مقام لکم بہا ۔۔۔ قتل الحسین فادمعی مدرار

اے اہل مدینہ اب یہ شہر تمہارے رہنے کے قابل نہ رہا حسینؑ شہید ہوئے اور میری آنکھوں سے لہو کے آنسو بہتے ہیں

الجسم منہ بکربلاء مضرج ۔۔۔ و الراس منہ علی القناۃ یدار

کربلا میں ان کا جسم خون میں لتھڑا ہوا ہے اور ان کا سر نیزہ پر پھرایا جاتا ہے

عورات مدینہ استقبال کے لیے جاتی ہیں

میں نے پکار پکار کہا کہ اے اہل مدینہ علی بن الحسینؑ اپنی پھوپھیوں بہنوں اور عورتوں کو لے کر یہاں آئے ہیں اور تمہارے قریب اترے ہیں۔ مجھ کو تمہارے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ تم سب کو ان حضرتؑ کے مقام سے آگاہ کر دوں۔ یہ سن کر کوئی عورت پردہ والی مدینہ میں نہ تھی کہ سر کھولے بال بکھرے منہ پیٹتی روتی جاتی فریاد و فغاں گریہ و زاری کرتی ہوئی باہر نہ نکل آئی ہو۔ میں نے اس دن سے زیادہ رونے والے نہیں دیکھے۔ اور رسول اللہؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں پر ایسا دن نہیں گزرا۔ میں نے ایک لڑکی کو امام حسینؑ کے غم میں یہ نوحہ کرتے سنا: ؎

نعی سیدی ناع نعاہ فاوجعا ۔۔۔ و امرضنی ناع نعاہ فافجعا

ایک مخبر نے مجھے میرے سردار کی خبر سنا کر درد مند کیا اور اس سنانے نے مجھے بیمار کر دیا

فعینی جودا بالدموع واسکبا ۔۔۔ و جودا بدمع بعد دمعکما معا

اے میری آنکھ رونے میں دریغ نہ کر اور پے در پے آنسو بہا

علی من دہا عرش الجلیل فزعزعا ۔۔۔ فاصبح ہذا المجد و الدین اجدعا

ایسے شخص پر جس کی مصیبت عرش تک پہنچی اور اسے ہلا دیا اب دین بزرگ بے ناک ہو گیا

علی ابن نبی اللہ و ابن وصیہ ۔۔۔ و ان کان عنا شاحط الدار اشسعا

ایسے شخص پر جو نبی اللہؐ اور ان کے وصی کا فرزند تھا اگرچہ ہم سے اس کا گھر بہت دور ہے

لوگوں کا ہجوم اور امامؑ کی حالت

بشیر کہتا ہے کہ اس کے بعد میں نے بھی گھوڑے کو مہمیز کیا۔ قیام گاہ کے قریب پہنچ کر دیکھا کہ لوگوں کا اس قدر ہجوم ہے کہ راہ پانا دشوار ہے۔ آخر میں اپنے گھوڑے سے اترا اور صفوں کو چیرتا ہوا جب در خیمہ پر پہنچا حضرت علی بن الحسینؑ خیمہ میں تھے

وہ حضرتؑ باہر تشریف لائے۔ دست مبارک میں ایک رومال تھا جس سے آنسو پونچھتے جاتے تھے۔ اور ان کے پیچھے ایک خادم کرسی لیے آرہا تھا۔ اس نے کرسی رکھ دی۔ حضرتؑ اس پر بیٹھ گئے۔ جوش رقت سے آپ رونے کو ضبط نہ کر سکتے تھے تمام لوگوں کے رونے چلانے کی آواز ہر طرف سے بلند تھی۔ لوگ حضرتؑ کو پرسا دیتے تھے۔ اس جگہ نہایت ہی شدت سے ماتم برپا ہوا۔ حضرتؑ نے سب کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ سب فوراً چپ ہو گئے اسی وقت آپ نے کہا:

امام زین العابدینؑ کا خطبہ

ایہا الناس! خدا ہی کے لیے حمد ہے جس نے بڑی مصیبتوں سے ہمارا امتحان لیا۔ ہماری مصیبت اسلام کے لیے ایک بڑا رخنہ ہے۔ اور خلق اللہ کے لیے ایک بڑی مصیبت ہے۔ میرے پدر بزرگوار ان کی عترت اور ان کے انصار شہید ہوئے۔ ان کے اہل وعیال قید کیے گئے۔ ان کا سر نیزہ پر رکھ کر شہروں میں پھرایا گیا۔ یہ ایک مصیبت ہے جو تمام مصیبتوں سے بڑھ گئی۔ اے لوگو! تم میں سے کون ہے کہ حسینؑ کے قتل کے بعد خوش ہو۔ اور کون ایسا دل ہے جو ان کی شہادت پر غمگین نہ ہو۔ اور کون ایسی آنکھ ہے جو آنسوؤں کو بند کرے اور بخل کرے۔ ان کے قتل پر ساتوں آسمان روئے۔ سمندر اپنی موجوں سے، سماوات اپنے ارکان سے، زمین اپنے اطراف سے، درخت اپنی شاخوں سے، مچھلیاں دریاؤں کے طلاطم میں۔ ملائکہ مقربین اور اہل سماوات اپنے طریقہ سے۔ کون سے کان ہیں جنھوں نے اسلام کی اس مصیبت کو سنا ہو اور بہرا نہ ہو گیا ہو۔ ایہا الناس! ہماری صبح اس طور سے ہوئی کہ ہم آوارہ وذلیل پریشان رسوا شہروں میں پھرائے گئے۔ حالانکہ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ نہ کسی مکروہ فعل کے مرتکب ہوئے۔ نہ ہم نے اسلام میں کوئی رخنہ ڈالا تھا۔ اور نہ ہم نے کوئی بری بات کی تھی۔ خدا جانتا ہے کہ اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے قتل کے لیے حکم دیتے تو لوگ اس سے زیادہ نہ کر سکتے جو کچھ کیا گیا۔

حضرت محمد ابن حنفیہؒ آئے

حضرت محمد ابن حنفیہؒ بیمار تھے مگر وہ بھی خبر سن کر آئے تھے۔ اور ناسخ التواریخ کے موافق سیاہ علم دیکھ کر گر پڑے اور پوچھا: بھتیجے میرا بھائی کہاں ہے؟۔

حضرت سجادؑ نے فرمایا: اے چچا ہم یتیم ہو گئے اور حضرت ابا عبداللہ شہید ہو گئے۔ کاش ہوتے آپ اور دیکھتے اپنے بھائی کو کہ کس طرح استغاثہ کرتے تھے اور مدد چاہتے تھے۔ ان کی کوئی نصرت نہیں کرتا تھا۔ کل جانور سیراب تھے لیکن حسینؑ کو پانی نہیں ملتا تھا۔ اور بقول نور العین حضرت محمد حنفیہؒ نے فرمایا: اے میرے پیارے بھائی کاش میں تیرے ساتھ ہوتا اور تجھ پر اپنی جان قربان کرتا۔

حضرت ام سلمہؓ

بقول ناسخ التواریخ حضرت ام سلمہ اپنے فرزندوں کا نام نہیں لیتی تھیں بلکہ حسینؑ کا نام لے کر روتی تھیں۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام جس وقت خطبہ فرما چکے صوحان بن صعصعہ بن صوحان لنگڑے تھے۔ سہارے سے کھڑے ہوئے اور عذر کیا کہ میں لنج تھا اس وجہ سے نصرت امامؑ میں شریک نہ ہو سکا۔ حضرتؑ نے ان کے عذر کو منظور کیا۔ حسینؑ بجاوت کا شکریہ ادا کیا اور ان کے باپ کے لیے خدا سے طلب رحمت کی۔

حضرت ام کلثومؑ کے اشعار مدینہ کو مخاطب کر کے

حضرت ام کلثومؑ نے مدینہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

مدینۃ جدنا لا تقبلینا ✦ فبالحسرات و الاحزان جئنا

اے نانا کے مدینہ ہمیں چشم قبول نہ کر کہ ہم بڑی حسرتوں اور اندوہ کے ساتھ آرہے ہیں

خرجنا منک و الاہلین جمعا ✦ رجعنا لا رجال و لا بنینا

ہم مع خاندان کے تجھ سے باہر گئے تھے اب اس حال سے آرہے ہیں کہ نہ ہمارے مرد باقی ہیں نہ اولاد

و کنا فی الخروج علی المطایا ✦ و جئنا خاشعین و سبینا

جاتے وقت ہم لوگ سواریوں پر تھے اب بدحالی سے واپس آئے ہیں

و مولانا الحسین لنا انیسا ✦ رجعنا لا حسین و لا معینا

اس وقت ہمارے مولا حسینؑ ہمارے ساتھ تھے اب واپس ہیں تو حسینؑ ہیں نہ کوئی مددگار

فلا عیش یدوم لنا لعمر ✦ و زین الخلق مدفون حزینا

کیونکہ عمر بھر کی زندگی ہمارے لیے دوامی نہیں ہے زینت خلق بحالت حزن مدفون ہے

و نحن بنات یسین و طہ ✦ و نحن الباکیات علی ابینا

ہم یسین اور طہ کی بیٹیاں ہیں جو اپنے بزرگوں پر رو رہے ہیں

و نحن الصابرون علی البلایا ✦ و نحن الباکیات و لا معینا

ہم لوگ بلاؤں پر صبر کرنے والے ہیں ہم گریاں ہیں اور کوئی معین نہیں ہے

و قد ہتکوا محارمنا و صرنا ✦ علی الاقتاب جہرا اجمعینا

انھوں نے ہماری ہتک حرمت کی اور ہمیں کھلے چہروں سے پالانوں پر بیٹھنا پڑا

و زینب اخرجوہا من خباہا ✦ و فاطمۃ و ما احد معینا

انھوں نے زینبؑ اور فاطمہؑ کو پردے سے نکالا اور کوئی مددگار نہ تھا

سکینۃ تشتکی من حر شجو ✦ تنادی یا اخی جاروا علینا

سکینہ سوزش غم کی شکایت کر رہی ہے کہ اے بھائی ہم پر ظلم کیا گیا

و قد طافوا البلاد بنا جمیعا ✦ و بین الخلق جمعا قد رمینا

انھوں نے ہم سب کو شہروں میں تشہیر کیا اور ہم تمام خلق میں ذلیل کیے گئے

فہذا قصتی مع شرح حالی ✦ الا یا مسلمون ابکوا علینا

یہ میرا مفصل حال ہے اے مسلمانو! ہم پر رو

بشیر صلہ قبول نہیں کرتا

مدینہ میں کئی روز تک ماتم رہا جب رہنما نے روانگی کا قصد کیا تو اہل بیت نے اسے کپڑے اور مال دینا چاہا لیکن اس نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ جو کچھ خدمت میں نے کی ہے وہ مال کی امید سے نہیں کی بلکہ قرابت جناب رسالت مآبؐ کی وجہ سے

امام کے اشعار

صاحب نور العین نے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی زبانی روضۂ رسولؐ پر چند اشعار کہلوائے ہیں جو گویا اظہار واقعہ ہے۔ میں اس کے مخصوص اشعار نقل کرتا ہوں۔

الی جدنا نشکو عداۃ قد تحکموا و نالو بنا و اللہ کل مناء

ہم اپنے نانا سے دشمنوں کی شکایت کرتے ہیں جنھوں نے ہم کو تباہ کرکے اپنی تمام آرزوئیں پوری کرلیں

و قد رام قتلی یقطع نسلنا و فی عمتی صاحت بغیر عزاء

یزید نے میرے قتل کا بھی ارادہ کیا تاکہ ہماری نسل کو منقطع کردے تو میری پھوپھی نے بے صبری سے چیخ ماری

و صاح بہم کل الحضور جمیعہم فقال دعوہ انہ من الطلقاء

اور ان کے ساتھ تمام حاضرین بھی چلائے آخر یزید نے کہا اس کو چھوڑ دو یہ آزاد ہے

غدا یستحل الان کل محرم یبیح باھل البیت سفک دماء

ظلم یوں ہوگیا کہ آج ہر حرام کو حلال جانتا ہے اور اہل بیت کا خون بہانا مباح جانتا ہے

اذا یستبیح الان آل محمد و یصبغ لاھل البیت کل رداء

اب آل محمدؐ کا قتل کرنا مباح سمجھتا ہے اور اہل بیت کی ہر چادر کو خون آلود کرتا ہے

باب چہاردہم

شہادتِ حسینؑ کے بعد (متعلق باتیں)

سرِ مبارک

- کوئی کہتا ہے کہ سر مبارک حضرت امام زین العابدین علیہ السلام اپنے ہمراہ لائے اور جسمِ اطہر کے ساتھ کربلا میں دفن کیا گیا۔
- کوئی کہتا ہے کہ فرقِ مطہر مدینہ بھیجا گیا اور بقیع میں حضرت فاطمہ زہراؑ کے روضہ کے پاس دفن ہوا۔
- کوئی کہتا ہے کہ پہلوئے امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام میں دفن ہوا۔
- کوئی کہتا ہے کہ یہ سلسلہ خزانۂ دمشق میں رہا اور حکومت بنی عباس میں شام سے عسقلان گیا۔ اور افرنگیوں کے غلبہ کے زمانہ میں عسقلان سے قاہرہ لے گئے۔
- یہ بھی کہا گیا ہے کہ امیر افضل بن امیر الجیوش نے فرق مطہر ایک عمدہ جگہ رکھا اور اس کے بعد ۵۲۸ھ میں قاہرہ لے گئے۔
- قاہرہ میں اس وقت تک حضرت امام حسین علیہ السلام کا روضہ مبارک موجود ہے۔

غمِ حسینؑ کا نشو و نما

امام زین العابدین علیہ السلام اپنی بقیہ حیات تک اس غم سے متاثر رہے۔

حضرت ربابؑ بنت امراء القیس ایک برس تک چھت کے نیچے نہ بیٹھیں۔ برابر محزون رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ اس مدت کے بعد رحلت فرمائی۔

ابو عمارہ شاعر کہتا ہے کہ جس وقت حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے سامنے ذکرِ حسینؑ ہوتا تھا شام تک کوئی حضرتؑ کو ہنستے نہ دیکھتا تھا۔

اہلِ بیتؑ برابر سوگ میں رہے اور کسی اسبابِ راحت و تزئین پر التفات نہ کی۔ جب تک ابن زیاد کا سر مختارؓ بن ابو عبیدہ ثقفی نے حضرتؑ کے پاس نہ بھیجا۔

خصائصِ حسینیہ

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے حضور میں جعفر بن عفان، عبد اللہ بن غالب، ابو ہارون مکفوف وغیرہ مرثیہ پڑھتے تھے۔ حضرتؑ اس کا بھی اہتمام فرماتے تھے کہ حرم محترم بھی سنیں اور کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ پس پردہ سے یا ابتاہ کی آواز آجاتی تھی۔

حضرت امام رضا علیہ السلام کے دربار میں دعبل خزاعی مرثیہ پڑھتا تھا اور حضرتؑ بھی مثل اپنے پدر بزرگوار کے اہتمام فرماتے تھے۔

امیر سیف الملک اور قاضی موتمن وغیرہ حضرتؑ کے مرقد منور کی زیارت کو جایا کرتے تھے۔ (ناسخ التواریخ)

عاشور کے دن سلطان افضل مجلس برپا کرتا تھا۔ داہنے بائیں قاضی رہتے تھے۔ روضہ خوان ایک دوسرے کے بعد پڑھتے تھے۔ شعرا مرثیہ کہتے تھے۔ لوگ روتے پیٹتے تھے۔ اس کے بعد دسترخوان بچھایا جاتا تھا۔ نان جویں رکھی جاتی تھی۔ زوال کے وقت لوگ روتے پیٹتے تھے اور دوکاندار اپنی دکانیں بند رکھتے تھے۔

معزالدولہ دیلمی نے حکم دیا تھا کہ دسویں محرم کو لوگ غم حسینؑ برپا کریں۔ دوکانیں بند کر دیں۔ اظہار غم کیا جائے۔ مرد اور عورتیں بال پراگندہ کریں اور کپڑے پھٹے ہوئے پہنیں ۔۔۔ منع نہ کر سکتے تھے کیونکہ شیعہ بہت تھے اور بادشاہ ان کی طرف تھا۔ (ابوالفدا)

بعد شہادت ظلم کی مثالیں

ابو یوسف یعقوب جو ابن سکیت کے نام سے مشہور تھا متوکل عباسی کے لڑکوں کا استاد تھا۔ ایک روز جب کہ ابو یوسف پڑھا رہا تھا متوکل آیا اور پوچھنے لگا کہ تجھ کو میرے لڑکوں سے زیادہ محبت ہے یا حسنینؑ سے۔ ابن سکیت نے جواب دیا کہ قنبر جو علیؑ کا غلام تھا وہ تجھ سے اچھا تھا۔ اس پر غریب ابو یوسف کا شکم چاک کیا گیا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ زبان کھینچ لی گئی۔

مسترشد عباسی کے متعلق لکھا گیا ہے کہ اس نے مرقد مبارک کا کل مال لے لیا اور کہا کہ قبر کو مال کی کیا حاجت ہے۔
متوکل عباسی نے لوگوں کو زیارت قبر حسینؑ سے روکنے کے لیے لشکر بھیجا۔ لوگوں نے اس حکم کی مخالفت کی اور کہا کہ جب تک ہم میں کا ایک بھی زندہ ہے اس وقت تک زیارت سے باز نہ آئیں گے۔ یقیناً مخالفت قوت کے ساتھ ہوئی تھی کہ وہ لشکر واپس ہوا۔ اور زیادہ سختی سے اس حکم کا نفاذ ضروری نہ سمجھا گیا اور ظاہر کیا گیا کہ لشکر بے ضرورت واپس کرلیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر حکم دیا گیا اور اس مرتبہ زائرین کے قتل کی بھی اجازت دی گئی۔ قبر حسینؑ پر بیس برس تک زراعت ہوتی رہی اور یہاں فوجی چھاؤنی بھی بنائی گئی۔ علی بن احمد بن منصور نے قبر کھودنے اور زیارت سے منع کرنے پر شعر کہے۔ جس کا مفہوم تھا کہ اگر بنی امیہ نے اپنے نبی کے نواسہ کو ظلم قتل کیا تھا تو تیرے باپ کی اولاد نے بھی ویسا ہی کیا کہ اس کی قبر کو اکھاڑ ڈالا۔ افسوس ان پر اگرچہ وہ شریک قتل نہ تھے لیکن بنی امیہ کی متابعت کی جب کہ حضرت سیدالشہداؑ کی ہڈیاں بوسیدہ ہو گئی تھیں۔

زید مجنون

زید مجنون نے جب مصر میں یہ خبر سنی تو بے تاب ہو کر پیادہ چلے۔ راستہ میں بہلول سے ملاقات ہو گئی۔ اور یہ دونوں بزرگ زیارت کو چلے۔ ایک روز شہر میں بڑا ہجوم دیکھا اور دیکھا کہ لوگ ایک جنازہ لیے جا رہے ہیں۔ پوچھا کہ کیا متوکل مر گیا؟ کسی نے جواب دیا کہ متوکل کی کنیز ریحانہ مر گئی۔ یہ لوگ بھی قبر کے پاس گئے۔ قبر میں پھول، مشک، اور عنبر ڈالا گیا اور لوگوں نے اظہار غم میں کوشش کی۔ یہ دیکھ کر زید کا دل بھر آیا۔ منہ پر طمانچے مارتے تھے اور کہتے تھے: اے حسینؑ تم بے مددگار شہید ہو۔ تمہارے اہلبیتؑ قید ہوں اور کوئی تم پر نہ روئے۔ بے غسل و کفن تمہیں دفن کریں اور اس ظلم کے بعد تمہاری قبر کھودیں اور زراعت کریں اور تمہارے نور کو بجھائیں۔ حالانکہ تم فرزند علیؑ و فاطمہؑ ہو اور ایک کنیز سیاہ کے لیے اس شان و شوکت کا اظہار کیا جائے۔ جوش غم میں اس کے بعد زید اشعار پڑھنے لگے۔ جن کا مفہوم تھا کہ: قبر حسینؑ کربلا میں خراب ہو اور اولاد زنا کی قبہ مجیں تعمیر ہو۔

شاید زمانہ پلٹے اور دولت و اقبال اہل حق کو پہنچے۔ مفسدوں اور دنیا طلب بے دینوں پر خدا کی لعنت ہو۔ یہ اشعار لکھ کر زید نے متوکل کے دربان کو دیے۔ متوکل نے انھیں بلوایا اور پوچھا: یہ ابوتراب کون ہے؟ زید نے جواب دیا: تو خوب جانتا ہے۔ اور بجز منافق کے کوئی ان کا منکر نہیں ہو سکتا۔ متوکل نے ان کے قید کا حکم دیا۔ لیکن کچھ ہی دن کے بعد ملزم نفس نے ان کے توحش کے لیے اسباب پیدا کر دیے اور اس نے زید کو بلوا کر پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ حسینؑ کی قبر کی تعمیر کرا دی جائے اور کوئی زائرین سے متعرض نہ ہو۔ متوکل نے اسے قبول کیا۔ اب زید خوش خوش قریوں اور شہروں میں پھرتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ جس کا جی چاہے مرقد حسینؑ کی زیارت کرے کہ وہ امان میں ہے اب کوئی ممانعت نہیں ہے۔

شہادت کس لیے ہوئی

ایک روز حمران نے حضرت ابوجعفر سے آ کر کہا کہ حسنؑ اور حسینؑ نے خدا کی اطاعت کی لیکن وہ ہوا جو آپ جانتے ہیں۔ حضرتؑ نے فرمایا: یہ ان کے بلندی مرتبہ کے لیے تھا نہ کہ جرم گناہ سے، جیسا اور انبیاءؑ کے حال سے ظاہر ہے۔

نقلی جھگڑا

ایک روز حجاج نے عامر الشعبی کو طلب کیا۔ عامر خوف زدہ ہوئے اور اہل و عیال کو وصیت کر کے اس کے پاس گئے۔ جا کر دیکھا کہ اس کے پاس تلوار رکھی ہے اور ایک شخص زنجیروں میں جکڑا ہوا کھڑا ہے۔ عامر کو دیکھ کر حجاج نے کہا خوف نہ کر یہ شخص (سعید بن جبیر) حسینؑ کو فرزند رسولؐ کہتا ہے۔ اگر یہ قرآن سے سند نہ لائے گا تو میں اسے قتل کروں گا۔ یہ سن کر سعید نے کہنا شروع کیا: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِہٖ دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ وَاَیُّوْبَ وَیُوْسُفَ وَمُوْسٰی وَھٰرُوْنَ ؕ وَکَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ○ وَزَکَرِیَّا وَیَحْیٰی وَعِیْسٰی وَاِلْیَاسَ ؕ کُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ○ (۶: ۸۴-۸۵) اس کے بعد پوچھا کہ عیسیٰؑ کا باپ کون تھا۔ کہا باپ نہ تھے۔ کہا خدا نے عیسیٰؑ کو جانب مریمؑ سے سلک فرزندان انبیاءؑ میں قرار دیا۔ حالانکہ دو ہزار دو سو ساٹھ برس گزرے تھے۔ لیکن کیا باوجود قرب زمان حسینؑ فرزند رسولؐ نہ تھے؟ حجاج نے انھیں کچھ اشرفیاں دیں یہ بانٹتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ یہ حسینؑ کی برکت سے ملی۔

ایسا ہی واقعہ حضرت موسیٰ بن جعفر کا ہارون سے پیش آیا تھا۔ اور آپ نے متذکرہ صدر آیت کے علاوہ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَکُمْ (۳: ۶۱) تلاوت فرمائی اور اس کے بعد کہا کہ ظاہر ہے کہ مباہلہ میں بجز علیؑ و فاطمہؑ و حسنینؑ کے کوئی نہ تھا۔ حسنینؑ اَبْنَآءَنَا میں داخل ہیں۔

شہادت کا ایک نتیجہ

صاحب تاریخ الخلفا کہتے ہیں کہ ۶۳ھ میں یزید کو خبر پہنچی کہ اہل مدینہ نے اس کی خلافت سے انکار کر کے اس پر خروج کیا ہے۔ یزید نے فوراً ایک بڑا لشکر ان کی طرف روانہ کیا اور اہل مدینہ سے جنگ کرنے کا حکم دیا۔ پھر ابن زبیر سے جنگ کرنے کے لیے مکہ جانے کا حکم دیا۔ حسن بیان کرتے ہیں کہ اہل مدینہ میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اس لشکر کے ہاتھ سے پناہ میں رہا ہو۔ بہت سے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور دیگر لوگ قتل ہوئے۔ مدینہ شریف خراب کیا گیا اور بدبخت لشکریوں نے ہزار لڑکیوں کا

ازالہ بکارت کر دیا ---- اہل مدینہ کے خلع کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ یزید نے گناہوں میں بہت ہی زیادتی کی تھی۔ چنانچہ ابن غسیل نے فرمایا کہ ہم نے اس وقت تک یزید کی خلافت سے انکار نہیں کیا کہ ہمیں یقین نہ ہو گیا کہ آسمان سے پتھر برسں پڑیں گے۔ غضب ہے لوگ ماؤں بیٹیوں اور بہنوں سے نکاح کریں۔ علانیہ شراب پئیں اور نماز چھوڑ بیٹھیں۔ وہی کہتے ہیں کہ جب یزید اہل مدینہ کے ساتھ اس بدی سے پیش آیا (وہ شراب تو پیتا ہی تھا) لوگ اس سے برافروختہ ہو گئے۔ اور سب کے سب برافروختہ ہو گئے۔ اور سب کے سب اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس نے اپنا لشکر اہل مکہ سے جنگ کے لیے بھیجا۔ راستہ میں اس لشکر کا سپہ سالار مر گیا تو ایک اور سپہ سالار بنا دیا گیا۔ آخر صفر ۶۴ھ میں اس نے مکہ شریف کا محاصرہ کر دیا۔ ابن زبیر سے جدال و قتال شروع کر دیا اور منجنیق سے مارنے لگا یہاں تک کہ اس کے شعلوں سے کعبہ شریف کے پردے اور اس دنبہ کی سینگ جل گئی جو حضرت اسماعیل کا فدیہ بنا کر بھیجا گیا تھا اور جو اس زمانہ سے برابر سقف کعبہ میں رکھی چلی آتی تھی۔ اسی اثناء میں خدا نے ماہ ربیع الاول میں یزید پلید علیہ اللعنہ کو ہلاک کر دیا۔ یہ خبر مکہ شریف میں عین حالت جنگ میں پہنچی۔ ابن زبیر نے فوراً پکار دیا کہ اے اہل شام تمہارا گمراہ کنندہ مر گیا۔ یہ سنتے ہی لشکر اشرار بھاگ کھڑا ہوا۔ لوگوں نے ان کا تعاقب کیا اور ان کو خوب ذلیل و خوار کیا۔

صاحب روضۃ الصفا کے موافق مسلم بن عقبہ اہل مدینہ سے اس شرط پر یزید کی بیعت لیتا تھا کہ: "ہر تصرفیکہ امیر در اموال و اولاد شما کند شمارا مجال نہ باشد"۔ یعنی: امیر جو تصرف بھی تمہارے مال و اولاد میں کرے تمہیں اس میں کوئی مجال نہیں ہوگی۔

اور بعض یہ کہتے ہیں کہ وہ اس شرط پر بیعت لیتا تھا کہ تم یزید کے غلام بن کر رہو گے۔ (ابن ابی الحدید مثلاً)

رائٹ آنریبل سید امیر علی صاحب بالقابہ تاریخ الاسلام میں فرماتے ہیں: "اس بات (تاراجی مدینہ) سے اسلام کو کئی طرح بڑا ضعف پہنچا۔ وہ شہر جس نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پناہ دی تھی وہ شہر جو آنحضرتؐ کی زندگی اور نبوت سے سرفراز ہوتا رہا۔ وہ شہر جو مصیبت کے وقت آنحضرتؐ کے ساتھ رہا۔ اب کشت و خون اور قتل عام کا آماجگاہ بن رہا تھا۔ ایسی دہشتناک مثال کو یا تو فرانس کے سپاہیوں کی غداری اور یا پیروان لوتھر کی روم پر تاخت و تاراج کی تباہی پہنچتی ہے اور بس۔ جامع مسجد کا طویلہ بنایا گیا اور مزاریں زر و جواہر کی خاطر زمین کے برابر کی گئیں۔ یہی ظلم کی پھر فتح ہوئی اور یورپین مورخین کے قول کے مطابق اس کا دوبارہ جنم اسلام کے لیے سخت خوفناک اور تباہی بخش ثابت ہوا۔ امیہ والوں نے یہ عوض دیا اس رحم و لطف کا جو فتح اسلام کے وقت ان سے مرعی رکھا گیا تھا۔ مدینہ کے چیدہ چیدہ آدمی یا تو تیغ بے دریغ ہوئے یا جانیں بچانے کے خاطر دور دراز ممالک کی طرف بھاگ گئے۔ وہ جو بچے یزید کے غلام بننے پر مجبور کیے گئے"۔

شہادت کا دوسرا نتیجہ ○ یزید کی موت حسینؑ کے انتقام میں

یزید حضرتؑ کے بعد چند روز زندہ رہا۔ ایک روز شکار کے لیے گیا اور ہرن کے پیچھے دور دوڑ گیا۔ جہاں اس کے رفقاء نہ تھے۔ بھوک اور پیاس کی حالت میں تھا کہ اسے ایک اعرابی دکھائی دیا۔ یزید نے اس سے کہا کہ: "میں یزید بن معاویہ ہوں"۔ اعرابی نے

اُسے گالیاں دیں اور کہا: "واللہ لاقتلنک کما قتلت الحسین بن امیر المومنین"۔ یہ کہہ کر اس پر تلوار چلائی گھوڑا بھڑکا اور یزید گرا۔ سم اس کے پیٹ پر پڑا اور اس کی انتڑیاں کٹ گئیں اور وہیں مر گیا۔ (ابی مخنف)

عبداللہ بن جریر طبری کہتا ہے: "چوں یزید از کار حسینؑ پرداخت و کوفہ و بصرہ و خراسان و شرق او را صافی گشت پنداشت کہ ملک او تمام شد۔ پس از آں عبدالرحمٰن بن زبیر با حجاز و مکہ و مدینہ بسیار رنج دید۔ چنانکہ کار حسین رضی اللہ عنہ او را فراموش شد و یزید پشیمان شد از کشتن حسین"۔ یعنی: جب یزید حسینؑ کے کام سے فارغ ہو گیا اور کوفہ، بصرہ، خراسان اور شرق اس کے لیے صاف ہو گئے تو اس نے خیال کیا کہ اس کی سلطنت مکمل ہو گئی ہے۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن بن زبیر نے حجاز، مکہ اور مدینہ میں بہت تکلیف اٹھائی۔ جیسا کہ اُسے امام حسینؑ کا کام بھول گیا تھا اور یزید حسینؑ کے قتل سے پشیمان ہو گیا۔

آگے چل کر کہتا ہے: "و عبیداللہ چوں سر امام حسین رضی اللہ عنہ را فرستاد پنداشت کہ خراسان بوے بازدہد (یزید) بہ برادرش داد۔۔۔ ازیں کار بیازرد و از کشتن حسین رضی اللہ عنہ پشیمان شد و گفت کاشکے با حسین رضی اللہ عنہ بچنیں داشتے تا یزید را بمن حاجت بودے"۔ یعنی: عُبیداللہ نے جب سرِ امام حسینؑ کو یزید کے پاس بھیجا تو اس کا خیال تھا کہ خراسان اسے پھر دے دیا جائے گا۔ یزید نے اس کے بھائی کو دے دیا۔ اس کام سے وہ رنجیدہ ہوا اور قتل حسینؑ سے پشیمان ہوا اور کہا کاش میں حسینؑ کے ساتھ اس طرح سلوک رکھتا کہ یزید کو میری ضرورت رہتی۔

صاحب روضۃ الشہدا کہتا ہے: "راویان معتبر گویند کہ بعد از شہادت حسینؑ ہیچ یک از امرا و سرداران لشکر ابن زیاد سوار و پیادہ و غلام و مخدوم دمے آسائش نہ دید و آب بخوش دلی نہ خوردند و در اندک زمانے ہر یک بہ عقوبتے دیگر کہ بسبب عبرت عالمیان بود ہلاک شدند"۔ یعنی: معتبر راوی کہتے ہیں کہ شہادتِ حسینؑ کے بعد لشکر ابن زیاد کے امیروں، سرداروں، سواروں، پیادوں، غلاموں، مخدوموں میں سے کسی نے بھی لحظہ آرام نہ پایا اور خوش دلی سے پانی بھی نہ پی سکے۔ تھوڑے ہی وقت میں ہر ایک عالمیان کے لیے عبرتناک سزا سے ہلاک ہو گیا۔

جناب حسن میاں صاحب پھلواروی اپنے رسالہ "غمِ حسینؑ" میں فرماتے ہیں: بعد واقعہ کربلا اسلامی دنیا کا کیا رنگ ہو گیا وہ بھی جان لینا ضروری ہے۔ عموماً اہلِ اسلام بنی امیہ سے نفور ہو گئے اور اہلِ عراق بالخصوص اہلِ کوفہ پر ہر جگہ نفرین و ملامت ہوتی تھی۔۔۔۔ مکہ معظمہ اور مدینہ میں عموماً لوگوں نے یزید کی بیعت سے انکار کیا۔ اور عبداللہ بن زبیر پر بھی اس واقعہ کا بڑا اثر پڑا۔۔۔۔ لوگوں نے ان سے بیعتِ خلافت شروع کر دی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ان کی بیعت نہ کی تھی۔ یزید کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو اس نے خط لکھا کہ تم نے ملحد ابن زبیر کی بیعت نہ کی اور میری خصوصیت کا خیال کیا۔ ہم آپ کے بہت ممنون و مشکور ہیں اور آپ کے صلہ رحمی کے حقوق کو کبھی بھولنے والے نہیں ہیں۔ اور آپ سے امید ہے کہ لوگوں کو میری طرف مائل کریں گے۔ اور ابن زبیر کی طرف سے دلوں کو پھیر دیں گے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے جو اس خط کا جواب دیا اس میں امام مظلوم کی شہادت کا ذکر کیا اور ظاہر کر دیا کہ اس واقعہ کے بعد ممکن نہیں ہے کہ ہم لوگ تیری جانب سے کبھی کوئی امید رکھیں۔۔۔ (سو برس کے اندر) سفاح عباسی نے ان اشرار بنی امیہ کو بیخ و بن سے کھود کر پھینک دیا اور ہزار ہا بنی امیہ و بنی مروان و عبدالملک و ولید وغیرہم کی قبریں کھود کر ان کی لاش اور ہڈیاں تک جلائی گئیں۔

سلیمانؓ بن صرد الخزاعی

ادھر کوفہ و عراق میں ان شیعوں کو جنھوں نے امام کو بلایا تھا اور پھر مدد نہ کی تھی۔ ادھر ادھر ٹل گئے تھے، روپوش ہو گئے تھے، سخت ندامت ہوئی۔ بیچ کثیر کر کے بہت روئے پیٹے اور سلیمان بن صرد خزاعی جو مرد ضعیف اور صحابی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے اس گروہ کے پیشوا قرار پائے اور یہ امر طے ہو گیا کہ اس گناہ کا کوئی کفارہ نہیں ہو سکتا بجز اس کے کہ ہم لوگ ان کے قاتلین سے بدلہ لیں اور خود بھی ہلاک ہو جائیں۔ اور آخر پانچ ہزار کی جمعیت کر کے آہ واویلا کرتے ہوئے یا ثارات الحسینؑ کہتے ہوئے کوفہ سے باہر چلے سرزمین کربلا گئے اور ان شہیدوں کے غم میں آنسوؤں کے دریا بہا دیے اور ضریح مبارک سے لپٹ لپٹ کر چیخ چیخ کر روئے اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے تھے۔ تین دن تک بے آب و دانہ وہیں سب کے سب رہے۔ پھر یا ثارات الحسینؑ کا نعرہ کرتے ہوئے ملک شام کی طرف بڑھے۔ ادھر سے شقی ابن زیاد نے فوج بھیجی۔ یہ جاں نثار خوب لڑے اور راہ خدا میں اپنی جانیں تصدق کیا کیے۔ کچھ لوگ بچ کر آئے اور مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کی فوج سے جا ملے۔ اور قاتلین اہل بیتؑ کے درپے ہوئے۔ شمر ملعون، خولی بن یزید، حرملہ، عمر بن سعد، عبیداللہ بن اسد الجہنی، مالک بن نسیر الکندی، حمل بن مالک المحاربی، زیاد بن مالک الضبعی، عمران بن خالد القسری، عبدالرحمٰن خشکارہ البجلی، عبداللہ بن قیس الخولانی، عبدالرحمٰن بن طلحہ، عبداللہ بن وہب الہمدانی، عثمان بن خالد الجہنی، ابوالسما بشر بن سمیط، عمر بن حجاج الزبیدی، حکیم بن الطفیل الطائی، عمر بن صبیح الصدائی سب کے سب بری طرح سے مارے گئے۔ پھر فوج آگے بڑھی اور ابراہیم بن مالک اشتر سپہ سالار تھے۔ موصل کے قریب ابن زیاد بد نہاد بھی فوج جرار لے کر پہنچا اور سخت لڑائی کے بعد وہ شقی بھی مارا گیا۔ اور اس کی فوج بھاگ گئی۔ یا ماری گئی۔ اور اس کا سر کوفہ میں مختار کے پاس آیا۔ اور پھر اور اشقیا کے سر کے ساتھ مکہ معظمہ حضرت محمد ابن حنفیہ کے پاس گیا۔ پھر مدینہ طیبہ میں بھیجا گیا۔

متذکرہ مندرجہ واقعات میں سے اکثر ان شاید دوں میں مناسب تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ ان سے میری غرض یہ ہے کہ حضرتؑ کے شہید کرنے کے بعد ان کے قاتلوں کے یہ خیال غلط ثابت ہوئے کہ وہ بڑے راحت و آرام سے بسر کریں گے۔ سلیمان بن صرد اور ان کے رفقا کا جوش انتقام بجز جوش انتقام کے اور کسی نیت سے نہ تھا اور اس کا یہ ارادہ تھا کہ ہم قاتلان امامؑ کو نیست و نابود کر دیں۔ ہمارے پاس کچھ ہی سامان کیوں نہ ہو اور خود ہمارا کوئی نتیجہ کیوں نہ ہو۔ ابن صرد نے کئی برس کوشش کی۔ ان کی کوشش اگر پوری کامیاب ہوتی تو غالباً بنی امیہ فوراً نہیں تو ان کی کوششوں کے چند سال کے اندر ہی اپنی ثروت و اقتدار سے علیحدہ کر دیے جاتے۔ لیکن اگر ابن صرد کے جانباز رفقا یہ نہیں کر سکے (کامل طور پر) تو ان کی تعریف یہ ہے کہ انھوں نے انتقام کا قرنا پہلے پھونکا اور سولہ ہزار آدمیوں کا کم سے کم تیس ہزار آدمیوں سے لڑنا اور ان میں سے اکثر کو موت سے ہم بغل کر دینا تھوڑی بات نہ تھی۔ حالانکہ دشمن کے پاس متواتر امداد پہنچ رہی تھی۔ یہ اس وقت واپس گئے جب انھوں نے دیکھا کہ اب ہمارے پاس اتنے آدمی نہیں ہیں جو مقابلہ کر سکیں۔ اور اب لڑے تو گویا حسینؑ کے دوست تمام ہو جائیں گے۔ نہایت صحیح فیصلہ تھا لیکن اگر فیصلہ کی یہ قوت ابتدا ہی سے ہوتی اور افسروں نے اپنے کو تلواروں میں اس لیے نہ جھونک دیا ہوتا کہ اگر ہم زندہ رہیں گے تو پھر لوگوں کو جمع کر کے اپنا کام جاری رکھیں گے تو غالباً زیادہ کامیابی ہوتی اور ایک فوری تسکین کے مقابلہ میں دیرپا نفع ہو سکتا۔

مختار ابن ابوعبیدہ ثقفی

لیکن آگ لگ چکی تھی اور وہ حیرت خیز انسان ان واقعات کو سن چکا تھا اور پیشتر سے ایسی ہی کوشش کے لیے موقع درست کر رہا تھا جس کا نام مختار ابن ابوعبیدہ ثقفی ہے اور خوش قسمتی سے اسے فولادی ارادہ کا فرزند ابراہیم مل گیا اور جس حد تک کوشش ممکن تھی دشمنان حسینؑ کی تلاش اور قتل میں وہ اٹھا نہ رکھی گئی یہاں تک کہ کوئی اس بات کا کہنے والا نہ رہا کہ ہم بھی میدان کربلا میں شریک تھے۔

مقتولین سے زیادہ پانی میں ڈوب کر مرے

ابن زیاد اور ابراہیم کی جنگ میں ایک حیرت خیز امر یہ تھا کہ رفقائے ابن زیاد جس قدر مارے گئے، اس سے زیادہ دریا میں ڈوب کر مرے۔

حضرتؑ کی پیشین گوئی

انتقام پورا ہو گیا اس مفہوم میں کہ حسینؑ کے قاتل نیست و نابود ہو گئے اور اسلام کے سب سے بڑے دشمنوں کا خاتمہ ہو گیا لیکن ان چند سطروں کے لکھنے سے جہاں میری غرض یہ ہے کہ ہر بڑی شہادت کے بعد ویسا ہی عظیم الشان انقلاب ہوا کیا ہے، وہاں حضرتؑ کے ان فقرات کا واقعات سے نہایت مختصر ترجمہ کرنا ہے کہ بنی امیہ اس طرح تباہ ہوں گے کہ ان میں آپس میں نفاق اور جنگ ہوگی اور ایک مضبوط قوم ان کو نیست و نابود کر دے گی۔

ابن صرد اور مختار کی کوشش جس میں ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب بنی امیہ مارے گئے بنی امیہ کی تباہی کا سنگ بنیاد تھا۔ ابن زبیر کی خواہشیں جو کچھ بھی ہوں لیکن ان کی دعوت کا ایک عنصر یہ بھی تھا کہ وہ حضرت خامس آل عبا کا انتقام لے رہے ہیں۔ ان کے رفقاء نے بھی بے انتہا بنی امیہ کو قتل کیا اور پھر اس کے بعد بکثرت وہ حیلے ملنے لگیں کہ کیونکر حصول ثروت و اقتدار کے لیے بنی امیہ آپس میں وہ کل ملکی چالیں کام میں لاتے ہیں جو انھیں اپنے حوصلوں میں مدد دے سکے۔ (ترجمہ ابن خلدون کتاب ثانی جلد پنجم واقعات شہادت حسینؑ کے بعد سے ان واقعات سے لبریز ہے) حتیٰ کہ یہ حیرت خیز مثال بھی سامنے آتی ہے کہ حصین بن نمیر حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے خلافت قبول کر لینے کی استدعا کرتا ہے۔ (طبری) یا خود ابن زبیر کو حصول خلافت کے لیے شام چلنے کی صلاح دیتا ہے۔ ایسے دو اموی رکن جیسے مروان اور ضحاک بن قیس تھے آپس میں بیس دن تک ۶۰ ہزار اور تیس ہزار فوجیں لے کر جنگ کرتے ہیں۔ مروان کی فوج اور گورنر مصر کی فوجوں میں جنگ ہوتی ہے۔ مروان بستر خلافت پر مارا جاتا ہے۔ ایران میں سلیمان ابن مرثد اور بنو تمیم کی لڑائیاں، اوس بن ثعلبہ اور عبداللہ بن خازم کی نبرد آزمائیاں اس کی مثالیں ہیں کہ کیونکر بنی امیہ اپنے کو اپنے ہاتھ سے قتل کر رہے تھے۔ اور پھر وہ سخت اور بڑی لڑائیاں شروع ہوتی ہیں۔ جو یزید بن مہلب اور یزید بن عبدالملک سے ہوئیں جن میں یزید اعلان کرتا ہے کہ اہل شام سے جنگ کرنا ترک و دیلم کی جنگ سے افضل ہے۔ غیر مسلمین سے جنگ ہو رہی ہے لیکن سورہ بن ابجر اور جنان سلمی بھی آپس میں تلوار آزما رہے ہیں۔ عبدالملک بن مروان اور عمر بن سعید الاشدق کی سیاسی ردو بدل اور اشدق کا قتل، عبدالرحمن بن محمد بن اشعث اور حجاج کی خونریز لڑائیوں میں عبدالرحمن بن ربیعہ بن عبدالمطلب کو موقع ملتا ہے کہ محمد بن اشعث کی فوجوں کی امامت کرائیں اور ہزیمت یافتہ فوجیں ان کے پاس جمع ہو گئیں۔ عبدالملک بن مروان کا

اپنے لڑکے کو اور عبدالعزیز بن مروان کا اپنے لڑکے کو خلیفہ بنانے کی کوشش کرنا۔ عبدالملک بن مروان جو خلیفہ ہو کر قرآن مجید سے کہتا ہے کہ اب تیری ملاقات قیامت تک گئی۔ وہ حجاج کے ایسے دشمن انسانیت کو اپنے بعد بھی خلق اللہ پر اس لیے قائم رکھنے کی وصیت کرتا ہے کہ اس نے اسے خلافت پر قائم رکھنے کے لیے منبروں کو پامال کیا۔ اور پھر سلیمان بن عبدالملک اس طرح اس سے انتقام لیتا ہے کہ حجاج کے دشمن یزید بن مہلب کو گورنر بناتا ہے جو حجاج کی اولاد سے انتقام لیتا ہے۔ قتیبہ خلیفہ کو اس لیے دھمکی دیتا ہے کہ اگر تم مجھے خلیفہ نہ کرو گے تو تمہیں معزول کر دوں گا۔ بنی امیہ اپنے سب سے اچھے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کو اس لیے زہر دیتے ہیں کہ وہ ظلم سے منع کرتا تھا۔ نصر بن سیار اور عمر بن قتیبہ بن مسلم کی جنگ جلیہ اور حاسم کی عداوتیں اور ایک دوسرے کو ایذا رسانیاں۔ غرض کہ یہ سب ایک طرف ہو رہا تھا۔ اور ابھی ۱۰۰ھ نہ شروع ہوا تھا کہ محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس کے دعاۃ کوفہ و خراسان میں پھرنے لگے۔ اور چونکہ یہ دعاۃ نہایت خاموشی سے کام کرتے تھے، اور زیادہ تعداد میں تھے یہ لوگوں کے قلوب کو بنی امیہ سے پھیرنے، آلِ رسالت اور بنی عباس سے محبت پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ خراسان کے نامی سردار اشد بن حرث بن شریح نے ۱۱۶ھ میں سیاہ کپڑے پہنے لوگوں کو اتباع کتاب اللہ و سنت رسول اور بیعت امام رضا کی دعوت دینے لگا اور بنی امیہ کا تھوڑا نقصان نہ کیا۔ اور ۱۲۲ھ میں حضرت زید بن علی نے تھوڑے لوگوں کے ساتھ جس طرح بنی امیہ کے کثیر آدمیوں کو قتل کر کے شہادت حاصل کی اس نے ثابت کر دیا کہ سادات کی شجاعت باوجود خاموشی کے ان سے علیحدہ نہیں ہوئی ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ غالباً حضرت زید شہید ہی کا یہ فقرہ تھا کہ: "وہ قوم ذلیل ہوتی ہے جو تلوار کی باڑھ سے ڈر جاتی ہے"۔ اور اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا ہے تو اصول بھی اب تک فراموش نہیں ہوا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۳۲ھ میں مختار کے ایسے دو حیرت خیز شخص سامنے آئے جن کا نام ابوسلمہ (جن کا خطاب وزیر آلِ محمد تھا) اور ابو مسلم خراسانی ہے۔ یہ دونوں شخص چاہتے تھے کہ خلافت آل ابی طالب میں جائے۔ لیکن امام وقت کے قبول نہ کرنے سے یہ بنی عباس ہی کے لیے کوشش کرتے رہے۔ ابو مسلم کو سفاح نے قتل ہی اس لیے کیا کہ وہ آل ابی طالب کا دوست تھا۔ یہ تھے جنہوں نے بنی امیہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تباہ کر دیا اور پیشین گوئی پوری ہوئی۔

میں نے متذکرہ صدر سطروں میں واقعات کے صرف نام لے دیے ہیں لیکن یہ واقعات یا اور جو کچھ پہلے بیان ہوئے ان کے ساتھ بے انصافی ہے کہ قصر فکر کے حوالہ کیے جائیں۔ بنا بریں میں اس خیال سے خالی نہیں ہوں کہ ان کے ساتھ کافی انصاف ہو سکے گا اگر میں اسے کتاب کی شکل میں پیش کروں۔ اور یہ شہید اعظم حصہ سوم ہو۔ لیکن میں اپنی محنت کے لیے قوم کے میلان کا منتظر رہوں گا۔ اگر اس کے لیے عام خواہش مجھ سے کی گئی تو بشرط توفیق الٰہی اس کا تیار ہو جانا میرے لیے نسبتاً آسان ہوگا اور یہ تتمۂ شہادت حسینؑ ہوگا۔

ابن بابویہ علیہ الرحمۃ نے کتاب عیون اخبار رضاؑ میں ابوالصلت ہروی سے روایت کی ہے کہ کوفہ میں ایک جماعت کہتی ہے کہ حسینؑ بن علیؑ قتل نہیں ہوئے۔ خدا نے حنظلہ بن سعد شامی کو حضرتؑ کی صورت میں بنا دیا اور ان کو عیسیٰ ابن مریم کی طرح آسمان پر بلا لیا اور وہ لوگ اس آیت کو دلیل میں لاتے ہیں کہ وَلَن يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا

(س: ۱۴۱) (حق تعالیٰ کافروں کو مومنوں پر تسلّط نہیں دیتا) فرمایا (حضرت علیؑ رضا نے) جھوٹ کہتے ہیں۔ غضب نازل ہو ان پر۔ وہ لوگ کافر ہوئے بسبب تکذیب کرنے پیغمبر خدا کے کہ حضرتؐ نے قتل حسینؑ کی خبر دی۔ قسم بخدا حسینؑ قتل ہوئے اور قتل ہوا وہ شخص جو حسینؑ سے بہتر تھا یعنی علیؑ بن ابی طالب۔ اور مراد حق تعالیٰ اس آیہ میں یہ ہے کہ مومنوں پر کفار کی کوئی حجت نہیں ہے۔ اور وہ کیونکر ہو سکتی ہے اس لیے کہ حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں خبر دی ہے کہ کافروں نے اکثر پیغمبروں کو ناحق قتل کیا لیکن باوجود قتل کرنے کے حجت پیغمبروں کی ان پر غالب تھی اور حقیقت ظاہر تھی۔

کتاب اکمال الدین و احتجاج وغیرہ میں محمد بن ابراہیم بن اسحاق طالقانی سے روایت ہے کہ میں ایک دن شیخ ابوالقاسم حسین بن روح قدس اللہ روحہ کہ نائب جناب صاحب الامر علیہ السّلام تھے مع ایک جماعت کے بیٹھا تھا اور علی بن عیسیٰ قصری بھی ان میں تھا۔ ناگاہ ایک شخص ان میں سے اٹھ کر کہنے لگا:

شخص : "ایک مسئلہ تم سے پوچھتا ہوں"۔

حسین بن روح : "پوچھو!"۔

شخص : "آیا حسینؑ بن علیؑ ولی خدا ہیں؟"۔

حسین بن روح : "بے شک"۔

شخص : "قاتل ان جناب کا دشمن خدا ہے یا نہیں؟"۔

حسین بن روح : "بے شک"۔

شخص : "آیا جائز ہے کہ حق تعالیٰ اپنے دشمنوں کو اپنے دوست پر مسلط کرے"۔

حسین بن روح : "آگاہ ہو کہ حق تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتے اور سب آدمی کلام خدا کو بے واسطہ نہیں سن سکتے اور نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن جناب مقدس ان کے لیے ایک رسول ان کی جنس اور صنف سے بھیجتا ہے کہ مثل ان کے ہو اس لیے کہ اگر رسول ان کی صورت نہ ہوتا اور غیر جنس سے ہوتا تو ہر آئینہ یہ اس سے نفرت کرتے اور اس کے کہنے کو قبول نہ کرتے۔ اور جس وقت ان کی جنس سے تھے، کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں پھرتے تھے تو کہنے لگے تم بھی مثل ہمارے ہو ہم تمہارے کہنے کو قبول نہ کریں گے، جب تک کوئی ایسی چیز نہ لاؤ کہ ہم اس فعل سے عاجز ہوں اور ہم اس پر قادر نہ ہوں۔ اور جانیں کہ حق تعالیٰ نے اپنی رسالت اور ہدایت کے لیے تم کو مخصوص کیا ہے۔ اس وقت حق تعالیٰ نے رسولوں سے ایسے معجزات مقرر فرمائے کہ تمام مخلوقات ان کے بجالانے سے عاجز تھی۔ بعض پیغمبر نذر لائے اور تخویف اُمت کے لیے طوفان لائے ۔۔۔ جب رسول ایسے معجزے لائے اور ان کی اُمت بجالانے سے عاجز ہوئی حق تعالیٰ نے اپنے لطف و مہربانی اور حکمت کاملہ سے پیغمبروں کو باوجود ان سب معجزات کے کبھی غالب کبھی مغلوب کبھی مقہور کیا۔ اس واسطے کہ اگر پیغمبر باوجود معجزات اور خوارق عادات کے ہر حال میں غالب اور قاہر رہتے اور بلا و مصیبت میں امتحان نہ کیے جاتے تو ہر آئینہ لوگ انھیں خدا جاننے لگتے اور خصلت ان کے صبر کی بلا و مصیبت میں لوگوں کو نہ معلوم ہوتی۔ لیکن حق تعالیٰ نے ان امور میں پیغمبروں کے احوال کو مثل اوروں کے رکھا۔ اس لیے کہ محنت و بلا میں صبر کریں اور عافیت میں شکر کریں اور ہر حال میں تواضع اور فروتنی کریں۔ تکبر اور تجبر نہ کریں۔ لوگ جانیں کہ ان کے لیے ایک خدا ہے کہ وہ خالق و مالک سب ہے۔ اس کی

عبادت کریں اور محبت خدا کی تمام ہو اس شخص پہ جو حدود خدا سے ان کے باب میں نکل جاوے اور دعویٰ ان کی خدائی کا کرے، یا عداوت و مخالفت اور نافرمانی ان کی کرے اور جو پیغام خدا کی طرف سے لاتے ہیں اس کا انکار کرے۔ تاآنکہ جو ہلاک ہو بعد اتمام محبت کے ہلاک ہو اور جو نجات پائے بہ دلیل و برہان نجات پائے۔

حسینؑ علیہ السلام کا مرثیہ

قریب قریب ان کل زبانوں میں جو مسلمانوں میں مستعمل ہیں حضرتؑ شہید کربلا کے مرثیے پائے جاتے ہیں (انگریزی اور بنگلہ میں بھی ہیں) اور ہر ایک نے اپنے جوش میں اس عبرت خیز واقعہ کو اپنی وسعت نظر اور درجہ جذبات کے موافق نظم کیا ہے۔ اگر شاعری کے ایک معنی اظہار جذبات ہے (عام اس سے کہ خوبصورتی کا کیسا ہی درجہ کیوں نہ ہو) جو ہمیشہ شاعر کی وسعت نظر اور درجہ معلومات بلکہ اس کی ساخت پر موقوف رہے گا اور عربی النسل قومیں اپنے جذبات کے لیے ممتاز ہیں، تو مجھے عربی شاعری پر پہلا لحاظ کرنا پڑے گا عربی شاعری پر سب سے پہلے نظر کرنے کی ایک یہ وجہ بھی ہے کہ حضرتؑ عرب تھے، قاتل عرب تھے۔ جذبات عربی تھے۔ زمین و آسمان عرب تھے۔ ان اتفاقات میں عربی ہی اس کے لیے موزوں ہے کہ وہ واقعات اور جذبات محبت و غم کی مصوری کرے۔

اوپر کے فقرات سے غالباً اس کی یہ حد بندی ہوتی ہوگی کہ میں عربی زبان کے علاوہ مراثی کو عزت کی نظر سے نہیں دیکھ رہا ہوں، بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ جو فطری مواقع اس خاص امر میں عربی شاعری کو حاصل تھے وہ دوسری زبان کو حاصل نہ تھے۔ چشم دید گواہ اور سنے ہوئے راوی کا فرق تھا جو ہر چیز راوی سے قرض لیتا ہے۔ ورنہ فارسی زبان کی خوبصورتی اور حسن ادا بلکہ اکثر اوقات شاعر کے خلاصہ کے موافق اظہار قوت میں بھی نہیں ہے۔ پھر بھی عربی شاعری زیادہ تر واقعاتی شاعری ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں غالباً فارسی زبان کی شاعری ان حدود میں زیادہ ڈوب گئی۔ جسے عروض کی پست خصوصیات کہیں۔ اس سے میرا مطلب یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان میں فردوسی کا ایسا عذر لانے تھی، سعدی کا ایسا اخلاقی شاعر، حافظ کا ایسا خوبصورت گو، عرفی کا ایسا قصیدہ مرثیہ پینے والا نہ تھا، یا محتشم کاشی اور ملا محتشم کا ایسا کوئی مرثیہ گو نہ تھا۔ نہیں بلکہ فارسی شاعری کی خوب صورتیوں کے ساتھ قاآنی کا ایسا قادر الکلام بھی پیدا ہوا جس نے بہت کچھ فطری شاعری بھی داخل کر دی۔ ایک لفظ اپنی زبان کے لیے میری غرض اردو سے ہے۔ اردو یعنی وہ زبان جس کے الفاظ میں نے دنیا میں پہلے سنے جس میں میری ماں نے مجھے کھلایا، جس کے الفاظ پیارے میرے منہ میں دیے گئے جس وقت میں بولتا نہ تھا اور جس میں مجھ سے ہر اس شخص نے بات کی جسے مجھ سے محبت تھی۔ زبان جس نے مجھے بنایا۔ میں جیسا بھی ہوں (مولف انسانی خیالات کے نشوونما پر زبان کے درجہ کے اثر کے متعلق یہاں کچھ زیادہ نہیں کہہ رہا ہے) میر، انشاء، سودا، مومن، غالب، انیس، آتش، میر عشق، اور صحیح وغیرہ کی تعلیم جن میں کوئی فلسفی کا ایسا حسین۔ کوئی نسیم سحر کا ایسا نازک ادا، کسی میں مردوں کی سی سختی اور کسی میں محبت کی اثر خیز لچک تھی اور کوئی پانی کا سا صاف تھا، زبان اور اظہار خیال میں دیکھنے کی پہلی چیز یعنی "قوت" کے آثار بھی کم و بیش معدوم نہیں ہیں اور اگر سب نہیں تو بعض نے اپنے الفاظ میں بلند شان پیدا کی ہے۔ لیکن مجھے شاعری کی عام حیثیت سے اس جگہ بحث نہیں جب بلکہ ایک خاص حیثیت یعنی مرثیہ سے ہے۔ اور میرا معیار یہ نہ ہوگا کہ کوئی کہاں تک مبالغہ کر سکتا

ہے۔ یا بے معنی مضمون آفرینی میں کہاں تک ملکہ حاصل کیا ہے۔ یا مضمون کی افراط نے مرثیت معدوم کر دی ہے۔ یا رعایت لفظی اور مبالغہ کس حد تک ہے۔ بلکہ سچائی کی ایسی کھری جسے سن کر دل اقرار کرے کہ یہ واقعہ ہے۔ استعارہ اور تشبیہ کی لطیف شان، شعر پڑھ کر معلوم ہو کہ یہ شخص نہ صرف واقعات سے واقف ہے بلکہ وہ اس کے غور کا نتیجہ ہے۔ جذبات کا اظہار اس طرح نہیں جس سے معلوم ہو کہ وہ ہماری رقت یا نرمی سے کھیل رہا ہے۔ اور پھر اس کے بعد سب سے بڑی ضروری چیز خاصہ نگاری ہے۔ شاعر اگر محض مسدس یا قصیدہ یا رباعی گڑھ سکا اور وہ مصور نہ ہوا تو وہ ایک معمار ہے جو بغیر نقشہ کے کچھ بناتا جاتا ہے جو کچھ بھی بن جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسی محنت بغیر کسی طے شدہ نظام کے کیسی غیر مرتب ہوگی۔ صنعت بغیر شعور اور نظم کے اور نظم بغیر صنعت کے کبھی تعمیر کے اعلیٰ درجہ پر نہیں پہنچ سکتی۔ میرے ان فقرات سے ظاہر ہوگا کہ میں شاعری کے کس درجہ کا متمنی ہوں۔ میں ایک حد تک اپنے زمانہ کے شعرا اور مرثیہ گویوں کے کلام سے واقف ہوں اور ان میں ایسے ہیں جو کسی زبان کے لیے قابل داد ہوں۔ میں اپنے زمانہ کے شعرا سے امید کروں گا کہ وہ آئندہ کے لیے ایک ترقی خیز نظام اور اصول قائم کریں گے۔ اور اسلام کے نفوس قدسیہ کی مدح اور مرثیہ میں متذکرہ صدر نکات کا لازمی لحاظ کیا جائے گا۔ وقت جا چکا کہ عوج بن عنق کی جسامت اور ہاتھی گھوڑے کی غیر ضروری مصوری میں کیسی دل چسپی کی امید کی جائے۔ لیکن مجھے اپنی زبان کی مرثیہ گوئی سے ابھی خطاب باقی ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کا اندازہ کیا جائے اور وہ یہ ہے کہ ہمارے ایک قومی شغل یعنی مجلس کے عناصر میں شاعری کو ایک دخل حاصل ہے۔ اور چونکہ مجلس کو ایک وہ انسٹی ٹیوشن ہونا چاہیے جو قومی حیثیت سے مفید ہو۔ میں اپنے اس جلسہ کی صحیح حیثیت کا لحاظ لازمی ہے۔ جو اثر مجلس کا ہماری قوم پر ہے۔ اگر اس میں کسی کا غیر صحیح میلان یا اس قومی عنصر نظم کا غلط اندازہ شامل ہے تو قوم کو بازپرس اور اصلاح کا حق حاصل ہے۔ ہماری مجلس عزا حسینؑ کے واقعات عظیم کے تذکرہ کی جگہ ہے۔ حسینؑ کے واقعات میں قوم گری اور خصائل سازی کی پوری صلاحیت ہے۔ اس لیے کوئی ترکیب یا نوعیت جو اس میں مدد دیتی ہے وہ ہماری پسندیدگی کے قابل اور کوئی نوعیت جو اس معیار پر پوری نہیں اترتی ہمارے لیے نظر ثانی کی چیز ہے۔ یاد رکھو کہ ہم کسی شاعر کو مجلس میں اس کی شخصی قابلیت کی داد نہیں دینے جاتے جو مجلس حسینؑ کے مفہوم کے خلاف ہے۔ بلکہ اس لیے کہ ہم دیکھیں کہ حسینؑ اور واقعات حسینؑ کو شاعر کہاں تک سمجھا اور سمجھا سکا ہے۔ اور اس کی اس مخصوص کوشش کی کامیابی میں اس کی ضمنی داد ہے۔ ہم ایک نفس عظیم کے خصائل سے اثر لینے جاتے ہیں اور ہم ان صحیح اثرات پیدا ہونے دے سکتے ہیں نہ کہ اس کے برخلاف۔ اس کے برخلاف اگر کوئی ہمارے حسینؑ کی مجلس کو کسی اور طرح صرف کرنا چاہتا ہے تو وہ نہ صرف ایک مستقل کی نوعیت تبدیل کر رہا ہے، بلکہ ہمارے قومی فوائد کو روک رہا ہے۔ اور اس میں ناقص یا غیر متعلق چیزیں شامل کرتا ہے۔

ہمارے مراثی کی صورت میں رخصت، اور شادی بیاہ کی امید اور پھر یاس کو بہت کچھ دخل ہے۔ اور پھر شہادت کے بعد بین ایک نتیجہ ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ رخصت میں عورتوں کی نرم دلی اور ماں کے حوصلوں کی بڑی گنجائش ہے۔ اب میں یہ کہتا ہوں کہ میں اس کا مخالف نہیں ہوں کہ جذبہ غم میں ہیجان پیدا نہ کیا جائے۔ لیکن جذبہ غم کی ایسی مصوری سے جو زیر ذکر خصائل کے بجائے میں غلطی کرتے ہوں۔ میں اسے اس سے بہتر فقروں میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ بیبیاں جو شہدائے کربلا کی مائیں، بہنیں اور بیبیاں ہو سکتیں خصائل نگاری میں انصاف کی خواہاں ہیں۔ جذبہ غم کے ہیجان کے معنی یہی نہیں ہیں کہ

کوئی شخص بدحواسی سے چیخیں مار کر روئے۔ بلکہ اظہار غم کے موقع اور بے چینی کے وقت صبر ہی سب سے بڑا مرثیہ ہے۔ اس شاخ میں جو کچھ ہوا میرے نزدیک قوم پر اس کی خصائل سازی میں بہ نسبت اچھے کے پست تر اثر ہوا۔ اس لیے کہ طبقہ اناث کا مثالیہ زیادہ بلندی کا محتاج تھا اور اس وجہ سے قوم میں بہ نسبت گوارا نرمی کے بے احتیاط نرمی پیدا ہوئی۔ یہ عام مفہوم میں عورتوں کا سا رونا کہا جائے نہ ان کا ایسا جیسے کربلا کی مخدرات تھیں۔

آئندہ میرے متذکرہ صدر ریمارک کے متعلق کسی حیثیت کی غلط فہمی نہ پیدا ہونے کے لیے کہتا ہوں کہ اس میں کسی ایسے خیال کی گنجائش نہیں ہے کہ میں کسی یا کل مرثیہ گویوں کی کوشش کو خفت کے حوالہ کر رہا ہوں۔ یا چونکہ میں نے یہ چند کے بہت سے نام نہیں لیے ہیں اس لیے میرے نزدیک ان کی کوئی قدر نہیں ہے جن کا نام میں نے نہیں لیا یا کسی سے باوجود ان باتوں کے پائے جانے کے اعراض کر رہا ہوں۔ نہیں۔ تمام تعظیم ان کے لیے جنھوں نے کوششیں کیں۔ میری کتاب اور میرے نزدیک انیسیے اور دبیریے کی ایسی کوئی جنگ نہیں ہے۔ میں کسی شخص سے بحث نہیں کر رہا ہوں بلکہ اصول سے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ میں حسینؑ کا سوانح نویس ہوں نہ کہ کسی شاعر کا۔ سوانح نویس، مداح یا نقاد۔ اور اس لیے حسینؑ کی ذات مقدس کے متعلق کسی کوشش کو شخص کی عام حیثیت سے نہیں دیکھ رہا ہوں بلکہ اس کی اس مخصوص حیثیت سے۔ مجھ سے یہ بھی امید نہ کی جائے کہ میں ذکر حسینؑ کی عظمت کو نرمی اور رعایت سے غیر شایان ہاتھوں میں دیکھ کر اعتراف کروں گا۔

خیر تو میں مختصر اشارے کر چکا جو کچھ مجھے کہنا تھا۔ اب میں بعض کے اشعار اور بعض کا مفہوم پیش کرتا ہوں۔ (مؤلف کو یاد آتا ہے کہ ناسخ التواریخ میں حضرتؑ کا عربی مرثیہ کافی حد تک جمع کیا گیا ہے۔ مولوی سید محمد ہارون صاحب زنگی پوری نے بھی شہید اسلام میں جمع فرمایا ہے) میں نے اپنے نوٹ میں طوالت کے لحاظ سے اشعار نہیں نوٹ کیے۔ بلکہ صرف ان کا مفہوم۔ اس لیے میں الزام کا مورد نہ قرار دیا جاؤں۔ میری غرض یہ ہے اور بس کہ میں مرثیت کا مفہوم لکھوں۔ جو کتابیں میرے پاس ہیں ان میں سے بعض اشعار بھی نوٹ کر دوں گا۔

موقع کے لحاظ سے میں اس کے پہلے اشعار درج کر چکا ہوں۔ وہ حضرتؑ سید الشہدا کے ہوں، اہل بیتؑ طہارت کے ہوں یا شعرا کے جو میری غرض پوری طرح نبھاتے ہیں۔

ابن قتہ

مررت علی ابیاتِ اٰل محمدٍ فلم ارھا امثالھا یوم حلت

میرا گزر ہوا آل محمد کے گھروں کی طرف تو میں نے اس دن کا ایسا نہیں دیکھا جس دن آیا تھا

فلا یبعد اللہ الدیار و اھلھا و ان اصبحت منھم بزعم تخلت

خدا کسی کو اس کے شہر سے جدا نہ کرے اگرچہ وہ دشمنوں کے گمان میں خالی ہو گئے ہوں

الا ان قتل الطف من اٰل ھاشم اذلت رقاب المسلمین فذلت

آگاہ ہو کہ کربلا میں آل ہاشم کے قتل نے مسلمانوں کی گردنوں کو شرم سے نیچا کر دیا

امام زین العابدین علیہ السلام

ان الزمان الذی قد کان یضحکنا بقربہم صار بالتفریق یبکینا

وہی زمانہ جو کبھی ان (مجھڑ عزیزوں کے) قرب سے ہم کو خوش کرتا تھا اب ان کے فراق سے ہم کو رلا رہا ہے

خلت لفقدھم ایامنا فغدت سودا و کانت بہم بیضا لیالینا

ان کی جدائی سے ہمارے دن سیاہ ہوگئے حالانکہ (ان کی موجودگی میں) ہماری راتیں بھی نورانی تھیں

فہل تری الدار بعد البعد آنسۃ ام ھل یعود کما قد کان نادینا

کیا ان کے فراق کے بعد تو گھر کو آباد پائے گا یا جس طرح پہلے ہم کو بلانے والا بلاتا تھا اس طرح پھر بلائے گا

ترفقو بفوادی فی ھوادجکم فقدتہ یوم راحت من اراضینا

اپنے ہودجوں میں میرے دل کے ساتھ نرمی کرو جو اس روز سے گم ہے جب وہ ہماری سرزمین سے کوچ کرگئے

فوالذی حجت الرکبان کعبتہ و من الیہ المطایا الکل ساعینا

قسم ہے اس ذات کی جس کے کعبہ کا حج کرنے کے لیے سوار جاتے ہیں اور جس کی طرف تمام سواریاں دوڑتی ہیں

امام صنبری

و بریحانتین طیبہما منک الذی اودعتہا الزہراء

(یا رسول اللہ) میں آپ کے آپکے ریحانتین کا واسطہ دیتا ہوں جن کی خوشبو آپ سے تھی اور جو حضرت فاطمۃ زہرا کے سپرد کیے گئے تھے

کنت تؤویہما الیک کما أ وت من الخط نقطتیہا الیاء

آپ کو اس طرح اپنے سے لگائے رکھتے تھے جس طرح حرف یاء کا خط کشیدہ اپنے دونوں نقطوں کو پناہ میں رکھتا ہے

من شہیدین لیس ینسینی الطف مصابیہما و لا کربلاء

وہ دونوں ایسے شہید ہیں کہ طف اور کربلا ان دونوں مصیبت زدوں کو مجھے بھولنے نہیں دیتے

ما رعی فیہما دمائک مرؤ سٌ و قد خان عہدک الرؤسا

رعایا نے آپ کے ذمہ داریوں کی رعایت نہ کی اور رئیسوں نے بھی آپ کے عہد میں خیانت کی

ابدلوا الود و الحفیظۃ فی القر بی و ابدت ضبابہا النافقاء

(لوگوں نے) محبت اور حفاظت کو جو آپکے قرابت مندوں کے لیے چاہیے تھی بدل دیا اور سوراخ نے اپنے سوسماروں کو ظاہر کردیا

و قست منہم قلوب علی من بکت الارض فقدھم و السماء

ان کے قلوب ان لوگوں کے لیے سخت ہوگئے جن کے کھو جانے پر زمین و آسمان روئے

فابکہم ما استطعت ان قلیلا فی عظیم من المصاب بکاء

پس رو ان لوگوں کو جتنا ہوسکے کیوں کہ بکا ایسی عظیم الشان مصیبت زدہ کے لیے تھوڑا ہے

کل یوم و کل ارض لکربی منہم کربلاء و عاشوراء

ہر روز وہر زمین ان کی مصیبت کی وجہ سے میرے لیے کربلا و عاشورا ہے

آل بیت النبی ان فوادی　　لیس یسلبہ عنکم التأساء
اے اہل بیتؑ نبیؐ میرے دل کو تمہاری مصیبتیں چین نہیں لینے دیتیں
آل بیت النبی طبتم فطاب　　المدح لی فیکم و طاب الرثاء
اے اہل بیتؑ رسول اللہ تم لوگ پاک ہو اس وجہ سے میری مدح اور مرثیہ خوانی بھی پاکیزہ ہے
انا حسان بمدحکم فاذا نحت　　علیکم فاننی الخنساء
میں تمہاری مدح میں مثل حسان کے ہوں اور جب تمہارا ماتم کرتا ہوں تو خنساء ہوں (خنساء ایک عورت تھی جو ہجو اور مرثیہ کہنے میں مشہور تھی)
سدتم الناس بالتقویٰ و سواکم　　سودتہ البیضاء و الصفراء
تم تقویٰ کی وجہ سے لوگوں کے سردار ہو اور تمہارے سوا اوروں کی سرداری سونے اور چاندی کی وجہ سے ہے

سید مرتضیٰ علم الہدیٰ

لھم جسوم علی الرمضاء مھملۃ　　و انفس فی جوار اللہ یقربھا
ان کے جسم خاک پر پڑے ہیں اور ان کی جانوں کی مہمانی خدا اپنے جوار رحمت میں کرتا ہے
کان قاصدھا بالضر نافعھا　　و ان قاتلھا بالسیف محبیھا
جو ان کے ضرر کا ارادہ کرتا تھا اس نے ان کو نفع پہنچایا اور ان کو تلوار سے مارنے والا ان کا جلانے والا تھا

لا اعلم

انعی حسینا ھبلا　　کان حسینا جبلا
میں خبر لایا ہوں کہ حسینؑ شہید ہوئے حسینؑ جو پہاڑ تھے

جعفر بن عفان

اگر کوئی مصیبت پر روتا ہے تو اسلام پر روئے کہ اس کے احکام کو اس روز ضائع کردیا جس روز تلوار اور نیزوں کو امام حسین علیہ السلام کے خون سے سیراب کیا۔

عبداللہ بن غالب

حسینؑ کے جسم اقدس کو روؤ جو کربلا کی خاک گرم پر عریاں پڑا تھا اور ہوائیں گرد و غبار اس لاش اقدس پر جمع کرتی تھیں کہ برہنگی سے محفوظ رہے

دعبل خزاعی

اے فاطمہؑ زہرا۔ اے سیدہ زنان عالم اگر آپؑ ہوتیں اور اپنے پارہ جگر کو بالب تشنہ فرات پر افتادہ و شہید دیکھتیں تو ضرور اپنے منہ پر طمانچے مارتیں اور مثل پرنالہ کے آنسو رخسار پر جاری ہوتے۔

حضرت زینب علیہا السلام

یا ھلالا لما استتم کمالا　　غالہ خسفہ فابدا غروبا
اے ہلال ابھی تو تو کمال کو پہنچا ہی تھا کہ گہن لگ گیا اور ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا

ایضاً

اگر وہ (بنات رسولؐ) جبر سے بے پردہ ہیں تو اپنے عفت و حیا کی وجہ سے پردہ میں ہیں۔

حضرت ربابؑ

ان الذی کان نورا یستضاء بہ ۔۔۔ بکربلاء قتیل غیر مدفون

وہ جو نور تھا اور لوگوں کو اس سے نور حاصل ہوتا تھا کربلا میں شہید کیا گیا اور کسی نے دفن بھی نہیں کیا

سبط النبی جزاک اللہ صالحۃ ۔۔۔ عنا و جنبت خسران الموازین

اے سبط نبی خدا آپ کو جزائے خیر دے آپ میزان کے نقصان سے بچ گئے

فقد کنت لی جبلا صعبا الوذبہ ۔۔۔ و کنت تصحبنا بالرحم و الدین

آپ میرے لیے ایک مضبوط پہاڑ تھے جس میں پناہ لیتی تھی اور آپ ہمارے ساتھ رحم اور دین سے پیش آتے تھے

من للیتامی و من للسائلین و من ۔۔۔ یغنی و یأوی الیہ کل مسکین

اب کون رہا ہے جو یتیموں اور فقیروں کو پناہ دے۔ اور جس کی طرف مسکین جاویں

و اللہ لا ابتغی صھرا بصھرکم ۔۔۔ حتی اغیب بین الرمل و الطین

واللہ تمہارے گھر کے سوا اب کسی کی بہو نہ ہوں گی جب تک کہ ریگ اور خاک میں دفن نہ ہوجاؤں

لااعلم

اری قتل طفل من سلالۃ ھاشم ۔۔۔ تنوح لہ کل الوری نوح ماتمہ

میں دیکھ چکا ہوں کہ اگر بنی ہاشم میں کوئی بچہ قتل ہوجاتا تھا تو تمام دنیا اس کے لیے نوحہ کرنے لگتی تھی

و کانو غیاثا ثم بادوا جمیعھم ۔۔۔ و قد عظمت تلک الرزایا بفاطمہ

پھر وہ دن آیا کہ سب کے سب ہلاک ہوگئے حالانکہ وہ فریادرس تھے اور یہ مصیبتیں حضرت فاطمہؑ زہرا کے لیے بہت بڑی ہوگئیں

عقبہ بن عروۃ الشعبی

مررت علی قبر الحسینؑ بکربلا ۔۔۔ ففاض من دموعی غزیرھا

جب کربلا میں حسینؑ کی قبر پر میرا گزر ہوا تو میری آنکھوں سے آنسوؤں کی سیل جاری ہوگئی

فیا عین ابکی للحسینؑ و عصبۃ ۔۔۔ اطاف بہ من جانبیہ قبورھا

اے آنکھ حسینؑ اور ان کے اعزا پر رو جن کی قبریں حسینؑ کے گرد بنی ہیں

سلامی علی اھل القبور بکربلاء ۔۔۔ و علی کل من للسلام یزورھا

ان پر میرا سلام جن کی قبریں کربلا میں بنی ہیں اور انھیں بھی میرا سلام پہنچا جو ان کی زیارت کرتے ہیں

شافعی

میرا دل مبتلائے آہ ہے ۔۔۔ کون ایسا ہے جو حسینؑ تک میرا سلام پہنچادے۔ اگرچہ اس پیغام رسانی سے لوگوں کے نفس و قلوب کراہت کرتے ہیں۔ حسینؑ بے گناہ ذبح کیا گیا اور اس کا کرتہ ارغوانی رنگ کے پانی (خون) سے رنگین ہوا۔

کیسا تعجب ہے کہ رسولِ ہاشمی پر صلوات بھی بھیجی جائے اور ان کی اولاد سے جنگ کی جائے۔

جوھری

روزِ عاشورا پکارا کس قدر افسوس ہے دین پر اے آلِ یٰسین ــــ آج کے دن فخرِ مضر کے ستارے ذلت و توہین کے ساتھ ٹوٹے۔ آج کے دن اللہ تعالیٰ کا نور روشن بجھ گیا اور تقویٰ کا خون زمین پر بہایا گیا ــــ آج کے روز بنی حرب نے بدر و صفین کے کینے نکالے۔

کمیت

ابتدا ظلم کی اہلِ بیتؑ پر جس نے کی ہے اس کا تتمہ یزید نے پورا کیا۔

حضرت ام کلثوم علیہا السلام

ٹھہرو اے مسافرانِ عدم اور ہمیں وداع کر لو قبل اس کے کہ ہم سے دور ہو ــــ کشادہ زمین تمہارے بعد مجھ پر قید خانہ بن گئی۔ تم پر سلام ہو (اے شہیدانِ کربلا) تمہارا فراق کس قدر تلخ ہے ــــ جب آفتاب طلوع کرتا ہے تو اے اہلِ وطن تم یاد آتے ہو اور جب غروب کرتا ہے تو تمہاری وجہ سے غم تازہ ہو جاتا ہے۔ (شہیدِ اسلام)

قاآنی

بارد چہ؟ خون کہ؟ دیدہ چساں؟ روز و شب۔ چرا؟ ۔۔۔ از غم۔ کدام غم؟ غمِ سلطانِ اولیا

نامش چہ بد؟ حسینؑ نژاد کہ؟ از علیؑ ۔۔۔ ماںش کہ بود؟ فاطمہؑ جدش کہ؟ مصطفیٰؐ

چوں شد؟ شہید شد۔ بہ کجا؟ دشت ماریہ ۔۔۔ کے؟ عاشر محرم۔ پنہاں؟ نے برملا

شب کشتہ شد؟ نے روز۔ چہ ہنگام؟ وقت ظہر ۔۔۔ شد از گلو بریدہ سرش؟ نے نے از قفا

سیراب کشتہ شد؟ نہ۔ کس آبش بداد؟ داد ۔۔۔ کہ؟ شمر۔ از چہ چشمہ؟ ز سر چشمہ فنا

مظلوم شد شہید؟ بلے۔ جرم داشت؟ نہ ۔۔۔ کارش چہ بود؟ ہدایت و یارش کہ بد؟ خدا

ایں ظلم را کہ کرد؟ یزید۔ ایں یزید کیست؟ ۔۔۔ زولاد ہند۔ بلا بر او لعنت خدا

خود کرد ایں عمل؟ نہ فرستاد نامہ ای ۔۔۔ نزد کہ؟ نزد زادۂ مرجانۂ دغا

ابن زیاد زادۂ مرجانہ بد؟ نعم ۔۔۔ از گفتۂ یزید تخلف نہ کرد؟ لا

ایں نابکار کشت حسینؑ را بدست خویش؟ ۔۔۔ نہ او روانہ کرد سپہ سوئے کربلا

میر سپہ کہ بود؟ عمر سعد۔ او برید؟ ۔۔۔ حلق عزیز فاطمہؑ؟ نے شمر بے حیا

بہر چہ؟ بہر آنکہ شود خلق را شفیع ۔۔۔ شرط شفاعتش چہ بود؟ نوحہ و بکا

کس کشتہ شد ہم از پسرانش؟ بلے دو تن ۔۔۔ دیگر کہ؟ نہ برادر۔ و دیگر کہ؟ اقربا

دیگر پسر نہ داشت؟ چرا داشت۔ آنکہ بود؟ ۔۔۔ سجاد۔ کو بد او بہ غم و رنج مبتلا

ماند او بکربلائے پدر؟ نے بشام رفت ۔۔۔ باعز و احتشام؟ نہ با ذلت و عنا

تنہا؟ نہ با زنانِ حرم۔ نام شاں چہ بود؟ ۔۔۔ زینبؑ سکینہؑ فاطمہؑ کلثومؑ بے نوا

بر تن لباس داشت؟ بلے گرد رہگزر — بر سر عمامہ داشت؟ بلے چوب اشقیا
بیمار بد؟ بلے چہ دوا داشت؟ اشک چشم — بعد از دوا غذاش چہ بد؟ خونِ دل غذا
کس بود ہمرہش؟ بلے اطفال بے پدر — دیگر کہ بود؟ تپ۔ کہ نمی گشت از و جدا
از زینت حرم چہ بجا ماندہ بود؟ دو چیز — طوقِ ستم بگردن و خلخال غم بہ پا
گبر این ستم کند؟ نہ۔ یہود و مجوس؟ نہ — ہندو؟ نہ۔ بت پرست؟ نہ۔ فریاد ازیں جفا
قاآنی یست قائل ایں شعر ہا؟ بلے — خواہد چہ؟ رحمت۔ از کہ؟ ز حق کے؟ صفِ جزا

یعنی: ● برسائی ہے۔ کیا؟ خون۔ کون؟ آنکھ۔ کیسے؟ دن رات۔ کیوں؟ غم ہے۔ کونسا غم؟ سلطان اولیاءؑ کا غم۔
۲ آپؑ کا نام کیا تھا؟ حسینؑ۔ کس کا بیٹا؟ علیؑ کا۔ اس کی ماں کون تھی؟ فاطمہؑ۔ اس کا نانا کون تھا؟ مصطفیؐ۔
۳ آپ کو کیا ہوا؟ شہید ہو گئے۔ کہاں؟ صحرائے ماریہ میں۔ کب؟ دسویں محرم کو۔ پوشیدہ؟ نہیں برسرِ عام۔
۴ رات کو مارے گئے؟ نہیں دن کو۔ کس وقت؟ بوقتِ ظہر۔ ان کا سر گلے کی طرف سے کاٹا گیا؟ نہیں پسِ گردن سے۔
۵ پانی پی کر شہید ہوئے؟ نہیں۔ کسی نے انھیں پانی دیا تھا؟ دیا تھا۔ کس نے؟ شمر نے۔ کس چشمہ سے؟ فنا کے سرچشمہ سے۔
۶ مظلوم شہید ہوئے؟ ہاں۔ کوئی جرم تھا؟ نہیں۔ کام آپ کا کیا تھا؟ ہدایت۔ آپ کا مددگار کون تھا؟ خدا۔
۷ یہ ظلم کس نے کیا؟ یزید نے۔ یہ یزید کون ہے؟ ہند کی اولاد سے ہے۔ اس پر خدا کی لعنت ہو۔
۸ اس نے یہ عمل خود کیا؟ نہیں، خط بھیجا۔ کس کے پاس؟ ابن مرجانۂ مکار کے پاس۔
۹ ابن زیاد مرجانہ کا بیٹا تھا؟ ہاں۔ یزید کے حکم سے اس نے سرتابی نہیں کی؟ نہیں۔
۱۰ اس نابکار نے اپنے ہاتھ سے حسینؑ کو قتل کیا؟ نہیں۔ کربلا کی طرف فوج روانہ کی تھی۔
۱۱ فوج کا سالار کون تھا؟ عمر سعد۔ اس نے فاطمہؑ کے پیارے بیٹے کا گلا کاٹا؟ نہیں، شمر بے حیا نے۔
۱۲ کس مقصد کے لیے حسینؑ نے شہادت قبول کی؟ اس لیے کہ مخلوق کے شفیع ہو جائیں۔ آپ کی شفاعت کی شرط کیا تھی؟ نوحہ اور رونا۔
۱۳ ان کے بیٹوں میں سے بھی کوئی قتل ہوئے؟ ہاں، دو فرد۔ اور کون؟ نو بھائی۔ اور کون؟ قریبی رشتہ دار۔
۱۴ اور کوئی بیٹا نہ تھا؟ کیوں نہیں، تھا۔ وہ کون تھا؟ سجّادؑ۔ کہ جو بیماری و غم میں مبتلا تھے۔
۱۵ کیا وہ باپ کی کربلا میں رہ گئے؟ نہیں، شام چلے گئے۔ عزت و احتشام کے ساتھ؟ نہیں، ذلت و سختی کے ساتھ۔
۱۶ اکیلے؟ مستوراتِ حرم کے ساتھ۔ ان کے نام کیا تھے؟ زینبؑ، سکینہؑ، فاطمہؑ، کلثومؑ بے نوا۔
۱۷ تن پر لباس تھا؟ ہاں، راستے کی دھول۔ سر پر عمامہ تھا؟ ہاں، اشقیاء کا تازیانہ۔
۱۸ بیمار تھے؟ ہاں۔ دوا کیا تھی؟ آنکھوں کے آنسو۔ دوا کے بعد آپ کی غذا کیا تھی؟ خونِ دل غذا تھی۔
۱۹ کوئی آپ کے ہمراہ بھی تھا؟ ہاں، یتیم بچے۔ اور کون تھا؟ بخار تپ کہ جو آپ سے الگ نہیں ہوتا تھا۔
۲۰ حرم کی زینت سے کیا بچ رہا تھا؟ دو چیزیں۔ گردن میں ستم کا طوق اور پاؤں میں غم کی جھانجر۔

زرتشتی نے یہ ستم کیا؟ نہیں۔ یہود نے؟ نہیں۔ مجوس نے؟ نہیں۔ ہندو نے؟ نہیں۔ بت پرست نے؟ نہیں۔ اس جفا سے فریاد ہے۔

یہ شعر کہنے والا قاآنی ہے؟ ہاں۔ کیا مانگتا ہے؟ رحمت۔ کس سے؟ حق سے۔ کب؟ روزِ جزا۔

ملا محتشم کاشی

باز ایں چہ شورش است کہ در خلق عالم ست
باز ایں چہ نوحہ و چہ عزا و چہ ماتم است

گر خوانمش قیامت دنیا بعید نیست
ایں رستخیز عام کہ نامش محرم است

جن و ملک بر آدمیاں نوحہ میکنند
گویا عزائے اشرف اولاد آدم ست

خورشید آسمان و زمیں نور مشرقین
پروردہ کنار رسولِ خدا حسینؑ

اے چرخ غافلی کہ چہ بیداد کردۂ
در کیں چہا دریں ستم آباد کردۂ

کام یزید دادۂ از کشتن حسینؑ
بنگر کرابہ قتل کہ دل شاد کردۂ

بہر خسے کہ خار درخت شقاوت است
در باغ دیں چہ با گل و شمشاد کردۂ

حلقے کہ سود لعل لب خود نبیؐ براں
آزردہ اش بہ خنجر بیداد کردۂ

با دشمنانِ دیں نتواں کرد آں چہ تو
با مصطفیؐ و حیدر و اولاد کردۂ

کشتی شکست خوردہ طوفان کربلا
در خاک و خوں فتادہ بمیدانِ کربلا

در آب ہم مضائقہ کردند کوفیاں
خوش داشتند حرمت مہمانِ کربلا

آہ از دمیکہ لشکر اعدا نکردہ شرم
کردند رو بخیمہ سلطانِ کربلا

کاش آں زمان سرادق گردوں نگوں شدے
ایں خرگہ بلند ستوں بے ستوں شدے

آل نبیؐ چو دست تظلم بہ آورند
ارکان عرش را بہ تزلزل براورند

بر خوان غم چو عالمیاں را صلا زدند
اول صلا بہ سلسلہ انبیا زدند

نوبت بہ اولیاء چو رسید آسمان طپید
زاں نوبتے کہ بر سر شیر خدا زدند

آنگہ سرادقے کہ ملک محرمش نبود
کندند از مدینہ و در کربلا زدند

اہل حرم دریدہ گریباں کشادہ مو
فریاد بر در حرم کبریا زدند

چوں خون حلق تشنہ او بر زمیں رسید
جوش از زمیں بذروہ عرش بریں رسید

نزدیک شد کہ خانہ ایماں شود خراب
از بس شکستہا کہ بارکانِ دیں رسید

باد آں غبار چوں بمزار نبی رساند
گرد از مدینہ بر فلک ہفتمیں رسید

پر شد ز شور غلغلہ چوں نوبت خروش
از انبیا بہ حضرت روح الامیں رسید

کرد ایں خیال و ہم غلط کارکاں غبار
تا دامن جلال جہاں آفریں رسید

ہست از ملال گرچہ بری ذات ذوالجلال
او در دل ست و ہیچ دلے نیست بے ملال

روزیکہ شد بہ نیزہ سر آں بزرگوار خورشید سر برہنہ بر آمد ز کوہسار
جمعے کہ پاس محمل شاں داشت جبرئیل کردند بے عماری و محمل شتر سوار
با آنکہ سر زد ایں عمل از امت رسولؐ روح الامیں ز روئے نبی گشت شرمسار
بر حسرتگاہ چوں رہ آں کارواں فتاد شور نشور در ہمہ کون و مکاں فتاد
ہر جاکہ بود آہوئے از دشت پاکشید ہر جاکہ بود طائرے از آشیاں فتاد
شد وحشتے کہ شور قیامت بگرد رفت چوں چشم اہل بیتؑ برآں کشتگاں فتاد
نا گاہ چشم دختر زہرا در آن زماں بر پیکر شریعت امام زماں فتاد
بے اختیار نعرۂ ہذا حسینؑ زد سرزد چناں کہ آتش ازو در جہاں فتاد
پس با زبان پرگلہ آن بضعۃ البتول رودر مدینہ کرد کہ یا ایہا الرسولؐ
ایں کشتۂ فتادہ بہ ہاموں حسینؑ تست ایں صید دست و پا زدہ در خوں حسینؑ تست
ایں خشک لب فتادۂ ممنوع از فرات کز خون او زمیں شدہ جیحوں حسینؑ تست
ایں قالب طپاں کہ چنیں ماندہ بر زمیں شاہ شہید نا شدہ مدفوں حسینؑ تست
ایں غرقہ محیط شہادت کہ روئے دشت از موج خون او شدہ گلگوں حسینؑ تست
خاموش محتشم کہ ز ذکر غم حسینؑ جبریل را ز روح پیمبر حجاب شد
خاموش محتشم کہ ازیں نظم گریہ خیز روئے زمیں ز اشک جگر گوں خضاب شد
تا چرخ سفلہ بود خطائے چنیں نہ کرد بر ہیچ آفریدہ جفائے چنیں نہ کرد

یعنی: ● پھر یہ کیا پریشانی سی ہے جو ساری کائنات میں چھائی ہوئی ہے۔ پھر یہ کیسا نوحہ عزا اور کیسا ماتم ہے۔
● اگر میں اسے دنیا کی قیامت کہوں تو کچھ غلط نہ ہوگا یہ انقلاب و قیام عام کہ جس کا نام محرم ہے۔
● جن اور فرشتے آدمیوں پر نوحہ کرتے ہیں گویا اولادِ آدمؑ میں سے سب سے بڑے بزرگ کی عزا ہے۔
● زمین و آسمان کے خورشید اور مشرقین کے نور رسولِ خداؐ کی گود کے پالے ہوئے حسینؑ۔
● اے فلک تو غافل ہے کہ تو نے کس پر ظلم کیا ہے دشمنی میں اس ظلم بھری آبادیِ عالم میں تو نے کیا کیا کیا ہے۔
● یزید کو مقصود قتل حسینؑ سے دیا ہے دیکھ کہ کسے کس کے قتل سے خوش کیا ہے۔
● ایک تنکے کے لیے جو بدبختی کے درخت کا کانٹا ہے تو نے دین کے باغ میں گل و شمشاد کے ساتھ کیا کر دیا ہے۔
● وہ گلا کہ جس پر اپنے لب کے لعل کو خود نبی ملتے تھے اسے تو نے ظلم کے خنجر سے تکلیف و رنج دیا ہے۔
● دین کے دشمنوں کے ساتھ بھی وہ کچھ نہیں کیا جاسکتا جو تو نے مصطفےٰؐ و حیدرؑ اور ان کی اولاد کے ساتھ کیا ہے۔
● کربلا کے طوفان کی ٹوٹی ہوئی کشتی میدان کربلا میں خاک و خون میں پڑی ہوئی ہے۔
● کوفیوں نے پانی دینے سے بھی سختی کی۔ انھوں نے کربلا کے مہمان کی خوب عزت و حرمت رکھی۔
● آہ! اس وقت سے کہ دشمنوں کے لشکر نے بے شرم ہو کر سلطانِ کربلا کے خیمہ کی طرف رُخ کیا۔

۱۳ کاش! اس وقت آسمان کا قبہ گر گیا ہوتا اور یہ اونچے ستونوں والا بڑا خیمہ بے ستون ہو جاتا۔
۱۴ آلِ نبیؐ جب ظلم کی شکایت پر ہاتھ رکھیں تو عرش کے ارکان کو ہلا دیں۔
۱۵ غم کے دسترخوان پر جب تمام جہان والوں کو بلایا گیا تو سب سے پہلے آواز سلسلۂ انبیاؑ کو دی گئی۔
۱۶ جب اولیاء کی باری آئی تو آسمان کانپ گیا۔ اس نوبت سے جو شیرِ خدا کے سر پر بجائی گئی۔
۱۷ اس وقت وہ سراپردہ کہ فرشتے بھی جس کے محرم نہ تھے اسے مدینہ سے اکھاڑ کر کربلا میں جا لگایا۔
۱۸ اہلِ حرم گریباں چاک بال کھلے ہوئے اللہ کے حرم کے در پر فریاد کرنے لگے۔
۱۹ جب اس کے پیاسے گلے کا خون زمین پر پہنچا تو زمین سے عرش کی چوٹی تک اس کا جوش پہنچا۔
۲۰ قریب تھا کہ ایمان کا گھر ہی خراب ہو جائے ان شکستگیوں سے جو دین کے ارکان کو پہنچیں۔
۲۱ ہوا نے جب اس غبار کو مزارِ نبیؐ پر پہنچایا تو دھول مدینہ سے ساتویں آسمان تک پہنچ گئی۔
۲۲ غلغلہ کے شور سے جب چیخ و پکار کی نوبت پر ہو گئی تو یہ دھول انبیاؑ سے روح الامین تک پہنچی۔
۲۳ قوت وہم جو سوچ میں غلطی کر جاتی ہے اس نے یہ خیال کیا کہ جہان کے خالق کے دامن تک غبار جا پہنچا ہے۔
۲۴ اگرچہ ذات ذوالجلال ملال سے منزہ ہے لیکن وہ دلوں میں ہے اور کوئی دل ملال سے خالی نہیں ہے۔
۲۵ جس دن ان بزرگوار کا سر نیزے پہ آ گیا خورشید پہاڑ سے سر ننگے نکلا۔
۲۶ وہ گروہ کہ جن کے محمل کا لحاظ جبرائیل رکھتا تھا۔ انھیں بغیر عماری اور محمل کے اونٹوں پر سوار کرا دیا گیا۔
۲۷ روح الامین رسولؐ کے منہ کے سامنے شرمسار ہو گیا۔ کیونکہ یہ عمل امت سے سرزد ہوا تھا۔
۲۸ جب اس قافلے کا گزر میدانِ جنگ سے ہوا تو ہر کون و مکان میں قیامت کا شور اٹھا۔
۲۹ ہرن جہاں بھی تھا صحرا سے نکل پڑا اور پرندہ جہاں بھی تھا گھونسلے سے گر گیا۔
۳۰ اتنی وحشت ہوئی کہ قیامت کا شور ماند پڑ گیا جب اہلِ بیتؑ کی نگاہ ان مقتولوں پر پڑی۔
۳۱ اچانک دخترِ زہراؑ کی نظر اس وقت امام زمانؑ کے جسم شریف پر پڑی۔
۳۲ بے اختیار پکار اٹھیں کہ یہ حسینؑ ہے اور اس طرح سر پٹکا کہ اس نے سارے جہان میں چنگاریاں گریں۔
۳۳ گلہ سے پر زبان کے ساتھ مدینہ کی طرف منہ کر کے بتولؑ کی اس جگر گوشہ نے کہا اے رسولِ خدا۔
۳۴ یہ صحرا میں پڑا ہوا مقتول تیرا حسینؑ ہے۔ یہ خون میں ہاتھ پاؤں مارنے والا بسمل تیرا حسینؑ ہے۔
۳۵ یہ پیاسا فرات سے روکا ہوا کہ جس کے خون سے زمین دریائے جیحون بن گئی ہے تیرا حسینؑ ہے۔
۳۶ یہ تڑپتا لرزتا بدن جس کے موج خون سے روئے صحرا گلگون ہو گیا ہے، تیرا حسینؑ ہے۔
۳۷ محتشم چپ ہو جا کہ غم حسینؑ کے ذکر سے جبرئیل کو روحِ پیغمبرؐ سے حجاب آ گیا ہے۔
۳۸ محتشم چپ ہو جا کہ اس گریہ پیدا کرنے والی نظم سے جگر گوں آنسوؤں سے روئے زمین خضاب ہو گیا ہے۔
۳۹ جب تک فلک پست تھا ایسی خطا نہ کی تھی۔ کسی مخلوق پر ایسی جفا نہ کی تھی۔

ملا مقبل

پس از شہادت عباس بے برادر شد	غریب و بے کس و بے آشنا و یاور شد
سرے نہ دید کہ زینت دہ سناں گردد	تنے نہ دید کہ در خاک و خوں طپاں گردد

یعنی : (۱) عباس کی شہادت کے بعد بھائی کے بغیر ہو گئے۔ غریب، بے کس، بے مددگار ہو گئے کہ کوئی جاننے والا نہ رہا۔
(۲) کوئی سر نہ دیکھا تھا کہ نوک نیزہ کی زینت بنتا کوئی جسم نہ دیکھا تھا کہ خاک و خون میں تڑپتا۔
(حضرت زینبؑ کو طلب فرما کر وصیتیں اور حضرت سکینہؑ کے ساتھ مخصوص لطف کی وجہ)

کہ او از اہل حرم ظلم نا کشیدہ تر است	ز دختران یتیم ستم نہ دیدہ تر است
لباس کہنہ از اہل بیت کرد طلب	سوال کرد ز تفتیش حال آں زینب
جواب گفت کہ اے نور دیدۂ زہرا	سرور سینہ ام الائمۃ النجبا
نہ گفتمت کہ خبر دادہ است پیغمبر	کہ آب خوردنم از آب جدول خنجر
کنوں بوعدۂ حق بایدم وفا کردن	بمژدہ خبرش جان و سر فدا کردن
چو سر ز پیکرم از تیغ کیں جدا سازند	گل سر سبد نیزہ جفا سازند
ازیں بہ کہنہ لباس ست حاجتم اکنوں	کہ چوں لباس برآرند از تنم بیروں
بجامہائے نو ام اہل ظلم در سازند	دگر بہ سوئے کہن جامہا نہ پردازند
روایت است کہ چوں تنگ شد برو میداں	فتاد از حرکت ذوالجناح و از جولاں
نہ سید الشہدا بر جدال طاقت داشت	نہ ذو الجناح دگر تاب استقامت داشت
کشید پا ز رکاب آں خلاصہ ایجاد	برنگ پرتو خورشید بر زمیں افتاد
بلند مرتبہ شاہے ز صدر زیں افتاد	اگر غلط نہ کنم عرش بر زمیں افتاد

یعنی : (۱) کہ وہ تمام اہل حرم سے کم ظلم جھیلے ہوئے ہے۔ یتیم بچیوں سے کم تر ستم دیکھے ہوئے بچی ہے۔
(۲) اہل بیتؑ سے پرانا لباس مانگا تو زینبؑ نے صورت حال معلوم کرنا چاہی۔
(۳) جواب دیا کہ اے نورِ چشم زہراؑ نجیب اماموں کی ماں کے سینہ کا سرور۔
(۴) میں نے آپ سے کہا نہیں ہے کہ پیغمبرؐ نے خبر دی ہے کہ خنجر کی نہر سے میں نے پانی پینا ہے۔
(۵) اب مجھے وعدہ حق کو وفا کرنا چاہیے۔ آپ کی خبر کے مطابق بخوشی سر و جان مجھے قربان کر دینا چاہیے۔
(۶) جب میرے سر کو میرے جسم سے کینے کی تلوار سے جدا کر دیں گے اور اسے نیزۂ جفا کے گلدستہ کے سب سے اوپر والا پھول بنائیں گے۔
(۷) اس وجہ سے مجھے پرانے لباس کی اب ضرورت ہے کیونکہ یہ لوگ میرے بدن سے لباس اتار لیں گے۔
(۸) میرے نئے کپڑوں کو اہل ظلم اتار لیں گے تو پھر پرانے لباس کو نہ لیں گے۔
(۹) روایت ہے کہ جب میدان آپ پر تنگ ہو گیا اور ذوالجناح حرکت کرنے اور دوڑنے سے رہ گیا۔

- سید الشہداءؑ کو جنگ کی طاقت نہ رہی اور ذوالجناح بھی استقامت کی تاب کھو بیٹھا۔
- تو اس موجودات کے خلاصہ نے رکاب سے پاؤں کھینچ لیا اور خورشید کے سائے کی طرح زمین پر گر پڑے۔
- بلند رتبہ بادشاہ زین کے صدر سے گر گیا۔ اگر غلط نہ کہوں تو عرش زمین پر گر گیا۔

شفیق مکرم خواجہ غلام محمود صاحب بی اے وکیل اقبال

تھا کون جو کربلا میں برباد ہوا — لوٹا گیا کون؟ کون آباد ہوا
جو پھول بکھر گیا وہ کس باغ کا تھا — گلچیں اس کا وہ کون ناشاد ہوا
فریاد کریں گے ماتمی ہوئیں گے — سر پیٹ کے آنسوؤں سے منہ دھوئیں گے
گر کوئی نہ رونے کا زمانہ میں تھیں — اس وقت بھی اے حسینؑ ہم روئیں گے

مجالسِ حسینؑ اس جگہ میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ حضرت کی سوانح عمری کے لحاظ سے مجلس جو حضرتؑ کے سوانح کا ایک جز ہوگئی ہے اس کے متعلق بھی کچھ کہا جائے۔ جو کچھ میں اوپر کہہ چکا ہوں اس سے ظاہر ہے کہ نہ صرف حضرات ائمہؑ نے حضرتؑ کے ذکر کا اہتمام فرمایا بلکہ شاعروں کی قدر دانی سے وہ زبان خرید لی جو اشاعت مدح میں کام دے اور اس طرح شاعری کی ایسی دل پسند چیز خصوصاً عرب کے لیے اس بہتر شغل کے لیے کام میں لائی گئی۔

ائمہ کے علاوہ ملوک دیالمہ اور بنی فاطمہ نے اس کا اہتمام کیا اور اس وقت سے برابر اس وقت تک مجالس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ اب یہ صورت ہوئی جو ہم میں آج موجود ہے۔

بادی النظر میں مجالس کا مفہوم یہ قرار دیا گیا ہے کہ حضرت شہید کربلا پر رونا ہی اس کی غایت ہے۔ اور دلیل کے لیے ائمہ اہل بیتؑ کی حدیثیں پیش کی جاتی ہیں کہ جو شخص روئے حسینؑ پر وہ داخل بہشت ہوگا۔ یا اس نے خمسہ نجباء پر احسان کیا۔ یا جو شخص روئے یا رلائے یا رونے والوں کی سی صورت بنائے وہ داخل بہشت ہوگا۔

میں چاہتا ہوں کہ رونے کی حالت پر میرے ساتھ غور کیا جائے۔ رونا کیا ہے اور کوئی شخص کیوں روئے گا۔ کیا کوئی بلا اثر لیے رو سکتا ہے۔ یہ سوچنا محال ہے کہ ہیجان غم پیدا ہو بغیر اس کے کہ انسان کسی اندوہناک حالت سے اثر لے اور وہ اثر اس قدر تیز ہو جو اس کی احساس میں ایسی تھراہٹ پیدا کرے کہ آخر میں یہ دوسری حالت پیدا ہو جائے، جسے رونا کہتے ہیں۔ رونے کے معنی لازماً آنسو بہانا نہیں ہیں بلکہ یہ رونے کی ایک بے اختیارانہ صورت ہے جو کمزوری احتیاط کہی جا سکتی ہے۔ صاحب ارادہ اور صاحب ہوش اور صاحب احتیاط لوگوں کے نزدیک داغ غم کی موجودگی میں، ضبط اور حتی الوسع کم اظہار غم اور اثر کی کوشش سب سے بڑا رونا سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک شخص رو سکتا ہے بغیر اس کے کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی یا چہرہ میں کوئی ظاہر تغیر کہا جا سکے۔ یہ رونا بھی دیکھا جاتا ہے اور کچھ خفی تحریریں ایسی ہوتی ہیں جو بغیر ظاہر ہوئے نہیں رہتیں۔ ضبط کی حالت میں ان تحریروں کی وضاحت سب سے زیادہ اثر خیز ہے۔ اس کے علاوہ باوجود ضبط کے غم سے متاثر ہونے کی حالت اگرچہ وہ ہمارے اعضائے ظاہری میں ظاہر نہ ہو وہ اثر ڈالتی ہے جسے قلبی اثر کہیں۔ اور دوسرا انسان اس سے بغیر اثر لیے نہیں رہ سکتا۔ یہ ضابط اور صابر لوگوں کا رونا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی سرد آہ یا کوئی کراہ یا صدا کی کوئی تھرتھراہٹ یا آنسو کا کوئی بے چین قطرہ صابر کو اپنے درجہ صبر سے گرا دیتا ہے۔ نہیں بلکہ اس کی اس وقت کی اس کے علاوہ صورت صبر یا عدم صبر کا تصفیہ کرتی ہے اور پھر صابر بھی انسان ہی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا جوش کثرت ہیجان سے ذرا سا جھپک جائے اور وہ سیل جسے صبر نے روک دیا تھا اس تھوڑے سے وقت میں امنڈ آئے جسے ہوش کی معاد روک دے اور پھر تھمتے آنسو تھمیں کیونکہ یہ سچ مچ رونا ہے۔ کچھ ہنسی نہیں ہے۔

تو رونا جو ایک حالت ہے جسے ضبط اور صبر کا گل جانا اور دل کا پگھل جانا کہیں فطرت انسانی کا ایک ایسا ہی جزو ہے جیسے اور جذبات ہیں۔ اور جماعت انسانی نے رونے کو اظہار محبت و لحاظ و ہمدردی سمجھا ہے۔ اور ان سب کے معنی وہ پیاری چیز ہے جو جماعت انسانی کے کھینچنے اور قریب کرنے کا سب سے بڑا نسخہ ہے۔ جسے قلبی وابستگی کہتے ہیں۔ کسی کو حالت اندوہ میں دیکھ کر ہنسو اور صاحب غم کے علاوہ دیکھنے والے یعنی جماعت انسانی کا کوئی ٹکڑا ہنسنے والے کے اس فعل کو خلاف انسانیت بے رحمانہ تہذیب سے معرا عدم موقع شناسی بے حسی کہے گا اور دفعتہً اس ہنسنے والے کی طرف سے ہر دیکھنے والے کا خیال بدل جائے گا۔

کیا تم نے نہیں دیکھا ہے اور کیا تم نے خود نہیں کیا ہے کہ کسی کی اندوہناک حالت کو عام اس سے کہ تمھیں تعلق ہو یا نہ ہو دیکھ کر تم نے دفعتہً اپنے کو ایسا بنایا ہے جو تمھارا متاثر ہونا کہا جائے۔ ممکن ہے کہ یہ تصنع ہو۔ لیکن وفقہ تصنع ہی کا خیال آجانا بھی اس وجہ سے ہے کہ ہمارے پہلے کے ایک طویل زمانہ اور جماعت انسانی پر غم کے اثر نے جو روش اختیار کی ہے وہ فضا توریث اور تربیت میں لاعلمانہ حیثیت سے اس طرح ہم میں داخل ہو گئی ہے کہ عام اس سے کہ ہم کو اپنے کسی خاص انداز کا احساس اور ہوش ہو یا نہ ہو ہمارا اتمام خاصہ ویسا ہی بنجاتا ہے جیسا اس موقع کے لیے موزوں ہے۔ یہ حالت پر لحاظ معاشرت کی ایک جزو ہے۔

اب ذرا ان احادیث ائمہ کے وقت اور موقع پر غور کرو۔ تم جانتے ہو کہ یہ وہ موقع تھا جب کہ حکومت اور لازماً ملک کے تمام افراد بجز معدودے چند کے اہل بیتؑ رسالتؐ کے ساتھ دشمنی کے درجہ میں اس قدر ترقی کر گئے تھے جس کا نتیجہ کربلا کا سانحہ عظیم تھا۔ یعنی دشمنوں کی ایک کوشش جس میں یہ ارادہ کیا گیا کہ آل رسالت میں کوئی مرد باقی نہ رہے جس سے نسل تک قائم رہے۔ ایسی حالت میں یہ امید کرنا کہ کوئی ہمدردی کرتا اور اس سانحہ کی عظمت کو اپنے درجہ پر قائم کرنے اور رکھنے کی کوشش کرتا محال تھا۔ لیکن مشیت ازدی تھی کہ یہ سانحہ اپنی پوری عظمت اور شان سے دنیا کو معلوم ہوتا اور فطرت ہیجان غم کو حسینؑ کے نام سے ایسی نسبت دیتی جس قدر کسی گوشت اور خون کے انسان کے لیے نہ ہوئی ہوگی۔ اور یہ ہیجان غم اس طرح نہ پیدا کیا گیا تھا جو کسی حکومت اور اس کے تعلقات کے سایہ میں ہو۔ نہ کوئی ایسی ترکیب اختیار کی گئی تھی جیسی تاریخ یہود میں۔ یہود کے آخری خود مختار بادشاہ ہیرودؔ اعظم نے اختیار کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ اس نے اپنے آخری وقت جوڈایا کے چند مخصوص خاندانوں کو گرفتار کرایا اور ہیپوڈرم میں زیر حراست رکھ کر اپنی بہن سلوم سے وصیت کی کہ جونہی میں مرجاؤں انھیں قتل کر ڈالنا۔ اور اس سے تمام شہر میں رونا شروع ہو جائے گا اور یہ رونا اس کی موت پر رونا سمجھا جائے گا۔

آلِ رسالتؐ سے دُور تھا کہ وہ ایسے ذرائع اختیار کریں۔ پھر کیا کیا۔ وہی جو ہمدردان حسینؑ جانتے ہیں۔ یہ ایک

نہایت سست رفتار کام تھا۔ اس کے علاوہ چارہ نہ تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ ائمہ کے ان فقرات میں تصنع سے احتیاط نہیں کی گئی ہے اور رونے اور رلانے کے اہتمام کی ایسی کوشش میں فوری لوگوں کا اثر خیز حد تک متاثر ہو جانا محال تھا۔

بفرض محال میں اس میں کوئی ایسی قابل اعتراض شان نہیں پاتا جس میں یہ کہا جاسکے کہ اچھی غرض برے ذرائع سے حاصل کی گئی ہے۔ کامیابی تصنع کی حیثیت میں نہیں تھی نہ تصنع کوئی بڑا نتیجہ حاصل کر سکتی ہے جب تک کہ اصلیت اس کی حقیقی بنیاد نہ ہو۔ ان احادیث کا اصول یعنی جوش ہمدردی پیدا کرنا۔ حقیقتاً حسینؑ کے عظیم الشان موقع اور ان کی شہادت کی نوعیت سے تھا اور پھر اس کے بعد ان ائمہ کا منتقدی قوت دار جوش تھا جنھوں نے ان فقرات میں ایک اصول کے نشوونما کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ اصول کی سادگی اور اسے سانحہ کی دردانگیزی سے جو ربط تھا اور پھر اس کے علاوہ رونے رلانے اور رونے والوں کی صورت بنانا جس قدر بے خرچ تھا اس نے قلوب کے مائل کرنے میں آسان کامیابی حاصل کی۔ اور پھر موجود لوگوں میں اس شرم کا فطرۃً ہونا کہ نواسۂ رسولؐ شہید ہو جائے لیکن ہم اپنے دنیاوی اغراض یا تساہلی یا کمی ہمت سے مدد نہ کریں۔ اس میں معین ہوا کہ اب اظہار ہمدردی میں کچھ کوشش کی جائے۔ رونے سے زیادہ آسان زیادہ کارگر اور زیادہ باموقع کچھ اور نہ تھا۔ سوچو کہ کون ذریعہ کس غرض کے لیے کام میں لایا گیا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ وہم یقینی نہیں ہے کہ اس اصول کے نفاذ اور نشوونما میں یہ غرض پنہاں تھی کہ جب ایک زمانہ کے بعد ہمدردان حسینؑ کی کافی تعداد ہو جائے گی تو ہم بنی امیہ سے اس شہادت کا انتقام لیں گے۔ اور اب بجائے کسی فوری کوشش کے اثر کے طویل نشوونما سے کام نکالنے کا ارادہ کیا گیا تھا۔ نہیں، بلکہ میں سوچتا ہوں کہ حسینؑ کی شہادت کے بعد بنی امیہ کے خلاف جو ہیجان نفرت پیدا ہوا تھا اور جس کا یہ اثر تھا کہ خود اموی اور یزید و قاتلان حسینؑ بھی اس سے انکار کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ حسینؑ کی شہادت کا صحیح انتقام تھا اور اس میں جب ہمدردی کا یہ آسان اصول شامل ہوتے ہوتے ترقی کرتے کرتے اور جزو عادت و خصائل ہوتے ہوتے ایک حد تک پہنچ جاتا۔ یعنی قتل حسینؑ عموماً ایک ملعون فعل سمجھا اور یقین کر لیا جاتا اور حسینؑ کی شہادت اور اس کے اصول کی عظمت عام ہو جاتی تو اس کے دوسرے معنی یہ تھے کہ اموی روح عداوت فنا ہو جاتی عام اس سے اموی نسل ضائع ہوتی یا نہ ہوتی۔ اور اس طرح ان انقلابات کی محتاجی نہ ہوتی جو مختار وغیرہ سے ظاہر ہوئی۔ اگرچہ شہادت کے عظیم الشان اثر سے کوئی فوری ہیجان نہ ہونا بھی عجب خیز ہوتا۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اس اصول سے کیا غرض تھی اور ائمہؑ کی اس وقت کیا حالت تھی؟۔ اس اصول سے یہ غرض تھی کہ حسینؑ سے محبت اور ہمدردی پیدا ہو جائے۔ اور جب میں "حسینؑ" کا لفظ استعمال کر رہا ہوں تو میں یہ سمجھا رہا ہوں کہ وہ تمام حیثیتیں جو اس نام سے متعلق تھیں ان کا مرکز۔ اور جب میں محبت کا لفظ استعمال کر رہا ہوں تو اس کے پورے وسیع مفہوم سے میرے خیال کا تعلق ہے۔ حسینؑ کی سب سے بڑی حیثیت ان کی شہادت تھی۔ شہادت اس لیے تھی کہ حسینؑ کا وہ بلند خاصہ جس کی تربیت کے مختلف اثرات تم پہلے پڑھ چکے، وہ اسے گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ اسلام یعنی مسلمانوں کے دینی اخلاقی رسمی قانونی تمدنی اصول کا رہنما اور افسر یزید کا سا شخص ہو۔ اور وہ اس طرح ہو کہ ہمیں اپنی رسمی موافقت پر مجبور کر کے ہماری ہستی کو (جو اسلام کا مثالیہ سمجھی جاتی ہے) اصولاً نیست و نابود کر دے۔ اگرچہ ہمارا گوشت یا ہڈیاں اور خون لوگوں کو دکھائی دے۔ اب ائمہؑ کی مصلحت کے یہ معنی تھے کہ ایسے حسینؑ سے محبت و ہمدردی پیدا کرے یعنی لوگوں کے ارادہ اور خیال کو

ان اصول کی محبت بے رنگ دے۔ تم سوچ سکتے ہو کہ یہ کوئی آسان کام نہ تھا جب حسینؑ کے خلاف جوش عداوت ترقی کرتے کرتے پچاس برس میں ایسا ہوا تھا کہ واقعہ کربلا ہو سکتا تو ایک جڑ پکڑی ہوئی عداوت کو اکھاڑ دینے اور طبائع انسانی کا خاصہ بدل دینے کے لیے نسبۃً زیادہ وقت اور زیادہ سامان چاہیے تھے۔ سامان کی یہ حالت تھی کہ اور چیزوں کا تو کیا ذکر صدیوں تک ممالک اسلامی میں اس سے بڑا کوئی سلطنت کا جرم نہ تھا کہ کوئی اہل بیتِ رسالتؐ سے اظہارِ محبت کرے۔ اس سے تم کچھ سکتے ہو کہ حسینؑ سے محبت و ہمدردی کے اس اصول کے نشو میں ائمہؑ کو یہ تک موقع حاصل نہ تھا کہ وہ اس طرح مجلس منعقد کرتے جیسے مجمع ہم کرلیا کرتے ہیں۔ لیکن یہ سوچنا محال ہے کہ ایک قوم میں عموماً محبت و ہمدردی پیدا کرنا کسی اصول سے پیدا کرنا، ایک انفرادی حیثیت کا اصول تھا۔ نہیں۔ بلکہ یہ معاشرت اور اس کی قوت کا سب سے قوی اصول تھا۔ اسلام کو بہ نسبت دیگر ادیان کے اس کی معاشرتی قوت سے امتیاز حاصل ہے۔ وہی معاشرتی اصول اب پھر برتا گیا تھا۔ اسلام کے نام سے نہیں بلکہ اس کے پیچ مثالیہ یعنی حسینؑ کے نام سے۔ حسینؑ کے نام کی مرکزیت سے۔ یعنی حسینؑ کا اسم مقدس وہ کنجی تھی جس سے انسان کی تکمیل۔ انسان کی معاشرت، انسان کے مذہب اور انسان کے اخلاق میں ایک انقلاب عظیم پیدا کرنے کا ارادہ کیا گیا تھا۔ محبت اور ہمدردی سے۔ یعنی واقفیت، تربیت، ارادہ اور وابستگی سے۔ یا دوسرے لفظوں میں ایک قوم بنانے کا سانچہ تھا جس کے افراد سے حسینؑ یاد آئیں۔ حسینؑ ظاہر ہوں اور حسینؑ ابدالآباد تک اپنی جسمانی حیات سے قوی تر حیات میں زندہ رہیں۔ زیادہ بسیط، زیادہ لطیف اور زیادہ واضح ہو کر۔

تو میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اس اصول کے معنی انفرادی ہمدردی نہیں ہو سکتی اور نہ یہ ممکن تھا کہ کسی خاص ذات سے انفرادی ہمدردی کا مجموعہ ہمیشہ منفرد رہتا۔ نہیں بلکہ ایک نوعیت کی چیزیں ضرور ایک جگہ جمع ہوتیں اور وہ دینی اور معاشرتی صورت اختیار کرتیں۔ اس اصول کی ایک سب سے بڑی خوبصورتی یہ تھی کہ راسخ حیثیت سے افراد بنائے تھے جن میں قوم بننے اور اور مجموعہ کی صورت اختیار کرنے کی فطری صلاحیت تھی۔ اور اگر اس کی کوشش کی جاتی کہ ہم مجمع اور کافی تعداد سے ہم خیال چاہیں تو اس کی کامیابی نہایت ظاہر طریقوں کی محتاج ہوتی جن میں سے کوئی ممکن نہ تھی۔ قوم گر اپنے اصول میں کامیاب ہوئے اور مجلسیں اس اصول کی کامیابی کی بہترین دلیل ہیں۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ مجلسیں ہونے لگیں اور لوگ دکھائی دینے لگے۔ حسینؑ کے مصائب کا ذکر ہونے لگا تو کیا اصول کی غرض پوری ہو گئی؟۔ نہیں واللہ۔

یہ تو اصول کے ظاہری آسان نتائج یا ابتدائی شکلیں تھیں۔ آنسو کے چند قطرے یا غم کی صورت تمہارا پہلا عہد تھا۔ تمہارا پہلا پیش کش تھا۔ جس کے بغیر تم اصول کے پہلے دروازہ پر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ یہ کشف صدر تھا اور بس۔

تم نے بانیانِ قوم، رہنمایانِ ملت اور رؤسائے روحانی کے اقوال خصوصاً بڑے اصول کو اس قدر چھلا کیوں سمجھ لیا ہے کہ ان کی غرض یہ تھی اور بس کہ عورتوں کا آکہ تمہارا اجزو خصائل ہوتا اور بس۔ یہ ہماری کاہلی، ہماری غلط فہمی، ہماری بے مغزی ہوگی کہ بانیان کا فرض بیج بونے تک پورا ہو گیا۔ پودا اگے یا نہ اگے۔ اور اگے تو اسے پانی دیا جائے یا خشک ہو جائے۔ نہ آبیاری کی ضرورت رہی نہ غیر ضروری اور بدنما شاخوں کے تراشنے کی۔

یہ ہمارا ضعف تخیل، پیش بینی کی کمی، مفید باتوں سے فائدہ اٹھانے کی کمی صلاحیت تھی جس نے ہمیں انحطاط اور زوال کا

مرادف بنا دیا۔ نتیجہ کیا ہوا۔ یہ کہ مجلس کا مفہوم تو سوخت ہو گیا اور اب ایک محاسب کے نزدیک اس اعتراض کی گنجائش پیدا ہوگئی کہ یہ اقتصادی فشار کی حالت میں ایک اور بار ہے اور ہمارے مزید غور کی راہ میں اپنی رسمی صورت سے ایک آڑ ہوگئی۔

"میکانہ امید" جو یہود کے قومی مصالح میں مفید ترین تھی اور جو مؤرخین کے نزدیک قومی تیاری کا ایک ذریعہ ہو سکتی ہے اپنی معاشرتی صورت اور عناصر کے لحاظ سے مجلس کی ایسی معاشرتی قابلیت نہ رکھتی تھی۔ ہمارے پاس نہ صرف میکانہ امید کی طرح اُصولاً "اِنتظارِ مہدیؑ" تھا۔ بلکہ مجلس بھی تھی جو اگر ایک نظریہ تو دوسرا عملی ذریعہ سے تعبیر کیا جا سکے۔ ہم کس طرح تیار تھے۔ اسے ہمارے زمانہ کی تاریخ نے دکھا دیا۔ اس طرح دکھایا جس سے سخت تر اور زیادہ نادم کرنے والی کسی قوم کی مثال نہیں ہو سکتی تھی۔ کیا تھی۔ امام ثامنؑ کے روضہ مقدس کا واقعہ۔ واقعہ نے ہمیں کیونکر پایا۔ یہ کہ ہم نے چند اشعار موزوں کر لیے۔ جس میں ہم امام صاحب الزمانؑ سے فریاد کرتے تھے۔ لوگوں نے ان نفوس قدسیہ کے وجود کو کائنات اور اسباب کائنات کی نفی سمجھ لیا ہے۔ اور اس کے بعد ایک مجلس بڑھ گئی!۔ کیا ہوگا اگر بقیہ اماکن مقدسہ کی بھی یہی حالت ہو۔ چند ایسی ہی اور مجلسیں بڑھ جائیں گی۔ دوسرے لفظوں میں ہم اس سے ایک قدم آگے نہیں بڑھے تھے۔ جس حالت میں حسینؑ یادین کے مجمع نے اپنے کو بے یار و مددگار پایا تھا۔

کیا یہ مجلس جو بڑھ گئی اسلام، اصول، اور اس کے مجمع سے تجدید بیعت تھی اور ہم قومی خصائل اور قومی تیاری کا حلف لے رہے تھے۔ نہیں۔ اس کا اہتمام کر رہے تھے کہ ایک جگہ جمع ہو کر چتے بیٹھیں۔ کچھ شیرینی بانٹ دیں اور کچھ ذاکری کے مخصوص انداز دیکھ لیں۔ اس کے بعد؟ اس کے بعد یہ کہ انھیں امتیاز کا ایک موقع یاد رکھیں۔ ذاکر فاتحانہ انداز سے داہنے بائیں دیکھے اور لوگ اپنے ایثار پر ناز کریں کہ ہم نے کچھ وقت اس مشغلہ میں صرف کر دیا۔ بس؟۔ بس۔ شاید اس قدر اور کہ کسی اخبار میں چھپوا دیا جائے۔ یا مجلس کا فوٹو لے لیا جائے۔ اس کے بعد۔ اب پھر کہیں گے۔ نیند لگی ہے۔! کیا تم انھیں خصائل پر امام عصر کی امید کرتے ہو؟۔ نہیں ایسی امید۔ اصول سے مضحکہ ہے۔ اصول کی ناسمجھی ہے۔ تمھاری ترقی ظہور کی ایک صورت ہوئی۔ کیا تم نے ایسی احادیث نہیں سنیں کہ امام عصر کا ظہور ایسے ایسے چالیس آدمیوں کے ہونے پر ہوگا۔ یا امام عصر کے ہمراہ ایسے اور ایسے آدمی ہوں گے۔ اور جماعت کا ربط ضبط اس درجہ پر ہوگا۔ کیا یہ ایک بے معنی فقرہ ہے یا لفظوں کا بے کار مصرف ہے؟۔ نہیں، بلکہ ہماری قومی ترقی کو ایک لامحدود زمانہ کے حوالہ کیا ہے۔ درست خصائل کا ایک معیار اور اصول حوالہ کیا ہے اور مایوسی سے روکا ہے۔

کیا حسینؑ کی شہادت کی غرض یہ تھی کہ کچھ رونے والے پیدا ہو جائیں اور بس۔ یا ہمدردی کے اس اصول سے ائمہ کی یہ غرض تھی کہ جب ایسا ہوگا تو ہم کو حصول اختیار میں آسانی ہوگی۔ اس سے زیادہ لغو کوئی خیال نہیں ہو سکتا۔ اگر ان انوار مقدسہ میں یہ حوصلہ ہوتا تو ایک اشارہ اور بس بنی امیہ اور بنی عباس کی سلطنتیں ان گھروں کو سونے اور چاندی سے بھر دیتیں۔ اگر ان میں ایسا ہی حوصلہ ہوتا تو پھر یہ علاج بالمثل کیوں نہ کرتے۔ علاج بالضد کی کیا ضرورت تھی۔ کیا بنی امیہ کی کامیابی ان کے سامنے نہ تھی کہ انھوں نے مل کر بنی تیم اور عدی سے اختیار لے لیا۔

یہ نفوس قدسی نہ ملنے اور علیحدگی میں ایک بڑی شریف حس ایک بڑے بلند ارادے پر کھڑے تھے اور وہ بداخلاقی سے مس تک نہ ہونے، ہوا تک نہ لگنے دیتا تھا۔ اور اپنے اصول سے ایک قوم بناتا تھا جو ایک صاحب خصائل، صاحب ارادہ

بلند قوم ہو جو حق پر چلتی ہو۔ تمھیں دیکھ کر یہ الفاظ طلحہ کے حلق میں اٹک جائیں کہ ہماری دنیا ایک مرکزِ اخلاق کی بنائی ہوئی نہیں ہوسکتی۔ جہاں اس قدر وحشت، اس قدر مغائرت، اس قدر خود غرضی، اس قدر ظلم اور ایسی برائیاں ہیں، بلکہ یہ دنیا کو جنت بنا رہے تھے۔ جہاں سے فرد اور جماعت کی ایذا رسانی سے فرد اور جماعت محفوظ ہوتی اور اس خیالی لفظ کی حقیقی حکومت ہوتی۔ جسے محبت کہتے ہیں۔ تو "قومی تیاری" اور خصائل کی درستی یا ایسی قوم جسے اور جس کے افراد کو دیکھ کر حسینؑ یاد آئیں۔ اس سے میری کیا غرض ہے۔ کیا اس سے میرا ویسا ہی مفہوم ہے جس کا ہمیں اکثر طعنہ دیا جاتا ہے کہ اگر جناب امیرؑ "غالب علی کل غالب" تھے تو انھوں نے ایسا اور ایسا کیوں نہ کیا۔ دوسرے لفظوں میں قوی ہونے یا بعض حالتوں پر مختار ہونے کے معنی بدنصیبی سے یہ سمجھ لیے گئے ہیں اگر کوئی شخص جسمانی حیثیت سے قوی ہے تو وہ لازماً دوسرے کا بات بات پر ٹیٹوا دبایا کرے۔ نہیں بلکہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر ایک قوم جسمانی، دماغی، علمی، اقتصادی اور روحانی حیثیت سے بغیر آزار خلق ممتاز ہونا چاہیے تو وہ دین اور دنیا کسی کا بھی گناہ نہیں کر رہی ہے بلکہ وہ عالم کے لیے ایک مثالیہ خیر پیش کر رہی ہے۔ اور ان چیزوں کو آپس میں ایک دوسرے سے جو ربط ہے اگر ان میں سے کسی ایک میں بھی کمی ہے تو پہچاننے والی نگاہ کہہ دے گی کہ کس جگہ قومی چول ڈھیلی ہے۔

لیکن ان تمام باتوں میں ممتاز ہونا اگرچہ خیال دلاتا ہے کہ ایک قوم اپنے ضروریات زندگی اور روحانی میں بڑی ذی ہوش ہے۔ لیکن آگے میں اکثر مواقع پر کہہ چکا ہوں کہ کچھ ضرور نہیں ہے کہ بڑے عالم کے معنی بڑے صاحب اخلاق حمیدہ یا بڑے واقف مذہب کے معنی بڑی متقی کے ہیں۔ نہ کسی پہلوان کے معنی یہ ہیں کہ وہ دماغی پہلوان بھی ہے۔ نہ اس طرح بڑے ماہر اقتصاد کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کا عامل بھی ہے۔ اور اس میں کوشاں ہے کہ کن مختلف ذرائع سے قوم کے اخراجات سے اس کی آمدنی اس طرح بڑھا دے کہ تجارت اس کی ہم وزنی، رقابت اور تعصبات اسے گھٹنے نہ دیں اور وہ اپنی معاش وغیرہ میں دوسروں کا دست نگر نہ ہو جائے۔ اور اپنے ذرائع معاش میں ترقی کرتا جائے۔ بلکہ میری غرض یہ ہے کہ ان باتوں میں انفرادی یا مجموعی حیثیت کے بعد بھی درستی خصائل ایک چیز باقی رہ جاتی ہے۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا ہوں کہ علمی، دماغی اور روحانی ترقی کے معنی یہ ہیں خصائل درست ہوں۔ یا ہونے چاہییں۔ مختصر لفظوں میں یہ کہتا ہوں کہ جب آدمی، اپنے، حقوق عباد اور حقوق معبود میں انصاف کر سکتا ہے، جب عدل اس کا جزوِ عادت ہو جاتا ہے، جب حق روی اس کی طینت میں داخل ہو جاتی اور اعتبار قائم ہو جاتا ہے، جب دنیا اس کے شر سے محفوظ ہو جاتی ہے اور جب اس کے مخالفین پر بھی اس کی عادت اور اس کی ذات کی ہیبت طاری ہوتی ہے اور جب فریب دینے والی چیزیں اس کے سامنے اپنا عجز ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً ہو کہ قوم کی کمزوریوں کا ساتھ دینا بھی اصول قومیت ہو لیکن اگر وہ دیکھتا ہے کہ ہم ایسے اصول قومیت کے شریک نہ ہو کر جو اصول انسانیت اور مخلوقات کے مضر ہیں بجائے اپنے سے منسوب جماعت کے عام انسانیت کے لیے نافع ہوں گے تو وہ ایسے کسی کمزور حس سے متاثر نہ ہو کہ ہم اصول قومی کے خلاف کر رہے ہیں۔ قومی ملامت اسے انسانی ملامت کے سامنے مغلوب نہ کر دے۔

حقوق (جس سے فرائض علیحدہ نہیں کرتا) عدل اور حق روی کے ایسے وسیع الفاظ نہ کسی وضاحت کے لیے استعمال کر رہا ہوں اور نہ مجھے اس کا خوف ہے کہ میرے ناظرین کی کافی تعداد اس کے مبہم ہونے کی شکایت کرے گی۔ بلکہ مجھے

یقین ہے کہ وہ اس کی بلندی مفہوم اور خصائل پر ان کے اثر سے میرے مفہوم کا اندازہ کریں گے۔
ذرائع علمی کی کتابی صورتیں اگرچہ اس سے عاری نہیں ہیں کہ وہ درستی خصائل میں مدد دیں۔ لیکن تاثر کے ایسے لمبے لیکچر اور ہوئل (محفل) کی ایسی فربہ کتابیں اس حیرت انگیز ساحرانہ اثر کے مقابلہ میں کوئی ہستی نہیں رکھتیں، جسے ذاتی مس کہتے ہیں اور جو زندہ مثال سے حاصل ہوتا ہے۔ مسلمان ناخوش ہیں کہ کفار قریش اکمل افراد عالم کو ساحر کہتے تھے۔ میرے ناچیز خیال میں اس ذات اعلیٰ کے اثرات سمجھانے کے لیے اگر مجھ سے کوئی مناسب لفظ پوچھے تو سب سے پہلے میری نگاہ اس لفظ پر پڑے گی، اور میں خوش ہوں گا کہ میں نے وسیع تعریف کی۔ ذات کی حیرت انگیز کشش کا یہ سحر ہی تو تھا کہ برا کہتا ہوا آتا ہے غلام بن کر دعائیں دیتا ہوا جاتا ہے۔ مس اور تمام خاصہ بدل گیا!۔ اس کی مثالیں نہ صرف سفیر الٰہی بلکہ شرح سفیر الٰہی اور ہمارے "شاہزادہ صلح" کے علاوہ اصول خیر کے سب سے وسیع مفہوم کے شہید اعظم میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن اصل منا ذات مقدس نبوی تھی۔ جس نے اپنا سلسلہ جاری رکھا۔ ایک کتاب تھی جو بول رہی تھی۔ اور یہ بولے گی، جب تک آخری سانس دنیا میں چلے گی۔
مختصر صاف اور مشہور لفظوں میں صاحب خصائل وہ کہا جاتا ہے جو سچ بولتا ہے۔ جو خفیف الحرکات نہیں ہوتا جسے معاشرت اور اخلاق کے امور معروف کا لحاظ ہوتا ہے۔ اور جو دوسروں کی اخلاقی قوت اور خوبیوں کا معترف ہوتا ہے۔ بغیر ایسی صورتوں کے جس میں "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو"۔ سے کوئی واسطہ ہو۔ یا بغیر اپنے کسی مخصوص حلقہ اور لحاظ فوائد کے۔ وہ خوبیوں کو خوبیوں کی وجہ سے پسند کرتا ہے۔ اور جسے ذلیل باتوں کے قبول کرنے سے شریفانہ نفرت ہے۔ ایسے ہو اور اس وقت تم ابجد خواں ہو گے اس مدرسہ کے جو حسینؑ کا درس دیتا ہے۔ اور تم کہے جاؤ گے کہ فلاں شخص حسینؑ کے مدرسہ خصائل کا شاگرد ہے۔ اور جب اس طرح تمہارے افراد کی تعداد بڑھے گی اور بڑھتی جائے گی تو تم ایک قوم ہو گے جو منفعیت اور خود غرضی پر نہیں بنی ہے بلکہ انسانیت پر بنی ہے۔ جو چارہ پر نہیں بنی ہے روٹی پر نہیں بنی ہے، دھاتوں پر نہیں بنی ہے۔ اصول خیر پر بنی ہے۔ اور اس بلندی پر جمع ہو کر ایک ہوتی ہے۔ اب میں سوچتا ہوں کہ "قومی تیاری" خصائل کی "درستی" اور "جسے دیکھ کر حسینؑ یاد آئیں" میں واضح حد تک سمجھا جا سکا۔
خیر، تو اچھا ہے اور بہت اچھا ہے کہ کوئی شخص آنسوؤں کے چند قطرے سے وہ بڑا انعام حاصل کرلے جسے جنت کہتے ہیں۔ ہمارا مسئلہ شفاعت مسیحیوں کے ایسا عجب خیز نہیں ہے کہ گناہوں کی گٹھڑی صرف بیٹھے خدا کے حوالہ کر دینا ہے اور بس۔ خود کچھ ہی کیوں نہ کیا جائے۔ نہیں۔ بلکہ ہم پر اور طاعات ویسی ہی فرض ہیں جیسے حسینؑ کا غم کرنا۔ کیونکہ حسینؑ کے مصائب تو انھیں طاعات کے قائم کرنے کے لیے تھے۔ وہ عظیم الشان ہیجان جسے رونے کی حالت کہتے ہیں۔ ایک مظلوم کے لیے چند قطرہ اشک آنکھوں میں نمی اور سرد آہ۔ اور آدمی محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک عالم راحت میں ہے۔ اس میں سکون پیدا ہو گیا۔ وہ ایک بے آزار عالم میں ہے۔ وہ دنیا ہی میں جنت میں تھا۔ اسے جنت کا نمونہ دکھایا گیا تھا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا حسینؑ پر رونا چاہیے اور میں نے کہا کہ جو شخص واقعہ کربلا سے متاثر نہیں ہوتا میرے نزدیک اس کے خاصہ اخلاقی میں کمی ہے۔
لیکن کیا تم اس پر کفایت کرو گے؟ جس وقت میں یہ سوال کرتا ہوں اس وقت یہ سمجھا رہا ہوں کہ تمہارا ادعائے

پیروی حسینؑ اس شخص سے بلند درجہ پر نہیں ہے جو مسلمان بھی نہیں ہے۔ لیکن چونکہ انسانی فطرت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ کسی انسان کی مصیبت سن کر متاثر ہو جائے۔ اس لیے وہ بھی تمہاری طرح رو دیتا ہے۔ حسینؑ ہی پر کیا موقوف ہے کسی کے مصائب کیوں نہ ہوں۔ وہ ایک گھڑا ہوا قصہ ہی کیوں نہ ہو۔ اب تم سمجھو گے کہ عام اثر اور عارفانہ احساس میں تیں حد بندی کر رہا ہوں۔ اور میں یہ بھی کہہ رہا ہوں کہ محض رو دینا کافی نہیں ہے جب تک کہ تم حسینؑ کے شرافت اعمال اور غرض شہادت کے سمجھنے کے قابل نہ ہو۔ میں آنسو کے پیچھے دیکھنا چاہتا ہوں کہ تمہارا درجہ ہمدردی اور اثر کیا ہے۔ تم کتنے حق پسند، مستقل مزاج، کریم النفس، رحیم، ہمدرد، سخی اور شجاع ہو۔ تم مصیبتوں کا کس طرح مقابلہ کرتے ہو۔ تم میں غیرت کتنی ہے۔ اب مجھے یہ پوچھنے دو کہ کیا ہم اپنے موجودہ درجہ تعلیم اور خصائل سے، شرافت اعمال، شہادت اور حسینؑ کو سمجھ سکتے ہیں۔ نہیں۔ ہزار نہیں۔ حسینؑ کی شہادت کے بعد آج تک ایسے بہت سے نہیں گزرے۔ جنھیں حسینؑ اور ان کے عمل کا کامل احساس ہو۔ میں واقف ہوں کہ ادھر کئی برس کے واقعات میں اخباروں کے اکثر مضامین میں حسینؑ کا نام بلند ہو گیا۔ کیا ہوتا اگر حسینؑ کے خصائل طرابلس، مراقش، بلقان اور ایران میں پائے جاتے؟ یہ لوگ نہ تھے۔ جنھیں حسینؑ یاد آئے۔ یہ حسینؑ کی حیات تھی جس نے اپنا ثبوت دیا۔ اور ہمارے زمانہ کے سب سے بڑے شہید شہید تبریز ثقۃ الاسلام کی ذات پر اپنا اثر بھی دکھا دیا۔ کیا ان ممالک مین ایک سو یا ہزار مارے گئے تھے؟ نہیں۔ کیوں؟ بلندی خصائل جس نے انسان کے خاصہ اخلاقی میں ایک تموج پیدا کر دیا۔

تمھیں یاد ہوگا کہ میں نے کہیں کہا ہے کہ "میں نے ایک مرتبہ نہیں سوچا کہ حسینؑ کو زندہ قومیں بہ نسبت ہمارے بہتر سمجھ سکتی ہیں"۔ میرا اس سے کیا مطلب ہے؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ مسائل اخلاق، دین اور قومیت کو ایک تعلیم یافتہ اور صاحب خصائل انسان بہ نسبت جاہل کے بہتر سمجھ سکتا ہے۔ اور کیا زندہ قوموں میں اپنی ان تمام چیزوں کی ترقی اور حفظ جان سے زیادہ عزیز نہیں ہوتا؟ اور وہ اس دن کے لیے تیار ہوتی رہتی ہیں۔ مال، وقت اور دماغ کی قربانیاں کرتی ہیں کہ اس وقت کو اپنے سے دور رکھیں جب کہ ہم سے ایک زیادہ صاحب ارادہ قوم ہمارے خصائل پر قبضہ کر لے اور پھر ہم بجائے اپنے کے دوسرے کے ہو جائیں۔ یہاں تک کہ اپنی جانوں کی قربانیوں کو بھی اس کے مقابلہ میں ہیچ سمجھتے ہیں۔ وہ قوم حقیقی ہے جو اپنے سامانوں میں زیادہ تیار رہتی ہے۔ ایسی قومیں دوسروں کی ایسی ہی بلندی خصلت کی قدر کیے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ کون ہے جو اس کی قدر نہ کرے گا کہ حسینؑ نے کس وقت اور کس سامان سے دین، قوم اور اخلاق کی حفاظت کی۔ نہ مجبوری سے بلکہ پر مسرت شوق سے۔

تم میری مسرت کا اندازہ نہیں کر سکتے جب میں نے اپنے کئی انڈر گریجویٹوں اور گریجویٹوں سے جو مشن کے کالجوں میں پڑھتے تھے سنا کہ ان کے دوران تعلیم میں کئی پروفیسروں نے ابن مریمؑ کی شہادت کو بنی آدم کے لیے بڑی قربانی ثابت کرنا چاہا، اور انھوں نے شیر خوردہ بنتِ رسولؐ کی عظیم الشان قربانی کا ذکر کر کے چپ کرا دیا۔ اگرچہ انھیں حسینؑ سے اتنی ہی واقفیت تھی جس قدر مجلسوں میں سن کر حاصل ہوئی تھی۔ میرے دیکھنے کے لیے واقعہ نہ تھا۔ بلکہ وہ اثر تھا جو ایک استاد کو اپنے شاگرد پر حاصل ہے۔ خصوصاً جب کہ شاگردوں کو اپنے لیے آخر میں ایسے استادوں کے اسناد کی بھی ضرورت ہے۔ اور سلسلہ تعلیم بھی جاری رکھنا ہے۔ لیکن حسینؑ کے ذکر اور نام نے اتنی اخلاقی جرأت پیدا کر دی تھی کہ وہ کمزوریوں پر غالب آئے اور

صاف گوئی کی ہمت ہوتی۔ حیرت کہ جس وقت ایک مرتب نظام اور اس کے کارکن کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ صداقت کہہ رہی تھی کہ تمھارے نظام میں اس وقت ہماری حکومت ہے!۔ میں نے اپنا کوئی زمانہ حال کا تعلیم یافتہ نہیں پایا مگر یہ کہ اس پر حضرتؑ کے کارناموں کا وجدانی اثر تھا۔ حسینؑ اس قدر زبانوں پر نہ تھے جس قدر دل میں تھے یا اس قدر بلند نہ تھے جس قدر گہرے تھے۔ یہ حالتیں امید کے اندر رہیں اور سمجھ میں آتا ہے کہ علم اور خصلت کا اقتضا حسینؑ شناسی ہے۔

اگر ایسا ہے کہ علم اور خصلت کا اقتضا حسینؑ شناسی ہے جیسا بلا شبہ ہے۔ تو ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ سب سے بڑی نیکی وہ ہے جو زیادہ سے زیادہ افراد جماعت کو پہنچائی جاسکے۔ بے شک یہ نیکی ہے کہ کوئی ایسی مجلس قائم کرے جہاں مثالی انسانوں کے خصائل بیان ہوں، بے شک یہ ایک حیثیت کی نیکی ہے کہ کچھ لوگوں کا منھ میٹھا کر دیا جائے اور یہ معاشرتی یک جہتی کا ہی ایک ذریعہ ہے۔ لیکن مقتضیات زمانہ اور عقل چاہتی ہے کہ یہ اور زیادہ مضبوط بنیاد پر قائم کیا جائے۔ زمانہ اب نظریہ کا فریفتہ نہیں ہے عمل کا دلدادہ ہے۔

تو مضبوط بنیاد سے میرا کیا مطلب ہے۔ یہ کہ اگر تم سے کوئی غیر قوم کا شخص پوچھے کہ تم روئے تو خوب لیکن تم نے حسینؑ کے اسم مقدس اور ان کے بلند خصائل کے قیام اور نفاذ کے لیے کیا کیا؟ اور ان کے پہنچوانے کے لیے وقت، مال اور دماغ کی کس قدر قربانی کی؟۔ حسینؑ کے نام پر تعلیم دو اور حاصل کرو۔ یہاں تک کہ تم میں کوئی ایسا نہ ہو جو کم سے کم اپنے زبان میں حسینؑ کے حالات نہ پڑھ سکے۔ ہر سال کے محرم ختم ہونے پر اس سے خوش نہ ہو جاؤ کہ اس سال خوب گریہ و بکا ہوئی اور خوب شیرینی تقسیم ہوئی، بلکہ یہ بھی دیکھو کہ تم نے حسینؑ کے نام پر کتنے لوگوں کی روٹیوں کا سہارا کیا۔ تم نے کتنے بڑھئی، لوہار، کفش دوز، زردوز، دوکاندار اور کارخانہ دار بنائے۔ تم نے کتنی بیواؤں کا عقد کر کے انھیں مطمئن اور غلط خیالوں سے روکا۔ اور کتنے یتیموں کے باپ بن کر انھیں دنیا میں غیرت سے زندہ رہنے کا طریقہ بتایا۔ اور اس طرح بیواؤں اور یتیموں کو اس سے بھی محفوظ کیا کہ وہ تمھاری ہو کر مجبوریوں سے غیر قوموں کے مالی فریب میں جذب نہ ہو جاویں۔ اور تمھاری تعداد کو قائم رکھیں اور ترقی دیں۔ خدا کے لیے ذرا غور کرو کہ ہم جس افلاس کی حالت میں ہیں اس میں اگر ہم چاہیں بھی کہ بڑے بڑے حصوں کی مجلسیں کریں تو نہیں کر سکتے۔ دیکھو وہ لوگ جو باوجود قابلیت رزق کے لیے جان توڑ کوششیں کرتے ہیں، انھیں بھی نہایت ضروری چیزیں نہیں ملتیں۔ کیا تم امید کرتے ہو کہ ہم بغیر جان توڑ کوشش کے اتنا پائیں گے کہ بسر اوقات کے علاوہ تقسیم اور اجرت ذاکری پا سکیں۔ وقت ہے کہ ہماری فراوانی معیشت پر رسومات مذہبی کی حیات موقوف ہے۔ اور چونکہ جہل نے بجائے اصول کے رسومات ہی کو عین مذہب سمجھ لیا ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا موجودہ افلاس مذہب کی فنا نہیں تو بے اثری کا ذریعہ ہے۔ قوم کی تعلیمی امداد سے قومی روپیہ ضائع نہ ہوگا۔ بلکہ جو حسینؑ کے نام کے صدقہ میں علم اور ذریعہ معاش حاصل کرے گا، وہ وجہ حسینؑ کا حامی ہوگا۔ نا احسان شناس نہ ہوگا۔ وہ سمجھے گا دنیا سمجھے گی کہ اب تک حسینؑ کے نام میں بھلائیاں کرنے کی قابلیت ہے؟۔ یہ ایک کارخانہ ہوگا جو حسینؑ کے ذکر کو قائم رکھنے کا ایک مستقل سرمایہ ہوتا جائے گا۔ بہت دن تک لوگوں نے حسینؑ کے نام پر بسر کیا۔ حسینؑ کا نام تم سے پوچھتا ہے کہ تم نے میرے قیام کے لیے کونسی علمی اور مالی بنیاد قائم کی ہے۔ کیا کسی قوم میں مجلس کا ایسا عالمگیر انہماک ہے؟ تمسخر کے لیے ہوگا۔ رونے کے لیے نہ ہوگا۔ یہ ایک صبر آزما جس کے لیے ہمارا بڑا صبر ہے۔ کیوں نہ مجلس ہی وہ ذریعہ ہو جو نہ صرف

حضرتؑ کی حقیقی ہمدردی ہو، بلکہ وہ اور فوائد بھی پہنچا سکے۔ جو اس غرض میں مدد دے۔ حسینؑ کی ایسی صبر پسند قوم سے ایسی امید بے جا نہ ہوگی کہ وہ صبر اور اصرار سے اس کامیابی کی کوشش کرے گی۔ مجلس جسے ایک چھوٹا سے قومی جسم ہونا چاہیے۔ دیکھو کہ ہر حیثیت سے اس میں تم کیسے لوگ پاتے ہو پھر بھی اگر تم اسے اپنے بلند اور شاندار روایات کے شایان سمجھو کہ جہل اور افلاس پر قناعت کرو تو بھی مجلس حسینؑ کو قائم رکھنا میں کسی مجلس میں نہیں گیا مگر یہ کہ مجھ پر جہل، افلاس اور اس کے لازمی آثار دیکھ کر اثر ہوا کہ حضرت کی مجلس کا مفہوم اور اسم گرامی "ھل من ناصر ینصرنا" کا استغاثہ بلند کر رہا ہے۔

اعلیٰ حضرت ملک معظم قیصر ہند اور حکومت ہند کا شہنشاہانہ لطف اور لحاظ

اگرچہ وقت گزرے کئی برس ہوئے لیکن میں اس وقت کے بعد حسینؑ کا پہلا مؤرخ ہوں کا جس نے اس لحاظ کو فراموش نہیں کیا ہے جو حکومت ہند اور اعلیٰ حضرت ملک معظم قیصر ہند جارج پنجم سے ظاہر ہوا۔ میں اس یادگار موقع کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ جب کہ تاریخ ہند میں بہت عرصہ کے بعد اہل ہند کو اس کا موقع ملا تھا کہ ہندوستان کے کسی شہنشاہ کی رسم تاجپوشی دیکھتے۔ یہ شاندار موقع اوائل جنوری ۱۹۱۲ء میں تجویز ہوا تھا۔ یہی محرم کا زمانہ بھی تھا۔ اس کے علم سے اپنی اسلامی رعایا کے احساس مذہبی کے لحاظ سے شاہانہ لطف نے رسم تاجپوشی کے دن بدل دی اور یہ مبارک رسم اوائل دسمبر ۱۹۱۱ء میں ادا کر دی گئی۔ یہ کوئی بڑی آسان بات نہ تھی، جب کہ بڑے سامانوں کے لیے کچھ دن کم کر دیے گئے تھے۔ ہمدردان حسینؑ کے پاس اس بے مثال شاہی تسخیر کا جواب جس نے ہمیں اپنی عنایت میں جذب کر لیا۔ اس سے بہتر کیا ہے کہ اپنے دل اور زبان سے اس کا شکریہ ادا کریں اور تعلق اور اطاعت میں اور زیادہ بے سہو رسوخ حاصل کریں۔ ہمارے لیے یہ عنایت تاریخی حیثیت کی ہوگی۔ ان ایڈیٹران اخبار کا بھی شکریہ جنھوں نے توجہ دلانے میں سعی یا پیش قدمی کی۔

مؤلف کا اطمینان اور خواہش

میں خوش ہوں کہ اب میں وہ تمام واقعات اور متعلق باتیں لکھ چکا جن کا کہنا میرے نزدیک ضروری تھا۔ اب میں اصحاب، اہل بیتؑ اور حضرت شہید اعظم پر تبصرہ شروع کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وہ شایان غور سے پڑھا جائے گا۔

بابؑ پانزدہم

تبصــــــــرہ

اصحابؑ

اصحاب سے میرا مطلب نہ صرف حضرتؑ کے غیر اعزا ہیں بلکہ اعزا بھی ہیں

میں اپنے موقع کی دشواری کو سمجھ رہا ہوں جب میں ان لوگوں پر نظر کرنے کے لیے کمر باندھ رہا ہوں جو ایسے تھے جن کی حسینؑ مدح کرسکتے۔ ان کی بہترین مدح یہی تھی کہ ان کی لاثانی خدمات کا حسینؑ اعتراف کرتے۔ یہ ایسے نہ تھے کہ حضرتؑ شب نہم یا شب شہادت کو ان کے متعلق یہ فرماسکتے کہ میں سچ کہتا ہوں کہ مرغ کی بانگ کے قبل تم میرا انکار کرو گے۔ نہ ایسے تھے جن کی نسبت کہا جاتا کہ "بروٹس تو بھی" یہ وہ تھے کہ حسینؑ انھیں ان کی جانیں حوالہ کر رہے تھے اور یہ پھر اس سے حسینؑ ہی پر قربان ہونے کا عہد کرتے تھے۔ ان کے لیے ممکن تھا کہ یہ دشمن سے مل جاتے اور اس حالت میں اگر انھیں کوئی عہدہ یا مال نہ بھی ملتا تاہم ٹل کی جائیں اس یقینی موت سے محفوظ ہوجاتیں۔ لیکن حیات کو وقار دینی اور قومی کے مقابلہ میں محفوظ نہ کرنے کا ارادہ تھا کہ یہ سب کچھ کر رہے تھے۔ موت اپنے کو اس قدر مہیب شکلوں میں انھیں دکھارہی تھی جس قدر ہیبت اپنے منہ پر اوڑھ سکتی تھی۔ یہ کہہ رہے تھے کہ ہم اپنے نشو صفات اور ارادہ میں وہ بچے نہیں ہیں جو تجھ سے ڈر جائیں۔ یہ موت پر ہنس رہے تھے۔ نہ اس شخص کی طرح جو دنیاوی آسائش سے محروم ہو کر ملحدانہ مادی عقیدہ سے یہ سوچتا ہے کہ ہم اپنی زندگی ختم کرکے دنیاوی تکلیف ختم کردیں۔ جس کے بعد نہ کوئی راحت ہے نہ کوئی تکلیف۔ کیونکہ خودکشی سے کامل فنا ہے۔ یہ لوگ دنیاوی راحت کے لیے اپنی حیات نہ سمجھتے تھے بلکہ پوری تسلیم و رضا سے ہر حالت کو برداشت کرنا جانتے تھے۔ اور اس برداشت اور اس پر صبر و شکر کو موجب تقرب ایزدی سمجھتے تھے۔ ان پر ان کی یہ حیات بار نہ تھی۔ بلکہ اس کی لذتوں سے متمتع ہو رہے تھے۔ غربت سے ہو یا امارت سے۔ یہ مادی عالم کی راحتیں نہ تھیں جن پر آہ سرد بھرنے کے لیے انھوں نے موت گوارا کی۔ بلکہ اس لیے کہ مادی عالم کی راحتیں انھیں اس لیے اپنا فریفتہ کر رہی تھیں کہ وہ اخلاق کا خون بہائیں اور "اہرمن" کی حکومت تسلیم کرلیں۔ ان کی شہادت ایسی راحتوں اور ایسی حیات کے خلاف صدائے احتجاج تھی۔ اور ان کی روش کی ایک نہایت بلند شان یہ تھی کہ جس وقت کمزور دل مصائب کے ہجوم سے اپنے زندگی کا جلد خاتمہ چاہتے یہ اپنی ان حالتوں میں اس لیے حیات کے متمنی تھے کہ ہم حسینؑ کی حفاظت کریں۔ یہ اپنے لیے نہ جیتے تھے بلکہ حسینؑ کے لیے زندہ تھے۔ اور حق یہ ہے کہ انھوں نے اپنی حیات اور موت دونوں کو ایک مثالیہ قرار دیدیا۔ اگر وہ رہے تو اس لیے کہ دیکھو دنیا کے انبوہ مصائب ہمیں حق روی اور صبر و شکر سے باز نہیں رکھ سکتے۔ اور اگر انھوں نے جان دی تو اپنی موت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک زبان چھوڑی جو یہ کہتی رہے گی کہ دیکھو کربلا کے مرنے والے

اس لیے مرے ہیں کہ برائیاں انھیں اپنا ماتحت بنانا چاہتی تھیں لیکن وہ اپنی حکومت کے ساتھ دنیا سے گئے۔ حکومت اور اختیار نے اپنے نیزوں اور تلواروں سے ان کے جسم پاش پاش کردیے۔ لیکن تمام ذرائع جو انھیں ان کے بلند ارادے اور خیال سے ہٹا سکتے تھے ہیچ ثابت ہوئے۔ وہ کوئی ذریعہ ایسا نہ پیدا ہوا تھا جو انھیں مغلوب کرسکتا۔

اب ذرا ہم ان میں سے ہر ایک کی مخصوص حالت کا جائزہ لیں:

خطرہ کا پہلا احساس اور جانبازی کی مستعد شان اس وقت ظاہر ہوئی جس وقت حضرتؑ ولید کے دربار میں لے جارہے تھے۔ اصحاب اور اعزا دروازہ پر تھے۔ چوکنے تھے۔ اپنے سردار کی صدا پر کان لگائے تھے۔ صدا کی بلند جھنجھناہٹ کانوں میں پہنچی تھی کہ ہاتھ تلواروں کے قبضہ پر پہنچ گئے۔ دوڑے۔ دوڑے یعنی تیس آدمی حکومت کا مقابلہ کرنے کے لیے مستعد ہوگئے۔ نتیجہ جو کچھ ہو۔ حکم یہی ہے۔ امام کی جان اس سے زیادہ عزیز ہے کہ نتائج کا خیال کیا جائے۔ لیکن تاریخ نے یہ موقع صرف اس لیے پیش کیا تھا کہ ان کی سرفروشی اور اطاعت کے آثار مل جائیں۔ ان کی حقیقی شان اس وقت کے لیے اٹھا رکھی گئی جو آج سے چھٹے مہینہ ظاہر ہونے والی تھی۔ اگرچہ تاریخ میں ان سرفروشوں کے نام نہیں ملتے لیکن محال تھا کہ ان میں مسلمؑ نہ ہوتے، عباسؑ نہ ہوتے، یا علی اکبرؑ باپ کے سایہ کے ساتھ نہ رہتے۔

اس وقت یہ تھا چند گھنٹوں کے بعد اس کے لیے تیار ہونا تھا کہ وطن اور اس کی تمام یاد کو دل سے بھلا دیں۔ چلیں۔ کہاں؟ نہیں معلوم۔ کب تک کی جلا وطنی کے لیے؟ نہیں معلوم۔ وطن وہ ہے، جہاں حسینؑ ہوں۔ یا وہ ہے جو حسینؑ کے سایہ میں ہو۔ حسینؑ کا ایک چہرہ ان تمام مناظر اور ان کی دل چسپیوں کا خلاصہ تھا۔ جو ان کو بھلی معلوم ہوتیں۔ کہیں نہیں پایا جاتا کہ اصحاب اور اعزا نے ہمراہی میں کوئی تساہلی کی ہو۔ کہیں نہیں معلوم ہوتا کہ یہ اس وقت تیار نہ تھے جس وقت ان کے سردار نے ترک وطن کا ارادہ کیا۔ کہیں کسی پیاری چیز نے انھیں اس طرح نہ الجھایا۔ جس سے حسینؑ کو دیر ہوتی۔ ادھر سردار اپنے گھوڑے پر دکھائی دیا تھا کہ جانبا جلو میں اور پس پشت دکھائی دے رہے تھے۔ حسینؑ کے گھوڑے کا پہلا قدم اٹھا تھا کہ ان کا گروہ بیک جسم حرکت کر رہا تھا۔

ترک مقام آسان چیز نہیں ہے۔ نہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اس کی محبت اور وابستگی کے احساسات نہ تھے۔ تھے۔ اور اس لیے اور گراں تھا کہ اہل بیت کی نگاہوں کو وہ سب چیز پیاری تھی جسے مدینہ میں رسولؐ کے نام اور خیال سے نسبت ہو۔ مدینہ چھوڑنا بہت کچھ چھوڑنا تھا۔ اور پھر اس کا نعم البدل کیا تھا؟ ویران مقامات جن کے متعلق یہ بھی یقین نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہاں حوائج زندگی معمولی حیثیت سے بھی پائے جاتے ہوں گے۔ ہو۔ جو کچھ ہو۔

یہ مدینہ سے روانگی کا وقت تھا اور شاہراہ سے روانگی کا حکم تھا جس کے متعلق مسلم ابن عقیل نے صلاح دی کہ اگر ہم لوگ شاہراہ سے نہ چلیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اس لیے کہ اگر کوئی فوج تعاقب میں آئے گی تو غالباً شاہراہ سے آئے گی۔ تجربہ نے ظاہر کیا کہ ان کا خوف ایک وہم تھا۔ لیکن اس ہم کر معنی یہ نہ تھے کہ جو صلاح یہ محبت سے دے سکتے اس سے خاموشی اختیار کرتے۔

ہونے والا یہ تھا کہ بنی ہاشم کے باغ کے اس پھول کی پہلی صلاح اس کی پیشین گوئی ہوتی کہ یہ ایک اہم ترین کام کے لیے تجویز ہوتے۔ میری غرض اہل کوفہ کی طرف ان کی روانگی سے ہے۔ اس کی اہمیت اس سے کچھ میں آئے گی کہ

یہ ایسے خوفناک وقت میں تنہا جاتے ہیں۔ ایسی طرف جہاں کا تجربہ امید افزا نہ تھا اور نہ جس کے تازے وعدوں کا کوئی یقین تھا۔ یقین کرنے جا رہے تھے۔ تجربہ کرنے کی اس مخدوش حالت میں اپنی آمادگی ظاہر کرنا حسینؑ اور ان کی وجہ سے ان کی وابستگی ظاہر کرنا ہے اور پھر کام کچھ بہت آسان نہ تھا۔ لوگ تھے جو یہ کہہ رہے تھے کہ ہم ایک حکومت اور اس کے طرز عمل سے خوش نہیں ہیں اور چاہتے ہیں کہ تمھیں اپنا والی امر قرار دیں۔ طبائع کے میلان کو نہ صرف دیکھنا تھا بلکہ میلان کا رخ بھی اپنے موافق بدلنا تھا۔

ہم نہیں جانتے کہ حضرت مسلمؑ کا سن شریف اس وقت کیا تھا۔ لیکن غالباً باستثنائے حضرت امام حسینؑ علیہ السلام بنی ہاشم میں یہ سب سے زیادہ مسن تھے۔ اور اس لیے کسی اہم کام کے لیے حسینؑ کی جگہ یہی جاسکتے تھے۔ حضرتؑ کے چچازاد بھائی حضرت مسلمؑ جسمانی قوت کے لیے مشہور تھے اور حضرتؑ سے کبھی جدا نہ ہوئے تھے۔ روانہ ہوئے۔ روتے ہوئے اور یہ سن کر کہ امید ہے کہ خدا ہمیں اور تمھیں شہادت کا درجہ عطا فرمائے گا! باوجود اس امکان کے کہ اگر دشمن کو ہماری سفارت کی خبر ہوتی تو ہمیں بغیر قتل کیے نہ رہے گا۔ لیکن کام کے شروع کرنے والے معمولی دل گردے کے نہیں ہوا کرتے۔ وہ کچھ کر نہیں سکتے اگر ان میں ہمت اور استقلال نہ ہو۔ ان کے فولادی ارادے پر جان کا خیال کبھی غالب نہیں آتا۔ اور اگر فوری غلبہ حاصل بھی ہو جائے تو وہ پھر اسے قابو میں لے آتے ہیں۔

روانہ ہوئے۔ مدینہ آئے کہ مسجد نبی میں نماز پڑھ لیں۔ مدینہ اور اس کی یاد کو ایک مرتبہ تازہ کر لیں۔ روانہ ہوئے۔ بیابان کی غیر مانوس شکل اور بے آبی۔ رہنما کی ہلاکت ایک صورت تھی جو اثر کر سکتی۔ اور بری فال بھی جاتی۔ میں نہیں جانتا کہ ان کی یہ درخواست کہ "مجھے اس سفر سے معاف رکھیے" ان کی شکستہ دلی سے تھی یا اس اظہار سے وہ حضرتؑ پر موقع کی دشواری ظاہر کر رہے تھے۔ جس خیال سے کیوں نہ لکھا ہو حسینؑ کے مستحکم خط کے سبب وہ شکستہ دلی ہو یا مصلحت کا مشورہ ہو سب کو نظر انداز کر دیا، اور اس سپاہی کی طرح آگے بڑھے جو جانتا ہے کہ قلعہ سے فنا کرنے والے آلات راستہ ہی میں تمام کر دیں گے مگر وہ حکم کی عزت اور تعمیل کرتا ہے اور اپنے غور کو معلق کر دیتا ہے۔

کوفہ میں داخل ہوئے اور کچھ وقت تک انھوں نے حالت ویسی ہی پائی جیسی اہل کوفہ کے خطوط میں تھی۔ ہم نہیں جانتے کہ مسلمؑ کو انسان شناسی میں کہاں تک ملکہ و استعداد تھی اور انھوں نے کہاں تک کسی یا اکثر کے وعدوں کو احتیاط کی نظر سے دیکھا۔ اس پر اعتبار کے لیے ہمارے پاس کوئی تاریخی اشارہ نہیں ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ ان کے دیکھنے کی چیز یہ نہ تھی کہ عوام الناس کے طبائع کی نقادی میں وقت صرف کرتے بلکہ یہ روسائے کوفہ کے انداز دیکھ رہے ہوں گے اور لوگوں کی آمد بجائے ان کے انھیں روسا کے تشخص سے ہوگی۔ اس لیے انھیں صرف یہ دیکھنا تھا کہ لوگ یعنی عامہ ناس کہاں تک آرہے ہیں۔ اور غالباً اسی کو ان کے وعدہ کا معیار قرار دیا ہوگا۔ نہ جو وقت کہ ان کے پاس تھا اس میں اس کی کافی گنجائش تھی کہ وہ انفرادی طبائع کی پوری جانچ کر سکتے۔ جو کچھ انھوں نے کیا ہوگا وہ غالباً یہی تھا کہ جس وقت گروہ گروہ لوگ ان کے پاس آتے تھے یہ حضرتؑ کا خط سناتے تھے اور لوگوں کے میلان کو ان کے تسلیم یا عدم تسلیم سے سمجھتے تھے۔ اور سچ اگر یہ سوچنے کی گنجائش بھی ہو کہ اہل کوفہ کے وعدہ فوری قبولیت کے شایان نہ تھے بلکہ احتیاط چاہتے تھے تو اس سوال کے ساتھ یہ فراموش نہ کرنا ہوگا کہ ذمہ داری روسائے کوفہ کی تھی نہ مسلمؑ کی۔ اور مسلم کی آمد ہی تجربہ کا درجہ رکھتی تھی، حد یقین پر

نہ تھی۔ اس کے علاوہ اس وقت کی کسوٹی مفقود تھی۔ یعنی اب تک وعدہ کرنے والے حالت خوف میں مبتلا نہ ہوئے تھے کہ اس پر ان کے وعدے کسے جاتے۔ اس لیے تیقن یا عدم تیقین دونوں پر کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا۔
جو کچھ بھی ہو، یہ نہیں سوچا جاسکتا کہ کوفہ پہنچنے پر اپنے بے کس بھائی کی مدد کی لوگوں میں آمادگی دیکھ کر مسلمؑ خوش نہ ہوئے ہوں گے۔ اور نہ یہ عجب انگیز ہے کہ ان کے حیز نگاہ میں ایک دلچسپ عالم ہوگا لیکن یہ صورت دیرپا نہ تھی۔ ابن زیاد کی آمد اور لوگوں کی پاشانی اور خوف نے امید کو مبدل بہ یاس کرنے کی ابتدا کی ہوگی۔ اگر اس اشارہ پر اکتفا کی جائے کہ مسلمؑ نے دار مختار سے ہانی بن عروہ کے گھر پناہ کا ارادہ کیا تو اس کے کوئی معنی میرے نزدیک اور نہیں ہیں کہ مسلمؑ لوگوں کی حالت کو سمجھ گئے اور انھوں نے عامہ ناس کے وعدہ مدد پر شخصی پناہ کو ترجیح دی۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا مسلمؑ نے اس نقل مرکز کو اپنی حیات کے لیے تجویز کیا تھا؟ نہیں۔ ان کی جان اب اپنی جان نہ تھی۔ بلکہ اس وجہ کی جس کے لیے یہ بھیجے گئے تھے۔ سچ ہے کہ انسان ایک وقت فوری تصفیہ پر مجبور ہوتا ہے اور اس پر وقتی عمل بھی کرتا ہے۔ لیکن یہ تصفیہ نہ حتمی ہوا کرتا ہے اور نہ یہ عمل ناقابل ترمیم ہوتا ہے۔ بلکہ وہ ہمیشہ تجربہ کی حالت سے قابل ترمیم رہا کرتا ہے۔
مسلمؑ کا جگہ بدلنے کا تصفیہ اس وجہ سے تھا کہ انھوں نے ابن زیاد کی آمد سن کر لوگوں کے خوف سے متاثر ہونے کو سنا تھا اور غالباً اپنے پاس لوگوں کی کمی تعداد دیکھی ہوگی۔ حالت کے اس احساس کے بعد مضبوط تر موقع کا تجویز نہ کرنا غلطی ہوتی۔ اس لیے کہ اگر لوگوں کی ترک رفاقت مصدق ہو جاتی اور انھوں نے نقل مکان نہ کیا ہوتا تو انھوں نے ایک امکانی کوشش کرنے سے غفلت کی ہوتی۔ درآنحالیکہ ایسی کوشش کے بعد انھیں اس کا موقع تھا کہ انھوں نے لوگوں کے طبائع کے متعلق جو فوری تصفیہ کی اتھا اسے تجربہ پر آزماتے۔ اور لوگوں کی فوری دحشت کو ایک مرکز سے پھر دور کرتے اور انھیں ایک مقصد پر متحد ہونے کا موقع دیتے۔ نقل مکان اور ہانی کے شخص کو اپنی پناہ تجویز کرنے میں مسلمؑ نے غلطی نہ کی تھی جو اس سے ظاہر ہے کہ پھر گم گشتہ جمع ہونے لگے۔ اور اگر پہلے سے زیادہ نہیں تو پہلے سے کم بھی لوگ جمع نہ ہوئے۔
اب وقت تھا کہ حضرت مسلمؑ خصوصیت سے یہ فرماتے تھے کہ "تم اپنے اقراروں پر ثابت قدم رہنا بے وفائی نہ کرنا"۔
حضرت مسلمؑ کو ایک نہایت ہی نادر موقع ملا جس وقت ابن زیاد عیادت کے لیے آیا۔ شریک کا حتمی تصفیہ یہ تھا کہ ابن زیاد قتل کر دیا جاتا۔ اور اگر ایسا ہوتا تو فوری حیثیت سے ایک سخت اور منتظم آدمی درمیان سے اٹھ جاتا اور پھر نتیجہ سوچنا دشوار نہیں ہے کہ لوگ مسلمؑ کی رفاقت میں بے خوفی سے راسخ ہو جاتے اور انھیں اپنے کام کے لیے کافی وقت ملتا۔ اس وقت تک کہ یزید کسی شخص کو بھیجتا اور انتظام کرتا۔ یزید کو اس وقت بڑے پیمانہ پر انتظام کرنا ہوتا جس وقت مسلمؑ کو قبضہ کیے ہوئے کچھ زمانہ گزر جاتا۔ اور چونکہ مسلمؑ کے پاس کوفہ اور بصرہ کی ایسی دو فوجی چھاؤنیاں اور مرکز ہوتے اس لیے عراق عرب کا صوبہ کام دے سکتا اور پھر حجاز پر قبضہ کرنا بھی چنداں دشوار نہ ہوتا۔ بادی النظر میں صلاح بری نہ تھی۔ خصوصاً ایسی حالت کہ ایک ذرا سی کوشش سے بڑا فائدہ حاصل ہوتا۔
لیکن اس موقع پر سوال یہی نہیں ہے کہ مسلمؑ نے اس موقع پر ابن زیاد کو قتل نہ کرنے میں غلطی کی یا نہیں؟ ایک اصولی بات تھی کہ ایسی حالت میں کہ ابن زیاد عیادت کی غرض سے آیا تھا اس کا قتل کرنا مناسب تھا یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ ہانی بن عروہ کے گھر آیا تھا۔ اور اس لیے ہانی اصول مہانداری کے لحاظ سے اس کی پناہ تھے۔ تیسرے مسلم ایک حدیث کی سند

لا رہے تھے۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ محض قتل کرنا یا نہ کرنا نہ تھا بلکہ وہ بہت سے احساسات کے تابع تھا۔ ایک موقع بین مدبر کے لیے یہ موقع خدا کا بھیجا ہوا سمجھا جاتا۔ یا وہ اس اصول کو مد نظر رکھتا کہ ایسی حالت میں اگر ابن زیاد کو قتل کرنا جائز فعل نہ بھی ہو تاہم اس کے قتل سے آئندہ کے بڑے منافع حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً خلق اللہ اس کے ظلم سے آزاد ہوتی ہے اور یزید کے مرکز ظلم کا اثر کم ہوتا ہے اور آئندہ بہتر طریقہ کے نفاذ میں آسانی ہوتی ہے۔ یہاں تھوڑی سی برائی بہت سی بھلائی کا مقدمہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر برائی ہو بھی تو صرف موقع کی تھی نہ کہ ابن زیاد کے قتل کی۔ اس لیے کہ ابن زیاد تو گویا ان کے خلاف اعلان جنگ دے چکا تھا، اور اس لیے وہ اسے قتل کر کے گویا اپنی حفاظت کا اقدام کرتے۔ تیسرے یہ کہ ابن زیاد کے اعمال کی بنیاد پر اس حدیث کا استعمال اور تعلق صحیح تھا یا نہ تھا۔ یہ دلائل بظاہر با موقع ہیں اور ہم پر ان کا اثر اس لیے بھی پڑ سکتا ہے کہ ہم ایسے زمانہ میں ہیں جب کہ دنیا کے نزدیک اس پر عمل نہ کرنا احتیاط سے دور ہے۔ یا مختصر لفظوں میں یہ فلسفہ سیاست ہے اور ہمیشہ ان حکومتوں کا اصول رہا جنھیں محض وقتی مفاد پر غور سے بحث رہی۔ مثلاً ابن زیاد نے ہانی کو بلا کر گرفتار اور قتل کیا۔ اور اسے ان احساسات سے کوئی بحث نہ ہوئی کہ ہم نے وعدے کیے ہیں اور اپنے گھر بلایا ہے۔ یا کچھ لوگوں کو درمیان میں ڈالا ہے۔ اسے محض اپنے نقطہ نگاہ سے ایک دشمن یا سلطنت کے ایک مخدوش شخص کو ہٹانا تھا، اور بس۔

ابن زیاد کا کچھ کرنا شخص کو انفرادی احساسات، قومی، معاشرتی یا اخلاقی سے بری نہیں کر سکتا تھا اور اس لیے ہم اس بلند حوصلگی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے جو ایک سخت ترین دشمن کے لیے عمل میں لائی جا سکے۔ اس کے علاوہ جیسا ہم پیشتر کہہ چکے ہیں جہاں تک ہمیں معلوم ہے کہ زیر بحث شعار مصلحت اسلام کی پسند کے قابل نہ تھا۔ اور اس وقت چونکہ حضرت مسلمؒ حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کے وکیل تھے ان کے ہر فعل کو ہمیں تبعیت حسینؑ سے سمجھنا ہوگا۔ ہم نہیں جانتے کہ حضرتؑ نے مسلمؒ کی اس مصلحت کو مناسب سمجھا یا اس موقع کی فروگزاشت کو غلطی سمجھا۔ میرا خیال ہے کہ چونکہ حضرت مسلمؒ سے ایک بلند درجہ کا فعل سرزد ہو چکا تھا، حضرتؑ اس کے خلاف خیال ظاہر نہ فرما سکتے تھے۔ اگر ان کے نزدیک موقع کے لحاظ سے ابن زیاد کے قتل ہی کے وجوہات ہوتے۔

لیکن مُہلک غلطی کا وقت آ رہا تھا، اور وہ ہانی بن عروہ کا تصفیہ تھا کہ وہ ابن زیاد کے دربار میں جاتے۔ اور بغیر اس کے کہ احتیاط اور پیش بندی کی جاتی۔ یہاں بھی قبیلہ کے قول کی پابندی اور اثر تھا جس سے ہانی متاثر ہوئے۔ ابن زیاد پیشتر ہی سے انتظام کر چکا تھا، اور ان لوگوں میں جو ہانی کے لانے کے لیے مقرر ہوئے تھے اشعث کا ایک لڑکا بھی تھا۔ ممکن ہے کہ اسماء بن خارجہ اور عمر بن حجاج ابن زیاد کے ارادوں سے ناواقف ہوں۔ لیکن معمولی احتیاط یہ چاہتی تھی کہ مسلمؒ کی آمد سے جو واقعات تھے ابن زیاد کے آنے کی جو وجہ تھے اس کی بنا پر مرکزی احتیاط کی جاتی جس کے بغیر کسی انقلاب کے لیے آسانی ممکن نہ تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اسماء اور ابن حجاج کو کسی انقلاب سے زیادہ وابستگی نہ ہو لیکن قرابت کی بنیاد پر انھیں ہانی کی حفاظت کا لحاظ تھا جیسا ان کی گرفتاری کے بعد چھڑا لینے کی مستعدی سے ظاہر ہے۔ اور زیادہ افسوس اس کا ہے کہ فطرت کے لامعلوم اسباب نے ہانی کے دل پر اثر کیا۔ قصر تک پہنچتے پہنچتے ان کے دل نے خطرہ کا احساس کیا۔ مگر انھیں تنبیہ نہ ہوا۔ اور دوبارہ وہ اپنے لے جانے والوں کے قول سے مطمئن ہو گئے۔

بہت جلد ہانی کو حقیقت امر معلوم ہوئی۔ مقتل کا سامنے آنا، آئینہ دیکھ لینا تھا۔ ہانی نے یہی بات کہی کہ میں نے مسلمؑ کو خود نہیں بلایا۔ اور اس کے بعد وعدہ کیا کہ میں اب انھیں نکال دوں گا۔ اسی وعدہ میں ان کی مصلحت تھی۔ اور وہ یہ ہے کہ ہانی انھوں نے واقعاً یہی ارادہ کیا تھا کہ مسلمؑ سے کہیں کہ صورت معاملہ یہ ہے اب آپ اپنی دوسری کوئی پناہ تلاش کیجیے تو یہ خوف سے متاثر ہو کر یا اپنا موقع کمزور دیکھ کر ایک اعلیٰ احساس سے دست بردار ہوتے۔ یعنی جس پناہ دہی کو انھوں نے حیا اور مہانداری کے لحاظ سے قبول کیا تھا اس سے باز آتے۔ اور یا اس سے انھوں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ ہم ابن زیاد کے پاس جس حالت میں ہیں کہ اس کے لوگوں میں گھرے ہیں۔ باہر جا کر ہم بہت کچھ کر سکیں گے اور پھر ابن زیاد ہم پر قبضہ نہ کر سکے گا۔ واقعات کا ماحول آخر الذکر توجیہ کا قرینہ ٹھہراتا ہے۔ ہانی جانتے تھے کہ اگر ہم یہاں سے نکل سکے تو ہم اپنے قبیلہ ملازمین اور ان لوگوں میں ہوں گے جو مسلمؑ کی بیعت کر چکے ہیں اور اس وقت ہمارے ذرائع ابن زیاد کے مقابلہ بہت زیادہ ہوں گے۔ ہانی اپنے قول اور مہانداری اور پناہ کے احترام پر جس درجہ ثابت قدم تھے اور جو مصمم تصفیہ انھوں نے مسلم بن عمر الباہلی سے ظاہر کیا کہ "میں فرزند رسولؐ کے پیغامبر اور اپنے مہمان کو کبھی دشمن کے حوالہ کرنے کی رسوائی گوارا نہ کروں گا"۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ بجز دفع الوقتی کے کچھ نہ چاہتے تھے۔ لیکن ابن زیاد کا سا موقع بین اس وقت کی ایسی مفید ضمانت سے دست بردار نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس پر راضی نہ تھا کہ ہانی جائیں اور زیادہ سے زیادہ مسلمؑ پر سے اپنی پناہ ہٹا لیں۔ بلکہ وہ ہانیؒ کے اس وقت کے مجبورانہ موقع سے یہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا کہ وہ مسلمؑ کو ہمارے حوالہ بھی کر دیں۔ یہ ہانی سے ممکن نہ تھا۔ قتل کی دھمکی دی گئی۔ لیکن یہ بھی ان کے ارادہ میں لغزش پیدا نہ کر سکی۔ اور اب انھوں نے بھی اپنے قبیلہ کی قوت کی دھمکی دی۔ لیکن افسوس کہ ہانی نے موقع سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ ابن زیاد نے توہین کی اور اب ہانیؒ نے دوسرے سپاہی کے قبضہ پر ہاتھ ڈالا جس کے معنی یہ ہیں کہ خود کوئی تلوار لے کر بھی نہ گئے تھے۔ اس میں بھی کامیابی کا موقع نہ تھا۔ اسماء نے ابن زیاد کے برتاؤ کی مخالفت کی اور اس کے ساتھ بھی سختی کا برتاؤ ہوا۔ اس سب کے معنی یہ تھے کہ رفقائے ہانی کو ابن زیاد کے ارادہ میں شبہ نہ رہتا۔ عمر بن حجاج الزبیدی نے قصر کا محاصرہ کیا۔ لیکن تھوڑے سے لفظوں نے اسے ایسا اطمینان دلا دیا کہ وہ واپس بھی ہو گیا۔ کیا صرف لفظ ہی تھے جس سے وہ نہ صرف اس وقت واپس گیا بلکہ اس کے بعد ابن سعد کی کمکی فوج کا ایک افسر بھی تھا؟۔

باوجود قرابت کے ابن حجاج واپس ہوتا یا نہ ہوتا۔ مسلمؑ تھے اور ان پر ہانیؒ کا یہ احسان تھا کہ ہانیؒ نے خوف کے وقت میں پناہ دی تھی۔ مسلمؑ نے اپنے رفقا میں صدا دلائی۔ لوگ جمع ہوئے۔ غرباء اور بے ہتھیار لوگ!۔ اور امرا اس عذر میں اپنا منھ چھپا رہے تھے کہ ہم نے حسینؑ کے لیے تم سے بیعت کی ہے۔ انھیں آنے دو۔ ایسے لوگوں سے کامیابی کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ کیونکہ ان کے فطری مرکز نہ تھے جو عامہ ناس کو سنبھالے رہتے۔ جو کچھ بھی ہو۔ اور جتنے اور جیسے لوگ بھی ساتھ ہوں حملہ کیا گیا۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ قصر میں اس وقت تھوڑے سے آدمی تھے تو حملہ جوش اور قوت کے ساتھ نہ کیا گیا تھا۔ ورنہ قصر پر قبضہ اور ابن زیاد کی گرفتاری مشکل نہ تھی۔ "شام تک یہی کیفیت رہی"۔ ابتدا کا وقت نہیں معلوم۔ لیکن یہ کیفیت غالباً غل اور بے سود الفاظ سے زیادہ نہ تھی۔ اور نہ یہ خبر ہے کہ کچھ لوگ مارے بھی گئے یا زخمی ہوئے۔ چند دھمکی کے الفاظ نے اس مجمع کو منتشر کر دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ مجمع تلوار کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اور دیکھو کہ اب مسلمؑ

تنہا کھڑے ہیں۔ داہنے بائیں کہیں کوئی مددگار نہیں ہے۔ مسلمؑ واپس ہوتے ہیں اور طوعہ پناہ دیتی ہے۔ ان کی دلی کیفیت اس سے معلوم ہوگی کہ طوعہ کا پیش کیا ہوا آب و طعام رغبت نہ دلا سکا۔ دماغ نتیجہ کی مہیب شکلیں پیش کر رہا تھا اور وہ اس وجہ کو ضائع دیکھ رہے تھے۔ جس کی امید تھی۔ ضائع ایک بے خیال اور بے ارادہ جماعت کے ہاتھوں۔ قبل اس کے کہ اس پر کوئی سختی پڑی ہوتی۔

کہیں پناہ لینا دم لینے اور اس فوری دل خراش حالت کے بعد آئندہ روش طے کرنے کے لیے تھا۔ مسلمؑ غور کر رہے تھے اور ابن زیاد امان کی منادی کرا رہا تھا۔ اور اب وہی لوگ اس کے گرد جمع ہو رہے تھے جو اپنے وعدوں میں بہت پیش پیش تھے۔ ابن زیاد لالچ اور دھمکی دے رہا تھا۔ اور ہر شخص اس فکر میں تھا کہ مسلمؑ کو گرفتار کرا کر رسوخ اور روپیہ حاصل کرے۔

ہونے والا یہ تھا کہ ابن زیاد کو مسلمؑ کی خبر بھی اشعث کی اولاد سے ملتی۔ اور وہی اس کام کے لیے روانہ کیا جاتا کہ زندہ یا مردہ گرفتار کرے۔ صبح ہو چکی تھی کہ سموں کی آواز ہتھیاروں کی جھنکار سنائی دی۔ مسلح ہونے اور جنگ کے لیے نکلنے تک غریب بڑھیا کے گھر میں آگ لگا دی جا چکی تھی اور سپاہی اندر داخل ہو چکے تھے۔ "تبسم" اور نفس سے خطاب کہ "مرنے کے لیے مستعد ہو جا"۔ تلوار کا چمکنا اور گرنا اور سپاہی دروازہ کے باہر تھے۔ کچھ دیر کوشش جاری رہی۔ سپاہی اپنی تعداد کے فائدے سے داخل ہو جاتے تھے لیکن مسلمؑ کی ہمت اور ارادہ باہر نکال دیتا تھا۔ ابن زیاد کو مسلمؑ کے "مقابلہ سے پیش آنے کی" خبر دی گئی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ دشمن یہ سمجھ رہے تھے کہ مسلمؑ مرعوب ہو کر اپنے کو ہمارے حوالہ کر دیں گے۔ لیکن امر شہادت میں حسینؑ کا پیش رو۔ حسینؑ کی شان شہادت کا پیش خیمہ تھا۔ سوچو کہ تمام کوفہ کی مخالفت ہے۔ تنہا خود ہیں خستگی ہے لیکن کوئی سپاہی نہیں سامنے آتا۔ مگر یہ کہ زمین پر گر کر غلبہ حاصل کرنے سے عجز ظاہر کرتا ہے۔ ابن زیاد لکھتا ہے کہ کیوں جنگ کرنے اور کئی شخصوں کو ہلاک کرنے کا موقع دیا۔ غالباً یہی موقع نہ دینے کا خیال تھا کہ گھر میں آگ لگا دی گئی تھی کہ پہلے اس ترکیب سے سفیر حسینؑ ہلاک ہو جائے۔ ٹھیک جواب دیا ابن اشعث نے کہ "اگر ایسے شخص کا کوئی ساتھ دینے اور مدد کرنے والا ہوتا دنیا کو ہماری آنکھوں میں تاریک کر دیتا"۔ اب "پناہ" کا مشہور مکر شروع کیا گیا۔ لیکن اس خود دار ہاشمی نے ویسا ہی جواب دیا جو حسینؑ کے قائم مقام کو دینا چاہیے تھا۔ جس لفظ کو دشمنوں نے شاندار اظہار کرم کے لیے استعمال کیا تھا اسے نہ صرف مسلمؑ کے جواب کی حقارت بلکہ ان کی خون آلود شمشیر کی ایک ضرب نے کاٹ دیا۔ مسلمؑ کی تلوار حقیقی جہاد کا اعلان کرتی ہے۔ جس وقت وہ فرماتے ہیں کہ تم غدار، فجار، فاسق، اور خدا و رسولؐ کے دشمن ہو۔ اور اس کے بعد مسلمؑ شہیدانہ جوش شجاعت میں رجز پڑھتے ہیں۔ شیر گرجتا ہے اور تلوار کی چمک کے ساتھ یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ "میں نے قسم کھائی ہے کہ سوا بہادر کے کسی کو قتل نہ کروں گا"۔ یہ تو خیر۔ وہ شجاع ہے جوان کا نام لے اور جوان کا اسلحہ بردار ہو۔ شجاعت ان کی اسلحہ بردار تھی۔

اس وقت جب کہ یہ اس طرح مہیائے قضا تھے اور شہادت ان کا آماج تھا۔ عجب نہیں ہے کہ ان کی روشن ضمیری نے ان کے منہ سے یہ فقرہ نکلوایا کہ: "مجھے خوف ہے کہ میں جھٹلایا یا دھوکا دیا جاؤں گا"۔ تھوڑی ہی دیر میں یا تو یہ ایک گڑھے میں گرے جو دشمن نے انھیں گرانے کے لیے کھودا تھا یا کسی زخمی سپاہی کے خون سے پھسل گئے۔ اور یا کسی نامرد دشمن نے پشت پر سے حملہ کیا۔ دشمنوں کی تعداد کافی سے بھی زیادہ تھی کہ وہ سب اپنا موقع دیکھ کر ٹوٹ پڑتے اور شیر کو

سنبھلنے نہ دیتے۔ فوراً اسلحہ ہٹا دیا گیا۔ اب شجاعت نمائی اور تلخ گفتگو سے کوئی چیز مانع نہ تھی۔ لیکن اس وقت بھی مسلمؑ کا جسم گرفتار تھا۔ مسلمؑ کا بلند شخص اور رنا مغلوب دماغ گرفتار نہ تھا۔ اس وقت بھی زبان کی تلوار مسلم بن عمر الباہلی پر گری اور اسے اس پر ملامت کی کہ "تو نے آلِ رسولؐ کی متابعت پر آلِ ابوسفیان کی ترجیح دی"۔

نہ انکار کی ضرورت ہے نہ حیرت کی کہ مسلمؑ کے چہرہ پر آثار حزن ظاہر ہوئے۔ اور اگرچہ عبداللہ اسلمی سے تنہا مسلمؑ سے جنگ میں کوئی آثار شجاعت ظاہر نہ ہوئے لیکن وہ اس وقت طنز کے لیے آمادہ ہو گیا اور بجائے اس کے کہ وہ مسلمؑ کی یہ حالت کا اندازہ کرتا اس نے وہ کہا جو خود کر سکتا تھا۔ لیکن مسلمؑ کا جواب موجود ہے اور وہ مسلمؑ کے حزن کا ترجمہ ہے کہ: "میں اپنے لیے نہیں روتا بلکہ میں حسینؑ کے لیے متاسف ہوں"۔

کس کے قلم میں یہ قوت ہے کہ وہ اس فقرہ کے احساسات کا ترجمہ کر سکے۔ کس کے خیالات اس قدر محبت کی لطیف تھرتھراہٹ میں آلودہ ہیں جو اس کا اندازہ کر سکیں اور پھر کس میں اس قدر صبر ہے جو اس فقرہ میں داخل ہو اور اس میں وہ ہیجان نہ ہو جسے غم انگیز اثر کہتے ہیں۔ کونسا ایثار پسند دل ہے جو ایک شریف النفس کو مجبور اور آمادہ قتل دیکھ کر اس کی قدر نہ کرے کہ اسے اپنی گردن کی قدر نہیں ہے بلکہ سوچ یہ رہا ہے کہ کہیں وہ ہماری حالت میں گرفتار نہ ہو جائے جس پر ہم قربان ہو رہے ہیں۔ اس فقرہ اور اس کی تخیل سے احساس محبت کا عمل بازگشت پہلے مسلمؑ ہی پر ہوا۔ اور وہ مغموم نظر آئے۔ وہ بھول گئے کہ ہم گرفتار ہیں۔ ہر طرف پردہ تھا۔ صرف حسینؑ کی صورت اس تاریکی میں سے نکل کر مسلمؑ کو دیکھ رہی تھی اور وہ اس کی ذمہ داری محسوس کر رہے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حسینؑ اس حالت کو نہ جانیں اور یہاں آ کر مصیبت میں پھنس جائیں۔ مسلمؑ کے آن کی قربانی اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ ابن اشعث یا ابن سعد سے کہتے کہ حسینؑ کو مطلع کر دینا کہا۔ اس لیے کہ حسینؑ کے لیے تھا۔

عبداللہ اسلمی کا مکروہ اور بے رحم طنز ختم چکا تھا اور مسلمؑ سنبھل چکے تھے کہ وہ ابن زیاد کے سامنے لائے گئے۔ یقیناً اس صورت سے کہ چہرہ خون آلود ہے۔ بہا ہوا خون جم گیا ہے۔ چند نامرد تلواریں کھینچے ہیں اور بن رہے ہیں جس قدر بہادرانہ شان بنا سکتے ہیں۔ احمق کب سمجھے ہوں گے کہ شجاعت خاصہ کا ایک عکس ہے جو تصنع کا محتاج نہیں ہے۔ اسے تو نفس ایک زمانہ میں بناتا ہے۔ لیکن شجاعت نے اپنی صورت دکھا دی، جس وقت خون آلود چہرہ کی نگاہیں اہل دربار پر پڑیں اور مسلمؑ کا ہر قدم اس طرح اٹھا کہ گویا وہ ابن زیاد کے دربار کی تمام شان کو کچلتا ہوا بڑھ رہا ہے۔ آئے۔ اور جس وقت ان کی نگاہیں اپنے پر اطمینان تبسم سے دربار پر سوئیاں برسا رہی ہیں اہل دربار خصوصاً ابن زیاد اینٹھ رہا ہے کہ گرفتار رعب میں نہیں آیا اور نہ جھکا۔ اب وہ سب بل کھاتے ہیں جب وہ خلاف انسانیت اطمینان حاصل نہیں ہوتا جو کسی مجبور کی اظہار مجبوری پر ہوتا۔ گرتے ہیں اور اب وہ سب اپنے کو سمجھتے ہیں۔ اپنی شان کو سمجھتے ہیں اور مسلمؑ کی شان کو سمجھتے ہیں اور سنتے ہیں تو یہ کہ "اس پر میرا اسلام ہے جو ہدایت پر چلتا ہے موت کے سرانجام سے ڈرتا ہے اور اس (خدا) سچے بادشاہ کی اطاعت کرتا ہے"۔ کیا دنیاوی شان و شوکت، درباریوں کا مجموعہ، لباس، آرائش اور آلات حرب کا کسی کے پاس ہونا اور اس وجہ سے لوگوں کا کسی کی تعظیم کرنا مسلمؑ کے لیے تعظیم کا اصول نہ تھا۔ نہیں بلکہ وہ "ہدایت" اور "خدا کی اطاعت" کرنے والے کو سلام کرتے ہیں۔ جس سے استنباط یہ ہے کہ ان کے نزدیک انسان اس سے بہت بلند ہے کہ

چیزوں کی تعظیم کرے۔ وہ اس وقت کسی انسان کی تعظیم کر سکتا ہے جس وقت کسی میں خدا کی اطاعت، ہدایت اور موت کے سرانجام سے ڈرنے کا اثر پایا جائے۔ چھوٹے چھوٹے لفظ ہیں۔ جس کی شرح دفتر میں ہو سکتی ہے۔ نمائش کا وظیفہ خوار حاجب خوشامد میں غل مچاتا ہے کہ "امیر کو سلام نہیں کیا!" اور اب مسلمؑ کے معلوم الفاظ لامعلوم فلسفہ کا پتا دیتے ہیں۔ جب وہ کہتے ہیں کہ "چپ رہ۔ وہ میرا حاکم نہیں ہے" یا اس کے بعد فرماتے ہیں کہ: "امیر تو صرف میرے آقا کا بیٹا حسینؑ ہے"۔ یہ ضرب تھی جس نے زیاد کے بیٹے کو اپنی جگہ بھلا دی ہوگی۔ اور زمین پر اس کا ہاتھ پہنچ گیا ہوگا۔ اور خوشامدیوں کی مضحک صورت تو مصور کے قلم سے باہر ہے۔ ابن زیاد اگر اس سے علاوہ جواب دیتا جو کچھ اس نے دیا تو طبیعت شناسوں اور عمل دماغی پر غور کرنے والوں کے لیے ایک معمّہ ہوتا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ: "میں تم کو ضرور قتل کروں گا"۔ ہاں جب اسے ایک گرفتار کی مجبورانہ حالت بھی مرعوبیت اور خوشامدانہ تعظیم کی مسرت حاصل نہ کرا سکی تو وہ چوندھیا کر اپنے موجودہ اختیارات کی فہرست پر نظر ڈال رہا تھا، اور اب تصفیہ کر رہا تھا کہ ہم قتل کر کے خوش ہو سکتے ہیں۔ جسم پر اظہار اختیار اس مجموعۂ اجسام کی مدد سے جو حکومت کے ٹکڑوں سے پلے تھے۔ سامانوں سے جو مکر فریب، ظلم اور خلاف انسانیت کارروائیوں سے حاصل ہوا تھا۔ جو مٹ سکتا تھا۔ دوسروں کے قبضہ میں جا سکتا تھا۔ لیکن ایک آزاد نفس وہ چیز ہے جس پر دنیا کی سلطنتیں قبضہ کرنے سے عاجز ہیں۔

مسلمؑ اب وصیت کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔ مجمع میں سب سے زیادہ وثوق انھیں ابن سعد پر چاہیے تھا۔ اور یہ اس مجمع کا سب سے زیادہ قابل اعتبار تھا۔ جو ذلیل خوشامد میں وصیت کا احترام نہیں کرتا، بلکہ اسے ابن زیاد سے کہہ دیتا ہے۔ اور بعض کے موافق عبیداللہ بن زیاد نہ صرف اسے عہد شکنی پر ملامت کرتا ہے بلکہ یہ پیشین گوئی بھی کرتا ہے کہ حسینؑ سے بھی جو لڑنے جائے گا وہ تو یہی ہوگا۔ یہ ابن سعد کی طبیعت کا نمونہ نہ تھا قوم کا چربہ تھا۔ اور ان وصیتوں میں کوئی ایسی نہ تھی جو سیاسی رنگ میں رنگی جا سکے بجز حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کی تشریف آوری کے۔ اور چونکہ حضرت مسلمؑ اطلاع کی خواہش کر رہے تھے۔ اگر ابن زیاد صلح پسند ہوتا تو اس اطلاع سے اس بنیاد پر خوش ہوتا کہ اس سے آئندہ کا قابل الزام موقع دور ہو جائے گا۔ لیکن انسان کی طبیعت سب سے زیادہ اپنی راز گو ہے۔ وہ اپنے درجہ کو چھپا نہیں سکتی۔

بہرحال اس موقع پر جس میں ایک ہاشمی اپنے آخری وقت اپنے فرائض ادا کر رہا تھا، اور اپنے فرض ادا کرنے کی وصیت سے اپنی زبان اور معاملت کا اعتبار قائم کر رہا تھا۔ قائم مقام حکومت اپنی مصلحت بھی ظاہر کر رہا تھا کہ "زرہ کے فروخت کے متعلق ہمیں اختیار ہے"۔ لیکن یہ تو ایک ذاتی معاملہ تھا۔ بڑے مسئلہ پر بھی ابن زیاد کے جواب سے عکس پڑ رہا تھا کہ "حسینؑ کو بھی یہاں آنے دینا چاہیے تا کہ وہ بھی موت کا ذائقہ چکھ لے"۔ یہ مصلحت تھی اور دشمنی کا درجہ اس فقرہ سے سمجھ میں آئے گا کہ "حسینؑ کے لیے کوئی کرامت نہیں ہے"۔

ان باتوں کے بعد ابن خلدون سے میں نے مسلمؑ اور ابن زیاد کا مکالمہ درج کیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ اموی مؤرخ کا تدبر ہے یا حقیقتاً انھیں لفظوں میں گفتگو ہوئی۔ بہرحال میں اسے فرض کرتا ہوں کہ انھیں لفظوں میں گفتگو ہوئی۔ ابن زیاد مسلمؑ پر گروہ بندی اور نفاق کا الزام لگا رہا تھا، اور مسلمؑ کہہ رہے تھے کہ "شہر والوں نے یہ خیال کیا تھا کہ تمھارے باپ نے ان کے اچھوں کو مار ڈالا۔ خون ریزی کی اور کسریٰ و قیصر کے برتاؤ کیے۔ ہم ان کے بلانے سے ان کے پاس اس غرض سے

آئے کہ ان میں عدل و انصاف کریں اور کتاب و سنت پر عمل کرنے کی ہدایت کریں"۔ مسلمؑ کے جواب نے گروہ بندی اور نفاق کو شیشہ کی طرح چور کر دیا۔ گروہ بندی اور نفاق کیسا اور کس میں جب اہل شہر ہی نے بلایا ہے اور بلایا اس لیے ہے کہ ایک ظالمانہ نظام کی جگہ عدل و انصاف قائم کیا جائے اور کسریٰ و قیصر کے برتاؤ کی جگہ کتاب و سنت کی ہدایت کی جائے۔ افسوس کہ دربار میں کوئی مسلمان نہ تھا، ورنہ مسلمؑ کا کہنا کچھ عملی اثر کرتا۔ اس جواب کے بعد ابن زیاد کا موقع یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ مسلمؑ کو ملزم قرار دے خود اپنے اور اپنے نظام کو ملزم دیکھ رہا ہے۔ جس کا جواب اسے ایک قوم کو دینا ہے۔ لیکن اپنی مصلحت اور اپنے نظام کی صحت یا عدم صحت کے جواب میں وہ کیوں الجھتا جب کہ وہ اپنے نظام کو قائم دیکھ رہا تھا اور تلوار اس کی حفاظت کر رہی تھی۔ لیکن کچھ کہنا تھا اور اس کا طبعی کمینہ پن اس اصول کے قائم کرنے والے کو نامقبول کرنے کے لیے مسلمانوں کے مجمع میں شراب پینے کا الزام لگا دیتا ہے۔ اگر میں اس وقت موجود ہوتا تو یہ سننے کے ساتھ ہی ان لوگوں کی قبروں کی طرف دوڑتا جو یزید کے پہلے حکومت کر چکے تھے یا اعضائے حکومت تھے اور ان کی ہڈیوں کی کھڑکھڑاہٹ سنتا اور نہ حکومت کرنے والوں نے ابن زیاد کے بعد اس کے اس کہنے سے کوئی نصیحت حاصل کی بلکہ علانیہ درباروں کو شراب سے نم کیا، اور مسلمانوں کی بہت سی بدنصیبیوں میں ایک اس بڑے سبق کے باعث ہوئی۔ یہ تو خیر۔ کیا وہ محفوظ رہے جن کے حلق میں شراب بہنے کے بعد فتوے بہتے تھے؟ لیکن اسے کیا غم تھا کہ اس کے اس فقرہ کے وقت مسلمانوں میں شراب عام ہو چکی تھی۔ اور اس کا دلی نعمت ام الخبائث سے ایسا عقد کر چکا تھا جس میں طلاق نہ تھا۔ اسے تو ایک جواب اور نامقبولیت چاہتی تھی۔

بہر حال ایک نقاد کے سامنے میرے متذکرہ صدر ریمارک مسلمؑ پر سے اس الزام کو رفع نہیں کرتے۔ اور وہ کچھ دلیل چاہ سکتا ہے۔ بہتر۔ اگر حسینؑ کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ ایسے شخص کو اپنا سفیر بنا سکتے تو ان کے لیے یہ بہت آسان تھا کہ وہ یزید کی بیعت بھی کر لیتے۔ اگر ایک یہ گوارا ہوتا تو وہ یزید کے ہاتھ سے جام شراب قبول بھی کر لیتے۔ جب وہ مکہ میں آیا تھا، اور اس کی حکومت اور بیعت کی ناجوازی اس کی شراب خواری وغیرہ نہ چاہتے۔ لیکن ابھی تو مسلمؑ کا جواب باقی ہے۔ دشمن کا دربار ہے۔ اکیلے ہیں۔ کوئی ان کا گواہ نہیں ہے۔ لیکن ان کا ضمیر اس بڑے گواہ کو موجود دیکھتا ہے جو کسی جگہ غائب نہیں ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ: "اللہ خوب جانتا ہے کہ تو جھوٹا ہے"۔ لہجہ کی قوت اور معصومانہ سادگی ان کی بے گناہی کی بہترین دلیل ہے۔ کیا اس کے بعد ابن زیاد نے کسی ثبوت کو پکارا۔ اس کے لیے بہت آسان تھا اگر یہ واقعہ ہوتا۔ ایک حکم اور مدینہ سے گواہوں کا پورا قافلہ آ جاتا۔ اور ابن زیاد ہی کے دربار میں تو یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ سب اسی کے خوشامدی بیٹھے تھے۔ اس وقت تو یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی شخص جھوٹوں محض خوشامد میں گواہی دیتا کہ ہاں ہم نے مسلمؑ کو شراب پیتے دیکھا ہے۔ لیکن سچائی اور بے گناہی نے لوگوں کی زبان سی دی تھی۔ لیکن اسے اس کی بھی کیا فکر۔ جواب کی صفائی اسے پھر قلابازی کھلاتی ہے۔ اور اس میں پھر اسے اپنا اختیار دکھائی دیتا ہے اور زبان قتل کا حکم جاری کرتی ہے۔ اور پھر اسے مسلمؑ کا یہ چبھتا ہوا جواب سر شکستہ سانپ کی طرح بل کھلاتا ہے کہ: "بے شک یہ لیاقت تجھی میں ہے کہ اسلام میں بدحلقی و بدخلقی و خباثت کا موجد ہو۔ اب وہ برا بھلا کہنا شروع کرتا ہے۔ اس لیے کہ مسلمؑ اپنے موقع کے مختار نہ تھے اور نہ ان کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ اس کے بعد ہی وہ قتل گاہ کی طرف لے جائے جاتے ہیں۔ قاتل کا ہاتھ کانپتا ہے اور ضرب کارگر

نہیں ہوتی، لیکن آمادہ شہادت کا نہ دل کانپتا ہے اور نہ زبان میں لکنت ہوتی ہے۔ جب وہ فرماتا ہے کہ: "یہ غراش کافی نہیں ہے!" کبھی کسی نے موت سے اس طرح مضحکہ نہیں کیا، اور نہ کبھی کسی نے اس طرح اپنے اس قول کا عملی ثبوت دیا کہ "موت سے مجھے کوئی خوف نہیں ہے"۔ حسینؑ کا سفیر دنیاوی زحمات سے سبکدوش ہو گیا اور اس عالم راحت میں پہنچا، جو ایسے بڑے فرض کو اس طرح ادا کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ کوئی کتبہ مسلمؑ کے لوح مزار پر اس سے بہتر نہیں ہو سکتا کہ "یہاں سفیر حسینؑ دفن ہے جس نے اپنا فرض ادا کیا"۔

لیکن دشمنوں کی خباثت اور وحشیانہ عداوت قتل کے بعد نہ تھمی اور لاش نے کوفہ کے اطراف میں اپنے خون سے جدول کھینچی۔ ٹھیک کہا شاعر نے کہ: ع

خون خالص راستوں میں بہ رہا ہے

میں نہیں جانتا کہ کبھی کسی قوم کے لیے ایسا عبرتناک اعلان ہوا۔ مسلمؑ کی لاش وہ منادی تھی جو اہل کوفہ سے کہہ رہی تھی کہ تمہاری نامردی اور بے وفائی کی ہماری لاش گواہ ہے۔ یہ ہماری لاش نہیں ہے جو بازاروں میں کھنچی جا رہی ہے بلکہ تمہاری عزت ہے جو خاک میں مل گئی۔ لیکن مسلمؑ کی لاش اکیلی نہ تھی بلکہ اس شریف کی لاش بھی تھی جسے اپنی زبان کا پاس تھا۔ یہ رئیس کوفہ کی لاش تھی۔ یعنی اہل کوفہ اپنے فطری سردار کی توہین دیکھ رہے تھے اور چپ تھے۔ یہ مثال وہی ہے شاعر نے جس کا طنز موقع کی مصوری کرتا ہے کہ: "اگر تم نے انتقام نہ لیا تو تمہاری مثال اس فاحشہ کی سی ہے جو تھوڑی خرچی پر راضی ہو جاتی ہو"۔ یہ صرف شاعری نہ تھی۔ محض جوشِ انتقام نہ تھا، واقعہ خوانی بھی تھی۔ اپنے سردار کی توہین اور اپنے خاصہ کو ذلیل کر کے اہل کوفہ نے کیا پایا، چند لفظ اور چند وعدے جس کے بعد وہ اور برائیوں کے لیے کام میں لائے گئے۔ میرے الفاظ محمد بن کثیر اور ان کے لڑکے کے لیے وہی ہیں جو میں نے ہانی کے لیے استعمال کیے ہیں۔ اگر ان کے واقعات صحیح ہیں۔ بلکہ اس قدر زیادہ کہ ان کے کسی لفظ یا انداز سے خیال کی کوئی قابل شکایت رجعت نہ ظاہر ہوئی اور انھوں نے اکثر دشمنوں کو قتل بھی کیا۔ ایک دوسرا بڑا نقصان جو مسلمؑ کے اغراض کو پہنچا، وہ شریک بن اعور کی ناوقت موت تھی۔ سردار بصرہ جو راستہ میں وہ حرکتیں اختیار کرتا ہے جس سے ابن زیاد کے کوفہ پہنچنے میں دیر ہو۔ اور حضرتؑ کوفہ پہنچ جائیں۔ اس کے بے حد مفید ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن بے چارے شریک کو کیا خبر تھی کہ حضرتؑ ابھی کوفہ سے بہت دور ہیں۔ پھر کوفہ پہنچ کر شریک کا جزرس دماغ اس موقع کو ڈھونڈھ لیتا ہے جو یقینی کامیابی کا ذریعہ ہو سکے۔ شریک کو بحیثیت ایک حامی وجہ مسلمؑ ہونے کے ان کے فوائد کی صورت تلاش کرنی تھی۔ مصلحت کی حیثیات سے بحث نہ ہونی چاہیے تھی۔ افسوس کہ مواقع نے اس مفید تجویز کو بھی عملی صورت اختیار کرنے نہ دی اور یہ خوش دماغ مدبر، آزادانہ تجاویز حمایت سوچنے والا، مداح علیؑ، اپنی علالت میں دنیا سے گزر گیا۔ جو اپنے اشعار عام نہیں کرتا تھا، زمانہ کی وجہ سے۔ لیکن ایسے زمانہ میں مدح علیؑ کرتا تھا۔ ایسے لوگ جو خاموشی سے دین کی حمایت میں سرگرم رہتے ہیں، عام اس سے کہ ان کی کوششیں شہرت پائیں یا نہ پائیں حقیقۃً دین و ملت کے ستون ہیں۔ زوال سے محفوظ ہے۔ وہ دین و ملت جس میں ایسے کام کرنے والے پائے جائیں۔

مورخین نے ایک دوسری فرد گزاشت یہ کی ہے کہ ان غیر اہل بیت اصحاب کے نام نہیں دیے ہیں جو مدینہ سے ساتھ

سے چلے۔ یا جو مکہ سے ساتھ ہوئے۔ اس سے یہ سمجھنا ہوگا کہ جن لوگوں کے نام راستوں سے شریک ہونے۔ کوفہ سے آنے یا عمر بن سعد کے لشکر سے مل جانے کے متعلق ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ سب مدینہ سے آئے یا بعض مکہ سے ساتھ ہوگئے۔

میں اب دُوسرے وفاشعار قاصد کا ذکر کرتا ہوں جو بصرہ بھیجا گیا تھا۔ جس زمانہ میں ابن زیاد وہاں کا عامل تھا۔ سُلیمان وجہ حسینؑ کا دوسرا شہید تھا۔ یہ سوچا جاسکتا ہے کہ سُلیمان پر اظہار راز اور ان لوگوں کا نام بتانے کے لیے کیا کچھ تشدد نہ ہوا ہوگا۔ اور کیا لالچ نہ دی گئی ہوگی۔ لیکن بہادر نامہ بر کے واقعات میں کہیں نہیں ہے کہ اس نے اعتبار کو فروخت کر دیا۔

تیسرا قاصد قیس بن مسہر ہے جس کی آزادانہ حمایت وجہ حسینؑ کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ دیکھو اس سے کہا جاتا ہے کہ تمہاری جان بخشی اس پر موقوف ہے کہ تم حسینؑ کو برا بھلا کہو۔ خاموشی سے بغیر کچھ کہے سنے وفادار قیس منبر پر چڑھ جاتا ہے اور اسے وہ مقام توجہ مل جاتا ہے جہاں سے وہ حسینؑ کے لیے لوگوں کو دعوت دے سکے۔ اور یہاں سے وہ حسینؑ کا نسب ظاہر کر کے لوگوں کو حضرتؑ کی شرکت کے لیے پکارتا ہے۔ ابن زیاد کو کہتا ہے جس کا وہ مستحق تھا اور امیرالمومنین علیؑ بن ابی طالبؑ کی مدح کرتا ہے۔ یہ مدح اور قرابت مدح تھی۔ بہت گراں قیمت تھی۔ ظاہر یہ ہوتا ہے کہ ابن زیاد کے اس کہنے پر کہ تم منبر پر سب علیؑ و حسینؑ کرو۔ قیس نے کوئی ایسے انداز ظاہر نہ کیے جس سے ابن زیاد کو قیس کے ارادہ کی خبر ہوتی یا شبہ ہوتا کہ وہ ایسا نہ کرے گا۔ ابن زیاد سمجھا ہوگا کہ قیس کے لیے جان کی امان سب کچھ ہوگی۔ کیسی ذات تھی علیؑ اور حسینؑ کی کہ بغیر امید انعام ایک شخص اپنی حیات کو موت اور منبر کو سولی بنالیتا ہے۔ تمام تعظیم اور مدح ایسے وفاشعار کے لیے جو ایک وجہ کی حمایت میں چند الفاظ سے گراں قدر موت خرید سکے۔

یہ بہادر اور وفا کے پھول اس طرح کھلا رہے تھے کہ کوئی ان کا ہمدرد دیکھنے والا نہ ہوتا۔ لیکن وہ جو حضرتؑ کے ساتھ تھے۔ راستوں کی ہیبت ناک شکلیں دیکھ اور سن رہے ہیں کہ دشمن کی فوجیں ہر طرف سے گھیرتی جاتی ہیں۔ سن رہے ہیں کہ قیس اور مسلمؑ اپنا فرض ادا کر چکے اور کچھ لوگوں پر اس کا یہ اثر بھی دیکھ رہے ہیں کہ وہ ساتھ چھوڑتے جاتے ہیں۔ لیکن جس جس طرح اغراض دنیاوی کی امید میں ساتھ دینے والے کم ہوتے جاتے ہیں ان رکھنے جانباز کا ارادہ رفاقت اور زیادہ وزنی ہوتا جاتا ہے جوں جوں مادیت تفرقی جاتی ہے روحانیت ظاہر ہوتی جاتی ہے۔

ایسی حالت میں ہلال بن نافع کی تقریر پر غور کرو جو اس وقت شروع ہوئی جس وقت حضرت قیس کی خبر شہادت سنتے ہیں اور متاسف ہیں۔ اور ہلال کی تمام تقریر کا منشاء ایک یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: ● رسُولِ خدا اور علیؑ مرتضیٰ کے ایسے بزرگوں کے لیے بھی یہ ممکن نہ ہوا کہ وہ سب کو دوست بنا سکتے۔ یہ مثال سے تسکین تھی۔ ● دوسری بات اپنی رفاقت کا یقین دلاتا ہے۔ ● تیسرے حکم الٰہی پر راضی رہنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے۔ یہ تینؔ چھوٹی چھوٹی باتیں بہت آسان نہ تھیں۔ ہلال کی طرح موقع سمجھنے والے بہت کم تھے۔ اور تھے تو ان میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ حسینؑ کے ساتھ ویسے ہی عہد کرتے جیسے انھوں نے کیے۔ اے کاش ایسے بہت سے لوگ ہوتے جو اہل بیت سے دائمی اور وفائی عہد کر سکتے۔

یہی ہلال بن نافع (بجلی) معرکہ کربلا کے روز حسینؑ کے لشکر کے افسر میسرہ قرار دیے جاتے ہیں۔

میں دیکھتا ہوں کہ بعض مؤرخین نے نافع بن ہلال (مرادی) بھی لکھا ہے اور دونوں کے واقعات عام ہیں۔ غالباً یہ دو آدمی نہ تھے، بلکہ مؤرخین نے کنیت کے پس و پیش میں سہو کی ہے۔ اگر ایسا ہے تو ان کے درجہ میں اس ایک اور بحث

امتحان سے اضافہ ہوتا ہے (اگر روضۃ الشہدا کی روایت سچ ہے) کہ یہ نوداماد تھے۔ اور ان کا جوش اور اخلاص بلکہ ان کا تصفیہ اور اعلان بھی ان کے رجز سے معلوم ہوتا ہے کہ "میں علیؑ کے دین پر ہوں جن کا دین نبی اللہ کا دین ہے"۔ انھوں نے تیراندازی میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ ایک حالت خوف میں بسر کرتے ہوئے شخص کے لیے جسے کھانا پانی بھی کئی پہر سے نہ ملا ہو ستر آدمیوں کا قتل اور بہتیروں کا مجروح کرنا چھوٹی بات نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کس جرأت قوت اور ناقابل مقابلہ جوش کے آدمی تھے۔ ان کے لیے سب سے اندوہناک بات یہ تھی کہ موت کے قبل ان کا بازو ٹوٹا اور ٹوٹا تو دشمنوں کی کثرت ان پر قبضہ کرلی۔ لیکن یہ گرفتار بہادر اپنی جسمانی مجبوری میں بھی ابن سعد کے سامنے فخر کرتا ہے کہ میں نے تمھارے اتنے آدمیوں کو قتل کیا ہے اور افسوس کہ میرے ہاتھ سالم نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی دشمن کو اور بھڑکانا تھا۔ جس کا نتیجہ قتل میں عجلت تھی۔ بقول ایک مثل کے کہ کیچڑ میں پھنسے ہوئے ہاتھی کو مینڈک بھی لات مارتا ہے۔ بہادر بلال حالت گرفتاری میں شہید کیا گیا۔ اس پر شکر کرتا ہوا کہ اس کی موت بدترین خلائق کے ہاتھ سے ہوئی۔

دوران سفر تھا کہ اس صاحب نفس شیر دل سے ملاقات ہوئی جس کا نام زہیر بن قین البجلی تھا۔ ابن خلدون انھیں ہوا خواہ عثمان کہتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہی اثرات تھے جن سے یہ اہتمام کرتے رہے کہ نواسہ رسولؐ کے خیام سے دور دور مقام کرتے رہیں۔ اگرچہ یہ ہم سفر تھے۔ یا یہ تھا کہ وہ حسینؑ کے نازک موقع کو سمجھ رہے تھے اور اس وقت تک ان کا ارادہ اس قدر پختہ نہ ہوا تھا کہ وہ حسینؑ کی رفاقت سے تمام آفات میں بسر کرنے کا تصفیہ کرتے یا دونوں خیالات علیحدگی کے محرک تھے۔ مجھے اس پر بھی تعجب نہیں ہے کہ حضرتؑ کے طلب پر یہ "اکراہ" گئے ہوں۔ میں خوش ہوتا اگر ابن خلدون اس کا کچھ ضمیمہ بھی پیش کرسکتا۔ یا روضۃ الصفا کے موافق دیلم کو غیرت دلانے کی ضرورت ہوئی "کچھ باتیں" ہوتی ہیں اور اب جو زہیر واپس ہوتے ہیں تو "رنگ برافروختہ" ہے۔ اور کہہ رہے ہیں کہ: "جس کو میرے ساتھ چلنا ہو چلے۔ میں حسینؑ کے ساتھ جاتا ہوں۔ یہ میرا آخری عہد ہے۔ اور یہ بھی کرنا تھا کہ اپنی بی بی کو طلاق دیتے۔ طلاق۔ یعنی وہ ضرب جو ایک زمانہ کے شریک رنج و راحت کے تمام سلسلہ احساسات کو کاٹ دیتی ہے۔ نہ اس لیے کہ بی بی سے خلاف مزاج امورات سرزد ہوئے تھے۔ اور اس وجہ سے قوت صبر نے مزید اشتراک سے انکار کیا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ اپنے نفس کو دفعتہً ایسے اتفاقات میں دیکھ رہے تھے۔ جس نے تمام علائق دنیاوی سے فوری علیحدگی پر مجبور کیا تھا۔ تعجب خیز قوت اور حیرت انگیز تصفیہ۔ سخت اور ناگہانی چوٹ تھی مگر قدر کے قابل وہ دل تھا جو چوٹ کھانے یا نہ کھانے میں مختار تھا۔ لیکن چوٹ کے سامنے سر رکھ دیا۔ بغیر اس کے کہ دل تھراتا۔ زوجہ زہیر ہر طرح تعریف کی مستحق ہے کہ اس نے خاموشی سے اس دل شکن تصفیہ کو منظور کیا ہو یا اس کے بعد اہل بیت رسالت کی رفاقت منظور کی ہو۔ اسلام کے سخت وقتوں میں ایسی عورتوں کو بھولنا۔ ناانصافی ہے۔ زہیر نے طلاق کی وجہ بھی بتادی تھی کہ "میں نہیں چاہتا کہ تم قید و گرفتار کی جاؤ"۔ اس سے ظاہر ہے کہ زہیر کا تصفیہ ایسا نہ تھا جو فوری جوش میں کر بیٹھے ہوں اور مزید غور یا نتائج سمجھ کر پھر طبیعت اپنے پہلے رنگ پر آنے لگی ہو۔ نہیں بلکہ انھوں نے رفاقت حسینؑ تمام نتائج کو سمجھ کر اختیار کی تھی۔ انھیں جنگی مواقع کے متعلق بھی جو بصیرت تھی وہ اس سے ظاہر ہوگی کہ حر سے گرم گفتگو کے وقت زہیر نے صلاح دی کہ شط فرات کے قریہ کے پاس جس کا نام عقر ہے تشریف لے چلیے چونکہ ادھر سے صرف ایک راہ ہے ہم دشمن کی فوجوں کی آمد سے اچھی طرح اپنی حفاظت کریں گے۔

باب پانزدہم

یہی تھے کہ جس وقت حبیب کی شہادت کے بعد حضرتؑ بہ نفس نفیس میدان میں جانے کے لیے تیار تھے۔ یہ حضرتؑ کو روک رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ: "ہم آپ پر سینہ سپر ہو کر فنا ہونے کو موجود ہیں۔ ہمارے ہوتے ہوئے آپ میدان جنگ میں نہ جائیے"۔ فوجوں کا ریلا ہے یہ اور حرمل کر لو رہے ہیں۔ ایک نرغہ میں گھرا تو دوسرے کی تلوار میٹر چھانٹ کر نکال لاتی ہے۔ اور دوسرا فوج کی تاریکی میں چھپا تو دوسرے کی شمشیر روشنی دکھاتی ہے۔ نماز کے بعد انھوں نے شہادت نہ کہ جنگ کا تصفیہ کر لیا۔ اور اب یہ فوجوں کے ریلہ میں بغیر خیال واپسی گھس گئے۔ کیے کا خیال کرتے۔ دشمن بہت تھے۔ ہر ایک کو جو سامنے آنے سے کانپتا میٹر میں حملہ کو موقع تھا کئی نے مل کر بہادر شیر کو زخمی اور شہید کیا۔

مُسلمؓ بن عوسجہ وہ بزرگ جو حضرت مُسلمؓ بن عقیل کے اعتبار کے قابل ٹھہرے۔ اور ان کی نظم امورات میں شریک تھے۔ اسلحہ اور لوگ جمع کرتے تھے۔ جنھوں نے لشکر اسلام کے ساتھ اکثر کفار سے جنگ کی۔ جنگی انتظام کے ماہر تھے۔ قرآن مجید لکھنے کی مقدس خدمت بھی بجالاتے تھے۔ یہی تھے جن سے معقل جاسوس سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے احتیاط کا کوئی پہلو اٹھا نہ رکھا اسے فوراً اپنے راز نہ بتا دیے۔ ہانی کی گرفتاری اور مُسلمؓ کے خروج کے وقت یہ قبیلہ مذحج اور بنی اسد پر افسر مقرر کیے گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ آخر وقت جو حضرت مُسلمؓ کے پاس تیس آدمی بچ گئے تھے ان میں مُسلم بن عوسجہ بھی ایک ہوں گے۔ اور اگر ایسا ہوا کہ اس کے بعد یہ حضرت مُسلمؓ کی وجہ کو لوگوں کے چلے جانے سے ضائع دیکھ کر اسے بے سود سمجھے ہوں کہ اس وقت کی مُہلک شرکت پر اڑے رہیں۔ تو اپنے مستقبل کے لحاظ سے یہ کسی ملامت کے مستوجب نہیں ہو سکتے۔ ہر شخص اس ارادہ کا نہیں بنایا گیا ہے کہ وہ اپنے لفظ سے پیچھے نہ ہٹے۔ اس کے علاوہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ جس وقت یہ واپس گئے وہ یہ تصفیہ کر رہے تھے کہ اگرچہ ہم اس وقت جانبازی سے ممتاز نہ ہوں گے لیکن چونکہ حضرت امام حسینؑ علیہ السّلام کے لیے ایسے ہی مواقع کا قرینہ ہے ہم اپنے حوصلہ سرفروشی کو اس کی رفاقت میں پورا کر سکیں گے۔ اسے انھوں نے پورا کیا۔

یہ مُسلم بن عوسجہ تھے جنھوں نے شب نہم کے یادگار موقع پر حضرتؑ کا خطبہ سن کر جو کچھ کہا اس نے دیگر اصحاب کے لذت اخلاص میں تجدید کی۔ ان کے اس اِستفہام کی شرح نہیں ہو سکتی کہ: "کیا آپ کو تنہا چھوڑ کر ہم چلے جائیں؟ حفاظت اور دشمنوں سے جنگ اس سے بہتر قوت سے نہیں کی جاسکتی کہ: اگر میرے پاس کوئی آلہ حرب نہ ہوتا تو میں آپ کی حمایت میں پتھروں سے مارتا۔ یہاں تک کہ میں اپنے آپ کو آپ پر فدا کر دیتا۔ حمایت کے لیے یہ خیال محرک تھا کہ لوگ دیکھیں کہ غیبت رسُولؐ میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ یہ فقرہ تاریخی نقل اور عکس رکھتا ہے۔ جس کی شرح کی اب ضرورت نہیں ہے۔ اور پھر اس کے بعد ان کے شہیدانہ جوش میں فلسفیانہ لحن شامل ہو جاتا ہے کہ: "یہاں سے ایسی جگہ جاتا ہے جہاں کی کرامتوں کی نہایت نہیں ہے"۔ ان کی شہادت اس سخت وقت واقع ہوئی جس وقت دشمن نے فرداً فرداً لڑنے سے عہد شکنی کی اور عمر بن حجاج الزبیدی کے دستہ نے مجموعی حملہ کیا۔ چونکہ دشمن واپس گیا اس لیے یہ تصفیہ آسان ہے کہ جو چند آدمی اس حملہ کو روک رہے تھے انھیں کس قدر جوش، ہمت اور بے جگری سے مقابلہ کرنا پڑا ہوگا۔ انھیں یہ افتخار حاصل ہوا کہ حضرتؑ سرہانے تشریف لاتے اور شہادت کے احتضار کو اپنے الفاظ سے شیریں اور خوشگوار بناتے۔ اور جنتی ہونے کی بشارت دیتے اور یہ بڑا مرتبہ تھا کہ مُسلم بن عوسجہ یہ سن کر خوشی سے اپنے وداعی وقت

امتحان سے اضافہ ہوتا ہے (اگر روضۃ الشہدا کی روایت صحیح ہے) کہ یہ نو داماد تھے۔ اور ان کا جوش اور اخلاص بلکہ ان کا تصفیہ اور اعلان بھی ان کے رجز سے معلوم ہوتا ہے کہ "میں علیؑ کے دین پر ہوں جن کا دین نبی اللہ کا دین ہے"۔ انھوں نے تیر اندازی میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ ایک حالت خوف میں بسر کرتے ہوئے شخص کے لیے جسے کھانا پانی بھی کئی پہر سے نہ ملا ہو ستر آدمیوں کا قتل اور بہتیروں کا مجروح کرنا چھوٹی بات نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کس جرأت قوت اور ناقابل مقابلہ جوش کے آدمی تھے۔ ان کے لیے سب سے اندوہناک بات یہ تھی کہ موت سے قبل ان کا بازو ٹوٹا اور ٹوٹا تو دشمنوں کی کثرت ان پر قبضہ کرتی۔ لیکن یہ گرفتار بہادر اپنی جسمانی مجبوری میں بھی ابن سعد کے سامنے فخر کرتا ہے کہ میں نے تمہارے اتنے آدمیوں کو قتل کیا ہے اور افسوس کہ میرے ہاتھ سالم نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی دشمن کو اور بھڑکانا تھا۔ جس کا نتیجہ قتل میں عجلت تھی۔ بقول ایک مثل کے کہ کیچڑ میں پھنسے ہوئے ہاتھی کو مینڈک بھی لات مارتا ہے۔ بہادر ہلال حالت گرفتاری میں شہید کیا گیا۔ اس پر شکر کرتا ہوا کہ اس کی موت بدترین خلائق کے ہاتھ سے ہوئی۔

دوران سفر تھا کہ اس صاحب نفس شیر دل سے ملاقات ہوئی جس کا نام زہیر بن قین البجلی تھا۔ ابن خلدون انھیں ہوا خواہ عثمان کہتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہی اثرات تھے جن سے یہ اہتمام کرتے رہے کہ نواسہ رسولؐ کے خیام سے دور دور مقام کرتے رہیں۔ اگرچہ یہ ہم سفر تھے۔ یا یہ تھا کہ وہ حسینؑ کے نازک موقع کو سمجھ رہے تھے اور اس وقت تک ان کا ارادہ اس قدر پختہ نہ ہوا تھا کہ وہ حسینؑ کی رفاقت سے تمام آفات میں بسر کرنے کا تصفیہ کرتے یا دونوں خیالات علیحدگی کے محرک تھے۔ مجھے اس پر بھی عجب نہیں ہے کہ حضرتؑ کے طلب پر بہ "اکراہ" گئے ہوں۔ میں خوش ہوتا اگر ابن خلدون اس کا کچھ ضمیمہ بھی پیش کر سکتا۔ یا روضۃ الصفا کے موافق دلیم کو غیرت دلانے کی ضرورت ہوئی "کچھ باتیں" ہوتی ہیں اور اب جو زہیر واپس ہوتے ہیں تو "رنگ برافروختہ" ہے۔ اور کہہ رہے ہیں کہ: "جس کو میرے ساتھ چلنا ہو چلے۔ میں حسینؑ کے ساتھ جاتا ہوں۔ یہ میرا آخری عہد ہے۔ اور یہ بھی کرنا تھا کہ اپنی بی بی کو طلاق دیتے۔ طلاق۔ یعنی وہ ضرب جو ایک زمانہ کے شریک رنج و راحت کے تمام سلسلہ احساسات کو کاٹ دیتی ہے۔ نہ اس لیے کہ بی بی سے خلاف مزاج امورات سرزد ہوئے تھے۔ اور اس وجہ سے قوت صبر نے مزید اشتراک سے انکار کیا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ وہ اپنے نفس کو دفعتہ ایسے اتفاقات میں دیکھ رہے تھے۔ جس نے تمام علائق دنیاوی سے فوری علیحدگی پر مجبور کیا تھا۔ تعجب خیز قوت اور حیرت انگیز تصفیہ۔ سخت اور ناگہانی چوٹ تھی مگر قدر کے قابل وہ دل تھا جو چوٹ کھانے یا نہ کھانے میں مختار تھا۔ لیکن چوٹ کے سامنے سر بڑھا دیا۔ بغیر اس کے کہ دل تھراتا۔ زوجہ زہیر ہر طرح تعریف کی مستحق ہے کہ اس نے خاموشی سے اس دل شکن تصفیہ کو منظور کیا ہو یا اس کے بعد اہل بیت رسالت کی رفاقت منظور کی ہو۔ اسلام کے سخت وقتوں میں ایسی عورتوں کو بھولنا نا انصافی ہے۔ زہیر نے طلاق کی وجہ بھی بتا دی تھی کہ "میں نہیں چاہتا کہ تم قید و گرفتار کی جاؤ"۔ اس سے ظاہر ہے کہ زہیر کا تصفیہ ایسا نہ تھا جو فوری جوش میں کر بیٹھے ہوں اور مزید غور یا نتائج سمجھ کر پھر طبیعت اپنے پہلے رنگ پر آنے لگی ہو۔ نہیں بلکہ انھوں نے رفاقت حسینؑ تمام نتائج کو سمجھ کر اختیار کی تھی۔ انھیں جنگی مواقع کے متعلق بھی جو بصیرت تھی وہ اس سے ظاہر ہوگی کہ حر سے گرم گفتگو کے وقت زہیر نے صلاح دی کہ شط فرات کے قریہ کے پاس جس کا نام عقر ہے تشریف لے چلیے چونکہ ادھر سے صرف ایک راہ ہے ہم دشمن کی فوجوں کی آمد سے اچھی طرح اپنی حفاظت کریں گے۔

اگر ایسا ہوتا تو ہم پھر کربلا کی تھرماپولی اور لی اینڈس کے کارناموں کو دہراتا ہوا دیکھتے۔ یا جیسا دروں اور پلوں کی حفاظت میں اکثر فوجوں کو موقع آجاتے ہیں۔ لیکن فوجوں کا فوجوں کو روکنا دوسری چیز ہوتی۔ ان کا یہ دوسرا تصفیہ بھی ویسا ہی قابل وقعت ہے کہ یہ حر کے لشکر سے جنگ کرنے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ اس بنیاد پر کہ تھوڑی فوج سے بہ نسبت زیادہ تعداد کے جنگ کرنا آسان ہے اور ایسی ہی پر جگری تھی ان کی کہ خیام حسینؑ پر شمر کے حملہ کے وقت چند آدمیوں سے اسے روک کر اپنی تلوار کا وزن منوایا۔ یہ زہیر ہی تھے کہ جس وقت حضرتؑ نے اپنی بیعت سے لوگوں کو آزاد فرمایا تو انھوں نے کہا کہ میری خواہش ہے کہ میں ہزار بار مارا جاؤں اور زندہ کیا جاؤں لیکن آپ اور آپ کے اہل بیت قتل وغارت سے بچ جائیں۔ یہ لوگ تھے جو دین کے سچے سرفروش اور سپر کہے جائیں جو اپنی حیات کی غرض محض دین پر اس کی قربانی سمجھتے تھے۔ کبھی کوئی ایثار اس سے بلند تر درجہ کا نہیں ہوسکتا۔

ان باتوں کے علاوہ جو کچھ میں کہہ چکا اب میں ان کی دماغی بزرگی کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ اور یہ وہ موقع ہے جب وہ صفوں کی درستی کے بعد ابن سعد کے لشکر کے سامنے تقریر کرتے ہیں۔ ان کی چھوٹی سی تقریر وسیع اصول کا آئینہ ہے۔ اور تمام تقریر کا لہجہ اس طرح کا ہے جیسے کوئی اپنے آخری وقت نہایت ضروری باتوں کو انتہائے صفائی اور بے غرضی سے ادا کرتا ہے۔ موقع نے زہیر کے اس فقرہ میں درد بھر دیا ہے کہ مُسلمانوں پر مُسلمانوں کا یہ حق ہے کہ ایک دوسرے کو نصیحت کریں۔ گویا میرے کان زہیر کا لہجہ سن رہے ہیں۔ اور میں مقرر کی شریفانہ بلند خیال اور نیک نفسی کی مدح کررہا ہوں۔ گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک شخص جو اس وقت کی حالت کو سمجھ رہا ہے۔ اصلاح کے اعلیٰ احساسات سے دین اور انسانیت کے فرض کا اعلان کررہا ہے۔ وہ دشمن کی کرخت اور سڑی ہوئی دشمنی کو بھول گیا ہے۔ وہ اس کا خیال نہیں کرتا کہ موقع بین دشمن اس وقت اپنے موقع سے فائدہ اٹھانے کو تمام ان چیزوں سے جو دنیا میں اچھی کہی جائیں منھ موڑ لے گا۔ وہ اپنے الفاظ کی بلندی مفہوم پر کھڑا ہے جس سے بڑھ کر گوشت اور خون سے بنے ہوئے انسان کو کھڑے ہونے کے لیے بہتر جگہ نہیں ملی۔ آگے بڑھتے ہیں کہ: "اس وقت تک ہم اور تم بھائی ہیں اور ایک ہی دین پر ہیں جب تک ہم میں اور تم میں جنگ نہ ہو"۔ ذرا سا غور اور اس وقت کا نقشہ کھنچ جائے گا کہ جس وقت دو فوجیں ایک دوسرے سے تلوار سے فیصلہ پر آمادہ ہیں۔ ایک شخص سامنے آتا ہے اور جوش کی غفلت کو محبت کے الفاظ سے دور کرتا ہے۔ کبھی صلح شکن حالت کو صلح کی طرف لانے کے لیے اس سے بہتر الفاظ استعمال نہیں ہوئے۔

اور آخر میں ان کے فقرات میں سب سے بلند فقرہ اور الفاظ میں سب سے بلیغ لفظ اِستعمال ہوا کہ "پس جب کہ ہمارے اور تمھارے لڑائی ہوجائے گی تو عِصمت اٹھ جائے گی"۔ میرا ذاتی یقین ہے کہ ہر قوم وملت کے مرثیہ گو اس سے بڑھ کر قوم کی آئندہ پاشانی کا مرثیہ نہیں کہہ سکتے اور نہ فصحا اور بلغائے دہر عِصمت کی جگہ کوئی دوسرا ایسا خوبصورت اور معنی خیز لفظ استعمال کرسکتے ہیں۔ اے کاش زہیر کی تقریر کے وہ تمام فقرات جو میں نے اب تک نوٹ کیے کتبہ کی شکل میں درست کرکے اسلام کے ہر فرقہ کے پاس ہوتے۔ قیامت تک ضائع نہ کیے جاتے اور وہ ان اندوہناک مواقع پر خصوصیت سے دیکھے جاتے جو مُسلمانوں کی بدنصیبی سے خواہی نخواہی پیدا ہوجاتے ہیں شعراء کو اس کی لطافت اِستعارہ اور مدبرین کو اس کی خوبصورت احتیاط اور الفاظ کے استعمال سے سبق لینا چاہیے۔

یہ باتیں کہنے کے بعد اب زہیر اس خاص امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو صورت حال کہی جائے۔ اور کہتے ہیں کہ ہم اور تم آل رسولؐ سے آزمائے گئے ہیں۔ ان کی مدد کرو اور اس ابن زیاد کو ذلیل کرو جس سے سوائے بدی کے اور کسی چیز کی امید نہیں کی جا سکتی۔ اور پھر اس کے باپ کی مثالیں دیتے ہیں کہ اس نے کیونکر اچھوں کو شہید کر دیا۔

ان کی یہ تمام تقریر جو تناسب اور ترتیب خیال کا بہترین نمونہ ہے۔ نہیں معلوم پوری ختم بھی ہوئی تھی یا نہیں کہ کوفیوں نے وہی کچھ کہا جس کے لیے وہ آئے تھے اور اب بھی زہیر نے اسی متانت اور نفس پر قابو کے ساتھ جواب دیا کہ: "ابن سمیہ کی نسبت ابن فاطمہؑ امداد و محبت کا زیادہ مستحق ہے"۔ اور پھر اس کے بعد حضرتؑ کے متعلق چلے جانے دینے کی صلاح جس قدر رفع شر کی نیت سے تھی اس سے بدرجہا مفید معنی میں تھی کہ وہ حضرتؑ کو موجودہ موقع سے نکال سکتی۔ زہیر جس اطمینان سے نہایت پختہ باتیں کہہ رہے تھے اور اہل لشکر مخاطب تھے۔ اس وقت شمر کا تیر مارنا اور بے ہودگی سے روکنے کی کوشش کرنا غالباً ان کی تقریر کا اثر سمجھتا ہے۔ گرم گفتگو ہوتی ہے اور اس وقت بھی زہیر سے ان کا تدبر نہیں جاتا جب وہ کہتے ہیں کہ: میں تجھ سے مخاطب نہیں ہوں، بلکہ اہل لشکر سے۔ شمر موت کی دھمکی دیتا ہے اور زہیر اس وقت وہ فقرہ کہتے ہیں کہ جو انبیاءؑ اور صلحاء بلکہ خود مسلمانوں کی تاریخ اخلاص میں بھی بہت سے لوگوں نے نہیں کہا کہ: "خدا کی قسم تیرے ساتھ کی حیات ابدی سے حسینؑ کے ساتھ مرجانا بہتر ہے" اور پھر اس کے بعد نصیحت کرتے ہیں۔ یہ تعجب خیز شخص جس کے درجہ شجاعت، تدبر، اخلاص، اور خطرہ سے لاپروائی کے ایسے خود کربلا میں بہت سے نہ تھے۔ ایک دوسری مثال دیتا ہے جب حبیب قتل ہوتے ہیں۔ حضرتؑ کو غالباً حبیب کی شہادت سے متاثر اور غور میں دیکھ کر حضرتؑ کو مخاطب کرتا ہے۔ مخاطب بھی کرتا ہے اس فقرہ سے کہ: یا ابن رسول اللہؐ! یہ کیسا اِنکسار ہے جو میں آپ کے چہرہ پر دیکھ رہا ہوں؟"۔ خیال کرو۔ اِنکسار کا لفظ حسینؑ کے لیے اِستعمال کیا تھا۔ یعنی مجسمہ غیرت کے لیے۔ روح حمیت کے لیے۔ میں سوچتا ہوں کہ زہیر نے عمداً تاسف کی جگہ اِنکسار کا لفظ اِستعمال کیا جو سخت تر تھا۔ اس لیے کہ زہیر کے نزدیک لفظی کرختگی بہتر تھی بمقابلہ اس کے کہ حسینؑ کا تاسف کچھ دیر قائم رہے۔ نتیجہ یہ تھا کہ حسینؑ اس حالت سے الگ ہوتے اور پہلی شان طبیعت پر واپس آتے۔ دوسرے لفظوں میں ایک خیال سے علیحدہ ہو کر اس سوال کا جواب دیتے کہ: "کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟"۔ ذرا اس کی لطافت پر غور کرو کہ ایک شخص اس پر توجہ دلاتا ہے کہ غم بے حقیقت ہے۔ اگر وہ حق روی سے پیدا ہو۔ حسینؑ کو اس سے بہتر لفظوں میں تسکین نہیں دی جا سکتی تھی۔ خصوصاً جب کہ اس کے فقرہ کے بعد فوراً ہی میدان جنگ میں جانے کی اجازت طلب کر کے اپنے خیال کا عملی ترجمہ بھی کرتے ہیں۔ شیر گونجتا ہے۔ رجز پڑھتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں حسینؑ کی بزور شمشیر حفاظت کروں گا۔ وہ حسینؑ جو طاہر العابدین ہیں۔ جو امام صادق الیقین ہیں۔ ان کی تلوار دشمنوں کے خون سے کھیلتی ہے۔ لیکن اس مقدس شغل کے اِنہماک میں دوسرا فرض یاد آتا ہے۔ اپنے امام کے پاس دوڑے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یا مولا مجھے خوف ہے کہ آپ کے ساتھ نماز نہ پڑھ سکوں گا۔ یعنی میں اس طرح شہید ہوں گا کہ آخری وقت آپکے ساتھ نماز نہ پڑھی ہوگی۔ اللہ رے موت سے لاپروائی اور نماز کا خیال۔ ظاہر ہے کہ اس میں یہ اِلتجا اور آرزو چھپی ہوئی تھی کہ حیات کے آخری وقت نماز کو اس طرح صرف کریں کہ اپنے پیچھے نماز پڑھ لی ہو۔ یہ لوگ تھے جنھیں ایک فرض دوسرے فرض سے غافل نہیں کرتا تھا۔ زہیر میں اگر اور کوئی خوبی نہ ہوتی تو یہ محض اس وجہ سے زندہ جاوید رہ سکتے تھے کہ انھوں نے ایسے وقت نماز پڑھی۔

یہی تھے کہ جس وقت حبیب کی شہادت کے بعد حضرتؑ بہ نفس نفیس میدان میں جانے کے لیے تیار تھے۔ یہ حضرتؑ کو روک رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ: "ہم آپ پر سینہ سپر ہو کر فنا ہونے کو موجود ہیں۔ ہمارے ہوتے ہوئے آپ میدان جنگ میں نہ جائیے"۔ فوجوں کا ریلا ہے یہ اور حرمل کر لڑ رہے ہیں۔ ایک نرغہ میں گھرا تو دوسرے کی تلوار بیڑ چھانٹ کر نکال لاتی ہے۔ اور دوسرا فوج کی تاریکی میں چھپا تو دوسرے کی شمشیر روشنی دکھاتی ہے۔ نماز کے بعد انھوں نے شہادت نہ کہ جنگ کا تصفیہ کر لیا۔ اور اب یہ فوجوں کے ریلہ میں بغیر خیال واپسی گھس گئے۔ بچے کا خیال کرتے۔ دشمن بہت تھے۔ ہر ایک کو جو سامنے آنے سے کانپتا تھا پیٹھ میں حملہ کو موقع تھا۔ کئی نے مل کر بہادر شیر کو زخمی اور شہید کیا۔

مسلمؓ بن عوسجہ وہ بزرگ جو حضرت مسلمؑ بن عقیل کے اعتبار کے قابل ٹھہرے۔ اور ان کی نظم امورات میں شریک تھے۔ اسلحہ اور لوگ جمع کرتے تھے۔ جنھوں نے لشکر اسلام کے ساتھ اکثر کفار سے جنگ کی۔ جنگی انتظام کے ماہر تھے۔ قرآن مجید لکھنے کی مقدس خدمت بھی بجالاتے تھے۔ یہی تھے جن سے معقل جاسوس سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے احتیاط کا کوئی پہلو اٹھا نہ رکھا اسے فوراً اپنے راز نہ بتادیے۔ ہانی کی گرفتاری اور مسلمؑ کے خروج کے وقت یہ قبیلہ مذحج اور بنی اسد پر افسر مقرر کیے گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ آخر وقت جو حضرت مسلمؑ کے پاس تیس آدمی بچ گئے تھے ان میں مسلم بن عوسجہ بھی ایک ہوں گے۔ اور اگر ایسا ہوا کہ اس کے بعد یہ حضرت مسلمؑ کی وجہ کو لوگوں کے چلے جانے سے ضائع دیکھ کر اسے بے سود سمجھے ہوں کہ اس وقت کی مہلک شرکت پر اڑے رہیں۔ تو اپنے مستقبل کے لحاظ سے یہ کسی ملامت کے مستوجب نہیں ہو سکتے۔ ہر شخص اس ارادہ کا نہیں بنایا گیا ہے کہ وہ اپنے لفظ سے پیچھے نہ ہٹے۔ اس کے علاوہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ جس وقت یہ واپس گئے وہ یہ تصفیہ کر رہے تھے کہ اگرچہ ہم اس وقت جانبازی سے ممتاز نہ ہوں گے لیکن چونکہ حضرت امام حسینؑ علیہ السّلام کے لیے ایسے ہی مواقع کا قرینہ ہے ہم اپنے حوصلہ سرفروشی کو اس کی رفاقت میں پورا کر سکیں گے۔ اسے انھوں نے پورا کیا۔

یہ مسلم بن عوسجہ تھے جنھوں نے شب نہم کے یادگار موقع پر حضرتؑ کا خطبہ سن کر جو کچھ کہا اس نے دیگر اصحاب کے لذت اخلاص میں تجدید کی۔ ان کے اس اِستفہام کی شرح نہیں ہو سکتی کہ: "کیا آپ کو تنہا چھوڑ کر ہم چلے جائیں؟ حفاظت اور دشمنوں سے جنگ اس سے بہتر وقت سے نہیں کی جاسکتی کہ: اگر میرے پاس کوئی آلۂ حرب نہ ہوتا تو میں آپ کی حمایت میں پتھروں سے مارتا۔ یہاں تک کہ میں اپنے آپ کو آپ پر فدا کر دیتا۔ حمایت کے لیے یہ خیال محرک تھا کہ لوگ دیکھیں کہ غیبت رسولؐ میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ یہ فقرہ تاریخی نقل اور عکس رکھتا ہے۔ جس کی شرح کی اب ضرورت نہیں ہے۔ اور پھر اس کے بعد ان کے شہیدانہ جوش میں فلسفیانہ لحن شامل ہو جاتا ہے کہ: "یہاں سے ایسی جگہ جانا ہے جہاں کی کرامتوں کی نہایت نہیں ہے"۔ ان کی شہادت اس سخت وقت واقع ہوئی جس وقت دشمن نے فرداً فرداً لڑنے سے عہد شکنی کی اور عمر بن حجاج الزبیدی کے دستہ نے مجموعی حملہ کیا۔ چونکہ دشمن واپس گیا اس لیے یہ تصفیہ آسان ہے کہ جو چند آدمی اس حملہ کو روک رہے تھے انھیں کس قدر جوش، ہمت اور بے جگری سے مقابلہ کرنا پڑا ہوگا۔ انھیں یہ افتخار حاصل ہوا کہ حضرتؑ سرہالیں تشریف لاتے اور شہادت کے احتضار کو اپنے الفاظ سے شیریں اور خوشگوار بناتے۔ اور جنتی ہونے کی بشارت دیتے اور یہ بڑا مرتبہ تھا کہ مسلم بن عوسجہ یہ سن کر خوشی سے اپنے وداعی وقت

اس کی کوشش کرتے کہ آنکھ کھول کر وہ صورت پھر دیکھ لیں جس پر قربان ہوئے اور پھر نزع کی کیفیت میں اس فرض کا یاد رہنا کہ وہ اشارہ سے یا شکستہ لفظوں میں حضرتؑ کی حفاظت کی وصیت کرتے ان کا درجہ محبت وجہ کی پاکیزگی اور عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ وہ تھے کہ دشمن بھی ان کے قتل سے متاسف تھا۔ ایسے شخص کو امیرالمومنین علیؑ بن ابی طالبؑ علیہ السّلام یہ فخر عطا کر سکتے تھے کہ "بھائی" فرمائیں۔

کوفہ کے لوگوں میں جو حضرتؑ کے ساتھ شرف شہادت سے ممتاز ہوئے حبیب بڑا درجہ رکھتے تھے۔ روضہ خوانی کی کتابیں کہتی ہیں کہ یہ حضرتؑ کے بچپنے کے دوست تھے اور انھیں بھی یہ فخر حاصل ہوا تھا کہ حضرتؑ نامہ گرامی ارسال فرماتے۔ مضمون خط پر مطلع ہو کر ان کی اور ان کے بیوی کی باتیں غم انگیز ہیں اور پھر جس وقت حبیب کے حکم سے ان کا غلام گھوڑا لیے ہوئے ایک ایسی جگہ کھڑا تھا جو عام رہگزر نہ تھا۔ دیر ہونا اور غلام کا کہنا کہ اگر میرا مالک نہ آیا تو میں خود تیری پشت پر سوار ہو کر نصرت حسینؑ کو جاؤں گا۔ جوش وفا کی نادر روایتیں ہیں۔ حبیب کا افسر میسرہ قرار دیا جانا۔ ان کی شہادت پر حضرتؑ کا خصوصیت سے متاسف ہونا اور ان کے متعلق فرمانا کہ مرد فاضل تھے جو ایک رات میں قرآن ختم کرتے تھے۔ ان کے درجہ کو ظاہر کرتا ہے اور سمجھ میں آتا ہے کہ حضرتؑ ان سے بخوبی واقف تھے۔

ذرا ان کی غیرت ملاحظہ فرمائیے کہ وقت وہ ہے کہ جب حضرتؑ کی خواہش یہ ہے کہ اگر تھوڑی دیر کے لیے جنگ ملتوی ہو جائے تو فریضہ ظہر ادا کر لیں لیکن ابن نمیر سخت گستاخانہ بات کہتا ہے۔ حبیب سنتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ وائے ہو تجھ پر حسینؑ کی نماز قبول نہ کی جائے گی۔ لیکن تجھ سے ابن خمارہ کی نماز مقبول ہوگی۔

اس تیز فقرہ نے ابن نمیر کو دونوں لشکروں میں ذلیل کیا اور اس نے جھلاہٹ میں حبیب کو تنہا دست بدست جنگ کے لیے بلایا۔ حبیب اس سے بہتر کوئی بات نہ چاہ سکتے تھے کہ ایسی مکار دشمن کے خون کا اپنی تلوار کو مزا چکھاتے۔ حصین بن نمیر فریب کا سپاہی تھا۔ بہادرانہ جنگ کا آدمی نہ تھا۔ چھپ چھپا کر کسی کو تیر سے زخمی کرنا یا فوج کے انبوہ میں اکا دکا کو زخمی کرنا اور گرا دینا جانتا تھا۔ تلوار چلی۔ اور حصین کے گھوڑے کا سر زخمی ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنے کو ایسا وانخ بلند کیے ہوئے نہ تھا اور نہ اس قدر قریب تھا کہ حبیب کی تلوار اس کا سر لے سکتی۔ گھوڑے نے زخم کھا کر اسے گرایا۔ اور حبیب اسے اپنی تلوار کے سایہ میں دیکھ کر خوش ہوئے ہوں گے کہ آج سارا فریب موت کے خزانہ میں داخل ہو جائے گا۔ مگر لوگوں نے نرغہ کیا اور اسے بچا لیا۔ اب حبیب جنگ شروع کر چکے تھے۔ ان کی تلوار دشمنوں کو کم کرنے لگی۔ یہاں تک کہ سینتیس آدمی قتل کیے۔ ابھی بدیل بن حریم کو قتل کیا تھا کہ کسی نے پشت پر نیزہ مارا۔ اس کی طرف پھرے تھے کہ اب ابن نمیر کو اس کا موقع ملا کہ خود بھی بہادر بن جاتا۔ اور اس کے زخم سے حبیب گرے۔ اور مجمع نے شہید کر ڈالا۔ میں حبیب کے اس فقرہ کی طبعی شرح نہیں کر سکتا کہ اب میں آپ کے بزرگوں کے ساتھ نماز پڑھوں گا اور آپ کا سلام پہنچاؤں گا۔ کیا اطمینان تھا۔ کیا خوشی تھی۔ کیسی مستعدی تھی۔ کیسا یقین تھا۔ یہ ایسے ہی تھے جن کا حسینؑ کو غم ہوتا۔

ابو ثمامہ صائدی۔ وہ بزرگ جو حضرت مسلمؑ کے خروج کے وقت ان کے لشکر کے ایک افسر تھے اور بنی تمیم و ہمدان پر متعین تھے۔ حضرت مسلمؑ کے آخر وقت ان کے نہ ہونے کے متعلق میرے الفاظ وہی ہیں جو میں نے مسلم بن عوسجہ کے تذکرہ کے ضمن میں لکھے ہیں۔ فوجی قاعدہ اور داب کی انھوں نے منزلت قائم کی کہ قاصد کو اپنے سردار کے پاس مسلح

نہ جانے دیا۔ جس کی حقیقی غرض یہ تھی کہ مکار دشمن حضرتؑ کے ساتھ غفلت میں کوئی فریب نہ کرے۔ خدا کے اس بندہ کا شوق عبادت دیکھو کہ ابھی ابھی جس وقت دشمن کے کئی متواتر حملے ان روح شجاعان عالم نے دفع کیے اور مجمع سے اپنی تلوار کا ادب کرایا ہے۔ دم نہیں لیا۔ خوش نہیں ہوئے۔ دیکھ یہ رہے ہیں کہ نماز کا وقت آیا یا نہیں۔ اور ایک مرتبہ اور حسینؑ کے ساتھ نماز پڑھ لیں۔ بڑھتے ہیں۔ اور کمال بے ساختگی سے کہتے ہیں کہ "اے میرے مولا ہم لوگ ضرور قتل ہوں گے"۔ بس۔ نہ شکوہ ہے۔ نہ خوف ہے۔ کہنا یہ ہے کہ "نماز کا وقت آگیا ہے"۔ "اب آرزو یہ ہے کہ آخری نماز آپ کے ساتھ پڑھ لوں"۔ کبھی بے غرض اخلاص نے اس سے بہتر خواہش نہ کی تھی۔ اور متانت اور ادب و انکسار یہ ہے کہ "شاید ہمیں اس طرح لقائے الٰہی حاصل ہو کہ اس موضع عظیم میں ہم نے فرائض میں سے ایک فرض ادا کر دیا ہو"۔ فرض کو ان پر ناز تھا۔ ان کا محض یہ فقرہ ان کی پچی سوانح عمری ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ سعید بن عبداللہ حنفی کا ذکر ابو ثمامہ صائدی ہی کے ساتھ ہونا چاہیے۔ کیونکہ نماز کے وقت انھیں لوگوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر ہے۔ ان کے متعلق میرے وہی ریمارک ہیں جو میں ان کے اثنائے واقعات میں کر چکا۔ اتنا اور کہوں گا کہ ان کے طرز عمل میں ایک یہ خصوصیت تھی کہ انھوں نے اپنے سے یہ خوشی بھی دور رکھی کہ وہ جنگ کرتے اور دشمنوں کو قتل کر کے خوش ہوتے۔ انھوں نے اس متبرک اور مقدس حوصلہ سے بھی انکار کیا اور اپنی ہستی کو حیات ہی میں نیست سمجھ لیا۔ انھوں نے اپنے کو وہ تودہ اور سپر بنا لیا جو خود تیر اور تلوار کھاتی ہے لیکن دوسرے کو بچاتی ہے۔ ان کی یہ خود انکاری عدیم المثال ہے۔ میرا قیاس ہے کہ یہ نماز بھی نہ پڑھ سکے اس لیے کہ یہ حفاظت کر رہے تھے کہ حسینؑ نماز پڑھ لیں اور اپنا سینہ اس طرف بڑھا دیتے تھے جس طرف سے کوئی تیر حسینؑ کی طرف آتا تھا۔ یہ اخلاص بھرا ہوا سینہ اس قابل تھا کہ دنیا کے عابد ہی اس پر بوسہ دے سکتے۔

کوفہ کے مددگاروں میں میں اس پر بصیرت نابینا کو فراموش نہیں کر سکتا ہوں جس کا نام عبداللہ بن عفیف تھا۔ ایک تجربہ کار بہادر جس کی آنکھوں کو یہ فخر حاصل تھا کہ ان میں سے ایک جمل میں اور دوسری صفین میں ضائع ہوئی۔ اور پھر اس کے بعد عبادت اور اعتکاف سے زندگی بسر کرتے۔ انھیں یہ فخر بھی حاصل تھا کہ یہ صحابی رسولؐ تھے۔ ایسے صحابی نہیں جو آل رسولؐ کی ہر طرح بیخ کنی کی کوششوں میں شریک ہوں بلکہ وہ جو اپنے مجبوریوں میں بھی ان کی حمایت اور علوئے شان کے لیے جان دے کر کوشش کریں۔ کوئی نہ تھا جو عبداللہ بن عفیف سے زیادہ اپنی حیات پر متاسف ہوتا کہ وہ اس وقت تک جیتے رہے کہ آل علیؑ و رسولؐ کوفہ میں اور ایک نمک حرام کے سامنے اس ذلت سے کھڑی ہے۔ ابن عفیف کو یقین نہ آتا ہو گا کہ کیا زمانہ ایسا بھی آسکتا ہے؟ لیکن واقعات کا انکار ممکن نہیں ہے وہ کیسے ہی سخت و تلخ کیوں نہ ہوں۔ بوڑھا صحابی اندوہناک تشنج سے ابن زیاد کے مکروہ الفاظ سنتا ہے اور آخر میں بے چین ہو کر چیخ اٹھتا ہے کہ: "کیا تیرے لیے قتل حسینؑ کافی نہ تھا کہ تو منبر پر ان کی مذمت بھی کر رہا ہے"۔

بنی امیہ کے زمانہ میں آل رسولؐ کی حمایت کرنے والوں کا گوشت اور خون جس قدر سستا تھا اس کے لحاظ سے کوئی حکم قتل نظر کے قابل بھی نہ تھا۔ لیکن چونکہ ابن عفیف صاحب قبیلہ تھے۔ ابن زیاد اپنے حکم میں کامیاب نہیں ہوا۔ لیکن اگر اخلاقی قاتل روشنی سے ڈرتا ہے تو رات کی تاریکی کو اپنے ارادوں کے لیے ایک پردہ سمجھتا ہے۔ خصوصاً جب کسی کو اپنے

ملحدانہ ارادوں کے لیے خولی بن یزید اصبحی کا ایسا آدمی ملتا ہے۔ ایک بوڑھا نابینا اور پانچ سو سواروں کی یورش! معلوم یہ ہوتا ہے کہ ابن عفیف کا کوئی لڑکا نہ تھا۔ ورنہ بجائے لڑکی کے اس کا تذکرہ شجاعت ہوتا۔ یہ چھوٹی سے لڑکی معنا اور اصطلاحا ابن عفیف کی نور چشم تھی۔ دنیا کے نامرد اس بوڑھے کی ہمت سے سبق لیں اور شجاعان دہر اس کی مدح میں گیت گائیں۔ جس نے باوجود فطری مجبوریوں کے اسے گوارا نہ کیا کہ جب تک حیات کا آخری شرارہ بجھ نہیں گیا ہے اس وقت تک ذلت سے دشمن کے قبضہ میں جائے۔ حسینؑ کے وقار پر جان دینے اور علیؑ کا ساتھ دینے والے ایسے ہی ہونے چاہییں۔

اب کیا میں یہ بھی کہوں کہ ابن عفیف نے کس طرح جنگ کی۔ ہاں کسی بوڑھے اور نابینا نے اپنی حیات اس قدر گراں قیمت پر نہیں بیچی۔ اور ہر وہ شخص جس میں احساس شجاعت ہے ان کی اشعار کی تصدیق اور ان سے ہمدردی کرے گا۔ کہ "آنکھیں نہ ہوئیں" پھر بھی ایک اندھی تلوار نے پچاس اموی سپاہیوں کو بکریوں کی طرح ذبح کر کے ڈال دیا تھا۔ اور سیکڑوں کی یورش سے اس طرح گرفتار ہوئے کہ دشمنوں کو روندتے ہوئے اٹھنے کا حوصلہ پورا ہو جاتا۔ دربار اور ابن زیاد کا خبیثانہ طنز کہ خدا نے تجھے اندھا کیا۔ جواب اور اندھا کر دینے والا جواب کہ لیکن خدا نے تیرے دل کو اندھا کر دیا۔ اگرچہ آنکھیں کھلی ہیں۔ حکم قتل، اور گرفتار کی مطمئن ہنسی۔ شکر اور اظہار مسرت کہ دعا قبول ہوئی۔ دعا یہ تھی کہ آنکھوں کے ضائع ہونے سے اب اگر میدان جنگ میں شہید نہیں ہو سکتے تو دنیا کے سب سے بڑے شریر کے ہاتھوں قتل ہوں۔ بنی امیہ اور ان کے ہوا خواہ بچ بچ انھیں برباد کر کے بھی خوش نہ ہو سکے۔ یا دوسرے لفظوں میں اپنی امارت، جماعت اور فولاد سے بھی ان پر فتح نہ پائی۔

میری خواہش نہیں ہے کہ ان کی شاعرانہ حیثیت پر نظر کروں۔ لیکن اس قدر کہوں گا کہ ان کے اشعار کی سلاست جوش اور فصاحت عرب کی بہترین شاعرانہ روایت کے حدود میں ہے۔ وقت یہ ہے کہ ایک شخص کے سر پر تلوار کھنچی ہے۔ گردن باڑھ محسوس کر رہی ہے۔ لیکن زبان حسینؑ کی کرامت، فضل اور ہدایت کی نغمہ نجی کر رہی ہے۔ کبھی شاعری مصوری، موسیقیت اور مرثیت میں ایسی ہم آہنگی پیدا نہ ہوئی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ ان کے اشعار اس طرح ختم ہوئے کہ سر گردن پر تھا یا آخری شعر گردن سے ابلتے ہوئے خون کے نغمے نے ختم کیا۔

لاش صلیب پر چڑھائی گئی۔ اس لیے کہ یہ حکومت کے نزدیک اظہار ذلت تھا۔ ذلت کا حیرت خیز عکس۔ اے کاش ابن مریم اس لاش کو صلیب پر دیکھتے!۔ ان کے سر کا بہترین فخر یہ تھا کہ وہ نواسہ رسولؐ کے فرق مطہر کے ساتھ پھرایا گیا۔

عبداللہ بن عمیر کلبی کوفہ کا وہ پر اخلاص جو مع اپنے بیٹے بیوی اور غالبا بہو کے حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خاندان سمیت حاضر ہونا۔ زیارت کی خوشی اور شوق کا مظہر ہے۔ زیارت شہادت سے بدلی۔ اور یہ بہادر وابستگی کو جان نثاری سے بدل دیتا ہے۔ اور تلوار لیے میدان میں کھڑا ہے۔ نہ یہ فکر ہے کہ بی بی بیوہ ہوگی۔ اور نہ اس سے رکتا ہے کہ ہمارے بعد ہمارے خاندان پر کیا گزرے گی۔

موقع یہ ہے کہ سالار اور یسار بن زیاد کے دو غلام میدان میں کھڑے ہیں۔ اس طرح کہ ابن زیاد کی شان ظاہر کریں۔ یہ پالے ہی اس لیے گئے ہیں کہ نوالوں پر قربان کیے جائیں۔ عبداللہ سامنے جاتے ہیں اور دونوں غلام اپنے کو بھول کر حبیب اور بریر کو مقابلہ کے لیے طلب کرتے ہیں۔ سختی سے عبداللہ نے ان کے اظہار شان کو شکستہ کر دیا۔ تواضع اور فروتنی

یہ ہے کہ اپنی علوئے شان ظاہر نہیں کرتے بلکہ اپنے لیے انکسار ہی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تو اس قابل نہیں ہے کہ سرداران لشکر تیرے مقابلہ کے لیے آئیں۔ جنگ شروع ہوتی ہے۔ عبداللہ کو مُطلق فکر نہیں ہے کہ میرے مقابلہ کے لیے دو ہیں۔ ہاتھ اٹھا تلوار چمکی۔ یسار زمین پر دکھائی دیا۔ سالم یا سالار مدد کے لیے دوڑا۔ استے میں عبداللہ کی تلوار یسار کے سینہ کو چاک کر چکی تھی۔ حضرتؑ کے لشکری آواز دیتے ہیں کہ سالم تم پر حملہ کیا چاہتا ہے۔ بچنے کی تو وہ فکر کرتا ہے جینا ہوتا۔ لاپرواہی سے عبداللہ نے تلوار کی باڑھ کی طرف بایاں ہاتھ بڑھا دیا۔ کئی انگلیاں کٹ گئیں۔ پہلے دشمن کو تمام کر چکے تھے۔ وہی خون آلود تلوار پھر چمکی اور سالم شکستہ ہوگیا۔ داد چاہیے تھی۔ دل بڑھانے کی ضرورت تھی۔ بیوی دوڑی۔ یہ نہیں کہا کہ بس کرو حق ادا کر چکے۔ نہیں۔ "رسُول اللہ کے نواسوں کے لیے لڑتے لڑتے اپنے کو تصدق کردو"۔ اس لیے کہ بیوی بیوہ ہونے کی ذمہ داری لے چکی۔ راضی ہوگئی۔ اور مجھ سے صبر کرلیا۔ ہیں مرتے وقت فکر سے آزاد کردیا۔ ہم خوشی سے مرسکتے ہیں۔ ام وہب دوڑی تھی۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ: "میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں" دل کی حرکت اس دوڑنے کے پیچھے تھی۔ فدا ہونے کی حسرت رونی ہنسی تھی۔ ام وہب کو کیا خبر تھی کہ اس کی حرکت اور انداز میں مدح اور مرثیہ اس طرح مل گیا ہے کہ حد بندی نہیں کی جاسکتی۔ میں ناانصافی نہ کروں گا اگر یہ کہوں کہ وہب دیوانوں کی سی ہنسی ہنس رہی تھی۔ میں اس سے بہتر کسی لفظوں میں مصوری نہیں کرسکتا۔ "اور تصدق کردو"۔ کہنے کے وقت اس کے احساسات کی شرح مجھ سے ممکن نہیں ہے!۔ ام وہب بھول نہیں گئی تھی کہ میں اپنے شوہر کو مرنے کے لیے ابھار رہی ہوں۔ کوئی عورت اس نتیجہ سے ناواقف نہیں ہے۔ غور کرو کہ ام وہب کا دل "تصدق کردو" کہنے کے وقت کس جگہ تھا۔ عورت تھی۔ رودیتی۔ کوئی جرم نہ کرتی۔ لیکن اس وقت روتی یا ردتی تو کربلا کے شہید کی بیوی نہ کہی جاتی۔

ام وہب کی حرکات نفس کا کوئی شارح یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے دل سے محبت کا حس جاتا رہا تھا۔ اس کے لفظوں میں نہیں بلکہ اس کے انداز اور لفظوں کی مجنونانہ سادگی میں اس کی محبت چھپی ہے۔ جس نے غم اور زیادہ شدید کردیا ہے۔ کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو اس سے قوی تر مرثیت کا دعویٰ کرسکے۔ لیکن یہ اندوہناک منظر یہیں ختم نہیں ہوگیا تھا۔ شوہر سے یہ تو کہہ چکی تھی کہ اپنے کو تصدق کردو۔ لیکن اس کے بعد آمادہ شہادت شوہر کی محبت نے موج مارا اور میدان شہادت کی طرف اس کے قدم بھی بڑھ گئے۔ شہیدانہ شان اس کے چہرہ پر آگئی۔ اور کہا کہ: "جب تک زندہ ہوں تمہارا ساتھ نہ چھوڑوں گی"۔ نیزوں کا جنگل، تلواروں کی چمک، گھوڑوں اور سپاہیوں کا وسیع مجمع اس شیردل عورت کو مرعوب نہیں کرتا۔ اور نہ ارادہ سے روکتا ہے۔ لیکن حسینؑ کی صدا۔ قانون کا ایک لفظ زمین میں گاڑ دیتا ہے کہ "اے ام وہب عورتوں پر جہاد نہیں ہے"۔ حسینؑ کہتے ہیں کہ تم لوگوں نے اہل بیت پر بڑا احسان کیا۔

اگرچہ میں نے ارادہ کیا ہے کہ عورتوں کا ذکر اہل بیت کے تبصرہ میں کیا جائے۔ لیکن میرے نزدیک ام وہب کی بہترین داد یہ تھی کہ ان کا غیر فانی ذکر ان کے شوہر کے ساتھ کیا جاتا۔

اگر ام وہب ہی کا نام قمر تھا تو اس اخلاص کی تصویر اور ساتھ ہی فولادی ارادہ کی عورت کو ایک اور بڑا صدمہ اٹھانا تھا۔ بیٹے کی موت کا صدمہ۔ اٹھانا تھا ہنستے ہوئے، خوش ہوتے ہوئے، فرزند کو مرنے بھیجنا تھا۔ نصیحتیں کرتا تھا کہ دیکھو اپنی نئی دلہن کے فریب میں نہ آجانا۔ دشمن نے سر کاٹ کر پھینکا۔ ماں کی طرف پھینکا۔ ماں دوڑی۔ بیٹے کا سر اٹھانے دوڑی۔

عرفی کا یہ شعر اس سے زیادہ مناسب موقع کے متعلق استعمال نہیں ہو سکتا کہ :

ہر کجا مژدہ لندوہ نوے بشنودم جستم از درد گراں توشہ و رقصاں رفتم

اور پھر کیسے یہ قوت پائی کہ اپنے پارہ جگر کا خون آلود سر بہو کی گود میں رکھ دیتی۔ اور پھر یہی سر اپنے دو ہاتھوں سے اٹھاتی اور دشمن کی طرف کھینچ مارتی۔ عورت کا ہاتھ اٹھانا اور اس قوت سے کہ کسی دشمن کے سینہ پر پڑتا۔ محبت ہاتھوں میں تھرتھراہٹ نہ پیدا کرتی۔ ایثار اور قربانی کا عزم قربانی کے بعد بھی ویسا ہی بے لغزش تھا۔ اے کاش کل مسلمانوں کی ایسی ہی مائیں ہوتیں!۔

وہب اسی طرح مرنے کے لیے تیار ہوئے جس طرح عبداللہ کلبی اور ام وہب کے بیٹے کو آمادہ ہونا چاہیے۔ سب ماؤں نے وہب کے ایسے لڑکے پیدا نہیں کیے۔ یہ ماں کے حکم پر دیسی ہی خوشی سے مرنے جاتا ہے جیسے وہ اور کوئی دلچسپ شغل میں مصروف ہوتا۔ جی چاہتا ہے کہ بیوی سے وداعی باتیں کریں۔ محبت آنکھوں اور لبوں پر امنڈ آئی ہے۔ لیکن اپنی تسکین اور اس وقت کی تسکین سے بھی متمتع نہیں ہوتا۔ یا اس میں کمی کرتا ہے۔ اس لیے کہ یہی وقت امتحان کا ہے۔ ماں کہہ رہی ہے کہ خوش ہو چکے دنیا کی لذتیں ختم ہو چکیں۔ آج اور اسی وقت کی لذت اب یہ ہے کہ اپنے خون میں لوٹو اور ہم دیکھیں۔ دیکھیں اور یہ کہہ سکیں کہ تم نے میرے دودھ کا حق ادا کیا۔

رجز بھی پڑھتا ہے اور میں اس کے شعر کے لہجہ میں پختہ کارانہ سختی نہیں پاتا بلکہ چھپتی ہوئی نرمی پاتا ہوں۔ یہی حقیقۃً اس کے رجز کی شاعری ہے۔ اور اس کی شاعری کا بھولا حسن ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حسینؑ میرے امیر ہیں اور کیسے اچھے امیر ہیں۔ ان کی روشنی چراغ کی سی روشنی ہے۔

میں نہیں جانتا کہ اس وقت بھی یہ اپنی شادی کا کپڑا پہنے تھا یا نہیں۔ شادی میں رنگ کی شوخی اور نمائش عالمگیر ہے۔ عرب کا یہ موقع نہ تھا کہ وہ ہر وقت کے کپڑے دوسرے رکھ سکتا۔ میں سوچتا ہوں کہ یادہ کپڑے زرہ کے نیچے پہنے تھا اور یا زرہ بھی نہ تھی۔ اور ایسی خلعت پر شہادت کا رنگ چڑھا۔ مبارک ہے وہ کپڑا جو خدا کی راہ میں اپنے خون سے رنگا جائے۔

اب میں اس ایمان دار بہادر کے ذکر کے لیے آمادہ ہوتا ہوں جس کا نام حر بن یزید ریاحی ہے۔ میں طبیعت کے تغیر کی مثال ایک حیثیت کی زہیر بن قین کی ذات میں دے چکا ہوں۔ اب میں حر کے تغیر کی طرف توجہ مائل کرتا ہوں۔ دونوں کے تغیر میں فرق تھا۔ یہ کہ زہیر بن قین عثمانی تھے۔ کسی شخص کا کسی جماعت سے منسوب کیا جانا اس جماعت کے مخصوص تاریخی آثار کا اس شخص پر عکس سمجھا جاتا ہے۔ مجھے اب حضرت عثمان کی حیات یا ممات کی تاریخ نہیں لکھنی ہے۔ جس پر میں حصہ اول میں ہر حیثیت سے بحث کر چکا ہوں۔ نظر بریں زہیر کا جماعت عثمانی سے منسوب ہونا ان کے واقعات تاریخی سے متاثر ہے۔ اس لحاظ سے زہیر بن قین حضرتؑ سے ملاقات کے قبل اگر کشیدہ ہوں تو کچھ بعید نہیں ہے۔ خصوصاً جس سے جماعت عثمانی کا کوئی فرد کھچا ہوا ہو۔ وہ فرزند علیؑ ہو۔ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ وہ ظاہر بظاہر ایک جماعت کے آدمی تھے۔ لیکن حر بن یزید کسی جماعت سے منسوب نہیں معلوم ہوتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ اموی حکومت کے ایک ملازم تھے۔ اس کے معنی یہ نہ تھے کہ وہ بجز دنیاوی امورات کے بنی امیہ کی اس مخصوص روش میں بھی ہم خیال تھے جو اہل بیت رسولؐ کے ساتھ تھی۔ اگر میں مثال دوں تو کہہ سکتا ہوں کہ حر بنی امیہ کے ویسے ہی رفیق تھے جیسے مالک اشتر، قعقاع اور احنف

بن قیس یا ہاشم بنی تمیم یا عدی کے شریک تھے۔ پوچھا جاسکتا ہے کہ حر بن یزید کے متعلق یہ کیوں نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ہر صورت میں بنی امیہ کے ہم خیال نہ تھے۔ خود حر کے خیال سے یہ نکتہ صاف ہوجاتا ہے جب وہ حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنا عذر پیش کرتے ہیں۔ عذر یہ تھا کہ: "اے فرزند رسولؐ اگر مجھے گمان ہوتا کہ یہ قوم تیرا انکار کرے گی تو میں اپنے گھر سے باہر نہ نکلتا۔ میرا گمان اس کے خلاف تھا۔ پس میں نے سوچا کہ اگر بعض امور میں ان کی اطاعت کردوں تو میں کوئی گناہ نہ کروں گا۔ اب ان کی سرکشی دیکھ کر ان کا گناہ ظاہر ہوگیا اور اب میں تائب ہوکر آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں"۔ یہ روضۃ الصفا کے الفاظ ہیں اور میں موقع کی مناسبت سے اسے صحیح باور کرتا ہوں۔ ابن خلدون کے وہ تمام فقرات جو عذر سمجھے جائیں ان میں سے بعض نہ صرف موقع کی مناسبت کے خلاف بلکہ سلسلہ خیال کے لحاظ سے غیر فطری ہیں۔ میں ایسے قبول نہیں کرتا۔ اگرچہ سلسلہ واقعات میں لکھ گیا ہوں نہ اس کے تنقید کی ضرورت سمجھتا ہوں خصوصاً جب کہ کامل ابن اثیر جس سے ابن خلدون اکثر نقل کرتا ہے وہی کہتا ہے جو روضۃ الصفا سے لکھا گیا۔

خیر! تو اس سے صاف ہوگیا کہ بنی امیہ کے بعض امور میں شرکت کے یہ معنی تھے کہ ہم ان کی ملازمت کریں اور ان کے ایسے امور کے شریک رہیں جو منافی ضمیر نہیں ہیں۔ لیکن جس وقت حر کو یہ یقین ہوگیا کہ بنی امیہ کی روش حسینؑ کے ساتھ روادارانہ نہیں بلکہ انتہائی حیثیت کی نزاعی ہے تو انھوں نے بنی امیہ کی رفاقت ترک کردی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اپنی ملازمت کے زمانہ اور خود اس کے قبل اہل بیت رسالت کے دوست تھے۔ لیکن اگر یہ رئیس تھے تو انھیں کوئی شغل اور اگر رئیس نہ تھے تو حصول معیشت کے لیے کچھ کرنا چاہیے تھا۔ اور یہ ملازم تھے۔ اب ایسے موقع پر کہ یہ بنی امیہ کے ملازم تھے ان کا بنی امیہ کے ساتھ رہنا یا حسینؑ کے شریک ہوجانا ایک دشوار تصفیہ تھا۔ خصوصاً عملی پہلو سے۔

میں ان کے واقعات میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ موجودہ فرض اور دینی فرض کو اپنی اپنی جگہ رکھنے میں انتہائی احتیاط برت رہے تھے۔ اور ان تمام حالتوں میں برابر یہ دیکھتے جاتے تھے کہ بنی امیہ کی غرض کیا ہے۔ میرے نزدیک ان کے لیے غور کی ابتدا اس وقت سے ہوئی جب سے ابن زیاد نے انھیں یہ حکم دیا کہ تم حسینؑ کو کوفہ پہنچاؤ۔ (مجھے افسوس ہے کہ تاریخ میں ان ابتدائی مراحل کا تذکرہ اور تفصیل نہیں ہے) ممکن ہے کہ کوئی یا خود حر یہ سوچ سکتے ہوں کہ اس سے ابن زیاد اور یزید کی نیت اچھی نہ ہو۔ لیکن نیت اچھی نہ ہونے کے معنی یہ نہیں ہوسکتے تھے کہ ابن زیاد اور یزید بجز اس کے کسی اور امر پر راضی نہ ہوگا۔ یعنی بجز قتل اور بیعت کے وہ ان کی متوقفانہ حالت یا امن سے کہیں رہنے پر راضی نہ ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جس وقت حر سوچتے ہوں کہ اس معاملہ کا کیا انجام ہوگا تو ان کے نزدیک انتہائی مصلحت اور درگزر میں انتہائی مصلحت کا قرینہ غالب ہو۔ لیکن یہ محض وہم ہو تا یقین نہ کہا جاسکتا۔ خود حر ابن یزید کے اقوال سے یہ ظاہر نہیں ہے کہ وہ یہ تصفیہ کرسکتے تھے کہ بنی امیہ حسینؑ کے ساتھ وہ کچھ کریں گے جسے دیکھ کر وہ حسینؑ کے پاس آئے اور بقول ابی مخنف کہا:
واللہ یا مولای ما علمت ان الملاعین یبلغون منک ھذا الفعال۔ (قسم خدا کی یا مولا مجھے یہ علم نہ تھا کہ یہ ملعون آپ کے ساتھ ایسا کریں گے) اور سچ یہ ہے کہ کوئی شخص جسے واقعات کربلا کی خبر نہ ہو اگر اس کے سامنے ان واقعات کا تذکرہ کیا جائے تو اس کے فوری یقین نہ کرنے پر عجب نہیں جاسکتا۔ انسان نے بہت ہی کریہ گناہ کیے ہیں اور کرتا ہے۔ اور غالباً کرے گا۔ لیکن ایسے لوگوں کے ساتھ ایسی بے رحمیاں کسی نے جان بوجھ کر نہیں کیں۔ خصوصاً جب کہ ظلم

کرنے والے ہر حیثیت سے باشندائے خباثت ان کے بنائے ہوئے ہوں۔

تو ایسی صورت میں کہ حرؔ یقین کی جرأت نہ کرتے تھے صورت معاملہ کو دیکھتے جاتے تھے۔ اور اس وقت تک بنی امیہ کے مطیع تھے جب تک ان سے انتہائی ظلم اور عمل کے ظاہر ہونے کا یقین نہ ہو گیا۔ درمیانی زمانہ کو انھوں نے اس لیے بنی امیہ کے ساتھ صرف کیا کہ اگر بنی امیہ نے حسینؑ کے ساتھ سختی نہ کی اور طلبی یا محاصرہ سے کوئی نرم غرض ہے تو ہم کیوں خواہ مخواہ انگشت نما ہوں۔ اور انھیں اپنا دشمن بنائیں اور اسی لیے اپنے عذرات میں یہ بھی کہتے ہیں جیسا میں نے ابن خلدون سے نقل کیا کہ: "اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ آپ سے وہ نہ لڑیں گے تو میں ہرگز آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہوتا"۔ یہاں وہ سپاہی اور مدبر دونوں تھے۔ لیکن جس درجہ کے سپاہی تھے اس سے ان کے الفاظ اعتبار کے شایاں ہیں۔

اب اگر میں ابتدا سے حسینؑ کے ساتھ ان کی معاملت پر نظر کروں تو مجھے یہ شخص دنیاوی اور دینی فرض کا مجموعہ، تہذیب اور شائستگی کا نمونہ احتیاط اور برداشت سے متصف معلوم ہوتا ہے۔ یہ سپاہیانہ ادائے فرض کا نمونہ نہ دھوپ کو دھوپ سمجھتا ہے اور نہ پیاس اسے روکتی ہے۔ حکم ہے کہ حسینؑ کو تلاش کرو۔ ڈھونڈھ رہا ہے۔ ایک قافلہ کے آثار دیکھتا ہے دوڑتا ہے۔ اور روکتا ہے۔ گفتگو ہوتی ہے۔ نماز کا وقت آجاتا ہے اور حرؔ حضرتؑ کے پیچھے نماز پڑھتا ہے۔ اہل کوفہ کے خطوط سے لاعلمی ظاہر کرتا ہے کہ یکایک ابن زیاد کا تاکیدی حکم پہنچتا ہے کہ حسینؑ کو نظر بند کرے۔ پہلا موقع جب کہ حرؔ کا نفس حکم کی سختی سے منقلب ہوتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ: "جہاں تک میں سوچتا ہوں میرا دل مجھے اس کام پر آمادہ نہیں ہونے دیتا"۔ حرؔ کا اثر ابوشعثائے کندی پر بھی پڑتا ہے۔ پھر نماز پڑھی جاتی ہے۔ اور حرؔ حضرتؑ سے کہتا ہے کہ مجھے ابن زیاد نے حکم دیا ہے کہ میں آپ کو اس کے پاس لے چلوں۔ اس سوال کا نتیجہ یہ تھا کہ اگر حضرتؑ چلنے پر راضی ہو جاتے تو حرؔ اپنا ایک فرض پورا کرتا بغیر اس کے کہ اس نے حسینؑ پر تشدد کیا ہوتا۔ اور چلنے یا نہ چلنے کی ذمہ داری حضرتؑ پر ہوتی۔ حضرتؑ اس کے جواب میں سوار ہو کر غالباً دوسری سمت اختیار کرتے ہیں اور اب حرؔ روکنے پر آمادہ ہوتا ہے اور مصمم ارادہ کے ساتھ۔ لیکن حرؔ کے عزم کے سامنے حسینؑ کا ارادہ تھا۔ حرؔ دیکھتا ہے کہ ہمارے اصرار کے معنی یہ ہوں گے کہ حضرتؑ ہمیں تنہا جنگ کے لیے بلاتے ہیں۔ حرؔ کا ارادہ ڈھیلا ہوتا ہے یہاں تک کہ تمام شکن جاتی رہتی ہے۔ مغلوب ہو گیا حرؔ اور اب اس نے ایک راز کہہ دیا۔ راز یہ تھا کہ مجھے لڑنے کا حکم نہیں ہے۔ بلکہ حکم یہ ہے کہ آپ کے ساتھ سے علیحدہ نہ ہوں۔ یعنی اب تک جو کچھ کر رہا تھا اور اس میں جو کچھ سختی تھی وہ محض دھمکی تھی کہ مرعوب کر کے ابن زیاد تک لے چلنے میں آسانی ہو۔

ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ اسے ابن زیاد کے حکم کی اطاعت سے کس قدر کراہت ہے اور اسے کس قدر خیال ہے کہ کسی لفظ یا کسی حرکت سے حضرتؑ کو ناخوش نہ کرے۔ اعتقاد؟ ممکن ہے۔ اور اب وہ فوجی اصول پر اعتقاد کو غالب کر دیتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ سمجھتا ہے کہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ میں کوفہ میں داخل نہ ہو سکوں گا۔ تصفیہ یہ کرتا ہے کہ جو کچھ بھی ہو حسینؑ سے نہ لڑیں گے۔ اور وسیع دنیا میں کہیں چلے جائیں گے۔ اور اب چونکہ یقین کے اسباب فراہم ہوتے جاتے تھے حرؔ استغاثہ کے لہجہ میں صلاح دیتا ہے کہ: "اپنی جان پر رحم کرو کوفہ نہ جاؤ"۔ پھر بھی حرؔ نے اب تک بنی امیہ سے قطع تعلق کا تصفیہ نہ کیا تھا۔

دونوں لشکر روانہ ہوتے ہیں۔ اور صورت معاملہ میں پھر نیاپن پیدا ہوجاتا ہے کہ کوفہ سے پانچ آدمی آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ (میں ان میں سے نافع بن ہلال اور طرماح کا نام لکھ چکا۔ اس کے بعد ابی مخنف پر نظر پڑی اور بقیہ تین آدمیوں کے نام بھی مل گئے۔ یہ تھے عمر الصیداوی، سعید بن ابی ذر غفاریؓ، اور عبداللّٰہ المذجحی) حر آگے بڑھتا ہے اور ان لوگوں کو روکتا ہے۔ روکنے کی غرض یہ تھی کہ چونکہ اب تک حر کو اپنی ملازمت کے قائم رکھنے کا خیال تھا۔ اس لیے وہ اس کا اہتمام کر رہا تھا کہ اب تک حکومت کی کوئی خیر خواہی کر سکے اور چونکہ یہ لوگ کوفہ سے آئے تھے حرؒ اسے اپنا فرض سمجھ رہا تھا کہ انھیں حسینؑ کے مددگاروں میں شریک نہ ہونے دے۔ بلکہ یا اپنی حراست میں رکھے اور یا کوفہ لوٹا دے۔

پھر حضرتؑ آگے بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ: "کیا تونے مجھ سے یہ عہد نہیں کیا تھا کہ میرے اصحاب میں سے کسی سے تعرض نہ کرے گا۔ جب تک کہ تیرے پاس ابن زیاد کا کوئی جواب نہ آئے اگر تو اپنے اقرار پر قائم نہیں ہے تو بجز اس کے کہ ہم اور تو جنگ پر آمادہ ہوں اور کیا چارہ ہے۔ حرؒ رک گیا۔ اور حسینؑ نے ان آنے والوں کا استقبال کیا"۔

یہ دوسرا موقع تھا کہ وہ دلیل سے ہو یا لہجہ کی شان اور الفاظ کی قوت سے (جس کے پیچھے انسان کے نفس کا درجہ رہا کرتا ہے) ہو۔ حرؒ مغلوب ہوا۔ لیکن میں ناظر کو متنبہ کرتا ہوں کہ یہ مغلوبیت حرؒ کی کوئی وہ حالت نہ تھی جسے بودا پن کہتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ اس میں کئی احساسات شامل تھے۔ یہ کہ جنگ کا حکم نہ تھا۔ یہ کہ اعتقاد مانع مزاحمت تھا۔ یہ کہ ایک قوی نفس سے مقابلہ تھا۔ لیکن باوجود اس حالت کے میں حرؒ کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تعریف کی بات یہ ہے کہ وہ صحیح تصفیہ کر سکا کہ توقف کیا جائے۔ اتنا ہوش تھا کہ وہ بہت سے متضاد احساسات میں اپنے کو حد اعتدال پر رکھے۔ یہ کہ اس میں اپنی زبان کا پاس تھا۔ اور انصاف پسندی ایسے موقع پر بھی اس سے دور نہ ہوئی تھی۔ سوچا جاسکتا ہے کہ اب تک حرؒ کے طبیعت کی جو کشتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ اس سے ایسے شخص کے لیے یہ کس قدر ناخوشگوار ہوگا کہ وہ ایک غیر صاف حالت میں بسر کر رہا ہے۔ اور وہ ایسے افعال اور انداز میں مبتلا ہوتا ہے جو اسے پسند نہیں ہیں۔ لیکن اب تک وہ ملازم ہے۔ اور پھر ابن زیاد کا خط آتا ہے کہ حسینؑ کو روک دو۔ قطعی حکم، اور قاصد کا ایک فرض یہ بھی تھا کہ وہ دیکھے کہ حرؒ نے تعمیل کی یا نہیں۔ یہ موقع تھا کہ اب دونوں گروہ کربلا پہنچ گئے تھے۔ اور سمجھ میں یہ آتا ہے کہ چونکہ حضرتؑ اور حرؒ دونوں نے قیام کیا تھا۔ حرؒ نے بہ لحاظ اس حکم کے کہ حسینؑ کو پانی سے علیحدہ رکھنا اپنے کو فرات، اور حضرتؑ کے خیموں کے درمیان قائم کیا۔ اس وقت سے حرؒ اور حسینؑ سے وہ معاملت ختم ہوگئی جو اب تک اس نوعیت کی تھی کہ حرؒ ابن زیاد کے احکام کا حامل تھا۔ یہاں پہنچ کر جتنی دیر اور گزری ہو اس کے بعد چونکہ ابن سعد کل افواج کوفہ و شام کا امیر تھا۔ اس لیے اب وہ معاملت کا ذمہ دار تھا۔ اور حرؒ اس کے ایک ماتحت کی حیثیت سے تھے۔ یہ مہلت حرؒ کے غور اور صورت معاملہ دیکھ کر آخری تصفیہ کے لیے مفید تھی۔ ہر چیز اس کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ نہ احکام اس کے لیے کوئی راز کی چیز تھی اور نہ ابن سعد کے ہمراہیوں کی نیت اور انداز حرؒ سے پوشیدہ تھے۔ وہ تمام باتیں دیکھتا اور سنتا ہے۔ جو کچھ آج سے دسویں کی صبح تک ہوئی۔ لیکن اب تک کوئی تصفیہ حرؒ نہ کر سکا۔ یا اس کے کوئی انداز ظاہر نہ ہوسکے۔ ممکن ہے کہ شب دہم کو اس میں اس کے بیٹے بھائی اور غلام وغیرہ میں صورت معاملہ پر کچھ گفتگو ہوئی ہو۔ لیکن یہ نہیں معلوم کہ ہوئی یا نہیں اور ہوئی تو یقیناً کامل احتیاط سے جس میں کسی نے اپنا کوئی میلان ظاہر نہ کیا۔

صبح ہو گئی۔ اور وہ درد انگیز منظر نگاہوں کے سامنے آیا کہ حسینؑ اور ان کے چند رفقا ارادہ جنگ سے میدان میں آئے۔ لوگ جن کے چہروں پر بھوک اور پیاس نے ان کی فطری رنگت اور شان باقی نہ رکھی تھی۔ لیکن تمام رنگ ان کے چہرہ سے اس لیے اڑ گئے تھے کہ اس جلالت خیز رنگ کے لیے جگہ خالی کریں جسے شان شہادت کہیں۔ ان کے چہرہ پر ان کی قلبی نورانیت کا عکس تھا۔ جو یہ کہہ رہا تھا کہ ہم اور ہماری تشنگی یا گرسنگی دشمن کی شکم سیری اور آسودگی سے مغلوب ہونے والی نہیں ہے۔ نہ ہماری کمی تعداد انبوہ کے سامنے جھکے گی اور نہ ہمارے قلب کا نور سیاسی اغراض کی تاریکی سے بجھے گا۔ حرؓ کی شجاعت، کوئی قوم، دنیا کے کسی گوشہ کی جسے شرافت اور شجاعت سے انس ہے ایسے کسی گروہ کو اس حالت میں دیکھ کر جس میں حسینؑ اور ان کے اصحاب تھے غیرت میں آتی اور اس چھوٹی سے صف میں کھڑے ہو جانے کو اپنی حیات کی غرض اور فخر سمجھتی۔

یہ وقت تھا کہ حرؓ کی نگاہیں ان لوگوں پر گڑ جاتیں اور اگر اکھڑتی بھی تو درمیانی میدان میں رہتیں۔ کسی چیز پر نہیں بلکہ کھوئی ہوئی۔ غور میں نہیں معلوم کدھر دیکھ رہا ہے۔ بھول گیا ہے کہ ہم دشمن کی صف میں ہیں۔ ہم جنگی صف میں ہیں۔ جسے لڑنا ہے۔ حالت یہ ہے کہ غور نے ایسی محسوس تھراہٹ پیدا کی ہے کہ جسم تھرتھرا رہا ہے۔ مہاجر ابن اوس دیکھ رہا ہے۔ چہرہ پر ایک گھنا ہوا بادل ہے۔ جس سے حرؓ کا چہرہ صاف نہیں دکھائی دیتا۔ چونکتا ہے۔ حرکت، انقلاب ناقابل ضبط جوش اور یہ اپنے چچا سے اب بھی ہوش میں سوال کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں ہوش میں اس لیے کہ اب بھی وہ ظاہر نہیں کرتا کہ میں حسینؑ کی حالت سے متاثر ہوا ہوں۔ بلکہ صرف حالت دکھاتا ہے۔ ضرور نرمی سے۔ اور تصفیہ اور جواب کا ابن قرہ کو ذمہ دار بناتا ہے۔ سوال بھی اس سے کیا ہے جسے "چچا" کہتا ہے، ابن قرہ کا جواب کہتا ہے کہ اس کے سر میں دیکھنے کی آنکھیں نہ تھیں۔ وہ بالکل ہی متاثر ہی نہ تھا۔ جواب کے بعد حرؓ اس سے مڑتا ہے۔ بغیر اس کے کہ اس کے بعد کوئی لفظ کہے۔ اور اب لڑکے کے پاس آتا ہے۔ وہی الفاظ دہراتا ہے۔ جو ابن قرہ سے کہے تھے۔ جس کے معنی یہ تھے کہ انھیں الفاظ کے خیال نے حرؓ کے دماغ میں اس قدر دخل حاصل کر لیا تھا کہ نہ دوسری طرف توجہ تھی اور نہ لازماً دوسرے الفاظ منھ سے نکل گئے تھے۔ وہ قوت جذب اور پھیلتا ہوا اثر جو باپ کے دل کو بیٹے کے نفس پر حاصل ہے امید سے دیکھ رہا ہے کہ میرے استفہام کا اقرار کرتا ہے یا نہیں۔ اقرار۔ نہایت خوبصورت الفاظ اور لہجہ میں: "حبا و کرامة" کہتا ہے۔ تسکین، جوش محبت۔ لیکن سپاہیانہ ضبط، اور تصفیہ۔ بوجھ اتر گیا۔ دونوں کے بے قرار گھوڑے دوڑے۔ لوگ سمجھے کہ جنگ کے ارادہ سے جا رہے ہیں۔ ضرور جس نے ان کی حرکت نفس پر غور نہیں کیا تھا، اور واقعات سے بے خبر تھا۔ اس نے موقع کے لحاظ سے جوش کو جوش جنگ ہی سمجھا ہوگا۔ جوش جنگ کا سمجھنا بھی غلط نہ ہوتا۔ غلطی یہ تھی کہ لوگ یہ سمجھے تھے کہ وہ حسینؑ سے جنگ کرنے جاتا ہے۔ لیکن میں لوگوں کے ایسا سمجھنے کو بھی غلطی نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے کہ حرؓ نے اپنے چہرہ پر وہ انداز اوڑھ لیے ہوں جس کی نمائش یہ ہو کہ وہ حسینؑ کی طرف بقصد جنگ جا رہا ہے۔ کیا وہ ابن زیادہ کی گھنی ہوئی صفوں اور انبوہ کے لمبے سایہ میں ملفوف نہ تھا؟۔ وہ اپنے کو اس مرعوب کن حلقہ سے باہر کر رہا تھا۔ اور اپنے کو نکالنے کے لیے اس سے بہتر کوئی ترکیب نہ تھی کہ وہ اپنی نقل و حرکت میں حسینؑ کی طرف میلان کو کوئی شبہ نہ پیدا کرتا۔

اگرچہ ابی مخنف نے بیٹے سے گفتگو کے بعد یہ نہیں لکھا ہے کہ حرؓ نے ابن سعد سے بھی گفتگو کی لیکن حرؓ کی طبعی کیفیت

یہ چاہتی ہے کہ حُرؓ نے اس کے بعد مزید اطمینان کے لیے ابن سعد سے گفتگو کی ہو اور ابن سعد کا تصفیہ معلوم کر کے حسینؑ کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا ہو یا بیٹے کی گفتگو کے بعد تصفیہ کر چکے ہوں اور اس کے بعد ابن سعد کی گفتگو نے ارادہ کے نفاذ میں سرعت پیدا کی ہو۔ مجھے اس میں بھی کوئی عذر نہیں ہے کہ حُرؓ نے ابن سعد سے پہلے گفتگو کی یا اپنے بیٹے سے۔ اگرچہ میرا ذاتی میلان یہ ہے کہ حُرؓ نے پیشتر اپنے بیٹے وغیرہ سے بات کی اور اس کے بعد ابن سعد سے گفتگو کر کے نہ صرف تیقین حاصل کیا بلکہ اسے صلاح دے کر بھی حسینؑ کی وکالت کی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ابن سعد سے گفتگو کے بعد اس نے اپنی صف میں کھڑا ہو جانا بھی مصلحت سمجھا ہو۔ لیکن جو کچھ بھی ہو اب اسے زمین و آسمان نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ غور میں ڈوبا ہوا اور جس طرح وہ مہاجر ابن اوس کو جواب دیتا ہے اس سے اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ وہ کنوئیں میں بول رہا ہے۔ جواب اور چونکا ہم وقت تھا۔ گھوڑا بڑھا۔ تموج میں قوت آئی۔ مہمیز گھوڑے کے سینہ میں چبھی، چمچک اور بے چین عرب (گھوڑا) حسینؑ کے لشکر کی طرف سناٹے بھرنے لگا۔

حُرؓ میں اس وقت خوف تھا۔ دو خوف۔ ایک یہ کہ وہ محسوس کرتا ہوگا کہ دشمن اس کے دلی ارادہ پر مطلع ہو گئے ہیں۔ پیادے اور سوار اس کے گرفتار کرنے کو بڑھ رہے ہیں۔ شور انگیز صدائیں ہیں۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ حُرؓ کا محاصرہ کر لو۔ اب کوئی نیزہ لگا۔ اب کوئی تیر گھوڑے کے شکم میں در آیا۔ اور گرا۔ حسینؑ تک پہنچنے میں دشواری ہو گئی۔ سوچتا ہوگا کہ آج میرا گھوڑا اس قدر سست رفتار کیوں ہو گیا ہے۔ ممکن کہ حُرؓ کی گردن اس بے چینی میں پیچھے پھر گئی ہو۔ اور دیکھتا ہو کہ اس کا تعاقب ہو رہا ہے یا نہیں۔ ساتھ ہی مہمیز اور قوت سے گھوڑے کی پسلیوں پر لگی ہو۔ صبا رفتار گھوڑا غزال کی طرح جست کر رہا ہو اور حُرؓ کا وہ دماغی انتشار اس میں یہ یاس پیدا کر رہا ہو کہ مبادا حسینؑ سے اپنا عذر بیان کرنے کے قبل ہم گرفتار ہو جائیں۔ کبھی حُرؓ کو اس وقت سے زیادہ اپنی جان عزیز نہ ہوگی۔ روشنی، امید، اور دیکھتا ہے کہ ہم حسینؑ کے قریب ہیں۔ ابن سعد کا لشکر دور ہو گیا۔ وہ گھوڑے سے کودا۔ اب تھراتا نہ تھا۔ قصور واروں کی صورت بنا رہا تھا۔ محسوس یہ کر رہا تھا کہ دریا میں گر کر وہ تیرتا ہوا کنارہ آیا ہے۔ ہاتھ پاؤں پھولے جاتے ہیں۔ دیکھو حُرؓ انابت کی تصویر بنا ہوا ہے۔ حسینؑ کا پائے مبارک ہاتھ میں آ گیا۔ آنکھیں دست اقدس تک پہنچیں۔ ایک نگاہ اور حسینؑ حُرؓ کے استقبال کے لیے تیار تھے۔ اسی شان سے گھوڑے پر بیٹھے رہے۔ دست مبارک مرہم عطوفت بن گیا۔ رسولؐ کی زبان بولی "ارفع راسك یا شیخ"۔ اطمینان کی لمبی سانس۔ "فرفع راسه"۔ اس کے بعد نہ مصور کی ضرورت ہے نہ کسی مصور کے قلم میں یہ نرمی ہے جو حُرؓ کی اس نگاہ کو کھینچ سکے جو اس کے بعد حسینؑ کی طرف اٹھی۔

باوجود ان تمام طبعی مراحل کے جو تائب ہونے کے لیے فطرۃً ہو سکتے ہیں۔ حُرؓ یہ بھی چاہتا ہے کہ رحم، رحمت، اور نقیب مغفرت کے فرزند سے اپنی توبہ کی مقبولیت سن لے۔ سنی، دھو گیا۔ لیکن اس وقت اب وہ اپنے کو ایک سادہ ورق دیکھ رہا ہے۔ چاہتا ہے کہ اس کے بعد کچھ کر لیں۔ اور گزشتہ بے عنوانی کی یاد سے آنکھیں چار کرتے شرماتا ہے۔ راستہ سامنے تھا۔ میدان شہادت پاؤں کے نیچے دکھائی دے رہا تھا۔ اجازت چاہتا ہے۔ یا "قال لولدہ احمل یا بنی علی القوم الظالمین"۔ (اپنے فرزند سے کہتا ہے بیٹا ظالموں پر حملہ کرو) دیکھتا ہے کہ بیٹا لڑ رہا ہے۔ کیا ایسا ہوتا ہوگا کہ جب فرزند کسی دشمن کو قتل کرتا تھا۔ یا جب اسے کوئی زخم لگتا تھا تو حُرؓ کی نگاہ خوشی سے حسینؑ کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ وہ اپنے ہر زخم جگر سے

بے عنوانی کا جرمانہ ادا کر رہا تھا۔ اور اپنی غلطی کو فرزند کے خون سے دھو رہا تھا۔ حُرؒ نہایت اطمینان سے دیکھتا رہا یہاں تک کہ بیٹا شہید ہو کر گرا۔ فلما راٰہ ابوہ مقتولا فرح بذالک فرحا شدیدا وقال الحمد للہ الذی رزقک الشہادۃ بین یدی مولانا الحسین ابن امیر المومنین۔ (پس جب باپ نے بیٹے کو مقتول دیکھا تو وہ اس سے بہت خوش ہوا۔ اور کہا: شکر ہے اس خدا کا جس نے تجھے میرے مولا حسینؑ فرزند امیر المومنینؑ کے سامنے شہادت نصیب کی)

اجازت مل گئی خود چلا اور ایک نہایت مفید گفتگو کی جو گویا حسینؑ کی حالت اور دشمنوں کے عمل کی ایک مستند تاریخی شہادت ہے۔ گفتگو لشکر سے کی۔ بلانے اور مدد نہ کرنے کی شکایت کے بعد کہتا ہے کہ "تم نے اس غریب کو اس طرح روک رکھا ہے کہ کہیں وہ جا نہیں سکتے۔ تم نے ان کو قیدیوں کی طرح گرفتار کر لیا ہے۔ کسی ملجاد مامن کی طرف نہیں جانے دیتے۔ نہ وہ کوئی نفع حاصل کر سکتے ہیں اور نہ کسی مضرت کے دفع کرنے پر قادر ہیں۔ تم نے ان کو آب فرات سے بھی روک دیا ہے"۔ عام جنگی حالت کے متعلق میں حُرؒ کی واقعہ خوانی میں کہہ چکا جو کہنا تھا۔ آخر یہ تھا کہ حُرؒ کا خون آلود سر تھا اور حسینؑ کا ہاتھ اور رومال تھا۔ دانتوں سے خون پونچھ رہے تھے۔ آنکھیں نم تھیں اور فرما رہے تھے: "نعم الحر"۔ کیا اچھا حُرؒ تھا۔ تعریف ختم ہو چکی۔ اس تعریف کی وسعت لہجہ میں ہے!

حُرؒ کے فرزند اور بھائی کے متعلق میں صرف اس قدر کہوں گا کہ وہ حُرؒ کے فرزند اور بھائی تھے۔ اور حُرؒ کے ایسے شخص سے امید کی جاتی ہے کہ اس کا غلام اس کے اور دین کے ساتھ وفاداری کرتا۔

کوفہ سے طرماح اور نافع بن ہلال مراوی کے ساتھ آنے والوں میں عمر الصیداوی، سعید بن ابی ذر غفاری، اور عبداللہ المذحجی ہیں۔ نافع بن ہلال مراوی یا ہلال بن نافع بجلی کا مشروط تذکرہ میں کر چکا۔ اگر یہ ایک شخص نہ تھے تو نافع بن ہلال مراوی ان لوگوں میں تھے جنھوں نے مشکل وقت میں کوفہ سے زحمت سفر اختیار کی۔ جس کا اور کوئی منشا بجز حسینؑ کی مدد کے دوسرا نہ تھا۔ اور انھیں درجہ شہادت نصیب ہوا۔ طرماح کے تذکرہ میں مورخین کا اختلاف لکھ چکا۔ اگر یہ شریک جنگ نہ بھی تھے تو انھوں نے کوہ آجا میں لے چلنے اور قبیلہ طے کے سواروں سے مدد کرنے کا وعدہ کر کے اپنا اس وقت کا حق ادا کر دیا۔ طرماح نہایت تیز تقریر اور حاضر جواب آدمی تھے اور عدی بن حاتم کے ایسے مشہور محب علیؑ کے فرزند تھے۔

عبداللہ المذحجی یا عمر بن عبداللہ المذحجی کا شہدا میں نام آ گیا ہے کوئی تفصیل نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مددگاران اہل بیت اس وقت شہید ہوئے ہوں جس وقت دشمنوں نے متواتر حملے کیے تھے۔ اور اس وقت شہادت پانے والوں کی فہرست نہ ہونے کی وجہ سے ان کا علیحدہ ذکر نہیں ہے۔

ظہیر بن حسان اسدی اگر روضۃ الشہداؒ کی تحقیق صحیح ہے تو ظہیر بن حسان کربلا کے بڑے نامور بہادروں میں تھے۔ ان کا آوازہ شجاعت تھا کہ کوفہ و شام کے سپاہی سامنے آتے کانپتے تھے۔ غیرت و حمیت کا نمونہ، خوف اور خطرہ سے لاپروا۔ کام پورا کرنا چاہیے۔ یہ بہادر تنہا جس طرح لڑا، نرغہ میں اسی طرح باحواس رہا کثرت زخم یا گھیرنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ لیکن یہ اسدی شجاع اسی اطمینان سے سرگرم جنگ رہا۔ جس طرح پہلے تھا۔ محبت اور وفا کا نمونہ جس سے اور جس کے ہر انداز سے فرزند رسولؐ کی محبت کی خوشبو پھیلتی ہے۔ لیکن ان میں محض سپاہیانہ دبدبہ نہ تھا۔ اس قابل بھی تھے جو یہ کہہ سکتے کہ ابن زیاد دین میں بدعتیں کرتا ہے۔ لالچ دی جاتی ہے۔ لیکن یہ بے غرض سپاہی مال نہیں بلکہ علوے نفس کے

تقاضا کی بنیاد پر اپنے کو حسینؑ کا پیرو بتاتا ہے۔ نہایت بلند بات کہی تھی۔ یہ تکلیفوں پر ثابت انسان بے شمار زخم کھاتا ہے۔ لیکن کہیں سے عجز اور انکسار ظاہر نہیں ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اس بے جگر شہید پر غشی طاری ہوچکی تھی اور قریب تھا کہ گھوڑے سے گرے کہ حضرتؑ نے اپنے رفقا کو اسے میدان جنگ سے لانے کی ہدایت کی۔ اب زبان میں بولنے کی طاقت نہیں ہے۔ آنکھ کھل سکتی تھی۔ ایک سخت کوشش کی۔ سر حسینؑ کے قدموں پر رکھ دیا۔ دیکھا۔ آنکھوں میں تبسم کی لطیف لہر اور بہادر نے دنیا کو وداع کیا۔

عمر بن خالد، خالد بن عمر، حماد بن انس، اور شریح بن عُبید، عبداللہ و عبدالرحمٰن مزنی، عبداللہ و عبدالرحمٰن غفاری، قیس بن امیہ کو یہ فخر حاصل ہوا کہ یہ سیدالشہداءؑ کے اصحاب کہے جاسکتے۔ اور اپنے امام کے سامنے اپنے کو خون میں لوٹتا ہوا دکھا دیتے۔ عمر بن مطاع الجعفی ان پر جوش لوگوں میں تھے جو رجز پڑھ سکتے اور حسینؑ کی مدح کرتے۔ کم نہ تھا کہ یہ تیس دشمنوں کو قتل کر کے تسکین حاصل کر سکتے۔

اسی طرح یزید بن مظہر اسدی حسینؑ کے متعلق اپنے احساسات کا اس مصرعہ سے پتا دے سکتے کہ اے میرے رب میں حسینؑ کا مددگار ہوں۔

علی بن مظاہر دشمنوں کے ستر سپاہی قتل کر سکے۔ اور آخر یہ اسدی بہادر بھی عالم راحت کی طرف رخصت ہوا۔ سخت طنز کیا مالک بن انس نے جب ابن سعد کو مخاطب کر کے کہا کہ: اگر سعد بن ابی وقاص کو معلوم ہوتا کہ تجھ سے یہ حرکت سرزد ہوگی تو وہ اپنے ہاتھ سے تیرے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالتا۔ یہ تلوار سے زیادہ کاری زخم تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ ہر شہید کی کوئی ضربت سپہ سالار تک پہنچ سکتی۔ لیکن اس بہادر کی حاضر جوابی نے ایک ضرب چنی جو کارگر ہوئی۔ اور یہ ناممکن ہے کہ ایسے چبھتے ہوئے فقرہ نے جس سے انکشاف حقیقت بھی ہوتی تھی۔ سپاہیوں کو شرمندہ نہ کیا ہو۔ خود تو مرنے کو گئے ہی تھے۔ سچی بات کہہ کر کیوں نہ مرتے۔

سعید بن حنظلہ تمیمی ایک تجربہ کار سپاہی۔ ان کی شان کے شایان تھا کہ اپنے رجز میں کہتے کہ: "میں نے تلواروں اور نیزوں پر صبر کیا"۔ وجہ بھی دوسرے مصرعہ میں ہے کہ "جنت میں داخل ہوں"۔ موقع یہ تھا کہ میدان جنگ کی اس زینت کو نام و شہرت، انعام اور فتح کا خیال بھی نہ ہوتا۔ یہ سب تو حیات کے ڈھکوسلے ہیں۔ میدانِ کربلا کے جانباز تو اپنے کو مرا ہوا سمجھتے تھے۔ حسینؑ کے پاس کچھ دیر رہنا یا میدان جنگ میں دکھائی دینا حیات کی ایک وقتی معاد تھی۔ اب تو شہادت کا نشہ تھا۔ ایک حوصلہ تھا کہ کیونکر شہید ہوں۔ زخم کھائیں اور یہ کل ارادے اس لیے ہیں کہ "نجات" حاصل ہو۔

عمر بن قرظہ انصاری حسینؑ کے پاس ان کا موجود ہونا اس لیے اور امتحان خیز تھا کہ ان کا ایک بھائی دشمن کے لشکر میں تھا۔ دنیا میں ایسے ہی لوگوں نے اپنی آزادیٔ نفس فیصلہ اور ارادہ کا نشان چھوڑا ہے۔ نہ کہ انھوں نے جو قرابت، روپیہ، لالچ اور خوف سے دب گئے ہیں۔ وہ کل تذکرے جو اصحاب کے ہوئے یا جواب ہوں، اس سے سمجھنا محال ہے کہ ان لوگوں میں حضرت سیدالشہداءؑ کی محبت اور لحاظ کس درجہ تھا۔ اسی بہادر کو دیکھیے کہ اب زخموں سے چور ہے۔ لیکن یہ پوچھ رہا ہے کہ: "یا ابن رسول اللہ! کیا میں نے آپؑ کے عہد کو پورا کیا؟"۔ عہد کا ان لوگوں نے مرتبہ بڑھایا۔ اور انسان کی زبان کی شرافت ایسے لوگوں سے قائم ہوئی۔ کوئی یحییٰ بن کثیر کا ایسا مؤرخ شاعر تھا جو اپنے رجز میں کہتا ہے کہ ایک دن

تھا کہ عہدِ نبیؐ میں انصار کے شجاع کفار کے خون سے اپنے نیزے رنگتے تھے۔ آج فجار کے خون سے رنگنا چاہیے۔ وہ فجار جنھوں نے حسینؑ کے ساتھ خیانت کی اور یزید کو راضی کیا۔ آج ہم اپنی تلوار کی حد تک ان سے ایسا ہی شغل کریں گے۔ اور یہ خزرج اور بہادرانِ نجار کے لیے آج فرض واجب ہے۔ یہ لوگ نقیب حقیقت اور سچائی کی کسوٹی تھے۔

سیف بن الحرث بن سریع اور مالک بن عبد بن سریع حضرتؑ کے پاس اس طرح آتے ہیں کہ کوئی دیکھنے والا ان کی حالت کو رونا سمجھے۔ اور ان کی یہی حالت ہے جس سے مجھے بحث ہے۔ ایسی ہی ایک حالت بقیہ اصحاب کی لکھی گئی ہے جس وقت نمازِ ظہر کے بعد اہلِ بیتِ رسولؐ انھیں مخاطب کرتے ہیں اور وہ رو دیتے ہیں۔ اس سے میں اس پر غور کرانا چاہتا ہوں کہ اصحابِ حسینؑ کی حالت ان لوگوں کی ایسی نہ تھی جن سے جذبات کا احساس جاتا رہا ہو۔ اور اس کے بعد انھوں نے موت کا لاپروائی سے مقابلہ کیا ہو۔ نہیں بلکہ آخر وقت تک ان میں احساسات ویسے ہی تیز تھے جیسے ایک صحیح الحواس انسان میں ہونا چاہییں۔ اور اس کے بعد بھی وہ اس پر غالب اور حسینؑ کی حفاظت، دین کی مدد، اور موت کے ذوق پر ویسے ہی ثابت قدم تھے۔ جیسے وہ جس پر بے حسی کا پردہ پڑا ہو۔ اور بے شک یہ بڑی حالت حسینؑ اور ان کے رفقاء ہی میں اس درجہ ممتاز تھی۔ اب اگر اس کی شرح چاہتے ہو تو حسینؑ کے سوال اور ان کے جواب پر غور کرو۔ یہ کہتے ہیں کہ:

"ہم اپنے لیے نہیں (روتے) بلکہ ہم کو اس پر رونا آتا ہے کہ ہم اپنی جان دے کر بھی آپؑ کو نہیں بچا سکتے!"۔

محبت اور اخلاص نے کبھی اس سے بہتر الفاظ نہیں جنے تھے۔ نہ کبھی لفظوں نے اندرونی جذبات کی اس شدت سے مصوری کی تھی۔ انھیں اپنے خیالات کا احساس ہے۔ انھیں قربانی کا خیال ہے جو اپنی حیات کو بے قدر کر دیتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جان دے کر بھی وہ نتیجہ حاصل نہیں کر سکتے جس کی آرزو ہے۔ لیکن پھر مرتے ہیں۔ کیوں؟ اس خوفناک نتیجہ کو ٹال دیں اور ہماری آنکھیں اس موقع کو دیکھنے کے لیے نہ رہیں!۔

معلی کا ایسا شخص جو اپنی شجاعت کے لیے مشہور تھا میدان میں آتا ہے اور اپنے رجز میں نافع بن ہلال کا مضمون کہتا ہے۔ نافع کہتے تھے: "انا علیٰ دین علی و دینه دین النبی"۔ اس کہنے کی کوئی وجہ ہونی چاہیے۔ خصوصاً جب کہ شرح بھی کی گئی ہے کہ میں علیؑ کے دین پر ہوں جن کا دین نبیؐ کا دین ہے۔ اس کی شرح اس شخص کے قول سے ہوتی ہے جو ان کے مقابل آتا ہے اور کہتا ہے کہ "انا علیٰ دین عثمان" اس سے دو گروہ کے خیالات کی شدت اور تفریق معلوم ہوتی ہے۔ اور چونکہ نافع ہوں یا معلی اپنے وقت کے خیالات سے واقف تھے۔ وہ اپنے آخری وقت اپنے یقین کو ظاہر کر کے فخر کرتے تھے کہ ہم احمدؐ اور علیؑ کے دین پر ہیں۔ یہ فخر تھا جسے یہ لوگ اپنے خون سے زندہ کرتے تھے۔ اور سچ ہے کہ ان مرنے والوں ہی نے اسے زندہ رکھا۔ اور اس کا ثبوت دیا کہ اکثر چیزوں کی حیات موت ہی سے ہوتی ہے۔

ایک نومسلم شوقِ شہادت میں دوڑا آتا ہے۔ نوجوان، تجربہ نہیں ہے۔ لیکن کہتا یہ ہے کہ مجھے موت کا کوئی خوف نہیں ہے اور شہادت پا کر اس روز جب کہ حالت کرب ہوگی مجھے جنت ملے گی۔ یہ بھی کہتا ہے کہ مجھے اپنے رب پر وثوق ہے۔ اور وہی میرے لیے کافی ہے۔ نئے نئے جوش کا بجھنا آسان ہے۔ بچانے کا غم نہ تھا۔ مرنے کا حوصلہ تھا۔ حوصلہ پورا ہوا۔ دشمن نے حسینؑ کی طرف اس سر کو ڈھلکا دیا۔ خوش اتفاقی نے شاید یہ چاہا ہو کہ اس سر کو اس کے مولا حسینؑ کے پائے اقدس سے ایک مرتبہ پھر مس کرا دے۔ ماں دوڑتی ہے۔ اور اس سر کو پھر دشمن کی طرف کھینچ مارتی ہے۔ غرض؟

غالباً اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ماں یہ نہیں چاہتی ہے کہ میرے بیٹے کا سر میرے پاس یا میری نگاہ کے سامنے رہے اور یہ سامنے رہنا میری کمزوری اور میلان ظاہر کرے۔ راہ خدا میں نثار ہو چکا۔ اب ہمیں نہیں چاہیے۔ صبر کر چکے!۔

حنظلہ بن سعید الشیبانی۔ میدان میں آ کر دشمنوں کو عذاب خدا سے ڈراتے ہیں۔ ان کی تقریر کے لحن سے میرا اثر یہ ہے کہ یہ بے حد نیک نفس اور سیدھے آدمی تھے۔ جس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کرتا کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جو جان بوجھ کر برائی کر سکتے ہیں۔ لشکر شام ان کی تقریر کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ غالباً ان کے سیدھے پن کے ساتھ تمسخر تھا۔ حسینؑ سمجھاتے ہیں کہ جب یہ ابتدا میں نصیحت پذیر نہ تھے تو اصحاب کو قتل کرنے کے بعد اب کون امید ہے کہ سنیں۔ میں نہیں جانتا کہ حضرتؑ کو سمجھانے کی کونسی وجہ محرک ہوئی اور آیا یہ دشمن کے کسی ناملائم انداز پر مبنی تھی۔ اس کے سمجھنے کا کوئی اشارہ نہیں ہے۔ حنظلہ سمجھ گئے۔ اور ان کی قلبی کیفیت اس سے معلوم ہو گی کہ وہ درود پڑھتے ہوئے میدان کی طرف جا رہے ہیں۔ اس کے معنی ہیں کہ وہ علائق دنیوی سے قطع تعلق کر چکے۔ تمام خیالات کو دماغ سے نکال دیا۔ اور خدا کے ان بندوں کی تعریف سے آخری وقت اپنے زبان اور دل کو پاس رہے ہیں۔ شہادت۔

محمد بن بشیر الحضرمی

وہ وفادار جو سنتا ہے کہ میرا بیٹا گرفتار ہو گیا ہے۔ حضرتؑ زر فدیہ عطا فرماتے ہیں اور اجازت دیتے ہیں۔ لیکن یہ نمونہ اخلاص کہتا ہے کہ مجھے درندے کھا جائیں اگر میں اس وقت آپؑ کو چھوڑ کر چلا جاؤں!۔

مالک بن داؤد جنادہ

مالک بن داؤد جنادہ اور ان کا فرزند عبداللہ بن جنادہ، ابراہیم بن الحصین نے شجاعت نمائی اور وفاداری کا حق ادا کیا۔ سعید بن عبداللہ الحنفی (مؤلف یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اور سعید بن عبداللہ الحنفی ایک ہی بزرگ تھے۔ اور یہ صرف کاتب کی غلطی ہے) کا آمادہ شہادت ہونا کوئی عجب کی بات نہ تھی۔ جب کہ یہ حضرت محمدؒ ابن حنفیہ کے مادری اعزا میں تھے۔ برزل انصاری اور مرہ غفاری نے بھی دین کا حق ادا کیا۔

روضۃ الشہداءؒ جس ترک کی شہادت کو اس خوبصورتی سے بیان کرتا ہے وہ حقیقتہً وفاداری اطاعت اور حق نمک کی لاجواب مثال ہو گی۔ یہ ظاہر نہیں ہو سکتا تھا اگر حضرؑ اور امام زین العابدین علیہ السلام کا برتاؤ اس کے ساتھ پدرانہ نہ ہوتا۔ اور یہ اس خاندان کے اس برتاؤ کا لحاظ کر کے جو انسان بلکہ حیوانوں تک کے ساتھ جائز رکھتے تھے ذرا حیرت کے قابل نہیں ہے۔ اور پھر ترک کی شہادت کے بعد دیکھو حسینؑ اس کی لاش پر گئے، ملنے، سر زانو پر رکھا اور منہ پر منہ ملا۔ ترک کی آنکھ کھولنے اور موت کے درمیان تبسم تھا۔

حجاج بن مسروق الجعفی :

حجاج بن مسروق الجعفی حضرت کے مؤذن تھے۔ اور واقعات کربلا میں ان کی یہی خصوصیت تھی۔ وقت یہ ہے کہ حرؑ کے

لشکر اور حضرتؑ کے اصحاب میں تصفیہ نہ نکلنے کی گرانی ہے۔ ہر شخص دماغی بے چینی میں مبتلا ہے۔ نماز کا وقت آتا ہے اور حجاج کی بانگ اذان عصر کے وقت بلند ہوتی ہے۔ دھوپ ہے، ریگستان ہے۔ اتفاق سے پہنچ نکلنے لوگ ہیں۔ انتشار ہے۔ لیکن ان سب پر اذان کی صدا پھیل رہی ہے۔ اور تھوڑی دیر کے لیے دماغ کے تمام اضطراب خیز خیالات کو دُور کر رہی ہے۔ یہ دقتی محویت اس وقت ان کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ لیکن اتفاقات نے یہ بھی چاہا تھا کہ انھیں اس سے بدرجہا سخت وقت اللّٰہ کا نام بلند کرنا ہوتا۔ اس وقت جب کہ کسی مؤذن کو فخر حاصل نہ ہوا ہوگا۔ ظہر عاشور، حجاج اذان دے رہے ہیں۔ یہ ان کی آخری اذان تھی۔ حسینؑ کے بعد کونسا ایسا نفس مطمئن تھا جس کا کربلا میں اذان دینے والا مؤذن ہو سکتا۔ بہتر ہے کہ وہ گلا کٹوا دیا جائے جس سے اذان دی جاتی تھی۔ اس کے قبل کہ سید العابدین دنیا میں نہ رہے۔

ابوالشعشاء یزید الکندی

وہ تغیر جو حرؑ بن یزید ریاحی میں ہوا اسی کا ایک عکس ابوالشعشاء پر تھا۔ یہ یقین ہوگیا کہ لشکر شام نواسہ رسولؐ کے ساتھ انسانیت کا برتاؤ نہیں کرنا چاہتا۔ اپنی امیدوں کو طلاق دیا۔ موت اور شہادت کی طرف آئے۔ معمولی درجہ کے تیرانداز نہ تھے کہ سو تیروں میں سے کسی نے خطا نہ کی۔ اور ان کے تیروں کو امتیاز یہ تھا کہ ہر تیر کے ساتھ حسینؑ کی دعا تھی اور دعائے مغفرت فرما رہے تھے۔ راحت ابدی نصیب ہوئی۔

عابس اور شوذب

اگر میں ان کی سب سے بڑی اور سب سے بچی تعریف کروں تو کہوں گا کہ ان میں مالک اشتر کی جھلک تھی۔ سپاہی، بے پیچ، سیدھا صاف، جو کچھ کہتا ہے وہ مدبرانہ ہو یا نہ ہو لیکن اس پر سپاہیانہ خاصہ کی مہر ہے۔ اور یہی اس بات کی جو کہی گئی ہو بہترین سفارش ہے۔ مثال : سیدھے حسینؑ کے پاس جاتے ہیں اور اپنا قطعی تصفیہ ظاہر کرتے ہیں کہ "روئے زمین پر کوئی شخص آپ سے زیادہ عزیز نہیں ہے"۔ اس کے بعد نذر، بہترین تحفہ جو ایک سپاہی پیش کر سکتا ہے۔ "اگر میں اپنے نفس سے کوئی نفیس تر چیز پاتا تو اسے آپ کی ذاتِ مقدس اور نفسِ مکرم پر فدا کرتا"۔ اس کے بعد کے فقرہ کی صفائی ہزاروں مدح اور قصیدہ پر ہنستی ہے کہ "میں گواہی دیتا ہوں آپ اپنے پدر بزرگوار کی طرح سالک راہِ مستقیم ہیں"۔ کوئی کہے گا کہ حضرتؑ کے نفسِ مکرم، ذاتِ اقدس اور روش کے متعلق ریمارک میں یہ اپنی حد سے آگے بڑھ رہے تھے۔ پھر کون کہہ سکتا اگر ایسے لوگ کچھ نہ کہتے۔ لحاظ کے بے معنی گونگے پن سے یہ صاف گوئی بدرجہا شیریں تھی۔ بیکار لفاظی نہ تھی وہ حقیقت تھی جو ایک سادہ مزاج سپاہی سمجھا تھا۔ آورد نہ تھی۔ تیار نہ ہوا تھا۔ اس کا تمام خاصہ مجبور ہوا کہ کچھ کہتا اور باوجود کوشش کے بھی نہ اس کے علاوہ اور نہ اس سے بہتر کچھ کہہ سکتا تھا۔ یہ لفظ تھے جو اس کے منہ میں بھر آئے تھے اور ان کی آمد میں عابسؓ نے پس و پیش کی اڑ نہ کی تھی۔

اس کے قبل وہ کچھ دیکھنے کے بعد جوان کی شہادت کے قبل گزر چکا تھا اس بہادر کی سیدھی گردن مڑتی ہے اور نرم متانت سے شوذبؓ سے سوال کرتا ہے۔ سوال جس میں حکم کی سختی نہیں ہے صرف سوال ہے جس میں غلام کا تصفیہ دریافت

کیا ہے۔ سوال ہی میں یہ سمجھا رہا ہے کہ میں میدان شہادت کی طرف جا رہا ہوں، میرے بعد تو اپنی آزادی کو سوچ رہا ہے یا میرے ارادہ کا رفیق ہے۔ شوذبؓ، وفادار شوذبؓ وہی جواب دیتا ہے جو ایک وفادار کو دینا چاہیے۔ جوش ہے اور عابسؓ شاندار داد دیتا ہے کہ "تم سے میرا ایسا گمان تھا"۔ کبھی کسی غلام کو اپنے آقا کے ہم مرتبہ ہونے کا اس سے بہتر موقع نہ ملا تھا۔ جب کہ آقا اور غلام دونوں مجسمہ اصول خیر کے غلام تھے۔ پھر جب تصفیہ ہو چکا تھا تو اب قدم بڑھانا رہ گیا تھا۔ ایک عمل تھا جس کی "بڑی مزدوری" کی آقا اور غلام دونوں ہوس کر رہے تھے، بڑھے۔ ربیع بن تمیم دیکھ رہا تھا۔ دیکھا کہ عابسؓ آ رہا ہے اور اس کے آنے کی تصدیق یہ تھی کہ اس کے راستہ میں آنے والے شمع کی طرح بجھتے جاتے تھے اور لاشیں بتا رہی تھیں کہ ادھر سے عابسؓ گیا ہے۔ ربیع غل مچا دیتا ہے اور امیرِ شام کا انبوہ مصلحت یہی سمجھتا ہے کہ کوئی تنہا اپنی جان سے سخاوت نہ کرے۔ اور اس کے بعد عابسؓ کا نفس وہ عمل کرتا ہے جو نہ صرف تاریخ عالم میں معدوم ہے بلکہ تاریخ اسلام میں بھی اس کی ایک ہی مثال ہے۔ (عباس بن عبادہ، احد میں) اور وہ یہ کہ عابسؓ اپنی زرہ اور خود اتار کر پھینک دیتے ہیں اور غالباً معمولی کپڑے پہنے ہوئے انبوہِ لشکر میں گھس جاتے ہیں۔ عباسؓ بن عبادہ کی غرض جس قدر ان کے ایسے ہی فعل سے ظاہر ہو سکتی، وہ ان کا شوقِ شہادت تھا، اور یہ عابسؓ میں بھی تھا۔ لیکن کربلا کا موقع ایک بے مثال موقع تھا۔ یہاں ابتداہی سے چند سپاہی تھے۔ بہتر اور اکتیس ہزار اور ان یادگار بہتر کا ایک اس کا اہتمام نہیں کرتا کہ ہم اپنی کافی اور غیر معمولی حفاظت کریں بلکہ اسباب حفاظت کو بھی دور پھینک رہا تھا۔ دور نہیں پھینک رہا تھا، ان چیزوں سے امیرِ شام کے سپاہیوں کی سپاہیانہ غیرت اور شجاعت پر وہ ضرب لگا رہا تھا جس کے روکنے کے لیے کوئی سپر نہیں ہو سکتی۔ کبھی کسی سپاہی نے اپنے مقابل کو اس ذلت و حقارت سے نہیں دیکھا جیسا کربلا کے بہتر سپاہیوں نے اکتیس ہزار سپاہیوں کو دیکھا۔ جوان سے لڑنا ننگ سمجھتے تھے۔ ان کی ذلیل کوششوں کو دیکھنا گوارا کریں؟ نہیں اپنے کو جلد تمام کر دیں۔ قیاس آسان ہے کہ عابسؓ کے ایسے دل، ایسے ارادہ، ایسی شان، ایسے بشرہ اور ایسی ضرب کا کون مقابلہ کر رہا ہوگا۔ تیر، پتھر، انبوہ، اور اس کا نامساوی وزن، ہو جو کچھ بھی ہو۔ دشمن جن چیزوں کو اپنی کامیابی کا ذریعہ سمجھتا تھا اس کے لیے عابسؓ نے اپنے کو تیار دکھایا۔ نہ ہم زرہ پہنے رہیں گے نہ سر بچائیں گے، تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہاری ضرب کے لیے کوئی حفاظت کی جائے۔ بہادر شوذبؓ پشت کا نگہبان ہے۔ کہاں تک زخم نہ کھاتا، گرا، شہید ہوا، شیر دل عابسؓ ایک مرتبہ انبوہ کو پسپا کر دیتا ہے۔ یورش پر یورش ہو رہی ہے۔ زخم لگتے جاتے ہیں۔ کہاں تک۔ وہ وقت آ گیا جس کی جلدی کر رہے تھے۔ وہاں پہنچے جہاں ذلیل دنیا کی کسی ذلیل معاملت کا تماشہ نہ دیکھیں گے۔

دارالاسلام۔ دارالایمان

جونؓ غالباً جان

کوئی حبشی عیسائی جو اسلامی فتوحات میں گرفتار ہوا، اور مسلمان ہوا، اور وہ بھی ابوذرؓ کا غلام۔ اور پھر اپنے آقا کے بعد حسینؑ کی پناہ لیتا۔ شہداء کا جوش دیکھ رہا ہے۔ شہادت کا سلسلہ ہے جس میں جھجکی نہیں ہے۔ ابھارنے کی ضرورت نہیں

ہے۔ ہر شخص خود دوڑ رہا ہے۔ عجز اور انکساری سے۔ حسینؑ کے سامنے آتا ہے۔ یقین نہیں آ رہا ہے کہ میں بھی ایسا خوش نصیب ہو سکتا ہوں کہ فرزند رسولؐ پر نثار ہو سکوں۔ کہتے جو کچھ جونؓ کہتے۔ لیکن ان کا انکسار اور اس کی سادی سچائی کہہ رہی تھی کہ اب وہ بڑے حسب و نسب کے شریفوں کے فخر ہیں۔ ذرا ان کے اس فقرہ کے جوش، محبت اور خلوص کا اندازہ کرو کہ "میں آپ سے جدا نہ ہوں گا یہاں تک کہ میرا سیاہ خون آپ کے خون پاک میں مل جائے"۔ اسلام ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ اپنا ایک ایسا آزاد غلام بنا سکتا۔ میدان میں "پدرم سلطان بود" کا رجز نہیں پڑھتے۔ فخر یہ ہے کہ ہم آج تلوار سے فرزند رسولؐ کی حمایت کریں گے۔ اور ہم بھی اپنے امام اور شافعِ روزِ جزا کی وساطت سے وعدہ کی ہوئی کامیابی کی امید کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد حسینؑ ہیں اور جونؓ کی لاش ہے۔

بریرؓ ہمدانی

قبیلہ ہمدان نے امیرالمومنینؑ اور حضرت امام حسن علیہ السلام کے ساتھ جو عملی اظہار اخلاص و وفا کیا تھا اس کی بنیاد پر اس قبیلہ کے کسی شخص کا حضرت امام حسین علیہ السلام کی مدد کرنا حیرت خیز نہ تھا۔ بریرؓ کوئی معمولی فرد نہ تھے۔ بلکہ مشہور عابد اور قاری تھے۔ لیکن ان کا اس سے بلند تر درجہ ظاہر نہ ہوتا، اگر ان کی لاش پر حضرتؑ کا یہ فقرہ موجود نہ ہوتا کہ "بریرؓ خدا کے بندگان صالحین میں سے تھے"۔ صالح کے لفظ میں بریرؓ کی تاریخ مضمر ہے۔

لیکن بریرؓ کے واقعات انھیں ذی ہوش، جزرس اور موقع شناس بھی کھاتے ہیں۔ جسے کوئی مخصوص حالت اپنے ساتھ لے نہیں جاتی بلکہ جس میں اتنی قوت ہے کہ وہ اپنے کو اپنی جگہ قائم رکھے۔ مثلاً جس روز مشورہ جنگ ہوتا ہے بریرؓ موقع کی دشواری ظاہر کرتے ہیں اور ان کے نزدیک اس دشواری سے نکلنے کی صرف ایک راہ معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ابن سعد کو باز رکھیں۔ یقیناً اس کے علاوہ کوئی دوسری راہ نہ تھی۔ اس کے بعد ان کے انداز میں ان کی تدبیر، تدبیر میں ان کی عقل اور عقل میں موقع کی نفس شناسی مخفی تھی اور وہ یہ ہے کہ ابن سعد کے سامنے جاتے ہیں لیکن اسے سلام نہیں کرتے۔ بریرؓ کوئی غیر مشہور آدمی نہ تھے۔ جنھیں ابن سعد نہ جانتا ہوتا۔ خصوصاً جب کہ یہ اس کے پاس گئے تھے اگر وہ نہ بھی جانتا ہوتا تو اسے جاننے والوں نے اطلاع دی ہوتی۔ اس بنیاد پر یہ قیاس نہیں ہو سکتا تھا کہ بریرؓ اس اسلامی اور رسمی فرض سے مطلع نہ ہوتے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ابن سعد، سعد بن ابی وقاص کا لڑکا اور اس وقت امیر شام کے لشکر کا سپہ سالار ہے۔ یہ بھی گمان نہیں ہو سکتا کہ ابن سعد کو بریرؓ نہ جانتے ہوں۔ پھر بریرؓ کے سلام نہ کرنے میں کوئی غرض پوشیدہ ہوگی اور کچھ اثر ڈالنا چاہتے ہوں گے۔ غرض تھی جس کے ظاہر کرنے میں ابن سعد کے سوال نے پیش قدمی کی کہ: "کیا میں مسلمان نہیں ہوں جو تو نے مجھے سلام نہیں کیا"۔ یہی کہلوانا ان کی غرض تھی۔ اور اسی میں ان کے ترکیب کی کارگری اور جدت تھی۔ اس موقع کی خود مصوری کر لو کہ کوئی شخص کیونکر یہ فقرہ کہہ سکتا تھا۔ اور کونسا موقع ہوگا کہ کوئی شخص عمداً ایک فریضہ کو ایک شخص کے لیے متروک سمجھے گا۔ اور اب بریرؓ کے چہرہ اور لہجہ کا خیال کرو جس وقت وہ کہہ رہے ہوں گے کہ "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں"۔ اے کاش کسی زمانہ میں کسی مسلمان کا گھر اس کتبہ سے خالی نہ ہوتا۔ اے کاش ہر مسلمان کا کان اس سے آشنا ہوتا۔ اے کاش ہمارے اور ہمارے بعد کے واعظین، مقررین، مؤلفین اور

مضامین نگار اور مسلمان افراد اسے ہر وقت اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتے۔
جس خوبی سے بریرؑ نے ایک بات کے سننے کے لیے ابن سعد کو تیار کیا تھا اس سے بہتر کوئی ترکیب ممکن نہ تھی۔ وہ بات حدیثِ رسولؐ تھی۔ اور بات بھی ایسی اور اس موقع پر جب کہ ایک شخص اس کے گھر کے تباہ کرنے پر آمادہ ہے جس کی بدولت ابن سعد کا گوشت پوست اور موقع بنا ہے۔ اور یہ بے مثل حدیث بھی اسی کے گھر کی بتائی ہوئی ہے۔
اثر؟۔ "ابن سعد دیر تک سر جھکائے رہا" وہ محسوس کر رہا ہے کہ کس قوت نے اس کی گردن اور دل کو مروڑ کر زمین کی طرف جھکا دیا ہے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے دماغ پر ایک کند ضرب لگی ہے۔ بدحواس ہو گیا ہے۔ اور اس کے مُنہ کے الفاظ بکھر گئے ہیں۔ دیر میں اس نے اپنے کو مجتمع کیا۔ بالکل فطری تھا کہ ابن سعد بریرؑ کے ہر لفظ کی تصدیق کرتا۔ موقع کے لحاظ سے انسانی نفس دوسرا عمل نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اقرار نہ کرتا لیکن اس وقت دوسری مکارانہ تصنع ہوتی جس سے نفس اور زبان کی حرکت میں مطابقت نہ کہی جاتی۔ تصدیق کے بعد ابن سعد کے اختیار میں تھا کہ اپنے ارادہ سے باز آتا۔ اور پھر اسے یہ بھی اختیار تھا کہ باز نہ آتا۔ اس نے دوسری صورت کو پسند کیا۔ اس لیے کہ اس کا "دل حکومت اور فرماں روائی کی ہوس سے باز نہیں آتا تھا"۔
کھڑے ہو گئے بریرؑ۔ یہ ان کی نفس شناسی اور موقع فہمی تھی۔ بے کار باتیں اور بے سود کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک آدمی گمراہی پر مصر ہے اور اس کا ہٹانا اب محال ہے۔ اب انسان کے پاس اس موقع میں جس میں بریرؑ تھے کوئی ترکیب نہ رہ گئی تھی۔ بریرؑ بھی اگر کسی دنیاوی سلطنت کے وکیل ہوتے تو وہ بھی کسی شہر یا صوبہ کی حکومت دے سکتے اور اب ابن سعد کا مُنہ بند ہو جاتا۔ بریرؑ حضرتؑ کے پاس آئے اور شبہ نہیں بلکہ یقین کے ساتھ ابن سعد کی گمراہی کی اطلاع دی۔
لیکن بریرؑ اپنی ایسی ہی کوشش سے جس سے انھوں نے قریب قریب ابن سعد کو بدل دیا تھا، باز نہیں آئے اور انھوں نے عاشور کی صف کشی کے بعد بھی ایک کوشش کی۔ یہاں بھی میرے خیال میں تدبر کا ایک ٹکڑا تھا۔ اور وہ یہ کہ پہلے بریرؑ ابن سعد سے سوال کرتے ہیں کہ "کیا تو امیر المومنین حسینؑ سے جنگ کرے گا؟"۔ ابن سعد جواب میں "ہاں" کہتا ہے اور اسے سب لوگ سنتے ہیں۔ بریرؑ حسینؑ کے لیے واپسی کا سوال کر کے اب عامہ ناس کی طرف مخاطب ہو جاتے ہیں۔ اور وہ کچھ کہتے ہیں جسے انھوں نے اور اکثر لوگوں نے کہا تھا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یا تو ابن زیاد کا خوف اور یا ابن سعد کی تعلیم اور اکثر دشمنانِ اہلِ بیتؑ کی دیکھ بھال تھی کہ کسی نے ان کے خطاب کا کچھ جواب نہ دیا اور دیا تو غیر معقول تھا۔
بریرؑ میدان میں اس طرح گئے کہ یزید بن معقل نے انھیں مکالمہ کے لیے بلایا اور گفتگو کی۔ تصفیہ اس پر ہوا کہ مباہلہ کیا جائے۔ ایک دوسرے کو بددعا دے اور اللہ سچے کو فتح اور جھوٹے کو شکست دے اور اس کے بعد جنگ شروع ہو گئی۔ یزید کی کوشش نے بریرؑ کا بال بھی بیکا نہ کیا۔ لیکن بریرؑ نے وار کیا تو یزید کا فولادی خود چاک ہو گیا۔ اور بریر کی تلوار کو بریر کا سر اس قدر پسند آیا کہ اس پر مضبوط بیٹھ گئی۔ ان کی یہ ضرب بتاتی ہے کہ بریرؑ صرف زاہد خشک اور عابد گوشہ نشین نہ تھے بلکہ مسلمان تھے۔ جو ایک وقت متمدن، فرد کاسب اور صاحب اہل و عیال ہے۔ دوسرے وقت عابد ہے اور تیسرے وقت سپاہی ہے اور میدانِ جنگ میں حصولِ شہادت ہی کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ یہ صرف معمولی قوت کی ضرب

نہ تھی بلکہ اس سے مشاق ظاہر ہے۔ ابھی دشمن کے سر سے تلوار کھچ رہی تھی کہ ایک دوسرے نامرد دشمن ابن منقذ نے اپنی شجاعت نمائی کا موقع پایا، اور بریرؓ پر وار کیا۔ بریرؓ نے تلوار یزید کے سر میں چھوڑی اور ابن منقذ کا ٹینٹوا لیا۔ زور آزمائی ہونے لگی، اور ہمارے عابد نے ابن منقذ کو بھی زمین پر لٹادیا۔ کمر سے خنجر نکال رہے تھے کہ ایک نامرد کعب بن جابر پشت پر پہنچا اور نیزہ مارا۔ یہ زخم کاری تھا۔ جواب دینے اٹھے تھے کہ اب کعب نے تلوار کا وار کیا اور بریرؓ اس کے یا اور چند کے متواتر زخموں سے شہید ہوگئے۔ ان کا تقدس اور اس کی شہرت اس سے ظاہر ہے کہ قاتل کو اس کی بیوی نے ملامت کی اور آئندہ کے لیے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ (کیا اچھے خاصہ کی عورت تھی؟۔) اور خود قاتل نے ندامت میں شعر کہا اور ہلاک ہوا۔ ایک تنہا بریرؓ میں ان کے مختصر واقعات سے ان خوبیوں کی قوی جھلک پائی جاتی ہے، جو ایک زندگی چاہیے والی قوم اور فرد میں ہونی چاہیے۔ یعنی غور، پاکیزگی نفس، حمیت اور ہمت۔

جابر بن عروہ غفاری

حسینؑ کس حالت میں تھے اور کیسی ذات تھی کہ ان پر گہوارہ کے بچے اور قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے بوڑھے قربانی کے لیے تیار ہوتے۔ صرف بوڑھی عمر کا نقشہ اپنے سامنے کرلو اور تم سب سمجھ جاؤ گے۔ اگر جابر نے واقعہ بدر میں شرکت کی تھی تو اسے انسٹھ برس ہوئے تھے اور اگر یہ قیاس کیا جائے کہ وہ بیس برس کے تھے جس وقت شریک ہوئے تو بھی وہ آج اسی برس سے کم نہ تھے۔ ایک ضعیف جس میں گوشت نہیں ہے۔ رنگ میں حیات نہیں ہے، خون نہیں، جوش نہیں ہے، کھڑے ہونے کی قوت نہیں ہے، آنکھوں میں شیخوخیت سے مردنی چھائی ہے، کمر یا خم ہوگئی ہے یا مائل بہ خمی ہے۔ جس کی یہ مجبورانہ عمر اس کی عزت اور لحاظ کے لیے کافی ہے۔ وہ کمر باندھ رہا ہے۔ نیزہ اور تلوار کھانے جارہا ہے۔ اعضاء کا رعشہ انکار کرتا ہوگا کہ وہ نیزہ یا تلوار تھام سکے۔ لیکن اگر وہ اتنے بوڑھے تھے کہ آنکھوں سے دیکھنے کے لیے پلکیں اوپر اٹھا لیتے تو وہ میرے نزدیک سو برس کے قریب تھے۔ کب میدان جنگ نے وہ اندوہناک منظر دیکھا ہوگا جس وقت یہ بوڑھا مجاہد دشمن کے سامنے کھڑا ہوگیا ہوگا۔ لیکن اگر یہ یا اس کا چوتھائی بھی سچ ہے کہ جابر نے اسی آدمیوں کو قتل کیا تو سمجھ میں آتا ہے کہ بجھے ہوئے چراغ کی روشنی آخری مرتبہ تیز ہوگئی تھی۔ روح جوش اور ہمت نے کبھی اس سے قوی تر آخری کوشش نہیں کی۔ میں باوجود کوشش کے بھی آسانی سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ بوڑھا مجاہد اپنے خون میں لوٹا۔ اگر ایسے لوگوں کی کوشش بھی کسی قوم کے لیے مثال نہ ہو تو جدوجہد کی تاریخ ایک سادہ ورق ہے۔

سوید بن مطاع

صاحب لہوف کے موافق "بڑے شریف اور نمازی۔ انھوں نے شیرانہ حملہ کیا اور خوب ہی لڑے۔ خوب تکلیفوں پر صبر کیا"۔ ایسا لڑے جس کی مثال نہیں دی جاسکتی۔ وقت وہ ہے کہ ہزاروں آدمی فاتحانہ نعرے بلند کر رہے ہیں۔ اللہ اکبر کہہ رہے ہیں۔ قتل الحسینؑ کا غل ہے۔ اور یہ شور سوید کو جگاتا ہے۔ یہ زخمی اور ایسے زخمی تھے کہ دوست اور دشمن سب انھیں مردہ سمجھتے تھے۔ لاش اٹھتی ہے۔ حیات عود کرتی ہے۔ اب خود سوچو کہ یہ کیا سنتے ہیں۔ کیا اثر ہوتا ہے۔ کیونکر تلوار

ڈھونڈھتے ہیں اور کس طرح لڑتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ استے وقت میں یہ حسینؑ کی لاش مطہر اور فرقِ مقدس دیکھ سکتے تھے یا نہیں۔ رونے کے لیے ہاتھ رکا تھا یا نہیں۔ یا مرنے کے بعد ان کی آنکھوں میں نمی دکھائی دی تھی۔ مطالعہ۔ سوید کی قریب المرگ حالت نے نہ خلاصہ میں تغییر کیا تھا نہ روح کی قوت میں نسبتاً کمزوری پیدا کی تھی بلکہ اور خالص قوت کی چمک تھی۔

ختم ہو گیا ان اصحاب کا تذکرہ جنھیں پیشِ نگاہ رکھنے کا مجھے فرض تھا۔ ممکن ہے کہ ان کے علاوہ کچھ اور ہوں اور میری نظر لیک گئی ہو۔ یا میری کمی وقت نے مزید تفحص نہ کیا ہو۔ لیکن میں مطمئن ہوں اس پر جس قدر میں کہہ سکا۔ یہ اپنے وعدے پورے کر چکے۔ انھوں نے اپنی حیات تک اہلِ بیتؑ تک کوئی آنچ نہ آنے دی۔ یہی تھے جنھوں نے اپنے دلوں کو اپنی زرہ اور آستینوں پر پہن لیا تھا۔ اور اپنی جان دینے کے لیے گرتے تھے۔ ان کا فخر تھا کہ یہ حسینؑ کے اصحاب ہوتے۔ اور ان کے جانکاہ مصائب میں شرکت کرتے لیکن کسی سردار کا فخر تھا کہ اس کے ایسے رفقا ہوتے۔ انھوں نے حسینؑ کا نام بلند کرنے اور ان کی وجہ کو قوت دینے میں اس طرح مدد دی جس طرح ممکن تھی۔ یہ حسینؑ کی طرح زندۂ جاوید ہوئے۔ کون ہے حسینؑ کا نام لینے والا جو ان کا ذکر نہ کرے اور کون ہے حسینؑ کا زائر جو ان کی خاک قبر کو آنکھوں سے لگانا اپنی عزت نہ سمجھے۔ کربلا کسی ایک یا چند قبروں کا نام نہیں ہے۔ بلکہ تمام شہدا کی ایک قبر ہے جس کی لوحِ مزار سید الشہداءؑ کی قبر مطہر ہے۔ چند اعزا کا اور تذکرہ اور یہ باب تمام ہے۔

ایک ایک شاخ کٹ گئی لیکن جڑ کی حفاظت کرتی رہی۔ آج اب کوئی نہ تھا جو بنی ہاشم سے کہتا کہ ہم اپنی زندگی تک تمھیں میدان میں نہ جانے دیں گے۔ کسے حق تھا کہ وہ بنی ہاشم میں سفیر حسینؑ کے فرزند کے پہلے جام شہادت نوش کرنے کے لیے آگے بڑھتا۔ تاریخ نے یہی حرکت محفوظ رکھی ہے جہاں لکھا ہے کہ بنو عقیل واپسی کی صلاح اور مسلمؑ کی شہادت سن کر "اچھل پڑے" اس کے معنی صلاح پر حیرت ہے۔ اس کے معنی فرزندانِ مسلمؑ کی کم عمری ہے۔ اس کے معنی ناگہانی چوٹ ہے۔ اس کے معنی ان کا جوش ہے۔ اچھل پڑنا جس کا عنوان تھا اس کا نفس مضمون یہ تھا کہ "واللہ ہم سرزمینِ کوفہ کو اس وقت تک نہ چھوڑیں گے جب تک مسلمؑ کے خون کا بدلہ نہ لیں گے۔ یا جیسا مسلمؑ نے ذائقہ موت چکھا ہے ہم بھی نہ چکھ لیں گے"۔ امید کے باہر ہوتا اگر بنو عقیل اس کے علاوہ کچھ کہتے۔ بنو عقیل کو عقیل کی حاضر جوابی میں کافی حصہ ملا تھا ـــــ اور نہ جو کچھ انھوں نے کہا۔ اس میں کسی شبہ کی گنجائش تھی۔ سوچا نہیں جا سکتا کہ عموماً بنو ہاشم اور خصوصاً بنو عقیل سے زیادہ کوئی بے چین ہوگا کہ جلد لڑائی شروع ہو اور ہم مسلمؑ کا بدلہ لیں۔ ان کی اندوہناک شہادت کا وقت گزرا یہاں تک کہ دنیا کا وہ یادگار وقت آیا کہ یہ چھوٹی سی مقدس اور خالص جماعت اپنے امام سے یہ سنتے کہ تم لوگ جاؤ۔ دشمنوں کو میری فکر ہے۔ تم سے کوئی تعرض نہ ہوگا۔ اور یہ سنتے ہی وہ جذبات بھڑک اٹھتے جو سینہ میں دبے تھے۔ کہنے کو سب کہہ رہے تھے لیکن غالباً بنو عقیل کی صدا اس ہم آہنگی میں اس قدر ممتاز تھی کہ حضرتؑ انھیں کی طرف مخاطب ہوئے اور پھر بنو عقیل کو کہتے سنا کہ: "آپ سے علیحدہ ہو کر ہم لوگوں سے کیا کہیں گے؟"۔ لفظ اس استفہام کی شرح نہیں کر سکتے۔ اور سچ یہ ہے کہ میرے پاس اس سادی، سچی اور گہری حیرت کے سمجھانے کے لیے مناسب لفظ ہی نہیں ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ دل کٹ گیا ہے۔ لہذا آتا ہے اور روتی چیخ ہے جس سے جواب دیا گیا ہے۔ یہ ایک تنہا جذبہ محبت نہ تھا۔ محض جوشِ انتقام نہ تھا۔ حسینؑ کے تقدس کی عظمت نہ تھی، بلکہ مجموعہ تھا جس میں ایک لہر اپنے خلوص کی حفاظت کی تھی جو چلے جانے کی صلاح

سے متزلزل ہو سکتا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے گرد و پیش کے موت خیز سامانوں نے ہمیں جوشِ رفاقت میں کمزور نہیں کردیا ہے کہ اس صلاح پر عمل کریں۔ نہ مجھے اس کے بعد ان کے اور فقرات کی شرح کرنی ہے، جو ان کی شرافت ان کی غیرت اور ان کی حمیت کی تاریخ ہے۔ صرف یہ پھر یاد دلانا ہے کہ: "اللہ تعالیٰ اس عیش کو نہ دکھائے جو آپ کے بعد ہم کو ملے"۔ وہ وقت آگیا جس کے یہ منتظر تھے۔ بازارِ شہادت گرم ہوا اور اجازت خواہی کے وقت اوپر لکھے ہوئے شوق کی تکرار تھی۔ حسینؑ نے بھانجا کو مرنے کی اجازت دے دی۔ عبداللہ بن مسلمؓ چلے۔ اب انھیں فکر نہ تھی کہ کوئی روتا ہوگا۔ یہ خوش خوش میدان کی طرف جا رہے تھے اور رجز پڑھ رہے تھے۔ ان کا رجز ایسے افتخار کا اظہار نہ تھا جو ان میں نہ تھا۔ بلکہ عین واقعہ تھا کہ ان کے بنی ہاشم، فرزندانِ رسولؐ اور شیرِ خدا کی نسل میں ہونے سے انکار تھا۔ لڑے جس طرح بنی ہاشم کو لڑنا چاہیے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کتنے زخم کھائے لیکن موت کی ظاہر وجہ ایک نیزہ اور دور کے تیر کے زخم سے ہوئی۔ ایک کلی جو ابھی کھلی بھی نہ تھی۔ فولاد سے کچل گئی۔ حسینؑ اس نوخیز کی خون آلود لاش پر پہنچے جس کے گرم خون سے ابھی بھاپ نکل رہی تھی۔ "دار الامان" کی تسکین دی۔

جعفرؓ، عبداللہؓ، موسیٰؓ اور عبدالرحمٰنؓ بن عقیلؓ۔ ان کی شہادت میرے زیادہ تر متذکرہ صدر ریمارک کے ذیل میں ہے۔ ان میں سے ہر ایک اس طرح لڑا کہ دشمن کی کثیر تعداد کو قتل کیا۔ ہر ایک رجز پڑھتا تھا اور میدانِ جنگ میں دشمنوں کی حیات سے کھیلتا تھا۔ یہ کہتے تھے اور ثبوت دیتے تھے کہ اے دشمنو ہم تمھیں تلوار اور نیزوں سے ماریں گے۔ اور اہلِ بیتؑ اور امامِ انس و جان کی حفاظت کریں گے۔ شام کے لشکر میں بجلیاں چمکیں، اور ہر ایک نے اپنے نامقابلہ جوش، بے جگری اور ہمت کا ثبوت دیا۔ مثال دی کہ ہم اپنی خاموشی اور بے تعلقی میں بھی اپنے تمام احساسات کو قائم رکھے ہیں۔

(اولادِ عقیل کی صحیح تعداد کی تلاش میں میں عمدۃ الطالب فی انساب آلِ ابی طالبؑ کھولتا ہوں۔ اور اس میں مؤلف کہتا ہے کہ عقیلؓ کے بعد بجز محمد بن عقیلؓ کے کوئی نہ تھا۔ مسلمؑ بن عقیلؓ کوفہ میں شہید ہوئے اور ان کا سلسلہ منقرض ہو گیا۔ اس کے بعد محمد بن عقیلؓ کا سلسلہ دیتا ہے۔ جس میں کوئی حضرتؑ کے ساتھ شہید نہیں ہوا۔ اور نہ حضرت مسلمؑ بن عقیلؓ کی کسی اولاد کا تذکرہ کرتا ہے۔ ان سطروں کے لکھنے کے وقت مؤلف کے پاس انساب میں کوئی اور کتاب نہیں ہے۔ جس سے مزید تفتیش کی جاتی۔ اس صورت میں اپنے اس سلسلۂ بیان کو جو میں نے اوپر لکھا ہے غالب اور قوی قرائن کی وجہ سے قبول کرتا ہوں بجز اس شبہ کے کہ جو نام لکھے گئے ہیں ممکن ہے کہ نام اور کنیت دونوں معلوم نہ ہونے کی وجہ سے مؤرخین نے نام اور کنیت کے ایک ہی شخص کو علیحدہ لکھا ہو۔ حالانکہ شخص ایک ہی ہو) پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا حضرت مسلمؑ کے صرف ایک صاحبزادے میدانِ کربلا میں شہید ہوئے اور میرا جواب غالباً اثبات میں ہوگا۔ اور اس سے سوال ہوگا کہ آیا حضرت مسلمؑ کے فرزندوں کے متعلق اس روایت کی کیا نوعیت ہے کہ وہ کوفہ میں بعد شہادت حضرت مسلمؑ شہید کیے گئے یا صاحب بحار کے موافق بعد واقعۂ کربلا حضرت مسلمؑ کے دو صاحبزادے گرفتار ہوئے اور ایک برس قید رہے۔ خود صاحب بحار نے اس کا تصفیہ نہیں کیا ہے کہ وہ پسرانِ حضرت مسلمؑ تھے بلکہ انھیں پسرانِ حضرت جعفرِ طیارؓ بھی کہا ہے۔ اب یہ امر ہے کہ آیا حضرت مسلمؑ کے صاحبزادے حضرت مسلمؑ کے ساتھ کوفہ گئے اور وہ حضرت مسلمؑ کے بعد شہید ہوئے۔ نہ صرف اس کا معتبر تذکرہ نہیں ہے بلکہ ایک معترض کے نزدیک بہت سی قابلِ اعتراض باتیں ہیں۔ مثلاً

- ایسی حالت میں جس میں حضرت مسلمؑ روانہ کوفہ ہوئے تھے یہ بہت کم قرینہ ہے کہ انھوں نے دو چھوٹے بچوں کو اپنے ہمراہ رکھا ہو۔
- موضع مضیق سے اگرچہ مصائب سفر اور نایابی آب کا خط آتا ہے لیکن کہیں بچوں کا تذکرہ نہیں ہے۔ اگر ساتھ ہوتے تو یقیناً ایسی حالت میں واپس کر دیے جاتے۔
- پسران مسلمؑ کا نہ صرف حضرت مسلمؑ کی روانگی کے وقت کوئی تذکرہ نہیں ہے بلکہ دارِ مختارؒ، دارِ ہانیؒ، طوعہ یا کہیں حضرت مسلمؑ کی حیات میں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔
- حضرت مسلمؑ کی شہادت سن کر اگرچہ بنو عقیلؑ متاثر ہوتے ہیں لیکن کہیں کوئی پسرانِ مسلمؑ کو نہ دریافت کرتا ہے نہ ان کی کوئی خبر ہے۔ حضرتؑ سے بھی اگرچہ یہ روایت ہے کہ حضرت مسلمؑ کی صاحبزادی پر اظہارِ نوازش فرماتے ہیں لیکن بچوں کا کہیں تذکرہ نہیں کرتے۔
- حضرت مسلمؑ اگرچہ اپنی شہادت کے وقت وصیتیں فرماتے ہیں لیکن کہیں اس کا تذکرہ نہیں کرتے کہ میرے بچوں کی حفاظت کرنا یا انھیں حسینؑ کے پاس پہنچا دینا۔

ہو سکتا ہے کہ کچھ اور سلسلہ واقعات ہو جس سے پسرانِ مسلمؑ کی شہادت ثابت ہو۔

اب میں اولادِ حضرت جعفر طیارؓ کے تذکرہ پر پہنچتا ہوں۔ صاحب عمدۃ الطالب پھر ایک علیحدہ سی بات کہتا ہے کہ حضرت جعفر طیارؓ کے دو لڑکے "عون و محمد فقتلا مع عمهما الحسين عليه السلام يوم الطف"۔ یہ ابن خلدون، کامل ابن اثیر، روضۃ الصفا، نور العین اور کشف الغمہ وغیرہ کے منافی ہے جن مورخین کے نزدیک عون و محمد پسران عبداللہ بن جعفر تھے نہ پسران جعفر طیارؓ۔ اور میں یہاں بھی ان آخر الذکر مورخین کے قول کو قبول کرتا ہوں۔

محمدؒ بن عبداللہؒ جعفر اور عونؒ بن عبداللہؒ جعفر

مجھے صرف اس قدر کہنا ہے اور بس کہ یہ حضرت جعفر طیارؓ کے پوتے تھے اور غالباً میں اس سے ان کی تمام اخلاقی اور شجاعانہ توریث اور خاصہ کو بجھا دیتا ہوں۔ میں حضرت جعفرؓ اور حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کے مفید تذکرے کر چکا ہوں۔ اتنا اور کہہ دوں کہ کربلا کے ان نوخیز شہیدوں کی مادر گرامی حضرت زینبؑ خاتون تھیں۔ ان کی عمر کے متعلق میری کوئی ذاتی تحقیق نہیں ہے۔ لیکن غالباً ان کی عمر بھی حضرت علی اکبرؑ کی مشہور عمر اور یا کم و بیش حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی عمر ہوگی۔ غالباً بیس برس کا اوسط آسانی سے قبول کیا جا سکتا ہو۔ صاحب کشف الغمہ کے موافق محمد بن عبداللہؒ نے دس دشمن قتل کیے۔ "خویشتن را در میان اعدا افگند" اور عون بن عبداللہ بن جعفرؓ نے تین سوار اور آٹھ پیادے قتل کیے۔ ابو مخنف جیسا میں پہلے کہہ چکا، ان کے مقتولین کی تعداد اسی بتاتا ہے۔ جو کچھ بھی ہو ان کی ذات میں نسباً وہ سب تھا جو عرب کے نزدیک بہترین فخر کے قابل تھا۔ اور ان کی خصوصیات جن سے وہ متاثر تھے وہ تھیں جن سے اہل عالم کی بہترین پسند اعراض نہیں کر سکتی۔ سوچ کہ لوگ ان کے رجز اور ان کی موجودگی سے سوچ رہے ہوں گے کہ جعفر طیارؓ کے پوتے میدان میں آئے ہیں۔ نتیجہ نہ سہی لیکن لوگ سوچ سکتے تھے کہ اسلام کے کس بہادر کے پوتے ہیں اور حضرت جعفرؓ تو ایسے زمانہ میں نہ تھے

جب کہ سیاسی حوصلوں کا زور شور اور حسد و عداوت کی لہریں کسی خاص کنارے سے ٹکراتی ہوں۔ کم سے کم حضرت جعفرؑ کی ذات وہ نہ تھی جس سے کوئی ایسی لہر ٹکراتی۔ لیکن کیا یہ علیؑ کے نواسے نہ تھے؟۔ اور کیا یہ حسینؑ کے لیے اس وقت نہ لڑ رہے تھے۔ عونؑ کہہ رہے تھے: ـــ

اقسمت لادخل الجنة موالیاً لاحمد و السنة

لڑ رہے تھے کہ جنت میں داخل ہوں اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سنت کا حق ادا کریں۔ اسی لیے آئے تھے۔ راستہ میں ملے تھے۔ شاید باپ نے بھیجا ہو۔ شاید ماں کی محبت کھینچ لائی ہو لیکن کسی صورت میں ان سے حضرتؑ کا موقع پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا۔ خصوصاً ایسے شخص سے جن سے عامل نے خط و کتابت کی ہو اور وہ جسے معاویہ حسینؑ کا رقیب بنانے کے لیے کوششیں کر رہا تھا۔ اس سے میری غرض یہ ہے کہ یہ لوگ سردار قبیلہ کی قسمت کی شرکت کے خیال سے خالی نہ تھے اور تمام ان مشکلوں کے لیے تیار تھے جو اس فرض کے ادا کرنے میں پیش آئیں۔ ان کی ابتداء اگر پوشیدہ بھی ہو تو انتہا نے ان کی غرض ظاہر کر دی۔ اس وقت جس وقت یہ اس بہترین خلعت کو پہن کر کربلا کی سرزمین پر سوئے۔ ایسی نیند جس سے پھر نہ چونکے۔

میں اس کے پیشتر حضرت عبداللہ بن جعفرؑ کے صبر آزما مواقع کے متعلق کہہ چکا ہوں جو کچھ میرا شکستہ قلم کہہ سکتا تھا لیکن حقیقتاً بیٹوں کی شہادت سے ان کا ایسا امتحان ہوا جس کا دشمن کی سیاسی نمائشوں اور فریبوں سے امتحان کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک چوٹ تھی جو سیدھی دل و دماغ پر لگی تھی۔ اس وقت جب کہ ادھیڑ ہو گئے تھے۔ امتحان ہوا لیکن حضرت عبداللہ بن جعفرؑ نے بڑھتے ہوئے صبر اور برداشت سے اس کا مقابلہ کیا اور جس طرح مقابلہ کیا اس میں کسی تصنع کی گنجائش نہ تھی۔ کیونکہ وقت نہ ملا تھا کہ سنبھلتے اور سنبھل کر کچھ کہتے۔ نہیں، خبر سنی، چوٹ کھائی۔ غلام نے خوشامد کی۔ خوشامد پر طیش آیا۔ اور ساتھ ہی مُنہ سے نکلا کہ: اگر میں ہوتا تو دوست رکھتا کہ ان کے ساتھ مارا جاتا۔ یہ وہ بات ہے جو مجھ سے میرے نفس کی سخاوت کرا سکتی۔ اگر میں نہیں تھا تو میرے بیٹے حسینؑ کے ساتھ تھے"۔ ان فقرات کے قبل کی حالت ابی مخنف کے الفاظ میں خوب ادا ہوتی ہے کہ: "فجذبه عبدالله بن جعفر و ضربه بنعله ثم قال یابن اللخنا تقول بالحسین مثل هذا الکلام"۔ یہ تھے حضرت عبداللہ بن جعفرؑ۔ ان کا ایسا ہونا ان کے خاندان کے لحاظ سے عجب خیز نہ تھا لیکن سوچو کہ یہ اپنے خاندان کے قوی تر روشنی کے مہر و ماہ (جناب رسالت مآبؐ اور امیرالمومنینؑ) سے علیحدہ کر کے افراد عالم میں کیسے روشن جسم تھے۔ اسلام ایسے خاصوں پر فخر کرتا ہے۔ اسلام ہی نے انھیں ایسا بنایا تھا۔

عبداللہ بن حسنؑ

اسلام کے شاہزادہ صلح کا فرزند۔ اگرچہ میرا قوی میلان یہ ہے کہ انھیں کا نام احمدؑ بن حسنؑ تھا۔ لیکن میں اس جگہ عبداللہ بن حسنؑ پر نظر کرتا ہوں جس حیثیت سے اعثم کوفی اور روضۃ الشہدا وغیرہا سے اس نام کے واقعات لکھے گئے۔ میدانِ جنگ میں چاند نکل آیا۔ خوبصورت ہاشمی صبا رفتار گھوڑے پر بلند تھا جس میں حسنؑ کی شیرینی اور وقار اور علیؑ کی شجاعت تھی۔ جوانی نہیں شباب کی بے چینی اور جوش۔ جنگ کا پہلا حوصلہ۔ چہرہ پر فطری شگفتگی نہیں بلکہ گزشتہ اندوہناک دنوں کے

آثار۔ ترحم خیز تحریریں۔ جنھیں دیکھ کر خیال ہو کہ ابھی یہ اس قابل نہ تھے کہ زمانہ ان کے چاند سے چہرہ پر اپنے فشار کا نقش کرتا۔ لیکن وہ میدان میں تھے۔ سخت مستقل، تند اور آمادہ جنگ۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نوعمری میں بھی وہ تمام صفات اپنے میں لیے ہیں جن کے لیے بنی ہاشم مشہور ہیں۔ ناتجربہ کار ساری نگاہیں بدلیں ان میں دشمنوں کے قتل کا عکس آیا۔ چاند اور کالے بادلوں کی جنگ شروع ہوئی۔

کچھ حیرت نہیں ہے اگر اس ہاشمی نورس سے یہ رحم اور ایثار ظاہر ہوا ہو کہ اپنے گھر کے ایک خادم (فیروزدان) کو زخمی دیکھ کر گھوڑے پر سوار کرلیا ہو اور خود پیدل چلے ہوں۔ (اگر روضۃ الشہدا کی واقعہ نگاری صحیح ہے) اور اسے بہادروں کی موت مرتے ہوئے دیکھ کر آنکھیں ڈبڈبا آئی ہوں۔ عبداللہ بن حسنؑ کی مطمئن جنگ با حواس اور پھرتی ساتھ ہی ثقیل ضرب دشمنوں کو بہت دنوں یاد رہی ہوگی۔ کچھ دیر کی جنگ میں کتنے تیر، تلوار اور نیزوں کے زخم لگے ہوں گے اور کس طرح صباحت خون آلود ہوتی جاتی ہوگی اور پھر سرخی گہری ہوتی جاتی ہوگی۔ لیکن تازے زخموں سے خون کی تہ کتنی ہی دبیز کیوں نہ ہوتی جاتی ہو۔ مغرور دماغ اور شجاع دل اپنی آخری حرکت تک اس سے انکار کرتا رہا کہ وہ ضعف سے مغلوب ہوتا۔ ضرب کی آخری قوت بھی دشمن پر صرف کی گئی۔ یہاں تک کہ بے رحم موت نے اپنا اثر شروع کیا۔ حسنؑ کے فرزند کی لاش آرہی ہے۔ اس نے حسینؑ کی نگاہوں میں کونسے واقعات کو زندہ کردیا ہوگا۔ اور خیالات کا کس قدر مجموعی سلسلہ ہوگا جس سے حسینؑ محسوس کررہے ہوں گے کہ ہم رو رہے ہیں۔ وہ لہریں دماغ پر اپنا اثر کررہی ہوں گی۔ جن سے بڑھ کر کوئی ضرب تکلیف دہ نہیں ہے۔

احمدؑ بن حسنؑ

یہ عبداللہ بن حسنؑ تھے یا نہ تھے، میرے تمام ریمارک وہی ہیں جو میں کرچکا۔ نیا پن اتنا ہے کہ حسینؑ کے استغاثہ کے وقت یہ خیمہ میں تھے۔ چچا کی آواز سن کر دوڑے آئے۔ "لبیک لبیک" کہتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ہم موجود ہیں، حکم دیجیے۔ اور حسینؑ فرمارہے تھے حملہ کرو۔ اور اپنے جد کے حرم سے دشمنوں کو دُور کرو۔ رجز پڑھتے ہوئے حملہ کیا۔ اسی دشمنوں کو قتل کرکے اس طرح واپس ہوئے کہ پیاس سے آنکھیں دھنس گئی تھیں۔ پانی مانگتے ہیں۔ اس لیے کہ "خدا و رسولؐ کے دشمنوں سے جنگ کی قوت آجائے"۔ حمایت وجہ حق کا بڑا جوش تھا۔ لیکن ان کے قلب کی قوت زیادہ تر اس سے ظاہر ہے کہ وہ چچا سے جواب سنتے ہیں کہ: "ذرا صبر کرو یہاں تک کہ اپنے نانا رسولؐ اللہ سے مل جاؤ۔ وہ تمھیں پانی پلائیں گے جس کے بعد تم پیاسے نہ ہوگے"۔ ساتھ ہی پلٹ پڑے۔ ہمت پست نہ ہوئی۔ پھر رجز خوانی کی قوت آگئی اور ایک مرتبہ پچاس اور پھر ساٹھ دشمن قتل کیے۔ ممکن ہے کہ تعداد مقتولین میں راوی نے مبالغہ کیا ہو۔ نہ اس وقت نہ اس کے پہلے اور نہ بعد میں۔ میں تعداد پر مصر ہوں۔ بلکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ انھی اس حالت میں کس طرح لڑتے تھے۔ اس سولہ برس کے بچہ نے جس صبر و اطمینان سے زخم کھائے اور جس تسلیم و رضا سے موت کی طرف سبقت کی وہ اپنے گھر کے روایات کی تصدیق تھی۔ یہاں تک کہ حسنؑ کا یہ نونہال بھی بے رحم موت کی گود میں سو گیا۔

حسنؑ مثنیٰ

غالباً حضرت امام حسن علیہ السّلام کے سب سے بڑے فرزند، شہیدِ کربلا کے داماد جنگ کی اور سب نے سمجھا کہ شہید ہو گئے۔ لیکن دشمنوں نے جس وقت شہداء کے سر کاٹنے چاہے یہ زندہ پائے گئے۔ علاج کیا گیا اور اچھے ہو گئے۔ اگر ایسا ہے اور ان کی زبانی اس واقعہ عظیم کی روایتیں محفوظ ہوتی تو وہ واقعات کربلا کے سمجھنے میں معین ہوتیں۔

قاسمؑ بن حسنؑ

ایک چودہ برس کا خوبصورت بچہ۔ ابھی زرہ پہننے کے قابل نہیں ہیں۔ غالباً گھوڑے پر بھی نہیں ہیں۔ نعلین پہنے ہیں۔ اور ایک کرتہ ہے اور تیروں تلواروں اور نیزوں میں جانا ہے۔ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اب تک انھیں یہ تجربہ نہ ہو سکا تھا کہ زخموں اور انسانی جسم میں کیا تعلق ہے۔ کیونکر خوبصورت جسم قیمہ ہو سکتا ہے اور پھر کیا صورت ہوتی ہے۔ تجربہ تھا۔ ہو چکا تھا۔ چند گھنٹوں میں۔ لیکن چچا کو اس حالت میں دیکھ کر حکم چاہتے اور حکم ملتا ہے۔ دوڑتے ہیں گویا میدان میں چوگان کھیلنے چلے ہیں۔ انھیں سے کسی وقت حضرتؑ پوچھتے ہیں کہ: "موت کیسی معلوم ہوتی ہے"۔ اور یہ خلاف امید (ایک بچہ کے لحاظ سے) جواب ملتا ہے کہ: "شہد سے زیادہ شیریں"۔

کوئی قوم و مذہب جس کا کوئی اتنا بڑا بچہ قربانی کو اس خوشی سے قبول کرے جینے کے قابل تھی۔ سچ یہ ہے کہ انھیں کی وجہ سے زندہ رہے۔ ابھی تو قاسمؑ اس قابل نہ تھے کہ تلوار اٹھاتے۔ لیکن زمانہ نے مجبور کیا تھا۔ ایک بڑی وجہ نے مر جانے کا وہ ذوق پیدا کیا تھا جو قاسمؑ کی آمادگی سے ظاہر ہے۔ اور جب تلوار اٹھائی تو تلوار کو فخر ہوا کہ ہم قاسمؑ کے ہاتھ میں ہیں۔ قاسمؑ کے اس فقرہ میں نہ صرف باوجود کم سنی کے حضرت قاسمؑ کا تشخص ہے بلکہ وہ تمام اسباب ہیں جن میں حضرت قاسمؑ کے خصائل کا نشو و نما ہوا تھا۔ بلکہ ہو رہا تھا۔ ایک دوسری بات یہ تھی کہ حضرتؑ نے رخصت کے وقت قاسمؑ کا گریبان چاک کر دیا تھا۔ چاند سا سینہ کھلا ہوا تھا اور دشمنوں کے خوفناک حربے دیکھ رہے تھے۔ کیا قاسمؑ کی یہ صورت اور اس طرح میدان میں جانا اس قابل نہ تھا کہ انسانیت اور شجاعت رحم کا خیال کرتی۔ رحم؟ اور پھر یہ کیسے سمجھ میں آتا کہ انسان ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ایسے ظلم بھی کر سکے۔ اور تمام احساسات شرافت اور انسانیت سے مُنہ پھیر لے۔ قاسمؑ کو دیکھ لو۔ یہ چھوٹا سا جسم ایک لختہ خون ہو رہا ہے۔ آخری وقت ہے اور قاسمؑ ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ موت سے آخری جنگ ہے۔ لاش سرد ہوا چاہتی ہے۔ حسینؑ سرہانے ہیں اور یہ اندوہناک منظر دیکھ رہے ہیں۔ کیا لاش تک پہنچنے میں سواروں کی آمد و رفت سے قاسمؑ کی لاش پامال ہو گئی تھی۔ پشت پر کیوں لاش گئی۔ کیا ایک پشتارہ بنایا تھا۔ عبرت خیز بغل گیری۔ وہی جسم جسے رخصت کے وقت گرم دیکھا تھا۔ اس وقت سرد اور نم پا رہے تھے اور اس کی سرخ نمی حسینؑ کے جسم اور کپڑوں پر منتقل ہو گئی تھی۔ حضرت امام حسنؑ کی اولاد میں اب کوئی تلوار اٹھانے کے قابل نہ رہا۔ شہید ہونے کے قابل نہیں۔ تلوار اٹھانے کے قابل۔

عبداللہ بن علیؑ، جعفر بن علیؑ، عثمان بن علیؑ، محمد بن علیؑ، ابوبکر بن علیؑ

یہ فرزند تھے اس کے جس نے دنیا کو شریفانہ شجاعت کا اصول سکھایا۔ جو شجاعت کا باپ تھا۔ یہ لوگ نوجوان تھے۔ بیس سے پچیس برس تک کے۔ میدان میں گئے۔ حسینؑ کے علمدار نے انھیں یاد دلایا کہ وقت آگیا۔ انتظار کا وقت کٹا۔ پے در پے میدان میں جانے لگے۔ اور ایک سلسلہ تھا کہ عباسؑ اور حسینؑ نے بھائیوں کو یکے بعد دیگرے لڑتے اور گرتے دیکھا۔ علیؑ کے پھول خون کے چھینٹوں سے میدانِ جنگ میں کھلے۔ علیؑ کے فرزندوں کے لیے اس سے کوئی بڑا حوصلہ نہ تھا۔ خصوصاً جب کہ فرزند رسولؐ پر قربان ہونا سرفروشی کی غرض ہو۔ علیؑ کا نام، علیؑ کا جسم، علیؑ کا خیال، علیؑ کا شخص اس لیے قائم ہوا تھا کہ وہ ہادیٔ عالمؐ اور ان کے اصول کے لیے مختلف زمانوں میں۔ اپنے کو قربان کیا کرتا۔ میدانِ کربلا میں ان کے یہ فرزند شہید نہ ہوئے تھے بلکہ ان کا نام زندہ ہوا تھا۔ علیؑ نے اپنے کو یاد دلایا تھا۔ یاد دلانے کا سامان چھوڑتے گئے تھے اور یہ سامان ایک ذخیرہ ہے جو قیامت تک خرچ نہ ہوگا۔ اس روز ختم ہوگا جس روز اسلام اور اس کی ضرورت ختم ہوگی۔

عباسؑ بن علیؑ

حسینؑ کے لشکر کے علمدار بچوں کے سقہ وہ ذات جو اس طرح دنیا میں آئی کہ شجاع باپ میں ایک شجاع فرزند کا حوصلہ تھا۔ اس کے علاوہ میں نہیں جانتا کہ حکیم الاسلام کو اور کونسی وجہ داعی ہوئی کہ وہ ایک شجاع فرزند کی خواہش کرتے۔ یقیناً ان جناب کی شجاعت پرور نگاہ میں کچھ کام اور بڑھتی ہوئی ضرورتیں ہوں گی جس سے ایسے نفوس کی موجودگی لازم ہوگی۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ حضرتؑ کو اپنے اور فرزندوں کی شجاعت کے متعلق شبہ تھا۔ حاشا۔ زمانہ آیا کہ حضرت محمد بن حنفیہؒ نے اپنے کو اپنے شجاع باپ کا شایان فرزند ثابت کیا۔ جناب امیرؑ نے انھیں کسوٹی پر سختی سے کسا۔ اور حسینؑ اپنی فطری خواہش اور میلان سے شریک جنگ ہوئے اور اس نادر سپاہی کا اعتراف حاصل کیا جس کا نام مالک اشتر تھا۔ لیکن غالباً حسینؑ ہی کی ذات میں جناب امیرؑ کی خواہش کا حل ہے۔ نواسۂ رسولؐ، رسولؐ کی یادگار۔ جناب امیرؑ کا وہ بے مثال لحاظ جو سرورِ کائناتؐ کے متعلق تھا وہ نہیں چاہتا کہ ان کی کوئی نشانی ان کی نگاہ کے نیچے یا خیال کے سامنے (وہ کوئی زمانہ ہو) موردِ ہلاکت ہو۔ خصوصاً جب کہ رسولؐ کی کوئی نشانی حسینؑ کی ایسی ہو جن سے رسولؐ اور اسلام کا مستقبل وابستہ ہو۔

عباسؑ پدری سلسلہ سے عبدِ مناف تک پہنچتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی ذات کو یہ روایاتی خصوصیت حاصل تھی کہ میرے وجود پر میرے باپ کی اس خواہش کا عکس ہے کہ یہ فرزند شجاع ہو۔ کیوں؟۔ شاید عباسؑ جانتے ہوں۔ لیکن سپاہی اکثر، مصالح کی پیچھے نہیں دوڑتا۔ (بقول میر حبش کے کہ "من مرد کنکاش نیستم اگر بہ یک ضرب پارہ نہ کنم دست مرا ببرند") اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عباسؑ اپنے ہوش کے زمانہ سے شجاعانہ تربیت کے تابع تھے اور ان کا نشو و نما اس خیال کے سایہ میں ہو رہا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عباسؑ کے انداز، حرکات، لہجہ اور قیافہ پر اس کا اثر پڑا تھا۔ لیکن یہ نہ بھولنا کہ علیؑ کا رحم و کرم مخلوقات کا لحاظ اور خدا کا خوف ان میں کم تھا۔ نہیں کوئی اسلام کا سپاہی نہ کہا جائے گا جس میں شجاعت کے ساتھ شرافت اعمال نہ ہوگی۔ حقیقۃً شجاعت شرافت اعمال کا ایک بہترین حسن ہے۔ اس میں

حضرت امام جعفر الصادقؑ کے ایسے بزرگ کا یہ قول بھی ضم کر لو کہ حضرت عباسؑ بہت ہی صاحب بصیرت اور پختہ ایمان تھے۔ بصیرت اور ایمان کا کسی میں ہونا اور وہ بھی ایک مقدس حکیم اور فلسفی کی زبان سے ایک سند ہے۔ جس کے مقابلہ میں زیادہ وزنی شہادت طلب نہیں کی جاسکتی۔ ابو اسحاق اسفرائنی نے ایک نہایت ہی عمدہ ٹکڑا محفوظ کر رکھا ہے جو مجھے حضرت عباسؑ کی مصوری میں مدد دے گا کہ حضرتؑ مارد ابن صدیف سے فرماتے ہیں کہ: "میں اپنی شرافت، عقلمندی، دینداری، نفس کشی، دشمن شناسی، شجاعت، مقابلہ آرائی، تیغ زنی، جفاکشی اور شکر و توکل میں مشہور ہوں"۔

ان باتوں کے ساتھ بلند بالا اور قوی ہیکل تھے۔ عباسؑ کا ذکر یہیں تمام نہیں ہو گیا بنی ہاشم بالعموم خوش شکل اور خوش لہجہ ہوتے تھے اور جن میں ایک قوت جذب کا ورثہ تھا۔ ان میں عباسؑ اس قدر ممتاز تھے کہ "قمر بنی ہاشم" کہے جاسکتے۔

صاحب عمدۃ الطالب کے نزدیک حضرتؑ کی عمر چونتیس برس کی تھی۔ اور اعثم کوفی کے موافق امیرالمومنینؑ نے حضرت ام البنینؑ سے کوفہ میں عقد کیا۔ اس لحاظ سے حضرتؑ کی عمر قریب ۲۵ برس کے تھی۔ اس لیے یہ صاف سمجھ میں آتا ہے کہ ابھی جوانی کے دن بھی پورے نہ ہوئے تھے۔

اتنا کہنے کے بعد اب مجھے دکھائی دیتا ہے کہ حضرت عباسؑ اپنے بھائی کی آواز سن کر ان لوگوں میں سب کے آگے تھے جنھیں حضرتؑ ولید کے دروازہ پر بٹھا گئے تھے۔ تلوار لیے ہوئے۔ اس ناقابل تسخیر عزم کے ساتھ جس کے مقابلہ کی جرأت اس میں ہو جسے اتفاقات نے عباسؑ کا ایسا بنایا ہو۔ کون تھا جو ایسا ہوتا۔ میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ اہل بیتؑ کا قافلہ مدینہ سے کوچ کر رہا ہے اور اس وقت یا تمام راستہ میں عباسؑ کیا کر رہے ہیں۔ ہر وقت ہوشیار، مستعد، خطرہ پر ٹوٹ پڑنے کے لیے بے چین۔ حر سے گرم کلام اور عباسؑ حسینؑ کے سامنے آنے جاتے ہیں اور گویا پوچھتے ہیں کہ کیا عباسؑ موجود نہیں ہے؟۔ آپ حکم کیوں نہیں دیتے پھر دیکھیے کہ حر کیا ہوتا ہے۔ حسینؑ عباسؑ کی گرمیاں دیکھتے ہیں پیار سے مسکراتے ہیں اور آنکھوں میں کہتے ہیں کہ ابھی صبر کرو۔

یہاں تک کہ وہ مشہور دن آگیا جس کا پاسنگ بھی اگر قوموں میں ہوتا تو انھوں نے اس کے یادگار رکھنے کے لیے اہتمام کی طرح اہتمام کیا ہوتا۔ آٹھویں تاریخ پانی لانے کا حکم ہوا ہے۔ اور عباسؑ کے بہادر پچاس اس عزم کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں کہ ہزارہا دشمن سے گھاٹ چھین لیں گے۔ تیس پیادے اور بیس سوار مشکوں سے مسلح جا رہے ہیں۔ پیاسے پیاسوں کے وکیل اور سقا فرات کو دیکھتے ہیں اور دشمن کی مداخلت ہوتی ہے۔

اس چھوٹے سے لشکر میں حکم کی صدا بلند ہوتی ہے کہ: "پانی بھر لو"۔ بجلی دوڑی، تلواریں برسیں، راستہ صاف ہوا۔ اور خشک مشکیں بے صبری سے پانی پینے لگیں۔ یہ سوچنا ممکن ہے کہ عمر بن حجاج الزبیدی چپکا منھ دیکھ رہا تھا۔ جب کہ بزور شمشیر پانی لینے پر بات آپنی تھی۔ صرف یہ ہوسکتا ہے کہ تمام لشکر جو محافظ فرات تھا وہ دفعۃً تیار نہ ہو گیا ہو۔ عباسؑ اور ان کے سوار کیا کر رہے ہیں۔ رجز پڑھ رہے ہیں۔ اپنے سواروں کے ساتھ مستعد ہیں۔ کسی اجل رسیدہ نے حرکت کی اور اس پر ٹوٹ پڑے۔ عباسؑ کو بھی اتنی مہلت ملی کہ اب داہنے ہاتھ میں بجائے تلوار کے پانی ہوتا۔ کیا اب اس پانی کی وقعت بڑھ گئی تھی؟۔ کسی دریا کی عزت تھی کہ اس پر قبضہ کیا جاتا اور ایسے فاتح سیراب ہوتے۔ نہیں۔ صرف چلو میں لے لیا تھا۔ قبضہ دکھانا منظور ہو۔ اس کے بعد ہی فرماتے ہیں: "واللہ لاذقت الماء و سیدی الحسین عطشان"۔

واللہ نہ پیوں گا میرے سید حسینؑ پیاسے ہیں۔ دوسرے انداز میں میں پیوں اور حسینؑ پیاسے ہوں؟۔ ثم رمی الماء۔ بس پانی پھینک دیا۔ گھاٹ سے نکل آئے۔ اور مشک عباسؑ کے کاندھے پر تھی۔

احسنت اے بہادر پیاس! تجربے سے چلو۔ لیکن تمہاری متانت اور بلندی فخر طلب نہ تھی۔ دوڑو۔ دوڑو۔ کوئی پیاسا بچہ گر نہ جائے۔ جاؤ۔ ان کا بھولا تبسم تمہاری بہترین داد ہے۔ ان کی سیرابی تمہارا بہترین صلہ ہے۔ حسینؑ کی "منتظرانہ نگاہ" تمہاری نگاہ تمہاری خیر مقدم کی منتظر ہے۔ میں محمد آ حسینؑ کی "منتظرانہ نگاہ" کہہ رہا ہوں۔ یہی فرات تھی۔ حسینؑ تھے۔ شام کا لشکر تھا اور گھاٹ چھینا تھا۔ آج دیکھنا تھا کہ جو کچھ میں نے کیا تھا وہ عباسؑ نے کیا۔ دادا اس کی دیتی تھی کہ میرے ماتحت دس ہزار سوار تھے اور مزید کمک کی امید تھی۔ میں اور میرے سپاہی تمہارے اور تمہارے سپاہیوں کی طرح پیاسے نہ تھے۔

نویں تاریخ پھر عباسؑ کے متعلق ایک نہایت شاندار فرض متعلق ہو گیا تھا۔ جب عمر سعد کا لشکر حملہ کی نیت سے بڑھ رہا تھا۔ عباسؑ حضرتؑ کو نہیں جانے دیتے بلکہ خود جاتے ہیں۔ اور ہزاروں سپاہیوں کے موج خیز دریا کے سامنے بیس سواروں سے کھڑے ہو کر فرماتے ہیں: ٹھہرو، عجلت نہ کرو۔ ابو عبداللہ حسینؑ کو اس خبر کی اطلاع کرتا ہوں۔ کوئی شبہ نہیں کہ عباسؑ کی ذات تھی جس نے اس طوفان کی قوت میں سکون پیدا کر دیا۔ اور درمیانی وقت کا یہ مصرف نکالا کہ "خدا کو یاد دلاتے رہے"۔

اندوہناک واقعات میں غم کی زیادتی ہوتی جا رہی تھی۔ دیکھ رہے تھے کہ بے مثل رفقاء ایک ایک کر کے تمام ہو گئے۔ اور اب بجز بھائیوں کے کوئی نہیں ہے۔ عباسؑ کی نگاہ بھائیوں کی طرف اٹھتی ہے۔ جس میں اشتیاق، محبت اور حکم سب کچھ ہے۔ زبان یہ کہتی ہے کہ "بہادروں کی طرح ابن سعد کے لشکر کی طرف بڑھو اور لشکریوں کے چہرہ اور سینوں کو زخموں سے بھر دو"۔ اس لیے کہ "مخالفین خدا و رسولؐ ہمارے قتل پر تل گئے ہیں"۔ دیکھا کہ ایک ایک بھائی خون میں نہایا۔ عباسؑ اپنی شہادت کے لیے راستہ بنا رہے تھے۔ جانتے تھے کہ حسینؑ ہمیں جانے نہ دیں گے۔ جب تک کوئی تلوار اٹھانے والا رہے گا حسینؑ کے نشان فوج میں حرکت ہوئی۔ اس کے ساتھ حسینؑ کے دل میں حرکت ہوئی۔ عباسؑ کو آمادۂ شہادت دیکھ کر حسینؑ آمادہ ہونے لگے ہوں گے۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ حضرت علی اکبر حضرت عباسؑ کے قبل شہید ہوئے تو حضرت عباسؑ اور حضرت امام حسین علیہ السلام گویا ساتھ ساتھ معروف جہاد ہوئے۔ اور شہادت میں بہت کم وقفہ تھا۔ اس صورت میں بھی عباسؑ نے تعظیم پر جاں نثاری کو مقدم رکھا۔ حسینؑ کے "آگے آگے تھے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت عباسؑ کو اجازت جہاد مل ہی گئی تھی تو حضرتؑ نے مرجھائے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر مناسب سمجھا کہ ایک مشک بھی ساتھ رکھ لیں۔ حضرتؑ دوبارہ فرات پہنچے ہوں یا نہ پہنچے ہوں۔ یہ علیؑ ہی کے فرزند کی ہمت تھی کہ وہ تنہا گھاٹ پر قبضہ کا خیال کرتے۔ اور نہ رحم دانسانیت نے اس سے کوئی بہتر مثال دی ہے۔ اس کے بعد میں جو کچھ کہوں گا وہ طبعاً وہی ہو گا جو میں حضرت جعفر طیار کے متعلق کہہ چکا ہوں۔ جس وقت یہ شیر شکار کھیل رہا تھا۔ دشمن پس پشت سے وار کرنے کی فکر میں تھا۔ عباسؑ کس کا خیال کرتے۔ وار چل گیا اور عباسؑ کا فرض کش ہاتھ زمین پر تڑپنے لگا۔ ہو سکتا ہے کہ عباسؑ پر مایوسی کی ایک خفیف سی لہر آ گئی ہو، خصوصاً اس لیے کہ وہ ہاتھ کٹ گیا جس سے اس سب کی

باب شانزدہم

(اہلِ بیتؑ)

اس جگہ اہلِ بیتؑ کی سرخی سے میری مراد نہ صرف مخدرات عصمت و طہارت ہیں بلکہ وہ بیبیاں بھی ہیں جن کا واقعہ کربلا سے کوئی تعلق ہے۔

اہلِ بیتؑ کا تذکرہ ایک ایسا قصہ غم ہے جیسا سانحہ شاید ہی کسی شریف خاندان پر ہوا ہو۔ ایک مسلسل داستان اندوہ ہے جس میں کہیں خوشی کی جھلک نہیں ہے۔ اور نہ کسی قلم کے تہا شکاف میں یہ درد ہے کہ ان بہت سے دل فگاروں کے ماتم کا چربہ اتار سکے لیکن ان اندوہناک واقعات میں خصائل کی ایسی بلند شان دکھائی دی جاتی ہے جس سے غم سے متاثر دل بے ساختہ مدح کے لیے بیچ اٹھتا ہے۔ ان کی پہلی مصیبت اس سے کم نہیں ہے کہ اپنے افسرانِ خاندان کے قتل یا یزید کی بیعت پر آمادہ رہو۔ قتل اندوہناک تھا لیکن اس سے زیادہ افسوس ناک ہوگا اگر ہم اپنی بلندی سے ایسا کریں گے کہ یزید کی بیعت پر مجبور ہوں۔ ان دو مصیبتوں نے جلا وطنی کی درمیانی اور تیسری مصیبت گوارا کی۔ وطن اور اس کی یاد بھلا دی گئی۔ بے عذر صبر سے اس پر آمادہ ہو گئے کہ ہم نواسہ رسولؐ کے ساتھ چلیں۔ روانگی کے وقت کا یہ حال اس فقرہ میں ہے کہ "روانگی کے وقت اہلِ بیتِ رسالت سے زیادہ کوئی خوف اور ہراس میں نہ تھا"۔

اس طرح مکہ پہنچے لیکن مکہ میں بھی کسی کے چہرہ پر بشاشت نہ تھی۔ دن گزرتے جاتے تھے اور دنوں کے گزرنے کے ساتھ آنے والی مصیبتیں دور نہ ہوتی تھیں، بلکہ ہونے والی بات قریب ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ جگہ بھی ترک کی گئی جہاں سے قتل کا کام خارج کر دیا گیا تھا۔ ترک اس لیے کی گئی کہ اگرچہ اب بھی جا بجا کسی کے لیے یہاں قتل جائز نہ رکھا جاتے لیکن ہم کسی قاتل کا چھپا ہوا خنجر، تلواروں کی چمک اور نیزوں کا جانستان حلقہ دیکھ رہے ہیں۔ اندوہناک ہوگا وہ وقت جس وقت اہلِ بیتؑ اپنے کو مکہ معظمہ سے بھی علیحدہ ہوتے دیکھتے ہوں گے۔ وہ محسوس کرتے ہوں گے کہ ہم ایک پناہ سے نکل رہے ہیں۔ کیا کرتے جب مامن ہی مذبح یا قید خانہ بنا چاہتا تھا اور یہی بس نہ تھا۔

روانگی اور ساتھ ہی دیکھتے ہیں کہ سوار ہمارے تعاقب میں ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ امیر مکہ یزید کا عامل نہیں چاہتا کہ ہم جائیں۔ کیا اس لیے کہ وہ ہمیں اپنی پناہ میں رکھنا چاہتا ہے اور ہمارے چلے جانے سے ہماری سلامتی کا اسے خوف ہے۔ ایسی صورت میں نمائش قوت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ہم بزورِ شمشیر تم سے اظہارِ محبت کرتے ہیں۔ ہم دھمکا رہے ہیں اور تم اب بھی اسے محبت نہیں سمجھتے۔ گرم صدائیں، تلواروں اور نیزوں کا چمکتا طبقہ نسواں کا دل پسند شغل اور نظارہ نہیں ہے۔ عورتوں کی عموماً ذہنی اور جسمانی کمزوری، نرمی، لطف اور رعایت کی مستحق ہے۔ لیکن عورت احساسِ شجاعت اور داد دینے کی بہترین قابلیت رکھتی ہے۔ شجاع بنانے میں اسے فطرت نے حصہ دیا ہے۔ اب اس کے بعد دیکھو کہ امیر مکہ کے نیزوں اور تلواروں کا اپنے ہمراہیوں اور نامور اعزا کے کوڑوں سے منہ پھیرتے ہوئے دیکھ کر عرب کے بہترین شجاعوں کی یہ بہترین

یادگار طبیعت کی کس کیفیت میں ہوں گی۔
پھر روانگی، غیر مانوس راستوں سے۔ کونسی زحمت تھی جو نہ ہوگی اور کیسی متوحش خبریں ہو سکتی ہیں جو ان تک نہ پہنچی ہوں گی۔ لیکن یہ تو اپنے سردار کے ساتھ شریک راحت و رنج ہونے گئے تھے۔ شکایت کے لیے نہ گئے تھے۔ یہاں تک کہ وہم اور خوف سے گزر کر اب عملی غم کی پہلی کاری ضرب لگتی ہے۔ حضرت مسلمؑ کی شہادت کی خبر سنائی دیتی ہے۔ مکہ میں سواروں کا گھیرنا اگر محض اظہار اختیار ہی سمجھا جائے تو بھی ایک وجہ یہ تھی کہ اب تک متوحش خبروں کا درجہ بہت سخت نہ تھا جو ہر روز کے سفر سے بڑھتا جاتا تھا۔ اور یزید کے خیالات اس کے انتظامات سے معلوم ہوتے جاتے تھے۔ مسلمؑ کی شہادت ایسی خبر نہ تھی جو اب مستقبل کو پوشیدہ رکھ سکتی۔ لیکن اب بھی کہا جاسکتا تھا کہ شاید ہمارا موقع ان سے کچھ مختلف ہو۔ یہاں تک کہ سوار دکھائی دیے۔ حر کے ایک ہزار سوار، اور اس بڑے جسم نے ہیبت ناک جنگی طریقہ سے تعاقب کیا۔ اس وقت ویسے ہی جنگی اصول سے محفوظ مقام کا پس پشت لیا جانا اہل بیتؑ کو حقیقت حال بتا رہا تھا۔ کیا وہ سوچ رہے تھے کہ وہ وقت آگیا جس کا خوف تھا۔ بلاشبہ آگیا تھا۔ لیکن حسینؑ کے لیے نہیں۔ جن کے استقلال، زبان اور عقل نے پھر وقت ٹال دیا۔ یہاں تک کہ مقتل دکھائی دیا۔ فرات اور اس کی نرم لہریں صعوبات سفر کے بعد بھلی معلوم ہوں گی۔ بچے لب ساحل کھیلنے کے لیے تڑپ گئے ہوں گے۔ کون جانتا تھا کہ فرات کا یہ منظم خیز چہرہ اہل بیتؑ کو خون رلانے کا۔ اسی وقت حر کو حکم تھا کہ وہ اس آوارہ وطن قافلہ کو لب ساحل نہ اترنے دے۔ بستی سے دور رکھے۔ اس لیے نہ سامان آسائش ملیں اور نہ کوئی مدد مل سکے۔ دشمنوں نے حضرتؑ کو اس جگہ گھیرنے میں بھی مصلحت ملحوظ رکھی تھی کہ اگر آبادی کے قریب نواسۂ رسولؐ نے قیام کیا تو بہت ممکن ہے کہ لوگ ان کے استغاثہ مدد پر تیار ہو جائیں اور امیدیں بر آنا محال ہو جائے۔ بنی ہاشم کے پھول ریگستان اور جنگل میں جمع کیے گئے اس لیے کہ ان کی پامالی دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔
یہ موقع ہے کہ حضرت زینبؑ علیا مقام بھائی کی صدا سنتی ہیں اور صورت اقدس دیکھتی ہیں۔ اشعار تھے جو موجودہ موقع سے متعلق تھے۔ زمانہ کی کج روی کی واقعہ خوانی تھی۔ کوئی مخاطب نہ تھا۔ یہ نفس عظیم خود سوچ رہا تھا۔ کوئی ہوتا تو شاید حسینؑ قطعاً خاموش ہوتے۔ دیکھا بہن آرہی ہے۔ اور حضرت زینبؑ بغیر رکے ہوئے فرماتی ہیں کہ اے خلیفۃ الماضین اور حمایۃ الباقین یہ باتیں ایسی ہیں جیسے موت کا وقت قریب آگیا ہے۔ یا کیا آپ نے اپنے نفس کے فدیہ کرنے کا قصد کر لیا ہے؟ پیار کے الفاظ تھے، محبت کا لہجہ تھا۔ لیکن احترام سے اعراض نہ تھا۔ اور محبت و احترام کے ساتھ اس خوبصورت فقرہ اور الفاظ میں گزشتہ اور موجودہ تاریخ کا خلاصہ تھا۔ اشعار سن کر حضرت زینبؑ میں ہیجان ہونا اور تمام آنے والے واقعات کو سمجھ لینا ان کی ذکاوت کی مثال ہے۔ ہر طرف کی یاس انگیز صورتوں اور دشمنوں کی عداوت کی خبروں میں، بہن کے محبت آمیز الفاظ اور لہجہ نے اثر کیا۔ حسینؑ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ ساتھ ہی حضرتؑ نے اہل بیتؑ کو بے صبری نہ کرنے کے متعلق جو ہدایتیں فرمائیں اس پر عمل کرنا انھیں خواتین کا کام تھا۔ بلکہ صبر کے ساتھ انھوں نے اس ہوش، خودداری اور جرأت سے کام لیا جس نے ان کی حقیقت اور عظمت لوگوں پر منکشف کر دی اور وجہ حسینؑ کو مدد دی۔ مثالوں پر توجہ دلانے کا وقت آگے آئے گا۔ اس درمیان میں دیلم، طوعہ اور ابن عفیف کی چھوٹی سی لڑکی کے متعلق ایک ایک لفظ کہہ لوں۔
یہ تصفیہ نہیں کیا جاسکتا کہ اگر دیلم نے زہیر بن قین سے نہ کہا ہوتا کہ "سبحان اللہ فرزند رسولؐ تمھیں طلب

فرما رہا ہے اور تم تساہلی کر رہے ہو"۔ تو زہیر کیا تصفیہ کرتے لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ زہیر کے آئندہ کارنامے دیلم کے اس سوال سے متاثر تھے۔ غیرت دلائی تھی۔ اظہارِ حیرت کیا تھا۔ اعتقاد کی قوت ظاہر کی تھی۔ کہا جاسکتا ہے کہ دیلم کو نتائج کا علم نہ تھا۔ اگر ایسا ہی ہو تو کہیں اس کا ثبوت نہیں ہے کہ دیلم نے زہیر کے تصفیہ شراکت کے بعد ان سے ایک لفظ بھی کہا ہو جو انھیں روکنا کہا جائے۔ نہیں بلکہ کمال صبر سے اس پر راضی ہو گئیں کہ وہ ایک زمانہ کے رفیق سے ترک تعلق کریں۔ بڑی قربانی تھی۔ یہ اور اس کے علاوہ مثالیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ جس وقت مرد مختلف حیثیت کے سیاسی اثرات سے متاثر تھے عورتیں خاندانِ رسالت کی دوستی میں عموماً راسخ تھیں۔ اس کی مثالیں آگے بھی آئیں گی۔ میں خصوصیت سے دکھاؤں یا نہ دکھاؤں۔

طوعہ نے خاندانِ رسالتؐ کے ساتھ جس بے غرض محبت کا اظہار کیا وہ بے حد اثر خیز ہے۔ ابن عفیف کی چھوٹی سی لڑکی کی جرأت اس سے ظاہر ہے کہ وہ مسلح دشمنوں کی یورش اور آلاتِ حرب کی مہیب چمک اور صدا سے متاثر نہیں ہوئی بلکہ کمال ہوشیاری اور بے خوفی سے دشمنوں کا موقع اس صحت سے بتا رہی تھی کہ بوڑھے نابینا مجاہد نے بہت سے دشمن اشاروں پر قتل کیے۔ مبارک ہے وہ کم عمر صاحبزادی جس سے ایسے صفات ظاہر ہوئے ہوں اور اس نے خدا و رسولؐ کے دشمنوں کے کم کرنے میں ایسی مفید مدد دی ہو۔

میں قاتل بریر اور خولی بن یزید اصبحی کی بیبیوں کا معترف ہوں کہ انھوں نے اپنے ملعون شوہروں کو ان کے گناہوں پر ملامت کی اور ایسے گناہگاروں کی ترک رفاقت کا عہد کیا اور میں اسی طرح ہندہ کا مداح ہوں کہ اس نے یزید کی بداعمالیوں کو نہایت قوت سے ظاہر کرنے کی جرأت کی جب وہ شہادتِ حسینؑ سے متاثر ہو کر دربار میں نکل آئی اور یزید کو ملامت کی۔

کربلا کا قیام کسی طرح امن کا نہ تھا بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہاں کی سکونت کسی وقت سکون کی حالت نہ تھی۔ فوجیں پے در پے آ رہی تھیں، جن کی غرض مخفی نہ تھی۔ میں نہیں جانتا کہ دورانِ قیامِ کربلا میں جس قدر لوگ حضرتؑ کے پاس آئے ان کی تعداد کس قدر تھی لیکن مثال تھی۔ مثلاً حُرؒ اور چند اور شاید اس سے اہلِ بیتؑ کو کچھ تسکین ہوئی ہو۔ لیکن مدد کا درجہ جو کمی عدد پر مبنی تھا امید خیز نہ ہو سکتا تھا۔ یہاں تک کہ اب دشمن نے اپنی فوجی زیادتی پر قناعت نہ کی بلکہ اس ملعون فوجی اصول پر بھی کاربند ہونے کا ارادہ کیا کہ اس چھوٹے سے گروہ تک پانی نہ پہنچ سکے۔ بات بھی جاسکتی ہے کہ ان بیبیوں کو جو بچوں کے داشت کی ذمہ دار تھیں معصوموں کی پانی کے لیے ضد اور بے قراری سے کیسی روح فرسا تکلیف ہوئی ہوگی۔ بچے جنھیں یہ سمجھایا نہیں جاسکتا کہ کوئی چیز کیوں نہیں مل سکتی۔ مکروہ دنیا۔ چیزوں۔ خدا کی چیزوں پر اتفاقی قبضہ سے فخر کرتی ہے۔ اور دوسرے انسان کو ستانے مغلوب کرنے یا ذلیل کرنے کے کام میں لاتی ہے۔ اور دوسروں کی ضرورت پر اس کا کیسا ہی درجہ کیوں نہ ہو بے جنبش ظلم سے دیکھتی رہتی ہے۔ یہ تھا۔ چیزوں۔ قبضہ اور معاملت کا مکروہ اصول جن کے خلاف ہمارے ہادیوں نے اپنے عمل سے کامل مثالیں دیں۔ انھوں نے خلق اللہ کی ضرورت کے مقابلہ میں کسی چیز پر قبضہ کو مکروہ سمجھا اور یہ سمجھا کہ ہم عارضی طور پر کسی چیز پر قابض تھے کہ ضرورت کے وقت کسی انسان کے حوالہ کر دیں۔ یہ مثالیں دنیا کے ہادیوں میں نہ ملیں گی۔ کیونکہ ان میں کے اکثر دوسروں کی کمائی پر بسر کرتے تھے۔ ایسے سوچ کہ اہلِ بیتؑ کے بچے

تو در کنار بوڑھے بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ کوئی انسان ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پانی کی ایسی چیز میں انسان کے حق بشری سے اعراض کرے۔ یا پانی ہی کو ظلم کا ذریعہ قرار دے۔

مثال پیشتر گزر چکی ہے کہ معاویہ نے آج کے پہلے بھی اس ظلم کو جائز رکھا تھا اور جناب امیرؑ نے اسے اس پر ملامت کی تھی۔ اور فرمایا تھا کہ: "لشکر کے ساتھ بوڑھے بچے اور ضعیف بھی ساتھ ہیں پانی کے متعلق کوئی روک نہ ہونی چاہیے"۔ لیکن سنتا کون تھا جب تک تلوار نہ چلائی۔ امیر المومنینؑ نے قبضہ کیا اور باوجود اس کے کہ انتقام میں عام لوگوں کے نزدیک پانی روکنے کا حق پیدا ہو گیا تھا لیکن امیر المومنینؑ نے تو اس لیے قبضہ کیا تھا کہ مخلوقات کو ان کا حق دلائیں نہ اس لیے کہ حکومت کا قبضہ کریں۔ اور خود سے منادی کرائی کہ: "پانی حلال ہے ہر شخص لے سکتا ہے"۔

اور اگرچہ حضرت عباسؑ اپنی بے مثال شجاعت سے پانی لائے مگر وہ کب تک کے لیے کافی ہو سکتا تھا اگرچہ یہ تسلیم کیا جائے کہ صرف پیادے مشکیں لے گئے تھے تو تیس مشکیں تھیں اور اگر یہ بھی قیاس کیا جائے کہ سواروں نے بھی پانی کے لیے مشکیں رکھی تھیں تو پچاس تھیں۔ حالانکہ اتنے سے قافلہ کے پاس اتنی مشکیں ہونا کسی قدر غیر معمولی ہو گا اور پھر اتنی مشکوں کے رکھنے میں قوت آئے گی۔ جب عرب کے سفر اور نایابی آب کا خیال کیا جائے جس میں ہر شخص کے پاس ایک مشک رہنا ضروری ہے۔ بہر حال زیادہ سے زیادہ پچاس مشکیں بھری گئیں۔ اب سوچو کہ سو کے قریب مرد تھے۔ ان کے علاوہ عورتیں تھیں، جن کی تعداد معلوم نہیں۔ بچے تھے۔ بار برداری کے جانور تھے۔ غالباً کم سے کم بیس اونٹ، اور پچاس گھوڑے۔ یہ پچاس مشکیں اگر بے انتہا کفایت سے صرف کی گئی ہوں تو اتنے جانداروں میں ایک وقت کے لیے مشکل سے کام آسکتی ہیں۔ اس میں اگر یہ خیال کیا جائے کہ عباسؑ کے سواروں نے اپنے گھوڑوں کو پانی پلا لیے دیا تھا تو وقتی ضرورت کچھ کم ہو جاتی ہے اور اگر یہ بھی خیال کیا جائے کہ کچھ پانی بچوں کی ضرورت کے لیے روک رکھا گیا تھا تاہم اس کے آثار ہیں کہ نویں کے آخری حصہ میں پانی نہ تھا اور دسویں کو تو یقیناً نہ تھا۔

میں اجتہاد نہیں کر سکتا کہ یہ واقعہ بحیثیت روایت کے کہاں تک صحیح ہے کہ حسینؑ کی لاڈلی بیٹی پیاس سے بے چین ہو کر حضرت زینبؑ کے پاس جاتی ہے کہ پانی مانگے لیکن وہاں دیکھتی ہے کہ دودھ پیتا بچہ مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہے اور پھوپھی نایابی آب کی شکایت کر رہی ہیں۔ اور یہ حالت دیکھ کر حضرت سکینہؑ اپنی پیاس کی شکایت بھول جاتی ہیں۔ لیکن یہ کہہ سکتا ہوں کہ بحیثیت واقعہ کے یہ واقعہ ہے۔ یہ حالتیں تھیں۔ یاس اور تاریکی ہر طرف دکھائی دے رہی تھی کہ دفعتہ حضرت زینبؑ ہوں یا ام کلثومؑ شور سنتی ہیں۔ شور جو فوجوں کے بڑھنے کا ایسا ہے سموں کا کڑا کا ہتھیاروں کی جھنکار۔ پیادوں سے دھلتی ہوئی زمین، فوجی احکام کی سخت صدائیں۔ یہ منظر حضرتؑ سے دور نہ تھیں۔ بلکہ حضرتؑ قریب ہی خیمہ آرام میں تھے۔ قیاس آسان ہے کہ باوجود انتہائے احتیاط کے بھی ہوشیار کرنے کی ضرورت کہتی ہے کہ اضطراب تھا اس وقت سے زیادہ منظر کرنے والی تخییل ممکن نہ تھی۔ تمام خوف [illegible] وقت سامنے موجود ہو گئے تھے جن کا خلاصہ بھائی کی شہادت اور اپنی تباہی تھی۔

پھر وقت ٹل گیا۔ اس امید کے ساتھ نہیں کہ کل بھی شاید ٹل جائے۔ نہیں۔ بلکہ یقین کے ساتھ کہ کل تصفیہ ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بیبیاں جن کے شوہر کربلا میں موجود ہیں۔ اپنا رنڈاپا اور اپنے شوہروں کو اپنی آنکھوں کے سامنے

حمایت کر رہے تھے۔ جیسی وجہ کے لیے کبھی کوئی انسان لڑا ہو۔ لیکن عباسؑ کا جوش انھیں بایاں ہاتھ دکھا دیتا ہے۔ اور اب دشمن کش بجلی اس ہاتھ میں چمکتی ہے۔ ساتھ ہی ہاتھ کٹنے کا مرثیہ نہیں ہے بلکہ کہہ یہ رہے ہیں کہ: "اگرچہ میرا داہنا ہاتھ کٹ گیا پھر بھی میں دین کی حمایت کے لیے جہاد کروں گا"۔ پھر لڑنے لگے اور اب دشمن کے لیے پیشتر سے آسان تھا کہ دوسرے ہاتھ پر بھی وار کرتا۔ ضرب چل گئی۔ اور دوسرا ہاتھ بھی کٹ گیا اور ساتھ ہی عباسؑ کا نا مغلوب نفس کہنے لگا: "اے نفس کفار سے نہ ڈر تجھے غفار کی رحمت کی بشارت ہو"۔ کبھی اس وقت سے زیادہ عباسؑ اپنے باپ کے بیٹے ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ باپ اگر قاتل ضرب کھا کر "فزت برب الکعبۃ" فرما سکتا تھا تو عباسؑ کے فقرہ سے لقائے الٰہی اور رحمت ایزدی کے اسے اطمینان، محبت اور رضا کا نغمہ پیدا تھا۔ دونوں قوی بازوؤں سے خون کی چادر بھری۔ لیکن عباسؑ کا چہرہ ویسا ہی غیر متحرک اور شاندار تبسم کا مرکز ہے۔ نگاہیں ہیں جو دشمن کو اب بھی ویسی ہی حقارت سے دیکھ رہی ہیں۔ کہا یہ گیا ہے کہ مشک کو اب تک کاندھے پر محفوظ رکھا تھا۔ اور اب بھی عباسؑ موزے کی نوک سے دشمنوں کو دور کر رہے تھے اور خیمہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ غالباً مشک کہہ رہی تھی کہ ہمیں خیمہ تک پہنچا کر سونا۔ اس وقت کی کوشش کی داد کون تھا جو دیتا بجز سید الصابرینؑ کے۔ لیکن اس وقت بھی میرا یہی کہنے کو جی چاہتا ہے کہ کاش حضرت ام البنین دیکھتیں۔ دیکھتیں اور احسنت کہتیں۔ فرماتیں کہ شاباش اے فرزند تو نے علیؑ کے حوصلہ کو اس وقت پورا کیا۔ علیؑ کے لفظ چاہیے تھے جو اس وقت عباسؑ کے جہاد کی مصوری اور مدح کرتے۔ عباسؑ نے اسلام کے علم داری کی شان قائم رکھی۔ اس کی جلالت خیز روایات کو قائم رکھا۔ حضرت جعفر طیار کو حق تھا کہ اپنے اس بھوکے پیاسے بھتیجے کو دیکھتے۔ اس کے ہوش، حواس، صبر، استقلال اور حمایت دین کے جوش پر وجد کرتے۔ نہیں۔ ان کٹے ہوئے ہاتھوں کو چوم لیتے جو زمین پر گرے۔ تڑپے اور سرد ہوئے تھے۔ نہیں۔ حضرت جعفر طیار حوصلہ کرتے کہ شجاعان عالم میری طرح عباسؑ کی رکاب چوم لیتے اور اس نوک موزہ کی مدح میں سپاہیانہ سادگی سے شعر کہتے۔

قیاس آسان ہے کہ شیر کو مجبور دیکھ کر دشمن کی نامردانہ شجاعت میں کس قدر زیادتی ہوتی ہوگی۔ مجھے یہ روایت ماتم کدہ سے ملتی ہے کہ عباسؑ کا بہت سا گوشت دشمنوں کی نوک نیزہ پر آ گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خیال یا شاعری ہو۔ لیکن یہ اندوہناک شاعری واقعہ سے دور نہیں ہے۔ خصوصاً اس شخص کے لیے جسے ذاتی یا تاریخی تجربہ ہے کہ ایک نامرد انسان یا قومیں اپنے موقع پر کیا کچھ کرتی ہیں۔ جو کچھ بھی ہو دشمن کا مکروہ مشغلہ جس شدت سے بھی جاری رہتا۔ ستون شجاعت اس طرح بے جنبش ہے۔ اور اگر اسے کسی سمت حرکت ہے تو حسینؑ کے خیمہ کی طرف۔ ذرا خیال کرو کہ بے شمار حربوں نے عباسؑ کے خوبصورت جسم کی کیا حالت کی ہوگی۔ عباسؑ ایک لختۂ خون تھے۔ زرہ کی کڑیاں ساہی کی جلد بن گئی تھیں۔ لیکن اب بھی فکر یہ تھی کہ خیمہ تک پہنچ جائیں۔ کوئی منظر اس سے بڑھ کر شجاعت خیز اور اندوہناک تلاش نہیں کیا جا سکتا خصوصاً جب کہ عباسؑ کی اس کوشش کے پیچھے ایک مایوسانہ غرض تھی۔ پیاسوں کی سیرابی۔

اس طرح کچھ دیر عالم کا یہ عبرت خیز تماشہ قائم رہا۔ عباسؑ اپنا خون آلود جنازہ لیے جا رہے تھے کہ مشک تیروں سے چھد گئی۔ سر پر گرز پڑا۔ اور عباسؑ کے مقدس خون کے ساتھ یہ پانی بہہ گیا۔ جس کی قیمت کا اندازہ ممکن نہیں ہے۔ اس وقت عباسؑ نے بھائی کو آخری سلام کیا: "یا ابا عبداللہ علیک منی السلام" فرمایا۔ راہِ خدا میں حق جہاد ادا کر چکے تھے۔

اب ساحل فرات کو ابدالآباد تک کے لیے اپنی آرام گاہ قرار دیا۔ سو گئے عباسؑ۔
کیا خوب کہا ہے شاعر نے جس کی آمد، سادگی اور یکجہتی واقعہ خوانی نے اس کے اشعار کو بے مثل قرار دیدیا ہے کہ:

احق الناس ان یبکی علیہ فتی ابکی الحسینؑ بکربلاء
اخوہ و ابن والدہ علیؑ ابو الفضل المضرج بالدماء
و من واساہ لا یثنیہ شئ و جادلہ علی عطش بماء

یعنی۔ کون اس جوان سے رونے جانے کا زیادہ مستحق ہے جس پر حسینؑ کربلا میں روئے۔ وہ جوان حسینؑ کا بھائی اور ان کے پدر گرامی علیؑ بن ابی طالبؑ علیہ السّلام کا فرزند تھا۔ کون فرزند؟ ابوالفضل۔ جو خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ اس جوان نے جیسی غم خواری کی اس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ اور وہ پیاس میں پانی کے لیے خوب لڑا۔

علیؑ اکبر

بعض کا خیال ہے کہ علیؑ اکبر حقیقۃً حضرت امام زین العابدینؑ تھے۔ اور وہ حضرت امام حسین علیہ السّلام کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ حضرت علیؑ اکبر حقیقۃً علیؑ الاوسط تھے اور سب سے چھوٹے حضرت علیؑ الاصغر تھے۔ حضرت علیؑ اکبر کی ابھی عمر ہی کیا تھی کہ ان کی بڑی تاریخ ہوتی۔ لیکن ان کا ایک فقرہ جو ہمارے لیے محفوظ ہے وہ ایک مشعل ہے جو تاریکی میں راستہ دکھا رہی ہے اور اسی میں علیؑ اکبر کی ہر حیثیت کی تاریخ ہے۔ منزلیں گزری ہیں۔ صعوبات سفر ہیں۔ وطن کی راحتوں کے بعد ہر قدم پر متوحش اور اندوہناک خبریں اور سامان ہیں۔ ثعلبیہ میں پہنچے ہیں۔ باپ کو نیند آگئی ہے۔ علیؑ اکبر قریب ہیں۔ عجب نہیں ہے کہ عالم خواب میں باپ کے چہرہ کا مطالعہ کر رہے ہوں کہ حضرتؑ بیدار ہوتے ہیں۔ علیؑ اکبر نے ہنستے ہوئے مطیعانہ چہرہ سے باپ کی طرف دیکھا ہوگا۔ گویا پوچھتے ہیں کہ کوئی حکم ہے۔ دیکھتے یہ ہیں کہ باپ کے بشرہ میں بے چینی ہے۔ اثر اور قلبی حرکت سے مخاطب ہو کر وجہ پوچھتے ہیں۔ حضرتؑ وجہ بتا دیتے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ حضرتؑ کو علیؑ اکبر پر اس قدر اعتبار تھا کہ وہ انھیں کیسی ہی خبر اور حالت کے قابل قوی سمجھتے۔ خبر اس کے علاوہ کیا تھی کہ کوئی کہہ رہا تھا کہ: "تم عراق کی طرف جانے کی جلدی کر رہے ہو اور موت تمہارے تعاقب میں جلدی کر رہی ہے"۔ اب نفس کی تیاری، تربیت، تعلیم، توریث، فضاء مصائب پر مسرورانہ غلبہ کا اظہار ہوتا ہے۔ علیؑ اکبر بجائے جواب یا تسکین دینے کے چھوٹتے ایک سوال کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ "بابا کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟"۔ کبھی کوئی کند سوال اس سے زیادہ اپنا شارح نہیں تھا اور نہ ایسا معنی خیز تھا جس کے جلو میں اپنا اعتبار، اپنی روش کی پسندیدگی اور کیسے ہی مستقبل کے لیے تسلیم و رضا کا خوشی سے خیر مقدم ہے۔ حسینؑ میں اس اِستفہام سے ایک لطیف حرکت علیؑ اکبر کے چہرہ پر نظر، اور اقرار اب علیؑ اکبر سامنے آتے ہیں۔ یہی علیؑ اکبر ہیں جو کہہ رہے ہیں کہ: "پھر کوئی پرواہ نہیں ہے کہ ہم موت کی طرف جائیں یا موت ہماری طرف آئے"۔

لکنت نہیں ہے، جنبش نہیں ہے، پس و پیش نہیں ہے۔ ایک تیر ہے جو اپنی آماج کی طرف جا رہا ہے۔ لیکن خیال

رہے کہ یہ علیؑ اکبر کا سا بیٹا ہے جو باپ سے اپنی آمادۂ مرگ اور مہیائے قضا ہونے کی خوشی ظاہر کر رہا ہے۔ غم انگیز فطری شاعری، طرزِ کلام جس نے مرکز بدل دیا۔ حسینؑ کا ذاتی اثرِ غم نہ رہا۔ علیؑ اکبر نے اسے اپنا کر لیا۔ اس سے بڑھ کر حسینؑ کو کسی اور طرح تسکین نہ دی جا سکتی تھی اور نہ حسینؑ اپنی اس داد سے زیادہ کسی لفظ میں نہ کسی اور طرح دے سکتے تھے کہ:

"اے فرزند تو نے دل خوش کر دیا"۔

میں سوچتا ہوں کہ یہ بہت ممکن ہے کہ بنی ہاشم میں حضرت علیؑ اکبر پہلے شہید ہوں، مرنا ہی تھا۔ پہلے یا پیچھے کیا۔ علیؑ اکبر کا پیشتر جانا نہ صرف اس کا مظہر ہوتا کہ وہ اصحاب کے پیچھے نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی شہادت کو اور آسان کر دیتا۔ اطمینان دلا دیتا۔ حسینؑ کے گھر کا چراغ بجھ رہا ہے۔ لیکن سچ کہا ہے شاعر نے کہ: ؎

آگر بر شہادت کمر بستہ چست   خوشم زانکہ قربانیٔ راہِ تست

اور اجازت بھی عجب طرح ملی ہے۔ حسینؑ نے علیؑ اکبر کی طرف دیکھا ہے اور آنکھیں نیچی کر لیں۔ اجازت مل گئی۔ دیکھا کہ علیؑ اکبر بپھرے ہوئے ہیں۔ ولولہ ہے۔ شوقِ شہادت ہے۔ رکیں گے نہیں۔ آنکھ نیچی کر لی۔ جاؤ۔ کیا قدرت نے علیؑ اکبر کو اس لیے شبیہ پیغمبرؐ بنایا تھا کہ میدانِ جنگ میں ایک ہیجان پیدا کر دے۔

عمر بن سعد نے تو رسالت مآبؐ کو دیکھا تھا۔ کتنے ہوں گے جنھوں نے دیکھا ہوگا۔ پھر وہ کیا سوچ رہے ہوں گے کہ جناب رسالت مآبؐ اپنے فرزند حسینؑ کی سفارش کرنے آئے ہیں۔ اس کی بے گناہی کی وکالت کر رہے ہیں اور اس کے لیے شمشیر بکف ہیں۔

آثار ہیں کہ لشکر میں علیؑ اکبر سے جنگ کرنے کے متعلق بد دلی پیدا ہو گئی تھی بلکہ انھیں اپنی طرف کر لینے کی کوشش کی تھی۔ اور اس کے بھی آثار ہیں کہ ابن سعد سپاہیوں پر وہی جادو چلاتا ہے جو ابن زیاد نے اس پر کیا تھا۔

اب مجھے اور کیا کہنا ہے بجز اس کے کہ علیؑ اکبر اس طرح دشمنوں کی طرف دوڑ رہے تھے کہ گویا اس موت کے مشتاق تھے جو دشمنوں کے حربوں میں تھی۔ خبریں ہیں کہ علی کا پوتا مشہور اور یادگار جنگ کے بعد ایک مرتبہ باپ کے پاس میدانِ جنگ سے واپس آیا۔ ہو سکتا ہے کہ بے چینیٔ شباب اور اس کی امنگوں نے کہا ہو کہ اس کارنامے کے بعد باپ کی نگاہ حاصل کرو۔ مگر سوال آب تھا۔ اس لیے کہ جنگ کی قوت آ جائے، بشارت شہادت اور پلٹ پڑے شیر گونج رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ: "فرزند زنا کار حضرتؑ پر ظلم نہیں کر سکتا"۔ دشمن کے انبوہ میں کمین سے سر پر گرز لگا۔ نیزہ کی انی سینہ توڑ گئی۔ ہاتھ رکا تھا کہ بے شمار حربے چل گئے۔ حسینؑ کو معلوم ہوا کہ علیؑ اکبر لڑ چکے۔ بس۔ حضرتؑ کسی طرح لاش لائے۔ چہرہ اور دانتوں سے خون پونچھ رہے ہیں۔

علیؑ اصغر

اب میں حسینؑ کے آخری سپاہی کی شہادت بیان کرنے کے لیے اپنے کو تیار کر رہا ہوں۔ لیکن تیار نہیں ہوتا۔ اپنے کو کھینچتا ہوں لیکن منقلب ہو رہا ہوں۔ ایک مجاہد جو حیرت خیز سواری پر گیا۔ اور عبرت خیز حربے سے لڑا۔ گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتا۔ پاؤں پاؤں نہیں چل سکتا۔ گھٹنیوں نہیں چل سکتا۔ سواری باپ کا ہاتھ یا آغوش ہے۔ اور حربہ وہ سوکھی زبان

ہے جو ورق گل سے باہر نکل آتی ہے۔ زبان جس پر بہت دیر سے پانی یا دودھ کی نمی نہیں پہنچی ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ اس کے بجائے کہنے کے بجائے اس کے کہ میں ایک معصوم بچے کی صورت دکھاؤں، حسینؑ کے کپڑوں کی سرخی دکھاتا ہوں۔ "ودمہ یجری علی صدر الحسینؑ"۔ (اور اس کا خون حسینؑ کے سینہ پر جاری تھا) تم نے حضرت ہاجرہؑ کی جلاوطنی میں سنا ہوگا کہ جب ان کے مشک کا پانی تمام ہوگیا اور اسمٰعیلؑ پیاس سے بے تاب ہوئے تو حضرت ہاجرہؑ اسمٰعیلؑ کو ایک درخت کے سایہ میں بٹھا کر خود ایک تیر کے پرتاب پر بیٹھ گئیں۔ اس لیے کہ اپنے بچے کا پیاس سے مرنا نہ دیکھیں ذرا سوچو ان بیبیوں کا کیا حال ہوا جب اپنے بولتے ہوئے کھلونے کو خاموش اور خون آلود دیکھ رہی ہیں۔ دنیا کے مشہور مرثیوں میں بیت المقدس کی تباہی کے متعلق حضرت یرمیاہ کا نوحہ نہایت مشہور ہے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی نوحہ اس درد انگیز نوحہ سے نہیں بڑھ سکتا جو حضرت علی اصغرؑ کی لاش دیکھ کر کہا گیا تھا: ؎

یا لہف قلبی علی الصغیر الظامی فطمتہ السہام قبل الفطام

غرغرہ بدمہ و ہو طفل لہف قلبی علیہ فی کل عام

(اس پیاسے بچے کے لیے میرا قلب اندوہناک ہے جس کا دودھ تیرے دودھ چھوٹنے کے زمانہ کے قبل چھڑا دیا۔ ابھی تو وہ بچہ تھا لیکن اسے خون کی کلی کرادی۔ میرا قلب ہمیشہ اس پر متاسف رہے گا۔)

ختم ہو گیا ان چند افراد عالم کا ذکر جن کے حیرت خیز کارنامے، جان ہیں ان تمام خوبیوں کی جو کسی نام سے جماعت انسانی میں پکاری گئی ہوں۔ یہ وہ تھے جن کے متعلق علامہ ابن ابی الحدید ایک چشم دید گواہ کی روایت بیان کرتے ہیں کہ: "ہم نے ان لوگوں سے معاملہ کیا ہے جن کے ہاتھ حملہ کرنے والے شیر کی طرح قبضوں پر تھے۔ وہ داہنے بائیں بہادروں کو کچل ڈالتے تھے اور اپنے کو موت کے اوپر گرا دیتے تھے۔ وہ نہ امان قبول کرتے تھے اور نہ انھیں مال کی طرف رغبت تھی۔ کوئی چیز ان کے اور موت کے درمیان یا ملک پر غالب آنے میں حائل نہ تھی۔ اگر ہم نے کچھ بھی تامل کیا ہوتا تو یقیناً تمام لشکر کا لشکر ختم ہو جاتا"۔ (صواعق محرقہ)

یہ لوگ حضرتؑ کے پیشرو تھے۔ ان کی شہادت سے ایک بڑے خطہ زمین کے مثالی خصائل کا بیج ضائع کردیا گیا جن سے ہر طرح کی خوبیوں کا نشو و نما ہوتا رہتا۔ لیکن یہ سر فروشان راہ خدا جب یہ سمجھ گئے کہ ہماری فنا ہی میں دین کی حیات ہے تو انھوں نے موت سے زیادہ کسی شے کو دل پسند نہ سمجھا۔ سچ کہا ہے شاعر نے کہ کوئی خطہ زمین اور باغ نہیں ہے جسے تمہاری قبر بننے کی آرزو نہ ہو۔ ان قبروں پر سلام جو حسینؑ کی قبر کو گھیرے ہیں۔ کربلا کے سونے والوں کو سلام۔ جب تک نسیم سحر کی ہلکی سے ہلکی موج دنیا میں چلے۔

اور پھر فرماتی ہیں: قسم ہے خدا کی تیرے بزرگوں سے اس کا عہد لیا گیا تھا"۔ یہ تھیں حضرت زینبؑ۔ جو ایک زمانہ کا نبیانہ اور ولیانہ عمل نفس اور عزم قربانی یاد دلا رہی تھیں۔ اور امکان کے ہو چکنے کے بعد صابر تھیں کہ ہم عہد پورا کر سکے۔ بڑا عہد اور بڑے عہد کرنے والے!۔

میں اس موقع پر آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک ملا محتشم کے اس موقع کے یادگار بند کی داد نہ دے لوں۔ ع

ناگاہ چشم دخترِ زہراءؑ دراں زماں

ان کے بے مثل اشعار غیر فانی ہو گئے اور عام مقبولیت اس کی مدح ہے۔ اس سے یخ تر مصوری، اس سے مناسب تر الفاظ، اس سے لطیف تر لحن اور آمد محال ہے۔ اس لیے کہ اتفاقات نے ان کے اشعار میں واقعات کی روح کو اس طرح نافذ کر دیا ہے کہ اب اس کے بعد کسی کی تعریف یہ ہوگی کہ اس نے اچھی یا بری نقل کی ہے۔

اب دیکھو کہ یہ لٹا ہوا قافلہ امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام کی دار السلطنت میں ہے۔ جہاں حضرت زینبؑ اور اُمّ کلثومؑ شاہزادیاں تھیں۔ اور کوفہ کا دار الامارت اس کا متمنی رہتا تھا کہ ان کی خاک کفش سے میری عزت ہو۔ وہی جگہ جہاں سے زیاد کی تقرری منظور کی گئی تھی اور اس پر عنایات ہوئی تھیں۔ ممکن ہے کہ بیس برس میں ایک نئی نسل پیدا ہو گئی ہو لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ ایسے نہ ہوں جنھیں یہ باتیں یاد نہ ہوں۔ اور اگر بھول بھی گئے ہوں تو کیا حضرت مسلمؑ ابن عقیل نے ہزاروں کو یہ یاد نہیں دلا دیا تھا کہ فرزند امیر المومنینؑ اس حالت میں ہے کہ تمھاری مدد اسے آج کے دن سے بچا لیتی۔

کوفہ کا ایسا مقام جو اس کے بعد بھی برابر ایک صوبہ کا دار السلطنت رہا، آبادی کے لحاظ سے ممتاز تھا، اور اب اسی میں یہ منظر دکھائی دے رہا ہے کہ ہزارہا ہزار آدمی ان راستوں پر کھڑے ہیں جدھر سے دختران رسولؐ کا لٹا ہوا قافلہ گزرنے والا ہے۔ کھڑکیاں، چھتیں، بالا خانے بھرے ہیں۔ دس ہزار سوار اس لیے مستعد ہیں کہ اہل بیتؑ کے لیے ذرا سی کوئی جنبش دکھائی دے اور تلوار اپنا کام کرنے لگے۔ اہل بیتؑ اس ذلت سے کوفہ میں نہیں گزر رہے تھے۔ دین، قومیت، حمیت، غیرت، اور شرافت کی توہین ہو رہی تھی۔ اور مسلمان دیکھ رہے تھے۔ اس سے سمجھ میں آئے گا کہ لوگ کس حالت پر پہنچ گئے تھے اور کیسے تغیرات عظیم ہوئے تھے کہ یہ کچھ آنکھوں کے سامنے سے گزرتا اور کسی میں کوئی حس نہ ہوتا۔ اس ملعون خاموشی میں کوئی بوڑھا صحابی اپنے ہی کو مخاطب کر کے اشعار میں روتا کہ فرزند رسولؐ کا سر نیزہ پر بلند کیا گیا ہے۔ مسلمان دیکھتے اور سنتے ہیں لیکن نہ کسی کو ناگوار گزرتا ہے نہ کوئی رونے والا ہے!۔ لیکن اگر رونا ہے سب کچھ ہے تو رونے والے تو اس وقت بھی تھے۔ عورتیں تھیں جو رو رہی تھیں اور اکثر تماشائی تھے جن پر اثر تھا اور آنکھیں اشک آلود تھیں۔ آنسو ہی اگر قومی ذلت کو دھونے کا نسخہ ہوں اور کسی کو غیرت دار اور قومی قوم بنا سکیں تو ہر حیثیت سے عورتیں دنیا پر حکومت کرتی ہوتیں۔

اب میں اس موقع پر پہنچا ہوں جہاں سے اس کا پوری طرح اندازہ ہو سکتا ہے کہ نرم دل، ضعیف القویٰ خواتین کس طرح صبر اور اپنے قوت نفس سے مجمع پر حکومت کر رہی ہیں۔ رو کر نہیں۔ اپنے اوپر اختیار سے، ضبط سے، اپنے حقیقی احترام اور خاصہ کی بلندی سے۔

کیا غرض تھی ابن زیاد کی کہ وہ اہلِ بیتؑ کو امکانی ذلت سے سر و پا برہنہ، بے ہودج، و محمل کے اونٹوں پر لائے جانے کا حکم دیتا۔ بجز اس کے کہ وہ یزید کی فتح اور حسینؑ کی شکست کی نمائش کرتا۔ اور یہ دکھاتا کہ ہم نے اپنے دشمنوں کو کس قدر ذلیل کیا۔ لیکن یہ خود نما دشمنانِ انسانیت نہیں جانتے تھے کہ نمائشِ ظلم اکثر وہ قبر ہوتی ہے جس میں ظالم دفن ہو جایا کرتے ہیں۔ اور کیسے ہی مظلوم کے متعلق انسان کی طبعی ہمدردی اپنے کو باز نہیں رکھتی نہ کہ جب مظلوم اہلِ بیتؑ رسالت ہوں۔ اور انھوں نے اس کا اہتمام کیا ہو کہ ہم اپنے کو اس وقتی ذلت سے متاثر نہ دکھائیں بلکہ ان لوگوں کو جو ہماری ذلت کے دیکھنے کے لیے آئے ہیں اپنی اصلی شان دکھائیں۔ بلاشبہ جس انبوہ مصائب میں اہلِ بیتؑ رسالت مبتلا تھے اس میں کوئی ایسی کوشش ایک نہایت سخت کوشش تھی۔ جس کے لیے ہر انسان تیار نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن وہ تیار تھے جو یہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے بزرگوں سے آج کے مصائب کا عہد لیا گیا ہے۔ وہ تیار تھے جنھوں نے حسینؑ سے سنا تھا کہ ہمیں اس ذلت میں خدا سے امید عزت و کرامت ہے۔ وہ تیار تھے جنھیں حسینؑ نے آخر وقت تک کہا تھا کہ دیکھو کسی طرح ایسے افعال اور انداز اختیار نہ کرنا جس سے ہماری منزلت میں نقص پیدا ہو۔

اب دیکھو کہ جس وقت تماشائی اسیروں کے شکستہ چہرے فریادی صورتیں اور مستغیثانہ لہجہ کی امید کرتے ہوں گے، وہ دیکھتے ہیں کہ ایک اونٹ پر سے ایک ہاتھ اٹھا، جس کا مجمع سے اشارہ ہے کہ چپ رہو۔ چہرہ پر نگاہ جاتی ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ ایک بے جنبش، غیر متاثر، ناشکستہ صورت سامنے ہے۔ جس کی بلندی بشرہ، نگاہ کا تحکّم، اور لہجہ کی صاف قوت خاموشی چاہ رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی دفعۃً صدائیں ڈوبتی جاتی ہیں۔ حیرت اور استعجاب لوگوں کو مخاطب کرتا جاتا ہے اور دفعۃً کوفہ کا وہ ٹکڑا جو حضرت زینبؑ کی نگاہ کے نیچے تھا حلقہ خموشاں بن جاتا ہے۔ خاموشی۔ یہاں تک کہ اونٹ کے گلوں کے گھنٹوں کی صدا بھی نہیں سنائی دیتی۔ کوئی اتفاق تھا کہ ایسے موقع پر دفعۃً ایسی خاموشی چھا گئی۔ نہیں۔ بلکہ حضرت زینبؑ علیا مقام کا ارادہ اور اس کے پیچھے ان کے عظیم الشان نفس کی قوت تھی، جس نے حتمی تصفیہ کیا تھا کہ ہم کچھ کہیں گے۔ یہ ارادہ ایک بجلی تھی جو دوڑ گئی تھا اور لوگ مسحور معلوم ہوتے تھے۔ ممکن نہ تھا کہ لوگ متوجہ نہ ہوتے۔ علیؑ کی بیٹی کا نفس مجمع پر چھا گیا تھا۔

اس خاموشی میں حضرت زینبؑ کی صدا بلند ہوتی ہے۔ ایک ایک لفظ اپنی حد سماعت پر چوٹ مار رہا ہے۔ اور سننے والے اس طرح سن رہے ہیں کہ اب گویا انھیں اور کسی بات کا ہوش ہی نہیں ہے۔ سن وہ باتیں رہے ہیں جس کے لیے وہ تیار نہ تھے۔ اس طرح جس کی امید نہ تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مجبور قیدی بجز اس کے کہ اپنی حالتِ زار سے ہمارے رحم و کرم کا استغاثہ کریں اور کیا کہیں گے۔ نہ جاننے والے جو سمجھتے ہوں گے کہ ان قیدیوں کو دین سے کوئی غرض نہیں ہے۔ انھیں زمین و آسمان نہ دکھائی دیتا ہوگا۔ بہر صورت اہلِ کوفہ کو یہ امید نہ ہوگی کہ حسینؑ کی شہادت کے بعد آلِ رسالت کے اسرا ایک انگلی سے سرہائے شہدا کی طرف اشارہ کریں گے اور ہم سے کہیں گے کہ دیکھو تمھاری بے وفائی اور نامردی سے یہ ہوا۔

مجمع حضرت زینبؑ سے خدا کی حمد اور ہادی برحق کی نعت سنتا ہے۔ اور اس کے بعد اپنے کو مخاطب دیکھتا ہے کہ:

"اے اہلِ کوفہ! اے اہلِ غدر و مکر۔ اب تم روتے ہو ـــــ تمھاری مثال اس عورت کی سی ہے جس نے اپنا سوت کات کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہوں۔ تم اپنے عہدوں میں ایک حیلہ بناتے ہو"۔ زینبؑ خاتون اپنی اندوہناک

حالت نہیں دکھا رہی ہیں بلکہ اہل کوفہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ ہمیں دکھا رہی ہیں کہ تم کیسے ہو۔ اہل کوفہ کی خصلت ان کی آنکھوں کے سامنے پیش کردی گئی تھی اور تمثیل عورتوں کے عمل سے دی گئی تھی۔ اثر بجو اگر تمھاری تخییل مدد کرے۔ ایک مجبور خاتون ملامت کر رہی ہے۔ میں صاف دیکھ رہا ہوں کہ اہل کوفہ پر ایک بجلی تھی جو گری تھی وہ چوندھیا گئے تھے۔ اور ان کی وہ آنکھیں جو قیدیوں کا تماشہ دیکھنے کے لیے اٹھی تھیں زمین میں گڑ گئی تھیں۔ ان کی گردنیں موم کی بن گئی تھیں۔ اور وہ سیدھی نہ ہو سکتی تھیں۔

وہ سنتے ہیں: "آگاہ ہو کہ تم میں نہیں ہیں مگر ایسے لوگ جو بے ہودہ اور رذیل ہیں۔ تم میں ایسے سینہ ہیں جن میں کینے بھرے ہیں (اور) وہ لونڈیوں کی طرح خوشامدی ہیں۔ تم کینہ پن میں اس سبزی کی صورت ہو کہ جو نجاست پر اگی ہو۔ تم اس قبر کی صورت بے فائدہ ہو جو چاندی سے آراستہ کی گئی ہو"۔

سلاست، فصاحت، بلاغت، اور مغز تو جانے دو، تشبیہ کی تیزی سے بھی الگ ہو جاؤ۔ بلکہ ان فقرات کو وہ استعارے سمجھو جو ایک قوم کے نفس کو چیر کر دنیا کو دکھا رہی ہیں۔ اہل کوفہ اپنے کو دیکھ رہے ہیں اور یہ کوڑے انھیں ہوش میں لاتے ہیں کہ ہم ایسے ہیں۔ اہل کوفہ یا سپاہیوں کی نسل اگر تلوار سے زخمی ہوتی تو خوش ہوتے کہ ہم نے بہادری سے زخم کھائے۔ یہ وہ زخم تھے جسے اپنی شجاعت نمائی کے لیے دکھا نہ سکتے تھے اور جو کبھی مندمل نہ ہو سکتے تھے۔ وہ ہر وقت تازے تھے جس وقت انھیں خیال آتا۔

وہ سنتے ہیں کہ: "تم نے برے اعمال پیش کیے۔ جس کی وجہ سے تم قہر الٰہی کے مستحق ہوئے۔ اب روتے چلاتے ہو۔ بخدائے توانا بہت رو اور کم ہنسو گے (اس لیے کہ) عار و ننگ عیب امت تم نے حاصل کیے ہیں۔ وہ تم سے ہرگز ہرگز جدا نہیں ہو سکتے"۔ لہجہ کی قوت، نفس شناسی کا درجہ الفاظ کی شان اور آمد بتا رہی ہے کہ حضرت زینبؑ علیا مقام فرما رہی ہیں۔ بلاشبہ حضرت زینبؑ کو یہ کہنے اور سمجھنے کا حق تھا کہ کس میں امت کی خوبیاں اور کس میں برائیاں اور بے شرمیاں آگئی ہیں۔ اور اب وجہ بتاتی ہیں کہ: "تم نے یادگارِ رسولؐ، سردار جوانان بہشت، ملجاو ماوائے نیکوکاران، جائے پناہ اہل مصیبت، ستون حجت خدا، اور اپنے راہ نما کو قتل کر ڈالا ہے"۔ اہل کوفہ اپنے کو دیکھ چکے تھے اب سنتے ہیں کہ حسینؑ کیسے اور کون تھے۔ کبھی اس سے لطیف تر سلسلہ اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ اس سے مناسب تر الفاظ میں دو متضاد صورتیں دکھائی جا سکتی تھیں۔ کیا کر رہا ہو گا وہ مجمع جو سن رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا کہ خارجی کا سر آتا ہے اور اب وہ تعریفیں سن رہا ہے جس کے انکار کی نہ صرف اس مجمع بلکہ یزید کی تمام سلطنت اور عالم کے تمام اہل قلم کو قدرت نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ عین واقعہ ہی تھا جو بیان کیا جا رہا تھا۔ اگر بات میں کوئی قدرت ہے تو میں کہوں گا کہ اس وقت اس مجمع پر یزید اس کے اسلحہ برداروں اور مصلحت کی حکومت نہ تھی بلکہ حضرتؑ شہید کربلا کے نفس عظیم کی حکومت تھی جو اس وقت حضرت زینبؑ کے دہن اقدس سے اپنے کو ظاہر کر رہا تھا۔ کب کسی اور کے لب و زبان کو یہ حق تھا کہ وہ حسینؑ کی مدح کر سکتا۔ مگر یہ کہ وہ حقیقی معنوں میں حسینؑ کی "ہمشیر" کا لب و زبان ہوتا۔

مخاطب لوگ سنتے ہیں کہ: "تم نے پیغمبر خدا کا جگر کاٹا ہے اور جناب رسالت مآبؐ سے کیسی عداوت ظاہر کی ہے!"۔ "تم نے ایک بڑی آفت اور حادثۂ عظیم برپا کیا کہ اس سے فضائے آسمان و زمین تنگ ہو گئی"۔ یہ فقرہ تھا

جو اپنی شرح کا انکار کرتا ہے۔ جس کی بلاغت اپنی داد یہ چاہتی ہے کہ وہی اسی طرح رہنے دیا جائے۔ قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ اہل کوفہ کا ملوم نفس کس کس طرح اس فقرہ کو سن رہا ہوگا کہ: "چند روزہ مہلت پر مغرور نہ ہو۔ یہ خون پائمال اور ضائع نہ ہوگا۔ عذابِ خدا تمھاری کمین میں ہے!"۔ یہ فقرہ تھا جو ان کی آئندہ زندگی تاریک کر رہا تھا۔ ان کی بے ہوشانہ خوشی اور تساہلی کو موت کا کرب بنا رہا تھا اور بجھا رہا تھا کہ خدا کے لیے وقت کا ضائع ہونا وقت کا ضائع ہونا نہیں ہے۔ وہ اس نبیانہ پیشین گوئی سے روز جزا کو سامنے دیکھ رہے ہوں گے اور سوچ رہے ہوں گے کہ خدا کا انتقام ہمیں بھول نہیں گیا ہے۔

میرا آخری فقرہ اور بس کہ یہ ہمارے اندازے کے باہر ہے کہ حضرت زینبؑ خاتون کی تقریر کا کیا اثر ہوا ہوگا۔ اگر تاریخی اشارہ کی ضرورت ہو تو وہ موجود ہے کہ ایک بوڑھا پاس کھڑا ہے۔ ناتجربہ کار دل نہیں ہے۔ عمر کے اکثر مدارج طے کرچکا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اس کی سفید داڑھی ایک آبشار بن گئی ہے۔ جس سے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ اور کہہ یہ رہا ہے کہ: "جوان تمھارے بہترین جوانان، عورتیں تمھاری بہترین عورات اور نسل تمھاری بہترین نسل ہے۔ کبھی تمھاری نسل رسوا اور ذلیل نہ ہوگی"۔ اس سے مجمع پر استنباط کا موقع ہے۔ لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہ ایک نگاہ میں اس قدر باتوں کی روح کا مجموعہ سمجھ لیتا ہے جہاں استنباط جواب دیتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ تقریر حضرت زینبؑ کی تھی۔ جس میں ان کے مقدس بزرگوں کی روح تھی۔ خود اپنی صورت پر ان تمام تحریرات کے علاوہ ناقابل مقابلہ غم کے آثار تھے۔ انھیں دور رکھنے کی کوشش تھی۔ ایک مجمع تھا جسے ان مخدرہ کی اس وقت اس حالت میں دکھائی دینے سے ایک نسبت تھی۔ ان حالتوں میں حضرتؑ کی تقریر تھی۔ تقریر کہتی ہے کہ وہ کس طرح ادا ہوسکتی تھی اور کس لہجہ میں۔ یہی لہجہ تھا جس کی بجلی ہماری تشریح کے باہر ہے۔ لیکن یہ کہنا ہے کہ باوجود تمام صبر کے یہ اک دردرسیدہ کا جوش بھی تھا۔ یہ مجموعہ ہے جس کا کسی لفظ یا کسی فقرہ میں دکھانا میرے قلم کی وسعت سے باہر ہے۔ سچ یہ ہے کہ میں کبھی اس موقع سے زیادہ اپنے عجز بیان کا معترف نہیں ہوا۔ اس لیے کہ یہ قلم اور لفظوں کا کام ہی نہیں ہے بلکہ ایک وقت میں نہایت سریع حافظہ، تیز تخیل، قیافہ شناس نگاہ کا کام ہے۔ جیسی تیز تخیل، سریع حافظہ اور قیافہ شناس نگاہ کم انسانوں کو دی گئی ہے۔ ایسا دیکھنے والا بھی بجز اس کے کہ ایک کیفیت محسوس کرے اس جگہ کھو جائے گا جب وہ اسے قلم کے حوالہ کرنا چاہے گا۔ مختصر لفظوں میں کبھی کسی ایسے اندوہناک موقع پر کسی ایسے اسیر نے اپنی جلالت شان کا ایسا اظہار اور اثر نہیں کیا تھا۔ انسان کی زبان تو تاج کے نیچے اور تخت شاہی پر ٹھہری ہوئی تقریر کے ادا کرنے میں تھراتی ہے۔ یہ تو ایک مظلومہ تھی جس کا گلا حلقہ فولاد میں تھا۔ بازو حرکت نہ کرسکتے۔ ایک بے کجاوہ اونٹ تھا۔ اور زبان تھی جس پر آہ بھی بے احتیاطی سے نہ آسکتی تھی۔ کون اس موقع پر ایسا کچھ کہہ سکتا تھا۔ مگر یہ کہ وہ نقیب الٰہی اور خطیب ربانی کی بیٹی ہوتی۔ کسے حق تھا کہ وہ حضرت زینبؑ کی تقریر کی داد دیتا بجز حضرت امام زین العابدین علیہ السّلام کے کہ: "آپ عالمہ غیر معلمہ ہیں!"۔

کچھ عجب نہیں ہے کہ اس کے بعد لوگ "حیران اور بھوچکے" ہوگئے ہوں اور اب انھیں یہ منظر غم قطعاً دوسری صورت میں دکھائی دیتا ہو۔ یہ اور اس کے مثل تقریریں تھیں جن میں مقررین نے اس منظر کو جسے ان کے دشمنوں نے ذلت کا ذریعہ بنایا تھا، اپنی عزت اور ہمدردی کا آلہ بنالیا۔ اپنے شخص، اپنی صفات اور اپنے نفس اور خیالات کی بلندی سے،

ٹکڑے ٹکڑے دیکھنے پر مستعد ہو جائیں۔ جن کی اولادیں ہیں۔ وہ اپنے مہر مادری کی جگہ فرزندوں کی شہادت کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ ان مخدرات میں دین کے وقار کے محفوظ کرنے کا کس درجہ لحاظ تھا کہ نہ کسی نے کوئی شکوہ کیا اور نہ شکایت کا کوئی لفظ زبان سے نکالا۔ بلکہ اس کے علاوہ سوچا نہیں جاسکتا کہ ایسے بڑے عالم اندوہ میں بھی ان خواتین کو اپنے فرزندوں اور شوہروں کے کارناموں پر فخر تھا کہ انھوں نے اس طرح ادائے فرض میں شہادت اختیار کی۔ ظاہر ہے کہ جن کی شجاعت اور وفا باعث تسکین تھی ان کی موت کس قدر دل شکن ہوگی۔

بیبیاں ہیں جو اپنے رنڈاپے پر بے اولادی کو ضم کر رہی ہیں اور حسرت و افسوس ظاہر کرتی ہیں کہ عورتوں پر جہاد واجب نہیں ہے۔ آثار ہیں کہ بیبیاں جن کی اولادیں نہیں ہیں وہ متاسف ہیں کہ آج ہمارے پاس کوئی تحفہ نہیں ہے جسے ہم حسینؑ پر قربان کرتے۔

لیکن جس بی بی کو خلاف امید چوٹ لگی وہ مادر حضرت علیؑ اصغر تھیں۔ نہیں۔ کسی انسان کی تخییل ایسی بے رحم نہیں ہے جو سوچے کہ اتنا بڑا بچہ تیر کا نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن اللہ رے صبر احتیاط اور دل کہ کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ ان پر کوئی بے چینی طاری ہوئی۔ بلکہ یہ کہ حسینؑ سے حضرت اُمّ کلثومؑ نے لاش لے لی۔ اور سینہ سے لگالی۔ ماں نے غالباً ایک مرتبہ حسینؑ کی طرف دیکھا اور آنکھیں نیچی کر لیں!۔

اضطراب کا کیا ذکر بیبیاں تھیں جن کے آنکھوں کے سامنے عبداللہ بن مسلمؓ عونؑ و محمدؑ۔ قاسمؑ و احمدؑ اور علیؑ اکبر کے ایسے ناشگفتہ پھول تلواروں اور نیزوں میں جا رہے تھے۔ اور وہ اس سے خوش تھیں کہ وہ اپنی جانوں کو حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کے لیے سپر بنا رہے ہیں۔

توجہ کے قابل ہے کہ اب کوئی نہیں ہے۔ اور قافلہ سالار اہلبیتؑ اسلحہ جنگ طلب فرما رہا ہے۔ حضرت شہربانوؑ ہوں یا کوئی بی بی ہوں اسلحہ جنگ دیتی ہیں۔ بے قراری نہیں ہے۔ شکایت نہیں ہے۔ تسلیم و رضا ہے۔ صرف حضرت اُمّ کلثومؑ و کھتی ہیں اور پوچھتی ہیں: "اے بھائی! کیا آپ اپنے آپ کو موت کے حوالے کر چکے؟"۔ بس میں اس وقت اسے ممکن نہیں سمجھتا کہ کسی بی بی یا حضرت اُمّ کلثومؑ ہی نے فرمایا ہو کہ: "اپنے نانا کے حرم کی طرف لوٹ چلو"۔ یہ نہیں سوچا جاسکتا کہ اس وقت تک جس قدر واقعات گزر چکے تھے ان سے اہلبیتؑ ناواقف تھے کہ وہ ایسا سوال کر سکتے۔ میرے نزدیک محاصرہ کے قبل ایسا کوئی امر قابل خیال ہو سکتا تھا۔ مجھے اس میں عذر نہ ہوگا اگر یہ سوال حضرت سکینہؑ نے کسی وقت کیا ہو۔ اس کے بعد کس طرح اہلبیتؑ نے وہ کپڑا حسینؑ کو دیا ہوگا جو اس امکان کے لحاظ سے زیب جسم کیا جا رہا ہے کہ اس کی بوسیدگی دشمن کو مائل نہ کرے۔ اور لاش برہنگی سے محفوظ رہے۔ یہ بھی ایک نیا منظر تھا کہ کسی شہید راہ خدا کے اہلبیتؑ یہ دیکھیں کہ ایک کپڑا ہے جو جا بجا سے چاک کیا جا رہا ہے۔ بے شک جناب امیرؑ کا میدان میں مخدوش موقع پر جاتے وقت ایک خاص سربند استعمال کرنا۔ حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کے لیے باعث اضطراب ہوتا ہوگا۔ لیکن وہ اس کا یقین نہ تھا کہ جناب امیرؑ ضرور شہید ہی ہوں گے۔ امکان تھا۔ لیکن یہاں حسینؑ کپڑا پہن رہے ہیں جو موقع ہی نہیں ظاہر کرتا بلکہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ شہادت کے بعد لاش سے کپڑے بھی لے لیے جائیں گے۔

کب کسی چھوٹی سی لڑکی نے یہ منظر اندوہ دیکھا ہے کہ باپ مرنے جا رہا ہے۔ بچہ، لاڈلی لڑکی، چند سال کی، اس

حال میں ہے کہ آنسو باپ کے چہرہ کو صاف دیکھنے نہیں دیتے۔ باپ سینہ سے لگاتا ہے۔ پیار کرتا ہے۔ آستین سے آنسو پونچھتا ہے۔ لیکن نہ بیٹی کہتی ہے کہ مرنے نہ جاؤ، نہ باپ اپنے بچہ کی اس امتحان خیز حالت سے اپنے ارادہ کو کمزور پاتا ہے۔ بلکہ وصیتیں فرماتا ہے۔ صبر و احسان کی۔ یاد دلاتا ہے کہ ہم لوگ اپنے باپ دادا، اور بھائی کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں۔
یہ ہونا ممکن تھا کہ جس وقت حضرتؑ رخصت کر چکے ہوں اور اب مقتل کی طرف روانگی کا قصد ہو گھوڑے کو چلنے کا حکم دیا ہو۔ اور گھوڑا جنبش نہ کرتا ہو۔ کیوں۔ سکینہؑ سموں سے لپٹی ہیں اور جب باپ دیکھتا ہے تو ہاتھ پھیلا کر کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ پھر سینہ سے لگا کر پیار کر لو۔ حسینؑ اترتے ہیں اور دنیا کی اس آخری راحت کو قبول کرتے ہیں۔
اور کیا یہ برداشت کے قابل تھا کہ حسینؑ کو رخصت کرنے کے لیے کوئی مرد نہیں ہے کہ رکاب تھام کر سوار کرے۔ علیؑ کی بیٹی یہ رسم ادا کرتی ہے۔ شجاعان عالم اس بی بی کے قدم کی خاک اپنی آنکھوں میں لگائیں اور فخر کریں۔ شہدائے عالم دیکھیں اور وجد کریں کہ کوئی بے مددگار بی بی جو اس کے بعد اپنے لیے دنیا کی مصیبتیں مہیا دیکھ رہی ہے اس فرض کو کس طرح ادا کرتی ہے۔
حسینؑ کا رخصت ہونا اس کا مقدمہ تھا کہ اہل بیتؑ اسیری کے لیے تیار ہوتے۔ ایسے ایسے غم اٹھانے کے بعد بھی راحت کی امید نہ تھی۔ بلکہ جانتے تھے کہ اب ان کے بعد دشمنوں کی عداوت اور شیطنت کا روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ وقت ہوگا جب حضرتؑ کی تنہا تلوار صفوں کو الٹ کر پیچھے کر دیتی ہوگی اور غل و شور ہوتا ہوگا۔ مگر اہل بیتؑ اس شور کو بجائے اپنے انتہائے فخر کے دھڑکتے ہوئے دل سے سنتے ہوں گے اور سمجھتے ہوں گے کہ ہماری آخری پناہ معدوم ہو گئی۔
جذبات غم و خوشی کا اپنے اپنے موقع پر پیدا ہونا عین تقاضائے فطرت ہے۔ لیکن تعریف یا عدم تعریف یہ ہے کہ کوئی شخص کس طرح ان پر غالب آتا ہے۔ اور ان جذبات کو اپنے قبضہ میں رکھتا ہے۔ اس وقت دیکھو کہ حضرتؑ اب قریب ہے کہ گھوڑے کی پیٹھ پر قائم نہ رہ سکیں۔ دشمنوں کا مشغلہ جاری ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زینبؑ غور سے دیکھ رہی ہیں۔ غور جس میں آج سے زیادہ کبھی اس قدر صبر، شہادت پر اس قدر رضامندی، حکم خدا کی اطاعت، غیرت پر قیام نہیں سمایا۔ اور یاد رکھو کہ یہ سب کچھ ایک بی بی سے ظاہر تھا۔
عورتیں تو نرم دل، کمزور اور مغلوب ہو جانے والی ہیں غم سے۔ لیکن یہ سب منظر اندوہ علیؑ کی بیٹی کی نگاہ کے سامنے تھا۔ اور جیسے حسینؑ نے وصیت کی تھی کہ دیکھو تمہاری بے صبری منزلت کو نقصان نہ پہنچائے اور دشمن شماتت کرے۔ اب حضرت زینبؑ کا ارادہ تھا۔ ارادہ جو اگرچہ فی نفسہ عورت کا ارادہ تھا مگر اب فولاد اس کی سختی اور پہاڑ اس کے وزن کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس وقت فرض یہی ہے کہ ہم دیکھیں اور صبر کریں۔ میں کسی امکان کی تشریح نہیں کر رہا ہوں بلکہ عین واقعہ لکھ رہا ہوں۔ واقعہ کہ ابن سعد حضرتؑ کو زخمی دیکھ کر نامرد سپاہیوں کو للکار رہا ہے کہ نواسہ رسولؐ جلد تمام کر دیا جائے۔ حضرت زینبؑ اس کی طرف دیکھتی ہیں اور فرماتی ہیں: "کیوں ابن سعد ابو عبداللہ حسینؑ اس بے کسی سے مارے جائیں اور تو دیکھتا رہے"۔ یہ حضرت زینبؑ ہیں۔
کیا یہ استغاثہ مدد تھا؟ نہیں استغاثہ اور مدد کا وقت تو جاتا رہا تھا۔ یہ ملامت تھی۔ ملامت جو عرب کے شجاع اور شریف ترین خاندان کی ایک بی بی نے ایک عرب کو کی تھی۔ یہ حسینؑ کا وقار یاد دلاتا تھا۔ اور اسے یاد دلاتا تھا کہ تو

دنیا کا سب سے بڑا گناہ کرچکا کہ تو نے اس مرکزِ خیر کو قتل ہوتے دیکھا۔ بلاشبہ یہ نرم لہجہ میں کہا گیا تھا۔ اور اسی میں مرثیہ تھا۔ جس نے ابن سعد کو حسینؑ کو شہید کرنے کے جوش اور فتح کی خوشی میں رلا دیا۔ لیکن زینبؑ علیا مقام منظر اندوہ اور ابن سعد کی خجالت دیکھنے کے لیے پھر اسی طرح بے جنبش کھڑی تھیں!۔ ہزار ہا سپاہی خوشی کے نعرے بلند کر رہے ہیں۔ سنیں گے۔ حسینؑ کا فرق مطہر نیزے پر بلند ہے اور تازہ خون ٹپک رہا ہے۔ دیکھیں گے اگر حسینؑ نے شیر فاطمہؑ سے پرورش پائی تھی تو زینبؑ و اُمِ کلثومؑ بھی اسی سے پلی تھیں۔ حسینؑ اگر شہید ہونے کو تھے تو یہ بیبیاں دکھانے والی تھیں کہ جو کچھ بھی ہو ہم اپنے خاندان کی انتہائے بلندی خصائل کے دکھانے کے لیے کربلا میں حسینؑ کے ساتھ آئے ہیں۔ حسینؑ کی لاش پامال ہوگی۔ لیکن ہم اپنی بے صبری سے اپنے اور حسینؑ کے وقار کو پامال نہ ہونے دیں گے!۔ تعریف کی گئی ہے کہ: "کان حسینؑ جبلا"۔ میں حیران ہوں کہ نرم دل بیبیوں کے اس صبر و استقلال کی کن لفظوں میں تعریف کروں۔

ذرا ٹھہر جاؤں اور بکر بن وائل کی اس عورت کو داد دے لوں جسے یہ غیرت آئی کہ بے غیرت سپاہیوں کو چند بے کس عورتوں کے لوٹنے کے لیے جاتا دیکھ کر نکل آئی۔ اِستغاثہِ مدد کیا؟ اور تلوار لیے تھی۔ افسوس اب کوئی مرد نہ تھا جس میں اہلِ بیتؑ کی مدد کا جوش پیدا ہوتا۔

اب اس کے بعد مجھے کیا کہنا ہے بجز اس کے کہ کچھ چیزیں (اسباب) جو اہلِ بیتؑ کے خیمہ میں تھیں دشمنوں نے لوٹ لیں۔ یہی معرکہ کربلا کی روح ہے۔ ذرا سمجھو کہ حسینؑ کے جسم مطہر پر وہ پرانا اور چاک شدہ کپڑا بھی نہیں ہے جو احتیاطاً پہنا گیا۔ اسی میں قوم کی تاریخ ہے کہ وہ کیسی تھی۔ کیونکر ایسی ہوگئی اور کب سے ایسی ہوئی تھی۔ چیزیں جن کی لالچ میں لشکر آیا تھا۔ جس کے لیے ابن سعد اور ابن زیاد ایسے مکروہ مظالم ایجاد کر رہا تھا۔ چیزیں جس پر قابض رہنے کے لیے یزید حسینؑ کو اپنے راستہ سے ہٹا دینا چاہتا تھا۔ چیزیں جس نے یزید کے پہلے ایسے اسباب پیدا کیے کہ آج کے عبرت خیز منظر پر منتہی ہوتے۔ حسینؑ کی برہنہ اور خون آلود لاش دیکھ لو اور سمجھو کہ کیا ہوا تھا۔ میں کوئی برہنہ لاش نہیں دکھا رہا ہوں۔ میں کوئی خون آلود لاش نہیں دکھا رہا ہوں۔ میں ایک برہنہ لاش دکھا رہا ہوں جو خون آلود ہے۔ یا ایک خون آلود لاش دکھا رہا ہوں جو برہنہ ہے۔

کیا اسلام اور رسولؐ نے چیزوں کی محبت سکھائی تھی۔ اور اس طرح؟ نہیں۔ تو کچھ روح اسلام میں بھی تغیر ہوا تھا۔

اہلِ بیتؑ کے لیے تاراجی خیام اس لیے زیادہ اندوہناک نہ تھی کہ ان کے اسباب پر دشمن قابض ہوگئے تھے۔ کچھ چیزیں غارت ہوگئیں۔ نہیں۔ بلکہ اکثر چیزوں کا تباہ ہونا اس لیے اندوہناک ہوگا کہ ان سے اکثر نفوس کی یاد وابستہ ہوگی۔ چیزوں کا دیکھنا شخص کو یاد دلاتا ہوگا۔ نظر بریں یہ چیزیں نہیں غارت ہوئیں بلکہ سلسلہ یاد غارت ہوا اور یہی عزیز تھا۔ مثلاً جہاں اہلِ بیتؑ کے خیام تھا وہاں اب خیمہ نہیں ہے۔ بلکہ راکھ کا ڈھیر ہے۔ یا جلے ہوئے خیموں کے کچھ ٹکڑے ہوا کے ساتھ زمین میں لوٹ رہے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان خیموں سے حسن مجتبیٰؑ، علیؑ مرتضیٰ اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اکثر وقت کی تاریخ وابستہ نہ تھی۔ گھر کے لوگ جانتے تھے کہ کس وقت وہ کہاں تھے۔ انھوں نے کسی خاص فرد سے کونسا مخصوص اظہار عنایت کیا تھا۔ یا کسی جگہ سے کونسی خوشگوار حالت تازی ہوتی تھی۔ یہ سب بھی نہ سہی یہ ضرور تھا کہ حسینؑ اپنے دوران سفر میں خیموں میں کس کس طرح دکھائی دیے تھے۔ اور اپنے آخری وقتوں میں کسی خاص جگہ کیا کر رہے تھے

اور اہلِ بیتؑ کا ہر ایک جگہ کیا موقع تھا۔ ان چیزوں کا غارت ہونا اس تاریخ کا ضائع ہونا تھا جو ان چیزوں پر لکھی تھی۔ اور اس طرح ان بزرگواروں کے ضائع ہونے کے بعد یاد دلانے والی چیزوں کا ضائع ہونا غم بالائے غم تھا۔

کس کا تصور اس قدر قوی اور وسیع ہے جو اس وقت کی حالت لکھ سکے جس وقت اہلِ بیتؑ حضرتؑ کے گھوڑے کو خالی زین دیکھتے ہیں۔ زین پر سوار نہیں ہے۔ اور خون آلود ہے۔ اس وقت کے مذکورہ اشعار اپنی آپ ہی شرح ہیں۔ عین واقعات ہیں۔ اور صابروں کے رونے کا نمونہ ہیں۔ نوحہ میں ایک وقار ہے۔ جس کے پیچھے عزم اور استقلال کی دیواریں ہیں۔ اور پھر کس کی تخیل اس قدر ہمدرد غیور ہے جو اس وقت کا نقشہ کھینچ سکے جس وقت دشمنوں کو اس کی جرأت ہوئی کہ اہلِ بیتؑ کی چادریں اور زیورات چھین لیں۔ وقت کی بہترین مصوری اس واقعہ میں ہے کہ ایک ذلیل کسی بی بی (حضرت زینبؑ یا حضرت فاطمہؑ صغریٰ) کا زیور لے رہا ہے اور رو رہا ہے۔ پوچھا جاتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ "میں تمہاری مصیبت پر رو رہا ہوں"۔ پھر پوچھا جاتا ہے کہ: "تو کیوں تو زیور لیتا ہے؟"۔ اور وہ کہتا ہے کہ: "اس لیے کہ اگر ہم نہ لیں گے تو کوئی دوسرا لے لے گا"۔

اور دشمنوں کا یہ برتاؤ اس ہمدرد حاکم کی اولاد کے ساتھ ہے جو انبار پر دشمن کے حملے اور لوگوں کی کمک میں تساہل پر ملامت کرتا تھا اور تنہا مدد کرنے پر آمادہ تھا اور فرماتا تھا: "مجھے ان حملہ آوروں کے ظلم و جور کی یہاں تک خبر پہنچی ہے کہ ان میں سے ایک شخص کسی مسلمہ یا ذمیہ عورت کے گھر میں داخل ہوا۔ اس کی پازیب، اس کے کڑے، اس کا گلوبند، اس کے گوشوارے۔ یہ سب زیورات نہایت بے رحمی سے چھین لیے۔ وہ عورت اس مرد کو نہ روک سکی مگر ہاں برابر وہ صدائے گریہ بلند کر رہی تھی۔ اور قبیلہ والوں کو بلا رہی تھی۔۔۔۔ اب اگر کوئی مسلمان اس سانحہ دلخراش پر افسوس کرتے کرتے مر جائے تو اسے ملامت نہیں کی جاسکتی بلکہ وہ اسی مرگ کا سزاوار ہے"۔ اچھا برتاؤ کیا گیا اس کی اولاد کے ساتھ جو نہ صرف مسلمہ بلکہ ذمیہ کی حفاظت کا ایسا لحاظ فرماتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ اہلِ بیتؑ پر سب سے سخت اور اندوہناک رات روز شہادت کی پہلی رات تھی۔ ایک رات قبل سب تھے اب کوئی نہیں ہے۔ اسباب ضرورت تھا۔ اب اس کا نام بھی نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ اب کیا ہوگا۔ یہ معلوم ہے کہ ہم گرفتار ہیں۔ اور ابن زیاد اور شام تک جائیں گے۔ اور یہ پوچھنے والا کہاں تھا کہ کے دن سے کھانا یا پانی تمہارے لبوں تک نہیں پہنچا ہے۔ محال ہے کہ کوئی انسان اس سے زیادہ عالم اندوہ کا خیال کر سکے۔ کبھی کسی شریف خاندان پر اس سے زیادہ طویل رات نہیں گزری۔

صبح ہوئی۔ اہلِ بیتؑ دیکھ رہے ہیں کہ دشمن اپنے کشتوں کو دفن اور سامان سفر کر رہے ہیں۔ اہلِ بیتؑ کسی طرح شہدا کی لاشوں پر پہنچے ہیں۔ دوست دشمن سب رو رہے ہیں۔ حضرت سکینہؑ آخری مرتبہ باپ کے سینہ سے لپٹ گئی ہیں۔ اور سر کو حسینؑ کے گلوئے مبارک پر رگڑ رہی ہیں۔ لیکن دشمن اس پر بھی راضی نہ تھے کہ اہلِ بیتؑ کو یہ اندوہناک تسکین بھی کچھ دیر حاصل ہو۔ لاشوں سے بجبر ہٹائے گئے۔ قافلہ روانہ ہوتا ہے اور اب بیمار کربلا کی نگاہ مقتل پر پھیلتی ہے۔ سب کچھ نگاہ کے سامنے ہے اور آپ میں ایک تغیر عظیم پیدا ہوتا ہے۔ حضرت زینبؑ کی نگاہ بیمارِ کربلا کے چہرہ پر جم جاتی ہے۔ اور فرماتی ہیں: "اے میرے بزرگوں کی یادگار میں تجھے کس حالت میں دیکھ رہی ہوں۔ کیا تیرا ارادہ ہے کہ دنیا سے گزر جائے؟"۔

اور یہ یزید کے خلاف بلکہ بنی امیہ کے خلاف ہیجان اور تباہی کا سنگ بنیاد ہوا۔

اب میں جن تقریروں یا حالتوں پر نظر کروں گا وہ متاثر ہو گا میرے ان خیالات سے جو میں حضرت زینبؑ خاتون کی تقریر کے ضمن میں ظاہر کر چکا۔ اور اب میں اس کے بعد نہایت مخصوص فقرات اور پیش کروں گا۔ حضرت فاطمہؑ صغریٰ بھی حمد سے شروع فرماتی ہیں۔ جناب رسالت مآبؐ کی رسالت کی "گواہی" دیتی ہیں۔ اور فرماتی ہیں کہ ان کی اولاد کو "اشقیائے امت" نے "ناحق" قتل کیا۔ "حالانکہ وہ کسی سے بغض و عداوت نہ رکھتے تھے"۔ یہ فرض جناب فاطمہؑ صغریٰ سے متعلق کیا گیا تھا کہ وہ جناب امیر علیہ السّلام کے فضائل لوگوں کو یاد دلا دیتیں۔ اسی کوفہ میں جہاں ایک زمانہ گزر گیا تھا کہ کوئی اموی حاکم نہیں آتا تھا۔ مگر یہ کہ اپنے حاکمانہ فرائض میں سبِ علیؑ کو ایک اہم ترین فرض سمجھتا تھا۔

فرماتی ہیں کہ: "اے اہلِ کوفہ! خدا نے تمہارے امتحان ہم سے کیا"۔ اس فقرہ میں ایک زمانہ کی تاریخ تھی کہ قوم کی کیا حالت تھی۔ کس طرح اہلِ بیتؑ حفاظتِ دین اور حقوقِ قومیت کے لیے کھڑے ہوئے اور اس قوم نے کیا معاوضہ دیا۔ اس احسان کا جس کے لیے اہلِ بیتؑ رسالت نے ہمت کی تھی۔ اہلِ کوفہ امتحان میں پورے نہ اترے، بلکہ نا احسان شناسی کی۔ اور جب ان کی نا احسان شناسی سے حفاظتِ دین و قومیت میں اہلِ بیتؑ مبتلائے مصیبت ہوئے تو اہلِ بیت کی یہ کوشش اور تسلیم و رضا خدا کے نزدیک بہتر تھی اور اس نے "ہماری بلا کو اچھا جانا" "ہم کو علم و حکمت عطا کی...... اپنی کرامت سے ہم کو معزز کیا" اور بوجہ اپنے رسولؐ کے تمام خلق پر ہم کو عزت و شرافت بخشی"۔ کس میں اتنی جرأت تھی کہ وہ ان اصول اور واقعات کے خلاف کچھ کہہ سکتا۔ اب فرماتی ہیں: "تم نے اپنے پیغمبر کی تکذیب کی (اس لیے کہ) ہمارے خون و مال کو جائز و حلال جانا...... یہ سب تمہاری پرانی عداوت و کینہ کی وجہ سے ہے"۔

"تم ہمارے قتل و غارت سے خوش نہ ہو کہ یہ وہ مصیبتیں اور بلائیں ہیں جو قبل از وقوع واقعہ خدا نے کتاب میں لکھی ہیں"۔ یہ فقرہ عمداً میں نے اس جگہ لکھا ہے۔ اور وہ اس وجہ سے کہ بعض بینا اندھے اسے جاہل اندھوں کے فریب دینے کے لیے استعمال کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں۔ کون کہے کہ تمہاری ہمہ دانی کا یہ مضحک ٹکڑا اس آگ پر جلا دینے کے قابل ہے جس سے تم خدا کی اکثر نعمات کو رسماً خاک کر دینے کو قرینِ عقل سمجھتے ہو۔ بجائے اس کے کہ اس نعمت سے اپنے ہی ایسے مخلوق کو نفع پہنچاؤ۔ ایسے دماغ سوختوں کو بھولنا نہ ہو گا کہ پانی کے چند قطرے ان کے آلہ پرستش کو فنا کر دے سکتے ہیں۔ نہ عامہ مسلمین ایسے ادعائے توجہ والے آتش پرستوں کے فریب سے آپس میں لڑ کر انھیں خوش کریں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب یہ لکھا ہی ہوا تھا کہ ایسا ہو تو پھر اس پانے والے، تذکرے اور واقعہ کے اہتمام تازگی کی کیا ضرورت ہے۔ حسینؑ بغیر شہید ہوئے نہ رہ سکتے تھے۔ اور یزید بغیر شہید کیے نہ رہ سکتا تھا۔ پھر اس میں حسینؑ کی تعریف اور یزید کی مذمت کی کیا ضرورت ہے؟ بینا اندھوں اور جاہل اندھوں دونوں کو جاننا چاہیے کہ عالم کی توحید خدا کو عالم جانتی ہے۔ ان تمام واقعات کا جو ہو چکے، جو ہو رہے ہیں یا جو ہوں گے۔ علم الٰہی ارادہ الٰہی نہیں ہے۔ اور یہ موٹی سے بات ہے کہ ہمیں کسی چیز کا علم ہو سکتا ہے لیکن کچھ ضرور نہیں ہے کہ اس چیز سے ہمارا ارادہ بھی وابستہ ہو۔ اور ہم نے اپنا ارادہ اس طرح جاری بھی کیا ہو کہ دوسرے کی قوت فاعلی ہم نے ضائع کر دی ہو۔ کیا معترضین کے پاس خدا کے اس پروانہ کی نقل ہے جو اس نے یزید کے پاس بھیجا تھا کہ تم حسینؑ کو شہید کرو۔ اور ایسا ایسا ہمارے علم میں گزر چکا ہے۔ جس کی ہم تمھیں اطلاع دیتے ہیں۔ اور مطلع

حکم خدا زید اس حکم کو مجبوراً تعمیل کرتا ہے۔ اور تعمیل کیسے نہ کرے کہ اس کے خزانہ کا روپیہ اڑ اڑ کر سپاہیوں کے ہاتھوں میں چلا رہا ہے۔ اسلحہ خانہ کی تلواریں قاتلین حسینؑ کی کمروں سے لپٹی جا رہی ہیں۔ اس کے گھوڑے اصطبلوں سے کھل کر ان کے پاس آتے ہیں۔ پیٹھ پر سوار کر کے کربلا کی طرف دوڑتے ہیں۔ تلواریں نیام سے ہاتھوں میں آئی جاتی ہیں۔ اور ہاتھ خود بخود حسینؑ پر چلنے لگتے ہیں۔ اور انھیں زخمی کرتے ہیں۔ سپاہی اس کے خلاف چاہتا ہے لیکن کچھ نہیں کر سکتا۔ زید کا ارادہ اور عقل ضائع ہو گئی ہے۔ اور وہ بجز اس کے کچھ سوچ ہی نہیں سکتا کہ حسینؑ کو شہید کرے۔ حسینؑ چاہتے ہیں کہ زید کی بیعت کر لیں۔ لیکن ان کا ہاتھ بیعت کے لیے حرکت ہی نہیں کرتا۔ اور نہ زبان بجز انکار کے کوئی لفظ نکال سکتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حسینؑ شہید ہوتے ہیں!۔

مختصر یہ کہ ایسا معترض کارخانہ عالم کو درہم و برہم دکھانے کا بھی وعدہ کرتا ہے۔ شاید معترض کا دارفتہ دماغ اس کی آنکھوں کے سامنے کوئی ایسا تماشہ دکھاتا ہو لیکن عالم اور اس کے اسباب اور نظم حسینؑ کی شہادت کے قبل جیسا تھا شہادت کے وقت ویسا ہی تھا اور شہادت کے بعد ویسا ہی رہا۔

خدا کے علم نے انسان کے فاعل مختار حیثیت کو ضائع نہیں کیا تھا۔ زید کو اختیار تھا کہ وہ اپنے ارادہ سے وہ اسباب پیدا کرے جو قتل حسین پر منتہی ہوں اور حسینؑ کو اختیار تھا کہ وہ انکار سے اپنی قتل گاہ تک جائیں۔ اور اس کے بالعکس زید کو یہ بھی اختیار تھا کہ وہ اپنے دہم کو اپنے قبضہ میں رکھتا جیسا بعد شہادت اس نے تصنع ہی سے سہی تاسف ظاہر کیا۔ اور حسینؑ کو بھی یہ اختیار تھا کہ وہ بیعت یزید کر لیتے۔ اور واقعہ کربلا کا دنیا میں وجود نہ ہوتا۔ انفرادی آزادی ارادہ کی بھی مثالیں ہیں کہ جس وقت لشکر یزید حسینؑ کے قتل پر آمادہ تھا حر اور ابوالشعثا وغیرہ اپنے لشکر سے الگ سوچ سکتے تھے اور اسی طرح جس وقت حضرت امام حسینؑ کے رفقائے نامدار اپنی قتل گاہ کی طرف جا رہے تھے وہ لوگ جو امید فتح سے ساتھ تھے ساتھ چھوڑتے جاتے تھے۔

اس کے بعد بجز اس کے کہ کسی پر "سوم" یا بھنگ کا اثر ہو اور کوئی ایسے لغو اعتراض سے کسی مسلمان کا وقت ضائع نہ کرے گا۔

بلاشبہ حسینؑ اور یزید کو اپنے افعال کے نتائج معلوم تھے۔ یزید جانتا تھا کہ ہم اپنی مصلحت میں کدھر جا رہے ہیں۔ اور حسینؑ جانتے تھے کہ ہمارا انکار بیعت ہمیں کدھر لے جا رہا ہے۔ لیکن یزید نے اپنے ارادہ اور اختیار سے عالم کے بہ بہتر سے بہتر احساس کو کربلا میں قتل کر دیا۔ اور حسینؑ نے اپنے علم ارادہ اور اختیار سے اپنی گردن کٹا کر دنیا کے بہتر سے بہتر احساسات کو ابدالآباد کے لیے زندہ کر دیا۔

حسینؑ تھے جن کا تجربہ سیاسی، قوم شناسی، انسان شناسی، روشن ضمیری ان سے کہہ رہی تھی کہ تمہارا بیعت کر لینا دین کی شہ رگ کاٹ دے گا۔ حسینؑ نے اس شہ رگ کے بچا لینے کے لیے اپنی گردن آگے بڑھا دی، اور جب دیکھا کہ ایسے اسباب پیدا ہو گئے ہیں تو کمال تسلیم و رضا سے یہ تصفیہ کیا کہ مشیت ایزدی یہ ہے کہ ہم ان اتفاقات میں یہ کریں۔ خدا کی شکایت نہ تھی۔ امتحان سے اعراض نہ تھا۔ مہیا ہونا اور اہتمام کرنا تھا۔ حق ہے۔ دنیا میں حسینؑ کا یہ عمل نفس کیسے ہر شخص کے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ حسینؑ اور حسینؑ کے پیشرو اور ان کے بعد ان کے سلسلہ روش کے قائم رکھنے والے یہی کرتے تھے۔

وہ اس کے قائل نہ تھے کہ خدا انسان کو اس کے افعال میں مجبور کر کے اپنے قائم کردہ نظام کا بطلان کرتا ہے۔ بلکہ وہ اس بلند درجہ پر تھے کہ جب وہ کسی ایسے اتفاقات میں اپنے کو پاتے تھے جو مصائب پر منتہی ہوتا تھا تو وہ خدا سے عطائے صبر و استقلال کی دعا کرتے تھے۔ اور امتحان کو شہیدانہ محبت خدا سے "مشیت" کے لفظ میں غرق کر دیتے تھے۔ اور "خدا کی کتاب میں لکھا" ہونے سے بجز اپنے اظہار تسکین کے اور کچھ نہ کہتے تھے۔ جس کی غرض یہ تھی کہ یہ علم خدا میں تھا، نہ یہ کہ کسی کاغذ اور چمڑے کی بندھی ہوئی جلد میں۔ کافی۔

خیر ہماری شہزادی نے اس کے قبل فرمایا ہے کہ: "تم ہمارے قتل و غارت سے خوش نہ ہو"۔ اور اس کے بعد فرمایا ہے کہ ہماری عادت یہ ہے کہ: "جو چیز جا رہی ہے اس پر رنجیدہ نہ ہوں اور جو کچھ حاصل ہو اس پر خوش نہ ہوں"۔ اس سے جہاں اپنی بے جنبش صبر اور صبر سے شجاعت جھلائی ہے دشمنوں کو اس بڑے جاننے والے کے غضب سے ڈرایا ہے۔ جس کی آنکھ سے انسان کا کوئی عمل مخفی نہیں ہے۔ اور وہ ہر ایک کے افعال کی پاداش عطا کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ چونکہ جناب فاطمہؑ صغریٰ یہ فرما رہی تھیں کہ یہ امورات علم الٰہی میں تھے اس کے اقرار سے اپنے علم اور روشن ضمیری کی امکانی مستعدی ظاہر کی تھی۔ یہ نہ تھا کہ دشمنوں کی ایذا رسانی نے انھیں عدم مستعد پایا ہو، اور اس سے ان میں کوئی ایسا اضطراب پیدا ہوا ہو جو مغلوبیت نفس کہی جائے۔ اور اس سے دشمنوں کو خوش ہونے کا موقع ہو۔

اس کے بعد عجیب پر ہیبت فقرہ تھا کہ: "عذاب و لعنت خدا کے منتظر رہو۔ گویا تم پر پے در پے غضب خدا اور عذاب شدید آسمان سے نازل ہوا ہے۔ اور تم کو کردار زشت کی پاداش نے ہلاک کر دیا ہے اور تم میں سے بعض کو بعض کے عذاب میں گرفتار کر دیا ہے"۔ زمانہ جانتا ہے کہ اگرچہ یہ الفاظ اس وقت ممکن ہے کہ ایک یتیمہ کی فریاد سے زیادہ نہ سمجھے گئے ہوں۔ مگر چند برس بعد کا یہ ایک واقعہ تھا۔

آخر میں یہ بھی فرما دیا ہے کہ: "ہر شخص کے لیے اس کے افعال کے مطابق سزا و جزا ہے"۔

اور نتیجہ یہ ہوا کہ: "گریہ و زاری کی صدائیں بلند ہوئیں، اور لوگوں نے کہا کہ: بنت طیبین تمھارے لیے بس اسی قدر کافی ہے"۔

حضرت زینبؑ علیا مقام اور حضرت فاطمہؑ صغریٰ انتہائے وقار اور صبر سے ایسے کلمات ارشاد فرما چکی تھیں جو بہت سے امور پر حاوی تھے۔ لوگ متوجہ ہو چکے تھے۔ غم لوگوں کے دلوں میں بھر گیا تھا۔

ٹھیس کی ضرورت تھی کہ پیمانہ چھلک جاتا۔ ضرورت تھی کہ آنسو لوگوں کے دلوں سے رہی سہی رکاوٹ بھی دھو دیتے۔ یہ کام غالباً حضرت اُمّ کلثومؑ عَلَیْہَا السَّلَام کے سپرد کیا گیا تھا۔ آپؑ کی تقریر کی ابتدا بلند آہ یا غم انگیز صدا تھی۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے تو حضرت اُمّ کلثومؑ کی یہی تقریر تھی۔ اگرچہ اس کے بعد بھی آپ نے کچھ فرمایا جس میں کوئی تمہید نہ تھی۔ بلکہ اپنے برادر عالی مقدار کے اندوہناک واقعات بیان کیے۔ لیکن یہ صرف اظہار غم کی شرح تھی۔ اور بس۔ فرمایا ہے کہ تم نے میرے بھائی کو قتل کیا اور ایسا خون بہایا جسے قرآن اور رسولؐ نے حرام کیا تھا۔ (وانی لأبکی فی حیاتی علی اخی، علی خیر بعد النبی ــــ) اب عمر بھر اپنے بھائی کو روؤں گی۔ وہ بھائی جو نبیؐ کے بعد سب سے بہتر تھا۔ اس غم انگیز نوحہ کو اس فقرہ سے سمجھو کہ: "تمام حاضرین اس کلام سے شور و نالہ کرنے لگے۔ عورتوں نے بال کھول دیے، خاک سر پر ڈالی۔

چہرے ناخون سے نوچے۔ طمانچے گالوں پر مارے اور مردوں نے اپنی داڑھی نوچی۔ اور اس روز سے زیادہ رونے والی اور رونے والیاں نہیں دکھائی دیے۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السّلام کے متعلق مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ ان جناب کا خطبہ زیادہ تر اپنا تعارف تھا۔ ہاں ایک ہادی خلق کے بعد دوسرے ہادی کو اس کی ضرورت تھی کہ وہ ایسے بڑے مجمع سے یہ کہہ دیتا کہ سلسلہ ہدایت منقطع نہیں ہوگیا ہے۔ لازماً موقع یہ تھا کہ ہر چیز غم آلود ہوتی۔ ذرا سوچیے کہ ایک نحیف و ناتواں ہے۔ بیمار ہے۔ جسے بیٹھنا بھی مشکل ہے۔ اس پر بھی دشمنوں نے یہ اہتمام کیا ہے کہ گلے میں لوہے کا طوق پہنا دیں اور پاؤں کو اُونٹ کے پیٹ میں باندھ دیں جس کا اثر یہ ہے کہ اس بیمار کی رانیں لخت لخت خون ہو رہی ہیں۔ امام کی تقریر یہی تھی اور بس کہ "میں علیؑ بن الحسینؑ ہوں"۔ مجھے دیکھ لو کہ میں کس حالت میں ہوں اور کیوں۔ میں اس کا فرزند ہوں جو راہِ خدا میں فرات کے کنارہ ذبح کیا گیا۔ جو صابر و شاکر شہید ہوا اور اس کا فخر میرے لیے کافی ہے۔ بڑا فخر تھا اور یہی حقیقی فخر تھا۔ امام اپنے کو اپنے صابر باپ کی صفات کا فرزند کہہ رہے تھے۔ محض حضرت امام زین العابدین کا اپنی طرف لوگوں کو مخاطب کر لینا ہزار مرثیوں سے زیادہ اثر خیز تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ ہم ہلاک ہوتے اور ہم نے غفلت کی۔ تخویف کافی حد تک ہو چکی تھی اور اس کی بھی ضرورت تھی کہ رحمۃ للعالمینؐ کا یہ جانشین بشیر بھی ہوتا۔ امامؑ فرماتے ہیں خدا کی رحمت اس پر ہے جو گوش دل سے نصیحت سنے اور قبول کرے۔ رحمت کے لفظ کا یاد دلانا اس وقت سے زیادہ کبھی کم مفید ہوا ہوگا۔ لوگ سننے کے لیے مستعد ہوتے اور اکثر تو عہد کرنے لگے اور یہاں تک بڑھے کہ انھوں نے یزید سے اِنتقام کا وعدہ کیا۔ یہ وعدے غیر فطری نہ تھے۔ اس پر قیام یا عدم قیام سے بحث نہیں ہے۔ لیکن امام انھیں ان وعدوں سے روکتے ہیں۔ انھیں اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ کے وعدے یاد دلاتے ہیں اور اپنے لیے فرماتے ہیں کہ میری خواہش تم سے صرف یہ ہے کہ تم ہم کو نفع و ضرر کچھ نہ پہنچاؤ!"۔

یہ بھی توجہ کے قابل ہے کہ اہل کوفہ ان مظلوموں کے طرف خرمے پھینکتے ہیں اور حضرت اُمّ کلثومؑ فرماتی ہیں کہ: "اے اہل کوفہ صدقہ ہم پر حرام ہے"۔ یا اپنے دیکھنے والوں سے ارشاد بلکہ حکم فرماتی ہیں کہ: "بند کرو اپنی آنکھوں کو کیا تمھیں خدا و رسولؐ سے شرم نہیں آتی کہ تم اہلِ بیتؑ کو بحالت عریانی دیکھتے ہو!"۔

ان تقریروں کے بعد کوئی عجب نہیں ہے کہ کوفہ کے خیالات اس سے بالکل بدل گئے ہوں۔ جیسے اس حسرت خیز قافلہ کی آمد کے پہلے تھے۔ خبریں ایک زبان سے دوسری زبان تک پہنچی ہوں گی کہ یہ اسیران آلِ محمدؐ ہیں اور ان کے ساتھ کربلا میں کیا ظلم کیے گئے ہیں۔ یہ محال ہے کہ خوف زدہ دوستوں میں ان خبروں سے کرب نہ پیدا ہوا ہو۔ ساتھ ہی ایسے لوگ بھی معدوم نہ ہوئے ہوں گے جنھیں خاندان رسالت سے منتقمانہ عداوت تھی۔ لیکن متوقفین کی ہمدردی قرینہ ہے کہ اہلِ بیتؑ کی مظلومی سے ان کی طرف مائل ہوئی ہو۔

وہ جوش خیز موقع آیا کہ اہلِ بیتؑ ابن زیاد کے سامنے ہوتے۔ آج اذن عام تھا۔ اہلِ بیتؑ کی یہ حالت تھی کہ کنیزیں انھیں گھیرے تھیں اور خاموش ایک گوشہ میں بیٹھے تھے۔ غالباً رسمی گفتگو شروع ہونے کے قبل کی خاموشی ابھی نہ ٹوٹی تھی کہ حضرت سید الساجدین نے گفتگو میں پیش قدمی کا تصفیہ کیا۔ کہنا یہ تھا کہ عنقریب تم بھی اسی طرح ٹکڑے کیے جاؤ گے۔ اور تم سے سوال کیا جائے گا۔ لیکن تم رسول اللہؐ کو کوئی جواب نہ دے سکو گے۔ ظاہر ہے کہ اس پیش قدمی کی غرض

یہ تھی کہ ابن زیاد کی تقریر اور کسی اثر ڈالنے کے قبل۔ مسلمانوں سے یہ کہہ دیں کہ ہم کون ہیں اور کس حالت میں ہیں۔ بلاشبہ اس سے حاضرین میں اپنے موافق حالت پیدا کرنے کی کوشش تھی جس کا اثر اس سے سمجھ میں آئے گا کہ ابن زیاد "چپ ہو گیا اور اسے یہ پسند نہ آیا"۔

آخر ابن زیاد نے حضرت اُمّ کلثومؑ کو پوچھا اور کسی نے جواب نہ دیا۔ دوسری مرتبہ پوچھا اور پھر کسی نے جواب نہ دیا۔ تیسری مرتبہ اس نے قسم دی اور جواب یہ دیا گیا کہ : "ما تزید؟"۔ (کیا چاہتا ہے؟) قیاس کرو کہ اس نا مرعوب بلکہ مظہر حقارت جواب نے ابن زیاد کی پیشانی کو پسینہ سے نہلا دیا ہوگا۔ لوگ اپنی نشستوں سے اکھڑ گئے ہوں گے اور ایک گرفتار کی جرأت نے حیرت میں غرق کر دیا ہوگا۔ اور اب ابن زیاد کہتا ہے کہ خدا نے تمھیں اور تمھارے جد کو جھٹلایا۔ کذبکم وکذب جدکم۔ اور انھیں رسوا کر کے مجھے ان کی طرف سے مطمئن کر دیا۔ کیا ابن زیاد اس فقرہ کے اظہار سے کوئی سیاسی راز کہہ دے رہا تھا؟ اور کیا یہ اس وقت تک منہ سے نہ نکلا تھا جب تک حوصلہ مندوں اور دشمنوں نے اپنے کو پوری طرح کامیاب نہ دیکھ لیا۔ اور کیا وہ تمام کوششیں جن کا ہم نے کبھی ذکر کیا اور جو شہادت حسینؑ یعنی اہلِ بیتؑ رسالت کے فنا کر دینے کے قریب قریب پہنچ گئیں۔ اس کے پیچھے حقیقت میں یہی راز تھا کہ جب ہم کامیاب ہو لیں گے تو کہہ سکیں گے کہ تم جھٹلائے گئے۔ اور خدا کا نام لے کر پھر ایک پردہ رکھیں گے۔ اور اب بھی مسلمانوں کی نگاہ میں پوری دشمن اسلام کی حیثیت سے نہ دکھائی دیں گے۔ اور کیا کبھی یہ سیاسی بے تمیزی نہ ہوتی اگر دشمن اپنے کو فتح یاب اور آلِ رسولؐ کو اپنا اسیر نہ دیکھتا۔ اور اگر ابن زیاد اپنی اس فقرہ میں محض جوش کی وجہ سے حد کے آگے بڑھ گیا تھا اور حکومت کے ایک جزو سے زیادہ نہ تھا۔ تو کیا یزید یعنی سرحکومت کے مشہور اشعار خصوصاً یہ شعر کہ :ـ

لعبت ھاشم بالملك فلا خبر جاء و لا وحی نزل

اس سیاسی بے تمیزی کو دہرا کر کیا مصلحت کی تصدیق نہیں کر رہا تھا اور اب اس کے ظاہر کرنے ہی کو اپنی کامیابی نہیں سمجھ رہا تھا۔ یہ ایک موقع ہے جس کے متعلق بجائے اس کے کہ میں اثبات یا نفی میں کچھ کہوں بہتر ہوگا کہ ناظر خود تصفیہ کرے۔ اور اگر مجمع کی حالت کا اندازہ کرنا چاہتے ہو تو اس پر غور کرو کہ ابن زیاد تین مرتبہ پوچھتا ہے لیکن حاضرین کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی کہ نواسۂ رسولؐ کی ہمشیر کون ہے۔

مجھے تو یہ کہنا ہے کہ وقت محض یہ نہ تھا کہ اہلِ بیتؑ اپنی ذاتی موقع اور وجاہت کو معرض ذلت میں دیکھتے۔ بلکہ دیکھتے کہ ہمارے اس موقع کو دشمن دین کی توہین اور تکذیب کے سلسلے کام میں لا رہا ہے۔ اب وقت نہ تھا کہ اہلِ بیتؑ اپنے چہرہ پر کسی شکستگی کو رہنے دیتے۔ بلکہ باوجود بے خورد خوابی اور باوجود غم اور لازمی نخافت کے دیکھ رہے تھے کہ آج موقع ہے کہ ہم اپنے اور اپنے اصول کا وقار قائم کریں۔ اور توفیق الٰہی سے اپنے انداز، اپنے دل، اپنے لہجہ اور اپنی صدا میں اتنی قوت پیدا کریں کہ سب ہمارے جواب کو سن لیں اور ہمیں دیکھ لیں کہ آیا ہم میں کسی مغلوبیت یا انکسار کے آثار ہیں۔ جس سے کہا جا سکے کہ ہماری شکست ہوئی کہ شکست ہماری تکذیب کا ذریعہ قرار دیا جا سکے۔ جواب سوچا نہیں گیا۔ دیر نہیں ہوئی۔ پس و پیش نہیں ہوا۔ ادھر ابن زیاد کے الفاظ تمام ہوئے تھے کہ جواب ہر ایک نے سن لیا۔ سنا کہ : "اے دشمن خدا۔ خدا فاسق کی تکذیب اور جھوٹے کی فضیحت کرتا ہے اور واللہ تو کذب و فجور کا عامل ہے"۔ وہ جو اپنے وحشیانہ افعال کو

خدا کے حوالہ کر رہا تھا اپنی خوشدلیوں اور خلق اللہ کے سامنے "دشمن خدا" کہہ دیا گیا۔ اصول بتادیا گیا ہے کہ اصل خیر (خداوند تعالیٰ) "فاسق کی تکذیب اور جھوٹے کی فضیحت کرتا ہے"۔ صادقین اور عاملان خیر کی تکذیب یا فضیحت نہیں کرتا۔ نیکوں اور سچوں کی تو وہ تکذیب اور فضیحت کرتے ہیں جنھوں نے اپنے دلوں پر خدا کی حکومت سے انکار کیا ہے۔ تقریر کی روح تمام ہو چکی لیکن اس کے اثر کی شرح ابن زیاد کے اس فقرہ میں ہے کہ: "اے شجاع کی بیٹی اگر تو عورت نہ ہوتی تو میں گردن مار تا"۔ مجھے تمام فقرہ سے بحث نہیں ہے۔ مجھے شجاعت کے خیال کے درمیان میں آجانے سے غرض ہے۔ فطرۃً شوکت اور قوت نمائی اگر محض اظہار قوت و شوکت کے لیے ہو خصوصاً مجبوروں اور عورتوں پر انسان میں ایک کیفیت پیدا کرتی ہے جسے نفرت کہیں۔ اور فطرۃً ایک عورت کی حق گوئی اور حق گوئی کی جرأت انسان میں ایک حالت پیدا کرتی ہے جسے پسندیدگی کہیں۔ اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ابن زیاد کی بے احتیاط خود نمائی اور حضرت اُمّ کلثومؑ کی بے ساختہ جرأت نے دربار میں کیا اثر کیا ہوگا۔ عام لوگوں پر اثر کا کیا ذکر خود دار فتہ ضمیر ابن زیاد شجاعت کا معترف ہوتا ہے۔ شاید بعض کے نزدیک ہماری خرادی کے لہجہ اور انداز کے لیے اشارہ ضروری ہو۔ واشنگٹن ارونگ "مغرورانہ" کہتے ہیں۔ غرور کا لفظ زیادہ سخت اور نیم مصور ہے۔ میں "شریفانہ غرور" کہوں گا۔

اس جگہ یہ بھی کہہ دوں کہ بعض مؤرخین نے حضرت اُمّ کلثومؑ اور حضرت زینب علیہا السّلام کے مکالمے الگ الگ لکھے ہیں۔ اور بعض نے یہ مکالمہ صرف زینب خاتونؑ سے منسوب کیا ہے۔ جو کچھ بھی ہو اگر یہ تقریریں دو بھی تھیں تو اصولاً اس میں کچھ زیادہ علیحدگی نہ تھی۔ بلکہ وہ تفصیل ہی سمجھی جائے۔ احتیاطاً میں دوسرے مکالمہ کو اس حد تک دیکھتا ہوں جہاں تک اس میں سنے پن کا عکس ہے۔

ابن زیاد حضرت زینبؑ سے بھی گفتگو چھیڑنے کی خواہش کرتا ہے اور حضرت زینبؑ شروع اس جواب سے فرماتی ہیں کہ: "اے دشمن خدا و رسول کیا چاہتا ہے۔ تو نے نیکوں اور بدوں میں ہماری ہتک کی"۔ ابن زیاد اس سے باز نہیں آتا کہ وہ ابھی اپنے کو ظلم کا ذمہ دار سن چکا ہے بلکہ پھر وہی پرانا کھیل کھیلتا ہے کہ خدا نے نام کو اپنے مظالم کی آڑ قرار دے۔ اور کہے کہ "تمھارے بھائی نے ارادہ کیا تھا کہ یزید سے خلافت لے لیں۔ ان کی امید ٹوٹ گئی۔ اور خدا نے ہمیں مطمئن کردیا اس کو تو زمانہ نے بتادیا کہ بنی امیہ قتل حسینؑ کے بعد کہاں تک مطمئن ہوئے۔ لیکن اگر اطمینان کوئی چیز ہے تو اس کی لہر کو حضرت زینبؑ کے اس فقرہ میں دیکھو کہ: "وائے ہو تجھ پر۔ اگر میرے بھائی نے طلب خلافت کی تو وہ ان کے باپ اور نانا کی میراث تھی۔ لیکن تو اپنے نفس کو جواب کے لیے مستعد رکھ"۔

غالباً گفتگو کا انداز سخت ہوتا جارہا تھا کہ حضرت بیمار کربلا نے دخل دیا اور اس مجہول النسل کو مخاطب کیا جس نے اپنے اختیار کے زعم میں عرب کی اس جاگرفتہ عادت سے بھی اعراض کیا تھا کہ وہ عورتوں اور ستم رسیدہ عورتوں کے زخم پر اور نمک نہ چھڑکے۔ مخاطبہ اس سے کم کسی فقرہ سے نہ تھا کہ: "کب تک او ابن زیاد تو میری پھوپھی کی توہین کرے گا؟"۔ ابن زیاد قتل کا حکم دیتا ہے۔ اگرچہ اس حکم کا نتیجہ سامنے ہے کہ اہلِ بیتؑ کے ساتھ حضرت امام زین العابدینؑ کے بعد کوئی نگران مرد نہیں رہتا۔ اور گویا نسل منقطع ہوجاتی ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی کوئی استغاثہ نہیں کرتا بلکہ حضرت زینبؑ اگر کچھ فرماتی ہیں تو یہ کہ اگر تیرا ارادہ قتل ہی کا ہے تو مجھے بھی قتل کر ڈال۔ شاید ابن زیاد کو اپنے وحشیانہ حکم اور اس کے

اثر کی تخیل سے کوئی لطف آیا ہو مگر خدا نے ارادہ کیا تھا کہ اہلِ بیتؑ کے نفس کی بلندی اپنے درجہ سے نہ گرے۔ بیمار کربلا ابن زیاد کے فقرہ کے تمام ہونے کے ساتھ ہی نہایت حقارت سے فرماتے ہیں کہ: "تو مجھے قتل کی دھمکی دیتا ہے کیا تو نہیں جانتا کہ قتل ہمارے لیے شہادت اور خدا کی طرف سے ایک درجہ ہے!"۔

یہ حکم واپس لیا گیا۔ کیا ابن زیاد میں دفعتہ رحم پیدا ہو گیا تھا؟۔ رحم اور ابن زیاد میں خصوصاً ایسے زمانہ میں جب کہ کسی حکم کا واپس لینا حکومت کی کمزوری سمجھی جاتی تھی۔ بلکہ اس کے بعد غالباً لوگوں کی حالت تھی جسے دیکھ کر ابن زیاد اس میں متردد تھا کہ وہ یا اپنا حکم واپس لے کر تھوڑی سی کمزوری ظاہر کرے اور یا فوری انقلاب اور لوگوں کی مخالفت کا مقابلہ کرے۔ ابن زیاد نے حکم قتل واپس لیا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کے احساسات اس قدر ظاہر تھے کہ جس سے وہ ڈر گیا۔ ایسی ہی ظاہر مثال آگے آئے گی۔

اس کے بعد ہی عبداللہ بن عفیف وغیرہ کے فقرات اور اشعار اثر اور نتائج ظاہر کریں گے کہ کیا ہوتا جا رہا تھا۔ یہ کہا جانے لگا تھا کہ فرزند رسولؐ کے قتل سے گویا رسولؐ اللہ کو علی الاعلان شہید کر دیا۔

میں نے منازل کے نام اس لیے نہیں لکھے ہیں کہ ان مقامات کی جغرافیہ لکھوں بلکہ ان کے لکھنے سے میری غرض صرف اس قدر تھی کہ یہ سمجھا جا سکے کہ اکثر مقامات پر اہلِ بیتؑ کے موافق ہیجان ہوا۔ اور باوجود اس کے کہ یہ مقامات اموی حکومت کے اثر میں تھے لیکن اکثر مقامات پر یزید کی فوج کو دم تک نہ لینے دیا گیا۔ اور یہ امر واضح ہو گا کہ اہلِ بیتؑ کی توہین کی مصلحت غلط تھی۔ بلکہ وہ بنی امیہ کے لیے قبر تیار کر رہے تھے۔ اور آل رسولؐ کی ہمدردی کا اعلان کر رہے تھے۔

قافلہ دمشق پہنچا۔ دمشق جو کم سے کم تین ہزار برس سے مشہور ہے۔ جس نے یہود کی قوم کے بہت سے تماشے دیکھے۔ جہاں اکثر حکومتوں کے نشان لہرائے۔ اور جو معاویہ بن ابوسفیان کا ایک زمانہ سے مرکز حکومت تھا۔ جہاں یہود اور عیسائیوں کی بڑی آبادی تھی اور چونکہ اب وہ مرکز حکومت تھا ظاہر ہے کہ اس وقت دنیا کے مشہور مقامات کے لوگ یہاں بہت سی حیثیتوں سے جمع ہوں گے۔ اس جگہ اور ان مختلف النسل اور مذہب قوموں میں اہلِ بیتؑ رسالت کو گزرنا تھا۔ گزرنا تھا طوق و زنجیر کے بوجھ سے دبے ہوئے لیکن واشنگٹن ارونگ یعنی غیر قوم مورخ بھی کہتا ہے کہ علیؑ بن الحسینؑ کے گلے میں زنجیر تھی لیکن وہ اپنے کو شان سے لے گئے۔

شہر کی دوکانیں بند تھیں اور لوگ شراب کے نشہ میں تھے۔ یزید کے دربار میں اس قدر لوگ تھے کہ ٹڈیوں سے تشبیہ دی جا رہی تھی۔ دروازہ خیزران، غالباً دمشق میں داخل ہونے کا پہلا دروازہ تھا اور باب الساعات جہاں اہلِ بیتؑ کا قافلہ تین ساعت کھڑا تھا۔ دربار سے قریب تھا اور یہاں اس لیے ٹھہرایا گیا تھا کہ جب یزید اجازت دے لے تو داخل کیے جائیں۔ حکومت کی نمائش کا صرف اس قدر اشارہ ہے کہ ایک سو بیس نشان فوج کھلے تھے۔ اگر یہ قیاس کیا جائے کہ ہر نشان کسی فوجی دستہ کے ساتھ تھا ایک بڑی فوج کا موجود ہونا ممکن ہو گا۔ ورنہ کم سے کم وہ پانچ سو سوار ہوں گے جو ابن زیاد نے قافلہ کے ساتھ کیے تھے۔

انھیں وقتوں میں سے کوئی وقت تھا کہ حضرت زینبؑ فرماتیں کہ اگرچہ ہم بہ جبر بے پردہ ہیں، لیکن اپنی عفت و حیا سے پردہ میں ہیں۔ اور یا سہل کے ایسے کسی شخص سے خواہش کی جاتی کہ وہ مجمع اور تماشائیوں کا رخ بدل دے۔

اس وقت کے متعلق اشعار ع

جاؤ براسك یا ابن بنت محمد

یا جب کہ کسی ناواقف بوڑھے نے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کو مخاطب کیا اور ان حضرت کا جواب غالباً دور کے دمشق کے کچھ حصہ کو حقیقت امر سے مطلع کرتا جاتا ہوگا۔ اگرچہ دمشق بنی امیہ یعنی دشمنان رسولؐ اور آل رسولؐ کا ایک زمانہ سے مرکز تھا جس سے یہاں اہل بیتؑ رسالت کے ہمدردوں کی کافی جماعت کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن پھر بھی یہ محال تھا کہ یہاں کچھ لوگ نہ ہوتے۔ بلکہ آثار تو اس کے بھی ہیں کہ کچھ ہاشمی عورتیں بھی تھیں۔ جو کچھ بھی ہو داخلہ دمشق سے داخلہ دربار یزید تک بیز متذکرہ صدر امورات کے اہل بیتؑ نے کوئی تقریر نہیں کی۔ اور نہ بیز حضرت امام زین العابدینؑ کے اور کسی نے اپنا تعارف کرایا۔ یہ جیسا آئندہ ظاہر ہوگا' دربار یزید کے لیے اٹھا رکھا گیا تھا۔

بے کار ہے یہ کہنا کہ یزید نے اپنے دربار کی نمائش کے لیے کیا کچھ کیا ہوگا۔ اور ہونے والا یہ تھا کہ جس وقت یزید شراب کے نشہ میں سر مبارک کو چھڑی سے چھیڑتا کوئی ابوبرزہ اسلمی کا ایسا بے خوف صحابی بھی موجود ہوتا اور وہ چیخ اٹھتا کہ: "اے یزید جس سر کے ساتھ تو یہ بے ادبی کر رہا ہے میں نے اسی کو بارہا دیکھا ہے کہ رسولؐ چومتے تھے"۔ غالباً اہل بیتؑ رسالت کی موافقت میں یہ پہلی صدا تھی جو تخت کے قریب بلند ہوئی۔ اور بلند کرنے والا بھی ایک بوڑھا صحابی تھا۔ اور یزید نے اپنے حکومت کے زعم میں اس بوڑھے صحابی کو دھکے دے کر نکلوا دیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کچھ لوگوں نے یہ دیکھا کہ یزید نے کسی پر سختی کی۔ نہ جاننے والے جان گئے ہوں گے کہ یہ بوڑھا کون ہے اور کیوں وہ اس عتاب شاہی کا مستحق ہوا ہے۔ اور اس حالت نے بھی لوگوں کی واقفیت میں مدد دی ہوگی اور یقیناً دربار سے نکل کر بھی ابوبرزہ کی زبان خاموش نہ ہوئی ہوگی۔ بلکہ اب انھیں اظہار خیال وغم کا کافی موقع ملا ہوگا۔ پے در پے ایسے اتفاقات ہوتے جارہے تھے۔ اور بیرونی لوگوں کا کیا ذکر خود زوجہ یزید محل سے باہر نکل پڑی۔ سر مبارک سامنے رکھا تھا۔ ہند نے دیکھا اور چیخ کر رو دی۔ پوچھا اور یزید نے کہا کہ یہ حسینؑ بن علیؑ بن ابی طالبؑ کا سر ہے۔ اور وہ کہتی ہے کہ یہ فرزند فاطمہؑ کا سر تیرے سامنے ہے تو خدا اور رسولؐ کی لعنت کا مستحق ہوا۔ اب نہ میں تیری بی بی ہوں اور نہ تو میرا شوہر ہے۔ اور یزید پوچھتا ہے تجھے فاطمہؑ سے کیا کام۔ اور وہ کہتی ہے کہ فاطمہؑ زہرا کے پدر بزرگوار' علیؑ اور ان کے فرزندوں سے ہماری ہدایت ہوئی اور ان کی بدولت یہ لباس (حکومت) حاصل ہوا۔ ویل ہو تجھ پر تو کس منھ سے خدا اور رسولؐ کو دیکھے گا۔

میرے خیال میں یہ واقعہ اہل دربار کو وقت کے ساتھ صورت حال بگھار رہا تھا۔ لیکن اتفاق یہی نہ تھا۔ بلکہ ہونے والا یہ تھا کہ قاتل بھی صلہ کی امید میں جو ڈینگیں مارتا اس سے مقتول کی حقیقت آشکار ہو گئی کہ وہ خیر الناس اور سید اہل حرمین ہے اور یزید کہتا کہ جب تو جانتا تھا کہ وہ خیر الناس ہیں تو تو نے کیوں قتل کیا۔ اب تو خدا سے آگ اور لکڑی کا جائزہ طلب کر یہ کہہ کر اسے تلوار کی پشت سے مارا اور اسے باہر نکلوا دیا۔ صرف یہی نہ تھا بلکہ غیر قوم کے لوگ یہود مثل راس الجالوت اور جاثلیق نصرانی بھی یزید کو اس کی حرکت پر نادم کرتے۔ کوئی مسلمان مثل یحییٰ بن حکم شعر کہتا اور یزید اسے چپ رہنے کے لیے ڈانٹتا۔ یا نعمان بن بشیر کراہتا کہ رسولؐ انھیں اس حالت میں دیکھ کر کیا کہتے۔

وقت آیا کہ یزید دماغی آماس کے عالم میں اپنے اشعار پڑھتا۔ اور حضرت زینبؑ کے بولنے کا وقت آتا۔

فرماتی ہیں: "تیرا گمان ہے کہ تو نے زمین و آسمان کو ہم پر تنگ کر دیا۔ ہم ذلیل ہوئے اور تو عزیز ہوا؟۔ اس پر خوش نہ ہو کہ دنیا تیرے لیے درست ہو گئی۔ تیرے سب امور ٹھیک ہو گئے اور ملک تیرا ہو گیا۔ صبر کر۔ کیا تو ارشاد خداوندی کو بھول گیا کہ وہ جنھوں نے انکار حقیقت کیا یہ نہ سمجھیں کہ ان کے نفس کے لیے اچھا ہوا بلکہ اس کا کفر بڑھ گیا۔ اور اس کے لیے بڑا عذاب ہے۔

ان فقرات میں حضرت زینبؑ یزید کے دماغی احساس کی شرح کر رہی تھیں۔ یا جیسا لوگ سوچ سکتے تھے۔ لیکن حضرت زینبؑ کے انداز کلام میں جیسی نبیانہ صاف بینی اور وزن تھا وہ یقیناً ایک ملزم نفس اور اس کے شرکاء کو تخت پر شکنجے میں مبتلا کر سکتا تھا۔ حضرتؑ نے نہ صرف اپنے فقرات بلکہ قرآن مجید کی آیت سے اپنے خیالات کو پورا کیا تھا۔

اس کے بعد حضرت زینبؑ یزید کے گھر کی تاریخ بیان کرتی ہیں کہ اس نے خاندان رسالت کے ساتھ کیا کیا۔ یہ نہایت ہی قوت دار اور تیز لفظوں میں تھی۔ جس کے سننے کے بعد یزید تو خیر لوگ بھی اپنی بے ہوشی سے چونک سکتے تھے۔ فرماتی ہیں: "کیا امید ہو سکتی ہے ان لوگوں سے جنھوں نے پاکبازوں کا جگر کھایا ہو۔ جن کا گوشت خون شہداء سے پلا ہو"۔ یقیناً کسی کو جو انسانی جسم میں ہو اس سے سخت تر کوئی بات اس خوبصورتی سے نہیں کہی جا سکتی تھی۔ خصوصاً جب کہ یہ شاعری نہ تھی بلکہ عین واقعہ تھا۔ قیاس ممکن ہے کہ ایسے انسانی درندوں کے متعلق دوسرے انسانوں میں کونسا خیال دوڑ گیا ہو گا۔ اگرچہ پنجوں کے خوف سے اپنے گلے یا انداز سے کسی نے نفرت نہ ظاہر کی ہو۔

فرماتی ہیں: "تو اپنے بزرگوں کو بلاتا ہے اور گمان کرتا ہے کہ وہ سن کر آئیں گے۔ اسے! عنقریب تو بھی وہاں جائے گا جہاں وہ ہیں۔ اس وقت تو آرزو کرے گا کہ کاش میں لنجا ہوتا، گونگا ہوتا کہ جو کچھ میں نے کیا نہ کرتا۔ اور جو کچھ کہا نہ کہتا"۔ مجھے امید ہے کہ کبھی یزید نے موت کی ایسی ظاہر حقیقت کو اس صفائی سے نہ سنا ہو گا۔ اور سنا بھی تو اس وقت جب کہ وہ ریشم، سونے اور جواہرات پر ناز کر رہا تھا۔ کیا اسے معلوم ہوا ہو گا کہ عزرائیل کا ہاتھ اس کی گردن تک پہنچ گیا ہے۔

فرماتی ہیں: "تو مومنین کی گردن پر مسلط ہوا ہے۔ بہت جلد تجھے معلوم ہو گا کہ ظالموں کے لیے برا بدلہ ہے"۔

اس فقرہ میں حضرت زینبؑ۔ نہیں۔ حقوق عباد کے نقباء۔ اور مخلوقات الٰہی کے خدائی رہنماؤں کی یادگار بول رہی تھی۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ یزید کے زوال حکومت کے لیے اس سے کاری تر ضرب لگائی جا سکتی تھی۔ یزید جانتا تھا کہ وہ کیسا ہے۔ اس کے دست و بازو جانتے تھے کہ وہ کیسا ہے۔ لوگ جانتے تھے کہ وہ کیسا اور کیونکر خلیفۃ المسلمین بنا ہے۔ سب کچھ تھا لیکن یہ کہنا۔ لوگوں کے منہ پر کہنا۔ حقیقی اصول حکومت ظاہر کرنے والوں کی اس روح، زبان، گوشت و خون اور خصائل کی زبانی انحصار رکھا گیا تھا۔ اس کی سیاسی لطافت اس میں ہے کہ یہ نہیں کہا گیا ہے کہ یزید جیسا ہے اسے کیوں لوگوں نے خلیفہ تسلیم کر لیا ہے۔ یا کیسے لوگوں نے اسے حاکم بنانے میں مدد کی ہے بلکہ "مومنین" کا لفظ استعمال کرتی ہیں۔ میرے خیال میں کبھی مسلمانوں کو اس سے بہتر اور قوی تر جھنجوڑ سے ہوش میں لانا ممکن نہ تھا۔ بلکہ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ حقیقتاً یہ فقرات بھی منجملہ دیگر اسباب کے وہ سبب ہوئے جو نہ صرف یزید کے خلاف تباہ کن انقلاب کھڑا کر دیتا بلکہ بنی امیہ کے خلاف وہ نفرت انسانی قلوب میں ساری کر دیتا جو کسی آلہ سے چھیلی نہ جا سکتی۔ مجھے اس سے بحث نہیں ہے کہ زینبؑ خاتون کے ان فقرات کی روشنی موجودہ موقع کے علاوہ کیا کچھ نہ دکھا رہی تھی۔ فرماتی ہیں: ایک ستم رسیدہ خاتون کہتی ہے:

"اگرچہ مجھ پر مصیبتیں پڑی ہیں۔ لیکن میں تجھ سے کہتی ہوں کہ میں تیری قدر کو ذلیل جانتی ہوں اور تیری شان و شوکت کو حقیر سمجھتی ہوں۔ تعجب ہے کہ شرفا اور مردانِ خدا گروہِ شیاطین کے ہاتھ سے قتل کیے جائیں (لیکن) خدا بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ خدا ہی سے میری شکایت ہے اور اسی پر بھروسا ہے۔ تو مکر کر جو مکر کر سکے۔ اور کوشش کر جو کر سکے۔ بخدا تو ہمارے ذکر کو نہیں مٹا سکتا۔ ہماری شرع کو ضائع نہیں کر سکتا۔ ہماری درازی مدت کو نہیں پا سکتا اور اس ننگ و عار کو اپنے سے دُور نہیں کر سکتا"۔

ان فقرات کی بلاغت اور بلندی اس سے بلند ہے کہ وہ شارح کے قلم کی زد کے اندر آسکے۔ اس لیے کہ اس میں ایک مخدّرہ اپنے صبر، اپنے یقین، اپنی خود داری، اور اپنے افتخار کو اس خوبی سے بیان فرما رہی ہے جن حالتوں میں ان احساسات کا ہونا مدح کا محتاج نہیں ہے۔ یہ ایک عزیز مردہ، ستم رسیدہ اور آفات میں مبتلا مظلومہ ہے جو ظالموں سے کہہ رہی ہے کہ تم ہم سے اپنی قدر نہیں کرا سکتے اور نہ اپنی شان و شوکت کا ہم پر اثر ڈال سکتے ہو۔ اب تک جس قدر مصائب برداشت کیے ہیں ان کے علاوہ بھی ابھی صبر اور برداشت کی ہمت ہے اور وہ فرماتی ہیں کہ جس قدر مکر اور کوشش کر سکے کرے اور پھر اس کے بعد اپنی عظمت اور وقار کا یقین دیکھو۔ اپنے جاگرفتہ اثر کا اعتبار دیکھو کہ فرماتی ہیں کہ تو ہمارے ذکر کو مٹا نہیں سکتا اور نہ ہماری شرع کو ضائع کر سکتا ہے۔ یزید ایک بادشاہ ہے جس کے ماتحت وہ تمام سامان اور اختیار ہیں جو ایک بادشاہ کے متعلق ہو سکتا ہے لیکن بادشاہ قلوب اور حاکم روحانی کی روح اس وقت اپنا دائمی اقتدار ظاہر کرتی ہے کہ: "تو ہماری درازی مدت کو نہیں پہنچ سکتا"۔ مٹ گیا یزید۔ اس کے بعد کے اس کے پہلے کے لیکن اہلِ بیتؑ کا ذکر انسانی روحانیت کا آج بھی ویسا ہی دستور العمل ہے جیسا پہلے تھا اور رہے گا۔ جب تک انسان میں مذہبی احساس رہے گا۔ یزید دیوانہ نہ تھا جو اس کا انکار کر سکتا اور مجبور تھا کہ باوجود اپنے تمام سامانوں کے اہلِ بیتؑ کے اس اثر کا مقابلہ نہ کر سکتا جو زمانہ اور انسانی دماغ میں مضمر ہو گیا تھا۔ وہ دیکھیں جو دیکھنا چاہتے ہیں کہ آیا یزید ان پر اپنی قوت کا اثر ڈال سکا یا نہیں۔ وہ سوچتا تھا کہ جب ہم اہلِ بیت کو مٹا دیں گے اور انھیں ذلیل کریں گے تو وہ مجبور اور مرعوب ہو کر ہمارے مطیع ہو جائیں گے۔ اور لوگ سمجھیں گے کہ یزید غالب آیا۔ لیکن کونسا ایسا وہ مخبوط الحواس دربار یزید میں تھا جو ان مجبور مخدرات کے ایسے عالی، قوت دار، صاف اور جوش خیز کلام سنتا اور کہتا کہ یزید کی فتح ہوئی۔ نہیں بلکہ ان لوگوں نے بہت سی قربانیوں کے بعد یہ وقت پایا کہ یزید کے تخت کے سامنے اپنی حکومت قائم کرتے۔

میرا ارادہ نہیں ہے کہ میں اب کسی اور مکالمہ یا تقریر کی شرح کروں۔ اس لیے کہ متذکرہ صدر تقریر خلاصہ ہے ان تمام کا جس پر کوئی بحث ہوئی ہو۔ اس جگہ میں اپنے میں یہ کہنے کی خواہش بھی پاتا ہوں کہ ممکن ہے کہ کسی وقت کوئی کہے کہ یہ تقریر حضرت زینبؑ یا حضرت ام کلثوم کی نہ تھی۔ میں نہ صرف اس اثر سے جو مجھ پر ہے بلکہ موقع، انداز، لہجہ، مناسبت، اور حضرت زینبؑ کے خصائل بلند کے لحاظ سے اس یقین کے ساتھ اس تقریر کو حضرت زینبؑ کی تقریر سمجھتا ہوں گویا میں دربار یزید میں موجود تھا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور اپنے کانوں سے سن رہا تھا۔ اس تقریر کی طمطراق گری انکار کرتی ہے کہ یہ اس موقع کے کسی اور وقت ادا ہوئی ہو۔

واشنگٹن اردینگ کی اس جگہ یہ صحیح واقعہ بھی شاید پر لطف ہو کہ: "یزید نے حضرت زینبؑ سے گفتگو میں

حضرت علیؑ اور حضرت امام حسینؑ کی تخفیف منزلت کی اور اس شجاع بی بی کا دل پھر اس کے لبوں پر آگیا اور انھوں نے ایسی شریفانہ طنز اور مناسب ملامت سے جواب دیا کہ یزید شرما کر چپ ہو گیا"۔

غالباً یہ بھی واقعہ تھا کہ کوئی شامی یزید سے کہتا کہ مجھے یہ لڑکی دے دے۔ اس پر اہلِ بیتؑ نے جس سختی سے مخالفت کی اس کا اثر تھا کہ جس نے محفوظ رکھا۔ اس فقرہ کو سن کر کوئی ناواقف نہ رہ سکتا تھا کہ: "چپ رہ او ذلیل بنات انبیاء خادمہ نہیں ہوتیں"۔ یزید اپنے اختیار کے جوش میں کچھ آگے بڑھا تھا کہ کہا گیا کہ تو اس وقت تک یہ نہیں کر سکتا "جب تک ہماری ملت سے نکل کر دوسرے دین میں داخل نہ ہو"۔ کیا کسی کو اس میں شبہ تھا کہ یزید مسلمان نہیں ہے۔ کوئی شبہ نہ تھا۔ لیکن اس فقرہ کے بعد یزید مسلمانوں میں ظاہر بظاہر مخالفت کے لیے مصر سمجھا جاتا اور اس کا موقع نہایت نازک ہو جاتا۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ فقرہ مسلمانوں کے سامنے مسلمانوں کے سنانے ہی کے لیے کہا گیا تھا۔ گفتگو سخت ہو چلی تھی کہ اس فقرہ نے اسے پھر خاموش کر دیا کہ "تو بادشاہ ہے اپنی حکومت سے ہم پر جبر کرتا ہے"۔ اور اس اندوہناک موقع کو بھی اہل بیت کے شریفانہ استقلال نے اپنے سے دور رکھا۔

اور اب وہ موقع آیا کہ یزید امام زین العابدین علیہ السّلام سے گفتگو میں کامیاب نہ ہو کر اپنے خوش ہونے کی یہ صورت نکالتا کہ اس یادگار رسولؐ کے قتل کا حکم دیتا۔ کونسا قلم بڑھ سکتا تھا۔ ان بے کس بیبیوں کی اس وقت کی حالت سے جب کہ وہ اس بیمار اور نحیف کے گرد آگئیں۔ اور بچانے کی کوشش کی۔ بیبیوں کی حالت اور حضرت ام کلثوم علیہا السّلام کے اس شعر نے جو اثر پیدا کیا اس نے تیسری مرتبہ نسل امامت کو منقطع ہونے سے بچا لیا کہ: ؎

انادیك یا جداه یا خیر مرسل حبیبك مقتول و نسلك ضائع

یہ مواقع تھے جس نے بے شمار حاضرین پر اثر کیا اور اب یزید کو لوگوں کے خیال بدلنے کے لیے کوششیں کرنی پڑیں۔ فصیح مقرر منبر پر بٹھایا گیا جس نے یزید کی تعریفیں شروع کیں اور بنی امیہ کے پرانے وظیفہ سے حاضرین کی عادی طبیعت سے کھیلنا چاہا۔ اب وقت تھا کہ موجودہ امام بغیر کچھ بولے نہ رہتے۔ وہی قافلہ سالار اہل بیتؑ جو طوق و زنجیر پہننے کے وقت کچھ نہیں بولتا۔ سیکڑوں میل منزلیں طے ہوتی ہیں لیکن ناشکستہ خاموشی ہے۔ وہ منبر پر ایک فصیح بے ہودہ گو کی تقریر سن کر فرماتا ہے کہ تو نے ایک بندہ کو تو خوش کیا لیکن خدا کو ناراض کیا۔ اور اب امام یزید سے اجازت چاہتے ہیں کہ وہ کچھ فرمائیں۔ جس سے خدا خوش ہو۔ اجازت طلبی کے معنی یہ تھے کہ دین کی زبان رسن بستہ تھی۔ دین کے پاؤں اور گلے میں طوق و زنجیر پڑی تھی۔ لیکن اس حالت میں بھی اس کی قوت ظاہر ہے کہ یزید منبر پر جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ لوگ اصرار کرتے ہیں اور یہ اصرار اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ یزید کو اجازت دیے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ اور اب امام منبر پر دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے تخت پر۔

حمد خدا اور ہادی برحق پر درود سے تقریر شروع کی گئی۔ خدا اور رسولؐ کی تعریف شایان زبان کے حوالہ تھی۔ اسی میں اس کا اثر تھا۔ زین العابدینؑ اور سید الساجدینؑ نے خدا کا نام لیا تھا۔ اور رسولؐ کے فرزند نے اپنے جد بزرگوار پر درود بھیجا تھا۔ سوچو کہ سلسلہ خیال نے لوگوں کی نگاہ میں کتنا زمانہ روشن کر دیا ہوگا۔ اور وہ امام کو موجودہ موقع میں دیکھ کر کیا سمجھ رہے ہوں گے۔ کیا اس میں کسی کو شبہ ہے کہ وہ بڑا مجمع جو اس وقت تھا کس خاموشی سے سن رہا ہوگا۔ سانس معلق ہوگی۔ ہر شخص

اپنی جگہ گڑ گیا ہوگا اور خاموشی بول رہی ہوگی۔ جس میں امام کی نحیف لیکن خلق اللہ کو حقیقت امر سمجھانے کے جوش سے قوت پاتی ہوئی صدا بلند ہو رہی تھی۔ لوگوں نے اپنی توجہ امام کے حوالہ کر دی تھی۔ امام کا نفس مطہر اس مجمع پر حاوی تھا اور سننے والے روشنی اپنے گرد محیط دیکھ رہے تھے۔

امام کی تقریر کا دوسرا درجہ دنیا کی اس عظیم الشان مسئلہ کی یاد دہانی تھی۔ جسے موت اور حیات کہتے ہیں۔ جس کی بنیاد بغیر نہ فلسفہ ہوتا، نہ مذہب ہوتا۔ نہ اخلاق ہوتا اور نہ انسان پر کوئی اثر ہوتا۔ کس طرح جیو اور کس طرح مرو۔ اسی کا دستور العمل مذہب ہے۔ اسی کے لیے اخلاق کی ضرورت ہے۔ اسی کو ہر مصلح بنی آدم نے اپنے درجہ کے موافق سمجھایا۔ امام موت کی سی ظاہر لیکن موثر حقیقت کا ذکر کرتے ہیں۔ یعنی انسانی حیات کا ابدی انجام دکھاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ "اپنی گزشتہ عمر پر افسوس کر کے آئندہ کی تلافی کی کوشش کرو۔ اور بقیہ عمر میں نیکی کمالو"۔ اس میں وہ سب کچھ تھا جس سے قوم کو جوش میں لاتے اور ان تمام باتوں کی طرف اشارہ کرتے جن کی غفلت قوم کی دنیا اور عاقبت خراب کرتی ہے اور اسی سے وہ تمام باتیں یاد دلا رہے تھے جن پر عمل اور جن کے ہوش سے انسان اور قومیں اپنی دنیا و آخرت درست کرتی ہیں۔ پھر اسے اس مجمع سے کیا مخصوص نسبت تھی؟ یہی اس تمہید کی خوبصورتی تھی۔ کیا وہ مرکز سامنے نہ تھا جس نے دنیا کا برا پہلو اختیار کیا اور دنیا کے اس پہلو کو بری طرح اختیار کر کے انسانیت اور ہر اس روش پر جو اچھی طرح زندگی بسر کرنا کہا جائے ظلم کیا۔ اس نے چند مادی چیزوں کے حصول کے لیے دنیا کے ہر شریفانہ احساسات اور امورات معروف کو چیزوں سے کچل دیا اور تمام امورات منکر کو نہ صرف فروغ دیا بلکہ انھیں عارضی اختیارات سے فروغ دیا۔ کیا مختصر لفظوں میں یزید نے اس سارے نظام کو جو انسان کے تجربہ تاریخی اخلاقی یا الہامی سے بہتر سمجھا گیا تھا۔ فولاد سے ٹکڑے ٹکڑے نہیں کر دیا۔ واضح لفظوں اور مثالوں میں کیا یہ یزید اور اس کے مددگار نہ تھے۔ جو چند خون آلود سر اور چند مجبور عورتوں کو دیکھ کر غیر شریفانہ اظہار میں مبتلا ہیں۔ اور یہ چند خون آلود سر اور یہ چند مجبور بیبیاں وہ ہیں جن سے وہ تمام روشیں ظاہر ہوئی تھیں۔ جو انسان کے نزدیک بہتر طریقہ سے جینے اور بہتر طریقہ سے مرنے کی مافوق العادت مثالیں تھیں۔ واضح تر لفظوں میں امامؑ اپنی انگشت مبارک سے حاضرین کو شہدا کے گلوئے مبارک دکھا رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ دیکھو تم نے دنیا میں اس طرح زندگی بسر کی ہے کہ چند چیزوں کے لیے ایسے گلے کاٹے ہیں۔ حالانکہ تمہاری چیزیں بھی معرض خطر میں نہ تھیں۔

تقریر کا تیسرا ٹکڑا اپنا اور اپنی حالت کا تعارف اور اس کی شرح تھی۔ وہ فرما رہے تھے کہ ہم کس کے فرزند ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ حسینؑ، حضرت فاطمۃ زہراؑ، حضرت خدیجۃ کبریٰ اور ہادی عالم کے فرزند تھے۔ لیکن اس کے معنی کیا تھے کہ میں مکہ و منیٰ یا مروہ و صفا کا بیٹا ہوں۔ کیا یہ چیزیں شعائر اللہ میں داخل نہ تھیں۔ کیا یہ چیزیں بہترین مذہبی روایات میں ملفوف نہ تھیں۔ کیا اس سے ایک زمانہ سے مسلمانوں کے فرض رسومات وابستہ نہ تھے۔ اور کیا یہ رسول اللہ کی تصدیق کردہ نہ تھے۔ اور کیا انھیں کا خاندان اس کا محافظ نہ تھا۔ اب ان چیزوں کا اپنے کو بیٹا کہنا ایک طویل زمانہ کی تاریخ، احکام، خدمات، محافظت، رسومات مذہبی، قلبی تعلق اور میلان کی یاد دہانی تھی۔ ایسی بلیغ فصاحت اور ساتھ ہی ایسی واضح طریقہ سے اثر کرنے والی کسی اور لفظ سے ظاہر نہیں کی جا سکتی تھی۔

اب بھی استعارے تھے لیکن اس کے بعد غالباً امام کی آنکھ یہ دیکھ چکی تھی کہ لوگوں کی توجہ اور قلب

کس درجہ پر تھا۔ غالباً پیمانہ چھلکنے کی حد پر آ گیا تھا۔ دل بھر آئے تھے۔ پلکوں نے آنسوؤں کو روکنے سے عجز ظاہر کر دیا کہ امام کی مُختار صدا کانوں میں جاتی ہے کہ: "میں اس امام کا بیٹا ہوں جو ظلم سے شہید کیا گیا۔ جس کا سر گردن کی طرف سے کاٹا گیا۔ جو پیاسا شہید کیا گیا۔ جو کربلا میں شہید کیا گیا۔ جس کا عمامہ اور چادر دشمنوں نے چھین لیے"۔

بارہ صدیوں کے زمانہ اور مقامی فاصلہ نے میرے حس کو اس قدر کمزور نہیں کر دیا ہے کہ میں ان آہوں کراہوں چیخ اور ہچکیوں کو نہ سن سکوں جن کی لہروں نے اس وقت دمشق کو زیر و زبر کر دیا تھا۔ یہ چیخیں عالم اسیری میں مل گئیں۔ اور ان کی تھراہٹ یا جھنجھناہٹ معدوم نہیں ہوئی۔ کچھ تھا اور وہ کچھ یہ تھا کہ تمام دمشق اس وقت ایک عزا خانہ تھا۔ لوگ تھے جو رو رہے تھے۔ بہت سے اس متعدی غم سے متاثر ہوئے تھے۔ اگرچہ ان کے کانوں میں امام کی آواز نہ پہنچی تھی۔ بہت سے حیران تھے اور نہ جانتے تھے کہ ایک مظلوم کی روح اور ایک مظلوم کی زبان نے دمشق پر کیا کر دیا ہے۔ ہاں دمشق نے ایک منظر اندوہ اس کے قبل دیکھا تھا۔ جب کہ شرفائے یہود گرفتار کر کے لے جائے جاتے اور ریا ستر برس کی غلامی کے بعد واپس ہوتے اور خوشی کا رونا روتے۔ لیکن کبھی دمشق یا اس کے علاوہ کسی شہر نے ایسی مجلس عزا نہیں دیکھی تھی۔ کیونکہ زمانہ نے کبھی ایسے اتفاقات فراہم نہیں کیے تھے۔

تم یا کوئی کہے گا کہ متذکرہ صدر سطریں میرے عالم تخیل کا نتیجہ ہیں۔ تخیل کے معنی اگر خیال کی آنکھ سے حقیقت بینی ہے تو مجھے اس کا فخر ہوگا لیکن اگر اس کے معنی خلاف واقعہ شاعری ہے تو میں یزید کی بے چینی اور مصالح کی ایجادیں دکھادوں گا۔ اور بس میں جواب دے چکا۔ دیکھو کہ یزید کی مصلحت یہ ہے کہ وہ آگ کو آگ سے بجھانا چاہتا ہے یعنی فرزند رسولؐ کا اثر زائل کرنے کے لیے وہ رسولؐ کے احکام کی مدد لے رہا ہے۔ یعنی وقتی توجہ حاصل کرنے کے لیے وہ اذان دلوا رہا ہے۔ اور اس طرح یا تو لوگوں کا خیال بدل رہا ہے اور یا توجہ کو مُعلق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن امام منبر پر تھے اور ابھی انھوں نے اتر آنے کا تصفیہ نہیں کیا تھا۔ اور اس طرح موقع کو اپنا کر لیا کہ گویا یزید نے امام کو یہ موقع ملنے کے لیے یہ تدبیر کی تھی۔ مؤذن اشہد ان محمداً رسول اللہ کہتا ہے اور اب امام اپنی خاموشی توڑتے ہیں اور تمام قوت سے مؤذن کو مخاطب کر کے خدا کا واسطہ دیتے ہیں کہ وہ ٹھہر جائے۔ رکا مؤذن۔ اور اب امام پوچھتے ہیں کہ "اے یزید بتا کہ محمد جن کا نام اذان میں لیا جا رہا ہے وہ تیرے نانا ہیں یا میرے"۔ کیسے یزید نہ کہتا کہ یہ تمھارے نانا ہیں۔ سوچو کہ یزید نے کس بشرہ سے جواب دیا ہوگا اور اب امام کہتے ہیں کہ: "جب تو جانتا تھا تو پھر کیوں تو نے ان کی اولاد کو قتل اور ان کے حرم کو قید کیا"۔ اور نتیجہ یہ تھا کہ لوگ رو رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے کہ: "یہ واقعہ اسلام کے لیے ایک بھاری مُصیبت ہے"۔ اور دیکھو کہ یزید لوگوں یعنی امام کا خطبہ سننے والوں سے کہہ رہا ہے کہ "تم نے میرے ملک کے زوال کا ارادہ کیا تھا"۔ اور یہ کہتا ہوا محل میں بھاگا جا رہا ہے۔ نماز پڑھنے یا پڑھانے کے لیے بھی موجود نہیں ہے۔ بلکہ اجزائے قرآن پاشان کرتا ہے کہ لوگ اس کے چننے میں مشغول ہوں۔ جماعت کھڑی کراتا ہے کہ لوگ نماز میں مشغول ہو جائیں۔ اس کے بعد سوچو کہ کون فتح یاب ہوا۔ اور اب بھی کسی اشارہ کی ضرورت ہو تو دیکھو کہ یزید محل میں ہے۔ امام کا سر مبارک رکھا ہے۔ یزید جھکا ہے اپنے منھ پر ہاتھ رکھے ہے اگر طمانچے نہ بھی مار رہا ہو اور کہہ رہا ہے کہ "مجھے کیا ہوا تھا کہ میں نے حسینؑ کو قتل کیا"۔

اور اشارہ کی ضرورت ہو تو دیکھو کہ اہلِ بیتؑ کے قید خانہ کا کوئی محافظ اس وقت کا ایسا بھی مُسلمان نہیں ہے۔

رومی ہی تھے۔ اور میں نے تو یہ بھی سنا ہے (میری ذاتی تحقیق نہیں ہے) کہ یزید نے رومی سپاہی بھی حضرت سے لڑنے کے لیے بھیجے تھے۔

ان باتوں کے بعد جو کچھ ہو چکی تھیں کسی طرح یزید کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ اہل بیتؑ پر کسی مزید تشدد کو جائز رکھ سکتا۔ پھر اس نے غالباً ایک آخری کوشش کی کہ اپنے کو قتل حسینؑ کے الزام سے بری کر کے معاملہ کسی دوسرے کے سر تھوپے۔ اور اس لیے اس نے ان تمام لوگوں کو بلایا جو قاتلان حسینؑ کہے گئے تھے۔ لیکن ان میں سے کسی نے یہ کہہ دیا کہ قاتل حسینؑ وہ ہے جس نے جھنڈے نصب کیے۔ مال دیا، ترغیب دی، دھمکایا اور لالچ دی۔ اب یزید کے لیے کیا چارہ تھا بجز اس کے وہ اہل بیتؑ کے ساتھ اظہار نرمی کرتا۔ اور اس طرح لوگوں کے خیال کی شدت کو روکتا۔ زمانہ نے بتایا کہ یزید نے بہت دیر کی تھی اور جو کچھ وہ کر چکا تھا اس نے جس انقلاب کا بیج بو دیا تھا وہ ضائع ہو جانے والا نہ تھا۔

کہا گیا ہے اور میں اسے صحیح باور کرتا ہوں کہ اہل بیتؑ رسالت بیس صفر کو کربلائے معلی میں پہنچ گئے تھے۔ اس کا حساب یہ ہے کہ عمرو بن سعد گیارہ محرم کو کربلا سے چلا۔ بارہ کو اہل بیتؑ کوفہ میں تھے اور کوفہ کی جو حالت تھی اس کے لحاظ سے کسی طرح یہ قرین مصلحت نہ تھا کہ ابن زیاد اسیران آل محمد کو کوفہ میں مقیم رکھتا۔ اس بنیاد پر غالباً تیرہ کو قافلہ دمشق کی طرف چلا اور تیرہ دن میں دمشق پہنچا۔ یعنی چھبیس کو دمشق میں موجود تھا۔ اس کے بعد روایتیں ہیں کہ اہل بیتؑ چھ دن دمشق میں رہے۔ یعنی تیسری صفر کو دمشق سے کربلا کی طرف روانہ ہوئے۔ اس طرح وہ کربلا میں سترہ تاریخ کو پہنچ جاتے ہیں۔ تین دن جو بچتے ہیں یا تو ان میں کا کوئی حصہ کہیں زیادہ صرف ہوا یا کوفہ اور دمشق میں ایک ایک دن زیادہ قیام کیا گیا۔

اہل بیتؑ نے کربلا میں پہنچ کر جو کچھ دیکھا یہ ایک تیسری صورت تھی۔ کبھی انھوں نے اپنے عزیز ترین رفقا کو موجود اور اپنا محافظ دیکھا تھا۔ کبھی انھیں خاک و خون آلود اور خاموش دیکھا۔ آج قبروں کے نشان دیکھتے ہیں۔ ان کے اس وقت کے عالم کا قیاس ممکن نہیں ہے۔

اس سے کچھ کم مدینہ کا داخلہ نہ ہوگا۔ بشیر کا بھیجا جانا اسی غرض سے تھا کہ اہل مدینہ کے درجہ احساس کا اندازہ کیا جاتا۔ جو کچھ ہوا ایسا نہیں ہے کہ اس پر حیرت کی جائے۔ مجمع کو دیکھ کر امام نے جو خطبہ فرمایا وہ بجز تسلیم و رضا اور اپنے درجہ اثر کے اور کسی بات کا مظہر نہیں ہے۔ جو کچھ ہو چکا تھا اس کا اندازہ امام کے اس فقرہ سے زیادہ کسی لفظ یا عبارت سے نہیں ہو سکتا کہ "اگر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمارے قتل کا حکم دیا ہوتا تو لوگ اس سے زیادہ نہ کر سکتے جو کچھ کیا گیا"۔

اجاڑ گھروں نے اپنے رہنے والوں اور رہنے والوں نے اپنے اجاڑ گھروں کو دیکھا۔ گھروں نے وہ کل باتیں یاد دلا دیں جن سے ان کی آبادی کی زینت تھی۔ وہ گھر جو کبھی آرام دے سکتے تھے اب ان کے بعد جن کی قبریں کربلا میں بنی تھیں ذریعہ غم بن گئے تھے۔ صرف یہ دیکھ لو کہ اہل بیتؑ مسجد رسولؐ کے دروازہ اور قبر مطہر سے فریاد کر رہے ہیں اور لپٹ رہے ہیں۔ بجز ان خاموش چیزوں کے اور کوئی نہ تھا جن سے یہ اپنا درد دل کہتے اور نہ کسی میں اتنا صبر تھا کہ ان کا قصہ اندوہ اس طرح سن سکتا۔

داؤد کے ایسے مستند شجاع نے اپنے حرم کو ایسا نہ بنایا تھا جن کی اسیری نے ان کے افتخار کی کوئی یاد قائم رکھی ہوتی۔ لیکن خاتم النبیینؐ کی ان یادگاروں نے اپنے کو مجبوریوں میں ایسا دکھایا جیسا کوئی قوت و اختیار میں اپنے کو نہیں دکھا سکتا۔ انھوں نے غیرت و شرافت کا مرتبہ بلند کر دیا۔ ان کی مختصر تعریف یہ ہے کہ یہ حسینؑ کے پس ماندہ تھے۔ جنھیں حسینؑ

اپنی مصلحت کا ذمہ دار بناتے اور جن پر اعتبار کر سکتے۔ سچ مچ انھوں نے وجہ حسینؑ کو پورا کر دکھایا۔ بلکہ اس کی مخفی حقیقت کو روشن کر دیا۔ ان کا مرتبہ لوگوں کو پہچنوا دیا۔ اور یہ دکھا دیا کہ ہمیں حسینؑ نے ایسا بنایا ہے، جیسے ہم ہیں۔
ہم نہیں ہیں مگر یہ کہ حسینؑ کے خصائل ہم سے روشن ہیں۔ تم پر سلام ہو اے آل محمدؐ ہر اس شخص کا
جسے انسانی نفس کی بلندی اور شرافت کی قدر ہے۔ تم سے ہر شریف ہمدردی کرے گا
وہ کسی قوم کا کیوں نہ ہو۔ شرافت تم پر ناز کرے گی۔ جب تک دنیا میں
اس لفظ کا وجود رہے گا' اسلام مخدوش وقتوں
میں اپنے بیٹے اور بیٹیوں کو تمھیں دکھائے گا
اور بس جس کی درازی
مدت کو تم نے ابد
سے پیوست
کر دیا

○

باب ہفت دہم

(حسینؑ)

اس باب کے شروع کرنے کے ارادہ کے ساتھ مجھے خیال ہوتا ہے کہ میں ناظر سے یہ سفارش کروں کہ وہ حصہ اول کا باب ہفتم ایک مرتبہ پھر پڑھ لے۔ جس میں میں نے حسینؑ کے نشوونما کا رجب سنہ ۶۰ھ تک تذکرہ کیا ہے۔ پیش نظر باب اسی کا سلسلہ ہے۔

یاد دہانی کے لیے اس قدر کہنا مناسب ہوگا کہ اس وقت تک حضرت امام حسین علیہ السلام جن اتفاقات میں بسر کر رہے تھے اور ایک زمانہ تک جن نفوس قدسیہ کے سایہ میں حسینؑ کی ہر حیثیت کی تعلیم ہوئی تھی اس نے یہ کہنے کی جگہ نہیں چھوڑی کہ ہجرت مدینہ کے بعد سے جو واقعات پیش آئے ان کے متعلق حضرتؑ کو تجربہ نہ تھا۔ یا مماثل واقعات ان کے اثر، دشمنوں کی مصلحت، درجہ عداوت اور ان کے طبائع سے حسینؑ واقف نہ تھے۔ بلکہ اتفاقات زمانہ نے حضرتؑ کی چھپن برس چار مہینہ کی عمر میں جس قدر انواع کے واقعات پیش کیے تھے اور انھیں حضرتؑ کی ذات سے جیسا تعلق تھا کم ایسے انسان ہیں، جنھیں اتنی مختلف قسموں کے واقعات سے سابقہ پڑا ہو۔ اور اب حضرتؑ اس حالت تک پہنچ گئے تھے کہ ان کے افعال تقلیدی حیثیت سے بڑھ کر عین خاصہ کا اظہار سمجھے جاتے۔

اس زمانہ تک نہ صرف حضرتؑ کا شخص، خاصہ، صفات اور روایات، کافی حد تک شہرت پذیر ہو چکے تھے بلکہ اتفاقات نے ابتدا ہی سے اس کا اہتمام کیا تھا کہ حسینؑ کے عدم تعارف کی کسی کو شکایت نہ ہو سکتی۔ وہ کسی حیثیت کا تعارف کیوں نہ ہوتا۔ صفاتی ہو یا شخصی۔ کون جانے کہ ابتدا ہی سے حسینؑ کے تعارف سے مشیت الٰہی کا اقتضا یہ تھا کہ ان کی عظیم الشان شہادت کے بعد ایک بڑے حصہ ملک کی بڑی جماعت اس طرح ان کے افعال اور نتائج کو سنے کہ واقعات کے سننے کے ساتھ ہی ان کا روئے مبارک آنکھوں کے سامنے آجائے اور کہے کہ ہمیں ہیں جس کے تم نے حالات سنے ہیں۔

کون تھا جس نے رسولؐ کو دیکھا تھا اور حسینؑ اس کی آنکھوں سے پوشیدہ ہوتے۔ کیا بازاروں، محلوں اور فوجی مواقع نے حسینؑ کو رسولؐ کا آویزہ دوش نہ دیکھا تھا۔ کیا جماعتوں، مسجد، اور نماز نے حسینؑ کو رسولؐ کا جزو جسم نہ دیکھا تھا۔ کیا غیر قوموں نے اس کا طعنہ نہ دیا تھا کہ آپ لڑکوں سے جس طرح محبت کرتے ہیں وہ ہماری عادت سے زیادہ ہے۔ کیا مباہلہ میں نہ تھے اور کیا حسینؑ ایسے موقع پر رسولؐ کے دست اقدس، پہلو اور آغوش میں نہ تھے۔ جس وقت رسولؐ یہ فرماتے تھے۔ تعارف کے لیے فرماتے تھے کہ یہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ یا یہ سردار جوانان بہشت ہے۔ یا میرا ریحان ہے۔ اس کی محبت کرو۔ کیا یہ حسینؑ نہ تھے، جنھیں رسولؐ دست مبارک سے تھام کر بلند کرتے تھے۔ اپنی زبان دکھاتے تھے۔ اور حسینؑ اس کی سرخی دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ بلکہ زبان چوستے تھے۔ اور کیا ان لوگوں نے حسینؑ کو

رسولؐ کے سینہ اقدس پر نہ دیکھا تھا جو لوگ ہادی برحق کے عالم ارتحال میں عیادت کے لیے آئے ہوں۔ اور وصیتیں نہ سنی ہوں۔ بے شک دیکھا اور سنا تھا۔ اور بے شک حجۃ الوداع کے موقع پر اک لاکھ سے زیادہ بدوی اور شہریوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا تھا۔ اور اس طرح ان کی شہرت نہ صرف مشہور بلکہ غیر معروف دروں، مواضعات اور ریگستانوں میں ہوتی تھی۔ اور مدینہ اور مکہ کا بچہ بچہ تمام حجاز کا پہچانتا تھا۔

بے شک رسولؐ کے بعد ایسے مواقع پیدا ہوتے جس سے ان کی منزلت اور شہرت اپنے فطری موقع سے دور افتادہ ہو جاتی لیکن کیا عدالت اور انصار کے محلوں نے انھیں نہ دیکھا تھا اور پھر کیا اس کے بعد منبر نے یہ نہ سنا تھا کہ تمہارا ہے۔ اور کیا یہ حسینؑ ہی نہ تھے جسے شہربانو پہچانتی۔ اگرچہ کسریٰ کی بیٹی نے شاہزادہ کونین کو کبھی دیکھا نہ تھا؟ لیکن ایک بادشاہ کی بیٹی شرافت اور جلالت سے واقف تھی۔ اب وہ ایک ایسی شرافت اور جلالت دیکھ رہی تھی جس کا مطیع بننا اسیری میں شاہی سے زیادہ خوش آیند تھا۔

صرف یہی نہ تھا بلکہ موقع یہ بھی آنے والا تھا کہ کوفہ حسینؑ کو فرزند امیرالمومنینؑ کی حیثیت سے پہچانتا۔ اور پھر فوجیں ہوتیں جو حسینؑ کو اپنا افسر دیکھتیں اور فوجیں ہوتی جو اپنے مقابلہ میں حسینؑ کو دیکھتیں کہ وہ بہادر سپاہیوں کے سر پر ہیں۔

اور پھر کتنی مرتبہ حسینؑ نے پیدل حج کیے تھے۔ اور ان کے خصائل کی مقامی شہرت جس حیثیت کی تھی وہ ان کے پہچنوانے میں کافی سے زیادہ معین تھی۔ اور اگر اب بھی کسی کو حسینؑ سے عدم تعارف کی شکایت ہو تو کیا یہ نہ تھا کہ جس وقت اہل مدینہ نے ولید بن عتبہ کے نام یزید کا حکم اور حسینؑ کا انکار اور جلاوطنی سنی تھی اس وقت بھی حسینؑ پوشیدہ رہ سکتے تھے۔ پھر مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کربلا کے سلسلہ مقامات نے کوئی آباد یا غیر آباد مقام چھوڑا تھا جہاں حسینؑ کا نام مخفی رہ سکتا۔ یہ بھی سہی کیا یہ نہ تھا کہ حضرتؑ نے کوفہ و شام کے لشکروں کے سامنے کئی مرتبہ کئی تاریخوں میں اپنا تعارف کرایا۔ اور پھر کیا یہ نہ تھا کہ حضرتؑ کے سر مبارک نے کربلا سے دمشق تک ہر ایک کو پہنچوا دیا کہ ہم کون ہیں۔ عبرت خیز ہے کہ حسینؑ کی جلاوطنی زندگی ہی تک محدود نہ تھی بلکہ انھیں شہادت کے بعد بھی سیکڑوں میل چلنا تھا۔

آیا یہ شہرت بے سود تھی؟۔ اس سے میں دو حالتیں سمجھانا چاہتا ہوں۔ ایک حیات کی اور ایک بعد شہادت۔ حسینؑ کی حیات کا تعارف مدینہ سے کربلا تک کچھ پکار رہا تھا۔ اس طرح جس سے قوی تر زبان اور قوی تر الفاظ میں سمجھانا انسان کے امکان سے باہر تھا۔ اور وہ یہ کہ لوگ دیکھتے ہیں کہ نواسہ رسولؐ اپنے جد نامدار کے حرم اور حرم خدا میں نہیں رہ سکتا اس لیے کہ نہیں رہنے دیا جاتا۔ لوگ وجہ جانتے ہیں اور خاموش ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی قوم کے احساس عزت و شرافت، ملت اور مذہب کی مغلوبیت کی کوئی اور مثال تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس پر راضی تھے کہ ملت و مذہب کا یزید کا ایسا بھی عنانگیر ہو سکتا ہے اور باوجود اس کے کہ ہمارے ہر حیثیت کے محسن کے اصول، اہل بیت اور وارثان خصائل پر کچھ ہی کیوں نہ کیا جائے لیکن اس ظالمانہ دست برد پر بھی ہمیں کسی تیغ اور چشم کشائی کی ضرورت نہیں ہے۔ سوچا جا سکتا ہے کہ قوم اب ایک لاش تھی جس پر اس قدر مٹی ڈالی جا سکتی تھی جس قدر مٹی دینے والے چاہیں۔ قیاس ممکن نہیں ہے کہ کسریٰ اور قیصر نے اپنی مفتوح قوموں کو اس حد تک کچلا ہو کہ ان کی زبان سے لفظ گر گئے ہوں۔ ان کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی ہو۔ اور ان کے کانوں نے سماعت کو طلاق دیا ہو۔ ان کے دل اس حالت میں پہنچ گئے ہوں جس کے بعد

حرکت کا سکون اور موت ہے۔ اور یہ وہ قوم تھی جسے سکھایا گیا تھا اور ہر شخص سیکھ گیا تھا کہ ہم پر کسریٰ و قیصر کے برتاؤ نہیں ہو سکتے۔ ان میں کا ہر شخص جزو حکومت اور صلاح دینے کا مجاز سمجھا جاتا تھا۔ اور اسے بخلاف راست اپنے والیان امرے اپنے دکھ درد کہنے اور رفع شکایت کا استغاثہ کرنے کا حق تھا۔

حسینؑ کے تعارف کا دوسرا اثر یہ تھا کہ وہ اپنی کامل مردم شناسی، اور موقع شناسی سے جو انھیں قوم کے متعلق حاصل تھی اور ان حالتوں کے علم کی بنیاد پر جس میں قوم کے بسر کرنے کا انھیں ایک زمانہ سے تجربہ تھا۔ انھوں نے اپنی شہادت میں دیر کی۔ یعنی اپنے مصائب کو بجائے اس کے کہ فوراً شہادت سے منقطع کردیں یہ گوارا کیا کہ ہم اپنے مصائب کے سلسلہ کو طویل کردیں جس کا درجہ اور زمانہ ہمیں اس میں مدد دے کہ ہم مخلوقات خدا کے ایک کافی حصہ کو نہ صرف اپنے غیر بلکہ اپنی روش سمجھا کر سمجھنے میں مدد دیں۔ حسینؑ اس میں کامیاب ہوئے۔ کوئی شخص جس میں حسینؑ کا ایسا استقلال ہوتا اور وہ یہ روش اختیار کرتا کامیاب ہوتا۔ اس لیے کہ حسینؑ نے مظالم پر صبر اور اچھی روش پر اصرار کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ بجز اس کے کہ انسان کے دل کی حرکت کو اپنے موافق کرلیتا اور کوئی نتیجہ نہ پیدا کرسکتا تھا۔ اور چونکہ یہ صبر و استقلال غیر معمولی حالتوں میں ایسا غیر معمولی تھا جس کی مثال انسانی نفس کی تاریخ میں مفقود ہے۔ اس لیے اس نے اثر بھی ویسا ہی عظیم الشان کیا۔ خدا نے ایک ہی حسینؑ پیدا کیا تھا۔ یقیناً دنیا میں مرتی ہوئی اسلامی طاقت کو نہ مرنے دینے کے لیے کوئی علاج ہی نہ رہ گیا تھا۔ بجز اس کے کہ وہ جس میں رسولؐ کے استقلال، رسولؐ کا جوش ہدایت، اور رسولؐ کی صفات کا ورثہ تھا اس آمادگی کی جرأت کرتا کہ ہم اپنی عبرت خیز شہادت اور ناقابل برداشت مصائب سے لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مائل کرلیں گے۔ مائل اس لیے نہیں کریں گے کہ ہم خلافت رسولؐ کے مالک ہو کر کسریٰ و قیصر کے سے برتاؤ کریں بلکہ اس لیے کہ اپنے کو فنا کرکے رسولؐ کی حقیقی حکومت یعنی احساس مذہب کو زندہ کردیں۔ جس کے معنی خدا شناسی، خدا کا خوف، امورات معروف کی پیروی منکر سے اعراض، انسانی ہمدردی، انصاف، رحم اور حقوق عباد کا سمجھنا ہے۔

اسے بھی جانے دو کہ حضرتؑ نے کوئی نزاعی روش اختیار نہیں کی اور وہ اس پر مجبور کیے گئے کہ دفاع کے لیے کچھ راستے تلاش کرتے اور فرض کرو کہ جب لوگوں نے سنا کہ حسینؑ شہید ہوگئے تو شہادت کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ حسینؑ نے یزید سے خلافت لے لینے کا ارادہ کیا تھا۔ یزید اپنے کو اپنے موقع پر قائم رکھنے کے لیے مجبور تھا کہ جنگ کرتا۔ اور اس جنگ میں ایک طرف کو شکست ہوئی اور وہ طرف حسینؑ تھے۔ اب اس کے بعد میں پوچھتا ہوں کہ کیا تمام حجاز، عراق عرب، عرب، شام، مصر اور ایران یہ سوچ سکتا تھا کہ حسینؑ نے اس لیے حکومت پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ وہ یزید کی طرح یا یزید سے سخت تر قیود کے ساتھ حکومت کرتے۔ اور وہ یزید کی طرح منہیات میں مشغول ہوتے؟۔ ہر شخص جسے اس خاندان کی طرز حکومت، طریقہ، روش، خصائل، اور معاملت کا علم ہے وہ بجز اس کے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ لوگوں کے نزدیک یہ سوچنا محال تھا کہ وہ ہمارے اوپر اس طرح حکومت کرتے کہ ہم شکنجوں میں کسے رہتے۔ ہمارا مغز کھاتے رہتے اور ہم وہ ذرائع ہوتے جسے حکومت اپنی ضروریات کے لیے کام میں لاتی رہتی۔ جس طرح اس کے اغراض اور اس کے مدبرین کے مصالح کے نزدیک مفید ہوتا۔ مشیت ایزدی کا مقتضا یہ تھا کہ کیسی ہی کم وقت کے لیے کیوں نہ ہو لیکن لوگ ہادی برحق، فاتح عرب اور حسن مجتبیٰ کے طرز حکومت اور خلق اللہ کے ساتھ برتاؤ کو دیکھ چکے ہوتے۔ اور جانتے۔ بغیر جانے نہ رہ سکتے کہ انھوں نے کبھی اپنے لیے کچھ نہیں کیا۔

اپنے لیے جو کی بھوسی لگی ہوئی روٹی بھی نہ رکھی وہ اسباب آرائش، زینت و لطف کیا رکھتے۔ جس میں سے کسی غریب چند غریبوں یا ایک جماعت انسانی کے خون کی بو آتی ہو۔

تو حسینؑ کی شہادت کی غرض کسی کے نزدیک دنیا طلبی کے مفہوم میں حصول خلافت ہو یا نہ ہو، ان کے اور ان کے خاندان کے متعلق ہر حیثیت کا تجربہ اس سے انکار کر رہا تھا کہ ان کا طرز حکومت ایک ایسے بادشاہ کا طرز عمل بھا جاتا جو خدا اور مخلوقات کسی کو اپنے اپنے افعال کا جوابدہ نہیں سمجھتا۔ بلکہ اس کا تجربہ تھا کہ ہم مساوی رعایت، عدل، حق روی اور تحفظ حقوق کی یقینی امید کر سکتے ہیں تو پھر وہ جو حسینؑ سے لڑنے آئے تھے وہ اس غرض سے نہ آئے تھے کہ ہم ایک آنے والی مصیبت کو دور رکھنے کے لیے اپنے تمام قوائے ذہنی و جسمانی اور تمام اسباب ظاہری سے مدافعت کریں۔ نہیں۔ تو کیا یہ تھا کہ وہ لوگ جو حسینؑ سے لڑ رہے تھے وہ اپنے فوائد کے تحفظ کے لیے اس کے کوشاں تھے کہ حسینؑ کو درمیان سے ہٹا دیں؟ بلاشبہ۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہم ایسی حکومت کرنا چاہتے ہیں جو ان کی مثالیہ حکومت اور ہر اس شخص کے نزدیک جو طرزِ حکومت کی کوئی منصفانہ صورت پیش کرے قطعی نفی ہو۔ ہم وہ چاہیں اور کریں جسے ہمارے درجہ عقل، اخلاق تخیل اور روایات قومی سے مناسبت ہو جس کی شرح زمانہ نے کی کہ ہم عامہ ناس کو جاہل اور بے تعلق رکھیں، ان کی زبانیں سی دیں۔ انھیں اپنے طرز عمل کی طرف نگاہ اٹھانے کا مستحق نہ سمجھیں۔ بلکہ بدترین قسم کی غلامی میں مبتلا رکھیں۔ اور ان تمام باتوں کو جنھیں زمانہ دراز کے تجربہ نے کسی حیثیت سے اچھا سمجھا ہو ہمارے نزدیک کوئی مجبوراً تتبع کی چیز نہ ہو بلکہ ہم ان تمام باتوں میں بھی کسی کے جواب دہ نہ ہوں جسے عالم کے تجربہ نے برا سمجھا ہو۔ حسینؑ کو اس لیے اٹھا دیں کہ وہ نہ صرف وہ مرکز ہیں جو ایک بہترین مثالیہ حکومت یاد دلاتا ہے۔ بلکہ ان کی ذات وہ زبان ہے جو خاموشی میں بھی ہماری روش کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حسینؑ کے خلاف کوششیں کرنے والی جماعت، جماعت حکومت تھی۔ جس نے خلق اللہ کے جسم کو زمین پر لٹا دیا تھا اور اپنے ناخون اس طرح اس کے جسم میں چبھو دیے تھے کہ اس جسم کو حرکت کی جرأت اسی وقت ہو سکتی تھی جب وہ اس پر آمادہ ہو جائے کہ ہماری حرکت ناخونوں کے فشار کو اور تیز کر دے۔

ان حالتوں کا صحیح احساس تھا جس نے حسینؑ کے خاصہ بلند میں اموی حکومت سے انتہائی نفرت کے ساتھ خلق اللہ کے ساتھ ایک ناقابل بیان جوش ہمدردی پیدا کیا۔ اور وہ اس پر آمادہ ہوئے کہ اگر دبے ہوئے مخلوقات میں یہ جرأت نہیں ہے کہ کچھ کہہ اور کر سکے تو ہم میں یہ جرأت ہے کہ ہم اموی ناخونوں کے فشار کا مقابلہ کریں اور اسے اس حد تک برداشت کریں کہ ظلم کا ذخیرہ ختم ہو جائے لیکن ہمارے صبر اور برداشت کا ذخیرہ ویسا ہی ناقابل اختتام ثابت ہو۔ یہ مدینہ طیبہ میں بھی ممکن تھا۔ لیکن اگر حسینؑ نے اسے مدینہ ہی میں گوارا کیا ہوتا تو وہ اعلان جو ان کی مسلسل جلا وطنی سے ہوا نہ ہوتا۔ اور لازماً وہ جوش ہمدردی نہ پیدا ہوتا۔ حسینؑ پر اعتراض ہوتا کہ انھوں نے باوجود اس صورت کے کہ انھیں اپنے بچانے اور چلے جانے کا اختیار تھا خہلکہ سے بچنے کی کوشش نہ کی اور پھر اگر حسینؑ کی شہادت کے بعد مدینہ طیبہ کا وہی حال ہوتا جو مسلم بن عقبہ کے ہاتھوں ہوا، تو کہا جاتا کہ حسینؑ نے اس آنے والی مصیبت کا خیال نہ کیا تھا۔ یقیناً ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی مدینہ سے فوراً چلے جانے کی کہ ہم ان مقامات کو جو ہمارے جد بزرگوار کے یاد دلانے والے ہیں انھیں دشمنوں کے کسی دستبرد

کے حوالہ نہ کریں۔ اور اگرچہ اس امر خاص کے متعلق حسینؑ کا کوئی خیال تاریخ میں موجود نہیں ہے لیکن مماثل واقعہ نے قوی استنباط کی جگہ چھوڑی ہے جو کچھ ان حضرتؑ نے مکہ معظمہ سے روانگی کی وجہ میں ارشاد فرمایا۔

ایک خود غرض اور بے رحم بلکہ قابل ستائش احساسات کو اپنے فوائد کے لیے عمل ڈالنے والا مدبر یہ کر سکتا کہ وہ مدینہ طیبہ یا مکہ معظمہ ہی میں اپنے لیے کچھ کرتا۔ اس لیے کہ وہ اپنی حیات کے لیے لوگوں کے احساسات میں پناہ لیتا۔ اور مختلف مقامات کے تقدس اور ان کی یاد کو اپنی سپر قرار دیتا لیکن حسینؑ نے یہ نہیں کیا۔ اس لیے کہ یہ سرتاج شجاعان عالم بجز خدا کی پناہ کے اور کسی پر بھروسا کو اپنی غیرت کے منافی سمجھتا تھا اور ان چیزوں کا احترام جیسا تھا وہ بجز اس کے اور کوئی فیصلہ نہ کرا سکتا تھا کہ اسے قائم رکھو۔ اگرچہ اپنی ذاتی بے حرمتی دشمنوں کے ہاتھوں ہو جائے۔ سچ ہے اگر حسینؑ روضہ مقدس نبوی اور کعبۃ اللہ کے قیام احترام کا ایسا لطیف لحاظ نہ فرماتے تو کون تھا جو حسینؑ کے بعد ان روح احساسات اسلامی کو اپنے لحاظ کا شایان قرار دیتا۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ حسینؑ ان مقامات متبرکہ کو اپنی حفاظت کے کام میں اس لیے بھی نہ لائے کہ جب ان مقامات کی بے حرمتی ہوگی تو لوگوں میں بے حرمتی کرنے والوں کے خلاف ایک ہیجان ہوگا جو ہمارے مفید ہوگا۔ اصول سیاست میں یہ امر مفقود نہیں ہے۔ لیکن میں حسینؑ کی اصول سیاست کا ذکر کر رہا ہوں۔ ایک عطر جو پاکیزگی، بلند حوصلگی، اور قربانی سے کھینچا گیا ہے۔

غور طلب ہے یہ امر کہ جو کچھ اہل مدینہ، اہل کوفہ اور ابن زبیر نے چند دنوں کے بعد کیا اگر وہ حسینؑ کی پیروی سے کرتے تو اس کا کیا نتیجہ ہوتا؟ بلاشبہ یہ نہایت آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ ہر زمانہ میں فوجی فتح و شکست صرف تعداد پر مبنی نہ تھی بلکہ اس کا ایک نہایت زبردست عنصر افسروں کا دماغ اور شجاعت تھی۔ اب اگر مدینہ یعنی مرکز مسلمین میں حسینؑ کو مسلمانوں کی تعداد کی مدد ملتی، اور عبداللہ بن غسیل ان کے لڑکوں، عبداللہ بن مطیع، معقل بن سنان اشجعی اور فضل بن عباس کے علاوہ کربلا کے بہتر شجاعوں کی بھی تعداد ہوتی تو فوجی جسم ایک فولادی دیوار ہوتی جو پیچھے کی طرف ہل نہ سکتی۔ لیکن جس میں آگے بڑھنے اور پھیلنے کی پوری قابلیت ہوتی؟ اور اسلام کا وہ روز بد نہ آتا جو آیا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے مفلوج جسم میں صرف شہادت حسینؑ ہی کی وجہ سے ذرا سی حرکت پیدا ہوئی تھی۔ یہ حسینؑ کی مثال تھی ورنہ بہت ممکن تھا کہ اگر حسینؑ نے یہ نہ کیا ہوتا تو اہل مدینہ یا کسی کو کان ہلانے کا بھی خیال نہ ہوتا۔ اور اپنے غلامانہ طرز عمل میں ایک ذلت اور بڑھا دیتے۔

خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ حسینؑ کی شہرت کس طرح کی تھی۔ ذاتی اور صفاتی۔ ذاتی سے میرا مطلب یہ ہے کہ لوگ نہ صرف حضرتؑ کے برگزیدہ نسبی تعلقات سے واقف تھے بلکہ ایک کثیر جماعت انسانی بھی روشناس تھی۔ اسی طرح تعارف صفاتی سے لوگ اس طرح واقف تھے کہ حضرتؑ کون سے نفوس متبرکہ کی یادگار ہیں۔ بلکہ خود حضرتؑ کونسی صفات کے مظہر ہیں۔ اس کا اثر سمجھنا دشوار نہیں ہے۔ جس کی مثالیں میں حصہ اول میں کافی حد تک دے چکا۔ لیکن مثال کی خصلت کرار کی یاد دہانی مفید ہوگی کہ یہ ایک مرتبہ نہیں ہوا کہ لوگوں نے دیکھا کہ حضرتؑ کس درجہ حلیم ہیں۔ حلم اس وقت جب کہ آپ کو سزا دینے اور گستاخیوں کی سخت باز پرس کرنے کا پورا اختیار تھا۔ لیکن حضرتؑ نے یہ دکھایا کہ ہم نہ صرف بڑے نفس شناس ہیں بلکہ انسانی کمزوریوں کو کس درجہ عفو کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ حضرتؑ کی وسیع دور بینی ایسے گستاخ یا بے خیالوں سے جو مستحق سزا تھے ایسی عنایت کا برتاؤ کرتی تھی کہ دفعتاً ان کا خاصہ بدل جاتا تھا اور اس وقت

انھیں نہ صرف حضرتؑ کے نفسِ عظیم سے تالیف حسی ہوتی بلکہ ان کی سمجھ میں یہ آتا تھا کہ ایسی حالتوں میں ایسا رحم و کرم بھی دکھایا جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی اس رحم و کرم عفو اور حلم کے لوگ اس کے قطعاً عکس میں ایک سخت جوش حضرتؑ میں پاتے تھے اور وہ جوش اس وقت ظاہر ہوتا تھا جس وقت کوئی شخص کوئی اصولی غلطی کرتا تھا۔ جوش سے اس جگہ میرا مطلب یہ ہے کہ جب حضرتؑ سنتے تھے کہ کوئی کسی اصولی غلطی کا مرتکب ہے اور حضرتؑ کا جواب نہ دینا اسے اپنی گمراہی پر مصر رکھے گا۔ تو حضرتؑ کیسی ہی صورت میں اس کے مناسب پہلو کے واضح کرنے سے اپنے کو باز نہ رکھتے تھے۔ اس کے لیے عبد اللہ ابن عمرو بن عاص کا مکالمہ یا معاویہ کی تقریر والا موقع اور لوگوں کا دریافت کرنا اور حضرتؑ کا حقیقت حال سے لوگوں کو واقف کردینا معاویہ سے مکالمہ اور بے خوف صاف گوئی، زمانہ حج میں خطبہ اور ایک ہزار کے قریب آدمیوں کو آئندہ کی آنے والی گمراہیوں سے مطلع کردینا۔ ایسی مثالیں ہیں جس سے واضح ہوگا کہ اگرچہ یہ مواقع ایسے تھے کہ صاحبِ اختیار گروہ اسے اپنے اظہارِ عداوت کے لیے ایک وسیلہ سمجھتا لیکن اس بازپرس کے خوف نے کبھی حضرتؑ کو خاموش نہیں کیا۔ اس لیے کہ اس وقت کی خاموشی ان کے حقیقی منصب کی نفی ہوتی۔ اور باوجود اس کے کہ آپ کی ذات اقدس سے لوگوں کی امید اور خیال وابستہ ہوسکتا کہ وہ اپنے گھر کے اصول کے بھلانے کے ذمہ دار ہیں لیکن پھر بھی حضرتؑ ہدایت کے مواقع کو ضائع کرکے اپنے منصب کا انکار اور اپنے جد بزرگوار کے اصول کی روح کو فنا کے حوالہ کردیتے۔

اس کے ساتھ ساتھ حضرتؑ کی ذات اقدس ایک ایسے لطیف ایسے شیریں اور ایسے دلکش حزم و احتیاط کی مظہر تھی جس سے الفاظ، انداز اور حرکات پر غور کرنے والے کے لیے بجز وجد کے اور کوئی حالت پسندیدگی کے قابل نہیں رہتی۔ ایک مدبر جس کے سامنے کوئی مسئلہ نہیں آتا مگر یہ کہ اس کی روشن نگاہ اس کے سارے جسم میں پھر جاتی ہے۔ ایک نقاد جو ناقابل غلطی فیصلہ کرتا ہے اور کمزوری کو روشن کردیتا ہے۔ ایک سیاسی رہنما جو تاریک اور مخدوش حالتوں میں محفوظ طریقہ تلاش کرلیتا ہے۔ ایک مصلح قوم جس کی آنکھ نہیں جھپکتی اور قوم کا وسیع جسم کسی حیثیت سے داغدار نہیں ہوتا مگر یہ کہ اس کی نگاہ فوراً اس داغ کو دیکھ لیتی ہے اور اس پر متنبہ کرنے کے لیے ایک طریقہ اختیار کرتی ہے۔ بلکہ ایک طریقہ اختیار کرتی ہے جو مجموعی حیثیت سے مفید ہو۔ ایک شہید جو خدا پر اس لیے ناز کرتا ہے کہ اس نے ایسے موقع پر اسی کو اس کا موقع دیا کہ وہ اس کی حکومت کا نقیب ہوتا۔ اور باوجود اس کے کہ انسان بغاوت کرتا اور اسے راہ سے ہٹانے کے لیے دنیا کی ہر ممکن مصیبت سے خوف دلاتا۔ لیکن وہ کہلوا دیتا کہ ہم اسی لیے بنائے گئے ہیں کہ آج یہ دکھادیں کہ کمزور انسان کس قدر قوی بھی ہے!۔

یہ باتیں میں محض تازگی کے لیے کہہ رہا تھا۔ ورنہ میں یہ سب کہہ چکا ہوں اور مثالیں دے چکا۔ اس وقت اسے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ سمجھنے میں مدد دوں کہ اس کا کوئی اثر مخلوقات پر تھا یا نہیں۔ بلاشبہ تھا۔ اگر حسینؑ کے خصائل رفیع کا اثر نہ ہوتا تو کیا ضرورت تھی کہ معاویہ کے اس تقریر کے بعد کہ حسینؑ نے مجھ سے بیعت کی ہے۔ لوگ حیرت زدہ ہوتے اور اس وقت تک لوگ اس کا یقین نہ کرسکتے جب تک دوبدو حضرتؑ سے دریافت اور تصدیق کرکے اپنی تسکین نہ کرلیتے۔ حضرتؑ نے کیا سمجھایا اور یقین دلایا۔ یہ کہ حضرتؑ نے نہ صرف فریب کو کھول دیا اور بتایا کہ ہماری ذات سے ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ بلکہ اپنے خصائل کی مستند قوت سے لوگوں پر یہ اثر کیا کہ معاویہ نے جس مفید اثر کا اہتمام کیا تھا۔ اس سے بدرجہا زیادہ برا اثر ہوا۔

یعنی حسینؑ کی ذات اقدس وہ رہنما ہوئی جو شاہی قوت کے مقابلہ میں لوگوں کے قلوب کو اپنی طرف سچائی سے نہ صرف مائل رکھتی بلکہ غلط روی سے باز رکھنے کا ذریعہ ہوئی۔ یہ حسینؑ ہی کے صفات اور خصائل کی شہرت تھی کہ قیس بن سعد بن عبادہ، حجر بن عدی اور شبیب بن نخبہ کے ایسے لوگوں کی نگاہیں حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کی طرف بعد صلح اٹھ سکتیں۔

یہ تھے حسینؑ جن کے لیے وقت آیا کہ یزید یعنی مجموعہ قبائح حسینؑ یعنی مجموعہ حسن سے اپنی اطاعت کا طلب گار ہوتا۔ اس طلب کے ساتھ ممکن نہ تھا کہ لوگوں کی نگاہ سے حضرتؑ کے خصائل کی طویل یاد فراموش ہو گئی ہوتی۔ عام اس سے کہ کسی میں حضرتؑ کی حمایت کی جرأت ہوتی یا نہ ہوتی۔ وقت آیا کہ حضرتؑ نہ صرف اپنی گزشتہ کی تجدید اور تصدیق کرتے بلکہ اس کا کمال دکھا دیتے۔

حاکم مدینہ کے پاس یزید کا قطعی حکم پہنچا۔ ولید کا تردد اور مروان یعنی اپنے رقیب اور دشمن سے صلاح لینے کی ضرورت مسئلہ کی اہمیت پر عکس ڈالتی ہے۔ یعنی ولید اس حکم کو ایسا نہیں سمجھتا جو اگرچہ اس کے حاکم کا حکم ہے۔ لیکن وہ بلا تردد نافذ کیا جا سکے۔ اس کی دو وجہ ہو سکتی تھیں یا دونوں تھیں۔ اولاً یہ کہ ولید مصلحت کی اس شدت کو خلافِ مصلحت سمجھتا تھا۔ ثانیاً یہ کہ وہ اس مصلحت کو نواسۂ رسولؐ کے خلاف نافذ نہ کر سکتا تھا۔ ثالثاً یہ کہ چونکہ یہ حکم نواسۂ رسولؐ کے خلاف تھا۔ نواسۂ رسولؐ کے موقع اور اثر کے مقابلہ میں یہ حکم بلا تردد نافذ نہ ہو سکتا تھا۔ مروان آتا ہے اور کہتا ہے کہ "حسینؑ ہرگز یزید کی بیعت اختیار نہ کریں گے۔ خدا کی قسم اگر میں تیری جگہ ہوتا تو حسینؑ سے کچھ بھی نہ کہتا۔ انھیں قتل ہی کر ڈالتا"۔ یا کہتا ہے کہ: "آلِ ابو تراب ہمیشہ کی ہماری دشمن ہے"۔ کہتا ہے کہ: "اگر تو نے جلدی نہ کی اور حسینؑ تیرے ہاتھ نہ آئے تو یزید کی طرف سے تیری حرمت اور مرتبہ کو نقصان پہنچے گا"۔ یہ فقرات کسی کے چند الفاظ نہ تھے۔ بلکہ یہ ایک زمانہ کی تاریخ تھی۔ اس میں ایک قوم کی روش بول رہی تھی۔ اس کا مثالیہ عزت و منقصت بول رہا تھا۔ اور حسینؑ اور ان کے خاندان کا طرز عمل کو میں آتا تھا۔

حسینؑ کی طلبی کے لیے آدمی جاتا ہے۔ حسینؑ یا مسجد میں ہی یا روضہ رسولؐ پر ہیں۔ عثمان کے نواسہ کے انداز میں بے وقت طلبی کی وجہ سمجھتے ہیں۔ وقت بھی رات کا ہے۔ حسینؑ کو معا خیال ہوتا ہے کہ معاویہ مر گیا۔ اور یہی عین واقعہ تھا۔ ابھی اہتمام روانگی نہ کیا تھا کہ دوسرا قاصد پہنچتا ہے۔ اور طلبی کی شدت سے حسینؑ سمجھتے ہیں کہ پہلی مرتبہ فوراً میرے نہ پہنچ جانے سے ولید کو شاید خیال ہوا ہو کہ میں نہ جاؤں گا اور اب قوت سے فرماتے ہیں کہ کوئی آئے یا نہ آئے میں آؤں گا۔ دوبارہ بھی قاصد کے ساتھ حسینؑ کو نہ دیکھ کر مروان کہتا ہے کہ وہ نہ آئیں گے۔ صرف ٹال دیا ہے۔ اور اب ولید کہتا ہے کہ حسینؑ بے وفا نہیں ہیں، جو کہتے ہیں اسے پورا کرتے ہیں۔

اتفاق یہ تھا کہ جس وقت قاصد پہنچا۔ حسینؑ اس وقت تنہا نہ ہوتے بلکہ ابن زبیر بھی موجود ہوتے اور اس وقت حسینؑ کی یہ گفتگو موجود ہوتی کہ معاویہ سے کیا عہد تھا۔ اور اگر اس نے یزید کو خلیفہ بنایا ہے تو امر اہم واقعہ ہوا ہے۔ نہ صرف بہ لحاظ عہد بلکہ اس لیے بھی کہ: "یزید شرابی جھوٹا اور علانیہ فساد کرنے والا ہے۔ ہم رسولؐ خدا کے اہلِ بیتؑ ہیں۔ ہم سے ایسی بات (بیعت یزید) وقوع میں نہیں آسکتی"۔ زمانہ مستقبل نے جانا کہ حسینؑ نے جو کچھ اس وقت کہا وہ ایک تصفیہ تھا جس میں کسی وقت گنجائش ترمیم نہ ہوئی۔

حضرتؑ کا اہتمام روانگی نہ صرف حضرتؑ کے تجربہ بلکہ دور اندیشی پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اور ایسے موقع پر ولید سے

گفتگو کا طرز حضرتؑ کے اطمینان کا مظہر ہے۔ مروان اینٹھتا ہے، اور انتہائی اقدام کی صلاح دیتا ہے۔ حسینؑ کی نگاہ اٹھتی ہے۔ آواز بلند ہوتی ہے اور مروان کی گردن اڑا دینے والی تلوار اس کی نیام ہی میں دفن رہ جاتی ہے۔ حسینؑ دار الامارت سے باہر تشریف لے آئے۔ اگرچہ حضرتؑ کی احتیاط اور استقلال نے برے وقت کو سامنے سے دور کر دیا لیکن صورت حال ایسی نہ تھی جو یہ نہ کہتی کہ معاملہ کس حد تک آپہنچا ہے۔

اس کے بعد حضرتؑ نے مدینہ سے روانگی ہی کا تصفیہ کیا۔ اولاً اس خیال سے کہ ہم اہل مدینہ کو اپنی مدد کے لیے بلا کر انھیں آمکروہ کی زحمات میں مبتلا نہ کریں۔ ثانیاً اہل مدینہ اس قدر غیر سپاہی اور اس قدر اثرات سے مسخ ہو گئے تھے کہ ان سے کسی مدد کی امید نہ تھی۔

اور اگر ان سے ایسی امید مدد ہو بھی جو مقامی ضرورت کے لیے کافی ہو تاہم ان کا درجہ مدد یزید کی بڑی فوجوں کے مقابلہ میں ناکافی تھا۔ (ہم مدینہ کے حرم رسولؐ ہونے کی حیثیت سے بحث کر چکے ہیں)

یہ باتیں تھیں جو حسینؑ کے ایسے قوم پر رحیم مدبر کے سوچنے کی تھیں۔ اور ان سے ایسی امید کی جاتی تھی۔ لیکن کچھ اہل مدینہ پر بھی حسینؑ کا حق تھا۔ اور اہل مدینہ کو بھی سوچنا چاہیے تھا۔ انھیں سوچنا چاہیے تھا کہ ہمارا موقع اور ہماری کم سے کم دو پشتوں کا گوشت و پوست حسینؑ کے گھر کی بدولت پلا ہے۔ ہمارا احترام حسینؑ کی بدولت اور اس روضہ مقدس کی بدولت ہے جس کی مجاوری حسینؑ کو شاہی سے زیادہ پسند تھی۔ یہ مدینہ تھا جسے رسولؐ اہل مکہ کی تالیف قلب کے لیے مکہ یا اپنے پہلے وطن سے بدل سکتے تھے۔ لیکن اہل مدینہ کے لیے اس روز سے زیادہ غم کا کوئی دن نہ تھا جس روز انھیں وہم ہوا کہ رسولؐ ترک مدینہ کریں گے۔ رسولؐ کی نوازش نے سمجھا دیا کہ مدنی وہم غلط تھا اور ہادی کے یہ لفظ ہمیشہ کے لیے ان کی تسکین کے باعث تھے کہ اگر تمام دنیا ایک طرف جائے تو میں ادھر جاؤں گا جدھر اے انصار تم جاؤ۔ یا مؤلفۃ القلوب کو سونا چاندی اونٹ بکری لے جانے دو، میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔ اور یہ سن کر اہل مدینہ خوشی سے رو رہے تھے۔ حسینؑ کے جد عالی مقدار نے اہل مدینہ کو ایک منضبط اور عادلانہ حکومت عطا کی۔ پدرانہ توجہ مبذول رکھی اور ان کے عادات و اطوار درست کیے۔ آج حسینؑ ہیں جو دیکھ رہے ہیں کہ جس کے دادا کو میرے گھر نے حکم دیا تھا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگا اسے پناہ دی جائے گی۔ وہ اس پر آمادہ ہے کہ اگر میں اس کی بیعت نہ کروں تو قتل کیا جاؤں۔ آج حسینؑ کسی زندہ کے پاس نہیں جاتے۔ کچھ قبروں کی طرف جاتے ہیں۔ کوئی انسان نہیں ہے جس سے امت کی شکایت کرتے۔ ہزاروں کی خاموشی حسینؑ کو اپنی فضا میں موجود دکھتی ہے۔ خاموش، افسردہ اور بے جان۔ کیوں ان خاموش قبروں کے پاس آئے اور کسی مجمع انصار کو مخاطب نہ کیا؟ اس لیے کہ حسینؑ کی غیرت اس سے بلند تر تھی کہ کسی انسان کو اپنی افسردگی دیکھنے دیتی۔ کوئی انسان نہ تھا جو حسینؑ کو تسکین دیتا اور حسینؑ اپنا دکھ اسے سنا سکتے۔ نانا کی قبر تھی جس پر جھکے تھے یا جسے سینہ کھول کر لپٹ گئے تھے۔ بے حس قبر آنسوؤں سے نرم ہو رہی تھی اور کہہ رہے تھے: "نانا جس حسینؑ کے لیے آپ نے وصیتیں کی تھیں" ضائع اور محروم ہو گیا۔

سو گئے حسینؑ۔ دماغی بے چینی کو ذرا سا سکون مل گیا۔ اس لیے کہ نیند کے عالم میں یا اپنے صحیح تصفیہ کا عکس دیکھتے۔ یا ارواح مقدسہ کا قلبی اتصال ہوتا۔ یا روشن ضمیری ہوتی۔ جو زمانہ مستقبل دکھا دیتی۔ چونکے۔ اب حسینؑ دوسرے تھے۔

قطعی تصفیہ ہو چکا۔ اب اہتمام کر رہے تھے۔ مقتل کی طرف جانے کا اہتمام۔ ایک تصفیہ جسے کوئی بدل نہیں سکتا تھا۔ لوگ آتے ہیں صلاح میں بہت کچھ دیتے ہیں۔ زیادہ تر ناصحانہ، جن کی نظر نہ وقت، موقع اور نہ سلسلہ اتفاقات پر پھیلتی ہے۔ کہتے ہیں جو کچھ منھ میں آتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ نیک نیتی کہی جائے، حضرتؑ شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اور مبہم الفاظ میں جواب دیتے ہیں کہ مجھے کچھ حکم ہے جو ضرور پورا ہوگا۔ وہ ٹل نہیں سکتا۔ کیا تھا وہ حکم۔ حکم نہ تھا۔ ایک لو تھی۔ ایک روشنی تھی جو اکثر نفوسِ مقدسہ پر چمکی تھی کہ اگر ایسا ہو تو کیا ہوگا۔ اور تصفیہ تھا کہ یہ ہوگا کہ اس وقت کا محافظ اپنے کو قربان کرے گا۔ اور ہم اس پر راضی ہیں کہ وہ قربان ہو۔ یہ رضا اور یہ تصفیہ چونکہ حسینؑ کے آباءِ طاہرینؑ کا تھا اور چونکہ یہی روشنی حسینؑ پر چمکی تھی، اس وقت کا مکاشفہ حسینؑ کے لیے گزشتہ کی تصدیق تھی۔ ایک حکم تھا جس سے حسینؑ اعراض نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی دُور بین نگاہ سامانوں کو دیکھ رہی تھی۔ دیکھتی تھی کہ یہ کس حد پر پہنچی ہوں گے۔ اور اس صحیح نتیجہ شناسی نے انھیں بتا دیا کہ وہ وقت آ گیا جس کے لیے ہماری جد بزرگوار، پدر عالی مقدار اور مادرِ گرامی تیار ہوئی تھیں۔ اب یہ حسینؑ کے لیے کوئی غم کی بات نہ تھی۔ فخر کی تھی۔ خوشی کی تھی کہ ہم ہی وہ ہیں جو حکم خدا کو اپنے متعلق پورا کریں گے۔ مصیبتیں حسینؑ کو اس سے ہٹا نہ سکیں۔

لیکن مکاشفات روحی اور الہام نے تو حسینؑ کو ایک عالم میں نتیجہ دکھا دیا تھا۔ نتیجہ کی تفصیل مادی عالم سے متعلق تھی۔ انھیں روش وہ اختیار کرنی تھی جسے عالمِ اسباب کو جواب دینا تھا اور وہ یہ تھا کہ حسینؑ وہی راستہ اختیار کرتے ہیں کہ ہم نے اپنی حفاظت کے لیے کوئی طریقہ اور شرطِ مصالحت اٹھا نہ رکھی۔ اور یہ اس سچے مدبر کی طرح کیا۔ جو نہ صرف سچائی بلکہ تیزی فہم اور قائم بہ اعتدالِ عقل، صحیح احساس سے ایک ایک قدم اٹھاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی نہ تھا جو یہ کہہ سکتا کہ حسینؑ نے فلاں جگہ غلطی کی۔

لیکن حسینؑ کو مدینہ سے نکلنا تھا۔ مدینہ جس کا ہر سنگریزہ حسینؑ کو کبھی پیار سے دیکھتا تھا اور تعظیم کرتا تھا۔ دیکھو اے حسینؑ وہ تمھارا گھر ہے۔ تم جانتے ہو کہ اس نے تمھارے لیے راحت کے کیسے کیسے وقت مہیا کیے تھے۔ وہاں تمارا گہوارہ تھا۔ اور تمھاری مادرِ گرامی لوریاں دیتی تھیں۔ وہاں تم نے اپنے پدرِ بزرگوار کو زخمی اور ماں اور نانا کو تیمار داری کرتے دیکھا تھا۔ وہاں تم اور حسنؑ کھیلتے تھے۔ اس جگہ تم تھے کہ رسولؐ فلاں جنگ کے فتح کی خوش خبری دینے آئے تھے۔ یا سنا تھا کہ خدا کے دین میں لوگ غول کے غول داخل ہو رہے ہیں۔ وہ تمھارا محلہ ہے۔ یہاں تم کھیلتے تھے اور رسولؐ تم سے کھیلتے اور پیار کرتے ہوئے بڑھ جاتے تھے۔ وہ محلہ بنی جذعان ہے جہاں تم کھو گئے تھے۔ اور لوگ تمھیں لینے آئے تھے۔ وہ حدیقہ بنی نجار ہے اور تمھیں رسولؐ مع امیرالمومنینؑ کے لینے گئے تھے۔ اور وہ مسجدِ رسولؐ ہے جس کے منبر پر تم نانا کو دیکھتے تھے اور تم اس پر سے بلند کیے گئے تھے۔ اور لوگ دیکھتے تھے۔ تم نے اپنے گھر میں فلاں فلاں جگہ ان کو آخری مرتبہ دیکھا تھا جو تمھیں دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھے۔ اور وہ جگہ ہے جہاں رسولؐ کی رحلت کے بعد انتشار اور خستگی کے عالم میں تم بیٹھے تھے۔ تم نہ جانتے تھے کہ کیا سوچیں لیکن تم غور میں کھوئے ہوئے تھے۔ وہاں تم بھوک میں سو گئے تھے اور وہ جگہ ہے جہاں تمھاری خوشی کی گھڑیاں صورت پذیر ہوئی تھیں۔

یہ اور بہت کچھ چیزیں، مقامات اور سلسلہ خیال تھے جو حسینؑ کے دماغ میں اس سرعت سے آ اور جا رہے تھے۔ جس کے وقت کا اندازہ ممکن نہیں ہے۔ آنکھیں تھیں جو ان چیزوں پر گڑ گئی تھیں۔ موقع کہتا تھا کہ بڑھو بڑھو۔ لیکن وابستگی

کہتی تھی کہ تم آخری مرتبہ انھیں دیکھ رہی ہو۔ اس طرح وداع کر لو کہ پھر دیکھنے کی آرزو نہ رہے۔

یہ سچ ہے کہ حضرت موسیٰ مصر سے خائف نکلے تھے اگرچہ والی مصر سے عہد ہوا تھا۔ اکیلے نہ تھے۔ کوئی چھوٹی سی جماعت نہ تھی۔ چھ لاکھ آدمی تھے جو حضرت یوسفؑ کے وقت سے اس وقت تک بڑھے تھے۔ قوم کو ایسی جگہ کی بشارت دیتے ہوئے نکلے تھے کہ ہم تمھیں دودھ اور شہد کے ملک کی طرف لے چل رہے ہیں۔ جہاں تم آزاد رہو گے۔ مصر کی ایسی غلامی میں مبتلا نہ ہو گے۔ پھر بھی خائف تھے۔ خوف اس لیے نہ تھا کہ رمیسس ثانی سے اور ان سے کوئی عداوت تھی۔ یا قوم کے قتل اور غارت یا بے عزتی کا اندیشہ تھا۔ نہیں بلکہ اہل مصر اور فراعنہ کچھ زمانہ سے بنی اسرائیل کو اپنا غلام سمجھتے تھے اور ان سے بیگار کا کام لیتے تھے۔ ان کا چلا جانا مفت کے خدمت کاروں کا چلا جانا تھا۔ جو تھوڑے خرچ سے بڑے کام دیتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ اقتصادی تعلق۔ حضرت رسولؐ کی ہجرت مخدوش تھی لیکن ان کی ہجرت کے وقت مکہ میں کوئی منظم حکومت نہ تھی جس کا سلسلہ ہر جگہ گلوگیر ہوتا۔ اور اگرچہ قریش دشمن تھے لیکن وہ بھی حضرتؐ کے قبیلہ سے ڈر رہے تھے۔ قبیلہ کا اثر اب تک زائل نہ ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی دشمنی صرف ذات مقدس نبوی تک محدود تھی۔ قریش کو حضرتؐ کے متعلقین سے بحث نہ تھی۔ کیا اس کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ نانا کی ہجرت جن اتفاقات میں ہوئی تھی، نواسہ کی ہجرت اپنے موقع کے لحاظ سے سخت تر تھی۔ ہادی برحق کا مکہ کے بعد مدینہ میں پر لطف استقبال ہوا اور امنیت و سکون حاصل ہوا۔ حسینؑ کی ہجرت سے امنیت و سکون کے لفظ خارج تھے۔ صرف وقت ٹلنا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرتؑ کی روانگی کے وقت اعزا، احباب، سامان بار برداری، ان کے سامان آب و خورش کے اہتمام کے لیے کچھ روپیہ کی ضرورت ہونی چاہیے تھی۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ فوراً روانہ ہو جانا تھا۔ اہل بیت اس کے لیے مشہور نہ تھے کہ وہ بڑی دولت ہر وقت جمع رکھتے۔ پھر بھی حضرتؑ نے جیسا فوری انتظام کیا اور جس طرح کربلا تک ضروریات کی کمی کا مسئلہ پیش نہ ہوا اس سے ظاہر ہے کہ حضرتؑ نے کیا انتظام بہت تھوڑے وقت میں کر لیا تھا۔ یہ بھی ظاہر نہیں ہے کہ تاراجی خیام کے وقت دشمنوں کو زر نقد کس قدر حاصل ہوا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ حضرتؑ کے پاس ایک ہزار اشرفی نہ تھی۔ ورنہ محمد بن بشیر حضرمی کے لڑکے کے زر فدیہ کے لیے اس قیمت کی چادریں عطا نہ فرماتے۔

اس سب سے غرض یہ ہے کہ اگرچہ وطن اور اس کی ان تمام یادگار چیزوں سے ترک تعلق کرنا تھا جن سے حسینؑ کو قلبی وابستگی تھی اسی وقت اہل بیت کو بھی ساتھ رکھنا تھا۔ اس لیے کہ ایسا نہ ہو کہ ہم تنہا اپنی جان بچا کر چلے جائیں اور دشمن ہماری حیات میں ہمارے پس ماندوں سے اپنا جوشِ انتقام پورا کرے۔ یہ حسینؑ نے باوجود صلاح کے بھی نہیں مانا۔ اس لیے کہ یہ حسینؑ کی ذمہ دارانہ غیرت کے خلاف تھا۔ صلاح دینے والے دشمن کا درجہ عداوت اور وحشت نہ سمجھتے تھے اور نہ کسی نے یہ کہا یا اطمینان دلایا کہ ہم آپ کی ناموجودگی میں ہر طرح ان کی حفاظت کریں گے۔ ایسی صورت میں حسینؑ انھیں بھی اپنے ساتھ کیوں نہ رکھتے۔ خصوصاً جب کہ ہونے والا یہ تھا کہ وجہ حسینؑ کو ان سے بڑی مدد ملتی۔ کم سے کم یہ لوگ اس وقت تک محفوظ تھے جب تک حسینؑ دنیا میں رہتے۔ اور یہ ہوا۔ اس وقت تک ہوا جب تک حسینؑ کی آخری مقدس سانس ان کے سینہ مبارک سے نکلی۔

حضرتؑ کا موقع یہ تھا کہ ایک مشکل کے بچانے کے لیے اگر اسباب پر نظر ڈالتے تھے تو دوسری ویسی ہی مشکلات

سامنے آتی تھیں اور حضرتؑ جس طرح ان کا انتخاب فرماتے تھے وہ ان کی عزیمت تصفیہ بلکہ صحت تصفیہ کی دلیل ہے اور ان تمام انتخاب میں اصول یہ ہوتا تھا کہ کہیں سے ہم اپنی بلندیٔ نفس کے خلاف کوئی امر نہ کریں اگرچہ مصائب کا وزن بڑھ جائے۔

اب اس جگہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ میں ان مکالمات کی شرح، جرح یا تنقید کروں جو اس وقت حضرت محمد ابن حنفیہ، ابن عباسؓ یا ابن عمر سے ہوئے۔ میں اس میں محمد ابن حنفیہ کے مکالمہ سے صرف ایک فقرہ یاد دلاتا ہوں کہ: "اگر دنیا میں میرا ایک دوست بھی نہ ہوگا اور کسی جگہ بھی امن و امان نہ پاؤں گا تب بھی یزید کی بیعت نہ کروں گا"۔ یا اپنے وصیت نامہ میں تحریر فرمایا تھا کہ: "میں کسی ظلم یا فساد یا خواہش دوری حق کے اندیشہ کے سبب سے مدینہ سے باہر نہیں جاتا ہوں بلکہ محض امت محمدیؐ کی درستی کے واسطے جاتا اور چاہتا ہوں کہ نیکی کی ہدایت اور بدی کی ممانعت کے شرائط لوگوں پر ظاہر کروں"۔ ابن عباس سے شکایت کرتے ہیں کہ ہم تربت رسولؐ کی زیارت نہیں کرنے دیے جاتے اور ایسے ڈرائے گئے ہیں کہ کہیں نہیں رہ سکتے۔ ابن عمر سے فرماتے ہیں: "میں ہرگز یزید کی بیعت نہ کروں گا بلکہ اپنے نانا رسولؐ خدا کی سنت اور باپ علیؑ مرتضیٰ کی خصلت پر چلوں گا"۔ یہ فقرات ہیں جن میں حسینؑ نے اپنی آئندہ روش ظاہر فرمائی اور یہ ایک ایک لفظ صحیح ثابت ہوئی۔ حضرتؑ نے اسے بھی ظاہر فرما دیا اگرچہ مخصوص مواقع پر کہ میرا خاتمہ قتل سے ہوگا۔

اور اگرچہ اہل مدینہ نے رحلت رسولؐ کے بعد سے اہل بیت رسالت کی رفاقت کا کوئی عملی ثبوت نہ دیا بلکہ امتحان کے موقعوں پر سرد اور سہل انگار پائے گئے۔ لیکن اب وہ موقع تھا جو اس کے پیشتر کبھی نہ آیا تھا۔ یعنی اگرچہ جناب امیرؑ نے وقتی مصالح کی بنا پر کوفہ کو مستقر الخلافت قرار دیا جس سے اہل مدینہ کا درجہ خلوص ظاہر ہے۔ تاہم کوئی ایسا موقع نہ آیا تھا جیسے شعبان کی تیسری یا چوتھی تاریخ کو جس میں آل رسالت کا ایک ایک بچہ مدینہ کو چھوڑ رہا تھا۔ خوف بالضرور۔ لیکن انتہائی نتائج کے خطرات میں بھی ملحوظ۔ یعنی قتل، گرفتاری، اور توہین۔ پھر بھی اہل مدینہ میں ان کے موافق کوئی حرکت نہ ہوئی۔ مدنی خصائل کے اس تغیر کا حل پچاس برس گزشتہ کی تاریخ میں ہے۔ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسا موقع اہل مدینہ کے تاسف کا نہ تھا۔ جب وہ دیکھ رہے تھے کہ ہادی کا بہر حیثیت کا قائم مقام آج کس حالت میں مدینہ ترک کر رہا ہے۔

بہ فرض محال چند رونے والے ہوں۔ کیا ایسا ممکن تھا کہ ایسے مخدوش وقت حسینؑ اپنی عزت، اپنی جان، اور اپنے حرم کی حفاظت کو چند رونے والوں کے سپرد کرتے۔ نہ اس وقت اور نہ اس کے بعد کبھی جماعت انسانی میں حسینؑ کے خصائل کی ترقی محض رونے سے ممکن ہے۔ یہ حضرتؑ کا اثر اس وقت اور اس وقت کے بعد تھا کہ عبداللہ بن مظعون کہہ رہا تھا کہ: "آپ سید عرب ہیں اگر آپ ہلاک ہوں گے تو ہم بعد آپ کے غلام ہو جائیں گے"۔

خیر، تو جو کچھ بھی ہوتا اور احساسات کی کیسی ہی قربانی کیوں نہ ہوتی لیکن حسینؑ سے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایک ایسے اصول کی تقلید منظور کر لیتے جسے انسانیت، اخلاق اور مذہب نے کبھی پسندیدگی سے نہیں دیکھا۔ نکلے وطن سے اس طرح کہ ان حضرتؑ کی نگاہوں میں موت کا دریا مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق تک لہریں مار رہا تھا۔ لوگ آتے ہیں اور صلاحیں دیتے ہیں۔ حضرتؑ انھیں کہنے دیتے ہیں جو وہ کہنا چاہتے ہیں۔ ملاحظہ فرماتے ہیں کہ ان کی صلاح میں موقع کے پہلوؤں کا احساس نہیں ہے۔ ان کی صلاح کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور کند جواب دے دیا کرتے ہیں جس سے کچھ سمجھا نہ جا سکے۔ سچ ہے جو ظاہر باتیں نہ دیکھ رہا ہو، اسے مصالح پر مطلع کر کے اپنے کو اور مصیبتوں میں مبتلا کرنا ہے۔ اس طرح

یہ سفر جو شاہراہ سے تھا تمام ہوا۔ یعنی وہ تمام لوگ جو سفر کر رہے ہوں، دیکھتے تھے کہ فرزند رسولؐ اکیلا نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کے ساتھ جو جزو خاندان اور متعلقین ہیں مکہ جا رہا ہے۔ اور اگر مدینہ سے روانگی کے وقت فرمایا تھا کہ خدا ظالموں سے نجات دے تو اس وقت مکہ کی پہاڑیاں دیکھ کر فرما رہے تھے کہ خداوندا منزل مقصود تک پہنچا دے۔

مکہ کا سامنے آنا اس کی گزشتہ یاد کا سامنے آجانا تھا۔ خیال میں ایک نرم لہر کا شامل ہو جاتا تھا کہ یہاں نباتی اور حیوانی قتل جائز نہیں ہے۔ ایک گونہ امید خیز سکون تھا کہ ہم نے جس جائے پناہ کا ارادہ کیا تھا وہاں پہنچ گئے۔ لوگ بھی استقبال کو آئے۔ موذن اذان دینے لگا۔ لوگ نمازوں میں شریک ہونے لگے۔ اور گویا بادی النظر میں رفقائے حضرتؑ کو مکہ کی تہ سکونت سے ایک گونہ مطابقت ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اہل مکہ میں کبھی کی مقدس یاد تازہ ہو گئی۔ اور انھیں کبھی کبھی خیال آتا ہوگا کہ رسولؐ کا یہ نسبی سلسلہ ہدایت کبھی ہمارے ساتھ شکستہ نہیں ہوا تھا۔

لیکن یہ بھولنا نہ ہوگا کہ ابن زبیر کا بھائی کس طرح عین خانہ کعبہ میں لڑنے کے متعلق حاکم مدینہ سے ڈینگیں مار چکا تھا۔ اور بھائی سے مکہ میں لڑ کر اپنا حوصلہ پورا کر چکا تھا۔ یا کچھ ہی دن کے بعد کیا چاہتا تھا۔ اور نہ امکان سے دوری تھی۔ میرا ذاتی اثر یہ ہے کہ مکہ کی آمد سے اور پھر یہاں کے خروج تک کبھی حضرتؑ مطمئن نہ تھے بلکہ آئندہ کے امکانات سے برابر حالت خوف میں بسر کر رہے تھے۔ اس پر میں باب ہشتم (واقعات کا نشو) میں نظر کر چکا ہوں۔ ان اتفاقات میں اور اس شہرت سے کہ حضرتؑ نے یزید بن معاویہ کی بیعت نہیں اختیار کی اہل کوفہ نے حضرتؑ کو مدعو کیا۔ یہ شہرت اس قدر تیز رفتار تھی کہ اس زمانہ میں کہ حضرتؑ مدینہ سے مکہ تشریف لے جاتے مدینہ سے کوفہ پہنچ گئی۔ اور ادھر مکہ میں سکونت اختیار کیے ہوئے دو ہفتہ گزرا تھا کہ اہل کوفہ کا قاصد آگیا۔ قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ اگر حضرتؑ کے علاوہ کوئی ذات منکر بیعت یزید ہوتی تو وہ ایک بڑی جماعت میں یہ ہیجان پیدا کر سکتی کہ لوگ اسے اس طرح طلب کرتے اس لیے کہ کسی دوسری ذات میں وہ باتیں نہ ہوتیں جن کی بنیاد پر طلب کر رہے تھے۔ حضرتؑ نے باوجود اس کے کہ بیعت یزید کا اکراہ حضرتؑ اور اہل کوفہ میں عام تھا ان کی دعوت قبول نہ کی۔ اس لیے کہ حضرتؑ کو اہل کوفہ کا گزشتہ درجہ استقامت جو کچھ معلوم تھا وہ امید خیز نہ تھا۔ اس لیے بھی کہ حضرتؑ دیکھ رہے تھے کہ اگر ہم مکہ میں رہنے دیے جائیں تو ہمیں یہ زیادہ پسند ہے کہ ہم اپنی مدد کے لیے کسی جماعت کی طرف امید سے دیکھیں۔ اور اتفاقات کی رفتار یہ تھی کہ جس وقت وجوہات خوف میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اہل کوفہ کے اصرار میں بھی شدت ہوتی جاتی تھی۔ ان کی استدعا نے ہدایت یابی کے لیے استغاثہ کیا تھا۔

حضرتؑ یا کسی کے لیے ایسے وقت کوئی راستہ نہ رہ گیا تھا۔ بجز اس کے کہ وہ کہیں اور چلا جاتا۔ لیکن کہیں اور کہاں جاتا۔ کیا کسی حکومت اور وسیع حکومت سے ناموافق ہو کر کہیں چلا جانا آسان ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ دوسری کوئی حکومت قریب نہ ہو جس کی سرحد کو عبور کر جانا آسان ہو اور وہ دوسری حکومت اس اصول کی بھی حامل ہو کہ وہ پناہ گزینوں کو قبول کرے۔ اس لیے حضرتؑ کے واسطے یہی راستہ تھا کہ وہ تجربۃً مسلمؑ بن عقیل کو دریافت حال کے لیے روانہ کرتے کہ اہل کوفہ اپنی ہم آہنگی میں کہاں تک راسخ اور صادق ہیں۔ اور اہل کوفہ کو بھی اس کی اطلاع دے دی کہ مسلمؑ "کوفہ کی مسجد میں تمہاری امامت کرائے گا۔ اور شرعی فیصلہ کیا کرے گا۔ نعمان میرے آنے تک تم میں احکام جاری کرے گا"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرتؑ نے اپنے سفیر کو بجز اس کے کچھ ہدایت نہ کی تھی کہ وہ امورات انتظامی

میں دخل نہ دے بلکہ اس حد کے امورات شرعی کا محافظ ہو۔
اتفاقات نے یہ چاہا تھا کہ حضرتؑ نے مسلم بن عقیل کو یزید کی سلطنت کے الٹ دینے ہی کے لیے کیوں نہ بھیجا ہو لیکن ان کے جواب کا انتظار نہ کر سکیں اور اس وقت ترک حرم خدا پر مجبور ہوں۔ جس وقت بے شمار امت احکام حج بجا لا رہے ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سیاسی غرض ہو یا ہدایت کوئی ایسی فوری نہ ہو سکتی تھی کہ حج سکھانے والے کا فرزند جو فرائض کا نمونہ تھا اپنے ذاتی فرض کو دوسرے دن بغیر ادا کیے ہوئے چلا جاتا تاوقتیکہ اسے اپنے کو فوری مہلکہ سے بچانا اور حرم خدا کی اپنے قتل سے حفاظت متصور نہ ہوتی۔ یہ حسینؑ ہی کا کام تھا اور انھیں کی ذات عظیم تھی جو اپنی ذات اور حج کے مجمع یا حرم خدا سے یہ کام نکالنا نہ چاہا کہ وہ یزید کے خلاف ایک ذریعہ ہوتا چلے گئے۔ اس لیے کہ اپنے کو بچاتا تھا لیکن کسی جگہ کسی مجمع سے اپنے لیے استغاثہ نہ کیا۔ خود کچھ لو اگر کچھ سکو اسے ہم روک نہیں سکتے۔ دیکھو اگر آنکھیں ہوں اور سنو اگر کان ہوں۔ اور اس طرح سے چلے جانے سے اس کا بھی تصفیہ ہو گیا کہ کہیں یا کوفہ ہی کی طرف حضرتؑ کا روانہ ہونا یقین خلافت سے نہ تھا۔

یہ وقت تھا کہ عامل مکہ دیکھتا کہ ہماری حکومت کا محصور ہمارے قبضہ سے نکلا جا رہا ہے۔ ایک سرہنگ مع سپاہیوں کے بھیجا جاتا ہے اور حسینؑ کی دین پرور ذات کمال شجاعت سے تلواروں سے روکنے کا حکم نہیں دیتی۔ بلکہ دشمنوں کی چمکتی ہوئی تلواروں اور بلند نیزوں کے مقابلہ میں کوڑوں سے روکنے کا حکم دیتی ہے۔ حضرتؑ کے اصحاب کے لیے یہ ایک تفریح تھی۔ آمادگی جنگ نہ تھی ا۔ موقع یہ ہے کہ یا حسینؑ کی شجاعت کی تعریف کرو کہ فولاد کا مقابلہ کوڑوں سے کیا یا دور بینی کی کہ وہ جانتے تھے کہ ذرا سا روک دو اور عامل مکہ میں مقابلہ کا موقع دیکھ کر یہ جرأت نہ ہوگی کہ وہ زمانہ حج میں اپنے حکم پر اصرار کرے۔

پھر لوگ آتے ہیں اور صلاحیں دیتے ہیں اور حضرتؑ ویسے ہی جواب دیتے ہیں جیسے پیشتر دے چکے تھے۔ یا کچھ نہیں فرماتے۔ اور زیادہ ضد پر فرما دیتے ہیں کہ خدا نے چاہا ہے کہ مجھے مقتول دیکھے اور خدا نے چاہا ہے کہ اہل حرم کو متحیر دیکھے۔ یہ بڑے لفظ ہیں جن میں امام الشہداء نے نتیجہ بتایا تھا۔ جو آج سے ایک مہینہ بعد کا واقعہ تھا۔ کسی کی محض روشن ضمیری پیشین گوئی نہیں کر سکتی تاوقتیکہ اس میں ان اتفاقات پر تسلیم و رضا کا عزم قوی نہ ہوتا۔ حسینؑ نے نہ چاہا اور نہ وہ چاہ سکتے تھے کہ ان کا عزم ان کی صاف بینی نتائج سے تخلف کرتا۔ یہی مجموعہ حسینؑ کا آئینہ ہے۔ حضرت موسیٰ کو یقین دلایا گیا تھا کہ تم دودھ اور شہد کا ملک دیکھو گے لیکن ان کے عزم کا بعض مواقع پر تعطل اس کا سبب ہوا کہ وعدہ ٹال دیا جاتا۔ جنگ آ رہا داؤد باوجود مدافعت اور جنگ و انتقام کے اس پر بے صبر ہو گئے کہ عمالقہ ان کے حرم کو لے گئے۔ ابن مریم موت سامنے دیکھ کر کہہ سکے کہ کیا تو مجھے بھول گیا۔ یا اس کے دفعیہ کے خواہاں ہوئے۔ لیکن حسینؑ نے موت دیکھی۔ اتفاقات دیکھے اور اس کا ایسا یقین ہوا کہ جو بدلا نہ جا سکتا تھا۔ اتفاقات تھے جن کا نتیجہ ان کی صاف نگاہ اور روشن ضمیری کے سامنے دو اور دو چار کی طرح واضح تھا۔ لیکن اس نتیجہ نے تزلزل کیا معنی انھیں سمجھا دیا کہ ایسے موقع کا مجمع ہو جانا چاہتا ہے کہ دینی، قومی، انسانی اور اخلاقی روح کی عظمت قائم کی جائے۔ اور یہ جسمانی فنا سے ممکن ہوگا۔ جس کے آثار ہیں۔ اب حسینؑ کا ہر قدم اس طرح اٹھ رہا تھا جس طرح کسی صاحب خصائل اور وعدہ وفا انسان کا قدم ایفائے وعدہ کے لیے اٹھتا ہے اور اس کی طبعی مسرت ہوتی ہے وہ کچھ رہے تھے کہ وہ ایک وعدہ کو پورا کر رہے ہیں۔ وعدہ جو ہر انسان میں ودیعت کیا گیا ہے کہ وہ حدود الٰہی کو قائم رکھے۔ لیکن ہر انسان میں امتحان کے وقت اس پر قائم رہنے کی جرأت نہیں ہے چہ جائے کہ اس امتحان میں جس میں

حسینؑ تھے ایسے وعدہ کا سمجھنا اور وعدہ پر قائم رہنے کی قوت اور اس کے نتائج سمجھنا حسینؑ سے کہلوا رہا تھا کہ خدا نے چاہا ہے کہ مجھے مقتول دیکھے۔ اور اس کے بعد دشمنوں کی طبیعت شناسی کہلوا رہی تھی کہ اور خدا نے یہ بھی چاہا ہے کہ میرے اہل بیت کو اسیر دیکھے!۔ کون انسان ہے جو اس عظمت نفس کا پورا اندازہ کر سکے۔ یہ اخلاقی اعتبار کی جان تھے۔ اعتبار کا ان سے اعتبار ہوا۔

اب تم سمجھو گے اس حالت کو جو مکہ کی روانگی سے ورودِ کربلا تک حسینؑ میں پائی گئی اور تم حیرت زدہ تھے کہ خبریں ہیں۔ متوحش لیکن حسینؑ ہیں جن کے لیے گویا خوف پیدا ہی نہیں کیا گیا تھا۔ کیا ایسا ہی تھا؟ نہیں۔ حسینؑ نہایت ہی صحیح الحواس اور ذکی الحس انسان تھے۔ ان میں تمام انسانی قوتیں تھیں بلکہ لطیف تر حالت میں۔ وہ جو معمولی انسان کی سمجھ میں نہیں آتا وہ ان کی روحانی قوت تھی۔ انسان ان پر کمزور احساسات کا اثر نہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ ان کے لیے وقت تھے کہ چہرہ مبارک پر مصائب کا عکس دکھائی دے جاتا جیسا حضرت علیؑ اکبر، زہیر بن قین اور حضرت زینبؑ خاتون نے ملاحظہ فرمایا۔ یہ سب تھا لیکن یہ سب گزرتی ہوئی باتیں تھیں۔ حسینؑ وہ تھے جو ان باتوں کے بعد جواب سے ظاہر ہیں۔ نہ صرف جواب بلکہ کل سمجھو اگر سمجھ سکو کہ حضرتؑ اپنے فرزند کے قول کو سن کر کہ: "اگر ہم حق پر ہیں تو موت سے کیا خوف ہے۔ اور ہم موت کی طرف جائیں یا موت ہماری طرف آئے"۔ فرماتے ہیں کہ: "اے فرزند تو نے دل خوش کر دیا"۔ یہ لفظ نہیں ہیں بلکہ ان سے سچ سچ خوشی ظاہر ہے۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ: "خدا تجھے وہ بہترین جزا دے۔ جو باپ کی طرف سے فرزند کو دی جاتی ہے"۔ یہ بیٹے کے آمادگی شہادت کی خوشی ہے اور اس کی داد دی ہے۔ فطری رنج طبعی پسندیدگی نے دھو دیا۔ یا اسی طرح حضرت زینبؑ موثر اشعار سے متاثر ہوتی ہیں۔ تو ہادی عالم اور امام الائمہ کی رحلت کے تذکرے اور مثال سے تسکین دیتے ہیں۔ اور یہ بھی کہہ کر کہ "تمہارے صبر کو کیا ہوا ہے"۔ غیرت کو مجبور کر آئندہ کا استقلال بتایا تھا۔ حسینؑ نے جو کچھ فرزدق سے فرمایا وہ نہ صرف حسینؑ کو سمجھاتا ہے، بلکہ وہ انسان کے لیے ایک دستور العمل بھی ہے کہ: "اگر حکم الٰہی ہماری مرضی کے موافق صادر ہوا تو ہم اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کریں گے حالانکہ وہ ادائے شکر سے مستغنی ہے اور اگر قضائے خداوندی خلافِ توقع نازل ہوئی تو ہم صبر کریں گے"۔ اور ایسے ہی اتفاقات سے پیدا شدہ خیالات کے متعلق ایک حیثیت یہ تھی کہ "اگر انسان کا جسم موت ہی کے لیے بنا ہے تو تلوار سے مارا جانا ہی بہتر ہے"۔ کوئی حیرت نہیں اس لیے کہ اس کا فرزند یہ فرما رہا تھا جس کا قول تھا کہ: "مجھے میدان جنگ میں مارا جانا فراش پر مرنے سے بدرجہا پسند ہے"۔ یا "جنت تلواروں کے سایہ میں ہے"۔ موت سے اس درجہ لاپروائی ظاہر ہونا کچھ سمجھاتا ہے۔ اور وہ اصول کی وقعت ہے۔ طبیعت کا ایک درجہ ہے۔ درجہ جس میں حیات اپنے کو بے سود سمجھنے لگتی ہے اور موت ہی کو اپنی حیات کی غرض سمجھتی ہے۔ خیالات کی ایسی قوت اور عمل کی آمادگی طبعی نشو و نما کا کوئی فوری اتفاق نہیں ہے۔ بلکہ ایک زمانہ کی مختلف حیثیتوں کے عمل کا نتیجہ ہے۔

راستہ میں شہادتِ مسلم کے ایسے اندوہناک حادثہ کی خبر ملتی ہے اور فوراً زبان پر جاری ہوتا ہے کہ جو کچھ (ان پر) بیتنے والا تھا ہوا۔ اور جو کچھ (ہم پر) بیتنے والا ہے ہو گا۔ ساتھ ہی مسلم کے متعلق فرماتے ہیں کہ مسلم نے اپنا فرض پورا کیا۔ اور پھر مسلم کے بچوں پر نوازش فرماتے ہیں اور مسلم کے پس ماندوں سے صلاح لیتے ہیں۔ یہ کوئی اتفاق نہ تھا۔ بلکہ یہ تمام باتیں ایک دوسرے کے حقوق و فرائض میں داخل تھیں جن میں ہر ایک کے لیے جداگانہ ارادہ کی ضرورت تھی۔

دوران سفر کے تعجب خیز واقعات میں زہیر بن قین اور حر کا اپنا کر لینا بڑے واقعات تھے۔ ظاہر بظاہر یہ دونوں آدمی دو طرح کے اثر میں تھے۔ دونوں جانتے تھے کہ حسینؑ کس حالت میں ہیں۔ دونوں جانتے تھے کہ ہم ان کے شریک نہ ہو کر مصائب سے دور اور دنیاوی راحت میں ہیں۔ اور اس لیے حسینؑ کے پاس جانا مطلق امید خیز نہیں ہے بلکہ مصائب سامنے دکھائی دے رہے ہیں۔ پھر کیا تھا کہ یہ اپنی مطمئن حالت کو چھوڑ کر ایک نہ صرف تئی بلکہ غیر مطمئن حالت کی طرف آئے۔ اور جس طرح، جس وقت اور جس صورت سے آئے وہ معلوم ہے۔ ایک کا رنگ برافروختہ ہے، چہرہ پر شہادت کا رنگ چڑھ گیا ہے۔ دوسرا پائے مبارک چوم رہا ہے۔ اس قلب ماہیت کے پیچھے حسینؑ ہیں۔ جن کا شخص آدمی کو بدل دیتا ہے۔ مس اور دوسرا جو گیلا دشمن تھا وفادار غلام بن گیا یقیناً ان دونوں کی یہ حالت نہ ہوتی اگر ان کے ذاتی احساسات اور حواس سرد ہوتے۔ اور یا اس حالت میں حسینؑ کی خوبیوں کے سمجھنے کے قابل نہ ہوتے۔ اب تم سمجھو گے کہ کیوں یہ متاثر ہوئے اور کیوں عبداللہ بن حر الجعفی متاثر نہ ہوا۔ اگرچہ وہ ابتدا سے دشمن نہ تھا۔ اور نہ آخر میں۔ اس لیے کہ اس کی دماغی حرکت ابتدا ہی سے یہ رنگ اختیار کر چکی تھی جو بے دلی، بلکہ حالت خوف اور موت سے مقابلہ کی عدم جرأت کہی جائے وہ اپنی اس حالت کے اندازہ ہی سے نکلا تھا کہ دور رہے۔ اور یہ حالت اس قدر اس کا جزو شخص ہو گئی تھی کہ کوئی فوری اثر اسے اس حالت سے نکال نہ سکتا تھا۔ اس لیے کہ طبیعت اثر کے قبول کرنے سے انکار کر رہی تھی۔ اور کیسا ہی عمدہ کام ہو لیکن اس کے کرنے کے قابل ارادہ پیدا نہ ہو رہا تھا۔ مختصر لفظوں میں خیال کے قابل الزام ہونے سے بحث نہ تھی ارادہ کا ضعف قابل نظر تھا۔

ایک موقع ہے کہ دفعتہً حر کے ایک ہزار سوار دکھائی دیے ہیں۔ ریگستان ہے۔ کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ لیکن نایابی یا کمیابی شے کا مرثیہ ہمیشہ مفید نہیں ہوا کرتا۔ اور نہ بے سود موشگافی ہر وقت مفید ہے۔ بلکہ حالتوں کے موافق تجویز اکثر بہترین حل ہوا کرتا ہے۔ خطرہ کے احساس کے ساتھ ہی حضرتؑ کی نظر فوجی استحکام پر پڑتی ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اپنے رفقا کی تعداد مقابلۃً بہت کم ہے۔ ایسے موقع پر ہر ذی ہوش سپہ سالار چاہے گا کہ وہ ہر طرف سے گھر نہ جائے۔ اگر نکل نہ جانا چاہتا ہو یا نکل نہ سکتا ہو۔ حضرتؑ سمجھ چکے تھے کہ اس وقت نکل جانا ممکن نہیں ہے۔ ضرورت اس کی تھی کہ کوئی محافظ پشت جگہ ہو۔ معلوم ہوا کہ ایسی جگہ ذو خشم ہے۔ سرعت قضیہ اس لحاظ سے کوشش کی گئی کہ دشمن کے پہنچنے کے قبل اس پر قبضہ کیا جائے۔ قبضہ کیا اور دشمن نے دیکھا کہ چند آدمی عمامے اور قبائیں پہنے کھڑے ہیں۔ مطمئن با حواس، منتظر جن کے ہاتھوں کا میلان قبضۂ شمشیر کی طرف ہے۔

حضرتؑ سے گفتگو ہوتی ہے۔ اس وقت اس کے پہلے یا اس کے بعد جب ہوتی ہو میں یہ کہنا چاہوں کہ ہر موقع پر کوئی شخص نظر نہیں کر سکتا مگر یہ کہ تصفیہ کرے گا کہ اس میں سلیم الطبعی، خشک دماغی، الفاظ کی قوت دلیل کی فطریت اور لہجہ کی راستی نمایاں ہے۔ حسینؑ کی باتوں کا انکار معقول جواب سے نہیں کیا گیا بلکہ اس لیے کہ یزید اور پیروان یزید کی مصلحت یہ تھی کہ وہ ہمیشہ ان کی مخالفت کریں۔ اور یہ تو حسینؑ تھے جن کے منہ میں رسولؐ کی زبان تھی اور جنھیں امیر المومنینؑ یا خطیب لاثانی نے تقریر کرنا سکھایا تھا۔ بیبیاں تھیں جنھوں نے درباروں میں ابن زیاد اور یزید کو اس طرح خاموش کیا کہ اس کی ساری حکومت جواب نہ لا سکی۔

حر سے گفتگو میں ایک موقع آتا ہے جس میں حر کہتا ہے کہ ہمیں ابن زیاد کا حکم ہے کہ آپ کو اس کے پاس لے جائیں۔ حضرتؑ "مسکرا کر فرماتے ہیں کہ: تم یہ کام نہیں کر سکتے"۔ مسکرانا ایک اپنے سے دس گنا لشکر کے مقابلہ میں ہے۔ سپہ سالار کے اظہار شدت پر ہے۔ کس درجہ حسینؑ کو اپنے اوپر اختیار تھا۔ کیسی قوت تھی۔ کیسا ارادہ تھا اور کس قدر مطمئن تھے کہ انداز کی خوبی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ حر پھر رد کرتا ہے۔ اور حسینؑ کے متبسم چہرہ پر ذرا سی گرمی کی چمک آجاتی ہے اس لیے کہ ہاتھ قبضۂ شمشیر پر جا رہا تھا۔ سکون میں فرق نہیں ہے۔ فرما رہے ہیں کہ: "آ جنگ کریں۔ تصفیہ ہو جائے۔ قطعی تصفیہ، حر کی شدت تمام ہو گئی۔ وہ اس موقع کے لیے تیار نہ تھا۔ نرمی اور صلاح۔ اور اب حضرتؑ اسی حرارت آلود سکون میں اشعار فرماتے ہیں کہ: "تو مجھے موت سے ڈراتا ہے! جوانمرد کو مرنے سے عار نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ اس نے نیکی کی نیت کر لی اور مسلمانوں کی طرح مجاہدہ کیا۔ اچھے لوگوں سے محبت کی اور باغیوں کا ساتھ چھوڑا۔ پس اگر میں اس کے بعد زندہ رہا تو مجھے کچھ ندامت نہ ہوگی۔ (میں نے تو اپنی خوشی اور ارادہ سے اسے گوارا کیا تھا) تجھے اتنا کافی ہے کہ ذلیل و رسوا ہو کر عمر بسر کرے گا"۔

ان لاثانی اشعار میں حسینؑ نے عزت کی موت اور حیات اور ذلت کی موت اور حیات کی کیسی مصوری کی ہے۔ اس کی ان سے امید کی جاتی تھی۔ اور یاد رہے کہ یہ اشعار اس وقت کے تھے جس وقت طبیعت اس موقع پر ہے کہ ہاتھ قبضۂ شمشیر پر جا سکے!۔

اس وقت بھی یہ قابل لحاظ ہے کہ حضرت زہیر بن قین کو ابتدائے جنگ کی اجازت نہیں دیتے۔ جنگ شروع نہ کرنے کی ایک غرض یہ تھی کہ حضرتؑ خود سے ابتدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بس؟۔ اس سے دو اور مفید نتیجہ پیدا ہو سکتا تھا ایک یہ کہ ممکن تھا کہ اس وقت جنگ نہ کرنا آگے چل کر کوئی ایسی صورت پیدا کرتا جو مفید تر ہوتی۔ اور وہ صلح یا امداد تھی، جس کا امکان اس وقت کی جنگ سے سوخت ہو جاتا۔ اسے حضرتؑ نے قائم رکھا۔ قائم رکھا حر کو قطعی تصفیہ کے بلانے کے بعد۔ یعنی اس طرح نہیں کہ اپنے کو مغلوب کر کے۔ اس کے بعد بھی طرماح وغیرہ کی آمد اور حر کے ٹوکنے پر دوبارہ اسے اس سختی سے روکا۔ اس لیے کہ اصول کا معاملہ پیش ہو جاتا تھا۔

عذیب میں پہنچ کر طرماح کی صلاح پر کہ آپ کوہ آجا میں چلیے میں فاصلہ کی لاعلمی کی وجہ سے کوئی قابل تسکین فیصلہ نہیں کر سکتا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے آجا اور کوفہ میں امید مشترک ہو گئی تھی۔ آجا دور اور کوفہ نزدیک تھا۔ اہل کوفہ کے قلوب کی تیاری کا ایک گونہ سامان ہو چکا تھا۔ آجا کے متعلق شخصی وعدہ کی ابتدا تھی۔ دوسرے یہ کہ حر کوفہ کی طرف جانے میں روک نہ رہا تھا۔ آجا کی طرف جانے میں مخل ہوتا اور چونکہ اس سے ایک حیثیت کا تصفیہ ہو چکا تھا اس وقت آجا کی طرف کوئی پیش قدمی ایک نیا اقدام ہوتا۔ جو ممکن نہ تھا۔

اس حیص بیص میں حسینؑ کربلا پہنچے اور حضرتؑ نے اپنے پدر بزرگوار کا خواب اور اپنے جد عالی مقدار کا قول نقل فرمایا۔ یہ بھی کہا کہ اس جگہ ہمارے خون بہائے جائیں گے۔ اور اسی جگہ ہمارے حرم قید کیے جائیں گے۔ بہت سے قلبی محرکات اور ظاہر سامان تھے جو حضرتؑ سے یہ کہلوا رہے تھے۔ کون جانتا ہے کہ جس وقت یہ اسباب حضرتؑ کو اپنا مقتل دکھا رہے تھے اسی وقت سلسلہ خیال نے یہ خوشگوار یاد تازی کر دی تھی کہ ایک دن یہیں اپنے پدر بزرگوار کے سایہ میں کھڑے تھے۔ اور

اس نفس عظیم کی قربت محسوس کر رہے تھے۔ اور وہ نفس ہند کی آنے والے واقعات کے متعلق صبر کی ہدایت فرما رہا تھا۔
کربلا میں خیمے گاڑے جانے لگے۔ تھکے ہوئے اپنے اپنے خیموں میں گئے۔ حسینؑ کو آرام کہاں۔ خیمہ کے سامنے تلوار صاف کر رہے ہیں۔ خیالات میں ڈوبے ہوئے۔ صریح اور بے شمار خیال۔ چند اشعار ورد زبان ہیں۔ ان سے اور بھی تکلیف وہ خیالات دور رکھے جاتے ہیں کہ دفعتہً بہن سامنے آتی ہے۔ اس کی محبت لذت درد پیدا کر دیتی ہے۔

کربلا میں قیام ہوا تھا کہ ابن زیاد کا بیعت یا قتل والا خط آیا اور آپ نے اسے زمین پر ڈال دیا اور فرمایا کہ ایسے لوگوں کے لیے عذاب ہی ہے۔ عمر سعد آیا۔ اس نے دریافت حال کیا اور حضرتؑ نے صاف فرمایا کہ اگر تم لوگ بلانے سے پھر گئے ہو تو میں واپس چلا جاؤں۔ اولاً اس لیے کہ اہل کوفہ نے اپنے ہم آہنگی کو جھٹلایا۔ دوم اس لیے کہ یہ ابن سعد یعنی ابن زیاد اور یزید کے سپہ سالار سے عہد ہوتا۔ لیکن ابن سعد کے خط پر ابن زیاد نے اس کا جو جواب دیا اس سے ظاہر ہے کہ دشمنانِ آلِ رسالتؐ محض بیعت پر اکتفا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ ان کی خواہش تھی کہ پہلے بیعت لوگوں کو دکھاؤ اور پھر اس کے بعد گزشتہ عدم بیعت کی باز پرس کر کے تمام کرو جس سے خلقت کو ہاتھ میں لائیں اور اہل بیتؑ رسالتؐ کے اثر سے بے خوف اور مطمئن ہو جائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اموی اپنی اس مصلحت پر آ پہنچے تھے کہ ان سے کسی درمیانی راہ کا طے کرنا ممکن نہ تھا۔ اور وہ مخلوقات پر بھی اپنی مصلحت کا ساتھ دینے کے لیے یہ جبر کر رہے تھے کہ حسینؑ سے جنگ نہ کرنے والوں کو دھمکاتے۔ مثال کے لیے عذر ڈھونڈتے اور چند کو قتل کر کے خوف پیدا کر دیتے کہ آئندہ کوئی تساہل یا انکار نہ کرے۔ اسی طرح فرات سے منع کرنے کی کوشش اور اہتمام کہتا ہے کہ انھوں نے انسانیت کے ادنیٰ ترین احساسات کو دور کر دیا تھا۔ اسی طرح بچوں کا قتل اور عورتوں کے ساتھ بے رحمانہ برتاؤ کہتا ہے کہ یہ خونخوار درندے محض انسانی بھیس میں تھے اور انھوں نے ہر خوبی کو جو انھیں بتائی گئی تھی دنیا سے محو اور برتاؤ سے خارج کر ڈالنا چاہا تھا۔ ایسے درندے، وحشی اور خبیثوں کے لیے اس کی ضرورت تھی کہ وہ دنیا سے نیست و نابود کر دیے جاتے۔ اس لیے کہ ان کی یہ خصلتیں آنے والی قوموں اور انسانوں میں اثر نہ کرتیں۔ نیکیوں کا معجزہ کہ اسے حسینؑ کے علم، صحیح جوئی، صبر اور بلندی اعمال نے فنا کر دیا۔ اور بنی امیہ کے خلاف ان کی بے رحمیوں نے ایک عام ہیجان پیدا کر دیا۔ ان کی خوش کرنے والی چیزیں ہی ان کی موت کا ذریعہ بن گئیں۔

اس کے بعد بھی باوجود اس کے کہ حضرتؑ سے بنی امیہ مخفی نہ تھے۔ لیکن آپ نے کئی مرتبہ اپنے کو پہچنوایا اور کیا کہنا چاہیے تھا جو نہ کہا۔ بنی امیہ اور ان کے رفتار درندوں سے بدتر ہوا کرتے لیکن یہ کوئی وجہ نہ تھی کہ نقیب الٰہی کا فرزند انھیں وہ باتیں یاد نہ دلا دیتا جس پر توجہ انھیں بہت سے خوفناک نتائج سے دور رکھتی۔ حسینؑ مخلوقات کے لیے اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔ اور جس طرح حسینؑ سمجھ رہے تھے کہ کونسی حالت ہمارے پیش نظر ہے۔ اسی طرح وہ صاف ملاحظہ فرما رہے تھے کہ بنی امیہ کے لیے بھی کیا ہونے والا ہے۔ اور فرما دیتے ہیں کہ تم آپس کے اختلاف سے ہلاک ہو گے۔ اور ایک قوم تمھیں ہلاک کرے گی۔ اس پیشین گوئی میں حسینؑ کی روشن ضمیری، قوم کے عروج و زوال کے سمجھنے کا ملکہ، خصائل سمجھنے اور پختہ تصفیہ کرنے کی استعداد تھی۔ بلکہ قوم گری کی بنیاد بھی تھی۔ وہ آج ہی سے اس کا بیج بو رہے تھے کہ بنی امیہ کے تباہ کرنے والی زبردست قوم قومی اعتبار سے نوعیت پذیر ہو۔ بنی امیہ اس وقت اس کا احساس نہیں کر رہے تھے۔

کیونکہ حسینؑ تنہا اور زخمی کھڑے تھے۔ چند رفقاء اپنے خون میں نہلائے پڑے تھے۔ اور یزید کے ریزہ خوار تنگ ظرفی سے یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم نے حسینؑ کو تمام کیا اور ہم کامیاب ہوئے۔ انھیں قتلِ حسینؑ کے نتائج سمجھ میں نہ آ رہے تھے۔ کیونکہ اس وقت تک انھیں نتائج سمجھنے کے سامان دکھائی نہ دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ وقت آیا۔ جس کا پہلا دور یہ تھا کہ قاتلانِ حسینؑ سوراخوں میں چھپتے اور نکالے جاتے۔ اپنی جان کے لیے نامردوں کی طرح گڑگڑاتے اور موت ہنستی کہ تم یہی تھے جس نے رحم کو اپنی لغت سے خارج کر دیا تھا۔ جس کا دوسرا دور بنی امیہ کی آپس کی تباہ کن لڑائیاں تھیں اور جس کا تیسرا دور یہ تھا کہ کتوں کو بے گوشت ہڈیاں چبانی پڑتیں۔

ان وقتوں میں جس کا ہر وقت اپنی حیثیت سے نیا تھا حضرتؑ کو حضرت عباسؑ کی کارگزاری سے جیسے تسکین ہوئی، اس کی مقدار کا سمجھنا انسان کی تاریخ میں ممکن نہیں ہے۔ کب کسی تنہا یا چند نے اس طرح دشمن کے انبوہ کثیر سے کوئی چیز لڑ کر چھین لی تھی۔ کب کوئی لشکر فوجی ضرورت سے بڑھ کر ذاتی عداوت اور انتقام کے جھوٹے الزام کو درمیان میں لا کر پانی روک کیا تھا۔ اور کب کسی لشکر کے ساتھ اس قدر پیاسے تھے۔ جنھیں پانی پلا کر کوئی خوش ہوتا۔ اور دیکھتا کہ مرجھائے ہوئے پھول تازے ہو رہے ہیں۔ اور کب کسی نے یہ دردناک منظر دیکھا تھا کہ پیاسے بچے بزورِ شمشیر حاصل کیا ہوا پانی ڈگڈگا کر پی رہے ہیں۔ عباسؑ کے تیور اور جنگ نے حسینؑ کو کیا کچھ یاد نہ دلا دیا ہوگا۔ اور پھر حسینؑ کی آنکھ بھی اشک کو آلود ہوگئی ہوگی۔

مصالحت کے متعلق جو کچھ شرائط پیش ہوئے وہ وہی تھی جو عقبہ بن سمعان کہتا ہے کہ مجھے مکہ یا مدینہ جانے دو یا اگر یہ منظور نہ ہو تو کہیں جانے دو۔ اور جب اسے بھی دشمنوں نے منظور نہ کیا تو فرمایا کہ تم مجھ سے وہ بات کیوں نہیں منظور کرتے جو رسولؐ مشرکوں سے منظور کر لیتے تھے۔ وہ بات صلح تھی۔ مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اگر حضرتؑ نے اسے دشمن کی منظوری یا عدم منظوری کے پہلے پیش کیا۔ لیکن یہ باتیں بھی دشمن کے نزدیک قبول کرنے کے قابل نہ تھیں اس لیے کہ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ حسینؑ اب "ہمارے جنگل میں ہیں"۔

کوئی شخص اس پر جرأت کر سکتا ہے کہ حضرتؑ جن اسباب میں محیط تھے ان کے لحاظ سے یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی شخص محفوظ رہ سکتا۔ پھر حضرتؑ نے دسویں تاریخ سے کچھ پہلے اس کا اہتمام کیوں کیا کہ خندق کھدواتے اور اس میں لکڑیاں بھرواتے۔ امکاناً آخری وقت تک نا امیدی نہ دکھانے کے لیے یہ بڑا سبق دینے کے لیے کہ ہم قبل از مرگ واویلا سے اس مفید وقت میں اپنے فرائض معلق نہ کر دیں جس میں ہم ایسی مصیبت میں مبتلا ہوئے ہوں جس کا نتیجہ موت ہو۔ اور جس وقت تک جئیں وہ کل کام جنھیں عقل اور تجربہ مستحسن سمجھتا ہو کرتے جائیں۔ عام اس سے کہ کچھ ہی نتیجہ کیوں نہ ہو۔ کیونکہ کسی نتیجہ کا قبل وقوع یقین محال ہے۔ اس لیے ایسے قبل وقوع یقین سے یاس کیوں پیدا کی جائے اور یہ بھی صحیح کہ کسی چیز کے قوی قرائن ہوں لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کمزور سمت کے لیے احتیاط نہ کی جائے۔ یا غفلت کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک کوشش تھی جس سے حسینؑ اپنی حیات، اپنے خیال اور اپنی روش میں آخر وقت تک مختار رہنا چاہتے تھے۔ نہ چاہتے تھے کہ ہم دشمن کے ہاتھ میں گرفتار اور مجبور ہو کر کوئی عمل کریں۔ اور اس وقت تک تو خیر جنگ شروع نہ ہوئی تھی۔ وہ وقت بھی آیا کہ اب ان بندگانِ خدا کی حیات چند ساعت سے زیادہ دنیا میں باقی نہیں ہے اور دشمن آگ لگانے کا ارادہ کرتا ہے۔ ہوش و حاضر دماغی دیکھو حسینؑ کی کہ اصحاب دشمن کو روکنے کا ارادہ کرتے ہیں لیکن حسینؑ روکتے ہیں کہ

بے سود کوشش نہ کرو۔ تم جس نتیجہ کے لیے کوشش کرنا چاہتے ہو وہ اسی سے حاصل ہو جائے گا کہ دشمن اپنا ارادہ پورا کرلے۔ یعنی اصحاب چاہتے تھے کہ دشمن کو روکیں اور دشمن آگ لگانا چاہتا تھا۔ دشمن نے پشت کے خیموں میں اگر آگ لگائی تو وہ خود آگے نہ بڑھ سکتا تھا اور اس طرح پشت حملہ سے محفوظ ہو جاتی تھی۔ بغیر اس کے کہ اصحاب روکتے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ جس وقت نویں تاریخ دشمن نے حملہ کا ارادہ کیا وہ دنیا میں حضرتؑ کے حیات کی آخری نیند تھی۔ بہن یا بھائی نے اگرچہ نرمی سے جگایا۔ لیکن جگانا خوف سے متاثر ہو کر تھا۔ حسینؑ اور انتشار یہ دو متضاد چیزیں تھیں۔ حسینؑ یا تو بھائی کو بھیجتے ہیں اور کہتے ہیں۔ کہ چلو ہم بھی آئے۔ اور یا عباسؑ کی سفارت کے نتیجہ کا انتظار کرتے ہیں۔ لیکن مضمون سفارت بجائے خود ایک غور کی چیز ہے۔ اور وہ یہ کہ جاگنے کے بعد ہی جو کچھ سنتے ہیں اس کے بعد یہ فرمانا کہ ایک شب کی مہلت طلب کرو۔ سمجھاتا ہے کہ حضرت خواب میں ہو یا جاگنے میں اس خبر کے منتظر تھے اور یہی کہنے والے تھے۔ اور اگر یہ منظور نہ بھی کیا جاتا تو غالباً حضرتؑ وقتی حیات کو ابدالآباد کی حیات سے بدلنے کے لیے اسی اطمینان سے مستعد ہو جاتے۔ جیسے کل مستعد ہوئے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ حضرتؑ نے یہ مہلت کیوں طلب کی تھی۔ اس لیے کہ حضرت کو شب بیداری اور عبادت الٰہی بہت محبوب تھی۔ ایسی محبوب کہ لئیم دشمنوں سے ایک رات کی مہلت اس لیے طلب کرتے کہ اس رات کو عبادت کے ارادہ سے طلب اور مخصوص کی ہوئی عبادت کی رات قرار دے دیں۔ لیکن نہایت عظیم وجہ کے لیے۔ جس کی عظمت کا ہمارے گناہگار دلوں میں سمانا محال ہے۔ اس لیے کہ وہ اس طرح خالق اپنی کے احساس سے اور قریب ہو جائیں اور اس طرح تقرب ایزدی کے خیال کو اپنے میں بھرلیں کہ علائق دنیوی کی گزشتہ یاد اس پر غالب نہ ہو۔ یہ نور تھا جس کو اوڑھے ہوئے شہدائے کربلا صبح کو دشمن کے مقابلہ میں کھڑے تھے۔ اس طرح کہ حسینؑ ان کے سپہ سالار ہوں۔ اور یہ نور تھا جس کی موجودگی میں کسی غم، فکر اور انتشار کی تحریر چہرے پر ظاہر نہ ہو سکتی تھی۔

حضرتؑ نے اس کا بھی اہتمام فرمایا کہ جب یہ دیکھ لیتے کہ دشمن کسی صلح وآشتی پر راضی نہیں ہے اور اس کی کوئی غرض سوائے اس کے نہیں ہے کہ ہمیں قتل کرے تو اپنے رفقائے عالی نفس سے فرمایا کہ تم لوگ چلے جاؤ دشمن کو صرف مجھ سے غرض ہے۔ یہ تصفیہ تھا حضرتؑ کا۔ جس کی مثالیں بھی ہیں کہ دشمن اکثر کے لیے پروانہ معافی لائے تھے۔ اور اس سے بہتر ان کے لیے کیا ہوتا کہ جب مدافعت کرنے والے کم رہ جاتے تو انھیں اپنے ملعونانہ ارادہ کے نفاذ میں اور آسانی ہوتی۔ مجھے یہ کہنا نہیں ہے کہ اگر کوئی دوسرا انسان حسینؑ کی جگہ ہوتا تو وہ کیا کرتا۔ لیکن یہ کہنا ہے کہ حسینؑ ہی کے نفس میں یہ قوت تھی کہ وہ اس موقع پر بھی اپنے نقطہ لحاظ سے نہیں بلکہ دوسروں کے نقطہ لحاظ سے ان کی حالت پر غور کرتا اور اپنے مصائب میں ان کی کمی مصائب کی سبیل نکالتا۔ اگرچہ تنہائی اپنے لیے کیسی ہی محدوش کیوں نہ ہوتی۔ لیکن کیسے ممکن تھا کہ وہ اصحاب جنھیں حضرتؑ باوفا فرما چکے تھے۔ وہ اعتبار کے ساتھ کمی کرتے۔ یہ بھی ایک ذریعہ تھا جو اس وقت حضرتؑ کو خوش کرتا اور حضرتؑ تصفیہ فرماتے کہ دشمنوں کو آسانی سے اپنے اوپر قابض نہ ہونے دیں۔

صبح ہو گئی۔ آج وہ وقت آگیا جسے کچھ کر حسینؑ کے رفقا ان کے ساتھ ہوئے تھے۔ وہ وقت آگیا جس کے لیے حسینؑ نے انکار بیعت یزید کیا تھا اور ایک زمانہ سے جس کے لیے تیار ہوئے تھے۔ وہ وقت آگیا جس کے لیے نور اور الہام سے دھوئے ہوئے دلوں نے خبریں دی تھیں۔ ابتدائے مراحل طے ہو چکے تھے۔ اب صرف بشارت شہادت کا

پورا کردیا تھا۔ وعدہ گاہ پر کھڑے تھے۔ انہوں نے وعدہ کردیا تھا۔ کسی دیکھنے والے کے لیے یہ منظر کیسا ہی منظر اندوہ کیوں نہ ہو تا جس میں چند بھوکے پیاسے، وطن آوارہ، بچے، جوان، اور بوڑھے اس طرح تہیا نے قضا ہوتے لیکن کونسا بے حس انسان ہے جو ایک آنکھ سے شام کی تاریک گھنی اور لمبی صفوں کو دیکھتا اور پھر ان چند بوڑھے، جوان، اور بچوں کو دیکھتا کہ وہ کس اطمینان سے مرنے کے لیے کھڑے ہیں اور وہ حیرت سے منقلب نہ ہوجاتا۔ یہ چھوٹی سی صف اس لیے نہیں کھڑی ہے کہ وہ یزید سے اس کا ملک چھین لینا چاہتی ہے۔ نہ اس لیے کھڑی ہے کہ اس نے ملک اور قوم کے مسلمہ اصول کے خلاف کچھ کیا ہے۔ نہ اس لیے کہ اس نے انسانیت پر ظلم کیا ہے۔ یا دین کے ساتھ کوئی خیانت کی ہے۔ یہ سب تو انھوں نے کیا ہے جو فرات کے قریب کی لمبی صفوں میں ہیں۔ یہ چند اس لیے کھڑے ہیں کہ حسینؑ کو بچائیں۔ حسینؑ یعنی اصول خیر کی جان۔ بولتی ہوئی تصویر۔ عملی شکل، انسانیت اور اس کی خوبیوں کا بہترین نمونہ۔ دین اور اس کے فلسفہ کی روح اور اس سب کی تاریخ جو کبھی اچھی تھی۔ قومی یادداشت کا دفتر اور عرب کی شرافت کا مرکز اور حسینؑ اس لیے کھڑے تھے کہ اصول خیر آج ہماری قربانی چاہتا ہے۔ تسلیم۔ یہ دکھا چکے تھے کہ ہم کیونکر جیتے ہیں۔ اب دکھا رہے ہیں کہ ہم کیونکر مرتے ہیں۔ دیر تک معرکہ کارزار گرم رہا۔ چند آدمیوں نے ظہر تک ہزاروں کے ریلوں کو روکا۔ دشمن باوجود اپنی کثرت کے وعدوں سے ہٹ گیا۔ یہ اپنے فرائض سے نہ ہٹے۔ بہرحال کو وقت سے کیا۔ کون مرنے گیا جسے حسینؑ نے ہنستے ہوئے چہرہ سے رخصت نہ کیا اور کون مرا جس کے احتضار کو حسینؑ نے بشارت سے خوشگوار نہ کیا اور پسندیدہ الفاظ سے اس کی کارگزاری کا اعتراف نہ فرمایا۔ خزاں کہہ رہی تھی کہ ہم پھولوں کا ایک ایک ورق خشک کردیں گے۔ حسینؑ فرما رہے تھے کہ ہماری بہار یہی ہے کہ تمام ورق خشک ہوجائیں۔ موت کہہ رہی تھی کہ ہم ایک ایک نونہال کو چن لیں گے۔ اور حسینؑ فرما رہے تھے کہ تو یہی ان کی حیات ہے۔ اولاد مسلمؑ عقیلؑ، جعفرؑ تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے ہوئی دیکھا حسینؑ کے پارہ جگر زمین پر لوٹے۔ دیکھا علی اکبر کا ایسا چاند افق خون میں چھپ گیا۔ لیکن یہ حسینؑ ہی تو تھے جنھوں نے فرمایا تھا کہ تھوڑی دیر میں تم حوض کوثر سے اس طرح سیراب ہوگے کہ پھر پیاس نہ لگے گی۔ علی اکبر کی جنگ کے وقت یقیناً حسینؑ کی ایک نظر علی اکبر پر پڑتی تھی اور دوسری مرتبہ ہنستی ہوئی آسمان کی طرف اٹھتی تھی۔ آج حسینؑ اپنے جگر کا ٹکڑا اپنے مرکز محبت کے سامنے تحفہ لائے تھے اور یہ عزیز پیش کش قبول ہوا تھا۔ علی اکبر کے سینہ کی نوک سنان سے حسینؑ نے اُف نہیں کیا۔ دل خوشی سے چیخ اٹھا کہ ہم بڑا امتحان دے چکے۔ عالم اس سے کہ صدا بلند ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ کیونکہ متین چہرہ پر سرخی دوڑ گئی تھی۔ ساکن دریا پر ایک ہلکی موج دکھائی دی۔ صبا کی نرم حرکت سے تلاطم نہیں۔ ہنستی ہوئی لہر جو اٹھی اور پھر ڈوب گئی۔ دریا پھر ویسا ہی ساکن تھا۔ لاش لائے۔ دیکھا کچھ دیر دیکھا اس نگاہ کی معال شرح نہ کرو سمجھ لو کہ حسینؑ بیٹے کو آخری مرتبہ دیکھ رہے ہیں۔

حسینؑ عباسؑ کی جنگ بھی دیکھ چکے۔ یہ دیکھا کہ کربلا کے موجود بھائیوں میں آخری بھائی بھی نگاہ سے اوجھل ہوگیا۔ عباسؑ کی شہادت حسینؑ کے لشکر کی فوجی حیات کا خاتمہ تھا۔ یہی معنی تھے اس کے کہ اب میری کمر ٹوٹ گئی۔ اب حسینؑ نے ارادہ کیا کہ اہل حرم کو آخری مرتبہ دیکھو اور سلام کرلیں۔ اور اس کے بعد شہادت کے لیے آمادہ ہوں۔

ذرا سوچو رشی گوتم سنیاس کا ارادہ کرنے کے بعد بی بی اور بچہ کو آخری مرتبہ چپکے سے سوتے ہوئے دیکھتا ہے اور جگانے کی ہمت نہیں کرتا۔ غالباً اس لیے کہ ان کی باتیں اور عالم ہوش میرا ارادہ فسخ نہ کردے۔ لیکن حسینؑ مرنے کا

ارادہ کر کے اہل بیتؑ کی شکستہ صورت دیکھتے جاتے ہیں اور نہ صرف اپنا ارادہ شکستہ نہیں ہونے دیتے بلکہ اہل بیتؑ کو بھی آئندہ کی تسلیم و رضا کا سبق دیتے ہیں۔ میں اس سے بہتر کوئی مثال اس کی نہیں دے سکتا کہ دوسرے مذاہب کے ترک دُنیا اور اسلام کی باوجود معاشرت ترک دُنیا یہی تھی۔ یقیناً اسلام کا عمل فطری اور زیادہ شجاع اور صابرانہ ہے۔ بیبیاں ہیں۔ بچے ہیں جن کے خشک لب کچھ کہیں یا نہ کہیں اس کے معنی یہی یہ تھے کہ ہمیں کس پر چھوڑے جاتے ہو اور حسینؑ فرماتے ہیں کہ میں تمھیں خدا کے سپرد کرتا ہوں جو سب سے اچھا وکیل ہے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ میں جانتا ہوں کہ تم کس حالت میں ہو۔ آئندہ کیا حالت ہوگی۔ تم میرے آخری وقت کی تسکین ہو۔ لیکن تمھیں ہمارے اس ارادہ پر راضی ہونا ہوگا کہ ہم سر کٹوائیں اور تم دیکھو اور آئندہ کے مصائب برداشت کرو۔

اور اسی وقت حسینؑ کا سب سے بڑا امتحان لیا گیا اور وہ یہ تھا کہ ایک پیاس سے تڑپتے ہوئے بچے کو گود میں لیا۔ جس نے صدا اس کر اپنے ہمکنے سے ظاہر کیا تھا کہ ہم ہوش میں آگئے ہیں۔ ہمیں پیار کرلو۔ سوکھے ہونٹوں نے سوکھے ہوئے ہونٹوں کو پیار کیا۔ یہ حسینؑ کی آخری راحت تھی۔ یہ اور غالباً انسانیت کے لیے انسان سے آخری اِستغاثہ بھی تھا کہ اس بچے کو دشمنوں کی طرف لے جاتے اور دکھاتے کہ آخر یہ بے گناہ شیر خوار کیوں تمھارا مورد انتقام ہو رہا ہے۔ تیر اور لاش حسینؑ کے ہاتھ پر منقلب تھی۔ خون اڑا تھا اور چہرہ اور ہونٹ خون سے نم ہو گیا تھا۔ سیراب ہو گئے علیؑ اصغر لیکن لاش اسی طرح حسینؑ کے ہاتھ پر تھی۔ ہاں قوی انسان بڑے بڑے بوجھ اٹھا سکتا ہے لیکن اس چھوٹی سی لاش کا بوجھ اٹھائے رہنا سخت مشکل تھا۔ اور دیکھو حسینؑ اس خوبصورت لاش کو اور بلند کرتے ہیں۔ آنکھیں آسمان کی طرف اٹھتی ہیں اور فرماتے ہیں کہ خداوندا تیرا حسینؑ اب بھی صابر ہے یا خداوندا اس مصیبت پر اپنے حسینؑ کو صبر عطا فرما۔ اور پھر حسینؑ اس خون اخشاں گلے کے نیچے چلو لگا دیتے ہیں اور ٹپکتے ہوئے خون کو اتنی دیر تک دیکھتے ہیں جتنی دیر تک چلو بھرے چلو میں کافی مقدار خون آئے آسمان کی طرف اچھال دیا۔ کیوں؟ کس لیے یہ اہتمام تھا کہ یہ پردرد تماشہ دیکھتے ٹپکنے ہی کیوں نہ دیا۔ آسمان پر اسے اچھالنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہی حسینؑ تھے جو ایک معصوم کے خون کو اصول خیر پر چڑھا رہے تھے۔ کبھی انسان نے خدا سے ایسا ناز نہیں کیا۔ اور نہ کبھی کسی اصول کے لیے اس سے بڑھ کر قربانی کی گئی۔ اور اس طرح مجھ سے پوچھو کہ حسینؑ کی سب سے بڑی تکلیف تھی۔ اور میں کہوں گا کہ ان کی سب سے بڑی مصیبت ان کے ناشکستہ ہوش کی وجہ سے تھی۔ جس کی ذکاوت آخری سانس تک کم نہیں ہوئی۔ اور اسی طرح حسینؑ کی مصیبت یہ نہ تھی کہ چند رفقا اور اعزا شہید ہوئے۔ نہیں۔ بلکہ ایک سلسلہ تھا جو حسینؑ کی شہادت کے بعد بھی نہ ٹوٹا۔ اس لیے کہ شہید ہوتے وقت یہ یقین تھا کہ اہل بیت اسیر ہوں گے اور باوجود اس کے صبر اور استقلال تھا۔ یہی سب سے بڑی تعریف بھی تھی۔

کیا حضرت سکینہؑ سے حسینؑ کا رخصت ہونا کوئی بڑی چھوٹی سی بات تھی؟ اس لیے نہیں کہ کوئی باپ اپنی چھوٹی اور بھولی لڑکی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہا ہے۔ نہیں میں اس کے غم کے پہلو کی طرف اشارہ نہیں کرتا ہوں لیکن اگر کوئی چاہے تو کیا اس کے لیے اس سے بڑا مرثیہ چاہیے کہ اگرچہ یہ فرما رہے ہیں کہ سکینہؑ جلدی آ کہ تجھے مرنے والے کی طرح وداع کرلوں"۔ اور اس میں سب سے مرثیہ یہ ہے کہ "دیکھ اے خیر النسوان جب تک میرے جسم میں روح ہے اس وقت اپنے آنسو سے میرے قلب کو نہ جلانا"۔ یہ حسینؑ کا اپنی چھوٹی سی لڑکی سے اِستغاثہ تھا؟ اپنے لیے تھا۔

زمانہ نے اس چھوٹی لڑکی کا بھی بڑے صبر سے امتحان لیا کہ باپ کو مرتے دیکھے اور نہ روئے۔ بلکہ میں اس لیے اس کا ذکر کر رہا ہوں کہ باپ آخری نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ اور سر پر دست شفقت پھیرتا جاتا ہے اور فرماتا ہے کہ: "میں اگل یتیموں، اور پڑوسیوں کے حق میں تجھے وصیت کرتا ہوں۔ اے سکینہؑ قضائے الٰہی پر صابر رہنا۔ یاد رکھو کہ ہم اہل صبر و احسان ہیں اور اپنے باپ نانا اور بھائی کے اسوۂ حسنہ پر چلنے والے ہیں"۔

حسینؑ کے اس وقت میدان میں جانے کی آمادگی کے لیے اس سے بہتر کوئی اور داد نہ تھی کہ علیؑ کی بیٹی رکاب تھام کر انھیں سوار کرتی اور میدان میں بھیجتی۔

حضرت ریاض کے لفظوں میں: ؎

جگر میں داغ تھے عباسؑ و اکبرؑ کے مگر پھر بھی تبسم خیز اطمینان سے تیری رجز خوانی

اور رجز ہی کے متعلق مجھے کہنا ہے کہ اس کی مخصوص شان یہ تھی کہ اس کا بڑا حصہ جناب امیر کی مدح میں تھا۔ کیا یہ اس لیے تھا کہ جناب امیر حسینؑ کے پدر بزرگوار تھے۔ نہیں۔ اصل غرض اشعار کے مفہوم میں ہے۔ اور اس روش میں ہے جو بنی امیہ نے اس ذات اقدس کے متعلق اختیار کی تھی۔ دکھایا ہے کہ انھوں نے بدر حنین میں کیا کیا۔ وہ ابن عم مصطفیٰؐ تھے۔ انھوں نے دین اور جناب رسالت مآبؐ کی کیسے کیسے وقتوں میں مدد کی اور اور وہ کیسے تھے۔ خوبصورتی اور حقیقت دیکھو اس اظہار خیال کی کہ انھوں نے بتوں کی یہ حالت کر دی کہ اب قریش انھیں سجدہ نہیں کرتے یا انھوں نے اسلام کی حمایت کی اگرچہ دشمنوں کو یہ اچھا نہ معلوم ہوتا تھا۔ اور انھوں نے دین کو کس وقر سے بلند کر دیا۔ میدان کربلا کے نادر امور اور شاعری کی تاریخ میں حسینؑ کا قصیدہ ایک حیرت خیز چیز ہے۔ کون کہتا مگر وہ جس میں حسن انتخاب اور حقیقت شناسی کا حسینؑ کی طرح احساس ہوتا۔ اچھی بات کی فقاہت کے لیے حسینؑ کا سا جوش ہوتا۔ حسینؑ کی ایسی حاضر دماغی اور حسن اظہار ہوتا۔ اور کسے حق تھا کہ وہ اس حیرت خیز قدرت الٰہی کی حسینؑ کے علاوہ مدح کرتا۔ اس قصیدہ کے پیچھے حسینؑ کے الفاظ اور ان میں حسینؑ کا شاندار لہجہ اور لہجہ کا ملوکانہ اور نبیانہ طرز ادا ہے۔

اس کے بعد مجھے کیا اور کہنا ہے بجز اس کے کہ حسینؑ نے جنگ بھی کی۔ جنگ کے معنی یہ ہیں کہ حسینؑ نے یہ ارادہ فرمایا کہ جب تک ہم یا ہمارا کوئی رفیق تلوار اٹھا سکے اس وقت تک دشمن ہم پر قابض نہ ہو، جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی حیات اور دفعیہ کے اسباب کی ممکن موجودگی تک ہم حفاظت کی کوشش سے باز نہ رہیں۔ کہنے میں چھوٹی سی بات ہے۔ ذرا خیال کرو کہ اس وقت آدمیوں کے جنگل میں صرف ایک حسینؑ ایک طرف ہیں اور دوسری طرف ہزارہا دشمن ہیں لیکن حسینؑ کی تلوار اس طرح بلند ہے جس کی ہیبت کا دشمن ادب کر رہا ہے۔ اور اس تنہا پر بھی تیر، پتھر اور آگ پھینک رہا ہے۔ وقت تھا کہ امیرالمومنین کے لیے لا فتی الا علی لا سیف الا ذوالفقار کہا جاتا۔ اس لیے کہ اس وقت سوائے علیؑ کے ہاتھ اور ذوالفقار کے کوئی دوسرا ہاتھ اور تلوار اسلام کے وقار کے تحفظ کے لیے بلند نہ تھی۔ آج وقت تھا کہ امیرالمومنین ہی اپنے فرزند کو داد دیتے کہ تیرا ہاتھ اور تلوار سخت تر وقت میں بلند ہے!۔ تمام بیانات کا ایک ہی آہنگ ہے کہ اس روح شجاعت کا حملہ صفیں لپیٹ دیتا تھا اور دشمن گرتے پڑتے ایک دوسرے پر بھاگتے تھے۔ یہ حسینؑ کے نفس عظیم کی ہیبت اور ان کے ارادہ کی قوت تھی۔ جس کا کوئی آنکھ اور دل مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ دشمن بھی متحیر تھا۔

دیکھنے والے انگشت بدنداں تھے اور کہہ رہے تھے کہ تم نے حسینؑ سے زیادہ کوئی بہادر دیکھا ہے جس کا گھر اس کے سامنے تباہ ہو گیا اور وہ اس طرح لڑ رہا ہے کہ گویا اس پر غم کے پہاڑ ہی نہ ٹوٹے تھے۔ گویا یہ حسینؑ ہی دوسرے تھے۔ وقت آیا تھا کہ دشمن اپنے سپاہیوں کو نام اور خاندان کی رسوائی کے تذکرہ سے ابھارتا۔ یا کہتا کہ ان کے ہاتھ سے مارا جانا افتخار ہے اور حسینؑ کا گھوڑا جس وقت دور تک دشمن کا تعاقب کر کے میدان صاف کر دیتا ہے تو حسینؑ باگ روک لیتے ہیں اور فرماتے ہیں لاحول ولا قوۃ الا باللہ دیکھتے ہیں کہ ہم تنہا ہیں۔ ہر طرف میدان صاف ہے۔ رجز پڑھتے ہیں۔ اپنے خون آلود رفقا کی لاشیں دیکھ کر انھیں لازوال الفاظ میں مخاطب فرماتے ہیں یا خیمہ میں جو آتے ہوں۔ زخموں کا شمار اس سے کرو کہ بیٹا باپ کو نہیں پہچانتا۔ جس وقت حضرتؑ سید سجادؑ کو وداع کرنے جاتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ کوشش عبث ہے کہ حضرتؑ کے جسم اطہر پر کس قدر زخم لگے تھے۔ ایک زخم دوسرے کی صورت قائم نہ رکھتا تھا۔ اور پھر پامالی نے تمام جسم مبارک لختہ خون بنا دیا تھا۔ حسینؑ نے یہ بھی دکھا دیا کہ ہم کیونکر فرات تک پہنچ سکتے ہیں۔ دشمن کا عجز تھا کہ اس نے بہانہ کیا۔ بہانہ نے حسینؑ کی غیرت ظاہر کی۔ ہم تاریخ کے خاموش لفظوں سے حسینؑ کو سمجھ رہے ہیں لوگ تھے جن کے سامنے یہ شاندار تصویر ہر صورت سے کھڑی تھی۔

لڑ چکے حسینؑ۔ دور کے سہ پہلو تیرے نے روئے مبارک زخمی کیا۔ پہلو پر بھی کاری زخم لگا۔ اور نیزے کے کئی شدید زخم کھائے۔ حقیقت یہ کہ بے شمار حربوں کے وار کسی وقت نہ رُکے تھے۔ دشمن کوشش کرتا جاتا وہ قریب ہوتا یا نہ ہوتا یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ جس وقت حضرتؑ بے حد مجروح ہو گئے تھے گھیرنے والے معمولی سپاہی نہ تھے بلکہ افسران لشکر تھے جو گرد تھے اس لیے ادنیٰ سپاہی کسی بڑے انعام کی امید نہ کر سکتا۔ یہ سرداران لشکر تھے۔ جنھیں انعام کی لالچ اس شدید گناہ کے لیے قریب لا رہی تھی۔ پھر بھی جب حضرتؑ کسی طرف کا ارادہ ظاہر فرماتے تھے سب بھاگتے تھے اور کوئی نامرد دشمن انبوہ میں وار کرتا جاتا تھا۔ ستون الٰہی جنبش میں آیا۔ زین خالی ہو گیا۔ مگر جسم اقدس زمین پر نہیں ہے۔ بلکہ ان بے شمار تیروں پر ہے۔ جو جسم اقدس پر لگے تھے۔ پھر حسینؑ نے اپنے کو سنبھالا۔ کسی دشمن کو قریب دیکھ کر گھٹنے کے بل کھڑے ہوتے ہیں اور اس کے بھاگنے کے ساتھ پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ دور کے زخم لگتے جاتے ہیں۔ اس وقت ایک چھوٹا سا بچہ دوڑتا ہوا آیا۔ آیا یہ دیکھ کر کہ کوئی دشمن چچا کے فرق مطہر پر وار کیا چاہتا ہے۔ دو چھوٹے چھوٹے ہاتھ آگے کر دیے۔ بے رحم دشمن کی تلوار چلی اور بچہ کا خون حسینؑ پر چھڑ گیا۔ اب اتنی قوت بھی نہ تھی کہ دست دعا حرکت کر سکتے۔ لیکن زبان حرکت میں تھی۔ آہستہ آہستہ فرما رہے تھے: صبراً علیٰ قضائك یا رب لا الٰہ سواك یا غیاث المُستغیثین (اے فریادیوں کے مددگار سوا تیرے کوئی خدا نہیں ہے۔ تیرے حکم پر صبر کرتا ہوں۔) یہی حسینؑ تھے اور اسی اللہ کی حکومت کو مستند اور اپنے خون سے قائم کرنے کے لیے حسینؑ آج وعدہ وفا کر رہے تھے۔ وہ خون بہ گیا جو شیر سیدۃ النساء سے بنا تھا۔ خدا کے سجدہ میں بھی حسینؑ کا آخری شغل تھا۔ اور خدا کا بزرگ نام حسینؑ کی زبان اقدس پر آخری لفظ تھا۔ اور حسینؑ کی چشم مبارک کی آخری حرکت یہ تھی کہ خیمہ کی طرف اٹھ گئی تھی۔ غیرت حسینی۔ دشمن فتح کی خوشی میں شادیانے بجا رہا تھا یا فاتحانہ نعرے بلند کر رہا تھا۔ لیکن ان دشمنان انسانیت کو کیا خبر تھی کہ تمھارے طبل و بوق کی صدا چند لمحوں میں ڈوب جائے گی اور حسینؑ کے ماتمی باجوں پر ابدالآباد تک ان کے غم کا بار رہے گا۔ فاتحانہ صدائیں ڈوب جائیں گی لیکن حسینؑ کے غم کی صدا

انسانی جماعتوں سے بلند ہوتی جائے گی۔ لہریں پھیلیں گی۔ یہاں تک کہ فضا اور عالم اثیری اس کی تھراہٹ سے بھر جائے گا اور یہ تھراہٹ کبھی ساکن نہ ہوگی بلکہ ہر زمانہ اسے محسوس کر رہا ہوگا۔ اور زمانہ کا تازہ غم اسے چھیڑتا جائے گا۔ کوئی حسینؑ کا نام لے گا اور معلوم ہوگا کہ دشت و در فضا اور ملا سے جواب مل رہا ہے۔ خاموش اسباب فطرت جواب دیں گے کہ ہم نے حسینؑ کا نام سنا ہے۔ حسینؑ کا غم جزو زمان ہوگیا۔

حسینؑ ان کی چھوٹی سی خالص جماعت اور ان کے دشمنوں کے متعلق تاریخ عالم اور دنیا کی قومیں اپنا فیصلہ دے چکیں۔ لیکن یہ فیصلہ تو ہماری ضمنی تائید ہے ہم اپنے تصفیہ کے لیے غیر قوموں کے محتاج نہیں ہیں۔ اگرچہ مشکور ہوں۔

ہمیں تو حسینؑ کے افعال کو سبق آموزی کی حیثیت سے دیکھنا ہے۔ جس کے رحم سے دشمن اور جانور فیضیاب ہوتے ہیں جو جوش میں ہوش سے کام لیتا ہے۔ جس کا اعتدال طبیعت کبھی ضائع نہیں ہوتا اور جو اصول کے سامنے کسی چیز کی وقعت نہیں کرتا۔ بلکہ سب کچھ قربانیاں کر دیتا ہے۔ حسینؑ کی شہادت اسباب عروج و زوال اسلام کا خلاصہ ہے۔ عروج حسینؑ بنا سکتا ہے۔ زوال ایسے لوگ مہیا کر سکتا ہے جو اپنے بہترین فرد کو ضائع کر دیں۔

آج دنیا کا مشکل سے کوئی گوشہ ہے جہاں حسینؑ کے نام سے کوئی واقف نہ ہو اور جوش و ہمدردی نہ پیدا ہوتی ہو۔ مظلوم کی قبر اگرچہ ایک زمانہ کے سیاسی تشدد کے تابع رہی۔ باوجود اس کے کہ لاش اور سر میں تفرقہ رہا لیکن اس مظلوم کا نام اس ریگستانی تنہائی سے جسے کربلا کہتے ہیں بلند ہوا۔ وہاں وہاں ایک نشان قبر اور روضہ بن گیا جہاں کسی نے نام لیا اور ہمدردوں کی جماعت اس طرح اپنے وقت، اپنی توجہ اور اپنے مال کو ان کے تذکرے کے لیے صرف کرنے لگی۔ گویا اس کی طبعی پسند کے لیے اس سے خوشگوار فرض کوئی دوسرا نہ تھا۔ کیا ہوا اگر حسینؑ کی قبر مطہر کے لیے مختلف روایتیں ہیں۔ کیا ہوا اگر سر اور لاش کے یکجا دفن ہونے کے متعلق بیانات مختلف ہیں۔ کیا ہوا اگر کوئی متوکل پھر پیدا ہو جائے یا ایسے اتفاقات ہوں کہ ہم کو حسینؑ کی قبر مطہر کا نشان نہ ملے۔ حسینؑ کی قبر تو اس بلند اور مخصوص زمین میں ہے جس سے بڑھ کر مدفن تلاش کرنا بے سود ہے۔ اور وہ جگہ شرافت پسند انسانوں کا دل ہے۔

حسینؑ کا نام اس وقت بھی فخر سے لیا جائے گا جس وقت تک ایک انسان بھی رہے گا۔ اور استقلال و حق روی کا نام لیا جائے گا۔

اولوالعزم بادشاہ اور شہنشاہوں کا نہ کوئی نام لیتا ہے اور نہ کوئی ان کا زائر ہے لیکن مظلوم حسینؑ کی زیارت کرنے والوں کے سیلاب کی تعداد بارہ صدیوں سے برابر ترقی پذیر ہے۔ اور یہ سیلاب ذرائع آمد و رفت کے ساتھ بڑھتا جائے گا۔ انسانوں کی جماعتیں اس نشان کو دیکھنے جائیں گی جہاں شرافت، شجاعت، انسانی ہمدردی، اصول کی حفاظت اور خدا کی ناقابل مقابلہ اطاعت اور اعتبار کی روح دفن ہے۔ جائیں گے۔ ادب سے کھڑے ہوں گے۔ خاموشی سے غور کریں گے اور روح مطہر کا سایہ فگن عکس حاصل کریں گے۔ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے الٹے پاؤں پھریں گے اور کہیں گے کہ اس طرح بھی انسان اور قومیں زندہ ہو سکتی ہیں جس طرح حسینؑ ہوئے۔ ان کی مدح اس لیے نہ ہوگی کہ یہ دنیاوی عیش و نعمت کے گہوارے میں تھے بلکہ اس لیے کہ یہ مصیبت اور امتحانوں میں عظیم الشان تھے۔ حسینؑ کی شہادت انفرادی اور قومی حیات کا مقدمہ ہے۔ حسینؑ اس لیے شہید ہوئے کہ شرافت اور انسانیت کا مرتبہ بلند کریں۔

یہ ذات ہے کہ جس جس طرح مسلمانوں میں حب وطن، حب قوم، حب ملت، حب دین، ترقی کرتی جائے گی اس اس طرح حسینؑ کی محبت بھی بڑھتی جائے گی۔ جہل نہ حسینؑ کو بجھائے گا نہ ان کا نام بلند کرے گا۔ بلکہ روشنی کی عادت اس جسم روشن کے دیکھنے میں مدد دے گی۔

حسینؑ نے اپنی شہادت سے یہ بجھا دیا کہ ان کی خاصہ اقدس ہر زمانہ میں اسلام کی آخری امید ہے۔ حسینؑ کی شہادت دین کی تازہ حیات کی بنیاد تھی۔ دین کی ان صورتوں یا بھولی ہوئی صفات کو جن کے پہچانتے کا ذریعہ مفقود ہو گیا تھا۔ حسینؑ نے اپنے حیرت خیز عمل سے پہنچوا دیا۔ دین کی نا قابل سہو شرح کر دی۔ جس کے اصولاً غور اور مطالعہ میں وہ گرمی اور بیان خیزی حاصل نہ ہوتی جو ان مثالوں سے ہوئی جو حسینؑ نے دیں۔ ہو سکتا ہے کہ مسلمان مختلف حیثیتوں کے اختلاط اور اثرات سے اپنا اسلامی مزاج بھول جائیں۔ یا وہ کسی روش اور اسلامی روش میں فیصلہ نہ کر سکیں۔ اور اسی لیے حسینؑ کی ذات اقدس وہ بلند روشنی ہوگی جو بھولے ہوؤں کو راستہ بتا دے گی۔ حسینؑ مردہ ہڈیوں کے مرتیل ہیں۔

سلام ہو تم پر اے حسینؑ۔ تمھاری حیات کے مصور ایک شکستہ قلم کا اسلام۔ ایک ناچیز سوانح نویس کا اسلام
جس کی حیرت اس کے ہوش پر غالب آتی جاتی ہے۔ اور وہ مدہوشی میں کہہ رہا ہے
کہ تمھاری حیات یہ صاف نہ بجھاتی تھی! تم کیوں پیدا کیے گئے تھے۔
تمھاری شہادت بجھاتی ہے کہ تم کیوں پیدا کیے گئے تھے۔
حسینؑ نہ ہوتے اگر اسلام نہ ہوتا۔ تا شکستہ
لطافت اسلام نہ ہوتی
اگر حسینؑ نہ
ہوتے

○

ریاض

۲ر محرم ہفتہ ۹ بجے دن ۱۳۶۶ھ۔ ۲۱ر نومبر ۱۹۴۶ء

تمت

خطاطی اشاعت اول: قلم حبشی بناری ساکن محلہ مقیم گنج شہر بنارس (بھارت)